فہرست

طلوع — محمد طفیل
تصریحات — محمد طفیل

مکتوبات منجانب:

۱ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں
۲ — سرونسٹن چرچل
۳ — جنرل آئزن ہاور
۴ — ہیرلڈ میکملن
۵ — برٹرینڈ رسل
۶ — ایلیا اہرن برگ
۷ — پنڈت جواہر لعل نہرو
۸ — ٹی - ایس - ایلیٹ
۹ — ایذرا پاؤنڈ
۱۰ — لارڈ ڈل ہوزی
۱۱ — ہر میجسٹی فرح دیبا پہلوی
۱۲ — ہز ہائینس آغا خاں
۱۳ — ڈاکٹر رادھا کرشنن
۱۴ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین
۱۵ — رابرٹ فراسٹ
۱۶ — جیمز تھربر
۱۷ — ڈبلیو - ایس ماہم
۱۸ — الڈس ہکسلے
۱۹ — اے - ای سٹیونسن
۲۰ — سمرسٹ ماہم
۲۱ — فیض احمد فیض
۲۲ — [illegible]
۲۳ — محمد [illegible]
۲۴ — [illegible]
۲۵ — چینی سفیر
۲۶ — [illegible]
۲۷ — امریکی سفیر
۲۸ — انڈونیشی سفیر
۲۹ — سفیر متحدہ عرب جمہوریہ
۳۰ — سفیر سعودی عرب
۳۱ — ترکی سفیر
۳۲ — لبنانی سفیر
۳۳ — سوڈانی سفیر
۳۴ — [illegible]
۳۵ — [illegible]
۳۶ — [illegible]
۳۷ — [illegible]
۳۸ — [illegible]
۳۹ — سفیر [illegible]
۴۰ — ہائی کمشنر [illegible]
۴۱ — سفیر سوئٹزرلینڈ
۴۲ — ہائی کمشنر [illegible]

مضامین

۱ — آپ بیتیوں کی اہمیت — مولانا غلام رسول مہر ، ۳۶
۲ — آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو — مولانا علاء الدین سالک ، ۴۰
۳ — آپ بیتی — ڈاکٹر رشید احمد ، ۹۰
۴ — آپ بیتی کی مختلف صورتیں — یوسف جمال انصاری ، ۹۸
۵ — آپ بیتی کیا ہے ؟ — ریحانہ خاتون ، ۹۳

سربراہِ مملکت

۱ — قائد اعظمؒ — ۳
۲ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان — ۱۵

---

۳ — تیمور گورگانی — ۱۵۳
۴ — ظہیر الدین بابر — ۳۲

۷۰ — شیخ عبدالقادر ۷۲۰
۷۱ — ابوالکلام آزاد ۸۳۵
۷۲ — چودھری افضل حق ۵۸۰
۷۳ — عطاءاللہ شاہ بخاری ۷۱۵
۷۴ — سر راس مسعود ۴۳۹
۷۵ — سر سید رضا علی ۳۱۰
۷۶ — نواب آغا مرزا دہلوی ۶۳۳
۷۷ — سید ہمایوں مرزا ۱۷۸۹
۷۸ — سر اسمٰعیل مرزا ۷۶۳
۷۹ — راجہ غضنفر علی ۱۸۱۳
۸۰ — سر ظفر اللہ خاں ۹۶۲
۸۱ — شیخ محمد عبداللہ ۹۰۳
۸۲ — ڈاکٹر اشرف ۱۵۸۲
۸۳ — خلیق الزمان ۱۷۳۳
۸۴ — میر لائق علی ۱۷۱۲
۸۵ — شورش کاشمیری ۱۲۱۱
۸۶ — بیج ناتھ جج ۵۷۰

غیر ملکی ادیب

۸۷ — روسو ۱۵۷۵
۸۸ — جان کیٹس ۹۷۳
۸۹ — دوستووسکی ۱۶۳۳
۹۰ — گورکی ۸۱۳
۹۱ — چیخوف ۷۸۳
۹۲ — آسکر وائلڈ ۹۱۹
۹۳ — برنارڈ شا ۱۸۳۱
۹۴ — رابندر ناتھ ٹیگور ۱۶۷۶
۹۵ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۲۴۹
۹۶ — ایرسکن کاڈول ۹۶۹
۹۷ — جان اپڈائیک ۹۸۴
۹۸ — ہرمن ووک ۹۳۷
۹۹ — ونگ سے ۹۸۵
۱۰۰ — یوانگ آنگ ۹۸۷
۱۰۱ — من مظفر ناتھ گپت ۱۵۹۱
۱۰۲ — شیدا گجراتی ۶۷۷
۱۰۳ — سید حسین ناصر ۹۸۸
۱۰۴ — رابین چاچیم مناہیم ۹۹۰

۳۷ — میر غلام علی آزاد بلگرامی ۲۵۳
۳۸ — مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶
۳۹ — مولانا عبید اللہ سندھی ۱۳۲۰
۴۰ — نواب حبیب الرحمن شروانی ۱۶۳۸
۴۱ — مولانا حسین احمد مدنی ۲۶۳
۴۲ — سید سلیمان ندوی ۲۷۷
۴۳ — اسلم جیراجپوری ۱۳۰۹
۴۴ — مولوی محمد شفیع ۱۳۵۸
۴۵ — عبد الماجد دریابادی ۱۰۶۷
۴۶ — ابو الاعلیٰ مودودی ۱۳۸۵

مؤرخ

۴۷ — ملا عبد القادر بدایونی ۳۰۳
۴۸ — ابو الفضل ۱۶۷۱
۴۹ — مولوی رحمٰن علی ۱۲۸۳
۵۰ — حکیم سید عبد الحی ۱۳۸۶
۵۱ — فقیر محمد جہلمی ۱۳۸۰
۵۲ — جسٹس امیر علی ۲۸۵
۵۳ — منشی ذکاء اللہ دہلوی ۸۳۳
۵۴ — مولوی کریم الدین ۲۵۲
۵۵ — لالہ سری رام ۵۵۷
۵۶ — عبد الرزاق کانپوری ۲۶۵
۵۷ — محمد دین فوق ۹۷۰

مصلحین ، سیاسین

۵۸ — میرزا ابو طالب اصفہانی ۶۱۳
۵۹ — مسیح الدین خاں سفیر اودھ ۳۷۰
۶۰ — محمد عنایت حسین خاں ۱۷۷۵
۶۱ — سر سید احمد خاں ۱۱۱، ۳۲۵
۶۲ — دادا بھائی نوروزجی ۳۱۳
۶۳ — نواب محسن الملک ۳۳۲
۶۴ — نواب وقار الملک ۳۳۳
۶۵ — جسٹس محمود ۶۳۸
۶۶ — گاندھی ۳۴۶
۶۷ — مولانا محمد علی جوہر ۷۷۸
۶۸ — ڈاکٹر محمد اقبال ۲
۶۹ — مولانا ظفر علی خاں ۷۳۱

١٠٥ —	پال جون جرجفیس	٩٩١
١٠٦ —	زکی ولیدی توغن	٩٩٢
١٠٧ —	فندی کوغلو	٩٩٣
١٠٨ —	لیونیر برشین	١٣٨٢
١٠٩ —	محمد معین	١٨٥١

— ادباء، شعراء

١١٠ —	میر تقی میر	١٨
١١١ —	میر اثر	٢٨٧
١١٢ —	عبدالقادر بیدل	٢٢١
١١٣ —	رجب علی بیگ سرور	٣١
١١٤ —	حیدر بخش حیدری	١٢٨٧
١١٥ —	کاظم علی جوان	١٢٨٩
١١٦ —	نہال چند لاہوری	١٢٨٣
١١٧ —	بہادر علی حسینی	١٢٨٣
١١٨ —	شیخ حفیظ الدین	١٢٨٣
١١٩ —	مرزا علی لطف	١٢٨٥
١٢٠ —	میر شیر علی افسوس	١٢٩٣
١٢١ —	سید مظفر علی اسیر لکھنوی	١٢٩٦
١٢٢ —	خواجہ قمر الدین خاں راقم	١٢٩١
١٢٣ —	سراج الدین علی خاں آرزو	٣٢٩
١٢٤ —	اسد اللہ خاں غالب	٣٥٦
١٢٥ —	مومن خاں مومن	٣٩٧
١٢٦ —	ظہیر دہلوی	٥٠٢
١٢٧ —	مظفر علی سندیلوی	٢٩٧
١٢٨ —	منیر شکوہ آبادی	٣٠٣
١٢٩ —	مولوی غلام قادر تمکین رامپوری	٧٠
١٣٠ —	عبدالغفور نساخ	٥٢٣
١٣١ —	صفیر بلگرامی	١٥٠٠
١٣٢ —	سید غلام حسنین بلگرامی	١٥٠٣
١٣٣ —	میر حسن دہلوی	١٥٦٧
١٣٤ —	جلال لکھنوی	١٥٠٦
١٣٥ —	تسلیم لکھنوی	١٥٠٣
١٣٦ —	مصطفیٰ خاں شیفتہ	١٦٦٢
١٣٧ —	غلام ہمدانی مصحفی	١٣٨٦
١٣٨ —	سعادت یار خاں رنگین	١٣٨٣
١٣٩ —	محمد حسین آزاد	١٨٢٠

۱۴۰	ڈپٹی نذیر احمد	۴۳
۱۴۱	داغ دہلوی	۱۶۸۳ ، ۴۳۰
۱۴۲	امیر مینائیؒ	۱۳۹۳
۱۴۳	مولانا حالی	۲۸۱ ، ۴۳۴
۱۴۴	مولانا شبلی	۴۲۶ ، ۴۶۳
۱۴۵	مولوی عبدالحق	۱۳۵
۱۴۶	ریاض خیرآبادی	۱۵۵
۱۴۷	نظم طباطبائیؒ	۲۰۹ ، ۵۷۳
۱۴۸	وحیدالدین سلیم	۴۳۷
۱۴۹	عبدالحلیم شرر	۴۳۶ ، ۵۶۴
۱۵۰	اکبر الہ آبادی	۴۲۸
۱۵۱	منشی رحمت اللہ رعد	۴۳۶
۱۵۲	میر ناصر علی	۴۳۷
۱۵۳	ہوش بلگرامی	۲۱۶
۱۵۴	عزیز مرزا	۵۶۵
۱۵۵	احمد علی شوق قدوائیؒ	۵۶۶
۱۵۶	مرزا رسوا لکھنوی	۵۶۷
۱۵۷	پیارے لال آشوب	۵۶۹
۱۵۸	نکو برت لال ورمن	۵۷۱
۱۵۹	امداد امام اثر	۵۷۲
۱۶۰	مرزا سلطان احمد	۵۷۶
۱۶۱	مولوی محبوب عالم	۵۷۹
۱۶۲	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵۸۶
۱۶۳	شاد عظیم آبادی	۶۰۵
۱۶۴	جگر بسوانی	۶۸۵
۱۶۵	اطہر ہاپڑوی	۶۹۰
۱۶۶	خواجہ غلام الحسنین	۷۳۴
۱۶۷	ناطق لکھنوی	۷۴۹
۱۶۸	جالب دہلوی	۷۵۶
۱۶۹	مولوی مہیش پرشاد	۷۶۰
۱۷۰	امجد حیدرآبادی	۷۹۹
۱۷۱	عنایت اللہ دہلوی	۱۳۹۶
۱۷۲	احسن مارہروی	۱۴۰۶
۱۷۳	دیا نرائن نگم	۱۴۳۰
۱۷۴	پریم چند	۱۸۳
۱۷۵	آسی الدنی	۱۴۳۲
۱۷۶	دل شاہجہانپوری	۱۴۳۵

۱۷۷ — عبدالمجید سالک [illegible]
۱۷۸ — اختر شیرانی [illegible]
۱۷۹ — یگانہ چنگیزی [illegible]
۱۸۰ — ہادی مچھلی شہری [illegible]
۱۸۱ — سیماب اکبر آبادی [illegible]
۱۸۲ — علی اختر اختر [illegible]
۱۸۳ — رضا علی وحشت [illegible]
۱۸۴ — آزاد انصاری [illegible]
۱۸۵ — نوح ناروی [illegible]
۱۸۶ — فانی بدایونی [illegible]
۱۸۷ — تاجور نجیب آبادی [illegible]
۱۸۸ — جلیل مانک پوری [illegible]
۱۸۹ — آغا حشر [illegible]
۱۹۰ — صفی لکھنوی [illegible]
۱۹۱ — ثاقب لکھنوی [illegible]
۱۹۲ — حسرت موہانی [illegible]
۱۹۳ — جگر مراد آبادی [illegible]
۱۹۴ — سعادت حسن منٹو [illegible]
۱۹۵ — مجید لاہوری [illegible]
۱۹۶ — ماسٹر [illegible] [illegible]
۱۹۷ — شوکت تھانوی [illegible]
۱۹۸ — چودھری محمد علی ردولوی [illegible]

۱۹۹ — نیاز فتح پوری [illegible]
۲۰۰ — رشید احمد صدیقی [illegible]
۲۰۱ — جوش ملیح آبادی [illegible]
۲۰۲ — حفیظ جالندھری [illegible]
۲۰۳ — فراق گورکھپوری [illegible]
۲۰۴ — مجنوں گورکھپوری [illegible]
۲۰۵ — قاضی عبدالودود [illegible]
۲۰۶ — لطیف الدین احمد [illegible]
۲۰۷ — مسعود حسن رضوی [illegible]
۲۰۸ — اثر لکھنوی [illegible]
۲۰۹ — حکیم احمد شجاع [illegible]
۲۱۰ — عبدالقادر سروری [illegible]
۲۱۱ — ڈاکٹر اعجاز حسین [illegible]
۲۱۲ — ڈاکٹر سید عبداللہ [illegible]

۲۱۳ — جوش ملسیانی ۱۱۳۳
۲۱۴ — تلوک چند محروم ۱۱۰۸
۲۱۵ — اختر اورینوی ۱۰۹۷
۲۱۶ — ڈاکٹر عندلیب شادانی ۱۲۶۶
۲۱۷ — آنند نرائن ملا ۱۲۸۲
۲۱۸ — شوکت سبزواری ۱۱۵۰
۲۱۹ — نصیر الدین ہاشمی ۱۳۳۴
۲۲۰ — میکش اکبر آبادی ۱۱۹۰
۲۲۱ — دیوان سنگھ مفتون ۱۱۹۸
۲۲۲ — شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۱۷۸۳
۲۲۳ — صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۱۰۹۳

۲۲۴ — کرشن چندر ۱۰۳۳
۲۲۵ — عصمت چغتائی ۱۰۳۷
۲۲۶ — راجندر سنگھ بیدی ۱۷۶۷
۲۲۷ — قرۃ العین حیدر ۱۷۳۱
۲۲۸ — خواجہ احمد عباس ۱۰۳۶
۲۲۹ — ممتاز مفتی ۱۱۳۱
۲۳۰ — ہاجرہ مسرور ۱۰۳۷
۲۳۱ — کنہیا لال کپور ۱۱۳۶
۲۳۲ — خدیجہ مستور ۱۱۰۵
۲۳۳ — شاہد احمد دہلوی ۱۱۱۳
۲۳۴ — منظور الٰہی ۱۳۳۵
۲۳۵ — نثار احمد فاروقی ۱۳۷۶
۲۳۶ — میرزا ادیب ۱۱۷۶
۲۳۷ — اختر انصاری دہلوی ۱۳۹۳
۲۳۸ — گوپی چند نارنگ ۱۲۰۷
۲۳۹ — ڈاکٹر گیان چند ۱۱۷۰
۲۴۰ — ڈاکٹر محمد حسن ۱۱۳۷
۲۴۱ — تقی محمد خاں خورجوی ۱۳۰۳
۲۴۲ — ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۱۲۶۹
۲۴۳ — شکیلہ اختر ۱۳۵۲
۲۴۴ — جیلانی بانو ۱۲۵۸

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر
ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا

آپ بیتی نمبر

اکبر الہ آبادی

محمد علی ردولوی

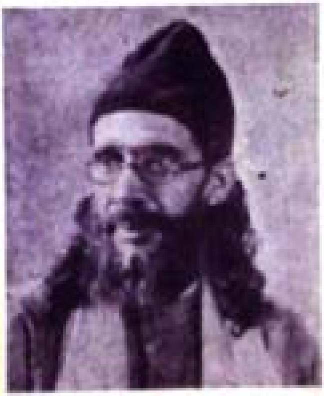

خواجہ حسن نظامی

شاد عظیم آبادی

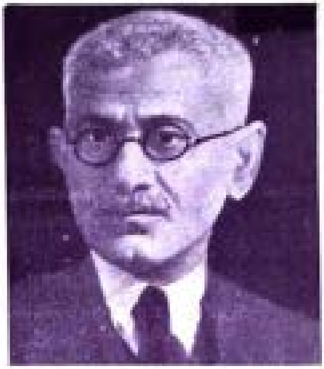
فرحت اللہ بیگ

جلیل لکھنوی

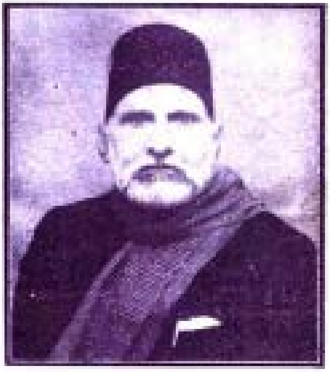
محمد دین فوق

ہوش بلگرامی

احسن مارہروی

صفی لکھنوی

[illegible]

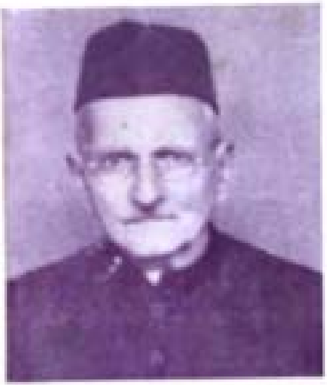

[illegible]

[illegible]

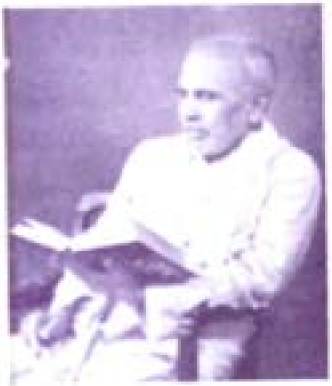

[illegible]

[illegible]

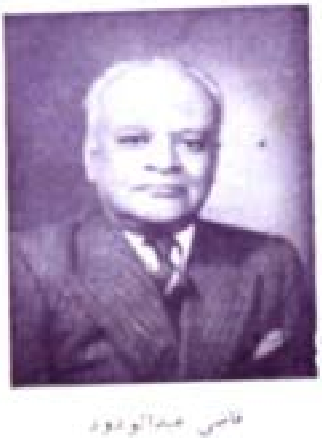

قاضی عبدالودود

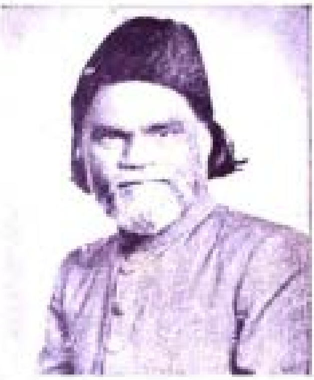

جگر مراد آبادی

فراق گورکھپوری

جوش ملسیانی

مجنوں گورکھپوری

اختر اورینوی

شوکت تھانوی

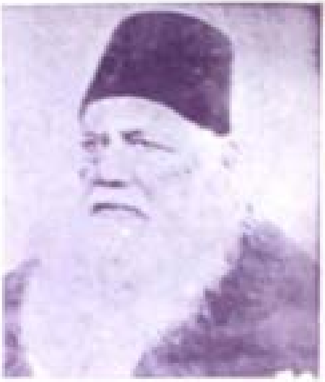

سر سید

[illegible]

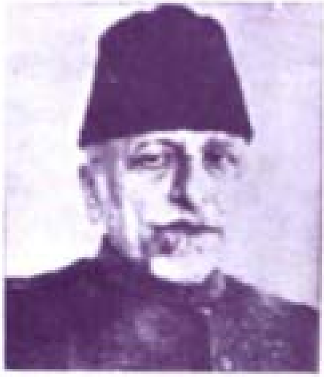

ابو الکلام

[illegible]

سر رضا علی

[illegible]

ڈپٹی نذیر احمد

صفیر بلگرامی

امیر لکھنوی

امیر مینائی

حضرت ریاض خیرآبادی

ریاض خیر آبادی

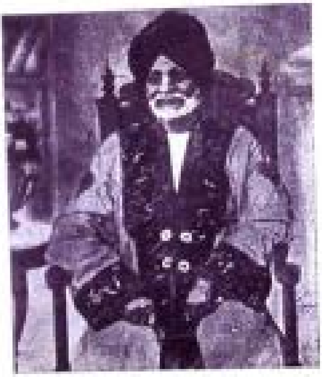

میر ناصر علی

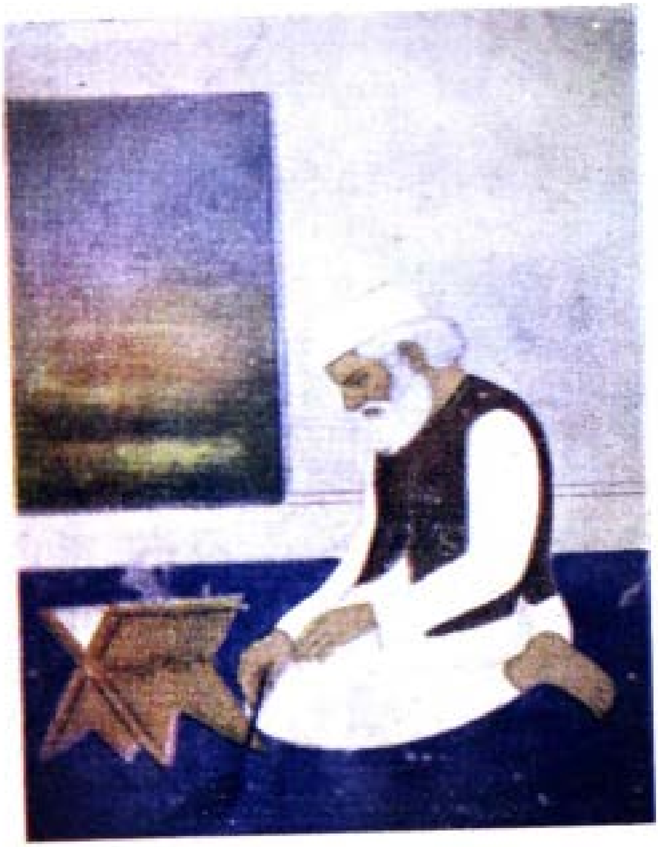

غلام ہمدانی مصحفی

ڈاکٹر اقبال

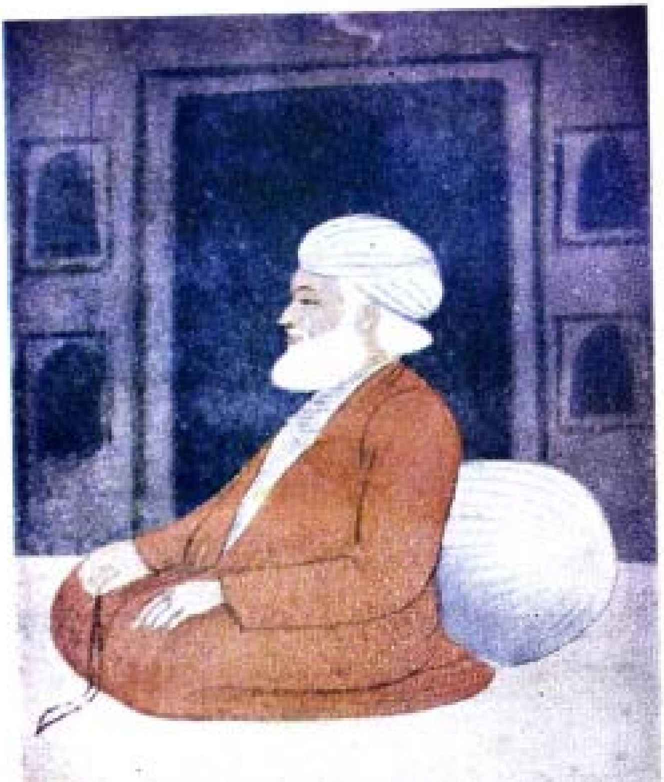

مرزا مظہر جان جاناں

حفیظ جالندھری

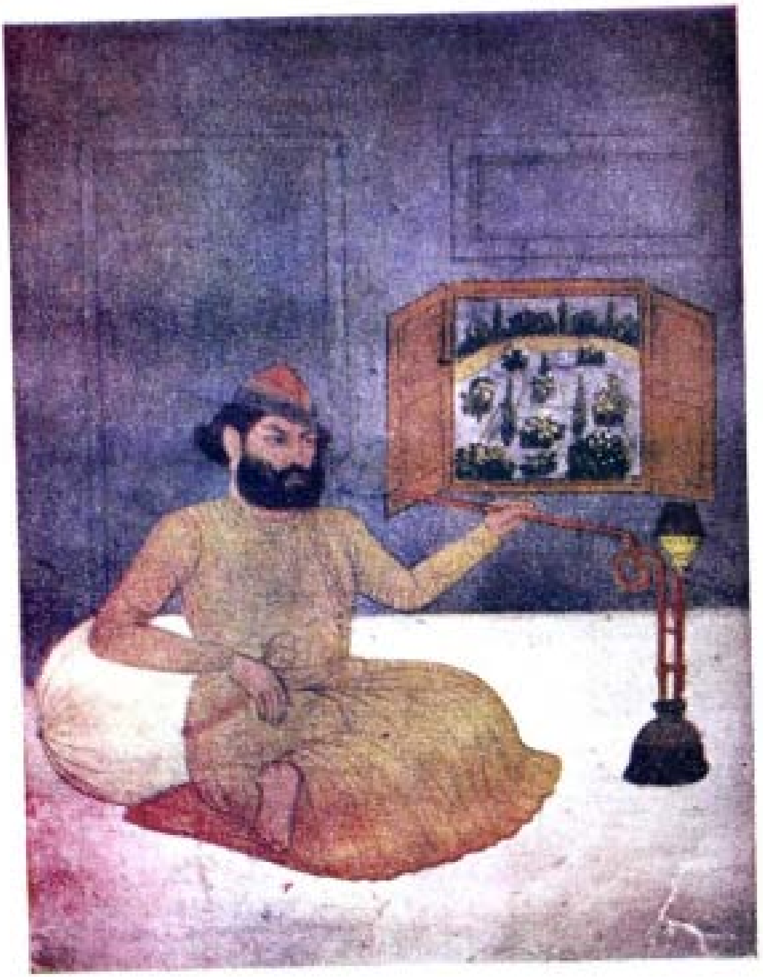

میر تقی میر

جوش ملیح آبادی

غالب

نیاز فتح پوری

کرشن چندر

منٹو

عصمت

قرۃ العین

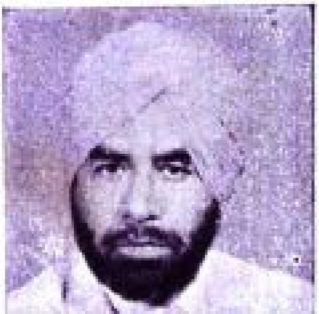

راجندر سنگھ بیدی

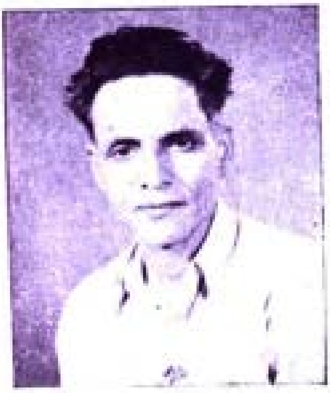

ممتاز مفتی

جیلانی بانو

ھاجرہ مسرور

شاہد احمد دہلوی

خدیجہ مستور

اختر انصاری دہلوی

شوکت سبزواری

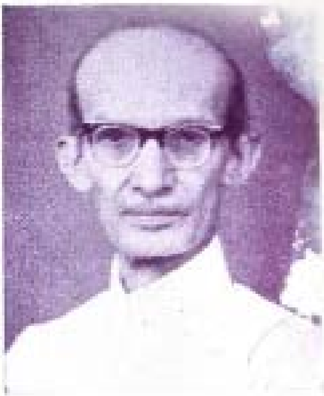

نصیرالدین ہاشمی

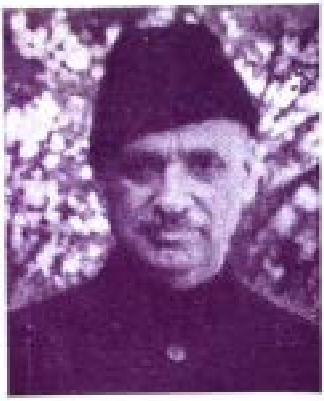

عندلیب شادانی

ڈاکٹر محمد حسن

منظور الٰہی

ڈاکٹر گیان چند

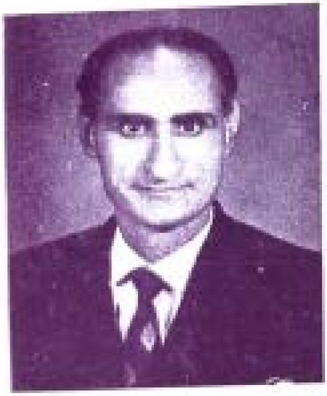

مرزا ادیب

محمد طفیل (مدیر)

ہرمن وُوک

ڈیئر مسٹر طفیل!

خط کا شکریہ۔ لیجئے، تین چیزیں بھیج رہا ہوں۔ میری سوانح حیات جو میرے پبلشروں نے لکھی ہے، میری تصویر جس پر میرے دستخط بھی ہیں اور اپنی مختصر سی سوانح جو میں نے خود لکھی ہے۔ اُمید ہے ان سے آپ کی فرمائش پوری ہو جائے گی۔ پبلشروں کی لکھی ہوئی میری سوانح غالباً طویل ہوگی۔ اپنی ضرورت کے مطابق مختصر کر لیجئے گا۔ چند ایک تفصیلات تو میں خود ہی مختصراً لکھے دیتا ہوں اس سے آپ کے لیے تلخیص کا کام آسان ہو جائے گا۔

میں ۱۹۱۵ء میں نیویارک سٹی میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والدین روس کے یہودی مہاجر تھے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک میں ریڈیائی فیچر اور ڈرامے لکھتا رہا۔ جنگ نے مجھے گھر نہ بیٹھنے دیا۔ میں بحریہ میں بھرتی ہو گیا اور چار برس تک بحریہ میں ڈیک آفیسر رہا۔ جنگی خدمات اور کارناموں کے صلے میں مجھے پانچ تمغے ملے۔ میں نے سمندری زندگی کے دوران، جب جنگ کی قیامت خیزی عروج پر تھی، ایک ناول "اُرورا ڈان" لکھنا شروع کیا جسے بحریہ سے نکل کر مکمل کیا۔ لٹریچر کے ایک کلب نے اس ناول کو منتخب کتب کی فہرست میں لے لیا اور اس طرح میری پہلی ہی ادبی کاوش نے میرے لیے ادبی دنیا میں مقام پیدا کر دیا۔ میں نے پانچ ناول لکھے ہیں — اُرورا ڈان۔ دی سٹی بوائے۔ دی کین میوٹنی۔ مارجوری مارننگ سٹار اور ینگ بلڈ ہاک — سبھی کو امریکہ اور یورپ کے مختلف ادبی اداروں نے امتیازی حیثیت دے کر منتخب کتب میں شامل کیا اور ان میں بیشتر فلمائے بھی جا چکے ہیں۔ میں نے مذہب پر بھی ایک کتاب "یہ ہے میرا خدا" لکھی ہے۔ اسے امریکہ میں ہی نہیں یورپ میں بھی وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

میں نے ۱۹۴۵ء میں کیلیفورنیا کی ایک لڑکی بیٹی سارا براؤن سے شادی کی۔ تین لڑکے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا بچہ ابراہیم ۱۹۵۱ء میں میکسیکو میں مر گیا۔ ہم ورجن آئی لینڈ میں سینٹ تھامس کی ایک پہاڑی پر اپنے مکان میں رہتے ہیں۔

مجھے اور بھی اعزاز ملے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی نے مجھے ایکسیلینس کا تمغہ عطا کیا ہے۔ یشیوا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف ہیومین لیٹرز کا اور کلارک یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لیٹرز کا تمغہ دیا ہے۔

میں ان دنوں چھٹا ناول لکھ رہا ہوں۔

آپ بیتی نمبر جیسے مشکل کام کی تکمیل میں میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

مخلص

ہرمن وُوک

حالات

امریکہ کا شہرۂ آفاق ناول نگار، ہرمن ووک، جس گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ گھریلو مسرتوں اور باہمی پیار و محبت سے لبریز تھا۔ ماں باپ یہودی تھے اور روس سے ہجرت کر کے امریکہ میں آباد ہوئے تھے۔ باپ ۶۹ برس کی عمر میں تل ابیب میں فوت ہوا، اس وقت ہرمن کی عمر ۴۲ برس کی تھی۔ کالج کے دوران ہرمن نے ادب اور فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ وہ طلباء کی ہر طرح کی تقریبوں اور سرگرمیوں میں شریک ہوتا تھا اور کالج کے ایک مزاحیہ رسالے "جیسٹر" کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اُس نے انیس برس کی عمر میں بی اے کیا۔ فطرت میں مزاح غالب تھا جو اُس کے ادب پاروں میں جھلکنے لگا کالج سے فارغ ہو کر اس نے مزاح نویسی میں پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر لی اور ریڈیو والوں نے اُسے اپنا باقاعدہ مزاح نویس رکھ لیا۔ اس کے بعض ادب پاروں کو شاہکار مانا گیا۔

ریڈیو سے اُسے بہت معاوضہ ملتا تھا۔ آمدنی کے لحاظ سے ہرمن کو ریڈیائی مزاح نویسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی لیکن اُس کے الفاظ میں —— "میں اپنے آپ کو کبھی بھی قائل نہ کر سکا کہ میری جن ریڈیائی تخلیقات کو لوگ منفرد شاہکار کہتے تھے اور جن کی بدولت مجھے دنیا کی ہر مسرت اور ہر آسائش میسر تھی۔ میری زندگی میں کوئی قابل قدر اضافہ کر رہی تھیں۔ میں اپنے آپ سے مطمئن نہ تھا جیسے میں نے بہروپ دھار رکھا تھا" —— وہ مسلسل پانچ برس تک ریڈیو کے لیے مزاحیہ فیچر وغیرہ لکھتا رہا۔ یہ پیشہ اس کے لیے سونے کی کان سے کم نہ تھا لیکن ایک روز اُس نے اچانک اس کان کو اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا اور انتہائی قلیل معاوضے پر سرکاری خزانے کے بانڈوں کی فروخت کو بڑھانے کے لیے ریڈیو سکرپٹ لکھنے لگا۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ امریکہ کی زندگی کے ہر شعبے میں جنگی تیاریوں اور ملک کے دفاع کے ہنگامے تھے۔ ایسے کڑے وقت نے ہرمن کو بھی متاثر کیا۔ پرل ہاربر پر جاپانیوں کا اچانک حملہ امریکی جنگی بحریہ کے لیے ضرب کاری ثابت ہوا۔ بحریہ کا جو نقصان ہوا اُسے پورا کرنے کے لیے نئی بھرتی ہونے لگی۔ ہرمن بھی بھرتی ہو گیا اور اُسے ٹریننگ دے کر ایک آفیسر کا عہدہ دیا گیا اور ایک جنگی جہاز میں کھلے سمندر میں بھیج دیا گیا۔

ہرمن تو ملک کی خاطر لڑنے گیا تھا لیکن کسی کو گمان تک نہ تھا کہ وہ سمندر سے دنیائے ادب کے لیے اپنا دامن موتیوں سے بھر لائے گا۔ ۱۹۴۳ء کا دور تھا جب جنگ نے بحرالکاہل کو موت و حیات کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ آسمانوں میں، لہروں اور سمندر کی تہوں میں موت کی حکمرانی تھی۔ اوپر بمبار طیارے غراتے تھے۔ سمندر پر بحری توپیں دھواں دھار دھماکے اگلتی تھیں۔ پل کا بھروسہ نہ تھا۔ سینکڑوں انسانوں کو ساتھ لیے بحری جہاز دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کے سیاہ پیٹ میں غائب ہو جاتے تھے۔ ہرمن نے تین برس اس قیامت میں گزارے۔ اُسے جنگی جہاز میں مختلف ڈیوٹیوں پر لگایا گیا۔ جن میں بعض نازک اور خطرناک تھیں لیکن اُس نے ہر جگہ، ہر حال اور ہر ڈیوٹی پر ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑا اور جان لیوا خطرات سے نبرد آزما رہا۔ ایک بار اس کا جہاز ڈوب گیا۔ لیکن ہرمن موت کو جُل دے کے نکل آیا۔

بے رحم سمندر میں ہرمن پر جو بیتی اس کا ذکر وہ بڑی مسرت سے کیا کرتا ہے ۔ ان ہولناک تجربات نے اس کی ذہنی نشوونما اور رجحان کے ارتقا میں عظیم کام کیا ہے ۔ ہرمن کہتا ہے کہ مجھے سمندر کے ہنگاموں میں جا کے مجھ پر انکشاف ہوا کہ امریکہ کی زندگی میں تصنع ہے ۔ میں محدودیت میں قید رہا لیکن بحریہ میں جا کے مجھے طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا تو میرے تخیلات میں نئے افق نمودار ہوئے ورنہ میں تو الفاظ کی دنیا میں گزارا الفاظ سے کھیلنے والا لڑکا تھا ۔

۱۹۴۳ء کا ایک دن ہے جسے ہرمن جھوم جھوم کر یاد کیا کرتا ہے ۔ اس کا بحری جہاز سین پیڈرو کی بندرگاہ میں مرمت وغیرہ کے لیے لنگر انداز تھا ۔ جنوبی کیلیفورنیا کی یونیورسٹی کی ذہین گریجویٹ لڑکی ، بیٹی سارا براؤن ، بحریہ کے سپاہیوں کا نفسیاتی جائزہ لینے کو آئی جب یہ نوجوان اور دلکش طالبہ ہرمن ووک سے ملی تو اس کی اپنی نفسیات متزلزل ہونے لگی ۔ یہ جھوٹے رومانی تھے ۔ وہ ہرمن کی چابک و چوبند شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ تعلیماتی انٹرویو محبت کی پہلی ملاقات ثابت ہوا ۔ ہرمن کو یہ لڑکی یوں لگی جیسے وہ سمندروں کی قیامت خیزی میں اسی لڑکی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا ۔ اس بندرگاہ میں ہرمن کا قیام چند روزہ تھا ۔ اس تھوڑے سے عرصے میں دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ۔ ہرمن نے سارا براؤن کو اپنے ذوق کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ جنگ کے بعد افسانوی ادب کو ہی پیشہ بنانا چاہتا ہے تو سارا براؤن اور زیادہ خوش ہوئی ۔ وہ ادب کی دلدادہ تھی ۔ اس نے ہرمن سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے عزائم اور ذہنی رجحان کا تازیست ساتھ دے گی ۔

ہرمن کا جہاز مرمت ہو گیا اور وہ سارا براؤن کو ساحل پر چھوڑ کر سمندر میں چلا گیا جہاں جنگ کی ہولناکیاں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں ۔ نہ ہرمن کو یقین تھا نہ لڑکی کو کہ وہ لوٹ آنے کے لیے سمندر میں گیا ہے یا وہ سمندر کی مخلوق تھا اور چند گھڑیوں کے لیے محبت کا حسین ہیولا بن کے ساحل پر آ گیا تھا ۔ وہ ساحل پر اس کا انتظار کرتی رہی ۔ جنگ ختم ہو گئی ۔ ہرمن لوٹ آیا اور تھوڑے دنوں بعد ان کی شادی ہو گئی ۔

بحر الکاہل کی سمندری جنگ کے دوران اسے جہاز میں سستانے کو فراغت کی چند گھڑیاں مل جایا کرتی تھیں جنھیں وہ سستانے کی بجائے ایک ناول لکھنے میں صرف کرتا رہا ۔ جنگ ختم ہو گئی ، ناول نہ ختم ہوا ۔ اسے اس نے بحریہ سے نکل کر مکمل کیا ۔ اس کا یہ پہلا ہی ناول انتخاب میں آ گیا ۔ گو یہ اتنی تعداد میں فروخت نہ ہوا جتنی توقع تھی لیکن ہرمن نے اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیا ۔ یہ ناول اس کی شہرت کے لیے سنگِ میل ثابت ہوا اور اس نے ناول نویسی کو ہی ذریعۂ معاش بنا لیا ۔ اس نے سمندری زندگی کے تجربات ، مشاہدات اور واقعات کی روشنی میں دو تین طویل کہانیاں لکھیں اور جس فضا اور ماحول میں خود چار برس رہ چکا تھا اسے فنی مہارت سے افسانہ نویسی میں استعمال کیا ۔

اس کا اپنا جہاز سمندری طوفان کی نذر ہو گیا تھا ۔ چنانچہ اس طوفان سے اس نے ایک کہانی تخلیق کی جو ہالی وڈ والوں کو پسند آ گئی ۔ یہیں سے وہ فلمی دنیا میں متعارف ہوا ۔ اسی کہانی کے ماحول ، قالب اور کرداروں کو اور زیادہ وسعت دے کر ہرمن نے وسیع کینوس پر سمندری زندگی کے ہنگاموں کی ایک واضح تصویر ایک شہرہ آفاق ناول "کین میوٹنی" کی صورت میں پیش کی ۔ ہرمن کے اشاعتی مشیر نے اس کہانی کی تلخیص ایک پبلشر کو بھیجی اور ساتھ ہی چٹ لگا دی ۔ " اگر اشاعت کے لیے

پسند آجائے تو بیس ہزار ڈالر ملیں گے" — پبلشر گھبرا گیا۔ اس نے حساب لگایا کہ اگر وہ بیس ہزار ڈالر میں یہ مسودہ خرید لے تو منافع چالیس ہزار کاپیاں بکنے کے بعد شروع ہو گا۔ کہانی ایسی تھی جسے چھوڑنا بھی آسان نہ تھا۔ مسودہ دو تین ہاتھوں میں گیا لیکن کوئی بھی جوا کھیلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر ریڈرز ڈائجسٹ نے اسے اپنے عظیم کتب کی تلخیص کے شعبے کے لیے خرید لیا۔ ناول چھپ کے بازار میں آیا تو آغاز میں اسے متوقع یا غیر معمولی مقبولیت حاصل نہ ہوئی لیکن چند ہی مہینوں میں یہ اُن کتابوں سے آگے نکل گیا جنھوں نے فروخت میں ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اگلے سال اسے پولٹزر پرائز مل گیا تو ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔

اس ناول کو فلمایا گیا اور فلم نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اس کہانی کی بنیادی خوبی حقیقت نگاری ہے۔ ہرمن خود کہتا ہے — "کہانی کے لیے حالات و واقعات اور پلاٹ اختراع کیے جا سکتے ہیں اور انھیں موڑا توڑا بھی جا سکتا ہے لیکن سچائی کا ایک ہی رُوپ ہوتا ہے جسے بگاڑا نہیں جا سکتا۔ افسانے میں حقیقت نگاری بہت بڑا کمال ہے۔ حقیقت افسانے میں عجیب طرح حُسن پیدا کر دیتی ہے۔"

ہرمن ووک نے چار اور ناول لکھے۔ ان کے علاوہ اُس نے مذہب پر ایک کتاب "یہ ہے میرا خدا" لکھی جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ چند ڈرامے بھی لکھے جن میں دو خاصے کامیاب ہیں۔

ہرمن ہفتے میں پانچ دن اور دن میں چھ گھنٹے کام کرتا ہے۔ کہانی لکھتے وقت پلاٹ روانی سے آگے بڑھتا ہے تو ہرمن کہتا ہے کہ "جی خوش ہوتا ہے۔" اور اگر پلاٹ رُکنے لگے، کوئی بات جچتی نظر نہ آئے تو وہ دانت پیسنے لگتا ہے مگر لکھے جاتا ہے اور کہتا ہے "گھسیٹ رہا ہوں۔" ہرمن بیوی کے مشوروں، اضافوں اور قطع و برید کو بہت پسند کرتا ہے۔ کہانی مکمل کر کے دونوں اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں اور کہانی کو منظر بہ منظر پڑھتے ہیں۔ بیوی نکتہ چینی کرتی ہے۔ دونوں سوچتے ہیں۔ رد و بدل کرتے ہیں اور کہانی کو ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں۔ ہرمن اکثر کہا کرتا ہے کہ میری بیوی کی رائے اور نکتہ چینی نے ہمیشہ میری کہانی میں حُسن پیدا کیا ہے۔

ہرمن کی ازدواجی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے۔ وہ گرمیاں فائر آئی لینڈ میں ٹیلیفون اور کار کے بغیر گزارتے ہیں اور سردیوں میں ورجن آئی لینڈ میں چلے جاتے ہیں۔ چار برس ہوئے اُنھوں نے سینٹ تھامس کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر اپنا مکان بنا لیا ہے۔ جہاں سے بحر اوقیانوس کی وسعت افق تک نظر آتی ہے۔ ہرمن کے بچے دو ہیں اور مداح کروڑوں، کرۂ ارض کی وسعت میں پھیلے ہوئے۔

آئزن ہاور

آفس آف ڈوائیٹ ڈی آئزن ہاور
گیٹس برگ۔ پنسلوانیا
یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء

ڈیر مسٹر محمد طفیل!

آپ کے ۱۰ ستمبر کے خط کے مطابق جنرل آئزن ہاور نے اپنی تصویر اور سوانح بھیجنے کے لئے کہا ہے۔ دونوں چیزیں آپ کے جریدے نقوش کے خاص نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ آپ انہیں دوسری عالمی شخصیتوں میں شامل کریں۔

جنرل سلام کہتے ہیں۔

مخلص

رابرٹ ایل شلز

بریگیڈیر جنرل۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ (ریٹائرڈ)
ایگزیکٹو اسسٹنٹ

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے چونتیسویں (۳۴) صدر جنرل آئزن ہاور کے دادا پارسا اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپ واعظ بھی تھے اور کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ آپ کے والد ڈیوڈ آئزن ہاور کا دل کھیتی باڑی میں نہ لگ سکا اور آپ نے جنرل مرچنٹ کی دکان کھول لی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد آپ نے ایڈا ایلزبتھ سٹوور سے شادی کر لی۔ دکان نہ چل سکی اور آپ ہجرت کر کے ٹیکساس کے ایک قصبے ڈینیسن میں چلے گئے اور وہاں ریلوے میں مکینک بن گئے۔

۱۴ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو آپ کے ہاں تیسرا بچہ پیدا ہوا جس کا نام ڈوائیٹ آئزن ہاور رکھا گیا۔ محلے کے بچے اسے "چھوٹا آئیک" کے نام سے پکارنے لگے۔ آپ کی عمر ایک برس تھی جب آپ کے والد کنبے سمیت ایبلین میں جا کے آباد ہو گئے اور دودھ مکھن کے کارخانے میں کام کرنے لگے۔

ایبلین میں کنبہ بڑھنے لگا۔ آئزن ہاور کے چھ بھائی پیدا ہوئے لیکن پال بچپن میں ہی مر گیا۔ متانت اور انکساری اس کنبے کا خصوصی وصف تھا۔ باورچی خانے میں آگ جلانے کے لیے بچے ہر روز علی الصبح باری باری اٹھتے تھے اور ناشتے کی تیاری کا سامان کرتے تھے۔ روزمرہ

زندگی میں ہر بچے کے سپرد گھر کا کوئی نہ کوئی کام تھا جس کے وہ حقیقی طور پر ذمہ دار تھے۔ کوئی باغیچے کی باغبانی کرتا تھا کوئی چوزوں کو دانہ پانی دیتا تھا۔ انڈے بیچنا، گائے دوہنا، سبزیاں اور بیج نرسے بازار سے لانا اور کئی چھوٹے چھوٹے کام تھے جنہیں بچے کمال نظم و نسق اور ذمہ داری سے کرتے تھے۔

آئزن ہاور ۱۹۰۹ء میں ہائی سکول سے پاس ہوئے۔ آپ کا تعلیمی معیار اور کھیلوں اور دوڑوں کا ریکارڈ خصوصیت سے بلند تھا۔ جب آپ سکول سے فارغ ہوئے تو آپ کے والد کا فارم وسیع اور زرخیز ہو گیا تھا۔ دو برس تک آئزن ہاور باپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ باپ نے بچوں کو جو گھریلو نظم و ضبط سکھایا تھا اور جس ڈھنگ سے ان کی تربیت کی تھی اس نے سب کا مستقبل روشن کر دیا۔ آئزن ہاور دوسری عالمگیر جنگ کے ہیرو ہی نہیں امریکہ کے پریذیڈنٹ بنے۔ ایک بھائی (جو ۷۱ برس کی عمر میں فوت ہو گیا ہے) بینکر تھا، دوسرا قانون دان، تیسرا الیکٹریکل انجینئر، چوتھا گورنمنٹ کا اعلیٰ حاکم اور پانچواں بھائی (جو ۱۹۴۲ء میں فوت ہو گیا ہے) امریکہ کا معروف کیمسٹ اور ڈرگسٹ تھا۔

گھریلو فضا اور ماحول پر مذہب غالب تھا۔ جنرل آئزن ہاور نے اس کا اثر پارسائی اور کٹر پن کی حد تک قبول کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آپ سے کسی نے پوچھا "کیا آپ واقعی مذہب پرست ہیں؟" تو آپ نے فرمایا تھا "میں نے اتنا مذہب پرست کوئی نہیں دیکھا جتنا کہ میں ہوں۔ محکم یقین کے بغیر کسی انسان کا چھ برس طویل جنگ سے بخیر و خوبی لوٹ آنا آسان نہیں ہوتا۔"

آپ نے سکول سے فارغ ہو کر دو برس باپ کا ہاتھ بٹایا پھر آپ نے فوج میں کمشن کا امتحان دیا۔ آپ پاس تو ہو گئے لیکن فٹ بال کھیلتے آپ کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور آپ کو فوج میں لے جانے سے انکار کر دیا گیا۔ آپ نے ہاتھ پاؤں مارے، ٹانگ ٹھیک ہو گئی پھر بھی فوجی حکام لینے سے ہچکچاتے رہے لیکن بورڈ کے افسران کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو چکے تھے لہٰذا انہیں خصوصی رعایت دے کر فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے لے لیا گیا ورنہ ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ آئزن ہاور فوج میں نہ آتے تو دنیا ایک جنگجو ہیرو سے محروم رہتی اور جنگ کی صورت اور انجام بالکل ہی مختلف ہوتا۔

ویسٹ پوائنٹ میں ٹریننگ کے بعد آپ کو انیسویں پیادہ پلٹن میں بھیج دیا گیا۔ اس دوران ایک پارٹی میں آپ کی ملاقات ایک لڑکی میمی جینیوا ڈوڈ سے ہوئی اور ۱۹۱۶ء میں آپ نے اس سے شادی کر لی۔ آپ کا پہلا بچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوا مگر ۲ جنوری ۱۹۲۱ء کو بخار سے مر گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام جان شیلڈن رکھا گیا۔ شیلڈن بڑا ہو کر فوجی افسر بنا اور دوسری جنگ عظیم میں یورپ کے کئی محاذوں پر لڑا اور کوریا جنگ میں بھی شریک ہوا۔ جنرل آئزن ہاور کے چار پوتے پوتیاں ہیں۔

جنرل آئزن ہاور فوجی زندگی کے اوائل ہی میں اپنے اعلیٰ حکام سے خداداد ذہانت، شجاعت، قوت ارادی اور قوت فیصلہ کی داد لینے لگے تھے۔ آپ نے ۱۹۲۶ء میں کمانڈ اور جنرل سٹاف سکول کے کورس کئے۔ ان کورسوں کے دوران اعلیٰ افسروں نے خاص طور پر دیکھا کہ آپ غیر معمولی قابلیت اور عسکری دانشمندی کے مالک ہیں۔ اس فوجی سکول میں صرف اسی افسر کو بھیجا جاتا تھا جو غیر معمولی ذہانت کا مالک ہو۔

آپ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں گئے تھے۔ آپ محاذ پر جانے کے لیے بے تاب رہتے تھے لیکن آپ کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا جس کا آپ کو افسوس ہی رہا۔ آپ کو ایک ٹینک بریگیڈ کا کمانڈنگ آفیسر بنا دیا گیا۔ آپ نے جس اچھوتے انداز سے اس بریگیڈ

کی کمان کی۔ اس کی داد حکومت امریکہ کے محکمہ رفاہ نے ایک تمغے کی صورت میں دی۔

آپ محکمہ جنگ میں بھی اور جنرل میکارتھر کے ساتھ بھی کام کرتے رہے، پھر آپ کو آرمی چیف آف سٹاف کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب جنرل میکارتھر کو فلپائن میں فوجی مشیر بنا کر بھیجا گیا تو آئزن ہاور بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت آپ میجر تھے۔ آپ چار برس تک فلپائن میں رہے۔

۱۹۴۱ء میں جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی، آپ کو عسکری جوہر دکھانے کا موقع مل ہی گیا اور آپ کے خواب پورے ہونے لگے۔ اس وقت آپ تھرڈ آرمی کے چیف آف سٹاف تھے۔ ایک محاذ پر آپ نے غیر معمولی جنگی چالوں کا مظاہرہ کیا تو آرمی چیف آف سٹاف جنرل جارج مارشل آپ کی قابلیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر اچانک حملہ کر دیا تو جنرل جارج مارشل نے آپ کو تھرڈ آرمی سے بلا کر محکمہ جنگ میں جنگی منصوبہ بندی کے شعبے کا چیف بنا دیا لیکن جنرل آئزن ہاور فطری جنگجو تھے۔ کھلے محاذ پر لڑنا چاہتے تھے۔ آپ دفتری چکر سے اکتائے اکتائے رہتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں آپ کو لندن میں برطانوی جنگی لیڈروں کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیجا گیا۔ یہ کانفرنس ہٹلر کو شکستِ فاش دینے کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض اور لائحہ عمل کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ آئزن ہاور نے جنگ کی صورتِ حال اور دیگر کوائف کا جائزہ لے کر ایک پُر مغز رپورٹ تیار کی اور ایسے فیصلہ کن حملے کا منصوبہ تیار کر کے جنرل مارشل کے سامنے پیش کیا جو پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ آپ نے ایک جنرل کا نام بھی لکھ بھیجا تھا کہ اسے اس حملے کا کمانڈر بنایا جائے لیکن جنرل مارشل نے آئزن ہاور کو ہی یورپی محاذ کا کمانڈنگ جنرل بنا دیا۔

۱۹۴۲ء کے آخر تک آپ کو شمالی افریقہ کی اتحادی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شمالی افریقہ میں جرمن جنرل رومیل کی افواج کو پسپا کیا، سسلی پر قبضہ کیا اور اٹلی کا نام محوری طاقتوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ ایسی فتح تھی جس نے جنگ کا پانسہ ہی الٹ دیا اور جنگ کے شعلے بجھتے نظر آنے لگے۔ آپ کو اس وقت کا سب سے بڑا تمغہ عطا کیا گیا اور آپ کے اس تاریخی کارنامے کو ان الفاظ میں لکھا گیا۔

> "جنرل آئزن ہاور نے تیونس میں محوری افواج کے مقابلے میں برطانوی، امریکی اور فرانسیسی ہوائی، بری اور بحری افواج کو نہایت چابکدستی سے منظم کر کے ایسا کامیاب حملہ کیا کہ افریقہ میں محوری عناصر کی مزاحمت نیست و نابود ہو گئی۔ اڑتیس دنوں کے حملے سے جنرل آئزن ہاور نے اتحادی عساکر کو اس طرح یکجان کر کے چلایا کہ سسلی تسخیر ہو گیا اور اٹلی کا تختہ الٹ گیا۔"

یہ تحریر تمام فوجوں کو پڑھ کر سنائی گئی۔

اس تاریخی معرکے نے اس وقت کے امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کو اور زیادہ متاثر کیا اور آپ نے جنرل آئزن ہاور کو اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بنا دیا۔ آپ نے جنگ کی ابتدا سے ہی سوچ رکھا تھا کہ برطانیہ سے یورپ پر کھلا حملہ کیا جائے۔ اب آپ کو عزائم کی تکمیل کا موقع مل گیا چنانچہ آپ نے اپنا ہیڈ کوارٹر لندن کے قریب بنا کر اتحادی فوجوں کو ہٹلر کے خلاف یورپ پر چڑھا دیا۔ ۶ جون ۱۹۴۴ء کو

آپ نے نارمنڈی پر حملہ کیا۔ یہ یورپ پر چڑھائی کا پہلا قدم تھا۔ اینگلو امریکی بیڑے نے سینکڑوں ہوائی جہازوں کے سائے میں فرانس کے ساحل پر زلزلے بپا کر دیے اور وہ بے گناہ اور معصوم مخلوق جو ہٹلر کی ظالمانہ گرفت میں آ گئی تھی آزاد ہونے لگی۔

آپ گیارہ مہینے ہٹلر کی طاقتور فوجوں سے اُلجھے رہے۔ آخر آپ نے نازی صفوں کا صفایا کر دیا اور ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو نازیوں کو نہتا کر کے ان سے شکست تسلیم کروا لی۔ جنگ ختم ہو گئی۔

جنرل آئزن ہاور کو یورپ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی افواج کا کمانڈنگ جنرل اور مقبوضہ جرمنی کا فوجی گورنر بنا دیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں آپ کو امریکہ بلا کر جنرل جارج مارشل کی جگہ آرمی چیف آف سٹاف بنا دیا گیا۔ آپ ۷ فروری ۱۹۴۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

آپ دنیا کے عظیم ترین اور قابل ترین جنگجو تھے لیکن آپ نے جنگ سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ آپ کئی بار کہہ چکے ہیں: "میرے پیشے کے لوگوں کو بے روزگار کر دینا چاہیے"۔

آپ شہری زندگی میں کھلے بھی نہ پائے تھے کہ آپ کو دسمبر ۱۹۵۰ء میں جوائنٹ چیفز آف سٹاف کا چیئرمین بنا دیا گیا پھر آپ کو ۱۹۵۱ء میں نیٹو کی اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۲ء میں آپ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور امریکی صدارت کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ غالب اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ دوسرے انتخاب کے لیے اٹھے اور غالب اکثریت سے صدر منتخب ہوئے۔

۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو جب آپ پچاس برس ملک اور قوم کی خدمت کر چکے تھے کرسیِ صدارت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس تھی۔ آپ امریکہ کے تمام صدروں سے زیادہ عمر تھے۔

صدارت سے سبکدوش ہو کر آپ گیٹسبرگ کے اپنے ۱۸۹ ایکڑ وسیع فارم میں جا آباد ہوئے۔ یہ جگہ خانہ جنگی کے دور میں میدانِ جنگ رہ چکی ہے۔ آپ نے یہ زمین اپنی کتاب "کروسیڈ ان یورپ" کی آمدنی سے خریدی تھی اور آپ نے یہ کتاب ہوابازوں، بری اور بحری سپاہیوں کے نام منسوب کی ہے۔

لنڈن بی جانسن

میں آزاد شخص ہوں ۔ امریکی ہوں ، امریکہ کا سینیٹر اور ڈیموکریٹ ہوں۔

میں کچھ اور بھی ہوں — آزاد خیال ، قدامت پسند ، ٹیکساس کا باشندہ ، ٹیکس دہندہ ، زمیندار — تاجر بھی ، صارف بھی ، والد اور ووٹر بھی ہوں۔ میں اتنا جوان تو نہیں جتنا ہوا کرتا تھا اور اتنا بوڑھا بھی نہیں جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔

میرے سیاسی نظریات یا سیاسی فلاسفی ایسی نہیں جو ایک یا دو لفظی لیبل کے احاطے میں سما جائے۔ میں نے ان پر لیبل چپکانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اس کے حق میں ہوں۔ میرا رویہ عام روش کے خلاف سہی لیکن اپنا ایک مزاج ہے اور مزاج کے اپنے تقاضے۔

میں امریکی قوم یا اہل امریکہ میں علاقائی ، معاشی ، معاشرتی ، مذہبی ، نسلی یا کسی اور نوع کی درجہ بندی کے خلاف ہوں بلکہ میرے عقائد کی روح اس درجہ بندی سے باغی ہے۔ ہم لوگ سر راہے جیسے بے خیالی میں ایک دوسرے سے پوچھ لیتے ہیں — "تمھارے سیاسی نظریات کیا ہیں ؟" — یہ سوال ایک عادت سی بن گیا ہے مگر مجھے اس عادت سے گھن آتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بُری عادت ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک گونہ سادہ لوحی کارفرما ہے۔ سادہ لوحی یا کم فہمی یہ کہ لوگ صرف عقیدوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ اس سوال — "تمھارے سیاسی نظریات کیا ہیں ؟" کا جواب ایک یا دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے۔ سیاسی نظریے تو ہماری تمام عمر کے تجربات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ خدا نے کسی انسان کو اس قدر سادہ لوح تو نہیں بنایا کہ وہ ان تجربات کے لامتناہی تسلسل کو کسی ایک اہم صفت سے متصف کر کے بات ختم کر دے یوں ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ہم اصرار کرتے ہیں کہ ہر شخص کا مکتبۂ فکر ایک آدھ خط کھینچ کر ظاہر کیا جائے۔

میرے مکتبۂ فکر اور سیاسی فلاسفی کا ڈھانچہ یہ ہے :

میرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہر امریکی کے دل میں کچھ نہ کچھ ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اور ہمارے نظام میں اس کا حق ہے کہ لوگ اس کی سنیں۔

دوسرے ، مجھے یقین ہے کہ ہر قومی مسئلے کا ہمیشہ ایک قومی حل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں ماننے پر قطعاً آمادہ نہیں کہ ہر مسئلے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

تیسرے ، میں ان حکومتی پالیسیوں کا قائل ہوں جن کا اعلیٰ ترین مقصد ہمارے طبعی ، انسانی اور دیگر ذرائع اور ان کی ممکنات کی پوری پوری نشوونما کرنا ہو لیکن میں حقوق کے تحفظ کو مقدم سمجھتا ہوں ، وہ حقوق جو قابلِ تغیر نہیں۔

چوتھے، میں ضیاع کو معاشرے کا سرگرم دشمن سمجھتا ہوں۔ ضیاع خواہ وسائل اور ذرائع کا ہو، جانوں کا یا مواقع کا، اس کا انسداد حکومت کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں جس کا مجھے شدت سے احساس ہے۔ میں نے قومی زندگی کے جن عظیم ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ فخر دریائے کالوریڈو کے زیریں حصے کی ترقی پر ہے۔ یہ منصوبہ اس صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں مکمل ہوا تھا۔ یہ فخر اس لیے نہیں کہ میں نے دریا پر بند باندھے اور سیلابوں کو روکا بلکہ اس لیے کہ اس خطے کے بے اندازہ نقصانات کو ختم کر دیا ہے جو خطہ میری جوانی میں زرخیزی اور صلاحیت کے لحاظ سے کچھ بھی نہ تھا اب اسے قومی معیشت میں اہم مقام حاصل ہے۔ سب سے بڑی بات فخر یہ ہے کہ انسانی وسائل کا ضیاع ختم گیا ہے۔

نوجوان ذہنوں کے لیے نئے افق نمودار ہو گئے ہیں جس کی وجہ خواہ اور کچھ بھی ہو لیکن اس کا باعث یہ ہے کہ وہاں بجلی پہنچ گئی ہے۔ اب وہاں کے مرد اور عورتیں اس جان لیوا جدوجہد سے آزاد ہو گئے ہیں جو انھیں ٹیکساس کی کچھ نہ اگلنے والی چٹانوں کے پتھروں کے خلاف کرنا پڑتی تھی۔ حکومت کی حقیقی ذمہ داریوں کا مفہوم بھی یہی ہے۔

جہاں تک میرے کچھ اور ہونے کا تعلق ہے۔ میں اس کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑتا ہوں۔ وہ جیسا چاہیں اور جس پیمانے میں چاہیں مجھے ناپیں اور جو جی میں آئے سمجھیں — میں امریکی ہوں، امریکہ کا سینیٹر اور ڈیموکریٹ ہوں — اس سے آگے میری شخصی حیثیت ختم ہے۔ میں کسی امتیاز کا قائل نہیں۔

حالات

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے چھتیسویں[۳۶] صدر مسٹر لنڈن بی جانسن ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء سٹونوال ٹیکساس کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو پانچ برس کی عمر میں جانسن سٹی کے پبلک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس وقت تمام امریکہ شدید اقتصادی بحران کی گرفت میں تھا۔ گھریلو زندگیوں میں خوشحالی اور فارغ البالی ناپید تھی اور لوگ تنگدستی کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ مسٹر جانسن کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے نو برس کی عمر میں ہی ایک حجام کی دکان میں جوتے پالش کرنے پڑے۔ آپ جس ماحول میں پرورش پا رہے تھے وہاں علم و فضل عام تھا۔ ننھیال والے بھی کسی نہ کسی گرجے یا مدرسے سے متعلق تھے۔

پندرہ برس کی عمر میں آپ سیکنڈری سکول سے فارغ ہو گئے اور سڑکیں بنانے کے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ اس مزدوری نے آپ کو کیلیفورنیا تک پہنچا دیا۔ وہاں پہنچنے تک ایک عرصہ صرف ہوا۔ راستے میں چند پیسے کمانے کی خاطر آپ کو جو کام ملا اور جیسی بھی ملازمت نظر آئی آپ کر گزرے۔ آپ لفٹ اپریٹر رہے، ورکشاپوں میں کاریں دھوئیں اور ایک کیفے میں بھی کام کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ ٹیکساس واپس آ گئے اور ایک بار پھر سڑکیں بنانے کے کام میں لگ گئے لیکن تعلیم کی تشنگی اور اہمیت نے آپ کو چین نہ لینے دیا۔ نہ کسی اور کام میں دلچسپی پیدا ہونے دی۔ اس عقیدے نے کہ تعلیم کے بغیر انسان لڑھکتے پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ کی تشنگی کو بھڑکائے رکھا۔

آخر آپ اُنیس برس کی عمر میں علم کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے لیکن پلّے کچھ نہ تھا۔ آپ نے راہ چلتی کاروں اور گھبیوں میں لفٹیں مانگیں۔ کوئی دو میل تک لے گیا، کسی نے چند فرلانگ اور آگے جا اتارا۔ اسی طرح قدم بہ قدم، کوس بہ کوس آپ سین مارکوس پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے ساؤتھ ویسٹ سٹیٹ ٹیچرز کالج میں داخلہ لے لیا لیکن دیگر اخراجات کا مسئلہ پریشان کُن تھا۔ اس کا واحد حل پارٹ ٹائم ملازمت ہی تھی جو کہیں ملتی نظر نہ آتی تھی۔ کالج میں دربان کی جگہ خالی ہوئی تو آپ نے وہی قبول کرلی اسی پر اکتفا نہ کی، آپ نے در در اور گلی گلی جُتامیں اور جرابیں بیچنے کا کام بھی کیا۔ اس کے علاوہ کالج کے پریذیڈنٹ کی سیکرٹری کی ڈیوٹی بھی سنبھال لی۔ اب حالت یہ تھی کہ یا تو آپ کام کر سکتے تھے یا پڑھ سکتے تھے۔ ایک تو وقت نکالنا مشکل تھا۔ دوسرے اخراجات پُورے نہ ہوتے تھے۔ نتیجۃً آپ کو مجبوراً کالج چھوڑنا پڑا۔

آپ نے ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے قصبے میں سکول ٹیچری کی ملازمت کر لی۔ اس دوران آپ باقاعدہ مطالعہ کرتے رہے۔ دن کو پڑھاتے اور رات کو خود پڑھتے تھے۔ آپ نے اپنا خون تو پی لیا لیکن خون کا ایک ایک قطرہ رنگ لایا، اور آپ نے ۱۹۳۰ء میں بائیس برس کی عمر میں بی۔ ایس۔ سی کرلی۔ آپ دو سال تک ایک سیکنڈری سکول میں تقریر اور بحث و تمحیص کے فن کی تعلیم دیتے رہے۔ اب آپ کے پاس ڈگری بھی تھی اور تجربہ بھی۔ چنانچہ آپ نے پبلک سروس میں آنے کا ارادہ کیا۔ آپ ٹیکساس کے کانگریس کے نمائندے کے سیکرٹری رچرڈ کلیبرگ کے سیکرٹری بن گئے۔ اس دوران آپ واشنگٹن یونیورسٹی لاء سکول میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی عرصے میں آپ کی ملاقات مس کلاڈیا اُلیا ٹیلر سے ہوئی اور آپ نے چھبیس برس کی عمر میں اس سے شادی کرلی۔ اب آپ امریکہ کی فسٹ لیڈی ہیں۔

مسٹر جانسن کے آباؤ اجداد جنوب مغربی ریاست کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے ہیں۔ اپنے خطے کی انفرادیت، خودداریت، سالمیت اور تحفظ آپ کے باپ دادا کا جزو ایمان رہا ہے جو مسٹر جانسن کو ورثے میں ملا ہے۔ خاندانی روایات آپ کے خون میں رچی ہوئی ہیں۔ اب تو آپ امریکہ کے عوام کی ہی نہیں بنی نوع انسان کی بہبود کے قائل ہیں۔ نسل پرستی سے آپ اس وقت سے متنفر ہیں جب آپ بے مایہ سے طالب علم تھے۔ ملکی سیاست میں آپ شہری حقوق کے تحفظ اور عائلی آپ کا مذہبی عقیدہ بن گیا ہے۔

۱۹۳۵ء میں پریذیڈنٹ روزویلٹ نے آپ کو ٹیکساس میں نیشنل یوتھ ایڈمنسٹریشن کا سٹیٹ ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا تھا لیکن آپ نے دو ہی سال بعد استعفےٰ دے دیا۔ اس وقت آپ کی عمر "انتیس" برس تھی۔ آپ نے کانگریس کی ایک سیٹ کے لیے الیکشن لڑا اور نو امیدواروں کو شکست دی۔ دوسری عالمگیر جنگ میں آپ ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز کے ممبر کی حیثیت سے محاذ پر چلے گئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے۔ اس دوران آپ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ گئے۔ محاذ پر ایک کارنامے کے صلے میں جنرل میکارتھر نے آپ کو اپنے ہاتھوں سلور سٹار تمغہ دیا۔ آپ صرف آٹھ مہینے امریکی بحریہ میں لفٹیننٹ کمانڈر رہے کیونکہ صدر روزویلٹ کے ایک حکم کے تحت کہ دستوریہ کا کوئی آدمی افواج میں نہیں رہ سکتا آپ کانگریس میں لوٹ آئے۔

۱۹۴۴ء میں آپ کی پہلی بچی 'لنڈا برڈ' پیدا ہوئی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ کانگریس کے ممبر رہے اور باقاعدہ منتخب ہوتے رہے۔ یہ کامیابی کم ہی سیاست دانوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی دوسری بچی، لُوسی جینس پیدا ہوئی۔

آپ کی عمر تنتالیس برس تھی جب آپ یونائیٹڈ سٹیٹس سینیٹ میں وہپ منتخب ہوئے۔ سینیٹ کی قیادت کی تاریخ میں آپ پہلے کم عمر قائد تھے۔ سابق صدر آئزن ہاور کے دور میں آپ ملک کے سیاسی میدان کے اہم ترین اور قوی ترین سیاستدان ثابت ہوئے۔ آپ نے گذشتہ بیاسی برسوں میں شہری حقوق کا پہلا بل پیش کیا اور سول رائٹ ایکٹ ۱۹۵۷ء کی صورت میں پاس کرایا ——— پُرامن تحقیق کے مسئلے پر صدر آئزن ہاور کی نمائندگی کی اور ایسا تاثر پیدا کیا جسے اقوامِ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔

۱۹۶۰ء تک ملک میں آپ کی لیڈرشپ مسلّمہ قرار دی جا چکی تھی اور بین الاقوامی سیاسیات میں آپ کی شخصیت کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ آپ آنجہانی صدر کینیڈی کے مقابلے میں امریکہ کے صدارتی انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے لیکن ہار گئے۔ آنجہانی نے آپ کی اہلیت، قابلیت اور ٹھوس اصولوں سے متاثر ہو کر آپ کو نائب صدر کے انتخاب کے لیے کھڑا کیا اور اُن کی کامیابی کے لیے بہت کام کیا۔ آنجہانی کینیڈی نے مسٹر جانسن کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا: "عالمی امن کے لیے ہمیں قوی انسانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں جن صلاحیتوں اور خصوصیات کی ضرورت ہے وہ لنڈن جانسن کی شخصیت میں موجود ہیں اور وہ کئی موقعوں پر ان کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔"

مسٹر جانسن انسان دوستی کے خواہاں ہیں۔ آپ ستائیس ملکوں میں گھوم چکے ہیں۔ آپ برلن کی دیوار کے بحران کے وقت برلن بھی گئے تھے۔ کرۂ ارض کے جس گوشے میں بھی آپ گئے، آپ امن، صلح اور آشتی کا پیغام اور پرچار لے کے گئے۔ آپ نے جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے چھوٹے چھوٹے کم ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں جا کے وہاں کے عوام کو یقین دلایا کہ ان کی ہر ابتلا میں امریکہ عملاً ان کے ساتھ ہے۔

آپ مئی ۱۹۶۱ء میں پاکستان بھی آئے تھے۔ آپ نے کراچی کے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں کیا ہے اور ہم آپ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے دلوں میں کیا ہے۔" آپ کی عوام دوستی کا زندہ ثبوت کراچی کا بشیر شتربان ہے جسے آپ نے کراچی کی ریتیلی پگڈنڈیوں سے اٹھا کر جیٹ طیارے میں بٹھایا اور اُس کی قسمت ہی بدل ڈالی۔

مسٹر جانسن عالمی امن اور صلح جوئی کے علمبردار ہیں۔ آپ نے ایک موقع پر کہا تھا ——— "ہم جنگ سے گریز اس لیے نہیں کرتے کہ ہم بزدل ہیں بلکہ اس لیے کہ ہمیں جنگ سے نفرت ہے" ——— آپ نے پس ماندہ قوموں کی ترقی کے لیے اُس وقت بھی بہت کچھ کیا تھا جب آپ ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز کے ممبر تھے، اور اُس وقت بھی جب آپ نائب صدر تھے۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے ٹیکنیکل تعاون اور امداد کا چار نکاتی منصوبہ اور دوسری جنگِ عظیم کے تباہ حال مغربی یورپ کی اقتصادی بدحالی کو سنبھالنے کے لیے مارشل پلین آپ ہی کی پُرزور پشت پناہی کے کرشمے ہیں۔

صدر کینیڈی نے کہا تھا — "اب میں اور مسٹر جانسن ایسے مسائل کو حل کر سلجھائیں گے۔ جن میں آپ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔" وہ مسائل یہ تھے، معاشرتی توازن اور تحفظ، خلائی اور بین الاقوامی امن — دونوں نے تین برس تک ملکی، عالمی اور خلائی امن اور صلح و آشتی کے لیے جدوجہد کی لیکن ایک انسان اجل بن کر جھپٹا اور مسٹر جانسن سے ان کا ساتھی چھین لیا۔ لیکن مسٹر جانسن دوراہے پر لمحہ بھر کے لیے بھی نہ رکے اور آپ امن کا جھنڈا اٹھائے اور تیز چل پڑے۔ آپ نے صدارتی حلف اٹھانے کے چند روز بعد کہا تھا —

"ہم امن کی تلاش میں کبھی نہیں تھکیں گے۔"

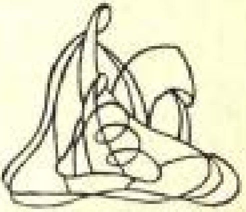

ہر میجسٹی ملکہ ایلزبتھ دوم

ہر میجسٹی ملکہ معظمہ ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء کو لندن میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ ڈیوک اور ڈچس آف یارک کی پہلی بچی ہیں۔ آپ کو بکنگھم پیلس میں کرسچن کر کے آپ کا نام ایلزبتھ الیگزینڈرا میری رکھا گیا تھا۔

آپ کا بچپن ۱۴۵ پکاڈلی لندن میں گزرا۔ یہ مکان آپ کے والدین نے آپ کی پیدائش کے فوراً بعد لیا تھا۔ اس عمر میں آپ اپنے دادا دادی شہنشاہ معظم جارج پنجم اور ملکہ میری کے دیہاتی مکان میں بھی رہیں۔ آپ چھ برس کی تھیں جب ڈیوک اور ڈچس آف یارک رائل لاج ونڈسر گریٹ پارک میں چلے گئے۔

شہزادی ایلزبتھ اور ان کی چھوٹی بہن شہزادی مارگریٹ نے جو آپ سے چار برس چھوٹی تھیں گھر پر سکاٹ لینڈ کی ایک گورنس مس میرین کرافورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ مس میرین کرافورڈ ایڈنبرا یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں۔ (آپ نے بعد میں میجر جارج بکلے سے شادی کر لی تھی) جب شہزادی ایلزبتھ کے والد تخت نشین ہو کر کنگ جارج ششم ہوئے تو شہزادی نے جو اب ولی عہد تھیں آئین کی تاریخ اور قانون کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان مضامین میں آپ سر ہنری مارٹن پرووسٹ آف ایٹن (پھر وائس پرووسٹ) کی شاگرد رہیں۔

بڑی ہو کر آپ باہر کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگیں۔ آپ نے چودہ سال کی عمر میں پہلی بار اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں حصہ لیا۔ جنوبی افریقہ کے ناول نگار سارا گرٹروڈ ملن نے اپنی ڈائری میں ملکہ کے نشریہ کی بہت تعریف کی۔ اس نے لکھا تھا کہ "یہ بچی اچھی ملکہ ہوگی"۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں شہزادی ایلزبتھ کو گرینیڈیئر گارڈز کا کرنل بنا دیا گیا۔ سولھویں سالگرہ پر آپ نے پہلی بار باہر کی زندگی میں قدم رکھا اور رجمنٹ کا معائنہ کیا۔ یوں ایک روز پیشتر آپ نے پہلی بار سرکاری طور پر شرف باریابی بخشا تھا۔ کرنل پریکاٹ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو رجمنٹ کے افسروں اور سپاہیوں کی طرف سے سالگرہ کا تحفہ ہیروں سے جڑا ہوا بروچ پیش کیا۔

ازاں بعد سرکاری فرائض کے سلسلے میں آپ آئے دن عوام کے سامنے آنے لگیں۔ آپ موسیقی کی دلدادہ ہیں۔ اس وقت آپ پیانو سیکھ رہی تھیں۔ سترہ برس کی عمر میں آپ نے رائل کالج آف میوزک کی صدارت قبول کر لی۔ برطانیہ کی حدود میں آپ شہنشاہ اور ملکہ کے ساتھ سرکاری دوروں پر جانے لگیں۔ آپ نے متعدد سرکاری دفاتر میں کام بھی کیا۔ آپ کی سوشل سرگرمیوں میں کوئن ایلزبتھ ہسپتال کی صدارت بھی ہے۔ آپ نے اس ہسپتال کی رسم افتتاح پر پہلی پبلک تقریر کی تھی۔ آپ نے

نیشنل سوسائٹی برائے انسدادِ بے رحمی اطفال کی بھی صدارت کی۔ جب شہنشاہِ معظم جارج ششم اٹلی کے محاذ کے دورے پر گئے تو شہزادی ایلزبتھ کو کونسلر آف سٹیٹ مقرر کیا گیا۔

فرصت کی گھڑیوں میں آپ ہمجولی لڑکیوں کے ساتھ ہنسا کھیلا کرتی تھیں۔ آپ کو آرٹ اور موسیقی سے بہت پیار ہے۔ آپ نے لڑکیوں سے مل کر گانا بھی سیکھا اور پیانو بجانے میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ گھر سے باہر کی سرگرمیوں اور گھوڑوں کی بہت شوقین ہیں۔ آپ بچپن سے ہی گھڑسواری میں طاق ہیں۔ آپ تیراکی اور ڈوبتوں کی جان بچانے کے فن میں بھی ماہر ہیں۔ آپ نے تیرہ برس کی عمر میں باتھ کلب میں بچوں کی چیلنج شیلڈ جیتی تھی۔ آپ کو تھیٹریکل تقریبوں میں شریک ہونے کا بھی شوق رہا ہے اور ونڈسر میں کرسمس کی تقریب پر آپ پرنسپل بوائے کا پارٹ ادا کیا کرتی تھیں۔

نوجوانوں کی سرگرمیوں میں آپ خاص طور پر شریک ہوا کرتی تھیں۔ گیارہ برس کی عمر میں آپ گرل گائیڈ میں شامل ہوئیں اور بکنگھم پیلس گائیڈ کمپنی کی پٹرول لیڈر، بعد میں سی رینجر بنیں۔ آپ ۱۹۴۵ء میں باقاعدہ ٹریننگ لے کر سیکنڈ لفٹیننٹ بنیں اور ٹرانسپورٹ ٹریننگ سنٹر میں کورس کر کے بحیثیت کار ڈرائیور رہ گئیں۔ آپ وومن رائل آرمی کور کی آنریری بریگیڈیر بھی رہیں۔

جنگ کے بعد آپ کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ بہت سے ادارے آپ کو اپنی سرپرستی اور صدارت پیش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں آپ کو برطانیہ بھر میں گھومنا پڑا۔ آپ سکاٹ لینڈ بھی گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں آپ والدین کے ساتھ جنوبی افریقہ کے دورے پر گئیں اور اسی دورے کے دوران اپنی اکیسویں سالگرہ منائی۔ اس تقریب پر آپ نے کیپ ٹاؤن سے دولتِ مشترکہ کو ریڈیو سے خطاب کیا۔

جنوبی افریقہ سے واپس آتے ہی شہنشاہِ معظم نے شہزادی ایلزبتھ اور لفٹیننٹ مونٹ بیٹن کی منگنی کا اعلان کر دیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو دونوں کی شادی کر دی گئی۔ دولہا کو ڈیوک آف ایڈنبرا بنا کر ہز رائل ہائی نس کا رتبہ دے دیا گیا۔ اگلے سال ان کا ولی عہد 'پرنس آف ویلز' پیدا ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں پرنس آف ویلز کی بہن اور ۱۹۶۰ء میں ایک اور بھائی پیدا ہوا۔

ملکۂ معظمہ سرکاری دوروں پر متعدد بار کئی ممالک میں بھی گئیں۔ ڈیوک آف ایڈنبرا کے ساتھ آپ فرانس، ایران اور کینیڈا بھی گئیں۔ جب آپ شہزادی تھیں تو آپ چار بار مالٹا گئیں۔ ان دنوں ڈیوک آف ایڈنبرا وہیں ہوتے تھے۔ آپ کے خاندان کا کوئی فرد کرۂ ارض پر اتنا نہیں گھوما جتنا آپ کو موقع ملا ہے۔ آپ کے والد نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے دورے کا پروگرام بنایا تھا مگر علالت کی وجہ سے نہ جا سکے۔ ان کی جگہ شہزادی ایلزبتھ چلی گئیں۔ آپ کینیا میں تھیں جب آپ نے اپنے والد کنگ جارج ششم کی وفات اور اپنی جانشینی کی خبر سنی۔

تخت نشینی کے موقع پر آپ نے فرمایا تھا۔

> "میں اپنے والد کی طرح آئینی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اور
> کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی اپنی رعایا کی خوشنودی اور خوشحالی کے لیے
> ہمیشہ سرگرم رہوں گی۔ میں ان لوگوں کی شکر گزار ہوں ان کی

> وفاداری اور محبت اور پارلیمنٹ کے صلاح مشورے کے بغیر میں اپنے وعدے پورے کرنے کے قابل نہ ہو سکوں گی۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھے یہ عظیم ذمہ داری جو مجھ پر اسی عمر میں ڈال دی گئی ہے نبھانے میں دستگیری کرے۔

آپ کی رسم تاجپوشی ۲ جون ۱۹۵۳ء کو ادا کی گئی۔ ملکہ کی حیثیت سے آپ نے دولت مشترکہ کا دورہ شروع کیا۔ نومبر ۱۹۵۳ء سے مئی ۱۹۵۴ء تک آپ اور ڈیوک آف ایڈنبرا نے برمودا، جمائیکا، فجی، ٹونگا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، لنکا، یوگنڈا، مالٹا اور جبرالٹر کا دورہ کیا۔ اس کے بعد آپ ناروے، نائجیریا، پرتگال، فرانس، ڈنمارک، کینیڈا، امریکہ، نیدرلینڈ، اٹلی، گھانا، ہندوستان، نیپال، ترکی، ایران اور چند اور ملکوں اور مملکتوں میں گئیں۔ آپ پاکستان بھی تشریف لائی تھیں۔ آپ جہاں بھی گئیں لوگوں نے آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں۔

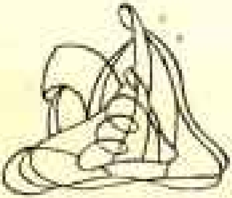

تیمور گورگانی

ولادت : ۷۳۶ھ (۳۶-۱۳۳۵ء)

وفات : ۹ر فروری ۱۴۰۵ء

میرے پیر نے مجھے لکھا کہ "ابوالمنصور تیمور! تم کاروبارِ سلطنت میں چار باتوں پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ باہمی مشورہ، ذاتی رائے، دُور اندیشی اور بیدار مغزی — کیونکہ جو سلطنت بادشاہ کی زبردست ذاتی رائے اور مشیروں کی نیک صلاح سے خالی ہو وہ بالکل اس جاہل شخص کے مشابہ ہے جس کے تمام افعال و اقوال از سرتا پا غلط ہوتے ہیں اور اس کی باتیں اور اس کے کام از اول تا آخر پشیمانی اور ندامت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی سلطنت کے کاروبار کو چلانے میں داناؤں کے مشورہ اور اپنی تدبیر پر عمل کرو تاکہ آخر میں پچھتانا نہ پڑے۔

تم کو یہ بھی یاد رہے کہ سلطنت کے کاموں میں ایک حصّہ برداشت اور تحمل کا ہے اور دوسرا حصہ جاننے اور سمجھنے کے بعد غافل اور ناداں بننے کا۔ مگر پختہ ارادہ، صبر، پامردی و استقلال، دُور اندیشی اور انجام بینی کے ذریعے سارے کام سُدھر جاتے ہیں۔ والسلام۔"

یہ خط گویا ایک رہنما تھا جس نے مجھے راہِ راست دکھائی اور بتا دیا کہ سلطنت کے امور نو حصے تدبیر و مشورہ کے ذریعے طے ہوتے ہیں اور صرف ایک حصہ تلوار کے وسیلے سے۔ داناؤں کا قول ہے کہ ایک ہی عمدہ تدبیر سے ایسے ملک فتح کیے جا سکتے اور اس قسم کی فوجیں منہزم کی جا سکتی ہیں جو سینکڑوں لشکروں کی تلواروں سے بھی قابو میں نہ آسکیں۔ مجھے تجربہ ہوا ہے کہ ایک آزمودہ کار بہادر، جوانمرد، صاحب عزم و تدبیر اور دُور اندیش آدمی ہزار بے تدبیر اور غیر دُور اندیش آدمیوں سے کہیں بڑھ کر اچھا اور مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک کاردان آدمی ہزار آدمیوں سے اپنے ماتحت کام لیتا ہے۔

مجھے یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ دشمنوں اور مخالفوں پر غالب آنے میں لشکر کی زیادتی کوئی سبب نہیں ہوتی اور نہ فوج کی کمی دشمن کے مقابلے میں مغلوب بنا سکتی ہے بلکہ غلبہ اور فتح خدا کی مدد اور تدبیر پر موقوف ہے۔ چنانچہ صرف ۲۴۳ شخصوں کے ساتھ مشورہ اور تدبیر کی وجہ سے شہر قرشی کے قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ امیر موسیٰ اور ملک بہادر دو نامور سردار بارہ ہزار سواروں کی جمعیت سے قلعہ کے اندر اور اس کے گرد و پیش جمع ہوئے تھے مگر میں نے خدائے بزرگ کی امداد اور درست تدبیر کی اعانت سے اس قلعہ پر قبضہ کر ہی لیا اور پھر امیر موسیٰ اور ملک بہادر دونوں بارہ ہزار سواروں کے ساتھ آکر مجھے قلعہ قرشی میں محصور کر لینے کے درپے ہوئے لیکن میں نے خدا کی تائید پر بھروسہ کیا اور تدبیر و دُور اندیشی کی راہ سے میدان میں نکل آیا۔ ان سے باری باری جنگ کی اور انہی

دو سو چالیس آدمیوں سے بارہ ہزار سواروں کو شکست فاش دی۔ کئی فرسنگ کی دوری تک ان کا تعاقب بھی کیا۔

مجھ کو یہ تجربہ بھی ہوا کہ مشورہ اور تدبیر ہمیشہ بیدار مغز اور ہوشیار آدمی ہی سے درست ہوتی ہے۔ اگرچہ کاموں کی رفتار کا ان کا چل پڑنا پردہ تقدیر میں پوشیدہ ہے لیکن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن روش پر چل کر میں نے جو کام کیا وہ صلاح مشورہ ہی سے کیا۔ جس وقت میں اپنے مشیر کاروں کو جمع کرتا اور ان سے کسی باب میں صلاح لینا چاہتا تو ان تمام کاموں کو جو درپیش ہوتے ان سے بیان کر کے ان کے نفع و نقصان، کرنے یا نہ کرنے اور خوبی و خرابی کے متعلق صلاح لیتا تھا۔ پھر ان کی باتیں سن کر ان کے دونوں پہلوؤں پر خود بھی کامل غور و خوض کرتا اور سوچتا کہ ان آرا میں کیا فائدہ ہے اور کیا ضرر ہے۔ پھر بڑی ژرف نگاہی سے اس کام کی دشواریوں اور خطروں کو سوچتا اور جس کام میں دو خطرے نظر آتے اسے چھوڑ کر وہ کام اختیار کر لیتا جس میں ایک ہی خطرہ ہوا کرتا۔

تغلق تیمور خاں کے ماتحت سرداروں اور امیروں نے جتہ کے میدان میں اس کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اس سے پھر گئے۔ تغلق تیمور خاں نے مجھ سے صلاح پوچھی کہ اس حالت میں کیا کرے؟ میں نے کہا کہ اگر تم ان کے مقابلے پر فوج روانہ کرو گے تو دو خطرہ کی صورت نظر آتی ہے اور اگر خود ان کی گوشمالی کرنے جاؤ گے تو صرف ایک ہی خطرہ ہے۔ اس نے میری اس رائے پر عمل کیا اور خود جتہ کو گیا اور وہی ہوا جو میں نے اسے کہا تھا۔

میں نے تمام کاموں میں صلاح مشورہ ہی پر عمل کیا ہے اور بعد صلاح سے جس کام کے کرنے کا فیصلہ ہو گیا اس کی انجام دہی میں ٹھیک تدبیر کی ہے۔ پہلے دیکھ لیا ہے کہ اس کام کے بر آنے کا کیا طریقہ ہے، تب اس کو شروع کیا ہے اور یوں کہ درست تدبیر، عزم، دراکی اور ہوشیاری، پیش بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اسے انجام کو پہنچا دیا ہے۔

تغلق تیمور خاں نے ۷۶۲ھ میں ماوراءالنہر پر دوبارہ لشکر کشی کی۔ اس نے مجھ کو طلبی کا خط بھیجا۔ میں پیش قدمی کر کے اس سے ملنے گیا۔ لیکن تغلق تیمور خاں نے عہد شکنی کی۔ ماوراءالنہر کی حکومت مجھ سے لے کر اپنے بیٹے الیاس خواجہ کے حوالے کی اور مجھے اس کا سپہ سالار بنا دیا اور جب دیکھا کہ میں اس برتاؤ سے ناخوش ہوں تو اس وقت میرے دادا اور مورث اعلیٰ قاچولی اور قبل خاں کا عہد نامہ مجھے دکھایا۔ یہ عہد نامہ فولاد کی تختی پر کندہ تھا اور اس کا مضمون یہ تھا کہ خانی (شاہی فرمانروائی) قبل خاں کے بیٹوں اور اولاد کا حق ہوگا اور قاچولی بہادر کی اولاد ان بادشاہوں کی سپہ سالار رہے گی۔ دونوں کی اولاد باہم کوئی مخالفت نہ رکھے گی۔ میں نے اس عہد نامہ کو دیکھ کر سر تسلیم خم کر دیا اور بے عذر و حیلہ سپہ سالاری منظور کر لی۔

مگر چونکہ ازبک قوم نے ماوراءالنہر میں بڑی دھاندلی مچا رکھی تھی۔ اس لیے ظلم و تعدی حد سے بڑھ گیا تھا۔ انھوں نے ستر سیدوں اور سیدزادوں کو قید میں ڈال رکھا تھا۔ الیاس خواجہ کو سلطنت و فرمانروائی کا دماغ نہ تھا۔ اس سے ازبکوں کا ظلم اور ان کی دست درازیاں دور کی نہ جا سکیں۔ آخر میں نے دباؤ ڈال کر ازبکوں کو نیچا دکھایا اور مظلوموں کو ان کے ہاتھوں سے رہائی دلوائی۔ الیاس خواجہ کے ماتحت فوجی سردار اور امیران دربار اور ازبک اس بات سے میرے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے تغلق تیمور کو لکھا کہ تیمور باغی ہو گیا ہے۔ خان نے اس افترا کو مان لیا اور میرے قتل کا شاہی فرمان صادر کر دیا۔ وہ فرمان خوش قسمتی سے میرے

ہی ہاتھ لگا اور میں نے دیکھا کہ اب جان کی خیر نہیں۔ گردن ماری جائے گی۔ اس کا چارہ کرنا چاہیے۔ بس یہ تدبیر کی کہ الوس برلاس کے جوانوں کو جمع کر کے انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں میں سے جس شخص نے سب سے پہلے میری متابعت کے لیے ہاتھ بڑھایا اس کا نام ایکو تیمور تھا۔ دوسرا امیر جاکو برلاس تھا اور دوسرے بہادروں نے بجان و دل میری ماتحتی اور جاں نثاری منظور کی۔

ماوراء النہر کے باشندے میرے ارادے سے خبردار ہوئے اور انھیں معلوم ہوا کہ میں نے ازبکوں پر حملہ کرنے اور انھیں پامال کرنے کا قصد کیا ہے تو چونکہ ان کے دل بھی ظالم ازبکوں کے گروہ سے برگشتہ تھے، تمام بڑے اور چھوٹے باشندگان ماوراء النہر میرے ہم خیال و ہمدم ہو گئے اور علماء و مشائخ نے گروہ ازبکیہ کو ملک سے دُور و دفع کرنے کا فتویٰ لکھ دیا اور چند قبائل اور فوجوں کے سردار بھی اس بارے میں متفق الرائے ہو گئے۔ علماء و مشائخ کا فتویٰ اور اہل ماوراء النہر کے عہد نامے کو ایک کاغذ پر اس طرح سے لکھا گیا:

"خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی صورت و سیرت کے مطابق اہل اسلام سپاہ و رعیت اور علماء و مشائخ نے اس کو معزز و صاحب کرم دیکھ کر سلطنت کے لقب "قطب السلطنت امیر تیمور ایدہ اللہ" سے ملقب کیا ہے اور وعدہ کرتے ہیں کہ مال و جان سے گروہ ازبکیہ کو رفع دفع اور قلع قمع کرنے میں جس نے مسلمانوں کے نام و ناموس و آبرو اور مال و جان پر دست ظلم و تعدی دراز کر رکھا ہے، کوشش کریں گے اور اپنے قول و پیمان میں پکے رہیں گے۔ اگر ہم اس قول و اقرار کے خلاف کریں تو خدا کی مدد و قوت سے نکل کر شیطان کے بندے ہوں گے۔"

یہ فتویٰ اور معاہدہ میرے روبرو پیش کیا گیا اور میں نے اس کو دیکھتے ہی چاہا کہ جنگ و پیکار کا نشان بلند کر کے ازبکوں پر فوج کشی کروں اور مظلوموں کا حق اور بدلہ ظالموں سے لوں۔ لیکن چند کمینہ خصلت آدمیوں نے راز فاش کر دیا اور اس بات کا موقع نہ ہونے دیا کہ اچانک دشمن پر حملہ کیا جائے۔ میں نے دوبارہ دل میں سوچا کہ اگر سمرقند ہی میں رہ کر ازبکوں سے جنگ چھیڑ دوں تو ایسا نہ ہو کہ ماوراء النہر کے باشندے مدد میں کوتاہی کریں۔ بس یہ رائے قرار دی اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ شہر سمرقند سے باہر نکل کر پہاڑی علاقہ میں ڈیرہ ڈالوں تاکہ جو میرا ساتھ دینے والا ہو وہاں آ کر مجھ سے ملے اور تب جمعیت بہم کر کے ازبکوں سے میدان کارزار گرم کروں۔ چنانچہ جس وقت میں شہر سمرقند سے باہر نکلا، ساٹھ سواروں سے زیادہ کوئی میرے ساتھ نہ آیا اور میں نے جان لیا کہ میری رائے غلط نہ تھی۔

میں ایک ہفتہ تک پہاڑ میں پڑا رہا اور کوئی بھی نہ آیا۔ آخر اپنے دل میں ٹھان لی کہ بدخشاں چل کر وہاں کے حکمرانوں کو اپنا شریک بناؤں۔ سوار ہو کر روانہ ہوا۔ امیر کلال کے پاس پہنچا۔ انھوں نے مجھے رائے دی کہ خوارزم جاؤ تو اچھا ہو گا۔ میں نے ان کو سمرقند کی ایک سال کی آمدنی نذر کرنے کی پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ مجھے ازبکوں پر فتح ہوئی تو یہ رقم آپ کے نذر کی جائے گی۔ انھوں نے فاتحہ فتح و ظفر پڑھ کر مجھے رخصت کر دیا۔

امیر کلال کے پاس سے رخصت ہونے کے بعد بھی کل ساٹھ ہی سوار میرے ہم رکاب تھے۔ خوارزم میں میری آمد کی خبر الیاس

خواجہ کرل بھی تھی۔ اس نے شہر خیوق کے حاکم تغل بہادر کو لکھا کہ مجھ پر حملہ کر کے مجھے قتل کر ڈالے۔ تغل بہادر ایک ہزار کی جمعیت سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میرے پاس کل وہی ساٹھ سوار تھے۔ راستہ میں میرا سالا امیر حسین مجھ سے آکر مل گیا۔ ہم دونوں نے اپنی ہمراہی اور کے ساتھ دشمن کے کثیر لشکر کا مقابلہ کیا اور لڑائی شروع کر دی۔ میں اس درجہ دلیری اور سرفروشی سے لڑا کہ دشمن کے ہزار سواروں میں سے کل پچاس زندہ باقی رہے اور میرے ساٹھ سواروں میں سے صرف دس بچے تھے مگر اخلاقاً فتح میری ہوئی اور دشمن بھاگ کے بچ گیا تھا۔

الیاس خواجہ اور امیران جتہ کو میری ظفر مندی کی خبر ملی تو وہ کہنے لگے کہ تیمور عجیب با اقبال اور تائید ایزدی سے بہرہ ور ہے۔ میں نے اس فتح کو اپنے لیے نیک شگون تصور کیا۔ اوزبکوں کی آنکھیں میرے آگے جھک گئیں اور وہ بہت خائف ہو گئے۔

تغل بہادر کی جنگ میں میری سلطنت و دولت کی بنیاد درہم برہم ہو گئی تھی اور صرف دس آدمی میرے پاس تھے ان میں سے بھی سات سوار اور تین پیدل تھے اور کوئی میرا رفیق و معین نہ تھا۔ امیر حسین کی بہن جو میری معزز بیگم تھی۔ میں اس کو خود اپنے گھوڑے پر سوار کئے تھا اور خوارزم کے بیابان میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک رات ایک کنوئیں پر قیام کیا تو تین پیدل خراسانی بے وفا جو میرے ساتھ تھے تین گھوڑے لے کر بھاگ گئے۔ اب یہ وقت ہوئی کہ سات آدمیوں میں کل چار گھوڑے رہ گئے۔ میری حالت کمال ابتر تھی۔ پریشانی حد سے بڑھی ہوئی تھی مگر دل قوی تھا اور میں بدحواسی کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس کنوئیں کے پاس سے آگے چلا۔ راستے میں علی بیگ رہزن نے مجھ پر حملہ کیا اور گرفتار کر کے لے گیا۔ اس نے مجھے ایک مکان میں جس کے اندر پسو بھرے تھے قید کر دیا اور بہت سے نگہبان مقرر کئے کہ مجھے حراست میں رکھیں۔ باسٹھ دن میں اس کے یہاں قید رہا۔ آخر اپنے دل میں ٹھانی اور خدا کی مدد شامل حال ہوئی۔ دلیری و جانبازی کر کے نگہبانوں ہی میں سے ایک کی تلوار چھینی اور ان پر حملہ کر کے ان کو بھگا دیا۔

میں زنداں سے نکل کر علی بیگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور وہ اپنے ناشائستہ فعل سے کہ مجھ کو قید کیا تھا، شرمندہ و نادم ہو کر معافی کا طالب ہوا۔ میرے گھوڑے اور اسلحہ کو لا کر حاضر کیا اور ایک مریل سا گھوڑا معہ ایک کمزور اونٹ کے اپنی طرف سے نذر کیا۔ اس کے بھائی محمد بیگ نے جو تحفہ مجھے بھیجا تھا اس میں سے بھی طمع کر کے کچھ خود رکھ لیا اور باقی مجھے دے کر رخصت کیا۔ میں پھر خوارزم کے جنگل کی طرف چلا۔ بارہ سوار میرے پاس جمع ہو گئے تھے۔ وہی ساتھ تھے۔ دو دن بعد ایک گاؤں میں پہنچا۔ ایک گھر میں اترا۔ اس بستی میں ترکمانوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ لوٹ لینے کے ارادے سے مجھ پر حملہ آور ہوتی۔ میں نے امیر حسین کی بہن کو گھر میں بحفاظت بٹھا دیا اور خود نکل کر رہزنوں کا مقابلہ کیا۔ اسی حالت میں ترکمانوں میں سے ایک شخص حاجی محمد نامی نے مجھے پہچان لیا اور شور مچایا کہ یہ تو امیر تیمور ہے۔ وگرا اس سے نہ لڑنا۔ پھر میرے سامنے آکر سر اطاعت جھکا دیا۔ میں نے اس کی دلدہی کی اور اپنا رومال اس کے سر پر ڈال دیا۔ وہ معہ اپنے بھائیوں کے آکر میری خدمت میں ملازم ہو گیا۔

تسخیر ہندوستان کی تجویز

ہندوستان پر علم فتح و ظفر بلند کرنے سے قبل میں نے فرزندوں اور امیران سپاہ سے مزاج دانی کے طور پر صلاح لی۔

امیر زادہ پیر محمد جہانگیر نے کہا کہ جب ہم مملکتِ ہند کو فتح کریں گے تو وہاں کے مال و زر سے عالمگیر ہو جانا ممکن ہے۔ امیر زادہ محمد سلطان نے رائے دی کہ ہم ہندوستان فتح تو کر لیں گے لیکن اس ملک کے بہت سے مستحکم قلعے ہیں۔ اوّل تو اس میں بہت سے دریا ہیں۔ پھر جنگل اور میدان اور سوم مسلح سپاہ اور آدمیوں کو شکار کرنے والے تربیت یافتہ جنگی ہاتھی۔ ان چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کا سامان کر لینا واجب ہے۔ امیر زادہ سلطان حسین نے کہا کہ جب ہم مملکت ہندوستان لے لیں گے اس وقت آباد دُنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر حکمران بن جائیں گے۔ امیر زادہ شاہ رخ نے یہ جواب دیا کہ اُس نے ترک کے قوانین میں مطالعہ کیا ہے کہ دُنیا میں پانچ بادشاہ نہایت عظیم الشان ہیں۔ ان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ عزت و حرمت کی وجہ سے لوگ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ خاص القاب سے یاد کرتے ہیں۔ بادشاہ ہندوستان کو رائے کہتے ہیں۔ روم کے بادشاہ کو قیصر۔ ختا اور چین و ماچین کے فرمانروا کو فغفور۔ ترکستان کے جہاندار کو خاقان اور ایران و توران کے اورنگ نشین کو شاہنشاہ کہتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شہنشاہ کا حکم ہمیشہ ملک ہندوستان پر جاری رہا ہے۔ اس لیے کہ ایران و توران کا ملک ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ ہمیں لازم اور واجب ہے کہ ہندوستان کو بھی فتح کریں اور مسخر بنائیں۔ غرض کہ فرزندانِ والا قدر کی تو یہ رائے ہوئی کہ ملک ہندوستان کی تسخیر ضروری ہے اور اس کا سامان مکمل کر کے چلنا ہو گا۔

اور دیگر سردارانِ سپاہ و سردارانِ لشکر نے یہ کہا کہ گو ہم ملک ہندوستان کو فتح کریں گے لیکن اگر ہم نے وہاں قیام کیا اور سکونت اختیار کی تو ہماری نسل برباد ہو جائے گی اور ہمارے بیٹے پوتے اپنی ترکی ترکیب سے خارج ہو کر ہندی نژاد اور ہندی زبان ہو جائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ عزم تسخیر ہندوستان میں مذبذب ہیں۔ مگر میں نے چونکہ اس بات کو دل میں ٹھان لیا تھا کہ ضرور ہندوستان کو فتح کروں گا۔ اس لیے اپنے ارادہ کو ترک نہ کرنا چاہا اور امیرانِ سپاہ کو جواب دیا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر قرآن شریف سے جنگ کی فال نکالتا ہوں۔ پھر جو خدا کا حکم ہو گا۔ اسی پر عمل کروں گا۔ یہ بات سبھوں نے مان لی۔ میں نے قرآن مجید سے فال نکالی اور آیۂ کریمہ برآمد ہوئی "یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین"۔ علماء دربار نے اس آیت شریفہ کا مضمون سردارانِ سپاہ کو سمجھایا تو وہ سب سر جھکا کر چپ ہو گئے اور میں ان کی خاموشی سے رنجیدہ خاطر ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جو سردارانِ سپاہ تسخیر ہندوستان پر راضی نہیں ہوتے ہیں ان کو سرداری کے رتبہ سے الگ کر دوں اور ان کی فوجوں اور جماعتوں کو ماتحت افسروں کے حوالہ کر دوں یا بے افسر کے اپنے تحت میں رکھوں مگر چونکہ وہ میرے ہی دست پروردہ تھے۔ میں نے ان کو برباد نہ کرنا چاہا اور ان سے نرمی اور لطف کے ساتھ پیش آیا۔ اگرچہ ان لوگوں نے مجھ کو بہت رنجیدہ اور برہم کیا تھا لیکن جب وہ آخر میں میرے ہم خیال ہو گئے تو میں نے بھی ان کی اس لغزش سے درگزر کی اور ان کی بے حوصلگی کا خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔

اب دوبارہ قرار داد اور مشورہ کر کے چلنے کی صلاح ٹھہرائی، تو میں خانۂ اقبال ہندوستان کی سمت روانگی کے لیے نکل آیا اور میں نے فاتحۂ فتح پڑھا۔ ہندوستان کے پایۂ تخت پر اپنے لشکروں کے متعین کرنے کی تجویز میں نے اس طور پر کی کہ امیر زادہ پیر محمد جہانگیر کو جو تیس ہزار سواروں کے ساتھ کابل میں حکمران تھا حکم دیا کہ وہ کوہ سلیمان کے راستے سے ہندوستان میں جائے اور دریائے سندھ

عبور کر کے صوبۂ ملتان پر حملہ کر کے اس کو فتح کرے۔ امیرزادہ مذکور لشکر جرانغار (افواج دست راست) کا سپہ سالار تھا۔

سلطان محمد خاں امیرزادہ رستم اور دیگر کئی امیروں کو تیس ہزار سواران برانغار (سپاہ دست چپ) کے ساتھ حکم دیا کہ وہ دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد کوہ کشمیر کے دامن سے صوبۂ لاہور پر حملہ کرنے کو بڑھیں۔ خود میں تیس ہزار سواروں کے ساتھ بعزم جنگ و فتح ہندوستان روانہ ہوا۔ چونکہ میرے لشکر کی مجموعی تعداد ۹۲ ہزار سوار تھی اور یہ عدد نام پاک "محمد" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداد بحساب جمل کے ساتھ بالکل موافق و مطابق ہے۔ اس لیے میں نے اس کو نیک اور مبارک فال تصور کیا۔ خوشی میں سوار ہو کر سرحد بدخشاں کے موضع اندراب میں خیمہ زن ہوا اور وہاں پر کوہستان کتور کے کافروں کی گوشمالی کر کے انھیں سیدھا کیا اور جب دارالحرب ہندوستان کے راستہ میں اوغانیوں کی جو شریر جماعت سدراہ اور موجب زحمت تھی ان کو رام اور ہموار کرنے کی میں نے یہ تجویز کی کہ جس وقت بعض اوغانیوں کا ارادہ ہندوستان میں راہزنی کرنے اور آیندو روند کو چھیڑنے کا میں نے سن پایا اور معلوم کیا کہ خاص کر موسیٰ خاں اوغان جو کہ قبیلہ کرکس کا سردار کلاں ہے اور اس نے امیرزادہ پیر محمد کے مقرر کردہ لشکر شاہ اوغان پر جو کہ میرا اچھا کار اور ہوا خواہ تھا اور قلعہ ایاب کی حفاظت کر رہا تھا حملہ کر دیا ہے اور اس کو قتل کر کے تمام ساز و سامان جو کچھ بھی قلعہ میں موجود تھا یا نہ تھا لوٹ لیا ہے۔ نیز اسی وقت لشکر شاہ مقتول کا بھائی ملک محمد بھی میرے دربار میں آکر فریادی ہوا کہ موسیٰ خاں نے ظلم و تعدی کر کے اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے مصلحت و تدبیر سے کام لیا اور حکم دیا کہ ملک محمد کو قید کر لیں اور موسیٰ خاں کی نسبت برملا کہا کہ وہ میرا ہوا خواہ اور مخلص ہے۔ میرے سرداران سپاہ و امیران دربار کو میری یہ حرکت ناگوار گزری۔ انھوں نے مجھے ظالم و ناحق کوش کہا۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

موسیٰ کو ملک محمد کے قید کیے جانے اور میرے کلام کی خبر ملی تو وہ قوی دل ہو گیا اور جونہی میرا فرمان طلبی اسے ملا وہ بے دہشت و بلا تامل حاضر ہو کر قلعہ میری نذر کر دیا اور جس وقت میں اس قلعہ کی سیر کو گیا ہوں۔ موسیٰ ہی کے سپاہیوں میں سے کسی نے ایک تیر مارا۔ یہ تیر مارنے والے نے مجھے تاک کر چلایا تھا مگر قدرت کردگار سے لگا موسیٰ کے اور وہ گنہگار اپنی کرنی کا بدلہ پا گیا۔ یوں ہندوستان کا راستہ بے خرخشہ کھل گیا۔

سلطان محمود حاکم دہلی اور ملو خاں کو شکست دینے اور نیچا دکھانے کی تدبیر میں نے یوں کی کہ سلطان محمود اور ملو خاں پچاس ہزار فوج سوار اور پیدل اور ایک سو بیس جنگی ہاتھیوں سمیت قلعہ دہلی میں قلعہ بند ہو کر مجھ سے جنگ مدافعت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اندیشہ آیا کہ اگر میں قلعہ دہلی کو فتح کرنے کا پابند ہوتا ہوں تو ممکن ہے کہ یہ کام دیر طلب نکلے اور بات دور جا پڑے۔ اس لیے میں نے اپنے دل میں یہ صلاح قرار دی کہ اپنے آپ کو عاجز اور بے حوصلہ نمایاں کر کے دشمن کو میدان میں نکل آنے کا حوصلہ دلاؤں اور کھلے میدان میں اس سے جنگ کروں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی حکم دے دیا کہ میرے کیمپ کے گرد خندق تیار کی جائے اور کیمپ کو خوب مورچہ بند بنا لیا جائے۔ پھر ایک مختصر فوج کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور انھیں سمجھا دیا کہ دشمن کے مقابلہ میں منہزم اور خائف بن کر پسپا ہو آئیں تاکہ غنیم کا حوصلہ بڑھے اور وہ دلیری کر کے میدان میں نکلے۔

میری یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ غنیم نے دیکھا کہ وہ غالب ہے۔ اس کی عقل ماری گئی۔ وہ از راہِ حماقت و بدبختی میدان میں نکل کر میری قاہر فوجوں کے بالمقابل آیا۔ سلطان محمود حاکم دہلی نے اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شکست کھا کر کوہستان کی طرف بھاگ گیا۔ میری سپاہ کے لوگوں کو بے شمار غنیمت اور مال و زر اس جنگ میں حاصل ہوا اور میں نے ایک سال کے اندر ہی ہندوستان کے دارالملک کو فتح کر کے اسی سال کے آخری ایام میں اپنے دارالسلطنت کو واپس بھی آگیا۔

آئین جہانگیری وجہانداری

دین و شریعت کے اہتمام سے فارغ ہو کر میں نے اپنی سلطنت کے کارخانہ کا قاعدہ و قانون مرتب کیا اور اپنی سلطنت کے مراتب کے متعلق جو ضابطہ و قاعدہ بنایا اس پر عمل کرتا رہا۔ اس غرض کے لیے میں نے یہ قواعد قائم کیے۔

اوّل یہ کہ اپنی سلطنت کے قواعد کو دینِ اسلام اور شریعت خیر الانام اور آں حضرت کے واجب الاحترام اصحاب اور آل کی محبت سے استوار کیا اور اپنی سلطنت کے مرتبہ کی نگہداشت ضوابط و قوانین سے اس طرح کر دی کہ کسی کو میری سلطنت میں دست اندازی کی جرأت نہ پڑ سکتی تھی۔

دوم سپاہ اور رعیت کو امید اور خوف کے مرتبہ میں رکھتا۔ دوست و دشمن سے مروت اور مدارا کا سلوک مرعی رکھ کر ان کی گفتار و کردار سے تحمل و تغافل کے ساتھ درگذر کرتا اور دوست و دشمن میں سے جو شخص مجھ تک کوئی التجا لاتا تو دوستوں سے ایسی مروت کرتا کہ ان کی دوستی اور بڑھ جاتی اور دشمنوں سے ایسا سلوک کرتا کہ ان کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جاتی۔ اگر کسی شخص کا مجھ پر کچھ حق ہوتا تو اس کے حق کو کبھی ضائع نہ کرتا اور اگر کسی سے جان پہچان ہو جاتی تو اسے کبھی نظر سے نہ گراتا۔ ان تمام لوگوں کو جو دولت و سلطنت کی ابتدا کے زمانے میں میری طرف رجوع لائے تھے، خواہ نیک تھے یا بد۔ اور خواہ مجھ سے نیکی کی تھی یا بدی جونہی تخت سلطنت پر بیٹھا اپنے احسان کا شرمندہ بنا لیا۔ ان کی بدیوں کو جو مجھ سے کی تھیں بھول گیا اور ان کے نامۂ اعمال پر عفو کا خط کھینچ دیا۔

سوم: کسی شخص سے انتقام کے درپے نہ ہوا اور ان لوگوں کو جنھوں نے مجھ سے بدی کی تھی خدا کے سپرد کیا۔ اربابِ شجاعت اور مردان کار و آزمودہ کار کی خاطر مدارات کرتا اور اصیل لوگوں، سادات و علماء و فضلاء کو بلا تامل پاس بلاتا اور شریر بدنفسوں اور لئیموں کو اپنی مجلس سے دُور رکھتا۔

چہارم: خلقِ خدا کو کشادہ روئی اور رحم و شفقت سے اپنا گرویدہ بنایا، عدل و انصاف سے رام کیا اور جور و ظلم سے دُور رہا۔

ان ایام میں میرے پیر نے مجھے یہ خط لکھا کہ "ابوالمنصور تیمور ایدہ اللہ تعالیٰ کو معلوم رہے کہ سلطنت کا کارخانہ خدائی کارخانہ ہی کا ایک نمونہ ہے کہ جس میں عملہ خلفا، نائب اور حاجب ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنے کام میں مشغول رہتا ہے اور

اپنے مرتبے سے تجاوز نہیں کرتا اور امر اعلیٰ کا منتظر رہتا ہے۔ پس مجھے اعتبار کرنی چاہیے کہ سپہ سالاروں، کارکنوں، عمال، لشکریوں اور وزراء میں سے ہر ایک اپنی اپنی حد کے اندر رہ کر حکم کا منتظر رہے۔ اسی طرح ہر قوم اور ہر گروہ کو اپنے اپنے مرتبہ پر قائم رکھ تاکہ تیری سلطنت کا انتظام و نظام درست رہے۔ اگر تو نے ہر چیز اور ہر شخص کے متعلق حفظ مراتب کا انتظام نہ کیا تو تیری سلطنت میں بہت خلل اور فساد رونما ہو جائے گا۔ پس لازم ہے کہ تو ہر چیز اور ہر شخص کا پایۂ قدر و منزلت نگاہ میں رکھے اور آل محمدؐ کے مرتبہ کو تمام مرتبوں سے اعلیٰ و برتر رکھ کر ان کی تعظیم و تکریم بجا لاتا رہے اور اُن کی محبت کو اشد ادا کرنے کو اسراف نہ سمجھے کیونکہ جو کچھ خدا کے لیے ہے اس میں اسراف کا شائبہ نہیں ہو سکتا اور سلطنت کے بارہ گروہوں سے اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ رکھ۔ والسلام۔

جب اپنے پیر کا یہ خط مجھ کو ملا۔ میں نے ان کے ارشادات کی تعمیل میں مراتب سلطنت کو نسق و انتظام سے آراستہ کیا اور مرتبہ سلطنت کو ضوابط و قانون سے مزین کیا اور بارہ گروہوں سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا اور ان بارہ گروہوں کو آسمان کے بارہ برجوں اور سال کے بارہ مہینوں کی طرح اپنی سلطنت کے کارخانے کے بارہ ستون قرار دیا۔

مجھ سے یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ ایک دفعہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اگر آپ نبوت و رسالت پر مبعوث و مامور نہ ہوتے تو کیا کام اختیار فرماتے۔ جواب میں فرمایا۔ سلاطین کی خدمت اختیار کرتا تاکہ مخلوق خدا کو نفع پہنچاتا۔ لہذا یہی وجہ تھی کہ میں نے تغلق تیمور خان کے بیٹے الیاس خواجہ کی وزارت و سپہ سالاری قبول کی تھی کہ مخلوق کی مدد کروں اور یہ اس امداد خلق اللہ کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سلطنت کے رتبہ تک پہنچا دیا۔

نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی

ولادت

اللہ تعالیٰ کی عنایت بے نہایت سے پنجشنبہ کے دن آٹھویں تاریخ ماہ جمادی الآخرہ کی ۱۰۱۴ھ میں دار الخلافہ آگرہ میں بہ عمر ۳۸ سال کے تخت سلطنت پر میں نے جلوس کیا۔ میرے والد بزرگوار کے جب تک اٹھائیس برس کی عمر ہوئی کوئی فرزند زندہ نہ رہتا تھا اس واسطے ہمیشہ اولیاء اللہ سے اس بات کی دعا طلب کرتے تھے۔ چونکہ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سرچشمہ اولیائے ہند کے ہیں تو واسطے حصول اس امر کے نیت کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو فرزند باحیات عنایت کرے تو میں آگرے سے روضہ متبرکہ تک کہ ایک سو چالیس کوس ہے، از راہ اخلاص پیادہ جاؤں گا۔ ۹۷۷ھ میں چہار شنبہ کے دن سترہویں تاریخ ربیع الاول کی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پیدا کیا۔ جن دنوں میرے باپ کو فرزند کی خواہش تھی حضرت شیخ سلیم نام ایک صاحب کمال سیکری کے پہاڑ میں قریب آگرے کے رہتے تھے۔ میرے باپ نے ان کا حال و کمال سن کر ملاقات کی اور ایک دن حالت توجہ میں پوچھا کہ حضرت میرے کے لڑکے ہوں گے؟ حضرت شیخ سلیم نے فرمایا کہ بخشندۂ بے منت تم کو تین فرزند عنایت کرے گا۔ میرے باپ نے کہا کہ میں نے نذر کی ہے پہلے لڑکے کو تمہارے دامن تربیت میں سونپوں گا۔ اس ولی اللہ نے اس بات کو قبول فرمایا اور اپنی زبان گوہر فشاں سے ارشاد کیا کہ مبارک ہو ہم نے بھی اس کو اپنا ہم نام کیا۔ جب میری والدہ کو زمانہ وضع حمل کا قریب آیا تو اُن کو حضرت شیخ سلیم کے گھر بھیج دیا کہ ولادت میری اُن کے گھر میں واقع ہو۔ بعد میرے پیدا ہونے کے میرا نام محمد سلیم رکھ کر سلطان کا خطاب دیا اور پیارے باتوں میں شیخو بابا کہا کرتے تھے۔ پھر میرے باپ نے موضع سیکری کو مبارک جان کر اپنا پایۂ تخت مقرر کیا اور چودہ پندرہ سال کے عرصے میں وہ سب جنگل اور میدان کہ درندوں کا مسکن تھا ایک عمدہ شہر مشتمل بر باغات و عمارات عالیشان کے ہو گیا۔ بعد فتح گجرات کے اس کا نام فتح پور رکھا۔

نام اور لقب

جب میں بادشاہ ہوا تو میرے دل میں آیا کہ اپنا نام بدلوں کیونکہ اس نام میں شبہ پڑتا ہے روم کے بادشاہوں کے نام کا تو غیب سے میرے دل میں آیا کہ بادشاہوں کا کام جہانگیری ہے، اپنا نام جہانگیر رکھوں اور چونکہ تخت نشینی میری اول وقتوں میں کہ وقت نور ہے واقع ہوئی ہے تو خطاب اپنا نور الدین کروں اور ایام شاہزادگی میں دانایان ہند کی زبان سے میں نے سنا تھا کہ بعد اکبر بادشاہ کے نور الدین نام ایک شخص حاکم ہوگا۔ اس واسطے میں نے نور الدین جہانگیر بادشاہ اپنا نام اور لقب مقرر کیا۔

پہلا حکم جو میں نے صادر کیا، ایک زنجیر عدالت کا تھا کہ اگر عدالت والے لوگوں کے انصاف میں سستی اور طرفداری دیکھیں تو وہ مظلوم لوگ اس زنجیر کو ہلا دیا کریں تاکہ میں اس کی آواز سے مطلع ہو کر خود فریاد سنا کروں اور صورت اس زنجیر کی یہ ہے کہ میں نے حکم دیا کہ سونے کی تیس گز لمبی ایک زنجیر بنا دیں اور ساٹھ گھنٹے اس میں ہوں کل وزن چار من ہندی کے کہ تیس من عراقی ہوتے ہیں۔ ایک سرا اس کا کنگرے میں قلعے کے شاہ برج سے باندھ دیا اور دوسرا سرا دریا کے کنارے پتھر کا ستون گڑوا کر کے باندھ دیا۔ سوا اس کے بارہ حکم فرمائے۔ کہ تمام ممالک محروسہ میں اس پر عمل ہو۔ ایک حکم یہ تھا کہ شراب اور تمام نشے کی چیزیں

جو شریعت میں منع ہیں کوئی نہ بنائے۔ اور نہ بیچے۔ باوجودیکہ میں خود شراب پیتا ہوں اور اٹھارہ برس کی عمر سے اب تک کہ (۳۸) سال کا ہوں اس کو کبھی ترک نہ کیا۔ اول میں نے بباعث حرص کے کبھی کبھی بیس پیالے تک دو آتشہ عرق نوش کیا ہے۔ لیکن جب مجھ میں اس کا اثر تمام و کمال ظاہر ہوا تو میں نے اس کو کم کرنا شروع کیا۔ سات برس کے عرصے میں پانچ چھ پیالے تک آیا اور پینے کے وقت بھی مختلف تھے۔ کبھی رات کبھی دن، کبھی صبح کبھی شام، آخر کو وقت شب کا مقرر کیا کہ دن کو کاروبار سلطنت میں خرابی نہ ہو۔ اور اب بالکل چھوڑ دی ہے۔ فقط ہضم طعام کے واسطے پیتا ہوں اور روا اس بات کا نہیں کہ کوئی اور بیچے پیئے۔ میں نے ایک سال پہلے اقرار کیا تھا کہ جمعہ کی رات کو شراب نہ پیوں گا۔ اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ ہمیشہ مجھ کو اس ارادے پر قائم رکھے۔ علماء اور مشائخ اسلام کو حکم دیا کہ اسمائے مقدسہ الٰہیہ کو تلاش کر کے جمع کریں تاکہ واسطے حفظ کے آسان ہو۔ میں اپنا ورد مقرر کروں اور جمعہ کی رات کو میں نے علماء اور سادات اور مشائخ کے ساتھ مجلس مقرر کی۔

پہلا نوروز

سہ شنبہ کی رات گیارھویں تاریخ ذیقعدہ کی ۱۰۱۴ھ پہلا نوروز میرے جلوس کا تھا۔ میں نے فرمایا کہ مکانات دولت خانہ خاص و عام کے عمدہ فرش اور آئینہ بندی سے آراستہ کریں اور پہلے دن نوروز کے سے انیسویں درجہ حمل تک تمام مخلوق نے داد عیش و کامرانی کی دی۔ اہل ساز اور ارباب نغمہ ہر قسم کے جمع تھے۔ لولیاں، رقاص اور دلبران ہند جو ناز و ادا سے دل فرشتوں کا لیتے تھے باعث گرمی مجلس کا ہوتے اور میں نے حکم دیا کہ اشیاء مسکرات جو چاہے اس جشن میں کھائے۔ کوئی اس کی ممانعت نہ کرے۔

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما　　مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

ابتدائے سال ۹۹۰ سے یہ قاعدہ میری دادی کے گھر میں مقرر ہوئی۔ جب تارو میں بیٹھا اس کی برسی کو ایک ایک بوڑھے شخص نے پکڑ کر مجھ کو دعائیں دیں۔ اول میں سونے سے تلا۔ تین من دس سیر چڑھا۔ پھر باقی دھاتوں اور خوشبوؤں میں بارہ دفعہ تلا اور اسی طرح سال میں دو بار اپنا وزن کرتا ہوں۔ ہر بار سونا، چاندی اور باقی دھاتیں اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور غلے میں وزن کرتا ہوں۔ نقد اور سامان اپنے وزن کا تحویل داروں کو دیتا ہوں کہ فقراء اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیں۔

۱۰۱۴ھ میں کلیان راجہ بکرماجیت کا بیٹا خدمت میں آیا۔ میں نے بہت بری باتیں اس حرامزادے کی سنی تھیں ایک ان میں یہ تھی کہ اس نے ایک مسلمان عورت بیوی کر کے اپنے گھر میں چھپا رکھی ہے اور اس کے ماں باپ کو مار کر گھر میں دبا دیا ہے۔ میں نے اس کو قید کر کے ان باتوں کی تحقیق کی جب ثبوت ہوا اس کی زبان کٹوا کر حکم دیا کہ جنگلیوں کے ساتھ کھانا کھایا کرے اور دوام الحبس رہے۔

شیر افگن

اسلام خاں کی عرضداشت آگرے سے سے جہانگیر قلی خاں کے خط کے دیکھنے میں آئی معلوم ہوا کہ ماہ صفر کو بردوان میں قطب الدین خاں کو علی قلی استاجلو نے ایسا زخم مارا کہ دو پہر رات گئے وہ مر گیا۔ یہ علی قلی سفرچی شاہ اسمٰعیل والی ایران کا تھا۔ بسبب اپنی شرارت اور فتنہ پردازی کے وہاں سے بھاگ کر قندھار میں آیا۔ خان خاناں نے اس کو بندگان اکبری میں داخل کیا۔ مدت تک میرے والد کی خدمت میں رہا۔ جب والد دکن کو جانے لگے اور مجھ کو رانا پر بھیجا تو اس نے اختیار نوکری میری کی میں نے اس کو شیر افگن کا خطاب دیا۔ جب میں الٰہ آباد سے والد کی خدمت میں آیا تو بواسطہ بے اتفاقی کے جو ان دنوں مجھ پر تھی اکثر میرے لوگ مجھ سے جدا ہو گئے وہ بھی مجھ سے دور ہو گیا لیکن بباعث مروت بعد جلوس کے میں نے اس کی تقصیریں معاف کیں اور صوبہ بنگالہ میں اس کو جاگیر دی۔ وہاں سے خبر آئی کہ ایسے مفسدوں کا یہاں رکھنا مناسب نہیں۔ اس واسطے میں نے قطب الدین خاں کو لکھا کہ اس کو روانہ درگاہ کرے اور اگر وہ فساد کا خیال کرے تو اس کو سزا دے۔ قطب الدین خان اس کو خوب جانتا تھا میرا حکم پہنچتے ہی اپنے لوگوں کے ہمراہ بردوان کی طرف گیا جو اس کی جاگیر تھی۔ قطب الدین خاں نے اس کو پاس بلایا کہ تنہائی میں مضمون فرمان

کاشانے اس نے فرصت پا کر قطب الدین خاں کو دو تین تلواریں ماریں۔ انبہ خاں کشمیری نے مردانگی سے اس کے پاس جا کر علی قلی کے سر پر زخم مارا، پھر انبہ خاں کو بھی کاری زخمی کیا۔ جب قطب الدین خاں کی یہ حالت لوگوں نے دیکھی اس کو گھیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ امید ہے کہ ہمیشہ دوزخ میں رہے۔ انبہ خاں وہیں شہید ہوا۔ اور قطب الدین خاں بعد چار پہر اپنے گھر آ کر راہی ملک عدم ہوا۔ یہ سن کر میں کمال غمناک ہوا۔ مجھ کو بعد میرے باپ کی وفات کے ایک اس کی وفات کا غم اور اس کی ماں کی وفات کا غم ایسے ہوئے ہیں کہ کوئی غم اس کے برابر نہیں۔

مان سنگھ کے بڑے بیٹے جگت سنگھ کی دختر کی میں نے خواستگاری کی تھی۔ بتاریخ سولھویں صفر ۱۰۱۷ھ اسی ہزار روپیہ ساچق گھر میں راجا مذکور کے واسطے میں نے بھیجا اور معتبر خاں نے چند عجائبات سے ایک پردہ فرنگستان بھیجا کہ اس مرتبے کا کام مصوران فرنگ کا نہیں دیکھا گیا ہو تحفہ دیا۔ الحاصل کو جگت سنگھ کی لڑکی زمرۂ پرستاران محل میں داخل ہوئی۔ میری دادی کے محل میں مجلس اس کی شادی کی آراستہ ہوئی۔ من جملہ اس سب جہیز کے کہ راجا مان سنگھ نے ہمراہ کیا تھا سات ہاتھی تھے۔

چوتھے سال جلوس میں رام چند بندیلے نے اپنی لڑکی میری خدمت میں دی میں نے اسے قبول محل میں داخل کی۔ میں ایک نیل گاؤ بندوق کو مارا چاہتا تھا کہ اس کے سامنے ایک اردلی اور دو کہار آ نکلے۔ وہ بچ کر بھاگ گیا۔ میں نے اس اردلی کو غصے سے مروا ڈالا اور کہاروں کے پاؤں کٹوا کر گدھوں پر سوار کر کے لشکر کے گرد پھرایا تاکہ پھر کوئی ایسا کام نہ کرے۔ لیکن بعد میں بہت پچھتایا۔ دوسرے دن ایک نیل گاؤ قراول لشکر بندوق سے میں نے مارا اور اس کو خوش ہو کر منصب تین صدی ذات اور پانچ سو سوار سے مع اصل و اضافہ کے سرفراز کیا۔

بر سمت کج کلاہے

۱۰۱۸ھ میں ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ چند قوال دہلی کے میرے روبرو گا رہے تھے اور سید شاہ کو فقیروں کی طرح حال آ رہا تھا۔ یہ بیت حضرت امیر خسرو کی پڑھی جاتی تھی۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے   من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

ناگاہ ملا احمد علی مہرکن کہ اپنے فن میں بے مثل اور خلیفہ اور خدمت گار قدیم میرا تھا، میں نے لڑکپن میں اس کے باپ سے پڑھا تھا، سامنے سے آیا اور بولا میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ ایک دن حضرت شیخ الشیوخ نظام الدین اولیا قدس سرہ ٹیڑھی ٹوپی سر پر رکھے ہوئے کنارۂ جمنا پر ایک کوٹھے سے ہندوؤں کی عبادت کا تماشا دیکھ رہے تھے اس حال میں وہاں امیر خسرو تشریف لائے شیخ موصوف نے ان سے فرمایا: اس قوم کو دیکھتے ہو اور یہ مصرع زبان مبارک سے فرمایا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت امیر خسرو نے بے تامل یہ دوسرا مصرع حضرت شیخ کی طرف اشارہ کر کے پڑھا۔

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

غرض جب اس ملا نے یہ بات کہی اور مصرع اخیر کا یہ ٹکڑا کہا "بر سمت کج کلاہے" تو اس کا حال بدل گیا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں اس کے گرنے سے گھبرا کر اس کے سر پر کھڑا ہوا۔ لوگوں نے مرض صرع یعنی مرگی کا گمان کیا۔ جو طبیب حاضر تھے گھبرا کر نبض دیکھنے لگے اور دوائیں سنگھائیں ہر چند کوشش کی نہ ہوا۔ وہ پہلے ہی گرنے کے وقت تمام ہو گیا تھا۔ لیکن بدن کی گرمی سے خیال حیات کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ مر چکا ہے۔ آخر اس کی لاش اٹھا کر اس کے مکان پر لے گئے۔ پھر اس کی لاش دہلی کی طرف لے گئے کہ اس کے بزرگوں کے مقبرے میں دفن کریں۔

نظیری نیشاپوری

نظیری نیشاپوری فن شاعری میں کامل ہے، اور گجرات میں تجارت سے اوقات بسر کرتا تھا، چنانچہ اس کو میں نے پہلے طلب کیا تھا، ان دنوں میں آکر اس نے ملازمت حاصل کی اور یہ قصیدہ انوری پر کہا جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

باز این چہ جوانی و جمال است جہاں را

قصیدہ کہہ کر میرے واسطے لایا۔ میں نے ہزار روپیہ اور اسپ اور خلعت صلہ میں اس کو مرحمت کیا۔

ایک نیل گاؤ شکار ہوا۔ نر اور مادہ میں کا تھا۔ دو سال گزرے میں واسطے سیر شکار کے اسی جگہ آیا تھا۔ اور اسی نیل گاؤں کے بندوق ماری تھی۔ چونکہ زخم کاری نہیں لگا تھا، نہیں گرا اور بھاگ گیا۔ اس مرتبہ پھر یہ نیل گاؤ نظر آیا۔ قراولوں نے پہچانا کہ یہ دو سال پہلے زخم کھا کے بھاگا تھا۔ تین بندوق اس دن میں اس کے اوپر ماریں کارگر نہیں پڑی۔ لیکن میں نے اس کا پیچھا کیا۔ تین کوس تک مسافت پیچھے اس کے پیادہ طے کی۔ آخر میں نے نذر مانی کہ اگر یہ نیل گاؤ گر پڑے تو اس کا گوشت کا کھانا واسطے ثواب روح حضرت خواجہ خواجگان معین الدین کے، فقرا کو کھلاؤں گا۔ مجرد اس نیت کے نیل گاؤ کا کھڑا ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر فرمایا اسی وقت اس کو حلال کریں۔ لشکر میں لا کر اسی طریقے سے کہ میں نے نذر کی تھی بجا لایا۔ بعد دو تین روز کے پھر ایک نیل گاؤ نظر آیا۔ ہر چند تردد کیا اور یہ چاہا کہ ایک جگہ آرام کر بیٹھے تو تفنگ ماروں، لیکن بالکل قابو میں نہ آیا اور شام تک اس کے پیچھے کندھے پر تفنگ رکھے پھرا یہاں تک کہ سورج غروب ہوا اور میں اس کے مارنے سے ناامید ہو گیا۔ یکبارگی میری زبان سے نکلا کہ خواجہ یہ نیلا بھی تمہاری نذر کیا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے جلد اس کے بندوق ماری اور اس کو بھی پہلے کے مطابق فرمایا کہ طعام پکا کر فقرا کو کھلاؤ۔

ایک رات یہ بیت میرے دل میں آیا ؎

بود بر آسماں تا مہر انور مبادا عکس او از چتر ما دور

جو گویوں اور نعت خوانوں کو میں نے حکم دیا کہ سلام و صلوٰۃ بھیجتے وقت اور نعت کہنے کی ابتدا اس شعر سے کیا کریں اور اب اسی طرح ہوتا ہے۔

کسی تقریب میں یہ شعر میرزا عبدالرحیم خان خاناں کا پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از سر کشتگان عشق یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

چونکہ میری طبیعت موزوں ہے، کبھی اختیار سے کبھی بے اختیار مصرع یا رباعی یا بیت میری خاطر میں آجاتی ہے۔ یہ بیت زبان پر گذرا ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

جب یہ پڑھا گیا تو ہر شخص نے جو طبع موزوں رکھتا تھا اس زمین میں بیت کہہ کر گزرانی۔ ملا علی احمد مہرکن نے بھی برا نہیں کہا ؎

اے محتسب ز گریہ پیر مغاں بترس
یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

نیا تجربہ

میں جانتا تھا کہ دیوانہ کتا جس جانور کو کاٹے مر جاتا ہے، مگر یہ بات ہاتھی کے واسطے میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ میرے عہد دولت میں ایسا ہوا کہ ایک رات کو ایک دیوانے کتے نے فیل خاصہ کے بندھنے کی جگہ جسے گجی کہتے تھے، ایک ہتھنی کے پاؤں میں کاٹ لیا، وہ فوراً ہتھنی چلائی، جب فیل بان دوڑ کر پہنچے تو سگ دیوانہ بھاگ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جھاڑیوں سے نکل کر اس نے ایک ہاتھی کے کاٹا، ہاتھی نے اسے مار ڈالا۔ جب اس پر ایک مہینہ اور پانچ روز کی مدت گزر گئی، ایک روز تیرہ ابر کی تھی، بادل کی گڑگڑاہٹ کا شور ہتھنی کے کان میں پہنچا وہ اس وقت چرنے میں مشغول تھی یکایک اس نے چیخنا

شروع کیا اور اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ کانپ کر زمین پر گر پڑی پھر اٹھ کر سات روز تک اسی حالت میں رہی کہ اس کے منہ سے پانی جاری تھا، زیادہ رقیق تھی اور نہایت بے چین تھی۔ فیل بان ہر چند علاج کے در پے ہوئے کوئی فائدہ نہ ہوا آٹھویں روز گر پڑی اور مر گئی۔ ایک مہینہ گزرنے کے سبب ہاتھی کو جنگل میں پانی کے کنارے لے جاتے تھے، اس وقت پھر ابر و رعد ظاہر ہوا اور فیل مذکور یکبارگی کانپ کر زمین میں بیٹھ گیا۔ اتنی ہی مدت کے بعد ہتھنی کی طرح یہ ہاتھی بھی مر گیا۔ اس سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا جانور باوجود اس ڈیل ڈول اور ہیکل اور ترکیب کے ادنیٰ جراحت میں ایک حیوان ضعیف سے اسے بھی اس قدر متاثر ہوئی۔

ملا گدائی

۱۰۲۷ھ کشمیر کے اخبار نویس نے لکھا کہ ملا گدائی نام ایک درویش نے جو چالیس برس سے یہاں ایک خانقاہ میں بیٹھا تھا دو سال قبل اپنی وفات کے مالک خانقاہ سے اپنی جگہ مانگی تھی انھوں نے اسے خانقاہ میں قبر کی جگہ دی تھی۔ جب وفات کے دن قریب آئے تو اس نے دوستوں سے کہا: مجھ کو حکم ہوا ہے کہ جو امانت میرے پاس ہے، اسے اور کسی کے سپرد کر کے عالم آخرت کی طرف سفر کروں۔ دوستوں نے یہ سن کر تعجب سے

خندہ کیا اور کہا کہ انبیا علیہم السلام کو بھی اپنی موت پر اطلاع نہیں تو یہ بات کس طرح کہتا ہے؟ اس نے پھر یہی کہا کہ "مجھ کو حکم ہوا ہے۔" پھر وہاں کے ایک قاضی زادے سے جو اس کا معتقد تھا کہا کہ ——— میرا قرآن سات سو تنکے کی بابت کا ہے اسی قدر میں اسے بیچ کر کے میری تجہیز و تکفین کر، اور جب جمعہ کی اذان سننا تو میری خبر لینا۔ یہ سب باتیں جمعہ کی رات کو کہیں۔ پھر سب اسباب اپنے حجرے کا دوستوں اور مریدوں کو بانٹ دیا اور اسی دن عصر کے وقت حمام میں نہا کر لباس پہنا۔ دوسرے دن قاضی زادہ مذکور جمعہ کی نماز سے پہلے اس کے احوال کی تحقیق کرنے آیا۔ دیکھا کہ حجرے کا دروازہ بند ہے اور ایک مرید اس پر بیٹھا ہے۔ خادم سے جب حال پوچھا تو اس نے کہا کہ ملا نے حکم کیا ہے جب تک یہ دروازہ خود بخود نہ کھل جائے اندر نہ آنا۔ پھر ایک گھڑی بعد دروازہ خود بخود کھل گیا۔ قاضی زادہ مع خادم کے اندر گیا۔ دیکھا کہ ملا قبلہ رو دو زانو بیٹھا ہے۔ اور جان جان آفریں کے سپرد کی ہے۔ کیا خوش احوال ہیں وہ لوگ کہ اس دنیا سے جو دام گاہ تعلقات ہے یوں آزادانہ چلے جاتے ہیں۔

ایک ہزار اشرفی

خواجہ ہاشم نے جو ماوراء النہر کی طرف مشہور درویش اور معتقد علیہ اس ملک کے لوگوں کا ہے اپنے ایک مرید کے ہمراہ ایک خط مشتمل بر دعا و اخلاص قدیم ساتھ اس خاندان عالی شان کے بھیجا اور وہ شعر جو حضرت جہانبانی نے خواجگی نامی ایک بزرگ کے واسطے تحریر فرمایا تھا جس کا آخری مصرع یہ ہے ؎

خواجگی را بندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

بھی اس خط میں لکھا۔ میں نے بھی اس خط کے جواب میں چند سطریں اپنے ہاتھ سے تحریر کیں اور یہ رباعی اسی وقت کہہ کر ہزار اشرفی جہانگیری خواجہ کو بھیجی۔

اے آنکہ مرا عمر تو خیر اندیشی است ——— از دولت یاد بود تو نے درویشی است
چنداں کہ ز خرقہ ات دلم شاد شود ——— شاہیم ولی کہ لطفت از حد بیش است

میں نے مصاحبوں کو حکم دیا کہ جو کوئی شعر کہتا ہو اس پر رباعی کہے۔ حکیم مسیح الزماں نے کہی اور بہت خوب کہی۔

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش
ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش ——— آں را شمریم حاصل شاہی خویش

میں نے حکیم مذکور کو اس کے صلے میں ہزار اشرفی عنایت کیں۔

شراب نوشی

اسی سال (۱۰۲۵ھ) وزن فرزند خرم کا ہوا۔ آج تک کہ اس کی عمر ۲۴ سال ہے اور صاحب اولاد ہے۔ اس نے کبھی شراب نہیں پی اس مجلس وزن میں میں نے کہا: بابا تو صاحب اولاد ہوا ہے، اور بادشاہ اور بادشاہ زادے شراب پیتے آئے ہیں۔ آج تیرا جشن وزن ہے تجھ کو شراب پلاتا ہوں، اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن اور نوروز اور بڑی مجلسوں میں شراب بطریق اعتدال پیا کر۔ اس قدر کہ عقل زائل نہ ہو۔ اس سے غرض فائدے اور نفع کی رکھا کر آخر بالاصرار تمام میں نے اس کو شراب دی۔ میں نے بھی پندرہ برس کی عمر تک اس کو نہ پیا تھا۔ مگر لڑکپن میں کہ والدہ نے دو تین بار بطور دوا مجھ کو دی تھی۔ ایک تولے کی مقدار پانی اور گلاب میں ملا کر کھانسی کی دوا کے نام سے پلا دی۔ اور جب میرے والد کا لشکر افغانان یوسف زئی کا فساد رفع کرنے کے واسطے قلعہ اٹک میں دریائے نیلاب کے کنارے واقع تھا۔ میں ایک دن شکار کو گیا۔ چونکہ بہت تھک گیا تھا استاد شاہ قلی نے جو میرے چچا میرزا محمد حکیم کا افسر توپ خانہ تھا مجھ سے کہا کہ اگر پیالہ نوش جاں فرماؤ تو سب کسل اور ماندگی جاتی رہے گی۔ چونکہ جوانی کے دن تھے اور طبیعت ایسے کاموں کی طرف راغب تھی میں نے محمود آبدار سے کہا کہ حکیم علی کے پاس جا کر شربت کیف ناک لے آ۔ حکیم نے آدھے پیالے کی مقدار زرد رنگ کی شراب چھوٹی شیشی میں بھیجی۔ میں نے پی تو اس کا نشہ پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے شراب پینا شروع کیا اور روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ شراب انگوری سے نشہ نہ ہوتا تھا پھر عرق پینا شروع کیا اور اتنا بڑھا کہ ۹ سال میں بیس پیالے عرق دو آتشہ کے روز پینے لگا۔ چودہ دن میں باقی رات میں۔ اس سب کا وزن چھ سیر ہندوستانی ہوتا ہے۔ خوراک میری ان دنوں ایک مرغ نان اور مولی کے ساتھ تھی۔ اس وقت مجھ کو کوئی منع نہیں کر سکتا تھا میرا یہ حال ہو گیا کہ رعشے کی وجہ سے پیالہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور لوگ پلایا کرتے تھے۔ پھر میں نے حکیم ہمام برادر حکیم ابوالفتح کو جو میرے والد کے مصاحبوں میں سے تھا بلا کر اس حال سے مطلع کیا۔ اس نے کمال دل سوزی اور اخلاص سے کہا کہ صاحب عالم جس طرح آپ عرق نوش فرماتے ہیں، خدائے تعالیٰ پناہ دے اگر چھ مہینے اسی طرح گزرے تو علاج نہ ہو سکے گا۔ چونکہ اس نے خیر خواہی سے کہا تھا اور جان عزیز ہے مجھے اس کے کہنے کا اثر ہوا اس دن سے میں کم کرنے لگا اور فلونیا کھانا شروع کیا۔ جس قدر شراب کم کرتا رہا فلونیا بڑھاتا رہا۔ نوبت چھ برس میں چھ پیالوں پر پہنچی اب پندرہ برس سے اسی قدر پیتا ہوں نہ اس سے کم نہ زیادہ اور رات کو پیا کرتا ہوں مگر جمعرات کو کہ دن میرے جلوس مبارک کا ہے اور شب جمعہ کو کہ مبارک شب ہے نہیں پیتا ہوں، اس کے عوض آخر دن میں پی لیتا ہوں جمعرات اور اتوار کو گوشت بھی نہیں کھاتا۔

ایک سنیاسی سے ملاقات

میں نے کئی بار سنا تھا کہ ایک سنیاسی صاحب ریاضت جادروپ نام بہت برسوں سے اجین کے پاس جنگلوں میں عبادت کرتا ہے مجھے اس کو دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ آگرے میں میں نے چاہا تھا کہ اس کو بلا کر دیکھوں۔ لیکن اس کی تکلیف کے خیال سے میں نے نہ بلایا۔ اب جو میں اس شہر کے قریب پہنچا رستے میں کشتی سے اتر کر پاؤ کوس تک پیادہ اس کی ملاقات کو چلا۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے ایک ٹیلے میں سوراخ کر لیا تھا۔ اس میں رہا کرتا تھا۔ اس کا رستہ اتنا مختصر تھا کہ دبلا آدمی بہ ہزار مشقت داخل ہو سکے۔ وہ تنہا اس میں رہتا تھا۔ فرش یا چٹائی کچھ اس کے پاس نہ تھی اور کڑاکے کی سردی میں بھی سوائے اپنی لنگوٹی کے کچھ نہ اوڑھتا تھا۔ آگ بھی نہیں جلاتا تھا۔ اس پانی میں جو غار کے قریب ہے ہر روز دو بار نہاتا ہے اور دن میں ایک بار شہر اجین کی طرف آتا ہے اور ان سات گھروں میں سے جو اس کے معتقد ہیں تین گھروں سے پانچ لقمے کھانے کے لیے جو کچھ انھوں نے اپنے کھانے کے لیے پکایا ہو۔ مانگ کر ہتھیلی پر رکھ کر بے چبائے نگل جاتا ہے تاکہ لذت اس کی معلوم نہ ہو۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ان گھروں میں سے کسی پر اس دن کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی ہو یا کوئی حائضہ عورت نہ ہو۔ ہمیشہ سے اس کا یہی طریقہ ہے کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ لیکن اس کی شہرت کی وجہ سے لوگ ملنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ شخص یقیناً عقل سے بہرہ رکھتا ہے۔ علم ویدانت جو ہندوؤں کا علم تصوف ہے خوب جانتا ہے۔ چھ گھڑی تک میری اس کی

ملاقات رہی بہت اچھی باتیں کرتا رہا اس کی باتوں کا میرے دل میں اثر ہوا۔ میرے ملنے سے وہ بھی بہت خوش ہوا۔ جب وقت میرے والد قلعہ اسیر اور ملک خاندیس کو فتح کرکے آگرہ جا رہے تھے۔ اسی جگہ اس سے ملے تھے اور ہمیشہ اس کو یاد کرتے تھے۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا

اسی سال اسلاطین خلجیہ کے مقبروں میں شادی آباد مانڈو گیا۔ وہاں قبر روسیاہ ازل نصیر الدین ابن سلطان غیاث الدین کی بھی تھی۔ مشہور ہے کہ اس بدبخت نے دو بار اپنے باپ کے مارنے کو زہر دیا لیکن وہ دونوں بار زہر مہرے کے استعمال سے بعنایت الٰہی بچ گیا۔ تیسری بار شربت کے پیالے میں خوب زہر ڈال کر اپنے ہاتھ سے باپ کو دیا کہ اسے نوش کیجیے۔ باپ نے جو اس کو کام کے درپے دیکھا تو پہلے زہر مہرہ اپنے بازو سے کھول کر بیٹے کے آگے ڈال دیا اور عجز و انکسار کے ساتھ پروردگار سے عرض کی کہ الٰہی اب عمر میری اسّی برس کو پہنچی، آج تک بڑی عشرت سے خوشی و خرمی گزری ایسا عیش کسی بادشاہ کو میسر نہ ہوا ہوگا۔ اب کہ آخر وقت ہے امیدوار ہوں کہ نصیر کو میرے خون میں نہ پکڑے اور میری موت کو اجل مقدر میں شمار کرکے اس سے مواخذہ نہ فرمائے۔ یہ کہہ کر وہ شربت کا پیالہ پی لیا اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ جب اس کا بیٹا نصیر تخت سلطنت پر بیٹھا تو ۴۸ برس کا تھا مصاحبوں سے کہنے لگا میں اپنے باپ کے روبرو تیس برس تک دشمنوں سے لڑا ہوں اور ہر طرف فوج کشی کی ہے اب میرا ارادہ ملک گیری کا نہیں ہے چاہتا ہوں کہ باقی عمر عیش و عشرت سے بسر کروں۔ مشہور ہے کہ پھر اس نے پندرہ ہزار عورتیں اپنے محل میں جمع کیں اور ایک شہر عورتوں کا بسایا جس میں مرد نہ تھے تمام پیشہ ور، حاکم اور قاضی عورتیں ہی تھیں۔ وہ کاروبار اور شغل میں بھی عورتیں تھیں۔ جہاں کوئی عورت حسین سنتا ہزار حیلے اس کو ہاتھ میں لاتا۔ شکار کا بھی اسے بہت شوق تھا ایک رمنا بنا کر اس میں ہر طرح کے جانور چھڑوا دیے جب دل چاہتا عورتوں کے ساتھ اس میں شکار کھیلتا۔ سلطنت کے بعد تیس برس تک زندہ رہا انھیں باتوں میں مشغول رہا کسی طرف لشکر کشی نہ کی فراغت اور عیش سے عمر گذاری۔ اسی طرح کسی اور نے بھی اس کے ملک پر چڑھائی نہ کی۔ کہتے ہیں کہ جب شیر خاں افغان اپنی حکومت کے زمانے میں اس کی قبر پر آیا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ قبر پر لکڑیاں مارو۔ جب میں بھی جب دل نہیں بھرا تو چاہا کہ اس کی قبر کھدوا کر جو کچھ لاش باقی ہے اسے آگ میں جلوا دوں پھر خیال آیا کہ آگ اللہ کا نور ہے بہتر ہے کہ اس ناپاک کے اجزائے بدن سے نہ ملے اور یہ بھی دل میں گزرا کہ مبادا میرے جلانے سے کچھ اس کا عذاب کم ہو جائے اس واسطے حکم دیا کہ قبر اکھیڑ کر اس کے اجزا کو نربدا میں ڈال دیں۔ وہ زندگی میں کمال حرارت کی وجہ سے پانی میں رہا کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک بار مستی میں کالیادہ کے کسی حوض میں گر پڑا وہ بہت گہرا تھا خدمت گاروں نے بہزار وقت اس کے سر کے بال پکڑ کر باہر کھینچا۔ جب اس کو ہوش ہوا، اپنا نکلنا اس طرح سنا کہ میرے بال پکڑ کر کھینچا ہے تو بہت خفا ہوا اور ان خدمت گاروں کے ہاتھ کٹوا دیے تھے۔ دوسری بار نشے کی زیادتی سے پھر اسی میں گرا تو کسی نے مارے خوف کے اس کے نکالنے کی جرأت نہ کی یہاں تک کہ غوطے کھا کر اسی میں مر گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اب ایک سو دس برس گزرنے کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ اس کا گلا سڑا بدن پھر پانی میں پھینکا گیا۔

حقے کی بندش

(بارھویں سال جلوس ۱۰۲۶ھ) میں نے حکم دیا کہ کوئی ممالک محروسہ میں حقہ نہ پیا کرے اور میرے بھائی شاہ عباس نے بھی نقصان پر نظر کرکے تمام ملک ایران میں اس کے پینے کی ممانعت کر دی تھی۔ یادگار علی سلطان ایلچی شاہ ایران نے یہ حال شاہ عباس کو لکھا کہ خان عالم بے حقہ ایک ساعت نہیں رہ سکتا۔ شاہ عباس نے اس کے جواب عرضی میں یہ شعر لکھا۔

وصول یار می خواہد کند اظہار تنباکو   من از شمع وفا روشن کنم بازار تنباکو

خان عالم نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

من بیچارہ عاجز بودم از اظہار تنباکو   ز لطف شاہ عادل گرم شد بازار تنباکو

اسی سال سید عبد اللہ بارہہ نے جو شاہزادہ خرم کا فرستادہ تھا ملازمت میں حاضر ہو کر اس فرزند نامدار کے عرائض پیش کیے جن میں دکن کے فتح ہونے کی خبریں تھیں کہ سب امرائے دکن نے اطاعت اختیار کی ہے۔ اس خبر کے آنے سے چند روز پہلے دیوان حافظ میں اس کی فال دیکھی تھی تو یہ غزل نکلی ؎

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد　　زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

مجھے حافظ مرحوم کے لسان الغیب ہونے سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ بعد پچیس روز کے فتح کی خبر آئی۔ میں نے بہت سے مطالب کی فال دیوان حافظ سے نکالی ہے۔ جیسا نکلا آخر کو ویسا ہی ہوا، کم خلاف ہوا۔

لیلیٰ مجنوں

ان دنوں سارس جوڑے سے جفتی کی۔ سارس کا نظارہ عام مشہور ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک جوڑا سارس کا میری سرکار میں ہے، لیلیٰ مجنوں ان کا نام ہے۔ ایک دن خواجہ سرا نے عرض کی کہ میرے سامنے یہ دونوں سارس جفت ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر اگر جفت ہونے کا ارادہ کریں تو مجھ کو اطلاع دینا۔ صبح صادق کے وقت اس نے عرض کی کہ اب جفت ہوا چاہتے ہیں۔ میں نظارے تماشے کے واسطے گیا۔ مادہ پاؤں پھیلا کر جھک گئی، نر نے اول ایک پاؤں پھر دوسرا پاؤں اس کی پشت پر رکھا، پھر کچھ دیر بیٹھ کر جفتی کی اور اتر آیا، پھر گردن زمین پر جھکا کر ایک بار مادہ کے گرد گشت کی۔ ممکن ہے کہ انڈے دے کر بچے نکالیں۔

صلہ

ان دنوں ایک قصیدہ معزی کا جو مدح سلطان سنجر کا ہے سننے میں آیا، نہایت صاف اور سلیس تھا۔ مطلع اس کا یہ ہے:

اے آسماں مسخر حکم رواں تو　　کیواں پیر بندۂ بخت جواں تو

سعیدائے زرگر باشی نے کہ طبیعت ناظم رکھتا ہے قصیدہ مذکور پر قصیدہ کہا، یہ چند شعر اس کے ہیں۔

اے رنگ خوردہ از آستان تو　　دوران پیر گشتہ جواں در زمان تو

بخشد دل تو فیض و نجوید سبب چو مہر　　جانہا ہمہ فدائے دل مہربان تو

یارب چہ گوہری تو کہ از وحدت ازل　　جاں ہائے قدسیاں ہمہ از نور جان تو

میں نے اس قصیدے کے صلے میں حکم فرمایا کہ سعیدا کو سونے میں تولیں۔

وصال حضرت سلیم چشتی

دوشنبہ، حضرت سلیم چشتی کے روضے میں جا کر فاتحہ پڑھی۔ ان کی کرامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو اس نیاز مند کے قدوم کی خوش خبری کے ساتھ میرے اور بھائیوں کا امیدوار کیا تھا اور پھر ایک دن حضرت عرش آشیانی نے کسی تقریب سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ اور زمانہ رحلت کب آئے گا؟ جواب میں کہا کہ حق جل و علا پوشیدہ باتوں کا عالم ہے، لیکن اصرار کرنے پر اس نیاز مند کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس وقت یہ شہزادہ کسی معلم کی تعلیم سے یا کسی شخص سے کچھ یاد کرے اور باتیں کہنے لگے تو میرے وصال کے آثار ہیں۔ حضرت والد نے ان لوگوں کو جو میری خدمت میں رہتے تھے، تاکید فرما دی کہ کوئی آدمی شہزادے کو نظم و نثر سے کچھ تعلیم نہ کرے۔ یہاں تک کہ دو برس اور چھ مہینے گزر گئے۔ ایک دن ایک عورت خادمہ جو اسی محلے میں رہتی تھی اور ہمیشہ چشم بد کے واسطے سپند جلایا کرتی تھی اور اسی بہانے سے میری خدمت میں آ جاتی تھی، مجھ کو تنہا پا کر بے خبری میں یہ بیت مجھ کو تعلیم کر گئی ؎

الٰہی غنچۂ امید بکشا　　گلے از روضۂ جاوید بنما

میں نے شیخ کی خدمت میں جا کر یہ بیت پڑھی۔ شیخ بے اختیار اپنی جگہ سے اچھل کر حضرت عرش آشیانی کی خدمت میں دوڑے اور اس واقعے سے آگاہی بخشی۔ قضائے الٰہی سے اسی رات کو بخار کے آثار ظاہر ہوئے۔ ایک آدمی کو حضرت والد کی خدمت میں بھیجا اور تان سین کلاونت کو

جو قوالوں میں بے نظیر تھا بلایا۔ تان سین نے خدمت میں جا کر قوالی شروع کی۔ اس کے بعد پھر ایک آدمی حضرت عرش آشیانی کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب حضرت والا تشریف لائے تو فرمایا کہ دم وصال کا آپہنچا اور تم سے وداع ہوتا ہوں۔ اپنے سر سے پگڑی اتار کر میرے سر پر رکھی اور کہا "ہم نے سلطان سلیم کو اپنی جگہ بٹھایا اور اسے خدا کو سونپا۔" ان کا ضعف دم بدم زیادہ ہونے لگا اور آثار مرگ ظاہر ہوتے گئے حتیٰ کہ واصل بحق ہو گئے۔

مجدد الف ثانیؒ

(۱۰۲۸ھ) لوگوں نے عرض کی کہ ایک شخص شیخ احمد نامی نے سرہند میں فریب اور مکر کا جال بچھا کر بہت سے سادہ لوح ظاہر پرستوں کو اپنا صید کر رکھا ہے اور ہر شہر و ولایت میں اپنا ایک مرید خلیفہ بنا کر بھیجا ہے جو معرفت فروشی، مردم فریبی اور دکان آرائی کا فن دوسروں سے بہتر جانتا ہے اور جو مزخرفات اپنے مریدوں و معتقدوں کو لکھی ہیں ان کا نام "مکتوبات" رکھا ہے اور اس مجموعۂ مہملات میں بے فائدہ باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب میں لکھا ہے "اثنائے سلوک میں میرا گزر مقام ذی النورین سے ہوا۔ یہ ایک مقام تھا نہایت عالی اور خوب صفا۔ وہاں سے گزر کر مقام فاروق میں پہنچا اور مقام فاروق سے مقام صدیق کو عبور کیا۔ اس جگہ سے مقام محبوبیت میں پہنچا۔ عجب مقام دیکھا نہایت نورانی اور رنگین۔ اپنے کو قسم قسم کے نوروں اور رنگوں کے ساتھ میں نے منعکس پایا یعنی۔ استغفر اللہ مقام خلفاء سے گزر کر میں عالی مرتبت حضرتؐ میں آیا۔" ایسی ہی اور گستاخیاں جن کا لکھنا طول ہے۔ اس واسطے میں نے حکم دیا کہ درگاہ عالی میں حاضر کریں۔ موافق حکم کے ملازمت میں حاضر کیا گیا۔ جو بات میں نے دریافت کی معقول جواب نہ دیا اور عقل و دانش کی کمی کے باوجود مجھے بہت مغرور، خود پسند اور متکبر معلوم ہوا۔ میں نے اس کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھا کہ چند روز قید خانۂ ادب میں مقید رہے اس طرح آشفتگی دماغ اور شوریدگیٔ مزاج کچھ کم ہو گی۔ ناچار انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا کہ قلعہ گوالیار میں قید رکھے۔ [بعد میں یہ غلط فہمی عقیدت میں بدل گئی]

شیخ عبدالحق محدث

اسی سال سفر دلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو اہل فضل اور ارباب سعادت سے ہے دولت ملازمت حاصل کی۔ ایک کتاب انھوں نے تصنیف کی تھی جس میں مشائخ ہند کے احوال ہیں وہ نظر سے گزری۔ بہت محنت کی ہے۔ مدتوں سے دلی کے گوشے میں توکل و تجرید کی زندگی گزارتے ہیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ اُن کی صحبت ذوق سے خالی نہیں۔ قسم قسم کی مرحمت کے ساتھ دل نوازی کر کے میں نے رخصت فرمایا۔

طالب آملی

اسی سال طالب آملی نے ملک الشعرا کے خطاب کے ساتھ امتیاز کا خلعت پہنا۔ اس کی اصل آمل سے ہے۔ کچھ دنوں اعتماد الدولہ کے ساتھ رہا۔ جب اس کے سخن کا رتبہ ہم عصروں سے بڑھ گیا تو پائے تخت کے شعرا کی سلک میں شامل ہوا۔

ز غارت چمنت بر بہار منت ہاست — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
گر می بجائے جوہر آئینہ بودے — بے رو نقاب بر تو کسے بی خبرے

طالب اصل میں اصفہان کا رہنے والا ہے۔ آغاز جوانی میں لباس تجرید و قلندری میں کشمیر گیا۔ اس ملک کی خوبی اور آب و ہوا کی لطافت کا شیفتہ ہو کر وہیں توطن اور توکل اختیار کیا تا فتح کشمیر کے بعد حضرت عرش آشیانی کی خدمت میں پہنچا اور بندہ ہائے درگاہ میں منسلک ہوا۔ اب اس کی عمر ستر برس کے قریب ہے اور کشمیر میں فراغ خاطر کے ساتھ مع اپنے فرزندوں اور متعلقوں کے دعا گوئی میں مصروف ہے۔

ایک حادثہ

(۱۰۲۸ھ) کشمیر میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ شہزادہ شجاع محلات دولت خانہ میں کھیلتا تھا۔ اتفاقاً دریا کی جانب ایک کھڑکی ہے۔ اس پر پردہ پڑا تھا اور دروازہ بند نہ تھا۔ شہزادہ کھیلتا ہوا اس کھڑکی میں گیا اور اس میں جھانکتے ہی سر کے بل نیچے گرا۔ اتفاق سے ٹاٹ کا ایک تہ کیا ہوا گٹھڑ اور وہاں دیوار کے نیچے رکھا تھا اور فراش اس کے پاس بیٹھا تھا۔ شہزادے کا سر اس ٹاٹ کے گوشے پر پڑا اور پاؤں فراش کے کندھے اور پشت

پر باوجودیکہ سات کوس کی چڑھائی تھی مگر عنایت الٰہی شامل حال تھی تو فرزند کا وجود دولت کا شکرانہ اس کی زندگی کا باعث ہو گیا ہے۔ اس وقت استراحت میں تھا یہ خبر وحشت اثر میرے کانوں میں پہنچی تو گھبرا کر باہر کو دوڑا جب اس کو ایسے حال میں دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ بہت دیر تک اس کو گود میں لے کر اللہ کی عنایت کا شکر ادا کیا۔ صدقے بٹنے لگے اور میں نے حکم دیا کہ جتنے فقرا اور اہل استحقاق اس شہر کے ہیں وہ حاضر ہوں اور ہر ایک کی حیثیت کے موافق معیشت مقرر ہو۔ عجائبات سے یہ ہے کہ تین چار مہینے پہلے جوتک رائے نے کہ جوتش علم نجوم میں انتہائی مہارت رکھتا ہے مجھ سے کہا تھا کہ شہزادے کے زائچے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تین مہینے کے دنوں میں شاید کسی اونچی جگہ سے گر پڑیں گے مگر ان کی زندگی کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ چونکہ اس نجومی کی اکثر باتیں سچ ثابت ہوئی تھیں تو اکثر وہم دل میں رہتا تھا میں نے ان خطرناک راستوں اور اونچے ٹیلوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غفلت نہیں کی ہمیشہ اسے نگاہ میں رکھتا تھا اور اس کی انتہائی حفاظت کی جاتی تھی۔ تو کشمیر پہنچ کر یہ واقعہ پیش آ گیا۔ والی گھڑی سب ٹل گئیں خیر اللہ کا شکر ہے کہ خیریت گزری۔

زندہ درگور

اسی سال موضع قصبہ راجور گاہ کا شکار قبول ہوا۔ یہ مقام گو کہ بہت خوشنما ہے مگر اس منزل سے ہوا اور لباس اور زبان اور جانوروں میں جو گرم سیر ولایت کے لیے مخصوص ہیں۔ بڑا فرق نظر آیا۔ یہاں کے لوگ زبان ہندی و فارسی دونوں میں کلام کرتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں پشمینہ نہیں پہنتیں اور ہندوستانی عورتوں کی طرح ناک میں حلقہ پہنتی ہیں۔ اس کے بعد راجوری میں منزل ہوئی۔ وہاں کے لوگ زمانہ قدیم میں ہندو تھے۔ یہاں کے زمیندار راجا کہلاتے ہیں۔ سلطان فیروز نے ان کو مسلمان کیا مگر اسلام کے باوصف زمانہ جاہلیت کی باتیں ان میں جاری ہیں۔ جس طرح ہندو عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ جل جاتی ہیں یہاں مسلمان عورتیں اپنے شوہر کے ساتھ زندہ قبر میں مدفون ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں میں ایک دس بارہ برس کی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہوئی۔ دوسرے یہاں کے مفلس کم معاش لوگ، اگر ان کے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اسے پھانسی دے دیتے ہیں۔ ہندوؤں سے رشتہ داری بھی کرتے ہیں۔ لڑکی لے لیتے ہیں اور ان کو آپ دیتے ہیں۔ ان کی لڑکی لے لینا تو خوب ہے گر دینا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ حکم ہوا کہ اب یہ رسوم نہ ہونے پائیں۔

(از ترجمہ مولوی احمد علی سیماب ٹونکی، تزک جہانگیری)

محمد رضا شاہ پہلوی

میرے والد کی پیدائش اٹھارہ سو اٹھتر عیسوی (۱۸۷۸ء) میں بحر کیسپین کے قریب مازندران کے صوبے میں ہوئی۔ میرے دادا اور پردادا قدیم ایرانی فوج میں افسر رہ چکے تھے۔ میرے والد رضا خان صرف چالیس دن کے تھے کہ میرے دادا کا انتقال ہو گیا۔ پھر چودہ برس کی عمر میں وہ ایرانی "قزاق فوجی دستے" میں بھرتی ہو گئے۔ اس وقت انہیں لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا کیونکہ اس وقت تعلیم صرف امراء اور مولویوں کی وراثت بنی ہوئی تھی اور یہ لوگ اس کو عوام میں پھیلنے سے روکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عوام جہالت کا شکار رہیں تاکہ انہیں من مانی کرنے کا موقع ملتا رہے۔

مطالعہ کی عادت نے ترقی کرنے میں میرے والد کی مدد کی۔ پختہ عمر کو پہنچ جانے کے باوجود انہوں نے ابتدائی باتیں سیکھنے میں شرم نہیں محسوس کی۔ فوجی ذمہ داریاں ختم کرنے کے بعد وہ روزانہ بہت صبر کے ساتھ چھاؤنی میں اپنے ایک دوست سے لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے۔ وہ لیمپ کی دھیمی روشنی میں اپنا سبق یاد کرتے اور جب تھک جاتے تو اپنے چھوٹے سے کمرے سے باہر آ کر تہران کی ٹمٹماتی روشنیوں پر نظر جمائے کھڑے رہتے جو کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

ذاتی طور پر اور سرکاری افسر کی حیثیت سے والد نے کئی لڑائیاں لڑیں۔ وہ خاص طور پر ان سرکش قبیلوں سے لڑے جنہوں نے ملک کے بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں تباہی مچا رکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب یہ ملک ملک نہیں رہا تھا کیونکہ یہاں کوئی قابلِ ذکر مرکزی حکومت نہیں رہی تھی۔

سن انیس سو بیس (۱۹۲۰ء) کے اوائل میں روسی افسر ایرانی قزاق فوجی دستے کے سردار تھے۔ اگست کے مہینے میں والد نے اپنے ضمیر کے جوش دلانے پر روسیوں کو برخاست کر دیا اور خود دستے کے کمانڈر بن گئے۔ ایرانی حکومت نے ان کے اس اقدام کی تائید اور تعریف کی۔

اس وقت سے والد کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہوتی گئی اور وہ ایک نوجوان انقلابی صحافی سید ضیاء الدین طباطبائی کے ساتھ شریک ہو گئے۔ وہ شمال مغربی شہر قزوین سے تہران پہنچے اور قتل و خون کے بغیر ۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء کو انہوں نے ایران کی کمزور اور ناکارہ حکومت کو برطرف کر دیا۔ ضیاء الدین وزیر اعظم بنے اور والد وزیر جنگ اور ایران کی مسلح افواج کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

۱۹۲۳ء میں والد وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو پارلیمنٹ نے ان کی شہنشاہیت کا اعلان کیا۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۲۶ء کو والد تخت نشین ہوئے اور مجھے ولی عہد مقرر کیا گیا۔

تمام دنیا میں باپ بیٹے کے کردار کی تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ میرے والد نے اس ضمن میں مجھ پر کچھ زیادہ ہی اثر ڈالا لیکن اس کا

یہ مطلب نہیں کہ میں ان کا چہیتا ہوں۔ میں ولی عہد مقرر ہونے سے پہلے اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے والد نے کئی شادیاں کی تھیں اس لیے میرے کافی سوتیلے بھائی بہن بھی تھے۔ تخت نشینی کے بعد والد نے مجھے ان سے علیحدہ کر لیا اور حکم دیا کہ مجھے "مردانہ تعلیم" دی جائے چنانچہ مجھے ایک ابتدائی فوجی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

درحقیقت میں شاذ و نادر ہی نچلا بیٹھتا تھا۔ میں ہمیشہ دوڑتا، اچھلتا، درختوں پر چڑھتا یا مٹی سے کھیلتا رہتا اور وہ ساری باتیں کرتا جو نارمل چھوٹے بچے عام طور پر ہر جگہ کرتے ہیں۔ مجھے کشتی لڑنے میں مزا آتا اور مجھے یاد ہے کہ ایک بار کھانا کھانے کے بعد کشتی لڑنے پر صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے مجھے تنبیہ بھی کی گئی تھی۔

مجھے چیزیں بنانا خاص طور پر پسند تھا۔ ندی کنارے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بند بنایا کرتا تھا جو ایک طرح ان ڈیموں کا چھوٹا چربہ تھے جو آج ایران میں آبپاشی اور بجلی کے لیے بنائے جا رہے ہیں۔ میں موسم سرما میں "گھنٹوں" بیلچا و تیشہ سے مشینی نمونے بنایا کرتا تھا۔

عمر زیادہ ہونے کے ساتھ میں زیادہ وقت گھڑ سواری اور شکار میں گزارنے لگا۔ اس کے ساتھ مجھے بائیسکل پولو بھی بہت پسند تھا۔ والد ہر روز کم و بیش ایک گھنٹہ میرے ساتھ رہتے۔ جب میں نو برس کا ہوا تو وہ دوپہر کا کھانا مجھے اپنے ساتھ کھلانے لگے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ میں رفتارِ زمانہ سے کس قدر واقفیت رکھتا ہوں۔

ولی عہد مقرر ہوتے ہی مجھے سخت میعادی بخار ہو گیا۔ کئی ہفتے تک میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ اسی بیماری کے زمانے سے میری مذہبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اس زمانے میں حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا۔ ان کے ساتھ ان کی مشہور تلوار ذوالفقار بھی تھی۔ چھ یا سات برس کی عمر سے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے جیسے کوئی قادرِ مطلق میری رہنمائی کر رہا ہے۔ بعض اوقات یہ خیال مجھے بہت پریشان کر دیتا ہے ——— میں اپنے آپ سے پوچھنے لگتا ہوں کہ آخر میری اپنی شخصیت کیا ہے اور میں کوئی ذاتی ارادہ بھی رکھتا ہوں یا نہیں ——؟

میرے والد ایران کو مغربی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس لیے جب انہوں نے مجھے وہاں کے ایک اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا تو کسی کو بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا جانشین مغربی تہذیب سے اور زیادہ واقف ہو جائے بلکہ مغرب کی ترقی کے راز اپنے اندر جذب کر لے۔ انہوں نے مجھے سوئٹزرلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ میرے وہاں تعلیم پانے سے کسی قسم کی سیاسی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا کیونکہ یہ ایک چھوٹا اور روایتی غیر جانبدار ملک ہے۔

مجھے سوئٹزرلینڈ میں چار برس قیام کرنا تھا۔ یہ زمانہ میری زندگی میں بہت اہم ہے کیونکہ مغرب کے جمہوری ماحول نے میرے کردار کی تعمیر میں میرے والد کے علاوہ سب سے زیادہ اثر ڈالا۔

میری جسمانی نشو و نما نے سب کو ہی متعجب کر دیا۔ کھیلوں کے مختلف انفرادی مقابلوں میں انعام جیت کر مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا۔ میں اسکول کی فٹ بال اور ٹینس ٹیموں کا کپتان بھی ہو گیا تھا۔

میں نے کئی تعلیمی انعامات بھی حاصل کیے۔ جغرافیہ، تاریخ اور نیچرل سائنس سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔ مجھے فرانسیسی زبان بھی خوب

انگلشی اور فرانسیسی ادب سے میں خاص طور پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ میرے اساتذہ عمدہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی سے میری خاص دوستی ہوئی۔ ان میں سے کچھ سے ہم ڈرا کرتے تھے۔

مجلسی زندگی کے اعتبار سے بھی میں بہت ترقی کر رہا تھا۔ اسکول کے دوسرے لڑکے مجھے میرے مرتبے سے نہیں بلکہ میری ذاتی صلاحیتوں سے پرکھتے تھے۔ اس بات سے مجھے بہت زیادہ تحریک ملتی۔ میرا کمرہ لڑکوں کی ملاقات کی جگہ بن گیا۔ اکثر تو یہ پوری طرح بھر جاتا تھا۔

اس کے باوجود میری اسکول کی زندگی عام لڑکوں سے بہت مختلف تھی۔ مجھے دوسروں سے زیادہ مطالعہ کرنا پڑتا کیونکہ روزمرہ کے تعلیمی پروگرام کے علاوہ میرے والد کی خواہش کے مطابق مسٹر مستشر مجھے فارسی سکھاتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ گمبھیر بات یہ تھی کہ ڈاکٹر نفیسی میرے مشغلوں پر پابندی لگاتے تھے۔ میں گویا ایک قیدی کی طرح تھا اور گاہے گاہے ان کے ساتھ کہیں جانے کے علاوہ مجھے اسکول کے احاطے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

میرے خیال میں اسی تنہائی نے مجھے سنجیدہ بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی سنجیدہ بنا دیا۔ میرا مزاج آج بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ یہ اس زمانے میں تشکیل ہوا۔ میں بہت خاموش طبیعت ہوں اور جھگڑے کے وقت یا کسی بھی موقع پر میرا مزاج بے قابو نہیں ہوتا۔ عام لوگوں سے گفتگو کرنے میں مجھے تسکین اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بچے پسند ہیں اور کسی بنیادی اسکول کا دورہ کرتے ہوئے عزت افزائی کا احساس ہوتا ہے۔ میں ان سے بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے بے جھجک بات چیت کرتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے دوران میں فطری طور پر اپنی آئندہ ذمہ داریوں کے بارے میں غور کیا کرتا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تخت نشینی کے بعد میں مذہب کی سچی روح کی پیروی کروں گا۔ میں ان مخصوص پالیسیوں کے بارے میں بھی غور کیا کرتا جنہیں میں عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے ملک کے عوام اور خاص طور پر کسانوں سے مجھے پہلے ہی ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ تخت نشینی کے بعد شاہی جاگیروں میں کھیتی کرنے والے کسانوں سے دو تین برس کے لیے ہر قسم کی وصولیابی پر پابندی لگا دوں گا۔ میں کسان گھرانوں کو کچھ روپیہ جمع کرنے دوں گا تاکہ وہ ایک مکان بنا سکیں یا جانور خرید سکیں یا کچھ دوسرے وہ کام کر سکیں جنہیں وہ اپنی بہت معمولی آمدنی میں پورا نہیں کر سکتے۔

ایک دوسرا خیال جو ان دنوں میرے ذہن میں آیا یہ تھا کہ میں ایک عوامی شکایتی بکس بنواؤں گا۔ ہر آدمی ہر قسم کی شکایت اس میں لکھ کر ڈال سکے گا۔ یہ خیال ایک حد تک نوشیرواں عادل اور اس کی گھنٹی کی کہانی کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔

۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں مجھے ڈپلوما مل گیا اور وطن کو واپسی کا وقت آیا۔ موسم گرما کی تعطیل اور گھر والوں سے ملاقات کے بعد میں نے تہران کے فوجی کالج میں کام شروع کیا۔ فوجی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی مجھے زیادہ سے زیادہ والد کے حضور میں حاضر رہنا پڑا۔

اس میں حیرانی کی بات نہیں کہ میرے والد نے جرمنی سے اقتصادی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ہمارے کچھ طلبا جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کئی جرمن پروفیسر تہران یونیورسٹی میں بحیثیت استاد موجود تھے۔ وہاں کے ٹیکنیکل ماہر اچھے، سامان عمدہ اور تجارتی شرائط بھی سود بخش تھیں۔

جب یورپ میں جنگ شروع ہوئی تو ایران نے بہت پُر زور انداز میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ ۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو

ہٹلر کے روس پر حملے کے چند روز بعد ہی ایران نے پھر ایک بار اپنی غیر جانبداری پر زور دیا۔ ۹ ستمبر کو نئے وزیرِ اعظم نے اتحادیوں کی تجاویز پوری کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کی۔ اتحادیوں نے دارالسلطنت سے کچھ فاصلے پر اپنی فوجیں روک رکھی تھیں مگر کچھ دن بعد اتحادی افسروں نے ایرانی حکومت پر اپنے وعدوں پر عمل کرنے سے بچنے کا الزام لگاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ۱۷ ستمبر کی دوپہر کو ان کی فوجیں تہران کے مضافات میں داخل ہو جائیں گی۔ ۱۶ تاریخ کی صبح کو پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا کہ میرے والد نے تخت چھوڑ دیا ہے۔ اسی دن میں ان کی جگہ تخت نشین ہوا۔

میرے والد نے جنوبی ایران سے ایک برطانوی بحری جہاز میں روانہ ہوتے ہوئے اپنے وطن پر آخری نظر ڈالی۔ انہوں نے جنوبی امریکہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس کے بجائے انہیں پہلے ماریشس اور پھر جوہانسبرگ لے جایا گیا جہاں ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کچھ برس پہلے ایک آدمی جس کا نام ڈاکٹر محمد مصدق تھا ماضی قریب کے کسی بھی ایرانی سے زیادہ دنیا کے اخباروں کی جلی سرخیوں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں اور بعض لوگوں کے خیال میں اس سے کچھ پہلے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں اس کی پیدائش ہوئی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں اس نے قانون اور اس سے متعلقہ مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شہری انتظام اور کابینہ کی کئی اہم جگہوں پر مامور رہا۔ صوبائی گورنر کی حیثیت کے ضمن میں وہ وزیر خزانہ، وزیر انصاف اور وزیر خارجہ بھی رہا۔ وہ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار پارلیمنٹ میں داخل ہوا اور آخری تنزل تک بہت کافی عرصے تک ممبر رہا۔ ایک مختصر وقفے کے سوا اپریل ۱۹۵۱ء سے جولائی ۱۹۵۳ء تک وہ وزیر اعظم بھی مقرر ہوا اور یہی زمانہ اس کے اقتدار کا نقطۂ عروج ہے۔

فروری ۱۹۵۳ء میں اس نے مجھے عارضی طور پر ملک سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ میں ہوائی جہاز میں بغداد پہنچا۔ عراقی حکومت اس بے اطلاع آمد پر حیران رہ گئی لیکن انہوں نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بغداد میں ہمارے سفیر نے مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی لیکن چند روز بعد جب میں ایران واپس ہو رہا تھا تو بغداد کے ہوائی اڈے پر یہی شخص مجھ سے سب سے پہلے ملنے کے لئے آیا۔

سوئٹزرلینڈ میں تعلیم کے دوران مجھے لڑکیوں سے شناسائی کا کم موقع ملا تھا لیکن وہاں سے واپسی کے بعد ملٹری کالج میں میری تعلیم ختم ہوتے وقت والد نے میرے لیے ایک موزوں دلہن مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف وہ اپنے بیٹے کے لیے اعلیٰ خاندان کی شہزادی کی تلاش میں تھے اور دوسری طرف ان کی کوشش تھی کہ اس بہانے ایک ہمسایہ ملک سے تعلقات بھی استوار ہو جائیں۔

انہوں نے مصر کی خوبصورت شہزادی فوزیہ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اپنے مخصوص اور براہِ راست انداز میں جو دل کے معاملات کے بجائے شاید مشینی منصوبوں کے لیے زیادہ موزوں تھا، انہوں نے تحقیق شروع کی۔ میرے والد نے سرکاری طور پر یہ معلوم کیا کہ آیا وہ شہزادی ان کے بیٹے کی زوجیت کے لیے مل سکتی ہے۔ اس وقت تک میں نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھے اس سے ملنے کے لیے قاہرہ روانہ کیا گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے دو ہفتے کا وقفہ ملا۔ ایک امام قاضی نے قاہرہ میں شادی کی رسم انجام دی۔ میرے قریبی رشتہ داروں میں کوئی موجود نہیں تھا، ان ایرانی معززین کا ایک وفد اس تقریب میں شرکت کے لیے ضرور آیا تھا۔ ان کے

بعد میں اپنی دلہن کو گھر لے آیا۔

اس شادی میں شاید سب سے زیادہ خوشی کا موقع ۱۹۴۰ء میں میری عزیز لڑکی شہناز کی پیدائش تھی۔ کچھ ان وجوہات کی بنا پر جن سے ابھی تک میڈیکل سائنس لاعلم ہے ملکہ فوزیہ کے ہاں صرف ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس طرح بد قسمتی سے ہماری شادی کے نتیجے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا۔ ایرانی قانون کے مطابق صرف بادشاہ کا لڑکا ہی تاج کا حقدار ہو سکتا ہے۔ جب ملکہ فوزیہ مصر گئیں تو ہم دونوں نے طلاق کا فیصلہ کیا۔

طلاق کے بعد میری نئی شادی دو برس بعد ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے ایک لڑکی ثریا اسفندیاری کا پتہ لگا اور اس کے متعلق جو واقفیت حاصل ہوئی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک ہی برس میں ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔ میری منگیتر کے باپ ایک بختیاری قبائلی سردار اور اس کی ماں جرمن تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کوئی بچہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے میری پریشانی بڑھتی گئی کیونکہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ قوم کے اصل مفاد ایک جانشین کے متقاضی ہیں۔ میرے مشیروں نے مجھ سے مشورہ کیا اور اس کا ناگزیر نتیجہ مارچ ۱۹۵۸ء میں پھر طلاق کی صورت میں سامنے آیا۔

ایک دن میری لڑکی شہزادی شہناز نے جس کی آنکھوں میں اس وقت معمول سے زیادہ چمک تھی، مجھے بتایا کہ وہ اور اس کے شوہر ایک ایسی نوجوان لڑکی سے متعارف ہوئے ہیں جو ان کے خیال میں ملکہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ شہزادی شہناز نے بتایا کہ اس لڑکی کا نام مس فرح دیبا اور عمر اکیس برس ہے۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو خالص اسلامی رسومات کے مطابق ہماری شادی ہو گئی۔ جب فرح سے پوچھا گیا کہ کیا اسے مجھ سے شادی کرنا قبول ہے؟ تو وہ ایرانی روایت کے مطابق دو بار خاموش رہی اور تیسری بار اس نے اقرار کیا۔ منگنی سے پہلے ہی میں نے فرح کو بتا دیا تھا کہ ملکہ کی حیثیت میں اس کی ذمہ داریاں فن تعمیر کی طالبہ سے واضح طور پر مختلف ہوں گی۔

مجھے کس قدر خوشی ہوئی تھی جب خدا نے ہمیں ہمارا پہلا لڑکا عطا کیا۔ یہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

ایک بادشاہ کی روزانہ زندگی کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس کا کام دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے؟ شاید میرے ناظرین ان سوالوں کے جواب جاننا پسند کریں گے۔ میں اپنی روزمرہ زندگی میں ایک معین ضابطہ کی پابندی کرتا ہوں۔ یہ موقع محل اور میرے موڈ سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں ہر روز تقریباً صبح ساڑھے سات بجے اٹھتا ہوں۔ شیو بناتے اور نہاتے ہوئے میں تھوڑا بہت سلطنت کے کسی معاملے کو سوچتا ہوں یا بہت تیزی سے تمام دن کی مصروفیتوں کو ذہن میں دہرا لیتا ہوں۔ ناشتہ میں تنہا کرتا ہوں۔ یہ پھلوں کے کچھ رس، ایک پیالہ سیاہ قہوے اور ٹوسٹ کے ایک ٹکڑے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مختصر سی خوراک کو ختم کرنے میں بس دو تین ہی منٹ لگتے ہیں لیکن عام طور پر میں میز پر دس منٹ بیٹھتا ہوں اور اخبار پڑھتا رہتا ہوں۔

تقریباً نو بجے میں اپنے دفتر میں کام شروع کرتا ہوں۔ ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ میں دفتر سے نکل کر ملکہ کے ساتھ یا کبھی رشتہ داروں یا ایرانی یا غیر ملکی معززین کے ساتھ لنچ لینے چلا جاتا ہوں۔ کھانا کبھی ایرانی کبھی یورپی اور کبھی ملا جلا ہوتا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کے برخلاف میں دوپہر کو ہلکا کھانا پسند کرتا ہوں۔ لنچ کے وقت بلکہ ہر موقع پر میں نشیلے مشروبات سے پرہیز کرنا پسند کرتا ہوں۔

میں لنچ کے بعد کچھ اور اخبارات کا تقریباً پینتالیس منٹ مطالعہ کرتا ہوں اور اگر وقت ہو تو تھوڑی ہی دیر قیلولہ کر لیتا ہوں۔ آرام کے بعد میں پھر دفتر میں جا کر دو تین گھنٹے رپورٹیں پڑھتا ہوں۔

اگر کوئی مصروفیت مانع نہ ہو تو میں دوپہر کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کھیلتا یا جسمانی مشق کرتا ہوں۔ اس کے بعد ملکہ میرے ساتھ ناشتہ کرتی ہیں۔ شام کو ہم اپنی رہائش گاہ پر موسیقی سنتے ہیں یا فلم دیکھتے ہیں۔ رات کو ہم عام طور پر جلدی آرام کرنے چلے جاتے ہیں۔

میری تفریح کے کچھ اور ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً سعد آباد میں جو میرا موسم گرما کا رہائشی محل ہے، ہم نے گائیں اور چوپائے پال رکھے ہیں اور ہر موسم میں ہم کئی دفعہ انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ برقی ریلوں میں مجھے بچوں کی سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میں وہ سیٹ جو میں نے چند برس پہلے سوئٹزرلینڈ میں خریدا تھا اکثر چلایا کرتا ہوں۔ ثانوی اسکول کے دنوں میں میں نے ایک برس لکڑی کے کام کی تعلیم حاصل کی تھی اور کبھی کبھی اس شوق کو جگانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

دنیا میں اتنی تیزی سے انقلاب آ رہا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے لیے اپنے بندھن توڑ دینا آسان ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کی موجودہ ڈرامائی تبدیلیاں اس بات کی شہادت ہیں کہ ہم تعمیری تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کچھ ایسی اعلیٰ اقدار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال میں ہماری اپنی خصوصیت ہیں۔ ہم باغات، شاعری، خاندانی زندگی اور ایرانی مہمان نوازی کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں صحراؤں، برف پوش پہاڑوں، دیودار اور سرو کے درختوں، دریاؤں، چشموں، گلاب کے پودوں، صنوبر کے درختوں اور بلبلوں کی اس سرزمین سے محبت ہے اور ہم کو اپنے سیاسی اور سماجی اداروں پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔

(ترجمہ : نعیم احمد)

فرح دیبا پہلوی

ملکۂ ایران، ہر امپیریل میجسٹی فرح پہلوی کی ولادت باسعادت ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کی شب ساڑھے دس بجے ہوئی۔ آپ کے جدِ امجد کا سلسلہ حضرت امام حسینؑ کے بھتیجے سے جا ملتا ہے اور آپ کا شجرۂ نسب حضرت عبدالعظیم کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کے والد سہراب دیبا مرحوم افواجِ ایران میں افسر تھے۔ مرحوم گریجویٹ تھے اور انھوں نے پیرس سے لا کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔

فرح پہلوی کمسن تھیں اور ابھی پرائمری سکول میں آپ کا دوسرا برس تھا کہ اجل نے آپ کو باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ آپ کی والدہ مادام فریدہ دیبا کا سہاگ اُجڑ گیا مگر انھوں نے موت کی تاریکیوں کو سینے میں سمیٹ کر بھی ننھی فرح کے مستقبل کی روشنی کو بجھنے نہ دیا۔ ماں نے نہ صرف باپ کے خلا کو پُر کیا بلکہ اپنی زندگی بچی کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی۔

ہر امپیریل میجسٹی کی ابتدائی تعلیم جینڈی آرک سکول میں ہوئی۔ پھر آپ نے تہران کے رازی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ آپ ہونہار طالبہ تھیں۔ ان کے نزدیک سکول کی سرگرمیوں میں معاشرتی فلاح و بہبود کو خصوصی مقام حاصل تھا اور یہ سرگرمیاں منظم ہوا کرتی تھیں۔ تعلیم کی ابتدا میں ہی جب آپ ننھی سی بچی تھیں، آپ نے ان سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی عمر میں آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ معاشرتی فلاح و بہبود ایک فریضہ ہے جس سے بیوفائی نہ کر سکیں گی۔ اس جہاد میں آپ نے چند ذمہ داریاں اپنے سر لیں اور انھیں کمال اہتمام سے نبھایا اور خوبی یہ کہ تعلیم میں بھی ذرہ بھر کوتاہی نہ کی۔

آپ ذہنی اور جسمانی طور پر چاک و چوبند اور مستعد تھیں۔ سکول میں جتنی بھی تقریبات جو (خصوصاً) کھیلوں اور دوڑوں کے متعلق ہوتی تھیں، ان کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ رہتی تھیں۔ چنانچہ آپ سکول کی مبصر بھی اور اس کی محفلوں کی روحِ رواں تھیں۔ کھیلوں میں آپ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ صرف حصہ ہی نہیں لیتی تھیں بلکہ کھیلوں کا حصہ بن جاتی تھیں۔ آپ [illegible] میں کھلاڑی تھیں اور کھیلوں میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ آپ نے ۴.۰۳ میٹر کی چھلانگ لگا کر لمبی چھلانگ کا ریکارڈ توڑا۔ اونچی چھلانگ میں بھی ۱.۲۲ میٹر کا نیا ریکارڈ قائم کیا اور دونوں کھیلوں میں آپ نے چاندی کے تمغے حاصل کیے۔ اس سے اگلے سال کے مقابلوں میں بھی آپ اول رہیں۔ دوڑوں کے مقابلوں میں آپ سکول میں ہمیشہ اول آیا کرتی تھیں۔ تین سال تک آپ باسکٹ بال کی چیمپئن رہیں اور ٹیم کی قیادت آپ کے ہاتھ رہی۔ اس کے علاوہ تیراکی اور ڈرائیونگ میں بھی آپ کو منفرد مقام حاصل تھا۔ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اب آپ پیانو بجاتی ہیں۔ موسیقی کی سُر تال اور اس کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ پینٹنگ میں بھی دسترس رکھتی ہیں۔

آپ نیچرل سائنس کی بیچلر کی ڈگری لے کر ACOLE SPECIALE D' ARCHITECTURE کی ڈگری لینے کے لیے

پیرس چلی گئیں۔

پیرس میں آپ کو دو برس رہنا تھا۔ اسی عرصے کا ذکر ہے۔ مئی ۱۹۵۹ء میں آپ کو دوسرے سال گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو آپ تہران چلی آئیں۔ چھٹیوں کا مختصر سا عرصہ ہنستے کھیلتے گزر گیا اور آپ فرانس کے لیے رختِ سفر باندھنے لگیں۔ زرِ مبادلہ کی ضرورت تھی۔ حکومتِ ایران نے غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو زرِ مبادلہ کی خاص رعایت دے رکھی تھی اور طلبا کے زرِ مبادلہ کا محکمہ ہی الگ بنا رکھا تھا۔ جناب اردشیر زاہدی اس محکمے کے انچارج تھے۔ جب فرح زرِ مبادلہ کی درخواست لے کر محترم زاہدی کے دفتر میں داخل ہوئیں تو آپ کو گمان تک نہ تھا کہ اس درخواست کی وساطت سے آپ کو چند فرانک کا زرِ مبادلہ ہی نہیں ایران کا تخت و تاج بھی مل جائے گا — اور آپ تختِ ایران کے پہلے ولی عہد کو جنم دیں گی۔

اُن دنوں شہنشاہِ ایران ایسی ہی ایک رفیقہ کی تلاش میں تھے جیسے فرح دیبا، پُر وقار، شوخ اور دلکش شخصیت اور جو اپنے دلآویز قد کاٹھ اور چہرے مُہرے کے خطوط میں ہنستی مُسکراتی رہتی ہو۔ جناب اردشیر زاہدی نے آپ کی زرِ مبادلہ کی درخواست کو کم ہی دیکھا مگر پہلی نظر میں آپ نے جانچ لیا کہ شہنشاہِ ایران رعنائیوں کے اسی پیکر کی جستجو میں ہیں۔ آپ نے فرح کو اپنے گھر بلایا اور شہنشاہ کی بیٹی شہزادی شہناز کو بھی مدعو کیا۔ دونوں کا تعارف ہوا۔ شہزادی اپنے والد سے زیادہ بے تاب تھیں۔ جانتی تھیں کہ انھیں ایسی دلہن ڈھونڈنی ہے جو ایران اور شہنشاہِ ایران کے شایانِ شان ہو۔ آپ نے فرح کے روپ میں اس دُلہن کو دیکھ لیا۔

ایک روز شہزادی شہناز نے اپنے والد شہنشاہ کو دعوت پہ مدعو کیا۔ فرح بھی مدعو تھیں۔ شہنشاہ تشریف لائے لیکن آپ کو علم نہ تھا کہ آپ اپنی ہونے والی ملکہ سے ملنے جا رہے ہیں۔ فرح اپنے شہنشاہ کو جانتی پہچانتی تو تھیں لیکن اُنھوں نے جب بھی انھیں دیکھا شہنشاہیت کے لبادے میں دیکھا تھا اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو آداب اور سرکاری پن سے بوجھل تھا لیکن اُس روز فرح نے اپنے ملک کے بادشاہ کو انسان کے روپ میں دیکھا تو اپنے آپ کو خوابوں کی بہشت میں پایا۔ ماحول دوستانہ تھا، فضا میں اپنائیت تھی نہ درباری اور سرکاری آداب۔ بادشاہی کے خول سے نکل کر بادشاہ کس قدر خوبرو اور دلکش لگ رہے تھے، لیکن فرح محسوس نہ کر سکیں کہ وہ شہنشاہ کو دلکش لگ رہی ہیں اور وہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے شاہِ ایران کے دل میں بیٹھ چکی ہیں۔

پہلی ملاقات میں ہی شہنشاہِ ایران نے زندگی کا عظیم فیصلہ کر لیا اور فرح کو محل میں مدعو کر کے اپنے خاندان سے ایران کی ہونے والی ملکہ کا تعارف کرایا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو فرح اور شاہِ ایران کی شادی ہو گئی اور فرح دیبا ہر امپیریل مجسٹی فرح پہلوی ملکۂ ایران بن گئیں۔ آپ شاہِ ایران کے اُن تمام خوابوں کی حسین تعبیر ثابت ہوئیں جو اُنھوں نے سوتے جاگتے دیکھے تھے۔ آپ نے شہنشاہ کی وہ آرزو بھی پوری کر دی جس پر تمام دُنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں — آپ نے ایران کے ولی عہد کو جنم دیا۔

فرح پہلوی فرانسیسی زبان سے خوب واقف ہیں اور روانی سے بولتی ہیں۔ آپ طبعاً فیاض اور خوش گفتار ہیں۔ دل عوام دوستی، ہمدردی اور ترحم سے لبریز ہے۔ مصیبت زدوں کی امداد اور دستگیری کی خاطر آپ دُنیا بھر کے کام بھول جاتی ہیں۔ آپ کا بیشتر وقت اور سوچ و فکر بہبود کے کاموں پر صرف ہوتا ہے اور آپ معاشرتی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کو منظم کرتی رہتی ہیں۔ تعلیم و تعمیرِ نو میں آپ خصوصی دلچسپی لیتی ہیں۔ آپ نے تہران اور دوسرے صوبوں کی "فرح پہلوی ویلفیئر ایسوسی ایشن" کی سرپرستی بڑے شوق سے

قبول کر رکھی ہے۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام چالیس یتیم خانے ہیں جن میں سے چھ تو صرف تہران میں ہیں اور چونتیس مختلف شہروں میں۔ ایک معاشرتی ترقیاتی منصوبے کے تحت اس تعداد میں ہر سال بارہ یتیم خانوں کا اضافہ ہوا کرے گا۔ ان تمام اداروں کے سالانہ اخراجات تیس کروڑ ریال سالانہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کثیر رقم یتیم خانوں کی صرف تعمیر اور انتظامی امور پر خرچ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر امپیریل مجسٹی فرح پہلوی نے نابینا بچوں کے ایک ادارہ کی تعمیر کے لیے لائن کلب کو تیس لاکھ ریال اور بیس لاکھ ریال اُن حاجت مندوں کے لیے عطا کیے ہیں جو وقتاً فوقتاً امداد کی درخواست کیا کرتے ہیں۔

آپ تپ دق کے مریضوں کی انسدادی اور حفاظتی ایسوسی ایشن کی بھی صدر ہیں اور آپ مطبوعات کے ترجمے اور نشر و اشاعت کے ایک ادارے کی بھی سرپرست ہیں جو ہر سال تیس کتابیں چھاپتا ہے۔

فرح پہلوی ایران کے تخت و تاج کی ہی نہیں ہر ایرانی کے دل کی ملکہ ہیں۔

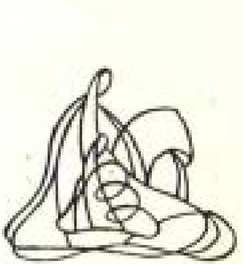

جمال عبدالناصر

ولادت : ۱۵ر جنوری ۱۹۱۸ء

میں تاریخ کے استاد اور مورّخ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرنا چاہتا —— یہ بات تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں —— لیکن اس کے باوجود اگر کسی مبتدی طالب علم کی طرح بھی اپنی قومی جدوجہد کی تاریخ کا مطالعہ کروں تو یہی کہوں گا کہ ۲۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب درحقیقت اہلِ مصر کی اس تمنا کا رُوبہ عمل آنا ہے جو زمانۂ حاضرہ میں ان کے دلوں میں اس وقت سے کروٹیں لے رہی تھی جب سے یہ احساس ان میں پیدا ہوا کہ ملک کی باگ ابنائے ملک کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے تاکہ اہلِ ملک اپنی قسمتوں کے آپ مالک ہوں . . . .

آج میں اپنی یادداشت کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس اثنا میں بے شمار واقعات و حادثات مجھ پر گزر چکے ہیں اور ایک زمانہ بیت چکا ہے جب انقلابی رجحان کا آغاز ہوا تھا۔ بہرحال ماہ و سال کے اس فرق کو طے کر کے میں آپ کو وہ دن بتانا چاہتا ہوں، جب میں نے پہلے پہل اپنے دل میں اپنے انقلاب کے اوّلین تاثرات محسوس کیے۔

وہ دن میری زندگی میں بہت پہلے آیا تھا —— نومبر ۱۹۵۱ء سے بہت پہلے جب افسروں کے کلب کا انتخابی بحران شروع ہوا —— ناقص سامانِ جنگ کی رُسوائیوں سے بھی بہت پہلے —— ۱۶ر مئی ۱۹۴۸ء سے بھی پہلے جب کہ معرکۂ فلسطین میں میری فوجی زندگی کا آغاز ہوا —— اسی طرح میری زندگی میں وہ دن ۱۹۳۵ء کے اس پُرآشوب دور سے بھی پہلے آچکا تھا۔ جب میں طالب علم تھا اور میرے شب و روز فلک شگاف نعروں اور جلوسوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جو بالآخر بحال کر دیا گیا —— میں ان دنوں طلبا کے وفود کے ساتھ قوم کے زعماء کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا تھا کہ خدا کے لیے مصر کی خاطر متحد ہو جایئے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں نیشنل فرنٹ کا قیام عمل میں آیا وہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے انہی ہیجان انگیز دنوں میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس پر ۲ر ستمبر ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔ میں نے لکھا تھا:

> "آج صورتِ حال بڑی نازک ہے اور مصر نازک تر پوزیشن میں ہے . . . . شاید ہمیں زندگی کو خیرباد کہنا پڑے، موت سے ہمکنار ہونا پڑے، یاس کی دیواریں بڑی مستحکم ہیں، کون ان کو ڈھائے گا، کون انھیں گرائے گا؟ . . . ."

اور میرا یہ خط اسی انداز سے چلا گیا تھا . . . . اب بتاؤ کہ وہ دن کونسا تھا جب انقلاب کا جذبہ میرے دل کی گہرائیوں

میں اُبھرا تھا؟

میں کہتا ہوں کہ یہ جذبہ صرف میرے ہی دل کی گہرائیوں پوشیدہ نہیں تھا۔ اپنے علاوہ میں نے اور بھی بہتوں کے سینوں میں اس جذبہ کو اسی طرح بل کھاتے دیکھا ہے لیکن میری ہی طرح یہ لوگ بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ جذبہ کب اور کس وقت ان کے اندر پیدا ہوا — تو کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ یہ جذبہ ہمارے اندر اسی وقت سے موجود تھا جب ہم پیدا ہوئے؟ اور یہ وہی تمنائے ناکام ہے جو پیشرو نسل نے ہمارے وجدان کو سونپی تھی؟ . . . یہ ہمیں ورثہ میں ملی، گھٹی میں پڑی . . . .

بہرحال کچھ ہوا اور جس طریقے سے بھی ہوا، اس کے پیچھے تو میں ہی تھا، پھر اس انقلاب کی گفتگو یا اس کے مفہوم و معنی اور مقصد کی وضاحت کرتے وقت یہ کہاں ممکن ہے کہ اپنے آپ کو اس سے جُدا رکھ کر کچھ عرض کروں۔

میرا ایمان ساری عمر عسکریت ہی پر رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ عسکریت، فوج کے سر صرف ایک ہی فریضہ عائد کرتی ہے اور وہ فریضہ یہ ہے کہ یہ سرفروش اپنی جانیں وطن کی سرحدوں پر نچھاور کریں۔ اس لیے واقعی یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہماری فوج سرحدوں کی بجائے عین قلب وطن میں — مصر کے دارالحکومت میں — ایسا اقدام کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی؟

۲۳ر جولائی سے پہلے ہمارے سامنے مختلف عوامل ایسے موجود تھے جو بجائے خود اس امر کی تشریح و بیان ہیں کہ فوج نے جو اقدام کیا وہ اقدام اس کے لیے کیوں ضروری تھا . . . .

ہم کہا کرتے تھے کہ اس کام کے لیے اگر فوج نہ اُٹھی تو پھر اور کون اُٹھے گا؟ — ہم یہ بھی کہتے تھے کہ فوج ہی تو وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے خواب قومی کو ہر مرتبہ پریشان اور پراگندہ کر دیا جاتا ہے لہٰذا وقت آگیا ہے کہ اب یہی ہتھیار خود سامراج کے خلاف پلٹ پڑے اور اس کے سارے مستبدانہ خواب و خیال کو درہم برہم کر کے رکھ دے . . . .

۲۳ر جولائی سے پہلے میرا خیال تھا کہ ساری قوم پوری طرح عمل کے لیے تیار ہے اور اس کو انتظار صرف مقدمۃ الجیش اور ہراول کا ہے جو آگے بڑھ کر سامنے کی فصیل کو ڈھا دے۔ پھر ساری قوم آپ ہی اس کے پیچھے باقاعدہ صف آرا ہو کر پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے مقصدِ عظیم کی طرف پیش قدمی شروع کر دے گی۔

لیکن ۲۳ر جولائی کے واقعے نے اس فریب کو میرے سامنے بے نقاب کر دیا . . . .

مقدمۃ الجیش نے اپنا فرض ادا کیا، سرکشوں اور جابروں کے قلعے کی فصیلیں ڈھا دیں۔ استبداد شاہی کا طوق بھی گلے سے اتار پھینکا، مگر اس کے بعد یہ ہراول انتظار ہی کرتا رہا کہ اپنے مقصدِ عظیم کی طرف مجاہدانِ قومی کی مقدس اور منظم پلٹنیں بڑھیں گی . . . انتظار پر انتظار رہا . . . . عوام کا ہجوم تو بے شک نظروں کے سامنے بے پناہ تھا . . . . لیکن حقیقت اور خیال میں کتنا بُعد ہے! یہ بے پناہ ہجوم جو ہم تک پہنچا وہ ٹولیوں، گروہوں اور جماعتوں میں منقسم تھا، پراگندہ فکر و خیال افراد کا مجموعہ — اور مقصدِ عظیم کی طرف ہونے والی پیش قدمی تعطل میں پڑ گئی۔ اس دن جو نقشہ ہمارے سامنے آیا وہ حد درجہ خوفناک اور بھیانک تھا — اور خطرات سے بھر پور — میرا دل غم و الم سے لبریز ہو گیا، تلخیاں چھلک پڑیں اور مجھے احساس ہوا کہ مقدمۃ الجیش اور ہراول کی خدمت گزاری ختم نہیں ہوئی بلکہ خدمت تو دراصل اب شروع ہوئی . . . .

ہمیں ایک نظام مطلوب تھا مگر ہم نے جب اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی تو وہاں افراتفری اور طوائف الملوکی کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا . . . . ہمیں وحدت و اتحاد کی ضرورت تھی مگر ہم نے دیکھا تو ہر طرف انتشار و افتراق ہی نظر آیا . . . . ہمیں عمل درکار تھا لیکن جب ہم نے نظر دوڑائی تو کاہلی اور عیاشی کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا . . . .

یہ تھے وہ حقائق — ان کے سوا دوسری اور کوئی چیز نہ تھی — جن کی بنا پر انقلاب نے اپنی راہ خود نکالی اور یہ تھا وہ سرچشمہ جہاں سے انقلاب کا سیل رواں امنڈ پڑا — اور اب میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ایک انقلاب سے نہیں بلکہ بیک وقت دو انقلابوں سے گزر رہے ہیں . . . . ایک تو سیاسی انقلاب ہے اور دوسرا معاشرتی . . . .

اب ایک انقلاب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم متحد اور باہم دگر شیر و شکر ہو کر حصول نصب العین کی دھن میں کھو جائیں اور دوسرا انقلاب ہماری مرضی کے خلاف یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ ہمارے اندر تفریق پیدا ہو، منافرت کے دروازے کھلیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے سوا اور کسی کی فکر نہ کرے . . . .

یہ احساس مجھ کو شروع ہی سے تھا کہ ہماری کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اپنے ملک کی تاریخ میں ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے حالات کی نوعیت سے پوری طرح باخبر رہیں۔ یہ ہماری قدرت میں نہ تھا کہ بیک جنبش قلم ہم ان حالات کو بدل دیتے اور نہ یہ اپنے بس میں تھا کہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے پیچھے کر کے زمانے کی رفتار پر کوئی حکم چلا دیتے . . . . پھر یہ بات ہماری استطاعت میں نہ تھی کہ تاریخ کے چوراہے پر ٹریفک کے کسی سپاہی کی طرح کھڑے ہو کر ایک انقلاب کے گزر جانے تک دوسرے انقلاب کو روکے رہتے اور اس طرح بغیر کسی حادثے کے دونوں کو بچا کر اپنے اپنے رُخ پر لگا دیتے۔ ہمارے بس میں تو صرف ایک ہی بات تھی اور اسی پر ہمیں اختیار تھا کہ حتی الامکان ہماری طرف سے کوششیں بہتر سے بہتر ہوں اور ہم چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دب کر پس جانے سے محفوظ رہیں . . . .

ہم نے جب سیاسی انقلاب کی راہ میں قدم رکھا اور فاروق کو تخت سے اتارا تو اُس کے ساتھ ہی اُسی قسم کا ایک قدم معاشرتی انقلاب کی راہ میں بھی اٹھایا اور ملکیت زمین پر ایک حد مقرر کر دی اور زمینداریوں کو محدود کر دیا۔

ہمارے پاس بجلی کا کوئی ایسا بٹن نہیں تھا کہ اس کو دبا دیتے اور ہمارے خوابوں کی تکمیل ہو جاتی . . . . اور نہ یہ ممکن تھا کہ صدیوں کی جمع شدہ کثافتیں اور کئی نسلوں کی اخلاقی پستیوں کا ملبہ چشم زدن میں صاف ہو جاتا۔

آج ہماری قوم کی مثال اس قافلے کی سی ہے جس کو کسی نہ کسی معین راستے پر لگ جانا چاہئے تھا مگر اس کی راہ کھوٹی ہوتی چلی گئی۔ کبھی دشواریوں میں مصیبتوں نے اسے گھیرا۔ کبھی راہزنوں اور قزاقوں نے اس کی راہ کاٹی۔ کبھی سراب نے اس کو گمراہ کیا۔ آخر قافلے میں ابتری پھیل گئی — پھر تو جس شخص کا منہ جدھر کو اٹھا وہ ادھر ہی چل نکلا . . . .

ایسی صورت میں ہماری مہم بھی اسی شخص کی مہم جیسی ہے جو ان تمام پراگندہ حال و پراگندہ خیال بچھڑے اور بھٹکے افراد کو سمیٹ کے از سر نو قافلے کی صورت میں صحیح راستے پر لگا دینے کے لیے دوڑ پڑا ہو۔

مجھے پورا احساس تھا کہ یہ مہم بھی کچھ آسان نہیں اور شروع ہی سے مجھے اس کا بھی علم تھا کہ اس مہم کی انجام دہی میں ہماری

ہر دلعزیزی بھی خاصی قربان ہوگی۔ لیکن ہمیں تو بہ صورت صاف گوئی سے کام لینا تھا اور قوم کی عقل و خرد کو آواز دینا تھا — ہمارے پیش رو قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کے عادی تھے اور لوگوں کے جذبات جیسی باتیں سننے کے خواہاں تھے ویسی ہی باتیں وہ ان کو سنایا کرتے تھے۔

کرنے کو تو ہم بھی یہی کچھ کر سکتے تھے — لیکن اس کے بعد — ؟ کچھ بھی نہیں۔

مگر کیا یہی وہ مہم تھی جس کی انجام دہی کے لیے قدرت نے ہمیں پسند کیا ؟

کتنے لوگوں نے مجھ سے کہا: "آپ نے تو لوگوں کی ناراضی مول لے لی"۔ لیکن اس قسم کی باتوں کا جواب میری طرف سے ہمیشہ یہی رہا کہ صورتِ حال پر کوئی اثر لوگوں کی ناراضی سے نہیں پڑتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ لوگوں کی ناراضی وطن کے مفاد کی خاطر ہے یا کسی اور بنا پر ؟ —

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے بڑے بڑے جاگیرداروں کو چراغ پا کر دیا لیکن کوئی بتائے تو سہی کہ ان کو چراغ پا کیے بغیر کوئی چارہ بھی تھا ؟ کیا ہم اس کیفیت کو یونہی دیکھتے رہتے کہ اس ملک میں ایک طرف تو وہ لوگ ہوں جو لاکھوں ایکڑ زمین پر قابض ہوں اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں جن کی ملکیت میں اتنی بھی زمین نہ ہو کہ مرنے کے بعد اس میں دفن ہو سکیں ؟

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے پرانے سیاستدانوں کو برافروختہ کر دیا۔ لیکن کیا یہ ممکن بھی تھا کہ ہم انھیں برافروختہ نہ کرتے ؟ ان کی حرص و ہوس کا، بدعنوانیوں کا اور "عہدوں کی لوٹ" پر ان کے باہمی جنگ و جدل کا لقمۂ تر بننے کے لیے اپنے وطن کو یونہی چھوڑ دیتے ؟

مجھے پورا احساس ہے کہ ہم نے بہت سے سرکاری افسروں کو بھی نہایت ناخوش کر دیا۔ لیکن نہ کرتے تو کیا کرتے ؟ کیا یہ ممکن تھا کہ حکومت کے میزانیے کا آدھے سے زیادہ حصہ تو ان کی تنخواہوں پر اڑا دیں لیکن ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکے کہ — جیسا کہ اب ہم نے کر لیا ہے — چالیس ملین پونڈ (چار کروڑ پونڈ) تعمیری منصوبوں کے لیے نکال دیں ؟

اب تک جو اقدامات ہم نے کیے ہیں ان کا مقصد ماضی کے زخموں کا اندمال اور پرانے عیبوں کی صفائی ہے اور اس راہ میں ہمارے قدم اُٹھ چکے بلکہ جو کڑیاں ابھی جھیلنی تھیں وہ بھی جھیل چکے۔

ملک کی سیاسی زندگی کے تحفظ کی خاطر ہم لوگوں نے یہ بھی کیا کہ مختلف طبقات و تصورات کے قائدین تک پہنچے اور ان سے استدعا کی کہ ملک کے لیے ایسا دستور مرتب کیجیے جو ملک کی تمام محبوب و مقدس چیزوں کا محافظ ہو — اس طرح مجلسِ دستور وجود میں آئی۔

ملک کی معاشی زندگی کے تحفظ کی خاطر ہم نے یہ کیا کہ بڑے بڑے ماہرینِ فن اور ممتاز تجربہ کاروں کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا کہ ملک کی خوش حالی کے لیے ایسا نظامِ حیات مرتب کیجیے جس میں اس بات کی پوری ضمانت ہو کہ ہر شخص کو روٹی میسر آئے گی — اور یوں "نیشنل پروڈکشن کونسل" قائم ہوئی۔

ہماری حدود تو یہی ہیں جن سے ہم سرِمو تجاوز نہیں کریں گے۔ راستے کے تمام پتھروں، چٹانوں اور رکاوٹوں کو دُور

کریں گے خواہ یہ خدمت ہمیں کتنی ہی مہنگی کیوں نہ پڑے۔ یہ ہمارا فریضہ ہے — ہماری مہم کا تقاضا صرف یہ ہے کہ مصر کے مستقبل کی خاطر سب کو سمیٹ کر یکجا کر دیں — ایک آزاد، مضبوط اور طاقتور مصر کی خاطر۔

آج ہم اس بات پر قادر نہیں کہ دسویں صدی میں لوٹ جائیں اور وہ لبادے اوڑھ لیں جو ہماری نظروں کو عجیب و غریب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں یا اس دَور کے افکار و نظریات میں کھوئے رہیں جو آج ہمیں تاریکیوں کے ایسے تہ در تہ پرت نظر آتے ہیں جنھیں روشنی کی ایک رمق بھی چھو نہیں گئی۔

اور ٹھیک اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ زندگی ایسی بسر کریں گویا ہم قطب شمالی کے علاقہ الاسکا کا کوئی حصہ ہوں یا کوئی جزیرہ "ویک" ہوں جو بحرالکاہل کی پہنائیوں میں دُنیا سے دُور، سب سے الگ تھلگ اور کٹا چھٹا واقع ہے۔

وہ دن گئے جب لوہے کے تاروں کی چاردیواریاں مملکتوں کی سرحدیں بن جاتی تھیں اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے الگ کر کے حد بندی کر دیتی تھیں — اب تو ہر ملک کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ اپنی سرحدوں کے اس پار کی دُنیا پر بھی بھرپور نظر دوڑاتا رہے اور پوری طرح باخبر رہے کہ وہ لہریں کدھر سے آ رہی ہیں جو اس کے اندر اتری چلی جاتی ہیں متاثر کیے دیتی ہیں۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کی جاتی ہے وغیرہ — وغیرہ۔

اب تو ہر ملک کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ اس کی نگاہیں اپنے گرد و پیش پر رہیں تاکہ اس اقلیم معانی میں اپنے موقف و مقام کا تعین کر سکے۔ یہ دیکھے کہ وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کی دُنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی جولانگاہِ حیات کیا ہے؟ اس کا میدانِ عمل کہاں تک ہے اور وہ عمل ایجابی، وہ مثبت کردار کیا ہے جو اس مضطرب الحال و محروم سکون دُنیا سے اسے ادا کرنا ہے؟

میں نے ملکی احوال و ظروف پر از سر نو نگاہیں دوڑائیں تو دائروں کا ایک ایسا مجموعہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے اس کے سوا اور گنجائش ہی نہیں کہ یہی دائرے ہماری سرگرمیوں کا مرکز ہوں اور ہم اپنی ساری کوششیں پوری طاقت کے ساتھ انہی کے اندر صرف کر دیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس عرب حلقے کو نظر انداز کر دیں جو ہمارے اردگرد احاطہ کیے ہوئے ہے؟ یہ دائرہ اسی قدر ہمارا ہے جس قدر ہم اس کے ہیں۔ ہماری اور اس کی تاریخیں باہم مخلوط و مشترک ہیں۔ ہمارے اور اس کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم براعظم افریقہ کے وجود سے آنکھیں بند کر لیں جس کے اندر قدرت کے ہاتھوں نے ہمیں رکھ چھوڑا ہے اور جہاں قدرت ہی کے فیصلے کے مطابق اس کے مستقبل کی خاطر آج ایک خوفناک کشمکش برپا ہے — وہ کشمکش کہ ہم چاہے اس کو پسند کریں یا نہ کریں اس کے نتائج سے ہمارا متاثر ہونا لازمی اور یقینی ہے۔

پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عالم اسلام کو نظرانداز کر دیں — وہ عالم اسلام جس کے ساتھ صرف ہمیں دینی عقیدے ہی نے مربوط نہیں کیا بلکہ تاریخی حقائق نے بھی باندھ رکھا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے "عربیت" کا احساس و شعور میرے دل و دماغ میں اس وقت سے نکھرنا شروع ہوا تھا

جب میں سکنڈری اسکول کا طالب علم تھا اور جہاں ہر سال ۲ نومبر کو اعلان بالفور کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلاس سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ وہ اعلان بالفور جس کے ذریعے انگلستان نے قانونی مالکوں سے ان کی زمینیں چھین کر یہودیوں کو فلسطین میں ایک قومی وطن عطا کیا۔

اس وقت تو میں اپنے سینے میں ہمدردی کی گونج کے سوا اور کچھ نہ پاتا تھا لیکن یہ موضوع میری سمجھ میں آنا اس وقت شروع ہوا جب میں عسکری کالج میں تربیت کے لیے داخل ہوا اور وہاں بحیثیت "کیڈٹ" فلسطینی جنگوں کی تاریخ کا خصوصی اور اس پورے منطقے کی تاریخ اور اس کے حالات کا عمومی مطالعہ کیا اور یہ دیکھا کہ اس آخری صدی میں یہ منطقہ کس طرح بھوکے درندوں کا شکار بنا رہا اور وہ اس کی بوٹیاں نوچتے رہے۔

پھر میرے فہم و ادراک کو مزید روشنی اس وقت میسر آئی جب میں نے اسٹاف کالج میں فلسطینی مہم اور بحر متوسط (بحر روم) کے مسائل کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے سے وہ تمام بنیادی حقائق مجھ پر روشن ہو گئے جو ان کی تہ میں پوشیدہ تھے۔

اور جب فلسطینی بحران کا آغاز ہوا تو میرے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو چکا تھا کہ فلسطین کی جنگ کسی غیر ملکی سرزمین کی جنگ نہیں اور نہ اس میں ہمارا حصہ لینا محض جذبہ ہمدردی کی بنا پر تھا۔ یہ تو وہ فریضہ تھا جو خود اپنی مدافعت اور اپنے تحفظ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔

اس معرکے میں تمام عرب قومیں ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کر دوش بدوش لڑی تھیں۔ ان سب کے احساسات بھی ایک تھے اور اپنی سلامتی کی حدود اور ان کی اہمیت کا بھی بخوبی سب کو علم تھا۔

اور پھر مایوسی اور تلخ کامی کے ایسے ہی شدید جذبات کے ساتھ ان سب کو وہاں سے نکلنا بھی پڑا۔

کیونکہ ان میں سے ہر قوم اپنے اپنے ملک میں ایک ہی طرح کے عوامل کی زد میں تھی۔ ایک ہی طرح کی قوتیں ان سب پر مسلط تھیں جن کی بدولت ان سب کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور شرم و ندامت کے بوجھ سے سب کا سر جھک گیا۔

میں ان دنوں اس علاقے میں تعینات فوج کی چھٹی کمپنی کا اسٹاف افیسر تھا۔ اس کمپنی کو کبھی کبھی مدافعت اور زیادہ تر آگے بڑھ کے دشمن پر یلغار کرنی پڑتی تھی — گرد و پیش کے جو علاقے دشمن کی گولہ باری سے تباہ ہوئے تھے، ان کے کھنڈروں میں میں اکثر نکل جاتا تھا اور پھر میرے خیالات کی رو مجھے دُور دُور بہا لے جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو پرواز خیال ستاروں کے اُفق تک لے اڑتی تھی اور میں اس بلندی سے اپنے پورے منطقے پر نگاہیں دوڑانے لگتا تھا اور سارا نقشہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے اُبھر آتا تھا۔

ستاروں کی اس بلندی سے جب میں سطح زمین پر آ جاتا تو یہ احساس ہوتا کہ میری یہ جنگ تو میرے اپنے گھر اور اپنی اولاد کے تحفظ کی خاطر مدافعانہ ہے۔ پھر مجھے اپنے موہوم خوابوں کی کوئی پروا رہتی نہ دارالحکومتوں کی نہ قوموں کی، نہ حکومتوں کی نہ تاریخ کی — میری نظروں میں سب ہیچ ہو جاتے۔

محاصرہ ٹوٹا اور فلسطین کے معرکے ختم ہوئے تو میں اپنے وطن واپس آ گیا مگر اب یہ منطقہ سارے کا سارا میری نگاہوں میں

ایک ہی کُل" اور ایک ہی وحدت کا مظہر بن چکا تھا۔ پھر بعد میں جو واقعات رونما ہوئے ان سے تو میرا یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا۔

فلسطین اگر برطانوی انتداب میں نہ آتا تو صیہونیت کو فلسطین میں اپنا قومی وطن بنانے کے فکر و خیال کو ہرگز کوئی تقویت کہیں سے نہ مل سکتی۔ یہ تجویز محض ایک دیوانے کا خواب بن کر رہ جاتی اور اسے کبھی میسر نہ آتا۔

اصل میں سب سے بڑی قوت جس نے اس پورے منطقے کا ایک غیر مرئی مگر مہلک اور سفاکانہ محاصرہ کر رکھا ہے وہ صرف استعمار ہے، امپیریلزم ہے۔ استعمار کا یہ محاصرہ تو اس محاصرے سے بھی سینکڑوں گنا سخت اور ہولناک ہے جس نے فالوجہ میں ہماری تمام فوج کو اور ہماری تمام فوجوں کو اور دارالحکومتوں میں ہماری حکومتوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

جب یہ تمام حقائق مجھ پر واضح ہو گئے تو ایک مشترک اور متحد محاذ کی ضرورت کا احساس شدت سے میرے دل میں پیدا ہوا اور میں نے بار بار آپ سے کہا کہ جب یہ خطہ ایک ہے، اس کے حالات ایک ہیں، مسائل ایک ہیں، مستقبل ایک ہے . . . اور ہم دشمن بھی ایک ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی مختلف بھیس کیوں نہ بدلے — تو پھر ہماری جدوجہد میں یہ انتشار اور اختلاف کیوں ہے؟ —

اور ۲۳ جولائی کے انقلابات کے بعد جو تجربات ہوئے۔ ان سے میرا یہ ایمان اور بھی پختہ ہو گیا کہ متحدہ محاذ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جس کے بعد تصویر کے تمام دھندلے نقوش اور مخفی گوشے جو مجھ پر روشن ہوتے چلے گئے اور جزئیات پر جو دھندلکا چھایا ہوا تھا وہ چھٹ گیا۔

اس کے بعد ہی میں نے سیاسی رابطوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ میں اس متحدہ محاذ کو بہر قیمت وجود میں لانا چاہتا تھا خواہ اس کے وسائل کچھ بھی ہوں۔ چنانچہ میں نے خوب دوڑ دھوپ کی اور آخر اس اہم نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے راستے کی بنیادی رکاوٹ صرف "شبہات و شکوک" ہیں۔ ظاہر ہے کہ شبہات و شکوک کے یہ کانٹے بھی ہمارے قلوب میں اسی مشترک دشمن کے بوئے ہوئے ہیں تاکہ ہمارے اندر کبھی کوئی وحدت بیدار نہ ہونے پائے۔

میں جب اپنی قومی قوت کے عناصر کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے تین سرچشمے نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا سرچشمہ تو یہی ہے کہ ہم پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ملی ہوئی قوموں کا ایک مجموعہ اور گروپ ہیں جس کو ہر ممکن مادی اور روحانی رشتوں نے باندھ رکھا ہے۔ ایسی قومیں جن کی اپنی خصوصیات ہیں، اپنے مزاج ہیں اور اپنی وہ تہذیب ہے جس کی آغوش سے تین تین مقدس آسمانی دین کا ظہور ہوا۔ دنیا کو ایک پائدار گہوارہ امن و عافیت بنانے کی کوشش میں تو اسے کبھی نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔

دوسرا سرچشمہ خود ہمارا خطہ ہے اور اس کا وہ محل وقوع جو نقشۂ عالم میں آپ کو نظر آتا ہے۔ یہ مقام ایک نہایت ہی اہم فوجی مرکز (اسٹریٹیجی) ہے اور اس کو بجا طور پر دنیا کا چوراہا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تجارت کی شاہراہ اور فوجی گزرگاہ ہے۔

اب رہا تیسرا سرچشمہ تو وہ پٹرول ہے یعنی تمدن کی وہ شہ رگ جس کے بغیر اس کے تمام کل پرزوں کا وجود بیکار ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ عظیم کارخانے چل سکتے ہیں جہاں انواع و اقسام کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ نہ بری، بحری اور فضائی مواصلات باقی رہ سکتے ہیں نہ آلات جنگ ہی کسی کے کام آ سکتے ہیں۔ چاہے وہ ہوائی جہاز ہوں جو بدلیوں میں ڈوب ڈوب کر پرواز کرتے ہیں۔ چاہے آبدوز کشتیاں ہوں جو موجوں کے نیچے چھپی چھپی پھرتی ہیں — پٹرول کے بغیر ان سب کی حیثیت لوہے کے چند ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی — چند زنگ آلود ٹکڑے محروم حرکت اور بے جان . . .

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دُنیا کا نصف محفوظ (ریزرو) پٹرول صرف ممالک عربیہ کی سرزمین میں چھپا ہوا ہے اور باقی نصف امریکہ، روس اور منطقہ کریبیہ وغیرہ ممالک میں منقسم اور منتشر ہے۔

تو پھر ہم لوگ قوی ہیں۔ لیکن اس مفہوم میں نہیں کہ چیخ چیخ کر نالہ و فریاد کریں، شور مچائیں، داد رسی کی صدائیں لگاتے پھریں۔ ہماری قوت کا مفہوم یہ ہے کہ بیٹھ کر سنجیدگی سے غور و فکر کریں۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر اپنی قوت عمل کی وسعت کا اندازہ لگائیں اور قوت کا حقیقی فہم پیدا کریں جو ہم سب کے درمیان محکم رشتۂ ارتباط جس کی بدولت ہماری سرزمین ایک علاقائی وحدت ہے۔ ایسی وحدت جس کا کوئی جزو اپنے کل سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں سے کوئی جزو بھی کسی جزیرے کی طرح دوسرے اجزاء سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب مملکت سعودیہ کے تاجدار کی وفات پر میں تعزیت کے لیے حجاز گیا تو وہاں پہنچ کر اس موثر ایجابی قوت کی تخلیق اور وسعت و حدود پر میرا ایمان اور بھی محکم ہو گیا جو مسلمانانِ عالم کے باہمی رشتۂ اسلامی کی بنیاد پر رُو بہ عمل آ سکتی ہے۔

میں خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا اور میرا تصور دنیا کے ان تمام خطوں اور دُور دراز گوشوں کا طواف کر رہا تھا جہاں اسلام پہنچا ہے — پھر میں نے اپنے آپ کو بے اختیار دل ہی دل میں یہ کہتے پایا کہ حج کے متعلق ہمارے نظریہ میں اب تبدیلی ہونی چاہیے۔ سفر کعبہ کا مطلب یہ تو ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ یہ ایک مدت دراز کے بعد جنت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ ہو یا عیش و عشرت کی بھرپور زندگی گزار چکنے کے بعد خریداریٔ مغفرت کی ایک بھولی بھالی کوشش۔

جب میرا خیال انڈونیشیا کے آٹھ کروڑ، چین کے پانچ کروڑ، ملایا، سیام اور برما کے کئی کروڑ، پاکستان کے دس کروڑ، مشرق اوسط کے دس کروڑ سے کچھ زائد، پھر روس کے چار کروڑ اور ان کے علاوہ دُنیا کے دُور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی طرف جاتا ہے اور جب یہ تصور کرتا ہوں کہ یہ سارے کے سارے ایک ہی ایمان کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں تو مجھے اس زبردست قوت، صلاحیت اور امکان کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے جن کا رو بہ عمل آنا ان تمام مسلمانوں کے باہمی اتحاد و تعاون سے یقیناً ممکن ہے — ان کا یہ اتحاد و تعاون اگرچہ اپنے اپنے ملکوں کی قدرتی وفاداری کی حدود سے تجاوز نہ کرے گا لیکن اس کے باوجود وہ خود ان کے لیے اور ان کے تمام دینی بھائیوں کے لیے لامحدود قوت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

آج ایک کارنامہ ایک کردار بڑی بے چینی سے اس سُورما کی راہ دیکھ رہا ہے جو اسے انجام تک پہنچائے — اور
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

تو یہ وہی دَور، وہی کارنامہ اور وہی کردار تھا جو ابھی آپ کے سامنے پیش ہوا — یہ اسی کے خدوخال تھے جن کا تذکرہ ہوا، اور یہ اسی کردار کا اسٹیج ہے جس کی اتنی تفصیل عرض کی گئی — لیکن مکان اور ماحول کے تقاضے کو پوچھیے تو پھر ہم ہی ہیں جو اس کارنامۂ کردار کو انجام تک پہنچانے کے لیے اُٹھ سکتے ہیں، آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ڈیوک آف ونڈسر ایڈورڈ ہشتم

گمان بھی نہ تھا کہ ایک عورت سے رسمی سی ملاقات میری زندگی اور انگلستان کی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ بن جائے گی۔

اس سے میری ملاقات محض رسمی اور سرسری تھی جو چند ہی دنوں میں بین الاقوامی سیکنڈل بن گئی۔ میں اس عورت کے متعلق اسی قدر جانتا تھا کہ اُس کا نام ولیس وارفیلڈ سمپسن ہے، وہ امریکی ہے اور وہ مسٹر سمپسن کی بیوی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے جاڑوں کی بات ہے، دونوں میاں بیوی انگلینڈ کی ایک شکارگاہ میں لومڑیوں کا شکار کھیلنے آئے۔ میں بھی اپنے بھائی جارج کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ شکارگاہ کی قیام گاہ میں میری اُن سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اپنے ملک میں انھیں مہمان سمجھتے ہوئے میں نے مسز سمپسن سے رسمی سی معذرت کی کہ ہمارے ہاں کمرے گرم رکھنے کے لیے امریکہ جیسا کوئی انتظام نہیں۔

"انگلینڈ میں جو بھی امریکی عورت آتی ہے۔ اسے یہاں کے میزبانوں سے یہی گلے سننے پڑتے ہیں۔" مسز سمپسن نے متین سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "پرنس آف ویلز سے تو مجھے غیر رسمی الفاظ کی توقع تھی۔"

اس نے کہہ دیا، میں نے سُن لیا اور میں دوسرے مہمانوں کی طرف چل پڑا۔ لیکن مسز سمپسن کے الفاظ، اس کی مسکراہٹ انداز، بے ساختہ پن اور متانت جیسے ایک تاثر بن کر میرے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ انوکھی سی ایک کشش تھی جو مجھے ایک بار پھر اس امریکی عورت سے دو باتیں کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں گھوم پھر کر ایک بار پھر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا معاشرتی مقام کچھ اور تھا۔ مقام کیا تھا۔ ایک دیوار تھی جو مجھے اس عورت سے بے تکلف ہونے سے روکے کھڑی تھی اور میرے دل کی یہ بات وہ بھانپ گئی تھی۔

غنیمت ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے کھل کر متعارف ہو گئے اور آئندہ ملتے رہنے کے وعدے بھی ہو گئے۔ میں تو اُسے ہر روز ملنا چاہتا تھا، لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ ہم کبھی کبھی ملتے رہے۔ کسی ڈنر میں، پکنک میں، سرراہے بھی مگر جس بے تکلفی سے میں اُس کے قریب ہونا چاہتا تھا اُس کا موقع کم ہی پیدا ہوتا تھا۔ ہمارا ماحول کچھ ایسا رہا کہ میں دوستی کا رنگ پیدا نہ کر سکا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ لندن میں ایک خوبصورت فلیٹ میں رہتی تھی۔ اُس کے گھر کی ہر چیز اُس کے ذوق کی غماز اور اس کی جدت پسندی کا پتہ دیتی تھی۔

چند برس بے کلی میں گزر گئے۔

ایک روز مسز سمپسن میرے والد سے ملنے بکنگھم محل میں آئی۔ میں والد کی مسند کے پیچھے کھڑا تھا۔ میری والدہ بھی والد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مسز سمپسن دربار میں داخل ہوئی، مسند تک آئی، میرے والدین سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گئی۔ اُس کی چال میں ایک جاذبیت تھی جس نے میرے جذبات کو ایک بار پھر جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس کا سراپا نشہ آور، چال میں تمکنت اور انداز میں ساحرانہ وقار تھا جس سے ماحول آپ ہی آپ

بے خود ہوا جا رہا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ وہ میرے خوابوں کی شہزادی تھی۔ میں اُن کے ہاں جانے پر مجبور ہو گیا۔ اُس کا خاوند میری آؤ بھگت کرتا تھا لیکن میں تو مسز سمپسن کی ہستی میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی ہر ادا میں، ہر بات میں حتی کہ اُس کی پسند و ناپسند میں زندگی کا رچاؤ بھی تھا، ولولہ بھی تھا۔ وہ شگفتہ مزاج تھی اور خوش نما محفل کی دلدادہ۔ میں نے اُسے قریب ہو کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس کی شخصیت متعدد رنگوں کا امتزاج ہے اور ہر رنگ دلفریب۔ وہ صرف انگلینڈ اور امریکہ ہی نہیں بین الاقوامی سیاست کے نشیب و فراز اور معاشرتی حالات سے بھی کلی طور پر آگاہ تھا۔ اُس کا مطالعہ وسیع تھا۔ کسی موضوع پر بحث چل نکلے تو اُس کا استدلال دوسروں کو صرف قائل ہی نہیں کرتا تھا بلکہ رام کیا کرتا تھا۔ یہ ایسی خوبی تھی جو میں نے کم ہی لوگوں میں دیکھی ہے۔

پھر وہ وقت آیا کہ مسز سمپسن رومانوں سے لبریز ایک احساس بن کر میری زندگی میں سما گئی —— ایسا جذبہ، جو میری شاہانہ ہستی کو روحانی ہلکورے دینے لگا —— اور وہ جیسے میری وارفتگی سے بالکل ہی بیگانہ نہ ہو، گو اُس نے مجھ سے کبھی بیگانگی نہیں برتی تھی تاہم ایک فاصلہ تھا جسے وہ پھلانگنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی اور میں تھا کہ اُسے شریک حیات بنانے کے دھندلے دھندلے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ برطانوی شہزادوں کی شادیاں شہزادوں کا ذاتی مسئلہ نہیں ہوتا۔ انھیں شاہی خاندان میں سے ہی کسی لڑکی سے بیاہ کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی پارلیمنٹ کی منظوری سے۔ اس کے باوجود میرے خوابوں کا رنگ نکھرتا چلا گیا۔ حالانکہ ایک نہیں دو رکاوٹیں تھیں اور دونوں ناقابلِ تسخیر۔ ایک یہ کہ کیا میرے والدین رضامند ہو جائیں گے اور دوسری یہ کہ کیا مسز سمپسن اپنے خاوند سے طلاق لے لے گی؟

طلاق کا مسئلہ تو میں نے نظر انداز کر دیا، سب سے بڑا مسئلہ اپنے والد سے بات کرنے کا تھا۔ موزوں موقع نہ ملتا تھا۔ کچھ میں بھی ہچکچا رہا تھا۔ والد کی عمر ستر برس ہو چکی تھی اور ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ایسے علیل بڑھاپے میں مَیں اُن پر غیر متوقع سی ضرب لگانے سے کترا رہا تھا۔ بات ہی اُلجھی تھی۔ میں ڈرتا تھا۔ مبادا یہ اُن کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہو۔ میرے والدین میری شادی کے متعلق کبھی کا سوچ رہے تھے اور میں اپنی جگہ پریشان تھا۔ کیونکہ شاہی خاندان کا کوئی رشتہ مجھے منظور نہ تھا۔ اب جبکہ میں نے مسز سمپسن کو حالِ دل سنا دیا تھا اور اُس نے میری محبت کو قبول کر لیا تھا تو میں کیونکر شاہی خاندان کی کسی لڑکی کو قبول کر لیتا۔

والد سے بات نہ ہو سکی۔ موت نے موزوں موقع پیدا ہی نہ ہونے دیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء کی رات آدھی گذر گئی تھی۔ میرے والد نے نہایت سکون سے آخری ہچکی لی اور اس جہان سے اُٹھ گئے۔ ہم سب اُن کے بستر مرگ کے گرد کھڑے تھے۔ میری والدہ نے لپک کر میرا ہاتھ تھاما اور چوم لیا۔ مجھے دھچکا لگا۔ والد کی موت کا صدمہ اپنی جگہ تھا لیکن میرے سینے میں جو ارمان انگڑائیاں لے رہا تھا اُس کا اندازہ میرے سوا کوئی کر نہ سکتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں سنبھلتا میرے بھائی جارج نے میرا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ ان دونوں نے مجھے یاد دلایا کہ ”ایڈورڈ! اب تم برطانوی تخت و تاج کے شہنشاہ ہو۔“ اور مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ بادشاہ بن کر مسز سمپسن کے ساتھ شادی کرنے کے امکانات بہت ہی تاریک ہو گئے ہیں۔

میں نے چاہا کہ یہ لوگ مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں تاکہ میں اپنا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ ہی لے لوں، سوچ لوں شاید شاہانہ زنجیروں اور دل میں تڑپتی تمناؤں میں سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے مگر میں نے محسوس کیا جیسے میں تھیٹر کے سٹیج پر ایسے دل

کی ادائیگی کے لیے کھڑا کر دیا گیا ہوں جو ابھی کھیلا ہی نہیں گیا۔

میں نے تخت و تاج سنبھال لیا اور بظاہر دلجمعی سے نئے فرائض سے عہدہ برآ ہونے لگا۔ آغاز کے چھ مہینے تو سرکاری طور پر سوگ منانے میں گزر گئے۔ میں اس عرصے میں کسی تقریب یا معاشرتی محفل میں شریک نہ ہوا۔ کبھی کبھی ہفتے اتوار کو چھٹی منانے کو میں لندن سے پچیس میل دُور شاہی قلعے میں چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں دوستوں اور عزیزوں کا ہجوم ہوتا تھا اور اس ہجوم میں مسز سمپسن بھی ہوا کرتی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ میرے دل کا درد جان گئی تھی۔ وہ بھی اب میرے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور مجھے دلاسے دے کر ثابت قدم رہنے اور جذبات سے نکلنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ اُس کی پیار بھری ہمدردی میں ایک قوت تھی جو مجھے سہارا دیا کرتی تھی۔

اُسی سال، یکم اگست کو میں نے تفریح کے لیے ایک چھوٹا سا شاہی دخانی جہاز لیا اور کھلے سمندر میں جانے کا پروگرام بنایا۔ جو لوگ میرے ساتھ آ رہے تھے ان میں مسز سمپسن بھی تھی۔ لوگ اب میری اور اس کی ملاقاتوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ حتیٰ کہ امریکہ کے اخباروں نے ہماری دوستی کو موضوعِ سخن بنا لیا اور اس دوستی کو عشق و محبت کی داستان بنا کر اس کا پہلا باب مکمل کر دیا۔

ہم ۱۴ر ستمبر کو واپس آئے۔ جب میں بکنگھم محل میں داخل ہوا تو در و دیوار سے کچھ ایسی بُو اُٹھتی محسوس ہوئی جس سے میرے دل و جگر بالکل ہی آشنا نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس اجنبی کی بُو یا اس سے آشنا ہونا نہ چاہتا تھا حالانکہ یہ میری زندگی کا لازمی جزو تھا اور میں اسی میں پل کے جوان ہوا تھا۔ محلات کی فضا میں عجائب خانوں کی طرح ایک گونہ یکسانیت سی ہوتی ہے جس پر زمانے کا کوئی تغیر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس یکسانیت سے کوئی کیسے دل لگائے! تاہم میں سرکاری دھندوں میں ڈوب جانے کی کوشش میں منہمک ہو گیا۔

میری آہیں رنگ لائیں۔ مسز سمپسن نے خاوند سے طلاق کی درخواست عدالت میں دے دی۔ امریکی اخباروں نے اس درخواست کو خوب اُچھالا اور پیش گوئی کی کہ سمپسن مجھ سے شادی کرے گی۔ برطانوی اخبار اس پیش گوئی پہ کان دھرنے کو کسی طور تیار نہ تھے اور وہ ایک حد تک چپ ہی تھے۔ لیکن کب تک؟ میں نے سوچا کیوں نہ میں صفِ اوّل کے دو اخباروں کی حمایت حاصل کروں! میں نے ۱۶ر اکتوبر کو "ڈیلی ایکسپریس" کے رُوحِ رواں لارڈ بیور بروک کو محل میں بلایا اور اسے کہا کہ اور جو کچھ بھی ہو میں سہہ لوں گا لیکن مسز سمپسن کو میں سکینڈل اور رُسوائی سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ کم از کم انگلینڈ میں وہ سنسنی خیز خبروں کی سُرخی نہ بنے۔ بیور بروک نے حامی بھر لی اور "ڈیلی میل"، "ایوننگ نیوز" اور دو تین اور اخباروں سے اُس نے تعاون کا وعدہ لے لیا۔ بیور بروک صاحبِ رسوخ تھا۔ وہ بہت کام آیا۔ ان تمام ایڈیٹروں نے وعدہ کیا کہ وہ مسز سمپسن کے متعلق جو خبر چھاپیں گے۔ اس میں صرف خبر کا رنگ ہوگا، سنسنی خیزی اور سکینڈل بازی نہیں ہوگی۔

اُمید بندھ چلی تھی کہ میں نے مسز سمپسن کی آبرو کے تحفظ کے لیے جو کچھ سوچا تھا پُورا ہو جائے گا۔ لیکن ایک روز میرے وزیرِ اعظم مسٹر بالڈون نے مجھ سے ملاقات چاہی۔ ہم ملے تو اُس نے بغیر تمہید کے کہا — "میں وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اور دوست کی حیثیت سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ اور کینیڈا کے اخباروں میں جو افواہیں چھپ رہی ہیں اُن سے برطانوی شہنشاہیت کا وقار خطرے میں

پڑ گیا ہے۔ میں متفکر ہوں" — وہ دراصل کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ مسز سمپسن طلاق کی درخواست واپس لے لے تاکہ افواہوں اور سکینڈل کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔

بہت باتیں ہوئیں۔ آخر بالڈون نے کہہ ہی دیا — "کیا مسز سمپسن کا کیس عدالت میں چلنا ہی چاہیے؟ اسے رکوایا نہیں جا سکتا؟" میں نے کہا — "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دوں؟"

بالڈون کی باتوں سے مجھے یہ تلخ سا احساس بھی دلایا کہ میری اور سمپسن کی دوستی کو (جو سراسر میرا ذاتی معاملہ تھا) اخباروں نے بین الاقوامی اہمیت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔

چار روز بعد مسز سمپسن کی درخواست کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ میں بے تابی سے منتظر تھا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ طلاق کے چھ ماہ بعد تک مسز سمپسن دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ گویا اپریل ۱۹۳۷ء تک۔ میری تاجپوشی کی رسم ۱۲ مئی کو ادا ہونی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ مجھے آخری فیصلہ کرنے کو خاصا وقت مل گیا ہے۔

میں نے شاہی فرائض سے دلچسپی سے نپٹنا شروع کر دیا اور حال دل کسی پر آشکارا نہ ہونے دیا۔ ۳ نومبر کو میں نے برطانوی پارلیمنٹ کی پہلی افتتاحی تقریر کی۔ میں نے اپنے والد کی طرح اس تقریب میں پوری طرح دل لگائے رکھا لیکن حاضرین محفل کے چہروں پر دبا دبا سا اضطراب تھا جو بزبان خاموشی کہہ رہا تھا کہ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز میں جا کر میں نے اپنے اندر بے تعلقی سی محسوس کی۔ تقریب بے کیف سی لگی اور مجھے متلی آنے لگی۔ جب میں بلند کرسی پر بیٹھا تو دل بڑی زور سے اچھلا۔ جیسے تیسے دھڑکتا رہا۔ میں نے اٹک کر وہ تقریر پڑھی جو برطانیہ کے شہنشاہ اس موقع پر پڑھا کرتے تھے۔ میری اپنی آواز نے میری بے کلی کو دبا لیا اور میں سنبھل گیا۔ پھر میں بولتا چلا گیا اور میرا دل تقریب کا ساتھ دینے لگا۔ اگلے روز "دی ٹائمز" نے اس تقریب کی خبر خاصے اچھے الفاظ میں شائع کی۔

اس عرصے میں مسز سمپسن (جو اب مسز سمپسن نہیں ولیس تھی) مجھ سے ملتی رہی اور ہم کسی تنہا گوشے میں جا بیٹھنے کو بیقرار ہوتے رہے۔ مجھے اس عورت سے بے پناہ پیار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس ہو تو دوسرا کوئی نہ ہو لیکن یہ اکثر ممکن نہ ہوتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بادشاہ سے تو وہ غریب اچھے جو اپنے دل کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ہر حال میں آزاد ہوتے ہیں مگر میں بادشاہ ہو کر دل کے ہاتھوں اور شاہی آئین کی گرفت کی وجہ سے مجبور تھا، بے بس تھا۔

۱۲ نومبر میری ڈاک کے انبار میں مجھے ایک سربمہر لفافہ نظر آیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ یہ میرے پرائیویٹ سیکرٹری کا خط تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ایک آدھ روز میں وزیر اعظم بالڈون اپنی کیبنٹ کا اجلاس بلا رہا ہے جس میں اس مسئلے پر غور و خوض ہو گا کہ میری اور ولیس (مسز سمپسن) کے تعلقات سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اسے کس طرح سنبھالا جائے۔ سیکرٹری نے یہ بھی لکھا کہ برطانوی اخبارات بھی اس معاملے میں چپ نہیں رہیں گے اور موجودہ وزارت کے مستعفی ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اس نے آخر میں لکھا — "شہنشاہ معظم! مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت دیجئے کہ پیشتر اس کے کہ حالات کی کوئی غیر متوقع کروٹ خطرناک صورت حال پیدا کر دے، آپ ولیس کو مشورہ دیں کہ وہ انگلینڈ سے چلی جائے۔ پھر آپ اس کی غیر حاضری میں میری عرضداشت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔"

مجھے صدمہ بھی ہوا، غصہ بھی آیا۔ صدمہ اس لئے کہ یہ مشورہ مجھے اچانک دیا گیا تھا جبکہ میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا اور غصہ اس لیے کہ مجھے اُس عورت کو مُلک سے نکال دینے کا مشورہ دیا جا رہا تھا جس کی ذات پر میں نے امیدوں کے محل کھڑے کئے تھے اور جسے میں رفیقۂ حیات بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے وزیر اعظم بالڈون اور اس کے حواریوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کر لیا اور اپنے ایک پُرانے دوست مسٹر والٹر مانکٹن کو اپنا ذاتی مشیر اور رابطہ آفیسر مقرر کر دیا۔ سر مانکٹن کی چابکدستی بالڈون پر اثر انداز ہوئی جس سے مجھے خاصی مدد ملی۔ مسز سمپسن (جسے اب میں ولیس کہوں گا) اُن دنوں اپنی خالہ کے ساتھ ہفتہ اتوار کی چھٹی منانے میرے قلعے میں آئی ہوئی تھی۔ جی نہ چاہتا تھا کہ میں نے جو طوفان دل میں روک رکھا ہے اُسے یوں ایک دم سے ولیس پر آشکار کر دوں۔ وہ تفریح کے لیے آئی تھی لیکن میرے دل و دماغ پر بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ میں اکیلے سہار نہ سکتا تھا۔ دو روز بعد میں نے ولیس کو الگ لے جا کر اُسے اپنے سیکرٹری کا خط دکھا دیا۔

اُس نے اپنے مخصوص باوقار انداز سے خط کی تہہ کھولی۔ خط پڑھا تو اُس کے چہرے کے دل نشین خط و خال بجھ سے گئے۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا — "میں کل وزیر اعظم سے مل رہا ہوں۔ اُسے کہوں گا کہ اگر حکومت ہماری شادی کے خلاف ہے تو میں اس بادشاہی سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔"

"اس قدر خشمناک ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" ولیس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا: "کوئی اور راہ مل جائے گی۔ راہیں مل ہی جایا کرتی ہیں۔"

"نہیں!" میں نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا: "اور کوئی راہ نہیں۔ میں اس چیلنج کو اپنے اوپر ایک دن بھی اور کھلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

۱۶ر نومبر کا دن تھا۔ میں بالڈون سے ملا اور میں نے بغیر تمہید کہا کہ معلوم ہوا ہے۔ آپ اور کیبنٹ ولیس سے میری شادی کے خلاف ہیں؟

"جی ہاں!" بالڈون نے کہا: "ساری کیبنٹ اور حکومت کا ہر فرد پریشان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ بادشاہ کسی مطلقہ سے شادی کرے۔ ہمارے پیش نظر برطانوی عوام کا وقار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ کیا کچھ برداشت کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔"

"ضروری نہیں کہ تمام انسان ایک ہی اُصول کو اپنائیں۔ میں تو فرد کی حیثیت سے اپنے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ گناہ تو نہ تھا۔ انسان کی حیثیت سے مجھے اپنے حقوق اور اپنی انفرادی حیثیت کے تحفظ کا حق حاصل تھا۔ میں ایک انسان کی حیثیت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" میں نے بالڈون کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ ولیس قانونی پابندی کا عرصہ ختم ہوتے ہی مجھ سے شادی کر لے گی۔ اگر میں بادشاہ کی حیثیت سے شادی کر سکا تو بہتر ہوگا۔ اس صورت میں میں یقیناً بہتر بادشاہ ثابت ہوں گا۔ اگر حکومت کو اعتراض ہوگا تو میں یہاں سے چلے جانے کو تیار ہوں۔

بالڈون کو تو میں نے کھل کے کہہ دیا لیکن اپنی والدہ اور اپنی بہن میری سے ذکر آسان نہ تھا۔ میں نے اگلے روز کھانے کے بعد انھیں بتا ہی دیا کہ مجھے ولیس سے بے پناہ محبت ہے اور میں اُس سے شادی کر رہا ہوں ورنہ میں تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ والدہ اور میری کا ردِ عمل وہ نہ تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انھوں نے دلی ہمدردی کا اظہار کیا مگر اُن کے چہروں پر گھبراہٹ چھا گئی۔ میری

ماں تخت و تاج کی تقدیس کی قائل تھی۔ اُسے خدشہ تھا کہ میں اس تقدیس کی تذلیل کر رہا ہوں لیکن میں نے واضح کر دیا کہ میں تخت و تاج اور برطانوی شہنشاہیت کے احترام سے گریز نہیں کر رہا لیکن میں اپنی انفرادی حیثیت کا احترام بھی کرنا چاہتا ہوں۔

"آپ ولیس سے ملئے تو سہی"۔ میں نے ماں سے کہا: "میں اُسے لے آتا ہوں۔ آپ خود ہی محسوس کریں گی کہ میرے لیے یہ عورت کس قدر اہم ہے اور میں اس کی محبت میں حق بجانب ہوں۔ آپ شاید یہ بھی سوچنے لگیں گی کہ ولیس نہیں، کیا میں ولیس کے قابل ہوں؟"

لیکن ماں کے گرد بادشاہت اور تخت و تاج کی جو سنہری زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں۔ ان سے وہ ایک ثانیے کے لیے بھی آزاد نہ ہو سکی۔

میں نے اپنے تینوں بھائیوں کو بلایا اور انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ تینوں کا ردِعمل مختلف تھا۔ صرف جارج کو (جو بعد میں جارج ششم بنا) سب سے زیادہ صدمہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے ولیس سے کس قدر پیار ہے۔ اُس نے اسی قدر کہا کہ تم نے جو فیصلہ کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ ملک کے مفاد کے منافی نہ ہوگا۔

اُس روز کے بعد آخر تک، میں ماں اور بہن سے نہ ملا۔ ایک کنبے کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے تھے جس طرح ایک بیٹا اور بھائی اپنی ماں اور بہن کو چاہتا ہے لیکن یہاں مسئلے کی صورت آئینی تھی۔ اس آئین نے مجھے اپنے کنبے سے ایک حد تک الگ کر دیا۔ حکومت کے ساتھ گفت و شنید چلتی رہی۔ ولیس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں اپنے طور پر خاصے سکون میں رہا۔ میری رُوح بھی مطمئن تھی۔ کیونکہ میں نے دو ٹوک فیصلہ کر لیا تھا۔ تذبذب کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

طویل گفت و شنید کے بعد بالڈون صرف اسی قدر رضامند ہو سکا کہ میں اپنے طور پر کیبنٹ کے ممبروں سے بات چیت کروں۔ گویا بادشاہ کو اُس کے وزیر نے تھوڑی سی آزادی دے دی۔ میں نے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنگ لارڈ ناروچ کے ساتھ بات کی تو اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی رسم تاجپوشی تک چُپ رہوں۔ تاجپوشی کے ایک عرصہ بعد جب لوگ مجھ سے بادشاہ کی حیثیت سے مانوس ہو جائیں تو میں پُرامن اور موزوں فضا پیدا کر کے اپنی مرضی کی شادی کا سوال اٹھاؤں۔

میں جانتا تھا کہ مجھے پابہ زنجیر کیا جا رہا ہے۔ تاجپوشی کی تقریب معمولی سی بات نہیں ہوتی۔ اس میں مذہب کا بھی دخل ہوتا ہے اور حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ میں مذہبی اور معاشرتی آئین کا پابند رہوں گا۔ اس آئین کی ایک شق بڑی صاف ہے کہ بادشاہ اس آئین کے خلاف شادی نہیں کر سکتا۔ گویا مجھے مشورہ دیا گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں کلیسا کے نام پر جھوٹا حلف اٹھاؤں اور مذہبی آئین کی خلاف ورزی کر کے اپنی مرضی کی شادی کروں۔ مجھے یہ جرم منظور نہ تھا۔

میں نے تاجپوشی کو یکسر نظرانداز کر دیا اور اپنی مرضی کی شادی پر ڈٹا رہا۔ میرے حامی اخبار "ڈیلی میل" اور "ایوننگ نیوز" کے نگران اور پروپرائٹر ہیرمز ورتھ نے ولیس کو مشورہ دیا کہ شادی کی ایک ہی صورت ہے اگر اُسے قبول ہے تو وہ یہ کہ بادشاہ کسی غیر شاہی خاندان میں شادی کر سکتا ہے لیکن اس کی بیوی کو بادشاہ کی برابری کا رتبہ نہیں مل سکتا نہ اس کے بچے تخت و تاج کی وراثت کے حقدار ہوتے ہیں۔

ولیس نے مجھ سے بات کی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا کیا خیال ہے۔ وہ بے چین سی ہو کے بولی: "یہ تو غیر انسانی سا آئین ہے۔ مجھے قبول نہیں۔"

لیکن میں نے اپنے طور پر اس مشروط شادی پر غور کیا۔ میں نے بالڈون کو بلا کے بات کی کہ اگر شادی کی یہ مشروط صورت نکل سکے تو کیا امکانات ہیں۔ بالڈون نے کہا کہ پارلیمنٹ شاید اس کی بھی اجازت نہ دے۔ اُس نے طویل تقریر جھاڑ دی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مشروط شادی ہو بھی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے پارلیمنٹ کی مرضی کے مطابق شادی کی ہے۔ گویا اس میں بھی میں آزاد نہ تھا۔ چنانچہ میں نے یہ صورت بھی دل سے نکال دی۔

۲۷ نومبر بالڈون کی زیر صدارت کیبنٹ کا اجلاس ہوا جس میں بالڈون نے متذکرہ بالا شادی کو ناقابل قبول قرار دے دیا اور کہا کہ دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی بیوی لازماً ملکہ ہو جو اس معاملے میں ممکن نہیں۔ دوسری یہ کہ بادشاہ اگر اپنے فیصلے سے دستبردار نہیں ہوتا تو تخت سے دستبردار ہو جائے۔ چنانچہ کیبنٹ نے متفقہ طور پر بالڈون کی تائید کر دی۔

"ڈیلی ایکسپریس" اور "ایوننگ سٹینڈرڈ" کے روح رواں بیوربروک کو کیبنٹ کے اس فیصلے کا علم ہو گیا۔ وہ خلاف معمول میرے پاس بھاگا آیا۔ اُس کے لب و لہجے میں احتجاج ہی احتجاج تھا۔ بولا: "عالی جاہ! آپ نے اپنا سر قلم ہونے کے لیے پیش کر دیا ہے اور بالڈون کو کلہاڑا چلانے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ بالڈون نے برطانیہ کی دوسری مملکتوں کو بھی تار دے دیے ہیں۔ وہ اپنی حمایت میں جم غفیر جمع کر رہا ہے۔ آپ اُسے روکیں۔"

میں نے اس وقت محسوس کیا کہ بالڈون نے مجھے کیبنٹ کے اجلاس کی کارروائی دکھائی ہی نہیں تھی اور وہ برطانوی راج کی تمام مشینری کو میرے خلاف کر رہا ہے۔

اس دوران مجھے اور ولیس کو گمنام خطوط ملتے رہے جن میں ولیس کو لوگوں نے نازیبا باتیں لکھیں اور دھمکیاں بھی دیں۔ ولیس کے خلاف عوام میں نفرت سی پھیل رہی تھی۔ اُس کا اب شاپنگ اور سیر و تفریح کے لیے بھی نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ لوگ اُس کے مکان کے گرد قابل اعتراض انداز سے منڈلاتے رہتے تھے۔ یہ صورت انتہائی ناگوار تھی۔ میں نے ولیس کو قلعے میں بھیج دیا اور اُسے کہا کہ یہ طوفان بدتمیزی ختم ہو جانے تک وہیں رہے۔

لیکن طوفان تھم نہ سکا کیونکہ یکم دسمبر بریڈ فورڈ کے بشپ (اے۔ ڈبلیو۔ ایف۔ بلنٹ) نے اپنے مذہبی اجلاس میں اعلان کر دیا کہ تاجپوشی کے متعلق بادشاہ کا رویہ غیر واضح نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کلیسا میں آنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ اُس کا یہ رویہ عوام کو آج شاید بے ضرر معلوم ہو مگر یہ کل کی ایک عظیم بے راہ روی کا پیش خیمہ ہے۔

بشپ کے اس اعلان کی اطلاع مجھے بیوربروک نے ہی دی تھی۔ اُس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اخباروں کو اب بشپ کے الفاظ میں وزنی مواد مل گیا ہے اور اب میں "اپنے" وزیروں کے ساتھ بھی مفاہمت کے لیے فضا پیدا نہ کر سکوں گا۔

ہوا بھی یوں ہی کہ میری اُمیدیں جل کر خاکستر ہونے لگیں۔ میں آج اُس دور کو یاد کرتا ہوں تو حیران سا ہو جاتا ہوں کہ یہ بحران کس سرعت سے پیدا ہوا تھا اور حالات کس قدر تیزی سے پلٹا کھاتے چلے گئے تھے۔ اُدھر حالات کا تیز رو دھارا تھا۔ ادھر جذبات کا دریا

ہوا سیل تھا۔ دس ہی روز میں ایک عظیم ڈرامے کا پردہ اُٹھ گیا۔

جن اخباروں نے ولیس کو رسوائی سے بچانے کے لیے میرے ساتھ وعدے کیے تھے وہ وعدوں پر قائم رہے۔ اُنھوں نے بشپ کے بیان کو بلا تبصرہ چھاپ دیا۔ بہت سے لوگوں کو اُس وقت تک میرے خیالات اور میری جذباتی کیفیت کا پوری طرح علم نہیں تھا یا وہ کم از کم میرے نقطۂ نگاہ سے واقف نہیں تھے۔ اُسی شام بیور بروک نے مجھے فون پر کہا کہ اخباروں نے وعدہ تو نبھا دیا ہے لیکن دارالحکومت کے پرچے میرے اور حکومت کے درمیان جو بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے متعلق سنسنی خیز اور ڈرامائی انکشافات شائع کرنے کی تیاری کر چکے ہیں۔ وہ تو فلیٹ سٹریٹ کے اخبار تھے جو میری خاطر خاموش تھے۔ بھلا دارالحکومتی پرچے کیوں چپ رہتے، وہ تو حکومت کے خیر خواہ پرچے تھے اور اُن کی خبریں عوام کے لئے قابل یقین بھی تھیں۔ بیور بروک نے مجھے کہا کہ ان اخباروں کی خبروں سے عوام کو دُکھ ہوگا اور وہ بالڈون کے حق میں اور میرے خلاف بھڑک اُٹھیں گے۔ بیور بروک نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں رائے عامہ کا رُخ اپنی طرف موڑنا چاہوں تو مجھے اپنے دشمنوں کو جوابی حملے کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔

لیکن میں کسی اور رنگ میں سوچ رہا تھا۔ اس رُوح کش کشمکش میں مجھے تین باتوں کا خیال تھا۔ پہلی یہ کہ اس جھگڑے کو ذرا سا دبا سکوں دوسری یہ کہ قوم اس مسئلے پر بٹ نہ جائے اور محض میری وجہ سے شہنشاہیت کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے اور تیسری یہ کہ ولیس کو سنسنی خیزی کا نشانہ بننے سے بچا سکوں۔

بیور بروک میرے اس رویے سے خوش تو نہ ہوا لیکن اطمینان تھا کہ وہ میرا خیر خواہ تھا اور ہم میں اختلاف پیدا ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بالڈون آ گیا۔ میں اس کے چہرے مہرے اور انداز سے ہی سمجھ گیا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ میں اس کے ساتھ لمبی چوڑی بحث کے لیے قطعاً آمادہ نہ تھا۔ اُس نے بتایا کہ کیبنٹ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں ولیس کے ساتھ مشروط شادی بھی نہیں کر سکتا۔

”لیکن پارلیمنٹ سے تو مشورہ کیا ہی نہیں گیا؟“ میں نے ترش روئی سے کہا۔

”ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ بالڈون نے کہا۔ ”میں نے اپنے رفقائے کار اور مشیروں سے بات کر لی ہے۔ ہم سب اس فیصلے پر متفق ہیں کہ عوام شہنشاہ معظم کی شادی مسز سمپسن کے ساتھ کسی طور پر قبول نہ کریں گے۔“ اس نے عجیب انداز سے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور عجیب سے لہجے میں بولا: ”اگر آپ اپنی مرضی پر قائم رہیں گے تو آپ کے لیے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ تخت سے دستبردار ہو جائیں۔“ اور پھر اُس نے لہجے میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کر کے کہا: ”عالی جاہ! میری ذاتی مسرت اور کیبنٹ کی خوشی اسی میں ہے کہ آپ ہمارے بادشاہ رہیں۔“

”مسٹر بالڈون!“ میں نے خود اعتمادی سے کہا۔ ”میں بادشاہ رہوں یا نہ رہوں، میں شادی کروں گا۔ اپنی انفرادی حیثیت اور اپنی پسند پر میں تخت و تاج کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

کس قدر تکلیف دہ صورت تھی کہ میری پسند اور میری خواہشیں میرے وزیروں کی پابند تھیں۔ اس کے برعکس وزیر اعظم جو چاہے آزادی سے کر سکتا ہے۔ اقتدار کی تمام مشینری اس کے قابو میں تھی۔ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ حزب مخالف

کے ساتھ سودا بازی کر سکتا تھا، پارلیمنٹ پر ہر جائز و ناجائز طریقے سے دباؤ ڈال سکتا تھا، عوام کی رائے اور ردِّ عمل اپنے حق میں کر سکتا تھا اور اخباروں پر اثر ڈال کر پریس کی آواز اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ جن دوستوں پر مجھے بھروسہ تھا وہ بھی بالڈون کے جیبی یا قطعاً اثر سے آزاد نہ تھے —— آہ بادشاہی! بادشاہ ایک چالاک وزیر اعظم کے پیدا کردہ ماحول میں کس قدر تنہا اور بے بس تھا اور مملکت کی تمام مشینری اُس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ خواہ وہ بادشاہ کے خلاف ہی چلے۔

میں شام کو قلعے میں چلا گیا۔ ولیس وہیں تھی۔ سوچا اُسے حالات کی روش اور اس کی تفصیلات بتا ہی دوں۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں ولیس کو باہر لے آیا۔ ہم دونوں ٹہل رہے تھے۔ رات اداس تھی اور اندھیرے میں پھیلی ہوئی دھند کا نم ناک سکوت طاری تھا۔ فضا بڑی یاس انگیز تھی۔ میں چلتے چلتے رُکا اور شہر کی طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے میں اُن اخباروں کے پریسوں کا لرزہ محسوس کر رہا ہوں جو ہماری دوستی کے متعلق سنسنی خیز انکشافات چھاپ رہے تھے۔

"دن اچھا نہیں گزرا،" میں نے بوجھل سے لہجے میں ولیس سے کہا، "بالڈون نے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ کہتا ہے مجھے تم سے یا تخت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔"

ولیس نپے تُلے الفاظ میں آہستگی سے اور خود اعتمادی سے بولی اور وہ بولتی ہی چلی گئی۔ اُس کا کہنا اسی قدر تھا کہ میں اپنی بہتری کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھوں۔ خواہ ہمیں جدا ہی ہونا پڑے مگر میں تخت نہ چھوڑوں۔

مجھے دکھ ہوا کہ میری وجہ سے ولیس کی مسکراہٹیں بھی چھن گئی تھیں اور اس کی فطری شگفتگی بجھ چلی تھی۔ یہ میرا ہی قصور تھا سراسر میرا قصور۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ تمام اخبار ہماری دوستی پر فیصلہ کن حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں تو اس پر غم زدہ سا سکوت طاری ہو گیا۔

"میں انگلینڈ سے چلی ہی جاؤں؟" اُس نے سکوت توڑا۔

گو اُس کی تجویز اچھی تھی لیکن اُس کی ابتلا کا ذمہ دار میں ہی تھا۔ لہٰذا اب کوئی بھی فیصلہ، ادھر یا اُدھر، صرف میرا ہونا چاہیے تھا۔ اُس کے ساتھ ہی پریس کے حملے سے ولیس کو بچائے رکھنا بھی میری ذمہ داری تھی۔

جس طرح کسی ڈرامے میں اداکار کو معلوم ہوتا ہے کہ کس ایکٹ اور کس منظر میں اُسے تخت و تاج سے دستبردار ہونا ہے اسی طرح مجھے بھی علم ہو گیا تھا کہ میری زندگی کے ڈرامے کا وہ عظیم اور اہم ترین منظر آگیا ہے اور پردہ اُٹھنے ہی والا ہے —— آخری بار گرنے کو —— میں نے ولیس کو کہا۔ "تم میرے ملک سے چلی جاؤ۔ مجھے یہ جدائی منظور ہے لیکن میں تمہارے بغیر تخت پر نہ بیٹھوں گا۔ تم جاؤ اور تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی تم سے آملوں گا۔"

اگلی صبح اخبار آئے تو میں بنیادوں تک ہل گیا اور میں گہری سوچ میں پڑ گیا —— کیا میں بادشاہ ہوں یا بالکل عام سا انسان —— اخبار خود ہی بناتے ہیں خود ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق کو بھی مسخ کر ڈالتے ہیں۔ مجھے تلخ سا خیال آیا کہ میں یہ تمام عمر مٹی کا بنا ہوا شہزادہ رہا ہوں اور اب اس فطرت پرست انسان کا گلا گھونٹا جا رہا ہے جو تمام عمر میری ہستی میں پرورش پاتا رہا ہے۔

اخباروں کا خبروں کا رنگ سرکاری تھا اور وہ وزیر اعظم کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ یہ بالڈون کی پہلی فتح تھی

میں اُس صبح ولیس کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا لیکن رہا بھی نہ گیا۔ اُس کا چہرہ جو ہر لمحہ کھلا رہتا تھا بجھا بجھا ہوا تھا — یہ ایک ٹریجڈی تھی — کاش! دُنیا محسوس کر سکتی کہ ایک حساس عورت کو جینے کا سلیقہ آتا ہے اچانک اُسے پوچھے بغیر، اخباروں کے پہلے صفحوں کی سنسنی خیز سُرخی بنا دیا کتنا بڑا حزنیہ ہے — کسی نے محسوس نہ کیا۔

” مجھے گمان تک نہ تھا کہ یُوں بھی ہو گا“ ولیس بولی۔ اس کے لب و لہجے میں ملول سا ٹھہراؤ تھا۔ کہنے لگی ” یہ حملہ ہم دونوں پر نہیں شہنشاہِ معظم پر کیا گیا ہے۔“

ہم نے اُس روز بہت سی باتیں کیں۔ بہت کچھ کہا سُنا۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ولیس فرانس چلی جائے۔ دوسرے ہی روز وہ جانے کو تیار ہونے لگی۔ وقتِ رخصت ہم دونوں پر رقت طاری تھی جیسے کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ وہ رختِ سفر باندھ رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا۔ اداس اور یاس انگیز سی ایک دُھند تھی جو ہم دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔ ولیس نے مسکرانے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہوئے دو چار باتیں کیں۔ وہ شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ شہنشاہِ معظم کس قدر دباؤ کے زیرِ اکراہ رہا ہے اور کس قدر بے بس و مجبور ہے۔ وہ میرے متعلق بہت پریشان تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا جب اُس کی کار قلعے سے نکلی۔ میں نے آنسوؤں کو روکے رکھا مگر آنسو روکے رکھنا اسی قدر دشوار تھا جس قدر ولیس کے بغیر تخت پر بیٹھے رہنا محال تھا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا ایک آدمی اس کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا۔ کار پچھلے دروازے سے نکلی اور اس کے ساتھ میری آہ نکل گئی۔ دل میں ایک غبار تھا جس کا دُھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اچھا ہوا۔ ولیس کی خالہ آ گئی۔ اس کے سینے میں عورت کا دل تھا اور اس دل میں ولیس کے جذبات تھے مجھ سے پوچھنے لگی — ” ولیس کے متعلق اب تمھارے ارادے کیا ہیں؟“ اور میری سُنے بغیر بولی — ” لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات دراصل عورت کے فیصلوں سے جنم لیتے ہیں اور ان کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ ہوتی ہے لیکن ولیس نے جو باتیں مجھ سے کی ہیں تم سے کرتی تو تم محسوس کرتے کہ وہ تمھیں تخت و تاج سے محروم کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں۔ اس کے چلے جانے کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تمھارے لیے حالات کی تلخی کچھ تو کم ہو جائے۔“

” جُدائی نے بھلا تلخیاں کم کی ہیں کبھی؟“ میں نے رنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا۔

” تم کسی اور سے شادی کر سکتے ہو؟“ اُس نے کہا۔ ” لیکن ایک بار چھوڑ کے تم تخت کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے . . . . . .
میں تم دونوں کے لیے دُعا گو ہوں۔ خدا نہ کرے تم تخت و تاج سے محروم ہو جاؤ۔“

اُس نے مجھے ولیس کی بہت سی باتیں سُنائیں۔ اُس وقت جبکہ میرا دل بیک وقت خوف اور دُکھ کی گرفت میں تھا۔ میں صرف ولیس کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ درد میں کمی اسی سے ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے ولیس کے بچپن کے پیارے پیارے قصے سُنائے۔ پھر جوانی زندگی کے رچاؤ اور بیاہی سے محبت، اس کی آزاد روی، احساس پن اور جذبۂ دل جو کسی پہلو خام نہ تھا۔ کاش امریکہ کی ایک اجنبی عورت کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے برطانوی ذرا سا سوچ کر فیصلہ کرتے۔ ذرا تحمل کر رائے دیتے، اُن کا کیا بگڑ جاتا!

جمعہ کی صبح تھی۔ میں سر مانکٹن کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے فرش پر بے شمار اخبار بکھرے پڑے تھے۔ اُس نے

فاتحانہ انداز میں کہا: "آج کے اخبار پڑھئے۔ بیوربروک اور روتھرمیر نے جوابی حملہ کر دیا ہے" — میں نے اخبار دیکھے۔ "ڈیلی ایکسپریس" نے لکھا تھا: "کوئی حکومت شہنشاہ معظم کے راہ میں حائل نہیں ہو سکتی . . . شہنشاہ کو اپنا فیصلہ کرنے دو . . . . فیصلے بادشاہ کیا کرتے ہیں، عوام نہیں۔ اُس کے فیصلوں کے جواز بھی سنو۔"

ڈیلی میل نے پُرزور الفاظ میں کہا: "تخت سے دستبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مملکت پر اس کا اثر تباہ کن ہوگا۔"

لندن کی چند اور خبریں بھی اُمید افزا تھیں۔ کچھ لوگ تھے (جو بہت زیادہ نہیں تھے) جنھوں نے بکنگھم محل کے باہر، سینٹ جیمز پارک میں، ڈاؤننگ سٹریٹ میں وزیراعظم کے مکان کے سامنے مظاہرے کئے۔ ہجوم کی ہمدردیاں بادشاہ کے ساتھ تھیں۔

اُسی شام بالڈون نے اس مسئلے پر ہاؤس آف کامنز میں پہلی سرکاری وضاحت کی۔ اُس نے کہا کہ اس مسئلے کا کوئی درمیانی حل نہیں۔ مشروط شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بادشاہ کی بیوی مکمل شاہی حقوق کی حق دار ہوگی۔ برطانوی آئینی روایات کو توڑنے کا قائل نہیں . . . . یہ شادی نہیں ہوگی۔

اس کا مطلب یہی تھا — تخت سے میری دستبرداری یا وزارت عظمیٰ سے بالڈون کا استعفیٰ! — لیکن قرائن میرے خلاف تھے۔

اُسی رات چرچل میرے ساتھ کھانا کھانے آ گیا۔ اس نے کہا: "اگر کیبنٹ نے محض سیاسی وجوہ کی بنا پر آئین کو استعمال کیا ہے۔ کچھ بھی ہو، میں تو کہتا ہوں کہ وراثت کے اصول پر سیاست دانوں کا سایہ نہیں پڑنا چاہیے۔ چرچل نے اگلے روز اخباروں میں جو بیان دیا۔ اس میں اس مسئلے کے حل کو وقت اور صبر و تحمل پر چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ اس کا بیان مدلل اور دانشمندانہ تھا۔ ذرا فرق ملاحظہ ہو کہ جب بالڈون نے مجھ سے بادشاہت کے متعلق بات کی تھی تو مجھے بادشاہت بے کیف اور روکھی پھیکی شے محسوس ہوئی تھی اور مجھے تخت و تاج سے گھن آنے لگی تھی مگر چرچل نے مجھ سے بات کی تو مجھ پر تاج و تخت کی اہمیت روشن ہو گئی۔ چرچل کی نیت میں دیانتدارانہ جذبہ تھا۔ کوئی ہیر پھیر نہیں تھا۔ بالڈون نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ میں ونڈسر کیسل میں چلا جاؤں اور دروازے بند کر لوں۔

چرچل کے چلے جانے کے بعد میں نے رات بہت دیر تک اُن مختلف تجویزوں اور مشوروں کا تجزیہ کیا جو مجھے مختلف حلقوں اور انسانوں سے ملتے رہے تھے لیکن بات سلجھ نہ سکی۔ کوئی راہ ہی نہ تھی۔ اس ہنگامے اور تکدر سے ایک راکٹ ابھرا جو بہت بڑا تو نہ تھا لیکن تادیر آسمان میں معلق رہا۔ وہ تھا "بادشاہ کی جماعت"۔ یہ نہ جانے کس کی اختراع تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس جماعت کا اصل کیا ہے، کس نے بنائی ہے اور اس کی شکل و شباہت کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ نام اُن بکھرے بکھرے لوگوں کی جمعیت کو دیا گیا تھا جو دن بھر کاروں پر بڑی بڑی تختیاں لگائے سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے تختیوں پر لکھ رکھا تھا — "خدا شہنشاہ کو سلامت رکھے — بالڈون سے" . . . "شہنشاہ کا ساتھ دو" اور انہی الفاظ کے اشتہار دیواروں پر بھی دیکھے گئے تھے۔ اگر "بادشاہ کی جماعت" کے نام کی کوئی پارٹی تھی بھی تو اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔

اگر میں ایسی جماعت کو منظم کر لیتا تو عوام کی اکثریت کو اپنے حق میں کر سکتا تھا اور اگر میں عوام سے اپیل کرتا تو مجھے یقین تھا کہ لوگ میری اپیل پر لبیک کہتے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ بالڈون کو چیلنج نہ کروں گا اور لوگوں کو روایات کے خلاف نہ ہونے دوں گا ورنہ یہ ایک قسم کی خانہ جنگی ہوگی۔ ایسی خانہ جنگی جو توپوں سے نہیں الفاظ سے لڑی جاتی۔ مجھے شدید احساس تھا کہ برطانوی تخت و تاج قومی سالمیت اور اتحاد کی

علامت ہے۔ میں عوام میں نفاق پیدا کرنے کے حق میں نہ تھا۔ مجھے اس علامت کی تقدیس کی توہین منظور نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے جذبات کو الگ رکھ کر فیصلہ کر لیا کہ ملک میں آئینی بحران پیدا نہ ہونے دوں گا۔ اس فیصلے کی عملی صورت یہی تھی کہ میں اپنے بھائی کے حق میں تخت و تاج سے دستبردار ہو جاؤں — میں نے نہایت سکون اور ٹھنڈے دل سے آخری فیصلہ کر لیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے محبت اور بادشاہی کے تصادم میں یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ محبت کی فتح ہے۔ یہ بڑی حد تک درست ہے لیکن دستبرداری کے فیصلے کے پس منظر میں ایک فرض تھا۔ محبت اپنی جگہ تھی۔ جس نے مجھے پابجولاں کئے رکھا لیکن میرے نزدیک محبت سے زیادہ فرض اہم اور مقدس تھا۔ فرض یہ تھا کہ میں برطانوی تاج کے وقار کو مجروح نہ ہونے دوں۔ مجھے سر پر تاج رکھنے کی خواہش نہیں تھی جتنا میرے دل میں اس کا احترام تھا۔ یہ تھا وہ فرض جس نے مجھے تخت سے دستبرداری پر زیادہ مجبور کیا۔

میں نے اپنے فیصلے سے ہر کسی کو آگاہ کر دیا۔ اب دستبرداری کی صرف دفتری اور رسمی سی آئینی کارروائیوں کا سلسلہ جو اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ اس دوران صورت حال نے ایک اور کروٹ بدلی جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہی لیکن میرے لیے اذیت ناک تھی کیونکہ میری شادی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ کروٹ میرے دوست بیوربروک نے پیدا کی تھی جس کے پس منظر میں اس کا خلوص ہی تھا۔ اس نے خود اعتمادی سے سوچ سمجھ کر ایک شوشہ چھوڑا کہ میں شادی کا ارادہ ملتوی کر کے ابھی تخت پر بیٹھا رہوں لیکن میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی پر آمادہ نہ ہوا۔ بیوربروک نے مجھے بتائے بغیر ولیس سے جا ملا اور اُسے قائل کر لیا کہ وہ شادی نہ کرنے کا اعلان کر دے تاکہ بالڈون نے جو بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے وہ اُس کے اپنے ہی دامن میں دم توڑ جائے اور عوام کا ردعمل سرد پڑ جائے۔ اس طرح یہ التوا اور حالات کی تبدیلی ہمارے عوام کے لیے سُود مند ثابت ہو گی۔ ولیس محض میری بہبود کی خاطر رضامند ہو گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ التوا محض بے سُود ہو گا۔ جو صورت آج پیدا ہوئی ہے وہ کل بھی ہو گی۔

بیوربروک کے استدلال سے قائل ہو کر ولیس نے ایک بیان لکھ ڈالا۔ اُس کے بیان کا لب لباب یہ تھا: ”مسز سمپسن نے ہر اُس عمل اور اقدام سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو شہنشاہِ معظم اور اُس کے تخت و تاج کے وقار کے منافی ہو سکتا ہے۔ . . . مسز سمپسن نے کہا ہے کہ اگر میری کنارہ کشی سے ناخوشگواری ختم ہو سکتی ہے تو میں اس پر کلی طور پر کاربند رہوں گی۔“

ولیس نے یہ بیان پریس میں دینے سے پہلے مجھے ٹیلیفون پر پڑھ کر سنایا تو میں نے بھی جانے کیوں ہاں کر دی۔ اُس کے انداز اور عزم میں جو وقار اور خود اعتمادی تھی میں اس کے زیر اثر قائل ہو گیا۔ ولیس کا تو مجھ پر جادو کا اثر تھا۔ لیکن میں محسوس نہ کر سکا کہ وہ میری محبت سے بھی کنارہ کش ہونے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ یہ اُس کا ایثار تھا۔

ولیس کا وکیل بالڈون کے ساتھ بات کرنے کے لیے آ گیا۔ وہ بالڈون کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا کہ ولیس نے مجھے فون پر کہا کہ شادی کے انکار کے بعد کی تمام کارروائیاں وہ خود کرے گی اور یہ بھی کہ وہ فرانس سے جا رہی ہے۔ اُس نے یہ نہ بتایا کہ کہاں جا رہی ہے۔ مجھے صدمہ ہوا۔ چنگاریاں جو سینے میں دبا رکھی تھیں بھڑک اُٹھیں۔ میں نے اُسے فیصلۃً کہہ دیا — ”اب ممکن نہیں۔ تخت سے دستبرداری کے کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ کیبنٹ ابھی ابھی ان پر مہر ثبت کر رہی ہے۔ اب تم فرانس سے نکل کر دنیا کے کسی کونے میں چلی جاؤ۔ میں تم سے آملوں گا۔“ ولیس نے مجھے باز رکھنے کی تمام کوششیں کر ڈالیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر میں اس سے دیوانہ وار محبت نہ کرتا تو شاید وہ مجھے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتی۔

میں ناشتے کی میز پر تھا جب دستبرداری کے کاغذات میرے دفتر کی میز پر پہنچ گئے۔ دس بجے میرے تینوں بھائی آ گئے۔ یوں لگا جیسے ہم چاروں بھائی فضا میں پھیلی ہوئی اُس دُھند کو صاف کرنے کو جمع ہوئے ہیں جس نے ہر سُو تعفن اور گھٹن پھیلا رکھی تھی — ہم کس لیے سے اکٹھے ہوئے تھے۔

میں بھائیوں کو پاس بٹھا کر کاغذوں پر دستخط کرنے لگا۔ آخری کاغذ پر دستخط کر کے میں کرسی سے اُٹھا اور کرسی بھائیوں کے سپرد کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ میں کھل کر مسکرایا تھا مگر میرے بھائی ملول تھے۔ انھوں نے گواہ کی حیثیت سے دستخط کئے۔ عجیب جذباتی سی فضا تھی۔ مجھے دکھ بھی تھا، مسرت بھی۔ بارے یوں لگا جیسے ساگر کی اتھاہ گہرائی سے اُبھر آیا ہوں۔ میں چپ چاپ کمرے سے نکل آیا۔ باہر آ کے مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ باہر کی ہوا کس قدر تر و تازہ اور روح افزا ہے۔

بالڈون کاغذات اٹھائے فتح مندی سے ہاؤس آف کامنز میں جا پہنچا۔ میں نے بالڈون کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں جانے سے پہلے ریڈیو پر برطانیہ کے لوگوں سے خطاب کروں گا۔ حکومت کے بعض افراد نے میرے اس خیال کو ذرہ بھر اہمیت نہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ جس ڈرامے کا مرکزی کردار میں ہی تھا بھلا میں اس کا راوی کیونکر ہو سکتا تھا۔ ڈرامے پر تو پردہ گر چکا تھا۔ میری والدہ نے بھی مجھے نشری تقریر سے روکا تھا لیکن میں تقریر کرنے پر اس لیے آمادہ تھا کہ میں ایک بھگوڑے یا مفرور کی طرح ملک سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔

لوگوں کو اب بھی یقین ہے کہ میری تقریر چرچل نے لکھی تھی لیکن یہ بات غلط ہے۔ تقریر میں نے ہی لکھی تھی اور چرچل کو دکھائی تھی۔ میں نے اسے لنچ پر مدعو کیا تھا اور تقریر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے اس میں قطع و برید کی تھی اور چند اور باتیں لکھنے کو بتائی تھیں۔

جب چرچل مجھ سے رخصت ہونے لگا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرا بزرگ دوست تھا۔ اُسے میرے چلے جانے کا دلی صدمہ تھا۔ وہ منظر مجھے ابھی تک یاد ہے جب چرچل اُٹھا اُس کے ایک ہاتھ میں ہیٹ دوسرے میں چھڑی تھی۔ وہ چپکے سے قدم اٹھاتا دروازے تک گیا، رکا، گھوم کے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے اینڈریو مارویل کے اُس وقت کا ایک شعر سنایا جو اُس نے کنگ چارلس اوّل کے قتل کے وقت کہا تھا۔ کنگ چارلس کو تختہ دار پر کھڑا دیکھ کر شاعر نے کہا تھا — "اس نے تختہ دار پر بھی کوئی عامیانہ بات یا گھٹیا حرکت نہ کی" — چرچل نے جذباتی لہجے میں یہ شعر مجھے سنایا اور وہ چلا گیا۔

میں نے تقریر سرکاری حلقوں کو دکھانے کے لئے بھیج دی۔ تقریر واپس آ گئی۔ بالڈون نے مجھے اکھڑے سے لہجے میں کہا بلکہ التجا کی کہ میں تقریر میں اُس کے متعلق دو چار تعریفی جملے شامل کروں اور یہ بھی کہوں کہ وزیر اعظم نے میری کبھی مخالفت نہیں کی اور وہ ہمیشہ میرا حامی رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ شخص اول تا آخر میری جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف رہا اور مجھے تخت سے ہٹانے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا اور جی بھر کے میری راہیں کانٹے بکھیرے۔ وہ شخص اب مجھ سے تعریفی جملے لکھوانا چاہتا ہے۔ بارے خیال آیا کہ انکار کر دوں لیکن معاً خیال آیا کہ بے تاج ہی سہی میں بادشاہ تو ہوں۔ ایک آدمی نے بادشاہ سے التجا کی ہے۔ بادشاہ پر لازم ہے کہ فیاضی کا ثبوت دے۔ چنانچہ میں نے مسکرا کر کہا — "یہ خیال اچھا ہے، میں ایسے ضرور لکھوں گا۔"

میری نشری تقریر یہ تھی :

"آخر مجھے آزادی مل ہی گئی ہے کہ اپنے دل کی چند باتیں کھل کر اپنے لوگوں سے کہہ سکوں۔ میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ دل کی دل میں رہنے دوں لیکن آئین کے دستورِ زبان بندی نے کچھ کہنے نہ دیا۔

چند گھنٹے گزرے، میں شہنشاہی کے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہوں اور اب میرے بھائی، ڈیوک آف یارک نے میری جگہ سنبھال لی ہے۔ میں تہہ دل اور خلوصِ نیت سے اس کی فرماں برداری کا اعلان کرتا ہوں۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ میں تخت و تاج سے کیوں دستبردار ہو رہا ہوں لیکن میں بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے میں تخت اور ملک کے وقار اور احترام سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جس عورت کی محبت کی خاطر میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اس کی رفاقت اور روحانی سہارے کے بغیر میں بادشاہی کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ فیصلہ سراسر میرا اپنا ہے کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ ولیس نے مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن میں نے تن تنہا، بغیر کسی دوسرے دماغ کی مدد سے، زندگی کا عظیم ترین فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی نہایت خوش اسلوبی سے میری جگہ سنبھال سکے گا — وہ شاہی فرائض کے نبٹنے کی کلی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے خوش نصیب ہے — اور اسی لحاظ سے میں بدنصیب تھا — کہ اس کی بیوی بھی ہے، بچے بھی اور اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔

ابتلا کے اس دور میں میری ماں، بہن اور میرا تمام کنبہ میرے احوال و کوائف اور جذبات میں شریک رہا ہے۔ ان کا سہارا اور دعائیں مجھے سہارا دیتی رہی ہیں۔

تخت و تاج کے وزرا، خصوصاً وزیرِ اعظم بالڈون نے میرے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان کبھی آئینی تعلق، بحران یا اختلاف پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی پارلیمنٹ کے ساتھ میرا کبھی اختلاف چل رہا ہے۔ میری تربیت ان آئینی روایات میں ہوئی ہے جو باپ نے مجھے ورثے میں دی تھیں۔ انہی کا احترام تھا کہ بحرانی کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔

میں آپ سب کا شکرگزار ہوں کہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے، پھر بادشاہ کے بارے میں ہر کسی نے مجھ سے مشفقانہ سلوک کیا۔ میں نے اب امورِ عامہ کا بوجھ اتار دیا ہے۔ میں شاید کبھی اپنے وطن واپس بھی آؤں لیکن میں جہاں بھی ہوں گا برطانوی نسل اور راج کے نیک و بد میں شریک رہوں گا۔ جب بھی میرے ملک اور میرے شہنشاہ معظم کو میری خدمات کی ضرورت پڑی میں کوتاہی نہ کروں گا۔

اب ہم سب کا نیا بادشاہ ہے۔ میں بادشاہ اور آپ سب کی مسرت و شادمانی کے لیے تہہ دل سے دست بدعا ہوں۔ خدا آپ سب پر کرم کرے۔

خُدا بادشاہ کو سلامت رکھے ۔"

نشری تقریر کے بعد جب میں اپنے گھر واپس آیا تو خاندان کے تمام افراد موجود تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہوا کہ ہم میں جو بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میری تقریر نے ختم کر ڈالی تھی۔ فضا میں روح افزا سا پیار تھا۔ گو یہ پیار اداس اداس تھا لیکن کوئی تکدر نہیں تھا۔

میں نصف شب تک بھائیوں کے ساتھ رہا۔ سر مانکٹن بھی آ گیا۔ ہم سب نے مل کے تھوڑی سی پی اور ہم پورٹسمتھ کی بندرگاہ کو روانہ ہو گئے۔ ایک بحری جہاز (فیوری) مجھے فرانس کے ساحل تک پہنچانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میرے بھائی جہاز کے دروازے تک میرے ساتھ آئے۔ میں جب کبھی کہیں باہر جایا کرتا تھا وہ اسی طرح میرے ساتھ الوداع کہنے ہنستے کھیلتے آیا کرتے تھے لیکن اس روز فضا کچھ اور تھی۔ میں اپنے بھائی جارج — جارج ششم — کے سامنے تعظیماً جھکا۔ مجھے جھکنا ہی چاہیے تھا کیونکہ وہ میرا بادشاہ بھی تھا اور میں اس کی رعایا۔ لیکن جارج کا ردِ عمل بڑا ہی جذباتی تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور دھاڑیں مار کر رو پڑا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی اور ہچکیوں کی زبان میں بولا — "نہیں . . . یوں نہیں . . . یہ ناممکن ہے . . . ایسے نہیں ہو سکتا"

لیکن سب کچھ ہو چکا تھا۔ میں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

صبح کے دو بج رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے دسمبر کی بارہ تاریخ تھی۔ بحری جہاز مجھے آغوش میں اُٹھائے بڑے ہی سکون اور بڑی ہی خاموشی سے بندرگاہ سے نکلا۔ ایک بادشاہ اپنے آپ کو جلاوطن کر کے جا رہا تھا۔ انگلینڈ کا ساحل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ نیچے سمندر کی لہریں تھیں، میرے سینے میں جذبات کی موجیں تھیں۔ جذبات اور احساسات کا ایک ریلا تھا کہ میں ہچکولے کھانے لگا۔ اگر تخت و تاج چھوڑنا مشکل تھا تو وطن چھوڑنا محال نظر آ رہا تھا۔ میرے وطن کی ہر شے، وطن کی بحری کا ہر چراغ نہایت آہستہ، ہوتے ہوتے سحر کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا جا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا — میں دیکھتا ہی رہا۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔ مجھے اپنے وطن کے اندھیرے سے بھی پیار تھا۔

لیکن میں مسرور ہوں کہ محبت نے سیاست پر فتح پا لی۔

شیخ محمد عبداللہ

میں ۵ دسمبر ۱۹۰۵ء میں بمقام سرینگر (کشمیر) پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے پندرہ روز قبل میرے والد محترم شیخ محمد ابراہیم کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد مرحوم مغفور جو اثاثہ چھوڑ کر فوت ہوئے والدہ محترمہ نے اس سے میری پرورش فرمائی اور ان کے پاس جس قدر دنیوی دولت تھی سب میری تعلیم و تربیت پر نثار کر دی۔ ایسی شفیق، ایسی عقلمند اور ایسی [illegible] مائیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگر میں آج اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی کی ڈگری استعمال کر سکتا ہوں تو یہ انہی کی مشفقانہ اور مادرانہ ہمدردی اور ایثار کا نتیجہ ہے۔

میرے والد محترم پشمینہ کے تاجر تھے۔ تجارت ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ ان کے فوت ہونے کے بعد بھی ان کا کاروبار میرے قریبی رشتہ داروں کی زیر نگرانی چلتا رہا۔ اور والدہ محترمہ نے بھی پردہ میں بیٹھ کر کاروبار کا خاص خیال رکھا۔ مجھ سے ایک بڑا بھائی ہے شیخ مقبول جو سرامر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سرینگر میں ڈرائنگ ماسٹر ہے۔

مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ میں نے اپنا وقت کبھی فضول باتوں میں ضائع نہیں کیا۔ خداوند تعالیٰ نے شروع ہی سے مجھ کو خودداری کا مادہ ودیعت کیا تھا اور مجھے اس کے برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

والدہ محترمہ کا انتقال ابھی میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات سے دنیا سے ایک ایسی ہستی اٹھ گئی جن کے احسانات کے بارے میرے بدن کا رواں رواں دبا ہوا ہے۔ کاش وہ اور زندہ رہتیں اور دیکھتیں کہ ان کا وہ خوددار بچہ جس نے اپنی شان خودداری برقرار رکھنے کے لیے کئی بار مصائب و آلام کا مقابلہ کیا کس طرح اپنے ہم وطنوں کی آن اور شان پر قربان ہونے کے لیے جان بکف میدان میں نکل آیا ہے۔ شفیق مائیں داغ مفارقت دے جاتی ہیں۔ لیکن ان کی محبت اور ان کی شفقت کبھی فراموش نہیں ہوتی۔

کشمیریوں کی مظلومیت پر افسوس دسویں جماعت پاس کرنے اور والدہ محترمہ کے انتقال فرمانے کے بعد میں نے بڑی بڑی مالی مشکلات برداشت کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی اور سرینگر میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخل ہو گیا۔ مجھے بچپن ہی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی مظلومیت پر افسوس ہوتا تھا۔ میرا دل خون ہو جاتا تھا اور اکثر میری معصوم آنکھیں فرط ہمدردی سے پرنم ہو جاتی تھیں۔

بچپن کا واقعہ بچپن کا واقعہ ہے اور اس وقت میری عمر ۱۴ یا ۱۵ سال ہوگی۔ میں حسب معمول گھر سے سیر کرنے نکلا۔ میں باہر یعنی شہر کے باہر جوگی خانہ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میری آنکھوں نے دل کو تڑپا دینے والا ایک منظر دیکھا۔ میں سیر و سیاحت سے آنے

والے غریب کشمیری بھائیوں کو لکڑیاں اٹھائے یا کوئی اور شے لادے شہر آتے دیکھا تھا۔ ان بے گناہ اور مظلوم انسانوں سے حکومت کشمیر میں جو اہلکار ہیں بے رحمی اور سنگدلی کا سلوک کرتے تھے اور جس طرح وہ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سے مجھے ہمیشہ رنج پہنچتا تھا۔ میں بچہ تھا میرے معصوم دل میں بارہا جوش پیدا ہوا کہ میں بے گناہ اور غریب دیہاتی بھائیوں پر ظلم کرنے والے حکام کا ہاتھ پکڑ لوں لیکن ایک معصوم اور کمسن ایک صاحب طاقت حاکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتا تھا۔ اس روز بھی میری آنکھوں نے ایک دلخراش نظارہ دیکھا۔ یہ نظارہ اتنا دردناک اور رُلا دینے والا تھا کہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اپنے دل کی آگ کے شعلوں میں ظالم کو لپیٹ ہی لیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا دیہاتی بوسیدہ چیتھڑے پہنے سر پہ لکڑیوں کا بار اٹھائے چونگی خانے آیا۔ محالدار نے جو شائیلاک سے زیادہ دنیوی دولت کا حریص اور انسانی خون کا پیاسا تھا۔ اس بوڑھے سے محصول لینے کے بعد بھی چند لکڑیاں زبردستی چھین لیں اور زائد رقم بھی لی۔ اس سے بھی اس کا پیٹ نہ بھرا۔ اور اس کی آنکھیں غریب کے بار کی ایک موٹی سی لکڑی پہ پڑیں اور اس بوڑھے اور بے کس دیہاتی سے اس کا مطالبہ کیا۔ لکڑ ہارے نے ڈرتے کانپتے جواب دیا مہاراج یہی لکڑیاں ہیں جن کو فروخت کر کے میں اپنا، اپنے بال بچوں اور بیوی کا پیٹ پالوں گا۔ اگر آپ نے دوسری لکڑیوں کی طرح یہ بڑی لکڑی بھی لے لی تو میں بازار میں کیا فروخت کروں گا؟ پنڈت جی نے اس بے کس اور غریب انسان کی نالہ و زاری پر ذرا رحم نہ کھایا اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے ساتھ لکڑی اٹھا کر لاتے مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ یہ ظالم اس غریب کو بے وجہ اور ناحق مار رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگا میں لپک کر آگے بڑھا اور اس سے گویا ہوا:۔

”مہاراج! آپ اس غریب کو کیوں بے وجہ پیٹتے ہیں، وہ بال بچوں والا ہے۔ غریب ہے۔ اگر آپ نے لکڑیاں چھین لیں تو وہ کیسے بال بچوں کا پیٹ پال سکے گا؟“

پنڈت جی کے سر پہ حکومت کا جن سوار تھا۔ انہوں نے میرے دخل در معقولات کا بُرا مانا اور بات کا جواب یوں دیا کہ غریب دیہاتی کو زیادہ سختی سے پیٹنے لگے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جھٹ آستینیں چڑھا لیں۔ اس نے مجھے مُکا مارا میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے اس کی خبر لینے لگا۔ ہمارا شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔

تھانے پہنچ کر مجھ سے پوچھا گیا کہ تم نے پنڈت جی پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟ میں نے پولیس والوں کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ میرا دل ظالم محالدار کا ناروا جور و استبداد دیکھ کر تڑپ گیا اور میں خاموش نہ رہ سکا۔ اگر اس نے پھر کسی غریب پر یوں ظلم کیا تو میں پھر اس کی خبر لوں گا۔ پولیس نے کچھ دیر بٹھا کر مجھے رہا کر دیا۔ میں اس واقعہ کے بعد بھی وہاں جاتا رہا۔ ہر روز چونگی کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اب محالدار کو کچھ سمجھ آ گئی تھی اور وہ کم از کم میرے سامنے غریب دیہاتیوں پر ظلم برپا نہیں کرتا تھا۔

لاہور کی آزاد فضا کا اثر جب میں نے لاہور کی آزاد فضا میں ہوا کھائی اور میں نے پنجابی بھائیوں کی زندگی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی حالت کا موازنہ کیا تو مجھے شرم کے مارے سر جھکانا پڑا۔ میں نادم تھا کہ کیا ہم کشمیری بھی مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں؟ کیا دنیا کے تختے پر ہم سے زیادہ کوئی غلام ہے؟

موسم سرما میں میرے بہت سے غریب ہم وطن لاہور آتے اور وہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے۔ جب میں ان کو مٹی ڈھوتے اور بھاری شہتیریاں یا وزنی بوریاں اٹھاتے دیکھتا تو دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی۔ میرا دل ان غریب الوطنوں کی بے کسی، مفلسی اور مظلومیت پر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا اور ہر لحظہ دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ اے غریبوں اور بے کسوں کے والی خدا! تو وہ دن لا کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کو خوشی امن اور چین کی زندگی بسر کرتے دیکھوں۔ ان پر کوئی جابر ہاتھ ظلم برپا کرنے نہ اٹھے اور وہ یوں بے کسی اور مظلومی کی حالت میں کشمیر کے بہشت زار کو چھوڑ کر پنجاب کے تابستان میں جھلسنے نہ آئیں۔

میں کشمیری تھا اور میرے ہم وطن بھائی پنجاب میں گدھوں سے زیادہ محنت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ ان کی وجہ سے میرے ہم جماعت دوست مجھ پر آوازے کستے، مجھ پر طعن زنی کرتے اور مجھے جنس کے طور پر ہتو کہہ کر پکارتے میں بے اختیار تھا، اپنے ہم وطنوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو بہانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے پنجابی دوستوں کا مذاق مجھ پر بجلیاں گراتا تھا مجھے اپنے وطن عزیز سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ میں مظلوم تھا اور مظلوم قوم کا فرد تھا۔ ایک مظلوم کے لیے اس کا وطن ہی بہترین جائے پناہ ہے۔

علی گڑھ میں تعلیم

میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی ایس سی جماعت پاس کر کے علی گڑھ چلا گیا، اور وہاں علی گڑھ کالج کی ایم ایس سی جماعت میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی میری ایسی ہی حالت تھی۔ میرے لیے کشمیری ہونا ایک عیب تھا۔ جو نہ لاہور میں معاف کیا گیا اور نہ علی گڑھ میں۔ وطن اور وطن سے باہر اپنے عزیز وطن اور اہل وطن کی یہ ذلت و رسوائی دیکھ کر میرا دل پاش پاش ہو گیا اور میں نے بے زبان کشمیریوں کے استخلاص کے لیے دعا کی اور سچے دل سے یہ حلف اٹھایا کہ میں یا تو اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کو ان مصائب سے نجات دلاؤں گا یا خود بھی صیاد کے ظلم و ستم کا شکار ہو جاؤں گا۔

میری ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ اپنے وطن عزیز کو تمام دنیا میں سر بلند دیکھوں۔ میں فرقہ پرستی کو قوم و ملک کے لیے لعنت سمجھتا ہوں اور میں کبھی بھی فرقہ پرستی کا جرم معاف نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا نہ پہلے کبھی کیا ہے کہ ایک قوم یا ایک جماعت دوسری قوم یا جماعت پر ظلم کرے، اس سے ناانصافی برتے اور اس کے حقوق پامال کرے۔ میں قومیتِ متحدہ کا حامی ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف کا طلب گار بھی ہوں۔ میرا مسلک انصاف ہے، اور میں ہمیشہ سے حق کی حمایت پر کاربند ہوں۔

سر ایلبین بیزجی کا بیان

میں ابھی علی گڑھ میں تھا کہ اخبارات میں کشمیر کے سابق وزیر سر ایلبین بیزجی کا بیان چھپا۔ اس بیان کی اشاعت کے بعد مسلسل مضامین چھپنے شروع ہو گئے اور کشمیر کا معاملہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے کی بنا بن گیا۔ ہندو اخبارات نے سر بیزجی کے سراپا صداقت بیان کو جھٹلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مسلم اخبار نے بھی جی کھول کر کشمیریوں کی حالت واشگاف بیان کی۔ یہ مخالف و موافق مضامین میری دلچسپی کی آماج گاہ بن گئے۔ ان کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر حکومت کشمیر مدعیان انصاف کے سامنے مسلمانوں کے اصلی حالات پہنچ جائیں تو شاید اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکے۔

سیاسی میدان میں

میں علی گڑھ کالج سے ایم ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد سری نگر چلا آیا۔ اس وقت خوش قسمتی سے مجھے دس بارہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان ملے جو تازہ تازہ سرینگر وارد ہوئے تھے۔ مقامی ہندو

حکومت نے دیکھا کہ مسلمان سخت ترین مشکلات کے باوجود تعلیم میں ترقی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اب ہماری خیر اسی میں ہے کہ اسی طرح ان تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مزید قیود عاید کر کے انھیں حکومت میں کسی قسم کا بھی حصہ نہ لینے دیا جائے اس نے اسی مقصد کے لیے کرسول سروس ریکروٹنگ بورڈ کا ڈھونگ رچایا۔ نوجوان مسلمانوں نے میری سرکردگی میں اس بورڈ کی مخالفت میں ایک موثر یادداشت کابینہ وزارت میں پیش کی۔ ایک وفد بھی کابینہ وزارت سے ملا جس میں میرے محترم دوست عبدالعزیز بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی شامل تھے۔ وفد نے ریکروٹنگ بورڈ کے نقائص بتفصیل واضح کیے۔ لیکن وفد کو قابل وزرا نے جو جواب دیا وہ حد درجہ حوصلہ شکن تھا۔ بس پھر تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خصوصاً اور عام مسلمانوں میں عموماً بے چینی پیدا ہو گئی اور مسلمان حکومت کی جانب دارانہ حکمت عملی پر خفیہ یا علانیہ حملے کرنے لگے اور مسلم نوجوانوں نے اپنے مقصد کی اشاعت کے لیے پنجاب کے اسلامی اخبارات سے استمداد کی۔

حکومت کا تشدد

جب حکومت نے دیکھا کہ ہماری تمام سازش طشت از بام اور دنیا پر مظلوم کشمیریوں کی حقیقی حالت روشن ہوتی جاتی ہے تو اس نے اخبارات کا داخلہ بند کرنے کا حربہ استعمال کیا۔ ”سیاست“ کا داخلہ پہلے ہی حدود ریاست میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اب ”انقلاب“ اور ”مسلم آؤٹ لک“ پر عتاب کی بجلیاں گرانے کے مشورے ہونے لگے اور جلدی ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اخبارات کی بندش سے حکومت نے مسلمانوں کو مفلوج کر دیا۔ اخبارات کا داخلہ بند کرنے کے ساتھ جب حکومت نے غیر سیاسی ہمدردان کشمیر کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا تو مسلمان بے قرار ہو گئے ہم نوجوانوں نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور حکومت کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہماری ہر کوشش بے سود اور ہر آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

سرکاری ملازمت

ادھر یہ سلسلہ جاری تھا کہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول سرینگر میں ملازم ہو گیا۔ میں ایم ایس سی تھا لیکن حکومت نے مجھے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ اور ۲۲ روپے الاؤنس کی ملازمت دی۔ حالانکہ مجھ سے کم تعلیم یافتہ یا بلفاظ صحیح تر کم تعلیم یافتہ ہندو بڑے بڑے عہدوں بلکہ وزارتوں پر قابض تھے۔ حکومت کی یہ روش بتا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو انتظام ملک میں شریک کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ ناممکن بات ہے جب تمام ہندوستانی شریک حکومت ہونے کے باوجود انگریزوں سے مطالبہ حقوق پر اڑے ہوئے ہیں کشمیری اپنی غلامی پر کیسے قانع رہ سکتے ہیں۔ بیرونی تحریک آزادی کا کشمیر کے باشندوں پر اثر انداز ہونا یقینی امر ہے حکومت لاکھ کوشش کرے اُسے مسلمانوں کو ــــ ان مسلمانوں کو جو کشمیر کی آبادی میں ۹۵ فی صد ہیں اپنا ساتھی بنانا پڑے گا۔

جموں کے واقعات

میرے تقرر کے بعد جموں میں خطبہ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کا واقعہ رونما ہوا۔ اور ادھمپور میں نماز عید کی ممانعت کی گئی اس بیہودہ پے درپے دل آزاری سے تمام خطہ کشمیر برافروختہ ہو گیا۔ جب جموں میں خطبہ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کے واقعات کی خبر سرینگر میں پہنچی تو مسلمانوں کے رنج کی انتہا نہ رہی وہ اپنے دین پاک کی یہ کھلی ہوئی توہین دیکھ کر تلملا اٹھے ان افسوس ناک واقعات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے جامع مسجد میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا گیا۔ جلسہ میں چند ریزولیوشن منظور کیے گئے اور مہاراجہ بہادر سے التجا کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والے اہل کاروں کو قرار واقعی سزا دے کر عوام کے مجروح دلوں پر تسکین کا پھاہا رکھیں۔

حکومت کا عتاب

اس جلسہ میں میری شرکت کو حکومت نے پسند نہ کیا گورنر نے جامع مسجد کے دروازوں پر ایک نوٹس چسپاں کرایا

جس کا منشا یہ تھا کہ گورنر کی اجازت کے بغیر کوئی جلسہ یا تقریر مسجد میں نہیں کی جا سکتی چونکہ یہ حکم صریحاً مذہب میں مداخلت تھی ہم نے تہیہ کر لیا کہ اس کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دیں گے اور کبھی بھی مذہبی مداخلت گوارا نہ کریں گے۔ ہم نے ایک اور عام جلسہ کا اعلان کر دیا اور اس میں گورنر کی اس نازیبا حرکت پر صدائے احتجاج بلند کی۔

میری پبلک سرگرمیوں سے حکومت مشتعل ہو گئی اور حکام تعلیم نے مجھ کو سیاسی لحاظ سے مردہ بنانے اور تمام قومی و ملکی تحریکات سے علیحدہ رکھنے کی خاطر مجھ کو مظفرآباد تبدیل کرنے کا حکم دے دیا مگر میں نے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی اور حکومت کو اس کے حکم کے جواب میں لکھ دیا کہ گورنمنٹ کا ملازم ضرور ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے دین عزیز کی توہین ہوتے دیکھ کر خاموش رہوں۔ میں دیگر مسلمانوں کی طرح کبھی بھی اپنے مذہب کی توہین گوارا نہیں کروں گا اور اس توہین کا ارتکاب کرنے والے حکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں گا۔ میں نے سرکار کا ملازم ہو کر چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا اور نہ ایسا کر سکتا ہوں۔ حکام متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ میرے کام کو دیکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ میں وقت معینہ پر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہوں یا نہیں۔ لیکن ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

میرا استعفیٰ یا برطرفی

حکام متعلقہ نے میری بات پر کان نہ دھرا اور میں نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اور جانتے ہوئے کہ انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ میں حکام کی روش پر زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا اور میں نے محکمہ تعلیم کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا اور کھلم کھلا میدان سیاست میں کود پڑا۔ حکام کا کینہ اس سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میرا استعفیٰ منظور کرنے کی بجائے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی تھا۔ لیکن جہاں استعفیٰ کے قبول کرنے سے حکومت کی مصالحت پسندی ظاہر ہوتی وہاں میری جبری برطرفی سے اس کا کینہ آشکارا ہو گیا۔

[اس کے بعد کشمیر میں فسادات شروع ہوئے۔ شیخ صاحب کبھی جیل میں اور کبھی جیل سے باہر مختلف تحریکات کی رہنمائی کرتے رہے۔ سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور آپ بیتی ناتمام رہ گئی۔

۱۹۴۶ء میں انہوں نے ڈوگرہ راجے کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا اور جیل بھیج دیئے گئے۔ ابھی جیل ہی میں تھے کہ ہندوستان کی سیاست میں انقلاب رونما ہوا۔ انگریز ہندوستان کے حصے بخرے کر کے یہاں سے کوچ کر گئے اور شیخ صاحب کو جیل سے نکال کر کشمیر کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔ لیکن ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو انہیں حق خود ارادیت کا حامی سمجھ کر پھر نظر بند کر دیا گیا اور وہ اب تک جیل میں ہیں۔]

اڈولف ہٹلر

ولادت ———— ۱۸۸۹ء

خودکشی ———— ۳۰ر اپریل ۱۹۴۵ء

میرے والدین

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری جائے ولادت جرمنی اور آسٹریا کی حدِ اتصال پر واقع ہے۔ برنیو کا یہ چھوٹا سا قصبہ پہلے بھی تاریخ میں قابل عصبیت کے نمونے پیش کر چکا ہے جب نپولین کا اقتدار ہماری قومی عزت کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو اسی قصبے کے ایک غیور کتب فروش نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اپنی حق گوئی کے پاداش میں آخر جان عزیز تک قربان کر دی۔ اس قصبے میں میرے والدین انیسویں صدی کے اواخر میں آ کر مقیم ہوئے۔ ابا ایک سرکاری دفتر میں بابو تھے وہ اپنا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے انجام دیتے تھے اماں گھر کا کام کاج کرتی تھیں اور بڑی محبت سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی تھیں۔

چھپن سال کی عمر میں ابا کو پنشن ملی تو ان سے بیکار نہ بیٹھا گیا۔ انہوں نے شمالی آسٹریا کے شہر لیچ میں کچھ زمین خرید کر خود کھیتی باڑی شروع کر دی غرض عمر کا ایک طویل حصہ دفتری ملازمت میں بسر کر کے آخر انہوں نے پھر اپنے باپ کے پیشہ کی طرف رجوع کیا۔

میرا بچپن

یہی زمانہ تھا جب میں نے ہوش سنبھالا اور خود منصوبے باندھنے کے قابل ہوا میرے وقت کا بہت سا حصہ گھر سے باہر کودنے پھاندنے میں گزرتا تھا۔ چوڑی کے نٹ کھٹ لڑکے میرے ہمجولی تھے۔ ہماری شرارتوں سے اماں کو بڑی فکر رہا کرتی تھی گھر میں ہمارا دل ہی نہ لگتا تھا۔ میں نے یہ سوچنے کی تکلیف تو کبھی گوارا نہ کی تھی کہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے۔ ہاں ابا کا پیشہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

مجھے اب خیال آتا ہے کہ مجھ میں تقریر کا ایک فطری ملکہ ودیعت تھا جو اسی زمانے میں ظاہر ہونے لگا۔ لڑکوں سے بڑے زور شور کے مباحثے رہا کرتے تھے۔ میں اپنی پارٹی کا منچلا سردار تھا۔ اسکول میں پڑھتا تو خوب تھا لیکن قابو میں نہ رہتا تھا۔ خالی وقت میں لیچ کے گرجا گھر جا کر وہاں کے گویوں سے گانا بھی سیکھا کرتا تھا۔ بار بار مذہبی رسوم کے شاندار مناظر دیکھنے سے میرے جذبات پر گہرے تاثرات نقش ہو گئے۔ جس طرح کبھی ابا کو اپنے گاؤں کا مسکین پادری انسانی شوکت کا نمونہ نظر آیا تھا اسی طرح میرے لیے بھی لیچ کا بشپ کچھ عرصہ منتہائے نظر بنا رہا۔ ابا میری فصاحت و بلاغت کے کچھ ایسے قائل نہ تھے جب ان سے ذکر ہوا تو انہوں نے میرے لیے یہ پیشہ پسند نہ کیا۔

اسی دوران میری آرزوئیں ایک ایسے پیشے کی طرف راغب ہو گئیں جو میرے مزاج کے زیادہ قرین تھا۔ ابا کی لائبریری دیکھتے دیکھتے چند کتابیں میری نظر سے گزریں جو جنگ سے تعلق رکھتی تھیں ان میں ۷۱-۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس کی ایک تاریخ بھی تھی یہ تاریخ چند ایسے باتصویر رسائل کا مجموعہ تھی جو اس جنگ سے تھوڑی مدت بعد شائع ہوئے تھے۔ مجھے اس کتاب سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ اکثر میرے زیر مطالعہ رہنے لگی میرے دل و دماغ میں جنگ کے نقارے بجنے لگے میں تھوڑے ہی عرصہ میں ہر اس شے کا عاشق ہو گیا۔ جو کسی طرح جنگ و جدال سے

تعلق رکھتی ہو۔

آج میرے سیاسی مخالفین میری بچپن کی زندگی کی چھان بین کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ چال باز شخص روزِ اول ہی سے بڑا اشتعلی تھا۔ میں خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بچپن کے ایام اس طرح بسر کرنے کی توفیق عطا کی کہ آج ان دنوں کی یاد سے دل میں مسرت اور طبیعت میں استقلال کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اوائل عمر کے جنگل اور ٹیلے میرا میدانِ جنگ تھا جہاں میں نے اوائل زندگی کے معرکے سر کرنے کی تربیت حاصل کی۔

جب میں بارہ سال کا ہوا تو مجھے اپنے مستقبل کی بابت ایک عجیب سوجھی سر پر یہی دھن سمائی کہ میں تو نقاش بنوں گا۔ اس ارادے کا اظہار کرنا تھا کہ صورتِ حالات بد سے بدتر ہو گئی۔ ابا سخت ناراض ہوئے۔ انہوں نے صریح حکم دے دیا کہ میں نقاش بننے کا وسوسہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دوں۔ میں نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور برملا کہہ دیا میں نقاشی کے سوا کچھ نہ سیکھوں گا۔ نہ معلوم میرا قیاس صحیح تھا یا غلط۔ ہاں اسکول میں میرے نقاش کا نتیجہ ضرور جلد ہی ظاہر ہونے لگا۔ میں صرف انہی مضامین پر دھیان دیتا تھا جو میرے مذاق کے مطابق تھے۔ بالخصوص میں ان مضامین میں تو پوری رغبت سے محنت کرتا تھا، جو نقاش بننے کے لیے مفید مطلب ہو سکتے تھے۔ اس کے سوا باقی تمام مضامین میرے نزدیک کسی کام کے نہ تھے۔ تاریخ جغرافیہ میرے مرغوب مضامین تھے۔ چنانچہ میں ان دونوں مضامین میں جماعت بھر میں اوّل تھا۔

جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے متعلق دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو مجھ پر قومی عصبیت پھوٹ پھوٹ کر طاری ہونے لگی۔ اور دوسرے مجھے تاریخ کی معنوی حیثیت کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔

میں یتیم رہ گیا

اسی اثنا میں میرے لیے کسی پیشے کو اختیار کرنے کا مسئلہ اس آسانی سے حل ہو گیا جس کا خیال تک بھی نہ تھا۔ میں تیرھویں سال میں تھا کہ ابا اچانک انتقال کر گئے وہ چنگے بھلے تھے موت نے انہیں بغیر طویل ایذا دیے ہم سے جدا کر دیا۔ ہمیں جو صدمہ پہنچا وہ ظاہر ہے — پہلے پہل تو زندگی میں کوئی خاص تغیر رونما نہ ہوا۔ ابا کی خواہش کے مطابق میری تعلیم کی تکمیل اماں اپنا فرض خیال کرتی تھیں۔ گویا وہ بھی مجھے دفتر کا بابو بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن میرا اب پہلے سے بھی زیادہ مصمم ارادہ ہو چکا تھا کہ میں ہرگز دفتر کا بابو نہیں بنوں گا۔

اسی دوران میں علالت نے میری مدد کی۔ میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ اماں نے میری بیماری سے متاثر ہو کر مجھے اسکول سے اٹھا لیا اور فنی درس گاہ میں داخل کرانے پر بھی آمادہ ہو گئیں۔ اب جو زندگی شروع ہوئی اس کی مسرتیں مجھے عالمِ خواب کا سماں دکھاتی تھیں۔ لیکن یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ دو سال بعد اماں کی موت نے میری تمام تمناؤں کو خاک میں ملا دیا — خاندان کی جو تھوڑی سی بہت پونجی تھی وہ اماں کی بیماری پر خرچ ہو چکی تھی۔ مجھے یتیمی کا جو وظیفہ ملنا شروع ہوا وہ ضروریاتِ زندگی کے لیے بھی ناکافی تھا۔ مجھے اپنی روزی کسی نہ کسی طرح خود پیدا کرنی ہو گی۔

میں نے اپنے کپڑے ایک تھیلے میں ڈالے اور ایک آہنی ارادہ دل میں لے کر ویانا کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ جس طرح پچاس برس پہلے ابا نے خود اپنی تقدیر کی بنیاد تعمیر کی تھی میں بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں عزم بالجزم کر لیا تھا کہ ”میں کچھ بن رہوں گا“ لیکن دفتر کا بابو کسی صورت بننا قبول نہ کروں گا۔

یہیں مجھے پہلی مرتبہ ان دو ہولناک خطرات کا علم ہوا جن کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔ خطرات جو جرمن قوم کے وجود کو لاحق تھے۔ ان میں سے پہلے کا نام اشتراکیت اور دوسرے کا نام یہودیت ہے۔

محنت مزدوری

اکثر لوگوں کو ویانا کے ذکر سے معصوم مسرتوں اور میلے تماشوں کے تصورات یاد آ جاتے ہیں۔ افسوس میرے حافظہ کے لیے

یہ تمام غم و درد کی ایک المناک داستان ہے۔ آج بھی جب میں اس شہر کا ذکر کرتا ہوں تو میرے دماغ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں نے مفلسی کے پانچ سال اس کٹھن چوروں کے شہر میں بسر کیے۔ میں اس پانچ سال کے عرصہ میں پہلے قلی بن کر اور پھر ایک معمولی نقاش کی حیثیت سے پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔ بھوک ہر وقت ستاتی تھی جو ٹکڑا میسر آتا تھا اس سے شکم سیری بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ فاقہ کشی ایک مستقل محافظ تھا جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں جو کچھ کماتا اس میں یہ بھوک بھی شریک تھی اگر میں کوئی کتاب خریدتا تو پیٹ پر پتھر باندھ کر۔ اگر میں رنگ خرید لاتا تو اگلے دن کا کھانا ملتوی رہتا۔ غرض میں ہر وقت فاقہ کشی کے اس بے رحم ساتھی سے مصروف پیکار تھا۔ باوجود اس کے جتنا کچھ میں نے اس زمانے میں سیکھا پہلے کبھی نہ سیکھا تھا۔

میں نے اس دور میں بہت کچھ پڑھا، پھر جو پڑھا اس پر گہری غور و خوض کی۔ کام سے فرصت کا جو وقت ملتا وہ مطالعہ کتب میں صرف ہوتا۔ اس طرح میں نے چند ہی سالوں کے عرصہ میں وہ سرمایہ علم جمع کر لیا جو میرے لیے آج بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔

غرض میری حالت یورپ کے ان خانہ ویرانوں کی سی تھی جو مسافت کی گرد پاؤں سے جھاڑتے ہوئے امریکہ پہنچ جاتے تھے اور جن کے دل میں ایک آس سی موہوم ہوتا تھا کہ ہم نئی دنیا میں اپنے لیے ایک نئی قسمت تلاش کریں گے اور ایک نئے گھر کی بنیادیں ڈال کر رہیں گے۔ یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اپنے ہنر، اپنی روایات اور اپنی عادات کی معطل کر دینے والی قیود اور تعصبات کو پیچھے چھوڑ کر ہر وہ ملازمت کرنے کو تیار رہتے تھے جو انہیں میسر آ جائے اور ہر وہ کام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جو انہیں مل جائے۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ روز بروز راسخ ہوتا چلا جاتا تھا کہ جو محنت و مشقت ایمانداری سے کی جائے چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے کبھی عزت کو بٹہ نہیں لگتا۔ مختصر یہ کہ میرے سامنے جو نئی دنیا آگئی تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر رہوں گا۔ اور اس کے بعد جو راہ اپنے لیے انتخاب کر لی ہے اس پر پورے استقلال سے آگے بڑھتا چلوں گا۔

میں نے ۱۹۰۹ء کے سال میں اپنی حالت اس قدر سدھار لی تھی کہ مجھے قلی بن کر روٹی کمانے کی حاجت نہ رہی تھی۔ اب میں ایک نقاش اور نقشہ نویس کی حیثیت میں کام چلاتا تھا۔ جہاں تک آمدنی کا تعلق ہے یہ پیشہ بھی غیر ہموار سا تھا۔ ضروریات زندگی کا گزارہ بمشکل چلتا تھا باوجود اس کے میں مطمئن تھا کیونکہ یہ پیشہ میرے نصب العین کے قریب تر تھا۔ علاوہ ازیں اب میں رات کو گھر لوٹتا تو پہلے کی طرح تھکان سے نیم جان نہ ہوتا تھا ورنہ قبل ازیں تو یہ حالت تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی نیند نے بے ہوش کر دیا۔ اب میں اپنے وقت کا آپ مالک تھا۔ میں اپنے اوقات کی تقسیم پہلے کی نسبت بہتر طریق پر کر سکتا تھا۔ نقاشی تو میں اس لیے کرتا کہ روزگار کا سہارا یہی تھا لیکن کتابیں اس لیے پڑھتا کہ مجھے مطالعہ کا شوق تھا۔ اس طرح معاشرتی مسئلہ کی نسبت وہ علمی واقفیت بھی حاصل ہو گئی جس کے بغیر جو کچھ میں نے ذاتی تجربہ سے دیکھا تھا وہ ادھورا رہتا۔

جب میری عمر بیس سال ہوئی تو میں اس ٹریڈ یونین میں جو مزدوروں کے معاشرتی حقوق کی حفاظت اور ان کے معاش کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کی خاطر قائم کی جائے اور اس ٹریڈ یونین میں جو کسی جماعت کے ہاتھ میں کھلونا بن کر طبقاتی جنگ کے اندر سیاسی آلۂ کار کا کام دے فرق کرنا سیکھ چکا تھا۔

زندگی کے بعض شعبوں میں یہودیوں کی کرتوتیں ابھی تک میرے لیے سربستہ راز تھیں۔ مجھے آج تک ان کا کھوج لگانے کا موقع نہ ہوا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ ان کارستانیوں کی اہمیت پوری توجہ کی متقاضی ہے۔ کوئی سازش اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس میں کم از کم کسی

ایک یہودی کا نام ذہن بالخصوص تمدنی عیوب کے متعلق تو یہ قاعدہ کلیہ اور بھی سچا ثابت ہوا جب کبھی اس قسم کے پھوڑے پھنسیوں کو نشتر سے بلند کر دیا جاتا تو جس طرح متعفن زخم میں ہمیشہ کرم ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی ذلیل یہودی نکلتا تھا جو اپنے یوں غیر متوقع طور پر افشا ہو جانے سے ایک طرح بوکھلا کر رہ جاتا۔

مارکس ازم یہود کا فلسفہ ہے

مارکس ازم کا عقیدہ یہودیوں کی ایجاد ہے۔ یہ عقیدہ فطرت کے قانون حفظ مراتب کو ترک کر کے اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے جبر و تشدد مسلط کر دینا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کثرت تعداد اور بے جان بوجھ کا اقتدار مسلم کر دیا جائے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی قدر و قیمت اور قوم و نسل کی بنیادی اہمیت یہاں کچھ وقعت ہی نہیں رکھتی، بلکہ ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے یہ عقیدہ نسل و تہذیب انسانی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اگر کائنات کا نظام مارکس ازم کی تعلیمات کے مطابق کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ ہو کہ نظم و نسق کی کوئی ایسی صورت برقرار نہ رہے جسے انسان کا دماغ تصور کر سکتا ہے ان کا قانون اس کارخانہ کو فنا کر دے گا جس کا بدل انسانی احاطۂ عمل سے باہر ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کرۂ ارض کے باشندے مٹ جائیں گے۔

لوگوں کو قائل کرنے کا ڈھب

اگرچہ میں ان دنوں اکثر دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں سیاسی مسائل پر غور کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا، پھر بھی میں نے کھلے طور پر سیاسیات میں حصہ لینے سے پوری طرح احتراز کیا۔ جو امور ہمیشہ مجھ پر مسلط رہتے تھے یا جو سوالات میرے دماغ میں ہیجان برپا رکھتے تھے ان کا ذکر میں صرف ایک محدود حلقہ کے سامنے کیا کرتا تھا۔ ایسے محدود دائرے کے اندر رہ کر مسائل پر بحث کرنے سے کئی فائدے تھے۔ مجھے لوگوں کے سامنے لیکچر بازی کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ برعکس اس کے میں اپنے گرد و پیش بیٹھنے والوں کے خیالات و عقائد کو ٹٹول کر انہیں آہستہ آہستہ اپنے ڈھب پر لانے کا ڈھنگ سیکھ گیا۔ اکثر ان کے خیالات و عقائد بالکل خام اور دقیانوسی ہوتے تھے۔ اس طرح میں نے ہر ممکن طریقہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانی نفسیات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانی شروع کی۔ اس قسم کے مطالعہ کے لیے وائنا سے زیادہ مناسب مقام تمام جرمن قوم کے ہاں اور کہیں نہ تھا۔

میں بچپن سے جرمن زبان بولتا آیا تھا۔ آسٹریا کے نچلے حصے میں مقامی طور پر یہی زبان رائج ہے۔ میں اپنا لب و لہجہ کبھی نہ بھولا نہ ہی میں وہ زبان سیکھ سکا جو وائنا میں رائج تھی۔ جرمن تمدن کے اس قدیم گہوارہ کا ستیاناس کر کے یہاں اجنبی قوموں کی جو غلط ملط بھیڑ پل رہی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے اس شہر میں رہتے جتنی مدت گزرتی، اتنی ہی میرے دل میں ان کی طرف سے نفرت بڑھتی تھی — میرا دل جرمنی میں بس رہا تھا۔ مجھے آسٹریا کی شہنشاہیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لیے مجھے آسٹریا کے عالم انتشار میں خیال یہی نظر آتا تھا کہ جرمن قوم کی نجات کی طرف پہلا قدم اٹھ رہا ہے —— میں امیدیں باندھتا تھا کہ ایک دن میں فن عمارت میں اپنا نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا پھر کم و بیش جیسے قسمت نے اجازت دی، اپنی لیاقت اپنے ملک کی خدمت میں وقف کر سکوں گا۔

وائنا میرے لیے ایک کڑا مکتب تھا۔ اس نے مجھے میری زندگی کے دقیق ترین سبق سکھائے۔ ابھی میرا بچپن بمشکل ختم ہوا تھا کہ میں یہاں رہنے آیا، جب میں یہاں سے گیا تو ایک سنجیدہ و فہمیدہ مرد بن چکا تھا۔ میں نے وائنا ہی میں اپنے ضابطۂ حیات کی بنیاد

ٹھالیں۔ بالخصوص سیاسی مسائل کا تجزیہ کرنا میں نے یہیں سیکھا۔ اس وقت میں نے جو سیاسی خیالات اور ضابطہ حیات قائم کیا وہ پھر میں نے کبھی ترک نہیں کیا۔ میں آج بھی اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ پیشہ ورانہ شاگردی کے ایام میرے لیے کتنے قیمتی تھے ——— تلخ حقیقت نے وائنا میں مجھے وہ سچائیاں سکھا دیں جو اب ہماری جماعت کے بنیادی اصول ہیں۔ پانچ سال میں یہ جماعت ایک حقیر ابتدا سے ترقی کر کے آج ایک عظیم الشان مقبول عام تحریک بن گئی ہے۔ اگر میں اسی نوعمری کے زمانے میں ذاتی اعتقاد کا ایک خزانہ جمع نہ کر لیتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آج یہودیت اور سوشلزم یا دوسرے الفاظ میں مارکس ازم کے متعلق بحیثیت مجموعی میرا کیا رویہ ہوتا یا میں معاشرتی مسئلہ کی بابت کیا روش اختیار کرتا۔

میونخ آخر میں سنہ ۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں میونخ پہنچا ——— مجھے یہ شہر ایسا مانوس نظر آتا تھا گویا میں یہاں برسوں سے مقیم ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فن عمارت کے مطالعہ کے دوران بار بار میری توجہ جرمن آرٹ کے مرکز کی جانب متوجہ ہوتی رہی تھی۔ اگر کوئی شخص جرمنی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے ضرور میونخ کی سیر کرنی چاہیے۔ میونخ کے بغیر جرمن آرٹ کو سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔

اپنے پیشہ کے کاروبار کے علاوہ مجھے سیاسی واقعات کی رفتار کے مطالعہ سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ بالخصوص جن سیاسی واقعات کا تعلق خارجی حکمت عملی سے ہوا ان میں تو مجھے اور بھی زیادہ شغف تھا۔ ابھی میں آسٹریا ہی میں تھا کہ مجھے جرمنی کی دوسری اقوام سے اتحاد کی پالیسی سرتاپا غلط معلوم ہونے لگی تھی۔ پھر بھی وائنا میں مجھے صاف صاف اندازہ نہ تھا کہ جرمنی سلطنت اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کس قدر دور نکل چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ برلن کے ارباب اختیار جس قوم سے اتحاد کیے بیٹھے ہیں اس کی کمزوریوں سے واقف ہوں گے ——— جب مجھے جرمنی کے باشندوں سے میل ملاپ کا موقع ملا تو میں یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ میرے تمام مفروضے غلط تھے ——— چند سال بعد جب اس اتحاد کا پہلا امتحان ہوا تو جرمنی میں سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا۔ اٹلی نہ صرف اتحاد ثلاثہ (جرمنی۔ آسٹریا۔ اٹلی) سے نکل گیا، بلکہ اس نے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کر لی۔ باقی کے دونوں ساتھی ٹکر ٹکر تکتے رہ گئے ——— میں نے سنہ ۱۹۱۳ء اور سنہ ۱۹۱۲ء میں پہلی مرتبہ اپنی رائے مختلف حلقوں کے سامنے پیش کی۔ اب ان میں سے کچھ لوگ نیشنلسٹ سوشلسٹ تحریک کے رکن ہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ جرمن قوم کا مستقبل بھی شاندار بنایا جا سکتا ہے جب پہلے یہ معاملہ حل کر لیا جائے کہ مارکس ازم کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں اتحاد ثلاثہ کی تباہ کن حکمت عملی مارکس ازم کی تعلیمات کے پراگندہ کر دینے والے اثرات کا نتیجہ تھی۔ خطرناک بات یہ تھی کہ یہ تعلیم صحیح سیاسی اور اقتصادی نظریات کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔

جنگ عظیم بچپن اور جوانی سے مجھے اکثر تمنا رہی تھی کہ موقع ملے تو ثابت کر دوں کہ میرا قومی جوش خالی ڈینگ ہی نہیں ——— آسٹریا سے میری ہجرت زیادہ تر سیاسی وجوہات کی بنا پر تھی۔ اب جنگ چھڑ گئی تو مجھے اپنے سیاسی عقائد کے منطقی نتائج پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔

۳ اگست سنہ ۱۹۱۴ء کو میں نے ملک معظم لیوگ ثالث شاہ بویریا کی خدمت میں ایک ضروری درخواست پیش کی کہ مجھے بویریا کی رجمنٹ میں بھرتی ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان دنوں محکمہ وزارت ایسی پیشکشوں کے طوماروں تلے دبا ہوا تھا۔ اس لیے جب اگلے روز مجھے جواب ملا کہ میری عرضی منظور ہو گئی ہے تو میں اور بھی خوش ہوا...... چند ہی روز میں وردی میرے زیب تن تھی جو پھر چھ برس تک اتارنے کی نوبت نہ آئی تھی۔

اب میری زندگی کا وہ دور شروع ہوا جو ہر جرمن کی طرح میرے لیے سب سے زیادہ قابل یادگار ہے۔ اس زبردست کشمکش کے تقاضوں نے ماضی کی ہر یاد ہمارے ذہن سے محو کر دی۔ آج اس زمانہ کو دس سال گذر چکے ہیں۔ پھر بھی جب میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں تو دل ایک مست کر دینے والے فخر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جنگ کے وہ ابتدائی ہفتے یاد آتے ہیں، جب اقوام عالم کے شجاعانہ دنگل میں

مجھے بھی حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔۔۔ میری رجمنٹ کا نام تھا لسٹ رجمنٹ۔ اس رجمنٹ کو پوری فوجی تربیت نہ ملی تھی لیکن اس کے سپاہی تجربہ کار مردانِ میدان کی طرح جان دینا جانتے تھے۔۔۔۔ یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ اسی حال میں سال کے بعد سال گزرنا شروع ہوئے۔۔۔ ایک لڑائی کے بعد دوسری لڑائی۔ اپنے سے زیادہ تعداد اور بہتر اسلحہ والے دشمن کے مقابلے میں جمے رہنا، بھوک اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنا، یہ تمام امتحانات اس لاثانی فوج کے راستہ میں آئے لیکن وہ ہر مرحلہ پر کامیابی سے آگے بڑھتی گئی۔۔۔ جنگ عظیم میں جرمن فوج کی دلیری کی داستانیں آئندہ ایک ہزار سال تک تاریخ کیلئے مایۂ ناز رہیں گی۔

۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو میں زخمی ہو گیا لیکن خوش قسمتی سے اتنی طاقت تھی کہ اپنے پاؤں چل کر اپنی صفوں میں واپس آگیا۔ یہاں سے ایمبولنس ٹرین کے ذریعے مجھے جرمنی بھیج دیا گیا۔۔۔ مجھے گھر چھوڑے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ان دنوں کے حالات میں یہ ایک لامتناہی مدت محسوس ہوتی تھی۔ — جوں ہی میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا میں نے برلن جانے کے لیے چھٹی حاصل کی۔ ہر جگہ انتہائی قحط کے آثار نظر آرہے تھے۔ دارالحکومت کی لاکھوں مخلوق بھوک کے عذاب میں گرفتار تھی۔

جب میں صحت پا کر ہسپتال سے چلا آیا تو مجھے میونخ کے ایک ریزرو بٹالین کے اندر متعین کر دیا گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کسی اجنبی شہر میں آگیا ہوں۔ ہر جگہ غصہ، بے اطمینانی اور شکایات کا زور تھا۔ اس لیے میونخ پہنچنے کے فوراً بعد میں نے پھر محاذ جنگ پر حاضر ہونے کی آمادگی ظاہر کر دی اور اوائل مارچ ۱۹۱۷ء میں اپنی پرانی رجمنٹ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ہم محاذ جنگ پر تعینات تھے۔

۱۹۱۷ء کے اواخر میں ایسا دکھائی دیتا تھا گویا محاذ جنگ پر بددلی کی بدترین گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ روس کی شکست کے ساری فوج میں ایک نئے حوصلہ اور اُمید کی روح دوڑ گئی۔ ۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں اٹلی کو بھی شکست ہو گئی۔ اس خبر کا اثر حیرت انگیز تھا۔ ثابت ہو گیا کہ جرمن روسیوں کے علاوہ دوسرے دشمنوں کا محاذ بھی توڑ سکتے ہیں۔ اس ہمت افزا اعتقاد سے محاذ جنگ پر ہزارہا سپاہی سرشار ہو گئے وہ اب اطمینان سے ۱۹۱۸ء کے موسم بہار کا انتظار کرنے لگے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ دشمن کے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔۔۔۔ عین اس وقت جبکہ فتح جرمنوں کے پاؤں چومنے والی تھی جرمنی کے قلب میں خنجر بھونک دینے والی سازش کی گئی۔۔۔ گولہ بارود کے کارخانوں میں ایک عام ہڑتال کا بندوبست کیا گیا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو جرمنی شکست کھا جاتا۔

۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں اتحادیوں کے سر پر مایوسی کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے پراپیگنڈا کا اہتمام بھی قابلیت سے کیا جا رہا تھا۔ یہ پراپیگنڈا محاذ جنگ پر سپاہیوں کے حوصلے تمام کر رہا تھا۔ جرمنی کے سر پر انقلاب منڈلا رہا ہے۔ اتحادیوں کی فتح ناگزیر ہے۔۔۔۔ ورویک کے جنوب میں ایک ٹیلے پر ۱۳ اکتوبر کی رات کو ہم پر کئی گھنٹے تک زہریلی گیس سے زبردست گولہ باری کی گئی۔ آدھی رات تک ہم میں سے کئی سپاہی ناکارہ ہو چکے تھے۔ صبح کے قریب مجھے بھی درد محسوس ہونے لگا پندرہ منٹ کے بعد درد میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ سات بجے کے قریب میں نے لڑکھڑاتے ہوئے آخری خط افسروں تک پہنچایا جو اس جنگ میں محاذ سے واپس لے جانا میری قسمت میں لکھا تھا۔ اس وقت میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ چند ہی گھنٹوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا گویا میری آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے ہیں مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

مجھے پامیرنیا کے قصبہ پاسے واک میں ایک ہسپتال میں بھیج دیا گیا میں وہیں تھا کہ مجھے جرمنی میں انقلاب ہو جانے کی خبر ملی۔۔۔۔

۱۰ نومبر کو مقامی پادری نے ہسپتال میں آ کر ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمارا وطن اب ایک جمہوریہ بن گیا ہے۔ ہمیں قادرِ مطلق سے دعا کرنی چاہیے کہ اس جدید نظامِ سلطنت کو اپنی رحمت سے محروم نہ رکھے۔" . . . پادری اپنی تقریر میں خاندانِ شاہی کی خدمات کی مختصر توصیف سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا خیال ہے اس وقت کوئی آنکھ خشک نہ تھی جہاں تک میرا تعلق ہے میرے ہاتھ سے تو ضبط کا دامن بالکل ہی چھوٹ گیا۔ جب پادری نے پھر تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: "اب ہم یہ طویل جنگ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جنگ میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہم فاتحین کے رحم و کرم پر ہیں۔ مستقبل میں ہمارے وطن کو بھاری بوجھ برداشت کرنے ہوں گے۔ ہم متارکہ کی شرطیں قبول کر رہے ہیں۔ اب ہمارا بھروسہ کل کے دشمن کی فیاضی پر" میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا اور کچھ سننا ناممکن ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آیا اور نڈھال ہو کر اپنے بستر میں گر پڑا۔

——— اور نومبر کے آخر میں میونخ واپس آ گیا۔

میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

ان دنوں میرے دماغ میں ان گنت تجویزیں آیا کرتی تھیں۔ میں سارا سارا دن یہی سوچا کرتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر تجویز اس پتھر پر سر پٹخ کر رہ جاتی کہ میں بالکل گمنام تھا۔ میں تجویزِ عمل کے لیے پہلی ضروری شرط ہی پوری نہ کر سکتا تھا ——— ہم اپنے محدود حلقہ میں ایک نئی پارٹی قائم کرنے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے سامنے وہی موٹے اصول تھے جن پر بعد میں جرمن مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ . . . ہم نے سماجی انقلاب پارٹی کا نام پسند کیا۔ یہ نام چننے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری جماعت جن اصولوں پر سماج کو کھڑا کرنا چاہتی ہے وہ بالکل انقلابی ہیں ——— میں اس پارٹی کا ساتواں ممبر تھا۔

ہماری نوزائیدہ تحریک کا اولین خطاب ان لوگوں سے تھا جو کمیونزم کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ہم اپنی تحریک کو مطمئن اور مستغنی افراد کی تنظیم نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم تو اس تحریک میں ان لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے جو تشویش سے مضطرب تھے جو اطمینان سے محروم تھے، جو آزردہ و غمگیں تھے اور جو بے چین تھے۔ ہم اپنی تحریک کو قوم کی بالائی سطحوں کی پرواز تک محدود نہ رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہم تو اسے عوام کی گہرائیوں تک اتار لے جانا چاہتے تھے ——— ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر مہینے ایک ایسا عوامی جلسہ منعقد کریں گے جہاں خلقت کو شرکت کی دعوت دی جایا کرے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز کس طرح میں نے خود سات سو دعوت نامے لوگوں میں تقسیم کیے اور شام کے وقت ہم سب اس انتظار میں تھے کہ ہجوم جوق در جوق ہمارے جلسہ میں شامل ہوگا۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کرنے کے بعد آخر کار صدر کو جلسہ شروع کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ پھر جلسہ میں سات ہی آدمی شامل تھے وہی پرانے جانے پہچانے سات ——— حاضرین کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ گیارہ سے بتدریج تیرہ ہوئے۔ پھر سترہ، چھبیس اور آخر کار چونتیس۔

میں نے سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں تحریک کا پہلا بڑا جلسۂ عام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کے متعلق ہمارے مابین اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ تحریک کے بعض سرکردہ اراکین کا خیال تھا کہ ابھی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا وقت نہیں آیا ——— ہم نے فیصلہ کیا کہ اس تحریک کے زیرِ اہتمام جو کہ ابھی تک بالکل گمنام تھی۔ ہمارا پہلا بڑا جلسۂ عام ۲۴ فروری سنہ ۲۰ء کو منعقد کیا جائے گا۔ تمام ابتدائی انتظامات کی نگرانی میں نے ذاتی طور پر کی ——— اعلان کیا جا چکا تھا کہ جلسہ ساڑھے سات بجے شروع ہوگا۔ جلسہ شروع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے میں ہاف براؤ ہاؤس کے سب سے بڑے ہال میں داخل ہوا۔ یہ ہال میونخ شہر کے پلاٹز نامی بازار میں

وائن براؤ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ عظیم الشان ہال جو اس وقت مجھے بہت ہی بڑا نظر آ رہا تھا۔ حاضرین سے پٹا پڑا تھا۔ جن لوگوں کو ہال کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی۔ وہ باہر کھڑے تھے حاضرین کی تعداد قریباً دو ہزار تھی۔

جب پہلا مقرر تقریر ختم کر چکا تو میں بولنے اٹھا چند ہی منٹ کے بعد مجھ پر اعتراضات کی ایسی بارش ہونے لگی گویا اولے برس رہے ہیں۔۔۔ میں تقریباً نصف گھنٹہ بولا ہوں گا کہ مردہ باد کے نعرے "زندہ باد" کی گونج سے دب گئے۔۔۔ آخرکار جب میں نے تحریک کے پروگرام کے پچیس نکات لوگوں کے سامنے ایک ایک کر کے پیش کئے اور انہیں اظہار رائے کی دعوت دی تو ہر نکتہ کا پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ جب میں آخری نکتہ تک پہنچا تو جلسہ گاہ کے تمام حاضرین ایک نئے اعتقاد، ایک تازہ ایمان اور ایک جدید عزم پر متحد ہو چکے تھے۔ جب عوام کندھے سے کندھا ملائے جلسہ گاہ کے دروازوں پر دھکم دھکا ہو کر باہر جا رہے تھے۔ تب انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی ہے جس کے طفیل جرمن قوم کا نام کبھی صفحۂ ہستی سے مٹنے نہ پائے گا۔۔۔ جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی۔۔۔ تحریک کا قافلہ منزل کی جانب اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

ہماری جدوجہد

ابھی اس جلسہ کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی کہ ہم نے آئندہ جلسہ کا انتظام شروع کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہر ہفتے ایک جلسہ عام منعقد کریں گے۔۔۔ اس زمانے میں میونخ شہر کے ہاف براؤ ہاس کا ہال ہم قوم پرست اشتراکیوں کی نگاہ میں ایک مقدس درگاہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ہر ہفتہ جلسۂ عام منعقد ہوتا۔ ہر مرتبہ ہال میں حاضرین کی تعداد سابقہ جلسے سے زیادہ ہوتی تھی۔ حاضرین ہماری باتیں بھی زیادہ توجہ سے سنتے تھے۔۔۔ جب میں جلسہ میں تقریر کرنے جاتا تو سامعین کے اعتقادات جو کچھ میں کہنا چاہتا اس کے بالکل الٹ ہوتے جو کچھ میں چاہتا تھا کہ ہو جائے وہ چاہتے تھے کہ نہ ہو۔ میں قریباً دو گھنٹہ دو یا تین ہزار لوگوں کو یہ منانے کے لیے صرف کرتا کہ وہ اپنی پہلی رائے بدل ڈالیں۔ میری ہر چوٹ سے ان کے پہلے خیالات کی ایک نہ ایک بنیاد مسمار ہو جاتی۔ آخرکار میں انہیں اپنے ڈھب پر لا کر اپنے اعتقادات اور اپنے ضابطہ حیات کا ہمنوا بنا لیتا۔

ان مجلسوں کا مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں آہستہ آہستہ مجمع عام کے سامنے جلسہ گاہ میں تقریر کرنے کا ماہر بن گیا مجھے لوگوں کے جذبات ابھارنے اور وسیع جلسہ گاہوں میں ہزارہا اشخاص کے سامنے تقریر کی مناسبت سے جسمانی حرکات کرنے میں کمال حاصل ہو گیا۔

اس وقت تک ہماری تحریک کا کوئی جماعتی نشان یا طغریٰ نہ تھا۔ ہمارا اپنا کوئی جھنڈا بھی نہ تھا۔۔۔ لاتعداد تجربوں کے بعد میں نے ایک آخری نقشہ تیار کر لیا۔ میرا نقشہ یہ تھا کہ سرخ جھنڈے میں ایک سفید دائرہ ہو جس کے مرکز میں سواستیکا کا نشان بنایا جائے۔ کئی تجربوں کے بعد میں نے جھنڈے اور سفید دائرے کا رقبہ اور سواستیکا کی جسامت میں مناسب توازن پیدا کر لیا۔ اس کے بعد ہمارے جھنڈے کی شکل آج تک نہیں بدلی گئی۔

جنوری سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مرتبہ پھر جرمنی کے لیے سخت تشویش کے اسباب پیدا ہو گئے۔ معاہدہ پیرس کی رو سے جرمنی کو دس کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کی جلد و باز شرط عائد کر دی گئی۔ پھر یہ بھی حکم تھا کہ یہ رقم سونے کی اشرفیوں میں ادا کرنی ہو گی۔ جب جرمنی نے یہ شرط ماننے سے کچھ عذر کیا تو جرمنی کے دشمنوں نے لندن میں جمع ہو کر جرمنی کو الٹی میٹم دے دیا۔۔۔ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے

کے لیے میونخ کے وطن پرست عناصر کی ایک مشترکہ مجلس منتظمہ نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہ دیکھ کر سخت مضطرب ہوا اور جھنجلا اٹھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور عملاً کچھ نہیں کیا جا رہا — مجھ میں اب یارائے ضبط نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم خود احتجاجی مظاہرہ کریں گے بدھ کی دوپہر کو میں نے دس منٹ میں اشتہار کا مضمون لکھوا دیا۔ اسی وقت اگلے روز یعنی ۳ فروری کے لیے کرونے سرکس ہال بھی ہم نے کرائے پر لے لیا — جب میں ہال میں داخل ہوا تو مجھے وہی مسرت محسوس ہوئی جو ایک سال پہلے میونخ ہاف براؤ ہال کے ایوان دعوت میں ہمارے پہلے جلسے کی تقریب پر محسوس ہوئی تھی۔ جلسہ گاہ میں ہجوم کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا۔ پانچ ہزار چھ سو ٹکٹ بک چکے تھے اس کے علاوہ بیروزگاروں، غریب طالب علموں اور خود ہمارے ضبط و نظم قائم رکھنے والے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی۔ اندازہ تھا کہ ساڑھے چھ ہزار افراد موجود ہوں گے۔

میری تقریر کا عنوان تھا "مستقبل اور تباہی"۔ مجھے یقین ہو گیا کہ عوام کا یہ ہجوم جس سے میں مخاطب ہوں مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ اس یقین سے مجھے وہ مسرت حاصل ہوئی کہ میں خوشی سے جھوم گیا۔

جب میں جرمن مزدور پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے فوراً تبلیغ اور پروپیگنڈا کا شعبہ سنبھال لیا۔ میں اپنی جماعت کا ناظم تبلیغ تھا۔ ایک طرف میں نے یہ کوشش شروع کی کہ بعد میں تحریک کو جو عظمت حاصل ہونے والی ہے اس کے واسطے ابھی سے میدان تیار کرنا شروع کر دیا جائے دوسری جانب میں نے ایسے انقلابی اقدامات کا اہتمام کیا کہ تحریک کی تنظیم میں سوائے بہترین عناصر کے کوئی گھسنے نہ پائے۔

مجلس منتظمہ کی کارروائی ایک آئین کے ماتحت ہوتی تھی۔ مجلس منتظمہ کے تمام اراکین ہر مسئلہ کی تفصیلات میں دخل دیتے تھے۔ پھر رائے شماری کی نوبت آتی تھی۔ تب کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا چنانچہ ناظم نشر و اشاعت اس مسئلہ پر بھی ووٹ دیتا تھا کہ مالیات کے معاملہ میں کس شخص کا تقرر مناسب ہے۔ ناظم مالیات ان معاملات میں بھی دخیل تھا جن کا تعلق فقط تنظیم سے تھا۔ ناظم تعلیمات ان امور میں رائے ظاہر کرتا تھا جو میرے متعلق ہوتے تھے، وغیرہ وغیرہ — میں نے یہ حماقت برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد میں نے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں شمولیت ہی ترک کر دی۔ میں تبلیغ کے محکمہ کا انصرام کرنے کے سوا اور کسی بات میں دخل نہ دیتا۔ نہ ہی میں دوسروں کو یہ اجازت دیتا کہ وہ میری سرگرمیوں میں خواہ مخواہ مشورے دیں۔ میں خود بھی دوسروں کی سرگرمی کے متعلق انہیں کوئی مشورہ نہ دیتا۔

جب نیا آئین منظور ہو گیا اور میں صدر مقرر ہوا تو مجھے مطلوبہ اختیارات مل گئے تب میں نے تمام اس قسم کی حماقتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مجلس منتظمہ میں کثرت رائے سے فیصلے کرنے کے بجائے اب مطلق شخصی ذمہ داری کے اصول پر عمل ہونے لگا۔

ہم نے اخبار نکالا

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہم نے فولکیشر بیوباختر نامی اخبار خرید لیا، جیسا کہ اس اخبار کے نام سے ظاہر ہے یہ عوام کا ترجمان تھا۔ اب ہم نے اس اخبار کو جرمن قوم پرست مزدور پارٹی کا ترجمان بنا لیا۔ پہلے یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسے روزانہ کر دیا گیا۔ ماہ اگست ۱۹۲۳ء میں یہ اخبار بڑے سائز پر شائع ہونے لگا — میں صحافت میں بالکل نوآموز تھا چنانچہ میں نے کئی نئے سبق سیکھے۔ یہ سبق میں نے خاصی تکلیف اٹھا کر حاصل کیے۔

ہمارا اخبار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک ہر دلعزیز اخبار ہونے کا مدعی تھا۔ اس کی ساری باتیں اچھی تھیں لیکن اس کا مالی انتظام سخت بدنظمی کی حالت میں تھا۔ قسمت نے میری یاوری کی۔ مجھے ایک ایسا شخص مل گیا جس نے اس وقت سے لے کر آج تک

کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے صرف ہمارے اخبار کے مال منیجر کے طور پر ہی کام نہیں کیا بلکہ وہ ہماری تحریک کے مال منیجر کی خدمات بھی انجام دیتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ چکی تھی کہ میرا تعارف میکس آمان سے ہوا۔ وہ تب میرا افسر تھا۔ آج وہ ہماری سیاسی جماعت کی مالیات کا ناظم اعلیٰ ہے۔ مجھے جنگ کے چار سال کے عرصہ میں متواتر اس شخص کی غیر معمولی قابلیت، محنت اور دیانت داری کا تجربہ ہوا۔ یہی شخص مستقبل میں میرا رفیق بننے والا تھا۔

میری یہ روش اختیار کرنے کا جواز ۹ رنومبر سنہ ۱۹۲۳ء کو ثابت ہوگیا۔ چار سال قبل جب میں تحریک میں شامل ہوا تھا تو تحریک کے پاس ربڑ کی ایک مہر بھی نہ تھی۔ ۹ رنومبر سنہ ۱۹۲۳ء کو ہماری تحریک خلاف قانون قرار دے کر جبراً منتشر کر دی گئی اور اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ تب ہماری تحریک کی تمام جائداد اور کاغذات کو نیلام کر کے جو قیمت وصول ہوئی وہ تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار جرمن سونے کی اشرفیوں کے برابر تھی۔

میری گرفتاری

میں اس سلسلے میں اپنی ایک تقریر کا آخری حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں میرے خلاف اور میری جماعت کے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا تھا یہ تقریر میں نے اسی ضمن میں عدالت کے سامنے کی تھی۔

”اس سرکار کی عدالت چاہے تو خوشی سے ہمارے اعمال کی پاداش میں ہمیں سزا دے سکتی ہے۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے اس قسم کا ایسا طرز عمل کیوں اختیار کیا۔ لیکن تاریخ ایک عدالت عالیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس عدالت کے سامنے اس سے زیادہ بھی گواہی پیش ہوتی ہے۔ اس عدالت کا قانون بھی زیادہ منصفانہ ہے۔ جب تاریخ کی اس عدالت عالیہ کے سامنے ہماری سزا یابی کا یہ حکم نامہ پیش ہوگا تو اس کے جج کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگی۔ وہ اس حکم نامہ کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دے گا۔ وہ عدالت ہمیں بری کر دے گی اور اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم سزا کے مستحق نہیں۔“

یہاں میں وہ حالات بیان نہیں کرتا جن کے باعث ۹ رنومبر سنہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ پیش آیا۔ واقعات کا وہ سلسلہ اسی دن ختم ہوگیا۔ میں آج دہرانا اس لیے نامناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی تکرار سے آئندہ کسی فائدہ کی امید نہیں۔ جو پرانے زخم حال ہی میں بھر چکے ہیں، انہیں پھر کھولنے سے کیا حاصل ہوگا۔ میں ان لوگوں کی تقصیر کا ذکر کیا کروں جن کے دل میں شاید اپنی قوم کی محبت ویسی ہی ہو جیسی کہ میرے دل میں ہے۔ میں نے جو راستہ اختیار کیا، انہوں نے شاید اس لیے وہاں میرا ساتھ نہ دیا کہ وہ اس کو صحیح راستہ نہ سمجھتے تھے یا صحیح سمجھتے تو اختیار کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔

آج ہمارے وطن پر بہت بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس مصیبت کا اثر ہم سب پر ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں کسی کی دل شکنی نہ کروں۔ مجھے ان لوگوں کے اتحاد میں کوئی خلل پیدا نہ کرنا چاہیے جو شاید آگے چل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنے والے ہیں۔ اس متحدہ محاذ میں تمام مخلص اور وفادار جرمن شامل ہوں گے۔ اس متحدہ محاذ کو ہماری قوم کے دشمن کے متحدہ محاذ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جس روز وہ دن آیا تو جن لوگوں نے ہمیں دشمن سمجھ کر ہم سے یہ سلوک کیا ہے تب ان کے دل میں بھی ان لوگوں کا احترام پیدا ہوگا جنہوں نے وطن کی خاطر اپنی جانیں دے دیں۔

۹ رنومبر سنہ ۱۹۲۳ء کو جرمن قوم پرست اشتراکی مزدور پارٹی کے قیام کے ساڑھے چار سال بعد ہماری جماعت ساری جرمن

سلطنت میں خلاف قانون قرار دے کر توڑ دی گئی — آج دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہماری جماعت جرمنی کے طول و عرض میں پھر قائم ہو چکی ہے ہمیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ آج ہماری جماعت پہلے سے زیادہ مضبوط اور متحد ہے۔

ہماری تحریک کو دبانے کے لیے بڑے بڑے مظالم توڑے گئے۔ تحریک کے قائدین پر ستم کیے گئے۔ ہمارے خلاف بہتان تراشیاں الزام تراشیاں کی گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوا۔ ہمارے مقاصد مبنی برحق ہیں ہماری نیتوں میں خلوص ہے۔ ہمارے اراکین جذبۂ ایثار سے سرشار ہیں۔ اسی لیے ہم اپنے خلاف جبر سے ختم نہیں ہوئے۔ امتحان سے گزر کر ہماری طاقت اور بڑھ گئی ہے۔ ہمارے گرد و پیش جو پارلیمنٹری تحریکیں قائم ہیں ان کی بنیاد خیانت پر ہے۔ اس ماحول میں ہماری تحریک کو یہ احساس ہے کہ ہماری جدوجہد کس قدر پُرمعنی ہے۔

ہماری تحریک نسل، شخصیت اور کردار کے اقدار کی ترجمان ہے۔ ہمارا لائحہ عمل انہیں اقدار کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ مستقبل میں ہماری کامیابی ایسی ہی یقینی ہے جیسے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں — آج دنیا میں نسلی پاکیزگی مٹی میں ملائی جا رہی ہے اس عالم میں جو سرکار اپنے بہترین نسلی عناصر کے تحفظ و بقا کا اہتمام کرتی ہے وہ ایک روز ساری دنیا پر حکمران ہوگی۔

آسکر وائلڈ

ریڈنگ جیل
۱۸۹۶ء

میں شکوہ نہ کروں گا۔

میری عمر کا آغاز تو ایک مدت ہوئی ہوا تھا لیکن آپ بیتی کا آغاز پچھلے برس کے نومبر سے ہوتا ہے۔ نومبر کے اوائل کے دن تھے۔ ان دنوں ۔۔۔ اور ۔۔۔ میری ذات کے درمیان زندگی کا دریا بہا چلا جا رہا ہے۔ دریا بھی اس قدر وسیع کہ اس پار کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ میرے ساتھ جو بیتی ہے وہ کل کی بات نہیں آج کی واردات ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے رنج والم ایک ہی لمحہ ہے جو بہت طویل ہے۔ میری عمر سے زیادہ طویل۔ وقت و زمانہ جیسے ایک مقام پر آ کے رک گئے ہیں۔ گاہے لگتا ہے جیسے میں نے جیل ہی میں آنکھیں کھولی تھیں اور یہیں بند ہو جائیں گی۔

جیل خانے میں وقت آگے نہیں بڑھتا۔ کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹتا رہتا ہے۔ ایک نقطے کے گرد، جیسے وہ نقطہ رنج والم کا سرچشمہ ہے جس کے گرد لمحات چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ زندگی میں روح کش جمود اور سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی چیز بدلتی نہیں۔ نہ کوئی تغیر آتا ہے۔ جو سمجھو کل تھا وہی آج ہے۔ ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، لیٹتے ہیں، اٹھتے ہیں، عبادت کرتے ہیں یا کم از کم دوسروں کی دیکھا دیکھی عبادت کے لیے دو زانو ہو جاتے ہیں مگر یہ تمام حرکتیں ہم سے مشین کی طرح سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن کی طرح وحشت ناک ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا میں فصلیں اگتی ہیں، پکتی ہیں، کٹتی ہیں۔ انگور کی بیلیں ابھرتی ہیں۔ درختوں پر چڑھتی ہیں۔ انگور پکتے ہیں، دانے گرتے ہیں۔ باغوں میں پھول کھلتے ہیں۔ پھل گرتے ہیں مگر ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ہم جیسے بھول ہی گئے ہیں کہ باہر کی دنیا کیا ہے، کیا رنگ بدلتی ہے۔ وہاں رت آتی ہوگی، رت جاتی ہوگی مگر ہم اسیروں کے لیے یہاں ایک ہی موسم ہوتا ہے ۔۔۔ رنج کا ملال کا۔

ہم سے آفتاب و ماہتاب بھی چھین گئے ہیں۔ آزاد دنیا کا فلک نیلگوں بھی ہو گا اور شفق رنگین بھی ہو گی مگر میری کال کوٹھری کے تنگ روزن کی سیاہ سلاخوں سے جو کرنیں اندر آتی ہیں ان کا رنگ سلیٹی اور پھیکا پھیکا سا ہوتا ہے پھر بھی میں ایک بات کہہ ہی سکتا ہوں کہ کنج زنداں کی بھی ایک شفق ہوتی ہے اور ایک شفق دل کی دنیا کی بھی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بجھی بجھی سی ہوتی ہے۔ جیل میں آ کے خیالوں کی دنیا پر جمود طاری ہو جاتا ہے ۔۔۔ خیالوں پر نہیں، خیالوں کی دنیا پر ۔۔۔ خیالوں میں تو بھونچال آ جاتے ہیں مگر خیالوں کی دنیا میں کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ جو واردات برسوں گزرے ہوئی تھی اور جسے میں نے بڑی آسانی سے فراموش کر دیا تھا آج ذہن کے نہ جانے کون سے گوشے سے ابھر کر پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور اس کی تمام تر تفصیلات میری آنکھوں تلے بکھر گئی ہیں۔ بھولی بسری باتیں پھر سے یاد آ گئی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ مگر آج میرے لکھنے کا انداز وہ نہیں جو ہوا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جگ بیتی تھی یہ آپ بیتی ہے۔

پچھلے ہی ہفتے مجھے اس جیل میں منتقل کیا گیا ہے۔ اور تین مہینے گذرے میری والدہ وفات ہو گئی ہے کون جانے میرے دل میں ماں کی کس قدر محبت اور احترام تھا۔ اس کی موت کے دکھ نے میرا سینہ ہی جلا ڈالا ہے۔ میں جو ادب کا بادشاہ اور الفاظ کا شہنشاہ تھا چند الفاظ ڈھونڈ رہا ہوں جن سے ماں کے مرنے کے ملال کو بیان کر سکوں۔ میں فنکار تھا، میرے الفاظ سے ترنم رستا تھا مگر آج دل کے دامن سے وہ الفاظ ہی لڑھک کر بکھر گئے ہیں جنہیں چن کر اور ایک لڑی میں پرو کر غم و درد کی دھیمی سی صدا پیدا کر سکوں۔

ماں باپ نے مجھے ایک نام دیا تھا جو فلسفے، فن و ادب اور سائنس میں بڑی نہیں فکر و حکمت کے ارتقا میں روشن ہوا۔ میں نے اس نام کی تذلیل کی ہے۔ یہ نام ٹھٹھیار گروں کی منطقوں میں توہین آمیز ضرب المثل بن گیا ہے۔ میں نے اسے غلاظت میں گھسیٹا۔ اسے وحشیوں کے آگے پھینک کر اس میں وحشت بھر دی اور اسے احمقوں کے آگے ڈال کر اسے حماقت سے ملوث کیا۔

میری معقل کوٹھڑی کے باہر ایک تختی لٹک رہی ہے جس پر میرا نام، نمبر، سزا اور تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ ایک روز دیکھا تو پتہ چلا کہ مئی کا مہینہ ہے۔ خوشحالی، مسرت اور بحالی قدرت کی تخلیق ہے۔ ایک ہی تخلیق کے تین نام۔ اس تخلیق کا مزاج اور تانا بانا پائیدار ہو سکتا ہے۔ حساس نہیں لیکن غم قدرت کی ایسی تخلیق ہے جو بہت پائیدار ہے اور بے حد حساس۔ خیالوں کی دنیا میں ذرا سی جنبش آئے تو غموں کے تانے بانے میں وہ ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تو سونے کے ورق جیسے باریک سے ورق سے بھی زیادہ حساس ہوتا ہے جو مکھی کے لمس سے بھی اڑنے لگتا ہے غم ایسا ناسور ہے جو رستا ہی رہتا ہے صرف محبت کا لمس ہے جو اسے سہلا لیتا ہے لیکن یہ جب بھی رستا رہتا ہے صرف درد کی کسک نہیں رہتی۔

جہاں غم اور دکھ ہے وہاں تقدس اور پاکیزگی بھی ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے وہ زندگی سے بیگانہ ہیں۔ جیل میں آنے تک میں بھی زندگی سے بیگانہ تھا۔ مجھے جب عدالت کے تنگ سے برآمدے سے دو سپاہیوں کے جلو میں ہتھکڑیوں میں جکڑ کر گزارا جا رہا تھا تو ”وہ“ غالباً میرے ہی انتظار میں تماشائیوں کے ہجوم سے الگ تھلگ برآمدے کی نکڑ پہ کھڑا تھا۔ برآمدے میں ڈراؤنا سا سکوت تھا جسے میری ہتھکڑیوں کی جھنکار اور قدموں کی آہٹ مرتعش کر رہی تھی۔ ”اس“ نے ٹوپی اتار لی اس کے لب سلے رہے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اور اس کے قریب سے گذر گیا یا گذارا گیا۔

”اس“ نے ٹوپی کیوں اتاری تھی؟ میری تعظیم کو؟ ہاں شاید میری ہی تعظیم کو۔ ”اس“ نے بہت بڑی نیکی کی تھی۔ میں تو نفرت و حقارت کا پیکر تھا۔ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا مجرم۔ مگر اس نے میرے احترام میں ٹوپی اتار لی۔ یہی جذبہ ہے اور یہی حُبِ انسانیت ہے جس کے تحت پارساؤں نے فقیروں کے پاؤں دھوئے ہیں اور کوڑھیوں کے منہ چومے ہیں۔ میں نے تو اسے کچھ بھی نہ کہا تھا بلکہ یہ بھی نہ کہا تھا کہ مجھے جیل بھجوانے کا سہرا ”اسی“ کے سر ہے لیکن اس نے ٹوپی اتار کر سر جھکا لیا تو میرے آنسو بہہ نکلے اور ان آنسوؤں نے سب گلے دھو ڈالے۔ یوں لگا جیسے میں [illegible] پہ چلا جا رہا تھا کہ ”اس“ نے میری تعظیم میں ٹوپی اتار کر کس قدر عظیم نیکی کی ہے۔ وہ تو اسی قدر جانتے ہیں کہ میری ابتلا کا ذمہ وار وہی ہے۔

”وہ“ مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ اس کے خطوط ادب پارے ہوتے ہیں۔ ان میں پیاری پیاری طنز، ہلکا پھلکا مزاح، تنقید بھی اور بڑی ہی دلچسپ باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے خطوط سے میرا رشتہ اس حسین مگر غیر حقیقی دنیا سے قائم ہے جس کا میں ایک روز بادشاہ تھا۔ میں بادشاہ ہی رہتا اگر میں خام خیالوں کے گھوڑے پہ سوار دنیا کے رنگ و بو میں نہ کھو جاتا۔ میری خواہشات میں تشنگی تھی جسے میں نے جذبات کے بھڑوں سے بجھایا۔ یہ تو ہوس تھی اور میں حرص و ہوا کی لامحدود وسعتوں میں کھو گیا ورنہ میں آرٹ، ادب اور ثقافت کی دنیا کا بادشاہ ہی رہتا۔ میرے پاس

اعتراف یا اقبالِ جرم کرے وہ — تو بہت ہی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

جب کسی انسان کے سینے سے عیش و نشاط، امن و آسائش کو نوچ کر اسے زنداں میں قید کر لیا جاتا ہے تو وہ کال کوٹھڑی میں چھپ کر دنیا والوں کے ڈنک اور زہر آلود تیروں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کوٹھڑی کا اندھیرا اور تنہائی اس کے لیے ماں کی گود کی سی پناہ گاہ بن جاتی ہے۔ وقت و زمانہ زنداں کی مہیب چھتوں دیواروں سے اس طرح اپنی رفتار پہ گزرتے چلے جاتے ہیں اور قیدی بڑی ہی رازداری سے یاس و الم کا دامن تھام کے دنیا والوں سے ناطہ توڑ کر بے نیازی سے دکھ سہتا ہے اور بڑے ہی اطمینان اور سکون سے آہیں بھرتا ہے۔ لیکن مجھے تو قفس کے گوشے میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا گیا، چوری چھپے رونے بھی نہ دیا گیا۔ میرے آنسوؤں کو لوگوں کے طنز آمیز قہقہوں تلے روندنے کے لیے مجھے تین مختلف جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر بار بار دن دہاڑے سرِ عام چوکوں پہ گھمایا گیا، بھرے بازاروں سے گزارا گیا اور جو مجھے نہیں جانتے تھے انہیں بتایا گیا کہ میں کون ہوں، یا کون تھا۔ لوگوں نے میرے گرد حلقہ کر کے قہقہے لگائے، فقرے چست کیے اور پھبتیاں کسیں۔

جانے مجھے کیوں توقع تھی کہ جب انہیں پتہ چلے گا کہ یہ تو ہمارا محبوب افسانہ نویس اور ان کے دکھوں کے ذمہ دار امیروں وزیروں کے خلاف طنزیہ لکھنے والا فن کار ہے تو وہ انگلیاں دانتوں تلے دبا لیں گے، سر جھکا لیں گے اور ان کے سینوں میں اس معاشرے کے خلاف غم و غصے کے شعلے بھڑکنے لگیں گے مگر انہوں نے تمام تر دانتوں کی نمائش کر کے چیخ چیخ کر قہقہے لگائے ——— اسی فریب خوردہ مخلوق کے دکھ درد نے مجھے طنز نگار بنایا تھا۔

میری کوٹھڑی مقفل تھی لیکن میری ذلت و رسوائی کے لیے اس کے کواڑ کھلے رکھے گئے۔ پھر ذلت و رسوائی اور جگ ہنسائی کو بھی میری کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا، پھر جیسے تنہائی بھی مجھے ہر لمحہ طعنے دینے لگی۔ قانون نے تو قید کی سزا دی تھی مگر مجھ سے میرے بچے بھی چھین لیے گئے۔ میں نے سب کچھ، بہت ہی کچھ برداشت کر لیا لیکن بچوں کی جدائی منوں وزنی سل کی طرح سینے پہ پڑی رہتی ہے۔ مہیب بوجھ اعصاب کو کچل رہا ہے۔

جیل میں ہر کوئی مفلس ہوتا ہے یا شاید جیل بنی ہی مفلسوں کے لیے ہے۔ مفلسی ہی سب سے بڑا جرم ہے نا! لیکن غریب لوگ عقل والے ہوتے ہیں۔ وہ رحم دل ہوتے ہیں، فیاض بھی، حساس بھی۔ دولت والوں کے ہاں وہ بات کہاں! غریب قید کو زندگی کا حادثہ سمجھتے ہیں اور ہر قیدی کو حادثے کا شکار۔ ان کا درد مشترک ہوتا ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دلوں کی تہوں سے ابھرتا ہے۔ ہر قیدی دوسرے قیدی کے دکھ اپنے سینے میں سمیٹنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ ان کے انداز میں بے لوث پن اور بے ساختگی ہوتی ہے اور ہم جو اپنے آپ کو معاشرے کی ناک کہلاتے ہیں ان سے بہت ہی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تو جیسے روح سے بیزار ہوتی ہیں ——— بے کیف اور مصنوعی ——— الفت جو روپے پیسے کے انبار سے ابھرتی ہے بے مایہ ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی سی حقیقت مجھ پہ قید خانے میں آشکار ہوئی ہے۔ ہم قیدی کو اچھوت اور دھتکارا ہوا انسان سمجھتے ہیں۔

معافی چاہتا ہوں، میں نے اپنے آپ کو بھی "ہم" میں شامل کر لیا ہے۔ میں اس خلق کے راندے ہوئے گروہ سے مختلف نہیں ہوں۔ میں اسی پا بجولاں انبوہ کا ایک فرد ہوں۔ میری بھی انفرادیت کا گلا گھونٹ کر اس ہجوم میں پھینک دیا گیا ہے جس کی کوئی انفرادیت اور کوئی شخصیت نہیں۔

انسانیت سے ہمارا رشتہ کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا گیا ہے۔ ہم سے چاند تارے بھی چھین لیے گئے ہیں۔ ہماری سحر کی تازگی بھی لٹ

لگ گئی ہے۔ جیسے اسے تیرگی نے ڈس لیا ہو۔ ہمیں زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نیچے سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ ہم سے دور تو نہیں، یہ وہ ہاتھ پر ہی تو ہیں۔ دیوار کے اس طرف۔ قریب ہی۔ لیکن اس قربت میں کتنی بھیانک دوری ہے۔ آزادی اور اسیری میں چند سلاخیں ہی نہیں ماہ و سال حائل ہو گئے ہیں۔ یہ مسافت اب کبھی طے نہ ہو گی۔ اب ہم سوسائٹی کی دہلیز پر کبھی قدم نہ رکھ سکیں گے جس طرح اچھوت کو مندر کے سائے تلے دم بھر کے لیے سستانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ لطف و کرم بھی ہم سے چھین لیا گیا ہے جو دل کے آبلوں اور روح کے زخموں کا مرہم ہوتا ہے۔

میں کیوں نہ اعتراف کروں کہ اپنے آپ کو میں نے خود ہی تباہ کیا ہے اور جو بھی تباہ ہوتا ہے اپنے ہی ہاتھوں ہوتا ہے۔ دنیا نے مجھ سے جو بھی سلوک کیا، اچھا ہی کیا۔ مگر اپنے ساتھ میں نے بھی جو کیا بہت برا کیا۔

جوانی کے آغاز میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں ادب اور آرٹ کی مملکت کا بادشاہ ہوں۔ کم ہی لوگوں کو اس قدر اہمیت ملی۔ اہمیت دیتا ہی کون ہے فن کاروں کو؟ تو اس وقت قدر و منزلت ملتی ہے جب وہ خود بھی مر چکے ہوتے ہیں اور ان کا دور بھی۔ یہ قدر و منزلت بھی اسی صورت میں ملتی ہے جب کسی نقاد یا مورخ کو سرِ راہے یاد آ جائے کہ اس نام کا بھی کوئی فن کار ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دور میں ہی اور اپنی زندگی ہی میں اپنی عظمت کو محسوس کیا اور لوگوں سے منوایا کہ میں عظیم فن کار ہوں۔ خدا نے مجھے کیا نہیں دیا تھا؟ میں جینئس تھا۔ سوسائٹی میں میرا نام اور مقام بلند تھا۔ شہرت، عظمت، دولت، بے فکری، تعیش پرستی، سبھی کچھ ہی تو دیا تھا خدا نے مجھے۔ اور میرے قلم میں قوت کہ میں نے اپنے دور کے تخیلات اور رجحانات میں زلزلے پیدا کر دیئے۔ میں نے ڈراموں میں وہ روح پھونکی کہ ڈراما تا ابد زندہ رہے گا۔ ڈراما ہو یا ناول، افسانہ ہو یا نظم، میں نے جسے بھی چھوا، اس میں وہ حسن اور وہ رنگ بھر دیئے جو دنیا والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے حق میں باطل کی رعنائیاں سمو کر باطل کو اس قدر دل فریب بنا ڈالا کہ حق و باطل کا امتیاز ختم ہو گیا۔ میں نے آرٹ کو زندگی کی عظیم حقیقت بنا کر ثابت کر دیا کہ زندگی محض فسانہ افسوں ہے —— یہ میرے فن کا کمال تھا، میرے تخیل کا عروج —— لیکن میرے دل نے اماں پائی تو عیش و نشاط اور آوارگی میں پائی۔

میں نے بے اندازہ دولت کمائی اور جی بھر کے اڑائی۔ رنج و الم، یاسیت اور تفکر و فکر کو میں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ زبوں حالی اور فاقہ کشی کو میں نے ہمیشہ موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن میرے ذہن نے کبھی تصور کی آنکھ سے، بھولے بھٹکے سے بھی زبوں حالی اور فاقہ کشی کو دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے مفلسی کے تصور سے ہی گھن آتی تھی۔ غریبوں کے ترجمان کے اعصاب پر تعیش اور خوش باشی سوار تھی۔ میں نے لندن، پیرس اور امریکہ کے ہوٹلوں میں ایک ایک رات میں سینکڑوں پونڈ لٹا ڈالے۔ عیش و نشاط میرا ایمان تھا۔ میں خیر کا باغی تھا۔ لیکن تان ٹوٹی تو کہاں ٹوٹی —— وقت رسوائی میں —— وقت نے محفلِ طرب سے نوچا اور کنجِ تنہائی کی متعفن گھٹن میں پھینک دیا۔ اب یہی میرا نصیب ہے۔ میں اُجڑا ہوا نصیب ہوں، بگڑی ہوئی بات ہوں جو کبھی نہ بن سکے گی۔

”بات جو بگڑی ہے اب سنور نہ سکے گی، نہ جانے میرے سینے میں کس نے چپکے سے کہا“۔ یاسیت کی یہ گھٹائیں اب چھٹ نہ سکیں گی۔ آہ! میرا دل بحرِ الم کی اندھیری تہوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا، کبھی نہ ابھرنے کو۔ میرے سینے کو غم و غصے اور انتقام نے وہ جھٹکے دیئے کہ میں نے اپنا ہی خون پی لیا۔ میرا غصہ بھی بے بس تھا اور جذبۂ انتقام بھی بے بس۔ اس بے بسی نے تلخی جو پیدا کی تو حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور انگ انگ میں انگارے سلگنے لگے۔

ورڈز ورتھ نے عجب کہا تھا —— دکھ آتے ہیں تو جاتے ہی نہیں۔ دکھ کی فطرت میں جس قدر تاریکی ہے اسی قدر دوام ہے —— تو

مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے ہی الفاظ کے معانی کی گہرائی کا علم نہ تھا۔ ورنہ ضرور مجھ سے پوچھتے کہ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔

لیکن وہ لمحے آئے کہ مجھے مسرت سی ہوئی کہ چلیے دکھ ہی سہی دوام تو ہے۔ یہ کھٹکا تو نہ ہوگا۔ جانے کل کیا ہو؟ آج دکھ ہے تو کل بھی یہی ہوگا۔ اس مسرت میں خود فریبی تھی یہ بھی میری فنکاری کا کمال تھا کہ میں نے اپنے لیے حسین ترین فریب تخلیق کر لیا۔ میری ایسی تخلیق کے تاریک اجالوں سے خود آگہی کی پہلی کرن پھوٹی۔ یاسیت کے جھروکے سے کرن نے جو جھانکا تو دھندلکے میں مجھے اپنا آپ نظر آنے لگا۔ میری حیثیت بدل بدل سی گئی تھی۔ میرے چہرے پر رنج والم اور شکست خوردگی کے جو تاثرات تھے مدھم پڑنے لگے اور ان کی جگہ عجز و انکسار کی رونق آنے لگی جیسے مریض نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔

میں ڈوب چلا تھا۔ خود آگہی نے مجھے تھام لیا۔ اپنی ہی مجروح ہستی سے اٹھتی ایک پیاری پیاری، ٹھہری ٹھہری سی آواز نے مجھے قائل کر لیا کہ دنیا میں کوئی شے بیکار نہیں اور حالات کی ہر کروٹ بلا مقصد نہیں۔ حالات کی نیت کبھی خراب نہیں ہوتی۔ دکھ اور اندوہ بھیانک اور روح کش ہی سہی بیکار نہیں۔ ان کے بھی معانی ہیں اگر سمجھ سکو۔ ان کا بھی مقام ہے اگر پا سکو۔ معانی گہرے ہیں مقام بلند ہے۔

کچھ علم و فضل نے ساتھ دیا کچھ اپنی ذات آڑے آئی۔ میں نے اپنے ہی غم گزیدہ سینے سے ایک خزانہ ڈھونڈ نکالا —— عجز و انکسار، کسر نفسی —— یہ عظیم دریافت تھی جس نے میرے رجحان اور ردعمل کا رخ ہی موڑ ڈالا۔ میں جو مایوسیوں کی کھائی پہ کھڑا تھا اور کوئی دم گرنے کو تھا ایک شاہراہ پہ چل پڑا جس پہ نہ کھائی تھی نہ اندھیرا۔ اگر قید خانے سے باہر کوئی مجھے کہتا کہ چھوٹے پن میں بھی بڑا پن ہے، انکساری اور جھک جانے میں بھی برتری ہے تو میں اسے کسی سر پھرے فلسفی کی جھک سمجھ کر ہنس دیتا۔ میں کسی کے آگے کبھی جھکا نہیں تھا۔ میرا کوئی قبلہ نہیں تھا۔ میں اپنا خدا خود تھا۔ لیکن اس فلسفے نے آپ ہی آپ میرے اندر جنم جو لیا تو میں نے بڑی خندہ پیشانی سے اس حقیقت کو سینے میں سمو لیا کہ انکساری میں جو عظمت ہے وہ نرالی ہے۔ جس نے اس حقیقت کو پا لیا اس نے اپنی فطرت کی سنگلاخ چٹانوں کی تسخیر کر لی۔ لاریب سب سے بڑی فتح یہی ہے۔

جب میں نے اپنے آپ پہ فتح پائی تو انوکھا سا سرور اور کیف ملا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دل و دماغ میں قید کے خلاف اور مجھے قید کرنے والوں کے خلاف جو غصہ بھر گیا تھا وہ یوں اڑ گیا جیسے سورج کی تمازت سے ہلکے ہلکے بادل فضاؤں کی نیلاہٹ میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ میرے ذہن سے امارت، فیشن، تعیش و آوارگی کی یادیں مٹ گئیں۔ کوئی نقش ہی نہ رہا جو میری یادوں کو الٹے پاؤں ماضی تک لے جاتا۔ میں نے ماضی سے رشتہ توڑ ڈالا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ جیل سے سوسائٹی اور انسانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ لے کر نہیں ایک مقدس سا جذبہ لے کر نکلوں گا۔ میں در در بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کروں گا لیکن بھیک غریبوں سے مانگوں گا۔ غریب فیاض ہوتے ہیں، دیتے ہیں کچھ نہ ہو تو دھتکارتے نہیں۔ وہ اپنے دل اپنے جھونپڑوں کے کواڑوں کی طرح کھلے رکھتے ہیں۔ امیروں میں وہ بات کہاں! جانتا ہوں مجھے کھویا ہوا چمن نہیں ملے گا۔ میرا آشیاں جل چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ راکھ آشیاں نہیں ہوتی۔ میں اب جلے ہوئے تنکوں کو نہ ڈھونڈوں گا۔ مجھے راتیں ویرانے میں گزارنی پڑیں تو میں چاند تاروں اور فلک کے نکھار سے دل بہلاؤں گا۔ انہی کے حسن پہ نظمیں لکھوں گا۔ شب کی تاریکی کے قصیدے لکھوں گا۔ کس مپرسی اور بدحالی میں میری تخلیقی قوتوں کو جلا ملے گی۔ اب جب کہ میرا دل خود ساختہ بڑے پن کے احساس، حسد، بغض، ظاہرداری اور تصنع سے آزاد ہو گیا ہے میں زندگی کی شاہراہوں پہ سینہ تان کر چل سکوں گا۔ میں محبت کروں گا، اس کے عوض مجھے محبت ملے گی۔

مذہب، اخلاقیات، فلسفہ اور منطق اب میری دستگیری نہیں کر سکتے۔ میرے اتالیق میری عمر کی قیمتی گھڑیاں ضائع کرتے رہے ہیں۔ مجھے جو کچھ سکھایا ہتھکڑیوں، آہنی سلاخوں اور قیدِ تنہائی نے سکھایا ہے۔ اس مقید اور متعفن فضا میں جہاں پابجولاں انسانیت سسک اور کراہ رہی ہے مجھے وہ سبق ملا ہے جو مجھے فلسفے کی ضخیم کتابیں نہ دے سکیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جس نظامِ معاشرت اور جس قانون نے مجھے سزائے قید دی ہے وہ دونوں ہی ناقص ہیں لیکن میں نے ان دونوں کے نقائص سے جو بات نکالی ہے وہ کسی پہلو ناقص نہیں۔ میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے انسانی کردار اور اخلاقیات کے ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ میں بھٹک گیا تھا۔ راہ پا گیا ہوں۔

میں جب پہلے روز قید خانے میں آیا تو قیدیوں نے مجھے کہا ——— اپنے آپ کو بھول جاؤ، جو کچھ کہ تم تھے وہ اب نہیں ہو ——— اور جب میری رہائی کا وقت آیا تو قیدیوں نے کہا ——— اب بھول جاؤ کہ تم کبھی قید بھی ہوئے تھے ——— مگر میرے لیے دونوں نصیحتیں قابلِ قبول نہیں۔ تجربات کو فراموش کر دینے سے کردار کی نشوونما رک جاتی ہے اور انسان کے ہونٹوں سے ایک جھوٹ چپک جاتا ہے ——— نہیں! میرے ساتھ یوں نہیں ہوا تھا ——— میں اب جھوٹ نہ بولوں گا۔ جس طرح جسم ہر موسم اور قدرت کے ہر اچھے برے رنگ کو اپنے خلیوں میں جذب کر کے صحت مند رہتا ہے، اسی طرح روح آسائشوں اور ٹھوکروں سے، عروج و زوال سے، مسرت اور غم سے، ظلم اور مظلومیت سے اثرات اخذ کرتی ہے اور تخیلات میں عظمت اور تصورات میں پاکیزگی اور اٹھان پیدا کرتی ہے۔

میری زندگی میں دو اہم موڑ آئے ہیں۔ ایک جب ماں باپ نے مجھے مدرسے میں داخل کیا، دوسرا جب سوسائٹی نے مجھے جیل میں داخل کیا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ قید خانے کے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ میں نے لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے بچے کی طرح اچھی اچھی خوشنما چیزوں کو توڑ پھوڑ دیا تھا مگر اب ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑ جوڑ کر انہیں نئی نئی شکلیں دے رہا ہوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب کسی نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میرے متعلق اب لوگ کچھ بھی کہیں مجھے پرواہ نہیں۔ مجھے اب اسی حقیقت سے سروکار ہے جو میرے احساسات نے جذبات سے نکل کر کال کوٹھڑی اور رسوائی سے اخذ کی ہے اور یہ حقیقت میری شخصیت کا لازمی جزو بنتی جا رہی ہے ——— عجز و انکسار۔

مجھے چند ایسے گناہوں کی بھی سزا مل گئی ہے جو مجھ سے ابھی سرزد نہیں ہوئے لیکن ان گناہوں کی سزا بھی مل گئی ہے جو میں نے کئے تھے۔ میں اس پر بھی خوش ہوں اگر یہ فلسفہ صحیح ہے کہ خدا نیکی کی بھی سزا دیتا ہے بدی کی بھی تو میں سر جھکا لیتا ہوں۔ مجھے سزا ملی ہے، میں گناہ گار تھا۔ میں شرمسار نہیں، سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔

جب قیدی سزا کا بھیانک موسم پورا کر کے جیل سے نکلتا ہے تو اعصاب پر قید خانے کا آسیب اٹھائے پھرتا ہے۔ وہ اس بوجھ کو سینے کی ظلمت میں چھپانے کو ہلکان ہونے لگتا ہے لیکن چھپا نہیں سکتا۔ وہ سوسائٹی سے چھپتا پھرتا ہے، چھپ نہیں سکتا۔ وہ زیست کے اندھیرے سے غاروں میں سوسائٹی کی نظروں سے اوجھل ہو کر سسک سسک کر مر جاتا ہے۔ خود نہ مرے تو اس کی روح مر جاتی ہے۔ یہ سوسائٹی کا جرم ہے۔ سوسائٹی ہی اسے یاد دلاتی رہتی ہے کہ وہ مجرم ہے، سزا یافتہ ہے، خلق کا راندہ ہوا انسان ہے۔ سوسائٹی چاہتی ہے کہ وہ اپنے متعلق اس حقیقت کو نہ بھولے۔ اس کے ردِ عمل کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ وہ سوسائٹی کا منہ نوچنے لگتا ہے یا اپنا وہ بھی خزینہ [illegible]۔ دونوں صورتوں میں اس کے سینے کا انسان مر جاتا ہے اور وہ چلتا پھرتا پتھر یا شعلہ بن

جاتا ہے۔ انتقام کا شعلہ جہیں سے جرم کی تخم ریزی ہوتی ہے اور جرم پرورش پاتا ہے۔

لیکن میرا ردِ عمل مختلف ہوگا۔ لوگ گمنامی کی دنیا سے جرائم کی بستی میں آتے ہیں لیکن میں شہرت سے اس اندھیرے میں پھینکا گیا ہوں۔ معاشرہ جب اپنی برائیوں پر پردہ ڈال کر مجھ پر انگلی اٹھائے گا تو میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ میں اپنے فن اور دھن میں کھو جاؤں گا کوئی نظم، کوئی افسانہ، کوئی شاہکار ڈرامہ تخلیق کر کے اپنا کھویا ہوا نام پھر سے حاصل کر لوں گا۔ سوسائٹی مجھے وہ مقام دے نہ دے جو میں کھو چکا ہوں ادب اور آرٹ کی دنیا کے باسی تو مجھے میرا تخت و تاج لوٹا دیں گے۔ سوسائٹی کو شرمسار کرنے کا اس سے بڑھ کر اور طریقہ کیا ہو سکتا ہے!

میں اس افسوس ناک حقیقت پر شرمسار نہیں ہوں گا کہ میں دو برس جیل میں رہا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اگر میں قید نہ ہوتا تو زندگی کا حقیقی رُخ کبھی نہ دیکھ سکتا نہ اپنی خود سری کو تسخیر کر کے اپنی ڈھکی چھپی روحانی قوتوں کو دریافت کر سکتا۔ میری اپنی ذات میرے لیے عظیم انکشاف ہے۔ میں نے اپنی ہستی میں مرے ہوئے انسان کو زندہ کر لیا ہے اور اپنے آپ کو مار دیا ہے۔ میں نے جامِ حیات کو عیش و نشاط سے لبریز کر لیا تھا۔ لیکن قدرت کی ایک ہی ٹھوکر نے جام لڑھکا دیا اور اب اسے دائمی مسرت سے بھر کر میرے لرزتے ہاتھوں میں دیا گیا۔

میں اس فلسفے کو کہ "مذہب گناہ سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے" مذہبی پیشواؤں کی بڑ سمجھتا رہا ہوں۔ میں ڈانٹے کے بھی اس فلسفے کو کہ "دکھ درد اور رنج و الم انسان اور خدا کا رشتہ مضبوط تر بنا دیتے ہیں" کبھی قبول نہیں کیا تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک روز یہی فلسفہ میرے خام استدلال کو کچل کر مجھے جینے کا نیا ڈھنگ سکھا دے گا۔

میں جب جیل میں نیا نیا آیا تھا تو میرے دل میں مر جانے کی خواہش بڑی شدت سے تڑپتی تھی۔ غم و غصے اور جذبۂ انتقام نے اس قدر مجبور کیا کہ میں کسی کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ میں نے خودکشی کی ٹھان لی لیکن میں ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ چکی کے دو پتھر مجھے پیسنے لگے۔ میں کراہنے لگا اور آنسوؤں کی روانی میں میں کوٹھڑی کے فرش پر دو زانو ہو گیا اور خدا سے نجات کی التجا کی۔ یہ میری بے بسی اور شکست خوردگی کی انتہا تھی ورنہ میں تو کلیسا کے خدا کے آگے کبھی جھکا نہیں تھا۔ جلتے ہوئے سینے سے فریادیں جو نکلیں تو خدا نے میری سن لی۔ بے بسی کی التجا کو خدا سن ہی لیا کرتا ہے۔ میرے کھنچے تنے اعصاب ٹھکانے پر آنے لگے اور مجھے آنسوؤں اور دعا نے ایسا سکون دیا جس کا ذائقہ میں نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ میں نے کوٹھڑی کی تنہائی میں خدا کی غیر مرئی موجودگی کو محسوس کیا۔ میں نے خدا کو پایا اور نجات بھی پالی جیسے مجھے اسیری میں ہی آزادی مل گئی۔ میرے دل سے عزم سا ابھرا کہ میں خوش باش رہوں گا۔ سر جھٹک کے جو دیکھا تو رنج و الم بدستور موجود تھے لیکن ان کی ہیئت حسین ہو گئی تھی۔ مجھے رنج و الم سے بھی پیار ہو گیا۔ اور خیال آیا کہ سوچوں تو سہی کہ غم سے بڑھ کر بھی کوئی حسین شے دنیا میں ہے؟

اگلے ہی روز دو دوست مجھے ملنے آئے تو میں نے سوچا کیوں نہ مظلومیت کا اظہار کر کے انہیں بھی غمزدہ کر دوں جو جانے کتنی دور سے مجھے ملنے آئے ہیں۔ وہیں کیوں اپنے سینے کا آتش دان ان کے دلوں میں انڈیل دوں۔ جب خیال آیا کہ میں رنجیدہ ہو کے شکوہ کروں گا تو مجھ سے ہمدردی کریں گے تو سوچا کہ یہ تو بھیک مانگنے والی بات ہے۔ میں بھکاریوں کی طرح مظلوم بن کر ہمدردی کے دو چار ٹکڑوں کی بھیک مانگوں گا؟ جھٹ سے اس خیال نے میری خودداری کو بیدار کر دیا۔ میرے دوست آئے۔ میں ان سے ملا۔ وہ نصف گھنٹہ میرے ساتھ رہے اور تمام عرصہ میں چہرے پر شگفتگی اور لب و لہجے میں تازگی برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا اور میں اس حسین کوشش میں کامیاب تھا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ میں خوش باش انسان تھا۔ غم اور دکھ سے میرا دور کا بھی واسطہ تھا نہ کبھی پالا پڑا تھا۔ یاد آتا ہے کہ میری ماں مجھے گوئٹے کا ایک شعر سنایا کرتی تھی — جس نے رنج و غم نہ دیکھا۔

نیم شب کی آہیں نہ بھریں
صبح کو نالے نہ کیے
اے خدا
وہ تیری قوت کو کیا جانے!

لیکن میں ماں سے کہا کرتا تھا کہ میں رنج و غم کبھی نہ دیکھوں گا نہ میں راتوں کو آہیں بھرنا چاہتا ہوں۔ میں آرام سے گہری نیند سو کر ہنستا کھیلتا اٹھنا چاہتا ہوں۔ ماں نہ جانے مجھے کیا کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور میں کچھ نہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر وہی فلسفہ وقت نے سمجھایا آخر میں نے جیل و محبت قبول کر لیا۔

میں اب سمجھا ہوں کہ غم انسانی حیات اور جذبات میں سب سے اہم حس اور سب سے بڑا جذبہ ہے۔ یہ محک بھی ہے پیمانہ بھی۔ ایک عظیم آرٹ جس نے عظیم فن کار پیدا کیے۔ ملال اور مسرت دو متضاد احساس ہیں لیکن ان میں ایک فرق اور بھی ہے۔ مسرت کے پس منظر میں متعدد احساسات اور جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں بددیانتی بھی ہو سکتی ہے، کج خیالی اور آوارگی بھی اور جانے ایک انسان کی مسرت میں کتنے انسانوں کے نوحے سسک رہے ہوتے ہیں لیکن ملال کے پس منظر میں ملال ہی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مسرور انسان کی روح بھی مسرور ہو لیکن ملول انسان کی روح بھی ملول ہوتی ہے۔ روح بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم، دکھ اور درد خدا کو بھی عزیز ہیں اور جس نے خدا کو پایا ہے دکھ اور درد کے اندھیروں میں ہی پایا ہے۔

میں فخر سے کہتا ہوں کہ مجھے ان باتوں پر یقین ہے۔ دور، بہت دور خلاؤں میں مجھے ایک مکمل سیارہ چمکتا نظر آ رہا ہے وہ یقیناً خدا کا شہر ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ایک بچہ بھی اس تک پہنچ سکتا ہے لیکن میرے لیے اور مجھ جیسے لوگوں کے لیے بات مختلف ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک لمحہ کا سفر جاودانہ صد سالہ بن جائے۔ ہم ابد کی سوچتے ہیں مگر ہم زماں میں آہستہ آہستہ گزرتے ہیں۔ جیل کے باسی تو بہت آہستہ گزرتے ہیں۔ ہم قیدیوں کے لمحات لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہیں۔ ان کی کمریں جیسے قیدیوں کی ہی طرح ٹوٹ کے جھک آئی ہیں اور یاسیت نے روحوں کے دیے پھونک مار کر بجھا دیے ہیں۔

میرے دوستوں اور ہم عصروں کو شاید یقین نہ آئے کہ قید خانے کی روح کش گھٹن میں بھی لوگ اپنی فطرت تک بدل کر حلیمی اور انکساری کے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ بظاہر ناممکن ہے۔ جیل کی زہریلی تنہائی اور قید و بند کی صعوبتیں قیدی کے سینے میں بغاوت کا لاوا ابھارتی ہیں۔ وہ باغی ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ سے، سوسائٹی سے، خدا سے بھی باغی۔ سب سے بڑی بے رحمی تو یہ ہوتی ہے کہ جیل قیدی کا دل توڑتی نہیں، دل کو پتھر بنا دیتی ہے۔ قیدی خون جگر پی کر اور انگارے نگل کر لمحہ بہ لمحہ زندہ رہتے ہیں۔

جس کے سینے و دل میں بغاوت اور غم و غصے کے شعلے بھڑک رہے ہوں اسے کیا خبر کہ روحانی عظمت کیا ہے اور کردار و اخلاق کسے کہتے ہیں۔ لیکن مجھے کسی نے جھنجھوڑ کے کہا کہ اسی کیچڑ اور بدبودار دھند میں تجھے راہ حق ملے گی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آکسفورڈ میں ایک بار اپنے ایک ہم جماعت سے کہا تھا کہ میں کرۂ ارض کے گوشے گوشے کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں اور میں روئے زمین

کے ہر پیڑ کا ثمر چکھوں گا، یہ خواہش نہیں جو موم تھا میں نے پوری کی ۔ ہر ڈال کا گدرا ہوا اور شیریں ثمر کا پھل کھایا، کلی کلی کا رس چوسا، یہی میری خواہش تھی کہ میں ڈال پات کی ہریالی اور گل و ثمر کی دلفریبی اور مٹھاس کو ... سارا جہاں ہی میٹھا تھا۔ اس جنت سے پرے چھائی ہوئی دھند کو میں نہ دیکھ سکا۔ گمان بھی نہ تھا کہ یہ دھند گھٹا ٹوپ بن کر بڑھی چلی آ رہی ہے اور ایک روز میں اس میں گم ہو جاؤں گا پھر میرا دل مجھے ڈھونڈتا پھرے گا۔ میں تو زندگی کا یہی رخ دیکھنے کا عادی تھا۔ جو خوشنما اور دلفریب تھا۔

ناکامی، نامرادی، تذلیل، مفلسی، غم، مایوسی، مصائب، اشک بھی کسی دل جلے کے سینے سے نکلے ہوئے تیر تھے مگر یہ ظالم بھی ضمیر پر حسین گناہ ہر کا ہلکا پھلکا بوجھ بھی نہ سہار سکے اور درماندگی اور یہ تمام بدنصیبیاں ایسی تھیں جن سے میں بیگانہ نہ تھا۔ خود وہ بھی رہا لیکن دولت اور اپنی ہی عظمت کے سہارے ان سے محفوظ رہا اور میں مطمئن بھی تھا کہ تمام عمر ان سے محفوظ رہوں گا۔ یہ تھی میری زندگی۔ سوچتا تھا، دکھ اور درد میں جینا بھی کوئی جینا ہے۔ مگر وقت نے مجھے پامال کر کے ایک ایک بدنصیبی سے گزارا تو میں نے ہر ایک کا ذائقہ چکھا۔ جس طرح دیس دیس گھوم کر ہر پیڑ کا پھل کھایا تھا۔ یہی بدنصیبیاں میری خوراک بن گئیں اور اب یہی میری روح کی غذا ہے۔

وہ کونسی مسرت تھی جس کے ذائقے سے میں بیگانہ رہا۔ میں نے روح کے موتی کو شراب میں پھینک دیا تھا۔ میں موسیقی کی مترنم تانوں میں شہد کے چھتوں میں اور حسینوں کی محفل میں جیتا رہا۔ مجھے تاسف نہیں کہ میں نے عیش و نشاط میں دن گزارے ہیں۔ وہ عیش و نشاط کے بھی دن تھے گزر گئے۔ گاہے یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک لمحہ تھا جو گزر گیا۔ اضطراب شروع ہوتا ہے اور میں نے جو زندگی قید خانے سے باہر گزاری ہے اس کی رعنائیاں تو محض فریب نگاہ تھیں۔ عظیم حقیقت کو تو میں نے اب پایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے خدا کو بھی اب دیکھا ہے۔

میں نے مذہب کا مطالعہ خوب کیا ہے مگر مذہب سے ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے لیکن مجھے جب عرش سے نوچ کر زنداں کے متعفن فرش پر پھینک دیا گیا اور جب قفس کی تنہائی نے میرا منہ چڑایا تو میرے ذہن میں تاریخ انسانیت کی عظیم اور مقدس ترین شخصیت یسوع مسیح کی تعلیمات گونجنے لگیں۔ یہ گونج اس قدر رس بھری، اس قدر سریلی اور اس قدر حقیقی تھی کہ میں اس میں کھو گیا اور میں نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا یوں میری نظروں کے سامنے آ گیا جیسے ایک غیبی قوت نے ایک ضخیم کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی ہو۔ میں اس کے اوراق میں کھو گیا۔ ہر ورق پر مجھے یسوع مسیح کی مقدس مسکراہٹ نظر آئی۔ اسی مسکراہٹ کے پس منظر میں مجھے وہ دکھ، آلام اور جان لیوا مصائب بھی نظر آ گئے جو یسوع مسیح نے جھیلے تھے۔ میں نے بلا تامل یقین کر لیا کہ حضرت مسیح نے شخصیت کا پر تو اور معجزے مصائب کے اعتبار سے ہی حاصل کئے ہیں۔ وہ پتھروں پہ گہری نیند سویا، سوکھے ڈالوں کو بڑی رغبت سے نگلا، دریاؤں کے سیلابی پانی کو میٹھی شراب کی طرح پیا۔ اسے پتھر مارے گئے گلی گلی رسوا کیا گیا۔ اس پہ غلاظت پھینکی گئی۔ آخر اسے سولی پر چڑھا دیا گیا تو بھی وہ مسکرا رہا۔ یہی اس کی عظمت تھی، یہی پیغمبری!

میرے ذہن میں یسوع مسیح کی زندگی کے نشیب و فراز ابھر آئے اور میں شرم سار ہونے لگا کہ میں بندہ ناچیز خود پہ دکھ، وہ مصائب اور نامرادیوں پہ رو رہا ہوں کیوں نہ میں اعتراف شکست اور اقبال جرم کر کے اسی ابتلا سے مسکراہٹیں اخذ کروں۔

میں نے ہر چوٹ سہی یہ جانتے ہوئے کہ سوسائٹی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے، دولت، شہرت، عزت اور نام بھی۔ میں اب قیدی تھا اور مفلس مگر ابتلا کی ابتدا میں میرے دل دھڑکا اس ظلم کو نہ سہ سکے کہ مجھ سے میرے بچے بھی چھین لیے گئے ہیں۔ جب مجھ پر خود آگہی کی گرہیں پڑنے لگیں تو مجھے خیال آیا کہ بچے کا وجود خدا کی ہستی کی طرح پاک اور مقدس ہوتا ہے، میں اب دونوں کے

قائل نہیں رہا۔ مجھے حق ہی نہیں کہ بچے کو جھوٹوں میں پالی ہوں۔ میں نے جب یہ تسلیم کر لیا تو حیرت بھی میری رگوں میں جذب ہو گئی اور روحانی مسرت دوبالا ہو گئی۔

بیشتر انسانوں کی شخصیتیں اپنی نہیں ہوتیں۔ انھوں نے انداز اور ادائیں مستعار لی ہوتی ہیں۔ نہ خیال اپنے نہ تصورات اپنے۔ ان کی حرکات و سکنات کسی اور کی نقال ہوتی ہیں۔ وہ صبح و شام اداکاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ شاید میرا بھی یہی حال تھا لیکن یسوع مسیح کی شخصیت اپنی تھی، اپنی انفرادیت۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خدا کا نور تھا لیکن گمنام سا گذر گیا تھا —— زندگی کی چراگاہ کے کسی پیڑ تلے بیٹھا رہا اور گذر گیا —— جس نے اسے نور بخشا وہ انفرادیت ہی تو تھی۔ جداگانہ ایک شخصیت۔ اُسے غریبوں پر ترس آتا تھا اور امیروں پر رحم۔ اس کے نزدیک غربت نعمت تھی اور امارت ایک ٹریجیڈی تھی۔ میں نے جب قفس کے گوشے میں تنہا بیٹھ کر اپنے آپ کا جائزہ لیا تو خیال آیا کہ میں اس ٹریجیڈی کا اہم کردار رہا ہوں اور اسی کا شکار۔ طربیہ پہلو تو یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میں نے انفرادیت اور خودی پالی ہے۔

یسوع مسیح کی تعلیمات مجھے یاد آئیں تو میں انہی میں ڈوب گیا۔

جب خدا کہتا ہے کہ دشمن کو بخش دو تو اسے آپ کے دشمن سے نہیں آپ کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے وہ آپ کے دل سے غصہ اور حقارت نکال کر اس میں ترحم اور محبت کا نور بھرنا چاہتا ہے۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا جو کچھ تمہاری ملکیت ہے بیچ ڈالو اور غریبوں کو دے دو تو وہ آپ کے دل میں غربت اور بے مائگی کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اور آپ کے دل سے دنیا کے رنگ و بو کی ہوس اور جذبہ ملکیت نکال دینا چاہتا تھا۔

جب مجھے غربت کا احساس ہوا تو ابتدا میں تو میں جل اٹھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں نے احساسات کو کریدا تو غربت کے احساس سے مجھے بے بہا خزانہ ملا۔ اب جب میں قید خانے کی بے مزہ سی روٹی کھا چکتا ہوں تو ٹین کی ٹوٹی ہوئی پلیٹ میں روٹی کے جو چھوٹے چھوٹے ذرے بچ جاتے ہیں وہ بھی چن کر منہ میں ڈال لیتا ہوں اس لیے نہیں کہ میں اس قدر بھوکا ہوتا ہوں بلکہ اس لیے کہ میں خدا کی نعمت کا ایک ایک ذرہ جسم میں داخل کر لینا چاہتا ہوں۔ یہ ذرا ذرا سے ننھے ذرے میری روح کو منور کر دیتے ہیں۔

یسوع مسیح کو بے علم لوگوں سے بہت محبت تھی میں اب سمجھا ہوں کہ اس محبت کا باعث کیا تھا۔ بے علم اور گنوار کے دماغ میں اچھے خیال سمانے کو بہت جگہ ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں پڑھے لکھے لوگوں کو مسیح نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے کتابوں سے استدلال کی راہ فرار ڈھونڈ لی ہے۔ وہ ایک بُرے فعل کے جواز میں نہایت خوبصورت بات کہہ سکتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ کتابوں نے انھیں علم اور استدلال دیا ہے عقل نہیں۔ ان کے دلائل علمی ہوتے ہیں عقلی نہیں۔ میں نے بھی علم اور فلسفے پر بہت کچھ کیا ہے اور میں نے بھی علمیت کا سہارا لے کر سنگین گناہوں کا جواز ڈھونڈا ہے۔ مگر ٹھوکر لگی اور میں زنداں کی دہلیز پر آگرا اور روح لہولہان ہو گئی۔ ضمیر کو ہوش میں آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ کھنڈر کی طرح خالی ہے۔ میرے سیکڑوں علمی دلائل کے جواب میں قدرت نے ایک ہی علمی دلیل دے کر میری زبان گنگ کر دی اور اب میں نے خالی ذہن میں حضرت عیسےٰؑ کو بٹھا لیا ہے۔

لوگوں کو زاہد اچھے لگتے ہیں لیکن یسوع مسیح نے گناہ گاروں سے محبت کی ہے۔ وہ گناہ گاروں کو ان کے گناہ یاد دلانے سے گریز کرتا رہا۔ اس نے کبھی بھی نہ چاہا تھا کہ کسی مجرم کو اس کے جرائم کے پلندے سمیت کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے تاکہ وہ مستقبل کو بھول کر ماضی کی غلط کاریوں پر پچھتاتا رہے۔ نہیں۔ ماضی پر پچھتانے سے کیا حاصل؟ ماضی تو بدلنے سے رہا۔ یونانیوں نے کہا ہے —— ماضی کو تو خدا بھی

نہیں بدل سکتے۔ عیسیٰ مسیح نے دوسروں کے گناہوں سے پیار کے سبق دیئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گناہ گاروں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ جب توبہ کر لی تو وہ اپنی ذات سے روشناس ہوئے اور اس روشناسی نے ان پر علم و فضل کی جنت کے دروازے کھول دیئے۔

خود آگہی آسان نہیں۔ انسان سورج کے ذروں کو ترازو میں تول لے گا، چاند تک سیڑھیاں لگائے گا، سات آسمانوں کے تارے بھی گن لے گا لیکن اپنی ذات کے خلاف تحقیق نہ کر سکے گا۔ مجھے امید ہے کہ اسیری سے آزاد ہو کر میں ایک کتاب لکھنے تک زندہ رہ سکوں گا پھر یہ لکھ سکوں گا — ہاں یہ ہے وہ منزل جہاں فن کار اندر کی زندگی انسان کرتے آتی ہے۔

آغازِ قید کے چند مہینے میں جیل میں کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا لیکن آخری چند مہینے میری روح اور رجحانات میں ایسے تعمیری تغیر آئے جنہیں میں یہ تمام روئیداد لکھنے کے باوجود سمجھتا ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکا۔ جیل میں آ کے میرے سینے سے فریاد نکلی تھی — آہ! کس قدر بھیانک انجام ہے! — لیکن قید کے دوسرے ہی سال روح سے آواز اٹھی — آہ! کس قدر حسین آغاز ہے! یہ مبالغہ نہیں، یہ میرا کمال ہے۔ یہ اس حقیقی انسان کا معجزہ ہے جو ہر انسان کی ہستی میں نہاں ہے اور جو مصائب کے زلزلوں اور جیل کی گھٹن میں بیدار ہوتا ہے۔ میں نے اس انسان کو شراب اور تعیش پرستی میں ڈبو دیا تھا لیکن آہنی سلاخوں کے عقب میں میری ہستی کا گم ہوتا ہوا ایک عظیم انسان بیدار ہو گیا۔

مجھے گذشتہ مئی میں رہا ہو جانا چاہیئے تھا۔ میں نے کوشش بھی کی تھی مگر مجھے رہا نہ کیا گیا اور مجھے پورے دو سال جیل میں رہنا پڑا۔ اس وقت تو مجھے دکھ ہوا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ میں ایک سال جیل رہا ہو جاتا تو مجھے آج دکھ ہوتا کیونکہ میں اس وقت باہر آتا تو دنیا والوں کے خلاف زہریلی نفرت اور انتقام کے انگارے لے کے آتا اور میرا دل بغض اور کینے سے لبریز ہوتا لیکن میں اب محبت، خلوص اور صلح جوئی لے کے نکلوں گا۔ زنداں کے باسیوں نے میرے دل میں عجز و انکسار اور محبت بھر دی ہے۔ میں ان سب پابہ زنجیر ساتھیوں کا شکر گزار ہوں۔

جیلوں کے اندر کا نظام بہت ناقص ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے میں جان تک کے ایثار سے گریز نہ کروں گا۔ قیدیوں سے زیادہ تو قید خانے کا عملہ قابلِ اصلاح ہوتا ہے۔ دھتکارے ہوئے اس انبوہ کی اصلاح خلوص اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی ترویج کے بغیر ممکن نہیں کہ حضرت عیسیٰ جو ہر جگہ موجود ہے کلیسا سے لاپتہ ہے۔

میں جیل سے نکلوں گا تو مفلس اور قلاش کے روپ میں نکلوں گا۔ پچھلے برس میری بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی ہے اور میرے بچوں کو نہ جانے کون سے دیس لے گئی ہے۔ باہر میرا اب کچھ نہیں رہا لیکن سوچتا ہوں تو سکون ہوتا کہ باہر کی دنیا میں بے شمار چیزیں میری منتظر ہیں۔ اڑتے اڑتے بادل، کھلی فضائیں، سبزپوش وادیاں، وادیوں میں گنگناتی ندیاں، ان کے جل ترنگ اور قدرت کا تمام تر حسن اور فضل میری منتظر ہے۔

میری رہائی کے بعد میرے کسی امیر دوست نے کوئی پارٹی یا ڈنر دیا اور مجھے مدعو نہ کیا تو مجھے ذرہ بھر رنج نہ ہوگا۔ مگر کسی دکھیارے اور غریب انسان نے مجھے اپنے دکھ میں شریک نہ کیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میں اس کے بند دروازے توڑ کر اندر گھس جاؤں گا اور اس کے دکھ اس کے سینے سے نوچ کر اپنے سینے میں رکھ لوں گا۔ انسان ہوتے ہوئے دوسروں کے غموں میں بن بلائے شریک ہونے کا مجھے حق حاصل ہے۔

مجھے ایک بار پھر کہنے دیجئے کہ مجھے ۱۳ نومبر ۱۸۹۵ء کو اس جیل میں لایا گیا تھا لیکن یہاں لانے سے پہلے مجھے ریلوے سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر گھنٹوں کھڑا رکھا گیا جہاں مسافروں کا ہجوم رواں دواں تھا۔ مجھے ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا اور سارا ریلوے سٹیشن

قہقہوں سے گونج اٹھے لیکن ان کے قہقہوں میں نفرت اور حقارت تھی۔ اسی طرح مجھے تین بار ہتھکڑیاں پہنا کر بھرے بازاروں سے گزارا گیا اور چوکوں میں کھڑا کیا گیا لوگوں نے مجھ پر قہقہے لگائے اور فحش فقرے چست کیے۔ میں جیل میں آ گیا ہوں۔ اس رسوائی پر میں روز روتا تھا۔ راتوں کو نیند نہ آتی تھی تو میں رونے لگتا۔ جیل میں آنسو ارزاں ہیں۔ اہم نہیں۔ جس روز قیدی رونے سے رک جائے اس کی وجہ یہ نہ سمجھیے کہ وہ ٹوٹ چکا ہے بلکہ اس روز اس کا دل پتھر بن گیا ہے۔

وہ وقت کہ مجھ پر معاشرہ ہنستا تھا اور میں رو پڑتا تھا مگر آج میں معاشرے کی جلسی پر ہنس رہا ہوں لیکن میری ہنسی میں طنز نہیں، رحم اور پیار ہے اپنے اوپر ہنسنے والوں پر رحم آ رہا ہے کہ ان کے قہقہے مسرت سے محروم تھے مگر میری مسکراہٹ مسرت سے لبریز ہے ——— روحانی مسرتوں سے ——— وہ اس بت پر ہنستے تھے جس کی انہوں نے کبھی پوجا کی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے معبود بت کو خوشنما چبوترے سے اتار کر سولی پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

لوگ کہا کرتے تھے کہ میں خود پسند ہوں۔ ہاں، میں خود پسند ہی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر حسین شے کو دامن میں سمیٹ لوں۔ میں نے سمیٹ بھی لی مگر اب میرا دامن ان حسین چیزوں سے خالی ہو گیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی ذات میں دبکے چھپے ہیروں اور موتیوں کو سمیٹ کر اپنی زندگی کا دامن بھر لوں ——— میں نے بھر لیا ہے دامن!

جب ہتھکڑیوں کی جھنکار مجھے اپنی بے بسی یاد دلاتی تھی تو میں نے عمر بھر کی سب سے بڑی غلطی کی تھی کہ میں نے سوسائٹی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ خام سی ایک توقع تھی کہ جن لوگوں کی پیٹھ میں نے کئی بار ٹھونکی تھی وہ دوڑے آئیں گے مگر انہوں نے کہا ——— تم نے ہمارا قانون توڑا اور اب ہم ہی سے مدد چاہتے ہو؟ قانون تم سے وہی سلوک کرے گا جو اسے کرنا چاہیے۔ اور میں جیل میں پہنچ گیا۔ انسان اپنے دشمنوں کے انتخاب میں کبھی محتاط نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں ایسے اچھوتوں میں زندگی بسر کر رہا ہوں اور ایک روز وہ مجھے بھی اچھوت بنا ڈالیں گے۔

لوگ کہا کرتے کہ میں بڑے شاہانہ ٹھاٹھ میں رہتا ہوں جہاں جوانیاں رقص کرتی ہیں اور جام چھلکتے ہیں۔ ہاں، میں نے شاہانہ ٹھاٹھ دیکھے لیکن آج انکشاف سا ہو رہا ہے کہ میں زہریلے سانپوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں۔ میں وہ سپیرا تھا جس نے بین کے نغموں پر زہریلے ناگوں پر وجد طاری کیا تھا۔ مگر ناگ کو موقع ملا تو مجھے ہی ڈس لیا۔ میں نے آستین میں بے شمار سانپ پالے ہیں لیکن مجھے رنج نہیں۔ رنج ہے تو یہ کہ میں گنواروں کے ماحول میں پلا ہوں اور میں راجوں کی دنیا کا بادشاہ تھا۔ میری نگاہ میں اس جیب کترے کا مقام بلند ہے جس نے پہلے روز مجھے جیل میں دیکھ کر کہا تھا ——— تمہیں یہاں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے یہ جگہ ہمارے لیے ہے تمہارے لیے نہیں ——— کس قدر خلوص اور کس قدر اپنائیت تھی اس جیب کترے کے الفاظ میں جو وہ شک و شبہات کے پیچھے سے نکلے تھے۔ اس کے برعکس مہذب لوگ مجھے ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر چیخ کر ہنستے تھے۔ صرف اس لیے کہ میں ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔

میرے ایک دوست نے مجھے جیل میں کہا کہ تم بے قصور تھے۔ تمہارے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ میں نے اسے خفا ہو کے کہا میں بے قصور نہیں گناہ گار ہوں۔ جیل میں آنے تک میری تمام عمر گناہوں کا ایک تسلسل رہی ہے۔

جب جج میرے خلاف فیصلہ پڑھ رہا تھا اور میں مجرم بنا اس کی رائے سن رہا تھا تو مجھے خیال آیا کاش اپنے متعلق یہ سب کچھ میں خود کہہ رہا ہوتا۔ دوسرے کے منہ سے اپنے خلاف بات اچھی نہیں لگتی۔ میں نے اب محسوس کیا ہے کہ زندگی کا وہ لمحہ مقدس ترین ہوتا ہے جب انسان زمین پر دو زانو ہو کے اپنے گناہ اپنے سامنے پھیلا دیتا ہے اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اعتراف کرتا ہے کہ یہ گناہ میرے ہیں۔

چند مہینے باقی ہیں پھر میں رہا ہو جاؤں گا اور سمندر کے کنارے جھونپڑے میں جا رہوں گا کہتے ہیں سمندر روح کے زخم اور دل کے داغ دھو ڈالتا ہے۔ مجھے اب ماضی سے کوئی خوف نہیں۔ اگر سوسائٹی مجھے یاد دلائے گی کہ میرا ماضی جھوٹا اور مشکوک تھا تو میں نہیں مانوں گا۔ ماضی، حال اور مستقبل ایک ایک لمحہ میں جو گزر گئے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ خدا کی نگاہ کرم نے میری نظر بدل ڈالی ہے۔ شاعر کہتا ہے "سحر طلوع ہو رہی ہے" میں کہتا ہوں "خدا کا نور انگڑائی لے رہا ہے"

میں نے اب اپنا آپ خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ خدا ہی کے آگے نہیں میں ہر دکھ اور تکلیف کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ وہ بھی خدا یہ بھی خدا، دولت اور عیش و نشاط میں جو مسرت ہے وہ انسان کو عزیز ہے اور رنج و الم اور مصائب میں جو سرور ہے وہ خدا کو عزیز ہے۔

سوسائٹی میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ سہی۔ قدرت کی کائنات میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ قدرت، جس کی بارش اور دھوپ محل اور جھونپڑی پر یکساں پڑتی ہے مجھے چٹانوں میں ایک گوشہ عطا کر دے گی جہاں میرا بسیرا ہوگا اور جہاں میں بڑے سکون سے آنسو بہاؤں گا۔ رات مجھ پر تاروں سے مرصّع اندھیرے کا پردہ ڈال دے گی اور میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں دور نکل جاؤں گا۔ ہوا کے جھونکے میرے نقوش پا پر مٹی ڈال دیں گے اور سوسائٹی میرے تعاقب میں نہ آ سکے گی۔ سوسائٹی جان ہی نہ سکے گی میں کونسی راہ گزر پر کس منزل کو چلا جا رہا ہوں۔ میری منزل مجھے نظر آ رہی ہے، وہ سامنے، خدا کے قریب ہی۔

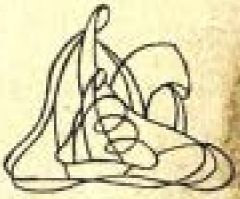

جہاں آرا بیگم

ولادت ——— ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (یکم اپریل ۱۶۱۴ء)

وفات ——— ۳ رمضان ۱۰۹۲ھ (ستمبر ۱۶۸۱ء)

جہاں آرا جسے عام طور پر "بیگم صاحب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے شاہ جہاں کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ وہ پاک منش اور پاکباز خاتون تھی اسے اولیائے کرام اور خاص کر اولیائے چشت سے قلبی لگاؤ تھا اس نے اولیائے کرام کے بارے میں دو رسالے ——— مونس الارواح اور صاحبیہ لکھے ہیں۔ مونس الارواح اولیائے چشت کے ملفوظات اور واقعات کا مرقع ہے۔ یہ ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو تمام ہوا۔ اس کے آخر میں جہاں آرا لکھتی ہے۔

زیارت اجمیر "فقیرہ حقیرہ جہاں آرا کہتی ہے کہ جب میں بخت کی یاوری اور طالع کی فیروزمندی سے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ اکبر آباد سے خطۂ پاک اجمیر کی طرف متوجہ ہوئی تو اٹھارویں ماہ شعبان المعظم ۱۰۴۹ھ سے ماہ رمضان المبارک روز جمعہ تک میں عمارات تال آنا ساگر میں مقیم رہی۔ خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں ہر روز ہر منزل میں دو رکعت نماز نفل ادا کرتی۔ ایک بار سورۂ یٰسین سورۂ فاتحہ پورے اخلاص اور عقیدت سے پڑھتی اور ان کا ثواب حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین کی پاک روح پر نثار کرتی۔ ان چند دنوں میں جو میں نے ان عمارات میں گزارے ادب اور عقیدت کی بنا پر پلنگ پر سونا گوارا نہ کیا۔ میں آپ کے روضہ متبرکہ کی طرف پاؤں نہیں پھیلاتی تھی بلکہ اس طرف پیٹھ بھی نہ کرتی۔ دن کا وقت درختوں کے نیچے بسر کرتی۔

حضرت پیر دستگیر کی برکت اور اس جنت نظیر سرزمین کے فیض سے جو ذوق، سکون قلب اور جمعیت خاطر مجھے حاصل ہوا وہ میں بیان نہیں کر سکتی ایک رات میں نے مولود اور چراغاں بھی کیا۔ روضہ کی زینت اور خدمت جس قدر مجھ سے بن آئی میں نے اس میں تقصیر نہ کی۔ ان شاء اللہ آئندہ ایسا کروں گی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ پنج شنبہ کے دن ۴ رمضان المبارک کو آپ کے مرقد مبارک کی زیارت سے سعادت اندوز ہوئی۔

ایک دن میں روضہ کی زیارت کے لیے گئی اور اپنے چہرے کو اس آستانہ کی خاک پر رگڑا اور دروازے سے گنبد مبارک تک ننگے پاؤں زمین چومتی ہوئی اندر پہنچی۔ جب میں گنبد شریف کے اندر داخل ہوئی تو سات مرتبہ اپنے پیر اور ہادی کے مرقد کے گرد طواف کیا۔ اپنی پلکوں سے جھاڑو دی۔ وہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ اس وقت اس عاجزہ پر ایسی حالت طاری ہوئی اور وہ ذوق میسر آیا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں ذوق و شوق کی بنا پر حیران تھی کہ اس وقت میں کیا کروں اور کیا کہوں۔ مقصد مختصر میں نے قبر پر اپنے ہاتھ سے عطر ملا اور پھولوں کی چادر جو میرے سر پر تھی اور جو میں خود اس جگہ کے لیے لائی تھی روضہ مبارک پر چڑھائی اور سنگ مرمر کی مسجد میں جو اس عاجزہ کے باپ نے بنوائی ہے جا کر نماز پڑھی۔ گنبد مبارک میں بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور سورۂ فاتحہ کا ثواب آپ کی روح پُرفتوح پر نثار کیا۔ مغرب کے وقت تک وہاں رہی۔ آپ کے مزار پر شمع

روشن کی اور چار گل پانی سے میں نے روزہ افطار کیا، وہاں عجیب شان دیکھی جو صبح سے بہتر تھی۔ اگر میں اختیار رکھتی تو ہمیشہ آپ کے روضہ میں رہتی۔ میں عافیت چاہتی تھی، عافیت اسی گوشے میں تھی اور سعادت سے مشرف ہوتی رہی جیسی چاہتی تھی کہ ایسی متبرک جگہ چھوڑ کر اپنے گھر آتی لیکن میں مجبور تھی

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

آخر با چشم گریاں اور دل بریاں صد ہزار افسوس کرتی ہوئی اس درگاہ سے رخصت ہوئی اور اپنے ڈیرے پر آئی۔ تمام رات عجیب بے قراری مجھ پر طاری رہی۔ اس روز کی صبح کو جمعہ کا دن تھا۔ والد بزرگوار کوچ فرما کر اکبر آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔

جہاں آرا کی دوسری غیر معروف تصنیف صاحبیہ ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ احمد آباد کے کتب خانے میں موجود ہے اور دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ اس رسالہ میں جہاں آرا نے ان تمام باتوں پر مجمل سا تبصرہ کیا ہے جو اس کی روحانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں آرا کی یہی خواہش تھی کہ وہ سلسلہ چشتیہ سے وابستہ ہو مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ آخر اس نے اپنے بھائی دارا شکوہ سے روحانی فیض کسب کرنا شروع کیا اور دارا شکوہ کے ذریعہ ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ وہ صاحبیہ میں لکھتی ہے:

بیعت کی کہانی

مجھے بیس سال کی عمر سے خواجگان چشت سے عقیدت اور ارادت ہے اور خواجہ معین الدین کا حلقۂ ارادت میرے گوش جان میں ہے۔ چند سال پیشتر میں آپ کے روضۂ پاک کی زیارت سے مشرف ہو چکی ہوں۔ ان سے میری یہ عقیدت زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ذوق طلب کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ میرے بھائی دارا شکوہ کی صحبت سے، جو عارف کامل ہے، یہ شوق بہت تیز ہو گیا ہے۔ بسنہ ۱۰۴۹ھ میں جب میں اپنے والد خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کی ہمراہی میں لاہور پہنچی تو میرا بھائی بھی میرے ساتھ تھا۔ اسی سال میرے بھائی کو والد نے کابل کی طرف روانہ کیا۔ بھائی کو الوداع کہتے ہوئے مجھ پر بہت زیادہ رقت طاری ہوئی۔ اس وقت میرے بھائی نے مجھے نفحات الانس کے مطالعہ کی تاکید کی۔ میں نے ہمیشہ اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھا اور اس سے روحانی فیض حاصل کیا۔

میرے والد نے کابل کا ارادہ کیا۔ میرے بھائی نے خطوں سے مجھے دو بزرگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ ان میں سے ایک شیخ شاہ دولہ دریائی تھے جو گجرات خورد میں سکونت رکھتے ہیں۔ دوسرے حاجی عبداللہ تھے جنہوں نے تال جلال گکھڑ کے جوار میں گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ جب ہماری سواری گجرات پہنچی تو میں نے اپنے ایک خواجہ سرا کے ذریعے شاہ دولہ کے پاس نیاز بھیجی اور فیض کی درخواست کی مگر جو کچھ میں چاہتی تھی وہ مجھے حاصل نہ ہوا۔ جب ہم تال جلال گکھڑ کے قریب پہنچے تو حاجی صاحب سے بھی کسب فیض کرنا چاہا۔ میں نے جو نذر بھیجی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی اور اپنی طرف سے ایک تسبیح اور جا نماز بھیجی۔ یہ جا نماز انہوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی۔ وہ کسب حلال سے روزی کماتے تھے اور اسی کسب حلال سے انہوں نے دو روٹیاں بھی مجھے بھیجیں۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا کھایا تو میرا دل روشن ہو گیا اور مجھے روحانی تسکین اور جمعیت خاطر حاصل ہوئی۔ یہ دو روٹیاں میں نے تین روز تک خود بھی کھائیں اور اپنی کنیزوں کو بھی کھلائیں۔

یہاں سے قافلہ حسن ابدال پہنچا۔ جہاں میری ملاقات اپنے بھائی سے ہوئی۔ اس نے مجھے مشائخ کے حالات پڑھنے کی تلقین کی۔ میرا بیشتر وقت انہی کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

ان دنوں میں اکثر بیمار رہا کرتی اور اپنے آپ میں ضعف محسوس کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے دل لگانے کی خاطر جو نمازیں قضا ہو چکی تھیں انہیں پڑھنا شروع کیا۔ جو روزے رہ گئے ان کا کفارہ ادا کیا اور ساتھ ہی ساتھ نفل روزے اور نمازیں شروع کیں جب ہم کابل پہنچے تو کچھ مدت کے بعد بھائی بھی وہاں پہنچ گیا۔ والد نے بلخ وغیرہ کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا اس پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نفل پڑھے۔

اب والد نے لاہور کا ارادہ کیا اور ہم ۲۹ رجب ۱۰۴۹ھ کو شہر لاہور میں داخل ہوئے۔ لاہور میں بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء اللہ رہتے تھے میں نے مشائخ چشت کی تلاش شروع کی مگر مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ ملا خواجہ بہاری کی شہرت دور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی مگر وہ کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ میں بہت پریشان ہوئی مگر تلاش کا سلسلہ جاری رہا اور میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں کسی مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت کروں خواہ اس کا تعلق کسی سلسلے سے ہو کیونکہ میری عمر ستائیس برس ہو چکی تھی۔

اسی سال والد بزرگوار نے کشمیر کا ارادہ کیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھی ہم ۷ ذوالحجہ سنہ مذکور کو کشمیر پہنچے انہیں یہاں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ میاں میر کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی کشمیر میں ہیں میرے بھائی کو ان سے بے حد ارادت ہے۔ انہوں نے ملا کی بڑی تعریف کی۔ میرا دل ان کے بارے میں عقیدت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ میں نے خلوص اور عقیدت سے انہیں کچھ عریضے لکھے۔ ایک عریضے میں یہ شعر بھی لکھا۔

گر میسر شود آں روئے چو خورشید مرا
بادشاہی چہ کنم و طرۂ سلطانی بہ سرم

میں نے نذر نیاز کی بجائے اپنے ہاتھ سے روٹی پکائی اور ساگ تیار کیا اور اپنے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے عریضوں کا کوئی جواب نہ دیا اور فرمایا ہمیں دنیا داروں اور بادشاہوں سے کیا کام مگر میں مایوس نہ ہوئی اور برابر خط لکھتی رہی جب انہوں نے مجھے تلاش حق میں ثابت قدم پایا تو میرے بعض عریضوں کا جواب بھی دیا۔ میں پر امید تھی۔ میں نے انہیں چھپ کر دیکھا ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر میری حق بین نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ میں نے اپنے بھائی کے ذریعے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر انہیں مرشد حقیقی بنا لیا۔ انہوں نے بھائی کے ذریعے مجھے سلسلہ قادریہ کے ذکر اور اشغال کی تلقین کی تصور شیخ کے سلسلے میں میرے بھائی نے مجھے ان کی تصویر دی جسے میں بڑے اخلاص اور عقیدت سے دیکھتی تھی۔ اور خاص خاص اوقات میں ان کی صورت کا تصور کر کے میں مراقبہ کر لیا کرتی تھی۔

پہلے روز جب میرے بھائی نے مجھے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا میرے مرشد کی شبیہ اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار یار اور دوسرے اولیاء اللہ کے تصور کا طریق میرے ذہن نشین کیا میں نے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے، روزہ رکھا اور شام کو اس چیز سے روزہ افطار کیا جو میرے مرشد نے از راہ کرم میرے لیے بھیجی تھی میرے پیر طریقت حضرت ملا شاہ عام طور پر ملا محمد سعید کے گھر سے کھانا کھایا کرتے تھے میں نے ملا محمد سعید سے لے کر کچھ کھانا کھایا اور گھر کی مسجد میں نصف شب تک بیٹھی اور نماز تہجد ادا کر کے گھر آ گئی پھر ایک خلوت میں تنہا ہو کر بیٹھ گئی۔ ملا شاہ کی شبیہ پر توجہ لگائی۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کبار اور اولیاء اللہ کا تصور کر کے مراقبے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اس وقت کچھ تذبذب تھا کہ میں نے سلسلہ چشتیہ چھوڑ کر قادریہ اختیار کیا ہے۔ شاید مجھے روحانی فیض حاصل نہ ہو۔ اس وقت مجھ پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی جو نہ خواب تھی نہ بیداری۔ میں نے حضور کی مجلس مقدس میں دیکھا جس میں صحابہ کبار اور اولیائے کرام

بھی شریک تھے ملا شاہ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنا سر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں رکھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ملا شاہ! تو نے تیموری چراغ روشن کر دیا ہے۔ جب یہ حالت گزر گئی۔ میں بیدار ہوئی تو میرا دل اس خوشخبری سے باغ باغ تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔

کم و بیش چھ ماہ ہمارا قیام کشمیر میں رہا۔ میں اپنے پیر و مرشد کو خط لکھتی اور وہ مجھے جواب سے مشرف فرماتے۔ وہ اگرچہ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد تھے مگر میں سعادت مندی کے خیال سے ان کی خدمت میں ہر قسم کی خوشبوئیں اور طرح طرح کے کھانے اپنے ہاتھ سے پکا کر بھیجا کرتی تھی۔ اس بیعت کے بعد میری زندگی میں بڑا انقلاب آیا۔ میں اس سے پہلے بھی غیر شرعی امور سے بچتی تھی اب میں اور زیادہ اجتناب کرنے لگی۔

جب ہم کشمیر سے روانہ ہونے والے تھے تو دو تین روز پہلے میں نے مراقبے میں آپ کو دیکھا۔ آپ سے وہ دوپٹہ مانگا جو آپ اپنے کندھے پر رکھا کرتے تھے۔ آپ نے وہ دوپٹہ مجھے عنایت فرمایا۔ علی الصباح جب میں بیدار ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں اور دوپٹہ طلب کروں۔ ابھی میں یہ ارادہ کر ہی رہی تھی کہ میرا خواجہ سرا جو ہمیشہ آپ کی خدمت میں آیا جایا کرتا تھا میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں کل شام آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغرب کی نماز کے بعد آپ نے اپنا دوپٹہ دوش مبارک سے اتار کر مجھے دیا کہ اسے ان کے لیے لے جاؤ۔ میں نے دوپٹہ خواجہ سرا سے لیا، آنکھوں سے لگایا۔ مجھے بے حد روحانی سرور حاصل ہوا۔

میں دو دفعہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوئی۔ پہلی دفعہ کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں۔ دوسری دفعہ مجھے آپ کی زیارت اس دن نصیب ہوئی جب میں کشمیر سے لاہور آ رہی تھی۔ میں نے آپ کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ چونکہ میں کشمیر سے جا رہی ہوں آپ مہربانی فرمائیں تاکہ میں آپ کے دیدار سے فیض یاب ہوں۔ آپ نے درخواست قبول کر لی اور اس راستے پر جہاں سے میں گزرنے والی تھی ایک توت کے درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ میں ہاتھی پر سوار تھی جب اس درخت کے برابر پہنچی تو کھڑے ہو کر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا۔ اس وقت آپ کی خدمت میں تین آدمی حاضر تھے۔ ایک محمد حلیم تھا جسے آپ فرزند کہا کرتے تھے دو آپ کے کشمیری خادم تھے۔ جو خضر اور حسن نام رکھتے تھے وہ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھوڑا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کچھ پان اور گلاب کا ایک شیشہ خواجہ سرا کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجا اور اسے حکم دیا کہ شیشہ گلاب حضرت سے چکھوا کر واپس لا۔ آپ سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور میں وہاں سے رخصت ہوئی۔

(ترتیب۔ محمد نظام الدین سالک)

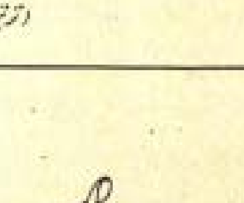

امیر عبدالرحمن خاں

ولادت ——— ۱۸۴۴ء

وفات ——— ۳ر اکتوبر ۱۹۰۱ء

میں نو برس کا تھا جب کہ میرے والد نے مجھے کابل سے بلخ بلا بھیجا۔ اس زمانے میں وہ بلخ اور اس کے مضافات کے فرمانروا نائب السلطنت تھے۔ بلخ پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ شبرغان کے محاصرے میں مصروف ہیں۔ میں بلخ میں مقیم رہا اور بعد دو مہینے کے جب شبرغان فتح کر کے واپس تشریف لائے تو میں نے دس میل شہر سے باہر نکل کر جانب جنوب ایک مقام پر جو دشت امام کے نام سے مشہور ہے ان کا استقبال کیا۔ انہیں دیکھ کر میں نہایت مسرور ہوا۔ اور انہوں نے بھی مجھے بخیر و عافیت پا کر خداوند کریم کی درگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا۔ دو دن ایک ساتھ بلخ واپس آئے۔

نوشت و خواند

چند روز بعد مجھے پڑھنے لکھنے کی فہمائش کی لیکن باوجود دن بھر محنت کرنے کے میں نے نوشت و خواند میں مطلق ترقی نہ کی۔ میں نہایت کند ذہن تھا۔ سبق سے سخت نفرت تھی۔ دماغ ہر وقت گھوڑے کی سواری اور شکار کے ذوق سے پُر رہتا تھا جو کچھ آج پڑھا کل بھول گیا لیکن مجبوری تھی پڑھنا پڑتا تھا اور اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ میرے استاد نے میری تعلیم میں مطلق پہلو تہی نہ کی لیکن کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ ایک برس بعد حوالی شہر میں بمقام تختہ پل میرے لیے ایک باغ تیار کرایا گیا اور وہی میرا مکتب قرار پایا۔ رفتہ رفتہ وہاں حرم سرا، چھاؤنیاں، کچہریاں اور کارخانے قائم ہوئے۔ باغ لگائے گئے اور تین سال کے عرصہ میں ایک نیا اور خوبصورت شہر آباد ہو گیا

چوتھے سال موسم بہار میں میرے والد (امیر محمد افضل خاں متوفی ۱۸۶۷ء) امیر دوست محمد خاں میرے دادا سے ملنے کے لیے کابل تشریف لے گئے اور مجھے اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس کے بعد چھ مہینے تک میرا دستور العمل یہ رہا کہ صبح آٹھ بجے تک نوشت و خواند میں مشغول رہتا اور پھر آٹھ سے دو بجے سہ پہر تک دربار کرتا۔ دربار برخاست ہونے پر سوتا اور قریب شام گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے باہر نکلتا۔

گورنری

شروع جاڑوں میں والد نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ میرے جد امجد نے از راہ الطاف بزرگانہ اس طرح میری عزت افزائی کی کہ تاشقرغان کا گورنر مقرر فرمایا اور حکم صادر کیا کہ ایک ہزار سوار، دو ہزار پیدل اور چھ توپیں ہمراہ لے کر وہاں چلے جاؤ۔ میں فوراً حکم بجا لایا اور تاشقرغان روانہ ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی سردار محمد امین خاں برادر وزیر محمد اکبر خاں نے گورنری کا چارج مجھے دیا اور آپ کابل کی راہ لی۔

میری تقرری کے پانچ مہینے بعد میرے والدین مجھے دیکھنے کے لیے آئے اور ان کی قدم بوسی حاصل ہونے سے مجھے از حد خوشی ہوئی موسم بہار تک والد میرے ہمراہ رہے اور پھر والدہ کو میرے پاس چھوڑ کر آپ بلخ تشریف لے گئے۔ میں بدستور اپنا کام انجام دیتا رہا اور پڑھنا لکھنا بھی برقرار رکھا۔ فوج اور نیز رعایا کے ساتھ میں ہمیشہ مہربانی کے ساتھ پیش آتا تھا اور چونکہ بہت سے تاشقرغان کے لوگ میرے ذاتی

لازم بھی تھے، میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ اکثر اچھا سلوک کرتا تھا اور قحط سالی کے موقعوں پر مقررہ خراج میں تخفیف کر دیتا تھا۔

استعفا

دو برس بعد والد واپس تشریف لائے اور میرے صوبہ کا حساب طلب کیا۔ میری نرمی اور رعایت دیکھ کر جو تخفیفیں میں نے کی تھیں ان کی منظوری سے انکار کیا۔ میں نے مؤدبانہ عرض کی کہ معاف شدہ رقمیں وصول نہ کی جائیں لیکن والد نہ مانے اور فرمایا کہ ملک کی آمدنی قلیل ہے اور فوج بہت زیادہ اس لیے رقوم واجب الادا ضرور وصول کی جائیں گی۔ تین مہینے قیام کے بعد تقریباً ایک لاکھ روپیہ وصول کر کے جو میں نے کیا تھا وہ بلخ واپس گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے گورنری سے اس بنا پر استعفا دے دیا کہ مجھے اپنے خیالات کے مطابق حکومت کے پورے اختیارات حاصل نہ تھے۔ اپنے مددگار احمد خاں کو اپنا کام سپرد کر کے میں تختہ پل واپس آیا اور دوبارہ نوشت و خواند میں مصروف ہو گیا۔

اسی زمانہ میں وزیر یار محمد خاں گورنر ہرات نے والد کو لکھا کہ مجھے نہایت خوشی ہوگی اگر میری لڑکی سے عبدالرحمٰن کی شادی ہو جائے۔ والد نے اسے منظور کیا اور میری نسبت ہو گئی۔ اس رشتے کی وجہ سے وزیر یار محمد خاں اور میرے والد میں اور زیادہ اتحاد ہو گیا۔

جھوٹی تہمتیں

ایک اور شخص جسے والد نہایت عزیز رکھتے تھے سردار عبدالرحیم خاں تھا جو کہ سردار رحیم داد خاں کے خاندان سے تھا۔ لیکن یہ شخص نہایت بدطینت اور دغا باز تھا اور رشک و حسد اس کے خاندان کا موروثی مرض تھا۔ والد کے دربار میں میرا رسوخ زیادہ ہونا اسے نہایت شاق گزرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر مجھے فوج کی کمان مل گئی تو اس کے اختیارات بالکل جاتے رہیں گے۔ اس لیے وہ اکثر میری غلط شکایتیں کیا کرتا اور جھوٹی تہمتیں مجھ پر لگاتا تھا جس کی وجہ سے بعض وقت والد بھی مجھ سے بلا وجہ ناراض ہو جایا کرتے تھے۔

فوجی تربیت

والد کی فوج کا سردار ایک انگریز جنرل شیر محمد خاں تھا جس نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ یورپ میں اسے کیمبل کے نام سے جانتے ہیں اور میرے دادا کی فوج نے سنہ ۳۵ء قندھار کی لڑائی میں جو شاہ شجاع سے ہوئی تھی اسے گرفتار کیا تھا۔ یہ اپنے فن میں نہایت ہوشیار اور ڈاکٹر بھی اچھا تھا۔ بڑا جواں مرد اور باہمت شخص تھا اور مجھ سے نہایت التفات کے ساتھ پیش آتا تھا۔ ایک روز شیر محمد خاں نے والد سے درخواست کی کہ مجھے ان کے سپرد کر دیا جائے تاکہ اپنی زندگی میں وہ مجھے اپنے فن میں طاق کر دیں۔ والد نے منظور کیا اور روزانہ دو تین گھنٹے ان کے پاس جانے کی ہدایت کی۔

دو تین سال جراحی اور فن جنگ سیکھنے میں گزرے۔ والد نے چند بندوق ساز کابل سے بلائے تھے اور میرے مکتب کے قریب ایک کارخانہ کھولا تھا۔ جہاں میں دوپہر کے وقت سبق ختم کر کے اپنے ہاتھ سے آہنگری سیکھتا تھا۔ اس طرح میں نے بندوق سازی سیکھی اور پوری تین بندوقیں اپنے ہاتھ سے تیار کیں۔

قید و بند

عبدالرحیم خاں کہ جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے یہ دیکھ کر نہایت حسد و رشک ہوتا تھا اس لیے اس نے میرے برخلاف سازش شروع کی۔ ایک دن والد سے کہہ دیا کہ میں نے شراب خوری اور گانجہ پینا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کبھی یہ کام نہیں کیے تھے لیکن چونکہ میری عمر بہت چھوٹی تھی اور مجھے والد کے ہمیشہ ناراض ہونے سے نہایت رنج ہوا کرتا تھا، میں نے بلخ سے ہرات بھاگ جانے کا ارادہ کیا جہاں میرے خسر رہا کرتے تھے۔ میں خفیہ طور پر سفر کی تیاریاں کر رہا تھا کہ میرے نوکروں نے والد کو خبر کر دی۔ انہوں نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور جب ثابت ہو گیا کہ خبر صحیح تھی تو مجھے قید کر دیا اور میرے سپاہی غلام اور نوکر مجھ سے علیحدہ کر دیے۔ پورے ایک سال میں جیل خانہ میں بیڑیاں پہن کر رہا اور میری زندگی نہایت تلخ ہو گئی۔

قید سے رہائی

اسی ایک سال کے بعد شیر محمد خاں نے وفات پائی۔ عبدالرحیم کو امید تھی کہ ان کی جگہ اسے ملے گی لیکن والد بھی اس سے بدظن ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے ترکی قبیلہ کے ایک معتبر اور آزمودہ کار اہلکار کو سپہ سالار مقرر کیا ان کا نام عبدالرؤف خاں تھا۔ انہوں نے سپہ سالاری سے انکار کیا اور کہا کہ ایک سال کی قید میرے لیے کافی سزا تھی۔ مجھے شیر خاں کی جگہ ملنی چاہیئے۔ والد نے اولاً اسے منظور نہ کیا اور کہا کہ عبدالرؤف کے دماغ میں ضرور خلل ہے جو انہوں نے اس قسم کی تجویز پیش کی لیکن بہت سے اصرار کے بعد وہ راضی ہو گئے اور مجھے طلب کیا۔

میں سیدھا جیل خانہ سے بلا سر کے بال درست کیے یا ہاتھ دھوئے بیڑیاں پہنے اسی پوشاک میں جس میں کہ انہوں نے مجھے اخیر مرتبہ دیکھا تھا والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا: "پھر تم کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ "میں بالکل بے قصور ہوں۔ میرے اس حالت میں ہونے کے باعث وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں آپ کا بہی خواہ کہتے ہیں۔" یہ کہہ ہی رہا تھا کہ عبدالرحیم دربار میں حاضر ہوا اسے دیکھ کر میں نے کہا: "یہی وہ دغاباز شخص ہے جس کی وجہ سے مجھے بیڑیاں نصیب ہوئی ہیں۔ زمانہ بتلا دے گا کہ یہ سچا ہے یا میں۔" یہ سن کر غصہ اور گھبراہٹ سے عبدالرحیم کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

میرے والد نے تمام فوجی افسروں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اس جوان بیٹے کو میں تمہارا سردار مقرر کرتا ہوں۔" سب نے جواب دیا "خدا نہ کرے کہ حضور کا بیٹا پاگل ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ نہایت عقل مند اور سمجھ دار ہے۔ حضور پر بھی رفتہ رفتہ روشن ہو جائے گا کہ اسے بدنام کرنے والے نمک حرام ہیں۔" اس کے بعد والد نے مجھے رخصت کیا اور اس نئی خدمت کے انجام دینے کی اجازت دی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا اور واپس آتے ہی حمام کو گیا۔ میرے ملازم بھی آ پہنچے اور چاروں طرف سے مبارک باد کی صدائیں آنے لگیں۔

اُونٹ سے کشتی

ایک سال تک تختہ پل کی فوج کا انتظام میرے سپرد رہا بعد اس کے موسم بہار میں میں تاشقرغان روانہ ہوا۔ راہ میں جو ایک عجیب واقعہ پیش آیا اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ خونیاز نامی ایک مقام پر ہم فروکش ہوئے اور جانوروں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ میں ہوا خوری کے لیے پہاڑیوں کی طرف نکل گیا اور اپنے سپاہیوں سے علیحدہ ہو گیا ایک شتر نے مجھ پر حملہ کیا۔ میرے پاس اس وقت ایک پیش قبض کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ میں نے ایک بہت بڑے پتھر کے گرد گھومنا شروع کیا۔ اونٹ بھی میرے پیچھے اسی طرح گھوما۔ قریب تھا کہ میں تھک کر گر جاؤں۔ ادھر سپاہیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ مجبوراً جان بچانے کے لیے میں شتر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر اپنی پوری طاقت سے اس کے کان پر مارا جس کے صدمے سے وہ پیروں کے بل گرا۔ کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ پیش قبض نکال میں نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ میرے تمام کپڑے خون سے رنگ گئے اسے اپنے روبرو مرتا دیکھ کر نیز اس وجہ سے کہ میں بہت خستہ ہو گیا تھا مجھے غش آ گیا اور قریب ایک گھنٹہ میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو شتر کو مردہ پاکر میں بہت خوش ہوا۔ میرے نوکروں نے اتنی دیر تک میری خبر نہ لی میں نے اس کی سزا یہ دی کہ ہر ایک کو تیس درّے مارنے کا حکم دیا اور آئندہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اگر کسی خاص کام کے لیے اپنے محافظوں سے تھوڑی دیر کے لیے علیحدہ بھی ہو جاؤں تب بھی دو یا تین معتبر اشخاص میرے قریب رہیں۔ یہ سچ ہے دنیا خطروں سے پُر ہے۔

بے علمی پر ندامت

اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں ایک روز دربار کر رہا تھا کہ امیر اعظم خاں کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا یہ کابل میں تھی اور میرے ساتھ منسوب ہوئی تھی۔ اس نے قاصد کو ہدایت کر دی تھی کہ خود میرے ہاتھ میں خط دے اور کسی دوسرے شخص کو نہ کھلانے اور جواب مجھ سے لکھا کر اور خط بند کر کے لے آئے۔ جیسا کہ میں نے پیشتر ذکر کیا ہے مجھے پڑھنے لکھنے

کا کبھی شوق نہ تھا اور جو تھوڑا بہت سیکھا تھا اسے بھی بھول گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ خط پا کر مجھے کس قدر ندامت ہوئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے اپنے آپ کو سخت ملامت کی کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایسا اچھا شخص ہوں لیکن درحقیقت مردانگی سے بعید ہے کہ جاہل رہوں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت رویا اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت عاجزی اور انکسار سے دعا مانگی اور ارواح اولیاء اللہ سے سفارش کی درخواست کی جو دعا میں نے مانگی وہ یہ تھی: "اے خداوند پاک! مجھے روشنی عطا کر تاکہ میرا دل اس سے منور ہو جائے اور میں پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ تو اپنی مخلوق کی نظروں میں مجھے شرمسار نہ کرے گا۔"

خواب میں بشارت

آخر روتے روتے صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ میانہ قامت لیکن بالکل راست۔ آنکھیں بادامی اور ابرو نہایت باریک۔ ریش دراز، چہرہ بیضاوی اور انگلیاں پتلی اور لانبی تھیں۔ بھورے رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ ایک دھاری دار کپڑا کمر سے بندھا تھا اور ایک لمبا عصا ہاتھ میں تھا جس کے سرے پر لوہے کی شام تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بزرگ میرے سرہانے کھڑے ہو کر آہستہ سے فرماتے ہیں "عبدالرحمٰن اٹھ اور لکھ"۔ میں چونک پڑا اور کسی کو نہ پا کر پھر سو گیا۔ وہی بزرگ پھر تشریف لائے اور فرمایا: "میں کہتا ہوں لکھ اور تو سوتا ہے"۔ میں نے کچھ پس و پیش کی اور جاگ گیا۔ لیکن کسی کو نہ دیکھ کر دوبارہ سو رہا۔ تیسری بار پھر وہی بزرگ دکھائی دیئے اور ناراض ہو کر فرمانے لگے: "اگر اس مرتبہ تو سویا تو اس عصا سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا۔" یہ سن کر میں خوف کے مارے اٹھ بیٹھا اور پھر نہ سویا۔ خادم کو بلا کر کاغذ قلم منگوایا اور مکتب میں جو حروف لکھا کرتا تھا انہیں سوچنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ تمام حروف کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ میرے حافظے نے مدد کی اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا یاد آنے لگا۔ ایک ایک لفظ کر کے کاغذ پر لکھا۔ اس طرح طلوع آفتاب تک میں نے ساٹھ سطریں لکھیں۔ بعض حروف اچھی طرح نہ ملا سکا تھا اور بعض درست بھی نہ تھے لیکن جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب پڑھ سکتا ہوں اور غلطیاں بھی معلوم کر لیں جو کہ بہت تھیں۔ میں نے کاغذ پھاڑا اور پھر لکھا اور اتنا مسرور ہوا کہ خوشی سے جامہ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس روز صبح اٹھ کر میں نے گورنروں کے دو ایک خط جو میرے نام آئے تھے کھولے اور یہ بھی دیکھ کر کہ ان کا مضمون میں سمجھ سکتا تھا مجھے دوچند خوشی ہوئی۔

اعانت غیبی

جب دربار کا وقت آیا تو حسب معمول میرا سیکرٹری جو خط پڑھا کرتا تھا آیا لیکن میں نے کہا "میں اپنے خطوط آج خود پڑھوں گا تم میری غلطیاں درست کرتے جانا۔" اس نے مسکرا کر کہا: "لیکن بندگان حضور کہاں پڑھ سکتے ہیں؟" یہ سن کر میں نے ایک خط کھولا اور کہا: "اچھا سنو میں پڑھ سکتا ہوں یا نہیں۔" پھر میں نے پڑھنا شروع کیا اور جواب لکھایا۔ اس طرح دو سو خط پڑھے اور سب کے جواب دیئے۔ چند روز بعد مجھے سیکرٹری کی مدد کی بھی ضرورت نہ رہی۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد میں نے دوبارہ قرآن شریف پڑھا اور انبیاء اولیاء کے نام پر خیرات کی اور اس اعانت غیبی کی خبر میں نے اپنے والد بزرگوار کو بھی دی۔ انہوں نے مجھے ایک سنہری کام کی مرصع تلوار، دس پارچہ ہائے کمخواب اور چند پارچہ ہائے پشمینہ بھیجے۔ میں نے خداوند کریم کی حمد و ثنا کی اور والد کی مہربانی کا بذریعہ خط شکریہ ادا کیا۔

سردار فیض محمد کی بغاوت

بلخ کا ملک فتح کرنے کے بعد میں نے فیض محمد، ناظر حیدر خان اور جنرل علی عسکر خان کو وہاں کا گورنر مقرر کیا تھا۔ جب بامیان پہنچا تو سنا کہ ان تینوں اشخاص میں آپس میں نا چاقی ہے۔ موسم سرما میں میں نے فیض محمد کو لکھا کہ ایک ہزار بار برداری کے شتر بھیج دے لیکن اس نمک حرام نے یہ دیکھ کر کہ میں جنگ میں مصروف ہوں انکار کیا۔

فتح سعید آباد کے بعد میرے والد نے اسے لکھا کہ آ کر ان سے ملاقات کرے اس سے بھی اس نے انکار کیا۔

سردار فیض محمد روز بروز زیادہ تکلیف دینے لگا اور مجبور ہو کر میرے والد نے سرور خاں کو اس پر فوج کشی کا حکم دیا۔ آب کل نامی گاؤں میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سرور خاں نے شکست کھائی اور بھاگ گیا ـــــ معلوم ہوا کہ فیض محمد کابل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ والد نے اسے روکنے کے لیے مجھے لکھا۔ گو میں اس وقت عارضہ گردہ کی وجہ سے نہایت کمزور تھا تاہم خط پاتے ہی فوراً روانہ ہوا۔ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے تخت رواں پر چلا اور ڈبل کوچ کر کے پانچویں دن غزنی پہنچ گیا۔ پانچ روز غزنی ٹھہر کر میں کابل روانہ ہوا والد کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور والدہ کی قدم بوسی حاصل کر کے نہایت خوش ہوا۔

موسم گرما آیا اور کابل میں ہیضہ شروع ہوا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خبر آئی کہ والد بھی اس وبائی مرض میں مبتلا ہو گئے اور اس ملک کے جاہل عطاروں کی دواؤں کی ان پر آزمائش ہونے لگی۔ یہ بھی سنا گیا کہ شیر علی خاں بلخ پہنچ گئے تھے جہاں فیض محمد بھی ان سے مل گیا تھا اور دونوں کابل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ سن کر میں والد سے رخصت ہوا اور چارہ کار روانہ ہوا۔ انہوں نے میری فتح یابی کے لیے دعا کی۔ میں نے تمام شب کوچ کیا اور طلوع آفتاب تک گل بہار نامی مقام اور قلعہ الہ داد پہنچا۔ فیض محمد نے شب ہی کو پہاڑی کی چوٹیوں پر مورچہ بندی کی اور دوسرے روز صبح کے وقت میں نے اس پر حملہ کیا۔ وہ پہاڑیوں کے پیچھے سے سامنے آیا اور میں نے اس پر ایک ایسا سیدھا گولہ چلایا کہ اس کے ٹھیک شکم میں جا کر لگا۔ ہمارا نمک جو اس نے کھایا تھا وہ اس طرح پھوٹ کر نکلا۔ اور ایسے نمک حرام کی زندگی کا اس موزونیت کے ساتھ خاتمہ ہوا (۱۳ ستمبر ۱۸۶۵ء)

والد کی وفات

کابل پہنچتے ہی میں والد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو حالت نزع میں پایا۔ خواتین حرم سرا نے بآواز بلند کہا کہ عبدالرحمن آ گیا ہے اور قدم بوسی کے لیے حاضر ہے۔ لیکن انہیں یارائے کلام نہ تھا۔ تاہم مجھے دیکھ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں رونے لگا۔ تیسرے روز جمعہ کے دن انہوں نے اس دار ناپائیدار سے رحلت کی اور مجھے اپنی مفارقت کا داغ دے گئے۔ اپنی وصیت کے مطابق وہ قلعہ ہوشمند خاں میں جو ان کی ملکیت تھی دفن کیے گئے۔ میں دل شکستہ کابل واپس آیا اور غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا۔

بلخ کو روانگی

چار روز بعد جمعہ کی شب کو میں نے اہل خاندان، امرا اور صوبجات کے سرداروں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ چچا صاحب (امیر محمد اعظم خاں) کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ اس کے بعد سب سے پہلے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور دوسرے سرداروں نے بھی ایسا ہی کیا اور انہیں مبارکباد دی۔ چند مہینے بعد مفسدوں نے میرے چچا کو مجھ سے بدظن کر دیا اور انہیں باور کرایا کہ میرے کابل میں رہنے کی وجہ سے ان کا رعب کم ہے۔ بہتر ہو کہ مجھے بلخ بھیج دیں۔ میں بلخ روانہ ہو گیا اور اپنے اہل و عیال کو کابل میں رہنے دیا۔

قدرت کی ستم ظریفی

جب سے مجھے شکست ہوئی تھی اس وقت سے اس شب تک جب کہ ہم وزیریوں کے ملک میں پہنچے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سواروں سے کہا کہ نہایت بھوکا ہوں۔ ایک پارچہ گوشت مل جائے تو کیسا اچھا ہو۔ ان کے پاس ایک روپیہ تھا اس سے گوشت، نمک اور پیاز خرید کی۔ اس وقت یہ دقت پیش آئی کہ پکانے کے برتن ہمارے پاس نہ تھے۔ اس ملک کے لوگ صرف مٹی کے ظروف استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال میرے آدمی کہیں سے ایک کڑھائی لے آئے اور اس میں میں نے تھوڑا شوربے دار گوشت پکایا۔ میں نے کڑھائی کو دو لکڑیوں سے باندھ کر آگ پر لٹکایا تھا اور گوشت کھانے کے لیے نکالنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کتا غالباً یہ سمجھ کر کہ وہ رسی جس سے کڑھائی بندھی ہوئی تھی کسی جانور کی آنتیں ہیں اسے منہ میں لے کر بھاگا اور کڑھائی وغیرہ سب کچھ

ساتھ لے گیا۔ میرے سوار کتے کے پیچھے دوڑے لیکن گوشت گر پڑا تھا۔ یہ واقعہ بھی خدا کی قدرت کا نمونہ تھا۔ تین دن پہلے ایک ہزار شتر صرف میرے کھانا پکانے کے برتن لانے کے لیے میرے پاس تھے اور آج ایک کتا میرا کھانا اور برتن دونوں لے گیا۔ مجھے اس خفیف سے واقعہ پر تبسم آیا اور روکھی روٹی کھا کر سو رہا۔

انتقامی جھگڑا

گیارہویں دن سہ پہر کے وقت کاگر گاؤں میں ہم پہنچے۔ میرے ساتھیوں نے اپنے کھانے پینے کی چیزیں جمع کیں۔ میں بھی ایک جوان نر بھیڑ تلاش کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے ایک مل گئی اور میں سودا چکا لیا۔ اس کی قیمت قرار پائی جو میں نے ادا کر دی۔ پھر اس کو ذبح کرنے لگا ہی تھا کہ بھیڑ والا آیا اور کہا کہ بھیڑ واپس کر دیجیے میں نہیں بیچتا۔ لیکن جب میں اسے واپس کرنے لگا تو پھر وہ فروخت کرنے پر راضی ہو گیا۔ آخر وہ ذبح ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اس نے روپیہ مجھ پر پھینک مارا اور کہا۔ میری بھیڑ زندہ کر دیجیے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ قدرت نہیں۔ لیکن اگر دل چاہے تو روپیہ اور یہ مذبوحہ بھیڑ لے جا۔ اس نے دوبارہ انکار کیا اور اصرار کیا کہ اسے زندہ کر دیجیے۔ اب تو مجھے بھی چال چلنی پڑی۔ ایک ملا میرے پاس کھڑا تھا۔ اس سے میں نے کہا یہ شخص تمہاری نسبت سخت کلامی کر رہا ہے۔ اس پر وہ ملا بھیڑ والے کی طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسی وقت کہا کہ اگر تمہارا دل چاہے تو مجھے بد دعا دو۔ لیکن اس بزرگ پارسا کی بی بی کی نسبت کیوں بد زبانی کرتے ہو۔ چونکہ ملا یہ سن کر آگ ہو گیا اور اس شخص کو سخت سست کہنے لگا۔ یہاں تک کہ بات بڑھتے بڑھتے دونوں لڑنے لگے اور موقع پا کر میں بھیڑ اور روپیہ دونوں لے آیا۔

ایک یا دو گھنٹے بعد وہ بھیڑ والا میرے لیے دو آفتابہ دہی۔ دو خوانچے روٹی کے اور ایک بچہ بھیڑ کا بھنا ہوا لایا اور بہت سلام کیے میں نے کہا ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ تم اس قدر گستاخانہ کلام کر رہے تھے اور اس وقت اتنے مؤدب ہو۔ پھر اس کی گفتگو سے معلوم کر کے کہ اس کے حواس بجا تھے میں نے دریافت کیا کہ بھیڑ کے بہانے سے مجھ سے کیوں جھگڑا نکالا تھا اس نے جواب دیا کہ سردار خاں نے قندھار میں میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا یہ اس کا بدلہ تھا جو میں نے لیا۔ میں نے کہا سردار خاں یہاں ہیں۔ تم ان سے لڑے ہوتے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے لیکن سردار خاں کو قندھار کا گورنر آپ نے مقرر کیا تھا میں آپ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں اسی طرح کئی گھنٹے تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ جس کے بعد وہ گھر چلا اور میں سو گیا۔

خانہ بدوشی

ہم طہران پہنچے اور خانہ بدوش لوگوں کے ساتھ پانچ روز اس وجہ سے رہے کہ ایک تو کھانے پینے کا سامان مہیا کرنا تھا۔ دوسرے ایک گھوڑے نے میرے پیر میں لات ماری تھی اس لیے مجھے آرام کرنے کی ضرورت تھی چھٹے دن ہم ارگنج روانہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم شب کے وقت کوچ کرتے اور دن کی گرمی کسی مقام پر سو کر گزارتے تھے یہاں تک کہ ایک قافلہ ترکمانوں کا ملا اور یہ سمجھ کر کہ ہم ایرانی تھے اور ان پر حملہ کریں گے چھپ گئے۔

اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ ایرانی اور ترکمان ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ گو دونوں مسلمان ہیں لیکن ان کے ملا شیطان کے ایسے غلام ہیں کہ ایک دوسرے کے قتل کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس خواری اور رسوائی کا باعث جہالت ہے اسلام میں کسی قسم کا نقص نہیں یہ صرف ہمارا قصور ہے کہ ہم عیبوں سے پر ہیں۔

ہم کو چند ترکمانوں سے یہ دریافت کرنے کا موقع ملا کہ کوئی ترکمان بھی نزدیک ہے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو رفتار ہماری

تھی اسی طرح چلتے رہے تو طلوع آفتاب سے قبل ایک کنواں ملے گا۔ ہم اس وقت تک چلتے رہے کہ آفتاب خوب بلند ہو گیا دھوپ تیز ہو گئی۔ گھوڑے آگے بڑھنے سے رہ گئے لیکن کنویں کا نام و نشان نہ تھا۔ ہماری زبانیں پیاس سے کانٹا ہو گئیں اور گھوڑوں کی زبانیں سوکھ کر لکڑی ہو رہی تھیں بعض گھوڑوں کی زبانیں میں نے چاک کر کے دیکھیں مطلق خون نہ نکلا۔ ایک لیمو کاٹ کر میں نے اپنے منہ میں نچوڑا اور اپنی زبان گھوڑے کی زبان سے رگڑی لیکن مطلق نمی پیدا نہ ہوئی۔

جسمانی دوزخ

پانی نہ ملنے کی وجہ سے مجھے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ ہر انسان کے جسم میں خود دوزخ موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ پانی نہ پا کر آگ کی طرح گرم ہو جاتا ہے۔ شام کے قریب ہمیں ایک کنواں ملا لیکن صرف چار آدمی میرے ساتھ پہنچے باقی شدتِ تشنگی سے گر پڑے اور پیچھے رہ گئے۔ تھوڑا پانی پی کر مجھے چھوٹے ہوئے ساتھیوں کا خیال آیا اور ان کی مصیبتوں کو یاد کر کے میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا جو کہ عشق آباد کے ترکوں سے مجھے ملا تھا دوسروں کی بہ نسبت کم تھکا ہے دو ڈول پانی کے اس پر رکھے اور ایک شخص سے کہا کہ واپس جا کر ساتھیوں کو تلاش کرے۔ تھوڑا تھوڑا پانی اس نے ہر شخص کے منہ میں ڈالا۔ رفتہ رفتہ سب کو ہوش آیا اور وہ مجھ سے آ کر ملے اس کنویں پر ہم سات روز رہے اور ترکمانوں کا وہ قافلہ بھی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے پہنچا۔ ان کو جب میرا حال معلوم ہوا تو ان میں سے بعض شخص آئے اور مجھ سے معذرت کی کہ آپ کو ایلچی سمجھ کر ہم نے غلط راستہ بتلا دیا تاکہ پیاس سے مر جائیں۔

سمرقند میں قیام

(سنہ ۱۸۶۹ء لغایۃ سنہ ۱۸۸۰ء) کل گیارہ سال میں سمرقند میں رہا اور اپنا تمام وقت شکار کھیلنے میں صرف کیا۔ مجھے فکر اور غم تھا تو اس کا کہ اپنی بی بی، والدہ اور اپنے بیٹے عبداللہ کی خیر و عافیت کی مطلق خبر نہ تھی اور یہ سب قید تھے۔ سمرقند پہنچ کر میں نے میر بدخشاں کی لڑکی سے شادی کی اور دوسرے سال خداوند تعالیٰ نے مجھے فرزند عطا فرمایا جس کا نام میں نے حبیب اللہ رکھا۔ اس وقت میری اولاد میں وہ سب سے بڑا ہے اور ولی عہد بھی ہے۔ دوسرے سال خدا نے مجھے ایک اور فرزند عطا کیا جس کا نام نصر اللہ رکھا اور اسی طرح دو اور لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن ان تینوں نے چھوٹی عمر میں قضا کی۔

افغان روسی معاہدہ

موسم سرما کے اخیر میں اور شروع بہار میں مشہور ہوا کہ امیر شیر علی خاں انگریزوں سے پھر گئے تھے اور ان میں اور روسی گورنمنٹ میں دوستانہ اتحاد روز بروز ترقی پر تھا جو وعدے امیر شیر علی خاں نے کیے وہ یہ تھے کہ روسیوں کو ہندوستان جانے کے لیے افغانستان میں سڑکیں بنانے دیں گے۔ تاروں کی حفاظت کی ذمہ داری لیں گے۔ ہندوستان کی طرف ریل بنانے دیں گے اور انگریزوں کے مقابلے میں روس کا ساتھ دیں گے ان کے عوض روسی گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ جو ملک دریائے اٹک سے ملا ہوا تھا اور پیشتر افغانستان کے ماتحت تھا اور افغان فرمانرواؤں کی موروثی جائیداد ہے اس لیے ان کے ملک کا حصہ ہے وہ چھین کر شیر علی خاں کو دیا جائے گا۔ لیکن ان کے تمام منصوبے الٹ گئے۔ اس لیے کہ شیر علی خاں اور انگریزوں سے درہ خیبر اور شترگردن پہاڑ میں جسے پیوار کوتل بھی کہتے ہیں مقابلہ ہوا۔ امیر کی فوج تعلیم یافتہ نہ تھی اس لیے وہ انگریزوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور امیر شیر علی بلخ کی طرف بھاگ گئے جہاں تھوڑے ہی دن بعد فروری ۱۸۷۹ء میں انہوں نے وفات پائی۔

وطن کو روانگی

میں افغانستان کی تیاریوں میں بہت زیادہ مصروف رہا اور جنرل کاف مین کے ساتھ بہت بحث مباحثہ کے بعد روسی گورنمنٹ سے اپنے ملک جانے کی اجازت حاصل کی۔

میں درہ آپی روانہ ہوا۔ جو کہ بہت دور تک پہاڑ میں ہو کر جاتا ہے اور سمرقند سے آنے والے اسی راہ سے آتے ہیں۔ یہ درہ حصار اور کولاب کے نزدیک ہے اور برف کی وجہ سے موسم سرما میں بند رہتا ہے۔ بدخشاں جانے کے لیے میں اس راہ سے روانہ ہوا لیکن پہاڑ برف سے مثل بیضہ مرغ سفید ہو رہا تھا۔ جب چوٹی کے قریب پہنچے تو سردی بہت سخت تھی اور نہایت سرد ہوا چل رہی تھی گھٹنوں تک برف میں تھے۔ گھوڑوں کو ہم نے آگے رکھا اور ان کی دُمیں پکڑ کر چلنے لگے۔ تین چار میل کی چڑھائی کے بعد میرے نوکر اور ساتھی شدت سردی سے گھبرا گئے۔ میں نے موذن سے اذان دینے کے لیے کہا۔ صرف سات مرتبہ اذان دی ہو گی کہ خدا کے فضل سے ہوا بند ہو گئی اور سردی بھی کم ہو گئی اس طرح خداوند تعالیٰ نے ہماری خوش اعتقادی کے صلے میں ہماری جان بچا دی۔ طلوع آفتاب کے قریب ہم گاؤں پہنچے۔ جب میں گھوڑے سے اترا تو اس قدر تھک گیا تھا کہ بے ہوش گیا۔

شہزادہ حسن کی مزاحمت یہاں مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ شہزادہ حسن میر جہاں شاہ اور اس کے چچا میر یوسف علی اور میر نصر اللہ نے استاق، تالقان اور بدخشاں کے مساوی حصے کر لیے تھے۔ شہزادہ حسن فیض آباد میں حکومت کرتا تھا میر یوسف علی رستاق میں اور میر نصر اللہ قشم میں۔ میں نے شاہزادہ حسن کو خط لکھا جس میں اپنے خواجہ گلگون پہنچنے کی اطلاع دی اور میر عالم کو کے ذریعے یہ خط بھیجا۔ یہ میر میرے خسر کا بھائی تھا۔ شاہزادہ حسن کو میرا یہ پیام اچھا نہ معلوم ہوا۔ میرے ملازم کو گرفتار کر لیا اور مجھے دریائے جیحوں پار کرنے کی مخالفت کی اور لکھا کہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہماری زمین پر اگر کسی افغان کا قدم پڑ جائے تو ہم اتنی زمین کو اس کو ناپاک سمجھ کر باہر پھینک دیں گے۔ یہ خط مجھے استاق میں ملا جس کا میں نے یہ جواب لکھا۔

> اے احمق اور احسان فراموش بزدل! میں نے تیری اور تیرے بھائیوں کی مدت تک پرورش و پرداخت کی اور تیرے خاندان سے رشتہ داری کی۔ اس خیال سے کہ ضرورت کے وقت تو کام آئے گا۔ لیکن مجھے آج اپنی غلطی معلوم ہوئی اور تیری حقیقت کھلی۔ اگر موت کا خوف ہوتا تو اتنی دور کبھی نہ آتا ـــــ اے نامرد! کل معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں میں کون زیادہ طاقتور ہے۔

اسی شب شہزادہ نے ایک ہزار سوار تعینات کیے کہ مجھے دریا پار کرنے سے روکیں۔ میرے پاس کل تین سو سوار لڑنے کے لیے تھے اور دس علم بردار وغیرہ اور دوسرے روز بارہ ہزار دشمن کی فوج سے مقابلہ کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کیسی ہی ہمت کیوں نہ ہو اتنے آدمیوں کے مقابلے میں کامیابی ممکن نہیں لیکن اپنی زندگی چونکہ خدا کی راہ میں وقف کر چکا اور سب آیتیں قرآن شریف کی یاد تھیں جن میں خدا نے ان لوگوں سے بڑی بڑی نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جو کہ راہ حق میں جان دیں۔ میری آنکھوں میں دس ہزار اور ایک لاکھ دونوں یکساں تھے۔ خدا کی محبت میرے دل میں تھی اور میں اسی محبت کی وجہ سے لڑ رہا تھا اور خوش تھا کہ کل اس کی راہ میں جان دوں گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس مرتبہ بچ گیا تو اہل بدخشاں اور قطغان مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اور ان سے بھی بچ گیا تو انگریزی فوج کا سامنا تھا۔ ان سب باتوں پر غور کر کے مجھے کوئی امید زندگی کی نہ تھی۔ لیکن خدا ایک ادنیٰ اور ناچیز شخص کو بچانا چاہے تو تمام دنیا اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ میرا دل اتنا مضبوط تھا کہ اگر تمام دنیا کی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو وہ میری نظروں میں پیر کے نیچے کی چیونٹیاں معلوم ہوتیں۔ خدا جانتا ہے کہ میں سچ کہتا ہوں۔ یہ بہادری نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی الٰہی قوت ہے جو خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں صاف طور پر تمام مسلمانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے کیا کچھ پیش نہ آیا۔ لیکن میری زندگی کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ اگر تم سچے دل سے خدا کی خدمت گزاری کرو تو وہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔ یہ اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آج میں بادشاہ ہوں۔

بادشاہت ۲۰ جولائی ۱۸۸۰ء کو افغان قبیلوں کے تمام سرداروں اور سرگروہوں نے جو کہ وہاں موجود تھے مجھے چارہ کار میں اپنا بادشاہ

اور امیر تسلیم کیا اور مجھے ملک کا فرمانروا قرار دے کر خطبہ میں میرا نام داخل کیا۔ لوگوں کو نہایت خوشی تھی کہ خداوند تعالیٰ نے ان کا ملک ایک مسلمان کے سپرد کیا۔ گریفن صاحب نے بھی ۲۲ جولائی کو کابل میں دربار کیا اور انگریزی اہلکار اور افغان سرداروں کے روبرو میرے امیر ہونے کا اعلان کیا۔ اس طرح افغانستان کی دوسری لڑائی اور ملک پر انگریزوں کے قبضے کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح تخت کابل پر افغانی حکومت پھر سے ہاتھ آ گئی۔ اس کے بعد میں نے ملک کا انتظام کرنا شروع کیا۔ امن و امان قائم کیا۔ اور اسے ترقی دینے کا بندوبست کیا لیکن یہ بہت آسان کام نہ تھا۔

ملکی اصلاحات

ملک میں باقاعدہ حکومت قائم کرنے کے لیے میں پوری تفصیل ان معاملات کی بیان نہیں کر سکتا جن کی طرف کہ ابتدائے سلطنت ہی میں میں نے توجہ کی۔ مفصلہ ذیل قصے سے معلوم ہوگا کہ میرے زمانہ سے پہلے حکومت اور اس کے ضروری محکموں کی کیا کیفیت تھی۔

ایک شخص نے ایک باغ بنوانے کا ارادہ کیا اور چند آدمیوں کو اس کا ٹھیکہ دے کر انہیں پیشگی روپیہ دے دیا اس شرط پر کہ فلاں تاریخ تک باغ تیار ہو جائے گا۔ ٹھیکہ داروں نے روپیہ خرچ کر دیا اور باغ کا انہیں مطلق خیال نہ رہا۔ لیکن جس روز کہ باغ بن کر تیار ہونے کا دن تھا وہ سب اس شخص کے پاس گئے اور کہا کہ باغ تیار ہے۔ پھر ایک خطۂ زمین دکھانے کے لیے اسے لے گئے۔

شخص۔ لیکن اس زمین میں درخت ایک بھی نہیں۔

ٹھیکہ دار۔ درختوں کے سوا اور سب کچھ تیار ہے۔

شخص۔ لیکن باغ کو پانی دینے کیلئے نہر بھی تو نہیں۔

ٹھیکہ دار۔ سوائے نہر کے ہر چیز تیار ہے۔

شخص۔ لیکن باغ کے چاروں طرف چہار دیواری بھی نہیں کہ اس سے درختوں کی مویشیوں سے حفاظت ہو سکے۔

پھر وہی جواب ملا کہ صرف دیوار باقی رہ گئی ہے۔

شخص۔ لیکن زمین میں ہل بھی تو نہیں چلایا گیا ہے۔

وہی جواب پھر دیا گیا کہ اس کے سوا باقی ہر شے درست ہے۔ حکومت افغانستان کی بھی بجنسہٖ یہی حالت تھی کہ باقی ہر شے درست تھی۔ لیکن کسی ضروری چیز کا وجود بھی نہ تھا۔

مقدمات اور عدالت کرنے کا یہ دستور تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص شاہ کے سامنے عرض معروض کر سکتا تھا اور اس سہل طریقہ سے کہ شاہ کی ریش و دستار پکڑ لیتا تھا جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اس ریش کی شرم کرو اور میری فریاد سنو اور شاہ کو مجبوراً سننا پڑتا تھا۔ ایک روز میں حمام جا رہا تھا کہ زن و شوہر دوڑ کر میرے پیچھے حمام میں داخل ہو گئے۔ شوہر نے میری ڈاڑھی آگے سے پکڑ لی اور پیچھے سے عورت نے دستار کھینچنا شروع کی۔ مجھے نہایت تکلیف ہوئی۔ اس لیے کہ بڑے زور سے وہ میری ڈاڑھی کھینچے جاتا تھا چونکہ مجھے ان دونوں سے چھڑانے کے لیے کوئی سنتری وغیرہ اس وقت قریب نہ تھا۔ میں نے منت کی کہ میری ڈاڑھی چھوڑ دو۔ اس لیے کہ بغیر ڈاڑھی کھینچے بھی میں تمہاری درخواست سن سکتا ہوں۔ لیکن بیکار۔ مجھے اس وقت کسی قدر افسوس ہوا کہ یورپین طرز میں نے کیوں نہیں اختیار کیا اور ڈاڑھی کیوں رکھی۔ اس کے بعد میں نے حکم دیا کہ آئندہ حمام کے دروازہ پر مضبوط پہرہ رہا کرے۔

ایک اور دستور یہ تھا کہ دربار میں جب کبھی مٹھائی کے خوانچے آتے تھے تو وزرا اور دیگر اہلکار بجائے اس کے کہ اپنے حصہ کا انتظار کریں، اس پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ ہر شخص جس قدر زور آزمائی سے لے سکے حاصل کرے۔ میں نے انہیں حتی الامکان سمجھایا کہ یہ وحشیانہ حرکت ہے کہ جنگلی جانوروں کی طرح اپنے بادشاہ کے روبرو پیش کرتے ہو۔ اس میں میری اور تمہاری دونوں کی ہتک ہے۔ لیکن انہوں نے مطلق خیال نہ کیا۔ ایک مرتبہ عید کے دن مجھے ان کی اس حرکت پر اتنا طیش آیا کہ پہرے کے سپاہیوں کو میں نے حکم دیا کہ جہاں تک ہو سکے انہیں زدوکوب کریں۔ بعد میں یہ دیکھ کر مجھے کسی قدر ہنسی آئی اور افسوس بھی ہوا کہ مٹھائی کے لیے ان کے سر پھٹ گئے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس سزا کا یہ نتیجہ نکلا اور اس روز سے یہ احمقانہ و بے ہودہ حرکت موقوف ہو گئی۔

(تلخیص تزک عبدالرحمانی)

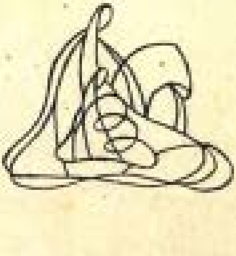

اورنگ زیب عالمگیر

ولادت : ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء)
وفات : ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۰ فروری ۱۷۰۷ء)

جائے ولادت

[مالوے اور گجرات کی سرحد پر ایک قصبہ دوحد تھا۔ اس قصبے میں عالمگیر پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے محمد اعظم کو اس کے بارے میں لکھتا ہے:]

"فرزند عالی جاہ! قصبہ دوحد جو صوبہ گجرات کے متعلقات میں سے ہے اس گنہ گار کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں کے باشندوں پر خاص نظر عنایت رکھو۔ کہنہ در بوڑھے کی جو بڑی مدت سے وہاں کا وظیفہ دار ہے دلجوئی کرو اور اسے بحال رکھو۔ اگر غرض مند لوگ اس کی غیبت کریں تو اسے نہ سنو ؎

عنایت بر ضعیفاں گوشۂ چشم دگر دارد
بعمر کوچک خود لطف دیگر ہست شاہاں را

(کمزوروں پر مہربانی اور نوازش کرنا اپنے اندر ایک نیا لطف رکھتا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں پر مہربانی کرنا بادشاہوں کے حق میں اور ہی لطف رکھتا ہے)

جنگِ فیلان

جب میں ہنوز کم پندرہ برس کی عمر کا تھا تو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تیموریوں میں ہاتھیوں کی جنگ دیکھنا شان و شوکت اور وقار کا ایک پہلو سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ شاہ جہان کے حکم سے دو ہاتھیوں کو میدان میں اتارا گیا۔ ایک ہاتھی حریف سے شکست کھا کر بھاگا۔ اس نے اس جانب رُخ کیا جہاں میں (عالمگیر) کھڑا تھا۔ ہاتھی میدان سے نکل گیا مگر فتح مند ہاتھی میری طرف بڑھتا گیا۔ میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ میں نے ہاتھی پر حملہ کیا۔ تلوار اور برچھے نے ہاتھی کو زخمی کیا۔ ہاتھی نے طیش میں آکر گھوڑے پر سے مجھے ہوا میں اچھالا اور مجھے پاؤں میں روند دینا چاہتا تھا کہ میں بڑی پھرتی سے اٹھا اور ہاتھی کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اتنے میں شجاع اور دوسرے امیر موقع پر پہنچ گئے۔ انھوں نے ہاتھی کو مار بھگایا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ آخر میدان صاف ہو گیا۔ شاہ جہان شہزادے

کے لیے بڑا مضطرب تھا۔ اس نے اعتماد خاں کو حکم دیا کہ وہ جلد شہزادے کو اس کے پاس لائے۔ میں بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ باپ کی طرف جا رہا تھا، اعتماد خاں نے کہا "شما آہستہ می آید۔ بادشاہ عجیب حال دارند"۔ میں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "اگر قبل ایں جا می بود۔ من جلدی می کردم۔ الحال چہ اضطراب است"۔ جب میں باپ کے حضور میں پہنچا تو اس نے ایک لاکھ اشرفی مجھ پر سے نچھاور کی اور کہا "شکر خدائے تعالیٰ کہ بخیر گزشت۔ اگر خدا نخواستہ نوع دیگری شد چہ رسوائی بود"۔ یعنی اگر خدانخواستہ ہاتھی تمہیں مار دیتا تو بڑی رسوائی ہوتی۔ میں نے تسلیم بجا لا کر کہا "اگر نوع دیگری بود رسوائی نہ بود۔ رسوائی ایں بود کہ از برادران شد ع

پردہ پوشی پادشاہاں مرگ است

دریں چہ رسوائی است"۔ یعنی اگر دوسرا معاملہ (موت) ہوتا تو کوئی رسوائی نہ تھی۔ رسوائی تو اس عمل میں ہے جو بھائیوں کی طرف سے ظاہر ہوا۔

باپ کی نظر میں

عالمگیر اپنے بیٹے اعظم کو لکھتا ہے:

"فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شخص کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلمبند کیا ہے تاکہ آپ بھی پڑھ لیں،

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہ جہان) نے علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خلوتِ خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست عقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی بے جوہر بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنائے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے۔ رعایا پریشان ہوگی۔ بیداد اور نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئے گی۔ تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کرو کہ وہ پاکیزہ خاندانوں کے لیے دعا کیا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص برا کلمہ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو اسے خدا نیک توفیق دے۔

بعض اوقات ہمارے دل میں خیال آتا ہے کہ اگرچہ سب سے بڑے بیٹے (دارا شکوہ) کے پاس شان و شوکت کا اہتمام اور کرّ و فر اور رعب داب کا سب سامان موجود ہے لیکن وہ نیکوں کا دشمن اور بدوں کا دوست ہے۔

شجاع میں سیر چشمی کے سوا اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ مراد بخش ایسا ہے کہ جس کی حالت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسے شراب نوشی کے سوا اور باتوں سے بہت کم سروکار ہے مگر . . . بیٹا (اورنگ زیب) پختہ مغز، دور اندیش اور مستحکم ارادے کا مالک نظر آتا ہے۔ غالباً یہ سلطنت کا بھاری بوجھ برداشت کر سکتا ہے۔

سعد اللہ خاں نے مولانا روم کا یہ مصرع پڑھا۔ ع

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

شاہجہان نے فرمایا ع

تا دوست کرا خواہد میلش بہ کہ باشد

دیکھیں دوست کس کو چاہتا ہے اور اس کی رغبت کس کی طرف ہوتی ہے۔

آنے والا دور

عالمگیر نے اپنے ایک بیٹے کو عبرت دلانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے یہ لکھا:

فرزندِ دلبند! علی مردان خاں، سعید میرزا اور قلیچ خان شاہجہانی کا یہ قاعدہ تھا کہ چوکی پہرہ کے دن سپاہیوں کی تواضع پہلے قہوے سے کرتے تھے۔ پھر حاضری کے وقت حاضری اور چاشت کے وقت چاشت کھلاتے تھے۔ رخصت کے وقت عطر اور پان دیتے تھے۔ ان لوگوں کے گھروں میں قسم قسم کے کھانے بھیجتے اور کہتے تھے کہ ان کی عورتیں اور بچے ان کی تنہا خوری پر طعن نہ کریں۔

گذشتہ زمانے میں ایک شخص ایک بزرگ کے پاس گیا اور زمانے کی شکایت کی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور سپاس ادا کرنا چاہیے کہ انسان کو نہ دل کا خوف ہے نہ مال و جان کا غم اور نہ دین و ایمان کی سستی کا اندیشہ۔ آئندہ زمانے میں دنیا والوں کی نیتوں میں فتور آ جائے گا۔ قسم قسم کے ظلم و ستم ہوں گے۔ عدل و انصاف احسان و شکر کا نام و نشان تک باقی نہ ہوگا۔ شہروں کے محافظ اور صوبوں کے ناظم کھلم کھلا لوٹ مار کی طرف مائل ہو جائیں گے اور بادشاہ بھی داد خواہوں سے چشم پوشی کرے گا۔ امیر لوگ ایک دوسرے کی مصلحت سے ظالموں کو مدد دینے میں کوشش کریں گے۔ سچ زائل اور باطل ہو جائے گا۔ عورتیں بیباک ہوں گی۔ لڑکیاں وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوں گی۔ عالی مرتبہ لوگ بے دل ہو جائیں گے اور ناقدری کی وجہ سے جان بوجھ کر کاموں کی درستی کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ قابل اور اہل لوگ گوشہ نشینی کے باوجود امن و امان میں نہ ہوں گے۔ بے وقوف اور ناتجربہ کار لوگ حکومت کریں گے۔ لڑکے باپ کو تکلیف دیں گے اور باپ کے دل سے شفقت کا جذبہ اٹھ جائے گا۔ نیک عورتیں برے شوہروں کی بدکاری اور بے توجہی سے نالاں ہوں گی۔ بارش وقت پر نہ ہوگی۔ حاکم غلہ کو نفع کی غرض سے زیادہ مہنگا بکوائیں گے۔ ملک حاکموں کے ظلم سے ویران ہو جائیں گے۔ بادشاہوں اور بڑے خانوں کے گھروں میں زانیہ عورتیں کھلم کھلا رہنے سہنے لگیں گی اور مرد عورتوں کا لباس پہننے کی خواہش کریں گے۔

عالمِ شہزادگی

عالمگیر معظم کو امرا سے بہتر تعلق پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوا اپنی شہزادگی کا حال یوں سناتا ہے:

عین پور خلافت! عقلمند اور خوش اخلاق ہونے کے باوجود تم نے فتح اللہ خاں کو کیوں ناراض کر دیا ہے۔ ہم شہزادگی کے زمانے میں امرا سے اتنا اچھا سلوک کرتے تھے کہ ہم سے سب خوش تھے۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہماری تعریف کرتے تھے۔

اس کے خلاف برادر نامہربان (دارا شکوہ) کے بااختیار ہونے کے باوجود بعض آدمی اس کا ساتھ چھوڑ کر ہم سے آملے تھے اور جن لوگوں نے برادرِ نامہربان کے اشارے سے ناشائستہ حرکات کر کے گستاخی کے کلمات استعمال کیے تھے، ہم نے چشم پوشی کی اور بُردباری کے تازیانے سے ان کی تنبیہ کی۔ اُنھوں نے انصاف سے کام لے کر ہمارے عالی حوصلہ ہونے کا اقرار کیا یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت (شاہ جہان) کے دل پر ہماری بہادری اور سرداری کا نقش بیٹھ گیا اور اس کمزور چیونٹی کے بازوؤں کے زور سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے۔ تم نے فتح اللہ خاں جیسے شخص کو ناراض کر کے ایک ایسے جفاکش بہادر سپاہی کا دل توڑ دیا ہے جو تمھارے بہت کام آسکتا تھا ؎

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود
دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

(اگر تم بے شمار لعل و گہر بھی دے دو تو کیا فائدہ۔ تم نے ایک دل توڑا ہے نہ کہ گوہر) اب جو کچھ ہوا سو ہوا، اس کی دلجوئی کرو تو بہتر ہے کیونکہ معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے یہی مفید ہے۔ آئندہ تمھاری مرضی۔ اس شخص پر سلامتی ہو، جو سیدھے راستے پر چلا۔

غیروں کا تمدن

محمد معظم کو غیر مسلموں کا تمدن اختیار کرنے سے روکنے کی خاطر لکھتا ہے:

بیٹے! ایک بے غرض آدمی کی عرضداشت سے معلوم ہوا کہ تم نے اس سال ایرانیوں کی طرح جشنِ نوروز بڑے دھوم دھام سے منایا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمھارے اعتقادات درست ہیں۔ پھر تم نے یہ تازہ بدعت کس سے سیکھی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرب نے جو سیّد کہلاتا ہے اور نیکوں کو بدنام کرنے والا ہے۔ یقیناً اس قسم کی تعلیم دی ہوگی۔ بہرحال چونکہ یہ دن آتش پرستوں کی عید ہے اور ہندوستان کے ہندوؤں کے نزدیک راجہ بکرماجیت کے جلوس کا دن ہے اور ہندی سنہ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اس لیے آج سے یہ دن نہ منایا جائے اور اپنی جہالت کا اظہار نہ کیا جائے ؎

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو
از شما یک تن نہ شُد اسرار جو

(میں نے کہتے کہتے بہت کچھ کہہ ڈالا ہے مگر تم میں سے کوئی بھی جویائے اسرار نہیں ہوا)

ایک اور رقعہ میں اسی قسم کی ایک حرکت پر محمد معظم کو تنبیہ کرتا ہے:

ایک تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ تم سر پر کیسری چیرا باندھے اور جلوان کا کرتا پہنے دربار لگاتے ہو۔ آپ کی عمر چالیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس سن و سال اور داڑھی مونچھ پر یہ نخرہ؟

روزمرہ کے مشاغل

عالمگیر اپنے بیٹوں کو جفاکشی اور سلطنت کے معاملات میں انہماک سے حصہ لینے کی تلقین کرتا ہوا شاہ جہاں کے یومیہ پروگرام (جس پر کہ وہ خود بھی بڑی سختی سے عمل پیرا ہوتا تھا) کا نقشہ پیش کرتا ہے:

شاہ جہاں فرمایا کرتے تھے کہ شکار بے کاروں کا مشغلہ ہے۔ انسان اگر عاقبت کے کاموں میں مشغول نہیں ہو سکتا تو اسے دنیا کے کام سنوارنے میں کیا برائی نظر آتی ہے . . . . کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ شاہ جہاں بنفس نفیس چار گھڑی رات رہے خواب گاہ سے باہر آ کر توفیق کے آبشار سے وضو کرتے اور ورد وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ صبح صادق سے پہلے اور نماز کی اذان کے بعد فاضل عالموں کی جماعت کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ کر جھروکہ درشن میں تشریف لاتے تھے اور درشن کرنے والوں کو اپنے دیدار کی سعادت سے مشرف فرما کر چار گھڑی دن چڑھے دیوانِ عام میں تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اس دربار میں تمام چھوٹے بڑے منصب دار حاضر ہو کر مجرا بجا لاتے تھے دیوانِ اعلیٰ اور میر بخشی اہلِ خدمات کی تجویز اور صوبوں کے کروڑیوں، امینوں، فوجداروں اور ناظموں کی جان نثاری اور حسن خدمت کے واقعات عرض کر کے ہر شخص کی امید کا دامن گلہائے مراد سے بھر دیتے۔

پھر خاصہ کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ملاحظہ کے بعد ایک پہر دو گھڑی دن چڑھے دیوان عام سے دیوانِ خاص کو رونق بخشتے تھے۔ اس مقام پر بلند مرتبہ رکھنے والے بخشی نئے منصب داروں کے حالات عرض کرتے اور اعلیٰ حضرت سے نظر ثانی کا حکم لیتے۔ ہر صوبے کے حالات و واقعات کا خلاصہ مجمل طور پر بیان کر کے ہر معاملے کے متعلق بادشاہ کا آخری حکم حاصل کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً دوپہر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد خاصہ کے کھانے کی طرف متوجہ ہو کر جسم کی مضبوطی اور عبادت و انصاف کی قوت حاصل کرنے کے لیے اس میں سے تھوڑا سا نوش فرماتے۔ وظیفہ خوار، روزینہ دار و وابستگانِ دامن کے کھانے کے متعلق جن میں سے اکثر عالم، فاضل، طالب علم، مسکین، غریب، یتیم، بے کس اور بے یار و مددگار ہوتے تھے اور ان میں اکثر ایسے ہوتے جنھیں اعلیٰ حضرت پہچانتے تھے دریافت کر کے خاص خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں تھوڑا عرصہ آرام فرماتے مگر ان کا دل پھر بھی بیدار رہتا تھا۔ پھر وہ پہر چار گھڑی دن گئے خواب گاہ سے باہر آ کر وضو کرتے اور نماز خانے میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد وظیفہ کرتے اور ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے برج اسد میں آ کے بیٹھ جاتے۔ دیوانِ اعلیٰ وہاں حاضر ہوتا اور مالی و ملکی معاملات عرض کر کے اکثر کاغذات پر دستخط کراتا۔

چار گھڑی دن رہے پھر دیوان عام لگاتے۔ اس وقت بخشی اور میر بیوتات نئے منصب داروں اور جاگیر کے طالبوں کو حضور میں پیش کرتا۔ اعلیٰ حضرت بڑے غور و خوض کے بعد ذاتی لیاقت اور خاندانی حالات کی تحقیق کر کے اس کا منصب و جاگیر مقرر کرنے کا حکم صادر فرماتے۔

شام کے بعد دیوانِ عام سے اٹھ کر مغرب کی نماز پڑھتے اور خلوت خانے میں تشریف لے جاتے۔ وہاں شیریں بیان و

اور قصہ خواں، خوش الحان قوال اور جہاں گرد سیاح حاضر ہوتے۔ پردے کے اندر عورتیں اور پردے کے باہر مرد بیٹھتے، ہر شخص ملکوں کے عجیب وغریب تحفے پیش کرتا۔ مورخ اور قصہ خواں قدیم بادشاہوں اور بزرگوں کے حالات بادشاہ کو سناتا۔ الغرض اعلیٰ حضرت آدھی رات تک اپنے شب و روز کے اوقات اس طریق پر تقسیم فرما کر زندگی اور حکومت کی داد دیتے تھے۔

چونکہ ہمیں تم سے دلی پیار اور محبت ہے اور یہ محبت اور پیار جھوٹا اور بناوٹی نہیں ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی مناسب معلوم ہوا اور تم جیسے فرزند ارجمند کے حق میں بہتر اور مناسب نظر آیا اسے ہم نے بے اختیار لکھ دیا ہے۔

اولاد کی تربیت

عالمگیر اپنے بیٹوں کی تربیت جس طرح کرنی چاہتا تھا اس کا پتہ ان واقعات سے ہو سکتا۔ وہ محمد اعظم عالی جاہ کو لکھتا ہے:

"معلوم ہوا ہے کہ تم سواری کے وقت گھوڑے کو بڑی تیزی سے دوڑاتے ہو۔ چنانچہ تمہارا چتر بردار جو پیدل ہے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ تم ایک مدت تک میرے پاس رہے اور سواری کے طور طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا ؎

"آہستہ خرام بلکہ مخرام   زیر قدمت ہزار جان است"

ایک دوسرے موقع پر محمد اعظم کو لکھتا ہے:

کوٹا کا چکلہ دار حسن بیگ اب تک معزول نہیں ہوا۔ وہاں کی رعایا واویلا کرتی ہے اور پتھروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر کہہ رہی ہے۔ ؎

اگر تو می ندہی داد روز دادے ہست

اصل محاسب حاکموں کے ظلم و ستم کو ہمارے اور تمہارے حساب میں لکھ رہے ہیں۔ اعمال کی سزا یعنی آخرت کی آمد پر ایمان رکھتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے ساتھ انصاف کرو اور رواداری سے کام لو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہاری جاگیر بدل دی جائے گی اور تمہیں اس کا بدلہ ملے گا۔

اچھے کارکنوں کی تلاش

عالمگیر کو ہمیشہ خواہش رہی کہ اسے اچھے کارکن میسر آئیں وہ ان کی تلاش میں رہتا۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو لکھتا ہے:

ایک روز سعد اللہ خاں درود وظائف سے فارغ ہونے کے بعد دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رہا۔ ایک گستاخ مصاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ اب کیا آرزو باقی ہے؟ اس نے کہا۔ اچھے آدمی کی ضرورت ہے"۔ واقعی اچھے

خوب کہا۔ اگرچہ انسان میں دیانت و امانت کا جوہر فطری اور خداداد ہوتا ہے لیکن اس میں آقا کی ہمت اور انصاف کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے ملازم کو فکرِ معاش کی طرف سے فارغ البال اور خوش حال رکھے تاکہ وہ دنیا کی ضروریات سے پریشان نہ ہو اور اس طرح اس کے اعتقاد میں خلل پیدا نہ ہو کہ ؎

مزدور خوش دل کند کار بیش

حوصلہ افزائی

اسی سلسلے میں ایک دیانت دار ملازم کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے اعظم کو لکھتا ہے:

"معلوم ہوا ہے کہ تمھارا دیوانِ خاص مصطفےٰ قلی بیگ اپنے فرائض بڑی احتیاط اور دُوراندیشی سے بجا لاتا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے۔ اگر تم لکھو تو اس کے منصب میں اضافہ کر کے اسے "خان" کا خطاب دے دیا جائے۔ اچھے آدمی خالص سونا ہوتے ہیں جو بہت کمیاب اور بیش بہا ہیں ؎

آنچہ پرجستیم و کم دیدیم بسیار است و نیست
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یعنی جس چیز کو ہم نے بہت تلاش کیا اور کم پایا وہ اس جہان میں انسان کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو بہت بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔

ایک اور رقعہ میں عالمگیر لکھتا ہے:

صوبہ مالوہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سنگھ بدباطن جس نے تکبر اور غرور کے نشے میں چور ہو کر شورش و فساد برپا کیا تھا اور جو اس علاقہ میں فتنہ اور فساد کی جڑ تھا وہ اب اس با اقبال اور عالی مقام فرزند کے نائب دیوان تلوک چند کے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔

اصل میں اس واقعہ کا ظہور تمھارے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔ تم نوکروں کی دلجوئی کر کے انھیں سلطنت کے عمدہ امور میں مصروف رکھتے ہو۔ اس وجہ سے ہم زبانی مبارکباد نہیں دیتے بلکہ قیمتی موتیوں کی مالا جس کی قیمت پچاس ہزار روپے ہے، عطا کرتے ہیں۔ تلوک چند نے اپنے فعل سے یہ مثل سچ کر دکھائی ہے کہ چڑیا نے بہادری سے کام لے کر باز کو مار ڈالا ہے۔ اس لیے ہم اسے بھی پانصدی ذات اور دو صد سوار کا منصب دیتے ہیں۔ اسے "رائے" کا خطاب، خلعت، شمشیر اور ہاتھی انعام کے طور پر عطا کرتے ہیں۔ تم بھی تلوک چند کے مرتبے میں ایسا مناسب اضافہ کرو جس سے وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز ہو جائے۔ سو واجب یہ ہے کہ تحسین و آفرین کے ساتھ اسے صوبے کی نیابت پر مستقل کر دو تاکہ دوسرے نوکروں کے دلوں میں حسنِ خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔

غفلت و بے پروائی

عالمگیر اپنی ساری سلطنت پر نظر رکھتا تھا۔ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے خفیہ نویس مقرر کیے ہوئے تھے جو اسے ذرا ذرا سی بات پہنچاتے تھے وہ اپنے بیٹے کو اس کی غفلت پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

فرزند عالی جاہ! جاسوسوں کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ بلادل پور سے خجستہ بنیاد تک شاہراہ پر خطر ہے۔ ڈاکو بیوپاریوں اور مسافروں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔ عوام امن و امان کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ جب ہمارے اور تمہارے لشکروں کے قرب و جوار میں یہ حالت ہوگی تو دور و دراز راستوں کی کیفیت کتنی افسوسناک ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخبر تمہیں معتبر خبریں نہیں بھیجتے۔ چونکہ غفلت اور بے پروائی حکومت اور جہاں بانی کے اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے تم نئے مخبر مقرر کرو اور پہلے مخبروں کو سزا دو اور ایک ہوشیار فوج مقرر کر کے ان فتنہ پردازوں کی بیخ کنی کرو۔ شاہراہ کو ڈاکوؤں کی تاخت و تاراج اور وجود سے پاک کر دو۔ بدنظمی کی یہ لعنت کیسے اور کب تک گوارا ہو سکتی ہے؎

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکر سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

فقیروں کی خدمت

عالمگیر میاں عبداللطیف برہانپوری کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ ان کے فیضان اور نصائح سے ایک مدت تک مستفید ہوتا رہا۔ اپنے بیٹے کو ایک صحبت کا حال لکھتا ہے:

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ہم میاں عبداللطیف قدس سرہ الشریف کی خدمت میں گئے۔ دوران گفتگو ہم نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو کھرکھون کے آس پاس کے چند گاؤں خانقاہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیے جائیں۔ اس پر انھوں نے اپنی زبان سے فرمایا؎

شاہ ما را دہ دہد منت نہد   رازقِ ما رزق بے منت دہد

(بادشاہ ہمیں گاؤں دے کر ممنون احسان کرتا ہے لیکن ہمارا رازق (اللہ تعالیٰ) ہمیں بغیر احسان کے رزق دیتا ہے)

ہم نے کہا: ایسا ہی ہے لیکن فقیروں اور اللہ والوں کی خدمت کرنا دنیوی خیر و برکت، اپنے آرام و آسائش اور نعمت اور دولت کی زیادتی دعا کے لیے ہے نہ کہ حرص و احسان کے لیے۔ میاں صاحب نے فرمایا۔ اگر واقعی تمہارا ارادہ پختہ اور نیت نیک ہے تو ہم رعایا کے حصے میں سے نصف غلہ لے لیں گے بلکہ جفاکش مظلوموں کے لیے اس سے بھی زیادہ چھوڑ دیں گے۔ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

رکھنے والے گوشہ نشینوں کے لیے جو زبانِ سوال بند کیے بیابانوں اور ویرانوں میں رہتے ہیں۔ دائمی وظیفہ مقرر کرو اور مظلوموں کی اس طرح دادرسی کرو کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ طاقتور کمزوروں کو تنگ نہ کر سکیں۔

چکلہ کوڑہ کے باشندوں کی نالش کے موقع پر ہمیں یہ نقل یاد آئی جو بے اختیار تمھیں لکھ دی گئی ہے۔

فقیروں کی دُعا

اسی طرح احمد آباد گجرات میں ایک درویش میر عرب نامی رہتا تھا۔ عالمگیر اس سے بھی متاثر تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

تم نے احمد آباد گجرات میں میر عرب درویش کو دیکھا ہے۔ وہاں دوبارہ جاؤ اور اس شرمندۂ عاقبت اور طالبِ دنیا کا سلام اسے پہنچاؤ اور صدقِ دل سے انجام کار کی اچھائی اور ایمان کی سلامتی کے لیے ان سے دُعا چاہو۔ کہو، موت کا وقت قریب آپہنچا ہے اور میں اعمالِ نیک سے دُور ہوں۔ اس غافل کی عمر بے سود گزر گئی اور اب جس قدر باقی ہے۔ وہ بھی بے فائدہ گزر رہی ہے۔ زندگی کا قدم آگے پڑتا ہے اور نجات کی فکر پس پُشت ہے ؎

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد
درمیانِ خانہ گم کردیم صاحب خانہ را

نصائح

عالمگیر اپنے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے نصیحت کیا کرتا تھا۔ ایک موقع پر وہ سعد اللہ خاں کی بیاض کے حوالے سے کچھ نصیحتیں لکھتا ہے۔ یہ نصیحتیں جہانبانی و جہانداری کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

سلطنت کا قیام انصاف سے ہوتا ہے۔ ملک و مال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالم اور فاضل لوگوں کے ساتھ صحبت رکھنا جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔ اپنے عقائد پر عمل کرنا عین مصیبت کے عالم میں مستقل مزاج رہنا۔ تدبیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا خاندان کے دائمی قیام کی بنیاد یتیموں پر رحم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے۔ ملکی کام وزیروں کے صلاح مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ فتح و کامرانی فقیروں کی دُعا سے اور ستم رسیدہ دردمندوں کا درد دُور کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ مجرموں کے گناہ معاف کرکے خدا کی جناب سے رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔

ہم نے چاہا کہ تنہا ہی ان سے لطف اندوز نہ ہوں اس لیے یہ نصیحتیں تم کو بھی لکھ بھیجی ہیں۔ خدا سب کو عمل کی توفیق دے۔

آخری وصیت

جب اورنگ زیب کا آخری وقت قریب آیا تو اُس نے یہ فرمان سب بیٹوں کے پاس بھیجا:

بڑھاپا آگیا۔ کمزوری زیادہ ہو گئی۔ اعضا میں قوت نہیں رہی۔ دنیا میں بیگانہ (تنہا) آیا تھا۔ اب سب سے بیگانہ جارہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ کی خبر نہیں کہ کون ہوں اور کس کام کے قابل ہوں۔ جو دم عبادت کے بغیر گزرا اُس کا افسوس باقی ہے۔

حکومت اور رعیت پروری کوئی مجھ سے نہ بن آئی۔ قیمتی عمر مفت میں ضائع ہو گئی۔ گھر کا مالک (خداوند تعالیٰ) تو موجود ہے لیکن میں اپنی تاریک آنکھوں میں اس کی روشنی نہیں دیکھتا۔ زندگی پائدار نہیں۔ گزرے ہوئے دم کی نشانی ظاہر نہیں اور مستقبل کے متعلق کوئی امید نہیں۔ تپ نے جدائی اختیار کی اور چمڑے کو تنہا چھوڑ دیا۔

فرزند کام بخش اگرچہ بیجا پور چلا گیا ہے لیکن وہ نزدیک ہے بلکہ وہ عالی جاہ (اعظم) سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ عزیز القدر شاہ عالم بہادر سب سے زیادہ دُور ہے۔ فرزند زادہ محمد عظیم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہندوستان کے نزدیک پہنچ گیا ہے۔ فوج کے آدمی سب کے سب بے دست و پا مضطرب و پریشان اور میری طرح بے قرار ہیں جو اپنے خداوند حقیقی سے علیحدگی اختیار کر کے بیتابی کی حالت میں ہے اور پارہ کی طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ہم پر بھی ایک حاکم اعلیٰ ہے۔ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا مگر افسوس گناہوں کا بوجھ ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر نظر اور اس کی رحمت سے قوی اُمید ہے لیکن اپنے اعمال و افعال کو دیکھتے ہوئے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔

اگرچہ پروردگار اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا لیکن ظاہری حالات پر نظر رکھتے ہوئے فرزندوں پر بھی واجب ہے کہ خلق خدا اور مسلمان ناحق نہ مارے جائیں۔ فرزند زادہ بہادر کو آخری دُعا کہہ دیں۔ ہم نے رخصت کے وقت اسے نہ دیکھا۔ شوق باقی رہا۔ بیگم (نواب بائی والدہ کام بخش) اگرچہ رنجیدہ خاطر ہے لیکن دلوں کا مالک خُدا ہے۔ عورتوں کی کوتاہ اندیشی ناکامی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔ الوداع۔ الوداع۔ الوداع۔

(مرتب: محمد علم الدین سالک)

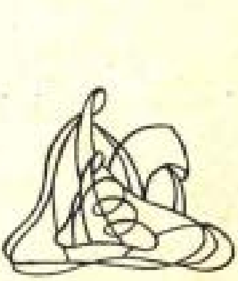

ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن

میں ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء میں مدراس سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف چھوٹے سے ایک قصبے تروتانی میں پیدا ہوا تھا۔ میں ہندو ماں باپ کا دوسرا بچہ ہوں۔ خاندانی ورثے میں میرے لیے کچھ بھی نہ تھا، نہ فوقیت، نہ اہمیت، نہ امارت۔ میری عمر کے پہلے بارہ سال تروتانی اور تروپتی میں گزرے۔ یہ دونوں قصبے یاترا کے لیے مشہور تھے۔

میں جب اپنی ذات کو پہچاننے کے قابل ہوا تو مجھے قدرت کے مافوق الفطرت ظواہر کے پیچھے ایک اور دنیا نظر آنے لگی جو حسیات سے نہیں ذہنی قوت یا روحانی بینائی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس غیر مرئی مگر حقیقی دنیا کا وجود میرے عقائد میں شامل ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اس پس پردہ دنیا کا کیونکر قائل ہوا تو شاید میں کچھ بھی نہ بتا سکوں لیکن میرا عقیدہ اس قدر پختہ ہے کہ زندگی میں طوفان بھی آئے لیکن میرے عقیدے کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس عقیدے نے مجھے سوچ و فکر میں ڈبو دیا اور میں تنہائی پسند ہو گیا۔

خارجی دنیا کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ میری تنہائی کی بھی ایک دنیا ہے — ایک داخلی دنیا — اس دنیا میں قدم گھسیٹتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری تنہائی کی ساتھی وہ شاہراہیں ہیں جو مجھ پر کتابوں نے کھولیں یا وہ چہرے ہیں جو مجھے کتابوں نے ہی دکھائے ہیں۔

ایک یا زیادہ سے زیادہ دو آدمی ایسے مل جائیں جو مجھے سمجھتے اور جانتے پہچانتے ہوں تو ان کے ساتھ ذرا سی دیر طبیعت جم جاتی ہے ورنہ محفل سے کتراتا ہوں۔ مشکل سے ہی جی لگتا ہے لیکن ضرورت پڑے تو مجھے وہ ڈھنگ بھی آتے ہیں کہ کسی بھی درجے اور کسی بھی عمر کے انسان کا دل موہ لیتا ہوں۔ اس فن میں مجھے ناقابل یقین حد تک مہارت حاصل ہے۔ میں خود تو تنہائی پسند ہوں اور مجھ میں حجاب کی حد تک جھجک بھی ہے۔ پھر بھی مجھے وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو سوشل اور محفل پسند ہوں۔ میرے متعلق لوگوں کی رائے درست ہے کہ مجھے جاننا آسان نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں گوشہ نشین ہوں اور اپنے خول سے کم ہی باہر آتا ہوں کہ کسی کو اچھی طرح نظر آ سکوں۔ بیشتر لوگ مجھے سرد مہر اور ہٹ کا پکا انسان سمجھتے ہیں لیکن معاملہ الٹ ہے۔

مجھ میں جلن اور جذباتی احساسات کی بڑی استطاعت ہے لیکن میں انھیں چھپائے رکھتا ہوں۔ میرے جذبات دوسروں سے پیچھے رہتے ہیں مجھ میں اعصابیت جیسی خامی بھی ہے اور میں پرلے درجے کا حساس آدمی ہوں۔ ایک ایڈیٹر نے مجھ سے خود نوشت سوانح مانگی ہے۔ اگر میں نے اپنے حساس پن اور دیگر خامیوں سے اپنی زندگی کا چہرہ مسخ نہیں کر لیا اور ایڈیٹر ہم بھی میری سوانح کو

کتابی شکل میں پیش کرنے کے قابل سمجھا ہے تو یہ محض اتفاق یا میری خوش قسمتی ہے۔ ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میری قسمت اچھی ہے۔ ورنہ میں آج کے مقام تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔ قسمت نے ہی میری راہنمائی کی ہے اور قسمت نے ہی میری حفاظت کی ہے۔ ورنہ میری ناؤ کبھی کی ڈوب چکی ہوتی۔

میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھے زندگی میں جس قدر مواقع ملے، میں نے جو منصوبے بنائے اور جو فیصلے کئے وہ کوئی غیبی قوت کرتی رہی ہے اور جس کا مقصد وہ نہیں جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایسی خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہونے دیا کہ پرمیشور نے اپنی قوتیں میرے ہی لیے وقف کر رکھی ہیں۔ البتہ اس حقیقت کا قائل ہوں کہ پرمیشور کو انسانی زندگی سے مکمل دلچسپی ہے۔

میں جب کہتا ہوں کہ میری کامیابیاں اس غیبی قوت یا قسمت کی بدولت ہیں تو میرا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میری ناکامیاں قسمت کا نتیجہ ہیں۔ میں نے جو پایا اپنے زور سے نہیں پایا لیکن جو کھویا وہ اپنی ہی لغزشوں سے کھویا۔

بلوغ کے بعد مجھے ہیگل کا یہ قول اکثر یاد آتا رہا ـــ "اُس انسان کی زندگی سنور گئی جسے وہ کام مل گیا جسے وہ پسند کرتا ہے اور وہ بیوی مل گئی جو اُسے پسند کرتی ہے" ـــ لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ہمارے گھرانوں کی ہر بیوی اپنے خاوند کو پسند کرتی ہے۔ زمانہ سو رنگ بدلے بیوی کا ذہنی رجحان وہی رہتا ہے جو اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے زندگی کی طرز اور اقدار تو نہیں بدلیں، بنیادی حقیقت تو وہی ہے جو پہلے تھی۔ خاوند کہیں جھک مارتا ہے تو مارے، ہندو بیوی دہلیز پر بیٹھی اس کی راہ بڑے ہی خلوص سے دیکھا کرتی ہے۔ کہتی ہے خاوند کہیں چلا تو نہیں گیا، لوٹ کے میرے ہی پاس آ گیا ہے خاوند کی جفائیں، بیوی کی وفاؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

ہم ہندوستانیوں کو قدرت نے سب سے بڑی نعمت جو دی ہے وہ ازدواجی زندگی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں چند ایک معاشرتی تبدیلیوں کی شدید ضرورت ہے۔ اس نظام میں بیوی کے حقوق کے تحفظ کا ضامن اُس کے خاوند کا خلوص ہے لیکن موجودہ دور میں یہ ضمانت خام سی لگتی ہے۔

میں نے عیسائی مشنری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس سے مجھے عیسائیت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں اور جس زاویے سے عیسائیت نے ہندومت پر نکتہ چینیاں کی ہیں اس کی تفصیلات کا بھی علم ہو گیا۔ لیکن کسی کے مذہبی جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ کسی کے مذہب میں کیڑے نکالنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مذہب بے شمار ہیں لیکن سب کی تان "ایک ہی خُدا" پر جا ٹوٹتی ہے، منزل سب کی ایک ہے، راہیں جُدا جُدا ہیں۔ مجھے عیسائی مذہبی پیشواؤں کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگتی کہ وہ اُن عقائد پر حملے کرتے رہتے ہیں جو دوسروں کو جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یسوع مسیح نے ایسے کبھی نہیں کیا ہوگا۔

آج کے زمانے میں کسی مذہب کو اجارہ داری حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ ہندومت کے خلاف عیسائیوں کی نکتہ چینی نے ہی مجھے اکسایا تھا کہ میں ہندومت کی تحقیق کر کے دیکھوں کہ اس کے کون سے اصول مر چکے ہیں اور کون سے مر رہے ہیں۔ میں نے خاصی مدت صرف کر کے تحقیق اور تجزیہ مکمل کیا اور ڈھیر سارا مواد جمع کر کے "ویدانت میں اخلاقیات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔

یہ کتاب مسیحیوں کے الزام کا جواب تھا کہ ویدانت اخلاقیات سے خالی ہے۔ میں آج اپنی اس پہلی تصنیف کو دیکھتا ہوں تو شرم سی آتی ہے کہ میں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ میں تو اسے علمی خامیوں کا پلندہ سمجھتا رہا ہوں لیکن مدراس کرسچن کالج کے نامی گرامی پروفیسر ہاگ نے اس کی بے حد تعریف کی تھی۔

۱۹۰۹ء میں میں مدراس پریزیڈنسی کالج میں فلاسفی کا لیکچرار لگ گیا۔ میں نے ہندوستانی فلاسفی اور مذہب کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں مذہب کی بنیادوں تک اتر گیا اور میں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ مذہب انسان کی داخلی دنیا کا معاملہ ہے۔ حق کو جاننے کے لیے بچے جیسا معصوم دل چاہیے اور خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے دل میں خلوص اور نکوکاری کی قندیلیں روشن ہونی چاہئیں۔ اخلاقیات کے بغیر خدا سے لو لگانا ممکن نہیں۔

ہندومت کے طور طریقے کیسے ہی ہوں لیکن اس مذہب کو دنیا کے مذاہب سے خارج تو نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی منزل بھی وہی ہے جو دوسروں کی ہے۔ یہ بھی روح کی پاکیزگی اور بنی نوع انسان سے پیار و محبت کے سبق دیتا ہے۔ ہندوستان کا تمدن دراصل معاشرتی زندگی میں فلسفیانہ دانش مندی سمونے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ ہندومت دوسرے مذاہب کی طرح حق دار کو حق دینے، معاشرے میں یک جہتی، توازن اور مسرت کا قائل ہے۔

ہندوانہ اخلاقیات اور مایا کے تصور کے مطالعہ کے لیے مجھے رابندرناتھ ٹیگور نے بہت متاثر کیا ہے اور اس مفکر کی تعلیمات نے مجھے بہت مدد دی ہے۔

۱۹۱۸ء میں مجھے میسور یونیورسٹی میں فلاسفی کا پروفیسر لگا دیا گیا۔ میں نے فلسفہ اور مذہب کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ شروع کر دیا اور ۱۹۲۰ء میں ایک کتاب لکھی جو لندن میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۱ء میں مجھے کلکتہ یونیورسٹی میں کنگ جارج ففتھ چیئر آف مینٹل اینڈ مورل سائنس میں ایک اعلیٰ جگہ دے دی گئی۔ یہاں سے میری علمی سرگرمیوں کا بھرپور دور شروع ہو گیا۔ مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کا دعوت نامہ ملا اور میں نے ۱۹۲۶ء میں وہاں "ہندو نظریۂ حیات" پر لیکچر دیا۔ پھر میں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی لیکچر دیا۔ یہ میرا امریکہ اور یورپ کا پہلا دورہ تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جس طرح میرا استقبال کیا اور جس خلوص کا مظاہرہ کیا۔ وہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔

میں نے ایک بات اس دور میں بھی کہی تھی، آج بھی وہی بات کہتا ہوں کہ علم جدید نے ہم پر نئی راہیں کھولی ہیں اور علم کے نئے خزانوں سے پردہ اٹھایا ہے لیکن اس کے باوجود ہم پچھلی نسلوں سے کسی صورت بہتر نہیں بلکہ ہم رو بہ تنزل ہیں۔ ہماری ذہنیت مشینی بن گئی ہے۔ ہم معاشرے کے محض پرزے بنا دیئے گئے ہیں، جیسے ایک ہجوم کے بے معنی افراد — علم نفسیات نے محض دعوے پیش کر دیا ہے کہ انسان کی ظاہری حرکات سے ہی اس کی داخلی دنیا میں جھانکا جا سکتا ہے۔ سائنس اور مشین نے انسان کی روزمرہ کی سرگرمیوں کو سرد کر دیا ہے اور سائنس نے غربت کو نیست و نابود کر دینے کا بھی دعوے کیا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں، دنیا میں غربت صرف موجود ہی نہیں بلکہ روز افزوں ہے۔ اس ناگوار صورت حال کا سبب یہ ہے کہ دلوں میں وہ خلوص اور آشتی ہی نہیں رہی جو مذہب نے سکھائی تھی۔ سائنس اور علم نفسیات نے مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ اس ضمن میں خیال آتا ہے کہ اشتراکی اور منطقی نظام شاید بہتر ہیں جو

معاشرے میں دولت اور اقتدار کے توازن کے قائل ہیں۔ مگر وہ ایسا نظام رائج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں نظام انفرادیت اور ذاتی آزادی کو بھی سلب کر دینے کے حق میں ہیں اور وہ دستورِ زباں بندی کے بھی حامی ہیں۔

کیوں نہ ہم ایک متوازن اقتصادی نظام کے لیے جدوجہد کریں لیکن یہ خیال بھی رکھیں کہ اس توازن سے روحوں کی مسرت دلوں کا پیار، رکھ رکھاؤ اور انسانیت کا جذبہ ہی ختم نہ ہو جائے۔ عالمی امن ایک ہی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر ایک کی روح کو اس سے سرشار کیا جائے۔ فرد کی روح میں امن ہو تو عالمی امن کے حصول میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ روح علیل یا تشنہ ہو تو جسمانی اور علمی قوتیں محض بیکار رہیں۔ ہم آج کے ترقی یافتہ دور میں ایسے ایسے مظاہرے دیکھتے ہیں جو ہمیں جہالت کے تاریک دور کی یاد دلا جاتے ہیں۔ انسانوں کے دماغوں میں تو علم ہے لیکن روحوں اور دلوں میں زہر بھر گیا ہے۔

میں عالمی امن کا متمنی ہوں۔ آج کے معاشرتی ڈھانچے میں ضرور کوئی ایسی بنیادی خامی ہے جو اقتدار کے بھوکے لوگوں کی نفسیاتی تقاضوں سے عبارت ہے۔ لیگ آف نیشنز کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے کہ اس ادارے کے فیصلے طاقتور قوموں کے ہاتھ میں تھے اور کمزور قومیں محض تماشائی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی میں مانچسٹر کالج کے پرنسپل کی جگہ پُر کرنی پڑی تو میں نے زندگی کی فلاسفی پر دل کھول کر لیکچر دیے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ لیکچر "مذہب میں مشرق و مغرب" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو لندن میں ہی شائع ہوئی۔ ان تمام لیکچروں کا بنیادی خیال ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ مذہب انصاف پسندی، امن پرستی، جذبۂ ترحم اور حُبِّ انسانی کا مرکب ہے۔ اگر کسی انسان کو مسرور اور مطمئن زندگی میسر آ جائے تو اسے یوں نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں ہر کوئی مسرور اور مطمئن ہے۔ گردوپیش کو ایک نظر دیکھیے تو سہی۔ آپ کو بہت کم ایسے خوش نصیب نظر آئیں گے جو جینے کی آسائشوں سے آشنا بھی ہوں۔ انہی بدنصیبوں سے فیاضی سے پیش آنے کو ہی حُبِّ انسانی کہتے ہیں۔

مجھے اس بات پر اکثر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے طلباء کو ان کی عمر کے اس دور میں تعلیم دی ہے جب ان کی شخصیتیں کسی خاص سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار تھیں اور لڑکپن خارجی اثرات کے تحت ایک واضح شخصیت اور کردار کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ میں نے ان کے اس نازک ترین دور سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھیں ذہن نشین کرایا کہ جس کے دل میں تصوف، فیاضی اور محبت گھر کر جاتی ہے۔ اسے آئندہ عمر میں انگیخت خواہ وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، مذہب سے منحرف نہیں کر سکتی۔ میں نے بیشتر طلباء کو دوراہے پر راہ دکھائی ہے۔

مذہب کے لیے عبادت لازمی ہے اور عبادت کے لیے خاموشی لازمی ہے۔ خاموشی میں ہی انسان اپنی روح کی صدا سن سکتا ہے۔ عبادت خدا کی تلاش کا دوسرا نام ہے لیکن اکثر انسان اس خدا کی جستجو میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں جو ان کے دلوں میں موجود ہوتا ہے کم عقل انسان گہری جھیلوں میں غوطے لگاتا ہے، اونچے پہاڑوں کی بلندیاں پھلانگ جاتا ہے اور گھنے جنگلوں کی پُرخار راہوں پر مارا مارا پھرتا ہے — کیوں؟ — وہ خدا کے حضور میں پیش کرنے کو کوئی حسین ترین پھول ڈھونڈ رہا ہوتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ دونوں ہاتھ جب مل کے دعا کو اٹھتے ہیں تو ان کی شکل کنول کے پھول کی سی ہو جاتی ہے اور یہی وہ پھول ہے جو خدا کو بہت ہی عزیز ہے۔

میں اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہوں کہ میں نے کتابیں اور مضامین لکھنے میں جو محنت کی ہے وہ رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے چند ایک شاگرد ملے ہیں جنھوں نے میری عینیت کا راز پا لیا ہے۔ وہ اس حقیقت کے قائل ہو گئے ہیں کہ انسان کی بڑائی امارت اور معاشرتی درجے کی محتاج نہیں۔ خدا مفلسوں اور گنواروں کو بھی اپنی نگاہ و کرم کا برابر کا حق دار سمجھتا ہے۔ انسان جذبِ انسانی سے ہی بڑا بن سکتا ہے۔ میرے شاگردوں نے اس حقیقت کو کردار میں سمو لیا ہے کہ محبت اسی دل میں ہوتی ہے جس میں درد بھی ہوتا ہے۔ غم و اندوہ سے روح پاک ہوتی ہے اور انسان انسان کے قریب ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت بھی انھی کے لیے ہے جو دُکھی ہیں، دُکھ سہتے ہیں اور اشک بہاتے ہیں — کچھ اپنے لیے، کچھ اوروں کے لیے۔

مجھے اس سنت کا قصہ یاد آتا ہے جو ہے تو شاید خیالی لیکن اس میں عظیم حقیقت نہاں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک سنت مر کے آکاش پر گیا تو اس کے سر پر سونے کا تاج رکھا گیا۔ اس نے دیکھا کہ دوسرے سنتوں کے سروں پر ہیرے جواہرات کے تاج تھے۔ اس نے ایک فرشتے سے پوچھا: "ان کے تاجوں میں ہیرے کیوں جڑے ہوئے ہیں اور میرا تاج ہیروں کے بغیر کیوں ہے؟" فرشتوں نے کہا: "یہ ہیرے ان کے اپنے آنسو ہیں جو وہ روئے زمین پر دوسروں کی خاطر بہاتے رہے ہیں۔" سنت نے کہا: "میں آنسو کیونکر بہاتا، میں تو خدا کی محبت میں بہت خوش رہا ہوں۔" فرشتوں نے کہا: "اسی لیے تمھیں سونے کا تاج دیا گیا ہے۔ ہیرے تو ان آنسوؤں سے بنتے ہیں جو دوسروں کی خاطر بہائے جاتے ہیں۔"

میں نے ہمیشہ ایسی ہی زندگی کی خواہش کی ہے جو دوسروں کی خاطر بسر کی جاتی ہے۔ میرے ایک پرانے دوست نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ نہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ کسی کو ناپسند کر سکوں، شاید اسی لیے میں جاہلوں اور بدکاروں سے مل بیٹھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دراصل میرا دوست مجھے سمجھ نہیں سکا۔ وہ نہ مجھے سمجھ سکا ہے نہ جاہلوں اور بدکاروں کو۔ ہمارے ہاں نیک و بد کا تصور ہی غلط ہے۔ نیک یا بد انسان نہیں ہوا کرتے خیالات ہوا کرتے ہیں۔ میں نے بہت سے گنہگار لوگ دیکھے ہیں جو سراپا خلوص ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں ہمدردی ہوتی ہے اور وہ ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورت محبت ہے اور محبت ہی اس کے خمیر کا غالب جزو ہے۔ میں انسانوں سے محبت کرتا ہوں، ان کے خیالوں میں کوئی خامی دیکھتا ہوں تو اُسے سدھارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مجھے لوگوں کے بے شمار خطوط ملتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پند و نصیحت مانگتے ہیں۔ ان میں بعض خط بے معنی سے ہوتے ہیں بعض قابلِ ہمدردی اور چند ایک بے معنی بھی اور قابلِ ہمدردی بھی۔ ان لوگوں میں بعض میرے واقف کار ہیں اور دیگر اجنبی لیکن میرے لیے سب برابر ہیں۔ میں انسانوں کی درجہ بندی عمر، تعلیم اور امارت سے نہیں کیا کرتا۔ مجھے تو ان کی روحوں سے دلچسپی ہے۔ میرے سلوک و برتاؤ اور رویے میں ایک گونہ بے ساختگی ہوتی ہے جس سے میرے مخاطب اکثر بوکھلا جاتے ہیں اور مجھے غلط سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل آج کے مشینی دور میں خلوص اور بے ساختگی مفقود ہو گئی ہے۔ خلوص کا مظاہرہ کرو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص عیار ہے۔ تاہم میں خوش ہوں کہ میری عینیت اور عقیدوں نے مجھے انسانوں کے قریب کر دیا ہے اور میں کسی نہ کسی طور ان کے کام آنے کے قابل ہوں۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ ذہنی اور جذباتی بھی۔ لیکن جن سے میں ہمدردی کرتا ہوں وہ مجھ سے ہمدردی

کرتے ہیں تو دل کو ایسا سکون ملتا ہے جیسے سب دُکھ دُور ہو گئے ہیں اور تمام مسئلے حل ہو گئے ہیں۔

کسی دکھی دل پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دو، کسی بچّے کو دیکھ کر مسکرا دو، کسی بدنصیب کی سسکتی اُمیدوں کو ذرا سا سہارا دو تو اس سے بڑھ کر اور پُرسکون زندگی کیا ہو گی۔

حالاتِ زندگی

آپ نے تیروتی، ویلور اور مدراس میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۹ء میں مدراس پراونشل ایجوکیشن سروس میں شامل ہو گئے۔ آپ زیادہ تر فلاسفی کے پروفیسر رہے اور اس مضمون کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں "فلاسفی آف رابندرناتھ ٹیگور" اور ۱۹۲۰ء میں مذہب کی فلاسفی پر ایک کتاب لکھی۔ پھر آپ کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے اور "انڈین فلاسفی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء تک تین اور کتابیں لکھیں۔

۱۹۳۱ء میں آپ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یہ دور ان کی علمی سرگرمیوں کا دور تھا۔ آپ کے مضامین بھی مختلف جریدوں میں چھپے اور دو اور کتابیں بھی۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک یونیسکو میں ہندوستانی وفد کے سربراہ رہے اور دو سال اس عالمی ادارے کے چیئرمین بھی رہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک روس میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انڈین یونین کے وائس پریزیڈنٹ بنے اور ۱۹۶۲ء میں انڈین یونین (بھارت) کے پریزیڈنٹ بن گئے۔

آپ نے کرۂ ارض کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک کے دورے کئے ہیں۔

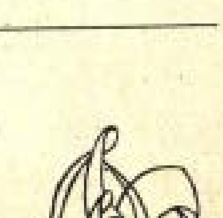

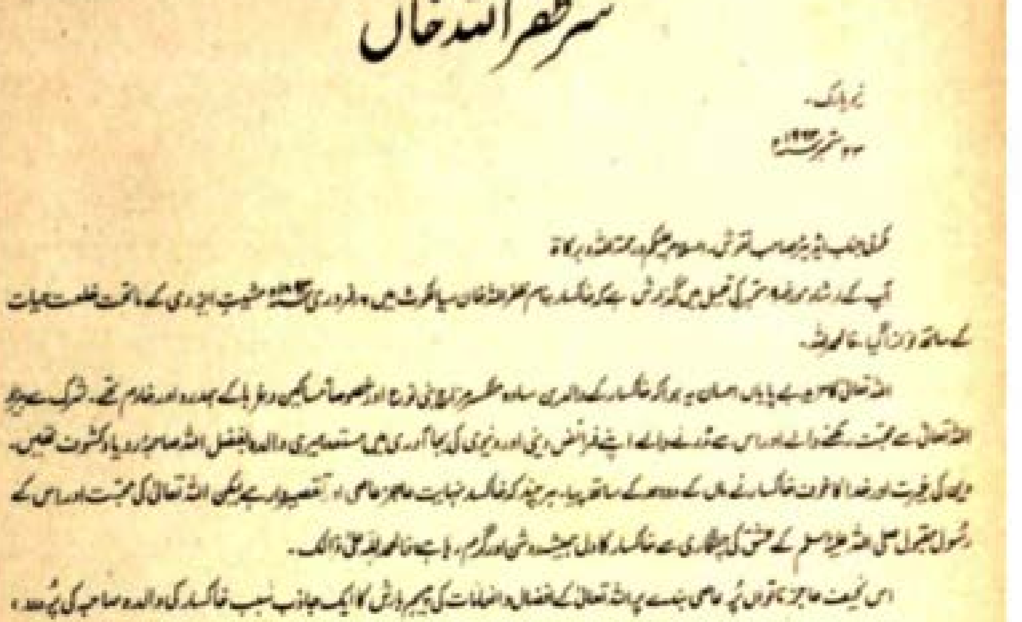

سر ظفر اللہ خاں

نیویارک۔
۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب نقوش، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے ارشاد مرقومہ [illegible] کی تعمیل میں گزارش ہے کہ خاکسار مسمّی ظفر اللہ خاں سیالکوٹ میں ۶ فروری ۱۸۹۳ء مشیت ایزدی کے ماتحت خلعت حیات کے ساتھ وارد دنیا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بے پایاں احسان ہے کہ خاکسار کے والدین سادہ طبیعت [illegible] اور خصوصاً سلسلہ عالیہ احمدیہ کے پیرو اور خادم تھے۔ شرک سے بیزار، اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے اور اس سے ڈرنے والے، اپنے فرائض دینی اور دنیوی کی بجا آوری میں مستعد۔ میری والدہ بفضل اللہ صاحب رؤیا و کشوف تھیں۔ دین کی غیرت اور خدا کا خوف خاکسار نے ان کے وجود کے ساتھ وابستہ پایا۔ ہر چند کہ خاکسار نہایت عاجز و عاصی ہے، [illegible] اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی چنگاری سے خاکسار کا دل ہمیشہ روشن اور گرم رہا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس [illegible] عاجز کا وجود [illegible] اللہ تعالیٰ کے افضال و انعامات کی بیمثال بارش کا ایک حصہ ہے جو خاکسار کی والدہ صاحبہ کی [illegible] دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک فرمان الجنۃ تحت اقدام الامہات کی حقیقت کا والدہ صاحبہ کے قدموں میں [illegible] رؤیا و کشوف [illegible] خاکسار کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت نصیب ہوئی یعنی خاکسار نے [illegible] سال کی عمر میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر بیعت کی اور سلسلہ احمدیہ میں داخل ہونا نصیب ہوا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب ستر سال کی عمر میں زندگی کی آخری منزل [illegible] حالت بیم و رجا کی ہے۔ اپنی خطاؤں اور تقصیروں کے احساس سے روح کانپتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں مغفرت و رحمت کے وعدوں سے [illegible] ڈھارس بندھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عفو و بخشش، چشم پوشی اور ذرہ نوازی پر بھروسہ کیے ہوئے [illegible] شیرازی کا ہمنوا ہوں۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست
روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم!

والسلام
خاکسار ظفر اللہ خان

جواہر لال نہرو

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں اکثر لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کا کوئی بھائی بہن نہ ہو تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے۔ اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گزرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا۔ کیونکہ مجھے کنڈرگارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ گھر پر استانیاں اور اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر ایک بہت بڑا کنبہ تھا اور یہ سب ہندو خاندان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے مگر میرے بھائی عمر میں بہت بڑے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے غرض اتنے بڑے گھرانے میں میں اپنے آپ کو اکیلا پاتا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کا اصل وطن کشمیر ہے۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا، کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے کہنے سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترک وطن کر کے دلی آ گیا۔ بادشاہ نے اسے جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگا۔ اب خاندان کا نام "کول" کی جگہ "کول نہرو" قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی اور ہمارا خاندان آگرے پہنچا۔ چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں (تایاؤں) پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا (تایا) بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمہ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہو گیا۔ چھوٹے چچا (تایا) نندلال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک راجپوتانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرے میں وکالت کرنے لگے۔ میرے والد نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے وہ اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ میرے چچا (تایا) ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الٰہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الٰہ آباد ہمارا وطن ہو گیا۔ یہیں ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا شمار

رفتہ رفتہ ہائیکورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہو گیا۔ میرے والد کانپور اور الٰہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں اُنھوں نے عربی، فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ برس کی عمر میں جا کر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر ان مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔

یونیورسٹی کے امتحانوں میں اُنھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بی اے کی نوبت آئی اور یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی۔ اے اُنھوں نے پاس نہیں کیا۔ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی چنانچہ اُنھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اوّل نمبر پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اُنھوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا۔ تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الٰہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ اُنھیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے ان کی ساری زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انھیں دنوں نیشنل کانگریس انگریزی جاننے والے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اُصولی طور پر اس کے حامی بن گئے مگر وہ کسی ایسی انجمن یا تحریک میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں اُنھیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خود سری بچپن اور جوانی میں تھی وہ بہ ظاہر دب گئی تھی مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو اور ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا برتاؤ بہت بُرا لگتا تھا۔ لیکن جہاں تک یاد ہے افرادی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم اُستانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انھیں اور ان کے دوستوں کو دیکھا کرتا تھا۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی میں اُنھیں قوت۔ ہمت اور عقل کا پتلا جانتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ بڑا ہو کر میں بھی ان جیسا ہو جاؤں مگر میرے دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بچپن کی جو باتیں یاد ہیں ان میں والد کا غصہ بھی ہے اس لیے کہ مجھ پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو سوت قلم (فاؤنٹین پن) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ انھیں ایک ساتھ دو قلموں کی ضرورت تو ہونے سے رہی۔ اس لیے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب میں نے دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا۔ والد بہت خفا ہوئے اور میری خوب مرمت ہوئی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بیتاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ کسی قدر حکم کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے سے قد کی تھیں اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا۔ اس لیے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ وہ ایک نووارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گزری تھیں۔ میرے دوسرے ہم راز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے میرے لیے ان کا دامن جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ ان کی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے ان کی بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلیٰ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سنا کرتا تھا۔ میری والدہ اور چچی (تائی) دیومالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ اس سے میری معلومات ہندوستان کی کتھا مالا اور دیومالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں لاپرواہی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الٰہ آباد، بنارس اور دیگر شہروں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں لے جاتی تھیں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی چھڑکتے تھے یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دیئے جلاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانے میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی۔ دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پرانی کہانی جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے۔ دونوں عیدوں کو منشی جی کے گھر جا کر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لیے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھیے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے مگر اسی زمانہ میں ہمارے گھر میں ایک نئی بات ہوئی جس نے میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی یعنی میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ میں برآمدے میں بڑی بے چینی سے اس واقعہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر نے آ کر مجھے یہ خبر سنائی کہ تم خوش ہو گے کہ لڑکا نہیں ہوا۔ ورنہ وہ باپ کے ترکہ میں حصہ بٹاتا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔

والد کے یورپ جانے سے ہندوستان کے کشمیری برہمنوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے واپس آ کر پرائشچت یعنی پاک کئے جانے کی رسم ادا کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ میری دونوں بہنوں کی شادی غیر کشمیریوں میں ہوئی ہے۔

کوئی گیارہ برس کی عمر میں ایک نئے اتالیق فرڈنینڈ ٹی بروکس کے سپرد کیا گیا۔ تین سال تک وہ میرے ساتھ رہے اور ان کا مجھ پر کئی طرح سے بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں میرے صرف ایک ہی اتالیق اور تھے اور یہ ایک نیک دل بوڑھے پنڈت تھے جو مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لیے رکھے گئے تھے۔ کئی سال کی کوشش میں پنڈت جی مجھے جو کچھ پڑھا سکے۔ وہ اتنا تھوڑا تھا

(لاطینی کی طرح جو میں نے آگے چل کر ہیرو میں سیکھی تھی) کا معاملہ شُد بُد سے آگے نہ بڑھا۔ قصور یقیناً میرا ہی تھا۔ میں زبانیں سیکھنے میں کچا تھا۔ خصوصاً قواعد سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

ف۔ ٹ بروکس نے میرے دل میں مطالعہ کا ذوق پیدا کر دیا اور میں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انھوں نے مجھے سائنس کے اسرار سے بھی آشنا کرایا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا معمل بنا لیا۔ میں اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں کیمیا اور طبیعیات کے تجربے کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ بروکس نے میری زندگی پر ایک نیا اثر ڈالا۔ وہ اپنی قیام گاہ میں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی صحبت منعقد کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا جس سے میں ایک عرصہ تک متاثر رہا۔ میں خواب میں ہمزاد کو دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا پاتا تھا۔ اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ الہ آباد آئیں اور انھوں نے تھیوسوفی کے اوپر کئی لکچر دیئے۔ میں ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوا۔ میری عمر اس زمانے میں صرف تیرہ برس کی تھی۔ میں تھیوسوفی انجمن کا رکن ہو گیا اور خود مسز بیسنٹ نے میرے داخلے کی رسم ادا کی۔ اس تھیوسوفی دور میں میرے چہرے پر وہ افسردگی اور بے رونقی چھا گئی تھی جو پرہیزگاری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اس کے بعد جس اہم واقعہ سے متاثر ہوا وہ روس اور جاپان کی لڑائی تھی۔ جاپان کی فتوحات سے مجھے بڑا جوش آتا۔ میرا دل قومیت کے جذبے سے سرشار رہتا اور سوچا کرتا تھا کہ کاش سارے ایشیا کو یورپ کی غلامی سے نجات مل جائے۔ اب میری عمر چودہ برس کی ہو گئی تھی۔ میرے دل میں نئے خیالات اور دھندلے تصورات منڈلا رہے تھے اور مجھے عورتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں جہاں حسین لڑکیاں کثرت سے ہوتیں یا اور مقامات پر کسی سے نظریں مل جاتیں یا بدن سے بدن چھو جاتا تو میرے جسم میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ مئی ۱۹۰۵ء میں میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ میرے والد مجھے، میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔ آخر مئی کی کسی تاریخ کو ہم لندن پہنچے۔ ڈوور سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو تشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دوسرے دن ڈربی کی گھڑ دوڑ تھی۔ وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی۔ ان دنوں وہ لندن کے ایک اسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی سمجھئے کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی۔ کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور یہ داخلے کی عمر سے کچھ تھوڑی سی زیادہ تھی۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا۔ ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں میں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا اور میں اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخابات سے جو غالباً ۱۹۰۵ء میں ہوا بہت دلچسپی تھی۔ اس میں لبرل جماعت نے بڑی زبردست فتح پائی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشوونما تھی۔ میں ہیرو سے مانوس ہو گیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر یہ احساس بڑھ چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہوں اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈنے لگا۔ چنانچہ میں والد کی اجازت حاصل کر کے ہیرو سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قیام صرف دو برس رہا۔

اور اس کے چھوٹنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔

شروع اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ء، سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹرینٹی کالج کیمبرج کا منظر۔ میرا دل فخر و مسرت سے معمور تھا۔ اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا اور اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گزر گئے۔ یہ بھی کیا خوشگوار زمانہ تھا۔ میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتیات تھے۔

میرا عام تصورِ زندگی اس زمانے میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی اس میں کچھ تو جوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا اثر۔ اس لیے زندگی کے جمالیاتی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور منچلے پن کے کام بھی میرے لیے ایک کشش رکھتے تھے۔ مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپیہ کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں کی ایک انجمن تھی جو "مجلس" کے نام سے مشہور تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر تقریر نہ کرے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانٹیگو جو آگے چل کر وزیرِ ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ انھیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سُنی تھی یعنی اس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو۔ اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے ان میں بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ ہندوستانیوں میں ہردیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے۔ میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں ج۔ م۔ سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر بیس برس کی تھی اور سول سروس کے لیے اس زمانہ میں ۲۲-۲۴ سال کی قید تھی۔ غرض فیصلہ یہ ہُوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ بیرسٹری اختیار کروں اور میں انر ٹیمپل میں داخل ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۲ء کی گرمی میں میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور اسی سال سات برس کے بعد ہندوستان کو روانہ ہو گیا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوائے خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے جلسے میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شامل ہُوا تھا۔ گوکھلے اس جلسہ میں سب سے نمایاں تھے میں ان سے بہت متاثر ہُوا۔

میں نے ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ نہ ذہنی نشو و نما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح اور دل بہلانے کا کوئی بھی معقول انتظام تھا۔ اس لیے میری طبیعت پر اُداسی طاری رہنے لگی۔ سیاسیات متوسط طبقے کے اُونچے لوگوں تک محدود تھی اس میں اتنی قوتِ عمل اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے کہ دوسرے کاموں کے لیے مہلت نہیں ملتی۔ مجھے سیر و شکار سے کچھ رغبت

تھی۔ بالآخر ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی ختم ہو گیا۔

اس زمانہ میں مسٹر گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے میں بہت متاثر تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے کہ حکومت نے پریس کا گلا دبانے کے لیے ایک نیا قانون بنایا تھا۔ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ کیا گیا۔ اسی جلسہ میں میں نے مجبوراً انگریزی میں تقریر کی۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے ڈائس ہی پر مجھے گلے لگا لیا۔ وہ پھولے نہ سماتے تھے۔ گویا قومی کام کے لیے ایک نیا رکن ہاتھ آ گیا۔ گاندھی جی سے میں پہلے پہل سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں ملا تھا۔ لکھنؤ کانگریس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو نے الٰہ آباد میں چند پُرجوش تقریریں کیں۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ میں اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ اس کے بعد بھی میرا محبوب مصنف برٹرینڈ رسل تھا۔

میری شادی سنہ ۱۹۱۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ بسنت پنچمی کا دن تھا جو ہندوستان میں بہار کی آمد آمد کی خبر دیتا ہے۔ اس سال گرمیوں میں چند مہینے کے لیے میں کشمیر گیا۔

ایرسکن کاڈویل

شاید ہر مصنف جو اپنی تصنیفات کو ذریعہ معاش بناتا ہے، کسی نہ کسی وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ اداکار، بینکر یا جفت فروش کی بجائے مصنف کیسے بن گیا؟

کچھ زیادہ عقل یا بہتر حافظہ رکھنے والے لوگ، اپنی نوجوانی کے کسی ایسے دلچسپ واقعہ کا اعادہ کر سکتے ہیں جو ان کی زندگی میں اس قسم کی تبدیلی لانے کا باعث بن گیا ہو۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں۔ مجھے تو بعض وقت اب بھی حیرت ہوتی ہے کہ پچیس یا چھبیس برس پہلے، آخر وہ کونسی فیصلہ کن بات ہوئی تھی جس نے میری رہنمائی کی، مجھے ابھارا یا اس راستے پر دھکیل دیا؟

مجھے یقین ہے کہ افسانہ نویسی یا ناول نگاری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے میں نے جدوجہد کے بغیر یا باوقار انداز میں شروع کیا ہو۔ میں نے اس کام کی بہت مشکل سے ابتدا کی تھی اور اس کے نتائج میرے لیے بہت پریشان کن تھے۔ جسمانی اعتبار سے یہ ایک ناگوار کام تھا۔ بعض وقت زبردستی ڈیسک پر بیٹھے رہنا پڑتا حالانکہ دل چاہتا کہ اسے چھوڑ کر کہیں گھر سے نکل جاؤں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کام مجھ پر ٹھونسا گیا ہے۔ کسی استاد نے کبھی یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ میں تحریر کو پیشہ بناؤں۔ کسی مدیر یا ناشر نے بھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میری والدہ چاہتی تھیں کہ میں وکالت یا ڈاکٹری پڑھوں اور اگر میں پادری بن گیا ہوتا تو میرے والد کو شاید ذرا بھی ناامیدی نہ ہوتی۔

بارہ اور سولہ برس کی عمر کے درمیانی عرصے میں مجھے مصنف بننے کی کوئی خواہش تھی نہ تحریک اور میرا اس قسم کا ذہنی رجحان بھی نہیں تھا لیکن پندرہ سولہ یا سترہ برس کی عمر میں کوئی ایسی بات ہوئی کہ جب میں بائیس یا تئیس برس کا ہوا تو یہ محسوس ہونے لگا کہ تحریر مجھے دنیا کے ہر کام سے زیادہ پسند ہے۔

ابتدائی برسوں میں، میں نے جو اہم سبق سیکھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے خود زندگی کو اپنا مستقل استاد بنانا ہوگا۔ آپ چاہیں تو اسے تجربہ کہیے لیکن اسے خواہ کچھ بھی نام دیا جائے میں اسی وقت سے اس پر عمل کر رہا ہوں۔

۱۹۱۸ء میں جب میں پندرہ برس کا تھا تو مجھے اس بات کا علم ہوا کہ بعض حالتوں میں کام کے ذریعے روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ ایسی بھی صورتیں ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں محنت کا معاوضہ نہیں ملتا۔ میرے والدین جورجیا کے جیفرسن نامی علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے رینز میں منتقل ہو گئے تھے۔ رینز کی آبادی بارہ سو افراد پر مشتمل تھی اور میرے والد ریورنڈ ایرا ایس۔ کاڈول وہاں ایسوسی ایٹ ریفارمڈ پریسبیٹیرین چرچ کے مذہبی صلاح کار تھے۔

میں رینز کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا کچھ مہینے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اسکول کے کئی بڑے لڑکے ایک کاٹن سیڈ آئل مل میں کچھ دیر کام کرتے ہیں۔ میں فورمین سے ملنے گیا تو اس نے مجھے رات کی شفٹ میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ شفٹ گیارہ بجے شروع ہو کر صبح ساڑھے سات

بجے ختم ہوتی درمیان میں ڈھائی سے تین بجے تک نصف گھنٹہ کھانا کھانے کے لیے وقفہ رہتا۔ ایک رات کے کام کا معاوضہ ایک ڈالر ملتا۔ مجھے علم تھا کہ میری والدہ، میری تعلیم اور صحت کی بنا پر مجھے یہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ اس لیے میں نے یہ بات پوشیدہ رکھی۔ میں شام جلد سونے کے لیے چلا جاتا۔ گیارہ سے کچھ پہلے کپڑے بدل کر مل پہنچ جاتا اور رات بھر وہاں کام کرتا۔ فورمین مجھے آدھ گھنٹہ پہلے چھٹی دے دیتا اور اس طرح میں ٹھیک ناشتے کے وقت گھر جا پہنچتا۔ آٹھ بج کر بیس منٹ پر میں اسکول روانہ ہو جاتا۔

یہ مشقت میں دو مہینے تک برداشت کر سکا۔ اس عرصے میں دو سے پانچ چھ رات تک فی ہفتہ کام کرتے ہوئے میں نے تقریباً تین ڈالر جمع کر لیے تھے۔ میری والدہ کو شبہ ہو گیا تھا کہ میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوں جس کی مجھے اجازت نہیں، لیکن اس وقت تک مجھ سے کچھ نہ کہا گیا جب تک ایک صبح کو ناشتے کی میز پر میں نیند سے غافل نہ ہو گیا۔ اس طرح میری یہ نوکری ختم ہو گئی۔

ستمبر کے مہینے میں، اپنی سترھویں سالگرہ سے تین مہینے پہلے میں نے کالج میں داخلہ لیا۔ میں اپریل کے مہینے میں میکن، اگسٹا اور اٹلانٹا کے اخباروں کو خبریں بھیجنے لگا۔ مجھے ہمیشہ کی طرح نامہ نگاری کا کام پسند تھا۔ اس کے علاوہ موت، پیدائش اور حادثوں سے متعلق میرے اطلاع نامے کئی گز برسوں سے زیادہ اب کے اور زیادہ جگہ میں چھپنے لگے تھے، لیکن جلد ہی مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں کالج کی زندگی دوبارہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

ورجینیا یونیورسٹی میں کل خرچ کم از کم بارہ سو ڈالر سالانہ تھا۔ میرے والد نے بتایا کہ وہ اس رقم کا تیسرا حصہ ہی ادا کر سکتے ہیں۔ میرا تعلیمی ریکارڈ ایسا نہیں تھا کہ میں وظیفے کی درخواست پیش کرتا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تعلیمی وظیفے کے علاوہ ایک اور وظیفہ بھی ہے اور وہ وظیفہ مجھے دے دیا گیا۔

میں نے سنہ ۱۹۲۵ء کے موسم بہار سے یہ محسوس کیا کہ مجھے زندگی میں جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ میری عمر اکیس برس کی تھی اور تعلیم مکمل کرنے میں دو برس باقی تھے۔ میں شارلوٹس ول سے چلا گیا اور وہاں دی اٹلانٹا جرنل میں نوکری کے لیے درخواست دی۔ میری صحافت کو تمام عمر اختیار رکھنے کی تمنا نہیں تھی لیکن اخبار میں لکھنے کا کام ہوتا ہے اور یہی میں سیکھنا چاہتا تھا۔

بے چینی، گھومنے کی ہوس اور کہیں جانے کی ناقابل تسخیر خواہش کسی جگہ زیادہ عرصے تک مجھے مطمئن نہیں رہنے دیتی۔ چھ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر میں ایک دن اور رات کے کچھ حصے تک ایک گودام میں چھپا رہا تھا۔ نو برس کی عمر میں سہ پہر کے اخبار بیچتے ہوئے میں شپیڈ ٹرین میں چڑھ گیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ، اس وقت میں چوبیس برس کا تھا، میرے لیے زیادہ عرصے ایک جگہ قیام کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ "جرنل" سے اتنی تیزی سے استعفے دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے بعد میں اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ میرے خیال میں تحریر کے پیشے کا یہ تقاضا نہیں تھا کہ آدمی ایک ہی جگہ پر رہنے لگے۔

میں نے گذشتہ بارہ مہینوں میں درجنوں افسانے لکھے تھے۔ میں اپنے ذہن میں صرف اپنے آپ کو مطالعہ کرنے والا فرض کر کے لکھتا۔ اگر کوئی کہانی مجھے متاثر کرتی تو میں اس کے نتائج سے مطمئن ہو جاتا، خواہ وہ روایتی افسانے کے سٹائل سے کتنی ہی مختلف ہوتی۔ میرے خیال میں افسانے کے تاثر کے لیے اسٹائل سے زیادہ مواد اہم تھا۔

کیپ الزبتھ میں موسم خزاں میں مجھے میکسویل پرکنس کا ایک خط ملا۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس نے میری ایک دو کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ اسکرائبنرز میگزین کے لیے میری کچھ غیر شائع شدہ کہانیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے مسودات طلب کیے تھے۔

میں نے شروع میں میکس پرکنس کو ایک ہفتے تک ایک کہانی روزانہ بھیجی۔ ہر کہانی نامنظور ہو کر واپس آ جاتی لیکن میں مایوس نہ ہوتا۔ اس کے بعد میں نے خود پر ایک ہفتے میں دو سے زیادہ افسانے نہ لکھنے کی پابندی لگائی۔ بہت جلد کیپ الزبتھ کی پرسکون زندگی سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اور کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پہلے میں مورگن پہنچا وہاں سے اکتا گیا اور گرین اسٹریٹ میں ایک سستی جگہ کرائے پر لی۔ وہاں کئی ہفتے دن رات لکھنے میں لگا رہا۔ میں ان میں صرف دو مرتبہ کھانا لانے کے لیے باہر نکلتا تھا — جنوری کے مہینے میں بھی کمرہ بالکل سرد تھا۔ میں نے مالک سے اس بات کی شکایت کی۔ وہ پہلے ہی رات دو دو تین تین بجے تک میرے ٹائپ رائٹر کے شور مچانے کی شکایت کر چکی تھی۔ اس مرتبہ اس نے کہا کہ ایماندار اور محنتی آدمی دن میں کام کرنے جاتے ہیں وہ تمام رات ٹائپ رائٹر کے سامنے نہیں بیٹھے رہتے۔ اس نے سختی سے یہ کہا کہ یا تو میں کوئی نوکری تلاش کروں ورنہ کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔

میں ہر ہفتے ایک نئی کہانی لکھتا اور فوراً میکس پرکنس کو بھیج دیتا۔ کچھ کہانیاں نیو انگلینڈ کے ماحول سے متعلق ہوتیں اور بعض کا پس منظر جنوب سے متعلق ہوتا۔ میرا ذہن لکھنے کے لیے ختم نہ ہونے والا مواد جمع کر لیتا۔ میں جس مقدار میں لکھنا چاہتا تھا اسے پورا کرنے کے لیے وقت کی فراہمی سب سے بڑی مشکل بنی ہوئی تھی کیونکہ چوبیس گھنٹے کا عرصہ مختصر محسوس ہوتا۔ میں نے کچھ عرصے کے لیے گھنٹے کو چابی دینا بند کر دیا۔ لیکن اس کا مشاہدہ بھی میرے لیے پریشان کن تھا۔ اس لیے میں آخر میں اس کو اپنی نظروں سے چھپا کر رکھنے لگا۔ جیسے ہی کہانی واپس آتی، میں اس وقت تک اسے کہیں نہ کہیں بھیجتا رہتا جب تک وہ منظور نہ ہو جاتی۔ ڈاک خرچ کھانے اور سگریٹ سے بھی بڑھ گیا تھا۔

مارچ کے بعد مجھے میکس پرکنس کا ایک خط ملا جس سے مجھے اپنی مہینوں کی جدوجہد کامیاب ہونے کی امید ہوئی۔ میکس نے لکھا تھا کہ اس نے میری ایک کہانی شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۴ جولائی ۱۹۳۰ء کے بعد میں نے اپنے تمام مسودات جمع کیے ان میں ناول، ناولٹ اور دوسرا مواد بھی شامل تھا۔ میرے غیر شائع شدہ مسودات سے تین سوٹ کیس بھرے ہوئے تھے۔ لیکن تمام رات انہیں چھانٹنے کے بعد میں اپنے گذشتہ کام سے اتنا غیر مطمئن ہوا کہ اگلی صبح تمام چیزیں جھیل کے کنارے لے جا کر جلا ڈالیں۔

”ٹوبیکو روڈ“ کا پہلا ڈرافٹ جو تقریباً دو سو صفحات کی ضخامت رکھتا تھا، اپریل ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا۔ اس وقت میرے پاس ماؤنٹ ورنن کے سفر کے لیے بس کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے بھی باقی نہیں تھے۔ ”امریکن ارتھ“ اسی مہینے کے آخر میں شائع ہوا۔

کئی برس پہلے میں نے ماؤنٹ ورنن میں گھر لے لیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہاں کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ موسم گرما میں ایندھن کاٹنے اور آلو کی کاشت کے لیے میرا وہاں واپس آنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ نیویارک میں قیام کرنے یا کہیں اور جانے کے لیے میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔

”گاڈز لٹل ایکر“ کے آخری صفحے کے آخری پیراگراف کے آخری جملے کے آخری لفظ کی نگارش میری اس وقت تک کی تخلیقی زندگی کا سب سے زیادہ طمانیت بخش تجربہ تھا۔ اپنے اس کام سے میں ”ٹوبیکو روڈ“ سے بھی زیادہ خوش تھا۔ اس وقت اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے یہ محسوس کیا کہ خود کو پیشہ ور ناول نگار سمجھ سکتا ہوں۔

۱۹۳۳ء میرے لیے اتنا مصروف سال تھا کہ میں نے دس برس کے عرصے میں پہلی بار ان بارہ مہینوں میں ایک بھی افسانہ یا ناول نہ لکھا۔ ڈرامے کی صورت میں ”ٹوبیکو روڈ“ کی نمائش نیویارک میں پیر کی شام ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو شروع ہوئی۔ پہلے برس کے خاتمے تک یہ براڈوے

میں جم گیا اور اس کی نمائش ساڑھے سات برس تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس وقت تک نیویارک میں کوئی بھی ڈراما اتنے طویل عرصے تک نہیں چلا تھا۔

ایک برس تک نیویارک میں رہنے کے بعد ایک بار پھر سفر کی خواہش نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں چونتیس برس کا ہو گیا تھا اور ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا سے کبھی باہر نہیں گیا تھا۔ میں نے مارگریٹ بورک وائٹ کو یہ صلاح دی کہ ہم دونوں تصویروں اور عبارت پر مشتمل ایک اور کتاب ترتیب دیں۔ ہمارے خیال میں ہماری مشترکہ کوشش "یو ہیو سین دیئر فیسز" کامیاب رہی تھی۔ کئی ممکن صورتوں پر غور کرنے کے بعد ہم نے زیکوسلوواکیہ جانے اور وہاں دو مہینے تک ایک سفر نامے کے لیے مواد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم مئی کے آخر میں "فرینچ لائن" کے بحری جہاز "ایس ایس نارمنڈی" سے روانہ ہوئے۔ پھر ٹرین کے ذریعے فرانس اور جرمنی ہوتے ہوئے زیکوسلوواکیہ پہنچے۔ اگست کے آخر میں ہم ریاست ہائے متحدہ واپس آ گئے۔

"سے از دی یو۔ ایس۔ اے" کی تکمیل کے وقت مارگریٹ نے تصویروں اور عبارت پر مشتمل چوتھی کتاب مل جل کر تشکیل دینے اور مواد کے لیے روس چلنے کو کہا۔ سوویٹ یونین میں صاحبِ تصنیف ہونے کا بہت بھاری انعام ملا۔ میں اور مارگریٹ بورک وائٹ ماسکو تصویریں کھینچنے اور ایک کتاب لکھنے کے لیے گئے تھے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہاں عیش و عشرت کے دن گذاریں گے لیکن اچانک پرتعیش زندگی کے ذرائع مجھ پر مسلط کر دیے گئے۔

ماسکو پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد میخائل اپتین نے جو روسی مصنفین کی یونین کے غیر ملکی شعبے کا سیکرٹری تھا مجھے بتایا کہ میری کتابوں کی رائلٹی کی مد سے میرا ایک بڑا اکاؤنٹ جمع ہے۔ سوویٹ یونین میں غیر ملکی مصنفین سے گفت و شنید یا معاہدے کے بغیر ان کی کتابیں شائع کر لی جاتی تھیں، لیکن رائلٹی کا حق سے حساب رکھا جاتا اور وہ اسٹیٹ بنک میں مصنف کے نام سے جمع ہوتی رہتی۔ اس کی وصولی کے لیے روس جا کر بذاتِ خود وہاں موجود رہنا ضروری تھا۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ کو روس اور جرمنی کے مابین جنگ چھڑ جانے کے نتیجے میں ہم نے مواد فراہم کرنے کے لیے جو منصوبے بنائے تھے، وہ اچانک ختم ہو گئے۔ ہم نے ایک حفاظتی بیڑے کے رفاقتی جہاز میں انگلینڈ پہنچنے کا انتظام کیا اور دسمبر ۱۹۴۱ کے پہلے ہفتے میں نیویارک واپس آ گئے۔

مجھ سے دو سوال اکثر و بیشتر پوچھے جاتے ہیں۔ ایک کہانی لکھنے کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور دوسرا اسے شائع کرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تمام برسوں کے بعد آج بھی میں یہ نہیں جانتا کہ ان سوالوں کا کس طرح ایسا جواب دوں، جس سے پڑھنے والوں اور نوجوان مصنفین کے اشتیاق اور بے چینی کی تسکین ہو سکے۔ ان میں سے بیشتر یہ سوچتے ہیں کہ میں ان سے یہ راز چھپا رہا ہوں کیونکہ میرے جواب سے ان کو تسلی نہیں ہوتی۔ میں اکثر جو جواب دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ لکھنے کے لیے جو بہترین طریقہ ہے وہ لکھنا ہے اور کسی کہانی کو شائع کرانے کا سب سے اچھا ذریعہ، اس کو اس وقت تک ناشروں میں بھیجتے رہنا ہے، جب تک کوئی اسے چھاپنے پر راضی نہ ہو جائے۔

(ترجمہ: نعیم احسن کمال)

جان کیٹس

(اپنے خطوط کی روشنی میں)

۱۷۹۵ء — ۱۸۲۱ء

۲۹ر اپریل ۱۸۱۸ء

یہ ہفتہ نہایت پُرمسرت تھا۔ مجھے آج تک مستقبل میں ایک عظیم ہستی ہونے کا شاید اتنا شدید، ناقابلِ مزاحمت اور مسلسل احساس نہیں ہُوا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بغلوں میں غبارے دبے ہوں اور رُوح میں ایتھر بھرا ہو۔ جب میں تصویر بنا رہا تھا یا چل رہا تھا یا سوچ رہا تھا تو قوت کی تابناک جھلکیوں نے مجھے متاثر کیا۔ اے خدا! کاش یہ احساس فقط خوش فہمی پر مبنی نہ ہو۔ میں تیرے حضور دُعا کرتا ہوں کہ یہ عظیم رُوح کے آتشیں خوابوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا پیش خیمہ ہوں۔ یہ مجھ پر طاری ہوگئے ہیں۔ مجھ میں سرایت کر گئے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے لرزا دیا ہے اور مجھے اس شدت سے متاثر کیا ہے کہ میرا دل اُچھلنے لگا ہے۔ اس لیے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

بیلیؔ کے نام

مجھے قلبی واردات کے مقدس ہونے اور تخیل کے سچا ہونے کے سوا اور کسی چیز پر یقین نہیں۔ تخیل جس شے کو حسین گردانتا ہے، وہ سچائی ہے۔ خواہ یہ پہلے موجود تھی یا نہیں۔ باقی تمام جذبات کے بارے میں میرا وہی خیال ہے جو محبت کے بارے میں ہے جس کی ارفع اور بنیادی قوتِ تخلیق میں یہ مضمر ہیں۔ تخیل کو آدم کے خواب سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اُس نے آنکھ کھولتے ہی حقیقت کو پا لیا۔ میں اس بارے میں اور بھی زیادہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ استدلال کے بغیر آدمی صداقت کو کیسے پا سکتا ہے۔

دُنیا بیماریوں سے بھری پڑی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ مجھے سب لگی ہُوئی ہیں — میرا خیال ہے کہ جین یا ماریانی کی اس لحاظ سے میرے بارے میں بہتر رائے ہے — میرا فی الواقع اور سچ مچ یہ خیال نہیں کہ میرے بھائیوں کی بیماری کا مجھ سے

ؔ کیٹس کا ایک ادیب دوست

کچھ تعلق ہے یقیناً اصل وجہ کا ان کی نسبت کہیں زیادہ علم ہے۔ مجھے اتنی زیادہ اذیت پہنچنے کا امکان نہیں جتنی کہ تمھیں ہے۔

خوشی کے بارے میں

مجھے یاد نہیں کہ میں نے مسرت پر کبھی اعتبار کیا ہو۔ اگر یہ اب گزرتی ہوئی ساعتوں میں موجود نہیں تو میں اسے اس کے باہر کہیں اور تلاش نہیں کروں گا۔ مجھے گزرتے ہوئے لمحے سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں چونکاتی۔ ڈوبتا ہوا سورج ہمیشہ میری ذہنی کیفیت بحال کر دیتا ہے —— یا اگر ایک چڑیا میری کھڑکی کے سامنے آجائے تو میں اس کی زندگی میں شریک ہو جاتا ہوں اور اس کے ساتھ مل کر زمین پر دانہ دنکا چگنے لگتا ہوں۔

آر[1] کے نام

۲۱ ستمبر ۱۸۱۹ء

گذشتہ تین برس سے ہمارے انگلستان میں شیطانوں کے ایک گروہ نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں ان سے اتنی نفرت کرتا ہوں کہ مجھ میں اذیت ناک آدمی بننے کی وحشیانہ خواہش پیدا ہو گئی ہے تاکہ میں ان سے نپٹ سکوں —— شیطان عورتوں کے اس گروہ نے ادبی لحاف کا ایک ٹکڑا لے لیا ہے —————— اور اپنی طرف سے سیفو کی زبان میں شاعری کر کے بابل کا ایک مینار کھڑا کر دیا ہے —— جیومیٹری میں اقلیدس کے مسائل —— اور نفی میں ہر شے۔ میں ان چہروں میں نسوانی حجاب مدتوں تلاش کرتا رہا۔ لیکن ——؟

ڈبلیو[2] کے نام

مجھے دنیا کا بھلا کرنے کی خواہش ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو ممکن ہے یہ خواہش عمر کے ساتھ زیادہ ذہنی پختگی آنے سے پوری ہو جائے —— اس دنیا میں قدرت نے جتنی صلاحیت مجھے بخشی ہے۔ میں اس کے ذریعے شاعری کی انتہا تک پہنچنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ مجھے آئندہ جو نظمیں لکھنی ہیں ان کے تصور ہی سے میرا دماغ چکرا جاتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں انسانی مسائل میں دلچسپی لینا بند نہیں کروں گا۔ یعنی جب اعلیٰ ترین ہستیاں میری تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی تو میری منفرد بے نیازی' مجھ میں جو تھوڑی بہت بصیرت ہے اسے کند نہیں کرے گی۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہو گا۔ اگر میری شبانہ محنت ہر صبح نذرِ آتش ہو جائے اور اس پر کسی کی

---

[1] کیٹس کا ایک مداح ادیب دوست

[2] کیٹس کا ایک دوست

نظر بھی نہ پڑے۔ تب بھی مجھے یقین ہے کہ میں لکھنے کے شوق اور حسن کی جستجو میں لکھتا چلا جاؤں گا۔

آر کے نام

میں نے تمھیں شادی کے خلاف لکھا تھا لیکن یہ ایک عام بات تھی۔ مجھے ایسے معاملات میں اتنی کم امید نظر آتی ہے کہ میں مرنے سے نہیں گھبراتا لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے زندہ رہنے کے مقاصد ہیں۔ مجھے امریکہ میں اپنے ننھے بھتیجوں سے ملنا ہے اور تمھیں اپنی حسین منگیتر سے شادی کرتے دیکھنا ہے۔ بعض اوقات ہفتوں لگاتار میری حسیات مردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن یقین جانو میں نے ایک بار نہیں کئی بار تمھاری آنے والی خوشی کی تمنا کی ہے۔ جولیٹ کی زبان سے میرے متعلق ایسے کلمات سن کر وقتاً فوقتاً میری بے ہودہ گپ بازی سن کر تمھیں شاید اس بارے میں دھوکا ہوا ہو۔ مجھے اپنی جان کی قسم! میں روز بروز تمھارے قریب سے قریب تر آ رہا ہوں۔ جب سے ہماری دوستی ہوئی ہے میں جو خوشیاں دیکھنے کا منتظر ہوں۔ ان میں سے ایک تمھاری شادی کی خوشی بھی ہے — اس سے بھی زیادہ کیونکہ میں ایک جادو سے پیار کرنے کا لطف اٹھا چکا ہوں۔

آر کی ایک چچا زاد بہن کو دیکھ کر

جب میں مسز آر سے ملنے گیا تو وہ اس کے ساتھ دوسری منزل پر محو گفتگو تھی۔ نیچے نوجوان خواتین اس کی جی کھول کر تعریفیں کر رہی تھیں۔ وہ اسے شفیق، دل کش اور سینکڑوں اور ناموں سے یاد کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی کوئی پروا نہ کی۔ میں ہنگامی طور پر دیکھنے کے حق میں نہ تھا — اب حالات بدل گئے ہیں۔ وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اور میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کمزوریوں سے مبرا نہیں حقیقی کمزوریاں۔ لیکن اس میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کے باعث گھٹیا قسم کی عورتیں بھی اس سے نفرت کریں گی — وہ کلوپیٹرا نہیں پر کم از کم دلفریب ضرور ہے۔ اس کے دو دندان شرقی قسم کے ہیں۔ اس کی آنکھیں خوبصورت، اخلاق عمدہ ہیں۔ جب کمرے میں داخل ہوتی ہے تو ایسا تاثر پیدا کرتی ہے جیسا کہ چیتے کی مادہ کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ نہایت نفیس ہے۔ اتنی حساس بھی کہ اگر کوئی شخص اس سے مخاطب ہو تو وہ کبھی اس سے متنفر نہ ہوگا — فطرتاً وہ آوارہ مزاج نہیں۔

میں اس قسم کی عورت سے ہمیشہ بے تکلفی محسوس کرتا ہوں۔ اس قسم کا نظارہ مجھ میں ہمیشہ ایسی روح پھونک دیتا اور ایسی تحریک پیدا کرتا ہے جو کسی گھٹیا قسم کی چیز سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں اس وقت بے جھجک خودرو وحشی ہوتا ہوں۔ اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں کیونکہ اس میں کھو جاتا ہوں۔ اب تم شاید یہ خیال کرو کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ لیکن کچھ اور بات کرنے کی بجائے میں تمھیں بتا دوں کہ نہیں۔ ایک رات اس نے مجھے اپنی دھن میں جگائے رکھا۔ میں ایسی عورت کو جس کے لبوں سے "ہاں یا نہ" نکلنا آسان ہو ایک ذریعہ خوش وقتی اور تفریح طبع سمجھتا ہوں۔ میں چاند کو اپنی جیب میں ڈال کر گھر لے جانے کے لیے نہیں ترستا۔ نہ اسے دیکھے

چھوڑ آنے پر پریشان ہوتا ہوں۔ میں اسے اور اس وضع کو پسند کرتا ہوں ہم بے حس ہیں۔ جیسے بھی ہیں ہمیں قبول کر لیا جاتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ میں چونکہ اسے گھور گھور کر نہیں دیکھتا اس لیے پسند نہیں کرتا۔ کہتے ہیں کہ وہ نخرے باز ہے۔ کیا یہ لالچ کی انتہا نہیں۔ وہ کمرے میں سے یوں گزر جاتی ہے کہ آدمی کو مقناطیس کی مانند اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ اسے نخرے دکھا سکتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم؟ وہ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے؟

بی کے نام

مجھے یقین ہے ہمارے حسین دوست اس بات پر خوش ہیں کہ مجھے آنا ہی چاہیے لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان کے لیے باعث کوفت ہوتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو انھیں سکون ملے۔ عورتوں کے متعلق میرا نظریہ یقیناً صحیح نہیں۔ گو اس وقت میں ان سے جائز برتاؤ کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ کیا یہ نہیں کہ وہ میرے طفلانہ معیار سے بہت پست ہیں؟ جب میں اسکول جایا کرتا تھا تو میرا خیال تھا کہ حسین عورت دیوی ہوتی ہے۔ میرا ذہن ایک ایسا آشیانہ تھا جس میں ان میں سے ایک انجانے میں جو خواب ہو۔ مجھے کیا حقیقت سے زیادہ جاننے کی امید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میرا خیال تھا وہ مردوں سے بالاتر آسمانی شے ہیں۔ میں انھیں شاید ان کے برابر پاتا ہوں . . . .

جب میں عورتوں کے درمیان ہوتا ہوں تو میرے ذہن میں بُرے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہ تو بول سکتا ہوں، نہ خاموش رہ سکتا ہوں۔ اس وقت میں سراپا شک و شبہ ہوتا ہوں اور اُن کے ایک لفظ پر بھی کان نہیں دھرتا۔ مجھے وہاں سے جلد جلد جانے کی پڑی ہوتی ہے۔ تمھیں فراخ دلی سے کام لے کر میری کجروی کو طفلانہ محرومی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

(ایک ایسی عورت کے بارے میں جو شاہو کی زندگی میں آئی)

ہم آئی لنگٹن کی جانب چل دیے۔ یہاں ہم نے اس کی ایک سہیلی سے ملاقات کی۔ جو ایک بورڈنگ کا کاروبار چلاتی ہے۔ وہ میرے لیے ہمیشہ ایک معمہ بنی رہی۔ اُس نے تمھارے اور آرنلڈ کے ساتھ ایک کمرے میں رات بسر کی اور اُس کی خواہش ہے کہ ہمارے مشترکہ واقف کاروں کو اس بات کا علم نہ ہو۔ جب ہم کبھی مہذب کبھی غیر مہذب گلیوں میں سے گزرتے تو جو قیاس کیا کرتے۔ گو یہ نہ جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں ہر قسم کے حیران کن واقعہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ پہلا مرحلہ تو آئی لنگٹن میں واقع اس مکان پر طے ہوا۔ وہاں سے رخصت کے وقت میں نے اسے گھر چھوڑنے پر اصرار کیا۔ وہ مان گئی۔ اس کے بعد میں پھر خیال دوڑانے لگا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ گو ان کو بورڈنگ ہاؤس کی صورت حال کے بارے میں ایک لطیف اشارہ مل گیا تھا۔

گلاؤسٹر اسٹریٹ پہنچ کر وہ اوپر اپنے بالاخانے میں چلی گئیں۔

یہ انتہائی خوش ذوق جگہ نکلی۔ اس میں کتابیں، تصویریں، نپولین کا کانسی کا بُت رکھے تھی، موسیقی تھی — ایولی بربط اور ایک طوطا تھا۔ لائنٹ تھی ——— چیدہ چیدہ شرابوں کی الماری تھی۔ اُس کا برتاؤ نہایت مربیانہ تھا۔ اس نے مجھے شام کے کھانے کے لیے گراؤس کا گوشت بھی دیا، شکار بھیجنے کے لیے میرا پتہ بھی پوچھا۔ میں پہلے اس کے ساتھ گرم ہو چکا تھا اور اسے چوما تھا — میں نے خیال کیا کہ میرا اصرار کرنا اس سے از سرِ نو تعلقات پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ وہ زیادہ با مذاق تھی۔ جان گئی کہ ایسا کرنا محض معمولی تھا اور وہ کترا گئی — گو کسی اخلاقی بناوٹ کے تحت نہ تھا، تاہم میں اسے اپنے الفاظ میں شائستہ و جمیل کہوں گا۔ اُس نے مجھے انوکھے انداز میں مایوس کر دیا۔ میں ایک بوسہ لینے سے کہیں زیادہ لطف اندوز ہوا۔ اُس نے کہا۔ اگر میں اس کا صرف ہاتھ دبا کر ہی چلا جاؤں تو اسے زیادہ خوشی ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا جب میں اسے ملا تھا۔ اس وقت اس کے مزاج کی کیفیت اور تھی یا میں نے اسے ذہنی طور پر ڈگمگا دیا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ خوشگوار گھڑیاں بسر کرنے کی اُمید کرتا ہوں اور پھر — علم اور ذوق کے معاملے میں میں اس کی خدمت کر سکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو ضرور کروں گا۔

میرے دل میں اس کے متعلق کوئی شہوانی خیالات نہیں۔ تم اور تمھاری جارج ایسی عورتیں ہیں جن کو میں فقط ذہنی تعلق اور دوستی کی بنا پر جاننا پسند کروں گا۔

سفر یا سیر کے آخر میں اگر کوئی حسین ترین ہستی میری منتظر ہو۔ قالین ریشم کے ہوں اور پردے صبح کے بادلوں کے، صوفوں، کرسیوں میں ہنس بچوں کے نرم پر بھرے ہوں، غذا منّائے ربانی پر مشتمل، شراب لال ہو۔ کھڑکی وینانڈر پہ کھلتی ہو مجھے احساس ہوگا — بلکہ مجھے اتنی لطیف مسرت حاصل نہ ہوگی جتنی کہ ارفع تنہائی میں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ گھر پر ایک ارفع اعلیٰ چیز میری منتظر ہے۔ ہوا کی گھن گرج میری بیوی ہے۔ کھڑکی میں سے دکھائی دیتے ہوئے ستارے میرے بچے ہیں۔ تمام چیزوں میں موجود حسن کے متعلق میرا عظیم غیر مرئی تصور نسبتاً مختصر اور معمولی گھریلو خوشی کو دبا دیتا ہے — دلآویز بیوی اور پیارے بچوں کو میں حسن کا ایک جزو سمجھتا ہوں لیکن میری مکمل دلی تسکین کے لیے ایسے ہزاروں خوبصورت ذرات کی ضرورت ہے۔ میرا ذہن روز بروز جیسے جیسے پختہ ہوتا جاتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں صرف اس دُنیا میں نہیں بلکہ ہزاروں دُنیاؤں میں رہتا ہوں۔ جونہی میں اکیلا رہ جاتا ہوں میرے ارد گرد رزمیہ ہستیاں اکٹھی ہوتی ہیں اور میری روح کی ایسی خدمت کرتی ہیں جیسے بادشاہی کے محافظ اس کی کرتے ہیں — تب عصائے شاہی تھامے المیہ میرے پاس سے گزر جاتا ہے۔ میں اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق کبھی نوجوان اچیز ACHILLES کے ہمراہ خندقوں میں چلتا پھرتا ہوں، کبھی تھیوکریٹس کے ساتھ سسلی کی وادیوں میں ہوتا ہوں، کبھی اپنی ذات کو ٹرائلس میں جذب کر دیتا ہوں اور یہ مصرعے دہراتا ہوں: میں ایک گم گشتہ روح کی مانند دریائے موت کے کنارے، ہوا کے دوش پر دوسرے کنارے پہنچنے کے لیے بھٹکتا رہتا ہوں، میں اتنی لطیف لذت کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہوں کہ تنہا رہنے کو پسند کرتا ہوں۔ عورت ذات کے متعلق میری جو رائے ہے اس سے یہ باتیں مل جاتی ہیں — عورتیں مجھے ایسے بچے معلوم ہوتی ہیں جنھیں میں اپنا وقت دینے کی بجائے کھانڈ کی گڑیاں دینا بہتر سمجھوں گا اور بیاہ کے خلاف دیوار کھڑی کرنے سے لطف حاصل کروں گا۔ . . چنانچہ میں اتنا ہی خوش ہوں جتنا

ایک انسان کو ہونا چاہیے . . . یعنی اگر ٹام روبصحت ہو جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا ــــ تب میں واقعی قابلِ رشک ہوں گا۔ ــــ حسن سے مجھے بے مثال شیفتگی ہے جس کے ذریعے میں اپنی ذہنی امنگ سے ہم آہنگ ہو گیا ہوں۔

ٹام کی موت پر

. . . میرے پیارے بھائی اور بہن! میری خاطر میری طرح ہر صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار رہو جیسے میں آپ کی خاطر کرتا ہوں۔ ہمارے تعلقات ایسے ہیں کہ اپنے مخصوص جذبات سے قطع نظر ایک عظیم صدمے کے اثرات کو روکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ میں بے چارے ٹام کے ساتھ اس لیے رہتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا واحد سہارا سمجھتا ہے اس لیے ایسے جذبات کے بغیر مجھے شدید ذاتی رنج پہنچے گا ــــ تمھاری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے ــــ آنے دو ــــ اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاؤ ــــ تمھیں جو خوشی میسر آتی ہے۔ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرو اور دو ایک پل یہ سوچنے کے بعد کہ تم انسانیت کے شریکِ غم ہو دوبارہ خوش ہونے کو گناہ نہ سمجھو۔

ایف۔ بی[1] کا حلیہ

کیا تمھیں براؤنی کا حلیہ بتاؤں؟ اس کا قد تقریباً مجھ جتنا ہے ــــ خدوخال نستعلیق لمبوترے قسم کے ہیں۔ اس میں جذبات کی کمی محسوس ہوتی ہے ــــ اسے اپنے بال سنوارنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کے نتھنے عمدہ ہیں حالانکہ قدرے تکلیف دہ ہیں۔ ــــ اس کا منہ بڑا بھی ہے اور اچھا بھی ــــ اس کے رخسار اس کے پورے چہرے سے بہتر ہیں جو بے شک بھرے ہوئے نہیں بلکہ زرد اور دبلے ہیں کہ ہڈیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اس کی وضع قطع کی مانند اس کی حرکات و سکنات بھی بڑی شائستہ ہیں۔ اس کے بازو عمدہ، ہاتھ قدرے خراب، پاؤں گوارا ہیں ــــ اس کی عمر سترہ برس کی لیکن وہ الھڑ ہے۔ طرزِ عمل ہیبت ناک ہے۔ ہر طرف وار کرتی ہے لوگوں کو طرح طرح کے ناموں سے پکارتی ہے۔ اس لیے مجھے حال ہی میں اس کے لیے دیدہ دلیر کا نام استعمال کرنا پڑا۔ اس کی وجہ میرے خیال میں فطری برائی نہیں بلکہ اک انداز معشوقانہ ہے۔ تاہم میں ایسے انداز سے تنگ آگیا ہوں اور آئندہ اس کی مذمت کروں گا۔

شاعر کا نصب العین

عقاب کو ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کی طرح ــــ ان دونوں کو دیکھو۔ یہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

---

[1] کیٹس کی محبوبہ

اور ایک ہی طریقے سے حاصل کرتے ہیں . . . امیر آدمی تفریحِ طبع کے لیے پائپ پیتا ہے۔ عقاب بادلوں میں توازن قائم کرتا ہے۔ ان کی خوش وقتی میں صرف یہی فرق ہے . . . .

میں کھیتوں میں نکل جاتا ہوں اور مرجھائے ہوئے گھاس میں سے نیولے یا چوہے کی قسم کے جانوروں کو بھاگتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ہر جانور کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں اس کے باعث چمکتی ہیں۔ میں شہر کی عمارات سے گزرتا ہوں اور ایک آدمی کو تیز تیز جاتے دیکھتا ہوں۔ کس لیے؟ اس ہستی کا بھی مقصد ہے اور اس کی آنکھیں اس کے باعث چمکتی ہیں . . . .

انسانی فطرت میں ایک برقی آگ پائی جاتی ہے جو اسے پاک کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ نت نئی شجاعت جنم لیتی رہتی ہے۔ افسوس ہم اس پر حیران ہوتے ہیں گویا ہمیں کوڑے کرکٹ سے موتی مل جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہزاروں ایسے نامعلوم انسان ہو گزرے ہیں جن کے دل دلچسپی سے خالی تھے — سقراط اور عیسیٰ — ان کی زندگیاں یہی ثابت کرتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے سقراط کے بارے میں شیلی کا نظریہ دیکھا تھا۔ یہ وہی تھا جو عیسیٰ پر صادق آتا ہے کہ وہ اتنا بڑا آدمی تھا کہ گو اس نے آنے والی نسلوں کو ورثے میں کوئی تحریر نہ دی۔ ہمیں اس کا ذہن، اس کے ملفوظات اور اس کی عظمت ورثے میں ملے۔ افسوس کا مقام ہے کہ موخرالذکر سوانح حیات ایسے آدمیوں نے لکھی اور اس میں ترمیم کی جنھیں مذہب کے خبر کے ڈھکوسلوں میں زیادہ دلچسپی تھی . . . .

الف کے نام

مجھے کئی روز سے خاص خوشی میسر نہیں آئی۔ کسی کی موت یا بیماری نے ہمیشہ میرا وقت برباد کیا — اور اب کہ کسی مصیبت کے باعث میری طبیعت معطل نہیں، تمھیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ کسی اور قسم کے ورطے میں خائف ہوں۔ میری جان! اپنے آپ سے پوچھو کہ آیا تم نے میری زندگی میں بے پناہ رکاوٹ نہیں ڈالی۔ میری آزادی پاش پاش نہیں کر دی؟ اس بات کا اقرار کر کے مجھے خط لکھو اور اس کے ذریعے مجھے تسلی ہو۔ اسے اتنا مزے دار بناؤ کہ یہ پوست کا ست بن کر مجھے مدہوش کر دے — نرم ترین الفاظ استعمال کرو اور اس کو چوم لو تاکہ جہاں تمھارے ہونٹ لگے ہوں، اسی جگہ میں اپنے ہونٹ ثبت کر دوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے معلوم نہیں کہ میں ایسے محدود پیکر سے دل بستگی کیسے بیان کروں۔ مجھے حسین سے حسین تر الفاظ کی ضرورت ہے۔ بہتر سے بہتر لفظ — کاش ہم تتلیاں ہوتے اور گرما کے صرف دو تین روز زندہ رہتے۔ تمھارے ساتھ تین روز میں میں اتنی خوشی کھو دیتا کہ پچاس برسوں میں بھی نہ کھوئی جا سکتی۔ لیکن میں اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی خود غرض کیوں نہ گردانوں، مجھے یقین ہے کہ میرا عمل کبھی خود غرضانہ نہ ہو گا . . . . حالانکہ میں اپنی خوشی تم پر مرکوز کر دوں گا۔ مجھے تمھارے دل کو کلی طور پر اپنے بس میں کرنے کی اُمید تو نہیں — اگر تم واقعی اتنا محسوس کرتیں جتنا میں محسوس کرتا ہوں تو میں تم کو ایک بار اپنے ساتھ ہم آغوش ہونے سے منع نہ کرتا، لیکن نہیں۔ امید دار موقع کے سہارے جیتا ہے۔ اگر مجھے کسی بدتر واقعہ کا بھی سامنا کرنا پڑے تو بھی میں تم سے محبت کرتا رہوں گا — لیکن ایک غیر کے لیے میرے دل میں کتنی نفرت ہوتی؟

(فینی کی والدہ کا خیال تھا کہ کیٹس جیسے غریب نوجوان کے ساتھ اس کی بیٹی کا عشق چند روز کی بات ہے۔ اس لیے اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے زیر اثر کیٹس نے اس کی محبت کا دم بھرتے ہوئے اسے لکھا)

میری محبوبہ! کیا تم اس معاملے میں مجھے کچھ سمجھتی ہو؟ میرے دل میں تمھاری اتنی محبت ہے کہ اگر تم کسی قسم کا نقصان پہنچنے سے گھبراجاؤ تو مجھے تمھارا مانع بننا پڑے گا۔ میری تمنا ہے کہ میں تمھاری آنکھوں میں خوشی، تمھارے ہونٹوں پر محبت اور تمھارے قدموں میں خوشدلی کے سوا کچھ نہ دیکھوں۔ میں تمھیں ایسے سامان تفریح سے لطف اندوز ہوتے دیکھنے کا آرزومند ہوں جو تمھارے مزاج کے مطابق ہو نہ کہ تکالیف اور تفکرات کا موجب بنے تاکہ ہماری طبیعتیں خوشیوں کے درمیان قائم رہیں۔ لیکن مجھے خاصا شک ہے کہ بدترین قسم کے حالات پیدا ہونے کی صورت میں میں خود بھی اپنی نصیحتوں پر عمل نہ کرسکوں گا۔ اگر میرے ارادے سے تمھیں تکلیف پہنچتی نظر آئے تو میں ایسا نہیں کروں گا۔

(یہ جان کر کہ کیٹس فینی کو بے حد حسین گردانتا ہے اور اس کے دل میں شک ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی، وہ اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ایک خط لکھتی ہے۔ کیٹس اس کے جواب میں کہتا ہے)

میں تمھارے حسن کا ذکر کیوں نہ کروں؟ اس کے بغیر میں تم سے محبت نہیں کرسکتا۔ مجھے تم سے ایسی محبت شروع کرنے کا خیال بھی نہ آسکتا۔ ممکن ہے کوئی ایسی محبت ہو جسے حقیر جانے بغیر میں احترام کروں اور دوسروں میں موجود پاکر پسند کروں لیکن اس میں میرے ذوق کے مطابق گھمبیرتا اور رغبت کی سحرکاری نہ ہوگی۔ اس لیے مجھے اپنے حسن کی باتیں کرنے دو، خواہ اس سے مجھے خطرہ ہی پیدا ہو۔ خواہ تم مجھ پر اتنا ظلم ڈھاؤ کہ اس کی قوت کو کسی اور جگہ آزماؤ۔ تم کہتی ہو تمھیں ڈر ہے کہیں میں یہ خیال نہ کروں کہ تمھیں مجھ سے محبت نہیں۔ یہ کہہ کر تم مجھے اپنے قریب آنے کے لیے بے چین کرتی ہو۔

(فینی کی طبیعت قدرے علیل ہونے کی خبر سن کر)

تمھارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ میں تمھیں ملنے کے لیے کتنا بے قرار ہوں۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات کے لیے میں مر رہا ہوں — دنیا میں اور رکھا ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ تم مجھے ویسی ہی نظروں سے دیکھو جیسی نظروں سے میں تمھیں دیکھتا ہوں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا — اگر تم مرد کو پہلی بار دیکھ کر کبھی وہ محسوس کرسکو، جو میں نے تمھیں دیکھ کر کیا تھا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ تاہم میں تم سے نہیں الجھوں گا۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو اپنے آپ سے نفرت کروں گا، بات صرف اتنی ہے کہ وہ آدمی اگر اتنا نفیس نہ ہوا جتنی تم ہو تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔

(کیٹس اپنے آپ کو اپنے دوستوں کے نظریے کے برعکس "قابل تحسین" نہیں سمجھتا تھا کیونکہ وہ اسے خوبرو اور بے حد دلکش سمجھتے تھے اس لیے لکھتا ہے)

مجھے مردوں میں وہ مقام حاصل ہے جو چپٹی ناک، بھورے بالوں اور جڑے ہوئے ابروؤں والی عورتوں کو میسر آتا ہے — میرے نزدیک وہ بیہودہ ہیں۔ کاش مجھے ان میں سے ایک ایسی مل جائے جس کے دل میں آگ کا دریا اسی طرح موجزن ہو جس طرح میرے دل میں ہے لیکن تم مجھ پر خطاء کرنے والا جادو بن کر چھا جاتی ہو — صرف تم ہی۔ اس لیے کہ میں اس امید پر خوش ہوں جسے لوگ گھر بسا لینا کہتے ہیں۔ گو میں گھریلو تفکرات ہی کے خیال سے گھبرا جاتا ہوں، تاہم تمھیں حاصل کرنے کے لیے میں ان کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس سے اگر تمھیں خوشی ہو تو میں ایسا نہ کرنے پر موت کو ترجیح دوں گا . . . .

میں آج رات تمھیں ذہن میں تصور کروں گا اور کافر کی مانند تمھارے ستارے سے دعا کروں گا۔ دعا کروں گا۔ دعا کروں گا۔

اپنے ڈرامے اودھودی گریٹ کے بارے میں

ادبی فیشن پرستوں کے نزدیک میرا نام بازاری حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نظر میں میں جولاہا ہوں۔ ایک المیہ مجھے اس خرافات سے نجات دے گا۔ جہاں تک اس کا ہماری جیب سے تعلق ہے۔ یہ واقعی بکواس ہے . . . .

مجھے ہر طرح اس بات کا یقین ہے کہ اگر میں چاہوں تو ایک مقبول مصنف بن سکتا ہوں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ اس کے باوجود میرا گزارہ ہو رہا ہے۔ مجھے عوام اور عورت کی داستانِ جنت سے یکساں نفرت ہے — یہ دونوں فنی آزادی کے دشمن ہیں۔ میں عوام کو اچھی نظمیں لکھ کر دینے کے لیے ہمیشہ اپنا رہینِ منت سمجھوں گا۔ میں ان کی داد و تحسین کا طلب گار نہیں۔ مجھے اس کی حاجت نہیں۔

(اودھودی گریٹ کی کامیابی پر اپنی مالی مشکلات کے پیش نظر ایک دوست کو لکھتا ہے)

یہ خط پڑھ لینے کے بعد تم اسے ایک طرف رکھتے ہوئے کہو گے: "تنہا رہنے سے آدمی میں کتنا غرور اور کتنی خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے"۔ یہ درست ہے لیکن مجھے یہ غرور اور خود پسندی کسی اور چیز کی بجائے بہتر چیزیں لکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے میں ان کی تسکین کروں گا۔ میں جنیس کے سامنے جتنا عاجز ہوتا ہوں، ادبی دنیا کو اتنا ہی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔

بڑے بھائی کے نام

جب کبھی مجھ پر مراقی کیفیت طاری ہوتی ہے، میں اپنے آپ کو جھنجوڑتا ہوں، منہ ہاتھ دھو کر اُجلی قمیض پہنتا ہوں اور اپنے بالوں اور کپڑوں کو برش کرتا ہوں۔ صفائی سے بوٹوں کے تسمے باندھتا ہوں اور یوں بن ٹھن کر تیار ہو جاتا ہوں جیسے مجھے باہر جانا ہو — پھر صاف ستھرا ہو کر لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

فینی کے نام

میں آج گزرے ہوئے کل میں بسر کر رہا ہوں۔ میں سارا دن کھویا سا رہا۔ میں تمھارے رحم و کرم پر ہوں۔ ہمیشہ کی طرح مجھے فقط چند سطریں ہی لکھو اور بتاؤ کہ تم مجھ پر پہلے سے کم مہربان نہیں ہو۔ تم نے میری نظروں میں چکا چوند پیدا کر دی ہے۔ تم نے کوئی شے اتنی تابناک اور نازک نہیں دیکھی۔

جان کی قسم! مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا ـــ وہ وقت گیا جب مجھ میں تمھیں اپنی مایوس کن صبح زندگی کے بارے میں نصیحت کرنے اور خبردار کرنے کی ہمت تھی۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمھیں دیکھنے کے سوا مجھے کوئی بات نہیں سوجھتی۔ میری زندگی یہیں ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے مجھے اپنے آپ میں جذب کر لیا ہے۔ مجھے اس لمحے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہوا میں تحلیل ہو رہا ہوں . . . . اب میری محبت کی انتہا نہیں رہی۔ یہ موتیوں کی مالا سے زیادہ بھرپور ہے۔ مجھے ازراہ مذاق بھی نہ ڈرانا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ لوگ مذہب کی خاطر شہید کیوں ہو جاتے ہیں۔ میں اس خیال سے کانپ جاتا تھا۔ پر اب نہیں عشق میرا مذہب ہے۔ میں اس کے لیے قربان ہونے کو تیار ہوں۔ میں تمھاری خاطر مرنے کو آمادہ ہوں۔ محبت میرا ایمان ہے اور تم اس کا واحد اصول ہو۔ تم نے مجھ پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا تاہم میں اس کا اس وقت تک ہی مقابلہ کر سکتا ہوں جب تک تمھیں دیکھ نہیں لیتا اور جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے۔ میں نے "اپنی محبت کے اسباب کے خلاف دلائل" ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ میری محبت خود غرض ہے۔ میں تمھارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔

(کیٹس تپدق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ خون تھوکنے کے بعد اس نے اپنی محبوبہ کو لکھا)

سب سے پیاری فینی! تم جونہی واپس آؤ گی۔ میں تمھیں یہ خط بھیجوں گا۔ کہتے ہیں کہ میں کچھ عرصہ اس کمرے سے باہر نہ نکلوں۔ یہ جان کر کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، تمھارے ساتھ والا مکان میرے لیے خوشگوار قید خانے کا کام دے گا۔ ضرور آنا اور مجھے زیادہ ملتے رہنا۔ آج شام بھول نہ جانا۔ اس وقت میرا مدھم لہجے میں گفتگو کرنے کا برا نہ ماننا۔ مجھے ایسا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ حالانکہ میں بلند آواز سے بات کر سکتا ہوں۔

(اپنی شہرت کے بارے میں)

"اگر میں مر گیا" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ تو اپنے پیچھے کوئی لازوال تخلیق چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ـــ کوئی ایسی چیز جس پر میرے دوست ناز کر سکیں ـــ میں نے ہمیشہ حسن کے وجود کی پرستش کی ہے اور اگر میری زندگی نے وفا کی ہوتی تو میں اپنی یادگار چھوڑ جاتا۔ جب میں صحت مند تھا تو گو اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں دھیمے پن سے آتے لیکن میرا دل برما

تمھارے لیے دھڑکتا — اب تم ایسے خیالات کو (کیا مجھے یہ کہنے کی اجازت ہے؟) اعلیٰ دماغوں کی آخری کمزوری پر محمول کرسکتی ہو۔

(آخری خط — ان دنوں وہ فینی کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے رہتا
تھا۔ گو ان کی شادی نہیں ہوئی تھی)

ہر گھڑی ہر پل میں تمھارے خیال میں کھویا رہتا ہوں۔ دوسری ہر شے چھانن کا مزہ دیتی ہے۔ میرے لیے اٹلی جانا ناممکن ہے۔ دراصل میں تم سے جدا نہیں ہوسکتا۔ مجھے پل بھر چین نہیں آئے گا جب تک تمھیں میرے ساتھ ہمیشہ رہنے کا موقع نہیں مل جاتا — جو لوگ مجھے ایلم کاٹیج اور ونٹ ورتھ پلیس میں ملا کرتے تھے۔ ان کی محفل آئندہ کبھی برداشت نہیں کرسکوں گا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آخری دو برس میں تانبا چاٹتا رہا ہوں۔ اگر میں تمھارے ساتھ نہ رہ سکا تو اکیلا رہوں گا۔ میرے خیال میں جب تک میں تم سے جدا رہوں گا، میری صحت نہیں سدھرے گی۔

(ترجمہ: احمد سعید)

جان اپڈائیک

میں پنسلوانیا کے ایک قصبے شلنگٹن میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد ایک ہائی سکول میں ریاضی کے استاد تھے۔ وہ تو ریاضی دان تھے لیکن والدہ ادب کی دلدادہ تھیں اور شوقیہ لکھا بھی کرتی تھیں۔ شاید ماں کا ہی اثر تھا کہ میں بچپن ہی میں ادب کی راہ پر چل پڑا تھا۔ اگر میں کہوں کہ میری آج کی ادبی تخلیقات مجھے ماں کی آغوش سے ملی ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ میں نے اوائل عمر میں کارٹونسٹ کیوں بننا چاہا تھا۔ لاشعوری اثرات تو بتائے نہیں جا سکتے۔ میں نے کارٹونسٹ بنتے بنتے دو شاعروں، اوگڈن نیش اور فلس میگنلے کے سٹائل کو اپنانے کی کوشش میں ہلکی پھلکی نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔

شلنگٹن ہائی سکول سے میٹرک کر کے میں کیمبرج ہارورڈ کالج میں چلا گیا۔ ادب تو جیسے مجھے گھٹی میں دیا گیا تھا، میں نے تعلیم کے دوران انگریزی ادب کا خوب مطالعہ کیا، افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے فنی نشیب و فراز کو کریدا اور اس قدر مطالعہ کیا کہ اس فن کے ڈھکے چھپے گوشے مجھ پر واضح ہو گئے۔ میں نے عملی تجربہ کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی لیکن مجھے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ مجھے ایک مزاحیہ جریدے "دی لیمپون" کی ادارت مل گئی۔ یہیں سے میری فنی اہمیت کے عمل ارتقاء کا آغاز ہوا اور میرا بچپنے کا خبط ایک واضح فنی شکل میں سامنے آ گیا۔

اسی دور کا خوشگوار واقعہ ہے کہ ایک لڑکی مس میری پینگلٹن سے ملاقات ہوئی۔ چند ہی روز میں رسمی سی یہ ملاقات ہم دونوں کے جذبات کو گدگدانے لگی۔ ملاقاتیں بڑھیں اور ہم راہِ زیست کے ہمسفر ہو گئے۔ آج وہ لڑکی میرے چار بچوں کی ماں ہے۔

میں کالج سے ڈگری لے کے نکلا تو میں نے تمام تر توجہ ادبی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی۔ نئے زاویے نکالے اور نئی راہیں ڈھونڈیں۔ میری ایک نظم اور ایک افسانہ پہلی بار "دی نیویارکر" میں شائع ہوا۔ شائع ہو جانا مجھے ادبی میدان میں میری کامیابی کا صرف ایک پہلو تھا، دوسرا یہ کہ مجھے دونوں کا معاوضہ بھی دیا گیا۔ ان دنوں نئے لکھنے والوں کی زبانی حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی۔ اس جریدے میں میرے قدم ایسے جمے کہ یہی جریدہ میری آمدنی کا ذریعہ بن گیا اور اسی جریدے کے صفحات نے مجھے وہ شہرت دی جس کے میں نے کبھی خواب دیکھے تھے۔

ہم میاں بیوی ابھی جوان تھے، ہمارے ولولے بھی پُرشباب تھے۔ میری بیوی میری زندگی کی ہی نہیں، میرے ذوق، میرے خبط اور میرے مشاغل کی بھی ہمرکاب تھی۔ ہم دونوں نے ایک برس تک آکسفورڈ، انگلینڈ کے رسکن سکول میں ڈرائنگ اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کی اور ہم واپس امریکہ چلے آئے۔ آتے ہی مجھے "دی نیویارکر" کے سٹاف میں رپورٹر کی حیثیت سے لے لیا گیا۔ ۱۹۵۷ء تک میں اسی اخبار میں نامہ نگار رہا۔

اس ملازمت سے فارغ ہو کر میں نے ادب کو ہی ذریعہ معاش بنا لیا۔ میں نے افسانوں، ناولوں اور نظموں کے علاوہ مضامین اور تبصرے بھی لکھے۔ میری سات کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں تین ناول ہیں، دو مجموعے افسانوں کے اور دو مجموعے نظموں کے ہیں ——— میرے فن نے پروسٹ، کیفکا، ہنری گرین، جیمز تھربر اور جیمز جوائس جیسے کلاسیکی ادیبوں کا اثر زیادہ قبول کیا ہے ——— ہمارے چار بچے اور دو کاریں ہیں۔

ونگ چے

میرا وطن دریائے یانگ زی کے نشیبی حصہ میں کیان شو صوبے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں واقع ہے۔

میرے والد ریلوے میں کام کرتے تھے۔ کام کے لئے وہ ادھر ادھر پھرا کرتے تھے۔ میری پیدائش ۱۲۔ جون ۱۹۲۳ء کو دریائے زرد کے وسطی حصہ میں ایک قدیم شہر میں ہوئی۔ جب میری عمر چھ برس کی ہو گئی تو میرے والد غربت اور بیماری کی حالت میں چل بسے۔ اس کے بعد میرا پورا خاندان وطن لوٹ آیا۔ ۱۹۳۵ء میں میں نے ایک دیہاتی اسکول سے سند لی۔ زندگی گزارنے کے لئے مجھے ایک چھوٹی سی دوکان میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس دوران مجھ پر سامراج اور رجعت پسندوں کے طرح طرح کے ظلم و ستم ہوئے اور مجھے دنیا میں بے یار و مددگار ہونے کا پورا پورا احساس ہوا۔

۷۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو جاپانی سامراج نے چین کے خلاف ہمہ گیر جارحانہ جنگ شروع کی۔ میں جاپان کے خلاف مدافعتی جنگ میں شامل ہو گیا۔ قومی آزادی کے لئے دوڑ دھوپ اور سعی کرتا رہا۔ پھر میں یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کو جاپان کے خلاف جمہوری مقدس مقام ——— یانگ آن" پہنچا اور اپنے آپ کو نیا چین کے قیام کے سلسلے میں، ایک عظیم الشان مقصد کے لئے وقف کر دیا۔

میں اخبار کا ایڈیٹر اور نامہ نگار رہ چکا ہوں۔ فاضل اوقات میں ادبی کاموں میں دلچسپی لیتا تھا۔ میری پہلی اور پڑ امدافعتی نظم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ نامہ نگار کی حیثیت سے میں اپنے ملک کے مالامال اور دل کش قسم کے لوک گیتوں کے متعلق بہت کچھ جاننے لگا۔ اس کے بعد میں انہماک سے نظمیں لکھنے لگا۔ میرے "تھینگ سان (آسمانی پہاڑ) کے چرواہوں کا گیت" وغیرہ نظموں کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر دو اور بڑے بھی اس میں شامل کئے جائیں، تو ان کی کل تعداد اشاعت تین لاکھ ہے۔ میری نمایندہ، طویل رزمیہ نظم "انتقام کی آگ" ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد شائع ہو چکی ہے۔ اس کی کل تعداد اشاعت اسّی ہزار ہے۔ اب میں اپنے گاؤں میں رہتا ہوں۔ ایک طرف "انتقام کی آگ" کی تیسری جلد لکھتا ہوں۔ دوسری طرف نئی نظم لکھنے کے لئے مواد اکٹھا کرتا ہوں۔

میں انجمن مصنفین چین کی کونسل کا ممبر ہوں اور پیشہ ور ادیب بھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی حقیقی شاعر بننا چاہتا ہو، تو اسے سب سے پہلے اپنے عوام اور اپنی مادر وطن کی تعمیر کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ جوش و خروش کے ساتھ عوام کے لئے گیت گانے چاہیئے۔ اپنے قلم سے ملک کی تعمیر کے متعلق نظمیں لکھنی چاہئیں۔ ایک حقیقی شاعر کو صبح کی چڑیا کی طرح کبھی بھی ناامید اور اُداس نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے ہمیشہ پُرمسرت انداز میں افق، صبح کی ہوا اور سورج کی تعریف میں نغمے گانے چاہئیں۔ اور جد و جہد

محنت اور عشق کے متعلق گیت لکھنے چاہئیں۔

نئے چین کے قیام کے بعد سے میری زندگی بہت خوش حال ہو گئی ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا اب مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ چھوٹی لڑکی بھی اسی سال اسکول میں داخل ہو جائے گی۔ میرے خاندان کے تمام افراد چین کی مقامی اوپڑا کو پسند کرتے ہیں۔ ہم اکثر تھیٹر جاتے رہتے ہیں۔ میری چھوٹی بچی کو مصوری سے بھی دلچسپی ہے۔ سات سالہ بچی اپنے تصور اور خیال سے اونچی اونچی عمارتوں، نئے تعمیر شدہ کارخانوں، خوش حال دیہاتوں، خوبصورت باغوں اور عظیم الشان مناظر کی تصویریں بناتی ہے۔ ہم اکثر اس کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ وہ نئے چین کی حال اور مستقبل کی مصوری کر رہی ہے۔

مجھے دیہات پسند ہیں۔ میں اکثر دیہات میں رہتا ہوں۔ میں ایسی نظمیں لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو چینی دیہاتوں کی نئی زندگی، نئی شکل، نئی صورت حال اور نئے اشخاص کی عکاسی کرتی ہوں۔ حالانکہ میری ادبی زندگی بیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس طویل سفر میں، میں نے ابھی صرف پہلا قدم ہی آگے بڑھایا ہے۔ آرٹ کی بلندی ہمیشہ میرے سامنے ہی ہے۔ میں اپنی پوری کوشش سے آگے بڑھنا چاہتا ہوں، آگے بڑھتا جاؤں گا۔

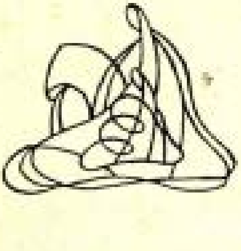

یوانگ اِنگ

میں ۲۸ - اکتوبر ۱۹۲۴ء کو چین کی "نہرِ عظیم" کے کنارے ایک قدیم شہر میں پیدا ہوا۔ خوبصورت شہر ہانگ چو اور چین کے سب سے بڑے شہر شنگھائی میں درمیانی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں ہانگ چو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا۔ اس کے بعد میں نے ایڈیٹر، نامہ نگار اور مڈل اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۴۳ء سے میں نے جاپانی سامراج کے خلاف قومی آزادی کی تحریک اور چیانگ کائی شک کے رجعت پسندوں کے خلاف انقلابی جدوجہد میں حصہ لیا۔ میری شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی میری بیوی استانی ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی بچی ہے۔

بیس سال پہلے میں نے شعر کہنا شروع کئے اور ساتھ ہی ساتھ نثر میں افسانہ اور بچوں کی کہانیاں لکھیں۔ میری پہلی کتاب، بچوں کی کہانی "پیکنگ میں ایک لڑکا" ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ وہ پانچ دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کی تعداد اشاعت اسّی ہزار ہے۔ اب تک میری سات نظموں کے مجموعے، پانچ نثر کے مجموعے اور پانچ بچوں کی کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کل تعداد اشاعت چار لاکھ سے زیادہ ہے۔ میں نے اپنی کتابیں مادرِ وطن، عوام اور نئی نسل کے نام پیش کی ہیں۔ ان خدمات کی وجہ سے اور میری ہمت افزائی کے لئے ۱۹۵۴ء میں مجھے بچوں کے ادب کا انعام دیا گیا۔

میں عرصہ دراز سے اخبار میں کام کر رہا ہوں۔ اس طرح مجھے ہر میدان میں اپنی دلچسپی بڑھانے میں مدد مل رہی ہے۔ قدیم اور جدید ادب کے مطالعہ اور بطور خاص نظموں کے مطالعہ کے علاوہ مجھے سیر و تفریح سے بے حد دلچسپی ہے۔ مادرِ وطن کے خوبصورت مناظر، عوام کی خوشحال زندگی اور تعمیری اداروں کی پُرجوش جدوجہد، غیر ممالک کے دلکش نظاروں اور چینی عوام کے لئے ان کے دلوں میں گہری دوستی کے جذبہ نے مجھے لکھنے کے بے شمار سرچشمے مہیا کئے۔ ایک نئے چین کے ادیب اور نامہ نگار کی حیثیت سے میں اپنے قلم سے ان کے لئے لکھنے اور ان کی خوشی اور تمنا کی عکاسی کرنے میں بے حد فخر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس دفعہ یورپ اور افریقہ کے دورے کے بعد میں پاکستان آیا۔ نہ صرف اس لئے کہ میری زندگی کا یہ سب سے طویل سفر ہے بلکہ اس لئے کہ پاکستان ہمارا دوست اور ہمسایہ ہے اور پاکستان کے جفاکش اور عقلمند عوام چینی عوام کے سچے دوست ہیں۔ پاکستان کی خوبصورت سرزمین پر، پُرجوش پاکستانی دوستوں کے درمیان آ کر میں بالکل ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں اپنے ہی خوشیوں سے بھرپور وطن میں ہوں۔

سیّد حسین ناصر

میں ۷ اپریل ۱۹۳۳ء کو تہران کے ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جہاں علم و فضل عام تھا۔ میرے والد ولی اللہ نصر ایک عرصہ محکمہ تعلیم کے ہیڈ اور سکول کے ڈین اور فزیشن رہے۔ آپ معروف عالم تھے۔ میری والدہ ایران کے اس خاندان سے ہیں جو دینی علوم میں مشہور ہے۔ ایران میں معدودے چند ایسے خاندان ہیں جو دینیات کی بدولت صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔

میں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم تہران میں حاصل کی اور امریکہ چلا گیا۔ امریکہ میں سیکنڈری تعلیم مکمل کرکے میں نے کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم۔ آئی۔ ٹی فزکس میں بی۔ ایس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ۱۹۵۸ء میں ہسٹری آف سائنس اینڈ لرننگ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اس عرصے میں میں نے متعدد بار یورپ کا مطالعاتی دورہ کیا اور شمالی افریقہ کی بھی سیاحت کی۔ ۱۹۵۸ء میں میں ایران لوٹ آیا۔ اس وقت سے میں تہران یونیورسٹی میں ہسٹری آف سائنس اور فلاسفی کا معاون پروفیسر ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں فیکلٹی آف تھیولوجی میں بھی پڑھاتا ہوں اور فیکلٹی آف لیٹرز کی لائبریری کا ڈائریکٹر ہوں۔

۱۹۶۲ء میں مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں عالمی مذاہب کے مطالعہ کے ایک ادارے میں مدعو کیا گیا۔ اسی سال میں حکومت فرانس کے بلاوے پر فرانس گیا اور وہاں ایک لیکچر دیا۔ میں نے دنیا کی اور بھی چند ایک یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے ہیں۔ ان میں پرنسٹن، ایم آئی ٹی، سمتھ کالج، کالگیٹ یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ ویلزلے کالج، امریکہ اور کینیڈا کی چند یونیورسٹیاں، پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی، ہندوستان میں دہلی، پٹنہ اور چند اور یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔

متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے جو مختلف ممالک میں منعقد ہوتی رہیں۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں مراکش میں، ۱۹۵۹ء میں پاکستان میں منعقدہ فلاسفیکل کانگریس میں، کلکتہ میں ٹیگور صد سالہ کی تقریبات میں بھی شریک ہوا۔ یہ ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ ۱۹۶۴ء میں مجھے دہلی میں بین الاقوامی اورینٹلسٹ کانگریس میں بھی شمولیت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ان تمام کانفرنسوں میں میں ایران کی حکومت اور یونیورسٹی کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔

میں شیعہ عقیدے کا مسلمان ہوں۔ مادری زبان فارسی کے علاوہ عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔

1- THREE MUSLIM SAGES. (HARVARD UNIVERSITY PRESS- 1963)

2- INTRODUCTION TO ISLAMIC COSMOLOGICAL DOCTRINES (HARVARD UNIVERSITY PRESS- 1964)

3- SCIENCE AND CIVILIZATION IN ISLAM (CHICAGO UNIVERSITY PRESS_1964)

4- SIX CHAPTERS IN HISTOY OF MUSLIM PHILOSOPHY_ 2 VOLS 1963-64

۵۔ رسالہ سہ اصل صدر الدین شیرازی

۶۔ نظر متفکران اسلامی دربارہ طبیعت

۷۔ بررسی و نوشتہ ہائے بررسی در جہان اسلامی

آپ نے میرے فرصت کے لمحوں کے مشاغل کا پوچھا ہے۔ فرصت ملتی ہے تو لکھنے میں گزار دیتا ہوں۔ میں عام طور پر گھر شام کو یہاں بیٹھ کر لکھتا ہوں یا لائبریری میں۔ دیگر مشاغل اور دلچسپیاں پوچھتے تو مجھے سیر و سیاحت اور کوہ پیمائی کا بہت شوق ہے جسے میں پورا کرتا رہتا ہوں۔ ایرانی اور ایشیائی کلاسیکل موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔

کرۂ ارض پر بہت گھوما ہوں لیکن شمالی افریقہ اور فارس کے صوفیائے کرام سے جو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ہند و پاک کے برِ اعظم کا پہلا سفر میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات ہیں۔ رومی، ڈانٹے اور شیکسپیئر نے بہت متاثر کیا ہے اور جن کتابوں نے متاثر کیا ان میں قرآن اور بھگوت گیتا سرِ فہرست ہیں۔

حق، حسن اور نیکی کے متعلق میرے نظریات کچھ اس قسم کے ہیں:۔

حقیقت کے کئی پہلو ہیں۔ داخلی بھی، خارجی بھی لیکن حق یا حقیقت خود ان سب سے ماورا ہے۔ یہ محدود معانی میں مشہود ہے تو بھی نوعیت کے اعتبار سے لامحدود ہے اور عقل و فہم کی دسترس سے دور۔ اس حقیقت کو پا لینا حق کو پا لینے کے برابر ہے اس سے ہم آہنگی حسن ہے اور اس کی مشیت سے مطابقت نیکی ہے۔

رابن چائیم مناحم

RABIN CHAIM MENACHEM

میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو جرمنی کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ والد کا نام اسرائیل ابراہم ہے۔ میں نے یروشلم یونیورسٹی اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی ہے۔ مادری زبان ہیبرو ہے۔ عربی، فارسی، ایتھوپک اور چند اور زبانیں روانی سے بول سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے جب عربی نظم کے رموز کو پالیا تو خیال آیا کہ یہ شاید میری زندگی کا عظیم واقعہ ہے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ یہ واقعی میری ادبی زندگی کا سنگ میل ہے۔ دوسرا انمٹ نقش یہ ہے کہ میں نے ''ہیبرو میں سنسکرت کے الفاظ'' کے موضوع پر سنسکرت کے پروفیسروں کو ایک کامیاب لیکچر دیا تھا۔

میں نے ۱۹۴۹ء میں ایک کتاب ''عربک ریڈر'' لکھی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں ''روزمرہ عربی'' ۱۹۵۱ء میں ''قدیم مغربی عرب'' اور ۱۹۵۵ء میں ''قرآنی مطالعہ'' لکھی ہے۔ ان کے علاوہ میری چند اور تصانیف بھی ہیں۔

میں آج کل یروشلم یونیورسٹی میں ہیبرو زبان کا پروفیسر ہوں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کس نوعیت کے ماحول یا فضا کو میں لکھنے کے لیے موزوں سمجھتا ہوں، اس کا جواب اسی قدر ہے کہ میں صرف اس وقت لکھتا ہوں جب محسوس کر لیتا ہوں کہ اب لکھنے کے سوا چارہ نہیں۔ فضا خواہ کیسی ہی ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کس مصنف سے زیادہ متاثر ہوں کیونکہ میں صرف مختلف زبانوں کا ہی مطالعہ کیا کرتا ہوں۔ زبانیں سیکھنے کا مجھے خبط ہے۔ میں کسی ایسی کتاب کا بھی نام نہیں لے سکتا جس کا میں نے کوئی قابل ذکر اثر قبول کیا ہو۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میرا حلقۂ فکر متنوع ہے۔

موجودہ سائنسی نظریات ہی کو میں برحق اور کائنات کی حقیقت سمجھتا ہوں۔ انسانوں کی مختلف النوع لسانی اظہاریت اور زبان کے حسن کو ہی میں کائنات کا حسن سمجھتا ہوں بشرطیکہ صرف و نحو کے استاد اس کا چہرہ مسخ نہ کر ڈالیں۔

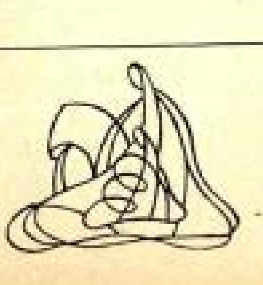

بال جون جوہنیس۔ ایم۔ ایس

BALJON JOHANNES_M_S

میں ۱۰ر جولائی ۱۹۱۹ء کو جاوا میں پیدا ہوا تھا۔ زبان ولندیزی ہے اور مذہب عیسائیت۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، لاطینی، ہیبرو، عربی اور اردو زبانیں اچھی طرح سمجھ بول سکتا ہوں۔ لنڈن اور لیڈن کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ زیادہ تر مطالعہ مذہب کا ہے جو آگے چل کر تحقیقی صورت اختیار کر گیا۔ تحقیقات میں زیادہ تر اثر انجیل مقدس کا ہے۔

میری لائبریری میں کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں جن کے نرغے میں بیٹھتا ہوں تو دل و دماغ لکھنے کو تڑپنے لگتے ہیں۔ خیالوں میں ہلچل سی ہوتی ہے اور یہ کتابیں ایک تحریک بن جاتی ہیں۔ انہی کتابوں کے سہارے میں بیٹھ کر لکھتا ہوں اور لکھنے کے لیے اسی ماحول کو موزوں سمجھتا ہوں۔ کبھی رات کی تاریک تنہائی میں بیٹھے بیٹھے ذہن سے خیالوں کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور لکھنے کو بہت کچھ ہاتھ آ جاتا ہے لیکن لکھتا ہوں تو کتابوں کے ڈھیروں کے سامنے ہی بیٹھ کر۔ میں نے دو قابلِ ذکر کتابیں لکھی ہیں:۔

1_ THE REFORMS AND RELIGIONS IDEAS OF ZIR ZYED AHMED KHAN

2_ MODERN MUSLIM KORAN_ INTERPRETATION.

تفریحی مشاغل موسیقی اور کھیل ہے۔ پیانو بجاتا ہوں اور ٹینس کھیلتا ہوں۔

ان دنوں ہالینڈ کی ایک یونیورسٹی کے شعبۂ مذہبیات میں ریڈر ہوں۔ میں پاکستان اور ہندوستان بھی دیکھ آیا ہوں۔ یہ ایک تعلیمی دورہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

حق کسے کہتے ہیں یا حقیقت کیا ہے؟ میں اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا نہ ہی دیا جا سکتا ہے کیونکہ زندگی حق کی جستجوئے مسلسل کا ہی نام ہے۔ میرے نزدیک حسن تناسب یا توازن تک محدود نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شے آپ کو اپنے اچھوتے پن کی بنا پر مسحور کرے وہ حسین ہے۔ نیکی نوع انسانی کے مفاد کا نام ہے۔

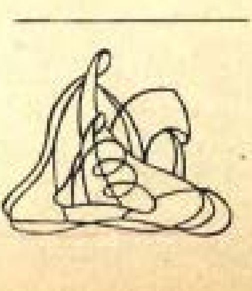

ذیکی ویلیدی توغن (ترکی)

ZEKI VELIDI TOGAN

میں ۱۹۲۷ء سے استنبول یونیورسٹی میں ہسٹری کا پروفیسر ہوں۔ روسی، ترکی، انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ میں یہ زبانیں جانتا ہوں۔ عربی، جرمن اور فارسی بھی بولتا ہوں۔ مادری زبان ترکی ہے۔ میں ترک ہوں۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۰ء کو ایک مسلمان باپ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اس وقت ہم روس میں رہتے تھے۔ باپ کا نام احمد شاہ تھا۔ میں نے تعلیم وی آنا یونیورسٹی میں مکمل کی تھی۔

آپ نے چند اور باتیں بھی پوچھی ہیں۔ میں اس سال کے اوائل میں پاکستان آ رہا ہوں۔ آپ سے ملوں گا اور اپنے متعلق آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا۔“

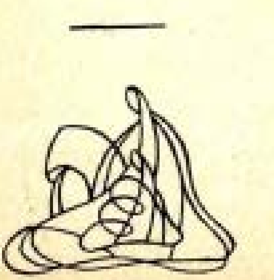

فندی کوغلو

FINDI KOGLU

معاشرت کی بنیادی حقیقت کیا ہے؟
جو کچھ بھی ہے!
معاشرت کا مرکزِ فکر و عمل کہاں ہے؟
جہاں کہیں بھی ہے!
معاشرتی تحریک کی روح کیا ہے!
جیسی بھی ہے!

اسی کو میں حق سمجھتا ہوں، کائنات کی حقیقت بھی یہی ہے اور زیست کا حسن اور دلآویزی بھی یہی ہے۔

غزالی، رومی، مولانا جلال الدین اور برگسن نے میری سوچ و فکر کو نئے افق بخشے ہیں۔ خصوصاً مولانا جلال الدین کی تصانیف نے میرے انداز و افکار پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

میں نے تین کتابیں لکھی ہیں۔

1- SOCIAL CHANGES IN TURKEY.

2- CODE FAMILIAL EN TURQUIE.

3- ZIYA GOKALP: TURKISH SOCIOLOGISTE.

میں ہندوستان گیا تھا۔ تاج محل بھی دیکھا اور چند اور تاریخی یادگاریں دیکھیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ کیا ہے تو یہی کہوں گا کہ میں نے تاج محل اور مغل بادشاہوں کی تاریخی عمارتیں دیکھی تھیں۔

پیشے کے لحاظ سے تو میں استنبول میں معاشرتی علوم کا پروفیسر ہوں لیکن دلچسپی صحافت میں ہے۔ فرصت کی گھڑیاں اسی شغل میں گزارتا ہوں۔ معاشرت اور تمدن کے مشاہدات میری تحریروں کے محرک ہوتے ہیں۔

اپنی زبان ترکی ہے۔ میں ترکی کے ایک قصبے ارضروم میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد محترم مفتی نے مجھے دل کھول کر تعلیم دلائی اور میں نے فلاسفی اور معاشرتی علوم میں ڈگریاں لیں۔ فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبان پر عبور حاصل ہے جو روانی سے بول سکتا ہوں۔

(چودھری) محمد علی ردولوی

میری تصانیف

"فروغِ اردو" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بقول انشا مرحوم (بتصرف) "اس چھوٹی سی جاگہ میں یہ وسعت یہ سماوات اللہ رے جودت" ڈاکٹر جانسن نے برک کے لیے کہا ہے کہ اگر راہ میں دو شخصوں کو نکل جانے کے لیے آپ برک کے ساتھ لمحہ بھر کے لیے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جائیے تو صرف اتنی ہی دیر میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ برک کوئی راہ گیر نہ تھا۔ یہی حال ماشاء اللہ "فروغِ اردو" اور اس کے اعزازی مدیر کا ہے۔

مجھے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی کتابوں کی فہرست بھیج دو اور کچھ ذاتی حالات کے بارے میں بھی شاید کہا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ اتالیق بی بی ۲۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم و مغفور ۳۔ نقادی کے نکتے یعنی قلمی تصاویر کی پرکھ ۴۔ صلاح کار ۵۔ پردے کی بات (ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ضبط تولید پر) ۶۔ گناہ کا خوف ۷۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر۔ ان کے علاوہ "معلومات" ایک ماہنامہ تھا جس میں اکثر چھوٹے چھوٹے ایکٹ کے ڈرامے نکلا کرتے تھے۔ عیاش، کسان، سعید و سلمہ وغیرہ۔ اگر وہ مل جائیں تو اردو کی تاریخ تو کیا اس سے یہ ضرور پتہ چلے گا کہ انگریزی سے کس کس وقت اردو نے کیا کیا لیا۔ آسکر وائلڈ کا مقدمہ ضرور ہوت۔ پیرا ڈاکس برنارڈ شا کی شہرت کا عروج کمال ہے اس کے علاوہ ایک کاپی شملہ میں کھو گئی۔ شاید کسی وقت پانی روپے کو اچھال دے تو دو چار افسانے مل جائیں مگر ان کا ذکر فضول ہے۔

شاید آپ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ کہیں میرے حالات لکھے ہوں تو ان کا پتہ بتا۔ حضرت! افلاک کی وجہ سے دماغ بگڑ گیا ہے۔ ایک بڑھیا ایک ٹوکرے میں دھان کوٹنے کو لیے جاتی تھی۔ اس پر بندر کود پڑا۔ ٹوکرا گر پڑا۔ دھان بکھر گئے۔ اس عورت نے کہا "لیو اب کیا کری؟" یہی حال میرا ہے۔ ایک صاحب ہیں عسکری صاحب ادیب ایک بار انہوں نے میرا ایک بہترین افسانہ ایڈٹ کیا تھا۔ دوسرے مصنفین کے ساتھ میرا بھی ایک افسانہ "تیسری جنس" چھاپا تھا۔ اس میں ان کے علاوہ کچھ اپنا حال بھی میں نے لکھ دیا تھا۔ اگر وہ آپ ڈھونڈ نکالیں تو کچھ حال میرا مل جائے۔ نہیں تو یہ مصرع کافی ہوگا:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

بلکہ یہ اس سے بہتر ہوگا۔

"سیّاں آون کی بھئی بیریاں ۔ دروا جو اٹھاری رہوں"

میرے حالات

محمد علی قوم شیخ صدیقی، ساکن ردولی، پیشہ آبائی تعلقہ داری، نام تعلقہ میر پور، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ۔ تاریخ پیدائش ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء اس وقت

(سنہ ۱۹۴۳ء) تک بقید حیات ہے۔ پہلے مکتب میں تعلیم پائی۔ پھر کالونی تعلقہ دار اسکول (اب کالج) میں پڑھتا رہا۔ مگر کوئی امتحان پاس نہیں کیا۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آج تک جاری ہے۔ انگریزی فارسی کا شوق تھا۔ عربی سے نابلد مگر پیش ملا حکیم و پیش حکیم ملا۔ غیر عربی دانوں کی صحبت میں اکثر عربی جملے اور آیات قرآنی بول جاتا ہے۔ انگریزی میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ اردو میں تصانیف حسب ذیل ہیں۔

اتالیق بی بی۔ مطبوعہ دلگداز پریس۔ پہلی طبع عمدہ ہوئی تھی بعد کو دیباچہ جس پر لکھنے والے کو ناز تھا نکال دیا گیا اور آج اسی طرح سے ہے جیسے بڑے گھر کی لونڈی۔ صلاح کار۔ جنسیات پر خود مصنف سے مل سکتی ہے اور جامعہ ملیہ سے بھی شاید مل جائے۔ [آزادی کے نکتے] ایک رسالہ قلمی تصویروں کی پرکھ پر۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الٰہ آباد ہائی کورٹ۔ یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا۔ اب نہیں ملتا۔ [گناہ کا خوف۔ نیا سنسار لکھنؤ مل سکتا ہے۔ پردے کی بات۔ ایک رسالہ ضبط تولید پر جو مصنف سے مل سکتا ہے اس کے علاوہ اودھ پنچ مرحوم۔ معلومات مرحوم اور دوسرے رسالوں میں وقتاً فوقتاً افسانے، بعض مضامین باقی ہیں۔ بعض کہانیاں، چھوٹے ڈرامے شائع ہوئے۔ ایک کتاب کا مواد اس وقت بھی موجود ہے مگر کاغذ کا قحط اور شائع کرنے والے کی کمی مجبور کئے ہوئے ہے۔

چھ برس صوبہ کونسل میں رہا اور اردو میں تقریریں کیں۔

میں بقول ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" بڈھا ہوں اور واقعہ بھی یہی ہے شبلی نعمانی مرحوم جب اسلامی دنیا کے سفر سے واپس آئے تب میں نے ہوش سنبھالا اور اس طرح ان کے بیان فارسی ترکیبیں مرزا عبدالقادر بیدل غالب وغیرہ کی پیروی میں ہوتی تھیں شروع کیں اور شعر کہتا رہا۔ پھر خیال گذرا کہ بولنے کی زبان گر اور ہوتی اور لکھنے کی زبان اور، تو کام کیسے چلے گا۔ زبان ترقی کیسے کرے گی؟ ناچار یہ کوشش کی کہ جو بولا جائے وہی لکھا جائے۔ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ مرنے کے پیچھے کوئی دوسرا مجنوں بدایوں ہوگا یا اسی لکیر کا فقیر ہوں گا اس کا علم خدا کو ہے۔

ماں باپ کا مذہب شیعہ تھا۔ دو تین سال ہوئے محرم کی مجالس، تعزیہ داری وغیرہ یک قلم چھوڑ دی۔ سنی احباب اور اعزہ نے خوش ہو کر پوچھا کیا سنی ہوگئے؟ لکھنے والے نے جواب دیا کہ اگر سنی ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔ اب دعا ہے کہ مسلمان مرے اور مسلمان اٹھے۔ آمین۔

دو شادیاں کیں اور بہت سی کرنے کی آرزو رہ گئی ؎

آتا ہے حسرتِ غمِ دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اپنے چھوٹے چھوٹے عیوب نہایت چالاکی سے ظاہر کر کے بڑے بڑے عیوب چھپاتا ہے۔ انانیت سے ظاہراً متنفر ہے جب کہ شاید اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہو۔ مگر اپنا ذکر، ذکر حبیب کے برابر لذیذ پاتا ہے۔ خود لکھنے والے کا خیال ہے کہ جو کچھ نیک نامی، شہرت، گمنامی اس کو نصیب ہوئی وہ صرف سنس آف ہیومر کے دربار سے عطا ہوئی۔ نوجوانوں کا ادب کرتا ہے کیوں کہ آئندہ کی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی بڈھے کی موت سنتا ہے تو کہتا ہے بڑھاپے کی یہی سزا ہے۔

میری تصویر

حضرت کا خیال ہے کہ میں نے مضمون لکھنے میں پہلے عذر کیا تھا۔ یہ نخرہ نہ تھا بلکہ بڑھاپا، گرمیاں، زمینداری جانے سے فقیری کا دھڑکا سب طرح طاری ہو گئے تھے۔ اب اس کے بعد تصویر کی فرمائش۔ کچھ شکوری کا جذبہ ایسا ابھرا آتا ہے کہ دل چاہتا ہے بڑا سا خط لکھوں۔ اس وقت بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل

دقت ہے۔ اس لیے طبیعت ذرا مزے میں ہے۔ آپ نے مضمون اس اصرار سے مانگا تھا اور تصویر بھی طلب کی ہے کہ انانیت اور اوچھا پن راضی ہو گئے۔

مرد فربہ شود از راہ گوش

اس بڑھاپے میں میرے بچے سب دُور جا پڑے۔ ان کے کہنے سے یہ تصویر کھنچوائی تھی ورنہ اس عمر میں تصویر کھنچوانا کیسا۔ آئینہ دیکھ کر غصہ چڑھ آتا ہے۔ اڑسٹھ برس دو مہینے کے سن میں ۸ر جولائی ۱۹۵۵ء کو یہ تصویر کھنچوائی تھی اور حسب ذیل عبارتیں لکھ کر مختلف بچوں کو بھیجی تھی!

۱۔ یہ تمہارا باپ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۲۔ پیر و صد عیب می گفتند۔

۳۔ یہ تصویر میری نہیں ہے۔ میں اتنا بوڑھا اور بدصورت کیسے ہو سکتا ہوں؟

۴۔ جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔

۵۔ بڑھاپے کی مسکراہٹ جوانی کا ماتم۔

جو تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں اس پر بھی کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ "ہم اُمید لگائے تھے کہ چہرے کی شکنیں 'جلد کا' تو جلد ختم ہو جائیں گی۔ مگر "نقوش" کے ہاتھوں ہم "ڈورین گرے" ہو کر رہ گئے۔"

آپ کو یاد ہو گا کہ آسکر وائلڈ کا ہیرو ڈورین گرے جو جو آوارگی سیاہ کاریاں کرتا تھا ان سب کا اثر بجائے اس کی صورت کے اس کی تصویر پر پڑ جاتا تھا ایک مرتبہ اس نے اپنی تصویر دیکھ لی اور اس کو اس قدر نفرت ہوئی کہ اس نے تصویر کو خنجر سے چاک کر دیا۔ تصویر جیسی کھنچی تھی ویسی ہی ہو گئی اور ڈورین گرے سینہ چاک ہو کر اسی وقت مر گیا۔

یہ نہ خیال کیجیے گا کہ داد طلبی کے لیے انکسار کی کٹیا لگا کر تعریفوں کی مچھلیاں پکڑ رہا ہوں بلکہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میرے اوپر بڑھاپے کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ سٹھیاناپن قبضہ کرتا جا رہا ہے۔ حس استحضار کم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات احساس کمتری بڑھ جاتا ہے اور کچھ لکھتے وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ جن باتوں پر ہم دوسروں پر عبرت کرتے تھے وہی دن ہم کو دیکھنا پڑا۔ اظہار تشکر میں اپنی کتابیں جو موجود ہیں بھیجتا ہوں۔ بعض ایسی جو ناپید ہیں۔ نہیں تو داد طلبی کے شوق میں وہ بھی حاضر کرتا۔

(۸ر جولائی ۱۹۵۵ء)

چلے چلو

دل پر اللہ میاں قفل چڑھا دیتے ہیں۔ وہ کسی طرح نہیں کھولتے۔ اگر وہ قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا۔ اب نماز بھی زیادہ جی لگا کر پڑھتا ہوں اور دُعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں۔ اس کے رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر ؎

مرا دل ایست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولتے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے ؎

عالم بجز وشش لا لا الا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں بھی پایا جاتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا ہے جس کو پرسنل گاڈ PERSONAL GOD کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہِ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو یہ طلب تمہاری صادق ہے؟

میں عرض کرتا ہوں۔ میرے مالک! میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جس سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ذرا غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو چاہا ہے بھلا ایمان سے کبھی بھی بے تابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو؟

میں عرض کرتا ہوں۔ جی نہیں اس طرح کی تڑپ، بے چینی تو نہیں پاتا، ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم تمہارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو۔ عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت گھڑی گھور رہی ہے۔ اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔

میں عرض کرتا ہوں۔ بار الٰہا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی میری خواہش انہی مجبوریوں سے ہوگی مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دیدے دولتِ ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو ؎

ہجرو وظیفۂ تو دعا کردن است و بس
در فکر آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمہارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔

میں عرض کرتا ہوں۔ اے میرے رب۔ میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے۔ کریم ہے۔ غفار ہے۔ تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دیدے۔ میرے قلب کو تو تسکین ہو جائے حکم ہوتا ہے۔ زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا ہے کہ چلے چلو اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمہاری عبودیت تو ضبط ہوتی جائے گی مگر مانتے ہی نہیں۔ قفل کھولو قفل کھولو کی رٹ لگا دی ہے۔ اب ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں بہروپیا جب جمایا دنیا ابھرے گا۔ آیا ہے وہاں سے اٹھا باندھنے۔

میں عرض کرتا ہوں۔ اب حضور مالک ہیں۔ جو جی چاہیں کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیم نے بھی پوچھا تھا کہ تو نے کر دیا۔ مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوتی۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔ آخر کہاں جائیں۔ کس سے عرض حال کریں؟ میں ساڑھے تین برس کا تھا۔ آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہتے ہیں۔ اس کے بعد بے وقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کر دی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چونی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے۔ یہ چونی لو اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں چچا دادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے

قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ اسپنسر وغیرہ کے خیالات دل میں جمنے لگے کفر و الحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح سے تو نے خسرہ (چھوٹی چیچک) مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے۔ اسی طرح سے شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کی بیماری ہو جاتی ہے جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی ہیں کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا اور بعض بیچارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو خیالات کی دق ہو جاتی ہے جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اسی طرح ان خیالات کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت خوش قسمت بچ جاتے ہیں۔ بہت سے ہمارے ایسے جو انجام مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور اجازت بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں؟

ہاتف غیب۔ کہو کہو۔ کہے جاؤ ہم سنتے ہیں۔

میں۔ نیاز ڈنہ ہیں، کہیں ٹھکرائی۔

ہاتف غیب کی آواز میں ایک ذری سی ہنسی اور خوش دلی کا انداز پایا جاتا ہے۔ بڑے منطقی ہو۔ خوب زبان چلتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ چلے چلو۔ ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو جاؤ۔

جاؤں میں اسی طرح سجدے میں پڑا رہتا ہوں۔

حکم ہوتا ہے۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ کہو کہو۔ کوئی ہرج نہیں۔ ہم اپنے بندوں کے عرضِ حال کو بُرا نہیں مانتے۔ کہے چلو۔

میں۔ یا الٰہا۔ تیرے مذہب کی تعلیم دینے والے کہا کرتے تھے۔ بس خدا میں یقین رکھو۔ ہم یقین کے معنی واضح تو سمجھتے نہیں تھے۔ مگر سن لیتے تھے۔ اس دن ایک امریکن کی ایک کتاب میں نکلا:

"To BELIEVE IN GOD IS TO DESIRE HIS EXISTENCE AND WHAT IS MORE TO ACT AS IF LIFE EXISTED."

لے بھلا حضور ہی فرمائیں ایک طرف تو منطق نے عقل کو باؤلا کر رکھا ہے دوسری طرف مولوی بے ایمان دنیا بھر کے خرافات بچپن سے دماغ میں ٹھونس بیٹھے ہیں۔ اگر آپ کے بندے بگڑ جائیں تو کیا تعجب ہے!

ہاتف۔ سنو محمد علی! تم یوں ہی چلے چلو۔ ہم اپنا قاعدہ تو تمہارے لیے بدلیں گے نہیں۔ مگر اتنا جان رکھو کہ ہم جبار و قہار بھی ہیں اور رحیم و کریم بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کو ابھی اپنی بک بک سے سیری نہیں ہوتی ہے مگر تمہارا بکنا بالکل تحصیل حاصل ہے۔ کیوں کہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہم تمہارے اوپر مشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ الایمان بین الخوف والرجا۔ بس اٹھو سجدے سے۔ اپنا کام دیکھو۔

دنیاوی مصائب جو تم نے بیان کئے ہیں ان میں ممکن ہے کچھ مبالغہ ہو مگر ہیں اور بہت شدید ہیں۔ کوئی چھٹکارا خیال آتا ہی نہیں لیکن میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے۔ جب میں اس پر راضی ہو گیا ہوں تو پھر کچھ اور کہنے کی حاجت نہیں۔ (۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء)

بے بسی بے اختیاری

یہ زندگی بھنگ کا نشہ ہے۔ جس میں لہریں آتی ہیں۔ یکبارگی معلوم ہوا کہ آسمان پر جا بیٹھے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ وہیں سے جو چلے تو تحت الثریٰ کو پہنچ گئے۔ وقت کا اندازہ نہیں۔ قرب اور بعد کا ٹھکانا نہیں۔ درد میں اگر پہلے کچھ مزا تھا تو وہ بھی غائب۔ فکر سے چھٹی ملی۔ مگر بے فکری بجائے خود ایک عارضہ ہو گئی

یہاں محمد علی کا حال سنو۔ یہ سب کچھ ہوا اور وہ جہاں تھے وہیں ہیں۔ علاقوں کے جانے کی ۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء تاریخ مقرر ہے۔ عمر قمری حساب سے ۸۰ کے اوپر ہو چکی ہے۔ آئندہ کی امید موہوم۔ مستقبل بالکل اندھیرا ہے مگر منصوبے برسوں آگے کے باندھے بیٹھے ہیں۔ حقہ ایسا پیتے ہیں کہ پچھلے داروغوں سلطان عالم مرحوم مغفور کی یاد تازہ کرتا ہے۔ چائے پر مکھن۔ مربہ۔ بسکٹ ہیں۔ دستر خوان پر مزے مزے کی چیزیں ہیں۔ کاہلی میں ایسے مگن ہیں کہ پنکھے کا بٹن ہی دبانا ہو تو گھر میں یہاں "آؤ" کی فرعونی آواز گونج جاتی ہے مگر خود ہاتھ بڑھا کر بٹن نہیں دبا سکتے۔ باوجود ان باتوں کے بے بسی۔ بے اختیاری برابر زور پکڑ رہی ہے مگر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ تمہارے گھر کے پاس سنگل کی بازار میں ایک بہت بڑا املی کا درخت تھا۔ اس شان کا درخت دہلی میں دوسرا نہیں تھا۔ آندھی جو آئی تو ٹوٹ پڑا۔ دیکھا گیا تو شاندار تنا اندر سے بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ لکڑی نہ سوختنی نہ فروختنی۔ اب پورے خط کی سب باتیں پیش نظر لاؤ اور دیکھو ہماری تصویر۔ تم لوگوں کی دوری، ہمارے غرور کی اونچائی، درخت کا کھوکھلا پن، ہواؤں کے مخالف جھونکے اور روز روز کے تھپیڑے۔ بس اب اس آخری آندھی کا انتظار ہے۔

(۳۱، دسمبر ۱۹۵۲ء)

شکستہ ساز

ہر وقت کی فکریں، ہر وقت کی ٹھوکریں، زمانے کے ہاتھوں ہر وقت کے کچوکے۔ زندگی ایک دوسری طرح کی ہو گئی ہے۔

اعصاب کا یہ حال ہے جیسے کبھی کا پڑا ہوا ستار ہو اور تم یکبارگی اس کو اٹھا کر بجانا شروع کر دو۔ ہر تار جھن جھن جھن جھن کرے اور تم الجھ الجھ کر ساز کو ہاتھ سے رکھ دو۔ کھونٹیاں ڈھیلی، جواری بند، سندریاں ٹیڑھی۔ اودھت رے اودھت تیری کونسی کل سیدھی۔ یہ حال ہمارا ہے۔

ممکن ہے عبارت سے ہی پتہ چلتا ہو۔ اگر نہ چلتا ہو تب بھی یقین جانو کہ ہماری عقل پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے۔ انتظام اور اخراجات کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ایک روز بازار دہلی میں نوشاد سے ملاقات ہوئی۔ پرانے تعلقات کی بنا پر وہ میری امداد کو تیار ہو گیا۔ آج کل وہ انتظام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انتظام کوئی کیا کرے گا۔ جیسے کسی گھر میں آگ لگے اور آگ بجھنے کے بعد چیزوں کا جائزہ لیا جائے کہ فلاں چارپائی کے پائے پٹی ابھی کام کے ہیں اور دوپٹہ کا جل گیا ہے اس کی چاندی پگھلا دو تو بک جائے گی۔ سب سے زیادہ مشکل سوال جابر کا ہے۔ ان کی خبر گیری کرنے والا سوا اللہ میاں کے اور کون ہے اور اللہ میاں کی مشیت نہیں معلوم۔ یہ کہہ دیا کرو۔

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ٹھیک تو ہے اور ہر شخص یہی کہتا ہے مگر ایسی مجبوری سے کہتا ہے کہ جیسے جنگل میں راستہ ڈھونڈنا۔ یعنی جب پڑتی ہے وہ ڈھونڈنے کی کوشش تو کرتا ہی ہے مگر دل کو سکون نہیں ہوتا۔

(۱۷، جنوری ۱۹۵۳ء)

میرا مذہب

جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ہزار عبادتیں کریں، جہد کریں، ریاضتیں کریں مگر انوار الٰہی نہیں ساطع ہوتے۔ اور ایک زمانہ بسط کا ہوتا ہے جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوار الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اسی طرح سے میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خط لکھنے کا تقاضا ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو یاد کیا کرتا ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ غالب کہتے ہیں ؎

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

یعنی ایامِ قبض میں سب کوششیں بیکار ہیں۔ ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر بہاروں کا لطف آتا ہے۔ آج نہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمہارا خط پڑھ کر یکبارگی بسط شروع ہو گیا۔

میں ادھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں "میرا مذہب" اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفۂ اول کا نام آیا تمہارا جی دھک سے ہو گیا ہے جانے نا پختہ شیعہ ہے۔ اس نے کچھ ان کی شان میں برا کہا ہوگا۔ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قائل ہوں۔ میں نے اس رسالے میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ تھوڑا سا اقتباس لکھے دیتا ہوں تاکہ تم کو اطمینان ہو جائے۔

"جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ وہ رسولؐ کی گود کے پالے تھے، شاگردِ رشید تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں۔ انہیں سب سے افضل جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابو بکرؓ کے صفات کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو درجۂ محبت حضرت ابو بکرؓ کو رسولؐ سے حاصل تھا جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفۂ اول کو ذاتِ پاک محمدیؐ سے حاصل تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمرؓ فاروق پوچھتے تھے کہ کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں؟ رسولؐ کی گود کے پالے حضرت علیؓ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انہوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ رسول کا لفظ صلح نامے سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یارِ غار عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کہ میاں جو کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گھڑا ہوا ہے مگر مجھ کو اس میں کچھ وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر لکھے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ جنگِ احد میں رسول اللہ کی شہادت کی غلط خبر مشہور ہو گئی تو حضرت عمرؓ کے منہ سے بہ تقاضائے محبت یہ نکل گیا "اب کیا کریں گے لوگ" حضرت ابو بکرؓ نے کہا۔

"اب کیا کریں گے جی کر"

(۱۲ جون [illegible])

آدمیوں کی کمی بندروں کی بہتات

میں اچھا ہوں اور زندہ ہوں۔ کچھ دن ہوئے بیمار تھا لیکن اب بفضلہ اچھا ہوں۔

اس وقت صبح کا وقت ہے۔ نماز پڑھ کر تقریباً آدھ پاؤ خشک میوے کا چبینا کیا ہے۔ بجائے چاء کے ایک پیالی دودھ پیا ہے۔ مریض ابھی آنا شروع نہیں ہوئے ہیں۔ باغ بندروں نے اجاڑ کر دیا ہے۔ بقول سوداؔ کے

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

وجہ یہ ہے کہ آدمیوں کی کمی اور بندروں کی بہتات۔ کہیں کہیں ایک آدھ گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے۔ جو باغ آج کل دلہن بنا ہوتا تھا وہ مرزا سوداؔ کی دلی ہو گیا ہے جیسے ان کے شہر آشوب میں ہے۔

ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو وہ چراغ بھی بقول سوداؔ کے دل کا داغ ہی ہو کر چمک رہا ہے۔

زندگی کٹتی جا رہی ہے۔ ستر برس کا ہو گیا ہوں۔ جینے کے دن کم اور جینے کی ہوس زیادہ ہو رہی ہے۔

(۱۲ فروری [illegible])

عالم بخروش لا الٰہ الا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو پرسنل گاڈ PERSONAL GOD کہتے ہیں مگر وہاں فاصلہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہِ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو یہ طلب تمہاری صادق ہے؟

میں عرض کرتا ہوں۔ میرے مالک! میری تمنا ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے، جی سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ذرا غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو چاہا ہے جیسا ایمان سے کبھی تم نے چاہا؟ تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو؟

میں عرض کرتا ہوں، جی نہیں اس طرح کی تڑپ اپنے جی میں تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم تمہارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو۔ عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کھڑی گھور رہی ہے۔ اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔

میں عرض کرتا ہوں۔ بار الٰہا! تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش انہی مجبوریوں سے ہوگی مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دے دولتِ ایمان۔ جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو ؎

پھر وظیفہ تو دعا کردن است و بس
در فکر آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمہارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔

میں عرض کرتا ہوں۔ اے میرے رب۔ میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے۔ کریم ہے۔ غفار ہے۔ تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دے دے۔ میرے قلب کو تو تسکین ہو جائے۔ حکم ہوتا ہے۔ زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا ہے کہ چلے چلو اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمہاری عبودیت تو ضبط ہوتی جائے گی مگر مانتے ہی نہیں۔ تفل کسو و تفل کسو کی رٹ لگا دی ہے۔ ارے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ جو دیا جب ہوا یا دنیا بھر کا۔ آیا ہے وہاں سے بڑا پارسا بننے۔

میں عرض کرتا ہوں۔ اب حضور مالک ہیں۔ جو جی چاہے کہیں۔ مجھ نامنہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی کہا تھا کہ مانا کہ تو تو نے کر دیا۔ مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوتی۔ وہ بھی آدمی تھے۔ تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔ آخر کہاں جائیں۔ کس سے عرض حال کریں؟ میں ساڑھے تین برس کا تھا۔ آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہتے ہیں۔ اس کے بعد بے وقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کر دی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چونی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے۔ یہ چونی لو اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں چچا دادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمہارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی جب بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے

یعنی ایام قبض میں سب کوششیں بیکار ہیں۔ ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر بہاروں کا لطف آتا ہے۔ آج نہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمہارا خط پڑھ کر یکبارگی بسط شروع ہو گیا۔

میں ادھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں "میرا مذہب" اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفہ اول کا نام آیا تمہارا جی دھک سے ہو گیا ہوگا کہ لکھنے والا تو شیعہ ہے۔ اس نے کچھ ان کی شان میں برا کہا ہوگا۔ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قائل ہوں۔ میں نے اس رسالے میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ تھوڑا سا اقتباس لکھے دیتا ہوں تاکہ تم کو اطمینان ہو جائے۔

"جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ وہ رسولؐ کی گود کے پالے تھے، شاگرد رشید تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں، انہیں سب سے افضل جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کے صفات کا بھی دل سے قائل ہوں۔ جو درجہ قربت حضرت ابوبکرؓ کو رسولؐ سے حاصل تھا جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفہ اول کو ذات پاک محمدیؐ سے حاصل تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے تھے کہ کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں؟ رسولؐ کی گود کے پالے حضرت علیؓ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انہوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ رسول کا لفظ صلح نامہ سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف ابوبکرؓ یار عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کہ میاں جو کہتے ہیں درست ہے۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گھڑا ہوا ہے۔ مگر مجھ کو اس میں کچھ وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر لکھے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ جنگ احد میں رسول اللہ کی شہادت کی غلط خبر مشہور ہو گئی تو حضرت عمرؓ کے منہ سے بتقاضائے محبت یہ نکل گیا: "اب کیا کریں گے لوگ" حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔

"اب کیا کریں گے جی کر"

(۱۲، جون [illegible])

آدمیوں کی کمی بندروں کی بہتات

میں اچھا ہوں اور زندہ ہوں۔ کچھ دن ہوئے بیمار تھا لیکن اب بفضلہ اچھا ہوں۔

اس وقت صبح کا وقت ہے۔ نماز پڑھ کر تقریباً آدھا پاؤ خشک میوے کا چبینا کیا ہے۔ بجائے چاء کے ایک پیالی دودھ پیا ہے۔ مریض ابھی آنا شروع نہیں ہوئے ہیں۔ باغ بندروں نے اجاڑ کر دیا ہے۔ بقول سوداؔ کے

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

وجہ یہ ہے کہ آدمیوں کی کمی اور بندروں کی بہتات۔ کہیں کہیں ایک آدھ گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے۔ جو باغ آج کل دلہن بنا ہوا تھا وہ مرزا سوداؔ کی دلی ہو گیا ہے جیسے ان کے شہر آشوب میں ہے۔

ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو وہ چراغ بھی بقول سوداؔ کے دل کا داغ ہی ہو کر چمک رہا ہے۔

زندگی کٹتی جا رہی ہے۔ ستر برس کا ہو گیا ہوں۔ جینے کے دن کم اور جینے کی ہوس زیادہ ہو رہی ہے۔

(۱۰، فروری [illegible])

نیاز فتح پوری

"طفیل صاحب!

آپ میری آٹو بیاگرافی چاہتے ہیں یعنی مکمل سوانح حیات! طلب محال بھی اور اس پر اصرار بھی! کیا قیامت ہے!

صرف چار ساعتوں کا ذکر حاضر ہے اور وہ بھی مختصراً۔ اس لیے سوچیے کہ جس شخص پر ہزاروں ساعتیں ایسی گزر چکی ہیں وہ آپ کی فرمائش کیونکر پوری کر سکتا ہے!

میری زندگی تمام تر خطرات ہی میں بسر ہوئی ہے (یہاں تک کہ میرا پاکستان آ جانا بھی ایک ADVENTURE ہی ہے) جس میں عورت اور مولوی کے علاوہ بہت سی باتیں اور بھی شامل ہیں۔ اس لیے سوچیے کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو اس تقاضا کا جواب کیا دیتے!

میں نے تو آپ کی خاطر سے یہ چند سطریں لکھ بھی دیں لیکن آپ یقیناً گالیوں پر اتر آتے۔ معاف فرما کر آئندہ اس موضوع پر لکھنے کی فرمائش مجھ سے نہ کیجیے۔ یہ سن کر چیخ مارنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو کیا خبر کہ اس وقت تک میں نے کتنے گناہ کیے ہیں اور ان سے زیادہ کتنے ناکردہ گناہوں کی حسرت اب بھی دل میں لیے ہوئے ہوں۔ پھر آپ ہی بتائیے کیا ان سب کو اپنی سوانح سے علیحدہ کر دوں اور اگر ایسا کروں تو پھر مجھ میں کیا رہ جائے گا — پروانہ ہوں "نیمہ داغ و نیمہ خاکستر" اسی حال میں اسے رہنے دیجیے، چھیڑیے نہیں۔"

نیاز

آپ نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "اپنی سرگزشت لکھ کر بھیج دو" لیکن انہیں کیا خبر کہ اس کی تعمیل "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔ معلوم نہیں غریب فرہاد خسرو کی اس فرمائش کی تعمیل کر سکا تھا یا نہیں لیکن میں قطعاً معذور ہوں۔

میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور پانچ سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک ۷۵ سال کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس لحاظ سے اس پون صدی کے دنوں کا شمار کیا جائے جو ۲۷،۳۷۵ ہوتے ہیں اور ہر دن کے لیے اوسطاً میں صرف ایک سطر لکھنے پر قناعت کروں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۵ سطر کے صفحے پر ۱۸۲۵ صفحات کی کتاب لکھ دوں۔ حالانکہ میں نے اپنی زندگی کے

کچھ دن ایسے بھی گزارے ہیں کہ ان کا ایک ایک لمحہ پوری "داستان ہوشربا" ہے اور "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" تو پوری "تاریخ خلافت" ہے۔ پھر بتائیے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے لیے "کہاں سے جگر آئے" ۔۔۔ لیکن چونکہ طفیل صاحب کا اصرار بھی قضائے مبرم سے کم نہیں اس لیے سرگزشت تو خیر کیا اپنی سخت جانی کے چند واقعات سنا کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دنیا میں غالباً کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہو۔ حادثہ سے میری مراد اعزہ و اقربا کی موت نہیں کیونکہ اوّل تو موت کوئی حادثہ نہیں زندگی کا انجام ہے ، اور اگر ہو بھی تو یاد رکھیے کہ اس وقت تک میں دو سو سے زیادہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سپرد خاک کر چکا ہوں) بلکہ حادثہ سے مراد وہ آفات ارضی و سماوی ہیں جو خلاف توقع بالکل اچانک سامنے آ جاتے ہیں اور ان کا نتیجہ اکثر و بیشتر موت ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ حوادث اربعہ عناصر کی کوئی صورت ایسی نہیں جو مجھے پیش نہ آئی ہو تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مجھ سا سخت جان، مجھ سا خوش نصیب انسان کوئی اور مشکل ہی سے آپ کو نظر آئے گا۔

دنیا کے وہ عناصر جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے چار ہیں، آب، آتش، خاک، باد اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کا دشمن ہو جائے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں، لیکن یاد رکھیے کہ میں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آ جانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔

(۱) طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتح پور میں ہوں، عمر بارہ سال کی ہے اور ۱۸۹۶ء۔ ہر جمعہ کی صبح کو چند ساتھیوں کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ و صحرا میں چکر لگانا زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانہ میں ہم سب ایک باغ میں پہنچے ہیں اور نیت یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اس لیے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا اسی پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے ایک سیاہ آندھی اٹھی اور دفعتاً اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پرِ کاہ کی طرح ہلنے لگا اور اس کی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہوش و حواس، بصارت و آواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں ایسی چرچراہٹ کے ساتھ جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کر کے زمین پر آ رہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری اور بجائے اس کے کہ زمین سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا، میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا، لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے (آندھی بھی اب گزر گئی تھی) اور پھر شاخ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ گو پاؤں اب بھی پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ ہماری تلاش میں نکلے اور جب انہوں نے مجھے کنوئیں سے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے تمام ساتھی شاخوں میں الجھ کر ختم ہو چکے تھے۔

(۲) رامپور میں ہوں، میرے والد بھی پنشن لینے کے بعد وہیں وکالت کر رہے ہیں اور مولانا وزیر محمد خاں سے فلسفہ و الٰہیات پڑھ رہا ہوں۔ یہ بات ۱۸۹۹ء کی ہے۔ مولانا مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور رات کو بھی میں انہی کے مکان کے بیرونی کمرہ میں سوتا تھا کیونکہ میں صبح زیادہ دیر میں اٹھنے کا عادی تھا اور والد مرحوم بہت صبح تہجد کے وقت بیدار ہو کر سب کو جگا دیتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل کم از کم دو گھنٹے ضرور مطالعۂ کتب میں صرف کرتا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا کہ ایک رات میں کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا اور چراغ گل نہ کر سکا (اس وقت بجلی کیا لالٹین کا رواج بھی کم تھا) رامپور میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیے دو دو رضائیاں ملا کر مجھے اوڑھنا پڑتی تھیں، انھی میں لپٹ کر غافل سو گیا۔ کمرہ میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ صبح تین بجے دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے اور گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سارے کمرہ میں دھواں بھرا ہوا ہے۔ میرا بستر، میری رضائیاں اور تکیے نصف جل چکے ہیں اور میرے جسم کے کپڑے بھی سلگ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت چراغ کی بتی بستر پر آ گری اور کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ چونکہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا اور ہوا کے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے آگ شعلہ نہ بن سکی اور میں بالکل محفوظ رہا۔

(۳) اب سے پورے ۹۳ سال قبل (۱۹۰۰ء) کا ذکر ہے میں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ پا رہا ہوں اور معمولاً ہر تعطیل میں رامپور اپنے والد کے پاس چلا جاتا ہوں۔ زیادہ تر ریل سے اور کم تر تانگے پر۔ رامپور اور مراد آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ میل اور ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کا راستہ بڑا آباد رہتا تھا۔ تانگے، یکے، بہل گاڑیاں وغیرہ بھی چلتے تھے۔ مراد آباد، دریائے رام گنگا پر واقع ہے اور رامپور دریائے کوسی پر اور یہ دونوں بارش کے زمانہ میں بہت پُرشور اور خطرناک ہو جاتے ہیں اس لیے اس زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ سے ان کو عبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، تاہم جانے والے جاتے ہی تھے۔ علی الخصوص غلہ وغیرہ تو عموماً کشتیوں ہی پر پار ہوتا تھا۔

جب جولائی ۱۹۰۰ء میں اسکول ایک ہفتہ کے لیے بند ہوا تو معمولاً میں نے رامپور جانے کا قصد کیا۔ میرے ساتھیوں میں چند ایسے بھی تھے جنھیں رامپور سے ۴۰ میل اور آگے بریلی جانا تھا اور ریل پر جاتا تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ بریلی چلوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مرتبہ کیوں نہ ریل کی جگہ یہ سفر تانگے پر کیا جائے۔ اس سال بارش غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہوئی تھی اور رام گنگا کی طغیانی نے کشتی کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا تھا۔ لوگوں نے مجھے سمجھایا بھی کہ یہ ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نہیں مانا کیونکہ میری فطرت شروع ہی سے ایسی تھی کہ جب امن و خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو میں ہمیشہ خطرہ کی راہ اختیار کرتا تھا اور آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ رام گنگا کو کشتی ہی پر عبور کروں گا۔

اس وقت رام گنگا کا یہ عالم تھا کہ حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور اس کی پُرشور اونچی موجیں سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یوں تو ساحل پر متعدد کشتیاں رہتی تھیں لیکن بارش کے زمانہ میں صرف بار برداری کی بڑی کشتیاں کام کرتی تھیں اور دن میں صرف ایک بار آتی جاتی تھیں۔

میں صبح آٹھ بجے ساحل پر پہنچ گیا۔ ایک بڑی کشتی جو مردوں، عورتوں، بچوں، گائیوں، بھینسوں، گھوڑوں اور غلہ کی بوریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی چھوٹنے والی تھی۔ میں بھی جلدی جلدی ریتلے ساحل کو عبور کر کے کشتی کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور وہ چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ کم از کم چار گھنٹے اس کے دوسرے کنارہ تک پہنچنے میں لگیں گے۔ اس وقت دریا کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا اور حالت یہ تھی کہ کشتی جتنی آگے بڑھتی جاتی تھی پانی کی زبردست موجیں اٹھ اٹھ کر اسے پیچھے دھکیل دیتی تھیں اور وہ کانپ کانپ کر رہ جاتی تھی۔ خدا خدا کر کے دوپہر تک وہ وسط دریا میں پہنچی جہاں اس کے دھاروں کا پورا زور تھا لیکن شومئ قسمت کہ ٹھیک اسی وقت کشتی کی تہ میں

ایک بڑا سوراخ پیدا ہوگیا اور ایک بلند فوارہ پانی کا اچھلنے لگا۔ ملاحوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ سوراخ کسی ترکیب سے بند ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی کہ جو پانی کشتی میں آ رہا ہے اسے اُلیچ اُلیچ کر باہر پھینکتے رہیں۔ چونکہ خطرہ جان کا تھا اس لیے سبھی مسافر اس کام میں لگ گئے لیکن پانی اتنی تیزی سے اندر آ رہا تھا کہ اس کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ پانی اتنا بڑھا کہ تختے کے پورے نصف نصف ڈوب گئے اور جو جانور کشتی میں کھڑے تھے پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسافروں کی پریشانی عورتوں کی گریہ وزاری، بچوں کی چیخ پکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور میں بھی ایک کونہ میں بیٹھا ہوا اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی رفتار اب بہت سست ہوگئی تھی کیونکہ اس پر پانی کا وزن بھی بڑھتا جاتا تھا اور چپوؤں سے کام لینا بھی ملاحوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ تاہم چونکہ ہوا کا رخ موافق تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

رام گنگا کے بعض دھارے تو بیچ میں تھے لیکن ایک سب سے زیادہ خطرناک دھارا مشرقی ساحل کے قریب تھا اور اب کشتی کا رخ اسی طرف تھا۔ لوگوں کو بالکل یقین تھا کہ کشتی اس دھارے سے صحیح وسلامت نہ گزر سکے گی اور اس یقین کے تحت سراسیمگی کا جو عالم ہونا چاہیے وہ انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور چیخ پکار اٹھنے والے نے طوفان کے شور کو بھی دبا دیا تھا۔

مجھے کیا سبھی کو یقین تھا کہ بچنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں اور فرطِ مایوسی سے ہر شخص نڈھال تھا۔ میں نے سوچا کہ جان تو جاتی ہی ہے کیوں نہ کوئی آخری کوشش جان بچانے کی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ جس وقت کشتی مشرقی دھارے پر پہنچے گی تو یقیناً ڈوب جائے گی اس لیے میں نے مسافروں سے کہا کہ جان بچنے کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو لوگ پیرنا جانتے ہیں وہ اپنے کو دریا میں ڈال دیں اور ساحل تک کا فاصلہ (جو ۱۰۰ گز سے کم نہ تھا) پیر کر عبور کریں۔ یہ کہہ کر میں نے پانی میں چھلانگ ماری اور میرے ساتھ دس بارہ آدمیوں نے اور بھی ——— میرا یہ فعل یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت میسر بھی تھی ہی نہیں۔

جس وقت میں پانی میں کودا تو ایک لہر مجھے سیدھی تہ تک لے گئی لیکن چونکہ میں فنِ شناوری سے واقف تھا اور زمانہ بھی عنفوانِ شباب کا تھا اس لیے میں ہاتھ پاؤں چلا کر اُبھرا اور موجوں سے لڑتا بھڑتا ساحل کی طرف بڑھا۔ چیخ پکار کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی لیکن پھر مڑ کر میں نے کشتی کو نہیں دیکھا۔ اس کے دس منٹ بعد جب میں کنارے تک پہنچ گیا اور پلٹ کر کشتی کو دیکھنا چاہا تو ایک بھنور کے سوا جو ساری کشتی کو مع اس کے مسافروں کے نگل چکا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

(۴) ۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندھیل کھنڈ) سے ہوگیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں مودہا (ضلع ہمیرپور) کے تھانہ میں مامور تھے اور میں ہر پندرھویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔ یہ سفر میری انتہائی تفریح کا ہوتا تھا کیونکہ بالعموم میں شام کو چلتا تھا اور راستہ کے سنسان جنگلوں کو طے کرتا ہوا رات کو ۹ بجے مودہا پہنچتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا مجھے بڑا شوق تھا اور جب اس کا موقع نہ ہوتا تھا تو پھر میں پیدل سفر کرتا تھا۔ چنانچہ میری عمر کا وہ حصہ جو بندھیل کھنڈ میں بسر ہوا یا تو گھوڑے کی سواری کے لیے وقف تھا یا پیدل چلنے کے لیے اور اس سلسلہ میں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک مکمل داستان ہے جس کے چھیڑنے کا یہ موقع نہیں۔

اس وقت تو صرف اس حادثہ کا ذکر کرنا ہے جو ایک بار کدورہ سے تورہ جاتے ہوئے پیش آیا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا لیکن ذرا دیر سے، اس لیے جب میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو گیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور تورہ جانے کے لیے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے اور میں ریت کے اس حصہ کو عموماً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے ہی پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتلا حصہ ہے جو بظاہر صاف و مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے بارہا اس دریا اور اس کے ریگستانی حصہ کو طے کیا لیکن کبھی چور بالو سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لیے معمولی راستے سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک ریتلی تنگنائے ملی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اس کو پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا تھا، زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز سمجھتا تھا حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ پھر میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصہ کے اندر ہی رہے۔ خیر یہ تو کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس پر دھیان دھرتا لیکن جب اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (کیونکہ اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔ اگر میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بیشک اس ترکیب پر عمل کر سکتا تھا لیکن اب کہ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا کیونکر اس پر عمل کر سکتا تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لیے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا لیکن لگام بدستور اپنے ہاتھ میں رہنے دی کہ ممکن ہے اس کے جھٹکا دینے سے گھوڑا کسی وقت اوپر آ جائے۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت بیری کے دو شخص گھومتے وقت میرے پاس سے گزرے اور میں نے انہیں آواز دی۔ وہ فوراً دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا ایک سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیونکر نکالا جائے سو اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرا سرا پکڑ کر قریب ہی ایک اونچی جگہ پہنچ کر لگام کا جھٹکا دینے لگا۔ گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ اس جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔ خیر گھوڑے کی جان جانے کا صدمہ تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن اب یہ فکر لاحق تھی کہ دس میل کا صحرائی

کا بڑا مضبوط پل ہے۔ پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اتنا کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آتے جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کسی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شاندار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصور کی نگاہ میں حضرت صفی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشیں اور ولولہ انگیز لہجے میں سناتے نظر آتے ہیں۔

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمت و دبدبہ کے ساتھ ہمارے گرد آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعراء کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا انداز شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نظر نہیں آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں جو دوسری منزل پر واقع تھا، کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اُردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ اس عمر، زمانے، ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا فلک رستخیز رک جائے گا۔

مجھے ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اُردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی، میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اُردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے اور میرا بہی خواہ ہے۔ اُردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہے، مجھے کوئی فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اسی طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، شریفانہ اور پُر وقار جلوس، نہ

پولیس کا انتظام نہ ایسا کوئی اژدہام، ہزار پانسو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا اور پھر منتشر ہو جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم ؎

خدا سے شخص نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر لہجے و انداز سے سنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی۔

میری ایک عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا اگر پڑا کیوں نہ ہو میں اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی دلچسپ یا نئی بات ضرور مل جاتی ہے۔ اُردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پیرائے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا مستفید ہونا لازمی ہے۔ موضوع سیاست، قومیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عشق جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پاتی تھی۔

یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوب تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیس اعظم جون پور کے داماد تھے۔ سُرخ و سپید رنگ، بلند قامت، متناسب الاعضا، خوبرو، خوش گفتار، شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو۔ بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آ جاتا ہو۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کر دوں کہ ابتدائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد کے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اُردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں۔ فارسی جانتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف مسئلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور رہنے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لیے دیہات کے پرائمری سے مڈل پرائمری سکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ و برتر ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آتی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لیے وجہ معاش قرار پائی یعنی اُردو، میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف راماین۔ وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ واسطہ نہ رکھتے تھے اس لیے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ املا میں جو کچھ لکھایا جاتا ہو گا دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف راماین سُناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے۔ دور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بڑھیا، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پیے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہو گی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے اتار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوش سلیمانی نہیں لٹکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

۱۹۱۵ء میں یہاں فرسٹ ایر میں داخل ہوا جب سے آج تک کم و بیش چالیس بیالیس سال ان تمام چھوٹے بڑے انقلابات سے دوچار رہا جو علی گڑھ میں یا اس سے باہر دور و نزدیک پیش آتے رہے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا؟ بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اس کو چھیڑے کون؟ اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہو گا۔ تمام زندگی میں بس ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتش نمرود میں کود پڑا۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا، تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلبا کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ یہ فطرت اور ارباب کالج کی متفقہ تجویز تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نووارد کا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لیے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔

کچی بارک (سید محمود کورٹ) کیا چیز تھی، کوئی عمارت تھی، عبارت تھی، علامت یا حادثہ، یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، نہایت درجہ نیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور لٹک بھی رہی تھیں جن میں کڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح

کے چند دن لگ گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم وردی دھول اور دھند میں جھول رہی ہو کانپتی، کرہتی، کراہتی، کھانستی!

میں نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحت برما" کے عنوان سے لکھے جو "میگزین" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چاٹگانگ، اکیاب کے دورے میں پیش آئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا، جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈھرے پر ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک کی صورت و معنی میں مجھ پر منکشف ہوئی، جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اسے جدا کر سکتا ہوں۔ در اصل تمام عمر کچی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں۔

ابتدا میں مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے۔ یہ تاثرات کلیتہً احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اردو کا لہجہ اور تلفظ سن کر ایک لمحے کے لیے دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایک دن مولانا (اقبال احمد خاں سہیل) سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کیے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے، اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے "ارے بھائی! ٹکسالی اردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جونپور ہی پر موقوف نہیں۔ ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دور افتادہ خطوں میں اردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اردو بھی بول سکتا ہے۔ اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اردو سنواؤں گا۔"

مولانا نیز ہم سب کو ڈاکٹر صاحب مغفور کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کر لاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان سب پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لیے حسب حیثیت خاصہ اور کبھی کبھی خوانچے والوں سے پھل، فیرنی یا کباب خرید دیتے۔ شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا عملی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روزمرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا "چلو تم کو دلی کی زبان سنواؤں"۔ چنانچہ ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک کچی بارکوں کے غلط کمروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ بالآخر

فضل الرحمٰن قدوائی رفیقی مرحوم کے کمرے پر پی پارک پہنچے۔ پوچھا "آغا حیدر حسن نہیں آئے؟" مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔ موصوف دلّی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اب حیدر آباد میں رہ بس گئے۔ دلّی کی زبان بالخصوص بیگمات کی، دلّی کے کوچے، دلّی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔

مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بھئی آغا حیدر! ان کو دلّی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔" پھر تو آغا صاحب نے "گل افشانیٔ گفتار" ہی نہیں "انداز گل افشانیٔ گفتار" کا وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سنا رہا ہو بلکہ جیسے ہم آپ روزمرہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کر رہے ہوں۔ یا جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں۔

کچھ دنوں بعد سید آل عبا نادری مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں میرے ہم روزگار تھے۔ ظرافت لسانی اور علم مجلسی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے شہروں کی کوروتی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضرات لکھنؤ ان کے اس کمال کے معترف تھے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کی دلّی اور لکھنؤ کے ماحول و معاشرت کی کیسی دلکش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین "بے پرکی" کے عنوان سے آج سے تقریباً ۳۵، ۳۶ سال قبل میں نے علی گڑھ میگزین کی طرف سے شائع کئے تھے جو بہت پسند کئے گئے تھے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوتے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آتیں اور دونوں طرف نامور کھلاڑی اور پورے ہنر کار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی۔

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا۔ جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اُردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب۔ عام خیال یہ تھا کہ انگریزی یا اُردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آجائے ذاکر صاحب اور سہیل صاحب علی گڑھ کی نمائندگی بہتر سے بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے طالب علمی کے زمانے میں سر کئے۔ جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

کالج میں طلبا کے علاوہ اساتذہ میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے ایف رحمان بی۔ اے (آکسن)، ممبر لیجسلیٹو کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن جن کو گورنمنٹ نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا اور دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔

انعام اللہ خاں صاحب انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفّیٰ انگریزی بڑی روانی اور ٹھسّے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کی کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں، اس لئے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رٹنے سے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے تشدد بہت لگتا ہے۔ یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آجائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے [illegible]

ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دیے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر یک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا "دیکھیے جی! یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو! بیچ کا کوئی راستہ نہیں"۔

انٹرمیڈیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مراد آبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگران بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ خوب سوجھتی تھی۔ اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے اور بعضوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دست راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لیے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہ و تعبیر کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا معاند بھی اعتراض یا مذمت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کا نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام گھپلا کوش یا کوش گھپلا رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے "در عمل کوش و ہرچہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیے جاتے جن کی تعبیر و توجیہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتداد زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے، محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیان ملک اور اکابر و امرا کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی۔ علی گڑھ شعرا کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں پیش از پیش حصہ لیا اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے جس کی نظیر شاید کسی دوسری درس گاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حسن قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلم ہو جاتی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی رہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق پگی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کا شمار طلبا کے بڑے قابل قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں۔ ۱۸۹۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔

اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ ایک نادار لیکن ہونہار طلبا کے لیے مالی امداد فراہم کرنا، دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔ اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلبا ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں وفد لے کر جاتے ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے اسے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

سوسائٹی سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل و توازن، خیر اندیشی، خوش مذاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین، خطبے، پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لیے لکھنے پڑے میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ حکیم صاحب کا مطب ماریسن روڈ پر اس جگہ تھا جہاں اب ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں کم و بیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے جس پر ڈاکٹر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرلے دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی ع میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

ہسپتال میں "بڑے ڈاکٹر صاحب" سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتا ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو محض بربنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج بلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، سن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری، داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش، ہاتھ میں رعشہ، نسخہ لکھتے تو انگشت شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لیے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر ادھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "قربان جائیے اس کمال پر، ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ٹائپ بھی کرتے جاتے ہیں۔"

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر کیے جانے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار ابھرتے ہیں لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لیے بڑا مشکل ہے۔

(تلخیص)

قاضی عبدالودود

میں باپ کی طرف سے تاج فقیہی[1] اور ماں کی طرف سے دسنوی ہوں۔ اجداد پدری[2] میں ملا غلام یحییٰ گزرے ہیں جو پہلے قاضی اور بعد کو مفتی ہوئے۔ تصوف و فلسفہ میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ان کے بیٹے قاضی کمال الحق شاعری میں ناصر علی کے پیرو تھے۔ ان کا کلیات ان کے دوران حیات میں ضائع ہوگیا، مختصر دیوان باقی ہے۔ ان کے بیٹے جوانی میں مرگئے۔ پوتے قاضی اکرام الحق سید احمد بریلوی کے مرید یا محض معتقد تھے۔ ان کی شادی قاضی امام بخش (خلف قضا خاندان قاضی شہر پٹنہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں قاضی اکرام الحق تو زندہ نہ تھے لیکن ان کے چھوٹے بھائی واعظ الحق بقید حیات تھے اور یہ ان چند علما میں سے ایک تھے جو شورش کے زمانہ میں نظر بند کیے گئے تھے۔ قاضی اسمٰعیل قاضی اکرام الحق کے بیٹے، خاندانی روایت کے بموجب اس وقت متولد ہوئے جب سید احمد بریلوی وارد پٹنہ تھے اور باپ نے مقدم الذکر کے کہنے سے بیٹے کا نام ان کے مشہور مرید شاہ اسمٰعیل دہلوی کے نام پر رکھا تھا۔ یہ بات ان کے عقائد پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوئی اور وہ حنفی مذہب ہوئے۔ یقین ہے کہ وہ بہت سے امور کے مرتکب ہوئے ہوں جو شاہ صاحب کے نزدیک بدعات شنیعہ میں محسوب ہوتے تھے۔ قاضی محمد اسمٰعیل اردو فارسی کے شاعر تھے اور ان کا کلام موجود ہے۔ نثر فارسی میں بھی ان کی کتابیں تھیں جن میں سے کچھ اب تک محفوظ ہیں۔ یہ پہلے قاضی اور بعد کو منصف ہوئے تھے۔

ان کے بیٹے قاضی عبدالحمید میرے دادا تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے لگاؤ تو تھا مگر یہ بات میرے علم میں نہیں کہ انھوں نے خود بھی شعر کہا ہو۔ انوار عالم تخلص بہ شاد عظیم آبادی[4] کے شاگرد وحید نے اپنی زندگی کے آخری چند سال انھیں کے ساتھ گزارے۔ ایک خط جو شاد نے قاضی عبدالحمید

---

[1] مشہور صوفی مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری ان کے اخلاف میں تھے۔

[2] اس جگہ بہت پرانے بزرگوں سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

[3] اس کا ذکر تاریخی کتابوں میں ہے۔

[4] اب تو شاد سے بہت کم لوگ واقف ہیں لیکن اپنے دوران حیات میں یہ صوبہ بہار میں خاصی شہرت رکھتے تھے اور یہاں ان کے بہت سے تلامذہ تھے جن میں سے ایک نشتر عظیم آبادی تھے جو قاضی عبدالحمید کے یہاں نوکر تھے اور ۱۹۲۲ء میں فوت ہوئے۔ شاد کا یہ مطلع میرے لڑکپن میں پٹنہ میں بچوں کی زبان پر تھا:

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں
جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

ان کا کلام حسب قول نشتر ان کی وصیت کے مطابق ضائع کردیا گیا۔ ایک نظم گریۂ فراق ان کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھی، میں نے اسے لڑکپن میں دیکھا تھا، خبر نہیں کہ کوئی نسخہ اب کہیں موجود ہے یا نہیں۔ بدیع الدین احمد علی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں شاد کو غالب کا شاگرد لکھا تھا۔ میں نے نشتر مرحوم کی زبانی ان کے بہت سے حالات سنے تھے لیکن انھوں نے کبھی تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا۔ جن پرانے گلدستوں میں شاد کی غزلیں ملتی ہیں، ان میں بھی ان کے ساتھ شاگرد غالب مرقوم نہیں۔ میری رائے میں مرحوم کو اس کے متعلق غلط اطلاع ملی تھی۔

کے نام بھی تھا۔ شاید نثر کا اچھا نمونہ سمجھ کر اسی زمانے میں چھپوا دیا گیا تھا۔[۱]

میرے والد قاضی عبدالوحید نے عربی کی تکمیل کر لی تھی اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں تعلیم پا رہے تھے کہ ان کے خیالات میں انقلاب آیا اور انھوں نے انگریزی کا پڑھنا چھوڑ دیا۔ قاضی رضا حسین[۲] کے مشورے سے میرے دادا میرے والد کو تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ وہ عقائد میں احمد رضا خانی ہو گئے تھے اور یقین کامل رکھتے تھے کہ تہتر فرقوں میں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں صرف ایک ناجی ہے اور وہ فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔ انھوں نے ندوۃ العلماء کی سخت مخالفت کی اور جس زمانے میں اس کا ایک سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا تھا، انھوں نے ایک شاندار جلسہ کیا تھا جس میں ان کے ہم عقیدہ علماء بشمول احمد رضا خاں بریلوی شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لیے ایک ماہانہ رسالہ تحفۂ حنفیہ نکالا تھا جو ان کی وفات کے سال دو سال بعد تک جاری رہا۔ ان کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ بھی تھا، جس کے لیے قاضی عبدالمجید کی خالہ اہلیہ شیخ احمد اللہ نے کچھ جائداد بھی وقف کر دی تھی۔ ان صاحب نے جو اس کے متولی تھے، میرے والد کی وفات پر مدرسے کو جاری رکھنے کا بڑی شد و مد سے وعدہ کیا تھا مگر بہت جلد اسے بند کر دیا اور مدرسے کے کتب خانے کی جو کتابیں تھیں وہ سب بریلی بھیج دیں۔ قاضی عبدالوحید نے اپنے ابتدائی زمانے میں شاعری بھی کی تھی اور وحید[۳] الہ آبادی کی صحبت پائی تھی۔ ان کا اردو کلام گلدستوں میں ملتا ہے اور ان کے کچھ عربی اشعار بھی بعض اصحاب کے پاس ہیں۔ ان کی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ باقر شاگرد وحید الہ آبادی نے "مغفور" سے تاریخ نکالی تھی۔

مجھے اپنی پیدائش کا صحیح سنہ معلوم نہیں لیکن ۱۹۰۹ء سے دو تین سال پیشتر ہو گا۔[۴] میری تعلیم پرانے طور پر ہوئی اور میں نے قبل اس کے کہ انگریزی شروع کروں، قرآن حفظ کر کے صرف و نحو عربی کی تکمیل کر لی تھی اور منطق قدیم کے متوسطات پڑھ لیے تھے۔[۵] تھوڑے دن گھر پر انگریزی پڑھنے کے بعد میرا داخلہ پٹنہ کے محمڈن اسکول میں ہوا مگر میں جلد ہی علی گڑھ چلا گیا اور وہاں اسکول میں داخل ہوا۔ اس اسکول میں سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں رہا اور میں مسٹر سید حسن بلگرامی[۶] کے ساتھ ان کے قائم کردہ بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں رہنے لگا۔ اس کالج میں لڑکے جونیر اور سینیر کیمبرج کے

---

[۱] میں نے چند سال قبل اسے ایک اصل نمائش میں دیکھا تھا۔

[۲] یہ میرے دادا کے ماموں کے بیٹے تھے مگر ان کی نانہال (دختر قاضی اسد علی) کے بطن سے نہ تھے۔ مسلمانانِ صوبہ بہار میں انگریزی تعلیم کی ترویج میں ان کا بڑا حصہ تھا اور سر سید کے احباب میں تھے۔ ان کے حالات میں ایک رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

[۳] وحید الہ آبادی کے تلامذہ پٹنہ میں بہت تھے جن میں سے ایک شاہ مبارک حسین مبارک تھے۔ وحید جہاں تک میں نے سنا ہے پٹنہ میں انھیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ میری دادی کے ماموں کے بیٹے تھے اور میرے دادا وحید سے انھیں کے یہاں ملا کرتے ہوں گے۔ ان کے بعض اخلاف میں بھی شعر گوئی کا شوق باقی ہے۔ ان میں سے ایک شاہ محمد حسن جمیل شاگرد شاد ہیں۔ مبارک کا مختصر کلام شائع ہو گیا۔ ایک غزل میری نظر سے گزری ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

وہ جو اس جیبِ خسروی میں نہیں
لاکھ ساماں ہیں دل کسی میں نہیں

[۴] پرانے کاغذات جن میں یہ درج ہو گا، ضائع ہو گئے۔

[۵] مطابق درس نظامی۔

[۶] نواب عماد الملک کے سوتیلے اور سید علی بلگرامی کے حقیقی بھائی تھے۔ آئی ایم ایس میں تھے اور جیا کو رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر توجہ (بقیہ

امتحان کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ ییس نام کا ایک شخص صدر مدرس تھا۔ دو گھنٹوں کے لیے علی گڑھ کے استاد انگریزی انعام اللہ خاں بھی آیا کرتے تھے اور کچھ دن (ڈاکٹر) عمر حیات ملک بطور معلم ریاضیات رہے تھے۔ ییس لاطینی اور انگریزی پڑھاتے تھے اور میجر سید حسن بلگرامی ان طلبہ کو جو فرانسیسی اور جرمن سیکھنا چاہتے تھے، ان زبانوں کا درس دیتے تھے۔ اس کالج کے بیشتر طلبہ تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہتے تھے اور رہنا سہنا کھانا پینا انگریزی طور پر تھا۔ صبح کی چائے بہت سویرے لیمپ کی روشنی میں پی جاتی تھی اور میجر صاحب بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہی حال دوپہر اور شب کے کھانے اور تیسرے پہر کی چائے کا تھا۔ شب کے کھانے کے بعد وہ دیر تک ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ زیادہ تر وہی بولتے۔ لیکن ہم لوگ آزادانہ گفتگو کے مجاز تھے۔

میں بلگرامی میموریل کالج میں سینیئر کیمبرج کے امتحان کے لیے تیاری کر رہا تھا اور شیکسپیر کی ایک تمثیل وینس کا سوداگر درس میں تھی۔ میجر صاحب کو خیال آیا کہ اس کا ڈراما سٹیج کرایا جائے اور اس کے لیے طلبہ کو وہ خود ہدایات دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً پوری تمثیل مجھے حفظ ہو گئی تھی۔ ڈراما سٹیج کرنے جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں مگر کسی وجہ سے جو مجھے یاد نہیں رہی، ان کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ اس زمانے میں جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور مجھے اخبار بینی کا اس قدر شوق تھا کہ علی گڑھ کالج یونین میں جا کر کئی اخباروں کا روزانہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جنگ کی خبروں سے سب کو بڑی دلچسپی تھی اور شاید ہی کوئی شخص ہو جسے ترکوں سے ہمدردی نہ ہو۔ میجر صاحب اپنی زبان سے کوئی بات نہیں نکالتے تھے جو انگریزوں کے خلاف ہو۔ لیکن ترکوں کی فتح کسی معرکے میں اگر ہوتی تو اس کا ذکر اس طرح کرتے کہ ان کے مافی الضمیر کے متعلق کسی کو کچھ شبہ نہ رہتا۔

میں نے اس کالج میں رہ کر انگریزی ادب کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس زمانے میں تھیکرے[1] اور مس جین آسٹن کے ناولوں کو بہت پسند کیا کرتا تھا اور ڈکنس کسی طرح میرے مستحسنین میں نہ تھا۔ وہاں میں نے لاطینی پڑھنی شروع کی تھی اور کچھ اس میں آگے بھی بڑھا تھا۔ لیکن جو کچھ پڑھا تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بھول گیا اور میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ میں اس زبان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۶) کے ساتھ ہے۔ کسی وجہ سے جو انھوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں بتائی مستعفی ہو کر وہ مدتوں انگلستان میں رہے تھے۔ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں وہ انگلستان سے واپس آگئے اور علی گڑھ میں مقیم ہوئے۔ مغربی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور کسی قدر ہسپانی جانتے تھے۔ میں نے خود ان کی زبان سے سنا تھا کہ انھوں نے خود اپنے سفر اسپین کے حالات قلمبند کیے تھے۔ یہ کیا ہوئے، اس کی مجھے خبر نہیں۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے اور ان کا انگریزی خطبۂ صدارت چھپا ہوا موجود ہے۔ اردو میں میں نے ان کا ایک مضمون دیکھا تھا، جو محمد علی کے اخبار ہمدرد میں چھپا تھا۔ ان کا قلب کمزور تھا اور وہ لکھنؤ میں سر علی امام کے مہمان تھے کہ یکایک ان کی وفات ہو گئی (۱۹۱۵ء) وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو یقین ہے کہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری ہو جاتے۔ وہ مرزا غالب کے بڑے مداح تھے اور کبھی کبھی ان کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ میں نے ان کی زبان سے وہ قطعہ بھی سنا تھا جو نواب عماد الملک کی سند پر دیوان غالب کے بعض جدید نسخوں میں درج ہوا ہے۔

[1] میں نے لڑکپن میں داستان امیر حمزہ کے بہت سے مجلدات دیکھے تھے۔ اس کے بعد شرر کے جو ناول نظر سے گزرے تو یہ سمجھ میں آیا کہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ انگریزی ناولوں کے مطالعہ سے یہ شبہ گزرنے لگا کہ شرر کے ناول 'ناول' کہے جانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۸)

سے واقف ہوں۔[1]

ہیجر صاحب کی وفات کے بعد ان کے قائم کردہ کالج کو جاری رکھنے کا وعدہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم نے ماتمی جلسے میں کیا تھا لیکن اس کی کوئی صورت نہ نکلی اور میں پٹنہ واپس آ کر پرائیویٹ کے طور پر کلکتہ یونیورسٹی کے میٹرکولیشن کے لیے تیاری کرنے لگا اور اس کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ جنگ جاری تھی۔ انگلستان جانا جس کا سینئر میں کامیابی کے بعد ارادہ تھا، خارج از بحث تھا۔ میں پٹنہ کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے چار برس میں بی اے ہوا۔

والد کی وفات کے چند سال بعد میں آزادانہ طور پر کتابوں کا مطالعہ کر سکتا تھا۔ میں نے سید احمد خاں اور شبلی کے مذہبی تصانیف دیکھے اور اس سے صرف یہی نہیں کہ وہ عقائد جو کچھ ترکے میں ملے تھے یا باطل نظر آئے، خود ان اصحاب کے پیش کردہ دلائل کمزور نظر آنے لگے۔ میرے ذوق شعری کی تربیت میں حسرت موہانی اور شبلی کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے۔ شعرائے اردو[2] سے دلچسپی تو یقیناً بڑی حد تک اردوئے معلیٰ کے قدیم مجلدات کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے میں اس زمانے کا پکا کانگرسی تھا اور مسلمانوں میں مظہر الحق، ابو الکلام اور محمد علی کے معتقدین میں سے تھا۔ الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ اب تک یاد ہے۔ میں ابو الکلام کے علمی تبحر، وسعت معلومات اور انشا پردازی کا بھی بہت مداح تھا۔[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۷) ٹھیکرے کی جو قدر پہلے تھی۔ اب میری نظر میں نہیں مگر ابھی حال میں جین آسٹن کی بعض کتابیں جو پڑھیں تو اس کے متعلق تبدیلیٔ رائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

[1] ڈاکٹر مختار الدین احمد کا جو مضمون میرے متعلق نقوش میں شائع ہوا تھا، اس میں بہت سی غلط باتیں درج ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں لاطینی سے واقف ہوں۔ میں نے اگر ان سے اس بارے میں کچھ کہا ہو گا تو وہی جو اس مضمون میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے موصوف کا مضمون دیکھ کے انھیں اور مدیر نقوش کو بہت سی باتوں کی تردید لکھ بھیجی تھی مگر یہ شائع نہ ہوئی۔ اس وقت ان کا مضمون پیش نظر نہیں اور اس کا وقت بھی نہیں کہ ان کے کل اغلاط کی تصحیح کی جائے۔

[2] میں شاعر ہرگز نہیں لیکن موزوں طبع ضرور ہوں۔ لڑکپن میں بہت سے مصرعے موزوں کیے۔ پہلا مکمل شعر جو میں نے بیت بازی کے سلسلے میں شاید بارہ برس کی عمر میں کہا یہ تھا ؎

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جو اشعار اپنے مضمون میں میری طرف منسوب کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ فارسی اشعار کا ترجمہ ہیں۔ یہ بات نہ جانے کیوں انھوں نے نہیں لکھی۔

[3] ابو الکلام کا تذکرہ شائع ہوا اور میری نظر سے گزرا تو میں یہ سمجھا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر اردو کو ناز ہو سکتا ہے۔ حال میں اسے پھر پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ باتوں کو ناحق طول دیا ہے اور خواہ مخواہ ثقیل عربی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کتاب کی علت غائی اس کے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۰۱۹)

میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس دہلی میں محض تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں تھے جنھوں نے اپنے شعبے میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے ؎

ایں استر لگد زنی بابا از آن من — ویں گربۂ مصاحب بابا از آن تو
از صحن خانہ تا لب بام از آن من — وز سقف خانہ تا بہ ثریا از آن تو

پنڈت مدن موہن مالوی اجلاس کے صدر تھے اور ان کا خطبۂ صدارت انگریزی میں تھا۔ اس اجلاس میں مسلمان معمول سے بہت زیادہ شریک ہوئے تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزی کم جانتے تھے یا اس سے بالکل ناواقف تھے۔ پنڈت جی کو کل تجاویز کا جو اصلاً انگریزی میں تھیں، ترجمہ کرنا پڑتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ترجمے کی زبان کو اردو کہا تھا[۲]۔ اگر میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو مسز اینی بیسنٹ اس اجلاس میں شریک تھیں اور انھوں نے تقریر بھی کی تھی۔ اگر دہلی میں نہیں تو کسی اور جگہ میں نے ان کی تقریر سنی تھی اور میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر انگریزی کا مقرر ان کے معاصرین میں نہ تھا۔ بیگم حسرت موہانی بھی بے پردہ اس اجلاس میں شریک تھیں اور انھوں نے تقریر کرنی چاہی مگر رعب غالب آگیا۔ یا تو کچھ نہ بول سکیں یا ایک آدھ جملہ بول کر رہ گئیں۔ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے یہاں مقیم تھا اور محمد علی کے خاص الخاص معتقدین (شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ) بھی انھیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کانگرس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی ہوا تھا۔ ان لوگوں سے سنا کہ سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں جناح اور معتقدین محمد علی میں شدید اختلافات رونما ہوئے تھے اور بعد کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے مکان میں اس کے متعلق گفتگو ہوئی اور عبدالرحمٰن صدیقی نے ڈاکٹر انصاری پر یہ اعتراض کیا کہ ان کی خاموشی سے نقصان پہنچا اور اس خاموشی کو مجرمانہ قرار دیا تو ڈاکٹر انصاری اس پر بہت خفا ہوئے تھے اور اٹھ کر چلے گئے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کانگرس کی سبجکٹس کمیٹی کی ممبری کے امیدوار آصف علی بھی تھے اور وہ ناکام رہے تھے۔ اس پر معتقدین نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وجہ یہ کہ ان لوگوں کے علم کے مطابق محمد علی کی نظربندی کا ایک بڑا سبب آصف علی تھے۔

بی اے میں کامیاب ہوتے ہی خلافت کمیٹی نے ترک موالات کے متعلق تجاویز منظور کیں اور میری تعلیم کا سلسلہ اس وقت ختم ہوگیا۔ کانگرس کے لیڈروں میں اس کے متعلق شدید اختلافات تھے۔ اس پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک خاص اجلاس بصدارت لالہ لاجپت رائے کلکتہ میں منعقد ہوا۔ میں اس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور اس اجلاس نے ترک موالات کو بھی بڑی کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱۸) سوا کچھ نہیں کہ اپنے کو بہتر وقت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ انسان اس قدر بدل جاتا ہے کہ خود اپنی پرانی تحریریں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا واقعی میری ہی ہیں۔ دو تین سال قبل کی بات ہے کہ بیدار صاحب نے اپنا ایک مضمون مجھے دکھایا جس میں میرے دو خط شامل تھے جو کسی رسالے کے ایڈیٹر کو لکھے گئے تھے۔ ان کے پاس ثبوت موجود نہ ہوتا تو میں ہرگز یاد نہ کرتا کہ یہ میرے قلم سے نکلے تھے۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ شاید ۱۹۱۷ء میں میں نے ایک کہانی لکھی تھی جو خالص رومانی تھی اور جس کے اسلوب میں پریم چند کا اثر نمایاں تھا۔ وہ پرچہ جس میں یہ شائع ہوئی میرے پاس موجود نہیں۔

[۱] ممکن ہے کہ متن کا املا صحیح نہ ہو۔

[۲] مجھے اس کا علم نہیں کہ پنڈت جی کا یہ قول اخباروں میں یا کانگرس کے سالانہ جلسے کی باضابطہ روداد میں شائع ہوا یا نہیں۔

رائے سے[1] منظور کیا لیکن کئی بڑے لیڈروں کی مخالفت برقرار رہی اور اس کا اندیشہ تھا کہ ناگپور کے اجلاس میں یہ لوگ ترک موالات کے خلاف تجویز منظور کرانے کی کوشش بلیغ کریں گے۔ مسلم نوجوان جو کانگرس میں شریک ہوئے تھے، اس چکر میں لگے ہوئے تھے کہ پراونشل کانگرس کمیٹی کو اعتدال پسندوں کے قبضے سے نکالا جائے اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بہاری ممبر ایسے اصحاب منتخب ہوں جو ترک موالات کے حامی ہیں[2]۔ ان لوگوں نے ممبر بنانے شروع کئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سچدانند سنہا صدر اور چندر بنسی سہائے (بیرسٹر) پراونشل کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ ان لوگوں کو وہم بھی نہ تھا کہ ان نوجوانوں کی کیا نیت ہے۔ جب جلسہ ہونے لگا تو ان لوگوں نے امیدواروں کی ایک فہرست بنائی اور اس کی ایک ایک نقل پارٹی کے ہر ممبر کے حوالے کر دی گئی۔ کچھ اور نقلیں بھی تھیں جو عین جلسے میں انتخاب سے پیشتر ان اصحاب کو دی گئیں جو ہمارے ہم خیال تو ضرور تھے لیکن ہماری پارٹی میں شامل نہ تھے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے اس فہرست میں صرف اس حد تک ترمیم کی کہ فہرست کے بعض امیدواروں کے نام نکال کر خود اپنے نام رکھے لیکن بڑی حد تک ہماری فہرست کے مطابق ووٹ دیئے۔ نتیجہ اعتدال پسندوں کے نقطۂ نظر سے بڑا حیرت انگیز اور اذیت بخش تھا۔ ان میں کا ایک آدمی بھی منتخب نہ ہوا تھا اور ہماری فہرست کا ایک ایک آدمی کامیاب ہو گیا تھا[3]۔ اس پر اعتدال پسند اخباروں میں برہمی کا اظہار بھی کیا گیا۔ لیکن اس سے اب حاصل ہی کیا تھا۔

میں ناگپور کانگرس میں بھی شریک ہوا۔ خبر تھی کہ سی آر داس کی پوری جماعت ترک موالات کی مخالفت کرے گی اور بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں کے بھی بہت سے ڈیلی گیٹ ان کے ساتھ تھے لیکن گاندھی جی نے سی آر داس کو رام کر لیا اور وہ اس تحریک کے حامی ہو گئے۔ جناح نے مخالفت میں تقریر کی۔ گاندھی جی کا نام آیا تو انھوں نے مسٹر گاندھی کہا۔ اس پر بڑا شور مچا کہ مہاتما گاندھی کہیں۔ انھوں نے اس مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور کہا "اول رائٹ مہاتما گاندھی"۔ محمد علی کو انھوں نے مسٹر محمد علی کہا تو اس پر بھی بڑا ہنگامہ ہوا۔ لیکن اس بار وہ اڑے رہے اور صدر جلسہ کی استدعا پر لوگ خاموش ہو گئے۔ کانڈر رو جو اس اجلاس میں شریک تھے اور انھوں نے ترک موالات کی مخالفت کی تھی اور جناح کے متعلق کہا تھا کہ "یہی ازاے میں فرمائی گئی[4]"۔ ترک موالات سے متعلق تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں میری شادی شاہ رشید اللہ صاحب (متوفی سنہ ۱۹۶۲ء) کی بیٹی سے ہوئی۔ وہ پٹنہ کے سربرآوردہ وکلا میں تھے اور اصل وطن ان کا غازی پور تھا۔

مارچ سنہ ۱۹۲۳ء میں میں انگلستان گیا۔ وہاں مڈل ٹیمپل میں داخلے کے بعد کئی مہینوں کے لیے جرمنی گیا۔ وہاں مارک کی شرح تبادلہ [illegible] ہونے کی وجہ سے لوگوں کا بہت برا حال تھا۔ بیرونی لوگ بھی جو اس زمانے میں وہاں مقیم تھے کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہوئے تھے۔

---

[1] وجاہت سنہا نے اپنی آخری تقریر میں ترک موالات کی بڑی مخالفت کی تھی اور مسلمانوں کی کثرت کے ساتھ شرکت کو ناپسند کیا تھا۔

[2] اس زمانے میں کانگرس کے قواعد آج کل کے قواعد سے بالکل مختلف تھے جو بات اس زمانے میں آسانی ممکن تھی اب سخت مشکل ہے۔

[3] ابوالکلام کا نام ہماری فہرست میں تھا۔ اس سے قبل وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبر نہ تھے۔

[4] یہ گھڑ دوڑ سے لگاؤ رکھنے والوں کا محاورہ ہے۔

میرے ایک دوست جو آئی سی ایس کے لیے نامزد ہو چکے تھے اور آکسفورڈ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جلد ہی ہندوستان جانے والے تھے، برلن میں مجھے ملے۔ کہنے لگے کہ میں وینا جا رہا ہوں۔ کوئی ساتھی نہیں۔ تم چلو۔ میں نے جواب دیا کہ اگر تین چار دن انتظار کرو تو میں تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ٹکٹ خرید چکا ہوں اور شلاف واگن[1] میں جگہ مخصوص کرا چکا ہوں۔ میں انھیں ساتھ لے کے ٹریول بیورو جس کے ذریعے سے انھوں نے ٹکٹ خریدا تھا، گیا۔ یہ دریافت کیا کہ اگر ٹکٹ واپس کیا گیا تو کیا تاوان دینا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ پچاس ساٹھ کروڑ مارک دینے ہوں گے۔ میں اپنے دوست سے لاکھ کہتا رہا کہ پچاس ساٹھ کروڑ مارک چھ پنس سے زیادہ نہیں ہوتے مگر وہ تاوان ادا کرنے پر راضی نہ ہوئے اور تنہا روانہ ہوئے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے اور چھ پنس کا سکہ سڑک پر گر پڑتا تو شاید اٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے۔

میں نے دوران قیام جرمنی میں گوٹنگن کی ڈاکٹر روز برگ سے جرمن سیکھی مگر اب بہت سے الفاظ بھول گیا ہوں اور متوسط درجے کی کتاب سمجھنے کے لیے بھی مجھے لغت کی ضرورت پڑے گی۔

انگلستان واپس ہونے کے بعد میرا کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ ہوا اور میں نے اکنومکس ٹرائی پوس[2] لیا۔ میں آخری امتحان میں شریک ہونے والا ہی تھا کہ بیمار پڑ گیا اور مجھے انگلستان ہی کے ایک سینیٹوریم میں جانا پڑا۔ وہاں چھ ماہ قیام کے بعد میں سوئزرلینڈ گیا اور مونٹانا کے استفانو سینیٹوریم میں جہاں مسز جواہر لال نہرو بھی تھیں، داخل ہوا۔ وہاں پانچ چھ ماہ قیام کے بعد تندرست ہو کر کیمبرج واپس آیا اور امتحان میں شریک ہوا۔ کامیابی کے بعد لندن گیا لیکن بعض اوقات وقت پر کسی کام کا انجام دینا بغیر اس کے کہ کوئی خاص بات مانع ہو، میرے لیے ناممکن ہوتا ہے اور بار کے امتحانات سے فارغ ہونے میں بلا سبب بڑی دیر ہوئی اور میں مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس آیا۔

یہاں بیرسٹری سے میرا برائے نام تعلق رہا اور میرا زیادہ وقت ادبیات اردو کے مطالعہ میں صرف ہوتا رہا[4]۔ بعد کو ادبیات فارسی کے باقاعدہ مطالعے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں میں نے ایک ماہنامہ بنام معیار نکالا لیکن میری صحت سخت خراب ہو گئی اور یہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔

ادھر چند سال ہوئے میں نے ادارۂ تحقیقات اردو قائم کیا ہے جس کی طرف سے کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔ اس ادارے نے ایک تجویز غالب کے کل تصانیف کے صد سالہ اڈیشن کے متعلق جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے تیار کی تھی جسے حکومت بہار نے منظور کر لیا ہے اور جس کے لیے معتد بہ رقم ادارے کو عطا بھی کی ہے۔ حکومت بہار نے اسے حکومت ہند کے پاس اس استدعا کے ساتھ بھیجا ہے کہ وہ اس کے اخراجات میں شریک ہو۔ حکومت ہند نے ابھی اس کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ پہلی جلد جو قاطع برہان و رسائل پر مشتمل ہے، زیر طبع ہے[5]۔

---

[1] سونے کی گاڑی۔ [2] ٹرائی پوس کے دوسرے حصے میں اکنومکس اور پولیٹکس خاص اکنومکس نہیں۔

[3] میں فرانسیسی پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔ مونٹانا جس علاقے میں ہے وہاں کی زبان یہی تھی۔ یہاں فرانسیسی ادب کی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزریں۔

[4] انگلستان میں میں نے جدید انگریزی ادب کا کسی حد تک مطالعہ کیا اور اس ادب اور جدید نفسیات سے متاثر ہوا۔

[5] یہ مضمون طفیل صاحب کے اصرار پر لکھا گیا ہے اور میں نے اپنے دستور کے خلاف اسے قلم برداشتہ لکھا ہے۔ بہت سی ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ غیر ضروری داخل بھی ہو گئی ہوں۔ ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

آج ایک لطیف اور نازک کسک کے ساتھ کئی روز سے مجھے رومی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔ کسی زمانے میں مجھے اس مثنوی کے جس کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے، بیشتر حصے پورے کے پورے یاد تھے۔ اس وقت بھی جی چاہتا ہے کہ آگے کے شعر پڑھتا چلا جاؤں لیکن فی الحال میرا مطلب اسی شعر سے ادا ہو رہا ہے۔ اس تحریر کے پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ زبردستی کی کھینچ تان کیسی؟ رومی کی مثنوی جس کو بانسری کا الم نامہ THE TRAGEDY OF THE REED کہا گیا ہے تمثیلی کلام ہے جس کا موضوع حقیقت اور عرفانِ حقیقت ہے۔ روحانیت کے رموز و نکات کو مادی دنیا کے عارضی اور کثیف معاملات و مسائل سے تعبیر کرنا اور عالمِ بقا کے حقائق و معارف کو اس دارِ فنا کے حالات و حوادث پر منطبق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ اعتراض ایک خاص مقام اور ایک خاص زاویۂ نگاہ سے درست و بجا ہوگا۔ لیکن اور ایک بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ شاعری کی رمزیت کو بہت جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہیے اور عظیم المرتبت اور جلیل القدر شاعری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلاغت دراصل اسی کا نام ہے۔

عام طور سے حقیقت کے اسرار مجاز کے پردے میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ مادی اور جسمانی زندگی کے استعارات میں روحانی تجربات و واردات بیان کرنے کا دستور بہت عام ہے۔ خسرو و جامی، سعدی اور حافظ وغیرہ کے سادہ اور معمولی سے معمولی اشعار کی جب تک عارفانہ تاویل کر کے ان میں تصوف کا مفہوم نہ پیدا کیا جائے ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ چاہے خود شاعر نے شعر کہتے وقت شعوری طور پر اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا ہو۔ میرا میلانِ طبع اور میری عادتِ فکر اس کے برعکس رہی ہے۔ عالمِ صوری کی رنگینیوں میں ایک "جلوۂ بے رنگ" دیکھنا ایک بہت پرانی رسم ہے۔ میں ہمیشہ عالمِ حقیقت کی بے رنگی و یک رنگی میں عالمِ مجاز کی جملہ رنگینیاں تلاش کرتا رہا۔ بڑے سے بڑے عارفانہ بصیرت رکھنے والے شاعر کے نازک سے نازک شعر میں مجھے اس وقت لذت نہیں ملی جب تک کہ وہ ہمارے مادی وجود کے عادات اور روز مرہ تجربات پر بھی محیط نہ ہو اور ان پر بھی صادق نہ آتا ہو۔ شعر کی زبان سادہ سے سادہ ہوتے ہوئے بھی استعاری ہوتی ہے یعنی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک ایک ہی انداز کے متعدد تجربات و مواقع پر صادق آ سکے اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں بہترین اشعار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی اصل عظمت یہی ہے۔ مثال کے طور پر رومی کا یہی شعر لیجیے جس کو میں لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتا۔ حالانکہ اس وقت مجھے یہ سوچنا اور بتانا ہے کہ میرا اصلی وطن کہاں ہے۔

گزشتہ تیس سال کے اندر مجھ سے دنیا نے کتنی بار پوچھا جا چکا ہے کہ اپنے قلمی نام کے آگے گورکھپوری کیوں لکھتا ہوں۔ پوچھنے

والوں میں زیادہ تعداد بستی کے لوگوں کی ہے۔ میں نے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ پہلو بچایا۔ جن دنوں میں رسالہ "ایوان" نکلتا تھا اور فرصت اور ذہنی اطمینان کی فراوانی تھی اور میں تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس سوال کو ٹالتا ہی رہا۔ لیکن ابھی دو چار روز ہوئے میرے دیرینہ مہربان جناب نرما شنکر ناشاد نے جو گنگیریا انٹر کالج بستی میں معلم ہیں، مجھ سے کچھ اس طرح دریافت کیا ہے کہ آج میں اس سوال کا جواب دے کر سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں جس سے آج تک گریز کرتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل سوال کی طرف رجوع کروں ایک اور بات قابل ذکر ہے جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ذرا زمانہ میں اُلٹے پاؤں چلیے اور اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے کے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن واقعہ کی روداد سنیے۔ ابھی "جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن" بھی اچھی طرح نہیں آئے تھے یعنی پندرہ سولہ برس کا ہی سن تھا لیکن شعر و سخن کا حوصلہ نشہ کی طرح عروج پر تھا اور ساری ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اور اُردو اشعار اس طرح یاد تھے کہ انھیں کی سانسیں لیتا تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی دھن میں رات دن کھویا رہتا تھا۔ فارسی یا اُردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی مشہور سے مشہور اور مشکل سے مشکل غزل پر میں نے دو چار شعر نہ کہے ہوں۔ اکثر اساتذہ کے مصرعوں پر بھی خود اپنے مصرعے لگا لیتا تھا۔ خود اپنے مطالب ادا کرنے کے لیے تخلیقی اُپج کی کمی ہر لمحے مجھے بے چین رکھتی تھی اور میں اس بے چینی میں عجیب لذت محسوس کرتا تھا۔ غرض کہ عجب سرشاری اور مدہوشی کا زمانہ تھا۔

شعر کہنے کے لیے ایک عام اور دیرینہ رسم تخلص رکھنا بھی ہے۔ میں اپنے کو اس رسم کی پابندی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا۔ دوسروں نے بھی سمجھایا کہ جب سرسید جیسے نثری مزاج رکھنے والے نے اپنے لیے "آہی" کا تخلص ضروری سمجھا جب نیتا جاگ بٹولوی جیسے غیر شاعر نے اپنے لیے ایسا غیر شاعرانہ تخلص اس طرح رکھ دیا کہ آج اُن کا اصل نام کسی کو یاد بھی نہیں اور جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا ایک شعر بھی حافظہ میں رہ جانے کی قابلیت نہیں رکھتا، بغیر تخلص کے نباہ نہ سکے تو پھر میں کس شمار قطار میں ہوں۔ میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی تخلص ضروری ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا تخلص ہو۔ میرا مطالعہ اس وقت بڑا وسیع تھا۔ اور جو تخلص ذہن میں آتا تھا، اس تخلص کے کم سے کم نصف درجن شاعر گزر چکے ہیں۔ آخر کار میں نے ایک روز جھنجلا کر کہا کہ میں ایسا تخلص رکھوں گا جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ رکھا ہو اور جس کو آئندہ رکھتے ہوئے ہر شخص ہچکچائے یعنی 'مجنوں'۔ یہ غالباً ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب کہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے تو جھنجلاہٹ میں یہ کہا تھا اور شاید یہ بات رفت و گزشت ہو جاتی اور میں کوئی تخلص نہ رکھتا لیکن میرے ایک بچپن کے عزیز اور دوست تھے جو میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور جو ابھی حال ہی میں کلکٹری سے پنشن لے کر گھر بیٹھے تھے، ان کا نام احمد حسن ہے اور وہ مشہور انشا پرداز مہدی حسن افادی الاقتصادی کے بیٹے ہیں۔ وہ یہ تخلص لے اُڑے اور مجھے اس شہر میں احباب کے حلقے میں اسی نام سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ قلمی نام اختیار کر لیا اور اسی نام سے شعر کہنے لگا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد معلوم ہوا کہ مجھ سے سیکڑوں برس پہلے فارسی میں ایک مجنوں مشہدی گزر چکے ہیں جو غالباً جامی کے ہمعصر تھے اور جو اتنے برگزیدہ اور قابل احترام تھے کہ تذکرہ نگار ان کے نام کے ساتھ 'مولانا' کا اضافہ کرنا ادب کی رُو سے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر مجھے اس وقت بھی یاد آ رہا ہے خوب ہے ؎

بر وادیِ عدم زار زار می گریم
بدین بہانہ ز ہجران یار می گریم

اسی زمانے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اُردو میں بھی ایک مجنوں گزر چکے ہیں اور میر تقی میر کے شاگردوں میں تھے اور اتنے شعر کہتے تھے کہ میر جیسے بے دماغ نے اُن کو اپنی شاگردی میں لے لینا مناسب سمجھا۔ یہ مجنوں عظیم آبادی تھے۔

میر حسن کو میر ضیاء کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ان کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے ؎

دن میں سو سو بار اس کے روبرو جانا مجھے
اس پہ سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات اپنے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دُنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا۔ ایک تسکین یہ تھی کہ چلو میرے سوا بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس تخلص کا کوئی اور شخص گذر چکا ہے مگر یہ تسکین بھی نہیں رہی۔ میرے بعد ایک لکھنوی حضرت کو بھی شوق ہوا کہ وہ اپنے کو اس تخلص سے رسوا کریں۔ میں ان کی ہمت اور توفیق کی داد دیتا ہوں۔

مجنوں تو میں ضرور ہوا لیکن یقین مانئے کسی مقامی نسبت کا خیال دُور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا۔ میں اپنے کو اس زمانہ میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب کہ انسان کی نظر بلند ہوتی ہے اور اس کے فکر و احساس میں کائنات کی سمائی ہوتی ہے۔ میری تخئیل بے حد وسیع اور ہمہ گیر تھی اور میں اپنے تخئیل کے نشے میں چور تھا۔ اور مصلحت اندیشی اور مصالحت کوشی کا عنصر ابھی زندگی میں پیدا نہ تھا۔ اس زمانہ میں واقعی

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

اور "فضا کے پیچ و خم" میں خاک کر رہ جانے کا دھندلے سے دھندلا اندیشہ نہیں تھا۔ بڑے حوصلہ اور بڑے نشاط کے ساتھ محسوس کیا کرتا تھا اور بڑے زعم کے ساتھ دعویٰ تھا کہ ؎

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جب پہلے پہل میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تو میں اپنا تخلص رکھ چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کہیں سے وہ پھر مجھے پکار کر اپنا سراغ دے رہی ہے۔ پھر ایسا آدمی جو صدقِ دل سے اپنے کو مردِ آفاقی سمجھ رہا ہو۔ اپنے نام کے آگے گورکھپوری کیسے لگا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُردو کے اخبار و رسائل نے میرے نام کے آگے اوّل اوّل گورکھپوری اضافہ کیا۔ اس لیے کہ میرے افسانے گورکھپور ہی کی ڈاک سے روانہ ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ پھر مدت تک یہ ہوتا رہا کہ میں اپنے کو صرف "مجنوں" لکھتا رہا اور رسالے برابر "مجنوں گورکھپوری" چھاپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجنوں گورکھپوری مشہور ہو گیا اور مجھے بھی اس کو قبول ہی کر لینا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ میں گورکھپوری ہوں یا نہیں۔ جواب میں اگر اصرار کے ساتھ کہوں میں گورکھپوری ہوں تو کوئی منطقی یا قانونی غلطی نہ ہوگی۔ لیکن جو مجھ سے یہ سوال کرتے رہتے ہیں اور جن کو مجھے گورکھپوری ماننے میں تامل ہے۔ وہ بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ میرا خمیر یقیناً "بستی" کی خاک سے ہوا۔ ایک دُور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں میں جو گھاگھرا اور کنوانوں کے کنارے تحصیل خلیل آباد ضلع بستی

میں واقع ہے اور بدھ حوت کلی جوت کہلاتا ہے پیدا ہوا جہاں تمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گذر ہوتا تھا۔ میری ددھیال کی سرزمین ہے جہاں بدویت اور بربریت کے جملہ علامات و آثار اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح اب سے سو سال پہلے پائے جاتے تھے۔

مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی تعمیر بستی ہی کے دوسرے موضع میں ہوئی جو خلیل آباد اور مگہر کے درمیان لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے اور منجھریا کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر آمی ندی کے کنارے گورکھ پور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ جوار واقعی میری تربیت گاہ ہے، جہاں میں اپنی دادی کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں عرصے سے یہاں آنا جانا چھوٹا ہوا ہے لیکن میری روح اس بچھوڑے ہوئے دیار کی طرف اب بھی بے ساختہ کھنچتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ میرے بڑے نازک جذبات اور سربلند ترین تخئیلوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں ایک چھوٹی سی نظم اسی کی یاد میں کہی گئی تھی جس کے دو اشعار یہ ہیں ؂

دفن تیری جھاڑیوں میں میرے دل کا راز ہے
تیری ہر موجِ ہوا میں میری ہی آواز ہے

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہِ الہامات ہے
مکتبِ عرفان ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

یہیں میں نے چودہ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی۔ یہیں میرا شعور بالغ ہوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوقِ جمال پیدا ہوا جو تمام مخالف حادثات و حالات کے باوجود آج تک جی کا روگ بنا ہوا ہے۔ یہی علاقہ میرے افسانوں کا جغرافیہ ہے اور اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے ہیں۔ جب میں انگریزی تعلیم کے لیے گورکھ پور چلا آیا۔ اس طرح کہ پھر زیادہ تر گورکھ پور رہنے لگا۔

تو بھی ایک مدت تک کوئی چھوٹی یا بڑی تعطیل ایسی نہیں ہوتی تھی جو میں یہاں آ کر نہ گزارتا رہا ہوں کہ مٹی اور روح "THE SOIL AND THE SOUL" کے درمیان اندرونی نسبت اور باطنی اختلاطات سے جو انکار کرے اس کو قائل کرنے کے لیے جہاں اُور سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں وہاں ایک زبردست مثال میں بھی ہوں۔ طرح طرح کی معاملات اور موانع ہوتے سے مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے دل و دماغ کی اس اوّلین تربیت گاہ کی طرف رجوع کروں اور میں اپنی عملی اور ظاہری زندگی میں عرصے سے گھنٹے کے لیے اس کو بالکل فراموش کیے ہوئے ہوں مگر میری ہستی کی ایک ایک تہ میں اس کی یاد بسی ہوئی ہے اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس یاد سے بے چین نہ رہتا ہوں۔

اگر میری ابتدائی تعلیم اور پرورش بستی میں ہوئی تو میری تعلیم کی تکمیل گورکھ پور میں ہوئی اور پھر نہ صرف میں بلکہ میرے خاندان کے تمام قریبی رشتہ دار معاش اور کاروبار کے سلسلے میں گورکھ پور میں رہے۔ اگر میں صرف اتنا کہہ دوں کہ بستی میرا اصل وطن ہی گورکھ پور میرا وطنِ مالوف ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن اتنا ہی نہیں ہے۔ حقیقت اس سے بہت زیادہ ہے اور جو نسبت مجھے گورکھ پور سے

ہے۔ اس کی جڑیں زیادہ گہری اور مضبوط ہیں۔ میری ددھیال ضلع بستی ہے اور ننھال شہر گورکھپور۔ دادا اور باپ کی طرف سے مجھے بستی سے تعلق ہے اور دادی اور ماں کی طرف سے میں گورکھپور کا ہوں۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بیک وقت مجھے بستی اور گورکھپور دونوں سے نسبت ہے وہ تنہا میری ذات سے نہیں ہے بلکہ دو پشت پرانی ہے۔ میری دادی جن کا ذکر میں ایک سے زائد بار کر چکا ہوں، گورکھپور کے ایک ایسے خاندان کی تھیں جو علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ خود میری دادی بڑی فاضل اور ورع و تقویٰ والی ہستی تھیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں میں بھی بہت کم لوگ نکلیں گے جو ایسی پختہ اور جید شخصیت کے مالک ہوں۔ میری تربیت انھیں سے کی اور عربی فارسی اور ہندی میں مجھے جو کچھ استعداد ہے وہ انھیں کی دین ہے۔

مجھے اپنے گورکھپوری ہونے کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب لوگ جو چاہیں سمجھیں اور مجھے جہاں سے چاہیں منسوب کریں۔ میں نے اپنی باشعور عمر کا وہ حصہ جس کے لیے سعدی نے عمر عزیز کے چالیس سال کی اصطلاح استعمال کی ہے، گورکھپور ہی میں بسر کیا لیکن جس سرزمین کو میری زادبوم ہونے کی برکت یا نحوست حاصل ہے۔ اس سے اصلی اور اندرونی طور پر میں کبھی بھی اپنا دل ہٹا نہ سکا۔ اس کا خیال اور اس کی یاد اب تک میرے دل کا داغ بنی ہوئی ہے اور آج جب کہ میں انتہائی ضعف کے عالم میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، میرے قلب و روح کی جو کیفیت ہے۔ اس کو "رومی بانسری" ہی کی آواز میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو رجعتی میلان یا ماضی پرستی کی علامات سمجھیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف واقعات سمجھنا چاہیے اور خواہ مخواہ ان کی تاویل میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔

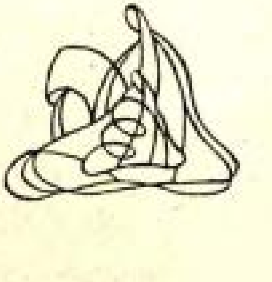

عصمت چغتائی

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ بگڑے شیخ پتلی دال کھانے والے۔ مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپھی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بچی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں: "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہوگی۔

مگر مجھے بذاتِ خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جمِ غفیر میں ایک پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی۔ آپس میں چونچیں چلتیں، نئے نئے چٹکلے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھی جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اُڑنے کے بعد ایکدم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بُڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھجوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

"نوج بوا۔ چھوکری کی لونڈیا ہے کہ موا بگاڑ، توبہ توبہ۔"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار میں بچھو کہتے تھے شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی اُن مُردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نچوں گلیوں میں گیڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں وہاں گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے۔ اپنے کنبہ میں آ کر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ چھپ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔ بزرگوں کو چکموں میں اُلو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی . . . وہی بھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت، اور ان کھیتوں میں گلہریاں گھیرتے جانا، پیڑوں پر چڑھنا۔ اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے۔ اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا انھیں ملتی، اُلٹے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آ کر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انھیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چٹکیاں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انھوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے اُن کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اُردو میں اور اُردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پورے ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا۔ لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل اُن کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں جھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے اُنھوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خود سر اور ضدی تھی ان کی شہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انھیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹھی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انھوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی ہوتے تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند سطروں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" اُنھوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انھیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ چھٹیوں میں اُنھوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انھوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے۔ اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں۔ . . . قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے۔ . . . میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا، بے تحاشا مجھے چومتا، اور میری حسین موت پر ڈاڑھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انھیں لکھنے میں انتہائی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتم کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور وہ تھیں وہ

میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ اُن کہانیوں کا نچوڑ تھیں جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے

"آہا ہا۔۔۔ ٹھنّی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ"

شمیم سور نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔۔۔۔

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ۔۔۔۔"

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی، اُف، بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی۔۔۔ یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو بس ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارا کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اُسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اُسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارا پرلے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی۔ البتہ اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اوّل تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ چیتھی پیے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا۔ اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی۔ اے کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لیے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجے سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں والی مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر کھنچتا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انھیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے سرادھما کچھ کر رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انھوں نے سامنے

کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں، اُن کے کٹے ہوئے بالوں پر، بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم دھار دار نہیں تھی، کیونکہ تقریر کے بعد انھیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیباکی کا علم بلند کیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے اُن کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۳۶ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سُلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے سب ہیچ ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگِ مرمر کے سارے بُت منہدم کر دیے۔

زندگی ننگی ہو کر سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا انھیں کھا جاؤں۔ کیا کروں جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں، انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اکثر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں۔ مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور جیالی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے چکر میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے اور پھر:-

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ جس گروپ کی طرف لوگوں کی نظریں اشارہ کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بیڑی کا خرچ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو بھیڑ جٹا کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں بجز سُنی سُنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ "دھانی بانکیں" اور "جڑیں" سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی۔ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ

یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ اُنھیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں اُن پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے، "یہ نہ کرو" "وہ نہ کرو" اب تک میرے دماغ میں بسا ہُوا تھا لیکن یہ وہ مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انھیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں اُن سے ملنے جودھپور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اُجڑے ہوئے کمرے میں میری امّاں بیٹھی تھیں۔ امّاں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی اُنھوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانہ میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پُرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان اُبل آیا۔ مامتا جاگ اُٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دُنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا، جو دُنیا کو بساتی ہیں ہر جنم دیتی ہیں۔ انھیں پالتی پوستی ہیں، جو کچھ اُن پر نچھاور کرتی ہیں نہ اُن سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکّے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرے تو فرمانبردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اُٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مُردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہُوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے . . . کائی چھٹ جاتی ہے . . . جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لَو دینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔

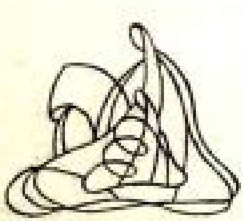

کرشن چندر

میرا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اور زیادہ تر فطرت کی آغوش میں گذرا ہے۔ اس لیے زندگی کی سب سے بڑی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا ہے وہ فطرت ہے۔ سردیوں میں برف کے گرنے سے بہاروں میں پھولوں کے کھلنے تک میں نے فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی وحشت اور سرکشی میں بھی میں نے ایک قسم کا نظم ایک قسم کی جمالیاتی شان دیکھی ہے جو میں نے اور کہیں نہیں پائی۔ میں سب سے زیادہ خوشی فطرت کے ساتھ رہنے میں محسوس کرتا ہوں۔ شہروں سے مانوس ہونے پر بھی میں شہروں سے نامانوس ہوں اور بالعموم شہر سے باہر رہنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ جہاں کھیت اور درخت، پہاڑ اور سمندر میرے سامنے رہیں۔ میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساسِ جمال کسی کو ملتا ہے، اس کا منبع بھی فطرت ہے۔ واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی تنگ دستی، مجبوری، بے چارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا سلسلہ جو چلا تو پھر بہت دور تک پہنچا اور ابھی آگے کہاں جائے گا، یہ میں آج نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں گورکی بہت بعد میں آیا۔ پہلے تو فطرت ہی آئی! اور پہلے تو صرف اس کے حسن نے اس کے کلی حسن نے مجھے متاثر کیا۔ بعد میں جب غور کرنے کی عادت جڑ پکڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ فطرت کے حسن کے اندر بھی، تتلیوں کی شوخ رنگی، بلبل کی نغمہ سرائی اور بھونروں کی بھنک کے اندر بھی ایک مربوط منظم مقصد کارفرما ہے۔ اس سے پہلی بار مجھے یہ خیال آیا کہ اگر فطرت بے مقصد نہیں ہے تو انسان بھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی، اس کا سماج، اس کا ادب بھی بے مقصد نہیں ہو سکتے!

ظاہر ہے فطرت میں تخلیق ہے تو تخریب بھی ہے، وحشت ہے تو سکون بھی ہے، جدلِ مسلسل کے ساتھ مفاہمت بھی ہے اور دوام بھی، لیکن ان تمام مختلف عناصر کو نظامِ فطرت نے ایک ایسے توازن سے باندھا ہے، جسے دراصل خوبصورتی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اسی توازن کو میں حسن کہتا ہوں اور جب میں انسانی سماج میں حسن لانے کو کہتا ہوں تو میرے ذہن میں کلی حسن کے بعد جو حسن کی دوسری تصویر آتی ہے وہ اسی فطری توازن کے حسن کی ہے جسے میں انسانی زندگی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہوں۔ گویا میری زندگی کے، سوچنے سمجھنے، میرے آرٹ اور فن کے پہلے اصول فطرت نے مرتب کئے ہیں۔

فطرت کے بعد سائنس آتی ہے۔ اسکول میں پڑھائی جانے والی ابتدائی سائنس نے، آپ اسے شخصیت کہہ لیجئے یا واقعہ، مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کا طریقہ استدلال اور استخراج مجھے آج بھی یاد ہے جو اشیا کو اجزا میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر ان اجزا کو ایک مرکب میں باندھ دیتا ہے اور اس طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عملی کوشش کرتا ہے۔ کسی شے کی آخری ماہیت شاید

سائنس بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اس دروازے تک تو پہنچ سکتی ہے، جسے حرفِ آخر کہنا چاہیے اور جس کی چابی سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن سائنس میں یہ تو خوبی ہے کہ وہ کسی حرفِ آخر کو آخر نہیں سمجھتی۔ مذہب کی طرح! —— ایک ایٹم کو توڑنے سے لاکھوں نئی دنیائیں آباد ہوتی ہیں اور برباد ہوتی ہیں اور سائنس کو اپنی تگ و دو کے لیے نیا میدان مل جاتا ہے۔ لیکن مذہب اور ہر مذہب اپنی قطعیت میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے اور مذہب کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ سائنس نے مجھے مذہبی ہونے سے بچا لیا اور اس حد تک بچایا کہ آج میں بھی سائنس کے کئی اصولوں اور کئی دریافتوں کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تم کہتے ہو یہ سچ ہے۔ کل کو خدا جانے کیا سچ ہو؟

سائنس نے میرے بہت سے اوہام دور کیے۔ ذہن کے بہت سے پرانے جالوں کو صاف کیا اور شکوک کے کئی نئے جالے بُنے (ایسا بھی ہوتا ہے!) لیکن سائنس میری زندگی میں اس لیے اہم ہے کہ اس نے میری فطرت پسندی کو ایک نئی شکل دی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں انسانی سماج کی مصیبتوں کو دور کرنے کا اگر کوئی منصوبہ تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انسان کو فطرت کے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ شہری چالاکی سے بچنا چاہیے۔ زیادہ مشینیں انسان کے لیے مفید نہیں ہیں یعنی ٹالسٹائی یا گاندھی! مگر بہت جلد یہ خیال دور ہو گیا اور سائنس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے راز معلوم کر کے ہم انسانی سماج میں فطرت کا سا توازن لاتے ہوئے فطرت سے کہیں بہتر نظامِ زندگی مرتب کر سکتے ہیں۔ یعنی انسان اپنی عقل و دانش سے فطرت پر اضافہ کر سکتا ہے۔ سادہ زندگی کی بجائے بھرپور اور پیچیدہ زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ شہر اس طرح وسیع اور کھلے آباد کیے جا سکتے ہیں کہ ہر گام پر فطرت کا شبہ ہو اور یہ سب کام مشینوں کے بغیر ممکن نہیں۔

فطرت اور سائنس کے بعد میری زندگی کا تیسرا موڑ اور سب سے اہم موڑ اشتراکیت کی آمد ہے۔ وہ خیال جو روسی انقلاب کے بعد اک دھماکے کی طرح ساری دنیا میں پھیلا اور ساری دنیا کے نوجوان اذہان نے اس کی گونج سنی۔ کالج کے پہلے سال ہی میں جہاں میں نے سائنس کے مضامین لیے وہاں میں نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک طرف دہشت پسندوں سے رابطہ قائم کیا تو دوسری طرف سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے علمی اور سیاسی جلسوں میں شریک ہونے لگا۔ وطن کی آزادی میرے سامنے صرف ایک ملک کی آزادی کی شکل میں نہ آئی بلکہ اسے میں نے ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ بلکہ خود یورپ کے بیشتر حصوں کے کروڑوں عوام کی آزادی کی تحریک کی صورت میں دیکھا، جو ایک مخصوص نظامِ زندگی کے چنگل سے نکل کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی آزادی کا تصور کانگرس کے پاس نہ تھا، مسلم لیگ کے پاس نہ تھا۔ مہا سبھا اور اکالی دَل کے پاس نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان جماعتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا یا ان کے پیچھے کارفرما تاریخی قوتوں کے وجود سے منکر تھا۔ لیکن میرے لیے ان کی دلچسپی محدود تھی۔ میں انھیں عوام کے نمائندے ان معنوں میں دیکھتا تھا جن معنوں میں اکثر لوگ سمجھتے تھے یعنی یہ ایسے لوگ ہوں گے، یہ ایسی جماعتیں ہوں گی جو ملکوں اور قوموں کو سامراجی نظامِ زندگی سے آزاد کرا کے ایک نئے نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالیں گی۔ میں نے ان جماعتوں کی محدود افادیت کو سمجھ کر بھی کبھی انھیں اپنا راہنما یا راہبر نہ جانا، ان سے زیادہ توقع نہ رکھی۔ لیکن اگر کبھی ان سے کوئی حسین کام ہو بھی گیا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ آئیں! ان لوگوں سے تو ایسے حُسنِ سلوک کی اُمید نہ تھی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اس بات کا مجھے ہمیشہ یقین رہا کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام تو کرنا ہو گا اور ان کے ساتھ

مل کر ہی ملک کو آزاد کرانا ہوگا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی یہ لوگ یہیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے انگریزوں سے زیادہ بہتر طریقے سے زیادہ سلیقے سے کھائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرغ کو بوٹی کر کے کھائیں لیکن کھائیں گے ضرور! اس لیے میں گاندھی، جواہر لال، جناح یا گول والکر کی تعلیمات کو اس روحانی تقدس کے بارے میں نہ دیکھ سکا جس طرح اور بہت سے باشعور لوگوں نے دیکھا اور آج بھی دیکھتے ہیں جس طرح کوئی خیال جزو ایمان بن جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی اور میرے متعلقہ حیات کا سب سے روشن پہلو! لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اور ہر روشنی اپنا سایہ ساتھ لاتی ہے۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لیکن میں اس کا اندھا معتقد نہیں ہوا۔ اشتراکیت بیسویں صدی کا مذہب ہے۔ مذہب ان معنوں میں کہ ہر مذہب تاریخ میں اپنا درس حیات، ایک مخصوص نظام زندگی، ایک مخصوص حلقہ اور فکر لے کے آتا ہے اور اس کی ترویج اشاعت کرنے میں اور کروڑوں انسانوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں کوشاں رہتا ہے اور تاریخ کے اس موڑ پر انسانیت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں میں اشتراکیت میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرمایہ داری اپنا کام کر چکی۔ اب اگلے سو سال یا ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک انسانی سماج کو لامحالہ اپنی بہتری کے لیے اشتراکیت کے راستے پر چلنا ہوگا۔ اس امر کا ایک بہت واضح تصور میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اشتراکیت کو انسانی ناطے اور نظام حیات کا حرف آخر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس کے اندر روشنیاں ہیں تو سائے بھی ہیں۔ اک زمانہ ہوتا ہے جب ہر فلسفہ شہیدوں کی تحریک ہوتا ہے۔ اشتراکیت کی تحریک آج دنیا بھر میں شہیدوں کی تحریک سے آگے جا چکی ہے۔ آج دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی سوشلزم میں اپنی راہ نجات دیکھتی ہے اور یہ تعداد بڑھتی ہی جائے گی۔ اب اشتراکیت کی تحریک اس منزل اور اس موڑ پر آ گئی ہے کہ خود اس کی بہبودی کے لیے سختی سے اس کا محاسبہ کیا جائے اور جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں اور ماضی کے تجربوں کی بنا پر اس پر کڑی سے کڑی تعمیری تنقید کی جائے۔ ورنہ اس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ جب کوئی تحریک اس حد تک پھیل جائے تو اس میں مذہبیت کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ عناصر جو اس کے بت بناتے ہیں اور خدا، اس کا مقدس کلام، رسوم اور روایتیں، پجاری اور پیرو کار اور اس طرح سے اس کے ارتقا کی رفتار کو کم کرتے ہیں۔ اس خطرے سے بچنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکیت مستحکم ہونے پر اگر اس کے روایت پسند خوشامدیوں کی تعداد بڑھے گی تو اس کے اپنے ہی بطن سے اس کے زیادہ سے زیادہ نقاد بھی پیدا ہوں گے۔ اس کی صورت بدلے گی اور وہ بدلی ہوئی صورت اشتراکیت کے موجودہ اور مروجہ سماجی اداروں کو بھی بدلے گی۔ پھر یہ اشتراکیت اپنی باطنی کیفیت میں بھی بالکل ہی بدل جائے گی اور اس کے بطن سے ایک نیا شگوفہ پھوٹے گا اور انسانی سماج کی ترقی کے لیے ایک نیا فلسفہ وجود میں آئے گا۔ یوں تو ہوگا ہی۔ اور اسے کوئی روک نہ سکے گا۔ خود اشتراکیت بھی اسے روک نہ سکے گی!

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بے حد معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے والد سے سیکھی ہیں۔ یعنی طے شدہ امور کو غیر طے شدہ سمجھنا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے حظ اٹھانا، اپنے مخالفوں کی عزت کرنا اور ان کی باتوں کو انتہائی غور سے سننا۔ نچلے آدمیوں پر اعتبار کرنا اور عام لوگوں سے میل جول رکھنا اور ان پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ میرے والد کو ایک ذہین اور قابل ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے راجاؤں مہاراجاؤں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان کی صحبت پر ہمیشہ معمولی آدمیوں کے ساتھ کو ترجیح دیتے تھے اور ان کے ملازم بھی

ہوئے بھی اپنی نجی گفتگو میں ان سے شدید نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے اوقات باغ کے مالی سے، راہ چلتے ہوئے کسی نادار راہگیر سے، یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہندوستان کے کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اکثر میں نے ان کو نہایت تنگ نظر، خود غرض، مکار اور جاہ پرست پایا ہے۔ اُن سے زیادہ انسانیت، رواداری اور خلوص میں نے ان لوگوں میں پایا ہے جو میرے ہمسائے تھے، یا میرے لیے بالکل اجنبی تھے، لیکن جو معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ اُن معنوں میں کہ ان کا آج بھی کہیں کوئی نام نہیں ہے۔ اور وہ کسی قومی یا بین الاقوامی حیثیت کے مالک نہیں تھے، لیکن جو دراصل قوم ہیں اور واقعی جن کے روزمرہ کے کام سے اور شرافت سے انسانیت کو بقا حاصل ہے۔ میرے والد بالکل ایک عام آدمی کی سی زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ انسان کو انسان کی طرح رہنا چاہئے فرشتے کی طرح نہیں۔ اس لئے تھوڑا سا گناہ کرلو، تھوڑی سی غلط کاری بھی بُری نہیں، تھوڑی سی بے راہ روی بھی جائز ہے بظاہر یہ بات کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے تجربوں نے اس کی صداقت بھی عیاں کر دی۔

پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلہ کا اُردو ترجمہ تھا۔ یہ تیسری جماعت کا قصہ ہے۔ والد ادبی کتابیں پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے لیکن والدہ کو سخت اعتراض تھا۔ الف لیلہ کے بعد میں نے سدرشن کی کہانیاں پڑھیں پھر پریم چند کی کہانیاں میٹرک تک میں نے بہت سا اُردو ادب کھنگال ڈالا۔ میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا۔ اس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلاب روس سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پشکن، گوگول، لیرمونتوف، آندریف، تورگنیف، چیخوف، ٹالسٹائی، دوستوفسکی۔ گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور عمدہ ہے کہ دوسری زبان کے ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں، وہ شیکسپیئر اور غالب ہیں۔ غالب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف اُردو نے بلکہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا بڑا شاعر نہیں پیدا کیا۔ لیکن یورپ کا مزاج اُنھیں کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوخوف، ارنسٹ ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں۔ اجنتا کی میں تعریف کرتا ہوں لیکن گزشتہ چار سو سال میں یورپی مصوری نے جو سرمایہ انسانی کلچر کو دیا ہے وہ اس قدر عظیم ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا گناہ کبیرہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کھجوراہو اور ایلورا کے بت کلاسیکل یونانی، اطالوی نشاۃ الثانیہ اور ماڈرن یورپی سنگ تراشوں اور مجسمہ گروں کی تخلیقات کے ہم پلہ ہیں اور کہیں ان سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے لکھنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعری میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں اور قتیل تو جانے کس کس کا ہوں کیونکہ ہر نیا روز ایک نیا سورج لے کر آتا ہے۔

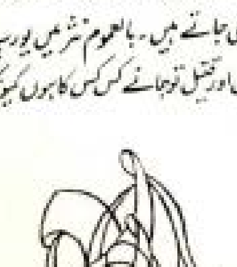

ہاجرہ مسرور

محترم بھائی طفیل صاحب! تسلیم

آپ کے سب تقاضے بلکہ مدیرانہ نوٹس وصول پائے۔ اس تاخیر سے آپ پر کچھ گزری ہو یا نہ گزری ہو، باعثِ تاخیر نے میرا بُرا حال کر دیا۔ اگر میں "آپ بیتی" کا پلندہ اس خط کے ساتھ ارسالِ خدمت کر رہی ہوتی تو شاید میری کوفت کا کچھ ازالہ ہو جاتا۔

اب میری سنئے! جب آپ نے "نقوش" کے آٹھ دس صفحوں میں آ جانے والی "آپ بیتی" لکھنے کی فرمائش پرسے کی تھی تو میں نے بے حد نیک نیتی سے "اچھا" کہہ دیا تھا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھی تو آپ کی یہ ننھی سی فرمائش "پھیرے" کے باہر آئی ہوئی بوتل کا جن بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر بار بار اس جن کو دوبارہ بوتل میں قید کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی — یعنی "آپ بیتی" لکھنے کا ارادہ ترک کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

کیا آپ یقین فرمائیں گے کہ اس دوران میں کوئی ڈیڑھ سو فل سکیپ کاغذ میں نے سیاہ کر ڈالے اور جب رکی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور دوبارہ سہ بارہ لکھنے کی کوشش کی۔

یہ مشکل اس لیے نہیں پیدا ہوئی کہ میری زندگی کے سلسلے اُلجھ کر میرے ذہن میں گتھی بن گئے ہیں۔ اگر گتھی ہوتے تو میں بڑی آسانی سے انھیں نوچ کھسوٹ کر، کچھ گرہیں لگا کر، ان کو اپنی زندگی کے اہم واقعات کی شکل دے دیتی اور آپ کے سامنے سرخرو ہو جاتی۔ مگر میری زندگی تاگے کی ایک ریل ہے جس کا ایک سرا پکڑ کر کھینچتی ہوں تو آخر تک کھلتی چلی جاتی ہے۔ اس تاگے پر دکھ سکھ کے کئی رنگ ضرور ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کہاں کہاں سے توڑوں (اور کیوں توڑوں) تاکہ "اہم" اور "غیر اہم" حصے الگ الگ ہو جائیں۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ ...

> "ہم چاہتے ہیں کہ آپ (ابتدا سے کر اب تک) اپنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو نقوش کے آٹھ دس صفحوں میں سمو دیں۔ امید ہے کہ آپ نہ صرف اس موضوع کی نزاکتوں سے عہدہ برا ہوں گی۔ بلکہ ہمیں اپنی زندگی کے دلچسپ اہم واقعات سے بھی روشناس کرائیں گی۔ غرض اردو ادب کے قاری کی آپ سے ملے بغیر پوری ملاقات ہو جانا چاہیے۔"

بھائی! اب اس بے بسی کے عالم میں آپ پر تھوڑا سا غصہ کروں تو سہہ جائیے گا۔

آپ نے آٹھ دس صفحوں میں "آپ بیتی" لکھنے کو کہہ دیا۔ میں نے کوشش کی مگر افسوس کہ آٹھ دس صفحے تو محض ایک دن میں

کر کے واقعات لکھے جانے کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوئے اور مجھے محسوس ہوا کہ محض واقعات بیان کر دینا "آپ بیتی" نہیں۔ واقعات سڑک پر پڑے ہوئے کنکر نہیں جنھیں چن کر اپنی جھولی میں ڈال لوں (ان کنکروں کا بھی پس منظر ہوتا ہے، ان کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ہر ایک کے پاؤں نہیں زخمی کرتے، اور جن ننگے پیروں کو زخمی کرتے ہیں ان کے لیے بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ پاؤں ننگے کیوں ہیں) انسانی زندگی میں حادثات کا پس منظر چاہے نہ ہو مگر واقعات کا پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ ان واقعات سے متعلق احساسات اور جذبات ہوتے ہیں اور پھر ان کے دور رس اثرات بھی ہوتے ہیں جو ذہن پر مسلسل پھیلتے جاتے ہیں اور پھر ایک مختصر سی مختصر زندگی میں بھی اہم واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان سب کو چند صفحوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ موت، قتل، حادثہ، فاقہ یا عشق بظاہر بہت اہم واقعے شمار ہوتے ہیں لیکن انسانی ذہن پر تو ایسی ان دیکھی موتیں بھی واقع ہوتی ہیں جن کے جنازوں کو کوئی کندھا دینے نہیں آتا۔ ایسے قتل بھی ہوتے ہیں جن کے قاتل کسی تھانے میں نہیں جاتے۔ ایسے حادثے بھی ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا صحیح سالم انسان درحقیقت روحانی ادھورے پن کا شکار ہوتا ہے۔ ایسے فاقے بھی ہوتے ہیں جن میں معدہ بھرا ہوتا ہے لیکن انسان نامعلوم بھوک سے تلملاتا رہتا ہے اور وہ عشق بھی تو ہوتے ہیں جو سر جھکا کر اسکول کی طرف جانے والی بے خبر معصوم لڑکی کو ملوث کر دیتے ہیں۔

یہ واقعات وہ ہیں جو سب کے علم میں نہیں ہوتے۔ بظاہر واقع نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود جب ذہن میں گزرتے ہیں۔ اس کے لیے یقیناً اہم ہوں گے اور کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ ان دونوں دنیاؤں میں آباد نہیں ہے؟ اور یہ دونوں دنیائیں اہم واقعات سے بھرپور نہیں؟ تو اب ذرا آپ ہی اپنی ان دو دنیاؤں کے اہم واقعات گن کر حساب لگائیے اور سوچیے کہ یہ سارے واقعات ایمانداری سے لکھے جائیں تو کتنے صفحات درکار ہوں گے؟

(اس میں اس ارادۂ قتل کو بھی شامل کر لیجئے گا جو میرے اس خط کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی مدت سے بھی تین مہینے سے "آپ بیتی" لکھ بھیجنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں اور اب بھیج دیا یہ خط ——)

تو بھائی طفیل صاحب! آپ ادیبوں سے ان کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات کے طالب ہیں۔ لیکن اس کی کیا گارنٹی کہ ہر ادیب کی زندگی میں دلچسپ اور اہم واقعات ضرور ہوں گے؟ (مثلاً ابھی تھوڑے دن پہلے ایک ادیب خاتون کہہ رہی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا "آپ بیتی" کیا لکھوں۔ میری زندگی میں واقعات ہی نہیں۔ اب بتائیے) یا قاری کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان ضرور ہوگا۔ کاش آپ نے دلچسپی کے بجائے ادیب سے ایمانداری طلب کی ہوتی۔ کیونکہ آپ "ہو از ہو" (WHO'S WHO) نہیں، "آپ بیتی" نمبر مرتب فرما رہے ہیں۔

بھائی طفیل صاحب، کیا آپ کسی انسان کے اسی وجود کے قائل ہیں جسے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دوسرے کو دکھایا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں اسی انسان کا وہ وجود بالکل قابل غور نہیں جسے دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ذہن میں جگہ دیتے ہیں؟ مثلاً میں اپنے گھر میں ایک سادہ سی عام سی بیوی اور ماں ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے جب میں اپنا یہ پہلو لکھوں گی تو یہ بات دہراؤں گی —— لیکن میرا جی یہ بھی چاہتا ہے کہ ان صاحب کا تذکرہ بھی کر دوں جنھوں نے میرے شوہر کی بیماری میں مجھے ان کے پاؤں دباتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا: "ارے آپ بھی اپنے شوہر کے پاؤں دباتی ہیں؟" کیونکہ یہ بے ساختہ سوال میرے اس وجود کی ترجمانی کرتا ہے

جو دوسروں کے ذہن میں ہے۔ معاشی اور معاشرتی برابری کی خواہاں عورت کی ازدواجی زندگی ان کے خیال میں محبت اور گھریلو فرائض سے کیوں عاری ہوتی ہے؟ — یہ سوچ کر مجھ پر ضرور کچھ "بیتی" ہوگی۔ آپ بیتی لکھتے ہوئے صرف اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی نازک نازک تصویریں پیش کرنا اور دوسروں کے ذہنوں پر چپکے ہوئے اپنے کارٹونوں سے منہ پھیر لینا زیادتی ہوگی۔ کیونکہ یہ کارٹون زندگی میں بارہا آپ کا منہ چڑاتے ہیں۔

اور طفیل بھائی! ایک بات بتاؤں — زندگی میں بڑے بڑے واقعات کبھی کبھی یوں دل پر گزرتے ہیں جیسے معمولی بات ہوں۔ لیکن ایک ننھا سا اشارہ کبھی پہاڑ بن کر دل پر گرتا ہے اور کچل ڈالتا ہے — مثلاً میرے ابا میاں جوانی میں چل بسے۔ میں نے چھوٹی سی عمر میں ایسی تابڑ توڑ مصیبتیں اپنے خاندان کے ساتھ سہیں، پھر بھی میں ان کی طرح ابا میاں کو یاد کر کے کبھی نہ رو سکی لیکن اس عمر میں (دو بے حد ذہین اور پیاری بچیوں کی ماں بن کر، ایک آئیڈیل شوہر کی نازاں بیوی ہوتے ہوئے) جب ایک دن میری ننھی بیٹی نے اپنے باپ کے سینے پر لیٹ کر پوچھا "امی آپ کے ابو کہاں ہیں؟ آپ اپنے ابو کے پاس کیوں نہیں جاتیں؟" تو میں اس بچی کی طرح بے تحاشا روئی جو اچانک میلے میں اپنے باپ سے بچھڑ گئی ہو۔

پھر بھی ماں، بیٹی، بیوی، اپنے گھر کی جنت کی مالکن، اچھی کتابوں کی مصنفہ (ماشاء اللہ جس کے بارے میں سی۔ آئی۔ ڈی کو بھی اپنے طور پر کچھ خوش فہمیاں ہیں۔ مثلاً بڑی توپ قسم کی انقلابی وغیرہ سمجھی جاتی ہیں) ایک تازہ متعارف صاحب کی زبان سے ٹیلی فون پر "ہاجرہ بیٹی" کہہ کر مخاطب کی جاتی ہیں تو موصوفہ سامنے بیٹھی ہوئی مہمان عورتوں کا خیال کئے بغیر دھاروں دھار رونا شروع کر دیتی ہیں — لمحہ بھر میں زندگی کا چکر الٹا چل گیا۔ باپ کی شفقت کے سائے میں بے خوف اور محفوظ زندگی نہ گزار سکنے کی محرومی نے اب پلٹ کر ڈسا تو تڑپا ڈالا — اسے کہتے ہیں پھول کی مار، اور ایک لمحے کی قیامت؟ یہ مثالیں میں نے اس لئے دی ہیں کہ آپ کو لمحوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے۔ یہ لمحے بھی "آپ بیتی" میں جگہ پانے کے لائق ہوتے ہیں۔

"میں لکھنؤ میں فلاں تاریخ کو فلاں سنہ میں پیدا ہوئی۔" اس سے کوئی اس گھر کا کیا تصور قائم کر سکے گا جہاں میں نے پہلی سانس لی؟

"ابا میاں سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس لیے تبادلوں کی وجہ سے میرا بچپن یو۔ پی کے قصبوں اور چھوٹے چھوٹے ابھرتے ہوئے شہروں میں بسر ہوا۔" الفاظ کے اس ننھے دائرے میں وہ اضلاعی معاشرت کیسے سمٹے گی جو لکھنؤ کی روایات اور تہذیب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ مگر میں نے آنکھ کھول کر اسی معاشرت میں سانس لی ہو اور میری بیشتر یادیں اور تحریریں اسی ماحول سے وابستہ ہیں مگر میں ایک دو صفحوں میں اس پس منظر کے ساتھ اپنے بچپن کی تصویر کشی کرنے پر قادر نہیں۔"

"میں اپنے والدین کی تیسری بیٹی ہوں۔" اتنا پڑھ کر کیا کوئی اس مایوسی کا تصور کر سکتا ہے جس کا سامنا میرے خاندان اور دادا میاں کو تیسری بار ہوا تھا۔ بہت سے گھروں میں رواجاً لڑکی کی پیدائش خوشی کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن ددھیال، ننھیال اور میری امی کی ننھیال تک میں لڑکوں کی کمی ایک حقیقی مسئلہ تھا (ابا میاں کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ خود ہماری زندگی کا سب سے اہم اور حقیقی مسئلہ تھا کیونکہ ان کے بعد کوئی چچا، کوئی پھوپھی، یا کوئی رشتے کا بھائی موجود نہ تھا جس کی چھاؤں میں ہم دم لیتے) ان تینوں خاندانوں میں کئی نسلوں

سے لڑکا ایک ہی ہوتا۔ اگر زیادہ ہوتے تو بچپن ہی میں مر جاتے۔ چنانچہ میرے دادا، میرے پرنانا، میرے نانا، میرے ابا، یہ سب اپنے والدین کی تنہا اولاد میں تھے۔ اس کے علاوہ میری امی کے ایک ہی سگے ماموں ہوتے اور میرے بھی ایک ہی ماموں زندہ بچے (اور وہ بھی جوان اور غیر شادی شدہ ختم ہو گئے) اس طرح ہمارا خاندان محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ابا میاں، اپنے باپ اور دادا کی نسبت خوش نصیب تھے کہ دو بیٹوں کے باپ بنے۔ لیکن صرف لڑکیوں کا باپ بننا منحوس تھا، چنانچہ میرے دادا امی کو دفعہ ایسے دھمکاتے کہ بیٹے کو دوسری شادی پر مجبور کر دیں گے — لیکن جب میں اپنے تیسری بیٹی ہونے کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاؤں گی تو آج کے مسلم معاشرے کی وہ لڑکی جو کسی سائنسی لیبارٹری میں بڑے اعتماد سے کام کر رہی ہے۔ یا امریکہ کے برّاعظم میں اپنے خاندان سے دور بھی مزید تعلیم حاصل کر رہی ہے (جو اپنے گھر کا اقتصادی ستون بھی ثابت ہوگی) وہ یا اس کا نوجوان بھائی آج سے پینتیس سال پہلے کے اس مسلم معاشرے میں بیٹی کی پوزیشن کا کیا اندازہ کر سکیں گے جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی؟ اس ماحول کو پیش کرنے کے لیے مجھے اپنا خاندانی پس منظر بتانا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ "آپ بیتی" لکھنے والے کو اپنا مکمل خاندانی شجرہ افرادِ خاندان کے تعارف کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ لیکن کم سے کم جو رشتے لکھنے والے کی زندگی پر کسی نہ کسی حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں ان سے کوئی کیسے دامن بچا کر گزر سکتا ہے؟ آج کل میری یہ ہے کہ میں نے اپنے دادا میاں کی زمیندارانہ ہیجان ذہنیت کے سائے میں اپنی ابتدائی زندگی کو خوف زدہ پایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ابا میاں کی اس شفقت کی چھاؤں میں آسودگی اور حفاظت کا احساس پایا ہے جو شعور و تبسم کے امتزاج سے بنی تھی۔ میرے سامنے میرے نانا میاں رہے ہیں جو دنیا کے ہاتھوں پے درپے شکستیں کھا کر بچوں کی طرح رو رو کر خاک میں لوٹ گئے کہ کوئی آئے اور انھیں منائے لیکن انھیں کسی نے نہ منایا۔ مجھ تک امی ابا کے ننھیال کے علم اور تقدس کے قصے پہنچے۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جو ولیوں اور شہیدوں کی اولاد کہلاتے تھے لیکن جو اپنے بزرگوں کے مزاروں پر عرس منعقد کرنے اور ان محترم ناموں پر فخر کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ یہ سب حضرات میری "آپ بیتی" کا ابتدائیہ ہیں۔ ان کے ذکر کے بغیر میں پڑھنے والے کو یہ نہ بتا سکوں گی کہ اس وقت اپنے خاندان میں تیسری بیٹی ہونے کا مطلب کیا تھا۔

پھر مجھے ان لوگوں کا تذکرہ بھی کرنا ہے جو اپنے تھے اور جنھیں موت نے ہم سے چھین لیا۔ جیسے میرے ابا میاں، جیسے میرے ماموں جن کے اٹھ جانے سے مستقبل کی بساط الٹ گئی۔

پھر مجھے ان مردوں کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے جنھیں یقیناً نامردوں اور وہ بھی نامردوں کی موت کہا جائے گا۔ کیونکہ ان کا بھی مجھ سے کچھ تعلق تھا۔

وہ لوگ جن کے وجود نے انسانیت، دوستی اور افرادی رشتوں پر میرا ایمان مستحکم کیا اور وہ ہستیاں جن کی بے لوث محبت نے میری ہر باقی زندگی کے دو خلا پُر کرنے کی کوشش کی جو قسمت اور موت نے مجھے بخشے تھے۔ ان کا ذکر نہ کر کے گویا میں نیکی کے وجود سے انکار کی مرتکب ہوں گی — کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کردار کی بلندی کے سامنے میرا سر احترام سے ہمیشہ جھکا رہے گا۔

میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے آپ بیتی کے کوئی ڈیڑھ سو صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ اسے میں نے اسی انداز سے لکھا جس سے میں خود مطمئن تھی لیکن جب اچانک "نقوش" کی حدود کا خیال آیا تو ان صفحات کو ایک طرف ڈال دیا۔ کیونکہ ان ڈیڑھ سو صفحات میں تو میں نے

ابھی اپنی زندگی کے چودہ پندرہ سال کی کہانی بیان کی تھی۔ اس حساب سے اب تک کے حالات تک پہنچتے پہنچتے پوری ایک ہزار صفحات کی کتاب بن جاتی اور "نقوش" کے میدانِ حشر میں میرا یہ نامۂ اعمال پیش ہونے کی کیا گنجائش تھی۔؟

ایک بات اور بتاؤں بھائی طفیل! اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہوئے کئی بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جو یادیں میرے لیے مقدس ہیں، جو لوگ مجھے عزیز ہیں، یا جن واقعات نے سدا کے لیے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے، کہیں وہ میرے قاری کے لیے بالکل ہی معمولی باتیں نہ ہوں۔ بچپن میں ایک کہانی سنی تھی کہ ایک چڑیا کو کہیں سے ایک ٹوٹا ہوا موتی مل گیا۔ وہ اسے چونچ میں دبا کر راجہ جی کے محل پر جا بیٹھی اور چلانے لگی۔ "جو میرے پاس وہ راجہ پاس نہیں"۔ کہیں یہی قصہ میرا نہ بنے کہ میرے دکھ سکھ میرے لیے تو اہم ہوں مگر ہمارے معاشرے میں عجوبہ نہ ہوں کیونکہ میں بھی آخر اسی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اور اس طبقے کے لوگ ایسے ریت کے گھروندوں میں رہتے ہیں جو ذرا سی تیز ہوا سے مٹ جاتے ہیں۔ بھرے پرے گھر کے ایک کمانے والے کے دم سے ساری رونقیں ہوتی ہیں اور جب وہ کمانے والا نہ رہے تو یہ موت ایسے گھروں میں غموں کی بنیاد بن جاتی ہے اور پھر آج سے پچیس تیس سال پہلے کے وہ گھر جہاں قدامت پسندی کا راج ہوتا تھا، ایسی موتیں ایک مسلسل خاندانی ٹریجیڈی بن جاتی تھیں۔ اتنی مسلسل کہ ان پر آنسو بہانے کی بھی مہلت نہ ملے۔

آپ سے اتنی بہت سی باتیں کرنے کے باوجود مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ "آپ بیتی" لکھنے کی عادت صحیح طریقے پر نہیں ڈال سکی ہوں۔ جو بات مجھے سب سے پہلے کہنا چاہیے تھی، وہ سب سے آخر میں کہہ رہی ہوں۔

بھائی طفیل صاحب! یہ تو بتائیے کہ کیا اپنی گزشتہ زندگی پر تفصیل سے نظر ڈالنے کی میری عمر آ گئی ہے؟

کیا اب مستقبل نے مجھ پر اپنے دروازے بند کر دیے ہیں؟ کیا اب امیدیں، ولولے اور تجربے میرا ساتھی نہیں بنیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ تیس پینتیس کی عمر میں اپنی سوانح عمری لکھنا جلد بازی ہے — میرے خیال میں "آپ بیتی" مصنف کی آخری تصنیف ہونا چاہیے۔

اس کے بعد آپ مجھے معاف کر دیں گے نا؟

مختصر حالاتِ زندگی ساتھ ملفوف ہیں۔ مناسب سمجھئے۔ اور اگر نقوش چھپ کر تیار نہ ہو گیا ہو تو انھیں چھاپ دیجئے۔

لاہور گئی اور جا کر بیماری کے باعث بستر سنبھال لیا۔ اٹھی تو ڈاکٹروں کے چکر میں آتے آتے مبتلا تھی۔ دو بار آپ کو ٹیلی فون کیا۔ ہر دفعہ معلوم ہوا کہ آپ آج دفتر نہیں آئیں گے۔ گھر میں سلام و دعا۔

مخلص

آپ کی ہاجرہ بہن

مختصر حالات

میں نے پرانے لکھنؤ کے ایک پرانے سے گھر میں زندگی کی پہلی سانس لی۔

میں ایک نو عمر ماں اور نوجوان باپ کی تیسری بیٹی تھی۔

اس وقت میرے والد تعلیم کی تکمیل کے بعد گھر میں بیکاری کے دن ملازمت کے لیے درخواستیں ٹائپ کر کے کاٹ رہے تھے۔

میری پیدائش کے تیسرے روز میرے والد کو ملازمت کا بلاوا مل گیا اور ان کی پہلی تقرری ایک قصبے میں ہوئی۔ اس کے بعد میری زندگی کا پورا ابتدائی زمانہ اپنے والدین کے ساتھ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں بسر ہوا۔

میری تعلیم کی ابتدا اپنی بہنوں کے ساتھ گھر پر رہ کر ہوئی۔ دن کے مختلف اوقات میں قرآن پاک، فارسی اور اسکول کا مروج نصاب پڑھانے والے مختلف استاد آتے اور پڑھا پڑھا کر ناک میں دم کر دیتے۔

میں ان استادوں کی نظر میں خاصی بدشوق اور کند ذہن بچی ثابت ہوئی۔ استادوں کے سامنے شوق سے پڑھنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میں نے بچوں کے ایک رسالے میں سے "سنڈریلا" کی کہانی بڑی بہن کی زبان سے سنی اور جب اس کہانی کو بار بار سننے کی خواہش کی تو ہر ایک سے جھڑکیاں ملیں۔

میرا بچپن ایسا خواب ناک اور چنبیلی کے پھولوں جیسا نازک بچپن نہیں تھا جن کا ذکر بعض خواتین و حضرات بہت لہک لہک کر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس دور کو یاد کرتی ہوں تو مجھے کسی بڑی چھین اور ناانصافی کی یاد نہیں آتی۔

ہمارے ہاں کھانے پینے کی چیزیں بچوں سے چھپا کر رکھنے کا طریقہ نہیں تھا اور نہ دوسرے بچوں سے گھلنے ملنے کی پابندی تھی۔ ہمارے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو امیر غریب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ گھر آنے والے سب بچوں کے ساتھ ایک سا سلوک ہوتا تھا۔ پابندی تھی تو یہ کہ بچے کونوں کھدروں میں گھس کر نہ کھیلیں۔ ہم کو کپڑا عموماً سادہ اور سوتی ملتا۔ ہاں سلائی اور تراش خراش میں خاصا اہتمام کیا جاتا۔ عید بقر عید کے موقعے پر ہم بچے ریشمی اور رنگین کپڑے پہنتے تو والدین میں سے کوئی نہ کوئی یہ بھی جتا دیتا کہ ریشمی کپڑے پہننا کوئی شان کی بات نہیں۔ شان تو سادگی میں ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کو کتابوں کی الماریوں میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت تھی اس لیے بچوں کے رسالے پڑھ کر ختم کر لیتے تو جو ملتا پڑھنے لگتے۔ اس زمانے کے تقریباً سبھی اہم ادبی، مذہبی اور دو ایک زنانہ رسائل ہمارے ہاں باقاعدہ منگوائے جاتے تھے۔ کچھ پلے پڑے یا نہ پڑے۔ ان سب کو پڑھ ڈالنا میرا مشغلہ تھا یہی عالم اخباروں کا تھا۔ اس سلسلے میں کتابوں کی الماریاں اجڑ جاتیں یا خدیجہ سے چھین جھپٹ میں کوئی کتاب یا رسالہ پھٹ جاتا تو امی کے ہاتھ سے ایک آدھ چپت بھی وصول ہو جاتی۔

گھونسے اور چپتیں تو مجھے اپنے ننھے بھائی سے بھی وصول ہوتی رہتیں۔ لیکن جواب میں اسے پیٹنے یا ڈانٹنے کا خیال کم از کم میرے ذہن میں جگہ نہ پاتا۔ مجھے اس ننھے شیطان سے بے تحاشا محبت محسوس ہوتی۔ کیونکہ مجھے اپنے ملک کی ہر بچی کی طرح ننھے پن سے ہی بھائی کے رشتے کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ ساون کے دنوں میں ہمارے آنگن میں جھولے کے کھمب گڑتے۔ بادلوں سے گھرے کسی سرمئی دن میں امی کی ملنے والیاں ساون منانے جمع ہو جاتیں تو کڑھائی چڑھتی، گلگلے تلے جاتے اور میری امی سب کے ساتھ جھولا جھولتے ہوئے بے حد دبی دبی آواز میں جو گانا گاتیں وہ یہ تھا ۔۔

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آئے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائے گا

جب بچیوں کے جھُمر لینے کی باری آتی سب مل کر یہی گانا مجھے چڑا کر گاتیں اور مجھے یہ گانا بہت اچھا لگتا تھا (بادل گھرتے ہیں تو میں اب بھی یہی گانا بے ساختہ گنگناتی ہوں)

میرے والد کسی بڑے شہر میں رہتے ہوتے تو زندگی نسبتاً مشکل اور گمنام سی ہوتی۔ لیکن قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں میرے والد خاصے اہم اور مقبول شخصیت کے مالک سمجھے جاتے۔ ان کی تھوڑی سی تنخواہ شریفانہ گزر بسر کے لئے کافی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کا سستا زمانہ تھا مگر میرے والد دوستوں کی خاطر مدارات، مستحقوں اور رشتے داروں کی امداد و اعانت کے سلسلے میں چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کے عادی تھے۔ ہر ماہ کی پہلی کو اخراجات کا رجسٹر کھلتا تو میرے والدین کے چہروں پر فکر کا سایہ پڑتا نظر آتا۔

اور ان سایوں کی حقیقت مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میرے والد جوانی میں اچانک چل بسے۔

اس کے بعد جو زندگی شروع ہوئی وہ مصیبتوں سے بھرپور تھی۔ یہ طویل داستان باپ کی موت سے لے کر میری شادی کے زمانے تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم کے شعلے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے اور ملک میں سیاسی بے چینی ہنگامے کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے مجھے کچھ لکھنے کا خیال آیا اور میں نے ایک شاعرانہ سی عبارت لکھ ڈالی — (میری بہن خدیجہ مجھ سے پہلے ننھے ننھے گیت اپنی کاپی پر لکھنے لگی تھی) میری یہ پہلی نثر نیلے آسمان، لمبی لمبی اڑانیں کرنے والے سفید کبوتروں اور رنگین پتنگوں کے بارے میں تھی جو اس سوال پر ختم ہوتی تھی کہ کیا اس نیلے پرسکون آسمان تلے بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو گزرنے کا حق ہے؟ میں نے اپنی اس پہلی تحریر کو اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کے نام سے ایک روزنامے میں بھیج دیا اور یہ عبارت ضرورت سے زیادہ نمایاں طریقے پر اخبار کے پہلے صفحے پر چوکھٹے میں چھپ گئی۔ میں نے یہ اخبار خدیجہ کو دکھایا اور وہ اس طرح خوش ہوئی جیسے ہم دونوں کو کوئی دفینہ مل گیا ہو — لیکن بڑوں کو میری اس جسارت کا علم نہ ہو سکا۔ اب میں سوچتی ہوں تو مجھے یہ بات بڑی بے تکی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے آسمان کی نیلی وسعتوں کے بارے میں الفاظ کا طومار باندھا جبکہ ایک عرصے سے آسمان کی وسعتیں میرے آنگن کے برابر تھیں اور میں نے برسوں سے کسی پرند کو لمبی اڑان کرتے نہ دیکھا تھا۔

پھر تھوڑے دنوں بعد ایک جلتی دوپہر کو خدیجہ کے حکم پر میں نے لکھنا شروع کیا جب قلم رکا تو معلوم ہوا کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا پہلا مختصر افسانہ لکھ دیا ہے۔ یہ افسانہ ایک فقیر کے بارے میں تھا جو سڑک پر جیا اور سڑک پر مر گیا۔ میرے ساتھ ساتھ خدیجہ نے جو چیز لکھی وہ ایک مضمون تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھی چھپ گئیں۔

اس کے بعد ہم دونوں بہنوں نے مل کر بے تحاشا لکھنا اور چھپنا شروع کر دیا تو بعض بڑوں نے اسے ہماری جرأت بے جا کہا۔ ان کے خیال میں افسانوں کے موضوعات کا تعین بڑوں کے مشورے سے ہونا چاہئے تھا، اس کے بعد ہی ان موضوعات پر ہم کو قلم اٹھانے کی جرأت کرنا چاہیے تھی۔ یہ تجویز اس لیے تھی کہ ہم دونوں نے چھ سات ماہ کے عرصے میں جو بہت سی کہانیاں لکھ ڈالی تھیں

ان میں سے کچھ کا موضوع "ادبی محبت" تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی کہانیاں لکھو گی تو مستقبل خراب ہو جائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ان کہانیوں کی ہیروئن تم خود ہو (اس وقت تو یہ دور اندیشی ہمیں قائل نہ کر سکی مگر میری منگنی کے بعد ایک خاتون نے یہی مثالیں دے کر میرے ہونے والے شوہر کو شادی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا) اس کے جواب میں میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ فقیر کی کہانی اور اس قسم کی دوسری کہانیاں پڑھ کر بھی وہ ایسا ہی سوچیں گے جو میں نے لکھی ہیں۔ اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ بہرحال اس کی وجہ سے خاصی کشمکش ہوئی اور کچھ اپنے دل بھی بُرے ہوئے۔ میری والدہ نے میرا ساتھ دیا (کیونکہ وہ خود زنانہ رسائل کی لکھنے والی تھیں) اس کے بعد کوئی رکاوٹ ہمیں لکھنے سے باز نہ رکھ سکی لیکن اس کے لیے ہم دونوں بہنوں کو بے شمار آنسوؤں کا خراج قدم قدم پر ادا کرنا پڑا۔

بچوں کے رسائل سے بڑے اور اہم ترین ادبی رسالوں تک پہنچنے کے لئے کڑی محنت کی۔ خود ہی لکھتے خود ہی ناپسند کرتے اور خود ہی دوبارہ سہ بارہ لکھتے۔

گھر سے باہر کی دنیا سے پہلا ادبی مشورہ ہمیں ایک اعلیٰ ادبی رسالے کے مدیر محترم نے دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دونوں بہنوں نے اپنے ابتدائی دور کے افسانے اس رسالے میں چھپنے کے لیے بھیجے اور جواب کے لیے بار بار تقاضا کیا لیکن مدیر موصوف نے اپنی مکمل خاموشی کی زبان میں جو مشورہ دیا وہ ہمارے بہت کام آیا۔ یہ مشورہ تھا "ابھی اور محنت کرو۔"

اس واقعے سے میرے اعتماد کو دھکا سا لگا۔ اب تک جو الم غلم لکھا تھا، جہاں بھیجتے چھپ جاتا، اس موڑ پر آ کر ہم نے اپنی تحریروں پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ خاصا بیکار بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنی تحریروں پر اور زیادہ محنت شروع کی۔ اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد ہم دونوں بہنوں نے "ساقی" کو اپنے افسانے بھیجے اور وہ چھپ گئے۔ اتنے بلند پایہ رسالے میں اپنے افسانے دیکھ کر خوشی کے مارے جو حال ہوا بتا نہیں سکتی۔ یوں ہمارے حوصلے بڑھانے میں جناب شاہد احمد دہلوی کا بڑا حصہ ہے۔

دوسرا ادبی مشورہ اس وقت ملا جب "ادبی دنیا" میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ ساتھ ہی جناب مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا ایک ادارتی نوٹ چھپا جس میں انھوں نے میری ہمت افزائی بھی کی لیکن مجھے بسیار نویسی اور سہل انگاری سے دامن بچانے کا مشورہ بھی دیا۔ اس مشورے کو بھی میں نے سر آنکھوں پر رکھا۔

تیسرا ادبی مشورہ مجھے "جناب احمد ندیم قاسمی" سے اس وقت ملا جب میں نے اپنا ایک افسانہ "ادب لطیف" میں چھپنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے "محترمہ و مکرمہ ہاجرہ مسرور صاحبہ" کو افسانے کا آخری پیراگراف حذف کر دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ خواہ مخواہ کی غنائیت سے بچیں۔ ان کا یہ مشورہ میں نے قبول کر لیا۔

اس کے بعد میں نے اور خدیجہ نے خود ہی ان سے ادبی معاملات پر مشورے طلب کرنا شروع کئے۔ دو تین سال بعد اپنے ایک ذاتی مسئلے کے بارے میں بھی ان کی رائے طلب کی۔ تب اچانک مجھے اور میری بہن خدیجہ کو (بلکہ میرے پورے خاندان کو) محترم و مکرم جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ساتھ "ندیم بھائی" بھی مل گئے۔

اعلانِ آزادی کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کا رُخ کیا، کراچی پہنچے، اور پھر لاہور چل دئیے۔ ہمارے کئی احباب نے بہت جلد لاہور ہی پہنچنے کا ارادہ ہم پر ظاہر کیا تھا۔

لاہور ریلوے ویٹنگ روم میں سامان اتارنے کے بعد اپنی بڑی بہن اور ایک ہم سفر دور کے رشتے دار کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر شہر میں نکلی۔ کسی ڈاکٹر کی تلاش تھی کیونکہ میرا ہاتھ بری طرح جل کر پک گیا تھا۔ ڈاکٹر ملنے سے پہلے "مکتبۂ اردو" اور "مکتبۂ جدید" مل گئے۔ لاہور کے یہ ادارے اس میلے میں ہر چیز سے زیادہ "اپنے" نظر آئے اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوا اور انہی کی مخلصانہ مدد سے لاہور پہنچنے کے دو دن کے اندر ہم اس گھر میں بیٹھے ہوئے تھے جو ابھی تک میرا مائیکہ ہے۔ قلم کا رشتہ اتنا مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل ہمیں معلوم نہ تھا۔

مہربان شہر لاہور کی نسبت روڈ کے اس گھر سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر میں پہلی بار ندیم بھائی آکر ہم سب سے ملے اور ہمیں تسلی دی۔

اسی مکان کے دروازے پر کچھ عرصے بعد "مکتبۂ افسانہ خواں" کا بورڈ لٹکایا گیا اور اسی گھر میں بھائی محمد طفیل کی شرکت سے "نقوش" نکالنے کی اسکیم تیار ہوئی۔

اسی گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہم دونوں بہنیں اور ندیم بھائی سر جھکا کر گھنٹوں کتابت شدہ کاپیاں پڑھتے، مسودات منتخب کرتے اور ادیبوں کو خطوط لکھتے۔

اسی کمرے میں ندیم بھائی نے آکر یہ خبر سنائی تھی کہ "نقوش" کی اشاعت پر چھ ماہ کے لیے سیفٹی ایکٹ کے تحت پابندی لگ گئی ہے (ایسی ہی پابندی "سویرا" اور "ادب لطیف" پر بھی لگائی گئی تھی)

"نقوش" کے دس شمارے مرتب کرنے کے بعد اسی گھر میں مجھے یہ علم ندیم بھائی کی زبانی ہوا کہ اب ہمارا "نقوش" سے کوئی تعلق نہ ہوگا کیونکہ بھائی طفیل کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اس گھر سے میری اور بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ مثلاً اسی گھر میں خدیجہ کی منگنی کی رسم ندیم بھائی کے بھانجے ظہیر بابر کے نام پر ادا کی گئی اور میں خدیجہ کا ساتھ چھوٹ جانے کے خیال سے چپکے چپکے روتی رہی۔

اسی گھر میں احمد علی خاں کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنائی گئی تو میں اس گھر کو چھوڑ دینے کے خیال سے اداس ہو گئی۔

پھر ایک دن اسی گھر کے دروازے پر ہم دونوں بہنیں دلہنیں بنی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئیں تو ہمارے بھائیوں نے ہمیں سہارا دے کر نئی زندگی کے حوالے کر دیا۔

اور پھر جب میں اس گھر میں ذرا دیر کو آتی اور مجھے "اپنے" گھر جانے کی جلدی پڑتی تو میرا چھوٹا بھائی کہا کرتا "سب لڑکیاں شادی کے وقت جھوٹ موٹ روتی ہیں — اب ہمارے پاس ایک دن گزارنا دوبھر ہے؟ — قطعی فراڈ ہیں آپ لوگ —"

زندگی کا سب سے زیادہ طویل عرصہ لاہور میں گزارا ہے۔ لیکن جب میرے شوہر احمد علی خاں نے "پاکستان ٹائمز" کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو کراچی آنا ہوا۔ اب تقریباً ڈیڑھ سال سے کراچی میں قیام ہے۔

دو بچیوں کی ماں ہوں۔ پانچ افسانوی مجموعوں اور ڈراموں کے ایک مجموعے کی مصنفہ ہوں — کچھ مضامین بھی مختلف موضوعات پر لکھے ہیں — ایک طویل ڈرامہ اور ایک ناول مکمل کرنے کا ارادہ ہے — کوئی ایسی چیز ابھی تک لکھنے کا ارمان ہے جسے چھپنے کے بعد پڑھوں تو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔

احمد عباس

میرے بچپن میں سب سے پہلی اور سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں ہمارے سارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اوّلیں یادیں ان کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ گیارہ برس ہوئے لگ بھگ اسّی برس کی عمر میں اُنھوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی مختصر ڈاڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور ان کے گورے چہرے پر جھرّیوں کا بھی کوئی نشان نہ تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں ان کی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل و دور اندیشی سے انسانی زندگی کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سندباد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔ در اصل ہم بچپن میں خدا کی ہستی کو بھی اپنے نانا کی نورانی صورت اور بزرگانہ شان ہی میں تصور کرتے تھے۔ سُنا تھا کہ خدا ساری کائنات میں بزرگ و برتر ہے۔ سو ہمارے نانا (جنھیں ہم بابا کہا کرتے تھے) بھی ہمارے قصبے کی سب سے بزرگ و قابلِ احترام ہستی تھے جن کا حکم ہر کوئی مانتا تھا۔ سُنا تھا کہ خدا نیکی سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور بدی سے ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ بس یہی خصوصیت ہمارے بابا کی تھی۔ وقت پر نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر ہمیں ان کے دربار سے دو پیسے ملتے تھے (اور اُس زمانے میں دو پیسے کتنی بڑی دولت ہوتے تھے اس کا آج اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا) اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر اُن کے ہاتھ سے ہمارے گالوں پر دو زنّاٹے دار چپت پڑتے تھے۔ جزا اور سزا کا مسئلہ ہمارے لیے بالکل ہی مبہم اور پیچیدار نہیں تھا۔

جب میں چار یا پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے اسکول کی دُنیا میں آیا اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوگئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی اسکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سیکرٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ در اصل ان کی زندگی تمام تر اس اسکول کے لیے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لیے اُنھوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی اے کی سند دولت اور اقتدار کی سنہری کنجی سمجھی جاتی تھی۔ یو پی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لیے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں۔ اُنھیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اس زمانے ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سشن جج ہو کر

دیا متاثر ہوا لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں اُن دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہی ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر جو تھائی تنخواہ پر پنشن لے لی اور جائداد بیچ کر اس کے روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام محبت اور محنت اس اسکول کے چلانے، پڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔ ۱۹۳۵ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو میں ان کے بستر مرگ کے قریب ہی تھا۔ موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے اُنھوں نے انتہائی کمزوری اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لیے آنکھ کھول اور ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے پوچھا: "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا؟" آخری دم میں بھی ان کو اسکول ہی کی فکر تھی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں متاثر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السبطین کی تھی۔ اگر نانا کی زندگی ایثار اور خدمت قومی کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے ان اصولوں کو سمجھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اُس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی جھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ حسب نسب۔ شرافت رذالت۔ اُونچے خاندان نیچ خاندان۔ سید، انصاری، شیخ، برہمن، مغل اور پٹھان کے امتیازات۔ شادی بیاہ کے رسوم میں فضول خرچیاں، تقریبیں، توہم پرستی، تعویذ گنڈے۔ پیری مریدی۔ نذر نیاز۔ عرس اور قوالیاں۔ مجلسیں اور ماتم۔ اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اُس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بُنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سُنا تھا نہ انسانی برابری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم بچے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "اُلّو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اس ملازم سے معافی نہیں مانگی۔ ابا کٹر قسم کے سادگی پسند (PURITAN) تھے۔ نہ اُنھیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے۔ نہ بیٹے کو انگریزی لمبے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوالی سننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سینما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں پان کھانے کی اجازت تھی نہ چائے پینے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو، توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پُوری توجہ دے۔ اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو ان کی اُصول پرستی کو کٹھ ملاؤں کی سی روکھی پند و نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر پُوچھتے۔ "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ مُنہ سے خون جاری ہے؟" چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آجاتا تو کہتے "ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑ آیا ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے اتنی ہی حد تک آزادیِ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر عمر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لیکن کبھی اُنھوں نے اپنے اُصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرما گرمی بھی کبھی کبھی ہو جاتی۔ لیکن جیسی دو دوستوں میں ہوتی ہے۔ ان کے کئی دوستوں نے بار بار اُنھیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ در اصل وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصولوں پر اٹل رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ اُن اصولوں کو وہ کتنا ہی غلط سمجھتے ہوں)

ماں باپ اپنی اولاد کے لیے نقد، مکان، جائداد، زمین ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ابا نے ان میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ مرنے سے چند روز پہلے مجھے ایک فہرست دی اُن رشتے داروں، دوستوں اور جاننے والوں کی جن کو اُنھوں نے مختلف رقمیں قرض دی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ کوئی ہنڈیاں، پرچے یا رسیدیں ہیں کیا۔ جواب میں اُنھوں نے سر ہلا کر نہیں کر دیا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ان میں سے کسی پر کبھی قرض کی ادائگی کا تقاضا نہ کرنا۔ ان لوگوں کے پاس ہوگا تو وہ خود واپس کر دیں گے۔ ساری رقمیں ملا کر چھتیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔ ایک ہزار روپے بھی واپس نہیں ملے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اب پاکستان چلے گئے ہیں اور مدت ہوئی میں نے وہ فہرست بھی پھاڑ دی ہے۔ ابا جو "جائداد" ہمارے لیے چھوڑ گئے وہ دوسری ہی قسم کی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر اُن میں اور مجھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نظر نہیں آتی۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی، میں روزانہ شیو کرتا ہوں۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، میں قمیص اور پتلون پہنتا تھا۔ وہ مسلم کانفرنس کی فرقہ وارانہ سیاست کو سراہتے تھے، میں کانگریس کے دائیں بازو کو بھی رجعت پسند قرار دیتا ہوں اور کوشاں ہوں کہ ہمارا ملک جتنی جلدی ہو سوشلزم کی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ کبھی فلم نہیں دیکھتے تھے، میں فلم بناتا ہوں۔ وہ عورتوں کو پردہ کرانے کے حامی تھے اور میں اس کا مخالف ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ ان کو میری شخصیت اور میرے کردار میں میرے والد کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے میں بھی ان کی طرح ضدی ہوں۔ کوئی کہتا ہے وہ بھی میری طرح "غیر مقلد" (NON CONFORMIST) تھے۔ کسی کی رائے ہے کہ میں بھی ان کی طرح روپے پیسے کی طرف سے لاپروا ہوں اور کوئی کہتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خود سر اور خود رائے ہیں اور شاید وہ غلط نہیں کہتے۔ میرے عقائد اور خیالات میری نسل اور میرے زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن جن اثرات نے میرے بنیادی کردار کی تشکیل کی ہے۔ ان میں (ہر معمولی انسان کی طرح) میرے والد اور والدہ کی شخصیات اور سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

میرے ابا اور میری اماں کے کرداروں کا تضاد نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز تھا۔ جن چیزوں کو ابا ناپسند کرتے تھے (ریشمی جامے، سرمہ، کاجل، مسی، چوڑیاں، زیور، بچوں کے لیے ریشمی کپڑے) ان سب کو اماں پسند کرتی تھیں۔ ابا کا اصرار تھا کہ ان کے بچے کھدر کے سادہ کپڑے پہنیں، مگر اماں آنکھ بچا کر ہمیں مل کے کرتے، لٹھے کے پاجامے اور عید پر ریشمی شیروانیاں بنا کر دیتی تھیں۔ ابا کبھی ہمیں ڈانٹتے تو وہ ہمیں پچکار کر تسلی دیتیں۔ ایک طرف سے سختی اور دوسری طرف سے نرمی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بچوں کی زندگی میں آپ سے آپ ایک قسم کا توازن آگیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنے بچوں کی تربیت کا یہ پروگرام بنایا تھا۔

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں بھی (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم

اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پُورا احساس ہُوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہُوا اس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں۔ جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آ جاؤں۔ مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں۔"

فسادات کے بیس بائیس دن انھوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں جیسی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا اور پان جو اماں کی زندگی کا اہم جزو تھا۔ روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لیے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا اور راتوں رات برقع پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے۔ تیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لُٹ گئے اور شرنارتھیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لیے بُرقع ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہو گا۔ مگر پہلے الفاظ جو ایئرپورٹ پر میں نے ان سے سُنے وہ یہ تھے: "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے۔"

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے اُنھوں نے کہا: "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے۔ نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے، نہ ہندوؤں اور سکھوں نے۔ سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ اُنھوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا۔"

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھہرا ہُوا تھا۔ یہ سُن کر کہ اُس کے شہر شیخوپورہ میں بہت سے ہندو مارے گئے ہیں اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات وہاں سے پیدل چل کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے۔ میری ماں بہت دیر تک روتی رہیں اور پھر مجھے الگ لے جا کر کہا: "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمھارا بھائی ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اس طرح سے ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کیے ہیں۔" رواداری اور انسان دوستی کی قدریں میں نے کسی کتاب سے نہیں حاصل کیں، اپنی ماں کی شخصیت سے ورثے میں پائی ہیں۔

شخصیات جنھوں نے مجھے متاثر کیا، یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتے داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہیں میرے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو آج گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سیکرٹری ہیں لیکن میں بچپن سے آج تک انھیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک IDEAL ہوتا ہے

اور عام طور سے وہ اس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو وہ دیکھ کر بچہ اس کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے کیمپ میں اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اسی طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لیے بچپن سے ہی اپنے چچا زاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ جب میں پانی پت کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو ان کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لیے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آجائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں۔ اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے ان کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لیے اور بھی دلچسپی اور حیرت اور رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن۔ لیڈز۔ کیمبرج۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ برلن۔ جینوا۔ ہم اپنے اسکول کے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے۔ کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے اور پھر وہ ولایت سے واپس آگئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر۔ اور علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اپنے نانا کے ساتھ میں بھی سفر کر کے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی، لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی ایک واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہوگی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ سر آغا خان۔ سر محمد اقبال۔ سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے۔ اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہیے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی۔ ان تمام مشاہیر و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی اسٹیج کی داہنی طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے ان کی مخالف سمت سے۔ جب ان سب کی تقریریں ختم ہو گئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انگریزی الفاظ نہ سمجھنے پر بھی میں ان کے زور کلام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ کتنی روانی تھی ان کی تقریر میں۔ کتنا سلجھا ہوا اور مدلل تھا ان کا انداز۔ کیسا جادو تھا ان کی آواز میں کہ ہر شخص مسحور اور مبہوت بنا ہوا ہمہ تن گوش بنا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا ان کے بیان میں کہ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور مسٹر علی امام جنھوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرت رائے سے تجویز پاس ہو گئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا: "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی انھوں نے، ایک دن میں بھی ان جیسا بنوں گا۔ ان جیسی تقریریں کروں گا مگر اس کے لیے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا۔ لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا . . . مگر میں سب کچھ کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کمشنر، اب صحافی اور مفکر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ان کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی "چھاپ" ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی: ان کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر صرف پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی ان کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ - جن کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو - جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ ہمیں حفظ یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند - جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا، انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

پورن چند جوشی - جن سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ کمیونسٹ مارکسی اصولوں کو دہرانے والی مشینیں ہی نہیں ہوتے انسان اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی مختلف منزلوں اور موڑوں پر میں ان سب ہی سے تو متاثر ہوا ہوں۔

اور واقعات:

پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب میں صرف چار پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے ان کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں۔ کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑا سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سے لے کر سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں کھڑے رہے۔ کئی بچوں کو لو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی مہلک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں، مشین گنیں، رائفلیں، بندوقیں، پستول، بھالے، تلواریں۔ ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لیے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا، اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ بچوں کے دلوں میں اس فوج کے رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب

بچے یا تو جنس جنس کر کہہ رہے تھے: "ارے کیسے لال لال مُنہ کے انگریز تھے جیسے بندریاں بندر" اور یا تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے جیسے:-

"کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"

اور اُس دن ایک چار پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا: "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا" اور اب چالیس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیوں اب بھی میں سرکاری نوکری کے خیال سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ۔ شاید ۳۳ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ وہیں تو تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی۔ لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لیے ایک گاؤں میں دو پہر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان۔ لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے۔ جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالا جس پر کروڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دُبلے پتلے سُوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کے لیے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ۔ جیسے انھیں یقین ہو کر ان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی . . . . .

اُس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

۳۸ء میں میں نے دُنیا کا سفر کیا۔ اس سفر نے میرے دماغ کو قوم پرستی کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی اشتراکیت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری کی اتنی صنعتی ترقی کے باوجود بھی افلاس ہے اور انگلستان میں سامراجی ہونے کے باوجود ترقی پسند اور اشتراکی حلقوں میں ہندوستان کے قوم پرستوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی ایک گمراہ کُن سیاسی فلسفے کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسپین میں فاشزم اور جمہوریت کے درمیان آنے والی جنگ کا ریہرسل ہو رہا ہے . . . .

اسی سفر کے دوران میں میں نے نیویارک کے قریب ایک قصبے پوکیپ سی (POUGHKEEPSIE) میں تمام دُنیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی جو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر سال ہی کہیں نہ کہیں نوجوانوں کے ایسے بین الاقوامی جمگھٹے ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال میں ماسکو میں تھا جب وہاں لگ بھگ سو سوا سو اور ملکوں سے آئے ہوئے چالیس ہزار نوجوان اکٹھے ہوئے لیکن ۱۹۳۸ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہماری کانفرنس میں صرف چھ سات سو نمایندے شریک ہوئے تھے جو شاید ۳۰-۳۵ ملکوں سے آئے تھے لیکن پھر بھی کئی وجوہ سے اس کانفرنس کا نقش میری یاد پر آج تک موجود ہے۔ میرے (اور دوسرے نمایندوں کے لیے بھی) اتنے مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امریکی، انگریز، فرانسیسی، جرمن (جو ہٹلر کی خفیہ پولیس سے چھپ کر آئے

آئے تھے) اطالوی جو مسولینی کے چنگل سے کسی طرح چھوٹ کر آئے تھے۔ میرے جیسے ہندوستانی نوجوان جو برطانوی سرکار سے مختلف بہانوں سے پاسپورٹ لے کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ پائے تھے۔ چینی نوجوان جو جاپانی فاشزم کے خلاف اس وقت بھی برسرپیکار تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس کانفرنس میں حیرت انگیز تنوع تھا۔ کہنے کو تو اس کے بارے میں بھی مخالفین نے کہا اور لکھا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا ڈھونگ ہے لیکن اس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، لبرل، قوم پرست اور یہاں تک کہ برطانیہ کی قدامت پرست CONSERVATIVE پارٹی کے وہ نوجوان افراد تک شامل تھے جو ونسٹن چرچل کی پیروی میں فاشزم کے مخالف تھے۔ ہندوستان سے جو نمائندے گئے تھے۔ ان میں علاوہ اور نوجوانوں کے مرحوم یوسف مہر علی تھے۔ جو اس وقت بھی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی کمیونسٹ ممبر رینو چکرورتی بھی جو اس وقت انگلستان میں پڑھتی تھیں اور شاید اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی میں تھیں۔ اس کانفرنس کے مباحثوں کا ایک دلچسپ پہلو جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ تھا کہ نمائندوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی خاطر کچھ عرصے کے لیے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو ملتوی یا کم کر دیا جانا چاہیے تاکہ امریکہ کے لبرل عقیدے کے سرمایہ داروں اور فرانس اور انگلستان کے ان سیاستدانوں کو بھی جو سوشلسٹ نہیں تھے ہٹلر اور مسولینی کے خلاف محاذ میں شامل کیا جا سکے۔ لیکن ہم ہندوستانیوں کے لیے تو برطانوی سامراج اور جرمن فاشزم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ یہی تھا کہ ایک بلا ہمارے گھر میں موجود تھی اور دوسری آفت کے بارے میں ہم نے صرف سنا تھا۔ جب کانفرنس کا بنیادی رزولیوشن پیش ہوا تو اس میں سامراجی مقبوضات اور نوآبادیات کے لیے مکمل آزادی کے بجائے بتدریج جمہوری خودمختاری کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ بھلا اس سے ہم ہندوستانی قوم پرستوں کی کہاں تسکین ہوتی۔

ہندوستان کی طرف سے مجھے اس تجویز پر بولنا تھا۔ میں نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اتنی شدومد سے تقریر کی اور اتنے زور شور سے ہندوستان اور ایسے دوسرے ملکوں کے لیے فوری مکمل آزادی کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کے غیر سوشلسٹ نمائندوں نے تو کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن تقریر کے ختم پر باقی نمائندوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں اور پلیٹ فارم سے نیچے اترتے ہی مجھے کئی ملکوں کے نوجوانوں نے گھیر لیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان میں سے ایک جرمنی سے نکالا ہوا فاشسٹ دشمن نوجوان تھا جس کے چہرے کی لکیروں میں اس کی جھیلی ہوئی مصیبتوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ بنانے کی خاطر ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ہندوستانیوں سے کہیں کہ تم سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو بند کر دو۔ یقین مانو کہ ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے پورے پورے حامی ہیں۔ ایک انگریز ترقی پسند نوجوان نے بھی آ کر مجھ سے کہا کہ میری تقریر سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ فاشزم کے خلاف بین الاقوامی محاذ بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہی تھی کہ ہندوستان جیسے ملکوں کو جلد از جلد مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ ان کے عوام فاشزم کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ ان دونوں کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد گو رزولیوشن میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ ہندوستان اور دیگر سامراجی مقبوضات میں فوری جمہوری آزادی کا نفاذ ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی جو نوجوان شریک ہوئے تھے ان میں سے بیشتر نے اتنے جوش و خروش سے ہماری آزادی کی حمایت کی کہ اس کانفرنس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

وہ کانفرنس فاشزم اور جنگ کو روکنے کے لیے منعقد کی گئی تھی لیکن بہت دیر میں ہوئی۔ اس کانفرنس کے ختم پر میں فرانس اور

انگلستان میں وقت بتایا جب برطانوی وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے چیکوسلواکیہ کا سودا کر رہے تھے اور ابھی سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔

میرے جیسے سب ہی ترقی پسند فاشسٹوں اور نازیوں کے خلاف تھے لیکن ہمارے اپنے ملک میں تو برطانوی سامراج ہمارے سر پر سوار تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگ آزادی کا آخری دور شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا۔

۹ اگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دے دیا۔ اسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں عام جلسہ ہوگا جس میں کستورا بائی گاندھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان میدانِ جنگ کا نقشہ بنا ہوا تھا مگر یہ جنگ اس جنگ سے مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف نہتے مرد، عورتیں، بچے۔ دوسری طرف ہزاروں مسلح پولیس والے ان کے افسران کے ساتھ جن میں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں، بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور آنسو لانے والی گیس کے بم۔ کئی گھنٹے تک یہ جنگ جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں۔ رائفلوں سے فائر کیے گئے۔ آنسو لانے والی گیس کے سینکڑوں بم پھینکے گئے جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے۔ جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں سی لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا۔ لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دوسرے نے ترنگا سنبھال لیا۔ اگر کوئی گولی کھا کر گرا تو والنٹیر اسے فوراً اٹھا کر لے گئے اور اس کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ بس پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے کر نکل پڑیں اور نہتے مرد ایک بار پھر پولیس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ جھنڈے لہرانے لگے۔ پولیس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جھنڈے لہرائے۔ آزادی کا پیغام دوبارہ پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی والوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولیس اور فوج کو شکست فاش دی۔

جنگ آزادی یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا۔ سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ بولے تھے لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس جنگ آزادی کو دیکھا۔ اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی تقریباً اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی ان جانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک مکان کی دوسری منزل پر لے گئے اور پھر نہ جانے کیا کر کے نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی جلن کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی۔ جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا دھندلکا صاف ہو گیا۔ دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شری رام چندر، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی

جگہ ہے جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول رکھے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

سو برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی اور پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں کچھ سٹپٹا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرے پاس آ کر مرہٹی میں بولیں: "کیوں اٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا: "نہیں اب میں ٹھیک ہوں، رات ہو گئی ہے، اب مجھے جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ پہلے دودھ پی لے۔" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں۔ سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا: "ماں جی! میں مسلمان ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ سوچ میں ضرور پڑ جائیں گی کہ اب اس مسلمان سے کیسے برتاؤ کیا جائے مگر انھوں نے ایک سیکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں: "تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا: "معاف کرنا ماں جی۔ میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی۔"

اُس بوڑھی، گمنام، شاید ان پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں: "تو کیا ہوا بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے۔" اور اسی وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور ان کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے دھیرے دھیرے دل کے راستے۔"

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء۔ آزادی کا پہلا دن۔ کسی قوم کی زندگی میں یہ دن ایک ہی بار آتا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ دن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آزادی کے اس جشن میں شرکت کی۔ اس واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر بھلا کون رہ سکتا تھا۔ بمبئی میں گوالیا ٹینک کے میدان سے وہ یادگار جلوس چلا جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ میری یاد میں پہلی بار اور (فی الحال) آخری بار تمام سیاسی پارٹیوں اور تمام فرقوں اور جاتیوں اور ہر پیشے کے لوگوں نے مل کر ایک قومی تہوار منایا۔ کانگریسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، ہندو مہا سبھائی، جن سنگھی، مسلم لیگی۔ اس روز ہر مسلک کے پیرو ایک ہی رُخ، ایک ہی راستے پر دوش بدوش چل رہے تھے۔ ادیب، کالجوں کے پروفیسر، طالب علم، مل مزدور، کلرک، چپراسی، تاجر، سیٹھ اور بھنگی اور جوتا پالش کرنے والے چھوکرے اور مشہور فلم اسٹار اور بین الاقوامی شہرت کی ناچنے والیاں اور چھوٹے موٹے دوکاندار اور ہوٹلوں کے بیرے اور باورچی اور بھکاری اور فقیر، اور کھدر پوش اور سرکاری افسر اور سٹے کا —— وہ جلوس نہیں تھا ساری ہندوستانی قوم تھی جو سڑکوں پر امڈ آئی تھی اور آزادی کی خوشی میں نعرے لگا رہی تھی، گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ایک مشہور اور مقبول فلم ایکٹر ڈھول بجا رہا تھا اور اسی کی لے پر ایک پڑھی لکھی کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی جو لندن اور پیرس اور نیویارک کی اسٹیج پر ناچ آئی تھی ناچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک کالا سا، دبلا سا مل مزدور ناچ رہا تھا اور ایک ادیب اور جرنلسٹ

یہ لوٹ مار، یہ مار دھاڑ اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے، ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اور اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام، انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمھارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں: "احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو چالیس برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ پانی پت جو اب بھی ہندوستان میں ہے اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین، جنھوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کر دی اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور سیاسی اختلافات میں رواداری سکھائی اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النسا بیگم جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں . . . . مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں — روس میں اور امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں — پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان JOHN DONNE نے کہا ہے:

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے۔
ہر انسان زمین کا ایک ذرّہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ میں اور انسانیت جُدا نہیں ہیں۔"

. . . . اور اسی طرح دن، مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لیے (اور ہر کسی کے لیے) لازمی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جوش ملیح آبادی

(لڑکپن کی چند جھلکیاں)

میری پیدائش

میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت نہیں لکھی جاتی تھی میری دادی کو قمری مہینوں کے حساب سے جو میری تاریخ پیدائش یاد تھی، اس کے لحاظ سے غالباً ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوا تھا۔

محل و وقت ولادت

ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج میں صبح کے چار پانچ بجے میری ولادت ہوئی تھی، جاڑے کا موسم تھا۔

میرا بچپن اور لڑکپن

دادی جان فرمایا کرتی تھیں کہ تو اس قدر لاغر پیدا ہوا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی میری روح نکل گئی تھی اس کمزوری کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے دس سال تک پیٹ کے امراض میں گرفتار رہا تھا۔ میرے گھر میں ہر آن گہما گہمی رہتی تھی، زنانے میں لونڈیوں، باندیوں، ماماؤں، اصیلوں، دائیوں، کھلائیوں، مغلانیوں، پیش خدمتوں، استانیوں اور کہانی کہنے والیوں کا ایک لشکر چلتا پھرتا نظر آتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ تعلقے سے آنے والی رعایا کی عورتوں کا بھی ہجوم رہتا تھا جو فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے، پانی گرم کرنے اور بھرنے، انگیٹھیاں دہکانے، غلہ صاف کرنے اور چکیاں پیسنے کی خاطر باری باری سے آیا کرتی تھیں۔

اسی کے دوش بدوش اس مستقل آبادی میں ان عورتوں کی آمد و رفت اور قیام سے اضافہ ہوتا رہتا تھا جو امداد حاصل کرنے اور آرام سے وقت گزارنے کے واسطے آئے دن آ جاتی رہتی تھیں۔ یہی چہل پہل مردانے میں بھی رہا کرتی تھی، جہاں سپاہیوں، خدمت گاروں، ضلع داروں، کارندوں، منشیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں اور غلاموں، باورچیوں، پہرہ دینے والوں، حقہ بھرنے والوں، بٹیر اور مرغ پالنے والوں، داستان کہنے، پنکھا کھینچنے والوں اور گھوسیوں کا ایک دریا سا بہتا رہتا تھا۔

اس مستقل آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا ان ارباب حاجت اور ان احباب شعرا کی آمد و رفت سے جو آئے دن آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض بلا کسی وجہ کے مہینوں ٹھہرا کرتے تھے۔

میرا مزاج

میرا مزاج انتہائی سخت گیری اور غیر معمولی قہر و مہر کا ایک عجیب نقطۂ اتصال و مجمع الاضداد تھا، غصہ آتا تھا تو اس قدر کہ خدا کی پناہ اور پیار آتا تھا تو اس قدر کہ الامان۔ قدرتی طور پر مجھ میں اپنے باپ کا اثر تھا۔ اپنی انتہائی بدمزاجی میں پھوپھی بہن انیس جہاں کو جب کہ وہ میرا منہ دھلاتی تھی ایسی ایسی پٹخنیاں دیتا اور اس کے بال اس قدر زور سے نوچتا تھا کہ وہ بلبلا اٹھتی تھی، اور جب گھر کی بڑی بوڑھیاں اسے میرے چنگل سے چھڑانے آتی تھیں تو ان سے الجھ جاتا اور دیوانہ وار چیخیں مار مار کر کہتا تھا، چھوڑ دو چھوڑ دو، میں اسے مار ڈالوں گا، مار ڈالوں گا۔

مجھے برفی کھانے کا بہت شوق تھا اور کنجی حلوائی کی دکان سے میرے واسطے برفی کا ایک بہت بڑا دونا روزانہ آیا کرتا تھا۔

میری کھلائی تھیں ستّر برس کی عباسی خانم، میں جب انہیں برفی کھلانے پر آتا تھا تو چاہتا تھا کہ آدھے سے زیادہ دونا انہیں کھلا دوں اور جب وہ بیچاری دو ایک ڈلیاں کھا کر یہ کہتی تھیں کہ بیٹا بس، میں اب نہیں کھا سکتی تو ان کے سفید بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیتا تھا اور وہ بیچاری تھرتھراتی آواز میں

۱۔ تعلقے کے ان باسیوں کو گوتیا کہا جاتا تھا جنھیں مالک کی خدمت اور رعایا کی نگرانی کے معاوضے میں معافی کی زمین دی جاتی تھی۔

وہیں مارتی تھیں کہ خدا کی پناہ شبیجے[1] مارے ڈال رہا ہے۔

باپ سے ہم سب بھائی بہن بے حد ڈرتے تھے لیکن میں شدتِ غضب میں ایک روز ان سے بھی گستاخی کر بیٹھا تھا۔

مرحوم کا حکم تھا کہ گھر سے بے اجازت قدم باہر نہ رکھو اور جب باہر جاؤ تو دو ایک سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاؤ۔

ایک روز والد مکان پر موجود نہیں تھے کہ ان کے ایک دو قدم کے پڑوسی دوست مشیر احمد خاں کی والدہ نے اپنے لڑکے مشتاق احمد خاں کی معرفت مجھے بلا بھیجا اور بڑے مزے کی بھنڈیاں منگوا کے بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے مجھے کھلائیں۔

بھنڈیاں کھا کر میں اپنے مکان میں جب داخل ہوا تو دیکھا کہ والد آرام کرسی پر دراز ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ پوچھا کہاں گئے تھے میں نے کہا مشیر خاں کے گھر۔ فرمایا کس سے اجازت لی تھی۔ میں نے کہا آپ یہاں تھے ہی نہیں۔ فرمایا سپاہیوں کے بغیر اکیلے کیوں گئے تھے۔ میں نے کہا سامنے ہی تو مشیر خاں کا مکان ہے۔ یہ سنتے ہی والد نے میرا ہاتھ پکڑا، زنانے میں لے گئے، اور وہیں زمین پر سے اٹھا کر ایک پتلی سی بید میری پیٹھ پر اتنے زور سے ماری کہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "اللہ کرے مر جائے۔"

بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، والد نے مجھے اس قدر چھڑیاں ماریں کہ میری کھال ادھڑ کر رہ گئی۔ اگر عین وقت پر میری دادی آ کر مجھے نہ بچا لیتیں تو میں بے ہوش یا ہلاک ہو جاتا۔ اس وقت جس قدر غیظ و غضب مجھ پر آخر تک طاری رہا۔ ویسا زندگی بھر میں شاید ہی کبھی طاری ہوا ہو۔

مجھے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ ہر چند میری ماں کو امورِ خانہ داری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر چونکہ وہ مجھے اپنے سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھیں اس لیے میرے واسطے صبح کو دودھ کا پیالہ خود تیار کیا کرتی تھیں، لیکن اگر دودھ میں کسی روز کوئی ذرہ سا تیرتا نظر آ جاتا تھا تو میں پیالہ ان کے ہاتھ سے لے کر اسے زمین پر اس طرح پٹک دیتا تھا کہ وہ چور چور ہو کر رہ جاتا تھا اور میری ماں بے اختیار رونے لگتی تھیں۔

نہیں معلوم کس بنا پر "میاں بسنت" میری چڑ ہو گئی تھی، ادھر کسی نے میاں بسنت کہا، ادھر میں نے اس پر حملہ کر دیا۔

ایک روز میرے باپ کی مجلس میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے کہ کھیلتا کھیلتا میں ادھر نکل آیا۔ مشیر احمد خاں نے جو بلا کے ظریف واقع ہوئے تھے ـــــ پیچھے سے ان بزرگ کے کان میں کچھ کہا۔ ان بزرگ نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور بڑی محبت سے کہا "ادھر آیئے میاں بسنت" بس پھر کیا تھا، میں نے چیتے کی طرح جست کر کے ایک آن میں دونوں ہاتھوں سے ان کی داڑھی پکڑ لی۔ اور لگا زور زور سے جھٹکے دینے۔ بے چارے مولانا صاحب کی پگڑی اور عینک زمین پر گر گئی، اور لگے وہ چیخیں مارنے۔

جب میرے ماں باپ نے ڈانٹ کر ان کی داڑھی چھڑوائی تو ان کی داڑھی کے جو بال میری مٹھیوں میں ٹوٹ کر آ گئے تھے انہیں زمین پر گرا کر میں اپنے پاؤں سے روندنے لگا اور ان کی جانب نفرت سے انگلی اٹھا اٹھا کر چیخنے لگا "کیوں بے خقشے پھر کہے گا "میاں بسنت"۔

ایک دن ہوائی بندوق لیے میں اپنے چچا کے پھاٹک پر کھڑا ہوا تھا کہ ادھر سے ایک نائی کا لڑکا گزرا اور مجھے سلام کیے بغیر بڑھنے لگا، یہ گستاخی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی۔ میں نے فوراً اپنی بندوق بھری اور اس پر زن سے داغ دی۔

وہ لڑکا گر گیا اور زمین پر لوٹنے لگا اور مجھ ظالم نے قریب جا کر اس کے اتنی ٹھوکریں ماریں کہ خود میرا پاؤں دکھنے لگا۔

---

[1] مجھے شبیجے بجیا کہا جاتا تھا۔

مجھے کھیل کود کا مطلق شوق نہیں تھا۔ مجھے نہ گولیاں کھیلنا آیا، نہ پتنگ اڑانا آیا، نہ کبڈی کھیلی، نہ فٹ بال، نہ شطرنج کھیلنی آئی، نہ تاش اور نہ کبوتر بازی ہی آئی۔

لے دے کر میرے صرف دو شوق تھے۔ کمرے کو سجانا اور ہم سنوں کو پڑھانا۔ میرے کمرے کی آرائشی چیزوں میں سے جب کوئی چیز کسی ملازم سے ٹوٹ جاتی تھی یا اپنے کمرے میں ایک تنکا بھی مجھے نظر آجاتا تھا تو ملازموں کو مارتے مارتے ادھ موا کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح ہم سن بچوں کو ماسٹر صاحب بن کر میں آٹھ آٹھ سبق دیا کرتا تھا اگر وہ ان کو یاد نہیں ہوتا تھا تو چھڑیوں سے ان کی کھال ادھیڑ دیا کرتا اور ان کے کانوں سے پکڑ کر انہیں چھڑیاں مار مار کر اتنا رلاتا تھا کہ ان کی سانس پھول جایا کرتی تھی اور وہ جس قدر زیادہ روتے تھے، اسی قدر مجھے آسودگی حاصل ہوتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے میں اپنے محل کے زنانے حصے کی انگنائی میں، اپنے گھر کے غلام زادے حسین بخش کو، یاد نہیں کس خطا پر، دریچے کی سلاخ سے مار رہا تھا کہ دادا میاں آگئے۔ دادا میاں کو دیکھتے ہی میرا ہات رک گیا۔ میں نے حسین بخش کو اس درندے کی نگاہ سے دیکھا کہ جس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔ سلاخ کو دور پھینک دیا اور ضبط کیے ہوئے غصے کے اثر سے تھر تھر کانپنے لگا۔ دادا میاں نے مجھے دیکھا، غور سے دیکھا، اس جوہری کی نظر سے دیکھا جو جواہر کے ٹکڑے ٹکڑے کو پرکھتا ہے۔ میرے قریب آئے، مسکرا کر میری پیٹھ ٹھونکی، میرا ہات پکڑ کر میرے باپ کے کمرے میں لے گئے۔ دادا میاں کو دیکھتے ہی میرے باپ نے سرو قد ہو کر تسلیم کی۔ دادا میاں نے میرے باپ سے کہا بشیر مبارک ہو، تمہارا یہ بیٹا بڑا سورما نکلے گا۔ میرے باپ نے ہات جوڑ کر کہا، ابا، یہ ایک روز مجھ سے گستاخی کر چکا ہے۔ میں نے جب اس کو ایک چھڑی ماری تو یہ مجھ سے لپٹ گیا اور لڑ کے مر جانے پر تل گیا۔

دادا میاں مسکرا کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے، بشیر اس فقرے کو بھی بچے کی گستاخی پر محمول نہ کرو، یہ تو ایک بہادر بچے کی ایک بے ساختہ جبلت تھی جس نے یہ ارادہ اس فقرے کا لباس پہن لیا تھا۔ بشیر، سپاہ گری میں ہماری کئی پشتیں گزر گئی ہیں۔ ہم نے اپنی تلوار کی دھار پر اتنے بڑے بڑے محل کھڑے کر لیے ہیں۔ ہم سے زیادہ کون بزدلی و بہادری کو پرکھ سکتا ہے۔ میرا لاڈلا جس تیوری سے غلام کو مار رہا تھا، اور مجھے دیکھ کر رک جانے والے غصے نے اس کے اندر جو ہیجان پیدا کر دیا تھا، ناممکن ہے کہ یہ تمام علامات کسی بزدل میں پیدا ہو سکیں۔

اس کے بعد دادا میاں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھے دیکھا، جیب سے دو اشرفیاں نکال کر مجھے دیں کہ ان کا میوہ کھانا، اور دس روپے اس غلام کو دے، جس کو تو مار رہا تھا، اور پھر فرمایا اگر تیری جوانی تک میں زندہ رہا تو تیرے کتخدائی میں تیرے نام دو گاؤں اور دو باغ براہ راست لکھ دوں گا۔

اس کے بعد دادا میاں نے اٹھتے ہوئے میرے باپ سے کہا، دیکھو بشیر جہاں تک کہ بہادری کا تعلق ہے اس نقطے کو بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر بہادر بچپن میں اسی طرح شقی معلوم ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر وہ عزم، بردباری اور شفقت و اطاعت شعاری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ یہ بلاؤں سے تو بے شک دو ہات کر لیتا ہے، لیکن بیواؤں کے روبرو سر جھکا دیتا ہے۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا، اب میری محبت کے بھی چند واقعات سن لیجیے۔

میں اپنی کھلائی عباسی خانم سے جنھیں میں بڑی بی اماں کہا کرتا تھا، اس قدر محبت کرتا تھا کہ شفتالو، میوہ اور پھل جو کچھ مجھے ملتا تھا، میں انہیں کھلائے بغیر کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے سن کی معذوری کی بنا پر جب وہ کھانے سے انکار کر دیتی تھیں تو فرط محبت کی بنا پر ان بیچاری کے جبڑے زبردستی کھول دیا کرتا تھا۔

۱۔ یہ دادا میاں کی مخصوص قسم تھی۔

بڑی بی کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر چھتیا پور میں تھا۔ جب وہ رخصت لے کر دو تین دن کے واسطے اپنے گھر چلی جاتی تھیں تو میں اداس ہو جاتا اور ان کے حصے کے پھل اور مٹھائی بچا کر الماری میں رکھ لیتا تھا۔ اور جب ان کی جدائی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی تو ٹمٹم میں بیٹھ کر ان کے گھر پہنچ جاتا تھا وہ لاکھوں دعائیں دے کر مجھے چمٹا لیتی تھیں۔ اور میری ٹمٹم میں بیٹھ کر میرے گھر آ جاتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں سینٹ پال اسکول سے بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آیا تھا اور وہاں پہنچ کر بڑی بی کے انتقال کی خبر سنی تھی تو میں کھڑے کھڑے منہ کے بل گر گیا تھا، میرے دانت بیٹھ گئے تھے، گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا تھا۔ فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تھا اور کئی روز تک میں بستر سے اٹھ نہیں سکا تھا۔

اثنائے تعطیل میں بڑی بی کی قبر پر جاتا، دہاڑیں مار مار کر روتا، ان کی قبر کی مٹی کو رومال میں رکھ کر لاتا، اور اسے آنکھوں سے لگا لگا کر دن دن بھر رونا میرا اصول ہو گیا تھا۔

صبح کے وقت میرے دروازے پر جو فقیر اور جوگی صدا دیتے تھے میں کبھی ان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتا تھا، روپے پیسے کے ساتھ ساتھ میں انہیں مٹھائی اور پھل کھلاتا تھا، انہیں گنے دیتا تھا، اور کبھی کبھی رات کے کھانے کی جو اچھی چیزیں ہوتی تھیں، وہ بھی انہیں کھلاتا، یا ان کے ساتھ کر دیا کرتا تھا۔

میری دودھ بڑھائی کے بعد میری انا جو لکھنؤ کی سیدانیوں میں سے تھیں، میری ماں کے بے حد روکنے کے باوجود جب لکھنؤ چلی گئی تھیں تو میری حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ خدا کے لیے انا کو بلا لیجئے نہیں تو چڑک چڑک کر مر جائے گا، بچے کے دشمنوں کا کیا حال ہو جائے گا۔ میری بڑی بی جب مجھے انا کی جدائی میں روتا دیکھتی تھیں تو دری بچھا کر زمین پر مٹی کا پتلا بناتیں اور اس پر رنگین چادر ڈال کر کہتی تھیں کہ بیٹا یہ تیری انا لیٹی ہے، میں فوراً اس تودۂ خاک سے چمٹ کر لیٹ جاتا تھا اور مجھے اس قدر آسودگی محسوس ہوتی تھی کہ سو جاتا، اور پہروں سوتا رہتا تھا۔

جب میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد خاں پیدا ہونے والا تھا، تو اس کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی مجھے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اس کے واسطے جو کھلونے اور کپڑے تیار کیے گئے تھے میں انہیں سینے سے لگا لگا کر چوما کرتا تھا۔ میں نے اس کا نام ننھو رکھا تھا "میرا ننھو کب پیدا ہو گا؟" دن میں بار بار میں اپنی ماں سے پوچھا کرتا تھا، اور ایک روز چھوٹا سا جوتا کہیں سے اٹھا لایا تھا کہ میرا ننھو جب پیدا ہو گا تو اسے یہ جوتا پہناؤں گا۔

وہ غمناک شام اب تک مجھے یاد ہے کہ جب میری بڑی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے بعد میرے نانا اور ماموں ملیح آباد سے رخصت ہو کر آگرہ جا رہے تھے میں نانا کے دربچے سے چمٹ کر نکالا گیا تھا، اور گھر آ کر میں اس قدر رویا تھا کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہر صبح کو جو پھل اور میوہ مجھے ملتا تھا میں اسے جیبوں میں بھر کر باہر آتا اور غلام زادوں کے کاندھوں پر بیٹھ کر گھوڑے کی سواری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھل اور میوے کا ایک ایک دانہ ان کے منہ میں ڈالتا رہتا اور بسا اوقات گھوڑے سب کچھ کھا جاتے تھے اور سوار کے واسطے کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں حیدر خاں، جو کمزور اور بوڑھے آدمی تھے، وہ افیون کے خوگر تھے میں ہر صبح ان کے واسطے گھر سے دودھ اور بالائی لایا کرتا تھا اور وہ مجھے دعائیں دیا کرتے تھے کبھی کبھی میں افیون کے واسطے دام بھی دیا کرتا تھا، اور پھر والد سے اصرار کر کے میں نے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ سال بھر کی افیون ہمارے علاقے سے مل جایا کرتی تھی۔

ایک روز میں اپنی کھلائی بڑی بی کے پاؤں داب رہا تھا، ہر چند بڑی بی نے مجھے بہت روکا، اور یہ بھی کہا کہ بیٹا اگر کوئی دیکھ لے گا تو میرے چونڈے میں ایک بال بھی نہیں رہے گا، بڑی بی کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں برابر ان کے پاؤں دباتا رہا۔ اتنے میں ہمارے گھر کی ایک منہ زور بدمزاج خادمہ ادھر آ نکلیں اور بہت تڑخ کر بڑی بی سے کہنے لگیں، واہ بڑی بی واہ، جس کا کھاتی ہو اس کے بچے سے پاؤں دبواتی ہو، اچھی نمک حلالی ہے، یہ کہا اور [illegible]

معاً میری دادی کے پاس پہنچیں اور کہنے لگیں سنتی ہو بی بی، عباسی خانم بڑھیا، بچے سے پاؤں دبوا رہی ہے۔ مت ماری گئی ہے اس دُمتڑو کی۔

دادی جان نے مجھے اور بڑی بی ــ دونوں کو بہت بُری طرح پھٹکارا۔ ہم دونوں رونے لگے۔ بڑی بی تو روتی ہوئی چلی گئیں۔ میں رہ گیا۔ دادی کی پھٹکار پر بھی انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر تسلی دی اور کہا کہ بیٹا امیروں کے بچے غریب بڈھوں کے پاؤں نہیں دبایا کرتے، یہ بہت بُری بات ہے۔ اب کبھی ایسی بُری بات نہ کرنا۔ دادی جان کی امیر اور غریب کی اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہے کچھ جو مجھے میری آنکھوں میں ایسے غصّے کے شعلے بھڑکنے لگے کہ اگر وہ دادی نہ ہوتیں تو میری شکایت ضرور کر دیتیں۔

بھوت، پریت، آسیب، بسرا، چڑیل، جِنّی، بڑ تقی، پچھل پائی، دیو، جن، پری، خبیث، عفریت، شبیہ، مردہ، اگیا بیتال، برہم راکس۔

ہمارے تمام محلوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور تھے اور کوئی ایک بھی ایسا محل نہیں تھا جس کے متعدد گوشوں میں ان ارواحِ خبیثہ کا تصرف نہ مانا جاتا ہو اور آئے دن بڑی بوڑھیاں کل آدھی رات کو کوئی نہ کوئی دکھائی دینے والا واقعہ نہ بیان کرتی ہوں۔ خوفناک داستانوں میں پلنے والے بچوں کے واسطے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اندھیرے اُجالے کہیں آ جا سکیں، تنہا بیٹھیں، تنہا ٹہلیں یا تنہا سوئیں۔

میری نو برس کی عمر تک بڑی بی جب تک میرے ساتھ نہیں سوتی تھیں، ناممکن تھا کہ مجھے نیند آ سکے۔ میں جب رات کو محل سرا سے باہر جانے کا ارادہ کرتا تھا تو ڈیوڑھی میں گزرنے کے واسطے ایک ماما میرے ساتھ ہو جایا کرتی تھی۔ اور حد یہ ہے کہ جب غسل خانے جاتا تھا تو ایک خادمہ دروازے پر پہرا دیتی، اور باہر سے پکار پکار کر میری ڈھارس بندھاتی رہتی تھی کہ بیٹا ڈرنا نہیں، ہم دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

جب راتوں کو بستر پر لیٹے لیٹے میری نظر سنسان محل کے اس گوشے کی چھت کی منڈیر کی جانب اٹھ جاتی تھی جو چڑیلوں کی آماجگاہ سمجھا جاتا تھا تو ترچھے پنچھیں، وحشت کی پھُریری کی ہیبت سے ہوش پست ہو جاتی تھی۔ میں ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور بڑی بی سے چمٹ جاتا تھا اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر تین بار تالی بجاتی تھیں، تو ڈر کے مارے میری چھاتی دھک دھک کرنے لگتی تھی۔

اس وحشت انگیز ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ عنفوانِ شباب تک آتے آتے میں نے ان تمام اوہامِ فاسدہ سے مکمل نجات حاصل کر لی تھی اور ہر روز پچھلے پہر بیدار ہو کر میں باغوں، صحراؤں، گھاٹیوں، کھنڈروں، میدانوں اور ویرانوں میں تنہا اور اکثر و بیشتر عبرت و مناظرِ قدرت کی خاطر گورستانوں میں بھی جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ روانی یاد کر میرا یہ معمول نماز فجر کے علاوہ آج تک جاری ہے، لیکن صاف گوئی کا یہ تقاضا ہے کہ اس موقع پر میں اپنے دل کے چور کو بھی ظاہر کر دوں یعنی ہر چند میں ارواحِ خبیثہ کے وجود کا قطعیت کے ساتھ منکر ہوں، اور ان تمام بے سروپا ناقابلِ عقل باتوں پر اپنے قہقہوں کو بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا، پھر بھی اگر آپ مجھ سے یہ فرمائش کریں کہ میں رات کو نہیں، دن کو بھی دادا میاں کے محل میں تنہا چلا جاؤں تو میں کسی قیمت پر بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔

جاڑا

جاڑے کے موسم کو میں بے حد پسند کرتا تھا۔ جب سنتا تھا کہ جاڑے کا دور آ گیا، میرے دل کی کلی چٹک جاتی تھی۔ صبح منڈیروں پر کوؤں کی ملائم کاؤں کاؤں اور ہلکی گلابی دھوپ کا پھیکا رنگ میرے دل کو موہ لیا کرتا تھا۔ یہی وہ موسم تھا جس میں کثرت کے ساتھ رت جگے اور گانے بجانے کی تقریبیں ہوا کرتی تھیں۔ رات رات بھر جشن اور گاجر کا حلوہ بنایا جاتا تھا۔ شب دیگیں اور سالن، خمیروں اور شکار کا گوشت پکایا جاتا تھا، باجرے کی ٹکیاں بنائی جاتی تھیں۔ صبح کو رات کی گرم گرم کھچڑی، خالص گھی، اور سوڑے کے اچار کے ساتھ کھائی جاتی تھی اور سردی کی دھار جس قدر تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی، اتنا ہی انشراحِ صدر ہوتا چلا جاتا تھا۔

ہم سب بھائی بہنوں کے واسطے ململ کی تھیلیاں سی جاتی تھیں۔ ان پر سنہرا پلہا ٹانکا جاتا تھا اور ان تھیلیوں کو ہر صبح کشمش، پستے، بادام اخروٹ اور چھلے ہوئے چلغوزوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ باہر گنوں کی پھاندیاں آتی تھیں۔ خدمتگار گنے چھیل چھیل کر ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں کھلاتے تھے پھر گنے میں دس پانچ گنڈیریاں بچ رہتی تھیں۔ باقی گنڈیریاں خدمتگار بچوں کے نام سے چوکھا جایا کرتے تھے۔

لحافوں اور توشکوں میں بھرنے کے لیے اجلی اجلی روئی کے ایک طرف انبار لگا دیے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خشک برف کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

پھر جب وہ روئی دھنکی جاتی تھی۔ تو اس کی دھن پر کائنات جھومتی نظر آتی تھی۔ اور جب دھنکی روئی کے ہلکے پھلکے گالے ہوا پر اڑتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سفید پھول ناچ رہے ہیں۔

دنوں سے کہیں زیادہ جاڑوں کی راتیں مزے کی ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کے داستان گو سید محمد امیر صاحب مردانے میں طلسم ہوشربا سناتے تھے اثنائے داستان گوئی میں افیون کی چسکیاں لے لے کے بالائی کھاتے جاتے، اور پھر بڑے انہماک کے ساتھ حقے کے کش لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جب وہ اونگھ جاتے تھے، تو منہال ان کے منہ میں گھس جاتی تھی اور سید صاحب چونک کر پھر وہ داستان سنانا شروع کر دیتے تھے۔

جب داستان سن کر ہم زنانے میں آتے تھے تو کھانے کے بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ہمیں کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔

ایک بہت لانبا چوڑا دالان ہمارا خواب گاہ تھا جس کے اونچے اونچے دروں میں موٹے موٹے پردے چھوڑ دیے جاتے تھے بیچ میں ایک بڑا تخت ہوتا تھا جس پر بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے ہوتے تھے۔ اس تخت پر ایک بڑے طشت میں ایک خوب دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی۔ انگیٹھی کے آتے ہی تمام کے اور چراغ سامنے سے ہٹا دیے جاتے تھے جس سے انگیٹھی کا جوبن اور بھی نکھر جایا کرتا تھا۔ ایک گوشے میں عود اور اگر بتیاں جلا دی جاتی تھیں اور اس اہتمام کے بعد گھر کی بڑی بوڑھیاں، اور اڑوس پڑوس کی جانی بوجھی مہمان عورتیں تخت پر بیٹھ کر کہانیوں کے ریشمی جال بننا شروع کر دیتی تھیں۔

جاڑوں کی خاموش، دھنک اور طویل راتوں کی سرمئی محراب میں جب میں کہانیاں سنتا تھا تو دروں کے پردوں کا آسمانی رنگ رینگنے لگتا تھا، کہانی کہنے والی کے چہرے کی جھریاں ایک چلمن بن جاتی تھی جس سے جل پریاں جھانکتی نظر آتی تھیں۔ انگیٹھی کے حسین کوئلوں کے بار بار چٹخنے میں کلیوں کے چٹخنے کی آواز گونجا کرتی تھی۔ ہلکی ہلکی آنچ کی لپک جھپک میں زہرہ کی کرن چمکتی دکھائی دیتی تھی۔ لحاف اور توشک کی نئی روئی کی خوشبو اور گدگداہٹ، بدن کی رہ رہ کر سرسراہٹ بار بار کھنچتے ہوئے بڑے بڑے پان دانوں کی کھڑکھڑاہٹ، ڈلی کاٹنے کی پیہم کٹاکٹ، کہانیوں کے شاہزادوں کے قدموں کی آہٹ اور شاہزادیوں کی میٹھی مسکراہٹ۔ یہ تمام دل آویزیاں گھل مل کر کسی نامعلوم جادو کے جزیرے کا ایک گہرا ابر بن جایا کرتی تھیں۔ ایسا چھا جانے والا ابر جو میرے تمام وجود کو اپنے میں یکسر جذب و گم کر لیا کرتا تھا، اور اس طرح کہ یہ واقعات و حوادث سے بوجھل کراہتی دنیا میری نظروں سے تمام تر اوجھل ہو جاتی تھی۔ اور کسی ہرن کی نامعلوم الطرف کے مانند ایک دبے پاؤں آنے والی نیند کی، مجھے نیند کے اس اتھاہ سمندر میں گھلتی ہوئی آہستگی کے ساتھ غرق کر دیا کرتی تھی جس کی موجوں کے جھکوروں میں ابدیت کے گھنگھروؤں کی آواز مجھے لوریاں دیا کرتی تھی۔

گرمی اس موسم سے مجھے بیر تھا، حالانکہ اس گرمی کی پشت پر خربوزے تھے، تربوز تھے، آم تھے، قلفیاں تھیں، بیر تھے، فالسے اور گڑ ملے کے شربت کے رنگین گلاس تھے، خس کی ٹٹیاں تھیں، دوپہر کو روش پنکھوں کی سلا دینے والی ہوا کی لہریں تھیں، شام کے سوندھے چھڑکاؤ تھے اور چنبیلی کے پھولوں کی بیلیں تھیں، لیکن اس موسم کی لُو سے مجھے نفرت تھی۔ دو اور تین بجے کی لو ایسی معلوم ہوتی تھی گویا دوزخ میرے منہ پر اپنے شعلوں کے کلمات دم کر رہا ہے یا آگ کی پھونکی

سے رہا ہے۔ اور پھر سونے پر سہاگہ اس خبیث موسم کی بے لگام و بد تمیز دھوپ، بوڑھے سود خوار مہاجنوں کی آنکھوں کی طرح بے مروت، اور سپاٹ دھوپ چلچلا اور جلا کی چنگاریاں اڑاتی ہوئی مونچھوں کے مانند جل جاتی ہے پھر دھوپ۔

رات کو انگنائی میں خوب چھڑکاؤ کر کے ہمارے پلنگ بچھا دیے جاتے تھے۔ تکیوں میں خس کا غلاف دیا جاتا تھا، اور اونچے اونچے لکڑی کے کھمبوں پر ایک بہت بڑی خس کی تان دی جاتی تھی۔ اسٹولوں پر کاغذی آب خورے اور کیوڑے میں بسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آگرے کی صراحیاں رکھ دی جاتی تھیں۔

علاقے کی عورتیں واری باری ساری رات پھر فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچتی رہتی تھیں۔ اور ان میں سے جب کوئی نیند کی ماتی اونگھ جاتی تھی، تو اس وقت جس خادمہ کی پہرے کی باری ہوتی تھی، وہ اس بے چاری کے جھونٹے پکڑ کر اس کی پیٹھ پر گھونسے مارنے لگتی تھی اور جب کبھی ایسے موقع پر میری آنکھ ان آوازوں سے کھل جاتی تو میرا دل پسلیوں میں سمٹنے لگتا تھا، اور پھر دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ بے درد پہرے داروں کو ڈانٹوں، پھٹکاروں، مگر رات کے سناٹے میں اس خوف سے آواز نہیں نکالتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیل میری آواز کی ڈوری پر سوار ہو کر آ جائے اور میرا شیشہ سا دماغ۔ اچھا ہوا کہ ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ظالم کے ہاتھ شل ہو کر رہ گئے، ورنہ آج بھی جاگیردار صاحب کی انگنائی میں رات کے وقت پنکھے کی ڈوری کھینچنے والی جوانی کی پشت پر کوئی پہرہ دینے والی خبیث بڑھیا محض اس خطا پر دوہتڑ گھونسے مار رہی ہوتی کہ رات کے وقت اس مردار کی جوانی کو نیند کیوں آ گئی۔

برسات

برسات کا میں بچپن سے عاشق ہوں، لیکن ہائے اس دور کی برساتیں اب کہاں، جھڑی، ٹھنڈی، شور کرتی گھٹائیں، بجلی ایسی کوند کر چمک دکھا جاتی اس قدر گرج گرج کے ساتھ اٹھتی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا، اور زمین پاش پاش ہو کر گڑھوں میں دھنس جائے گی۔

پانی برسنے پر آتا تھا تو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا، پندرہ پندرہ دن کی جھڑی لگ جایا کرتی اور گلیوں سے آوازیں آیا کرتی تھیں، بیر سو رام دھڑ دھڑ کے سے بچھا مر گئی فاقے سے اور گر گئی کی ریت میں، پانی گیا کھیت میں۔ ہمارے آم کے باغ کوئلوں، پپیہوں اور موروں کی آوازوں سے گونجتے رہتے تھے، اونچے اونچے درختوں میں جھولے پڑتے تھے، تالاب میں آم تیرتے تھے، تالاب کے کنارے کے بیچ میں کوا بنا ہوا تھا، اندر سے لڑکیاں باہر آتی تھیں، ایک طرف چھپر میں پھلکیاں تلی اور پوریاں پکائی اور ایک طرف دیگیں چڑھائی جاتی تھیں، تالاب میں تیر تیر کر آم کھائے جاتے تھے، آپس میں گٹھلیاں چلتی تھیں اور تمام دن دھوم مچائی جاتی تھیں، ہم تینوں بھائی اپنے باپ اور ان کے احباب کی ان رنگ رلیوں کو دیکھتے ضرور تھے، لیکن شریک نہیں کیے جاتے تھے، خیال یہ تھا کہ اگر ہم پانی میں اتریں گے تو ڈوب جائیں گے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی تالاب میں کود پڑوں، لوگوں کو گٹھلیاں ماروں، ڈبکیاں لگاؤں، اچھلوں اور شور کروں، لیکن باپ کا حکم نہیں تھا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد ہمیں وہاں سے گھر بھیج دیا جاتا تھا تو ہم سب اپنی تمنائیں نکالتے تھے کہ ہماری انگنائی کے گوشے میں جو ایک بہت بڑا ہرا نیم کا درخت تھا اس میں جھولا ڈالتے تھے، ہماری دادی جان جھولا جھلانے والیوں کو یہ تاکید فرماتی تھیں کہ بچوں کو آہستہ آہستہ جھولا جھلایا جائے، مگر میں یہ چاہتا تھا کہ میرا جھولا پینگ آسمان کو چھو لے، اس لیے چلاتا تھا کہ زور سے جھلاؤ، زور سے، اور جھلانے والیاں ادھر ادھر دیکھ کر میری پینگ تیز کر دیا کرتی تھیں۔

درخت کے سامنے ایک سہ دری تھی جس میں ہماری چچی نواب بیگم کے گھر جانے کی ایک کھڑکی تھی، اس سہ دری سے برساتی پھولوں کی خوشبو جب ناک میں آتی تھی پھر بے کا بہکا بہکا دھواں جب گھٹاؤں سے لدی ہوئی رنگین فضا پر ایک پیچ و خم کے ساتھ تیرتا تھا، اور جھولتے ہوئے

جب نیم کے گرد حلقہ باندھ کر لونڈیوں باندیوں کے گیت کانوں سے مس ہوتے تھے، اور شاخوں سے بوندوں کی ٹپ ٹپ اور بھیگی ہوئی نیم کی صحت افزا خوشبو جب میرے نتھنوں میں گھس جاتی اور سرسراتی تھی تو مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا اور میں کیا ہوں، میں کہاں ہوں اس بات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا

خلوت خاص عشق را بنگر
کہ برون کردہ اندیشہ مرا

وہ گھڑی اب تک مجھے یاد ہے کہ حسب معمول ایک روز اودی اودی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، اور ہم سب گیتوں کی پھوار میں جھول رہے تھے کہ ایک رقت آمیز تھرتھراتی آواز نے یہ سارا خوشی کا طلسم ایک آن میں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ آواز تھی میری کھلائی "بڑی بی" کی جنھوں نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں جن کے بغیر تمام اودھ ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا، یہ درد بھرا گیت، اپنی ستر برس کی کانپتی آواز میں گانا شروع کر دیا تھا "اسے تم بن رکھا نہ سہا جائے، مورے کلکتے کے جو پیا، اللہ تمہیں لائے دیا رے تمہارے بغیر مجھے برسات ایسی نہیں معلوم ہو رہی ہے، اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں واپس لائے۔"

نیز غمگیں وہ تیج تو بھی میرے حافظے میں اب تک جاگ رہا ہے جب کہ بڑی بی کو روتا دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا اور ان سے چمٹ چمٹ کر رونے لگا تھا اسی وقت میری پھپھی نواب بیگم جنھیں ممن بی بی کہا جاتا تھا، اتفاقاً ادھر آ نکلی تھیں اور مجھے روتا دیکھ کر انھوں نے میری بڑی بی کو جھڑک کر یہ کہا تھا کہ "آگ لگے تمہارے گانے کو، بھاڑ میں جائے تمہارا گانا، یہ بچہ پھپک پھپک کر رو رہا ہے۔" پھپی کی جھڑکی سن کر بے چاری بڑی بی تو خاموش ہو گئی تھیں اور اپنی روتی ہوئی آنکھیں آنچل کے کونے میں ڈال کر جب انھوں نے اپنا آگے کو جھکا ہوا سفید سر پیٹ پیٹ کر یہ کہا تھا کہ "ممن بی بی، چھاتی پر ہاتھ دھر کر غصہ اگلتی ہو کہ جس نصیبوں جلی کا سارا عیش برج میں بند کر دیا گیا ہے وہ گھڑی کیوں نہیں روئے گی، ہائے کیونکر نہیں روئے گی"، تو آس پاس کی تمام عورتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، اور خود میری بدمزاج پھپی بھی آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی تھیں، اور یہ رونا جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر تمام گھر پر چھا گیا تھا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اودھ کی تہذیب کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے۔

میرے نزدیک تمام شاہان عالم میں سے حضرت جان عالم کے علاوہ، شاید کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا ہر دل عزیز نہیں گزرا ہے جسے کھو کر اس کی تمام رعایا نے ایک زمانہ دراز تک، اس قدر مسلسل آنسو بہائے ہوں۔

مدتوں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

ہر چند اس وقت تک فرنگی کی غاصب حکومت نے اپنی مذموم اور ہوس کشور کشائی کے تحت حضرت جان عالم کے بے قصور پاک نفس پر جو تعدیات یاد رہ جانے والے بے پناہ مظالم ڈھائے جاتے تھے، مجھے ان کی ذرہ برابر خبر نہیں تھی، اور میں فقط اپنی "بڑی بی" کو روتا دیکھ کر رونے لگا تھا۔

لیکن ہوش آنے کے بعد جب مجھے فرنگیوں کے مظالم کا علم ہوا تو "بڑی بی" کا وہ گیت جو میرے سینے میں دبا ہوا تھا یکایک جاگ اٹھا اور بڑی بی کی روتی ہوئی آنکھیں میری جانب اٹھیں اور کہنے لگیں "بیٹا فرنگی سے کلکتے جانے والے کا انتقام ضرور لینا۔" بڑی بی نے میرے بچپن کی زمین میں آنسو بوئے تھے میری نوجوانی جھنکاریاں کاٹنے لگی۔

عبدالماجد دریابادی

۱۸۹۶ء کا ایک خوشگوار سہ پہر۔ اودھ کے ایک چھوٹے شہر کھیم پور کھیری میں اودھ ہی کے ایک دوسرے چھوٹے ضلع بارہ بنکی (متصل لکھنؤ) کے رہنے والے ایک ممتاز ڈپٹی کلکٹر کا مکان۔ ڈپٹی صاحب کے چھوٹے لڑکے عمر ۴ سال ۴ ماہ ۴ دن کی رسم تسمیہ یعنی بسم اللہ خوانی کی تقریب۔ زنانہ مکان کے صحن میں پردہ ہو گیا ہے۔ تخت پر ایک مولوی صاحب۔ صاحب علم ہیں۔ اور بچے کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ارد گرد عزیزوں، ملازموں وغیرہ کا مختصر مجمع۔ سب کے چہرے خوشی سے چمکتے ہوئے۔ تازہ گرم گرم مٹھائی خوان میں رکھی ہوئی، کہ ابھی بسم اللہ ہو جائے اور مٹھائی سب کے کھانے میں آ جائے ——— یہی اس زمانہ کا دستور ہر شریف مسلمان کے گھر کا تھا۔

مولوی صاحب سراپا لطف و شفقت بنے ہوئے بڑے رنگ سے کہتے ہیں "ہاں میاں اس سطر پر ذرا انگلی رکھ کر تو دینا۔ بسم اللہ ۔۔ ہاں کہو نا بسم ۔۔۔ ہاں شاباش کہو، ذرا جلدی سے بس ۔۔۔" لیکن یہ کیا! منٹ، دو منٹ، پانچ منٹ! مولوی صاحب بیچارے دم دلاسا دیئے رکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور گھر کے بڑے بوڑھے بھی مدد دیتے جا رہے ہیں۔ لیکن لڑکا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے۔ مجمع سے شرما پہلے ہی گیا تھا۔ اور اب اس چو طرفہ اصرار نے (گو وہ فرط شفقت ہی سے سہی) اس حجاب کو اور گہرا کر دیا۔ آخر انتظار کب تک ہو۔ اور اس عجیب و ناخوشگوار و سراسر غیر متوقع صورت حال پر غصہ والدہ کو کب تک نہ آتا؟ پہلے انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور جب اس سے بھی کام نہ چلا، تو مجبور ہو کر انھوں نے قمچی منگائی اور لگانا شروع کر دی۔ اس کا بھی اثر الٹا ہوا، اور لوگوں نے ہاں ہاں کرتے ہوئے یہ کہہ کر جان بچا دی کہ "اچھا اس وقت جانے دیجئے، ابھی تھوڑی دیر میں آپ ہی بسم اللہ کہہ دیں گے" پہلے سے منتظر بیٹھنے والی ماں کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی، اور اس کی افسوس اور اس کی حسرت تاپی بالکل ظاہر ہے۔

گھنٹہ بھر بھی مشکل سے ہوا ہوگا، کہ کھلانے والی انا (قصباتی زبان میں "بوا") نے چمکار کر بہلا کر بچے سے کہا کہ "واہ کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ نہیں آتی۔ جا کے پکار کر مولوی صاحب سے کہہ تو آؤ" بچہ دوڑا دوڑا گیا، اور مولوی صاحب کے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سنا آیا! اترے ہوئے چہرے بحال ہو گئے۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مٹھائی بٹنے لگی۔

یہ تھا وہ طفل ناہنجار جو آج ۷۰ سال کی عمر میں، دوستوں، قدر افزائی کی فرمائش پر اپنی رسوائیوں کی داستان لکھنے چلا ہے، آپ کو سنانے بیٹھا ہے! ——— "ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو" یہ زندگی کے آغاز ہی سے ظاہر ہے۔

دریاباد، انگریزی عملداری کے شروع میں خود ضلع تھا۔ اور اس سے پہلے اودھ کی سلطنت میں بھی ایک خاص اہم مقام تھا۔ یہاں چکلہ دار رہتے تھے، اور قلعہ اور کاروان سرائے وغیرہ سب کچھ تھا۔ اب تین پشتوں سے ضلع کیا تحصیل بلکہ تھانہ بھی نہیں، معمولی قصبہ ہے۔ اب حال میں پھر کچھ ترقی کرنے لگا ہے ریلوے اسٹیشن ہے لکھنؤ اور فیض آباد کے بین وسط میں لکھنؤ سے ۴۲ میل۔ اسپتال ہے، ڈاک خانہ ہے، تار گھر ہے، بلاک

ایک پرائیویٹ ہائی اسکول ہے، اور حال میں ٹیلیفون بھی لگ گیا ہے۔ اور بجلی کی روشنی بھی ٹاؤن ایریا نے کر لی ہے۔ تجارت میں جوتے کی صنعت کا زور ہے۔ مٹھائی میں یہاں کے پیڑے، برفی اور ربڑی مشہور ہیں۔ آبادی ۹ ، ۱۰ ہزار کے درمیان جس میں مسلمان آدھے سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ قصبہ کی آبادی کی بنیاد ۸۰۸ھ میں شاہانِ شرقیہ جونپور کے زمانے میں، دریا خاں چکلہ دار کی فرمائش پر ایک چشتی بزرگ مخدوم شیخ محمد آبکش قدوائی کے ہاتھ سے پڑی تھی۔ ایک پورا محلہ مخدوم زادگان کے نام سے انھیں کی اولاد سے آباد ہے۔

قصبے کے شریف خاندانوں میں ایک اہم خاندان انھیں قدوائی مخدوم زادوں کا ہے۔ قدوائی اسرائیلی نسل سے ہیں۔ سلسلۂ نسب ہاروی ہی حضرت یعقوبؑ تک پہنچتا ہے، حضرت ہارونؑ بن عمران کے واسطے سے۔ مورثِ اعلیٰ قاضی معز الدین معروف بہ قدوۃ العلم والدین کہا جاتا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور اجودھیا (اس کا دوسرا تلفظ اودھ ہے) میں آکر مقیم ہوئے۔ اجودھیا اب فیض آباد کے متصل ایک قصبہ ہے اور ہندوؤں کا مشہور تیرتھ۔ قدوائیوں کو اولادِ انبیاء ہونے کی بنا پر ہندوستان کے شیوخ (عثمانی و صدیقی وغیرہ) نے بلکہ خود سادات نے اپنا ہم کفو قرار دیا۔ اور آپس میں شادی بیاہ کا کثرت سے رواج ہو گیا۔ قدوائیوں کی نسل لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے قصبوں ردولی، بڑا گاؤں، گدیہ، مسولی وغیرہ میں خوب پھیلی اور اچھے بڑے نامور اُن میں پیدا ہوتے رہے۔

اسی قصبہ اور اسی خاندان میں میری پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء مطابق وسط شعبان ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔ والد مرحوم مولوی حاجی عبدالقادر (۱۸۵۳ء تا ۱۹۱۲ء) اودھ کے مختلف ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹر رہے، یہ اس عہد کا ایک اونچا اور معزز عہدہ ہندوستانیوں کے لیے تھا۔ دادا صاحب مفتی شریعت مولوی مظہر کریم، ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہانپور میں سررشتہ دار عدالت کلکٹری تھے۔ صحیح یا غلط اُن پر بھی بغاوت کا الزام لگا، اور سزایاب ہو کر کئی سال کالے پانی (جزیرہ انڈمان) میں رہے۔ نانا صاحب (جو بڑے دادا بھی تھے) مولوی حکیم نور کریم اپنے وقت کے ایک نامور طبیب اور اعلیٰ درجے کے خوشخط تھے۔ کتابوں پر کتابیں، لغت، طب، فقہ، تاریخ، تفسیر وغیرہ ہر قسم کی، اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ قیام لکھنؤ میں رہا۔ دوسرے قریبی عزیز بھی اچھے عہدوں پر رہے، یا طبابت، وکالت اور زمینداری میں ممتاز۔ علم کا چرچا خاندان میں خاصہ رہا۔ والد مرحوم بھی صاحب علم تھے اور ایک حد تک اہلِ قلم بھی۔ فقر و تصوف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ جوار میں بانسہ کی درگاہ قادری سلسلہ میں مشہور ہے۔ وہاں کی سجادگی اپنے قریبی عزیزوں کے حصہ میں رہی۔ لکھنؤ میں علماء فرنگی محل سے تعلقات، استادی اور شاگردی کے، گہرے رشتے کئی پشتوں تک رہے۔

والدہ ماجدہ (۱۸۵۶ء تا ۱۹۴۱ء) بڑی عبادت گزار و فیاض تھیں۔ روزہ اور نماز تہجد اخیر عمر تک قضا نہ ہوئی اور نہ موسم کی سختی یا ضعیف العمری ہی حائل ہوئی۔ ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ دونوں مجھ سے بڑے۔ بہن (وفات ۱۹۳۲ء) جلد بیوہ ہو گئی تھیں۔ عبادت و تہجد گزاری میں والدہ ہی کو پڑیں۔ بھائی صاحب (وفات دسمبر ۱۹۵۹ء) نے انگریزی پڑھی اور باوجود دائم المرض ہونے کے سینئر ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر پہنچ کر پنشن لی۔ دونوں مجھ سے انتہائی محبت کرتے رہے، مگر میری طرف سے کبھی بھی ان کے حقوق ادا نہ ہوئے۔

انگریزی تعلیم سیتاپور ہائی اسکول میں ہوئی۔ وہیں سے ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کیا۔ خانگی تعلیم خصوصاً فارسی کی، گھر پر ہو چکی تھی۔ کیمیائے سعادت، سکندر نامہ، یوسف زلیخا وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ اسکول میں ثانوی زبان عربی لی۔ استاد اچھے اور شفیق ملے، توجہ سے پڑھایا۔ کچھ شُدبُد آ گئی۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کی چار سال تعلیم لکھنؤ کیننگ کالج میں پائی۔ یہ اس وقت تک الٰہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھا۔ یہاں پہنچ کر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ دل عربی تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا اور استاد بھی ایسے شفیق نہ ملے۔ کالج کے زمانہ میں تھوڑی بہت شہرت جو حاصل رہی، وہ انگریزی اور منطق و فلسفہ میں حاصل ہوئی۔ انگریزی

سے مراد انگریزی تحریر ہے۔ ورنہ انگریزی تقریر میں تو بالکل یوں ہی سا رہا۔ اُستادوں میں ایک انگریز ڈاکٹر گیمری بڑے اچھے استاد تھے۔ ان کے ساتھ عشق کی نہیں دلی محبت رہی۔

پڑھنے کی رغبت و یوں ہی، ہر قسم کی کتابیں پڑھ ڈالنے کا مرض بچپن سے تھا۔ کالج میں رہ کر قدرۃً یہ بہت ترقی کر گیا۔ شہر کی پبلک لائبریریوں پر روز دھاوا رہتا۔ اور کالج کی وسیع و عظیم لائبریری کا تو ذکر ہی کیا۔ ڈاکٹر گیمری نے ایک سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ میرے علم میں کسی بھی طالب علم نے لائبریری سے اتنا استفادہ نہیں کیا ہے جتنا انھوں نے کیا ہے۔ کوئی ہادی و رہبر نہ تھا۔ اس لیے بہت سی کتابیں اور رسالوں کے پڑھنے میں وقت بھی ضائع ہوا۔ اور اُلٹے سیدھے، چت لیٹ کر، اور اندھیرے ہو کر اور دھندلی روشنی میں کتب بینی سے آنکھ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا وہ الگ۔

بی۔ اے کے امتحان کا جب زمانہ قریب آیا تو عربی میں اپنی کمزوری پر نظر گئی۔ کورس نثر و نظم کا اچھا خاصا اونچا تھا اور استعداد اُس کی نسبت سے بہت پست۔ اپنے ایک دوست اور ساتھی مولوی عبدالباری (مولانا شاہ عبدالباری ندوی اشرفی) کو کہ اس وقت ندوہ میں پڑھ رہے تھے، اور امتحان میٹرکولیشن کی فکر میں تھے، عربی کے سبق ان سے لینے، اور انگریزی کے سبق انھیں دینے شروع کیے۔ اور اس لین دین کے بعد پھر کسی طرح سنہ ۱۲ء میں شتم پشتم نکل گیا۔ سیکنڈ ڈویژن۔ انگریزی اور فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن ملا ہوگا، اور عربی میں تھرڈ، اوسط جا کر سیکنڈ ڈویژن کا پڑا۔

ایم۔ اے فلسفہ میں کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس وقت صوبہ بھر میں اس کا انتظام دو ہی جگہ تھا، کوئینس کالج بنارس اور علی گڑھ۔ لکھنؤ، الٰہ آباد، آگرہ تینوں اس سے محروم تھے۔ اکتوبر سنہ ۱۲ء میں علی گڑھ کا رُخ کیا۔ وطن سے دور کا سفر آج تک یاد ہے۔ لکھنؤ کے باہر گویا نکلا ہی نہ تھا۔ ایک بالکل نئی دنیا آباد نظر آئی۔ یوں پڑھا لکھا اچھا خاصا تھا۔ مضمون نگاری میں خاصا نام پیدا کیے ہوئے تھا۔ اردو کے علاوہ کسی قدر انگریزی میں بھی۔ مگر دنیا سے کورا تھا۔ سخت جھجکتا اور پریشان۔ خیر جوں توں داخلہ کالج میں ہوا۔ اور ایک بڑے دور افتادہ بورڈنگ میں جگہ ملی۔ اس میں بھی اپنے لیے سب سے چھوٹا کمرہ پسند کیا۔ جو دراصل غسل خانہ تھا۔ یہ عالم اپنی تنگ مزاجی اور مردم بیزاری کا اُس وقت تھا۔ کسی کھیل وغیرہ میں بھلا کیا شریک رہتا۔ علی گڑھ میں رہ کر اور کھیل سے کورا۔ اس مثال میں شاید میں منفرد ہی ہوں۔

اُستاد بے چارے کچھ یوں ہی سے ملے۔ ایک انگریز تھے، بعد کو خودکشی کر لی۔ امتحان میں بیٹھا، فیل ہوا۔ فیل ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ چار یا پانچ پرچوں میں سے ایک پرچہ کی کتاب ہی کہیں دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب فکرِ معاش بھی دامنگیر ہو گئی تھی۔ راجہ (بعد کو مہاراجہ) سر علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد سے خاندانی تعلقات آڑے آئے۔ بے چارے نے سال بھر تک مزید تعلیم کے لیے پوری امداد کر دی۔ اب علی گڑھ چھوڑ، صوبہ کے باہر، دہلی کے مسیحی کالج سینٹ اسٹیفنس میں پڑھنے گیا۔ یہاں استاد فلسفہ پروفیسر شارپ اچھے ملے۔ وہیں مشہور علم دوست، انسانیت دوست اور ہندو نواز پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے بھی ملاقات ہوئی اور دل نے ان کی شخصیت کا اثر قبول کیا۔ ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ جس بلاک[1] میں ہم لوگوں کی جماعت پڑھتی تھی، اس کے ویران ہو جانے کی خبر اُڑی اور میں اس کو بہانہ بنا کر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ واپس آگیا۔ اب سنہ ۱۲ء سے ہم لوگوں کی مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں تھی۔ وہیں خاندان ہی کی ایک لڑکی سے محبت پیدا ہو گئی اور وہی آگے چل کر بیوی بنیں۔ ان سے طویل جدائی طبیعت کے لیے سخت بار تھی۔ اور تحت الشعور میں یہی چیز تھی، جو دہلی سے تعلیم چھوڑ، لکھنؤ واپس لے آئی۔

---

[1] انگریزی کے بلاک کو اردو میں بنگ کہیں گے۔

اس وقت یونیورسٹیوں کی یہ بھرمار کہاں تھی۔ لکھنؤ تک میں یونیورسٹی نہ تھی۔ جی یہ شروع سے چاہتی تھی کہ کسی کالج میں فلسفہ کی پروفیسری کا عہدہ حاصل کیجیے، اردو زبان و ادب کا کوئی شعبہ اس وقت تک کہیں قائم نہیں ہوا تھا، اس کے لیے ایم اے کی شرط ضروری تھی۔ خیال یہ پیدا ہوا کہ بجائے ڈگری حاصل کرنے کے مختلف رسالوں میں فلسفہ پر مقالے لکھیے، اور انھیں کو ایم اے کی ڈگری کا قائم مقام بنائیے۔ ایک عمر علمی چیز یا مضمون دو ایک سے زیادہ نہ لکھے جا سکے۔ دوسری ملازمتوں کی طرف خیال گیا، ریاستوں اور ڈاک خانہ دونوں میں کچھ عہدے، دو ڈھائی سو کے مشاہرہ سے شروع ہو رہے تھے (اس وقت کے ... آج کے ہزار بارہ سو کے مترادف)، کوششیں کیں، سفارشیں اٹھائیں، کامیابی نہ ہوئی۔

والد مرحوم کے زمانہ تک معاشرت خاصی امیرانہ زندگی کی رہی۔ گاڑی، گھوڑا، نوکر چاکر وغیرہ۔ اب بھی تنزل آتے آتے زمانہ نسبتاً تنگ دستی کا آیا۔ کچھ تھوڑا بہت معاوضہ اردو رسالوں سے وصول ہوتا رہا۔ سب سے بڑھ کر دستگیری بابائے اردو عبدالحق نے کی۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کام تصنیف و تالیف و ترجمہ کا ملتے رہے اور اس طرح وہ زمانہ تین چار سال کا بسر ہو گیا۔ وسط ۱۹۱۶ء میں شادی کے معاً بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی قدر دانی کانفرنس آفس علی گڑھ میں کھینچ لے گئی۔ یہاں بھی جی نہ لگا۔ استعفا دے کر واپس آ گیا۔ ۱۹۱۷ء میں سر راس مسعود اور بابائے اردو نے تار دے کر حیدرآباد بلایا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے پر تھی، اور اس کے لیے کتابیں ترجمہ کی تیار ہو رہی تھیں۔ مشاہرہ کا آغاز تین سو تھا، آج کے ڈیڑھ دو ہزار! ڈیڑھ برس وہاں رہنا ہوا۔ پھر وہاں سے مستعفی ہو گیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ حضرت نظام دکن کے ہاں سے تار طلبی ہوئی۔ باریابی ہوئی اور ۲۰۰ روپے ماہوار کا وظیفہ مثل مولانا شبلی کے وظیفہ کی طرح عمر بھر کے لیے جاری ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء کے سوا سو روپے آج کے آٹھ سو کے برابر تھے۔ مرزا محمد اسمٰعیل وزیر اعظم حیدرآباد نے ۱۹۴۰ء میں یہ رقم بڑھا کر دو سو کر دی۔ پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ پنشن حیدرآباد گورنمنٹ نے بند کر دی۔ یہاں سے وزیر تعلیمات مولانا ابوالکلام سے مسلسل خط و کتابت کی، بے اثر رہی۔ مہینوں بعد خود پنڈت جواہر لال نہرو نے کی۔ جب جا کر بحال ہوئی، مگر دو سو سے گھٹ کر رہی سوا سو۔ کچھ روز بعد وہ وہاں سے یو پی گورنمنٹ کو منتقل ہو گئی، اور اب یہیں سے مل رہی ہے۔ کتابوں، اخبار وغیرہ کی مد سے آمدنی پہلے برائے نام تھی، اب بھی خاصی ہو رہی ہے اور زندگی اوسط درجہ کی خوشحالی سے بسر ہو رہی ہے۔

پڑھنا اور چیز ہے اور پڑھ ڈالنا اور۔ پڑھنے کے لیے سمجھنا بھی ضروری ہے، پڑھ ڈالنے کے لیے ضروری نہیں ——— پڑھ ڈالنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ جب سے حرف شناسی ہوئی، کہنا چاہیے کہ پڑھ ڈالنے کا بھی مرض پیدا ہو گیا۔ رطب و یابس، کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار جو چیز بھی چھپی ہوئی سامنے آ گئی بس اس کو بے پڑھے نہ چھوڑا۔ والد کے ہاں روزنامہ اودھ اخبار لکھنؤ آتا تھا اور وہی وقت کا واحد اردو روزنامہ یو پی بھر میں تھا۔ اور ریاض خیر آبادی کا ہفتہ وار نیم سیاسی مستند ریاض الاخبار گورکھپور سے بھی۔ یہ دونوں تو گویا میری خاص غذا تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کا پیسہ اخبار (ہفتہ وار) بھی کہیں ادھر ادھر سے لے کر پڑھ لیتا تھا۔ عمر کے بارھویں سال میں (۱۹۰۴ء میں) تھا، درجہ چھ کا طالب علم، کہ مذہبی عنوانوں پر اودھ اخبار میں مضمون نگاری شروع کر دی۔ گمنام نام لکھنے میں مانع کچھ تو طبعی جھجک یا حجاب رہی، اور اس سے بھی بڑھ کر والد ماجد کا ڈر۔ جب ذرا انگریزی چل نکلی، تو لکھنؤ کا سہ روزہ ایڈووکیٹ پابندی سے پڑھنے لگا۔ یہ بھی والد ماجد کے پاس آتا تھا۔ اور جب ذرا کچھ اور چل نکلا تو لکھنؤ کا روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف اپنے اسکول کے ساتھیوں کی شرکت میں منگانے لگا۔ علی گڑھ منتھلی (آدھا اردو، آدھا انگریزی) اس کے علاوہ، اور پھر کچھ ہی روز بعد والد سے کہہ سن کر الندوہ بھی منگانا شروع کر دیا۔

پنجاب کے مذہبی پرچوں کے علاوہ جب کالج میں پہنچ کر ذرا آزادی ملی، تو وکیل (امرتسر) میں بھی، اور اپنے زمانہ کا بڑا ذی وقعت پرچہ تھا: دو مقالے قسط وار لکھ کر بھیجے، ایک تاریخی، محمود غزنوی پر، دوسرا نیم علمی، ایک فلسفہ نباتات خوری کے جواب میں، بعنوان گوشت خوری یا غذائے انسانی کے عنوان سے۔ دونوں مقالے بہت زیادہ پسند کیے گئے۔ خوب داد ملی، اور وکیل والوں نے ۱۹۱۰ء میں انھیں مستقل رسالوں کی صورت میں چھاپ دیا۔ یعنی سے

اوپر لے ہی چکا ہوں، مضمون اردو کے نامی رسالوں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں جو پہلی بار دیکھا مولانا شبلی کی ’الکلام‘ پر ایک تنقیدی نظر، ۵، ۶ نمبروں میں ماہنامہ الناظر لکھنؤ کے پہلے ’ایک طالب علم‘ کے نام سے نکلی۔ ادیب الہ آباد میں بھی دو چار مضمون لکھے۔ دوسرے رسالوں سے بھی مانگ آنے لگی۔ الندوہ کے آخری زمانہ میں اُسے بھی دو مقالے ترجمے کر کے دیئے۔ یہ بجائے خود ایک بڑا اعزاز تھا۔ الناظر کا مستقل مضمون نگار ہو گیا، اور چند سال بعد ادارت کے چند صفحے میرے لیے مخصوص ہو گئے۔ اس میں ’بینی‘ کے نام سے لکھا کرتا۔ کتابوں پر تبصرے اس کے علاوہ۔ مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء میں ایک اونچے پیمانہ پر سیرۃ النبی لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے مولانا کی فرمائش پر انگریزی رسالوں، مقالوں، کتابوں سے ترجمہ کرتا رہا۔ اور مولانا اس کا معاوضہ بھی ماہانہ عنایت فرماتے رہے۔ چند سال بعد جب معارف (اعظم گڑھ) نکلا تو وہ گویا اپنا ہی تھا۔ جب چاہتا اس میں لکھتا پھر ایک مدت ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء تک ایسا بھی ہوا کہ اس کے کچھ صفحات میرے ہی لیے مخصوص رہے اور اس کا مستقل معاوضہ مجھے وصول ہوتا رہا۔

مسلمانوں کا پہلا روزنامہ یوپی سے ’ہمدم‘ کے نام سے سید جالب دہلوی کی ادارت میں اکتوبر ۱۹۱۲ء سے نکلا۔ وہ بھی گویا اپنا ہی تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ہفتہ وار ’حقیقت‘ لکھنؤ سے نکلا، وہ شروع میں تو قطعاً اپنا ہی تھا، رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ۱۹۲۴ء میں جب مولانا محمد علی کا روزنامہ ’ہمدرد‘ دوبارہ دہلی سے جاری ہوا، تو گویا اس کا ’انچارج‘ میں ہی تھا، پھر جب ۱۹۳۰ء میں مولانا اپنے سفر یورپ گئے، تو میں باضابطہ بھی اس کا نگراں یا قائم مقام ایڈیٹر قرار پا گیا۔

شروع ۱۹۲۵ء سے ’سچ‘ نکالا۔ پہلے میری شرکت میں، ۱۱ دسمبر کے بعد میرا ہو گیا۔ اس کی عارضی بندش کے بعد ظفر الملک مرحوم سے مجھ سے موافقت نہ رہ سکی۔ سچ کے نام پر وہ قابض تھے، میں نے نیا پرچہ ’صدق‘ کے نام سے نکالا۔ پھر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے قانونی مصلحت سے اُسے ’صدق جدید‘ کر دیا۔

انگریزی مضمون نگاری کی مشق بھی ایک مدت تک رہی۔ چھوٹے چھوٹے مراسلے لندن کے مشہور ہفتہ وار ’سپیکٹیٹر‘ ریویو اور مشہور سائنسی ہفتہ وار ’نیچر‘ میں طالب علمی ہی کے زمانہ میں لکھ ڈالے۔ دو مقالے بمبئی کے نامور رسالے ’ایسٹ اینڈ ویسٹ‘ میں لکھے۔ ایک آدھ مدراس کے ’انڈین ریویو‘ میں ایک آدھ مسز اینی بسنٹ کے ماہنامہ ’تھیاسوفسٹ‘ میں اور ’ماڈرن ریویو‘ کلکتہ میں تو مدتوں مضمون نگاری بھی کی، اور اردو اور اسلامی کتابوں پر تبصرہ نگاری بھی۔ عام اخبارات ’انڈین ڈیلی ٹیلیگراف‘، ’لیڈر‘، ’پانیر‘، ’بمبئی کرانیکل‘، ’نیو انڈیا‘، ’اسٹیٹسمین‘ میں مراسلہ نگاری اس کے علاوہ ——— اب انگریزی تحریر کی مشق ایک مدت ہوئی کہ چھوٹ چکی ہے۔

مقالہ نگاری ہی سے ملتی جلتی، گو اس سے بہت مختلف ایک چیز نشری تقریر بھی ہے۔ ہندوستان میں جب سے ریڈیو آیا، اس کے کچھ ہی دن بعد ریڈیو والوں نے بلانا شروع کیا، شروعات لکھنؤ ریڈیو نے کی، اور کثرت سے اس نے بلایا، اس کے بعد نمبر دہلی ریڈیو کا رہا، اور کبھی کبھی حیدرآباد دکن، لاہور، اور کراچی کے اسٹیشنوں سے بھی اس کا اتفاق ہوا۔ عنوان عموماً مذہبی یا ادبی۔ ابتداً جھجک تھی، رفتہ رفتہ اس نشریہ کی ٹیکنیک سیکھ لی۔ آواز کو قابو میں رکھنا اور اس کا اتار چڑھاؤ، اچھے نشریہ کی جان ہے۔ بغیر اس کے ہر نشری تقریر بے جان، بے مزہ، پھیکی، اکتا دینے والی۔

تصنیف و تالیف مضمون نگاری ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے، بعض باریک فرقوں کے ساتھ، یہ مشق بھی شروع سے ساتھ لگی رہی۔ شروع شروع اس کا کام بھی مضمون نگاری ہی کی طرح، اِدھر اُدھر کی چوری چکاری سے چلتا۔ کچھ اِس کتاب سے چرایا، کچھ اُس سے، اپنے نام سے ایک چیز تیار کر دی۔ مونگیر بہار کے ایک بزرگ مولانا محمد علی ناظم ندوہ بلکہ بانی ندوہ تھے، انھوں نے مسیحیت کے رد میں جو کچھ لکھا تھا، اُسی کو پڑھ پڑھا کر، اُن کے دیئے ہوئے حوالے بجنسہ نقل کر کے اپنی ایک چھوٹی موٹی کتاب تیار کر دی۔ سن بھی ۱۳، ۱۴ سال کا رہا ہوگا۔ طفلی یا نوعمری کا عالم تھا، اچھا ہوا کہ وہ مسودہ مدت ہوئی تلف ہو گیا، ورنہ اب دیکھ دیکھ کر شرمندگی ہی بڑھتی۔ ایک یونانی ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ بھی اُسی

زمانہ میں گزرا تھا۔ وہ زمانہ مذہبیت کے دور کا تھا۔ آریوں اور مسیحیوں کے جواب میں کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ’سرمہ چشم آریہ‘، مولانا ثناء اللہ کی ’ترک اسلام‘، مولوی احسان اللہ عباسی گورکھپوری کی ’الاسلام‘ کا کمال عقیدت و احترام سے پڑھنا اب تک یاد ہے۔ پھر دور مولانا شبلی کے تسلط کا آیا۔ اور سچ یہ ہے کہ لکھنا لکھانا سیدھا جو کچھ آیا، وہ اصلاً انھیں کا فیض ہے۔ کالج پہنچ کر جب عقاید میں تزلزل آیا، تو طبیعت کا رُخ اسلام سے الحاد کی طرف مُڑ گیا۔ انگریز ملحدین کی کتابیں بکثرت پڑھنے سے۔ تو اسی زمانہ میں ایک کتاب بعنوان فیصلہ بڑے چاؤ اور اہتمام سے لکھنا شروع کی، اور اُسے معنون بھی مولانا شبلی ہی کے نام سے کیا۔ الحمد للہ کہ اب اس کا مسودہ بھی معدوم ہے۔

سنِ شعور پر پہنچ کر پہلی باضابطہ کتاب ’فلسفۂ جذبات‘ قلم سے [illegible] میں نکلی۔ سن کا اُس وقت ۲۱ واں سال تھا۔ کتاب انجمن ترقی اردو نے لکھوائی اور اسی نے چھاپی (صحیح نام ’نفسیات جذبات‘ ہونا چاہیے تھا مگر نفسیات کی اصطلاح اُس وقت تک نامانوس تھی) اب اُس کی کوتاہیوں پر ہنسی تو کم آتی ہے، غصہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری کتاب ہر اعتبار سے لغو ’فلسفۂ اجتماع‘ لکھ ڈالی جس کا ایک ایک صفحہ الحاد سے داغدار، اُس کی اشاعت و فروخت مدت دراز ہوئے بند کرا چکا ہوں۔ پھر دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں، ایک ’تاریخ اخلاق یورپ‘ (لیکی) اور دوسری ’تاریخ تمدن انگلستان‘ (جزو اول) ایک ڈرامہ بھی ’ناظر‘ کے فرضی نام سے اسی درمیان میں لکھ ڈالا۔ [illegible] میں حیدرآباد جانا ہوا، یونیورسٹی کے سررشتۂ ترجمہ و تالیف میں۔ وہاں ایک خاصی ضخیم کتاب منطق پر لکھی اور جو خالی وقت بچ گیا اس میں ترجمہ ’تاریخ یورپ‘ کا کیا۔ دار المصنفین اعظم گڑھ کے لیے فلسفہ میں مکالمات برکلے کا ترجمہ کیا۔

دس سال تک ملحد رہنے کے بعد خیالات میں پھر انقلاب پیدا ہوا (تفصیل آگے آ رہی ہے)، چند فلسفہ و تصوف کا درمیانی راستہ طے کرتے ہوئے اسلامی تصوف کی طرف آیا، اور [illegible] میں از سرِ نو مسلمان ہو گیا۔ اس درمیانی دور میں ایک فرنچ فلسفی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ، مع اپنے اصلاحی قسم کے حواشی اور دو مستقل بابوں کے اضافہ کے ’پیام امن‘ کے نام سے کر دیا تھا، اور ’مصطفیٰ‘ کی ایک عاشقانہ مثنوی بھی ایڈٹ کر ڈالی تھی۔ تجدید اسلام کے بعد توجہ از سرِ نو اسلامیات کی جانب ہوئی۔ بھولی بھالی زنگ خوردہ عربی کو پھر سے تازہ و درست کیا، اور سرگرم مطالعہ پہلے تو تصوف اسلام کا رہا۔ بزرگوں کے ملفوظات، تذکرے، اور سب سے بڑھ کر مثنوی مولانائے روم، اور اس کے بعد مطالعہ حدیث و فقہ اور آخر میں تفسیر کی باری آئی۔ بہت کچھ اردو ترجموں سے بھی سہارا لے کر۔ تھانہ بھون کی حاضری [illegible] سے شروع ہو چکی تھی۔ وہیں خانقاہ میں دو ایک سال بعد ایک صاحب نے ہمت دلائی کہ قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں جمہور اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے کر ڈالو۔ ہمت آخر کار کسی طرح بندھ گئی، اور جس کا کام ہے، اُسی کی توفیق و امداد سے کئی سال کی مشقت میں کام پورا کر ڈالا۔ تفسیری حصہ بھی انھیں ضمن میں ختم ہو گیا، اور خاصا مطالعہ انھیں تفسیری نوٹوں کی خاطر کرنا پڑا۔ قرآن کے بے شمار معجزات میں ایک معجزہ اسے بھی سمجھنا چاہیے کہ مجھ سے کم علم، بلکہ بے علم سے بھی یہ کام کرا لیا۔ چھپائی میں دیر بے اندازہ لگ گئی۔ اور جب پریس کے شکنجہ سے باہر آیا، جب بھی میری مرضی کے مطابق نہیں۔ خیر اس کے بعد حوصلہ کھل گیا، اور اردو ترجمہ و تفسیر کا بھی کام شروع کر دیا۔ اور جوں توں اُسے بھی ختم کر دیا۔ انگریزی کام میں چھ برس لگ گئے تھے، یعنی [illegible] سے [illegible] تک۔ اردو کے کام میں اسی کے قریب قریب وقت لگا۔ دیر اس کی چھپائی میں بہت ہوئی۔ لیکن بہرحال انگریزی تفسیر سے دیر ہی کم۔ دوسری چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی قرآن ہی سے متعلق نکلتی رہیں: جغرافیہ قرآنی، اعلام القرآن وغیرہ۔ اور آخر میں دو کتابیں ایسی ہی جیسی تفسیر قرآنی کے بعد حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ ایک ’سیرۃ نبوی قرآنی‘ (جو دراصل مدراس میں دیئے ہوئے میرے لیکچروں کا مجموعہ ہے)، اور دوسری ’بشریت انبیاء‘، کہ اس موضوع پر مجھ کم نظر کو کسی زبان میں کسی کتاب کا اب تک علم نہیں۔

حج بیت اللہ کے لیے ۱۹۲۹ء میں گیا تھا، کچھ روز بعد سفرنامہ "سفرِ حجاز" کے نام سے شائع ہوا اور لوگوں میں بہت مشہور ہوا۔ دو کتابیں اپنے ذرا خصوصی محسنوں پر لکھیں، ایک حضرت تھانوی پر "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں، دوسری مولانا محمد علی پر "محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں۔ ان پر بھی دوستوں، رفیقوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ ایک کرم و محترم دوست مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) تھے اُن کے خطوط بہت سے ضائع ہو جانے کے بعد بھی کئی سو کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ دوستوں کے اصرار سے انھیں ایڈٹ کر کے چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ "مکتوباتِ سلیمانی" کی پہلی جلد میں ان سطروں کی تحریر کے وقت چھپ کر آ گئی ہے اور بقیہ دوسری جلد ان شاء اللہ سال آئندہ چھپ جانے کا پروگرام ہے۔ مولانا شبلی، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی کے خطوط کا مجموعہ "خطوطِ مشاہیر" کے نام سے مدت ہوئی چھپ چکا ہے۔ میری "فلسفہ" حصۂ اول و حصۂ دوم کے علاوہ نفسیاتِ علالت پر ایک کتاب "ہم آپ" کے نام سے بہت عرصہ ہوا چھپ چکی ہے۔ ادبی چیزیں بھی نکل چکی ہیں۔ مثلاً "انشائے ماجد" (اول و دوم) "اکبر نامہ" "نشریات" وغیرہ۔ تصنیفات کی یہ مکمل فہرست نہیں، چھوٹی بڑی اور بھی ہیں۔ یہاں انھیں کا ذکر ہے جو بے ساختہ یاد آ گئیں۔

اصل مرکزِ توجہ اب اردو تفسیر قرآن ہے اور سارا ہی اسی میں لگا ہوا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن کسی طرح مکمل ہو کر اپنی زندگی ہی میں نکل آئے۔ نظرثانی ایک ایک سطر کی کر رہا ہوں، بلکہ کہنا چاہیے کر چکا ہوں۔ کچھ حصہ خارج کرنا پڑا، اور بہت زیادہ اضافہ کرنا۔ انگریزی تفسیر پر نظرثانی کی ہمت اب نہیں، گو ضرورت اس کی بھی شدید ہے، اتنی مشقت اب کہاں برداشت کر سکتا ہوں۔ اردو ہی تفسیر کے نئے ایڈیشن کے لالے پڑے ہوئے ہیں، ہندوستان کا کون ناشر اتنی ضخیم کتاب پر سرمایہ لگانے کو تیار ہو گا؟

کتابوں کی آمدنی پچھلے برسوں نام ہی کو ہوتی تھی، اب ماشاء اللہ "منشی" وغیرہ سے اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ "صدق" بھی اچھا خاصا چل رہا ہے۔ اور بجائے بار ہونے کے اب مالی اعتبار سے بھی منفعت بخش ہے۔

لکھنے پڑھنے کے کام میں سب سے بڑا فیض مولانا شبلی سے پایا۔ برسوں ان کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا۔ ان کے فقرے زبانی یاد کر لیے، کوشش کر کے ان کی نقل اور پیروی کی۔ شبلی کے بعد اردو جو کچھ بھی آئی وہ مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی کتابوں سے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہتوں سے فیض حاصل کیا۔ بڑوں اور برابر والوں کا ذکر نہیں، چھوٹوں سے بھی سیکھنے میں کبھی شرم نہ محسوس کی۔ اب بھی سیکھتا رہتا ہوں۔ اور ۸۰ سال کے سن میں اپنے کو محض "طالب علم" ہی سمجھتا ہوں۔ اپنے نامور استادوں میں سے سب کے نام لکھنے بیٹھوں، تو شاید پورا صفحہ ہی اس فہرست کی نذر ہو جائے۔ اس کا یقین رکھتا ہوں کہ لکھنا اب بھی نہ آیا۔ اپنی ہر تحریر پر جب کچھ عرصے کے بعد نظر کرتا ہوں، تو معنوی خامی کے علاوہ زبان و بیان میں بھی بیسیوں عیب و سقم نظر آتے ہیں۔ اور بس نہیں چلتا کہ ان عیبوں کو کھرچ کر چھیل کر مٹا دوں۔

پڑھنے کا مرض شروع ہی سے تھا۔ پڑھتا تھا اور اندھا دھند پڑھتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول (اس وقت کا میٹرکولیشن) پاس کر کے گرمیوں کی بڑی چھٹیوں میں لکھنؤ آیا، اور ابھی انٹرمیڈیٹ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ اُن کی کتابوں میں ایک انگریزی کتاب پر نظر پڑی ELEMENTS OF SOCIAL SCIENCE مصنف جیسا کہ بعد کو معلوم ہوا کوئی ملحد ڈاکٹر (DRYSDALE) نامی تھا۔ اس پہلے ایڈیشن پر اس کی صرف ڈگری درج تھی۔ یعنی (BY AN M.D.) اور اس سن میں، اور اس زمانہ میں ذہن کو مرعوب کرنے کے لیے مصنف پر ایم ڈی کی ڈگری کافی تھی۔ پھر کتاب کا انداز بیان بھی خطیبانہ پر جوش اور ہر جوشِ نفس کے عین مطابق، بلکہ اُسے اور تیز کرنے والا۔ کتاب کا خلاصہ در خلاصہ یہ تھا کہ یہ اخلاقی بندشیں سب مذہب والوں نے گھڑ رکھی ہیں۔ جب اپنے میں اتنی جسمانی قوت آ جائے تو ہر نفسانی خواہش آزادی سے پوری کر سکتے ہیں۔ نکاح وغیرہ کی قید کے کوئی معنی نہیں۔ طبیعت کو دبانا اور روکے رکھنا تو اور مضرِ صحت ہو گا

وغیرہ وغیرہ۔ نفس مذہب کے خلاف پہلا اثر اس وقت طبیعت نے قبول کیا۔ پھر کچھ دن بعد جب لکھنؤ میں مستقل قیام ہو گیا اور انٹرمیڈیٹ میں پڑھنے لگا انگریزی ادب کے ساتھ تاریخ انگلستان، منطق اور عربی کے اختیاری مضمون لے کر، تو کتابوں کے عشق میں علاوہ کالج لائبریری کے دوسری لائبریریوں کے بھی چکر لگانے لگا۔ ایک دن اتفاق سے ایک لائبریری میں کئی جلدوں میں ایک کتاب دیکھی، نام اب (ENTER NATIONAL LIBRARY OF FAMOUS LITERATURE یاد پڑتا ہے)۔ اچھے مصنفوں کی تصانیف و مضامین کا انتخاب تھا۔ ایک مضمون سیرت نبوی پر بھی تھا، غالباً واشنگٹن ارونگ کے قلم سے۔ اسی کے ساتھ ایک پنے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بھی تھی، معاذ اللہ! چہرے سے خشونت اور غضبناکی برستی ہوئی، نہ کہیں ترحم نہ شفقت۔ کمر سے تلوار لٹکتی ہوئی، اور شانہ پر ترکش و کمان، رحمۃ للعالمینی کے تخیل سے کوئی دور کی بھی مناسبت نہیں۔ اور اس کے نیچے حوالہ کسی قدیم قلمی تصویر کا دیا ہوا! یہ گمان تو اس سن میں اور وقت کی اس فضا میں گزر بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تصویر مصنوعی یا جعلی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو بہر حال صحیح ہی ہے۔ ہو نہ ہو یہ خیال ہی غلط تھا جو اب تک رحمت عالم سے متعلق دماغ میں جاگزیں تھا! نفس مذہب کی طرف سے تزلزل تو اس ڈاکٹر والی انگریزی کتاب نے پیدا ہی کر دیا تھا، اب اس تصویر کم بخت نے براہ راست اسلامیت پر ضرب کاری لگا دی۔

طبیعت کسی دوسرے مذہب، مسیحیت، آریت، ہندومت، وغیرہ کی طرف مطلق ذرا بھی مائل نہ ہوئی۔ البتہ الحاد و دہریت اور بے دینی کے لیے جگہ دل و دماغ میں پیدا ہونے لگی۔ یہ کاوش ایک سال کے اندر ہو گئی تھی کہ ایک غیر مسلم یورپ زدہ دوست کے ہاں لندن کی رشنلسٹ ایسوسی ایشن کی بعض مطبوعات دیکھیں اور خود بھی گرویدہ ہو کر منگانا شروع کر دیں۔ کتابیں سب کی سب سستی قیمتوں کی تھیں اور سائنس، فلسفہ، تاریخ، وغیرہ کسی نہ کسی علمی عنوان کے قالب میں عموماً مذہب ہی پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کے مسلسل مطالعہ نے اسلام سے اتنی دور اور بے دینی میں اتنا پختہ کر دیا کہ ۱۹۱۰ء کے شروع میں جب انٹرمیڈیٹ کے امتحان کا فارم بھرنے لگا، تو مذہب کے خانے میں اپنا مذہب بجائے اسلام کے "ریشنلزم" (عقلیت) درج کر دیا اور جب فرسٹ بی اے میں پہنچ کر نفسیات کے زیادہ وسیع مطالعہ کی نوبت آئی تو اب اپنی شامت سے اور کتابیں اسی مضمون کی نظر سے گزریں ان ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی لکھی ہوئی کہ وحی و الہام سب ڈھکوسلے ہیں، یہ محض نفسیاتی کیفیتیں، محض صورتیں اختلال دماغی کی ہیں۔ کرتا یوں ہی کیا کام جو جنون ہے، اور پھر جو تعلیم پڑھتا ہوا ہو، رفتہ رفتہ ذات رسالتؐ سے ایک طرح کا بغض و عناد پیدا ہو گیا۔ لکھنؤ سے ایک ماہنامہ الناظر اسی زمانہ میں نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں ایک لمبا چوڑا مضمون کئی قسطوں میں فرضی نام سے، مولانا شبلی کی کتاب الکلام کے رد میں یا تنقید میں لکھ ڈالا۔ مضمون تھا حقیقت میں مذہب اور مذہب اسلام کے ابطال میں۔ لیکن اس پر پردہ پڑا ہوا تھا مولانا شبلی کی کتاب کی تنقید کا، اسی لیے ایڈیٹر صاحب نے جو مولانا سے خفا تھے اسے بلا تامل شائع کر دیا۔ والد صاحب مرحوم گھر سے دور ہی رہتے تھے، ان تک میری بے دینی کی اتنی تفصیلات تو پہنچی نہ تھیں، پھر اڑتی پڑتی جتنی خبریں بھی انھیں مل جاتی تھیں، ان سے ان کے دل کو جتنا صدمہ پہنچا تھا، ظاہر ہی ہے۔ بے چارے اپنے صدمہ کے اندر کوشش بھی اصلاح کی کسی نہ کسی ذریعہ سے کرتے رہے۔ نماز پنجگانہ تو مدت سے چھوٹی ہوئی تھی ہی، اب عید و بقر عید کی نمازیں بھی گئیں، بس اس وقت کہیں ٹل رہا جاتا تھا، لوگ سمجھتے کہ کہیں نماز پڑھنے گئے ہوں گے، حالانکہ اب نماز سے واسطہ کیا رہ گیا تھا۔

غنیمت بس یہ ہوا کہ معاشرتی، مجلسی تعلقات مسلمانوں سے نہیں ٹوٹنے پائے۔ مسلم قوم سے گہرا تعلق بدستور قائم رہا، اور اسی لیے ایسے آدمیوں سے بھی جن کا شمار مذہبی یا نیم مذہبی طبقہ میں تھا، مولانا شبلی، نذیر احمد، شرر، راشد الخیری وغیرہم، قومی اور معاشرتی حیثیت سے بحمد اللہ دور الحاد شدید میں بھی مسلمان ہی رہا، جب کوئی عیسائی یا ہندو، مسلمانوں کو برا بھلا کہنے لگتا، تو قومی عصبیت ابھر آتی اور اسے جواب دینے لگتا، چنانچہ مشہور دشمن اسلام پادری زویمر Zwemer جب ایک بار (غالباً ۱۹۱۱ء میں) ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں مسیحیوں کی بڑی کانفرنس میں شریک ہوئے، تو اپنے ایک رفیق مولوی عبد الباری ندوی کو لے کر ان سے ملنے گیا، اور ان کے سامنے ان کے اعتراضات کے جواب میں اسلام کی وکالت ہی کرتا رہا، اور یہی صورت چند سال بعد پھر پیش آئی۔ جب ایک دوسرے اور

ہوئے بھی ہیرو۔ دشمن اسلام پروفیسر مارگولیس آکسفورڈ سے لکھنؤ آئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہمراہ جا کر ان سے بھی ملا، اور ان سے بھی اسلام کی طرف سے مدافعانہ و وکیلانہ گفتگو کی۔

۳

یہ دور خالص مادیت کا کوئی دو سال تک رہا، ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک۔ بلکہ ابھی ۱۹۱۸ء ہی چل رہا تھا کہ ایک دوست نے ایک انگریزی کی لکھی ہوئی کتاب بدھ مذہب پر تعریف کے ساتھ دی۔ اس سے خیالات میں انقلاب کی شروعات ہوئی، اور مادیت کی صلابت و جمود پر پہلی ضرب لگی۔ ذہن نے مانا کہ مادیت کے سوا کچھ اور بھی سننے کے قابل ہیں۔ جیسا کہ مذہبی جینی اور غیر معروف مذہبوں (شنتو ازم، کنفیوشس ازم) ان کی کتابوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی وقعت بھی کچھ دل میں پکڑنے لگی۔ ان ہی دنوں کے ساتھ ایک طاقتور رو ہندو فلسفہ تصوف کی آئی۔ ان کے ہاں کی مشہور کتاب بھگوت گیتا، مسز اینی بسنٹ کی ترجمہ کی ہوئی نظر سے گزری، اور اس نے ایک زبردست ضرب عمارت فلسفہ مادیت پر لگا دی۔ بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس اور دوسرے ہندو فلسفیوں، مفکروں، تحریروں اور یوگیوں کی کتابوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ یعنی فرنگیت کے زہر کے لیے تریاق کا اثر ہندو فلسفہ کی کتابیں گو سمجھ میں نہ آئیں، پھر بھی انھیں پڑھ گیا۔ بدھ اور گاندھی جی بھی اس مرحلہ میں بڑے معین و مفید ثابت ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے میں محمود و بری سے ایک ہندو قسم کا مشرقی ہو گیا۔ اردو میں جوگی جتنے اس قسم کی کتابیں بھی بہت کام آئیں۔ سال سوا سال اسی دور کے گزرے ہوں گے۔ اور نظر صاحب مسلمان درویشوں کے بھی ملفوظات اور خوارق کرامات کے تذکرے بھی دلچسپی و عقیدت کے ساتھ گزرنے لگے تھے کہ حکمت الٰہی نے عین وقت پر دستگیری کی اور ایک عزیز کے ذریعہ سے مثنوی مولانا روم کا کانپوری نسخہ خوشخط و خوشنما، تحشیہ، ۶ جلدوں میں ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بیسیوں کیا سیکڑوں شعر مطلق سمجھ میں نہ آئے، لیکن تاثر کا یہ عالم کہ کتاب ایک مرتبہ کھول کر بند کر دینے کو بھی جی نہ چاہے۔ بس جی یہی چاہتا کہ اسے بند کمرہ میں تنہائی میں پڑھتے چلے جایئے اور روتے چیخ کرتے جایئے!۔۔۔ قدرت کے کرشمے دیکھئے کہ مثنوی ختم ہی ہوئی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول دیکھنے میں آگئی۔ اور اس سے ذات رسالت کے ساتھ جو غلط عناد سا پیدا ہوگیا تھا، وہ دور بالکل کافور ہوگیا اور رسول اللہ صلعم کی تو جیسے ایک بڑے اچھے مصلح نظر آنے لگے۔ اسی منزل پر تھا کہ محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن ایک عزیز کے پاس دیکھنے کو مل گئی۔ اس نے تریاقیت کا کام کیا۔ اب میں توحید و رسالت دونوں کا قائل تھا۔ اور قرآن کا مصدق۔ حضرت اکبر الہ آبادی کی حکیمانہ گفتگوئیں اور مولانا محمد علی کی تعلیم، خطوط اور گفتگوئیں سب اسی راہ میں ممد و ہدایت یابی میں شریک حال رہیں۔ اور شاید سب سے بڑھ کر میرے والد مرحوم کی وہ درد دل کے ساتھ نکلی ہوئی مخلصانہ دعائیں، جو انھوں نے ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (نومبر ۱۹۱۲ء) میں غلاف کعبہ کو پکڑ کر میری اصلاح و ہدایت کے لیے رب کعبہ سے مانگی تھیں۔ کتابوں کے سلسلہ میں آخری کتاب اس نوعیت کی مکتوبات مجدد سرہندی تھی۔ ... کسی کے چھپے ہوئے خوشنما و خوشخط مختصر نسخے کے ذریعہ، میں نے قریب قریب سب پڑھ ڈالے۔ اور اب میں ارتداد کے چنگل سے بالکل چھوٹ کر از سر نو اسلام و ایمان کے دائرہ میں داخل ہوا۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک دس سال کی مدت سرتاسر گمراہی میں گزری۔ ۱۹۱۸ء کے اواخر سے ہلکی ہلکی روشنی ہدایت کی نصیب ہونے لگی۔ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں بحمد اللہ پورا مسلمان تھا، نماز شروع کر دی۔ پہلے پہل بالکل چھپ کر، جب بیوی نے کسی طرح دیکھ لیا، تو اوروں کو رفتہ رفتہ معلوم ہوا۔ ایک زمانہ تک بزرگوں کے مزاروں پر حاضری کا شوق رہا۔ لکھنؤ، ردولی، دیوہ، بانسہ وغیرہ کا ذکر ہی نہیں، دہلی کے بھی کئی بار پھیرے کیے، اور اجمیر کے عرس میں بھی حاضر ہوا۔ خود اپنے گھر میں ایک عرس قائم کیا۔ محفل سماع میں کثرت سے شریک ہوتا اور اکثر یہ حالت طاری رہتا ... سے خاص حد پر بالکل رہی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں مطالعہ قرآن و حدیث کا بڑھتا گیا اور علمائے دیوبند سے قربت ہوتی گئی، یہ شوق بھی کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں بالکل ختم ہوگئے۔ معاصر مذہبی و روحانی شخصیتوں میں تاثر سب سے زیادہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے رہا۔ باقی کم و بیش دینی و روحانی استفادہ بہت سے دوسرے حضرات سے

بھی کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہم۔ عقائد اہلِ سنت والجماعت پر قائم ہوں لیکن دوسرے کلمہ گو فرقوں کی بھی تکفیر نہیں کرتا، بلکہ حتی الامکان ان کے اقوال کی تاویل ہی کرتا ہوں۔ فقہاً حنفی کا قائل ہوں، تاہم اس میں بھی کٹر نہیں، لیکن محدثین اور دوسرے ائمہ فقہ کی بھی دل سے عظمت کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھی ان کے طریقے پر عمل بھی کرتا ہوں۔ عقائد کا بیان ایجاز ہو چکا، اعمال صالحہ سرے سے بیان کے قابل ہی نہیں جو ان کا ذکر درمیان لایا جائے، ہاں گناہ البتہ بے شمار ہیں۔ عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی، تو اب ان کی اصلاح کی بھی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اللہ کی رحمت بے پایاں اور عفو بے حساب پر بھروسا اگر نہ ہو تو اپنے اعمال و احوال کے لحاظ سے تو شاید نجات سے بھی مایوسی ہی ہو جائے۔

شرمیلا اور جھینپو بچپن سے تھا۔ اسکول میں صحبتیں شروع ہی سے خراب ملیں، جیسی سب ہی کو ملتی ہیں۔ مگر اس طبعی شرمیلے پن نے ایک حد تک سپر کا کام دیا اور نفسِ امّارہ رنگ زیادہ نہ لایا۔ مسلمان زمینداروں کے گھروں میں طریقہ اس وقت پردہ دار لڑکیوں کا تھا، جنھیں اس وقت کی بولی میں لونڈی باندی کہا جاتا تھا۔ اُن میں ہر سن و سال اور ہر صورت شکل کی ہوتی تھیں۔ ان کی صحبت ملنی اور ملک زادوں، میاں لوگوں سے بچنا تقریباً محال تھا۔ اور اسی ذیل میں گھر کے پیچھے بھی آ جاتے تھے، مثلاً میراثی، نائی، مشتراتی، ان سب کی عورتیں بھی انہیں میاں لوگوں کے رحم و کرم ہی پر رہتیں۔ اپنے والد ماجد مرحوم کو ان سب حالات میں باوجود حاکم مقتدر ہونے کے بہت ہی محتاط پایا، اور والدہ ماجدہ مرحومہ تو ہم لوگوں کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اس لیے مجھے واقعہ پیر بہکنے کا زیادہ موقع نہ ملا، زیادہ کا لفظ حشو نہیں ہے۔ محفوظیت کامل کا دعویٰ ہرگز نہیں، ہائی اسکول پاس کر کے جب لکھنؤ میں مستقل قیام ہوا، تو یہاں آزادی ہر طرح حاصل تھی اور دین و مذہب کا خوف دل سے بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ جو کچھ نہ گزرتا، تعجب ہی تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان سارے حالات کے باوجود شاید شرافت و وقار خاندانی کے خیال کے ماتحت اسے بدکاری کی نوبت گنتی کے دو ایک بار سے زیادہ نہ آئی۔ اور یہ سب صرف اسی دور الحاد کے واقعے ہیں، جو ۱۸ سال کی عمر سے ۲۸ سال کی عمر تک رہا۔ غرض بیش جب کبھی بھی ہوئی لڑکیوں کا زور رہا ہو یا کسی بحث فلسفیانہ اور ہاں یہ چیزیں تو صحت قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں، اور ان سے پرہیز محض وہم اور وہم پرستی ہے۔ اور یہ تو فسق کی صرف ایک قسم ہوئی۔ فسق کی دوسری صورتیں بھی بہار دکھاتی رہیں۔

سنہ یعنی عمر کے ۲۰ویں سال تک میری الحاد پرستی اور فلسفہ خوانی کی دھوم رہی۔ اور اپنے کو خیال بھی شادی بیاہ کا نہ آیا۔ محبت خصوصاً جنسی محبت[1]، جانتا ہی نہ تھا کہ کیا چیز ہوتی ہے۔ صرف کتابوں میں اور شاعروں کے ہاں اس کا ذکر پڑھ کر اُس پر مسکرا دیتا۔ بی اے سنہ میں کر چکا تھا اور اس وقت یہ ڈگری آج کے پی ایچ ڈی کے برابر تھی۔ اور اس مطالعہ نفسیات، سائیکالوجی کے سلسلے میں ہپناٹزم (عملِ تنویم) کا جادو بھی تھا۔ لوگوں کا علاج بھی ہپناٹزم کے ذریعہ کامیابی سے کرنے لگا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں اور نوجوانوں کا۔ سنہ میں ایک حقیقی خالہ زاد بھائی جو اپنے شہر میں ایک خاصے خوشحال رئیس تھے، ان کی نوعمر قبول صورت لڑکی کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا۔ گھٹنوں کے درد کا علاج کرتا تھا۔ ہپناٹزم کے عمل کو دو ہی چار منٹ ہوئے تھے کہ درد بالکل جاتا رہا۔ اور مریضہ نے اپنی بہن سے خوشی سے پکار کر کہا، اب میں بالکل اچھی ہو گئی۔ اس فقرے نے جادو کا سا اثر کیا۔ اور دل کے اندر سے آواز آئی کہ شادی اسی کے ساتھ ہو جائے، تو کیا اچھا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دل میں شوق قائم ہی نہیں رہا بلکہ بڑھتا رہا۔ ذات پات کا کچھ پوچھنا تھا ہی نہیں۔ لڑکی خاندان ہی کی تھی۔ صحت و تعلیم کے معیار سے بھی اچھا تھا۔ عمر میں لڑکی سے ۱۰، ۱۲ سال بڑا تھا۔ مگر دوسری طرف مشکل یہ تھی کہ بچپن سے میری نسبت ایک اور عزیزہ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ والدین نے اُس زمانے کے حسبِ رواج، بغیر مجھ سے پوچھے گچھے ایک جگہ کر دی تھی۔ برسوں کی لگی لگائی نسبت کو توڑنا اور چھوڑنا اس وقت کے ماحول میں آسان نہ تھا۔ خیر کوششیں ہوئیں، دو ایک صلح جو عزیز درمیان میں پڑے اور وہ نسبت ٹوٹ گئی۔ یہ سب ہوتے ہوتے اور پیام جاتے اور اس کی منظوری آتے ڈیڑھ دو برس کی مدت لگ گئی ہیں

---

[1] محبت کا لفظ درمیان میں رہے۔ محبت اور چیز ہے اور ہیجانِ نفس یا تقاضائے جنسیت کچھ اور

درمیان میں ادھر عشق ترقی کرتا رہا، ادھر لکھنؤ میں ایک ہی مکان میں رہنے سہنے کے مواقع مل گئے۔ عشق تا آنکہ یک طرفہ ہی رہا، اس غریب کو خبر بھی نہیں کہ کس نظر سے دیکھی جا رہی ہے۔ یہ باتیں اس وقت کی شریف زادیوں میں عام کہاں تھیں۔ نسبت طے ہو جانے کے کوئی چھ مہینے بعد میرے ہونے والے خسر کا دفعۃً انتقال ہو گیا، اور اس لیے شادی کی گھڑی اُن کی برسی کے انتظار میں، ایک سال کے لیے اور ٹل گئی۔

خدا خدا کرکے جون ۱۲ء آیا، اور تین سال کی اُمیدواری کے بعد شروع جون میں عقد ہو گیا۔ اب ۶۲ء ختم پر ہے، اس ۵۰ سال کی ازدواجی رفاقت میں تقلبات خدا جانے کتنے آئے اور گئے، لڑائیاں ہوئیں، رنجشیں رہیں، شکر رنجیاں ہوئیں اور بجا بھی، روٹھنا منانا معمول سی ہو گئی۔ عسرت و تنگ دستی کے دور بار بار آئے، جوانی گئی وہ سب رنگ روغن گیا، پیرانہ سالی کی چیزیں آئیں، زلف عنبریں کی سفید تاریں، اور عارض گلگوں کی جھریاں، سب طرح طرح کی بیماریاں، آزاریاں کتنا جیسے لگے کا بار بار ہو رہے۔ اس پر بھی ادھر سے محبت کا پارہ، کہنا چاہیے کہ اسی درجہ پر قائم رہا۔ شباب کے زوال اور حسن رعنائی ڈھل جانے کے بعد قدرت کا ایک قانون اُنس نامی آ نکلتا، اور فریقین کے دلوں کو جوڑے رہتا ہے، خصوصاً جبکہ خوف خدا بھی دلوں میں پیدا ہو چکا ہو اور ادائے حقوق کی کوشش شعوری طور پر ہوتی رہے۔

اولاد کوئی زندہ ہو، لڑکیاں ماشاء اللہ چار ہیں، چاروں شادی شدہ، سب کی شادیاں گھر ہی میں ہوئیں میرے بھتیجوں کے ساتھ۔ چاروں پڑھی لکھی دینداری کے ساتھ ہی خدمتی، دینی ضرورت بھر کا علم رکھتی ہیں، چار میں سے تین صاحب اولاد بھی ہیں۔ گھر کا انتظام بحمد اللہ یوں بندھ گیا ہے کہ سال کا بیشتر حصہ ایک ایک دو دو لڑکیاں باری باری میرے ساتھ گزارتی رہتی ہیں، اور خدا کے فضل سے اب تک خانگی زندگی بڑے سکون خاطر کے ساتھ گزر رہی ہے۔

صحت بہت اچھی تو لڑکپن، جوانی اپنی دور کے کسی دور میں بھی نہیں رہی، لیکن خیر کچھ ایسی بری کٹے رہنے میں نہیں ہے احتیاطیں طرح طرح کی کرتا رہا خصوصاً غذائی۔ ورزش سے گو تعلق ہی نہ رکھا اور دانتوں کی صفائی پر کبھی توجہ رکھی، نہ آنکھوں سے کام لینے میں کوئی روشنی یا طرز نشست وغیرہ کا کوئی اہتمام رکھا مسلسل، یہ چیزیں آخر کب تک رنگ نہ لائیں۔ بال بہت قبل از وقت سفید ہو گئے، دانت یکے بعد دیگرے گرتے گئے، مایوپیا (نزدیک بینی) کے مرض نے لڑکپن ہی سے آنکھوں پر عینک کا لگانا ضروری کر دیا تھا، آگے چل کر ہوش آیا، اور عمر جب ۵۰ اور ۶۰ کے درمیان ہو گئی، تو لکھنؤ کے ایک بڑے مخلص و محترم بزرگ مولوی محمد نسیم صاحب (نامور ایڈووکیٹ) نے خاص طور پر چونکایا، اس وقت سے صحت پر توجہ کی اور ہلکی ورزش کے لیے بھی وقت نکالا، گرتی ہوئی صحت انشاء اللہ سے سنبھل گئی۔ دانت تو خیر اب سب جا چکے، اور آنکھ سے بھی اب کام رات کو زیادہ نہیں لے سکتا، شام کے جھٹپٹے، یا فجر کے دھندلکے، یا ابر غلیظ کے وقت دن میں بھی نہیں لے سکتا اور گرانی گوش بھی چند سال سے عارض ہو گئی ہے۔ تاہم عام صحت اب بحمد اللہ بہت اچھی ہے، ۷۰ سال کے سن میں خوب کھا پی لیتا ہوں، چل پھر بھی اچھا خاصا لیتا ہوں، رات کو نیند بھر سوتا ہوں، البتہ تیز چلنے سے مقام قلب پر تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے، اور دیر بہت زیادہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کام کے اوقات قدرۃً بہت گھٹ گئے کہ اب صرف دن کے چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔

علوم و فنون، زبان و ادب کسی شعبہ میں بھی کمال حاصل کرنا نصیب میں نہ تھا۔ وصف امتیازی بے کمالی ہی رہا۔ اردو اپنی مادری زبان تھی، خیر ٹوٹی پھوٹی کسی حد تک آ گئی، گو اس میں بھی جتنی خامیاں ہیں، اب مجھ پر خوب روشن ہیں۔ انگریزی لکھنے کی مشق ایک زمانہ میں کچھ تھوڑی بہت تھی، ہندوستان کے روزناموں اور رسالوں میں تو خاصی مضمون نگاری کرتا تھا، یورپ میں بھی دو ایک بار جسارت کر بیٹھا تھا، اور اواخر ۱۵ء میں تو ایک چھوٹی سی کتاب بھی سائیکالوجی آف لیڈرشپ کے عنوان سے ایک لندنی پبلشر کے ہاں چھپ چکی تھی، اور ۴۳ء سے ۵۷ء تک کا وقت لگ لپٹ کر انگریزی ترجمہ تفسیر قرآن میں صرف کر دیا تھا۔ لیکن اب سال ہا سال سے یہ مشق بھی بالکل چھوٹ چلی ہے، اور جب بھی کوئی معمولی سی تحریر انگریزی میں ناگزیر ہوتی ہے تو سوچ سوچ کر لکھ پاتا ہوں، ایک

زمانہ میں ضبط فرنچ زبان سیکھنے اور اس کے بہت بعد جرمن زبان سیکھنے کا رہا۔ اور جرمنی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر ان کے لیے بھی وقت نہ نکال سکا۔ اور جو کچھ دماغ میں آ گیا تھا سب صاف ہو گیا۔ رہی عربی، تو کام بھی عربی کا بساط بھر کیا۔ جسارت کی جسارت تھی کہ ترجمہ و تفسیر قرآن کے لیے قلم ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور اللہ نے اپنے اس بے علم بندے کی لاج اس حد تک رکھ لی، کہ اس اشتم پشتم کام کو انجام تک پہنچا دیا۔ حقیقتاً اسے بھی قرآن مجید ہی کا ایک زندہ معجزہ سمجھنا چاہیے

ایک طرف اپنی علمی بے بضاعتی کو دیکھتا ہوں، اور ایک طرف اپنے ان کاموں کو جو کسی نہ کسی طرح بہرحال انجام کو پہنچ ہی گئے ہیں، تو بس حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ بقول شخصے ؎

ہے آرزو کی اڑنے پہ تم کو دیکھیے
اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

کتابوں اور اخبار کے لیے جتنی قبولیت بھی ہو تمام تر ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ صدق کے شذرے اور بعض باتیں، اس کثرت سے ہندوستان کے اندر اور باہر (یعنی پاکستان اور برما میں) نقل ہوتی ہیں کہ اتنی کسی اور پرچہ کی نہ ہوتی ہوں گی اور کتابوں کی اشاعت بھی شکر کے قابل ہے۔ مالی مستقل آمدنی تو اس وقت تک وہی ایک سو روپیہ ماہوار کی علمی پنشن کی ہے جو حیدرآباد سے اب اپنے صوبہ اتر پردیش کو منتقل ہو گئی ہے۔ باقی کتابوں اور اخبار کے فروخت نیز کتابوں کی رائلٹی وغیرہ سے کئی ہزار سالانہ کی ہو جاتی ہے۔ اور گھر کا اچھا خرچ بہ آسانی چل جاتا ہے۔

سعادت مند بھتیجے اور داماد بھی کچھ نہ کچھ ماہانہ نذرانہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ غرض معیار زندگی، آج کل کی اصطلاح میں، بلند ہے۔ اور زندگی اگر رئیسانہ نہیں تو درویشانہ بھی نہیں بسر ہو رہی ہے۔ گھر میں نوکر چاکر پہلے متعدد تھے، بالفعل اب بھی ان سے محروم نہیں ہوں۔

خوش لباسی کا شوق مدت ہوئی ترک ہو چکا ہے۔ موٹا مہین، گاڑھا جیسا بھی مل جاتا ہے بہ خوشی پہن لیتا ہوں۔ بہت مہنگے ہوئے لباس سے بھی احتراز نہیں۔ کھانے کا شوق البتہ اب تک ہے۔ مگر وہ بھی بڑی حد تک قابو کے اندر۔ اور یہی حال مکان کا ہے۔ مکان وسیع اور آرام دہ چاہتا ہوں۔ آسائش کا حریص رہتا ہوں، مگر آرائش کا نہیں۔ مزاج کا غصہ ور پہلے سے ہوں۔ جوانی بھر غصہ سے بے طرح مغلوب رہا۔ میلان و صلاحیت اب بھی رہی ہے۔ البتہ اب کچھ تو سن اور تجربہ کے اثر سے، اور کچھ حضرت تھانوی کے فیضِ تربیت سے کبھی کبھی غصہ کو دبا لینے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہوں۔ حرص دنیا میں بھی گرفتار رہتا ہوں۔ بندوں کے حقوق کی ادائی اب بھی نہیں کر پاتا ہوں۔ اور پچھلا حساب جو سر و پشت پر لدا ہوا ہے، اس کا تو حساب ہی نہیں۔ عبادات میں بھی صد درجہ کاہل اور متساہل ہوں تن آسانی اور عافیت کوشی کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہوں۔ جد و جہد کیا، زیادہ سخت و پرمشقت صورتوں کے قریب بھی نہیں جاتا۔

جن زندہ شخصیتوں سے عمر کے مختلف حصوں میں متاثر ہوتا رہا ہوں، ان کی تعداد بڑی ہے۔ سب کے بیان کی گنجائش بھی اس مختصر سرگزشت میں نہیں۔ شاید چیدہ چیدہ کے نام کسی حد تک کافی ہوں گے۔

مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب اعتماد الملک خواجہ غلام الثقلین، اکبر الہ آبادی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بابائے اردو عبدالحق، مولانا ابوالکلام، گاندھی جی، ڈاکٹر بھگوان داس، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ سنوسی مرحوم اور حکیم الامت مولانا تھانوی۔ محمد علی اور مولانا تھانوی دو شخصیتیں سب سے زیادہ موثر رہیں۔ طالب علمی کے دور کے دو ساتھیوں کا اثر گہرا رہا، ایک ڈاکٹر محمد حفیظ سید مرحوم، دوسرے مولانا عبدالباری ندوی۔ گو دونوں سے رنجشیں بھی بارہا ہوئیں۔

بیعت ضابطہ سے مولانا سید حسین احمد مدنی سے سنہ ۲۵ء میں کی۔ اس وقت تک بیعت کی حقیقت سے بھی واقفیت نہ تھی۔ دل میں یہ جما ہوا تھا کہ جو بھی بزرگ و صالح نظر آئے، بس وہ اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے۔ چنانچہ کئی سال قبل مولانا محمد علی کے اخلاص و مقبولیت کو دیکھ کر انھیں سے بیعت

کا ارادہ کر لیا تھا۔ پر تو اس کے بعد جب حضرت تھانوی کے ہاں آمد و رفت زیادہ ہوئی، اور ان کی کتابیں بھی آنکھ کھول کر پڑھیں، جب سمجھ میں آیا کہ اولاً تو مرشد اور مرید میں مناسبت ہونا ضروری ہے، اور پھر مرشد کا مرتبہ بزرگی و مقبولیت عند اللہ جیسا بھی ہو، اُسے اصلاحِ نفس کے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت تھانوی ہی کی خدمت میں نیاز مندی بڑھتی گئی، اور اپنے ظرف و استعداد کے لائق جو کچھ بھی حاصل ہو سکا، سب اسی آستانے سے حاصل ہوا ——— یوں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی سے بھی بہت کچھ سیکھا۔

کتابوں میں، بعد کتاب الٰہی کے، جس کتاب سے عشق کی سی کیفیت ہے، وہ مثنوی مولانائے روم ہے۔ سیکڑوں شعر اب بھی سمجھ میں نہیں آسکے ہیں۔ بے سمجھ میں آئے ہوئے بھی وہ مؤثر ہیں۔ تاثر کے لحاظ سے کچھ یہی حال کلامِ اقبال کے بھی ایک حصّہ کا ہے، مگر سارے کلام کا نہیں۔ محض شعر و شاعری کا جہاں تک تعلق ہے، دیوانِ غالب کا مرتبہ بھی کم نہیں۔

زندگی کا کل کے لیے بھی اعتبار نہیں، اس جاں بلب کی جس کا سن ۸۰ سے اوپر ہو چکا ہو۔ بچپن میں اپنے خاندان میں تقریباً سب ہی سے چھوٹا تھا، کوشش ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا، عمر کی رفتار رُکتی ہوئی، اور بڑے بوڑھے میری کراہیوں، خامیوں، لغزشوں کو ہنس کر ٹالتے ہی رہتے! ——— اب کہنا چاہیے کہ سب ہی سے بڑا ہوں، اور سب کی نظریں میرے اوپر اس طرح پڑتی ہیں کہ گویا میں خاندان اور برادری ہی کا نہیں، بلکہ قوم و ملت کا مقتدا اور پیشوا ہوں! کاش اس ذمہ داری کے اٹھانے کی توفیق کسی ادنیٰ درجہ میں بھی مل جاتی ربنا لا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ کی دعا ایسے ہی موقع کے لیے ہے۔

زندگی پر تبصرہ کرنے بیٹھتا ہوں، تو احسانات الٰہی بے حد و حساب نظر آتے ہیں۔ پیدائش اچھے کھاتے پیتے، لکھے پڑھے گھر میں ہوئی۔ والدین اچھے ملے، بھائی بہن اچھے ملے۔ صحت کی نعمت ملی، بہترین علاج، بہترین معالجوں تک رسائی ہوئی۔ کوئی بھی دور زندگی کا خصوصی حسرت کا نہ آیا، بیوی رفیق ملیں، اولاد اچھی ملی، وقت کے بہترین بزرگوں سے فیض کا موقع مل گیا۔ اہلِ دین اور دنیا والوں دونوں کے دلوں میں اللہ نے محبت ڈال دی۔ اکثر جو حادثے کسی کی زندگی میں نہیں ہوتے، میرے لیے بھی پیش آئے۔ الحمد للہ کہ صبر کا پہلو شکر پر غالب رہا۔ یہ سب کچھ ادھر سے ہوا، ادھر سے ثبوت کم ظرفی ہی کا ملتا رہا۔ بزرگوں، چھوٹوں، رفیقوں، دوستوں، دشمنوں، کسی کے بھی حق پورے ادا نہ ہو سکے، بلکہ بعض کی تو شدید حق تلفیوں کا بار اپنے سر پر رہا۔ اللہ زندگی کا اگر یہ موقع دیتا، تو بجز کے بعد شاید بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ جاتا، اور خدمتِ قرآن ہی میں عمر تمام کر دیتا۔ اب بھی امید رحمتِ کاملہ سے یہی ہے، کہ بغیر کسی استحقاق کے اپنے دامنِ عفو میں پناہ دے، اور مواخذہ و بازپرس کا سوال ہی سرے سے حذف کر دے۔

صاحبِ نقوش کے ارشاد کی تعمیل جوں توں ہو گئی۔ اور عجب نہیں کہ اس خرافات نگاری کی فرمائش پر اب وہ خود بھی شرمندہ ہو رہے ہوں۔

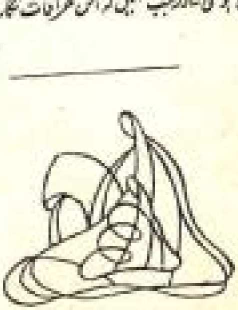

حفیظ جالندھری

شاعروں، ادیبوں اور دوسرے اہل فن کی آپ بیتیاں زیادہ تر اُن کی جسارت، عرقِ جبیں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور میرے پاس تو شعر و شاعری کے سوا اور کچھ دیکھنے کا تقاضا ہے۔ جس پر کچھ ایسی بیت جائے جس کا بیان لازم آئے۔

ترانۂ پاکستان لکھنے اور منظور ہو جانے پر جو داد مجھے اپنی اہل قلم برادری کے ایک حلقۂ خصوص سے پانچ چھ مہینے تک مسلسل ملتی رہی بیشک وہ بہت ہی قیمتی یادگار ہے۔ اس کے لیے ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔ یہ بھی داستان طولانی ہے۔ ورنہ آپ بیتیوں کے ہجوم کے درمیان، آپ بیتیوں کی یادوں جان بھی ہوتیں۔ کیونکہ ادب کی تاریخ میں اپنی ملت و ملک کا ترانہ لکھنے والوں میں سے کسی کے ساتھ ایسی نہیں بیتی ہوگی۔ !

اس نگارش کے آغاز پر آپ بیتیوں کی اس آن بان کی طرف ہلکا سا یہ اشارہ محض اس لیے ہے۔ کہ میرے ہم عصروں میں سے چند جغادریوں کے اشارے پر ہاؤ ہو کی گونج کا طوفان اُٹھا تھا، وہ محض سخن فہموں اور سخن پروروں کی دبی ہوئی صدا تھی۔ ان جغادریوں میں سے چند ایک کا قومی پریس پر "ناجائز" قبضہ یا اثر و رسوخ تھا۔ اس لیے مجھے اس پر ناز ہے کیونکہ یہ میرے لیے

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کا مصداق تھا۔ لیکن مجھے اپنے ہم عصروں کے حضور، اس عزت افزائی کے مقام تک پہنچنے کے لیے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ آج کون ہے جو ان مراحل پر نگاہ ڈالے۔ !

پاکستان کا ترانہ لکھنے کی عزت اور شہرت کا یہ مقام مجھ کو مشق شعر کے بل پر کتنی ذہنی و قلبی کاوشوں کے بعد نصیب ہوا۔ اس کی ایک آدھ جھلک آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ محض ایک آدھ جھلک ورنہ شعر و شاعری کے سلسلے میں آخر آپ بیتیاں ہیں۔ کہ تحریر کے ایک عمر کی بے پناہ صفحات نہیں۔ بہت سی اقساط مثنوی میں بھی شاید میں حفیظ جالندھری نہ سما سکوں۔ !

لیکن آپ بیتیاں میری کامیابیوں کے پہلو زیادہ دلکش ہیں اور یہ کارے کردہ ام کہنے کا عادی نہیں۔ کارے کردہ ام جگہ جگہ چھپی ہے۔ یہ تو لوگوں کا اپنا معاملہ ہے۔ کہ میرے کلام سے اُن کے ساتھ کیا بیتی۔ !

آج چہتر برس کا ہو چکا ہوں، سات برس کی عمر سے شاعر ہوں۔ وہ بھی پنجاب کے صوبے میں رہ کر اردو زبان کا شاعر !

میری دادی جالندھری پنجابی کو زور آگرے کے اس پار میرے ہی گاؤں کی بولی مانتے تھے جب ادائے میری اردو کو اپنے گوش کی غمزوں لکھے کروا رہیں گے۔ ماں بننے کے لیے کوئی نہ کوئی تمنگ بھی تو ہونی چاہیے —— !

ہائے ری نمک ! ابھی تک نہ میرے ساتھ رہ کر میرے دانتوں ہی سے مزہ کر بار بار میرے عزیزوں سے مجھے چھڑایا ہے ــ

عرقِ جبیں و جبرِ شکایات ہو گئی
چھوڑنا سامنہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

خیر، کلام رقیبوں کے ہاتھوں ذرا سی مرمت ہو جانے کو تو میں محبوب سے ان کی ناکامی کا صدقہ واجب جان کر میں نے ایک شعر اور بھی جڑ دیا تھا۔ جس میں اپنی ہار مان لی تھی ؎

دشنام کا جواب نہ سمجھا وہ جز سلام
ظاہر مرے کلام کی اوقات ہو گئی

ساتھ مقطع میں سخن گسترانہ بات بھی آ گئی تھی ؎ قصہ مختصر ہو گیا تھا۔

واعظ کی بات پہ بھی ہنسی آ گئی حفیظ
یہ مجھ سے ایک اور بڑی بات ہو گئی

ترانے کے سلسلے میں نقادوں کا جو تیر میں نے کھائے۔ وہ تو میرے سینے جھیل ہی رہے ہیں۔ ساتھ زخم وہ دو ہی چرکے ہیں۔ جو مجھے ماہروں کی محفلوں میں شعر سنانے کی پاداش میں لگے۔ یہ چرکے بہت گہرے اور بہت پرانے ہیں بظاہر مندمل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہیں ناسور۔ میں ان کا بھی تو شکر گزار ہوں۔ اور یہ شکر گزاری بیجا بھی نہیں۔ کیونکہ یہی چرکے تو مجھے ترانۂ پاکستان لکھوانے تک پہنچا گئے —!

جناب طفیل کو آپ بیتی نمبر کی بہت دیر میں سوجھی۔ میں آج کل کسی اور الجھن میں ہوں۔ کچھ تندرست بھی نہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ میرے شباب شاعری کے دور والے لوگ اب سب تشریف لے جا چکے ہیں ورنہ ایک عرصے کا دور دورہ تا [illegible] وغیرہ کا نقوش میں بھی ہو جاتا۔ یہ تمہید کچھ زیادہ ہوتی جاتی ہے مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ چیزوں میں میری تین جھلک کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ وہ کسی شاعر کسی ادیب کسی نقاد کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتیں اس کا تعلق کسی شاعر سے ہے بھی تو وہ میں خود ہوں۔

تو بطوف عشق چہ کردی کہ بما نشی نظیری
مجرا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

احتراز تو آپ بیتی میں ہو جائے گا۔ فی الحال مجھ پر اس بیتی ہوئی کو جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ پچاس برس بیت چکے ہیں۔ نقوش کے طفیل اچانک اس کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ لکھنا شروع کر دیا ہے تو قصیدے کے انداز میں تمہید۔ گل اندام بہار اور بہار کا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔

لیکن پہلے پیش بینی کر لیں کون ہوں ؟ اپنی مذمت سے پہلے اپنی مدح ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ میں پاکستان کا ہلال امتیاز ہوں اور پرائڈ آف پرفارمنس بھی۔ ابھی کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا۔ پاکستان سے پہلے غیر ملکی حکومت نے خان بہادر کے خطاب فرما کر میرا منہ بند کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اپنی وطنی ریاستوں نے ملک الشعراء اور نواب حسان الملک بہادر بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ادبی جلسے میں سجاد حیدر یلدرم نے علی الاعلان مجھے اردو کا فردوسی بنایا اور اسلام کا شاعر انقلاب بھی قرار دیا تھا۔ قوم ملک اور ملت فردوسی اسلام۔ شاعر پاکستان اور نہ جانے اور کیا اعزازات کے ساتھ فوراً سے چپکے ہی جا رہے ہیں۔ تاہم میرے اپنے گھر کے کاغذ پر جو قصیدہ درد میں خود لکھ رہا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب ایک گریز بنے گا کانٹے بچپن کی کیاری سے کانٹوں سے چھوٹے ہوئے زخم بے کاری کی طرف —!

یقیناً آپ آج ہر محفل میں میری واجب و ناواجب عزت افزائی پذیرائی اور میرے کلام کی شنوائی دیکھتے ہیں۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہاں تک آپ کے حضور حاضر ہو جانے کی راہوں کے آغاز ہی میں مجھ پر کیا کچھ بیت رہی تھی —!

اس وقت نقوش کو میرے بچنے کا محاسبہ تو مطلوب نہیں۔ فقط میری ذاتی آپ بیتی درکار ہے۔ اور میری سوانح حیات آپ بیتیوں کا ایک طومار ہے۔ اس لیے اپنے بارے میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ میں ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کی صبح سورج نکلنے سے ذرا پہلے زمین کے فرش پر عرش والے کی عطا کردہ صلاحیت لیے ہوئے وارد ہوا تھا۔ اللہ اکبر کی اذان نے میرے پیدائشی مسلمان ہونے کا اعلان میرے کان میں کر دیا تھا۔

پھر چھ برس کی عمر میں مسجد سے ملحقہ دالان میں صبح و شام حاضری دیتے ہوئے چند ہی ماہ کے بعد قرآن کریم میں نے معنی جانے بغیر ختم پڑھ لیا تھا۔ اور کسی لفظ کا مفہوم معلوم ہوئے بغیر ہی کر لیا اور داستانیں بھی دونوں رٹ لی تھیں۔ اس لیے ذہین گردانے والے کنبے نے مجھے اسکول کے سپرد کیا تھا وہیں سے شاعری نے مجھے ایسا دریا برد کر دیا۔ کہ آج تک مسلسل غوطے لگا رہا ہوں۔

شاعری کا دورہ مجھ پر ساتویں برس ہی میں پڑ گیا تھا۔ اس وقت میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ لیکن بھلا ہو مولوی فتح دین کا۔ کہ میرے کان کھنچے گئے۔ تھپڑ رسید ہوئے۔ مجھ پر اسٹر لگا دیا گیا اور مجھے اپنا سر سامنے دیکھ کر میرے سر کا سودا نے شاعری میرے سینے میں گھس کر روپوش ہو گیا۔ یہ روپوشی ظاہری آنکھوں سے تھی۔ ورنہ اس ظالم نے تو میرے صدر سینہ اور قلب و جگر کو گھڑ دوڑ جیتنے کی مشق کا میدان بنا رکھا تھا۔

گیارہ برس کی عمر میں چھٹی جماعت کے دنوں میں یہ جوبن پھر ابھرا اب کے یہ ایسے خوب صورت رجحان کی صورت میں سامنے آیا کہ میں نے اس پر دل لگی دل لگی میں کام شروع کیا لیکن دل لگی ثابت ہوئی یہ مرہم شعر و شاعری مجھے لے کر ایسا جاتا۔ ایسا گھنٹہ بجا کہ آج تک مسلسل بیے بیے پھر رہا ہے۔

لہذا شاعری کے علاوہ میری آپ بیتی میں اگر کچھ کہیں نظر بھی آ جائے تو فروعات میں سے سمجھئے گا۔ شاعری اور عاشقی ایک ہی بات ہے باقی تلاش معاش کے معاملات سب واہیات۔ اس ضمن میں میرا اپنا ہی ایک شعر بھی تو یاد آ رہا ہے ؎

ماسوائے عاشقی اور کچھ کیا بھی ہو　　　سر جھکا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کریں

شاعری میں میرا دلچسپی تو مشق غزل تھی۔ لیکن پہلی جنگ عالمگیر میں خلافت عثمانیہ پر جب اتحادیوں کے ہاتھوں زوال آ گیا تھا میں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ آزردہ و افسردہ تھا۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں ڈاکٹر کچلو کے اشارے پر ایک باغیانہ نظم کی وجہ سے میں چند روز کی حوالات میرے حق میں بھی اس لیے جالندھر کے پڑھے لکھے جتنے زیادہ مسلمان کم مجھے اپنا ہونہار شاعر ماننے لگے تھے۔

مشاعروں میں شاعروں سے مسابقت بھی ہو رہی تھی۔ آزاد کی آب حیات میں ذوق اور غالب کی ٹکر بھی میری نظر سے گزر چکی تھی۔ غالب کا میں ہمدرد بھی تھا۔ دونوں صاحبوں کا اپنے مذاق کے مطابق موازنہ بھی کیا تھا۔ غالب بیچارے کی منظور ہے گزارش احوال واقعی۔ پیش کرتے پا کر مجھ کو بھی تعجب تھا کہ اتنے بڑے شاعر کو خواہ مخواہ معذرت کرنی پڑ گئی۔ میرے خیال میں غالب کا سہرا ذوق کے سہرے سے کم نہ تھا۔ میں ایک سہرا بھی لکھ چکا تھا جو چھپا بھی گیا تھا پڑھنے کی سعادت نہیں ملی تھی۔ یہ تھا زمانہ جس کے دوران یہ آپ بیتی آج کاغذ پر اتار رہا ہوں —— [illegible]

ڈسکہ میں دو بھائی چوتھی جماعت سے ساتویں تک مشن اسکول جالندھر شہر میں میرے ہم جماعت تھے۔ ایک کا نام اعجاز اور دوسرے کا اب یاد نہیں مناسب ہے کیونکہ اگر وہ بھی کہیں میری ہی طرح زندہ و پائندہ عاجزی و انکساری گیر ہیں۔ تو بفضل خدا پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں والے ہوں گے اور اگر یہ تحریر ان میں سے کسی کی نظر سے گزری تو مبادا میری آپ بیتی اور بھی زیادہ طویل ہو جائے۔

مجھے تو وہ میرے اسکول فیلو اور کلاس فیلو ہی لگیں گے اور تب سے کچھ زیادہ میل ملاپ یا دوستانہ رنگ ڈھنگ کی رسم نہیں تھی۔ میرے ایک خاص اخلاص بھرے بزرگ کے پیر ذوق کے رشتہ دار ہی تھے انہوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ یہ دونوں بھائی ہم دونوں کی شکایت ابا جی سے بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکایت والدین کی دوا تک بھی پہنچتی تھی۔ لیکن الحمدللہ ہمارا ان سے کبھی کھیل کود کے سوا کوئی بے راہ روی کھیل یا راہ چلتے چلتے منہ دھرنا بھی پیش نہیں آیا تھا۔ شکایت فقط یہ تھی کہ ارے یہ بچے کا دوست ہے ہم سے کھیلتا بھی نہیں۔

میں تو ساتویں کلاس کا امتحان دے کر حساب میں فیل ہو جانے کے محض خوف سے اسکول ہی کو دھتا بتا گیا پر میٹرک پاس لڑکے فرسٹ ایئر ڈویژن میں شامل ہونے کے لیے لاہور، سیالکوٹ، دوسرے شہروں کو نکل گئے اور پڑھ کر بھی بعض تو کالجوں کی بھیڑ میں تتر بتر ہو گئے بعض جالندھر ہی میں پریکٹس، تحصیل کچہری کے منشی، مقدموں کی نقل نویس یا ہندو، مسلمان، سکھ وکیلوں کے جیب بردار منشی ہی نظر آنے لگے۔ انہی میں الف اور ب دونوں بھائی بھی تھے۔

اپنی حالت پر مسلسل برقرار فقط میں تھا جو محض سکول چھوٹے ہی نہیں بھاگا تھا۔ اپنے گھر سے بھاگنے اور پھر پٹ جانے کی پروا کیے بغیر میرے معمول تھے شعر و شاعری کی جنت سے گردشِ روزگار کا بھوت میرے سر پر سوار کر رکھا تھا۔ آخر بہت سے چکر کاٹنے کے بعد میں نے ایک ادبی رسالہ اعجاز نامی اپنے استاد مولانا گرامی کی سرپرستی میں جالندھر سے نکالا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ میری عمر بائیس برس کی ہو گئی تھی، اور میں جالندھر میں اچھا خاصا شاعر بن گیا تھا۔

رسالہ اعجاز کا دفتر دروازہ خندق کے مقابل سرکلر روڈ کے بازار میں تھا۔ یہ کمرہ اور برآمدہ اس کوچے کی نکڑ پر تھا، جس کوچے کے خاتمے پر الف اور ب کا ایک معزز پختہ اینٹوں کا مکان تھا۔ بازار سے میرے دفتر کے پاس سے گزر کر بہت سی ہندوؤں کی حویلیاں دونوں جانب تھیں۔ پھر ایک خالی زمین کا قطعہ تھا اس کے ساتھ الف اور ب کے مکان کی ڈیوڑھی پر کوچہ ختم۔ آگے کھلا میدان۔ اور میدان سے آگے شہر کے گندے پانی کا جوہڑ جسے ڈھکن کہتے تھے۔ ڈھکن سے پرے چند زمینیں تھیں جن پر کھیتی اور سبزیاں ترکاریاں شہر بھر کے لیے پرورش پاتی تھیں۔ یہ پرورش شہر کے گندے پانی کو چھپڑوں کے ذریعے چند زمینوں کے کھیتوں میں پہنچا کر ہوا کرتی تھی۔

الف اور ب بھائیوں کے کوچے کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اس کوچے میں دو چار گھر مسلمانوں کے بھی تھے لیکن بڑی بڑی حویلیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لہٰذا فرش پختہ ہونے میں ان ہندوؤں ہی کا زیادہ رسوخ کارگر تھا۔ کوچے میں مکانوں کے دروازوں اور باہر کی دیواروں کے ساتھ فرش کے دونوں جانب پکی نالیاں بھی تھیں۔ ہندوؤں کے محلے سے تمام گھروں کی نالیوں کا پانی اس کوچے کی نالیوں میں بہتا اور مزے کی بو باس سے پٹا ہوا سامنے کے میدان کی پیاس بجھاتا پکی نالیوں سے آگے ترقی پسندی کا جوہر دکھاتا، کچی زمین کو کیچڑ میں تبدیل فرما کر بہتا بہتا جوہڑ میں چلا جاتا تھا۔

میدان میں جا بجا بھینسیں بندھی رہتی تھیں ان کے گوبر اور بہتے ہوئے پانی کی سڑاند میں ملی جلی معاشرت تھی، باورچی خانوں سے بھی بڑھ کر نکلی ہوئی بساند سے میدان کی وسعت معمور۔ جوہڑ کی کیچڑ اور بھینسوں کے گوبر اور بول براز سے کھیلتی ہوئی پانی کی لہروں سے ہوا اور فضا مسحور رہتی تھی ــــــ!

بھینسیں دن کے وقت شہر سے بھی اس ڈھکن میں نہلانے کے لیے لائی جاتی تھیں۔ جو میرے دفتر کے قریب سے گزرتی ہوئی الف اور ب کے مکان تک کوچے کے پکے فرش پر اور میدان کے نالوں میں وحشی دھماچوکڑی جنگلی ناچ ناچتیں پھر گندے پانی میں اٹکھیلیاں فرماتی تھیں۔

ہمارا اصلی گھر تو محلہ پنج پیر میں رستا بستا تھا۔ لیکن شاعرانہ آوارگی کی پاداش میں میری شادی کر دی گئی تھی۔ اور شادی ہو جانے کے بعد سے مجھے اپنے محلے سے دیس نکالا مل گیا تھا۔ الف اور ب والے کوچے ہی کی طرح اسی سرکلر روڈ کے بازار سے ایک اور کوچہ بھی میرے دفتر سے شمال کی طرف چل کر اسی میدان کی طرف رُخ کیے ہوئے تھا جس میں ہماری ایک پرانی حویلی کرایہ داروں سے خالی ہو کر میرا اور بیوی کا مسکن تھی۔ میری والدہ ہماری نگران اور دیدبان تھیں۔ والد بھی ہمارے اور سامان درست رکھنے کے لیے آتے جاتے تھے۔ بھینس ہمارے گھر میں بھی تھی۔ چاچا "ڈوڈو" اور اس کی بوڑھی بیوی چاچی بھاگاں ہمارے خاندان کے پشتینی ملازموں میں سے ہماری حویلی کے ایک کونے میں رہتے اور بھینس ہماری ڈیوڑھی سے باہر بندھی رہتی۔ جوہڑ میں نہلانے کا وظیفہ چاچا ہی کا ورد تھا۔ البتہ دودھ دُہنا اور بلونا چاچی بھاگاں کے ذمے تھا۔ والدہ ہر صبح نماز کے بعد چاٹی میں دہی بلوتیں، مکھن نکالتیں۔ میری نئی نویلی دلہن بھی دہی بلونے کا شوق فرماتیں، جب میری بیوی دہی بلو رہی ہوتیں اُس وقت جب مکھن چھاچھ کے اوپر اپنی اصلی صورت دکھا دیتیں

اپنی والدہ سے آنکھ بچا کر چاٹی میں ہاتھ ڈال، مکھن کا ایک اچھا خاصا "ڈنگ" بھر کر اپنے منہ میں ڈال کر بھاگ جاتا۔ میری بیوی میری اماں سے شکایت کرتی تو اماں میری بیوی کو جھڑک دیتیں "نی وخا کر۔ کھا لین دے ایہنے تے ساری عمر ایہو جیہا شوخ گوانڈی بنیا رہنا ایں"— کہ اری ونج کر کھا لینے دے مکھنی ایسے تو ساری عمر یونہی شیطان بچہ ہی بنا رہنا ہے نا ———۔ لیکن چاچا ودو مجھے یہ حرکت کرتے دیکھتا تو واقعی ڈانٹتا تھا تو چاچا ملازم، مگر میرے والد ہی کے ساتھ گھر میں پلا تھا۔ اسی لیے ہم سب اس سے ڈرتے تھے۔ البتہ چاچی "جاگاں" شکایت کرتے دیکھ کر میری بیوی کو ڈانٹ دیتی تھی "نی دھیاے، ہویا کیہ فیر، تیرا سوہنا پتا جو ہویا، دو راں ای چٹیاں۔ پھر کیہ ہویا۔ تیرا پا تکا وادھا ہی تے۔"

آج میری باتیں جو میں لکھنے والا ہوں، آپ کو شاید بہت ہنسائیں گی۔ لیکن اس وقت قلم سے کاغذ پر آتی ہوئی یادیں فریاد کر رہی ہیں۔ اور میری آنکھوں کے دونوں آنسو میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازہ تازہ گر رہے ہیں ———!

آپ میری اس تمہید کو بے صرف نہ جانیں جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس کا تعلق میرے اس مکان۔ اس کوچے اور اس کوچے کے خاتمے پر اس میدان سے ہے جس کا تصور اس تمہید سے بہت اہم واسطہ رکھتا ہے۔ یہ میدان الف اور ب والے کوچے سے باہر شہر کے گندے پانی کا نالہ بنائے ہوئے تھا۔ میرا یہ کوچہ بھی الف اور ب والے کوچے کے متوازی تھا۔ دونوں کے درمیان حویلیوں کے پچھواڑے ہی تھے۔ درمیانی راستہ ایک کوچے سے دوسرے میں جانے کا نہیں تھا۔ پار میدان سے گزر کر بھینسوں کے پول براز اور مینگنوں سے دن کے وقت بھی بچتے اور گندے نالے کو پھاندتے پھلانگتے ہوئے شارٹ کٹ کی جا سکتی تھی اور مغرب کے رخ پتلے کوچے کے پکے فرش پر چل کر سرکلر روڈ والے بازار تک پہنچا پھر اپنے دفتر کا رخ فرما کر جنوب کی طرف چلنا ہوتا تھا۔ میں گھر سے نکل کر یہی لمبی راہ اختیار کرتا۔ اور اپنے دفتر میں جا پہنچتا مجھے الف اور ب کے مکان تک پہنچنے کی ضرورت کبھی پیش ہی نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں بھائی ہر صبح کچہری جاتے عصر کے بعد پلٹتے تو مجھے کبھی کبھی آغا صاحب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے دیکھتے ہوئے گزر جاتے البتہ میں تنہا ہوتا تو صاحب سلامت ہو جاتی۔ چونکہ یہ دونوں حقہ نہیں پیتے تھے اس لیے میرے پاس زیادہ بیٹھنا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کشتی کو بھینسوں کے ساتھ دھکیلنے میں چاچا ودو کی مدد کرتا ہو میں کبھی کبھار اس میدان سے گزرتا تھا۔ گندے نالے کو پھاندنا مجھے پسند نہ تھا۔ کیونکہ اگر کیچڑ سے سنبھال بھی لیے جاتے تو جوتوں کو کیچڑ سے ستھرے نہ ہی اس راہ ہفت خواں کو طے کرنا لکھا ہی نہ تھا۔ اور میں تھا جالندھر کا ان دنوں مشہور شاعر۔ شاعر ہی نہیں اب تو جالندھر کے ایک ادبی رسالے کا اڈیٹر بھی تھا۔ اور پھر میرے دفتر میں وکیل و کلا ہندو مسلمان شاعر شغل بھی بڑا مہمان ہوتے۔ کیونکہ حضرت گرامی ہر تیسرے چوتھے دن سہ پہر کے بعد مجھے نوازتے تھے میرے والد میری شاعری سے نالاں تھے کہ کیا تجارت میں بھلا کوئی ایسا ادیبانہ آدمی تھا، کہ گندی راہ سے "شارٹ کٹ" کا اقدام فرماتا ——— ؟ زبان ہو دھکی گی تو بھی نگری نہ تھی البتہ "راہ راست برو گرچہ دور است" پر عمل پیرا تھا۔ اور میں اپنے گھر سے دفتر، دفتر سے گھر کی سڑک، پھر انٹیوں کے فرش والے کوچے پر پیدل چلتا پہنچتا۔ آتا جاتا تھا، لیکن ———!

اور یہی لیکن میری آپ بیتی ہے آپ نے دو کوچوں اور بھینسوں والے میدان پھر کوچوں کی نالیوں اور میدان کے گندے نالے کا تصور تو کر ہی لیا ہوگا۔ اب سن لیجیے آپ بیتی!

گرمیوں کا ایک دن یہ سارا الف اور ب دونوں بھائی ایک صبح نو بجے مسکراتے ہوئے اپنی گلی سے نکل کر میرے دفتر کے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے میں رسالہ ہجوم کے کاتبوں کے سامنے منظوم کاپیوں کی تصحیح کے لیے تصریح میں منہمک تھا۔ دونوں بھائیوں نے آج ذرا زیادہ تپاک سے صاحب سلامت کی اور فرمایا کہ آج ان دونوں بھائیوں کا نکاح ہونے والا ہے۔ سو آج ہی خندہ پیشانی کے ساتھ مجھے بھی نماز مغرب کے وقت تشریف لانے اور برات کے ساتھ

چلنے کی دعوت دی۔ آج سنیچر کا دن تھا۔ دونوں نے کچہری سے چھٹی لے لی تھی۔ دوسرے دن اتوار یعنی بیک کرشمۂ شادی سے دو کار کا موقع تھا۔

دونوں بھائی آج میرے میز کے سامنے کی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ان کی گفتگو سے خوش نویسیٔ اعجاز کی تسلیم تو عاجز ہو گئی البتہ دونوں نے ایک عجیب اتفاق دکھایا یعنی بتایا کہ جس طرح الف اور ب دونوں محض ایک سال بڑے چھوٹے سگے بھائی ہیں ان کی آج رات سے ہونے والی دلہنیں بھی اسی طرح سگی بہنیں ہیں۔ الف اور ب کی خالہ زاد بہنیں ت اور ث ——— !

میری اس آپ بیتی کا آغاز آج اس طرح ہوا کہ دونوں سگے بھائیوں نے پرانی "کلاس فیلو" کا حق جتا کر مجھے جالندھر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے شاعروں سے بہتر بتایا پھر مجھ سے سہرے لکھنے کی فرمائش کچھ ایسی منت سماجت کی معصومانہ ادا سے کی کہ میں رد و کد کیے بغیر مان گیا یا تو نہیں، لیکن میرے اندر غالباً یہ قلق بھی ہوگی کہ ان "منشی صدری" جالندھریوں کو جو اپنی نقل نویسی اور مقدمہ بازی وغیرہ کو بہت اہم سمجھتے ہوئے میرے ساتویں جماعت سے بھاگ جانے پر آوازے کسا کرتے ہیں آج دکھا دوں کہ شاعر ان سب کے مقابل چیزے دیگرست۔ بتا دوں کہ حفیظ جالندھری غالب اور ذوق دونوں کا بیک وقت ہم مقابل ہے۔ درباری انعام کے لیے نہیں بلکہ بہت ہی معمولی سی کلاس فیلوی کی بہت ہی غیر معمولی جا بیجا کی قلم برداشتہ طاقت رکھتا ہے اور ایک ہی دن میں ایک ایسا سہرا لکھ سکتا ہے کہ اگر بہادر شاہ ظفر تخت طاؤس کے بغیر ہی سہی اس سہرے کی دلہن بن سن گن پا لیتے تو غالب و ذوق کو اپنے اپنے مقام سے پیچھے ہٹا کر حفیظ کو اپنا استاد بنا لیتے ——— !

سہرا بندی اسی شام کی نماز کے بعد تھی۔ الف اور ب نے بڑی محبت آمیز تاکید شدید کے ساتھ یہ اصرار بھی کیا کہ ان کے مکان سے متصل خالی زمین ایسے ہم جالندھری پنجابی میں "توڑ" کہتے تھے، صاف کی جا رہی ہے نماز مغرب کے بعد وہاں سہرہ بندی کی رسم ادا ہوگی لہٰذا اگر سہرے سہروں پر بندھ چکنے کے فوراً بعد میں اپنی زبان سہرا ترجمان سے ان کے سہرے پڑھ کر خود ہی سنا دوں تو ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہی ان کی ساری شیخ برادری کی عزت افزائی کا سب سے اوّلین باعث میں ہی بن جاؤں گا۔ اور مجھے برات کے ساتھ ہو کر دوسرے محلے میں دونوں دولہاؤں کی واحد سسرال کے سر بھی چڑھنا ہوگا۔ تاکہ اپنے سہرائی کلام کے عوض انعام بھی وصول کروں اور اس کو اپنا انعام جان کر تمام عمر پھولا نہ سماؤں۔

اگرچہ سہرے کا ایک واقعہ ایک برس پیشتر بھی گزر چکا تھا لیکن وہ بھی اپنے عزیز بھانجے حمید جالندھری شاعر ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ) کی اجازت کے بغیر لکھ تو سکتا ہوں شائع نہیں کر سکتا، یہاں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میں آج پھر اُس آپ بیتی ہوئی کو بھول گیا تھا میں نے اعجاز کی پہلی کاپی کاتب کے سپرد کر دی۔ خود کمرے کو بند کر کے میز سے ہٹ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر گرآں صاحب کو بٹھایا کرتا تھا۔ آج جلنے کی جگہ میں نے تیز سگریٹ کی ڈبیا وہ اٹھانے کاتب کو بھیج کر منگوائی اور ہو گیا سہرا لکھنے کے سمندر میں غرق ——— !

دونوں بھائیوں (الف اور ب) کا ایک سہرا ——— میری اختراع ——— !

چونکہ دونوں کے چہروں پر چمک کے مہر و ماہ رخساروں کی حدت کی ترجمانی اور دونوں تک متحد یا مسرت تھے میں نے ان کو یکجے آدھے آدھے نمایاں پھول بنایا اور الف اور ب کو ت، ث اور ان دیکھی دلہنوں کی تصویری گل رخساری کے عکس بتا کر اس ایک ہی سہرے میں پرو کر سجا دیا۔ دونوں کی ناکیں اس سہرے کے چہرہ پر شاندار گل تھیں اور دونوں دولہاؤں کے منہ دو عدد ہلکے گلابی غنچے وغیرہ وغیرہ ——— !

مجھے یقین تھا اور میں الفاظ کو غوغا پلاتا ہوا وجد میں بھی تھا کہ سہرا نویسی کی تاریخ قدیم میں چٹکتی کلیاں اور غنچے پہلی مرتبہ میں نے ہی بنا ڈالے ہیں۔ دو سگے دولہا بھائیوں، دو سگی دلہن بہنوں کو آج کی رات سے بیویاں بن رہی تھیں آدم سے ایں دم تک کسی شاعر نے ایسا انوکھا تحفہ پیش نہیں کیا ہوگا

ورنہ بھائی کبھی الف کبھی ب باری باری دو تین مرتبہ پھر مدرسے کے تخت پر بیٹھے ہوئے کاتب سے یہ پرچے لے ہی آتے۔ مگر میں کہیں ان کو ٹرخا تو نہیں دوں گا —!

عصر کے وقت تک میں کمرے ہی میں بند رہا۔ سگریٹ کی دوسری ڈبیا پر بھی مزید دو آنے خرچ کر ڈالے۔ "ایش" یا "ٹیش" نہ سے موجود نہ تھا اخبار کے دفتر کا فرش جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور پھینکے ہوئے ٹوٹوں سے بیزار آفریں تھا۔ آج دوپہر کا کھانا کھانے بھی گھر نہیں گیا۔ چاچا "دُودُو" کو اماں نے بلانے بھی بھیجا، میرے انکار پر میرے والد کا فقرہ "شاعری کا ریگ ماں" دُہراتا اور بڑبڑاتا وہ تو چلا گیا۔ البتہ میری اماں جان نے گلی کی لڑ دو روغنی پھلکے کے درمیان رکھ کر اور ان روٹی کے اوپر "ٹھنگے" ہوئے سرسوں کی گندلوں کے ساگ میں مکھن کی ایک پگھلتی ہوئی سفید گیند میٹ کر چاچی جاناں کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ میں نے کچھ شعر میں تھا محض دو چار لقمے اُچک لیے اور یہ نعمت خوشامد کے طور پر خوش ذوقی کا حق ہی —!

سہرا تیار اور نوک پلک کی سنوار سے میرے بھونڈے خط کے باوجود صفحہ پڑھا جا ہو گیا۔ میں نے کاتب سے گزارش کی اب اپنی خوش خطی کر میرے قسمی رنگ سے ہم آہنگ کر دے۔ اور خود کپڑے جھاڑتے جھاڑتے بال وال سنوارنے کے لیے گھر کا رُخ اس تاکید کے ساتھ کیا کر منشی جی آپ کی کتابت لاہور دونوں ہونے والے شوہروں کو ان کی ہونے والی بیویوں کی آنکھوں میں اور بھی چمکا دے گا۔ بس مغرب کی نماز تک اسے لکھ ڈالیے گا —!

اب میں دفتر سے نکلا۔ گھر پہنچا، پانی گرم کرنے کا آرڈر اپنی بیوی کو دیا۔ مارچ کے مہینے کا آغاز تھا۔ قدرے خنکی تھی۔ والدہ اور اپنی پیاری لاڈلی بیوی کو بتایا کہ آج پچھواڑے کی گلی میں شیخ برادری کے دو جوڑوں کی بات کے ساتھ جانا ہے۔ رات کا کھانا ان کے سسرال میں اڑانا ہے۔ میں نے سہرے کا تذکرہ نہیں کیا۔ مبادا والدہ کو پتہ چل جائے۔ اور گزشتہ برس کے واقعہ "سہرا رواں" کی یاد میں میری تواضع میرے اپنے ہی گھر میں ہو جائے۔ یوں بھی شاعری کو ہمارے گھرانوں میں منحوس سمجھا جاتا تھا۔

میری والدہ نے میری بیوی سے کہہ کر میرا اجلا لباس نکلوا دیا۔ میں نیم گرم پانی سے نہایا۔ داڑھی ان دنوں دوسرے تیسرے دن نائی ہی سے منڈوائی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میری بیوی نے اپنے صندوق سے میری اپنی شادی کا یادگار کوٹ نکالا۔ دُھلی ہوئی قمیض اور سفید شلوار پر میرے کوٹ کی شان ابھی جوان تھی۔ آج میری وہ کیسری رنگ کی پگڑی بھی نکلی۔ جو میری بیوی کو دو برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک بھاتی ہوئی تھی۔ سو کیسری پگڑی بھی کر سر پر پہنتے ہوئے سہرا شکار کریں۔ اس کو سجنے گیا تھا۔ یہ پگڑی کبھی کبھی اصرار کے ساتھ میرے سر پر سجائی جاتی تھی۔

ان دنوں اپنے اُستاد گرامی کی تقلید میں کالے وارنش سے چمکتے ہوئے چمڑے کا پمپ شو بھی کبھی کبھی مشاعروں میں جاتے ہوئے پہنا کرتا تھا۔ آج بھی ضرور پہننا تھا۔ خود ایک چیتھڑے سے اس کی پالش کر دی۔ جمی ہوئی گرد کو رگڑا اور وارنش کر لیا۔ نماز مغرب کی اذان سنی۔ لباس اتار دیا۔ اماں جان کی چٹائی پر ہی سات رکعتیں جلد جلد ادا کریں۔ نماز پڑھتے دیکھ کر میری اماں دعائیں دیا کرتی تھیں۔ یہ دعائیں آج تک میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں ان دعاؤں کے لیے صبح اور شام کی نماز ضرور اماں کی موجودگی میں اسی کے مصلے پر پڑھتا۔ میری بیوی تو نمازن تھی مرتے دم تک ہر صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ میں بھی تاحق اب صبح کے چار سجدوں کے بعد جانے کے ساتھ اخبار کے جھوٹ کا سچ چھاپی ہوئی خبریں پڑھتا ہوں۔ خیر یہ میری آپ بیتی کا دوسرا رُخ ہے۔ پھر کبھی سہی نماز پڑھ کر، سر پر کیسری پگڑی۔ تن پر سفید قمیض کے اوپر ٹائی کے بغیر کشمیرے کا اپنا نوشاہی کوٹ اور کمر سے پیروں تک سفید شلوار کے پلی درست کیے ہوئے پھولی ڈھلی ہوئی اور بیوی کے ہاتھوں روز فرسودہ جالی پیروں پر پنڈلیوں تک چڑھ جانے میں نے کالے وارنش والے پمپ شو پہنے عجیب سج رہا تھا۔ میری بیوی سجدہ ریزی سے اٹھی میں اس کے طاق سے آئینہ اٹھا کر اپنا کا رُخ دیکھ رہا تھا۔ ابا ابھی گھر نہیں آئے تھے۔ اماں تسبیح پڑھ رہی تھیں مجھے آئینہ دیکھتے ہوئے

دیکھ کر میری بیوی مسکرائی۔ اس مسکراہٹ پر میرے ہاتھ ابھی ایک جنبش کی جسارت کے لیے پر ہی تول رہے تھے کہ اماں نے درود شریف ختم کر کے رُخ ہماری طرف کر لیا ——!

اُف یہ آپ بیتیاں ——! اماں اُٹھیں۔ ایک صندوقچی سے دس روپے نکال کر میرے ہاتھ میں رکھ دیے اور فرمایا۔ (فرمایا تو پنجابی میں تھا۔ میں اردو ترجمہ ہی لکھ رہا ہوں)

• بیٹا تمھارے دوستوں کی شادی ہے۔ وہ ہماری برادری کے رئیس۔ تم پانچ پانچ روپے دونوں کی سہرا بندی پر ضرور نذر کر دینا ——! میری ماں کو کیا خبر تھی کہ میں پورے اور مکمل گیارہ شعر ان دونوں پر نچھاور کرنے والا ہوں۔ تاہم میں نے روپے لے کر اپنی شادی کے یادگار کوٹ کی داہنی جیب میں ڈال لیے۔ اماں کو سلام کیا اور بیوی کا منہ چڑا کر کیسری رنگ کی پگڑی کا طرہ پھڑکاتا ہوا جلد جلد گھر سے نکلا۔ باہر میری نگاہیں اپنے پیروں کے پمپ شوز کی چمکتی ہوئی دو نوکوں پر پڑ رہی تھیں۔ سفید شلوار کی مہریاں کشتی رنگ کی جرابوں کے ساتھ عجیب گلکاری کا سماں ہر قدم پر جوڑ رہی تھیں۔ میرا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب کے دس نقد نقد روپے ہلکے ہلکے چھنکا رہا تھا۔ کوچے کے اینٹوں والے فرش پر بھینسوں کے گوبر سے بچتا ہوا میں سڑک پر آیا۔ اپنے دفتر کا رُخ کیا۔ برآمدے میں کاتب صاحب میرے منتظر تھے۔ لیمپ کمرے میں روشن تھا۔ سہرا خوشنویسی کے مراحل طے کر چکا تھا۔ کالی روشنائی کے حروف نے الف اور ب دولہا بھائیوں کے چیچک زدہ داغوں کی یاد دلائی۔ لیکن خوشنویس صاحب نے تحریر کے گرد سہ رنگی جدول بھی کھینچ رکھی تھی۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں سہرا پڑھ لیا۔ ایک دو نقطے خود پنسل ہی سے درست کر دئیے۔ جی تو چاہا کہ یہ دس روپے کاتب کی اُجرت نذر کر دوں لیکن اماں کے حکم کی تعمیل فرض تھی دوسرے دن خوشنویسی کے انعام کا سن کر کاتب نے سلام کیا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلتا بنا میں نے سہرے کو گول کیا اور کوٹ کی بائیں جیب میں اس طرح ڈالا کہ گویا خود بھی اپنے اس جرم کو چھپانا چاہتا ہوں تو

چھپائے نہ بنے

اب میں نے دفتر بند کیا۔ تالا لگایا۔ اور اس کوچے میں گھسا جس کے خاتمے پر بائیں جانب وہ تُوڑ اور تُوڑ کے ساتھ ہی دولہاؤں کا مکان تھا۔ اور پھر جوہڑ سے پرے گندے نالے والا میدان ——!

اس کوچے میں چلتے ہوئے میرا داہنا ہاتھ دس روپوں سے کھیل رہا تھا اور بائیاں ہاتھ گول کیے ہوئے سہرے کو کوٹ کی جیب سے اوپر ہی سے تھپک رہا تھا۔ اس طرح میں الف اور ب کی سہرا بندی والے تُوڑ تک پہنچ گیا۔ ایک ہری کین لالٹین روشن تھی دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دوسری لالٹین ساتھ کے مکان کی دیوار پر کیل کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھی۔ بیس پچیس بڈھے اور ادھیڑ شیخ برادری کے منشی متصدی بزرگ ایک ہی لالٹین کے گرد جمگھٹ لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ جوان کم تھے۔ البتہ بچے بچیاں دری کے بعض حصوں پر اودھم مچا رہے تھے۔ دولہاؤں کے گھر سے ڈھولک کے ساتھ عورتوں کے گانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ مگر روشنی کم تھی آٹھویں شام کا نصف چاند سر پر تھا۔ ایک خشخشی داڑھی والا ادھیڑ آدمی جس کو میں جانتا تھا۔ تحصیل کا منشی ہے ایک پرات سامنے دھرے بیٹھا تھا۔ یہ الف اور ب کا باپ تھا۔ اس کے ساتھ بائیں ہاتھ الف دولہا تھا۔ ب دولہا کے ساتھ اکڑوں بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ سا جوان آدمی تھا جس نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نکٹائی بھی تھی۔ اس کے سامنے دو پرات تھی جس میں تھوڑے سے کچے چاول اور تھوڑی سی دیسی گھی کی شکر بکھری ہوئی تھی۔ پرات اور اکڑوں بیٹھے ہوئے کے سامنے ایک رجسٹر بھی فرش پر تھا۔ اور فرش ہی پر ایک ہری کین بتی روشنی رجسٹر اور پرات دونوں پر ڈال رہی تھی۔ اکڑوں بیٹھا ہوا شخص رجسٹر میں برات کے جمگھٹ کیے ہوئے آدمیوں کے نام اور ولدیت رجسٹر میں لکھتا ہوا بار

بار بار اپنی عینک اور ساتھ ہی ناک کو درست کرتا جاتا تھا۔ یہ "ندرانہ" "نیوتے" کا تھا۔ کوئی دو روپے کوئی تین روپے کوئی پانچ روپے نقد خشخشی داڑھی والے کو دیتا، نام اور باپ کا نام پکارتا۔ روپے ٹوٹے یا گنے جاتے پھر کچے چاولوں اور شکر پر دھر دیئے جاتے۔

ب دولہا اکڑوں ہو کر لکھنے والے کے بائیں جانب پیلی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ میں بھی گھس پل کر اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے کان میں بتا دیا کہ سہرا تیار ہے۔ اور میں بھی حاضر ہوں۔ اس نے بڑی خوشی سے میرا ہاتھ دبایا اتنے میں نیوتے ختم ہو گئے گھر کا نائی چنگیریں دھرے ہوئے چھواروں کے سہرے لایا ——— !

دولہا کا باپ برات میں سے روپے گن گن کر ایک تھیلی میں ڈال رہا تھا۔ رجسٹر بند کر دیا گیا تھا اکڑوں بیٹھ کر اندراج رقوم کرنے والا بائیں جیب سے رومال نکال کر عینک کی مالش کے بعد پھر آنکھوں پر جما رہا تھا کہ ایک لمبی سفید داڑھی والے بوڑھے نے الف اور ب دونوں دولہاؤں کی پگڑیوں پر سہروں کی ڈوریں باندھیں اور چھواروں کی لڑیوں نے چہرے کے داغوں پر رنگین چقیں سی ڈال دیں۔ مبارک ہو شیخ جی۔ مبارک ہو میاں جی کی آوازیں آئیں۔ نائی کو دو روپے اکڑوں بیٹھنے والے نے دولہاؤں کے باپ سے دلوائے ساتھ ہی اس نے کچے چاول اور شکر کی پوٹلی باندھ لی۔ یہ تھا نائی کا پہلا انعام۔

یہ عالم تھا کہ میں نے دس روپے جیب سے نکالے اور ب دولہا کو تھما دیئے تاکہ وہ اپنے الف بھائی اور اپنے درمیان پانچ پانچ تقسیم کر لیں۔ یہ نیوتہ نہیں تھا۔ نیوتہ تو اپنی برادری ہی میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو میری طرف سے دونوں کے لیے عطیہ تھا کام کا معاملہ تھا یا دوسرے یہ کہ ان دونوں پانچ پانچ روپے کوئی ایسی چھوٹی بات نہ تھی۔

یہ روپے ب دولہا نے اپنے اکڑوں بیٹھنے والے ماموں کے سپرد کر دیئے۔ میں نے اس کو پہلے بھی ان دونوں کے ساتھ کبھی کبھی اس کوچے میں آتے جاتے دیکھا تھا مجھے یہ تو معلوم تھا کہ یہ ان دونوں کا ماموں ہے۔ لاہور میں کسی دفتر میں اسسٹنٹ انچارج کلرک ہے۔ جب جالندھر آتا ہے تو سوٹ میں ملبوس رہتا ہے۔ ٹھگنے قد پر سوٹ اور پھر گلے میں نکٹائی جالندھر میں اس کے حلیے پر نگاہیں پڑ کر مسکراتی ہی تھیں۔ لیکن مجھے دس روپے ادا کرنے کے ساتھ ہی معلوم ہوا کہ دونوں دلہنوں کا ماموں بھی یہی ہے۔ اور رجسٹر پر لکھتے وقت اکڑوں بیٹھنا پتلون کی وجہ سے تھا۔ روشنی کی کمی کے سبب فرش پر بچھا پر رجسٹر فرش پر سیری لکھنے والی مشین کی وجہ سے عینکوں کے باوجود جھکنا بھی ضروری تھا ——— !

اب نیوتے کے خاتمے پر رجسٹر بند ہو چکا تھا لیکن یہ دس روپے مزید وصول ہوئے تو ماموں نے دائیں ہاتھ سے دولہاؤں کے ابا کو دے دیئے اور عینکوں والی نگاہ مجھ پر ڈال نام پوچھا۔ تو الف دولہا نے سہرے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس کے کان میں جو کچھ کہا وہ کانا پھوسی نہیں اعلان تھا۔

"یہ حفیظ جالندھری صاحب ہیں۔ روپیہ ہی نہیں دیا۔ سہرا بھی پڑھیں گے۔ ہمارے یہ دوست شاعر ہیں نا ——— !"

ماموں نے اور بھی تعجب سے میرا چہرہ اور میری کیسری پگڑی کو سہرے کے پڑھنے تک دیکھ ڈالا۔ اب ب دولہا نے بھی میرے کان میں اعلان کے طور پر فرمایا:

"ہاں حفیظ بھائی اب ہو جائے نا سہرا ——— !"

ذرا پھر تصور فرمائیے۔ سہرے بندھے ہوئے دو دولہے۔ ان کے درمیان ساری محفل میں ایک شرٹ پہنے ہوئے اکڑوں بیٹھے ہوئے ماموں دولہا

کالا پپ نیتے کی تھیلی میں میرے دس روپے میرا نام رجسٹر میں لکھوائے بغیر ڈال رہا ہے۔ رجسٹر تھیلی کے نیچے دبا ہوا ہے۔ بیجیں تیس شیخ برادری کے براتی خش منتظر ہی تو ہیں کہ بعد دُلہن کے گھر جا کر پلاؤ زردہ کھانے کی فکر میں۔ قل ہو اللہ پڑھتے ہوئے خالی شدہ جیبوں والی فکر میں سیدھی کر رہے ہیں۔ مگر سے ڈھولک کی آوازیں بلند ہیں: "تو نتھ سے باہر گلی میں باجے والے آگئے ہیں" اور انھوں نے ڈھونڈو، دھونڈو، ڈھمک ڈھمک کا آغاز کیا ہے۔ تیس لالٹینوں کی روشنی فرش پر، اور آٹھویں رات کا چاند عرش پر ہے لیکن فضا میں دھند اتنی چھٹ ہی چکی کہ اس بزم شادی پر چادر تانے ہوئے ہے۔

روشنی کا معقول انتظام شاید اس لیے نہیں کیا گیا ہو گا کہ اول تو اللہ میاں کا چاند روشن ہے اور پھر اگر دولہا دلہن کے گھر میں پہلے ہی سے روشنی کی جگ مگ موجود ہو تو ان دو سگی بہنوں یعنی آفتاب اور ماہتاب کو انھیں جا کر اس گھر میں لانے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ——— !

بہر صورت کوٹ کی داہنی جیب سے دس روپے نکل گئے تھے تو کیا ہوا بائیں جیب میں گیارہ شعر سہرے کے تو موجود ہی تھے۔ لہذا میں اٹھا اور کالا پپ شو بو بیٹھتے وقت محفل کے پاس ادب سے اپنے زانو سے دبا رکھا تھا، پہن لیا۔ جیب سے سہرا نکالا اور کھنکارا ——— ! یعنی کہ

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

کاغذ پر نگاہ ڈالی تو سہرے کے حروف چمکنے لگے۔ چاند کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ مجھ پر اسی طرح اپنے ہالے میں سے برسا رہا تھا لیکن یہ ہنسی چاندنی بھی ہو تو بہت پھیکی تھی ——— ! کسی نے باجے والوں کو چپ ہو جانے کی کڑک دار آواز دی۔ آگرہ کے ماموں اٹھے لالٹین اٹھائی۔ اور بائیں جیب سے نمایاں رومال کو بائیں ہاتھ میں لے کر میرے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اس کا قد ناٹا تھا یہ ماموں گھٹنا تھا۔ اس نے داہنے بازو کو میری داہنی بغل کے رُخ سے بڑھایا، اس ہاتھ میں لالٹین تھی۔ لالٹین کی روشنی چاندنی سے مل کر سہرے کے حروف پر پڑی۔ اب ماموں نے بھی اپنی خاص آواز میں فرمایا

"صاحبو! یہ شاعر ہیں۔ سہرا سنائیں گے۔ ہاں شاعر صاحب ہو جائے سہرا"

ہو جائے سہرا لکھا تو سہی لیکن شاعر نے شعر کہہ ڈالے ہوں، اور بزم خود یہ شعر ہوں بھی غالب اور ذوق تک کو شرمانے والے تو جب تک وہ ان اشعار کو سنا نہ لے پیٹ پھٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

ورنہ تھا اس بزم میں تنہا شاعر اب میں سہرا پڑھ رہا تھا۔ اس دور میں میری شعر خوانی تحت اللفظ ہی ہوا کرتی تھی۔ ترنم میرے لیے لاہور جا کر تشریف لانے والا تھا ——— !

میں نے دو تین شعر اپنے تحت اللفظ انداز سے پڑھے۔ سامنے۔ شیخ برادری کے براتی اس اتفاقی واردات پر بھلے چنگے میرا منہ تکنے کی مصیبت میں جتا نظر آئے۔ دو ایک طلب گار نگاہوں سے دیکھا کہ وہ مجھ کو تو تکتے ہی اب سب کے سب آدھا آدھا منہ کھولے میرے گلا اور شاعری کے اشعار جانے بغیر ہی اپنے حلق میں اتار رہے ہیں ——— !

میں جالندھر کے مشاعروں ہی میں نہیں۔ منٹگمری، امرتسر، کپور تھلہ، لدھیانہ اور فیروز پور کے مشاعروں میں داد و سبحان اللہ سننے کا عادی آج اس دراوی میں یہ کیا دیکھ رہا تھا !

بہر صورت یہ لوگ براتی تھے۔ کوئی شاعرہ تو تھا نہیں لیکن سانپ سونگھ جانے کی سی فضا تھی۔ ایک دو مرتبہ نصف سے بھی کم نمایاں چاند پر میری نگاہ اٹھی اور پھر اپنے وارنش زدہ پمپ شوز پر بھی میری آنکھوں نے جھانکا۔ دونوں چیزوں پر ستارے سے تر مر تر مر کر رہے تھے۔

لیکن یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ اس طرح کہ براتی عالم لاہوت میں ایک عجیب سی آواز سنائی دی جانے لگی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی مرغی اپنے

دبے ہوئے حلق سے ٹُن ٹُن۔ ٹُھن ٹُن۔ ٹُو ٹُو کر رہی ہو۔ ساتھ ہی میری نظروں کے سامنے خوشنویس کے لکھے ہوئے سہرے کی زبان سہرے کے پھولوں کی طرح ناچنے لگیں۔ یہ تھرکن کیوں اتنی تیزی اور اُجالے کی فراوانی ٹھٹک جھجک سی تھی میں نے اپنی داہنی جانب جھانکا۔ تو لالٹین بھی اسی حال ٹھٹکتی تھرائی۔ وہ بازو جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ بھی تھرک رہا تھا۔ لیکن میری آپ بیتی کا اصل موضوع وہ خشوع و خضوع کی گھٹی ہوئی ٹُن ٹُن، ٹُن ٹُن۔ ٹُو ٹُو ٹُن تھی جس کے تسلسل نے مجھے منہ موڑ کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھنے پر اکسایا۔ حالانکہ سہرے کے شعروں کی معارفی میرے دہن سے جاری و ساری تھی۔

مڑ کر دیکھا تو نظر آیا۔ کہ الف اور ب۔ وہ صاحب کا شرٹ پہنے اور نکٹائی لگانے والا ماموں جو لاہور میں اسسٹنٹ انچارج کلرک اور جو ادھر آکر ہیڈ کلرک تھا۔ جس نے سہرے پر لالٹین سے میرے سہرے والے کاغذ پر روشنی ڈال رکھی تھی۔ بائیں ہاتھ سے اپنا رومال اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ تاکہ میری سہرا پڑھنے کی ادا پر خوشی کی ہنسی جو اس کے اندر سے باہر کو چھوٹ رہی تھی۔ اس کو ضبط کرے۔ ضبط کرنے سے ہنسی نے اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری کر رکھا تھا۔ اور ٹُن ٹُن تی تی تھق تھق وغیرہ کی کرک کرک اس کے حلق ہی میں اُدھم مچاتی ہوئی میرے کانوں سے میرے قلب تک پہنچ رہی تھی —— !

جالندھر میں، ہندوؤں شادی بیاہ پر طوائفوں کے ناچ گانے کرانے پیشے مسلمانوں کے پاس اکثر ہوتے تھے۔ بھانڈ اور نقال وغیرہ بھی براتوں میں اپنے فن کا ٹیکس وصول کرنے خود بخود آ دھمکتے تھے لیکن۔ ابھی اس قسم کی برادریوں میں ارباب نشاط کا مقام کسی شاعر کو حاصل نہیں تھا۔ میں نے کھری چاندی کے پورے دس روپے دے کر سہرے کے گیارہ شعر سنا کر ان کو پریشان کرنے کی یہ جو حرکت فرمائی تھی وہ تو خیریت گزری کہ سامنے بیٹھے ہوئے منہ کھول کر میری صورت پر غور کرنے والے براتیوں کی سمجھ میں نہ آئی تھی کہ وہ مجھ سے کیا سلوک کریں۔ البتہ لاہور میں کلرکی کرنے والا مہذب ماموں دو لنگان اور دو لنباں کی شرافت تھی مگر ہنسی ہی چھوٹی لالٹین چھوڑ کر ہاتھ نہیں کھینچتا۔ اس کی تہذیب یافتگی لاہوری تھی۔ اس لیے وہ بیچارہ رومال کو فیشن ایبل کوٹ کی جیب سے نکال کر اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔

اور وہ بیچارہ جس نے ہنسی بھرپیٹ سے منہ کے راستے نکلنے کی آزادی چاہی تھی۔ اب اگر منہ میں ٹھنستے ہوئے رومال کو مزاحم پا کر حلق میں اٹکائے کراہوں والا بت جیسے کرنے والی مرغی کی مانند تی تی تو تو کر رہی تو اور کیا کرتی یہی ہے روداد۔ میری سہرہ نویسیوں اور سہرہ خوانیوں کی چند وارداتوں میں سے ایک واقعے کی چند یادوں میں سے یہ میری آپ بیتی ایک معصوم سا قصہ ہے۔ شاید آپ اس وقت جبکہ میں قلیل کا نام پڑھنے کے بعد جلد جلد یہ حرف کا تذکرہ کر رہا ہوں میری اس صورت کا تصور نہیں کر سکتے اور یہ صورت جو اس یاد کی افتاد سے میری اس وقت بنی ہوئی ہے میں نے ابھی ابھی ہوٹل جس کے اندر مقیم ہوں اس کے غسل خانے میں دیکھی ہے۔ خیر میری آج کی صورت کا تذکرہ تو اس وقت بے محل ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شہر ہو یا قصبہ ہر جگہ میں نے دیکھا کہ

بڑی اُمنگوں کی زباں سے کلام سن کے مرا بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

یہ تذکرہ اس وقت کا ہے۔ جب مٹی ڈوری کی دو لالٹینوں اور تھرکتی ہوئی ہری کیلی اور بانس میں لٹکے ہوئے نصف چاند کی دھندلی چاندنی میں ننھے بادری کے لیے بچھری ہوئی نو تقی نویسیوں کی صورتیں خود میرے سامنے بھی دھندلی ہو رہی تھیں۔ وہ محض جدا اُٹھ کر دو لالٹینوں کے گھیرے جالوں کی نظر میں تھے جن کی صورت اس کو شاید ہی نظر آ رہی ہو۔ اور اگر ان میں سے کوئی آنکھوں والا دیسی تصور کرنے والا بھی ہو تو مجھے یقین نہیں کہ میری شکل کی وہ جھلک دیکھ سکے جو اس سہرے کے پڑھنے اور پڑھے جانے کے وقت بنی ہوئی ہوگی —— !

لیکن داد دے ہیں —— ! نہ جانے اندر نہ پائے رفتن —— کے معنی آج پہلی مرتبہ مجھ پر صادق تھے۔ اس کیفیت کی نمود کے طور پر مجھے

دوبارہ کہنے دیجیے کہ واہ رے میں ——!

یہ کوئی سیاسی اسمبلی نہ تھی جس کا رکن ہونے کی وجہ سے میں واک آؤٹ کر جاتا۔ اس کوٹھے سے پانی کا جوہڑ بھی تھوڑے سے دور تھا۔ اور تھا بھی اس وقت کی اس برات سے بدذوق، ورنہ میں ڈوب کر مر جاتا۔ تاہم سہ بارہ واہ رے میں ——!

میں نے پورا سہرا پڑھ ڈالا۔ اپنی والدہ کے عطا کردہ دس روپے نذرانہ دینے کا حق ادا کر دیا۔ رجسٹر میں نام لکھوائے بغیر پورے گیارہ شعر پڑھ ڈالے اور فرد دیے۔ ہاں پورے گیارہ شعر تخلص والے مقطع سمیت ——!

مجھے یہ تو یاد ہے کہ سہرا پڑھ کر میں نے کاغذ توڑ مروڑ کر اسی جیب میں اڑس لیا تھا جس جیب میں روپے کھنکنا رہے تھے۔ مگر یہ اب تک یاد نہیں کہ میں نے یہ سب شعر کیسے پڑھ لیے۔ کب ختم کیے۔ اور ختم کرنے کے بعد میں کیا کر رہا تھا۔ میری حالت دیکھنے کے قابل ضرور ہو گی۔ ہائے افسوس نہ ہوئی اس وقت میری اپنی دلہن کیونکہ اگر وہ کسی جھروکے سے مجھے جھانک رہی ہوتی تو شاید میرے سر کی کیسری پگڑی اور اس کے طرے کے باوجود میرے چہرے کی خاکستری رنگت کو ہمیشہ کے لیے چندھیا دیتی۔

اس کے بعد کا میرا تصور یہ ہے کہ برات کے پچیس تیس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کوٹھے سے باہر نکل گئے اور باجا بجنے لگا۔ باجے والوں کے پیچھے ٹوں ٹوں ٹنگ والا ماسٹر اپنے دونوں بجانے والا، اور بجانے والوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر نچاتے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے براتی تھے۔ گھر کی ڈیوڑھی سے عورتیں بھی کوئی نیم برقعہ اوڑھے کوئی محض چادر سے گھونگٹ نکالے گلی کے فرش پر زنانی جوتیوں کی مرمر اور زبان سے مختلف خوش گفتاریوں کی جھرجھر کرتی ہوئی پیچھے پیچھے تھیں۔

اب تینوں لالٹینیں بھی برات کے ساتھ ہی تھیں۔ میں بھی ان سب سے پیچھے اٹھ کر دس قدم چلا اور پھر ! ہاں اور پھر یکایک رک گیا۔ برات سرکلر روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں کوئی ایک منٹ رکا کھڑا رہا۔ باجا میرے دفتر کے قریب پہنچ چکا ہو گا۔ میں نے اپنا منہ اسی میدان کی طرف موڑا جس کا تذکرہ اس آپ بیتی کی تمہید میں کر چکا ہوں۔ یعنی

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

میں غالباً یہ چاہتا تھا کہ الف اور ب دونوں کی ہونے والی دلہنوں کے گھر براتی بن کر جانے کی بجائے جلدی سے اپنی دو سالہ پرانی دلہن کے دامن میں جا چھپوں۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس شارٹ کٹ پر میرے پمپ شوز والے پاؤں چل پڑے تھے۔ جس سے میں باز رہا کرتا تھا۔

میں یہ شام بیان کر چکا ہوں۔ مارچ کے پہلے ہفتے کی تھی۔ سردی تھی۔ ہوا بھی خنک تھی لیکن میں سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کیا یہی پسینہ عرق ندامت کہلاتا ہے۔ اگر عرق ندامت اسی کا نام ہے تو ہیچ میرے اللہ میری توبہ ہے

سست روی تھی یا تیز خرامی تھی مجھے یاد نہیں۔ بہرا کیف میں اس کوچے سے میدان میں نکل آیا تھا۔ اور شمال کے رخ اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ رات سرد تھی۔ چاند کے گرد ہالا تھا۔ شاید میرے پسینے کو دھونے کے لیے کل کلاں مینہ برسنے والا تھا۔ چاندنی کا رنگ اس میدان میں پھیلے ہوئے گرد کی وجہ سے مٹیالا تھا۔ اچھی خاصی تاریخ بندی اور ایسی ہی سہرا نویسی اور سہرا خوانی کے باوجود برات عاشقاں بر شاخ آہو سے بھی بدتر گزر رہی تھی۔ عرق ندامت کے گھڑوں پانی میں غوطے لگاتے ہوئے چل نہیں رہا تھا بہہ رہا تھا۔ یہی حالت آج بھی سوچتا ہوں تو بغیر سہرے ہوئے سر دھننے پڑتا ہے۔ مشکل سی تھی جو حد شاعری کے شکست خوردہ سپاہی کو یاد نہ رہا تھا۔ کہ اس راہ میں وہ مزار بھی آتا ہے جس پر سے پھلانگنی میں کسر شان سمجھا کرتا تھا۔

پر پتہ اس وقت چلا جب میرا پاؤں پھسلا ۔ اور میرے دونوں پیر وارنش کے چکنے ہوئے چپ شوز جوتوں سمیت نالے کے پانی میں غوطہ لگا کر اُبھرے میری پشت میری شلوار اور میرے دو بٹن والے کوٹ کی پشت لیس دار کیچڑ پر ٹپک گئی ۔ اور میری دونوں کہنیاں دلدل نما سیلی زمین پر گڑ گئیں کیسری پگڑی والے سر کو کندھوں پر اُٹھائے میری آنکھیں آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو تک رہی تھیں اور میرے پیروں کی جرابوں اور چکنے چپ شوز جوتوں کو نرمی کے زاویے کے مقابل کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تو تھے مگر چاند کی ہنسی کا منہ چڑا رہے تھے ۔

* * *

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

میرے دادا ایک درویش منش بزرگ تھے۔ میں بچپن میں دو ایک سال انہیں کے یہاں رہا۔ انہوں نے مجھے ایک مسجد میں بٹھا دیا جس کے امام ان کے شاگرد تھے اور مکتب میں بھی پڑھاتے تھے۔ دادا اور دادی کا انتقال ہوا تو میں اپنے گھر چلا آیا۔ ہمارے مکان کے سامنے ڈاکٹر حکیم مفتی غلام رسول کا مطب تھا وہ میرے دادا جی کے دوست تھے۔ بلند پایہ طبیب ہونے کے علاوہ جید عالم بھی تھے اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ میں ایک آدھ گھنٹے کے لئے ان کے یہاں چلا جاتا۔ میں نے اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب انہیں سے پڑھی۔ ابتدائی حساب اور لکھائی کا کام والدہ محترمہ سے سیکھا۔ جب میں سکول جانے کے قابل ہوا تو ابا نے چرچ مشن ہائی اسکول کی ایک برانچ میں داخل کرا دیا۔

سکول میں تین پرائمری جماعتیں تھیں اور دو ماسٹر تھے۔ دونوں منتعلق قسم کے آدمی تھے۔ نہایت خوش پوش اور حسین خط تھے۔ بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے۔ چند دنوں میں مجھے مدرسے سے اتنی محبت ہو گئی کہ اگر کبھی تیز بارش ہوتی اور گھر والے مدرسے جانے سے روکتے تو میں زار زار روتے لگتا۔ تین سال یہاں گزارنے کے بعد ہائی اسکول میں چلا آیا۔

امرتسر کا شہر جہاں میں پیدا ہوا سکھوں کا مقدس شہر ہے۔ اس شہر کی اہمیت دربار صاحب کی وجہ سے ہے اور اسی دربار صاحب کی وجہ سے دور دور کے رہنے والے علاقوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے تھے۔ اور سب کے سب کاروباری لوگ تھے۔ ان میں بیشتر آبادی کشمیریوں کی تھی۔ یہ لوگ پشمینے کی تجارت کرتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ علمی روایات بھی لائے تھے جن کا چرچا مدتوں قائم رہا۔ لیکن بعض متمول گھرانے تو ایسے بھی تھے کہ ان کا گھر عبدالرحیم خانخاناں اور علی شیر نوائی کا دربار معلوم ہوتا تھا۔ اسی فضا میں شمالی پاک و ہند سے روزنامہ "وکیل" شائع ہوا اور علمی کتابوں کی نشر و اشاعت کے دور بدست ادارے روز بازار آشیم پریس اور وزیر ہند پریس جاری ہوئے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ابوالکلام اور عبداللہ عمادی کے علمی اور ادبی کارناموں کا آغاز ہوا۔ اور سیاسی آزادی کی تحریک کو ٹھوس تقویت پہنچی۔

انگلستان کی کلیسائی تبلیغی انجمن نے اس شہر میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا چرچ مشن ہائی اسکول وہی مدرسہ تھا جو الحاق پنجاب کے تین سال کے بعد انگریزی عملداری میں جاری ہوا۔ یہ مدرسہ اس وقت صوبے کی بہترین درسگاہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائیت کے خلاف عام تعصب کے باوجود ایک کامیاب تعلیمی درسگاہ تھا۔

اس زمانے میں فارسی اور انگریزی کی تعلیم چوتھی سے شروع ہوتی تھی۔ ہائی اسکول میں آتے ہی ایک ایسے عالم با لغ نظر استاد سے ملاقات ہوئی کہ جن کی یاد نصف صدی گزرنے پر بھی ویسی ہی تازہ ہے۔ یہ استاد اللہ انہیں غریق رحمت کرے ماسٹر شہدت سنگھ تھے۔ سکھ تھے وہ

ریاضی کے ماسٹر لیکن فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ فارسی کے چند ابتدائی اسباق پڑھنے کے بعد گلستان بوستان کا درس شروع ہوا اور رفتہ رفتہ شاہنامہ سکندر نامہ، مثنوی مولانا روم اور حافظ تک نوبت آئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ تنگ پاجامہ، سفید اچکن اور ریشم پگڑی باندھ کر لوہے کی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور سبق پڑھاتے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ انہیں سب کچھ ازبر ہوتا تھا۔ ہماری جماعت اچھی خاصی ذہین جماعت تھی لیکن ہم سے جہاں کوئی غلطی کرتا تو وہ جھنجھلا کر کہتے اوہ۔ مسلمانو تم نالائق کہاں سے آ گئے۔ تم نے ہماری فارسی کا ستیاناس کر دیا۔

اس سکول کے ہیڈ ماسٹر ایک بنگالی تھے۔ ایل ایم سرکار وہ اور ان کے والد بھی ماسٹر شیدت سنگھ سے پڑھتے تھے۔ جب ہم دسویں جماعت کے امتحان کے لئے سکول سے رخصت ہونے لگے تو ماسٹر شیدت سنگھ نے اپنی تقریر میں پہلا جملہ یہ کہا۔

”بچو یہ پچاسویں دسویں کلاس ہے جو میرے ہاتھ سے نکل کے جا رہی ہے“ میں ساتویں کلاس میں تھا کہ اسکول میں دو اور ماسٹر آئے۔ ایک ڈرائینگ ماسٹر ماسٹر اللہ بخش اور دوسرے انگریزی کے معلم قاضی حفیظ اللہ۔ ماسٹر اللہ بخش ماسٹر ہی نہیں آرٹسٹ بھی تھے۔ اور قاضی صاحب شاعر اور ادیب۔ ان کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ صبح سویرے کلاس میں آتے تو ”زمیندار“ اخبار کا پرچہ ساتھ لاتے۔ زمیندار کے پہلے صفحے پر بالعموم نظم ہوتی تھی وہ پڑھ کر سناتے اور پھر مجھ سے پوچھتے (اس لئے کہ مجھے شعر سے شغف تھا) کیسی ہے نظم۔

میں نے ظفر علی خان، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی اور اقبال کے نام سب سے پہلے انہی سے سنے۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ زوروں پر تھی اور روزنامہ زمیندار کا بہت چرچا تھا۔ یہ اخبار سہ پہر کو چار بجے امرتسر پہنچتا۔ ایک دکاندار ہمارا کرایہ دار ایک پیسہ میں اخبار خرید لیتا۔ وہ چاول بیچتا تھا۔ محلے کے لوگ جمع ہو جاتے اور میں چاولوں کی بوریوں پر بیٹھ کر شروع سے آخر تک سارا اخبار پڑھ کر سناتا۔

اسی زمانے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال نکالا۔ اسی کرائے دار کے طفیل مجھے اس جلیل القدر جریدے سے بھی شناسائی ہوئی۔ میری عمر اس وقت بارہ برس تھی اللہ جانے میں جو پڑھتا تھا سمجھتا بھی تھا کہ نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ لوگ شاباش دیا کرتے تھے۔

میرے والد کے ایک دوست مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے ”دلگداز“ کا رسالہ میرے نام جاری کرا دیا تھا۔ دلگداز کا سالانہ چندہ ایک روپیہ ہوتا تھا اور سال کے آخر میں شرر کا ایک ناول خریدار کو مفت ملتا تھا۔ ناولوں اور تاریخی مقالوں کے مطالعہ کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

دسویں جماعت بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کر لی۔ علیگڑھ میں جانے کا شوق تھا لیکن والد مرحوم کے دوست مانع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا ابھی چھوٹا ہے۔ کچھ عرصہ شہر ہی میں رہے تو بہتر ہے۔ شہر میں صرف ایک کالج تھا۔ خالصہ کالج۔ لیکن اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ٹکر کھاتا تھا۔ یہ کالج ہمارے گھر سے کوئی چار میل کے فاصلہ پر تھا لیکن میں اور میرے ہم کلاس بڑے ذوق و شوق سے یہ فاصلہ طے کرتے اور دن بھر اسی تعلیمی فضا میں رہتے۔

سکول ہی میں میں نے فارسی پڑھی تھی اور یہ احساس تھا کہ عربی کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ شہر میں عربی کے ایک عالم مولانا محمد عالم آسی تھے۔ چار بجے کالج سے فارغ ہو کر ان سے عربی صرف و نحو پڑھنی شروع کی۔ ڈیڑھ دو برس کے بعد مدرسہ غزنویہ سلفیہ میں مولانا محمد حسین

ہزاروی مرحوم کے درس میں شریک ہوگیا اور صرف و نحو اور حدیث پڑھی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے عزیز میرے ہم درس تھے۔ میرا ان کے گھر اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی صحبت نے مجھ میں یورپین زبانوں کے سیکھنے کا ولولہ پیدا کیا۔ میں نے فرانسیسی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ تو سیاست میں کھو گئے اور میں نے فرانسیسی زبان میں کافی دسترس پیدا کرلی۔

کالج میں پہنچ کر دیوان غالب اور شعر العجم کا مطالعہ کیا۔ شعر کا ذوق بچپن سے تھا اور ہزاروں شعر ازبر تھے لیکن ان دو کتابوں کو پڑھ کر یہ کیفیت ہوئی کہ اپنے شعر تو درکنار بڑے بڑے استادوں کے شعر نظر میں نہیں جچتے تھے۔ فارسی کی طرف طبیعت زیادہ راغب تھی۔ اُردو کو چھوڑ دیا اور فارسی کی طرف مائل ہوا۔ اسی زمانے میں حضرت فیروز طغرائی سے تلمذ کیا۔ وہ خود فارسی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اسی زمانے میں حکیم محمد حسین عرشی ہمارے محلے میں چلے آئے ان کی صحبت سے طبیعت کو اور بھی جلا ہوئی اور شعر و شاعری کی محفلوں نے اتنا زور پکڑا کہ ہم چار پانچ بچپن کے دوست اپنی اپنی جماعت میں فیل ہوگئے۔ لوگ ہماری ناکامی پر حیران تھے لیکن ہم معاملے کو سمجھتے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بکھر جانا چاہیے ورنہ زندگی برباد ہو جائے گی میں اور میرے ایک دوست لاہور آگئے۔ میں ایف سی کالج میں فورتھ ایر میں داخل ہوگیا۔ یہاں تاثیر۔ بشیر ہاشمی۔ شریف۔ کرنل مجید۔ پنڈت دیا ناتھ رشی۔ نواب نوازش علی خان سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب میرے ہم جماعت تھے

میرے والد کاروباری دل و دماغ کے آدمی تھے۔ خود نانبائی کی دکان کرتے تھے لیکن چاہتے تھے کہ میں کپڑے کی تجارت کروں۔ بی اے پاس کیا تو انہوں نے ایک دفتر کھلوا دیا۔ (IMPORT) اور (EXPORT) کا کام شروع ہوا۔ گھر میں کچھ دولت تھی۔ چند مہینے اس کاروبار میں گزرنے کے بعد ایم اے کا داخلہ شروع ہوا۔ میں لاہور میں کسی کام سے آیا ہوا تھا۔ اپنے دوستوں کو کتابیں اٹھائے ہوئے دیکھا تو جنون کے آثار پیدا ہوئے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔

والد مرحوم یوں تو کاروباری طبیعت رکھتے تھے لیکن مجھے بڑے چاؤ سے پڑھاتے رہے اور بے دریغ روپیہ بھی خرچ کیا لیکن نہ جانے کیوں بچپن سے مجھے اپنے ساتھ دکان پہ لاتے اور نانبائی کا سارا کام سکھاتے رہے۔ میں بلاناغہ دکان پہ کام کرتا تھا اور اچھا خاصا کاریگر تھا۔

میں ایم اے کے بعد دو ایک مہینے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا آرمی ہیڈ کوارٹرز۔ میڈیکل ڈائرکٹوریٹ میں کام کرتا رہا۔ لیکن طبیعت میں اُستاد بننے کا شوق تھا۔ آخر بی۔ ٹی کی سند حاصل کی۔ چند مہینے امرتسر گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر بھی رہا پھر اسی شہر میں انسپکٹر رہا اور پھر موقع ملنے پر ٹریننگ کالج میں استاد بن کر آگیا۔ یہاں چار سال کام کیا۔ اور میری تبدیلی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گئی۔ یہ میری تمناؤں کی انتہا تھی۔ تنکے کی خیر ہو پچیس برس وہیں ٹکا رہا یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

زندگی کیسے گذری یہ نہ پوچھئے۔ دن کالج کی چار دیواری میں پڑھنے پڑھانے میں گزرتے رہے اور راتیں دوستوں اور شاعروں کی محفل میں۔ وہ دوست جنہیں لوگ زندہ دلان پنجاب اور نیاز مندان لاہور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ شاگرد جو آج ملک کے بڑے بڑے سیاسی اداروں اور ادبی محفلوں کی روح رواں ہیں۔

ہماری محفل شعر و ادب کی محفل بھی ہوتی تھی۔ اس میں خوش گپیاں بھی تھیں اور ٹھوس علمی مباحثے بھی کتابوں کا تذکرہ بھی ہوتا تھا اور شخصیتوں کا بھی۔ استاد شاگردوں سے اور شاگرد استادوں سے کسب علم کرتے تھے "

اور اب

لحد میں جا سوئے یا الٰہی عزیز و غمخوار کیسے کیسے
کہ جب کبھی یاد آگئے ہیں تو پہروں نیندیں اچٹ گئی ہیں

اختر اورینوی

می شود پردۂ چشم پر کاہ گاہے!
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

میری زندگی موت کی آغوش میں گزری۔ آٹھ سال کا تھا تو چالیس دن تک ٹائیفائڈ بخار کے پنجوں میں بے ہوش سسکتا رہا اور پھر ایک سلسلۂ علالت شروع ہوا جوانی آئی تو سینۂ داغدار اور قلب بے قرار لے کر آئی۔ جسمانی اور روحانی طور پر برسوں اور مہینوں پابستر رہا۔ آج تک احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔ ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی رہتا ہوں۔

سوچتا ہوں کہ فطرت کا شکر کروں یا شکایت کہ مجھے اپنی علالت سے زندگی کے پیچیدہ راستوں پر چلنے کا موقع ملا، حیات کی نشیب و فراز سے گزرا اور ہر رنگ گردشِ روزگار کا تجربہ کیا۔

سخت جان ہوں یا صابر، نہیں معلوم لیکن ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ استقامتِ راہ میں میرے والدین کی تربیت اور ان کی بخشی ہوئی تعلیم نے بڑی مدد کی ہے۔ میرے ایک عزیز دوست پروفیسر معین الدین دردائی نے اپنی ایک کتاب "جلوے" میں لکھا ہے کہ "مذہب اختر کا کوڑھ ہے۔ اٹھتے بیٹھتے مذہب، بات بات میں مذہب۔" لیکن انہیں کیا خبر کہ اسی 'کوڑھ' نے مجھے ٹیک لگنے کا موقع دے دیا۔ دردائی یہ بھی نہیں جانتے کہ مذہب میرے لیے ایک سالم کشتی نہیں ہے بلکہ ٹوٹی ہوئی ناؤ ہے۔ یہ ناؤ شکستہ ہو یا نہ ہو دل شکستگی کی وجہ سے میں نے بے یقینی، کفر اور لادینی کی منزلیں بھی طے کی ہیں۔ کفر و اسلام، اقرار و انکار، یگانگی اور بیگانگی کے مد و جزر میں ڈوبتا ابھرتا رہا ہوں، انجام کیا ہوگا خدا معلوم، ہاں یہ جی ضرور چاہتا ہے کہ جس دامن کو پکڑا ہے وہ کبھی نہ چھوٹے۔

لوگ چاہتے ہیں کہ مرتب سوانح پیش کی جائے لیکن جب عمر ہی نامرتب ہے تو بھلا سوانح کیا مرتب ہوتا، تاہم اس بے ترتیبی میں ترتیب کی کوشش کرتا ہوں۔ راہِ جنوں میں سعیٔ خرد سب سے بڑا فریبِ حیات ہے لیکن یہ فریب کھانا ہی پڑتا ہے۔

تاریخوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا خاندان نقوی زیدی جاجنیری سادات کا خاندان ہے۔ نہ جانے عرب سے کن راہوں سے ہوتا ہوا کب ہندوستان وارد ہوا۔ یہ خبر ہے کہ صوبہ بہار کے اوّلین فاتح اختیار الدین بن محمد بختیار خلجی کے لشکر میں حضرت سیّد احمد جاجنیری شامل تھے، یہی میرے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان کا مزار گیاری ضلع مونگیر میں ہے۔ حضرت کے بیٹے اورین کی طرف جا نکلے اور قلعۂ اورین فتح کر لیا۔ 'فاتح اورین' اورین ہی کی خاک میں مدفون ہیں۔ آٹھ سو سال سے ہمارا خاندان دیارِ پیوند میں خاک نشین ہے۔ پیشۂ آباء سپہ گری تھا اور مقصد رشد و ہدایت۔ جب سپہ گری نہ رہی تو کاشتکاری شروع ہوئی۔ کاشتکاری میں بڑا مجاہدہ ہوتا ہے۔ میری فطرت میں مجاہدہ ہے اور میں سرکاری ملازمت سے گھبراتا ہوں۔ تحریکِ احمدیہ اسلامیہ میں حضرت امام جماعت ایدہ اللہ کے ہاتھ پر زندگی وقف کی تھی، کہ

خدمتِ اسلام کروں گا، لیکن جب مسلسل بیمار پڑتا رہا تو حضور نے یہ فرمایا کہ جو کام تم کر رہے ہو وہی وقف شمار کیا جائے گا۔ اس سے ایک نتیجہ نکلتا ہے، "امام جماعت جہاں کھڑا کر دے وہیں کھڑے رہنا فرض ہے اور جنگِ اُحد میں درّے کی حفاظت بھی جہاد ہے، صرف تلوار چلانا جہاد نہیں، خدمت اور اطاعت جہاد ہے۔ اگر میں اپنا درّہ چھوڑ کر بھاگوں تو مجرم ہوں گا۔

اوریں کی سرزمین بڑی سنگلاخ ہے، پرانا کھنڈر ہے، اونچا گڑھا ہے، پہلو میں خشک پتھریلی پہاڑی اور قریب ہی پہاڑوں کا نگینہ سلسلہ، شمال کی طرف وہیں گنگا بہتی ہے، میرے مزاج میں بھی پتھریلا پن ہے، مجاہدانہ جوش ہے لیکن ساتھ ساتھ محبت اور نرمی کی گنگا بھی بہہ اٹھتی ہے۔ میرا غصہ بُرا ہوتا ہے خود میرے لیے بھی، بہت پچھتاتا ہوں لیکن مزاج کا پتھر پانی نہیں ہوتا۔ ویسے چٹانوں کے درمیان اکثر آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔

میری ابتدائی تعلیم ماں کی آغوش میں ہوئی۔ میں اپنی ننھیال کاکو ضلع گیا میں پیدا ہوا۔ دیر میں پیدا ہوا، اماں بہت چاہتی تھیں لیکن تعلیم و تربیت کا انہیں بے حد خیال تھا۔ ابا جان کے مزاج میں بھی تیزی اور سختی ہے لیکن اماں جان کی محبت نے مجھے ابا جان کی سخت گیر تربیت کی ضربوں سے بہت حد تک بچائے رکھا۔ ابا جان اگر کڑے نہ ہوتے تو شاید اماں جان کی نرمی مجھے نقصان پہنچا دیتی۔ میں اپنے والدین کا ممنون ہوں کہ ان کے سایۂ تربیت میں توازنِ زندگی پیدا ہوا۔ میں اپنی دادی اماں اور اپنے منجھلے چچا جان کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے گاؤں ایسی جگہ میں میری اور میرے بھائی بہنوں کی پرداخت بڑی شفقت اور دلچسپی سے کی۔

میرے پردادا سید عنایت حسین نے حضرت سید احمد بریلوی سے بیعت کی تھی، دادا سید ہدایت حسین اتنے گرم جوش مذہبی آدمی نہ تھے ——— لیکن دادی اماں تو صوفی صافی تھیں۔ ایک بڑے رئیس کی بیوی تھیں لیکن محض نان و نمک پر گزارا کرتی تھیں اور گلیم پوش تھیں۔ پردادا، دادا اور دادی نے حج بیت اللہ کیا تھا۔ گھر کی فضا بہت مذہبی تھی لیکن دادا ابا سیاستِ دنیا بھی جانتے تھے۔ وہ گاؤں کے اکبرِ اعظم کہلاتے تھے، اگھوگھن سنگھ راجپوت ان کے ٹوڈرمل تھے۔ سادات اور راجپوتوں نے مل کر اوریں پر قبضہ کیا تھا اور فیروز تغلق کے زمانے میں جاگیر بھی پائی تھی۔ نصف نصف بٹے، اوریں میں بود و باش جداگانہ ہوتا تھا۔

ابا جان سید وزارت حسین اور چچا جان سید امارت حسین نے حضرت میرزا غلام احمد علیہ السلام کی تحریکِ احیائے اسلام کو بہ دل و جان قبول کیا اور میرے گھر میں احمدیت آگئی، اس سے مذہبی فضا اور گہری ہو گئی۔ ہر وقت قرآن و حدیث کے تذکرے رہنے لگے اور فتحِ اسلام کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ میرے بڑے چچا سید خلافت حسین بیرسٹر نے احمدیت قبول نہیں کی لیکن وہ بھی اس کے مخالف نہیں تھے۔

اسی دینی تعلیم کی فضا میں دنیاوی تعلیم بھی شروع ہوئی اور میں نے مونگیر میں انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں بعمر پندرہ سال پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ پھر سائنس کی تعلیم کے لیے پٹنہ چلا آیا۔ اماں جان کا انتقال ہو چکا تھا، وہ میری تعلیم کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہیں، تعلیم ان کا نصب العین تھی۔ میرے خاندان میں کسی نے انگریزوں کی سرکاری ملازمت نہیں کی تھی اور میں بھی ملازمت کو لعنت سمجھتا تھا اس لیے میڈیکل کالج کا رُخ کیا تاکہ آزادانہ روزی کما سکوں۔ ڈھائی سال میڈیکل کالج میں پڑھا۔ وہاں دو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس امتحانات پاس کیے اور صرف نیم حکیم بن کر رہ گیا۔ میرے دوست کاشی پرشاد اجشٹ کہتے ہیں کہ میں نیم حکیم بھی ہوں

اور نیم ملا ہیں، خطرۂ جان بھی اور خطرۂ ایمان بھی۔ لیکن اب تک نہ تو میں نے کسی کی جان لی ہے اور نہ کسی کے ایمان کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس احتیاط کرتا رہتا ہوں، احتیاط اور پرہیزگاری میری عادت ہو گئی ہے۔

میڈیکل کالج ہی میں تھا کہ سل کا حملہ ہوا اور میں پڑھائی چھوڑ کر اورین جا بیٹھا اور کاشتکاری کرنے لگا۔ کھیت کھلیان میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ سیر و شکار اور کتب بینی کا مشغلہ بھی تھا۔ ۱۹۳۱ء میں تبدیل آب و ہوا کے لیے ارول گیا۔ ساحل سون پر مجھے شفا تو ملی مگر ایک نیا روگ لگ گیا اور اس گرفتاریِ دل کا خمیازہ اب تک بھگت رہا ہوں۔

میرے افسانوں اور میری نظموں میں میری زندگی جھلکتی ہے۔ کوئی چاہے تو اس عکس خانے کی سیر کرے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی جرأت شرح و بیان میں نہیں ہوتی بلکہ ادب و شعر کے استعاروں، اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہیں۔

میں نے ۱۹۳۲ء میں پھر سے پڑھائی شروع کی، اب کے آرٹس لیا۔ انگریزی میں آنرز لیا اور ۱۹۳۴ء میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کر لیا۔ امتحان کے آخری پرچے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ پھر سل کا شدید حملہ ہوا اور لالکاری شروع ہوئی۔ برف کے ٹکڑے چوس چوس کر امتحان دیتا رہا اور پھر اتنا شدید طور پر بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ سینی ٹوریم جانے کا مشورہ ہوا اور وہاں ڈیڑھ سال گزارا۔ ۱۹۳۳ء میں میری شادی شکیلہ اختر سے ہو چکی تھی۔ انہوں نے چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں میرا ساتھ دیا اور مہینوں وہاں رہیں۔ اگر شکیلہ نہ ہوتیں تو میرے لیے زندہ رہنا بہت کٹھن ہو جاتا اور کون جانے زندہ رہتا بھی یا نہیں۔ روحانی سہارے کے علاوہ مادی سہاروں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

سینی ٹوریم کی زندگی میری حیات کا ایک خاص دور تھا۔ وہاں مجھے اشتراکیت کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ میں نے مغربی ادبیات سے بھی دلچسپی لی۔ اٹکی سینی ٹوریم میں میرے ذہن و روح میں بھی ایک خاص قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اور وہیں سے میری فنکاری کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ پہلے میرے افسانوں اور نظموں میں رومانی رنگ غالب تھا مگر اب میں حقیقت پسندی کی طرف نکل آیا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کئی افسانے اور نظمیں لکھیں۔ ہر چند کہ میں ۱۹۳۵ء کے دسمبر میں ارول لوٹ آگیا تھا لیکن پھر ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں اٹکی واپس آگیا۔ وہیں رہ کر ایم۔ اے کی تیاری کی اور پٹنہ آ کر ایم۔ اے اردو کا امتحان دیا۔ بفضلہ ہر امتحان میں بہت ہی نمایاں طور پر کامیاب ہوتا رہا ہوں، اس دفعہ بھی یونیورسٹی میں اول آیا، فرسٹ کلاس ملا اور طلائی تمغہ پایا۔

رانچی اور اٹکی میں بار بار جاتا رہا ہوں، چھوٹا ناگپور مجھے دل و جان سے پسند ہے، میں نے آدی باسی زندگیوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہاں کے کہسار مجھے پکارتے ہیں، بلند ٹیلے اشارے کرتے ہیں اور وہاں کی شاداب ہوائیں میرے وجود کو نئی روح عطا کرتی ہیں۔ دیارِ سون نے بھی مجھے متاثر کیا ہے اور چھوٹا ناگپور کے کہساروں نے بھی۔ کنارِ سون میرے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور جنوب بہار کے کہساروں میں میرا تخیل انگڑائیاں لیتا ہے۔ سون میرے لیے رکن آباد ہے اور چھوٹا ناگپور کے کوہ و صحرا وادیِ سینا۔

اورین اور ارول کی زندگیوں میں بڑا فرق تھا۔ اورین نے میرے اندر مذہبیت کو مستحکم کیا اور ارول نے شعریت کو استقلال بخشا۔ اورین میں پہاڑ ہیں، ارول میں دریائے سون ہے۔ وہ سون جس کا غالب بھی قصیدہ پڑھتا تھا۔ آپ سون پر غالب کی طبع آزمائی

دیوانی ہے۔ ارول کے آم کے باغ، شیشم کی قطاریں اور دریائے سون سے نکلی ہوئی شاداب نہر اور سرو چنار سے بھی بلند و بالا تاڑ کے جھنڈ رومان پرور رہے۔ اس دنیائے حسین کے اندر "پام ولا" اور "نیو ہاؤس" کے جاگتے ہوئے جادو آزمائش رنگین تھے۔ نہیں معلوم کہ حسن کی زلیخائی زیادہ قاتل ہوتی ہے یا اس کی گریزپائی، بہرحال حسن زہر بھی ہے اور امرت بھی۔ اگر ارول کا رومان نہ ہوتا تو اٹل کی حقیقت پسندی مجھے کٹر اشتمالی بنا دیتی کیونکہ اٹل سے آنے کے بعد بھی میں مخلص اشتراکیوں کے حلقے میں رہا اور اپنوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ میں کمیونسٹ اور دہریہ ہوتا جا رہا ہوں۔ شکر گزار ہونا چاہئے اہلِ حرم کو صنم کدۂ ارول کا کہ میں خدا کا انکار نہ کر سکا۔ بتانِ سیہ چشم نے مجھے گمراہی سے بچا لیا اور میری جبینِ نیاز کو سجدوں سے آباد رکھا۔

۱۹۳۸ء کے دسمبر میں میرے گلے میں ملازمت کا طوق آخر ڈال ہی دیا گیا۔ شکر ہے کہ میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوا۔ پٹنہ کالج میں تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہیں معلم بھی بنا۔ آج پٹنہ یونیورسٹی میں اُردو کا یونیورسٹی پروفیسر ہوں اور شعبے کی صدارت میرے سپرد ہے۔ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ یونیورسٹی پیاری ہے، مجھے پٹنہ یونیورسٹی عزیز ہے۔ یہی میرا نشیمن بھی ہے اور جولاں گاہ بھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے شاگرد اور میرے شریکِ کار مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میرے لیے شاہکاری یہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اُردو میرا اوڑھنا بچھونا ہے، اُردو میری محبت ہے، اُردو میرا ایمان ہے۔ اُردو زندہ باد!

میری زندگی، ناکامیوں اور کامیابیوں کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ مومن تو ہوں، متقی نہ بن سکا، کفر کو دلکش پایا لیکن کافر نہ بن سکا، رومان اپنی طرف بلاتا رہا مگر حقیقتیں دامن گیر رہیں۔ شادی ہوئی مگر اولاد نہ ہوئی۔ بہت اچھی بیوی ملی مگر اس کا حق ادا نہ کیا۔ بیوی جنت بداماں لیکن جنت سے انکار کی فطرت، اور اگر میں اپنے ضمیر کو تھپک کر سلانا چاہوں تو پھر یہ عذر بھی موجود ہے کہ اہلیہ محترمہ اپنے مزاج میں عجیب انفرادیت رکھتی ہیں اور حقوقِ نسواں کا انہیں اتنا پاس ہے کہ شوہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت چاہا ہے اور ایک دوسرے سے بہت جھگڑا کرتے رہے ہیں۔ دوستوں اور عزیزوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دورِ پیکار کون ہے اور دورِ محبت کون؟ کبھی کبھی دونوں دور متوازی بھی چلتے ہیں۔ زندگی ایک جدلیاتی تضاد ہے۔ مارکس تو صرف تاریخی جدلیاتی مادیت کا قائل ہے، میں نے تو اپنی ندگی میں روح اور مادہ دونوں کو ہر وقت برسرِ پیکار دیکھا ہے۔ شاید یہ ساری کائنات ایک مادی روحانی جدلیات کے چکر میں ہے۔

میں بچوں کو بہت پیار کرتا ہوں اور دوستوں کو بہت چاہتا ہوں اور صنفِ نازک بہت محبوب ہے، بھائی اور دوسرے زیزوں کے بچوں کو اپنا بنایا، خوشی بھی ہوئی اور موت کا غم بھی کھایا۔ بھائی کے تین بچے فوت ہوئے اور میرا اعجاز تو یوں چلا یا جیسے جیتے جی ہم سبھوں کی روح نکل گئی۔ تقسیمِ ملک کے بعد میرے بہت پیارے دوست دور دیس جا بسے اور بہت سی ین صورتیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ انجمن آرائی فطرت ہے مگر محفلیں ہمیشہ برہم ہو جاتی ہیں۔ یہ عجیب معاملہ ہے — عجیب تحفہ ہے۔

میرے ایک دوست شرف الدین عظیم آبادی ہیں جو کراچی جا بسے ہیں۔ وہیں حضرت شناق اور علی اظہر بھی ہیں اور وہ حضرت

بھی جنہیں عظیم آباد اور لکھنؤ کی لڑکیاں "مرغ" کہا کرتی تھیں۔ ساحلِ سون کا حسن بھی دریائے سندھ کی وادی و برہم پتر کی وادیوں میں بستا ہے اور ستم تو یہ ہے کہ بہار کے آسمان پر جو نئے ستارے طلوع ہوتے ہیں وہ بھی انہی افقوں کو چلے جاتے ہیں۔ کچھ قیمتی لوگ ابھی تک شہر عظیم آباد میں ڈیرا ڈالے جاتے ہیں جیسے، رضا نقوی اور جمیل عظیم آبادی۔ حضرت عباس علمبردار بھی کلکتہ جا بسے۔ انہیں سونار بنگال مرغوب ہو گیا۔ اب میں کن کن ناموں کا تذکرہ کروں؛ مستور کو محجوب ہی رہنا چاہیے۔

میں اپنی فطرت کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں اور کون پہچان سکا ہے۔ غافل افغان ہو یا کوئی اور انسان "اپنی خودی پہچان" کا واعظ ہمیشہ بے اثر رہا ہے۔ آدمی خدا شناس بن جائے ممکن ہے خودی شناس نہیں بن سکتا۔ شعور اور لاشعور کا گورکھ دھندا مجھ پہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ میں کیا بنا چاہتا ہوں نہیں معلوم، بس زندگی گزرتی چلی جا رہی ہے۔ میں اپنی سوانح عمری لکھ رہا ہوں یا جریدۂ عالم پہ غیر مرئی انگلیاں اَن گنت شخصیتوں کی سوانح عمریاں لکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

کتنے ستم ظریف ہیں یہ لوگ جو زخموں اور داغوں کا بازار لگا کر ہنگامۂ رسوائی گرم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سرگزشت حیات لکھنے کی کوشش مظاہرۂ لاف زنی بن جائے یا کوئی اس بہانے سے بہار زخم دکھانے لگے تو اسے سرگزشت حیات نہ کہیے۔ بادپیمائی یا خون فروشی کا نام دیجئے اور یہی تو مجھے آج اپنی سرگزشت کے بیان میں ڈراتے جاتا ہے۔ تاہم کچھ پردے ڈال کر اور کچھ پردے ہٹا کر میں اپنا مختصر سا حال بیان کرتا ہوں۔ مگر سنئے صاحب میری زندگی اہم واقعات سے بالکل خالی ہے اور کوئی ایسا پہلو میری زندگی میں موجود نہیں جو کسی کے لئے سامان عبرت یا متاع لذت بن سکے۔ تاہم چونکہ ہر زندگی محدود پیمانے پر کسی نہ کسی قسم کا انفرادی تجربہ یا سعی عمل ہے اس لئے اگر مقصود محض انفرادی ذہنی یا روحانی تجربوں کا لب لباب پیش کرنا ہے تو یہ کام ممکن ہے اور میں اس وقت یہی کام کر رہا ہوں اور اگر توقع واقعات عظیم کی ہے تو اس توقع سے باز آ جانا بہتر ہو گا۔

میری سرگزشت زندگی کی چند لکیریں یہ ہیں کہ میں منگلور تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ بزرگوں کا گاؤں شیربانی تھا جو تحصیل ایبٹ آباد میں ہے مگر معلوم نہیں اسلاف کرام کہاں کہاں رہے اور کیسے کیسے آئے۔ شجرۂ نسب موجود ہے جو مشہد کے سادات سے جا ملتا ہے خاندان میں طریقت۔ امامت۔ خطابت۔ زراعت کاری اور درویشی کی مختلف شاخیں ملتی ہیں۔ تعلیم پہلے اپنے گھر اور اپنے گاؤں میں پھر مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں۔ پھر علی گڑھ اور لاہور میں حاصل کی۔ کچھ باقاعدہ اور کچھ پرائیویٹ۔ کچھ اہل مسجد سے۔ کچھ خاندان مکتب سے۔ ڈاکٹریٹ ۱۹۴۰ء میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کی بیشتر منزلیں اورنٹیل کالج میں طے ہوئیں۔ ملازمت کا سلسلہ یونیورسٹی لائبریری کی کلرکی سے یونیورسٹی اورنٹیل کالج کی پرنسپل شپ تک پہنچا۔ لکھنے کا سلسلہ پندرہ برس کی عمر سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے کم و بیش اٹھارہ ہزار صفحات لکھے ہوں گے۔ ۱۸ برس کی عمر میں جاٹ اخبار کے نام سے ایک پرچہ نکالا مگر وہ محض طفلانہ تھا تاہم اس کے بعد صحافت اور اہل صحافت کے ساتھ مستقل تعلقات رہے۔ میں عرصہ دراز تک اپنے استادوں کے زیر اثر تاریخی اور واقعاتی تحقیق سے دلچسپی لیتا رہا مگر گزشتہ پندرہ برس سے فکری اور تنقیدی موضوعات پر بھی لکھتا ہوں۔ میرے استادوں میں حضرت مولانا احمد علی۔ خواجہ محمد سلیم۔ حضرت مولانا غلام مرشد۔ مولانا محمد علی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مولانا محمد سورتی۔ ڈاکٹر محمد شفیع۔ مولانا یمین۔ ڈاکٹر محمد اقبال اور پروفیسر شیرانی خصوصیت رکھتے ہیں۔ میں ملک سے باہر کبھی نہیں گیا اور مجھے اب بھی اس کی آرزو نہیں۔ مجھے اپنا وطن اور اپنے گھر کی خلوت سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یا وہ خلوت دل جو میری ہستی کا کل سرمایہ ہے۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خارجی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نشیب و فراز بہت کم ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ابتدائے عمر سے یہ شعور بخش دیا تھا کہ زندگی ایک بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود ایک آزمائش بھی ہے اور اس آزمائش میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو اس کی تلخ حقیقتوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں اور زندگی کو ایک مقصد کے تابع بنا کر خاموشی اور آہستگی کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اس فلسفے یا عقیدے کے زیر اثر میں قدرے آرزومند اور قدرے بے آرزو جادۂ حیات کو طے کرتا رہا اور اب بھی کر رہا ہوں۔

مگر یہ کہنا ادعائے محض ہوگا کہ میں ہچکولوں اور تھپیڑوں سے محفوظ یا ناآشنا رہا۔ میری روحانی زندگی میں ہمیشہ اضطراب کی کیفیت رہی جو عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا سعیِ حیات کا یہی انجام ہے کہ انسان لگاتار محنت کے بعد تھوڑی سی خوشی حاصل کرے مگر یہ خوشی بھی اس کے کسی کام نہ آئے۔ اس کے لئے وسیلۂ اطمینان نہ بن سکے۔ ابوالفضل نے کہا تھا۔ میں فرشتہ پیدا ہوا تھا مگر اب جب دنیا سے رخصت ہونے کے قریب ہوں مجھے اپنے انسان ہونے پر بھی شک ہے۔ میں سوچتا ہوں میں اپنی ابتدائی عمر میں (بلکہ جوانی میں بھی) خاصے خلوص اور اعتماد کا مالک تھا میں نے نیکی، شرافت اور راحت کا ایک فلسفہ بنایا تھا جس پر میں خاصی مدت تک بڑے خلوص سے عمل کرتا رہا مگر زندگی ایسی شاہراہ نہیں جو اوّل سے آخر تک ہموار اور سیدھی ہو۔ اب میں جس دور سے گزر رہا ہوں اس کو تشکیک کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یعنی بے اعتمادی کا دور۔ انسانوں سے بے اعتمادی۔ خود سے بے اعتمادی۔ ہر شے سے بے اعتمادی۔ نیک ارادوں کا یہ انجام۔ اس تصور سے جی کانپ اٹھتا ہے۔

زندگی کے ان اچھے برے تجربات کے درمیان جن میں سے بعض بے حد حیات کش ہیں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہمیشہ سہارا دیتی رہیں اور اب بھی تھوڑا بہت سہارا دے رہی ہیں۔ ان میں سے ایک میری عادتِ دعا ہے جو مجھے محور سے ہٹنے نہیں دیتی۔ دوسری چیز شعر ہے جو میری شعوری زندگی کے ہر فارغ لمحے میں میری ساتھی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو دعا اور تلاوتِ شعر میری سب سے بڑی عبادت ہے۔ میں شعر سے راحت بھی حاصل کرتا ہوں اور شعر ہی سے اپنا دستورِ حیات مرتب کرتا ہوں۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں شعروں نے میری امداد کی۔ حافظ۔ میر۔ غالب۔ اقبال اور دوسرے شعرائے اردو و فارسی میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔ خصوصاً حافظ کہ ان کے اشعار نے مجھے پست نہ ہونے دیا اور میر جو میری زندگی کی المیہ حقیقت کو مانوس بنا کر مطمئن کرتے رہے اور کہتے رہے "یعنی جب زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے تو رونے اور برہم ہونے سے کیا فائدہ" دکھ کی حقیقت سے باخبر ہو چکنے کے باوجود دوسرے انسانوں سے قریب ہونا سہل ہوتا جا رہا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی بساط کے مطابق انسانی دکھ درد کی قدر کر سکا مگر میری سب سے بڑی کمزوری بھی یہی ہے کہ میں اس بازارِ سوداگری میں متاعِ دردمندی لئے پھرا اور دنیوی فوائد سے بالعموم محروم رہا۔ میری نیکی بدی کا پھل لاتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اپنے دکھوں کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتے رہے ہوں لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق دنیا سے دردمندی کے اصول پر نباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال ذکر اس وقت شعر کی ریاضت اور عبادت کا ہے اور میں محسنِ حقیقی کا شکرگزار ہوں کہ اس نے شعر کو میرے لئے نسخۂ کیمیا بنائے رکھا۔ میری زندگی کی حیات افروز عناصر میں ایک چیز مقاصد کی لگن بھی ہے۔ اور عجب چیز ہے یہ لگن۔ جس نے کام چوری اور نشاط طلبی کے ہر اس وسیلے سے بے نیاز کر دیا جس کی جستجو میں لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے اس نشاطِ کار نے وہ خورسندی عطا کی جس کی طلب میں حافظ نے مئے ارغوان اور غالب نے رطلِ گراں کا طواف کیا۔

میری آرزوؤں کی دنیا بہت محدود ہے۔ ان آرزوؤں میں ایک یہ ہے کہ خدا مجھے ایسا قلم عطا کرے جو زیادہ نہیں تو دس فقرے ہی ایسے لکھ

جائے جو دونوں کا رشتہ رب العالمین سے جوڑ سکیں اور یہ خدائے کردگار پر احسان نہیں کیوں کہ وہ تو بے نیاز ہے۔ انسانوں کی خاطر ہے کہ وہ جہاں میں ضرورت مند ہیں اور اسی وسیلے سے سکون پا سکتے ہیں۔ میری دوسری آرزو یہ ہے کہ میں تہذیب اسلامی کی جمالی روح کے آئینہ مصفا پر سے غلط فہمیوں کی گرد کو دور کر سکوں اور نئی زبان میں بات کہہ کر اپنے مخاطبوں کے لئے قابل فہم بن سکوں۔ میری تیسری آرزو یہ ہے کہ میں انسانی ضمیر کو پھر اس طرح جگا دوں کہ انسان کا دل انسان کے لئے شفقت سے بھر جائے۔ اور انسان دکھ درد کی سطح پر پھر سے ایک ہو جائیں۔ میری ایک آرزو یہ بھی ہے کہ میں اپنے ملک میں ایک علمی روح پیدا کروں جس کی ترجمانی کا فرض اُردو زبان اختیار کر سکے۔ میں ان مقاصد کی پیش رفت میں لگا رہتا ہوں اور مدرسی کے وقت کو چھوڑ کر (جو میرے لئے نشاطِ زیست کا وقت ہوتا ہے) باقی ہر لمحہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل طلبی میں گزارتا ہوں اور ایسے زمانے میں بھی جب میرا دل بھیانک خلا محسوس کرتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے گویا میری ہستی راکھ کا ڈھیر ہے میں مقاصد کی لگن سے اس راکھ کو آتشِ خاموش کی مانند پُرسوز بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں اور خوش ہوں کہ یہ راکھ ابھی بالکل مردہ نہیں ہوئی۔

خدیجہ مستور

اپنی عمر کے لیے کون اندازے نہیں لگاتا۔ تقریباً ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اگر عمر خضر نہ پائی تو ساٹھ ستر سال تو ضرور ہی جی لیں گے کل کی کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی اور نہ کل کی آنے والی موت کے لیے سوچ سوچ کر کوئی دہلنا پسند کرتا ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ عمر کے اسی حصے میں آپ بیتی لکھوں گی جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ اس وقت [illegible] انسان کے پاس صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ وہ اذیت ناک ہوں یا فرحت بخش۔ مگر اڈیٹر نقوش میرے برادرِ محترم طفیل صاحب مصر ہیں کہ کچھ نہ کچھ لکھ دیجیے۔ سو میں جو کچھ لکھوں گی وہ میری آپ بیتی کے صرف چند تاثرات ہوں گے۔ آج اگر میں بہت کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو وہ قبل از وقت ہوگا۔ مجھے اس دنیا کو کچھ اور دیکھنے دیجیے۔ کچھ اور سمجھنے دیجیے اور وہ زمانہ بھی آنے دیجیے جب یادوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ جب کرن، میری ننھی سی اکلوتی بیٹی مجھے چھوڑ کر ایک نئے گھر میں آباد ہو جائے گی، اور میرا اکلوتا بیٹا پرویز بابر اپنی دلہن کے وجود میں کھو کر مجھے بھول جائے گا اور ظہیر بابر شاید عینک لگا کر گہرے مطالعے میں غرق رہا کریں گے تو پھر میں کیسی تھکن اور تنہائی محسوس کروں گی۔ اس وقت میں احساسِ تنہائی سے بچنے کے لیے اپنی آخری کتاب لکھوں گی جسے آپ بیتی کہا جائے گا۔

میرا بچپن ان غریب بچوں سے کھیل کر گزرا جنہیں لوگ اپنی زبان میں نیچ کہتے ہیں۔ میری رشتے کی ایک پھوپی ایسے بچوں سے کھیلتے دیکھ کر کہتی تھیں کہ رذیلوں کے گھر چھوت پیدا ہوئی ہے۔ میرے کھیل اپنی سب بہنوں اور بھائی سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ گلی ڈنڈا، کبڈی، گیڈی، تالاب میں بھینسوں کے ساتھ تیرنا، درختوں پر چڑھنا۔ بچپن میں مجھے جنون سا تھا کہ اونچے سے اونچے درخت سر کروں مگر یہ عجیب بات ہے کہ میں کبھی گری نہیں۔ ہاں، کبھی کبھی فراک پھٹ جاتی تھی جس پر گھر میں مار بھی پڑ جاتی تھی اور اس مار کا اتنا گہرا اثر ہوتا کہ گھنٹوں روتی تھی۔ بچپن میں جب میں نے کھیلنا سیکھا تو عام لڑکیوں کی طرح گھروندے بنا کر کھیلتی تھی مگر جلد ہی مجھے گھروندے بنانے سے نفرت ہو گئی۔ میں بڑی مشقت سے گھروندا بناتی مگر کوئی نہ کوئی شریر بچہ لات مار دیتا۔ میرے لیے بچوں کی یہ حرکت بڑی اذیت ناک ہوتی تھی۔ گھروندا بنا کر میں نے کبھی خود نہیں توڑا۔

آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے شوق چرایا کہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو بھی قرآن شریف پڑھایا جائے۔ سو دو مہینے تک برآمدے میں دری بچھا کر بچوں کو انتہائی بزرگی کے ساتھ سبق پڑھائے اور ابھی ان کا ایک ایک پارہ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ان کی کند ذہنی سے تنگ آ کر سب کو بھگا دیا۔ انہی دنوں کہانیاں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ والدہ اور والد کی زبان سے لفظ پلاٹ سن لیا تھا مطلب بھی معلوم کر لیا۔ اس کے بعد کہنا شروع کیا کہ میرے دماغ میں تو سینکڑوں پلاٹ ہیں۔ خوب مذاق اڑتا مگر میں ڈھیٹ بنی رہتی

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کوئی پرستان نام کی تھیٹر کمپنی آئی تھی۔ ابا میاں نے اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ مجھے، ہاجرہ اور عائشہ بجیا کو لکھنؤ بھیج دیا تاکہ بچوں کی تفریح ہو جائے۔ وہاں شوکت تھانوی مرحوم ملے۔ ہمارے گھر میں ان دنوں شوکت صاحب کی "سودیشی ریل" کا چرچا تھا۔ میں بہت بیتابی سے ملی اور انھیں بھی بتایا کہ میرے دماغ میں بہت سے پلاٹ ہیں۔ میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ شوکت صاحب مرحوم دوسروں کی طرح ہنسے نہیں (پتہ نہیں دل میں وہ بھی ہنس رہے ہوں) بلکہ بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ تم ضرور لکھو گی۔

۱۹۳۶ء میں ابا میاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے مرنے کے بعد راز کھلا کہ ایک معقول قسم کی تنخواہ پر حاتم طائیوں جیسی زندگی گزارنے والے ابا میاں اپنے تلے اوپر کے سات عدد بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک بے حوصلے تک زندگی کس طرح گزری۔ یہ ایک پوری داستان ہے۔ سوچتی ہوں کہ جب وہ سب تفصیلیں لکھوں گی تو کلیجے کا کیا حال ہوگا۔ ایک ننھا سا قصہ بتاتی ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد ہم سب لکھنؤ آ گئے۔ ہمارا مکان اسی جگہ تھا جہاں والد کے پیر نانا کا مزار تھا۔ مزار پر روز گھی کے چراغ جلتے۔ جانے کہاں کہاں سے عورتیں آتیں اور مزار کا طاق گلگلوں سے بھر کر چلی جاتیں۔ ایک رات ہمارے گھر فاقہ تھا کیونکہ ماموں میاں کا منی آرڈر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی توصیف جو صرف چھ سات سال کا تھا، بھوک سے بلبلا کر طاق پر سے گلگلے اٹھا لایا۔ باجی اماں (میری امی) نے اسے سمجھایا کہ یہ گلگلے تو فقیروں کے لیے ہوتے ہیں اور یہ سنتے ہی صابر بچہ گلگلے اسی طرح طاق پر رکھ آیا۔ ہم نے دکھوں کا وہ زمانہ انتہائی خاموشی اور غرور سے گزارا۔ ایسوں کو ہمارا حال کبھی نہ معلوم ہو سکا جو ہمارے دکھوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ ہم کبھی ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں ہم سب بے حد حساس ہو گئے تھے۔ ہم کسی دوسرے کے خلوص اور محبت کی ہلکی سی کرن کو بھی تاکتے تھے اور بخیل سنگ گراں گروں کے سامنے ہی قدم اٹھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک آدھ بار دھوکا بھی کھایا۔ مگر میں آج تک سوچتی ہوں کہ کیا دھوکا دینے والے کامیاب رہے؟ کیا انھوں نے خود اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیا تھا؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان کے دھوکوں کے بعد بھی میرا ایمان محبت اور انسان کی عظمت پر سے نہیں اٹھا؟ میرے ابا میاں مرحوم، میرے ماموں میاں مرحوم، میرے سوتیلے والد مولانا مصطفےٰ خاں صاحب مداح (آسی پھپھوندی مرحوم) میری سوتیلی والدہ، میرے پیارے سوتیلے بھائی، میرے منہ بولے نانا سید ناصر حسین صاحب مرحوم۔ کیا محبت اور ایثار کی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں؟ جب میں اپنی آپ بیتی لکھوں گی اور جب بیس پچیس سال بعد آئندہ نسلیں اسے پڑھیں گی تو وہ یقیناً اسی طرح حیران ہوں گی جیسے میں حاتم طائی کے قصے پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ ان کے بیچ میرے اکلوتے ماموں میاں کتنے عجیب سے انسان ہوں گے جو ناز و نعم میں پرورش پانے کے بعد اپنی بیوہ بہن اور بھانجیوں کو سنبھالنے کے لیے، اپنے مستقبل کو تاریک کر کے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں نوکری کرنے پردیس چلے گئے۔ اپنی ساری کمائی ہمارے پیٹ کے جہنم میں جھونک کر جانے خود کس طرح گزارہ کرتے تھے اور پھر سال کے اندر اندر آنتوں کی دق لے کر وطن واپس آ گئے اور وہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے اور یہ نئی نئی کوٹھیاں بنانے کے لیے ہزاروں جتن کرنے والے کب یقین کریں گے کہ ناصر نانا نے ہمارا سر چھپانے کا سہارا، اپنے باپ دادا کی یادوں کا مرکز، اپنا گھر لکھنؤ سے لاہور آنے کے سلسلے میں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے حکیموں کے خاندان کا یہ معزز فرد ہم سے ملنے کی خاطر ایک دن کی جیل بھی جھیل آیا مگر جیل اور مقدمے سے فرصت پاتے ہی پاکستان آ کر رہا۔ ناصر نانا کو مرے پورا ایک سال ہونے آ رہا ہے مگر آج بھی جب میں اپنے میکے، اپنے لاڈلے بھائیوں، بہنوں اور ماں کو دیکھنے جاتی ہوں تو وہاں مجھے نانا ناصر نظر آ جاتے ہیں۔ لحاف اوڑھے، بستر پر

بیٹھے کھانس رہے ہیں، سانس چڑھ رہی ہے، مگر آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے۔ وہ سر اونچا کر کے کہتے ہیں "دیکھو بٹیا۔ کیا میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب میں نے پاسپورٹ بنوانے کی درخواست دی تو اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی انور جہاں (میری امّی) سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ تحقیق کرنے کے بعد ان ظالموں نے کہا کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔ مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ لے بھلا تو میری بیٹی نہیں؟ دیکھو میں تو آ گیا۔ روک لیتے تو جانتا۔"

اور پھر احمد ندیم قاسمی، میرے بھیا، میرے سرپرست، میرے شوہر کے ماموں اور سسرال والوں کی نظروں میں میرے خسر، بھیا کے لیے میں صرف اتنا ہی لکھوں گی۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سب کچھ لکھنا شروع کر دیا تو ان گنت صفحے بھر جائیں گے۔ ہاں صرف ایک بات ضرور لکھوں گی کہ بھیا ندیم کی سرپرستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ سب نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا۔ مگر مجھے آج بھی ان باتوں کا ملال نہیں۔ ظالموں نے میرے ناصر نانا کو جیل بھیج دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ سچ بولتے تھے۔ ندیم بھیا، بھیا ہی رہے۔ سچ پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے؟

سنہ ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ایک رسالے کو (جس کا نام اب یاد نہیں) اپنی کہانی چھپنے کے لیے بھیج دی۔ کہانی تو خیر نہ چھپی مگر میرے نام رسالہ آ گیا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ تو اس دن کھیلنا یاد رہا اور نہ کھانا۔ رسالے پر سے پتے کی چیٹ اتار کر بڑی احتیاط سے بکس میں رکھ دی۔ پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک مضمون لکھا اور وہ ایک زنانے پرچے میں سچ مچ چھپ گیا۔ یہ مضمون پردے کی حمایت میں تھا اور ثابت کیا تھا کہ پردہ اتارنا سخت بے حیائی کی بات ہے۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ دو چار شعر بھی کہہ لیتی مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ شاعری اپنے بس سے باہر ہے۔ کہانیوں کا بھی یہی حال رہا۔ جانے کتنی لکھیں اور پھاڑ دیں۔ پھر بھی "خیام" اور "عالمگیر" میں ابتدائی کہانیاں برابر چھپتی رہیں۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ذرا سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اس روز بڑی مسرت ہوئی جب سید احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون لکھنؤ ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا اور اس مضمون میں میری کہانی "بھنور" کی بڑی تعریف تھی۔ میں اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اتنے بڑے نقاد میری کہانی کی تعریف کریں گے۔ اس ہمت افزائی کے بعد میں نے اور بھی سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اب تک لکھ رہی ہوں۔ ایک ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول پر "آدم جی ادبی انعام" بھی ملا تھا۔ اپنے لکھے سے آج تک مطمئن نہیں ہو سکی۔ شاید میں ایک چیز ایسی بھی لکھ سکوں جس سے خود بھی مطمئن ہوں۔

سنہ ۱۹۵۰ء سے میری شادی ظہیر بابر سے ہو گئی۔ اب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ ازدواجی زندگی خاصی پُرسکون ہے۔ میں عام بیویوں کی طرح جی جان سے ظہیر کو چاہتی ہوں حالانکہ لوگوں کو یہ شبہ ہی رہتا ہے کہ یہ افسانہ نگار عورتیں گھریلو زندگی کیا گزارتی ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۵۰ء میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ کی سیکرٹری منتخب کی گئی۔ ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنا پڑتی مگر حکمرانوں نے پیچھے لگ جانا شروع کیا اور یہیں سے سی۔ آئی۔ ڈی کی مہربانیاں نازل ہوئیں۔ یہ سب کچھ صرف ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنے کی وجہ سے ہوا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گناہ بھی ہوتا ہے ——— مجھے اپنی سب بہنوں اور بھائیوں سے بے تحاشہ محبت ہے مگر جانے کیسے مجھے ہاجرہ سب سے زیادہ عزیز رہی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہے۔ شادی بھی ایک ہی روز کی۔ شادی کے بعد بھی لاہور میں صرف گھر الگ الگ ہو گئے تھے مگر روز ملنا ہوتا۔ اب جب سے ہاجرہ کراچی میں مقیم ہے تو مجھے لاہور پردیس لگنے لگا ہے۔ جانے یہ پردیس کب دیس بنے گا۔

تلوک چند محرومؔ

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصّہ ہی مختصر ہے (میرؔ)

آج سے ستر برس پہلے پچیس تیس خس پوش گھروں کا ایک گاؤں سرسبز کھیتوں کے درمیان دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے آباد تھا۔ اس میں میرے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ گزرا۔ اگرچہ اس سرزمین کے قدرتی مناظر شاداب میدانوں اور سبز کھیتوں تک ہی محدود تھے اور کبھی کبھی باد و باراں کی ستم رانی اور دریائے سندھ کی بے پناہ طغیانی ناقابلِ برداشت بھی ہو جاتی تھی لیکن یہ مناظر میرے لیے نت نئی دلچسپی کا باعث ہوتے اور میں اکثر ان میں کھو جاتا یا دل میں ایک بے نام سی امنگ پیدا ہوتی۔ جب ساون بھادوں میں دریا چڑھاؤ پر ہوتا تو میرے دل میں بھی ایک عجیب سا تموّج پیدا ہوتا۔ گویا شعر کہنے سے پہلے طبیعت نامعلوم طور پر شعر گوئی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ چنانچہ سنِ شعور پر پہنچ کر کئی نظموں میں ان جذبات کا اظہار رہا۔ مثلاً یہ رباعی ؎

کچھ تازہ نہیں شعر کا سودا مجھ کو ہوتی بھی تو کیوں اس کی تمنا مجھ کو
گہوارے میں نالہ مرا موزوں نکلا قدرت نے یہ بچپن سے سکھایا مجھ کو

دیہات میں عام دستور ہے کہ بچوں کو جہاں کوسوں تک کوئی سکول نہ ہو چھوٹی عمر میں تعلیم شروع نہیں کرائی جاتی۔ مجھے بھی پانچ کے بجائے سات سال کی عمر میں سکول میں بٹھایا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ ابتدائی درجوں سے مجھے آزاد کے دلکش طرزِ بیان سے انس ہو گیا۔ کیا نثر اور کیا نظم دونوں میں شیر و شکر کا مزا ملنے لگا۔ اسی دور میں ایک منظوم کتاب "مجموعۂ قصص" نام کی کہیں سے ہاتھ آ گئی۔ اس میں چند منظوم قصّے سہل زبان اور خفیف بحروں میں تھے۔ انھیں بار بار پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود بخود زبان پر موزوں مصرعے آنے لگے اور پانچویں درجے میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی نظمیں غلط سلط زبان اور درست بحر میں موزوں ہونے لگیں۔ ابتدا میں وزن کا غلط نہ ہونا موزونیٔ طبع کی دلیل ہے لیکن زبان پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زبان کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

میری مادری زبان اُردو نہیں ملتانی ہے جو پنجابی سے بھی قدرے مختلف ہے۔ پڑھے لکھے لوگ خط و کتابت اُردو میں کرتے تھے۔ گویا میرے ضلع سابق بنوں اور بعد میں میانوالی کی کاروباری اور ادبی زبان اُردو ہی تھی۔ میں نے شعر کہنا تو اُردو میں شروع کر دیا لیکن درست نادرست میں امتیاز نہ تھا کیونکہ درست زبان پر عبور حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ وہ وقت تو دور رہا آج پچھتر برس کی عمر میں بھی میں یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اردو زبان پر مجھے پوری دسترس حاصل ہے اگرچہ کئی حضرات نے میری شاعرانہ زبان کو سراہا ہے جیسا کہ شیخ سر عبدالقادر مرحوم

نے گنج معانی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جب تک انھوں نے مجھے دیکھا نہ تھا وہ مجھے یو۔ پی کے کسی شہر کا باشندہ سمجھتے رہے۔ میں نے زبان سے متعلق اپنی اس خامی کا اعتراف کلام محروم حصہ اول میں جو آج سے چھبیس برس پہلے شائع ہوا۔ عرض حال کے زیر عنوان اس طرح کیا ہے ؎

دیکھی ہے میں نے دلی نہ دیکھا ہے لکھنؤ
محروم روبروئے اہل زباں شرمسار ہوں

یہی وجہ تھی کہ باوجود بیسیوں درخواستوں کے میں نے کسی کو مستقل طور پر اپنا شاگرد نہیں بنایا البتہ جگن سرشار کے بے حد اصرار پر ان کا کلام کئی سال تک دیکھتا رہا ہوں۔

زبان کے معاملہ کو یہیں چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ پانچویں درجے یعنی پرائمری کا امتحان پاس کر کے مڈل میں داخل ہوا اور چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں اُردو فارسی میں خاص دلچسپی لی۔ اُردو کورسوں میں شعرا، قدیم و متاخرین میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ وغیرہ کے علاوہ شعرا، جدید حالیؔ، آزادؔ، اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی کا کلام بھی موجود تھا۔ میری طبیعت دونوں سے متاثر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ساتویں جماعت میں تھا قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا۔ ملک بھر میں ماتمی جلسے ہوئے۔ ہمارے سکول میں بھی جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے ایک مسدس کی صورت میں مرثیہ پڑھا جس کا ایک شعر اب تک حافظے میں ہے ؎

فرط غم سے غنچے چپ ہیں، گل گریباں چاک ہیں
نوجوانان چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

انھی دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز سالانہ معائنہ کے لیے سکول میں تشریف لائے۔ آپ ادبی ذوق رکھنے والے ایک دہلوی بزرگ تھے۔ میرے اساتذہ نے مجھے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے وہ مرثیہ اور ایک نظم بہ عنوان "خدمت والدین" عرض کر دی۔ نظم کا مقطع تھا ؎

گو ضعیف العمر ہیں پر حق نہیں ان کا ضعیف
ہے نصیحت کام کی محروم اس سے مت گزر

مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ انعام اور تعریف سے میری ہمت بڑھائی۔ مرثیے کی نقل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کو بھجوائی۔ وہاں سے ایک پروانۂ خوشنودی ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت میرے نام آیا۔ اس واقعہ نے سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔

اس طرح میری شاعری کی ابتدا بغیر کسی رہبر یا رہنما کے شروع ہوئی۔ بے جا نہ ہوگا اگر یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ ممکن ہے اگر کوئی شاعر ان اطراف میں ہوتا تو بخوشی اس کا شاگرد ہو جاتا لیکن شاعر تو کیا شعر سے دلچسپی لینے والے بھی عنقا تھے۔ مجھے نہ تو یہ معلوم تھا کہ بذریعہ خط و کتابت بھی اصلاح لی جا سکتی ہے اور نہ یہ کہ کون حضرات ہیں جن سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسکول کی یہ حالت کہ نہ لائبریری، نہ اخبار نہ رسالہ، لے دے کے درسی کتابیں ہی میرے لیے شمع ہدایت تھیں۔

مڈل سکول کا امتحان پاس کرنے پر ہائی اسکول میں داخل ہوا تو میرا نام اساتذہ اور تلامذہ میں بطور شاعر مشہور ہو چکا تھا اور مجھے اس پر طفلانہ قسم کا کچھ فخر بھی تھا کیونکہ اساتذہ کی طرف سے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔ یہ ہائی اسکول شمال مغربی سرحدی صوبے کے

شہروں میں تھا۔ زبان یہاں کی پشتو تھی۔ چند قبائلی لڑکے بھی یہاں تعلیم پاتے تھے اور جب وہ اُردو بولنے پر آتے تو "پتیلی دال" کو "دیلا وال" کہتے۔ زبان کے معاملے میں کسی کا یہ مصرع میرے حسب حال تھا۔

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

لیکن سرسبزی اور شادابی میں یہ خطہ نہایت دل کش اور دل آویز تھا۔ شاعری کا جو چسکا پڑ چکا تھا اس میں عمر اور ماحول نے کچھ اضافہ کر دیا۔ یہاں اسکول کے ماہانہ ادبی جلسے میں مجھے کچھ نہ کچھ سنانا پڑتا تھا۔ اساتذہ میں بھی ایک صاحب شعر و سخن میں دلچسپی لینے والے نکل آئے علاوہ ازیں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی جو مشن احاطہ میں رہتے تھے اور ایک مذہبی ہفتہ وار پرچہ "تحفہ سرحد" چرچ مشن کی طرف سے نکالتے تھے شاعرانہ ذوق کے حامل تھے۔ نیز ایک اور نوجوان تھے۔ اپیل نویسی ان کا پیشہ تھا اور دیوان گویا ازبر تھا۔ ان دونوں سے تعارف کے بعد بے تکلفانہ میل جول ہو گیا۔ اکثر مدرسے کے اوقات کے بعد اور بعض وقت مدرسے سے روپوش ہو کر ان کے ساتھ شعر بازی اور شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی رہتی۔ ان ایام میں کئی تفریحی نظمیں کہیں اور چھوٹی چھوٹی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ ۱۹۰۶ء میں دسویں درجے میں تھا کہ "زمانہ" کانپور اور اس کے بعد "مخزن" لاہور میں نظمیں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) نے اپنے خطوط میں میرا دل بڑھایا۔ یہیں سے میں نے اپنا کلام محفوظ رکھنا شروع کر دیا۔ یہاں چند اخبار اور رسالے بھی پڑھنے کو مل جاتے تھے اور ملک کے سیاسی حالات سے بھی کچھ واقفیت ہوتی رہتی تھی۔ حب وطن کا جذبہ فطری ہے اور شاعرانہ طبیعت کے عین موافق۔ لہٰذا اسی طالب علمی کے زمانے میں سیاسی اور قومی نظمیں کہنا بھی شروع کر دیں۔ سودیشی تحریک، مہاتما گاندھی، جنوبی افریقہ کے ہندوستانی جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتا رہا اور پنجاب کے اخباروں میں اس نوع کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس وقت سے آج تک وطن اور حب وطن کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتا آیا ہوں جس کا نتیجہ ۱۹۰۶ء سے تقسیم وطن کے بعد تک قومی اور سیاسی کلام پر مشتمل "کاروانِ وطن" نام کی کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

طالب علمی کے انھی ایام میں رسالہ مخزن لاہور اور "زمانہ" کانپور میں علامہ اقبال، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی اور نادر کاکوروی اور پنجاب کے کئی دیگر شعرا کا کلام شوق سے پڑھتا رہا اور اس سے متاثر اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا ہی کہہ سکوں۔

اسکول کی طالب علمی کا مرحلہ ۱۹۰۷ء میں طے ہوا تو ایک سال کے لیے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں مدرسی کی تربیت کے لیے داخل ہوا۔ یہاں پہلی بار ایک مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اخبار صداقت ہند کے ایڈیٹر منشی دین محمد یہ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ طرحی کلام پڑھا جاتا تھا اور غزلیات تمام تر عاشقانہ ہوتی تھیں۔ میں اس مشاعرہ میں دو تین[1] بار شامل ہوا۔ پنڈت راج نراین ارمان دہلوی

---

[1] ایک دفعہ طرح تھی: ہم سے پیچھے رہیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

میری غزل کا مقطع تھا۔ محروم آزمائے طبیعت غزل میں کیا
یہ فکر کم نہیں ہے کہ دن امتحاں کے ہیں

دوسری بار طرح میں یہ مصرع تھا: خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

اس پر میں نے گرہ لگائی: ابھی آنکھ نرگس نے کھولی نہ تھی
خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

سٹیج کے پاس بیٹھے ہوئے مصرع اٹھاتے اور نہایت جوش و خروش سے داد دیتے جس سے سامعین شاعر کے شعر سے زیادہ ان کے داد دینے پر ہاؤ ہو کرتے۔

یہ ۱۹۰۷ء کا زمانہ تھا اور لاہور میں سیاسی تحریک زوروں پر تھی۔ میں نے بھی کئی سیاسی نظمیں لکھیں اور رسالوں اور اخباروں میں شائع بھی ہوئیں، لیکن چونکہ لب و لہجہ معتدل تھا سرکار کی طرف سے گرفت نہ ہوئی۔ اس ایک نظم پر ڈپٹی کمشنر نے رسالہ آزاد لاہور کے ایڈیٹر منشی بخش سہائے آزاد کو بلا کر پرسش کی۔ نظم کا عنوان تھا "اسیرو کرو کچھ وفا کی باتیں"۔ انہوں نے نظم کی اشاعت سے ہی تردید کر کے مخلصی پائی۔ انہی دنوں لالہ لاجپت رائے مانڈلے سے چھ ماہ کی جلاوطنی کاٹ کر لاہور واپس آئے۔ لاہور نے ڈی اے وی کالج میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب پر میں نے ایک طویل نظم (بصورت ترکیب بند) کہی تھی وہ ابتدا میں تصویب کے لیے مہاتما ہنس راج کو پیش کر دی۔ انہوں نے نظم تو شامل کر لی لیکن کئی اشعار خطوط وحدانی میں دے دیے اور فرمایا کہ یہ نہ پڑھے جائیں لیکن جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو خطوط وحدانی کو روندتا چلا گیا۔ جب پڑھ کر سٹیج سے اترا تو ٹریننگ کالج کے پروفیسر سید محمد حسن مرحوم نے مجھے بغل میں لے لیا اور انگریزی میں کہا میں تمہیں اس کامیابی پر مبارک دیتا ہوں۔ یہ واقعہ بھی میری آئندہ شاعری کے لیے جرأت آفریں ثابت ہوا۔

قیام لاہور کے زمانہ میں منشی سورج نرائن مہر دہلوی کے علاوہ اور کسی ادبی شخصیت یا شاعر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ مہر صاحب سے بھی ملاقات صرف رسمی طور پر کالج میں ہوئی۔ فائنل امتحان ہو رہا تھا اور میں طلبا کو اپنا امتحانی سبق پڑھا رہا تھا۔ وہ بطور ممتحن معائنہ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ چند منٹ مجھ سے پرسش حال کی اور مسکراتے ہوئے واپس چلے گئے۔

لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مشن ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور زندگی کے نئے میدان میں قدم رکھا۔ ملازمت اور خانہ داری کے فرائض کی ادائگی کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی اور حسب معمول اخبارات اور رسائل مثلاً ادیب، العصر، زمانہ اور مخزن وغیرہ میں کلام شائع ہوتا رہا۔ یہیں سے ۱۹۱۶ء میں اخلاقی، جذباتی اور نیچرل نظموں کا پہلا مجموعہ موسوم بہ کلام محروم حصہ اول مرتب کر کے شائع کرایا جس پر ملک کے بیشتر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ حضرت اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور حضرت کیفی دہلوی ایسے مشاہیر ادب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اکبر مرحوم نے تو ایک رباعی بھی براہ راست[1] رسالہ "زمانہ" میں شائع کرا دی تھی جو اب تک میرے لیے باعث فخر ہے۔ وہ رباعی یوں ہے ؎

ہے داد کا مستحق کلام محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

---

[1] معلوم نہیں کلیات اکبر کے مرتب کرنے والوں نے یہ رباعی کلیات میں کیوں شامل نہیں کی حالانکہ ایسے ہی موضوعات پر قطعات اور رباعیاں شامل ہیں۔

(محروم)

اس پر بطور رشکیہ میری طرف سے یہ رباعی رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی۔

طبع موزوں خدائے برتر سے ملی   تاثیر کلام حضرت مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقین کہ شاعر ہوں   جب داد سخن جناب اکبر سے ملی

کلام محروم حصہ اول کا دیباچہ میر کرامت اللہ نیر امرتسری نے لکھا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت پر مقررہ انعام کے علاوہ پنجاب گورنمنٹ نے کتاب کی ۵۰۰ جلدیں بھی خرید کر حوصلہ افزائی کی۔ بعد میں کلام محروم کے دو اور حصے بھی شائع ہوئے۔ ایک قومی، دوسرا عاشقانہ۔

نصف صدی کی طویل ملازمت کے دوران میں بعض ناگوار حالات اور کچھ ذاتی رنج دہ واقعات پیش آئے۔ طبیعت شروع سے رقت آشنا تھی۔ حالات نے میری شاعری میں غم و اندوہ کا عنصر شامل کر دیا۔ چنانچہ گنج معانی کے دیباچے میں شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے عملاً کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اساتذہ کے کلام پر ضرور نظر رہی ہے اور مولانا حالی اور آزاد کی ادبی تصانیف، مولانا شبلی کی شعرالعجم اور حسرت موہانی، چکبست لکھنوی، اثر لکھنوی اور جوش ملسیانی کے ادبی اور تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

چونکہ ایف اے اور بی اے کے امتحانوں میں جو میں نے ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے میرا ایک لازمی مضمون فارسی بھی تھا لہٰذا اس زبان میں کچھ شدبد ہو گئی اور چند غزلیں، رباعیاں اور قطعے فارسی میں بھی کہہ چکا ہوں۔ نیز انھی امتحانوں کے طفیل انگریز شعرا مثلاً ورڈز ورتھ، کیٹس، سر والٹر سکاٹ، ٹینی سن اور شیکسپیئر کے انتخابات کا مطالعہ بھی کیا اور ان کی کئی نظموں کا اُردو نظم میں ترجمہ بھی کیا جو میرے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہے۔

اب تک میری نظموں کے چھ مجموعے گنج معانی، رباعیات محروم، کاروان وطن، نیرنگ معانی، بہار طفلی اور شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں۔ ایسا کلام بھی جو رسالوں میں تو شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا، خاصی مقدار میں موجود ہے۔ کچھ حصہ ایسے کلام کا مکان اور سامان کے ساتھ تقسیم وطن کی نذر ہو گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہیں کیونکہ عمر کا آخری حصہ آزاد ہندوستان میں آرام کے ساتھ گزر رہا ہے۔

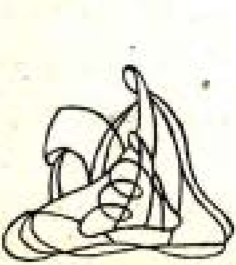

شاہد احمد دہلوی

ضلع بجنور (یو پی) کے ایک گمنام سے قصبے ریہڑ میں غریب مولویوں کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے پرانے دستور کے مطابق اسے قرآن شریف پڑھایا اور عربی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ مولویوں کا یہ گھر اتنا غریب تھا کہ اس بچے کا بار بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ بچہ بے حد ذہین اور پڑھنے کا شوقین تھا۔ باپ نے سوچا کہ دلی چل کر بچے کو کسی درسگاہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس زمانے میں دلی کی مسجدوں میں پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اپنے بچے کو لے کر دلی پہنچے اور کسی شناسا کی مدد سے بچے کو پنجابی کٹرے کی مسجد میں بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے کا ہے۔ بچے کی عمر اس وقت ہوگی کوئی آٹھ دس سال کی۔ باپ اسے مسجد کے ملا کے حوالے کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ مسجد ہی میں طالب علم رہتے تھے۔ رہتے کیا خاک تھے۔ رات کو کسی کونے کھدرے یا صحن میں پڑ رہتے۔ مسجد کا ملا بڑا بے رحم تھا۔ چھڑی سے لڑکوں کی کھال ادھیڑنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ دیہاتی لڑکا کڑاکے جاڑوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر رات کو پڑ رہتا۔ بچہ ہی تھا، کبھی صبح کو آنکھ نہ کھلتی تو ملا ایک لات رسید کرتا تو لڑکا لڑھکتا چلا جاتا اور صف بھی بچھ جاتی۔ طالب علموں کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ محلے کے گھروں سے ان کی روٹی بندھی ہوتی تھی۔ طالب علم جاتے اور گھروں سے روٹیاں مانگ لاتے اور جیسی بھی روکھی سوکھی ملتیں، اللہ عزیز کر لیتے۔ دیہاتی لڑکے کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جید عالم مولوی عبدالخالق کا گھر تھا۔ مفت کی روٹیاں بھلا مروڑ نے کون دیتا ہے؟ مولوی صاحب کی بیوی اس طالب علم سے بازار کا سودا منگواتیں، لکڑی پھڑواتیں، گھر کا پانی بھرواتیں اور مسالہ پسواتیں۔ ان کی ایک لڑکی پانچ چھ سال کی تھی۔ اسے بہلانا اور کولھے پر چڑھائے چڑھائے پھرنا بھی طالب علم کے ذمے تھا۔ لڑکی بڑی نٹ کھٹ اور چلبلی تھی۔ اگر مسالہ ذرا موٹا رہ جاتا تو اسی بٹے سے لڑکے کا ہاتھ کچل دیتی۔ غریب سی کر کے رہ جاتا۔ مگر تعلیم کے شوق میں ملا کی لاتیں بھی کھاتا اور لڑکی کی زیادتی بھی سہتا۔ راتوں کو مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں پڑھتا۔ جب یہ میسر نہ آتی تو گلی کی لالٹین کے نیچے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھوں کا تیل نکالتا رہتا۔ دو ایک سال یوں گزرے۔ پھر اتفاق سے دلی کالج کی طرف گزر ہوا تو دیکھا کہ داخلہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب بہادر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ کالج کے استاد بھی بیٹھے ہیں۔ لڑکوں کا باری باری سے زبانی امتحان لے رہے ہیں اور پاس فیل کر رہے ہیں۔ یہ کم عمر طالب علم بھی ہجوم میں گھس کر آگے بڑھنے لگا کہ کسی نے دھکا جو دیا تو گر پڑا اور رونے لگا۔ صاحب نے جو اسے روتے دیکھا تو پکار کر اپنے پاس بلا لیا۔ پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" لڑکے نے کہا "میں بھی کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔" صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور بولے۔ "تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہاں کی کتابیں نہیں پڑھ سکو گے۔" لڑکے نے کہا "میرا بھی امتحان لے لیا جائے۔" صاحب نے ایک کتاب میز پر سے اٹھا کر دے دی۔ کہا "اسے کہیں سے پڑھو۔" لڑکے نے کتاب کھول کر فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب حیران ہوئے۔ صاحب نے

پاس بیٹھے ہوئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا نے ایک اور کتاب آگے بڑھا دی۔ لڑکے نے اسے بھی بے جھجک پڑھنا شروع کر دیا۔ سب بہت خوش ہوئے اور لڑکا دلّی کالج میں داخل ہو گیا۔ شوق اور ذہانت کے پر لگا کر لڑکا اڑا اور کالج کی ساری منزلیں طے کر گیا پھر مدرس بنا، انسپکٹر بنا اور ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ اسی اثنا میں مولوی عبدالقادر صاحب نے دیکھ لیا کہ لڑکا ہونہار ہے، اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس لڑکے کا مذاق اڑاتی اور مرچوں بھرے بٹے سے اس کا ہاتھ کچل دیا کرتی تھی۔

ملازمت ہی کے زمانے میں ان صاحب نے کتابیں لکھیں جو اپنی مقبولیت کے سبب ان کی شہرت و عزت کا باعث ہوئیں اور سالار جنگ اُس زمانے میں حیدر آباد دکن میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو شمالی ہند سے بلا بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر رہے تھے۔ ان صاحب کو بھی دُگنی تگنی تنخواہ پر انہوں نے بلا لیا اور اس ریاست میں بھی انہوں نے اپنی عمدہ کارگزاری سے بلند ترین مرتبہ حاصل کیا۔ چند سال بعد جب دکن سے وظیفہ لے کر دلّی آئے تو لکھ پتی تھے اور علم و فضل کے آسمان پر سورج بن کر چمک رہے تھے۔

آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے خان بہادر شمس العلما، ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل جن کی کتابیں مراۃ العروس، توبۃ النصوح وغیرہ اور جن کا ترجمہ قرآن رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں لڑکیاں تو کئی ہوئیں مگر لڑکا صرف ایک ہی ہوا جس کا نام انہوں نے بشیر الدین احمد رکھا۔ میاں بشیر انگریزی محاورے کے مطابق، چاندی کا چمچہ منہ میں لے کے پیدا ہوئے۔ دونوں ماں باپ ان پر پروانہ وار نثار تھے۔ ابتدا میں ڈپٹی صاحب ہی نے انہیں عربی اور فارسی پڑھائی۔ اردو میں بچوں کے لئے مناسب کتابیں نہیں تھیں اس لئے شفیق باپ نے بیٹیوں کے لئے مراۃ العروس لکھی اور بیٹے کے لئے منتخب الحکایات۔ حسن اتفاق سے محکمہ تعلیمات کا ایک بڑا انگریز افسر دورہ کرتا ڈپٹی صاحب کی طرف آ نکلا اس نے میاں بشیر سے پوچھا کیوں میاں کیا پڑھتے ہو؟ میاں بشیر لپک کر اپنی کتاب اُٹھا لائے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا۔ میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ۔" میاں بشیر نے مراۃ العروس کا مسودہ بھی لا کر صاحب کو دے دیا۔ اسے بھی صاحب نے جستہ جستہ دیکھا۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب بھی آ گئے۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی عمدہ کتابیں لکھی ہیں، انہیں چھپوا دیجئے تاکہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچے۔" بعد میں یہ کتابیں چھپیں اور حکومت نے ان پر انعام دیئے۔ اور یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں اب تک چھپ چکی ہیں۔

جب میاں بشیر نے میٹرک پاس کیا تو ڈپٹی صاحب دکن سے پنشن پا چکے تھے۔ میاں بشیر نے آگے پڑھنا چاہا اور حیدر آباد جا کر ملازم ہو گئے۔ لڑکپن ہی میں ان کی شادی دلّی کے ایک رئیس خاندان میں ہو گئی۔ دس بارہ سال گزر گئے مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ خاندان کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شدہ شدہ بات ڈپٹی صاحب تک بھی پہنچی۔ وہ خود میاں بشیر کی بے اولادی سے افسردہ تھے۔ بہو کے علاج بھی ہوئے مگر معلوم ہوا کہ ان بہو سے اولاد نہیں ہو گی۔ ہار کے میاں بشیر سے دوسری شادی کے لئے کہا گیا۔ میاں بشیر نکاح ثانی کے لئے راضی نہ ہوتے تھے۔ انہیں اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بھلا اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے سوکن کو کیوں لا بٹھاتے؟ کچھ عرصہ اور گزر گیا تو ڈپٹی صاحب نے خود بیٹے کو سمجھایا اور شرعی مسائل سے بھی

حائل کیا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ باپ کا کہنا ٹل نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا بادلِ نخواستہ سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ دلی کے غریب سیدوں کے ایک خاندان کی دبلی دھان پان سی لڑکی مل گئی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ میاں بشیر ان چھوٹی بیگم کو اپنے والدین کے پاس دلی میں چھوڑ کر دکن اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ وہاں ان کے ساتھ بڑی بیگم رہتی تھیں۔ چھوٹی بیگم سسرال میں چھوٹی دلہن کہلائیں۔ انہوں نے ساس اور خسر کی اوّل دن ہی سے ایسی خدمت کی کہ دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ میاں بشیر جوگی کا سا پھیرا دلی کا لگا جاتے۔ دس سال بیت گئے۔ چھوٹی دلہن کی کوکھ بھی ہری نہ ہوئی۔ اب تو بڑی دلہن کی بن آئی۔ طعنوں تشنیعوں سے انہوں نے سسرال والوں کے دلوں میں ناسور ڈال دیئے۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ چھوٹی دلہن کا پیر بھاری ہو گیا۔ اب تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور چھوٹی دلہن کی بڑی اللہ آمین ہونے لگی۔ بڑی دلہن کوئلوں پر لوٹ گئیں اور کوئی بہتان ایسا نہ تھا جو انہوں نے چھوٹی دلہن پر نہ تراشا ہو۔ مگر غریب سیدانی نے صبر کیا اور منہ سے اُف تک نہ کی۔ نویں مہینے اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ اندھیرے گھر میں اس چراغ سے روشنی پھیلی اور بڑی دھوم سے اس کی خوشی منائی گئی۔ بھلا ڈپٹی صاحب کے ہوتے کسی اور کی کیا چلتی۔ میاں بشیر کی بے رخی بھی ختم ہوئی اور چھوٹی بیگم سے بھی التفات کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب نے بچے کا نام منظور احمد رکھا۔ چھوٹی دلہن دلی ہی میں سسرال میں رہیں۔ بڑی دلہن کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ میاں کے ساتھ حیدر آباد میں رہتی رہیں۔ بچہ یہاں دادا دادی کی آنکھ کا تارا اور سارے خاندان کا دلارا بنا رہا۔

ماں کی ممتا تو ہوتی ہی ہے۔ باپ کی بھی ممتا ہوتی ہے۔ میاں بشیر جب کبھی دلی آتے گل گوتھنا سا بچہ دیکھ کر ان کی ممتا نے جوش مارا۔ جب دکن واپس جانے کو ہوئے تو امّاں کے ذریعہ ابا سے اجازت چاہی کہ چھوٹی دلہن کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ انہیں کیا عذر تھا بخوشی اجازت دے دی۔ چھوٹی دلہن جب حیدر آباد پہنچیں تو بڑی دلہن کو ان کے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ وہ اپنے میکے سدھاریں۔ سوا سال ڈیڑھ سال بعد چھوٹی دلہن کے ہاں دکن ہی میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ ڈپٹی صاحب نے نام مبشر احمد رکھا۔ جب تیسرے بچے کے آثار ظاہر ہوئے تو چھوٹی دلہن دلی آ گئیں اور بڑی دلہن حیدر آباد چلی گئیں۔ تیسرا بچہ جب (۲۲ مئی ۱۹۰۶ء) پیدا ہوا تو ڈپٹی صاحب نے نام شاہد احمد تجویز کیا۔ وہ شاہد احمد یہی خاکسار ہے جو آپ کو آج آپ بیتی سنا رہا ہے۔

تین سال کی عمر تک کی مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ ہاں چار سال کے بعد کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ چار سال کی عمر میں میری آنکھیں اتنی بری طرح دُکھنے آئیں کہ میں اجالے میں آنکھیں کھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ان میں جب دوا لگائی جاتی تو ایسی مرچیں لگتی تھیں کہ میں چیخیں مارنے لگتا تھا۔ یہ واقعہ بھی انہی دنوں کا ہے کہ ہم اوپر چھت پر کھیل رہے تھے۔ نیچے گراموفون بجنا شروع ہوا۔ سب بچے گدا گد نیچے بھاگے۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی جو مجھ پر مرتی تھی مجھے گود میں اٹھا کر نیچے لے چلی۔ جب وہ زینے میں اترنے لگی تو جلدی چل جلدی چل کہہ کر اس کی گود میں اچھلنے لگا۔ جلدی میں اس کا پاؤں جو پھسلا تو دونوں کوئی بیس سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے صحن میں آ پڑے۔ میری امّاں "ہے ہے میرا بچہ" کہہ کر ننگے پاؤں سر بھاگیں۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا تو میرے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ ابا مجھے فوراً لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ سر کے پچھلے حصے میں زخم تھا۔ ڈاکٹر نے سات ٹانکے لگائے۔ ڈیڑھ انگل لمبا زخم کا نشان اب بھی باقی ہے۔

امّاں کا غمناک چہرہ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ امّاں بڑی سنجیدہ خاتون تھیں۔ مجھے ان کا ہنسنا یاد نہیں ہے۔ یہ بھی یاد

ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ حقہ وہ پیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں غرارے سوا سوا گھیروں کے ہوتے تھے۔ فرش پر چلنے میں پیچھے گھسٹتے تھے۔ یہ تو میں نے نہیں دیکھا کہ فرشی پاجاموں کو پیچھے سے لونڈیاں اٹھائے چلتی ہوں۔ ہاں تو آگے سے پائنچے اٹھا کر بائیں ہاتھ پر ڈال لیا کرتی تھیں۔ گھر میں مامائیں ملازم تھیں مگر اماں سالن خود پکایا کرتی تھیں۔ سالن دو قسم کا پکتا تھا۔ ایک بھنا ہوا اور ایک شوربے دار۔ ایک دال بھی ضرور ہوتی تھی۔ گھر ہمیشہ صاف ستھرا چندن سا رہتا تھا۔ بڑے دالان میں چاندنی کا فرش رہتا تھا اور چھوٹے دالان میں چوکیاں بچھی رہتی تھیں۔ چوکیوں پر دری چاندنی کا فرش ہوتا تھا۔ دونوں دالانوں کی کڑیوں میں ہاتھ سے کھینچنے کے پنکھے لٹکے رہتے تھے، جنہیں کھینچنے کے لئے کہاریاں آتی تھیں۔ گرمی کے زمانے میں خس کی ٹٹیاں بڑے دالان پر لگ جاتی تھیں اور ایک چھوکرا انہیں تر کرتا رہتا تھا۔ جاڑوں میں پنکھے اور ٹٹیاں اتر جاتیں اور روئی کے موٹے موٹے پردے باندھ دیئے جاتے۔ رات کو یہ پردے چھوڑ دیئے جاتے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اماں مجھے اپنی گود میں ہر وقت لئے رہیں۔ مگر چمکار کر گود سے اُتار دیا کرتی تھیں۔ جب میری پیٹھ پر کی بہن بشریٰ پیدا ہوئی تو اس کا لاڈ پیار زیادہ ہونے لگا۔ میں اس سے جلنے لگا تھا اور اماں سے کہا کرتا تھا "یہ چچی کی، یہ گندی"۔ اماں میرا دل رکھنے کے لئے مجھے خوب سا پیار کرتیں۔ ابا سے مجھے ڈر لگتا تھا، وہ جسیل آدمی تھے، ان کی آواز گرج دار تھی۔ اُن کی ڈانٹ سے نوکروں کا دم نکلتا تھا۔ ترکی پٹھے اور تازی تھرّاتے ہم بھی اُن سے ڈرتے تھے۔ ویسے وہ سب بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ گود میں بھی لیا کرتے تھے ساتھ سلاتے بھی تھے، پیار بھی کرتے تھے مگر ان کا خوف دل سے دور نہ تھا۔ جوان ہونے اور باپ بن جانے کے بعد بھی ان سے ڈر لگتا تھا اور بے بلائے کبھی اُن کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ گھر میں آتے تو ہم ادھر اُدھر دبکتے پھرتے۔

دادا ابا صرف اتنے یاد ہیں کہ جب ابا ہمیں لے کر دلی آیا کرتے تھے تو کوچہ نواب مرزا والے مردانہ مکان میں ہمیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ پیش دالان میں دو منشی بیٹھے تھے۔ پس دالان میں دروازے اور رنگ برنگ شیشوں والے بستے لگا کر کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ اس میں دائیں طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک چھدری ڈاڑھی والے بڑے میاں بیٹھے رہتے تھے۔ ابا اس کمرے میں داخل ہوتے ہی ان بڑے میاں سے لپٹ جاتے اور رونے لگتے۔ ہم حیران کھڑے سوچتے رہتے کہ ابا روکیوں رہے ہیں اور یہ بڑے میاں کون ہیں۔ پھر ابا ان سے الگ ہو کر ہم سے کہتے "دادا ابا کو سلام کرو"۔ ہم سلام کرتے تو وہ باری باری سے سب کو پیار کرتے اور صندوقچہ میں سے نکال کر ایک ایک اشرفی ہمیں دیتے۔ دادا ابا کے ملازم خدا بخش نے گچی میں بہت سارے کبوتر پال رکھے تھے۔ ہم کمرے میں سے باہر نکل کر کبوتر دیکھنے لگتے اور ابا بہت دیر تک دادا ابا سے باتیں کرتے رہتے۔

دادی اماں ہمیں بالکل یاد نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا ابا کی دیکھ بھال کے لئے ہماری اماں دلی ہی میں رہنے لگی تھیں۔ زنانی ڈیوڑھی اور مردانہ گھر دونوں دادا ابا ہی کے بنوائے ہوئے تھے۔ ان دونوں گھروں کے درمیان ایک مکان چچا اشرف حسین کا آ گیا تھا۔ اشرف حسین صاحب میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اماں صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا دادا ابا کے لئے خود گلی میں سے جایا کرتی تھیں۔ بشریٰ کے بعد ہمارا ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کا نام دادا ابا نے منیر احمد رکھا تھا۔ اچھا خاصہ کھیلتا تھا، بس دو ہی دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔ اسے جمونس کھا گئی۔ رشتہ کنبے کی عورتیں دیدے مٹکا مٹکا کے اور ہاتھ نچا نچا کر کہتیں "اے صاحب، تو چھوٹی دلہن چار چار لڑکوں کی ماں بن گئیں۔ دیمی ان کا مان: ہو گا تو اور کس کا ہوگا"۔ ایسی ٹوک لگی کہ وہ بچہ بھی اپنی جان سے جاتا رہا۔

صبح ہوتے اس بچے کا انتقال ہوا۔ میری اماں بڑی صابر سیدانی تھیں۔ انہوں نے اپنے روزانہ کے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ صبح وقت مقررہ پر دادا ابا کا ناشتہ لے گئیں۔ انہیں ناشتہ کرانے کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا اور رونے لگیں۔ دادا ابا نے گھبرا کر پوچھا کیوں چھوٹی دلہن خیر تو ہے؟ تو اماں نے کہا میر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دادا ابا اس واقعہ کا ذکر ہر آنے گئے سے کیا کرتے تھے کہ چھوٹی دلہن کے صبر و ضبط کو شاباش ہے بچہ مرا پڑا ہے اور ناشتہ تیار کر کے خود لا رہی ہیں اور مجھے کھلا رہی ہیں۔ پہلے نہیں بتایا کہ میں کہیں ناشتہ نہ چھوڑ دوں۔

میر کے بعد ایک لڑکا دلی ہی میں اور ہوا جس کا نام سراج الدین احمد دادا ابا ہی نے رکھا۔ یہ گود میں تھا کہ اماں حیدر آباد چلی گئیں۔

۱۹۱۲ء میں دادا ابا کی بائیں طرف فالج گرا اور وہ دو تین ہی دن میں چل بسے۔ یہاں انہی دنوں میں میری سب سے چھوٹی بہن صفیہ پیدا ہوئی۔ اماں ابھی خاصی کچی تھیں۔ دادا ابا کے انتقال کی وجہ سے ابا دلی روانہ ہو گئے۔ خبر نہیں جاپے میں کیا بگاڑ ہوا کہ اماں ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اکیلی ہی سدھار گئیں۔ ابا کو تار دیا گیا، شاید ریل ہی میں ان کو مل گیا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، آئے تو جنازہ صحن میں رکھا ہوا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ ابا ایک ایک بچے کو گلے لگاتے اور روتے رہے۔ شام تک اماں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ اماں کی پروردہ ایک چھوکری تھی برتی۔ اماں نے اسے ملازمہ بنا کر نہیں بیٹی بنا کر پالا تھا۔ اس کی شادی بھی ابا کی پیشی کے ایک چپراسی مخدوم صاحب سے کر دی تھی۔ ہم سب بچے انہی دونوں سے پلے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے اس موقع پر کچھ ایسی جان توڑ کر خدمت کی کہ ہم اماں کے غم کو بھول گئے۔ صفیہ صرف بارہ دن کی تھی۔ اس کے لئے فوراً ایک انا تلاش کی گئی۔ انا کا دودھ اسے راس آگیا اور اس نے پالا بھی اسے اپنی بچی کی طرح۔ ابا کو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوشش کر کے حیدر آباد سے اپنا تبادلہ کرا لیا، ضلع رائچور کے اول تعلقدار مقرر ہو گئے۔

رائچور پہنچنے کے بعد ہمیں کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابا ہمیں خود بھی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر بھی ہمیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک یورپین گورنس ہم پر رکھی گئی۔ یہ ہم سے انگریزی میں بات کرتی تھی اور ہمارے کھانے، لباس، کھیل، سیر ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ کانونٹ اسکول میں صرف ہم ہی ہندوستانی بچے تھے، باقی سب لڑکے لڑکیاں یورپین تھیں۔ ایک سال کی اثنا ہی میں ہم انگریزی روانی سے بولنے لگے تھے۔

۱۹۱۶ء میں ہم ابا کے ساتھ دلی آئے تو مطبع مجتبائی میں ابا کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیجئے۔ چنانچہ ہم تینوں بھائیوں کو ایم۔ اے۔ او۔ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ظہور وارڈ کا پانچ نمبر کمرہ ہمیں دے دیا گیا۔ بڑے بھائی ساتویں میں داخل ہوئے اور منجھلے بھائی اور میں پانچویں میں۔ بشریٰ عبداللہ صاحب کے زنانہ اسکول میں داخل کر دی گئیں۔ ہماری خدمت کرنے کے لئے مخدوم صاحب کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے اور منجھلے بھائی کو یہ یکسر تبدیلی بے حد ناگوار گزری۔ سوائے انگریزی کے ہم باقی سارے مضمونوں میں پھسڈی تھے۔ لہٰذا کالج کے ایک طالب علم کو ہمیں پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ سرحد کے ایک صاحب عبدالحق تھے جو بعد میں ریلوے میں اے۔ ٹی۔ ایس ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بہت محنت کی اور ہمیں اس لائق کر دیا کہ کلاس میں چل جائیں۔ ہمارے ساتھ بورڈنگ میں بھی اور کلاس میں بھی امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ ماسٹر ناظر حسن اور ماسٹر عزیز حسن لڑکوں کو بے دردی سے مارتے تھے مگر ہم پر ان کی نظر کرم ہی رہی۔ مولانا اسلم جیراجپوری ہمیں فارسی پڑھاتے تھے اور ہمیں غیرت دلاتے رہتے تھے کہ "دیکھو تم کس دادا کے پوتے اور کس باپ کے بیٹے ہو۔ اگر تم نہیں پڑھو گے تو لوگ کیا کہیں گے"۔ ناچار پڑھنا پڑتا تھا۔

بورڈنگ میں ہر قسم کا آرام اور بہت باقاعدگی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز وقت سے پڑھنی ہوتی تھی۔ روزانہ شام کو ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا ہوتا تھا۔ مگر علی گڑھ میں جب تک رہے طبیعت اچاٹ ہی رہی۔ دو سوا دو سال یہاں پڑھنے پائے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دیا۔ اسی زمانے میں ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اٹھا لیا اور دلی کے عربک اسکول میں داخل کر دیا۔ ابا پنشن لے کر دلی آ گئے تھے اور دادا ابا کی اور اپنی کتابیں چھپوا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ابا نے دلی کے چیف کمشنر ہیلی کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی تھی۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ لکھتے تھے اور دلی کے سارے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ تین ضخیم جلدوں میں یہ تاریخ مکمل ہوئی تو ہیلی صاحب نے اس پر سرکار سے انعام دلوایا۔ خان بہادری کا خطاب بھی دینا چاہتے تھے مگر ابا نے اسے منظور نہیں کیا کیونکہ خطاب یافتہ کو گورنمنٹ کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ مولوی عبدالاحد نے خان بہادر کا خطاب واپس نہیں کیا تھا تو دلی کے مسلمانوں نے انہیں ان کے مرنے پر کسی قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا تھا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور پولیس کی نگرانی میں ان کی میت دفن کی گئی۔

عربک اسکول میں میں نے چار سال پڑھا۔ ساتویں جماعت میں ہمارے کلاس ماسٹر تھرڈ ماسٹر کہلاتے تھے۔ یہ بھی بید مرکھنے تھے۔ چالیس پچاس لڑکوں کی کلاس کو اس سرے سے اس سرے تک ادھیڑ کر رکھ دیا کرتے تھے۔ ناک چپٹی تھی اس لئے نکٹ کہلاتے تھے۔ اسکول کے لڑکے بڑے شریر ہوتے ہیں۔ ماسٹروں کے نام ایسے موزوں رکھ دیتے ہیں کہ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب فضل الدین دلی کے تقریباً کل مسلمان خاندانوں کے استاد تھے۔ اسکول میں تو لڑکوں کی نگرانی کرتے ہی تھے شہر میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک عجیب وصف ان میں یہ تھا کہ جب کسی طالب علم کو ان کا خیال آجاتا تھا کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نہ آجائیں، اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب نمودار ہو جایا کرتے تھے۔ لہٰذا لڑکوں نے ان کا نام قطب رکھ دیا تھا۔ ایک ماسٹر صاحب تھے جو اس طرح بولتے تھے جیسے ان کے منہ میں کوئی چیز بھری ہوئی ہو۔ ان کا نام آلو رکھ دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب تھے جن کی شکل اور ڈاڑھی چینیوں جیسی تھی۔ ان کا نام "فیچو" پڑ گیا تھا۔ ایک "دوزخ کے چیونٹے" تھے، اور ایک اور صاحب "اللہ میاں کی اونٹنی"۔

دسویں جماعت میں کچھ تو پڑھا کم اور کچھ اس وجہ سے کہ امتحان سے تین مہینے پہلے ابا نے میری شادی کر دی میٹرک میں فیل ہو گیا۔ اس سال ہمارے اسکول کا نتیجہ بہت برا رہا تھا۔ شاید ۴۰ لڑکوں میں سے ۲۳ پاس ہوئے تھے۔ ابا نے مجھے اور منجھلے بھائی کو عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کر دیا۔ اگلے سال ۱۹۲۳ء میں میں نے اچھے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا۔

ابا کی یہ خواہش تھی کہ ہم میں سے کوئی بھائی وکیل بنے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجینئر۔ بڑے بھائی منظور احمد نے وکالت کو پسند کیا۔ منجھلے بھائی نے انجینئری کو اور میں نے ڈاکٹری کو۔ بڑے بھائی نے بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی پاس کر لیا اور رام کشور ایڈووکیٹ کے ساتھ کارآموزی بھی کی۔ مگر ان کی زبان میں لکنت ہے اس لئے ایک کل ہند مقابلہ میں بیٹھے اور انہوں نے سب پرچوں میں بہت اچھے نمبر لئے۔ زبانی امتحان میں لکنت ہی کی وجہ سے انہیں کم نمبر ملے۔ لہٰذا منتخب نہیں ہو سکے مگر گھر بیٹھے انہی نمبروں کی بنیاد پر ان کے پاس ریلویز سے آفر آ گیا اور بعد میں ترقی کرتے کرتے ریلویز کے صدر محاسب ہو گئے اور اب کے ڈی۔ اے میں مشیر مالیات ہیں۔ منجھلے بھائی میٹرک سے بددل ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور سب انسپکٹر پولیس ہو گئے۔ جب حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو وہ

اضلاع میں ایس پی تھے۔ زوال حیدر آباد کے بعد سخت معتوب ہوئے۔ بمشکل قید ہونے سے بچے مگر ملازمت سے برخاست کیے گئے۔ ہندوستان کے ہندوستان ہی میں رہے اور دلی میں ان کی تین چار لاکھ کی جائداد کسٹوڈین نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دی۔ بنک میں ان کا چالیس پچاس ہزار روپیہ تھا وہ بھی ڈوبا۔ اذیت ناک حالات میں وہیں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چچا اشرف حسین کے دو لڑکے تھے، ایک افضل حسین اور دوسرے اجمل حسین۔ افضل حسین محکمہ زراعت میں تھے اور اجمل حسین ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر اجمل سے میری بہن بشریٰ کی شادی ہوئی تھی۔ جب میں نے ۱۹۲۳ء میں میٹرک پاس کیا تو ڈاکٹر صاحب لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے مشورے سے ابا نے مجھے لاہور کے ایف سی کالج میں داخل کر دیا۔ ابا خود مجھے لے کر لاہور گئے تھے۔ ابا ہی کے ساتھ جا کر میں نے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر محبوب عالم مرحوم اور ممتاز علی مرحوم، ایڈیٹر تہذیب نسواں کو پہلی بار دیکھا۔ ان دونوں بزرگوں سے ابا کے گہرے تعلقات تھے۔ تہذیب نسواں کے دفتر میں تاج، پطرس اور سالک کو دیکھا جن سے کوئی دس سال بعد خود میرے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ اسی دفتر میں حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

ایف سی کالج سے میں نے ایف ایس سی (میڈیکل) پاس کیا۔ ابا کا ارادہ مجھے ایڈنبرا بھیجنے کا تھا مگر دو بڑے حادثے یکے بعد دیگرے اسی زمانے میں پیش آ گئے۔ ابا کی داہنی طرف فالج کا اثر ہو گیا اور وہ اسے موت کا پیام سمجھنے لگے تھے۔ پہلے جاپے کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میری بیوی کو پلورسی ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ان کا ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ ڈاکٹر اجمل کے مشورہ سے انہیں لاہور لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاں میرا قیام تھا۔ دو ایک دن بعد ڈاکٹر صاحب چار اور ڈاکٹروں کو گھر لائے۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ پھیپھڑے کے غلاف میں سے پانی نکالا۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پیپ پڑ گئی ہے اس لئے یہ ایک اور مرض ہو گیا ہے جس کا نام ایمپائیما ہے۔ تجویز اپریشن کی ہوئی۔ گھر ہی پر اپریشن ہوا۔ داہنی جانب کی دو پسلیاں کاٹ ڈالی گئیں اور زخم کو دھو کر ٹانکے لگا دیے گئے۔ مگر زخم نہیں بھرا اس لئے ٹانکے کاٹ کر اسے کھلا زخم بنا دیا گیا۔ ربڑ کی نلکی کا بالشت بھر ٹکڑا زخم میں ڈال دیا گیا اور روزانہ اس کی ڈریسنگ ہونے لگی۔ دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ صحت بالکل گر گئی اور کوئی امید زیست کی نہ رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہہ دیا کہ انہیں دلی لے جا کر لیڈی ہارڈنگ زنانہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ مریضہ کو نئی دلی کے لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ابا نے روپے کا بالکل منہ نہیں کیا۔ بڑے اچھے کمرے میں انہیں رکھا۔ بچے پر ایک تجربہ کار دایہ رکھی۔ میں انہیں داخل کرا کے لاہور چلا آیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تو تھی ہی مگر اب محبت سے زیادہ ان پر ترس آتا تھا کہ الٰہی یہ کس عذاب میں گرفتار ہو گئیں۔ زندگی کی کوئی آس نہیں رہی تھی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب ان کی سناؤنی آتی ہے کہ اب آتی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ وہاں ایک سکھ ڈاکٹرنی نے اس توجہ سے ان کا علاج اور ڈریسنگ کی کہ وہ رو بصحت ہونے لگیں۔ جب کوئی چار پانچ مہینے بعد دلی گیا تو وہ بظاہر بالکل تندرست ہو چکی تھیں مگر پہلو کا زخم ناسور بن گیا تھا اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر گوبند کور نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ یہ مرض کیا ہے اور کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔ اب صرف یہی کیا جا سکتا تھا کہ ناسور کو ربڑ کی ٹیوب کے

ذریعے روزانہ دھویا جائے اور عام صحت کو گرنے نہ دیا جائے۔ بیوی ہسپتال ہی میں رہیں اور میں نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ابا اور بیوی کی بیماری سے طبیعت ویسے ہی اچاٹ ہو رہی تھی کہ سڑے ہوئے مُردوں پر کام کرنا پڑا۔ گوشت کھانا چھوٹ گیا۔ ہاتھوں میں دو دو دن کی بو آتی رہتی تھی۔ کام سے اور اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے کہا "مجھ سے یہ پڑھائی نہیں چلے گی۔" انہوں نے بہت ہمت بندھائی مگر میں نے ابا کو لکھ دیا کہ آپ کی خواہش کی تکمیل میں میں نے ڈاکٹری پڑھنی شروع کی مگر یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔" ابا کو اس کا افسوس ہوا مگر انہوں نے مجھے اصرار نہیں کیا۔ خط لکھوا دیا (فالج کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے) کہ نہیں پڑھ سکتے تو دلی آ جاؤ۔ میں نے کتابیں اور ہڈیوں کا ڈھانچ اونے پونے ہم جماعتوں کے ہاتھ بیچا اور گھر چلا آیا۔ ابا آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ ابا نے پیار کیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا "اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا "بی۔ اے اور ایم۔ اے کروں گا۔" بولے "اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔"

ابا تھوڑا سا چل پھر لیتے تھے۔ اس لاچاری پر بھی دوسرے تیسرے ہسپتال کا پھیرا ضرور کر لیتے تھے۔ شام کو میں ابا کے ساتھ ہسپتال گیا۔ بیوی کی صحت بہت بگڑ گئی تھی۔ گو بند کمرے ابا نے اور میں نے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا "آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ میں دوائیں لکھ دوں گی اور ڈریسنگ کا طریقہ بتا دوں گی۔" اگلے دن انہوں نے میرے سامنے ڈریسنگ کی۔ پہلو میں ایک سوراخ تھا جس میں ٹیوب پڑی ہوئی تھی۔ اس ٹیوب کو نکال کر دوسری صاف ستھری ٹیوب زخم میں ڈالی گئی اور بڑی پچکاری سے زخم کو دھو کر گاز اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ ڈریسنگ دن میں صرف ایک دفعہ کرنی تھی۔ بیوی گھر آ گئیں اور چودہ سال تک میں ان کی ڈریسنگ کرتا رہا۔ دیکھنے والوں کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کے پہلو میں ناسور ہے۔ چودہ سال میں ان کے ہاں پانچ بچے اور ہوئے مگر یہ ناسور ان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ دنیا بھر کے علاج کرتے [illegible] لیجا کر ایک پہاڑ میں رہنے والے سادھو کو بھی دکھایا۔ اس کی دوا بھی استعمال کی، کچھ نقصان ہی ہوا۔ دلی کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کو دکھایا۔ اس نے کہا "اب صرف یہی صورت ممکن ہے کہ میں ان کی ایک طرف کی پوری بارہ پسلیاں نکال دوں۔" بیوی بیچاری اس پر بھی راضی ہو گئی تھیں۔ مگر تین دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر جوشی نے بھی جواب دے دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اتنے بڑے اپریشن کے بعد بھی یقین نہیں ہے کہ ناسور نہیں رہے گا۔ پھر اس اپریشن میں جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا روزانہ کی ڈریسنگ ہی پر زندہ رہیں۔ اور ایک دن وہ دیا کی ایک دم سے بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ سارے جسم میں ناسور کا زہر پھیل گیا اور تین دن کی شدید تکلیف کے بعد رخصت ہو گئیں۔

بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو خیر میرا فرض تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا تھا اور بُرے بُرے خیالات دل میں لاتا تھا تو شاید اللہ میاں مجھے اس لئے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المرض بیوی کو سوکن کا دکھ نہیں پہنچایا۔ حالانکہ درجنوں حسین لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ میں ان سب کو بہلاتا ہی رہا اور ان سے محبت جتاتا رہا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کی۔ اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہ روی اختیار کی۔ ویسے دس سال کی عمر سے میں بلا ناغہ عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں۔ حد یہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد بعض شادی شدہ سابقہ محبوبائیں اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔ ع

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

دلی آ جانے کے بعد میں نے بی۔ اے (آنرز) انگریزی ادبیات میں کیا اور فارسی (آنرز) کے دو پرچے بھی کئے۔ ہندو کالج

اور مشن کالج دونوں کشمیری دروازے کے قریب آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں ہماری کلاسیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں مشن کالج میں ایم۔ اے فارسی، میں داخلہ لیا۔ میں اس مضمون کا اکلوتا طالب علم تھا۔ یہاں کے استادوں میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) اور دوسرے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن مرحوم۔ ڈاکٹر قریشی نے دو ایک ہی سبقوں میں اندازہ لگا لیا کہ مجھے ان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مجھ سے کہہ دیا کہ اگر آپ کوئی دشواری محسوس کریں تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔ شمس العلماء دراصل عربی کے پروفیسر تھے، وہ مروت میں مجھے پڑھاتے تھے کیونکہ دادا ابا کی سفارش پر انہیں مشن کالج میں پروفیسری ملی تھی۔ مگر انہوں نے شرط یہ لگائی کہ علی الصباح میرے گھر آجایا کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے کچھ کم ایک سال پڑھا۔ غضب کا حافظہ تھا ان کا۔ منہ لپیٹے پڑے رہتے اور وقائع نعمت خان عالی اور اخلاقِ جلالی جیسی دقیق کتابیں مجھ سے آگے آگے منہ زبانی پڑھتے جاتے۔ ترجمہ میں انگریزی میں کرتا جاتا۔ مولوی صاحب انگریزی نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے مگر مجھے ٹوک کر ایسا صحیح لفظ بتاتے کہ میرا انگریزی دانی کا سارا گھمنڈ کرکرا ہو جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک دن مولوی صاحب خبر نہیں کس موج میں تھے کہ مجھ سے اڑ گئے۔ مجھے عربی نہیں آتی تھی اس لئے اخلاقِ جلالی اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ بالکل ہی نہیں چلا تو میں رک گیا۔ مولوی صاحب کمبل اوڑھے اوڑھے بولے "رک کیوں گئے؟" میں نے کہا "عربی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہی ہو۔"

"جی تو پھر؟"

"غلط سلط پڑھوں گا تو گناہ ہوگا۔"

"جی آپ پڑھیے، گناہ ثواب مجھ پر۔"

میں نے فرّاٹے کے ساتھ اردو کی طرح عربی کو پڑھ دیا۔

مولوی صاحب بولے "سبحان اللہ، سبحان اللہ! اور جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں!"

مجھے مولوی صاحب کا یہ طعنہ بہت برا لگا۔ میں نے تنک کر کہا "یہ میرا قصور ہے کہ میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟ وہ ہوں گے عربی کے عالم فاضل۔ مجھے عربی نہیں آتی۔"

مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ مجھے ان کا کہنا ناگوار گزرا۔ ملائمت سے بولے "تو بھئی پہلے عربی پڑھ لو۔" پھر بولے "ہاں پڑھو۔"

میں منہ تھتھا کر بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے کہا "جی پڑھیے۔"

میں نے کہا "میں نہیں پڑھتا وڑھتا۔ اور میں کل سے نہیں آؤں گا۔"

مولوی صاحب اٹھ بیٹھے۔ بولے "جناب کو غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔"

اس کے بعد مولوی صاحب بہت دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔ مگر میں "سلام علیکم" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر نہ مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج گیا۔

کئی مہینے بعد مولوی صاحب لال کنوئیں کے بازار میں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنے ماموں چشتی صاحب کے ساتھ

جا رہا تھا۔ میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ چشتی صاحب نے السلام علیکم کہہ کر مولانا کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ مولانا نے کہا نہیں، پہلے ناراض استاد زادہ سے۔" یہ کہہ کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا "میاں تم تو سچ مچ ناراض ہی ہو گئے۔" اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ابا نے ہم میں سے ہر ایک کے لئے بنک میں پچاس پچاس ہزار روپیہ چھوڑا تھا۔ جائداد کا کرایہ الگ تھا جو تقسیم ہونے کے بعد فی لڑکا کوئی تین سو روپے مہینہ ہوتا تھا۔ یہ تین سو روپے اُس زمانے کے ہیں، جب بیس سیر کا آٹا، روپے سیر گھی، چار آنے سیر بکری کا گوشت، آٹھ سیر کا دودھ، ڈیڑھ سیر کی شکر اور [illegible] کے ان سے ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے۔ میری شادی پر انیس روپے تولہ سونا تھا۔ گریجویٹ کو اگر چالیس روپے کی سرکاری ملازمت مل جاتی تھی تو اسے کھاتا پیتا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو رئیس زادہ سمجھتے تھے۔ نوکری کرنے کا میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ بڑے بھائی ملازم ہو چکے تھے، منجھلے بھائی حیدر آباد جا چکے تھے۔ خیال تھا کہ دادا ابا اور ابا کی کتابیں ہی اتنی ہیں کہ اگر کتب خانہ ہی کا کام سنبھال لیا جائے تو سینکڑوں روپے مہینے کی یافت ہو سکتی ہے۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ میاں انصار ناصری جو مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں خان بہادر میرزا ناصر علی، صاحب "صلائے عام" کے پوتے ہیں اور رشتے میں میرے بھانجے ہیں، میرے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ انہیں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور مجھے بھی۔ انہوں نے ایک دن کہا کہ لاہور سے کیسے اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں۔ ہمایوں، نیرنگ خیال، عالمگیر اور ادبی دنیا۔ مگر دلی سے کوئی اچھا پرچہ نہیں نکلتا۔ یہ بات کھٹ سے میں اتر گئی اور ہم اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسالہ ہم نکالیں۔ فوراً جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو خط لکھنے بیٹھ گئے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں، اس کے لئے مضمون بھیجو۔ نام بہت سوچے۔ میاں انصار نے کہا ساغر ہے، پیمانہ ہے، صہبا ہے، مینا ہے، مگر ساقی نہیں ہے۔ میں نے کہا تو بس ساقی ہی نکالیں گے۔ ڈیکلریشن لے لیا اور کام شروع کر دیا۔ رتی بھر تجربہ نہیں تھا۔ دوسروں کے سہارے کام کیا۔ ڈھائی تین سال میں پچیس ہزار روپے کا گھاٹا ہوا۔ بڑے بھائی نے بلا کر پاس بک اور چیک بک حوالے کی اور کہا تم جانو اور تمہارا کام۔ شاید دو ڈھائی ہزار روپے بنک میں باقی رہ گئے تھے۔ پریس اور کاغذ کے واجبات ادا کرنے کے بعد کوئی پانسو روپے بچے۔ شام کو انصار اور فضل حق قریشی حسب معمول آئے تو انہوں نے مجھے خاموش اور افسردہ پایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ساقی بند کرنا پڑے گا۔ فضل حق نے کہا اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ساقی میں نقصان ہو۔ آپ حساب کتاب خود سنبھالئے۔ یہ سارا روپیہ خورد برد ہوا ہے اور واقعی اسی بچے ہوئے پانسو سے پرچہ چلتا رہا اور اسی کی لوٹ پھیر میں میں نے کتابوں کا کام شروع کیا جو پندرہ سال میں بڑھ کر تقریباً پانسو کتابوں پر پہنچا اور روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ مجھے اپنے کاروبار سے پندرہ سو سے دو ہزار تک کی ماہوار آمدنی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور یہ سارا کاروبار اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس انقلاب میں جائداد بھی گئی۔ مسلمانوں کے ایک بنک میں روپیہ تھا، وہ بھی ڈوبا اور ہم بیک بینی و دو گوش مرتے کرتے لاہور پہنچ گئے۔

دلی سے لاہور تک پہنچنے میں ہم پر کیا گزری؟ اسے میں نے تفصیل سے "دلی کی بپتا" میں لکھ دیا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ۵ ستمبر سے ۱۵ ستمبر تک ہم گھر میں مقید رہے۔ اس کے بعد ایک فوجی ٹرک میں رائفلوں کی حفاظت میں گھر سے نکل کر پرانے قلعہ میں کھلے آسمان کے نیچے جا پڑے۔ تین دن قلعہ میں رہے، جہاں اسی ہزار دلی والے اس طرح بند تھے جیسے چوہے دان میں چوہے۔ شہر میں مسلمانوں کے

محلے کے محلے صاف ہو چکے تھے۔ قرول باغ، سبزی منڈی، پہاڑ گنج میں نام کو مسلمان نہیں رہا تھا۔ فوجی گولیاں چلا رہے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ پرانا قلعہ بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں مسلمان بھرنے شروع ہوئے اور ایک لاکھ آدمی اس میں بھی سما گئے۔ بے موسم کی بارش ہو رہی تھی۔ ہیضہ پھیلا، ہزاروں اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہمارے ریلوے کے پاس بنائے گئے تو تین دن پرانے قلعہ میں رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدین کے اسٹیشن پر پہونچایا گیا۔ یہاں ایک تھرڈ کلاس گاڑی میں اوپر تلے ٹھونس دیا گیا۔ سب کی تلاشی کے بعد ریل روانہ ہوئی تو خیال یہی ہوا کہ رات کے ۹ بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے مگر شام سہارنپور ہی پر ہو گئی۔ ریل میں اندھیرا رہا۔ ریل جوں کی چال چلتی رہی۔ گرمی، بھوک اور پیاس سے بچے بلک رہے تھے۔ بڑے چڑچڑے ہو کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ مگر نیند نے سب پر غلبہ پا لیا۔ بیٹھے ہی بیٹھے کوئی اونگھ گیا اور کوئی سو گیا کہ رات کے دو بجے گاڑی ایک دم سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ خبریں آ چکی تھیں کہ گاڑیاں کٹ رہی ہیں۔ بچے دھاڑنے لگے۔ عورتیں چیخنے لگیں، مرد انہیں خاموش کرنے کے لئے ان دونوں سے زیادہ چیخنے لگے۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور ان کے آگے سامان چنا جانے لگا۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا کہ باہر جھانک کر دیکھتا۔ ویسے ہی جانوروں کے واڑے پڑے ہوئے تھے۔ حبس اور گرمی کا یہ حال ہو گیا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آنے لگا۔ باہر موت ناچ رہی تھی۔ اور ہم ہر گھڑی یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہماری باری آئی کہ اب آئی۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد گولیاں چلنی بند ہو گئیں اور گاڑی کھسکی اور کھسک کر لدھیانہ کے اسٹیشن پر پہونچی تو باہر سے آواز آئی کہ اب گاڑی صبح کو یہاں سے روانہ ہوگی جو پلیٹ فارم پر اترنا چاہے اتر سکتا ہے۔ ڈبوں میں جام ہونے والے کھڑکیوں میں سے کود کود کر اترنے لگے۔ میں بھی اترا۔ دیکھا کہ ہم سے ایک ڈبہ آگے تک چھ ڈبے بالکل خالی پڑے ہیں اور پلیٹ فارم پر کئی عورت مرد زخمی پڑے تڑپ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے آدھی ریل لوٹ لی اور مسافروں کو مار ڈالا۔ پندرہ منٹ اور انہیں لوٹنے کے مل جاتے تو ہمارا ڈبہ بھی صاف ہو جاتا۔ زندگی تھی بچ گئے۔

دس بجے کے بعد گاڑی چلی اور دو گھنٹے چل کر جنگل میں رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن میں اب دم نہیں رہا۔ دوسرا انجن آئے گا تو ریل کو لے جائے گا۔ کئی گھنٹے گاڑی کھڑی رہی۔ دوسرے انجن نے آ کر اسے امرتسر پہونچایا۔ ایک گھنٹہ یہاں بھی کھڑی رہی۔ اور سکھ بلبلائے پھرتے رہے، مگر فوجی دستے کی وجہ سے دور رہے۔ مغرب کے وقت گاڑی پاکستان میں داخل ہوئی تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد لاہور پہونچے تو کئی لاکھ مہاجر اسٹیشن پر اور باہر دور تک پڑا ہوا تھا۔ شہر میں کرفیو تھا اس لئے رات پلیٹ فارم کے ایک کونے میں گزاری۔ بیوی بچے تھک کر چور ہو گئے تھے۔ پڑ کر سو گئے۔ صبح کو تانگا کر کے مشہور ادیب ایم اسلم کے گھر پہونچے۔ وہ اطلاع پاتے ہی گھبرا کر نکل آئے اور ہمیں جو برے حال اور بابکے وسیاٹے دیکھا تو آب دیدہ ہو گئے۔ فوراً اپنا بالا خانہ کھلوایا اور ہمیں اوپر پہونچایا۔ اپنے مکان سے قریب ایک مکان مجھے الاٹ کرا دیا۔ مگر اس میں جانے نہ دیا۔ بیس بائیس دن اپنے ہاں سب کو مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر میں آ گئے۔

دس مہینے لاہور میں رہے مگر سارے عزیز کراچی چلے گئے تھے اس لئے ہم نے بھی کراچی کو ترجیح دی۔ دو سال کی بیکاری میں کل اندوختہ ختم ہو گیا چند ہمدرد دوستوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے ریڈیو پاکستان میں نگران موسیقی رکھوا دیا۔ میری دوسری بیوی میٹرک پاس تھیں۔ انہوں نے ایک اسکول میں نوکری کر لی اور شام کو ایک کالج میں پڑھنے بھی لگیں۔ انہوں نے چپ چاپ چھ سال میں ایم اے کر لیا۔ خدا کے فضل سے ایک آسودہ حال گھر کی صورت بن گئی۔

میرے خاندان میں دور دور تک موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں ہے مگر مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے میرا جیب خرچ تیس روپے مہینہ کر دیا تھا۔ میں نے دس روپے مہینہ ایک استاد کو دے کر باقاعدگی سے ہارمونیم اور راگ راگنیاں سیکھنی شروع کر دیں۔ ۲۵ سال تک میں نے اچھے استادوں سے دلی میں گلوکاری اور سازی موسیقی سیکھی۔ ۱۹۳۶ء سے ریڈیو پر گانا بھی شروع کر دیا تھا مگر ایس۔ احمد کے نام سے کیونکہ میرے خاندان والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے پھر دیں سے دنیا رکھنی مشکل ہے۔ میں نے اس فن کو حاصل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کیا۔ یوں سمجھئے کہ میرا آدھا وقت ادب میں اور آدھا تحصیل موسیقی میں گزرا۔ کلاسیکل موسیقی ایک نہایت دشوار علم اور فن ہے، جسے کما حقہٗ حاصل کرنا عطائی کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ مگر میں نے مشق و مزاولت سے اچھے استادوں کی رہنمائی میں اس فن کے عملی پہلو پر عبور حاصل کیا اور اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں سے اس کے علمی پہلو پر دسترس حاصل کی اور ایک وقت وہ آ گیا کہ اکثر پیشہ ور فن کار مجھ سے راگ راگنیوں کی صحت کرنے آنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو کے بیشتر اور پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہونے کے بعد سینکڑوں غنائیے لکھے اور چھ سال سے موسیقی کے آسان سبق ہفتہ وار نشر کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ ساختہ پرداختہ بے مثل فن ناقدری اور کس مپرسی کا شکار نہ ہو جائے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ موسیقی کہاں سے اور کیوں میرے پیچھے لگ گئی مگر میں اس معمہ کا حل نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ میں اس شوق میں پڑ کر تقریباً سبھی برائیوں سے بچا رہا۔ ادب اور موسیقی کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ ہی نہ رہا۔ سینما، تھیٹر، کلب، ریس، شطرنج، جوا، کوئی بازی، کسی کے لئے کوئی فرصت ہی نہیں ملی۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی لم سمجھ میں آئی تو یہ آئی کہ ادب ذریعہ معاش نہیں بن سکے گا، دلی میں بھی نہیں تھا، مگر جائداد، کاروبار اور سرمایہ سے محروم ہونے کے بعد موسیقی ہی کے سہارے زندگی بسر کرنا مقدر تھا اس لئے مجھے اس آنے والے دور کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور پروفیسر بننے کے بدلے ادیب اور موسیقار بنا۔ یہ مقدرات ہیں جن میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

میری ادبی خدمت کی عمر بھی چالیس سال ہے۔ ساقی کو جاری ہوتے اب پورے ۴۰ سال ہو چکے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے اچھا نہیں لگتا، اس لئے مجھ سے مت پوچھئے کہ ساقی نے اردو کو کیا دیا؟ میرے ہم عصروں سے پوچھ لیجئے یا ۴۰ سال کے فائل دیکھ لیجئے۔ ساقی ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ بیس پچیس سال پہلے ساقی فیشن میں داخل تھا۔ گھر گھر ساقی کا چرچا تھا۔ دنیائے ادب سے متعارف ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ساقی میں اپنی چیزیں شائع کرائی جائیں۔ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ساقی پر بھی ادبار چھایا۔ لاہور پہنچے تو میں نے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی تھی، مگر پریس برانچ میں چودھری محمد حسین بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے

دس مہینے چھپوایا اور ڈیکلریشن نہیں دیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جو علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر بھی اپنی اصلاح نہ کر سکے۔ بے باک اور جدت پسند ادیبوں کو گرفتار کراتا اور ان پر فحش نگاری کے مقدمے چلانا ان کا شیوہ تھا۔ منٹو اور عصمت چغتائی سے انہوں نے باپ مارے کا بیر باندھ لیا تھا۔ ان کی رپورٹ پر تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ لاہور سے جاری ہوتے۔ لاہور، بمبئی اور دلی پر پولیس چھاپہ مارتی۔ اڈیٹروں، پبلشروں اور کتب فروشوں کی بھی پولیس تلاشی لیتی اور مقدمے والوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کرتی۔ ضمانتیں لیتی اور ان پر مقدمے قائم کر کے لاہور کھینچ بلاتی۔ ایک دفعہ مجھ پر بھی ان کی نظر کرم ہوئی۔ منٹو کی کتاب "دھواں" اور عصمت کی کتاب "چوٹیں" میں نے شائع کی تھی۔ مجھے پیشگی اطلاع مل گئی تھی کہ پنجاب کی سی آئی ڈی چھاپہ مارنے والی ہے۔ میں نے یہ کتابیں اپنے کتب خانے سے ہٹوا دیں۔ ایک دن ایک سب انسپکٹر صاحب دلی پولیس کے چند سپاہی ساتھ لیے آ دھمکے۔ مجھے وارنٹ دکھایا اور کہا "میں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔" میں نے کہا "تو پھر؟" بولے "پانچ ہزار کی شخصی ضمانت دیجئے۔" میرے پاس میرے رشتے کے بھائی علامہ منتخب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ضمانت کا کاغذ لکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے دفتر کی تلاشی لی۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ بے نیل مرام چلے گئے۔ ان کے دو مہینے بعد ایک دن جو میں اپنے دفتر آیا تو دیکھا کہ ایک سردار جی تلاشی لے رہے ہیں اور دو باوردی پولیس والے چوکیداری کر رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ سردار جی تلاشی لینے کے بعد خالی ہاتھ میرے پاس آئے۔ بولے "آپ ہی شاہد احمد ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں۔" پوچھا "دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں؟" میں نے کہا "جلوا دیں۔" بہت متعجب ہو کر بولے "جلوا دی ہیں؟" "جی ہاں۔" "کیوں؟" "کیونکہ آپ آنے والے تھے۔" "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟" "اپنی سی آئی ڈی سے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر ڈھیلے پڑ گئے۔ "بھئی ہمیں تو ایک ایک کتاب پڑھنے کے لئے دے دیجئے۔" "کتابیں دینے والے شکار پور میں رہتے ہیں۔" پھر بڑے زور سے ہنسے اور بالکل ہی کھل گئے۔ "آپ تو بڑے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی ایک سب انسپکٹر آپ کی تلاشی لے کر خالی ہاتھ چلا گیا۔ مجھے کچھ تو دیجئے۔" میں نے کہا "میں آپ کو صرف بیان دے سکتا ہوں۔" بچارا بہت زچ ہوا۔ ضمانت اور بیان لے کر چلا گیا۔ دو مہینے کے بعد ہم سب کے نام لاہور کی عدالت سے سمن آ گئے۔ میں، میرا منشی اور کاتب سب ملزم ٹھہرائے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کے مالک اور چند کتب فروش بھی پھانس لئے گئے ہیں۔ دس بارہ ملزموں کی پوری برات تاریخ پر لاہور پہنچی۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی۔ اسی طرح ہم سب کو کئی پھیرے کرائے گئے۔ ایک پیشی پر منٹو اور عصمت بھی بمبئی سے آ گئے۔ کافی فیس دے کر ہم سب نے ایک ہندو ایڈووکیٹ کو اپنا وکیل بنایا۔ بیان ہوئے، جرح ہوئی۔ سارے ادیب تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے۔ پولیس نے دو گمنام اخبار نویسوں کو گواہی میں پیش کیا تو وہ بچارے ٹھیک سے اردو بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وکیل نے انہیں ایک مضحکہ بنا دیا۔ رائے بہادر صاحب جو کرسی عدالت پر بیٹھے تھے مسکراتے رہے مگر انہیں حکومت نے ہدایت کر دی تھی کہ سب پر جرمانہ ضرور کیا جائے۔ چنانچہ منٹو اور عصمت پر دو دو سو جرمانہ اور باقی سب پر بیس بیس روپے جرمانہ ہوا۔ میں نے سات سو روپے وکیل کو دے کر ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جج انگریز تھا۔ اس کے سامنے کالی شلوار، دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلہ لکھا کہ ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں ہے۔ میں نے ان کتابوں کے نئے اڈیشن فوراً چھاپ دیئے۔ وکیل نے کہا "آپ سب کے جرمانے واپس ہو سکتے ہیں۔ میں درخواست دے دوں؟" میں نے کہا "آپ جرمانے واپس لے لیجئے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔" تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ میرا ان پیشیوں میں ضائع ہوا مگر میں خوش تھا کہ چودھری صاحب کو منہ کی کھانی پڑی۔ منٹو پر انہوں نے اور بھی کئی

مقدمے چلائے گئے۔ شاید ایک ہی جرمانہ قائم رہا۔ باقی سارے مقدمے اپیلوں میں خارج ہو گئے۔ دلّی میں ترقی پسند اور جدت پسند ادیبوں کا مرکز مجھے سمجھا جاتا تھا۔ جب سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک شروع کی تو ان کی خواہش کے مطابق میں نے ہی ترقی پسند مصنفین کی پہلی انجمن قائم کی تھی اور میں ہی اس کا سیکرٹری تھا۔ رسالہ شاہجہان کو میں نے اس انجمن کا آرگن بنا دیا تھا۔ جب اس کے مقاصد نے غلط رُخ اختیار کیا تو میں نے اس انجمن کو ختم کر دیا اور "بزم تہذیب و ادب" اس کے بدلے قائم کر دی جس میں پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے جلیل القدر حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔

اس بزم میں ڈراما اور اسٹیج کو بھی فروغ دیا۔ ہم نے چھ ڈرامے اسٹیج کئے اور کچھ رقم عربک کالج بلڈنگ فنڈ میں دی۔ میں نے بھی ان میں سے بعض ڈراموں میں ایکٹنگ کی تھی۔ کریپ کی ڈاڑھی مونچھیں چپکانے سے میرا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ آٹھ دن تک گھر میں مُنہ چھپائے پڑا رہا تھا۔ اس کے بعد کے ڈراموں میں بنی بنائی ڈاڑھی پہن کر پارٹ کرتا تھا۔ فضل حق قریشی ڈراموں کی روح رواں ہوتے تھے۔ مردانہ رول بھی ادا کرتے تھے اور زنانہ بھی۔ ان کے علاوہ حیات غازی، موسیو اقبال اور ماسٹر مختار حسین تھے۔ یہ تینوں حضرات بعد میں جماعت اسلامی میں شریک ہو کر تمام "خرافاتوں" سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکرٹری، یا مجلس عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب تو ان کی تعداد اور نام بھی یاد نہیں رہے۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ راڈیو تو [illegible] بھی دیں۔ شاہد احمد دہلوی کو شان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو ادب اور موسیقی کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ خرابی صحت اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود جو بھی خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا رہتا ہوں اور انشاء اللہ کرتا رہوں گا۔

۱۹۵۸ء کے اواخر میں جمیل الدین عالی کو ایک کل پاکستان جماعت ادیبوں کی بنانے کا خیال آیا تو انہوں نے چند مقامی مصنفین کو اپنے گھر بلایا۔ اس پہلے اجتماع میں صرف آٹھ ادیب شریک ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، غلام عباس، احمد عباسی، میں اور دو ایک اور۔ اس جماعت کے مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد اس کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ (ادارۂ مصنفین پاکستان) تجویز ہوا۔ مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا کیونکہ مجھے ادب میں نو پارٹی مین سمجھا جاتا ہے۔ میں نے پہلا کنونشن بلایا اور کوئی پانسو دعوت نامے جاری کئے۔ یہ دعوت نامے ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے سبھی شریک ہو گئے اور کراچی میں دو دن تک اس کی مختلف نشستیں ہوئیں۔ گرما گرم بحثیں ہوئیں، دستور بنا۔ گلڈ کی شاخیں کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں قائم ہوئیں۔ مشرقی پاکستان سے تقریباً ۲۵ ادیب اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ الیکشنوں میں بڑا ہنگامہ رہا۔ یہ بھی طے ہوا کہ مرکز کراچی میں رہے گا۔ مجھے مرکز کا ایک رکن چنا گیا۔ دو نشستوں کی صدارت پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی۔ آخری نشست میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ جلسے سے نہایت پُرمغز خطاب بھی کیا۔ گلڈ نے ہر زبان اور ہر خیال کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہی گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حکومت نے ایک لاکھ روپے سال کی امداد گلڈ کے لئے منظور کی۔ اور یہ امداد غیر مشروط ہے۔ پانچ سال میں گلڈ کی متعدد ذیلی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور ادیبوں کی بہبود کے لئے گلڈ سرگرم عمل ہے۔ چار سال مرکزی گلڈ کی رکنیت کے بعد مجھے کراچی علاقائی گلڈ کا سکرٹری چنا گیا۔ ریجنل گلڈ کا سکرٹری مرکزی مجلس عاملہ کا رکن بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب میرے سپرد گلڈ کی دو خدمتیں ہیں۔ جمیل الدین عالی گلڈ کے روح رواں ہیں۔ انہی کی

کوششوں سے پچیس پچیس ہزار سالانہ کے آدم جی اور داؤد انعامات سال کی بہترین تصانیف پر ادیبوں اور شاعروں کو دینے کے لئے گلڈ کو حاصل ہوئے۔ سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ آج کل ہالینڈ میں پاکستانی سفیر ہیں۔ گو ہماری آنکھوں سے دور ہیں مگر ہمارے دلوں سے قریب ہیں۔

ایک قابل ذکر انجمن جس کی بنیاد مولانا رزاق الخیری، اڈیٹر عصمت اور میں نے مل کر رکھی۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان ہے۔ ادبی رسائل کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے اس لئے ان کے مسائل اخباروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اخباروں کی ایک سے زیادہ انجمنیں ہیں مگر ادبی رسائل کی کوئی انجمن نہیں تھی۔ اس کی ضرورت کو محسوس کر کے مولانا خیری نے مجھے یاد فرمایا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ ہم نے کراچی کے تمام ادبی اور غیر فلمی رسائل کے اڈیٹروں کو عصمت کے دفتر میں آنے کی دعوت دی اور مولانا نے اس انجمن کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کئے۔ اتفاق رائے سے انجمن قائم ہو گئی اور وقتی طور پر مولانا خیری کو انجمن کا صدر اور مجھے سکریٹری چنا گیا۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی بنا دی گئی اور ممبر سازی کی مہم شروع ہو گئی۔ ہم نے اس انجمن میں پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو شریک کر لیا۔ انگریزی، اردو، بنگالی، پنجابی، پشتو، عربی، سندھی اور گجراتی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کو انجمن کا ممبر بنا لیا۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو تھی۔ اس کا پہلا سالانہ جلسہ لاہور میں کیا گیا۔ ملک فیروز خان نون اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ انہوں نے نہ صرف افتتاحی جلسے میں شرکت فرما کر حاضرین سے خطاب کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر اس انجمن کو غیر نفع ساز انجمن رجسٹر کرا لیا جائے تو پانچ ہزار کا عطیہ بھی دیں گے۔ انجمن رجسٹرڈ ہو گئی اور عطیہ بھی مل گیا۔ انجمن نے اپنی بساط بھر رسائل کی خدمت کی۔ مثلاً جس زمانے میں کاغذ کا کال پڑا تو انجمن نے رسالوں کا کوٹہ حکومت سے مقرر کرایا بلکہ لاہور کے دو ایک رسالوں کو یہاں سے کاغذ بھی بھجوایا۔ سرکاری اشتہارات رسالوں کو نہیں ملتے تھے۔ محکمے کے سکریٹری سید ہاشم رضا صاحب نے اس قدغن کو دور کرایا اور کئی رسالوں کو سرکاری اشتہارات ملنے لگے۔ کمپنیوں اور کارخانوں میں انجمن کے وفد گئے اور جو لوگ ان کے کرتا دھرتا تھے انہیں باور کرایا کہ رسائل میں اشتہار دینا بھی ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کے جتنے بھی سکریٹری اور وزیر آئے سب سے مل کر ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت انہیں بتائی اور انہیں رسالوں کی مشکلات کی طرف متوجہ کیا۔ مگر جب وہ انجمن کے لئے کچھ کرنے کو ہوئے تو ان کی وزارت ختم ہو گئی یا حکومت ہی بدل گئی۔ پچھلا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں اس وقت کے سکریٹری اطلاعات و نشریات سید ہاشم رضا صاحب نے اپنے خطاب میں بڑے کام کی باتیں کہیں اور اپنے محکمے سے انجمن کے اخراجات کے لئے روپیہ بھی دیا۔ لاہور میں جب بھی انجمن کا جلسہ ہوا انجمن کے سرگرم رکن محمد طفیل صاحب، مدیر نقوش نے سارے انتظامات کئے اور بیشتر اخراجات بھی اپنے ذمے لئے۔ اس انجمن سے جہاں اور کئی فائدے ہوئے یہ فائدہ بھی ہوا کہ تمام زبانوں کے ادبی کام کرنے والے مدیر ایک دوسرے سے قریب آ گئے اور ان کے بہت سے باہمی اختلافات دور ہو گئے۔ مگر حکومت کی نظر میں جو درجہ ادبی رسائل کو حاصل ہونا چاہئے وہ ابھی تک پوری طرح حاصل نہیں ہوا ہے اور اس کیلئے انجمن جد و جہد کر رہی ہے۔

[illegible] کی گرمیوں میں ایک دن اے۔ ایم۔ خان چیف کمشنر کراچی نے مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا

کہ سیٹو نے چند ایسے لوگوں کے نام پاکستان سے مانگے ہیں جو پاکستانی ثقافت سے سیٹو کے ممبر ملکوں کو روشناس کرا سکتے ہیں۔ میں چند نام کراچی سے بھیج رہا ہوں، ان میں آپ کا بھی نام شامل ہے۔ آپ مختصراً اپنے کام کا تعارف انگریزی میں لکھ کر مجھے جلدی بھیج دیجئے۔ سیٹو اور سنٹو کے نام تو سنے تھے مگر مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں ہیں اور ان کا کام کیا ہے۔ خاں صاحب سے میں نے زیادہ بات نہیں کی مبادا میری لاعلمی ان پر ظاہر ہو جائے۔ گھر آ کر اپنے "کارنامے" لکھ کر انہیں بھیج دیئے۔ کئی مہینے گزر گئے، کسی قسم کی اطلاع نہ ملی۔ سوچا کہ اور بہیتوں تجویزوں کی طرح یہ تجویز بھی سرد خانہ میں ڈال دی گئی ہوگی۔ میں اسے بھول بھی گیا کہ اچانک مجھے سیٹو کے سکریٹری جنرل پوٹے سیراسن کا تار اور اس کے بعد چٹھی ملی کہ سیٹو نے تھائی لینڈ اور فلپینز میں پاکستان پر لیکچر دینے کے لئے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ بتائیے کہ جلد از جلد کب روانہ ہو سکتے ہیں اور اپنے لیکچروں کی تفصیل لکھئے۔ میں اس اطلاع سے ایسا بوکھلایا کہ گھنٹوں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، سوچا کہ میاں جھگڑوں میں پڑ رہے ہو۔ انکار کر دو کہ میں نہیں آ سکتا۔ مگر جب اس کا ذکر چند مخلص احباب سے کیا تو انہوں نے تاکید کی کہ اس پیش کش کو فوراً قبول کرو۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ ملے گا اور ۲۰ ڈالر روزانہ۔ اچھا اس کو بھی چھوڑو، دیکھو کہ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ پورے پاکستان میں سے اس اہم اور ذمہ داری کے کام کے لئے تمہیں چھانٹا گیا ہے۔

میں نے سیٹو کی پیش کش کو قبول کرنے کی اطلاع سکریٹری جنرل کو دے دی اور دس بارہ لیکچروں کے موضوعات بھی انہیں لکھ دیئے اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صمد شاہین ریسرچ آفیسر ہیں، انہیں ایک مفصل خط لکھ کر دریافت کیا کہ معلوم کر کے لکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے، اور اگر میں بنکاک آؤں تو کس ہوٹل میں ٹھہروں۔ دونوں خطوں کے جواب ایک ساتھ آئے۔ سیٹو کے دفتر نے لکھا کہ آپ کے موضوعات بہت پسند آئے۔ آپ کو اکیس دن تھائی لینڈ میں اور اکیس دن فلپینز میں رہنا ہوگا۔ تفصیلی پروگرام یہاں پہنچنے پر بنایا جائے گا۔ جلد از جلد آئیے۔ فروری سے اس علاقے میں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے سارے کام سمیٹنے تھے، سارے لیکچر لکھنے تھے۔ موسیقی کے ریکارڈ بنا کر ساتھ لے جانے تھے۔ اور کپڑے بھی بنوانے تھے۔ صمد شاہین صاحب نے لکھا تھا کہ آپ کے لئے سریانون ہوٹل میں کمرہ روک لیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے۔ جلد آنے کی کوشش کیجئے۔

میں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر وسط فروری میں روانہ ہو گیا۔ مجھے کے۔ ایل۔ ایم سے روانہ ہونا تھا اور اسی کی اطلاع میں نے سیٹو اور صمد صاحب کو دی تھی مگر ایرپورٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج کے ایل۔ ایم بارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ ایک گھنٹہ بعد ایر فرانس جانے والا تھا۔ میں اس سے روانہ ہو گیا۔ صبح کے اندھیرے میں بنکاک پہونچا تو ایک کسٹم آفیسر نے بتایا کہ آپ کو لینے سیٹو کے دو افسر آئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ کے۔ ایل۔ ایم نہیں آیا تو واپس چلے گئے۔ میرا سامان نہیں دیکھا گیا کیونکہ مجھے V.I.P قرار دیا گیا تھا۔ کسی نے مجھے ایر فرانس کی شہر جانے والی بس میں بٹھا دیا اور اس نے مجھے سریانون ہوٹل پہونچا دیا۔ بڑا ہوٹل تھا اور کمرے کا کرایہ ۵۰ روپے روزانہ تھا، کھانے کے علاوہ۔ ناشتے کے بعد میں سیٹو کے دفتر گیا۔ ڈاکٹر صمد شاہین کو اطلاع کرائی۔ وہ فوراً آ کر گلے ملے۔ "آپ کس طرح سے آ گئے؟ میں اور یہاں کا کلچرل آفیسر آپ کو لینے گئے تھے۔" میں نے انہیں تبدیلی کی وجہ بتائی، بہت سی باتیں ہوئیں، کافی پی۔ اس کے بعد وہ مجھے شعبہ ثقافت میں لے گئے۔ اور وہاں کے کارکنوں نے

مجھے سکرٹری جنرل اور سفیر پاکستان مسٹر برک سے ملوایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ برک صاحب بولے آپ کا انتخاب سیٹو کے آٹھ ممبر ملکوں کے سفیروں اور سکرٹری جنرل نے بہ اتفاق رائے کیا ہے۔ میں نے کہا "آپ کا شکریہ"۔ بولے "جی نہیں۔ آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا ہے"۔ روداد طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ تھائی لینڈ میں میں نے بارہ لیکچر دیئے۔ ایک ڈھائی گھنٹے کا لیکچر پاکستان کی موسیقی پر مع نمونوں کے دیا۔ بعض باتیں خود گا کر بھی بتائیں۔ اس لیکچر میں دوسرے ملکوں کے سفیر بھی شریک ہوئے تھے اور دو سو کے قریب چیدہ چیدہ صاحب ذوق بلائے گئے تھے۔ ہندوستانی سفارت خانے کا اسٹاف بھی تھا۔ لیکچر کے ختم ہونے پر سوال جواب بھی ہوئے۔ جلسہ برخاست ہونے پر سب سے پہلے برک صاحب نے آکر ہاتھ ملایا اور اتنی تعریف کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ بنگ کاک کے علاوہ مجھے بعض نزدیک اور چھوٹے شہروں میں بھی بھیجا گیا۔ صوبوں کے گورنروں نے استقبال کیا۔ تھائی لینڈ کے لوگ بالکل مشرقی مزاج کے ہیں۔ ان کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ لاکھوں بدھ کی مورتیاں ان کی عبادت گاہوں میں ہیں اور ان پر اتنا سونا چڑھا ہوا ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تھائی لینڈ میں سب اپنی ترقی یافتہ زبان تھائی بولتے ہیں۔ ذریعہ تعلیم بھی تھائی ہے۔ بہت کم لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ لیکچر کے بعد اکثر مقامی لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ نے لندن یا آکسفورڈ میں پڑھا ہے؟ میں کہتا نہیں، اپنے ہی ملک میں پڑھا ہے اور ہمارے ملک میں ہر شخص کم از کم تین زبانیں جانتا ہے۔ ایک انفارمیشن آفیسر اور ایک کار میرے لئے ہر وقت موجود رہتی۔ مجھ سے سب خوش ہوئے اور میں سب سے خوش ہوا۔"

صمد شاہین اور ان کی بیگم ممتاز شیریں نے مجھے یہ بھلا دیا کہ میں ایک اجنبی دیس میں ہوں۔ انہوں نے کہا آپ رہیے ہوٹل میں تاکہ آپ کو زیادہ آرام رہے مگر کھانا آپ ہمارے ساتھ کھایئے۔ میں نے تکلف برتا تو انہوں نے بتایا کہ ہوٹلوں میں کھانا سور کی چربی میں پکتا ہے۔ لہٰذا شکریے کے ساتھ میں ۲۱ دن تک انہی کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ خالی وقت بھی انہی دونوں کے ساتھ گزرا۔ ان کا یہ احسان ایسا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ رخصت کرنے بھی دونوں میاں بیوی ائرپورٹ تک رات کے چار بجے آئے۔

منیلا پہونچا تو پاکستان کے سفارت خانے کے فرسٹ سکرٹری مسٹر حسین اور سیٹو کے ایک افسر نے پذیرائی کی اور مجھے منیلا ہوٹل میں پہونچا دیا۔ ایراوان کی طرح یہ بھی ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا مگر کمرہ کوئی ۵۵ روپے روز کا تھا۔

شام کی چائے پر محکمہ تعلیمات کی ایک خاتون افسر ہمارے فرسٹ سکرٹری کے ساتھ آگئیں اور میرے لیکچروں کا پروگرام مجھے بتا گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مغرب کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کاؤنٹر والے نے اطلاع دی کہ سفیر پاکستان آپ سے ملنے آئے ہیں۔ رات کی دعوت کا بلاوا حسین صاحب ان کی طرف سے مجھے پہلے دے چکے تھے۔ میں کپڑے پہن کر نیچے اترا تو دیکھا کہ پیر علی محمد راشدی صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی بھی تھے۔ اصل میں میری ملاقات انہی سے تھی اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع بھی انہی کو دی تھی۔ وہ بھی لپٹ گئے۔ دونوں کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آیا۔ ہسپانوی وضع کی شاندار کوٹھی تھی۔ مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں پہونچے تو راشدی صاحب

کی بیگم بھی آ گئیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انگریزی بہت اچھی بولتی ہیں۔ ادب اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتی ہیں۔ کھانے کے کمرے میں مشرقی پاکستان کے مشہور ادیبوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ بیگم راشدی نے ان میں سے کئی کو پوچھا چند فنکاروں کا تذکرہ بھی ہوا کہ اچانک بیگم راشدی صاحب نے پوچھا شاہد صاحب کہاں ٹھہرے ہیں؟ اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں "یہیں کیوں نہیں آ جاتے۔ یہ برابر والا کمرہ خالی ہے۔ آپ کھانے کے بعد جا کر انہیں یہیں لے آئیے۔ ہوٹلوں کا کھانا یہاں ٹھیک نہیں ہوتا۔" راشدی صاحب نے کہا "ہاں یہیں آ جائیں تو ٹھیک ہوگا۔" پھر انہوں نے بتایا کہ یہاں بھی سور کی چربی ہی چلتی ہے۔ بیگم نے کہا "آن کے ہوٹل جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کار بھیج کر سامان منگوا لیجئے۔" میں نے کہا "میرا سامان کمرے میں پھیلا ہوا ہے۔ صبح مجھے بلوا لیجئے۔" غرض اگلے دن میں راشدی صاحب کی کوٹھی میں آ گیا۔ بیگم اور دونوں بھائیوں نے مجھے پھول پان کی طرح رکھا۔ یہاں کی یونیورسٹی اور میوزک یونیورسٹی میں میرے لیکچر ہوئے اور چند چھوٹے شہروں میں بھی۔ ۲۲ دن عزت و آرام سے فلپائنز میں گزارے۔ اس ملک کی کوئی اپنی تہذیب مجھے دکھائی نہیں دی۔ امریکی تہذیب یہاں والوں نے اختیار کر لی ہے اور انگریزی بولتے ہیں۔ مذہباً عیسائی ہیں۔ اب انہیں اپنی مادری زبان تگالو کو ترقی دینے کا احساس ہوا ہے۔ ایک بہت دولت مند لوگوں کے ادارے نے مجھے لنچ دیا۔ اس کے صدر نے انگریزی میں کہا "میں اپنی زبان تگالو میں تقریر کروں گا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ معزز مہمان کس زبان میں بولیں گے۔" پھر خدا جانے انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں کیا کہا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ میں نے جوابی تقریر کرنے سے پہلے انگریزی میں کہا "مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو اپنی زبان اتنی پیاری ہے کہ اس کے آگے آپ اپنے مہمان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مجھے بھی اپنی زبان ساری دنیا کی زبانوں سے پیاری ہے۔ اس لئے میں اردو میں بولوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پاکستان کے متعلق اردو میں پانچ سات منٹ کی تقریر کی۔ سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور کھانا شروع ہو گیا۔

میں ۲۲ دن فلپائنز میں رہا اس کے بعد اپنے خرچ سے جاپان چلا گیا۔ ۲۵ سال پہلے میں نے پروفیسر برلاس کی مدد سے ساقی کا جاپان نمبر شائع کیا تھا۔ پروفیسر برلاس میرے رشتے کے بھائی تھے اور ان کی بیگم بھی ننھیال کے رشتے سے میری بہن ہوتی تھیں۔ پروفیسر برلاس ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ۱۰ سال جاپان میں اردو پڑھائی تھی۔ جاپان نمبر کے شائع کرنے کے بعد ہی سے مجھے جاپان دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ جاپان میں میں سولہ سترہ دن رہا۔ برلاس صاحب کے زمانے کا جاپان اب کہاں! جنگ کے بعد امریکی تسلط نے جاپان کی قدیم ثقافت کو بہت کچھ ختم کر دیا۔ ٹوکیو ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ میں نے عید الضحیٰ کی نماز ٹوکیو کی ترکی مسجد میں پڑھی۔ سو سوا سو مسلمان موجود تھے۔ پاکستانی سفارت خانے نے عید کی دعوت میں مجھے بھی بلایا تھا۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ میرے دوران قیام ہی میں ولی عہد کی شادی ہوئی۔ اور اتفاق سے اپریل کا پہلا اور دوسرا ہفتہ ہی موسم اور پھولوں کے لحاظ سے ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے سیاح جاپان آتے ہیں۔ چیری بلاسمز کی بہار اسی موسم میں دیکھی جاتی ہے۔ جاپان کے لوگوں کو دیکھ کر قائل ہونا پڑا کہ یہ قوم کبھی نہیں مر سکتی۔

جاپان سے واپسی میں میں چار دن ہانگ کانگ ٹھہرا۔ یہ فری پورٹ ہے اور یہاں دوسرے ملکوں کی درآمد کی ہوئی چیزیں تقریباً آدھی پونی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جاپان کے پاکستانی سفارت خانے میں دو ایک حضرات ایسے مل گئے تھے جو غائبانہ مجھے جانتے

تھے۔ انھوں نے بڑی خاطر تواضع بھی کی تھی۔ ان سے میں نے ہانگ کانگ میں پاکستان ٹریڈ کمیشن کے ایک کارکن کے نام تعارفی چٹھی لے لی تھی۔ میں ہانگ کانگ میں اس دفتر کو تلاش کرتا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اردو سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک بڑے میاں پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے کہا "پاکستان ٹریڈ کمیشن کا دفتر دیکھ رہا ہوں۔" بولے "وہ دیکھو وہ اونچی سی بلڈنگ جو دکھائی دے رہی ہے۔ بس وہی ہے۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا "کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟" بولے "ہاں، کئی سال سے۔"

دفتر میں اختر صاحب سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ بولے "پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ آئیے۔" گھر سے ان کا کھانا آیا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک صاحب کو ٹیلیفون کیا اور زبردستی مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک صاحب آ گئے۔ اختر صاحب نے ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ صاحب اپنے والد کے ساتھ کئی سال پہلے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ ان کا کام یہی ہے کہ آنے جانے والوں کو ان کی پسند کا سامان دلواتے ہیں۔ چلیے ان کے ساتھ چل کر آپ کا سامان بازار میں دیکھ لیتے ہیں۔ دو دن ہم نے کئی دکانوں میں سامان دیکھا۔ تیسرے دن ان صاحب نے رات کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ دن کو میرا سارا سامان مجھے خریدوا دیا۔ رات کو اختر صاحب کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ انھوں نے اپنے والد سے ملایا۔ کبھی ہندوستان میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر یہاں آ کر بس گئے اور یہیں شادی بھی کر لی۔ کمیشن ایجنٹ کا کام شروع کیا۔ اللہ نے برکت دی۔ لڑکے نے کام کو فروغ دیا اور سارا کام خود سنبھال لیا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس میں میرا سارا سامان آیا رکھا ہوا تھا۔ بولے "یہ سامان ایک مہینے کے اندر آپ کو کراچی میں مل جائے گا۔" چار بجے رات کو موسلا دھار بارش میں یہ صاحب میرے ہوٹل میں آئے اور مجھے ہوائی جہاز پر سوار کرا کے رخصت ہوئے۔ مجھے گھر سے نکلے دو مہینے ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر پہنچوں۔ مگر سخت بارش اور کہر تھی اس لئے جہاز چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوا۔ میں فرسٹ کلاس پسنجر تھا۔ حسب معمول اعلیٰ درجے کی شرابیں پیش کی گئیں۔ میں نے کہا "میں مسلمان ہوں، شراب نہیں پیتا اور نہ سور کا گوشت کھاتا ہوں۔" ایئر ہوسٹس نے حیرانی سے دیکھا۔ بولی "تو آپ کے لئے کافی لاتی ہوں۔" پھر مجھے سگریٹ پیتے دیکھا تو کریون اے کی بہت ساری ڈبیاں دے گئی۔ کھانے کے وقت آ کر کہا "فور پورک؟" میں نے کہا "نو۔" بولی "بیف اینڈ فش؟" میں نے کہا "یس۔" غرض یہ کہ اس نے چھوٹی موٹی چیزوں کی بھرمار کر دی۔ دوپہر کو بنگ کاک پر جہاز ٹھہرا۔ صوفی شاہین اور ممتاز شیریں کی پرتپاک مہمان نوازی یاد آ گئی۔ شام کو کلکتہ اترا اور رات کے ایک بجے کراچی۔ میں ہی ایک اترنے والا مسافر تھا۔ کسٹم والے بڑی شرافت سے پیش آئے۔ میرے ساتھ بہت سامان تھا مگر انھوں نے دیکھ بھال کر چھوڑ دیا کیونکہ کوئی چیز خلاف قاعدہ نہیں تھی اور پاکستانی اجازت نامہ کے مطابق سامان تھا۔ باہر نکلا بیوی، بچے اور عزیزوں اور دوستوں کا ہجوم تھا۔ چھ کاروں میں سب بھر کر آئے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بامراد و شاد کام اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ مجھے اس کی خوشی زیادہ تھی کہ میں نے اپنے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ مشرق کے ملکوں میں پاکستان کو لوگ جانتے ہی نہیں۔ میری شیروانی اور ٹوپی کو دیکھ کر لوگ پوچھتے تھے۔ "(ARE YOU FROM INDIA?)" اور میں کہتا تھا "(NO, FROM PAKISTAN)" تو وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ کون سا ملک ہے؟

پاکستان واپس آنے کے بعد پھر وہی روزانہ کنواں کھودنا اور پانی پینا۔ ایک مہینے بعد ڈھاکہ میں یوم امیر خسرو منایا گیا۔ مجھے ایماء

بلایا گیا، شاعروں کو فیس بھی مل جاتی ہے، صدر کو کوڑی بھی کوئی نہیں دیتا۔ مگر اردو، موسیقی اور خسرو کا معاملہ تھا اس لئے ڈھاکا گیا۔ امیر خسرو کی موسیقانہ اختراعات پر خطبۂ صدارت دیا اور ان کے وضع کردہ موسیقی کے اسلوبوں کا عملاً پیش کیا۔ کئی مقامی محفلیں ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک اجتماع ہوا اور کچھ بولنا پڑا۔ اردو کے سرگرم کارکنوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے پرانے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کھانے پر بھی بلایا اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ شرکت و صدارت کے سلسلے میں حیدرآباد، سکھر، خیرپور، نواب شاہ، ملتان، لاہور، پنڈی کے چکر کاٹے اور ادبی ہنگامے رہے۔

۱۴ اگست ۱۹۶۲ء کو اخباروں میں اعلان ہوا کہ اس سال عطیۂ صدر افتخارِ ادب مجھے دیا گیا اور اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنا بڑا اعزاز بھی ملا اور بروقت مالی امداد بھی ہوئی۔ مجھے بچی کی شادی کر کے ۲۰ ستمبر کو اسے کینیڈا روانہ کر دینا تھا اور یہاں روپے پیسے کے باب میں خیریت ہی تھی۔ سخت پریشان ہو کر اپنے ہم زلف کی ضمانت پر نیشنل بینک جا کر ممتاز حسن صاحب کی سفارش سے ایک ہی دن میں قرض حاصل کیا تھا جسے ادا کرنے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں تھی کہ غیب سے انعام کا انتظام ہوا۔ جو اخراجات پہلے ہو چکے تھے اُن کے علاوہ فی الوقت اتنی ہی رقم خرچ ہوئی تھی۔ چھ سو شریک ہونے والوں کی مہمانداری کی گئی تھی۔ بھرم بندھا رہا اور اللہ نے عزت رکھ لی۔ رقم ملتے ہی بنک کا قرضہ ادا کر دیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا بھروسا تو خدا پر ہے۔ وہی ساری مشکلیں حل کر دیتا ہے۔

میری عمر اس وقت ۵۷½ سال کی ہے۔ بہت گئی تھوڑی رہی۔ اللہ باقی بھی ساتھ خیر کے گزار دے۔ سر چھپانے کو جگہ موجود ہے۔ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا مل جاتا ہے۔ اُجلے پوشی سے گزر ہو جاتی ہے۔ مادی دولت نہیں ہے تو کیا غم، سکونِ قلب کی دولت سے تو مالا مال ہوں۔ بس یہ آرزو رہ گئی ہے کہ میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے سے ہو جائیں اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو جاؤں۔ بس پھر میں اطمینان سے مر سکوں گا۔

جوش ملسیانی

ملسیاں ضلع جالندھر مقامِ ولادت ہے اور فروری ۱۸۸۴ء سالِ ولادت۔ عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال نہایت تنگ حالی اور عسرتِ افلاس میں بسر ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں یتیم ہو جانے پر یہ مصیبت اور بھی سوہانِ روح ہو گئی۔ تہی دستی اور ناداری کی وجہ سے اسکول میں فیس معاف رہی۔ اس لئے مڈل تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ شاعری کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ آسان آسان بحروں میں کچھ کہنا شروع کیا، مگر ماحول اتنا غیر ادبی تھا کہ بقول پنڈت ہری چند اختر اس علاقہ کی زمین کو کھود جائیے، تو کسی ادیب یا شاعر کی ہڈی تک برآمد نہ ہو سکے۔ ان مخالف حالات میں رہنمائی کون کرے۔ وہ تو کہئے کہ یہ جذبہ وہبی تھا، اس لئے رہنمائی کے بغیر بھی ترقی پذیر رہا۔ ہم جماعتوں نے میرے بڑے بھلے شعر سن کر پیشن گوئی کر دی کہ یہ ضرور شاعر بنے گا۔ ابتدا نظم گوئی سے ہوئی۔ جھوٹ اور سچ کا مناظرہ ہوا۔ ایک مختصر سی نظم دیا سلائی پر کہی، جس کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

بازار ہی میں بکنا قسمت میں گر لکھا تھا
صنعت گروں نے پھر کیوں پردہ نشیں بنائی

عشقِ سخن سے جب نظر میں مزید وسعت پیدا ہوئی، تو اس مجموعہ کو پست اور حقیر سمجھ کر چاک کر دیا۔ ۱۶، ۱۷ سال کی عمر ہو گئی تھی۔ دیوانِ ذوق کو پڑھ کر طبیعت غزل کی طرف مائل ہو گئی۔ اسے عنفوانِ شباب کا تقاضا بھی کہا جا سکتا ہے۔ معاشی تفکرات قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کرتے رہے۔ آخر محکمہ تعلیم کے دو امتحان دے کر مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس طرح ناداری اور تہی دستی کا غم کسی حد تک دور ہو گیا۔ اس کے بعد منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان دے کر نکودر کے ہائی اسکول میں اول مدرس فارسی بن گیا۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں عمر کی شرط کے مطابق ملازمت چھوڑنی پڑی۔ اور مستقل سکونت نکودر ضلع جالندھر ہی میں اختیار کر لی۔ اس کا سلسلہ ۳۰ سال پہلے سے جاری تھا۔

اتنے غریب، اتنے نادار اور اتنے افلاس زدہ کو مبداءِ فیاض نے شاعری کا جوہر دے کر بہت بڑی ستم ظریفی سے کام لیا۔ میں جب اپنے ابتدائی حالات کا تصور کرتا ہوں تو بے اختیار اپنا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے ؎

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوقِ دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

ملسیاں کی نہایت غیر ادبی آبادی اور اقتصادی افلاس کو دیکھ کر اُسے خراب آباد کہا کرتا تھا۔ متعارف اصحاب یہ سن کر کہا کرتے تھے کہ تمہارے منہ سے یہ الفاظ زیب نہیں دیتے۔ مگر حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ پاکستان بننے سے یہ آبادی اور بھی تباہ حال ہو گئی۔ چند سال پہلے ایک غزل کا مقطع کہا تھا ؎

کیا کر دیے جو عشق تم جو ہوا کرتے ہیں   حسیناں اب بھی خراب تر ہو رہے

غزل گوئی کے آغاز میں پہلا جو شعر کہا وہ یہ ہے ۔

امیر وہ نہیں جس کا کمال ختم نہیں   فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

تین سال بغیر کسی رہنمائی کے تھوڑی بہت مشق سخن جاری رکھی۔ اس مدت میں نسیم بھرت پوری سے جو حضرت داغ کے نامور شاگرد تھے، اپنے فنی و لسانی شکوک رفع کرنے کے لئے خط و کتابت ہوتی رہی۔ چونکہ کلام میں حضرت داغ کے رنگ کی جھلک نمایاں ہوتی تھی اس لئے نسیم صاحب کی ترغیب اور فرمائش سے حضرت داغ کا تلمذ اختیار کیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے۔

۱۹۰۵ء کے شروع میں وہ وفات پا گئے گویا تین سال ان کے دامن فیض سے وابستہ رہا۔ تقریباً ۱۰۰ غزلیات پر اصلاح ہوئی جو میری رہنمائی کے لئے کافی تھی۔ استاد کی وفات کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی ہی طبیعت کو رہنما بنا کر مشق سخن جاری رکھی۔

نام و نمود کے لئے بھی کوشش نہ کی۔ وہ وقت کی ضرورت سے زیادہ گوشہ نشین رہا۔ مولانا تاجور بھی کہا کرتے تھے کہ گوشہ نشینی چھوڑ دو۔ عزیزی عرش نے بارہا کہا کہ باہر نکل آؤ۔ مگر حالات خانہ داری نے اس کی اجازت نہ دی اور گوشہ نشینی کی عادت نے ان مشوروں پر متوجہ نہ ہونے دیا۔ بڑی بھلی شہرت جو نصیب ہوئی ہے اسے خدا کی دین ہی کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک رسالہ ... محکمہ تعلیم لاہور کے شعبہ ادبیات کا مدیر بھی رہا ہوں۔ اب یہ رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ حضرت نوح اس کے سرپرست تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس رسالہ کی سرپرستی مجھے سونپ دی گئی ہے۔

۱۹۳۳ء ہی سے ملک کے بڑے بڑے مشاعروں میں شامل ہونا شروع کیا۔ بہت سے مشاہیر سخن سے تعارف ہوا، چنانچہ یاس یگانہ، نواب اثر، نوح ناروی، قمر بدایونی، دل شاہجہانپوری، سیماب، ساحر دہلوی، کیفی دہلوی، خواجہ [illegible] بیخود دہلوی، نواب سائل وغیرہ۔ سب سے زیادہ ادبی ربط حضرت نوح ناروی سے رہا ہے۔ متعدد فنی نکات کی تحقیق کے لئے میں ان سے کچھ دریافت کرتا رہا، بھی وہ مجھ سے فصاحت مشورہ طلب کرتے رہے۔

تین دیوان شائع کئے گئے ہیں۔ بادۂ سرجوش، جنون و ہوش، فردوس گوش، علاوہ ازیں آہنگ جوش ۱۹۳۳ء میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ شرح دیوان غالب بھی۔ اس طرح تقریباً اپنے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاحیں دیں ان کے ... اصلاحات کے نام سے شائع کیں۔ اس کتاب میں ... ایک ادبی ضمون طور سے بھی شامل کیا۔ متعدد مشاہیر سخن کے کلام پر جو تبصرے لکھے جو مختلف رسالوں کے خاص نمبروں میں شائع ہوتے رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں قومی اور جنگی نظمیں بھی لکھی تھیں۔ یہ مرکزی حکومت کی طرف سے ... نام کی کتاب میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۹۳۲ء سے مرکزی حکومت ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی دے رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت پنجاب نے بھی مجھے ادبی ایوارڈ دیا۔

سنہ ۵۸ء میں "انجمن دن گزشتہ" انجمن دن گزشتہ کمیٹی نے مرتب کر کے پنڈت پنت وزیر داخلہ کے ہاتھ سے دلی کے ایک بڑے جلسے میں پیش کیا۔

بی اے اردو کا ہیڈ ایگزامینر اور اردو آنرز کا ایگزامینر بھی رہا ہوں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ چودہ سال کی عمر سے اب تک اردو ادب ہی میرا اوڑھنا اور بچھونا رہا ہے۔

مجموعہ کلام میں غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی کافی طبع آزمائی کرتا رہا ہوں۔ مگر میری طبیعت کا اصل میدان غزل ہی ہے۔ نظم میں بھی غزل ہی کا انداز بیان قائم رکھنا پسند کرتا ہوں۔ مثلاً آنسو کی زبان سے جو نظم کہی ہے اس کے دو چار شعر یہ ہیں:-

تیغ قاتل کا مزا سب کو چکھا دیتا ہوں
زہر کے گھونٹ مسیحا کو پلا دیتا ہوں
میری چپ میں بھی تو ہے شورِ قیامت کا اثر
سیکڑوں فتنۂ خوابیدہ جگا دیتا ہوں
کیا ہے ساون کی جھڑی میری جھڑی کے آگے
آبرو ابر کی پانی میں بہا دیتا ہوں
بند کر دیتا ہوں دم تیغ و دودم کا دم میں
معجزہ اپنا قضا کو بھی دکھا دیتا ہوں

ساٹھ ستر کے قریب رباعیات بھی کہی ہیں۔ چند قطعات بھی ہیں۔ ایسے اشعار میں نے کبھی پسند نہیں کئے جن میں زبان ہی زبان ہو۔ ہمیشہ زبان اور تخیل کو دوش بدوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔

فارسیت اور عریانی مضامین کا مخالف بلکہ دشمن رہا ہوں۔ متروکاتِ زبان اور متروکاتِ شعری کی سختی سے پابندی کی ہے۔ ان کی تفصیل یا فہرست بھی دوسرے دیوان "جنون و ہوش" کے شروع میں شامل کتاب ہے۔ ان کے علاوہ چند متروکات اور بھی ہیں۔ مثلاً مصرع کے شروع میں "یہ" اور "وہ" کے سوا اور کسی لفظ کی تخفیف بارِ گوش خیال کرتا رہا ہوں۔

شاگردوں کی تعداد ایک صد سے زیادہ ہے۔ ان میں آٹھ دس ایسے بھی ہیں جن کو فارغ الاصلاح سمجھتا ہوں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو خود بخود اپنے آپ کو مزید اصلاح سے بے نیاز سمجھ رہے ہیں۔ اگر کوئی عزیز سلسلۂ اصلاح کو منقطع کر دیتا ہے، تو میں بجائے شکایت کرنے کے اس کا شکر گزار ہوتا ہوں۔ ایسے اصحاب کی تعداد شاگردوں کی تعداد سے چار چند ہوگی جنہیں ان کی پستیِ مذاق اور برائے نام موزونیِ طبع کی بنا پر یہ مشورہ دیا ہے کہ براہِ مہربانی شاعری چھوڑ دو۔ نیا شاگرد منظور کرنے کے لئے پیچیدہ بحر کا مصرع طرح بھیج کر یہ جانچ لیتا ہوں کہ طبیعت میں موزونیت بھی ہے یا شوق ہی شوق ہے۔ اس جانچ میں تقطیع کی غلطی کو ناموزونیِ طبع کی قوی دلیل سمجھتا ہوں۔ ایسے اصحاب بھی اس جماعت میں پائے گئے ہیں جو کالجوں میں تو سونے کا میڈل لے جاتے ہیں۔ مگر بحر مضارع میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پیچیدہ بحروں میں کچھ کہنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ تقطیع کی غلطی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ایسے شعر کو ہمیشہ قلم زد کر دیتا ہوں اور اس کی اصلاح سے دست کش رہتا ہوں۔

شاگردوں کے سلسلے میں پچاس سالہ ادبی خدمت گزاری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایسی طویل خدمت ہمیشہ بے غرضانہ کی ہے۔ کبھی کسی عزیز کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ کبھی کسی عزیز کو اپنی طرف سے کچھ لکھ کر نہیں دیا۔ اگر کسی نے اصلاح طلب اشعار میں کسی شعر کا ایک ہی مصرع لکھا ہے اور درخواست کی ہے کہ میں چونکہ دوسرا مصرع لگانے میں بہت زور مارنے کے باوجود ناکام رہا ہوں، براہِ کرم دوسرا مصرع لگا دیجئے، تو میں نے وہ لکھا ہوا مصرع بھی قلم زد کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستان کیا تمام ملک میں اردو کا مستقبل تاریک دیکھ کر تیسرا دیوان تو ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا۔ مگر اس کے بعد اس طرح خاموش ہو گیا ہوں، جیسے کوئی گھوڑے بیچ کر سو گیا ہو۔ گزشتہ شش ماہی میں مشکل سے ایک دو غزلیں کہی ہوں گی۔ عمر کے تقاضے سے طویل سفر مشاعروں میں شامل ہونے کے لئے چھوڑ دئے ہیں۔ ایسے دعوت نامے قبول کرنے سے اب انکار کر دیتا ہوں۔ دو سال ہوئے، کراچی کا دعوت نامہ بھی اسی بنا پر قبول نہیں کیا تھا۔

طبیعت بدلتے ہوئے ملکی حالات اور قومی تقاضوں کا اثر بھی قبول کر رہی ہے۔ اس تبدیلی کے اشارات بھی کلام میں پائے جاتے ہیں۔ دو تین مثالیں یہ ہیں ـــ

اب اس شکوے سے کیا حاصل کہ دورِ خود غرض نکلا
پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں

مرغِ چمن اب بھی ہے فریاد کناں   آپ تو کہتے تھے بہار آ گئی
نا اہل ہے وہ اہلِ سیاست کی نظر میں   وعدے سے کبھی جس کو مکرنا نہیں آتا
نظر آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو   محبت جس زمانے میں سیاسی ہوتی جاتی ہے

شطرنج کا شوق بلکہ خبط شروع سے رہا ہے۔ شاعری نے بھی اس کا اثر کہیں کہیں قبول کیا ہے مثلاً:

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

آنسو کی زبان سے جو نظم کہی ہے۔ اس کا ایک مصرع یہ ہے ـــ

جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ استاد کا رنگِ سخن اپنی طبیعت میں جذب کرنے کے لئے میں اس حد تک نہیں پہنچ سکا جس حد تک حضرت نوح ناروی، حضرت بے خود بدایونی، نواب ہجر شاہ جہاں پوری اور جناب رسا رامپوری پہنچے ہیں۔ نوح ناروی تو ان میں پیش پیش ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس رنگِ سخن کی جھلک میری ہر غزل میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ـــ

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہوگے   ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

اس قدر رنج پریشاں سے رہا خوف زدہ
حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

یہاں تک تو لکھوں گا میں کہ دل کا مدعا تم ہو
اب اس سے آگے کیا لکھوں میرے خدا تم ہو

کہا تم نے سنا میں نے اب اور اتنا بتا جاؤ
یہ وہ کیا ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

اے پردہ نشیں دیکھ یہ دن رات کے پھیرے
میں گرد نہیں ہوں ترے کوچے کی زمیں کا

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت
مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ اچھا ہوگا

گلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے
مرے خدا کو بھی عادت ہے بھول جانے کی

انہیں تو کر دیا خاموش تم نے
مگر روکو گے کس کس کی زباں کو

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

بڑا دعویٰ ہے تم کو امتحاں میں یہ نہ ٹھہرے گا
ذرا ٹھہرو تمہارے امتحاں تک بات آ پہنچی

نہ دیکھی بات کرنے کی بھی جب تاب و تواں مجھ میں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہاں تک بات آ پہنچی

جور سے تم کو اگر انکار ہے
پھر یہ کس کی ہیں کرم فرمائیاں

صحت ابھی اوسط درجہ کی ہے۔ چھ سات میل پیدل چلنا پڑے تو چل سکتا ہوں۔ اس کی وجہ میری نہایت سادہ زندگی ہے۔ برف استعمال نہیں کرتا۔ چائے دسمبر اور جنوری میں بھی نہیں پیتا۔ دہی کے سوا ہر قسم کی ترش اشیاء سے قطعی پرہیز کرتا رہا

ہوں۔ دن بھر جوتے رہنا بہت ناپسند ہے۔ یہی حال لباس کا ہے۔ ایک سرکاری جلسے کی روداد مقامی گزٹ میں شائع ہوئی تو میرے نام کے ساتھ دیہاتی سادگی کی مجسم تصویر لکھا گیا۔ کپورتھلہ کے کل ہند مشاعرہ میں، جو موسم گرما میں ہوا تھا۔ پگڑی، قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے شامل ہوا۔ صدر مشاعرہ سر عبدالقادر نے مشاعرہ ختم ہونے پر فرمایا کہ جوش صاحب یہ کیا شکل بنائی ہے۔ میں نے عرض کی کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ کہنے لگے، کلام سے تو یہ بات کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں اپنی سادہ عادتوں کی وجہ سے کوٹ پاجامے کو بھی دفتری وردی کہا کرتا ہوں۔ سارا زمانہ فیشن زدہ نظر آتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ فقط۔

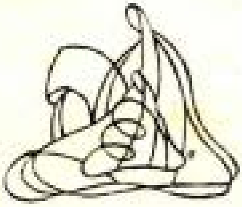

عبدالقادر سروری

میری ولادت ۱۵، ۱۹۰۶ء اگست کو شہر حیدرآباد میں ہوئی۔ میرے والد حضرت حاجی محمد سرور کو منصب سے کچھ حصہ ملا تھا جو بعد میں موقوف الخدمت ہو گیا تھا۔ دادا حضرت محمد جعفر قبلہ قدس سرہ ایک تارک الدنیا باخدا بزرگ تھے جن کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت سرور سلطان قدس سرہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے کشمیر ہوتے ہوئے دہلی آ گئے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد عالمگیر کے عہد میں دکن چلی آئی۔ عالمگیر کے عہد سے اس خاندان کے افراد دکن ہی میں رہ گئے۔

میرے خاندان کے افراد کو فقر کے علاوہ دینی علوم اور عربی و فارسی سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد جعفر سروری مرحوم عربی اور فارسی کے سربرآوردہ عالم تھے۔ جامعہ نظامیہ میں شیخ الادب عربی کی خدمت عرصہ تک انجام دی۔ اس کے بعد وہ محکمۂ تعلیمات میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر اعلیٰ علمی عہدوں اور مراتب پر پہنچے۔

میری والدہ کا خاندان حیدرآباد کے دیہات سے تعلق رکھتا تھا۔ خود والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن مذہبی امور اور اشغال میں انھیں غلو کا درجہ حاصل تھا۔ وہ حیدرآباد کے مشہور پیر طریقت حضرت سید شاہ محمد عمر قبلہ قدس سرہ سے بیعت تھیں جن کے مرید میرے والد بھی تھے۔

میں نے قرآن کی تعلیم مدرسہ مقبرہ زمان خان شہید میں حاصل کی اور فارسی کی تعلیم گھر پر بڑے بھائی اور والد مرحوم سے پائی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ شعبہ اداران میں داخل کیا گیا۔ انگریزی تعلیم مدرسہ مفید الانام میں شروع ہوئی جہاں سے مڈل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے سٹی ہائی اسکول میں داخل کیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوا اور انٹرمیڈیٹ بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ال ال۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۲۸ء میں میرا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت مددگار پروفیسر اور لکچرر اردو و فارسی عمل میں آیا۔ ۱۹۳۲ء میں میرا تقرر پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو فارسی و عربی کی خدمت پر جامعہ میسور میں ہوا۔ ہندی کے شعبہ کی نگرانی بھی میرے تفویض تھی۔ یہ خدمت میں نے ۱۹۴۷ء تک انجام دی۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ عثمانیہ کے اردو پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی اور مجھے صدر شعبہ کی حیثیت سے واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ کی جگہ پر مجھے ترقی ملی اور اس خدمت کو میں ۱۹۶۱ء تک انجام دیتا رہا۔ جامعہ عثمانیہ میں دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف پروفیسروں کی سبکدوشی پچپن برس کی عمر میں ہوتی ہے۔ وظیفے پر سبکدوشی کے بعد تقریباً ایک سال تک اعزازی پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تحقیقاتی کام کے لئے اعزازی پنشن پروفیسر کے عہدے پر مجھے مامور کیا۔

[illegible] میں میرا تقرر جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ اردو اور فارسی کی خدمت

پھر عمل میں آیا چنانچہ اس وقت یہی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

جن علمی اور ادبی اداروں سے میرا تعلق رہا ہے ان کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) مؤسس رکن ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن۔
(۲) مؤسس رکن و اعزازی معتمد مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن۔
(۳) رکن اکیڈیمک کونسل و سینیٹ عثمانیہ، میسور، جموں و کشمیر یونیورسٹی۔
(۴) صدر مجلس نصاب عثمانیہ میسور و جموں و کشمیر یونیورسٹی۔
(۵) رکن مجلس نصاب اردو جامعہ علی گڑھ، مدراس، وکرم و جبل پور۔
(۶) رکن لینگویج ایکسپرٹس کمیٹی کانسٹیٹیوئنٹ اسمبلی ہند۔
(۷) معتمد اعزازی انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند۔
(۸) صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند۔
(۹) رکن مجلس مشاورت اردو، ساہتیہ اکاڈمی ہند۔
(۱۰) رکن مجلس ترجمہ اردو دستور ہند۔
(۱۱) رکن مجلس مشاورت "آجکل" دہلی۔
(۱۲) رکن مجلس مشاورت "شیرازہ" سرینگر۔

تصانیف اور تالیفات کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(۱) دنیائے افسانہ ۱۹۲۶ء (۲) جامعہ عثمانیہ میں اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست ۱۹۲۸ء (۳) جدید اردو شاعری ۱۹۲۹ء طبع ثانی ۱۹۳۹ء - ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۵ء - ۱۹۳۷ء - ۱۹۴۰ء (۴) گروار اور افسانہ ۱۹۳۵ء (۵) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی ۱۹۳۳ء (۶) دنیا کے شاہکار افسانے ۱۹۳۳ء (۷) مجوبین ۱۹۳۹ء (۸) سراج سخن ۱۹۳۸ء (۹) کلیات سراج ۱۹۴۰ء (۱۰) قصہ بے نظیر منقی ۱۹۳۸ء (۱۱) اردو مثنوی کا ارتقاء ۱۹۴۸ء (۱۲) سراج اور ان کی شاعری ۱۹۴۱ء (۱۳) مراۃ الاسرار۔ شاہ صدرالدین ۱۹۴۳ء (۱۴) مہتاب سخن مجموعہ کلام لالہ مہتاب رائے سبقت سرینگ پٹن۔ میسور ۱۹۴۵ء۔

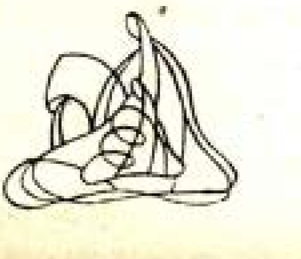

ممتاز مفتی

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ ان میں سے ہوں جن پر زندگی گزرتی ہے۔ زندگی بھر میں نے راہ نہیں بنائی بلکہ راستے آتے گئے اور میں انھیں اپناتا رہا۔ چار ایک بار راہ بنانے کے بھی مواقع آئے مگر طبعی طور پر راستہ اپنانے پر ہی مجبور ہوا سے کیا کیجیے۔ ادب کے دوار پر بھی میں ان جانے میں محض اتفاق سے آ پہنچا اور پھر اتفاقاً شہرت کی ایک پھلجھڑی سی چل گئی اور میں اچنبھے میں رہ گیا۔

ضلع گورداسپور میں بٹالہ ایک پرانا تاریخی شہر ہے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۵ء میں میں بٹالے میں پیدا ہوا۔ میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس کی اہمیت کا تمام تر انحصار زمانہ ماضی پر تھا۔ زمانہ حال نے مفتیوں سے ایفا نہ کیا۔ مستقبل روشنی کی کرن سے محروم تھا۔ گھر میں اس ماضی کے آثار جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ سربلند چونے گچی کے رنگ محل، دیواروں پر رنگین طغرے اور فارسی کے شعر، تہ در تہ طاقچے، خفیہ توشہ خانے، بوریوں میں بھری ہوئی کرم خوردہ قلمی کتابیں اور محلے کی بڑھیوں کی دردناک داستانیں۔

دادا جوانی میں رحلت فرما گئے۔ والد صاحب کی پرورش پردادا نے کی تھی۔ وہ لاہور کی ایک درسگاہ میں معلم تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد اور قلعے کے درمیان فصیل دیوار کے ان حجروں میں یہ درسگاہ قائم تھی جو آج بھی جوں کی توں قائم ہے۔ وہ مغلوں کے دربار میں میر منشی تھے جہاں انھیں مفتی کا لقب عطا ہوا تھا۔ والد صاحب محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

بچپن میں گھر سے متعلق میرے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے گھر گھر نہ ہو۔ اور ہو بھی تو ہم آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کوئی جاننے والا نہ تھا۔ کوئی اہمیت نہ تھی۔ کوئی حیثیت نہ تھی۔

گھر میں صرف دو شخصیتیں اہم تھیں، ابا اور نئی امی۔ وہ دونوں گھر میں رہتے تھے۔ آؤٹ ہاؤس میں تین افراد تھے۔ اماں، بڑی بہن اور میں۔ آؤٹ ہاؤس گھر ہی میں واقع تھا لیکن گھر آؤٹ ہاؤس سے کوسوں دور تھا۔ شاید اسی لیے آؤٹ ہاؤس میں پلنے والا لڑکا گونگا، تنہا اور بے چارہ رہا۔ ڈر، مسکینی اور میل جول سے کترانا مجھے اماں سے ورثے میں ملا۔

والد خوش گفتار تھے، صاحب ذوق تھے، رنگیلے تھے۔ اس لیے میرے تخیل کے ہیرو تھے۔ نئی امی ہیروئن تھیں۔ ہیرو سے فخر، احترام، ڈر، غم، غصہ اور عداوت کے جذبات منسلک ہو گئے۔ ہیروئن سے چڑ اور بے اندازہ کشمکش۔ اس جذبے میں ایسا ڈوبا کہ سالہا سال ڈبکیاں کھاتا رہا۔

باہر گلی میں ساتھی تو تھے لیکن جھجک اور کنارہ کشی کا ازلی جذبہ اس قدر حاوی تھا کہ گلی اور محلہ گھر کی طرح ویران ہی رہا۔ مدرسے میں بھی والد ہی کرسی نشین تھے۔ گھر اور مدرسے میں کچھ فرق نہ تھا۔ البتہ اتنی سہولت ضرور تھی کہ اساتذہ لحاظ کرتے تھے۔ ہر سال بغیر کھٹکے ترقی پا جانا یقینی تھا۔ لہٰذا پڑھنے سے فراغت تھی۔ ناول پڑھنے سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔

میٹرکولیشن کے بعد اسی ازلی جھجک کی وجہ سے اسلامیہ کالج لاہور راس نہ آیا۔ ڈی پی ایم کالج اپنایا اور اس کے بعد ہندو سبھا کالج امرتسر میں پناہ لینی پڑی۔ وہاں کچھ بات چل نکلی۔ لیکن پڑھائی میں وہی بے دلی قائم رہی۔ ۱۹۲۷ء میں پھر سے اسلامیہ کالج لاہور میں تھرڈ ایئر کا داخلہ لینا پڑا۔ جھجک تو اب بھی موجود تھی لیکن اس کی دھار میں وہ کاٹ نہ تھی۔

ان دنوں چار ایک ایسے ساتھی مل گئے جنھوں نے مجھے سہارا دیا۔ فیاض محمود نے میرے خوابیدہ ذہن میں بیداری پیدا کی۔ فیاض محمود میں طلب علم کا شوق دیوانگی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک عجوبہ تھا۔ تن تنہا۔ طنز اور تیوری سے مسلح۔ وہ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ کوئی آنے کی کوشش کرتا تو طنز کے طمانچے سے گولیاں چھٹتیں۔ جا پہنچتا تو طلب علم پیر تسمہ پا کی طرح شانوں پر سوار ہو جاتی۔ فیاض محمود نے مجھے بے غرض مطالعہ کے شوق سے سرشار کیا۔

اس کے بعد مجید ملک کی شخصیت نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ مجید ملک میری زندگی میں شہاب ثاقب کی طرح آئے اور چلے گئے لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات ابھی تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے بی اے پاس کیا۔ یہ وہ دور تھا جسے مالی انحطاط کا دور کہا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ سانپ گزرے دس سال بیت چکے تھے لکیریں اب ابھر رہی تھیں۔ بی اے میں اقتصادیات پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ میں نہ آیا کہا جاتا تھا کہ یہ انحطاط مالی ہے۔ حالت یہ تھی کہ تمام مقابلے کے امتحانات منسوخ ہو چکے تھے۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا۔ تنخواہوں میں کاٹ ہو رہی تھی۔ نوجوانوں کے لیے ملازمت حاصل کرنا ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ساری کی ساری پشت اس انحطاط کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بی اے کے بعد میں نے سٹینوگرافی کی۔ اس زمانے میں بی اے سٹینوگرافر خال خال تھے۔ کمشنر راولپنڈی نے میرا کام جانچا، پسند کیا اور اپنا سٹینو بنا لیا۔ یہ آسامی بڑی حیثیت کی آسامی تھی۔ صورت وقت یہ تھی کہ تنخواہ کے بغیر کام کرنا پڑتا تھا چونکہ سرکاری طور پر آسامی کا وجود نہ تھا۔

تنخواہ والی ملازمت حاصل کرنے کے لیے مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہونا پڑا۔ بی ٹی میں مجھے داخلہ نہ ملا چونکہ میرے مضامین سکول سے متعلق نہ تھے۔ بی اے میں میں نے فلسفہ اور اقتصادیات میں کیا تھا۔ اردو فارسی اور عربی سے قطعی ناواقف تھا۔ بصد مشکل مجھے ایس اے وی میں داخلہ ملا۔

ابھی تک فیاض محمود سے میل جول قائم تھا۔ بے غرض مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا۔ پھر محبت کا ایک رنگین جھونکا آیا جس نے مزید شدت کے ساتھ کتاب میں پناہ لی۔ مطالعہ کا جذبہ مثبت نہ تھا۔ مقصد فرار تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہوا۔ ادھر دیوانگی پر بہار آئی ادھر ان دنوں پنجاب پبلک لائبریری جوبن پر تھی۔ بہار اصیل ہو گیا۔ اور پھر خوب گزری۔

میں نے مطالعہ لٹریچر سے شروع کیا تھا۔ لیکن طبعی جمود کی وجہ سے ادب کی رنگینی راس نہ آئی۔ اس لیے سنجیدہ چیزوں کی طرف چل نکلا۔

برٹرنڈ رسل، بالڈون، نطشے، برگساں، فرائڈ۔

فلسفے سے نفسیات اور نفسیات سے جنس کی طرف جا نکلا۔ لٹریچر میں مجھے پراوسٹ، پیرل لوئی اور لاکلا پسند آئے۔ داستووسکی تو مجھے کھا گیا۔ داستووسکی میں وہی بے بسی، وہی بیچارگی، وہی اکیلاپن تھا۔ ایک مناسبت سی معلوم ہوئی۔ شاید اس لیے کہ داستووسکی میں میں نے زندگی کی تیسری سمت کا عکس دیکھا تھا۔

داستووسکی کے کردار ایک ہی ساعت میں ہنستے بھی تھے روتے بھی تھے۔ حاتم میں بخل اُبھرتا۔ طوائف میں سے راہبہ جاگتی۔ خود پرست قربانی کے جذبے سے سرشار ہو جاتا۔ سورما خوف سے تھر تھر کانپتا۔ میرے نزدیک یہ اصل زندگی تھی۔ جھرنوں کی طرح جھن جھن کرتے ہوئے

دکھا رنگ لئے میرے متضاد جذبات کی حیوانی انسانی شخصیت کے متعلق آج تک میں اسی نظریے پر یقین رکھتا ہوں۔

۱۹۳۱ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہوا تو انحطاط کا وہ عفریت اور بھی بھیانک ہو چکا تھا۔ پہ نیسری ابتدائی تنخواہ ۶۵ سے ۱۲۰ تک گر چکی تھی سینئر انگلش ٹیچر کی اسامی سے ۸۰ تک اور ملازمت حاصل کرنا بے حد مشکل تھا۔

ملازمت ملی تو میرے افسر اعلیٰ نے پاس بٹھا کر بڑے پیار و محبت سے مجھے سمجھایا: بابے دیکھو بچے۔ بچوں کو نئے اصولوں کے مطابق پڑھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ سب کتابی باتیں زندگی میں نہیں چلتیں۔ یہ ہاتھی کے دانت صرف دکھانے کے ہیں۔

بارہ سال میں مختلف مدرسوں میں پڑھاتا رہا۔ مدرسوں کا ماحول میرے لیے یوں تھا جیسے مرغابی کے لیے بارش۔ اساتذہ بڑے معقول جیتے اور وضع دار تھے، مگر نہیں جیسے تھے ویسا دیکھنے کی شدید کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ذاتی لحاظ سے مست تھے۔ اپنے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھتے تھے۔ وہ دنیاوی و جبلی تھوڑی اغراض کے بغیر ایک قدم بھی نہ چلتے تھے۔ قہقہہ لگانے کی جگہ مسکرانا کافی سمجھتے تھے اور مسکرانے کی جگہ تیوری چڑھاتے۔ طے شدہ باتوں کے متعلق سوچنا ان کے نزدیک جرم تھا اور ان فرسودہ ڈھانچوں سے ہٹ کر بات کرنے والا مشتبہ تھا۔ ان کے نزدیک میری حیثیت ہمیشہ قدرے دلچسپ مگر بیشتر مشکوک شخص کی رہی۔ اگر میں نے ۱۱ سال مدرسے کے ماحول میں بسر کیے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اصل طور پر میں راہ نہ پانے والا تھا راہ بنانے والا نہ تھا۔

اس دور میں مجھے صرف ایک ساتھی ملا، جو میری زندگی پر اثر انداز ہوا۔ وہ محکمہ تعلیم میں میرا رفیق کار تھا۔ میاں حفیظ الرحمٰن بلا کا ذہن رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں رنگینی و دلداریاں تھیں۔ اسی نے مجھے کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری پڑھنے کی لت ڈالی۔ میاں کا میرا ساتھ پندرہ برس تک رہا۔

انہی دنوں ایک بار چھٹیوں میں والد صاحب سے ملنے ملتان گیا تو وہاں میری ملاقات ن م راشد سے ہوئی۔ ان دنوں وہ نوعمر ہی تھے اور بی اے فائنل میں تھا۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ شاید ہماری واقفیت علیک سلیک تک ہی رہتی، لیکن ہم دونوں کے والد محکمہ تعلیم میں تھے اور دفتر میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ لہٰذا راشد اور میں قریب تر ہو گئے۔

ان دنوں راشد "تائیس" یا شاید "افرودائیت" کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ انھیں فارسی اور اردو میں دسترس تھی۔ میں دونوں میں کورا تھا۔ ہمارے درمیان گفتگو کا واحد موضوع نفسیاتی زاویہ تھا۔

انہی دنوں راشد کے ایک دوست کو جو ملتان سے ایک اردو جریدہ "نخلستان" مرتب کرتے تھے ناگہاں باہر جانا پڑا۔ پرچے کی ادارت وہ راشد کے ذمے کر گئے۔ راشد نے صفحات پُر کرنے کے لیے مجھ سے کچھ لکھنے کو کہا۔ اردو میں لکھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ بہرصورت میں نے کوشش کر کے اردو نظم کی ولی پر مضمون لکھا۔ علاوہ ازیں ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی نگاہ چڑھی۔ انھوں نے گورنمنٹ ہائی سکول کے میگزین کے سالنامے کے لیے فرمائش کی۔ ماہر علم کے لیے اتفاق۔ تحریک کے موضوع پر ایک مضمون "النجاۃ" لکھا۔ پھر پتہ نہیں کیسے منصور احمد نے جو ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ سالنامے کے لیے مختصر افسانہ مانگا۔ ۱۹۳۰ء کے سالنامے میں میرا پہلا مختصر افسانہ "جھلمل جھلمل آنکھیں" ایک بڑے جوڑے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا دیکھ کر دل میں ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔

پھر جیسے بعد پھر چھپے دیکھنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ ایک کہانی لکھ کر ادبی دنیا کو بھیجی۔ اس دوران منصور احمد اچانک انتقال کر چکے تھے اور ادارت کے فرائض عاشق حسین بٹالوی سرانجام دے رہے تھے۔ میری کہانی مجھے لوٹا دی گئی۔ مسودہ سرخ سیاہی سے لہولہان تھا۔ منسلکہ خط میں لکھا تھا۔

کنہیا لال کپور

مشہور انگریزی نقاد و ادیب ۔ ایچ ۔ ہڈسن W.H.HUDSON آدمی کا قول ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک دلچسپ کتاب لکھ سکتا ہے اور وہ ہے اس کی آپ بیتی۔ بہت سے نظریوں کی طرح ہڈسن کا یہ نظریہ بھی مبالغے پر مبنی ہے کیونکہ ایک عام آدمی کی زندگی اتنی سپاٹ اور غیر دلچسپ ہوتی ہے کہ کوئی قاری اس میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی زندگی سنسنی خیز یا عبرت انگیز واقعات سے عبارت نہ ہو اُسے آپ بیتی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے یا زیادہ سے زیادہ میر کے اس شعر پر اکتفا کرنا چاہیے۔

کہیں کیا کوئی ہم سے پوچھے جو میر تم آئے تھے دنیا میں کیا کر چلے

بلا ریب خدائے سخن حضرت میر تقی میر نے نوے سال کی عمر پائی اور سات دواوین اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے۔ اس کے باوجود کسر نفسی کا یہ عالم ۔۔۔۔ کہ فرماتے ہیں ہم نے کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا۔

میری زندگی سنسنی خیز واقعات سے یکسر خالی ہے۔ میں نے کبھی محبت کی، نہ بلیک مارکیٹنگ، نہ کسی کو قتل کیا اور نہ خود قتل ہونے سے بال بال بچا۔ نہ کبھی صحرا نوردی کی نہ جنگل چھانے۔ وزیر بنا نہ سفیر۔ حسن کا تعاقب کیا نہ جاہ و منصب کا۔ عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار۔ نہ فارغ البال ہوا اور نہ ہی ستم رسیدۂ روزگار۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر میں اپنی مختصر آپ بیتی لکھ رہا ہوں تو اس کی وجہ جواز محض یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قارئین عبرت پکڑیں اور میری ایسی زندگی بسر کرنے سے گریز کریں۔

میں ایک روایت کے مطابق ۲۷ جون ۱۹۱۰ اور دوسری کے مطابق یکم نومبر ۱۹۱۱ کو پیدا ہوا۔ میرے والد لالہ ہری رام کپور مرحوم ضلع لائل پور کے ایک گاؤں میں جس کا نام چک ۵۰۰ تھا، پٹواری تھے۔ یہ گاؤں پاکستان کے تاریخی شہر کمالیہ سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ جس گاؤں میں میرا بچپن بسر ہوا وہ تین چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ بلوچ، دھول اور کتے۔ ان تینوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بلوچ نہایت نیک اور اللہ والے لوگ تھے۔ میں نے اُن سے زیادہ خدا ترس انسان آج تک نہیں دیکھے۔ عام طور پر وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ اُن میں سے جب کوئی نوجوان بُرائی کی طرف راغب ہوتا ہے تو بڑے اسے یہی کہتے۔ خدا اور رسول کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ یہ محض ان کا تکیہ کلام ہی نہیں تھا بلکہ اصول زندگی بھی۔ انھیں ان پڑھ بلوچوں نے مجھے انسانیت کا پہلا سبق دیا۔

بلوچ جتنے اچھے تھے کتے اتنے ہی بے شعور۔ وہ ہر وقت اور ہر شخص کو دیکھ کر بھونکا کرتے۔ ان کی اس بدتمیزی پر میں اکثر دانت پیس کر رہ جاتا۔ چنانچہ مجھے کتوں سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ آج تک عجیب الطرفین سے نجیب الطرفین کتے کو پسند نہیں کرتا۔ کتوں کے علاوہ دوسری قباحت دھول تھی۔ گرمی کے موسم میں جب دھول کے جھکڑ چلتے اور سر اور منہ خاک آلودہ ہو جاتے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ دھول سے ہر روز

واسطہ پڑنے لگا یہ ردعمل ہوا کہ میں تمام خشک چیزوں کو ناپسند کرنے لگا جیسے خشک نثر۔ خشک آدمی اور خشک موسم !

میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ میرے اُستاد مولوی محمد بخش فارسی اور اردو کے عالم تھے۔ درسی کتب پڑھانے کے علاوہ انھوں نے مجھے گلستان اور بوستان کے رموز سے آگاہ فرمایا۔ کبھی کبھی قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ آسان اردو میں سمجھانے کے بعد کہتے۔ "دیکھو اتنے تھوڑے لفظوں میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے"۔

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لائل پور سے پاس کیا اور پنجاب بھر میں دوم رہا۔ انٹرمیڈیٹ ڈی۔ ایم کالج موگا اور بی اے۔ ڈی اے وی کالج لاہور سے کیا۔ اور یونیورسٹی میں انگریزی اور سنسکرت کے مضامین میں اول رہا۔ ایم اے انگریزی کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بخاری صاحب کی پرکشش شخصیت سے میں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ موصوف نہ صرف انگریزی زبان کے مانے ہوئے مقرر اور اُستاد تھے۔ بلکہ اردو زبان کے ایک منجھے ہوئے مزاح نگار بھی۔ بخاری صاحب سے میں نے ہر فرسودہ روایت اور ہر بے ہودہ شخص کا مضحکہ اُڑانے کا فن سیکھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے کہ جب کوئی چیز یا انسان زاویہ قائمہ کی بجائے زاویہ منفرجہ یا زاویہ حادہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے وہ مزاح کا موضوع بن جاتا ہے اور اردو مزاح کا ذکر کرتے ہوئے کہتے۔ "ابھی اس کا بچپنا ہے اسے ذہنی بلوغت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کم از کم پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔" بخاری صاحب کی تحریک پر ہی میں مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا اور اگرچہ ان دنوں میری حیثیت نو گرفتاری کی سی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۳۱ء میری زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ میں تب تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ والدین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اب نوجوان ہو گیا ہوں، حالانکہ نوجوان میں عمر کے کسی حصے میں نہیں تھا۔ میری شادی کر دی۔ میری اہلیہ پشپا وتی ایک متوسط گھرانے میں کہ جو قصبہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتا تھا۔ پیدا ہوئیں۔ چونکہ قصبے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے وہ تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔ ہمارے سات بچے (اتفاق سے میں سات کتابوں کا مصنف ہوا) ہیں تین لڑکے۔ چار لڑکیاں۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی نے شروع سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کریں گے۔ اپنے بجائے ہم ہمسایوں یا قومی رہنماؤں کو اپنی تنقید کا نشانۂ مشق بنائیں گے۔ پچھلے بیس سال سے ہم اس عہد پر قائم ہیں اور ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ جب ہم کسی میاں بیوی کو جھگڑتے یا ایک دوسرے سے روٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں ان پر بے حد رشک آتا ہے اور بسا اوقات دبی زبان میں ہم اس حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کاش ہمیں بھی خدا لڑنے بھڑنے کی توفیق دیتا۔

۱۹۳۳ء واقعہ ہے کہ جب میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ کوشش کے باوجود مجھے کہیں ملازمت نہ ملی۔ آخر ڈی اے وی کالج لاہور میں پچھتر روپے ماہوار پر [illegible] ٹیچر مقرر ہوا۔ اور ڈیڑھ سال کے بعد چھانٹی میں آ گیا۔ اب میں نے پرائیویٹ ٹیوشن کو ذریعہ معاش بنایا۔ اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس (چندر ہوسٹل لاہور) میں رہنے لگا۔ یہاں نہایت ڈرامائی حالات میں کرشن چندر سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن میں ایک سرٹیفکیٹ لینے کے لیے اپنے پروفیسر ڈکسن صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے فرمایا۔ "میں کسی شخص کی موجودگی میں سرٹیفکیٹ نہیں لکھ سکتا۔ تم لائبریری میں جا کر بیٹھو اور آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ آؤ۔" میں وقت کاٹنے کے لیے رسالہ "ہمایوں" کا تازہ شمارہ پڑھنے لگا۔ اس میں کرشن چندر کا ایک شائع شدہ مضمون "لاہور سے بہرام گلہ تک" کو پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ جب میں سرٹیفکیٹ لے کر چندر ہوسٹل پہنچا۔ تو میں نے اس مضمون اور اس کے مصنف کا اپنے ہمسائے ماسٹر شو رام بیرہ سے ذکر

کیا۔ وہ بحثیں کرنے لگے۔" دراصل یہ وہی کرشن چندر ہے جو آپ کے ساتھ دوسرے کمرے میں رہائش پذیر ہے۔" بخاری صاحب نے میرا تعارف کرشن چندر سے کرایا۔ اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ اکثر ہم علمی اور ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے۔ میں چونکہ باتیں بنانے میں تیز واقع ہوا تھا اس لیے عموماً کرشن چندر کو شکست تسلیم کرنا پڑتی۔ ایک روز جب ہم میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تم طباع اور منطقی طنز نگار ہو لیکن افسوس کہ اپنا سارا وقت ادھر ادھر کی گپوں میں ضائع کرتے رہتے ہو۔ یہی گپیں اگر معرض تحریر میں آجائیں تو طنز کہلائیں۔

بخاری صاحب کے بعد کرشن چندر دوسرا ادیب تھا جس نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے اسی دن فیصلہ کیا کہ کرشن چندر سے بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے میں کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ سب سے پہلا طنزیہ مضمون کرشن کے افسانے "یرقان" پر پیروڈی بعنوان "خفقان" لکھا۔ اسے کرشن چندر کے علاوہ صوفی تبسم نے بھی پسند کیا۔ لیکن اتفاق رائے سے اسے ضائع کر دیا گیا۔ کیونکہ اس میں کرشن چندر پر بہت تیکھی چوٹیں کی گئی تھیں۔ انہی دنوں مجھے ڈی اے وی کالج لاہور میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ جہاں میں تقسیم ہندوستان تک انگریزی کا مضمون پڑھاتا رہا۔

میرا دوسرا مضمون "اخبار بینی" مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ "شیرازہ" میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون "رنگین شاعری" رسالہ ادب لطیف کے سالنامہ (۱۹۴۰ء) میں چھپا۔ جب کرشن چندر نے اس مضمون کو پڑھا تو ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ لیکن جس مضمون کا سب سے زیادہ شہرہ ہوا اور جس نے ادبی دنیا میں تہلکہ سا مچا دیا وہ "غالب ترقی پسند شعراء کی مجلس میں" تھا۔ یہ ۱۹۴۱ء میں رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا اور چھپنے سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اسی مضمون سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

میری پہلی تصنیف "سنگ و خشت" اسی سال مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی۔ اسے پطرس بخاری کے علاوہ جناب احتشام حسین، جناب عبادت بریلوی۔ اور خواجہ غلام السیدین نے حوصلہ افزا الفاظ میں سراہا۔ کرشن چندر نے ایک انگریزی رسالے میں اس پر تنقید کی اور مجھے "بچہ" کا لقب عطا فرمایا۔ اس کے بعد کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ شیشہ و تیشہ (۱۹۴۴ء)، چنگ و رباب (۱۹۴۸ء)، نوک نشتر (۱۹۴۹ء)، بال و پر (۱۹۵۲ء)، نرم گرم (۱۹۵۵ء) اور گرد کارواں (۱۹۶۰ء)

میرے تین مضامین پر اچھے خاصے ہنگامے ہوئے۔ پہلا مضمون "اہل زبان" تھا جو ادب لطیف کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس میں یو پی کے نام نہاد اہل زبان پر چند کاری چوٹیں تھیں۔ اس کا چھپنا تھا کہ یو پی اور دہلی میں حشر بپا ہو گیا۔ جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی نے مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے مجھے بدزبان اور کج رو پنجابی کے خطابات سے نوازا اور لکھا "آج خاک پنجاب اہل زبان کے مزار پر ہے لیکن اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔" کچھ گھبرا اور کچھ چڑ کر میں نے اہل دہلی پر ایک اور طنزیہ مضمون بعنوان "منہ چڑانے لگے" گھسیٹ مارا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دہلی اور پنجاب کے رسائل میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کو وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ مزا آ گیا۔ تیسرے مضمون کا عنوان "مطالبات" تھا۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس میں چند زندہ دل لوگوں کے مضحکہ خیز مطالبات کا ذکر تھا۔ مثلاً ایک صاحب کا مطالبہ تھا کہ مجھے اقبال کا سب سے بڑا جلیس تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اقبال نے میرا ذکر مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اتفاق سے اسی مضمون میں قیام پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی آڑ لے کر خوب اپنے دل کا غبار نکالا

اور مسلم لیگی روزناموں میں مجھے گستاخ اور گردن زدنی ٹھہرایا، مجھ پر مقدمہ دائر کرنے اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہ طوفان تب تھما جب میں نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور مضمون ترمیم کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد میں نے فیروزپور میں پناہ لی اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ڈی۔ ایم کالج موگا میں یہ مجھے جیسے حیلے وسیلے چھٹا تو پھر کہیں جاکر تیسری نوکری کی۔ شروع شروع میں طبیعت بہت گھبرائی۔ لاہور اور موگا میں بعد المشرقین تھا۔ کہاں لاہور کی رنگینیاں، جلسے، ہنگامے اور کہاں موگا ایسا نیم ریگستانی قصبہ۔ جہاں سرکنڈوں اور ریت کے ٹیلوں کے علاوہ کوئی قابل دید چیز نہیں تھی۔ بارہا حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہائے، کراچی جانا چاہا لیکن سنبھلتے سنبھلتے جب طبیعت سنبھل گئی تو حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ لاہور کو چھوڑے سولہ سال ہو گئے ہیں اس کی حسین یادیں آج تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ لاہور کا تصور کرتے ہی دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور زبان پر بے اختیار ناسخ کا یہ شعر آجاتا ہے ؎

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

موگا میں ادبی ماحول کی جستجو ظلمات میں خورشید کی تلاش کے مترادف ہے۔ یہاں کے لوگ آرٹ اور ادب کی بجائے شراب اور دفعہ ۳۰۲ میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں وقت گزرتا نہیں رینگتا رہتا ہے۔ دن کے وقت کالج میں پڑھاتا، شام کو لمبی سیر اور رات کو مطالعہ۔ ذہنی خودکشی کرنے کے لیے یہ نہایت موزوں شہر ہے۔ یہاں آکر محسوس ہوتا ہے کہ روح نام کی کوئی چیز نہیں۔ انسان صرف جسم ہی جسم ہے۔

پچھلے سولہ سال سے میں موگا میں مقیم ہوں، دوست احباب اکثر سوال کرتے ہیں کہ میں نے جنت سے ہجرت کرنے کے بعد اس جہنم کو کیوں پسند کیا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ سوا اس کے کہ جب تک ہندوستان لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا، میرے لیے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔ پاکستانی احباب پوچھتے ہیں ہمیں ملنے کے لیے لاہور کیوں نہیں آتے۔ انھیں جواب میں لکھ بھیجتا ہوں ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ آپ بیتی نامکمل ہوگی اگر میں قارئین کو اپنی ذات سے متعلق چند ضروری تفاصیل سے آگاہ نہ کروں۔ میں ذات کا کھتری ہوں۔ پیشہ آبائی یقیناً سپہ گری نہیں بلکہ دکانداری تھا۔ میرا قد پانچ فٹ گیارہ انچ، وزن ڈیڑھ من اور رنگ گندمی ہے۔ جسم اکہرا اور بال کھچڑی ہیں۔ جھک کر چلتا اور سلام کرتا ہوں۔ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ ترقی پسند ہوں نہ رجعت پسند۔ اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند۔ سگرٹ نوش اور گوشت خور ہوں۔ اردو میں لکھتا، پنجابی میں بولتا اور انگریزی میں پڑھتا ہوں۔ میں نے اپنی فراغت کا معتدبہ حصہ کالج کی درسی کتب کی شرح لکھنے میں ضائع کیا ہے۔ میرے مشاغل کتابیں اکٹھی کرنا، سیر اور احباب کو بنانا ہیں۔ خدا کی ہستی کا قائل ہوں اگرچہ اس کے بھیجے ہوئے کسی اوتار یا پیغمبر پر ایمان نہیں لا سکا۔ اپنے علاوہ ہر ادیب کو ادیب سمجھتا ہوں اس کے ساتھ ہی کسی زندہ ادیب کو اقبال اور منشی پریم چند کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ قسمت، حکومت اور احباب کا شاکی ہوں کہ ان تینوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا۔ حالانکہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے۔ اس کے باوجود میرا نظریہ حیات قنوطی ہے رجائی نہیں ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست　　شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

شوکت سبزواری

میں کیا اور میری سرگزشت حیات کیا، مگر میں اس شخص کی طرح جس نے حضرت یوسف کے حالات ان چند جملوں میں بیان کر دیئے تھے۔ ع

پیرے بود پسرے داشت گم کرد و باز یافت

اپنے سوانح کا اختصار کرتا ہوں تو دریا کو اس طرح کوزے میں بھر سکتا ہوں: "پیدا ہوا، پلا بڑھا، پاپڑ بیلے اور اب اس منزل کا انتظار ہے جو سب کو آنی ہے۔" جس کی زندگی بے کیف اور مشرقی کہانیوں کے کرداروں کی سی رنگینیوں سے خالی ہو وہ اپنے سوانح کیا لکھے، انہیں کون پڑھے گا۔ اگر خلیل صاحب کا اصرار نہ ہوتا تو میں شاید کبھی بیٹھ کے پچھلے حالات لکھنے پر آمادہ نہ ہوتا، اور ان حالات میں کچھ باتیں دوسروں کے لئے، جو اپنے سفر حیات پر روانہ ہوئے ہیں، سرمایۂ عبرت نہ ہوتیں تو میرا قلم ہرگز حرکت میں نہ آتا۔ میرے حالات زندگی دلچسپ نہ سہی عبرت کا سامان ہو سکتے ہیں۔

میں مغربی یوپی کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سے عالمگیر شہرت کا مالک ہو چکا ہے۔ ولادت کا سن ٹھیک ٹھیک نہ بتا سکوں گا۔ خاندان میں بچوں کی پیدائش اور شاید بڑوں کی وفات کی یادداشت رکھی جاتی تھی اور سینہ بسینہ اور دست بدست منتقل ہوتی آ رہی تھی۔ لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو یادداشت ضائع ہو چکی تھی یا اسے غائب کر دیا گیا تھا۔ میں نے قرائن سے اپنی پیدائش کا سن ۱۹۰۸ء متعین کیا ہے۔ اب اگر یہ سن ولادت نہیں تو ہونا چاہیئے۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے دستور کے مطابق مجھے والدین کا پیارا اور آنکھوں کا تارا ہونے کے ساتھ ساتھ کھوٹا بھی ہونا چاہیئے تھا۔ سو والدین کا دستی میں اپنی والدہ کا جن کا ذکر آتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ لاڈلا ضرور تھا۔ ان کے لاڈ نے اول اول مجھے بگاڑا اور میں کھوٹا مشہور ہو گیا۔ بات بات پر روٹھنا، ضد کرنا، بگڑنا۔ اس زمانے کی باتیں کم سے کم مجھے یاد نہیں۔ کچھ بڑوں سے سنی ہیں، کچھ دھندلے نقوش ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ میرے والد مرحوم جن کی محبت بھول گیا ہوں سرزنش یاد ہے، اکثر محبت سے سرشار ہو کر فرمایا کرتے تھے۔ "شو - سے شوکت، روٹھنے والا سب بچوں میں ہے نرالا ...... اس کے بعد ایک "ہٹ" اور بھی تھی جس کو لکھتے ہوئے میں جھجکتا ہوں۔

بہرحال میرا کھوٹا پن یہ تھا کہ میں بچپن کی منزل سے گزر کر بھی بچہ ہی رہا۔ خاصا سیانا ہو گیا تھا لیکن بچھیروں کی طرح کھیلنے کودنے ڈنڈے بجانے کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ مکتب کے نام تک سے بھاگتا تھا۔ اس زمانے میں والد صاحب مرحوم بلند شہر میں رجسٹرار قانون گو تھے۔ وہیں بہلا پھسلا کر مجھے ایک بڈھے کھوسٹ ملا مکتبی کے پاس قاعدہ بغدادی دے کر بھیجا گیا۔ میں نے ابھی ایک آدھ تختی پڑھی ہوگی کہ والد صاحب ملازمت چھوڑ کر میرٹھ چلے گئے۔ بلند شہر کی زندگی کی چند بھولی بسری یادیں ذہن میں ہیں جنہیں طفلانہ شرارتیں سمجھ کر نظر انداز کرتا ہوں۔

اس کے بعد پھر کچھ عرصے تک استاد کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ننھے ماموں نے نئے نئے دورے اچھالے۔ شاید ہی کوئی کھیل ایسا ہو گا جس میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر میں نے حصہ نہ لیا ہو۔ گلی ڈنڈا، گیڑیاں، گڑیاں بھی کھیلیں، کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازیوں کا شوق بھی پورا کیا۔ میرے

ددھیال اور ننھیال عزیز اس طرح کھیلتے اور گلیاروں کی خاک چھانتے دیکھ کر والدہ مرحومہ سے کہتے تھے کہ اس لڑکے کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔ کیا اسے جاہل رکھو گی۔ میرے اعزہ قریب قریب سب میری طرف سے مایوس تھے اور شاید والدہ محترمہ کو بھی اس کا دکھ تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی عادت اور دستور کے مطابق میرے طرزِ عمل پر کبھی کوئی سرزنش نہیں کی۔ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ والدہ مرحومہ کے اس سلوک نے میری خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جس طرح ایک شیر خوار بچہ، ہاتھ پاؤں مار کر اور کلکاریاں بھر کر اپنے اعصاب کو توانا بناتا ہے۔ آزاد فضا میں بے روک ٹوک کھیل کودنے میری ذہنی قوتوں اور باطنی استعدادات کو بروئے کار لانے میں میری مدد کی۔ والدہ کے پیار کی وجہ سے اب تک والد صاحب کی سرزنش سے محفوظ رہا تھا اس نے دوسرے فطری جذبوں کی طرح جذبۂ غیرت میں بلا کی تیزی تھی۔ میرے دو چچا زاد بھائی ہم عمر ہونے کی وجہ سے سیر اور تفریحات میں برابر کے شریک تھے۔ یہ باقاعدہ مکتب میں تعلیم پاتے تھے اور اچھے خاصے پڑھ لکھ گئے تھے۔ ایک مرتبہ میں اپنے ان بھائیوں کے ساتھ نوچندی کا میلہ دیکھنے گیا۔ یہ دونوں آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے۔ میں نے دیکھا کہ ملک کے اطراف و اکناف سے آئی ہوئی دکانوں کے بورڈ اور پوسٹر پڑھتے ہیں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرتے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتے اور داد چاہتے ہیں۔ میری غیرت و انانیت نے ان کی مسکراہٹ میں اپنے لئے تحقیر اور ان کی مسابقت میں ایک للکار محسوس کی۔ اس کے بعد سے میری دنیا بدل گئی۔ دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئیں۔ سوئے ہوئے جذبے بیدار ہو گئے اور خود میں نے والدہ مرحومہ سے درخواست کی کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مکان کے قریب ایک تعلیم یافتہ بیوہ خاتون رہا کرتی تھیں۔ والدہ نے مجھے اور میری چھوٹی بہن کو قرآن شریف پڑھنے کے لئے اس خاتون کے پاس بٹھا دیا۔ انھوں نے قرآن شریف پڑھایا۔ میں اردو لکھنا پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن استانی نے یہ کہہ کر میرے اس شوق کا گلا گھونٹ دیا کہ مرحوم شوہر نے لکھنے کو منع کر دیا تھا اس لئے اصلاح دینے سے معذور ہوں۔

قرآن شریف ختم کرنے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ میں انگریزی پڑھوں یا عربی۔ ہمارے محلے کی مسجد میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک جوان صالح امام تھے جو ایک مقامی عربی درسگاہ میں عربی دینیات پڑھتے تھے۔ انھوں نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ نے اپنے دو لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلائی ہے اس لڑکے کو عربی پڑھائیے اور اپنے اور اپنے بزرگوں کی نجات کا سامان کیجئے۔ چنانچہ امام صاحب کے ساتھ مجھے اپنی دنیا سنوارنے سے پہلے بزرگوں کی عاقبت سدھارنے کے لئے اس درسگاہ میں جس کا نام امداد الاسلام تھا بھیج دیا گیا۔ یہاں مجھے خوش بختی سے ایک شفیق استاد مل گئے، جن کا نام اختر شاہ خاں تھا۔ یہ امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے تھے۔ فارسی بڑی اچھی جانتے تھے۔ عربی صرف و نحو عروض اور فرائض (علم وراثت) پر عبور تھا۔ عربی فارسی اردو میں شعر بھی کہتے تھے جن میں شعریت کم تھی علمیت زیادہ۔ وہ علم کے زور پر شعر کہتے تھے۔

مولوی صاحب قبلہ نے یہ دیکھے بغیر کہ میں حرف شناس بھی ہوں آمد نامہ (صفوۃ المصادر) میرے حوالے کیا اور اس کا ایک صفحہ کھلا کر کہا کہ اسے یاد کرو۔ نستعلیق کا سواد نہ تھا لیکن استاد کا خوف غالب تھا۔ ان کے پہلو میں رکھا ہوا بید دیکھ چکا تھا اگرچہ اس وقت تک میرے سامنے اس کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ برابر بیٹھنے والے لڑکے سے دریافت کیا کہ یہ کیا لفظ ہے۔ اس نے کہا ٹوپی کے پھندنے کا تار دو تو بتائیں۔ ہر لفظ کے عوض ایک تار دینا پڑا۔ ادھر آمد نامے کی تختی یاد ہوئی ادھر پھندنا غائب۔

مجھے عاقبت سدھارنے کی غرض سے عربی پڑھنے کے لئے مدرسے بھیجا گیا تھا۔ استاد نے فارسی شروع کرا کر میری دنیا بنانے کی کوشش کی۔ "نہیں پڑھ کر ہی تو لوگ عالیشان عمارت بنا کر کھڑی کر لیتے ہیں۔" لیکن میں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک رفیق طالب علم سے عربی پڑھنی شروع کی اور چند روز بعد ہمت کر کے استاد سے عرض کیا۔ میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں۔ استاد نے فرمایا عربی کلائی بے چربی۔ لیکن جب استاد مرحوم کو اس کا علم ہوا کہ چربی نکلوائے بغیر ہی "میزان" ختم کر چکا ہوں اور امتحان لینے کے بعد اس کا اطمینان کر لیا تو خود پڑھانے لگے۔ ابتدائی فارسی اور ابتدائی عربی کی تکمیل میں نے اپنے ان شفیق استاد کی خدمت میں کی۔ استاد مرحوم نے عربی پڑھانے کے ساتھ اپنے مقولے کے مطابق چربی نہیں نکالی تو چمڑی ضرور ادھیڑی۔ لیکن یہ چمڑی عربی کی تحصیل کے لئے نہیں ادب سکھانے اور اخلاق سنوارنے کے لئے ادھیڑی گئی تھی۔ مار بھی کھاتا رہا، پڑھتا بھی رہا اور شرارتیں بھی کرتا رہا۔ لیکن والدہ مرحومہ کو اس کا علم نہ ہونے دیا کہ ان کے لاڈلے کی، جسے انھوں نے انگلی تک نہ چھوائی تھی، چمڑی ادھیڑی جا رہی ہے۔ ان کا لاڈلا یہ سمجھ چکا تھا۔

قہر استاد بہ ز مہر پدر

جس دن اپنے جسم پر استاد کی بید سے اُتو بنوا کر اور بدھیاں ڈلوا کر آتا سخت گرمی کے باوجود اس خوف سے کرتا نہیں اتارتا تھا کہ کہیں ماں نہ دیکھ لے۔ ایک روز جب انھوں نے خود کرتا اتارا تو یہ راز کھلا۔ ان کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ان کا یہ فرمانا آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے: "میں اپنے بچے کو ایسے ملا کے پاس چمڑی ادھڑوانے ہرگز نہ بھیجوں گی۔"

شعور نے شوق کو چمکایا اور شوق نے شعور کو روشن تر بنایا۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا۔ پرکھ کا مادہ پیدا ہوا اور میں نے استادوں پر جرح کرنی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اساتذہ کو میرے بارے میں شبہ پیدا ہوا کہ میں اسلاف کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کرنا چاہتا ہوں۔ مدرسے کے مہتمم حافظ حفیظ الدین ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور تجربہ کار تاجر تھے۔ وہ کبھی کبھی اسباق میں تعلیمی رفتار و معیار دیکھنے کے لئے شرکت کرتے۔ زبانی امتحانات کی نگرانی تو وہ ہمیشہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ میری جرح و تنقید دیکھ کر انھوں نے یہ سمجھا کہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی نیا مذہب "ایجاد" کروں گا۔ چنانچہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد جب کبھی سر راہ ان سے مڈبھیڑ ہوئی انھوں نے مجھے روک کر یہی دریافت کیا: "تمھارا نیا مذہب اب کس منزل میں ہے؟"

اس دور کی دو چیزیں ذکر کے قابل ہیں۔ ایک علم کا چسکا جو ہوکے کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ پڑھ ڈالوں۔ کوئی فن یا شعبۂ علم ایسا نہ ہو جسے میں نہ جانتا ہوں ؎

عشق بے قید تصور شوق بے قید نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیئے بے حد و پایاں چاہیئے

چنانچہ اس زمانے میں اول ہندی پڑھنی شروع کی اور اس کے بعد انگریزی۔ ہندی کا سلسلہ زیادہ نہ چل سکا اس لئے کہ ایک ساتھی دھرم پنڈت سے اس کی پاٹھ شالہ (مکتب) میں جا کر میں پڑھا کرتا تھا مگر گرد و پیش کے ہندوؤں نے شاید اس کو پسند نہیں کیا اور پنڈت جی کو مجبور کر کے یہ سلسلہ منقطع کرا دیا۔ البتہ انگریزی کا مطالعہ جاری رہا۔ ادھر فارسی کی تکمیل ہوئی ادھر میٹرک میں شرکت کی۔ ایف اے اسی زمانے میں پاس کیا جب عربی کی انتہائی تعلیم سے فراغت حاصل ہوئی۔ یہ علم ہی کا ہوکا تھا کہ ان علوم کے پہلو بہ پہلو جو مدارس میں پڑھا علم

کو سند فضیلت حاصل کرنے کے لئے پڑھائے جاتے ہیں میں نے ان فنون کی بھی تحصیل کی جنہیں لوگ عام طور سے نہیں پڑھتے اور جن کے پڑھانے والے اس زمانے میں بھی نایابی کی حد تک کمیاب تھے۔ جیسے ہندسہ، ہیئت، مناظرہ وغیرہ۔ ان علوم کی تحصیل کے لئے مجھے بہت اساطین علم وفضل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑا۔

اس دور کی دوسری قابل ذکر چیز شعروشاعری کا ذوق ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کی شاعری جذبہ کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جس دور سے میں گزر رہا تھا اس میں کوئی ذکی الحس انسان جذبے سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے زیادہ تر اپنے عام شوق علم وادب کی تسکین کے لئے شاعری کی اور اس کی اتنی مشق بہم پہنچائی کہ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنانے لگا۔ ابھی عروج کی ابتدائی منزلوں میں تھا شاید اس لئے اہل ذوق دل کھول کر ایک نومشق کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ جناب ندرت اور حیران جیسے استادوں سے (دونوں مخصوص مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے اور میں دونوں میں شرکت کرتا تھا)۔ داد پا کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ رطب و یابس بھی کچھ کہا۔ کلام میرے پاس محفوظ نہیں اس لئے اس کے بارے میں اب کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ایک روز استاد مرحوم نے بلا کر فرمایا تم شعر کہتے ہو۔ میں نے فخر سے گردن بلند کر کے کہا جی ہاں کہتا ہی نہیں مشاعروں میں پڑھتا اور داد پاتا ہوں۔ استاد نے بڑی شفقت سے ارشاد فرمایا "شعر کہنا برا نہیں لیکن ابھی تم اس قابل نہیں کہ شعر کہہ سکو۔ شعر کے لئے جذبہ بھی چاہیئے اور فن پر عبور بھی۔ تمہارے جذبات خام اور فن سے آگاہی ناتمام ہے۔ پڑھ لکھ کر کامل ہو جاؤ، ذوق رچ جائے، علم میں پختگی اور فکر میں توانائی آ جائے تو شعر کہہ لینا" استاد کے ارشاد کے مطابق میں نے شعر کہنا ترک کر دیا اور جس منزل کا انھوں نے پتا دیا تھا اس کی طرف قدم بڑھا دئے۔ لیکن فن شعر سے آگاہی کی منزل قریب آئی تو جذبات سرد پڑ چکے تھے۔

یہ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے جب میں بیس سال کا تھا۔ ویسے تو یہ عمر جذبات کے سرد پڑنے کی نہیں لیکن جس طرح بعض لوگ بالغ ہونے سے پہلے بالغ ہو جاتے اور بعض جوان ہونے نہیں پاتے کہ بوڑھے ہو جاتے ہیں کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔

شعور کس قدر دیر سے بیدار ہوا تھا شاید اس لئے جذبات جلد سرد پڑ گئے۔ میری زندگی جذباتیت اور عقلیت کی آویزش کی ایک نبردگاہ رہی ہے۔ شعرگوئی سے میرا نثر نگاری کی طرف آنا یہ بتاتا ہے کہ اس مسلسل آویزش میں آخری فتح عقلیت کے نصیب میں تھی۔ مشرقی علوم کی تحصیل اور کسی حد تک تکمیل (کسی چیز کی تکمیل شاید کبھی نہیں ہوتی) ہو چکی تھی لیکن میں ابھی بی۔ اے کا طالب علم ہی تھا اور یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ میری آخری منزل کیا ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز نے "صداقت" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کا ڈکلیریشن داخل کر کے عنان ادارت میرے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ پرچہ کم و بیش ایک سال تک "آب و تاب" کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے چند مخصوص نمبر بھی شائع ہوئے۔ "رئیس التحریر" ہونے کی وجہ سے اس کی ترتیب تنہا میری ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سنجیدہ اور فکاہی شذروں کے ساتھ ساتھ اس کا منظوم حصہ بھی میری ہی کاوشوں کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ یہ پرچہ جب بند ہوا تو مجھے لکھنے کی چاٹ لگ چکی تھی۔ میرا سب سے پہلا نیم علمی اور نیم ادبی مضمون "قتال فی سبیل اللہ" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا جو اس زمانے کے علمی و ادبی پرچوں میں ایک خاص وقار کا حامل تھا اور اس میں کسی مضمون کا اشاعت پذیر ہونا اس امر کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ لکھنے والے میں کم سے کم لکھنے کی صلاحیت ہے۔ یوں تو میں نے ہر اچھے معیاری رسالے میں لکھا لیکن میرے نتائج فکر کو زیادہ تر

"نگار" ہی کے صفحات میں جگہ ملی۔

بی۔ اے کرنے سے پہلے ایک مقامی عربی درسگاہ سے میں نے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ جہاں جز وقتی طور پر فاضل اور کامل کے طلبہ کو انگریزی، فارسی اور عربی پڑھایا کرتا تھا۔ ادب کا کاروبار تو تھا ہی، مذہبی مسائل سے شغل بھی کر لیا کرتا۔ ہمارے شہر میں آریہ سماج نے ایک ڈبیٹنگ کلب قائم رکھا تھا جس کے سالانہ جلسوں میں سماج کے مشہور مناظر بلائے جاتے اور دوسرے مذہب کے علماء سے مختلف موضوعات پر پبلک بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کی نمائندگی ایک مشہور عالم مولوی احمد علی صاحب فرمایا کرتے تھے جو ایک قدیم عربی درسگاہ مدرسہ اسلامی میں صدر مدرس تھے۔ مولوی صاحب غالباً ۱۹۲۳ء میں مدرسہ فتح پوری کے مدرس اعلیٰ ہو کر دہلی تشریف لے گئے۔ اس سال آریہ سماج کے سالانہ جلسے میں مسلمانوں کی نمائندگی جب کوئی عالم نہ کر سکا تو آریہ سماجی چیلنج دے کر نکل کھڑے ہوئے ہر جگہ گئے اور سب سے آخر میں مایوس ہو کر اس درسگاہ میں آئے جس سے میرا تعلق تھا۔ جس وقت یہ مدرس اعلیٰ کے پاس پہنچے میں موجود تھا۔ مولوی صاحب کے معذرت کرنے پر انہوں نے کسی قدر ترشی سے کہا "تعجب کی بات ہے اتنا بڑا شہر، اتنے مدرسے، ایسے ایسے جید عالم لیکن ان میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ وہ ہمارے پنڈتوں سے شاستر ارتھ (مباحثہ) کر کے اپنے دھرم کی سچائی ثابت کر سکے۔" مجھے ان کی یہ تلخ گفتگو سخت ناگوار گذری۔ میں نے کہا: میں تیار ہوں۔ انہوں نے کہا آپ کس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ جو موضوع آپ پسند کریں۔ آخر جیو آتما اور پرکرتی کا اناد تو (روح اور مادے کی قدامت) موضوع بحث قرار پایا اور پوسٹر شائع کر دئے گئے۔ آریہ سماج کے مشہور مناظر پنڈت رام چندر دہلوی کو، جو بہترین مقرر ہی نہیں عربی کے فاضل بھی تھے۔ میرے مقابلے میں رکھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ الھڑ کے مقابلے میں پرانے گھاگ کو رکھنے میں یہ مصلحت تھی کہ انگریزی محاورے کے مطابق ابھرتی ہوئی کونپل کو شروع ہی میں مسل دیا جائے۔ یونانی فلسفے اور ہندسے کا علم میرے آڑے آیا۔ اس بحث کا عامۃ الناس پر کیا اثر ہوا یہ بتانا مشکل ہے لیکن خود پنڈت جی پر، جو چوٹی کے مسلمان اور مسیحی مناظروں (مثلاً مولوی ثناء اللہ امرتسری اور پادری عبدالحق) سے معرکے کی بحثیں کر چکے تھے، یہ اثر ہوا کہ دو گھنٹے کی بحث کے بعد وہ ڈائس سے اتر کر میری طرف آئے۔ بغل گیر ہوئے اور کہنے لگے۔ "میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک انصاف پسند سے معارض ہوا ہوں۔ میں آپ سے آپ کے مکان پر ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنا کچھ وقت دے سکیں گے؟" میں نے کہا "بسر و چشم آپ تشریف لائیے۔" لیکن جلسے کے منتظمین نے شاید اسے اپنی توہین سمجھا کہ ان کا عظیم مناظر ایک غیر معروف مقابل کے مکان پر جا کر اس سے ملاقات کرے۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن پنڈت جی تشریف نہ لائے۔

اس کے بعد متعدد بار مختلف موضوعات پر پنڈت رام چندر اور دھرم بھکشو وغیرہ آریہ سماجی مناظروں سے بحثیں کرنے کے مواقع ملے اور مجھے شدت کے ساتھ اپنی اس کمی کا احساس ہوا کہ میں سنسکرت نہیں جانتا۔ آریہ سماجی مناظر قرآن شریف کی آیتیں مولویوں بلکہ قاریوں کی طرح تلاوت کرتے تھے اور میں ویدوں اور سمرتیوں کے اردو ہندی ترجمے پیش کرتا تھا۔ اس کا عام لوگوں پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوتا تھا اور کبھی کبھی آریہ سماجی مناظر اصل سنسکرت عبارتیں پڑھ کر کہتا تھا کہ ترجمہ غلط ہے۔ اصل عبارت کا مفہوم و مطلب یہ ہے۔ ایک بار ایک بڑے مجمع میں اس پر بحث ہو رہی تھی کہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے اپنی تائید میں منوسمرتی کے ایک بند

دھرم کی ایک مستند کتاب ہے، ایک شلوک کا ترجمہ پیش کیا۔

"پاپ (گناہ) کر کے اگر توبہ کر لی جائے تو انسان پاپ سے چھوٹ جاتا ہے۔" پنڈت جی نے ایک سنسکرت عبارت پڑھ کے کہا کہ اصل میں سنتاپ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو تپ کے سے بنا ہے۔ "تپ" کے معنی ہیں "تپانا"۔ جب تک انسان کو تپایا نہ جائے یعنی سزا نہ دی جائے وہ گناہ سے پاک نہیں ہوتا۔

میں نے ہندی پڑھی تھی۔ سنسکرت مادوں سے اور اصول اشتقاق سے آگاہ نہ تھا۔ پنڈت جی کی یہ تقریر سن کر خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ سنسکرت پڑھوں گا۔ چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لئے ایک پنڈت سے پانچ روپے ماہوار پر سنسکرت پڑھنی شروع کی اور چھ ماہ کے عرصے میں اچھی خاصی مشق بہم پہنچا لی۔ اس کے بعد جب پھر "عفو گناہ" کے موضوع پر پنڈت رام چندر سے گفتگو ہوئی تو میں نے منوسمرتی کا اصل شلوک پڑھ کر کہا "سنتاپ کے معنی "تپانا" نہیں "تپنا" یعنی پچھتانا اور نادم ہونا ہیں اور یہ لفظ عربی "توبہ" سے بہت قریب ہے جس کے معنی ہیں رجوع کرنا۔ اس کے علاوہ میں نے ویدوں کے منتر بھی پڑھے اور اتنی ہی روانی سے پڑھے جتنی روانی سے پنڈت جی قرآن شریف کی آیات قرأت فرمایا کرتے تھے۔

بعض رفقا نے مناظرہ بازی کو میری آخری منزل قرار دیا۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ میری منزل ابھی نہیں آئی۔ کشتی حیات پہناور کائنات کے بحر زخار میں بے پناہ موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں اپنی منزل کا رخ متعین کروں۔ فارسی میں ایم۔ اے کر چکا تھا اور ساری یونیورسٹی میں اول آیا تھا۔ اس کے باوجود کسی اچھے کالج میں معمولی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے بقول شاعر:

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی
کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من

تحصیل علم کو ملازمت کرنے کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا۔ اپنی اس بھول کا احساس مجھے اول اول ۱۹۲۹ء کے بعد اس وقت ہوا جب میں نے کلکتہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔ اے کیا اور پرائیویٹ امیدوار ہونے کے باوجود درجہ اول میں کامیاب ہونے والے طلبہ میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ میں اس خوش خیالی میں مبتلا تھا کہ اب آسانی کے ساتھ مقصود کی دیوی سے ہمکنار ہو سکوں گا اور سفارش کے بغیر مجھے کسی کالج میں لیکچرار کی پیشکش کی جائے گی۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے ایک انٹر کالج کے لئے عربی لیکچرار کی اسامی کا اشتہار شائع ہوا۔ میں نے درخواست دی۔ میرے ہم وطن مولوی محمد علی نے جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ریڈر تھے، درخواست پر سفارش کی غرض سے چند کلمات تحریر فرما دئے تھے۔ جب ملاقات کے لئے الٰہ آباد جانے لگا تو ایک عزیز دوست نے کہا۔ مولانا نامی کا سفارشی خط لیتے جاؤ۔ میں نے کہا سفارش کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی امیدوار میری ہمسری کر سکتا ہے۔ میرے دوست کا خیال درست تھا۔ ایک دوسرے درجے کا ایم اے جو غالباً پرنسپل کا عزیز تھا مجھ سے بازی لے گیا۔

اس ناکامی سے بد دل ہو کر اپنے لئے ایک نئی منزل تلاش کی اور یہ طے کر کے کہ آزاد پیشہ اختیار کروں گا۔ ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ایل ایل بی کے ساتھ ساتھ اپنے ایک عزیز دوست کے اصرار سے جو اس وقت محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ افسر ہیں

ایم اے اردو کے سال اول میں بھی شریک ہوا اور ادھر ایل ٹی کیا۔ ادھر مشہور ماہر تعلیمات مولوی طفیل احمد صاحب کی سفارش سے مجھے اسلامیہ کالج بریلی میں جسے تازہ تازہ انٹر کالج کی حیثیت ملی تھی انگلش ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ اعزہ اور رفقا کی خواہش تھی کہ قانون کی پریکٹس کروں۔ میرا رجحان تعلیمات کی طرف تھا۔ ادب کی دیوی سے جو لو لگی ہوئی تھی اس نے اس رجحان کو ہوا دی اور میں نے یہ سمجھ کر کہ کالج کی ملازمت میں ادب کی خدمت کے مواقع بھی ملیں گے اپنے وطن کو، جس سے اب تک چمٹا ہوا تھا، خیر باد کہا اور اپنے بڑے بچے کو جو مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا روتا چھوڑ کر بریلی روانہ ہو گیا۔

انسان کی زندگی تجربات کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہے۔ یہاں بھی نئے تجربات سے دوچار ہوا۔ جیسے چاؤ سے معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے دل میں ولولے تھے۔ اس لئے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھانا شروع کیا۔ ایک روز میرے ایک رفیق نے جو جغرافیہ کے استاد تھے اچانک دریافت کیا۔ کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کیسا ارادہ؟ میں سمجھا نہیں۔ فرمانے لگے، رہو گے یا جاؤ گے۔ میں نے کہا رہنے کے لئے آیا ہوں۔ کیوں؟ کیا بات ہے۔ کیا کوئی غلطی ہو گئی۔ فرمایا۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ زندہ رہنے کی خواہش ہے یا جوانا مرگ۔ ہنس دیے اور مجھے حیران دیکھ کر فرمانے لگے:

"اگر پڑھانے کا یہی انداز رہا تو تم جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔ اس طرح پڑھاؤ جیسے ہم پڑھاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کلاس میں جاؤ۔ کرسی پر بیٹھ کر اطمینان کا سانس لو۔ عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرو۔ جب کچھ وقت گذر جائے تو آہستہ سے رجسٹر کھولو۔ ادھر سے ادھر تک ایک نظر ڈالو اور پھر ایک ایک لڑکے کا نام پکار کر حاضری لو۔ اس کے بعد دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرکے کسی لڑکے سے کہو کہ قرأت کرے۔ مختصر یہ کہ کم سے کم بولو یہاں تک کہ گھنٹہ بج جائے۔ یہ پڑھانے کا گر ہے جو بے معاوضہ ازراہ شفقت میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر بتا دیا ہے۔

ویسے تو سبھی رفقا ان صاحب کے لفظوں میں شفقت فرماتے تھے لیکن پرنسپل کی اور ان صاحب کی جو وائس پرنسپل تھے مجھ پر خاص نظر عنایت تھی۔ انھوں نے من جملہ عنایات کے ایک عنایت یہ فرمائی کہ نئے منیجر کو جو بلند کردار شریف انسان تھے، میرے خلاف یہ کہہ کر ورغلایا کہ میں پرانے منیجر کا دوست اور ہمدرد ہوں۔ بلدیہ کے انتخاب میں اپنے مکان پر ان کا دفتر قائم کرکے میں نے ان کی مدد کی تھی۔ ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے یہ تمام باتیں بتائیں۔

جیسا کہ میرا خیال تھا بریلی میں ادب و زبان کی خدمت کرنے کے مجھے خاصے اچھے مواقع ملے۔ یہیں میں نے اردو میں ایم اے کیا اور یہیں سے میری پہلی ادبی اور تنقیدی تصنیف "فلسفۂ کلام غالب" شائع ہوئی۔ اس کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ غالب پر ایک تنقیدی مضمون لکھنے کا ارادہ تھا جس کا قومی کتب خانہ کے مالک حافظ خلیل الرحمان صاحب کو کسی ذریعے سے علم ہو گیا۔ وہ ایک روز میرے پاس آئے اور کہنے لگے "مجھے ادبی کتابیں شائع کرنے کا شوق ہے جسے عرصے سے دل میں چھپائے بیٹھا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ ادیبوں سے فرمائش کرکے اپنی خواہش اور نظام کے مطابق اچھی معیاری کتابیں لکھواؤں اور انھیں پاکیزہ و ستھری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کروں۔ سنا ہے آپ غالب پر کوئی طویل مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اگر طویل تر بنا کر اسے ایک رسالے کی شکل دے دیں تو کیا ہی اچھا ہو۔" حافظ صاحب نے یہ بات کچھ ایسے پرخلوص اور موثر انداز میں کہی کہ غالب پر کتاب لکھنے

گا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ غالب جیسے ہمہ گیر شاعر پر مستقل کتاب لکھنے میں مجھے کن دشوار گذار راہوں سے گذرنا پڑے گا۔ وعدے کا تو پاس تھا ہی۔ حافظ صاحب کے پیہم تقاضوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز تھیلے میں انڈے بھر کر آ دھمکتے اور یہ کہہ کر پیش کش قبول کرنے پر اصرار فرماتے "میں نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ یہ تازے انڈے ہیں۔ سوچا کچھ آپ کو بھی پیش کر دوں۔ انڈے کھائیے۔ ان میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی" چلتے وقت یہ بھی ضمناً دریافت کر لیتے کہ کتاب کا مسودہ اب کس منزل میں ہے۔ غرض یہ کہ انڈے کھلا کھلا کر حافظ صاحب نے "فلسفۂ کلام غالب" لکھوائی اور اسے اپنے اشاعت گھر سے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ اس کا انہیں افسوس رہا کہ ان کے معیار کے مطابق اس کی کتابت و طباعت نہ ہو سکی۔

میں نے پورے تین سال اسلامیہ کالج میں گذارے۔ اس عرصے میں ادبی مقالے بھی لکھے، پڑھایا بھی اور یہ بھی دیکھا کہ سیاسی جوڑ توڑ کیا ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ میں نے ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا اس میں شرکت نہیں کی۔ ساحل پر بیٹھا موجیں گنتا رہا۔ ان سے گتھ جانے کی ہمت مجھ میں نہ اس وقت تھی نہ آج ہے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں اپنے شہر کی مشہور درسگاہ میرٹھ کالج میں، (جہاں میں ایک طالب علم رہ چکا تھا) اردو کا استاد ہو کر چلا آیا۔ اس سلسلے کا یہ واقعہ اگر نام لئے بغیر بیان کروں تو شاید بے جا نہ ہو۔ بریلی میں پہلے سال مجھے انٹرمیڈیٹ کی عربی پڑھانے کیلئے دی گئی۔ عربی کے استاد کا مشاہرہ اردو کے استاد کے مقابلے میں کم ہوا کرتا تھا۔ میں نے درخواست کی کہ میں اردو میں ایم۔ اے (درجہ اول میں) کر چکا ہوں۔ اس لئے مجھے اردو کا استاد بنایا جائے ورنہ سبکدوش کر دیا جائے۔ اردو کے استاد، جو ایک مشہور ادیب ہیں، فارسی میں ایم۔ اے کر چکے تھے اور ان دنوں اپنے ایک رفیق کے ایما سے اردو میں شریک ہو رہے تھے۔ نتیجہ آیا تو درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔ بہر حال یا تو اس لئے کہ وہ درجہ دوم میں کامیاب ہوئے تھے یا اس وجہ سے کہ کالج مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مجھے اردو کا استاد بنا دیا گیا اور ان صاحب کو اسسٹنٹ ماسٹر کی اسامی پر لوٹا دیا گیا۔ اس فیصلے سے ناخوش ہو کر وہ مستعفی ہو گئے۔

یہ ردوبدل اس نئے منیجر نے کی تھی جن کا ذکر سطور بالا میں کر چکا ہوں۔ جب اس فرشتہ خصلت انسان کو اس کا علم ہوا کہ میرا تقرر میرٹھ کالج میں ہو گیا اور میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں تو بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے۔ "میں نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جگہ دی اور ان صاحب کو (نام لے کر) ناخوش کر دیا۔ اس پر بھی تم ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔" یہ کلمات انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہے۔ میں بھی پسیج گیا۔ میں نے کہا۔ اگر آپ کو میرے جانے سے دکھ ہوتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن آپ یہ دیکھیں کہ میرٹھ میرا مولد و منشا ہے اور میرٹھ کالج شمالی ہند کا سب سے بڑا پوسٹ گریجویٹ (جہاں ایم۔ اے کی تعلیم ہوتی ہے) کالج ہے۔ اس کے علاوہ بریلی کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ میں اکثر ملیریا کا شکار رہا ہوں۔" میرا یہ عذر معقول مسموع ہوا۔ منیجر صاحب نے نہ صرف یہ کہ برضا و رغبت اجازت مرحمت فرمائی، پرنسپل کو ہدایت بھی کی کہ وہ مجھ سے درخواست لے کر ایک سال کی بلا تنخواہ رخصت دے دیں۔

میرٹھ کالج کے تقریباً پونے دو سو اساتذہ میں سے کل آٹھ استاد مسلمان تھے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک چار ہنگامہ پرور سال میں نے اسی درسگاہ میں گذارے۔ میرا تعلق شعبہ اردو سے تھا جس پر قیام پاکستان کے بعد بجلی بڑی زور کی

اکثر ایم۔ اے کے طالب علم تعلیم چھوڑ کر پاکستان چلے آئے جو رہ گئے وہ اپنے تئیں خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ دلچسپ ہے اور عبرت خیز بھی۔ اسے بیان کرتا چلوں کالج کے اساتذہ نے آزادی کی تقریب میں ایک جشن منعقد کیا۔ طے پایا کہ اس میں آزادی سے متعلق اردو ہندی نظمیں پڑھی جائیں۔ میں تو علم کے زور سے شعر کہہ لیتا تھا۔ میرے ایک رفیق کار شعر پڑھ تو سکتے تھے کہنے پر قادر نہ تھے۔ میں نے اس موقع کے لئے ایک نظم کہی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ دوسرے کی چیز پڑھ دیں بات بن جائے گی اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ انہوں نے کسی دوسرے کے مال پر دست تغلب دراز کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنی نظم سنائی۔ انہوں نے لہک لہک کر دوسرے کا کلام پڑھا۔ یہ مرحلہ تو گذر گیا لیکن اس کے بعد جو منزل آئی اس نے مجھے بھی پریشانی میں ڈال دیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جشن آزادی کی تمام نظمیں اور کوتائیں کالج میگزین کی خصوصی اشاعت میں چھاپی جائیں دوسرے کی نظم پڑھی جا سکتی تھی۔ میگزین میں چھاپنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ راز کے طشت از بام ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ میں نے حکمت عملی سے کام لے کر اپنی نظم دے دی۔ ان کی غائب کر دی۔

اس زمانے میں اردو ہندی ہندوستانی نزاع ابھر کر سامنے آیا جس کی وجہ سے میری زبان کے مسئلوں سے غیر معمولی دلچسپی بڑھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک طویل مقالہ لکھ کر پروفیسر اکیڈمی میں پڑھا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اردو قدرتی زبان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی غیر فطری اور مصنوعی ہے۔ اردو متحدہ قومیت کا مظہر ہے ہندی سے گھناؤنے تعصب کی بو آتی ہے۔ ثبوت یہ پیش کیا گیا کہ اردو میں جو الفاظ سنسکرت کے ہیں وہ پراکرت کی راہ سے آئے ہیں۔ ان کی تاریخ ہے۔ جو عربی و فارسی سے لئے گئے وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں۔ مسلمان جب ہندوستان آئے تو بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے اردو تہی مایہ تھی۔ علمی الفاظ کا سرمایہ ادبی ضرورتوں کی کفایت نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں نے عربی و فارسی الفاظ دے کر زبان کو سرمایہ دار اور باثروت بنایا۔ اب ہندی والے پراکرتی ذخیرے کو سنسکرت کی طرف لوٹا کر الٹی گنگا بہانا چاہتے ہیں۔ یہ ہندی کے غیر فطری ہونے کی علامت ہے۔ اور عربی و فارسی الفاظ کو بدیشی قرار دے کر ان کی جگہ خالص سنسکرت الفاظ ٹھونسنا اس امر کی دلیل ہے کہ ہندی والے زبان کی حد تک بھی دو قومی اتحاد کے قائل نہیں۔ یہ مضمون مدلل تھا۔ اس کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ ایک صاحب نے جو انگریزی پڑھاتے تھے مجھے الگ جا کر کہا: "تمہاری باتیں سب درست ہیں لیکن قیام پاکستان سے جو نئے حالات پیدا ہوئے ان میں کوئی یہ باتیں ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ تم دماغ سے اپیل کرتے ہو۔ لوگ دل سے کام لیتے ہیں۔ یہ عبوری دور ہے اسے گذر جانے دو۔ پھر کہنا ہم شوق سے سنیں گے۔"

زبان کے مسائل سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے اردو زبان کی تاریخ پر پورے انہماک کے ساتھ کام شروع کر دیا اور لگاتار چھ ماہ تک دن رات کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ کچھ سماجی کام بھی کئے۔ تقسیم کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں جو پے بہ پے بلوے ہوئے ان سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور انہوں نے بے سرو سامانی کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ یہ انتشار و اختلال کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سماجی زندگی کی طنابیں اکھڑ چکی تھیں۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ مسلمانوں کے سماجی مسائل سے میری دلچسپی کو میرے ہندو ساتھیوں نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ جو ہمدرد تھے انہوں نے پند کے طور پر سمجھایا اور جو مخالف تھے انہوں نے کھلم کھلا دھمکایا۔ اس کے باوجود میں ۱۹۵۰ء

تنگ ہمت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں میں نے ڈھاکے کا رخ کیا۔ میرے ایک عزیز دوست جو سماجی کاموں میں میرے شریک رہے تھے اس وقت جیل میں تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے فرمایا۔ آپ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ کچھ دن اور ٹھہر جائیے میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو سمجھا کر اور یہ وعدہ کر کے کہ جب ڈھاکے سے اپنے اہل و عیال کو لینے آؤں گا تو آپ کو بھی ساتھ لے چلوں گا ڈھاکے روانہ ہو گیا۔ ایک ماہ بعد جب واپس گیا تو وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں ترک وطن نہیں کرنا چاہئے۔

ڈھاکے میں ادبی کام کے لئے بڑا وسیع میدان تھا۔ ایک طرف اردو کے بارے میں مقامی باشندوں کے دلوں میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں جنہیں مجھے اور میرے رفقائے کار کو دور کرنا تھا۔ دوسری طرف اردو والے غفلت کی گہری نیند میں پڑے تھے۔ انہیں جھنجھوڑ کر جگانا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں مولوی عبدالحق صاحب ڈھاکے تشریف لے گئے۔ ان کی صدارت میں ایک عام ادبی جلسہ ایک پنڈال میں منعقد کیا گیا۔ آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر اردو کی طرف سے امیدیں بندھیں جو جلد ہی ٹوٹ گئیں۔ کسی کی نظر لگی یا کیا ہوا ہم جتنا کچھ اردو کے لئے کرتے اس کا الٹا اثر ہوتا۔ میں دیکھتا تھا کہ کچھ نادیدہ ہاتھ ہیں جو ہمارے بنے بنائے کھیل کو بگاڑ رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں اردو تحریک کے بارے میں باہر کے لوگ مختلف النوع غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور خاصے اچھے پڑھے لکھے اہل قلم بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کو الزام دیتے ہیں کہ پاکستان میں اردو کی تحریک جس طرح چلائی گئی اس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو شکست ہوئی اور وہ اردو کے مخالف ہو گئے۔ یہ درست نہیں۔ میں نے مشرقی پاکستان کے حالات کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور میں ان نادیدہ ہاتھوں کو پہچانتا ہوں جنہوں نے یہ کھیل بگاڑا۔ لیکن ابھی انہیں بے حجاب کرنے کا وقت نہیں آیا۔

وہ جو کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ڈھاکے پہنچتے ہی شدت کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میں اس ماحول میں کوئی کام نہ کر سکوں گا۔ میں نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کو لکھا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔

”آپ کے حالات سن کر مجھے بہت قلق ہوا اور اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے تو رنج ہوتا ہے۔ مجھے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے اخلاق اتنے کیوں گر گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ افلاس اور جہالت بہت سے جرائم کا باعث ہوتی ہے لیکن اچھے خاصے خوش حال تعلیم یافتہ لوگ رکشا والوں کی سی حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ زیادہ مایوس اور ملول نہ ہوں۔ ایک وقت آئے گا کہ ناانصافیوں کی تلافی ہو کر رہے گی۔“

مولوی صاحب کے ان الفاظ سے میرے ذاتی حالات کا جنہیں پوست کندہ بیان کرنے کے لئے ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا، خفیف سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر مولوی صاحب نے لکھا:

”آپ کی ڈھاکے سے بیزاری بے جا نہیں۔ آپ کو جن سے شکایت ہے ایسے لوگوں کی ہم میں کمی نہیں۔ اس بدنصیب قوم میں ابن الوقت اور غدار بے طلب اور بلا معاوضہ مل جاتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس صحبت ناجنس سے جلد نجات مل جائے گی۔“

یہ مولوی صاحب نے ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا۔ صحبت ناجنس سے نجات پانے کے لئے مجھے پورے سات سال اور انتظار کرنا پڑا۔

اس مدت میں میرے دو معمول رہے۔ ایک تو اصول کے معاملے میں میں نے سمجھوتا نہیں کیا۔ انسان ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر اپنے میں لچک پیدا کر سکتا ہے لیکن دب نہیں سکتا۔ لچک عارضی ہوتی ہے اس کا مقصد ہوتا ہے موقع پاکر ابھرنا۔ مستقل طور سے حالات کے سامنے جھک جانا دبنا ہے۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

ڈھاکے کی ملازمت کے دوران میں نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میرٹھ میں اردو ہندی مسئلے پر بیباکی کے ساتھ نڈر ہو کر اظہار خیال کیا تھا۔ ڈھاکے میں اردو بنگلا نزاع پر ایک مفصل اور کسی قدر تیز مقالہ لکھ کر مولوی صاحب کو بھیجا جو "قومی زبان" میں شائع ہوا۔ مولوی صاحب نے اس مقالے کی بابت مجھے ایک خط میں لکھا:

"آپ کا مضمون پہنچا، خوب لکھا ہے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی ہمت پر آفریں ہے کہ یونیورسٹی کے ملازم ہوتے ہوئے آپ نے صاف صاف اور سچی باتیں لکھ ڈالیں اور بہت موثر پیرایہ میں لکھیں۔"

دوسرے برابر علمی تحقیق میں لگا رہا۔ اردو زبان کے ارتقا پر میرٹھ میں جو تحقیقی کام میں نے کیا تھا وہ نامرتب اور کسی قدر نامکمل حالت میں تھا۔ اس پر نئے مواد کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت تھی چنانچہ نظر ثانی کے بعد میں نے اسے ترتیب دیا اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے طور پر پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی مجھے بہت سے ابتدائی دوروں سے گزرنا پڑا جن کا بیان تلخی اور ناگواری سے خالی نہیں۔ اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں مجھے ڈگری ملی۔ مقالے کی طبع و اشاعت کے لئے مزید تین سال انتظار کرنا پڑا۔ مولوی صاحب انجمن سے اس کو شائع کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے مجھے لکھا بھی تھا لیکن اتفاق سے مولوی صاحب کا یہ خط مجھ تک نہ پہنچا اور مقالہ پاک کتاب گھر ڈھاکے سے ۱۹۵۸ء میں "اردو زبان کا ارتقا" کے نام سے شائع ہوا۔ مولوی صاحب کو جب اس کا علم ہوا کہ مقالہ ڈھاکے سے شائع ہو رہا ہے تو تحریر فرمایا:

"میں نے اپنے کسی خط میں آپ کے مقالے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ میرے دریافت کرنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یونیورسٹی شائع کرنے پر آمادہ نہ ہو تو انجمن کی طرف سے شائع کیا جائے۔ اس میں آپ کو کچھ معاوضہ بھی مل جاتا۔ اب یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اسے اپنے اہتمام سے شائع کر رہے ہیں۔"

"اردو زبان کی داستان" لکھ کر میں نے اس کی تلافی کرنی چاہی۔ لیکن کتاب مولوی صاحب کو اس وقت موصول ہوئی جب انجمن کے حالات خراب ہو چکے تھے۔ اور وہ اس کو چھاپنے سے معذور تھے۔ مولوی صاحب نے "اردو" کی ایک اشاعت مخصوص کر کے پوری کتاب چھاپ دی۔ اس کے بعد انجمن کے حالات روبہ اصلاح ہوئے تو سب سے پہلے میری کتاب، جس میں دو ابواب بعد میں اضافہ کئے گئے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں "داستان زبان اردو" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب سال کی بہترین تصنیف قرار پائی اور مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے پہلے انعام سے سرفراز کیا۔

مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق میں نے اپنے تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دے کر مولوی صاحب کو بھیجا تھا جو انجمن کی ابتری کے باعث انجمن سے شائع نہ ہو سکا اور مجبوراً ایک دوسرے ناشر کو دے دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنے ایک خط میں اس کا

ذکر بھی کیا ہے۔

"آپ کے مجموعۂ مضامین کی کتابت ہو رہی ہے۔ انجمن کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے انجمن سے میں شائع نہ کر سکا۔ ناچار ایک ناشر کو طبع کے لئے دینا پڑا۔ وہ اس کی کتابت کرا رہے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ جلد شائع ہو جائے۔"

یہ مجموعہ مولوی صاحب کی وفات کے بعد مکتبۂ اسلوب، کراچی سے "نئی پرانی قدریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

مولوی صاحب میرے حالات سے آگاہ تھے ہی اس لئے برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مجھے کراچی بلالیں۔ اس کا ذکر مرحوم نے اپنے متعدد خطوط میں طرح طرح سے کیا ہے۔ کبھی تحریر فرماتے ہیں "میری بڑی تمنا ہے کہ آپ یہاں آجائیں"۔ کبھی لکھتے ہیں: "آپ کو صحبت ناجنس سے جلد نجات مل جائے گی"۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے: "آپ یہاں آجائیں تو انجمن کے کام میں آپ سے بہت مدد ملے گی۔ میں اکیلا ہوں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں"۔ کبھی پیش گوئی فرماتے ہیں: "ایک وقت آئے گا جب ان سب ناانصافیوں کی تلافی ہو کے رہے گی"۔ آخر ۵۵ء کے شروع میں وہ وقت آ ہی گیا۔ "ترقی اردو بورڈ" میں اردو کی جامع تاریخی لغت کے مدیر کی اسامی پر تقرر کرا کر مولوی صاحب نے لکھا:

"میں نے آپ کو اپنا ایک ایڈیٹر تجویز کیا اور گفتگو کر کے منظور کرا لیا۔ تنخواہ کے متعلق آپ کچھ فکر نہ کریں وہ آپ کے حسب منشا منظور کرائی جائے گی۔ یہ محض اطلاع کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ باضابطہ اطلاع آپ کو بعد میں بورڈ کی طرف سے دی جائے گی۔"

باقاعدہ اطلاع ملنے پر میں نے یونیورسٹی سے دو سال کی رخصت طلب کی لیکن چھ ماہ کی بدقت اجازت ملی۔ مولوی صاحب کو خبر ہوئی تو لکھا: "آپ چلے آئیے۔ دیکھا جائے گا۔ وہاں کوئی کرم فرما معلوم ہوتے ہیں۔" ڈھاکے سے رخصت ہونے لگا تو عزیز شاگردوں نے محبت اور خلوص سے وداعی پارٹی دی۔ اور جیسا کہ عام دستور ہے اپنے استاد کے بارے میں کچھ تعریفی کلمات کہے۔ ایک عزیز شاگرد نے جوش میں آ کر یہ بھی کہہ دیا: "ہمیں آپ کا بدل نہ ملے گا۔" اس پر میرے ایک کرم فرما جن کا میں نے ہمیشہ احترام کیا تھا کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: "مجھے اس سے اختلاف ہے۔ کیا ان کے آنے سے پہلے شعبے کا کام نہ چلتا تھا۔ جس مسجد میں مؤذن نہیں ہوتا کیا وہاں اذان نہیں ہوتی؟" وغیرہ وغیرہ۔ میرے کرم فرما نے صحیح ہی کہا تھا۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

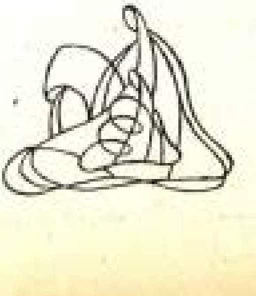

لطیف الدین احمد

صاحب وجناب!

بعد تسلیم نیاز اس القاب کی بخشش کا شکریہ قبول فرمایئے۔

آپ کی جرأت بیجا کی تو قسم کھانا پڑتی ہے۔

گزشتہ مراسلے کے ساتھ آپ کی تحریری فرمائش بھی ملی اور معلوم ہوا کہ آپ نے ایک اور راہ نکالی ہے۔ اس دفعہ آپ "آپ بیتیاں" لکھوا رہے ہیں اور اس محفل درویشاں میں مجھے بھی بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی خاطر عزیز ہونے کے باوجود مجھے آپ کو مایوس کرنا پڑ رہا ہے جس کا قلق بھی ہے اور ہر چند عذر بدتر از گناہ بتایا گیا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس گناہ کا ارتکاب بھی کرنا چاہیے ورنہ آپ کی تسکین کیسے ہوگی!

پہلی بات تو آپ یہ سمجھئے کہ میری "بیتی" عام انسانوں کی بیتیوں سے مختلف نہیں ہے اور میں اُن بے حد و حساب انسانوں میں سے ایک ہوں جو پیدا ہوتے اور زندگی کی جد و جہد کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اب کون بتائے کہ اُن ان گنت انسانوں میں ایسے بھی ہوں گے جن کو اگر سازگار حالات میسر آ جاتے تو ان کا جوہر قابل اُبھر سکتا تھا! بہر حال اگر یہ بے شمار "بیتیاں" اَن کہی رہ سکتی ہیں تو میری "بیتی" جس کے اندر کوئی خصوصیت نہیں، جس میں کوئی انوکھی نہیں ہے کوئی کیوں سنے! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری بیتی اگر بے کہی رہ گئی تو اردو ادب یا کہئے کہ نوع انسان کا مطلق کوئی نقصان نہ ہوگا۔

قدرت کی ایسی ستم ظریفی اس زندگی میں حائل اور دوسری بات یہ ہے کہ معاش کا حیلہ محنت مزدوری ٹھہرا، لگاؤ ہو گیا ادب سے اور شغف رہا عصری سیاست میں! اندازہ فرمائیے کہ جس زندگی میں ایسے متضاد رجحان جمع ہو جائیں اس میں کوئی خصوصیت پیدا ہو بھی کیسے سکتی ہے! اور لوگ اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی اس کے سننے میں کیوں ضائع کریں۔

بلاشبہ آپ کی دعوت پر بہت سی "بیتیاں" وجود میں آ جائیں گی اور انہیں باوقعت یا دلچسپ بنانے کی پوری کوشش بھی کی جائے گی! مگر وہ کیا کرے جسے اپنی "بیتی" قابل اعتبار خصوصیت سے معرّا اور قابل ذکر ندرت سے محروم نظر آئے اور اپنی بیتی کو باوقعت یا دلچسپ بنانے کا فن بھی نہ جانتا ہو؟

میں سمجھ رہا ہوں کہ فن نہ جاننے کا فقرہ پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ جائے گی اور آپ دل میں کہیں گے بھی کہ یہ شخص مجھے بنانے کی کوشش کر رہا ہے یا شاید آپ کا کریمانہ اخلاق آپ کو ایسا خیال نہ کرنے دے مگر مجھ پر بے جا انکسار کا الزام لگانے سے روکے گا بھی نہیں۔ آپ یہ خیال ضرور کریں گے کہ جو شخص ایک مدت سے قلم گھستا چلا آ رہا اور اتنے سارے افسانے

لکھ چکا ہے اور اگرچہ لکھنے پر تو دسترس نہیں مگر جو لکھ لکھ کر اس کی نشر و اشاعت کی جسارت بھی کرتا رہا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ فن نہیں آتا، صاف ظاہر ہے یہ شخص اگر بنا نہیں، رہا تو بن ضرور رہا ہے!

اب اگر میں اس الزام کو دھونا چاہوں تو مجھے اپنی اس "جسارت" کی وضاحت کر دینا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا سنئے۔ اس اعتبار سے میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ میرے تمام دوست احباب شاعر اور ادیب ہیں۔ مقدر نے ہمیشہ میرے لیے اہلِ علم و ادب کی صحبت کے مواقع مہیا کیے۔ میرے ان دوستوں میں سب سے پہلے ضیاء عباس ہاشمی کا نام آتا ہے جو اپنے دوستوں میں ضیائی کہے جاتے ہیں۔ ضیائی کو ڈراما سے خاص اور گہرا لگاؤ ہے۔ یہ ایک حسرت ناک ماجرا ہے کہ ان کا یہ جوہرِ قابل عملی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ غرض میں نے فوز کی "وارزخ" پڑھی تو آرزو ہوئی کہ ضیائی اس کی مثنویوں کو اردو ڈراما میں منتقل کر دیں۔ انھوں نے یہ شرط لگا دی کہ میں اگر پہلے نثر میں ترجمہ کر دوں تو وہ اسے ڈراموں کا جامہ پہنا دیں گے۔ چنانچہ میں نے ترجمہ کیا جو شاید ہشتم یا نہم میں مکمل ہو پڑا تھا۔ کیونکہ ضیائی اس طرف توجہ نہیں دے سکے تھے۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ آپ ضرور واقف ہوں گے کہ شاہ دستگیر اکبرآبادی مدیر "نقاد" بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور اپنے ذوق کی تسکین ہی کے لیے "نقاد" نکال رہے تھے۔ نیاز صاحب کو منظرِ عام پر لانے کا فخر دستگیر یا "نقاد" کو حاصل ہے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ نیاز صاحب نے تصنیف و تالیف کو معاش کا وسیلہ قرار دے لیا تھا۔ شاہ دستگیر نیاز صاحب کے مضامین بامعاوضہ شائع کرتے تھے۔ "نقاد" کو بند ہونا تھا اور جب وہ بند ہو گیا تو اردو کا اور کوئی ماہنامہ ایسا نہ تھا جو بامعاوضہ مضامین شائع کر سکے۔ اس وقت "مخزن" لاہور سے بیدل شاہجہان پوری کی ادارت میں نکل رہا تھا اور اس کی حالت ردی ہو چکی تھی پھر بھی بیدل صاحب نے نیاز صاحب کے دو تین مضمون قلیل معاوضہ دے کر شائع کیے۔ ان میں ایک مضمون کا عنوان "بدحواسیاں" تھا۔

اس مضمون کو پڑھ کر ضیائی نے اپنے دوستوں کو متوجہ کیا کہ اگر کوئی معیاری رسالہ ایسا نہیں نکلتا جو معاوضہ بھی دے سکے تو نیاز کا جوہرِ قابل مٹی میں مل کر رہ جائے گا اور یہ اردو ادب کے لیے ایک سانحہ ہوگا۔ ضیائی کے دوستوں کا پورا حلقہ نیاز کی انشا کا دلدادہ و شیدا تھا۔ اس تجویز پر سب آمادہ ہو گئے کہ ایک رسالہ نیاز صاحب کی ادارت میں نکلے اور سب دوست ایک مقررہ رقم ماہوار اس وقت تک ادا کرتے رہیں جب تک ضرورت باقی رہے، اور ایسا ہی ہوا بھی۔

چنانچہ "نگار" جاری ہوا اور نیاز صاحب نے "لاارزخ" قسطوں میں شائع کی اور یہ شرط بھی لگا دی کہ نگار کے یہ معاون مضمون بھی لکھا کریں۔

اب آپ سمجھے، وہ صورت اگر پیدا نہ ہو جاتی تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ میں نے وہ "جسارت" کبھی نہ کی ہوتی لہٰذا میں اگر ہوں تو مارے باندھے کا ادیب ہوں! اور اب کہ میں نے یہ الزام اپنے سر اوڑھ لیا ہے تو ایک اور بات سنا دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے۔

"یارانِ نجد" میں محمود اکبرآبادی سب سے کم عمر ہیں۔ اس وقت وہ قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک صحبت میں انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو اسی برس کی عمر کو پہنچ کر کہنے کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ جب کسی عمارت کا بننا قرار پاتا ہے تو زمین کی پیمائش ہوتی ہے، نقشہ بنایا جاتا ہے، نیو کھودی اور پھر بھری جاتی ہے۔ اردو کے قصرِ ادب کی تعمیر کے یہ مرحلے قدما طے کر گئے ہیں۔ موجودہ نسل کے ادیب ان مزدوروں کا درجہ رکھتے ہیں جو اینٹ پہنچاتے اور پتھر ڈھوتے ہیں۔ ہم لوگ ان مزدوروں سے قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ تعمیر مکمل ہو جانے پر جن انجینیروں اور معماروں نے اس کی تزئین کی ہوگی نام ان کا ہوگا مگر اس گمنام مزدور کی اہمیت قائم و دائم ہے جس نے اینٹ مسالا ڈھویا تھا۔ محمود صاحب

کا یہ فیصلہ میرا تو عقیدہ ہی بن گیا ہے۔

اس سے کون انکار کرے گا کہ نفسِ انسانی ایک لاینحل معمّہ ہے اور انسان کے ہر فعل و عمل کی متعدد اور مختلف تعبیریں ممکن ہیں اسی بنا پر میری دانست میں جب یہ فرمائشی آپ بیتیاں لکھی جائیں گی تو خواہی نخواہی خود نمائی کے پہلو در آئیں گے۔ لکھنے والا آخر انسان ہی تو ہوگا اور وہ بھی اس زمانے کا!

میرے اس خیال کو آپ حقیقت کی روشنی میں پرکھئے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں اپنی ہر بات کو صحیح اور ہر فعل کو درست سمجھتے ہیں اور جب ہمارے کسی قول یا فعل کی خامی برملا ہو کر نظر آتی ہے تو اس وقت ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم اس غلط قول یا فعل کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ اسے آسانی سے انسانی فطرت کہہ دیا جائے گا مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ تو اب آپ سوچئے کہ ایسی آپ بیتیاں جو خود نمائی کے جذبے کے تحت وجود میں آئیں گی اور جن میں خود ستائی کے بہت سے پہلو نکلیں گے ان کی ادبی اور اخلاقی قدر کیا اور کیسی ہوگی؟ گزشتہ چند سالوں میں ایسی "بیتیاں" لکھی گئی ہیں ان کو اس زاویۂ نظر پر پڑھئے کہ "نمائش" کا کون سا پہلو چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف کیا آپ نہیں مانیں گے کہ روزنامچے یا آپ بیتیاں بالعموم بصیغۂ راز وجود میں آتی ہیں اور ایک اعتبار سے ان کی صورت الہامی سی ہوتی ہے۔ الہامی سے میری مراد بس اتنی ہے کہ لکھنے والا اپنے بطون کے تقاضے سے لکھتا ہے، واہ واہ سننے کے لیے نہیں لکھتا — اور چونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے آتی بھی تو اس وقت آئے گی جب وہ خود اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا اس لیے وہ اپنے جذبات و محسوسات کامل مخلصانہ طور پر بلا کم و کاست قلمبند کر دیتا ہے۔

معلوم نہیں آپ اس سے متفق ہوں گے یا نہیں مگر میرا خیال ہے کہ جو تزک یا سوانح عمری آئندہ نسلوں کے لیے شمعِ ہدایت بن سکتی ہے وہ ایسی ہی ہستی کی ہو سکتی ہے جسے قدرت نے فقید المثال ذہن و ذکا بخشا ہو اور جس کا اخلاق کردار ایسا ہو جسے "فوق بشر" کہا جا سکے۔ آپ اگر موجودہ معاشرے پر اس تلاش میں نظر دوڑائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ نظر نامراد پلٹے گی اور یہ صورتِ حال اس وجہ سے ہے کہ ہم میں قحط الرجال ہے۔ علمیت کے درخت عنقا ہیں اور کمیت کے ارنڈ درخت پھیلے اور اُگے جا رہے ہیں۔ میں اسے بشدت مانتا ہوں کہ اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لیے خلوصِ مقصد کا ہونا شرطِ اوّل ہے — اور اُردو ادب کی دنیا میں تصنع اور آورد کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ایسی آب و ہوا میں نہ علم کا پودا جڑ پکڑ سکتا ہے نہ خلوصِ مقصد پاؤں ٹکا سکتا ہے۔

بلا ارادہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن ایک اہم نکتہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ بالفرض ان آپ بیتیوں کے ذریعے سے ہمارے بعض اساطینِ ادب کو حیاتِ جاوید مل گئی تو جن کو اب سے پہلے مل چکی تھی وہ کیوں مر گئے؟ باور کیجئے ہمارے حافظے میں ایسی چند ہی ہستیوں کے نام ہیں ورنہ وہ کتابیں بھی بھلا دی گئی ہیں جن میں وہ ہستیاں امر کی تھیں۔

آپ شاید مجھے بے عملی کا شکار سمجھیں گے مگر یہ واقعیت نہ ہوگی۔ بر سرِ عمل رہنا انسان کی فطرت ہے اور اس کی خواہش بھی

یہ تخریب و تعمیر کا قانون ایک لمحہ کے لیے معطل نہیں ہوتا۔ بہت سے کرم مٹتے ہیں تو ایک بہتر وجود پیدا ہوتا ہے۔

اب چونکہ انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری عمل اور نوعِ انسان کی ترقی کی ضمانت بھی ہے۔ مجھے اتنی اجازت تو ہو کہ میں کسی مفید کام کو بھی لاحاصل سمجھ لوں اور کہہ بھی سکوں! آپ کی اطلاع کے لیے لکھتا ہوں کہ میں پڑھتا رہتا ہوں اور کم نہیں پڑھتا پڑھتا البتہ ادبی یا تنقیدی کتابیں ہوں۔ اس پڑھنے کا اثر میرے اوپر تو یہ ہے کہ اکثر خیال گزرتا ہے کہ گزشتہ زندگی جہالت میں گزری! اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ ایسے آدمی کی "بیتی" سننے میں کسی کو کیا مزا آئے گا اور اس سے کون فائدہ اٹھا سکے گا۔ اس ساری سمع خراشی کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ میرا عذرِ گناہ بخش دیں۔

والسلام!

لطیف الدین احمد

سید مسعود حسن رضوی ادیب

میرا نسبی تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے جس کے مورثِ اعلیٰ ایران کے مشہور شہر نیشاپور سے آکر ہندوستان آباد ہو گئے تھے۔ میرے اجداد ذی عزت اور خوش حال تھے۔ شاہی زمانے کے کچھ سرکاری کاغذ میرے پاس ہیں جن میں میرے والد کے دادا سید عزیز علی اور سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے، جو مضافات لکھنؤ میں واقع تھی۔ یہی کاغذ بتاتے ہیں کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ اور سید محمد دونوں بادشاہ کے "چوکی خاص" میں سے تھے اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے اور والد سید عبدالمطلب "منصب دار چوکی خاص" تھے اور پانصدی ذات کا منصب، پچاس روپیہ نقدی اور ایک لاکھ چھتیس ہزار دام کی جاگیر پرگنہ ملیح آباد وغیرہ میں ان کی تنخواہ قدیم سے مقرر تھی۔ وہ عظیم آباد کے سفر میں ابتدا سے بادشاہ کے ہم رکاب تھے اور ان کو دو روپیہ یومیہ چوتھا شاگرد پیشے سے ملتا تھا۔ ان کا انتقال شاید اسی سفر کے اثنا میں جھوسی کے مقام پر جب محمد شاہ یہیں ہو کر ہوا۔ سید عزیز علی نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کر کے یہ درخواست کی کہ موضع چندولی بزرگ علاقہ پرگنہ ... سرکار لکھنؤ جس کی جمع تشخیصی پانچ سو روپیہ ہے، انعام التمغا میں میرے اور سید عبدالمطلب کے دوسرے متعلقین کے نام مرحمت فرمائی جائے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس درخواست پر کیا حکم صادر ہوا، لیکن کئی اور کاغذوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ موضع چندولی بزرگ میں سید عبدالمطلب پچاس بیگھے کے اور سید عزیز علی ستر بیگھے کے امیدوار تھے۔ سید عزیز علی کے ماموں، رفعت پناہ عبداللہ بیگ، ولد مرزا بیگ بھی منصب دار چوکی خاص و جاگیر دار موضع چندولی بزرگ تھے۔ ایک کاغذ پر ان کی مہر ہے، جس میں یہ الفاظ درج ہیں: "عبداللہ بیگ فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۲ھ" خود سید عزیز علی بھی نواب صفدر جنگ صوبہ دار اودھ کے عہد میں منصب دار چوکی خاص تھے، ان کا ابتدائی منصب دو صدی ذات تھا۔ مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ترقی کر کے کس منصب تک پہنچے تھے۔ سید عزیز علی کی ایک جاگیر راج گورکھ پور میں بھی تھی۔ ان کی دولت مندی اور شاہ خرچی کے قصے بیان کرنے والے دو چار بزرگ ابھی چند سال پہلے تک زندہ تھے۔

میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اس میں توکل تو رہ تھا، مگر پریشان حالی بھی رہتی تھی۔ میرے والد حکیم سید مرتضیٰ حسین صاحب مرحوم ایک ذی علم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اودھ کے ضلع اناؤ میں بیرونی کا قصبہ ان کا وطن تھا، مگر علم کا شوق انھیں لکھنؤ لے گیا تھا، اور آب و دانے کی کشش نے بہرائچ پہنچا دیا تھا، جہاں ان کی ذہانت، حذاقت، اتقا، استغنا اور پابندیِ وضع کو یاد کر کے افسوس کرنے والے کبھی بہت تھے، مگر اب شاید کوئی نہ ہو۔ میں عاشور محرم ۱۳۱۱ھ م ۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو یہیں پیدا ہوا۔

جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا، یعنی میری عمر کے پانچویں سال، پانچویں مہینے، پانچویں دن میری بسم اللہ ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم ہونے لگی۔ میرے والد مجھ کو اپنے نقشِ قدم پر چلانا اور طبِ یونانی کا ماہر اور علومِ اسلامی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مگر میں ابھی صرف دس برس کا تھا کہ ان کی نا وقت وفات نے میری تعلیم کا رخ بدل دیا۔ والد کے انتقال کے بعد چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عزیزوں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ میرے تعلیمی مصارف کا بار اٹھاتا۔ ملازمت کا

لیا۔ گو خانگی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا، تحصیل علم کے شوق کی آگ جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی وہ اس افسردگی کے عالم میں ضرور بجھ کر رہ جاتی اگر میری والدہ مرحومہ کی مردانہ ہمت اُسے بجھنے نہ دیتی۔ مختصر یہ کہ شوق کی رہنمائی اور استقلال کی دست گیری میں تعلیمی منزلیں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ طے ہونے لگیں۔ اسکول کا کوئی امتحان ایسا نہ تھا جس میں میں نے اول درجہ حاصل نہ کیا ہو، اور کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس میں میں نے سب سے زیادہ نمبر نہ پائے ہوں۔ میرے تمام استاد اس رائے پر متفق تھے کہ رسائی ذہن اور سلامت فہم میں سارے اسکول میں ان کا کوئی جواب نہیں، اور محاسن اخلاق میں یہ قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

میں تعلیم کے راستے ترقی کے قدم تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا تھا اور ورنیکلر فائنل امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول کے آٹھویں درجے تک پہنچا تھا کہ مشیت ایزدی نے میرے قوائے ذہنی کی ڈاک گاڑی میں درد سر کا "بریک" لگا دیا۔ اس وقت سے سات آٹھ سال تک شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو کہ میں شدید یا خفیف درد سر میں مبتلا نہ ہوں۔ اس پرانے رفیق نے مدت دراز تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک اشارے میں آ موجود ہوتا تھا۔ اور کئی کئی دن بلکہ بعض اوقات کئی کئی ہفتے سر اُٹھانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اب کئی سال سے سر میں ایک دوسری تکلیف پیدا ہو گئی ہے، جس نے دماغی کاموں کو اور زیادہ مشکل کر دیا ہے۔

دردِ سر کی تکلیف ہی کیا کم تھی کہ کچھ دن بعد تبخیر کی شدت نے اس کے ساتھ شریک ہو کر میری زندگی تلخ کر دی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ جان ہے تو جہان ہے مگر جہالت کی زندگی پر میرا دل کسی طرح راضی نہ ہوا اور جو قدم آگے بڑھ چکے تھے وہ پیچھے نہ ہٹے، یہاں تک کہ ۱۹۰۱ء میں میں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ کالج کے درجوں میں میں نے جو مضمون پڑھے وہ یہ ہیں: انٹرمیڈیٹ میں انگریزی، فارسی، تاریخ، منطق، تشریح الاعضا، اور بی اے میں انگریزی فلسفہ اور فارسی۔

بی اے پاس کرکے میں نے ایم اے کے درجے میں نام لکھا لیا اور ایک سال انگریزی ادبیات کی تحصیل میں صرف کیا، مگر امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ سبب یہ تھا کہ اسی سال میں مجھ پر ہیضے کے مہلک مرض کا حملہ ہوا۔ بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی مگر زندگی باقی تھی بچ گیا۔ ضعیف و نحیف تو ہمیشہ سے تھا ہی اب بالکل ضعف و نقاہت کی شاعرانہ تصویر ہو کر رہ گیا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ محنت کرکے امتیازی کامیابی حاصل کر سکوں، نہ گوارا تھا کہ تیسرے درجے میں پاس ہو کر چلتے چلاتے اپنی طالب علمانہ نیک نامی کو داغ لگاؤں۔

اسی اثنا میں صوبہ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی، جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبے میں جتنی کتابیں چھپیں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کرکے صوبے کے سرکاری اخبار یعنی گورنمنٹ گزٹ میں شائع کی جائے، اور جمہور کے خیالات و رجحانات دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کر اس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کیا جائے جو سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا اور دو برس کے مسلسل قیام کے بعد مجھے بادلِ ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد میں رہنا پڑا۔ کوئی ساڑھے تین سال میں نے اسی جگہ پر کام کیا۔ اُس زمانے میں صوبہ متحدہ میں ہر سال ڈھائی تین ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔ اس طرح اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں میری نظر سے گزریں۔ مطالعے کی اس کثرت اور تنوع نے میری نظر میں وسعت اور دل میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں سجھائیں۔

مدت مذکورہ تک اس جگہ پر کام کرنے کے بعد میں نے ساڑھے نو مہینے کی رخصت لے کر ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد میں فن تعلیم تحصیل کرکے ۱۹۰۷ء میں ایل ٹی کی سند حاصل کی۔ اسی سال جولائی کے مہینے میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں میرا تقرر ہو گیا۔ اس وقت صوبہ متحدہ کے سرکاری ہائی اسکولوں میں

مسلمان ٹیچر تنخواہ کے اعتبار سے مجھ سے سینئر نہ تھا اس لیے ہیڈ ماسٹری آنکھوں کے سامنے تھی جس کا گریڈ اس وقت ۲۵۰-۲۵-۵۰۰ تھا اس کے بعد بھی سررشتۂ تعلیم ہی میں ترقی کے دوسرے راستے کھلے ہوئے تھے لیکن اپنی زبان کا عشق اور اس کی خدمت کا شوق اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ لکھنؤ کا قیام اور اردو کا کام میری سب سے بڑی تمنا تھی اس لیے اس ملازمت کے صرف چالیس دن بعد جب لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیر لیکچرر کی جگہ مجھ کو دی گئی تو میں نے تمام مالی منفعتوں اور منصبی ترقیوں کے امکانات کو نظر انداز کر دیا اور سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر یونیورسٹی کی ملازمت بخوشی قبول کر لی۔

ادبیات کا ذوق اور اپنی زبان کی خدمت کا شوق تو پہلے ہی سے تھا۔ اب ادبی تحقیق فرائض منصبی میں داخل ہو گئی۔ اور میں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں لگ گیا۔ چار پانچ سال مسلسل اسی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانی خدا کا شکر ہے کہ میری یہ محنت رائگاں نہیں ہوئی اور ادبی تحقیق کے لیے بہت سا گراں قدر سامان فراہم ہو گیا جس میں اب بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۲۴-۲۵ء میں کوئی ڈیڑھ برس فارسی کے سینئر لیکچرر کی قائم مقامی کی اور اسی زمانے میں فارسی ایم اے کا امتحان اول درجے میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغا عطا کیا۔ لیکن جب فارسی کے لیکچرر کی جگہ پر میرے مستقل کا مسئلہ پیش ہوا تو درخواست دے کر میں اپنی پہلی جگہ پر واپس آ گیا جونیر لیکچرر کا گریڈ ۲۰۰-۱۰-۳۰۰ تھا اور سینئر لیکچرر کا گریڈ ۲۵۰-۲۵-۵۰۰ تھا لیکن مقصد زندگی تو اردو کی خدمت تھا۔ اس لیے ایک دفعہ پھر مستقل مالی نقصان برداشت کر لیا مگر اردو سے قطع تعلق گوارا نہ کیا۔

یونیورسٹی کی ملازمت کو ابھی صرف چار سال ہوئے تھے کہ اکتوبر ۱۹۲۹ء سے حسن خدمت کے صلے میں مجھ کو تنخواہ کے علاوہ پچیس روپے ماہوار اسپیشل الاؤنس ملنے لگا۔ اگست ۱۹۳۵ء میں اردو کے سینئر لیکچرر کی ایک نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ اس سے تین سال بعد فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہو گئی جس کا گریڈ ۵۰۰-۵۰-۸۰۰ تھا اور اگست ۱۹۳۸ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ اس گریڈ کی ابتدائی تنخواہ پر پہنچنے کے بعد میری تنخواہ میں ۱۰۰ روپے ماہوار پرسنل الاؤنس کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح ان مالی نقصانات کی ایک حد تک تلافی ہو گئی جو میں نے اردو کی خدمت کے شوق میں عمداً برداشت کیے تھے۔

۱۹۴۶ء میں یونیورسٹی کی مجلس عاملہ EXECUTIVE COUNCIL نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مجھ کو فارسی اور اردو کے پروفیسر کا عہدہ دیا جائے لیکن اس کے تقرر سے پہلے ہی دن بعد سیاسی ہنگاموں کا وہ زور ہوا جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہو گیا اور فرقہ وارانہ تعصبات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ملک کی زبانیں اور ادبی ذوق بھی تقسیم ہو کر اردو اور فارسی زبانیں پاکستان کے حصے میں چلی گئیں۔ جب ہنگامے فرو ہوئے اور تعصبات کی شدت کچھ کم ہوئی تو مسلسل آٹھ سال میری حق تلفی کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء کی منظور کی ہوئی تجویز پر عمل کیا گیا اور میں مئی ۱۹۵۴ء میں ۸۰۰-۵۰-۱۲۵۰ کے گریڈ میں ہزار روپے ماہوار پر فارسی اور اردو کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۵ جون ۱۹۵۸ء کو میری عمر سرکاری حساب سے ساٹھ سال کی ہو گئی جو یونیورسٹی کے قواعد کی رو سے ملازمت کی آخری حد تھی اور میں اسی تاریخ کو تینتیس برس لکھنؤ یونیورسٹی کی خدمت اور ۲۰ برس اس کے شعبۂ فارسی و اردو کی صدارت کر کے ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔

مدت سے اس مبارک سرزمین کی زیارت کا اشتیاق تھا جو صدیوں تک تمام عالم اسلامی کے لیے تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکی ہے اور جس کا اثر آج تک ہمارے فنون کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جب فارسی ادب اور اس کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ فرائض منصبی میں داخل ہو گیا تو اس دیرینہ اشتیاق نے ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی اور جون ۱۹۵۶ء میں میں ایران کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے راستے سے ایران کی حد میں داخل ہوا اور زاہدان، بیرجند، تربت حیدری، مشہد مقدس، طوس، نیشاپور، سبزوار، سمنان، دامغان، طہران، شاہ عبدالعظیم، قم، اصفہان، تخت جمشید وغیرہ کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا۔ یہاں بھی

سیاحتِ ایران کا نصف پروگرام بھی پورا نہ ہوا تھا، مگر مسلسل سفر کی تکلیفوں سے تھک کر میں نے بوشہر کا رُخ کیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر بصرے پہنچا، اور عراق کے مشہور شہروں کی سیر اور وہاں کے عتباتِ عالیات کی زیارت کر کے بحری راستے سے ہندوستان واپس آ گیا۔

تندرستی کی بے اعتدالیاں اور دوسری خرابیاں جو طفلی سے میرے شاملِ حال رہیں انھوں نے میری قوتِ عمل کو مضمحل اور جوشِ عمل کو افسردہ کر دیا۔ مجھ کو دنیا کے شور و شر سے الگ رہ کر سکوت اور سکون کی زندگی بسر کرنا پڑی اور اپنے دائرۂ عمل کو ادبیات کے حلقے میں محدود کر دینا پڑا۔ بہر حال ذوق کی تحریک، حالات کی مساعدت اور خیالات کی یک سوئی کی بدولت مجھ سے جو تھوڑا بہت کام اب تک ہو سکا ہے اُس سے میرا شمار ادب کے خدمت گزاروں میں ہونے لگا ہے اور میرے خود فراموشانہ انہماک سے امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی ادب کی کچھ قابلِ ذکر خدمت انجام دے سکوں گا۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف، تالیف، ترتیب، ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ امتحانِ وفا۔ فرہنگِ امثال۔ ہماری شاعری۔ فیضِ میر۔ مجالسِ رنگین۔ دلستانِ اردو۔ روحِ انیس۔ نظامِ اردو۔ جواہرِ سخن جلد دوم۔ شاہکارِ انیس۔ اردو زبان اور اس کا رسم الخط۔ دیوانِ فائز۔ متفرقاتِ غالب۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ رزم نامۂ انیس۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ تذکرۂ نادر۔ فسانۂ عبرت۔ آئینۂ سخن فہمی۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر ان کی تکمیل ہو گئی تو امید ہے کہ اردو ادب میری خدمتوں کو جلد فراموش نہ کر سکے گا۔

شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے، مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے زیادہ اور منظوم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خود رَو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تأثرات کا پرتو ہیں۔ اس لیے وہ اچھے ہوں یا بُرے ہر حال میں شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ چند شعر اس آپ بیتی کے آخر میں پیش کیے جائیں گے۔

اپنی زندگی کی نہایت مختصر روداد پیش کر چکا۔ خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ کا افسوس نہیں، آیندہ کی فکر نہیں۔ جو ہوا اچھا ہوا، جو ہو گا اچھا ہی ہو گا

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

میرے حالاتِ زندگی کی تفصیل میں بے مددگار طالبِ علموں اور ہونہار نوجوانوں کی ہمت افزائی کا کافی سامان موجود ہے۔ مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً صرف اتنا کہتا ہوں کہ میری تعلیمی زندگی بالکل اور کاروباری زندگی بہت کچھ حال شیخ حزیں کے اس شعر کی مصداق ہے۔

دستے وش آں کہ راست رود بہرِ فتحِ باب محتاجِ التفاتِ کلید کسے نمی کند

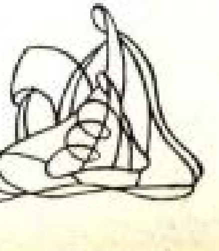

ڈاکٹر گیان چند

سوانح نگار سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے موضوع پر غیر جانبداری کے ساتھ لکھے گا، ہمدردی کے ساتھ بے لاگ جائزہ لے گا لیکن آپ بیتی کا معاملہ دگرگوں ہے یہاں ہمدردی ہی ہمدردی ہے جانبداری اس غضب کی ہے کہ مصنف اور موضوع میں ایچ پیچ نظر من تو شدم تو من شدی۔ کا معاملہ ہو جاتا ہے اس معذوری کا اعتراف کرتے ہوئے میں اپنے حالات پیش کرتا ہوں۔

میرا وطن یو۔ پی میں ضلع بجنور کا قصبہ سیوہارہ ہے۔ ضلع بجنور، قائم چاند پوری، نذیر احمد، سجاد حیدر یلدرم کا وطن ہے۔ سیوہارہ جس کی خاک نے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اور مولانا حفظ الرحمن کو جنم دیا۔ انھیں ہواؤں میں ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء کو میں نے ایک جین زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ میرے والد لالہ بحال سنگھ اور میری والدہ [illegible] جاتے تھے چچا کا نام لالہ عشقی لال کتنا عجیب لگتا ہے۔ غرض دونوں بھائیوں کے نام کا ایک جز عربی ہے۔ میرے والد اور دادا دونوں اردو سے نابلد تھے لیکن ان دونوں کے بعد تمام بھائی اردو پڑھے لکھے تھے۔ پردادا اردو فارسی ادب کے عالم تھے، تخلص کی حد تک شاعری کے گنہگار بھی تھے۔ ان کی یادگار کچھ فارسی مخطوطات گھر میں موجود تھے۔ میں نے انھیں خدا بخش لائبریری بانکی پور کی نذر کر دیا۔

میرے والد کے تین بچے دنیا میں آنکھیں کھولنے کے چند روز بعد ہی رخصت ہو گئے۔ چار بہنیں اور تین بھائی موجود ہیں جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔ ہم تینوں بھائیوں نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی پڑھی ہے۔ سب سے بڑے بھائی پرکاش چند مونس اردو میں فرسٹ کلاس ایم اے ہیں اور اب بجنور میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری میں یاس سنبھلی تلمیذ داغ کے شاگرد رہے لیکن اب ایک مدت سے شعر و سخن ترک کر چکے ہیں۔ ان کے بارے میں مزے کی بات یہ ہے کہ کسی اسکول یا کالج میں ایک دن بھی گئے بغیر انھوں نے ہائی اسکول سے لے کر ایم اے، ایل ایل بی تک کے تمام امتحانات پاس کر لیے تھرڈ ڈویژن کبھی نہیں آئی۔ منجھلے بھائی کرم چند نے ہائی اسکول کے بعد چھوڑ دیا۔ گھر پر بیٹھے ہیں۔

میں نے عالم صحت کی ایک ہی بہار دیکھی تھی کہ آب و ہوا راس نہ آئی۔ شدید بیماری کے سبب میں سات آٹھ مہینے صاحب فراش رہا، جانبری کی امید نہ تھی لیکن بچ گیا۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی سخت عارضہ نہ ہوا لیکن بدن ہمیشہ کے لیے کاہیدہ ہو گیا۔ غالباً چار سال کی عمر میں پورے خاندان کے ساتھ بہار میں ایک تیرتھ کے مقام پر گیا۔ اسی سلسلے میں کلکتے کی سیر کی جس کی یاد کے چند دھندلے نقوش اب بھی صفحۂ ذہن پر باقی ہیں۔

چار یا پانچ سال کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ اردو سے ابتدا کی۔ چوتھا درجہ پاس کر کے چار یا پانچ مہینے پرائیویٹ طور پر انگریزی کی اور اس کے بعد مقامی مسلم قدرت مڈل اسکول میں انگریزی کے پانچویں درجے میں داخل ہو گیا۔ حافظ محمد ابراہیم اس اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ ۱۹۳۶ء میں آٹھواں درجہ پاس کر کے ہائی اسکول مرادآباد چلا گیا جہاں میرے منجھلے بھائی دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ شہر میں ایک مکان

کلاس پہ سے رکھا تھا۔ ایک سال بعد میٹرک کر کے انہوں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں ایک عزیز کے پڑوس میں ایک کمرہ میں منتقل ہو گیا کھانا بھی ہوٹل یعنی ڈھابے میں کھاتا تھا۔ کیا ارزانی تھی اس زمانے میں دونوں وقت کھانے کے پانچ روپے ماہانہ دینے پڑتے تھے دوپہر کو روٹی اور شام کو روزانہ پوریاں ملتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول پاس کیا۔ انگریزی، ریاضی، اردو، فارسی اور جغرافیہ میرے مضامین تھے۔ اردو اور ریاضی میں امتیاز آیا۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے گورنمنٹ کالج مرادآباد میں داخلہ لیا۔ کالج کے ہوسٹل میں قیام کیا۔ رام گنگا ندی کے کنارے کھلے میدان میں کالج اور ہوسٹل کی عمارتیں تھیں۔ بڑی خوشگوار جگہ اور خوشگوار زندگی تھی۔ انٹر میں انگریزی، اردو، فارسی اور منطق یہ چار مضمون لیے ریاضی ترک کی۔ ابتدائے تعلیم سے انٹر کے پہلے سال تک میں اسکول اور کالج میں رہا ہمیشہ ہر امتحان میں کلاس میں اول آیا لیکن انٹر سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔

آٹھویں درجے سے بیت بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ بیت بازی نے شعر گوئی پر اکسایا لیکن طبیعت موزوں تھی۔ نویں درجے میں استاد کے بغیر عروض پڑھنا شروع کیا۔ خواجہ عشرت لکھنوی کی ایک دوسری کتاب سے ابتدا کی اور یاس یگانہ کے چراغِ سخن سے مشق آگے بڑھائی گیا۔ میں نے عروض پڑھ کر شعر کہنا سیکھا تاقی تخلص رکھا۔ پہلی غزل دسمبر ۱۹۳۶ء کی ہے۔ دسویں اور گیارھویں درجے میں دو غزلیں فارسی کی بھی کہیں اسی زمانے میں ایک ہم سبق نے ایک طرح دی "نہ بجھے آب سے آتش نہ جلے آگ سے خس" پر کوئی شاعر گرہ نہ لگا سکا۔ میں نے یوں تکمیل کی۔

اشک و سوزش ہیں بہم میرے موئے مژگاں پر
نہ بجھے آب سے آتش نہ جلے آگ سے خس

شعر میں نے کبھی کسی سے مشورہ نہ کیا۔ ہائی اسکول اور انٹر میں اسکول اور کالج میگزین کے ہر پرچے میں میرا تنقیدی مضمون ضرور ہوتا تھا لیکن شاعری کا راز زمانے سے پوشیدہ رکھا۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ سر چھپانے کو مسلم ہوسٹل میں پناہ ملی۔ بی اے میں اردو، انگریزی، انگریزی ادب، اردو ادب، اور سیاسیات یہ چار مضامین لیے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو کی تحریک ہوئی جس میں دوسرے طلبہ کی طرح الٰہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ حکومت کے خلاف مظاہرے کے لیے روزانہ جلوس نکلتے تھے جن میں میں شرکت کرتا تھا۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء کو طلبہ کے ایک جلوس پر پولیس نے گولی چلائی۔ میں بھی اس میدان میں موجود تھا لیکن اگلی صفوں میں نہیں۔ میری نظروں کے سامنے ایک لڑکا شہید ہو گیا کئی زخمی ہوئے۔ آج کل کے طلبہ اس دور انگیز ہیجانی منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اردو کے کلاس میں میرے ایک ہم سبق طفیل احمد تھے جو بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالہ معاشیات کے ایڈیٹر ہو گئے اور پاکستان بننے پر افکار کراچی کی مجلسِ ادارت میں شامل ہو گئے۔ میں نے بی اے کا امتحان ۱۹۴۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا جس کے بعد ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ استاد ڈاکٹر اعجاز حسین نے کسی طرح دریافت کر لیا کہ میں چھپا شاعر ہوں۔ افشائے راز کے بعد میں شعبے کے حلقۂ ادب میں شعر پڑھنے لگا۔ یونیورسٹی کے رسائل میں کلام کی اشاعت بھی کی۔

میں ایم۔ اے کے دوسرے سال میں تھا کہ ہوسٹل میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک سرکاری دفتر کے کلرک کو مسلم ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ چھوٹا آدمی اقتدار کو ہضم نہیں کر پاتا۔ اس نے بڑی سخت گیری اور تاناشاہی دکھائی۔ ہوسٹل میں کسی تقریب کے سلسلے میں پنڈت سندرلال

کر دیا گیا لیکن سپرنٹنڈنٹ سے کھٹ پٹ ہو جانے کے بعد تمام عہدہ داروں نے استعفیٰ دے دیا اور پنڈت جی سے جا کر منع کر دیا کہ آپ تشریف نہ لائیں۔ اس کے باوجود بھی پارٹی کے موقع پر پنڈت جی تشریف لے آئے لیکن اسی وقت چند لڑکے ہوسٹل سے واک آؤٹ کر گئے پنڈت جی نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجھے مدعو کر کے آئے تھے وہی مجھے منع کرنے بھی گئے۔ میں حالانکہ کوئی عہدہ دار نہ تھا لیکن بڑا نام ہونے کی وجہ سے باغیوں کا سرغنہ سمجھا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت تو تھا نہیں اس نے انتقاماً مجھے کمرہ تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ میں نے کمرہ چھوڑنے کی بجائے ہوسٹل چھوڑنا بہتر سمجھا لیکن بعد میں اس سپرنٹنڈنٹ کو بھی ایسے ناکوں چنے چبوائے کہ اسی سال میں اسے ہوسٹل سے بوریا بستر باندھ کر چلے جانا پڑا۔ دو تین ماہ بعد مجھے اس ہوسٹل سے کہیں زیادہ وقیع سر پی سی بنرجی ہوسٹل میں جگہ مل گئی اور یونیورسٹی میں قیام کے آخر تک میں اسی ہوسٹل میں رہا۔ میری رائے ہے کہ جو طلبہ ہوسٹل میں نہیں رہتے ان کی تعلیم ادھوری رہتی ہے۔ مل جل کر زندگی بتانے ہنسنے کھیلنے، پڑھنے پڑھانے کے جو مواقع ہوسٹل میں ملتے ہیں ان سے محروم رہنا متعلمانہ زندگی کی کیفیتوں سے بے بہرہ رہنا ہے۔ ہوسٹل ہی میں وہ پائیدار، پر خلوص اور بے تکلف دوستیاں بنتی ہیں جنہیں وقت کی یلغار منہدم نہیں کر پاتی۔

الٰہ آباد یونیورسٹی میں فراق صاحب کی شخصیت ایک روایت ایک داستان بن چکی تھی جس سے لڑکوں کو ان کے پاس پھٹکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی میں ایم اے فائنل میں پہنچ کر ان سے ملنے کی جسارت کر سکا۔ مجنوں گورکھپوری الٰہ آباد آ کر فراق صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ میرے ہم سبق مجتبیٰ حسین (تہذیب و تحریر کے مصنف) میں اور ہمارا ایک اور ساتھی مجنوں سے ملنے فراق صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ اس بہانے میری ملاقات فراق صاحب سے بھی ہوئی۔ بعد میں ان سے کئی بار ملا۔ [illegible] میں میں نے ایم۔ اے کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ مجتبیٰ حسین بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ان کی بھی فرسٹ کلاس آئی۔

ایم اے کا امتحان دینے کے چند روز بعد مجھ سے زندگی کی ایک نعمت بے بہا یعنی آغوشِ مادر ہی چھن گئی [illegible] کو [illegible] سال کی عمر میں میری ماں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ بڑی مذہبی خاتون تھیں۔ کثرتِ ریاضت ہی نے ان کی جان لے لی۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں اس لیے مجھے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ آٹھویں درجے کے بعد سے میں تعلیم کے سلسلے میں باہر رہا۔ مختلف چھٹیوں میں وطن آ کر جب درسگاہ کے لیے واپس ہوتا تو وہ کئی کئی دن تک روتی تھیں۔ وہ ممتا میرے لیے آج بھی تازیانۂ چشم تر ہے۔

ایم اے کے بعد میں نے ریسرچ میں داخلہ لے لیا۔ موضوع تھا "اردو کی نثری داستانیں شمالی ہند میں"۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر ضامن علی نگراں مقرر ہوئے۔ تحقیق کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے کتب خانے کو کھنگالا جہاں مولوی عبدالحق کی زیارت ہوئی۔ کتب خانۂ شاہی رامپور میں مولانا عرشی سے ملاقات ہوئی۔ لکھنؤ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی اور احتشام صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل کیا۔ اگلے سال ڈگری کی جماعتوں میں درس دیا لیکن ریسرچ میں حرج ہونے کے باعث اسے چھوڑ دیا۔ نومبر میں مقالہ تیار ہو گیا۔ مقالہ کی تکمیل کے بعد فرصت میسر آئی تو پھر شاعری چھیڑی۔ ایک شام جوش کا مجموعہ رباعیات "جنون و حکمت" پڑھا اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے بھی کثرت سے رباعیاں کہنا شروع کر دیں چند ماہ میں سوا چار سو سے زائد رباعیاں ہو گئیں لیکن طالب علمی کے ساتھ شاعری بھی چھوٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں صف اول کا شاعر نہیں بن سکتا پھر خونِ جگر پھونکنے سے کیا حاصل۔ میرے اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زائد ہے جن میں زیادہ سے زیادہ دو سو شعروں کے سوا بقیہ سے کسی کی چشم و گوش آشنا نہیں۔ اس ضبط کی داد چاہتا ہوں۔ شاعری چھوٹ گئی ہے لیکن مزاج

اب بھی شاعر ہوں۔ بے شاعری کی رگ مذاق حسن اب بھی باقی ہے۔ کون جانے شعر گوئی کے سوتے پھر کب پھوٹ پڑیں۔

ضامن صاحب کا دستور تھا کہ ریسرچ کے دوران میں ریسرچ اسکالر کو مطلق نہ چھیڑتے تھے۔ مقالہ مکمل ہو جانے پر پڑھوا کر سنتے تھے۔ استادی اعجاز صاحب نے اپنے تجربے سے ایک نسخہ بتایا تھا کہ ضامن صاحب مقالے سنتے سنتے جب اونگھ جائیں تو صفحے چھوڑ کر آگے بڑھ جایا کرنا۔ میری سماعت کا یہ آئین تھا کہ میں دوپہر کو ایک بجے کے قریب ان کے دولت خانے پر جا کر کتاب خوانی کرتا تھا۔ وہ کھانا کھا کر پلنگ پر تکیہ لے کے لیٹ جاتے تھے۔ داستانوں کا مقالہ ان پر داستان کا عمل کرتا تھا۔ وہ غنودگی سے بڑھ کر خواب کی دنیا میں تشریف لے جاتے اور میں حسب توقع دس دس صفحے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔ اس طرح پورا مقالہ ان کے گوش گزار کیا یا فریقین نے سنتے سناتے طے کیا۔ مقالے کی سماعت کے دوران میں انہوں نے مجھے کہیں، ذرا صرف اختتام کے بعد تبصرے کے طور پر ایک لکچر پلایا کہ دیکھو زبان اور محاورے کا خیال رکھنا۔ غرض یہ ہے کہ پورے مقالے کی تحریر و تکمیل کے دوران میں ایک جملے یا ایک لفظ پر کسی کی رہنمائی یا اصلاح نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک میں اس کتاب سے آسودہ نہیں ہوں۔ جون ۱۹۴۸ء میں مقالہ یونیورسٹی میں داخل کیا۔ ایک ممتحن صاحب پاکستان کے علاقے میں جا بسے اس لیے ۱۹۴۹ء میں نتیجہ آیا۔ نومبر میں ڈگری ملی۔

یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد تلاش معاش کا کٹھن مسئلہ سامنے آیا۔ میں پڑھانے کی ملازمت چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں دو اصول بنا رکھے تھے۔ ڈگری کالج سے نیچے ملازمت نہ کروں گا اور دو سو روپے سے کم پر نہ جاؤں گا۔ یہ دونوں مدتوں تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ ایک بار مہاراجہ کالج جے پور میں ایم۔ اے کے صدر شعبہ کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا لیکن تقرر سے پہلے وہاں ایم۔ اے اردو کا درجہ ہی کالعدم ہو گیا۔ تجربۂ ایجاب [illegible] اس وقت اندازہ ہوا کہ معاش سے محروم انسان کو اشتراکیت کی کیوں سوجھتی ہے۔ گھر کی حالت اچھی تھی اس لیے میں ایک مناسب اسامی کے انتظار میں تین سال بے روزگار بیٹھا رہا۔ آخر اردو سے مایوس ہو کر انگریزی صحافت کی دنیا میں جھانکنے کی ٹھانی۔ ۱۹۴۹ء میں انگریزی روزنامہ پائنیر لکھنؤ کے دفتر میں بغیر تنخواہ کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے یا سیکھنے لگا۔ پاس جانے پر یہ باغ بھی بے بہار نظر آیا۔ آخر مئی ۱۹۵۰ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں ۳۰۰ روپے پر لکچرر کی جگہ مل گئی۔ سرکاری ملازمت تھی۔ ایک دور آسائش کا آغاز ہو گیا۔ صدر شعبہ مسز صفیہ اختر تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں وہ جوانا مرگی کا شکار ہو گئیں۔ میں ان کی جگہ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

اب ایک رنگین مہم درپیش تھی۔ معاش کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد زوج کی یاد آئی۔ معلوم ہوا کہ روزگار کی طرح اس کا حصول بھی ہفت خواں سے کم نہیں۔ یہاں بھی میں نے ایک پخ لگا رکھی تھی کہ رفیقۂ حیات گریجویٹ ضرور ہو۔ آخر تین سال کی جد و جہد کے بعد جوئندہ یابندہ کی صحت ثابت ہو گئی تھی۔ ۲ جون ۱۹۵۳ء کو بہادر پور میں شادی ہو گئی۔ اسی سال میں نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے سوشیالوجی کے سال اوّل کا امتحان پاس کیا اور میری بیوی نے ایم۔ اے ہندی سال اوّل کا۔ میں نے آئندہ سال ایم۔ اے سوشیالوجی سیکنڈ ڈویژن میں کر لیا لیکن بیوی صاحبہ نے بجائے ایم۔ اے فائنل کے ماں بننے کا امتحان دیا یعنی مارچ ۱۹۵۵ء میں ہمارے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میرے بھائیوں میں کسی کے لڑکا نہ تھا۔ میرے سسر کے بھی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ان کی دوسری لڑکیاں بھی اس وقت تک بیٹے سے محروم تھیں۔ اس طرح میرا لڑکا دو گھروں کا اجالا بن کر آیا۔

۱۹۵۱ء میں میں نے اپنا تحقیقی مقالہ "اردو کی نثری داستانیں" اشاعت کے لیے انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھیجا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں کتاب شائع ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں حمیدیہ کالج میں ایم۔ اے اردو کی جماعتیں کھل گئیں جس کی وجہ سے مجھے ترقی دے کر ایم۔ اے کے شعبے کا صدر بنایا

گیا۔ آئندہ سال اُجین میں وکرم یونیورسٹی کی تشکیل ہوئی اور چار کالج اس سے ملحق کر دیا گیا جہاں میں اردو نصاب بورڈ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ اس حیثیت سے مجھے دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذۂ اردو کے قریب آنے کے مواقع ملے لیکن میں نے اردو بورڈ کی صدارت کو تجارت یا آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا۔

جون ۱۹۵۸ء میں مجھے مزید ترقی دے کر مضافات میں ایک گورنمنٹ ڈگری کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مشاہرہ تھا ساڑھے آٹھ سو تا گیارہ سو روپے۔ کافی غور کرنے کے بعد میں نے اس ترقی سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بہرحال پرنسپل ہونے کے مترادف تھا۔ روپے کا فائدہ ضرور تھا لیکن وہاں جا کر اردو کا دامن میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ پرنسپل کا کام پولیس داروغہ کی طرح محض انتظامی ہے علمی نہیں۔ پرنسپل کے سر کے ہزار سودے ہوتے ہیں۔ میں نے وہ پیشکش قبول کر لی ہوتی تو میری تنخواہ آج کہیں زیادہ ہوتی لیکن مجھے انکار کرنے کا قطعاً افسوس نہیں۔ وہاں روپیہ ملتا خوشی نہ ملتی تو میری زندگی میں جو کچھ قابلِ قدر ہے وہ سب گنوا دیتا۔ موجودہ ملازمت میں کتنی آزادی کتنا آرام کتنا سکون ہے۔ ۱۹۶۰ء میں وزیرِ تعلیم نے مجھے بلا کر پوچھا "سنا ہے آپ نے رائے بدل دی ہے اور اب پرنسپل بن کر جانے کو آمادہ نہیں ہیں؟" میں نے کہا "جی نہیں۔ میری طرف سے مستقل انکار سمجھئے۔ سنا ہے کہ ابھی عشق کے اور امتحان باقی ہیں۔"

ستمبر ۱۹۵۸ء میں میرا دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ اب میرے کل تین بچے یعنی ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ اسی سال میں نے اپنا مکان تعمیر کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں سرکاری کوارٹر سے نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ آٹھ سو گز کے قطعے پر سامنے کی طرف نصف سے زیادہ باغ کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنے پیشے کے علاوہ پھولوں کی کھیتی اور پکے گانے سننے میرے دو محبوب مشغلے ہیں۔ بھوپال کی پھولوں کی نمائش میں دو بار اوّل ہو چکا ہوں کئی بار پہلے انعام لیے ہیں۔ یوں تو میرا مکان کافی خوشنما ہے۔ کئی مہینے تک متعدد آدمی اسے دیکھنے آتے رہے اور تعریف میں رطب اللسان رہے۔ تعمیرِ مکان میں میں نے اپنا تمام اندوختہ لگا دیا۔ جو کمی تھی وہ والدہ سے دو ہزار روپے لے کر پوری کی۔ اس طرح میں کسی کا مقروض نہیں۔ ۱۹۶۰ء میں یہ مکان تین سو روپے ماہوار پر اور ۱۹۶۳ء میں چار سو پر اٹھ سکتا تھا۔ سرکاری کوارٹر کا بیش از بیش کرایہ پچاس روپے ماہوار تھا لیکن قوم کا بنیا ہونے کے باوجود میں نے روپیہ کمانا سیکھا ہی نہیں۔

ادھر میں کئی سال سے "شمالی ہند میں اردو مثنوی" کے موضوع پر ڈی لٹ کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں متعدد کتب کی سیر کی۔ پٹنہ میں جید محقق قاضی عبدالودود سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۹۶۱ء کے آخر میں مقالہ آگرہ یونیورسٹی میں داخل کیا۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں ڈگری ملنے پر میں نے مدھیہ پردیش کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر شنکر دیال شرما (پی۔ ایچ۔ ڈی کیمبرج) سے عرض کیا کہ آپ میرے غریب خانے پر آ کر چائے پئیں تو بڑی نوازش ہو۔ وہ کمال لطف سے فوراً تیار ہو گئے۔ ایک ہفتہ بعد آل احمد سرور میرے یہاں تشریف لائے۔ ڈاکٹر شرما لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کے ساتھی رہ چکے ہیں۔ میں نے اسی موقع پر انہیں بھی یہاں بلایا۔ اب جب کہ میں نے ملازمت میں اپنی ترقی کا دروازہ خود ہی بند کر دیا ہے ایسے لمحے ہی دل بہلاوے کا سامان رہ گئے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں میسور یونیورسٹی کے اردو پروفیسر کی انتخاب کمیٹی کی شرکت میں گیا۔ میسور کا برنداون باغ۔ پانی میں آگ اور آگ میں پانی۔ رنگ و نور کی جنتِ شداد۔ ہندوستان کا عظیم جوشربا ہے۔ میسور سے بنگلور اور مدراس گیا۔ مدراس میں سمندر کی پچھاڑیں اتنی پاس سے دیکھیں کہ جوتوں میں پانی بھر کر واپس آیا۔

مئی جون ۱۹۶۰ء میں لسانیات کا اسکول گرما ساگر یونیورسٹی میں ہوا۔ میں نے بھی بطور طالب علم شرکت کی اور سرٹیفکٹ لیا۔ اساتذہ میں دو کا ذکر کروں گا۔ ایک پونا یونیورسٹی کے پروفیسر لسانیات ڈاکٹر ایم۔ اے گھاٹگے اور دوسرے سنتی کمار چٹرجی۔ میری پوری تعلیمی زندگی میں دو اساتذہ کے تبحر علم نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ بی اے میں سیاسیات پڑھانے والے پروفیسر اودھ بہاری لال جو اب الٰہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبہ سیاسیات ہیں اور لسانیات اسکول کے ڈاکٹر گھاٹگے۔ گھاٹگے ذہنی معلومات اور انداز تدریس کے لحاظ سے صحیح معنی میں یونیورسٹی پروفیسر ہیں۔ ساگر میں ایک ہفتہ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے بھی پڑھایا لیکن اس احترام کے ساتھ جو موضوع انہیں دیا تھا اس کے آس پاس بھی نہ آئے۔ دوسرے مطالب ہی پر ترشح علم کرتے رہے۔ ان غیر متعلق تقریروں میں بھی علم و فضل کا اتھاہ سمندر موجیں مارتا رہتا تھا۔ مجھے تو یہ فخر ہی کافی ہے کہ میں ڈاکٹر چٹرجی کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ ایک دن میں ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملا۔ ساگر سے کھجوراہو کی شباب پرور سنگ تراشی دیکھنے گیا۔ بھوپال واپس آنے پر میں نے صوتیات کے بعض مسائل پر غور کیا اور مضامین لکھے۔ آگرہ میں صوتیات کے ماہر ڈاکٹر اشوک کیلکر سے بعض مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔

آئندہ سال لسانیات کا اسکول کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں ہوا۔ میں نے پھر شرکت کی۔ یہ علاقہ ایک جہان دیگر تھا۔ پہاڑی مقام خنک آلود موسم۔ ہر طرف اہل دکن تھے۔ مجھے غیر زبان والوں سے ملنا بہت پسند ہے۔ انگریزی کی برکت ایسے موقعوں پر ہی دکھائی دیتی ہے۔ دھارواڑ میں ڈاکٹر کیلکر میرے استاد ہو گئے۔ ان کے علم کا کیا ٹھکانا۔ دیکھنے میں ٹیڑھے میڑھے لنگ کرنے والے بچہ نما جوان ہیں۔ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں لیکن ان کے علمی مرتبے کی وجہ سے کسی کی مجال نہیں کہ ان سے زیادہ بے تکلف ہو جائے۔ ایک اور محترم استاد کیرالا یونیورسٹی کے پروفیسر تامل ڈاکٹر سبرامنیم تھے۔ یہ دونوں حضرات لسانیات میں امریکہ سے پی ایچ ڈی ہیں۔ دونوں عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ دھارواڑ ہی میں بمبئی کے عبدالستار دلوی سے دوستی ہوئی۔ ان کا مہمان ہو کر بمبئی گیا۔ یہ اور ان کی بیوی دونوں اردو میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ہندوستان میں اردو پی ایچ ڈی کا یہ واحد جوڑا ہے۔ دلوی آج کل لندن میں لسانیات کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۲ء میں میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عام کا ممبر منتخب کیا گیا۔ یہ رکنیت زندگی بھر کے لیے ہے۔ مجلس عام کے ممبروں کی تعداد ۴۴ ہے۔

مارچ ۱۹۶۳ء میں ۸۲ سال کی عمر میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ سر پر ایک سایہ بچا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس وقت سے پہلے میں اگر بچوں کا باپ تھا تو کسی شخص کا بیٹا بھی تھا۔ اب میں بیٹا نہیں محض باپ ہوں۔ یکایک کتنا مسن ہو گیا ہوں۔

تصانیف (۱) اردو کی نثری داستانیں (۲) اردو مثنوی شمالی ہند میں (۳) لسانیاتی مضامین (زیر طبع) (۴) تنقیدی و تحقیقی مضامین (زیر طبع) (۵) انتخاب کلام (زیر طبع)

میرزا ادیب

شہر لاہور میں بھاٹی دروازے کے اندر محلہ ستھاں آباد ہے۔ محلہ ستھاں کے ایک بیرونی گوشے میں ایک چوک ہے جسے چوک نیویں کہتے ہیں۔ جب اس چوک میں داخل ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر سمت سے ایک گلی پھوٹ رہی ہے۔ مغرب کی جانب رُخ کر کے کھڑے ہوں تو سامنے ایک چھوٹی سی گلی نظر آئے گی۔ اس گلی کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں اور یہ لوگ بھی وہ ہیں جنھوں نے اپنی عمریں اس محلے میں بسر کر دی ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ اس گلی کا کیا نام ہے تو وہ فوراً کہہ دیں گے "گلی مغلاں"۔ تو گلی مغلاں کے سرے پر کھڑے ہوں تو آخری سرے پر ایک بلند اور وسیع مکان دکھائی دے گا جو بارہا مرمت ہونے کے باوجود ابھی تک اپنے خدوخال سلامت رکھے ہوئے ہے۔ مدتوں پہلے اس مکان کے آخری کمرے میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس نے دنیا کو یہ بشارت دی تھی کہ خدا انسان سے مایوس ہے کیونکہ انسان ایک بڑے وسیع پیمانے پر انتہائی بے دردی اور سفاکی سے اپنی ہم جنس کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور یہ بچہ ــــ ظاہر ہے میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

جس وقت میرے شعور نے آنکھ کھولی تین چیزوں نے میرے دل و دماغ پر کافی گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے ایک تو جاندار چیز تھی اور دو بے جان۔

میری ماں میری ساری کائنات کا مرکز تھی۔ مجھے ان کی ذات سے کچھ ایسی وابستگی ہو چکی تھی اور وہ مجھ پر کچھ اس انداز سے چھا گئی تھیں کہ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے کبھی مجھ پر حکومت نہیں کی تھی۔ کسی طور پر بھی مجھے متاثر کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی لیکن میں تھا کہ ان کی طرف کھنچا ہی چلا جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شفقت کی روشنی تھی۔ پیشانی پر ممتا کا نور تھا اور لہجے میں پیار کی مٹھاس تھی۔ اس وقت جاگتی تھیں جب فضا میں اندھیرا ہوتا تھا اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد گھر کے مختلف کاموں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ میں نے انھیں کبھی بے کار نہیں پایا۔ بیماری کے دنوں میں بھی نہیں۔ گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر [illegible] کی نے منہ میں لے کر چھوٹی چھوٹی رسیوں میں گانٹھیں دے دے کر ان کے گچھے بناتی رہتی تھیں۔ ان گچھوں سے چلم کے لیے آگ بنتی تھی یا انھیں جلا کر سالن وغیرہ گرم کیا جاتا تھا۔

قرآن مجید وہ بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ صبح اٹھتے ہی دیا جلا کر وہ کوٹھڑی کے ساتھ والے کمرے میں تخت پوش پر جا کر بیٹھ جاتی تھیں اور خاموشی میں ان کی آواز بلند ہونے لگتی تھی۔ کئی بار آپا نے ان سے کہا تھا "بے بے! اتنی سویرے قرآن نہ پڑھا کرو، نیند ٹوٹ جاتی ہے۔" اس کا جواب وہ ہمیشہ یہ دیتی تھیں کہ "خدا تم لوگوں کو بھی قرآن پڑھنے کی توفیق دے۔" وہ باقاعدہ قرآن پڑھتی رہیں اور ہمیں باقاعدہ تلقین کرتی رہیں۔ ان کی تلقین کا کبھی کوئی فائدہ نہ ہوا ــــ دوسرا کام وہ یہ کرتی تھیں کہ ہر ایک کے بستر پہ جا کر

دم کیا کرتی تھیں۔ سردیوں میں جب ان کا سانس چہرے کو چھوتا تھا اور جس بچے پر یہ حادثہ گزرتا تھا وہ زور سے نعرہ مارتا تھا — "اوئی بے!" یہ نعرہ خطرے کا سگنل ہوتا تھا جسے سنتے ہی ہم لوگ جلدی سے لحافوں کے اندر چہرے چھپا لیتے تھے مگر ماں اس معاملے میں کسی کو معاف نہیں کرتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں "اللہ پاک کے کلام میں بڑی برکت ہے، سارا دن خوش رہو گے۔"

ان میں صبر و تحمل کا مادہ بہت تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے سارے گھر کو کھلانے سے پہلے پیٹ بھرنے کی کوشش کی ہو۔ ایک ایک کے آگے جاتی تھیں اور وہ تھال رکھتی جاتی تھیں جس میں روٹی ہوتی تھیں اور روٹی کے اوپر سالن کا برتن دھرا ہوتا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر ہم اپنے ہاتھ چھپا لیتے تھے کیونکہ کھانا ہمارے آگے رکھنے سے پہلے وہ ہمارے ہاتھوں کا ضرور مشاہدہ کرتی تھیں جو عموماً گندے ہوتے تھے۔ تاکید یہ تھی کہ روٹی کھانے سے پہلے ہاتھ دھوؤ۔ ہاتھ نہیں دھوؤ گے تو نہیں ملے گی روٹی ——— مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے روٹی دینے میں چند منٹ کا توقف بھی کیا ہو۔

ماں کو ہمارے ہاتھوں کی فکر رہتی تھی اور دادی اماں کو ہمارے پاؤں کی۔ وہ جھاوے سے مل مل کر ہمارے پاؤں دھلایا کرتی تھیں۔ ہم لوگ انہیں "اماں جھاوے والی" کہتے تھے۔ جب اماں ہمارے گھر سے نکل کر محلہ جلوٹیاں میں چلی گئیں تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ جھاوے سے نجات پائی۔

کبھی کبھی میں نے ماں کو یوں بھی دیکھا تھا کہ کوئی کام کاج کرتے ہوئے یکایک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہیں۔ شاید انہیں اپنے وہ دو بچے یاد آ جاتے ہوں گے جو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے یا انہیں اس بات کا خیال آ جاتا ہو گا کہ ابا عموماً بیکار رہتے ہیں۔ ٹھیکے میں دس دن کام کرتے ہیں اور باقی دن دوستوں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ اس سے گھر میں لڑائی کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔ سارے بچے ماں کی طرف ہوتے تھے مگر اس کا مطلقاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ابا سب کو ایسی ڈانٹ پلاتے تھے کہ کوئی بول ہی نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی ماں کہتی تھیں بچے کو ماں باپ کی باتوں میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ گستاخی ہے اور نیک اولاد کبھی گستاخی نہیں کرتی۔

ماں جتنی اچھی مجھے لگتی تھیں، ابا سے اسی قدر ڈر لگتا تھا۔ میں ان سے مانوس نہیں ہو سکا۔ باپ کے معاملے میں میری جذباتی زندگی خاصی مجروح رہی ہے۔

دوسری چیز کتابوں کا وہ صندوق تھا جو کوٹھری کے آخری حصے میں پڑا رہتا تھا۔ مجھے اس صندوق سے اتنی دلچسپی تھی کہ اوّل تو ہر روز ورنہ دوسرے تیسرے دن ضرور اسے کھول کر ان کتابوں کی ورق گردانی کر لیتا تھا۔ پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر مجھے ان کی رنگینی، منقش اور سنہری جلدیں اور ان کی خوشبو بڑی پسند تھی۔ عجیب خوشبو آتی تھی ان کتابوں سے۔ میں دیر تک ان کتابوں کو الٹتا پلٹتا رہتا تھا ——— ناک سے لگا کر ان کی خوشبو سونگھتا رہتا تھا۔ کتابیں بہت پرانی تھیں مگر ہر کتاب کی سیاہی میں ایک خاص چمک باقی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی لکھی گئی ہیں۔ علم کا یہ خزانہ ہمیں دادا جان کی طرف سے ورثہ ملا تھا۔ پچھلی نسل کو ان کتابوں سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے کوشش کر کے ان کا بیشتر حصہ محفوظ کر رکھا تھا۔ ابا کو ان کا بڑا خیال رہتا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی کتابوں کے صندوق پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ دادی اماں سناتی تھیں کہ "میاں کے مرنے پر مولا بخش کئی ایسی کتابیں لے گیا تھا جن کی جلدوں پر سنہری نقش و نگار کئے ہوئے تھے۔ اندر تصویریں بھی بڑے اعلیٰ درجے کی تھیں۔" مجھے یہ بات سن کر ہمیشہ افسوس رہا۔

میں بڑے اہتمام اور احترام سے صندوق کا ڈھکنا کھولتا تھا۔ ایک ایک کتاب باہر نکالتا تھا اور جب ساری کتابیں باہر آ جاتی تھیں تو انھیں ویسی ہی ترتیب سے اندر رکھ دیتا تھا۔ نصف سے زائد کتابیں قلمی تھیں۔ انھیں دادا جان نے خود لکھا تھا یا اس صورت میں دوسروں سے خریدا تھا۔ دادی جان شکایتہً کہا کرتی تھیں کہ ”انھیں کتابوں کا ’ٹھرک‘ تھا۔ کتابوں پر بڑے پیسے خرچ کر دیتے تھے۔ ہر مہینے تین روپے اٹھ جاتے تھے۔“

سب کتابوں کی جلدیں بڑی خوبصورت اور منقش تھیں اور انھیں دیکھ کر دادا جان کا رعب دماغ پر طاری ہو جاتا تھا۔ محلے کے بڑے بوڑھے بتاتے تھے کہ ”مرزا غلام حسین بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ محلے میں آتے تھے تو سب لوگ بڑے ادب سے انھیں سلام کرتے تھے —— افسوس اولاد باپ پر نہیں گئی!“ —— میں سوچا کرتا تھا اولاد باپ پر نہیں گئی تو کیا ہوا۔ میں یہ کتابیں ضرور پڑھوں گا۔

میں جب صندوق سے کتابیں نکالتے ہوئے یا انھیں دوبارہ ترتیب سے رکھتے ہوئے دادا جان کا تصور کرتا تھا تو میرے سامنے ایک ایسا شخص آ جاتا تھا جس کی سفید، پُرعظمت داڑھی سینے پر پھیلی ہو، آنکھوں پر عینک ہو، چہرے پر نور برستا ہو اور جو بڑے وقار سے بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ میں نے ایسی تصویر خواب میں بھی دیکھی تھی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ میری ایک چھوٹی بہن نے دادا جان کی کسی کتاب کو غیر ارادۃً زمین پر گرا دیا تھا جس سے کتاب کی جلد پھٹ گئی تھی۔ اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ سوتے میں دیکھا کہ ایک بزرگ سینے پر سفید داڑھی لہراتے ہوئے میرے قریب سے چپ چاپ گزر رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر ملال ہے، ان کے ہاتھ میں وہی کتاب ہے جس کی جلد پھٹ گئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر ان کی حالت بتا رہی تھی کہ اگر وہ کچھ کہتے تو یہ کہتے: ”تم لوگوں نے بُرا کیا۔ میری کتاب تباہ کر دی۔“ میں نے اپنا خواب ماں کو سنایا تو انھوں نے سب کو بتا دیا کہ وہ بزرگ دادا جان تھے جو خواب میں آئے تھے اور انھیں کتاب کے خراب ہو جانے سے بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ نتیجتاً کتابوں کا زیادہ احترام کیا جانے لگا اور ابا نے صندوق کو ایک بڑا سا تالا لگا کر بند کر دیا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں نے وہ خواب سنایا ہی کیوں تھا۔ نہ خواب سناتا اور نہ صندوق پر تالا لگتا۔

صندوق بند ہو گیا تھا مگر میں پھر بھی اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ دعا کی تھی: ”اللہ میاں! دادا جان سے کہو کہ وہ ابا کے خواب میں آئیں اور انھیں حکم دیں کہ وہ صندوق کھول دیں۔“ تیسرے دن صندوق کھل گیا تھا مگر ابا نے نہیں کھولا تھا اماں نے کھولا تھا اور وہ اس لیے کہ جو تالا یہاں لگایا گیا تھا وہ کوٹھری کا تھا۔ کوٹھری میں گہنے اور قیمتی کپڑوں والا ٹرنک تھا اس لیے صندوق سے تالا الگ کر کے دوبارہ کوٹھری کو لگا دیا گیا۔ اس طرح صندوق دوبارہ کھل گیا اور میری آرزو پوری ہو گئی۔

تیسری چیز جس نے میرے عالمِ طفلی کے ذہن کو بہت متاثر کیا تھا گھر کا وہ ننھا دیا تھا جو ہر شام جلا دیا جاتا تھا اور رات کے نو دس بجے بجھا دیا جاتا تھا۔ شام کے وقت وہ چولھے کے اوپر دیوار کے مختصر سے شگاف میں پڑا اپنی مختصر سی روشنی بکھیرنے لگتا تھا اور جب ہم لوگ کھا پی کر اپنی اپنی چارپائیوں پر پہنچ جاتے وہ برابر جلتا رہتا۔ ہم سونے لگتے تو اسے بھی آرام کا موقع مل جاتا۔ گرمیاں ہوتیں تو ماں پھونک مار کر اسے بجھا دیتیں اور سردیاں ہوتیں تو یہ ہمارے ساتھ ہی سونے کے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ماں اسے اپنی چارپائی کے سرہانے ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیتیں۔ ابا کو بڑی جلدی نیند آ جاتی تھی اس لیے اگر کسی کو دیے کی روشنی میں کام کرنا ہوتا تو وہ دیا لے کر باہر دالان میں چلا جاتا یا صبح کا انتظار کرتا۔ دیا نو دس بجے کے بعد وہاں نہیں جل سکتا تھا۔

میں نہ جانے کب سے مٹی کا یہ دیا دیکھ رہا تھا۔ حقے کی چلم بھی مٹی کی ہوتی تھی اور یہ دیا بھی مٹی ہی کا تھا مگر چلم دوسرے تیسرے دن ٹوٹ جاتی تھی ——— (اگرچہ توڑنے والے کی پیٹھ پر دادی کی ڈوئی بھی ٹوٹتی تھی) ——— مگر اس دیے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دیے کا دیا صحیح سلامت موجود تھا۔

میں دیر تک دیے کو دیکھتا رہتا تھا اور سوچا کرتا تھا۔ یہ روشنی جو اس میں سے نکلتی ہے کہاں سے آتی ہے۔ کیا اس کے اندر ہی رہتی ہے اور جب بتی جلا دی جاتی ہے تو فوراً باہر آ جاتی ہے لیکن دیے کے اندر تو تیل اور بتی کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی باریک سی دیواروں میں اتنی روشنی کیسے سما سکتی ہے۔ پھر سوچا روشنی دیے کے اندر نہیں ہوتی آسمان سے آتی ہے۔ چاند، سورج اور ستاروں سے آتی ہے اور دیا اسے اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ایک دن تو میں نے یہ نتیجہ بھی نکالا تھا کہ دیا آسمان کا ایک ستارہ ہے جو نیچے آ گیا ہے۔ اسی لیے تو یہ چلم کی طرح ٹوٹ نہیں جاتا۔ یہ سوچ کر مجھے بڑی فکر پڑی تھی کہ کہیں یہ دوبارہ آسمان پر نہ چلا جائے ——— اگر چلا گیا تو ہمارے گھر میں اندھیرا ہو جائے گا اور اندھیرا ہو جائے گا تو روٹیاں کیسے پکیں گی اور ہم کس طرح اندھیرے میں بیٹھ کر کھائیں گے۔

دیے کو بار بار دلچسپی سے دیکھ کر میرا اس سے ایک خاص ربط قائم ہو گیا تھا۔ میں اسے اپنی ماں کی طرح مغموم اور اداس ہی دیکھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں بیمار تھا اور آدھی رات تک سو نہیں سکا تھا تو میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے دیا جلتے جلتے تھک سا گیا ہے اور اسے نیند آ رہی ہے۔ روشنی دیتے دیتے وہ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا تھا ——— اور جب میری آنکھ لگی تھی تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں دیا ہاتھ میں لیے صحن میں کھڑا ہوں۔ دیا میرے ہاتھ سے نکل کر بلندیوں کی طرف جانے لگا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے یکایک احساس ہوتا ہے کہ ہمارے گھر میں ہر طرف اندھیرا ہو جائے گا۔ گھبرا کر میں اس کے پیچھے اڑنے لگتا ہوں۔ وہ دور ہوتا جا رہا ہے اور میں اس کا تعاقب کیے جا رہا ہوں۔ اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ شاید میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ ماں میری چارپائی پر بیٹھ کر آیتہ الکرسی پڑھ رہی تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا ——— دیا اپنی جگہ پر جل رہا تھا۔

یہ دیا گھر کی تیسری چیز تھی جس سے میں بہت متاثر تھا۔

مکان کے اوپر کا حصہ جس میں ہم لوگ رہتے تھے کئی کمروں میں منقسم تھا۔ ایک تو تھا "بڑا کمرہ" یہاں ہم سوتے تھے۔ ساتھ والے چھوٹے سے کمرے کو "گودام" بنا رکھا تھا۔ اس سے آگے دالان تھا جس کا ایک حصہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یہاں چھت پر ہمیشہ دھوئیں کی وجہ سے سیاہی رہتی تھی۔ اس سے آگے 'بارہ دری' تھی۔ اس پر تایا جان کا قبضہ تھا۔ وہ یہاں لوہے کی کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ دالان کے ایک طرف ایک تو کمرہ تھا جو اس اعتبار سے 'ڈرائنگ روم' تھا کہ یہاں مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا اور اس سے منسلک تھی کوٹھری ——— کوٹھری کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوٹھری سب کمروں سے مختلف تھی یہاں دن کے وقت بھی کہ سورج نصف النہار پر ہوتا تھا۔ نیم تاریکی اور نیم روشنی کا سماں رہتا تھا۔ ہر طرف چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ کوٹھری میں داخل ہوتے وقت مجھ پر ایک عجیب سا مبہم سا احساس چھا جاتا تھا۔ اس احساس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں دادا جان کی کتابوں والا صندوق پڑا رہتا تھا۔ پھر یہاں ایک ٹرنک میں بند مغل شہزادیوں کی تصویریں تھیں۔ ان شہزادیوں کے جھلملاتے ہوئے رنگین کپڑے میرے ذہن پر

ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتے تھے۔ یہاں مہندی کی خوشبو اتنی تھی مگر نہ جانے کہاں سے آتی تھی۔ مہندی کا احساس میرے لیے ایک خاص رنگ نہیں ایک خاص خوشبو ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں کہیں مہندی کے پتے سونگھے تھے۔ ان کی بُو میری رگوں میں رچ بس گئی تھی۔ اب بھی مہندی والے ہاتھ دیکھتا ہوں تو وہ پُراسراری بُو میرے ذہن کی تہوں میں جاگ اٹھتی ہے۔

دادی جان نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی جس میں کسی شہزادے کو دیو نے ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ شہزادہ اس کوٹھڑی میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے اور آنسو بہا رہا ہے۔ میرا دل تڑپ اٹھتا اور میں بے اختیار اسے ڈھونڈنے لگتا اور پھر مایوس ہو کر باہر نکل جاتا۔

دادی جان ہمارا مکان چھوڑ کر اس مکان میں چلی گئی تھیں جو محلہ چلوٹیاں میں ہے۔ یہ مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے میں دادی جان رہتی تھیں اور دوسرے میں پھوپھی جان۔ دادی جان نے مجھے اس وجہ سے یہاں بلا لیا تھا کہ وہ مجھے کوئی ہنر سکھانا چاہتی تھیں۔ پہلے انہوں نے مجھے ایک ایسی دکان میں چھوڑ دیا جہاں لوہے کا کام ہوتا تھا مگر میں تیسرے دن ہی بھاگ نکلا۔ اس کے بعد وہ مجھے بڑھئی کی دکان پر لے گئیں۔ وہاں سات آٹھ روز تک جانے کے بعد میرا دل بیزار ہو گیا۔ بیزاری کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ جو استاد کام سکھاتا تھا اس کے بڑے بڑے بالوں سے کڑوے تیل کی بُو ہر وقت آتی رہتی تھی اور جس ذہن میں مہندی کی 'موہوم بُو' رچی ہو وہ یہ بُو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ دادی جان نے لاکھ جتن کیے کہ میں کہیں جم کر کام سیکھوں لیکن میں آوارہ گردی کو ہر ہنر پر ترجیح دیتا تھا۔

میری آوارہ گردی کا خاص مرکز 'بھاٹیوں کا میدان' تھا۔ یہاں سے نکلتا تھا تو باغوں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب میں دُور دُور جانے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ہمارے مکان کے پاس ایک بڑا اونچا مکان کھڑا تھا۔ میرا ایک دوست یہاں رہتا تھا۔ میں اس مکان کی چھت پر چڑھ کر دور دور نظریں ڈالا کرتا تھا۔ افق کے دامن کو چھوتا ہوا کوئی مینار بلندیوں پہ گزرتا ہوا کوئی ہوائی جہاز اور پل بھر کے لیے اپنی جھلک دکھا کر غائب ہوتا ہوا کوئی پرندہ میرے دل میں ایک ہلچل سی ڈال دیتا تھا۔ جی چاہتا تھا میں بھی اڑنے لگوں۔ کہیں دُور چلا جاؤں —— کسی اجنبی دیس میں پہنچ جاؤں —— اور پھر میں عجیب و غریب خواب دیکھنے لگتا تھا —— جیسے کہیں دور چلا گیا ہوں —— جیسے آسمانوں میں اڑ رہا ہوں!!

یہاں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جسے میں آج تک نہیں بھلا سکا۔

میں اپنے مکان کے سامنے گلی میں کھڑا تھا اور فضا میں اڑتی ہوئی کوئی پتنگ دیکھ رہا تھا۔ اچانک پاؤں میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک سانپ میرے پاؤں پر سے گزر رہا تھا۔ خوف کے مارے میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ سانپ گزر گیا۔ خیال آتا ہے اگر ڈر کر پاؤں ہلاتا تو سانپ کاٹ دیتا —— اور سانپ کاٹ دیتا تو ——

دادی جان نے جب دیکھا کہ میں سیدھے راستے پر نہیں آتا تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا یعنی میری ذات ہی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ شام کو اپنے گھر جا کر کچھ کھا پی لیتا اور اسی طرح مزے سے بیت رہی تھی۔

میرے پھوپھا بہت کم گھر پر آتے تھے۔ باہر سے گائیں بھینسیں خرید کر شہروں میں بیچا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ گھر آئے اور انہوں نے مجھے اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے "بچے کی عمر ضائع ہو رہی ہے اسے سکول میں بٹھاؤ" اور انہوں نے مجھے بھاٹی کے اندر ہی

محمد نجیاں کے ایک پرائمری سکول میں داخل کرا دیا اور میں پھر اپنے گھر میں آ گیا۔

چوتھی جماعت تک پہنچتے پہنچتے چھ سکول تو میں نے بدلے ہی ہوں گے۔ یہ نہیں کہ ایک سکول سے نکل کر دوسرے سکول میں داخل ہو جاتا تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ ہوتا یہ تھا کہ میرا اسکول کچھ مدت کے بعد اپنی عمارت ہی بدل دیتا تھا۔ خبر نہیں پہلی عمارت کا مالک جواب دے دیتا تھا یا نہ جانے کیا وجہ پیش آ جاتی تھی۔ انہی دنوں دو ایسے واقعے گزرے جنہوں نے مجھے کافی متاثر کیا۔ پہلا واقعہ تو وہی ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دو تین مرتبہ کر چکا ہوں۔ میرا اسکول کسی ویران مقام پر تھا۔ چھٹی کے وقت گھر لوٹتے ہوئے راستہ بھول گیا اور ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جو شہر سے کافی دور تھی۔ ایک نیک دل انسان نے مجھے دیکھا اور اپنے گھر لے گیا۔ اس شخص نے اور اس کی بیوی نے مجھے اس طرح دلاسا دیا، اس طرح آرام پہنچایا کہ ان کا سلوک ایک ایسا نقش بن کر میرے دل میں جم گیا ہے کہ شاید کبھی محو ہونے نہیں پائے گا۔ انہوں نے غیر شعوری طور پر مجھے انسان سے محبت کرنا سکھایا —— اور میں ان کا احسان کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

یہ دوسرا واقعہ کوئی خاص واقعہ نہیں —— یہ معمولی سی بات ہے اور شاید اسے معمولی سی بات ہی سمجھا جائے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معمولی سی بات نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس نے آگے چل کر میرے ذہنی تجربات کو خاص رنگ روغن دیا ہے اور میری تخلیقی کاوشوں کی شاخوں سے جو برگ و بار پھوٹے ہیں ان کی نشوونما میں اس واقعے نے بھی ایک اہم حصہ لیا ہے۔

تایا جی نہانے کے لیے صابن تولیے لے کر کہیں باہر جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے ایک درخت کے نیچے ٹھہرنے کو کہا اور خود کسی تالاب یا کنوئیں کی طرف چلے گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں تنہا رہ گیا۔

اجاڑ جگہ —— چاروں طرف درخت ہی درخت۔ لگتا تھا کہ اس جنگل میں پہنچ گیا ہوں جس میں گلہری کا سرخ محل ہے۔ درختوں کی ایک طویل قطار کے آخر میں، آسمان کے کنارے ڈوبتا ہوا سورج ایک جھلملاتا ہوا سرخ محل معلوم ہوتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوئی میری روح سے سرگوشیاں سی کر رہا تھا —— فضاؤں میں چھایا ہوا دھندلکا میرے سینے میں اتر رہا تھا اور میری انگلیاں ننھے بادلوں کو چھونے لگی تھیں —— کانوں میں عجیب عجیب آوازیں گونج رہی تھیں اور مہندی کی خوشبو سی کوئی شے میرے دل میں تیرتی جا رہی تھی۔

مجھے ایک ایسی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا جو عجیب، مہیب، لذت ناک اور خواب آور تھی۔

میں اسی کیفیت میں غرق تھا کہ ایک بھاری سی چیز میرے شانے سے لگی۔ تایا جان آ گئے تھے اور مجھے چلنے کا اشارہ کر رہے تھے —— اُف! میری تنہائی!

خدا خدا کر کے پرائمری سکول سے نکلا۔ ابا نے مجھے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں داخل کرا دیا۔ ابھی تک کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ لکھنے لکھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب کسی شاعر کا نام سنتا تھا تو دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش میں بھی شاعر بن جاؤں۔ ساتویں جماعت میں میرا ایک کلاس فیلو تھا جس سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ نام تھا حسن شفتے۔ ایک دن ہم دو امتحان کی تیاری کے لیے اس باغ میں پہنچ گئے جو ٹاؤن ہال کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ بستے کھولے گئے، کتابیں کھول لی گئیں اور کتابیں ہاتھوں میں لے کر ہم باتیں کرنے لگے۔ اچھے اور برے ماسٹروں کی باتیں، کہانیوں والی کتابوں کی باتیں، شاعروں کی باتیں —— اور اس وقت

حسن شفیع کو نہ جانے کیا سوجھی کہ کہنے لگا: "میرے شعر سنو گے؟" میں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شاعر ہے اور شفیع تخلص کرتا ہے۔ اس نے مجھے کچھ شعر سنائے۔ ایک مصرع اب تک یاد ہے ؎

اسے میاں یار کیا کرتا تھا اور کیا کر دیا

مجھے خوب یاد ہے کہ یہ مصرع اس نے اپنا کہہ کر سنایا تھا۔

میں نے اسی دن سوچ لیا کہ میں بھی شاعر بنوں گا اور میں نے دوسرے دن جماعت میں اپنے تخلص کا اعلان کر دیا۔ میرا تخلص تھا عاصی۔ ہر کتاب، ہر کاپی پر اپنا نام یوں لکھا: "مرزا داود علی عاصی"۔ ہماری جماعت میں صرف ہمیں دو شاعر نہیں تھے، اور بھی تھے اور ایک بار تو یوں لگا جیسے ہر لڑکا شاعر ہے۔ کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنے نام کے ساتھ کوئی تخلص لگا لیا تھا اور تقاضا یہ تھا کہ جانے والا دوسرے کو پورا نام لے کر بلائے۔ مثلاً داود علی عاصی! ادھر آؤ۔ حسن شفیع شفیع! ذرا اپنی کتاب دو۔ حد یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ جغرافیے کے ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو پکارا: "ارشاد علی کھڑے ہو جاؤ۔" ارشاد علی بیٹھا رہا۔ ماسٹر صاحب کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ کہنے لگے: "سنا نہیں تم نے؟" نہ جانے ارشاد کس عالم میں بیٹھا تھا کہنے لگا: "ماسٹر جی! میرا پورا نام لیجئے۔ یوں کہئے: "ارشاد علی گلستان! کھڑے ہو جاؤ۔"——

"یہ گلستان کیا چیز ہے؟" ماسٹر جی نے پوچھا۔ "جناب میرا تخلص!" اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی مگر دوسرے دن یہ حرکت ایک اور لڑکے نے کی۔ اس کا نام تھا صفدر شاہ۔ ماسٹر جی نے بلایا تو وہی واقعہ ہوا۔ ماسٹر جی نے پوچھا: "تمہارا تخلص کیا ہے؟" اطلاع دی گئی "[illegible]" ماسٹر جی جھنجھلا پڑے۔ کہنے لگے: "سب سے پہلے تخلص کس نے رکھا تھا؟" سب لڑکوں نے شور مچایا: "داود علی عاصی نے۔" ماسٹر جی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "داود علی عاصی صاحب! کیا آپ نے بھی شعر کہے ہیں؟" "جی! عرض کرتا ہوں" اور انہوں نے بید سے کر میرے دونوں ہاتھ سرخ کر دئیے۔ سب لڑکوں نے اپنے تخلص چھوڑ دئیے اور میں نے اپنا تخلص بدل دیا۔ عاصی چھوڑ کر "شجر" کر لیا اور یہ شجر آنے والے موسم کی تاب نہ لا سکا کیونکہ کچھ ماہ بعد میں نے اپنا تخلص بدل کر برق بنا لیا۔ برق بھی زیادہ دیر تک نہ چمک سکی۔ آخر زبان اور ادب پر فوقی اور [illegible] پھر کبھی نہ بدلا۔

اسی زمانے کے ایک واقعے کی یاد ایک ہوک بن کر دل میں جم سی گئی تھی۔

ہمارے گھر کے عقب میں مایا رام کی کٹڑی تھی۔ بیسیوں مکان تھے اس کے اندر۔ مکان کیا تھے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس کٹڑی اور ہمارے مکان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا کنبہ رہتا تھا۔ ایک بوڑھی عورت، اس کا بیٹا اور بہو۔ بیٹے کا نام تھا جھنڈے۔ یہ خوش خلق اور شگفتہ مزاج آدمی تھا۔ ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ شوہر کے برعکس بڑی متین اور سنجیدہ تھی۔ بڑی کم گو تھی۔ ماں بیٹے کی ہم مزاج تھی۔ میں اور ابا کوٹھے کے اس حصے پر سوتے تھے جو بیٹھک کے کوٹھے سے ملحق تھا اس لیے ہر شام ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ میں اس کنبے سے بہت مانوس تھا اور وہ تینوں مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مایا رام کی کٹڑی میں کئی خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ عموماً معمار تھے۔ کچھ قلعی گر اور خوانچے لگانے والے بھی تھے۔ ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی اس جگہ۔ سب ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ناگاہ شہر میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ طاعون نے اس کٹڑی پر بھی حملہ کر دیا۔ روز ادھر سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ روز جنازے اٹھنے لگے۔ ہم بالائی کمرے میں سے ہو کر کوٹھے کے دوسرے حصے میں جاتے تھے۔ گھر والوں نے بالائی کمرے کے

دونوں دروازوں کو مقفل کر دیا کہ ادھر کوئی نہ جائے اور گھر کا کوئی فرد ادھر جانے کی سوچ بھی سکتا تھا؟ عجیب عالم تھا اس وقت۔ لوگ ایک شخص کو دفنا کر آتے ہی تھے کہ موت کا ایک اور شکار ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید ایک دن میں چار بار جنازہ اٹھا تھا۔ پہلے ہر گھر سے چیخیں بلند ہوا کرتی تھیں —— اب چیخیں بلند نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ رو رو کر تھک چکے تھے اور پھر روتا کون؟ کسے خبر تھی کہ وہ دوسرے دن زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟

ہم سب لوگ سہمے ہوئے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کرتے تھے۔ کوٹھے پر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک دن میں اوپر چلا گیا۔ بالائی کمرے میں پہنچا تو جی چاہا ایک نظر اس کنبے پر بھی ڈال آؤں۔ دیکھوں کہ ان کا کیا حال ہے۔ یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ میں کمرے کے دروازے پر چڑھ کر چھت پر جا پہنچا اور پھر دوسرے دروازے سے نیچے چلا گیا۔ آگے بڑھا —— اور آگے بڑھا۔ عیلے کے گھر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کوٹھے سے نیچے صحن میں جھانک کر عیلے کی بیوی کو دیکھا۔ اس کا سارا جسم روتے روتے کانپ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو "چلے جاؤ!" اور میں جس ترکیب سے اُدھر گیا تھا اسی ترکیب سے واپس چلا آیا۔

رات میری حالت بڑی خراب ہو گئی۔ ماں نے مجھے دیکھ کر زور سے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں۔

صبح میری طبیعت سنبھل گئی۔ غم کی وجہ سے میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ وبا نے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔

موت کا طوفان جو ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا تھا چپ چاپ واپس چلا گیا تھا۔ زندگی رینگتی ہوئی ایک تاریک غار سے آہستہ آہستہ باہر کی روشن دنیا میں آ رہی تھی۔

کئی دنوں کے بعد بالائی کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے اُدھر جا کر دیکھا۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ لگتا تھا غنیم نے آباد بستی پر حملہ کیا ہے اور اپنی ترکتازیوں سے تباہ کر دیا ہے اور اب یہاں کھنڈر ہیں۔ خاک اڑ رہی ہے اور موت کا سکوت طاری ہے۔

وہ تینوں کدھر چلے گئے تھے۔ وہ لوگ۔ پیارے لوگ۔ وہ قہقہے لگانے والا عیلے۔ وہ اس کی خاموش، متین خوبصورت بیوی اور وہ بوڑھی ماں! کیا اب وہ اوپر نہیں آئیں گے؟ وہ ہنسیں گے نہیں —— باتیں نہیں کریں گے؟

ان کے کوٹھے پر الگنی سے عیلے کی بیوی کا دوپٹہ لٹک رہا تھا —— ایک طرف اینٹوں کے بنے ہوئے چولہے میں راکھ اڑ رہی تھی۔ چلم ابھی تک چولہے کے پاس پڑی تھی!

نویں جماعت میں تھا کہ میری پہلی نظم "ہلال" میں چھپ گئی۔ "ہلال" ایک ہفت روزہ پرچہ تھا جسے میرے ایک کلاس فیلو ظہور الدین مجّی کے بڑے بھائی مرزا محمد سلطان کیف نکالتے تھے۔ اس پرچے میں مولانا علم الدین سالک اور عبداللہ قریشی عموماً لکھا کرتے تھے۔ مقبول انور داؤدی اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہی داؤدی تھے جنہوں نے بعد میں "سیاست" کے ایڈیٹر بن کر میری کئی نظمیں اپنے اخبار میں شائع کی تھیں اور بڑے اہتمام سے شائع کی تھیں۔

نظمیں کہتا تھا مگر کسی سے مشورہ نہیں لیتا تھا۔ واڈی صاحب خود ہی اصلاح کر دیتے تھے۔ ہلال کے علاوہ کئی نظمیں "شباب اردو" میں بھی چھپی تھیں۔ شاعری سے مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ میری شہرت سارے سکول میں پھیل گئی۔ ہمارے تاریخ کے ماسٹر جناب منتصر باللہ تھے۔ وہ طلبا کی ذہنی نشوونما میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے سکول میں ایک مجلس مذاکرہ (DE BATING CLUB) قائم کی۔ اس کی صدارت کے دو امیدوار تھے۔ ایک تو میں تھا اور دوسرے صاحب تھے سید راجہ علی شاہ (سید مراتب علی شاہ کے صاحبزادے) آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کے طلبا نے ووٹ دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسی فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو گیا۔ صدر بن گیا تو ماسٹر صاحبان مجھ میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ہمارے ایک دینیات کے استاد تھے۔ عبداللہ فاروقی صاحب! انھوں نے ایک دن مجھ سے میرے شعر سنے اور فرمایا: "کس کے شاگرد ہو؟" میں نے سن رکھا تھا کہ شاعر اللہ کا شاگرد ہوتا ہے اس لیے جھٹ بول اٹھا: "اللہ تعالیٰ کا!" وہ مسکرائے اور بولے: "اختر شیرانی کے شاگرد بنو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا وہ مجھے شاگرد بنا لیں گے؟" اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: "کسی دن لے چلیں گے تمہیں وہاں!"

اختر شیرانی اس وقت شعری فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کی نظم "اے عشق کہیں لے چل!" بے حد مقبول ہو چکی تھی۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا رسالہ "خیالستان" پڑھا کرتا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن میں فاروقی صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اتفاق سے اس دن وہ اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی کے ہاں جانے والے تھے۔ کہنے لگے بڑے اچھے وقت پر آئے ہو، چلو! وہ مجھے نیشنگ روڈ پر ایک احاطے کے اندر ایک چھوٹی سی گلی کے کونے والے مکان کی دوسری منزل میں لے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے نیچے راکھ بکھری ہوئی تھی۔ چارپائی کے پاس ایک میز پر بے شمار کتابیں بے ترتیبی کے عالم میں پڑی تھیں۔ فاروقی صاحب نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود حافظ شیرانی سے ملنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد ایک پہلوان قسم کا آدمی اندر آیا۔ بڑا سا چہرہ، چھوٹا قد، پھیلے ہوئے نتھنے۔ میں نے سمجھا اختر شیرانی کا نوکر ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کی۔ پہلوان نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کڑکتی ہوئی آواز میں بولا: "کالے!" ابھی آواز کی گونج فضا میں باقی تھی کہ فاروقی صاحب آ گئے۔ انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا: "کمال کر دیا ہے تم نے ادیب! یہ اختر شیرانی ہیں" ـــــ اور پھر وہ اختر شیرانی سے مخاطب ہو کر بولے: "معاف کیجیے! بے وقت تعظیم کے لیے کھڑا بھی نہیں ہو سکا!" میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

اختر شیرانی نے مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا: "کوئی بات نہیں مولانا ـــــ اچھا تو یہ ہیں میرزا ادیب! پڑھی ہیں ان کی نظمیں، اقبال کے رنگ میں کہتے ہیں۔"

اور میں اختر شیرانی کو اپنی نظمیں دکھانے لگا۔ پہلے پہل تو کبھی کبھی نظموں کا پلندہ لے کر ان کے پاس جایا کرتا تھا اور جب اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو دوسرے تیسرے دن حاضرِ خدمت ہونے لگا۔ نظموں پر ایک نظر ڈال کر فرمایا کرتے تھے: "تم تکلف کرتے ہو۔ جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے۔" اس وقت اس فقرے کو اپنی تعریف پر محمول کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ انھیں میرا رنگ پسند نہیں تھا۔ میں قومی نظمیں کہتا تھا اور وہ رومانی شاعر تھے۔ بہرحال ان سے جو شاگردانہ عقیدت وابستہ ہوئی تو آخر تک قائم رہی۔ میرے علاوہ اختر صاحب

کے یہاں ن۔ م۔ راشد، احمد ندیم قاسمی اور عطاء اللہ سجاد بھی آتے تھے۔ تینوں اختر صاحب سے مشورہ لیتے تھے۔ مرحوم ایک ادارہ تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان کی ذات سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اختر میرے استاد تھے مگر جس ذات گرامی سے میں خاص طور پر متاثر تھا وہ تھی اختر صاحب کے والد حافظ محمود شیرانی کی عظیم شخصیت۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا مطالعے ہی میں غرق پایا۔ ایک دن میں صبح اختر صاحب کے یہاں پہنچا ۔۔۔ حافظ صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد کالج چلا گیا ۔۔۔ شام کو دوبارہ اختر کے یہاں گیا تو حافظ صاحب بدستور مطالعے میں محو تھے۔

حافظ شیرانی جیسی علم پرست ہستیاں اردو ادب نے بہت کم پیدا کی ہیں۔ وہ حقیقتاً روشنی کا مینار تھے۔ ایسے علم دوست بلکہ علم پرست لوگوں میں سے تھے جن کا لمحہ لمحہ حصول علم اور فروغ علم میں بسر ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حافظ شیرانی نے اپنے صاحبزادے کی تربیت کے لیے کیا کیا اہتمام کیا تھا۔ اختر فرماتے تھے کہ میرے سات استاد تھے۔ ان میں دو ایسے بھی تھے جو محض اختر کو خوشخطی اور پہلوانی سکھاتے تھے۔ پہلوانی سے ان کی مراد جسمانی ورزش ہوگی! ۔۔۔ اختر کا مطالعہ بے پناہ تھا۔ اردو کا تمام کلاسیکل لٹریچر پڑھ چکے تھے۔ زبان کی باریکیوں پر ان کی خاص نظر تھی۔ خوشخط تو ایسے تھے کہ ان کی تحریر دیکھ کر معلوم ہوتا جیسے موتی پرو دیے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اختر نہایت شریف انسان تھے۔ انسانی خوبیاں ان میں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ میں نے بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جو اختر (مرحوم) کی طرح بلند کردار کے مالک ہوں۔ افسوس ایک ایسی کمزوری ان کی زندگی میں داخل ہو گئی جس نے موت کو بہت جلد ان کے گھر کا راستہ دکھا دیا ۔۔۔!

پچھلی نصف صدی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہمارے معاشرے میں موجود تھے جو انفرادی حیثیت سے بلند ہو کر باقاعدہ ادارے بن گئے تھے مثلاً علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر پطرس، ڈاکٹر تاثیر، حافظ محمود شیرانی اور اختر شیرانی ۔۔۔ اور بھی چند لوگ ہوں گے۔ کاش کوئی شخص اس موضوع کی طرف توجہ کر سکے۔

جس دور کا میں ذکر کرنے والا ہوں، اسلامیہ کالج کی فضا علمی سرگرمیوں سے معمور تھی۔ 'بزم فروغ اردو' ڈاکٹر تاثیر کی زیر نگرانی کام کر رہی تھی۔ 'بزم ادب' الگ طلباء کی ذہنی تربیت میں مصروف تھی۔ ان سرگرمیوں کا اثر تھا کہ ادبی ذوق برابر پھیلتا جا رہا تھا اور جس طالب علم میں ادبی جراثیم ہوتے تھے وہ ادبی گہماگہمی میں اتنی صلاحیت ضرور پیدا کر لیتا تھا کہ ادبی حلقوں میں شامل ہو کر نمایاں حیثیت اختیار کر لے۔ اساتذہ میں بڑی ممتاز شخصیتیں تھیں۔ ایک تو ڈاکٹر تاثیر ہی تھے۔ پھر پروفیسر حمید احمد خاں تھے، مولانا علم الدین سالک تھے، سید فیاض محمود تھے۔ طلباء میں شیر آزری تھے، مولا بخش خضر تمیمی اور لطیف انور گورداسپوری تھے۔ محمود نظامی اور عبدالرؤف ساحر تھے۔ تابش صدیقی اور حمید نظامی تھے۔ جب میں نے کریسنٹ کی ادارت سنبھالی تو معاون ایڈیٹروں کی حیثیت سے تابش صدیقی اور حمید نظامی میرے ساتھ تھے۔ اس فضا میں میرے ادبی ذوق کو پروان چڑھنے کا بڑا اچھا موقع ملا اور میں نے ان اساتذہ اور ان طلبا سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت کچھ حاصل کیا۔ اس وقت ملک کے طول و عرض میں آزادی کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ عدم تعاون ۔۔۔ ترک موالات اور قانون شکنی کی وارداتیں عوامی سطح پر ہنگامہ آرا تھیں۔ جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے۔ غیر ملکی استبداد کے خلاف منظم اور غیر منظم جدوجہد کا مظاہرہ سمندر کی ان موجوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور جہاں تک

پھیل جاتی ہیں۔

میں جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ جلوس دیکھتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ چاوڑی دروازے کے باہر میں نے کانگریس کے ایک والنٹیر کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ مٹی سے بھرے ہوئے ٹرک کے سامنے لیٹ گیا تھا۔ یہ ٹرک جلوس کو روکنا چاہتا تھا اور جلوس رکنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا ٹرک بڑھ رہا ہے اور بہادر نوجوان ذرا سی جنبش کیے بغیر سڑک پر لیٹا ہے۔

بعد میں ٹرک نے رخ بدل دیا تھا —— مگر نوجوان والنٹیر نے جس بہادری، شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا تھا اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ کانگریس نے بدیشی مال کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔ کانگریس کے والنٹیر جابجا بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کر رہے تھے اور بدیشی مال سڑکوں پر بکھیر کر دھڑا دھڑ جلا رہے تھے۔ میں نے ایک لڑکی والنٹیر کو دیکھا تھا کہ ایک دکان پر پکٹنگ کر رہی تھی۔ شدید بارش میں اس کے کپڑے شرابور ہو چکے تھے۔ اس کے ماتھے سے زدوکوب کی وجہ سے لہو بہہ رہا تھا۔ سپاہی اسے بار بار سختی کے ساتھ چبوترے سے اتارتے تھے مگر وہ پھر چبوترے پر چڑھ جاتی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے کھڑی تھی اور کب تک کھڑی رہتی کہ دکاندار نے تنگ آکر سارا بدیشی مال سڑک پر پھینک دیا۔ وہ لڑکی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہری۔ چلی گئی۔ لوگ کپڑوں کو آگ لگاتے رہے اور "بدیشی مال مردہ باد" کے نعرے لگاتے رہے۔

ان دو ہستیوں نے نہ جانے میرے کتنے کرداروں کو زندگی کی حرارت اور روشنی دی ہے۔

سال چہارم میں میرا نثر نگاری کا ذوق نظم نگاری پر غالب آ گیا۔ پہلے میں نظم کے ساتھ نثر بھی لکھا کرتا تھا۔ کریسنٹ میں میرے کئی افسانے اور ڈرامے چھپے تھے —— مگر اب نظم نگاری کا رجحان بہت مدھم پڑ گیا تھا اور میں بیشتر توجہ افسانہ نگاری کی طرف دیتا تھا۔ اس دور میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سید سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد اور خلیقی دہلوی سے خاصا متاثر تھا۔ میری نثر بڑی رنگین، ثقیل اور بوجھل تشبیہات و استعارات سے پُر ہوتی۔ یہ اندازِ تحریر کئی سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد میری روش بتدریج بدلنے لگی اور میں رواں نثر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

یقین تھا کہ تعلیم جاری رکھوں گا اور یورپ میں جا کر بالخصوص جرمنی پہنچ کر علم حاصل کروں گا مگر تعلیم کو آگے بڑھانے اور بیرونی ممالک میں جانے کے سارے تصورات درہم برہم ہو گئے۔ بی۔ اے (آنرز) کرنے کے بعد کچھ دیر آگے پڑھا کیں اور آگے نہ پڑھ سکا۔ وہ سفر جو اسلامیہ کالج کی دیواروں کے سائے میں شروع کیا تھا اب ختم ہو گیا تھا اور میں دوری سے اپنی منزلِ مقصود پر ایک حسرت ناک نظر ڈال کر تلاشِ روزگار میں منہمک ہو گیا تھا۔

کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے کالج کے زمانے میں، سب کے سب ان خشک پتوں کی طرح بکھر گئے تھے جنہیں تیز ہوا کے جھونکے شاخوں سے جدا کر کے آناً فاناً کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ خواب دیکھنا میری فطرتِ ثانی ہے۔ زندگی بھر خواب دیکھے ہیں میں نے —— حسین و جمیل خواب، قوسِ قزح کی طرح رنگین خواب، گلاب کے پھولوں کی مانند دلکش خواب، شبنم کے موتیوں ایسے چمکتے دمکتے خواب۔ ان خوابوں نے میرے دل و دماغ کو روشنی دی ہے۔ ان خوابوں کی وجہ سے میری روح پر اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ زمین کی پستیوں میں کھڑے ہو کر ستاروں کو چھو لینے کا تصور کتنا پیارا تصور ہے مگر جب ہاتھ میں ایک جگنو بھی نہ آئے

تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تپتی ہوئی ریت پر پاؤں رکھنا اور یہ سوچنا کہ دوسرا قدم وادیِ گلستاں ہی میں اٹھے گا کتنا خوشگوار خیال ہے لیکن جب گھٹنوں تک چھالے پڑ جاتے ہیں تو آدمی کس بلندی سے کس پستی میں آگرتا ہے۔

میں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں — اور عموماً ان خوابوں کی راکھ ہی اپنے دامن میں سمیٹی ہے مگر میں خواب دیکھنا چھوڑ نہیں سکتا۔ خواب میری زندگی ہیں۔ جس دن میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے — میں خود دنیا کے لیے ایک خواب بن جاؤں گا۔

کالج سے نکلا اور کچھ دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد "ادبِ لطیف" کے دفتر میں پہنچ گیا۔ 'ادبِ لطیف' کے مالک چودھری برکت علی مرحوم مجھے بڑی مدت سے جانتے تھے۔ 'ادبِ لطیف' کا پرچہ حکیم احمد شجاع نے نکلوایا تھا اور انھوں نے ہی پہلے شمارے کو ترتیب دیا تھا۔ دوسرے پرچے سے ادارتی فرائض میرے سپرد کر دیے گئے تھے۔ تنخواہ پچیس روپے ماہانہ مقرر ہوئی تھی — 'ادبِ لطیف' کے علاوہ 'پنجاب بک ڈپو' کی درسی کتابوں کا کچھ کام بھی میرے ذمے تھا۔

مجھ سے اکثر لوگوں نے پوچھا ہے کہ 'صحرانورد کے خطوط' کیسے لکھے گئے تھے اور ان کی 'شانِ نزول' کیا ہے؟

ہر ذہنی کاوش کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تحریک ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ تحریک غیر شعور یا نیم شعور کے اندھیرے میں چھپی رہتی ہے اور کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی طریقے سے تخلیقی ذہن کو آمادۂ تخلیق کر دیتی ہے اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے جو واضح طور پر کسی تخلیقی کاوش کا محرک بن جاتا ہے — 'صحرانورد کے خطوط' کے پیچھے بھی ایک واقعہ کارفرما ہے۔

خبر نہیں وہ کونسا دن تھا — کونسی تاریخ تھی — کونسا مہینہ تھا، میں اس زمانے میں لمبی سیر کا عادی تھا۔ ایک صبح شہر کے مختلف حصے سے گزرتا ہوا مستی گیٹ سے ہو کر اس جگہ پہنچ گیا جو لاہور کے شاہی قلعے کی سیڑھیوں کے آگے پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سیڑھیاں پہلے نہیں تھیں، بعد میں بنائی گئی ہیں — مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ان سیڑھیوں کے نیچے سڑک پر قدم رکھا تھا تو دور سے بانسری کی آواز سنی تھی۔ بانسری مجھ پر گہرا اثر کرتی ہے۔ عجیب درد ہوتا ہے اس کی آواز میں۔ تو میں چلا جا رہا تھا اور یہ آواز کانوں سے ہوتی ہوئی میرے دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا قدم اٹھا رہا تھا کہ یکایک ایک بڑی میٹھی، مترنم اور دلآویز آواز ابھری — "تو کیا صحرانوردی کرو گی؟"

میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک لڑکی چہرے سے نقاب ہٹائے اپنی سہیلی سے مخاطب تھی۔

اس نے مجھے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں — نگاہیں اٹھائیں — محجوب سی — ایک بار پھر دیکھا اور چہرے پر نقاب پھیلا دیا۔

ابدیت کے سمندر سے ایک موج اٹھی اور مجھے بہا کر نہ جانے کہاں لے گئی۔

ایک نغمہ بلند ہوا اور 'افق تا افق' میری کائنات پر چھا گیا۔

ایک ستارہ فضا میں چمکا اور میری روح میں سما گیا۔

میں کہاں ہوں — یہ پھولوں کی بارش کہاں سے ہو رہی ہے — یہ روشنی کا سیلاب کدھر سے اُمڈ آیا ہے — یہ گنگناتی ہوئی ہوائیں کس سمت سے آ نکلی ہیں؟ میں آج کس گلپوش وادی میں پہنچ گیا ہوں — کس اجنبی جزیرے میں سانس لے رہا ہوں — کس نغموں کی دنیا میں پرواز کر رہا ہوں!

مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

یہ ایک لمحہ کروڑوں لمحوں کے سیلاب میں بہہ رہا تھا — یکایک رُک کر پوری ایک زندگی بن گیا تھا۔

یہ لمحہ، پھولوں اور گیتوں کی ایک پھوار تھی کہ دل پر گر رہی تھی۔

یہ لمحہ نسیم سحری کا ایک جھونکا تھا کہ جینے کی ویرانیوں میں تیرنے لگا تھا۔

یہ لمحہ آیا اور پھر کبھی واپس نہ گیا — یہ لمحہ آیا اور ازل و ابد کے درمیان ایک سنہری لکیر بن گیا۔

میں نے اسے دیکھا — وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

میں نے اسے دیکھا — وہ جا رہی تھی۔

اور پھر وہ دُور جا کر رُک گئی — رُک کر نقاب اٹھایا — نقاب گرایا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی — ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

ہزاروں چہروں میں وہ چہرہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔

لاکھوں آوازوں میں وہ آواز پھر کبھی سُنائی نہ دی۔

وہ ایک پھول تھی — جو لہروں میں بہتا ہوا کنارے پر آیا اور پھر یکایک ایک ریلے میں بہہ کر دریا کی تاریک گہرائیوں میں اُتر گیا۔

وہ ایک جگنو تھی — جو رات کے اندھیرے میں کسی درخت کی گھنیری شاخوں میں ایک ثانیے کے لیے چمکا اور پھر اندھیرے کا جزو بن گیا۔

اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجتے رہے — گونجتے رہے اور ایک دن میں صحرا نورد بن گیا!

شاید یہ بھی تلاش ہی کا ایک پہلو تھا — مگر اسے پانے کی جستجو میں خود کو بھی کھو بیٹھا!

میں نے زندگی بھر صحرا نہیں دیکھا۔ صحرا تو رہا ایک طرف کبھی کوئی گھنا جنگل بھی نہیں دیکھ سکا۔ یہ محض تخیل کی پرواز تھی کہ مجھے صحراؤں میں لے گئی۔ میں نے صحرا نورد کے خطوط کی بیشتر کہانیاں قلعے کی سیڑھیوں کے اوپر دروازے کے جنگلے کے پاس بیٹھ کر لکھی ہیں۔ تاروں کی چھاؤں میں کاغذ، پنسل اور ایک بڑی سی کتاب لے کر وہاں پہنچ جاتا تھا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں ٹہل ٹہل کر پلاٹ سوچا رہتا تھا اور پھر جب سورج طلوع ہوتا تھا تو دیوار سے پشت لگا کر کاغذ کتاب کے اوپر پھیلا کر لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ جب پسینہ بہنے لگتا تھا اور اینٹوں کے فرش کی وجہ سے پاؤں دُکھنے لگتے تھے یا سر چکرانے لگتا تھا تو پنسل ہاتھ سے چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ دیر دوبارہ ٹہل کر طبیعت بحال کرتا تھا — کاغذ تہ کر کے کتاب میں محفوظ کر دیتا تھا اور گھر کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں باقاعدہ طور پر میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب کہ سن ۶۳ زندگی کا آخری مرحلہ طے کرنے میں مصروف ہے مجھے قلم گھساتے ہوئے کم و بیش تیس برس گزر گئے ہیں — اس دوران پانچ برس ریڈیو میں بھی بطور سٹاف آرٹسٹ کے کام کیا ہے۔ "ادبی حیثیت"

کی مجموعی ادبی عمر سترہ سال سے کم نہیں ہے۔ میں صرف مصنف ہی نہیں ہوں، شوہر اور باپ بھی ہوں۔ میری معنوی تخلیق بارہ کتابوں میں پھیلی ہوئی ہے اور مادی تخلیق پانچ جلدوں میں۔ پانچوں بچے میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں۔

ادب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور بہت کچھ لیا بھی ہے۔ ادب کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے طوفانی جذبات کے اظہار کا موقع دے کر مجھے ایک گھٹن سے بچا لیا ہے۔

کبھی کبھی میرے شب و روز پر مایوسیوں کے سایے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ میری رگوں میں تاب و توانائی کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہتی — اس وقت ادب میرا ہاتھ پکڑ کر امیدوں کی روشن دنیا میں لے آتا ہے۔ تخلیقی عمل کے ان لمحوں میں میں سب کچھ بھول جاتا ہوں — زندگی کی ساری تلخیاں، ساری نامرادیاں — ساری ناکامیاں — میرے کردار آتے ہیں — اپنے آنسو مجھے دیتے ہیں اور میرا غم آپ بانٹ لیتے ہیں۔ اپنے ان سچے دوستوں اچھے رفیقوں کے ہمراہ میں کتنا خوش ہوتا ہوں، یہ میں ہی جانتا ہوں!

اگر ادب میری زندگی میں نہ آتا تو نہ جانے کب کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی غار میں پہنچ گیا ہوتا۔

میری تصانیف :

صحرا نورد کے خطوط (رومان)، صحرا نورد کے رومان (رومان)، خوابوں کے مسافر (ڈائری)، جنگل (مختصر افسانے)، کمبل (مختصر افسانے)، میرزا ادیب کے بہترین افسانے (مختصر افسانوں کا انتخاب)، آنسو اور ستارے (یک بابی ڈرامے)، لہو اور قالین (یک بابی ڈرامے)، ستون (یک بابی ڈرامے)، فصیل شب (یک بابی ڈرامے)، شیشے کی دیوار (پانچ ابواب میں ڈراما)، فن اور فن کار (انتقادی مضامین)۔ —

بچوں کے لیے بھی اتنی ہی کتابیں لکھی ہیں۔

میکش اکبرآبادی

میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر کے باہر ہمارے لیے عزت و توقیر، محبت و عقیدت کے انبار تھے جو نہ صرف یہ کہ ہمارے کسی مصرف کے نہ تھے بلکہ ہماری معیشت اور اقتصادیات پر بار بھی تھے۔ دوسری طرف ہمارے خاندانی دشمن بندوق تانے کھڑے تھے اور ہمارا مختصر خاندان جس کا قافلہ سالار راستے میں بچھڑ گیا تھا بے مقصد و بے منزل اندھیری رات میں رواں تھا۔ دشمن تھکتے گئے عزت کرنے والے منتشر ہوتے گئے اور ہمارا قافلہ چلتا رہا۔

مجھے ماں کا بھرپور پیار حاصل تھا مگر باپ کا سایہ کہاں، مجھے جوانی کی دھوپ میں سارا سامان میسر ہو تب بھی بغیر سایے کے کام نہیں چلتا۔ مجھے اپنے والد یاد نہیں ڈیڑھ دو سال کے بچے کو یاد بھی کیا رہ سکتا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ سنا ہے وہ اپنی ماں سے، کنبہ داروں سے، ان کے معتقدوں اور دوستوں سے۔ سب ان کی خوش اخلاقی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے قصے سناتے، ان کی غیر معمولی عزت اور مقبولیت کی داستانیں بیان کرتے اور ہر شخص ان کی جواں مرگی اور خوبصورتی کا بیان کرکے آنسو بہاتا۔ یہاں تک کہ بچپن ہی سے مجھے رونے سے نفرت ہوگئی تھی۔ عید تہوار پر اماں ہم دونوں بھائیوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہناتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر ان کی بھیگی ہوئی سرخ آنکھیں مجھے اچھی بھی لگتیں اور پریشانی بھی ہوتی۔ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ روتی کیوں ہیں۔ ہم دونوں بھائی سہم جاتے۔ ہمارے چچا زاد پھوپھی زاد بھائی خوش ہوتے پھرتے اور ہم ایک نامعلوم غم اور معلوم خوشی میں معلق رہ جاتے۔ جب باہر دروازے میں آتے تو والد کے احباب گلے لگا کر اور معتقد قدموں سے لپٹ کر روتے۔ ہم ڈر جاتے۔ ہمارے دل دھڑکنے لگتے۔ اس طرح ہمارے تہوار منتے رہے۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اماں سے کہہ دیا کہ آپ ہمیں کپڑے پہنا کر کیوں روتی ہیں، اب آپ روئیں گی تو ہم کپڑے نہیں پہنیں گے۔ آخر انہوں نے ہمارے سامنے رونا چھوڑ دیا اور پھر ساری عمر میں نے انہیں روتے ہی نہ دیکھا۔ وہ جب کبھی موت کو یاد کرکے یا نعتیہ اشعار سن کر روتیں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا کہ وہ ہنس پڑتیں۔ بعض اوقات وہ چڑ بھی جاتیں، کہتیں تجھے بچپن سے میرے رونے سے چڑ ہے۔ مجھے واقعی ان کے رونے سے چڑ تھی۔ وہ تھیں بہت رقیق القلب، دوسروں کے غم کو بھی اپنا غم بنائے رکھتیں۔ کوئی گھر سے بھی ان کے سامنے روتا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ رونے لگتیں۔ میرے نانا الٰہ آباد اور پھر لکھنؤ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ وہ میر اعظم علی صاحب (غالب کے مکتوب الیہ) کے پوتے تھے۔ ان کی بسم اللہ غالب کے مکان ہی میں ہوئی تھی۔ ایک ہی محلے میں دونوں کے مکان تھے۔ میری ماں کا مزاج بھی اپنے والد پر تھا۔ ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی جھوٹ بھی بولتا ہے اور کوئی بے ایمانی بھی کرسکتا ہے۔ اماں کی عمر شادی کے وقت ۱۸، ۱۹ سال کی تھی۔ یہ شادی میری دادی کی مرضی کے خلاف تھی۔ وہ اپنی بھانجی سے والد کی شادی کرنا چاہتی تھیں اس لیے اماں کو دادی صاحبہ کے دل میں جگہ کرنے میں بڑی دقت اٹھانا پڑی۔ میرے والد کی پہلی شادی سے دو لڑکیاں تھیں۔ اماں ان دونوں لڑکیوں کی ہی سوتیلی ماں نہ تھیں بلکہ سارے گھر کے لیے سوتیلی تھیں اس لیے اماں کا سہاگ کا زمانہ بھی کچھ سکون کے ساتھ

نہیں گزرا۔ پھر ایک دن دوپہر کے گیارہ بجے والد مردانے میں سے اٹھ کر گھر کے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے کسی سے بات نہیں کی چادر اوڑھ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سارے بدن میں ایک قسم کا رعشہ سا تھا۔ حکیم ڈاکٹر دوڑنے لگے۔ آگرے کے مشہور حکیموں کا سارا خاندان سب ہی قریب کے عزیز تھا۔ ثناء اللہ خاں ولایت کے پاس شدہ ڈاکٹر والد کے بہت خاص دوست سب دن بھر تدبیریں کرتے رہے۔ انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں اور رات کے گیارہ بجے ۴۵ سال کی عمر میں، دو یتیم بچے اور ایک جوان بیوہ کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ یہ نومبر ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ والدہ کی عمر اس وقت ۲۴ سال کی، میری عمر پونے دو سال اور میرے چھوٹے بھائی کی عمر تین مہینے کی تھی۔ کمرے میں میاں کی لاش پڑی ہوئی تھی کہ اماں سے کنجیاں لے لی گئیں اور لاش اٹھنے سے پہلے کمرے کا سامان اٹھنے لگا۔ خصوصاً کاغذات کی قسم سے کوئی چیز بھی نہ چھوڑی۔ کیلیں اور دیواروں پر لگی ہوئی وصلیاں اور قرآن تک اتار لیے گئے۔ اماں پتھر کی مورت بنی سب دیکھتی رہیں۔ ان کی نظر میں یہ سب ہیچ تھا۔ وہ تو اس بے روح جسم کو تک رہی تھیں جو انہیں ان کا گھر بار چھڑا کر لایا تھا اور جس کی خوشی پر انہوں نے اپنی دنیا تج دی تھی۔ سارے شہر میں ان کی جوانمرگی اور اچانک موت پر کہرام مچا ہوا تھا۔ جو سنتا تھا بدحواس ہو کر دوڑا چلا آتا۔ مگر قریب کے عزیزوں کو رونے کی بھی فرصت نہ تھی۔ سارے کاغذ اور گاؤں کا حساب خرد برد ہو گیا تھا۔ جن جن پر میاں کا روپیہ واجب تھا اس سے ہم محروم ہو گئے تھے اور جن کی امانتیں میاں کے پاس تھیں ان کی ادائیگی ہمارے ذمے واجب ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عمر قرض ادا کرتے، سود دیتے اور تنگی برداشت کرتے گزر گئی۔

یہ زمینداری، جاگیر اور شہری جائداد جو ہمارے لیے رحمت تھی ایک عذاب بنی ہوئی تھی اور خاندان کا بزرگ اور شہر کا مقبول عام ہونا ایک آفت ہو گیا تھا۔ یہی ہماری عزت و آرام اور یہی ہماری مصیبتوں کا سرچشمہ تھا۔ میرے دادا حضور کا جب وصال ہوا تو والد سترہ اٹھارہ سال کے تھے۔ دادا حضور چونکہ تارک الدنیا اور گوشہ گیر قسم کے بزرگ تھے اس لیے عزیزوں نے جائداد اور خاندانی اثاثے اور زکوٰۃ کا ایک بڑا حصہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا اس لیے والد کی مختصر عمر کا ایک بہترین زمانہ مقدمہ بازی میں گزرا۔ ایک مقدمے میں کامیابی ہوئی تھی اور دوسرے مقدموں کے راستے کھلے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے مخالفین کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہمیں ختم کر دیا جائے۔ جو بالکل قریب کے عزیز تھے اور جو ہماری پشت پناہ ہو سکتے تھے ان کا حال پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ان حالات میں ہمارے ہمدردوں نے اماں کو مشورہ دیا کہ ان بچوں کو لے کر آپ میکے چلی جائیں مگر انہوں نے کہا ماں کے بچے اس کی چھتری ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ان بچوں کی جو عزت اس گھر میں بیٹھنے سے ہو گی کہیں اور نہ ہو گی، اور وہ خود مرتے دم تک اسی گھر میں رہیں۔ وہ سکون کی تمنا تو بہت کرتی تھیں ہمیں نے ایک مکان علاحدہ ان کے لیے بنوا بھی دیا مگر وہ وہیں رہیں۔ وہ چاہتیں تو میرے چھوٹے بھائی کے پاس مستقل رہ سکتی تھیں۔ وہاں ان کے بیٹے موٹر کاریں، عالی شان کوٹھی تھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ عزت اور حکومت تھی۔ وہ تین مہینے سال میں وہاں گزار آتی تھیں لیکن وہ اپنے شوہر کے گھر کو ایک مقدس مقام سمجھتی تھیں اور اپنے آپ کو اس گھر کی لونڈی کہتی تھیں۔ وہ اکثر کہتیں میں تمہارے باپ دادا کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی چیز کیوں چھوڑی؟ اور آخر انہوں نے اسی گھر میں اسی طرح جان دی جس طرح بہت بڑے اور روحانی آدمی جان دیتے ہیں۔ انہیں اسی جگہ کفن پہنایا گیا جس جگہ وہ بیاہ کر پہلی دفعہ آ کر بیٹھی تھیں اور ان کا جنازہ اسی دروازے سے نکلا جہاں سے ان کی پالکی آئی تھی۔ یہی ان کی تمنا تھی۔

ہمارے خاندان نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں اور جھیلے ہیں۔ میرے جدِ اعلیٰ سید ابراہیم قطب مدنی جہانگیر کے آخری عہد میں مدینے سے آگرے آئے۔ چھبیس واسطوں سے امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں تھے۔ آنے کے اسباب کی جو روایت عام صوفیوں کی ہے تقریباً وہی ان کی بھی ہے۔ خانجہاں لودھی اور عہدِ جہانگیری کے دوسرے امرا حضرت کے معتقد ہوئے۔ سکونت کے لیے ایک حویلی اور درس و تدریس کے لیے ایک مسجد بنوا دی۔ اب سے کچھ پہلے تک یہ جگہ لودھی خاں کا ٹیلہ کہلاتی تھی اور جمنا کے ساحل پر واقع تھی۔ خان جہاں لودھی نے شاہجہان سے بغاوت کی اور لڑائی میں مارا گیا۔ پھر جاٹ گردی کا زمانہ آیا۔ اسی زمانے میں ہمارے یہاں آگ لگی اور علاوہ دوسرے سامان کے ایک ہزار قلمی کتابیں جل گئیں۔ اس سانحے کا ذکر خصوصیت سے میرے جدِ سوم سید امجد علی شاہ متخلص بہ اصغر نے کیا ہے۔ پھر کمپنی کے دورِ حکومت میں اس مسجد اور زمین کے ایک حصے پر سے بھی قبضہ جاتا رہا۔ مرہٹوں کا جب زمانہ آیا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا میرے جدِ سوم سید منور علی شاہ کا معتقد ہو گیا اور اس نے تین گاؤں حینِ حیات اور ایک گاؤں بطور آلتمغا نسلاً بعد نسلٍ نذر کیا اور سند میں لکھا کہ شاہ صاحب موصوف کے بزرگوں کی خدمت شاہانِ چغتیہ کرتے آئے ہیں اس لیے مجھ پر بھی ان کی خدمت لازمی ہے۔ یہ معافی ہمیشہ کے لیے اور نسلاً بعد نسلٍ تھی مگر جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میرے دادا صاحب کے بڑے بھائی سید امیر علی شاہ صاحب قید کر لیے گئے اور قلعے میں ان کی پیشی ہوئی۔ وہ تو جیسے تیسے بری ہو گئے مگر معافی ضبط ہو گئی جو بڑی کوششوں اور جانفشانی سے واگزاشت ہوئی۔ گورنر جنرل نے لکھا کہ یہ معافی سید منور علی شاہ اور ان کی اولاد کے لیے ہمیشہ کے واسطے ہے اس لیے واگزاشت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ہمیشگی ۱۹۵۲ء میں قانون خاتمہ زمینداری کے تحت ختم کر دی گئی۔

میری ابتدا ایسے گھر میں ہوئی جہاں جاگیرداری قرض خواہوں اور سود خوار مہاجنوں کے شکنجے میں دم توڑ رہی تھی اور جہاں تصوف کی صرف روایات ہی رہ گئی تھیں۔ ویسے بھی میرے خاندان میں مریدوں سے نذر قبول کرنے کا دستور نہ تھا بلکہ آمدنی کا ایک معقول حصہ مریدوں پر ہی خرچ کیا جاتا تھا۔ میرے والد مرید بھی نہیں کرتے تھے اور عام رئیسوں کی وضع اور رہن سہن رکھتے تھے اور ان کے عہد میں تو ہماری زمینداری کی پوری آمدنی بھی نہیں ملتی تھی۔ اماں تنگی ترشی سے گزر کرتی تھیں۔ اکثر روزمرہ کے خرچ کے لیے وہ زیور رہن رکھواتیں اور جب گاؤں سے فصل کی آمدنی آتی تو زیور چھوٹ کر آتا۔ یہ سلسلہ جب میرے چھوٹے بھائی احمد علی شاہ منصفی کے عہدے پر مقرر ہوئے تو ختم ہوا مگر موروثی قرضے کا بار اس کے بعد بھی قائم رہا اور اس کو ادا کر کے ذرا سانس لی تھی کہ زمینداری ختم ہو گئی۔ لیکن ہم نے بزرگوں کی روایات اور وضع داری کو قائم رکھا۔ اس کے لیے بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اس رکھ رکھاؤ کو قائم رکھنے میں اماں کے سلیقے کو بڑا دخل ہے۔ گھر کے باہر ہی نہیں بلکہ خاندان والے بھی ہمیں بڑا مالدار سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاتمہ زمینداری کے بعد جب میں نے اپنے خاندانی اصول کے خلاف مطب شروع کیا تو یہ مجھ پر ایک اور بار بن گیا۔ نہ مجھے کسی سے دوا کی قیمت مانگنے کی ہمت ہوتی اور نہ کسی کو قیمت دینے کی۔ اور آخر اس شغل یا اس وضع کو قائم رکھنے کے لیے مجھے ہومیو پیتھی کی سستی دواؤں کا سہارا لینا پڑا اور اب لوگوں سے ملنے اور لکھنے پڑھنے کے مستقل مشاغل کے علاوہ یہ شغل بھی مجھ پر مسلط ہو گیا ہے۔

سب سے پہلی استاد تو میری ماں تھیں۔ وہ اردو کے علاوہ تھوڑی بہت فارسی بھی جانتی تھیں اور خدا رسول کی باتیں بڑے عجیب انداز اور قصے کہانیوں کی صورت میں سنایا کرتی تھیں۔ ضروری مسائل اور قصص الانبیاء کا بہت سا حصہ انہیں یاد تھا۔ پھر ہماری دادی کی سوتیلی بہن ہمارے لیے مقرر ہو گئیں۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتی تھیں۔ ان کے بعد کئی معلم چلے اور اسی طرح انگریزی کے معلم بھی بدلتے رہے۔ قابل تذکرہ ایک تو مولوی عبدالمجید صاحب ٹونکی ہیں۔ ان سے عربی کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ مولوی برکات احمد صاحب ٹونکی کے شاگرد تھے۔ اور مذہبی اعتبار سے بڑے کٹر تھے۔ ہمارے یہاں کے عرس و فاتحہ اور صوفیانہ عقائد کے خلاف ہمارے ذہنوں کو متاثر کرتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے یہاں ہی رہتے تھے اور اس لیے ہر وقت مستعد رہتے۔ وہ شعر و شاعری اور ہر لطیف شے سے معرا تھے۔ یاد نہیں کبھی عید بقرعید بھی انہوں نے ہم سے مسکرا کر بات کی ہو۔ انہوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں تفسیر جلالین، مشکوٰۃ اور منطق کی ابتدائی کتاب مرقاۃ تک ہم دونوں بھائیوں کو پڑھا دیا تھا اور اردو سے عربی میں بھی ہم اچھا خاصا ترجمہ کر لیتے تھے۔ میرے بہنوئی سید شہزاد علی صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور ہم لوگ نمائش دیکھنے وہاں جایا کرتے تھے۔ ان کے تعلقات علی گڑھ کالج میں بھی تھے۔ اس زمانے میں کالج ہی تھا، یونیورسٹی نہیں ہوا تھا۔ اماں عربی بالکل نہیں جانتی تھیں۔ انہیں فکر تھی کہ مولوی صاحب بچوں کو کچھ پڑھاتے بھی ہیں یا نہیں۔ بظاہر تو ہم صبح سے دس بجے تک مولوی صاحب سے پڑھتے تھے، پھر کھانے کی چھٹی ہوتی اور گیارہ بارہ بجے پھر مولوی صاحب کے پاس آ جاتے۔ مولوی صاحب سوتے اٹھتے بیٹھتے اور ہم شام کے چار بجے کا انتظار دھوپ کے اندازے سے کرتے رہتے۔ چار بجے چھٹی ہوتی تو مکان کی سب سے اوپر کی چھتوں پر چڑھ جاتے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں وہاں بھی ہمارا تعاقب کرتی رہتیں۔ مغرب کے بعد رات کا کھانا کھا کر ذرا سانس لیتے تو انگریزی کے ماسٹر آ جاتے۔ ہمارے پڑھنے کی سب ہی کو فکر تھی۔ جب ہم علی گڑھ گئے ہوئے تھے تو شہزاد علی صاحب ایک روز ہمیں کالج لے گئے اور امتحان کی غرض سے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات کی خدمت میں پیش کیا۔ چاروں طرف بڑی بڑی عمر کے داڑھی والے طالب علم جمع تھے۔ مولانا نے تفسیر جلالین اور مشکوٰۃ شریف میں ہمارا زبانی امتحان لیا اور پھر کاغذ پر ایک ایک عبارت اردو میں علیحدہ علیحدہ دونوں بھائیوں کو ترجمہ کرنے کے لیے دے دی۔ نتیجے میں مولانا بہت مسرور ہوئے اور متعجب بھی۔ میرے چھوٹے بھائی کو عربی کے طالب علم خوشی اور تعجب میں گود میں لیے لیے پھرے۔ مولانا نے باقاعدہ ہمارے امتحان کا نتیجہ اور حاصل کردہ نمبر لکھ کر چچا صاحب کو بھیج دیے۔ یہ ہمارا پہلا امتحان تھا اور مولانا سب سے پہلے ممتحن۔ مولوی عبدالمجید صاحب کی قدر اور بڑھ گئی اور وہ کچھ دنوں کے لیے ہم پر اور مسلط کر دیے گئے۔ کاش ہم امتحان میں فیل ہو جاتے تو مولانا کا بستر جلدی گول ہو جاتا۔ پھر بھی ان سے چھٹکارا جلد مل گیا۔ کیونکہ چھوٹے بھائی کو انگریزی سکول میں داخل کرانا تھا اس لیے طے یہ ہوا کہ مجھے مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا جائے۔ مدرسہ عالیہ میں حضرت مفتی سعادت اللہ صاحب سنبھلی مدرس اول تھے۔ ابتدا میں ان سے گھر پر کچھ کتابیں پڑھیں، پھر بھائی وکٹوریہ ہائی سکول میں اور میں مدرسہ عالیہ میں داخل ہو گئے اور اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں نے مدرسہ عالیہ میں اور وہاں کے علاوہ کتنے ہی عالموں سے پڑھا اور ان کی صحبت میں بیٹھا مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے مفتی صاحب جیسا وسیع علم، آزادہ رو، بے تعصب، ذکی، ذہین اور خوش مزاج اور خوش لباس عالم نہیں دیکھا۔ اگر ان کی صحبت اور تعلیم مجھے میسر نہ آتی تو مجھے یقین نہ آتا کہ علما میں ایسے صاحب دل اور بلند انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم سے مجھ میں آزاد ہو کر سوچنے، بات کو سمجھنے اور تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یہ ان کی ہی تعلیم کا اثر تھا کہ میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں درس نظامیہ کی سند تکمیل حاصل کر لی۔ درس نظامیہ کے علاوہ انہوں نے مجھے کئی کتابیں

جامعہ الازہر کے نصاب کی پڑھائیں اور یہ ان کی تربیت ہی کا فیض تھا کہ میں نے نوعمری ہی میں "نحو اور اسلام" جیسی تصنیف پیش کی جس نے علماء کی مجلسوں میں تہلکہ مچا دیا۔ میرے خلاف منبروں پر وعظ کیے گئے۔ چندے جمع ہوئے مگر نتیجہ صفر رہا۔ نہ کسی نے جواب لکھا نہ مجمع عام میں کوئی بحث کے لیے تیار ہوا۔ یہ واقعہ مجھے یاد رہے گا کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تصنیف پر ہمیشہ میرے سامنے میری بہت خفگی کی اور غائبانہ میری بے حد تعریف فرمائی۔ مفتی صاحب سنبھل کے مشہور علماء کے خاندان سے تھے۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی محشی ہدایہ ان کے ماموں تھے۔ وہ اپنے نانا حضرت مفتی عبدالسلام صاحب کے بہت معتقد و معترف تھے اور ان کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب خود بھی فارسی اردو کے شاعر تھے اور "سعدی" تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کے بڑے گہرے اور بہت اچھے شعر فرماتے تھے اور اردو میں بہت سادہ اور زبان کے ـــــ وہ داغ کے بہت معترف تھے۔ مفتی صاحب کی خدمت میں مجھے شاعری میں کچھ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ میرے شعر کہنے کا علم بھی مفتی صاحب کو میرے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہوا اور اس کے بعد بھی میں ادب کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے شعر کبھی نہ پڑھ سکا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی محمد حبیب صاحب پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور مفتی صاحب کے داماد محمد طاہر فاروقی مصنف "سیرت اقبال" اردو کے پروفیسر ہیں۔

استادوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم شخصیت حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نظامی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ وہ میرے استاد ہی نہیں استاد سے زیادہ میرے شیخ طریقت بلکہ شیخ طریقت سے بھی بہت زیادہ تھے۔ اگر میرے اندر کوئی خوبی ہے تو ان کی ہے۔ میری عمر دس گیارہ سال کی تھی کہ بغداد شریف سے حضرت پیر سید ابراہیم سیف الدین ہندوستان اور پھر آگرے تشریف لائے اور سارا شہر پروانوں کی طرح حضرت کے گرد جمع ہو گیا۔ میرے جد اعلیٰ سید امجد علی شاہ اصغر کو اپنے خاندانی سلسلوں کے علاوہ قادری سلسلہ حضرت سید عبداللہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پہنچا تھا۔ اس علاقے سے میری والدہ اور دادی صاحبہ نے ہم دونوں بھائیوں کو حضرت پیر صاحب کی خدمت میں حاضر کیا اور حضرت نے نہایت شفقت اور خصوصیت سے ہمیں سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کر لیا۔ غالباً یہ اس بیعت ہی کی برکت تھی کہ اس کے چند عرصے بعد ہی مجھے حضرت سراج السالکین کی زیارت اور شرف غلامی حاصل ہوا۔ حضرت سراج السالکین حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی کے پوتے اور جانشین تھے۔ حضرت شاہ نیاز رحمۃ اللہ علیہ میرے جد حضرت اصغر کے ہم خرقہ اور حضرت بغدادی کے خلیفہ تھے۔ اس طرح کی مجھے کئی خاندانی نسبتیں حاصل تھیں۔ اگر مجھے یہ حدیث یا غالباً حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے یاد نہ ہوتی کہ لوگوں سے ایسی باتیں بھی نہ کہو جو وہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیں تو میں حضرت کے وہ واقعات بیان کرتا جو میں نے خود مشاہدہ کیے ہیں اور جن کے لئے ایک علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ حضرت کی زیارت کے بعد مجھے جنیدؒ و بایزیدؒ کی زیارت کی تمنا نہیں رہی۔ میں نے حضرت سے تصوف کے دو مختصر رسالے سبقاً سبقاً پڑھے ہیں اور مختلف کتابیں سنی ہیں۔ میرے علم تصوف کا سرمایہ یہی ہے۔

اس کے باوجود کہ میری عمر کا بہترین حصہ علما اور صوفیا میں گزرا ہے مجھے سب علما اور صوفیوں سے حسن ظن نہیں ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ان دس بیس ہزار میں مشکل سے دو چار آدمی نکلیں گے۔ صوفیوں کی اکثریت جاہل، غلط کار اور ریاکار ہے اور علمائے ظاہر متعصب، کوتاہ نظر اور کور باطن ہیں۔ ان کا ظاہر شریعت سے آراستہ اور باطن معصیت سے پیراستہ ہے اور اس کی ذمہ داری اور

باتوں کے علاوہ نصابِ تعلیم اور ماحول پر بھی ہے جو اس زمانے کے اعتبار سے قطعاً ناقص ہے۔ علم دین پڑھنے والے عموماً ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ماضی اور گردوپیش اخلاقی یا علمی نہیں ہوتا اور وہ خاندانی اعتبار سے کند ذہن اور پست ہوتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے سے ان کا مقصد بھی کوئی بلند نہیں ہوتا۔ امامت، وعظ، فتویٰ اور مدرسی یہی ان کی معراج ہے۔ میں کئی سال مدرسہ عالیہ کا ممتحن بھی رہا ہوں۔ طالب علموں کو بالعموم ان کے درسیات کے مصنفین کا حال اور نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ زمانے اور عقیدے کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔ اب بھی درس میں ایسی کتابیں ہیں جن میں زمین کو ساکن ثابت کیا جاتا ہے۔ موجودہ اور رائج علوم اور نظریات سے یہ لوگ بالکل ناآشنا ہوتے ہیں مجموعی طور پر یہ لوگ آپس میں خوب لڑ سکتے ہیں لیکن زندگی کے کسی زمانے میں فٹ نہیں ہو سکتے۔ رہے صوفی تو چونکہ ایک صوفی باپ کے بعد اس کا بیٹا ہی اس کی جگہ بیٹھتا ہے اور اس کے باپ کے مرید اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اس طرح اس کا کاروبار چل نکلتا ہے اور نہ ریاضت و مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ تحصیل علم کی۔

میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں شاعری کو محبت یا محبت کو شاعری سے علیحدہ کر کے بیان کر سکوں۔ ایسا نہیں کہ میری شاعری میں محبت کے سوا کسی اور جذبے کی نمائندگی نہیں ہے لیکن حسن و محبت میری شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے والد محترم حضرت سید اصغر علی شاہ صاحب اصغرؔ، چچا سید عبدالعلی شاہ صاحب بیدلؔ اور جدِ محترم حضور سید مظفر علی شاہ صاحب الحق مصنف جواہر غیبی اردو، فارسی کے شاعر تھے اور جدِ سوم مولانا سید امجد علی شاہ صاحب اصغر صاحب دیوان فارسی اردو کے شاعر اور نظیر اکبر آبادی کے ہم عصر تھے۔ مختلف تذکروں میں حضرت کا بحیثیت شاعر کے ذکر ہے لیکن میری شاعری تو بہت ہی نو عمری سے شروع ہوئی جب گرمی کی ایک رات کو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے میں نے گنگنانا شروع کیا اور چند مصرعوں یا شعروں کی صورت میں کوئی چیز مرتب ہو گئی۔ اس زمانے میں اچھی طرح لکھنا نہیں جانتا تھا مگر صبح اٹھ کر میں نے ان مصرعوں کو لکھ لیا اور پھر ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر بار بار نقل کرتا رہا۔ یہ شعر عاشقانہ نہ تھے بلکہ اس حقیقتِ اعلیٰ سے متعلق تھے جسے میں بہت بچپن میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھ چکا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور میں اس کے ساتھ ایک نامعلوم اور غیر معین راستہ طے کر رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک حسین عورت کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی اور صبح مجھے اس کی جدائی کا شدید احساس ہوا اور ایک مسدس نما نظم میں میں نے اپنے جذبات اور اس واقعے کو ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ بہت سی غزلیں اور نظمیں جمع ہو گئیں۔ خواب کی حقیقت کچھ بھی ہو مگر میری پوری زندگی کو یہ دونوں خواب گھیرے ہوئے ہیں۔ دو مختلف طاقتوں کی یہ کشمکش زندگی کی کسی منزل میں بھی ختم نہیں ہوتی۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ پاکیزہ طاقت میرا ہاتھ تھامے ہوئے نہ ہوتی تو میری تباہی یقینی تھی کیونکہ اس عورت نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ خواب ہی میں نہیں جاگتے میں بھی میرے سامنے آئی بہت سے جمیل ناموں اور بہت سی حسین صورتوں میں جانی پہچانی اور انجانی شکلوں میں۔ اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے محبت کی، کبھی پاس سے اور کبھی دور سے۔ اسی کشمکش میں میری زندگی اور شاعری چلتی پھرتی اور بہکتی رہی۔ اسی میں مسائلِ حیات اور غمِ روزگار بھی شامل ہو گیا۔ میں محبت کو جنس اور ماورائے جنس دونوں سے عام اور دونوں میں مشترک مانتا ہوں۔ یہ میرا آفاقی نظریہ ہی نہیں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے اسی لیے میری شاعری میں دوسرے مضامین کے علاوہ صرف محبت کے بھی آپ کئی روپ دیکھیں گے۔

میرا خیال یہ ہے کہ شاعر کو حقیقت سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقت کو جس طرح محسوس کرتا اور جس طرح اس سے اثر پذیر ہوتا ہے ...... اس کو بہترین الفاظ اور انداز بیان میں ظاہر کر دیتا ہے ورنہ صرف حقائق کا بیان شاعری نہیں ہے۔ غالباً شاعری اور فلسفے کا فرق اس طرح واضح ہو سکے۔

نمود کا اظہار حسن کی فطرت ہے۔ حقیقت ازلی ابدی ہے، اسے فنا نہیں ہے لیکن اس کے مظاہر اور لباس بدلتے رہتے ہیں۔ نمود و نمائش کا تقاضا یہی ہے کہ لباس بدلتے رہیں۔ شاعر کی نظر حقیقت کو ان لباسوں میں بھی محسوس کر سکتی ہے اور جب مظاہر بدلتے ہیں تو وہ اضطراب محسوس کرتا ہے اور ایک مصور کی طرح اس حسن کو جس نے اسے مضطرب کیا ہے اپنے الفاظ سے حیات ابدی بخش دیتا ہے اور ان مٹتے ہوئے اور گزرتے ہوئے لمحات کو جاوداں بنا دیتا ہے۔ حسن، خیر اور حق ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔ شر اور باطل کا وجود فی الواقع نہیں ہے بلکہ وہ ایک سلبی اور اضافی شے ہے۔ حسن یا خیر اور حق کا نہ ہونا ہی شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقی شاعر وہی ہے جو حسن کی فطرت کا محمول بن جائے، جس کی زبان سے حسن اپنی رنگینی اور بوقلمونی ظاہر کر سکے۔ یہی مجازی شاعری ہے اور یہی حقیقی شاعری۔

میرے حالات نے مجھے شاعری میں کوئی استاد میسر آنے نہ دیا لیکن میری اس محرومی کی تلافی میری اس عادت نے کر دی کہ میں کبھی اپنی غلطی پر خبردار کرنے والوں سے بدمزہ نہیں ہوا بلکہ انہیں محبوب رکھنے لگا۔ یہ عادت غالباً اس لیے پڑی کہ میں نے شعر کہنا شروع کیے تو اپنے بھائی اور چچازاد، پھوپی زاد بھائیوں کو سناتے۔ ان میں سے بعض نے داد دی اور بعض نے مذاق اڑایا۔ داد و بیداد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ہم سب نے ایک انجمن بنالی۔ پندرھویں دن گھر کے بزرگوں سے چھپ کر مشاعرے ہوتے اور اس میں بھی داد و بیداد کا یہی سلسلہ قائم رہتا۔ پھر اس میں باہر کے کچھ نوعمر شریک ہونے لگے اور بڑھتے بڑھتے اس انجمن کی شہرت شہر کے اساتذہ تک بھی پہنچی اور ساتھ ہی ساتھ میرے اچھے شعر بھی ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچنے لگے یہاں تک کہ میں نے بعض رسائل کو اپنی غزلیں بھیج دیں اور وہ چھپ گئیں۔ آگرے میں جو باہر کے شعرا آتے تو یہاں کے شعرا سے میرا ذکر سنتے اور مجھ سے ملتے۔ مشاعروں کی شرکت سے اس زمانے میں میں معذور رہا۔ میری ماں کی اجازت نہ تھی۔ مشاہیر شعرا میں سب سے پہلے مجھ سے ملنے آنے والوں میں جگر مراد آبادی مرحوم تھے۔ پھر ۱۹۲۴ء میں جوش صاحب سے ملاقات ہوئی اور اس کے بعد فانی بدایونی مرحوم سے۔ ان سب نے میری ہمت افزائی کی۔ ان میں صرف جوش ملیح آبادی ایک ایسے شاعر تھے جو مجھے ٹوکتے بھی تھے۔ غلطیوں پر ٹوکنے والوں اور ہمت افزائی کرنے والوں میں جے پور کے شعرا حضرت تسکین خصوصیت سے اور مولانا اسمٰعیل خاں مذاق، سید احمد علی شاہ اور عبدالوہاب خاں عاصم قابل ذکر ہیں۔ آگرے میں اس زمانے میں بڑے اچھے صاحب ذوق اور شاعروں کا مجمع تھا۔ مولانا سیماب، خاں صاحب اخضر شاہ، دستگیر، آل احمد، حامد حسن قادری، مخمور اکبر آبادی، مانی جائسی، فانی بدایونی، قمر بدایونی جیسے اصحاب کی محفلوں اور صحبتوں میں مجھے شرکت کا موقع ملتا رہا۔ جب فانی آگرے آئے تو یہ صحبتیں اکثر گرم رہنے لگیں اور مجھے نوعمروں کی صف سے نکال کر ان بزرگوں نے اپنی صف میں شامل کر لیا۔ ان حضرات کے ساتھ مخصوص صحبتوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ ان صحبتوں کی داد اور بیداد میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ مخصوص سخن فہم اور مشاہیر شعرا کی ان بے تکلف اور علمی محفلوں نے میری انفرادیت کو ابھارا۔ ان شعرا کے رنگ اور مضامین سے بچ کر کہنے کی عادت ڈالی اور ان شعرا کے مقابلے میں مخصوص سخن فہم حضرات

اور خود ان شعرا سے داد حاصل کر کے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

میں یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ میری شاعری تقلید سے پاک ہے کیونکہ علامات، اصطلاحات اور ہیئت میں ذرا بھی نہ بدل سکا مگر میرا مزاج شاعری تقلیدی نہیں ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا، سمجھا اور مجھ پر گزرا ہے بیان کیا ہے۔ ایک مخصوص صحبت میں ایک دفعہ میں نے غزل پڑھی۔ ایک شعر تھا ۔

میرے رونے پہ روٹھتے وہ بھی
بدگمانی نکل گئی دل کی

شاہ دستگیر ایڈیٹر نقاد نے کہا یہ شعر مسلمات شاعری کے خلاف ہے معشوق کبھی روتا نہیں ہے۔ دوسرے شعرا نے اپنے تیوروں اور نظروں سے ان کی تائید کی۔ دستگیر صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے، ہم مذہب بھی اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے لیکن میں نے کہا میرا معشوق رو دیا تھا اس لئے میں نے شعر میں صحیح بات کہہ دی۔ ابھی کچھ روز کی بات ہے کہ دہلی میں علامہ نیاز فتحپوری سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور موصوف کی فرمائش پر میں نے اپنی غزل پیش کی۔ جب یہ شعر پڑھا ۔

میں نہ دیکھوں تو ترے حسن کی قیمت کیا ہے
میں نہ تڑپوں تو یہ انداز جفا کچھ بھی نہیں

تو داد دیتے دیتے سنجیدہ ہو گئے۔ فرمانے لگے "یہ تو عجیب معشوق ہے" میں احتراماً خاموش رہا مگر آپ نے کہا یہ واسوخت ہے۔

فانی مرحوم کے کہنے سے میں نے طرح پر غزل کہنا چھوڑ دی ویسے بھی میں طرح پر یا مشاعرے کے لیے غزل کہہ کر کبھی خوش اور مطمئن نہیں ہوا۔ اسی طرح میں اساتذہ کی یا کسی کی مشہور غزل پر غزل کہنا اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، مجبوری کی بات اور ہے کہ طرح ہی ایسی دی گئی ہو اور اس پر کہنا ضروری ہو مثلاً پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی مرحوم ہمیشہ اپنے یہاں کے مشاعروں میں غالب کی غزل کا مصرع طرح دیا کرتے تھے اور ایک دو بار مجھے اس طرح پر غزل کہنا پڑی۔ اسی طرح میں دوسرے شعرا کا مضمون لے کر اس پر اضافہ کرنا اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر میرے یہاں ایسا کوئی شعر ہو تو وہ میرا ارادی اور بالقصد فعل نہ ہو گا لیکن جن اساتذہ اور شعرا نے میری غزلوں یا اشعار پر شعر کہے ہیں ان پر میں یہ اعتراض وارد نہیں کرتا ہوں بلکہ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میری غزل اور میرے اشعار کو اس درجہ قابل التفات سمجھا کہ بعض نے مضمون کے علاوہ مصرعے کے مصرعے اور شعر کے شعر اپنے کلام میں شامل کر لیے۔

میرے نظریات، افتاد مزاج اور سوانح حیات بہت کچھ آپ کو میرے اشعار میں ملیں گے۔ کئی سال ہوئے جب کہا تھا ۔

اور کون جانے گا تیری بزم کے آداب
ہم نے دل دیا بھی ہے ہم نے دل لیا بھی ہے

بات کو طول دیجئے تو طویل ہو جاتی ہے ——— ورنہ میرے سوانح حیات ہی کیا! بس یہی کہ نام محمد علی شاہ تخلص میکش، سنہ پیدائش ۱۹۰۲ء، تعلیم انگریزی کم، فارسی اس سے کچھ زیادہ اور عربی ان دونوں سے کچھ اور زیادہ اور اب نہ کچھ کم نہ کچھ زیادہ۔ حتی الامکان تمام مشہور مذاہب، مشہور فلسفوں اور مختلف علوم و فنون سے واقفیت کا شوق اور رغبت، تکمیل کسی کی بھی نہیں۔ اگر تصانیف کا اظہار بھی ضروری ہو تو "نغمہ اور اسلام" (جواز سماع میں)، "میکدہ" اور "حرف تمنا" (مجموعہ ہائے نظم و غزل) اور "نقد اقبال"، "متفرق مضامین"۔ ان کے علاوہ یہ تو مطبوعہ ہیں، دو تین کتابیں مکمل اور غیر مکمل غیر مطبوعہ۔ فقط!

دیوان سنگھ مفتون

کام سے محبت

ایڈیٹر ریاست کا وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) ہے۔ یہ وہاں کے ایک کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہوا۔ خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں اور بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر ریاست کے والد اپنے زمانہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے جو نوں، میانوالی اور جہلم وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔ ایڈیٹر ریاست کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی جب والد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے کیونکہ والد نے اپنی کامیاب زندگی میں کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکانات پر قبضہ کر لیا اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریات زندگی اور بڑے بھائی اور بہنوں کی چار شادیوں میں روپیہ صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیٹر ریاست کی عمر بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ایڈیٹر ریاست پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑوں کے تھان لا کر گاہک کو دکھائے جائیں۔ اس ملازمت کے دو واقعات مجھے یاد ہیں جن کا میرے کیرکٹر پر بہت نمایاں اثر ہوا۔

یہ دکان ہندو بزاز کی تھی اور اس دکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی اور اس کا جوان بیٹا کام کرتے تھے۔ یہ باپ اور بیٹا حافظ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک روز چند دن کے لیے باپ کسی شادی میں شریک ہونے اپنے گاؤں گیا تو اپنی غیر حاضری کے دنوں کے لیے اپنے بیٹے کو چند کپڑے سپرد کر گیا کہ ان کو وہ تیار کر رکھے۔ بوڑھا درزی جب واپس آیا اور اس نے پہلے کے تیار کئے ہوئے کپڑوں کو دیکھا تو ان میں کسی بچہ کا سبز رنگ کی مخمل کا ایک کوٹ بھی تھا جس کو بیٹے نے بجائے سبز رنگ کے تاگے کے سفید تاگے سے سیا تھا۔ اس غلطی کو دیکھ کر بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا کہ نالائق تو دیہات کے رہنے والے جاٹ کے لڑکے کا یہ کوٹ سیا تھا ہم ذکر تا مگر اس مخمل پر تو رحم کرتا جس کا ستیاناس کر دیا چنانچہ بوڑھے باپ نے مخمل کے اس کوٹ کی سلائی کو کھولا، سفید تاگے نکالے اور سبز تاگے سے سیا۔

اس واقعہ کا میری طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ چاہے میں نے پانچ روپیہ تنخواہ لی یا بارہ روپیہ یا دو سو روپیہ اور چاہے ملازمت کی یا خود اپنا کام کیا تمام زندگی ہمیشہ کام کو دیکھ کر کام کیا نہ کہ اس کے معاوضہ کو۔ ہمیشہ بارہ گھنٹے کام کیا چاہے تنخواہ کچھ ملتی تھی اور شاید ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہوا کہ کسی کام کو کرتے ہوئے اس پر پوری توجہ نہ دی ہو۔ غرض کیرکٹر پر اس واقعہ نے بہت بڑا اثر کیا۔

طوائفوں سے نفرت

بزازی کی دکان کی اس ملازمت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس دکان کے بالکل سامنے اور قریب طوائفیں رہتی تھیں۔ یہ طوائفیں ادنیٰ اور ارذال قسم کی بالکل گندی تھیں۔ دکان پر آتے جاتے اور کام کرتے ان طوائفوں کو دیکھتا کہ یہ کیونکر چار چار اور آٹھ آٹھ آنے کے لیے اپنے ضمیر کو فروخت کرتی ہیں۔ کیسے گندے اور سڑے ہوئے لوگ آتے ہیں جن سے یہ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ پیش آتی ہیں، ان کے جانے کے بعد ان کو بیوقوف سمجھ کر ان کے خلاف باتیں کرتی ہیں اور ان میں سے اکثر شرمناک بیماریوں

میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اس دکان پر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان طوائفوں سے نفرت اور حقارت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اب کسی اچھی صحبت اور خوش سلیقہ طوائف کا گانا تو سن سکتا ہوں اور موسیقی کی اس مجلس میں بھی بیٹھ سکتا ہوں جہاں کوئی بلند معیار طوائف گا رہی ہو مگر پیشہ ور عورتوں کے بازار یا محلہ میں سے موٹر میں گزرتے ہوئے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ پاخانہ یا گندگی کے ڈھیر کے قریب سے گزرتے ہوئے اور اس کی وجہ بچپن کے وہ تاثرات ہیں جو پیشہ ور عورتوں کے حالات دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے۔

جرنلزم کی چاٹ اور عشق

میری تعلیم کچھ نہ تھی۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا۔ سکول میں چند روز گیا تو ماسٹر نے فیس کا مطالبہ کیا۔ دو روز تو یہ کہہ کر جاتا رہا کہ فیس لاؤں گا اس کے بعد سکول نہیں گیا کیونکہ حالات اس قابل ہی نہ تھے کہ فیس دے سکتا آخر مجبوراً سکول چھوڑنا پڑا اس کے بعد سکول میں پڑھنے کا زندگی میں اتفاق نہیں ہوا یعنی میری تعلیم صرف پانچویں جماعت تک ہی رہی اور اب اگر باتوں باتوں میں کوئی صاحب تعلیم کے متعلق پوچھتے ہیں اور میں بیان کرتا ہوں کہ پانچویں جماعت پاس کی ہے اور چھٹی جماعت میں چار پانچ روز پڑھا ہوں تو وہ اس پر یقین نہیں کرتے ایک مذاق سمجھتے ہیں اور بار بار یقین دلانے پر بھی میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

تعلیم کی کیفیت تو یہ تھی مگر مطالعہ کے شوق کی حالت یہ کہ فیروزپور کے سول ہسپتال میں کمپونڈر تھا چھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی مگر رسالہ زمانہ کانپور کا خریدار تھا اور رسالہ مخزن دہلی دوسرے لوگوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کا مجھے واقعہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ادبی رسالہ دیکھا ہو یعنی میری ادبی چاٹ کا سلسلہ سولہ سترہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں ابوہر کے ہسپتال میں رہا وہاں بھی ادبی رسائل پڑھا کرتا اور پڑھنے کی کیفیت یہ ہوتی کہ ایک ایک مضمون ایک ایک سطر اور ایک ایک شعر کو بار بار پڑھتا چنانچہ اپنی بے وقوفی کا ایک لطیفہ بتاتا ہوں۔ ابوہر میں ہی ایک روز خیال آیا کہ اگر میں اردو لٹریچر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے صرف ایک کتاب یعنی اردو کی کوئی لغات کیوں نہ یاد کروں تاکہ کوئی لفظ بھی ایسا باقی نہ رہے جس سے میں واقف نہ ہوں۔ اس خبط کو پورا کرنے کے لیے میں نے چھ آنے میں کریم اللغات کی ایک جلد خریدی اور الف کی تختی سے الفاظ شروع کیے ان الفاظ کو یاد کرتا تھا یاد نہ ہوتے تھے۔ یاد ہوتے اور آگے چلتا تو پیچھے کے یاد کیے ہوئے بھول جاتے آخر کئی روز کی اس کشمکش کے بعد اپنی بے وقوفی کو محسوس کیا اور ڈاکٹر آف لغات کی ڈگری کے خیال کو ترک کیا جو طریقہ غلط ناقابل عمل اور قطعی لاحاصل تھا۔

ابوہر کے بعد میں فیروزپور کے ہسپتال میں آگیا وہاں چھ ماہ کے قریب رہا تو موگا کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر رسائل اور کتابوں کا پڑھنا جاری رہا۔ موگا میں مجھے پہلے نو روپیہ بعد میں بارہ روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس زمانہ میں میرے پاس ادیب الٰہ آباد (جس کو نوبت رائے نظر ایڈٹ کرتے تھے) اور زمانہ کانپور (جس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے) آیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ روزانہ اخبار عام کا بھی خریدار تھا کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان کے اندر صرف وہی روزانہ اردو اخبار تھا۔ اس کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ تھا۔ میری مالی پوزیشن ان دو رسائل اور ایک روزانہ اخبار سے زیادہ کے خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ دوسرے اخبارات و رسائل اور کتابیں لوگوں سے لے کر پڑھتا اور شاید ہی اردو کی کوئی کتاب یا اخبار ایسا تھا جسے میں نے اس زمانہ میں نہ پڑھا ہو۔

اس زمانہ میں خیالات محدود، ذریعہ معاش محدود، پوزیشن محدود، معلومات محدود اور دوستوں کے تعلقات کا حلقہ محدود چنانچہ خیالات کے محدود ہونے کی تو حالت یہ تھی کہ جب اخبار عام آتا اور اس پر پتہ کی چھپی ہوئی چٹ اپنے نام کی دیکھتا تو ایک مسرت سی محسوس ہوتی کہ میرا نام بھی چھپا ہوا ہے۔

موگا میں ایک علم دوست شخص پنڈت وشنو دت وکیل تھے۔ اچھے مضمون لکھنے والے، اردو لٹریچر میں دلچسپی، آریہ سماج کے لیڈر اور آریہ سماجی رسالہ "آریہ مسافر" کے ایڈیٹر۔ یہ آریہ مسافر شائع تو شاید آگرہ یا لاہور سے ہوتا تھا مگر پنڈت جی اس کو موگا میں ایڈٹ کرتے اور وہاں سے ہی مضمون بھیجتے۔ پنڈت وشنو دت میرے لٹریری شوق کو دیکھ کر مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے۔ اپنے بیٹوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے اور میں کتابیں اور رسائل ادھار ان سے بھی کافی تعداد میں پڑھنے کے لیے لیتا۔

اخبار عام اور رسائل ہسپتال کی ڈاک میں آتے کیونکہ ایک چپڑاسی ہر روز صبح ڈاک لاتا تھا۔ یہ ڈاک ڈاکٹر متھرا داس کے ہاتھوں میں جاتی اور وہ جس کسی کا کوئی خط یا اخبار ہوتا اس کو دے دیتے۔ میرے رسائل اور اخبار کو دیکھ کر وہ پیشانی پر شکن ڈالتے اور میری اس فضول خرچی کو برا سمجھتے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے کیونکہ میں نہ صرف ان کے ماتحت تھا بلکہ ان کے مجھ پر احسانات بھی تھے۔ خاندانی تعلقات کے باعث میرے بزرگ تھے اور ان کو حق حاصل تھا کہ میری اور میرے کیریکٹر کی نگرانی کرتے۔

جب اخبار عام میرے نام جاری ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ شاید ایک روپیہ دے کر ایک مہینے کے لیے یہ ادبی عیاشی کی ہوگی۔ انھوں نے درگزر کیا مگر اخبار کو دیکھ کر ان کی پیشانی کے شکن ظاہر کرتے تھے کہ وہ میری اس "فضول خرچی" کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ میں نے ایک ماہ سے زائد عرصے کے لیے چندہ بھیج دیا ہے تو آپ مجھ پر بہت خفا ہوئے اور کہا۔ نو روپیہ ماہوار تنخواہ اور روزانہ اخبار کی خریداری۔ اس فضول خرچی پر شرم آنی چاہیے۔ اس ڈانٹ کے بعد میں نے ان سے تو کہا کہ بند کر دوں گا مگر شام کو ڈاکخانہ پہنچا۔ وہاں چٹھی رساں اور پوسٹ ماسٹر سے ملا اور ان سے کہا کہ میرے نام کا کوئی خط یا اخبار ڈاکٹر صاحب کی ڈاک میں نہ بھیجا جائے اور چٹھی رساں کے ہاتھ میرے کوارٹر میں بھیجا جائے، جہاں میری رہائش تھی چنانچہ اخبار عام اور رسائل مجھے میرے کوارٹر میں ملنے شروع ہوئے اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ میں اب فضول خرچ نہیں رہا۔ شریف ہو گیا ہوں۔

ایک یا ڈیڑھ ماہ تک میں اخبار عام ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ پڑھتا رہا۔ ایک روز پہلا چٹھی رساں بیمار ہو گیا اس کی جگہ دوسرا چٹھی رساں ڈاک تقسیم کرنے کے لیے آیا تو اس کم بخت نے میرا اخبار میرے کوارٹر میں دینے کی بجائے میرے ہاتھوں میں دیا جب کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑا آؤٹ ڈور بیماروں کا رجسٹر لکھ رہا تھا۔ اخبار کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ ان کو دھوکا دیا گیا تھا۔ اخبار مسلسل آ رہا ہے اور یہ فضول خرچی جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض ہوئے میں نے پھر وعدہ کیا کہ اخبار بند کر دوں گا چنانچہ سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہسپتال سے دور کسی دوسرے شخص کے نام اخبار جاری کرا دیا جائے اور میں وہاں سے منگا کر پڑھا کروں چنانچہ اخبار موگا کے قصبہ میں حکیم محمد صاحب مرحوم (جو میرے بھائیوں کی طرح دوست، وہ سماجی خیالات کے لحاظ سے مخالف مگر بہت بلند کریکٹر اور مخلص تھے) کے نام جاری کرا دیا گیا۔

اب اخبار ان کے نام پہنچتا۔ میں ہر روز چھپی ہوئی پتہ کی چٹ دیکھنے کی مسرت اور اخبار کو خود کھولنے کے لطف سے محروم ہو گیا۔ اخبار کو پہنچتے ہی حکیم صاحب اس کو کھولتے اور پڑھتے اور میں رات کو کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر جاتا اور کھلا اور پڑھا ہوا اخبار لیتے ہوئے ایسا محسوس کرتا گویا کہ گرم گرم پراٹھوں سے محروم ہو کر اب باسی روٹی کھانے پر مجبور ہوں، مگر کیا کرتا۔ اس گناہ کو جاری رکھنے کا اور طریقہ بھی کیا تھا کیونکہ اخبارات اور رسائل کے متعلق اس وقت میرے چسکے اور عشق کی وہی کیفیت تھی جو آج جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی سکاچ وسکی کے متعلق ہے چنانچہ میں جب تک موگا میں رہا میرے نام کے اخبارات تو حکیم صاحب کے نام آتے رہے اور رسائل میرے کوارٹر پر میرے نام۔

میرے موگا کے تین سال کے قیام میں پنڈت دشنو دت میری بہت رہنمائی کرتے رہے۔ رسائل، اخبارات اور کتابیں دیتے اور انھوں نے اس بات کا اس زمانہ میں متعدد بار مجھ سے مذاقاً اظہار کیا کہ میں ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں میں یہ سنتا اور شرم کر سر جھکا لیتا اور منہ سے کہتا کہ نہیں صرف دلچسپی کے لیے پڑھتا ہوں۔ آہ وہ اخلاص و محبت کے بے غرض لوگ آج اس دنیا میں موجود نہیں اور زمانہ دن بدن خود غرض ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میری اخبار نویسی اور اخبار نویسی کی زندگی میں مجھے کامیاب بنانے کے لیے ایک اور بات نے بڑا پارٹ ادا کیا۔ میں پانچویں جماعت تک پڑھا۔ پنجاب کا رہنے والا ہوں، اردو زبان کے جاننے کا تو کبھی سوال ہی نہیں۔ زندگی بھر محنت کر کے زبان سیکھا۔ پنجاب کے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کو ایڈیٹ کرتا رہا اور دہلی جیسے اردو کے مرکز سے اردو زبان میں ایسا کامیاب اخبار جاری رکھا جس کی نظیر بھی اردو جرنلزم میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایمانداری کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک اپنے آپ کو نالائق سمجھتا ہوں اور جب کبھی دوستوں میں ذکر آتا ہے تو مذاقاً یہی کہتا ہوں کہ بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھاڑ جھونکتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے ذہن کی یہ کیفیت (یعنی اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالب علم سمجھنا اپنی کامیابی کو کامیابی قرار نہ دینا اور کوشش میں دن رات مصروف رہنا) نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو لائق سمجھتا تو آج اخبار ریاست کو چلانے کی بجائے کسی ہسپتال میں پٹیاں دھونے کا کام کرتا۔

کامیابی کے لیے مضبوطیِ قدم کی ضرورت

ایڈیٹر ریاست نے موگا سے مستعفی ہونے کے بعد مانسہ ریاست پٹیالہ میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دی۔ آنکھوں کے یعنی موتیا بند کے کثرت کے ساتھ اپریشن کیے اور اپنا ہسپتال جاری کیا جہاں ان ڈور بیمار رہتے۔ اس زمانہ میں راقم الحروف کی آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان تھی۔ اخبارات اور رسائل کے پڑھنے اور مشہور مضمون نگاروں، ایڈیٹروں اور شعراء سے ملنے اور ان سے خط و کتابت کا بہت شوق تھا۔ اردو زبان کا شاید کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب ایسی ہوگی جس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کرتا۔ اس شوق میں ایک روز مضمون لکھا جو لاہور کے اردو ہفتہ وار خالصہ اخبار کو چھپنے کے لیے بھیجا۔ یہ مضمون ایک فرضی الشر سنگھ فیروز پوری کے نام سے شائع ہوا۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر مضمون اچھا نہ ہوا اور اپنے نام سے چھپا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں نے دو تین اور مضامین اسی نام سے شائع کرنے کے لیے اس اخبار کو بھیجے جو شائع ہوئے۔ ان مضامین کے چھپنے کے بعد بھائی مول سنگھ مینیجر خالصہ اخبار کا خط میرے پاس پہنچا جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ میں مانسہ میں کیا کام کرتا ہوں، تعلیم کہاں تک ہے، آمدنی کتنی ہے، کیا خالصہ اخبار کو ایڈٹ کرنے کے لیے لاہور آ سکتا ہوں اور اگر آ سکتا ہوں تو کیا تنخواہ لوں گا۔

اس خط کو دیکھ کر مسرت اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے باعث میری حالت عجیب سی تھی۔ خط کو بار بار پڑھتا تھا، غور سے دیکھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بن سکوں۔ اس خط کا میں نے جواب دیا کہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں، آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے، تعلیم معمولی ہے مگر لٹریچر کا مطالعہ کافی ہے۔

میرے اس خط کا جواب سردار مول سنگھ نے یہ دیا کہ وہ ایڈیٹر کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپیہ تنخواہ دے سکتے ہیں۔ اس جواب کے بعد بھی میں کچھ بیتاب سا تھا اور رہ رہ کر خیال کرتا تھا کہ میں جرنلزم اختیار کروں شاید اس میں میڈیکل پریکٹس سے زیادہ کامیابی نصیب ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک محترم خیر خواہ جگت کشن سنگھ بی اے انسپکٹر آف سکولز فیروز پور جو کئی کتابوں کے مصنف تھے اور جن کو میرے فرضی نام سے بھیجے گئے

ان مضامین کا علم تھا کہ میں نے لکھے ہیں۔ خط لکھا کہ خالصہ اخبار کے مالک مجھے ایڈیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں مگر تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے۔ میری موجودہ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے۔ میں اس اخبار میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ جگت گلشن سنگھ کا جو جواب آیا اس کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور شاید میں زندگی بھر انہیں بھول نہ سکوں کیونکہ یہی الفاظ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ آپ نے لکھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے قلم میں غیر معمولی زور ہے ———— یہ غیر ممکن نہ ہوگا کہ تم بطور جرنلسٹ کامیاب ہو جاؤ۔ میری رائے میں جرنلزم اختیار کر کے دیکھنا چاہیے کہ تم کس حد تک اس میں کامیاب ہوتے ہو۔"

اس خط کے پہنچنے کے بعد میں نے بھائی مول سنگھ کو خط لکھا کہ میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر ہی آنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کا جواب آیا کہ آجاؤ۔ چنانچہ میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ پر لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار مول سنگھ سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے لاہور آنے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے اور میں پوشیدہ طور پر اخبار کو ایڈیٹ کروں گا۔ میرے اپنے آپ کو چھپانے کی غرض صرف یہ تھی کہ میں ناکامی سے خوف زدہ تھا۔ اور سوچتا تھا کہ اگر ناکام ہوا تو دوست احباب مذاق اڑائیں گے۔ خالصہ اخبار کو میں نے شاید چار ماہ ایڈٹ کیا۔ اس عرصہ میں اخبار میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ ہر شخص ایڈیٹوریل مضامین کا مداح تھا۔ مگر میرے نام سے ناواقفیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار ماہ میں مالک اخبار سردار ہرچند سنگھ رئیس لائل پور اور سردار مول سنگھ پرنٹر پبلشر پر فوجداری مقدمات دائر ہو گئے۔ ان مقدمات میں ایک مقدمہ سردار امر سنگھ ایڈیٹر شیر پنجاب نے بھی کیا، جن کے خلاف مضامین لکھے گئے تھے۔ چنانچہ میں ان مقدمات کے باعث علیحدہ کر دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ وقت بہت نازک تھا۔ میڈیکل پریکٹس چھوڑ چکا تھا۔ خالصہ اخبار سے علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسری کوئی جگہ نہ تھی مگر میں ایک لمحہ کے لیے بھی مایوس نہ ہوا۔ اور لاہور ہی میں تھوڑی تھوڑی تنخواہ پر کئی ایک اخبارات میں کام شروع کر دیا۔ لاہور کے اخبارات میں مجھے کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز میں نے مرحوم لالہ رام چھپال سنگھ صاحب شیدا ایڈیٹر ہندوستان سے پوچھا کہ اردو جرنلزم میں سب سے زیادہ لائق کون صاحب ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ وسیع معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ لائق ایڈیٹر سید جالب ایڈیٹر ہمدم ہیں۔ راقم الحروف نے سید جالب کو لکھنؤ خط لکھا کہ مجھے جرنلزم سیکھنے کا شوق ہے اگر آپ اجازت دیں اور میرے اخراجات کے لیے معمولی تنخواہ مقرر کر دیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

سید جالب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد میں نے پھر خط لکھا۔ پھر جواب ندارد۔ اس بے اعتنائی سے میں مایوس نہ ہوا۔ لکھنؤ کا ٹکٹ لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر سیدھا گوردوارہ میں گیا اور وہاں بطور مسافر ایک کوٹھری میں سامان رکھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے ہمدم کے دفتر میں پہنچا۔ ہمدم کا دفتر اس زمانہ میں حضرت گنج کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ جو آئی۔ ڈی۔ ٹی کے ساتھ مشترک تھی کیونکہ دونوں اخبارات کے مالک غالباً مرحوم راجہ صاحب محمود آباد تھے۔ ہمدم کے دفتر میں پہنچ کر میں نے پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا نام لکھا اور چپراسی کے ہاتھ سید جالب کے پاس بھیجا۔ سید صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ سامنے کھڑا ہوا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔

"آپ کے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جواب نہ دے سکا کیونکہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔ اب بھی یہی پوزیشن ہے مجھے

افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کیا مجھے کام سیکھنے کا شوق ہے چونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ جرنلزم میں ایک لائق ترین شخصیت ہیں اس غرض سے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے لیے تیس روپے ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کروں گا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا۔ بطور چپڑاسی مجھے رکھ لیجیے۔ میں چپڑاسی کے طور پر تمام دن کام کروں گا اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم سیکھوں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے تو آپ نے فرمایا کہ افسوس چپڑاسی کی بھی کوئی جگہ نہیں۔

یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا۔ کیا آپ کو میرے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہے؟ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مفت کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر ہمدم میں بغیر تنخواہ کام شروع کر دیا۔ گزارہ کے لیے امین آباد پارک کے قریب ایک بنگالی کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ دن بھر دفتر ہمدم میں کام کرتا شام کو چھ بجے سے بارہ بجے تک اس کیمسٹ کے ہاں، رات گوردوارہ میں ہوتا اور چونکہ قد، جسم اور شکل و صورت بارعب تھی جب لکھنؤ کے بازاروں میں سے گزرتا تو پولیس کے ٹریفک کے سپاہی یہ سمجھ کر سیلوٹ کرتے کہ شاید کوئی نیا سب انسپکٹر یا انسپکٹر مقرر ہوا ہے کیونکہ یو پی کی پولیس میں سکھ کافی تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ جس کو سیلوٹ کر رہے ہیں وہ دن بھر ہمدم کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہے اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنہ روز سے زیادہ نہیں۔

ہمدم اور امین آباد کے کیمسٹ کے ہاں کام کرتے کچھ عرصہ گزر گیا۔ جون کا مہینہ تھا۔ لکھنؤ کی گرمی۔ صبح آٹھ بجے ہمدم کے دفتر میں پہنچتا اور دو بجے دوپہر کو گوردوارہ واپس آتا۔ ایک روز گرمی زیادہ تھی۔ لُو لگ گئی۔ تیز بخار ہو گیا۔ گوردوارہ کی ایک کوٹھری میں پڑا تھا کہ گوردوارہ کے گرنتھی نے پوچھا۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ اپنا حسب نسب بتلاؤ تاکہ اگر مر جاؤ تو تمہارے گھر والوں کو اطلاع کی جائے۔ میں نے جواب دیا حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کا رہنے والا ہوں۔ گرنتھی نے پوچھا کیا اسی حافظ آباد کے جہاں کے سردار گوربخش سنگھ سپرنٹنڈنٹ نیل گراٹ رہنے والے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ اس گرنتھی نے بغیر میری اطلاع کے سردار گوربخش سنگھ کو خبر کی۔ سردار گوربخش سنگھ میرے قریبی چچازاد بھائی تھے اور لکھنؤ میں آٹھ سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ پاتے تھے۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں گوردوارہ میں بیمار ہوں، گوردوارہ میں پہنچے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا کہ لکھنؤ کب آئے؟ میں نے جواب دیا چند ماہ ہوئے۔ پوچھا کہ اطلاع کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا۔ جب انسان اچھی حالت میں نہ ہو تو بلند پوزیشن کے رشتہ داروں کو اطلاع نہ دینا ہی مناسب ہے۔ سردار گوربخش سنگھ مجھے اپنی کوٹھی لے گئے۔ چند روز علاج کیا اور میں اچھا ہو کر واپس پنجاب آ گیا۔

اوپر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند جانا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہیں۔ مصائب و مشکلات سے گھبرائیں نہیں اور کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں جو ان کی بہتری کے لیے ہو چاہے اس راہ کو اختیار کرتے ہوئے ان کے لیے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں۔

ایڈیٹر ریاست کو شکایت ہے کہ مرحوم سید جالب نے اس زمانہ میں اس کے ساتھ حوصلہ افزا سلوک نہ کیا۔ سید جالب ان واقعات کے بعد کئی برس زندہ رہے۔ جب کبھی اپنے وطن دہلی آتے تو دفتر ریاست میں بھی تشریف لایا کرتے اور لکھنؤ اور دہلی میں جب کبھی اپنے شاگردوں (جو درجنوں کی تعداد میں تھے) کا ذکر کرتے تو فرمایا کرتے کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کامیابی پر

آپ کو لکھا ہے۔

خیالات میں انقلاب

میری عمر جب اٹھارہ برس کی تھی تو میں بہت ہی متعصب قسم کا سکھ تھا اور اس کا سبب وہ سکھ ماحول تھا جو مجھے دوستوں کے حلقے کے مجھے فیروز پور کے قیام میں نصیب ہوا۔ میرے یہ دوست مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دشمن تھے۔ دن رات اپنی علیحدہ قوم علیحدہ مذہب اور علیحدہ پنتھ کے خبط میں رہتے۔ یہ سنگھ سبھا کی تحریک کے سرگرم ورکروں میں سے تھے اور ان کی ذہنیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے گورمکھی زبان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں سوائے گورمکھی کے اردو انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کچھ نہ لکھیں گے اور نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ یہ اصحاب اگر مدراس، کلکتہ یا بمبئی خط لکھتے تو خط کا ایڈریس گورمکھی زبان میں لکھا جاتا۔ جو ان صوبوں کے ڈیڈ لیٹر آفس کی سیر کرنے کے بعد واپس آ جاتا۔ ان دوستوں کی اس سپرٹ کا مجھ پر بھی اثر ہوا اور مجھے یاد ہے کہ جس طرح ایک نو مسلم دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا زیادہ دشمن ہوتا ہے یا دشمن ہونا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کو مسلمان زیادہ مخلص اور اسلام پسند سمجھیں میں بھی ہندوؤں کا عموماً اور آریہ سماجیوں کا خصوصاً بہت دشمن تھا۔ یہی پوزیشن اسلام اور عیسائیت کے متعلق تھی یعنی بغیر ان مذاہب کی واقفیت کے ان پر بھی اعتراض کرتا۔

میں منصوری پہاڑ پر تھا اور چند روز کے قیام کے بعد واپس آنے والا تھا۔ جس روز شام کو وہاں سے روانہ ہونا تھا منصوری پہاڑ کا کچھ سامان چھڑیاں وغیرہ خریدنے کیلئے بازار گیا۔ بازار میں دیکھا کہ سینما کے پاس عیسائی طلباء و طالبات کا مجمع ہے اور یہ لوگ اپنے پادریوں کی معیت میں سینما کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا میں نے پوچھا کہ کیا یہاں آج عیسائیوں کا کوئی جلسہ ہے؟ ایک پادری نے جواب دیا کہ حضرت مسیح کی زندگی کے متعلق فلم کنگ آف کنگز دکھائی جائے گی۔ میں نے پوچھا کیا میں بھی اس فلم کو دیکھ سکتا ہوں؟ اور میں نے ٹکٹ کی قیمت دینے کے لیے کہا مگر پادری نے قیمت لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس شو میں ٹکٹ فروخت نہ کیے گئے تھے۔

میں یہ فلم کنگ آف کنگز دیکھتا رہا۔ میں ذہنی اعتبار سے کسی فلم کی تمام سٹوری کو یاد رکھنے کا اہل نہیں اور تمام زندگی میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی فلم کی پوری کہانی کو ذہن میں رکھا ہو۔ میں فلم کی تمام سٹوری پر غور نہ کر سکا اور نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔ مگر حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور یہ فلم ہی اس اعتقاد اور احترام کی بنیاد ثابت ہوئی جو آج میرے دل میں عیسائی مذہب کے بانی حضرت مسیح کے متعلق ہے۔ گو میں عیسائی نہیں اور میں نے بپتسمہ نہیں لیا مگر جہاں تک حضرت مسیح کی قربانیوں اور قدوسیت کا سوال ہے میں حضرت مسیح کا عیسائیوں سے کم معتقد نہیں ہوں۔

اسلام سے مجھے واقفیت نہ تھی اور نہ میں نے رسول اللہ کی زندگی یا قرآن کے مطالعہ کا کبھی خیال کیا۔ کیونکہ مذہبی لوگوں کے اعمال دیکھ کر مذہب سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں میرا قیام کانپور کے احراری مولوی عبدالقیوم (جو آج کل مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر ہیں) کے ساتھ تھا۔ مولوی عبدالقیوم ایک مخلص شخصیت ہیں۔ میں ان کے ساتھ دن رات رہتا اور یہ ہر بات میں مذہبی مسئلہ پیش کر دیتے جس پر میں نے کبھی توجہ نہ کی۔ ایک روز مہاتما گاندھی کی زندگی اور حق پرستی کا ذکر ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی کی سچائیوں اور صداقت بیانیوں کے ذکر کے بعد مولوی عبدالقیوم نے ایک حدیث پڑھی جس میں رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا جہاد بادشاہ کے منہ پر حق و صداقت کی آواز بلند کرنا ہے۔ اور اگر یہ شخص کسی سزا کی پروا نہیں کرتا تو اس شخص کا یہ فعل تمام جہادوں میں سب سے بڑا جہاد قرار

دیا جائے گا۔ مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر میں سوچنے لگا کہ جو رسول حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کو جہادوں میں سے افضل ترین جہاد قرار دیتا ہے اس رسول کے بلند حق پرست اور قابل احترام ہونے سے انکار کرنا کس قدر شرمناک اور باطل پرستی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کے اس حدیث کے بیان کرنے کے بعد اسلام کے متعلق میرے ذہن میں انقلاب پیدا ہوا اس کے بعد جب بھی موقع ملا میں نے رسول اللہ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مختلف موضوعات پر قرآن کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے دل میں گو بعض مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ان کے لیے نفرت ہے اور ان کے اعمال نامے کو عالم اسلام کے لیے رسوائی و ذلت کا باعث سمجھتا ہوں۔ مگر رسول اللہ قرآن اور اسلام کے لیے اپنے دل میں اتنی ہی عزت و احترام اور محبت کے جذبات رکھتا ہوں۔ جتنے کہ ایک مسلمان کے دل میں ممکن ہیں۔

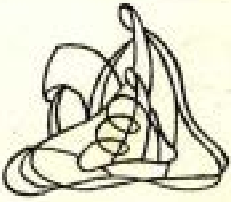

گوپی چند نارنگ

ترقی یافتہ ملکوں میں آئی بی ایم (I.B.M.) مشینوں کی دوڑ نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا میں ان کی ضرورت سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کا تجزیہ بھی اب سوراخ دار کارڈوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے۔ حال ہی میں ایک مجہول مصنف مارک اے پرنی (MARK EPERNAY) کی کتاب "دی مک لینڈرس ڈائی مین شن" (THE MCLANDRESS DIMENSION) شائع ہوئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ذہین پروفیسر مک لینڈرس ہے جس کی شہرت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس نے مک لینڈرس کو ایفی شینٹ (MCLANDRESS COEFFICIENT) کا نیا نظریہ دریافت کیا ہے۔ مختصراً اس نظریے کو مک ایل سی (MACK-EL-SEE) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخصیت کے تجزیے کا مشینی نظریہ ہے۔ اس کی رو سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیئے گئے وقت میں ایک شخص اپنی تقریر یا تحریر میں کتنی دیر تک اپنے خیالات کو اپنے علاوہ دوسرے موضوعات پر مرکوز رکھ سکتا ہے یعنی عام گفتگو میں وہ کتنی بار صیغہ متکلم کا استعمال کرتا ہے اور کتنی بار اپنی ذات و شخصیت کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے یہ پتہ چلانا دشوار نہیں کہ کوئی شخص اپنی انا کا زیادہ شکار ہے اور کوئی کس حد تک غیر جانب داری سے دوسرے مسائل پر یکسو ہو کر سوچ سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کا اصل مصنف ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر گال بریتھ ہیں جو خود ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکے ہیں اور جن کا شمار چوٹی کے ماہرین اقتصادیات و معاشیات میں ہوتا ہے۔ بہر حال اس نظریے کی رو سے بعض نہایت دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں، مثلاً صدر کینیڈی مرحوم اپنی ذات کو بعض ڈھائی منٹ تک بھول سکتے تھے۔ ان سے کہیں بہتر ریکارڈ فلمی اداکارہ الزبتھ ٹیلر کا ہے یعنی تین منٹ، اور بیچارے راک فلر آدھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں بھول سکتے۔ اس نظریے کی مدد سے اگر اردو شاعروں اور ادیبوں کا مک ایل سی دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو جہاں ایک طرف تفریح کا خاصا سامان فراہم ہو جائے گا وہاں کئی ماتھوں پہ بل پڑ جائیں گے اور بھویں بھی تن جائیں گی۔ ظاہر ہے آپ بیتی نمبر کے صفحات اس سلسلے میں بہترین مواد کا کام دے سکتے ہیں، لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے وہ یہ کہ ادیب اور شاعر کچھ عجیب مخلوق واقع ہوئے ہیں۔ جب انھیں ان ہی کے موضوع پر بولنے کو کہا جائے تو 'میں' سے زیادہ انھیں 'تو' کا خیال رہتا ہے۔ بہر حال اگر کسی کو ہوس گنتی کر کے دیکھنے کی ہے تو وہ زیادہ آس نہ لگائے کیونکہ اس عالم سے جو بھی نکلے گا صیغہ متکلم ہی میں ملبوس نکلے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ کسر نفسی اور کم نمائی کو مشرقی آداب میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جمہوری دور میں اسے قابل اعتنا سمجھا جائے یا نہیں مگر مک ایل سی کے نظریے نے تو غیر جانبداری بھی) اسی بنیادی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فارسی والوں نے بھی کیا خوب کہا ہے۔

آنکس کہ بداند و بداند کہ بداند — اسپ طرب از عرش بہ افلاک رساند
وانکس کہ بداند و نداند کہ بداند — او ہم خرک لنگ بہ منزل برساند

وانکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

یعنی جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا، وہ تو اپنا طرب کا گھوڑا آسمانوں تک لے جاتا ہے اور جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ بھی اپنے لنگڑے گدھے کے ساتھ منزل تک جا پہنچتا ہے۔ اور جو شخص نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ ہمیشہ جہل مرکب کا شکار رہتا ہے۔ گویا اہل عالم وہ ہیں جنہوں نے اپنا اشتہار لگانا پسند نہیں کیا اور جو تقاضوں کے، دوسرے درجے پر وہ معقول لوگ ہیں جو عالم ہیں اور جنہوں نے ان صفحات میں خود کو عالم تصور کیا ہے تیسرے درجے پر مجھ جیسے جاہل ہیں جو کچھ نہ جاننے پر بھی اپنے جاننے اور نہ جاننے والوں کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنتے ہیں!!۔

قلم اٹھاتے وقت سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ آپ بیتی کو خاندان کے ذکر سے شروع کیا جائے یا وطن کی خاک پاک کو مقدم سمجھا جائے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ بعض روایتوں کی رو سے تاریخ پیدائش سے بسم اللہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سماجی مسلمات بھی خوب ہیں کہ اکثر و بیشتر سنی سنائی پر یقین کر لیا جاتا ہے اور پھر غضب یہ کہ دوسروں سے بھی یقین کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اور چار و ناچار ہر شخص کر بھی لیتا ہے بہرحال مجھے معلوم نہیں کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۱ لکھوا دی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔

والد صاحب بلوچستان سروس میں افسر خزانہ تھے۔ سنتا آیا ہوں کہ میری پیدائش تحصیل دکی میں ہوئی۔ اس کے سال ڈیڑھ سال بعد والدین وہاں سے موسیٰ خیل آ گئے۔ کچھ یاد نہیں، دکی کیسا گاؤں یا شہر تھا۔ البتہ موسیٰ خیل کے کچھ دھندلے سے نقش ذہن کی سلوٹوں میں ابھی باقی ہیں۔ تحصیل کے مکانوں کے پیچھے کا چھوٹا سا باغ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ۔ مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈیمن کو جاتی تھی۔ اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔

شمال میں چھوٹا سا اسکول تھا جس میں پڑھائی کم اور انسپکٹر کے استقبال کی تیاری زیادہ کی جاتی تھی۔ اردو کا پہلا قاعدہ یہیں پڑھا۔ پڑھانے والے عبدالعزیز صاحب تھے ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، کلرک سبھی کچھ وہی تھے۔ میں اس زمانے میں استاد سے کچھ کچھ ڈرا کرتا تھا۔ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ڈر امتحان کا تھا جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہے کیا بلا؟ کچھ کچھ یاد ہے کہ جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو میں گھر میں دبکا رہا۔ بعد میں والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب پکڑ کے لائے اور کہا بیچارے کا سال برباد ہونے سے بچا لیجیے۔ عبدالعزیز صاحب نے قاعدے کا دوسرا صفحہ کھلوایا اور قدرے سختی سے کہا۔ پڑھو۔ سنا، دہشت تو طاری تھی ہی، میں نے بدحواسی میں قاعدہ بند کیا اور بجائے پڑھ کے سنانے کے جیسے جماعت میں رٹا کرتا تھا، زبانی ہی سنانا شروع کیا۔ ابھی پورا سبق نہ سنایا تھا کہ انھوں نے کہا۔ بس بس تم پاس، نہ صرف پاس بلکہ اوّل۔ والد صاحب نے گلے لگا لیا۔ آنسو پونچھے اور کندھے پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ وہ دن اور آج کا دن کتاب میری بہترین رفیق اور دمساز بن گئی۔

میں تیسری جماعت میں تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ حکومت ہند بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں بے دریغ لٹریچر تقسیم کرتی تھی۔ یہ سلسلہ پشتو اور اردو میں ہوا کرتا تھا۔ وہ پڑھنے کا چسکا یہیں سے پڑا۔ دلی سے جو رسالہ اب آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے اس کا ابتدائی نام نن پرون تھا اور پشتو رسالے کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسی زمانے میں دیکھا۔ پھول اور غنچے سے میری

شناسائی بعد میں ہوئی۔

پرائمری کے بعد میں لیّہ ضلع مظفر گڑھ چلا آیا، کیونکہ جن علاقوں میں والد صاحب کی ملازمت تھی، وہاں بعض جگہ ہائی اسکول نہیں تھے۔ گو پنج بنگلہ میں میں دو تین سال کے لیے کرسچین مشن کے اسکولوں میں بھی پڑھتا رہا، لیکن زیادہ وقت لیّہ ہی میں بسر ہوا۔ اردو لازمی مضمون تھا، سنسکرت اختیاری۔ پنڈت جی خالی پرچے پر بھی تیس میں سے تیس نمبر دیا کرتے تھے۔ اردو کے استاد مولوی مرید حسین تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، کسی کو بے جا پیٹتے بھی نہیں تھے۔ نہایت نرمی اور ہمدردی سے گفتگو کرتے اور بے پناہ شفقت سے پڑھاتے تھے۔ خدا جانے اب زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ سفید پگڑی باندھتے تھے، لمبا قد، بھرا بھرا بدن، کھچڑی داڑھی، سردیوں میں خاکی رنگ کا موٹا اونی کوٹ پہنتے تھے۔ بات بڑے دلنشین انداز میں کرتے تھے۔ اقبال اور چکبست کی نظمیں انھوں نے جس انداز میں پڑھائی تھیں، اب تک یاد ہے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور راشد الخیری کی کتابیں انھیں بے حد پسند تھیں اور ہمیں بھی پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ اردو سے محبت کی پہلی چنگاری انھیں نے روشن کی۔ ادبی دنیا، ہمایوں، اور ادب لطیف کے تازہ شمارے جماعت میں پڑھنے کو لا دیا کرتے تھے۔ میرے اس زمانے کے ساتھیوں میں ایک صاحب ریاض احمد تھے جن کا کلام بعد میں پاکستان کے اردو رسائل میں شائع بھی ہوتا رہا۔ سنا ہے اب وکالت کو پیارے ہو گئے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں، جرح زیادہ کرتے ہیں۔ مڈل کے بعد بھی میں مرید حسین صاحب سے اردو پڑھنا چاہتا تھا، لیکن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سائنس کی جماعت میں بیٹھنا پڑا۔ دوسرے استاد جن کی شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا، سعادت اللہ صاحب تھے۔ وہ ڈرل سے زیادہ ڈرائنگ کے ماسٹر تھے۔ واٹر کلر اور چہرے کی تصویر اتارنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ چند لڑکے آدھی چھٹی کے وقت ان کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ واٹر کلر سے تصویر کھینچنے کی مشق کراتے۔ افسوس اس ذوق کی تکمیل نہ ہو سکی، لیکن اب بھی پرانا شوق جاگ اٹھتا ہے تو کاغذ اور رنگ کے ضائع ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہال کمرے میں سامنے کی دیوار پر آنرز بورڈ تھا، اس پر ہر سال میٹریکولیشن امتحان میں اول آنے والے طالب علم کا نام اور نمبر لکھے جاتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بورڈ دیوار پر نہیں، آسمان میں لگا ہوا ہے، اور ہر وہ طالب علم جس کا نام اس پر درج ہے بہت بڑا فرشتہ ہے۔ بہرحال اول آنے کی میری ہوس ۱۹۴۷ء میں پوری ہوئی۔ نام لکھا گیا کہ نہیں، مجھے معلوم نہیں، کیونکہ نتیجے کے اعلان سے بہت پہلے میں وہاں سے جا چکا تھا اور فلک بے انصاف (یا بالانصاف) نے پھر اس اسکول کی زیارت کا موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے پہل میں ایمرسن کالج ملتان میں داخلے کے لیے پہنچا۔ یہاں اچھے نمبروں کی بنا پر فیس تو معاف ہو گئی، وظیفہ نہ ملا۔ میں نے لائل پور زراعتی کالج کا رخ کیا، یہاں میرے پہنچنے سے پہلے ہی داخلہ بٹ چکا تھا۔ وہاں سے دلی چلا آیا۔ اتنے میں آزادی کا آفتاب نکلا اور میں اور میرے گھر والے ایک دوسرے کے لیے اندھیرے میں کھو گئے۔ برسوں پریشانی میں گزرے۔ اس دوران میں ہیرا پھیری کی مشقت میں لگ گیا اور جب جب وقت ملا کچھ پڑھ بھی لیا۔ اس طرح ایف۔ اے اور بی۔ اے کی منزلیں تمام ہوئیں۔ تین چار سال کے بعد گھر والوں سے ملاقات ہوئی اور زندگی پھر ایک توازن کے ساتھ شروع ہوئی۔ والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ کالج میں ایک لڑکی سے شناسائی ہوئی۔ تقریباً آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ جب مخالفت ہونے لگی تو عشق کے آثار پیدا ہو گئے اور جب ایک آدھ بندش بھی حائل ہو گئی تو زندگی فلمی ہیرو کی پیروڈی سی ہو کر رہ گئی۔ بہرحال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔

شادی سے پانچ برس پہلے یعنی ۱۹۵۰ء میں دلی کالج میں ایم اے کے لیے داخل ہوا۔ یہاں اپنے کرم فرما ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے ملاقات ہوئی جن کی محنت کوشی، ذوقِ مطالعہ اور کام کی دھن نے میرے شوق کو مہمیز کیا۔ رسائل میں لکھنے کی لت تو کہیں سے پڑ چکی تھی۔ ابتدا افسانہ نگاری سے

ہوا۔ پہلا افسانہ کوئٹہ کے ہفتہ وار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا تھا، نام تو اب بھول چکا ہوں، البتہ اتنا یاد ہے کہ اس دن پاؤں زمین سے کچھ اوپر ہی اوپر تھے اور دیے بادل بند جانے والا سوائے تجربے جانے کے اور کوئی نہ تھا اور ساری ہی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا گویا۔

ساری دنیا کو میں دیکھ آیا

اس کے بعد چند اور کہانیاں بھی وہیں شائع ہوئیں۔ دہلی آکر ریاست، بیسویں صدی وغیرہ میں لکھتا رہا۔ گھر کے قریب ایک سرکاری لائبریری تھی تھرڈ کلاس فورتھ یعنی چپراسیوں کے لیے۔ شاید اسی لیے اردو ہندی کتابوں کا اس میں خاصا ذخیرہ تھا۔ سارا سارا دن وہیں پڑا رہتا۔ یاد ہے کہ اردو فارسی کے بعض امتحان میں نے پاس اس لائبریری کی وجہ سے دیئے۔ پھر اردو بازار کے بعض مہربان کتب فروشوں کی نوازش سے جو کتاب چند روز پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے یا پھر ادھار پر معاملہ کر لیتے تھے۔ جہاں تک مضمون نگاری کی ابتدا میں نے نگار، نوائے ادب اور آجکل سے کی۔ پہلا مضمون نگار میں اکبر الٰہ آبادی پر غالباً ۱۹۵۲ء میں نکلا۔ اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات پر جو مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس احمد آباد میں پڑھا تھا، وہ نوائے ادب میں شائع ہوا۔ آجکل میں پہلا مقالہ غزل سے متعلق شائع ہوا۔ دلی کالج میگزین کے دلی کالج نمبر میں مدیر معاون کی حیثیت سے شریک رہا اور اس کے لیے کئی دو مضمون لکھے۔ لیکن ادبی و بے ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ایم۔ اے کی منزل سے گزرنے کے بعد ہوا۔ حکومت ہند سے پی ایچ ڈی کے کام کے لیے وظیفہ ملنا، تحقیق کے دشت ویراں میں صحرا نوردی شروع کرنا، دوسرے دلی یونیورسٹی میں اردو کے ایک استاد اور ایک طالب علم کے سوا دور دور تک کسی کا نظر نہ آنا، رفتہ رفتہ کامیابی کے آثار پیدا ہونا، شعبۂ اردو کا قائم ہونا اور اللہ کے بعض نیک بندوں کا اس کی بنیادوں کو اپنی محنت کے خون سے سینچنا، حکومت ہند کی ملازمت کرنا، پھر کیمپ کالج اور سینٹ سٹیفنز کالج سے کام کی ابتدا کرنا، دلی یونیورسٹی میں ملازم ہونا، لسانیات کی تربیت حاصل کرنا، ریڈر مقرر ہونا اور پھر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) بلایا جانا، یہ سب کچھ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے جس کے بارے میں اس وقت مفصل لکھنا نہ تو مناسب ہے نہ ممکن۔

آخر میں چند باتیں اپنے ادبی مسلک کے بارے میں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اردو کے مستقبل کے بارے میں نوحہ گری کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرا میدان تخلیق نہیں، تحقیق ہے۔ دوسری وجہ میری نفسیاتی کمزوری ہے یعنی رجائیت پسندی اور تیسرے یہ کہ میں ان تہذیبی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور ارتباط سے وجود میں آئی ہیں۔ یہ بات ہندوستان کا مقدر ہو چکی ہے کہ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی یک رنگ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بنیادی وحدت تو موجود ہے لیکن اس کی ظاہری کثرت کو یک رنگ کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں، بار بار ناکام رہی ہیں۔ اس ملک کا فطری ارتقا مختلف عناصر کی آزادانہ نشو و نما کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی سے مختلف عناصر میں ارتباط پیدا کرنے کی سعادت کھڑی بولی کو نصیب ہوئی تھی جسے بنا سنوار کے اردو نے ایک اعلیٰ ادبی منصب تک پہنچایا۔ میرا ایمان ہے کہ نئے ہندوستان کو آج بھی جذباتی ہم آہنگی اور تہذیبی شیرازہ بندی کے لیے اردو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی اور ہندی کی۔ ان چار پانچ سالوں کے ارتقا میں اردو نے کس طرح اپنی تہذیب کو نکھارا، اس کی پشت پر کن سماجی اور ذہنی قوتوں کا ہاتھ رہا، اس نے متضاد تہذیبی عناصر سے رس لے کر کس طرح ذوق و احساس کی آسودگی کا سامان پیدا کیا، اور شائستگی اور لطافت کے کیا کیا معیار پیش کیے، ان سب امور سے معروضی علمی انداز میں بحث کرنا اور اردو کی چار سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ لکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور میری مطبوعہ کتاب ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں اسی وسیع تر کام کی نہایت ادنیٰ اور

محولہ شقوں میں، میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق محض کھودنے کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کار آمد ہے جو کسی لفظیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے۔ ہمارے ہاں تحقیق اس وقت شخصیت کی راہوں پر چل رہی ہے اور اس کی وجہ با مقصد تحقیق کے صالح شعور کا فقدان ہے۔

لسانیات پر میرا کام مشغلۂ ثانی کی حیثیت سے ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا جب میں نے معراج العاشقین کا نیا ایڈیشن لسانیاتی نوٹ، مقدمے، فرہنگ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مونوگراف اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو اور دوسرا دہلی کی کرخنداری بولی پر شائع ہو چکا ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی بڑی دھوم ہے۔ یہاں کے ماہرین نظریاتی سطح پر برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے ماہرین سے آگے نکل گئے ہیں۔ لسانیات کی حدیں منطق اور ریاضی سے ملنے لگی ہیں اور کمپیوٹر کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ اس وقت ماہرین کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ ایسا مشینی ذہن تیار کریں جو کسی بھی زبان کی صرف و نحو اور اصوات کا تجزیہ اور وضاحت خود بخود کر سکے۔ اس سلسلے میں لسانیات کی دنیا طلسمات کا سا منظر پیش کرتی ہے جہاں کل آسمان تھا وہاں آج زمین ہے، جہاں کل زمین تھی وہاں سناٹا ہے۔ ارادہ تھا کہ صوتیات پر کام کی ابتدا کروں گا لیکن منتظر ہوں کہ اس قدرت کے کارخانے میں سکوں بھی میسر آتا ہے کہ نہیں؟

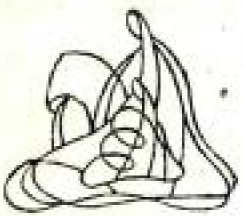

شورش کاشمیری

غالباً سب سے مشکل کام دنیا میں اپنی بابت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ کہا یا سب کچھ کہنا ممکن ہی نہیں صبر آزما بھی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی زندگی ہر شخص کے لیے دلچسپ ہو۔ فرض کیجیے ایک واقعہ سوانح نگار کے لیے بڑا اہم ہے یا جو شخص اپنے حالات بیان کر رہا ہے اس ایک واقعہ ہی کو زندگی کی اساس قرار دیتا ہے لیکن وہی واقعہ عام قارئین کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دوائر میں ممتاز و منفرد ہے لیکن سوانحی اعتبار سے دوسروں کے لیے کوئی سرو سامان نہیں رکھتا۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اپنے بارے میں سچی باتیں کہنا بڑے ہی گردے کا کام ہے گو اس زمانے نے سوانح نگاری کو نسبتاً آسان کر دیا ہے اور بہت سی چیزیں جو پہلے عیب تصور ہوتی تھیں اب ان کی رو بیان کی خوبی ہو گئی ہیں۔ لیکن حقائق میں اب بھی افسانہ شامل ہے اور جب تک قلم سے لیپا پوتی نہ کی جائے کوئی سا شخص بھی اپنے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر انسان اپنی سوانح زیب داستان کے خیال سے بڑھاتا اور عیب داستان کے خوف سے گھٹاتا ہے۔ شاعری میں تو یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے

ہر کسے را دامن تر ہست اما دیگراں   باز می پوشند و ما در آفتاب انداختہ

لیکن نثر میں تر دامنی کے بیان کا حوصلہ شاذ ہی ہوتا ہے بلکہ کوئی پُر پیچ راستہ ہو تو کاٹ کے نکل جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض بڑے لوگوں نے اپنی کمزوریوں کو بے نقاب کیا اور گفتنی ناگفتنی سب کہہ گئے لیکن کتنی ہی تصویریں تصور و خیال ہی میں ختم ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے سے بڑا آدمی بھی اپنے بارے میں کچھ کہنے سے قبل بعض حقائق کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ کسی مصنف کا یہ قول بالکل درست ہے کہ آپ بیتی لکھنا سہل نہیں اپنی بُرائیاں کہنے کو جی نہیں چاہتا کہ نفس کی ہیٹی ہوتی ہے اور اپنے منہ سے اپنی اچھائیوں کا تذکرہ اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ یوں بھی بات جچتی نہیں "اپنے منہ میاں مٹھو" ایسی ہی روایتوں اور حکایتوں پر پروان چڑھا ہے۔ بہرحال سوانح عمریاں بڑے آدمیوں کی ہوتی ہیں اور آپ بیتی بھی انھی کو جچتی ہے۔ انھی سے تاریخی سرمایہ نکھرتا اور بعض گمشدہ راہیں کھلتی ہیں۔ فی زمانہ سوانح عمری یا آپ بیتی داستان سرائی سے بہت آگے نکل گئی ہے اب یہ مرحوم بادشاہوں کی داستانوں کا بیان نہیں رہا بلکہ عام انسانوں کی کہانیوں کو اس پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے اب سوانح عمری کہانی ہے انسانوں کے دماغی نشو و نما، سماجی احوال و وقائع اور فکری سرگذشت کے آئینہ دار، ظاہر کی ایک انسان جس دائرہ میں زندگی بسر کرتا اور اس دائرہ میں اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرتا ہے۔ اس کی کہانی ہی اس کی آپ بیتی ہے جو شخص جہاں تہاں کمال حاصل کرتا ہے اس کے آثار و نتائج ہی اس کی سوانح عمری ہو سکتے ہیں۔

میں کیا اور میرے سوانح کیا؟ ۱۹۶۷ء شروع ہو چکا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء میرا یوم پیدائش ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اسی سال ۵۰ برس ہو گئے

کو زندگی کے ۵۰ سال پورے ہو جائیں گے۔ جس سال پاکستان بنا میری عمر کے اکتیسویں سال کا پہلا دن تھا تیس برس کی عمر تک دس سال اور کچھ ماہ قید و بند میں کٹ گئے لوگ یونیورسٹیوں میں پڑھتے اور پروان چڑھتے ہیں میں جیل خانوں میں پڑھتا رہا اور پروان چڑھا بالفاظ دیگر میری نشو و نما قید خانہ میں ہوئی ہے۔ باپ دادا کشمیری تھے۔ سری نگر کے قرب و جوار میں کوئی گاؤں ان کا وطن تھا صحیح نہیں کہہ سکتا وہ کشمیر سے اٹھ کر آئے تھے یا ان کے والدین میرے پردادا نے وطن چھوڑا اور امرتسر میں ٹھک گئے۔ ان کا دھندا سوداگری تھا۔ گوت ڈار تھی کوئی ڈاروں کو راجپوتوں کی شاخ قرار دیتا ہے کوئی برہمنوں کی۔ واللہ اعلم۔ اتنی بات البتہ معلوم ہے کہ پردادا کے دادا نے اسلام قبول کیا تھا اور ننھیال کی طرف سے نانا کے والد۔ نانی ہماری برہمن زادی تھیں اور ان کے والد مسلمان ہوئے تھے۔

ہوش سنبھالا تو گھر میں آسودگی تھی ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ ساتویں جماعت تک یہ دور رہا پھر حالات کی خرابی نے جھانکنا شروع کیا [illegible] جوڑ توڑ کر نکل گیا۔ نویں اور دسویں میں گھر کے معاشی حالات اتنے مضطرب ہو گئے کہ

ہم اس طرح تھے جیسے ہمارا خدا نہ تھا

والد میرے بڑے صابر و شاکر تھے۔ متقی، پرہیزگار، عزت مند کماتے اور ہمیں پالتے تھے۔ ہم تین بھائیوں اور دو بہنوں کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ان کا مشاہرہ اتنا قلیل تھا کہ ہم لوگ جی نہیں رہے بلکہ جینے کا پیرایہ کر رہے تھے۔ ہم پانچ کے علاوہ ان کے بوڑھے والدین بھی حیات تھے آٹھ جی کھانے والے ایک کمانے والا تھا۔ میں سب بھائیوں میں بڑا تھا دو بہنیں تھیں دو بھائی ایک سال ہی کا بچہ تھا کہ والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔ شوق بہت تھا۔ لیکن پڑھائی زر چاہتی ہے جیب و داماں خالی تھے۔ ساتھی طلبہ نے جب کالجوں میں داخلہ لیا تو اپنی مجبوری اور بے سروسامانی کا ڈنک کھلنے لگا۔ اسی قلق ہی نے مجھے سیاسی شاعری کے راستہ پر ڈالا پھر یہی قلق مجھے سیاسیات کے جنگ زار میں لے گیا۔ بعد میں کچھ اور محرکات بھی پیدا ہو گئے۔ لیکن اس قلق نے مجھے دنوں تک دل برداشتہ رکھا میں اس راہ پر نکل کھڑا ہوا جس کا مجھے احساس تک نہ تھا۔

اسکول میں ایک استاد تھے مولانا نیاز احمد نعمانی اردو فارسی پڑھاتے شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ ہم دو چار طلبہ جو ان کے خیال میں ذہین تھے ہمیشہ ان کی عنایتوں کا مرجع رہتے جس سال میٹرک کے لیے ہم اسکول چھوڑ رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے ہاتھ دیکھے۔ میرے ہاتھ کی ریکھا دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے جیسے انھیں کسی خلاف یقین چیز سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ فرمایا تمھارا ہاتھ کہتا ہے کہ تیس پینتیس برس تک تمھاری قسمت میں قید ہی قید ہے ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں۔

باور کیا کہ میں نے سرے سے زندگی ہی زنداں میں کیوں؟ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں ایک سیدھا سادہ سا نوجوان تھا مجھ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کا کچھ خوف ہوتا۔ اس کا تجزیہ قید و بند ہوں میں اس وقت تک کم آمیز شرمیلا اور مسکین سا نوجوان تھا میری طبیعت کا میلان رومانی شاعری کی طرف تھا اس میں شک نہیں کہ اسلامی اور سیاسی شاعری کی چھاپ قلم کو لگ چکی تھی اور میں اس رنگ میں بآسانی شعر کہہ لیتا تھا لیکن طبیعت کا رخ لمحہ بہ لمحہ غزل کی طرف جا رہا تھا۔ تقاضائے عشق نوجوانوں کی طرح میں نے بھی عشق و محبت کو موضوع فکر قرار دے لیا۔ اس کشاکش میں سال ڈیڑھ سال نکل گیا۔ عشق تو عشق کا نصاب پڑھ ڈالا ان دنوں عشق بھی کیا، شعر بھی کہے، کوچہ گردی بھی کی۔ ہجر و وصال کے مزے بھی لوٹے یعنی شب ہجراں بھی آئی اور شب وصال بھی۔ رقیبوں کا چہرہ دیکھا اور غزالوں کا زاویہ [illegible] کا لطف، دشمنوں کی بھی [illegible] رستے بھی کاٹے اور گیت بھی گائے مزاج عشق کے مسائل کا روپ اور بہروپ دونوں اختیار کیے ایکا ایکی پانسہ پلٹا جو چیز میرے خواب و خیال میں [illegible] میں نے اس کی اَن سُنی کر دی تھا محسوس ہوا مجبور [illegible] کی طرح آنکھ [illegible] ہے۔ شہید گنج نے مجھے جیل کا راستہ دکھایا اور میں قید ہو گیا اب جو یہ حالت پڑی تو آرزو نہ فطرت ہو گئی۔ جولائی ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۶ء کے آخر تک قید و بند کا حال یہ رہا کہ جیسے قدرت نے اسی دن کے لیے پیدا

تمام محفلیں موجود تھیں۔ ذکر و فکر، فاقہ، جھمیلوں کے دن اور مشقتوں کی راتیں تھیں۔ پیچیدہ داری کی وجہ سے نوجوانوں کا جتھا دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک طرف کمیونسٹ نوجوان ہوگئے جو اس جنگ کو جنتا کی جنگ کہنے لگے تھے، دوسری طرف سوشلسٹ نوجوان جو اب بھی اس جنگ کو سامراجی جنگ کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ باقی لوگ بھی انھی کے ہمنوا و ہم خیال تھے۔ دونوں میں باہمی چپقلش رہتی تاہم جیل والوں کے مقابلے میں سب اکٹھے تھے۔ یوسف مہر علی آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری رہے تھے اور دستۂ اول کے سوشلسٹ لیڈر۔ مجھے کسی کام کے لیے بمبئی سے وہ ہو آئے تھے کہ حکومت نے نوٹس دیا کہ فوراً صوبہ چھوڑ دو۔ ٹوٹ گئے پھر وہ قید ہوگئے۔ کتابوں کے کیڑے تھے۔ ان کے پاس سیاسیات پر بڑی قیمتی کتابیں تھیں۔ دبلے پتلے، گورا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، بشرے پر متانت، ماتھے پر سنجیدگی، بول چال میں رکھ رکھاؤ، بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ سوشلسٹوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔ مجھ پر بےحد مہربان ہوگئے۔ ایک صاحب علم کی تمام علامتیں ان میں موجود تھیں۔ زیادہ حصہ پڑھنے لکھنے ہی میں گزارتے۔ صبح و شام میرے ساتھ سیر کرتے۔ دن کو ایک گھنٹہ رات دو تین گھنٹے۔ ان سے معلومات کا ایک ذخیرہ حاصل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے دوستوں کی ایک مجلس ترتیب دی کہ ایک موضوع سے کہ یہ دوست ہفتہ بھر مختلف کتابیں پڑھتے، ان کے نوٹ لیتے، پھر ہفتہ کی شام کو مجلس لگتی۔ سب اپنا اپنا مطالعہ پیش کرتے۔ بحث ہوتی۔ تجزیہ ہوتا۔ پھر ایک شخص ان مباحث کو کتابوں اور تجزیوں کی روشنی میں قلم بند کرتا جو سب کے لیے ایک مفید مسودہ ہوتا۔ کوئی پندرہ سولہ موضوع اسی طرح قلم بند ہوگئے۔ جس سے ذہنی نشو و نما کو خاص مدد ملی۔ یوسف مہر علی کی رہائی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ مسائل کی شکلیں بدل گئیں۔ پروفیسر ملک راج بھلا اور پنڈی کے سوشلسٹ لیڈر تھے۔ آج کل جالندھر ہی میں غالباً گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیں۔ میرے ہم عمر یا مجھ سے چھوٹے ہی تھے۔ انھوں نے مجھے معاشیات اور مارکسزم پڑھانا شروع کیا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں اس علم میں کامل ہوگیا لیکن مجھے سرمایہ و محنت کی کشمکش کے اصول و مسائل سے آگاہی ہوگئی۔ تاریخ کے جدلیاتی مادی منظر سے بھی واقف ہوگیا اور استحصال معاشیات کے مبادیات سے بھی۔ یہ دن بھی ہوا ہوگئے۔ قید تھوڑی نہ تھی پانچ سال تھے لیکن جب بیت گئے تو بس سے نکل گئے۔ بے شمار تجربے حاصل کیے۔ تکلیفیں سہیں تو اس طرح جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ ایک سال پورا ملک قید تنہائی میں رہا۔ منٹگمری سنٹرل جیل میں کوئی تین سال بسر کیے۔ باقی اٹھارہ ماہ بھی قید تنہائی ہی کے حقدار تھے۔ پچیس (۲۵) دن بھوک ہڑتال کی، کوٹھڑی میں ہتھکڑی لگا کر ڈنڈا بیڑی بھی پہنی، مار کھائی۔ جب کوئی پرسان حال نہ رہا تو انقلاب زندہ باد کے نعرے کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ ادھر گنتی بند ہوئی جیل والے سب اپنے گھر کو گئے ادھر میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا۔ یہ نعرے جیل کی وحشت اور خوف کے منہ پر زناٹے کا طمانچہ تھے۔ حکام نے جواباً میرے منہ پر حفاظت کے تو بچھے باندھے، کوٹھڑی میں ہتھکڑی لٹکا کر لٹکا دیا۔ جوانی کے دن تھے، وہ بھی جوانی تھی، سپر انداز ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ نتیجہ حکام کو سپر انداز ہونا پڑا۔ لاہور سنٹرل جیل نے ان تمام مصائب کی تلافی کر دی۔

اثنائے اسیری میں طرح طرح کے قیدیوں سے رابطہ اور واسطہ پڑا۔ سیاسی قیدی بھی اور اخلاقی قیدی بھی۔ دس سالہ قید کی کہانی بہت لمبی ہے۔ "پس دیوار زنداں" کے نام سے میں نے کوئی پانچ سو صفحوں کی کتاب لکھی ہے جس میں یہ تمام روداد موجود ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ قید کا دور، جیل خانے کے شب و روز نے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ اور تجربہ بھی بخشا۔ سینکڑوں شکلیں سامنے آئیں۔ انسان جرم کیوں کرتا ہے؟ مجرم پیشہ ہیں یا بنائے جاتے ہیں؟ اخلاقی قیدی کیا کیا کچھ کر گزرتے ہیں؟ قانون کی منشا کیا ہوتی ہے؟ جیل خانہ کیا سبق دیتا ہے؟ تمام چیزیں کھل کے معلوم ہو گئیں۔ ہزاروں اخلاقی قیدیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سینکڑوں افراد میری اس قید کے زمانے میں پھانسی پا گئے۔ ان کی داخلی دنیا کو سمجھتا رہا۔ گناہ بھی دیکھے اور گناہ گار بھی۔ یہ ایسے تجربے، مشاہدے اور مطالعے تھے کہ فرضی ناول نگاری اور مفروضی افسانہ نویسی کا بھرم ہی کھل گیا۔ نئی پود کی اکثریت ایسی ہے جس کی تحریریں میری نگاہ میں نہیں جچتیں۔ یہ لوگ ادب برائے زندگی کی راگنی خوب الاپتے ہیں مگر انھیں زندگی

اور ایسے فرد شخص یا اس کے سب ادب کا قطعاً علم نہیں۔ ان میں اکثر سنی سنائی باتوں پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں پڑھا ہوتا ہے جس کا اکثر وہ اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک زبان میں پڑھتے دوسری میں سوچتے تیسری میں لکھتے ہیں۔

تاریخ اور سیاست میرے مطالعہ کی جان ہیں لیکن بنیادی طور پر میری روح ادبی ہے۔ میں نے کلاسیکل ادب کا بہت بڑا سرمایہ پڑھا ہے میرے دل میں قدیم نثر نگاروں اور بزرگ شاعروں کا انتہائی احترام ہے لیکن جن لوگوں نے مجھے متاثر کیا متقدمین میں میرزا غالب، مرزا دبیر اور محمد حسین آزاد سرفہرست ہیں۔ متوسطین میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ متاخرین میں رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام رسول مہر اور نیاز فتح پوری۔ میرے قلم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی چھاپ بہت گہری ہے میرے پاس ان کا علم نہیں لیکن ان کا عکس ضرور ہے۔ رشید احمد صدیقی کا طرزِ نگارش مجھے اس حد تک مرغوب ہے کہ ان کا تتبع چاہتا ہوں لیکن بن نہیں سکا۔ میں نے جس شخص سے جو کچھ حاصل کیا اس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ تحریر و تقریر دونوں میں طبیعت رکتی نہیں۔ تقریر کرنے، نثر لکھنے اور شعر کہنے میں مجھے ذرہ برابر پریشانی نہیں ہوتی۔ میں نے شعر کہنا شروع کیا تو میں پندرہ سولہ برس کا تھا۔ سیاسیات میں داخل ہوا تو شاعری کے شوق ہی سے دستبردار ہو گیا۔ ادھر طبیعت اس طرف راغب نہ ہوئی اچانک طبیعت کا دریچہ کھلا شعر ہونے لگے۔ پانچ برس کی اسیری میں تعطل رہا ایک آدھ نظم ہو گئی تو طبیعت کا ابال تھا۔ البتہ اس عرصے میں یہ ہوا کہ خطابت کا ایک اسلوب بن گیا۔ بطور خطیب طبیعت کا مطلع روشن ہو گیا۔ یہ کئی چیزیں جو میری طبیعت میں جمع ہو گئی ہیں ۱۹۴۵ء میں ان کا زور بندھا۔ جب چٹان نکالا تو یہ سب گوشے سامنے آ گئے۔ میری شاعری سیاسی شاعری ہے۔ اس میں غزل کا لہجہ ضرور ہے مگر تتبع ظفر علی خاں کا ہے۔ میں نے ان سے دو چار نظموں میں اصلاح بھی لی ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی سے بھی دو چار غزلوں کے الفاظ پر مشورہ کیا۔ پرائمری میں پڑھتا تھا تو احسان دانش مجھے گھر میں پڑھایا کرتے تھے۔ میرے سامنے وہ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے پہلے اسکول سے نکلا تو ان کی شاعرانہ صحبتوں سے فیض اٹھایا۔ قید و بند کے زمانہ میں گویا ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک ان سے قطع تعلق رہا۔ یعنی سیاسی زندگی کی حشر سامانیوں نے رسم و راہ کو موقوف رکھا۔ جب گفتنی ناگفتنی (مجموعہ کلام) مرتب کیا تو ان سے مشورہ کیا میں احتراماً انھیں استاد بھی کہتا ہوں۔ شاعری میں عادت میری یہ ہے کہ فی البدیہہ کہتا اور مسلسل کہتا ہوں۔ جس نظم کے لیے کرید یا بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہو اور دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگے میرا قلم اسے قبول ہی نہیں۔ چٹان کے لیے ہر ہفتہ ایک نظم لکھتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ دفتر میں بیٹھا ہوں کاتب نے نظم مانگی میں نے قلم اٹھایا کوئی مصرع ذہن میں آ گیا نظم ہو گئی۔ مشورہ اس حد تک مانتا ہوں کہ کبھی کبھار کسی طویل نظم میں کوئی لفظ کھٹکتا ہے تو شاں وہیں پر دوسرا لفظ سوچ لیتا ہوں۔ شاعری میں میرا اپنا ایک مزاج ایک ذہن اور ایک تاثر ہے۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ایک سیاسی آدمی ہوں اس لیے سیاسی اثرات پیدا کرنے کے لیے ایسے شعر کہتا ہوں جن کا اثر فوری ہو اور خطابت کی طرح اپنے اندر چمک دمک رکھتے ہوں مجھے اپنے بارے میں یہ دھوکا کبھی نہیں ہوا کہ میں کوئی زندۂ جاوید شاعر ہوں یا مجھے شاعروں کی قطار صف میں جگہ ملنی چاہیے۔ میں شعر زیادہ تر اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے کہتا ہوں نام نہیں گنوا سکتا لیکن اس دور کے ہر بڑے شاعر سے مجھے تعلق خاطر رہا ہے جن سے ذاتی روابط قائم نہ ہو سکے ان کے کلام سے وابستہ ہو گیا۔ اقبال کو میں پیر و مرشد مانتا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے مختلف موضوعات پر ایک ڈیڑھ لاکھ سے کیا کم شعر یاد ہوں گے۔ شعر کہتا ہوں سیاسی پڑھتا ہوں رومانی غزل کے اشعار میرے دل میں بری طرح تازہ ہو جاتے ہیں۔

صحافت کا شوق مجھے شروع سے تھا۔ کئی اخباروں میں شریک رہا۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے مولانا ظفر علی خاں کا طرز مجھ میں سما گیا ہے اور جس حد تک اداریہ نگاری کا تعلق ہے مولانا غلام رسول مہر کے طرز نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ قلم طنز میں تیز رہتا ہے۔ ہجو سے بچتا ہوں

لیکن اخبار نویسی پیشہ ہی ایسا ہے کہ ہو جاتی ہے۔ طنز اور ہجو پر نظمیں کہتے وقت طبیعت میں طغیانی آجاتی ہے۔ محمد دین تاثیر اور چراغ حسن حسرت میں جو قلمی معرکہ ہوا تھا میں اس معرکہ میں تاثیر کے ساتھ تھا۔ انھوں نے کل تین یا چار نظمیں کہی تھیں لیکن وہ تمام نظمیں جو حسرت اپنے نام یا ابو زید سروجی وغیرہ کے نام سے چھپتی رہیں میرے قلم سے نکلیں۔ یار لوگوں نے تاثیر کے نام مڑھ دیں اور آج تک انھی کے نام سے منسوب چلی آتی ہیں۔

عوام میں یہ عمومیت پائی جاتی ہے کہ ان کے خطبا و شعرا اور ادبا و علما اپنے معاملات پر فخر کرتے اور اس کے اظہار سے چوکتے نہیں۔ انسان کے پاس عام ہے۔ اگر اس روایت سے فائدہ اٹھاؤں تو کہنے میں مجھے عذر یا عیب محسوس نہیں ہوتا کہ میں نے خطابت کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ ناموری سے فکر و نظر کے اختلاف کے باوجود کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ میں نے ان کی صدارتوں میں عوام کو خطاب کیا اور دو دو گھنٹے بولتا رہا۔ انھوں نے جس خوشنودی کا اظہار کیا اور میرے بارے میں جو کلمات تحسین کہے میرا سرمایۂ افتخار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطابت کے معاملہ میں اللہ کی دین کا احسان مند ہوں۔ میں نے بڑے بڑے سرکش مجمعے توڑے ہیں۔ یہ ملکہ وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ مطالعہ، جوش، جذبہ اور تجربہ خطابت کو واقعی پروان چڑھاتا ہے۔ خطابت کا جوہر قدرت کا عطیہ ہے۔ میں جب تک پڑھتا رہا بلکہ بڑھاپے کے بعد بھی میرے سان گمان میں نہ تھا کہ میں ایک مقرر ہو سکتا ہوں یا مجھ میں ایک خطیب کی صلاحیت موجود ہے۔ ایکا ایکی بند کھلا اور میں مقرر ہو گیا پھر میرا مطالعہ خود بخود میرے کام آتا رہا۔ اس میدان میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر مجھ پر بہت زیادہ ہے بلکہ الفاظ کا شکوہ اور اس کی طاقت کا اندازہ انھیں کے خطبات سے ہوا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں سے میں نے الفاظ کا استعمال سیکھا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے خطابت کا طنطنہ و لہجہ۔ دانشوروں کی محفلوں اور عوام کے مجمعوں کو میں نے یکساں اعتماد کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ میرے نزدیک خطابت الفاظ کی جادوگری اور مطالب کی صناعی کا نام ہے۔ ایک خطیب (ORATOR) تھوڑی سی بنیادی تیاری کے بعد مجمع پر قابو پا سکتا ہے۔ الفاظ کی طاقت بڑی طاقت ہے۔ خطابت کا منتہیٰ یہ ہے کہ مجمع کو خیالات کی پراگندگی کے باوجود کانٹے میں جکڑ دے اور اس کے دل و دماغ کو مٹھی میں لینے کا نام خطابت ہے۔ تقریر کئی اجزا کا مرکب ہوتی ہے۔ زبان اور اس کی روانی، مطالب اور اس کی صراحت، موضوع سے وابستگی، مقصد سے عشق، اشارات و کنایات، مطائبات و ظرفیات، حرکات، استدلال، مقرر کی ذاتی شخصیت اور سب سے بڑھ کر مقرر کا اپنی ذات پر اعتماد وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر یقین۔ ایک ایسا مقرر کبھی پسپا نہیں ہو سکتا۔ خیالات سے اتفاق یا اختلاف دوسری چیز ہے لیکن جس مقرر میں یہ باتیں ہوں گی۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہو گا۔ میری ۲۸ سالہ خطیبانہ عمر کے لیل و نہار کا یہی خلاصہ ہے۔

میں نے عمر بھر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ میں خود ایک کہانی ہوں۔ کہانیاں بناتا رہا ہوں۔ کہانیوں میں سے گزرا ہوں اور کہانیوں میں رہا ہوں۔ میری قلم فرسائی نے مجھے مہلت نہیں دی کہ انھیں قلم بند کروں۔ زندگی کا ہر گوشہ میرے سامنے بے نقاب رہا ہے۔ اس بازار سے گزرا ہوں بازار حسن کی سیر و سیاحت کی ہے چونکہ کسی بازار میں دامن بھی تر نہیں کیا لہٰذا دامن کو نچوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کھلی کتاب کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ ایک سپاٹ میدان ہے جس سے خیالات و افکار کے سیکڑوں قافلے گزر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے خوش قسمت انسان ہوں کہ میں نے اس عظیم دور کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ عمر بتائی۔ بعض شخصیتوں کے ساتھ رہا ہوں۔ بعض کو قریب سے دیکھا ہے۔ بعض کے اعمال و افکار سے کی خوشہ چینی کی ہے اور اسی کی رہنمائی کی صحبتوں کا فیض ہے۔ میں نے بعض انقلابی تحریکوں اور سیاسی معرکوں میں اس توانائی کے ساتھ حصہ لیا ہے کہ بسا اوقات مجھے اپنی زندگی پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے کیسے طوفانوں سے گزر چکی ہے اور کن مرحلوں

میں محیرالعقول جرأت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض باتیں بڑے آدمیوں سے منسوب ہو کر بڑی ہو جاتی ہیں اور بعض بڑی باتیں چھوٹے آدمیوں کی وجہ سے گمنام ہو کر دفن ہو جاتی ہیں۔ دراصل طور پر میری روح اور ضمیر مطمئن ہیں کہ جو سیلاب گرداب بھی اثنائے سفر میں آتے رہے ان سے مردانہ وار نکلا ہوں۔ کئی دفعہ ان حوادث و وقائع کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن کم فرصتی مانع ہوتی رہی۔ ایک زمانہ میں۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل کے زیرِ عنوان اپنی سرگذشت کے بعض حصے لکھے بھی تھے۔ جو دو سال تک چٹان میں متواتر چھپتے رہے یہ تمام حصہ زبانی یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بعض غلطیاں بھی رہ گئی تھیں پھر فرصت نہ ملی کہ تصحیح و تفصیل کے ساتھ ترتیب دے کر مسودہ ادھورا پڑا ہے۔ میرے سامنے بعض بڑے آدمیوں سے مختلف العنوان ملاقاتوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جن بڑے بڑے ادبی اور سیاسی لوگوں سے ملتا رہا ہوں یا اُن سے جو جو گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں چاہتا ہوں انھیں لکھ دوں لیکن بہت سے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر رہ جاتا ہے سیاسی زعما میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، جواہر لال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، شہید سہروردی، عبدالرب نشتر، عطاء اللہ شاہ بخاری، افضل حق وغیرہم کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ بیشتر کے ساتھ سیاسی سفر کیا ہے دینی پیشواؤں میں علامہ انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اسی طرح نمایاں و ممتاز ادبی شخصیتوں سے رشتۂ قلم استوار کیا اور بعض کے ساتھ گھل مل کے عمر کے کچھ دن گذارے ہیں۔ ان ملاقاتوں کی کہانیاں مرتب کرنے کو جی بھی چاہتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا فرصت عنقا ہے۔ ہمت روز بروز مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ بارہا یہ سب کچھ حوالۂ قلم کرنے کی ٹھانی دماغ کو بھی تیار پایا اور حافظہ کی گرہیں بھی کھلتی چلی گئیں پھر یہ سوچ کر ارادہ منسوخ کر ڈالا کہ میں کیا اور میرے سوانح کیا۔ سوانح عمریاں اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے رہنمائی حاصل کریں اور جگمگاتے ہوئے واقعات کو مشعلِ راہ بنائیں۔ میں نے سرگذشت لکھی تو میری غرض و غایت یہ ہوگی کہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور جس سیاسی دور یا سیاسی فضا میں سے ہم نکلے ہیں اس کی کہانی بعض بڑے آدمیوں کی کہانی نہ رہے بلکہ اس عظیم کہانی میں ایک ایسے نوجوان کا نام آجائے جو اس معرکہ میں بھی شریک ہو جو تاریخ ساز تو نہیں لیکن خود ساز ضرور ہے اور جس کی تیس سالہ جدوجہد کا سرنامہ ہے۔

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

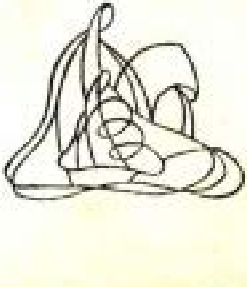

ڈاکٹر اعجاز حسین

میری حیات کا افسانہ دیکھنے والو
کہیں کہیں سے یہ قصّہ پڑھا نہیں جاتا (اعجاز)

ماہ و سال کے محور پر گردش کرتے کرتے انیسویں صدی تھک چلی تھی، انقلابات و انکشافات، محاربات سے دنیا کی تاریخ بدل کر جا رہی تھی مگر اس پیرِ زال کا دفترِ نظم و نسق ہنوز سرگرم تھا، اس کے جاتے جاتے بھی تعمیر و تخریب میں اضافے ہو رہے تھے، سیکڑوں تمدن اُبھرتی تھیں، سیکڑوں ڈوبتی تھیں، ہزاروں انسان مرتے تھے سیکڑوں پیدا ہوتے تھے، اس کی رحلت اور نئی صدی کی ولادت میں وہی ایک سال کا وقفہ تھا کہ میرے وجود کو عدم سے ہستی میں آنے کا حکم ہوا، ہزاروں، لاکھوں بچوں کی طرح اس جاتی بُوڑھی صدی نے اپنے آخری دَور میں مجھے بھی جنم دیا، اس کی یہ حرکت خدا جانے تعمیر سے متعلق تھی یا تخریب سے، بہر حال اس نے اپنا کام کیا اور میں نے نئی دُنیا کو سلام کیا۔

میری ولادت، تعلیم و تربیت سب کچھ نانہال میں ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے نانا سید حسین کو قدرت نے عرصہ دراز تک اولادِ ذکور سے محروم رکھا تھا۔ اُن کے چار بیٹیاں تھیں اور ان میں سے بھی بجز میری ماں کے کسی اور کے اولاد نہ تھی، بیٹیوں کے بہت بعد میرے نانا کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا، مگر عنفوانِ شباب میں باپ کے سامنے ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے نانا شروع ہی سے اپنی لڑکیوں کو بیحد عزیز رکھتے تھے، چاہتے نہ تھے کہ کوئی لڑکی اُن سے جدا ہو، چنانچہ انہوں نے لڑکیوں کی شادیاں ایسے اشخاص سے کیں جو خانہ دامادی پر راضی ہوئے۔ اس ضمن میں نانا مرحوم کا کہنا تھا کہ "دامادی کے لئے مجھے لڑکا غریب چاہئے لیکن ہڈی اچھی ہو"، میری والدہ چار بہنیں تھیں، سب کی شادیاں ایسے ہی گھرانے میں ہوئیں۔ میرے والد محمد شفیع بھی غریب آدمی تھے مگر بے حد شریف و نیک مزاج تھے۔ شادی کے بعد محکمہ پولیس میں ملازم ہو گئے تھے لیکن غالباً اپنی نیکی و شرافت کی وجہ سے کوئی خاص ترقی نہ کر سکے، اس لئے کہ یہ خصوصیات محکمہ مذکور میں روزِ ازل سے اچھی نظروں سے دیکھی نہیں جاتیں۔ ان کی غریبی، والدہ سے بیگانگی اور نانہال کی خوش حالی و علم دوستی نے مجھے ان سے کبھی اس طرح وابستہ نہ ہونے دیا جیسے باپ اور بیٹے عموماً ہوتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہ مجھے ان سے کوئی خاص محبت تھی نہ میرے دل میں وہ جذبہ و احترام ان کے لئے تھا جو ہونا چاہئے تھا، میرے لئے سب کچھ میرے نانا تھے، ان ہی کو میں باپ سمجھتا تھا، اور کہتا بھی تھا۔

میری نانہال بہت خوش حال تھی، آبائی جائداد کے علاوہ نانا نے مختلف ملازمتوں سے بھی بہت کمایا تھا۔ ملازمتوں میں ان کے بیان کے مطابق ان کی ایک ملازمت سب سے زیادہ نفع بخش تھی۔ لارڈ کرزن کے عہدِ حکومت میں جب دہلی دربار ہوا تو وہ فوجیوں و دیگر

سرکاری عہدہ داروں کی ضروریات کے نگراں ہو کر گورنمنٹ کے ساتھ ہو کر دہلی گئے، ان کا کہنا تھا کہ اس عہدہ پر رہ کر میں نے اتنا روپیہ کمایا کہ بیٹھنے کی فرصت نہ تھی، بہرحال وہ نہایت فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

تحقیق کے بعد بھی مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ میری پیدائش ۱۸۹۸ء میں ہوئی یا ۱۸۹۹ء میں، مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ صبح صادق کے وقت بروز جمعہ میں پیدا ہوا تھا، اگست کا مہینہ تھا۔ یہ دن اور مہینہ غالباً گھر والوں کو اس لئے یاد رہ گئے کہ جمعہ عیدالمسلمین سمجھا جاتا تھا اور اگست عرصہ دراز سے میرے خاندان میں منحوس خیال کیا جاتا تھا، دن اور مہینہ کی اہمیت نے یادداشت ذہن میں محفوظ کرا دی مگر سال اور صحیح تاریخ ولادت مشتبہ رہی۔ کبھی ۱۸۹۸ء کی بحث گھر میں ہوتی اور کبھی ۱۸۹۹ء کی، بہرحال یہ سب مانتے تھے کہ میں اس صدی میں نہیں پیدا ہوا میری ولادت پر بیسویں صدی کی پرچھائیں نہیں پڑی۔

الہ آباد کا سول لائن عرصہ دراز سے اپنی ساخت و رونق کے لئے مشہور ہے۔ میرے نزدیک اس کی خصوصیات میں ایک پہلو یہ بھی شامل ہے کہ اس کے دامن میں ایک محلہ راجہ پور بھی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دیہات ہے۔ باشندے، طرز معاشرت، رہنا وغیرہ کو دیکھ کر بغیر غور و فکر کے اس کو گاؤں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ہمیشہ حلقۂ میونسپلٹی میں شامل رہا۔ اس لئے اس کو شہر سے الگ نہیں سمجھا گیا۔ نہ دیہات کے خانہ میں سرکاری طور پر اس کا اندراج ہوا نہ انتظام کے لحاظ سے اس کو شہر سے الگ کیا گیا۔ میں اسی محلہ یا گاؤں راجاپور میں اپنے نانا کے یہاں پیدا ہوا۔

گھر اور گاؤں کا ماحول بدلتے ہوئے عہد کا اچھا خاصا نمونہ تھا۔ علم سے لوگوں کو دلچسپی تھی مگر انگریزی پڑھنے والوں کو اپنی برتری کا بھی احساس تھا، وہ دوسروں کو اپنے برابر علم والا نہ سمجھتے۔ اس وقت رواج کے مطابق شام کو بعض مقامات پر لوگ جمع ہوتے۔ نشست عموماً چارپائی اور تخت پر ہوتی۔ حقہ کا دور چلتا، پرانے زمانے کے قصے، طلسم ہوش ربا کے افسانے اور اپنے خاندان کے کارنامے بیان کرتے میرے گھر پر بھی روزانہ اس قسم کی نشست ہوتی۔ شعر سنانا اور سننا عام بات تھی، کبھی کبھی ایسی خاصی علمی باتیں بھی ہو جاتیں، پرانی صحبتوں کے تذکرے بھی ہوتے، ادب و ادیب پر بھی تبصرہ ہو جاتا۔

میرے نانا کا نام سید حسین اور تخلص فوق تھا، وہ بہ یک واسطہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ فارسی کے عالم تھے، عربی سے کم واقف تھے، جیسا میں نے عرض کیا کبھی اُن کا زمانہ بڑا اچھا تھا، گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ رئیسانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر ہوتی تھی، پرانے زمانے میں شانِ ریاست کا طرۂ امتیاز تفریحی زندگی کا وہ مایۂ ناز عنصر تھا جسے اب عرف عام میں عیاشی کہا جاتا ہے، وہ بھی نانا کی زندگی کا لوازمہ تھا۔ شاعری، موسیقی، سپہ گری سے مرحوم کو خاص دلچسپی تھی۔ ان ہی کے زیر سایہ میری زندگی پروان چڑھی، موصوف کی وجہ سے گھر میں کافی ادبی و علمی چرچا رہتا، اچھا خاصا علمی ماحول تھا، باوجود اس کے گھر میں انگریزی تعلیم سے بیگانگی تھی چنانچہ بدقت تمام اسکول میں نام لکھانے کی مجھے اجازت ملی، وہ بھی کافی عمر کے بعد۔ جب میں دوسرے درجہ میں بھرتی ہوا تو سکندر نامہ وغیرہ گھر پر پڑھ چکا تھا، فارسی و اردو سے ذہن کو بالیدگی اور احساس کو لذت ملنے لگی تھی جب اشعار سمجھنے کی پوری صلاحیت نہ تھی۔ تب بھی فارسی و اردو کے اچھے اشعار نانا کی زبان سے سُن کر مذاقِ شعری میں گدگدی محسوس ہوتی۔ بلا پوری طرح بات سمجھے ہوئے متعدد اشعار اردو فارسی کے یاد ہو گئے تھے۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ نانا کی آمدنی کم ہوتی گئی۔ والدہ اور ان کی بہنوں اور بھائی کا انتقال ہوگیا۔ ابھی میں دسویں درجہ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں اور اس بھرے گھر میں ایسا سناٹا ہوا کہ نانا اور ان کی بیوی (جو میری حقیقی نانی نہ تھیں) اور میں کل جملہ افراد خاندان باقی رہ گئے۔ گھر کی مالی حالت اتنی سقیم ہوگئی کہ صرف بیس۲۰ پچیس۲۵ روپیہ ماہوار تک آمدنی محدود ہوگئی۔ یہ مانا کہ اب سے پچاس برس پہلے یہ قلیل رقم بھی آج کے سو روپیہ کے برابر کہی جاسکتی ہے، مگر پھر بھی کافی نہ تھی اس میں جملہ اخراجات کے ساتھ میری تعلیم کا بھی خرچ شامل تھا۔ اس کشمکش میں نانا کے پاس آنے والے اکثر یہ رائے دیتے کہ مجھے کسی دفتر میں ملازمت دلادی جائے۔ بات معقول تھی مگر نانا کی علم دوستی و عالی حوصلگی اس کو قبول نہ کرنے دیتی اور نہ میرا علمی ذوق اس کو برداشت کرتا بلکہ ایسی معقول رائے دینے والوں سے مجھے اتنی نفرت ہوتی کہ جی چاہتا ان سب کو گولی مار دوں۔

اس ہجوم تنگ دستی و خستہ حالی میں بھی میرا سلسلۂ تعلیم جاری رہا مگر ایک ایسی کٹھن منزل آگئی کہ آگے قدم اٹھانا دشوار ہوگیا۔ کسی طرح دسویں درجہ سے میں آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ ریاضی الجبرا وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خواہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ادبی ذوق رگ و پے میں اتنا سرایت کرگیا تھا کہ یہ موضوعات ضرورت سے زیادہ خشک محسوس ہوتے یا میرے شاعرانہ مذاق کے لئے حساب وغیرہ روڑا بن گئے تھے کہ ذہن کو ادھر متوجہ نہ ہونے دیتے۔ دو سال دسویں درجہ میں فیل ہوتا رہا۔ اب ہمت جواب دینے لگی مگر ذوق علم اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ریاضیات کے بھاری پتھر سے کیسے چھٹکارا ملے۔ یا تو اسے چوم کر احتراماً سر جھکا لیا جائے اور کم ہمتی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ساحل ملازمت پر پاؤں جمائے جائیں یا فرہاد کی طرح سنگ شکن ہو کر راہ کی رکاوٹ کو ختم کردیا جائے مگر کم ہمتی و ذوق علم میں کوئی مصالحت نہ ہوسکی۔ ناچار راہ فرار اختیار کرنی پڑی یعنی صوبہ متحدہ چھوڑ کر بنگال کی طرف رخ کرنا۔ اس زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی میں نصاب ریاضیات یہاں کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔ وہاں سے دسواں درجہ پاس کرلینا میرے لئے بہت آسان تھا مگر وہاں جانا، قیام، کھانا اور دیگر اخراجات کا برداشت کرنا، ریاضی، الجبرا، اقلیدس سے بھی میرے لئے مشکل تھا۔ میرے ایک دوست علی اصغر مرحوم بھی میری طرح حصول علم کی دیوانگی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے آٹھ روپیہ کلکتہ جانے کا کرایہ فراہم کردیا۔ میں نے بھی کسی طرح کچھ روپوں کا انتظام کیا اور بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے گھر سے روانہ ہوگیا۔

کلکتہ پہنچنے سے پہلے یہ بھی عرض کردینا مناسب ہوگا کہ دسویں درجہ تک پہنچتے پہنچتے میرا ادبی شعور کافی نمایاں ہوچکا تھا۔ فارسی کے علاوہ اردو کے ممتاز اہل قلم کے کارناموں سے لطف اندوز و فیض یاب ہونے کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی میں نے حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری، شبلی کی شعر العجم اور محمد حسین آزاد کی آب حیات اور دربار اکبری غور سے پڑھ لی تھی۔ عبدالحلیم شرر کی متعدد ناولیں دیکھ چکا تھا۔ شعراء میں کبھی داغ میرے پسندیدہ شاعر تھے مگر بعد میں امیر مینائی کا کلام مجھے متاثر کرنے لگا۔ حالی کی مسدس مدوجزر اسلام مجھے پسند آئی۔ ان کی شاعری خیالات و جذبات کے لحاظ سے بڑی کارآمد و دلکش معلوم ہوئی۔ اس وقت میں اس کتاب کو ادبی انجیل سمجھ کر مطالعہ کیا کرتا۔ برخلاف اس کے کلیات حالی یوں ہی سا پسند آیا۔ اس وقت تک غالب کا کلام خشک و ادق معلوم ہوتا۔ ان کے دیوان سے کم دلچسپی رہی اور یہ عجیب بات تھی کہ کلیات میر کا مطالعہ بالکل نہ تھا۔ آتش و سودا کے کلام سے کافی انس تھا۔ مثنویوں میں زہر عشق و گلزار نسیم بہت پسند تھیں۔ زہر عشق تو زبانی یاد تھی۔ میر حسن کی مثنوی اس وقت مجھے بالکل متاثر نہیں کرسکی۔ بڑی پھیکی

و سادہ نظر آئی۔

جب میں ۱۹۲۱ء کے بعد کلکتہ سے آیا تو عزیز کا گلکدہ شائع ہوا۔ میں نے بھی ایک نسخہ خریدا۔ بہت پسند آیا۔ بقول فراق غالب کے دیوان کے بعد مدتوں لوگوں کو انتظار رہا کہ کسی موجودہ (اس دور کے لحاظ سے) شاعر کا دیوان ملے تو نئے رجحانات کا اندازہ ہو۔ اس انتظار میں عزیز نے بروقت اپنا دیوان شائع کیا تو بڑی تازگی محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں بھی اس سے اس حد تک متاثر ہوا کہ قریب قریب سارا دیوان حفظ ہو گیا۔ اب میری اس وقت کی سماجی اور ادبی پسندیدگی سے میری افتادِ طبیعت کا اندازہ کر کے آتش کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے کہ "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا" آگے بڑھ چلیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔

میرے ہم جماعت سر شاہ محمد سلیمان کے ایک بھائی شاہ محمد سلمان تھے۔ میری طرح ریاضیات میں وہ بھی دو سال سے فیل ہو رہے تھے۔ وہ بھی اس ناکامی کے ہاتھوں عاجز آ گئے تھے۔ وہ کلکتہ جانا چاہتے تھے مگر سر سلیمان اجازت نہ دیتے تھے اور ان کی نارضامندی کے معنی مفلسی کے تھے۔ مگر سلمان صاحب بھی میری ہی طرح سر پھرے تھے۔ دیوانے دو مل بیٹھے۔ ہم لوگ جولائی ۱۹۱۹ء میں کلکتہ پہنچ گئے۔ نہ سلمان کسی کو جانتے تھے نہ میں۔ پیسہ کسی کے پاس نہیں۔ اسکولوں کا پتہ نہیں۔ راستہ کون بتائے۔ مگر بقول امیر خسرو، شوق ہر دل را کہ باشد رہبرے درکار نیست۔ کسی نہ کسی طرح رہنے ٹھکانہ عبداللطیف (LANE) میں ایک جگہ مل گئی۔ دو تین دن مارے مارے پھرنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک ایسا اسکول بھی ہے جہاں داخلہ نسبتاً آسان ہے۔ بات بن گئی۔ وہاں دونوں آدمیوں کا نام بغیر کسی پرسش کے لکھ لیا گیا۔ کلکتہ میں اس وقت طالب علموں کی حاضری ضروری نہ تھی۔ اس لئے ہم لوگ کالج جانے کے بجائے حصولِ معاش کی فکر دن بھر کرتے اس سے جو وقت بچتا وہ شعر و شاعری کی نذر ہو جاتا یا انگریزی ناولوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ نہ کورس کی کتابوں سے واسطہ تھا نہ اسکول جانے کی فکر تھی۔ ذرا بھی سکون ہوتا تو ہاگ مارکیٹ کی سیر ضرور ہوتی۔ میں نے پہلی بار سینما کلکتہ ہی میں دیکھا۔ ہم لوگوں کی زندگی بڑی ناہموار تھی۔ نہ کھانے کا کوئی مستقل ٹھکانہ تھا نہ فیس ادا کرنے کا انتظام۔ ہر کام اللہ بھروسہ توکل پر چل رہا تھا۔ مفلسی کا یہ عالم تھا کہ سہ پہر کا ناشتہ بھنے ہوئے دانے سے ہوتا تھا۔ قیام گاہ کے قریب ہی ایک بھڑبھونجا تھا۔ جب بھوک لگتی تو ایک آنے کے دانے بھنا لیے جاتے جو دو آدمیوں کے لئے کافی نہ ہوتے مگر پانی پینے کا سہارا ضرور ہو جاتا۔ مجھے آج بھی یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ کبھی کبھی وہاں فاقہ سے بھی رہنا پڑا، حالانکہ اس وقت تک الفقر فخری کا نظریہ سامنے نہ تھا مگر غیر شعوری طور پر عمل ہو رہا تھا۔

کلکتہ کی اس یادگار زندگی میں ایک واقعہ آج تک میں نہیں بھلا سکا۔ کسبِ معاش کے سلسلہ میں ٹیوشن کی تلاش تھی۔ اتفاق سے پتہ چلا کہ ایک انسپکٹریس گرلز اسکول اردو پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان سے ذکر بھی آچکا ہے، میں طلب کیا گیا ہوں۔ میری قیام گاہ سے ان کا مکان کافی فاصلہ پر تھا۔ سواریاں متعدد تھیں مگر پیسہ کہاں تھا جو کرایہ ادا کیا جاتا۔ چار و ناچار پیدل روانہ ہوا۔ راستہ میں جس شخص سے اس محلہ کا پتہ پوچھتا وہ کہتا یہ ٹرام وہیں جائے گی، بیٹھ جاؤ! یہ انداز رہنمائی اور زیادہ کھلتا۔ مفلسی کا نشتر اور تیز محسوس ہوتا۔ چلتے چلتے اس محلہ کے قریب پہنچا تو پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ دوری منزل کو بوسیدہ جوتے نے اور سخت بنا دیا تھا۔ جس انسپکٹریس سے ملنا تھا اس کے مکان کے قریب پہنچ کر میں نے چاہا کہ جوتے اور موزے اتار کر صاف کروں۔ ذرا قاعدے سے سامنے جاؤں۔ اس خیال کو عمل میں لانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ چھالوں کی وجہ سے موزہ نہ اترتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس مرحلہ کو طے کیا۔ مکان کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ

میم صاحبہ (بنگالی تھیں) کہیں گئی ہوئی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ رہے سہے حواس جاتے رہے۔ بعض وقت مایوسی میں بڑی ہمت آجاتی ہے۔ میں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر نوکر سے کہا کہ گھر میں کوئی اور ہو تو بلاؤ۔ نوکر نے جا کر کہا تو ایک دوشیزہ باہر آئی، جہاں تک یاد ہے، ایسی قبول صورت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے سوال کرنے پر میں نے کہا کہ میم صاحب نے اردو پڑھانے کے لئے مجھے بلایا تھا۔ اس کے طرزِ گفتگو نے میری حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔ کلکتہ میں کسی بنگالی نوجوان عورت کا شستہ اردو بولنا غیر معمولی بات تھی۔ وہ کچھ کہے جا رہی تھی اور میں کھویا کھویا سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب چپ ہونے کے قریب ہوتی تو میں پھر کچھ پوچھ لیتا اور وہ پھر الفاظ کے پھول برسانے لگتی۔ میں نے بالآخر دریافت کیا کہ آپ یہاں رہ کر اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہیں۔ کچھ مسکرا کر جواب دیا کہ میں اپنی AUNT کے ساتھ لکھنؤ میں کافی رہی ہوں۔ وہاں کا اثر میری زبان پر ہے۔ لوگ کہتے ہیں میری تہذیب پر بھی یوپی کا گہرا اثر ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک نہ رہ سکا۔ ایک پیالی چائے کے بعد مجھے وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ مگر اس فضا کا اثر یہ تھا کہ اب مجھے نہ تکان محسوس ہوتی تھی نہ آبلہ پائی سدِ راہ تھی۔ آنکھوں میں اس کی صورت تھی۔ دل و دماغ میں اس کی گفتگو نے وہ تازگی پیدا کر دی تھی کہ باوجود پیدل ہونے کے میں قیام گاہ اس حالت میں پہنچا کہ جیسے کامیابی مقصد کے بعد کوئی مسرور ہوتا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد پھر وہی کشمکش شروع ہوئی۔ گھر کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی مگر آگے پڑھنے اور بڑھنے کا جذبہ دسویں درجہ میں کامیاب ہونے کو بھی منزل سمجھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس وقت تک سر شاہ سلیمان سے کافی مراسم بڑھ گئے تھے۔ ان کا ہائی کورٹ میں وہ اثر تھا کہ ایک جنبشِ لب پر مجھے وہاں ملازمت مل سکتی تھی۔ ایک دن موصوف نے خود فرمایا کہ اگر پڑھنے کو جی نہ چاہتا ہو تو میں رجسٹرار سے کہہ دوں، وہ آپ کو کوئی جگہ دے دے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مترجم کی جگہ مل سکے تو میں نوکری کر لوں۔ دوسرے یا تیسرے دن ہائی کورٹ کے رجسٹرار کا خط آیا کہ انٹرویو میں آئیے۔ مترجم کی جگہ خالی ہے۔ امید ہے کہ میں آپ کو یہ آسامی دے دوں گا۔ شام کو سلیمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ میں نے رجسٹرار سے کہہ دیا ہے۔ وہ آپ کو بلائے گا۔ میرا خیال ہے نوکری مل جائے گی۔ میں نے عرض کیا، جی وہ تو پروانہ بھی آگیا ہے۔ مجھے بلایا گیا ہے مگر بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ابھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھوں۔ موصوف بےساختہ ہنس پڑے۔ فرمایا، بھلے آدمی پھر مجھ سے کہلوایا کیوں تھا؟ خیر اچھا ہے، پڑھے جاؤ، میں رجسٹرار سے بات کر لوں گا۔

ایف۔ اے میں پڑھنے کا تو تہیہ کر لیا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ کس منہ سے اب نانا کے سامنے اپنی آرزو پیش کروں گا۔ گھر کی بے سروسامانی اس آرزو کے لئے ضربِ شدید تھی۔ اس کشمکش میں طے کیا کہ نانا سے جھوٹ بول کر سبز باغ دکھانے کی صورت پیدا کی جائے۔ یہ اطمینان تھا کہ حصولِ علم ان کی کمزوری بھی ہے وہ بھی دل سے چاہتے ہیں کہ جتنا ممکن ہے میں پڑھوں۔ شاید وہ راضی ہو جائیں۔ یہ سب سوچ کر ایک دن موقع سے میں نے عرض کیا کہ سر سلیمان سے میں نے اپنی ملازمت کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا اب ہائی کورٹ میں مترجمی اس شخص کو مل سکتی ہے جو ایف اے پاس ہو۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ تم ایف اے میں نام لکھا کر ایک سال بھی پڑھ لو تو میں ایف اے پاس کرنے کی قید سے مستثنیٰ کرا دوں گا، تم مترجم کی جگہ پا جاؤ گے۔ میرا یہ جھوٹ ان کو کام کا جچا۔ ابھر کر سانس لی اور فرمایا، خیر خدا کا نام لے کر ایف اے میں داخلہ کرا لو۔ میور سنٹرل کالج میں داخلہ حاصل کرنا ڈپٹی کلکٹری کی نامزدگی سے کم نہ تھا اور مجھے دھن تھی کہ اسی کالج میں پڑھوں۔ یہ خواہش بڑی مشکل سے پوری ہو سکی۔ اگر سر سلیمان انگریز پرنسپل سے بنفسِ نفیس میری سفارش

ذکر تے تو کسی صورت سے نام نہ لکھا جاتا۔ یہاں بھی ان کی ہمدردی و اعانت کام آئی۔ میرا نام لکھ لیا گیا۔

میور سنٹرل کالج میں مجھے ایک ایسا استاد بھی ملا جس نے میری ادبی تشنگی کو بہت کچھ سیراب کرنے کی زحمت کی۔ میری مراد شیخ مہدی حسن ناصری سے ہے۔ موصوف عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے مگر بجائے خود ایک درسگاہ تھے۔ نہایت شگفتہ مزاج، قابل، دنیا دیکھے ہوئے انسان تھے۔ درجہ میں تو مجھے عربی پڑھاتے تھے مگر کالج کے باہر اپنے گھر پر عربی، فارسی، انگریزی، اردو سب ہی کے متعلق باتوں باتوں میں ایسی معلومات فراہم کر دیتے جو کسی ایک کتاب میں کسی کو نہ مل سکتیں اور لطف یہ تھا کہ اس انداز سے نکات بیان کر جاتے کہ ساری باتیں ذہن نشین ہو جاتیں۔ شام کو ان کا گھر ایک ایسی محفل بن جاتا جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ لطف اندوز ہونے کے لئے جمع ہو جاتے۔ مولانا کا تخاطب اتنا دلکش تھا کہ ہر شخص کو خیال ہوتا کہ سب سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں۔

میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ ناصری صاحب کو علم سینہ زیادہ تھا یا علم سفینہ مگر اپنے متعلق یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری معلومات میں علم سینہ کا جزو غالب ہے۔ مختلف وجوہ سے میں اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکا، جتنی مجھے خواہش یا ضرورت تھی۔ بچپن اور جوانی میں نانا کے فیض سے اور جوانی میں ناصری صاحب کی زبانی گفتگو میرے ذہن کی بالیدگی میں کار فرما رہی۔

یہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نانا کئی سال سے نقد بصارت سے محروم تھے۔ اب وہ میرے اشعار پر اصلاح دینے میں تکلیف محسوس کرتے۔ ناصری صاحب کی ذات غنیمت سمجھ کر انہوں نے میرے کلام پر اصلاح بھی ان ہی سے متعلق کر دی۔ چنانچہ درجہ میں سبق لینے کے علاوہ ناصری مرحوم سے گھر پر باقاعدہ فن شعر و شاعری کا سبق لینے لگا۔

ایف اے میں میں نے جس محنت کے ساتھ درسیات پر توجہ کی اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی اس شغف سے نہیں پڑھ سکا۔ دو سال تک ایک یہ معمول تھا کہ صبح کو ناشتہ کر کے کتابیں لے کر میں کچھار چلا جاتا تھا۔ وہاں ہرے بھرے کھیت اور فطرت کی رعنائیوں سے فرحت و تازگی حاصل کرتے ہوئے مطالعہ کرتا۔ دوپہر کو کھانا کھانے آتا اور سہ پہر کو اسی مقام پر پھر جا کر پڑھنا لکھنا شروع کرتا۔ یہ پروگرام دو سال تک رہا اور میں سمجھ رہا تھا کہ میں اچھے ڈویژن میں پاس ہوں گا۔ یہ میری غلط فہمی نہ تھی بلکہ اس مفروضہ کی بنیاد حقیقت پر تھی۔ میرے اساتذہ بھی میری محنت و قابلیت سے یہی سمجھتے تھے اور مجھے اطمینان دلاتے تھے کہ تم فرسٹ ڈویژن میں ضرور پاس ہو گے بلکہ پوزیشن کے ساتھ پاس ہو گے۔ جن استادوں سے میں قریب تھا ان میں پروفیسر دیپ بھی تھے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ہندوستان کے چوٹی کے پروفیسروں میں سمجھے جاتے تھے۔ وہ امتحان کے آخری زمانہ میں مجھے منع کرتے تھے کہ اب انگریزی پر محنت کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو دوسرے مضامین پر توجہ کرو مگر ہر حال میں پڑھنا کم کر دو۔ میں موصوف کی نصیحت پر عمل پیرا نہ ہوا۔ اسی طرح پڑھتا رہا۔ امتحان شروع ہو گیا۔ پرچے اچھے ہو رہے تھے۔ جس دن تاریخ کا امتحان تھا اس سے اگلی رات کو میں رات بھر پڑھتا رہا۔ اس حماقت کا نتیجہ یہ تھا کہ صبح کو امتحان گاہ میں نیند کا غلبہ ہوا، آنکھیں بند ہونے لگیں۔ طرح طرح کے جتن کئے مگر خمار شب دور نہ ہوا۔ گو آنکھیں کھلی رہیں مگر حواس اتنے بجا نہ تھے کہ میں سوالات کو پوری طرح سمجھ کر معقول جواب دیتا۔ سوال از آسماں جواب از ریسماں کا مضمون تھا۔ آسٹریا ہنگری کی جنگ سے متعلق سوال ہوتا تو میں جواب میں جرمنی کی جنگ کے اسباب و نتائج لکھتا۔ دوسرے دن اس کا احساس ہوا مگر تسکین کا یہ پہلو پھر بھی مایوسی کو انتہا تک نہ پہنچنے دیتا کہ باوجود چند سوالوں کے جواب غلط ہونے کے بھی بقیہ جواب اتنے نمبر دلا دیں گے کہ جو اچھی طرح سے پاس ہونے کے لئے

کافی ہوں گے۔

امتحان ختم ہونے کے چند روز بعد سے عموماً مایوسی طلباء کی کم ہونے لگتی ہے۔ ممتحن کی فیاضی اور خدا کی رحمت، بزرگوں کی دعائیں اپنی عبادت پر بھروسہ، روز بروز زیادہ ہو جاتا ہے اور نتیجہ شائع ہونے سے پہلے غلط فہمی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ عام طور سے وہ طلباء بھی اپنی کامیابی کا خواب دیکھنے لگتے ہیں جو پرچے خراب کرتے ہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ اب بھی یقین تھا کہ ممکن ہے پوزیشن نہ ملے مگر فرسٹ ڈویژن تو آ ہی جائے گا۔ میں اپنے کسی امتحان کا نتیجہ دیکھنے یا سننے کبھی دفتر نہیں گیا مگر اس بار خود دیکھنے گیا۔ اس لئے کہ اب بھی یقین تھا کہ میں پاس ضرور ہوں گا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نہ فرسٹ ڈویژن نہ سیکنڈ، تیسرے درجہ میں بھی نام نہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر سنگین حقیقت اپنا لوہا منوائے بغیر نہیں رہتی۔ چار و ناچار ماننا پڑا کہ میں فیل ہوں۔ اس غیر متوقع خبر کا اثر یہ ہوا کہ بغیر کسی سے کچھ کہے میں گھر چل پڑا۔ راستہ کس طرح طے ہوا، یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر پہونچتے پہونچتے میرے کپڑے سلامت نہ تھے۔ غالباً میں نے عالم جنون میں چاک کر ڈالے تھے۔ اس ناکامیابی کا رنج پورا سال رہا۔ چنانچہ اس سال میں نے کسی کالج میں نہ نام لکھایا نہ پڑھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا اور بدحواس۔ آخر میں نانا کے سمجھانے پر میں نے مسلم یونیورسٹی میں پرائیویٹ امتحان دیا۔ ظاہر تھا کہ نہ پڑھا نہ لکھا۔ پرانی کمائی کہاں تک کام آتی۔ الہ آباد اور مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں اختلاف تھا۔ بغیر درسی کتابوں کے پڑھے ہوئے یہی کیا کم ہوا کہ میں پاس ہو گیا۔ خدا خدا کر کے یہ منزل بھی ختم ہوئی۔

اپنے اخراجات کے لئے میں نے ایف اے ہی سے ٹیوشن کرنا شروع کر دی تھی اور کبھی کبھی رسالوں میں مضامین بھی لکھ کر کچھ روپے پا جاتا تھا۔ اس لئے جرأت ہوئی کہ بی اے پاس کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بھی کر گزرا۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی میں نام لکھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بات سنہ ۱۹۲۳ء کی ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو میری کاوشوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے اور ہمت افزائی کرتے۔ ان میں چند احباب ایسے بھی تھے جو موسیقی و موسیقار سے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ان ہی کا سہارا لے کر میں نے بھی اس محفل رقص و سرود سے اپنے جذبات کو آسودہ کرنا سیکھا۔ گویا اپنے خاندان کی اس روایت پر قدم رکھا جس کے نقوش نظروں سے اوجھل ہو چلے تھے۔ یاد رہے اس وقت کا الہ آباد آج کا خشک بازار نہ تھا۔ اس کی رومانی دنیا ۴۰، ۵۰ سال پہلے بلکہ اس کے بہت بعد تک ناچ گانے اور طوائفوں سے آباد تھی۔ اس زمانے تک اس کوچہ کی ٹھنڈی ہوا، سرور افزا فضا پر آج کی طرح کوئی احتساب نہ تھا، ناچ گانا، مجرا عام تھا۔ شرفاء و رؤساء کے یہاں کوئی تقریب مشکل ہی سے ہوتی جہاں ناچ گانا نہ ہوتا۔ آج تقریبوں میں دل خراش آواز سنانے کے لئے مائکروفون لگا کر گانوں سے ذوق سماعت مجروح کیا جاتا ہے۔ اس دور میں نرم و نازک گلوں سے اچھی اچھی غزلیں، ٹھمری، دادرے وغیرہ سن کر دل و دماغ کو تازگی و لطافت نصیب ہوتی لیکن اب تو کہنا پڑتا ہے ؎

کم بخت یاد آتے ہیں قصے شباب کے

بہر حال میری جمالیاتی حس کو اس طرح بھی فروغ حاصل ہوتا رہا۔ میرے رومانی جذبات کی تشکیل ہوتی رہی۔ لیکن اس بزم نشاط میں کھو جانا، میرے لئے ممکن نہ ہوا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں حواس میں رہا۔ اس میکدہ سے جو جام مجھ تک آیا وہ شراب طہور سے کم تر نہ تھا مگر اتنا بھی مدہوش نہ کر سکا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ میں چوٹ کھا کر سنبھل جاتا تھا۔ ٹھوکریں لگتی تھیں مگر گرتے گرتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

میری اس گمراہی کی خبر شدہ شدہ نانا تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے عہدِ ماضی کے واقعات و انجام یاد کرکے چونک پڑے۔ نہایت خوبصورتی سے ایک دن نصیحت کرتے ہوئے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

بعد کو راہ راست پر رکھنے کے لئے انہوں نے ۱۹۲۰ء میں میری شادی کر دی۔ یہ شادی میری پسندیدگی و خواہش سے ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری نظرِ انتخاب نگاہِ غلط انداز نہیں ثابت ہوئی۔ بیوی کی صورت و سیرت دونوں میرے مذاق و معیار سے ہم آہنگ تھیں آج چالیس برس ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کے بعد بھی میری رائے یہی ہے کہ میں بیوی کے معاملہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ میرا کاروانِ حیات زندگی کے جس بیہڑ راستے سے گزرا ہے اس کو آج تصور میں لاتے ہوئے ڈرتا ہوں، مگر میری اس افتاد میں بھی وہ مری ہمدم رہی جو خود میری لائی ہوئی تھی، جس میں عورت کو فطرتاً شوہر سے بیزار ہو جانا چاہئے۔ غرضیکہ پرانی زبان میں تا دمِ تحریر خندہ پیشانی سے وہ میری رفیقِ حیات ہے۔ اس سلسلے میں کہا کرتا ہوں کہ میری رفیقۂ حیات بی بی ہے وائف نہیں۔

بی۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد تاریک راہوں میں میرے نزدیک کچھ جگنو چمکنے لگے تھے۔ مجھے کچھ فوجی انگریز افسروں کی ٹیوشن ملنے لگی تھی۔ انگریز افسر پڑھتے کم تھے باتیں زیادہ کرتے تھے، اور اجرت بھی اچھی دیتے تھے۔ اس لئے دقتیں کچھ کم ہو گئی تھیں مگر شادی ہو جانے کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ بھی ہو گیا۔ کبھی کبھی جب یونیورسٹی کی فیس و دیگر مصارف سے میں پریشان ہو جاتا اور ادائیگی کی کوئی صورت نہ رہتی تو بیوی اپنے زیور دے دیتی کہ آپ اسے رہن یا بیع رکھ کر اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ عورتوں کو زیورات جتنے عزیز ہوتے ہیں اس کا اندازہ کرنا آسان کام نہیں اور پھر اس عورت کو جس کی شادی حال ہی میں ہوئی ہو، جو یہ نہ سوچ سکتی ہو کہ میاں اس کا عوض دے سکے گا یا نہیں۔ اس کے لئے زیور کا علیحدہ کرنا اور بھی سخت مرحلہ ہو سکتا ہے۔ مگر میری بیوی کے سامنے شاید یہ مرحلہ سوال بن کر کبھی آیا ہی نہیں۔

میں نے بی۔ اے ۱۹۲۳ء ہی میں پاس کیا، علاوہ اور باتوں کے اس کامیابی پر خوشی اس لئے بھی تھی کہ میری عمر سرکاری ملازمت کے لئے زیادہ ہو گئی تھی۔ اس مسرت کا راز یہ تھا کہ ایک مدت سے میں نے طے کر لیا تھا کہ نوکری کروں گا تو یونیورسٹی میں ورنہ عمر بھر یونہی رہوں گا اس لحاظ سے جب میری عمر پچیس سال سے زیادہ ہو گئی تو یہ محسوس ہوا کہ سرکاری ملازمت کا دروازہ بحمد اللہ پوری طرح بند ہو گیا ہے، اور یونیورسٹی کی ملازمت کا دروازہ کچھ کھلنے لگا ہے۔ ممکن ہے ایم۔ اے پاس کرتے کرتے دو سال میں زمانہ کی ہوا اتنی سازگار ہو کہ یہ نیم وا دروازہ پوری طرح کھل جائے اس لئے ایم۔ اے بھی کر ہی لینا چاہئے۔ ہمت مرداں مددِ خدا کا مقولہ پیش نظر تھا۔ دل میں پڑھنے کا ذوق تھا مگر گھر والوں کو خاموش رکھنے کے لئے ادھر ادھر ملازمتوں کے لئے بھی درخواستیں دیتا رہا۔ سب یہ سمجھ گئے کہ زمانہ بُرا ہے ملازمت نہیں ملتی۔ قسمت کی خرابی ہے کیا کیا جائے۔ اس تقدیر پرستی کا چاہے کوئی مذاق اڑائے مگر مجھے تو فائدہ ہوا۔ یعنی جب میں نے دو سال اور پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو نہ گھر میں مخالفت ہوئی نہ موافقت۔ میں نے سمجھا راستہ صاف ہے۔ نام لکھا لیا۔ اس وقت الٰہ آباد یونیورسٹی نے ایم اے کا درجہ اپنے یہاں کھول دیا تھا بلکہ ایک سال ایم اے کی تعلیم کو گزر بھی چکا تھا۔ میرے نام لکھانے سے پہلے آٹھ طلباء ایم۔ اے میں زیر تعلیم تھے۔ اب میں اور میرے ایک دوست امرناتھ جھل نے اردو کے ایم اے پریویس میں داخلہ لیا۔ پڑھائی شروع ہو گئی۔

نام لکھانے کو تو لکھا لیا مگر بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ نہ کورس کی کتابیں میرے پاس تھیں نہ کسبِ معاش سے اتنی فرصت

کہ روز یونیورسٹی جا کر حاضری دیا کروں، لیکچر سنا کروں۔ جب موقعہ ملا چلا گیا ورنہ غیر حاضر۔ پھر یہ خبط کہ سیاست کی ایک کتاب (To..... treatises on politics by Lock) کا ترجمہ کر ڈالوں، اور زیادہ درسی کتابوں سے بیگانگی کا باعث ہوا۔ جب امتحان کو مشکل سے دو ہفتے رہ گئے تو ایک دسویں درجہ کے طالب علم اظہر حسن، جن کو میں ترجمہ بول کر لکھاتا تھا، نے کہا کہ اعجاز بھائی یہ ترجمہ تو ہفتہ عشرہ میں ختم ہونے سے رہا۔ ابھی کافی حصہ کتاب کا باقی ہے تو پھر آپ امتحان کی تیاری کیوں نہ کیجئے؟ بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس دن سے کتابیں فراہم کرنی شروع کیں۔ کچھ ملیں کچھ نہ ملیں۔ خام تیاری کے بعد امتحان میں شریک ہو گیا۔ نتیجہ نکلا تو میری اُمید کے خلاف تھا۔ میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ بجائے خوشی کے رنج ہوا بلکہ غصہ زیادہ آیا۔ اپنے پر نہیں بلکہ ممتحنوں پر۔ کسی کو نالائق سمجھا کسی کو لاپرواہ کسی کو سخت گیر غرض کہ بجز اپنے ہر ایک میں خرابی نظر آئی۔ اس خام خیالی میں ضامن صاحب صدر شعبۂ اردو کے گھر بھی نتیجہ کے بعد جانے کی زحمت نہ گوارا کی کیونکہ وہ بیچارے بھی مستحق تھے۔ ان سے بھی خفا ہونے کا حق تھا تو پھر میں کیوں یہ کہنے جاتا کہ آپ کی دعا سے پاس ہو گیا۔ کئی دن گزرنے کے بعد ضامن صاحب نے خود بلوایا۔ چار و ناچار جانا پڑا۔ مگر اس انداز سے میں گیا جیسے کوئی لڑنے کے لئے جاتا ہے۔ میرے تیور پر بل تھا دل میں شعبۂ اردو سے بیزاری، دماغ میں اپنی قابلیت کا زعم غرض کہ عجب عالم تھا۔

ضامن صاحب جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ میرے بشرہ سے میری خام خیالی کا انہوں نے اندازہ کر لیا ہو گا۔ اس لئے بجائے مبارکباد دینے کے موصوف نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، شربت پلایا، پان کھلایا۔ ہنسانے کی کوشش کی۔ جب کچھ وقفہ کے بعد مجھے مطمئن پایا تو کہا۔ کہئے اب کیا ارادہ ہے۔ ایم اے فائنل تو کرنا ہی ہے۔ ابھی وہ پورا جملہ ختم نہ کر چکے تھے کہ میں نے بے اعتنائی بلکہ کسی قدر بدتمیزی سے جواب دیا کہ جی نہیں! مجھے اب ایم اے نہیں پاس کرنا۔ اس سال مجھے سیکنڈ ڈویژن ملا ہے۔ مجھے اس کا بڑا رنج ہے جب میرے ساتھ یہ سلوک ہوا تو پھر کس کو فرسٹ ڈویژن ملے گا۔ ضامن صاحب میرے اس انداز گفتگو پر سنجیدہ ہو گئے۔ تیور بدل کر بولے جناب آپ اپنے کو قابل سمجھتے ہیں سمجھئے۔ مگر نہ آپ کے پاس کورس کی کتابیں تھیں نہ آپ روز لیکچر میں آتے تھے۔ آپ کو بڑی مشکل سے تو میں نے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دلائی۔ ایسی صورت میں جو ڈویژن آپ کو ملا ہے میرے نزدیک وہ بھی بہت ہے۔ پھر ایک لمحہ بعد کچھ سوچ کر فرمایا۔ بیشک آپ کی قابلیت ایسی تھی کہ آپ کو فرسٹ ڈویژن ملتا مگر میاں صرف معلومات کی بناء پر کسی کو اچھا ڈویژن نہیں ملتا جب تک طالب علم سباق و سیاق کے ساتھ سوالات کے جواب نہ دے گا کبھی فرسٹ ڈویژن نہ پائے گا۔ اگر آپ جی لگا کر پڑھیے۔ ایم اے کو ایم اے سمجھ کر درجہ میں غور و فکر سے کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو فرسٹ ڈویژن نہ ملے۔ ان کی یہ باتیں اس وقت مجھے بہت ناگوار گزریں۔ چپ ہو کر چلا آیا۔ میرے مزاج میں ہمیشہ سے حقیقت پسندی غالب رہی ہے۔ راستے بھر ضامن صاحب کی باتوں پر غور و فکر کرتا رہا۔ ان کی نصیحت و تنقید تلخ حقیقت محسوس ہوئی۔ مگر گھر پہونچتے پہونچتے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ استاد نے جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ درست ہے۔ میرے ہی لئے غالباً کہا گیا ہے کہ ؎

خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را

اب سب یاد آنے لگا کہ میں نے سال بھر کس کس طرح یونیورسٹی کے لحاظ سے غیر متعلق کاموں میں وقت ضائع کیا۔ پڑھی بھی تو اِدھر اُدھر کی کتابیں، کورس کی صرف ایک کتاب۔ کبھی کبھار پڑھی تھی وہ بھی امتحان کے لئے کم دلچسپی کے لئے زیادہ۔ غرضیکہ میں نے تہیا

کے لئے سنجیدگی سے کامیابی کی دعا مانگنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اس احساس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے سال میں نے پوری دلچسپی و توجہ سے امتحان کی تیاری کی اور نتیجہ حسب خواہش ہوا۔ میرا نام فرسٹ ڈویژن میں اوّل تھا۔ اس وقت تک دو ایک ہی سال تو اور گزرا تھا کسی طالب علم نے اردو میں اس امتیاز کے ساتھ کامیابی نہ حاصل کی تھی۔ میرے گھر والوں کے علاوہ دوستوں نے اس شاندار کامیابی پر بڑی مبارکبادیں دیں۔ خشک مبارکبادیں نہ تھیں، متعدد دعوتیں ہوئیں، گانا بجانا بھی ہوا۔ پارٹیوں میں میری مدح سرائی کی گئی۔ یہ ہنگامے غالباً اس لئے زیادہ ہوئے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں کسی اور یونیورسٹی میں اردو کا ایم اے نہ کھلا تھا اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی میں کوئی اس سے پہلے فرسٹ ڈویژن میں پاس نہ ہوا تھا۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد اس زمانہ میں بجا طور پر امید کی جا سکتی تھی کہ مجھے کسی کالج میں اردو پڑھانے کے لئے نوکر رکھ لیا جائے گا۔ اور یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ بعض کالجوں نے مجھے ملازمت کی دعوت بھی دی مگر میری برسوں کی خواہش نے اجازت نہ دی کہ میں یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر کہیں اور جاؤں۔ جس سال میں نے ایم۔ اے پاس کیا یعنی [illegible]ء میں اسی سال مجھے یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالرشپ سو روپیہ ماہوار کا ملنے لگا۔ اب ایک مستقل صورت کی آمدنی ہوئی۔ اس وقت سو روپیہ کی بھی کافی قیمت تھی۔ اخراجات کے تردد سے مجھے نجات ملی، حالانکہ ذمہ داریاں اور گھریلو اخراجات روز افزوں تھے۔ اب تک میں دو لڑکوں کا باپ ہو چکا تھا۔ میرا بڑا لڑکا ممتاز حسین [illegible]ء میں اور منجھلا لڑکا آفتاب حسین [illegible]ء میں پیدا ہو چکے تھے مگر بایں ہمہ گرہستی کے جھگڑوں سے نجات مل گئی تھی۔ حالانکہ اس وظیفہ کی مدت عارضی تھی۔ صرف ایک سال کے لئے ملا تھا۔ مگر اس سے پہلے جن مشکلات کا سامنا تھا ان سے اتنی فراغت بھی غنیمت محسوس ہوئی۔ نانا کو بھی اطمینان تھا اور بیوی کو بھی دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ میں نے بھی فرصت پاکر اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ مشکل انتخاب موضوع کا تھا۔ ضامن صاحب بڑی مشکل سے موضوع طے کرنے دیتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے لئے بھی وہ پہلا موقعہ تھا کہ ریسرچ کے بارے میں کچھ سوچیں۔ اس سے پہلے اردو ڈپارٹمنٹ میں نہ ریسرچ اسکالر تھا نہ ریسرچ کا کام ہوا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اس سلسلہ میں کرنا کیا ہے۔ بہر حال بہ ہزار دقت میرے لئے موضوع کا انتخاب ہوا۔ موضوع یہ تھا "تصوف کا اثر اردو شاعری پر" حالانکہ میرے لئے یہ موضوع بہت مشکل تھا، نہ تصوف سے کوئی دلچسپی تھی نہ اس کے مسائل کا مطالعہ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ جو کچھ ہو اپنا کام باقاعدہ شروع کر سکوں گا۔ چنانچہ میں نے مطالعہ شروع کیا۔ جیسے جیسے پڑھتا تھا دلچسپی زیادہ ہوتی جاتی تھی اور جب کچھ مطالعہ وسیع ہوا تو میں ایک طرح سے کھو گیا، عقائد میں فرق آ گیا۔ اس وقت تک میں پابندی بلکہ سختی سے نماز روزہ کا قائل تھا۔ اب اس پابندی میں تزلزل پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ شرعی پابندیاں بے معنی نظر آنے لگیں، خواہ اس کو تصوف کی وسیع الخیالی سمجھئے یا میری تنگ نظری اور مسائل کو خام طور پر جذب کرنے کا نتیجہ سمجھئے، بہر حال میرے مولویانہ عقائد میں فرق آ گیا۔ نماز روزہ سے بے نیاز ہو گیا۔ روح اسلام پر زیادہ نظر گئی، جسم مذہب پر کم۔

چونکہ اس موضوع سے کافی دلچسپی ہو گئی تھی۔ مطالعہ پہلے کی نسبت وسیع تر ہوتا گیا، اس لئے میں نے سال بھر میں ایک مقالہ آئینۂ معرفت و اردو شاعری پر تصوف کا اثر، بڑا اچھا لکھ کر ختم کر دیا۔ اس وظیفہ کی مدت ختم ہونے کے قریب آ گئی اور اب بھی مجھے یہ خبط رہا کہ یونیورسٹی میں مجھے ملازمت مل جائے گی۔ حالانکہ اس کی امید کسی طرف سے نہ تھی۔ ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی میں نیا تھا۔ اس کی عمر ۶، ۷ سال کی تھی۔ خلیفہ

کی تعداد بھی بہت افزا نہ تھی کہ اساتذہ کی تعداد میں کسی اضافہ کی گنجائش ہو، مگر میری خواہش کا کیا ٹھکانہ، اب بھی اپنی جگہ پر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ مستقبل قریب کیا بعید میں بھی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ مگر میرے خلوص نیت پر قدرت کو بھی ترس آ گیا۔ اس تیرہ و تار فضا سے ایک امید کی کرن پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے میری تمناؤں کا آفتاب بن گئی۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر تارا چند بھی شعبۂ اردو میں کچھ دیر کے لئے پڑھاتے اور کچھ وقت شعبۂ سیاسیات میں درس دیتے۔ دونوں جگہ سے وہ متعلق تھے۔ کیا جانے کیا ان کے دل میں آیا کہ خود بخود وہ اردو ڈپارٹمنٹ سے ناتا توڑ کر پورا وقت شعبۂ سیاسیات کو دینے لگے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے یونیورسٹی نے شعبۂ اردو میں ایک مستقل لکچرر کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ میری امیدیں حقیقت کا روپ لے کر سامنے آ گئیں۔ برسوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے دکھائی دیا۔ بے بنیاد خواہش کو ابھرنے کی بنیاد مل گئی۔ جگہ مشتہر ہوئی۔ میں نے بھی درخواست دی اور دوسروں نے بھی۔ جیسا ہوتا ہے اس جگہ کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ اس بھاگ دوڑ کا قصہ طولانی ہے کون بیان کرے۔ بہر حال ہوا یہ کہ بہ حیثیت لکچرر کے میرا تقرر ۱۹۳۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں ہوا۔

نوکر ہوتے ہی میری زندگی تیزی سے بدلنے لگی۔ اخراجات کے تردد سے نجات ملی۔ تنخواہ کے علاوہ دوسرے معقول کاموں سے آمدنی ہوتی رہی۔ کچھ امتحان سے روپے مل جاتے اور زیادہ درسی کتابوں کے مرتب کرنے سے آمدنی ہوتی۔ زندگی اس فراغت سے گزرنے لگی کہ بہ قول حالی۔ ؎

جیسے ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا

اب مطالعہ کا بھی زیادہ موقعہ ملا اور سچ تو یہ ہے کہ پڑھنے کا لطف بھی ملا۔ دائرہ احباب پہلے بھی کم وسیع نہ تھا۔ اب وسیع تر ہو گیا۔ یونیورسٹی کے مشہور اساتذہ اور سربرآوردہ حضرات میرے سب جانے پہچانے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو مجھے عنایت کی نظر سے نہ دیکھتا رہا ہو، طلباء میں کافی بڑی تعداد ایسی تھی جس سے میں بے تکلف و مانوس تھا۔ غرضیکہ ساری فضا سازگار تھی۔ صرف ایک دقت ضرور تھی کہ لکچرر ہونے کے بعد بعض اساتذہ کے خیال میں مجھے طلباء سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے۔ وہ میں نہیں کر سکا۔ اس وقت تو کیا آخر زمانہ تک میں اس "علیحدگی" سے علیحدہ ہی رہا۔ ہمیشہ طلباء میں طالب علم اور اساتذہ کی صحبت میں استاد کی حیثیت سے بات چیت کرتا۔ اس تقرر کے عرصہ بعد تک بھی ایم اے کے طلباء نے اکثر کہا کہ صاحب ہم کو نہ معلوم تھا کہ آپ استاد ہو کر ہم کو یہ محسوس نہ ہونے دیں گے کہ آپ استاد ہیں۔ ہم کو تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہم لوگوں کی برادری یعنی طالب علم ہیں۔" لیکن باوجود اس خرابی یا خوبی کے کبھی کوئی طالب علم حد سے تجاوز کر کے مجھ سے بے تکلف نہیں ہوا۔ جس عزت و محبت کے ساتھ انہوں نے مجھے دیکھا اور قدر کی اس کو یاد کر کے میں ہمیشہ یہی خیال کرتا ہوں کہ جیسے باوفا، سعادت مند، پُرخلوص شاگرد مجھے ملے کم ہی استادوں کو ایسے نصیب ہوئے ہوں گے۔

ملازمت کے ابتدائی عہد تک میں میرا مطالعہ زیادہ تر حالی و آزاد کے معاصرین تک محدود تھا۔ ان کے بعد کے شعراء اور نثر نگار کے کلام سے ابھی خاصی بیگانگی تھی۔ عہد جدید کی طرف میرے ذہن کو متوجہ کرنے میں احتشام صاحب کی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی آئے۔ بی۔ اے میں نام لکھایا اور تین مضامین میں ایک مضمون اردو بھی ان کے کورس میں شامل تھا۔ کلاس میں انہوں نے اپنی ذہانت و معلومات سے مجھے بہت متاثر کیا۔ ذہنی مماثلت کی وجہ سے وہ مجھ سے قریب تر ہو گئے۔ ان کی نظر اس وقت کے شعراء و

نثر نگاری پر بھی پوری تھی۔ وہ مجھے منتخب شعراء کے کلام اور ممتاز نثر نگاروں کے مضامین وغیرہ وقتاً فوقتاً سنایا کرتے۔ مصنف کے خیالات اور طرزِ بیان پر بھی زبانی تبصرہ کرتے جاتے۔ ان میں سے اکثر ادیبوں کے یہاں مجھے بڑی زندگی و تازگی ملی۔ رفتہ رفتہ واقفیت کے ساتھ ساتھ خود بھی مطالعہ کو جی چاہا۔ بہت کچھ اس وقت کے نئے ادیبوں کے کلام پر رائے قائم کرنے کے بعد اتنی دلچسپی ہوئی کہ جی چاہا اس وقت کے لوگوں پر کچھ تنقید و تبصرہ کیا جائے۔ چنانچہ مختصر تاریخ ادب اردو لکھ کر عہد قدیم و متوسط کے ادبی رہنماؤں کے علاوہ اس وقت کے لحاظ سے دورِ حاضر کے ادیبوں پر بھی میں نے کچھ تنقید و تبصرہ کی کوشش کی۔ اس وقت تک آخرالذکر شعراء و نثر نگاروں کے بارے میں ساری ادبی تاریخیں خاموش تھیں۔

شعراء و نثر نگاروں پر کچھ لکھنے کے بعد جی چاہا کہ اس دور کے رجحانات پر بھی کچھ لکھا جائے اس لئے کہ مجھے بھی اس وقت ان کے یہاں انفرادیت کے علاوہ طرزِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آیا۔ ان کے راستے اپنے ادبی بزرگوں کی راہ سے کافی الگ تھے۔ محسوس ہوا کہ یہ لوگ عہد قدیم و متوسط کی ادبی روایتوں میں کھو نہیں گئے۔ آنکھ بند کر کے ان کی تقلید نہیں کی۔ زمانہ و زندگی کی ضرورتوں سے باخبر ہو کر نظم و نثر کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس احساس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ دور بجا طور پر مستحق ہے کہ اس کے رجحانات کو کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس احساس و فرض کو میں نے نئے ادبی رجحانات کے نام سے شائع کیا۔

ادبی تعمیر کے ساتھ ساتھ ایک مکانی تعمیر کا بھی ولولہ پیدا ہوا۔ جی چاہا کہ آبائی مکان سے الگ ہو کر ایک نیا مکان بنایا جائے یہاں کا ماحول موجودہ زندگی کے رجحانات کے لحاظ سے ناقص ہے، حالانکہ آبائی مکان کافی بڑا تھا، مگر پرانے زمانے کا تھا۔ کچا، پکا، بے ہنگم، میرے اس نئے تعمیری رجحان کی تائید میری بیوی نے بھی کی۔ میاں بی بی میں یہ طے ہوا کہ گاؤں کے باہر ایک بنگلہ بنایا جائے، میں اپنی بیوی کی اصابت رائے کا قائل ہوں۔ معاملہ فہمی میں ان کا ذہن بہت رسا ہے، مگر خدا جانے کیوں اس معاملے میں ان کو بھی دھوکا ہوا، انہوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملا دی۔ مکان بننے لگا مگر گھر میں اتنا روپیہ کہاں تھا کہ تکمیل تک پہنچتا۔ جو کچھ اثاثہ و اندوختہ تھا سب اس تعمیر میں صرف ہو گیا، پھر بھی نامکمل رہا۔ اس کے بعد مہاجنوں سے قرض لے کر بنگلہ مکمل کرایا گیا۔ پرانا مکان چھوڑ کر نومبر ۳۳ء میں اس نئے مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ بنگلہ میں آنے کے بعد اخراجات حیثیت سے زیادہ ہونے لگے۔ نوکروں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہی، شان و شوکت یا حماقت کی نمائش کہ میں نے ایک موٹر کار خرید لی۔ میری یہ ناعاقبت اندیشی قدرت سے نہ دیکھی گئی۔ مجھے سزا یہ ملی میرا ایک بچہ جو شکل و شمائل میں ہو بہو نانا کی تصویر تھا، دنیا سے جاتا رہا، جس کا بے حد رنج ہوا، لیکن یہ سزا بھی قدرت کو ناکافی معلوم ہوئی اور بعد میں ضرب کاری لگی کہ آج تک یاد کر کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اس ناگفتنی کا ذکر ذرا وضاحت سے کروں گا، کیونکہ میری زندگی اس کے بعد ایسی پریشانیوں میں گزری کہ تخمیناً دس سال تک اس کا خمیازہ بھگتتا رہا۔ اسی درمیان میں مگر جس واقعہ کا ذکر کرنے والا ہوں، اس کے قبل میرے دل پر ایک ایسی چوٹ لگی کہ بقول خود ؎

بجلیاں کوندتی ہیں ابر دھواں دھار آیا
آنکھ کچھ ایسی لڑی غش مجھے سو بار آیا

بہ مشکل تمام اس چوٹ سے افاقہ ہوا تھا کہ وہ ضرب لگی جس سے اب جا کر نجات ملی۔ میرے ایک دوست سید عابد علی

ایڈووکیٹ الہ آباد کے مشہور آدمیوں میں سے تھے۔ بلا کا ذہن اور غضب کا حافظہ قسام ازل سے لے کر آئے تھے۔ وہ نہایت کامیاب وکیل تھے۔ کافی کماتے تھے۔ مگر خرچ اس سے کہیں زیادہ کرتے تھے۔ ہائی کورٹ کے ججوں سے لے کر چپراسی تک سے ان کے مراسم تھے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی دعوت کیا کرتے تھے مگر اس سے بھی زیادہ جس چیز نے ان کو پامال ہی کر دیا وہ تفریحی زندگی تھی۔ طوائفوں سے غیر معمولی دلچسپی ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے مشاغل کے لئے کتنا ہی روپیہ ہو کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کو بھی آئے دن قرض کی ضرورت رہتی تھی۔ ان کا اثر شہر کے مہاجنوں پر اتنا زبردست تھا کہ عموماً دست گردانی روپیہ مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی رقعہ لکھنا پڑتا تھا۔ مگر ایک مہاجن سے دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی کہ رقعہ لکھتے وقت وہ اپنے کسی دوست کو بھی شریک دستاویز کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے متعدد مخصوص دوست مختلف رقعوں میں شریک کار رہے۔ مگر مجھے جس رقعہ میں شریک ہونا پڑا، اس کی رقم تمام اگلے پچھلے رقعہ جات سے زیادہ تھی۔ پندرہ ہزار روپیہ میری ضمانت پر کون دیتا۔ نہ میں سرکاری ملازم نہ کثیر آمدنی کا مالک مگر ہاں وہ میری تعمیری حماقت یعنی میرا نیا مکان مہاجنوں کے نزدیک اتنی رقم کے لئے کافی سے زیادہ ثابت ہوا۔ اس نے بے تکلف ماجد صاحب کے دستخط کے نیچے رقعہ پر میرا بھی نام مجھ سے لکھا لیا۔ ماجد صاحب کی باتوں میں جادو کا اثر تھا۔ دستخط کرنے کے بعد نہ مجھے مآل کار کا خیال ہوا، اور نہ میں نے کسی سے کبھی ذکر کیا۔ وہ مرحوم ہمیشہ اطمینان دلاتے رہے کہ بڑی حد تک قرض ادا ہو گیا ہے، کچھ رہ گیا ہے وہ جلد ہی بیباق ہو جائے گا۔ بعد میں یہی ایک بات ان کی میرے نزدیک جھوٹ نکلی ورنہ آج بھی میں ان کو پر خلوص انسان سمجھتا ہوں اور یہ یقین کرتا ہوں کہ نہ ان کی نیت خراب تھی اور نہ ان کو نا امیدی تھی کہ کسی دوست کو زیر بار ہونا پڑے گا۔ وہ سچ مچ قرضہ ادا کرنے پر تل گئے تھے۔ ادائیگی کی صورتیں بھی نکال لی تھیں مگر دفعتاً ۱۹۳۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوست کا سوگ منایا جائے یا اپنے زندہ درگور ہونے کا ماتم کیا جائے۔

آخر نالشیں ہوئیں۔ بعض عرضی نالش میں مہاجنوں نے خود اقرار کیا تھا کہ روپیہ اعجاز صاحب کو نہیں دیا گیا اور نہ ان کے صرف میں آیا، عدالت کو بھی مجھ سے ہمدردی تھی مگر دستخط کرنے کی ذمہ داری ایسی تھی کہ قانونی گرفت سے بحالی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ فیصلہ یہی ہوا کہ مجھے سارے روپیہ کی ادائیگی کرنا ہے۔ سر تسلیم خم تھا۔ بجز ادا کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ خیر اتنا معاملہ ہو گیا کہ میں بالاقساط ادا کروں۔ قریب قریب ساری تنخواہ ہر ماہ مہاجنوں کی نذر ہو جاتی۔ نتیجہ یہ تھا کہ گھر کا خرچ چلنا دشوار ہو گیا۔ وہ بھی ایک قرض محسوس ہونے لگا۔ اس کو پورا کرنے کے لئے دوسروں سے قرض لینا پڑتا جس سے قرض خواہوں کی آمد و رفت کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا جو لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔ ہر وقت دماغ پراگندہ رہتا، کسی کام میں جی نہ لگتا۔ ہر وقت یہی فکر رہتی کہ کس طرح روپیہ فراہم کیا جائے۔ اس اُدھیڑ بُن کا سب سے زیادہ بُرا اثر میرے مطالعہ پر پڑا۔ اس دور کشمکش میں میں نے بہت کم پڑھا اور جو کچھ پڑھا وہ بھی مزے لے کر نہیں۔ ذوق طلب کے تقاضے سے مجبور ہو کر پڑھا یا پڑھانے کے لئے پڑھا۔ ایسا ادب کم ہی پڑھنے کا موقعہ ملا جو میری وسعت نظر میں یا معلومات میں وہ اضافہ کرتا جس کی مجھے خواہش تھی۔ بہر حال میرے ذہن کا دھارا چلتے چلتے اگر ختم نہیں ہوا تو سست رفتار ضرور ہو گیا۔ گو اس حالت میں بھی قلم برابر چلتا رہا۔ غالباً اسی ماحول کے اثر کا نتیجہ ہے کہ مجھے پڑھنے سے زیادہ لکھنے میں لذت ملتی ہے۔ اگر شمیم میرے گھر کا نام ہوتا تو مجھ پر یہ بجلیاں نہ گرتیں، نہ کوئی مجھے اتنی کثیر رقم کے ضامن ہونے کا اہل سمجھتا اور نہ میرے دستخط سے زیر بار ہوتے، دوسری خرابی وہ تھی جس کا

ذکر میں کر چکا ہوں کہ بنگلہ میں آتے ہی خرچ ایک دم سے دونا ہو گیا اور اس خرچ کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں جلوۂ کثرت اولاد بھی نظر آنے لگا۔ لڑکے لڑکیوں کے تعلیمی اخراجات ان کے کپڑے لتے خورد و نوش کا سوال اکثر ذوق کا یہ شعر یاد آتا تھا کہ ؎

توڑا کر شاخ کو کثرت نے ثمر کی،
دُنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے

ہاں! یہ صحیح ہے کہ ملازمت سے پہلے بھی مجھے آمدنی کی قلت سے گلہ تھا مگر اس وقت مجھے صرف اپنی فکر رہتی اب دوسروں کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اس پریشان کن ماحول میں، اس مہاجن کا قرض میں ادا نہ کر سکتا تھا جس نے مکان پر روپیہ دیا تھا، وہ تقاضا بھی نہ کرتا تھا۔ اس لئے یک گونہ سکون تھا، ساری تنخواہ ماجد مرحوم کے مہاجنوں کی نذر ہو جاتی اگر ان کو قسط نہ دی جاتی تو وہ تنخواہ قرق کرا کے لے لیتے اور بعضوں نے کبھی کبھی یہ کیا بھی، ایسی صورت میں اپنے مہاجن کو کس طرح سے میں کچھ دیتا، مہاجن کی خاموشی بہ ظاہر عدم تشدد کے مترادف تھی مگر بہ باطن مہلک تھی، اس کا قرضہ دستاویزی اور سود در سود تھا، وہ چاہتا تھا۔ کہ سود اتنا بڑھ جائے کہ مالک مکان کو رقم ادا کرنے کی کوئی صورت نہ رہ جائے تو میں مکان نیلام کرا کے خود مالک بن جاؤں، ۴۰،۰۰۰ ہزار کی مالیت کی کوٹھی ۶، ۷ ہزار اصل دینے میں مل جائے۔ بہر حال وہ خاموش رہا، سود بڑھتا گیا۔ میری اس پریشانی میں میرے ایک پرانے شاگرد نے مردے از غیب بروں آید و کارے بکند، کام کیا، وہ سرکاری ملازم تھا، الہ آباد کے باہر اس نے میرے چند شاگردوں مثلاً خواجہ سردار حسین انصاری، محمد اشرف مرحوم (ڈاکٹر اشرف نہیں) سے میری کشمکش کا حال سنا تو اس پر اتنا اثر پڑا کہ اچانک میری تلاش میں روپیہ لے کر میرے گھر آیا۔ میں گھر پر نہ تھا، اپنے ایک دوسرے شاگرد اختر عباس کے یہاں گیا تھا وہ اس وقت پی۔ اے۔ سی (P.A.C) کے اسسٹنٹ کمانڈنٹ تھے۔ میرے گھر سے بہت دُور رہتے تھے۔ یہ مردے از غیب مجھے تلاش کرتا کرتا وہاں پہنچا، الگ بلا کر مجھے پانچ ہزار روپیہ کی یہ تھیلی پیش کر دی کہ اگر آپ اسے نہ لیں گے تو میں خود کشی کروں گا، اس اچانک امداد کی نہ مجھے امید تھی نہ خیال، میں کچھ دیر تک متحیر رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، میں ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ وہ روپیہ مجھے دے کر چل دیا۔ جاتے جاتے ایک اور شرافت کا ثبوت دیتا گیا، پلٹ کر کہا "اس خدمت کا میں صرف یہ صلہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں نہ میرا نام لیں۔" میرے اشک ندامت نے جو کچھ بھی جواب دیا ہو، مگر میں زبان سے کچھ کہہ نہ سکا، البتہ اس وقت کی اس کی آخری شرط کا پاس ادب اتنا ہے کہ اس سلسلہ میں اس کا نام میری زبان پر اب بھی نہیں آیا ویسے وہ نام لوح دل پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا ہے۔

اس غیبی امداد سے بہت کچھ میری مشکلیں کم ہوئیں بلکہ بعض سامنے کی الجھنیں ختم بھی ہو گئیں مگر پھر بھی مالی دقتیں اتنی باقی رہیں کہ فراغت کی زندگی دُور ہی دُور سے سلام کرتی، یونیورسٹی میں میری زندگی اطمینان و دلچسپی سے گزرتی رہی۔ شعبۂ اردو میں طلباء و طالبات کی تعداد روز افزوں ترقی کرتی رہی، ضرورت کے لحاظ سے اساتذہ کی بھرتی ہوتی رہی، میرے پڑھانے سے طلباء خوش تھے۔ میرے مضامین اور تصانیف سے شعبہ کے اساتذہ اور اردو کی دنیا متاثر ہوتی گئی۔ یونیورسٹی کی فضا میرے لئے

پہلے ہی سے مانوس تھی۔ اب دلچسپی کا مرکز بن گئی تھی اس لیے کہ کچھ ایسے ہم خیال و ہم مذاق اساتذۂ شعبۂ اردو کے باہر مل گئے تھے جو رفتہ رفتہ شیر و شکر ہوتے گئے۔ ان میں سے چند ایسے تھے جن کو میں جانی بھائی سمجھنے لگا اور وہ مجھے بھی بھائی سے کم نہ سمجھتے۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر بھی شہر میں ایک اچھا خاصا حلقہ ایسا تھا جو میری شاعری کا بھی قدردان تھا مگر مجھے نہ مشاعروں سے کبھی دلچسپی نہ اشعار سنانے کا خبط۔ خصوصی صحبتوں میں شعر سننے یا شاعری پر گفتگو کرنے سے البتہ جی خوش ہوتا لیکن شعبۂ اردو کے مشاعروں اور اپنے استاد امرناتھ جھا مرحوم کے گھر کی ادبی نشست میں شرکت ضروری ہو گئی تھی۔ ان صحبتوں میں ضرور شعر پڑھتا تھا۔ لیکن ان جلسوں کو میں آج بھی "مشاعرہ" سے تعبیر کرنے کو تیار نہیں۔ ایسی محفلوں میں شعراء و سامعین بہت کم ہوتے تھے صرف خاص خاص باذوق لوگ بلائے جاتے اور دو ڈھائی گھنٹے میں شعر و شاعری، چائے پانی سب سے فرصت مل جاتی۔ بہرحال میری یونیورسٹی کی زندگی ہمیشہ پرسکون و پرلطف رہی۔ ایک طرح سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ نجی زندگی کی کشمکش کا نعم البدل یونیورسٹی کا ماحول ہو گیا تھا۔

غالباً ۱۹۳۵ء ہی کا زمانہ تھا جب الٰہ آباد میں مختلف وجوہ سے کئی ایک قابل اشخاص جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً سجاد ظہیر، ڈاکٹر زین العابدین احمد، ڈاکٹر اشرف مرحوم اور پروفیسر احمد علی۔ ان لوگوں کا ایک قدم میدان سیاست میں تھا اور دوسرا ادبی ادب میں۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ مختلف زبانوں کے اور طبقوں کے دلچسپ و اہم لوگ انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں پڑھی جاتیں، بحثیں ہوتیں۔ ان جلسوں کی شرکت اور خاص خاص حضرات سے شخصی تعلقات نے میرے نظریۂ ادب اور سماج کو نئی روشنی اور تقویت دی۔ اس انجمن میں بحث و مباحثہ اور مختلف اشخاص سے ملنے جلنے کا نتیجہ میری معلومات و تنقیدی شعور کے لیے صحت مند ثابت ہوا۔ اسی ماحول کا اثر تھا کہ میں نے ایک مستقل کتاب "نئے ادبی رجحانات" کے نام سے قلم بند کی اور انھیں رجحانات کے سلسلے میں کوئی بیس سال کے بعد دوسری کتاب "اردو ادب آزادی کے بعد" لکھی جو دراصل "نئے ادبی رجحانات" کی دوسری کڑی ہے۔

"قلم نداری بزیر خر" کا مقولہ تو سب ہی کا سنا ہوا ہے۔ اس کی معنویت و صداقت کا ذکر ہی کیا مگر میرے لیے یہ قول اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ اور ہی ثابت ہوا، قلم رکھتے ہوئے میں نے ایک رسالہ شائع کرنے کا تہیہ کیا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ایک علمی و ادبی رسالے کی اردو میں اب بھی کمی ہے۔ لہٰذا مجھے یہ کام کرنا چاہیے۔ اتفاق سے اس وقت یعنی تقسیم ہند سے پہلے آصف جاہ کاروانی[1] صاحب ایک ماہنامہ "شعاع اردو" کے نام سے کراچی سے نکالتے تھے۔ اس وقت وہاں اردو دان طبقہ کی اتنی کمی تھی کہ صرف یہی ایک رسالہ وہاں سے نکلتا تھا اور وہ بھی بڑی محدود تعداد میں۔ کاروانی صاحب نے مجھ سے اس رسالے کے سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کا ارادہ مزید تحصیل علم کے سلسلہ میں یورپ جانے کا ہوا۔ کسی کام سے وہ دہلی آئے اور اشتیاق ملاقات کی وجہ سے الٰہ آباد بھی آ گئے۔ انھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔ اب میں رسالہ بند کرنے پر مجبور ہوں۔ کراچی میں میرے بعد کوئی اور چلانے والا

---

[1] ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی جن سے بعد میں قرابت کا سلسلہ قائم ہوا۔ میری بڑی لڑکی کی شادی ان کے ساتھ ہو گئی۔ فی الحال مغربی پاکستان میں ایک سرکاری کالج کے پرنسپل ہیں۔

کا نوٹ کر لیا۔ بجز ایک شخص کے اور کوئی کاتب وہاں نہیں تھا۔ مجھے ان کی اس مجبوری پر اور فیصلہ پر افسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ آپ اس رسالے کے کاغذات مجھے دے دیجیے۔ میں یہاں سے شائع کروں گا۔ ویسے بھی میرا ارادہ ایک رسالہ نکالنے کا ہے۔ وہ راضی ہو گئے۔ کراچی پہنچ کر مجلّہ کا غذات اور کچھ روپے بھی بھیج دیے۔ رسالہ نکالنے کی خفیف سی خواہش اب ابھر کر تند جذبہ کی صورت میں سامنے آگئی۔ رسالہ نکالنے کا ارادہ مستحکم ہو گیا۔

رسالہ نکالنے اور اس کی مشکلات کی مہم میرے پیش نظر ضرور تھی مگر اس جرأت میں میرا یہ خیال ممد و معاون تھا کہ سارے ہندوستان میں مجھے جانے ماننے والے اتنے ہیں کہ ایک ہزار خریداروں کا مل جانا دشوار نہ ہوگا۔ میرا یہ تصور خام خیالی کا پروردہ نہ تھا بلکہ حقیقت کی دنیا کا آوردہ تھا اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا۔ مگر یہ بات ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئی تھی۔ سال بھر اس رسالہ کے متعلق انتظامات کا سلسلہ رہا۔ پھر اس کے بعد جب عملی صورت میں یہ خیال سامنے آیا تو دفعۃً سارے ملک میں انقلاب عظیم آگیا۔ ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان وجود میں آیا اور فرقہ وارانہ جنگ قیامت بن کر سامنے آگئی۔ اردو کی بنی بنائی محفل اجڑ گئی۔ میرے شاگرد و احباب زیادہ تر پاکستان چلے گئے۔ یہاں جو رہ گئے وہ خود ایسی الجھنوں میں رہے کہ رسالہ کے متعلق کیا، وہ اپنے بارے میں کچھ سوچنے سے معذور تھے۔ بہر حال جس طرح بھی ہو سکا میں اپنے کیے کی لاج رکھے رہا۔ دس بارہ سال تک باد مخالف میں کشتی چلاتا رہا! مگر کب تک سیلاب کا مقابلہ کرتا۔ رسالہ کبھی بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ مالی مشکلات کا ہر روز سامنا رہتا۔ میں اپنے ہی قرضوں سے کہاں فرصت پاتا تھا کہ اس کے لیے بھی قرضہ کی فکر کرتا۔ لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں جہاں سے مل سکا، قرض لے کر کارواں چلاتا رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر تھک کر بند کرنا پڑا۔

یونیورسٹی کے باہر قریب قریب ہر مقابلے میں مجھے شکست ہوتی رہی مگر یونیورسٹی کے اندر ہر علمی اقدام میں کامیابی ہوتی رہی۔ چنانچہ رسالہ نکالنے سے پہلے ہی میں نے ایک مختصر سی انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ شعبہ اردو کے چیدہ طلبا مضامین پڑھیں، سنجیدگی سے تنقید ہو۔ اس انجمن کا ہر رکن مضمون پڑھے اور اپنی باری پر ممبروں کو چائے پلائے۔ اتفاق سے جس دن اس انجمن کا خیال آیا وہ جمعرات تھا۔ چنانچہ اس کا نام THURSDAY CLUB طے ہوا۔ ویسے عرف عام میں جمعراتی کلب کہا جانے لگا۔ اس وقت جس درجے میں یہ بات طے ہوئی تھی وہ بی اے کا درجہ تھا۔ اس درجہ میں علاوہ اور لڑکوں کے نورالحسن[1] اور احمد حسین[2] بانی ممبروں میں تھے۔ اس انجمن کا قیام صدر شعبہ اردو کی مرضی کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر صدر شعبہ کے شعبہ میں کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شروع میں ہم لوگ اس انجمن کی نشست موصوف سے چھپا کر کیا کرتے تھے مگر خلوص نیت کی یہ برکت ہوئی کہ دو سال میں امید سے زیادہ انجمن مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ بڑی کامیاب نشستیں ہونے لگیں۔ تین چار سال کے بعد یہ رنگ محفل ہوا کہ خود صدر شعبہ بار بار کہتے کہ آپ لوگ اس انجمن میں مجھے کیوں نہیں بلاتے۔ چنانچہ کبھی کبھی ان کو شرکت کی زحمت دی گئی اور جمعراتی کلب کی نشستیں علانیہ ہونے لگیں۔ منتخب طلبا کے علاوہ اساتذہ بھی ممبر ہو گئے۔ بام

---

[1] ڈاکٹر نورالحسن صدر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی

[2] اب دہلی کے روزنامہ انڈین ایکسپریس (INDIAN EXPRESS) میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔

سے جو اہلِ علم و فن الٰہ آباد آتا۔ اس کو انجمن میں خاص طور سے دعوت دی جاتی۔ چنانچہ شعرا میں سید محمد جعفری[ل]، فراق، جوش، مجاز، حافظ، واثق، مجروح، علی سردار جعفری وغیرہ نے اکثر شرکتیں کیں۔ نثر نگاروں میں پروفیسر مسعود رضوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، خواجہ احمد عباس اور ممتاز حسین نے بھی بار بار اپنی تقریروں و مضمون سے سرفراز فرمایا۔ اس انجمن سے ممبروں کو اتنا لگاؤ ہو گیا کہ چلے جانے والوں نے اصرار کر کے ایک سالانہ جلسہ کی تجویز پر اصرار کیا۔ چنانچہ کئی بار یہ بھی کیا گیا جس میں دُور دُور سے پرانے ممبروں نے شرکت کی۔ مضامین پڑھے اور تین دن تک علمی و ادبی جشن منایا گیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہنا تو یہ تھا کہ یونیورسٹی میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ جمعراتی کلب اب بھی قائم ہے۔ اس کی نشستیں اب بھی سرگرمی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہوا کہ جگہ بدل گئی۔ شعبہ اردو کی ملازمت سے میری سبکدوشی کے بعد ممبروں کی یہ رائے ہوئی کہ اس کو اب یونیورسٹی سے ہٹا کر نشیمن (یعنی مکان پر) میں کر دیا جائے اس کی نشست ہر ہفتہ میں ہوا کرے۔ چنانچہ اب تک یہ ادبی سلسلہ بفضلہٖ برقرار ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میرا لگایا ہوا پودا اب بھی سرسبز ہے تو نہال ہو جاتا ہوں۔

یہ تو میں بتا چکا کہ میں نے ۱۹۲۳ء میں ایم اے کیا۔ اب یہ بھی سُنئے کہ اس کے کوئی ۱۰ سال بعد ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے فکر کی۔ اتنی تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہونا نہ عام تھا اور نہ آسان اور پھر اس وقت الٰہ آباد یونیورسٹی میں (D. Phil یا P.H.D) کی ڈگری حاصل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ صرف ڈی لٹ کی ڈگری دی جاتی تھی۔ جس کا حاصل کرنا اتنا مشکل تھا کہ دس سال کے بعد بھی مقالہ پیش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یونیورسٹی نے ۱۹۲۳ء کے بہت بعد اس سے کم درجہ کی ڈگری یعنی D. Phil دینے کا قاعدہ مرتب کیا۔ بعض مصلحت کے پیشِ نظر میرے احباب نے مجھ سے بھی اصرار کیا کہ میں ڈاکٹر کی ڈگری لے لوں تاکہ کچہری کی زبان میں سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے۔ اس وقت تک میں کئی کتابوں کا مصنف ہو چکا تھا۔ بحیثیت لکچرر بھی کافی مدت ہو چکی تھی۔

عام خیال تھا اور یونیورسٹی کو بھی احساس تھا کہ اب تک کسی نے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے اُردو میں D. Phil کی ڈگری نہیں لی۔ اس قسم کی یہ پہلی ڈگری ہو گی۔ اس لیے اس پر فیصلہ کرنے کے لیے نہایت مستند ممتحن منتخب کئے جائیں۔ اس احتیاط کے پیشِ نظر وائس چانسلر نے تین کی بجائے چار ممتحن منتخب کئے۔ ممتحنوں نے رپورٹ بھیج دی تو VIVA VOCE کے لیے لاہور سے سر عبد القادر تشریف لائے۔ موصوف نے بھی اس امتحان کے سلسلے میں پوری احتیاط برتی تھی۔ ایک کاغذ پر سو سے زیادہ سوالات لکھ کر لائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساڑھے تین گھنٹے تک مکالمہ ہوتا رہا۔ جس ہال میں امتحان ہو رہا تھا وہ پورا بھرا ہوا تھا۔ وائس چانسلر اور دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ یہ مرحلہ دیکھنے آئے تھے۔ سوال و جواب کے ساڑھے تین گھنٹے مجھے گراں نہیں گزرے۔ مرحوم سر عبد القادر اپنی شفقت و بزرگی کا لحاظ کرتے رہے اور میں اپنی خوردی اور امیدواری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ مگر چند ہی سوالات کے جوابات کے بعد باوجود بزرگی و خوردی کی تفاوت کے ہم دونوں دوست کی طرح باتیں کرنے لگے۔ وہ میرے جوابات سے اتنے مطمئن و مسرور ہوئے کہ اپنے فیصلے کا اظہار برسرِ محفل کر دیا۔ حالانکہ وہ صیغۂ راز کی بات تھی۔ اسے سربمہر لفافہ میں رجسٹرار یونیورسٹی کے پاس جانا چاہئے تھا گر وہ اپنے جذبہ مسرت

[ل] اردو کے ممتاز و مشہور مزاحی شاعر جن کے نزدیک خط کا جواب نہ دینا اور اپنا کلام نہ چھپانا بھی مزاحیہ شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

سے مغلوب ہوگئے۔ کھڑے ہو کر چند لفظوں میں میری غیر معمولی تعریف مجمع میں کی اور اسی وقت یہ فرما دیا کہ THESIS ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ میں اعجاز صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

مجھے تھوڑی بہت جو کچھ شہرت نصیب ہوئی۔ وہ یونیورسٹی کی رہینِ منت ہے۔ ذہنی فروغ و مالی منفعت بھی یہاں مجھے کم نصیب نہیں ہوئے۔ جونیئر لکچرر کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے میں پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو کے درجہ تک پہنچا۔ یہ صحیح ہے کہ جو مالی فائدہ تنخواہ وغیرہ سے دوسرے اساتذہ کو یونیورسٹی میں عموماً پہنچتا ہے وہ مجھے نہیں پہنچا۔ عرصہ تک جونیئر لکچرر رہنا پڑا۔ بہت دیر میں READER ہونے کی نوبت آئی۔ بظاہر پروفیسری سات آٹھ سال تک میرے ساتھ وابستہ رہی حقیقت میں استقلال و آزادی کے ساتھ پانچ سال تک میں پروفیسر رہا۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں میں جب ملازمت سے سبکدوش ہوا تو بجائے رنج کے مجھے خوشی تھی۔ یہ احساس بڑا اطمینان بخش تھا کہ میں نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس اطمینان کے پس پشت ایک اور خیال باعث مسرت تھا کہ اب وہ قرض جو میرے مکان کا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ پراویڈنٹ فنڈ سے جو روپیہ ملے گا وہ مجھے ہر قرض سے سبکدوشی دلا دے گا چنانچہ یہی ہوا۔ مکان کا قرض بیباق کرتے ہوئے عہدِ ماضی پر نظر گئی۔ خیال ہوا کہ قریب قریب ابتدائے ملازمت سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اور اختتامِ ملازمت پر ختم ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ ایک مہمان تھا جو کم و بیش پچیس سال تک میرا خونِ جگر اور گھر والوں کی راحت و آسائش مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ یہ ناخواندہ مہمان سات ہزار کی رقم بن کر آیا تھا اور جاتے وقت چودہ ہزار کی صورت میں مجھ سے رخصت ہوا۔ کہہ سکتے ہیں کہ اکہرے بدن کا آیا اور دوہرے جسم کا ہو کر گیا۔ اتنے دیرپا مہمان کے جانے پر مجھے یہ بھی سوچنا پڑا کہ کچھ بھی ہو رفیقِ مستقل مزاج تھا جو شروع سے لے کر اب تک میرا ساتھ دیتا رہا۔ اس کی رخصت کے وقت میں کہہ رہا تھا:

کس کے گھر جائے گا سیلاب
بلا میرے بعد

اب تک اُردو کے دفتر کا اچھا خاصا حصہ میں سیاہ کر چکا ہوں۔ اچھی یا بُری گیارہ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ فہرست یہ ہے:

(۱) آئینۂ معرفت (اُردو شاعری پر تصوف کا اثر) (۲) مختصر تاریخ ادب اردو (۳) نئے ادبی رجحانات (۴) مذہب و شاعری (۵) ملکِ ادب کے شہزادے (۶) اُردو ادب آزادی کے بعد (۷) ادب اور ادیب (۸) ادبی ڈرامے۔ (۹) حیات سیدنا[1]۔ (۱۰) میری دنیا[2] (۱۱) اُردو شاعری کا تمدنی پس منظر۔

۸، ۹، ۱۰ چھپ رہی ہیں اور نمبر ۱۱ زیرِ تصنیف ہے۔ اس کارنامے کے علاوہ کچھ تعلیمی میری تصنیفات اہم نہ سہی قابلِ ذکر ضرور ہیں مثلاً انتخاب کلام آتش اور ہندی زبان میں مہاکوی اکبر الٰہ آبادی اور اردو ادب کا ارتقا۔ بہر حال اتنا سیدھا سادا کام کر چکا ہوں آخر میں یہ مصرعہ پڑھنے کا مستحق اپنے کو سمجھتا ہوں کہ:

---

[1] سیدنا طاہر سیف الدین کی شخصیت و علمیت سے متاثر ہو کر میں نے موصوف کی سوانح عمری نظم بند کی جو اب چھپ رہی ہے۔

[2] میرے خود نوشت حالات اور میرے وہ تجربات و کردار، تحریکات جن سے یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں متاثر ہوا اور مخصوص شاگردوں اور دوستوں کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس روداد زندگی کے اختتام پر یہ بھی بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اب میں آٹھ لڑکے اور لڑکیوں کا باپ ہوں جن میں پانچ لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں۔ نام حسب ذیل ہیں:

(۱) سید ممتاز حسین (۲) سید آفتاب حسین (۳) سید انتخاب حسین (۴) سید سرفراز حسین (۵) سید خورشید حیدر (۶) حسن بانو عرف قیصر جہاں (۷) حسین بانو عرف نسیم بانو (۸) نرگس اعجاز۔ یہ فہرست تو اولاد کی ہے مگر اولاد در اولاد کی فہرست اس سے بھی زیادہ ہے۔ ماشاءاللہ (بلکہ عورتوں کی زبان میں) خدا نظر بد سے بچائے۔ اب میں ۱۴، ۱۵ بچوں کا دادا اور نانا ہوں۔ اس اولاد صلبی کے ساتھ ساتھ جب اولاد معنوی کی تعداد عالم خیال میں نظر آجاتی ہے تو بے ساختہ مجروح کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے رہے اور کارواں بنتا گیا

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں مگر اب یہ کارواں ساتھ ہے جو میرے بعد میرا نام و نشان باقی رکھنے کے لیے بظاہر کافی نظر آتا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب میں نے سود و زیاں کا جائزہ لیا تو بلاتکلف یہ نتیجہ نکلا کہ یونیورسٹی سے مجھے فائدے زیادہ ہوئے نقصان کم۔ مجھے فائدے کی اور صورتوں کو فی الحال جانے دیجیے۔ یہ نعمت کس دولت سے کم تھی کہ میرے متعدد شاگردوں نے اردو ادب کی خدمت کر کے اردو کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ مثال کے لیے ایسے چند شاگردوں کے نام یاد آتے ہیں: جلیل قدوائی، احتشام حسین، وقار عظیم، طالب الٰہ آبادی، مصطفےٰ زیدی، مجتبیٰ حسین، بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الزماں، عقیل رضوی، گیان چند جین وغیرہ۔ اور امید کیا یقین ہے کہ کم از کم اتنے ہی ابھی اور نمایاں ہوں گے کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ اردو کی دنیا کو اپنے کارناموں کی وجہ سے متوجہ کر رہے ہیں۔

مرتے وقت یہ اطمینان رہے گا کہ علم و ادب کی دنیا میں کچھ فاتحہ خواں چھوڑے جا رہا ہوں۔

ڈاکٹر محمد حسن

محرم الحرام کی ۲۰ ویں تاریخ تھی اور عیسوی سنہ ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء تھا۔ مراد آباد میں پیدا ہوا اور اپنا یوم پیدائش تقویم سے ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی ویسے ہائی اسکول سرٹیفکیٹ کے اعتبار سے یکم جولائی ۱۹۲۶ء یوم پیدائش ہے۔ مراد آباد میں ایک محلہ ہے نواب پورہ سنتا ہوں اسے میرے ہی آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا۔ اس گھرانے کی کبھی بڑی عزت تھی اور اس سے مختلف افسانے وابستہ تھے۔ جدِ اعلیٰ کو دو سو گاؤں جاگیر میں ملے تھے لیکن ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ طور پر امداد کرنے کے جرم میں وہ ضبط کر لئے گئے تھے بعد کو ہمارے پردادا نے اس کھوئی ہوئی جائداد کو پھر حاصل کیا۔ دل کے غنی تھے۔ پندرہ بیس گاؤں کی جاگیر تھی مگر سوائے گاڑھے کے اور کچھ نہ پہنتے تھے اور ہر روز نیا جوڑا پہنتے اور پہنا ہوا جوڑا خیرات کر دیتے تھے۔ ہوادار میں ہر جمعرات کو نکلتے۔ روپیوں کی تھیلیاں اِدھر اُدھر رکھی ہوتی تھیں۔ راستے میں غریبوں اور مستحقین کو دیتے جاتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انتہائی غصہ ور تھے۔ میرے والد اور تین چچا تایا کو یہی آخری وراثت سب سے بڑی مقدار میں ملی۔ میرے والد محمد الطاف حسین صاحب سب سے چھوٹے ہیں لیکن اس وراثت میں حصہ غالب پایا ہے۔

غرض زمینداروں کے گھرانے میں جنم لیا پرانے طرز معاشرت میں آنکھ کھولی، حویلی کی اونچی اونچی دیواریں، سہ دریاں، محل سرا، شیش محل، دس سال تک میں اپنے والدین کا اکیلا لڑکا تھا اس لئے زیادہ لاڈ پیار سے پرورش ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاکی کرکٹ، فٹ بال وغیرہ کھیل سکا نہ سائیکل پر چڑھنا سیکھ سکا شاید اسی وقت سے مجھے مامتا اور لاڈ پیار سے شدید نفرت ہے۔ میں اپنے گھر میں باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والا پہلا فرد تھا۔ ہیویٹ مسلم ہائی اسکول (اب کالج) میں داخل ہوا۔ اس سے قبل ایک سال یہاں کے مقامی مشن ہائی اسکول میں پڑھا اور ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان ہیویٹ مسلم اسکول ہی سے دیا۔ میرے خاندان کی قدامت اور میری پرداخت کا نتیجہ یہ تھا کہ میں نے ۱۹۴۰ء کے قبل اپنے گھر کے دروازے سے کبھی تنہا باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اسکول ساتھ لے جانے کے لئے ایک متقی بڑے میاں ملازم تھے، جو میرے ساتھ ہی اسکول جاتے اور ساتھ واپس آتے تھے۔ اسی لئے میں آزادی سے اپنے ہمجولیوں میں کھیلنے اور شرارتیں کرنے کے لطف سے ناواقف ہی رہا۔ قدرتاً میں اس وقت نہایت جھینپو، شرمیلا اور خلوت پسند تھا۔

اس کا بدل ذہن نے دوسری سمت میں تلاش کیا۔ مطالعہ کا چسکا لگا، اخبار بینی شروع کی۔ زمیندار، احسان اور مدینہ بجنور گھر پر آتے تھے۔ سیاسی بحثوں کا زمانہ تھا۔ خلافت وغیرہ کے قصے بھی سنے تھے اسی زمانے میں انگریز دشمنی اور وطن دوستی کے تصور نے دل میں گھر کر لیا۔ کھدر پہننا شروع کیا۔ مسلم لیگ سے شروع میں کچھ دلچسپی پیدا ہوئی شاید اس وجہ سے بھی کہ مجھے اپنے گھر خصوصاً اپنے والد کی قدامت پرستی، ضعیف پن اور ضد سے چڑ سی تھی۔ شاید میں انفرادیت کے اظہار یا ادعا کے لئے ان سے مخالف عقائد رکھنا چاہتا تھا وہ مثلاً

حسین احمد مدنی مرحوم کے معتقد تھے میں کھدر پہنتا تھا۔ مسلم لیگ کی حمایت کرتا تھا۔ البتہ اس کا قلق ہوتا تھا کہ مسلم لیگی لیڈر سارا زور بیان ہندوؤں ہی کے خلاف کیوں صرف کرتے ہیں۔ انگریز کو کچھ نہیں کہتے آزادی کا مطالبہ بھی شدومد سے نہیں کرتے اس کے لئے قربانیاں بھی نہیں دیتے نہ کھدر پہنتے ہیں نہ جیل جاتے ہیں۔

لیکن اسی زمانے میں دو اہم واقعے ہوئے ۱۹۳۹ء میں لڑائی شروع ہو چکی تھی، کانگرسی وزارتیں استعفیٰ دے چکی تھیں اور ملک کی صورت حال خاصی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ پہلا واقعہ یہ ہوا کہ انہی دنوں میں میں نے سیاست مدنی کا مطالعہ شروع کیا معلوم ہوا کہ کلاسیکل سیاست کی رو سے قوم کی بنیاد مذہب نہیں ہو سکتا بلکہ قومیت کی تعمیر مذہب کے علاوہ دوسرے مختلف عناصر سے ہوتی ہے جس میں جغرافیائی عناصر کو سب سے زیادہ دخل ہے دوسرا اہم واقعہ جذباتی تھا۔ عنفوان شباب کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ ہیجانات کا زمانہ تھا۔ پہلی بار جذباتی وابستگی کی لذت سے آشنا ہوا اس وابستگی کی نوعیت اس قدر حسن پرستی کی نہ تھی جتنی عشق پرستی کی تھی۔ اپنے خیال و خواب کو سجانا زیادہ مقصود تھا اور لذت اور آزار دو کم۔ اسی وابستگی کی بدولت میں نے زندگی میں پہلی بار منافقت اور بغاوت کے معنی سیکھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر اصرار کیا اور والد بزرگوار کی نہایت جائز مخالفت کے رد عمل کے طور پر مقامی کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ پرائیویٹ طور پر فارسی کے اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری شروع ہوئی اور دو سال بعد ان دونوں امتحانوں میں کامیاب بھی ہو گیا مگر اس کامیابی سے کہیں زیادہ اہم تھی میری بغاوت۔ اس عرصے میں میں نے مرزائی کے انداز سیکھے، وحشت اختیار کی، ہر ضابطے اور قاعدے کو توڑ دیا۔

پہلی بار تنہا محل کے دروازے سے باہر نکلا ٹوپی اوڑھنے کا التزام ترک کر دیا اور ایک بار شیروانی کے بغیر صرف کرتے ہی میں نکل کھڑا ہوا مسلم لیگ کے بجائے کانگرس کی طرف میلان بڑھا، گو جمعیتہ علما کا ہم نوا نہ ہو سکا۔ انہی دنوں ایک زیادہ گہری جذباتی وابستگی اور اس کے بعد اس کی ناکامی نے فسخ عزم سے آشنا کیا، دعائیں کارگر نہ ہوئیں تو خیال آیا کہ شاید دعائیں سننے والا کوئی ہے ہی نہیں ورنہ دنیا میں ایسی بے انصافی کیوں ہوتی کہ آدمی اپنے اختیار سے عاجز ہو جائے۔ بغاوت کی لے اور بڑھی، تشکیک سے ہوتی ہوئی الحاد تک پہنچی۔ آج سوچتا ہوں تو یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر انسان کتنے بڑے مسائل کا فیصلہ کر ڈالتا ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ اس وقت تک میں نے کوئی نماز قضا نہیں کی تھی۔ ہاں اس وقت تک شاید ہی کوئی روزہ قضا کیا ہو لیکن ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ مراد آباد کے چھوٹے موٹے کمیونسٹ لیڈر اور ترقی پسند ادیب منصور حسین نجم سے ملاقات ہوئی۔ میرا مطالعہ رسالوں اور کلاسیکی اور ترقی پسندوں کی تصانیف تک جا پہنچا تھا۔ مگر میں ابھی ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رمضان کے دن تھے کوئی بارہ ایک کا عمل ہو گا میں اپنے ایک دوست مولوی عبدالسلام کے ہمراہ پہنچا منصور حسین نجم اپنے ایک ہم مشرب ہندو کمیونسٹ گریش ماتھر کے ساتھ ایک پلیٹ میں گوشت روٹی کھا رہے تھے مجھ سے بھی اصرار کرنے لگے میرا روزہ تھا۔ مجھے سب بہت عجیب لگا۔ نجم نے روزے کا مذاق اڑایا تو یہ بات اور بھی عجیب لگی۔ مگر میں ان دنوں تشکیک کی اس منزل میں تھا کہ یہ بات دل میں چبھ گئی کہ بھلا خدا کو بندوں کے کچھ کھانے یا نہ کھانے سے کیا مطلب ہے۔ اسے ایسی ہی پابندی کی منظور ہوتی تو ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے انہیں پیدا ہی کیوں کرتا۔ اس زمانے میں نگار پڑھنا بے دینی کے مترادف تھا۔ میں اس کا باقاعدہ خریدار تھا جس نے آزاد خیالی اور تشکیک کے رجحان کو تقویت پہنچائی تھی۔

بہر حال اس دور میں بھی تمام افکار کو اپنے طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ تقلید اور روایت پرستی ختم ہوئی۔ مذہبیت اور مشرقیت

کے گنبد سے نکلا تو حویلی کے سائے پیچھے چھوٹتے محسوس ہوئے۔ جن چیزوں کو گناہ سمجھا جاتا تھا انہیں محض عقیدۃً گناہ نہیں سمجھا جنہیں نیکی اور سچائی کا ثبوت گردانا جاتا تھا انہیں راست بازی کا تمغہ نہیں جانا۔ آج نئی نسل کی جھنجھلاہٹ اور بت شکنی پر غور کرتا ہوں تو اس زمانے کا ابال، جوش و خروش اور تندہی یاد آتی ہے۔ شاید میں بھی اپنے طور پر نئے اقدار کی دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھنا اور اپنے تجربوں سے اسے پرکھنا چاہتا تھا۔ نئی نسل کی فکریں کہئے کہ ہر نوزائیدہ بچے یا ان کی قدرتی خواہش ہی ہوتی ہے کہ وہ محض رسمی حقیقتوں پر ایمان نہ لائے بلکہ ان حقیقتوں کو خود اپنے تجربے کی روشنی میں جانچے، تولے، پرکھے۔ اسی کو لوگ کبھی کفر کہہ دیتے ہیں کبھی اسے بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ لاوا ہے جس سے سارے علوم نے جنم لیا ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور حادثہ ہوا۔ سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک نوجوان شاعر مرزا حکیم دہلی کے طبیہ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر مراد آباد آ گئے اور ہمارے والد صاحب کے ایما سے ہمارے یہاں فروکش ہوئے۔ مرزا جی سیلانی تھے، کھلنڈرے، باتونی، نظم کے رسیا اور ادبی رسالوں کے شوقین۔ میں نے انہیں دنوں مجاز کی آہنگ، منٹو کے افسانے اور بیدی کی دانہ و دام اور گرہن پڑھی تھی۔ رسالہ ادبی دنیا اور ساقی برابر خریدتا تھا۔ منٹو کی ادارت میں مصور بمبئی سے نکلتا تھا وہ بھی میرے پاس آتا تھا۔ ان سب کا مزاج پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ افسانہ نگاری شروع کی۔ پہلا افسانہ وارفتہ مصور کو بھیجا۔ منٹو نے لکھا افسانہ اچھا ہے مگر ڈیفنس آف انڈیا رولز کی پابندیوں کی بنا پر چھاپنے سے معذور ہیں۔ دوسرا افسانہ علاج مصور ہی میں چھپا۔ حکیم رئیس احمد میری تخلیقی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان حضرت نے مذاق مذاق میں کہا کہ اگر دو سو افسانے لکھو تو اس کے بعد ہر افسانے کا معاوضہ میں دوں گا۔ اب کیا تھا لکھ لکھ کر پشتارے لگانا شروع کئے۔ چھوٹے موٹے بہت سے افسانے لکھ ڈالے دو چار ڈرامے بھی لکھے۔ ریڈیو والوں کو بھیجے۔ اتفاق سے پہلے ہی دو ڈرامے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے نشر کرنا منظور کیے اور دونوں کا مجموعی معاوضہ شاید چالیس روپے نکلا جو میری ادبی زندگی کی پہلی آمدنی تھی۔ اسی زمانے میں بعض افسانے نیرنگ اور مست قلندر وغیرہ میں بھی چھپے۔ یہ سب کے سب بڑے ہیجانی اور جذباتی افسانے ہیں۔ افسانہ نگاری کا یہ شوق یوں تو ۱۹۴۰ء کے بعد ہی ختم ہو گیا مگر اکا دکا افسانے میں نے ۱۹۴۷ء تک لکھے جن میں سے "مرجھائے ہوئے پھول" ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوا اور "تاریک گوشے" آجکل دہلی میں شائع ہوا۔

مئی یا جون سنہ ۱۹۴۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تو آگے کی تعلیم کا سوال اٹھا۔ والد نے علی گڑھ جانے پر زور دیا مگر اب علی گڑھ کی مسلم لیگی فضا سے نباہ مشکل تھا۔ یوں بھی میں اتنا کچھ بدل چکا تھا کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان مشترک اقدار بہت تھوڑی سی رہ گئی تھیں۔ اب میں باغی تھا، متشکک اور آزاد خیال تھا، نیم اشتراکی کانگریسی تھا۔ گو کسی سیاسی جماعت کا باقاعدہ رکن نہ تھا۔ اس زمانے میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے سول سروس کے امیدوار نکلتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے انقلابی اور اشتراکی۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کو پسند کیا اور اس بار والد محترم نے خود ہی جا کر مجھے داخلہ دلایا۔ جبلی ہوسٹل میں کمرہ مل گیا اور اس طرح میری زندگی کے سب سے اہم دور کا آغاز ہوا۔

سنہ ۱۹۴۲ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ میرے مزاج، کردار کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں سیاست و ادب اور [illegible] سے شناسائی ہوئی۔ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء میں میرا داخلہ عمل میں آیا تھا اس وقت علی سردار جعفری (جو علی گڑھ یونیورسٹی سے اخراج کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں اقتصادیات میں ایم۔ اے کرنے آئے تھے اور یونیورسٹی کے سکریٹری منتخب ہو چکے تھے) سید محمد جعفر (یونیورسٹی یونین کے کانگریسی صدر)، انصار ہروانی (جو سبھاش بوس کی پارٹی فارورڈ بلاک کے اہم رکن تھے اور مجاز کے بڑے بھائی ہیں) ہری کرشن (دستی یونیورسٹی

یونین کے سکریٹری دوسرے پرانے اور نئے طلبا اور نوجوانوں کے دوسرے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ اس سے ایک یا دو سال پہلے ہی دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گائر صاحب کانووکیشن ایڈریس پڑھنے لکھنؤ آئے تھے تو سردار جعفری وغیرہ کی سرکردگی میں اس کا کالے جھنڈوں سے استقبال کیا گیا تھا اور بڑی زبردست شورش اس بنا پر پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے بعض قوم پرست طلباء کا اخراج کر دیا تھا اور انہیں واپس لینے سے انکار کیا تھا۔ یونیورسٹی کی فضا پر سیاست مسلط تھی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا الگ زور تھا اور تحسین حبیب اللہ، اکبر مرزا اور علی رضا کی قیادت میں تین چار کے علاوہ سبھی مسلم طلبا اس کے ساتھ تھے۔ ان تین چار طلبا میں ایک میں بھی تھا۔ اس وقت میں ذہنی طور پر، یوں کہیے جذباتی طور پر اشتراکی تھا گو میں نے کمیونزم کی بنیادی کتابیں بھی نہیں پڑھی تھیں میرا ایمان تھا کہ ہر ملک کو آزاد ہونا چاہیے، برطانوی سامراج کو ختم ہو جانا چاہیے، مزدوروں، کسانوں کو پورے حقوق ملنے چاہئیں، مذہب کی پابندیوں کو ختم ہونا چاہیے اور روایات کی زنجیریں ٹوٹنی چاہئیں۔ یہ روایت شکنی کی لے اس قدر تیز تھی کہ اس وقت عصمت وغیرہ کے تصورات مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے اور FREE LOVE اور نراج بالکل قدرتی۔ نراج کا مفہوم میں نے کروپاٹکن اور ریڈ کی کتابوں سے سیکھا تھا یعنی انسان فطرتاً نیک ہے اور اس کے فطری تقاضے پورے ہونے چاہئیں اس لئے ایسے تمام قوانین جو ان فطری تقاضوں پر پابندی عائد کریں تنسیخ کے لائق ہیں انسان کو اگر تمام قوانین سے آزاد کر دیا جائے تو اس کی فطری نیکی رو بہ کار آئے گی اور ایک اچھے سماج کی بنیاد پڑے گی۔ لیکن اس ساری نراج پسندی اور اشتراکیت بت شکنی کے بعد بھی میں جنگی کوششوں میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے تعاون کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک کسی حالت میں بھی برطانوی سامراج سے تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے میں نے کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ پیدا کرنے کے بجائے کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی طرف رُخ کیا۔

اگست ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تجویز منظور کی۔ بمبئی میں سبھی کانگرسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ کانگرس خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی۔ ملک کے کونے کونے میں جلوس نکلے، ہڑتالیں ہوئیں، فائرنگ اور لاٹھی چارج ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا نے بھی ۱۰ اگست کو زبردست جلوس نکالا۔ منکی برج پر پولیس نے جلوس کو روکا، فائرنگ ہوئی۔ گولی طلبا کے لیڈروں کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن اتفاق سے میں بھی کنگ جارج میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹ وارڈ میں بحیثیت مریض کے داخل تھا نیشنل ہیرالڈ کا آخری الوداعی پرچہ نکلا تھا۔ طلبا بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے تھے۔ ملک بھر میں سنسنی خیز خبریں آ رہی تھیں۔ دوسرے دن یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دی گئی اور مجھے تایا صاحب اپنے ساتھ لکھنؤ سے مراد آباد لے آئے۔

تین ساڑھے تین مہینے بند رہنے کے بعد یونیورسٹی پھر کھلی۔ پولیس کی کڑی نگرانی تھی پھر بھی کانگرسی طلبا کی نئی لیڈر شپ آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ کشوری، چھوٹے رستگی اور بعض دوسرے طلبا کے ساتھ شامل ہو کر میں نے بھی انقلابی سرگرمیوں میں تھوڑا بہت حصہ لیا۔ ایک اہم کانگرس سوشلسٹ رہنما روپوش تھے اور میرے کمرے میں مقیم تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ یونیورسٹی میں کانگرس کا جھنڈا لہرایا جائے۔ ہڑتال جاری رکھی جائے۔ کانگرس چونکہ خلاف قانون جماعت تھی اس لئے گرفتاری عمل میں آئے گی اور اس کے بعد تحریک میں پھر سے جان پیدا ہو جائے گی۔ پہلا ڈکٹیٹر کشوری لال کو مقرر کیا گیا۔ جھنڈا لہرا دیا گیا مگر گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ دوسرے دن مسلم لیگی طلبا نے یونیورسٹی کے سب سے اونچے گنبد پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔ تیسرے دن سنگھ بھا

کر ہندو سبھائی طلباء نے اکھنڈ بھارت کے نعروں کے ساتھ ہندو سبھا کا پرچم بلند کر دیا۔ فضا سخت مکدر تھی۔ بلوے کا امکان تھا کہ چند منچلوں نے کسی طرح ان کے سارے جھنڈے اتار کر چاکلیٹ رنگ کا ایک جھنڈا لہرا دیا جس پر قورمے کی پیالی بنی ہوئی تھی اور لکھا تھا "کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ"۔

ایک آخری تدبیر کے طور پر دس دسمبر کو دس منٹ کی یادگار منانے کی کوشش کی گئی۔ جلسہ ہوا، جلوس نکالا گیا تاکہ اس پر واقعی چارج ہو مگر ترقی پسند طلباء نے جلوس کا راستہ روکا اور بھگا کر واپس کر دیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جلوس آگے نہ جا سکا مگر یونیورسٹی میں یو پی گورنمنٹ کا جو ایک شعبہ پبلسٹی کا تھا اس کی عمارت کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد بڑی ہیبت پھیلی۔ کچھ گرفتاریاں ہوئیں مگر یونیورسٹی بند نہ ہوئی۔

آخر کار تھوڑے دن بعد سیاسی شورش ختم سی ہو گئی۔ سیاست سے میری دلچسپی جاری رہی اور اس میں بائیں بازو کے رجحانات زیادہ واضح ہوتے گئے مگر ان دنوں میری ادبی زندگی کا آغاز بھی ایک نئے رنگ پر ہوا۔ اس زمانے میں میرا رابطہ چند ایسے حضرات سے پیدا ہوا جنہوں نے آگے چل کر میری زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ طلباء میں احمد حسن اور شہزادہ امیر الدین سے ملاقات ہوئی۔ احمد حسن اس زمانے میں بڑے رنگین رومانی افسانے لکھا کرتا تھا جن میں شفق کی سی لطافت اور چاندنی کی سی ہلکی ہلکی مستی ہوتی تھی۔ شہزادہ امیر الدین لاابالی اور سخت بوہیمین قسم کا نوجوان تھا جسے زندگی کے سارے مسلمات سے نفرت تھی۔ ان دونوں نے میرے فکری تجسس کو بڑھایا اور میری ادبی کوششوں کو بہت سراہا۔ سلام مچھلی شہری سے ملاقات ہوئی اور سلام کے ذریعے نصیر حیدر سے ملا۔ اس کے ایک یا دو سال بعد مجاز سے ملاقات ہوئی اور نصیر حیدر اور مجاز دونوں جلد مجھ سے قریب ہو گئے یا یوں کہیے میں ان سے بہت قریب ہو گیا۔

نصیر حیدر کے بارے میں کچھ لکھنا دشوار ہے۔ اس کے قہقہوں کا کھوکھلا پن اور اس کی بھرپور شخصیت دونوں اس تضاد کے غماز تھے جس کے سہارے نصیر نے میر کی طرح زندگی گزار دی۔ نصیر پڑھا لکھا ہوتے ہوئے پرلے درجے کا NIHILIST یا نفی مزاج تھا۔ اس کے نزدیک زندگی محض ایک دردناک اور سفاک ستم ظریفی تھی جس کی چیرہ دستیوں کو بھلانے کے لئے وہ ان دنوں شاہد و شراب کا سہارا لیتا تھا اور بے دردی سے جیتا تھا کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ اس کے تصورات پر جینے والی نسل کا شاید وہ آخری فن کار تھا جس کے لئے اس کا حسن اور اس کی ذہانت گویا ایک عذاب بن گئی تھی۔ یہاں سے میری لاابالی زندگی شروع ہوئی۔ میں بھی نصیر ہی کا نہ اس کے ساتھ بھی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر سکا نہ اپنے مطالعے سے غافل ہو سکا۔ تعلیمی فرائض کو بھلا سکا مگر زندگی کی تلخ کامیوں اور درد و داغ و جستجو و آرزو کو نصیر کے کرب و درد کے آئینے میں دیکھنے کا موقع ضرور ملا جس سے وان گو اور بودلیئر جیسے فن کاروں نے جنم لیا ہوگا۔ نصیر زیادہ دیر تک جی نہ سکا اور ان کی طرح کیونکہ وہ فن اور غم میں اس قدر دور چلا گیا تھا کہ فن یا اظہار ذات کے دوسرے وسائل کی بھی پروا نہ کی۔

اس زمانے کی میری زندگی عجیب تھی۔ عجیب و غریب نوجوانوں کا ایک قافلہ تھا جو میرے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ ایک طرف بیش، مہدی وغیرہ تھے جو اپنی تعلیم چھوڑ کر سیاست کے میدان میں کودنے پر آمادہ تھے۔ دوسری جانب نصیر حیدر جیسے نوجوان تھے جو لا نیستی کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ میرے تصورات تیزی سے بدل رہے تھے۔ میں دونوں میں سے کسی سے مکمل سمجھوتہ نہ کر سکا۔ تقریباً ہر روز یہ ہوتا تھا کہ قہوہ خانے کے شور و شغب میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا اور دوستوں سے بحث کرتا رہتا تھا۔ حافظ اور خیام، نظیری اور خسرو پڑھتا۔ غالب، اقبال، جوش اور فیض کو پڑھتا اور رات کو جب نشے میں سرشار کسی نامعلوم منزل سے نصیر حیدر اور مجاز کے ساتھ تانگے پر لوٹتا تو انہی مشاہیر شعرا کا کلام زبان پر ہوتا

تھا۔ اس درد و کرب نے پہلی بار مجھے تخلیق نگاری کی ذات کے درد و کرب سے دوچار کیا، میرے مذاق شعر کی آبیاری کی اور زندگی کے ایک نئے گوشے نے مجھے ادب کے مطالعے کی دعوت دی۔

احمد حسن اور بعض دوسرے رفیقوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی اس کا نام تھا حلقۂ احباب۔ صدارت کے لئے احتشام صاحب سے درخواست کی اور انھوں نے منظور بھی کر لی۔ اب اس انجمن کے جلسے باقاعدگی سے شعبۂ اردو میں ہونے لگے اس کا دو سالہ پروگرام بنایا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اردو ادب کے جملہ اصناف پر ایک ایک مقالہ پڑھا جائے۔ سائنس کے مختلف شعبوں پر فنون لطیفہ کی جملہ اقسام اور ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ادب پر مقالے پڑھوائے جائیں اس پروگرام کا افتتاح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کیا اور اس میں مقالہ پڑھنے والوں میں بیرزک کالج کے پرنسپل رتن جانکر، پروفیسر کالی پرشاد، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، خواجہ غلام السیدین، سجاد ظہیر، پروفیسر ربالد، پروفیسر ڈی پی مکرجی، ڈاکٹر کے این کرل جیسے لوگ تھے جن میں بعض سائنس کے شعبوں کے ماہر تھے، بعض اقتصادیات کے اور بعض مصوری اور موسیقی کے۔

حلقۂ احباب کے جلسے باقاعدگی سے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ہوتے رہے۔ میں اس وقت تک افسانے چھوڑ کر ایک خاص قسم کے ذاتی اور نجی انداز کے مضامین لکھنے لگا تھا ان میں بڑی جذباتیت، بڑا رکھ رکھاؤ اور بڑی رقت ہوتی تھی۔ یہ مضامین پہلی بار ادبی دنیا لاہور میں چھپے گئے اور مولانا صلاح الدین احمد نے نہایت ندرت دار تعریفی کلمات کے ساتھ چھاپے۔ میرے مضمون کا عنوان تھا "نیا سال" دوسرا تھا "تب دل بے تاب ٹھہر"۔ لیکن جس نے مجھے سنجیدگی سے تنقیدی مضامین لکھنے پر مائل کیا وہ دو اثرات تھے ایک حلقۂ احباب دوسرا سید احتشام حسین۔

احتشام صاحب ۱۹۴۲ء ہی سے میرے استاد تھے۔ احتشام صاحب کے تبحر علمی کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ انھوں نے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ اردو ادب کا مطالعہ دنیا کے دوسرے علوم کی مبادیات کے علم کے بغیر خاطر خواہ طور پر نہیں ہو سکتا۔ اپنی اس دور کی زندگی کے تمام بکھراؤ اور انتشار کے باوجود میں نے مختلف علوم و فنون پر ابتدائی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انگریزی سے خاص شغف پیدا ہوا اور نفسیات، فلسفہ، عمرانیات، فنون لطیفہ، جمالیات، خصوصاً ادب، تنقید، اقتصادیات اور تاریخ عالم کا مطالعہ تیزی سے شروع کیا۔ اسی سے یہ شوق پیدا ہوا کہ اردو ادب کا مطالعہ زندگی اور عالمی ادب کے اس وسیع ترین تناظر میں کیا جائے۔ یہ ایک ایسی آرزو ہے جو میری تنقیدی کوششوں میں ایک موج تہ نشین کی طرح ہمیشہ موجود رہی ہے۔

اگر میں ادبی زندگی پر اثر انداز ہونے والی چار اہم ترین شخصیتوں کا نام لوں تو ان میں نصیر حیدر، مجاز، احتشام صاحب اور سرور صاحب ہی شامل ہوں گے۔ احتشام صاحب کا اثر ان میں سب سے زیادہ دیرپا تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ اس پورے دور میں بھی مطالعہ اور محنت کی عادت قائم رکھنے میں انہیں کے اثر کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ وہ صحیح معنی میں میرے رفیق، مفکر اور رہنما تھے۔ گو میں ان کے سیاسی اور ادبی نظریات سے کبھی بھی سو فیصدی متفق نہ ہو سکا مگر ان کی وسعت نظر، ان کی بصیرت، اور ان کی تازگی فکر نے مجھے متاثر کیا۔

۱۹۴۶ء ختم ہونے سے پہلے میں ایم اے کر چکا تھا۔ آل احمد سرور اس کے کچھ مہینے بعد ہی ریڈر ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے برابر ان کے مکان پر ہوتے تھے میں باقاعدہ تنقیدی مضامین لکھنے لگا تھا۔ مرثیہ خوانی کا اثر مرثیہ گوئی پر میرا مقالہ رسالہ اردو میں شائع ہو چکا تھا۔ نگار میں بھی چند مضامین چھپے تھے۔ ساحر لدھیانوی کا شاہراہ دہلی سے نکلا اس میں ادب، زندگی اور

سماج کے عنوان سے میرا مقالہ شائع ہوا جسے بعد کو سنہ ۱۹۴۲ء کے منتخب ادب میں بھی جگہ ملی۔

تنقید کی طرف میرے میلان کے دو اسباب تو یہی تھے کہ حلقۂ احباب میں تخلیقی ادب سے زیادہ تنقیدی اور معلوماتی مضامین کو اہمیت دی جاتی تھی اور اس کے سکریٹری کی حیثیت سے کئی بار خود مجھ کو مضامین لکھنے پڑتے تھے۔ دوسرے احتشام صاحب نے مختلف علوم و فنون کی معلومات حاصل کرنے کی جو پیاس پیدا کر دی تھی اس نے جلد مجھے اس طرف راغب کیا کہ جدید علوم کی روشنی میں اپنے ادب کو پرکھنا چاہیے میرے نزدیک تنقید کو زیادہ سے زیادہ معروضی، زیادہ سے زیادہ سائنٹفک اور اصولی ہونا چاہیے۔ چنانچہ جلدی میں نے ان معیاروں اور کسوٹیوں کو دریافت کرنے کی کوشش شروع کر دی جو میرے نزدیک ادب کے معروضی مطالعے میں کام آ سکتی تھیں اس تلاش میں سب سے پہلے مارکس ازم سے سابقہ پڑا۔

مارکس ازم کی بنیادی کتابیں میں نے پوری توجہ سے پڑھیں۔ حتیٰ کہ مارکس کا کیپیٹل بھی لفظاً لفظاً پڑھا۔ فلسفے اور اقتصادیات کی بھی ابتدائی معلومات حاصل کیں۔ لینن، سٹالن، اینگلز، کاڈویل وغیرہ کی تصانیف پڑھیں۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ سماج کا ادب پر اور ادب کا سماج پر گہرا اثر پڑتا ہے مگر مارکس کے ادبی نظریے کی دو باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میرا ایمان تھا کہ ادب اور زندگی کی ہر قدر اضافی نہیں ہو سکتی۔ اس میں انسانی چند قدریں ایسی بھی ہیں جن کی شکل، نوعیت اور اہمیت تبدیل ہو سکتی ہے مگر وہ خود کبھی نہیں مٹتیں کیونکہ ان کا تعلق انسان کے ان حیاتیاتی اور مادی تقاضوں سے ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے مثلاً جسمانی اعتبار سے انسان کو ہمیشہ بھوک اور جنسی تسکین کی ضرورت رہے گی اور روحانی اعتبار سے محبت، رفاقت اور اقتدار کی۔ اب ان چند حیاتیاتی تقاضوں کی بدولت چند روحانی، نفسیاتی، جذباتی اور جمالیاتی اقدار کی ایک میزان کا قائم ہونا قدرتی مسلمات ہو جاتی ہے ادب کا رشتہ انھی میزان اقدار سے ہوتا ہے اسی لئے جب سماج کا سارا (SUPERSTRUCTURE) ڈھانچہ بدل جاتا ہے ایک زمانے کا پیدا کردہ ادب صدیوں بعد اور اپنے وطن کی سرحدوں سے بہت دور بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے اور دوسرے قارئین سے جمالیاتی اور جذباتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس بنیاد پر میں ادب کی چند دائمی اقدار کا قائل تھا اور ہوں مگر میرے نزدیک یہ دائمی اقدار، اخلاق، مذہب یا خیر و شر کی نہیں ہے بلکہ انسان کے حیاتیاتی تقاضوں کی ہیں اسی لئے محبت، نارسائی اور آرزومندی وغیرہ ازل سے آرٹ کا موضوع رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں پھر سیاست میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ عام انتخابات ہو رہے تھے۔ اس زمانے تک کمیونسٹ پارٹی سے سیاسی طور پر بہت قریب ہو چکا تھا گو باقاعدہ رکن نہ تھا۔ صوبائی پارٹی کا مرکز لکھنؤ میں گولہ گنج کے ادام ہاؤس میں تھا۔ یہاں محمود الظفر، سجاد ظہیر، رشید جہاں، مجاز، [illegible]، شفیق نقوی اور دوسرے اشتراکی رہنماؤں کی تقریریں اسی ادام ہاؤس میں سن چکا تھا۔ ان لوگوں کی عجیب و غریب زندگی مجھے بڑی بھلی لگتی تھی۔ کئی بی اے، ایم اے تھے مگر پھٹا جوتا پہنتے تھے اس کمیون کے تنگ چھوٹے چھوٹے کمروں میں ایک ساتھ رہتے تھے کل وقتی کارکن بیس روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ ہندو مسلم سب مل کر ایک ہی قسم کا سستا سا کھانا کھاتے۔ اچھوتوں، مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ گھل مل جاتے۔ ہڑتالوں اور جلوسوں میں پیش پیش رہتے اور لاٹھی گولی کھاتے۔ امین آباد میں ہر شام اخبار بیچتے نکلتے اور جیل خانے کی کوٹھریوں کا ہنستے ہوئے استقبال کرتے تھے۔ ان کے گرد آلود چہروں پر شاید اعتقاد اور ایمان کی روشنی جھلکتی تھی۔ یہ ایثار اور قربانی

کا نور تھا جو فرد کو وقت کی طرح ابدی اور نسیم سحر کی طرح عالم گیر بنا دیتا ہے۔

ادھر قہوہ خانوں، چائے خانوں اور شراب خانوں میں ایک عجیب بے نام قسم کا اضطراب تھا جو سارے سوچنے اور محسوس کرنے والے نوجوانوں کے سینوں میں ہلچل مچا رہا تھا اس اضطراب کا کوئی نام نہیں تھا کوئی واضح سبب بھی نہیں تھا۔ اسی لئے جوش کی /ANARCHY/ مزاج پسند انفرادیت اور فیض کی "تنہائی" ہمیں عزیز تھی سب اپنے سینوں میں گل شدہ شمعوں کی قطار لئے ہوئے تھے۔ سب اس درد سے بے قرار تھے جو گیتوں میں نہیں ڈھلتا تھا جس کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا اسی لئے اس دور کے تقریباً سبھی حساس نوجوان گویا اپنے آپ سے برسرپیکار تھے ان کی ذہانت خود ان کی شخصیتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی تھی، شراب خانے آباد تھے اور شراب گویا اسی اضطراب کا ایک مظہر تھی چائے خانوں میں پراگندہ مو اور پراگندہ دل نوجوان کبھی سیاست پر جھگڑتے، کبھی ادب پر رات کے دو تین بجے تک چائے خانے آباد رہتے۔ امین آباد کی سڑکوں پر پچھلے پہر بھی بے قرار نوجوان ٹہلتے۔ مباحثے، بحثیں، قصے اور نعرے، گویا ہندوستان کے احساس پر عنفوان شباب کا سارا اختلال و ارتعاش پھٹ پڑا تھا۔

سیاست نے اس ارتعاش اور اضطراب کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ ایک طرف مسلم لیگ کا اثر بڑھا اور مذہب نے جس کے خلاف انگارے کی پیدا کردہ نسل اور اس کے نام لیوا برابر جہاد کرتے رہے تھے ایک نہایت زبردست سیاسی اور سماجی اقتدار حاصل کر لیا۔ دوسری طرف خود اشتراکیوں نے مسلم لیگ کے مطالبۂ خود اختیاری کی حمایت کی، فیض پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر ہوئے مجاز پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے لگے۔ گویا میزانِ اقدار ہی الٹ گئی۔ کیا مذہب واقعی قوم کی بنیاد ہو سکتا ہے؟ کیا واقعی ساری بت شکنی محض حماقت تھی؟ کیا بزرگ ہی ٹھیک کہتے تھے؟ کیا ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان ہیں؟ یہ دونوں الگ الگ قومیں ہیں اور ان کے درمیان وہ تہذیبی وراثت موجود نہیں جو انہیں ایک قوم بناتی؟ ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کے ضمیروں میں ایک زبردست تلاطم پیدا ہو گیا۔

اتنے میں ۱۹۴۷ء آ گیا۔ مسوری میں اطلاع ملی کہ ہندوستان تقسیم ہونا طے ہو گیا ہے۔ لوٹتے ہوئے ٹرین میں مجھ سے سوال کیا گیا کیا تم مسلمان ہو؟ اور اس کا جواب اثبات میں سننے پر پورے ڈبے میں ایک خاص قسم کی خاموش کشیدگی پیدا ہو گئی چند روز بعد ہی بلوے شروع ہو گئے۔ پنجاب پھر دلی پھر مسوری۔ دلی میں میرے خالو اور ان کا پورا خاندان قتل ہو گیا ایک بچی زخمی حالت میں وہ لاشوں کے ڈھیر کے نیچے ملی، ایک لڑکا نہ جانے کس طرح بچ نکلا۔ میں مراد آباد میں تھا اس وقت لکھنؤ اور مراد آباد دونوں اس آگ سے محفوظ رہے مگر میرے چاروں طرف خبروں کے انگارے بکھرے ہوئے تھے۔ میرے عزیز، میرے بزرگ، میرے دوست مجھ سے پوچھتے تھے تمہاری متحدہ قومیت کہاں ہے؟ تمہارا مشترکہ کلچر کہاں ہے؟ تمہارے وہ تصورات کہاں ہیں؟ کہ قومیں محض مذہب کی بنیاد پر نہیں بنا کرتیں؟ تم تو کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، تم تو کہتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے خون کے دشمن نہیں ہیں۔ تم تو کانگرس کی وسیع دلی اور فیاضی کے قائل تھے؟ میرے چاروں طرف آگ تھی میں حویلی کے اوپر والے کمرے میں خاموش گھنٹوں سوچا کرتا اور کوئی جواب نہ پاتا۔ کیا جو کچھ میں نے سوچا سمجھا تھا سب غلط تھا؟

اس بحران میں تنہا روشنی اشتراکیت ہی کی تھی۔ اس زمانے میں میں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا تھا۔ فرانسیسی سیکھ رہا

تھا لیکن سیاست نے مجھے ایک بار پھر لکھنؤ میں اپنی طرف کھینچا۔ ڈسٹرکٹ پارٹی کے کیمپوں میں چند ماہ رہا اور وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے مجھے اور بھی متاثر کیا۔ میں صرف اشتراکیت کو ایک عقیدہ، یا فلسفے کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتا تھا نہ کہ عملی سیاست میں کود پڑنے کا ارادہ نہ تھا اس کے علاوہ مارکس ازم کے ادبی نظریوں سے مجھے اب بھی اختلاف تھا میں اب بھی ادب کو داخلی آواز جانتا تھا۔ ہنگامی ادب کا قائل نہ تھا محض پروپیگنڈے کا البتہ فرقہ وارانہ اتحاد، سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات انسان دوستی اور آزاد خیالی کے لئے لڑنا اپنا فرض سمجھتا تھا گویا میری سیاست اشتراکی تھی اور میرے ادبی نظریے غیر اشتراکی۔ اسی لئے جب "ادبی دنیا" میں میرے [illegible] قسم کے مضامین شائع ہوتے تو خود میرا جی مرحوم نے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرا جی سے اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہو سکا ایسا لگا جیسے ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کانگریس نے رنادیوے کی باغیانہ روش کو اپنایا اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آزاد عوامی حکومتوں کے قیام کا نعرہ دیا گیا اس سے پارٹی میں جہاں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا وہاں تنگ نظری اور عصبیت بھی آئی۔ لوگ مارکسزم کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے۔ میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں پارٹی ممبروں اور ہمدردوں کو مارکس ازم پڑھایا کروں۔ اب میں باقاعدہ ڈسٹرکٹ کیمپوں میں رہنے لگا اور سیاست اور اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری دونوں کام ایک ساتھ چلتے رہے۔ جب بھی مراد آباد آتا تو یہاں بھی مختلف عوامی تنظیموں کی داغ بیل ڈال جاتا مگر اس وقت تک بھی میں نے سیاست کے میدان کو منتخب نہیں کیا تھا میرے واسطے تھوڑی سی فضا اور مستعار رہ گئی تھی۔

میرے لئے یہ زمانہ بڑی پریشانی کا تھا تقسیم ہند کے بعد اردو پڑھانے کے لئے یونیورسٹی میں کوئی جگہ نکلنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میں اپنے لئے سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر چکا تھا اور طبیعت اس طرف رجوع بھی نہیں ہوتی تھی گھر کی حالت بد انتظامی کی وجہ سے سقیم تھی بس ضروری اخراجات چل رہے تھے پی ایچ ڈی کے مکمل کرنے کی کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ہر طرف انتشار تھا۔ گاندھی جی شہید ہوئے تو اچانک پھر وہی سوال ذہن میں ابھر آیا کیا نیکی، راست بازی، رواداری، انسان دوستی سب دھوکا ہے۔ کیا دنیا صرف نفسا نفسی کے لئے ہی ہے؟ کیا یہاں انسان محض فرقہ پرست، خود پرست اور کنبہ پرور ہی بن کر زندہ رہ سکتا ہے؟ جو شفقت اور ایثار ہی زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار ہیں؟ حقیقتیں ناگوار اور تلخ حقیقتیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن لیکن دل کے کسی کونے سے کوئی پکارتا تھا کہ یہ حقیقتیں نہیں ہیں یہ صرف ہنگامی اور اضافی ہیں۔ حقیقت زیر تعمیر ہے۔

اس تذبذب اور بے یقینی کے دور میں میں کمیونسٹ پارٹی سے اور زیادہ قریب ہوا اس کا عملی کارکن بن گیا مگر خیال یہی تھا کہ یہ میرا میدان نہیں ہے انقلاب آ جائے تو پھر کسی گوشے میں بیٹھ کر لکھوں پڑھوں گا۔ ہندوستان کی ریلوے ہڑتال کی آواز جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور بہتوں کا خیال تھا کہ ۱۹۱۷ء یا ۱۹۰۵ء کے روس کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ ۹ مارچ کی شام کو عجیب صورت حال تھی۔ ہم میں سے ہر شخص صبح قیامت کا انتظار کر رہا تھا۔ رات بھر ہم لوگ اپنے دوستوں کے ہاں چھپے پڑے رہے۔ اجنبی گھروں میں، ریل کے کوارٹروں میں، جھگیوں یا گھروں کے پیچھے والے جنگلوں میں۔ صبح کو معلوم ہوا کہ کہیں بھی ہڑتال نہیں ہوئی گویا اشتراکی سیاست محض ہوائی قلعے بنا رہی تھی!

زیادہ تر کارکن اب بھی روپوش تھے دو چار شام تک گرفتار ہوئے کسی نے کہا اخبار شوالہ پریس نے خبریں نہیں چھاپیں کسی نے کہا کہ [illegible]

کی گئی تھی، کسی نے ٹروٹسکسٹوں کو الزام دیا مگر حقیقت اپنی جگہ تھی۔ میں نے اس وقت کہا تھا کہ اگر مارکس ازم سائنس ہے تو ہندوستانی اشتراکیوں کی سیاسی پالیسی صحیح نہیں۔ روس یا چین کی رشتے علم نامہ آیا۔ لینن کی کتاب آپ "کیا کرنا چاہئے" پڑھ ہی جائیے۔ بہرحال ہندوستان میں کہیں چوک ہوئی ہے اور کام نہیں ہوا۔ الگ کچھ ناکام ہوئی تو ٹروٹسکسٹوں اور خود پارٹی کے اندر غداروں کی سازش سے۔ خرابی صورت حال کی نہیں ہماری کوششوں کی ہے۔ میں نے لینن کی کتاب "بائیں بازو کی اشتراکیت، ایک طفلانہ بیماری" پڑھنی چاہئے۔ ہم بائیں بازو کے میلان کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھ سے جواب طلب ہوا۔ انڈر گراؤنڈ سیل میں میری طلبی ہوئی۔ مجھے تاکل معطل کیا گیا۔ میرا دل مان گیا، دماغ نہ مانا۔ لیکن کیونکہ میری جذباتی وابستگی ابھی تک اسی پارٹی کے ساتھ تھی اس کے کچھ ہی دن بعد میں ریلوے مزدوروں کی تنظیم کرنے مراد آباد چلا گیا۔ میں اس پورے عرصے میں برابر لکھتا رہا۔ تنقیدی مضامین "شاہراہ" دہلی، "محاذ" بمبئی، "نگار" دہلی اور "علم و دانش" بمبئی میں چھپتے رہے۔

مراد آباد میرے اعصاب پر ایک خاص قسم کا اثر پیدا کرتا ہے جیسے زلزلے سے تباہ شدہ شہر میں کوئی پہلی بار آیا ہو۔ ٹوٹے ہوئے گھر، مٹے ہوئے خاندان، بیمار عورتیں، گندگی اور جہالت میں گھرے ہوئے لوگ۔ تنگ و تاریک زمین جن میں جدید جدید کی کوئی کرن بھی نہیں پہنچی ہے۔ مزدور ہماری داستان کا ہیرو اور رومانی ہیرو تھا۔ مزدوروں سے رابطے نے مجھے بہت کچھ دیا۔ ان میں کم سے کم ایک خاص قسم کے تیور تھے جو زندگی کو بھوگ اور بھگت کر ہی آتے ہیں۔ لیکن ہر مزدور ہیرو نہیں تھا۔ ان میں جاسوس بھی تھے، خوشامدی بھی، مجبور بھی تھے اور دلال بھی۔ ان میں پیسہ جوڑنے والے بھی تھے اور گھٹیا اور ذلیل بھی۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں اچانک مراد آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس سے میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ اس وقت بھی میرے گھر پر میرا ایک ہندو اشتراکی دوست موجود تھا۔ محلے والے ہماری حویلی میں آ گئے تھے۔ لوگ بندوقیں اور ڈنڈے لئے اپنی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے تھے۔ باہر ایک ہجوم ہماری حویلی کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نہ پہرہ دے رہا تھا، نہ ہتھیار اٹھاتا تھا۔ میں کس کو قتل کر سکتا ہوں۔ ہندو میرے بھائی ہیں، ہم قوم ہیں۔ کیا میں بھی قومی منافرت کی آگ میں جل جاؤں؟ کیا اس صورت میں میرے ہندو اشتراکی دوست کی زندگی محفوظ رہے گی۔ اس ہنگامے میں اچانک باہر سے محلے کے پرانے پنڈت جی کی للکار سنائی دی جنہوں نے ہمارے دادا کی خوشحالی کا زمانہ دیکھا تھا۔ "آج کم بختو! کس گھر پر دھاوا بول رہے ہو؟" الفاظ صاف سنائی نہیں دیے مگر ظاہر ہے کہ ہمارے خاندان کی تعریف و توصیف کے ہوں گے۔ ہجوم چند منٹوں میں واپس لوٹ گیا۔

کرفیو اٹھا تو میں نے اور اوم پرکاش نے پارٹی کے پمفلٹ بانٹنے کا کام شروع کیا۔ اچانک ایک دن صبح کو پکڑ لئے گئے اور اس طرح میری جیل یاترا شروع ہوئی۔ جیل کی زندگی نے مجھے صاف صاف دو راہے پر لا کھڑا کر دیا۔ ایک طرف سیاست کے طوفان تھے اس کا سنیاس تھا، دوسری طرف ادب۔ یہ بالکل غلط تھا کہ انقلابی سیاست کے ساتھ سنجیدہ علمی کام بھی چل سکتا ہے۔ میں نے اپنا راستہ منتخب کر لیا۔ سیاست میرا میدان نہیں تھا۔

اسی سال جولائی میں مجھے پہلی نوکری ملی۔ اخبار پائنیر لکھنؤ میں سب ایڈیٹر مقرر ہوا۔ لکھنؤ میں پہلی بار مکان لے کر رہنے لگا۔ تھوڑی سی تنخواہ ملتی تھی مگر بہت معلوم ہوتی تھی۔ انہی دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لئے فیچر اور ڈرامے لکھنے شروع کئے جو بہت مقبول ہوئے۔ "یہ لکھنؤ ہے" کے نام سے ایک فیچر کی دس بارہ قسطیں براڈ کاسٹ ہوئیں۔ ڈرامے لکھنے شروع کئے تو مراد آباد کے اس ٹوٹتے بکھرتے

ڈگمگاتے اور گرتے ہوئے تہذیبی ڈھانچے نے مدتوں ان گرتی ہوئی چھتوں کے نیچے حسین اور ذہین دوشیزائیں تھیں۔ مسکراتے ہوئے پرجوش نوجوان تھے مگر گرتے ہوئے تمدن کی بجلی انہیں جیسے نگل رہی تھی کبھی کبھی وہ ایک باغی کی طرح اپنا سر اٹھاتے تھے مگر کوئی ہاتھ انہیں پھر سے اپنی طرف سے گھسیٹ لیتا تھا۔ اپنے ڈراموں میں میں نے انہی گھرانوں کی تصویریں کھینچیں، نوجوانوں کی تصویر کھینچی۔ وہ نوجوان جو اپنے بچپنے ہی سے چھوٹے چھوٹے خواب دیکھتا ہے مگر بڑے شہر اس کے خوابوں کو بدل دیتے ہیں اس کے ارادوں کو تبدیل کر دیتے ہیں اور اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ جو اسے مل سکتا ہے اسے وہ نہیں چاہتا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ اسے مل نہیں سکتا۔ یہ ڈرامے میری توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئے۔ بار بار کئی اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہوئے، اسٹیج کئے گئے۔ اور اس طرح میں ڈراما نگار بن گیا۔ پھر اس داستان نے طول کھینچا، اسٹیج ڈراموں کا شوق ہوا۔ اس کے بارے میں مطالعہ کیا۔ عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے ایک منڈلی بنائی۔ ہندوستان کے بعض اہم مقامات کا سفر کیا۔ تقریباً ایک ہزار روپیہ اپنے پاس سے خرچ کیا اور اب بھی یہ ارمان دل میں ہے کہ دو چار ایسے اچھے ڈرامے لکھ جاؤں جو اردو کو بین الاقوامی اسٹیج پر آبرو دے سکیں۔

سیاست اور صحافت نے مجھے بہت کچھ دیا۔ کمیونسٹ پارٹی میں رہ کر مجھے "سرد و گرم" عالم کو سمجھنے کی عادت ہو گئی۔ ہر قسم کی مشکلات میں بھی کام کیا جا سکتا ہے اس کا اعتقاد پیدا ہو گیا اور قصہ پرستی اور عمل کا وہ ذوق پیدا ہوا جو اس کے بعد بھی ختم نہیں ہوا چنانچہ میں زندگی کے کسی شعبے میں بھی کاہل نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ انسان دوستی، جمہور دوستی، مظلوموں کی حمایت، مساوات اور سماجی انصاف کے لئے میرے دل میں ہمیشہ ایک زبردست جذباتی لگاؤ موجود رہا اور ہے۔ سیاست نے مجھے ادب میں قومی اور وطنی عناصر کی اہمیت کا بھی احساس دلایا جسے مقامی رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ قومیت اور بین الاقوامی تہذیب کا ایک نازک اور لطیف رشتہ ہے۔ بین الاقوامی تہذیب کو اپنائے بغیر پوری طرح اپنی قومی تہذیب سے بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے اپنے میں مگن رہ کر بین الاقوامی تہذیب کو اپنانے کی کوشش نہیں کی اسی لئے تمدن کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔

صحافت نے مجھے بتایا کہ ایسے کوئی حالات ہو ہی نہیں سکتے جن میں لکھا نہ جا سکے چنانچہ مجھے موڈ کا کبھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ موڈ میرے اختیار میں تھا۔ روٹری مشین کی گھڑگھڑاہٹ، ٹائپ رائٹروں کی کھٹر پٹر، سب ایڈیٹروں کی بات چیت، آنے جانے والوں کا شور و شغب، چپراسیوں کی آمد و رفت، ٹیلیفون کی گھنٹی۔ ان میں سے کوئی بھی میری یکسوئی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ میں نے اس صورت حال میں صرف اپنے صحافتی مضامین ہی نہیں لکھے ہیں، اپنا پورا ناولٹ زلفیں زنجیریں اسی طرح لکھا ہے۔ دوسرے صحافت نے مجھے اپنی انگریزی پر زیادہ توجہ صرف کرنے کا موقع دیا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم و فنون کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کی ضرورت اور زیادہ شدید ہو گئی۔ میرا اپنا کچھ ایسا خیال ہے کہ یہ دونوں ڈسپلن ایسے ہیں جن سے گزرنا ادیبوں کے لئے مفید ہے۔

اسی زمانے میں میں نے فرانسیسی ناول پڑھے جن میں خاص طور پر سیفو، اڈولف، بالزاک اور کارمن کے رومانی قصے تھے پھر گوئٹے کا ناول ورتھر کی داستانِ غم انگریزی میں پڑھا پھر ارونگ اسٹون کا زندگی کی ہوس (HUST OF LIFE) پڑھا۔ ان سب نے مل کر مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں ایک زمانے تک انہی کے اوراق میں سانس لیتا تھا۔ جذبات کا ایک رنگ برنگا طوفان تھا جو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اس طوفان کے لئے میرے پاس جذبات تھے، آرٹ سے لگاؤ تھا صرف ایک موہوم سی کمی تھی اسے میں نے محسوس کیا اور اپنے ذہن و جگر سے ایک

نئی سوانحی داستان لکھنے کی کوشش کی جس پر اب غور کرتا ہوں تو ایک عجیب مضحکہ خیز ٹریجڈی پاتا ہوں۔

اپنی جائے قیام سے ایک روز پائنیر جا رہا تھا راستے میں استاد محترم پروفیسر مسعود حسن رضوی کا تانگہ ملا وہ حسب معمول راستے میں اخبار یا کتاب پڑھتے ہوئے جا رہے تھے میں نے سلام کیا انہوں نے تانگہ رکوایا اور مجھے ہدایت کی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک عارضی لیکچرر شپ خالی ہوتی ہے کل سے آکر اس پر کام شروع کر دوں۔ میں نے پائنیر سے چھ مہینے کی چھٹی لی اور کام شروع کر دیا۔ چھٹی کی یہ مدت بڑھتی رہی۔ میں کچھ مہینے بعد دونوں جگہ کام کرنے لگا اس طرح یہ سلسلہ مارچ [illegible] اپریل تک جاری رہا جس کے بعد اس عارضی جگہ پر مستقل تقرر کا سوال پیدا ہوا۔ مختلف امیدوار میدان میں تھے۔ مسعود صاحب صدر شعبہ تھے۔ آل احمد سرور ریڈر۔ ایک امیدوار نے خاص طور پر سرور صاحب پر بہت زور ڈالا کہ میری حمایت چھوڑ کر ان کے تقرر کی کوشش کریں مگر سرور صاحب نے شدید پامردی سے ان زبردستیوں کا مقابلہ کیا۔ میرا ان کا کوئی رشتہ نہ تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اس سب سے بڑے رشتے کو نبھایا جو ایک ادیب اور ادب کے ایک طالب علم کا ہوتا۔ اس جہاد کے لئے میرے دل میں ان کا ہمیشہ احترام رہے گا۔

آل احمد سرور نے یوں بھی مجھے متاثر کیا اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں وہ ترقی پسندوں سے بہت قریب آگئے تھے ان کے انداز بیان کی دلکشی، ان کی وسعت نظر، ان کا ادبی زاویہ نظر سے گفتگو کرنے کا انداز، ان کا توازن اور سنجیدگی، ان سب نے مجھے متاثر کیا لیکن احتشام اور سرور صاحب کے اثرات میرے لئے ہمیشہ خطرہ بھی رہے ہیں کیونکہ تنقید میں ان کا انداز میرے اپنے انداز نظر اور انداز بیان پر غالب آکر میری انفرادیت کو ختم کر سکتا تھا اس لئے میں نے شعوری طور پر اس اثر کے آگے ہتھیار ڈالنے سے گریز کیا۔

مستقل جگہ پر لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا تقرر نہیں ہوا لیکن اس عارضی جگہ پر کام کرنے سے مجھے ایک بار پھر اردو ادب کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے ترقی پسند تحریک اور مارکسزم کے بارے میں میں نے اپنے خیالات کی ضابطہ بندی کی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ انسان کو اقتصادی خوشحالی، مساوات اور سماجی انصاف سے کوئی محروم نہیں رکھ سکتا اور اس حد تک سوشلزم وقت کی مانگ ہے مگر اس میں انفرادی آزادی، فن اور فنکار کی آزادی، جمالیات کا احترام اور پورے نظام میں ایک ایسی باطنی معنویت کی کمی ہے جو کم سے کم بعض اقدار کو بنیادی، آفاقی اور ابدی قرار دے سکے۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ سوشلزم ضرور آئے گا لیکن اگر سوشلزم فرد کو آزادی نہ دے سکا تو انسان اسی سے بغاوت کر کے جمہوری سوشلزم کی طرف قدم بڑھائے گا، کیونکہ کوئی فرد یا کوئی ادارہ خواہ وہ کتنا ہی جابر اور قاہر کیوں نہ ہو انسانی ضمیر کو ہمیشہ کے لئے غلام نہیں بنا سکتا۔

اردو کی ترقی پسند تحریک پر نظر ڈالی تو ایک یہ خرابی نظر آئی کہ اس کا رشتہ ہماری ادبی روایت سے استوار نہیں کیا گیا۔ دراصل ترقی پسندی بھی اسی جذباتیت کی ایک شکل تھی جس نے رومانی تحریک کو جنم دیا تھا۔ چنانچہ سرسید اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی مدت کی ادبی تحریکات کا مطالعہ شروع کیا اور ارادہ یہ تھا کہ جدید اردو ادب کے عنوان سے ایک پوری کتاب لکھوں گا اس کے دو ابواب لکھے گئے، ایک کا عنوان تھا نیا ادبی شعور جو [illegible] کے منتخب ادب میں چھپا اور دوسرا رومانوی تحریک جو پہلے اردو ادب علی گڑھ میں اور پھر کتابی شکل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے شائع ہوا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی عارضی جگہ ختم ہوئی تو پائنیر میں بھی جگہ ختم ہو چکی تھی میں صرف ان کے ہفتہ وار ایڈیشن کی تیاری میں مدد کرتا تھا آخر پائنیر نے میرے اصرار پر ایک پندرہ روزہ فلمی پرچہ انگریزی میں شائع کرنا شروع کیا جس کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ پرچہ نکلنے لگا اس نے مجھے ایک نئے شعبے سے روشناس کرایا۔ فلمی دنیا تک رسائی ہوئی، موسیقی اور مصوری سے لگاؤ پیدا ہوا اور اس لگاؤ سے میں نے بہت فیض پایا۔ اس زمانے میں میں نے ہندی کی طرف بھی توجہ کی یوں تو ہندی مجھے پہلے بھی آتی تھی مگر اس کی طرف باقاعدہ توجہ کی۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں احتشام صاحب کے امریکہ جانے سے ایک سال کی جگہ پر پھر میرا تقرر ہو گیا۔ اس دوران میں مہلت پا کر میں نے ہندی ادب کی تاریخ کا مسودہ مکمل کر لیا اور چند ماہ بعد اسے انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا۔ خیال یہ تھا کہ کھڑی بولی کے ادبی ذریعہ اظہار کے وسیلے سے شمالی ہند کی ذہنی اور جذباتی روداد کا مطالعہ کیا جائے۔ اس ذریعہ اظہار کی ایک شکل ہندی ادب میں ظاہر ہوئی دوسری اردو ادب میں۔ اس کے لئے ہندی ادب کی تاریخ لکھ کر میں نے راستہ ہموار کیا تھا لیکن کھڑی بولی کی تاریخ لکھنے کا موقع اس کے بعد نہیں مل سکا۔

احتشام صاحب ۱۹۵۳ء میں واپس آ گئے اور ۵۳ء کے اگست میں فلم میل کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ سال بھر میں پھر اسی دوراہے پر کھڑا رہا۔ روزی کے لئے انگریزی اور فلم، اور شوق کے لئے اردو ادب کا مطالعہ۔ محنت بہت کرنی پڑتی تھی صحت خراب رہتی تھی۔ دوست یوں تو بہت تھے، پرانوں میں صرف مجاز اور نسبتاً نئے لوگوں میں کمال احمد صدیقی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کی تنظیم بھی نئے سرے سے کی نوجوان ادیب تیزی سے میری طرف آئے۔ اپنی تمام پریشانیوں اور بے یقینی کے باوجود میں لکھنؤ کے اس دور کو اپنی زندگی کا ایک خوشگوار ترین دور سمجھتا ہوں۔ ۱۹۵۵ء میں فلم میل بند کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پائنیر کے ڈائرکٹروں میں ایک گروہ اس کے اجرا ہی کے خلاف تھا۔ میں بے روزگار ہو گیا۔ بمبئی کا سفر کیا وہاں فلمی دنیا کے اپنے رابطوں سے کام لیا۔ سہراب مودی سے ملاقات ہوئی۔ چیتن آنند اور دیو آنند سے گفتگو ہوئی۔ میں نے طے کر لیا کہ فلم کے ذریعے روزی کمانا ہے۔ جولائی کے اواخر یا اگست کے شروع میں بمبئی سے واپس لکھنؤ پہنچا۔ بمبئی سے ایک سوغات لے کر گیا تھا۔ یہاں کی کھچڑی زبان کے میں نے تفصیلی نوٹس بنائے تھے۔ ایرانی ہوٹلوں میں بیٹھ کر ملاحوں کی بستیوں میں گھوم کر میں نے یہ سوغات جمع کی تھی۔ جب آل انڈیا ریڈیو نے ڈرامہ کمپٹیشن کا اعلان کیا تو میں نے اسی زبان میں ایک ڈرامہ پیسہ اور پرچھائیں کے عنوان سے لکھا جسے اردو ڈراموں میں پانچ سو روپیہ کا پہلا انعام ملا۔

میرا چھوٹا بھائی ان دنوں میرے ساتھ تھا اور لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا اس کے لئے رہنے کا کوئی معقول انتظام کر کے بمبئی جانے کا قصد تھا۔ سرور صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جگہ نکلی ہے تم بھی درخواست بھیج دو۔ میں نے بے دلی سے درخواست بھیج دی ۱۵ اگست کو میرا تقرر ہو گیا اور ایک ماہ بعد میں نے علی گڑھ کے لئے رخت سفر باندھا۔ وہی علی گڑھ جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی بچپن سے اس قدر ارمان کیا تھا۔

اس سے ایک سال قبل ایک اور قابل ذکر واقعہ ہوا اور وہ تھی ۱۹۵۳ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی کانفرنس۔ اسٹالن کا انتقال ہو چکا تھا۔ کانفرنس پر اس صدمے کا سخت اثر تھا لیکن اس سے دو سال قبل انتہا کے دور کی غلطیوں نے ادیبوں کو

سخت بد دل کر دیا تھا ہر طرف جتھے بندی اور گروپ بندی کی شکایت تھی، عصبیت اور تنگ نظری کا شکوہ تھا مگر جب کانفرنس شروع ہوئی تو رام بلاس شرما سکریٹری کی طرف سے ایک رپورٹ ڈیلی گیٹ حضرات کو دی گئی جس میں اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے بجائے اپنی فرضی کامیابیوں کے افسانے ادیبانہ انداز سے بیان کئے گئے تھے۔ اس رپورٹ سے بے چینی تھی مگر کوئی پہل کرنا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ رپورٹ جب کھلے اجلاس میں پیش ہوئی اور مباحثے کی دعوت دی گئی تو کافی دیر تک خاموشی رہی۔ ہر ایک توقع کرتا تھا کہ اس کے دل کی بات کوئی دوسرا کہے گا۔ آخر کار میں نے مباحثے کا آغاز کیا اور ترقی پسند تحریک کی گزشتہ تنگ نظری، عصبیت اور دوسری غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے بارہ ڈیلی گیٹ بولے اور ان میں سے صرف ایک مقرر نے رپورٹ کی حمایت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو رہی تھی اور اس کے بعد وہ بالکل ہی ٹوٹ اور بکھر گئی۔

لیکن ترقی پسندوں کو برا بھلا کہہ کر جن ادیبوں نے سرے سے ادب کی سماجی ذمہ داری ہی سے انکار کر دیا ان کے فکری افلاس اور بے راہ روی کو بھی نعم البدل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ترقی پسند ادیب ادب کے ذریعے سے سماجی شعور کی جمالیاتی طور پر عکاسی نہ کر سکے تو دراصل یہ ان کی کمزوری ہے پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی ترقی پسند ادیب کو اس میں کسی قسم کی کامیابی حاصل ہی نہ ہوئی ہو، دشواری یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک نے اپنے سوچنے سمجھنے کی باگ چند غیر ادبی اجارہ داروں کے ہاتھ میں دے دی تھی اور سماجی شعور کو محض سستے تک محدود کر دیا تھا لیکن ان کی غلطیوں کا تدارک اسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ادب کو محض نجی ڈائری بنا دیا جائے یا اسے محض مریضانہ ہوس اور داخلی غم پرستی کا آئینہ دار بنا دیا جائے۔ ادب کو بقول [illegible] بھی رنگوں کی قوس قزح ہونی چاہئے اس میں سیاہ رنگ بھی شامل ہوگا اور ادیب کو حق ہے کہ ان میں سے جو رنگ چاہے اختیار کرے مگر ادب اور خاص طور پر ہمارا ادب اپنی سماجی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک خطرناک میلان کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں ترقی پسندی کے خلاف اس غلط ردعمل پر صدائے احتجاج بلند کی تھی آج وہ ردعمل پاکستان میں خصوصاً اور جدید ترین اردو ادب میں عموماً ایک مریضانہ رُخ اختیار کرتا جا رہا ہے۔

علی گڑھ میرے لئے نئی جگہ تھی۔ پہلی بار میں چھوٹے سے شہر میں رہنے کا تجربہ کر رہا تھا۔ علی گڑھ میں مجھے صرف تین چیزیں متاثر کر سکیں یہاں کی بے پناہ ہوش ربا چاندنی اور رشید احمد صدیقی صاحب کے جملے اور ذاکر صاحب کی دل نواز شخصیت۔ علی گڑھ چھوٹی جگہ ہے مجھے بھی اس کا احساس تھا اب بھی اس کی خامی ہے۔ یہاں میری شخصیت کے وہ گوشے سکڑ گئے جن کی میں نے بڑی محنت سے تربیت کی تھی یہاں مصوری کا چرچا تھا نہ موسیقی کا، نہ ڈرامے کا ذکر تھا۔ قہوہ خانے کی محفلیں تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علی گڑھ علیگ اور غیر علیگ برادری میں تقسیم ہو گیا تھا اور دونوں برادریوں کی باہمی اور [illegible] اخوت بھی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھی اس نے لوگوں کے دلوں کو بہت چھوٹا کر دیا اس میں سوائے ان کے اور کسی کی گذر نہ تھی۔ اس پر مستزاد وہاں کی سیاست۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ہر وقت ایک دوسرے کی برائی کرتے اور اس سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ پھر ستم یہ تھا کہ ہندوستان کی عام فضا سے علی گڑھ بہت کچھ کٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ ایک خصوصی جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس بناوٹی فضا میں لوگ ایک بناوٹی زندگی گذار رہے تھے۔

میں علی گڑھ میں بہت کچھ خانہ نشین ہو گیا یہاں مجھے روزی ملی ادبی اور ذہنی سکون نہیں ملا۔ تھوڑے دن بعد سرور صاحب بھی لکھنؤ سے یہیں آ گئے مگر ہم سب لکھنؤ کی فضا کے دو چار ذرے بھی یہاں نہیں لا سکے۔ یہاں کے سیاست بازوں نے چند ہی سال میں میرے

ان کے درمیان بھی ایک دیوار قہقہہ حائل کر دی۔ میری تنہائی اب مکمل تھی لیکن اس تنہائی میں یکسوئی اور رومانوی شورش نے دامن کھینچا۔ کتابیں میری رفیق تھیں اور عظیم مصنف میرے دمساز۔ اس نو سالہ قیام میں میں برابر لکھتا رہا ہوں ـــــ خیال لکھنوی، زلفیں زنجیریں، ہندی ادب کی تاریخ اور اردو ادب میں رومانوی تحریک "زیر لکھنؤ کے دوران قیام میں لکھی گئی تھیں۔ ادبی تنقید علی گڑھ آنے سے قبل چھپی تھی۔ لیکن علی گڑھ کے دوران قیام میں نے شعر و نغمہ، سوائے تنقیدی مراسلات، میرے اسٹیج ڈرامے، پیسہ اور پرچھائیں، "نئے ڈرامے، [illegible] (ترجمہ) اور ہندی میں اقبال پر ایک کتابچہ تصنیف اور شائع کئے۔ اردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر کے عنوان سے ایک تصنیف زیر طبع ہے شاید مارچ تک چھپ جائے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۶ء میں شادی کر لی اور ایک لڑکا جاوید اور ایک لڑکی ثمینہ بھی میری تخلیقات میں شامل ہیں۔

آج ۱۰ جنوری ۱۹۶۲ء سے پچھلے سال ۱۰ جولائی کو میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گیا ہوں۔ انسٹیٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ ایوننگ اسٹڈیز میں بحیثیت ریڈر سال بھر کی عارضی جگہ پر کام کر رہا ہوں مگر دہلی آکر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لکھنؤ کے کھوئے ہوئے لمحات اور امکانات گویا دوبارہ مل گئے ہوں یہاں کی تہذیبی زندگی کی ہما ہمی مجھے پسند ہے۔ اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ مستقبل کا سفید اور سادہ پردہ سامنے آ گیا۔

پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ساحل پر سیپیوں اور گھونگھوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں ساحل کی ریت پر قدموں کے نشان ہیں آڑے ترچھے، ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے اس جگہ تک آئے ہیں جہاں اس وقت کھڑا ہوں۔ گرد سفر پیشانی پر ہے مگر اتنا جانتا ہوں کہ اگر مجھے زندگی کی دولت دوبارہ ملے تو بھی شاید کم و بیش وہ دولت اسی طرح لٹے شاید وہ قیمتی لمحات بھی اسی طرح سوز و ساز درد و داغ جستجو و آرزو میں صرف ہوں۔!

شکیلہ اختر

"جگ بیتی بہت سنا چکی، مگر آج آپ بیتی سناتے ہوئے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے بیتے دنوں کے دھندلکوں میں نقش پا ڈھونڈھ رہی ہوں، جن کے اتھاہ سمندر میں زندگی کی کتنی لہریں ڈوب ڈوب کر ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہیں اور اب ان مٹتے اور جھلکتے نقوش میں سے دل کی دھڑکتی ہوئی دھڑکنوں کو تلاش کرنا اور انھیں پھر سے محسوس کرنا کتنا کٹھن ہے۔

گزری ہوئی زندگی میں کتنے پیارے پیارے پھول کھلے ہیں اور حسین، رنگ برنگی کلیاں چٹکی ہیں، قہقہے گونجے اور مسکراہٹیں بکھری ہیں۔ بہاروں پہ بہاریں بھی چھائی رہی ہیں اور ہم اپنی معصوم نگاہوں سے دنیا کو بڑا خوبصورت، رنگین اور پربہار سمجھتے ہوئے بچپن کے گھروندوں میں کھیلتے رہے اور چلتے [illegible] کانٹے چبھتے رہے پر جب ہمارے ننھے ننھے قدموں کے نشان ابھر آتے تھے تو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا کتنا اچھا لگتا تھا، مگر آج پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں نہ ہمت ہے نہ جرأت!

بچپن کا دور بڑے پیار اور محبت، لاڈ اور چاؤ سے گزر گیا۔ قصبے کی پرسکون زندگی، زمیندار گھرانے کا رعب داب، گھر میں چیزوں کی افراط، اتنے نوکر چاکر کہ خاندان در خاندان چاکری کرتے چلے آتے تھے، ساون کی میٹھی پھواریں، رس کے بھرے بھرے [illegible] اور [illegible] لگے تھے کہ ہم سارے بھائی بہن شہر کی درسگاہوں اور ہنگاموں سے دور بڑھتے چلے گئے۔

مہاتما بودھ بھی گیا میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے نروان پا گیا تھا، وہی جگہ بودھ گیا کہلاتی ہے اور یہی بودھ دھرم کا کعبہ بن گیا ہے۔ اسی گیا ضلع میں ہمارا ایک خوبصورت سا قصبہ اروَل بھی آباد ہے جو قلمی آم کے باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ جہاں جا بجا تاڑوں کی بے شمار قطاریں ہیں، شیشم اور نیم کے جھنڈوں میں گھرا ہوا اروَل بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ مغرب کی طرف سون ندی کا حسن چھلکتا ہے، جس کے نیلے نیلے رنگ کے پانی پر لطیف ہوائیں سرسراتی ہوئی گنگناتی ہیں اور غروب ہوتا ہوا سورج اسی کی گود میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ جہاں مشرق کی طرف دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے ہو کر ابھرتے ہوئے آفتاب کی شفق سے نہر کا پانی گلنار ہو اٹھتا ہے۔ چاندنی راتوں میں نہر کے کنارے جب شیشم کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر آتی تھی تو ایسے وقت میں آنکھ مچولی کھیلنے میں بڑا لطف آتا تھا، مگر میری یہ [illegible] اور کھیلنے کی پابندی اپنے گاؤں اور زمیندار گھرانوں کی اونچی ناک اور اس کی پابندیاں ہمیشہ گلا گھونٹتی رہیں۔ آج بھی انھی ناتمام حسرتوں کی یاد میرے دل کی ناآسودہ داستانیں ہیں۔

دس سال کی عمر میں [illegible] کے مکتب سے قرآن شریف اور اردو کی دوسری کتاب پڑھ کر پردے میں بٹھا دی گئی۔ اماں جان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ دنیا بھر کے پرچے اور اخبار گھر میں آتے تھے۔ اماں جان کبھی ابا جان کو افسانے پڑھ کر سنایا کرتیں اور کبھی جاڑے کی راتوں میں لیمپ کی تیز روشنی میں ابا جان کوئی افسانہ اماں کو سنایا کرتے تھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، اماں جان سے ہمیشہ بڑی محبت سے [illegible] کے قصے سنا کرتی تھی، [illegible]

رابعہ پنہاں، جنھیں جمال بریلوی اور پھر بعد میں حجاب اسمٰعیل کے تذکرے، اماں اس رنگ میں کیا کرتی تھیں جیسے اماں جان انھی لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہی ہوں۔ اماں اور ابا جان کی اسی ادبی دلچسپی نے ہم سب بہن بھائیوں اور گھر کی ساری فضا کو متاثر کیا تھا۔ چونکہ میں گھر کی بڑی لڑکی تھی اور میرے بعد رضیہ، رعنا اسی لیے والدین کا یہ ادبی ذوق ہم دونوں کے حصے میں برابر برابر رہا۔

آبائی مکان بستی کے اندر تھا۔ ابا جان کی کوٹھی جب گاؤں سے باہر تیار ہو گئی۔ تب ہم لوگوں نے دیہات میں رہتے ہوئے بھی اپنے لیے تھوڑی سی رونق کا سامان مہیا کر لیا تھا۔ ٹینس اور بیڈمنٹن کے لان بنے ہوئے تھے۔ جاڑے میں گل داؤدی کے گملوں کی قطاریں سیڑھیوں پر سجی رہتی تھیں۔ قسم قسم کے کروٹن کلکتے سے منگائے جاتے تھے۔ لان میں سبزہ مخمل کی بساط بچھاتی اور بائیں جانب باغ میں آم سے لدے ہوئے درختوں کو ہلا ہلا کر ہم لوگ پکے ہوئے آم کھایا کرتے۔ تالاب میں ہم مچھلیوں کو تیرتے ہوئے دیکھتے اور تالاب کے پیچھے ریت کے اونچے ٹیلوں پر سرکنڈوں کے ریشمی پھولوں کی بہار چھائی رہتی اور ان سرخ پھولوں کی اوٹ سے سون کا نیلا پانی جھلک اٹھتا۔

نئی کوٹھی کا نام "پام ولا" تھا جہاں سیکڑوں پام کی قطاریں کھڑی تھیں۔ حدِ نظر دھان کی ہریالی پھیلتی چلی جاتی تھی۔ اور جگہ جگہ آم کے باغوں کا گہرا کاہی جھنڈ فضاؤں میں سرمہ آمیز نقش ابھرتا چلا جاتا۔

پرانے مکان سے اس نئے گھر میں آ کر ہم لوگوں کو ایک جنت مل گئی تھی مگر اس مکان میں آنے سے چند مہینے قبل میری تیسری بہن نسیمہ اس گھر میں آنے کی حسرت لیے ناگہاں دنیا سے ختم ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی جنت پا کر بھی ہم ایک ساتھی کے بچھڑنے کے غم سے بے چین تھے۔ اور ہر آن اس نئے گھر کے در و دیوار سے اماں جان کی سسکیاں اور کراہیں ٹکراتی رہتی تھیں۔

اختر صاحب ہم لوگوں کی دنیا میں کیا آئے کہ جیسے ایک نئی دنیا مل گئی۔ اختر صاحب شعر کہتے، مصوری کرتے اور افسانے لکھتے رہتے تھے اور جب ان کا جی گھبراتا تو مجھے اقبال کی شاعری کی اونچ نیچ سمجھانے لگ جاتے۔

مظفر دادا کے مکتب میں جس لڑکی نے اردو کی دوسری کتاب پڑھ کر سمجھ لیا ہو کہ میں اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہوں۔ اس کی سمجھ میں اقبال کی شاعری کیا آتی؟ وہ تو خدا بھلا کرے والدین کا جنھوں نے اتنے ادبی ذخیرے جمع کر رکھے تھے کہ میری لاج رہ گئی۔

اختر صاحب نے شاید طے کر لیا تھا کہ "پام ولا" کا حق پورے طور پر ادا کر کے رہوں گا۔ اسی لیے انھوں نے ازراہِ کرم مجھ کو اپنی شریکِ زندگی بنا لیا۔ ابھی چند ہی مہینے چین سے گزرے تھے کہ وہ اتنے شدید طور پر بیمار ہوئے کہ اٹکی سینی ٹوریم جانے کی نوبت آ گئی۔ میں ساتھ گئی۔ سینی ٹوریم سے دو میل دور ایک غنیمت سا اجڑا ہوا مکان سر چھپانے کو مل گیا۔

میں گھنٹوں سینی ٹوریم کے سامنے ویران باغ میں بیٹھی رہتی اور بے اختیاری طور پر میری زبان پر شعر آتے چلے جاتے۔

رات کی تنہائیاں ہیں اور ملگجی چاندنی چاند کی کرنوں سے شرماتے چلے آتے ہو تم
پیچھے پیچھے پاؤں کی آہٹ چھپاتے دیکھئے اپنے سائے سے بھی گھبراتے چلے آتے ہو تم

سینی ٹوریم کی پابندیوں کو آج بھی جب یاد کرتی ہوں تو دل لرز اٹھتا ہے۔ دو میل پیدل چل کر آتی تھی اور جیسے آتے ہی منٹوں میں ریسٹ پیریڈ کی گھنٹیاں گونجنے لگتی تھیں۔ نرسیں مجھے پہچان چکی تھیں۔ میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں سے ان کا بھی دل دکھ جاتا تھا اسی لیے وہ گیارہ بجتے دیکھ کر اپنی گھڑی لیے میرے پاس آتیں اور بڑے پیار سے کہتیں "بھابی۔ اب ذرا جلدی کیا کیجیے۔"

ٹی بی سینی ٹوریم میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اِن بی بی جی سے ہمدردی نہ ہو۔ نرسیں تو آکے چہکنے لگتی تھیں کہ جیسے وہ میری سہیلیاں ہوں۔ فیملی وارڈ میں بھی۔ کبھی میری دوست بن چکی تھیں۔ جو مریض عورت جتنی زیادہ پوزیٹو ہوتی تھی اس کے پاس رہتی۔ میرا دل اپنی زندگی سے اتنا بیزار ہو چکا تھا اپنی صحت کا بوجھ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مسز ٹیشوری میری بڑی گہری دوست بن چکی تھیں۔ ——— وہ سینی ٹوریم میں سب سے زیادہ خطرناک طور پر بیمار تھیں، لیکن میں ساری دوپہریں انھی کے ساتھ گزارتی تھی۔ انھی کے ساتھ کھاتی۔ انھی کے گلاس میں پانی پیتی۔ نرس ایشری یا ڈولی جب کبھی اپنی ڈیوٹی پر آتیں تو مجھے گھسیٹ کر وہاں سے لے جاتیں۔ بھابی۔ تو مر جائے گی۔ سنا؟ تو مر جائے گی تو بچہ کیسے اچھا ہو گا۔ ؟ بول۔ ؟ پھر تو جان بوجھ کر یہ زہر کیوں کھا رہی ہے۔

میرا افسانہ "گھر ویرانہ" میری اپنی کہانی ہے، سینی ٹوریم میں بیتے دنوں کی یادگار !

ڈیڑھ سال ٹی بی سینی ٹوریم میں رہ کر اختر صاحب واپس آگئے، جیسے نئی زندگی پانے کی انتہائی خوشی تھی۔ دل پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ اب تو دو لڑکیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ میرے منجھلے چچا جان نوری صاحب ریٹائر ہو کر "ہام ولا" کے قریب ہی اپنی نئی کوٹھی نیر ہاؤس میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کی پانچوں لڑکیاں ہم سب بہنوں سے مل کر ایک اودھم مچائے رہتی تھیں۔ اختر صاحب کے سینی ٹوریم جانے سے پہلے ہی یہ رونق وارد ہو چکی تھی اور ساری ساری رات بیت بازی میں گزار کر ہم ساری بہنیں شاعرہ بن چکی تھیں۔ میری منجھلی بہن رضیہ رحمان بڑی جذباتی شاعرہ تھی۔ منجھلے چچا کی دو لڑکیاں نفیسہ ورانا اور نسیمہ سوز بڑی اچھی شاعرہ نکلیں، پتہ نہیں، ساون کے میٹھے پانی میں وہ کونسا جادو تھا جس نے بیت بازی کی ہار جیت میں ہمیں یہ تین اچھی شاعرہ عطا کر دی تھیں۔

ٹی بی سے واپس آ کر اختر صاحب ایک نئے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ رومیٹزم کا درد اور تیز بخار ایسا تکلیف دہ کہ خدا کی پناہ، اچانک اٹھائیس پونڈ وزن گر گیا، اور اس کے ساتھ ہی دل پر بھی ہلکا سا اثر پڑ چکا تھا۔ پٹنہ کے ہوسپٹل میں داخل کرا کے جو علاج کرایا گیا تو دل کی کمزوری دور کرنے کے لیے تین مہینے تک بیٹھنے اٹھنے تک کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جس صبر و استقلال سے اختر صاحب اپنی بیماریوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

خدا خدا کر کے بیماریاں ختم ہوئیں اور [illegible] میں وہ پٹنہ کالج کے لیکچرر مقرر ہوئے تب سے مستقل پٹنہ کی رہائش ہو گئی ہے، اور اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے ہوں۔ سون ندی کے خاموش کنارے گنگا کے پُر رونق کناروں کی زد میں آ گئے ہوں، زندگی کے اب نئے ہنگامے اور نئی الجھنیں بڑھ گئی ہیں، مہینوں بعد جب کبھی اداس ہوتی ہوں تو صحراؤں کی سی ویرانی ہوتی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے بچے بہت اچھے لگتے تھے، جس گھر میں بچے زیادہ ہوتے وہ گھر مجھ کو بہت پیارا لگتا تھا۔ جب اپنی پریشانیاں دور ہوئیں تب مجھے ہوش آیا کہ میں اب تک اکیلی کی اکیلی ہی ہوں۔ اور یہ سُونا پن پھر کبھی میری زندگی سے دور نہ ہو سکا تکلیف دہ ہے مقدر!

اختر صاحب کی ملازمت کے بعد میرا گھر میرے اور ان کے بھائی بہن کے بچوں کے لیے ہوسٹل بن گیا۔ اور اب جبکہ وہ لوگ خدا کے فضل سے بڑے بڑے عہدوں پر ہیں تو بھی ان کے بچے میرے ہی پاس رہ کر کانونٹ اور سنٹ زیویرز میں پڑھتے ہیں۔

شروع شروع میں صوفیہ اور نفیس کے دونوں بچے شمی اور نجمی میرے پاس پڑھنے کے لیے آئے، صوفیہ میری تیسری بہن ہے جس کی شادی اختر صاحب کے بھائی نفیس سے ہوئی ہے۔ شمی چھ سال کا تھا اور نجمی چار سال کا۔ شمی کا بچپن گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت تھا اور نجمی صاف صندل رنگ کا بڑے حسین نقش و نگار والا بچہ تھا، اور شمی بہت ذہین، محبت کرنے والا تھا۔ رضیہ کا بچہ ممتاز بھی انھی دنوں سینٹ زیویرز میں پڑھنے کے لئے آگیا تھا۔ ممتاز بیحد خوبصورت سفید

رنگت والا بچہ تھا اور نمی کا ہم سن۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں نے کبھی مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اپنے ماں باپ سے جدا ہیں۔

نمی کا سفید رنگ دیکھ کر گھر کے لوگ بجی کی سانولی رنگت پر اسے چھیڑا کرتے تھے۔ اس کی بچپن کی ایک ولایتی گڑیا تھی جس کا پینٹ سیاہ ہو گیا تھا، چونکہ یہی صفدر ہمیشہ بجی کو چھیڑتے کہ دیکھو تمہاری گڑیا بھی تمہارے ہی رنگ کی ہے۔ ایک دن ہم سب بہنیں برآمدے میں بیٹھی تھیں اتوار کی وجہ سے بچے گھر پر تھے، صفدر کسی کام سے اندر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بجی اپنی اسی ولایتی گڑیا کو برآمدے کی سیڑھیوں پر بٹھا کر اسے اپنے پیروں سے ٹھوکریں مار رہا ہے اتنا چھوٹا سا بچہ اور احساس کی یہ حد!

گھر کا ہر آدمی بجی کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔ مگر اس کو اس بات کا احساس تھا کہ میرا رنگ نمی جیسا نہیں ہے۔ صوفیہ ان دنوں چھپرہ میں تھیں بجی دو دن کی چھٹیوں میں بھی گھر چلے جاتے تھے، صوفیہ پٹنہ جاتیں تب انھوں نے بتایا کہ بجی جب پٹنہ واپس آگئے تو ایک دن الماری کے نیچے سے کریم کی بہت سی خالی شیشیاں نکلیں مرتبان دیکھا تو ساری ٹکیاں غائب تھیں پتہ چلا کہ بجی میاں نے ساری ٹکیاں اپنے چہرے پر گھس ڈالی تھیں۔

اسکول سے واپس آکر نمی اپنے کمرے میں چلا جاتا، اور بجی مجھ سے پیار سے میری گردن میں جھول جاتا، آپا، آپا آپ کے لیے قربانی لایا ہوں۔ بجی ہمیشہ نمی کی نقلیں اتارا کرتا تھا، نمی کیسے شرماتا ہے، کیسے باتیں کرتا ہے، اور نمی اس کو نقلیں کرتا ہوا دیکھ کر میرے پیچھے چھپ جاتا، ان ہی بھائیوں کے بیچ میں صفدر کی بڑی بچی یاسمین بھی آگئی تھی ننھی سی بچی جو بجی سے بھی چھوٹی تھی۔

بچوں کو پٹنہ میں رہتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے ننھے پیارے پیارے بچوں کو پاکر میں یہ بھول گئی تھی کہ یہ مانگے کے اجالے ہیں۔ اور میری جھولی خالی ہے۔

بچوں سے مشغولیت نے میری زندگی کی بہت بڑی کمی کو دور کر دیا تھا، میں انھیں اسکول بھیجتی، پھر ان کا انتظار کرتی، جب وہ آجاتے تب مطمئن ہوتی طرح طرح کے عذر کرکے اور دوست مجھے پریشان کیے رکھتے جب ذرا دیر ہو جاتی تو میں دیوانی سی ہو جاتی۔

میں نے اپنے خدا سے کبھی شکوہ نہیں کیا کہ میں اکیلی کیوں رہ گئی ہوں بلکہ اس بھری دنیا میں جہاں گلی گلی ڈھیروں ننھے چھوٹے ہوں میں نے سب کے ننھے اپنے جگر کا ٹکڑا بنا کے رکھ لیے۔ ننھے مرے میں رضیہ ہنسانی کی بچی شیریں بھی جو سب بھائیوں سے بڑی تھی گرد اسکول میں آگئی تھی، رضیہ کا بچہ ممی فی، بجی اپنی چھوٹی سی بہن یاسمین سے بہت پیار کرتے تھے ان سارے بچوں نے میرے گھر کو اپنا گھر بنا لیا۔

شنٹو کی گرمی آگئی تھی، اور نانک اسکول کی وجہ سے بچے گیارہ بجے تک گھر واپس آجاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بجی نے سب کی نقلیں اتارنی شروع کیں نمی تو منہ بند کیے ان کے ساتھ کام سیکھ رہے تھے، ان کی کافی شادی ہو رہی تھی بجی کو اچانک اپنی وہی باتیں یاد آگئیں جنھیں سے ہنسے، اور یہ اپنا گانا سنایا تھا بجی نے اپنی آواز مہین کی اور آنکھوں میں شرارت بھر کر دولہے کے شرمانے کی نقل اتارنے لگا۔

چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے

درد انوکھے ہائے دے گیا پیار کے

نمی شرم کے مارے کواڑ کے پیچھے چھپ گیا اور گھر کے لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے، پندرہ دنوں کے بعد گرمی کی اسکول بند ہو گیا تھا بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے، دو مہینے قبل فصل چھپرہ سے تبدیل ہو کر گیا آگئے تھے، نمی اور بجی گرمی کی چھٹیوں میں گیا چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب مولانا آزاد سیمینار میں شرکت کے لیے کشمیر چلے گئے تھے، اچانک دو مئی کو صوفیہ بجی کو لے کر پٹنہ پہنچیں، بجی کبھی بیمار نہ ہوا تھا

اس کی حسرت تھی کہ میری بھی شادی ہو جائے کیونکہ دو سال پہلے بجلی کو گٹھیے کے دورے کے ساتھ دل کی ہلکی سی کمزوری ہو گئی تھی۔ اس لیے بجلی کی صحت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ بجلی کو جب دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ معلوم ہوا اپنڈس کا درد اٹھا ہے۔ ڈاکٹر نے اپریشن کے لیے پٹنہ بھیجا ہے۔ ۱۰ مئی کی صبح کو پٹنہ پہنچ گئے۔ اپریشن ہوا۔ مگر ۶ بجے شام کو بجلی میری آنکھوں کے سامنے بڑی خاموشی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ اتنا شوخ اتنا چنچل اور اتنا پیارا بچہ مر بھی سکتا تھا آج تک میرا دل اس حقیقت کو قبول نہ کر سکا۔ بجلی کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ۔۔

چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے
درد انوکھے ہائے دے گیا پیار کے

بجلی بیٹے کو گڑیا کی گرمی نے مارا تھا۔ اپنڈس کا تو صرف بہانہ تھا۔ میری چاہنے والی اماں جان سنہ ۵۸ء میں جب ہم لوگوں سے جدا ہوئی تھیں تو دنیا آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی تھی۔ آٹھ سال کے بعد اچانک بجلی بچھڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس دنیا میں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ نہ جانے کیا بات تھی میں جب کبھی بجلی کو شرارتیں کرتے دیکھتی تھی تو میرا جی بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ میں اسے جلد سے جلد بڑا ہوتا ہوا دیکھوں۔ مجھے بجلی کے خوبصورت نقش و نگار پر اس کی آنے والی جوانی کو دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ اب بیگم بفضلہٖ ننھی اور منی جوان ہو رہی ہیں۔ میرا دل کبھی کبھی بیقرار ہو اٹھتا ہے کہ میں ان دونوں بچیوں کے ساتھ بجلی کی پیاری صورت بھی نکھار دیکھ سکتی۔ سوچتی ہوں بجلی کتنا بڑا ہوا ہوگا؟ کیا قیامت کے دن میں اس کا حسین چہرہ جو جوانی کی لکنتوں سے دمک رہا ہوگا دیکھ سکوں گی؟

میرا گھر ہوسٹل بھی ہے اور ہوٹل بھی۔ ان دنوں خدا کے فضل سے میرے آٹھ بچے میرے ساتھ ہیں۔ خدا کی تین بچیاں آگئی ہیں۔ تیسری بچی بے بی جنہیں بجلی کے پیدا ہوتے ہی خدا نے اس کو مجھے دے دیا ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ اختر صاحب کو چاہتی ہے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر لوگوں پر بڑا رعب جمائے رکھتی ہے۔ جب کبھی اختر صاحب مجھ سے یا میں اختر صاحب سے الجھتی ہوں تو اس کا موڈ آف ہو جاتا ہے وہ پریشان ہو جاتی ہے اب تو اس کے ڈر سے ہم دونوں نے لڑنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ یہ بچے خداوند کریم انہیں لمبی زندگیاں عطا فرمائے سب اپنے ماں باپ کے پیارے بچے ہیں۔ اب تو میں ان میں سے کسی کو اپنا کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔

اگر یہ پیارے پیارے بچے میری زندگی میں نہ آتے تو پھر شاید کبھی پٹنہ میں اس طرح سے جم کر نہ رہتی۔ مجھ کو سیاحت کی زندگی بہت پسند ہے۔ سوچتی ہوں خدا تعالیٰ کی اتنی خوبصورت دنیا کو نہ دیکھنا بڑی بدنصیبی ہے۔ اگر میں کسی کی بیوی نہ ہوتی اور میرے پاس دولت ہوتی تو شاید میں دو دن بھی ایک جگہ نہ ٹکتی۔

بجلی کے بعد مجھے دنیا کی کسی چیز سے لگاؤ نہ رہا لیکن اس کو میں کیا کروں کہ پھول بھی میری زندگی کی ایک کمزوری ہیں۔ میں ہر موسم میں پھولوں کے پیچھے دیوانی ہو جاتی ہوں۔ میرا یہ دیوانہ پن کبھی کبھی مجھے دیوالیہ بھی کر دیتا ہے۔ پھولوں کا یہ شوق ہم سب بھائی بہنوں کو وراثت میں ملا ہے۔

زندگی گزر ہی رہی تھی۔ بے کیف ہی سہی مگر اس میں ایک طوفان آ چکا تھا کہ ۶۳ء کے اکتوبر میں ابا جان کی چاہنے والی ہستی بھی ہم لوگوں سے جدا ہو گئی۔ ابا جان جب ہمارے درمیان تھے تو ان کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر میں کبھی کبھی بے چین سی ہو جاتی تھی کہ ابا جان اگر نہ رہیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ ہم پھر کیسے زندہ رہیں گے؟

لیکن ابا جان کو گئے ہوئے ڈھائی سال ہو چکے ہیں اور ہم اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ جیسے ابا جان کبھی ہماری زندگی میں موجود ہی نہ تھے۔ ہاں سون کے ساحل پر لب گنگا ایک خوبصورت مقبرے کی یاد ضرور جھلکتی رہتی ہے جس کی برجی پر بنا ہوا سفید چاند ہمیشہ اداس رہتا ہے اور جہاں سنگ مرمر کے کتبے پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

چاہنے والا ہے سب سے پیارا — اُسی پہ آئے دل تو جان فدا کر

ابھی ابا جان کی جدائی کا زخم بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک تازہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ اور ۲۸ سال کا بسا بسایا سجا سجایا گھر اچانک اجڑ کر رہ گیا۔ ۱۸ جون کو

اٹھائیس رات کے وقت پنڈی ہوسپٹل میں ایک ایسی بجلی گری جس نے تین معصوم بچوں کو بے سہارا کر دیا۔ یہ حادثہ کتنا بڑا حادثہ ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس درد کا مداوا کیا ہوگا۔ وہ رضیہ میری بدنصیب بہن جو ایک جذباتی شاعرہ تھی جس نے ایک بار یہ شکوہ کیا تھا کہ

دامنِ دل میرا کانٹوں سے چھڑوایا کیوں
وحشت

وہ حسرت کر رہ گئی۔ اس نے اپنے تخیل میں بچپن ہی سے کتنی حسین اور رنگین دنیا بسا رکھی تھی جو اپنے ریشمی پردوں پر لطیف ہوا کی سرسراہٹوں کو محسوس کر کے چاندنی راتوں میں شعر کہا کرتی تھی۔ وہ اجڑ کر رہ گئی، اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی گئیں اس کے مانگ کی افشاں پونچھ دی گئی۔ اب اس کی نازک خیالی اس کا حسنِ تخیل اور اس کے گھر کے کونے کونے کی آرائش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں مل گئی۔ سون کے جن حسین کناروں نے گاؤں کی اس معصوم لڑکی کو ایک شاعرہ بنا دیا تھا اب اسی ساحل پر ابا جان کے پہلو میں ایک تازہ بنی ہوئی تربت اس کی خوشیوں کا مدفن ہے۔

اور ہم سوچتے ہی رہ گئے تھے۔ بام و در کی رونقیں سون کے ساحل پر کیوں سوتی چلی جا رہی ہیں۔؟

یہ مضمون شروع کرتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو کچھ اپنے بارے میں بھی بتا سکوں گی۔ مگر آپ کو واسطہ پڑا میری ناتمام آرزوؤں سے، بکھرے ہوئے جذبات سے، میری ڈوب جانے والی زندگی سے۔ اس کے باوجود میں اپنے اس اللہ کی شکر گزار ہوں۔ جس نے مجھے چند تکلیف دہ لمحوں اور رلا دینے والے واقعات کے ساتھ اتنی ساری نعمتیں بھی دیں، میرے آس پاس صرف پیار ہی پیار کی فضا ہے۔ خلوص ہی خلوص کی حکمرانی ہے۔ میں اپنے واقعات اور حالات میں کچھ ایسی کھوئی ہوئی ہوں کہ میری اپنی الگ سے کوئی زندگی ہی نہیں سب کے ساتھ تو میرا کوئی وجود ہے الگ سے شکیلہ اختر کوئی ہے ہی نہیں!

میں اپنے ارد گرد اور اپنے گھر میں طرح طرح افسانوں اور کہانیوں کو گردش کرتے دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں۔ ناولٹ نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں انگلیاں قلم تھامنے کو بے قرار ہیں۔ مگر دل غم کی وادیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

اب خدا کی اس خوبصورت دنیا سے اکتا گئی ہوں، غموں سے بہت دور بھاگنے کو جی چاہتا ہے، رضیہ کی سسکیوں اور کراہوں کو سن کر سوچتی ہوں کہ کسی ایسی جگہ چھپ جاؤں جہاں کوئی نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو اور پھر اتنا لکھوں، اتنا لکھوں کہ ———

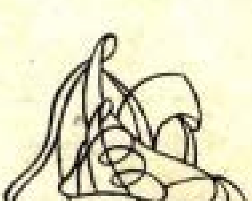

جیلانی بانو

یہ بانو کون ہے!

شاید آپ اس سے بالکل واقف نہ ہوں، کیونکہ جس افسانہ نگار جیلانی بانو نے آپ پر رعب جمانے کی کوشش کی ہے وہ میں تو نہیں ہوں۔ میں تو ایک نہایت کاہل قسم کی عورت ہوں جس کی ہر بات بے تکی، ہر کام بے موقعہ۔ کبھی سلیقے سے بات کرنے کا ڈھنگ تو آیا نہیں تب بھلا افسانے لکھنے کا دعویٰ کون کرے! شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے پہلی ملاقات پر سب بڑے تعجب سے کہتے ہیں۔

- بھئی آپ کا ہم نے بڑا عظیم قسم کا تصور کیا تھا۔ آپ تو نہایت مختصر سی نکلیں!

اور پھر اسلوب انصاری صاحب کی طرح اس بات پر بھی تعجب کا اظہار ہوتا ہے۔

" آپ ویسی تو نہیں ہیں جیسی افسانوں میں نظر آتی ہیں۔"

اس وقت مجھ پر بڑی ندامت سی چھا جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک کوشش کرتی ہوں کہ کوئی اچھا سا پوز بنا کر جاننے والوں کو ذرا باوقار سی افسانہ نگار نظر آؤں۔ کچھ علمیت جھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں اور پھر بے حد تکلف کے ساتھ بے تکلفی کا انداز بناتے بناتے گھپلا ہو جاتا ہے۔ جانے یہ دھاگہ کہاں الجھ جاتا ہے کہ میں پھر تکلف کے جال سے نکل کر نہایت زنانے کے ساتھ بے تکلفی کے میدان میں دوڑنے لگتی ہوں۔ ہوش اس وقت آتا ہے جب ملازم کی چوری کا قصہ سنا چکتی ہوں۔ بہت تیرے کی۔ ارے بھئی بڑے افسانہ نگار تو بہت بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ ارے وہ تو نوکروں کی چوری نہیں مانتے بلکہ ان کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالت کا تجزیہ کر کے افسانہ لکھ ڈالتے ہیں۔ اپنی کمائی ان کی جیب میں ڈال آتے ہیں۔ اور بس اسی وقت اپنے چھوٹے بہت چھوٹے ہونے کا احساس چھا جاتا ہے۔ لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں —— سچ مچ کے افسانہ نگار تو کچھ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہمارے قریب ہی ایک افسانہ نگار رہتی تھیں۔ بچپن میں جب میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھ لکھ کر بہن بھائیوں پر خوب رعب جمایا کرتی تھی۔ یہ وہ افسانہ نگار خاتون میری آئیڈیل تھیں۔ میں دل ہی دل میں منصوبے باندھتی کہ جب بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی ان کی طرح بڑے بڑے افسانے لکھا کروں گی۔ پبلک میٹنگوں میں جاؤں گی۔ چہرے پر سرخ، نارنجی، سیاہ، ہرے اور دوسرے رنگوں کی دھنک بنایا کروں گی۔ بلاؤز ایسے تن کے وجود پر تنگ ہو اور پھر اردو کے سارے روزمرہ الفاظ کے بجائے انگلش لفظوں کی پریکٹس بھی تو بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن ان کی کاپی کرنے کے لیے جو سب سے نازک کام تھا وہ ان کا اپنے بارے میں ہر وقت کہتے رہنا —— میں —— میں —— ہیں ——

پھر جب میں بھی افسانے لکھنے لگی تو کسی کے احوال پوچھنے پر جی چاہتا ہے کہ طویل مختصر افسانے کا انداز اختیار کروں۔ لیکن چھوٹی سی کہانیاں لکھنے والے اپنے بارے میں کہنا ہو تو بالکل نقادوں کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک کہیں ڈھونڈے زندگی کا کوئی شاندار کارنامہ یاد ہی نہیں آتا۔ بڑے فرسودہ انداز میں پالے گئے کہ غیر معمولی انسان بننے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ اتنی ہی خاموشی سے افسانہ نگار بن گئے کہ وہ جیسے اور دوسرے پہلے

رنگ جو دوری دور سے جھلملایا کرتے ہیں کبھی انہیں منہ پر ملنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

میں اس معنوں میں تو یو۔پی کی ہوں کہ میری ددھیال اور ننھیال وہیں ہیں۔ ابا ملازمت کے لیے حیدرآباد آئے تو اماں کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا۔ مگر اس طرح کہ تیس برس گزرنے کے باوجود انہیں اپنے میکے کے کوتے ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ہر سال جب وہ چند مہینے وہاں گزار کے اپنی سسرال (یعنی ہمارے گھر) واپس آتی ہیں تو یوں دھاڑ دھاڑ روتی ہوں جیسے ابھی پہلی بار میکے کی چوکھٹ لانگھی ہو۔

اسی وجہ سے ہم بہن بھائی چوں چوں کا مربہ بن گئے کہ یو۔پی جاتے تو وہاں سب حد یہ کہ ذرا ذرا سے بچے ہمیں حیدرآبادی پکار کے ناک بھوں سکیڑتے۔ حیدرآباد میں رہتے تو ہندوستانی کے تحقیر آمیز خطاب ملتے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میرا بچپن طویل طویل بیماریوں میں گزرا۔ اس لیے اماں اور خصوصاً ابا کی بے حد لاڈلی ہو گئی۔ مزاج کی تیز تو ہمیشہ کی تھی۔ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ میرے کمزور بدن اور چڑچڑے پن کی دھونس سہتے سہتے سارے بہن بھائی مجھ سے دور دور رہنے لگے۔ اس لیے میں کسی کونے میں تنہا بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کئے جاتی۔ ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتی جہاں ہر چیز پر میرا راج ہوتا۔ ان جاگتے خوابوں نے کچھ حساس بنایا کچھ سوچنے اور غور کرنے کی عادت ڈالی۔ اب چاند کے پیچھے اور بادلوں کے دوڑنے کی شاعرانہ تعبیروں سے تشفی نہ ہوتی تھی۔

ہم سات بہن بھائی ہیں۔ پھر ان کی سہیلیاں اور دوست ملا کر پوری بٹالین بنا لیتے۔ سب کو غیر معمولی اور انوکھا کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے بچوں کے عام اور گھسے پٹے کھیل کبھی نہ کھیلے جاتے۔ محلے کے سارے معمولی قسم کے بچوں کے ہم آئیڈیل تھے۔

ہمارے پڑھنے اور کھیلنے کی کاپی کر کے انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ ادھر ہم ہیں کہ بڑے فنکاروں کے انداز میں اسکیچ بنانے کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ کبھی پینٹنگ کی نمائش ہو رہی ہے۔ میوزک کنسرٹ منعقد کیے جا رہے ہیں۔ قلمی رسالے اور اخبار شائع ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پول کھولے جا رہے ہیں۔ صحافتی میدان میں اتنے اصول پرست اور وسیع النظر صحافی کبھی نہ آئے ہوں گے جیسے ہمارے دور میں تھے۔

اس کے علاوہ مشاعرے ہوتے۔ ڈرامے اسٹیج کیے جاتے۔ شاید اسی ماحول کا اثر ہے کہ ہم سب بڑے ہو کر بھی کسی نہ کسی آرٹ کے پیچھے پڑ گئے۔ کوئی آرٹسٹ ہے، کوئی فوٹوگرافر کوئی شاعر کوئی افسانہ نگار مگر سب کو اپنے اصول ابھی تک پیارے ہیں۔ آدرش کو کلیجے سے لگائے ہیں۔ ہے ہیں۔ کیا کہنا ان آدرش وادیوں کا۔

محض اتفاق کی بات تھی کہ میں افسانہ نگار بن گئی۔ ورنہ میرا بچپن تو قطعی ایسا نہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اپنے تجزیئے سے مجھے مستقبل کی افسانہ نگار ٹھہراتا۔

البتہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ میں مصورہ بن جاتی کیونکہ میں نے اپنا بچپن تو اسی شوق میں گنوایا۔ باقاعدہ پینٹنگ کے مقابلے ہوتے۔ لوگوں کے اسکیچ بنائے جاتے۔ مگر اپنی تصویریں کبھی بک کر نہ جاتیں۔ اسی مصلحت کے پیش نظر جب کوئی اونچے داموں یہ اسکیچ خرید لیتا تو کبھی اپنے نام سے نہ بیچتے۔ اپنی قدردانی کا یہ نقشہ ایسا نہ تھا کہ کوئی اور شوق اسے اتار سکتا۔ مگر یہ ایک ایسا دور تھا جب اپنے بارے میں خواہ مخواہ بڑی خوش فہمی تھی۔ یعنی کونسا کام ایسا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ چاہے کسی کام کا اور کسی سے مقابلہ ہو جائے لیکن جیتنا اپنا حق ہے چنانچہ شاعری ہوتی۔ تقریریں جھاڑی جاتیں۔ بچوں کے رسالوں کو کہانیاں بھیجتے۔ فرصت کے پروگراموں کا دلچسپ اور پسندیدہ آئٹم اسٹیج ڈرامہ تھا۔ ان ڈراموں کو ہر لحاظ سے درست کرنے کے لیے بالکل آغا حشر والا شوق طاری ہو جاتا۔ کیا مجال کہ ان ڈراموں پر کہیں بچگانہ انداز کی چھاؤں پڑنے دیں۔ اداکاروں کی ٹریننگ، ڈرامے

کا انتخاب۔ اسٹیج کی سجاوٹ اور کاسٹیوم کی اہمیت۔ ہر چیز پر کافی سوچ بچار سے کام لیا جاتا۔ اکثر ڈرامے معیار پر پورے نہ اترتے تو ماہدولت خود ہی ڈرامہ تصنیف کر لیتے (ملاحظہ فرمایئے معیار کی بلندی!)

چنانچہ ایک بار ایک ایسا ہی شاہکار قسم کا ڈرامہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیا۔ اس کوشش کے ساتھ کہ جانے اسٹیج ڈرامہ ریڈیو پر کیسا چلے گا۔ مگر ریڈیو سے وہ ڈرامہ کیا ہوا گھر والے یک لخت مجھ سے مرعوب ہونے کا تہیہ کر بیٹھے۔ اور میرے ماموں ریاض فرشوری نے ایک بار کہا ـــــ "بٹیا ـــ یہ رنگ ڈھنگ ایک طرف پھینکو۔ تم لکھنے کی مشق بڑھاؤ۔"

اے واہ ـــ گویا ہم بھی کوئی فرشتے ہیں کہ لکھنے کی مشق کریں گے۔ ابھی آپ کہیں تو ایسی ایسی کہانیاں لکھ پھینکوں کہ آپ حیران رہ جائیں۔

ان ہی دنوں کمال امروہوی کے "محل" کا ایک ادبی سوال نامہ اخباروں میں چھپا۔ یہ صرف نئے قلمکاروں کے لیے تھا۔ مگر جانے کیسے مجھے اس کا دوسرا انعام سو روپے مل گیا۔ اس وقت میں نے ایک بار اپنا لوہا گھر والوں سے منوانا چاہا۔ مگر صاحب کوئی ٹس سے مس نہ ہوا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھئی ان مقابلوں میں تو صرف قسمت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر یہ محترمہ اپنی قابلیت بگھارنے پر اتاری ہیں۔ یہ میری تحریر کا پہلا معاوضہ اور پہلی تنقید تھی۔

اس دور حیات میں ہم سب شاعر بھی تھے۔ اصلی نہیں نقلی۔ کوئی جوش۔ کوئی فراق۔ کوئی مجاز۔ ان شاعروں کا کلام ان ہی کے اسٹائل میں سنایا کرتے۔ لیکن کمال امروہوی سے اپنے آرٹ کی داد وصول ہوتے ہی ہم نے شاعروں کی نقل کرنے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ سب نے اپنے اپنے ذاتی تخلص رکھے اور خود ہی مشق سخن کی ٹھانی چنانچہ یہ خاکسار بانو تخلص بہ صبا بدایونی کہلائی جانے لگی۔ پھر شاعری کا طوفان بڑی شدت سے اٹھا جسے دیکھئے کاپی کھولے مشق سخن میں مبتلا ہے۔ ہفتہ واری مشاعرے ہوتے جس میں سامعین کو ناریل اور چنے بانٹے جاتے تاکہ وہ فراخ دلی سے داد دیں اور ضبط و تحمل سے کام لیں۔

لیکن ایک نہایت واہیات بات یہ لوگوں نے محسوس کی کہ ہمارے مصرعے گزوں سے ناپنے پر بھی برابر نہیں ہوتے اغیار اس کا خوب مذاق اڑاتے اور پھبتیاں کسی جاتیں۔ اس ندامت سے بچنے کے لیے میں نے سوچا کہ سب شاعر ہیں تو میں افسانہ نگار ہوں گی، لہٰذا بچاری صبا بدایونی کو پیدا ہوتے ہی اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا اور جیلانی بانو اکھاڑے میں کودنے کو تیار ہو گئی۔ شاعری سے توبہ کرنے میں ایک راز یہ بھی پنہاں تھا کہ شاعر کی بیٹی تھی۔ شاعر کی پوتی تھی۔ اس لیے بھی اس خاندانی پیشے سے جی اکتا گیا تھا۔ پھر اپنے گھر کے شاعروں کے پاس جو شاعر آتے تھے ان کی ہیئت کذائی، دبلا پن اور کاہلی دیکھ دیکھ کر شاعروں سے جی ڈوب گیا تھا۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ شاعری سے مجھے پھر بھی چھٹکارا نہیں ملے گا اور ایک ایسے شاعر کی بن جاؤں گی۔ جو صد درجہ شاعر مزاج ہو گا۔

چنانچہ افسانہ نگاری کے اعلان کے ساتھ ہی ایک عدد کہانی گھسیٹ کر "ادب لطیف" کو بھیج دی۔ مگر نہایت راز داری کے ساتھ تاکہ بیرنگ واپس آئے تو جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر دیکھتے کیا ہیں کہ وہ کہانی چھپی چلی آ رہی ہے۔ دوسری کہانی "سویرا" کو بھیجی جو فوراً شائع ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ اس قسم کا تعارف بھی کہ "لکھنے والو ـــــ مژدہ ہو تمہیں کہ وہ افسانہ نگار آگئی جس کا انتظار تھا۔ وغیرہ وغیرہ قسم کی کچھ عبارت تھی۔ تیسری کہانی "افکار" کراچی کو بھیجی۔ چوتھی "شاہراہ" دہلی کو۔ بس یہی چار کہانیاں تھیں جو میں نے کسی رسالے کو بغیر کسی فرمائش کے بھیجی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت بھی ان کہانیوں کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا اسی لیے ان کہانیوں کو "روشنی کے مینار" میں شامل بھی کیا، کیونکہ اپنے کام پر سب سے کڑی اور بے رحم

تنقید میں خود ہی کرتی ہوں۔ بلکہ کہیں کسی کہانی کی صرف تعریف ہوتی ہو تو اس کے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ دلائے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا۔ اگر میں ایسی جلاد قسم کی اپنی نقاد نہ ہوتی تو کتنی آسانی سے آرٹسٹ بن جاتی۔

کیونکہ یہ تو بچپن کا شوق تھا۔ مگر اپنے ادھر تنقید کے رجحان نے مجھے بار بار ٹوکا۔ یہاں تک کہ جھنجھلا کے میں نے رنگ اور برش پھینک دیئے اب جب کہ میری چھوٹی بہن عفیر بحرین میں آرٹ کی دھوم مچائے ہوئے ہے پہلے میں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ افسانہ نگاری نے مجھے کیا دیا۔ اگر لکھے بغیر تو میرا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے دس پندرہ دن نہ لکھ سکوں تو دل پر اداسی چھا جاتی ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے یہ احساس رہتا ہے کہ وقت کیسا فضول گزر رہا ہے۔ اگر کسی وقت فرصت کے چند منٹ نکال کر کوئی بات سوچے بغیر کاپی کھول کر بیٹھ جاتی ہوں اور ایک سطر لکھ ڈالتی ہوں جس میں پوری کہانی ہوتی ہے۔ کہانی کی پہلی سطر مجھے بڑی مشکل سے ملتی ہے اس کی خاطر میرے کئی کئی ہفتے برباد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کہانی کا آغاز و اختتام، تعارف اور پھیلاؤ سب کچھ مجھے اسی سطر میں لکھنا ہوتا ہے۔

یہ سن کر آپ کو سخت مایوسی ہوگی کہ افسانے کے اسرار و رموز سے میں بہت بعد میں واقف ہوئی۔ میں نے لکھنے کے بعد پڑھا۔ زندگی اور فن کا رشتہ، کلاسیکل ادب کی اہمیت اور کسی ایک نظریے پر عمل کا راستہ، میں نے بہت بعد میں جانا۔

مجھے سب سے پہلے تلگو کی دیو مالائی کہانیاں (ہری کتھا) نے متاثر کیا۔ دیوی دیوتاؤں کی ان ناقابل یقین کہانیوں کا سحر اور پھر انہیں سنانے والوں کی زبان کے جادو نے سمجھایا کہ کہانی دل میں کیسے اترتی ہے۔ ان کہانیوں کی خاطر میں نے تلگو سیکھی اور تلگو بولنے کی پریکٹس کی۔

ابا (حیرت بدایونی) کو کلاسیکل موسیقی کا بھی بڑا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے بھی ملا۔ سنگیت سیکھنے کی اجازت تو بھلا کیا ملتی کیونکہ ابا اپنی تمام روشن خیالی کے باوجود بڑے سخت قسم کے مولوی ہیں۔ لیکن سُر تال، مختلف راگوں کی بندش اور ان کی خوبیوں خامیوں کی پرکھ آ گئی۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میری افسانہ نگاری پر روشن آرا بیگم، ہیرا بائی، اونکار ناتھ ٹھاکر اور بڑے غلام علی خاں کا بھی گہرا اثر ہے تو آپ کو شاید یہ بات کچھ بے تکی سی لگے۔ میں نے اپنی کچھ کہانیوں میں کسی ایک راگ کے تاثر کو چھونے کی کوشش بھی کی ہے۔ جانے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں!

مجھ پر اپنے ابا کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا۔ جیسا کہ ہمارے گھروں میں ہوتا چلا آیا ہے کہ لڑکیاں باپ کو زیادہ پیاری ہوتی ہیں ہم بہنیں بھی ابا کی بڑی چہیتی رہیں۔ مگر میرے ناز نخرے کچھ زیادہ ہی تھے۔ کیونکہ شاید ابا کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے بچوں میں صرف میں نے ہی سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ ہمارے ابا نے بچوں کی تربیت میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ ان کے بچے صرف ڈگریاں لے کر پڑھے لکھے نہ کہلائیں بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کی تربیت بھی ہو۔ ہم جو کرنا چاہیں اسے کرنے کے قابل بن سکیں اس لیے انہوں نے عام باپوں کی طرح کبھی نہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا نہ زبردستی اپنی بات منوانے کی کوشش کی۔ اس برتاؤ کی وجہ سے ہم میں شروع سے ہی خود اعتمادی اور اپنی عزت آپ کرنے کا سلیقہ آ گیا۔

دیوانِ غالب، بانگِ درا، کلیاتِ میر اور ذوق کے قصیدے انہوں نے ہمیں خود پڑھائے۔ ابھی تک ان کی عادت ہے کہ اٹھتے بیٹھتے کسی خاص لفظ یا مشکل شعر کی تشریح ہم سے کروائیں گے۔ کوئی غلط ترکیب یا بے محل لفظ دیکھیں تو فوراً ہمارا امتحان لیا جائے گا۔ ویسے ہمارے گھر میں ایک سے ایک خونخوار قسم کا نقاد موجود ہے کہ اللہ کی پناہ۔ خدا کوئی خطا بخش دے مگر یہ سفاک نقاد ایک حرف کی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ چاہے کوئی کہانی لکھے، شعر کہے، فوٹو کھینچے یا پینٹنگ کرے۔ مگر یہ ہمہ دانی ہر قسم کے حضرات فوراً اپنے طنز کے نوکیلے نشتروں سے سرجری شروع

کریں گے۔ یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد مجھے ادب کے بامروت اور رحم دل نقادوں سے کبھی اتنا ڈر نہیں لگا۔

تو کہنا تھا کہ مجھ پر اپنے گھر اور اپنے ماحول کا گہرا اثر پڑا۔

میں ہائی اسکول میں تھی جب گورکی، موپاساں، چیخوف، میر امن، عصمت چغتائی، بیدی، کرشن چندر، فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کو پڑھ چکی تھی۔ ان ادیبوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ بلکہ سب میرے استاد رہے ہیں جنھوں نے مجھے فن کی نزاکتیں اور خامیاں سمجھائی ہیں۔ بعد میں بھی بہت سے عظیم فنکاروں کے شاہ پارے میں نے پڑھے اور ان کی بڑائی کے آگے جھکی ہوں مگر ان ادیبوں کا جو پہلا تاثر مجھ پر چھایا تھا وہ آج بھی ہے۔ یہ سب وہ ادیب ہیں جنھوں نے مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق دلایا ہے۔

یہ وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب حیدرآباد ابھی ابھی ایک بڑے سیاسی انتشار سے گزرا تھا۔ اس لیے ہر طرف ایک غیر یقینی کیفیت تھی۔ حیدرآباد کی وہ مخصوص تہذیب اور روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ جاگیرداری دور ختم ہو چکا تھا۔ اور بڑی بڑی ڈیوڑھیوں کے مالک رکشائیں پکڑے چوراہے پر لوگوں سے راستے پوچھتے تھے۔ ان لوگوں کا گناہ کیا تھا اور یہ کس سزا کے مستحق تھے، اس پر مجھے اس وقت بحث نہیں کرنا ہے۔ لیکن جب ایک بہت بڑے کاروں میں گھومنے والے جاگیردار شام کو کھانا مانگنے آتے تھے تو یہ حادثہ مجھے کچھ کرنے پر اکساتا تھا۔ ادب میں وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب بڑے لکھنے والے تھک سے گئے تھے۔ نئے ادیب سامنے نظر نہیں آ رہے تھے اور نقاد جمائیاں لے لے کر ادب میں جمود کا نعرہ بلند کر رہے تھے کچھ زیادہ پکے قسم کے حضرات ادب میں شدید قسم کی حد بندیاں قائم کر رہے تھے اور ترقی پسند ادب کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا جا رہا تھا۔

اس وقت اپنے خاموش کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں نے لکھنا شروع کیا تو یہ سارے مناظر میرے سامنے تھے۔ ایک نئے لکھنے والے کے فطری تجسس نے مجھے بھی ان باتوں پر غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن میں اس وقت بھی کسی کانفرنس میں بجنے والے نعرے پر لکھنے کی مشق کر سکی اور نہ کسی ادبی یا سیاسی حلقے میں رہ کر کہانی لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ حالانکہ میرا ذہن ایسی خبروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ ایک کمیونسٹ لڑکی نے اپنی رائفل سے پچاس سپاہیوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے اس وقت تک باقاعدہ مارکسزم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کے دو واضح سیاسی نظریات کے بارے میں میری کوئی رائے نہیں تھی۔ میں نے مزدور کو پسینہ بہا کے روٹی کماتے دیکھا تھا اور نہ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے واقف تھی۔ اس کے باوجود جاگیرداری دور میں عورت کی سماجی حالت میرے سامنے تھی۔ حیدرآباد کی عورت اونچے طبقے میں جتنی مظلوم تھی محنت کش طبقے میں اتنی ہی خود مختار تھی۔ کیونکہ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں میں سوکنوں کا جلاپا، شوہر کا حکم اور بچوں کی خود سری اس کی قسمت تھی تو ان ڈیوڑھیوں کو بناتے وقت وہ خود پتھر توڑتی تھی۔ خود کدال چلاتی اور اس نے مرد کا غرور اتار پھینکا تھا۔

شاید اسی لیے میرے دل میں اس لڑکی کے لیے بڑی عقیدت تھی جو پہاڑوں کی کھوہ میں چھپی اپنے حقوق کی لڑائی جیت رہی تھی۔ میرے آس پاس جب کوئی باپ بیٹی کو جہیز نہ دینے پر خودکشی کر لیتا، جب کوئی ماں بیٹی کی پیدائش پر آنسوؤں کی دھار نہ روک سکتی، جب کوئی شوہر تین بار زبان ہلا کر بیوی پر عزت و زندگی حرام کر دیتا ہے تو وہ لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ جواں ہمت کنواری لڑکی جو رسموں، روایتوں، سماج اور مذہب کے سپاہیوں سے بیک وقت نمٹ رہی تھی۔ وہ آئیڈیل لڑکی میرے خیالوں میں بس گئی تھی۔ میں جانے کتنی بار عزم اور جرأت مانگنے اس کے سامنے گئی ہوں اور ہر بار اس نے میرے سامنے ایک نیا چراغ جلایا ہے۔ ایک بار بس کے ایک چھوٹے سے سفر میں مجھے وہ کامریڈ مل گئی اور تین گھنٹے کے سفر میں اس نے مجھے تجربوں کی صدیاں سونپ دیں۔ تب میں نے روشنی کا مینار دیکھا۔ مگر لکھ کر اور پچھتائی کہ اس لڑکی کی عظمت کو میرا

قلم چھوٹ بھی نہ پایا۔ حالانکہ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی عظمت اور جرأت کو ہمیشہ اسی عورت سے مستعار لیا ہے۔ ایک بار کسی نقاد نے میرے بارے میں لکھا کہ میں اپنی ہی صنف کی نمائندگی کرتی ہوں لیکن میں نے صرف اسی پہلو کو سامنے نہیں رکھا۔ اگر ادب شعوری طور پر زندگی کو سمجھنے کا نام ہے تو میں نے بھی اپنے آس پاس ہی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے اس میں عورت کے احساسات اور اس کے مسائل سے میں زیادہ قریب ہوں۔

چند کہانیاں لکھنے کے بعد ہی جب ادبی حلقے میرے بارے میں سنجیدہ ہو گئے تو میں گھبرا گئی۔ کیونکہ ابھی تک بنیادی طور پر میں اپنے آپ کو طالبہ کہلوانے پر مُصر تھی۔ انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی اور افسانہ نگار کہلوانے میں خاصی وحشت ہو رہی تھی۔ ان دنوں میری دنیا محدود تھی۔ صرف کتابیں ہی میری دوست تھیں۔ میری ساتھی تھیں۔ مجھے مشورے دیتیں۔ لکھنے پر اکساتیں۔ بعض وقت دشمنی پر اتر آتیں اور میری سمجھ میں نہ آتا کہ ان دوستوں دشمنوں سے کیسے نباہ ہو سکتی ہے۔ مگر ان کتابوں نے مجھے اتنا سہارا دیا کہ میں اپنی راہ ڈھونڈ سکوں، طے کر سکوں کہ کیا لکھوں گی۔ کیسے لکھوں گی!

ایسے ماحول میں لکھتے وقت مجھے ذرا سی بات، معمولی سا حادثہ بھی غیر معمولی نظر آتا۔ انسانی جذبات، احساسات اور ان کے تہہ در تہہ پہلو پڑھ کر میں نے پڑھا اور یہ ہزار داستان کی طرح طویل اور دلچسپ کہانی نظر آئی۔ ویسے رنگوں اور برش کے شوق نے مجھے جیسے پڑھنا سکھا ہی دیا تھا۔ رنگوں نے مجھ سے زیادہ کھل کر بات کی تھی۔ رنگوں سے منظر نگاری اور احساسات کو واضح کرنا زیادہ آسان تھا۔ شاید اسی لیے میری کہانیوں میں کردار اور ماحول کی عکاسی زیادہ تفصیل سے ہوتی ہے۔ منظر نگاری کو جگہ کم ملی ہے۔ حالانکہ شعوری طور پر میں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ لکھتے وقت کس چیز کو ابھارنا چاہیے کسے پس منظر میں رکھنا ہے۔ شعوری طور پر تو میں نے کوئی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ کہانیاں لکھنے کی، نہ انھیں چھپوانے کی اور نہ کسی قسم کا صلہ پانے کی۔ اس بات پر مجھے ہمیشہ اطمینان رہے گا کہ اپنے بارے میں کبھی مجھے خوش فہمی کا شکار نہ ہونا پڑا اور نہ شہرت کے لیے الٹے سیدھے اور حیرت انگیز ہتھکنڈے آزمائے۔ بلکہ میری تنہائی اور کم گوئی نے میرے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ ترقی پسندوں نے مجھے قدامت پسندوں میں گنا تو کمیونسٹوں نے قدامت پرستوں کی طرف دھکیلا۔ مجھ سے جواب طلب ہوئے کہ آپ کس گروپ کی ہیں۔ لکھنے سے پہلے اس کی وضاحت کیجئے کہ کس حلقے سے وابستہ ہیں۔ یو۔ پی کی ہیں یا حیدر آباد کی — قوم پرست ہیں یا غدار — ان سارے سوالوں کے جواب میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کہانیوں میں دیتی رہی اور آیندہ بھی دیتی رہوں گی۔ لیکن یہ بڑا نقصان ہوا کہ ہر طرف سے حد درجہ سرد مہری کا سلوک ہوا۔ میں کسی گروپ کی چہیتی نہ بن سکی۔ کیونکہ میں نے کسی پارٹی کا مینی فسٹو سامنے رکھ کر لکھنے کی عادت ڈالی اور نہ کسی کانفرنس میں شریک ہو کر یہ وعدہ کیا کہ آیندہ کیا لکھوں گی۔ میری اس خود سری نے بہت سے ایسے لوگوں کو ناراض کر دیا جو ادب کی ٹھیکیداری کرتے تھے۔ چنانچہ ایڈیٹروں کو میرے خلاف خط لکھے گئے کہ یہ کون خاتون ہیں جن کی پہلی کہانی آپ نے اپنے معیاری پرچے میں شائع کر کے پرچے کا وقار مجروح کر دیا۔ "سنا ہے یہ کوئی بالشت بھر کی لڑکی ہے اور اس کے پردے میں کوئی اور لکھ رہا ہے۔" اور پھر یہ اعتراض — "انھیں حیدر آباد کے بارے میں لکھنے کا کیا حق ہے جب یہ حیدر آباد کی نہیں ہیں —" وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہی نہیں ایک مرتبہ ایک جعلی ایڈیٹر نے مجھ پر جھوٹا اور بے بنیاد الزام لگایا کہ میں نے پاکستان میں کسی کہانی کا معاوضہ دو ایڈیٹروں سے وصول کیا۔ میں نے صرف اسی ایڈیٹر پر ہتک عزت کا دعویٰ کر کے اسے سزا دلوائی۔ اس سلسلے میں بھی بڑی دھومیں رہیں۔ محض اس قصور میں کہ میں نے کسی سہارے کے بغیر خود ہی ابھرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مخالفت کی آندھیوں کا زور تھم گیا۔ ہر طرف سے صلح کے ہاتھ بڑھنے لگے۔ لیکن یہ صلح جو حضرات بھی اس بات سے پھر خفا ہو گئے کہ مجھ پر ان عنایتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ بعض وقت اپنی ہمت پر خود ہی تعجب بھی ہوتا تھا کہ اتنا منظم پروپگنڈہ تو بڑے سے بڑے ثابت قدم کو اکھاڑ پھینکتا۔ لیکن میں تناور درخت نہیں تھی بلکہ دھرتی کے سینے سے پھوٹی ہوئی ایک ننھی سی کونپل تھی۔ اس لیے تیز و تند

طوفان میرے سر پر سے گذر گئے۔ شاید ہار جاتی۔ شاید کبھی نہ لکھنے کی قسم کھا لیتی۔ اگر مجھے اس مخالفت کے علاوہ بے شمار بڑھاوے نہ ملتے، خصوصاً ان ادیبوں کی حوصلہ افزائی میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی جو میرے آئیڈیل تھے، جنھوں نے مجھے لکھنا سکھایا تھا۔

یہ تعریفیں اور حوصلہ شکنی ہر نئے ادیب کا مقدر ہیں۔ اگر لکھنے والے میں سچی لگن اور اپنے آورش کے ساتھ خلوص ہے تو وہ تعریفوں اور تنقیدوں کے لیے نہیں لکھتا۔ اس لیے اگر ابتدائی دور میں اس کی حوصلہ شکنی زہر ہے تو تعریف کا نشہ بھی زہر سے کم نہیں ہے۔ اس کٹھن دور سے تو وہ جتنی بے تعلقی سے گذرے گا فن اس کے نزدیک آتا جائے گا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں میری شادی ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ حادثہ تھا، کم سے کم مجھ ایسی جذباتی لڑکی کے لیے تو یہ ایک بے حد مشکل مسئلہ تھا۔ مگر شاید زندگی میں سب سے بڑا صلہ یہی ملا کہ انور بالکل ویسے ہی آئیڈیل ساتھی ثابت ہوئے جیسے ایک حساس جذباتی لڑکی اپنے خوابوں میں ڈھونڈتی ہے۔ اس شادی کی ادبی طور پر بھی بڑی اہمیت تھی، کیونکہ انور شاعر ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ اس کے علاوہ اپنی طالب علمی کے دور میں یہ حضرت لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر تھے۔ دروغ برگردن راوی۔ موصوف نے شادی کے بعد اپنے ان کارناموں کا مجھ پر خوب رعب جمایا۔

بہر حال جب ان کا قرعۂ فال میرے نام پڑا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان پر آنے والا عتاب مجھے بھگتنا پڑا ہوگا۔ ویسے شادی کے بعد اور ایک بچے کی ذمہ دار ماں بننے کے بعد عشق کا اعتراف کر لینا کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ یہ عشق یک طرفہ تھا اور اس کو شہرت انور کی ان نظموں سے ملی جو وہ جانے کس کس کے تصور میں لکھ کر میرے نام منسوب کر رہے تھے۔

شادی کے دوسرے برس ہمارے ہاں اشہیں آیا۔ عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت اپنے بچے کو دیکھ کر مجھے پہلی بار اپنے فن کار ہونے کا یقین آیا۔ میں بچے پر مغرور ہو گئی۔ میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا۔ اپنے بارے میں سوچنا، ہر بات بھول بیٹھی۔

مگر اچانک موت کی آندھی اسے میرے ہاتھوں سے چھین کر لے گئی۔ مہینوں مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا کہ میرے اوپر ظلم کرنے کی ہمت کون کر سکتا ہے۔ وہ مر گیا تو میں کیسے نہ مر سکی۔ شاید مر جاتی اگر انور مرنے دیتے ——— سب نے مجھے مشورہ دیا کہ لکھنے میں کھو جاؤ۔ اور میں نے جانے کیا کیا لکھ ڈالا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کی جگمگاہٹ کھو گئی ہے۔ ہر چیز کتنی بے رونق اور کھوکھلی دکھائی دیتی ہے۔

شادی کے بعد دو برس میں علی گڑھ میں رہی۔ علی گڑھ میں بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ ادیبوں کی بستی ہے اور یہاں خالص ادب بگھارنا چاہیے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ وہاں مجنوں گورکھپوری جیسے نقاد بھی ہمارا ادبی مزاج پوچھنے کی بجائے مرچوں کے سالن اور حیدرآبادی کھانے کا ذکر چھیڑ دیتے۔ وہاں ادبی حلقوں کی اس خاموشی اور بیزاری کو دیکھ کر کبھی تو یہ خیال آتا کہ ہم صورت سے ایک افسانہ نگار کی بجائے یقیناً ایک ماہر باورچن نظر آتے ہیں۔ کبھی سوچتے کہ بیچارے یہاں کے ادیب بھی کیا کریں جب کہ ان کے ذہنوں کو سکون ہی نہیں ہے۔ زندگی وہاں اچانک ٹوٹ پڑنے والے واقعات و حادثات کا نام ہے۔ وہاں تو صرف مجھ جیسے ادیبوں کا ہی بھلا ہوتا ہے جو چپکے چپکے سب کچھ سنتے رہیں اور ایک کونے میں بیٹھے سر جھکائے لکھے چلے جائیں۔ میں نے علی گڑھ کے دو برس میں صرف ایک کہانی لکھی ہے۔ وہ آئندہ اور لکھوں گی۔

سنتے ہیں افسانہ نگار ناول کی مسافت طے کرنے سے ہانپ جاتے ہیں۔ اس لیے نقاد افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو علیحدہ علیحدہ صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ میں نے اس اصول کو توڑنے کی بڑی کوشش کی کہ میں ابھی کسی کہانی سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس لیے چاہتی ہوں ناول لکھ کر دیکھوں۔ شاید اس ناول کے بعد میں اپنے نام کے ساتھ ادیب کا خطاب لکھا دیکھوں تو مجھے آج کی طرح شرم نہ آئے۔ ابھی چند مہینے پہلے پٹنہ

کی ایک کانفرنس میں مجھ پر یہ آکاش وانی ہوئی کہ میں دراصل ہندی میں لکھنے والی ہوں (شاید یہ میری ہر کہانی کے ہندی میں ترجمہ ہونے سے گڑبڑ پھیلی)، اگیہ کو، بمل مترا اور جینیندر کمار وغیرہ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں اردو میں بھی لکھا کرتی ہوں!

ایک بار ایگزیبیشن میں پانچ سات بچوں میں گھری ہوئی کسی ماں نے مجھے روک کر اپنے بچوں کو دکھایا۔

"دیکھو بھئی جیلانی بانو یہ ہیں جو کہانیاں لکھتی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتی ایک بچے نے میرا ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

"آپ ہماری کہانی کب لکھیں گی؟"

اس سوال کے بعد آپ ہی کہیے کہ میں اپنی کہانی سنانے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں ——؟

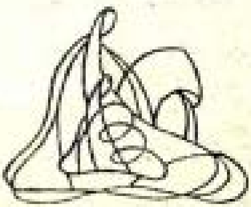

ڈاکٹر عندلیب شادانی

وجاہت حسین نام، عندلیب تخلص جو کبھی استعمال نہیں کیا۔ بعد میں اپنے استاد حضرت شاداں بلگرامی مرحوم کی نسبت سے اپنے آپ کو شادانی لکھنا شروع کیا۔ اب اصل نام کوئی نہیں جانتا۔ سب شادانی کہتے ہیں۔ سنبھل ضلع مراد آباد (یوپی) میرا مولد اور میری ددھیال (سابق ریاست) رامپور میری ننھیال۔ دونوں مقام میرے لیے وطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں جنون تھا۔ ادب سے خصوصیت کے ساتھ لگاؤ تھا۔ اس زمانے کے مروجہ سیکڑوں شعر زبانی یاد تھے۔ ہر اس چیز کی طرف دل کھنچتا تھا جو حسن و جمال کا مظہر ہوتی۔ ہندوستان کا نقشہ بڑے چاؤ سے بنایا کرتا تھا۔ کئی بار انعام بھی ملا۔ کھیل میں وہ بھی کھیل جو اس زمانے میں مروج تھے کھیلتا تھا۔ پتنگ بازی میں سارا محلہ ہماری استادی کا قائل تھا۔ بازار کی اچھی سے اچھی پتنگ پسند نہ آتی، خود اپنے ہاتھ سے پتنگ بناتے۔ خود ہی مانجھا سونتتے اور پیچ لڑاتے۔ بازی گری اور شعبدہ بازی سے بے حد دلچسپی تھی۔ اچھے اچھے پروفیسر کہلانے والے بازی گروں سے یہ فن حاصل کیا اور خاندان، اسکول اور محلے بلکہ شہر بھر میں جادوگر مشہور ہو گئے۔ موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس فن کے اکتساب کا کبھی موقع نہیں ملا مگر قدرت نے آواز اس قیامت کی دی تھی کہ سبحان اللہ! جادو کہئے تو برحق۔ بجلی سی کوندتی تھی اور اس آواز نے تیس بتیس برس کی عمر تک ساتھ دیا اور بڑی بڑی مصیبتوں میں پھنسایا۔ ایسا اتفاق بارہا ہوا کہ میں نے کوئی غزل چھیڑی اور راستے رک گئے، راہگیروں کے ٹھٹ لگ گئے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ اور کیا وقت تھا۔ آج کون ان باتوں کا یقین کرے گا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دو شعر پڑھتے ہیں تو سانس پھول جاتی ہے۔

دادا پردادا خاصے خوشحال زمیندار تھے۔ پنجاب کے زمیندار نہیں، یوپی کے زمیندار۔ والد صاحب کو تجارت سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے کانپور میں تجارتی لکڑی کا کارخانہ کھولا۔ میری ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہوئی، وہیں تحصیلی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ڈسٹنکشن ملا۔ ہمارے خاندان میں اس وقت انگریزی تعلیم کو برا سمجھا جاتا تھا اور ملازمت کو ہم لوگ برا جانتے تھے۔ خاندان میں کبھی کسی نے ملازمت نہیں کی تھی اس لیے انگریزی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غرض اردو مڈل پاس کرنے کے بعد میں والد صاحب کے پاس کانپور چلا گیا تاکہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں تجارت کا اہل نہیں۔ مگر کانپور کے قیام نے جیسے میری آنکھیں کھول دیں اور میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق شدت سے پیدا ہوا چنانچہ میں نے ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔

کچھ دنوں کے بعد سنا کہ گھر والوں میں میری شادی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ اس وقت میرا سن تیرہ چودہ سال کا ہو گا۔ بچپن ہی میں میری یاد سے پہلے ماموں زاد بہن سے میری منگنی ہو چکی تھی۔ شادی کا چرچا سن کر میں سخت پریشان ہوا حالانکہ پریشانی کی کوئی وجہ مجھے

معلوم نہیں تھی۔ شادی کو روکنا میرے بس کی بات نہ تھی' اچانک دل میں خیال آیا کہ چلو جاپان بھاگ چلیں۔ شادی سے بھی جان بچے گی اور کوئی صنعت بھی سیکھ آئیں گے مگر سفر خرچ کہاں سے آئے۔ جیب میں کل تین روپے اور ہاتھ میں ماں کی دی ہوئی سونے کی ایک انگوٹھی۔ اسی کو زادِ راہ سمجھے۔ پھر بھی شادی سے جان بچانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ آدھی رات کے وقت گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر لکھنؤ کی راہ لی۔ سرائے میں قیام کیا اور دوسرے دن پکڑے گئے اور کانپور لائے گئے۔ والد صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ پوچھا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا انگریزی پڑھوں گا۔ انھوں نے کہا اچھی بات ہے اور میں دوسرے دن والدہ کے پاس رام پور چلا آیا اور چھٹی کلاس میں داخل ہو گیا۔ مڈل پاس کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں داخلہ کرا لیا۔ ہمارا اسکول لیونگ کا فائنل امتحان ہونے ہی والا تھا کہ اسکول میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکوں نے بورڈنگ ہاؤس میں آگ لگا دی۔ لیڈروں کا دو دو برس کا رسٹیکیشن ہوا۔ ہم بھی اسی لپیٹ میں آ گئے۔ امید تھی کہ امتحان میں فرسٹ کلاس ملے گا اور نتیجہ یہ ہوا۔ سخت صدمہ ہوا' سوچا کہ اب انگریزی کی تعلیم پر لعنت بھیجو۔ مدرسہ عالیہ رامپور میں منشی عالم کے درجے میں نام لکھا لیا۔ اسی سال امتحان دیا' پنجاب بھر میں اول رہے۔ دوسرے سال منشی فاضل کا امتحان دیا۔ اس مرتبہ بھی یونیورسٹی میں اول نمبر آیا۔ چلئے فارسی کی تحصیل تمام ہوئی۔ اب کیا کریں' پھر ایک بار انگریزی پڑھنے کا شوق شدت سے دل میں پیدا ہوا۔

منشی فاضل کی بدولت پرائیویٹ امتحان دینے کا موقع مل گیا۔ میٹرکولیشن' انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے امتحانات ایک ایک سال کے وقفے سے صرف انگریزی میں پاس کئے۔ بی اے کی پوری ڈگری ملی۔ پھر اگلے سال یعنی ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ پروفیسر شیرانی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال جیسے شفیق اور فاضل استادوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ تعلیم کے سلسلے میں تقریباً چار برس لاہور میں قیام رہا اور اس روشنیوں کے شہر میں ہم پر وہ اندھیرے ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال وہ بھی گزر گئی۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد دو مرتبہ عارضی طور پر چیفس کالج لاہور میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب گورنمنٹ نے مجھے ایک دیسی ریاست کے کم سن نواب کا اتالیق بنا کر بھیج دیا۔ ایک برس وہاں گزرا۔ پھر ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کا لکچرار مقرر ہوا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا۔ ۱۹۲۸ء کے شروع میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں سینئر لکچرار ہو کر چلا آیا۔ بنگالے نے کچھ ایسا جادو کیا کہ زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ ۲۵ برس سے یہیں ہوں۔ لکچرار سے ریڈر ہوا۔ ریڈر سے پروفیسر۔ دوران ملازمت میں تین مرتبہ آرٹس فیکلٹی کا ڈین مقرر ہوا۔ اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں سینئر پروفیسر میں ہی ہوں۔

جس دن ساتویں کلاس میں پاس ہونے کی خبر ملی اسی دن میری شادی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں رفیقۂ حیات نے ۲۲ برس کا ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ایک دوست کے یہاں لندن میں ایک نہایت خوبرو ہندوستانی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھیں۔ وہ ایک جج کی بیٹی تھیں اور ناکتخدا' میں شادی شدہ اور ایک بیٹی کا باپ۔ اس وقت تو گمان بھی نہ تھا کہ قدرت ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دکھ درد کا ساتھی بنانے کی فکر میں ہے مگر ہوا یہی' ۱۹۴۰ء میں میں نے ان سے شادی کرلی اور اب وہی بیگم شادانی ہیں۔

نواب صاحب کی اتالیقی کے زمانے میں مجھے خود نواب صاحب' ان کے مصاحبین' ان کی درباری زندگی اور درباری سازشو

کے متعلق جو ہوش اڑا دینے والے تجربے ہوئے وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ نواب صاحب کا سن ماشاء اللہ ۱۶ سال کا تھا۔ اس کم سنی میں سیکس کے متعلق ان کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ انہیں ماہر جنسیات کہنا غلط نہ ہوگا۔ ریاست کے دیوان جی کے ایک خوش ذوق نوجوان تھے۔ موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ ان سے جلد ہی میری دوستی ہو گئی۔ بیگم صاحبہ یعنی نواب صاحب کی والدہ ان سے ناراض تھیں۔ اس دوستی کی بنا پر مجھ سے بھی ناراض ہو گئیں اور چپکے سے مجھے زہر دلوا دیا۔ زندگی تھی بچ گیا، دو دن تک بالکل اندھا رہا۔ تیسرے دن آنکھوں میں روشنی آئی۔ اس حالت کا تصور کرتا ہوں تو آج بھی دل دہل جاتا ہے۔

فارسی سے مجھے طبعاً عشق تھا اور میں ایران کی سیاحت کا بے حد آرزومند تھا چنانچہ تین بار ایران کی سیاحت کی۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن گیا۔ وہیں فرانسیسی زبان سیکھی اور لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اس کے بعد دو مرتبہ اور بھی یورپ کی سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا تفصیلی دورہ کیا اور واپسی میں ترکی کی سیر بھی کی۔ عراق اور مصر پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق زندگی بھر ساتھ رہا۔ افسانہ نگاری بھی کی اور شاعری بھی مگر شاعری میں کسی کے تلمذ کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

شاداں صاحب سے میں نے فارسی پڑھی تھی۔ ادبی تنقید و تحقیق سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اب تک ایک درجن سے زیادہ میری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ کئی کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔ یہی کہانیوں کے مصنف پریم پجاری کو پہچاننے کے لیے لوگ مدتوں بے چین رہے۔

یورپ اور امریکہ کے دوران قیام میں بھی شراب پینے کی ہمت اور توفیق کبھی نہیں ہوئی۔ اسے گھر کی تربیت کا اثر سمجھئے یا تنگ نظری کا نتیجہ۔ چائے کافی اور سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ نہ برج کھیلتا ہوں نہ رمی، پھر بھی نئی پرانی ہر قسم کی صحبت میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ اب تقریباً خانہ نشین ہوں۔ رنگین اور جوانی کے اکثر ساتھی رخصت ہو گئے۔ ہم بھی اب پا بہ رکاب ہیں اور اپنی باری کے منتظر بیٹھے ہیں۔

سدا رہے نام اللہ کا

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محمد طفیل مدیر نقوش کے دربار سے ایک "درخواست نما" حکم نافذ ہوا کہ اپنے حالات لکھو۔ سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ سچ بولوں تو جیل میں جاتا ہوں اور جھوٹ بولوں تو جہنم میں۔ پھر میرے حالات میں کس مرض کی دوا؟ ولی ہوتا تو منازل ولایت طے کرنے کی داستان لکھتا۔ موجد ہوتا تو کامیابی سے پہلے کی ناکامیوں کا حال سناتا۔ فاتح ہوتا تو فتوحات کی کہانی قلم بند کرتا۔ میں تو صرف ایک خشک سا مدرس ہوں جس کی زندگی ایک لق و دق بیابان کی طرح اجاڑ اور ایک سنگلاخ وادی کی طرح ناہموار ہے۔ اس میں خار دار جھاڑیوں اور نکیلے پتھروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ ایسی "آپ بیتی" سن کر آپ کیا کریں گے۔ اچھا! اگر آپ مُصر ہیں تو سنیے۔

بچپن میں میرے ہمجولی مجھے جانی کہا کرتے تھے۔ جانی ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے والد پٹواری تھے۔ ان کی تنخواہ سبکدوشی کے وقت (۱۹۱۷ء) چودہ روپے ماہانہ تھی۔ اس زمانے کے چودہ آج کے چار سو سمجھیے۔ گندم سوا روپے من تھی۔ گھی روپے میں تین سیر اور دودھ دس سیر آتا تھا۔ مٹھائی تین آنے، ریشمی کپڑا چھ آنے اور سفید لٹھا پانچ پیسے گز تھا۔ اس ارزانی کا نتیجہ یہ کہ جانی کے والدین دودھ کے لیے بھینس رکھ سکتے تھے۔ اور سواری کے لیے گھوڑی۔

سکونت، ولدیت

کیمبل پور سے بیس میل جنوب میں ایک چھوٹا سا گاؤں بسال کے نام سے مشہور ہے۔ یہی جانی کا مولد و مسکن ہے۔ اس کے والد کا نام محمد قاسم تھا۔ جانی نے ۱۹۰۵ء کے قریب ہوش سنبھالا۔ اور دیکھا کہ اس کے والد کافی عمر رسیدہ ہیں۔ داڑھی کو حنا سے رنگتے ہیں۔ نماز تہجد کے پابند ہیں اور کبھی کبھی جانی کو بھی نماز تہجد کے لیے مسجد میں ساتھ لے جاتے ہیں۔

تعلیم

بسال میں صرف تین جماعتوں تک ایک مدرسہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جانی اسی سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ہی مدرس تھا، ماسٹر جگت سنگھ۔ جو پڑھاتا کم اور مارتا زیادہ تھا۔ صبح آتے ہی ایک کلاس کو کان پکڑوا دیتا۔ دوسری کو "اٹھ بیٹھک" پہ لگا دیتا۔ اور تیسری کو پڑھانا شروع کر دیتا۔ یہ پروگرام ہر گھنٹے کے بعد بدل جاتا اور ہر جماعت کو باری باری ان منازل سے گزرنا پڑتا۔ چونکہ جانی جماعت میں بدترین لڑکا تھا اس لیے ماسٹر جگت سنگھ اس پر خاص توجہ دیتے اور دن میں تین چار مرتبہ لاتوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع فرماتے۔ سال بھر کے بعد ماسٹر صاحب تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ ماسٹر دیوان چند تشریف لائے۔ لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جانی کی پٹائی اسی طرح جاری رہی۔ آخر تنگ آ کر وہ تیسری جماعت میں سکول سے بھاگ نکلا۔ ہر روز گھر سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کرتا۔ دن بھر غلیل سے پرندے مارتا، سانڈھوں کے پیچھے بھاگتا، دوسروں کی فصلیں اجاڑتا۔ اور شام کو گھر آ جاتا۔ والد صاحب اس صورت حال سے بالکل بے خبر تھے۔ والدہ کو سب معلوم تھا۔ لیکن ماں ماں ہی ہے بچہ برباد ہو جائے یا بدقماش اس کا کام دعا و عافیت ہے۔

غیبی امداد

ضلع اٹک میں مکھڈ شریف ایک مشہور گدی ہے۔ جس پر بڑے بڑے باکمال بزرگ متمکن رہے۔ ان ہی سے ایک خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کا انتقال ۱۹۰۸ء کے قریب ہوا جانی کے والد انہی کے مرید تھے۔ اپریل ۱۹۰۸ء کی ایک شام کو یہ خبر اڑی کہ حضرت صاحب یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ اس خبر سے جانی کے گھر میں بڑی ہماہمی شروع ہو گئی۔ صفائیاں ہو رہی ہیں جوڑے سل رہے ہیں۔ نیاز نذر کے لیے نقدی، قرآن شریف اور باقی لوازمات کا انتظام ہو رہا ہے اور جانی بہت خوش کہ وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مرشد کی خدمت میں جائے گا۔ نذرانہ پیش کرے گا وہ سر و پشت پر ہاتھ پھیریں گے اور دعا دیں گے۔

آخر وہ صبح آ ہی گئی۔ پیر صاحب کے خیمے گاؤں سے باہر ایک نالے کے کنارے نصب تھے۔ جانی اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر غلام ربانی عزیز۔ آج کل پرنسپل اسلامیہ کالج قصور، کے ہمراہ ایک خیمے میں داخل ہوا۔ اندر مریدوں کے دائرے میں حضرت صاحب تشریف فرما تھے۔ گول سفید ٹوپی، سفید کرتہ، نیلا تہمد، سفید نورانی چہرہ، سفید داڑھی، شخصیت میں بلا کی کشش، اور آنکھیں گویا دو جلتی ہوئی قندیلیں۔ جانی والد صاحب کے ساتھ ان کے گھٹنوں پر جھک پڑا، چاندی کا ایک روپیہ نذر کیا۔ انھوں نے سر اور منہ پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی۔ بعد میں والد صاحب سے پوچھا:

"لالہ! لالہ! یہ دونوں بچے کہاں پڑھتے ہیں۔"

حضور! انگریزی سکول میں۔

"لالہ! لالہ! بہت برا، بہت برا۔ لالہ! انھیں آج ہی وہاں سے اٹھا کر علم دین پڑھاؤ، لالہ! یہ آج ہی کرو۔"

والد صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا، اور گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو سکول سے اٹھا لیا، اور گھر ہی میں سب سے بڑے بھائی پروفیسر[1] فاضل کی شاگردی میں دے دیا۔ جو دیوبند سے تازہ تازہ فارغ ہو کر آئے تھے۔

بھائی صاحب گاؤں کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے ہاں درجن بھر طلبہ جمع ہو گئے۔ جن میں سے ہر ایک کا سبق دوسرے سے الگ تھا۔ جب جانی اور اس کا بھائی کریما، نام حق اور پند نامہ عطار کے بعد بوستان تک پہنچے تو بھائی صاحب دوبارہ دیوبند چلے گئے اور جانی کو پڑھائی کے عذاب سے نجات مل گئی۔ اب جانی کا کام دن کو تیتر، بلبلیں اور کبوتر پکڑنا، اور بیر کھانا، چوری خربوزے توڑنا، اور رات کو دوسرے آوارہ مزاجوں کے ساتھ مل کر مختلف کھیلیں کھیلنا۔ کبڈی، چور، بادشاہ وغیرہ کھیلنا تھا۔ جانی کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایک نہ ایک شکایت ہر روز والد صاحب کے پاس پہنچ جاتی، اور وہ روزانہ پٹتا۔

جب والد نے دیکھا کہ جانی آوارہ گرد، چور اور شیطان بن رہا ہے تو وہ دونوں بھائیوں کو سات میل دور ایک گاؤں [illegible] میں لے گئے۔ جہاں دو عالم درس دیا کرتے تھے۔ ایک باپ تھا اور دوسرا بیٹا۔ باپ کا نام گلاب شاہ تھا۔ سفید داڑھی، سرخ چہرہ، اشراق و تہجد کے سخت پابند، حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ اور سارے علاقے کے پیر و مرشد۔ آپ عموماً مولانا روم کی مثنوی، خواجہ حافظ کا دیوان یا عربی صرف و نحو پڑھاتے تھے۔ باقی علوم مثلاً فقہ، منطق، فلسفہ، میراث، حدیث اور تفسیر کا درس ان کے فرزند ارجمند حضرت جناب شاہ دیا کرتے تھے۔ جناب شاہ ایک متبحر عالم تھے

---

[1] عربی، ادب، تاریخ، حدیث، سیرت اور تفسیر کے ممتاز عالم، المبرد "الکامل" نحو کی کتاب کے شارح، عربی زبان پر بے پناہ دسترس، بیس برس اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ وفات ۱۹۵۱ء۔

اور ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے بلخ و قندھار تک سے طلبہ آتے تھے۔ جانی ایک کتاب بیٹے سے اور دوسری باپ سے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے انہی بزرگ سے مثنوی کے تمام دفتر سبقاً سبقاً پڑھے اور چھوٹے استاد سے عربی نحو و منطق کی کئی کتابیں پڑھیں۔ یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔

جانی اور اس کے بھائی ہر روز صبح اپنے گھر سے نکلتے سات میل دور رنگ آباد جاتے سبق پڑھتے۔ طلبہ کی بحث و تمحیص میں حصہ لیتے اور شام کو گھر واپس آتے۔ اگر بارش وغیرہ کی وجہ سے کبھی وہاں رہنا پڑتا تو رات کو دونوں بھائی فرشِ زمین پر سوتے۔ وہاں زمین پر سونا میراثِ عشق و فقر متصور ہوتا تھا۔

طلبہ کا کھانا گاؤں سے آتا تھا۔ ہر صاحبِ حیثیت ایک روٹی اور تھوڑا سا سالن دیا کرتا تھا۔ راشن جمع کرنا کم سن طلبہ کا فرض تھا۔ جس شام جانی کو رنگ آباد میں رکنا پڑتا اُس سے نان اندوزی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

استادِ محترم مولانا جناب شاہ صاحب داڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ اس غرض کے لیے جمعرات کے دن دو طلبہ کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ دس میل دور ایک قصبے جنڈ سے ایک پیسے کی مہندی اور ایک پیسے کی کلف لے آئیں۔ مہینے میں ایک بار جانی بھی اس مہم پر جاتا۔ ایک دن جانی اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ کہ استادِ محترم یہ چیزیں اکٹھی کیوں نہیں منگوا لیتے۔ وہ کہنے لگا: "موت کا کیا اعتبار کیا معلوم کس وقت آ جائے۔" جانی کہنے لگا یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب ہم یہ خضاب لے کر گاؤں میں داخل ہوں تو استاد جی کا جنازہ نکل رہا ہو۔ اس پر اُس کے ساتھی نے جانی کو وہ دھول کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر دوسرے طلبہ سے بھی اُسے پٹوایا۔

یقین مانیے۔ کہ وہ طلبہ اپنے استاد کو نبی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ استاد کے سامنے نہایت باادب ہو کر بیٹھتے حلقے سے اٹھتے تو اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتے تاکہ استاد کی طرف پیٹھ نہ ہونے پائے۔ استاد کے ہر حکم کی ہر حالت میں تعمیل کرتے۔ اُن کی زمینوں میں ہل چلاتے ان کے ڈھور چراتے۔ ان کی فصلیں کاٹتے۔ رات کو ان کے پاؤں دابتے اور ان تمام خدمات کو وہ زادِ آخرت سمجھتے تھے۔

نہ جانے وہ اساتذہ و تلامذہ آج ہمارے کالجوں میں کیوں نہیں ملتے۔ غالباً وجہ یہ ہے کہ موجودہ نصابِ تعلیم میں اخلاق و ادب پر کوئی کام کی کتاب نہیں ہے۔ انگریز نے جو نصابِ تعلیم ہمیں بے ادب، گستاخ، بداخلاق اور لذت پرست بنانے کے لیے وضع کیا تھا وہی چل رہا ہے اور ہمارے ناظمینِ تعلیم اسی صورتِ حال پر مطمئن ہیں۔ کیونکہ ان کی اکثریت اسلامی فکر و نظر سے محروم اور فکرِ فرنگ سے مرعوب ہے، اور وہ مرشدِ عمل کلب، وسکی، زن اور زر کو حاصلِ زندگی سمجھتی ہے۔

اساتذہ میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لوگ خدا و رسول کے پیرو، عابد و زاہد، قناعت شعار، پاکیزہ کردار، ایثار پیشہ، دنیا کے امام اور اپنے شاگردوں کے لیے ایک مقدس نمونہ تھے۔ دوسری طرف ہمارے کالجوں کے بیشتر اساتذہ بے عمل، بے کردار، لذت پرست فرنگ مزاج اور مذہب سے متنفر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں وقار آئے تو کیسے اور رنگِ رہبری پیدا ہو تو کیوں کر۔ ڈاکٹر برق عموماً کہا کرتے ہیں کہ اڑسٹھ برس کی عمر میں صرف ایک صداقت پر یقین حاصل ہوا ہے کہ عبادت اللہ سے رابطہ پیدا کرنے کا واحد راستہ ہے اور اس رابطے کے بغیر شخصیت میں نہ سوز آتا ہے نہ ساز، نہ جمال پیدا ہوتا ہے نہ کمال۔ اسی رابطہ کا نام عشق ہے جو حیاتِ انسانی کا محور ہے۔ یہ ہے تو خودی خدائی ہے نہیں تو روسیاہی۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے   جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

وہ ماحول

اُس مکتب کا ماحول عجیب تھا۔ دن بھر درس کا سلسلہ جاری رہتا اور رات گئے تک چند طلبہ کسی فقہی، نحوی یا منطقی مسئلے پر جھگڑتے نظر آتے تھے۔ اُن کا انداز عجیب تھا۔ موضوع کو چھوڑ کر مقابل کو کسی ایسے مسئلے میں الجھا دیتے جس سے وہ قطعاً ناآشنا ہوتا۔ مثلاً،

خودکشی حرام ہے یا حلال؟
امام شافعی کے نزدیک حلال ہے!
امام شافعی کا مقام فقہ میں کیا ہے؟
وہی جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔
لاحول ولا قوۃ۔ یہ کفر صریح ہے۔
تم کفر و اسلام کی تعریف کرو۔
تم یہ بتاؤ کہ کفر و اسلام گرامر میں کیا ہیں۔
اور ان سے کتنے باب بنتے ہیں۔
تم یہ بتاؤ کہ مُسْتَشْنَئٌ کیا صیغہ ہے۔
تم اجوف و ناقص کی تعریف کرو۔
تم موجبہ کلیہ و مُنفصلہ مانعہ کا عکس بتاؤ۔
تم وحدت الوجود و وحدت الشہود میں فرق سمجھاؤ۔
تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔

اسے کج بحثی نہ کہیے، بلکہ مناظرانہ داؤ پیچ کی مشق تھی۔ ان طلبہ کی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لیے وقف تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مبلغوں سے اُن کی ٹکر ہوگی۔ اور اس ٹکراؤ میں کبھی کبھی کج بحثی سے بھی کام لینا پڑے گا۔

کردار و نظر

ان طلبہ کی اکثریت عابد، زاہد، پاکیزہ کردار، قناعت شعار، لذتِ دنیا سے نفور، اور خدا و رسول کی گرویدہ تھی۔ لیکن اُن میں خال خال ایسے بھی تھے، جو تسکینِ جنسیت کے لیے نازیبا وسائل اختیار کرتے تھے۔ ان کا تناسب ہزار میں پانچ سے زیادہ نہیں تھا۔

ان طلبہ کو ان کے اساتذہ آزادیِ فکر و نظر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ اور دیگر درجنوں مجتہدین ہر مسئلے پر اپنی رائے دے چکے ہیں، احادیث کے حسن و قبح پر حافظ ابن حجر، علامہ ابن ذہبی اور یحییٰ ابن معین جیسے بیسیوں نقاد بحث کر چکے ہیں۔ میراث کے اصول منضبط ہو چکے ہیں اور دین کے ہر پہلو پر ہر طرح کی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لیے تم لوگ ان مسائل پر مت سوچو ورنہ نزاع و اختلافات کا دروازہ کھل جائے گا، اور شیرازۂ ملت بکھر جائے گا۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ اُس وقت تو یہ بات اوکھی معلوم ہوتی تھی، لیکن آج سو فیصد صحیح نظر آتی ہے۔ ذرا اپنے گریجویٹوں کو دیکھیے، اہلکارانِ حکومت اور اساتذہ پر نظر ڈالو، کہیں اسلام دکھائی دیتا ہے؟ یہ

کرشمہ ہے انگریزی ادب و فلسفہ کا، فحش انگریزی فلموں کا، ان مصور انگریزی رسالوں کا جن کی تصاویر جذباتِ سفلی کی ہیجان اور حیا و عفت کی قاتل ہیں۔ ان ناچ گھروں، کلبوں اور شراب گاہوں کا جو انگریزی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ آج اگر پنڈت نہرو ہیگ کی بین الاقوامی عدالت سے یہ مقدمہ دائر کر دے کہ صاحب! نامعلوم زمانوں سے ہندوستان ایک وحدت چلا آ رہا تھا۔ ان مسلمانوں نے شور مچایا کہ ہم اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق الگ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہندوستان کے دو ٹکڑے کیجیے۔ ہم نے کر دیئے۔ لیکن انھوں نے پاکستان میں اسلامک آئیڈیالوجی کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ یقین نہ آئے تو پروفیسر ولفریڈ سمتھ کی تازہ کتاب "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" پڑھیے یا پاکستان میں خود جا کر دیکھیے ان کی برباد مسجدیں اور رقص گاہیں بے نور ہیں اور ویران چہرے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اسلام پاکستان میں دم توڑ رہا ہے۔ ان حالات و حقائق کی روشنی میں تقسیم ہند کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے پاکستان کو ختم کیا جائے

اے اہلِ پاکستان! ہے اس بات کا کوئی جواب؟

اے مسلماناں! فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب انقلاب اے انقلاب

جانی سے مولی جی

جانی ۱۹۱۰ء کے آغاز تک رنگ آباد میں رہا۔ اس کے بعد مختلف دیہاتی مکاتیب میں گھومتا ہوا ۱۹۱۴ء میں پنجراں کے ایک اسلامی مدرسہ میں جا داخل ہوا۔ وہاں ایک سال رہا۔ اس کے بعد لاہور کے نعمانیہ میں اور دو ماہ بعد نیلا گنبد میں جا پہنچا۔ وہاں حضرت مولانا غلام مرشد (آج کل خطیب شاہی مسجد لاہور، مرحوم) سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ اس مسجد کے ذیلی کمرے دراصل دارالاقامہ تھے جہاں اورینٹل کالج کے طلبہ بھی ٹھہر سکتے تھے۔ ان سب کو کھانا مفت ملتا تھا۔ جانی اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو عظیم القدر ہستیاں تدریس پر مامور تھیں یعنی مولانا نجم الدین فریادی جو منطق، عربی ادب، فلسفہ، تفسیر اور حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سید محمد طلحہ جو شعرِ جاہلیت کا درس دیا کرتے تھے۔ جانی نے ۱۹۱۹ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۱ء میں مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اور وہ اپنی علمی فضیلت نیز دو انچ لمبی داڑھی کی وجہ سے مولوی جی کہلانے لگا۔ جب اپنے گاؤں کو لوٹا تو صرف مولی جی رہ گیا۔

مولی سے مسٹر

نومبر ۱۹۲۱ء میں مولی جی اسلامیہ ہائی سکول نوشہرہ (سرحد) چالیس روپے ماہوار پر معلم عربی مقرر ہو گئے۔ وہاں دو برس رہے۔ ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کرنے کے بعد مولی جی کو احساس ہوا کہ انگریزی کے بغیر بات نہیں بنتی چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد سید انوار الحق سے جو آج کل پشاور یونیورسٹی کے شعبہ پشتو میں کام کر رہے ہیں اور خوشحال خان خٹک پر اردو میں ایک ضخیم کتاب لکھ چکے ہیں، اے بی سی شروع کی۔ جب کچھ شُدبُد ہو گئی۔ تو آزادانہ مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک سال بعد میٹرک، ۱۹۲۴ء میں ایف اے اور ۱۹۲۸ء میں بی اے کر لیا اور ۱۹۳۰ء میں داڑھی کو الوداع کہا۔ اور اس طرح مولی جی مسٹر بن گئے۔

مسٹر سے برق

جب غالب، اقبال اور حالی کی شہرت مسٹر جیلانی تک پہنچی۔ تو اس نے ۱۹۲۳ء میں شاعر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ تخلص برق رکھا اور کئی غزلیں اور نظمیں لکھ ماریں۔ لیکن اسے نہ کسی حلقے سے داد ملی، نہ کسی رسالے میں جگہ۔ برق آج تک غزلیں لکھ رہا ہے۔ لیکن دنیا سے ابھی تک تسلیم نہیں کرا سکا، کہ وہ شاعر بھی ہے۔

مسٹر سے پروفیسر

مسٹر برق ۱۹۲۹ء کو ایم اے فارسی میں جا بیٹھے اور فیل ہو گئے۔ ان دنوں یہ گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور میں ماسٹر اور رائے بہادر لالہ رتن لال کے تحت تھے جو راولپنڈی ڈویژن کے انسپکٹر تھے۔ رائے بہادر اعلیٰ درجے کے پاکستانی تھے ان معنوں میں کہ اگر ہندوؤں میں ایسے حضرات نہ ہوتے، تو پاکستان کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا۔ برق صاحب نے ان کے خلاف تین چار آرٹیکل لکھ مارے اور وہ ان کے پیچھے پڑ گئے۔ آئے دن تبدیلی اور وہ بھی بدترین مقامات پر۔ برق صاحب تنگ آ گئے۔ ایک سال کی رخصت لے لی اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ ایام رخصت کیسے کاٹے جائیں۔ کسی نے ایم اے میں داخلے کا مشورہ پیش کر دیا۔ بات معقول تھی۔ سیدھے لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے۔ ان دنوں اسلامیہ کالج بڑے عروج پر تھا۔ شیکسپیئر کے مشہور عالم ایم اے علی، خواجہ دل محمد، سید عبدالقادر، سردار کرامت، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر برکت علی قریشی اور مولانا اصغر علی روحی جیسے اساتذہ تھے اور سراج سجاد محمود نظامی، بشیر آذری، جہانگیر، نثار، خضر تمیمی اور مقبول بیگ بدخشانی جیسے تلامذہ۔ آئے دن بڑے بڑے ادبی اجلاس منعقد ہوتے تھے، جن میں مولانا ظفر علی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، احمد شاہ بخاری (پطرس)، شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال جیسی ہستیاں شریک ہوتی تھیں۔

ایم اے عربی کے طلبہ تاریخ عرب کا سبق ڈاکٹر برکت علی قریشی سے لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے ہی خوش صورت، خوش پوش اور خوش خلق انسان تھے۔ اور مہینے میں ایک دو مرتبہ پوری کلاس کو چائے پر مدعو فرمایا کرتے تھے۔ اسی کلاس کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر صدر الدین عربی شعر و ادب پڑھاتے تھے۔ اور دنیائے اسلام کے مایہ ناز فرزند خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع "الشعر و الشعراء" کا درس دیتے تھے۔ مولوی صاحب بے حد حسین، کم گو، اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ بہت کم ہنستے تھے۔ کسی بات پر محظوظ ہوتے تو ہلکی سی ایک مسکراہٹ ان کے لبوں سے اُٹھتی اور ان کی بڑی بڑی مونچھوں میں جذب ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ نرم اور دھیمی آواز میں کسی موضوع پر بحث کرتے تو ان کے متوازن خیالات چھوٹے چھوٹے چُست فقرات اور بے پناہ معلومات سے جماعت پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ ان عظیم و جلیل اساتذہ سے سال بھر پڑھنے کے بعد برق صاحب ایم اے میں بیٹھے۔ اور درجہ اوّل میں پاس ہو گئے۔

اُس دور کی ناقابلِ فراموش ہستیوں میں سے ایک ڈاکٹر تاثیر تھے۔ ہنس مکھ، ملنسار، لطیفہ سنج، مہمان نواز اور شرقی و غربی تہذیب کے سنگم۔ حکم تھا کہ چھٹی کے دن برق اپنے احباب سمیت اُن کے دولت کدے پر حاضر ہو اور غروب آفتاب تک وہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب شاعری، تصوف، نقاشی اور ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ان مسائل پر وہ ہر نشست میں مسلسل بولتے تھے۔ گوئٹے، رومی، اقبال اور عبدالرحمٰن چغتائی کا آرٹ موضوعِ سخن ہو۔ اور بولنے والا تاثیر جیسا ادیب شاعر اور فلسفی ہو۔ تو رنگِ محفل کا اندازہ خود ہی لگا لیجیے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد برق صاحب دو سال تک سکولوں ہی میں خوار ہوتے رہے۔ آخر ان کی دعا قبول ہوئی۔ اور ۱۹۳۲ء کے اواخر میں وہ نقد اسّی روپے ماہوار پر گورنمنٹ کالج ہوشیارپور میں لیکچرر، عرفِ عام میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ایم اے فارسی بھی کر لیا۔

پروفیسر سے ڈاکٹر

اب پروفیسر صاحب ڈاکٹر کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن وقت یہ کہ ڈاکٹریٹ کے لیے کتاب انگریزی میں لکھنا پڑتی تھی۔ اور پروفیسر صاحب انگریزی میں مطلق بودم بے دال تھے۔ صحیح انگریزی نہ لکھ سکتے تھے۔ نہ بول سکتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے کیلنڈر دیکھنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ اگر کوئی سکالر کلکتہ یونیورسٹی سے ایم او ایل کرے۔ تو وہ ڈاکٹریٹ

کے لیے اردو میں مقالہ لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایم اے اردو (کلکتہ) کی تیاری شروع کر دی۔ فیس داخل کی وہاں سے رول نمبر آ گیا۔ اور یکم جولائی ۱۹۳۵ء کو کلکتہ میل پر سوار ہو گئے۔ گاڑی لدھیانہ سے چلی۔ تو انھیں یک دم خیال آیا۔ کہ وہ رول نمبر گھر بھول آئے ہیں۔ گھبرا کر اٹھے، سوٹ کیس کھولا۔ اور ایک کونے سے رول نمبر نکل آیا۔ وہ خوشی میں ایک قلابازی لگانے کو تھے کہ ایک آواز آئی سنبھل بیٹھیے حضرت! کہیں گر جائیں۔ اور پروفیسر صاحب کا شوق قلابازی سرد پڑ گیا۔ اب انھوں نے رول نمبر کو پڑھا، دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا، آنکھیں مل کر پھر عینک لگا کر پڑھا اور معاً آنکھیں بند کر لیں۔ بعد از چند لمحات "اف رے بدقسمتی" کہہ کر سیٹ پر گر پڑے۔ رول نمبر میں لکھا تھا۔

اس امیدوار کو جس کا نام غلام جیلانی برق ہے ۵ جون کو امتحان کے ہال میں داخل ہونے دو۔ اور آپ امتحان سے پورا ایک ماہ بعد کلکتہ جا رہے تھے۔ سال بھر کی محنت کی بربادی اور مستقبل کی تباہی کا صدمہ اتنا شدید تھا۔ کہ پروفیسر صاحب کو کئی سو میل تک ہوش نہ آیا۔ آخر وہ سنبھلے، سامان اٹھایا۔ اور کسی سٹیشن پر اتر گئے۔ رات بھر اپنی بدحواسی پر لعنت بھیجتے رہے۔ اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالآخر انگریزی ہی میں مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور صبح پہلی گاڑی پر بیٹھ کر لاہور جا اترے سیدھا مولوی محمد شفیع صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے انھیں ساری کہانی سنائی۔ اور ساتھ ہی التماس کی کہ وہ مقالہ کے لیے کوئی عنوان تجویز فرمائیں۔ آپ نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا "کیا آپ "ابن تیمیہ" پر کام کر سکیں گے" جواب ملا "ضرور" معاً ارشاد ہوا تو جائیے کام شروع کیجیے اور جو مواد یونیورسٹی لائبریری سے مل سکتا ہے۔ وہ لیتے جائیے۔ برق صاحب اٹھے۔ استاد و مرشد کے ہاتھ کو چوما اور دعا لے کر چلتے بنے۔ ساڑھے چار سال کی تلاش و تحقیق کے بعد کتاب مرتب کی اس کے سات باب تھے۔ اصلاح زبان کے لیے ایک ایک باب حضرات ذیل کو بھیجا۔ انھوں نے کمال بندہ نوازی سے کام لیا اور زبان و محاورات کی تمام اغلاط دور کر دیں۔

۱۔ پروفیسر پیر غلام وارث[1]
۲۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد صادق[2]
۳۔ پروفیسر ڈاکٹر تاثیر مرحوم
۴۔ پروفیسر شیخ عبدالحق[3]
۵۔ خواجہ عبدالحمید مرحوم[4]
۶۔ گورنمنٹ کالج ہوشیارپور کے شعبہ انگریزی کے ایک پروفیسر سردار ہرنام سنگھ
۷۔ ساتویں کا نام یاد نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ مقالہ قبلہ شفیع صاحب کو دیا۔ انھوں نے لاتعداد خامیاں پکڑیں۔ جنھیں کسی حد تک دور کر دیا گیا۔ اور پھر یہ کتاب یونیورسٹی

---

[1] پیر غلام وارث گورنمنٹ کالج لاہور میں سائنس کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ آج کل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن لاہور کے سیکریسی آفیسر ہیں۔

[2] ڈاکٹر محمد صادق گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد دیال سنگھ کالج میں کام کر رہے ہیں۔

[3] آج کل ویٹرنری کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔

[4] گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔

کو بھیج دی گئی۔ سوا ماہ کے بعد نتیجہ نکلا اور پروفیسر برقؔ ڈاکٹر برقؔ بن گئے۔

داؤ

یوں تو پروفیسر برقؔ سیدھے پن یعنی حماقت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں ایک بڑا بھاری داؤ کھیل گئے۔ وہ یہ کہ رسوائی کے خوف سے کسی پر بھی [illegible] کر دیا کہ وہ ڈاکٹریٹ کے لیے چار سال تک کام کر چکے ہیں۔ اور ان کی کتاب کی دو نقلیں پنجاب یونیورسٹی کی وساطت سے جرمنی اور امریکہ میں جا چکی ہیں۔ جب نتیجہ کا تار آیا۔ تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ایک دوست پروفیسر فضل احمد قریشی* کے پاس پہنچے۔ انھوں نے خبر سن کر زور کا ایک قہقہہ لگایا اور دیکھنے لگے۔ مزید [illegible]۔ پھر وہ پرنسپل کے پاس گئے وہاں بھی یہی سلوک ہوا۔ اب انھوں نے قسم کھا کھا کر لوگوں کو بتانا شروع کیا۔ لیکن کوئی نہ مانتا۔ آخر وہ سائیکل پر سوار ہو کر گھر پہنچے۔ مقالے کی نقل اور یونیورسٹی سے چار سال کی خط و کتابت اٹھا لائے۔ تب کہیں کالج والوں کو یقین آیا۔

بحیثیت مُعلّم

بحیثیت مُعلّم ڈاکٹر برقؔ میں چار امتیازی صفات کے مالک ہیں۔

اوّل بھلکّڑ ہیں ایک دو دن کلاس نہیں لیتے۔ اور بعد میں کہہ دیا کہ بھول گیا ہوں۔

دوم۔ پڑھاتے کم اور لطیفے زیادہ چھوڑتے ہیں نتیجہ یہ کہ قہقہوں کے شور سے ساتھ کے ایک دو کمروں میں بھی پڑھائی نہیں ہو سکتی۔

سوم۔ چونکہ اسلامی تاریخ، فلسفہ، سیاست، فکری تحریکات، قرآن، سیرت اور ادبیات کا مطالعہ خاصہ ہے۔ اس لیے پڑھاتے وقت ادھر ادھر نکل جاتے ہیں۔ تعلق ہو یا نہ ہو اقبال کے فلسفۂ عقل و عشق کو بات بات میں گھسیٹ لاتے ہیں اور گھنٹوں ان دو افکار و مسائل پر بولتے رہتے ہیں چونکہ ان کی آواز گمبھیر، زبان فصیح و بلیغ اور بات کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے، اس لیے طلبہ ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔

چہارم۔ رہا نصاب، تو اس کا نصف ڈاکٹر صاحب پڑھا دیتے ہیں اور نصف دیگر طلبہ خود تیار کر لیتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے نااہل، غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس مُعلّم کے تقریباً تمام شاگرد ہر امتحان میں ہمیشہ پاس ہوتے رہے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاس گیدڑ سنگھی ہے۔

مست و ہوشیار

یوں تو ڈاکٹر صاحب بکارِ خود بڑے ہوشیار ہیں لیکن جب کوئی کتاب یا مقالہ لکھ رہے ہوں تو آٹھوں پہر اپنے خیالات میں گم اور حوادثِ عالم سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایسے میں جب گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ تو موٹروں والے لاکھ ہارن بجائیں، یہ سڑک کو نہیں چھوڑتے۔ ایک مرتبہ ایک ڈرائیور نے پیچھے سے ہارن بجائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سر جھکائے چلتے ہی گئے۔ موٹر پاس آ کر رکی۔ اور ڈرائیور نے غصے سے پوچھا۔ کیا آپ کی عقل ٹھکانے ہے؟ موٹر سے ایک اور آواز آئی۔ "ارے تیرے سے کام، یہ ڈاکٹر برقؔ ہیں۔ یہ باہر آتے ہیں۔ تو عقل گھر ہی چھوڑ آتے ہیں۔" یہ پھبتی سن کر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن تھوک ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ پرانی عادت ہے کہ جس شخص کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اُسے معاف کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جب کبھی عزمِ سفر باندھتے ہیں۔ تو بیگم صاحبہ ایک طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ "میں یہ چادر، وہ رضائی، یہ ٹرنک آپ کو نہیں دوں گی ہر مرتبہ آپ کچھ نہ کچھ ٹرین یا ٹانگے میں بھول آتے ہیں۔" ۱۹۵۰ء میں جب لاہور جانا پڑا تو اپنی بڑی لڑکی کو ساتھ کر دیا کہ سفر میں ہر چیز کا خیال رکھے۔ جب

---

* پروفیسر فضل احمد قریشی گورنمنٹ کالج کیمل پور میں برس ہا برس تک انگریزی و تاریخ کے پروفیسر رہے آج کل محکمۂ تعلیم کی انتظامیہ میں ایجوکیشن آفیسر ہیں۔ میری ایک کتاب "ایک اسلام" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ عنوان ہے "اسلام دی ریلیجن آف ہیومینٹی"۔ عمر ۵۰ کے لگ بھگ

لاہور اسٹیشن سے ایک تانگے میں سوار ہو کر اپنے ایک عزیز کے گھر پہنچے تو دونوں اتر کر سیدھے اندر چلے گئے اور سارا سامان تانگے میں چھوڑ گئے۔ [illegible] کو آج تک اپنے کپڑوں، زیور اور قیمتی گھڑی کا ماتم ہے اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے قلم کا ملال جس سے انھوں نے سو کتابیں اور سیکڑوں مضامین و مقالات لکھے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۶۳ء میں پھر لاہور جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ کیمبل پور کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر محمود احمد ان کے رفیق سفر تھے۔ وہ راہ میں بار بار کہتے: ڈاکٹر صاحب سامان کا خیال رکھنا۔ گوجرانوالہ اسٹیشن سے ایک اور مسافر اسی ڈبے میں آگیا اور اوپر والی سیٹ پر بیگ رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ محمود صاحب کہنے لگے: ڈاکٹر صاحب یہ بیگ آپ کے بیگ کا ہم رنگ ہے کہیں بدل نہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اپنے بیگ کو الگ کیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ لاہور پہنچ کر ڈاکٹر صاحب ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ رات کو کپڑے بدلنے کے لیے بیگ کھولا۔ تو اوپر ربڑ کا ایک پھولا ہوا ہاتھی نظر آیا۔ خیال آیا کہ شاید محمود صاحب نے مذاق کیا ہو۔ نیچے سے ایک میلا کچیلا پاجامہ نکلا پھر دو پرانے سلیپر اور بارہ انچ لمبے جوتوں کا ایک جوڑا۔ اب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس مسافر کا بیگ اٹھا لائے ہیں۔

طبی شاہکار

ان کی تصانیف میں طب کی چند کتابیں بھی شامل ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں مولوی جی ان کتابوں کو پڑھ کر چند روز کے لیے اپنے گاؤں گئے تو اتفاقاً ان کی ہمسائیگی میں ایک لڑکی اور اس کا باپ تپ محرقہ میں مبتلا تھا۔ مولوی جی نے اپنے طبی علم کا چرچا کیا۔ تو اس کے گھر سے ایک عورت آئی اور مولوی جی کو علاج کے لیے ساتھ لے گئی۔ وہاں پہنچ کر مولوی جی نے مریضوں کی نبض دیکھی۔ زبان کا معائنہ کیا۔ پانچ سات سوال پوچھے۔ اپنی کتاب دیکھی اور کہا انشاءاللہ بہت جلد آرام آجائے گا۔ گھر پہنچ کر دوا تیار کی اور کہا کہ ایک گولی بیٹی کو کھلا دو۔ باپ کا علاج کل صبح شروع ہوگا۔ آدھا ہی گھنٹہ گزرا ہو گا کہ اس گھر سے رونے دھونے کی صدا بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی فوت ہو گئی ہے۔ ایک کونے سے تایا جی کی آواز آئی "لے او حکیم کے بچے! اب جیل کی تیاری کر۔" یہ سن کر مولوی جی خوف سے کانپنے لگے اور تایا جی کے پاؤں پکڑ لیے خدارا مجھے بچائیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ تایا جی اٹھ کر مسجد کو چل دیئے۔ وہاں امام مسجد کو کہا تھا اور امام صاحب سیدھے اس گھر میں جا پہنچے۔ وہاں عورتیں اس قسم کے بین کر رہی تھیں: "او ظالم مر لیا! اس بیچاری نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ اس موئی کو سانپ ڈسے۔ اس کی واڑھی کو آگ لگے۔ اس کا خانہ خراب ہو۔" وغیرہ وغیرہ۔ امام صاحب نے پہنچتے ہی سب کو ڈانٹا کہ ارے او جاہلوں کی بچیو! یہ کیا کفر بک رہی ہو۔ موت کا وقت مقرر ہے اور سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بددعا دینا بند کرو اور درود شریف پڑھو ورنہ مرحومہ کی روح آسمان کے کناروں پر لٹکی رہے گی اور اسے بہشت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس پر سب عورتیں خاموش ہو گئیں اور مولوی نے بھی فن طب چھوڑ دیا۔ اللہ کی شان کہ ایک گھنٹے بعد اس لڑکی کا والد بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے متعلق لوگوں کی بدگمانی رفع ہو گئی اور شام کے وقت جب دو جنازے گاؤں سے نکل رہے تھے تو حکیم صاحب کی گاڑی گوجر خاں سے نکل چکی تھی۔

کردار

ڈاکٹر کا کردار کسی پہلو سے بھی قابلِ ستائش نہیں۔ اس کا بچپن شیر پالنے، خربوزے چرانے، گالیاں بکنے اور لفنگاپن میں گزرا۔ جوانی علم کی پرستش اور افلاس کی صعوبتوں میں بیتی اور بڑھاپا جوانی کے ماتم میں گزر رہا ہے۔ زندگی کو سنوارنے کی کبھی فرصت ہی نہ ملی۔ اگر ملی بھی تو بے سروسامانی آڑے آئی۔ سچ پوچھیے تو ایک گناہ نے اسے کئی گناہوں سے بچائے رکھا اور وہ برج یا تاش کا ایک انگریزی کھیل ہے۔ جو جوئے کی ایک قسم ہے۔ ڈاکٹر نے یہ کھیل ۱۹۳۳ء میں شروع کیا تھا۔ اور اب تک کھیلتا ہے۔ فرق یہ کہ شروع میں وہ داؤ لگاتا تھا اور اب داؤ کے بغیر کھیلتا ہے۔ "گناہ کے متعلق سوچنے کا موزوں ترین وقت شام ہے۔" اور ڈاکٹر کی ہر شام کلب میں گزر جاتی ہے جہاں وہ رات کے گیارہ بجے تک ہنستا، بولتا، اور کھیلتا ہے۔ گو اس کی زندگی کا آفتاب زرد ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی زندہ دلی، لطیفہ بازی، چہچہوں اور قہقہوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات بات پر وہ شعر اس

ایران و عرب کے اقوال، حکایات و واقعات سناتا اور چند بلند پایہ شعرا کے اشعار پڑھتا ہے۔ گفتگو شستہ، پُر مزاح اور مختصر ہونے کے علاوہ وہ ایک شاندار جوکر بھی ہے۔ اس نے کالج میں کئی ڈرامے کرائے اور ایک دو مرتبہ مسخرے کا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب اوّل درجے کے احمق واقع ہوئے ہیں۔ ان معنوں میں کہ جس آدمی سے ملتے ہیں اُسے سو فیصد شریف سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس وقت اپنی رائے نہیں بدلتے، جب تک کہ ہم فریب کھانے کے بعد انھیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ بدنیت، بدگو اور بداندیش ہے۔

بے اصول ہونے کے باوجود آپ نہایت استقلال سے چند اصولوں کی پابندی کرتے ہیں:

اوّل: اپنے دوست کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے اور رشتۂ محبت کو قائم رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے ہیں۔

دوم: اقارب میں صلح و آشتی کے پُرجوش مبلغ ہیں اور اس بات پر نازاں کہ زندگی کی کسی منزل پر بھی اُن کا اپنے بھائیوں سے اختلاف نہیں ہوا اور جو تعلقات عہدِ والد، آغوشِ مادر میں پروان چڑھے تھے وہ بدستور قائم ہیں۔

سوم: آپ اپنے محسن کو کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں ہزار عیب ہوں، وہ آنکھیں بند کر کے اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ آپ کی نگاہ ان معنوں میں حسن پرست ہے کہ آپ ہر چیز اور ہر انسان کا صرف روشن پہلو دیکھتے ہیں، اور جب تک مجبور نہ ہو جائیں عیوب و نقائص کی طرف توجہ نہیں کرتے

چہارم: آپ اپنے علمی مخالفین سے قطعاً نہیں الجھتے۔ اس وقت تک آپ کے خلاف آٹھ کتابیں اور درجنوں مضامین نکل چکے ہیں جن میں آپ کو کافر، مرتد، ملعون اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن آپ ہمیشہ خاموش رہے۔ صرف ایک مرتبہ آپ نے حماقت کی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک نہایت تیز خط لکھ دیا۔ انھوں نے وہ خط اپنے اخبار صدقِ جدید میں چھاپ دیا، اور بعض اردو اخبارات و رسائل پنجے جھاڑ کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔

پنجم: آپ ان لوگوں سے میلوں بھاگتے ہیں جو دولت یا اونچی کرسی ہی کو معیارِ عظمت سمجھتے ہیں۔

ششم: آپ حُسنِ فطرت کے شیدائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کیمل پور کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے۔ اس چھوٹی سی صاف پاکیزہ بستی کی کھلی فضا میں حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت اور گرد و پیش چشمے اور سرسبز وادیاں، گھنے جنگل، اُن میں ہرنوں، تیتروں اور چکوروں کے ڈار وہ نعمتیں ہیں جو شہروں کی غلیظ، متعفن، گرد آلود اور دُخان آلود فضا میں نہیں مل سکتیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ سحر کے وقت خدائے ذوالجلال زمین کے قریب آ کر آواز دیتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھے پکارے اور میں اُس کی فریاد سنوں۔ خدا ان بستیوں ہی میں زمین کے قریب آتا ہے۔ بڑے شہروں کا شور آلود و گھٹا ماحول اس شرف کا سزاوار کہاں!

شاہدِ فطرت کو اپنی بے نقابی کے لیے — ہاں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن (اقبال)

ہفتم: اس حقیقت پر محکم ایمان رکھتے ہیں کہ زندگی یہاں مسافر ہے اور اس کی منزل اللہ ہے۔ مسافر کو صرف زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ زر و سیم کے انباروں کی کم خوری، سادہ پوشی، قناعت اور استغنا میراثِ انبیا ہے اور دولت میراثِ فرعون۔ دولت ایک سیلاب ہے جو اخلاق و فضائل کی تمام تعمیریں بہا لے جاتا ہے، اور پیچھے شراب و گناہ کی غلاظت چھوڑ جاتا ہے۔ دولت غرور، نخوت، بدمستی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور انسان کو عرشی بلندیوں سے اٹھا کر اس جہنم میں پھینکتی ہے، جہاں بڑے بڑے فراعین و نماردو گل سڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ سے صرف لینا جانتے ہیں اور اگر ان سے اللہ کے نام پر کچھ واپس مانگو، تو جبیں پر بل پڑ جاتے ہیں

«ہم اگلی دنیا میں ان کے جسموں کو ان کے زر سے داغیں گے۔ اور کہیں گے، کہ زر اندوزی کا مزہ چکھو۔» (قرآن)

کسبِ دولت معیوب نہیں۔ آپ بیشک ایک لاکھ روزانہ کمائیں۔ لیکن اس دولت کو عیاشی پر صرف کرنا اور قومی اداروں کے لیے کچھ نہ دینا ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ ایسے بدقماشوں کی زاید از ضرورت دولت کو قومی ملکیت میں لے لینا ہی اس روگ کا واحد علاج ہے۔

ہشتم:۔ ڈاکٹر صاحب جھوٹ، فریب، بددیانتی، نظر بازی، نفاق، بدعہدی، حرص، حسد، سستی اور دیگر عیوب سے مدت ہوئی تائب ہو چکے ہیں۔ نماز و عبادت کے پابند ہیں اور سحر خیز بھی۔ آپ کہیں گے یہ ڈاکٹر تو زاہد ملا ہی ہے۔ جی ہاں! آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ یہ عافیت میں دمِ زندگی، غمِ زندگی ہے۔

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا   جہانِ تازہ تری آہِ صبحگاہ میں ہے (اقبال)

قلابازیاں

ڈاکٹر صاحب نے جوانی سے لے کر اب تک جہانِ فکر میں بڑی بڑی قلابازیاں کھائیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک آپ چاروں قسم کے مُقلد تھے، ائمہ فقہ کی رائے کو آخری سمجھتے تھے، اور اہلِ سنت کے سوا باقی تمام فرقوں اور مذہبوں کو گمراہ قرار دیتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں انھیں مرضِ تشکیک لاحق ہوا اور بڑھتا گیا۔ پہلے قرآن کے الہامی ہونے پر اعتراض سوجھے، پھر رسالت میں شک ہونے لگا، اور سنہ ۱۹۲۳ء میں خدا کی ہستی تک سے منکر ہو گئے۔ یہ تھا دورِ الحاد۔ اس دور میں آپ نے نئے مذہب کی تلاش شروع کی۔ پہلے عیسائیت کا مطالعہ کیا۔ انجیل تو سمجھ میں آ گئی۔ لیکن مذہب سمجھ میں نہ آیا۔ "ایک تین، تین ایک" ایسا گورکھ دھندا تھا جو آپ کی محدود فہم سے وراء تر تھا اور اس سے مشکل تر یہ مسئلہ کہ مسیح علیہ السلام ساری اُمت کے گناہ ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر عیسائی عدالتیں عیسائی چوروں کو سزائیں کیوں دیتی ہیں؟ انجیل کے بعد وید اور گیتا کو دیکھا۔ تعلیم تو پسند آئی لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ جب چالیس کروڑ ہندو اپنی مقدس تعلیمات کو چھوڑ کر بُت پرستی، قمار بازی، سُود خوری، چھوت چھات، تعصب، ذات پات، زر اندوزی اور جھوٹ جھات کو اپنا مذہب سمجھ بیٹھے ہیں۔ تو تم ہندو بن کر رہو گے کہاں؟ بھارت میں؟ وہ تمھیں ناستک ملیچھ اور مردود سمجھ کر مار ڈالیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان مذاہب پر الحاد کو ترجیح دی اور مذہب کا خیال ترک کر دیا۔

الحاد پر پانچ چھ برس گزر گئے۔ ایک دن اُن کے ایک دوست ایک کتاب لا کر کہنے لگے کہ ایک بہت بڑے سائنس دان نے یہ کتاب اسلام پر لکھی ہے۔ ذرا پڑھ لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کتاب لے کر ایک الگ کمرے میں چلے گئے اور پہلے ہی فقرے پر پھڑک اُٹھے۔ مصنف کا اسلوبِ بیان از بس شاعرانہ تھا۔ اور استدلال بے حد حیرت انگیز۔ قرآن کی عظمت، رسول کی بے پناہ دانش اور اسلام کے جہاں آرا پیغام پر مصنف کے خیالات اس قدر مؤثر تھے، کہ ضمیرِ برق لرز اٹھا اور اس کے کفر کا شیش محل دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اُس نے کتاب بند کی، کپڑے بدلے، مصلّے بچھایا، اور سجدے میں گر کر دیر تک اپنی نادانی پر روتا رہا۔ یہ تھا برق کا دوسرا جنم۔ اس کتاب کا نام ہے «تذکرہ» از علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی ادام اللہ فیوضہ۔

تصانیف

نمبر شمار	عنوان	سال تحریر	موضوع
۱	پیامِ ادب	۱۹۲۹ء	تنقید پر ایک رسالہ
۲	انفعال	۱۹۳۰ء	اصلاحِ رسوم پر ایک ڈرامہ

نمبر شمار	عنوان	سال تحریر	موضوع
۳	لمعات برقی	۱۹۳۲ء	پچاس ادبی مضامین کا مجموعہ
۴	انقلاب	۱۹۳۵ء	آپ بیتی (رسالہ)
۵	ابن تیمیہ (انگریزی)	۱۹۳۹ء	امام ابن تیمیہ کے حالات جس پر ڈاکٹریٹ عطا ہوئی۔ غیر مطبوعہ
۶	ابن تیمیہ (اردو)	۱۹۴۰ء	تلخیص اردو
۷	حیاتِ سکندر	۱۹۴۲ء	سر سکندر حیات کے سوانح (غیر مطبوعہ)
۸	آئین فطرت	۱۹۴۳ء	اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ایک ضخیم تبصرہ (غیر مطبوعہ)
۹	دو قرآن	۱۹۴۴ء	قرآن کا مطالعہ سائنس کی روشنی
۱۰	حکمائے عالم	۱۹۴۶ء	القفطی مصری کی تاریخ الحکما کا اردو ترجمہ اس میں اندازاً تین سو مسلم اور ایک سو چودہ یونانی حکما کے حالات ہیں۔
۱۱	جہانِ نو	۱۹۴۸ء	مختلف اسلامی مسائل پر بحث
۱۲	دو اسلام	۱۹۴۹ء	حدیث پر ایک تنقیدی نظر
۱۳	ہم اور ہمارے اسلاف	۱۹۵۰ء	صحابۂ کرام کی داستانہائے عدل و ایثار
۱۴	ایک اسلام	۱۹۵۲ء	وحدتِ مذاہب پر تفصیلی بحث
۱۵	حرفِ محرمانہ	۱۹۵۳ء	(حدیث پر ایک نظر
۱۶	اللہ کی عادت	۱۹۵۴ء	نیکی سکھ ہے اور بدی دکھ
۱۷	سلاطینِ اسلام	۱۹۵۵ء	انگلستان کے مشہور مؤرخ لین پول کی ایک کتاب "محمڈن ڈینا سٹیز" کا اردو ترجمہ
۱۸	بھائی بھائی	۱۹۵۸ء	شیعہ و سنی اختلافات تاریخ کی روشنی میں بے بنیاد ہیں۔
۱۹	تراجم	۱۹۵۸ء	اردو انسائیکلو پیڈیا کے لیے جو پنجاب یونیورسٹی مرتب کرا رہی ہے ایک سو دس مقالات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ
۲۰	من کی دنیا	۱۹۶۱ء	روح، تقدیر، دعا، عبادات وغیرہ پر بحث
۲۱	دانش رومی و سعدی	۱۹۶۳ء	رومی و سعدی کا پیغام (زیر طبع)
۲۲	کئی سو مقالات و مضامین		

تاریخ وفات

گو ابھی تک ڈاکٹر صاحب تندرست اور چاق و چوبند ہیں، جوانوں کے سے قہقہے لگاتے اور گولی کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی چند عادات آخر انھیں گور میں پہنچا کر ہی دم لیں گی۔ اول حقہ، دوم چائے۔ سوم دوڑتی

سے فراغ، چہارم دن کو پورے بارہ گھنٹے پڑھنے لکھنے کا التزام خیال یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے قریب وہ جاویدیہ داں میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن دنیا ان کی وفات سے مطلقاً بے خبر رہے گی۔ کیوں کہ ہمارے اخبارات صرف شاہزادوں (مثلاً) وزیروں اور سفیروں کے متعلق خبریں دیتے ہیں۔ رہے علمی لوگ تو ان کے ساتھ ہمیشہ وہ ایک عجیب سلوک کرتے آئے ہیں کہ اول تو ان کی موت کی خبر چھاپتے ہی نہیں، تاکہ ان کے قارئین خبر کے صدمے سے محفوظ رہیں اور اگر چھاپیں بھی تو آخری صفحہ پر اشتہاروں کے پیچھے ایک کونے میں صرف اتنا لکھ دیتے ہیں :-

- اختر شیرانی کا انتقال :
- کل شام کو فلیمنگ روڈ پر اختر شیرانی کا انتقال ہو گیا ہے، کل رسم قل ادا ہو گی :

یقین نہ آئے تو دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محقق خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے سانحۂ انتقال پر نظر ڈالیے، کتنے اخبارات نے ماتم کیا؟ کتنے سیاستدانوں نے تعزیت کے پیغام بھیجے، ملک کی کتنی درسگاہیں ان کے سوگ میں بند ہوئیں؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق کا انجام انشاء اللہ ان سب سے بہتر ہو گا۔ ان کی موت پر بعض مذہبی رسائل "خس کم جہاں پاک" کے عنوان سے طویل مضامین لکھیں گے اور زمین و آسمان سے شور برپا ہو گا ؏

ڈاکٹر برق در جہنم رفت

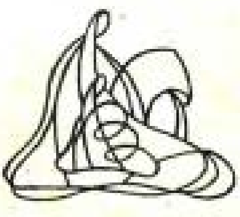

آنند نرائن مُلّا

پیدائش۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء۔ مقام پیدائش: آبائی مکان محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ۔ خاندان۔ میرا خاندان کشمیری ہے۔ میرے جدِ امجد پنڈت سیتارام مُلّا کشمیر سے کلکتہ چلے آئے تھے۔ ان کے صاحب زادے (میرے دادا) پنڈت کالی سہائے مُلّا کی تربیت لکھنؤ میں ہوئی اور اسی وقت سے میرا خاندان مستقل طور پر یہاں رہنے لگا۔ میرے دادا کی دو اولادیں ہوئیں۔ پنڈت کشن نرائن مُلّا اور پنڈت جگت نرائن مُلّا جو میرے والد تھے۔ تعلیم۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۷ء تک گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں ہوئی جو اب گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج ہے۔ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا پھر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں۔ ۱۹۱۹ء میں ایف اے ۱۹۲۱ء میں بی۔ اے ۱۹۲۳ء میں ایم اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھا۔ لیکن اردو کے پرچہ میں بہت کم نمبر ملنے کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ نمبر کم ملنے کی غالباً دو وجوہات تھیں ایک تو پرچے کے جوابات بجائے اردو کے انگریزی میں دیئے دوسرے رائج الوقت نقطۂ نظر سے بالکل اختلاف تھا۔ مثلاً میر کو خدائے سخن ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ میر کی شاعری محض ایک شکستہ دل کی شاعری ہے۔ نہ اس میں کوئی فلسفیانہ گہرائی ہے نہ ذہنی رفعت۔ میر کا شاعری میں یہ درجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک سوال پرچہ میں تھا اور ممکن ہے کہ ایسے جواب کو دیکھ کر ممتحن نے یہ اندازہ کیا ہو کہ یہ اردو ادب سے بالکل بے بہرہ ہے۔

۹ فروری ۱۹۲۵ء کو شادی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ وکالت خاندانی پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے "کہتے ہیں وکالت جیسے گھٹی میں پڑی ہے۔"

اسکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں گھر پر اردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضا مرحوم فرنگی محل سے پڑھتا تھا اور وہ اکثر سبق دے کر غزل کہنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہر طرح پر کم سے کم وہ پچاس ساٹھ شعر کہتے تھے۔ جب میں کالج کا طالب علم تھا۔ تب انھوں نے دو تین بار اپنے کہے ہوئے اشعار پڑھنے کے لیے دیئے۔ لیکن میں نے پڑھنا گوارا نہ کیا۔ مولانا بھی ناراض ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں سب یہی کرتے ہیں۔ لیکن مجھے پھر بھی قبول نہ ہوا۔ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے وہ شعر پسند نہ آتے تھے۔ مولانا نے میری طرف سے ایک قطعۂ تاریخ کہہ کر اپنے کسی شاگرد کے دیوان کے ساتھ جوڑ کر ایک رسالے میں چھپوا دیا تھا۔ ان کا نام شاید اشفاق حسین تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا تخلص بھی اثر رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں نے مولانا سے شکایت کی تب انھوں نے ناراض ہو کر فرمایا کہ آئندہ مجھے نہ کوئی قطعہ دیں گے اور نہ اگر میں کہوں گا بھی تو میرے اشعار کی اصلاح فرمائیں گے۔

جب سے کہ میں ۱۶ یا ۱۷ سال کی عمر میں کالج آیا تھا۔ مجھے انگریزی میں تھوڑی بہت نظم کہنے کی عادت ہو گئی تھی اور میرا انگریزی کلام کالج

میگزین میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے انہیں کی چند رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا جس کو لوگوں نے کافی پسند کیا تھا۔

۱۹۲۳ء میں میری صحت کچھ خراب ہوگئی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک مہینہ تک بستر پر ڈال رکھا تھا۔ کوئی ایسی بیماری نہ تھی کہ میں اور کام نہ کر سکوں صرف شام کو حرارت ہوجاتی تھی پڑے پڑے جی گھبراتا تھا۔ تو زیادہ وقت کتابیں پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ جو پیام مشرق کے نام سے شائع ہوا تھا پڑھا۔ اس کی پہلی نظم لالۂ طور پڑھی۔ یہ نظم اس قدر پسند آئی کہ میں نے بڑے قریب ... قطعات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔ جب میرے احباب نے یہ ترجمہ دیکھا۔ تو انھوں نے اسے بے انتہا پسند کیا۔

پنڈت منوہر لال زتشی جو جوبلی سکول میں میرے ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے، اور ہمیشہ میرا دل بڑھایا کرتے تھے۔ انھوں نے جب یہ ترجمہ دیکھا۔ تو انھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنی شاعرانہ قابلیت کو انگریزی شعر کہہ کر ضائع نہ کروں بلکہ اردو میں شعر کہا کروں۔ میں نے اس وقت تک غالباً شاید کبھی کوئی شعر کہا ہو لیکن ایک مکمل غزل بھی کہی نہ تھی۔ میں نے عذر کیا کہ اردو میں شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں مگر ان کا اصرار جاری رہا۔ اور جب ملتے تھے تو ٹوکتے تھے۔ کہ تم نے کچھ کہا یا نہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے غالباً ۱۹۲۴ء میں پہلی نظم کہی جس کا عنوان "پرستار حسن" تھا انھوں نے اس نظم کو اتنا پسند کیا، کہ اس کی نقلیں اپنے احباب کو بھیجیں جن کے مبارکباد کے خطوط میرے پاس آئے۔ اس نظم کو زمانہ میں انھوں ہی نے بھیجا اور "زمانہ" میں یہ ایک اڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی۔ اس کے بعد تو ان کا اور نیز دیگر احباب کا اصرار اور بڑھ گیا۔ اور میں مستقل نظم کہنے لگا۔ زمانہ میں دو چار نظمیں چھپنے کے بعد شہر کے مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اور بہار مرحوم نے گھیر کر انجمن معین الادب کا ممبر بھی بنالیا۔

کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھ کر آج تک شعر نہیں کہا جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھ کر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اور لمبی غزلیں شروع سے لے کر آخر تک دماغ ہی میں نظم ہوتی۔ پہلے خیال سے لے کر آخری خیال تک ہمیں اس کی اصلاح اور ترقی ہوتی رہی اور مکمل ہوجانے کے بعد بھی دماغ ہی میں محفوظ رہیں۔ اکثر نظمیں محفلوں میں پڑھے جانے کے کئی مہینے بعد کاغذ پر لکھی گئیں۔ آج بھی قریب قریب اپنی ساری نظمیں یاد ہیں۔ جن میں سے بعض کچھ کم بارہ سال پرانی ہوں گی۔ غزلیں بھی جو کہی گئیں اور وہ بھی اسی طرح یاد ہیں۔ چونکہ خیال پر کبھی قافیہ اور ردیف کی پابندی لگا کر فکر نہیں کی لہٰذا ایسا کئی بار ہوا کہ طرح پر تو کوئی شعر نہ کہہ سکے لیکن دو دو، چار چار شعر طبع زاد زمینوں میں نکل آئے ایسا تو ہمیشہ ہوا کہ ایک غزل کہنے کے بعد دو چار غزلیں تیار ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں کے مجموعہ میں طرحی غزلیں بہت کم ہیں اور غیر طرحی بہت۔

شروع شروع میں میرے احباب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کسی کا شاگرد ہو جاؤں لیکن میرے ذوق نے اسے گوارا نہ کیا۔ اول تو یہ کہ شاگردی سے انفرادیت اس قدر سخت مجروح ہوتی ہے کہ وہ پھر جاں بر نہیں ہوسکتی۔ استاد کا رنگ شاگرد کے کلام پر ایک حد تک ضرور حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات میں مختلف طریقوں سے کیف پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر ایک مخصوص عالم طاری ہوتا ہے۔ جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ ایک آدمی کے دل کی ترجمانی دوسرا کس طرح کر سکتا ہے۔ کہنے کو تو غم اور خوشی دنیا میں سب کو ہوتی ہے لیکن ایک ہی غم اور خوشی کا اثر دنیا میں دو انسانوں پر بھی یکساں نہیں ہوتا۔ وہی شاعر کامیاب ہے جو اس مخصوص اثر کو ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے سب سے پہلے صداقت کی ضرورت ہے اور صداقت دوسرے کے رنگ میں ڈوب کر قائم نہیں رہ سکتی۔ استاد زبان کی غلطیاں ضرور دور کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح شاگرد کی ذہنی ترقی نہیں ہوتی

اور اگر شاگرد میں جوہر قابل ہے تو وہ خود کچھ زمانہ بعد اپنے پرانے کلام پر نظرثانی کر کے ان غلطیوں کو بغیر اپنے مفہوم کا خون کیے ہوئے استاد سے کہیں بہتر طریقے سے نکال سکتا ہے۔ ابھی تک کوئی پچاس ساٹھ نظمیں کہی ہیں۔ اور تقریباً سو غزلیں۔ پیشے کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی وقت فکر سخن کے لیے نہیں تھا اور جو کچھ تھا بھی ہے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے کے خیال سے کسی غزل لکھنے میں صرف ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظمیں سال میں تین چار سے زیادہ کہنے کا وقت نہیں تھا۔ اتنی بھی فرصت نہیں حتی کہ جو کچھ کہا ہے اسی پر نظرثانی کر لی جائے اور اسے شائع کرا دیا جائے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو برس تک سلسلۂ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ سادات اہل بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ہرات کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی تھی جو "چشت" کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوئی۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ انہی سے صوفیہ کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی ایک دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلۂ نسب امام علی نقی علیہ السلام کے واسطے سے امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصر الدین ابو یوسف کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ (متوفی ۵۲۷ھ) تھے جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودیہ کے مورث ہیں۔

[حضرت خواجہ معین الدینؒ اجمیری کے شیخ حضرت عثمان ہرونیؒ تھے۔ ان کے شیخ حضرت حاجی شریف زندنیؒ اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود رحمۃ اللہ علیہم]

خاندان مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے، وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ جنہوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی، حضرت ابو الاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانہ میں چشت سے ہندوستان آئے اور کرنال کے قریب براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا اور اب تک کہ پانچ پشتیں گزر چکی ہیں اور چھٹی پشت گزر رہی ہے، اسی اجڑے دیار میں آباد ہے۔

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا میرزا قربان علی بیگ خاں سالک گو خود شاعر اور صاحب قلم تھے مگر پشت ہا پشت سے ان کا پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے میرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ماوراء النہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے۔ جب شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف سمتوں میں تتر بتر ہو گئے۔ چنانچہ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر، نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔ نیاز بہادر خاں کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ عاشور بیگ خاں ان کے ہم جد رشتے میں ان کے چچا تھے اور دولت آصفیہ نے اسی خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا تھا جو خطاب و اعزاز دولت مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نواب نیاز بہادر خاں ان کی جگہ نظم جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خاں کی شادی عبدالرحیم خاں قلعدار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور اسی بیوی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے۔ سنہ [illegible] میں نواب نیاز بہادر خاں چیل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ اس ہنگامے کے واقعات دکن کی تاریخوں میں تفصیل سے مذکور ہیں اور شہادت کا یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ:

"از شمشیر شمشیر خاں کار نیاز بہادر خاں واز شمشیر نیاز بہادر خاں کار شمشیر خاں تمام شد۔"

اس واقعہ کے بعد نواب عالم بیگ خاں اپنے خورد سال بچے کو لے کر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد میرزا سالک مرحوم پھر حیدرآباد واپس آئے اور سر سالار جنگ اعظم نے ان کو سررشتۂ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انھوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی و شرکت سے "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جو اگرچہ حیدرآباد کا سب سے پہلا نہیں تو کم از کم قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا اور اسی خاک میں دفن ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے۔

میرے والد مرحوم مولوی سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سر سید مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر محمد رفیق اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیق جماعت تھے۔ اسی زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا حال سب جانتے ہیں مگر ہمارا خاندان اس امر میں عام مسلمانوں سے کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا مگر سر سید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی اور یہ دیکھ کر انھیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیرطریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوئے تو دادا صاحب سے مل کر کہا:

"بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو بیٹھیے۔ میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ [illegible] پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔"

یہ خبر سن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہ وہاں تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے الٰہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اتالیقی کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ راجہ صاحب نے دہلی سے دو آدمیوں کو بلایا تھا تاکہ ان میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ ان میں سے ایک میرے والد تھے اور ایک والد مرحوم کے استاد تھے جنھوں نے بچپن میں ان کو پڑھایا تھا۔ دیوگڑھ پہنچ کر جب والد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میرے استاد کو بھی بلایا گیا ہے تو انھوں نے راجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف استاد صاحب سے والد کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ میرا شاگرد اور میرے سامنے کا بچہ ہے۔ بھلا وہ میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔" دونوں کے اخلاق کے یہ نمونے دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا کہ:

"ہمیں اُستاد کی ضرورت نہیں۔ شاگرد ہی ہمیں پسند آیا ہے۔"

کئی سال تک والد مرحوم دیوگڑھ میں رہے۔ پھر ایک سازش کے ماتحت ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا جس کا والد مرحوم کو سخت صدمہ ہوا اور دیوگڑھ کی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔ پھر کئی سال تک اُنھوں نے میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر وغیرہ مقامات میں وکالت کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمہ میں وکالتاً اورنگ آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میر عدل تھے اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ ان کے ایما سے یہاں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد مرحوم پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرز معاشرت کا غلبہ تھا اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت نے رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے اور اس کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے بیعت کر لی، اور ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے۔ تاہم اس وقت تک یہ رنگ اتنا چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین اور دنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں جب کہ میں صرف ایک سال کا تھا، والد مرحوم کے لیے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہو گیا اور اُنھوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیرباد کہا۔ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم مبنیٰ "عرب سرائے" میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترک دُنیا لازم نہیں۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر موکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب انھیں کامل اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان حالات میں وکالت کا چلنا معلوم۔ رفتہ رفتہ اہل معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں مگر اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ شبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد تشریف لائے مگر چند مہینے رہ کر خرابی صحت کے باعث بھوپال چلے گئے۔ جہاں میرے بڑے بھائی سید ابو محمد صاحب اگزیکٹو افسر تھے۔ وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ان کو بالکل بیکار کر دیا۔ چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ء میں اُنھوں نے انتقال فرمایا۔

میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔ اُنھوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد سے فرمایا کہ اس کا نام ابو الاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے اور انھی کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

اس لیے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، والد مرحوم نے دُنیا ترک کر دی اور تین سال تک درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد گو اُنھوں نے پھر دُنیا کی طرف رجوع کیا مگر اس دُنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا بلکہ ایک خالص مذہبی دُنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ ایک مکمل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔

والد مرحوم نے اوّل دن ہی تہیہ فرمایا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے چنانچہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی۔ اُردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان اور فقہ و حدیث کے درس پر ڈال دیا گیا اور انگریزی زبان، علوم اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ اخلاق و عادات کی صحت کا بھی خیال تھا۔ ایک مدت تک اُنھوں نے مجھے کسی مدرسے میں داخل نہیں کیا بلکہ گھر پر تعلیم دلوائی۔ پڑھنے کے علاوہ جتنے اوقات بچتے تھے۔ ان میں وہ بیشتر مجھ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے احباب میں لے جاتے تھے جو سب کے سب ثقہ اور سنجیدہ لوگ تھے۔ راتوں کو انبیاء کے قصے، بزرگانِ دین کے حالات، اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے، مختلف دلچسپ پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشین کرتے اور مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ زبان کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ بیس سال تک دکن میں رہنے کے باوجود ان کی زبان پر یہاں کا ایک لفظ اور ایک محاورہ بھی نہ چڑھا تھا۔ خالص اُردوئے معلّٰی بولتے تھے اور زبان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی اُنھوں نے ایک کافی مدت تک اس کا خیال رکھا کہ ہم عام بچوں میں ملنے جلنے نہ پائیں اور اس حفاظت کے باوجود اگر کبھی گھر کے نوکروں یا دوسرے لوگوں سے سُنا سنایا کوئی دکنی لفظ یا محاورہ زبان پر چڑھ جاتا تو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے اور صحیح لفظ بتا دیا کرتے تھے۔

نو سال کی عمر تک میں نے گھر پر پڑھا اور اس زمانے میں صرف و نحو، عربی ادب اور فقہ کی متعدد کتابیں پڑھ لیں۔ پھر میرے استاد مولوی ندیم اللہ حسینی مرحوم و مغفور کے مشورے سے مجھے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ میں داخل کر دیا گیا۔ داخلے کے چند مہینے بعد میں رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوا مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ریاضی کی تعلیم بھی میں نے صرف اسی چھ مہینے کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے سوا کسی اور مضمون میں میں کمزور نہ تھا۔ اس وجہ سے صدر مدرس ملا داؤد صاحب نے جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے میری ناکامی کے باوجود مجھے جماعت مولوی میں شریک کر لیا۔ یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہوا۔ گو ذریعۂ تعلیم اُردو تھی مگر پھر بھی طبیعیات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رکھائی اکل کھرے پن کو دور کر دیا جو ابتداءً سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بدولت پیدا ہو گئی تھی مگر اتنے دنوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا۔ والد مرحوم کی صحبت اور تعلیم و تربیت سے مجھ میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو چکی تھی

اور اُن کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کر سکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہوا جب میں اپنی زندگی میں کلیۃً آزاد اور خود مختار ہو گیا اور کوئی سر دھرا نگرانی کرنے والا نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی جس نے مجھ کو گمراہ ہونے سے بچا لیا۔ حالانکہ جب میں آزاد ہوا تھا اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی جس میں عام طور پر نوجوان کے لیے گمراہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

۱۹۱۲ء میں میں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہوا۔ اس زمانے میں والد مرحوم کی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ تاہم وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد تشریف لائے اور مجھے دارالعلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرا دیا۔ اس زمانے میں مولانا حمید الدین مرحوم دارالعلوم کے صدر تھے۔ والد مرحوم مجھے حیدر آباد چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور میں یہاں پڑھتا رہا۔ مگر یہ تعلیم کا سلسلہ چھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ ایک روز بھوپال سے دفعۃً اطلاع آئی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد سے روانہ ہوا اور بھوپال جا کر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان کے صحت یاب ہونے کی تمام اُمیدیں منقطع ہو گئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو محسوس کرانا شروع کیا۔ ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لیے جدوجہد کیے بغیر چارہ نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی۔ اسی زمانے میں جناب نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی۔ اس کے علاوہ دفتری ملازمت کی طرف طبعاً کوئی میلان نہ تھا اور اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ غرض ان تمام وجوہ سے یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہیے۔

۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے میرے بھائی . . . نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر کام شروع کیا لیکن ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ ہم وہاں نہ نباہ سکے۔ وہاں سے ہم دہلی واپس ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ کچھ فطری آزاد خیالی، کچھ ذاتی مطالعے، کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ابتدا ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی اور طبیعت ایسی ہر تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کی جائے۔ اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہو گئے۔ بہر حال ان وجوہ سے ہم نے "انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام" میں کام کرنا شروع کیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی مگر وہ ابھی زیرِ طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔

اسی زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی جو صوبہ متوسط کے رہنے والے تھے اور انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام کی روحِ رواں تھے۔ تاج الدین ان کا نام تھا۔ انھوں نے جبل پور سے "تاج" نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کی ایڈیٹری ہم

دونوں کے سپرد کی مگر وہ زمانہ اخبارات کے لیے سخت ناساز گار تھا۔ چند مہینے سے زیادہ تاج نہ نکل سکا اور ہم جبل پور سے بھوپال آئے بھوپال سے دلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا۔ خوش قسمتی سے ایک شفیق اُستاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مل گئے جنھوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اگر اس شاگرد کو پرائمر اور کنگ ریڈر پڑھائی گئی تو اس کا دل اکھڑ جائے گا۔ اس لیے اُنھوں نے ابتدا ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی۔ یہ تعلیم چار پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس مدت میں جو کچھ میں نے پڑھ لیا اس کے بعد میں اُستاد سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے خود انگریزی اخبارات و رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا۔ اوّل اوّل میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان کے محل استعمال اور مختلف اسالیب بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔

اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی مگر سنہ ۱۹۲۰ء سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔ بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر تاج نکالا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا۔ پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے تقریریں بھی کرنی پڑیں حالانکہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ بہرحال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے۔ ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی۔ پہلے میں ذمہ داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تھا۔ لیکن جبل پور میں جب میں نے تنہا کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمہ داری پر اخبار نویسی اور پبلک کی خدمت کی تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں جو ضرورت کے موقع پر خود اُبھر آتی ہیں جو میری مدد کرتی ہیں۔ اس وقت سے پھر کبھی میں ذمہ داری کو قبول کرنے میں نہیں جھجکا۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ میں اپنی زندگی میں کلیۃً خود مختار ہو گیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو عملاً برتنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھی۔

جبل پور کی زندگی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکی۔ بدقسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی اور چونکہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو اس طرح میں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی اور آئندہ کے لیے میں نے عہد کر لیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا بلکہ اپنی ہر جنبش قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔

۱۹۲۰ء کے خاتمے پر میں دہلی واپس ہوا۔ ۱۹۲۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب صدر و ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے ہوئی۔ اسی سال انھوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے اخبار "مسلم" نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ اخبار ۱۹۲۳ء تک جاری رہا اور آخر تک میں ہی اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ میرے لیے سخت مصائب، خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا مگر میں نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی میں بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیل تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچائی۔

۱۹۲۳ء میں "مسلم" بند ہو گیا اور میں نے حیدرآباد کے قصد سے دہلی چھوڑ دی لیکن رستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور میں نے حیدرآباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوپال میں ڈیڑھ سال تک میں ہمہ تن مطالعہ میں مشغول رہا اور بجز ایک دو مضامین کے تحریر کا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پھر دہلی واپس آ گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجھے "ہمدرد" میں اپنا مددگار بنائیں لیکن اسی زمانے میں مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اخبار "الجمعیۃ" نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے "الجمعیۃ" کو "ہمدرد" پر ترجیح دینی پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔ غرض ۱۹۲۵ء کی ابتدا سے الجمعیۃ کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۸ء کی انتہا تک میں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا۔ اس زمانے میں اخبار نویسی کے ساتھ مختلف علوم کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ عربی کے درسیات میں سے بعض انتہائی کتابیں جو رہ گئی تھیں ان کا درس بھی لیا اور دو کتابیں بھی لکھیں جو "الجہاد فی الاسلام" اور "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

اسی زمانے میں میں نے جرمن زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی مگر جن صاحب سے میں نے پڑھنا شروع کیا تھا وہ دو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ دہلی میں نہ رہے اس لیے میں اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

اب وہ زمانہ آیا جب دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندوستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بیزار کر دیا تھا اور میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ء کے خاتمے پر میں نے "الجمعیۃ" سے قطع تعلق کر لیا۔ اور آئندہ کے لیے تصنیف و تالیف کے شغل کو اپنے لیے پسند کیا لیکن جن مضامین سے مجھ کو دلچسپی ہے ان پر تحقیقات کے لیے دہلی میں مواد بہم پہنچانا مشکل تھا۔ اس لیے پھر اسی سرزمین کی طرف مجھے رخ کرنا پڑا جہاں سے بارہ سال قبل میں یہ سمجھ کر نکلا تھا کہ اب شاید کبھی یہاں آنا نصیب نہ ہوگا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد پہنچا اور اگست ۱۹۳۰ء تک یہاں رہا۔ اس مدت میں میں نے تاریخ آل سلجوق تالیف کی اور ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگست ۱۹۳۰ء میں بیمار ہو کر میں دہلی واپس چلا گیا۔ چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی۔ پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا جسے لکھنے کا میں ایک عرصے سے ارادہ کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں پھر حیدرآباد واپس آیا اور تاریخ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا۔

اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ اول کی سیرت لکھی جو عنقریب مکمل ہو جائے گی اور ایک مختصر تاریخ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ آج کل میں جامعہ عثمانیہ کے لیے علامہ صدر الدین شیرازی کی کتاب "الاسفار الاربعہ" کا ترجمہ کر رہا ہوں جو عربی میں فلسفے کی ایک ادق کتاب ہے۔

تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق احمد صاحب زاہدی (صاحب فراست الید) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا۔ اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت تک ہمارے ہاں رہے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشاپردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام رسالے اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی مگر اس زمانے میں گلستاں بوستان پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو معشوق کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک عزیب بیمار جلتا رہتا ہے اور اسی حالت کا نام ہجر ہے۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ اشفاق بھائی کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا۔ مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوں کو دیکھ کر چونک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔ اگرچہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ والد مرحوم کی شدید نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا مگر تعلیم سے جو کچھ وقت بچتا تھا۔ اس میں اردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف مضامین اور اسالیب بیان ذہن نشین ہوتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی سی فرصت میسر آ گئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی۔ اس فرصت کے زمانے میں اپنے بھائی . . . کی تحریک پر میں نے قاسم امین بے کی کتاب "المرأۃ الجدیدۃ" کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں مگر مجھے خوب یاد ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاست زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے بھی خوب داد دی تھی۔

یہ میری ابتدائی مشق تھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں بھوپال میں قیام ہوا اور عام مطالعے کے ساتھ انشاپردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک تو مشق کی حالت تھی جس کا انداز تحریر پسند آ جاتا تھا۔ اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا۔ میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا

نہیں بلکہ خود اپنے انداز میں لکھتا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا جس میں میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔ میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے۔ باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو میں اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے، تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے انتخاب سے میری بے اعتنائی ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتا۔ الا اس صورت میں جب کہ کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنی ہو۔

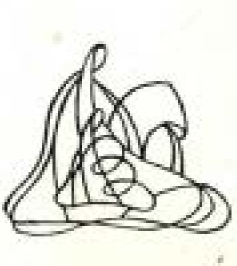

اختر انصاری (دہلوی)

کہہ نہیں سکتا کہ ان چند سطور کی تحریر و تسوید کے لئے قلم اُٹھانے میں کتنی جد و جہد کرنی پڑی، کتنا باطنی زور صرف کیا اور غیر آمادگی کی کیفیت کو آمادگی و رضامندی میں بدلنے کی کتنی زبردست مہم سے گذرنا پڑا۔

سب نہیں تو اکثر لکھنے والوں کے لئے لکھنا لکھانا ایک دشوار اور دقت طلب عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ پڑھنے میں کبھی کمی نہیں کروں گا۔ سوچنے کا جہاں تک تعلق ہے، ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر اس طرح غور و فکر کروں گا گویا مسائلِ کائنات اور کائناتِ مسائل کی تحلیل، تنقیح اور تصفیہ مجھی پر منحصر ہے اور خاص میری ذمہ داری ہے۔ لکھنے کو کہئے تو فرصت کہاں، نہ وقت ہے، نہ ذہنی سکون ہے، اور لیت و لعل کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ پھر جب عام ادبی مشاغل کے سلسلے میں تساہل کا یہ عالم ہو تو خود نوشت سوانح کے باب میں کیا کچھ تامل نہ ہوگا؟ یہ ضرور ہے کہ اگر آج سے چند سال پیشتر یہ مرحلہ درپیش ہوتا تو اس کو عبور کرنا ہرگز دشوار نہ ہوتا۔ نو عمری یا نوجوانی کی خود پسندی قدرتی طور پر اپنے اظہار کے لئے بے تاب رہتی ہے۔ لیکن اس عمر تک پہنچتے پہنچتے ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر آدمی کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے اور حواس درست ہو جاتے ہیں۔ انانیت کا بخار اُترنے لگتا ہے اور خود مستی و نرگسیت کا بحران ختم ہو جاتا ہے۔ ساری اکڑفوں خاک میں مل جاتی ہے اور سارا طنطنہ دھواں بن کے اُڑ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زمانے کی چکی میں پسنے کے بعد طبیعت میں ایک ہمواری اور فکر و نظر میں ایک اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو صحیح تناظر میں دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس حالت کو پہنچکر اپنے بارے میں لب کُشائی ایک فضول و لاطائل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کم سے کم اپنا تو یہی حال ہے اور ایماندارانہ طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا اور جو کچھ نہ کر سکے، ہم جو کچھ ہیں اور جو کچھ نہیں ہیں، وہ خود اپنے لئے بے حد اہم ہی، لیکن آخر دوسروں کے لئے اس کی اہمیت کیا ہے؟ کس کو کس کی پڑی ہے اور کس کو کس کا غم ہے؟ اور غم ہو بھی تو کیسے ہو اور کیوں کر ہو؟ یہاں کون ہے جو غموں سے خالی ہے اور کسے فرصت ہے کہ دوسروں کی افتادوں پر کڑھتا اور اپنا دل دکھاتا پھرے اور دنیا بھر کے بکھیڑوں اور خرخشوں کا دردِ سر مول لے؟ کس کو زمانے نے اتنی فارغ البالی، اتنی دل جمعی اور طمانیتِ قلب سے نوازا ہے کہ اُس کے ارد گرد جو ان گنت افراد اور اشخاص ہیں اُن میں سے ہر ایک کی واردات و کیفیات کی داستانِ امیر حمزہ کو بیٹھ کر سنے اور اس پر سر دھنے؟ سب اپنے اپنے جھنجھٹوں میں مصروف ہیں اور جسے دیکھئے وہ اپنے ذاتی جھمیلوں اور قضیوں کے جال میں پھنسا ہوا پوری یکسوئی کے ساتھ ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ زندگی کے بے کراں سمندر میں

ہر لحظہ اور ہر وقت بے شمار بے حد و حساب کشتیاں ڈوبنے اور اچھلنے کے عمل میں گرفتار ہیں، اور کسی کو کسی کی خبر نہیں، نہ ہو سکتی ہے یہ ایک عام تجربہ ہے اور ایک پیش پا افتادہ حقیقت کہ بڑے سے بڑا حادثہ گزر جاتا ہے اور سوا اس شخص کے جس کا اس حادثے سے براہ راست تعلق ہو، کسی دوسرے کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ مثلاً ایک روز (یہاں میں انگریزی محاورے کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک خوش گوار صبح بھی کہہ سکتا تھا، لیکن انگریزی دانی کا یہ کوئی معقول مصرف نہیں اس لئے درگزرا!) یہ خبر لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی ہے کہ بازار میں ایک بچہ کسی جہازی سائز کے ٹرک کی زد میں آ گیا اور زمین پر خون کی ایک گاڑھی تہ کے سوا کچھ باقی نہ بچا جس کو ماں باپ آخری دیدار کے بعد قبر میں دفنا دیتے۔ اب کچھ لوگ تو اس خبر کو اس طرح سنیں گے گویا کسی روزنامے کے ذریعے ایک دل چسپ اطلاع بہم پہنچی جس کے بعد اسی قسم کی دوسری دل چسپ اطلاع کے لئے نظر آگے بڑھتی ہے اور روزنامے کے اگلے صفحے کا جائزہ لیتی ہے۔ کچھ لوگ یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ چلو یہ اپنا بچہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ حقیقی تاسف محسوس کرتے ہوئے ہائے یا تچ تچ یا اسی قسم کا کوئی کلمۂ فجائیہ اپنی زبان پر لائیں گے۔ مگر کیا ان لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا ہوگا جو اگلے ہی لمحے اس واقعے کو زندگی بھر کے لئے نہ بھلا دے؟ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ کہیں کوئی ہے جو اپنی روزانہ زندگی کے فرسودہ، معمولی، عام بلکہ عامیانہ مشاغل اور ان سے پیدا ہونے والے انہماک پر اس روح فرسا اور لرزہ آفریں واقعے کی یاد کو ایک آنی و لمحاتی تفوق و ترجیح دینے کے لئے بھی تیار ہو؟ کوئی ہے جو اس حادثے کی وقوع پذیری کے بعد اپنے ذہن پر ایک خفیف سی خراش کا اثر بھی محسوس کرتا ہو؟ یا پھر فرض کیجئے کہ ایک آپ بیتی لکھنے والا اپنے بعض عزائم کی شکست کا بیان قلم بند کرتا ہے اور اس ضمن میں ان حالات، واقعات اور اسباب کو سامنے لاتا ہے جو اس شکست کا باعث ہوئی۔ وہ اپنی روح کے زخم دکھاتا ہے، اپنے وجود کے ناسوروں کو بے نقاب کرتا ہے، اپنا کلیجہ چیر کر رکھ دیتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ پڑھنے والوں میں کتنے ہیں جو اس کا درد محسوس کرتے ہیں اور کتنے ہیں جو اس کے درد کو عام انسانیت کے درد و داغ کا ایک پہلو خیال کرتے ہوئے کچھ بھی اہمیت دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

تو بات ذرا دور جا پڑی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا (اب یہاں بھی میں انگریزی محاورے کے تتبع میں "میں یہ کہنے جا رہا تھا" لکھ سکتا تھا، لیکن افسوس کہ مجھے تحریر کی یہ اتراہٹ بالکل نہیں بھاتی!) کہ آپ بیتی لکھنے کی فرمائش سر آنکھوں پر، لیکن ایک عام آدمی کی آپ بیتی آخر اہمیت کیا رکھتی ہے؟ کس کو اس سے دل چسپی ہے اور پڑھنے والوں کے لئے افادیت کا کون سا پہلو اس میں پنہاں ہے؟ یہاں عام آدمی سے میری مراد وہ شخص ہے جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی طرح پیدائش اور موت کے درمیانی فاصلے کو عام اور معمولی انسانی روش کے مطابق طے کرتا ہے اور بالآخر ایک دن نیستی یا عدم کی گھنی اور اتھاہ تاریکی میں روپوش ہو جاتا ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے، پلتا اور بڑھتا ہے، پھر تعلیم حاصل کرتا ہے، کوئی چھوٹی موٹی ملازمت اختیار کر کے ذریعۂ معاش فراہم کرتا ہے، شادی کر کے چند بچوں کا باپ بنتا ہے، اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیلتا ہے، قدم قدم پر قسم قسم کے سمجھوتے کرتا ہے، تلخیٔ حیات کے جام پر جام چڑھاتا ہے، دھکے کھاتا ہے، جھٹکے برداشت کرتا ہے، حق گوئی و حق اندیشی کو خیرباد کہتا ہے، اپنے مزاج کی تیس مار خانی کو تک کے طاق میں رکھ دیتا ہے، اپنے اندر کے طرم باز خاں کو قتل کر ڈالتا ہے، طہارتِ نفس اور شرافتِ روح کو تقویمِ پارینہ خیال کر کے (گویا وہ لتا منگیشکر اور گیتا دت کے دور میں جانکی بائی الٰہ آبادی کے گانے کا ریکارڈ ہو!) دماغ کے کسی اندرونی تہ خانے میں ڈال دیتا ہے۔

اور اس تمام جاں کاہی کا صلہ یہ پاتا ہے کہ اُس کے بال سفید ہونے لگتے ہیں، کمر جھک جاتی ہے، آنکھیں دو بھیانک ویرانوں کا منظر پیش کرتی ہیں، حلیہ بگڑ جاتا ہے، چہرے پر پھٹکار برسنے لگتی ہے، اور صورت دیکھنے میں آدمی سے زیادہ بندر کی معلوم ہوتی ہے۔ مطلب اس سب کا یہ کہ وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے، یعنی جوانی کا کوئی لطف اور جواں سالی کا کوئی سکھ اٹھائے بغیر نوعمری کی منزل سے چھلانگ لگا کر براہِ راست بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور پھر بقیہ عمر سانس لینے کی بجائے آہیں بھرنے میں گزار دیتا ہے۔ یہ ہے ایک عام آدمی کی تعریف! اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس عام آدمی کے سوانح حیات کیا اور آپ بیتی کیا! وہ اگر اپنی آپ بیتی لکھے بھی تو اُس کے پڑھنے سے کس کا بھلا ہوگا؟ اور کون ہے جو اُس کو سرمۂ چشمِ بصیرت سمجھ لے گا؟

اس منطق کی رُو سے آپ بیتی لکھنے کا حق وہ لوگ ضرور رکھتے ہیں جو اس عام آدمی سے کسی نہ کسی طور پر مختلف اور ممتاز ہوں۔ جنہوں نے بقولِ شخصے کچھ کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں، یا کسی گراں قدر انسانی خدمت کی سرخروئی حاصل کی ہو، یا کوئی عظیم الشان مہم سر کی ہو، یا کچھ اور نہیں تو کم سے کم یہ امتیاز ہی حاصل کیا ہو کہ افلاس، ناکسی اور ہیچ میرزی کی پستیوں سے ابھر کر اور جست لگا کر چشم زدن میں شہرت و عظمت اور جاہ و تمول کے بامِ رفیع پر فائز ہو گئے ہوں۔ وہ بے شک اپنے سوانح حیات قلمبند کریں اور بتائیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اُن سے کیسے بن پڑا، یا یہ کہ انہوں نے کن اصولوں کی رہنمائی میں کامیابی کی منزلیں سر کیں، یا یہ کہ وہ کون سی حکمتِ عملی تھی جس کے اختیار کرنے سے اُن کو یہ ترقی درجات میسر آئی۔

اس حساب سے بھی اپنا تو دامن خالی ہی نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس ننگِ خلائق سے عالمِ انسانیت تو کیا، خود اپنی بھی کوئی خدمت بن نہیں پڑی۔ نہ جاہ و منصب کی بلندیاں فتح کیں، نہ قوت و اقتدار کی سرفرازی حاصل کی، نہ دولت و ثروت کے اکتساب کا اہتمام کیا، اور نہ فقر و درویشی اختیار کر کے روحانی فیوض و برکات سمیٹنے ہی کی کوئی تدبیر کی۔ کچھ خواب دیکھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے، کچھ منصوبے باندھے جو عمل جامہ نہ پہن سکے، کچھ ارمانوں کو دل میں جگہ دی، مگر وہ بھی دیوانے کا خواب ثابت ہوئے۔ کچھ نثر لکھی، کچھ اشعار موزوں کئے، لیکن اس ساری کارگزاری کا انجام عبرت ناک ہوا، کیوں کہ یہ نری کارگزاری تھی اور اس میں کار آرائی اور کار نمائی کے ضروری عنصر شامل نہیں تھے۔ دین اور دنیا میں جہاں تک دنیا کا تعلق ہے، وہ تو کمائی نہیں، یا کمائی نہ جا سکی، کیوں کہ مزاج کی وہ ساخت ہی نہیں تھی اور لچھن شروع ہی سے خراب تھے۔ تھوڑی بہت کوشش جو اس باب میں صرف ہوئی وہ ایک اناڑی کی کوشش سے زیادہ نہیں تھی، اور نشانہ صاف خطا گیا۔ بالآخر ایک ہارے جواری کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اُس شعر کا سہارا لیا جس کا مطلب ہے کہ ہم قسّامِ ازل کی اس تقسیم پر قانع و شاکر ہیں کہ ہمارے لئے علم مقدر کیا گیا اور جاہلوں کے لئے مال و دولت! (حالاں کہ جو علم اپنے لئے مقدر ہوا اس کی حقیقت بھی بخوبی معلوم تھی اور ہے!) باقی رہا دین تو اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ؎

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند

اور ؎

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخِ پاک دامن! معذور دار ما را

شیخ کی پاک دامانی مسلّم، لیکن اگر وہ اپنی پاک دامانی کے زعم میں مذہب کو اتنے عقل سوز روپ میں پیش نہ کرتا اور اربابِ فکر و فہم سے تعقل و تفکر کی اتنی زبردست قربانی کا مطالبہ نہ کرتا تو شاید دین و مذہب کی بہتر خدمت انجام دیتا۔ عربی زبان کا رباعی نگار شاعر ابو العلا معری اپنی ایک رباعی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے صرف دو گروہ ہیں، ایک بے دین عقلاء کا اور دوسرا بے عقل دین داروں کا! خیر۔ قصہ مختصر یہ کہ کہاں کا دین اور کیسی دنیا، زندگی اس شعر کی تفسیر ہو کر رہ گئی ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ سوانحِ حیات درج کرنے کا کیا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اب آخر میں اس مسئلے کا صرف ایک پہلو اور ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ وہ یہ کہ اگر سوانحِ حیات اور آپ بیتی میں سے پہلی ترکیب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف دوسری ترکیب (آپ بیتی) کو مدِ نظر رکھا جائے اور اس کو ذہنی تاثرات اور داخلی واردات کے معنوں میں لیا جائے، تو بے شک بات کچھ بنتی نظر آتی ہے۔ ہر شخص، عام اس سے کہ وہ عارف ہو یا عامی، قلندر ہو یا دنیادار، قسمت کا سوتیلا بیٹا ہو یا تقدیر کا سکندر، زاہدِ خشک ہو یا رندِ شاہد باز، بے دین عاقل ہو یا بے عقل دین دار، افلاس کا مارا شاعر ہو یا بے شعور زردار، اپنے ذہنی تجربات، تاثرات اور تصورات بیان کر سکتا ہے، اور زندگی، زمانہ اور اہلِ زمانہ کے بارے میں اپنے اندازِ نظر یا اندازِ فکر کو دوسروں کے سامنے لا سکتا ہے، اور یہ چیز یقیناً سب کے لئے دلچسپی و دل افروزی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ اس طور پر لازم آیا کہ میں بھی کچھ کہوں۔ گویا فرمائش کے آگے سرِ تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں!

سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں اس دنیا کا آدمی نہیں تھا، لیکن اس دنیا میں بھیج دیا گیا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ "در مدحِ خود می گوید" کی تفسیر پیش کر رہا ہوں، نہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ یہ ناچیز اپنے آپ کو فوق البشر انسان تصور کرتا ہے یا مافوق الفطرت اوصاف کا مالک گردانتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ صرف اپنی نااہلی و نالائقی اور بد توفیقی و بدبختی کا اظہار مقصود ہے۔ حالت یہ ہے کہ انسان تو بڑی چیز ہے، کسی جانور کی تکلیف بھی نہیں دیکھی جاتی۔ پھر کچھ تکلیف ہی پر موقوف نہیں، نہ جانے کیا کیا کچھ ہے جس کو دیکھنا تو درکنار، خیال میں لانا میرے لئے عذابِ روح سے کم نہیں۔ کئی سال پہلے کا ذکر ہے۔ میں دہلی میں ایک شام اپنے ایک ناشر دوست کی دوکان پر بیٹھا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اُس زمانے میں رکشا نئے نئے چلے تھے اور یہ جو آج کل کے سائیکل رکشا ہیں ان سے کچھ مختلف تھے۔ یعنی آدمی سائیکل پر سوار ہو کر رکشا نہیں کھینچتا تھا بلکہ رکشا کا جُوا اپنے کاندھوں پر رکھ کر زمین پر دوڑتا تھا۔ خیر تو ہم لوگ اپنی باتوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک رکشا والے نے یک لخت اپنا رکشا دوکان کے سامنے لا کر روکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے الگ ہو کر ہم لوگوں کے قریب آ گیا۔ اور لگا رو رو کر فریاد کرنے۔ دو شخص جو حلیے اور لباس سے پردیسی اور قصباتی معلوم ہوتے تھے اُس کے رکشا میں سوار تھے اور اُس نے انتہائی مظلومیت کے انداز میں بتایا کہ یہ دونوں بہت دیر سے رکشا میں سوار ہیں۔ کبھی اِدھر چلنے کو کہتے ہیں، کبھی اُدھر لے جاتے ہیں، اور کسی طرح رکشا سے نہیں اُترتے اور نہ پیسے دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ دوکان میں جتنے اشخاص تھے سب کے سب اُن دونوں پر برس پڑے۔ خوب لعنت ملامت کی اور شرم دلائی۔ وہ دونوں اس اچانک حملے سے یکسر مغلوب ہو گئے اور جواب میں

ایک لفظ کہے بغیر اُن میں سے ایک نے خاموشی کے ساتھ جیب سے پیسے نکالے اور رکشا والے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر وہ دونوں جانے کے لئے مڑے۔ لیکن جانے سے پہلے اُن میں سے ایک نے کہا، ہمیں خبر نہیں تھی کہ دلی میں پردیسیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ خیر ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ دلی والے ہمارے ساتھ کیسی مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ دراصل یہ ایک عام حربہ ہے جو مغلوب انسان اختیار کرتا ہے جب وہ دشمن کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے اور قوت کے استعمال پر قادر نہیں ہوتا تو پھر اسی طرح مظلوم و مصائب کے روپ میں سامنے آتا ہے اور مسکینی و فدویت کے ذریعے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خیر۔ وہ دونوں شخص تو یہ جملہ سنا کے رخصت ہو گئے مگر یہاں دوکان والوں میں میرے ناشر دوست جو بڑے کٹر قسم کے دلی پرست واقع ہوئے تھے اس بات پر بہت طیش میں آئے کہ دلی اور دلی والوں کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بننا پڑا۔ وہ رکشے والا ابھی وہاں موجود تھا اور قدرتی طور پر وہی اُن کے قہر و غضب کا نشانہ بنا۔ چنانچہ انہوں نے شدت طیش کے عالم میں ایک زور کا طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا مرگھلا سا آدمی تھا۔ طمانچہ کھا کر اس کا عجیب حال ہوا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرے پر ایک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت ظاہر ہوئی۔ رگ پٹھوں میں ایک عجیب سا تموج اور تشنج، ایک عجیب سا کھنچاؤ اور اتار چڑھاؤ جس کو میں آج تک نہیں بھولا ہوں۔ اُس کے چہرے کی وہ کیفیت میرے حافظے کا جزو بن کر رہ گئی ہے۔ آج اس واقعے کو گزرے ہوئے کم و بیش بیس سال ہو گئے ہیں لیکن طمانچے کی ضرب سے تلملاتا ہوا وہ چہرہ جب بھی یاد آتا ہے۔ تو مارے تکلیف کے بلبلا اٹھتا ہوں۔ یہ ایک بچھو ہے جو میری رگِ جاں سے چمٹا ہوا ہے۔ اور یہی کیا! ایسے بے شمار —— حقیقتاً بے شمار بچھو اور کنکھجورے ہیں جو میری یادداشت کے نہاں خانوں میں مستقلاً جاگزیں ہیں۔ اُن کے نوچنے اور جھنجھوڑنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کسی افعی گزیدہ کے کرب سے کم نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ اگر کبھی نادانی میں میرے منہ سے نکلی ہوئی کسی بات نے کسی کے چہرے پر بے بسی و بے چارگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے تو وہ کیفیت عمر بھر کے لئے میرے کلیجہ کا ناسور بن کر رہ گئی ہے۔ ویسے خارج کی دنیا کا یہ منظر جو مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہو سکا، جس کو میں دیکھ کر اندر ہی اندر لرز جاتا ہوں اور دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو جاتی ہے وہ بے کس و بے نوا بچوں کا وجود ہے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے کہ کسی ایسے بچے کو جس کے چہرے پر بھوک، افلاس اور محرومی کے اثرات ہوں دیکھوں، اور زندگی اور زمانہ سے بیزاری محسوس نہ کروں۔ خدا سے دعا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ اور کرے یا نہ کرے، مظلوم بچوں کے سلسلۂ پیدائش کو ضرور منقطع کر دے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر کم سے کم مجھ جیسے دور از کار اشخاص کو وجود کی سرفرازی سے معاف رکھے جس بدبخت کی کم حوصلگی کا یہ عالم ہو کہ وہ کسی چہرے پر بے کسی و بے نوائی کے خفیف سے اثر کو بھی نہ دیکھ سکے، اُس کا ایسی دنیا میں کیا کام جہاں بے بس بچوں کو کوڑوں سے مارا جاتا ہو، جہاں گردنوں پر چھریاں پھیری جاتی ہوں، جہاں آسمانی قہر کی بارش کے ساتھ انسانی قہر کی بجلیاں بھی دن رات سروں پر ٹوٹتی ہوں، جہاں ناداری و احتیاج، محرومی و نامرادی، فتادگی و سرافگندگی، بے بسی و بے چارگی، تہی دستی و بے مایگی، اور خاک آلودگی و بے سروسامانی کے مناظر معمولات کا درجہ رکھتے ہوں، اور اُن کی بدولت زخمِ نظر اور جراحتِ قلب کا سامان ہر طرف وافر مقدار میں موجود رہتا ہو۔ شیشے کو پتھروں سے ٹکرانا کوئی معقول حرکت نہیں ہے!

تعجب کی بات یہ ہے کہ خود اپنے بچپن پر کیا کچھ نہ بیتی، اور پھر بھی زندہ رہے، اور آج بھی جیتے ہیں، اور نہ صرف جیتے ہیں بلکہ ہنستے بھی ہیں، مسکراتے بھی ہیں، اور کبھی کبھی خوشی کی لہر سے مغلوب ہو کر گنگنا بھی اُٹھتے ہیں۔ بچپن کا دور جس جہنم زار سے عبارت تھا

اس کے ہوتے ہوتے اگر دل و دماغ ماؤف، اور حواس مسلوب ہو جاتے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے جاتی، تخیل مر جاتا اور لطافتِ فکر و ذکاوتِ حس اور رعنائی تصور جیسی چیزیں ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ جاتیں تو کوئی بعید یا دور از کار بات نہ ہوتی۔ تاہم یہ تباہی بھی کوئی معمولی تباہی نہیں تھی کہ طرح طرح کی کمزوریاں طبیعت میں راہ پا گئیں اور قسم قسم کے خوف زندگی بھر کے لئے ذہن میں جاگزیں ہو گئے۔ مزاج و کردار کا ارتقاء جن خطوط پر ہونا چاہیے تھا ہوا نہیں، اور شخصیت ابھی بننے بھی نہیں پائی تھی کہ بگاڑ اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے واقف ہو گئی۔ مجموعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ بچپن نے میرے قوائے ذہنی کو مفلوج کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور بڑی حد تک ایک اپاہج بنا کے مجھے آئندہ زندگی کے حوالے کر دیا۔ تقدیر کی عنایت اور ماحول کی دناءت کے ہاتھوں کم عمری میں جو زخم میرے وجودِ باطنی پر آئے تھے میری بعد کی ساری زندگی اُن زخموں کی تدبیرِ رفو میں گزری ہے۔ میں زندگی بھر اُن زخموں کی مرہم پٹی میں لگا رہا ہوں۔ میری زیادہ تر قوتیں روحانی معذوریوں کے خلاف جنگ کرنے اور اپنے لنگڑے لولے پن سے نپٹنے میں صرف ہوتی ہیں۔

کمزوروں کو استبداد کا نشانہ بنانے میں دنیا کبھی کمی نہیں کرتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایک بچے سے زیادہ کمزور اور بے بس اور کون ہو گا میری ابتدائی تربیت نے جو زمانہ پایا وہ تربیتِ اطفال کے زاویۂ نگاہ سے سخت بربریت کا دور تھا۔ یہ بربریت اُس دور کے کم و بیش سبھی بچوں کے حصے میں آتی۔ اور اس عام اور متداول بربریت سے کچھ زیادہ ہی تھی وہ بہیمیت جس کا بار اپنے مخصوص تربیتی ماحول کی بدولت مجھے اٹھانا پڑا۔ یا شاید میرے مزاجِ طفولیت کی ترکیب و ساخت میں جو عناصر صرف ہوئے تھے وہ اتنے (لطیف و نازک تو کیونکر کہوں) کمزور اور بودے تھے کہ ماحول کا عام اور معمولی تشدد بھی میرے لئے ایک غیر معمولی قہر ثابت ہوا، اور اس قہرمانی صورتِ حال کے مہیب وزن نے میرے کم عمر وجود کی عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کمزور عمارت کی کمزور بنیادوں سے پیدا ہونے والی کراہوں کو میں آج بھی اپنے کانوں سے سنتا ہوں! یہ دراصل اُس ملعون معاشرے کا ذکر ہے جس نے ایک طرف جاگیردارانہ دور کی زوال پرستانہ روایات ورثے میں پائی تھیں، اور دوسری طرف مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے بعض صحت مند عناصر کے ساتھ ایک غلط اور جھوٹی برتری کا رجحان بھی درآمد کیا تھا۔ یوں میں جدید نفسیات کی اصطلاح میں OVER PROTECTED CHILD کی حیثیت رکھتا تھا۔ میری مجال نہیں تھی کہ میں گھر سے نکل کر باہر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیل سکوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے مجھے گھر سے باہر کہیں بھی پیدل جانے کا اتفاق ہوا ہو، یا کبھی تنہا یعنی ملازم یا کسی اور محافظ کی معیت کے بغیر بازار وغیرہ جانے کی اجازت ملی ہو۔ بیس سال کی عمر تک دہلی میں رہنے اور تعلیم و تربیت کے منازل طے کرنے کے بعد جب میں زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوا اور دہلی سے باہر نکلا تو اُس وقت تک میں لال کنواں اور کھاری باولی جیسے دہلی کے مشہور محلوں کو صرف نام سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا اور اب بھی معلوم نہیں ہے کہ دہلی میں کوچہ پنڈت، کوچہ قابل عطار، موری گیٹ، قطب روڈ، فراش خانہ اور تیس ہزاری وغیرہ محلے کہاں اور کس طرف واقع ہیں۔ جامع مسجد سے ایک طرف اجمیری گیٹ تک، دوسری طرف دریا گنج تک، اور تیسری طرف چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ تک کے بازار اور علاقے میری واقفیت اور شناسائی کی آخری حدیں تھیں۔ ان حدود سے پرے دہلی کا وسیع و عریض دامن جو کچھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے وہ میرے لئے اتنا ہی بعید اور دور افتادہ تھا جتنا کلکتے اور بمبئی۔ میں نے کبھی بازار جا کر سودا سلف نہیں خریدا، میں کبھی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ سڑکوں پر نہیں گھوما۔ بچوں کی غیر رسمی تعلیم کا ایک اہم حلقہ وہ ہے جسے PLAY - GROUP کہتے ہیں۔

میری ابتدائی تعلیم و تربیت میں اس چیز کا دخل صرف اس حد تک تھا کہ میں اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں دوسرے بچوں کو گلی میں گلی ڈنڈا، گیڑیاں، کیس کانٹے اور دوسرے کھیل کھیلتے یا آپس میں لڑتے جھگڑتے اور دھول دھپا کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ مطلب اس سب کا یہ کہ میں گویا ایک انوکھا بچہ تھا جو بقولِ شخصے ایک بھونرے میں پلا، اور جس نے بسم اللہ کے گنبد میں تربیت پائی۔ لیکن اس انوکھے بچے کا انوکھا پن صرف اسی ایک بات پر مشتمل تھا کہ وہ عام بچوں سے دور رہے اور عام انسانوں کی طرح سڑک پر پیدل نہ چلے۔ گھر کے اندر اُس کی حیثیت وہ تھی جو ایک پالتو کتے یا بلی کی ہوتی ہے، کہ اُس کے دو وقت کے کھانے کا معقول انتظام ہوتا ہے، اُس کے اٹھنے بیٹھنے اور آرام کرنے کی جگہ کو صاف ستھرا رکھا جاتا ہے، اور بس۔ اس سے آگے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، سوا اس کے کہ اگر وہ شرارت یا نافرمانی یا کسی اور غلطی کا مرتکب ہو تو اُس کو بے تامل ڈنڈوں سے مارا جاتا ہے۔

ہم بچوں کے سلسلے میں والد صاحب کا وہی رویہ تھا جو خالص حیاتیاتی سطح پر زندگی بسر کرنے والے جان داروں کا اپنی اولاد کی طرف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بھیڑ یا بکری یا گائے کو اپنے بچے کی اس سے زیادہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ کسی مزید غور و پرداخت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا ہی حال مرحوم کا بھی تھا۔ وہ خدانخواستہ ناقص الشعور یا غیر تعلیم یافتہ تو نہیں تھے، کیوں کہ انہوں نے بی۔ اے تک تو علیگڑھ میں تعلیم پائی تھی، اور پھر اُس کے بعد پانچ سال لاہور کے میڈیکل کالج میں رہے، اور آخر میں ایک یا دو سال کی مزید میڈیکل ٹریننگ مدراس میں حاصل کی تھی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ بعض اہم مسائل پر فکر کے تقلیدی پیرایوں سے ہٹ کر سوچتے تھے۔ مثلاً مذہب کے باب میں اُن کا مسلک اعتزال سے بہت قریب تھا، جو شاید نتیجہ تھا اس بات کا کہ جس زمانے میں وہ علیگڑھ میں بسلسلۂ تعلیم رہے اُس زمانے میں سر سید بقیدِ حیات تھے (اُن کی تعلیم کے چار سال، ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک سر سید کی زندگی کے آخری چار سال تھے) اور اُن کو سر سید کے مذہبی افکار سے براہِ راست متاثر ہونے کا موقع ملا تھا۔ علمائے دین کے ساتھ اُن کی گفتگو کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ کیسے کیسے جھاگ اُڑتے تھے مولویوں کے منہ سے، اور کیسا بے پناہ وِرد ہوتا تھا توبہ و استغفار کا! وہ عذابِ قبر کے قائل نہیں تھے۔ شیطان کو خارج عن الانسان ماننے کی بجائے اُسے خود انسان کی قوتِ بہیمیہ سے تعبیر کرتے تھے۔ ملائکہ و اجنہ کو تمثیلی و علامتی حیثیت دیتے تھے۔ معجزات و کرامات کے سرے سے منکر تھے۔ وحی و الہام کے روایتی تصور سے منحرف تھے۔ حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا یا زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا ایک عام عقیدہ ہے۔ اس کو وہ حقیقتِ نفس الامری نہیں مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قرآن شریف سے ثابت نہیں ہے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے لیکن نماز کے لئے پابندیٔ اوقات کو غالباً ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ سحر خیزی اُن کی عادت نہیں تھی اور میں نے کبھی اُن کو فجر کی نماز وقت پر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اس نماز کو کسی دوسرے وقت کی نماز کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ اُن کے خسر یعنی میرے نانا جو ایک سخت متشرع بزرگ تھے اور اپنے وطن بریلی کے غالی اور متشدد اہلِ حدیث علماء میں شمار ہوتے تھے دہلی آئے ہوئے تھے۔ یہ اپنے تشرع میں اتنے کٹر تھے کہ کسی زمانے میں بریلی کالج کی عربی کی پروفیسری پر فائز ہو گئے تھے، لیکن جب جاڑوں میں کالج کے اوقات دس سے چار بجے تک کے ہوتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا تو یہ کہہ کر مستعفی ہو گئے کہ میں ملازمت کی خاطر ایک سنتِ مؤکدہ کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں! خیر، تو اُن کی تشریف آوری کے موقع

پر یہ تماشا بھی ہم سب بچوں نے دیکھا کہ خود تو وہ شاید رات کے دو بجے ہی سو کر اُٹھ بیٹھے تھے، لیکن ابھی بالکل رات ہی تھی کہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر والد صاحب کے پلنگ کے پاس پہنچے اور للکار کر کہا، ارے بھئی اٹھو گے نہیں؟ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ چلو، جلدی کرو۔ ہم بچوں نے کسی کو والد صاحب پر اس طرح حکم چلاتے ہوئے بھلا کب اور کاہے کو دیکھا تھا۔ بہت متعجب ہوئے اور اس تعجب میں مزید اضافہ ہوا یہ دیکھ کر کہ والد صاحب برخوردار سعادت مندی اور سعادت مندانہ فرماں برداری سے کام لیتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اُٹھے اور نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ آخر میں ہم لوگ یہ دیکھ کر محظوظ بھی ہوتے کہ جب نانا صاحب منہ اندھیرے ہی ناشتے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل گئے تو والد صاحب دوبارہ بستر میں داخل ہوتے اور لمبی تان کر سو گئے۔ خیر۔ ان باتوں کے ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ والد صاحب مرحوم خدانخواستہ بلید الذہن یا بطی الفہم واقع نہیں ہوتے تھے، اور یقیناً فکر و تدبر کا کچھ ملکہ رکھتے تھے، بلکہ بعض امور میں تو عصری حدود سے بلند ہو کر اور اپنے ماحول اور معاشرے کی میکانیت کو رد کر کے بھی سوچ سکتے تھے لیکن بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اُن کا رویّہ اور احساسِ ذمہ داری اُسی حیاتیاتی سطح کی چیز تھی جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ مروجہ تربیتی نظام کی سختی، بے حسی اور بے دردی ہی میرے حصے میں آئی۔ اُس کی دلدہی، دل آسائی، ملاطفت اور ملائمت کی راحتوں اور رافتوں سے میں یکسر محروم رہا۔ ان آخر الذکر چیز کا ایک وافر ذخیرہ بلکہ ایک لامحدود خزانہ ماں کی محبت اور شفقت کی شکل میں قدرت کی طرف سے دنیا کے بچوں کو ارزانی ہوتا ہے، لیکن پانچ سال کی عمر ہی میں یہ دروازہ میرے اوپر بند ہو چکا تھا۔ یونانِ قدیم کی شہری ریاست اسپارٹا میں بچوں کے ساتھ جیسے بے رحمانہ اور جابرانہ برتاؤ روا رکھا جاتا تھا کچھ ویسا ہی سلوک میرے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔ لیکن اسپارٹا والوں کا تشدد ایک مخصوص تاریخی و سیاسی صورتِ حال کی پیداوار اور ایک شعوری طور پر مرتب کیے ہوئے تعلیمی منصوبے کا نتیجہ تھا۔ اور مجھے جس عذاب سے گزرنا پڑا اُس کا سبب محض بے حسی تھی۔ غالباً زیادہ صحیح مثال وہ ہو گی جو قدیم یہودی تمدن کی تاریخ فراہم کرتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ حمق بچے کی فطرت میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس کا اخراج صرف مسلسل مار پیٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ وہ ڈنڈے یا کوڑے کو تعلیمی فیضان کا اہم ترین وسیلہ خیال کرتے تھے اور ایک ایسے وحشیانہ نظامِ تعلیم کے علمبردار تھے جو تشدد اور جسمانی سزا کے تصور پر مبنی تھا۔ مگر میں ناحق مثالوں کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ میرے اوپر جو افتاد پڑی اُس کی تصریح کسی خاص تعلیمی و تربیتی نظام کی خصوصیات بیان کرنے سے نہ ہو گی۔ مجھے جس چیز نے تباہ کیا وہ دراصل ایک وسیع معنوں میں ماحول کی جابرانہ نوعیت تھی۔ میرے اردگرد کی دنیا میں محبت، ہمدردی اور دل جوئی کے عناصر کی سخت کمی تھی۔ میں ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک خوفناک شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ایک موہوم، بے نام اور نامعلوم سا خوف دن رات میرے ذہن پر مسلط رہتا تھا۔ اس خوف کا منبع دراصل والد صاحب کی خاموش، پُر وقار، پُر وزن، گمبھیر اور مستبد شخصیت تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اپنی کسی ضرورت کا ذکر اُن سے براہِ راست خود کیا ہو۔ میرا اُن کا سامنا صرف اُسی وقت ہوتا تھا جب اُن کو زجر و توبیخ مقصود ہوتی تھی یا کچھ احکامات (از قسم اوامر و نواہی) صادر فرمانے ہوتے تھے۔ جب میں اٹھارہ انیس سال کی عمر کو پہنچا اور اس تخویف و دہشت پسندی کے ماحول سے کسی قدر آزاد ہوا تو اُس زمانے میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں مدتوں کسی پہاڑ کے نیچے دبا پڑا رہا ہوں اور بالآخر اب وہ بوجھ میرے اوپر سے آہستہ آہستہ ہٹ رہا ہے۔ تعلیم کے مفکروں نے انیسویں صدی

کو بچے کی صدی کہا تھا کہ اس زمانے میں انسان نے بچے کی شخصیت کو تسلیم کیا اور اس کا احترام کرنا سیکھا۔ لیکن یہاں بیسویں صدی میں بھی یہ چیز میسر نہیں آئی۔ مختصر یہ کہ میں اپنے بچپن OVER-PROTECTED CHILD اور NEGLECTED CHILD کا ایک عجیب و غریب اور نادر مجموعہ تھا۔ اور مجموعی طور پر اس بری طرح پیس ڈالا گیا کہ میری بعد کی ساری زندگی ایک کچلے ہوئے وجود کی دل دوز کراہ بن کر رہ گئی۔ میں کبھی اپنے کسی پیدائشی حق کے لئے بھی جنگ نہیں کر سکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے کبھی کوئی کوشش ہی عمل میں نہیں لا سکا۔ چنانچہ میرے ہر قسم کے حقوق ہمیشہ پامال ہوتے رہے۔ جہدِ حیات کے بھیڑ بھڑکے میں مجھے ELBOW OUT کر دینا دوسروں کے لئے کبھی دشوار نہیں ہوا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں ہر جگہ اور ہر حال میں ایک BACK BENCHER رہا، جیسا کہ آج بھی ہوں۔

چند تفصیلات

پیدائش: بدایوں ۱۹۰۹ء
تعلیم: (۱) ہائی اسکول ۱۹۲۴ء
(اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی)
(۲) بی۔ اے (آنرز) ۱۹۳۰ء
(سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی)
(۳) بی۔ ٹی ۱۹۳۴ء
(مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)
(۴) ایم۔ اے ۱۹۴۷ء
(مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)
ملازمت: (۱) استاد مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علیگڑھ
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء
(۲) لیکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء
(۳) لیکچرر شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۱۹۵۰ء تا حال
تصانیف: نغمۂ روح (قطعے غزلیں اور نظمیں)
آبگینے (قطعات)
(۳) خوناب (غزلیں)
(۴) خندۂ سحر (نظمیں)
(۵) روحِ عصر (قطعے غزلیں اور نظمیں)
(۶) ٹیڑھی زمین (قطعات)
(۷) سرودِ جاں (غزلیات)
(۸) اندھی دنیا (افسانے)
(۹) نازو (افسانے)
(۱۰) خونی (افسانے)
(۱۱) افادی ادب (تنقید)
(۱۲) ایک ادبی ڈائری (تنقید)
(۱۳) حالی اور نیا تنقیدی شعور (تنقید)
(۱۴) مطالعہ و تنقید (تنقید)
(۱۵) غزل اور درسِ غزل (تعلیم)
(۱۶) STUDIES IN LANGUAGE AND LAGUAGE TEACHING
(۱۷) A BACKGROUND TO EDUCATIONAL THEORY-
(۱۸) بادۂ شبانہ (انتخاب)

نقی محمد خاں خورجوی

ہر شخص کی زندگی ایک ضخیم کتاب ہے بشرطیکہ وہ دُنیا کو سمجھنا اور خود کو پہچاننا بھی جانتا ہو۔ اگر اس کی زندگی میدانِ عمل میں گزری ہے اور وہ اسے بیان بھی کر سکے تو یہ حقیقت ہے کہ افسانہ اس کے مقابلے میں ہیچ ہے مگر کتنے ہیں جن کو یہ قدرت حاصل ہے، ایک سپاہی جس کے ہاتھ میں تلوار رہی ہو۔ قلم سے کام لینا اس کے لیے کچھ عجیب سی بات ہے۔ بہر حال کوشش کرتا ہوں۔ جب میں اپنے گزرے ہوئے تقریباً ایک صدی پہلے کے زمانے کو یاد کرتا ہوں تو زندگی کی حقیقت ایک ایسا خواب بن جاتی ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ چونکہ زندگی کا چراغ ہمیشہ نئے تیل سے جلتا ہے۔ اس وجہ سے اس سفر میں کسی ایک واقعہ پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پرانے دور کی حد ہے یا نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ تو ایک سلسلۂ عمل کائنات ہے جو مدام جاری و ساری رہتا ہے اور سکنڈ کی سوئی کی ہر حرکت مستقبل کو حال اور حال کو ماضی میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔

خاندان اور قبیلہ

باوا آدم کی اولاد میں نسلی امتیاز کیسا؟ لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ مساوات کی حدود کو توڑ کر بادشاہوں، انبیاء اور اولیاء سے اپنا شجرۂ نسب ملا لیتا ہے۔ ایک صوفی کا واسطہ تو اللہ ہی سے ہے اس لیے وہ حسب نسب کے جھگڑوں سے بے نیاز ہے۔ میرا بھی یہی عمل ہے ؎

بندۂ عشق شُدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

پٹھان بالعموم اپنے نسب اور جرگوں کا بے حد خیال کرتے ہیں اور ہر قبیلہ اپنے آپ کو دوسرے قبائل سے بہتر جانتا ہے۔ مجھے اپنے بارے میں جو معلومات حاصل ہیں اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

میں والد کی طرف سے خلیل اور والدہ کی طرف سے کاکڑ ہوں۔ تواریخ شاہد ہیں کہ سرحدی قبائل کے ہندوستان میں آمد کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب شاہ محمد ظہیر الدین بابر کابل کے تخت پر قابض ہوا اور پٹھانوں کی زبردست فوج لے کر ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد خلیلوں اور یوسف زئیوں کی تھی، جن میں بعض خاندان شاہجہان پور، فرخ آباد، بارہ بستی وغیرہ مقامات صوبہ یوپی میں آباد ہیں۔ لیکن میرے خاندان کے خورجہ میں آباد ہونے کا زمانہ وہ ہے، جب شاہ بابر کی وفات کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی۔ ایک طرف شیر شاہ سوری برسرِ اقتدار آنا چاہتا تھا۔ اور دوسری طرف ہمایوں، کامران، عسکری، ہندال شاہزادگان حصولِ تخت کے لیے برسرِ پیکار تھے۔

جب ہمایوں اور کامران میں جنگ کا آغاز ہوا تو ہمایوں کے ساتھ خلیل اور مہمند قبائل تھے۔ کامران کو شکست ہوئی اور ہمایوں دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ یہ زمانہ ۱۵۵۵ء کا تھا۔ اسی فوج میں میرے خاندان کے مورثِ اعلیٰ تندر خان خلیل بھی تھے جو خورجہ میں آباد ہو گئے۔ تندر خان کی نسل میں خضر خان، محمود خان، رسالدار میجر داؤد خان، عمر خان، دوست محمد خان اور ان کے بعد میرا نام ہے۔ تمام قوم افاغنہ کا سلسلۂ نسب قیس عبدالرشید پر ختم ہوتا ہے۔ جن کی شادی مشہور اسلامی جنرل خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ تمام قبائل کا باہمی رشتہ بھی ایک ہے جو بزرگوں کے سرداروں کے ناموں سے موسوم ہیں مثلاً "خلیل، گوڑ خلیل، کند، خیرالدین" اور عبدالرشید۔

میں خورجہ کے ایک معزز خاندان اور اوسط درجہ کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ والد انسپکٹر پولیس تھے جو ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ میرے نانا احمد خان کا کرہی تحصیلدار تھے اور ان کا شمار بھی خورجہ کے معززین میں تھا۔ میرے والدین کو مجھ سے غیر معمولی محبت کی یہ وجہ تھی کہ اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ پرانے زمانے میں بزرگوں کی دعاؤں پر زیادہ اعتقاد تھا جب میں پیٹ میں تھا تو ایک سرحدی بزرگ اخوند جی خورجہ تشریف لائے، میرے نانا نے اُن سے مل کر دُعا کی خواہش کی۔ اُنھوں نے دُعا دے کر فرمایا کہ خُدا کے حکم سے تمھارے نواسا پیدا ہوگا جس کا نام تقی محمد خان رکھنا اور دس سال تک سالگرہ کرنا، جس کو دسوند کہتے ہیں۔

طریقہ اس رسم کا یہ تھا کہ ہر سال چاندی کی ہنسلی بنوا کر لڑکے کو کوئی بزرگ پہناتا تھا۔ لباس سُرخ ٹول کا "جامہ" اچکن نما ٹخنوں تک نیچا اور گھیر دار مثل لہنگے کے۔ شاہی درباری لباس بھی یہی تھا۔ ختنہ کی تقریب اور شادی بیاہ میں دولہا دولھن کا لباس بھی یہی تھا البتہ ناموں میں فرق تھا۔ دولھا کے لباس کو "جامہ" دُلھن کے اسی لباس کو "تلک" اور جب ناچ کے وقت طوائفیں پہنتی تھیں تو اسی کو "پشواز" کہتے ہیں۔

پیدائش

۹؍ مارچ ۱۹۰۰ء بروز جمعہ میری پیدائش ہوئی۔ رسم سالگرہ کا یہ طریقہ تھا کہ صحن مکان اور دالان کی زمین کو پیلی مٹی سے لیپا جاتا، دیواروں پر سفیدی کی جاتی، فرش فروش چاندنی بچھائی، خوشبو کے واسطے لوبان اور اگر کی بتیاں جلتیں، بکثرت مٹھائی غربا اور برادری میں تقسیم ہوتی، مجھے سُرخ جامہ پہنا کر، سُرخ گدے کی چوکی پر بٹھاتے اور عزیز قریب اس تقریب میں شرکت کرتے۔ اس زمانے میں خواہ شادی ہو یا غمی یا معمولات دنیاوی ہر کام کی ابتدا اللہ کے نام سے ہوتی اور اس کی کامیابی کا یقین ہو جاتا۔ یہ دسوں ہنسلیاں احتیاط سے رکھی گئیں اور دس سال پورے ہونے پر ان کو فروخت کرکے غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا گیا۔ مجھے اس خیال کے ساتھ آج بھی لطف آتا ہے کہ ؎

اسیریٔ عشق کو منظور تھی میرے لڑکپن میں
جو ڈالے طوقِ منت کے بہانے میری گردن میں

بچپن کا گہوارہ، جوانی کی جذباتی زندگی، اور بڑھاپے کی کُبڑی لاٹھی، وہ اثرات ہیں جو ناقابلِ فراموش محبت ہیں اور کوئی زمانہ محبت سے خالی نہیں۔ بچپن میں ماں باپ کی محبت، جوانی میں معشوق کی اور بڑھاپے میں اللہ کی محبت۔ مجھے وہ زمانہ

تو یاد نہیں جب میں اپنے گہوارے میں لیٹ کر چاند کی نورانی شعاعوں سے کھیلا کرتا تھا اور دایا اماں میرے گہوارے کے پاس چھوٹی پلنگڑی پر لیٹ کر اور گنگنا کر مجھے لوریاں سُناتیں اور خود بھی محوِ خواب ہو کر کسی دوسرے ہی عالم میں چلی جاتی تھیں۔ یہ سب وقت کی نیرنگیاں ہیں، ایک زمانہ ایک آبشار کی مانند ہے جو آہستگی سے بہ کر ہمارے پیروں کے نیچے سے نکل جاتا ہے، جو نہ محسوس ہوتا ہے اور نہ واپس آتا ہے۔ وہی دنیا، وہی لیل و نہار ہیں لیکن ہم جو کل تھے آج وہ نہیں ہیں۔

جب میں خواب سے بیدار ہوا تو گہوارے والا بچہ نہ تھا، میری ماں بدن کو تھپک کر کہہ رہی تھیں کہ "بیٹا اٹھو، دن چڑھ گیا ہے، ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرو اور مکتب کو جاؤ۔"

یہ پہلا دن تھا جب مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا، اس کے بعد تو "یہ کرو اور وہ مت کرو" کا لامحدود سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے یہ تمیز نہ تھی کہ کون ہم عمر لڑکا ملنے کے قابل ہے اور کس کی صحبت میرے لئے مفید یا مضر ہے۔ کسی سے لڑتا اور کسی سے ملتا، اس تجربہ نے مجھے نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ؎

تازہ خواہی داشتن گر زخمہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مکتب میں داخلہ

میری والدہ فرصت کے اوقات میں مجھے قصہ کہانی کے طور پر سزا اور جزا کا مطلب سمجھاتیں، جنت کی نعمتیں بتلاتیں، دوزخ کے عذاب سے ڈراتیں۔ بچہ جو دیکھتا ہے وہ کرتا ہے، وہ جو سنتا ہے وہ کہتا ہے۔ مجھ پر اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ بچپن ہی سے نماز کا شوق پیدا ہو گیا اور جمعہ کی نماز تو شاید ہی قضا ہوئی ہو۔ کچھ عرصے تک ایک مولوی صاحب مکان پر پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد مجھے ملا نور احمد صاحب کے مدرسے میں جو قریب ہی تھا داخل کر دیا۔

اس زمانے میں اُردو فارسی اور قرآن پاک کی تعلیم عام تھی۔ مکاتب تقریباً ہر محلے میں ایک دو ضرور تھے اور فیس دو آنے یا آٹھ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ مکتب جس میں میرا داخلہ ہوا دوسرے مکاتب سے بہتر خیال کیا جاتا تھا، وجہ یہ تھی کہ ملا جی کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی شہرت تھی۔ نہ وہاں کرسی، اسٹول اور میز تھی نہ بورڈ اور گھنٹہ تھا۔ وقت معلوم کرنے کے واسطے ہر موسم کے لحاظ سے دُھوپ کے نشانات مقرر تھے۔ ایک مختصر مکان تھا جس میں دو دالان صحن اور دو مختصر سی کوٹھریاں تھیں۔ زمین کی نشست میں بھی یہ سادگی کہ کھجور کی چٹائی یا دری کا فرش جس پر امیر غریب سب ہی لڑکے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ خام چبوترے پر پانی کا مٹکا تختیاں دھونے کے لئے اور پینے کے واسطے صاف ستھرا گھڑا، ٹین اور پیتل کے گلاس اور مٹی کے آبخورے دو ڈھائی فٹ بلند طاق پر رکھے رہتے تھے۔ صفائی کا ملا جی کو کم خیال تھا۔ سات دن میں ایک مرتبہ کچھ لڑکے آن کر مکان کے ہر حصے میں جھاڑو دیتے اور چٹائی اور دری کے فرش میں سے اس طرح گرد اڑتی کہ گویا آندھی آ گئی۔

جمعہ کے روز تمام لڑکے صاف ستھرے کپڑے پہن کر آتے اور ملا جی کے ساتھ جامع مسجد جا کر نماز سیکھتے اور

پڑھتے۔ الغرض جیسی عوام کی زندگی سادہ تھی ویسی ہی مکتب کی سادگی تھی۔ کتابیں علم و ادب، اخلاق اور دینیات سے متعلق تھیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم کے ساتھ عمل کی بھی تاکید تھی۔ صفوۃ المصادر، کریما، مامقیما، خالق باری، دستور الصبیان، قاعدہ بغدادی اور کلام پاک۔ زیادہ عمر کے لڑکے گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوار سہیلی، گلزار دبستان پڑھتے اور معانی و مطالب سمجھتے۔ مولوی صاحب نہایت شفقت اور محبت سے ہر ایک کو سمجھاتے۔ قابل لڑکے خلیفہ کہلاتے اور دوسروں کو بھی پڑھاتے۔

ملا جی دیوار سے کمر لگا کر دو زانو یا چہار زانو بیٹھتے اور حرکات و سکنات پر غور کرتے۔ اُن کے رعب کی وجہ سے کوئی شرارت نہ کرتا۔ خوش وضع، خوش خصلت، نیک سیرت، متقی اور زاہد تھے۔ نہ اتنے کڑوے کہ گفتگو کرنے کو دل چاہے نہ اتنے میٹھے کہ لونڈے مٹھائی سمجھ کر چٹ کر جائیں۔ امیر غریب سب کے ساتھ یکساں سلوک۔ میاں یا صاحبزادے کہہ کر نام لیتے اور یہی تاکید کرتے کہ عزت کرو اور عزت کراؤ۔ لڑکے بھی مزاج داں تھے اور کوئی فضول بات نہ کرتے۔ تیز فہم اور ذہین لڑکوں سے خوش ہوتے۔ اگر طالب علم نے کہا کھیت اور وہ سمجھا کھلیان تو فرماتے کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست" یعنی تیری عقل پر تو رونا آتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا ہنس دیا تو اپنے قریب بلا کر کہتے کہ "میاں غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ آج تم اس پر ہنستے ہو کل یہ تم پر ہنسے گا۔" کسی سے اس بارے میں سعدی کا قول پوچھتے۔ کبھی خود ہی کلام پاک کی کوئی آیت پڑھ کر مطلب سمجھاتے اور فرماتے کہ "کیا عالم بے عمل بننا چاہتے ہو؟" برہنہ سر سے سخت نفرت تھی، اگر کسی کو گھر سے باہر برہنہ سر دیکھ لیا تو کہتے کہ "جس نے اپنی ٹوپی جو عزت کا نشان ہے اتار دی۔ اُس کو دوسروں کی ٹوپی اتارنے میں کیا تامل ہوگا۔" جھوٹ سے بھی نفرت تھی۔ اُن کا قول تھا کہ اگر بنیاد ہی ٹیڑھی ہے تو عمارت کیسے سیدھی ہوگی۔

غصہ آثار بشریت ہے۔ اگر کبھی جلال آ گیا تو کھجور کی پنکھیا (جو اُن کے ہاتھ میں رہتی تھی) کے دو چار ہاتھ رسید کر دیتے۔ اگر کبھی ہاتھ سخت پڑ گیا تو پنکھا حاضر اور ڈنڈی غائب۔ اگر اس کے بعد بھی غصے کا اثر باقی رہا تو فرماتے کہ "ہاتھ لاؤ" ہاتھ آگے کیا، لڑکے کے بازو کی ملائم سی کھال ٹٹول کر اس بلا کی چٹکی لیتے کہ دیر تک بچھو کی تکلیف کی طرح جلن رہتی۔ کبھی چھوٹے بچوں کے ہاتھ ٹانگوں کے اندر سے نکلوا کر کان پکڑواتے۔ اس سزا کو مرغا بنانا کہتے تھے۔

سلام کے بھی طریقے تھے۔ محض لفظ "سلام" کہہ دینا کافی نہ تھا۔ "السلام علیکم" کہنا لازمی تھا۔ بزرگوں اور خاندان کے معزز لوگوں کو سلام کے ساتھ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ لے جانا لازمی تھا۔ کوئی لڑکا یا لڑکی بڑوں کے سامنے بلا سر ڈھکے نہ آتی تھی۔ نہ کوئی ایسا مذاق کرتے تھے جو حفظ مراتب کے منافی ہو۔ یہی وہ ڈسپلن تھا جس سے گھروں میں زندگی خوشگوار اور دلچسپ بنی تھی۔

بڑوں کی شفقت

بڑوں کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ مرتضےٰ خان اور عاشق محمد خان دوستوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا، عاشق محمد خاں نے مرتضےٰ خان کی کمر میں چاقو مارا اور بھاگ گئے۔ مرتضےٰ خان اپنے والد عمر خان کے پاس خون میں تر بتر گئے اور شکایت کی۔ اُنھوں نے جراح کو بلا کر مرہم پٹی کرائی، اپنے لڑکے کو بلا کر وجہ دریافت کی، عاشق محمد خان نے اپنی غلطی کا تو اعتراف کیا لیکن دوست سے معافی مانگنے پر راضی نہ ہوئے۔ والد نے اپنے لڑکے سے

چاقو لے کر مضروب دوست کو دیا اور کمر پر سے اپنے لڑکے کے کرتا ہٹا کر مرتضےٰ خان سے کہا کہ تم بھی چاقو مار کر اپنا انتقام لے لو۔ عاشق محمد خان نے چاقو لے کر مارنے کے واسطے ہاتھ اٹھایا، پھر کچھ سوچ کر کہا کہ "میں مجبور کر کے بدلہ نہ لوں گا۔" چاقو زمین پر ڈال دیا اور بغلگیر ہو گئے۔

دوستی

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے کا دشمن موجودہ زمانے کے دوست سے بہتر تھا۔ وہ دشمنی انتقامی جذبہ تک ہی محدود تھی، کینہ نہ رکھتے تھے۔ لڑ لئے دل صاف ہو گیا۔ خان بہادر غلام قادر خان نے مجھ سے اپنا ایک واقعہ بیان کیا تھا جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔

اُن کے والد نے دریافت کیا کہ تمھارے کتنے دوست ہیں؟ انھوں نے تعداد بتلا دی۔ والد نے کہا کہ رات کو بارہ ایک بجے ان میں سے ہر ایک کے مکان پر جا کر اپنی فرضی مصیبت کا اظہار کرو اور بطور قرض حسنہ بیس تیس روپے طلب کرو۔ اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی لیکن سب نے روپے دینے سے انکار کر دیا۔ والد نے کہا کہ ہم نے بھی اپنی عمر میں ایک دوست پیدا کیا تھا لیکن کبھی آزمائش نہیں کی، ان کو بھی آزمائیں۔ دونوں آدھی رات کے وقت ان کے مکان پر گئے، دستک دی، نام بتلایا، تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آئے اور سلام علیک کے بعد دیر سے آنے کی عذر خواہی کی اور کہا کہ "تمھارے ناوقت آنے اور وقت کے بعد ملاقات ہونے سے مجھے یہ گمان ہوا کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔ اگر وہ روپیوں سے دُور ہو سکتی ہے تو دس بیس روپے اور بیوی کا زیور (جو ان کی اجازت سے لایا ہوں) حاضر ہے۔ اگر قصبہ سے باہر جانا ہے تو یہ ناشتہ حاضر ہے اور اگر کسی دشمن سے مقابلہ کرنا ہے تو تلوار موجود ہے۔" غلام قادر خان کے والد جذبۂ محبت سے آبدیدہ ہو گئے اور اپنے لڑکے سے کہا کہ "اگر ایسا مخلص دوست ایک ہی شخص مل جائے تو کافی ہے۔"

داخلہ انگریزی اسکول

تیرہ چودہ سال کی عمر میں میرا داخلہ خورجہ کے انگریزی وکٹوریہ جوبلی اسکول میں ہو گیا۔ مڈل (میٹرک) کو تیسری کلاس کہتے تھے۔ اس اسکول میں پندرہ فی صدی مسلمان باقی غیر مسلم تھے۔ ٹیچروں میں مولوی محمد محسن مسلمان تھے۔ انگریزی اسکول میں تہذیب اور اخلاق سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کلاسوں میں گپ شپ ہوتی، مذاق ہوتا، کل کی خبروں پر تبصرے ہوتے۔ چترال کی انگریزوں سے لڑائی ہو رہی تھی، اس کی خبریں حاشیہ چڑھا کر بیان کی جاتیں۔ جب زیادہ شور ہوتا تو ٹیچر میز پر دو چار ہاتھ زور سے مار دیتے اور تھوڑی دیر خاموشی ہو جاتی۔ فقرے بازی میں ٹیچر بھی شریک ہوتے۔ زیادہ پیش پیش مولوی صاحب تھے۔ لقوے سے اُن کا مُنہ ٹیڑھا تھا اور آنکھ میں بھی کجی تھی۔ اس لیے اُن کو آپس میں لڑکے ٹیڑھ مُوا مولوی کہتے تھے۔

خود لڑکوں سے مذاق کرتے اور جب چڑ جاتے تو رول سے پٹائی بھی کرتے۔ بطور نمونہ دو واقعات پیش ہیں:

عید کے واسطے دو بھائیوں نے ایک ہی قسم کے کپڑے کی اچکنیں سلوائیں۔ ایک بھائی ایاز محمد خاں کا قد لانبا، دوسرے بھائی نیاز محمد خاں کا قد چھوٹا تھا۔ عید کے کام کی زیادتی کی وجہ سے نوآموز کام کرنے والوں نے ایک اچکن کا پورا ایک طرف کا حصہ دوسری اچکن میں سی دیا۔ یہی حالت دوسرے بھائی کی اچکن کی ہوئی۔ بڑے بھائی نے تو اچکن نہ پہنی لیکن چھوٹے

بھائی مذاقاً اچکن پہن کر کھیل کے میدان میں گئے۔ لڑکوں نے اچکن کو دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔ کسی نے دامن کو ٹوکا، کسی نے آستین کا مذاق اڑایا، کسی نے کہا کہ بٹن ٹیڑھے ہیں، کسی نے کہا کہ سلوانے والے کی عقل ٹیڑھی ہے۔ ایاز محمد خاں بڑے حاضر جواب تھے۔ کہنے لگے کہ اس میں غلطی کسی کی بھی نہیں ہے۔ درزی نے تو مولوی صاحب کے منہ کی نقل کی ہے۔" اتفاق سے مولوی صاحب ان کے پیچھے کھڑے تھے، سن کر ایسے غضبناک ہوئے کہ اسٹمپ اکھاڑ کر ایاز محمد خاں کے دو اسٹمپ رسید کئے۔ یہ تھا عید کا انعام۔

موسم گرما میں جب نیند کا غلبہ ہوتا تو مولوی صاحب دونوں ٹانگیں میز پر رکھ کر کرسی پر دراز ہو جاتے اور دس پانچ منٹ خراٹے لے کر سو جاتے اور آنکھ کھلتے ہی لڑکوں پر رعب جمانے کے لئے فرماتے کہ "میں تم لوگوں کی بدتمیزیوں کو خاموشی سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ لاحول ولا، یہ اسکول ہے یا چنڈو خانہ؟"

اسکول میں جو نیا لڑکا داخل ہوتا اس کی وضع قطع اور صورت دیکھ کر کوئی نام پھڑکتا ہوا تجویز کر دیتے اور وہ مقبول ہو جاتا۔ "ہر فزونے رائے سے" ایک نووارد کا داخلہ ہوا جو خانابا خورجہ کے تحصیلدار کا بھانجا تھا۔ جب کلاس میں آیا تو سب کی نظریں اٹھ گئیں۔ مولوی صاحب نے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ گندمی رنگ، شریف صورت، چھریرا بدن، عمر سولہ سترہ سال، گول ٹوپی، ململ کا انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ، سلیم شاہی کامدار جوتی دیکھ کر مولوی صاحب مدظلہ العالی مسکرائے، لڑکے منتظر تھے کہ دیکھئے کیا نام تجویز ہوتا ہے۔ فرمایا:

"میاں گلفام، کس تھیٹر کو تباہ کر کے آئے ہو؟"

لڑکا تھا حاضر جواب، برجستہ جواب دیا کہ:

"جس تھیٹر کے آپ ہیجڑے تھے۔"

یہ کہہ کر لڑکا تو بنچ پر بیٹھ گیا لیکن مولوی صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور پھر نام رکھنے کی قسم کھائی۔

اس زمانے کے شوق

کھیلوں میں فٹ بال، ٹینس، کرکٹ کے علاوہ گیڑی، بھڑو کبڈی، آنکھ مچولی، تیر اندازی، کشتی، پٹا، بنوٹ، مگدر اور لیزم ہلانا۔ غلیل چلانا اور ایک غلہ کو ہوا میں پھینک کر دوسرے غلہ سے اس کو توڑنا، یہ شوق مجھے بھی تھا۔ کبوتر بازی کے علاوہ اور بازیاں بھی تھیں لیکن شاذونادر۔ کبوتروں کے اقسام یہ تھے۔ شیرازی۔ لال بند، گل آنکھ، کابلی، کلمئی، گلوبے، ٹقا، نساوری، اڑان کے کبوتر ایسے جاندار تھے کہ تمام دن اڑتے تھے اور اتنی بلندی پر جاتے تھے کہ نگاہ مشکل سے کام کرتی تھی۔

گھوڑے کی سواری

اس زمانے میں گھوڑے کی سواری اور تلوار کے کرتب بھی زندگی کے لوازمات میں داخل تھے۔ چونکہ والد صاحب بہت اچھے سوار تھے۔ اپنی خاص توجہ اور نگرانی میں مجھے سواری سکھلائی تھی اور چودہ سال کی عمر میں شہسوار ہو گیا تھا۔ کاٹھی اور لگاموں کے ایک ایک حصے کے نام یاد کرائے تھے۔ مثلاً نمدہ، زیربند، گدی، رکاب، رکاب دوال، دہانہ، قرنی، زیرکشی۔ باگ وغیرہ کے علاوہ یہ بھی بتلایا تھا کہ اگر گھوڑا الف ہو یا بے قابو ہو،

یا دریا عبور کرنا ہو، یا مقابلہ کرے تو سوار کو کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ مجھے عمر میں ایسے بہت سے مواقع پیش آئے اور اسی شہسواری کے علم نے مجھے ہمیشہ کامیابی دی۔ چودہ سال کی عمر تھی، والد صاحب ضلع اوناؤ میں تعینات تھے۔ کانپور اور اناؤ کے درمیان گنگا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ بیسیوں گاؤں بہہ گئے، ہزاروں مویشی اور انسان ہلاک ہوئے۔ لوگ تماشہ دیکھنے جا رہے تھے، میں نے پوچھا تو بتلایا کہ "غضب الٰہی" ہے۔ عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی ٹٹوانی پر تو سوار نہ ہوا، والد صاحب کی بڑی گھوڑی پر سوار ہو کر میں بھی "غضب الٰہی" دیکھنے کے واسطے چلا گیا اور یہ سنا کہ فلاں ٹیلے پر دریا کے پار والد صاحب کا کیمپ ہے اور سیلاب کے بہتے لوگوں کی جان بچانے کے کام پر تعینات ہیں اور بڑی جماعت پولیس کی ان کی ماتحتی میں کام کر رہی ہے۔ ان سے ملنے کے شوق میں گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی دکھلائی دیتا تھا۔ سمندری طوفان کی طرح موجیں بلند ہو کر غائب ہو جاتی تھیں۔ والد صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے باگ ڈھیلی چھوڑ دی، سمت بھول گیا۔ دھارے میں پہنچ کر سر چکرایا۔ گھوڑا تھک کر بہنے لگا۔ زیست کی امید منقطع ہو گئی۔ بہت سی کشتیوں میں سپاہی جو جانیں بچا رہے تھے، اپنے رسوں میں گھوڑے کو بہاؤ سے روکا، تب میری جان بچی۔

درازیٔ عمر کا راز اپنی زندگی کی روشنی میں

بچپن سے برابر مجھے کشتی اور ورزش کا شوق رہا۔ سوائے حقے کے تمام غشیات سے پرہیز کیا۔ کھانے میں اوقات اور اعتدال کی سختی سے پابندی کی۔ انسان کی کمزوریوں میں شہوانیت اور آوارگی کو بڑا دخل ہے۔ اکثر مواقع پیش آئے لیکن میں کبھی مغلوب نہ ہوا۔ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اپنے ہم عمروں میں کشتی میں مجھ سے کبھی کوئی نہ جیتا، لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں سب کو میں نے نیچا دکھلایا۔ گھڑ دوڑ، تیغ بازی، بندوق کی نشانہ بازی میں اکثر انعامات حاصل کئے۔ خطرناک مواقع پر جبکہ دشمن مسلح تھا اور میرے پاس کوئی چیز نہ تھی کبھی مرعوب نہ ہوا۔ میری اصول زندگی میں صداقت، خلوص، اعتماد باللہ اور اکل حلال اور سادہ زندگی میری تمام کامیابیوں کی بنیاد تھی جس نے مجھے ہزاروں آفتوں سے محفوظ رکھا۔ میں ہر بُری بھلی صحبت میں شریک ہوا لیکن بُرائی سے ہمیشہ دامن بچایا:

بگیر ترکِ تعلق دلا ز مرغابی
کہ چوں ز آب برخاست خشک پر برخاست

انگریزوں کی ملازمت کی لیکن انگریزیت سے ہمیشہ نفرت رہی۔ اسی وجہ سے انگریزی لباس کی نقالی کو بھی اچھا نہ سمجھا اور ترکی ٹوپی، اچکن اور پاجامہ جو میرے بچپن کا مرغوب لباس ہے۔ اسی کو پہن کر آج بھی خوش ہوتا ہوں۔

میرے وطن کے بعض دلچسپ حالات

میرے وطن خورجہ کی آبادی میرے لڑکپن میں پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی، آدھے حصے میں اہل ہنود اور آدھے میں مسلمان آباد تھے۔ پٹھانوں میں کاکڑ، خلیل، غلزئی، ترین، مہمند اور سلمان کے قبیلے تھے اور محلوں کے بھی نام یہی تھے۔ خورجہ کا فاصلہ دہلی سے باون میل، میرٹھ سے پچپن میل اور علی گڑھ سے تیس میل ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ کلکتہ، بمبئی اور پشاور کا

بھی خورجہ سے یکساں ہے، گویا خورجہ وسطِ ہند میں واقع ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے جو سب سے پہلی لائن ہے اور ۱۸۶۶ء میں جاری ہوئی تھی۔ اس کا اسٹیشن خورجہ سے تین میل ہے۔

سواری

اس زمانے میں صرف دو سواریاں کرایہ کی تھیں۔ دو پہیہ ایک صندوق نما سواری تھی جس کو ایک گھوڑا کھینچتا تھا اور شکرم چار پہیوں کی سواری تھی جس میں دو گھوڑے لگائے جاتے تھے۔ اب یہ دونوں سواریاں برسوں سے ناپید ہیں۔

مکانات

خورجہ کے مکانات پرانے سب چھوٹی گلیا اینٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ چنائی چکنی نالابوں کی سیاہی مائل مٹی سے ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ دیواروں کی چوڑائی آدھ گز اور پون گز کی تھی، اسی وجہ سے دیرپا تھے۔ میرا آبائی مکان ساڑھے تین سو سال کا بنا ہوا ہے جس میں سات پشتیں گزری ہیں اور اب بھی وہ قائم ہے۔ چھت کرپے اور کڑیوں کی خام ہوتی تھی اور آسانی سے بدلوائی جا سکتی تھی۔ مکانات کی وضع قطع تقریباً یکساں تھی۔ یک درہ، دو درہ، سہ درہ، دالان، دو جانب کوٹھڑیاں، کشادہ صحن، دیواروں میں دریچے اور طاق۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے خالی حصے میں لکڑی لگا دی جاتی تو وہ بخاری کہلاتی اور چھت پر جو کوٹھری ہوتی اس کو اٹاری کہتے جس کے بارے میں عشقیہ گیت مشہور ہیں: "اٹاریوں پہ گزاری کبوتر آدھی رات"۔ کبوتر سے مراد نامہ بر کبوتر ہے۔

غسل خانے کا رواج نہ تھا، چھت پر پلنگ کھڑے کئے اور غسل کر لیا۔ دروازے کو دواری یا ڈیوڑھی کہتے تھے جہاں پردہ نشین مستورات کو آڑ بند کر کے ڈولی یا پالکی میں سوار ہوتیں یا اترتیں۔ اسی میں مستقل طور پہ تخت بھی رہتا اور اسی پہ بیٹھ کر ملاقاتیں کی جاتیں۔ چائے کا مطلق رواج نہ تھا۔ تواضع صرف پان اور حقے کی تھی۔ بطور کلب ہر محلہ میں چوپالیں تھیں جہاں سب لوگ جمع ہو کر گپ شپ میں وقت گزارتے تھے۔

روشنی

لالٹین اور لیمپوں کا رواج برائے نام تھا۔ گھر گھر کڑوے تیل کے چراغ جلتے تھے۔ محفلوں میں پیتل کے فتیل سوز چوکھی بتیوں والے یا موم بتیوں کے رنگ برنگے جھاڑ فانوس محفلوں کی زینت کا باعث تھے۔ باقاعدہ مٹی کے تیل اور لیمپوں کا رواج ۱۹۰۶ء سے ہوا ہے۔

ارزانی

ارزانی کا یہ عالم تھا کہ راج کی مزدوری چار چھ آنے یومیہ اور مزدور کی چار چھ پیسے سے زیادہ نہ تھی۔ عہدہ داروں کی تنخواہ دو ڈھائی روپے اور کھانا۔ اسی لحاظ سے کپڑا اور دیگر اشیاء ارزاں تھیں۔ شریفوں کا عام لباس پگڑی یا صافہ، انگرکھا، پاجامہ۔ بوڑھے مرد اور عورتیں ملاگیری رنگے ہوئے صافے اور دوپٹے استعمال کرتے۔ یہ خوشبودار جڑی بوٹی کے عرق سے گھڑے میں رنگا جاتا تھا اور ملاگیری رنگ کہلاتا تھا۔ نری کے چمڑے کی سلیم شاہی جوتی یا کچے چمڑے کی ادھوڑی چمڑے پنجے کی جوتی ایک یا ڈیڑھ روپے میں ملتی اور سال بھر کام دیتی۔ مسلمان غدر کے زمانے میں انگریزوں کے بے پناہ مظالم سے اس قدر متنفر تھے کہ انگریزی چیز کے استعمال کو کفر، حرام اور ناجائز خیال کرتے تھے۔ بوشاک اور ڈاسن کے ولایتی جوتے (شو) ساڑھے چار روپے میں ملتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ولایتی شو سولہ سال کی عمر میں پہنا تھا۔

اس زمانے کے سکے یہ تھے، اشرفی (دگنی)۔ روپیہ، اٹھنی، چونی، دونی، ادھنا، پیسہ، دھیلا، پائی۔ نوٹ نہ تھے پیسے کی اتنی زیادہ قیمت تھی کہ اس کو کوڑیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دمڑی، چھدام، گنڈا، پون پیسہ، اس کے بعد پیسہ ہوتا تھا۔ غریب آدمی دس روپے ماہوار کی آمدنی میں بخوبی گزر اوقات کر سکتا تھا۔ سو دو سو کی آمدنی والوں کو خرچ کرنے کے واسطے ذرائع تلاش کرنے پڑتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ میری ہمشیرہ اور اُن کی چچا زاد بہن کو گڈے گڑیا کی شادی کا بچپن میں شوق ہوا اور تمام رسومات برادری کی شرکت وغیرہ اس طرح پر ادا کی گئیں کہ جس طرح عام شادیوں کا رواج تھا دعوتیں، ناچ گانے سب ہی ہوئے اور "لکھی بابل مورے کاہے کو بیاہی بدیس" گا کر گڑیا کو پالکی اور باجے کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس ارزانی کے زمانے میں خرچ ہی کیا ہوا ہوگا۔

رسومات شادی

شادیوں میں بے شمار رسومات تھیں۔ مثلاً منگنہ، عیدی، تہواری، صحنک (یہ رسم ایرانی ہے اور عہدِ جہانگیری سے جاری ہے) اس رسم میں بیوہ اور عقدِ ثانی والی مستورات شریک نہ ہوتیں۔ سرگ، مائیاں، برات، نکاح، سہرا بندھائی، جگیرن، تقسیم انعامات، مردانہ نوتہ، مستورات کے نوتے کو بیل کہتے تھے، چوبہ، ہاتھ دھلائی، جوتا چھپائی، ٹونے، سہاگ، تقسیم مٹھائی، دیویا، آرسی مصحف، رخصتی، روپے پیسوں کی بکھیر، باڑہ رکائی، چوبہ جس میں سات سہاگنیں ایک جگہ بیٹھ کر کھاتی تھیں۔ باڑہ یعنی دلھن کے ہاتھ سے چاولوں کی سات مٹھیاں بھروا کر کسی مسکین کو دی جاتی تھیں۔ چوبہ، تغاری، جوڑا کھائی، پیر دھلائی، چوتھی، مردانی اور زنانی دعوتیں۔

زیور

زیور جو اس زمانے میں رائج تھے اُن کی تفصیل یہ ہے:

سراسری۔ جھومر ٹیکہ۔ جھلنیاں۔ جھالے۔ بالیاں۔ پتے۔ بہارے۔ کرن پھول۔ جھمکے۔ بلاق۔ نتھ۔ کیل۔ ناک کی کیل۔ گلوبند۔ ٹیپ۔ کنٹھی۔ چمپا کلی۔ ڈھولنا۔ طوق۔ ہار۔ جگنو۔ پنچ لڑی۔ ست لڑی۔ بدھی نونگے۔ عل بند۔ شوق بند۔ بازوبند۔ پتلیاں۔ پری بند۔ کڑے۔ کنگن۔ چوڑیاں۔ رام جھول۔ چوہے دتیاں۔ بجلیاں۔ آرسی۔ چھلے۔ انگوٹھی۔ جوشن۔ چھاگل۔ جھانجن۔ پیروں کی چوڑیاں۔ لچھے۔ بچھوے۔ سانوٹ۔ پازیب۔ پیر کی انگلیوں کے چھلے۔ گھونگرو دار، سادے۔ دلھن کی جوتی کے گھنگھرو۔

کھانے

دعوتوں کے عام کھانوں کے علاوہ مثلاً پلاؤ، زردہ، قورمہ، فرنی، کباب، شیرمال، نان جو بازار سے پکوائے جاتے تھے اور بلا کر بھی کھایا جاتا تھا۔ ایک طریقہ اور بھی تھا جس کو "تورہ بندی" کہتے تھے۔ یہ تمام کھانے برادری میں بلا تخصیص امیر و غریب گھر گھر تقسیم کئے جاتے تھے اور گھر میں رہنے والے مرد، عورت، لڑکا، لڑکی، ماما، نوکر، یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ کے بچے کا بھی پورا حصہ ہوتا تھا۔ لفظ "تورا" ترکی زبان کا لفظ ہے اور دلی اور نواح دلی میں اس رسم کا رواج شاہ بابر کے محلات سے ہوا ہے۔ شاہی محلات میں یہ بھی طریقہ تھا کہ اگر کوئی کھانا نہ لے تو اس کے عوض میں پانچ روپے نقد فی کس دیئے جاتے تھے۔ تورے کے کھانے کی پلیٹیں اور پیالے

مانڈے سے ڈھکے جاتے تھے۔ مانڈہ پتلی روغنی چپاتی کو کہتے ہیں جو حلوے کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ یہ وہی حلوہ مانڈا ہے جس کی مثل مشہور ہے کہ "مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انھیں (مولویوں کو) اپنے حلوے مانڈے سے کام"۔ ایک طریقہ صحنک یا شہنک کا بھی تھا جس میں صرف پلاؤ یا زردہ تقسیم ہوتا تھا۔ غربا اُن چاولوں کو خشک کر کے رکھ لیتے اور دوبارہ پکا کر کھاتے تھے۔

خورجہ کی مشہور چیزیں

خورجہ کی مشہور چیزوں میں اچار شلجم، امبرزی (مٹھائی) اور چینی کے برتن مشہور ہیں۔ برتنوں میں ہانڈیاں، ڈھوبریاں (پلیٹ)، پیالیاں، طشتریاں، کلھڑ، کتھا چونا رکھنے کی کلھیاں، چائے کا سٹ، زمین کے ٹائلس، گلدان، مگلے وغیرہ بنائے جاتے، اور یہ چیزیں اس زمانے میں اس قدر ارزاں تھیں کہ غریب بھی بہ آسانی خرید سکتے تھے۔ مثلاً ہانڈی کی قیمت دو پیسے، رکابی کی قیمت اس سے بھی کم تھی۔

زبان اور تعلقات

زبان اور محاورات پر زیادہ اثر دہلی کا تھا، ہندو مسلم تعلقات خوشگوار تھے۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب گرد و نواح کے جاٹوں نے خورجہ کے متمول ہندوؤں کو لوٹنے کے لئے چڑھائی کی تھی تو میرے دادا رسالدار میجر داؤد خاں نے ہندو عورتوں کو اپنی بڑی حویلی میں پناہ دی اور خود پٹھانوں کو لے کر شہر کے باہر گئے اور جاٹوں کے سرغنہ سے کہا کہ ہندو ہماری پناہ میں ہیں، اگر ان پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو پہلے ہم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ وہ مقابلے کے لیے راضی نہ ہوئے اور ہندوؤں سے نجی طور پر کچھ معاملہ کر کے چلے گئے۔

ز شرحِ قصۂ ما رفت خواب از چشمِ خوباں را
شب آخر گشت افسانہ دراز افسانہ می خیزد

قبل اس کے کہ میں آپ بیتی شروع کروں، کچھ دلچسپ واقعات اس زمانے والوں کے بھی سن لیجیے جو اس مردم خیز خطہ کے رہنے والے تھے ؎

شکستِ جام و مینا پر تو ایک ہنگامہ برپا ہے
جو مے کش چل بسے ہیں اُن کا ماتم کیوں نہیں ساقی

احمد خاں سانپوں والے

خورجہ نے بزرگ، صوفی، عالم، شاعر، بہادر، صناع، پہلوان، طبیب، سب ہی پیدا کئے۔ پہلوانوں میں کالو نے بڑا نام پیدا کیا، بہادروں میں کافی تعداد تھی۔ میرے دادا نے پنڈاریوں کی لڑائی میں نام پیدا کیا اور زخمی ہوئے۔ ایک ہزار سوار اُن کی ماتحتی میں تھا۔ احمد خاں سانپوں کے علاج میں ماہر تھے اور مار گزیدہ کے زخم کو دیکھ کر سانپ کی قسم بتلا دیتے تھے اور اگر فوراً علاج شروع ہو گیا تو خواہ کالے ناگ ہی کا کاٹا ہوا ہو نوّے فی صد مریض شفایاب ہو جاتے تھے۔ اُنھوں نے "تریاقِ خورجہ" کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کرائی تھی جو اب ناپید ہے۔ شاعروں میں یعقوب خاں (جامع مسجد والے) فارسی اور

اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا۔ میرے لڑکپن میں اُن کی عمر ستر سال کی تھی۔ چند اشعار یاد ہیں ؎

ماجرا برہنہ پائی کا ہماری مجنون
خار سے پوچھ کہ سب نوکِ زباں ہے اس کے

مل کے خاروں سے دشتِ غربت میں
آبلے پھوٹ پھوٹ کر روئے

جب کیا عزمِ سفر دشتِ جنوں سے یعقوب
آبلے پاؤں پڑے خار نے دامن پکڑا

حضرت داغ خورجہ میں

ایک اور صاحب ولی اللہ خان ولی تھے، اُن کا بھی کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن خان فیروز بھی داغ کے شاگردوں میں تھے۔ جب داغ حیدرآباد جا رہے تھے، فیروز کے مکان پر خورجہ میں قیام کیا۔ ولی اللہ خان ولی سے بھی متعارف ہوئے۔ داغ کی شہرۂ آفاق غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

ولی نے کہا کہ "اگر اجازت ہو تو ایک غزل اسی ردیف قافیے میں میں نے بھی کہی ہے، عرض کروں۔" انھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ داغ سیاہ فام اور بھاری بدن کے تھے۔ یہ غزل دراصل اُن کا سراپا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اشعار یاد نہیں رہے۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ صرف مقطع یاد رہا ہے:

ولی خورجہ میں آنا داغ کا ایسا تعجب ہے
کہ جیسا پھنس گیا ہو جس طرح مکڑی کے جالے میں

بزرگوں میں کئی بزرگ اچھے گزرے لیکن حضرت مولانا مولوی نصراللہ خاں صاحب میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ریاست حیدرآباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج ہونے کے باوجود عالم، زاہد، عابد، صوفی اور حکیم بھی تھے۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد اُن کو منصب نسلاً بعد نسلٍ ملتا رہا۔ خورجہ آ کر ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دور دور سے طالب علم آ کر عربی، فارسی، فقہ، حدیث اور حکمت سیکھتے تھے۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی اسی مدرسہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور حضرت

کے مہمان رہے۔ میرے والد صاحب بھی اُن کے ہم جماعت اور ہم سبق تھے۔

ظرافت اور شرارت تقاضائے عمر ہے، مدرسہ میں ایک پٹھان کا لڑکا اپنی تختی دکھلانے حضرت کے پاس جا رہا تھا، نذیر احمد صاحب نے اس سے تختی لے کر دیکھی اور خوش خط یہ فقرہ لکھ دیا:

"نذیر احمد، ڈپٹی کلکٹر"

لڑکے نے جا کر حضرت سے شکایت کی، حضرت مسکرائے اور اسی فقرہ کے نیچے لکھ دیا کہ "اگر یہی خواہش ہے تو ڈپٹی کلکٹر ہو ہی جائے گا" جب نذیر احمد صاحب نے حضرت کی تحریر دیکھی تو بطور عقیدت مندی اس سے تختی خرید کر یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ بالآخر اس واقعہ کے مدت کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہی ہوئے۔ مولوی صاحب کے متعلق اور بھی بعض دلچسپ واقعات ہیں لیکن بوجہ اختصار ان کی گنجائش نہیں ہے۔

میری ملازمت

چونکہ سات پشت سے میرا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر مجھے بھی کم عمری ہی سے ملازمت کا شوق ہوا۔ براہ راست انسپکٹر جنرل پولیس سے ملا جو اتفاق سے دورے کی غرض سے خورجہ آیا ہوا تھا۔ یہ زمانہ دسمبر ۱۸۹۸ء کا تھا۔ چونکہ بیس سال سے قبل ملازمت شمار نہیں ہوتی نہ پولیس ٹریننگ کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے مجھے ہیڈ کنسٹبل مقرر کر کے علیگڈھ بھیج دیا تاکہ دو سال میں وہاں قانون اور قواعد پولیس کی تعلیم حاصل کر کے دو سال کے بعد ٹریننگ بھیج دیا جاؤں۔ اس زمانے میں ہیڈ کنسٹبل کی تنخواہ دس روپے ماہوار تھی۔ دو سال علی گڑھ رہ کر پولیس کے تمام کام سیکھے اور تمام صعوبتیں برداشت کیں۔

۱۹۰۱ء میں ٹریننگ کالج مراد آباد میں ایک سال رہ کر امتحان پاس کیا۔ واپسی کے بعد چند ماہ علی گڈھ رہ کر کوتوالی مظفر نگر کا تبادلہ ہو گیا۔

اتفاق سے ہر پرشاد کوتوال تھا جس کی بے عنوانیاں، مظالم، جھوٹے مقدمات، اور بے شمار رشوت ستانی کے حالات دیکھ کر پولیس کی ملازمت ہی سے نفرت ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس (انگریز) سے جا کر حالات بیان کئے۔ وہ شرابی اور کوتوال کی مٹھی میں تھا، سُنی اَن سُنی کر دی۔ جب ڈپٹی انسپکٹر جنرل معائنہ کی غرض سے آئے تو ان سے اپنا دکھ درد بیان کیا اور میری خواہش کے مطابق تبادلہ انسپکٹر جنرل پولیس الہ آباد کے دفتر میں کر دیا۔ یہ زمانہ سنہ ۱۹۰۲ء کا تھا۔ اس دفتر میں مجھے اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔

اکبر الہ آبادی

الہ آباد میں میری سب سے پہلی ملاقات سید علی حسین سے ہوئی جو خان بہادر اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ ایک روز میں نے سید سے کہا کہ اپنے ماموں سے ملاقات کرائیے، وہ راضی تو ہوئے لیکن یہ بھی کہا کہ کچھ عرصے سے وہ خانہ نشین ہیں اور سوائے ایک دو پرانے ملنے والوں کے عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم ہم دونوں ایک روز شام کو عشرت منزل پہنچ گئے۔ کوٹھی کے سامنے چمن میں تنہا آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، موتیابند کی وجہ سے پہچان نہ سکتے تھے، پوچھا کون صاحب ہیں؟ سید صاحب نے پہلے اپنا

اور پھر میرا تعارف کرایا۔ کرسی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ میں خورجہ میں منصف رہ چکا ہوں اور آپ کے خاندان والوں سے بخوبی واقف ہوں۔ جب یہ معلوم ہُوا کہ میں پولیس میں ملازم ہوں تو یہ شعر پڑھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر واعظ نہ تھے لیکن ان کی صحبت اور ان کے دلچسپ اشعار میں جادو کا اثر تھا اور نوجوان کو دین کی شکر لپٹی ہوئی گولی کو مزے لے لے کر گلے کے نیچے اتار لیتے تھے۔ میری طبیعت کا اندازہ کرنے کے لیے مختلف موضوعوں پر گفتگو کی، پھر ہم لوگ چلے آئے۔ مجھے اس پہلی ہی ملاقات میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کئی روز کے بعد سید نے پوچھا کہ "کہو اس ملاقات میں کیا رائے قائم کی؟" میں نے اس کا جواب اس شعر میں دیا ؎

آنا کہ رم نمودی با خوب رو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

دو چار روز بعد جب سید صاحب اکبر سے ملے تو اس شعر کا بھی ذکر کر دیا۔ فرمایا کہ خان صاحب سے کہہ دینا کہ وہ آتے رہا کریں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ایسے تعلقات اور مراسم قائم ہوئے کہ عشرت منزل کا ایک حصہ میرے رہنے کے لئے مخصوص کر دیا اور کئی سال متواتر انھیں کے ساتھ رہا۔ اور مجھے علمی اور ادبی فوائد حاصل ہوئے۔ وہ نہ براہِ راست کسی کو نصیحت فرماتے تھے اور نہ مسلسل کبھی تقریر کی لیکن رمز و کنایہ اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے جو نقش کالحجر ہو جاتی تھیں۔ اس پانچ چھ سال کی صحبت میں میں نے اکبر کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا، چونکہ طوالت مقصود نہیں ہے اس لیے چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں:-

بعض اصحاب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اکبر مُردہ دل تھے۔ میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ اکبر کی زبان اور قلم وقتی حالات اور تاثرات کے ترجمان تھے۔ وہ انسانی دل رکھتے تھے۔ تنہائی، بے کسی، ضعیفی اور علالت سے کیسے متاثر نہ ہوتے، سوائے ایک بیوہ ضعیف بہن کے کوئی بھی تو گھر میں نہ تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

جب طبیعت خوش نہ ہو تو کیا کرے اچھا مکان
دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

بیوی کے انتقال کے بعد ہاشم ایک سہارا تھا، جب وہ بھی جوان ہونے سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، فرماتے تھے کہ کتنا بڑا دل ہے کہ دل تنگی ہوتی ہی رہتی ہے۔ ایک روز میں نے ان کو بہت زیادہ غمزدہ دیکھا۔ جب غم غلط کرنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو یہ شعر پڑھا ؎

از بیابانِ عدم تا سر بازارِ وجود
بتلاشِ کفنے آمدہ عریانے چند

سُنتے ہی طبیعت کا رُخ بدل گیا۔ پوچھا، کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا کہ مشہور تو یہ ہے کہ حافظ کی غزل اسی ردیف قافیہ کی سُن کر کسی شیراز کے حلوائی نے یہ شعر موزوں کیا تھا اور حافظ نے اس شعر کو سُن کر یہ کہا تھا کہ اس شعر نے میری غزل کو بے کیف کر دیا ہے۔

اس کے بعد موت کے فلسفہ پر گفتگو شروع ہو گئی اور وہ حالت جاتی رہی۔ بعض صحبتوں میں جب طبیعت موزوں ہوتی تو خوردی اور بزرگی کا حجاب درمیان سے اٹھا دیتے۔ ایک روز مجھ کو اچانک سوال کیا کہ مس اور بیگم میں کیا فرق ہے؟ میں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ دونوں ایک باغ کے پھول ہیں، ایک خوشبودار ہے اور دوسرا بلا خوشبو ہے۔ فرمایا کہ اس شاعرانہ تخیل کو چھوڑو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک پیچوان حقہ ہے دوسری سگرٹ ہے!! میں اس ظریفانہ بلاغت پر حیران ہو گیا۔

ایک روز میں نے سوال کیا کہ حضرت غم کا بھی کوئی علاج ہے؟ فرمایا کہ میرے پاس ایک ہی مجرب نسخہ ہے:

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی
مُلّا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

جنگ عظیم کا زمانہ تھا، چنتامنی اڈیٹر اخبار لیڈر ملنے کے واسطے آئے، ان کو یہ شعر سنائے ؎

ہم سے سُن لو خلاصۂ اخبار جس کو مدت سے پڑھتے آتے ہیں
ہر طرف ہے شکست جرمن کو، بجز اس کے کہ بڑھتے آتے ہیں

گورنمنٹ نے اعتراض کیا اور چند ہی ماہ بعد گورنمنٹ نے اکبر کے اشعار کورس میں داخل کرنے کی اجازت چاہی۔ جب مجھ سے ذکر کیا تو میں نے یہ شعر پڑھا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اکبر کو زبان انگریزی سے بغض نہ تھا، نہ سر سید کے خلاف تھے، البتہ انگریزیت سے نفرت اور بلا کی نفرت تھی۔ وہ خائف تھے کہ مغرب کی چمک دمک پر شیفتہ ہو کر مسلمان اپنے اصلی جوہر نہ کھو بیٹھیں اور آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اکبر کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔

مولانا محمد حسین الہ آبادی

یہ مولانا محمد حسین مرحوم وہی بزرگ ہیں، جن کا انتقال اجمیر شریف میں عرس کے موقع پر ہوا تھا جبکہ قوال قدسی کی غزل کا یہ مقطع گا رہے تھے ؎

گفت قدسی فقیری در فنا و در بقا
خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

میں اکثر مولانا کی صحبت سے مستفید ہوا ہوں۔ الٰہ آباد میں رجبی شریف کی رسم انھیں کی ایجاد ہے جس میں بازار میں چراغاں اور دائرہ شاہ اجمل میں رسول کریم کے اسوۂ حسنہ بیان کئے جاتے ہیں۔ مولانا جب بیان فرماتے تھے تو برابر آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری رہتے تھے۔

ملازمت کا نچوڑ

میں الٰہ آباد میں انسپکٹر جنرل کے دفتر میں بحیثیت سب انسپکٹر آیا تھا۔ امتحان پاس کر کے ماہر نشان انگشت ہوا۔ سی آئی ڈی کا صوبائی محکمہ قائم ہوا۔ اس میں تمام یو پی سے سب انسپکٹر منتخب کئے گئے۔ میں بھی لیا گیا۔ انسپکٹری پر ترقی ہوئی۔ وہ زمانہ انارکزم کا تھا اور بنارس بنگالیوں کی سازشوں کا مرکز تھا۔ میرا تبادلہ بنارس کا ہوا۔ بڑے شہروں کی کوتوالی کے واسطے انتخاب ہوتا ہے، اس میں بھی مجھے کامیابی ہوئی اور کوتوال شہر ہونے کے علاوہ سی آئی ڈی بھی میری ماتحتی میں تھی۔ علاوہ ان دونوں ذمہ داریوں کے کاموں کے مجھے ایسی پرانی اور اہم تفتیشیں بھی دی گئیں جن کا سراغ لگانے سے ضلع پولیس اور سی آئی ڈی بھی قاصر رہی۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے تمام مقدمات میں کامیابی ہوئی۔ بوجہ اختصار صرف ایک تفتیش کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

دلچسپ مقدمہ، نوٹوں کی چوری

یہ مقدمہ چونکہ اپنی نوعیت میں عجیب تھا اس لیے کلکتہ پولیس اور یو پی پولیس باوجود کوشش کے ناکامیاب رہی۔ ایک سال کے بعد انسپکٹر جنرل کے حکم سے یہ تفتیش مجھے ملی۔ واقعہ یہ تھا کہ مرکنٹائل بینک کلکتہ نے ایک ہزار روپے کے نوٹ پوسٹل انشورڈ لفافے میں بنارس کے ایک سیٹھ کے نام روانہ کئے۔ سیٹھ نے جب لفافہ کھولا تو اس میں سے بجائے نوٹوں کے پوسٹل گائیڈ (کتاب) کے بے ترتیب پھاڑے ہوئے اوراق نوٹوں کے وزن کے مطابق برآمد ہوئے۔

تجارتی لوگ اس قسم کے لفافوں کو جن پر لاکھ کی مہریں ہوں کھولنے میں یہ احتیاط کرتے ہیں کہ کسی ایک طرف سے چاقو یا قینچی سے باریک کاٹ کر اور ڈورا کاٹ کر اندر کے کاغذ نکال لیتے ہیں۔ اس طرح لاکھ کی مہر محفوظ رہتی ہے، چنانچہ اس لفافے کی مہریں بھی محفوظ تھیں۔ بنارس پولیس اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ سیٹھ کا دعوے جھوٹا ہے، نوٹ اس کو مل گئے۔ کلکتہ پولیس کہتی تھی کہ جرم کسی سائنٹیفک طریقہ پر لفافے کو کھول کر ریلوے میل سروس میں ہوا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں قرین قیاس نہ تھیں۔ اس طرح دو علاقوں میں مٹی حرام ہو گئی۔

میں نے لفافے کو دیکھا، لاکھ کی مہریں درست حالت میں تھیں۔ لفافے پر بینک کے انگریز اسسٹنٹ منیجر کے دستخط تھے جس کے یہ معنی ہیں کہ نوٹوں کو لفافے میں رکھنے، وزن کرنے اور اپنی نگرانی میں اس پر لاکھ کی مہریں لگوانے کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ میں ان کاغذات کو لے کر کلکتہ گیا اور مرکنٹائل بینک کے انگریز اسسٹنٹ منیجر کا بیان لیا۔ اس نے اپنے دستخطوں کی تصدیق کی اور یہ بھی تسلیم کیا کہ نوٹ اس نے خود لفافے میں رکھے، لفافہ کا وزن ہوا اور مہریں اسی کے سامنے لگیں۔ یہی بیان اس نے دونوں پولیس افسروں کو بھی دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے ایک بڑے انگریز افسر کے بیان پر اعتبار کر کے مقدمہ کو قیاس آرائیوں پر ختم کر دیا تھا۔

میں تمام عمر نہ کسی کی وجاہت سے مرعوب ہوا اور نہ دولت، عزت، ریاست اور حکومت سے۔ البتہ علمی قابلیت مخلص احباب کی محبت، اور خدا رسیدہ بزرگوں کے سامنے میرا سر ہمیشہ جھک جاتا ہے۔

تمام دنیا کے مجرموں کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تک وہ لاجواب نہ ہو جائیں اقبالِ جرم نہیں کرتے۔ میں نے اسسٹنٹ مینجر سے مُہر لے کر سادہ کاغذ پر لاکھ سے دو تین جگہ لگائیں اور آتشی شیشے (میگنفائنگ گلاس) سے اس کی باریکیوں کو ماہر نشانِ انگشت کی حیثیت سے دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لفافے کی مُہر میں بنک کا N ایک طرف سے قدرے ٹیڑھا ہے اور بنک کی مُہر میں سیدھا ہے۔ بقیہ حروف یکساں ہیں۔

میں نے اسسٹنٹ مینجر کو دکھلا کر کہا کہ یہ دونوں مُہروں کے نشانات کیوں مختلف ہیں؟ اس نے نہایت چالاکی سے مجھے جواب دیا کہ یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ جو مُہر ہم نے لفافے پر لگائی تھی وہ ڈاکخانے یا ریلوے میل سروس میں کسی نے سائنٹیفک طریقے پر اتاری اور نوٹ نکال کر دوسری مہر لگا دی ہے۔ جواب تو ٹھیک تھا لیکن میرے گلے سے نہ اترا اور میرا شبہ زیادہ قوی ہو گیا کہ جرم بنک ہی کے اندر ہوا ہے۔ میں نے مینجر (انگریز) کو بلا کر اس کی موجودگی میں اسسٹنٹ مینجر کی تمام میز کی درازوں کی تلاشی لی، ایک دراز میں سے لکڑی کا دستہ ٹوٹی ہوئی پرانی پیتل کی مہر برآمد ہوئی۔ جب اس کو لاکھ سے کاغذ پر لگا کر دیکھا تو N کے ایک طرف کا حصہ ٹیڑھا تھا اور یہی مُہر تھی جو لفافے پر لگائی گئی تھی۔ اب مجھے اس پوسٹل کا پیڈ کی تلاش ہوئی جس میں سے نوٹوں کا وزن پورا کرنے کے لیے صفحے پھاڑے گئے تھے۔ ایک بڑے چیڑ کے صندوق میں سے جہاں ردی کاغذات جمع تھے۔ پوسٹل کا پیڈ بھی مل گیا جس میں سے وہی صفحے غائب تھے جو لفافے میں ملے تھے۔ معاملہ صاف تھا۔

اس زمانے میں انگریزوں کو صرف انگریز ہی گرفتار کر سکتا تھا۔ میں نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کو ٹیلی فون کر کے ایک انگریز سارجنٹ کو بلایا اور اسسٹنٹ مینجر کو اس کی حراست میں دے دیا۔ اس کے چپراسی سے بات چیت کی، وہ اس کا رازدار تھا۔ اس نے بھی ان واقعات کی تصدیق کی اور کہا کہ اس ایک ہزار کی رقم میں سے کچھ حصہ بطور انعام اس کو بھی ملا تھا، بقیہ رقم فلاں مس کو بڑے دن کی تعطیل میں سمندر کے کنارے لے جا کر خرچ کی اور گلچھرے اڑائے تھے۔ غرضکہ صاحب کو چھ مہینے قید کی سزا ہو گئی۔

خطرناک ملزم مُرلی

مجھے اس قسم کی الجھی ہوئی تفتیشوں کی کامیابی میں کبھی صلہ کی تمنا نہ ہوئی۔ کامیابی کی مسرت بذاتِ خود میری کوشش کا صلہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک خطرناک ملزم مُرلی کی وجہ سے شہر آگرہ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ وہ دھتورے کے ذریعہ سے جس کو چلم میں پلاتا یا کھانے میں ملا کر کھلاتا وہ بیہوش ہو جاتا اور اکثر ہلاک بھی ہو جاتے تھے۔

دھتورے کا پودا خود رو ہوتا ہے اور پھول اس کا سفید گراموفون کے ہارن کی طرح اوپر سے پھیلا رہتا ہے۔ زہر خوردہ اپنی انگلیوں سے زمین کو اس طرح ٹٹولتا ہے جیسے کہ وہ تنکے بین رہا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کو نہ زہر کھلانے پلانے کے واقعات یاد رہتے ہیں نہ ملزم کا حلیہ۔ ملزم اس سے فراری میں فائدہ

اُٹھاتا ہے۔ ملزم دوسرے جُرم کے لیے ایک دو ہفتوں کا وقفہ بھی دیتا تھا اور ہر مرتبہ نئے روپ میں ظاہر ہوتا تھا۔ نام پتہ تو سب ہی ملزم چھپاتے اور غلط بتلاتے ہیں۔

جب آگرہ پولیس عاجز آگئی۔ تب سی آئی ڈی کی طرف سے میں اس کام پر مامور ہوا۔ اس کی سرگرمیاں ہر جگہ تھیں۔ ہوٹل، سرائے، مسافر خانے، ریلوے لائن، سڑکیں سب ہی مقامات اس کے مشاغل کے جولانگاہ تھے۔ زہر دینے سے پہلے وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس کے پاس کتنی رقم ہے یا کچھ بھی نہیں۔ میری موجودگی آگرہ کے زمانے میں بھی ایک ایک ہفتے کے وقفہ سے دو جُرم ہوئے۔ ایک مر گیا ایک زندہ رہا۔ علاوہ اس کے وہ نقب زن اور سارقِ مویشی بھی تھا۔

ایک روز آگرہ کی سرائے میں ایک زمیندار سے ملا جو ڈھائی سو روپے مالگزاری کے جمع کرنے آیا تھا۔ مُرلی خود بھی سرائے میں مسافر کی حیثیت سے ٹھہرا اور اس سے مراسم پیدا کر کے دودھ میں دھتورہ ملا کر دیا اور روپے لے کر چمپت ہوگیا۔

شہر اور قصبات میں صلاحیت سرائے رجسٹر ہوتا ہے، پولیس کا سپاہی نو وارد مسافروں کے نام پتے اور حلیے درج کرتا ہے اور اس سے دستخط کراتا ہے۔ اگر مسافر ناخواندہ ہوتا ہے تو انگوٹھے کا نشان لیتا ہے۔ اس آخری جُرم کے بعد جب میں نے اسی کوٹھری کے دو مسافروں کے نشان دیکھے اور ہوش میں آنے کے بعد مدعی سے ملزم کا حلیہ وغیرہ اور دیگر حالات معلوم کئے تو مجھے یہ یقین ہوگیا کہ نام اور پتہ وغیرہ تو اس نے یقیناً غلط بتلایا ہے لیکن یہ شاطر بدمعاش سزا یافتہ سابق ضرور ہے۔ اس کے انگوٹھے کا نشان صاف تو نہ تھا تاہم بعض لکیریں اور اُن کی خصوصیات شناخت صاف تھیں۔ جیل میں جو قیدی داخل ہوتا ہے اس کا مصدقہ نام اور پتہ رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے اور نام کے سامنے اس کے انگوٹھے کا نشان لیا جاتا ہے۔ ملزم کے اصلی نام اور پتہ معلوم کرنے کا یہ نیا طریقہ میرے ذہن میں آیا کہ جیل کے رجسٹروں کے نشانات کو اس سرائے کے رجسٹر سے ملان کروں۔ گو یہ کام بہت دشوار تھا۔ کیونکہ ہر سال سنٹرل جیل آگرہ میں سینکڑوں قیدی داخل ہوتے ہیں۔ میں جیل کے دفتر میں گیا اور پندرہ روز میں صرف تین سال کے رجسٹر دیکھ سکا اور بالآخر ایک قیدی کے نشان سے مل گیا۔ جس کا نام رجسٹر میں مُرلا عُرف مُرلی درج تھا اور سکونت شہر آگرہ سے دو تین میل کے فاصلے کے ایک گاؤں کی تھی۔ اس کے سابقہ حالات جو رجسٹر میں درج تھے اُن سے معلوم ہوا کہ سات مرتبہ کا سابق سزا یافتہ ہے۔

میرے لیے اس کی گرفتاری اب زیادہ دشوار نہ تھی۔ میں شکاری بن کر اور اپنے اردلی کو سادہ لباس میں ساتھ لے کر اس گاؤں میں گیا۔ شام کو جب وہ گھر پر آیا تو گرفتار کر لیا۔ اس کے مکان سے دھتورے کے خشک پتے، کچھ زیور مسروقہ برآمد ہوا۔ چالان کیا گیا اور اس کو دوام الحبس کی سزا ہوئی۔

وائسرائے بم کیس

اور بھی اسی قسم کے اکثر مقدمات میں مجھے کامیابی ہوئی۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر جو دہلی میں جلوس کے وقت تین بنگالی انارکسٹوں نے بم پھینکا تھا اور وہ شدید زخمی ہوئے تھے۔ مجھے بنارس کی تعیناتی کے زمانے میں اُن کو بھی میں نے گرفتار کیا اور دوام الحبس کی سزا ہوئی۔ اتفاق سے اس واقعہ کے وقت بھی میں دہلی میں ڈیوٹی پر موجود تھا۔ دو مرتبہ وائسرائے کی ڈیوٹی میں بیکانیر اور باکی پور پٹنہ بھی گیا۔ یہ بھی بڑی ذمہ داری کی ڈیوٹی ہے

ریاست بھرت پور

۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ نے مجھ میں یہ اہلیت دیکھی کہ فارن سروس میں ریاستوں کی پولیس کی اصلاح اور وہاں کے بعض اُلجھے ہوئے معاملات کو صاف کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنا کر ریاست بھرت پور بھیج دیا۔ یہ ریاست جاٹوں کی ہے اور اقوام میو جو مسلمان ہیں علاقہ ڈیگ میں بکثرت آباد ہیں۔ بیانہ ایک تاریخی مقام بھی اسی ریاست میں ہے جہاں ایک قلعہ بھی ہے جو راجپوتانے کا دروازہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی وجہ سے ایک ناقابلِ تسخیر ہے۔ تاہم محمود غزنوی کی جرار افواج نے کئی سال متواتر لڑائی کے بعد اس کو فتح کیا تھا۔ میلوں تک شہداء کی قبریں ہیں۔ جن پر سنگ سُرخ کے منقش تعویذ ہیں اور کتبے لکھے ہیں۔ فوج کے جنرل ابوبکر قندھاری کا بھی مزار ہے۔ جس پر ہندو کوی (شاعر) کی یہ تاریخ کندہ ہے:

گیارہ سو تیرا پھاگن تیج رب وار
بجے مندر گڑھ توڑیاں ابوبکر قندھار

یعنی سمت ۱۱۰۳ بکری (مطابق سنہ ۱۰۴۶ء) پھاگن کی تیسری تاریخ تھی جس روز قلعہ جس کا نام بجے مندر ہے ابوبکر قندھاری نے فتح کیا۔

میں جب سرکاری کام سے وہاں جاتا تھا تو فاتحہ کے بعد اس گنج شہداء میں یہ شعر پڑھتا تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دوبارہ سنہ ۹۳۳ھ میں اس قلعہ پر شاہ بابر کا حملہ ہوا ہے جس میں تمام راجپوتانے کی ریاستوں کی افواج مقابلہ کے واسطے جمع تھیں۔ اس شدید معرکہ جنگ میں بابر خود شریک تھا، گو افواج کا بہت نقصان ہوا لیکن فتح ہوئی۔ بابر نے خود تاریخ ترکی زبان میں لکھی ہے:

اسلام اوچون آوارہ بازی بول دوم
کفار ہنود حرب سازی بول دوم
جزم ایلاب آیدیم اور دوم شہید
او لما قاقد المنۃ اللہ کہ غازی بول دوم

یعنی میں اسلام کے لیے جنگل جنگل پھرا، ہندوستان کے کفار سے مقابلہ کیا۔ میں نے شہید ہونے کا مصمم ارادہ کیا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں غازی ہو گیا۔

تبادلہ ریاست پونچھ

۱۹۲۱ء میں میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ پولیس ریاست پونچھ کشمیر کو تبدیل ہو گیا۔ بلحاظ آب و ہوا یہ مقام خوشگوار تھا۔ ڈیڑھ سال رہ کر اس ریاست کی پولیس میں اصلاحات کیں۔ لیکن بیوی کا انتقال ہو گیا۔ دونوں لڑکے بہت کم عمر تھے یعنی نقی محمد خاں کی عمر چار سال اور سمیع محمد خاں دو سال کے

تھے۔ اس وجہ سے وطن سے دُور رہنا پسند نہ کیا اور واپسی کی درخواست دے دی۔

ریاست دتیا

ریاست بُندیل کھنڈ کی ریاست ہے جو ضلع جھانسی سے سترہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کے سرکش ڈکیتوں کے متعدد مسلح گروہ تھے جو پہاڑوں میں رہتے تھے اور جھانسی، للت پور، گوالیار، آگرہ تک اُن کے مظالم سے پناہ مانگتی تھی اور ہر شخص خوفزدہ تھا۔ ریاست کی پولیس، گورنمنٹ پولیس، یہاں تک کہ برٹش فوج نے بھی ان خوفناک جنگلوں میں ان کو گھیر کر پکڑنا چاہا، لیکن وہ گرفتار نہ ہوئے۔ میں نے بلا امداد گورنمنٹ ریاست کی پولیس کو ان کے مقابلے کے واسطے تربیت دی اور پانچ سال میں سب گروہوں کا قلع قمع کر دیا۔ گو واقعات دلچسپ ہیں لیکن بوجہ اختصار کے ان کو نظر انداز کرتا ہوں، البتہ ایک واقعہ پیش کرتا ہوں:

بہادر سنگھ ڈکیت

ریاست دتیا میں سب سے بڑا گروہ اور سب سے زیادہ سرکش ڈکیت بہادر سنگھ کا تھا اور فی الحقیقت وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ اپنی ہی ریاست کے مہاراج سے جبکہ وہ شیر کا شکار کھیلنے جنگل میں گئے تھے آن کر ملا۔ ان کے ہاتھ میں سے 550 بور کا دو نالی رائفل اور ان کے اے ڈی سی کے گلے میں سے پچاس کارتوسوں کی پیٹی لے کر چلا گیا اور کسی نے چوں نہ کی۔ لانبا قد، بھرا بدن، چوڑا چکلا سینہ تھا۔ ایک مرتبہ نوآباد جھانسی میں ڈکیتی ڈالی۔ گورنمنٹ پولیس کے تھانہ دار اور سپاہیوں کو باندھ کر ڈال دیا اور تمام رات پچاس ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ کو اطمینان سے لوٹا۔ جس نے مقابلہ کرنا چاہا، اس کو ہلاک کر دیا۔ میں نے بھی اس کا ناطقہ بند کر دیا تھا اور اس نے بھی میری نیند حرام کر دی تھی۔ اکثر مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی مگر میں مرعوب نہ ہوا۔ ایسے خوفناک شخص سے بعید تو نہ تھا لیکن بقول شخصے "جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر۔" میری کوٹھی شہر سے کچھ فاصلے پر جنگل سے ملی تھی، ایک روز صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دو شخص کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر محمود خاں تھے، دوسرا شخص دراز قامت اور مسلح تھا، ہاتھ میں دو نالی رائفل، کمر میں تلوار اور بائیں شانے پر پستول لٹکا ہوا تھا۔

دونوں کمرے کے اندر آئے۔ محمود خاں کرسی پر بیٹھ گئے، دوسرا شخص دروازہ میں کھڑا ہو گیا اور نہایت دلیری سے مجھ سے بولا کہ میں فلاں موضع کا بہادر سنگھ ہوں۔ آپ کے یہ سب انسپکٹر گھوڑے پر مع سپاہی کے میری تلاش میں جا رہے تھے، میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے ان کو گھیر کر پکڑ لیا۔ سپاہی اور گھوڑا میرے آدمیوں کے قبضہ میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر مجھے معافی دلوا دو تو اپنی ریاست میں جرم نہ کروں گا۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ میرا یہ کام نہیں ہے، چلو سپرنٹنڈنٹ سے ملوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں جنگل کے راستہ سے راتوں رات یہاں آئے ہیں۔ اس نے چیمبر کھول کر اپنا رائفل دکھلایا اور کہا کہ یہ دو کارتوس جو اس میں ہیں آپ دونوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بقیہ چالیس میری پیٹی میں ہیں۔ انگلی اُس کی لبلبی پر تھی۔ برخلاف اس کے میرے اور تھانہ دار کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

اس کے دلیرانہ چیلنج نے کہ یا تو معافی کا پروانہ فوراً دو یا میں مار ڈالوں گا۔ مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا، اگر

میں مصلحتاً معافی کا حکم لکھ کر اس کو دے دیتا تو یقیناً وہ چلا جاتا لیکن باوجود اس خطرہ کے میں اپنے اصول پر قائم تھا اور اس کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا۔ دوئم ایسے مشہور اور خطرناک ڈکیت کا میرے مکان پر آن کر چلا جانا چھپنے والی بات نہ تھی اور نہ صرف میری ایمانداری اور نیک نامی پر حرف آتا بلکہ ملازمت کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا۔ یہ میرا پہلا اور شاید آخری امتحان تھا جس میں میں ثابت قدم رہا۔ اب میرے لئے دو ہی راستے تھے، اقرار یا موت۔

میں نے جواب دیا کہ میں ہرگز معافی کا پروانہ نہ دوں گا کیونکہ میرا یہ منصب نہیں ہے۔ تب اس نے اپنے انگرکھے کی جیب سے ایک بوسیدہ تہہ کیا ہوا پرچہ نکالا اور کہا کہ پہلے دیوان (ہندو) اور سپرنٹنڈنٹ پولیس (ہندو) کے اس معافی کے پروانے پر دستخط ہیں؛ اس کی تجدید ہی کر دی جائے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر ایک سکنڈ کے واسطے بھی اس کی انگلی رائفل کی لبلبی پر سے ہٹ جائے تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس سے گتھم گتھا ہو جاؤں لیکن اس نے تھانہ دار کے ذریعے (جو اس کے قریب تھا) وہ پرچہ مجھے دیا اور جب میں نے پڑھ لیا تو واپس لے لیا۔ موقع کی تلاش میں میں نے کہا کہ دیوان ریاست خان بہادر قاضی عزیز الدین کی کوٹھی ملی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تجدید حکم پر راضی ہو جائیں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور بولا کہ کوئی گفتگو تھانہ دار یا دیوان صاحب سے نہ انگریزی میں کی جائے اور نہ کوئی اشارہ کیا جائے، اگر مجھے شبہ ہوا تو مار ڈالوں گا۔ ہم دونوں کو آگے چلنے کے واسطے کہا اور خود پیچھے رہا۔

دیوان صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں اور تھانہ دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ جب دیوان صاحب کو معلوم ہوا تو بہت گھبرائے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے دیوان کے حکم کی تجدید کرانا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے بہادر سنگھ سے جس کے قریب میں قصداً بیٹھا تھا کہا کہ وہ پرچہ لاؤ جو مجھے دکھلایا تھا۔ جیسے ہی اس نے پرچہ ایک ہاتھ سے نکالا اور دوسرا ہاتھ کاغذ کو کھولنے کے لیے لگایا، میں تیزی سے اس سے چمٹ گیا اور خاصی کشتی ہونے لگی۔ سب انسپکٹر نے مدد کی، دیوان صاحب ننگے پیر بھاگ کر غسل خانے میں گھس گئے۔ کافی زور آزمائی کے بعد ہتھیار اس سے چھین لئے گئے۔ اس کے بعد اس پر مقدمات چلے، پھانسی کا حکم ہوا اور عبرت کے واسطے کھلے میدان میں اس کو ہزاروں آدمیوں کے ہجوم میں پھانسی دے دی گئی۔

دوسرے گروہ صورت سنگھ اور پربت سنگھ سے بندوقوں کے مقابلے ہوئے۔ پربت سنگھ جس نے متعدد گولیاں مجھ پر چلائیں مارا گیا اور صورت سنگھ گرفتار ہوا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ریاست بانسواڑہ

مدت ملازمت میں میرے ساتھ اس قدر حادثات پیش آئے ہیں کہ اگر انھیں ضبط تحریر میں لاؤں تو کافی ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ جس کا محافظ اللہ ہو اس کو کون مار سکتا ہے۔ چند مختصر واقعات ملاحظہ ہوں:

ریاست بانسواڑہ (راجپوتانہ) میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ مہاراج میرا دشمن ہو گیا اور دشمنی کا سبب بھی عجیب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں دوسرے افسران ریاست کی طرح ناچ رنگ کے جلسوں اور شراب ناب کی محفلوں میں شرکت کروں

لیکن میں پرہیز کرتا تھا۔ مہاراج کی سالگرہ کے روز تین علیحدہ کمروں میں گانا بجانا تھا۔ جس کمرے میں مہاراج تھے۔ اس میں وہ خود، ان کے اے ڈی سی، ریونیو ممبر اور مسلمان سٹی مجسٹریٹ تھے۔ طوائف بھی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔

مہاراج نے مجھے دوسرے کمرے میں سے بلوایا، تپاک سے فرش پر بٹھایا اور شراب لمینیڈ کی بوتل میں بھروا کر مجھے دھوکے سے پلانی چاہی۔ میں نے انکار کیا۔ طرح طرح کی فقرے بازیاں شروع ہو گئیں جو مجھے ناپسندہ تھیں لیکن ضبط کر رہا تھا۔ جب سید صاحب سٹی مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ میاں کیا ایک چلو پانی میں ایمان بہہ جائے گا تو میں نے کہا: سید آپ کو شرم نہیں آتی؟ اپنی عمر کو دیکھو اور یہ حرکت! مہاراج نے کہا کہ رنڈی کے ہاتھ سے بسم اللہ کہہ کر اور پاک کر کے پئیں گے۔ ریونیو ممبر ایک کائستھ تھا، دوسروں کی طرح وہ بھی نشہ میں مست تھا۔ کواڑ کمرے کے بند کرا دیے گئے تھے۔ کہنے لگا کہ آج آپ کو زبردستی مسلمان کریں گے۔ یہ سن کر میں اپنے غصے کو ضبط نہ کر سکا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور جیب میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور کہا کہ اگر زبردستی کا ارادہ ہے تو جس کو ہمت ہو وہ مقابلے پر آئے۔ یہ حالت دیکھ کر سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں نے کواڑ کی چٹخنی کھولی اور باہر چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تو تعلقات مہاراج سے خراب ہی ہوتے چلے گئے۔ انجام یہ ہوا کہ گورنمنٹ کا فرستادہ ہونے کی وجہ سے اور کوئی نقصان تو نہ پہنچا سکا۔ ایک پٹھان اور ایک بھیل کو میرے قتل پر آمادہ کیا۔

میرے قتل کی سازش

جنگ بلقان کا زمانہ تھا، زیادتی کام کی وجہ سے صرف رات ہی کو اخبار پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ کواڑ کوٹھی کے سب بند تھے، لیمپ میرے سرہانے تپائی پر روشن تھا، میرا اردلی دوسری جانب برآمدے میں سو رہا تھا۔ باورچی باورچی خانہ میں سو رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میں بھی سو گیا اور اخبار پہلو میں گر گیا۔ میری بائیں جانب غسل خانہ تھا اور غسل خانے کی کھڑکی بھی باہر کی جانب کھلی ہوئی تھی جس میں لکڑی کی چوکھوٹی کڑیاں لگی تھیں، جن میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ لیمپ کی روشنی کی وجہ سے کھڑکی میں سے میں بخوبی نظر آ رہا تھا، آدھی رات کے بعد مجھے خواب کی حالت میں لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی، میں سمجھا کہ باورچی آگ جلانے کے لئے لکڑیاں توڑ رہا ہے، نیند غالب تھی، پھر سو گیا، پھر لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی، بائیں جانب سر گھما کر دیکھا تو کھڑکی کے جنگلے کی دو لکڑیاں غائب ہیں اور دو چہرے ایک جانب ہٹتے ہوئے معلوم ہوئے۔ میں نے اردلی کو آواز دی اور کواڑ کھول کر باہر آیا، پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اردلی بھی ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک ہاتھ میں ڈنڈا لے کر آ گیا۔

میری کوٹھی پولیس لائن کے آخری حصہ میں تھی۔ ہم دونوں کھڑکی کے جنگلہ کی ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ رہے تھے کہ پولیس لائن کے کوارٹر گارڈ کی طرف سے جہاں اسلحہ اور سامان حرب رہتا ہے۔ بندوق کی آواز آئی۔ میں اور وزیر اسی طرف جا رہے تھے کہ فال ان کا بگل بجا اور سپاہی دوڑتے ہوئے اس طرف جانے لگے۔ میں بھی کوارٹر گارڈ پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ گارڈ کے سامنے آبکاری کی دیوار کے نیچے ایک بھیل بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر تڑپ رہا ہے۔

پہرے والے سنتری نے جو پٹھان تھا۔ بیان کیا کہ دو شخص بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ جب دو تین بار ٹوکنے پر نہ رکے تو اس نے گولی چلا دی۔ ایک زخمی ہو کر گر گیا۔ ایک بھاگ گیا۔

جب اس ملزم کا بیان لیا گیا تو اس نے بتلایا کہ اُس کا ساتھی فلاں پٹھان ہے اور مہاراج کے حکم سے وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہلاک کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ اگر جاگ نہ ہو جاتی اور ایک لکڑی اور ٹوٹ جاتی تو اندر داخل ہو کر سپرنٹنڈنٹ کو قتل کر دیتے۔ یہ شخص ہسپتال کے راستے میں مر گیا، دوسرا ریاست چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔

قتل کی دُوسری سازش

جب میں دوبارہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے ریاست بھرت پور بھیجا گیا، تو مہاراج بد اعتدالیوں کی وجہ سے معزول کر کے ولایت بھیج دیے گئے تھے۔ ریاست جاٹوں کی ہے، تمام جاٹ تقریباً باغی ہو چکے تھے، میرے اور ایڈمنسٹریٹر مسٹر مکنزی کے خلاف سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ جن بااثر اور سرغنہ جاٹوں نے رعایا کے ساتھ مظالم، استحصال بالجبر اور زنا بالجبر کے جرائم کئے تھے، اُن کے خلاف گورنمنٹ کے حکم سے میں مقدمات چلا رہا تھا۔ جاٹ مہاسبھا میرے خلاف تحریری اور تقریری برٹش علاقوں میں پروپگنڈہ کر رہی تھی، بالآخر مہاراج کے ایما سے یہ طے پایا کہ مجھے ہلاک کر دیا جائے اور اپنی یہ حالت کہ ؎

دامنِ صحراے اُٹھنے کو حسن کا بھی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

دوپہر کے وقت اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کورٹ انسپکٹر عبدالمجید خاں اور ہیڈ کلرک سے کچھ سرکاری معاملات کی باتوں میں مصروف تھا۔ ایک بوڑھا مسلمان سپاہی آیا اور علیحدہ لے جا کر مجھ سے بولا کہ "آپ روزانہ شام کو پیدل کلب جایا کرتے ہیں، آج نہ جائیں۔"

میں نے وجہ دریافت کی۔

جواب دیا کہ مہاراج کے باڈی گارڈ کے جاٹ کمانڈر نے آج اپنی فوج کے دو جاٹ سپاہی فلاں فلاں آپ کے ہلاک کرنے کی غرض سے تعینات کئے ہیں۔

تمہیں اس کا علم کیونکر ہوا؟ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا کہ میرا اور فلاں جاٹ سپاہی کا مکان ملا ہوا ہے اور درمیانی پردہ کی دیوار ایک ہی ہے۔ آج میری بیوی اپنے مکان میں اسی دیوار کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اور جاٹ فوجی سپاہی کی بیوی اسی دیوار کی پشت پر اپنی طرف بیٹھی تھی، اس کا شوہر آیا اور اپنی بیوی سے بولا کہ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، اگر کچھ روز نہ آسکوں تو فکر مت کرنا اور نہ میری عدم موجودگی کے راز کو کسی پر ظاہر کرنا۔ بیوی وجہ پُوچھنا چاہتی تھی اور وہ چھپا رہا تھا۔ مجبور ہو کر بطور راز اُس نے کہا کہ مجھے اور فلاں سپاہی کو کمانڈنگ افسر نے رائفل اور کارتوس دے کر یہ حکم دیا ہے کہ سڑک کے دونوں جانب درختوں پر ہم بیٹھ جائیں اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس پیدل اس راستے سے کلب جائیں تو گولیاں چلا کر ان کو مار دیا جائے۔ مہاراج اس صلہ میں معقول رقم انعام میں دیں گے۔

اس خبر کو آپ تک پہنچانے کے لئے میری بیوی گھنٹوں سے مجھے تلاش کر رہی تھی جب میں مل گیا تو مجھے یہ حالات

بتلائے ہیں۔ اس کی اس ہمدردی سے بہت متاثر ہوا اور شکریہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ میں اسی وقت فوج میں جا کر کمانڈنگ آفیسر (جاٹ) سے ملا اور کہا کہ ایک ضرورت سے میں آپ کے فوج کے سپاہیوں کی حاضری لینا چاہتا ہوں، وہ راضی نہ ہوا اور کہا کہ اس بارے میں مسٹر کنزی اڈمنسٹریٹر سے حکم حاصل کیا جائے۔ میں نے اسی وقت ٹیلی فون کر کے منظوری حاصل کی۔ حاضری لی، کچھ سپاہی داخل اسپتال تھے، کچھ رخصت پر تھے، جو غیر حاضر تھے ان میں وہ سپاہی بھی تھے۔ نہ ان کے ناموں کے سامنے کوئی اندراج تھا۔ اس فوج میں یہ طریقہ تھا کہ ہر سپاہی کا نمبر رائفلوں کی بٹ پر کھدا ہوا تھا۔ میں نے میگزین میں جا کر دیکھا تو وہ دونوں رائفل غائب تھے۔ دونوں سپاہیوں کی غیر حاضری کے بارے میں تو ان کا یہ جواب تھا کہ بلا اجازت غیر حاضر ہیں لیکن رائفلوں کی گم شدگی کے بارے میں وہ لاجواب تھے۔ میں نے انھیں سے تحریر حاصل کی اور اڈمنسٹریٹر سے مل کر تمام واقعات بیان کئے۔ سُن کر ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کو اطلاع دی اور منظوری آنے پر باڈی گارڈ کی فوج توڑ دی گئی اور تمام گھوڑے اور سامان نیلام کر دیا گیا۔

سانپ کی نصیحت

قدرت کاملہ بعض اوقات اپنے گنہگار بندوں کو بھی رحمتوں سے نوازتی ہے جس کے عجیب وغریب طریقے ہیں۔ اس قسم کے واقعات اب بھی میرے ساتھ پیش آتے ہیں یعنی جب کبھی رعونت کا خفیف اثر بھی پیدا ہو جاتا ہے تو قدرت کی طرف سے کوئی تنبیہ ضرور ہوتی ہے۔ ریاست بانسواڑے میں ایک مرتبہ میں دورہ کر رہا تھا اور پہاڑ کے نشیبی علاقے میں میرا کیمپ تھا۔ یہ ایسی زمین تھی کہ برسات کے زمانے میں جب پانی بھر جاتا تو دلدل ہو جاتی، جو قدم رکھتا زمین میں دھنس جاتا۔ اور گرمی کے زمانے میں خشک اور سخت ہو کر جا بجا سے شق ہو جاتی۔ میں دھوپ میں سفر کر کے غسل کی نیت سے ڈیرے کے غسل خانے میں داخل ہوا۔ چھ انچ اونچی چوکی پر بیٹھ کر ہاتھ دھو منہ پر پانی ڈالا، صابن لگایا، جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک کالا ناگ پھن نکالے ہوئے عین میرے مُنہ کے قریب کھڑا ہوا ہے یہ زمین کے شگاف میں تھا جو پانی اندر جانے سے باہر نکل آیا۔ اس کو اپنے مُنہ سے تقریباً آدھ فٹ قریب دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا بدن میں جان ہی نہیں۔ ذرا حرکت کرتا اور وہ منہ مارتا۔ نکلنے کا راستہ بھی وہی تھا جس کو وہ روکے ہوئے تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ کسی کو آواز دے کر بلانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا پھن پھیلائے ہوئے مجھے بغور دیکھ رہا تھا اور میں اپنی موت کو حسرت سے تک رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عالم جاں کنی سے زیادہ سخت تھا۔ کیمپ کے پولیس گارڈ کے پاس تلوار بندوق سب قسم کے ہتھیار تھے لیکن میرے لئے سب بیکار تھے۔ اگر یاد ہوتا تو بارگاہِ الٰہی میں یہ شعر پڑھتا ؎

ابھی اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری
میری موت سے نہ ہوگی میری داستاں پُوری

تقریباً ایک منٹ تک یہ جاں کنی کا عالم طاری رہا اور بت بنا ہوا میں اس کو اور وہ مجھ کو تکتا رہا۔ سُنا تھا کہ کالے سانپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ میں بیہوش تو نہ ہوا لیکن اپنے مُنہ کے اس قدر قریب جب وہ بار بار اپنی دو دھاری زبان نکالتا تھا تو نہ جانے قلب کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے سانپ کا غصہ کم ہوا اور

رفتہ رفتہ پھر وہ اس سوراخ میں جو زمین شق ہونے سے پیدا ہو گیا تھا داخل ہو گیا۔ آواز دے کر سپاہیوں کو بلایا۔ پانی ڈال کر اس کو پھر باہر نکالا اور مار ڈالا۔

شیر کا شکار

مجھے اپنے بندوق کے نشانے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ کیسا ہی تیز پرواز پرندہ ہو شاذ و نادر ہی نشانہ خطا کرتا تھا۔ رائفل کا نشانہ اس سے بہتر تھا۔ لیکن کبھی انسان اس زعم میں خطرہ مول لے کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ میں دورے کے سلسلہ میں ایک جاگیر میں پہنچا۔ ابھی گھوڑے سے اُترا ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ شیر نے گدھے کو ہلاک کیا ہے اور یہی وقت اس کے دوبارہ آن کر اس کو کھانے کا ہے۔ میں اسی وقت جنگل میں گیا جو قریب ہی تھا اور گدھے سے اندازاً دس قدم کے فاصلہ پر دو ڈھائی فٹ گہرا گڑھا کھدوا کر اس کے اندر بیٹھ گیا اور درختوں کی سبز شاخوں سے حصار بنایا۔ ایک گھنٹے کے بعد پہاڑی پر سے اُتر کر کافی بڑا شیر آیا اور گدھے کے قریب بیٹھا ہی تھا کہ میں نے فائر کیا۔ گولی ایسے مقام پہ لگی کہ بلا حس و حرکت وہ گدھے کے اوپر گر گیا۔ یہ طریقہ اس ملک میں "اودی" کا کہلاتا ہے اور نہایت خطرناک ہے۔

دُوسرا حادثہ

ریاست دتیا میں مہاراج اکثر شکار کے ہانکے میں موٹر بھیج کر مجھے بلایا کرتے تھے، ایک روز صبح سویرے موٹر آئی اور دس پندرہ میل فاصلہ پر جنگل میں لے گئی۔ شکاری قافلہ تیار تھا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ مقام مقصود پر پہنچ کر گھوڑوں سے اُترے، مہاراج اپنے مچان کی طرف گئے اور دونوں اے ڈی سی مہاراج کو بٹھا کر اپنے اپنے مچانوں پر جا بیٹھے۔ گھوڑوں کو سائیس لے کر چلے گئے۔ میں اسی انتظار میں رہا کہ کوئی مچان مجھے بتلائے۔ یہاں تک کہ ہانکا شروع ہو گیا۔ جنگل ایسا گھنا تھا کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مچان کس طرف ہیں اور ہانکا کس طرف سے شروع ہو رہا ہے۔ اور گولیاں کس طرف چلائی جائیں گی۔ شیر پر صرف مہاراج فیر کرتے تھے، دوسرے کو اجازت نہ تھی۔ اوّل تو دھتو درختوں کا جنگل۔ جس کے درخت ببول کی طرح چھوٹے اور پتے بھی املی کی طرح چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بڑا درخت بھی تھا تو برچھی کی وجہ سے میں اس پر چڑھ نہ سکتا تھا، ایک دو شاخہ چھوٹے درخت پر جو زمین سے تین فٹ بلند تھا کھڑا ہو گیا اور بندوق کو ایک شاخ میں لٹکا دیا اور جان بچانے کی فکر ہوئی لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی۔ میں صاف نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کافی بڑا شیر نمودار ہوا۔ جو میرے بائیں جانب سے کسی قدر ترچھا داہنی جانب کو آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور مجھ سے بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر رُکا۔ مجھے شیر سے زیادہ گولی کا بھی خوف تھا کہ نہ جانے کس طرف سے آ جائے۔ شیر کے رُکتے ہی فائر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ گولی اس سے تقریباً ایک گز زمین سے ٹکرائی اور گرد اڑی، شیر پہلے تو جھجکا، پھر رُخ تبدیل کر کے میرے قریب پشت کی جانب بھاگتا ہوا چلا گیا۔

ہانکا ختم ہوا۔ گھوڑوں کے قدموں اور لوگوں کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں، میں بھی اپنی بندوق لے کر شکاری قافلہ میں شریک ہو گیا۔

مہاراج کی عادت تھی کہ جب فائر ان کا خالی جاتا تو وہ غصہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سب خاموش تھے۔ کیمپ میں پہنچ کر سب ایک درخت کے نیچے فرش پر بیٹھ گئے اور اے ڈی سیوں نے مہاراج کو خوش کرنے کے لیے خوشامدانہ باتیں شروع کر دیں

کسی نے کہا کہ شیر زخمی ہو گیا ہے، کسی نے کہا کہ اس کے خون کے نشانات پر کھوجی پتہ لگانے کے واسطے بھیج دئے ہیں۔ گولی ایسے موقع سے نہیں لگی جو وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔

مہاراج کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی بات کی تصدیق کرنا چاہتے تو کسی کی طرف دیکھ کر "ہوں" کہتے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ میں چونکہ خاموش تھا اور اے ڈی سیوں کی حرکت پر کہ مجھے انھوں نے خطرے میں مبتلا کر دیا غصہ تھا، مہاراج میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا "ہوں"۔

میں نے کہا کہ "میں تو شیر کے قریب ہی تھا، آپ کی رائفل کی گولی کو زمین سے ٹکراتے دیکھا۔ شیر کو جھجک کر جاتے دیکھا۔"

حیرت سے پوچھا کہ "آپ وہاں کیوں تھے؟"

"مچان نہ ملنے سے ایک دو شاخہ درخت کے تنے پر کھڑا ہوا تھا۔"

"مچان پر کیوں نہیں بیٹھے؟"

"جب تک کوئی نہ بتلائے مجھے اپنے مچان کا علم کیونکر ہوتا؟"

مہاراج اپنے دونوں اے ڈی سیوں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ "تم نے خود لے جا کر مچان پر کیوں نہیں بٹھایا؟" ایک نے جواب دیا "نہ معلوم یہ کس طرف چلے گئے تھے۔"

یہ جواب سن کر مہاراج آگ بگولا ہو گئے۔ فرش پر کارتوسوں کی پیٹی پڑی ہوئی تھی، اس کو اٹھا کر ایک دو مرتبہ اس کے ماری اور پھر مغلظات گالیوں پر اتر آئے اور شکار نہ ملنے کا غصہ اتار دیا۔

مجھے روک لیا اور شیر کی تلافی کے واسطے محض میری وجہ سے قریب کی پہاڑی کا اسی روز ہانکا کرایا۔ ایک سانبھر نکلا اور نالے کی مینڈھ پر کھڑا ہو گیا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ میں نے، مہاراج اور رگھوناتھ سنگھ نے جو فائر کئے وہ ایک ہی وقت میں فائر ہوئے اور تینوں آوازیں مل کر ایک ہی آواز معلوم ہوئی۔ سانبھر گر گیا۔ اب یہ تصفیہ کیونکر ہو کہ کس کی گولی لگی۔ مہاراج نے مجھ سے پوچھا کہ نشانہ کس مقام کا لیا تھا؟

میں نے کہا کہ گردن کا۔

رگھوناتھ سنگھ نے پچھلی ٹانگ کا۔

مہاراج نے اس کی پیشانی کا۔

جب قریب جا کر دیکھا تو صرف میرے رائفل کی گولی اس کی گردن میں لگی تھی۔ چنانچہ مہاراج نے اس کی کھال تیار کر کے میرے پاس بھیج دی۔

شخصی حکومت

شخصی حکومت خواہ بادشاہ کی ہو یا نواب راجہ کی، ایک لحاظ سے خدا کی رحمت بھی تھی اور عذاب بھی۔ اگر والیِ ملک نیک دل اور خدا ترس ہوا تو رعایا کی زندگی امن اور اطمینان کی تھی اگر ظالم، جابر، شرابی، عیاش تھا تو رعایا کی عزت، آبرو، جان و مال سب خطرے میں تھے۔ جس ضمیر فروش کی حضوری کی بن آئی مالا مال ہو گیا، جس نے

حق بات کہی اور خودداری پر قائم رہا وہ ذلیل و خوار ہوا۔ میں گورنمنٹ کا فرستادہ چار ریاستوں بانسواڑہ، بھرت پور، دتیا اور پونچھ کشمیر کے علاقہ میں پندرہ سال رہا۔ مجھ سے سوائے کشمیر کے کوئی راجہ یا ان کے وزرا خوش نہ رہے بلکہ جان کے دشمن ہو گئے۔ ریاستوں میں جی حضوری اور خوشامدی اتنے تھے کہ بچپن سے بڑھاپے تک حکمرانوں کے خلاف حق بات کہنے کی جرأت نہ تھی اور میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام والیان ملک کی کم و بیش یکساں حالت تھی۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ عیاشی اور اغلام ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔ جھوٹ بولنے میں ماہر، کسی کی بہو بیٹی اغوا کرانا معمول میں داخل تھا۔ انگریزوں نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اجمیر پرنسز کالج قائم کیا، انگریز اتالیقوں کی نگرانی میں تجربہ حاصل کرنے کے لئے لندن بھیجا مگر بقول شیخ سعدی "تربیت نا اہل را چوں گردگاں بر گنبد است" اور کیوں نہ ہو، بہر حال وہ فرشتہ نہ تھے، جب بے غیرت وزرا اور ہمنشین اپنی لڑکیوں کو خود پیش کرنے میں فخر محسوس کریں تو دوسروں کا کیا ذکر۔ جب حکومت، دولت اور غرور کا نشہ سر پر سوار ہو جاتا ہے تو اس کو سوائے اپنی ذات کے دنیا میں کوئی چیز نظر نہیں آتی ؎

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
چوں بدولت برسی مست نگردی مردی

(شراب پی کر تو انسان اپنی حالت کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب دولت کا نشہ سوار ہوتا ہے۔ تب وہ مستی نہ کرے تو سمجھنا چاہئے کہ مرد ہے)

پرانے راجاؤں میں سے بعض کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نیک دل، خدا ترس اور داد و دہش میں مشہور تھے۔ لیکن میرے زمانے میں کسی ریاست کے راجہ کی بابت ایسی شہرت نہیں تھی۔ انگریزوں کو ان کی نجی بداعمالیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ریاستیں ان کی سیر و تفریح اور شکارگاہیں تھیں، البتہ اگر کسی نواب، راجہ نے انگریز کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ دیا تو اس کی شامت آ گئی۔ مہاراج بڑودہ نے سنہ ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے موقع پر نذر پیش کرتے وقت شہنشاہ کے روبرو سر نیاز (بوئنگ) خم نہیں کیا۔ سر ہری سنگھ والیٔ کشمیر نے بھی کچھ اسی قسم کی حرکت کی تھی۔ اُن کی کیا کیا ذلتیں نہ ہوئیں۔ مہاراجہ بھرت پور نے اپنی تقریر میں کہہ دیا کہ جاٹوں نے نہ شاہان مغلیہ کی اطاعت کی اور نہ اب حکومت کی پروا کرتے ہیں۔ معزول کر کے دہلی بھیج دئے گئے اور وہیں ختم ہو گئے۔ رام سنگھ (بھرت پور) نے شراب کے نشہ میں کسی طوائف کو گولی سے مار دیا۔ معزول کر کے آگرہ بھیج دئے گئے۔ مہاراجہ دتیا کو بھی قتل کے جرم میں افریقہ بھیج دیا تھا۔ مہاراجہ اندور کی منظورِ نظر امرت سر والی ممتاز بیگم جب بمبئی کے سیٹھ عبدالقادر باؤلا کی داشتہ ہو گئی اور مہاراج نے رقابت کی وجہ سے اپنے آدمی بھیج کر باولے کو قتل کرایا اور ممتاز زخمی ہو گئی تو مہاراج کو گدی سے اتار دیا گیا۔ اور بھی بہت سے واقعات اسی قسم کے ہیں۔ اُن کی بدکرداریوں کے بعض واقعات تو ایسے فحش ہیں کہ بیان کرتے شرم آتی ہے۔ یہ لوگ ابتدا ہی سے کثرت شراب نوشی و عیاشی سے جلد ناکارہ ہو جاتے تھے اور شوق اپنا مفعولیت سے پورا کرتے تھے۔ بطور نمونہ صرف ایک واقعہ ریاست دتیا کا ملاحظہ ہو:

مہاراجہ دتیا کی جب اپنی ریاست کے لڑکوں سے سیری نہ ہوئی تو سرحد ضلع جھانسی سے کسی لڑکے کو اغوا کر کے اپنی موٹر میں لے آئے، شراب پی بدمست تھے۔ جب اُس نے انکار کیا تو اس کو رسی میں باندھ کر الٹا لٹکا دیا اور یہاں تک زد و کوب کیا کہ

بیہوش ہوگیا اور ناک سے خون جاری ہوگیا، تب اس کو حدود جانسی میں سے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ شکار میں سینکڑوں دیہاتی ہانکے کے واسطے بیگار میں بلائے جاتے تھے، اور تمام دن اُن سے مفت کام لیا جاتا تھا۔ شکار میں کیمپ والوں کے واسطے چارپائیاں گاؤں سے منگائی جاتی تھیں، رات کو ان پر سوتے اور صبح کو اُن کو توڑ کر جلاتے، بدن گرم کرتے اور چلے جاتے۔ ضابطہ اور قانون سب کچھ تھا لیکن وہ محض دوسروں کے واسطے تھا، راجہ اور اُن کے خواص قانون سے مستثنیٰ تھے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات

پینتیس سال سروس کرنے کے بعد گورنمنٹ نے میرے کارناموں کے صلہ میں مجھے پہلے خان صاحب کا اس کے بعد "خان بہادری" کا اعزاز بخشا اور دربار میں گورنر جنرل نے اپنی تقریر میں میرے کارناموں کو ایک ایک کر کے گنایا۔ تمام ملازمت میں مجھے چھ تمغے طلائی و نقرئی ملے۔ اور پنشن لے کر دہرہ دون میں سکونت اختیار کی۔ کئی ریاستوں ٹونک، رامپور وغیرہ نے مجھے ملازمت کے لئے بلانا چاہا لیکن میں نے اپنے آپ کو ریاستوں کی ملازمت کے لئے موزوں خیال نہ کیا اور انکار کر دیا۔

بس اتنی بات پر طوفانِ برق و باد آیا
کہ کون چین سے بیٹھا ہے آشیانے میں

انگریزوں کی وہ حکومت جس میں آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا یکبارگی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور ۱۹۴۷ء کا وہ خونی سال آیا جس کے ظلم و ستم کو کبھی آسمان نے بھی نہ دیکھا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ دوسری تباہی تھی کہ جس میں چالیس لاکھ مسلمان بے رحمی اور بے دردی سے تہ تیغ کئے گئے۔ پنجاب کے سکھوں اور جاٹوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ بیس ہزار مسلمان عورتوں کہ جن میں زیادہ تر نا کتخدا تھیں پکڑ کر لے گئے اور کانگرس حکومت کی ہندو نواز فوج اور پولیس نے جن کا فرض رعایا کی جان و مال کی حفاظت تھا گولیوں اور سنگینوں سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

میں اس زمانے میں دہرہ دون میں تھا۔ ایک سال قبل سکھ پنجاب سے آنے شروع ہوگئے اور ایک ہی سال میں اتنی زیادہ تعداد میں آئے کہ منصوری اور دہرہ دون میں رہنے کے لئے گنجائش باقی نہ رہی۔ میرے بڑے لڑکے کی بیوی اپنی آٹھ سالہ لڑکی ذاکرہ کی تعلیم کی غرض سے میرے ہی پاس تھیں۔ شہر اور نواح شہر میں روزانہ ایک دو قتل کی وارداتیں برابر ہو رہی تھیں۔ ہندو کلکٹر تھا۔ ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ افسران جو مسلمان تھے سب تبدیل کر دئے گئے تھے۔ تمام مسلمانوں کے مکانات پر گیرو کے نشانات بنا دئے گئے تھے۔ گروہوں کو محلے تقسیم کر دئے تھے۔ بلوے سے دو روز پہلے دوپہر کے وقت آٹھ سات سکھ مسلح ہو کر میری کوٹھی کے دو دروازوں میں سے ایک دروازے پر جمع ہوئے۔ میں اس وقت صرف بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے وارنش بُرش میں لگا کر چارپائی کے دھبے دور کر رہا تھا۔ بندوق تو نہایت نفیس میں نے نواب صاحب ٹونک سے خریدی تھی لیکن ہندو کلکٹر نے ایک کارتوس بھی خریدنے کی اجازت نہ دی اور بحیثیت صدر مسلم لیگ مجھ سے کہا تھا کہ اگر یہاں فساد ہوا تو مسلم لیگ کے رُکن سب سے پہلے گرفتار کئے جائیں گے، بلکہ منادی کے ذریعہ سے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مسلمان اپنا اسلحہ حکومت کے حوالے کر دیں۔ اس لئے بندوق بھی بیکار رہی۔

شور کی آواز سن کر میں نے سر اٹھا کر کھڑکی میں سے دیکھا کہ ایک سکھ برہنہ تلوار لئے ہوئے تیزی سے میری کوٹھی میں داخل

ہو کر آ رہا ہے۔ مقابلے کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایسی حالت میں میں بھی بلا کسی ہتھیار کے تیزی سے برآمدے میں آیا۔ دیکھا برہنہ تلوار لئے مجھے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا اور میں اُتر رہا تھا۔ وہیں میرا اس کا مقابلہ ہو گیا۔ جوان اور بوڑھے کا مقابلہ ہی کیا؟ لیکن کبھی جوانی میں پٹا اور بنوٹ کے ایک دو ہاتھ سیکھے تھے اور استاد نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو حملے کی ابتدا اپنی طرف سے کرنی چاہئے تاکہ دشمن مرعوب ہو کر اپنی حفاظت کی تدبیر سوچنے لگے۔ اپنی عمر میں ایسی بے دست و پائی کا پہلا موقع تھا جس کی مجھے آزمائش ہوئی۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر تلوار کا وار کرے۔ میں نے تیزی اور پوری قوت سے اپنا گھونسہ اس کے ہاتھ پر مارا اور ساتھ ہی کمر پر لات ماری۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور خود لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں کے نیچے گرا۔ میں نے تلوار دوڑ کر اُٹھائی اور بیٹے کو خبردار کرنے کے لئے آواز دی کہ بندوق لاؤ۔ دوسرے لوگ دروازے ہی سے منتشر ہو گئے۔ وہ شخص دوسرے پھاٹک سے بھاگ کر سڑک پر گیا۔ اگر انگریزوں کا زمانہ ہوتا تو تلوار سے میں یقیناً اسے زخمی کرتا لیکن نہرو گورنمنٹ کا دور دورہ تھا اور حالت مسلمانوں کی یہ تھی کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ۔۔۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سڑک پر پہنچ کر میں نے اس کی تلوار سڑک پر پھینک دی اور اس سے کہا کہ اپنی تلوار لیتا جا۔ اس نے تلوار اٹھائی اور کرن پور کی طرف چلا گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ۱۵ ستمبر ۴۷ء کو سکھوں کا شہر میں جلوس نکلا۔ کلکٹر اور افسرانِ پولیس مع جمعیت پولیس ساتھ تھے۔ نہ اذان کا معاملہ تھا نہ باجے کا سبب تھا۔ بوجہ خوف مسلمان اپنی دکانیں بند کر کے چلے گئے تھے۔ دوپہر سے شام اور شام سے دوسری صبح تک مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ گھر لوٹے، دکانیں لوٹیں، جابجا آگ لگائی، مسجدوں سے قرآن پاک کے سیپارے پھاڑ کر سڑکوں پر ڈالے۔ عورتوں کو پکڑ کر لے گئے اور ایک ہی رات میں منصوری اور دہرہ دون کے مسلمان تباہ اور برباد ہو گئے۔

دوسرے روز میرے بڑے لڑکے تقی محمد خاں ملٹری پولیس الٰہ آباد سے گارد لے کر آئے۔ جہاں وہ کمپنی کمانڈر تھے اور اپنی بیوی بچی اور مجھے اس مصیبت سے نکال کر الٰہ آباد لے گئے۔ دوسرے لڑکے سمیع محمد خاں بریلی میں انسپکٹر ٹریفک پولیس تھے۔ وہ بھی فساد کی خبر سن کر میری مدد کو روانہ ہوئے لیکن رڑکی سے آگے نہ جا سکے اور واپس چلے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد الٰہ آباد میں بھی سکھوں کا جلوس نکالا گیا۔ مسلمان دکانیں بند کر کے چلے گئے تھے۔ چوک میں کوتوالی کے سامنے جہاں افسران و حکام ضلع اور کافی پولیس موجود تھی۔ سکھوں نے فساد شروع کیا۔ مسلمانوں کی دکانوں کو لوٹا، ٹرکوں میں سامان بھر کر لے گئے، آگیں لگائیں مسلمانوں کو مارا اور پولیس سوائے نمائشی اکڑفوں کے کچھ نہ کر سکی۔ دوسرے روز جب میں بازار گیا تو چند مسلمان اپنی دکانوں کے سامنے سر پکڑے بیٹھے تھے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے ؎

نشیمن پھونکنے والے بس اپنی زندگی یہ ہے
کبھی رویا کبھی سر رکھ دیا خاکِ نشیمن پر

گھریلو زندگی

میری گھریلو زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی۔ والد کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہو گیا تھا۔ اپنی تنخواہ کا چہارم حصہ تاحیات والدہ صاحبہ کو ۱۹۲۰ء تک برابر دیتا رہا۔ میری اولاد میں ایک لڑکی اور چار لڑکے ہیں، دو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں، ایک ایروڈروم پر ویلفیئر آفیسر اور چوتھے لاہور میں کانٹریکٹر ہیں۔ لڑکی کی شادی میرے بھانجے نیاز اللہ خان ڈپٹی کلکٹر سے ہوئی جو اب پنشن پاتے ہیں۔ میری گھریلو زندگی کا اندازہ اس ایک مثال سے کیجئے کہ میرے لڑکے سب مجھ سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ میں اس خیال سے کہ دہرہ دون کی کوٹھیاں اور خورجہ کا آبائی مکان فروخت ہو جائے رُکا رہا لیکن یہ نہ ہو سکا، چونکہ مکانات شروع ہی سے میں نے اولادوں کو تقسیم کر دیئے تھے، ان کے آنے کے بعد کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں میں ہوائی جہاز سے کراچی آ گیا۔ میری زندگی شروع ہی سے متوکلانہ رہی۔ کبھی پیسہ پاس نہ رہا۔ باوجود اس کے بھی کوئی خواہش، کوئی ضرورت ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ جب کراچی آیا تو میرے پاس صرف پچاس روپے تھے، تنہا تھا، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، بقول شخصے "نہ زر نہ زمین نہ زن" پریشان تھا کہ پنشن کئی سال بعد ملے گی، اپنی ضرورتوں کے لئے لڑکوں کے سامنے کیسے ہاتھ پھیلاؤں۔ دونوں لڑکے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ میں بھی انھیں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ چالیس پچاس روپے کبھی تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ملتے تھے کبھی اچکن کی جیب میں اور کبھی اونچی ٹوپی کے اندر، اور جب کبھی میں دریافت کرتا کہ یہ کس نے رکھے ہیں تو وہ دونوں اور ان کی بیویاں لاعلمی ظاہر کرتیں۔ یہ سلسلہ دو سال تک رہا جب دو سال کی مجھے یک مشت پنشن ملی تو میں نے بھی وہ رقم آدھی ایک لڑکے کے تکئے کے نیچے اور آدھی دوسرے لڑکے کے تکئے کے نیچے رکھ دی ؎

جو طلب میں نے کیا مجھ کو عنایت سے دیا
تیرے قربان مرے ناز اٹھانے والے

میرے مشاغل

یہ تو میری گھریلو زندگی کے حالات ہیں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میرے تعلقات ہمیشہ عزیزوں اور دوستوں سے بھی مخلصانہ رہے۔ آج بھی نہ میرا کوئی دشمن ہے نہ میں کسی کا بدخواہ ہوں۔ نہ میری کسی سے مقدمہ بازی ہوئی۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ میں ہمیشہ سے متوکل اور قانع ہوں۔ میرے مالک کا یہ بڑا کرم اور احسان ہے کہ میرا دل لالچ، حسد، بغض اور کینہ سے پاک ہے۔ میں اپنے ذاتی اغراض کے لئے کسی کو حتی المقدور تکلیف نہیں دیتا اور اگر میں کسی کے کام آ سکتا ہوں تو اس میں دریغ نہیں کرتا۔

مجھے تصوف سے ذوق ہے لیکن شرع کی پابندی کو بھی مقدم خیال کرتا ہوں، جو بزرگوں کی صحبت اور ان کی دعاؤں کا فیض ہے۔ خوش قسمتی سے بارہ سال کی عمر میں حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت حاصل کی لیکن پیر کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع نہ مل سکا، اڑتالیس سال کی عمر میں خوش قسمتی سے حضرت شاہ ابوالخیر صاحب دہلوی سے بیعت حاصل کی اور ان کی چند ماہ کی صحبت کو میں حاصل عمر خیال کرتا ہوں۔ باقی تو وبالِ آخرت ہے۔

ہمیشہ سے مجھے تین چیزیں مرغوب ہیں خوشبو، موسیقی اور حسن۔ حسن تاج محل میں بھی ہے، نشاط باغ اور گل و گلزار میں بھی ہے، بے نیازی ناز و انداز میں بھی ہے، انسانی حسن کی دلربائی میں بھی ہے۔ میں بلا ہر چیز کے خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی

کی لطافت اور ساز و آواز میں جو حسن ہے وہ میری غذائے روح ہے۔ محفلِ سماع اگر سلیقے کی ہو تو یقیناً دل میں کیف و سرور پیدا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہے لیکن مجھے کلاسکی موسیقی میں ہی ایسے جواہر ریزے مل جاتے ہیں جو صرف ساز و آواز ہی کا حصہ ہے۔ یہ غذائے روح مجھے شاہد احمد صاحب دہلوی کے ذریعہ سے حاصل ہو جاتی ہے جو کلاسکی موسیقی کے ماہر ہیں۔ دراصل آواز فطرت کی ایجاد ہے۔ قدرت کی ہر چیز مکمل ہوتی ہے، نغمہ ہائے ساز خواہ کتنے ہی طرب انگیز ہوں ان کے اثرات فرحت اور سرور کی خواہ کتنی ہی ترجمانی کریں لیکن دل کے سوئے ہوئے تاروں کو جنبش میں لانے اور گہرائیوں میں اُتر جانے کی بے پناہ قوت غم آفریں سروں، الم انگیز راگوں، دل کش اور دل شکن اثرات صرف راگ ہی میں ہوتے ہیں، اور یہ نیچر کے مدرسہ کی مختلف کلاسیں ہیں ؎

اے جوشِ جنوں بیکار نہ رہ کچھ خاک اُڑا ویرانے کی
دیوانہ تو بننا مشکل ہے صورت ہی بنا دیوانے کی

آج سے پچیس سال قبل مجھے ہارمونیم اور ستار کا شوق تھا۔ کچھ برا بھلا گا بھی لیتا تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو جانے کے بعد اس شغل کو جاری نہ رکھ سکا اور یہ معلومات اس وقت کام آئیں جب حضرت امیر خسرو کی بشارت ہوئی اور ارشاد ہوا کہ میں ان کے ایجاد کردہ راگوں کی تحقیقات کروں، چنانچہ جو کام سات سو سال سے نہ ہوا تھا حضرت پیر کی غیبی امداد سے پورا ہوا۔

تصنیف اور تالیف

تصنیف اور تالیف کا شوق تو ملازمت کے زمانے میں بھی تھا اور اب بھی ہے۔ سیکڑوں مضامین اخبار اور رسالوں میں شائع ہوئے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ میری تصانیف جو شائع ہو چکی ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ بزمِ حسیناں	عمر ۱۹ سال	اخلاقی ناول
۲۔ زینت الحرم	عمر ۲۰ سال	اُمورِ خانہ داری
۳۔ طلسمِ ہستی	عمر ۳۰ سال	عجائباتِ زندگی
۴۔ اعجوبۂ اسرار	عمر ۳۱ سال	فلسفہ اور تاریخ تصوف
۵۔ انتخابِ دل پسند	عمر ۳۲ سال	منتخب اشعار
۶۔ بقول شخصے	عمر ۴۰ سال	مثلیں اور کہاوتیں
۷۔ مذاقِ سلیم	عمر ۵۰ سال	اخلاقی لطیفے
۸۔ میلاد شریف	عمر ۵۵ سال	اسوۂ حسنہ (رسولِ کریم کی اصلاحات عالم عجیب ترجمہ ہے)
۹۔ شیطان کی خالہ	عمر ۶۵ سال	اخلاقی مزاحیہ ناول
۱۰۔ علاج بالغذا	عمر ۷۵ سال	صرف غذا کے ذریعہ سے ہر قسم کا علاج
۱۱۔ گلِ نورُستہ	عمر ۶۰ سال	میری اپنی غزلیں اور اشعار
۱۲۔ قدیم خورجہ	عمر ۷۰ سال	خورجہ کی قدیم معاشرت اور حالات

۱۳۔ تاریخ خاندان خلیل	عمر ۵۲ سال	اپنے خاندان کا شجرہ اور حالات
۱۴۔ حیات امیر خسرو	عمر ۵۶ سال	سوانح حیات مع تحقیقات موسیقی
۱۵۔ سرو شہید	عمر ۵۰ سال	تاریخی تحقیقات اور سوانح حیات
۱۶۔ غنچۂ ادب	عمر ۵۳ سال	میرے مضامین کا انتخاب
۱۷۔ عمر رفتہ	عمر ۵۰ سال	خود نوشت سوانح حیات

آخر الذکر کتاب جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ساقی کی فرمائش پر میں نے لکھی جگہ چھپائی مشین کاپی ہو چکی تھی اور ساقی کے ایک خاص نمبر میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن کتابی صورت میں ٹائمز پریس صدر کراچی نے شائع کیا اور تیسرے اڈیشن کا مسودہ تیار ہے۔ کتابوں کی اشاعت کا نہ میں معاوضہ لیتا ہوں نہ میرا کچھ خرچ ہوتا ہے، البتہ سو پچاس کتابیں مل جاتی ہیں اور اعزہ اور احباب میں تقسیم کر دیتا ہوں

"لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض
ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے

خلاصہ

تقسیم ہند کے بعد جو آزادی ہمیں نصیب ہوئی وہ اللہ کی بڑی نعمت ہے لیکن لفظ آزادی کا جو مفہوم ہماری قوم کے نوجوان سمجھ رہے ہیں اس سے ہماری توقعات پوری نہیں ہو سکتیں۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کی اپنی زبان نہ ہو، اپنی تہذیب، معاشرت اور اپنا لباس مخصوص نہ ہو۔ افسوس کہ ابھی تک ہم اس نعمت سے محروم ہیں جو راستہ ہمارے نوجوان اختیار کر رہے ہیں وہ گمراہ کن اور یورپ کی نقالی ہے۔ کسی قوم سے اس کی زبان چھین لینا ایسا ہی مضر ہے گویا جسم سے خون کھینچ لینا۔ ہماری تہذیب، مذہب، ثقافت، تمدن، معاشرت، اخلاق، تاریخ، روایات سب کچھ ہماری زبان اردو میں محفوظ ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

جو لڑکے اور لڑکیاں انگریزی اسکولوں سے فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں وہ اپنی مادری زبان سے غیر مانوس ہو جاتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا" کا کیا مطلب ہے۔

میں انگریزی جانتا ہوں اور بول بھی سکتا ہوں لیکن اگر کوئی اردو داں مجھ سے رعب جمانے کے لیے انگریزی میں بات کرتا ہے تو ہمیشہ میں اپنی مادری زبان اردو میں جواب دیتا ہوں تاکہ متکلم کو اپنی غلط روی کا احساس ہو۔ اگر اور میرے ہم خیال اصحاب بھی میری تقلید کریں تو شاید کچھ بہتر نتیجہ برآمد ہو۔

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
جو پوچھو تو اب جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

(حالی)

نصیر الدین ہاشمی

خاندانی حالات

میرے آباؤ اجداد ان اصحاب میں شامل تھے جو عراق و حجاز سے پر امن طریقہ پر تبلیغ اسلام اور اشاعت علم کے لیے جنوبی ہند کے ساحل پر آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے آئے تھے اور اہل نوائط کے نام سے مشہور ہوئے۔ ملک کوکن، بھٹکل وغیرہ ان کی ابتدائی اقامت گاہ تھی وہ پھر دکن کی بہمنی سلطنت میں تخت فیروزہ کے محافظ بنے اور اس کے بعد بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے وابستہ ہوئے۔ ان کی قضائت چار پشت تک انجام دیتے رہے پھر عہد عالمگیری میں سدھوٹ کے قلعہ دار بنے وہاں سے ارکاٹ گئے اور عدالتی فرائض کے ساتھ تصنیف و تالیف درس و تدریس میں مصروف رہے۔ گزشتہ ایک سو سال سے حیدر آباد میں مقیم ہیں اب بعض افراد خاندان نے پاکستان میں بھی اقامت کر لی ہے جس میں میرے حقیقی بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔

خاندان کے ایک بزرگ فقیہ مخدوم علی مہائمی بمبئی میں آسودہ ہیں تو ایک فرد شاہ حبیب اللہ بیجاپور میں مدفون ہیں۔ امام المدرسین جو آخری پرنسپل مدرسہ محمود گاواں تھے بیدر میں دفن ہیں۔ غرض افراد خاندان نے حکومت کی اعلیٰ خدمات نیک نامی، وفاداری، نمک حلالی اور خدا ترسی سے انجام دیں تو وہاں علم کی اشاعت، تصنیف و تالیف کو اپنا نصب العین بنایا۔ کتابوں کو جمع کر کے علمی خدمات انجام دیتے رہے اور سلوک اور باطنی مراتب بھی طے کیے۔

میری پیدائش ۱۷، ماہ رمضان روز جمعہ سنہ ۱۳۱۲ھ میں ہوئی جو عیسوی لحاظ سے ۱۵ مارچ ۱۸۹۵ء ہوتی ہے۔ میرے والد مولوی عبدالقادر تھے جو مدراس کے ایک امیر غلام محمد شرف الدولہ کے فرزند اکبر تھے۔ حکومت آصفیہ نے طلب کر کے سررشتہ عدالت میں مجسٹریٹ بنایا اور پھر رجسٹرار بلدہ کی خدمت دی گئی۔ صرف ۴۰ سال کے سن میں ان کا انتقال ہوا۔ مرحوم کے پانچ فرزندوں میں ایک میں ہوں۔

والد کے انتقال کے وقت میری عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ موصوف کے انتقال تک گھر ہی میں تعلیم ہوتی رہی۔ قرآن شریف، دینیات اور اردو، حساب اور خطاطی کے لیے استاد مقرر تھے۔ بچپن میں ہی دائم المریض رہا، بخار، دردسر، خارش وغیرہ میں کئی سال گزرے۔

والد کے انتقال سے ایک دنیا بدل گئی۔ نانا صاحب کے مکان میں قیام ہونے لگا۔ اگرچہ نانا صاحب کا مکان بھی وسیع تھا مگر ایک مستقل بڑے مکان جس میں ہر بچہ کے لیے علیحدہ علیحدہ اس کی رہنے کی جگہ مخصوص تھی جہاں اس کے لکھنے پڑھنے کا سامان قرینہ سے ترتیب دیا ہوا تھا وسیع احاطہ میں باغ کی سبزہ زاری اور پر فضا چمن بندی، میوہ دار درختوں کی بہار ان سب کو چھوڑ کر ایک دو کمروں میں پورے خاندان کا قیام جس قدر ماحول کو بدلنے والا تھا وہ پوشیدہ نہیں۔

والد محترم کے انتقال کے تقریباً تین سال کے بعد میرے نانا صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب پھر تبدیلی ناگزیر تھی نانا صاحب کا مکان چھوڑ کر ایک دوسرے مکان میں میری والدہ اپنے کنبہ کے ساتھ منتقل ہو گئیں جو اگرچہ دو کمروں کی گنجائش کے مقابل زیادہ گنجائش رکھتا تھا۔

کر کسی کا پابند ہونے سے کھیلنے کے لیے مواقع نہیں رہے۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال ہو چکی تھی۔ اب تک میری تعلیم گھر پر ہوتی رہی تھی میرے تینوں بڑے بھائی مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہو چکے تھے۔ اب مجھے بھی وہاں شریک کیا گیا۔ اس عرصہ میں میری جو تعلیم ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ قرآن شریف ختم کرایا گیا تھا۔ اردو میں چوتھی کتاب پڑھی جا رہی تھی۔ فارسی میں گلستان کا انتخاب تھا۔

مدرسہ میں مجھے چوتھی جماعت میں شریک کیا گیا۔ اس جماعت میں اردو ادب کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ فارسی کی جو کتاب شریک تھی اس سے زیادہ میری فارسی تعلیم ہو چکی تھی البتہ قواعد میرے لیے نیا مضمون تھا اس طرح حساب میں کوئی تردد نہیں تھا۔ صرف عربی میرے لیے بالکل نئی چیز تھی اور دینیات کا رسالہ بھی حنفی فقہ ہونے سے کسی قدر جداگانہ تھا کیونکہ میں نے شافعی فقہ پڑھی تھی میرے لیے عربی کی طرح انگریزی بالکل نئی چیز تھی۔

اس امر کا خیال رہے کہ مدرسہ دارالعلوم کے نصاب (کورس) کو مولوی شبلی نے مقرر کیا تھا۔ مولوی شبلی کے اس نصاب میں شروع سے آخر تک اردو ادب کی تعلیم مفقود تھی۔ اردو میں صرف تاریخ یا جغرافیہ یا سائنس کی تعلیم ہوتی تھی۔ باقی تمام مضمون یا تو فارسی میں تھے یا عربی میں۔ جماعت پنجم سے تاریخ اور جغرافیہ کے فن کا آغاز ہوتا تھا۔ اس جماعت میں دکن کی تاریخ اور دکن کا جغرافیہ تھا اور چھٹی جماعت میں ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ عالم رکھا گیا تھا۔

مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد حصہ وسطانی کے مدرسوں میں حضرت امجد کا نام لینا ضروری ہے جن سے میں نے نہ صرف تاریخ بلکہ فارسی۔ ریاضی۔ عربی بھی پڑھی۔ پانچویں جماعت سے موصوف کی شاگردی شروع ہوئی تمام مضامین میں تاریخ میرا محبوب مضمون رہا۔

مجھے تعلیم سے زیادہ انجمن ثمرۃ الادب کے سکریٹری کے فرائض انجام دینے میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ جو اس دارالعلوم میں طلبہ کی یونین تھی۔

اس زمانہ میں مدرسہ دارالعلوم کی کالج کی جماعتیں مدرسہ کے قدیم مکان سے منتقل ہو کر شہر کے باہر معتمد مالگزاری کے بازو کے مکان میں منتقل ہو گئی تھیں وہیں جماعت عالم کے پہلے سال میں شریک تھا۔ دارالعلوم میں جامعہ عثمانیہ کے لیے طلبہ کو تیار کرنے کیلئے دارالعلوم کالج میں چند طلبہ کے لیے صرف انگریزی تعلیم کی جماعتیں قائم کی گئی تھیں ایک جماعت صرف ایک سال میں انگریزی میٹرک کا امتحان دینے والی تھی اور دوسری جماعت دو سال میں اس کا امتحان دینے کے لیے کھولی گئی۔ سید راس مسعود کے کہنے سے میں نے بھی عالم کے دوسرے سال کی تعلیم ترک کر کے انگریزی کی دو سالہ تعلیم کی جماعت میں شرکت کر لی۔ مسٹر سری کنٹیا ایم۔ اے۔ بی ٹی ہمارے مدرس تھے۔ میرے ساتھ مسٹر نرسنگ راؤ (سابق منسٹر) ان کے بھائی ایم۔ رام چندر راؤ ایڈوکیٹ۔ محمد عزیز الرحمٰن ایم۔ ایس۔ سی۔ ابوالفتح اندھر انصراللہ ایم۔ اے وغیرہ کئی لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اس انگریزی تعلیم کے ساتھ بھی انجمن ثمرۃ الادب کے فرائض میرے ذمہ تھے۔ اس کے باعث رسالوں اور کتابوں کے مطالعہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ انجمن نے خاصی ترقی کر لی۔ ماہوار علمی جلسے ہوتے اور ایک علمی رسالہ ثمرۃ الادب شائع ہونے لگا۔ اس طرح انجمن کو تو ترقی ہوئی مگر میری تعلیم ناقص رہ گئی اور میں انگریزی امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس طرح کالج کے تین سال بسر ہوئے اور میری تعلیم کے انیس سال ختم ہوئے جب انگریزی میٹرک میں کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے فارسی کی جماعت میں شرکت کر لی۔ گویا جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں شرکت کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں قحط کے باعث کارہائے قحط کا سلسلہ جاری تھا مجھے اس سلسلہ میں ایک عارضی ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ہنگامی سلسلہ نے کسی قدر طویل صورت اختیار کر لی جس کے باعث اب تعلیم سے دست بردار ہونا ناگزیر ہو گیا البتہ ملازمت کے بعد خانگی

طور پر مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا گیا۔ مجھے بچپن سے مطالعہ کا شوق رہا۔ صدہا کتابیں۔ تاریخ، سوانح، سفرنامہ، ناول وغیرہ کا مطالعہ کیا گیا۔ مطالعہ وسیع ہو گیا۔ اردو کے ممتاز مصنفین کی کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں مجھے مولانا شبلی، مولانا شرر کی تصانیف سے زیادہ دلچسپی رہی۔

یہ ہے میری تعلیم کی سرگزشت۔ مجھے نہ تو کالج کی اعلیٰ تعلیم نصیب ہوئی اور نہ اُردو ادب کی تعلیم باقاعدہ ملی گئی۔ جو کچھ معلومات حاصل ہوئی۔ وہ صرف مطالعہ کی وجہ سے ہوئی۔ میری تعلیم ادھوری اور ناقص رہی اس میں بڑی حد تک میرا اپنا قصور اور ذوقِ تعلیم کا فقدان ہے۔

ملازمت

زندگی کے جائزہ میں دوسرا شعبہ ملازمت کا ہے جو تیس سال کے طویل عرصہ پر مشتمل ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دس دس سال کے تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔

پہلے دس سال نان گزیٹیڈ یعنی اہل کاری کے زمرہ میں رہا۔ دوسرے دس سال تک دفتر دیوانی و مال (ریکارڈ آفس) میں نائب مددگاری کی گزیٹیڈ خدمت پر مامور رہا اور آخری دس سال سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں مددگار ناظم پھر رجسٹرار بلدہ کی اور کچھ عرصہ ناظم رجسٹریشن کی حیثیت میں گزارا۔

مئی ۱۹۱۹ء کا مہینہ تھا گرمی اپنے شباب کے دور ختم کر کے زوال کی طرف مائل ہو چکی تھی لیکن آخری آخری مراحل بھی جان لیوا ثابت ہو رہے تھے۔ مدارس اور کالج کے امتحانات ختم ہو کر وہ بند ہو چکے تھے۔ طلبہ محنت و مشقت سے چھٹکارا پا کر آرام لینے کی دھن میں لگے تھے بعض اپنے دیہات کو جا چکے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی عالم وجود میں نہیں آئی تھی مگر اس سال پہلی مرتبہ ان طلبہ کا جنہوں نے علوم مشرقیہ میں عربی عالم اور فارسی دبیر میں کامیابی حاصل کر لی تھی صرف انگریزی میں میٹرک کے مماثل نصاب (کورس) کا امتحان لیا گیا تھا تاکہ اس کامیابی کے بعد ان کو جامعہ عثمانیہ کے ایف۔ اے میں داخل کیا جائے اور جامعہ کی پہلی کلاس کا افتتاح ہو سکے۔

میں بھی انہی طلبہ میں شامل تھا۔ انگریزی کے چار پرچوں کا امتحان دے کر دوسروں سے رہائی پائی تھی اور گھر میں بالکل بیکار تھے۔ مجھے بچپن سے قومی اور ملکی کاموں سے دلچسپی رہی جس کو باپ[1] کی میراث کہا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے بچپن میں طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ کے مصیبت زدہ کے ریلیف کے کام میں کسی قدر مدد دی تھی اس کے بعد جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانہ میں انجمن ہلال احمر کے تحت چندہ جمع کرنے میں مدد دی پھر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں والنٹیر بن کر انتظامی کام کئے اور پھر جنگ عظیم کے بعد انفلوئنزا کا وبائی مرض پھیل گیا تو اس وقت بھی والنٹیر بنا تھا۔ مدرسہ دارالعلوم کی انجمن ثمرۃ الادب کی سکریٹری شپ کے فرائض چار سال تک مجھ سے متعلق رہے۔ غرض اس طرح نام و نمود کا شوق دامن گیر رہا اس میں خلوص بھی تھا اور نام و نمود کا شوق بھی۔

---

[1] میرے والد مرحوم مولوی عبدالقادر صاحب رجسٹرار بلدہ (اسسٹنٹ رجسٹرار) تھے انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود اپنے زمانہ میں حیدرآباد کے تاریخی، سیاسی، سماجی، تمدنی مسائل کے اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی اخبارات میں حیدرآباد کے متعلق جو زہر اگلا جاتا تھا وہ ان کا دندان شکن جواب تحریر فرماتے تھے۔ حیدرآباد کے اخبارات ان سے مضامین حاصل کرتے تھے ان کو سرزمین دکن کی ہر جہتی ترقی سے دلچسپی تھی اس لیے ہر اس انجمن کے سرگرم رکن اور روح رواں ہوتے جو علمی معاشرتی ترقی اور اصلاح کے لیے منعقد ہوتی۔ میں نے اب ایک مستقل کتاب "مولوی عبدالقادر" کے نام سے شائع کر دی ہے۔

اسی زمانہ میں حیدرآباد اور اس کے بعض جنوبی اضلاع میں قحط سالی تھی۔ اضلاع سے مفلوک الحال فاقہ زدہ مخلوق حیدرآباد آرہی تھی حیدرآباد میں چاول کا نرخ فی روپیہ تین سیر ہو گیا تھا جو گراں تر سمجھا جا رہا تھا۔ اور جوار فی روپیہ چار سیر تھی اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اضلاع کے علاوہ حیدرآباد میں محتاج خانے کھولے گئے اور مفلس غریب بیواؤں وغیرہ کو روزانہ چاول اور نقدی دینے کا انتظام کیا گیا۔ کمشنر قحط خواجہ محمد علی صاحب المخاطب محمد نواز جنگ مرحوم تھے ان کے تحت حیدرآباد کے لیے ایک خاص مددگار کا انتخاب ہوا تھا۔

جیسا کہ تذکرہ کر دیا گیا ہے کالجوں کی گرمائی تعطیل ہو گئی تھی اور میں نے گرمائی تعطیل بسر کرنے کے لیے قحط کے سلسلہ میں عارضی طور پر کام کرنے کا ارادہ کیا اور اسی غرض سے موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خیال ظاہر کیا۔

موصوف نے کہا کہ بلا معاوضہ مفت کام کرنے کے بجائے وہ انسپکٹری کی خدمت دینے کو تیار ہیں۔ شہر حیدرآباد اس زمانہ میں بلدیہ کے چودہ حلقوں پر منقسم تھا اسی مناسبت سے ہر حلقہ پر ایک انسپکٹر قحط کا تقرر کیا جانے والا تھا تاکہ گھر گھر پھر کر مفلوک الحال اور قابل امداد اشخاص کا پتہ چلائے اور تنقیح کرے تاکہ انہیں امداد جاری کی جائے۔

مجھے ایک حلقہ کا انسپکٹر مقرر کر دیا گیا۔ یہ میری پہلی ملازمت تھی جو آج سے (۵۰) سال پہلے آغاز ہوئی اور نو ماہ تک جاری رہی۔ انسپکٹر قحط کے زمانہ میں میں نے کیا کیا تجربے حاصل کیے۔ کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں اس کی صراحت دلچسپ تو ہو سکتی ہے مگر طوالت کا موجب ہو گی۔

دفتر قحط کی ہنگامی ملازمت کے بعد مجھے دفتر دیوانی و مال یعنی ریکارڈ آفس کی ملازمت میں لیا گیا۔ میں وہاں بیس سال تک مامور رہا۔ دس سال اہل کار صیغہ دار اور مہتمم رہ کر اور دس سال مددگار ناظم بن کر کام کرتا رہا۔ اس دفتر کا کام ایک خاص نوعیت کا تھا یہاں پر ان تمام جاگیرداروں انعام داروں اور معاش داروں کے اسناد اور وثائق کی جانچ اور تصدیق ہوتی تھی جن کے مقدمات سررشتہ عطیات کی عدالت میں زیر تصفیہ ہوتے تھے۔ معاشوں کے داخلے نقدی اور اراضی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے اور رشوت کا بڑا اچھا موقع تھا کیونکہ معاش دار اپنی آبائی معاش کے باقی رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرتے تھے۔

بہرحال میں نے دفتر مذکور کے کاموں سے واقف ہونے کے علاوہ تاریخی کاغذات کو جو اب تک بے مصرف اور بلا توجہ رکھے ہوئے تھے انتخاب کر کے تاریخی مواد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا اور تاریخی کاغذ جو اہم حیثیت رکھتے تھے اور دوسرے کاغذات میں مخلوط تھے ان کو علیحدہ کرنے اور منظم کرنے کا آغاز کرایا۔ مجھ سے پہلے کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں کی تھی اور نہ کسی کو خیال ہوا تھا۔ اس دفتر سے تصدیق کے علاوہ تاریخی کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ میرا ہی کارنامہ ہے جو تاریخی حیثیت کو اجاگر کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس کو تاریخی مرکز اور سنٹرل ریکارڈ آفس کہا جانے لگا۔ میری کتاب "تاریخ عطیات آصفی" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ دفتر دیوانی ایک خاص قسم کا دفتر تھا۔ چند سال کے بعد اسی قسم کے اور چند دفاتر یعنی مال، مناصب و خطابات وغیرہ کے آنے سے دفتر وسیع ہو گیا اور ملازمین کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی۔ ایک گزیٹیڈ مددگار اور رجسٹرار بھی بن گئے۔ میرے ذمہ جو کام دفتر دیوانی میں تھا اب ان دفاتر کے آنے سے اور زیادہ ہو گیا بلکہ ان دفاتر کے جو مہتمم صاحب تھے ان کے کام کی جانچ بھی میرے ذمہ کر دی گئی تھی اور میں اس کے ساتھ ناظم صاحب کے پی۔ اے کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔ اس طرح کام کی زیادتی اور ذمہ داری میں اضافہ ہوتا گیا مگر میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا صرف امید تھی کہ نئی اسکیم میں مجھے اچھا اضافہ دیا جائے گا اس کو کئی برس ہو گئے اور

میری ملازمت کے دس سال بیت گئے۔ اس عرصہ میں میری کتاب دکن میں اردو کے صلہ میں حکومت نے سید راس مسعود صاحب اور سر امین جنگ کے طفیل مجھے ایک سال کے لیے یورپین وظیفہ دے کر انگلستان روانہ کیا تاکہ میں وہاں سے دکنی ادب کا مزید مواد فراہم کروں۔ اس کے ساتھ ہی میری خواہش پر سر اکبر حیدری نے جو اس وقت منسٹر فینانس تھے ریکارڈ کا کام بھی انڈیا آفس میں حاصل کرنے کے لیے سر محمد رفیق ممبر انڈیا کونسل کے نام سفارشی خط دیا۔ غرض میں نے تنخواہ کی اس غیر معمولی رخصت سے استفادہ کیا۔

انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور فرانس میں ایک سال کے قیام اور وہاں سے دکنی مواد اور ریکارڈز کے کام کا تجربہ حاصل کرکے میں واپس آیا اور اب بعض دوسرے نئے تقررات کے ساتھ مجھے بھی گزیٹیڈ جگہ ملی اور دفتر کا جو اہم ترین صیغہ تھا یعنی تصدیق اسناد وہ میرے تحت کر دیا گیا کیونکہ میں اس صیغہ کے جزو کل سے پوری طرح واقف تھا۔

اس صیغہ کی نگرانی کرتے ہوئے آٹھ سال گزر گئے اور اس عرصہ میں ایک جدید خدمت جو زیادہ ماہوار کی تھی منظور ہوئی اور بلحاظ سینیارٹی اور کارگزاری میں اس کا مستحق تھا مگر مجھے اس سے محروم کر دیا گیا۔ معتمد فینانس اور چیف منسٹر میرے موافق تھے مگر ناظم سررشتہ اور فینانس جن کے تحت ہمارا دفتر تھا میرے مخالف اور دوسرے صاحب کی تائید میں تھے۔ اس کی وجہ سے مجھے باوجود سینیر ہونے، کارگزار ہونے اور مستحق ہونے کے محروم کر دیا گیا اور دوسرے صاحب جن کے متعلق چیف منسٹر نے بہت سخت الفاظ میں اظہار ناراضگی کی تھی مامور کر دیے گئے اور اسی ترقی کے سلسلہ میں میرے افسر مجھ سے ناراض ہوگئے اور ناراضگی کے باعث میں نے دو ماہ کی رخصت حاصل کر لی اور جب واپس آیا تو ایک دوسرا صیغہ میرے تحت کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور مالی نقصان میرا یہ کیا گیا کہ میں نے جو کتاب حکومت کے سررشتہ عطیات کے متعلق لکھی تھی کرنل ٹرنچ نے کتاب کے پانچسو نسخے تین ہزار قیمت میں خرید کرنے کی منظوری دی تھی۔ اس کتاب کا مسودہ محض دیکھنے کے لیے مجھ سے حاصل کرکے رکھ لیا گیا جس کے باعث مجھے تین ہزار کی رقم نہیں ملی اور اس رقم کی امید میں میں نے اپنے مکان کی تعمیر کے لیے سودی قرضہ حاصل کیا تھا۔ جب اصل اور سود ایک عرصہ تک ادا نہ ہوا تو میں نے اپنا مکان قرضے سے نجات حاصل کرنے کے لیے چار ہزار کے نقصان سے فروخت کیا۔ غرض دفتر دیوانی و مال (سنٹرل ریکارڈ آفس) کی بیس سالہ ملازمت کے بعد سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں میرا تبادلہ ہوگیا۔ میرے افسر جن کا تذکرہ کر دیا گیا ہے انھوں نے میرا تبادلہ ایک مرتبہ سررشتہ تعلیمات میں کرنے کی بھی تحریک کر دی تھی۔ جہاں میرا اور زیادہ نقصان ہوتا۔ مگر خدا بھلا کرے اس سررشتہ کے منسٹر صاحب کا کہ وہ مجھ سے واقف تھے اور میرے نقصان کو گوارا نہ کیا اور تبادلہ کو نامنظور کر دیا گیا۔

رجسٹرار بلدہ کی خدمت میرے لیے ایک نئی جگہ تھی اگرچہ ابتدائی چند یوم مجھے کام کے سمجھنے میں گزرے اس کے بعد کوئی دشواری نہیں رہی۔ مجھے اپنی اصل یافت کے علاوہ کمیشن پر جاکر رجسٹری کرنے کا معاوضہ تقریباً ڈیڑھ سو ماہوار ملنے لگا۔ اس خدمت پر میں تقریباً چھ ماہ کارگزار رہا اس کے بعد مجھے صدر دفتر میں مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ کی خدمت پر منتقل کیا گیا۔

میں مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ کی حیثیت سے پانچ سال کارگزار رہا۔ اس میں ناظم کے قائم مقام کی حیثیت سے دورہ بھی کرتا رہتا۔ میں نے سلطنت آصفیہ کے سولہ اضلاع اور ایک سو ایک تعلقات اور چھبیس جاگیرات کے منجملہ (۱۳) اضلاع اور ساٹھ پینسٹھ تعلقات اور پندرہ سولہ جاگیرات کے مستقر کا دورہ کیا تھا۔ جن ناظم صاحب رجسٹریشن و اسٹامپ کے زمانہ میں میں اس سررشتہ میں منتقل ہوا

تھا ان کو بعض خاص حالات کے باعث سررشتہ مالگذاری میں واپس کر دیا گیا اور جدید ناظم کے تقرر اور ان کے آنے تک تقریباً دو ماہ میں بحیثیت ناظم رجسٹریشن پورے اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد جدید ناظم صاحب نے مجھ سے جائزہ حاصل کیا ان کے ساتھ میں تقریباً چھ سات ماہ بحیثیت مددگار کام کرتا رہا۔ جدید ناظم صاحب سے خاندانی تعلقات کے باوجود میری ان کی صفائی نہیں رہی اور میری توہین ہونے لگی اس لیے میں نے اپنی سابقہ خدمت رجسٹرار بلدہ پر واپسی کی درخواست کی اور بعد منظوری میں رجسٹرار بلدہ کی خدمت پر واپس ہو گیا۔

میرے اچھے انتظام کا مہاراجہ بہادر (شیشور ناتھ) (چیف جسٹس)، حسن احمد بیگ (جسٹس)، مسٹر حشمت راؤ (ممبر پبلک سروس کمیشن)، مسٹر جنگل ویلنگٹ رامارڈی (جو زمانہ مابعد میں نائب چیف منسٹر بھی ہوئے تھے) وغیرہ اصحاب نے ستائش کی تھی۔ میں وقت واحد میں کئی کام کرتا۔ رجسٹری ہوتی، نقول کی درخواست قبول کی جاتی، اجرت رجسٹری کی صراحت کی جاتی، دستاویزی نوعیت پر رائے دی جاتی غرض مجھے اہل معاملہ گھیرے ہوتے اور میں کسی پریشانی یعنی سختی کرنے کے بغیر ہر شخص کی تشفی کرتا تھا۔ جس پر بعض آنے والے گزیٹیڈ افسروں کو تعجب ہی ہوتا تھا۔ اس اچھے اور نمایاں کام کے باوجود میری اور افسر متعلقہ یعنی ناظم رجسٹریشن کی مخالفت رہی اور ایک قانونی معاملہ میں میرے صحیح استدلال کے باوجود مجھے نقصان پہنچایا گیا۔ قانونی معاملہ پر میرا استدلال صحیح ہونے کی دلیل یہ تھی کہ عدالت دیوانی میں مقدمہ چلا اور فیصلہ میری رائے کے موافق ہوا تھا۔ بہرحال میرا آخر زمانہ ملازمت ناظم صاحب کے باعث سخت کوفت اور پریشانی میں گذرا۔ موصوف کی ماتحتی میرے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ میری صحیح کارگزاری کی ماہوار رپورٹوں پر غلط اعتراض کر کے مجھ پر جرمانہ (تاوان) قائم کی جاتی تھی اور میری ماہوار سے وضعات کا حکم دیا جاتا۔ مگر میرے استدلال کو بالآخر قبول کرنا ہوتا۔

اس زمانہ ملازمت میں پولیس ایکشن ہوا (ستمبر ۱۹۴۸ء) صرف ایک دن دفتری کام بند رہا یعنی حاضری تو ہوئی مگر کوئی اہل معاملہ نہیں آیا۔ پولیس ایکشن کا ایک دن سررشتہ رجسٹریشن کا ایسا دن رہا جو آمدنی سے محروم رہا۔

میری (۵۵) سالہ عمر مارچ ۱۹۵۳ء میں ہوتی تھی میں نے قبل وظیفہ چھ ماہ کی رخصت جو مل سکتی تھی حاصل نہیں کی بلکہ اپنے آخری دن تک کام کرتا رہا۔ بہرحال میں (۵۵) سالہ عمر اور اکتیس سالہ ملازمت پر وظیفہ حسن خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ ملازمت کا ایک ثلث حصہ افسروں کی بیجا ناراضگی اور میری الجھنوں میں گذرا۔

ملازمت کے بعد

حکومت آصفیہ اور پھر حکومت حیدرآباد کی ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی کے بعد میں اپنے خانگی علمی کاموں میں مصروف ہوا اور اپنی سوانح حیات اور دیگر مضامین قلمبند کرنے کا آغاز کیا مگر کچھ عرصہ کے بعد انجمن ترقی اردو نے خرچ سواری کی ادائی کے معاوضہ پر مجھے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست لکھنے کی خواہش کی میں نے اس کو منظور کر لیا اور دو سال میں اس کام کو انجام دے کر تکمیل کر لیا۔ اس اثنا میں حکومت حیدرآباد نے تاریخ آزادی ہند میں حیدرآباد کے کارناموں کو قلمبند کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ مسٹر ستو مادھو راؤ اولاً ناظم تعلیمات پھر معتمد تعلیمات اس کے کنوینر تھے۔ مجھے اس سلسلہ میں فارسی اور اردو قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ و دفتر دیوانی و مال وغیرہ سے مواد فراہم کرنے کے لیے ریسرچ اسکالر مقرر کیا گیا۔ پانچ سال تک میں نے یہ مواد فراہم کیا۔ چنانچہ پہلی دو جلدیں جو حکومت حیدرآباد نے شائع کی تھیں اس میں بہت کچھ میرا فراہم کیا ہوا مواد شامل ہے اور

مسٹر مادھو راؤ نے اپنے صداقت نامہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک میں نے یہ کام کیا۔ آندھرا حکومت نے ۱۹۵۵ء میں مجھے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بانی زیادہ تر مسٹر جوشی تھے جو مادھو راؤ صاحب کے بعد گورنر ہوئے تھے۔

چونکہ میرا وظیفہ میرے اور میرے متعلقین کے لیے کافی نہیں ہوتا اس لیے مجھے اب بھی دو جگہ علمی کام کر کے ماہوار ایک سو پچاس روپیہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو کتب خانہ سالار جنگ ہے جہاں میں شعبہ اردو کا ایڈیٹر ہوں۔

میری علمی زندگی

مجھے اپنے خاندانی میراث اور والد محترم کے ترکہ میں گویا علم کی خدمت کرنے کی بچپن سے دلچسپی رہی۔ بچپن میں نانا صاحب کے مکان میں بیت بازی ہوتی تھی اس کے مقابلہ کے لیے میں نے اپنی درسی کتب سے ردیف وار اشعار جمع کیے تھے۔ والد مرحوم نے ہمت افزائی کے لیے کاغذ پر مسطر کر دیا اور کتاب کا نام "گلزار نصیری" تجویز فرمایا تھا۔ اس کا مسودہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۱ء طاعون کے موقع پر تعلقہ بھونگیر میں قیام کرنے کا موقع ملا تو یہاں کے حالات تاریخی، معاشرتی اور تمدنی وغیرہ حالات بھونگیر کے نام سے قلمبند کیے تھے۔

جیسا کہ میں نے اپنے تعلیمی ضمن میں ظاہر کر دیا ہے کہ مدرسہ دارالعلوم میں اردو کی تعلیم نہیں ہوتی تھی اس لیے میں نے باقاعدہ اردو کی ادبی تعلیم حاصل کی اور نہ مضمون نویسی کی مشق کی گئی البتہ انجمن ثمرۃ الادب اور اس کے بعد انجمن اسلامیہ میں مضامین سنائے گویا میری یہی مشق اور یہی کام آگے چل کر میرے لیے مفید ثابت ہوا۔ پہلے شائع ہونے والے مضامین "فوائد بیت بازی" اور "بیعت" ہیں۔

میری تالیفات کا آغاز ۱۹۲۳ء سے ہوا جو کتابیں اب تک شائع ہوئیں ان کے نام اور صفحات کی تعداد درج ذیل ہے۔

تاریخ و تنقید ادب

(۱) دکن میں اردو بار اول (۱۹۲۳ء) ۱۸۰ صفحات، بار دوم (۱۹۲۶ء) ۳۲۲ صفحات، بار سوم (۱۹۳۶ء) ۵۹۸ صفحات، بار چہارم ۱۹۵۲ء ۷۰۸ صفحات، بار پنجم ۱۹۶۰ء ۷۰۸ صفحات، (۲) سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری ۱۹۳۳ء ۴۴ صفحات (۳) ابجد کی شاعری ۱۹۳۳ء ۱۰۰ صفحات (۴) مدراس میں اردو ۱۹۳۸ء ۱۹۷ صفحات (۵) مقالات ہاشمی ۱۹۳۹ء ۲۹۴ صفحات (۶) دکنی ہندی اور اردو ۱۹۵۶ء ۲۵۰ صفحات (۷) دکن کے چند تحقیقی مضامین ۱۹۶۳ء ۲۰۸ صفحات۔

قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں

(۸) یورپ میں دکنی مخطوطات ۱۹۳۲ء ۱۴۲ صفحے (۹) دفتر دیوانی کے اردو مخطوطات ۱۹۳۵ء ۵۳ صفحے (۱۰) سنٹرل ریکارڈ آفس کے اردو مخطوطات ۱۹۳۹ء ۹۶ صفحے (۱۱) کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ۱۹۵۷ء ۳۴۰ صفحے (۱۲) کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات دو جلد ۱۹۶۱ء ۹۳۰ صفحے۔

تاریخ و سوانح

(۱۳) ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹۳۲ء ۱۱۶ صفحے (۱۴) تذکرہ دارالعلوم ۱۹۳۲ء ۱۲۹ صفحے (۱۵) تاریخ عطیات آصفی ۱۹۳۳ء ۲۲۲ صفحے (۱۶) جلوہ راز (بھاگ نگر کے بازار حسن کی تاریخ) ۱۹۳۳ء ۵۵ صفحے (۱۷) تذکرہ مرقع دہلی ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۵ء ۴۰ صفحے (۱۸) عہد آصفی کی قدیم تعلیم ۱۹۴۳ء ۱۸۶ صفحے (۱۹) آج کا حیدرآباد ۱۹۵۳ء ۱۱۲ صفحے (۲۰) جنگ آزادی کی کہانی ۱۹۵۸ء ۱۶ صفحے (۲۱) مولوی عبدالقادر ۱۹۶۳ء ۱۴۸ صفحے۔

نسوانیات

(۲۲) خواتین عہد عثمانی ۱۹۳۲ء ۹۸ صفحے (۲۳) خیابان نسواں ۱۹۳۵ء ۱۱۰ صفحے (۲۴) خواتین دکن کی اردو خدمات ۱۹۴۰ء ۲۹۲ صفحے (۲۵) حیدرآباد کی نسوانی دنیا ۱۹۴۳ء ۱۸۸ صفحے (۲۶) تذکرہ حیات بخش بیگم ۱۹۵۳ء ۴۸ صفحے۔

دیگر فنون

(۲۷) نجم الثاقب (فن شاعری) ۱۹۲۳ء ۱۵ صفحے (۲۸) رہبر سفر یورپ ۱۹۳۲ء ۹۰ صفحے (۲۹) فلم نما ۱۹۴۰ء ۹۰ صفحے۔
(۳۰) مکتوبات امجد ۱۹۴۲ء ۵۹ صفحے (۳۱) ذبیحہ کے ولیمہ میں ۱۹۵۵ء ۴۸ صفحے۔

زیر اشاعت کتب

(۱) یورپ میں دکھنی مخطوطات بار ثانی (۲) دکھنی کلچر۔
(۳) حیدرآباد کی تمدنی اور سماجی تاریخ۔

میرے علمی کاموں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت تاریخی رہی یا تنقیدی۔ تاریخ میں تاریخ دکن۔ تاریخ ادب۔ تاریخ زبان میرے موضوع رہے۔ عورتوں کی اصلاح کے لیے میں نے جو کام کیا ہے اس کو چار نوع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) عورتوں کے ادبی اور علمی کاموں پر تنقید کی گئی اور ان کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا تاکہ دوسری خواتین کو ترغیب اور تحریص ہو سکے۔ ان خواتین کے نقش قدم اور کارناموں کو اپنا رہبر بنائیں۔

(۲) خواتین کی معاشرتی خامیاں اور یورپ کی خواتین کی اچھی باتوں کو پیش کیا گیا تاکہ برائی سے بچ کر اچھی باتوں کی طرف توجہ کی جائے اور سبق حاصل کیا جائے۔

(۳) خواتین کو علم حاصل کرنے کی ترغیب اور مطالعہ کا شوق پیدا کرایا گیا۔

(۴) اسلامی معاشرت تاریخ اسلام میں عورت کا درجہ اسلام میں عورت کے حقوق معاشرت میں ان کی حیثیت وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی۔

(۵) عورت کو سلیقہ شعار عورت بننے کی ترغیب دلائی گئی۔

کوئی شخص اپنی علمی زندگی اور علمی کاموں کی زیادہ وضاحت کسی نہ کسی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ صراحت کر دی ہے وہ ناکافی نہیں کہی جا سکتی البتہ اب ان اصحاب کا کام ہوگا جو علمی کاموں کا تفصیلی جائزہ لیں اور جانچ کر ان کا مقام مقرر کریں۔ میں صرف یہ کہوں گا میں نے جو کچھ علمی خدمت کی ہے اگر اس کو تحقیقی علمی خدمت قرار دیا جائے یہ اردو کی محبت اور اردو کے شغف کے باعث انجام دی گئی ہے۔

خدا کو منظور ہے تو میری تصانیف سے ایک آدھ کتاب عرصہ دراز تک باقی رہ جائے گی اور دنیائے اردو اس سے مستفید ہوگی۔

جس وقت میں ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہوا میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ صاحب اولاد تھے۔ ہم سب بھائی اور ان کی بی بی بچے۔ والدہ صاحبہ کے پاس ان کے ساتھ ایک مکان میں رہا کرتے تھے اور سب کے کھانے کے اخراجات والدہ صاحبہ اپنے وظیفہ اور مکانوں کے کرایہ کی آمدنی سے ادا کرتی تھیں ایک عرصہ تک زندگی اس ڈگر پر چلتی رہی۔

جس وقت میں پیدا ہوا میرے چھوٹے ماموں (حامد صبغۃ اللہ صاحب) کی عمر دس بارہ سال کی تھی انھوں نے میرے پیدا ہونے پر میری والدہ کو کہا میں اس لڑکے کو اپنا داماد بناؤں گا۔ اس طرح یوم ولادت سے میری منگنی ہو چکی تھی جب کہ میرے ہونے والے خسر خود دس بارہ سال اور ہونے والی خوشدامن صاحبہ پانچ چھ سال کی تھیں میرے ماموں مولوی حامد صبغۃ اللہ صاحب اپنے چھوٹے ماموں حبیب اللہ

صاحب کی دختر سے بیاہ کرنے والے تھے۔ نسبت بہت عرصہ دراز قبل ہو چکی تھی بہرحال ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ میں میرے ماموں کی شادی ہوئی اور ۱۳۳۳ھ میں ان کو لڑکا اور ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء) میں لڑکی تولد ہوئی یعنی بالفاظ دیگر میری ہونے والی بیوی پیدا ہوئی اس وقت میری عمر کے چودہ مرحلے طے ہو چکے تھے۔ اس طرح میری اہلیہ عمر میں مجھ سے چودہ سال چھوٹی ہیں۔

میری شادی ۱۱ شوال ۱۳۶۱ھ کو ہوئی اور پہلا لڑکا ظہیر الدین عبد القادر ۱۹ رمضان ۱۳۶۲ھ کو تولد ہوا۔ میری اولاد میں چار لڑکیاں بھی ہیں جن میں سے دو لڑکیوں کی شادی کر دی گئی ہے اور وہ خدا کے فضل سے صاحب اولاد ہیں۔ دوسری دونوں زیر تعلیم ہیں۔

میری شریک زندگی کی طبیعت اور میری طبیعت میں اختلاف رہا جس کی وجہ سے ہم دونوں میں کبھی اتحاد اور اتفاق نہ ہو سکا۔ وہ میری انیس جلیس معین و مددگار ثابت نہیں ہوئیں میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری ان کے سر ہے اور میں ناکردہ گناہ ہوں کیونکہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی طرفین قصوروار ہیں۔ بلکہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ تر میں قصوروار ہوں۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے میں بچپن سے سلیقہ شعار رہا اپنی جگہ کو سنوار کر رکھنا ہر شے اس کی جگہ پر رکھنا۔ صاف ستھرا رہنا اچھے کپڑے پہننا میری بچپن سے عادت رہی۔ جب مجھے اپنے گھر کی حالت نظر آتی تو رنج ہوتا۔ طبیعتوں کا اختلاف بدمزگی کا باعث بنا سلیقہ شعاری وضع داری میری زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ مجھے کھانے پینے کا شوق نہیں جو مل جائے وہ کھانا میرا معمول ہے۔ البتہ لباس میں صفائی نفاست جزو زندگی ہے۔ سیماب صفتی میری زندگی کا معمول رہا جس کے باعث نقصان بھی ہوتا رہا۔ میرے چند عنوان مضامین کو یاد آ گیا۔

سیر و سیاحت

خانگی زندگی میں سیر و سیاحت کا بھی تذکرہ ہو سکتا ہے۔ میں نے قلمرو آصفی کے بڑے حصے کی سیاحت بعض دورہ کر لی ہے اس کے علاوہ بمبئی۔ مدراس کو کئی مرتبہ جانا ہوا۔ خصوصاً بمبئی کا سفر تو پندرہ سولہ مرتبہ ہوا۔ اس کے علاوہ برٹش انڈیا کے کئی مقام پونہ، بیجاپور، بنگلور، میسور وغیرہ کا سفر کیا گیا اور تقسیم ہند کے بعد کئی صوبے یعنی کیرالا۔ مہاراشٹر۔ میسور۔ گجرات وغیرہ جانا ہوا۔ کیرالا اور گجرات میں میں بھی گورنر صاحبوں کا مہمان بن کر رہا۔

دہلی۔ آگرہ۔ علیگڑھ وغیرہ جانے کا موقع ملا البتہ اب تک لکھنؤ۔ الہ آباد۔ بنارس۔ کلکتہ اور کشمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پاکستان میں صرف لاہور اور کراچی کا سفر کیا گیا ہے۔ ہند اور پاکستان کے علاوہ عراق میں بصرہ۔ بغداد۔ کربلا نجف سامرہ دیکھے گئے۔

یورپ میں انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ۔ فرانس اور اٹلی کی سیاحت کی ہے۔

دیر سفر یورپ کے نام سے یورپ کا سفرنامہ "زبیدہ کے دیس میں" کے نام سے عراق کا سفرنامہ مرتب کیا گیا۔ اب ایک اور سفرنامہ "دیس اور دیار غیر میں" کے عنوان سے ایک رسالہ میں شائع ہو رہا ہے۔

دوست احباب

میرا حلقہ احباب نہایت وسیع رہا ہے اور اس میں ہر فن کے اصحاب شامل ہیں۔ مثلاً انجینئر۔ ڈاکٹر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ پروفیسر۔ ادیب۔ شاعر۔ رنگین مزاج۔ خوش باش۔ تجار۔ وکلاء۔ وغیرہ میرے خیال میں اس طرح کے مختلف طبقے کے احباب کا حلقہ احباب دشوار ہوتا ہے۔ جس طرح میرے دوستوں میں مختلف الخیال اصحاب شامل ہیں۔ دوستوں کے لیے آسان نہیں ہے۔

گو یہ واقعہ ہے میرے زیادہ قریبی دوست وہ ہیں جو ادیب یا شاعر نہیں ہیں۔ اس طرح جنس نازک میں میرے دوستوں کا سلسلہ

وسیع ہے اور یہ امر قابل اظہار ہے کہ وہ میری طبیعت اور میری دوستی کی قدر کرتی ہیں اور میری دوستی پر تاسف نہیں کرتیں اور افسوس کرنے کا موقع نہیں ہوتا۔ جب تک حکومت آصفیہ قائم رہی۔ اس کے اعلیٰ و اوسط طبقہ سے راہ و رسم رہی۔ اسی طرح حکومت حیدرآباد ہی جانے پر یہ سلسلہ رہا۔ خانگی زندگی کے ضمن میں اپنے اخلاق یعنی کردار کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اپنے کردار کی وضاحت کوئی آسان امر نہیں ہے۔ مگر صرف چند باتوں کی صراحت کروں گا۔ میں اپنے وعدہ کی سختی سے پابندی کرتا ہوں۔ میرے دل میں کسی کا کینہ نہیں رہتا مجھے منافقت پسند نہیں جلد بازی میری عادت ہے میرا دل بچوں کا سا ہے جن کے دل میں کوئی تفکرات نہیں ہوتے۔

میری رنگین زندگی

رنگین زندگی کو دوسرے الفاظ میں عیش و طرب۔ سرور و نشاط کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ اپنی رنگین زندگی کے متعلق سنہ ۱۳۴۴ھ میں میں نے جن الفاظ میں صراحت کی تھی اس سے یہاں ابتدا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

" جس انسان کی طبیعت مناظر قدرت کی قدر داں ہو۔ سبزہ زار۔ آبشار۔ گل و گلزار کو پسند کرتی ہو۔ پھول پتوں میں نیرنگ قدرت کا تماشہ دیکھتی ہو۔ حسن پسند ہو۔ اللہ جمیل یحب الجمال کی دلفریبیوں سے واقف ہو اس کے لیے پرندوں کی آواز بھی موسیقی بن جاتی ہے۔ وہ موسیقی کا قدرداں۔ موسیقی کا دلدادہ ہوتا ہے اس کے دل پر موسیقی سے ایک پرکیف اثر ہوتا اور خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جلسہ ہائے طرب و نشاط اُسے پسند ہوتے ہیں۔ چند روزہ زندگی ہنس بول کر خوشی اور مسرت کے ساتھ بسر کرنی عطا ہوتی ہے۔ رقص و طرب کے جلسے انسان کے دل سے غم کو دور کرتے فکروں سے آزاد کرتے ہیں۔ جس انسان کا دل فکر و افکار سے معمور ہو متاثر ہو۔ اختلاج قلب کا بیمار ہو اس کے لیے کوئی دوا کارگر نہیں ہو سکتی صرف موسیقی ہی بہترین دوا ہو سکتی ہے۔

ان حالات کے تحت کوئی موسیقی طرب و نشاط سے بہرہ اندوز ہو تو اس کو نشان ملامت نہیں بنایا جا سکتا "!

یہ وہ صراحت ہے جو آج سے چالیس سال پہلے میں نے اپنی رنگین زندگی کے متعلق کی تھی اب اس کی تفصیل کرنی ہے یا روداد سنانی ہے۔ تشریح کرنی ہے، وضاحت لکھنی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپ بیتی لکھنے والے کا قلم حجاب کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی رنگین داستان کو پبلک سے پوشیدہ رکھنے کا متمنی اور پردہ اخفا میں رکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے اور میں بھی اس کو افشا کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ البتہ کچھ اشارے کیے جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ چوبیس پچیس سال تک میری زندگی میں عورت داخل نہیں ہوئی اگرچہ والد کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا مگر والدہ کی کڑی نگرانی ہم پانچوں بھائیوں پر ایسی سخت تھی کہ کسی کا قدم لغزش نہیں کر سکا اور ناچ رنگ اور جنسی لذات تو خیر حد یہ ہے کہ تھیٹر کا تماشہ دیکھنا بھی ناممکن تھا چوبیس سال سے پہلے صرف ایک دو مرتبہ میں نے تھیٹر کے دن کے کھیل جو دن میں ۲½ بجے سے شروع ہوتے تھے با اجازت والدہ مدرسہ کے طلبہ کے ساتھ دیکھے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بچپن کی زندگی کس طرح گزارا ہوں یا لذات جنس سے کس طرح پاک گزری۔ یہ صحیح ہے کہ چند شادیوں میں جو دوستوں کی تھیں طوائفوں کا گانا سننے کا اتفاق ہوا تھا مگر وہ بھی زیادہ قریب سے نہیں اور نہ کسی طوائف سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے کوٹھوں پر جانے کا تو کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا اور نہ اس کی جرأت ہوتی تھی۔

ملازمت کے بعد جب سے دوستوں کا اضافہ ہوا اور نوجوان دوستوں یا تجربہ کار ان جنسیات کی صحبت میسر ہوئی تو پھر ہمارے قدم کو بھی لغزش ہونے کی نوبت آ گئی۔ اس وادی پُر خار کی دشت پیمائی میں پہلے پہل کوٹھے پر جا کر گانا سننے اور ہاتھ سے روپیہ دینے سے ابتدا ہوئی۔

کہتے ہیں کہ "جوانی دیوانی" اس زمانہ میں اکثر جوان اپنے سن رشد ہی سے جنسی لذات میں منہمک ہو جاتے تھے مگر والدہ کی نگرانی کے باعث مجھے ایسا موقع نہیں ملا۔ چوبیس سال کے بعد جب اس کا موقع ملا تو ظاہر ہے کہ دل کی ہوس نکالنے کے لیے شدید تقاضے تھے۔ ملازمت مل چکی تھی۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ ماہوار تنخواہ سے جو آمدنی ہوتی وہ صرف ہمارے ذاتی اخراجات کے لیے تھی۔ کھانا پینا والدہ کے پاس مفت تھا۔ اس لیے طوائفین کی تصنع آمیز زندگی۔ بیگمات کی عیاشانہ طبیعت۔ "مرلیوں"[1] کی جھوٹی پارسائی کا کسی قدر تجربہ ہوا۔

یورپ کی روانگی کے وقت میری عمر کے چونتیس مرحلے طے ہو رہے تھے میری شادی ہو کر ایک لڑکا تولد ہو چکا تھا اور اس کی چار سال عمر تھی۔ تسمیہ خوانی کر کے میں انگلستان کے سفر پر روانہ ہوا تھا میرے اکثر دوستوں کو اس کا گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ میں نے یورپ کی رنگین فضا اور عیش و نشاط کے بے پایاں سامانوں میں خوب ہاتھ رنگے اور داد عیش دی تھی لیکن بمصداق "بد اچھا بدنام برا کا حال ہے" اور اگر میں یہ کہوں کہ صنف نازک کے مخصوص طبقہ (جو اپنے بستر کے کرایہ سے روزی پیدا کرتی ہیں) کے سوا میں نے کسی سے تمتع حاصل نہیں کیا تو شاید یقین نہ کریں مگر یہ واقعہ اور حقیقت ہے۔

اس کے ساتھ میرا یہ بیان بھی پیش نظر رہے کہ مجھ میں جرأت کا فقدان رہا ہے اور مجھے بزدل بھی کہا جاتا رہا ہے اس کے علاوہ جو باتیں یورپ کی عورتیں جنسی کشش کے لیے ضروری تصور کرتی ہیں یعنی دولت مندی۔ مردانہ قوی جسم اور خوبصورتی یہی امور یہاں بھی عورتوں کے پیش نظر رہا کرتے ہیں۔ اس لیے میرا بیان قابل نظر انداز نہیں ہے البتہ چند عورتیں جن کو تعداد کی زیادہ حرص نہیں یا بعض خاص وجوہ سے وہ زیادہ دولت کی خواہاں ہیں ایسی دو چار عورتوں کے عشرت خانوں میں بار حاصل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور انکار کروں تو صداقت کا بطلان ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ اس امر کا بھی خیال رہے کہ جن دو چار سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ میدان عیش فضا کی نومشاق نہیں بلکہ بڑی حد تک شہسوار بھی جا سکتی تھیں غرض کہ یہ ہے میری رنگین زندگی کی مختصر سی داستان۔

میں نے اپنی ملازمت سے پنشن لینے کے بعد یعنی سنہ ۱۹۵۰ء میں جو حالات قلمبند کیے اور ہنوز مکمل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ڈھائی تین سو صفحوں پر مشتمل ہیں اس کا یہ لب لباب ہے۔

ادراک حال ما ز نگہ می تواں نمود
حرفے ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

---

[1] دکن میں مرلی اس عورت کو کہا جاتا تھا جس کی شادی نہیں ہوتی اور دیوداسی کہی جاتی ہے۔

منظور الٰہی

بزم خاص است درو نقطہ بدستور بیار
معنی دُور طلب کن سخن دُور بیار

وقت اور حادثات ہماری شخصیت پر تعمیری اور تخریبی تجربے کرتے رہتے ہیں، ہر لمحہ ہم کچھ کھوتے اور کچھ پاتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا حقیقی طور پر ہم بدل بھی جاتے ہیں۔ شاید یہ یقینی طور پر کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے . . . . لیکن وقت گزر جاتا ہے۔ وقت نہیں بلکہ ہم خود گزر جاتے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے۔

میں خود اس راستے سے گزرا ہوں بلکہ وہ شخص گزر گیا جسے میں جانتا تھا۔ پھر اُس خاک سے اک اور ہستی نے جنم لیا جو مجھ سے تکلیف دہ طور پر مختلف تھی جیسے کوئی اجنبی ہو۔

یہ ۱۹۳۶ء کا فیروز پور ہے، وسیع و عریض بنگلے کے سامنے والے بڑے لان کو نیم دائرے کی شکل میں جامن کے گھنے درختوں نے ہالے میں لے لیا تھا، ساتھ ہی سارا گڑھی کا باغیچہ تھا جہاں توپیں بھی نصب تھیں۔ یہ جگہ اُن جوانوں کی یاد میں تعمیر کی گئی تھی جو مُدکی اور سبراؤں یا سکھوں کی پہلی اور دوسری جنگ میں کام آئے تھے۔ اُن آدمیں دنوں میں علامہ اقبال کی طویل نظم "شکوہ" کہیں سے ہاتھ لگ گئی اور چند بار پڑھنے سے ازبر ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ تلفظ غلط ہو گا اور معنی سے ناآشنائی، سات سال کی عمر کیا عمر ہوتی ہے لیکن اس تعارف کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ علامہ سے ایک لافانی رشتہ قائم ہو گیا اور زندگی کے مختلف مدارج میں اپنے ذہنی ارتقا کے مطابق کلامِ اقبال معنوی اور جمالیاتی طور پر مختلف نظر آیا اور اُس گل چینی نے ہر بار قندِ مکرر کا مزا دیا۔

کبھی کبھار ریل کی پٹڑی پر پہنچ جانا ایک دلچسپ مشغلہ تھا، کسی نے بتلایا کہ اگر انجن گزرنے سے پہلے تانبے کا پیسہ پٹڑی پر رکھ دیا جائے تو بہت چوڑا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ آزمایا گیا، واقعی پیسہ بہت پھیل گیا لیکن پھیلاؤ بے ہنگم تھا اور بھدا۔ اس کے بعد پٹڑی پر کنکریاں رکھی گئیں تو ریزہ ریزہ ہو گئیں، اب حوصلے بہت بڑھ گئے چنانچہ تیسرے روز بڑے بڑے مدوّر پتھر پٹڑی پر رکھ دیئے گئے۔ انجن کے پہیئے اُن پر سے گزرتے ہوئے خوب اُچھلے اور ہم نے تالیاں پیٹ کے زبردست قہقہہ لگایا لیکن آخری ڈبے میں گارڈ کا غضب ناک چہرہ نظر پڑا جو دانت پیس کے مُکّہ دکھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "پھر ایسا کیا تو یاد رکھنا ہاتھ توڑ دوں گا۔"

سخت گیر باپ اور شفیق ماں کا اشتراک ایک بے خوف دُھن کا پکّا، والۂ دُنیا اور انسان دوست ایک سچائی اور سادگی کی تصویر، ریا اور منافقت کے خلاف برسرِپیکار "لینا اک نہ دینے دو۔"

والد کے ملاقاتیوں کا آنا جانا، خطوط کے پلندے، دوستوں کا ہجوم، پارٹیاں، موٹر، سول لائنز لائل پور میں وسیع بنگلہ اور متوسط طبقہ کی آسودگی، ماں باپ کے زیرِ سایہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں بہت سی چیزیں دیکھ ڈالیں۔ قدرت نے اپنے بہترین تحفے بن مانگے دے دیئے تھے۔

عمر کے اولین سال ابا کے رعب تلے گزرتے رہے۔ اُن دنوں ابا کی طبیعت میں بہت "جلال" تھا۔ اُن کے سامنے جاتے ہوئے خوف آتا تھا اور ہم دونوں بھائی ابا کے دورہ پر جانے کی دُعائیں مانگا کرتے تھے کیونکہ اُن کی غیر حاضری میں کافی آزادی ملتی، امی کے التفات سے سینما کا شوق پورا ہو جاتا اور فتح علی مبارک علی کی قوالی سننے کا گاہے ماہے موقع مل جاتا۔ آہستہ آہستہ ابا اور ہم دونوں بھائیوں کے درمیان یہ جذبہ معدوم ہو گیا اور اُس کی جگہ دوستی نے لے لی جس میں مذاق بھی تھا اور چھیڑ بھی۔ اب رعب کی جگہ دل میں اُن کے لیے محبت اور عقیدت تھی۔

کلامِ اقبال نے سوزِ دروں بخشا۔ ایک بے کیف زندگی کو جلا بخشی۔ میری جوانی کی راتیں اس کے سوز و ساز اور جذب و مستی میں بسر ہوئیں۔ اُن کی طویل نظمیں سینے میں محفوظ ہو گئیں۔ اللہ وحدانیت، عشقِ رسولؐ، اسلام کی عظمتِ پارینہ، آدمیت احترامِ آدمی، قوتِ نفس، آرزو، استقلال۔ میں نے اپنا دیا اُس شمع فروزاں سے روشن کیا۔ علامہ کے احسانات سے گردن زیرِ بار ہے۔ اس مرشد روشن ضمیر کے طفیل زندگی کے رنگیں نکتے مجھ پر روشن ہوئے۔

پھول اخبار سے لے کر ادبی دنیا، ہمایوں اور ساقی تک، دارالاشاعت کی مطبوعات سے لے کر دورِ حاضر کے ادب تک بہت سے رسالے بہت سی کتابیں میری رفیق ہوئیں۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی اور راشد الخیری کے المیہ ناول، منشی پریم چند کی کہانیاں، ڈپٹی نذیر احمد کے کردار، عظیم بیگ چغتائی کا مزاح، شفیق الرحمٰن کے افسانے، حفیظ کے گیت، جوش کی نظمیں، اختر شیرانی کی رومانوی شاعری، ندیم قاسمی، فیض اور راشد کی کتابیں یہ سب اس راستے میں بکھری پڑی ہیں جو میں چل کے آیا ہوں۔ وہ راستہ اب بھی آباد و شاداب ہے، اگرچہ کئی سال گزر گئے لیکن وہ گلستاں پُر افشاں ہے۔

کرنیں، اور یہ شگوفے، میرے عنفوانِ شباب کے ساتھی، اُن کی خوشبو اب تک ذہن میں بسی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی چیزیں تھیں جو مجھے اچھی لگیں۔ میں نے انہیں ناقدانہ انداز سے نہیں دیکھا تھا، وہ عمر ہی ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے اُن کرداروں سے اُنس تھا، اُن کے ساتھ یگانگی کا احساس تھا، شاید اُن افسانوں میں میں وہ بے لوث محبت ڈھونڈتا تھا جو مجھے حاصل نہ تھی اور یہ سوال رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج جاتا۔ پس منظر یہی ہے، وہ میانہ طبقہ کی آسودگی، وہی ڈرائنگ روم اور گرمیوں پہ پہاڑ پہ چلے جانا۔ پھر اس محرومی کا سبب؟ میرے سینے میں یہ خواہش بیدار ہوتی اور ناقابلِ برداشت بن جاتی کہ کوئی مجھ سے بھی پوچھے تم تنہا اور اداس کیوں ہو، دو بولوں سے اپنائیت ٹپکتی، نگاہوں سے جھلکتی۔ کوئی حسینہ محرمانہ انداز میں اپنی سہیلی سے سرگوشی کرتی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ محبت کے معنی میرے لیے سربستہ راز ہے اور جذبات کا دھارا رستہ نہ پاتے ہوئے لوٹ کے آتا رہا، احساسِ محرومی دل پہ شبخون مارتا رہا۔ اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شخص جس نے ذہنی کرب سہا جو اُلجھنوں میں پڑا رہا۔ کوئی اور تھا، مجھ میں اور اُس میں مماثلت کم اور اختلاف زیادہ ہے۔

میں ایسا ذہین طالب علم بھی نہیں تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہی بتلایا گیا کہ میں بہت قابل ہوں اور میرے لیے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان

میں کامیاب ہونا کوئی مشکل نہیں۔ آئی۔ سی۔ ایس اُن دنوں ایک کامیاب زندگی کا معراج تصور ہوتا تھا۔ مجھے تعجب ضرور تھا کہ عزیز میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں اور جب محض اتفاق سے ایم۔ اے کے امتحان میں میں نے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کر لی تو لوگوں کی خوش فہمی علم الیقین کی صورت اختیار کر گئی۔

یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کوئی اگر مجھے کہتا کہ میں جلد خاکی وردی پہن لوں گا تو میں کھلکھلا کے ہنس دیتا لیکن چھ سال خاکی وردی میرے بدن سے چمٹی رہی۔ امیدِ حق پالش اور نشاستہ کے چھ سال ہیں جیسے بڑے تماشے اہلِ کرم دیکھتا رہا۔ چاہے وہ دہلی اور بمبئی کے دفتروں میں ہو یا شمالی برما کی دقّو پہاڑیوں میں جہاں ایک آئرش کرنل کے ساتھ زندگی کے وہ پُرسکون دن گزرے تھے۔ جنگ کے شعلے سرد پڑ رہے تھے۔ ایسے میں معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا لیکن برما کے سبزہ زار ہنوز حسین تھے۔ انہی دنوں دہرہ دون اور شملہ کی امتحان گاہ میں ایک زبردست FLUKE ہوا اور میں نے خاکی وردی پرانے کوٹ کی طرح اتار کے پھینک دی۔ میں نے ٹیسٹ کے لیے جانے سے پیشتر امی سے کہا تھا۔ "امی! میں تو آپ کو ملنے کے لیے بہانے آگیا، ورنہ دو سو بڑی عرضیاں ہیں۔ میں بھلا کس گنتی شمار میں ہوں۔" اور امی نے امتحان لینے والوں کو بے شمار صلواتیں سنا ڈالی تھیں۔

جب سول سروس کا بلاوا آیا تو کرنل نے کہا: "میرے عزیز ضلع کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ضلع کی پرابلمز سے تم جھلی ہو جاؤ گے۔"

لیکن فرض کی لگن کا تقاضا تھا کہ اس صدا پر لبیک کہا جائے۔ گوشہ ہائے عافیت تو اور بھی تھے لیکن یہ صدا سب کی قسمت میں نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

- - - - - - - - - - - -

آتشدان پر حشمت کی تصویر دیکھ کر "عمرِ رواں کا ایک ایسا لمحہ یاد آجاتا ہے جس کی دلفریبی ہاتھ میں آ کے نکل گئی تھی۔ ایک لمحہ جو پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کی طرف اُڑ گیا تھا۔" زیریں ہونٹ کا لطیف جھکاؤ اور وہ مسکراہٹ جس میں دانتوں کی لڑی صاف نمایاں ہے۔ اس معصوم لڑکی کے چاہِ غبغب تصویر میں بھی نہیں چھپتے —— تخیل ایک لمحہ کے لیے پھسل نہ بیٹھنے والی حشمت ہنسی میں بے تکلف ہو گئی جیسے کوئی کانچ کی گولیاں سنگِ مرمر کے فرش پر انڈیل دے اور وہ لڑھکتی جائیں، لڑھکتی جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ حشمت سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۰ء کے موسمِ بہار میں ہوئی تھی۔ نہر کے پار جو بنگلوں کی قطار ہے وہاں کسی صاحب سے ملنے گیا تو ان کی بیگم نے تعارف کرایا: "ان سے ملیے میری چھوٹی بہن لکھنؤ سے آئی ہیں۔" بڑی بڑی آنکھیں، تنگ ماتھا اور گُندھی ہوئی ملاحت، آداب آداب کے بعد اردو ادب پر جو بات شروع ہوئی تو ختم ہونے میں نہ آئی۔ بلا کا حافظہ تھا اس لڑکی کا۔ بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ استاد مان لیا۔

موسمِ گرما کے بے کیف دنوں میں کئی شامیں اس کی رفاقت میں بسر ہوئیں، وہ شامیں جو حشمت کے ادبی ذوق اور لطیفہ گوئی کی آئینہ تھیں۔ جب کبھی اردو ادب کے لطیف پہلوؤں پر بحث چھڑ جاتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ اقبالیات، جگر، حسرت، اصغر، فانی، جوش، مجاز، جذبی اور اختر الایمان ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی شام کو صحنِ چمن میں کرسیاں نکلوا لی جاتیں، خنک چاندنی مہرباں ماں کی طرح مسکراتی ہوا کے جھونکے بکھیر دیتے ۔ ۔ ۔ ۔ اور باتوں کی پھلجھڑی بھی، بھولی بسری باتیں، گاؤں میں بچپن کے دن، علی گڑھ کی نمائش کے قصے اور لڑکوں کی شرارتیں۔ اس کی باتوں میں بے پناہ روانی تھی اور انداز میں شگفتگی۔ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذاق کی

مسلسل کوشش رہتی، ہلکا پھلکا لطیفہ اس انداز میں بیان کرتی کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی آجاتا۔ "بزرگ کہتے ہیں اگر ہنستے ہنستے آنسو نکل آئیں تو وہ شخص مخلص ہوتا ہے۔" وہ تحسین آمیز لہجہ میں کہتی۔

دن اور ہفتے کیسے گزر گئے کچھ یاد نہیں۔ باتیں جو ختم ہونے میں نہ آتیں، ساعتوں کو پر لگ جاتے اور گھڑی دیکھ کے ہم دونوں چونک اٹھتے . . . . اب میں سوچتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ جہاں بھی ہوگی اپنی باتوں سے محفل کو زعفران زار بنا رہی ہوگی؟ وقت نے اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا؟ گردش ایام نے اسے پیس دیا یا ایک شفیق ماں کی طرح اپنے دامن میں پناہ دی۔ وہ لڑکی جس کے قہقہوں میں نقرئی گھنٹیاں بجتی تھیں، جو زندگی سے بھرپور تھی اور وہ گزرتے ہوئے لمحوں سے حظ اٹھانے کی حس جسے فرانسیسی اس اچھوتی ترکیب ژوا دو ویور (JOIE - DE - VIVER) سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی سے ہر ممکن حظ اٹھانے کا والہانہ شوق جو ارزاں تعیش تک محدود نہ ہو۔ جس میں اتوار کی ایک سہانی صبح کو تنہا سائیکل سوار ہو کر مرغزاروں میں پناہ ڈھونڈنا ممکن ہو جس میں انجانی جگہوں کا کھوج لگانا اجنبی لوگوں کی حسیات جانچنا اور رنج و راحت کی تانوں میں ان کے دلوں کی دھڑکنیں سننا بھی شامل ہو، جس میں ہم نفس اور ہم مشرب دوستوں کے ساتھ وقت کے بے رحم جبڑوں سے چھینے ہوئے فرصت کے لمحات کو وہی اہمیت دی جائے جو فانی انسان دولت اور شہرت حاصل کرنے کو دیتا ہے تو ژوا دو ویور کی حس اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

لیکن میں متذبذب ہو گیا۔ دماغ نے دل کی ایک نہ سنی۔

"بہت شوخ و شنگ ہے۔" میں نے سوچا تھا "وہ میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔" وہ میرے رویے سے مایوس سی ہو گئی۔ ایک شام اس کے یہاں ڈنر تھا تو وہ اپنی پلیٹ لے کے میرے پاس آگئی جس میں چکن روسٹ کا ٹکڑا تھا

"آیئے منظور صاحب WISH BONE توڑیں۔" میں نے جو WISH BONE توڑی تو اس کے حصے میں کچھ نہ آیا۔

میرے دامن میں نہ کانٹے ہیں نہ کلیاں نہ غبار

وائلٹ نے آخری خط میں لکھا تھا:

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ لوگ برائیاں یاد رکھتے ہیں اور اچھی باتیں طاق نسیاں کی زینت ہو جاتی ہیں تو تم میرے متعلق اچھی باتیں سوچنا اور میری خامیاں درگزر کرنا . . . . اور خدا کرے تمہیں اپنے ملک میں ایک محبت کرنے والی بیوی نصیب ہو جو تمہیں سمجھ سکے اور اللہ تمہیں پیارے پیارے بچے عطا کرے اور تم ننھی جانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اپنا غم بھول سکو۔ میں سوچتی ہوں بچوں کے چھوٹے چھوٹے پرابلمز میں کھو کے ہم اپنا دکھ بھول جاتے ہیں۔"

جسے میں کھلنڈری سمجھتا تھا، اس نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔ انجانے رستوں پر چلتے چلتے ہم لمحہ دو لمحہ کے لیے ملتے ہیں اور پھر اپنی اپنی ڈگر پر ہو لیتے ہیں اور وقت کا بے پناہ خلا ہمیں جذب کر لیتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے؟

بہت سال بعد میں نے ایک دوست کو جو گو مگو کی حالت میں تھا خط میں لکھا تھا: "شاید تم عورت کی ماہیت کے متعلق بہت سوچتے ہو۔ کیا وہ آئیڈیل بیوی بن سکے گی؟ کیا وہ میری پرواز تخیل کا ساتھ دے سکے گی؟ اس نے پہلے کسی مرد کو تو نہیں چاہا؟ وہ ہمیشہ مجھے ایسا ہی چاہے گی جیسے تر و تازہ شبنم آلود پھول کو چاہا جاتا ہے، یا وہ بھی ان بے شمار بیویوں میں سے ایک ہو کے رہ جائے گی جن کا مقصود حیات ایک اچھی روایتی زندگی، کیا اس کی پرواز بھی ایک سمارٹ کار اور نفیس کپڑوں پر جا کے دم توڑ دے گی؟ میرے دوست تم بھولتے ہو کہ زندگی تمام رنگین برستی شام ہی نہیں اور نہ گرم تنفس کا لمس ہمیشہ جادو جگا سکتا ہے۔ بیوی تمھاری دوست ہے، دمساز اور رفیق ہے۔ کب تک اس کے بالوں میں آبدار موتی پروتے رہو گے۔

دارد جمالِ روئے تو امشب تماشائے دگر

کی کیفیت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، تمھیں جمالیات سے ماورا جانا ہوگا اور اس اکتا دینے والی یکسانیت کا مقابلہ کرنا ہوگا جس کا نام زندگی ہے۔ زندگی کی حلاوت سستے داموں نہیں ملتی۔

اگر تم آئیڈیل کی تلاش میں ہو تو اسے ہونے والی بیوی میں نہ ڈھونڈنا، اگر پا بھی لو گے تو کچھ عرصہ بعد سوچو گے کہ شاید دھوکا ہوا، شاید سراب تھا، حالانکہ اس لڑکی میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو تم نے چاہی تھیں، مسلسل رفاقت رومان کا رنگ و حسن لوٹ لیتی ہے۔

کسی پارٹی میں فرانس کے سابق وزیر اعظم ماندے فرانس سے کسی خاتون نے پوچھا:

"موسیو آپ ساری عمر ناکتخدا رہے؟"

"مادام! میں ایک آئیڈیل عورت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔"

"پھر؟"

"بالآخر مجھے ایسی عورت مل گئی۔"

"تو اس سے شادی . . . ."

"جی وہ خود ایک آئیڈیل مرد کی تلاش میں تھی!"

زندگی تھکن سے بوجھل ہو چلی تھی۔ یوں تو زندگی خود ایک بار ہے لیکن ایسے دن بھی آئے کہ یہ گراں باری دردِ سر بن کے رہ گئی۔ افسردہ شامیں طویل راتوں میں ڈھلنے لگیں، ایسا بھی ہوا کہ معمولی سانحے میرے لیے ٹریجیڈی بن گئے۔ میری ہستی سیل کی زد میں رہی لیکن سیلاب آتے اور گزر جاتے، مہینے سالوں میں ڈھلتے رہے اور سال ایک غیر محسوس تسلسل کے ساتھ گزرتے رہے۔ وقت کی رفتار کون روک سکتا ہے؟ پھر زندگی کے افق پر ایک تابناک ستارہ طلوع ہوا، وہ بڑی بڑی پُرمحبت آنکھوں نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں: "تم تو یوں ہی اداس ہو گئے۔ محبت کے سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے"۔ میں نے پھر نظر اٹھائی تو اس نے ایک اور روپ دھار لیا تھا: "میں تمھارے بالکل قریب تھی، ذرا بھی کوشش کرتے تو مجھے پا سکتے تھے"۔ میں تو دلدل میں پھنسا ہوا تھا جتنی کوشش کرتا اتنا اور دھنس جاتا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا، اس کی نظروں میں پیار کی گھلاوٹ تھی، میں اپنے زخم بھول گیا اور میں

سنہری کرن کے تعاقب میں ہو یا جواں مہربان آنکھوں میں جلوہ گر تھی ــــ اک جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں!

زہرا چپکے سے میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی،

شادی کے اولین دن بھی خوب تھے، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مدت سے ہم اک دوسرے کو جانتے آئے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ مدین میں بھی پہاڑوں پر تازہ گری ہوئی برف دھوپ میں چمک اٹھتی، دریائے سوات کا مسلسل نغمہ "فردوسِ گوش" بن جاتا اور بکھرے پل سے کسمساتی، شور مچاتی موجیں دعوتِ نظارہ دیتیں۔ ہم نے آغازِ بہار کی نرم اور مہربان دھوپ میں ساحل کے منجمد کنارے پر جھاگ اڑاتے ہوئے دریا کو دیکھا اور کبھی چاندنی رات کے بیکراں حسن میں بہتے ہوئے دور نکل گئے۔

مدین کی وہ خوبصورت شام مجھے خوب یاد ہے، جب کف در دہاں موجیں پتھروں سے ٹکرا کر ایک مترنم شور پیدا کر رہی تھیں۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں گم تھے کہ زہرا نے جھک کے سرگوشی کے انداز میں کہا: "اگر میں نے تمھاری محبت پالی تو مجھے سب کچھ مل گیا۔" اس کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی اور آواز میں تھرتھراہٹ جیسے ستار پر شوخ کے بول ہوں اور مجھے احساس ہوا کہ اس نے کتنی عظیم بات کہہ ڈالی ہے اور میں نے سوچا تھا کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ میری زندگی میں چند سال پیشتر آ جاتی۔ کسی چور دروازے سے ان دیکھے داخل ہو جاتی۔ نکہت کی مانند۔ اور میں شبستاں کے حریری پردے کھینچ دیتا اور ظلمتوں سے کہہ دیتا کہ اب یہاں ان کا گزر ممکن نہیں۔

تا منزلِ جاناں ساتھ رہا کم بخت تصورِ غیروں کا
شوق اپنا قدم کھینچا ہی کیا پیچھا ہی کیے ہر گام سے ہم

اس تک پہنچنے کے لیے میرے قدم کئی بار ڈگمگائے، کئی بار میں نے مڑ کے دیکھا کہ کہیں راستہ تو نہیں بھول گیا اور کیا مجھے ان پُراسرار گلیوں میں تو نہیں جانا تھا جو میرے دائیں بائیں بکھری تھیں۔

اب جو میں نے سنہرے دھندلکوں کو پا لیا ہے تو سوچتا ہوں کہ ایک عورت کی محبت جیت لینے کے بعد کوئی ہوس باقی نہیں رہتی۔ ہم مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے اس بحرِ بیکراں کی تھاہ پا لی جسے زندگی کہتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ زہرا کو خط میں لکھا تھا:

"تم بنتِ عم ہو جس نے محبت کی اور اسے دل میں دفن کر دیا۔ تم وہ لڑکی ہو جسے میں نے "والکینو" (VOLCANO) کے خطاب سے نوازا، تمھاری وفا اس ذات کی یاد دلاتی ہے جو اس لفظ سے ناآشنا تھی، تم سب کچھ ہو اور کچھ بھی نہیں کہ دوئی کا حجاب درمیان سے اٹھ چکا، تمھاری محبت میں صہبا کی تندی نہیں۔

تکلم آتش فشاں کی حدت نہیں، ستاروں بھری رات کی آسودگی ہے . . . .

جب زمان و مکاں کی حدود مٹ جائیں اور چشمِ بصیرت وا ہو جائے، جب ہم اپنا جسمانی لبادہ کینچلی کی طرح اتار پھینکیں تو انسان دوستی کا وہ خواب یاد کرنا جو ہم نے اکٹھے دیکھا اور ان رفعتوں کو آواز دینا جو ہم نے ہاتھوں میں ہاتھ دیے طے کیں اور جن تک از خود پہنچنا حیطۂ امکان میں نہ ہوتا۔"

یوں تیز رفتار وقت گزرتا رہا۔ میں اپنے گرد و پیش سے تاثرات قبول کرتا رہا، اثبات رد کرتا رہا، کبھی عزیزوں کی جستجو ہوتی اور کبھی آسودگی اور بے دلی کا احساس، زندگی کی نعمتوں کو میں نے اپنانا چاہا اور نہ اپنا سکا، ہر وہ شے جسے خوش قسمتی اور کامرانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے عظیم جد و جہد کے بغیر ودیعت کر دی گئی جو کسی کے لیے معراجِ کمال ہوتا میرے لیے گنجِ بادآورد تھا۔

میں نے اپنے چراغ کے لیے دوسری شمعوں سے روشنی مستعار لینا عار نہیں سمجھا بلکہ اس میں کوشاں رہا ——— کبھی مقبول کی بے غرضی مشعلِ راہ بنی تو کبھی شہاب کی انسان دوستی، پھر اک وقت ایسا آیا جب ساری کائنات کے نقشے حقیر نظر آنے لگے اور میں بلند ہوتا چلا گیا۔ مجھے لگا میں کہکشاں چیرتے نکل گیا۔ اس میں کبر نہ تھا کبریائی تھی۔ اس میں اس انسان کا غرور تھا جس کا خمیر الوہیت سے گندھا گیا

من آں روز بودم کہ اسما نبود
نشان از وجودِ مسمّیٰ نبود

اب دل ایک لبریز پیالہ تھا جس میں مزید گنجائش نہ تھی۔ ایک قطرہ بھی زیادہ ہوتا تو ساغر چھلک جاتا۔

لیکن ان رفعتوں سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ بے نیازی اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی زیب دیتی ہے۔ کوئی حسرت باقی رہ جانی چاہیے، کسی خلش کسی چبھن کے بغیر زندگی زندگی نہیں ؎

دردِ دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

بہت عرصہ نہیں ہوا مقبول بھائی نے ایک خط میں لکھا تھا۔

”زندگی بے کیف ہو گئی ہے، زندگی میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی، میں نے یاس کی گہرائیاں چھو لی ہیں“ مقبول یہیں چوک گئے، کامیابی و ناکامی، فتح و شکست آنی جانی چیز ہے۔ مقبول جو دوسروں کے کام کرنے اور بگڑی سنوارنے میں اتنا مشہور تھا۔ آج زندگی سے ہار مان رہا تھا، کیا اس نے دوستوں سے توقعات وابستہ کی تھیں جو پوری نہ ہوئیں؟ توقعات کبھی پوری نہیں ہوتیں لیکن اس سے زندگی تو ختم نہیں ہو جاتی، زاہد حسین مرحوم نے اپنی بیٹی کو نصیحت کی تھی:

”بیٹا! جس دن تم نے زندگی سے ہار مان لی اس روز سب کچھ کھو گیا۔“

لیکن زندگی کے عطایا بے حساب ہیں، خود انسان ہی تنگ داماں ہے۔ ایک دفعہ ٹوکیو کے ہوائی اڈے سے پرواز کرنے کے بعد جہاز ابھی پوری بلندی پر پہنچ نہ پایا تھا کہ بڑی شدت کے ساتھ مجھ پر یہ احساس طاری ہوا ——— جیسے کوئی الہام ہو رہا ہو۔ خدا کی زمین خوبصورت ہے، اس پر پیارے لوگ بستے ہیں، ہر غم و اندوہ کے باوجود زندگی ناگوار کیسے ہو سکتی ہے، زندگی کے بھرپور خزانے بے انت ہیں۔ انسان کتنا ہی دکھی کیوں نہ ہو جائے، مصیبتوں کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑیں، پھر بھی بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے، ہمیں اپنے آپ سے محبت کرنا چاہئے اور دنیا کے ساتھ بھی۔ . . . . . .

. . . .

عنفوانِ شباب میں ہر شے حسین معلوم ہوتی تھی۔ بہاروں اور امکانات کی دنیا تھی، اس سے آورش کو تجسیم بخشنا ممکن تھا، ایک سندرتا، اک چہرے کے خد و خال، ایک حسین منظر آورش سے ممکن ہے، دراصل وہ جذبۂ شوق کے دوڑ کا دوسرا نام ہے جو ممکن کا

سرچشمہ ہے اور زندگی کی آلائش دھو ڈالتا ہے۔ ایک تصور جو جیون کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ ایک پُراسرار خوشبو جو انگ انگ میں پھیل جاتی ہے۔ ایک جذبہ آدرش جو زندگی کو جلا بخشے۔ جس کی بدولت زندگی زندگی بن سکے اور محض حیوانِ ناطق کا جینا نہ ہو۔

کچھ ایسی محبت مجھے تصورِ پاکستان کے ساتھ تھی۔ میرے مذہب میں کسی کے لیے نفرت نہیں تھی لیکن اپنے لوگوں سے محبت کوئی گناہ نہیں۔ خاص طور پر جب اُن کا تعلق محروم طبقے سے ہو، اُن کی بیکسی اور بے بضاعتی سوہانِ روح تھی۔ اُنھیں اپنا حق ملنا چاہیے اُنھیں اپنا جائز مقام حاصل کرنا چاہیے۔ تصورِ پاکستان کو بروئے کار لانے کے لیے جو تڑپ میرے ہم عمروں میں تھی وہ شاید ہی کسی اور طبقے میں ہو۔ ہم لوگ زندگی کی دہلیز پر تھے اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار، ہم نے سرد و گرم زمانہ کے دو چار سال ہی دیکھے تھے، اُس سے اس طرف میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ فیروز پور کے پرائمری سکول سے لے کر پنجاب یونیورسٹی کے دوسرے ایم اے تک ـــ اور مجھے کس شدت سے یہ احساس تھا کہ میرے لوگ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح شاطر کے داؤ گھات کے مرہونِ منت تھے۔ میری نظر میں تصورِ پاکستان ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لئے آماجگاہ، اک گوشۂ عافیت۔ اُدھر جو پود قیامِ پاکستان کے بعد پروان چڑھی۔ وہ اُس کے مقاصد سے کتنی بے خبر رہی، اُنھوں نے کبھی اُس کشمکش کی آنچ محسوس نہ کی کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ جو اس آگ میں جل کے کندن ہوئے۔

بہت ایسے بھی تھے کہ طوفان آیا اور گزر گیا۔ اُنھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی، ابن الوقت اور زمانہ ساز لوگ تملق اور خوشامد اُن کی گھٹی میں ہے، اُن کی اپنی دُنیا ہے، حکومت اپنی ہو یا پرائی اُنھیں اپنی چاندی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

لوگ کانٹوں سے گزر کے بھی گلستاں نہ بنے

تقسیمِ ملک کے وقت کیا کیا آفت ڈھائی گئی۔ وہ کون سا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا۔ پنجاب کی سرزمین شہیدوں کے خون سے لالہ زار بن گئی، بٹوارے کے ناسور ابھی رس رہے تھے کہ کشمیر کا زخم کھایا، پھر فلسطین اور الجیریا کا اور دیش کے اندر باہر لاتعداد دُکھوں سے سینہ چھلنی ہوتا رہا۔ گردش عظیم شخصیتوں کے بُت ٹوٹتے رہے، انسانیت اپنا سر پٹختی رہی۔ میں اپنے اندر جھانکتا تو کبھی حرص و آز کی جیت دکھنے لگتی۔ کبھی بے غرضی اور لاتعلقی کا کندن دکھنے لگتا۔ کبھی مال و زر میرے حلقہ بگوش غلام ہوتے اور کبھی جی چاہتا کہ دھن دولت جمع کروں، پھر محروم طبقے کے لیے خوشی کے پھول بکھیر دوں، کیا جلبِ منفعت اور آدرش کے ڈانڈے کہیں ملتے ہیں یا انسان ساری عمر خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے؟

میں نے ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا تھا جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی جہاں بھائی بھائی پر دشنہ تیز نہیں کرے گا۔

جہاں . . . . .

کچھ عرصہ ہوا میں یورپ سے پاکستان لوٹ رہا تھا، دوسری جنگ کے بعد یورپ کی حیرت انگیز ترقی نے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا۔ رات کے بارہ بجے طیارے نے روم کے ہوائی مستقر سے پرواز کیا۔ پی۔ آئی۔ اے والے مشروبات کے علاوہ اُٹھا کرتی کی ایک قسم سے تواضع کر رہے تھے۔ گفتگو سننے کے لیے سب نے کانوں میں ایئر فون لگا رکھے تھے، ہیروئن ایک محل کا سراغ لگانے کے لیے گنگنا رہی تھی، کوئی ایک بجے کا عمل ہو گا کہ میں نے دفعتاً نادانستہ طور پر شیشے میں سے باہر جھانکا، بڑا ہی پیارا منظر تھا۔ نیچے

دیکھی رومانوی روشنیوں کا شہر آباد تھا، وسط شہر میں ایک عظیم الشان عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اُس کے گرد اگرد جگمگ جگمگ کرتے ہوئے گھروندے، اور یہ رومانوی منظر میری دسترس سے باہر تھا اور جو لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا دل بیٹھ رہا تھا کوندے کی طرح یہ خیال ذہن کے دریچوں کو منور کرتا ہوا گزر گیا کہ یہ میرے سہانے سپنوں کا شہر تھا جس نے مجھے ہمیشہ چھل دیا تھا، رومانوں اور تمناؤں کی دُنیا جو اوائل جوانی کا سرمایہ تھا اور یہ رومانوی دُنیا جو میں پیچھے دیکھ رہا تھا میرے ارمانوں کی دُنیا تھی امیدوں کا مسکن تھی لیکن ہم دودھ اور شہد کی نہریں نہ بہا سکے، ایک ایسی سرزمین جو جان کی بازی لگا کے حاصل کی گئی تھی جس کی اساس محبت و اخوت پر تھی۔ اس سرزمین میں سونے کے بچھڑے کی پوجا ہونے لگی اور خود غرضی ایک مسلک بن گئی۔ ہل من مزید ہل من مزید کی صدا مسلسل بلند ہوتی رہی وہ قوس قزح کہاں تھی جس کی تلاش میں ہم سب نکلے تھے تو کیا وہ سپنے جو پیچھے چھوڑے تھے دسترس سے باہر تھے تو کیا یہ محمود و محمود کی رفاقت تھی۔ بس اس خیال سے سوتے ہوئے دھارے پھوٹ پڑے اور جذبات کا لاوا بہہ نکلا اور جب میرے ہم سفر ایرفون لگائے قاتل کی جستجو میں ہیروئن کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس احساس محرومی پر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ طیارے میں تاریکی تھی۔ لوگ پکچر میں گم تھے اور میں اپنی دُنیا میں سیل اشک سے دونوں رخسار بھگو رہے تھے۔

پنہاں ملول بودن و تنہا گریستن

یہ آنسو اُن سپنوں کی نذر تھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے، یہ آنسو اس کرب کی نذر تھے جس کا مداوا ہمارے پاس تھا لیکن ہم نے بخل سے کام لیا۔

وہ سر جو قربانیوں کے سامنے خم نہ ہوا تھا آج جھک گیا تھا وہ دل جسے دُنیاوی نعمتیں مسخر نہ کر سکی تھیں آج رو رہا تھا۔ وہ غرور جسے عورت کے آنسو زیر نہ کر سکے جسے بچوں کا پیار رام نہ کر سکا آج ٹوٹ گیا تھا، میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ

دُکھ بھری رات میرے ساتھ چلی جاتی ہے

اب وطن دور نہ تھا اور وہی میرا مطلب تھا۔ خاک وطن میں قریہ قریہ گھوم آیا، مرچ موچ ڈھونڈ چکا لیکن وہ بو باس کہاں تھی جو مجھ میں ہے، وہ سوندھی خوشبو جو موسم بہار کی بارش کے بعد مٹی سے اُٹھتی ہے، وہ ہلکی سیٹی بجاتی ہوئی تیز ہوا جو بانس کے جھومتے ہوئے جنگلوں سے گزرتی ہے۔

اب سحر قریب تھی، اُس کے ساتھ میری امیدوں کی توانائی لوٹ آئی۔ میں نے سوچا۔ اگر بٹوارے کے وقت (بلکہ آج سے پانچ سال پہلے بھی) اگر ذرا بھی چوک ہو جاتی تو اس محبوب خطے پر ظلمت کی لکیر کھنچ جاتی، اس کے چاہنے والے بے بس ہو کے، جلتے اور نورانی صبح کے شیدائی اُس چھینٹے کو بھی ترس جاتے، غنیمت ہے اب کہیں کہیں چراغ روشن تو ہوئے ہیں۔ ولولوں اور امنگوں سے بھرپور زندگی ہمارے سامنے ہے۔ عروس وطن سنوارنے کے لیے ہم نکل کھڑے ہیں، منزل دور سہی لیکن ایک نہ ایک دن اُسے جا لیں گے، راہبر اور راہرو ایسے بھی ہیں جو منزل کی محبت میں جگر کا خون کرتے ہیں۔ میرا یقین لوٹ آیا کہ وہ صبح طلوع ہو کے رہے گی جس کا میں منتظر رہا، کب یہ کوئی کہہ سکتا ہے

بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

لیکن اُفق کی لالی اک حسین سحر کی غمازی کر رہی تھی اور اک خوش گلو پرندہ نور کے دھارے کی نوید دیتا تھا۔ وطن لوٹ آنے کے بعد میں اُس شہر میں جا نکلا، جہاں میں نے سن شعور کی بہت سی منزلیں طے کی تھیں۔ یہ ہمارا آبائی مکان تھا۔ جہاں آن کر ہمیشہ آسودگی کا احساس

ہوتا اور صعوبتوں کی کلفت دُھل جاتی

صحبت ماہ وروں میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

مجھے خزاں کی وہ سہ پہر یاد ہے جب میں تھکا ماندہ اپنے کمرے میں پہنچا تھا اور گھوڑے بیچ کے سویا جیسے کسی نے منوں بوجھ تلے سے نکال لیا ہو۔ اُس شام بے اختیار میرے قدم باغ کی طرف اٹھ گئے۔ باغ کے پُرانے راستے پہلے سے تو نہ تھے۔ اب ترشی ہوئی راہوں کی بجائے سیمنٹ کی پختہ روشیں تھیں۔ یہ باغ میری معصوم آرزوؤں کا گہوارہ تھا۔ میں باغ کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں نے چاہا سرگوشی کے انداز میں اپنے سوالوں کا جواب اسی سے پوچھوں۔ اس باغ نے گرم و سرد زمانہ دیکھا ہے۔ اغیار کی حکومت دیکھی، اٹھتے ہوئے قافلوں کی آمد اور اپنوں کی سرد مہری دیکھی۔ پھر اپنوں کی حکومت دیکھی۔ وہ پنجاب کلب جہاں کالا آدمی دم نہیں مار سکتا تھا آج اپنوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ وہی پنجاب کلب ہے جہاں انگریز ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ٹینس کے ایک دوستانہ میچ کے بعد میرے ہم جماعتوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اُن سے ہاتھ تک ملانا گوارا نہیں کیا تھا۔ نیٹ پر سے صرف تھینک یو تھینک یو کہا تھا لیکن اب تو اپنی حکومت ہے۔

...... تاریکی میں چھپا ہوا باغ خاموش تھا اور میں باغ میں تنہا اپنا جذباتی سفر طے کر رہا تھا۔ سبزۂ بیگانہ ملول تھا۔ سرو آزاد و غریب تھے اور گُل داؤدی سے چھپے ہوئے تختے حیرت سے ایک اجنبی کو تک رہے تھے جو سر جھکائے اُن میں سے گزر رہا تھا۔ تو میرے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ باغ کے باسیوں میں ہمدردی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں "میاں تم کس چکر میں پڑے ہو۔ قاضی جی کو شہر کا اندیشہ، بیگانوں کی بات تو چھوڑو خویش و اقارب نے اپنوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔ لگانے بجھانے والے کتنے تھے اور نیک نیت کتنے۔ کوئی اقدار باقی بھی رہ گئی تھیں؟ کیا ہر منافقت اور ہر خباثت کا جواز موجود نہ تھا۔ وہ سرزمین جو سجدہ گاہ کی طرح پاک ہونی چاہیے تھی اُسے داغ داغ کرنے میں ہم سب کا ہاتھ تھا۔

باغ اُداس اور تاریک تھا اور میں تنہا۔

ذہن میں اچانک ایک واضح تصویر اُبھری — وہ یادگار تصویر سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس مسز کینیڈی آرلنگٹن کے قبرستان میں انتہائی غمگین مگر مسکراتا ہوا چہرہ۔ وہ مسکراہٹ دیکھ کے دل بے اختیار رو دیے تھے کیونکہ وہ مسکراہٹ ہزار ماتم گساریوں پر بھاری تھی۔ لیکن جو اپنے دیش، اپنے آدرش کی خاطر جان دیتے ہیں وہ کہاں مرتے ہیں اور یوں ہزاروں لاکھوں انسان جیتے مرتے ہیں اور دُنیا کو احساس تک نہیں ہوتا۔ چٹانوں سے ٹکرا جانا ہی زندگی ہے۔ چاہے اس کا انجام پاش پاش ہونے کے سوا کچھ نہ ہو۔ آدرش کی خاطر جان کی بازی پر لگا دینا ہی زندگی ہے اُس کی جیت ہار وہ نہیں جو دُنیا جانتی ہے۔ دُنیا کوتاہ بین کوتاہ اندیش ہے جو پھول دلوں میں کھلتے ہیں وہ دُنیا کہاں دیکھ سکتی ہے جو آدرش دل کی آبیاری سے بار آور ہوں دُنیا کو اس سے کیا؟

حکیم احمد شجاع

نشوونما میں یکم صفر المظفر ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۳ء ہجری کی القدر کو پیدا ہوا۔ میرے والد ماجد حکیم شجاع الدین محمد اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، خلیق اور ادیب تھے۔ سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ غزلیں، مخمسے، اہل بیت علیہم السلام کے مرثیوں کا مجموعہ اور داغ ہجراں ان کے اشعار کا دیوان ان کی شاعری کی یادگار ہیں۔ اس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی طفولیت کے عالم میں تھی۔ میرزا ارشد گورگانی، میر فیض الحسن اور سید ناظر حسین ناظم کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی انہیں ایام میں اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر جو اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، ان انگریزوں میں سے تھے جو ہندوستانی علوم و فنون کی سرپرستی کا درجہ نظم و نسق کے درجے سے کچھ کم نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی توجہ اور آبیاری سے پنجاب میں اردو کا باغ پھل پھول رہا تھا۔

۱۸۹۴ء میں میرے والد نے اردو زبان کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی شعر کہنا چھوڑ دیا اور ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ "شور محشر" اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر مہینے میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا وہ "شور محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر شعر و شاعری میں میرے سب سے پہلے استاد خان احمد حسین خاں تھے جن کی شہرت ایک ناولسٹ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔

سر محمد اقبال نے جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی۔ اتفاق کی بات ہے جس سال میں پیدا ہوا اقبال نے اسی مشاعرے میں وہ شعر پڑھا جس کا چرچا بہت دیر تک ارباب ذوق کے حلقوں میں رہا۔ ان کا یہ شعر اب تک بہت سے لوگوں کی زبان پر جاری ہے ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس واقعے کے بیس برس بعد سر محمد اقبال نے ایک دن مجھ سے کہا: "تم اور میری شاعری ہم عمر ہو۔ تم دونوں کی جوانی سدا بہار ہے۔"

جب تک میرے والد زندہ رہے یہ بزم مشاعرہ قائم رہی اور "شور محشر" باقاعدہ نکلتا رہا۔ ۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والد ماجد نے اس جہان فانی سے رحلت کی۔ اس وقت میری عمر کوئی ڈھائی برس کی تھی۔ میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین نے میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز الدین کے ساتھ مل کر "شور محشر" کو جاری رکھنے کی کوشش کی مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی اور جذب صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی نوجوانوں کی قسمت کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی۔ وہ صاحبان ذوق جنہیں اس بزم مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی اب ہر روز ہمارے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا اچھا خاصا کلب بن گیا۔ . .

سر عبد القادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی [illegible] مولانا مفتی عبد اللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر روز شام کو اس بیٹھک میں جمع ہو جاتے۔ مقصد بیان یہ ہے کہ میں نے مبداء فیاض کے کرم سے ایک ایسے گھرانے اور ایسے ماحول میں پرورش پائی جو علم و ادب کا گہوارہ اور فضل و کمال کا مخزن تھا... میں نے جو کچھ مدرسے میں پڑھا اس سے بہت زیادہ ان بزرگوں کی صحبت سے سیکھا۔ علم و دانش کے جو موتی میں نے کتابوں سے جمع کیے ان سے بہت زیادہ درخشاں اور آبدار جواہر میں نے ان لوگوں کی زبان سے لوٹے۔

۱۸۹۷ء میں میری والدہ ماجدہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کی وفات کے بعد میری تعلیم و تربیت کا بار گراں میرے عمزاد بھائی اور بہنوئی حکیم امین الدین اور میری بڑی بہن نے اس محبت اور شفقت سے سنبھالا کہ جب تک میں ان کے پاس رہا مجھے لوگوں نے انہی کا لاڈلا اور لخت جگر سمجھا... انہوں نے مولانا شرف علی کو جو اپنے وقت کے مجتہد اور مشہور مفسر تھے۔ مجھے عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا اور پروفیسر لیگ ہارن کو جن کا علم آج انگلستان میں بھی مسلمہ تصور ہوتا ہے۔ مجھے شیکسپیئر پڑھانے پر بمشکل رضامند کیا۔ ان کی اس کوشش اور کاوش کی بدولت میں اردو، فارسی اور انگریزی کے ادب سے اچھی طرح واقف ہو گیا... اردو ادب سے میری شناسائی کی یہی سند کافی ہے کہ سر عبد القادر نے اپنے مقبول عام و خاص ادبی رسالے مخزن میں اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے مشہور و معروف تنقیدی جریدے پنجاب ریویو میں میری نظمیں اور مضمون شائع کیے۔ سر عبد القادر اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے کسی مضمون کا انتخاب اور مخزن اور پنجاب ریویو میں کسی مضمون نگار کی تصنیف کی اشاعت اس زمانے میں فضل و کمال کی ایسی معراج تھی جو کسی کسی کو نصیب ہوتی تھی۔

میں نے پہلی جماعت سے لے کر میٹریکولیشن تک سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی... انہی ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس کا ذکر میرے تخیل کی مسرتوں کی معراج اور عمر گذشتہ کی ساری کامیابیوں کا سرور و کیف ہے۔ امام الہند مولانا ابو الکلام جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار وکیل کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے اتفاق سے ایک مرتبہ اپنے پرانے دوست اور ہمارے استاد مولوی غلام رسول قریشی سے ملنے لاہور تشریف لے آئے۔ مولوی غلام رسول ابو الکلام آزاد کی کم عمری کے باوصف ان کے علم و فضل کے قائل اور ان کے جمال و کمال کے دلدادہ تھے۔ جب ابو الکلام ان سے ملنے آئے تو اس وقت وہ ہماری جماعت کو عربی پڑھا رہے تھے۔ مصافحے اور معانقے کے بعد مولوی غلام رسول نے ابو الکلام آزاد سے کہا۔ آپ میرے شاگردوں کو بھی ایک دو لفظ پڑھا دیں تاکہ وہ آپ کی شاگردی کی سعادت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ یہ سنتے ہی علم و فضل کا ایک بحر مواج تھا کہ ابل پڑا، حکمت و دانش کا ایک ابر محیط تھا کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگان علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحر بیکراں کی اچھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور اس ذرا سے وقت میں اس بارش کرم کے جتنے موتی جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا۔ میں اس دن سے آج کے دن تک حضرت ابو الکلام آزاد کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بعد ان کے مشہور زمانہ جریدہ الہلال میں جو کچھ پڑھا اور اس کے مضامین سے جو کچھ سیکھا وہ حقیقت میں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آب رواں کا ایک جرعہ اور اسی دانائے آئین فطرت کے خوان نعمت کی خیر جاری کا ایک ریزہ تھا۔

علی گڑھ کالج

۱۹۰۹ء میں جب میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تو میرے بزرگ میرے مستقبل کے متعلق آپس میں مشورے کرنے لگے کہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی زندگی کے خواب جو میر فیض الحسن نے مجھے دکھائے تھے اور سر سید علیہ الرحمۃ کی قائم کی

ہوئی اس علمی اور اسلامی درسگاہ کی دلکشی کے وہ نقشے جو انہوں نے میری نظر میں جما رکھے تھے ایسے بے حقیقت نہ تھے کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان کوئی مشکل حائل ہو سکتی۔۔۔ میں ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج کی فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہو گیا اور حسنِ قسمت سے مجھے سرسید کورٹ میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی۔

ہز ہائینس نواب سر محمد حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال، نواب سر احمد سعید خاں جو بعد میں یوپی کے گورنر اور حیدر آباد کے مدار المہام ہوئے اور سر سکندر حیات خاں جو بعد میں پنجاب کے گورنر اور پھر اسی صوبے کے پہلے وزیر اعظم ہوئے اسی زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔۔۔ صاحبزادہ حمید اللہ خاں اپنی نامور والدہ کے ایما کے مطابق جو اس وقت سریر آرائے بھوپال تھیں، اس سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے کہ کبھی کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے ولی عہد اور اس کے آئندہ تاجدار ہیں۔ مجھے ان کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

میں فرسٹ ایر کے امتحان میں اپنی جماعت میں اول رہا اور جونیئر سکالر کے شرف سے مشرف ہوا۔ خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر اور خان بہادر ملک زمان مہدی کے بعد میں تیسرا پنجابی تھا جسے یہ اعزاز نصیب ہوا۔

ڈاکٹر ڈی کلف کیمسٹری کے پروفیسر جو بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور پھر گورنمنٹ آف انڈیا کے چیف کیمیکل ایڈوائزر مقرر ہوئے ان دنوں علی گڑھ کالج میں علم کیمیا کے شیدائیوں کے علاوہ فن تمثیل کے متوالوں کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ ناٹک کے تمام شعبوں سے ان کی واقفیت شہرۂ آفاق تھی اور ہدایت کاری کے فن میں تو وہ اس قدر طاق تھے کہ یورپ میں بھی دور دور ان کی مثال نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے ہم دلدادگانِ حسن و شعر کو جمع کر کے ایم اے او کالج کی اسٹیج پر شیکسپیئر کے کسی ایک ڈرامے کی تمثیل کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے لیے شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ ٹویلفتھ نائٹ منتخب کیا۔ ملک عبد القیوم، خواجہ غیور الدین، محمد شعیب قریشی، سید حسن شاہ اور مجھے پارٹ ملے۔ اس ڈرامے کے ساتھ ساتھ ہم نے اردو کا کوئی ناٹک بھی پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے نظرِ انتخاب آغا حشر کے مشہور ڈرامے صید ہوس پر پڑی۔ صید ہوس بھی حقیقت میں شیکسپیئر کے ڈرامے کنگ جان کا ہندوستانی ماحول کے ساتھ اردو زبان میں ایک دلکش چربہ ہے۔ سید حسن شاہ نادرہ کا، خواجہ غیور الدین نے قمرن کا اور میں نے ملک مہر علام کا پارٹ ادا کیا۔ دونوں ڈرامے بڑی کامیابی سے دکھائے گئے۔ سب نے انہیں پسند کیا۔ مگر نواب وقار الملک بہادر تماشے کے دوران ہی میں اسٹریچی ہال سے اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم یہ تماشا دوبارہ دکھانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ نواب وقار الملک بہادر کا حکم ہم قضائے مبرم کی طرح ہمارے سر پر آ دھمکا۔ یہ حکم امتناعی علی گڑھ کالج میں ہمیشہ کے لیے فن تمثیل کی موت کا حکم ثابت ہوا۔ ادھر ہمارے ذوق و شوق کا گلا گھٹا ادھر پرنسپل صاحب کی طلبی ہوئی اور ان سے استفسار کیا گیا کہ ایک اسلامی درسگاہ میں ایسے خلافِ شریعت فعل کی کیوں اجازت دی گئی۔

لاہور، دلی اور میرٹھ ۱۹۱۱ء میں ایف اے کا امتحان دے کر میں وطن واپس آیا۔ آغا حشر ان دنوں اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور میں مقیم تھے۔ میں نے جب یہ سنا تو بے تاب ہو گیا۔ شام کو ان کی تلاش میں نکلا جب میں نے وہ ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھا جس میں حشر ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک اور ہندوستان کا سب سے زیادہ عظیم المرتبت ڈراماٹسٹ رہتا تھا۔ تو میں سمجھا کہ میری آنکھوں نے مجھ کو دھوکا کھایا ہے۔۔۔ حشر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور فرمایا تم کون ہو بھائی اور مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو۔ میں نے شوقِ ملاقات کی داستان سنانی شروع کی۔

”دو برس ہوئے دلی میں“ میری بات کاٹ کر فرمایا ”ہوں گے میں۔ ہاں دو برس ہوئے میں دلی میں تھا۔ تم نے مجھے دلی میں دیکھا ہوگا۔ مگر اب

دلی وہ دلی نہیں رہی۔ دلی حشر کے ڈراموں کی قدر کرتی ہے حشر کی قدر نہیں کرتی۔ اسی لیے لاہور آیا ہوں اس شہر سے مجھے محبت ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں۔ تم لاہور ہی میں رہتے ہو؟ عرض کی "جی ہاں" فرمانے لگے تو پھر مجھے تم سے بھی محبت ہے۔ مجھے اس شہر کے در و دیوار سے محبت ہے۔ اس کے آسمان، اس کی زمین سے محبت ہے۔" یہ بے تکلف اور بے باک انداز گفتگو ایک بادشاہ کا انداز گفتگو تھا۔ ایک شاعر کا انداز گفتگو تھا۔ ایک ایسے جوان بے پروا کا انداز گفتگو تھا۔ جو بات کرتے وقت نتائج و عواقب سے بے خبر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں اور وہ پرانے دوست ہیں۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے کی روح سے واقف ہوں۔ ایک دوسرے کے جذبات سے آشنا ہوں۔ ایک دوسرے کی پسند کو جانتے اور سمجھتے ہوں۔ یہ دوستی پورے پچیس برس اسی فراوانیِ محبت اور صداقتِ جذبات کے ساتھ قائم رہی جسے میں جانتا ہوں یا حشر جانتا تھا۔

میرے بھائی حکیم امین الدین اس زمانے میں کچھ علیل تھے۔ حشر ایک دن ان کی عیادت کو آئے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت اور گفتگو کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ اب ان کے شب و روز یکجا بسر ہونے لگے۔ . . . ایک دن کا ذکر ہے وہ بھائی جان کو اپنا ڈراما سنا رہے تھے حشر کو جن لوگوں نے اپنی تحریر پڑھتے اور اپنا کلام سناتے دیکھا ہے، وہ اس محشرستان تکلم کی حشر آرائیوں سے خوب واقف ہیں۔ جب وہ اپنا ڈراما سنا چکے تو میں نے کہا۔ مجھے بھی اپنا شاگرد بنا لیجیے۔ فرمایا، کچھ لکھتے بھی ہو؟ عرض کی: جی ہاں۔ ارشاد ہوا "سناؤ" میں نے کچھ ٹکڑے اپنے لکھے ہوئے ڈرامے کے سنائے۔ اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا، "تم کو میری طرح لکھنا کس نے سکھایا؟" میں نے جواب دیا۔ "آپ نے۔" فرمانے لگے تو آج سے تم ہمارے شاگرد ہو۔ حشر کی صحبت میں چھٹیوں کے تین مہینے آنکھ جھپکتے ہی گزر گئے اور میں علی گڑھ واپس چلا گیا۔

مجھے علی گڑھ میں گئے کوئی دو تین مہینے ہی ہوئے ہوں گے کہ گھر سے بھائی جان کی علالت کے عود کر آنے کی اطلاع ملی۔ وہ حقیقت میں ذیابیطس کے جانکاہ مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بھائی جان کے احسان ایسے نہ تھے کہ میں ان کی خدمت میں کوتاہی کرتا۔ خبر سنتے ہی لاہور واپس آیا۔ دیکھا تو وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ . . . ان کی اس علالت کے دوران میں میں بار بار علی گڑھ گیا اور واپس آیا۔ دو بڑے اہم فرائض آپس میں متصادم تھے۔ آخر خون کے جوش نے خود غرضی پر فتح پائی اور طبیعت کی شرافت مطلب پرستی پر غالب آئی۔ علی گڑھ سے اسپائرنگ سرٹیفکیٹ لے کر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔

جب بھائی جان کی طبیعت اچھی طرح سنبھل گئی تو میں میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ میں میرٹھ گیا تو میرے دو چار اور دوست بھی علی گڑھ سے میرٹھ چلے آئے۔ خواجہ فیروز الدین، ظہیر شمسی، مقبول حسن اور میں یہاں بھی ایک کمرے میں اکٹھے رہنے لگے۔ میرٹھ میں جس چیز نے علی گڑھ کی تمام پرکیف مسرتوں کی یاد بھلا دی، وہ مسعود حسین کمبوہ کی عجیب اور دلکش شخصیت تھی۔ . . . یہ وہی مسعود حسن تھے جن کے دماغ کی جدت آفرینیاں جن کے تخیل کی کارفرمائیاں، جن کی حرکات و سکنات کی بوقلمونیاں اور خلوت و جلوت میں جن کی ہنگامہ آرائیاں علی گڑھ اور میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ سارے یوپی میں الف لیلے کے افسانوں سے زیادہ مشہور ہیں۔

انسان کے دل میں بھی عجیب وسعتیں ہیں۔ علی گڑھ کا رستہ بند ہوا تو دل کی راہ کھل گئی۔ دلی میں تین گھر ایسے تھے جن کو میں اپنا گھر سمجھتا تھا اور جن کے دروازے میرے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ منیا محل میں ممتاز حسن کا گھر، جوہری واڑہ میں ظہیر شمسی کا گھر اور پنڈت کے کوچے میں ظہیر زاہدی کا گھر۔ ان تین گھروں میں سے کسی ایک گھر کا انتخاب میری شانِ ورود کی نوعیت پر منحصر ہوتا تھا جس قسم کے ہنگاموں پر طبیعت مائل ہوتی

میں اسی قسم کا ماحول منتخب کر لیا کرتا تھا۔

ظہیر زاہدی کے والد منشی نثار احمد بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے عام و خاص میں منصف صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ انہی منصف نثار احمد کی وساطت سے مجھے دودمان شریف خاں کے وارث اکبر حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور انہی کی بدولت میری رسائی ان لوگوں تک ہوئی جو دلی کی پرانی عظمت کی یادگار تھے اور تنگ دستی اور نامساعدت روزگار کے باوجود اپنی پرانی وضع داری کو نباہے چلے جا رہے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مسیح الملک کے دولت کدے پر حضرت تاباں، حضرت سائل اور حضرت بیخود تشریف رکھتے تھے، میں بھی حاضر تھا۔ مشاعرہ کی سی ایک مختصر بزم تھی۔ سب نے ایک مصرع طرح پر اپنی اپنی غزل پڑھی۔ حضرت سائل کا یہ مشہور شعر ان کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

تمنا تھی کہیں پردیس میں کچھ مانگ کھائیں گے
گر قسمت میں تھے سائل جہاں آباد کے ٹکڑے

حضرت تاباں کا اسی زمین میں یہ شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

بُری ہوتی ہے کیف بادہ کی لکنت کہ ہوتے ہیں
زباں سے تا بہ لب آتی ہوئی فریاد کے ٹکڑے

اسی طرح پر میں نے بھی اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

سزا دے جا دل ناشاد کو مر مر کے مٹنے کی
اڑا جا ٹھوکروں سے خانماں برباد کے ٹکڑے

سب نے تعریف کی۔ حضرت تاباں نے بڑی داد دی۔ جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ اصرار کرتے رہے کہ تم غزل لکھا کرو اور مجھ سے اصلاح لیا کرو۔ یہ سعادت مجھے نصیب تو ہوئی مگر اس قدر نہیں جس قدر وہ چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری طبیعت کو محض قافیہ پیمائی اور ردیف آرائی سے کچھ ایسی مناسبت ہی نہ تھی۔

منصف صاحب کے مکان پر بھی کبھی کبھی شعر و سخن کا سلسلہ ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ان کے ہاں کلکتے سے ایک شاعر تشریف فرما تھے۔ صولت تخلص کرتے تھے اور ان کا سلسلۂ تلمذ میر انیس کے خاندان سے جا ملتا تھا۔ ان کی آمد کی تقریب سے منصف صاحب کے مکان پر شاعروں کی مجلس اکثر رہتی تھی۔ ایک حضرت نے کہا۔ اس پر مصرعے کہو۔ میں نے بھی یہ شعر عرض کیا جو انہیں پسند آیا۔

فرقت یار میں رو رو کے بہت دن سا کر
ہم نے دامان شب تار پہ گوہر ٹانکے

اس پر ایک صاحب نے فرمایا۔ دن میں شب تار کہاں ہوتی ہے؟ حضرت صولت نے کس قدر خشمگیں انداز سے جواب دیا۔ دلی والے بھی اردو بھول گئے۔ [illegible] شیخ اردو زبان لکھ گیا ہے۔

اسی طرح ایک دن نواب بدھن کے دولت کدے پر کچھ باخدا لوگوں کی محفل گرم تھی اور گناہ و ثواب کا ذکر ہو رہا تھا۔ سوال پیش

تھا کہ آمرزشِ گناہ کے لیے کون سا وظیفہ کارآمد ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا: "آنسو"۔ میں نے یہ نکتہ اسی وقت اس شعر میں موزوں کر کے پیش کیا۔ سب نے داد دی۔

پروئے آنسوؤں کے چند دانے تارِ مژگاں میں　　اسی تسبیح پر دن رات استغفار پڑھتا ہوں

ایک دن نواب غلام محمد حسن خاں صاحب کی حویلی میں چند باذوق لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں حضرت غالب رہا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو نے ایک شعر پڑھا جس کا قافیہ دشمن تھا اور ردیف دوست۔ فرمایا کسی زمانے میں دلی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔ میں نے کہا اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ نواب فیض احمد نے فرمایا، کہو۔ میں نے برجستہ یہ شعر کہا۔ سب نے نہایت پسند کیا۔

میرے سینے میں ہے دل یا ایک مارِ آستیں
رہ کے پہلو میں مرے دشمن ہے اور دشمن کا دوست

میر باقر علی نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ مرزا غالب کا فیض ہے۔" اس زمانے میں طبیعت اس قدر موزوں تھی کہ جو بات بھی منہ سے نکلتی تھی شعر بن جاتی تھی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خدمت اور ہم صحبتوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے ناعاقبت اندیش ہنگامے بھی برابر جاری رہے۔ ممتاز حسن، ظہیر زیدی، ظہیر شمسی، شمس الاسلام، حمید حسن، ضیاء الحق اور میں دہلی اور میرٹھ کی گلیوں کو زندگی کی دلفریب وادیاں سمجھ کر ان میں برسوں گم ہو رہے۔ کبھی یہ وادیاں سرسبز اور شاداب میدانوں میں جا نکلیں اور کبھی خم و پیچ اور دشوار گزار گھاٹیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ قدم قدم پہ پاؤں پھسلے اور سنبھلے۔ امیدوں سے بے نیاز اور مایوسیوں سے بے پروا ماضی کی یاد کو حال کا سرور بناتے اور حال کے سرور میں مستقبل کے خمار کو بھلائے ہم زندگی کے اس زمانے کو جسے شباب کہتے ہیں یا شباب کو جو زندگی کا دوسرا نام ہے، گزارتے چلے گئے۔ زندگی کے کچھ نشیب و فراز اس وقت رکھ دیے اور کچھ بقیۂ العمر کے لیے اٹھا رکھے۔

میں ۱۹۲۲ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی لٹریچر اور تاریخ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گیا۔ یہ انتخاب کالج کے پرنسپل مسٹر ولیم جیمس اور ہسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر لی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانے میں میرے بہنوئی دیوان سید محمد کا ارادہ حیدرآباد دکن جانے کا ہوا۔ خدا جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میری طبیعت بھی اس درس و تدریس کی زندگی سے کچھ اکتا سی گئی تھی۔ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے کالج کی ملازمت ترک کر دی اور مستقل طور پر وطن واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ زندگی کا دوسرا دور یہاں ختم ہوتا ہے۔

حیدرآباد دکن۔ پاکپتن شریف

حیدرآباد دکن میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کے دودمانِ آصفیہ کے علاوہ تین مسلمان امرا کے خاندان بہت عالی مرتبت ہیں اور پائیگاہوں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس وقت پائیگاہ اوّل کے امیر کبیر سر آسمان جاہ بہادر کے بیٹے نواب معین الدولہ بہادر، پائیگاہ دوم کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر کے بیٹے نواب ولی الدولہ بہادر اور پائیگاہ سوم کے نواب لطف الدولہ بہادر مالک و مختار تھے۔ یہ تینوں خاندان حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے ہیں اور ان کو دنیاوی حشمت و ثروت کے باوجود اس تعلق پر بڑا ناز ہے۔ جب سر آسمان جاہ اور خورشید جاہ پاکپتن شریف حاضر ہوتے ہیں۔

خاک آمیز گناہوں کے لیے کون سا وظیفہ کار آمد ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا: "آنسو" میں نے یہ نکتہ اسی وقت اس شعر میں موزوں کر کے پیش کیا۔ سب نے داد دی۔

پروئے آنسوؤں کے چند دانے تار مژگاں میں   اسی تسبیح پر دن رات استغفار پڑھتا ہوں

ایک دن نواب غلام محمد حسین خاں صاحب کی حویلی میں چند باذوق لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں حضرت غالب رہا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو نے ایک شعر پڑھا جس کا قافیہ دشمن تھا اور ردیف دوست۔ فرمایا کسی زمانے میں دلی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔ میں نے کہا اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ نواب فیض احمد نے فرمایا: کہو۔ میں نے برجستہ یہ شعر کہا سب نے بہت پسند کیا

میرے سینے میں ہے دل یا ایک مار آستیں
اُس کے پہلو میں مرا دشمن ہے اور دشمن کا دوست

میر باقر علی نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ مرزا غالب کا فیض ہے۔" اس زمانے میں طبیعت اس قدر موزوں تھی کہ جو بات بھی منہ سے نکلتی تھی شعر بن جاتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خورد نوازی، صحبتوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے نا عاقبت اندیش ہنگامے بھی برابر جاری رہے۔ ممتاز حسن، ظہیر زیدی، ظہیر شمسی، شمس الاسلام، حمید حسن، ضیاء الحق اور میں دہلی اور میرٹھ کی گلیوں کو زندگی کی دلفریب وادیاں سمجھ کر ان میں برسوں گم ہوئے۔ کبھی یہ وادیاں سرسبز اور شاداب میدانوں میں جا نکلیں اور کبھی خم در خم اور دشوار گزار گھاٹیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ قدم قدم پہ پاؤں پھسلے اور سنبھلے۔ امیدوں سے بے نیاز اور مایوسیوں سے بے پروا ماضی کی یاد کو حال کا سرور بنانے اور حال کے سرور میں مستقبل کے خمار کو بھلائے ہم زندگی کے اس زمانے کو جسے شباب کہتے ہیں یا شباب کو جو زندگی کا دوسرا نام ہے، گزارتے چلے گئے۔ زندگی کے کچھ نشیب و فراز اس وقت رکھ لیے اور کچھ بقیۃ العمر کے لیے اٹھا رکھے۔

میں ۱۹۲۳ء میں میرٹھ کالج میں انگریزی لٹریچر اور تاریخ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گیا۔ یہ انتخاب کالج کے پرنسپل مسٹر ولیم جینس اور ہسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر ایلی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانے میں میرے بہنوئی دیوان سید محمد کا ارادہ حیدرآباد دکن جانے کا ہوا۔ خدا جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میری طبیعت بھی اس درس و تدریس کی زندگی سے کچھ اکتا سی گئی تھی۔ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے کالج کی ملازمت ترک کر دی اور مستقل طور پر وطن واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ زندگی کا دوسرا دور یہاں ختم ہوتا ہے۔

حیدرآباد دکن۔ پاکپٹن شریف

حیدرآباد دکن میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کے دودمان آصفیہ کے علاوہ تین مسلمان امرا کے خاندان بہت عالی مرتبت ہیں اور پائیگاہوں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس وقت پائیگاہ اول کے امیر کبیر سر آسمان جاہ بہادر کے بیٹے نواب معین الدولہ بہادر، پائیگاہ دوم کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر کے بیٹے نواب ولی الدولہ بہادر اور پائیگاہ سوم کے نواب لطف الدولہ بہادر مالک و مختار تھے۔ یہ تینوں خاندان حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے ہیں اور ان کو دنیاوی حشمت و ثروت کے باوجود اس تعلق پر بڑا ناز ہے۔ جب سر آسمان جاہ اور خورشید جاہ پاکپٹن شریف حاضر ہوتے تھے۔

تو حضرت گنج شکرؒ کے روضۂ اقدس کی خاک پاک ہی کو آسمان رفعت اور مطلع انوار سمجھتے ہیں۔

جب ہم لوگ حیدر آباد پہنچے تو دیکھا کہ تینوں ریاستیں حضرت گنج شکرؒ کے سجادہ نشین کے قدموں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں آخر فردوس مکان خوش آشیان اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی ہمشیرۂ محترمہ اور نواب معین الدولہ بہادر کی والدۂ ماجدہ جو پاشا حضرت کے بلند مقام لقب سے ملقب تھیں، کا ارشاد واجب التعمیل سمجھا گیا اور دیوان صاحب ان کے قصر محل میں جو خانہ باغ پیلس کہلاتا ہے مقیم ہوگئے

اب ان امراء کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہم کبھی تو بیگم پیٹھ میں نواب ولی الدولہ بہادر کے قصر محل میں ان کی مختلف الالوان ضیافتوں میں شریک ہوئے اور کبھی خانہ باغ پیلس میں نواب معین الدولہ بہادر اور پاشا حضرت کی شاہانہ مدارات کی آسودگی میں اپنے شب و روز بسر کرتے

دیوان صاحب کی ناگہانی علالت کے باعث ان کا پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور ہم اعلیٰ حضرت بادشاہ دکن کی خدمت میں باریابی سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ یہ سعادت رسمی طور پر مجھے نصیب نہ ہوئی مگر حسن اتفاق سے میری آنکھیں اسلامی عظمت کی اس آخری یادگار کے نظارۂ جمال کی سعادت سے ایک دن بہرہ یاب ہو ہی گئیں۔

حیدر آباد سے واپس آکر میں کوئی تین مہینے تک پاکپتن شریف میں دیوان صاحب کے حضور حاضر رہا اور ان کی تیمارداری کی خدمات انجام دیتا رہا۔ میں نے اس فرصت کے دوران میں اپنے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچا آخر کار نواب ولی الدولہ بہادر کی تجویز ہی سب ارادوں اور تدبیروں سے زیادہ کارآمد اور امید افزا نظر آئی اور میں ملازمت کے ارادے سے حیدر آباد روانہ ہوگیا۔ نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے اور اپنی نوازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک کسی اچھی ملازمت کا انتظام نہ ہو جائے میں ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرے پر ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتا رہوں اور انہیں کے پاس رہوں۔

اس مرتبہ اگرچہ میں حیدر آباد میں کوئی دو مہینے تک مقیم رہا مگر جہاں تک مجلس ارتباط کا تعلق ہے میں حیدر آباد کے لوگوں سے بیگانہ ہی رہا۔

حیدر آباد میں میرے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ آسودگی اور خوشی کا کوئی ایسا سامان نہ تھا جو وہاں میسر نہ آسکتا ہو۔ سواری کے لیے نواب معین الدولہ بہادر کی رولز رائس تھی۔ رہنے کے لیے خانہ باغ پیلس۔ بشیر باغ اور نواب ولی الدولہ کا قصر۔ کھانے کے لیے انواع و اقسام کی اتنی نعمتیں کہ اگر انسان ان میں سے ایک ایک چیز کو چکھے تو پیٹ بھر جائے۔ وقت گزارنے کے لیے بادشاہی صحبتیں مگر طبیعت تھی کہ روز بروز بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ صحت رفتہ رفتہ جواب دے گئی۔ نعمتوں کے اس وفور میں میری خوراک صرف چائے کا ایک پیالہ اور ہنٹلی پامر کا ایک بسکٹ رہ گئی۔۔۔۔ آخر ایک دن مستقبل کی ساری امیدوں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دیا۔ ترقی و اقبال کا جو سنہری خواب دیکھا تھا اسے اپنے ہاتھوں سے پریشان کر دیا۔ عقل کو بے سمجھ کہا۔ دور اندیشی کو نادانی سمجھا اور دل کی بات مان لی۔ قصروں اور محلوں کی عشرت و آسائش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر میں ایک دن چپ چاپ حیدر آباد سے چلا آیا ؎

درویش را نباشد منزل سرائے سلطان
ماییم و کہنہ دلقے کاتش دراں تواں زد

تمثیل نگاری

۱۹۳۱ء میں آغا حشر کلکتے کے مشہور و معروف میڈن تھیٹر سے کچھ وقتی سا تعلق قائم کر چکے تھے۔ ادھر بمبئی کے تھیٹر والوں کی یہ حالت تھی کہ سفید خون، صید ہوس، یہودی کی لڑکی، خوبصورت بلا، آنکھ کا نشہ اور سورداس دیکھ چکنے کے بعد ان کی آنکھیں حشر کے ڈراموں کو ترس رہی تھیں۔ آغا صاحب کے پرانے قدردان کلکتے پہنچے اور ان سے کہا۔ آپ اپنی پرانی کمپنیوں کے لیے بھی کبھی کبھی

پھر لکھ دیا کیجئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا، میں دو مالکوں کی نوکری نہیں کیا کرتا اور تمہیں میرے ڈراموں کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔ پنجاب میں میرا ایک شاگرد اب مجھ سے بہتر ڈرامے لکھنے لگا ہے۔ ان الفاظ سے اس پیکر مروت نے میرا تعارف بمبئی کے تھیٹروں کے مالکوں سے کرایا اور یہ اسی تعارف کی برکت تھی کہ اردشیر دادا بھائی ٹھونٹی، سہراب جی اوگرا، سہراب جی ترک اور سیٹھ بہا بھائی جیسے صاحبانِ کمال نے مجھے اپنی اپنی کمپنی کے لیے ڈراما لکھنے کی دعوت دی ۔۔۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے "باپ کا گناہ" اور اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی نے "بیسٹر پرنگیا" کے نام سے مجھ سے اتنی قیمت پر خریدے جتنی قیمت حشر کے ڈراموں کے سوا کسی دوسرے ڈراماٹسٹ کے ڈراموں نے اب تک نہ پائی تھی۔ اس طرح آغا حشر نے مجھے تھیٹر کی دنیا سے روشناس کیا۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں ان کا لکھا ہوا ڈراما "یہودی کی لڑکی" کلکتے کے نیو تھیٹرز نے فلم کے لیے تیار کیا۔ یہ ڈراما اس قدر مقبول اور کامیاب ہوا کہ ادھر تو نیو تھیٹرز کو ان سے ایک اور ڈراما لینے کی آرزو ہوئی اور ادھر خود ان کو کمپنی بنانے کی ہوس۔ جب نیو تھیٹرز والوں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اسی شاگرد کا پتہ بتایا اور یہ اس دوسرے تعارف ہی کا نتیجہ تھا کہ نیو تھیٹرز نے مجھ سے "کاروانِ حیات" کا ڈراما لکھوایا اور اسے پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔ کاروانِ حیات نے کامیابی اور مقبولیت کی جو منزلیں طے کیں میں انہیں استاد ہی کی کامرانی اور سربلندی سمجھتا ہوں۔

اگر اسٹیج کی دنیا فلم کے ہاتھوں برباد نہ ہو جاتی اور ان ماہرانِ فن کی زندگی کا دور ختم نہ ہو جاتا جو اس دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے تو میرے اسٹیج کے ڈراموں کی تعداد اتنی مختصر نہ ہوتی۔ تاہم میں نے یہ شغل جاری رکھا۔ کچھ ڈرامے ہندوستان کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کے متعلق لکھے، کچھ دنیا کے بڑے بڑے تاریخی واقعات کے متعلق۔ ان میں "آخری فرعون"، "سیتا"، "منقوش" اور "ستارا" اس لیے قابل ذکر ہیں کہ پہلے ڈراموں کو اربابِ علم نے اور پچھلے تین ڈراموں کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے بہت زیادہ پسند کیا ... نقادانِ فن اور صاحبانِ ذوق کی نگاہوں میں میرے لکھے ہوئے ڈراموں کی یہ قدر و منزلت بھی ہوئی کہ انہیں ہندوستان کی بڑی بڑی نامی درس گاہوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کی اسٹیج پر بھی تمثیل کیا گیا اور ان کی تمثیل میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مسٹر گرو دت سوندھی، آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کے کنٹرولر سید احمد شاہ بخاری، ہندوستان کے نامور ادیب سید امتیاز علی تاج، پنجاب کے مشہور تمثیل نگار دیوان آتما نند شرر، اور اس ملک کے مایہ ناز کرکٹ کپتان مسٹر جگل کشور نے حصہ لیا۔ فلمی دنیا میں "کاروانِ حیات" اس کارواں کی جلو ثابت ہوا جس کے عقب میں میرے لکھے ہوئے فلمی ڈرامے "دھن والا"، "دو عورتیں"، "آنسوؤں کی دنیا"، "پریم یاترا" اور "صلاح الدین" یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے۔ یہ کارواں ابھی تک جلو پیما ہے اور خدا کے فضل و کرم سے امید ہے کہ جب تک میرے تخیل میں تخلیق کی قوت اور تحریر میں روانی کا جوش ہے اسی طرح شہرتِ عام اور قبولیتِ دوام کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔ یہی ۱۹۳۲ء کے دسمبر کی ایک پر لطف صحبت میں آغا صاحب کو "آخری فرعون" کے کچھ ٹکڑے سنائے۔ فرمانے لگے: "اب تمہاری تحریر کا رنگ میری تحریر کے رنگ سے بہت مل جل گیا ہے۔ تمہارے ڈرامے روز بروز میرے ڈراموں سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دن حشر بن جاؤ گے۔ ڈراما ضرور لکھا کرو اور دیکھنا میرا رنگ نہ چھوڑنے۔ آخر یہی رنگ جمے گا۔"

اے کاش! آج وہ زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ سب رنگ بدرنگ ہو گئے اور آخر کار انہیں کا رنگ جما۔

فراقؔ گورکھپوری

شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ بیرونی فرمائشیں بھی کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی کے تمام حلقوں سے نظموں، غزلوں، نثر کے مضامین، پیغامات، اصلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں، جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر لکچروں اور تقریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے معلم کے کارِ منصبی کی ذمہ داریاں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ امید و بیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم خوابی، سوءِ مزاج کی وجہ سے طبیعت کا انتشار، گھٹن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آ جانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں۔ بہرحال کام کیے جا رہا ہوں اور ہانپ ہانپ کر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ستر کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش: ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی ترتیب دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو طوفان اٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر پھیل جاویں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بُری باتیں، خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خط و خال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہم چشموں سے ممتاز کرتی ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظرِ قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کرتے تھے اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو ڈیڑھ برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی اور کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔ دس برس کی عمر ہی سے جس لڑکی یا لڑکے کو، مرد یا عورت کو اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساسِ حسن سے برانگیختہ ہونے والی جنسیت میرے اندر بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک

دکھائی دے جاتی، ان سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہوا گھر تھا اور میں ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساسِ تنہائی پاتا تھا۔

لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں، ان کے حسنِ اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا۔ اس طرح زندگی کے سترہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی بھرپور تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہارِ جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ کر رہ جاتی تھی، یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات ایک مصیبت بن جاتی تھی۔

اندازاً اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت شکل ویسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گزری جو ان گوں کی تھی، جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی اَن پڑھ انسانوں سے میری بیوی میں کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی۔ نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا، ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اونچی پوزیشن لاتا رہا۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے انتقال فرما گئے اور ایک بچی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پر آ گئے۔ پی سی ایس اور آئی سی ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بددلی اور بے دماغی نے مجھے اداس بنا دیا تھا کہ میں دونوں سے مستعفی ہو گیا تھا۔

ان تکلیف دہ اور کرب انگیز حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا۔ میرا گھریلو اور خارجی ماحول تو بچپن ہی سے بن گئے تھے۔ اب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی، اتنے ہی پُرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے اُدھر پو پھٹی اُدھر غزل کا مقطع ہوا ؎

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شامِ فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہے وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے "شاعرِ نیم شبی" کہا جا سکتا ہے۔

شاعری میں میری کوششیں بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہیں اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کیے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشق

حقیقت سے قطع نظر کر کے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ رچا سکوں اور اسے رس جس سے مالا مال کر سکوں۔ عشق کے نمو و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تلخی، اُلجھن، خشونت، منافرت اور چھچھورے پن سے بچانا اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدریں سمونا میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً ورڈز ورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے، سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے مجھے بار بار متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیار شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اُردو ادب سے متاثر رہی ہے اتنا اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اُردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثرات زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں اجاگر ہو۔ پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ نادر الکلامی ایک طرح کا عجز بیان ہے کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے محدود منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اُردو کے شعرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اب میری کوشش نظموں میں یہ ہونے لگی مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقا کی روشنی میں پیش کروں۔ محض متشکک ہونا یا زندگی جیسی ہے اس سے متاثر ہونا، قومی کلچر اور قومی مزاج کے تصور پر وجد کرنا اسے اب میں ناکافی سمجھنے لگا۔ اب دُنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر جاگزیں ہونے لگا۔ دُنیا کو بدل دینے کے عالمگیر عمل اور عوام عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، دُور رسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں جھلکانے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے — جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ کن کن سے میرے تعلقات رہے ہیں، ان تعلقات کو میں نے کس طرح منظم کیا ہے، جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں۔ اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلوں، رُباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تبدیلی حالات کے باوجود صورت حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حسن سے متاثر ہونے کے موقع تو ملے ہیں لیکن ان سے عشق برتنے کے موقع نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں بلکہ اس تعلق کو روحانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے۔ . . .

جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں حلول کر جائیں اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جائیں اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساس جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے . . . یہ حقیقت بڑے

کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت زدگی اور عشق زدگی نہ جنسیت کو چمکا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اُردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں نئی زندگی کی بیداری، نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جارہی ہے۔

تو عشقیہ شاعری میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ شرافت و صداقتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت، کیفیت، ہمہ گیری، داخلیت و معنویت، تخلیقی فضا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں اور فنی محاسن اگر آئیں تو انھیں صفات اور مقاصد کو اُجالنے اور چمکانے کے لیے آئیں ــــ میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک قیمتی عنصر سمونا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لا کر فطرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دُکھ، درد، غم، آنسو، اضطراب، ناکامی، سبھی کچھ ہے لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچاتا ہے۔ تصوف کا سہارا لیے بغیر مجازی دُنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے۔ حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں۔ وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقا پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک عینیت اور تصوف کا کچھ اثر مجھ پر ضرور رہا ہے لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہِ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے۔

میں نے اُردو کو نئے الفاظ، نئی تشبیہات اور نئے استعارے دیے ہیں لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ اُردو کے لیے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو۔ شعر میری زندگی ہے اور اُردو اس کا ذریعہ۔ اسی طرح اُردو میری زندگی ٹھہری اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی۔

میں اپنے ذاتی کردار اور کلام کے متعلق یہ کبھی نہیں سوچتا کہ "ایں چنیں دیگرے نیست" میں بسا اوقات اپنے کردار و کلام کا غیر جانبدارانہ اور سوچ بوجھ کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے کردار میں کئی کمزوریاں پاتا ہوں۔ بچپن ہی سے خاص طور پر میرے اندر غصّے کا بڑا لاوا کبھی پھوٹ جایا کرتا تھا۔ میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپ کو پاتا ہوں ــــ لگ بھگ ادھیڑ عمر تک تو میں اپنی دونوں جبلتوں کو تکلیف دہ صفات سمجھتا ہوا بھی ان پر فخر کیا کرتا تھا۔ جن لوگوں میں غصّے کی کمی یا نفرت کی کمی پاتا تھا، انھیں میں اخلاقاً نامرد سمجھتا تھا۔

میرے اندر یہ نیم وحشیانہ صفات غالباً میری ماں کے اثر سے پیدا ہوئیں لیکن میری ماں کا غصّہ کبھی کبھار ہوتا تھا اور وہ بہت جلد اپنے غصّے کو بھول جایا کرتی تھیں۔ مجھ پر غیظ و غضب کے دورے زیادہ جلد جلد پڑتے تھے اور میں دیر دیر میں اپنا غصّہ بھولا کرتا تھا۔ شدتِ ادراک و شدتِ احساس کی وجہ سے جو چیز مجھے بُری لگتی تھی۔ وہ ہر لمحہ میری نظر میں بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ اگر یہ غصّہ ملازموں پر آیا تو میں گالی گلوچ اور مار پیٹ تک اتر آتا تھا۔ اگر دوسروں پر آیا تو قریب قریب خون اور قتل کر دینے کے جذبات سے میں کھول اُٹھتا تھا۔ میں اُن لوگوں تک سے نفرت کرنے لگتا تھا جو غصّے کو بُری چیز کہتے تھے۔ غصّے کی بُرائی سُن کر بھی مجھے غصّہ آجاتا تھا۔ اب تک میری کچھ ایسی حالت ہے کہ چند اشخاص کے تصور ہی سے میرا جی چاہتا ہے کہ بُری طرح پیٹوں تاکہ ان کی تمام شرارتیں اور

حرامزدگیاں مفقود ہو جاتی ہیں۔

میرے اندر سے مغلوب الغضب اور مغلوب النفرت ہونے کی خصوصیت سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے یقیناً غائب ہو جاتی یا بہت کم رہ جاتی۔ اگر میری ازدواجی زندگی میرے لیے عذاب نہ ہوتی۔ سترہ برس کی عمر سے یعنی جب سے میری شادی ہوئی میرا وجود غصّہ اور نفرت کا ایک پکا پھوڑا بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری شادی کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا اور بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے ساتھ رہنا اور بار بار غصّہ و نفرت، بے دلی اور بددلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصّے میں آیا۔ غور و فکر کے بعد میں کچھ کچھ سمجھنے لگا اور اب تک سمجھتا جا رہا ہوں کہ غصّہ اور نفرت اگر وہ افراد کے خلاف ہے تو اس سے سوائے اپنے آپ کو تکلیف پہنچنے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میری شادی ایسی عورت سے ہوتی جس سے میں کافی حد تک آسودہ ہوتا کیونکہ تہ دل سے اور دل کی مرکزی طاقت سے میں یہی چاہتا تھا کہ دُنیا بھر کو اپنی محبت سے نہلا دوں۔ ازدواجی زندگی سے شدید تلخی کی وجہ سے مجھے دوسروں سے محبت کرنی پڑی۔ اگر یہ تلخی میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو اس سے کئی فائدے ہوتے۔ اُدھر خریدی ہوئی محبت کا میں قائل نہ تھا اور پیشہ ور طوائفوں کو چھوڑ کر بھلے گھر کی عورتوں سے بے تکلف ہو کر ملنا میرے زمانے میں قریب قریب ناممکن تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک جنسیت محض شہوت یا مباشرت کبھی نہیں رہی بلکہ ایک مکمل سازِ زندگی رہی ہے۔ اس ساز کا مرکزی تار تو عجیب آوازیں پیدا کرتا رہا یعنی وہ تار جس کا تعلق میری ازدواجی زندگی سے تھا۔ دوسرے تار یعنی غیر ازدواجی رومانوں کے تار بھی کبھی کبھی خوش آہنگ و خوش آیند نغمے پیدا کرتے تھے، لیکن اکثر یا تو خاموش ہو جاتے تھے یا ناہم آہنگ آوازیں پیدا کرتے تھے —— اس طرح غصّہ اور نفرت کے طوفان میرے اندر سے رفع دفع نہ ہو سکے، لیکن میری شخصیت کی جڑیں یہ آندھیاں اکھاڑ نہ سکیں۔ میری علمی دلچسپیاں، بلند اخلاقی قدروں کو اپنے تخیل میں جگہ دینے کا عمل، زندگی کے خوبصورت تصورات، سیاسی اور انسانی امور سے شائستہ دلچسپی، یہ تمام باتیں میری زندگی میں جاری ہیں، عملی زندگی کی نفرت، شاعرانہ زندگی میں محبت، نیکی، نرمی اور شرافت کے پھول کھلاتی رہی ؎

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

ازدواجی اور عشقیہ زندگی کے مسلسل غم نے مجھے حریمِ غم کے پوشیدہ ترین مقامات سے ہم آہنگ کر دیا۔ میں اپنے غم کو اُن نفوس سے بڑا غم سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا اور میں غم کی معنویت سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا اور میں غم کی معنویت سمجھنے لگا۔ نطشے کا یہ فقرہ میرے لیے بہت معنی خیز ہو گیا کہ "کرب کے روحانی بن جانے کا نام بھی ترقی ہے" اس خیال کے تحت میں نے یہ شعر کہا ہے ؎

مٹ جائیں زمانے سے سراسر غم و اندوہ
ہونا نہیں آیا ابھی انسان کو غمگیں

غم عموماً شروع تو ہوتا ہے کسی ذاتی سانحہ سے لیکن اگر صحیح معنوں میں کسی کو توفیقِ غم ہوئی تو یہی غمِ حیات و کائنات کی معنویت

کو جینے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اس میں آفاقیت آجاتی ہے۔

غم نے حیات و کائنات پر جو میرا اٹل ایمان تھا، اسے بجائے کمزور بنانے کے اور مستحکم بنایا۔ غم کا عنصر وجود کے مرکزی عناصر میں سے ہے اور نشاط کا عنصر بھی۔ ارتقائے حیاتِ انسانی میں وہ موقع بہت سعید و متبرک ہوتے ہیں جب ان دونوں عنصروں کا سنگم ہوتا ہے اور ان کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ کل پذیر وجود کا یہ احساس بہت وجد آور ہوتا ہے اور زندگی میں ایک جذبۂ سنجیدگی اور توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اب تعینات کے پردے اُٹھ جاتے ہیں "کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا" والی منزل میں شعورِ انسانی قدم رکھتا ہے۔ ایک رباعی میں میں نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہر ساز میں ہوتی نہیں یہ دُھن پیدا — ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گُن پیدا
میزانِ نشاط و غم میں صدیوں تل کر — ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

غم و نشاط کی اصلی حقیقت جب ہم پر کھلتی ہے تو غم و نشاط پھر غم و نشاط نہیں رہ جاتے بلکہ کل پذیر وجود کا جمیل ترین تصور بن جاتے ہیں۔ وجود کے اسی تموّج کو ہم غم و نشاط اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں۔

ابھی کچھ اور ذاتی کمزوریاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو میں مغلوب الغضب اپنے کو اس درجہ تک نہیں پاتا جتنا اب سے کچھ پہلے پاتا تھا۔ پھر بھی شراب کے نشے میں اگر میں نے کوئی ناخوشگوار اثر لے لیا تو حد سے تجاوز کر جاتا ہوں اور غصے کی رو میں بہہ جاتا ہوں۔ جوش نے میرے بارے میں یہ صحیح کہا ہے کہ ایسی حالت میں فراق سے وصال ہونے خدا بچائے۔ لیکن میں اپنے محترم دوست جوش صاحب کو اور دوسرے احباب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب میں اس بات سے بہت چوکنا رہتا ہوں کہ مجھے نشے میں غصہ نہ آئے اور اگر آئے تو حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ غصے کے بعد میرا پچھتاوا ناقابلِ برداشت کرب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جس شخص کی دل شکنی ہوتی ہے جب تک وہ مجھ سے صاف نہ ہو جائے میں بہت دُکھی رہتا ہوں۔

غصے سے ہی متعلق میرے اندر ایک اور کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی بحث چھڑ جاتی ہے تو کبھی کبھی میرا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے لیکن یہ کمزوری بھی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اب مجھے اس بات کا بہت دھیان رہتا ہے کہ جن لوگوں سے مجھے اُلجھنے کی نوبت آئی ہے۔ ہر لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور ہیں اور برابری کے احساس کے ساتھ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے میری عمر اور پوزیشن کا خیال کر کے انھیں دبنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں کے بعد جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں شرم سے کٹ کے رہ جاتا ہوں اور بڑی ندامت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کی غلطی اور کمزوری کا اب میں احترام کرنے لگا ہوں اور جو لمحے بھی میرے ساتھ گزارتے ہیں انھیں اپنے خلوص و رواداری سے انتہائی طور پر خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تیسری کمزوری میرے اندر یہ ہے کہ میں بہت سے کام وقت پر نہیں کر پاتا۔ خاص کر خطوط کا جواب تو بسا اوقات دے ہی نہیں پاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چند خیالات یا مسائل مجھ پر مسلط ہو گئے ہیں اور میں گفتگو میں اپنی چہیتی نفرتوں یا بلا وجہ کراہتوں پر ہی اظہارِ خیال کرتا رہتا ہوں لیکن اب میں سامعین کا رُخ پہچان کر ہی گفتگو کی تمہید اٹھاتا ہوں ——

معشوقوں سے اب میری محبت میں جنون کی شدت نہیں رہتی جس کا خوش آیند نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اپنے محبوبوں سے میں اب لڑائی نہیں کیا کرتا۔ محبت میں اعتدال، محبت میں اضافہ کرتا ہے اور شدتِ محبت کے لیے عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اشتراکیت کے فلسفے نے میری عشقیہ زندگی کو نسبتاً بہت کچھ متوازن بنایا۔ شاید اس عمر میں تجربات زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ جذبۂ عشق کہیں سے نہ اُٹھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نری جنسیت یا نرا عشق صحیح معنوں میں نہ جنسیت ہوتی ہے نہ عشق ہوتا ہے —— یہی بات شاعری کے بارے میں کہوں گا۔ نری شاعری اور نرا عشق صحیح معنوں میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ شاعر ہوتا ہے۔ پوری کائنات اور ماورائے کائنات میں ایک حقیقی شاعر کو گم ہو جانا پڑتا ہے۔ میری دلچسپیاں یا میری زندگی کی محرکات حسن و عشق و شاعری کے علاوہ تمام علوم و فنون سے تھیں۔ تمام انسانی کلچر سے تھیں۔ اپنے وطن کی بدنصیبی اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کوششوں سے تھیں۔ آزادی کی تحریک میں ڈیڑھ برس تک قید فرنگ جھیلا۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ سے استعفا دیا اور مستقل طور پر اپنی زندگی کو اقتصادی حیثیت سے ایک معمولی زندگی بنا لیا۔ میں اپنی قربانیاں نہیں گنوا رہا ہوں۔ صرف اپنی دلچسپیوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ انھی غیر عشقیہ دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری اور جمالیاتی شاعری کے خطوط کو توانائی اور تابانی بخشی۔

۱۹۳۶ء کے قریب میری ملاقات ایک بہت بڑی ہستی سے ہوئی۔ انھوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور میں ان کے ہاتھوں بے دام بک گیا۔ ایک بار ترقی پسند شاعری پر دورانِ گفتگو میں نے حسرت کا ذکر کیا اور کہا کہ حسرت اپنی غزلوں میں بھی اچھی حقیقتیں دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا، لیکن بہت چھوٹی حقیقتیں۔ یہ فقرہ میرے لیے طلسم شاعری کی ایک کلید ثابت ہوا۔ حسرت کی صحیح قدر و قیمت تو میرے دل میں قائم رہی لیکن میں سوچنے لگا کہ عشقیہ شاعری میں بھی وہ چیز آنے لگی جسے انگریزی میں بیلسٹ کہتے ہیں یعنی وہ وزنی شے جو جہاز کی تہ میں جما دی جاتی ہے تاکہ جہاز ڈانواں ڈول نہ ہو۔ جذبہ اور تفکر کا آپس میں سمو اٹھنا اور مل کر ایک ہو جانا یہ صفت ان ملاقاتوں کے بعد سے میرے عشقیہ اشعار میں جگہ پانے لگی۔ میرے مزاج میں پہلے ہی سے یہ بات تھی کہ عشق کائناتی اور آفاقی مسائل کے مَس اور لمس سے ہی صحیح معنوں میں عشق بنتا ہے۔

نرے عاشق کے عشق میں اور اگر وہ شاعر بھی ہے تو اس کی عشقیہ شاعری میں ایک گھٹن پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ آفاقی دلچسپیاں عشقیہ شاعری میں آفاقیت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تہذیب کے کارنامے ارتقائے جنسیت کے ہی کرشمے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس تہذیب کے کارناموں سے دلچسپیاں جنسیت کی ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ یہ امداد باہمی ہوتی ہے۔ شاعر پہلے دنیا بھر کو آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا ہے۔ تب آنکھیں بند کر کے من کی جوت جگاتا ہے۔ بہت پاکیزہ معنوں میں شاعر کو دنیا دار، کاروباری آدمی ہونا چاہیے۔ تاج محل شاہ جہان کی ہی یادگار نہیں ہے بلکہ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند کی جھلک بھی تاج محل میں نظر آتی ہے۔

اردو ادیبوں میں ایسا بہت کم لوگ کر سکے کہ تن تنہا ادب کے کئی اصناف کو اپنا سکیں۔ میری ادبی تخلیقیں اتنے اصناف میں آپ کو ملیں گی۔ وہ تین کتابیں اردو نثر میں جن کا موضوع ادبی تنقید ہے جن میں اندازے کو میرے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے غالباً

تاثری تنقید کے مضامین کا اُردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے۔ پھر میں نے چند افسانے بھی اُردو میں لکھے تھے۔ جو اب سے چھتیس برس پہلے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ میں اور مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کام جاری نہیں رکھ سکا۔ قریب ایک ہزار صفحوں کا تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ جو بہت سے رسالوں میں محفوظ تھا، میری غفلت سے دیمکوں کی نذر ہو گیا۔ ان کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ علاوہ ادب کے فلسفہ اور سیاسیات کے بہت سے مضامین میرے ذہن میں ہیں لیکن "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"۔

اب جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ بہت سے حضرات میری غزلوں کو اس شدت سے پسند فرماتے ہیں کہ میری نظمیں انھیں متوجہ نہیں کر سکتیں۔ ہزارہا پرستارانِ ادب میری رباعیوں تک ہی میں اپنی پسندیدگی کو محدود رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف عشقیہ یا جمالیاتی رُباعیوں تک۔ ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی نظر میری تمام مساعی پر ہو۔ یعنی نثر، غزل، عشقیہ اور جمالیاتی رباعیاں، طنزیہ رُباعیاں، اخلاقی اور فلسفیانہ رُباعیاں، منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں، مفکرانہ و فلسفیانہ نظمیں، منظوم ترجمے، غیر مقفیٰ نظمیں، مارکسی اور اشتراکی نظمیں۔

اپنی قصیدہ خوانی میری مراد نہیں بلکہ آپ حضرات کو دعوتِ غور و فکر دینا مُراد ہے۔ اُردو نظم کے مشاہیر نظیر اکبرآبادی، سوداؔ، انیسؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، درگا سہائے سرورؔ، اقبالؔ، حفیظ جالندھری، حالیؔ، اختر شیرانی کے کارناموں سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں، لیکن حفیظ کے گیتوں کو اگر ہم الگ کر دیں تو ان تمام مشاہیر کی سنجیدہ، مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگارنگی نہ ملے گی۔ جوشؔ ملیح آبادی کے یہاں دو تین اسالیب بیان ضرور مل جائیں گے لیکن میں نہایت خاکساری سے عرض کروں گا کہ تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیب بیان جتنے یہاں پیش کیے گئے ہیں کہیں اور نہیں ملیں گے۔ یہ سب اسالیب محض میرے دماغ کی اُپج نہیں ہیں بلکہ مختلف زبانوں کے ادب کی ٹکنیک میرے اسالیب بیان پر اثر انداز رہی ہے۔ غزلوں میں بھی غالباً سب سے زیادہ اسالیب بیان کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک گذارش اور ہے۔ پچھلے چالیس پچاس سال کی اُردو شاعری میں ٹھیٹ ہندی الفاظ، روزمرہ، ٹکسالی بول چال اور محاوروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کرنے میں میری کوششیں نگاہِ توجہ چاہتی ہیں۔ خوفِ طوالت سے ان کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔ استعاروں اور تشبیہوں اور تعبیروں کے بھی غالباً جوشؔ ملیح آبادی کو چھوڑ کر میں زیادہ سے زیادہ اور نازک سے نازک نمونے پیش کر سکا ہوں۔

ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے متعلق کوئی پُر مبالغہ خوش خیالی رکھتا ہوں یا میں بر خود غلط آدمی ہوں۔ مشاہیرِ اُردو کی خدمات کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا تمام پرستارانِ اُردو کرتے ہیں۔ پھر میرے کلام کا مجموعہ جو شائع ہوا ہے وہ پورے کلام کے نصف سے بھی کم ہے اور گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر چار پانچ ہزار اشعار کا میرا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جنھوں نے تمام مختلف رسالوں کو دیکھا ہو جن میں گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر میرا کلام چھپتا رہا ہے اس لیے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنی کوششوں کی طرف اشارہ کروں۔ مجھے ایسا کرنے میں جھجک بہت محسوس ہوئی اور ہو رہی ہے۔ مجھ میں جھوٹا پندار ہے نہ جھوٹی خاکساری۔ میں اپنی شاعری کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی مناسب ہے۔ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا

بھی مجھے احساس ہے۔ جیسی شاعری کر سکا ہوں اس سے کہیں بلند تر شاعری کے امکانات کا بھی قائل ہوں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں شاعر نہیں ہوں بلکہ صرف معلم و نقاد و ادیب ہوں۔ پھر دُنیا بھر کے بلند ترین فلسفہ و نظریات اور مختلف علوم پر سوچتے سوچتے بہت سا وقت کٹ جاتا ہے۔ پھر بھی میری شاعری کی عمر اب اندازاً پچاس برس ہو چکی ہے اور اب اتنی مشق ہو چکی ہے کہ چند لمحوں کے وقفہ میں بھی ایسے اشعار کہہ لوں جن میں اتنے برسوں کی مشق، مطالعہ و غور و فکر، تجربات و مشاہدات بھی کچھ آ جائیں۔ محض چالاکی سے یا ذاتی قوت سے یا محض اپنے زورِ بازو سے کوئی شاعر اپنے کلام میں گہرائی و گیرائی اور وزن و بلندی اور اعلیٰ جمالیاتی قدریں نہیں پیدا کر سکتا اور مصروفیتوں کے علاوہ خرابیٔ صحت اور گھریلو جھنجھٹ، پھر اقتصادی جھنجھٹ بھی مجھے اس طرح ادبی کام نہیں کرنے دیتے جس طرح میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری زندگی کی شام ہے۔ دن ڈوبنے سے پہلے جو تھوڑا سا وقت بچ رہا ہے۔ کاش میں اس مختصر وقفے میں ان کاموں کا ایک حصہ انجام دے سکتا جن کا نقشہ میرے دماغ میں ہے۔ مجھے خالص ادبی خدمت کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے اور وہ یکسوئی مجھے نصیب نہیں۔ بہرحال اپنی سی کوشش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ زندگی کی مشکلات میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ کوئی جتنا اور جیسا کام کرنا چاہے۔ اتنا اور ویسا نہ کر سکے۔

اثر لکھنوی

میں نے جب ہوش سنبھالا تو یوں ہی نہیں لکھنؤ میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ فضا شعریت سے لبریز تھی۔ پہلے بزرگوں کی زبانی سنے ہوئے چند واقعات کا تذکرہ کر دوں جس سے تھوڑا بہت اندازہ ہو گا کہ میں نے کس ماحول میں تربیت پائی اور کس طرح آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے پر میرے جذبۂ شعری کی پرداخت ہوئی۔

میرے دادا صاحب کے ایک مصاحب تھے میر ہادی بڑے متقی پرہیزگار و عبادت گزار مگر انھیں گلے میں خاک پاک کا تسمہ پڑا رہتا تھا۔ ایک رات پلنگ میں گھٹنے پر سانپ کا دھوکا ہو گیا اب اسے دبائے ہوئے خوف زدہ آواز میں چلا رہے ہیں۔ "ارے بڑا موذی ہے اس کا کاٹے کا منتر نہیں۔"

اس زمانے کی تہذیب بھی کہ لڑکا سن بلوغ کو پہنچا کہ زنان خانے میں نہیں بلکہ مکان کے مردانے حصے میں سوتا تھا والد مرحوم ملے ہوئے کمرے سے میر صاحب کی سہمی ہوئی آواز سن کر دروازے کے قریب آئے اور پوچھا کہ میر صاحب خیریت تو ہے گھبرا کے کہا اللہ میاں یہاں نہ آنا مجھے تمہاری جان سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں۔ والد مرحوم نے جب دیکھا کہ میر صاحب کمرے میں تنہا ہیں پریشان ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تو سمجھ گئے کہ تنکے کی جگہ انھیں پھانس کا بانس بنایا ہے اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے میرا خیال ہے کہ شاید ہزاروں میں ایک شخص ایسا نکلے جس کی جان پہ بنی ہو یا سانپ کے خوف میں ایسا ہی گھر گیا ہو تاہم اپنی گلو خلاصی کے لیے اپنے مالک کے فرزند کا خطرے سے دوچار ہونا گوارا کرے۔

دادا صاحب کے ایک دوسرے مصاحب امام علی شاہ تھے صوفی باصفا کسی کا نام نہیں لیتے تھے لوگ چھیڑ چھاڑ کے پوچھتے تھے "تم کون بولتا ہے؟ کوئل میں کون کوکتا ہے؟" سب کا ایک جواب تھا "وہی بولتا" ایک دن والد مرحوم کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ ایک ڈھیلا کھینچ مارا کہ اب تو میرا نام لیں گے کہنی میں سخت چوٹ آئی گلے میں رومال باندھ کر ہاتھ ڈال لیا۔ جب دادا صاحب کا سامنا ہوا تو انھوں نے پوچھا امام علی شاہ ہاتھ میں کیا ہوا مکرر پوچھنے پر بتایا کہ مشغول کی عادت ہے والد مرحوم کا نام نہ لینا تھا نہ لیا۔ ایسے لوگ اب کہاں ہوتے ہیں عجب نہیں کہ تصوف سے جو شغف مجھے بعد کو ہوا تحت الشعور میں یہی واقعہ اس کا ابتدائی محرک ہو۔

والد مرحوم کی کھلائی تھیں ٹھیک یاد نہیں غالباً بوا آرہین نام تھا تال کٹورے کی کربلا کے متصل ہم لوگوں کی آبائی جاگیر کا ایک حصہ متعلق لب سڑک واقع تھا عاشورہ اور چہلم کے موقع پر تعزیوں کی زیارت کے لیے وہاں جا کر خیمے قیام کرتے تھے۔ مکان ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جاڑے کا زمانہ تھا میرے چچا حکیم احمد صاحب مغفور بعد فراغ نماز رضائی اوڑھے ہوئے مصروف وظیفہ خوانی تھے۔ اتنے میں بوا آرہین آئیں اور ہمارے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کے نام لے لے کر اس کی حسب ضرورت دعا مانگنے لگیں۔ سب سے آخر میں اپنے لیے مانگا تو کیا مانگا؟ منجھلے میاں کا سہرا دیکھ لوں اور مر جاؤں

مجھلے میاں میرے والد کا عرف تھا۔ چچا صاحب نے بعد فراغ وظائف پیچھے مڑ کر دیکھا ہو گا کہ میں ہکا بکا ہو کر ادھا کوٹ کر بولیں۔ "واہ میاں تم ہو۔" چچا صاحب نے مسکرا کر پوچھا ہو تم کیا سمجھتی تھیں۔ قربان جاؤں میں جانتی تھی اللہ میاں طاق سے اتر کے بیٹھے ہیں۔"

جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا تو یہ حال اور کردار اتنا بلند کہ دوسروں کے لیے سب کچھ مانگتی ہیں اور اپنے لیے مانگتی ہیں تو کیا؟ گود کے پالے ہوئے کی شادی کے بعد اپنی موت۔ کیا ان لوگوں کی سادہ و بے لوث زندگی بجائے خود ایک شعر، ایک نغمہ، ایک گیت نہیں تھی؟

اب ذرا شاعری کو لیجئے۔ مکتب کے لڑکے ٹولیاں بنا کے بیت بازی کرتے۔ موزونیت گویا گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ شعر پڑھنے میں کوئی ذرا بھی کا یا اٹکا اور الف الف کا ہنگامہ بلند ہوا۔ جب کوئی حریف ہونے لگتا تو اس کی طرف کا کوئی نہ کوئی لڑکا سیدھا شعر فی البدیہہ موزوں کر کے پڑھ دیتا۔ میں اکثر اندھوں میں کانا راجا ثابت ہوتا اور پالا میری پارٹی کے ہاتھ رہتا۔ میرے چچا صاحب مرحوم نواب دلاور حسین خاں تھے۔ میری عمر آٹھ دس برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ میرے سامنے غالب کے اشعار پڑھتے اور وہ وہ معنی بیان فرماتے کہ یاد رہ جائیں۔ شاید حالانکہ غالب لکھنؤ میں اس وقت کچھ کم مشہور تھا اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ جہاں ایک شعر میں اتنے مطالب بھر دینا مشکل تھا وہاں سادہ شعر کہنا بھی آسان نہیں۔ جو ترتیب الفاظ نظم میں ہے وہی نثر میں بھی رہتی ہے فارسی یا عربی کا ایک لفظ نہیں پھر بھی کیا مزا ہے کیا گھلاوٹ اور مطلب کی رنگا رنگی ہے افسوس کہ اس نوعیت کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جا ——— جاتا ہوں
پھر اکیلے ہی تو گھبرائیے گا

میرے دوسرے چچا مرزا عابد حسین خاں صاحب مرحوم کے یہاں نماز مغرب کے بعد ہر شب ایک نشست ہوتی تھی جس میں مختلف خیالات اور رجحانات کے احباب جمع ہوتے تھے۔ کسی نے دوران گفتگو میں عربی کا شعر پڑھ دیا۔ جو لوگ عربی سے ناواقف تھے انہوں نے استدعا کی۔ وضاحت کے بعد سب نے تعریف کی۔ صاحب اول اٹھ کر فارسی والے نے بھی قریب قریب یہی خیال نظم کیا ہے تقاضا ہوا کہ سنائیے۔ اس کے بعد کوئی بول اٹھا کہ اردو میں بھی ہے اور شعر پڑھ دیا۔ کسی نے کہا کہ ہندی کا ایک دوہا بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ بچوں کو ان صحبتوں میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چھپ چھپ کے سنتے تھے۔ ان صحبتوں میں شریک ہونے والوں میں سے علاوہ دو چچاؤں کے جن حضرات کے نام اب تک یاد ہیں ایک تو دلی کے شہزادے نجھے مرزا صاحب مرحوم دوسرے سید جواد صاحب مرحوم تیسرے حکیم مہدی صاحب مرحوم موخر الذکر مرزا ہادی عزیز مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ عزیز مرحوم ان کے ساتھ آتے تھے اور ہم لوگوں کی بیٹھک الگ ہوتی تھی۔ اس وقت جو نام یاد آتے ہیں یہ ہیں ناصری مرحوم۔ نجھے نواب، محمد نواب، جعفر حسین۔ یہ حضرات اس زمانے میں پردیس میں رہتے تھے۔ شہزادے نجھے مرزا صاحب کو نماز پڑھانے کا اجارہ تھا۔ عربی و فارسی کے عالم متبحر تھے مگر جہاں تک اردو شاعری کا تعلق تھا بالکل کورے۔ تفریح طبع کے لئے لوگ ان کے سامنے اردو کا کوئی مہمل و بے معنی شعر پڑھ دیتے تھے کہ حضور اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ شہزادے صاحب تھوڑے غور و تامل کے بعد ارشاد فرماتے کہ پہلے اس کے مبادیات ذہن نشین کیجئے بس پھر کیا تھا گویا فلسفہ و حکمت و منطق و الٰہیات اور ما بعد الطبیعات کا دبستان کھل گیا۔ افلاطون نے یہ کہا ہے جالینوس کے یہ دلائل ہیں۔ ارسطو کا یہ قول ہے۔ سقراط یہ تھا اور نہ معلوم کیا کیا۔ ایک طویل تقریر کے بعد کل شعر میں کوئی نہ کوئی معنی پہنا دیتے اور لوگ سبحان اللہ و جزاک اللہ کے نعرے بلند کرتے مگر زیر لب تبسم رہتا۔ سید جواد صاحب آتش کے کلام کے عاشق تھے آواز بلند اور نہایت دلکش تھی اشعار لحن سے پڑھا کرتے تھے ان کا پڑھا ہوا آتش کا ایک شعر اب تک یاد ہے مگر ان کے پڑھنے کا وہ والہانہ انداز کہاں سے لاؤں۔

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

چچا مرحوم اور تعشق مرحوم سے گہرے مراسم تھے شاعری میں ان کے استغراق کا حال بیان کرتے اور ان کے اشعار سنایا کرتے تھے تو سب پہلے اور ذاتی مطالعے سے قبل میں انیس اور تعشق کے کلام سے متاثر ہوا۔

بچپن میں بیت بازی کے مشغلے کے علاوہ وہ مغلانیاں کہانیاں کہتی تھیں یا پہیلیاں بجھواتی تھیں یہ شب خوابی سے پہلے مشغلہ تھا پہیلیوں کی زبان بیشتر ہندی آمیز ہوتی تھی۔ بچے معنی پوچھتے اور اس طرح ہندی سے بھی تھوڑے بہت واقف ہو جاتے تھے ایک وسیلہ گیت اور ٹھمریاں بھی تھیں۔ چونکہ نواب وزیر مرزا ہندی کے زبردست کوی تھے۔ ان کی ٹھمریاں اور ہولیاں زبان زد خاص و عام تھیں طوائفیں محفلوں میں گاتی تھیں یہ بزرگ نرت اور موسیقی کے بھی زبردست ماہر تھے۔ کالکا اور بندادین دونوں بھائی لکھنؤ کے مشہور باکمال کتھک یا رقاص جب کوئی خوبصورت پہلو بھاؤ بتانے کا سمجھ میں نہیں آتا تھا تو نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر استصواب کرتے تھے اور جب مراد فیضیاب ہوتے تھے۔ صادق علی خاں ماہر موسیقی اور اس زمانے کی اکثر طوائفوں کے گانے میں استاد نواب صاحب موصوف کے شاگرد تھے ان کی بعض ٹھمریوں اور ہولیوں کے بول میری لوح دل پر اب تک نقش ہیں۔

مگر میرے جذبۂ شاعری کے خاص محرک میرے چچا[عہ] (موصوف) ہوئے یہ میری دادی صاحبہ کے سگے بھائی نواب جعفر حسین خان کے فرزند تھے مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت عزیز مرحوم سے خاندانی مراسم کے علاوہ ذاتی ربط ضبط اور بے تکلف دوستی و یکجہتی تھی وہ مجھ سے عمر میں دو چار برس ہی بڑے تھے۔ شعر تو نہ معلوم کب سے الاپ شناپ موزوں کرتا رہتا تھا ۱۹ یا ۲۰ برس کی عمر میں حضرت عزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور یہ بانگ لگائی۔

اثرؔ ہے نام وطن لکھنؤ عزیزؔ استاد
نکالتا ہوں نئے راستے زبان کے لیے

مگر جس شاعر کے کلام کا میں دلدادہ ہوں وہ میرؔ ہے اور متعدد اشعار میں اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اثرؔ ہے میرؔ سے نادیدہ بیعت
نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

میرؔ کے یہاں صاحب بھی ہیں مرأۃ میرؔ (انتخاب کلام میرؔ) کے مقدمے میں اس کا ذکر موجود ہے۔

خود شعر اور شاعری کی ماہیت پر میں نے متعدد نظمیں کہی ہیں غزل کے اشعار میں بھی کہا ہے مثلاً:۔

؎ شاعری لطف زباں تک نہیں محدود اثرؔ
ساتھ ہی ساتھ فراوانی جذبات بھی ہو
؎ جام خالی کو چھلکتے کبھی دیکھا ہے اثرؔ
شعر میں جوش کہاں دل میں اگر جوش نہیں

تصانیف

۱۔ اثرستاں ۲۔ بہاراں

[عہ] نواب دلاور حسین

۳ - نوبہاراں
۴ - لالہ و گل
۵ - نغمۂ جاوید
۶ - رنگ بست
۷ - پالک فریب
۸ - زنگاری بیگم
۹ - بادشاہ چینی کی دختر
۱۰ - اثر کے تنقیدی مضامین
۱۱ - چھان بین
۱۲ - انیس کی مرثیہ نگاری
۱۳ - مطالعۂ غالب
۱۴ - مزامیر (دو جلدیں)
(میر کے کلام پر مقدمہ اور انتخاب)
۱۵ - فرہنگ اثر

غیر مطبوعہ

۱ - غزلیات اور نظموں کا مجموعہ دیوان
۲ - پیشوایان دین کا ایک مجموعہ قصائد
۳ - منظوم تراجم کا ایک مجموعہ
۴ - سیاہ چشمان کشمیری کے عنوان سے نظموں کا ایک مجموعہ
۵ - اور بے شمار تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ
۶ - مکاتیب اثر (زیر طبع)

(ترتیب احراز نقوی)

نثار احمد فاروقی

میں ـــــ ایک ایسے دور کی پیداوار ہوں، جس کے دماغ سے ابھی "بادۂ پارینہ" کی بو نہیں گئی ہے اور جو اپنے ذہنی مزاج کو جدید فکر سے بھی ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔ اس طرح میں قدیم و جدید کے درمیان آویزاں ہوں۔ میری تعلیم نہ پوری طرح مغربی طرز پر ہوئی ہے نہ اُسے "خالص مشرقی" کہا جا سکتا ہے۔ میں نے قدیم معاشرت اور علوم و افکار سے بھی اثر قبول کیا ہے، اور دورِ حاضر کے تقاضوں سے بھی بیگانہ نہیں ہوں۔ خواہ مجھے سائنس سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہ رہا ہو، لیکن اس کی برکتوں اور کراماتوں کو میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے ذہن نے تسلیم کیا ہے۔ اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں میں جو تصادم ہو رہا ہے میں اس کا بھی تماشائی ہوں۔ میرے شعور کی عمر ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ نہیں، لیکن یہ تاریخ کا شاید سب سے اہم زمانہ ہے جس میں صدیوں کا قائم رشتہ ٹوٹا ہے۔ جس میں تاریخ کا ایک باب بند ہوا ہے اور دوسرے باب کھولے گئے ہیں۔ اس دور میں تہذیب ہی نہیں بدلی۔ الفاظ اور ان کے معانی بھی بدل گئے ہیں، بعض علمی تصورات بھی غیر یقینی سے بن گئے ہیں۔ یہ وہ عہد ہے جس میں انسان ـــــ خصوصاً ایک ہندستانی ـــــ ماضی کے دامن کو مستقبل سے باندھ دینا چاہتا ہے۔ شاید ہی کسی عہد کی تاریخ اتنے فکر کے ساتھ لکھی گئی ہوگی جتنے فکر سے اس دور کی داستان لکھی جائے گی۔

پندرہ سال کی اس بظاہر مختصر سی مدت میں، جو تاریخ کے سیلاب میں ایک پرِ کاہ کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ میرے لیے ایک کرب انگیز ذہنی سفر کی کتنی طویل اور دردناک کہانی ہے اس کا احصا کون کر سکتا ہے، کس کی مجال ہے کہ بیان کر سکے اور کسے تاب ہے کہ تحمل سے سن لے ؎

کس کو فرصت جو حال میرا سُنے رنگ ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ناکامی اور کامرانی کا انحصار انھیں دو باتوں پر ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا؟ مگر یہاں نہ کچھ کھونے کے لیے تھا، نہ کسی شے کے پانے کی تمنا تھی۔ سارا سفر اپنی ہی تلاش میں تمام ہو گیا ؎

نیروے عشق بین کہ درین دشتِ بے کراں
گامے نرفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

زندگی میں اب تک شوق و حرماں کی مختصر روداد یہ ہے کہ ہوس ہوئی ہے اور حسرت کاٹی ہے۔ کتنے ہی ارمان لالۂ صحرائی کی طرح اپنے حسن سے خود شرمسار ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی طرۂ دستار تک نہیں پہنچ سکے۔ کبھی ان خوں گشتہ تمناؤں اور نیم رس حسرتوں کا جائزہ لیتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شاید میں اس دور کے عام المیے کی ایک علامت ہوں۔ اس بھری محفل میں کوئی میرے سخن کا شنوا اور میرے درد

کا شناسا نہیں، زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے میرے خزانۂ استعداد کو کیسی بے دردی سے لوٹا ہے اور میرے خونِ جگر کی کشید کو پانی سے بھی ارزاں کر دیا ہے۔ میرے ضمیر کی آواز پر کتنے پہرے بٹھائے گئے ہیں، ان سب کی داد کو کون پہنچے گا، ان کی فریاد کون سنے گا، اس دنیا میں میرا صرف ایک دوست، ایک ہمدرد، ایک راز دار اور ایک غمگسار ہے اور وہ خود "میں" ہوں۔

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

اب تک میں سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں، کتنے ہی فریب دانستہ کھائے ہیں اور سپیدۂ فردا کی امید میں ظلمتِ شب کی چیرہ دستیوں کو گوارا کیا ہے۔ مگر وہ سحر شاید میری زندگی میں طلوع نہیں ہوگی، اُس "مرادِ نامراداں" کو میری نگاہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ لیکن میں اس پر سلام بھیجتا ہوں جس کی راہ تکتے آنکھیں سفید ہوگئیں اور جس کی امیدِ وصال اب "عمرِ دگر" پر موقوف ہے۔

سلامے چو بوئے خوش آشنائی
بداں مردمِ دیدۂ روشنائی
سلامے چو نورِ دلِ پارسایاں
بداں شمعِ خلوت گہِ پارسائی

میرے پاس دولتِ احساس و آگہی کے سوا کچھ نہ تھا، مگر یہ دولت بھی رائیگاں گئی۔ اب میں خود اپنا ماتم گسار ہوں، میں اسے ناامیدی یا شکست خوردگی نہیں سمجھتا، اگر مجھے مستقبل سے مایوسی ہوتی تو یقیناً ایسا ہی تھا۔ بحالاتِ موجودہ میں صرف اپنا اور اپنی صلاحیتوں کا کوئی مصرف نہیں پاتا، اندھوں کی بستی میں آئینے بیچ رہا ہوں اور خزف ریزوں کے بدلے موتی لٹا رہا ہوں۔ یہ میرا قصور نہیں، میرے ماحول اور میرے زمانے کی خطا ہے:

کمندِ کوتہ و بازوے سست و بامِ بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

بقولِ غالب ایک سناٹے کا عالم ہے، جہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں، ہر شخص کا جواب مطابق اس کے سوال کے دیے جاتا ہوں، خود کسی سے جواب کی توقع بھی اُٹھا دی ہے۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یارِ من
وز درونِ من نجست اسرارِ من
بے خبر بے تابِ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

کسے اپنا سینہ چیر کر یہ لق و دق صحرا دکھاؤں کہ اپنی تشنگی کا احساس کراؤں؟

امیدوں کے افق پر دور ایک پرچھائیں نظر آئی تھی۔ میری طرف لپکتی ہوئی، روح اس کی طرف کھنچنے لگی، دل نے اس کا استقبال کیا، کسی نے کہا کہ یہ پرچھائیں تم سے شناسائی پیدا کرے گی، یہ تمھارا دکھ بٹائے گی اور تمھاری فگار روح پر محبت و سکینت کا ہاتھ رکھے گی۔ لیکن میں اس پرچھائیں کے پیچھے دوڑا تو وہ مجھ سے بھاگنے لگی۔ افق کے بھی پار

الٰہی جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اب میں زندگی کے چٹیل صحرا میں کھڑا ہوں اور اس کے نقشِ قدم دیکھ رہا ہوں، چاروں طرف حسین یادوں کے شوخ چشم غزال رم کر رہے ہیں، میں انھیں صید کرنے کے لیے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں، ہانپ جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں اور وہ غزال قریب آ آ کر دُور ہوتے جاتے ہیں۔

کتنا بدبخت ہے وہ انسان جس کی عمر ان پرچھائیوں کے تعاقب میں، ایسے حسرت زار میں، اور ایسی حیرت گاہ میں گزر جائے وہ شاید صرف دوسروں پر رشک کرنے کے لیے پیدا کیا جاتا ہے، اُسے صرف ایک ہی چیز اُن کے برابر خوش نصیب بنا سکتی ہے اور وہ موت ہے، سب کی سطح کو ہموار کر دینے والی موت ——— مساوات کا آخری نقطہ ———

میں نے آباؤ اجداد سے میراث میں صرف اپنا وجود پایا ہے، اور کچھ نہیں رکھتا۔ نہ جاہ و حشم، نہ مال و متاع، نہ املاک و جائیداد، نہ شہرت، نہ عزت، نہ اقتدار، نہ اعتبار۔ اور آج دنیا انھیں "بتانِ وہم و گماں" کی پرستار ہے۔ میں اپنے ادب کے خول میں پڑا ہوا ہوں اور کچھوے کی طرح اپنا سر چھپا کر یہ سمجھتا ہوں کہ آفاتِ خارجی سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ حالانکہ یہ خول بھی ایک طلسم اور فریب سے زیادہ نہیں ہے!

زندگی کا سفر رومان سے حقیقت کی طرف اور ILLUSIONS سے CONCRETES کی طرف رہتا ہے، اسی لیے ماضی میں زیادہ کشش اور رومانیت نظر آتی ہے۔ کبھی چاندنی راتیں کتنی اُجیالی معلوم ہوتی تھیں، ہواؤں میں شراب کی تاثیر محسوس ہوتی تھی اور خوابوں میں زندگی نظر آتی تھی اور زندگی سراسر ایک رنگین خواب دکھائی دیتی تھی مگر آج ——— آہ آج کے خواب بھی کتنے سنگین ہیں!

عمر کا وہ زمانہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے، جب دردِ عشق کی خلش پہلی بار دل کو محسوس ہوتی ہے، ساری کائنات پیکرِ حسن نظر آتی ہے، زمین و آسمان ہی بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن زمانے کی تلخیاں ان خوابوں سے رنگینیاں چھڑا لیتی ہیں اور انھیں کھردری حقیقتوں سے دست و گریباں کر دیتی ہیں۔ جن نغموں سے کبھی سارا وجود ساز کے تاروں کی طرح جھنجھنا اُٹھتا تھا۔ آج وہ قلب و روح کی سطح سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے کسی چٹیل تودے سے نسیمِ صبح کے جھونکے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر ان کی لطافت ان چٹانوں کو ذرّہ بھر بھی متاثر نہیں کر سکتی۔

وہ راتیں، وہ دن، وہ خواب، وہ خیالات، وہ جذبے، وہ امنگیں، وہ ولولے، وہ جوش و ہمت، وہ ہواؤں میں پرواز کرنے کی خواہش، وہ عالم کو زیر و زبر کرنے کے حوصلے، وہ "کچھ" کر گزرنے کے ارادے ——— آج معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کیفیتیں ہم پر نہیں کسی اور پر گزری تھیں۔ اب تو بڑی سے بڑی حقیقت ایک افسانہ اور بڑی سے بڑی صداقت جھوٹ نظر آتی ہے بقول المتنبی

مَنْ صَحِبَ الدُّنْيَا طَوِيْلًا تَقَلَّبَتْ
بِعَيْنَيْهِ حَتّٰى يَرٰى صِدْقَهَا كِذْبَا

جس مسافر کو نہ سفر کی خبر ہو، نہ نہایتِ سفر معلوم، نہ خضر سے شناسا ہو، نہ راہزنوں سے آگاہ، نہ منزل کا آشنا ہو، نہ کارواں کا ساتھی، نہ بانگِ جرس سے چونکتا ہو، نہ زادِ راہ رکھتا ہو، نہ چلنے پر قادر ہو، نہ ٹھہرنے کا مقدور، اُسے آپ کیا کہیں گے؟ ——— وہ میں ہوں!

میں صرف زمانے ہی کا گلہ مند نہیں، مجھے اپنے وجود سے بھی شکایت ہے۔ اگر زمانہ میرے لیے بے رحم رہا ہے، تو خود میں نے

بھی کبھی اپنی زندگی پر ترس نہیں کھایا۔ میں نے کبھی اپنے مزاج میں لچک پیدا نہیں کی۔ اپنی "کج کلاہی" کو سپر حوادث سمجھتا رہا، فاقہ کشی کو قناعت اور خودداری کو توکل جانتا، دُنیا سازی کو ضمیر فروشی اور مطلب برآری کو تملق سمجھا۔ یہ ساری کمزوریاں میری اپنی مخلوق ہیں اور اسی لیے مجھے عزیز رہی ہیں۔

در دشتِ آرزو نبود بیم دام و دد
راہیست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

میں اپنی بپتا لکھنے کی سکت بھی نہیں پاتا۔ کوئی شخص اگر طوفان کے تھپیڑوں سے مقابلہ کر رہا ہو، گرداب بلا میں ہاتھ پیر مار رہا ہو، آپ اس سے کہیں کہ "آپ بیتی" بیان فرمائیے، وہ قلم کے پردے پر تو شاید اس حال میں بھی بیان کر دے، دنیا کے پردے پر ممکن نہیں۔ ہاں اس کشمکش سے عہدہ برآ ہو کر ساحل پکڑ لے اور کچھ مہلت نصیب ہو تو شاید اُس کرب کی "بازیافت" کا حوصلہ کر سکے۔ میری زندگی ایک معمولی انسان کی "غیر معمولی" زندگی ہے، خارجی ہنگاموں سے زیادہ داخلی تجربات اور کیفیات کی زندگی۔ لیکن اُسے جس طرح بیان کرنا چاہتا ہوں، نہیں کر سکتا۔ کاش کبھی ایسا کر سکوں۔

(۲)

اب کچھ باتیں "سوانحی" اور نظریاتی نوعیت کی بھی عرض کر دوں:

میں ۲۹ - جون ۱۹۳۳ء کو جمعہ کے دن امروہہ (ضلع مراد آباد) کے ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرا سلسلۂ نسب حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور ننھیال کا سلسلہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی کے وسیلے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔

میرے والد مولوی تسلیم احمد صاحب غالباً ۱۹۳۹ء میں فائز الحق ہو گئے تھے، اس وقت میں چھ سال کا تھا، اور دو چھوٹے بھائی انیس احمد و جلیل احمد بالترتیب چار سال اور دو سال کے تھے۔ ہماری تربیت، تعلیم، ساخت پرداخت زیادہ تر عم محترم حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی مدظلہٗ اور میرے نانا استاذی و مرشدی حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں ہوئی۔ عربی و فارسی کی تمام تر تعلیم گھر پر حاصل کی۔ میرے نانا بڑے صاحبِ نسبت بزرگ اور عالم باعمل تھے۔ اُن کی زندگی اولیائے سلف کی زندگی کا نمونہ تھی۔ یہ اُن کی ادنیٰ سی کرامت ہے کہ اُن سے میں نے جو کچھ پڑھا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا ہے، سب کچھ بھول گیا، لیکن اُن کی محبت و شفقت، اُن کی عالمانہ باتیں، اُن کی سیر چشمی، قناعت، فقر دوستی، شب زندہ داری، اور وہ منفرد طبیعت، قیامت اندیش نظر، اور عشق انگیز صورت، پردۂ تخیل سے ایک لمحے کے لیے بھی دور نہیں ہوتی ہے۔

بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی
چہ بخاطر گزرانم کہ تو از یاد روی

وہ اس دنیا میں میرے سب سے بڑے مربی، محسن، معلم، مشفق اور مرشد تھے۔ اُن کے بے پناہ احسانات سے سبکدوش

ہوتا تو کیا، اُن کا شمار کرنا بھی میرے لیے محال ہے۔ اُن کی خدمت میں رہ کر طبیعت میں گداز اور نظر میں تہ بینی پیدا ہوتی تھی۔ میں نے بارہا اُن کے گریۂ سحرگاہی کا منظر دیکھا ہے' انوار و برکات کے نزول کا برائی العین مشاہدہ کیا ہے' میں مختصر سی زندگی میں ہزارہا پڑھے لکھے انسانوں سے ملا ہوں لیکن اتنا راسخ علم اور اتنا رچا ہوا مذاق کہیں نظر نہیں آیا، انسانی ہمدردی کی ویسی رمق بھی کہیں نہیں دیکھی' اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ تو اُن کی ذات کے سوا کہیں نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے روضے پر انوار کی پیہم بارش فرمائے وہ اپنے ایک دست گرفتہ روسیاہ و نابکار کو مجلس دنیا میں بیٹھنے کا اہل بنا گئے۔ اس سے بڑھ کر میری احسان مندی کا اور کیا باعث ہوگا!

میری اسکول کی تعلیم بہت بے ضابطگی کے ساتھ ہوئی۔ کبھی پڑھا کبھی چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۲ء میں دہلی آکر ایک نجی ادارے میں ملازمت کرلی اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران میں ہائی اسکول' انٹرمیڈیٹ' بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات دیے۔ درمیانی وقفوں میں اردو و فارسی کے متفرق امتحانوں سے بھی "نپٹتا" رہا۔ گویا انگریزی و ہندی کی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک بالکل نجی طور پر حاصل کی۔ مضامین لکھنے اور شعر کہنے کا چسکا ۱۹۴۳ء سے تھا۔ لیکن ۱۹۵۱ء سے چھپنا شروع کیا۔ ۱۹۵۳ء سے ریڈیو پر نشری تقریریں شروع کیں۔ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار ذکرِ میر کا اُردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے مکتبہ برہان دہلی نے شائع کیا، ۱۹۶۲ء میں دہلی کالج میگزین کا میر نمبر "میر تقی میر: احوال و آثار" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا۔ اس کے علاوہ مضامین کا مجموعہ "دید و دریافت" اور ایک کتاب "تین تذکرے" آج کل پریس میں ہے۔ اور آدھی درجن کتابیں نامکمل مسودوں کی شکل میں پڑی ہوئی میری موت کا انتظار کر رہی ہیں تاکہ بنیے کی دکان پر پہنچ کر کسی کام آسکیں۔

میں اُردو سے اتنا نہیں جتنا اردو والوں سے "بدگمان" ہوگیا ہوں' یہی وجہ ہے کہ میں نے ایم اے کے لیے اپنا مضمون عربی ادب منتخب کیا۔ اور میرا ارادہ ہے کہ اسلامیات پر کچھ کام کروں۔ تعلیم کے دوران میں جو کچھ لکھتا رہا' وہ مالی ضروریات کی وجہ سے تھا، ورنہ اب صرف اتنا ہے کہ میرے دوست محمد طفیل صاحب (ایڈیٹر نقوش) ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ لکھوا لیتے ہیں، جس دن اُن کی طرف سے ڈھیل مل گئی تو یہ "ہیرا پھیری" بھی جاتی رہے گی۔

اُردو کے ادیبوں اور انشا پردازوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عجب نہیں کہ جہاں تہاں ان بزرگوں کی نقل کرتا ہوا بھی پکڑا جاؤں۔ شاعروں میں میر کو سچا اور غالب کو بڑا شاعر مانتا ہوں؛

میں تنقید کو تخلیقِ ادب کے لیے ضروری نہیں سمجھتا، مفید جانتا ہوں۔ اپنے قلم پر کسی گروہ یا پارٹی کا لیبل لگانا بھی مجھے گوارا نہیں، نہ میں قلم کی عصمت فروشی کا قائل ہوں۔ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں' اپنی تحریریں خود پڑھتا ہوں اور اگر مجھے مسرت حاصل ہو جائے تو اسے کارآمد سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُردو میں ابھی تنقید کا وقت ہی نہیں آیا' پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارا تحقیق کا معیار بلند ہو اور ماضی کا تمام ادبی سرمایہ اپنی صحیح نوک پلک کے ساتھ ہمارے سامنے آئے۔ میں ادبِ اردو کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے انگریزی ادب کا مطالعہ بھی اتنا اہم نہیں سمجھتا، جتنا بتایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر

ہم اسلامی ثقافت، ایرانی تہذیب، اور زبان و ادبیات فارسی و عربی سے باخبر نہ ہوں، ساتھ ہندستان کی اُن زبانوں سے واقفیت نہ رکھتے ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت میں اردو زبان و ادب کو متاثر کیا ہے، تو ہم اردو ادب کا مزاج نہیں پا سکتے۔

ہمارا ادب ہماری تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنا تاریخی سفر طے کرتا رہا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے پر کہاں کہاں اور کن حالات میں اثر انداز ہوئے ہیں۔ مغرب ہمیں ادب کے استقرائی مطالعے THEORY OF LITERATURE میں تو مدد دے سکتا ہے لیکن استخراجی مطالعے کے لیے ہم مشرقی سرمایۂ روایت کے بہر حال محتاج رہیں گے۔

میں نقادوں کی ٹھیکیداری کا سب سے بڑا مخالف ہوں اور انھیں گمراہ کرنے والا سمجھتا ہوں۔ وہ قاری کے ذہن کی کھڑکیاں کھلنے نہیں دیتے، اسے مختلف مسائل کی لایعنی توجیہوں میں الجھا دیتے ہیں اور اس طرح ادب سے وہی کام لینا چاہتے ہیں جو پچھلی صدیوں میں علماء سو نے مذہب سے لیا تھا۔ میں ادب کا مطالعہ کرنے والے کی قوتِ فیصلہ سلب کر لینے کا حامی نہیں، اور تنقیدی مسائل کے نام سے جو کچھ لکھا جاتا ہے، اُسے منطق کی اصطلاح میں "دفع دخل مقدر" سمجھتا ہوں، جو واقعی فقہ کا حال تھا، یعنی خود ہی مسئلہ گھڑنا اور خود ہی اس کا جواب تیار کر دینا۔ ادب میں مسئلے نہیں ہوا کرتے۔

میں نے اپنے ادبی نظریات کو بھی "دُکھتی رگ" نہیں بنایا، نہ اُسے مذہبی عقیدے (DOGMA) کی طرح پرورش کیا ہے۔ میں نمایاں طور پر محسوس کرتا ہوں کہ پچھلے دس بارہ برس میں میرا ذہن بہت سے تقلبات سے گزرا ہے اور اسے مبارک فال سمجھتا ہوں۔

میں آزادیٔ اظہار کو ادیب کا واحد حق سمجھتا ہوں، یہ تو ممکن ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ غلط دلائل پر مبنی ہو، لیکن جہاں تک میں اپنی تحریروں کا جائزہ لے سکا ہوں کبھی مصلحت سے، کسی کو خوش کرنے کے لیے، یا کسی سستے دنیاوی مقصد کے حصول کے لیے میں نے کبھی اپنے ذہن و ضمیر کی آواز کے خلاف نہیں لکھا اور اسی پر فخر کرتا ہوں۔

دس بیس مرتبہ قلم سے "میں" کی ضمیر نکلی تو ذہن میں یہ لمعان ہوا کہ حضرت یہ "میں" ہیں کون؟ —— یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم!

اور خیالات کا "بہاؤ" اچانک رُک گیا —— ہائے

دریں حیرت سرا عرفان ما ہم عالمے دارد
سراپا مغز دانش گشتن و چیزے نفہمیدن

موسیقار لیونیر برسٹین

امریکہ کا شہرۂ آفاق میوزک ڈائریکٹر لیونیرڈ برسٹین ۲۵ راگست ۱۹۱۸ء کو لارنس میں پیدا ہوا اور بوسٹن میں پرورش پائی۔ ۱۹۳۵ء میں بوسٹن لیٹن سکول میں تعلیم پا کر ۱۹۳۹ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لی۔ دو سال تک رینر کے آرکسٹرا کے ساتھ کنڈکٹنگ کی تربیت لی اور منجھے ہوئے استادوں سے پیانو کے سبق لئے۔ آپ ذہین اور ہونہار شاگرد تھے، جلدی ہی استادوں کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ نیویارک کے ایک آرکسٹرا کے میوزک ڈائریکٹر نے آپ کے فن میں استادی رنگ دیکھ کر آپ کو دو سال کے لئے اپنے آرکسٹرا میں ملازم رکھ لیا۔ یہ ملازمت آپ کی شہرت کی پہلی منزل ثابت ہوئی۔

آپ پچیس برس کی عمر میں ہی دھنیں تخلیق کرنے لگے۔ آپ کی فنکارانہ کاوش نے موسیقی کے قدیم رنگ سے نئے افق پیدا کئے۔ آپ نے شاہکار دھنیں مرتب کیں اور براڈوے تھیٹر کی موسیقی میں دلفریب رنگ پیدا کر دئے۔ آپ فنکار ہی نہیں خالق تھے۔ آپ کو مختلف اداروں نے متعدد اعزازات دئے۔ "ویسٹ سائڈ سٹوری" میں جسے ۱۹۶۱ء کی بہترین فلم قرار دیا گیا ہے آپ ہی کی موسیقی تھی۔ یہ آپ کی ہدایت کاری اور تخلیق کا عروج تھا۔ آپ نے فلمی موسیقی میں کئی سنگ میل قائم کئے جن میں انعام یافتہ فلم "آن دی واٹر فرنٹ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک آپ برکشائر میوزک سنٹر کے آرکسٹرا کے قائد اور برینڈیس یونیورسٹی میں شعبہ موسیقی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے ٹیلی ویژن کے "اومنی بس" پروگرام میں لیکچروں کا فصیح و بلیغ سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے دنیا کے شہرت یافتہ آرکسٹروں کی قیادت کی ہے اور متعدد ممالک میں استادی کے کمال دکھائے ہیں جن میں روس، جرمنی اور فرانس بھی شامل ہیں۔ آپ جہاں بھی گئے وہاں کی موسیقی میں اپنا اثر چھوڑ آئے۔ تمام دنیا کے نقادوں اور جریدوں نے آپ کی منفرد فنکاری پر طویل تبصرے لکھے ہیں۔

آپ نے ٹیلی ویژن کے پروگرام میں تین اعزاز حاصل کئے اور جن مختلف شخصیتوں اور اداروں نے آپ کو انعامات، سندیں اور اعزاز دئے ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ کے چوٹی کے اعزازات آپ کو ملے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں برسٹین نے پہلی کتاب "دی جوائے آف میوزک" لکھی جس کی صرف امریکہ میں ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کتاب کو کلاسیکل درجہ دے دیا گیا ہے۔ دو انعامات بھی دئے گئے ہیں اور اسے امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے ۱۹۵۹ء کی منتخب کتاب قرار دیا ہے۔ یہ کتاب انگلینڈ، جرمنی، سویڈن اور میکسیکو میں بھی چھپی ہے۔

۱۹۶۲ء میں سائمن اور شسٹر نے آپ کی دوسری کتاب چھاپی ہے جو پہلی کی طرح کامیاب اور مقبول ہوئی ہے۔

برسٹین نے ایک ایکٹرس سے شادی کی ہے۔ ان کے تین بچے ہیں اور آپ نیویارک سٹی میں رہتے ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین

ولادت ــــــــــ ۱۱۶۹ ہجری / ۱۷۵۶ عیسوی

وفات ــــــــــ ۱۲۵۱ ہجری / ۱۸۳۵ عیسوی

خادم الشعرا سعادت یار خاں رنگین اپنی کمال درجہ بے کمالی اور بے بضاعتی کا ہمیشہ سے معترف ہے۔ مگر پھر بھی تسلیم کرتا ہے کہ چند بزرگوں کے فیض اس کی ہمنشینی کی برکت اور ان کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ اب ایک مجھ سا حقیر و ناچیز شخص بھی فن سخن وری میں کافی دستگاہ رکھتا ہے اور اس میں بقدر قلیل قابلیت کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔ بقول حضرت سعدیؒ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

بروز ۱۷ رجب ۱۲۱۱ھ جب کہ شاہ عالم بہادر پادشاہ عالم پناہ بادشاہ غازی کا عہد تھا میں جب بلدۂ لکھنؤ میں مرزا ابراہیم بیگ متخلص بہ جوانؔ[1] جو میرے دلی دوست ہیں اور برادر مہربان سید انشاء اللہ خاں جن کا تخلص انشا ہے۔ اور میرے حقیقی بڑے بھائی نواب صمصام الدولہ بہادر صوفی اللہ یار بیگ خان شہامت جنگ، مرزا حاجی بیگ صاحب اور میر گدائی صاحبان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور خوب لطف صحبت اٹھا رہا تھا۔ ان دوستوں سے گزشتہ وقت کی صحبتوں کا کہ جن میں بعض شعرا کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور شرکت سخن گوئی و مطارحات کا اتفاق ہوا تھا، تذکرہ کر رہا تھا۔ اور یہ فصاحت کلام بیان کر رہا تھا کہ فلاں فلاں مقام پر یہ علمی بحثیں ہوئیں۔ اور فلاں فلاں موقع فلاں مجلس میں یہ ادبی معرکے و مجادلے ظہور میں آئے۔

یہ سن کر مرزا ابراہیم بیگ صاحب نے از راہ تلطف مجھ سے کہا کہ اگر آج کی تمہاری یہ ساری گفتگو بہ مناسب نظم و نثر یعنی شاعرانہ نکات قلم بند کر لی جائے۔ تو پورا یقین ہے کہ وہ تحریر ایک نہایت ہی اعلیٰ پایہ کی یادگار ہوگی۔ جو تم سے باقی رہ جائے گی مجھے معلوم ہے کہ بفضل خدا ہر طرح کے شاعرانہ کلام کے پرکھنے اور موازنہ کرنے کی خاص استعداد ہے اور ہر کلام کی اصلاح کی نظر سے بھی اس میں دخل معقول دینے کی پوری ہمت موجود ہے بلکہ بدیہہ گوئی و حاضر جوابی تو ماشاء اللہ تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس پر میں نے اپنے مخاطب دوست کو یہ جواب دیا کہ جناب مرزا صاحب یہ خاکسار تو زیور علم ہی سے عاری ہے اگر آپ کے کہنے کے مطابق کچھ لکھوں بھی تو اس میں خوبی انشاء و حسن تکلف کیا خاک پیدا کر سکوں گا۔ ابھی تو یہ کہ میری

---

[1] جوان، مرزا ابراہیم بیگ متخلص بہ جوان شاہ آبادی باشندہ محلہ کوچہ چیلاں دہلی، ملازم خاص مرزا سلیمان شکوہ، فن سخن میں حضرت مصحفی کے شاگرد۔ آپ خوش رو وجیہ جوان تھے۔ جوانی میں لکھنؤ جا کر صاحب عالم کے ملازم ہوئے اور مصحفی اور انشا کے مطارحات میں شریک رہے۔ (خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۲۰۹)

یہ شاعری اور سخن سنجی چیز ہی کیا ہے۔ جو اب اس کے حوصلے پر نثر فارسی لکھ کر اس میں فصاحت و بلاغت کے کچھ گل کھلا دوں گا۔ پہلے میری نظم و نثر میں کچھ ربط تو پیدا ہو لینے دو، بقول فردوسی ؎

ز گاو زمیں را گر ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

لیکن مرزا نسیم بیگ مصر ہوئے کہ نہیں صاحب تمہیں یہ کام ضرور کرنا ہو گا۔ کیونکہ فن شاعری میں تم نے ایک نام پیدا کر لیا ہے۔ اب نثر میں بھی کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرنا لازمی ہے۔ مگر اس سے مقصود کسی قسم کی فضول عبارت آرائی نہیں ہے۔ صرف ایک سلیس اور عام فہم زبان میں تم اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دو۔ بمصداق سعدی ؎

وصف ترا گر کنند ور نکنند اہل فضل   حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را

اب مرزا نسیم بیگ کے مکرر مکرر تاکید کرنے پر میں نے یہ کہا کہ اگرچہ شاعری کا چسکا مجھ کو زمانہ دراز سے ہے اور بڑے بھلے شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اور سب باتوں کو چھوڑ کر مجھے دوسروں کے کلام میں خورده بینی کرنے اور ان کے نقائص دکھانے کا بہت شوق ہے۔ اور عموماً ہر شعر کی باریکیوں اور اس کی تہ کو بخوبی پہنچ جاتا ہوں۔ چنانچہ اسی نگاہ عداوت سے میں جب کبھی اپنے کلام کو بھی دیکھتا ہوں۔ تو خیال کرتا ہوں کہ وہ حد سے زیادہ لغو لگ رہا ہے۔ اے کاش کہ یہی نکتہ بینی اور سعی اصلاح کی عادت مجھ پر شروع ہی سے ہوتی۔ اور میں اس سے اپنی شعر خوانی میں کچھ کام لیا کرتا۔ تو آج میری اور میرے کلام کی حالت بالکل ہی بدل جاتی ؎

عیب این و آں چوں روز روشن بود در چشم من   چو دیدم عیب خود بستم چشم و شب کردم

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ تو میرے اخی المکرم سید انشاء اللہ خاں بھی پاس سے بول اٹھے کہ ہاں، ہاں۔ یہ مضمون ضرور لکھ ڈالنا چاہیے اور اس سے جو نسخہ مرتب ہو۔ اس کا نام مجالس رنگین رکھنا بہت موزوں ہے۔

غرض میں نے جب دیکھا کہ میری کسی طرح مخلصی نہیں ہوتی کیونکہ سب حاضرین مجلس بس ایک ہی بات پہ تلے بیٹھے تھے۔ اور کہے جا رہے تھے کہ ایسی کوئی کتاب ضرور لکھی جائے لہذا میں نے بھی ان کی رضا جوئی اور خوشنودی طبع کے ارادہ سے یہ مجموعہ مکمل کیا۔ اور اس کا نام مجالس رنگین ہی رکھ دیا۔ اب وہ اصحاب جو مذاق سلیم رکھتے ہیں ان سے توقع ہے کہ وہ اس حقیر تحفہ کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ — مجالس رنگین[1]

تعلیم و تربیت

باپ میرا یعنی محکم الدولہ طہماس بیگ خان اعتقاد جنگ بہادر، روسی وہ شخص تھا کہ نادر شاہ کے لشکر میں دس برس رہا اور اپنے باپ سے تعلیم ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں آیا تو مجھے اور میرے بڑے بھائی یعنی نواب معتمد الدولہ صوفی المہ یار بیگ خان بہادر، شجاعت جنگ، روسی کو کہ اپنی ہم دس دس بارہ بارہ برس کے تھے تو چار گھڑی رات باقی رہے سے اٹھ کر اور لشکر سے باہر جا کر گھوڑوں پر اور پیادہ کر کے ہر ایک فن سے آگاہ کرتا تھا۔ اور ہر ہتھیار کو باندھنے اور رکھنے اور برتنے سے تعلیم کرتا تھا۔ باوصف اس فراغت اور حشمت کے سب طرح کی محنت اور مشقت اٹھا کر ہر ہر قسم کی ہم دونوں کو تعلیم کرتا تھا اور کوئی فن سپہ گری کا اس سے باقی نہ رہا تھا کہ جس سے اسے بخوبی آگاہی نہ تھی۔ سوائے بانک اور پٹا اور لکڑی اور کشتی اور کٹار، اور بلم وغیرہ کے کس واسطے کہ یہ چیزیں ولایت میں نہایت کم تھیں۔

(مجالس رنگین بحوالہ اخبار رنگین ص ۲۲)

---

[1] مجالس رنگین نے نواب بندہ علی کی فرمائش پر ۱۲۳۵ھ میں لکھا تھا۔ انڈیا آفس میں اس کا نسخہ محفوظ ہے۔ اخبار رنگین ص ۲۲

ڈاکٹر نورالحسن نے رنگین کا مدفن لکھنؤ لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ (اخبار رنگین۔ ص ۲۵)

تصانیف[1]

۱۔ دیوان ریختہ پہلا دیوان
۲۔ دیوان ریختہ دوسرا دیوان
۳۔ دیوان آمیختہ ہزلیات
۴۔ دیوان انگیختہ ریختی
۵۔ مجموعہ رنگین سات زبانوں کے قصائد و غزلیات کا مجموعہ
۶۔ مجالس رنگین
۷۔ امتحان رنگین نثر
۸۔ اخبار رنگین چشم دید واقعات
۹۔ ایجاد رنگین حکایات منظوم
۱۰۔ عجائب و غرائب رنگین۔

۱۱۔ شہر آشوب
۱۲۔ کہاوت ہائے رنگین
۱۳۔ حکایات رنگین
۱۴۔ بہار چمن رنگین اس کتاب میں چار باب ہیں
۱۵۔ نظم رنگین سو حکایتوں کا مجموعہ
۱۶۔ داستان رنگین۔ سرگزشت آغا عزیز سوداگر گجرات
۱۷۔ جنگ نامہ رنگین
۱۸۔ نصاب رنگین
۱۹۔ مثنوی فارسی بطرز مثنوی مولانا روم
۲۰۔ تصنیف رنگین
۲۱۔ گلدستۂ رنگین
۲۲۔ سجود رنگین
۲۳۔ رنگین نامہ
۲۴۔ ساقی نامہ رنگین
۲۵۔ تجربہ رنگین
۲۶۔ کلام رنگین
۲۷۔ فرس نامہ رنگین جس کا دوسرا نام اسپ نامہ ہے
۲۸۔ قرۃ الایمان۔ عقائد اسلام میں
۲۹۔ قصیدہ فارسیہ کا منظوم ترجمہ
۳۰۔ قصیدۂ بانت سعاد کا منظوم ترجمہ
۳۱۔ سودا کا ایک قصیدہ رنگین کی اصلاح
۳۲[2]۔ مسدس رنگین
۳۳۔ ایجاد رنگین
۳۴۔ عجائب رنگین
۳۵۔ غرائب رنگین
۳۶۔ داستان رنگین

ان کتابوں کے علاوہ ایک مجموعہ انتخابات بھی ہے جس میں رنگین کی کئی کتابوں کے انتخابات کے علاوہ ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں اور مضمون نثار میر ذوق کے پانچ مطلعوں کی تضمین بھی شامل ہیں۔

---

[1] جو کتابیں لندن میں انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ (مجالس رنگین ص ۱۵-۱۹ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)

[2] ۳۲ تا ۳۶ از اخبار رنگین ص ۲۶

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

محمد شیخ غلام ہمدانی مصحفی تخلص کے حسب و نسب کے حالات "مجمع الفوائد" میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ چونکہ قبل ازیں فارسی و ہندی کا تذکرہ لکھ چکا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ شہر لکھنؤ میں جس کی آج کل کی آبادی کے مقابلے میں شاہ جہاں آباد کی آبادی پاسنگ برابر بھی نہیں شعرا کی کثرت ہے۔

میں اپنی تحصیل علمی کے متعلق بتا دوں کہ میری فارسی زبان اور فارسی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہ جہان آباد میں بخوبی ہو گئی تھی جن دنوں میں نے وطن چھوڑا اور اس نئے شہر میں آکر قیام کیا۔ علوم عربی میں منطق و الٰہی و ریاضی مولوی مستقیم سکنہ گوپامؤ شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء سے سیکھے اور چند دن ہندی اور صرف کا درس بھی لیا۔ تاریخ مولوی مظہر علی سے پڑھا جس کا ثانی صرف و نحو میں کم پیدا ہوتا ہے۔ غرض اللہ کے فضل سے عمر کے آخری حصے میں عربیت اور تفاسیر قرآن میں اس قدر دسترس بہم پہنچائی کہ ایک عربی دیوان تصنیف کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ اس کی عملی صورت بھی پیدا ہو گئی۔ اور غزلوں کا تقریباً ایک جزو اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سو دو سو قصیدے لکھ لیے۔ مسودہ کے اجزا صاف کر کے ایک اونچے طاق پہ رکھ دیے۔ اسے بارش کی نمی لگ گئی اور دیمک نے اسے اپنی خوراک بنا لیا۔ کاغذ کے ٹکڑے کرم خوردہ اور کچھ سلامت نکلے چنانچہ اس نظم کا سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ دو تین مقامات حریری مع شرح میرے پاس تھے۔ ایک جزو میں

ے میں نے جو کچھ اپنے اجداد سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ میرے مورث اعلیٰ کا قیام موضع اکبر پور میں تھا جو موضع [illegible] اور موضع شیر پور کے درمیان واقع ہے۔ موضع مذکور پر [illegible] نے قدیم دشمنی کی بنا پر اس موضع کے تمام مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا۔ ایک [illegible] الدین جسے اس کی والدہ نے [illegible] کے سبب ایک گڑھے میں ڈال دیا تھا اور خود قتل ہو گئی تھی۔ اس حادثہ میں محفوظ رہ گیا۔ اس بچے کو ایک بڑھیا عورت نے اٹھا کر پرورش کیا [illegible] گئے اور وہاں ایک محلے کی ویران مسجد میں مقیم ہوئے۔ وہ معزز خاندان سادات میں ایک بزرگ کی [illegible] تھا۔ ایک دن ان کو بھی ساتھ لے گیا کہ بچے کی پیشانی سے شرافت اور سعادت ظاہر ہوتی تھی چنانچہ ان کو اولاد نہ تھی، انہیں اپنا فرزند بنا لیا۔ زیور علم و تہذیب سے آراستہ کیا اور اپنی دختر سے شادی کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ نظام [illegible] راجپوت تھے۔ ان کے بیٹے یعنی شیخ نظام کے والد اسلام لائے تھے۔ اس سید کے رشتہ داروں کو صدمہ ہوا کہ ایک نو مسلم نے سید ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ تعلقات کی کشیدگی دور کرنے کے لیے وہ وہاں سے چلے گئے۔ [illegible] شیخ نظام کی زوجہ نے ان سے کہا کہ مجھ سے تمہاری نسل نہیں چلے گی اس لیے تم اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کر لو۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔ شیخ نظام کا مقبرہ اب بھی اکبر پور میں موجود ہے۔ شیخ صاحب سے مصحفی تک بارہ پشتیں گزری ہیں۔ والد کا نام مولوی [illegible] دادا کا نام شیخ درویش محمد تھا۔ تین بھائی اور تھے۔ بڑے بھائی کا نام غلام جیلانی تھا، تیس سال کی عمر میں لاولد فوت ہو گئے۔ دوسرے کا نام غلام صمدانی تھا، ان کی شادی ہو گئی تھی۔ بال بچوں والے آدمی تھے۔ لیکن وہ اولاد بچپن ہی میں مر گئی۔ ان میں سے صرف دو فرزند باقی رہ گئے۔ بڑے بیٹے کی عمر بیس سال کی تھی، شادی ہونے پائی تھی کہ عین عالم شباب میں انتقال کر گئے۔ دوسرے بیٹے کی شادی خاندان میں ہوئی لیکن مجمع الفوائد کی تصنیف تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسرے بھائی کا نام مصحفی نے نہیں بتایا۔ اپنے متعلق مصحفی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ [illegible] ایک لڑکی پیدا ہوئی [illegible] لکھنؤ میں مقیم ہوں۔

نے لکھ ڈالا ہے۔ یہ کتاب میں نے اپنے شاگرد عنایت محمد کے پاس دیکھی تھی جنہوں نے نصاب عربی مجھ سے پڑھے تھے۔ اس سے میں نے زبان عربی کے کچھ محاورے سیکھے۔ اگر زمانے نے مہلت دی تو اسے مکمل کر ڈالوں گا۔

قرآن کے متن کے معنی حرف بحرف بغیر تفسیر کی ضرورت کے اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہوں۔ جب عربی کی کتابیں مثلاً مختصر و مطول ایک ہی مطالعے سے مجھ پہ آسان ہو گئی ہیں، میری فکر کی جودت کوئی گہرا مطلب مجھ سے پوشیدہ نہیں رہا۔ یہ نقص کہ میں عربی داں نہ تھا میں نے اس شہر میں رہ کر رفع کر لیا۔ دوسرا نقص علم عروض و قافیے سے ناواقفیت کا تھا۔ چند راتوں کے مطالعے سے گزشتہ استادوں سے عروض کی کتابیں چند عرصہ میں پڑھ ڈالیں اور عروض پر خود ایک مختصر کتاب لکھ ڈالی اس کا نام خلاصۃ العروض رکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا مقصود مجھے حاصل ہو گیا۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانیں میری جوانی کے زمانے سے رات اور دن غلام اور کنیز کی طرح میرے سامنے کمر باندھے تیار رہتی ہیں لیکن عربی میں خاطر خواہ طور پر مشق حاصل نہیں ہوئی۔ اور ریختہ میں امیرزادوں اور غریب زادوں کے تقریباً سو اشخاص میرے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں اور مجھ سے فصاحت و بلاغت کا درس لیتے رہتے ہیں۔

فارسی محاورہ میں جو کتاب مفید الشعرا میں نے لکھی ہے۔ اس سے میری فارسی دانی کا رتبہ آپ پر ظاہر ہو جائے گا۔ میرے ریختہ میں جو شیرینی ہے فارسی کے طفیل ہے اگرچہ مجھے فی الحال اپنے ہندی اور فارسی اشعار لکھنے سے شرم آتی ہے۔ لیکن اس جلد میں چاہتا ہوں کہ عربی اشعار لکھوں۔ لیکن عقل نے پکار کر مجھے کہا چونکہ اس فن میں تو نے نام پیدا کر لیا ہے۔ عربی شعر لکھنے سے تجھے کیا فائدہ؟ کون جانے گا اور کون سمجھے گا۔ فارسی زبان چونکہ صاحبان زمانہ کی بے علمی کے باعث اب نقاب میں منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ تو طبیعت کو اس لیے زیادہ تر ریختہ کی طرف رکھا۔ عقل صلاح اندیش ان شگفتہ پھولوں کو نظر سے گرانے اور عربی کے کانٹے دار درختوں سے الجھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آخر صحیح رائے کو ارشاد کے مطابق فارسی اور ہندی کلام کے رطب و یابس میں سے کچھ جو میں نے مناسب سمجھا، اسے تحریر کر دیا۔ خدا کرے کہ کلام پرکھنے والے سامعین کے زیور قبول سے آراستہ اور حقیقت جاننے والی طبیعتوں کی تائید سے پیراستہ ہو۔

اس وقت میری عمر اسی برس کو پہنچ چکی ہے دل اب دنیا سے بے زار ہو چکا ہے اور سوائے اللہ کی یاد اور نماز روزہ میں مشغولیت کے کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے۔

(از ریاض الفصحا)

آج سے چند سال قبل ایسا وقت تھا کہ ان دنوں مجھ مسکین نے زبانی دوستوں کے نامناسب سلوک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تنہائی اور قناعت کے گوشے میں بدبختی کا کمل کندھے پر ڈال کر گمنام لوگوں کی طرح زندگی گزارنا اختیار کر رکھی تھی شعر و شاعری اور امیروں کی ملاقات سے بے زار ہو چکا تھا اور وحشیوں کی طرح اس طبقے سے دور بھاگتا تھا۔ یہاں تک میری طبیعت کا نظام آہستہ آہستہ درستی کی طرف مائل ہوا۔ اردو کلام کی سلسلہ جنبانی کا سبب بنا وہ اس طرح کہ ایک دن شیخ محمد علی نے جن کا تخلص تنہا تھا۔ آ کر عرض کیا کہ اس سے قبل اگر ہم لوگوں کی مشق کے لیے جلسے کی صورت میں مل بیٹھنے کا انتظام ہو جائے تو یقیناً یہ آپ کی بلند رائے میں بھی بہت خوب اور مناسب رہے گا۔ ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے شہر سے باہر ویران جگہ پر جسے روش آ کہتے ہیں۔ اس تجویز کے متعلق غور و خوض کیا گیا۔ اس جلسے میں شاگردوں کے علاوہ دوسرا کوئی آدمی شامل نہ تھا چونکہ ان دنوں میرے لیے اور

کوئی کلام نہ تھا۔ میں نے یہ شغل دوستوں کی پاسداری کے لیے اختیار کر لیا۔ میاں نور الاسلام منتظر تخلص (خدا انھیں بخشے) اور میرزا حیدر علی گرم تخلص (جو ایک مدت تک حیدر آباد دکن میں رہ کر عزت و شہرت پا چکے تھے) جلسے کی محفل کی شمع ہے۔ وہ تین برس تک روز بروز جلسے کی رونق ترقی کرتی گئی۔ اسی دوران میاں نور الاسلام کو سل کی بیماری کی وجہ سے لازمی سفر درپیش ہوا۔ وہ وفات پا گئے۔ اس سے میرے دل پر سخت چوٹ لگی نیز مقرر کردہ جلسہ ختم ہو گیا۔ میاں منتظر کی وفات کے بعد میرزا حیدر علی گرم ایک دوست کے ہمراہ کالپی کی طرف چلے گئے جس سے مجھ پر افسردگی چھا گئی۔

ان ہی دنوں میری نواب مرزا محمد تقی خان بہادر تخلص ہوس سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ ان سے میری قدیمانہ صاحب سلامت تھی۔ انھوں نے ہاتھی کی لگام روک کر میری احوال پرسی کی۔ مجھے اپنے گھر بلایا اور مجھ سے پکا وعدہ لے لیا۔ میرے پیارے مرزا حیدر علی ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ میں ان کے پاس گیا۔ ان کی طرف سے بڑی حوصلہ افزا باتیں ہوئیں۔ جب میں نے ان کی شیریں زبان سے نہایت توجہ اور مہربانی دیکھی۔ تو اسی دن سے جسے آج چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے رفاقت اختیار کر لی۔ انھوں نے مجھے استادی کا درجہ بخشا ہے۔ اور ہمیشہ مجھ سے کلام کے متعلق مشورہ لیتے ہیں۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے ان کے ہاتھوں اور ان کی مہربانی اور بخشش سے مل جاتا ہے۔ وہ محفل مشاعرہ بھی منعقد کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ انھیں سلامت رکھے چونکہ پہلے تذکرے میں بھی اتفاق کی بات کہ ان کا ذکر آنے سے رہ گیا تھا۔ اس واسطے میں نے چاہا کہ اس کی تلافی اس کتاب میں کر دوں۔ اس جلد کی تصنیف کا سبب یہ بنا کہ موجودہ زمانے کے شعرا کی تعداد کثیر دیکھ کر ایک روز مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اگر میں ایک اور تذکرہ لکھ ڈالوں تو نئے نام مل جائیں گے کہ تمام حروف تہجی پورے ہو جائیں گے اس لیے میں نے قلم کے گھوڑے کو شعرا کے اشعار و احوال لکھنے کے لیے میدان میں ڈالا۔ ان شعرا کا ذکر میرے ہندی فارسی تذکرے میں نہیں ہے ان کے حالات میں نے جلد ثانی میں لکھ دیئے اور اسے مکمل کر دیا۔ جیسا کہ تذکرہ نگاروں کا قاعدہ ہے۔ میں نے ہر ایک کے حالات اس کی قابلیت اور لیاقت کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ امید ہے۔ اس بیاض کی سیاہی جو صاحبان بصارت کی آنکھوں کا نور ہے۔ دانا و بینا حضرت کی آنکھوں کا سرمہ ثابت ہو گی خدا کرے کہ اسے نکتہ چین زمانے کی بری نظر سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس تذکرہ کی تاریخ لالہ بخشی لال حریف نے حسب ذیل لکھی۔ تذکرہ کا آغاز بھی صاحب موصوف کی مہربانی سے لکھا گیا ہے۔

تاریخ

صد شکر کہ ایں ذخیرۂ اہل سخن
شد انجمن سپہر را رشک افزا
از خامۂ فکر خود بر آورد حریف
سال تاریخ او ریاض الفصحا ۱۲۲۱

(از دیباچہ ریاض الفصحا)

تاریخ ولادت: سنہ ۱۱۴۱ھ اور سنہ ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوئی۔ امروہہ آپکا مولد ہے اسلیئے امروہوی کہلاتے ہیں۔ (مقدمہ ریاض الفصحا از مولوی عبدالحق مرحوم)

تاریخ وفات: ۱۔ مصحفی نے چہتر سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے (گل رعنا ص ۲۲۲)

۲۔ وفاتش تا امروز دہ سال گزشتہ عمر بسیار یافتہ (از گلشن بے خار)

۳۔ گلشن بے خار چونکہ سنہ ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس لیے وفات سنہ ۱۲۴۰ھ درست معلوم ہوتا ہے۔

۴- آزاد کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ (تاریخ ادب اردو از بابو سکسینہ صفحہ ۱۹۶)

تصانیف: ۱- آٹھ دیوان (ریختہ)

۲- تین دیوان فارسی دو دیوان (نظیری جلال اسیر ناصر علی سرہندی کے جواب میں) ایک خورد

۳- تذکرہ ریاض الفصحا

۴- تذکرہ عقد ثریا

۵- تذکرہ ہندی

۶- دو جزو شاہنامہ (نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر)

۷- عربی دیوان (جس کا ذکر ریاض الفصحا میں ہے۔)

۸- خلاصۃ العروض (عروض پر ایک رسالہ)

۹- مفید الشعرا (فارسی محاورہ پر رسالہ)

۱۰- مقامات حریری پر نامکمل ترجمہ و حواشی

۱۱- مثنوی شعلہ شوق۔ } عشقیہ
۱۲- مثنوی بحر المحبت }

۱۳- مثنوی در ہجو چارپائی خود۔ مثنوی در ہجو مکان خود۔ مثنوی در ہجو افراد محفل۔ مثنوی در تعریف حیوان خراسانی۔ مثنوی در صفت حمام خوش انجام۔ مثنوی گرما۔ مثنوی در افراط آتش۔ مثنوی در افراط سرما۔ (ذاتی واردات کے تحت لکھی گئیں۔)

۱۴- رسالہ مجمع الفوائد

۱۵- نثر ہفت تصویر

۱۶- خطبہ نشاط باغ۔

۱۷- رسالہ در فضیلت انسان (لطیفۂ جاناں)

۱۸- مکتوب بطور پیچ مکتوب ملا ظہوری

(نقوش) ان کی تصانیف کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے۔ (صحیفہ مصحفی صہ ۴۲)

منٹو

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ ـــــ ذرا ٹھہریئے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں سن تو نہیں رہا ـــــ نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت گیارہ مئی سنہ ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجیے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خر ذات افسانہ نگار کیسے بنا۔ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹشے، مارکس ـــــ کے حوالے دیتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی سکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ

۵½ فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں، اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیے۔ وہ اول درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہیں چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں کہ اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں، اس نے بڑی خوشی سے برداشت کیے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا، بلکہ تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا اب گرا ــ لیکن وہ کم بخت آج تک نہیں گرا ــ شاید گر جائے۔ اوندھے منہ...... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لیے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ انڈا چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو ــ کوئی دکان کھول لو۔ لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لیے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی سٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ سٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے۔ جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے مگر خفگی نہیں سہی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لیے اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ ــــ

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لیے...... کہ اس کا ہمزاد ہوں ــــ

کہ وہ فراڈ کر رہا ہے ۔۔۔ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا ۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا ۔۔ لیکن اسے ناکامی ہوگی۔ پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو باہر پان لینے کے لیے چلا جائیگا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا۔ اس سے افسانے کا آغاز کرے گا۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، ممی، موذیل، یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجے میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے۔ جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ ۔۔۔ اور یہ شخص جو اکثر خدا کا منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے۔ جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب میں بیان کیے دیتا ہوں وہ چور ہے۔ جھوٹا ہے۔ دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لاکے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا ۔۔۔ یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اول درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع میں اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا۔ جھوٹ تھا۔ منٹو جھوٹ بقدر کفاف بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے ۔۔ اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ۔ میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیئے اسکو خود سمجھنا چاہیے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پائدان ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

امیر مینائیؒ

ولادت: ۱۲۴۴ھ   وفات: ۱۳۱۸ھ

امیر تخلص ہیچمیرز ہیچمدان اُمیدوار رحمت یزدان امیر احمد ابن مولوی کرم محمد ننگ خاندان مخدوم شاہ مینا ادام اللہ برکاتہم فنا فن شعر میں جناب منشی مظفر علی صاحب اسیرؔ کے تلامذہ میں داخل۔ برائے تمام تحصیل کتب درسیہ میں اکثر علمائے نامی کے شاگردوں میں شامل۔ سرکار فیض آثار کا نمک خوار آبائی ہے۔ باوصف فقدان ہرگونہ استعداد رونق اسی سرکار والا تبار کی بدولت پائی ہے

میں نے جب ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زبان دان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں انھیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بین کا شوق مجھے بھی ہوا۔ اور اُسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی، کہ اردو زبان کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں، اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہوگیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لُٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہو سکے۔ الفاظ کیسے! لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ فردوس مکان نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سایہ دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی مجھ سے متعلق تھی۔ لہذا فردوس مکان اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے۔ وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پا سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں۔ تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کا عہد آیا۔ تب فرصت کی کمی اور بڑھی۔ لیکن کچھ ہی ہوا۔ یہاں وہی دُھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدرداں سر آلفرڈ لائل صاحب بہادر (لیفٹیننٹ گورنر مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اُردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی۔ فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا۔ جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست و حال وائس پریذیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعے سر آلفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔ جنرل صاحب بہادر نے کہ بڑے مربی اس لغت[لہ] کے اُس وقت سے اس وقت تک ہیں اور ان کو اس لغت کے ساتھ پوری دلچسپی اور سچی ہمدردی بلکہ عشق ہے۔ دوسری جون ۱۸۸۶ء کو میری درخواست کے ساتھ پیش کیا۔ ہز آنر نے نمونے کو بہت پسند فرما کر جو جو ہدایتیں کیں اور وعدے فرمائے ان کو بطور یادداشت جنرل صاحب بہادر نے لکھ لیا۔ جن میں سے بعض یہ تھے:۔

[لہ] مراد امیر اللغات سے ہے

> "یہ درخواست معقول ہے کہ گورنمنٹ بہت سی جلدیں اس لغت کی خرید کرے۔ ہم مختلف ریاست ہائے ہندوستان اور بنگال، پنجاب، بمبئی اور مدراس کے گورنمنٹوں سے بھی درخواست اعانت کریں گے۔ اور ہز ایکسلنسی وائسرائے سے التجا کر کے ان کو سرپرست اور مربی اس کا بنائیں گے۔ جس قدر روپیہ منشی صاحب اس کی تالیف کے لیے خیال کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ مہیا ہو جائے گا۔ اول ایک دو ورقہ پروف کے طور پر تیار ہو جائے۔ اور قریب قریب دو سو جلدیں اس کی تمام ہندوستان میں گردش کرائی جائیں۔ ایک عمدہ چھاپہ خانہ اس کے واسطے ہو۔ جس قدر تالیف ہوتا جائے۔ اس کا پروف پہلے چھپوا کے مختلف اضلاع ہندوستان میں مشتہر کیا جائے۔ اور جب اس پر اعتراض اور حرف گیری ہو لے۔ اصلاح اور درستی کے چھاپا جائے۔"

چنانچہ وہی نمونہ جس پر پوری توجہ کی نوبت نہ آئی تھی ۱۸۸۶ء میں چھپوا دیا گیا۔

افسوس یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے پائی تھی کہ نواب خلد آشیاں مرض الموت میں مبتلا ہو کر دنیا سے رحلت فرما گئے۔ سر آلفرڈ لائل نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہا۔ میں کہا ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اردو کی قسمت ہی میں یہ بدا ہے کہ سنورنے نہ پائے۔ میں اسے کیا کروں اور کوئی کیا کرے۔ ان چوٹوں سے میرا دل ٹوٹا۔ مگر ہمت نہ ٹوٹی۔ اور رہ رہ کر تمنا گدگدایا کی۔ میں نے دیکھا کہ اردو کی بیل پھیلتی چلی جاتی ہے۔ دفتروں میں یہی زبان، اخباروں میں یہی زبان، پرانی شاعری سسک رہی ہے۔ تو کیا ہوا۔ نئی شاعری اردو کے نئے لباس سے دلہن بن کر نکلی ہے۔ آخر باسی کڑھی میں ابال آیا۔ اور میں نے ۱۸۸۶ء میں ایک تجربے کے واسطے سفر کیا کہ دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں۔ لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا۔ جس سے بات چیت ہوئی اس نے اپنی تمنا کے اظہار سے میری تمنا کو اور شہ دی۔ خان بہادر محمد حسین خان مذاق (تعلقہ دار بریانواں اودھ) مولوی حکیم قاضی سید محمد قائم علی رئیس کھیتا سرائے۔ سید محمد مہدی حسن خاں شاداب مرحوم (رئیس رسول پور ضلع مظفر پور) ذی فہم اور بلند حوصلہ لوگ قدردانی کرنے والے تھے۔ سفر سے پلٹنے پر عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خان[1] بہادر طاب ثراہ نے باجلاس کونسل ایسی دستگیری کی کہ میں نے رامپور میں امیر اللغات کا دفتر کھول دیا۔ پروف مشتہر کرنے کی صورت جو سر آلفرڈ لائل کی ہدایتوں میں تھی۔ کسی طرح بن نہ پڑی۔ اس لیے کہ سر آلفرڈ لائل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کام کو سرکاری کاموں کا ضمیمہ بنائیں۔ مگر اس خیال سے کہ لغت ملک کے لیے ہے۔ میں نے بیچ کی تحریروں اور اخباروں کے ذریعے سے تالیف کے اہم مسائل کو ملک کے سامنے پیش کیا۔ جس سے ایسے اچھے اچھے نتیجے نکلے جو کبھی کسی مصنف یا مؤلف کی خودداری سے نہیں نکل سکتے۔ جن لوگوں نے بیش بہا رایوں سے مجھے شکرگزار فرمایا۔ انھوں نے صرف مجھ پر احسان نہیں کیا، بلکہ اپنی زبان اپنے ملک پر بھی احسان کیا۔ زندگی ہے تو آئندہ جو مقدمہ ترتیب دوں گا۔ اس میں دل کھول کر احسان کرنے والوں کا شکریہ اور ترتیب و تالیف کی مصیبتوں کا کچا چٹھا لکھوں گا۔

---

[1] نواب مشتاق علی خاں نے ۲۵ فروری ۱۸۸۹ء دوشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔

در برویم عذر ما بپذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ بات میرے بیان کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام چھیڑا جاتا ہے تو پہلے اس میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ سیکڑوں کتابوں کے ورق اُلٹے۔ اپنے پچھلے سرمائے سے جو سالہائے دراز کا ذخیرہ تھا، مدد لی۔ لائق لوگوں سے مشورے لیے۔ خاص کمیٹی قائم کر کے بحثیں کیں۔ ہزارہا روپے خرچ ہوئے۔ تب جا کر دو برس کی جانکاہی میں اس حصے کو مرتب کر پایا۔ جس کو آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرما کر اب بھی جو کوئی نیک صلاح دے گا۔ میں ہرگز ہٹ دھرمی سے کام نہ لوں گا۔ بلکہ شکریے کے ساتھ آئندہ حصوں کے لیے اس کو صرف آنکھوں کے سامنے نہیں بلکہ دماغ کے خزانے میں احتیاط سے رکھوں گا۔

تصانیف:۔ (۱) محامد خاتم النبیین (۲) نور تجلی (۳) ذکر شاہ انبیا (۴) صبح ازل (۵) لیلۃ القدر (۶) شام ابد (۷) ابر کرم (۸) شیدائے رسول (۹) قصہ اویس قرنی (۱۰) مراۃ الغیب (۱۱) صنم خانۂ عشق (۱۲) گوہر انتخاب (۱۳) جوہر انتخاب (۱۴) مثنوی عاشقانہ (۱۵) مضامین دل آشوب (۱۶) واسوخت (۱۷) دیوان فارسی (۱۸) کبوتر نامہ (۱۹) زاد الامیر (۲۰) خیابان آفرینش (۲۱) غار کے اسرار (۲۲) وظیفۂ جلیلہ (۲۳) ہدایت السلطان (۲۴) ارشاد السلطان (۲۵) نغمۂ قدسی (۲۶) بہار ہند (۲۷) امیر اللغات (۲۸) انتخاب یادگار (۲۹) جان تاریخ (۳۰) سرمۂ بصیرت (۳۱) گنجینۂ قوافی (۳۲) رمز الغیب (۳۳) رموز غیبیہ (۳۴) رسالہ بحث اعداد حروف تہجی۔ (۳۵) محاورات مصادر (۳۶) ست سیا بہاری

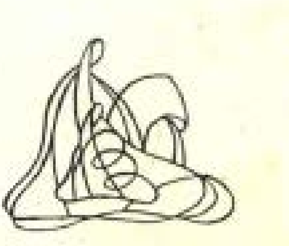

عنایت اللہ دہلوی

غالباً جولائی ۱۸۷۸ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم جو اس وقت میور کالج الٰہ آباد میں پروفیسر تھے گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے الٰہ آباد میں جانے لگے۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الٰہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (سر سید مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اس وقت آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو انہوں نے ہم دونوں کو گلے لگایا، پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور دوڑ کر والد کے پاس چلا گیا اس خوف سے کہ کہیں مجھے روتا دیکھ لیا تو پھر ساتھ نہ لے جائیں گے۔

آج کا دن میرے لیے نئے نئے تجربوں اور حیرتوں کا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی ریل میں نہ بیٹھا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا بیٹھا یا کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جا بیٹھتا تھا کبھی اس کھڑکی سے اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھیے ریل کب چلتی ہے۔ آخر کار یہ وقت بھی آ گیا۔ ریل کھسکی۔ اسٹیشن کی عمارتیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی کبھی سانپ کی طرح لہراتی جمنا کا پل اترتے ہی فراٹے بھرنے لگی۔ پہیوں کی لے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک امنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ میدان، کھیت، گاؤں، آدمی، درخت، مویشی کوئی ایسا نہیں تھا جو ریل کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی چیزیں بے تحاشا دوڑتی نظر آتیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے۔ اوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل، نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دور نظر آتی تھی مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آ جاتی اور ہر طرف اندھیرا سا ہو جاتا اور مینہ ترچھی ترچھی دھاروں میں برسنے لگتا۔ بادل کی گرج جسے گھر میں ڈر لگا کرتا تھا، اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت بھلی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اس گھٹا اور اندھیرے کو پیچھے چھوڑ کر روشن مطلع میں آ جاتی۔

جب کوئی اسٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لیے پٹڑی بدلتا اور پھر کون لڑکا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ، گارڈ کا اپنی گاڑی سے اتر کر انجن تک بھاگا بھاگا جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا اور اپنی گاڑی کی طرف آ چلتی ریل میں دوڑ کر اس کے پائدان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے اسٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ، کوئی کھڑا ہے، کوئی چل رہا ہے، کوئی صاف نظر آتا ہے، کوئی دھوئیں اور بھاپ کے بگولوں میں آدھا چھپا ہے، مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرز سے اسٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا، پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم اور انگریزی ہوٹلوں کے چمکتے ساز و سامان کی جھلک دکھا کر رک جانا۔ ٹکٹ کلکٹروں کا چلتی گاڑی میں آن پہنچنا، قلیوں اور مسافروں کا شور۔

سودے والوں کی بے ڈھنگی بولیاں گو سب معمولی چیزیں تھیں۔ مگر پہلی بار دنیا کے تماشوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز خود دیکھتا تھا چاہتا تھا کہ والد صاحب بھی اسے دیکھیں۔ سوالوں کی انتہا بھی مگر وہ زیادہ متوجہ نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی سے باہر منہ رکھنے کو بار بار منع کرتے تھے کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی خاک بھی پڑی مگر دیکھنے سے نہ ہارا۔ ایک دفعہ مجھے تھکن سی معلوم ہوئی تو کھڑکی کے پاس سے منہ ہٹایا۔ آنکھیں خمار آلود ہوئیں۔ پھر کچھ اماں یاد آنے لگی۔ دل گھبرا سا گیا چپ سی لگی۔ لیٹا اور نیند آگئی۔ سو کر اٹھا پھر منہ کھڑکی کے باہر تھا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آگیا اور یہاں اترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ہی ایک احاطے میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے اور ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھہر گئی۔

ہم نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گذرنے کے بعد ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا اس کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ٹٹی کے قریب ایک میز جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں بہت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بڑے بھاری بھرکم آدمی سفید سر سفید داڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا منہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہ سید احمد خان صاحب تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف کرسٹان والا کہنا ہی کافی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک خوف اور بیزاری کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ والد کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے اٹھے اور یہ کہہ کر کہ آپ آگئے والد سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا۔ یہ کون ہیں۔ ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت کو دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ دے کر سرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سے چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ کہیں کہیں سنہری چوکٹوں میں تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں پہاڑ، چشمے اور سبزہ زار نظر آتے تھے اور سب پر ایک سکوت کا عالم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی ان ہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کورنس میرے لیے اس قدر پُر لطف تھا اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی۔ اس پر بہت خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی زندگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کورنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا تھا۔ یہ مجھ کو منصور کا مقبرہ معلوم ہوتا تھا جسے میں دلی میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہے کہ کسی لڑکے کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچیں۔

سید صاحب اس قدر عظیم و جسیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے ورنہ خیال تھا کہ میں ان کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔ سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھتے تھے

میرے بڑے بھائی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا مگر میں نے نہ سنا کیونکہ بالکل عدیم الفرصت تھا۔ سید صاحب کے قریب ان کی میز کے پاس کھڑا رہا۔ اس وقت ایک چیز ایسی تھی جس کی طرف دیکھنے میں میں بالکل محو تھا۔ یہ سید صاحب کے لکھنے کی دوات تھی اس کے اوپر کا ڈھکنا کہیں سونے کا کہیں چاندی کا ہو بہو شیر ببر کا سر معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی تھی۔ اور اس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی خوب چمکتی تھیں۔ آخر کار اس خواب حیرت سے جاگنا پڑا۔ سید صاحب نے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا اردو کی چوتھی کتاب ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری کتاب اور اوائل ریڈر پڑھ رہا ہوں۔ اس جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ علم و فضل باعث مسرت ہوا ہو۔ یہ دونوں صاحب باتیں بھی کرتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ ان کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جو مصروفیت مجھ کو تھی وہ ان دونوں بزرگوں کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ یہ مشکل درپیش تھی کہ میں کسی چیز کو اٹھا کر اس کا کوئی ذاتی تجربہ حاصل نہ کر سکتا تھا اور نہ اتنی جرأت ہوتی تھی کہ والد سے ایک ایک چیز کو پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کروں۔ اتنے میں ایک اور نیا واقعہ درپیش آیا۔ سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی ہیبت آواز میں کہا پنکھا روکو پنکھا فوراً رک گیا۔ اور سید صاحب نے بکس میں سے ایک سگرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی سگرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو ان کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں تھی وہ سگرٹ کی تھی۔ اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا۔ اور یہ اس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔ جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اس کے قریب ہی ایک کمرہ والد صاحب کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب وغیرہ رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس بیٹھ کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ آئے گو اس کمرے میں دلکش چیزیں کم تھیں مگر غسل خانہ کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لیے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کے کسی کو چھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے پہننے کے کمرے میں آئینہ کی خوبصورت میز پر کچھ چیزیں شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ میں ان سے ڈرا کیوں کہ ان کو میرے ساتھ خاص دشمنی تھی جہاں میں نے خوش ہو کر ان کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر میرے میرے حق میں مشکلیں پیدا کر دیتی تھیں۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا اس پر بہت سی کرسیاں رکھی تھیں کھانے کے کمرے کے سامنے گھاس کا وہ بڑا تختہ جس کے چاروں طرف سرخ اینٹوں کی نالیاں اور پھولوں کی کیاریاں اور راستے پر بڑے بڑے گملے رکھے تھے، اس وقت موجود نہ تھا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں گلاب کے درخت تھے اور کچی روشوں کے گرد مہندیوں کی باڑ لگی تھی۔ ان سے جنوب کی جانب وہ چبوترہ تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور غالباً اسی زمانہ کے بارہ تیرہ برس کے بعد اسی چبوترہ کی جگہ ایک خوبصورت کمرہ بنایا گیا جو میاں مسعود کا مکتب کہلاتا تھا۔ چبوترے کے کنارے پھولوں کے گملے رکھے تھے اور تین طرف درخت تھے جو غالباً پھلوں کے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور والد پھر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں سید صاحب کے چند دوست گاڑیوں سے اتر کر آئے۔ ان میں دو صاحب یاد ہیں۔ ایک مولوی زین العابدین تھے دوسرے خواجہ محمد یوسف۔ مولوی فریدالدین صاحب

آتے ہی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں کیونکہ جو بات پوچھتے تھے اس طرح پوچھتے تھے جیسے میرے ہمیشہ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔ حالانکہ میں نے انھیں آج ہی دیکھا تھا۔ اس موقع کی صرف ایک بات مجھے خوب یاد ہے۔ سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا منہ کھولو۔ میں نے منہ کھولا کہنے لگے ارے اس لڑکے کے منہ سے تو خون نکل رہا ہے۔ توبہ توبہ! میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا اس لیے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ گیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔ گو جوان ہو کر پان کھانے کی عادت مدت تک نہ چھوڑی۔

جب رات ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا کھانا میز پر ہے۔ سب لوگ اٹھے اور کھانے کے کمرے میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لیے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر، چینی کے برتن، شیشے کے گلاس، چاندی کے چمچے کانٹے، ہاتھی دانت کے دستوں کی چھریاں، رنگین دیوار گیریوں کے علاوہ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے، پنکھا چل رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر کا دسترخوان، برتن اور تیل سوز دیا میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اجلا بچھایا کرتی تھیں مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لیے یا جب کوئی مہمان آئے تو جب برتے جاتے تھے گلاس گرمیوں میں یا رمضان میں شربت پینے کے لیے نکالے جاتے تھے۔ والدہ ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا تیل سوز دیا دیکھا تھا۔ مگر اس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے۔ تین چار سفید پوش ملازم، ایک بڑی اور لمبی داڑھی کا دبلا پتلا مگر بے حد چست اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا اور سب لوگ حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے ہم دونوں بھائیوں کی رکابی میں بڑھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے کچھ غور نہ کیا۔ مگر وہ گھر کا سا نہ تھا۔ نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ جب ہم دونوں کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ ان دونوں بچوں کو ان کے پلنگوں پر لیجا کر سلا دو۔

ہمارے پلنگ ڈرائنگ روم کے غربی برآمدے میں بچھے تھے اس زمانے میں یہاں دوہرا برآمدہ نہ تھا اور نہ بڑا کمرہ تھا جو سید محمود والا کمرہ مشہور تھا۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ برسات شروع ہو گئی تھی برآمدہ کے سامنے کیاریوں میں پانی بھرا تھا اور ان میں ہزاروں مینڈک بول رہے تھے۔ کہیں ہلکی ٹرٹر اور کہیں تیز ٹرٹر۔ کبھی کبھی جھینگروں کی آوازیں اور مچھر سب مل کر ایسا شور پیدا کرتے تھے کہ میں تھوڑی دیر تک جاگتا رہا۔ پھر جب نیند آنے لگی تو یہ شور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کہیں دور کسی بڑی دیگ میں پانی ابل رہا ہو۔

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کر چکا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ کیا الٰہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی۔ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے اور کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

اسی دن کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب کچھ دن چڑھا تو ایک فٹن دو گھوڑوں کی آئی۔ اور مولوی فرید الدین صاحب اس میں سے اترے

اور تھوڑی دیر سید صاحب سے باتیں کر کے ہم سب کو اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ سید صاحب ساتھ نہ تھے۔ رستے میں کالج کے احاطے میں سے گزرے وزیٹر ہوس کے بنگلے، اور ایک جگہ دو ایک کوٹھریاں سی لال اینٹوں اور ڈاٹ کی نظر آئیں جیسی بعد کو کبھی کبھی انگریزی چھاؤنیوں میں دیکھنے کو اپنی مدرسے کے قرب کہیں نظر نہیں آتے۔ اور گاڑی سے اترنے کی نوبت آئی البتہ جب کالج کے ایک دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں جابجا پانی کھڑا تھا۔ رات کو مینہ خوب برس چکا تھا یہاں گاڑی کے پہیے دلدل میں پھنس گئے۔ گھوڑے بگڑنے لگے۔ سب لوگ گاڑی سے اترے اور زور لگا کر گاڑی کو آگے کھسکایا۔ دروازے پر پہنچ کر سب اترے دروازے کے دونوں پہلو پایوں پر سنگ مرمر کی لوحیں لگی تھیں۔ میں نے انگریزی میں سید ظہور حسین اور گیٹ کا لفظ جلدی سے پڑھ دیا۔ مولوی فریدالدین صاحب نے جھٹ مجھے تھپکی دی اور کہا "ارے تو انگریزی بھی پڑھ سکتا ہے"۔ دروازے سے ملی ہوئی مشرق کی طرف احاطے کی سنگین جالیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جن جالیوں پر لوگوں کے نام پڑھتا ہوا دور تک دوڑا چلا گیا۔ والد نے آواز دے کر بلا لیا۔ اور اب ہم سب مولوی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے (مولوی صاحب اس کوٹھی میں رہتے تھے جو سائنٹفک سوسائٹی کے باغ سے بہت قریب تھی اسے اصل میں سید صاحب نے اپنے رہنے کے لیے جب علی گڑھ میں صدر الصدور تھے بنوایا تھا مگر غالباً ولایت سے آنے کے بعد قرضہ چڑھا اور مولوی سمیع اللہ خان صاحب کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ آج کل معلوم نہیں وہ کیوں بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور ہے) دس بجے کے قریب سب نے مولوی صاحب ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ اب یہ یاد نہیں آتا کہ ہم سید صاحب کی کوٹھی پر کب اور کس طرح واپس گئے۔

والد نے علی گڑھ میں ایک دن کی جگہ جو ان کا معمول تھا، دو دن قیام کیا۔ اس خیال سے کہ اگر ماں کی جدائی سے بچوں پر برا اثر پڑے تو دلی واپس کر دیں۔ بڑے بھائی کو گھر یاد آنے لگا تھا اور وہ سست بھی تھے۔ مگر میرے کہنے سے آگے چلنے پر تیار ہو گئے۔ تیسرے دن آدھی رات کی ریل سے جس سے علی گڑھ پہنچے تھے اٹاوہ روانہ ہو گئے۔ اور دوسرے دن سورج ابھی اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کے طرز معاشرت پر یہ چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر ان کے گھر کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ایسی ہی ہوں۔ اور یہ شوق پیدا ہوا کہ اب جہاں رہوں وہاں کی ہوا بھی ایسی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں، باغ ہو، پھول ہوں، گرد و پیش کی سب چیزیں صاف اور پاکیزہ چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ یہ خیال وہ تھا جس کا بہت کچھ اثر اور شوق تمام عمر رہا اور اب تک ہے۔

صبح ہی ریل سے اتر کر گھر پہنچے۔ مگر نہ وہ علی گڑھ تھا اور نہ سید صاحب کی کوٹھی اور اس کا باغ اور عمدہ سامان تھا۔ چاندنیاں اُجلی بچھی ہوئی تھیں، سب چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ خصوصاً والد کی کتابوں کی بڑی الماری میں رنگ برنگ کی جلدیں اور ان پر سنہری حروف بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ پہنچتے ہی تھوڑی دیر تک گھر کا جائزہ لیا پھرا، دالان، کوٹھریاں، توشہ خانے کو جھانک کر دیکھے نوکروں سے جو خاص طور پر [illegible] تھے، [illegible]۔ اس کے بعد دوڑ کر اپنے پلنگ پر آن بیٹھا۔ آسمان پر ہر طرف بادل چھائے تھے۔ اندھیرے سے جی گھبرایا۔ اور اب چار دن کے بعد اماں یاد آئیں۔ دلّی کے گھر کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اب اماں جان اشراق کی نماز پڑھ کر جا نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔ پکانے والی اماں پوچھ رہی ہوں گی بیوی کیا پکے گا؟ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا ہو گا کیوں کہ ہمارے لیے دعائیں کر رہی ہوں گی اور کہا بھی ہو گا تو یہی کہا ہو گا کہ بچے تو خدا رکھے سدھارے۔ کیا بتاؤں کیا پکاؤں گی وہ اس وقت تک صرف ہم دو بھائی تھے۔ اس لیے ہمارے چلے آنے سے والدہ بالکل تنہا رہ گئیں۔ گھر کی اور صورتیں بھی خیال میں آنے لگیں۔ یہاں دھوپ ہو گی، وہاں چھاؤں ہو گی، کوٹھے کی سب سے

اونچی منڈیر پر چیل روز آکر بیٹھا کرتی تھی اب آگئی ہوگی جیسے پر پھیلائے اڑتی ہوں گی۔ ایک آدھ کوا ابھی باورچی خانہ کی طرف اتر آیا ہوگا۔ یہ سب صورتیں تو پرچھائیوں کی طرح آئیں اور گئیں۔ مگر ماں کی ایک ایسی شبیہ تھی کہ جہاں اکیلے کمرے سے نکل کر چپ بیٹھا اور وہ روشن ہو گئی۔ پلنگ پر دیر تک منہ لپیٹے پڑے پڑے روتا رہتا۔ رونے سے بڑھ کر تکلیف اس کے چھپانے میں ہوتی تھی۔ یہی ڈر تھا کہ ظاہر ہو گیا تو گھر واپس جانا پڑے گا۔ اس خیال سے دل لرز جاتا تھا۔ اور یہ منصوبہ بھی عادت ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا کمرہ خوب آراستہ کر کے اس میں پڑھا کروں گا۔

الہ آباد میں کوئی کمرہ تو اپنا نہ تھا جسے آراستہ کرتا لیکن پڑھنے کی تین فٹ لمبی دو فٹ چوڑی میز جو ملی اسے میں نے رفتہ رفتہ اپنے لیے ایک نہایت وسیع اور خوبصورت دنیا بنا لیا۔ سامان کچھ بھی نہ تھا۔ میز کی سبز چادر پر شیشے کی ایک دوات تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے چینی کے کھلونے تھے۔ کچھ کتابیں اور مشق کی کاپیاں تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹائم پیس تھا جو کبھی چابی دینے سے بھی ٹھیک نہ چلا۔ ایک دندانے ٹوٹا نوک ٹوٹا چاقو بھی تھا جو کبھی کھو جاتا تھا کبھی مل جاتا تھا۔ دو دواتیں اور دو انگریزی قلم تھے جنہیں ہم اس زمانے میں ٹرنک کہتے تھے۔ دو چار رنگین روشنائیوں کی سیپیاں اور کئی رنگ کی پنسلیں تھیں۔ ایک بہت مختصر سا دو چار رنگ کے گلوب کا لیمپ بھی تھا جو دن کو بھی میری میز سے ہٹنے نہ پاتا تھا۔ رنگین روشنائیاں اور پنسلیں تو لازمی تھیں کیونکہ جب کوئی انگریزی کی نئی ریڈر شروع کی جاتی تو اس کا سبق پڑھنے سے پہلے اس کی تمام تصویروں میں رنگ بھر دینا ضروری کام تھا۔ حالانکہ والد کئی دفعہ ناراض بھی ہوتے کہ کتاب خراب نہیں کیا کرتے۔ مگر میں اپنی مصوری کا نمونہ ان کو ضرور دکھا دیتا تھا۔ یہ کس کو یاد رہتا کہ ہم خفا ہوں گے۔ جے پور کا بنا ہوا سفید سنگ مرمر کا ایک رنگین گڈا تھا جس کے پاؤں میں مہندی، ماتھے پر ٹیکا اور ناک پر سنہری رنگ کا ایک سینگ تھا۔ یہ روانی عمر اور میری بدذوقی کے ساتھ ساتھ کم و بیش نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے میری خدمت میں رہا۔ کبھی گردن میں ڈور بندھی اور چابک مار مار کر چلایا گیا کبھی پیار کی باتیں ہوئیں۔ کبھی سخت و سست سنتا رہا۔ میلا کچیلا ہوا تو غسل اتنے دیے گئے کہ رفتہ رفتہ اس کا سارا رنگ اڑ گیا نہ پاؤں کی مہندی رہی نہ ماتھے کا ٹیکا۔ کبھی قینچی یا چاقو سے ناک کے سینگ میں حسب ضرورت ترمیم کی گئی۔ ناک بھی ٹوٹی اور چاقو اور قینچی کو بھی زد لایا کبھی اس سے دیوار میں کیلیں ٹھونکنے کے لیے ہتھوڑی کا کام لیا گیا اور جب میں اور وہ دونوں پنشن کے قابل ہوئے تو مدتوں میرے کاغذوں پر پیپرویٹ کی جگہ میز فرش بن کر بیٹھا رہا۔ آخر کار حیدر آباد کے ایک نوکر نے جھاڑ کر گرا کر اس کی بیٹھک اور چاروں پاؤں توڑ دیے چنانچہ اب وہ اسی حال سے چیتھڑوں کے ایک پرانے بکس میں بند جیسے تابوت میں مصری ممی ہو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ بے جان کھلونا میرے لیے برسوں تک ایک زندہ ہستی رہا۔ میرے بچپن کے دوستوں سے بھی اس کی ملاقات تھی اور بڑے ہو کر بھی وہ اس کی خیر و عافیت پوچھ لیا کرتے تھے۔

ایک خوبصورت کمرے کی حسرت تو صرف پڑھنے کی میز کے آراستہ کرنے میں پوری ہوئی مگر گھر میں درخت مطلق نہ تھے۔ صحن بڑا تھا اس کے ایک گوشہ میں میرے اصرار پر والد نے ایک چمن بنوا دیا تھا۔ اس میں دو ایک درخت پھلوں کے باقی سب پھولوں کے لگائے گئے۔ اس وقت کا شوق کیا بتاؤں کیا تھا۔ نئی نئی باتیں نکالا کرتا تھا۔ جس دن خود کوئی بیج بوتا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب میں دن اور تاریخ لکھ لیتا تھا۔ کچھ دنوں یہ التزام رہا مگر پھر اور باتوں میں دھیان بٹا۔ اور جہاں اکثر چیزیں روز کھوئی جاتی تھیں وہ کتاب بھی کھوئی گئی۔ مجھ کو اپنی سب چیزوں سے محبت تھی مگر وہ سب بے وقعت تھیں جب ڈھونڈتا تھا نہیں ملتی تھیں۔ کہیں جب بے ترتیب تھیں اور غفلت کا الزام والد مجھ کو دیتے تھے۔

الہ آباد میں تعلیم کی رفتار

الہ آباد میں شروع میں ہم دونوں بھائیوں کے لیے ایک ٹیچر مقرر کر دیا گیا جو ہم کو انگریزی اور حساب پڑھاتا اور ایک مولوی صاحب فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ میرے بڑے بھائی کو گھر اس قدر یاد آیا کہ آخرکار

ایک مہینے کے بعد والدہ نے انہیں دلی بلوا لیا۔ بلوایا مجھے بھی تھا مگر میں کب جاتا تھا۔ والد کے پاس تنہا رہا۔ کبھی گورنمنٹ سکول الہ آباد میں پڑھا اور کبھی انگریزوں کے ایک پرائیویٹ سکول میں جو مسٹر سکاٹ نامی ایک انگریز نے قائم کیا تھا اور جس میں مسٹر سکاٹ کے ساتھ ان کی بیوی اور بہن بھی بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ اس سکول میں صرف دو ہندوستانی طالب علم تھے۔ ایک میں اور ایک بنگالی لڑکا۔ باقی سب انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔

مڈل امتحان میں ناکامی

دو برس تک اس طرح پڑھ کر غالباً ۱۸۸۰ء کے شروع میں میں نے مڈل کا امتحان پرائیویٹ دیا جس میں سب مضمونوں میں تو پاس تھا مگر فارسی میں فیل ہو گیا۔ سو نمبروں میں سے ۳۳ نمبر لانے چاہئیں تھے لیکن مجھے ۳۰ ملے کچھ دنوں تک اس ناکامی کی بڑی شرمندگی رہی۔ فارسی کے ممتحن مولوی امجد علی صاحب ایم اے تھے، جن کا تعلق اس وقت اودھ کے سررشتۂ تعلیم سے تھا۔ بعد کے زمانے میں جب وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور میں ان کا شاگرد ہوا تو میں نے ایک دن شکایت کی کہ آپ نے مجھے فیل کر دیا تھا۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسے، اور کہنے لگے "اوہو! بڑا افسوس ہوا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو۔ ورنہ ضرور پاس کر دیتا۔"

سید صاحب کا الٰہ آباد آنا

ایک مرتبہ غالباً ۱۸۸۱ء میں سید صاحب بمبئی سے علی گڑھ جاتے ہوئے والد صاحب کے پاس چند گھنٹے ٹھہرے۔ باہر کے دالان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے ان پر سفید چاندنی اور ایک بڑا سا گاؤ تکیہ رہتا تھا۔ سید صاحب دن بھر اسی پر بیٹھے رہے۔ میں پاس گیا تو پوچھنے لگے۔ "اب تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے جہاں اور کتابیں اپنے پڑھنے کی بتائیں ان سکندر نامہ کا بھی نام لیا۔ کہنے لگے "اچھا ایک مصرع پڑھتے ہیں اس کا مطلب بتاؤ۔" میں نے کہا فرمائیے۔ سید صاحب نے کہا۔

ع تو فخر خراسانی و فا ساقط ازو

میں نے فوراً معنی کہے "تو خراسان کا فخر اور اس میں سے ف نکال دی ہے" سید صاحب نے کہا "کس میں سے نکال دی ہے؟" میں نے کہا "فخر میں سے" کہنے لگے "پھر کیا رہا؟" میں نے کہا "خر"۔ اس پر انہوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ جب وہ ہنسے تو میں اس لطیفے کو سمجھا۔ معنی بتلاتے وقت مجھ کو مطلق خیال نہ تھا کہ میں گدھا بنایا جا رہا ہوں۔

بعد ازاں ایک اور مصرع سید صاحب نے مجھ سے پوچھا جس میں احول کا لفظ آتا ہے۔ میں نے کہا مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے اگر آپ بتا دیں تو میں مصرعے کا ترجمہ کر دوں گا۔ سید صاحب نے کہا "بھینگے کو کہتے ہیں"۔ اس پر میں نے سارے مصرعے کے معنی بتا دیئے۔ سید صاحب اس بات پر بڑے خوش ہوئے کہ جس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہ تھے اس کے پوچھنے میں میں نے کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ اور میرے والد سے کہنے لگے "اس لڑکے کو اب ضرور علی گڑھ بھیج دینا چاہیئے"۔

اگرچہ اس موقع پر سید صاحب صرف دو گھنٹے الٰہ آباد میں ٹھہرے مگر والد کے تمام دوستوں میں غل مچ گیا کہ علی گڑھ کے ریفارمر منشی ذکاء اللہ کے مکان پر مقیم ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی تھی کہ اسی دن اتفاقاً منشی غلام غوث صاحب کا حجام ہمارے یہاں آیا۔ یہ شخص بڑا پکا مسلمان اور حاجی تھا۔ کسی کی داڑھی نہیں مونڈتا تھا۔ کپڑے بھی منشی صاحب کی وضع کے بہت اچھے پہنتا تھا۔ غالباً ان کی اترن ہوتے تھے۔ سید صاحب نے اس سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کٹوائے۔ سید صاحب کے ناخنوں کے پیچھے گوشت آیا ہوا تھا۔ حجام کچھ اس گھبراہٹ میں کہ علی گڑھ کے ریفارمر ہیں اور کچھ ان کی شکل و صورت دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ ایک انگلی کا ناخن کاٹتے میں گوشت بھی ساتھ کاٹ دیا۔ سید صاحب نے اس صلے میں اسے ایک

پھر فی الحال وہاں سے نکلتے ہی حجام نے والد کے تمام دوستوں میں یہ خبر پہنچا دی۔ الٰہ آباد میں والد کے بہت سے مسلمان دوست والد کے مذہبی خیالات سے اس بنا پر کہ وہ سید صاحب اور مہدی علی خاں صاحب وغیرہ کے ملنے والوں میں سے تھے بدگمان رہتے تھے۔ بعضے دوست ایسے بھی تھے جو ہمارے گھر کا پانی اس خیال سے نہیں پیتے کہ پانی پیتے ہی ہم بھی کہیں نیچری نہ ہو جائیں۔

الٰہ آباد سے بار بار علیگڈھ آنا

الٰہ آباد کے چند سالہ قیام میں علی گڑھ سے میرا یہ تعلق رہا کہ جب کبھی والد تعطیلوں میں دہلی جاتے تو علی گڑھ ضرور قیام کرتے تھے۔ اور میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح والد دہلی جاتے ہوئے سید صاحب کے پاس ٹھہرے۔ میں ہمراہ تھا۔ اس زمانے میں سید صاحب گھاس کا تختہ بنوا رہے تھے شام کا وقت تھا۔ خواجہ محمد یوسف صاحب آ گئے۔ اور باتوں باتوں میں انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ آپ نے اس تھوڑی سی زمین میں گھاس لگانے میں صد ہا روپے صرف کر دیے ہیں۔ سید صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ تم نے نئی شادی کی ہے بیوی کے لیے گہنا پاتا اور اچھے اچھے کپڑے بنوا کر تمہارا دل خوش ہوا ہو گا۔ مجھ بڈھے کی شادی اسی میں ہے کہ گھاس پھوس لگا کر دل خوش کر لوں۔

علیگڈھ میں تعلیم پانے کا شوق

اس بار بار کے آنے جانے سے مجھ کو از حد شوق پیدا ہو گیا کہ میں بھی علی گڑھ میں تعلیم پاؤں اور اس کے لیے میں نے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ الٰہ آباد میں والد کے پاس علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ آیا کرتا تھا میں نے اس سے ٹائپ کے اردو حروف پڑھنے کی مہارت پیدا کر لی۔ اس پرچے میں جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی وہ لڑکوں کے کھیل تماشوں کی رپورٹیں تھیں۔ جن میں طالب علموں کے نام بھی چھپا کرتے تھے۔

مسدس حالی کو بھی میں اس زمانے میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا جو نئی نئی والد کے پاس آئی تھی مجھے اس کا دیباچہ بہت پسند تھا۔ مطلب تو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر شروع کے بہت سے جملے میں نے حفظ کر لیے تھے۔

علیگڈھ جانے کی تیاری

اب وقت آ گیا تھا کہ ہماری مدت کی آرزو پوری ہو۔ والد صاحب ہماری تعلیم کی طرف سے مطمئن نہ تھے سید صاحب کے کہنے پر انہوں نے مصمم قصد کر لیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو وہ علی گڑھ بھیج دیں گے۔ چنانچہ بڑے دن کی تعطیل میں جب میں والد کے ساتھ دہلی گیا تو انہوں نے وہاں مجھ کو حساب اور اقلیدس کی انگریزی اصطلاحیں یاد کرائیں۔ اب تک ہم نے حساب اور ہندسہ بجائے انگریزی کے اردو میں پڑھا تھا جس میں عربی کی اصطلاحیں مستعمل تھیں علی گڑھ میں یہ دونوں چیزیں انگریزی میں پڑھائی جاتی تھیں مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بھی تعطیل میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ مجھے ساتھ لے کر چاندنی چوک گئے اور وہاں ہم دونوں بھائیوں کے واسطے علی گڑھ لے جانے کے لیے سامان خریدا گیا۔ یعنی دو شیشے کی دواتیں، دو چاقو، جستی قلم، ایک ٹائم پیس اور دو بیگ وغیرہ خریدے گئے۔ کیا بتاؤں ان نئی نئی چمکتی ہوئی چیزوں کے متعلق یہ سمجھ کر کہ یہ سب اب ہمیں ملیں گی دل کس قدر خوش ہوا!

تعلیم کے لیے علیگڈھ روانگی

جب بڑے دن کی تعطیل ختم ہونے کو ہوئی والد ہم دونوں بھائیوں کو لے کر علیگڈھ گئے اور حسب معمول سید صاحب کے ہاں قیام کیا۔ سید صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور دفتر کے قریب ایک بڑا کمرہ ہمارے رہنے کے لیے تجویز کیا۔ اور اسی میں ہمارا سامان لگا دیا گیا۔ اس کمرے میں سید محمد علی جو سید صاحب کے حقیقی بھائی کے حقیقی نواسے تھے رہا کرتے تھے اب ان کو کوٹھی کے احاطے میں جو چھوٹا سا بنگلہ تھا اس کو دے دیا گیا۔ اور ہم کو ان کا کمرہ ملا۔ بورڈنگ ہاؤس

تھا۔ سید صاحب نے ابھی ہم کو نہیں بھیجا اپنے ہی قریب رکھا۔ والد ایک دن قیام کر کے الٰہ آباد چلے گئے اور مجھ کو چند نصیحتیں ایسی کر گئے جو اس وقت تک سمجھ میں نہ آئی تھیں، مگر اب بڑھاپے میں یاد آیا کرتی ہیں۔

سکول میں داخلہ

دوسری یا تیسری جنوری ۱۸۸۱ء کو ہم دونوں بھائی کالج کے سکول میں داخل ہوئے۔ نسبت صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ سید محمد علی حسن کی عمر اس وقت ۱۰ برس کی تھی ہم کو ہیڈ صاحب کے پاس لے گئے۔ ایک بڑے رجسٹر میں جس کے کاغذ نیلے رنگ کے تھے ہم دونوں بھائیوں کے نام لکھ لیے گئے۔ مجھے مڈل کلاس میں شامل کر لیا گیا۔

بقیہ حالات اور تصنیفات

یہاں تک کے حالات مولوی عنایت اللہ صاحب نے خود لکھ کر مجھے دیے تھے۔ بعد کے جو حالات میں نے ان سے پوچھ پوچھ کر لکھے، وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:-

اپریل ۱۸۸۵ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اپریل ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے ہوئے۔ بی۔ اے فلسفہ اور ریاضی میں کیا۔

۱۸۹۰ء میں علیگڑھ سے دہلی آ گئے۔ سرسید کو ان سے دلی لگاؤ تھا اور وہ ان کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کو ۱۸۹۲ء میں علیگڑھ بلا لیا اور کالج کی لائبریری ان کے سپرد کی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کالج میں ریاضی کے پروفیسر بھی رہے۔

اپریل ۱۸۹۴ء میں سرسید نے ان کو اپنے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا ایڈیٹر بنایا۔ اس خدمت کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے بہت سے مضمون انگریزی سے ترجمہ کر کے تہذیب الاخلاق میں شائع کیے۔

۱۸۹۵ء کا سال علیگڑھ کالج اور سرسید کے لیے نہایت منحوس تھا کیونکہ شام بہاری لال کالج کے ہیڈ کلرک نے ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے کا غبن کیا اور گرفتار ہونے کے بعد قید خانہ میں کچھ کھا کر مر گیا۔ اس نے عمداً دفتر کو بالکل ردی کی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ اس کی درستی کے لیے سرسید نے مولوی عنایت اللہ کو مقرر کیا اور انھوں نے بڑی لیاقت کے ساتھ اس مشکل کام کو انجام دیا۔

۱۸۹۶ء میں سرسید کی فرمائش پر مولوی عنایت اللہ نے ایک نہایت ہی بے نظیر کام کیا اور وہ اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی انگریزی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ تھا۔ جو اشاعت اسلام کی بڑی مبسوط تاریخ تھی۔ یہی ترجمہ تھا جس نے مولوی عنایت اللہ کے نام کو ہندوستان کی علمی دنیا میں مشہور کر دیا۔

سرسید نے یہ ترجمہ مولوی عنایت اللہ سے بڑے شوق کے ساتھ کرایا تھا اور ختم ہوتے ہی دسمبر ۱۸۹۷ء میں اسے چھپنے کے لیے آگرہ بھیج دیا۔ ابھی ترجمہ چھپ ہی رہا تھا کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا اور مولوی عنایت اللہ اپنے ایک نہایت ہی شفیق بزرگ سے محروم ہو گئے۔

سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۳ء تک آپ چیف سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جونپور رہے۔ جونپور سے مئی ۱۹۱۳ء میں آپ کا تبادلہ بریلی کا ہو گیا۔

جنوری ۱۹۱۶ء میں ریاست گوالیار نے آپ کی خدمات گورنمنٹ انگریزی سے مستعار لے لیں اور آپ وہاں چھ برس تک اسسٹنٹ سیکرٹری فینانس اور سیکرٹری اپیل ڈیپارٹمنٹ رہے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود نے آپ کو حیدر آباد دکن بلا لیا۔ جہاں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ کے ناظم اعلیٰ کا چارج لیا اور فروری ۱۹۳۵ء تک اس معزز عہدے پر فائز رہے۔ پھر ریٹائر ہو کر ڈیرہ دون میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۴ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو متحدہ ہندوستان کے اس سب سے بڑے مترجم نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا ایک ایسے انشا پرداز سے خالی ہو گئی جس کا نظیر پھر پیدا نہ ہوگا۔

مولوی صاحب مرحوم نے سینکڑوں علمی و ادبی مضامین مختلف رسالوں میں لکھے اور ساٹھ کے قریب تراجم اور تصنیفات کیں۔ جن میں سے اہم کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

تذکرہ ابوریحان بیرونی۔ دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام۔ زلفی۔ ارض نهرین۔ عرب قدیم کا تمدن۔ پیرک لیز اور ایتھنز کا دور اقبال مندی۔ قسطنطین۔ یونانی شہنشاہیت۔ جاپان کا تعلیمی نظم و نسق۔ تائیس۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ۔ تیمور۔ چنگیز خاں۔ نجم السحر۔ سلامبو۔ ہیرودیاس۔ داستان جم۔ عبرت نامہ اندلس ترجمہ سپینش اسلام حیات سقراط۔ صلاح الدین اعظم۔ نیز شکسپیئر کے اکثر ڈراموں کے ترجمے۔

مندرجہ بالا نام ان کتابوں کے ہیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم نے جو کتابیں نہایت محنت سے ترجمہ کی تھیں اور اب تک نہیں چھپیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

تاریخ ادبیات عرب۔ ترجمہ لٹریری ہسٹری آف عربس از نکلسن۔ تاریخ حکومت ہائے اسلامیہ اسپین ترجمہ نفح الطیب از علامہ مقری طوفان ترجمہ ٹمپسٹ از شکسپیئر۔

تاریخ مغل ترجمہ ہسٹری آف منگولز از سر ہنری ہوورتھ۔ آخر الذکر کتاب "نقوش" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ جو مغلوں کے تمام خاندانوں کی بے نظیر تاریخ ہے اور جسے مولوی عنایت اللہ نے ۵ سال کی محنت میں ترجمہ کیا تھا۔

(محمد اسمٰعیل پانی پتی)

احسن مارہروی

حسب و نسب

اودھ کے مشہور و مردم خیز قصبہ بلگرام میں سید محمد صغری نامی ایک بزرگ ۶۱۴ھ میں آباد ہوئے جن کی اولاد میں علامہ میر عبدالجلیل و حسان الہند میر غلام علی آزاد اور بہت مرحوم مشاہیر زمانہ گذرے ہیں۔ یہ خاندان نسبتاً صغراوی سادات زیدیہ سے ہے۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب اور مرحوم شمس العلما سید علی صاحب اسی خاندان کے ہم نسب ہیں۔ میر صغری کی اولاد بلگرام سے منتشر ہو کر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں آباد ہے منجملہ ان کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ برکت اللہ جو مشاہیر صوفیہ میں تھے قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ میں آباد ہوئے اور ۱۱۱۷ھ سے اب تک ان کا خاندان مارہرے میں آباد ہے احسن اسی خاندان کا ایک جز ہے۔

ولادت

پورا نام سید علی احسن ہے ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں بمقام مارہرہ پیدا ہوا۔ تقریباً ۱۳۰۳ھ تک اپنے خانقاہ کے مکتب میں عربی فارسی اور حفظ قرآن کی تعلیم پائی۔ اسی درمیان میں سفر حج اور والدین کے انتقال کی وجہ سے تعلیم مسدود ہو گئی۔ عربی میں صرف حرف شناسی کی لیاقت ہے اور فارسی میں مطالعہ کر کے دہرا دینے کا مادہ ہے باقی خیر صلا۔

ابتدائے شاعری

خاندان میں اکثر اصحاب شعر گوئی کا شغل رکھتے تھے اور خصوصاً تاریخ گوئی کا کم و بیش سب کو شوق تھا ۱۳۰۳ھ میں مجھے بھی یہی شوق ہوا اور تاریخیں کہنے لگا کبھی کبھی برا بھلا شعر بھی موزوں ہو جاتا تھا ۱۳۰۶ھ سے اس شوق نے استقلال کا پہلو لے لیا۔ اسی وقت سے اب تک اپنے دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ یہی مشغلہ جاری ہے۔ اسی شوق کی بدولت ۱۳۱۰ھ میں ایک ماہوار گلدستہ ریاض سخن کے نام سے شائع کیا جس نے اپنی ترقی کا یہ نمونہ دکھایا کہ سال ڈیڑھ سال کے اندر حضور نظام سادس میر محبوب علی خاں سلطان دکن اور نواب حافظ محمد ابراہیم خاں صاحب والی ٹونک نے اتنی توجہ فرمائی کہ ۱۳۱۲ھ میں ریاض سخن کا نام ان کے تخلص کی رعایت سے ریاض خلیل رکھا گیا بعض ناگفتنی بے عنوانیوں سے بالآخر یہ قدردانیاں نسیج عنکبوت سے زیادہ کمزور ثابت ہوئیں اور مجبوراً گلدستہ بند کرنا پڑا۔

مرزا داغ کی شاگردی

اسی شوق کی ابتدا میں استاد کی تلاش ہوئی اور حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت فخر تلمذ حاصل کیا۔ جب تک گلدستہ ریاض خلیل جاری رہا۔ برابر سلسلۂ اصلاح قائم رہا۔ آخر استاد مرحوم کے اشتیاق نے اتنا جوش پیدا کیا کہ ۱۳۱۹ھ میں حیدرآباد دکن کا سفر اختیار کیا اور مسلسل ۵-۶ برس ان کی خدمت میں شبانہ روز حاضر رہ کر وہ لطف حاصل کیا جس کا بیان تحصیل حاصل ہے حیدرآباد کے قیام میں استاد مرحوم کی سوانح عمری موسوم بہ جلوۂ داغ لکھ کر شائع کی جس کی بدولت بعض احباب کے سب و شتم بھی سنے۔

وہیں رہ کر فصیح اللغات کی ابتدا کی۔ اور اسی کتاب کی بدولت استاد مرحوم سے سینکڑوں ایسے اشعار بطور ضروریات کہوائے جن میں مستعمل محاورات خصوصیت کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ دیوان چہارم یادگار داغ کا بڑا حصہ میرے سامنے کہا گیا ہے اور زیادہ تر میرے ہی ہاتھ

مسودے میں لکھا گیا ہے۔ اپنے زمانۂ قیام میں استاد مرحوم کے دیگر تلامذہ کے کلام کی اصلاح کا تمام کام انجام دیتا رہا۔

مرزا داغ مرحوم کے انتقال سے کچھ قبل اپنی ذاتی ضروریات سے مجبور ہو کر وہاں کی سب داریوں سے گھر کی وطن آیا چند ماہ کے بعد واپسی کا ارادہ تھا کہ استاد مرحوم کی وفات نے ہمیشہ کے لیے مایوس و مجبور کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ۱۹۰۵ء میں لاہور کا سفر اختیار کیا اور برس ڈیڑھ برس قیام کر کے کچھ دنوں لالہ سری رام صاحب کے مؤلفہ تذکرہ خمخانۂ جاوید کا مسودہ لکھا اور اسی ضمن میں استاد مرحوم کی یادگار میں رسالہ فصیح الملک کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا ۱۹۰۹ء میں اپنے جد امجد کے انتقال سے مجبور ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ جائداد اور خاندانی چند ذمہ داریاں ہاں منتقل کسی دوسری جگہ جانے سے روکتی رہیں یہی وجہ ہے کہ مشاغل شاعری بھی اب چھوٹتے جاتے ہیں فصیح الملک اگست ۱۹۱۲ء تک جاری رہا اس کے بعد اب تک اس کی اشاعت بند ہے اگرچہ دوبارہ اس کے بند کر دینے کا ارادہ اب تک نہیں ہے مگر بظاہر کوئی صورت آسانی اشاعت کی نظر نہیں آتی۔ اردو ادب کے متعلق چند کتابیں عرصے سے زیر تالیف ہیں اور ان کا تھوڑا بہت کام شروع بھی ہو گیا ہے مگر فقدان فرصت اور دوسرے کاموں کا انہماک ان کی تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ فصیح الملک کی اشاعت کے سبب تھوڑی بہت ملک میں روشناسی ہو گئی ہے اور غالباً اسی روشناسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر احباب و مشفق مجھے شعر و سخن کے قابل سمجھنے لگے ہیں۔ اگرچہ خود اپنے آپ کو اس قابل نہیں جانتا میرے کلام نظم کا اتنا حجم ضرور ہے کہ ایک اچھا خاصا دیوان بن سکے مگر میں اس کی اشاعت فی الحال ضروری نہیں سمجھتا علاوہ اس کے ترتیب دیوان کے لیے سلسلہ ردیف وار غزلیں مکمل نہیں ہیں بعض معزز احباب کا اصرار ہو رہا ہے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو آئندہ یہ بوجھ بھی سر سے ٹال دیا جائے گا۔

(مرسلہ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے لکچرار اردو کالج کراچی)

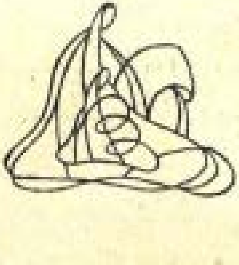

اسلم جیراجپوری

مجھے اپنی طالب علمی کے حالات کو منظر عام پر لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہل حدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترک تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سر تا سر ذہنی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہل علم کو تقلید شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لیے علمی کوشش شروع کی کیونکہ اس ماحول میں جب کہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر مسلمان تلواریں کھینچ کر ان کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علماء میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ کے زمانے میں خالص کتاب و سنت کی حامل ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انھوں نے پوری توجہ اعلاء کلمۃ الحق میں صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقا کے لیے علماء اہل حدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین کا حصہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ انھوں نے دہلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ ان کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علماء محدثین پھیل گئے جنھوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب و سنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا۔ میاں صاحب کے آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے ایک تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کیلئے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو محمدی کہنے لگے پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہؒ سے ہوا پھر مولانا شہید نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلوی کو بنایا۔ اس کے بعد صادق پوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوششوں سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا کام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خاں کی ذات اور نواب شاہجہان بیگم کی علمی قدردانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ نیز اقطاع ہند میں جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب و سنت کی اشاعت کرتے تھے ان میں سے اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصے سے اس جماعت کے اہل علم کی وہاں آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف

کی شہرت کی وجہ سے عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علما بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ میرے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم علمائے بھوپال میں سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لیے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو ۱۳۰۷ھ میں ہوا بیرونِ ہند کے علما کی آمد کا سلسلہ تو بہت کم ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان کے اہلِ علم شاہ جہاں بیگم کے عہد میں یعنی ۱۳۱۹ھ تک آتے رہے کیونکہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری رہا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی امیرانہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علما کا گزر مشکل تھا۔ اس لیے وہ لوگ اکثر والد کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانے میں ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے مہتمم تھے اور اعلیٰ حضرت سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کے لیے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر کے معزز ترین حصہ میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء اہلِ حدیث کا مرجع تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان بزرگوں کی خدمت میں رہا اس وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔ بھوپال میں میری طالب علمی کا زمانہ ۱۳۰۸ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۹ھ میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شاہ جہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا جن کی دینداری، علم قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوش حالی نمایاں تھی اور علمِ دین کا چرچا عام تھا۔ اس دورانِ مدت میں بہت سے علماء و فضلاء کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا۔ اب کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انہیں کو لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی طالب علمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

آغاز

میری ولادت میرے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ ۱۲۹۹ھ میں ۶ ربیع الاول یوم جمعہ کو ہوئی۔ اس سال میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے۔ حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علماء اہلِ حدیث تھے جن میں مولانا حکیم عبد اللہ صاحب جیراجپوری، مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری بھی تھے۔ ان لوگوں نے حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔ وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں بلا کر مدرسہ وقفیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہو گئے۔ پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی مہتمم مدرسہ مذکور کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ وہ ہر سال کنوار کی تعطیل میں ایک ماہ وطن آیا کرتے تھے۔ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازہ پر تھا۔ اس میں ایک میاں جی مولوی شکر اللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسی لٹکائے رکھتے جس میں قصوروار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی پیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے۔ لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لیے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ سختی نہ کیجئے گا۔ چنانچہ انھوں نے مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور وہی

برتاؤ رکھا جس کی والد صاحب نے ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب جاتا تو مجھے سبق دے دیتے اور یہ کہہ دیتے جس وقت یاد کر کے سنا دو گے اس وقت چھٹی مل جائے گی۔ اس میں مجھے بڑی آسانی ہوئی۔ محنت کر کے تھوڑی دیر میں یاد کر لیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دے دیتے تھے۔

پھر سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے میں نے ختم کیے۔ دوسرے سال جب والد تعطیل میں مکان پر آئے تو مجھ کو مع میری والدہ کے بھوپال لائے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبدالاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے مگر ان کی کفالت اپنے ذمہ میں لے لی تھی اور ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے جب میں بھوپال میں آیا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظ قرآن میں لگا دیا۔

حفظِ قرآن

والد کے پیش کار سید مظفر حسین مرحوم بڑے متقی، باوضع اور جید حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسہ میں جا کر ان سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ جو پنجاب کے رہنے والے تھے صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور آموختہ سننے کے لیے ملازم تھے۔ ان کا نام عبدالکریم تھا۔ لیکن حافظ، میتو کہے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کیے تنہائی میں ایک شعر گا رہے تھے جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

میتو میتو کسن وہانی اس دن کی زبانی

اسی دن سے ان کا لقب، میتو، پڑ گیا اور سب اسی نام سے ان کو پکارنے لگے یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعد قرأت سے واقفیت رکھتے تھے۔ والد صاحب نے ہمارے لیے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطے کے اور کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں تمام ہوتا ہے۔ جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ ہم ہر مہینہ میں آسانی سے بلکہ ڈیڑھ بلکہ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے۔ روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی دن آزادی۔

عبدالاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والدہ نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔ سبق ہمارے مختلف منزلوں سے ہوتے تھے باوجودیکہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے تھے۔ میرے ختم قرآن کے دن ان کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے جن میں سے تقریباً تین مہینے بیماری میں گذر رے۔

بیماری تپ محرقہ کی تھی۔ حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سر شام ہی سے بالکل بے ہوش جاتا رہا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جب کہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے تھے میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل میں سے لوٹا بھر رہی تھیں کہ سیڑھیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا کہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ والد الٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دعا مانگی تھی یہ خبر سنائی

پھر گھر میں آئے۔ میں بشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننھیال خاندان بھی یہیں ہے۔ بچپن سے مجھ کو میری نانی اور نانا نے پرورش کیا تھا۔ اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس تھا اور چھٹیاں آنے پر ان کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا۔ والدہ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ دیکھو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تمہارے حق میں تمہارے نانا کی زبان سے کوئی برا کلمہ نکل جائے کیونکہ اللہ ان کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا ہماری بات نہیں سنتا؟ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے مگر ان کی جلد مان لیتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً ٹھیک وہی وقت جب کہ والد ادھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ ادھر اللہ نے مجھ کو دوبارہ زندہ کر دیا اس لیے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آ گیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کر دینے کی منت مانی تھی۔ جس کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے حوالہ کر دی۔ انھوں نے اس کو طلبا کے مصرف کے لیے ابراہیم پورہ کی مسجد میں بھیج دیا۔ والدہ نے اس کے بعد سے پھر کبھی چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیث نعمت الٰہی کے یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک کہ تقریباً پچاس سال ہو گئے اور مجھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت ہی میں رہنا پڑا کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت ہو جاتی ہے تو دوا کرتا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والدہ کو لکھ دیتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاک میرے گاؤں جاتا ہے اسی دن شفا کی اُمید رکھتا ہوں کیونکہ جہاں خط پہنچا والدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور ادھر میں اچھا ہوا۔ حفظ قرآن کے بعد رمضان آنے میں چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سنانا تھا اس وجہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیے اور خوب رواں کر لیا۔ بالآخر ۱۳۲۲ھ میں جب کہ میری عمر کا نواں سال تھا۔ میں نے پہلی محراب سنائی۔ روزانہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا۔ لیکن دن بھر اس کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سنا لیتا تھا۔ میری قرأت قواعد کے مطابق اور صاف تھی کہیں جھول نہ تھا۔ آواز بھی اس وقت اچھی تھی اس وجہ سے لوگ پسند کرتے تھے اور اہلِ حدیث دور دراز محلوں سے سننے کے لیے آتے تھے۔ شب قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لیے متعین ہوئی اس دن مسجد آراستہ کی گئی۔ والد نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے آئے اور کچھ روپے بھی جو ان حافظ صاحب کو دیے گئے۔ جنھوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سنا تھا۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل ہوئی ہے۔

شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتہ اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا اب تک مجھ کو اس کرتے کا رنگ اور بوٹے یاد ہیں۔ اس وقت مجھے عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہنِ یوسف کی طرح زندگی بھر کے لیے محفوظ کر لیتا۔

دوسرے دن صبح کو والد نے ایک نہایت قیمتی زریں دوشالہ جو ان کو اسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپے رکھ کر مجھے حکم دیا کہ اپنے استاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لے جا کر پیش کرو۔ ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا۔ حافظ صاحب بہت خوش ہو کر اپنا متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک میں دیکھ رہا ہوں۔

فارسی

حفظِ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانہ میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ہر جمعرات کو ان کے ایک ایک باب کا آموختہ کھڑے ہو کر زبانی سنایا کرتے تھے۔ قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعد اصلیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانہ میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔

اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاہ گڑھ کے دو رسالے پنج سبق اور دہ سبق مع تحریری مشق کے پڑھے جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آ گیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آبِ حیات کے قصہ میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ ہے۔ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آبِ حیات معانی۔ جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں سے آبِ حیات لاتا ہے اور یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے۔

جیسے سکندر کو خضر کی رہنمائی سے بھی آبِ حیات اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھ لیا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہو گئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں مثلاً شاہنامہ فردوسی، دواوین اساتذہ و مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

ریاضی

حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لیے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی دان تھے مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آ کر تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن انھوں نے امتحان لیا کسر ملتف کا سوال تھا۔ سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا۔ انھوں نے سلیٹ کو دیکھا اور الٹ کر رکھ دیا اس کے بعد میرے ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں وہ ان کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے جب سب کے جوابات آ گئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا بے ساختہ ایک طمانچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا۔ اس لیے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا۔ جب انھوں نے اطمینان سے جوابات دیکھے تو کسی کا حل غلط تھا اور کسی کا جواب۔ لیکن میرا جواب اور حل دونوں ٹھیک نکلے۔ میں نے پوچھا کیا غلطی ہوئی؟ کچھ نہیں بولے میں اٹھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا مجھے سخت رنج تھا کیونکہ میں ہر استاد کی عظمت کا لحاظ رکھتا تھا اور اس کے ہر حکم پر اس کے منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کسی استاد کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا اور ان کی طرف سے بھی سوائے شفقت اور محبت کے کوئی دوسری بات نہیں دیکھی۔ اس لیے اس واقعہ سے نہ صرف میری عزتِ نفس بلکہ اس اعتقاد کو بھی صدمہ پہنچا جو میں استادوں پر رکھتا تھا اگرچہ تسلی کے لیے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات کیوں پیش آئی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقعہ کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کے لیے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی اکبر خان صاحب جو مدرسہ جہانگیریہ میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔

میرے نزدیک استاد اور شاگرد کا تعلق روحانی ہے۔ یہ نہ بیٹے اور باپ کا سا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا سا۔ بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود استاد پر لازم ہے۔ کیونکہ استاد کی ذرا سی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لیے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کے لیے اسی وقت میں آنے لگے۔

صرف و نحو

ان کی تعلیم میں کتابوں کی بجائے اصل فن کے سکھانے پر نظر رکھی گئی۔ طریقہ یہ تھا مولوی فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آ جاتے۔ ان کے مواجہہ میں والد مجھے حکم دیتے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا کھڑے ہو کر سنا دیتا۔ اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دے دیتا۔ ہر مہینہ کے آخر میں اس مہینہ کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ فصول اکبری اور کافیہ تک رہا جو زبانی یاد کرائی گئی تھیں۔

بھوپال میں اس وقت صرف و نحو کے اچھے اچھے استاد تھے۔ جب ان میں سے کوئی ہمارے یہاں آتا تو امتحان لیتا۔ میرے ساتھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد دو تک پہنچ گئی۔ میں اتنا سبق مطالعہ کر کے تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات کے پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ان کو یہ بات معلوم تھی اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ ہی سے کراتے تھے۔ تکرار میں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بارہا شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انہوں نے تو کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر برنسبت ان کو مستحضر تھی اس کے اعتراضات کرتے تھے۔ مگر وہ کتاب میرے پاس بھی تھی اس لیے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

فقہ و اصول

مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف و نحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح فقہ اور اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انہیں کے سپرد کی۔ اہل حدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کے لیے دی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔

ایک مرتبہ قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے کہا شرح وقایہ۔ پھر پوچھا حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے والد بہت دانش مند ہیں وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے۔

اصول فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب شکایت سنی تو غزالی کی "المستصفیٰ" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب عصبت کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو ان سے زیادہ مجھ کو قلق ہوا۔ میرا دل قطعی قبول نہیں کر سکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن جس قدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث و علماء سلف کو متفق پایا اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو مگر دل میں یہ خلش برابر رہی۔ الحمد للہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح

نہیں ہے آخر میں خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کے رسائل سے جو انہوں نے اس مسئلے پر لکھے تھے مجھے مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہل علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہل فتویٰ ہیں ان سے تحریری مناظرے کیے مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اسی وقت رسالہ حجب الارث لکھ کر شائع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمد الدین صاحب نے اپنے رسالہ معجزہ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو علمی شکل میں ترتیب دے کر عربی زبان میں الوراثۃ فی الاسلام کے نام سے شائع کیا۔

منطق و فلسفہ

والد نے خود صغریٰ وکبریٰ وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے پھر تہذیب زبانی یاد کرائی۔ اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایۃ الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے مولوی فتح اللہ صاحب کے یہاں ہوتے تھے اور دو سبق منطق و فلسفہ کے والد کے یہاں معقولات میں پہنچ کر صرف تین سبق روزانہ رہ گئے جن کو والد خود ہی پڑھاتے تھے صدرا و شمس بازغہ نیز سلسلہ ریاضیات میں تصریح اور چغمنی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

ادب

والد نے پہلے زمخشری کی اطواق الذہب حفظ کرائی۔ پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھیں لیکن والد ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ و بعض دیگر اشعار کا ایک مختصر مجموعہ والد نے تیار کیا تھا۔ اس کو ہم سب نے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا۔ پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا۔ حریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان متنبی و حماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیئے تھے پڑھے۔

حکیم معز الدین خاں صاحب سابق افسر الاطباء بھوپال نے مطول کو محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوایا تھا۔ جس زمانہ میں اس کتاب کو میں شروع کرنے والا تھا انہوں نے ایک نسخہ والد کے لیے ایک نسخہ خاص میرے لیے بھیج دیا۔ اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا تھا آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی ہی زبان میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتہ میں ایک قصہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا مطالعہ کے لیے واقدی کی فتوح الشام اور الف لیلیٰ کی جلدیں ملیں جن کو میں نے چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا پھر محاضرات اور تراجم رجال کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

حدیث

سب سے پہلے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے رسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا اور جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ ہیں سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام مالک۔ اصول حدیث میں نخبہ و دیگر رسائل سے جملہ اقسام حدیث اور اس کے علل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے۔ آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی ایک کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث جگت استاد تھے۔ مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے وہ لیاقت پیدا کرانی چاہتے تھے۔

والد نے کہا میں قرآن پڑھاؤں گا تم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک الگ الگ تفسیر منتخب کرے اور سبق اسی سے

تیار کر کے لانے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق وقیع الحسن نے چن لیا۔ کشاف کو عبد الغفور نے لیا۔ میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائمی کی تبصیر الرحمن رکھی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اوروں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کسی نے بیضاوی کو کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹہ میں ہوتا تھا۔ ہر آیت کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔

درسی نصاب

جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے تھے ان کی غرض و غایت فنی حیثیت سے اگرچہ بیان کر دی جاتی تھی مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسانیت کے لیے شرف ہے۔ اس وقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری یا مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا۔ لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اس وقت بھی کھٹکتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوئی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ خود متون مثلاً شمسیہ، مسلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر مغلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہونے کیونکہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیئے جائیں خواہ وہ معما ہی کیوں نہ بن جائیں۔

شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانہ میں میں نے ایک طالب العلمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

چیستاں مسلم، مسلّم سر بسر ابہام ہے ‏ ‏ ‏ کچھ عبارت سے نہ حل عقدۂ باطن ہوا
ہو سکے شرحوں سے شرح صدر کی امید کیا ‏ ‏ ‏ شارحوں میں بحث لفظی کا مرض مزمن ہوا
ایک کا اجمال مہمل، ایک کی تفصیل لغو ‏ ‏ ‏ علم تھا جتنا وہ نذر شارح و ماتن ہوا

بے شک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متن متین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ معلوم کس وقت نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم و کاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھایا گھٹایا یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوتی ہیں۔ جن سے اس کے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں کیونکہ یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیأۃ وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلّمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے میری طبیعت میں کچھ تو فطرۃً تنقید کا مادہ ہے کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے۔ کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو ہر شے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لیے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا ان پر اعتراض کرتا تھا۔ میرے استاد اس رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ

شرح عقاید نسفی پڑھتے وقت میں نے ملا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انھوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے باوجود اس کے کہ اس کی مدافعت نہ کر سکے ان کو اعتراضات سے بالاتر قرار دیا اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر مجھے خاموش کر دیا۔

خیالات خیالی بس بلند است　　ورآنجا جائے عقل احمد زچند است
ولے عبدالحکیم خوش خصال　　کہ حل کردہ خیالات خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر مقلد کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من حیث القوم صدیوں سے ماضی پرستی میں مبتلا ہیں۔ ان کی مثال مکہ کے اس نانبائی کی سی ہے جو باسی روٹی کو تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہد رسالت سے ایک رات قریب تر ہے اس لیے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر آپ پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کوسوں بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کلی انقلابات چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خاص قرآن و سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے اُمید ہے کہ امت میں جس دن یہ مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پا سکے گا۔

تربیت

والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو۔ کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی بار ان کی زبان سے سنا:۔

طلبنا العلم للدنیا لکن ابی العلم ان یکون الا للّٰہ

صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ تاکید رکھتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہمارے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے پڑھائی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اس میں دن بھر میں اور میرے دس بارہ ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی اور نہ وہاں کوئی بجز اہل علم یعنی علماء، طلباء کے آتا جاتا تھا۔ والد بھی اس میں بیٹھا کرتے تھے اور اکثر اسی جگہ پڑھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ خوش و بشاش رہتے تھے اور ایسا ہی ہم کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی محبت اور عظمت کا گھر بھر پر اس قدر اثر چھایا ہوا تھا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر احیاناً کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو تنبیہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ تحکمانہ۔ ایک بار رسالہ کے دو افسر ملنے کے لیے آئے جب اُوپر آ کر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں پیچھے سے نیچے اُترا اور ان گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل ہمارے بالمقابل رہتے تھے۔ چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوش نما چمن لگایا گیا تھا۔ اس سڑک پر

میں نے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دو چکر دیئے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہوگی اور یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ کون ہے۔ جب میں اوپر آیا تو اپنے قریب بلا کر یہ جملہ فرمایا جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔

إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ

بھوپال میں اس زمانہ میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیزگار تھے روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے شہر کے لوگ دور دور سے اس میں آ کر شریک ہوتے تھے۔ والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب نے ان کے ترجمہ کی تعریف کی اور اس کے ساتھ ان کی علمیت کی بھی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقولی نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا اس وجہ سے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ ان کو علم سے کیا واسطہ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؂

وما عبر الانسان عن فضل نفسه   بمثل اعتقاد الفضل فی کل فاضل

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ والد مغرب کی نماز پڑھ کر آ گئے۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین کہ جماعت کا بھی خیال نہیں رکھتے عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بیجا تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ یکساں تھا۔ خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفریق جائز ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی۔ وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اوپر والد کے کمرہ کے بازو میں تھا گرمیوں میں جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔ تو میں ان کی دعائیں سنتا تھا۔ دین و دنیا کی کونسی خوبی تھی جس کو میرے لیے نہیں مانگتے تھے۔ خاص کر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دے کر الحاح و زاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے۔ اس وقت فرط رقت سے بستر میں پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے تکیہ پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا۔ اس لیے میں جانتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا میں میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف جسمی نہیں بلکہ روحی بھی ہے۔

انہوں نے ہمارے لیے ایک استاد بھی مقرر کر دیا تھا جو روزانہ شام آ کر بانک۔ بانا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی جب ریاست کے دورہ پر والد کے ساتھ ہوتا تھا۔

کچھ حدیث کے متعلق

یہ خیال اس وقت دل میں بطور تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا ۱۹۰۲ء میں لاہور میں مولوی عبداللہ چکڑالوی جو حدیث کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے جا کر ملا۔ تین گھنٹہ تک گفتگو رہی جس کو انہوں نے اسی بحث میں ختم کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں جہاں جہاں آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان۔ میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں۔ انہوں نے سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سخت مشکل میں گرفتار تھے اور سوائے تاویلات رکیکہ کے حل کیلئے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔ پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصل

حیثیت بالکل واضح ہو گئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ تو وہ اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر ثبت کروا جاتے۔ دین کے لیے قرآن کافی ہے یہ کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔

کچھ قرآن کی نسبت

قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی و نظری کتاب بنا رکھا ہے اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا زیادہ توجہ علمی و ادبی لطافت یا منطقی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق دین کی تعلیم کے لیے وہ نازل کیا گیا ہے نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا اس کے بعد سے میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چونکہ میری زندگی پر پڑا ہے اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں

۱۹۲۶ء میں جب میں علی گڑھ کالج میں مدرس تھا ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سرسبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں۔ وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی۔ میں پہاڑی سے اتر کر اس کی طرف گیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام زرد رنگ سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں۔ ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا۔ جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر جو نورانی تھے اس طرح نظر آئے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک پیکر زیادہ ممتاز تھا میں حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ روشنی کی طرح نیچے اتر کر جنوبی رخ کی سیڑھیوں سے چلے گئے۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مشرقی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں۔ کوئی کسی سے بولتا نہیں سب چپ ہیں۔ سب سر برہنہ ہیں اور جوان۔ سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں اور چہروں پر سیاہ داڑھیاں۔ ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر چپٹے ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ نماز باجماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں اس نے کہا بے شک۔ سلام پھیرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس میں سے نکلے تھے۔ میری نگاہ کمرے سے نکلتے ہی گنبد کی طرف گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ پانچوں شکلیں پھر اپنی جگہ پر ہیں۔ میں نے ان نمازیوں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز پیکر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

اس نے کہا تم نہیں پہچانتے۔ یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا ان کے بعد؟ اس نے جواب دیا ابو بکرؓ۔ میں نے کہا پھر کون ہیں؟ بولا عمرؓ۔ میں حیران ہوا کہ یوسفؑ کے ساتھ ابو بکرؓ و عمرؓ؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوسفؑ ہمارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کا دل کو یقین آ گیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ فلاں کا بیٹا فلاں آ گیا ہے اس کی امانت اس کے حوالہ کر دو۔ وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا پہلے ایک کلام مجید دیا جس کو میں نے داہنی بغل میں دبا لیا۔ پھر سات رنگ کے شیشوں کی بڑی رحل جس کو بائیں بغل میں رکھا اس کے بعد ایک قلمدان جس کو داہنے ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پا کر میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا میں نے گردن جھکا کر شکریہ کا سلام

کیا اور ان کو لیے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اُتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم میں معنی کا نیا راستہ کھلنے لگا۔ یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں اور قرآنی حقائق کے چہرے سے نقاب اُٹھنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک مدت مدید کے بعد دو حقیقتیں عین الیقین میں سامنے آگئیں۔

(۱) قرآن دینِ الٰہی کا کامل اور بے شائبہ مجموعہ ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اس کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔

(۲) قرآن مفصل قرآن کتاب ہے جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے اور اختلافِ فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے یقین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آگیا اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت رحمت محمد شفاء لمافی الصدور بلکہ سر تا سر نجات ہے۔

اس نعمت عظمیٰ پر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں جس نے قرآن نازل فرمایا اور اس کے سمجھنے کی توفیق دی اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا پھر اس کو دلسوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لیے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

انہیں دونوں باتوں کو سمجھانے کے لیے میں نے تعلیمات قرآن لکھ کر شائع کی جو اسلام میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔

یہ کتاب عقاید و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی نہج پر میرے مخلص رفیق چوہدری غلام احمد خان پرویز ہیں۔ انہوں نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہو گئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دل کش مشغلہ ہو جائے گا اور ترجموں اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہو جائے گی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں میں مقالہ نگار حضرات کی قدر کرتا ہوں لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ کوئی شخص تصحیح کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے چند مختصر واقعات لکھنے پر مجبور ہوں۔

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا ہمارے خاندان کا اصل پیشہ زرگری تھا لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا، اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہتے ہیں عموماً مسلمان فارسی کی اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھنا شروع کیا مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا میری بڑی ہمشیرہ کا نام جیونی تھا۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبید اللہ بن رام سنگھ لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش و یتیمی

میں بروز شب قبل صبح ۱۰ محرم ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا میرا باپ میری پیدائش سے چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ یہ ایک خاص سکھ خاندان تھا میرے نانا کی ترغیب دی پر میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے جب نانا فوت ہو گئے تو ہم انکے پاس چلے آئے میری تعلیم وہیں اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۴ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ دو سال کے لیے ضلع سیالکوٹ میں رہا اس لیے ایک ہی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعۂ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے سکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا تحریک اسلام کی صداقت پر میرا یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے پرائمری سکول اور مڈل سکول سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے انہی کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی اس کے مطالعے سے اسلامی توحید اور بت پرستی کا شرک اچھی طرح سمجھ گیا اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھوی کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ میں نے نماز سیکھی اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں یہ دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں ورنہ اصل ارادہ تو یہ تھا کہ میں کسی ہائی سکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

اظہار اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو جام پور سے نکل کھڑا ہوا میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبد القادر تھا ہم دونوں عربی مدرسے کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحیم شاہ

مظفرگڑھ پہنچے وہاں اپریل ۱۸۸۷ء میں میری سنت تطہیر ادا ہوئی اس کے چند دن بعد جب میرے ماموں تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا عربی صرف کی کتابیں جو راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی اسی طرح سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت اسی طرح میری طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اسی لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی اس کا نتیجہ یہ محسوس کیا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ ۶ ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی "خدا کرے عبید اللہ کو کسی راسخ عالم سے واسطہ پڑے"۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اسی طالب علم کے ساتھ بہاولپور کی دیہاتی مسجد میں پہنچا جہاں حضرت کے خلیفہ مولانا غلام محمد صاحب رہتے تھے ہدایۃ النحو تک میں سکھر میں مولوی عبدالقادر صاحب سے پڑھی۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھ دیا وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ یہ فیصلہ ہے کہ میری والدہ دیو بند چلی گئیں۔ شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور سے کوٹ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھی یہیں ایک دو طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا اور میں مظفرگڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیو بند پہنچا۔

دارالعلوم دیو بند

صفر ۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوا گیارہ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل مختلف اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلد ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسے میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں مولوی ناظر الدین سے کتابیں پڑھیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو دیو بند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند

دیو بند دو تین مہینے تک حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ ہدایہ، توضیح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد دہلوی صدر مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف فرمائی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔ چند دوستوں نے مبشر خواب دیکھے جیسے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے تھے جن میں جمہور علماء کے خلاف محققین کے اقوال کو ترجیح دی تھی، مثلاً [illegible] کا قائل جنھیں بحرالعلوم قائل جانتے ہیں۔ شوال ۱۳۰۸ھ سے بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔

ترمذی حضرت شیخ الہند سے پڑھی ابو داؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ احادیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیو بندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں مجھے یاد ہے کہ نسائی اور ابن ماجہ

میں نے چہار دواوین میں پڑھیں تھیں اور ترمذی، ابو داؤد میں ختم کیں۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور رشید احمد کے غیر مشہور لیکن محقق شاگرد تھے۔ دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا ہماری زندگی کے وہ بھی دن تھے۔ وہ بیماری شادی ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا سکھر پہنچا میرے مرشد میرے آنے سے دو دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور وہاں کمال الدین صاحب سے ابو داؤد پڑھی۔ شوال سے پہلے امروٹ کے دوسرے خلیفہ مولانا تاج محمود کے پاس امروٹ ضلع سکھر چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میرے سے عزیز تر بنا چکے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر محمد عظیم خان کی لڑکی سے کرا دیا۔ میری ہر ضرورت کا وہ میرے پاس ایک وقت تک بہت خیال رکھتے رہے۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۲۷ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔ مگر پیر جھنڈا سید رشید الدین شاہ صاحب العلم کے پاس جو ہم جیسے کا کتب خانہ تھا میں وہاں جاتا اور کتابیں مستعار لاتا۔ میرے تحقیقی مطالعہ میں اس کتب خانہ کا فیض بھی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کتابیں دیکھیں ذکر اصحاب الحق میں نے انھی سے سیکھا وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے علمی تعلق رہے۔ وہ علم حدیث کے متبحر عالم اور صاحب تصانیف تھے ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا امام صاحب نانوتوی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک کا سلسلہ علما میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلے سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منتظم ہو گئیں اور میں اسلام کی خالص معنی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے دہلی میں تفہیمات کا مطالعہ کیا اس کے معارف میری روح میں پیوست ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف شیخ الہند نے کرا دیا تھا آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا میں نے علما کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد شیخ الہند پڑھی۔

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ مولانا اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات و حکایات سے آشنا کر دیا تھا مولانا عبد الکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی سنا دی میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا اب دہلی کے لیے سوچنے لگا مولانا اسمٰعیل شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

دیوبند واپسی

۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اپنے مطالعہ کا ثمرہ دو رسالے لکھ کر لے گیا ایک حدیث دوسرا فقہ حنفی میں حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے اس وقت دس بارہ حدیث کی اجازت سند کر دوبارہ وہ اجازت حاصل کی۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی اس کے بعد میرے تمام تعلیمی و سیاسی مشاغل حضرت شیخ الہند سے گزرتے رہے۔

دار الرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی میں نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسے کے چل نہیں سکتا تھا اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ مولانا رشید اللہ صاحب نے ۱۹۰۱ء میں میری تجویز کے موافق مدرسہ چلانے کا ارادہ کیا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک کامل اعلیٰ و انتظامی اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ باہر علماء سے حضرت شیخ الہند اور شیخ حسین یمانی امتحان کے لیے تشریف لاتے۔ اس مدرسے میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام مالک کو خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں کام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جماعت کی تحریک تاسیس میں مولانا صادق سندھی اور مولانا احمد لاہوری اور مولانا احمد علی میرے شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک بھی اسی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح دو سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف کرایا، اسی طرح دہلی پہنچ کر وہ نئی طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس لیے دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد سے ملایا۔ اس طرح دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلامی کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔

سیاحت روس

۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ وہ اس وقت بیمار تھا اور اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کر لے

کی مادہ پرستی سے بچنے میں کامیاب ہوا۔

جدید ترکی

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا سفیر ترکی اور وزارت خارجہ ماسکو نے سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا [illegible] اس کا پتہ نہ لگا سکے۔ تقریباً ۳ سال ترکی میں رہا ہوں میں نے تحریک اتحاد اسلامی کا آخری مطالعہ کیا مجھے مستقبل قریب میں اس کا مرکز نظر نہیں آیا اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور میں نے اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر خلاف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام

میرا خیال ہے کہ یورپ کو اس طرح اسلام سے متعارف کرانے میں ہی مولانا قاسم نانوتوی کی ایک تعلیمی خواہش کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں۔

مکہ معظمہ

۱۹۲۶ء موسم حج پر مکہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر روانگی مکہ پہنچنے کی کوشش کی مگر مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں مکہ پہنچا میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا ہوں۔ حکومت [illegible] یہاں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا اس طرح سے میں محفوظ ہو گیا

علمائے مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے دو ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی، دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب، تیسرے ابو الشرف عبدہ دہلوی ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا عرب خاندان سے مراد شیخ محمد بن عبداللہ [illegible] شیخ الحدیث مکہ اور شیخ عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں یقیناً ۲۰، ۲۵ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ کا نظریاتی مطالعہ کر رہا ہوں تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ کے اصول پر اطمینان حاصل کر سکا ہوں اگر میری طرح ان کو نہیں مانتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں نے شاہ صاحب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ خاص طور پر جاری رکھا۔ شفاء [illegible] تفہیمات، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے پڑھی رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، مولانا شہید کی عبقات اور مولانا قاسم کی تاسم العلوم، تقریر دلپذیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔ اگر مجھے موقع دیا جائے کہ امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مستقل مجتہد فرض کریں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کی اس حکمت کے شارح مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا نانوتوی کو [illegible] کے مرتبہ پر تسلیم کروں تو میں اس حکمت قرآنی کا ایسا مکمل نظام قائم کر سکتا ہوں جس میں قرآن عظیم، سنت رسول، سنت خلفائے راشدین، تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح مکمل ہو سکے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جائے۔

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کر دی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے اس لیے مجھے یکم [illegible] کو اجازت مل گئی علاوہ ازیں [illegible] جنوری ۱۹۳۸ء کو حج بیت اللہ کا فیصلہ ہوا حج کا موسم سر پر آ گیا اس لیے ارادہ ہے کہ مناسک کے بعد واپسی کا ارادہ ہے۔

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان پہنچ کر پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

۱۔ کانگریس کی ممبری، اور عملی حصہ۔

۲۔ میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا۔ میں اہل علم کے ہر طبقے کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔

۳۔ جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں کانگریس میں فلسفہ ولی اللہی کی روشنی میں، اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

کابل میں ۷ سال

۱۵ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی اور بغیر کسی پاسپورٹ کے افغانستان میں داخل ہوا۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو انگلستان سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ نائب حکومت سے ہماری ملاقاتیں اچھی رہیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اگرچہ غزنوی دل سے ہمارا اشتغال کم رہا ہے لیکن اس امتحان میں کامیاب رہے۔ ہمیں خاص راہداری دی اور اول درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا۔ اپنے پرائیویٹ دوستوں کے نام خطوط بھی دیئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی تھی۔ اس لیے ان کی وزارت میں ہمیں شیخ ابراہیم کے ہاں سب سے پہلے جو شخص ہمیں دیکھنے کے لیے آیا وہ اولین سردار عبدالہادی خاں تھا۔

ہمارا تعارف شیخ ابراہیم کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اترے اور ان کے توسط سے ان سب لوگوں سے مل گئے جن کے لیے ہمارے پاس خطوط تھے۔ ان میں قابل ذکر سپہ سالار محمد نادر خاں اور سردار محمود خاں طرزی تھے۔ سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو مشکلات ہوتی تھیں ان کے حل کے لیے اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم انقلابیوں سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ ان کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے۔ اس لیے ان کا ہر قول ذہنی اخلاص پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا اس لیے ہمارا ربط ان سے زیادہ ہو گیا۔ انھوں نے ہمیں سردار نائب السلطنت سے ملایا۔ اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ سلطنت افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کا فاضل ہے۔ حدیث حضرت گنگوہی سے پڑھی تھی۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

امیر حبیب اللہ کے حضور میں باریابی

ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارہ میں بلایا، عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت تشریف لائے اور کوئی آدمی نہ تھا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ حضور میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹے تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقروں سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور کام کرنے کے لیے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔

جنود اللہ کا قیام!

(چند جوانوں کی مدد سے) ہم نے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا۔ جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو دو سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ انھیں ہم نے جمع کر لیا اور کسی قدر مذہبی، سیاسی عام اصول پر ان سے مذاکرات ہونے لگے۔ اس

میں شیخ ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اسی عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے پہنچ گئے جن میں سے مولانا منصور انصاری جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں کے ساتھ کام کر چکے تھے اور مولانا سیف الرحمن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو لاہور جماعت اہل حدیث کے معزز کارکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں آئے تھے۔ نوجوانوں کی ہجرت میں اس کا خاص مقام تھا وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لیے کابل پہنچے ان لوگوں کے مشورے سے ہم لوگوں نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے اس میں اگر عسکریت تھی تو اس قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابت کو دور کر سکے۔

سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے سے افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی وہ چونکہ حضرت شیخ الہند کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے جب ان کے وکلا کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے

حکومت موقتہ ہند

راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کر لیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ اور ڈاکٹر خوشی محمد جالندھری وفد میں تھے اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے مناقشہ شروع کر دیا اس میں ہمارے دوست عبد الباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی راجہ مہندر نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر مجھے حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا اور حلف نامہ تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ البتہ حکومت موقتہ کے ۳ ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر ان کی شخصی ڈکٹیٹرشپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا ہم نے بڑے دروپیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دی۔ جب انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کے لیے بھیجا تھا جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لیے ۳ مرکز تجویز ہوئے۔ کابل، نیپال، بنگال، کابل کے مرکز کا کام میں ہی تھا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ کے مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ہی حکومت کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کیے گئے جنگ کی کامیابی میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا کہ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ مگر ان کے تذبذب پر ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری نظر بندی اور قید

اس کے بعد ہم پر ہندوستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمن کابل سے یاغستان روانہ کر دیے گئے۔ جہاں باڈنگ دونوں ساتھ رہے۔ وہاں مولانا سیف الرحمن کو بعض افغانوں نے اپنی حمایت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ کرایا انور پاشا کے نام حضرت شیخ الہند کا خط پکڑا گیا۔ اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا گیا ہم لوگ ۲۰، ۲۵ آدمی تھے اور وہ کسی حالت میں دس آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے سپرد تھی انھیں ہم نے توجہ دلائی انھوں نے ہمارے لیے سرکاری باغ میں خیمے

گورنر نادر وغیرہ ہمارے خیمے میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی مدد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

جب امیر امان اللہ خاں کابل میں منتقل ہو گئے تو انھوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمایا "من ہم ہستم" اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

اعلیٰ حضرت کی سلطنت میں ہم نے چند روز اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھی تھی جس قدر وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھیوں کا معاملہ بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے، ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جو قبول نہیں فرمایا، ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے افغانستان کے استقلال و استحکام میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ حضرت شیخ الہند کی وفات پر جس شان بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقد کی وہ ایک یادگار ہے۔ میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں۔

"مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند ما او را پورا می کنم

تلخیص ——— شمس تبریز خاں

اختر شیرانی

۱۹۰۵ء کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں (غالباً) میرے دادا جن کا نام مولوی محمد اسمٰعیل خاں تھا تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اُن کے نام سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے ان کی تنقیدی نظر مستشرقین سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ جاننے والی نظریں انھیں جاننے کی طرح جانتی ہیں اور ماننے والی حقیقت شناسیاں ماننے کی طرح مانتی ہیں۔

۱۹۲۱ء میں والیِ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احساس فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والد ماجد کی معیت میں لاہور جیسی متمدن، مہذب اور شاندار دنیا میں آنا پڑا۔ ہندوستان کے مشہور، اور دنیائے اسلام کے مشہور تر شاعر علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر تھے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ آغازِ عقل میں داغ جیسے مشہور شاعر کو بھی میری خوش مذاقی یا بد مذاقی نے توہین آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ پندرہ سالہ عمر کی نادانیاں، مرزا نوشہ کی غزلوں پر غزل لکھنا، اپنے لیے قابلِ تعریف سمجھا جاتا۔ ان کی تقلید میں بہت کچھ غزل گوئی کے بعد مرحوم کی ذہانت کی قدر دانیاں اس عہد میں اپنے اوجِ شباب کو پہنچی تھیں۔ مگر سر عبدالقادر، سر اقبالؒ اور ان کے ہم مذاقوں کی قدر شناسی مرزائے مرحوم کے "اوجِ قبول" کی ابتدائی تربیت میں مصروف تھیں۔ لاہور آنے پر والد ماجد نے اپنے چند عزیز دوستوں سے ملاقات کرائی۔ اُن میں علامہ اقبالؒ، مرزا محمد سعید (آئی ای ایس) اور سر عبدالقادر بھی تھے۔ ایک بھولا بھالا بچہ ایک مشہور اور مقبول شاعر کو جس عقیدت بھری نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ نظر انارکلی کے پُرشور و پُر از ہجوم بازار میں بھی اس کی اداؤں کی شریک تھی۔ لیکن نتیجہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے محترم دوست مولانا نیاز فتح پوری نے سر اقبالؒ مرحوم کی ملاقات کے بعد کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو مرحوم کے عقیدت کیشوں کے لیے زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ میرا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا بہرحال بقول شاعرؔ

بھری بہار میں ڈالی سے بچھڑ کے چلے

کے تصور کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اس لیے اس تذکرے کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ اب رہے اپنے حالات جن کے اظہار کے دوران میں کسی قدر بہک چلا تھا۔ اس کی طرف اپنے عزیز رشید (بشیر ہندی) کے اصرار پر رجوع کرتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ دو چار مہینے منشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر وولنر آنجہانی جو بعد کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ ہے کہ گلستان کا ’’ باب پنجم ‘‘ اور خیام کی ’’ رباعیات ‘‘ لاہور کے ہر گوشے میں دعوت قبول دے رہی تھیں یہاں یہ عالم تھا کہ بقول آقائی میرزا حسین کاظم زادہ مدیر و سردبیر مجلّہ ’’ ایران شہر ‘‘ (برلن) :-

’’ شما کہ یک تن تو صالح جانِ پرشور و دل تپان و جذبات سوزان دارید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیف باشد کہ زبان سعدی در کام و ذوالفقار علی در نیام بماند ‘‘

چنانچہ ایرانیوں کی اس دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ہمایوں کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے ’’ بہارستان ‘‘ کی ادارت کا بار اٹھانا پڑا۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ اور جنونِ عشق و شباب کے ہاتھوں اُسے خیرباد کہنا پڑا۔ چند سال گزرنے کے بعد از سرِ نو تعلیم کی دھن سوار ہوئی اور میں اپنے پرانے کالج (اورنٹیل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے بعد صحافت کی وحشت جو اب تک ع

میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

کا ہیولا خونِ گرمِ دہقاں کی شکل میں کرم فرما رہی تھی۔ از سرِ نو دامن گیر ہوئی اور میں نے ’’ خیالستان ‘‘ کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا۔

’’ بہارستان ‘‘ کی زندگی میں جبکہ مرحوم مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا، میرے ایک مضمون نے جو مولانائے مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا، مولانا محمد علی کو اتنا متاثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے ادارہ کے توسط سے مجھے مجبور کیا میں ’’ ہمدرد ‘‘ کے نظامی کالم کے لیے کم از کم ہفتے میں ایک بار کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔ چنانچہ اس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔

محمد علی بھی آج رخصت ہو گیا۔ ہمدرد بھی مٹ چکا۔ مگر میں اور میری جنون سامانیاں ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔

۱۹۲۵ء میں ’’ رومان ‘‘ کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا جو بوجوہ بند ہو گیا۔ اب رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ، جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے علم کے بعد نہ کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو، ورنہ یہ موضوع میرے لیے ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

پر عمل کر سکوں ع

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اٹھا رکھی ہے

پر اس کو ختم کروں

شاعری کے متعلق مجھ سے میرا نظریہ دریافت کیا گیا ہے مختصر تر الفاظ میں گزارش کروں گا کہ میرے نزدیک شاعری ایک ایسا جذبہ ہے، صرف عاشقانہ تمناؤں کی پیداوار اور انھیں کے لیے باعثِ حصولِ مسرت ہے اور بس ـــــ !

دیانرائن نگم

لگ بھگ بیس سال کی بات ہے ضلع کے حکام صدر اسپتال کے ہندوستانی اسسٹنٹ سرجن صاحب پر کچھ شبہ کرنے لگے تھے۔ کسی نوجوان لڑکے معاملے میں ان کی رپورٹ غلط ثابت ہو گئی تھی یا اسی کا شبہ تھا۔ کلکٹر صاحب منصف مزاج مگر سخت حاکم تھے۔ ضلع بھر میں ان کے رعب کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ سبھی لوگ ان کی صاف گوئی اور سخت گیری سے ڈرتے تھے۔ لیکن اپنے طور پر صاحب بہادر عوام کے خیر خواہ اور غریبوں کے مددگار تھے۔ ان کے مزاج میں بناوٹ اور دکھاوے کی بو بھی نہ تھی خوشامد سے انہیں نفرت تھی اس لیے کھری بات کہنے اور سننے کے عادی تھے۔ میری بھی صاحب سے ملاقات تھی خوشامد مجھے بھی نہیں آتی۔ میری صاحب سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دن وہ بہت دکھی اور بددل ہو کر سرجن صاحب سے شکایت کرنے لگے "ادھر دیکھیے انگلینڈ میں اس دیس کے آدمی کتنے فرض شناس ہوتے ہیں کیا مجال ہے کوئی کتنے ہی روپے خرچ کرنے پر تیار ہو مگر کسی کا اختیار ہے ایسی غلط اور جھوٹی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا۔" یہاں تک مجھے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ لیکن صاحب اور آگے بڑھ کر ہندوستانیوں کے کردار پر حملہ کرنے لگے "ہندوستانیوں نے ابھی تک اچھے چال چلن کی اہمیت نہیں سمجھی وہ بڑی آسانی سے لالچ میں پڑ جاتے ہیں۔" اس میں شک نہیں کہ صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے سچے دل سے اور افسوس کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ان کی یہ بات بری معلوم ہوئی ایک فرد واحد کے جرم کے لیے ساری قوم کو کیوں بدنام کیا جائے۔ بہرحال میں صبر کے ساتھ صاحب کی اس تقریر کو سنتا رہا اور جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو میں نے بھی نہایت افسوس کے ساتھ کہا۔ "ہماری صدیوں کی غلامی نے بے شک ہمارا اسی وقار گھٹا دیا ہے اور آپ نے جو کچھ کہا وہ بڑی حد تک ٹھیک ہی ہے لیکن بد قسمتی سے یہاں کا اب وہ حال کچھ ایسا ہو آگیا ہے کہ یہاں اگر صداقت کے پرستار انگریز بھی اپنے آدرش سے گر جاتے ہیں اور ڈاکٹری جیسا پیشہ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔"

صاحب اس وقت رنج میں تھے مگر میرا یہ جواب سن کر چونک پڑے۔ اب تک کرسی پر اداس بیٹھے ہوئے تھے کہاں ایک بارگی جھٹکے سے اچھل پڑے اور کھڑے ہو کر بولے "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"!

میں نے اطمینان کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کی ——— میرا مطلب تو صاف ہے آپ ہندوستانی ڈاکٹروں کے برتاؤ سے دکھی ہیں لیکن میں انگریزوں کو بھی اس طرح کی باتوں سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ اچھے برے دونوں ہی قوموں میں ہیں اور افراد کے اعمال سے قوموں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" لیکن صاحب کو اطمینان نہ ہوا وہ برابر یہی کہتے رہے کہ میرے اعتراض بے بنیاد ہیں اور اگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو مجھے کسی پر ایسا الزام عائد نہیں کرنا چاہیے۔

میری مشکل یہ تھی کہ اس وقت میں اس موضوع پر مفصل گفتگو کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ بات میں بات نکل آئی۔ کچھ سنی سنائی باتیں میرے ذہن میں تھیں میں انہیں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر جب صاحب اصرار کرنے لگے تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ صاحب قائل نہ ہوئے۔ ان کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ فرمانے

گئے۔ دیکھو سنی سنائی باتوں پر تمہیں یقین نہ کرنا چاہیے اور دوسروں پر الزام تراشنے سے پہلے بات کو خوب تول لینا چاہیے۔ صاحب کے خیال میں میری بتائی ہوئی مثالوں سے ہندوستانیوں ہی کی بے ایمانی ثابت ہوئی۔ کہنے لگے "ہندوستانی ماتحتوں نے اپنے انگریز افسروں کو دھوکا دے کر ان سے رپورٹ پر دستخط لیے ہوں گے۔ اس سے افسروں کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

یہ جھگڑا بڑھتا جاتا تھا۔ میں بھی آسانی سے دبنے والا نہ تھا اور صاحب بھی پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے تھے کہ کافی ثبوت اور واضح دلیلوں کے بغیر مجھے ایسی بات منہ پر نہ لانی چاہیے اور ان اعتراضوں کو واپس لے کر معافی مانگنی چاہیے۔ وہ مجھے بار بار اطمینان دلاتے تھے کہ اگر میں ثبوت کے ساتھ کوئی الزام لگا سکوں تو وہ اس کی پوری تحقیقات کرنے کو تیار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ صاحب غیر جانبدار آدمی تھے لیکن قومی غرور ان میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یا شاید یہ اندیشہ ہو رہا ہو کہ میں نے صرف مقابلے کے لیے یہ الزام تراشی کی ہے۔ میں بھی یہ سوچ رہا تھا دیکھیں اس جنگ میں کون آخر تک ڈٹا رہتا ہے۔ صاحب بہادر اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور میں بھی اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار نہ تھا۔

اتنے میں مجھے ایک نکتہ سوجھ گیا۔

میں نے کہا: "اگر آپ ثبوت چاہتے ہیں تو میں دے دوں گا۔ ہاں اس میں روپے خرچ ہوں گے اور میں اتنا مالدار نہیں ہوں۔ روپے آپ کو خرچ کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ اطمینان آپ چاہتے ہیں نہ کہ میں ——"

صاحب نے پوچھا: "روپے کا کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "سنیے" اور کوئی ثبوت تو میں دے نہیں سکتا اور نہ مجھے اتنی فرصت ہی ہے کہ میں اپنا کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاؤں۔ ہاں اگر آپ روپے خرچ کرنے کو تیار ہیں تو میں ایک کام کر سکتا ہوں۔ پہلے آپ اس کی جانچ کرا لیجیے کہ مجھے کوئی خاص بیماری ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر میں دیکھ سکتا ہوں، تو اندھا ہونے کا سرٹیفکیٹ لا دوں گا۔ جس مرض کی مجھ میں پرچھائیں بھی نہیں ہے اس میں گرفتار ہونے کا سرٹیفکیٹ لا دوں گا اور انگریز ڈاکٹروں سے۔ مجھے اختیار ہو گا جہاں سے چاہوں لاؤں اور جتنا خرچ ہو گا اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ صاحب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کہاں تو اکڑے بیٹھے تھے کہاں دھم سے کرسی پر بیٹھ رہے۔ مجھے اس وقت ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ فوراً ٹھنڈے پڑ گئے اور نرمی سے بولے —— "اگر واقعی تم ایسا کر سکتے ہو تو بڑے افسوس کی بات ہے!"

مجھے انہوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر مجھے ان کے کسی ماتحت انگریز کے بارے میں کوئی خاص شکایت سننے میں آئے تو میں ان سے صاف کہہ دوں اور وہ اس کی اتنی ہی غیر جانبداری کے ساتھ تحقیقات کریں گے جس طرح انہوں نے ہندوستانی اسسٹنٹ سرجن کی گردن پکڑی تھی۔ مجھے ان کی طرف سے اس کا پہلے ہی سے یقین تھا۔ لہٰذا میں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ میری بات رہ گئی اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں انہیں صرف یہ بتلانا چاہتا تھا کہ ہندوستانی ہوں یا انگریز، اچھے برے دونوں ہی میں ہیں اور کسی فرد کی خطا پر کسی قوم کو نیچ اور برا سمجھ لینا ناانصافی ہے۔

مجھے دیر ہو رہی تھی، گھر چلا آیا۔ لیکن اس دن کے بعد صاحب سے اس موضوع پر پھر میری بحث نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صاحب خود بہت فرض شناس اور ایمان دار آدمی تھے۔ سیاسی معاملات میں البتہ ان کے خیالات متعصبانہ اور سخت تھے اس لیے مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد ہی وہ سول سروس سے استعفیٰ دے کر ولایت چلے گئے جہاں وہ اپنے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔

آسی الدنی

میرا نام عبد الباری، تخلص آسی، ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمذ مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن عبد الحکیم عاشق عرف تھن میاں مرحوم جلیس میر تقی میر مرحوم۔ وطن ضلع میرٹھ تحصیل ہاپوڑ مولد ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ء قصبہ الدن میں جو شرفا کی ایک بہت قدیم بستی ہے، پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۸۹۸ء میں میرا سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی سے کی اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم سے۔ مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے کتب طب پڑھیں اور ان کے مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں شاہجہان پور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اس سے بھی گھبرا گیا۔ تو دفتر اخبار ہمدرد دہلی مولانا محمد علی کے یہاں کام کرتا رہا، جس زمانہ میں جالب صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں ہمدرد کی مالی حالت نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس لیے وہاں سے دل برداشتہ ہوا اور ماہ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو لکھنؤ چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں۔

میری شاعری کی ابتدا کسی ترغیب و تشویق کی ممنون احسان نہیں ہوئی۔ بلکہ اس وقت سے جب کہ میں انشاء خلیفہ و مادھو رام وغیرہ پڑھتا تھا، شعر کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی۔ تا آنکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا۔

کیا تم نے زخمی ایسا دل ہمارا　　بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۰۶ء کا ہے۔ اس کے بعد قریب قریب روز شعر کہتا رہا اور سنہ ۱۹۱۰ء تک بغیر کسی تخلص کے مشق سخن جاری رہی۔ ایک روز ایک دوست نے صلاح دی کہ تم عاصی تخلص رکھ لو۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا سید سراج احمد صاحب مرحوم نے مشق سخن کرانا شروع کی کوئی طرح دیدی اور اس پر سب کو طبع آزمائی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ پہلی طرح یہ تھی۔

مسافر ہے تو ٹھیرنے کا ارادہ نہ کر اے پردیسی

اس پر میں نے بھی شعر کہے، جو اس وقت مجھے یاد نہیں۔ اب بات چھپنے والی نہیں رہی تھی۔ اس موزوں طبعی کی میرے والد مرحوم کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ خود فارسی اور اردو کے خوشگو شاعر تھے اگرچہ وہ زیادہ تر نثر پر قائم تھے۔ انھوں نے ایک بار یہ طرح دی۔

اٹھا دو گھڑی سنبھال بستر کہ رات اب کچھ نہیں رہی ہے

میں نے غزل لکھ کر سنائی۔ خوش تو ہوئے، مگر کہا ابھی بہت کمی ہے۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح دیتے رہے۔ میں بیشتر اساتذہ کے دیوانوں اور اپنے پردادا مرحوم کا دیوان دیکھتا رہا۔ اس وقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ تھا، نہ ان کے کلام سے کچھ زیادہ لطف

اردو ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے حواشی کی عبارتیں دیکھ کر مزا آتا تھا۔ کہیں لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی میر کی غزل پر کہی۔ اور میر صاحب استادی میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی۔ کہیں یہ تھا کہ میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے۔ اور میں نے ان کے اس شعر پر اعتراض کئے۔ کہیں قائم کی ملاقات کا حال کہیں سودا کی بات چیت۔ غرض فارسی کے دیوانوں اور اس دیوان کو اپنا رہبر رکھا تھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے اردو میں مرزا غالب کا دیوان پڑھا۔ اور اس کو اپنے والد سے سمجھا اور اس کے معانی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر گلزار نسیم کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ تا آنکہ ۱۹۱۰ء میں مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق سے ملاقات ہوئی۔ مولانا میرے عزیز قریب بھی ہیں۔ میں پہلے ان کی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ وہاں روز و شب شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ اور مولانا کا یہ شعر سن کر

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو
میں کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہوں نہ کافر ہوں

میں اس شعر کو سن کر ایسا وارفتہ ہوا کہ مولانا سے اصلاح کی استدعا کی۔ مولانا نے ازراہ مہربانی منظور فرمایا اور سب سے پہلے میرے تخلص میں اصلاح فرمائی یعنی عاصی کی بجائے آسی تجویز کیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک اپنا کلام ان کو دکھاتا رہا۔ بعد کو مولانا نے اتنا دل بڑھا دیا جس پر مجھے بذات خود ناز ہے۔ اس حساب سے شاعری کے تین خانوادوں سے فیضیاب ہوا ہوں۔

مولانا سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم تلمیذ میاں یزدانی میرٹھی۔ مولانا منشی شیخ خلیفہ حسام الدین احمد صاحب حسام تلمیذ مرزا غالب مرحوم۔ مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق تلمیذ مرزا داغ۔ اس لیے میں نے اس بات کو خود نظر انداز کر دیا ہے کہ میں نے براہ راست دو غزلوں پر داغ مرحوم سے بھی اصلاح حاصل کی جو شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مگر اصل استفادہ ناطق صاحب کی ذات سے حاصل کیا۔

میں نے شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف سکولوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہ اس کی قباحتیں ذہن نشین ہوئیں تو مولانا حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانہ میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیئے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا جس کی مولانا ناطق نے تنبیہی الفاظ میں سخت مخالفت کی۔ اس کے بعد مرزا داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگا۔ اور ۱۹۱۳، ۱۴، ۱۵ء کی غزلیں قریب قریب سب اسی انداز کی ہیں۔ مگر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ آگیا۔ اس وقت یہاں انجمن معیار کا زور شور تھا۔ اور اساتذہ لکھنؤ مرزا غالب کے رنگ میں طبع آزمائیاں فرما رہے تھے۔ میں بھی اسی وجہ شاہراہ پر چل نکلا۔ اگرچہ بعد کو بہت جلد میری سمجھ میں آگیا کہ:

کایں رہ کہ تو میروی بترکستان است

میں نے ہجر و بکا اور شادی کی شاعری کو الوداع کہہ دیا۔ اس کے بعد فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا۔ مگر جلد تجربہ کر کے معلوم ہو گیا کہ اگر شاعری کو محض فلسفے اور تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ میر کے انداز سخن کا میں پہلے بھی شیدائی تھا۔ اور اب بھی ہوں۔ مرزا غالب اور مرزا داغ کا رنگ میرے لیے پہلے بھی قابل اتباع تھا اور اب بھی ہے۔ مگر ان سب میں سے کسی کا پابند نہیں۔ اب میرا مذہب شعر یہ ہے کہ شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو کیسی ہی نادر ترکیبیں بہترین الفاظ اور بدیع۔ استعارات اور تشبیہیں اس میں صرف کی گئی ہوں۔ مگر پھر بھی کوئی ندرت بیان، اثر، جوش کلام ضرور شامل ہو۔ اگر اس کی تہ میں ایک قسم کی شگفتگی، طنز، کنایہ، تعریض وغیرہ کی جھلک بھی نظر آجائے تو سبحان اللہ۔ شاعر اگرچہ اصناف سخن میں سے کسی ایک صنف خاص کا زیادہ دلدادہ ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس کی مشق ہر صنف کلام میں ہونا چاہیئے۔ عشق و محبت کے جذبات، اثر و تاثیر

سے کوئی خالی نہ ہو۔ پھر اثر کے معنی صرف سوز و گداز بیان اور موت کے تلخ مناظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا خاص دستور ہے کہ پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ مایوسی کے زندگی کے ایک خوش انجام پہلو کی بھی تصویر پیش کر سکے۔ یہی میرا خیال ہے۔ اور انھیں باتوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں شعر کہتا ہوں۔ میرا کلام غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعیات وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں بہت کافی ہے۔ مگر رباعی اور غزل میری سب سے زیادہ محبوب چیز ہے۔

میری تصانیف میں اکثر ناول بھی ہیں۔ اور شرح دیوان غالب جو دو حصوں پر مشتمل ہے شرح تحفۃ العراقین، ترجمہ و شرح دیوانِ حافظ، ترجمہ فرہنگ آنند راج لغت اردو اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں۔ ورنہ عام تصنیفات کی تعداد تیس تک پہنچی ہے جن کو صراحتاً لکھنا بیکار ہے۔

میرے شاگردوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک ہے۔ یوں تو سب خوش فکر خوش گو ہیں۔ مگر شوکت تھانوی، امین سلونوی، عزم انصاری، شمیم جلالی، زکی لکھنوی، اسد الٰہ آبادی، آزاد لکھنوی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ صرف لکھنؤ یا دہلی کا زباں داں یا اہل زبان ہونا قابلِ استناد و لائق فخر نہیں بلکہ دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کی زبان پر کم از کم اتنا عبور ضرور ہو کہ وہ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کر سکے۔

میری ابتدائی مشق کے دو دیوان مرتب ہو چکے تھے مگر اب میں انھیں ضائع کر چکا۔ اب ایک دیوان اردو غزلیات کا، ایک قطعوں اور ایک رباعیات کا تیار ہے۔ جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی۔ البتہ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ بصائر چھپ چکا ہے۔

دِل شاہ جہان پوری

ولادت : ۱۸۶۵ء وفات : ۱۹۵۹ء

نام حکیم ضمیر حسن خان دِل شاہ جہان پوری ابن احمد حسن ابن جمال الدین عرف قدرت علی خان۔ فارسی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ صرف و نحو سے فارغ ہونے کے بعد مولوی سید محمد علی خان صاحب خیالؔ اور مولوی نورالدین صاحب سے معقول کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد صاحب مراد آبادی اور مولوی عبدالباری خان صاحب شاہ جہان پوری سے حاصل کی۔ بعد ازاں علم طب کا درس جو خاندانی مشغلہ تھا مولوی حکیم محمد صاحب سے۔

پندرہ سال کی عمر سے ذوقِ شاعری پیدا ہوا۔ چند سال تک بغیر اصلاح مشغلۂ شاعری قائم رہا۔ مگر استادِ کامل کی تلاش تھی۔ بذریعہ خط و کتابت منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ قائم ہوا۔ بعد ازاں بمقام رامپور حاضر ہو کر شرفِ نیاز بھی حاصل کیا۔

حسب الارشاد استاد علیہ الرحمۃ بذریعہ خط و کتابت حضرت استاد و نیز دیگر اہلِ فن استفادہ کیا۔ میری فطرت ہی جذبات نگاری۔ اثر پسندی، واقعہ نویسی کی حامل تھی۔ تصوف اور فلسفیانہ انداز بیان بھی میں جزو تغزل سمجھتا ہوں۔ اکثر صوفیوں کی بارگاہ میں باریابی رہی ہے۔ اس لیے گو صوفی نہیں ہوں۔ مگر اس رنگ سے آشنا ضرور ہوں۔ میں غزل کے اس شعر کو شعر نہیں سمجھتا جس میں تصنع ہو۔ اور دماغ سے پیدا کیا گیا ہو۔ بلکہ دل سے نکلا ہوا شعر شعر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ الفاظ جن کو غزل برداشت نہ کر سکے۔ میری رائے میں پسندیدہ نہیں۔ کنایہ مجھ کو بے حد پسند ہے۔ وہ انداز بیان میرا خاص رنگ ہے۔ جو الفاظ سے ظاہر نہ ہو۔ مگر ذہنِ سامع اس کی سماعت سے حسنِ تخیل تک بادنیٰ سماعت پہنچ جائے۔

باوجود لکھنؤ اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے میں نے دہلوی رنگ اختیار کیا۔ دہلوی رنگ سے میرا مقصود میرؔ و غالبؔ و مومنؔ کی شاعری ہے۔ جذبات نگاری میں عریانی پسندیدہ نہیں۔ مذاقِ سلیم کا دلدادہ ہوں۔ اکثر اشعار جو دورِ گزشتہ میں حاصلِ غزل تسلیم کیے گئے تھے۔ میں نے تغزل سے خارج کر دیے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بوقتِ طباعتِ ثانی ان مجموعوں میں جو کانٹے باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی چن لیے جائیں گے۔ میں حسن پرست ہوں۔ حسن کی قدر کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی احترامِ منزلتِ حسن میری فطرت میں داخل ہے۔ حسن کی بے اعتنائی کا شکوہ عاشقِ مظلوم کا دستور ہے۔ لیکن میں حتی الامکان اس حد تک روا رکھتا ہوں جہاں تک حسن منفعل نہ ہو۔ میں اس محبوب کا دلدادہ ہوں۔ جس کی بارگاہ میں رقیب کا گزر نہیں۔ میرا محبوب معصوم ہے۔ میرے حسن و عشق کی داستان میں شکوۂ دشمن بھی شامل نہیں۔ میں ہمیشہ مجبور رہا۔ اس لیے وصل سے بھی نا آشنا ہوں۔ وصل کی تمنا فطرتِ عشق ہے۔ لیکن اس کا اظہار اور اس تمنا کی صراحت میری ہمت سے بالا ہے۔

باوجود رنگِ قدیم مطالعہ کرنے کے میری طبیعت خود رہنما ہوئی اور میں نے وہ رنگِ تغزل اختیار کیا۔ جو میری رائے میں حسنِ غزل ہے۔ میری رہنما ایک حسین پاکیزہ ہستی ہی ہے۔ جس کے خیال نے مجھ کو صحیح حسن پرست بنا دیا۔ چونکہ باوفا عاشق ہوں۔ ہمیشہ احترامِ حسن کرتا رہا۔ عشق کی نیازمندی بھی پیشِ نظر رہی۔ میرا ہادی وہ ہادی ہے۔ جس نے میری رگ رگ میں جوشِ محبت، خلوص اور وفاداری کا اثر پیدا کر دیا۔ میں اکثر نالہ و فریاد کرتا ہوں۔ بیشتر انقباضی مضامین نظم کر جاتا ہوں۔ کہیں کہیں میری شگفتگیٔ طبع مجذوب کی بڑ ہو جاتی ہے۔ جس کو حقیقت نہ سمجھنا چاہیے۔ عیش و مسرت فطرتِ انسان ہے۔ مگر مجبور ہوں میں نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ جہاں نالے کے سوا نغمہ کی آواز کم محسوس ہوتی ہے۔ میرے اشک ہمیشہ اپنے ہی دامن پر ٹپکتے ہیں۔ محبوب کا خیالی دامن بھی اس سے اثر پذیر نہیں۔ اپنے رہنما کے نام کا اظہار پسندیدہ نہیں لیکن جو کچھ کر رہا ہوں حقیقت ہے میں خمخانۂ عشق میں قدیمی بادہ پرست ہوں۔ جس کے کیف کے اثر سے حافظِ شیراز اور خیام مخمور نظر آتے ہیں۔ میں اس کا بھی متوالا ہوں۔

رندانہ جذبِ مذاق میری رائے میں پسندیدہ ہے۔ بشرطیکہ جوش بوالہوسی تک نہ پہنچ جائے۔ بادۂ جوش بادۂ طہور کا لطف دے۔ گندگی نمایاں نہ ہو۔

میری رائے میں جب تک شاعر نے کوچۂ حسن کی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں۔ شاعر کا دل دردآشنا نہ ہو۔ اس کی غزل میں اثر نہیں پیدا ہوگا۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ شعرائے دہلی کے رنگِ تغزل میں اثر کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اس عہد میں نشوونما پائی جب سلطنتِ مغلیہ برباد ہو چکی تھی۔ اس وقت سوائے نالہ و بکا کے کوئی سامانِ عیش و عشرت پیشِ نظر نہ تھا۔ اس کے علاوہ شعرائے دہلی صوفیائے عظام کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اس صحبت نے ان کے رنگِ تغزل میں تصوف اور عرفان کی جھلک بھی پیدا کر دی۔

شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا زمانہ شبابِ شاہانِ اودھ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے وہ محض اپنے سطحی خیالات کی حد میں رہے۔ تشبیہہ و استعارات کو حاصلِ شاعری سمجھے۔ درد و اثر سے ان کا کلام بیشتر تشنہ نظر آتا ہے۔ اس ثبوت کی دلیل قوی یہ ہے کہ جب سلطنتِ اودھ بھی پامالِ حوادث ہو گئی۔ تو دورِ حاضر میں شعرائے لکھنؤ کا رنگ بھی بدلا۔ ایک وقت تک ان کے کلام کا حاصل صرف واہ واہ تھا۔ لیکن اب انقلابِ زمانہ سے اثر پذیر ہو کر آہ آہ بھی کرنے لگے ہیں۔

مجھ سے بعض سخن سنج استفسار فرماتے ہیں: کہ با یار سخن گفتن تعریفِ غزل ہے۔ پھر آپ کے کلام میں بوسہ کی آرزو اور تمنا اظہارِ جذباتِ عشق کی حد میں ہے۔ لیکن مجبور ہوں۔ حسنِ غیور کی بارگاہ میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ خود بوسہ کی نہیں۔ میرے محبوب کے لب و رخسار اس گستاخانہ جذبے سے بے نیاز ہیں۔ بوجوہ مذکور جب بوسہ ہی میرے مذہب میں ناروا ہے تو وصل کی طلب انتہائی گستاخی کیوں نہ سمجھوں۔

اقتدار الملک۔ حکیم الشعرا۔ لسان الدہر آپ کے خطابات تھے۔ جو اکثر رسائل میں ان کے نام سے پہلے دیکھے گئے۔

تصانیف :

۱ ۔ نغمۂ دل	دیوانِ اوّل	مطبوعہ
۲ ۔ ترانۂ دل	دیوانِ دوم	مطبوعہ
۳ ۔ یادگارِ دل	دیوانِ سوم	غیر مطبوعہ
۴ ۔ متروکاتِ دل	نثر	غیر مطبوعہ
۵ ۔ جدید رنگِ تغزل	غزل پر تبصرہ	غیر مطبوعہ
۶ ۔ گلدہ پر تبصرہ	گلدۂ عزیز لکھنوی پر تنقید تبصرہ (مطبوعہ ۔ مگر کتابی صورت میں ابھی تک طبع نہیں ہوا ۔)	
۷ ۔ مکتوباتِ دل		غیر مطبوعہ
۸ ۔ دردِ دل	ایک ناول	مطبوعہ

۹ ۔ رضا لکھنوی کی فرمائش سے چھ سات سو غیر معروف محاورات اور ضرب الامثال نظم ہے۔ افسوس یہ کتابی شکل میں نہ چھپ سکے۔

یگانہ چنگیزی

ولادت : ۱۸۸۴ء　　　　وفات : ۱۹۵۶ء

میرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی ابن پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی۔ یہ سلسلۂ نسب چنگیز خان تک پہنچتا ہے۔ میرے ننھیالی بزرگ جن کا سلسلہ میرزا آغا جان تک پہنچتا ہے لکھنؤ سے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

میری ولادت کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں۔ مگر اتنی معلوم ہے کہ ۱۳۰۱ھ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔ عظیم آباد کا محلہ مغلپورہ میرا مولد ہے۔ میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ[1] عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی۔ اس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا۔ اول سے آخر تک وظیفے، تمغے اور انعام پاتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ میرے ذوق سخن کی اصلاح سب سے پہلے استاذی مولوی سید علی خاں[2] صاحب بیتابؔ عظیم آبادی نے کی اور بعد ازاں اپنے استاد خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شادؔ کے سپرد کر دیا۔ جن کی ذات گرامی سے خاکسار کو بہت فیض پہنچا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں میں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا۔ جہاں پر میں مرزا محمد مقیم بہادر (سلطان عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلم رہا۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ کچھ دنوں علیل رہ کر عظیم آباد واپس آیا۔ یہاں بھی صحت درست نہ ہوئی۔ آخر کار لکھنؤ پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جاتا اور جائداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے ایک سال میرے مکرم و محترم نواب بنا صاحب موجؔ عظیم آبادی اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور انھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے معزز متوسط گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ میرے خسر جناب حکیم مرزا محمد شفیع صاحب اور نواب بنا صاحب موجؔ سے دیرینہ مراسم تھے۔ کتنے شائستہ، کتنے پاکیزہ مزاج لوگ تھے۔

---

[1] حضرت شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی ابن مولوی واحد علی صاحب مرحوم عظیم آباد کے ایک باوقعت رئیس تھے۔ عربی فارسی میں یگانۂ روزگار اور فن خوش نویسی میں استاد مانے جاتے تھے۔ ۱۳۲۳ھ میں گورنمنٹ عالیہ سے شمس العلما کا خطاب پایا۔

[2] مولوی سید علی خاں عرف لاڈلے صاحب بیتابؔ عظیم آباد پٹنہ کے باشندے اور مولانا علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

خدا جنت نصیب کرے۔

میرزا واجد حسین صاحب یاسؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ بعد میں یگانہؔ تخلص اختیار کر لیا۔ ادبی دنیا میں یاس یگانہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز رہے۔ غالباً ۳۵-۱۹۳۴ء میں وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ آ گئے۔

تصانیف :-

۱ — نشترِ یاس	غزلیات کا پہلا دیوان
۲ — چراغِ سخن	عروض و قوافی کی بحث میں ایک کوشش
۳ — غالب شکن	عنوان ہی سے کتاب کا متن واضح ہے
۴ — ترانہ	مجموعۂ رباعیات
۵ — اندھی نگری	جس میں ہم عصر شعرا پر لے دے کی گئی ہے
۶ — ادبِ خبیث	ادبِ لطیف کے عنوان سے جو مضامین مختلف رسائل و جرائد میں طبع ہوئے ہیں ان پر تنقید اور ان کی پُر زور مذمت۔
۷ — آیاتِ[1] وجدانی	غزلیات کا دوسرا مجموعہ از میرزا یاسؔ یگانہ مع محاضرات از میرزا مراد بیگ شیرازی

---

[1] اس کا جواب "وہ میرزا" ایک آیاتِ وجدانی کا مصنف، دوسرا اس کا مفتری از مولوی اسمٰعیل احمد مینائی۔

ہادی مچھلی شہری

وفات: سنہ۱۹۶۱ء　　　　ولادت: سنہ۱۸۹۰ء

میرے والد مولانا سید عبدالرزاق شاکر غالب مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ چنانچہ ان کے نام کے اکثر خطوط مکتوبات غالب کے مجلدات میں اب تک موجود ہیں۔

والد مرحوم مستقل طور پر التزاماً مشق سخن نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے ان کا کلام بجز چند عربی، فارسی اور اردو منظومات کے دستیاب نہ ہو سکا۔

میں نسباً جعفری الزینبی ہوں۔ حسباً صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے والد بزرگوار سب جج تھے۔ ان کے تینوں لڑکوں میں سے سب سے بڑے صاحبزادے سید محمد تقی مرحوم ڈپٹی کلکٹر تھے۔ حصول پنشن کے بعد جے پور میں وزیر مال ہو گئے۔ دوسرے صاحبزادے علی نقی ایڈووکیٹ تھے۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے معلم اور صدر تھے۔ اور اسی حالت میں انتقال ہوا۔ حضرت شاکر مرحوم کی اولاد ذکور میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

والد مرحوم فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی۔ میں نے فارسی اور عربی کے صرف و نحو کی تعلیم اوّلاً مولانا حافظ احمد حسن مچھلی شہری مرحوم ثانیاً مولانا مظہر حسین مچھلی شہری مرحوم سے حاصل کی تھی اور بالآخر خود فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔

میری شاعری کا مستقل دور سنہ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی میں نے چند غزلیں لکھی تھیں۔ جو جلیل القدر حضرت جلیل مرحوم کی اصلاح کے بعد ایک رسالہ میں جس کو وہ حیدرآباد سے اس زمانے میں نکالتے تھے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے بعد سنہ۱۹۱۰ء سے میں نے مستقل طور پر شعر کہنا شروع کیا۔ تو کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ اپنے فطری ذوق شعری سے مدد لے کر خود اپنے اشعار کی اصلاح کر لیتا تھا۔ اگر صرف تین چار غزلوں پر اصلاح اور وہ بھی ایسے زمانہ میں جب وہ محض اتفاقیہ طور پر لکھی گئی ہوں کسی کا شاگرد ہونے کے لیے کافی ہے۔ تو بے شک میں حضرت جلیل مرحوم کا شاگرد ہوں۔ ورنہ کسی کا بھی نہیں۔

آج کل شاعری کی تقسیم دو اسالیب یعنی جدید اور قدیم میں کی جاتی ہے۔ فی زمانہ ہذا عریاں نگاری اور غیر ذمہ دارانہ شاعری کا جو رنگ نظر آتا ہے۔ اگر اس کو جدید شاعری کہا جاتا ہے۔ تو دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں تک متین، مہذب اور صحیح شاعری کا تعلق ہے۔ شاعری کو جدید اور قدیم اصناف میں تقسیم کرنا میری رائے میں ایک اصولی غلطی ہے۔ شاعری حقیقتاً وہ ہے۔ جو حیات مختلفۂ انسانی اور مناظر فطرت کی مستقل اور گوناگوں کیفیات کی مناسب الفاظ میں صحیح ترجمانی کر سکے۔ یہ حیات فطری حیثیت سے کم و بیش ہر انسان کے دل میں ہمیشہ موجزن ہوتی رہتی ہے۔ انسانی فطرت ہر دور میں ان کے عکس سے منعکس ہوتی ہے۔ اور شاعر ان کی ترجمانی کر کے انہیں

دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ لہٰذا ان تظاہرات کے مابین کوئی جدید یا قدیم کی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ جن مظاہرِ فطرت اور حسیاتِ رقیقہ و دقیقۂ انسانی کی ترجمانی میر اور مومن نے کی تھی۔ انہیں کی ترجمانی غالب اور ان کے مابعد کے شعراء نے بھی عمل میں آئی۔ اگر کچھ فرق تھا۔ تو صرف موضوع اور اسلوبِ بیان کا۔ نہ کہ جدید اور قدیم ہونے کا۔ داغ اور میر کی شاعری ان اساتذہ کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف نوعیت کا ہے۔ نہ کسی اور چیز کا۔ حال کے شعراء نے عامیانہ تخیل سے بچ کر میر، مومن اور غالب وغیرہ کی تقلید کی ہے۔ جن میں اقبال، فانی، اصغر، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی وغیرہ کی ہستیاں ممتاز طور پر نمایاں ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا اسلوبِ کلام جدید ہے۔ اور ان کی شاعری داغ، امیر یا اکثر شعرائے لکھنؤ کے مقابلے میں نئی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں یہ فرق صرف نوعیت کا ہے۔ نہ کہ جدت اور قدامت کا۔ بعض باکمال شعراء میں مصوری کی قوت اس قدر زبردست اور ان کا انداز بیان اس قدر مخصوص اور منفرد ہوتا ہے کہ معمولی روایتی باتیں بھی جو ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔ نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی دھوکے میں پڑ کر لوگ خود شاعری کو جدید اور قدیم کا عنوان دے دیتے ہیں۔

اب یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود میرا رنگِ شاعری کیا ہے۔ یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا کہ میرا وہ رنگ نہیں جو داغ اور میر کا تھا۔ ہاں اگر اس کو کچھ نسبت ہو سکتی ہے۔ تو اس رنگ سے ہو سکتی ہے۔ جس کے علمبردار میر، مومن اور غالب وغیرہ تھے۔ اس نظریے کے بعد میرے رنگ کو جو کچھ بھی کہا جائے جدید یا قدیم مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے شاعری کے میدان میں اپنے کو ہمیشہ رکیک اور عامیانہ تخیل سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میرے دیوان میں کوئی ایسا لفظ نہ ملے گا۔ جس کے ادا کرنے میں ایک مہذب شخص کو کسی قسم کا پس و پیش ہو۔

شاعری کے لیے سب سے بڑی چیز اس کا مؤثر ہونا ہے۔ صنائع اور بدائع اور مشکل اور الجھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال یا صرف زبان کا گورکھ دھندہ جس کو اصطلاح میں روزمرہ کہتے ہیں۔ درحقیقت شاعری نہیں۔ اس قسم کی شاعری گو سننے میں مرغوب ہو گئی ہے۔ لیکن جب اس کو کاغذ پر بصورت تحریر دیکھیے تو کچھ لطف نہیں آتا۔ یا یوں کہیے کہ اس کا اثر صرف کان تک محدود رہ جاتا ہے۔ دل تک نہیں پہنچتا۔

اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ حقیقی اور مؤثر شاعری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں وہ چیزیں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ زبان پر قدرت۔ ۲۔ مناسب الفاظ و تراکیب کا استعمال۔
۳۔ کلام کی صفائی، پختگی، برجستگی اور روانی۔
۴۔ خیال کی پاکیزگی اور بلندی جس میں فلسفیانہ اور متصوفانہ محسوسات بھی شامل ہوں۔
۵۔ انداز بیان کی خصوصیت اور ندرت۔ ۶۔ حشو و زوائد سے اجتناب۔
۷۔ مرکزی خیال سے الفاظ و تراکیب کی مطابقت و ہم آہنگی۔ ۸۔ استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال
۹۔ الفاظ اور تراکیب کے الٹ پھیر سے کلام میں اثر پیدا کرنے کی قابلیت

۱۰۔ پست عامیانہ اور رکیک جذبات سے اجتناب ۱۱۔ اصول اور قواعد اور شاعری کی پوری پابندی۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے۔ اس دور کے بیشتر شعراء اپنے کو ہر اصول شاعری سے بے نیازی سمجھتے ہیں۔ نو مشقوں کا ذکر ہی کیا بعض وہ ہستیاں بھی ہیں جن کا شمار صف اول کے شعراء میں ہے اس مرض سے محفوظ نہیں۔ ایسی نظمیں دیکھنے میں آتی ہیں جن کے عنوان سے ان کی توضیح و تشریح کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ شوکت الفاظ اور صفت اُلجھی ہوئی ترکیبوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ناقدانہ اور منصفانہ حیثیت سے ان کے معنوی پہلو کو دیکھئے۔ تو بجز مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پڑھنے والے کو اتنا تو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت بلند آہنگ نظم پڑھ رہا ہے۔ لیکن جب الفاظ و تراکیب کے طلسم سے باہر نکل کر اس بات پر غور کرتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا تھا اور اس نے کیا کہا ہے تو بالکل کھو جاتا ہے۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ حشو و زوائد تو گویا کچھ عیب ہی نہیں۔ منظومات میں کسی مخصوص عنوان کے تحت لکھی گئی ہوں۔ متعدد ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن کو اصل موضوع سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہوتا۔ اور وہ ایک ناخواندہ مہمان کی طرح نظم میں دخیل نظر آتے ہیں۔ قطعات و رباعیات بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ جن میں پورا پورا مصرع حشو معنوی کی صورت اختیار کیے ہوتا ہے ایک ہی حالت کے لیے متعدد اور متناقض تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں۔ جو اکثر ناقص غیر مستقل اور غیر مناسب ہوتی ہیں چنانچہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غلط گوئی آج کل کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنی ہوئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ عام لوگوں میں شاعری کا ذوق بڑھتا جاتا ہے اور مشاعروں کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔ مگر سخن فہم حضرات اور نقاد نگاہیں مفقود ہیں۔ مشاعروں میں عام طور سے وہی لوگ بلائے جاتے ہیں جو بیک وقت شاعر اور مغنی دونوں کا کام دے سکیں۔ بہتر سے بہتر اور بلند تر سے بلند تر اشعار جو سادہ طریقہ پر پڑھے جاتے ہیں مقبول نہیں ہوتے۔ بخلاف اس کے معمولی سے معمولی اور سست سے سست اشعار جو ترنم اور موسیقی کے لباس میں رونما ہوتے ہیں قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ جب دنیائے شعر و سخن کا یہ رنگ ہے۔ تو میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے کلام کا کیا حشر ہوگا۔ ارباب ذوق سے میری یہ گزارش ضرور ہے کہ وہ میرے کلام کو بہ نظر دقت مطالعہ فرمائیں۔ اگر میرے اشعار ان محاسن کے حامل اور ان معائب سے مبرا ہیں۔ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ تو وہ ضرور زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ورنہ

؏ "ایں دفتر بے معنی در آتش و آب اولیٰ"

مجھے فارسی سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے۔ اور اگرچہ اس دور میں فارسی کی کوئی قدر نہیں۔ اور شاذ و نادر ہستیاں اس جانب ملتفت و مائل نظر آتی ہیں۔ لیکن میری طبیعت کے قدرتی لگاؤ نے مجھے اس سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ اور چونکہ ایرانی ادبائے عصر حاضر نے میرے فارسی کلام کو بنظر پسندیدگی دیکھا ہے۔ اس لیے میں اپنی سعی کو مشکور سمجھتا ہوں۔ اور خوش ہوں۔ کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوا۔ جدید فارسی میں علاوہ نظم کے میرے نثر کے مضامین بھی جرمنی اور ایران وغیرہ کے مجلات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کے متعلق جن خیالات کا ادب شناسان ایران نے اظہار کیا ہے۔ وہ ان شاء اللہ فارسی کلام کی اشاعت کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیے جائیں گے۔ میرا فارسی دیوان جس میں ہزار سے زیادہ صرف رباعیات ہیں مرتب ہو چکا ہے۔ اگر میں زندہ رہا۔ اور زمانے نے مساعدت کی تو امید ہے کہ اردو کے کلام کی اشاعت کے بعد اس کی بھی نوبت آ جائے۔

سیماب اکبرآبادی

میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی۔ گھگّل والے مکان میں پیدا ہوا۔ والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نوراللہ مرقدہٗ) فاضل عصر اور عالم متبحر تھے۔ اجمیر شریف میں "ٹائمز آف انڈیا پریس" کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اپریل ۱۸۹۷ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری میرا فطری ذوق اور پیدائشی میراث ہے۔ کتب متداولہ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا، جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق و الحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا۔ برانچ اسکول کے مدارج درس بعجلت طے کر کے جب کالج پہنچا تو وہاں مولوی سعید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اس ذوق شاعری کو بے حجاب کر دیا، جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا۔ میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریک درس ہوتے تھے اُن کا اُردو ترجمہ نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا اور یہ مقدس حضرات میری اس جسارت کی حوصلہ افزائی سے پذیرائی فرماتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستاں کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا، تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا:

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم میں کر کے لانا۔ مختصر یہ میری عادت جاری رہی تھی۔ کریمہ، ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ، جن کا انتخاب کلام جزو نصاب تھا، ہمیشہ بصورت نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بر جبیں نہ ہوئے۔

۱۸ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں ایف۔ اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ مگر چونکہ شاہراہِ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا، اس لیے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک ہوتی تھی۔

والد مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزند اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پر آ پڑا، اور مجھے بسلسلۂ معاش کان پور جانا پڑا۔

حکیم ازل لکھنوی، جناب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعراء سے مجالست رہی۔ اسی زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور قریب قریب ہر لحاظ سے کانپور لکھنؤ کے زیر اثر تھا لیکن میری طبیعت نے فوراً "دبستان دہلی" کی طرف رخ کیا۔ اسی لیے ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے"۔ اس تنبیہ کے بعد غزلوں کی ترسیل کچھ عرصے کے لیے بند کر دی اور مشق سخن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرے کا اعلان ہوا "دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے" میں نے ایک غزل کہی اور استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا "آفرین ہے کیا خوب غزل کہی ہے" بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اُن کی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ منظر مرحوم وارثی تھے۔ کانپور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں (بمقام گوال ٹولی) رہا کرتے تھے۔ ان کی تحریک سے انھیں کی ہمراہی میں ایک دن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جب کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا۔

کانپور سے پھر آگرہ آیا۔ آگرہ سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہ کر [illegible] پھر آگرہ آیا اور "رسالہ مرقع" کا مدیر رہا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بہ صیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ "ٹونڈلہ اخبار" کی ادارت بھی نوکری ملازمت کے ساتھ شریک مشاغل تھی۔

جب معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کروں، بلکہ میری تخلیق خدمت ادب کے لیے ہوئی ہے۔ اس انکشاف ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دے دیا اور اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء سے اپنے وطن مستقر پر قائم رہتا ہوں۔

علی اختر اختر

میرا نام علی اختر ہے اور وطن علیگڑھ۔ ۱۳۱۱ھ میں بمقام ریاست رامپور پیدا ہوا۔ کچھ دن علیگڑھ میں تعلیم پائی اور اس کے بعد ننہال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانس کالج میں رہا۔

فارسی اور عربی کا درس مولانا نصیر الدین صاحب سے حاصل کیا تھا۔ اور اس زمانہ کی مروجہ تکمیل کے بعد اسکول میں داخل کیا گیا تھا۔ کالج کے ابتدائی ایام ہی میں سل میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایک سال تک تعلیم بند رہی، پھر حالات بدل گئے، اور طبیعت ادھر رجوع نہ ہو سکی۔ غالباً ۱۸ء یا ۱۹ء سے حیدرآباد میں بسلسلۂ ملازمت مستقلاً قیام پذیر ہوں۔

شعر مجھے خود یاد نہیں کہ کس عمر سے کہہ رہا ہوں۔ میرے گھر میں شعر و ادب کی فضا پہلے سے مرتب تھی۔ اس لیے میری شاعرانہ فطرت کو اس سے بہت مدد ملی۔ شاید چودہ پندرہ سال کی عمر کے دو شعر حافظہ میں ہیں۔ جنھیں ذیل میں لکھتا ہوں:۔

قفس میں سمجھے تھے ہم کہ حالت رہین امن و امان رہے گی
کسے خبر تھی کہ برق اب بھی نگاہ بر آشیاں رہے گی

(۲)
ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبضِ دلِ دیوانہ
ملتی ہی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ میرے خاندان کے دوسرے افراد، خورد و بزرگ عام طور پر داغ اور امیر کے راستوں پر چل رہے تھے۔ لیکن اس نوع کی شاعری سے مجھے ابتدا ہی میں کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ ذخیرہ کے ابتدائی نمبروں میں بھی میری نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ واقعہ بھی شاید ۱۲ء یا ۱۳ء کا ہے۔ چنانچہ 'بہار کا آخری پھول' کے عنوان سے جو نظم لکھی اُسے قبولِ عام بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ ہیں میرے مختصر حالات۔

رضا علی وحشت کلکتوی

ولادت: ۱۸۸۱ء وفات: ۱۹۵۶ء

خود نوشت سوانح عمری اپنی جگہ پر ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مگر جہاں تک اپنی ذات سے تعلق ہے۔ میں ہمیشہ اپنے حالات قلم بند کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اول تو میری زندگی بے مصرف ہی گزری ہے۔ چند سطریں لکھ کر پیش کرتا ہوں۔

میں ۱۸، نومبر ۱۸۸۱ء شہر کلکتہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم مولوی شمشاد علی بھی بنگالہ کے رہنے والے تھے۔ دادا حکیم غالب علی مرحوم تھے جن کا وطن دہلی تھا۔ وہ دہلی چھوڑ کر بنگالہ آئے اور شہر ہوگلی کو سکونت کے لیے پسند کیا۔

لڑکپن ہی میں والد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ تعلیم میری یونہی سی[1] ہوئی اور ملازمت حاصل کرنے کی ضرورت جلد محسوس ہوئی۔ چنانچہ امپیریل ڈیپارٹمنٹ کلکتہ (اب یہ دفتر دہلی میں ہے) ۱۹۰۲ء میں ملازم ہوگیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فارسی مکاتیب کا خلاصہ انگریزی میں لکھنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب گورنمنٹ اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ میں اُردو کا لیکچرار مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پنشن مل گئی۔ لیکن پھر ۱۹۴۲ء میں لیڈی بریبورن کالج کلکتہ میں اُردو کا پروفیسر مقرر ہوا اور سال بھر کے بعد اردو کی جگہ فارسی پڑھانے لگا۔ ۱۹۴۹ء میں اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہوگیا۔ اسلامیہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں خان بہادر[2] کا خطاب مجھے تفویض ہوا تھا۔

لڑکپن ہی سے مجھے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگا۔ حضرت ابوالقاسم محمد شمس مغفور (خلف حضرت نساخ شاگرد داغ دہلوی) سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ میرے اُردو اشعار پر اصلاح دیتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنا مجموعہ کلام دیوانِ وحشت شائع کیا۔ جس کا اس وقت اطرافِ ہند میں چرچا ہوا اور مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) علامہ اقبال اور دیگر اکابر عصر نے اس کی تحسین میں حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرمائے۔ بقول مولانا حالی اس حقیر نے تتبع غالب کا حق ادا کیا۔ اب چالیس برس کے بعد میرا دوسرا دیوان موسوم بہ "ترانۂ وحشت" زیر طبع ہے۔

میں ۱۹۵۰ء کے وسط میں وطن کو خیرباد کہہ کر مشرقی پاکستان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ چلا آیا اور ڈھاکہ میں مقیم ہوں۔

تصانیف:۔ (۱) دیوانِ وحشت۔ (دیوان عاشقانہ)
(۲) ترانۂ وحشت۔ (دیوان عاشقانہ)

---

[1] وحشت نے ۱۸۹۹ء میں انٹرنس پاس کیا۔

[2] خانصاحب کا خطاب ۱۹۲۳ء میں سرکار انگریزی کی طرف سے مرحمت کیا گیا تھا اور خان بہادر ۱۹۳۱ء میں۔

آزاد انصاری

الطاف احمد مشہور نام، نظیر حسین تاریخی نام، ابوالاحسان کنیت، آزاد تخلص، والد کا اسم گرامی محمد حسن خلف امیر احمد، نسلاً شیخ انصاری جن کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ والدہ ماجدہ کا پدری سلسلہ نسب بھی انصاری ہی ہے۔ مگر مادری سلسلہ صدیقی ہے۔ سال ولادت ۲۷ رجب ۱۲۸۸ھ مقام ولادت ناگپور جہاں والد ماجد اس وقت اوور سیری کے عہدے پر فائز تھے۔

ہم نے اٹھارہ انیس سال کی عمر تک مختلف درس گاہوں میں فارسی و عربی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ہماری شادی ہو گئی اور تعلیم چھوٹ گئی۔ لیکن کچھ مدت بعد مولانا حکیم نورالدین صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خان صاحب لکھنوی اور ان کے علاوہ دیگر اساتذۂ فن سے تعلیم حاصل کی اور مولوی حکیم معین الدین صاحب نانوتوی سے جو ہماری والدہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے، سند طب حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں ڈیرہ دون میں جاکر مطب کھولا اور پھر ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کانپور میں یہی مشغلہ جاری رکھا۔ یہاں ہماری اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور سہارنپور چلے آئے۔ ایک سال بعد جب یہ صدمہ کم ہوا تو ہم نے انبالہ چھاؤنی (پنجاب) میں جاکر مطب جاری کیا اور قریباً آٹھ سال تک وہاں علاج و معالجہ کا کام کرتے رہے۔

۱۹۱۹ء میں ہم علیگڑھ آ گئے۔ وہاں ہمارا ڈیڑھ سال تک قیام رہا۔ مگر جب وہاں ہم نے اپنا کاروبار مطب چلتے نہ دیکھا تو ہم دہلی چلے آئے اور اواخر ۱۹۲۳ء تک دہلی میں رہ کر بسر اوقات کرتے رہے، اس کے بعد ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد دکن پہنچ گئے اور کاروبار مطب چھوڑ کر عینک کی تجارت اختیار کر لی، جس پر آج تک گذر اوقات ہے۔ مجھے مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل ہے۔

نوح ناروی

ولادت: ۱۸۷۹ء   وفات: ۱۹۶۲ء

یکم شوال روز جمعہ وقت صبح صادق ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء اپنے ننھیال بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی اودھ اپنے نانا علامہ صاحب کے دولت کدہ پر پیدا ہوا۔ پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمن صاحب جائسی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ ان صاحبوں کے بعد میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں تک مدرسہ کے علاوہ اپنے مکان واقع قصبہ نارہ ضلع الہ آباد میں انگریزی بھی پڑھی۔ شعر و سخن کا شوق میر نجف علی صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا۔ شروع میں انہیں سے اصلاح لیتا رہا، اور پھر جناب امیر مینائی لکھنوی کو دو تین غزلیں دکھائیں، پھر جناب جلال لکھنوی سے پانچ چھ غزلوں میں مشورہ سخن لیا۔ اور آخر میں نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔ دو تین سال ہی گزرے تھے کہ حضرت داغ نے خود اپنے پاس دوبارہ بلا لیا، اور ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد پہنچا۔ اور یہاں حضرت داغ جناب تخلیص دہلوی سے   مستقل سندیں حاصل کیں۔

حضرت داغ دہلوی کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے۔ اور جلد ہی اس کے مدعی بہت سے لوگ تھے۔ لیکن سائل صاحب دہلوی نے خیال کیا کہ ایک شخص پر یہ شرف کیوں محدود کیا جائے، جتنے قابل قابل شاگرد ہیں وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں۔ بہرحال سب سے پہلے مجھ کو جانشینی کی سند عطا کی گئی ہے۔ دو دیوان سفینۂ نوح و طوفان نوح چھپ چکے ہیں۔ تیسرا دیوان اعجاز نوح مکمل ہو چکا ہے۔ مگر ابھی طبع نہیں ہوا۔ میرے شاگردوں کی تعداد ۱۰۰۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ ان میں چالیس پچاس اشخاص نہایت اچھے لکھنے والے ہیں اور بجائے خود صاحب تلامذہ ہیں۔ (خود نوشت حالات ۱۹۳۳ء)

تصانیف: (۱) سفینۂ نوح (۲) طوفان نوح (۳) اعجاز نوح (۴) یادگار نوح (۵) مقالات نوح (۶) مکتوبات نوح۔

فانی بدایونی

میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۱۹۳۹ء ہے، زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے۔ اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انھیں اور اُن کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز کیے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے، صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے، پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، غیرت اور جرأت کے ساتھ گزار دی۔ میری جوان لڑکی نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔

میں نے ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں پیشہ وکالت ذریعہ معاش رہا۔

کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً تنگ خانماں بھی ہوں اور بارِ زمیں بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لیے تو کیا مفید ہوتی، خود میرے لیے نہیں۔

میری موجودہ تصنیفات دیوان فانی مطبوعہ نقیب پریس بدایوں ۱۹۱۷ء۔ باقیات فانی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ۱۹۲۶ء اور عرفانیات فانی مطبوعہ علیمی پریس دہلی ۱۹۳۹ء ہیں۔ باقی تصنیفات تلف ہو گئیں۔

تاجور نجیب آبادی

[illegible] میں میری صحافتی زندگی کا آغاز تھا یوں تو اس سے پیشتر بھی یعنی [illegible] میں رسالہ "[illegible]" دیوبند اور اس کے بعد "آفتاب" اور اس کے بعد بھی غالباً [illegible] میں رسالہ "صبح الخلوص" نجیب آباد کی ایڈیٹری کر چکا تھا مگر یہ ابتدائی مشقیں "ریہرسل" کے طور پر تھیں۔ میری صحافت کا اصل آغاز [illegible] ہی سے ہوتا ہے۔

مشہور و مرحوم رسالہ "مخزن" اس وقت دم توڑ رہا تھا۔ میر نثار علی شہرت دہلوی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے اور صورت واقعہ یہ تھی کہ بوڑھے ایڈیٹر کے ہاتھوں بوڑھا "مخزن" سطح زمین سے گم ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بالآخر انیسویں صدی کا شہرت بیسویں صدی کے تاجور کو مخزن کی ادارت دے کر قطعی گمنامی میں گم ہو گئے۔ میں اس وقت طالب علم تھا۔ مخزن کی حیثیت میری نگاہ میں لندن ٹائمز سے کم نہ تھی۔

مخزن کی بدحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے نئے ایڈیٹر کی تنخواہ پانچ روپے ماہوار تھی اور اس کا [illegible] منیجر جو مقامی پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر بھی تھا دس روپے اور بعد کو پانچ روپے ماہانہ پر منیجری کر رہا تھا۔ بہرحال ایڈیٹر بھی ایڈیٹر ہے۔ پانچ روپے پاتا ہو یا پانچ سو روپے اور دنیا کے ہر طبقے کے آدمی سے ہم سطح ہو کر بات کرنے کی [illegible] حیثیت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس واقعیت کو بہ حیثیت تقرر سے بہت پہلے معلوم کر لیا تھا۔ مالک مخزن اس خیال میں تھا کہ مجھے بہت سستا ایڈیٹر نصیب ہو گیا ہے اور میں اس خیال میں مست کہ مخزن کی ادارت مفت تفریح کے طور پر ہاتھ لگی غرضیکہ ہم دونوں ایڈیٹر و مالک مخزن اپنی اپنی خوش فہمیوں میں شاد اور مطمئن تھے۔

پانچ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس مدت میں جو خاصی طویل تھی میں نے اپنی ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ "مخزن" بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا۔ لیکن ...

مولانا احسان اللہ خاں تاجور، نجیب آباد (صوبجات متحدہ) کے رہنے والے یوسف زئی پٹھان تھے۔ آپ کے اجداد احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ افغانستان سے آکر نجیب آباد میں آباد ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کرنے کے بعد لاہور آگئے جہاں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مولوی فاضل و منشی فاضل پاس کیے۔ یہیں دیال سنگھ ہائی اسکول میں استاد مقرر ہوئے بعد میں ترقی کر کے دیال سنگھ کالج میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر عمر بھر یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور ہی میں انتقال کیا۔

مولانا کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ حضرت رسا رامپوری کی شاگردی اختیار کر کے نظم و نثر میں کمال حاصل کیا۔ کئی اخبار اور رسالے جاری کیے اور دنیائے ادب میں ہمیشہ ایک ہنگامہ برپا کیے رکھا۔ "میری صحافتی زندگی" مولانا تاجور مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون ہے جس میں انھوں نے آپ بیتی کے رنگ میں اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کی کشمکش پر روشنی ڈالی ہے۔

"جو آگے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولے کو "عزیزی" کے حق میں میں نے غلط ثابت کر دیا۔

پانچ سال کے بعد مجھے عزیزی سے کنارہ کشی ہونا پڑی۔ اب میری شہرت اتنی وسعتوں میں پھیل چکی تھی کہ بمشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ مجھے رسالہ "ہمایوں" کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریاں حاصل ہو گئیں۔ یہاں مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہایت شریف الطبع اور باغ نظر مالک کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

"ہمایوں" کی ہر دلعزیزی اور قبولیت عام کے زیر سایہ اہل قلم کے التفات عام کے سبب ہمایوں میں مجھے لکھنے کا موقع بہت کم ملا لیکن جب کبھی میں نے ہمایوں میں کچھ لکھا میری تحریر محبت و احترام کی نگاہوں سے پڑھی گئی۔

پانچ سال تک "ہمایوں" میں کام کرنے کے بعد ہمایوں کی جدید ضرورتوں نے مجھے ہمایوں سے بھی رخصت کر دیا۔ مگر اس زمانے کے میاں بشیر احمد بار ایٹ لا مالک رسالہ اور میں نے باہم مشورے سے ایک نئے ایڈیٹر کا انتخاب کیا۔ ہمارے موجودہ ادوار میں اس حسن معاملہ کی مثال بہت کم مل سکتی ہے۔

"ہمایوں" کی پانچ سالہ ادارت کے بعد میری ادبی شہرت ہندوستان گیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے میں کسی پرچے کی ایڈیٹری تلاش کیا کرتا تھا۔ اب ایڈیٹری میری تلاش میں رہنے لگی۔ ایک سال چند ماہ کے بعد وہ یادگار علمی و ادبی رسالہ میں نے جاری کیا جس کا نام "ادبی دنیا" ہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" اس سطوت و جلال کے ساتھ افق صحافت پر طلوع ہوا کہ سارے ادبی پرستاروں کے چراغ گل ہو گئے۔ اس بیان میں شاعری ہے نہ خود فروشی۔ وہ آنکھیں ابھی بے نور نہیں ہوئیں جنھوں نے ادبی دنیا کا عہد طلوع و دور زندگی دیکھا ہے۔ عام طور نے اسے صحافت کے لیے نشان راہ تسلیم کیا۔ اس کی دھنگ دنیا کے ہر اس منطقے میں تھی جہاں ہندوستانی پہنچ چکے ہیں۔ اس کی خیر مقدمی ڈاک اتنی ہوتی تھی کہ دس بیس اردو اخباروں کی مجموعی ڈاک بھی اس مقدار کو کبھی نہ پہنچی ہوگی۔

"ادبی دنیا" کے بعد جتنے اردو رسالے جاری ہوئے ان میں سے اکثر کے نام میں "دنیا" کا لفظ ضرور شامل ہوتا تھا۔ یہ علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے ملک گیر علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں موجزن رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا مگر ان کی زیرکی کیسے بامحنت جاتی انھیں اس طوفان سے بچائے گی۔ سیلاب پانی ان کے سروں سے گزر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ یورشوں کے ایسے ایسے انوکھے تماشے دیکھنے میں آئے کہ اکثر نگاہ و تماشا حیرتوں میں ڈوب ڈوب گئی۔

میں پہلے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری ادبی صحافتی کاوشوں میں یہ نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ بعض معاصرین "ادبی دنیا" کے جنازہ فرضی دیکھ رہے ہیں اور "ادبی دنیا" کے خلاف ایک مجلس تبرائی منعقد کر کے اپنے صد پیشہ ساتھیوں کے ساتھ "مرثیہ" گا رہے ہیں ——

زندگی کا سامان محسوس کرتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات اب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا ایک تنخواہ دار جاسوس "ادبی دنیا" کے دفتر میں مستقل طور پر رہتا تھا بہرحال "ادبی دنیا" کے جاہ و جلال نے ہر صحافتی بستی میں جان ڈال دی تھی۔ لیکن میری انتظامی نااہلیت اور عدم انتظام پر زود اعتقادی کے سبب وہ پرچہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس حادثے پر گزشتہ حسد و عناد میں خلقدہ خوشیاں منائی گئیں۔ عام سطح کے رسالوں میں اسے میری ادبی موت تصور کیا جانے لگا۔ وہ نادان

---

[1] مرثیہ بروزن مرثیہ تعزیہ، اس قسم کے مصنف کا نام ہے جو تبرائی حضرت عمرؓ و ابوبکرؓ و عثمانؓ کی شان میں کہا کرتے ہیں۔ یہ صنف شیر محشری کی ایجاد ہے۔ علیہ ما علیہ

آخر وہ یہ سمجھے کہ احسان اللہ خاں میرا نام پر تو رحمت عزّ و جلّ طاری ہوگی، لیکن قوم کا رفطرت علامہ تاجور مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے ان کی اعلیٰ نثر آسمان کے مہر و ماہ کی طرح غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مارچ ۱۹۳۲ء میں رسالہ "ادبی دنیا" چند احباب نما باطنوں کی سازش کے سر صدقے ہو گیا۔ مجھے اس کا بے حد قلق ہوا حتیٰ کہ اس صدمے کے سبب اپنی زندگی میں ایک کمی محسوس کرتا رہا۔

رسالہ ادبی دنیا ان لوگوں کے ہاتھوں میں گیا جو علم و ادب کی باتوں سے بے بہرہ اور پتھر باہر کے لوگ تھے۔ انھوں نے تیسرے درجے کے ادیبوں اور شاعروں کے بخلاف ان کی اشاعت سے پرچے کے معیار کو گرا دیا۔ اس سے بھی قطع نظر میرے ان حاسد تیرہ و دشمنوں کی تبلیغ شروع کرا دی جن کے ادبی کارنامے فضائے علم و ادب کے حق میں ہونے ناساز گار ثابت ہوئے تھے اور جو ہمیشہ اسی کے کارن میری تخریب کے درپے رہے کہ میں انھیں قابل اعتنا کیوں نہیں سمجھتا۔

رسالہ ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۲ء میں میرے ہاتھ سے نکلا اور جنوری ۱۹۳۵ء میں رسالہ "شاہکار" جاری کر دیا گیا گویا دو سال کے لگ بھگ "وقفۂ زندگی" میں بسر کرنے کے بعد پھر نیا سفر شروع کر دیا۔ "شاہکار" بھی اسی آن بان سے نکلا جس سطوت و جلال سے "ادبی دنیا" طلوع ہوا تھا۔

ملک کے ادبی نظر نے "شاہکار" کے آئینے میں "ادبی دنیا" کے عہد عروج کی جھلکیوں کو دیکھ لیا۔ فضائے شعر و ادب اس جلوہ کار ادب سے جگمگا اٹھی جیسے طلب انتشار پر وہ سادہ لوح سے ایک پھیری کے سر اٹھا بیٹھے۔ یہ دور صحافت کا بحرانی دور تھا میں مبتلا ہو کر بے ربط ادبی نثریں لگانے لگے۔ ہر ایک کی اپنے زرکش پرچوں میں پڑی دبی قلم کی زبانیں اب پھیل گئیں۔ شاہکار کے دفتر کا ہر دفتر بازار رشد و فساد میں منہ مانگی قیمت پانے لگا۔ مختصر یہ کہ قیمتی وقت مرنے کے علاوہ ان کے شوقینوں کے زیر سایہ پروان میں ترقی کر رہا تھا۔

یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ "ادبی دنیا" کا استقبال منتشر جہات ادب میں جس طوفان بپا کی صورت میں ہوا، "شاہکار" کو وہ حالات نصیب نہ ہو سکی۔ اس کے وجوہ و اسباب کئی تھے، جو سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ یہ تھا کہ "ادبی دنیا" کے دفتر کی بے نظمی جگہ بہ جگہ نقل کے چرچے نگاہ پبلک میری انتظامی ناقابلیت کا اندازہ کر چکی تھی، ادب کے خریدار بدگمان ہو گئے تھے۔ اس کی بدگمانی کچھ بے جا بھی نہ تھی مجھے اس نقص جبلت کا خود بھی اعتراف ہے کہ میں کسی کاروبار کے نظم و نسق کا اہل بالکل نہیں ہوں۔ حسن انتظام کی شکایت کر سکتا ہوں، میرا ذہن، دماغ چپت ہے یا قلم اور انتظام چلانے کے لیے ان دونوں کی ضرورت نہیں۔ در اصل بات کیا ہے وہ بھی بتا دوں، بات یہ ہے کہ میری آنکھوں میں مروت بھری ہوئی ہے میں اپنے کارکنوں کا سخت گیر کار فرما کبھی نہیں ہو سکا اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے ہر کارکن کو یہ احساس دلایا کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اکثر اوقات دفتر کے کارکنوں سے متعلق میرا انداز احترام ہوا اور انھیں پہنچا رہا۔ میری یہی احترام کاری کاروبار کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئی۔ آج ہندوستان کی حالت تو یہ ہے کہ کاروبار کی تنزلی اس کی بے وقعتی اور کمزوری کے جو سمجھی ہوتی ہے۔ اس غلام ملک میں مزدور، ایک دیانت دار مزدور کی حیثیت میں کاروبار کا ہم رتبہ دوست بن کر کام کرنے کو تیار نہیں۔

اگر آپ زبان اور ہاتھ دونوں کو گرم رکھیں، تھکے ہوئے ایک غلام سے خوب کام لے سکتے ہیں۔ مزدور کو دوست بنا کر آپ اسے جو دیانت ساز، شرافت، ار رنگ اور فرض شناسی سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ یہی یہ تھی میری اصل کمزوری جس کے سبب میرے دفتر میں بدنظمی نے راہ پائی اور میرا کاروبار زیر و زبر ہوتا رہا۔ اسی تجربے نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں مزدور کو تحریک بے دردانہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آزاد ممالک کے مزدور اپنی ڈیوٹی بڑی دیانت داری سے انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حقوق کی بھی کوئی تحریک رائیگاں نہیں جاتی۔ یہاں یہ بات نہیں۔ یہاں آپ چند روپے کے مزدور پر جب تک پچاس روپے کا خرچ نہ کریں گے، وہ کام نہیں کرے گا اور اگر ان دونوں کی آپ تمام اوقات میں خوشامد نہ کریں گے تو یقیناً یہ ہیں سازش کر کے کام کو تباہ کر دیں گے آپ ان سے جتنی شرافت برتیں گے، اسی نیت سے انھیں ہر وقت کینہ کاری پر آمادہ پائیں گے۔

میں نے اپنے مزدوروں اور کارکنوں سے نرمی برتی اور ان پر نگرانی کرنا عزت و احترام کے خلاف تصور کیا جبکہ میرا کاروبار ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا یا نہیں کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میرے پاس مزدور نکھٹو اور کام چور ہو گیا اور کام فرصت ہی کر نکلا۔ ہاں ایک بات ضرور ہوئی کہ جو کارکن ایک مرتبہ میرے پاس کام کر گیا پھر دنیا کے کسی مصرف کا نہ رہا۔ بس اس کے آگے آگے رزق رہا اور پیچھے پیچھے جیل۔ میرے پندرہ سال کے طویل مشاہدات میں بدقسمتی سے کوئی ایک استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ کم از کم میرے علم میں تو کوئی نہیں۔

جا و بے جا مروّت کے ساتھ مجھ میں ایک بڑا نقص اور بھی ہے۔ زود اعتمادی۔ اس کی بدولت بھی زندگی میں بڑے بڑے نقصان اٹھائے اور آج تک اٹھا رہا ہوں۔ میرا ایک اور نقص بھی میری ناکامیوں کا سبب بنا، وہ یہ کہ مجھے حساب، حساب فہمی اور حساب بینی جیسے خشک مضامین سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں سو فیصدی مسلمان ہوں۔ دفتر کے کاتب میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے رہے۔

یہ وجوہ تھے میری کاروباری ناکامی کے۔ ان کے ہوتے میرا کاروبار کسی طرح بھی فراغت کے بغیر جاری نہیں رہ سکتا تھا، نہ رہ سکا، نہ رہنا چاہیے تھا۔ ورنہ پبلک نے آج میرے کسی کاروباری اقدام کو سراہنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ میرا یہ تشکر گزارانہ اعتراف ہے کہ اہل نظر اصحاب و دوست حضرات نے میری ہر ادبی خدمت کو نگاہ محبت سے دیکھا۔ رسالہ "ادبی دنیا" کے عہد عروج میں ہر ماہ اکتیس من کاغذ خریدا جاتا تھا۔ ادب کی تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پبلک میرے پرچے کو اپنے مطالعہ کی چیز خیال کرتی رہی۔ ظاہر ہے کہ اکتیس من کاغذ کا رسالہ چھاپ کر اس کی کاپیاں آسمان کے فرشتوں کو تو بانٹی نہیں جاتی تھیں۔ انسان ہی اسے خریدتے تھے، وہی اسے خرید سکتے تھے۔ رسالہ "شاہکار" چھ سال تک میری ملکیت میں جاری رہا اور اس کے بند کرنے کو، تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ میرے دفتری نظام کی ابتری اپنی روایات کو دہرانے پر مصر ہوئی۔ یہ داستان دور بھی بڑی دردناک ہے۔ مختصراً کچھ یوں سمجھئے:

یہ سرزمین جہاں میں اپنی زندگی کے دن بتاتے ہوئے ہوں، نوسربازوں کی سرزمین ہے۔ یہاں تعلیم کی ہمہ گیری کے سبب جرم کاری ایک مستقل سائنس بن چکی ہے۔ ہر فریب سائنٹفک اصول پر کیا جاتا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ جرم کاروں نے جرائم سے سادگی اور سادہ لوحی کا حسن چھین لیا ہے۔

"ادبی دنیا" اسی نوسربازی کے سر صدقے ہو گیا، "شاہکار" کے کارکن نے پانچ سال تک اسی فریب میں رکھا کہ پرچہ فائدہ پر چل رہا ہے اور ہر سال مجھے ہزار بارہ سو روپے اپنی ذاتی آمدنی میں سے اس پر خرچ کرنا پڑا۔ بالآخر ایک عزیز دوست کی بے پناہ عقیدت نے یہ امانت جس کا نام شاہکار ہے مجھ سے لے کر اپنے گلے منڈھ لی۔

"شاہکار" کو اپنے ہاتھ سے کھو کر قدرت قاہرہ کی مہربانی سے ملازمت کے عہدے پر مجھے ایک ایسا سرسبز باغ ملا ہے جس میں دن رات گھومتا ہوں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا۔ شاید اس میں کوئی دروازہ تھا ہی نہیں اور مجھے باغبان علم کاری نے اس کی فصیل کی جھریوں سے بھی بچپن میں پھینک دیا تھا۔

"شاہکار" کا حشر بھی دل کے پرانے زخموں کو ہرا کرنے کا باعث بن گیا۔

اَلقَلبُ یَحتَمِلُ مَالَا یَحتَمِلُ غَیرُہٗ

(دل وہ صدمات بھی برداشت کر لیتا ہے جو کوئی برداشت نہیں کر سکتا، آخر رفتہ رفتہ یہ داغی دل بھی بے ندامت ہو گیا۔)

"شاہکار" سے گو میرا کاروباری تعلق ٹوٹ گیا لیکن اس کے روح رواں ملک سے روابط محبت و مودت برقرار ہیں۔ اس کا ہر نیا ڈائریکٹر میری تحریک پر [illegible] مجھے معاشی مشاغل اتنی فرصت دیں کہ میں صحیح معنوں میں اس کی نگرانی کے فرائض انجام دوں اور اس امر سے واقف ہو سکوں کہ شاہکار میں کیا کچھ شائع ہو رہا ہے اور اس میں اصلاح و ترقی کی کس قدر گنجائش ہے۔ پچھلے دنوں اس کے کچھ پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں میں نے صلاح الدین [illegible] اور [illegible] جالندھری کی شان

میں نقوی زادے کے وہ قصیدے پڑھ کر مسرور ہوا کہ یار فرشاد تحسین کے نرغے پر پچ کی شان کے شایاں ہیں۔

ساحر اور مجروح اپنی غزل نگاریوں میں پختہ ہو چکے ہیں۔ کسی پچھلے پرچے میں ان کی خام مشقیوں کی اشاعت بھی موزوں نہیں۔ نہ یہ چاہئے کہ انہیں اپنے وقت کا "شیلے" "و کیٹس" بنا کر رکھ دیا جائے اور اس طرح ان عزیزوں کو بر خود غلط بنا کر ترقی کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں۔

مختصر یہ کہ ادب لطیف سے مجھے محبت ہے کہ سات سال تک اس نے میرا خون جگر پیا ہے۔ میں اسے بے اعتبار "قلم فرسائیوں" سے منزہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

مجید لاہوری

"تذکرہ" کے سلسلہ میں گزارش ہے کہ میں پیدا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر پیدا نہ ہوتا تو موجود نہ ہوتا۔ میری موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں آسمان سے گرا نہ زمین سے اُگا۔ اس طرح پیدا ہوا جیسے حضرت آدم سے لے کر اب تک لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح مر جاؤں گا۔ جیسے لوگ مرتے چلے آئے ہیں۔ اس جینے اور مرنے کے درمیان کیا ہے؟ اس کو میں اب تک خود بھی نہیں سمجھ سکا اور جب سمجھوں گا تو شاید سمجھا نہ سکوں۔ زندگی میں اور کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک دور میں آرزو تھی کہ سرکاری ملازمت مل جائے۔ اور اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزادی کی موت دے۔ ضمیر بہت مجروح ہو چکا ہے اور اب تو وہ قابلِ فروخت بھی نہیں رہا۔ شاعری میں نے اخبار کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کی تھی۔ خبروں میں جہاں جگہ بچ جاتی تھی، وہاں شعر لکھ دیا کرتا تھا۔ اب یہ گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ صبح اٹھتا ہوں تو غریب کے بچوں کی طرح کالم منہ پھاڑے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتا ہوں اور اس سے میرا پیٹ بھرتا ہے۔ دفتری نظام یہی ہے کہ تم مسل کا پیٹ بھرو، مسل تمہارا پیٹ بھرے گی۔

اوّل اوّل سنجیدہ شعر کہتا تھا۔

یہ جب کی بات ہے کہ جب آتش جوان تھا۔

اس کے بعد "سیفٹی قوانین" کی عنایت سے اظہارِ خیال کے لیے طنز و مزاح کو اپنایا۔

"سیفٹی آرڈی ننس" کی کوئی لاکھ مخالفت کرے لیکن میں تو اسے "رحمتِ خداوندی" سمجھتا ہوں۔ "سیفٹی آرڈی ننس" کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے مجھے "مزاح نگار" بنا دیا۔ اکبر کو اپنا پیر و مرشد اور نظیر کو اپنا رہنما مانتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی سب سے بڑا عوامی شاعر تھا۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس میں "مسلم لیگ" اور "عوامی لیگ" دونوں متحد ہیں اور اکبر اپنے مقام پر تنہا کھڑا ہے۔ الٰہ آباد اور اکبر آباد کے دوراہے پر امید و بیم لے آئی ہے۔ دعا کیجیے کہ "دیر و حرم" نہیں تو گھر کا راستہ مل جائے۔ جب سنجیدہ شعر کہتا تھا تو مولانا عبدالمجید سالک سے اصلاح لیتا تھا۔ مزاح میں میرے استاد مولانا انعام الحق قدوسی گنگوہی ہیں۔ جنہیں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ مولانا عبدالباری آسی لکھنوی مرحوم نے مولانا انعام الحق کا ذکر تذکرہ خندۂ گل میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

ماسٹر جگت سنگھ

میں پنجاب کے ایک دور افتادہ مقام پنڈی گھیپ (ضلع اٹک) میں ۲۰ مئی ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوا جو میرے آباؤ اجداد کا مسکن ہے۔ میرا بچپن کا زمانہ دیہات کے عام بچوں کی طرح کھیل کود میں گزرا۔ ۱۴ سال کی عمر میں مڈل پاس کیا اور اس کے بعد جے۔ وی کا امتحان دیا۔ گھر آسودہ حال نہ تھا اس لیے جے۔ وی کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی جو اتفاق سے فوراً ہی مل گئی۔ یہ گوڑہ (ضلع راولپنڈی) کے ایک پرائمری سکول میں مدرسی کی ملازمت تھی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک ایم۔ بی۔ ہائی سکول جہلم میں ٹیچری کی پھر اسے چھوڑ کر ۱۹۰۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے مئی ۱۹۰۵ء میں فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں وطن چلا آیا اور وہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جس میں خود بھی پڑھاتا تھا۔ یہیں میں نے ۱۹۰۵ء ہی میں رسالہ ہمدرد تعلیم جاری کیا۔ اس کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ ۲۴ صفحات اور چھوٹی تقطیع کا بہت معمولی سا رسالہ تھا۔ میں اس کے خود ہی مضمون لکھتا اور مسودہ خود ہی راولپنڈی لے جاتا۔ کسی کاتب کی منت سماجت کر کے اپنے سامنے رسالہ لکھواتا۔ بازار جا کر خود ہی کاغذ لاتا اور مطبع والوں کی خوشامد کر کے خود کھڑے ہو کر چھپواتا۔ چھپے ہوئے فرمے سر پر اُٹھا کر پنڈی گھیپ لاتا اور انہیں خود ہی فولڈ کرتا اور خود ان کے پیکٹ بنا کر اور خود ہی ان پر ٹکٹ لگا کر خود ڈاک خانہ میں دے کر آتا یعنی ایڈیٹر بھی میں ہی تھا اور منیجر بھی، کلرک بھی تھا اور چپراسی بھی۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ انتہائی جدوجہد اور دوڑ دھوپ کے بعد بھی ایک سال میں صرف ۱۴۰ خریدار ہوئے۔

فروری ۱۹۰۶ء میں مجھے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں ایک ملازمت مل گئی اور میں یہاں ورنیکلر ٹیچر مقرر ہو کر آ گیا اور رسالہ کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ مگر لاہور آتے ہی مجھ پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ بعض حاسدوں نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ جگت سنگھ سرکاری ملازم ہے اور سرکاری ملازم اپنا ذاتی پرچہ نہیں نکال سکتا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کروں۔ اُن دنوں شمس العلماء مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین پنجاب میں انسپکٹر تعلیمات تھے اور میں نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت نیک نفس، رحمدل اور بے تعصب بزرگ ہیں۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے عرض کیا کہ اگر آپ ڈائرکٹر تعلیمات سے سفارش فرما کر مجھے رسالہ نکالنے اور جاری رکھنے کی خاص اجازت دلوا دیں تو میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔

خواجہ صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ میری گذارش کو سنا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔ جس کے نتیجہ میں مجھے ڈائرکٹر تعلیمات کی طرف سے اجازت مل گئی اور میں بے فکری کے ساتھ اس کی اشاعت کرنے لگا۔

میں نے محنت اور دیانت کے ساتھ کام کیا۔ قدرت نے فیاضی کے ساتھ میری مدد کی اور رسالہ چل نکلا۔ رسالہ کی اشاعت میں لالہ سورج نرائن مہر ایڈیٹر آف بکس پنجاب نے بھی میری قابل قدر امداد کی اور رسالہ تمام پنجاب کے سکولوں میں جانے لگا اور دن بدن ترقی کرنے لگا۔ اس کی اشاعت ہزاروں تک گئی۔ اور اس کے کئی خاص نمبر بڑی شان سے میں نے نکالے۔ عام نمبر بھی میں نے دو دو سو صفحے کے شائع کیے۔

۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۲ء تک منشی طالب علی پابند بحیثیت ایڈیٹر میرے ساتھ کام کرتے رہے پھر لچھمی چند صاحب دوبارتھی بی۔ اے۔ ل۔ ٹی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس بطور آنریری ایڈیٹر کام کرتے رہے اور ان کے ساتھ بعض دوسرے اصحاب بھی میری امداد کرتے رہے۔

۱۹۳۰ء کے بعد حضرت جوش ملسیانی حصہ نظم کے انچارج اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی حصہ نثر کے ایڈیٹر ہوئے اور اس وقت تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آرہا ہے۔ میں ممنون ہوں ان دونوں صاحبوں کا کہ وہ آنریری طور پر اتنے عرصہ دراز سے میری قلمی امداد کر رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں میں نے اپنے رسالہ کا ۲۵ سالہ جوبلی نمبر نہایت نفاست اور شان کے ساتھ شائع کیا اور میں نے کوشش کی کہ اس وقت کے تمام مشہور اہل قلم اس میں اپنے بہترین مضامین لکھیں۔ میری توقعات کامیاب ہوئیں اور میں بڑے سائز کے ۳۰۰ صفحات کا ایک ضخیم پرچہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکا جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور بیس پچیس سال تک یہ ریکارڈ قائم رہا۔ یہاں تک کہ رسالہ نقوش کے جہازی نمبر شائع ہونے لگے جس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بعد کے ایام میں میں نے بہت ہی نفاست اور عمدگی کے ساتھ افسانہ نمبر، ریڈ کراس نمبر، سلور جوبلی نمبر اور تاجپوشی نمبر بڑی آب و تاب سے آرٹ پیپر پر شائع کیے۔ جو بہت کافی مقبول ہوئے ان میں سے ریڈ کراس نمبر اتنا پسند کیا گیا کہ اس پر سرکار انگریزی نے مجھے "سردار صاحب" کا خطاب دیا اور پہلے کے یہ چاروں نمبر شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بڑی محنت سے مرتب کیے تھے۔

اس کے بعد میں نے دل نمبر اور تعلیم جدید نمبر وغیرہ بھی شائع کیے۔

میں بڑی مفلسی اور غریبی کی حالت میں لاہور آیا تھا۔ گھر سے چلتے ہوئے ہمارے محلہ کی ایک بڑی بوڑھی مسلمان خاتون نے مجھے بلا کر پیار کیا اور کہنے لگی کہ بیٹا خدا حافظ خدا تمہیں جلدی واپس لائے اور تم لاہور میں خوش اور آرام سے رہو اور یہ کہہ کر بڑی بی نے بڑی محبت کے ساتھ امام ضامن کے نام کا ایک روپیہ کپڑے میں لپیٹ کر میرے بازو پر باندھ دیا اور مجھے پیار کر کے رخصت کر دیا۔ لاہور کا ٹکٹ لینے کے بعد صرف دو آنے میرے پاس بچے تھے اور ایک روپیہ تھا یہ ایک روپیہ دو آنے میری کل دولت تھی جو لاہور سٹیشن پر اترنے کے وقت میرے پاس تھی۔

لیکن رسالہ کی بدولت اور خدا کی مہربانی سے میری مالی حالت آہستہ آہستہ ترقی کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا ایک چھوٹا سا پریس بھی لگا لیا۔ ایک بکڈپو بھی قائم کر لیا جس میں بہت سی تعلیمی اور ادبی کتابیں برابر چھپتی رہتی تھیں۔ جب زیادہ ترقی ہوئی تو میں نے رام گلی میں زمین خرید کر اور ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ایک چار منزلہ عمارت بنائی نیچے کی منزل میں میرا دفتر تھا اور اوپر کی منزل میں میں خود رہتا تھا۔ باقی مکان کا بہت سارا حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔

میں آرام اور اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا اور سوچتا تھا کہ باقی کی زندگی بھی اسی طرح خوشی خوشی بسر ہو جائے گی کہ ناگاہ ۱۹۴۷ء میں بربادی اور تباہی کا ایک بہت بڑا طوفان اٹھا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور مجھے اپنے اس عزیز شہر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا پڑا جس میں میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال گزارے تھے۔ لاکھوں کی جائیداد، مال و اسباب اور ایک بہت بڑا کتب خانہ چھوڑ کر مجھے دہلی آنا پڑا۔

میں نے اگرچہ ہمت نہیں ہاری اور دہلی پہنچتے ہی فوراً رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی سے جاری کر دیا۔ مگر وہ بات نہ تھی جو لاہور میں تھی لیکن میں برابر اپنی دھن میں ہوں اور رسالہ نکالے جا رہا ہوں۔ اس دوران میں کئی لوگوں نے مشورے دیئے کہ رسالے کو بند کر دو اور کوئی اور دھندا دیکھو لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ جس پودے کو چالیس برس تک اپنے خون سے سینچا ہے اسے اپنے ہاتھ سے شمشان بھومی میں آگ پر رکھ دوں۔ اس لیے رسالہ برابر نکالے جا رہا ہوں اور جب تک زندہ ہوں نکالتا رہوں گا۔

مولوی محمد شفیع

میری سرگزشت ایسے طالب علم کی سرگزشت ہے جس کی تمام عمر کتابوں میں گزری یا یوں کہئے کہ بسم اللہ کے گنبد میں گزری۔ قصور میرا وطن ہے۔ انٹرنس کی تعلیم قصور ہائی سکول میں پائی۔ ۱۹۰۰ء میں انٹرنس پاس کرکے لاہور آیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے اور فورمن کالج لاہور سے ۱۹۰۵ء میں انگریزی میں ایم۔ اے پاس کیا۔ اگلے سال ٹریننگ کالج لاہور سے مدرسی کی سند حاصل کی اور سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔

غرض ۱۹۰۶ء میں میری طالب علمی کا پہلا دور ختم ہوا۔ طالب علم کی زندگی اس زمانے میں بہت سادہ اور یک رو زندگی تھی۔ یا پڑھائی تھی یا کھیل کا میدان۔ سینما اور آرٹ کونسلیں اور کافی ہاؤس اس زمانے میں نہ تھے۔ سیاسی مشاغل اور مخلوط تعلیم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لاہور کی آبادی اس وقت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بجلی کی روشنی ابھی شہر میں نہ آئی تھی۔ طالب علمی مٹی کے تیل کی روشنی کے بل پر چلتی تھی۔

قصہ مختصر ۱۹۰۶ء سے میری ملازمت کا زمانہ شروع ہوا اور میں نو سال تک انسپکشن اور تدریس خصوصاً تعلیم المعلمین کا کام کرتا رہا۔ چند سو طالب علموں کی تربیت بڑی توجہ اور محنت، خلوص اور دلسوزی سے کی۔ یہ ۴۸، ۵۰ برس کی بات ہے۔ ان میں سے اکثر یا شاید سب کے سب تعلیمی خدمات سرانجام دے کر اب ریٹائر بھی ہو چکے ہوں گے۔

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

ان نو سالوں میں تین چار مرتبہ نہایت خطرناک حالات پیش آئے جن سے بچ نکلا۔ یقین سا پیدا ہوا کہ کارکنانِ قضا و قدر کو شاید کچھ کام لینا منظور ہے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔ سردیوں میں شملے کے ضلعے میں سرمائی تعطیل تھی اور میں انسپکٹر لاہور کی اعانت کے لیے لاہور آیا ہوا تھا۔ شاہدرے کے اسکول کے معائنے کے لیے مرحوم و مغفور خلیفہ عمادالدین صاحب کی نہایت جاندار گھوڑی پر سوار ہو کر گیا۔ دن بھر کے کام سے تھکا ہوا تھا۔ سڑک پر ہوا خوب تھی۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی تو وہ سرپٹ ہو گئی اور ہوا میں اڑنے لگی۔ دریائے راوی کا کشتیوں کا پل تھا جس نے دریا پر ایک قوس بنا رکھی تھی۔ اوپر پیال بچھی ہوئی تھی اور ہر قدم پر پھسلنے کا ڈر تھا۔ خدا خدا کرکے پل سے پار ہوئے مگر پھر بھی گھوڑی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اسے اور مجھے دیکھ کر کوپر کے JOHN GILPIN کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ آخر کار شہر کے قریب آ کر گھوڑی رکی اور جان میں جان آئی۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک سواری کا ایک اور واقعہ تھا۔ دورے میں تحصیل قصور کے ایک قصبے سے دوسرے قصبے کو جار

نمبردار کی گھوڑی تھی۔ بارش کی وجہ سے چھتری لگائی ہوئی تھی۔ بارش تھمی تو چھتری بند کی۔ اس سے گھوڑی بدک کر سرپٹ بھاگی۔ لگام کا چمڑا ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور چمڑے کی جگہ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی، وہ کھل گئی۔ اب لگام بیکار تھی۔ رکاب پر زور پڑا تو ایک طرف کا تسمہ ٹوٹا، پھر دوسری طرف کا۔ گھوڑی سرپٹ اور نہ لگام نہ رکابیں۔ دو تین میل دوڑنے کے بعد گھوڑی کچھ تھک گئی اتفاق سے راستے میں کچھ پانی اکٹھا ہو گیا تھا، گھوڑی تھم گئی اور اس کے گلے کے رسّے سے عارضی لگام بنا کر منزل تک پہنچ گیا۔ وقت کم ہے اس لیے ان قصوں کو چھوڑتا ہوں۔

اب میری طالب علمی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں میں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے عربی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اگلے سال گورنمنٹ نے مجھے وظیفہ دیا کہ کیمبرج کی تکمیل کروں۔ اگست ۱۹۱۵ء میں میں سمندر کی راہ سے روانہ ہوا۔ میں اس وقت جب بحیرۂ روم میں جرمن آبدوزوں کی ہلاکت آفرینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ چند ڈوبی ہوئی کشتیوں کے بچے کھچے لوگوں کو ہم نے راستے کے مقامات سے ساتھ لیا مگر حسن اتفاق اور لطف ایزدی سے ہمارا جہاز صحیح سلامت انگلستان پہنچ گیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ کیمبرج یونیورسٹی میں گزرا اور وہاں کے فاضل استادوں سے بے حد فیض پایا۔ ان اساتذہ کرام کی مہربانیوں کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اس زمانے میں اور اس سے متصل بعد ان بزرگوں نے اپنی تصنیفات میں اپنے اس ہیچمدان شاگرد کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے سال بھر کے لیے ہندوستانی پڑھانے کے لیے متعین کیا۔ اس تمام عرصے میں عالمی جنگ جاری تھی اور انگلستان پر اس زمانے میں جو کچھ گزر رہا تھا بمباری، کپڑے اور غذا کی کمی وغیرہ وغیرہ اور ان حادثوں کا رد عمل سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ بالآخر ہمارے سامنے ہی ۱۹۱۸ء کے آخر میں جنگ کا خاتمہ ہوا اور میں جنوری ۱۹۱۹ء میں وطن کو واپس ہوا۔ جہاز میں ہم صرف چار طالب علم تھے اور کوئی مسافر نہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک ہیٹر تھا، انگیٹھی نہ تھی۔ اوورکوٹ پہن کر بھی کمرے میں ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جہاز میں ٹنوں (T N T) لدا ہوا تھا اس لیے آگ جلانا ممکن نہ تھی۔

فروری ۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں میں نے اورنٹیل کالج میں عربی کی پروفیسری کا کام سنبھال لیا۔ جلد ہی کالج کا وائس پرنسپل بنا دیا گیا اور ۱۹۳۶ء میں پرنسپل۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو ریٹائر ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ۲۳-۲۴ برس کا زمانہ مستعدی سے اور آنکھیں کھول کر گزارا اور اس دور کا سرد و گرم اور تلخ و شیریں بھی کچھ چکھ چکا تھا۔

۱۹۱۹ء سے لے کر اب تک سنڈیکیٹ کے رکن کی حیثیت سے (چھ سالوں کے سوا) یونیورسٹی کی اچھی بری خدمت کی۔ ایسا بھی زمانہ آیا جب صرف میں سنڈیکیٹ کا مسلمان ممبر تھا۔ پھر کئی سال تک یہ تعداد دو سے زیادہ نہ ہوئی۔ عربی بورڈ اور اورنٹیل فیکلٹی اور یونیورسٹی کے دیگر شعبوں میں اپنی بساط بھر کام کیا۔ قلمی کتابوں کا نایاب ذخیرہ یونیورسٹی لائبریری کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فراہم کیا اور لائبریری کمیٹی کے صدر کے فرائض مکرر ادا کیے۔ اس تمام مدت میں بلکہ اس کے بعد اسلامیہ کالج کی مردانہ و زنانہ کی مجلس منتظمہ کا ممبر بھی رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد چار سال تک زنانہ اسلامیہ کالج کی مجلس منتظمہ کا سیکرٹری بھی رہا اور ایم۔ اے عربی کی جماعت کھولی اور خود اور بعض ہم کاروں کی اعانت سے اس جماعت کو اعزازی طور پر ایم۔ اے کی تعلیم دی۔ تقریباً ایک درجن طالبات نے عربی میں ایم۔ اے کر لیا۔ ان میں سے اکثر زنانہ کالجوں میں پروفیسر ہیں اور بعض پرنسپل بھی بن چکی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی تدریس کے زمانے میں میرے جن طالب علموں نے سند تحصیل

حاصل کی وہ پاک و ہند میں کلکتے سے بمبئی اور پشاور سے حیدرآباد تک تمام بڑی بڑی دانش گاہوں میں پہنچے اور فیض جاری کا منبع بنے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے یونیورسٹی نے اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کا کام سپرد کیا وہ اب تک جاری ہے۔

اس طویل عرصے میں تصنیف و تالیف کا کام برابر جاری رہا جو زیادہ تر عربی اور فارسی ادب سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج میگزین جاری کیا جو علمی اور ادبی رسالہ ہے اور اس کی افادیت کو مشرق و مغرب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ گو اس رسالے کی ادارت کے فرائض اب اور صاحبوں سے متعلق ہیں۔

سیاحت کے موقعوں سے بھی بہت استفادہ کیا۔ علوم شرقیہ کی مجالس کے سلسلے میں پاک و ہند کے بڑے بڑے مرکزوں کو دیکھا۔ [illegible] کے سندھ کے مطالعے کی غرض سے اور قلمی کتابوں کی تلاش میں سندھ میں کئی چکر لگائے۔ استنبول کے مشہور عالم کتاب خانوں کی سیر کئی بار کی۔ ایرانی فنونِ لطیفہ کی نمائش پر نیویارک کی ایک علمی مجلس کی دعوت پر نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کو دیکھا۔ حکومتِ ایران کی دعوت پر ایک جمعیت فرہنگی کی قیادت کے سلسلے میں ایران پہنچا اور اس کے تقریباً تمام اہم علاقے دیکھے۔ دوسری مرتبہ پھر تہران گیا اور بہزاد بوعلی سینا میں شرکت کی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مجلس منتظمہ کے ایسوسی ایٹ ممبر کی حیثیت سے روم اور اپسالا کی مجالس میں شریک ہوا۔ غرض دنیا دیکھنے کے کافی مواقع میسر آئے۔

یہ ناشکری ہوگی اگر بزرگوں اور احباب کی قدرشناسی کا ذکر نہ کیا جائے۔ پاکستان نے ستارۂ پاکستان سے عزت افزائی کی۔ حکومتِ برطانیہ کے زمانے میں خان بہادری ملی۔ یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی اعزازی ڈگری عنایت کی اور پروفیسر ایمریطس بنایا۔ حکومتِ ایران نے بھی پہلے نشانِ علمی درجہ اوّل عطا کیا۔ پھر نشانِ سپاس درجہ اوّل۔

جلیل مانک پوری

وفات: ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء　　　ولادت: ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۵ء

جلیل تخلص۔ جلیل حسن نام خلف مولوی حافظ عبدالکریم مرحوم۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانک پور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن سے فراغت پائی۔ طالب علمی کا زمانہ اکثر لکھنؤ میں گزرا۔ عربی اور فارسی میں استعداد بہم پہنچائی۔ ابتدا ہی سے سخن گوئی کا شوق تھا۔ کوئی امتیاز خاندانی علمی و عملی ایسا نہیں ہے۔ جو قابلِ ذکر ہو۔ سوائے اس کے کہ حضرت امیر مینائی قدس سرہٗ کی خدمت میں مدت دراز تک رہنے کا اتفاق ہوا۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد　　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

عروض قوافی کے ساتھ جملہ نکات و محاسن شعری حضرت امیر کے فیضانِ صحبت سے حاصل کیے۔ رامپور میں جب امیر اللغات کی تدوین کے لیے ایک وسیع دفتر کھولا گیا تو اس کی ادارت بھی سپرد ہوئی۔ سفر بنارس اور بھوپال وغیرہ میں حضرت امیر کے ہم رکاب رہے۔ ۱۰ر جمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد پہنچا۔ اور اس زمانے میں مہاراجہ بہادر سر یمین السلطنت کی اعانت اور مہمان نوازی شامل رہی۔ اور دو رسالے محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفیہ کی ترتیب و اشاعت کا کام سپرد کیا گیا۔ ۱۳۳۶ھ میں چند احباب کے اصرار سے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث نہایت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے لکھا ہے۔ پھر اختر مینائی کی شرکت سے دکن کی ایک ضخیم تاریخ سرکار نظام کے حکم سے مرتب اور مطبوع ہوئی۔

حضرت داغ مرحوم کی وفات کے بعد ۱۳۲۲ھ میں حضرت غفراں مکاں میر محبوب علی خان بہادر سابق تاجدار دکن نے اپنی استادی کا شرف بخشا۔ اور داغ مرحوم کی جگہ پر مامور فرمایا۔ اور "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔ پہلا دیوان تاج سخن اسی زمانے کی یادگار ہے۔ حضور پُرنور میر عثمان علی خان بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہٗ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی استادی کے شرف سے مشرف فرمایا۔ پہلے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔

تصانیف:- (۱) تاج سخن (۲) جانِ سخن (۳) روحِ سخن (۴) سرتاجِ سخن (۵) معراجِ سخن (۶) گلِ صد برگ (۷) عطرِ سخن (۸) اردو کا عروض (۹) تذکیر و تانیث (۱۰) معیارِ اردو (۱۱) تاریخ دکن (۱۲) تفہیم الصلوٰۃ (۱۳) مکاتیب جلیل (۱۴) بحرِ سخن (۱۵) بہارِ سخن (۱۶) سوانح عمر امیر مینائی (۱۷) سوانح عمر امیر مینائی حصہ دوم

آغا حشر کاشمیری

تاریخ پیدائش : ——— شب جمعہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ
۳ اپریل ۱۸۷۹ء
تاریخ وفات : ——— ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرتسر اٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلہ میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ ہر چند انھوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملائے مکتبی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی پہنچا۔ وہاں پارسیوں نے تھیٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈراما لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر شکسپیر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگرچہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشاپرداز اور شاعر موجود تھے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب گرد ہو گئے۔ لو میرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصہ تو چند لفظوں میں ختم ہو گیا۔

جوانی کے زمانے میں ہمارے دوست کون کون لوگ تھے؟ بزرگوں میں مولانا شبلی مرحوم، نوجوانوں میں ابو نصر غلام یٰسین، مولانا ابوالکلام اور حکیم فقیر محمد چشتی۔ لیکن میں نے ابو نصر آہ جیسا ذہین آدمی نہیں دیکھا۔ آہ کون تھا؟ ابوالکلام کا بڑا بھائی۔ بیچارے نے جوانی میں انتقال کیا۔ زندہ رہتا تو لوگ ابوالکلام کو بھول جاتے۔ آہ نے وفات پائی۔ میں اور ابوالکلام دونوں برسوں سے ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ لیکن سلام کلام تک ترک ہے۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔ میں ڈرامے بھی لکھتا تھا شراب بھی پیتا تھا۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ لیکن دینی حرارت سے دل گداز تھا۔ آریہ اور عیسائی اسلام پر اعتراض کرتے تھے۔ میں اور ابوالکلام جواب دیتے تھے۔ اسی شوق میں مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھیں۔ آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ بڑے بڑے مناظرے کیے اور جس دنگل میں اترا فتح پائی۔

ان دنوں پادری احمد مسیح کا بڑا زور تھا۔ ایک تو اندھا دوسرے حافظ قرآن۔ کترنی کی طرح زبان چلتی تھی۔ وہ دہلی میں فوارہ پر اکثر تقریریں کرتا تھا۔ میرے اور اس کے معرکے ہوئے اور ہمیشہ میدان میرے ہاتھ رہا۔ وہ کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ صرف مجھ سے اس کی کور دبتی تھی۔ اکثر مناظروں میں نوک جھونک تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میں اس پر پھبتیاں کستا تھا وہ مجھ پر۔ ایک دفعہ پادری احمد مسیح بمبئی آیا اور ایک دو معرکے کی تقریریں کیں۔ ان دنوں میرے قیام کا سلسلہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کبھی کلکتہ کبھی دہلی۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ احمد مسیح کو بمبئی آئے صرف دو دن ہوئے تھے کہ میں بھی پہنچا۔ لوگوں نے مجھے مناظرے کے لیے کہا۔ میں نے کہا میں چلنے کو تیار ہوں لیکن اسے میرا نام نہ بتانا۔ حاضرین مجھے لے گئے اور احمد مسیح سے صرف اتنا کہا کہ ایک مولوی صاحب مناظرہ کرنے

اتنے میں جیسے ہی میں نے جب تقریر شروع کی، تو وہ آواز پہچان کر بولا۔

"آغا صاحب ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں!"

وہ کہنے لگے۔

"ارے کسی مولوی کو لائے ہوتے۔ اس بھانڈ کو کیوں لے آئے؟"

میں بولا۔

"پادری صاحب! کسی بھلے مانس کے ہاں کوئی شخص آئے تو وہ اُٹھ کے اسے نہیں دھتکارتا، بلکہ آپ نے کہا ہے کہ اسے باہر نکال دو، پھر تمھارے مقابلے میں کوئی مولوی کیوں آئے؟"

پادری چیخ کے بولا۔

"یہ مجلس مناظرہ ہے یا بھانڈوں کی منڈلی؟"

میں نے کہا۔

"بھانڈوں کی منڈلی سہی لیکن ان میں چہیتے تو تمھی ہو۔"

پادری نے کہا۔

"ارے تو تو تھیٹر کا بچہ ہے۔ تجھ سے کون زبان لڑائے۔"

میں نے کہا۔

"اب تمھیں تھیٹر میں نچاؤں گا۔"

غرض میں نے مارے پھبتیوں کے اُڑا دیا اور وہ صاف انکار کر گیا کہ میں آغا سے بحث نہیں کرتا۔

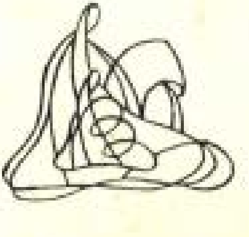

صفی لکھنوی

خودنوشت حالات

نام سید علی نقی[1]، تخلص صفی، ابن سید[2] فضل حسین۔ ولادت بمقام لکھنؤ ۳ جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو ہوئی۔ سلسلۂ نسب حضرت زید شہید تک پہنچتا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ شاہزادگان جہاں قدر اور ثریا قدر فرزندان شاہزادہ سلیمان قدر کے ساتھ ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد مرحوم سے پڑھیں۔ نجم الدین کاکوری سے درسیات فارسی اور شیخ حافظ علی صاحب بھیروی اور جناب سید علی میاں کامل کے والد اور مولوی احمد علی صاحب لکھنوی شاگرد غفران مآب اعلی اللہ مقامہ اور اپنے عم بزرگوار مولانا سید حسین صاحب مرحوم سے درسیات فارسی اور عربی کی تحصیل کی۔ فن کی تکمیل حکیم باقر حسین صاحب مرحوم سے کی۔ بارہ برس کی عمر میں درسیات عربی و فارسی سے فراغت پائی۔ امین آباد ہائی اسکول اور کیننگ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تین برس تک لال اسکول اور پانچ اسکول جو کیننگ کالج سے متعلق تھے بطور مدرس عارضی انگریزی تعلیم دینے کی خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۵ء تک بحیثیت نقل نویس کے طور پر سرکاری عدالت سلطان پور میں فرائض انجام دیے۔ ۱۸۹۵ء میں سلطان پور سے بریلی میں بعہدہ اہلمد اپیل تبدیل کیا گیا۔ اور پھر ۱۸۹۸ء میں وہیں ناظر عدالت منصفی مقرر ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں مئی سے جون تک منصفی گنڈہ بطور قائم مقام منصرم پہلی مرتبہ بعد ازاں پھر ابتدائے جولائی لغایت اکتوبر دوسری مرتبہ بھیجا گیا۔ اس وقت وہاں جونپور کے مولوی سید محمد باقر صاحب منصف تھے۔ جو خود بڑے ذی علم اور شاعر و ادیب تھے۔ انہیں کے ماتحت کام کیا۔

۱۹۰۹ء میں منصفی گنڈہ سے مولوی محمد باقر صاحب تبدیل ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی محمد اسماعیل منصف ہو کر آئے اور راے بریلی کے جج سمیع اللہ خان نے مجھے منصفی راے بریلی سے منصفی گنڈہ سے بعہدہ ناظر تبدیل کیا۔ یعنی جس آفس میں چار مہینے بحیثیت افسر میں کام کر چکا تھا۔ اب بطور ماتحت مجھے رہنا پڑتا۔ ہر چند میں نے عذرات پیش کیے۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ گنڈے کی آب و ہوا بھی خراب تھی۔ اور اس وقت تک ریل بھی نہ تھی۔ راستے بریلی سے گنڈے تک یکے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ اور لکھنؤ پہنچنے کے لیے بذریعہ سرا قمر اسٹیشن پہنچ کر براہ کان پور لکھنؤ جانا پڑتا تھا۔ گنڈہ میں بعہدہ ناظر کچھ روز رہ کر اور بالآخر

---

[1] لسان القوم مولانا صفی کا خطاب تھا۔

[2] مولانا سید فضل حسین صاحب اعلی اللہ مقامہٗ آخری تاجدار اودھ کے بھائی شہزادہ سلیمان قدر بہادر مرحوم کے معتمد خاص تھے۔

تنگ آکر میں نے رخصت بلا تنخواہ ۱۹۰۹ء[1] میں پہلے چھ مہینے کی لی پھر توسیع کرا لیا۔ اور یہاں بخدمت جناب جوڈیشل کمشنر بہادر و ز میل مسٹر وسیم بیگ بذریعہ قصیدہ[2] اپنے مصائب گوش گزار کیے۔ چنانچہ جناب ممدوح نے مجھے کنڈہ سے عدالت خفیفہ لکھنؤ میں تبدیل فرمایا بالآخر ۱۹۲۱ء میں ججی خفیفہ لکھنؤ کے عہدہ سررشتہ داری سے پنشن لی۔

قومی زندگی شیعہ[3] کانفرنس کے پلیٹ فارم سے شروع ہوئی میرا قومی نقطۂ نظر صحیفۃ القوم اور لختِ جگر میں واضح ہے۔ کانفرنس کے اجلاس ۱۹۴۵ء میں مجھے صدارت کا شرف ملا۔

میں[4] شاید یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک ایسے دور میں جب نوجوان خون کی ضرورت ہے مجھ سا پیرمرد آپ کی صدارت کے لیے موزوں نہ ہے مگر شاید آپ نے شہنشاہ سخن حضرت انیسؔ کے اس شعر کو میرے لیے موزوں تر سمجھا ہے ؎

گھٹا زور مشقِ سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

موازنۂ ماضی و حال

اپنی جانب سے پھری ہیں محو نگاہیں آپ کی	ساری دنیا سے جداگانہ ہیں راہیں آپ کی
آپ سے جو قافلے پیچھے تھے آگے بڑھ گئے	چار کیونکر ان سے ہوتی ہیں نگاہیں آپ کی
آج تک جن پر زمانہ چل رہا ہے بے خطر	سب وہ ہیں تعمیر کردہ شاہراہیں آپ کی

---

[1] مولانا صفی کی اسی رخصت کے دوران لکھنؤ میں کئی مشاعرے ہوئے نواب اصغر حسین فاخر کے ہاں صحبت مشاعرہ اعلیٰ پیمانہ پر ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشتاق صاحب، ماہر صاحب، رسا، جلال، اعلیٰ میاں کامل اور عزیز رشید ایسے صاحبانِ نظر اور ماہرینِ فن بزمِ سخن کی زینت تھے انہیں مشاعروں میں صفی کی شہرت کا آغاز ہوا۔

[2] اسی قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

جہاں کہ پیرِ کہن بود نوجواں گردید
بعہدِ دولتِ عالی جناب وسیم بیگ

[3] شیعہ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ہوا جس میں مولانا صفی نے ایک دردناک نظم پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہم اپنا دردِ دل رو رو کے بیتابانہ کہتے ہیں
الٰہی ہوش میں رہیں وہ جو ہمیں دیوانہ کہتے ہیں

[4] خطبۂ صدارت سے اقتباس

آپ ہی کے خون میں محو گرم جوشی جب ہو — ٹھنڈے دل سے کیوں ترقی چاہیں آپ کی
قوم کے دل پر اثر کرتی نہیں یہ بے اتفاقی ؟
عرش اعظم کو ہلا دیتی ہیں آہیں آپ کی

ستم ظریفی احباب

شکستِ دل کی صدائیں صفی تلخ نوا — زمانہ گوش بر آواز ہے سناتے جا
ستم ظریفی احباب دیکھئے حضرت — صفی گوشہ نشیں صدر مجلس شوریٰ

بیاں کیا ہو عجب گومگو کی حالت ہے — ہوں یہ دم ہے ضعیفی میں کیا ہوں نکتہ سرا
گئے وہ دن کہ صفی جوش تربیت ہر دم — دل و جگر میں ہر جلوہ ور بڑھتا تھا
وہ دن ہیں اب نہ وہ دن کیا کروں نوا سنجی — جو سننا چاہتے ہیں آپ نظم میں خطبا
حضور! خطبۂ منظوم ہی ہے لختِ جگر — تمام عمر جو میں پاتا رہا ہوں کہتا
بغور پڑھئے اگر آپ اس کو بندہ نواز — مفید قوم ہر اک راستے انہیں پائیے گا
مطالبات مفید کا ہے وہ اک دفتر
انہیں پہ کیجئے عمل ہے یہی مرا خطاب

"انتباہ"

اگر ہے شوقِ گل چینی تو اے بینوا سنیئے — مگر دلدوز کانٹے ہیں سمجھ کر پھول لو چنیئے

"نوائے بینوا"

اللہ رے تیرا زور کشش خطبۂ دسوہ — تو نے کچھ اس طرح سے دلوں کو لیا ہے موہ
آیا ہے لکھنؤ سے وہ طے کر کے پشت کوہ — پیری نے کر دیا ہے جسے عاجز و ستوہ
اجلاس تیرا بلکہ ہے اک جنتِ نگاہ
ہوتا ہے دل کو ابر بہاراں کا اشتباہ
ہوں آستانِ شاہ نجف کا میں اک فقیر — ہر زر پرست میری نگاہوں میں ہے حقیر
اس دل کو جب ہے کلبۂ احزاں میں گوشہ گیر — ممکن نہیں کمند ہوس کر سکے اسیر
"دنیا اگر دہند نخیزم ز جائے خویش — من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش"

نام خدا جوان ہے لختِ جگر[1] مرا میں پیر ناتواں، میری پیری کا یہ عصا
ہر لحظہ میری اس کے لیے ہے یہی دعا یارب ہمیشہ دُور رہے اس سے ہر بلا
یوماً فیوماً اس کو ترقی نصیب ہو
تیمار دارِ قوم یہ حاذق طبیب ہو

ہم میں کوئی کسی کو ذرا مانتا نہیں بدخواہ و خیر خواہ کو پہچانتا نہیں
ہے کوئی دور جو ہمیں تانتا نہیں ہم کب سنبھل سکیں گے یہ کوئی جانتا نہیں
کس درجہ اپنا حسنِ عمل دل فروز ہے
چھبیس سال بعد بھی پہلا ہی روز ہے

ختم دعا

نگاہیں محوِ دیدارِ عجائب خلوصِ قلب معدومِ شوائب
گرہ جیبوں میں لختِ جگر کی یہاں دانتوں کی بتیسی ہی غائب
زبانِ قوم کیونکر کام دے جب تمام اعضا ہوں پامالِ مصائب
ہمارے منعمانِ قوم اکثر بہ شوقِ منزلت غیروں کے نائب
جدا اپنوں سے بیگانوں میں شامل مساعی ان کے سرتا پا غرائب
خداوندا انہیں تو دے یہ توفیق کہ اب ہوں بادۂ نخوت سے تائب
صفی کی یہ دعا ہے تجھ سے یارب!
عطا کر عزمِ راسخ عقلِ صائب[2]

۸؍ نومبر کو علی الصباح جب بستر سے اٹھ کر چلا تو بوجہ پیری بایاں پاؤں لڑکھڑانے سے زمین پر گر پڑا۔ کمر، پہلوؤں اور پسلیوں میں چوٹ آجانے سے صاحب فراش ہو گیا۔ کروٹ بدلنے میں سخت زحمت ہوتی تھی۔ دو ہفتے تک صرف رقیق غذا ملتی رہی۔ اور اس کی طرف بھی رغبت نہ تھی۔ بے حد کمزور ہو گیا ہوں۔ مالش برابر ہوتی رہتی ہے۔ اور دوا و شربت کا بھی استعمال جاری ہے۔ مگر بجز سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور درد کمر وغیرہ زائل نہیں ہوا۔ نشست و برخاست میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بادی بواسیر کا زور بدستور ہے

---

[1] لختِ جگر مرحوم کی ذاتی نظموں کا مجموعہ ہے۔

[2] مذکورہ اشعار طویل منظوم نظم سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ ان سے مرحوم کے ذاتی جذبات کی کچھ عکاسی ہوتی ہے۔ یہ نظم [illegible] میں [illegible] کا [illegible] پڑھا گیا۔

اخراجِ ریاح نہیں ہوتا۔ ڈکاریں آتی رہتی ہیں۔ اشتہا کا فقدان اسی طرح ہے۔ بیٹھ کر کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتا بدقت یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دوا و پرہیز سے بہت تدریجاً افاقہ ہو رہا ہے۔ علاج میں مالش اور دواے مشروب ابھی تک استعمال ہوتی رہتی ہے۔ کئی دن سے دھوپ نکلتی رہتی ہے۔ اور دھوپ کھاتا رہتا ہوں۔ شب کو بھی آگ سے سینک پہنچائی جاتی ہے۔ سردی کم ہونے پر امید ہے کہ سیدھا چل سکوں۔ ابھی تک دو چار قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ کمر کا درد بڑھا رہتا ہے۔ (۱۲ جنوری ۱۹۴۳ء)

غالباً آخر نومبر ۱۹۴۳ء میں، آپ کا خط آیا تھا۔ دماغ مختل ہے۔ امسال دو مرتبہ رامپور سے جانا ہوا۔ پہلی مرتبہ آخر مارچ سے ۱۵ مئی تک قیام رہا۔ اور اس مرتبہ ۶ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک وہاں درد کمر کا علاج ہوتا رہا۔ بجلی بھی لگائی گئی۔ مگر زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ ابھی تک دس پانچ قدم سے زیادہ چل نہیں سکتا۔ درد بڑھ جاتا ہے۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ نسیان غالب بصارت بھی کمزور ہو گئی ہے باریک خط عینک لگا کے پڑھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ (۱۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

۱۰ دسمبر ۱۹۴۳ء کا جواب میں اپنی خرابیِ صحت کے سبب سے اب تک نہ لکھ سکا۔ برابر ارادہ کرتا رہا کہ اب لکھوں اب لکھوں۔ مگر کمزوریِ دل و دماغ مانع رہی اور رجب سے سرمائی بارش ہوئی اور سرد ہوائیں چلیں۔ مجھے بہت سخت زکام ہو گیا۔ ریزش برابر ہوتی ہے۔ اور دو تین روز تک سر میں دھمک بھی ہوتی ہے درد کمر اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ قبض اور حبسِ ریاح سے طبیعت نڈھال رہنے لگی۔ رطوبات معدے میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ جنوری میں قلبی ایک دورہ ہوا جس کے اثرات ابھی تک ہیں۔ قویٰ اس قدر مضمحل ہو گئے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ خط لکھنے میں بھی زحمت محسوس ہوتی ہے۔ علاج برابر جاری ہے۔ مگر یہ سب عوارض اعراضِ پیری میں داخل ہیں۔ نوے سال کی عمر میں اور کیا ہو گا۔ بہر حال شکر ہے۔

دسمبر میں ایک عنایت نامہ سیماب صاحب کا اور اس کے بعد دو پرچے پرچم کے آئے تھے۔ خط میں قلمی امداد کی خواہش کی گئی تھی۔ بوجہ خرابیِ صحت میں نے چند رباعیاں پرچم کے متعلق کہہ کر بھیج دی ہیں غالباً وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ زبانِ اردو کی تعلیم غیر ممالک میں بھی جاری ہو جائے دیگر ممالک کے سفرا سے اس کے متعلق مراسلت ہو رہی ہے۔ اگر یہ سعی کر رہے ہیں تو بہت قابلِ قدر ہے۔ اس سے اس کی وسعت بڑھ جائے گی۔ غلے کا قحط یہاں بھی ہے۔ راشن میں آدھ پاؤ گیہوں فی کس ملتے ہیں۔ اور اسی قدر جو اور چاول خدا کرے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مکمل اتحاد قائم ہو جائے۔ (۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء)

(ماخوذ از صحیفۃ القوم، نقشِ فرنگ، لحنِ جگر، خطوط بنام
کسریٰ منہاس

مولانا صفی انتقال سے دو ماہ قبل وضو فرماتے ہیں گر پڑے اور جب سے صاحبِ فراش ہو گئے ایسا گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ تیمارداری کے فرائض اور طبی علاج حتی المقدور ہوتا رہا ہے۔ لیکن مرحوم کی تکالیف میں اضافہ ہوتا گیا کرب و بے چینی بڑھتی گئی۔ آخر ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو سہ پہر کے وقت تقریباً چار بجے شعر و ادب کا وہ آفتاب غروب ہو گیا دوسرے روز امام باڑہ غفران مآب سے متصل مقبرہ راجہ نواب علی خاں میں سپردِ خاک کیے گئے۔

مرحوم کی قبر پر یہ تاریخ کندہ ہے ؎

قبلہ ام حضرت لسان القوم　　افصح العصر شاعر یکتا
صاف باطن صفی سحاب شراہ　　صوفی حق نما بصدق و صفا
مصلح طرز لکھنؤ[1] در شعر　　پیش گستر ادیب نکتہ سرا
در قناعت نداشتہ ثانیش　　چشم او بود بر عطائے خدا
رفت از خار زار کون و فساد　　بہر گلگشت جنت ماوے
ایں رقمی[2] قول سلیم نعیمی
منزل نوم و مرشد الشعرا

۱۳ ھ ۶۹

بے شمار قطعات تاریخ آپ کی وفات پر لکھے گئے۔ حضرت اطہر ہاپوڑی نے پانچ قطعات تاریخ جو انہوں نے راقم الحروف کو لکھ کر دیئے تھے۔ ہر چند غیر مطبوعہ ہیں ان میں سے ایک قطعہ تاریخ بطور یادگار درج ذیل ہے ؎

وفات صفی سے جو صدمہ ہوا ہے　　نہ ہوگا وہ اہل سخن کو کبھی بھی
لکھا مصرع سال ہم نے یہ اطہر
ہوئے زیب باغ بہشت اب صفی بھی

۱۹ ء ۵۰

تصانیف

(۱) صحیفۃ القوم	قومی مسدس
(۲) صحیفۃ الفت (لخت جگر)	"
(۳) تنظیم الحیات	مثنوی
(۴) ہفتخوان اردو	زبان اردو کی منظوم تاریخ
(۵) اتحاد	شیعہ سنی اتحاد پر ایک طویل نظم
(۶) نقش فرنگ	قصیدہ فارسی

---

[1] مولانا حسرت موہانی مرحوم صفی صاحب کے نام سے پہلے "مصلح طرز لکھنؤ" لکھا کرتے تھے اور اردوئے معلی میں بھی اس کا اعلان کیا گیا ہے۔

[2] سید منظور حسن رقمی مولانا صفی مرحوم کے منجھلے فرزند تھے۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں انہوں نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۷) فریاد	قوم کے لیے مختلف تجاویز
(۸) صحیفۃ الغزل[1]	مختلف غزلوں کا دیوان
(۹) صحیفۃ العزا	مراثی و سلام کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)
(۱۰) صحیفۃ السنین	تاریخوں کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)
(۱۱) صبح امید	مہاراجہ محمود آباد کی مسند نشینی پر ایک طویل نظم
(۱۲) صحیفۃ الثنا	قصاید مدحیہ و نعتیہ (غیر مطبوعہ)
(۱۳) قومی نظمیں	غیر مطبوعہ
(۱۴) خرافات خیام[2]	خیام کی رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ
(۱۵) تخمیس رباعیات خیام	چار جلدوں میں (غیر مطبوعہ)
(۱۶) مکاتیب صفی	غیر مطبوعہ
(۱۷) خطبۂ صدارت	جو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس سی و دوم بمقام امروہہ یو۔ پی منعقدہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو پڑھا گیا۔ (مطبوعہ)

مرتبہ کسریٰ منہاس

---

[1] صحیفۃ الغزل میرزا صفی کی وفات کے بعد رئیس المقرر شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ۱۹۵۳ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ شیخ ممتاز حسین مشہور ادیب اور قومی کارکن تھے جن کا انتقال حال ہی میں ۱۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو ہوا۔ مرحوم میرزا صفی مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے۔

[2] خرافات خیام اور تخمیس رباعیات خیام آج کل راجہ محمد امیر احمد خان سابق والئ ریاست محمود آباد کے پاس ہیں۔ یہ مسودہ ان کو مولانا مرحوم کے پوتے سید محمد احمد زیدی پروفیسر ڈگری کالج لکھنؤ نے مطالعے کے لیے دیا ہوا ہے۔

میرزا ثاقب لکھنوی

ولادت: ۱۲۸۵ھ   وفات: ۱۳۶۵ھ

میرزا ذاکر حسین نام۔ ثاقب تخلص۔ وطن طبرستان۔ مولد اکبرآباد (آگرہ)۔ گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش مازندرانی المعروف بہ علی قلی خاں سے ملتا ہے۔ جو شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ تھے۔

ولادت ۲ ماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ ماہ مبارک رمضان ۱۲۸۵ھ کو آگرہ میں ہوئی۔ نامساعدتِ روزگار نے والد ماجد کو اکبرآباد چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ مع اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی۔ انگریزی تعلیم کی تکمیل آگرہ میں ہوئی اور وہیں میر مومن حسین صفی کی صحبت میں شاعرانہ اہلیت بروئے کار آئی۔

پچپن سال شاعری کی خدمت کی۔ اس طویل مدت میں یہ کوشش رہی کہ زبان میر کی اور تخیل غالب کی سی ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ سعی مشکور ہوئی یا غیر مشکور؟ اپنا عیب بھی محبوب ہوتا ہے۔ لہذا یہ میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ البتہ حسن ظن رکھنے والے احباب مجکو میرو غالب کا صحیح پیرو خیال کرتے ہیں۔ اس خیال کی ذمہ داری میرے سر عاید نہیں ہوتی۔ میں تو احباب کی اس عنایت کا جواب آج سے اکیس برس پہلے ایک نظم میں دے چکا ہوں۔ جو ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے رسالہ تمدن میں بمقام لکھنؤ شائع ہو چکی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

جانشینی میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں
وہ خدائے فن تھے ان سے مجکو نسبت کچھ نہیں

اتنی عمر میں صرف اتنا سا خیال کرنے کا گنہگار ہوں کہ شاید چند شعر ان دونوں باکمال استادوں کے رنگ میں نظم ہو سکے ہوں۔ دنیا اس جرم کو معاف کردے تو اس کا احسان ہے۔ اب صرف یہ عقدہ رہ جاتا ہے کہ پھر اس مجموعۂ مہملات کو چھپوایا ہی کیوں۔ خدا گواہ ہے یہ بھی اپنے بس کی بات نہ تھی۔

آزردن دل دوستاں جہل است و کفارہ یمیں سہل!

پیرانہ سری کے باعث مدح و قدح دونوں کی پروا باقی نہیں۔ یہ بھی اختیار ہے کہ جس شعر کا مطلب پسند خاطر ہو، اور الفاظ یا طرز ادا نامرغوب، تو اُسے اصلاح دے کے اپنی پسند کا بنالیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اس صورت میں اصلاح دینے والے کی گرانیٔ جمعیت مندفع ہو جائے گی۔ اور بے چارہ شاعر جواب دینے کی زحمت سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر درحقیقت

؎ تاریخی نام میرزا انتظار مہدی (۱۸۶۹ء) اور آغا محمد فائق (۱۲۸۵ھ)

راقم الحروف کا کلام ناظرین کرام کی رائے میں لغو ٹھہرے۔ تو پھر قرآن پاک کی اس ہدایت پر عمل فرمانا اولیٰ ہے۔

اذا مروا باللغو مروا کراما

معائب کلام کا میں خود معترف ہوں۔ ظاہر ہے کہ جامۂ بشریت میں خطا اور نسیان کا پیوند روز ازل سے لگا ہوا ہے۔ بدمذاقی اگرچہ میرا خاصۂ طبیعت نہیں۔ مگر احباب کی خوشنودی مزاج سے روگردانی بعید از اخلاق تھی۔ بنابریں اقل البغیضین کو ترجیح دینا گوارا کیا۔

تصانیف:۔ دیوان ثاقب، تاریخی نام، "تجلائے شہاب ثاقب"
۵۵ ھ ۱۳

وفات:۔ ۲۹؍ ذی الحجہ (اتوار) ۱۳۶۵ھ۔ مدفن لکھنؤ
جناب نکہت سسوانی نے تاریخ وفات کہی ہے

ثاقب روشن بیاں ذاکر حسین نکتہ سنج — جانشین میر و غالب صاحب فکر رسا
جس کا ہر اک شعر تھا ڈوبا ہوا تاثیر میں — جس کا انداز غزل خوانی تھا دنیا سے جدا
نو بجے تھے صبح کے انتیسویں ذی الحجہ کی تھی — جب ہوا اتوار کے دن سوئے جنت رہگرا
آگیا یہ نکہت محزوں کے لب پر سال غم
ہائے اوج شاعری کا نجم ثاقب چھپ گیا
۶۵ ھ ۱۳

؎ منشی شاکر حسین نکہت (المتوفی ۲۳؍ دسمبر ۱۹۷۰ء) نکہت سسوانی وہی بزرگ ہیں جنہوں نے مفتی تسلیم کو مرتب کیا۔ جو تاریخ گوئی کی ایک جامع اور بے مثل کتاب ہے۔

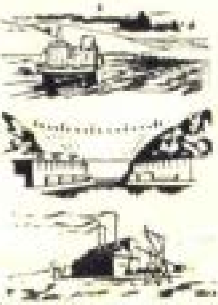

نفع اور

خوشحالی

نفع، جب یقینی ہو، تو خوشحالی کا دوسرا نام ہے۔ سیونگ سرٹیفکیٹ پر ۶ فی صدی بلا ٹیکس منافع ملتا ہے۔ ایک حد تک سرمایہ پر بھی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔

اپنی بچت کی رقم جو آپ سیونگ سرٹیفکیٹ میں لگاتے ہیں، قوم کی خوشحالی کی ضامن ہے۔ جو آپکی مزید خوشحالی کا باعث ہے!

ہر شخص سیونگ سرٹیفکیٹ میں تیس ہزار روپے تک سرمایہ لگا سکتا ہے۔

سیونگ سرٹیفکیٹ

خریدیئے

ایک کشمیری خاندان

آج سے سو سال پہلے ...... یہ شخص ایک نوخیز جوان تھا اور اپنے باپ کے ساتھ منگلا گاؤں میں جہاں جدید وسائل نام کو بھی نہ تھے، بڑی با مشقت زندگی گزارتا تھا۔ حالانکہ آج اس کا گاؤں اجڑ کر زیرِ آب آگیا ہے لیکن پھر بھی یہ خوش ہے۔۔ اسے ایک نیا گھر ملنے کی توقع ہے جس میں بجلی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ کاشت کیلئے بہتر زمین ملیگی اور آبپاری کیلئے وافر پانی۔

منگلا بند کی تکمیل پر اس سارے علاقے کیلئے برقابی قوت اور پانی کا ایک بہت وسیع ذخیرہ پیدا ہو جائیگا جو ملک کی مادی ترقی اور اس کے درخشندہ مستقبل کا ضامن ہوگا

برماشیل کو اس بات پر فخر ہے کہ اس بند کی تعمیر میں کام آنے والی تیل کی تمام مصنوعات وہی فراہم کر رہی ہے اور اس طرح پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کیلئے ایک انتہائی اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔

اعلیٰ خدمت
اپنا شعار

برماشیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ ۔۔ (انگلستان میں قائم شدہ ۔ کمپنی کے ممبران کی ذمہ داری محدود)

مولوی رحمٰن علی

ولادت ۔ ۲ ذی الحجہ بروز جمعہ ۱۲۴۴ھ ۔ وفات ۔ دسمبر ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ)

فقیر حقیر (مؤلف تذکرہ علمائے ہند) کی کیا مجال ہے کہ ارباب علم کی صف نعال سے تجاوز کرکے علماء و فضلاء کے پہلو میں بیٹھے اور اپنے کو مؤلفین و مصنفین کی جماعت میں شامل کرے ۔ لیکن اما بنعمۃ ربک فحدث (اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو) کی تعمیل میں قلم ژولیدہ نگار کو تحریک ہوئی پس واضح ہو کہ مؤلف اوراق محمد عبد الشکور عرف رحمان علی (اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف کرے) ابن حکیم الحکماء حکیم شیر علی (اللہ تعالیٰ انہیں بخشے) ۲ ذی الحجہ بروز جمعہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) کو پیدا ہوا۔

والد ماجد نے نہایت لاڈ پیار سے پرورش فرمائی۔ تسمیہ خوانی کی رسم کے بعد، جیسا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کا طریقہ ہے، ناظرہ قرآن مجید پڑھا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں ۔ ابو النصر فراہی تک نصاب پہنچا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم احسان علی خاں حقیقی بھائی جو سب میں بڑے تھے، مجھ ہیچ کارہ کی تربیت و تادیب کے لیے آمادہ ہوئے اور مجھے فتح پور لے گئے ۔ جہاں وہ خود مقیم تھے ۔ وہاں ضروریات فارسی سے فراغت حاصل کی ۔ پھر مولانا محمد شکور مچھلی شہری صدر الصدور ضلع فتح پور ہسوہ، مولانا ثابت علی بھکوی، مولوی سید حسین علی فتح پوری، مولانا عبد اللہ زید پوری، مولانا شاہ سلامت اللہ بدایونی کانپوری اور مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتی سے کتب درسیہ کی تحصیل کی ۔

۱۸ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم امان علی خاں مرحوم کے توسط سے ریاست ریواں پہنچا۔ جب بابو رگھو راج سنگھ خلف الصدق و ولی عہد مہاراجہ بشناتھ سنگھ والیٔ ریواں کے دربار میں آیا، تو انہوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے عرض کیا، عبد الشکور۔ فرمایا، یہ لفظ ہماری زبان کو ثقیل معلوم ہوتا ہے ۔ تمہارا نام تمہارے بھائی کے ہم وزن رحمان علی ہے ۔ میں تسلیمات بجا لایا۔ اس روز سے اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ اس ریاست میں سفارت جے پور، منصرمی فوج، باغیوں کی تادیب جنہوں نے شاہراہ دکن کو مسدود کر دیا تھا، دیوان ریاست کی پیشی، انتظام پرمٹ، ڈپٹی مجسٹریٹی، سول جج اور مجسٹریٹی (درجہ اول) پر وقتاً فوقتاً مامور رہا اور ۱۸۸۶ء میں ریاست کی کونسل کا ممبر سیکرٹری کی حیثیت سے مقرر ہوا اور اسی عہدہ پر ممتاز ہوں۔

۱۶ فروری ۱۸۸۷ء میں قیصر ہند (ملکہ وکٹوریہ) کی جوبلی کے موقع پر گورنمنٹ ہند کی بارگاہ سے خان بہادری کا خطاب عطا ہوا۔ ڈی۔ ڈبلیو۔ کے۔ بار صاحب بہادر پولیٹیکل ایجنٹ و سپرنٹنڈنٹ ریاست نے مقام ریواں میں ۲۲ اپریل ۱۸۸۷ء کو دربار عام منعقد کیا اور اپنی تقریر کے بعد گورنر جنرل بہادر کی مرسلہ خطاب کی سند گورنمنٹ ہند کی طرف سے اور چاندی کا عصائے چوبدار اور خلعت ریاست کی طرف سے اپنے دست خاص سے عنایت فرمایا۔

اس سے قبل ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) میں ریواں میں، میں نے ایک مسجد پتھر کی تعمیر کرائی جس کے مصارف مسجد کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتے ہیں اور دو گاؤں جو دوامی معافی میں مجھے ریاست سے ملا تھا مسجد مذکور کے مصارف کے لیے وقف کر دیا تاکہ اس گاؤں کی آمدنی سے مسجد کے مؤذن و پیش امام کی تنخواہ اور مرمت و جا نماز کا صرف ہوتا رہے۔ اس مسجد کی بنا کے چند قطعات تاریخ مولانا ابوالخیر معین الدین کاظمی نے لکھنؤ کے شعراء کے منظوم بھیجے ہیں جن کو ناظرین کے ملاحظہ کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔[1]

حبذا مسجد کہ صحنش چوں رخ حور از نور
ہر ستونش ساق عرش کبریا یا ساق حور
بہر تاریخ بنائش غشی فکر رسا
زد رقم مسجد بنا قبلہ عبد الشکور

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

دیگر

اسس العبد مسجد الفرق   فجزاہ المہیمن الغرق
ارخ الفکر ذالک معراجاً   ذالک المسجد الحرام بحق

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

مسجد کے صدر دروازہ پر یہ آیۂ کریمہ کندہ ہے کہ اس سے بھی مسجد کی تاریخ بنا نکلتی ہے:۔

"لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین"

۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء)

چاروں خاندانوں میں سلسلہ چشتیہ صابریہ کے ساتھ اجازت بیعت و خلافت مولانا حافظ حاجی محمد حسین عمری محب اللٰہی الٰہ آبادی سے پائی ہے۔

اپنی تصنیفات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنا ایسا ہے جیسے بادشاہ کے حضور میں کوئی فقیر اپنی جھولی اور زنبیل پیش کرے۔

بقول
نم چشم قلم ما شرم دارم   کہ سوئے چشمۂ حیواں فرستم

اس لیے جو متاع قلیل میرے پاس ہے اس کو لکھتا ہوں۔

کتب مطبوعہ

(۱) قواعد جلالیہ منظومہ فارسی اصول نحو میں مأۃ عامل کے وزن و قافیہ پر ہے۔ (مطبوعہ دہلی)
(۲) تحفۂ قبول در فضائل رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (اردو) (مطبوعہ مطبع نظامی کانپور)
(۳) طریقۂ حسنہ در روایات مولد و قیام (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

---

[1] بانی خود بھی اسی مسجد کے احاطے میں دفن ہیں۔ غم درد و الم سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

(۴) آداب احمدی در بیان سنن زوائد (اردو) مطبوعہ بنارس۔

(۵) ریاض الامراء۔ تاریخ ایران اندرونی و بیرونی جو گورنمنٹ ہند سے توپ کی سلامی پاتے ہیں (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

(۶) تحفۃ البحرین۔ در بیان حفظ صحت مشتمل بر قواعد مسلمہ اطباء یونان و ہندوستان (اردو) مطبوعہ لکھنؤ۔

(۷) ابنیۃ الاسلام (عربی) در بیان ابنیۂ خمسہ اسلام بطور شرح حدیث بنی الاسلام علی خمس الحدیث جو دار الخلافہ قسطنطنیہ میں طبع ہوئی اور حرمین شریفین، بغداد، مصر، بصرہ، شام اور تیونس وغیرہ میں تقسیم ہوئی۔

(۸) طب روحانی۔ مشتمل بر معالجات تحلیل الاجزاء (فارسی) مطبوعہ آگرہ۔

(۹) صحت جسمانی۔ مشتمل بر بیان فصول ستگانہ و خواص ماکول و مشروب (اردو) مطبوعہ مطبع نظامی کانپور۔

(۱۰) بہر ہفت۔ در بیان اشیاء ہفتگانہ (اردو) مطبوعہ دیوان۔

(۱۱) کفارۃ الذنوب۔ روزہ اور نماز کے کفارہ کے ادا کرنے اور فدیہ کے اسقاط کے بیان میں ہے۔ مطبوعہ آگرہ۔

(۱۲) عجالہ نافعہ۔ متضمن اقوال نصیحت آمیز (مطبوعہ دہلی)

(۱۳) تحفہ خان بہادر۔ در بیان کرسی نامہ قوم بگھیل (مطبوعہ الہ آباد)

کتب غیر مطبوعہ

(۱) منیۃ الطبیب فیما لیہ بالاریب (عربی نثر)

(۲) دریائے لطافت (لطافت و ظرافت) اردو۔

(۳) آفتاب حکمت (اقوال حکمائے سلف) اردو۔

(۴) تواریخ بگھیل کھنڈ (اردو)

کتب زیر تالیف

(۱) تاریخ التواریخ (۲) میزان الموازین (۳) تعلیم روحانی (۴) جغرافیہ عرب۔

(۵) ندیم الاطباء۔

(آخری وقت تک علمی مشاغل جاری رہے۔ مندرجہ بالا تصنیفات کے علاوہ (۱) المشاہد (۲) مشیر تندرستی۔

(۳) باقیات الصالحات بھی شائع ہو چکی ہیں)

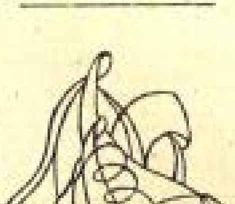

مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مصنف گل رعنا

میرے والد بزرگوار مرحوم کا اسم گرامی مولوی سید فخرالدین[1]، اُن کے والد کا نام مولوی سید عبدالعلی "سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے۔ نسب کا اتصال "ابو محمد حسن مثنیٰ" منت الصدف سبط اکبر امام "حسن مجتبیٰ" سے ہوتا ہے۔ "حسن مثنیٰ" اپنے عم نامدار شہید کربلا امام حسینؓ کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰ سے بیاہے ہوئے تھے، اسی لئے اس خاندان کے لوگوں کو حسنی حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خاندان میں سید شاہ علم اللہ، سید محمد، سید شاہ لعل، شاہ ابو سعید، شاہ محمد واضح، مولانا قطب الہدیٰ محدث، مولانا محمد ظاہر، مولانا خواجہ احمد، مولانا ضیاء النبی، سید مصطفیٰ اور سب سے زیادہ مشہور حضرت سید احمد شہید جیسے زبردست علماء و مشائخ گزرے ہیں۔ والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ[2] میں ہوئی۔

(گل رعنا ص [illegible])

وارد ہوا کہ شاہ محمد عمر سے جو آخوند صاحب کے نواسے مشہور ہیں، ملاقات کرنے کو جاؤں وہ فراش خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں اور آخوند صاحب کے سجادہ نشین ہیں، وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ خلوت خانہ میں ہیں ...... میں بیٹھا تھا کہ وہ اندر سے نکل کر مصلے پر کھڑے ہو گئے، میں بھی نفل کی نیت سے شریک ہو گیا، نماز کے بعد معمولاً ختم خواجگان کے واسطے بیٹھے، میں بھی جا کر بیٹھا، معمولی تعارف مجھ سے ہوا، اثنائے گفتگو میں مجھ سے کہا کہ آپ کہاں بیعت ہیں، میں نے کہا اپنے ہی خاندان میں، اس کے بعد میرے خاندان کے سلسلے کا حال پوچھنے لگے، میں نے سب بیان کیا، پھر میں نے کہا رسالہ فخر الحسن[3] کے دیکھنے کا مجھ کو بہت شوق ہے، آپ کے یہاں ہو تو عنایت فرمائیے، کہا میرے یہاں نہیں ہے، مگر میں نے دیکھا ہے، وہ عربی میں ہے، اس کی ایک شرح ہے "القول المستحسن" وہ بھی عربی میں ہے، میں نے کہا کہ خاندان نقشبندیہ کے سلسلے میں بھی انقطاع بیان کیا جاتا ہے، کہنے لگے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی اور حضرت بایزید بسطامی کا لقا ثابت نہیں ہے، میں نے کہا دوسرے طور کا اور بھی ہے، یعنی قاسمؒ[4] اور حضرت سلمانؓ[5] کے لقا میں گفتگو ہے، کہنے لگے یہ مجھ کو معلوم نہ تھا آج معلوم ہوا، پھر مجھ سے کہا یہ کہاں سے معلوم ہوا، میں نے کہا کتب طبقات سے، کہنے لگے، آپ نے دیکھی ہیں؟ میں نے دو چار کتابوں کے نام لیے، پھر پوچھا آپ نے تحصیل کہاں کی ہے، میں نے لکھنؤ میں، کہا حدیث کس سے پڑھی ہے، میں نے کہا شیخ حسین صاحب محدث[6] یمنی سے اور مسلسل بالاولیہ کی روایت شاہ ابوالحسین

---

[1] آپ حاذق طبیب اور شاعر و مصنف تھے، کئی تصانیف کی ہیں، ان میں سے مہر جہاں تاب (تذکرہ) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ [2] [illegible] ۱۳۱۲ھ میں ۔

[3] یہ رسالہ حضرت مولانا فخرالدین دہلوی (متوفی ۱۱۹۹ھ) کی تصنیف ہے، اس میں حضرت حسن بصریؒ اور حضرت علیؓ کا لقا ثابت کیا ہے، یہ رسالہ اب بھی نایاب ہے [4] حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ [5] حضرت سلمان فارسیؓ [6] شیخ صاحب بھوپال میں درس حدیث دیتے تھے۔ (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ میں ملاحظہ کیجئے)

صاحب مرادآبادی سے بھی حاصل کی ہے۔ اس کے بعد پوچھتے رہے کہ شاہ صاحب سے کہاں ملاقات ہوئی، میں نے سب حال بیان کیا، یہ بھی کہا کہ مجھ کو شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی تک سند حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، اسی وجہ سے زیادہ تر میں نے ان سے سند لی (دہلی اور اس کے اطراف صـ)

میں مولوی نذیر حسین صاحب سے ملنے کی غرض سے "حبش خان" کے پھاٹک کے اندر گیا، اتفاق سے راہ میں مولوی صاحب مل گئے، ان کے ساتھ مسجد گیا، بعد تعارف کے میں نے مسلسل بالاولیہ کی درخواست کی، مگر مولوی صاحب نے تبسم فرما کر دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارے حضرات کے یہاں یہ سب باتیں نہ تھیں۔ (دہلی اور اس کے اطراف صـ)

روز دوشنبہ ۱۹ رجب ۱۳۱۲ھ۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر ۸ بجے مولوی نذیر حسین صاحب کے مدرسہ گیا، بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا شریک ہو گیا، ۱۱ بجے تک متعدد کتابوں کے درس ہوئے، سب میں شریک رہا، ابتدا میں معمولی طریقہ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معمول سے زیادہ مولوی صاحب مدح سرائی کا خیال فرمانے لگے، میرا گمان ہے کہ وہ (ان بعض الظن اثم) کہ پہلے مولوی صاحب نے درس کی مشغولی کی وجہ سے مجھ کو نہیں دیکھا، جب انہوں نے مجھ کو دیکھا تو اس کے بعد ہی انہوں نے طرز بدل دیا، ۱۱ بجے اٹھے، میں بھی ساتھ اٹھا، مجھ سے فرمایا کیسے چلے؟ میں نے عرض کیا صرف سماعت کی غرض سے حاضر ہوا تھا، کہنے لگے میاں تم پڑھے لکھے ہو، جوان صالح ہو، کہیں بیٹھ کر خود پڑھاؤ، میں بوڑھا آدمی کثیر الامراض، ہوش و حواس باختہ، سترا بہترا ہوں، یہ ایسا ہی پڑھانا کیا، اور سراپا عوارض میں مبتلا ہوں، اس کا جواب میں نے مناسب الفاظ میں دیا، جیسا کہ ارادت مند کو زیبا ہے، اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ صبح سے آ جایا کرو تاکہ سب حلقوں میں شریک ہو سکو۔ (صـ)

روز شنبہ ۲۱ رجب ۸ بجے مدرسہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ بخاری شریف کا سبق شروع ہو گیا ہے، اس میں شریک ہو گیا، اس کے بعد مقدمہ صحیح مسلم ہوا، بالکل سادہ درس ہے، مال و ماعلیہ سے بحث نہیں ہوتی، اس کے بعد بیضاوی کا سبق شروع ہوا، مولوی صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالحفیظ پڑھتے ہیں، اس کا سبق بالکل خراب ہوتا ہے، پڑھنے والے قطعاً نہیں سمجھتے، عبارت بالکل غلط پڑھتے ہیں، جس سے سننے والا بھی کچھ مطلب اخذ نہیں کر سکتا، مولوی صاحب کی نسبت عوام کا گمان حسن ظن ہے، کیا عجب ہے کہ کبر سنی کی وجہ سے اخذ مطلب کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں، شواہد میں "اعشیٰ" کا ایک شعر آیا، اس میں دیرینگ تواری اور صنائع مشہور ہے، مگر طلبہ بھی ناکامیاب ہوئے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ "حل الابیات" ہمارے پاس ہے اس میں خوب حل کر دیا ہے، میرے دل میں بار بار آتا ہے کہ کچھ بولوں، مگر مولوی صاحب کی خفگی کے وجہ سے نہیں بولا، وہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور طالب علموں کو الفاظ سخت و درشت کہتے ہیں ...... یہ مصرع بہت پڑھتے ہیں۔ ع

گھوڑے کے اصطبل میں کوئی خر بھی چاہیے

(صـ)

روز پنجشنبہ ۲۴ رجب ۱۳۱۲ھ صبح کو اٹھ کر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ گیا، ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے بعد جتنے سبق ہوئے

۱؎ ایک حدیث کی سند جو کہ حضور سے شیخ وقت تک مسلسل چلی آتی ہے اور لوگ تبرکاً اس کی سند حاصل کرتے ہیں۔ ۲؎ شاہ صاحب نے ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی ان کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند، ترجمہ محمد ایوب قادری صـ) ۳؎ بعض مشہور اہل حدیث عالم میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔ انہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی اور اس کے صلے میں نقد انعام کے علاوہ خوشنودی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور پھر ۱۸۹۷ء میں "شمس العلماء" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

۴؎ میاں نذیر حسین صاحب کے درس میں۔

سب گئے، جب مولوی صاحب گھر جانے لگے تو میں نے وہ پرچہ دیا، جس میں آپ سے حدیث پڑھنے کا حال لکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس ہے کہ اگر سند موجود ہوتی تو مجھ کو اس عبارت کے لکھنے کی حاجت نہ پڑتی، بہرحال مولوی صاحب نے وہ پرچہ لے کر رکھ لیا اور میں قیام گاہ پر واپس آیا۔ (ص۹۲)

ظہر کی نماز پڑھ کر تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، اور سند کے خیال میں مولانا نذیر حسین صاحب کے یہاں چلا، راستہ ہی میں وہ مل گئے، ڈولی پر کہیں جا رہے تھے، ایک خادم ساتھ تھا، مجھ سے کہا کہ میں تمہاری سند لکھ کر قرآن شریف میں رکھ کر آیا ہوں، مسجد میں جا کر لے لو، میں مسجد گیا، سند رکھی ہوئی تھی، لے کر قیام گاہ پر واپس آیا، خلاصہ مضمون سند کا یہ ہے۔

ان المولوی عبد الحی بن السید فخر الدین الحسنی قد
قرأ الصحاح الستة وطرفا منها علی العلامة المحدث
حسین بن محسن السبعی الانصاری وطلب منی ایضا
سندا لزیادة الوثوق فاجزت له باقراء الکتب المذکورة
لتلامیذہ لانه اهلها واحق بها، الخ

میاں صاحب نے اپنے حسن ظن سے یہ فقرہ سند میں بڑھا دیا ہے، "لانه اهلها واحق بها" یعنی یہ اس کے اہل اور سب سے زیادہ حق دار ہیں، ورنہ ایسی صورت میں قاعدہ محدثین کا یہ ہے کہ یہ فقرہ لکھتے ہیں "بالشرط المعتبر عند اهل الحدیث والاثر" یعنی اس شرط کے ساتھ جو اہل حدیث کے نزدیک معتبر ہے۔ والحمد للہ علی ذلک (دہلی اور اس کے اطراف ص۹۳)

میرے ماموں مولانا سید عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی، اردو اور بھاشا میں ان کے حالات لکھے، کسی نے مثنوی لکھی، کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اس وقت چودہ برس کا تھا، دیکھا دیکھی ان کے وفات کی تاریخ فارسی میں میں نے بھی لکھی اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، اس لیے میں نے والد مرحوم سے استدعا کی، انہوں نے نظم عالی کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہے (گل رعنا ص۳۶)

میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبدالجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہاں نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، نامورانِ ملک کی موت و حیات کا اُبھرا ہوا خاکہ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل، شعراء کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ غرضیکہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔

میں نے انہیں بزرگوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا، جب زمانے نے آنکھیں کھولیں اور اور کاموں میں لگ گیا پھر خبر نہیں رہی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔

ندوۃ العلماء کے کاموں سے جب فرصت ملتی، تو تصنیف و تالیف میں لگ جاتا، دن کے اُجالے اور راتوں کی تاریکی میں جو کام بن پڑتا وہ انہیں دو چیزوں میں محدود تھا، "جنۃ المشرق" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ہندوستان کا جغرافیہ ظہور اسلام سے لیکر غدر ۱۸۵۷ء تک

کی اسلامی تاریخ، مسلمانوں کا طریقۂ حکمرانی اور امورِ نافعہ کا بقدرِ امکان تلاش و تحقیق سے ذکر کیا ہے۔

دوسری کتاب "المعارف" کے نام سے لکھی، جس میں علوم و فنون کی تاریخ اور ہندوستان میں جس علم کی جیسی مسلمانوں نے خدمت کی ہے اور جو کتابیں ان علوم میں یہاں تصنیف ہوئی ہیں ان کی تفصیل دی ہے۔ تیسری کتاب "نزہۃ الخواطر" آٹھ جلدوں میں تصنیف کی جس میں ہندوستان کے علماء اور دوسرے ناموروں کے حالاتِ زندگی جنہوں نے علم کی خدمتیں کی ہیں، بڑی کاوشوں اور کاہشوں سے فراہم کیے ہیں، علاوہ ان کے چند کتابیں اور بھی لکھیں جو فقہ و حدیث سے تعلق رکھتی ہیں، مگر بدقسمتی سے یہ کتابیں عربی میں تالیف کیں جن کی اس ملک میں مانگ نہیں، یہ سودا ہنوز دماغ میں موجود تھا کہ سال گزشتہ میں صحت نے بے وفائی کی اور سال کا سال مرض کے الجھاؤ میں گزر گیا، اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا، برسوں کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعہ پر مائل کرنا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے، انہیں کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ میں ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی، اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام "گلِ رعنا" میں نے رکھ دیا ہے۔

اُمید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر افزائی فرمائیں گے اور کیا عجب ہے کہ اس طریقہ سے جس سرزمین کی مختلف حیثیتوں سے میں نے اب تک خدمتیں کی ہیں، اس کی مُلکی زبان کی یہ ادنیٰ خدمت بھی ہو جائے۔

غرض نقشیست کز ما یاد ماند ۔۔۔ کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت ۔۔۔ کند در حالِ این مسکیں دعائے

عبدالحئی ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ ۔ لکھنؤ

(گلِ رعنا طبع ثانی شائع کردہ مطبع معارف اعظم گڑھ لکھنؤ ص۳)

مولانا عبدالحئی مرحوم ۱۸ رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ کو تکیہ شاہ علم اللہ "بیرون شہر رائے بریلی" میں پیدا ہوئے، اور ۲ فروری ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۱ھ کو وفات پا گئے۔ میت کو بریلی لے جا کر ان کے اجداد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ان کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں:۔ "نزہۃ الخواطر (عربی) آٹھ جلدوں میں" "گلِ رعنا"، "یادِ ایام"، "تحفۃ المشرق"، "المعارف" اور "ارمغانِ احباب" جواب "دہلی اور اس کے اطراف"۔ ایک سفرنامہ اور روزنامچہ اس کے نام سے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور انجمن ترقی اردو دہلی نے مل کر شائع کیا ہے۔

(مرتبہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

مولوی فقیر محمد جہلمی

چونکہ ہمارے ایسے تذکرہ و شکریہ میں بہ تصرف فرمان واجب الاذعان واما بنعمۃ ربک فحدث کی ہی تعمیل ہے، بلکہ اس کے ضمن میں حسب وعدۂ حق و صادقہ "لئن شکرتم لازیدنکم" کے افزونی و ترقی انعامات کا مصداق ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر یہ بندہ درگاہ الٰہی بھی حسب اقتدائے بعض اہل علم خداوند کریم کے بعض ان احسانات کا ذکر کرتا ہے جو عہد شعور سے محض اس کے تفضلات وعنایات سے اس ذرۂ بے مقدار پر مبذول ہوتے ہیں۔

راقم یعنی فقیر محمد بن حافظ محمد سفارش بقریہ قالب ۱۲۵۰ھ میں موضع "چتن" میں جو شہر جہلم سے دو میل کے فاصلہ پر جانب غرب واقع ہے پنجشنبہ کے روز رات کے وقت پیدا ہوا، جب چھ سات سال کا ہوا تو پڑھنے پر بٹھایا گیا۔ اور قرآن شریف کے ختم کے بعد کتب فارسیہ میں مشغول اور موضع "کالیاں والا" میں جو چتن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے میاں قطب الدین مرحوم سے پڑھنے جاتا لیکن اکثر روز راستہ میں ہی موضع "جادہ" میں اپنے ماموں حافظ فتح علی مرحوم کے پاس رہ جاتا اور اپنے ماموں زاد میاں غلام محمد مرحوم سے بھی جو ایک ذہین و مستعد صاحب علم تھے، استفادہ کرتا، اسی اثنا میں فقیہ اجل عالم بے بدل مولوی نور احمد صاحب تلمیذ فقیہ فاضل محدث کامل مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی مصنف ازالۃ الاوہام و اعجاز عیسوی و اظہار الحق وغیرہ حال مہاجر مکہ معظمہ جب لاہور سے مراجعت فرما کر اپنے وطن مالوف موضع کھائی "کوٹلی" میں جو جہلم سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے، سکونت پذیر ہوئے تو یہ احقر بھی ان کے درس میں جو اس وقت علاقہ جہلم میں کیا بلکہ کل پنجاب میں ایک بے نظیر گنا جاتا تھا حاضر ہوا اور کئی سال ان کی خدمت میں صرف و نحو، فقہ و دیگر علوم کی ابتدائی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا بعد ازاں راولپنڈی میں چلا گیا جہاں پہلے مولوی عبدالکریم صاحب حال مفتی شاہ پور سے جو کچھ روز کے لیے وہاں وارد تھے منطق شروع کی اور ان کے وہاں سے چلے جانے سے مولوی محمد حسن صاحب فیروز والا سے جو وہاں بتلاش روزگار تشریف لائے ہوئے تھے پڑھنا شروع کیا۔ انہیں دنوں ۱۲۶۷ھ میں دہلی کا ارادہ کر لیا اور ایک فوج کے ساتھ جو کانپور کو جاتی تھی دہلی پہنچ گیا۔ پہلے پہل پنجابی کٹرہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں حاضر ہوا مگر انہوں نے یہ عذر کر کے کہ ہم معقولات نہیں پڑھا سکتے مولوی محمد شاہ صاحب مصنف مدار الحق کے سپرد کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد بستی نظام الدین اولیاء میں جناب صدر الافاضل اعلم العلماء ملاذ الکل مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور دہلی تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث کی خدمت میں چلا گیا جن کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قرأۃً و سماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا اور اواخر ۱۲۶۹ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوف میں آیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد لاہور میں چلا گیا جہاں فاضل جلیل القدر فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الٰہی صاحب متوفی ۱۲۹۴ھ سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا اور ساتھ ہی اس کے خوش خطی حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو گئی اور من جد وجد کا مصداق ہو کر مطبع آفتاب پنجاب لاہور میں کتابت کی خدمت پر تقرر ہو گیا۔ انہی دنوں میں ۱۲۸۳ھ میں مناظر بے نظیر، مناظر حسن التقریر مولوی حافظ ولی اللہ لاہوری کی پادری عماد الدین سے امرتسر میں تحریری بحث

بھی جس سے مجھ کو بھی تردید عقاید نصاری کا شوق پیدا ہوا اور حافظ صاحب مرحوم سے بھی کچھ استفادہ کر کے اس فن میں وہ مہارت پیدا کی کہ ایک کتاب فارسی تصدیق المسیح نام کا اردو سلیس میں ترجمہ کیا اور اس میں جا بجا اپنی طرف سے تذئیلات و تصریحات اضافہ کر کے اس کو چھپوایا۔ پھر اس مباحثہ کا جو مابین حافظ صاحب مرحوم و پادری عماد الدین کے ہوا تھا تکملہ لکھا جواب مباحثہ دینی مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور کے ساتھ چھپا ہوا موجود ہے۔ کتاب جماعۃ الانسان من وسوسۃ الشیطان، ابحاث ضروری جو حافظ صاحب مرحوم نے تصنیف کر کے چھپوائی تھیں۔ ان پر میں نے حواشی لکھے۔ ۱۱ محرم ۱۳۱۱ھ سے اخبار آفتاب پنجاب کی ایڈیٹری کی خدمت اس خاکسار کے سپرد ہوئی جس کو ۱۳۲۳ھ تک جیسا ہو سکا انجام دیا۔ اب ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ سے خاص جہلم اپنے وطن مالوف میں اپنے لخت جگر محمد سراج الدین اطال اللہ عمرہ و اعلی اللہ درجات العلیا کے نام پر مطبع سراج المطابع مع اخبار سراج الاخبار کے جاری کیا ہے۔ علاوہ حواشی و تعلیقات کتب مرقومہ بالا اور اس کتاب حدائق الحنفیہ کے ایک کتاب زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل اور رسالہ آفتاب محمدی بھی اس خاکسار کی تصنیفات میں سے ہیں۔ اب خداوند کریم کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ اپنے رسول مقبول کے طفیل اور ان بزرگان دین اور علمائے کرام حنفیہ کی برکت سے جن کا تذکرہ اس کتاب میں درج ہوا ہے۔ میرا خاتمہ بخیر کرے۔ آمین ثم آمین

(منقول از حدائق الحنفیہ طبع بار سوم ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

[مولوی فقیر محمد صاحب بمقام جہلم ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں فوت ہو گئے۔]

(حدائق الحنفیہ)

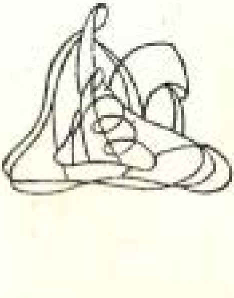

بہادر علی حسینی

اس کتاب کو ہند میں ہتوپدیس یعنی نصیحت مفید کہتے ہیں اور اس میں چار باب مندرج ہیں۔ ایک میں ذکر دوستی کا۔ دوسرے میں دوستوں کی جدائی۔ تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا وجود جس سے اپنی فتح ہو اور مخالف کی شکست۔ چوتھے میں کیفیت ملاپ کی، خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے۔ غرض ایسے عجیب و غریب قصوں میں قصے پلٹے ہوئے ہیں جن کو دیکھنے اور سننے سے آدمی نیک کار و بار میں بہت ہوشیار، نہایت چالاک ہو جائے۔ علاوہ اس کے بھلی بری حرکتیں ہر ایک کی نظر میں آجاویں۔ چنانچہ یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کی جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی، پہنچی۔ جب انھوں نے سنا اس میں قصے ازبس کہ دلچسپ ہیں اور نصیحتیں بہت مرغوب اور باتیں بہت خوب اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو، تو میں اپنے مطالعے میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب اون میں سے ایک شخص حکم بجا لایا، اور نام اوس کا مفرح القلوب رکھا۔ بالفعل اس عاصی میر بہادر علی حسینی نے سنہ اٹھارہ سو دو عیسوی (۱۸۰۲ء) میں مطابق سنہ بارہ سو سترہ ہجری (۱۲۱۷ھ) کے فرمانے سے صاحب خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے زبان فارسی سے ترجمہ سلیس رواجی ریختہ میں، جسے خاص و عام بولتے ہیں، کیا اور نام اس کا اخلاق ہندی رکھا۔ جو کوئی اس پر عمل کرے گا، تو دل و دماغ اوس کا عقل کی بو سے ہر دم تازہ ہوگا اور اکثر دانائی کی باتوں سے واقف ہو کر ہمیشہ خوش و خرم رہے گا۔

تصانیف:- (۱) نثر بے نظیر (۲) اخلاق ہندی (۳) تاریخ آسام (۴) رسالہ گل کرسٹ

شیخ حفیظ الدین

شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ جلال الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر صدیقی کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد پہلے عرب سے دکن کو آئے۔ بعد کو دو تین پشتوں کے شیخ حسن مرحوم و مغفور جنۃ البلاد بنگالے کو تشریف لائے۔ ان کے عہد سے پانچ پشت تک توکل و عبادت میں گزری۔ چنانچہ ان کی اولاد سے شیخ سعدی عرف شاہ بران قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عنایت اللہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حضرت شاہ عبداللہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ نعمتیں حاصل کیں اور ان سے تمکین ہو کر زہد و ریاضت میں حد سے زیادہ کمال کو پہنچے۔ بحسن اتفاق حضرت قبلہ مغفور السامی نے پیشہ نوکری اختیار کیا۔

اس حقیر نے بیس برس کے سن تک بیس شنگز صاحب کے مدرسے (کلکتہ مدرسہ) میں رہ کر علوم عربی و فارسی سے فراغت کی۔ تب تحصیل علم کے بعد معیشت میں جو انسان کو لازم ہے، ادھر آیا اور کمپنی بہادر کے اس مدرسہ عالیہ (فورٹ ولیم کالج) میں نوکر ہوا۔ کہ جس کی بنا امیر پرتدبیر، فتح نصیب۔ فتح شکوہ۔ افلاطون فہم۔ عالی جاہ فلک بارگاہ انگلستان۔ اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی کہ جس کے وقت میں داناؤں کی عزت عالموں کی توقیر سرکشوں کی تادیب۔ ظالموں کی تنبیہ بمرتبہ ہے۔

تصنیف "خرد افروز" جو شیخ ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا اردو ترجمہ۔

(ولادت اور وفات کا سال کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔)

نہال چند لاہوری

اس مستمند نہال چند لاہوری کہ مولد اس نحیف کا شاہجہان آباد ہے، آب و دانہ کھینچ کر بیچ شہر اشرف البلاد کلکتے کے جو اس وقت میں دارالسلطنت ہندوستان کا ہے لایا۔ اور یہ خاکسار ڈیوڈ رابرٹسن (DAVID ROBERTSON) بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ انھیں کی دست گیری سے صاحب خداوند نعمت حاتم زماں، دست گیر ماندگاں، جود و عطا، چشمۂ فیض و سخا، دریائے عنایت و کرامت، بحر احسان و شجاعت، جناب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہ العالی کے دامن تک رسائی ہوئی۔

ثنا میں اُن کے بجا ہے اگر صغیر و کبیر — ہزار صفحۂ کاغذ سدا کریں تحریر
وہی ہے باغ فصاحت کے نخل عالم میں — گل سخن سے وہی ہے شگفتہ دل پذیر
وہی ہے گوہر بحر سخاوت کان عطا — نہیں ہے اس کا جہاں میں کوئی عدیل و نظیر
چراغ علم سے شمع مراد روشن کی — وہ ذات کہ مہر انور ہے جن کا ضمیر منیر
بجا ہے گر کہوں ہے وہ یہ نعمت خلاق — خدا نے اپنی عنایت سے اس کو دی توقیر

ہر ایک خدمت عالی سے فیض پاتا ہے
گواہ دل سے ہے اس بات پر امیر و فقیر

غرض صاحب بہادر کے تفضلات سے اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور آگے کو بھی اُمید بندھی کہ اگر یہ دامن دولت اپنے ہاتھ میں رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن بیڑا پار ہو جائے گا۔ پھر ایک روز خداوند نعمت نے ارشاد کیا کہ قصۂ تاج الملوک اور بکاؤلی کا موجب خوشنودی ہماری ہے، چنانچہ اس نحیف نے بموجب ارشاد فیض بنیاد کے اپنے حوصلے کے موافق فلاطون فطنت، والا شکوہ، عالی حشمت، فلک احتشام، مارکوئیس ولزلی نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہندی میں تالیف کیا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔

(از مذہب عشق)

مرزا علی لطف

علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے سنہ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم نکتہ دانی۔ رونق افزائے محفل معانی۔ سخن کی جان اور سخن دانوں کے قدردان صاحب والا مناقب مسٹر گل کرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان مفصل ان کا بزبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو۔ اور ہر ایک شاعر کی پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو۔ ہندی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نوشتی کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خلق دہلی میرزا لطف علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے۔ بہ نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ اگر تو وہی اس مقدمے میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔ اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا۔ لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں اور ایک سرمو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحر حلال ہے۔ جن لوگوں کا یہ آئین ہے۔ ان کا خوشا حال ہے۔ غرض مدعائے دل اس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد یہی ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں۔ ہم ان کی تربیت کے لیے سدا یہ خون جگر کھاتے ہیں۔ تاکہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھاوے۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو ہندی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ۔ اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ویسا جس کو نوشتی پڑھ کر کہیں واہ واہ۔ امید جناب اقدس الہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور قبول نگاہ خاص و عام ہو۔

الحمد للہ آج کے دن تک سنہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک (۱۸۰۱) مطابق عیسوی کے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

موافق حکم حضور فیض گنجور بادشاہ کیواں بارگاہ، اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر ناظم ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر و میر اعظم عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقہ کشور ہند۔ فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی عہد دولت میں اس عالی جناب کے ازبس کہ آرام و چین ہر ایک شخص کو نصیب ہے اور عز و وقار اہل علم کے قریب ہے۔ موافق حکم اس والا مناقب کے نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اسی صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔ تاریخ نظم اس کی اس طور پر لکھی ہے ؎

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقے کا　　کہتا ہے یوں خزاں سے یہ کیا پشت ہے
حیراں پھرے ہیں بے سر و پا بہمن و دے　　تاریخ اس کی جب یہ "رشک بہشت" ہے
۱۲۱۵=۱۲-۱۲۲۷

لطف تخلص۔ میرزا علی نام راقم ہے۔ اس چند اوراق پریشاں کا کہ مانند نامہ اعمال اپنے کے سیاہ کیے ہیں اور اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خان ہے۔ متوطن استرآباد، شجاعت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۴ گیارہ سو چوّن ہجری میں نادر بادشاہ کے ساتھ شاہجہان آباد میں تشریف لائے۔ ابو المنصور خاں حضور جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی مصدر عنایت بادشاہی ہوئے۔ اب آگے بیان امورات دیگری باعث ہے۔ طول کلام کا اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہتے ہیں حضرت کو ید طولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا ہے۔ اصلاح فارسی کی اس ہیچداں کو آپ ہی کی جناب سے ہے۔ اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔

(از گلشن ہند)

حیدر بخش حیدری

(۱)

یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہ آبادی۔ تعلیم یافتہ۔ مجلس نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم شاگرد مولوی غلام حسین غازی پوری دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخن دان آبرو بخش سخن وراں۔ معدن مروت و چشمہ فتوت دریائے جود و کرم۔ منبع علم و حلم۔ خداوند نعمت والا شان جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی سے بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے سن بارہ سے پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں سرگروہ امیران جہاں، حامی غریباں دوست بےکساں و زبدہ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے محمود قادری کے طوطی نامے کو جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے۔ زبان ہندی میں موافق محاورہ اُردوئے معلےٰ کے نثر میں عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا تاکہ صاحبانِ نوآموز کے فہم میں جلد آوے۔ اور یہ ہیچمدان ہر ایک اہلِ سخن سے اُمید رکھتا ہے، کہ جو کوئی بچشم غور سے اس ترجمے کو ملاحظہ کرے اور غلطی معنی یا نامربوطی الفاظ اس کے نظر پڑے تو وہ شمشیر قلم سے اس صفحۂ ہستی سے اڑا دے۔

جو ہو اصلاح اس پہ رکھے قلم
الٰہی نہ دینا کبھی اس کو غم
الٰہی بحق امام انام
یہ جلدی ہو مجھ سے کہانی تمام

بتاریخ بست و ششم شہر ذیقعدہ سنہ مرقومۃ الصدر، روز پنج شنبہ بوقت شام بخوبی تمام خدا کے فضل سے یہ قصہ شیریں کلام انجام کو پہنچا اور توتا کہانی اس کا نام رکھا۔

قطعہ

کہانی ہوئی ختم جب حیدری
تو ہاتف نے نام اس کا سُن کر کہا
سر آہ کو کھینچ کر تو نے خوب
رکھا نام توتا کہانی عجب

ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں حرف طوے نہیں اور اس حقیر نے طوطی نامہ فارسی کو زبان ریختہ میں لکھا۔ اس واسطے اس طوطی کی طوے کو تے سے بدل لیا۔

(توتا کہانی)

(۲)

الٰہی دے مجھے روشن بیانی
کہ تا دل پر کھلے رازِ نہانی
زباں کو مخزنِ تقریر کر دے
دہن کو گوہرِ معنی سے بھر دے

کمیت نادر کو میرے لگا پر   یہ معنی میں مجھکو آشنا کر
پلا دے مجھکو جام ارغوانی   کہ جس سے مے ہو حاتم کی کہانی
کہیں سن کر اسے ارباب اردو   کہ ہے یہ گوہر نایاب اردو

یہ قصہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سے حیدر بخش تخلص بہ حیدری دلی کے رہنے والے نے امیر والا قدر بہشت پناہ سپہر بہرہ جواں دست گیر درماندگاں و بے کساں، نوشیروان وقت، ہمایوں بخت، زبدہ نوآئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوئیس ولزلی گورنر بہادر دوام اقبالہ کے حکم سے سنہ بارہ سے سولہ ہجری اور اٹھارہ سے ایک عیسوی کے موافق اور سنہ جلوس تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے مطابق زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق۔ اس کتاب سے جو واقف تھی۔ ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں جمعیت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔ (آرائش محفل)

تصانیف :- (۱) قصہ مہر و ماہ (۲) قصہ لیلیٰ مجنوں (۳) ہفت پیکر (۴) تاریخ نادری (۵) گلزار دانش (۶) گلدستۂ حیدری (۷) گلشن ہند (۸) توتا کہانی (۹) آرائش محفل (۱۰) گل مغفرت

کاظم علی جوان

یہ ہیچمداں ہر صغیر و کبیر کی دریافت کے لیے اس روزگار کے سررشتے سے کہ سرکار کمپنی بہادر دام اقبالہٗ کے مقرر ہوا، بیان کرتا ہے۔

کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں انھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہٗ ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر شرف البلاد کلکتے کو روانہ کیا۔ انھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا، اور موافق حکم حضور خدمت میں مدرس ہندی کے جو صاحب والا مناقب جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں بشرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن انھوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو۔ للو جی کب کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھایا کرے۔

اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی۔ لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء ہیں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے۔ ممدوح نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس کتاب کو سرنو چھپوا دیں۔ نظر ثانی لازم ہے اور اسی کب کو فرمایا کہ تم بھی اسی کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہو نہ رہے۔ چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا ورنہ اگلا یہی ہے۔

خدا کا نام لے پہلے زباں پر
لگا پھر دل کو اپنے داستاں پر

یہ قصہ فرخ سیر بادشاہ کی سلطنت میں سنسکرت سے برج بھاکا میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اور نوابان عظیم الشان وشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی۔ گورنر جنرل بہادر دام ظلہٗ کی حکومت میں ۱۸۰۱ء میں مطابق ۱۲۱۵ھ کے جناب گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اسے زبان ریختہ میں بیان کیا۔

اس داستان کے لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ فرخ سیر بادشاہ کے فدویوں میں سے مولی خان، فدائی خان کے بیٹے نے جب ایک لڑائی ماری۔ تب حضور پرنور سے اس کا خطاب عظیم خان ہوا۔ اسی ایام میں اس نے نواز کبشور کو حکم کیا کہ شکنتلا ناٹک جو سنسکرت میں ہے برج کی بولی میں کہہ۔ اس کبشور نے یہ کہانی کبت دوہرے میں کہی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے اور جو انگریزی میں ہے سو سنسکرت سے ہوا ہے۔ اگر اس میں اور اس میں فرق ہو تو ممکن ہے۔

اب صاحبانِ دانش و بینش کی خدمت میں التماس میرا یہ ہے کہ چشم و گوش انصاف کھولیں اور رنگ منصفی سے بولیں کہ بکٹ اور دوہرے کا ترجمہ جیسا چاہیے ویسا زبان ریختہ میں کب ہو سکتا ہے۔ اس کے اور اس کے مضمون کی بندش کا فرق کھلا ہوا ہے۔ بیان کی احتیاج کیا۔

طرز اس کی جدا اس کا نرالا طور ہے
اس کا عالم اور ہے اور اس کا عالم اور ہے

(از شکنتلا ناٹک)

تصانیف :- (۱) شکنتلا ناٹک (۲) بارہ ماسا (۳) قرآن شریف کا اردو ترجمہ (۴) ترجمہ تاریخ فرشتہ (خاندان بہمنی) (۵) سنگھاسن بتیسی (۶) میر و سودا کے کچھ منتخبات بھی شائع کیے (۷) خرد افروز۔ مولوی حفیظ اللہ کی کتاب پر نظر ثانی

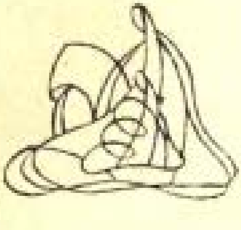

خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ

اپنی سوانح عمری گزارش کرتا ہے کہ ابتدائی عمر میں اوّل بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے ممتاز ہوا۔ فن تیر اندازی میں بادشاہ کا شاگرد ہو گیا۔ پندرہ روپے ماہانہ سرکار شاہی سے دو برس تک ملتا رہا۔ بعد اس کے بادشاہ نے اپنے ولی عہد مرزا فخر الملک کے مجھے سپرد کر دیا۔ دو برس ان کی ملازمت میں رہا۔ اتفاق سے مرزا فخر الملک کا وبائے ہیضہ میں انتقال ہو گیا۔ مجبوراً ریاست الور میں اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ راجہ بنے سنگھ والیِ الور نے مجھے رکھ لیا اور اپنے فرزند شیو دان سنگھ کی تعلیم میں سپرد کر دیا۔ چالیس روپے ماہوار میرے مقرر کیے۔ شیو دان کی نو برس کی عمر تھی۔ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے نوکر ہوئے چار برس گزرے تھے کہ دہلی میں بغاوت ہو گئی اور عالم پر آشوب ہو گیا۔ انہیں ایام میں راجہ بنے سنگھ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں مر گئے۔ شیو دان سنگھ کی والدہ نے مجھے تاکید کی کہ شیو دان سنگھ کو ایک لحظہ بھی نہ چھوڑو۔ رات دن ان کے پاس رہو۔ اس کے علاوہ شیو دان سنگھ خود مجھ سے اس قدر مانوس تھے کہ مجھے جدا ہونے نہ دیتے تھے۔ اس عرصہ میں دہلی فتح ہو گئی۔ بعد ایک سال کے الور کے بعض لوگ اسی آشوب عالم میں باغی ہو گئے۔ شہر میں فساد برپا کر دیا۔ جتنے اہلکار دہلی والے الور میں تھے سب کو اخراج کر دیا۔ اب الور جائے امن نہ رہا۔ اب بہ مصلحت والد نے وہاں سے علیحدہ ہونا چاہا۔ مگر وہ باغی راجپوت ہماری علیحدگی پر راضی نہ ہوئے۔ اسی اثنا میں دہلی میں پنشن کی تحقیقات کے لیے حکام کا حکم آیا۔ اس وقت بمشکل الور سے میں بھی اور والد بھی علیحدہ ہوئے۔ والد دہلی کو روانہ ہوئے اور میں جے پور آ گیا۔ مہاراج شیو دان سنگھ اپنی جیب خاص سے مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ ایک سال تک میں جے پور میں رہا۔ اس عرصہ میں والد کی پنشن بحال ہو گئی اور میں بھی دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے چھاپہ خانہ جاری کر لیا۔ والد بوستان خیال کا ترجمہ کرتے تھے۔ میں بھی ترجمہ میں شریک رہتا تھا اور چھاپتا تھا۔ میرے والد نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ پانچ جلدیں چھپوا کر شائع کر چکے تھے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ان کے اس بے مایہ نے جلد ششم ترجمہ شدہ چھپوائی اور دو جلدوں کا ترجمہ خود کر کے شائع کر دیا جو ان کی یادگار میں باقی ہے۔ اسی اثنا میں میرے ایک دوست کرم فرما مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سیکرٹری نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ نے مجھے نامہ لکھ کر اپنے پاس حیدر آباد دکن میں بلا لیا۔ میں حسب الطلب اپنے مخدوم کے روانہ ہو گیا۔ میرے مخدوم سراپا کرم نے مجھے سر سالار جنگ سے ملا دیا۔ سالار جنگ نے مجھے روک لیا۔ دو برس امیدواری میں رہا۔ بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ اب اس امیدوار کو کیا حکم ہے۔ نواب نے فرمایا کہ ہم نے تیرے لیے تجویز کر لیا ہے۔ فی الحال ہم شاہزادہ ولیعہد کے استقبال کو بمبئی جاتے ہیں وہاں سے آتے ہی بندوبست کر دیں گے۔ مگر میری تقدیر میں اس سرکار کا آب و دانہ نہ تھا۔ نواب بمبئی روانہ ہو گئے۔ خیال آیا کہ میں بھی چل کر جلسہ دیکھوں۔ بس یہ خیال آتے ہی میں بمبئی میں آ گیا۔ ایک سوداگر اہل دہلی کی دوکان میں مقیم ہوا۔ بارہ دن شہر اجلاس وغیرہ جب ختم ہو گیا، قصد ہوا کہ نصف دور تو آ گیا ہے گھر چل کر ایک ہفتہ کے لیے بال بچوں سے مل آؤں۔ آخر جی کیا کل مال و اسباب جو پانسو روپے کی مالیت تھا سوداگر کی دوکان میں رکھ کر دہلی میں آ گیا۔ یہاں آ کر سنا کہ جے پور کی ریل کھل گئی ہے۔ ارادہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے لیے جے پور چل کر عزیزوں سے مل آؤں اور کچھ اسباب وقت روانگی جے پور سے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بچا ہو تو وہ بھی لے کر فروخت کر دوں تاکہ زاد راہ ہو جائے۔ یہ قصد کر کے جے پور روانہ ہو گیا۔ بس جے پور پہنچا تھا کہ اس سرزمین نے پاؤں

پڑ گئے۔ مہاراج رام سنگھ کو خبر ہوئی مہاراج نے مجھے بلا کر روک لیا جانے نہ دیا اور کسی قدر وظیفہ دوامی میری مدد خرچ کو مقرر فرمایا اور یہ اقرار کیا کہ ہم جلد تیری ترقی کریں گے اس کے بعد مہاراج سنگھ مر گئے میری تقدیر وہاں پست ہو گئی بس وہی جزو قلیل تقدیر کا رہ گیا۔ اس بے مایہ کی زندگی اسی قلیل بضاعت میں بسر ہوتی ہے اس فقیر کی عمر قریب پچھتر کے ہو گئی ہے۔ زندگی مثل چراغ سحری کے ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ فقط۔

خواجہ شمس الدین خاں غالب کے بھتیجے راقم کے چچا [illegible] میں چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے ان کی والدہ ان سے قبل مر گئی تھیں خواجہ شمس الدین نے فن موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے کاملین داد دیتے تھے اور ان کی دن رات عبادت گزاری میں بسر ہوتی تھی۔ ان کے بعد خواجہ بدرالدین خاں راقم کے والد ماجد نے بھی بعمر چونسٹھ سال ماہ اگست [illegible] میں وفات پائی اور ان کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی۔ ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزند اکبر خواجہ قمرالدین خاں راقم باقی رہے۔ خواجہ بدرالدین خاں اپنے وقت کے جمیع کمالات تھے خوشنویسی میں ایسے ہی تھے مصوری اور ستار نوازی میں کامل فن رمالی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے جیسا کہ ان کے چچا مرزا اسداللہ خاں غالب نے جلد اول بوستان خیال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میرا بھتیجا وصف کمالات میں یکتا ہے۔ ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا، مصوری میں مانی کو پس پشت بٹھایا۔ الی آخرہ۔ حق یہ ہے کہ خواجہ بدرالدین خاں ہمہ صفت موصوف تھے۔ ان کی تصنیف افسانہ بوستان خیال گواہی دیتا ہے اور عالم جانتا ہے۔ غرض جب خاندان میں سوائے اس ناشاد ننگ خاندان خواجہ قمرالدین خاں راقم کے کوئی نہ رہا۔ جاگیر کی آمدنی بند ہو گئی پھر اس بے بضاعت خواجہ قمرالدین خاں راقم نے اپنی موروثی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ حکام ضلع نے بعد تحقیقات کامل پچاس روپیہ ماہوار میرے گزارے کے لیے تجویز کیے کل محکموں سے وہ رقم منظور ہو گئی جس وقت حکام ماتحت کی رپورٹ گورنمنٹ کے ملاحظہ میں پیش ہوئی مجھ بد نصیب کی تقدیر الٹ گئی گورنمنٹ نے پچیس روپیہ ماہوار بطور پنشن منظور فرمائے۔ قسمت پر دیش بجائے رو پیش سمجھ کر خاموش رہا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مہاراج رام سنگھ والیٔ جے پور نے اپنی سرکار سے اس قدر وظیفہ فقیر کا مقرر کر دیا جو آج تک اس سرکار سے ملتا ہے اور خاکسار بدعائے دولت و اقبال سری حضور مہاراجہ صاحب فرمانروائے حال جے پور میں بسر کرتا ہے۔ خواجہ قمرالدین خاں کی اولاد میں دو دختر نیک اختر صاحب اولاد اور ایک فرزند ارجمند خلف الرشید خواجہ مرزا امیرالدین خاں صاحب اولاد و نمک خوار سرکار آصفی بجوش اقبال عہدہ جلیل پر ممتاز ہے۔

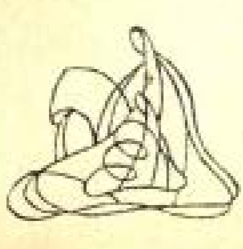

میر شیر علی افسوس

عاصی شیر علی ابن مظفر علی خاں ابن غلام مصطفیٰ خاں مرحوم و مغفور، متخلص بہ افسوس کہتا ہے کہ اصل اس حقیر کی ملک خاف (خواف) ہے اور قوم سادات حسینی۔ آبا و اجداد جو ہندوستان میں آئے اور وطن انھوں نے پٹنا نارنول[1] میں کیا۔ اس سبب سے نارنولی مشہور ہوئے۔ مگر جد پدر اس کے عہد میں بادشاہ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے شاہجہان آباد میں وارد ہوئے اور رفاقت نواب عمدۃ الملک امیر خاں جنت مکان اختیار کی چنانچہ کمال .... دل گرم خوردہ ان کا اس سرکار میں ہوئی۔ بعد مرحوم ہونے سلطنت کے اور وفات نواب صاحب مغفور کے ایک مدت مدید والد مرحوم خانہ نشین رہے۔ آخر دلی کو چھوڑا اور روزگار بنگالے کے صوبہ داروں کا کیا۔ ان دنوں میں فقیر کا سن گیارہ برس کا تھا۔ گلستاں پڑھتا تھا۔ ورد میر دیوان دلی کی اکثر کرتا تھا۔ طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعر اوقات مذکورہ میں بہ طرح قدما کے کہے تھے۔ یہ مطلع بھی انھیں میں سے ہے ؎

اے مسیحا سے تیرے اس حسن رنگیں کا خدا حافظ
تیری اس زلف پر پیچ کا خدا حافظ

قضا کار والد ماجد نواب جعفر علی خاں مرحوم کے واقع تک بھی عظیم آباد میں تھے۔ بعد اس سانحے کے لکھنؤ میں آئے اور حقیر ان سے دو برس پہلے یہاں آچکا تھا۔ آخر وہ تو حیدرآباد کو تشریف لے گئے اور بعد چند روز کے وہیں بہ قضائے الٰہی بہشت نصیب ہوئے لیکن میں نے بود و باش اپنی یہیں ٹھہرائی اور ابتدائے جوانی سے سرکار میں نواب سالار جنگ بہادر کے پرورش پائی۔ بلکہ جب تک مرشد زادۂ آفاق صاحب عالم جہاں دار شاہ جنت آرام گاہ رونق افروز لکھنؤ کے ہوتے، تب تک اسی سرکار میں بہ عہدۂ مصاحبت سرفراز تھا۔

ان دنوں بھی فکر شعر و سخن تھی لیکن تحصیل علوم عربیہ میں نہایت مصروف تھا۔ مشق سخن اس تمام طبع کی اہل سخن کے نزدیک پختگی کو پہنچ چکی تھی اور دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا چنانچہ کلام اس ہیچ مدان کا مرشد زادۂ آفاق کو نہایت پسند آیا اور جو اعیان حضور میں بہ عہدۂ شاعری سرفراز فرمایا بسبب ان کی قدردانی کے پھر بعد وفات بندہ فکر سخن میں رہتا تھا۔ غرض جب انھوں نے رحلت فرمائی تب میں نے شعر و سخن ترک کیا مگر درس و تدریس سے سروکار رکھا خرچ روزمرہ کا نواب سرفراز القدر حسن رضا خاں بہادر کی بدولت جو کچھ مقدر تھا پہنچ جاتا تھا اور تکلیف نوکری کی کچھ نہ تھی غرض اس بزرگ کے اخلاق اور خوبیوں کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ خدا اس کو جزائے خیر دیوے، اور جنت الماویٰ میں درجہ اعلیٰ عطا کرے۔

سنہ عیسوی تاریخ (دہم جمادی الاول) روز جمعہ کہ وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی، سن ہجری بارہ سے پندرہ تھے اور سن عیسوی اٹھارہ سے ایک کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلا بھیجا اور کلام میرا سنا۔ بکمال الطاف و نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بہ دل بھی تمام لکھنؤ کو روانہ ہو کہ صاحب عالیشان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا

---

[1] قصبہ نارنول (صوبہ بنگالہ) میں ہے۔

چاہتے ہیں۔ بر بنا اس کے مجھے طلب کیا ہے۔

یہ ہیچ مداں اگرچہ لیاقت موافق اساتذۂ سابق کے نہ رکھتا تھا اور اس فن سے بھی دل برداشتہ تھا۔ پر قدرداں جو اس بزرگ کو دیکھا اور صاحبوں کو جوہر شناس سمجھا۔ جتنے الواقع قدردان اہلِ فن اور عزت بخش سخن ان سے بہتر کوئی نہیں اور ان کی سرکار مجمع علماء و طلبا ہے۔ عازم اس ملک کا ہوا اور آب و دانہ یہاں سے آیا۔ غرض صاحبان ذوی الاحترام کی قدردانی جتنی سنی تھی ان سے دو چند دیکھی۔ سو واقعی اس ملک میں انہی کے سبب اس ہیچ مداں کی اس قدر عزت ہوئی اور اس کے کلام نے اتنی رونق پکڑی ورنہ یہ کس قطار میں اور اس کا کلام کس شمار میں۔ لیکن تعلق میرا مدرسہ ہندی سے ہوا۔ بر بنا اس کے بیشتر اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام ثروتہ کو جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کو زبان اردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بظاہر صاف و بباطن پیچ دار ہے اور اپنی قوتِ تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا۔ تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سرِ خر آگے دھروں۔ پھر دل میں سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں ان کے (گل کرسٹ کے) گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کو نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اس کا ترجمہ کروں۔ اگر خوبی سے انجام پائی اور اہلِ معانی کے پسند پڑی تو بہتر۔ والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و عقلا و چند شعرا کے یہاں تھے۔ ان کو پسند پڑا۔ تب اس ضعیف نے کمرِ ہمت بہ قوت باندھی اور یہیں بیٹھ گیا۔ بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور مقبول خاص و عام کی ہوئی۔ نام اس کا باغ اردو رکھا چنانچہ اس کے شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے۔

یہ تاریخ اس کی جو چاہا کہ نام — کہوں دل چسپ با آئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا — ہے آغاز اردو سے باغ اردو
۱۲۱۴ + ۱

لیکن فی الحقیقت یہ کتاب جب مقبول ہوئی کہ حضور امیر والا تدبیر، عادل بے نظیر، پشت پناہ کہتر و مہتر، غریب پرور، قدر افزائے علما و شعرا، راحت رساں، جمع پریشاں، چارہ ساز بے چارگاں و درویشاں، بانی مدرسۂ علم و فضل، ماحی بنیاد ظلم و جہل سے

شجاعت اگر اس کی رستم بھی پائے — تو ہاتھی کو ہرگز نہ خاطر میں لائے
جو ابرِ کرم اس کا برسائے زر — تو ہر اک گدا لیوے دامن کو بھر
بیاں کیا کروں دانش و عقل کو — فلاطوں بھی اس سے تعلیم ہو
سخاوت شجاعت کیاست کرم — عیاں اس میں سب ہیں بوجہ اتم

آغاز اردو سے ایک عدد کا اخراج واضح کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔

زبدۂ نوئینانِ عالی شان، مشیرِ خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر اقبالہٗ کے قبول ہو گی ؎

پسند آئے جو اس کی باغ و بہار
رہے تازگی اس کی لیل و نہار

اگرچہ اس باغ کے گل اور پھول بے مقدار ہیں اور کم تر از خار، لیکن توقع اس ابرِ کرم سے یہ ہے کہ متوجہ اس پر ہووے اور اپنے تفضلات کے رشحات سے شاداب کرے۔ چنانچہ ہر جگہ برستا ہے۔ گل و خار اس کے فیض سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ ؎

کرم سے ہوں تیرے یہ اُمیدوار
نظر مہر کی اس پہ ہو ایک بار

(از باغ اردو)

تصانیف: (۱) باغ اُردو۔ (۲) آرائشِ محفل (۳) دیوانِ افسوس (۴) سودا دہلوی کے دیوان کا انتخاب (۵) میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثرِ بے نظیر کی نظرِ ثانی۔ (۶) مذہب عشق از نہال چند لاہوری کی تصحیح۔

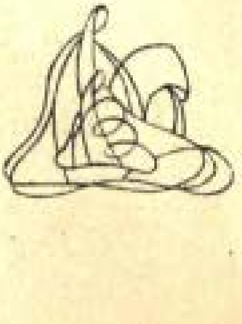

سیّد مظفر علی اسیر لکھنوی

حقیقت میں دیکھو تو دنیا میں کیا نہیں ہے۔ سب کرشمہ ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے۔ وقفہ کم ہے۔ اوّل بھی عدم ہے۔ آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزم آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دنیا سے برخاستہ ہے۔ زیادہ رہنے سے کیا۔ دنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز و قریب اندر گوشۂ تربت میں سو رہے۔ جن سے دل بہلتا تھا۔ وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ منتخب تھے وہ پردۂ خاک میں پنہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم نوالہ تھے انہیں کا ماتم کرنا پڑا۔ جن کے لیے پوشاکیں قطع کیں انہیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا ان کے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے ان کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو نظروں میں ہر وقت ہم چشم رہتے تھے ان کو گور میں سلایا۔ سر سبز چمن غارت و پامال ہوا۔ بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ ساقی۔ زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ اس سرائے میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار۔ فقط مرگ کا انتظار ہے۔ ضعیفی میں جوانی کا مزہ کہاں۔ ہم تو رہ گئے زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ اب کچھ اپنا حال بیان کروں جو سننے کے قابل ہے۔ قصبۂ امیٹھی جو آباد ہے۔ وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے۔ بچپن ہے لیکن خود ان دیدہ۔ رئیساں صاحب حشم رئیسان عالی ہم سب اٹھ گئے۔ جب نو دس برس کا سن ہوا۔ بخت رسا لکھنؤ میں لے آیا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی[1] تھے۔ محب نبی و علی شیعہ پاک و صاف اعتقاد عالی وقار پڑھے فارسی دان، حضرت عباس علمبردار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ قابل شخص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا، شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا۔ استاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے مکدر ہوا تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا۔ وہاں خوشنویسوں کا مجمع تھا مجھ کو بھی شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعروں کی ہوس ہوئی۔ مضامین تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کر کے دیکھے۔ پچھلوں کے رنگین کلام یاد کیے۔ بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی۔ فکر ہوئی، اس کا بھی کچھ علاج کیجیے۔ چچا میر سید علی[2] رجب علی عربی میں بہت ذی لیاقت تھے۔ صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے۔ حکمت منطق میں بے مثل حدیث قرآن پر شیفتہ۔ آپ نے جلاء العیون[3] ختم کر کے درس لیا۔ میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم

---

[1] کتب خانۂ مصنف کے زرد مخطوطات جلد اوّل کے صفحہ ۶ پر حضرت امیر کے والد کا نام سید امداد علی درج ہے جو صحیح نہیں۔

[2] سید مدد علی ماہل ساداتِ علوی ساکن امیٹھی طبع رسا و موزوں دارد، چند ماہ نزد شاہ حاتم اصلاح شعر گرفتہ بود (ریاض الفصحا، تذکرہ ہندی گویاں از مصحفی صفحہ ۵)۔

[3] ملا محمد باقر مجلسی کی مشہور تالیف ہے۔

حاصل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا، فکرِ قوت میں اضطراب ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کی صحبت باقی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ الغرض کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشاگری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شان رزاق وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم سنائی[1] پڑھا۔ علم حاصل کیا، وہ کامل تھے، مجھ کو بھی کامل کر دیا۔ کبھی کبھی میر کاظم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔ ترکِ عادت تو بہت مشکل ہے۔ شاعری کا بھی کچھ خیال رہا۔ جابجا مشاعروں میں گیا، شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے مگر لوگ تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح و شام سیر کی، کتابیں پیشِ نظر رہیں۔ جب حضرت ثریا جاہ خاقانِ زماں محمد امجد علی شاہ زیبِ تخت و کلاہ ہوئے، بڑے نیک طینت، معینِ شریعت، فرشتہ خصال تھے، تو مدار المہام وزیر الملک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قدر بنایا، کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں ستایا۔ صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونقِ اسلام کی بڑھا دیے۔ روز افزوں تائیدِ خدا رہی لیکن خاکساری بدستور قائم رہی۔ ان کے بزرگ بھی بہت صاحبِ ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا۔ مکانات خرید لیے۔ جب وزارت ملی تو ماہِ نو سے ماہِ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان تھا، مرزا سکندر شکوہ کے مکانات ان کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لیے۔ وزیر نے ان سب کی تعمیر کی۔ مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔ اسی جگہ باغ پتھرایں تھا، وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ اس کو خوب تیار کیا اور "امداد باغ" نام رکھا۔ عجب عشرت آباد بن گیا۔ دکانوں سے بازار تحفہ بن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونقِ دین اور کچھ حرص نہیں۔ ایک مجتہد ملازم ہیں۔ صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ نقد تقسیم زر ہوتی ہے۔ مرزا جی کا باغ مول لیا ہے۔ اس کے قریب درگاہ حضرت عباس علمبردار بنائی ہے جہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحبِ نیاز مند بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پہ ناز کرتا۔ مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا عہدہ دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کٹے۔ کچھ حسبِ حال مقدرت حاصل ہوئی۔ جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب موافق رہے۔ خدا کا شکر و سپاس ہے، یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا۔ یہاں نہ تو خوش صورت ہے، نہ خوش خط ہے۔ املا بھی غلط، انشا بھی غلط، شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے۔ خدا ہمارے محسن پہ احسان کرے۔

بعد ازاں گردشِ روزگار ہوئی۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ آسمان و زمین دوسرے ہو گئے۔ فلک نے ہمیں خانہ نشین کر دیا۔ کیا کیا جورِ زمانہ ہوئے، تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا، دل کو نہایت ملال ہوا۔ میرے سر پہ اس قدر بلا پر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی، الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

---

[1] حکیم سنائی، المتوفی ۵۴۵ھ۔ حدیقہ میں پسندیدہ مطالب، اخلاقی سود مند نصائح اور صوفیانہ مسائل کا بیان ہے۔

میں یہاں نیک نام رہا۔ اب علی نقی کی محبت میں تمام ہوں۔ سخن مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ میں کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوانِ خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحب

جناب اسیر کے دادا صاحب کا نام سید محمد علی تھا جو مولوی سید معین الدین ابن محمد صالح کروری کے بیٹے تھے۔ امجد علی بادشاہ اودھ اور واجد علی شاہ اختر کے عہدِ حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ تدبیر الدولہ، مدبر الملک مظفر علی خان بہادر جنگ حضرت اسیر کے خطاب تھے جو دربارِ اختری سے مرحمت ہوئے۔ فنِ شعر میں حضرت مصحفی کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ انتخاب یادگار صـ۱۰) ریاست رام پور میں نواب سید محمد سعید خان کے عہد میں ملازم ہوئے۔ نواب سید یوسف علی خان ناظم کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ نواب کلب علی خان خلد آشیاں کے عہد میں دوبارہ ملازم ہوئے۔

ولادت:- حضرت اسیر کی صحیح تاریخ ولادت کسی تذکرے سے دستیاب نہ ہو سکی البتہ "انتخاب یادگار" (۱۲۹۰ھ) میں حضرت امیر مینائی نے ان کی عمر پچھتر سال بتائی ہے۔ اس حساب سے سنہ ولادت ۱۲۱۵ھ قرار دیا گیا ہے۔

وفات:- اسیر مرحوم کے سالِ وفات اور مدفن کے متعلق اختلاف ہے۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) میں تاریخ وفات ۱۲۹۶ھ درج ہے اور صاحب خم خانۂ جاوید نے مدفن رام پور تحریر کیا ہے جو غلط ہے۔ حضرت اسیر نے ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں وفات پائی۔ چنانچہ امیر مینائی مرحوم نے اپنے استاد کی وفات پر جو تین اشعار کا قطعۂ تاریخ کہا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے۔

دیدم بفغاں و نالہ گفت امیر
سلطانِ سخن، امامِ فن، قبلۂ من

۹۹ ھ ۱۲

"سلطانِ سخن امامِ فن قبلۂ من" مصرعِ تاریخ ہے جس کے عدد ۱۲۹۹ برآمد ہوتے ہیں۔

اسی طرح "مسدس تہنیت جشن بے نظیر" مصنفہ میر یار علی جان ریختی گو مرتبہ محمد علی اثر رامپوری کے صفحہ ۴۹ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

> "ہم نے مزید تحقیق کی غرض سے جب اخبار "دبدبۂ سکندری" رام پور مطبوعہ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۸۲ء جلد نمبر ۱۸ کے صفحہ ۴ کو دیکھا تو یہ اعلان ملا کہ (اودھ اخبار میں [illegible] دیکھ کر کمال صدمہ ہوا کہ ۷ فروری ۱۸۸۲ء کو منشی سید مظفر علی خان اسیر نے قضا کی۔ گویا شاعری کا چراغ گل ہو گیا۔"

اس تحقیق سے نہ صرف تمام اختلافات سالِ ہجری و عیسوی ختم ہو گئے بلکہ صحیح تاریخ و ماہِ وفات کا بھی تعین ہو گیا۔

امیر اللغات حصہ دوم صفحہ ۲۵۱ پر حضرت امیر مینائی فرماتے ہیں:-

"۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کو دو بجے دن کے لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔"

تصانیف:- ۱- گلشنِ تخشن (دیوان فارسی) ۲- گلستانِ سخن (دیوان اُردو) ۳- ریاضِ مصنف (دیوان اُردو) ۴- ریاضِ مصنف (دیوان اُردو)

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سے رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور رہے۔ ان ایام میں ایسے بادشاہ کہاں۔ پائے تخت بلند رہے۔ چشم بد سے گزند نہ پہنچے۔ مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو در حقیقت گل انتخاب تھی۔ میں نے حسب الحکم اسے نظم کیا۔ سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔

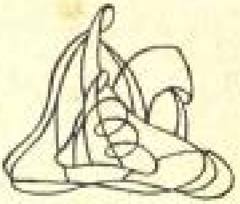

(حاشیہ صفحہ سابق) ۵۔ گلدستۂ امامت (دیوان منقبت میں) ۶۔ دیوانِ امیر (اُردو) ۷۔ دیوان غیر مطبوعہ ۸۔ کلیات قصائد (فارسی و اُردو میں قصائد کا مجموعہ) ۹۔ ورۃ التاج (عاشقانہ مثنوی) ۱۰۔ مثنوی جس میں نواب امین الدولہ وزیر کے زخمی ہونے کا ذکر ہے۔ ۱۱۔ مثنوی معارج الفضائل (معجزات ائمہ معصومین) ۱۲۔ ذکر کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار (علم عروض و قوافی کے بیان میں) ۱۳۔ شجرۃ العروض (علم عروض کے بیان میں) ۱۴۔ روضۃ القوافی (علم قافیہ کے بیان میں) ۱۵۔ رسالہ اضافت (اضافات کی بحث میں) ۱۶۔ رسالہ تشریح الحروف (فارسی میں) ۱۷۔ [illegible] (علم نحو زبان فارسی) ۱۸۔ مراثی اور سلاموں کا مجموعہ جو ہنگامۂ غدر میں تلف ہو گیا۔

مندرجہ ذیل داستانیں حضرت امیر کی تصنیف سے ریاست رام پور کے کتاب خانے میں موجود ہیں:۔

۱۹۔ طلسم باطن بالا باختر ۲۰۔ طلسم باطن آفات ۲۱۔ طلسم ضحاکیہ ۲۲۔ طلسم نادر در رنگ ۲۳۔ طلسم باطن زیر نجات
۲۴۔ طلسم زبان ۲۵۔ ترجمہ لعل نامہ

(مرتبہ کسریٰ منہاس)

صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد صفیر حسینی واسطی بلگرامی شاگرد سحر لکھنوی و وزیر لکھنوی و غالب دہلوی عرض کرتا ہے کہ ۱۲۴۹ھ[1] میں میری ولادت مقام مارہرہ ضلع ایٹہ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں بلگرام ہوتا ہوا والدین کے ساتھ قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد میں آیا۔ چودہ برس کی عمر میں مجھے شعر و سخن کا شوق ہوا۔ میرے گھر عربی فارسی اردو سب کا ذخیرہ موجود تھا۔ اور میرے بزرگ سب اپنے زمانے کے یکتا تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی صحبت اور ذخیرہ کی کثرت نے مجھے اچھی طرح اس راہ کے چلنے میں مدد دی اور بہت جلد منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ دو باتیں مجھے ایسی آگئیں۔ یا یہ میری جبلت تھی۔ کہ کسی کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھنا اور حتی الوسع تحقیق میں کوشش کرنا۔ ان دونوں باتوں نے آنکھوں کے آگے سے پردے اٹھا دیئے۔ یعنی پہلی بات کے سبب ہر ایک کا کلام بنظرِ عظمت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیونکہ میں آپ کو ہر ایک کا ذلّہ ربا سمجھا۔ دوسری بات نے ان کے کلام سے جو کچھ حاصل کیا۔ اس کو حافظہ میں محفوظ رکھا۔ اور جس میں شک ہوا۔ دوسری کتابوں کے دیکھنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ جس کے سبب سے شوق کا درجہ ایسا بڑھا کہ جمیع علوم و فنون کی کتابوں پر آمادہ کر دیا۔

؎ تمتع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

سوانح عمری اس تحقیقات کی بہت طول طویل ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں دونوں باتوں نے لوگوں کو میری طرف گرویدہ کر دیا۔ اور آخر یہ کہنے کا موقع ملا ع شکر خدا کا ہم بھی اب آئے شمار میں

میرا فن اگرچہ شاعری ہے۔ مگر کسی غیر شاعر سے مجھے لڑائی نہیں ہوئی۔ اور ہوئی تو انہیں سے آخر یہ سمجھ کر چپ رہنا پڑا کہ

؎ نہ ہو جس کو علاقہ کچھ تو پھر اس کی عداوت کیا؟

ہمیشہ دشمنِ جاں آشنا ہوتے ہوئے دیکھے

الغرض ان دونوں باتوں کے استحکام کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پہلے تو شعرا کے کلام کا ذخیرہ اور ان کی حقیقت حال کا مجموعہ میرے پاس تیار ہو گیا اور پھر ان کے جھگڑے قضیے بگاڑ بناؤ کے جو حالات معلوم ہوئے تو تحقیق کا درجہ بڑھ گیا۔ اکثر تحریریں مفید میرے قلم سے نکلی ہیں کچھ چھپ گئی ہیں اور کچھ قلمی ہیں۔

[2] ۱۲ھ میں بندہ اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا۔ اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رستہ میں فرخ آباد دیکھا۔ وہاں جناب ڈپٹی طالب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کی۔ لطف اٹھایا جب مارہرہ پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربطِ خاص تھا۔ مگر لطف یہ ہے ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت غالب

---

[1] تذکرہ جلوۂ خضر صفحہ ۵۰

[2] جلوۂ خضر صفحہ ۲۳۱

کا شاگرد ہوں۔ اور ایک عریضہ سے دو غزل ہندی کے مارہرہ سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد قصری ابر گہربار کی اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بفرمائش تفضل حسین خاں، جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا ہے، مارہرہ میں کہا تھا کہ اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا۔ اور وہاں سے آرہ پہنچا۔ حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا۔ حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ میں بھیجا۔ میں نے ایک جلد بھیج دی۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ[1] میں بے اختیار مجھے آرہ سے دہلی چلنے کی تحریک کی۔ اور بے شان گمان مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا۔ نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک لوکرہ بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔ شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی۔ صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدہ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے۔ دیکھ کر بشاش ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں۔ میں نے عرض کی صفیر۔ ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا۔ بولے ذرا ٹھہر جائیے۔ یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے۔ اور برآمدہ سے اندر آکر بیٹھے۔ گرمی کے دن تھے۔ صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار، دوپلی کالی دار، نیمہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا۔ رنگ سرخ سفید، منہ پر ڈاڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا۔ جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۲

خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے۔ دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے۔ جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۶۔ غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی۔ خوب لطف اٹھائے۔ آخر رمضان ۱۲۸۲ھ تک آرہ چلے گئے جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی۔ جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۷

خالق بے چگونہ نے قصبہ مارہرہ ضلع کول میں مجھے خلعت پہنا دیا، جو میرے نانا حضرت شاہ سید[2] صاحب عالم صاحب علیہ الرحمۃ سجادہ نشین مارہرہ کا مسکن ہے۔ جن کو حضرت غالب دہلوی نے پنج آہنگ اور اردوئے معلیٰ وغیرہ میں پیر و مرشد کر کے یاد کیا ہے۔ اور قصبہ بلگرام کو میرا وطن جو صوبہ اودھ میں نام برآوردہ اور مصدر ارباب علم و فن ہوتا آیا ہے۔ اور شیخ امان علی سحرؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ اور مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا شاگرد، و شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی کا منظور اور میر مظفر علی اسیرؔ کا معتقد ہے۔ مگر آب و دانہ پانچ برس کی عمر میں قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد و قریب عظیم آباد پٹنہ کے لایا۔ اور شوق علم نے ہمیشہ زاویہ نشین نادانی کو اکثر بلاد و امصار میں صورت پرکار پھرایا۔ بار ہا لکھنؤ کی

---

[1] مطابق ۱۸۶۵ء۔ [2] حضرت صاحب عالم مارہروی ولادت ۲۹ ربیع الآخر ۱۲۱۱ وفات ۲ محرم ۱۲۸۸ ہجری۔

میرکا، دل لگا۔ اساتذہ سابق سے سابقہ رہا، تجربات نے روز بروز ترقی کی۔ (مجموعہ فیض صفیر صفحہ ۱۹)

خود نوشت حالات اسی قدر دستیاب ہو سکے۔

ولادت: ۹ اپریل ۱۸۳۴ء، ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ

وفات: بروز دوشنبہ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء مطابق ۲۰ رمضان ۱۳۰۷ھ ۱۲ بجے دن ——— پٹنہ عظیم آباد میں انتقال کیا اور آرہ میں دفن ہوئے۔ کمال لکھنوی فرزند حضرت جلال لکھنوی نے تاریخ کہی۔

میں نے جو سنی ناگہاں مرگ صفیر کی خبر — منہ سے نکل گئی اک آہ، آکے لگا جگر میں تیر
کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال — اڑ گئے جا کے اب صفیر روح القدس کے ہم صفیر

۱۳۰۷ ہجری

تصانیف:

(۱) صفیر بلبل۔ دیوان (۲) خمخانہ، دیوان (۳) دیوان صفیر ۳ جلد (۴) دیوان صفیر (در بحر مثنوی سالم) (۵) دیوان صفیر ۳ جلد فارسی (۶) تذکرہ جلوۂ خضر جلد اوّل (۷) تذکرہ جلوۂ خضر جلد دوم (۸) چشمۂ کوثر، تذکرہ مرثیہ گویاں (۹) مثنوی در جواب گلزار نسیم (۱۰) مثنوی در معرفت (۱۱) مثنوی خوان یغما (فارسی) (۱۲) مثنوی دعوت احباب (۱۳) دیگر مثنویات اردو (۱۴) دیگر مثنویات فارسی (۱۵) رشحات صفیر (تذکرہ تانیث) (۱۶) جغرافیہ بلگرام (۱۷) تاریخ بلگرام ۳ جلد (۱۸) رسالہ عروض (۱۹) رسالہ فن طباعت (۲۰) رسالہ محاورات (۲۱) مجموعہ رباعیات (۲۲) مخمسات (۲۳) مراثی سلام، قطعات (۲۴) قصائد فارسی (۲۵) قصیدہ زمزمہ (جوبلی قیصر ہند) (۲۶) درسوخت (۲۷) ترجمہ بوستان خیال ۱۰ جلد (۲۸) مختصر بوستان خیال ۳ جلد (۲۹) تحفہ ہائے دیگر (۳۰) جوہر مقالات (ناول بطرز مرآۃ العروس) (۳۱) جواب نصاریٰ (۳۲) ابعاد ثلاثہ (۳۳) آئینۂ فیض (۳۴) بیاض اشعار (۳۵) گلستان مسرت (۳۶) گلدستۂ ادبین (۳۷) مناظرہ زلف و رخ (۳۸) تحقیق الصاد و تحقیق زبان اردو (۳۹) خاتم (۴۰) تماثل (۴۱) نادر علی (۴۲) حسین نامہ (۴۳) ہیکل (۴۴) مجرفات (۴۵) مطلع الانوار (۴۶) مرغوب القلوب (در حال تیار) (۴۷) صراط مستقیم (۴۸) قیامت نامہ (۴۹) شبستان معراج (۵۰) معراج العقول در عظمت آل رسول (۵۱) ترجمہ تفسیر منہج الصادقین (۵۲) جوشش وحشت (۵۳) شور محشر (۵۴) تحفۂ مسرت (۵۵) عجز و فخار (۵۶) راحت طفل (۵۷) نالۂ نادر موسوم بہ ترغیب (۵۸) جام کوثر (۵۹) ہیلی (۶۰) چیستان (۶۱) متفرقات (۶۲) مکاتیب۔

سحر: شیخ امان علی لکھنوی۔ ناسخ کے شاگرد، کلام فصیح رنگ عاشقانہ۔ تذکرہ تانیث جلیل صفحہ ۲۶۵

بحر: شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ تحقیق الفاظ و محاورہ میں مشہور، فن عروض کے استاد تھے۔ رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

تسلیم لکھنوی

چمنستانِ سخن اور اس دانش، نخلبندِ گلستانِ آفرینش کی آبیاری حمد سے شاداب ہے کہ جس نے گل زمینِ خیالاتِ شعرا میں مضامین رنگا رنگ کے پھول کھلائے بہارستانِ بلاغت و فصاحت اور چمن آرائے گیتی کی نعت سے سرسبز و شاداب ہے کہ جس نے ارشاد انا افصح العرب والعجم سے ہم کو صنائع و بدائع کے طریقے سکھائے صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم بعد حمد کبریا و نعت سرورِ انبیا سر برآوردۂ گروہِ گمنامی پست نشین صدرِ والا مقامی محمد امیر اللہ تسلیم خوشہ چین خرمنِ فیض جناب نواب اصغر علی خان نسیم[1] شاگرد رشید والا مناقب بلند مناصب جناب حکیم مومن خان صاحب دہلوی بیوالہ ضعیف عباد اللہ مرقعہ عبا خدمت ارباب سخن و ماہرین فن اظہار مدعا کرتا ہے ضروری مطلب پیرایۂ تحریر میں ادا کرتا ہے کہ چھپ جانے دیوان اول بہت کچھ تجربہ ہر روز خیال سرمایۂ آشفتہ حالی فراہم ہوگیا۔ جس کا ترتیب دینا بھی اہم ہوگیا۔ دیکھ کر دل پریشان ہوتا ہے کار کا نقصان ہوتا۔ آخر حسب ارشاد محب دلی جناب منشی اشرف علی صاحب کو شاگرد رشید جناب نسیم دہلوی کے ہیں اور بڑے ماہر مشاق فن شاعری کے ہیں ردیف وار لکھنا شروع کیا ایک مدت میں سب کو ترتیب دیا۔ ہنوز نظر ثانی کی نوبت نہ آئی تھی۔ اطمینان خاطر نے صورت نہ دکھائی تھی۔ دیوان مختصر تھا جلد نہ ہوا تھا کہ احباب واسطے دیکھنے کے لیے جانے لگے مگر نظم کا اٹھانے لگے جب مجھ کو واپس دے گئے میں نے صندوق میں رکھ دیا۔ پھر مدتوں تک نہ دیکھا جب صاحبان مطبع نے واسطے طبع کے طلب فرمایا تب خیال آیا کہ ایک نظر دیکھ کر اطمینان دل حاصل کروں۔ نقصانات کو نکال کر کامل کروں۔ دیکھا تو جا بجا سے ابتر پایا اکثر کترا پایا نہیں معلوم کہ یاروں نے بے پرواہی سے تلف کر دیا یا اپنا دیوان ناقص کامل کیا ناچار باقی ماندہ پھر سے ردیف وار لکھا مگر نئے سرے سے طلب دیوان پھر اک جگہ کیا اور ایک دیوان میرا زمانہ غدر میں وقت فرار خلاق چھوٹ گیا۔ اثاث البیت کے ساتھ لکھنؤ میں لٹ گیا۔ وقتاً فوقتاً جو شعر یاد آگیا لکھتا گیا۔

اس دیوان میں ہر ردیف کے آخر میں بطور متفرقات درج کر دیا۔ اس مجموعۂ پریشانی کا تاریخی نام نظم دل افروز رکھا۔ ارباب سخن و ماہران فن سے امید ذرہ نوازی کا خواستگار ہوں کہ وقت سیر جہاں کہیں غلطی یا خلاف محاورہ ملاحظہ فرمائیں۔ راہ عطوفت سے چھپائیں۔ میں اس فن خاص میں مرد میدانی ہوں لیاقت و قابلیت کی طرف سے بہرہ اندوز ناکامی ہوں۔ صرف طبیعت موزوں رکھتا ہوں کبھی کبھی اپنا دل خوش کرنے کو شعر کہہ لیتا ہوں بقول میرزا آشنا

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

---

[1] نواب اصغر علی خان پہلے اصغر تخلص کرتے تھے۔ پھر نسیم اختیار کیا۔ خاطری دلی میں سے تھے۔ ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی تسلیم لکھنوی نے تاریخ کہی۔

حضرت گل در شیونم تاریخ ہا نسیم ملک معانی ہے

[2] احمد حسن نام عرف امیر اللہ مولوی عبدالصمد صاحب کے فرزند تھے۔ قصبہ منگلسی میں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے ان کا مولد کسی فیض آباد تھا۔ ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا مرزا احمد حسین لکھنوی نے تاریخ کہی۔

سال رحلت یہ لکھا ہوں نے ہے غم مرگ جناب تسلیم ۱۳۲۹ھ

سیّد غلام حسنین قدرؔ بلگرامی

ولادت: ۱۲۴۹ھ　　　وفات: ۱۳۰۱ھ

برادر برابر سید فرزند احمد صاحب صفیرؔ دیروزی۔ عجبا۔ مزاج مقدس دو خط آپ نے بھیجے اور ایک پیغام آپ نے بلگرام کی تاریخ شروع کی بلا تمام۔ یہ بڑا کام کیا۔ تمہید بھی اچھی لکھی ہے۔ مجھے یوں نہ لکھو دیا، کہ ایک فقیر مذہب آزاد مشرب ہے۔ بگڑا۔ لاابالی مزاج۔ نیم دیوانہ نیم ہوشیار ہے۔

نہ بے آزاد پابندی　　　نہ بے پابند آزادی
بکار خویش سرمستی　　　بکار غیر ہشیاری

بھئی سچ کہوں یا جھوٹ۔ جھوٹ بولے مری بلا۔ میرا خدا اور میں اتنا جانتا ہوں، کہ شفقت علی میرے باپ کا نام اور کرامت علی دادا تھے۔ اور شاہ عبدالواحد شاہدی جدّ اعلیٰ اور سید محمد صاحب المعروف مصطفیٰ جد القبیلہ زیدیہ سید ہوں۔ زید سجادؑ کے بیٹے۔ سجاد حسینؑ کے فرزند۔ حسین حضرت فاطمہ کے جگر گوشہ۔ فاطمہ پیغمبرؐ کے جسم کا ٹکڑا۔ طریقہ پوچھو۔ تو نصیری ہوں ؎

شیعی مرا طریق ہے آگے خدا کا نام
بے شک علی بھی نام ہے پروردگار کا

فارسی گویوں میں غالبؔ سے بہتر اور اردو میں بحرؔ سے بہتر اور مرثیہ میں انیسؔ سے بہتر کسی کو نہیں جانتا۔ تیس برس سے شعر کہتا ہوں۔ اور شعر کہنا نہ آیا۔ دو دیوان مرتب تھے۔ انہیں چھانٹ کر سنہ ۱۲۸۵ ہجری میں ایک کیا۔ اور تم خانہ رکھوا دیا۔ اب تیسرا دیوان جس کو میرے حساب دوسرا سمجھنا چاہیے ترتیب دے رہا ہوں۔ اس میں صرف مسمط چہار خانہ کے ارکان ہیں۔ علاوہ کوئی غزل نہیں۔ ابتدائی مشق میں ایک مثنوی قضا و قدر کی اور اچھی، جس کو اب میں خود ناپسند کرتا ہوں۔ دوسری مثنوی دیا دۂ ارغوانی بطور ساقی نامہ ظہوری کی طرز کی تھی۔ جس میں سید فرزند احمد صفیرؔ کے ذکر کی ایک چوری داستان رکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

کروں حمد ساقی جام الست　　　کہ ہو جس سے درست دیا دست
نکلے جب قلمدان سے خانہ ہو　　　چلے جب قلم رقص مستانہ ہو

حضرت قدرؔ کا تاریخی نام غلام حسنین تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی ولادت کی تاریخ میں یہ قطعہ موزوں کیا تھا۔

سر جان سے ہیں فدائے نام حسنینؑ　　　ہے چشم و دل و جگر غلام حسنینؑ
ہم روز ولادت سے ہوئے نام آور　　　تاریخی نام ہے غلام حسنینؑ
۱۲۴۹ھ

مگر افسوس کہ ۱۲۹۵ھ ہجری میں جب میں مہونا سے تبدیل ہو کر ہردوئی جانے لگا۔ وہ کتاب نو جزو کی اور سواد تصنیف سے ریل پر رہ گئے۔ جن کا ایک مصرع میرے پاس نہ رہا۔ پھر اب تیسری میں لگ گیا ہوں۔ اور لیلۃ القدر اس کا نام ہے۔ یہ مثنوی کلید دو سنہ کا ترجمہ ہے۔ نصف کتاب نظم ہو چکی ہے۔ کہ کار فرما کا انتقال ہو گیا اور اس طرح ادھوری پڑی ہے۔

عروض فارسی۔ عربی اردو میں ایک رسالہ ۹ جزو کا مرتب ہو گیا۔ اس کا تاریخی نام قواعد العروض[1] ہے۔ اب تک اہل فن سے مباحثہ کرتے گزری۔ آخر کو میری باتیں بحال رہیں۔ وہ کتاب تمامت کر چکی۔ کیا عجب کہ جلد چھپ جائے۔

بعدہٗ اشعار گلستان کے کل نظم کی تقطیع سے چند اشعار لکھ کر بفرمائش نظام یار جنگ بہادر حیدر آبادی نظم الارکان ۱۲۹۲ ہجری سے موسوم کیا۔ اور حیدر آباد بھیجی۔ ابھی تک دو برس سے وہاں پڑی ہے۔ وعدوں کا دودھ پلا رہی ہے۔ نہ چھاپنے دیتے ہیں نہ خود لیتے ہیں۔

نظم الارکان سے پیشتر بحکم ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اودھ ایک رسالہ الموسوم "حل مجموعہ" لکھا اس کا انعام بھی مل گیا اور چھپ بھی گیا۔ یہ کتاب ایک رسالہ کی شرح ہے جس کا نام مجموعہ حق ہے۔

فی الحال ایک کتاب اور زیر تحریر ہے۔ اس میں اردو کے محاورات ہیں۔ اور اہل دہلی میں ذوق۔ غالب۔ مومن اور لکھنؤ والوں میں ناسخ۔ آتش اور دونوں کے تلامذہ یک پشتی کے کلام سے نکال کر لکھتا ہوں۔ یہ کتاب ابھی ناتمام ہے۔ اور اصل میں پانچ بحث ہیں۔

اول: محاورات حال و تمیز۔ محاورات کل و بیرونی۔ دوم: تذکرہ تانیث جہاں دونوں میں مشترک ہیں یا تفصیل طلب۔

سوم: وہ الفاظ جن کا تعلق محاورات سے ہے مثلاً ڈھے پڑ دیا روک وغیرہ۔

چہارم: وہ محاورے جن کا ترجمہ فارسی میں موجود ہے۔ مثلاً آگ لینے آنا۔ آتش در گرفتن فارسی میں موجود ہے اور ایک ہی معنی پر۔

پنجم: وہ الفاظ جن میں اساتذہ کی بحثیں ہیں۔ آیا یہ فارسی الاصل ہیں۔ یا اردو۔ مثل تیجہ وغیرہ۔

الغرض ابھی تک صرف پانچ چھ شعرا کے کلام سے محاورہ لکھے ہیں۔ اور کتاب قریب چالیس جزو کے پہنچ گئی۔ بظاہر یہ کتاب میری عمر سے پیشتر ختم ہوتی معلوم نہیں ہوتی۔ ع

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

اے فرزند عزیز تیرے مرحوم باپ کی قسم۔ مجھے اپنا حال اسی قدر معلوم تھا۔ بزرگوں کے مقامات بشرح و بسط بزرگ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑے ماموں کو لکھا ہے کہ وہ لکھیں گے۔ تمہیں بھیج دوں گا۔ میں نے اپنا دیوان ایک شاگرد کو دیا ہے کہ وہ دو غزلوں کی نقل کر دے۔ اور کہا ہے کہ جو تمہیں پسند آئیں۔ وہ غزلیں لکھ دو۔ آج شام کو وہ دے گا۔ اسی دم اس خط میں رکھ دوں گا۔

تم نے نام تاریخ بلگرام کا میری رائے کے خلاف رکھا۔ دار السلام کیوں نہیں رکھتے۔ یہ نام بھی دار السلام بلگرام کا لقب ہے۔

جب تک تم پسند نہ کرو گے میں کتاب محاورات کا کاتب نہ ہوں گا۔ ایک جزو بھیجنے میں مجھے نہایت تکلیف ہوگی۔ نقل کرنے کو میں تالیف سے زیادہ مشکل جانتا ہوں۔

شیخ امان علی سحر مرحوم کا چھوٹا سا دیوان چھپ گیا ہے۔ اور ان کے علاوہ آپ کے پاس ان کی غزلیں اور ہوں تو ہم از سر نو چھپوا سکتے ہیں۔ (تذکرہ جلوۂ خضر جلد دوم حصہ اول ۲۳ شعبان روز پنجشنبہ (سنہ درج نہیں) از صفیر بلگرامی مطبوعہ آرہ۔ شاہ آباد)

---

[1] قواعد العروض ایک نایاب کتاب ہے۔ علم عروض میں اس سے بہتر کتاب آج تک نہ چھپی۔

جلال لکھنوی

نام سید ضامن علی تخلص جلالؔ ابن حکیم اصغر علی خان تلمیذ امیر علی خان ہلال تلمیذ برق۔

فقیر ہیچمداں، کج مج بیاں، خرمن سخنوران کا ادنیٰ خوشہ چیں خوان پایۂ فصحائے اردو زبان کا زلہ ربائے کمترین احقر بندگان ایزد متعال حکیم سید ضامن علی متخلص بہ جلالؔ۔ کہ جب سے زبان اردوئے معلّیٰ نے علم ایجاد کو میدان گاہ سخن میں بلند کیا کسی سخن ور اردو زبان نے کوئی لغت ایسا کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات و محاورات و کنایات و مصطلحات و مثلہائے زبان اردو کا اور بعضے ان لغات اردو کا جن کو جملہ یا بعض فصحائے متاخرین نے استعمالاً ترک کر دیا ہے اور بعضے ان لغات کا جن میں باہم فصحا میں اختلاف ہے یعنی کچھ فصیح کسی طرح ان لغات کو بولتے ہیں اور کچھ فصیح کسی طرح بولتے ہیں، آج تک نہیں لکھا۔ پس بنا بریں مؤلف مستہام بہ سعی بلیغ و کوشش و استقرائے تام چند سال کی مدت میں جامع اس کتاب جامع کا ہوا بدیں نہج کہ جملہ محاوروں اور کنایوں اور اصطلاحوں اور مثلوں کے معنی اور محل استعمال لکھ دیے اور بیشتر کے اسناد و نظائر کلام نظم شعرائے نامور و معتبر اردو زبان سے اخذ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کیے اور جن محاوروں اور کنایوں وغیرہ کی فارسی یا عربی دستیاب ہوئی وہ بھی بعد حل معنی و بیان محل استعمال کے لکھ دی اور اختصار کے واسطے ہر جگہ علامت فارسی کی (ف) اور علامت عربی کی (ع) لکھی گئی اور جو محاورے مختص تھے عورتوں کے ساتھ یا مشترک تھے مرد و زن میں ان کی اطلاع بھی جابجا کی گئی اور محاوراتِ خواص اور محاورات عوام یعنی بازاریوں کے محاوروں پر بھی آگاہی دی گئی اور ترتیب میں اس تالیف کے حرفِ اول کو باب اور حرفِ ثانی کو فصل قرار دیا گیا اور باقی حروف کی ترتیب میں موافق ترتیب حروفِ تہجی کے اہتمام کیا گیا اور اس کا نام سرمایۂ زبانِ اردو رکھا گیا۔

ہیچمداں کی تالیفات و تصنیفات سے آٹھ کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہیں کہ ہر ایک ان میں سے مطبوع طبائع اہل سخن ہیں تمام عالم ان کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ وہ آٹھوں کتابیں یہ ہیں۔ تنقیح اللغات، گلشن فیض، سرمایۂ زبانِ اردو (لغت میں)، مفید الشعرا (تذکیر و تانیث میں)، افادۂ تاریخ (بحث قواعد تاریخ گوئی)، شاہد شوخ طبع (اردو کا دیوان اول)، کرشمۂ گاہ سخن (دیوان دوم)، مضمون ہائے دلکش (دیوان سوم) اب یہ نویں تالیف ہے کہ ایک مختصر سا رسالہ چند قواعد میں زبان ہندی الاصل کے وہ قواعد جو سلف سے آج تک نہیں لکھے گئے اور وہ زبان ہندی الاصل جو اردو میں بھی مستعمل ہے تالیف کیا گیا ہے۔ نام اس کا منتخب القواعد رکھا گیا ہے اور بنا اس کی صرف دو بابوں پہ قائم کی گئی ہے۔

(ماخوذ از سرمایۂ زبان اردو اور منتخب القواعد و افادۂ تاریخ)

حضرت جلال ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شروع میں حضرت ہلال سے اصلاح لی لیکن

والد نے ان کو جلد ہی اپنے استاد میر علی اوسط رشک[1] کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جلال اعلیٰ درجے کے شاعر اور تحقیقات لغات میں بے مثل تھے۔ فن عروض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء (۱۳۲۷ھ) کو ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔[2]

مشفق و مہربان کل احباب آں سخن گوئے کہ زیں سال برد
گفت تاریخ رحلتش جعفر وائے ضامن علی جلال برد

۱۳۲۷ھ

تصانیف :۔

۱۔ شاہد شوخ طبع، دیوان اوّل
۲۔ کرشمہ گاہ سخن، دیوان دوم
۳۔ مضمون ہائے دلکش، دیوان سوم
۴۔ نظم نگاریں، دیوان چہارم
۵۔ افادۂ تاریخ، تاریخ گوئی پر مختصر رسالہ
۶۔ منتخب القواعد، قواعد اُردو
۷۔ گلشن فیض، فارسی لغت
۸۔ تحفۂ سخنوراں (سرمایۂ زبان اُردو)، اُردو لغت
۹۔ مفید الشعرا، تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ
۱۰۔ دستور الفصحا، فن عروض پر ایک رسالہ
۱۱۔ تنقیح اللغات، صحت لغات میں ایک تحقیق
۱۲۔ دیوان پنجم (غیر مطبوعہ)
۱۳۔ نقشہ عروض، جس میں جملہ بحور کا بیان ہے
۱۴۔ رسالہ عروض و قوافی، قوافی کی فہرست
۱۵۔ داستان بالا باختر، (غیر مطبوعہ) سرکاری کتاب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

---

[1] علی اوسط نام، رشک تخلص، میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ وطن فیض آباد تھا، لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ ناسخ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ لغات کی تحقیق اور زبان کی تصحیح میں ناسخ کے تمام تلامذہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نفس اللغۃ ان کی مشہور تالیف ہے۔ نظم گرامی اور نظم مبارک دو دیوان بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔

آخر عمر میں عتبات عالیہ کی زیارات کے لیے کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے اور وہیں ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔

میر صاحب جو تھے علی اوسط
چل بسے آہ سوئے ملک بقا
مصرع سال فوت کہہ رحمت!
رشک کامل نے انتقال کیا!

۱۲۸۳

[2] جلال لکھنوی از ڈاکٹر محمد حسن صفحہ ۲، اگلی رفتار صفحہ ۲۳، لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۴۹۵ اور دوسری کتابوں میں وفات کا سال ۱۳۲۵ھ مرقوم ہے جو غلط ہے۔

شاہ محمد غوثؒ

وصال بمقام لاہور ۱۱۵۲ ہجری

میرے اور مجھ عاجز کے والد سید حسن کا نسب کئی واسطوں سے سید عبدالقادر الحسنی الحسینی الجیلانی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل ہے۔

حضرت سید حسن بن سید عبداللہ بن سید مسعود بن سید عبدالقادر بن سید عبدالباسط بن حسین بن سید القطب العالم بن سید احمد بن سید شرف الدین قاسم بن شرف الدین یحییٰ بن سید بدرالدین حسن بن سید علاؤالدین علی بن سید شمس الدین محمد بن سید شرف الدین یحییٰ بن سید شہاب الدین احمد بن سید قطب العالم بن سید صالح النصر بن قطب الدائرہ سید عبدالرزاق بن قطب ربانی غوث صمدانی حضرت سید عبدالقادر جیلانی الحسنی الحسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

اس عاجز کے دادا کا نام سید محمود ہے۔ بغداد سے ملک ٹھٹھہ میں تشریف لائے اور وہاں سادات کے خاندان میں سے ایک کے ہاں آپ کی شادی ہو گئی اور عاجز کے والد پیدا ہوئے کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے آپ پر محبت الٰہی غالب تھی۔ اپنے والد ماجد اور بعض دیگر بزرگوں کی خدمت میں مشغول رہ کر ریاضتوں اور مجاہدوں اور صفائے دل اور خلوت اور تنہائی میں بسر کرتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال اور حصول کے بعد عزم سفر کیا۔ ہند اور عرب کی سیر کی۔ بزرگوں کی زیارت سے مستفید ہوئے۔

اکثر شہروں میں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خلوت میں بیٹھے۔ چلّے کاٹے اور فائدے اٹھائے۔ اس کے بعد سیر کے طور پر ملک پشاور میں تشریف لائے کچھ مدت بعد باطن میں حضرت غوث اعظمؓ سے حکم ملا کہ تم اسی ملک میں قیام کرو، سیاحت چھوڑ دو اور شادی کر لو۔

اس کے بعد آپ نے غور کیا کہ اگر صحیح النسب سیدوں کا کوئی بڑا خاندان ہو تو وہاں شادی کی جائے چونکہ سید عباس فقیر کے ماموں جو حضرت سید علی ترمذی اور سید علی ہمدانی قدس اللہ اسرارہم کی اولاد میں سے صحیح النسب تھے اور بڑے متقی و پرہیزگار تھے اور کمالات ظاہری و باطنی میں کامل تھے ان کی ہمشیرہ سے جو کہ عاجز کی والدہ ہیں حضرت والد ماجد کی شادی ہو گئی اور فقیر پیدا ہوا۔

جب عاجز کی عمر سات سال ہوئی تو بہتیرا ہی قرآن پڑھا ضبط نہ ہوا بہت ہی کم فہم اور غبی تھا۔ عاجز کے والد نے باطن میں جناب پیر دستگیرؓ کے حضور میں عرض کی کہ اس لڑکے پر مہربانی فرمائیں آپ نے مہربانی کی اور علم ظاہر و باطن کا حصہ ملا اس کے بعد تو خدا کے فضل سے علوم کے دروازے کھل گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ظاہری علوم حاصل ہو گیا۔ چنانچہ انیس سال کی عمر میں مروجہ کتب میں نے پڑھ لیں۔ معقول کو چھ ماہ میں پورا کیا اور دوسری کتابوں کی بھی بڑی سرعت سے مطالعہ کر لیا۔

اثنائے تعلیم میں بھی خاکسار کو طلب حق کا بڑا شوق تھا لیکن حضرت والد ماجد فرماتے کہ تحصیل علم سے فارغ ہو چکنے کے بعد تمہیں کچھ بتلا دیا جائے گا۔ چونکہ فقیر کو طلب بہت تھی۔ اس لیے فقراء اور مشائخ میں سے جس کا نام سنتا اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

حافظ عبدالغفور نقشبندی پشاور میں ایک درویش تھے فقیر ان کی خدمت میں جاتا اور فیض صحبت سے مستفید ہوتا۔ شیخ یحییٰ قدس اللہ اٹک میں رہتے تھے۔ بڑے ہی بزرگ تارک الدنیا اور خدا یاد آدمی تھے ہر وقت مراقبہ ہی میں رہتے تھے میں ان کی صحبت میں جانے اور رہنے

لگا۔ شیخ مذکور ساری رات مراقبے میں اور حبس دم میں گزارتے تھے کبھی ایک نفس کبھی دو نفس اور کبھی تین یا چار نفس میں رات گزر جاتی تھی۔ دنیا اور دنیاداروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ فقیر پر مہربان رہتے اور توجہ فرماتے تھے۔ بعض باتیں ان سے حاصل ہوئیں۔

میرے والد ماجد کا طریق یہ تھا کہ فقراء اور مساکین کی بے حد خدمت کرتے اور سب کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آتے گویا کہ سب لوگ آپ کے عیال ہیں۔ ہر روز کئی آدمیوں کو کھانا کھلاتے کھانا ہر وقت تیار رہتا اور گھر کے خادم دن بھر تقسیم کرتے رہتے یہاں تک آدھی رات کو تقسیم طعام سے فراغت ہوتی کھانا کھلانے یا کسی اور چیز کے دینے میں ان کو ذرا ملال نہ ہوتا تھا نقدی اور پارچات بھی دیتے تھے اور خود لوگوں سے کسی چیز کے لیے بھی التجا نہیں کرتے تھے۔ حکام اور بادشاہ وقت سے مدد معاش قبول نہیں کرتے تھے۔ غیب کے خزانوں سے انہیں مدد ملتی تھی ورنہ ظاہر میں ان کے پاس کچھ نہ تھا عموماً ضروریات کے وقت باوجود ناداری کے انہیں جو مطلوب ہوتا مل جاتا تھا۔

بارہا لوگوں نے ایسا دیکھا کہ ذکر اور شغل کی عبادات میں آپ مشغول رہتے اور درد اور شوق کا اس قدر غلبہ ہوتا کہ اگر کوئی شخص کچھ پڑھتا یا خدا کا نام زبان پر لاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ اکثر روتے رہتے اور جس کو توجہ دیتے اس پر بھی شوق اور درد و شغل کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اسمائے الٰہی کی وحدت کے علم میں بھی کامل تھے اور عالم غیب اور اسمائے کے توسل ان کے مطیع و منقاد تھے۔ آخر عمر تک ذکر مراقبے اور شغل لسانی و قلبی میں مشغول رہے جن عزیزوں کو عمل اسماء الٰہی اور وظائف ظاہری کی طلب ہوتی ان کو اسی قسم کی تلقین فرماتے اور اسی کے آثار ظاہر ہوتے بعضوں کو سلوک باطنی کے طور پر ارشاد کرتے اور بعض کو جذبہ اور توجہ سے ارشاد فرماتے۔

حضرت غوث اعظم بھی ابتدا میں لوگوں کو دعوت اسماء اللہ اور وظائف لسانی میں مشغول رکھتے تھے۔ وسط عمر میں چونکہ خود بھی سلوک اور شغل باطنی میں مصروف رہے۔ لوگوں کو بھی یہی ارشاد فرماتے۔ آخر عمر میں استغراق اور محویت میں محظوظ تھے اس وقت لوگوں کو جذبہ اور نظر توجہ سے تربیت فرماتے تھے۔ چنانچہ بعضوں کو ایک ہی نظر سے مرتبہ ابدال تک پہنچا دیا۔

حضرت والد مرحوم سے بہت خوارق عادات ظاہر ہوتے تھے جو اگر لکھے جائیں تو اس مختصر میں ان کی گنجائش نہیں۔

احقر نے تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں اس رستہ کو والد مرحوم سے طلب کیا۔ انہوں نے قبول کیا اور طریقت اور طریقہ عالیہ قادریہ میں بیعت کر کے شغل اور ذکر کے لیے فرمایا اور خلوت میں بٹھایا۔ چنانچہ چار چلوں تک حضرت والد مغفور کی خدمت میں بیٹھا رہا بعض اعمال اور اشغال عمل میں لا کر ایک علیحدہ مکان میں چھ مہینے تک گوشہ نشین رہا میں ذکر لسانی جہر اور خفیہ طور پر ذکر قلبی و مراقبات کرتا۔ استعداد اور قسمت کے مطابق حالات وارد ہوتے اور اپنے حال کی حقیقت ہمیشہ آپ کے حضور میں عرض کرتا رہتا۔ جو درست ہوتا اس کی تحسین فرماتے اور جس میں غلطی ہوتی اس کا تدارک کرتے۔ اس کی تفصیلات لکھنے میں نہیں آتیں۔ شغل اور کسب ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ چھ سال کے بعد مہربانی فرما کر اجازت نامہ لکھ کر مرحمت فرمایا۔

اگرچہ اس عاجز کو اتنے بڑے کام کی لیاقت نہ تھی لیکن حضرت والد ماجد کی تعمیل ارشاد سے عذر اور انکار نہ کر سکا جو باتیں ضروری تھیں میں اپنے آپ میں نہیں پاتا تھا اور اعلیٰ مطلوب درجہ پر نہیں پہنچا تھا چھ سال کے بعد جناب والد ماجد کا انتقال ہوا ۱۱۳۱ ہجری ماہ ذیقعدہ کی اکیسویں تاریخ کو جمعہ کے دن رحلت فرمائی اور اس عاجز کو خرقہ اور اجازت بخشی اور وصیت کی کہ محتاجوں، فقیروں اور ہر وارد و مسافر کی خدمت کیا کر۔ لوگوں سے کسی قسم کی امید نہ رکھنا امیروں سے کوئی التجا نہ کرنا جو کچھ بتلایا گیا ہے اس میں لگے رہنا اور جو خدا دے اسی پر قناعت کرنا

حضرت والد مرحوم کے انتقال کے بعد خاکسار کو فقیروں سے ملنے ان کی صحبت میں رہنے اور ان کے طریق کی جستجو کا کمال شوق رہا۔

اسی شہر (پشاور) میں میرے دوست حافظ عبدالغفور کشمیری طریقہ نقشبندیہ میں باأثر بزرگ تھے ان سے اکثر صحبت رہتی۔ اگرچہ ان کی صحبت مؤثر تھی لیکن اس سے میری طبیعت کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اٹک میں میرے دوست یحییٰ نامی ایک باکمال بزرگ ہیں۔ وہاں جاؤ۔ پشاور سے اٹک کو روانہ ہوا اور ان کی خدمت میں پہنچا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ چند روز تک آپ کی صحبت نصیب ہوئی ان کی صحبت میں ذکر قلبی غالب ہوا۔ حبس نفس بہت کرتے تھے۔ رات بھر میں ایک دو دم لیتے تھے۔ بڑے ریاضت کش تھے خدا کے سوا کسی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔ ان کی نظر میں خاک و زر اور شاہ و گدا یکساں تھے۔ شغل حق کے سوا انہیں مطلق فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔ نہ وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے تھے کسی کو آپ کی مجلس میں بات کرنے کی جرأت تھی جو بھی آپ کے حضور میں حاضر ہوتا مہر بلب بیٹھا رہتا۔ صرف خدا کی طرف دھیان جماتا۔ خاکسار کو ان کی صحبت میں بہت فائدہ حاصل ہوا۔ راتیں بیٹھ کر کاٹتے۔ نہ زیادہ سوتے۔ عشا کے وضو سے عموماً نماز تہجد اور نماز صبح پڑھتے ان کی صحبت بہت مؤثر تھی۔ ان سے اکثر کشف اور خوارق عادت ظہور میں آتے۔ چارپائی پر نہیں سوتے تھے نہ تکیہ ہی سر کے نیچے رکھتے تھے سفر پیدل کرتے تھے سوار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے مرشد کی زیارت کے لیے لاہور کا چودہ روز کا سفر تین چار روز میں پیدل طے کرتے تھے۔ خاکسار پر آپ کی باطنی توجہ مبذول تھی۔ کبھی کبھی زبان سے بھی کچھ فرماتے تھے چنانچہ ذکر قلبی اور طریقہ حبس کی بعض ابتدائی اور ضروری باتیں آپ کی صحبت سے حاصل ہوئیں اور آپ نے بھی طریقہ قادریہ نقشبندیہ کی اجازت خاکسار کو عطا فرمائی۔

اٹک کے گرد و نواح میں میاں نور محمد خاکسار کے ایک دوست رہتے تھے جو ظاہری منصب بھی رکھتے تھے اور شاہ رسانہ مجذوب کی صحبت سے آپ کو کامل جذبہ عطا ہوا تھا۔ جس پر توجہ فرماتے تھے صاحب حال ہو جاتا تھا۔ ان کی خدمت میں بھی بار ہا جانا رہا۔ توجہات فرمائیں اور ان کے آثار بھی نظر آئے۔

شاہ محمد فاضل درویش صاحب تاثیر بھی اٹک میں رہتے تھے ان سے بھی کئی دفعہ صحبتیں رہیں۔

میرے ایک اور دوست شاہ زندہ فقیر تھے جو چالیس سال سے بول و براز نہیں کرتے تھے اور ایک جگہ بیٹھے رہتے تھے بہت کم کھاتے تھے۔ بڑے ہی صاحب کمال تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی مہربانی فرما کر رخصت کیا۔

کابل کے پرگنوں میں سے جلال آباد کے قریب بھرکا ایک جگہ ہے وہاں اخوند محمد نعیم میرے ایک دوست ہیں ان کو ظاہری اور باطنی علم میں پوری مہارت تھی۔ میں آپ سے کتاب توضیح و تلویح پڑھتا تھا۔ وہ مجھ پر مہربان تھے۔ خاکسار دو ماہ تک تحصیل کی غرض سے ان کی خدمت میں رہا۔ آپ بھی سلسلہ نقشبندیہ کے پیر تھے اور باطن میں جذبہ بھی رکھتے تھے لیکن نسبت بالفعل کا باطن میں کچھ اثر نظر نہیں آتا تھا۔

پشاور میں تہکال سے شاہ حسین نام شافعی المذہب میرا ایک دوست وارد ہوا۔ بڑا ہی ریاضت کش مرد تھا۔ زبانی وردوں میں پورا شغل رکھتا تھا۔ مجھ پر بڑا ہی مہربان تھا۔ میں ان کی صحبت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے اوراد کے سماع میں دل پر رقت طاری ہوتی تھی۔ وہ کبرویہ طریقہ رکھتے تھے۔

پکھلی میں میرے ایک دوست شاہ چراغ تھے وہ بھی پشاور میں آئے ہوئے تھے کچھ مدت تک ان کی صحبت بھی نصیب ہوئی۔ وہ قادری طریق پر تھے اور دعوت اسمائی دعاؤں اور شغل قلب میں مشغول رہتے تھے مجھ پر بڑی مہربانی کرتے تھے اور اپنے طریق کے متعلق اکثر

خاکسار کے سامنے بیان فرماتے رہا کرتے تھے۔

پرگنہ اٹک کے شہر چھچھ میں شاہ لطیف نام ایک مجذوب صاحب کمال اور صاحب کشف رہا کرتے تھے ان سے اکثر خوارق عادت ظاہر ہوئے ان کی خدمت میں دو دفعہ جانے کا موقع ملا اور ان کے خوارق عادت کو بچشم خود دیکھا۔ ایک دن آپ نے توجہ باطنی بھی فرمائی اور مجھ میں کچھ اثر بھی ظاہر ہوا لیکن ایک دن کے بعد وہ اثر زائل ہو گیا۔

اس کے بعد فقیروں کے دیکھنے کے لیے میں نے ایک لمبا سفر اختیار کیا۔ گجرات پہنچا۔ اس کے اطراف میں نوشہرہ ایک گاؤں ہے وہاں حضرت شیخ پیر محمد سو سال سے زیادہ عمر کے ایک مسن بزرگ رہتے تھے۔ اور مریدوں سے حضرت حاجی ملا ایک بزرگ تھے۔ اس قدر جذبہ تھا کہ توجہ کی ایک ہی نظر سے حرارت، ذکر قلب، گریہ اور حال کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ آپ ایک چھوٹے سے باغ میں پڑے رہتے تھے۔ خادم آپ کے پاؤں داب رہے تھے۔ میں نے بھی پاؤں دبانے شروع کیے۔ آپ نے فرمایا یہ کون عزیز ہے کہ مجھ کو اس کے ہاتھ سے ذکر کی آواز آتی ہے۔ دوبارہ یہ کلمہ فرمایا اور اٹھ کر بیٹھ گئے مجھ سے حال پوچھا اور میرے حال پر توجہ اور مہربانی فرمائی تین دن مجھ کو اپنے پاس رکھا۔ ہر روز توجہ فرماتے تھے اور اپنے ہاتھ سے فقیر کے منہ میں نوالے دیتے تھے۔ ان کی توجہ سے مجھ میں اثر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ نہیں آپ نے مجھ کو اپنی ٹوپی اور چادر دی اور اجازت دے کر رخصت کر دیا جب میں رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں کو جو گوشہ نشین ہیں دیکھتے جانا دو تین دن تک ان کے یاروں کو دیکھنے کے لیے ادھر ادھر جانا پڑا اس کے بعد میں شہر گجرات گیا۔ اس جذبے سے میں نے اپنے آپ میں کوئی اثر نہ دیکھا پھر دوسرے دن شیخ کی خدمت میں گیا۔

گجرات کے قریب کنجاہ میں میرے ایک دوست محمد جعفر ایک بزرگ رہتے تھے جس دم میں بڑی مشق بہم پہنچائی تھی۔ ان کی ملاقات بھی حاصل ہوئی انہوں نے بڑی سخت ریاضتیں اٹھائیں۔ میں نے ان ریاضتوں کی خاطر چلہ کشی کی۔ کچھ فائدہ تو ہوا لیکن کچھ زیادہ اثر معلوم نہ ہوا۔

اس کے بعد میں لاہور میں آیا جو ایک پرانا شہر اور بزرگوں کا مسکن ہے یہاں اولیاء کے بعض مقبروں پر راتیں کاٹیں۔ میں حضرت میاں میر لاہوری کے مقبرہ پر گیا۔ ان کو دیکھا انہوں نے شغل بتایا اور فرمایا کہ اس میں مشغول رہنا اور کسی دوسرے کو مت بتانا۔

اس کے بعد میں نے ایک دوست شیخ حامد سروش کی زیارت کی جو پیر علی ہجویری کے مزار کے پاس ہی دفن ہیں اور اس رات کے متعلق ان سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ رات کو حضرت میاں میر صاحب نے جو کچھ آپ کو ارشاد فرمایا ہے وہ کافی ہے۔

اس کے بعد میں پھر اپنے وطن کی طرف لوٹا اور حضرت میاں میر صاحب اور دیگر بزرگوں کے فرمائے ہوئے شغلوں میں کوشش کی لیکن سابقہ اشغال کے سوا جو حضرت ولی نعمتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور شیخ یحییٰ سے حاصل ہوئے کوئی شغل غالب نہ ہوا۔

لاہور میں خاکسار کے ہم درد دوست میاں جان محمد صاحب بھی ایک بزرگ تھے۔ وہ محدث تھے۔ دعوت اسماء میں صاحب تاثیر تھے۔

میاں جان محمد مرحوم شہر لاہور کے محلہ قصاب پورہ میں رہتے تھے یہ بھی بڑے باکمال بزرگ تھے ان سے بہت سے خوارق عادت اور کشف ظہور میں آئے۔ آپ سہروردیہ طریق پر تھے۔ دونوں بزرگوں کی زیارت نصیب ہوئی اور بعض اسماء اللہ کی اجازت حاصل ہوئی۔

دعوتِ اسماء کے سوا کوئی اور باطنی شغل نہیں فرمایا۔

میاں نور محمد مدقق بھی لاہور میں ایک فاضل اجل بزرگ تھے۔ زاہد متوکل اور مرتاض تھے طریقہ قادریہ میں خاص دسترس حاصل تھی۔ ان کی خدمت میں ایک ماہ تک صحبت نصیب ہوئی باطنی اشغال بتلائے اور بعض دوسرے بزرگوں کو بھی وہاں دیکھا۔

میں پشاور گیا تو ہندوستان سے شیخ سرور نام ایک درویش پشاور میں وارد ہوئے۔ ان سے بارہا ملاقات ہوئی بعض باتیں بتلائیں جو عمل میں لائی گئیں لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

شہر پشاور کے قریب قصبہ نندی میں ایک مرتاض متقی بزرگ رہتے تھے اور عرصہ چالیس سال سے گوشہ نشینی اور عبادت و ریاضت میں مصروف تھے علم ظاہر و باطن میں شغل رکھتے تھے۔ دولت مندوں کو آپ کی صحبت میں دخل نہ تھا۔ خادم ہمیشہ کلمہ طیبہ سے رطب اللسان رہتے تھے۔ خود بھی صوفی مشرب اور موحد تھے ان کی صحبت میں بڑا اثر ہوتا تھا خاکسار اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور نصیحت سنتا لیکن آپ کی خدمت سے مجھے مزید سلوک اور جذبہ حاصل نہ ہوا۔

پھر کچھ مدت بعد ساکن حاجی گلگ کے خاندان سے میاں عصمت اللہ ایک بڑے بااثر اور صاحب جذبہ بزرگ ہیں ان کی زیارت کیلئے پشاور سے گجرات آیا۔ وہ گجرات سے بھی چند کوس پرے رہتے تھے۔ وہاں پہنچا اور ان کی زیارت حاصل کی۔ اگرچہ وہ علم ظاہر اور طریقہ سلوک سے بے بہرہ تھے اور طریقت کے اوصاف بھی ان میں نہ تھے لیکن جذبہ کی نسبت غالب تھی کبھی سماع کے وقت توجہ کرتے تھے تو حاضرین پر حرکت قلب یا رقت قلب اور گریہ کا اثر ہوتا تھا بعض عام لوگوں پر رقص اور بےخودی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ میں بھی آپ کی صحبت سے مستفید ہوا ان کی مجلس میں اکثر رقت قلب حاصل ہوتی تھی اگرچہ حرکت قلب پہلے بھی بہت تھی لیکن گریہ اور درد ان کی صحبت میں زیادہ ہوا۔ چند روز وہاں رہ کر رخصت ہوا گھر پہنچ کر بہت کم اثر باقی رہ گیا۔ ایک سال بعد میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر اثر بڑھ گیا جب لوٹتا تھا پھر کم ہو جاتا تھا۔ یونہی بارہ سال تک ان کی خدمت میں بار بار آتا جاتا رہا لیکن اثر کا وہی حال رہا۔ البتہ سماع کے وقت بڑھ جاتا اور اس کے بعد وہی پہلی نسبت قائم رہتی۔

اس کے بعد شاہجہان آباد کی طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی میاں شیخ محمد چشتی صاحب وجد و حال ایک بزرگ تھے۔ ان کی خدمت سے بعض مفید باتیں حاصل ہوئیں۔

شیخ کلیم اللہ نام ایک چشتی فقیر کو دیکھا۔ بڑے عالم و عارف اور زاہد تھے۔ ان سے بہت صحبت رہی۔ کتاب تقیمات جو انہوں نے سلوک میں تحریر فرمائی ہے۔ مجھے عنایت کی۔ اس میں اکثر اشغال و اذکار درج ہیں زبانی بھی بیان فرمائے۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی غالب نہ ہوا۔

سید بھیک نام چشتی کئی ہزار مرید رکھتے تھے اور خادم عموماً پچھلی رات کو ذکر جہر کا بڑا شغل رکھتے تھے۔ حال بہت رہتا تھا۔ عمر رسیدہ اور مجرد تھے۔ ان کی خدمت میں بھی چند روز رہا اور طریقہ چشتیہ کے بعض طریقوں سے مستفید ہوا چنانچہ ذکر سہ پایہ ہشت رکنی اور عموماً اور ضمیر کا شغل اور ان کا طریق اور فائدہ ان کی خدمت سے حاصل ہوا بہت مہربان ہوئے اور رخصت کیا۔

اس کے بعد سرہند میں حضرت شیخ احمد سرہندی کے پوتوں میں سے صبغت اللہ نام ایک بڑے بزرگ اور باکمال رہتے تھے۔ صاحب

ارشاد متبرک اور بڑے صاحب تاثیر تھے طریقہ نقشبندیہ میں اپنی آپ نظیر تھے۔ ان کی زیارت بھی نصیب ہوئی میرے حق میں کرم خاص توجہ فرمائی آپ کی صحبت بڑی موثر تھی۔

اس کے بعد حضرت میاں عبدالاحد عرف میاں گل کی زیارت حاصل ہوئی۔ یہ بھی حضرت شیخ احمد سرہندی کی اولاد سے تھے ان کی صحبت بھی موثر تھی۔ تھوڑے سے عرصہ میں سالک کا سلوک کامل کرا دیتے تھے اور حال خوب ہوتا تھا فقیر پر بڑی مہربانی کی اپنے دادا کے مزار کے پاس لے جاکر توجہ فرماتے تھے ان کی صحبت میں بھی اثر معلوم ہوا اور سلوک کے بعض مقامات زبانی بھی بیان فرمائے اور رخصت کے وقت ایک کتاب معجزات نبوی ﷺ جو ان کی اپنی تصنیف تھی فقیر کو دی۔

اس کے بعد لاہور کی طرف دوابہ میں سیام چوراسی رشام چوراسی نام ایک گاؤں میں میاں شیخ عبدالنبی طریقہ نقشبندیہ میں ایک مسلّم بزرگ رہتے تھے۔ کسی تقریب سے لاہور میں تشریف لائے۔ میں بھی دوبارہ ان کی زیارت کے لیے گیا۔ ہمیشہ شغل میں رہتے بڑے کم گو اور موثر تھے اکثروں کو ان کے فیض صحبت سے اثر ہوا۔ ان کی مجلس میں بہت کم گفتگو ہوتی تھی۔ مراقبہ کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ مجھ کو خلوت میں خاص صحبتیں میسر ہوئیں۔ ذاتی توجہ سے محوی اور بے رنگی کی نسبت غلبہ کرتی تھی اس نسبت کی اور دیگر شغل و مراقب ذکر کی اجازت فقیر کو دی۔ کچھ مدت تک وہ نسبت غالب رہی اس کے بعد کبھی کبھی غلبہ کرتی رہی۔

نیز شاہ مرتضیٰ ساکن سکندرہ کے خادموں سے اکبر آباد میں شاہ دشتانی مجذوب رہتے تھے۔ ان سے ملا ہر وقت اپنے حال میں طرف زمین پہ بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اٹھتے تو پانی اور روٹی کا ٹکڑا کھا لیتے تھے وہ بھی ایک مہینے یا نصف ماہ بعد وہ بھی نہیں مانگتے تھے۔ دائم الاستغراق اور دائم السکر تھے کبھی کبھی مجذوبانہ طریق پر کلام کرتے تھے۔ لیکن باطن کا اثر اور جذبہ مجھ پر ظاہر نہیں ہوا اور مجذوبوں سے فائدہ بھی کم ہی ہوتا ہے۔ دیگر سالکوں بزرگوں، مجذوبوں، صالحین اور مرتاض لوگوں کی کثرت سے زیارت حاصل ہوئی سب مہربانی سے پیش آتے اور جس قدر قسمت میں تھا کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا رہا۔ مگر میری دلی مراد پوری ہوتی نہ ہوئی۔

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا بیارد بوئے
ز دمیدہ صبح بجستم چہ گناہ نسیم صبا را

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پہ اجمیر گیا کچھ دن اجمیر میں کاٹے۔ آپ نے باطن میں مہربانی فرمائی اور بڑی توجہیں عنایت کیں۔

پھر میں جہان آباد میں رہا تو خواجہ قطب الدین کے مزار پر کچھ مدت گزار دی۔ انہوں نے عنایتیں اور مہربانیاں کیں۔ دوسرے بزرگوں کے مزارات پر بھی کچھ مدت رہا۔ پھر پشاور کو واپس ہوا۔

حضرت سید محمد گیسو دراز ساکن شاہجہان آباد کی اولاد سے میر سید یداللہ نام ایک بزرگ میرے دوست تھے۔ نوکری اور سپہ گری کرتے تھے۔ بہادر شاہ کے ساتھ پشاور میں آئے۔ علم تصوف اور حقائق و معارف کے بیان میں ماہر کامل تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم و فتوحات کی اور دوسری تصوف کی کتابیں انہیں ازبر تھیں۔ اور شیخ محمد اعظم درویش ساکن دکن بھی ملازمت کے سلسلے میں تھے۔ عموماً میر سید یداللہ اور یہ دونوں مل کر فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ تصوف کی کتابوں میں پوری مشق رکھتے تھے اس نے بھی شیخ مذکور سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مجھے ان دوستوں سے بھی ملاقات کا موقعہ ملا۔ مگر ان دوستوں میں عمل اور حال کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان میں ہو لیکن مجھے معلوم نہ ہوا ہو ہاں حقائق و معارف کے مقدمات

کے بیان اور تصوف کی کتابوں میں تو بے نظیر ہے میں بھی ان دونوں فصوص کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی ان عزیزوں کے پاس جا کر بیان کرتا اور شافی جواب پاتا چنانچہ دو بار فصوص کا مطالعہ ہوا اور خدا کے فضل سے اپنی سمجھ اور لیاقت کے مطابق سمجھ گیا لیکن دو مقام میں شبہ باقی رہا۔ ایک تو وجود مطلق کی تحقیق اور اس سے کثرت کے ظاہر ہونے کی کیفیت دوسرے خاتم الاولیاء کا مسئلہ جیسا کہ شیخ کہتا ہے کہ خاتم الانبیاء بھی مرتبہ ولایت میں خاتم الاولیاء سے فیض حاصل کرتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آخر ایک رات حضرت شیخ ابن عربی اور شیخ صدر الدین قونوی کو جو شیخ اکبر کے اجل اصحاب سے تھے مع مولوی جامی کے خواب میں دیکھا خدا ان سب پر رحمت کرے جنہوں نے ان دونوں مسئلوں کو خاکسار کے سامنے حل کر کے بیان کر دیا اور سمجھا دیا جب میں جاگا تو پوری تسلی حاصل تھی بلکہ اس خواب کے ذریعے جو تصفیہ عالم میں وارد ہوتا ہے ایسا صاف ہو جاتا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اپنے وجدان سے حاصل ہوا ہے۔ پس بزرگوں کے باطن سے اس علم کے مسئلے ایسے واضح ہو گئے کہ اب ذرا بھی شبہ باقی نہ رہا اور جو شخص ان مسئلوں میں تصرف کرتا ہے اس کا منشائے شبہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ کجی کے باعث ہے اور فوراً اس کا جواب بھی سوجھ جاتا ہے ذرا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گویا اس علم کے مسئلے حاضر ہیں چنانچہ اس علم میں کئی رسالے بھی لکھے گئے ان میں ایک اسرار التوحید نام عربی میں ایک کلاں رسالہ ہے۔ دوسرا فارسی رسالہ تصوف میں ہے اور بعض وجدانی حقائق بھی درج کیے گئے اور ایک اور رسالہ جس میں طریق تحصیل طریقت درج ہے لکھا گیا۔ اور اب تو ان مسئلوں کے بیان کرنے اور لکھنے سے طبیعت سیر ہو گئی ہے۔ ہاں کوئی قابل آدمی ملے یا کوئی طالب صادق اس علم کے سمجھنے والا آجائے تو اسے کچھ بتلا دیا جائے گا۔ اگرچہ علم الیقین اور عین الیقین سے تو معلوم ہو گیا لیکن ذوقی علم اور حق الیقین کے درجے ابھی بہت ہیں آرزو ہے کہ اعلیٰ درجہ پر پہنچیں۔ واللہ الموفق۔

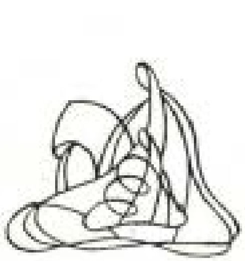

شاہ محمد سلیمان پھلواروی

ولادت : شب یازدہم محرم الحرام ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء

وفات : روز جمعہ ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ/ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء

پرگنہ پھلواری کی قدامت پرگنہ پھلواری بہت قدیم پرگنہ ہے۔ اکبر کے وقت میں بھی یہ ایک پرگنہ تھا۔ چنانچہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں پرگنہ پھلواری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں شیوخ، مغل اور راجپوت آباد ہیں۔ خاندان جعفری چونکہ اسی زمانہ میں یعنی کچھ ہی پہلے یہاں آباد ہوا تھا، جس کے محض چند ہی گھر ہوں گے اس لیے اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ اکبر کے وقت کا سروے کس قدر مکمل تھا؟ آئین اکبری میں پرگنہ پھلواری کا پورا رقبہ دے کر یہ بھی درج ہے کہ کتنے بیگھے مزروعہ ہیں اور کتنے غیر مزروعہ و مسکونہ۔ شیوخ تو پھلواری میں اب تک آباد ہیں مگر مغل اور راجپوت خاندان یہاں باقی نہیں رہے۔ میرے بچپن تک چند مغل و راجپوت یہاں آباد تھے۔

ہمارے بزرگ پھلواری میں عجیب عجیب بزرگان دین گزرے ہیں۔ میرے پھوپھا حضرت مولانا محمد حسین قادری پھلواروی جو چھوٹے مولوی صاحب کے نام سے مشہور ہیں اپنے بھائیوں یعنی حضرت صاحب (حضرت شاہ نعمت اللہ قدس سرہٗ) کے ساتوں فرزندوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ یہ مرید اپنے والد کے تھے اور ان سے خلافت بھی ملی تھی۔ مگر آپ کی تکمیل اپنے بڑے بھائی حضرت عزو اور مولانا محمد امام صاحب رحمہما اللہ سے ہوئی۔ آپ حج و زیارت سے فارغ ہو کر گھر آنے کے لیے جدہ پہنچے۔ یہاں سے یکایک پھر مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور بیمار ہو کر انتقال کیا۔ جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ ستر احوال میں آپ کو اس قدر مبالغہ تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ میاں یہ مولوی محمد حسین عجیب شخص تھا۔ اپنے کو اس قدر چھپایا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ یہاں سے گھر جانے کے لیے جدہ گئے۔ پندرہ دن کے بعد بھاگ آئے اور مر گئے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں رکھا۔ میں نے ان کی پیشانی سے لے کر آسمان تک ایک نور دیکھا۔ اللہ اکبر! یہ ایسا شخص تھا اور اپنے کو اس قدر چھپائے رکھا۔

مولانا آل احمد صاحب مولانا آل احمد صاحب محدث مہاجر مدنی سے بھی جو میری نانی کے حقیقی بھائی تھے، حضرت حاجی صاحب کو ربط تھا۔ حضرت حاجی صاحب انہیں صاحبزادے کہا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت کو معلوم تھا کہ مولانا آل احمد صاحب پھلواری کے پیرزادوں میں ہیں۔ ایک بار مجھ سے فرمانے لگے کہ صاحبزادے آئے تھے آل احمد صاحب۔ انہیں مدینہ منورہ جانے کی بڑی جلدی تھی۔ میں نے کہا۔ حج کو کل دو مہینے ہیں۔ اس کے بعد چلے جانا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ میرا وقت اخیر ہے بالآخر وہ جلد عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ کو روانہ

ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

مولانا آلِ احمد صاحب نے اپنے عالمِ شباب ہی میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ اور تقریباً چالیس برس وہاں مقیم رہے اس کے بعد آپ کئی بار ہندوستان آئے اور گئے۔ آپ کو حضور شاہ علی حبیب صاحب نے حدیث سنانے اور سند حاصل کرنے کے لیے بلایا تھا۔ پھر انہی لوگوں نے حضرت سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ آپ کا ثبت کاکوری میں بھی پہنچا ہے جو شائع بھی ہوچکا ہے۔ حجاز میں آپ کے معتقدوں کا خاصا حلقہ تھا۔ ترک اکثر آپ کے معتقد تھے۔ آپ کے پاس بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت چیزیں ہمیشہ نذر میں آتی رہتی تھیں مگر آپ فوراً خیرات کردیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر میں جھاڑو پھر جاتی تھی۔

آپ کا علمِ حدیث بہت وسیع تھا۔ آپ کی رہائش بالکل سیدھی سادی اور بے تصنع تھی۔ جب آپ حضور شاہ علی حبیب صاحب سجادہ نشین کو حدیث پڑھانے پھلواری آئے تو اس وقت پھلواری کے لوگ جبہ و دستار کے عادی تھے اور آپ بدویانہ بے تکلفی کے عادی۔ آپ دھوبیوں، دھنیوں یا اس طرح کے لوگوں کو ساتھ بٹھاتے۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے، گھاس پر لیٹتے بیٹھتے، درخت پر چڑھ جاتے، سڑکوں پر کوسوں پیدل چلتے۔ یہ باتیں پھلواری کے اکثر شرفا کو ناگوار گزرتیں کیوں کہ ان سے ان کی وضع میں فرق آتا تھا۔ آپ کا سب سے محبوب مشغلہ قرآن کریم کی تلاوت تھی۔ اکثر باغ یا میدان میں جاکر تخلیہ میں گھاس پر بیٹھ کر تلاوت کرتے رہتے۔ زمین صاف نہ ہوتی تو درخت پر چڑھ جاتے اور وہیں تلاوت کرتے رہتے۔ بخاری شریف بھی اکثر تلاوت کے طور پر پڑھتے۔ حدیث و علمِ حدیث کے علاوہ آپ دیگر فنون کا بھی درس دیتے تھے۔ روپے اٹھنی وغیرہ آپ ہانڈی میں رکھتے۔ فرماتے کہ "ہانڈی میں رکھ دو۔ اسی میں جانے بھی ہے۔" پھر تخلیہ ہوتا تو طالب علموں کو بلاکر تقسیم کردیتے۔ کبھی کوئی نہ ہوتا تو سنگی مسجد کی صف کے نیچے یا مخدوم راستیؒ کی درگاہ پر برگد کی جڑ میں جاکر روپیہ رکھ آتے۔

جب حضور کو حدیث پڑھانے کے بعد آپ حجاز واپس جارہے تھے تو حضور نے بمبئی تک کا ٹکٹ اور تین سو روپے کی تھیلی آپ کے ساتھ کردی۔ تین سو روپے اس زمانے میں بہت کافی رقم تھی مگر جبل پور پہنچتے پہنچتے وہ ساری رقم ختم ہوگئی۔ خالی ہاتھ بمبئی پہنچ کر ایک مسافرخانہ میں پڑے تھے کہ ڈومری کے مولوی فضل الرحمٰن صاحب بھی بہ ارادۂ حج وہاں پہنچے۔ حضرت کا ارادۂ سفر معلوم کرکے عرض کی کہ میری بڑی سعادت ہوگی اگر حضور میرے ساتھ چلیں۔ حضرت راضی ہوگئے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا گیا مگر وہاں کے ٹھاٹھ باٹھ سے حضرت کو وحشت ہوتی۔ چپ چاپ نیچے اتر کے تو تق بعض لوگ مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں چلے آئے۔ مولوی فضل الرحمٰن سخت حیران ہوئے کہ حضرت کہاں چلے گئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ وہاں ملے اور فرمایا کہ میں گدّے ودّے پر نہیں جاؤں گا۔ بس یہیں رہوں گا۔ جدہ تک اسی جہاز پر ساتھ آئے۔ وہاں سے پھر غائب ہوگئے تو ایک دم مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔ پھر وہاں سے غائب ہوئے تو ایک دم مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی۔ ایک بار مدینہ منورہ ہی میں تھے کہ حضرت اشرف جہانگیر کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں: "آلِ احمد اگر قطب خواہی شدن در کچھوچھہ بیا۔" آپ مدینے سے سیدھے کچھوچھہ آئے مگر کچھوچھہ آنے کے بعد پھر کیا ہوا؟ کسی نے کچھ نہیں بیان کیا۔

میں نے ایک بار ان سے عرض کیا "بڑے نانا! آپ ہندوستان میں بہت گھوم رہے ہیں۔ کہیں یہیں آپ کا انتقال نہ ہو جائے۔" فرمانے لگے کہ "میں نے اپنے باوا (مولانا محمد امام صاحبؒ) کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ نے مجھے کندھے پر اٹھائے جنت البقیع میں لے جاکر پھینک دیا۔ اس لیے میں سوا مدینہ منورہ کے کسی دوسری جگہ مر نہیں سکتا۔"

آخری مرتبہ جب آپ ہندوستان سے مدینہ منورہ گئے تو بڑی عجلت میں گئے جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد آپ نے ایک شب غسل کیا اور پورا کفن پہن کر سو گئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ صبح کو چول کھسکا کر لوگ اندر گئے تو آپ کو مُردہ پایا۔ دوبارہ غسل دیا گیا اور دوسرا کفن پہنایا گیا اور جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا آلِ احمد مجلس سماع میں شریک ہوتے تھے مگر حال نہیں کرتے تھے۔ قبروں کو بوسہ بھی نہیں دیتے تھے۔ آپ کے مکان میں جب مال و اسباب بہت ہو جاتا (یعنی مدینہ منورہ میں کیوں کہ پھلواری میں تو کوئی مکان آپ کا تھا نہیں) تو چپ چاپ حرم شریف کی طرف جاتے اور بدوؤں سے کہتے "میرا گھر لوٹو گے؟" وہ سب آپ کے ساتھ ہو لیتے۔ گھر لا کر آپ ان سے کہتے کہ لوٹ لو۔ بس ایک تماشا ہو جاتا تھا۔ کوئی استنبولی قالین لیے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی روسی سماوار اٹھائے دوڑا جاتا ہے۔ کوئی چائے کی ہانڈی (جس میں اکثر سونے چاندی کے ٹکڑے بھی پڑے ہوتے تھے) لیے جاتا ہے۔ الغرض تھوڑی دیر میں جھاڑو پھر جاتی تھی اور حضرت وہی بوریا بچھائے بیٹھے ہیں۔

حضرت شاہ نعمت اللہ حضرت شاہ نعمت اللہ پھلواروی قدس سرہٗ نے اپنے دو فرزندوں یعنی شاہ ابو تراب آشنا اور مولانا محمد امام صاحب سے بڑی سخت ریاضتیں کرائی تھیں۔ چار چار یا پانچ پانچ چلے چالیس چالیس دن کے کراتے تھے۔ جن میں روزے کھولنے کے بعد صرف ایک مٹھی چنا کھانے کی اجازت تھی۔ جس مقام پر اب حضرت صاحب (حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب) کی قبر مبارک ہے۔ اس کے نیچے تہ خانہ تھا وہی چلے کی جگہ تھی۔ یہ لوگ اپنے احوال قلمبند کر کے حضرت صاحب کے پاس بھیجا کرتے تھے لیکن بعد میں لکھنے پڑھنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ چلے سے نکل کر کئی کئی مہینے تک بیمار پڑ جایا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا محمد امام صاحب چلے میں تھے اور اپنا احوال لکھ لکھ کر حضرت صاحب کے پاس بھیجتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک بار آپ نے لکھا کہ ایک گیدڑ دوسرے گیدڑ سے چلا کر کہہ رہا ہے کہ پھلواری کے قاضی ابراہیم حسینی صاحب نے انتقال کیا۔ حضرت صاحب کو بذریعہ کشف معلوم ہو گیا۔ آپ نے آدمی بھیجا کہ محمد امام سے کاغذ لے لو اور خبر کر دو کہ واقعی قاضی نے انتقال کیا۔

ایک بار مولانا محمد امام صاحب اپنے چلے سے نکل کر باہر آ رہے تھے کہ ایک جن نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آپ کو بھی طیش آ گیا۔ فرمایا کہ اگر تو ناری ہے تو میری بھی حرارت دیکھ۔ یہ کہہ کر اس پر ایسی توجہ ڈالی کہ "جلا۔ جلا" چلاتا ہوا بھاگ گیا۔

حکیم شاہ محمد داؤد میرے والد (حکیم شاہ محمد داؤد) نے طب کی کتابیں حکیم علی حسین صاحب لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ میں نے ان کی زیارت کی تھی۔ یہ سنی تھے اور ان کے حقیقی بھائی شیعہ تھے۔ حکیم مجن صاحب کا ننہالی خاندان ان سے ملتا ہے۔

میرے والد کی عمر ۷۱ برس کئی مہینے ہوئی تھی۔ ۱۲۳۵ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۰۶ھ میں وفات ہوئی۔ ایک بار حضرت نے کٹھل کے کوئے کھا لیے تھے تو ایک سو دست آئے۔ بواسیر ہمارا خاندانی مرض ہے۔

بزرگوں کا تاج جب میں پیدا ہوا تو ہمارے حضور شاہ علی حبیب نصر قدس سرہٗ نے میرے سر پر بزرگوں کا تاج رکھا۔

میری بڑی نانی بی بی بتول صاحبہ نے خواب دیکھا کہ بڑے حضرت یعنی حضرت مجیب اللہ قدس سرہٗ نے مجھ کو اٹھا کر حضور شاہ علی حبیبؒ کی گود میں دے دیا۔ جب میں حضور سے مرید ہوا تو سمجھا کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہے۔ ایک مدت کے بعد حضور کی لڑکی سے میری شادی ہوئی تو اس خواب کی دوسری تعبیر سمجھ میں آئی۔ مگر میری غلامی کی نسبت زیادہ قوی ہے۔ حضور کی وفات کو آج ۵۵ برس ہوئے۔ آج حضور کے عرس کا

دن ہے ۱۶، ربیع الاول ۱۳۵۰ھ)

میرے بچپن میں ہندو مسلم تعلقات ہندو مسلمانوں کے درمیان موجودہ عداوت و جنگ انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے یہ جنگ نہ تھی۔ ہمارے حضرت شاہ مجیب اللہ صاحبؒ کی خانقاہ میں اور تقریباً تمام خانقاہوں میں ہندو مسلمان دونوں طلب رہتے تھے۔ اور ہندو طلبہ کو خشک جنس بجائے پکے ہوئے کھانوں کے خانقاہ کی طرف سے دی جاتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچپن تک یہ بات دیکھی تھی۔ ایک ہی مولوی صاحب کے یہاں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے تھے۔ شورمپور کے منشی جانکی سہائے میرے والد کے بڑے دوست تھے۔ ہولی کے دن وہ زبردستی میرے گھر آ کر والد پر رنگ کی پچکاری ڈالتے۔ بے تعصبی کا یہ رنگ تھا کہ بقرعید میں دس دس پندرہ پندرہ خصی قربانی کے لیے اپنے مواضعات سے منگوا کر میرے والد کے یہاں بھیجا کرتے تھے۔ میں ایک بار رمضان شریف میں دن کے وقت شورمپور سے گزرا اور سلام کرنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ انہوں نے کہا تم افطار کیے بغیر ہرگز نہیں جا سکتے۔ اپنے آدمی کو کہا کہ بستی دیکھو فلاں جلاہے کو کہو کہ فوراً مرغا ذبح کرے۔ میں نے بڑی معذرت کی کہ مجھے فوراً چلا جانا ہے۔ تو اٹھے اور اندر سے چار روپے نکال لائے اور کہا کہ لو مٹھائی کھانا۔ میں نے سلام کیا اور لے لیے۔ پھر رخصت ہوا۔ میں ان کو برابر چچا کہتا تھا۔ ان کے بیٹے منشی ہنومان سہائے مجھ کو برابر بھائی صاحب کہتے تھے۔ بیوڑ ان کا موضع ہے۔ وہ ایک بار اپنے موضع پر آئے۔ آدمی میرے پاس بھیجا کہ جاؤ بھائی صاحب سے کہو کہ چند کرسیاں ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لیے بھیج دیں اور میرا کھانا بھی بھیج دیں۔ میں نے کرسی بھیج دی اور کھانا مع کباب وغیرہ کے ان کے پاس بھیج دیا۔ منشی ہنومان سہائے کے بیٹے چندر بنسی سہائے بیرسٹر ہیں۔ جو اس وضعداری کو اب تک نباہتے ہیں اور مجھ کو چچا کہتے ہیں۔

کتب درسیہ کی تکمیل میں جناب استاذ الہند تاج العلماء مولانا شیخ عبدالحق انصاری قدس سرہٗ (فرنگی محل) کے حضور میں حاضر ہوا اور جو کچھ حاصل ہوا انہیں کی کفش برداری سے حاصل ہوا ؎

ساز و برگ من از حمایت اوست
آنچہ دارم ہمہ عنایت اوست

اتمام کتب درسیہ کا انہیں کی خدمت میں ہوا۔

شیوخ حدیث ہمارے ساٹھ ستر سے متجاوز ہوں گے۔ فاتحہ فراغ کی تاریخ "آج فارغ ہوا" (۱۲۹۷ھ) سے نکلتی ہے۔

صرف و نحو ابتدائے زمانہ میں زمین و آسمان میرے بہت مختصر تھے۔ صرف و نحو کو کافیہ و شرح ملا میں منحصر سمجھتے تھے۔ پس نحوی و صرفی قاعدہ کو قاعدۂ کلیہ جانتے تھے۔ نہ سیبویہ و فرا کے اختلافات سے آگہی تھی اور نہ نحاۃ کوفہ و بصرہ کے مسالک متنوعہ سے خبر۔ آیات قرآنیہ میں بھی خلجان پیدا ہوتا تھا۔

آیۂ پاک "اِنَّ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ" میں متحیر ہوتا تھا کہ تثنیہ کا الف بحالت نصب کیوں کر قائم ہے۔ مگر جب کتب تفاسیر کی طرف رجوع کیا تو یہ کھٹک جاتی رہی۔ بالخصوص کتاب اتقان جلال الدین سیوطیؒ کو ایسے شبہات کے دفعیہ میں بہت زیادہ مفید پایا۔ پھر اعراب القرآن علامہ عکبری کا خوب مطالعہ کیا۔ تمام تراکیب اس سے حل ہو جاتی ہیں۔ اور اب تو خدا والے نحو پر مشتمل کتاب سیبویہ اور مفصل زمخشری اور اس کی شروح اور اقتراح اور اشباہ و نظائر سیوطی و مغنی اللبیب مع الشرح وغیرہ سب چھپ کر شائع

ودائع ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد اپنی سب نحوی قابلیت ہوا ہو جاتی ہے۔ [1]

دلائل الخیرات سنہ ۱۲۹۹ھ سے میں نے ورد دلائل الخیرات شروع کیا اور اوّل اس کی اجازت مجھے حضرت استاذ العلماء الکرام قدوتنا مولانا الشیخ عبد الحق الانصاری رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمائی اور میری کتاب دلائل الخیرات پر اجازت لکھ دی اور بہت خوش ہو کر فرمایا۔ "ماشاء اللہ تم پڑھتے ہو۔"

پھر سنہ ۱۳۰۲ھ اور سنہ ۱۳۰۳ھ میں حرمین الشریفین زادہما اللہ عزاً و شرفاً میں شیخ الدلائل فی الحرم النبوی حضرت شیخنا سید محمد رضوان اور سید محمد امین رضوان اور دیگر محدثین حرمین سے واصل ہوئی اور حضرت شیخ شیوخ العالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے خاص کر اس کی اجازت فرمائی۔ یہ اجازت بحضور باطنی تھی اور سید امین و محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی اجازت گویا بحضور ظاہری تھی۔ لانہما کانتا تجاہ الروضۃ النبویۃ فکانی حضرت لدیہ وصلیت وسلمت علیہ۔ اللّٰھم صل وسلم وبارک علیہ۔ [1]

چشتیت سے مناسبت چشتیت سے میری اوّل مناسبت اپنی والدہ اور خالہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہ لوگ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد سے تھیں اور برابر حضرت بابا صاحب و دیگر خواجگان چشتیت کے احوال بیان کیا کرتی تھیں۔ بچپن ہی سے میرا دماغ ان بزرگوں کی یاد سے معمور رہا۔ اور اکثر خواب میں ان بزرگوں سے مشرف ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ بہت بچپن میں میں نے خواب دیکھا کہ میرے کوٹھے کے ناغول پر حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کا مزار ہے۔

چشتیت سے میری دوسری مناسبت اس وقت ہوئی جب کہ تعلیم سے فراغت پا کر مولانا احمد علی محدثؒ کو حدیث سنانے سہارنپور گیا۔ وہاں ایک بزرگ جن کی عمر مجھ سے بہت زیادہ تھی یعنی پچاس سے کم نہ ہوگی۔ اسی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ذی استعداد عالم تھے اور حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کا نام مولانا شاہ قدرت اللہ تھا اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے رہنے والے تھے۔ درس کے علاوہ جائے قیام پر بھی میرا ان کا ساتھ رہا۔ وہ ذاکر و شاغل اور عابد و زاہد شخص تھے۔ ہم دونوں میں دلی انس ایک دوسرے سے پیدا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر باہم طریقت کی گفتگو کیا کرتے یہاں تک کہ ان کی صحبت نے مجھے چشتیت سے داغ دیا۔ میں نے ان سے ان کے طریقے کی بھی اجازت لی ہے جو "سلسلۃ الذہب" میں درج ہے۔ مولوی حسن الزماں خاں صاحب حیدرآبادی کی تصنیفات سے بھی میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ پھر حضرت شیخ المشائخ قطب المکۃ المشرفہ مولانا الحاج امداد اللہ چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ البتہ ان سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ؎

من کہ سر بر نہ آوردم بدو کون ‏ ‏ گردنم زیر بار منت اوست

اور اپنی اجازت خلافت سے بھی مشرف فرمایا۔ یہ ان کی بندہ نوازی ہے ورنہ میں اس قابل نہیں۔ حضرت قبلہ کی چند روزہ صحبت سے نسبت چشتیہ مجھ پر بہت غالب ہو گئی اور میں اب تو چشتی ہی چشتی ہوں ؎

عاشقان خواجگان چشت را ‏ ‏ از قدم تا سر نشانے دیگر است

---

[1] مکتوب بنام جعفر میاں صاحب۔ نقوش مکاتیب نمبر

غلاموں پر توجہ جن دنوں میں مطب کرتا تھا، اس زمانے میں برادری کے اکثر بزرگان کی نشست میرے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ یحییٰ نانا صاحب[1] میرے تینوں[2] ماموں۔ شاہ بدرالدین صاحب مرحوم اور اکثر لوگ ہمارے یہاں آکر بیٹھا کرتے تھے۔ چونکہ مولوی یحییٰ صاحب سبھوں میں بزرگ تھے، اس لیے جب وہ آتے تو صدر میں تکیہ پر وہی بیٹھتے ورنہ میرے ماموؤں میں سے کوئی بیٹھتا۔ ایک شب میں نے خواب دیکھا کہ خواجہ غریب نواز تشریف لائے اور نشست گاہ کے صدر مقام پر چار زانو تکیہ لگا کر بیٹھے اور فرمایا۔

”میاں سلیمان! حقہ لاؤ“

جب صبح ہوئی تو وقت مقررہ پر لوگ آنے لگے۔ سب سے آخر میں یحییٰ نانا صاحب تشریف لائے۔ آتے ہی تکیہ لگا کر صدر مقام پر چار زانو بیٹھ گئے اور پکار کر مجھ سے کہا۔

”میاں سلیمان! حقہ لاؤ“

یہ سنتے ہی مجھ پر وجد طاری ہوا اور میں نے زور سے نعرہ لگایا اور اپنا خواب بیان کیا۔

سلسلۂ بیعت کے بغیر کشود میں وقت ایک شخص تھے پنجابی اہل علم، پرہیزگار، عابد اور زاہد۔ مجھ سے ان کو بہت خلوص تھا۔ انہوں نے ریاضتیں کی تھیں۔ مگر کسی کے مرید نہ تھے۔ میں نے انہیں شغل ورود کی تلقین کی مگر انہیں اس کا مراقبہ جما نہیں۔ انہوں نے بہت ہمت کی مگر پھر بھی نہ جما۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ان کا کشود میرے ذمہ نہ ہو۔ میں نے ان کو اپنے پیر بھائی (شاہ بدرالدین صاحب مرحوم) کی طرف راجع کیا۔ انہوں نے تقریباً ایک سال تک ان کے ساتھ کوشش کی۔ مگر ان سے بھی کام نہ نکلا۔ پھر شاہ صاحب مرحوم کی اور میری دونوں کی رائے ہوئی کہ انہیں (سید سلیمان ندوی کے والد ماجد) حکیم ابوالحسن صاحب مرحوم اسلام پور کے حوالے کریں مگر حکیم صاحب مرحوم کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ تب میں نے ان کو لکھا کہ چونکہ آپ باضابطہ کسی سلسلے میں داخل نہیں ہوتے ہیں اس لیے شاید آپ کے کشود میں دیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آپ کے متعلق کسی طرف سے کوئی خاص اشارہ نہ ہو میں آپ کی بیعت نہیں لوں گا۔ وہ صاحب اجمیر شریف حاضر ہو کر چلہ کش رہے اور استخارہ کرتے رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسی فقیر کے متعلق کچھ بات دریافت ہو۔ ایک دن وہ حضور غریب نواز سے مشرف ہوئے اور سنا کہ حضور غریب نواز فرماتے ہیں کہ ”شاہ سلیمان میرے شیعہ ہیں“۔ وہ اس واقعہ کے بعد اپنے مکان پر گئے اور مجھ کو خط لکھ کر اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ حضور غریب نواز نے آپ کو اپنے چاہنے والوں میں شمار کیا ہے۔ اب آپ کو میری بیعت میں تامل نہ ہونا چاہیے اس خط کو دیکھ کر میں بہت رویا اور جواب لکھا کہ صحیح طور پر خدا کو ہی معلوم ہے کہ اس ارشاد کا مفہوم کیا ہے۔ جب تک صاف و صریح طور پر کچھ معلوم نہ ہو میں آپ جیسے شخص کی بیعت سے متامل رہوں گا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک مجھ سے ان کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر اب نہیں معلوم وہ شخص کیا ہوئے۔ کیوں کہ سالہا سال سے کوئی خط و کتابت نہیں۔ نہ معلوم وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ عجیب اتفاق کہ مجھ کو ان کا نام و پتہ بھی یاد نہ رہا۔

---

[1] حضرت مولانا شاہ محمد یحییٰ صاحب قادری پھلواروی [2] مولانا شاہ نعمت مجیب صاحب۔ مولانا شاہ صفت اللہ صاحب اور مولانا شاہ اشرف مجیب صاحب

تلقین وعظ گوئی جب میں حج کو گیا تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز نے مجھ پر غیر معمولی شفقت فرمائی اجازت وخلافت بھی دی اور مجھے سب سے پہلے آپ ہی نے وعظ گوئی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک دن فرمایا کہ میاں تم تذکیر (وعظ ونصیحت) کیا کرو۔ میں اس وقت گویا طالب العلم تھا اور کبھی اس میدان میں گامزن ہونے کا خیال تک نہ تھا۔ مگر حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد نے میرے دل میں ایک چٹکی لی۔ دریں کعبۃ اللہ جا کر غلاف کعبہ تھام کر بہت رویا اور کہا۔ "پروردگار! اتنا بڑا شیخ مجھے تذکیر کے لئے کہتا ہے اور مجھے بولنا تک نہیں آتا۔ خداوندا! تو مجھے اثر بیان کی نعمت سے مالا مال فرما۔" اس کے بعد خدا جانے کیا تائید غیبی ہوتی رہی۔ میں نے یہ سلسلہ خدا کا نام لے کر شروع کیا۔ پھلواری میں سب سے پہلے سنگین مسجد میں جمعہ کے دن ہم نے وعظ بیان کیا۔ جس میں وہ مثنوی بھی پڑھی۔

"گفت مشق نام لیلی می کنم" شاہ وحید الحق صاحبؒ وغیرہ بھی اس وقت موجود تھے۔ وہ تمام لوگ بہت متاثر ہوئے اور زار زار روئے اور مجھے دوسرے بزرگوں نے دعائیں دیں۔ اسی سلسلے سے میں کانپور گیا ہوا تھا اور ایک مسجد میں (بغرض اعتکاف) ٹھہرا ہوا تھا اور چونکہ وعظ گوئی کا آغاز تھا سوچا کہ معلوم نہیں اب آگے کچھ ترقی کر سکوں گا یا نہیں۔ مجھے نیند آ گئی تو خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا ان بزرگ کا نام مجھے یاد نہیں رہا کہ فرما رہے ہیں۔ گھبراؤ مت۔ تم سے بڑھ کر اب صرف ایک واعظ اور پیدا ہوگا۔

مثنوی کا لہجہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں مثنوی کا درس بھی ہوتا تھا۔ میں بھی مولوی عبد اللہ (کالج دین) کے ساتھ درس میں شریک ہوا ہوں۔ ابیات ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ کہیں کہیں پر حضرت فرط وجد سے دھیمی سریلی آواز کے ساتھ حق حق کا نعرہ لگاتے جو بظاہر سننے میں حُق حُق معلوم ہوتا۔ پھلواری کے اکثر بزرگان دین پہلے اسی طرح نعرہ لگاتے تھے۔ مثنوی شریف کے درس میں تقریر کرتے کرتے اکثر حضرت پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

مثنوی شریف جس لہجے میں میں پڑھتا ہوں اور جس کو اب عام طور پر واعظوں نے اختیار کر لیا ہے وہ خود بخود ایک بار مجھ پر القا ہوا ورنہ اس سے پہلے میں سادے طور پر مثنوی شریف پڑھا کرتا تھا۔ اس لہجے کے قلب پر وارد ہونے کے بعد سب سے پہلے میں نے پھلواری کی سنگی مسجد میں بعد جمعہ وعظ بیان کیا۔ اور اس میں مثنوی شریف جدید انداز سے پڑھی۔ پھلواری کے اکثر بزرگان دین جو میرے بزرگ تھے موجود تھے۔ ان سبھوں پر بہت رقت طاری ہوئی۔

مثنوی کا مخالف لکھنؤ کے ایک شیعہ مولوی صاحب جو مثنوی مولانا روم کے بڑے مخالف تھے ایک بار نخاس کے ردی بازار میں گئے جہاں بہت سی کتابیں بک رہی تھیں۔ ایک مطلا و مذہب نسخہ مثنوی شریف کا بھی تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ یہ کون کتاب ہے؟ جواب ملا مثنوی! آپ نے کہا۔ مثنوی یعنی مت سنو۔ پھر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پہلے شعر پر جو نظر پڑی تو یہ تھا ؎

مثنویم را تو خوانی مثنوی
اے سگ دنیا چہ عوعو می کنی

سلسلۂ مداریہ میں جوان تھا جب اول مرتبہ مکن پور شریف حاضر ہوا۔ وہاں ایک بزرگ مداریہ طریقے کے بڑے کاسب وشاغل اور عابد و زاہد تھے۔ ان کی عمر اس وقت ایک سو بیس برس کی ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم مداری ہو؟ میں نے کہا۔ جی ہاں! انہوں نے پوچھا کَے طریقوں سے؟ میں نے کہا۔ تین طریقوں سے! فرمایا۔ چھ طریقے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ بقیہ تین طریقے میں آپ سے حاصل کروں گا۔ انہوں نے مجھ کو اپنا مہمان بنایا۔ ان کے پوتے جو جوان تھے میرے لئے ماش کی دال اور روٹی کھانے کے لئے لائے۔ حضرت نے

مجھے اسم کا ایک ذکر بتلایا اور پھر فرمایا کہ اپنے خاندانی طریقے پر ہی استوار رہو۔ یہ واقعہ میرے مکتوبات میں شائع ہوگیا ہے۔

پچھلی مرتبہ جب میں اجمیر شریف سے کانپور واپس آیا تو مکن پور سے ان بزرگ کے کئی پوتے پروتے میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ میرے دادا کی چیز مجھے تعلیم فرمائیے۔ میں سخت گھبرایا۔ کیوں کہ مجھے حضرت نے صرف اس ذکر کی تلقین کی تھی مگر یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم دوسروں کو بھی اس کی تلقین دے سکتے ہو۔ چونکہ میں ان کی طرف سے مجاز نہ تھا۔ اس لیے آج تک میں نے کسی دوسرے کو نہیں بتایا میں نے ان صاحبزادگان سے بھی اسی بنا پر بڑی معذرت کی۔ میں نے کہا کہ مداریہ طریقے کی اور کئی چیزیں جو مجھے اپنے خاندان سے ملی ہیں اور جن کا میں مجاز ہوں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ مگر جس چیز کا میں مجاز نہیں ہوں خواہ وہ آپ کے دادا ہی سے کیوں نہ حاصل کی ہو اسے اصولاً دوسروں کو تلقین کرنے سے بالکل مجبور ہوں۔ صاحبزادوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ انہوں نے بعض چیزوں کی مجھ سے اجازت لی اور پھر وطن تشریف لے گئے۔

سلسلۂ قادریہ کی اجازت

عشق غوثیہ تو میرے خمیر میں ہے ؎

دل ربود از من جمال شیخ عبدالقادرم
ای سر ما و خیال شیخ عبد القادرم

[illegible] میں بہ نظر اماکن مقدسہ عراق کا سفر کیا۔ وہاں اعلیٰ حضرت نقیب الاشراف السید عبد الرحمن المحض علیہ الرحمۃ سجادہ نشین آستانہ غوث پاکؒ پیران پیر کے مہمان ہوئے۔ حضرت نقیب الاشراف اس وقت دولت عراق کے وزیر عظم تھے تبرکاً و تیمناً آپ سے اپنے جدی سلسلہ قادریہ کی اجازت لی جو حضرت نقیب الاشراف مرحوم و مغفور کے دستخطوں کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہے

میں نے مدراس میں مولوی شریف اعظم صاحب اور حسین میاں دونوں سے ”یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ“ کی زکوٰۃ دلوائی۔ حسین میاں کو اس سے زیادہ مناسبت نہیں پیدا ہوئی۔ مگر میاں شریف اعظم نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس خاندان کے شغل درود کی طرف حسین میاں کو بہت مناسبت ہے۔

میں روز شب کو یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ کا ملاحظہ کرتا ہوں اس طرح کہ جمال مبارک بالکل میرے سامنے ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے خواجہ غریب نوازؒ کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہوں اور ”یا حبیب اللہ شیئاً للہ“ کا ملاحظہ کرتا ہوں۔ یہاں کا فیض زیادہ جلدی آتا ہے۔ ”حبیب اللہ“ خواجہ غریب نواز کا خطاب ہے۔

سفر اجمیر کے دلچسپ تجربات

ایک بار کلکتہ سے کچھ لوگ سا اجمیر شریف جاتے ہوئے ہم سفر ہو گئے۔ اٹاوہ اسٹیشن پر ان لوگوں نے اپنا ڈبہ بدلنے کے لئے کل اسباب اتارا۔ اور پھر دوسرے ڈبہ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ اتفاقاً ان میں سے ایک صاحب کا بکس جس میں نقدی اور دیگر سامان تھے پلیٹ فارم پر چھوٹ گیا۔ وہ بہت گھبرائے۔ میں نے کہا کہ آپ خواجہؒ کے یہاں جا رہے ہیں۔ مطمئن رہئے وہ بکس غائب نہیں ہو سکتا۔ مگر انہیں اطمینان نہ تھا۔ مجھ سے کہنے لگے ”حضرت! میں تو اپنا بکس آپ سے لوں گا“ چونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ بکس ضرور مل جائے گا۔ میں نے کہہ دیا ”بہت خوب“ اجمیر شریف پہنچنے کے بعد اٹاوہ سے ایک صاحب نے میرے نام تار بھیجا کہ آپ کا بکس اسٹیشن پر چھوٹ گیا ہے۔ وہ میں اپنے ساتھ فلاں تاریخ کو لاؤں گا۔ میں نے وہ تار اپنے دوست کے پاس بھجوا دیا۔ پھر وہ بکس آیا اور کھولا گیا کل چیزیں جوں کی توں اس میں موجود تھیں۔

ایک بار میں اور میاں شریف اعظم اجمیر شریف حاضر ہوئے۔ میاں شریف اعظم کی جیب میں دو واپسی ٹکٹ کانپور تک کے تھے اور کچھ مختصر سی نقدی تھی۔ وہ آستانہ شریف پر مراقب بیٹھے تھے کہ کسی نے ان کی جیب سے سب چیزیں نکال لیں۔ میرے پاس دس روپے تھے۔ وہ بھی کسی نے نکال لیے۔ اب ہم دونوں کانپور جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے مگر کوئی سامان نہ تھا۔ ہم دونوں اپنی قیام گاہ پر جا کر سو رہے۔ صبح کو جناب مولوی انوار اللہ صاحب (فضیلت جنگ) تشریف لائے اور ساٹھ روپے نذر کیے۔ میں نے دل میں کہا کہ ابھی دس گئے تھے اور اس کا ششگنا مل گیا۔ ایسی چوری کون نہ پسند کرے گا۔ بس فوراً ہم لوگ کانپور روانہ ہوگئے۔

مدرسہ معینیہ عثمانیہ کا معائنہ موجودہ حضور نظام (میر عثمان علی خاں) جب اجمیر شریف حاضر ہوئے تو اپنے مدرسہ معینیہ عثمانیہ کے ملاحظہ کے لیے بھی تشریف لائے اور لڑکوں سے کچھ امتحان بھی لیا۔ اتفاق سے اس وقت لڑکے مسلم شریف میں حدیث ثقلین پڑھ رہے تھے۔ سرکار نظام نے غدیر خم کی جغرافیائی پوزیشن اور تاریخی اہمیت لڑکوں سے دریافت فرمائی۔ مگر اس طرح کی تعلیم ہی نہیں ہوتی کوئی صحیح جواب نہ دے سکا۔ میں نے کہا "حضرت! میں بھی طالب العلم رہ چکا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو میں یہ تفصیل عرض کروں۔" مولانا انوار اللہ صاحب (استاد حضور نظام) نے ہنس کر فرمایا کہ حضرت آپ کی طالب العلمی بہت پرانی ہوگئی۔ آپ کیوں نہ بتائیں گے؟ ضرورت ہے کہ جب اس طرح کی حدیثیں پڑھائی جائیں تو اس کی تاریخی اہمیت اور جغرافیائی حیثیت بھی بوضاحت بتلا دی جایا کرے۔ بخاری نے تو اپنے صحیح میں حدیث ثقلین کو نہیں روایت کیا ہے۔

استقامت شریعت اور فیضان خواجہؒ میں تقریباً چالیس برس سے آستانہ غریب نوازؒ کی سالانہ حاضری کا پابند ہوں۔ دو اک سال ایسا ہوا کہ عرس کے موسم میں بیمار تھا اور حاضر آستانہ نہ ہو سکا تو دوسرے مہینہ میں آکر اس کی قضا کی۔

فرائض و سنن کی پابندی اور شریعت پر استقامت کے ساتھ جب کوئی یہاں حاضر ہوتا ہے تو اسے بے اندازہ فیض حاصل ہوتا ہے بہت عرصہ ہوا کہ ایک بار میں اجمیر شریف آتے ہوئے کانپور ٹھہرا۔ وہاں کسی ذریعے سے ایک طوائف نے کہلا بھیجا کہ میں چاہتی ہوں کہ تبرکاً آپ کو کچھ نعت سناؤں۔ میں نے کہا "بلاؤ" وہ زنانہ مکان میں تھی اور میں متصل ہی مردانے مکان میں تھا۔ وہیں سے اس نے کچھ غزلیں گا کر سنائیں اور پھر چلی گئی۔ عمر بھر میں یہی ایک بار میں اس لغویت کا مرتکب ہوا۔ مگر مجھے اس غلطی کا احساس تک نہ ہوا۔

جب اجمیر شریف حاضر ہوا تو طبیعت میں بجائے کشود کے سخت انقباض پایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ سماع میں بیٹھا تو وہاں بھی انقباض۔ درود و وظائف میں لگتا تو بھی طبیعت منقبض تھی کہ عصر کے بعد آستانہ شریف میں مراقبہ میں بیٹھا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور فوراً ہی مجذب ہوگیا۔ اسی حیرانی و پریشانی میں شب کو سو رہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خود بدولت سرکار غریب نوازؒ تشریف لائے ہیں۔ ہاتھ میں ایک عصا ہے اور فرماتے ہیں کہ "لو یہ شیخ عبدالقادرؒ کا عصا ہے۔ اس کو مضبوط پکڑ لو۔" آنکھ کھلی تو قلب کیفیت سے معمور تھا۔ تعبیر سمجھ میں آگئی۔ غوث پاک کا عصا استقامت علی الشریعۃ کا عصا تھا۔ چونکہ میں بیعتہً قادری ہوں۔ اس لیے سیدی شیخ عبدالقادرؒ کا عصا عنایت ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم رہو۔

مجھے فوراً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا جو کانپور میں مجھ سے سرزد ہوئی تھی توبہ و استغفار کی۔ آستانہ شریف پر حاضر ہوا تو قوال گا رہا تھا۔

خواجۂ خواجگاں معین الدینؒ　　فخر کون و مکاں معین الدین

قلب پہلے سے بھرا تھا۔ نہایت زور شور کے ساتھ اور بہت دیر تک مجھ پر کیفیت طاری رہی۔ اسی واقعہ کی طرف میں نے اپنی غزل میں اشارہ کیا ہے ؎

"میرے خواجہ نے دیا مجھ کو عصائے غوث پاکؒ"

غزل کے چند شعر

عاشق خواجہ ہوں میں اور ہوں گدائے غوث پاک   دل نثار خواجہ ہے اور جاں فدائے غوث پاک
دیدہ و دل اپنے دونوں قابل عزت ہوئے   اس میں خواجہ کی ولا اس میں ضیائے غوث پاک
اپنا مذہب اپنا مسلک عاشقو بس ہے یہی   جس میں خواجہ کی خوشی جس میں رضائے غوث پاک
یا الٰہی یہ تمنا ہے کہ وقت جاں کنی   سر ہو خواجہ کے قدم پر اس پہ پائے غوث پاک

حاذق مسکیں تھا یہ فیض عام اور یہ سخا
ہے یہ فیض خواجہ اور جود و سخائے غوث پاک

حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کی زیارت ایک دن میں اور لکھنؤ کے مولوی فتح محمد تائب مرحوم حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ کی زیارت کے لیے گنج مراد آباد روانہ ہوئے۔ ریل سے اتر کر کافی مسافت بیل گاڑی پر طے کرنا پڑتی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ہم دونوں کے دل شوق اور ولولے سے لبریز تھے۔ میں باآواز بلند عراقیؔ کی اس غزل کو گانے لگا جس کا مطلع ہے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

مجھ پر وجد طاری ہو گیا اور مولوی فتح محمد تائب سسک سسک کر رونے لگے۔

تم صافہ نہیں باندھتے؟ میں ایک بار سردی کے زمانہ میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے سر پر عمامہ نہ تھا۔ جوان تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "مولوی سلیمان! تم صافہ نہیں باندھتے؟" میں خاموش رہا، کیا بولتا۔ مولانا نے اپنے سر مبارک سے عمامہ اتارا اور میری طرف بڑھا کر ارشاد فرمایا۔ "لو صافہ باندھ لو" میں نے حسب ارشاد اس کی تعمیل کی۔ واللہ کیا لوگ تھے ؎

میں نے دیکھی ہیں وہ آنکھیں ساقی   جام مے کی مجھے حاجت ہی نہیں

ہلال نو است ایں تابانی من   کہ ہستم شہرۂ آفاق دوراں
چو حقی از کرامات بہیں بیں   کہ مورے بودم و ہستم سلیماں
منم مست مے خمخانۂ او   حباب بادۂ توحید و عرفاں

مولانا محمد حسین الٰہ آبادیؒ مولانا محمد حسین الٰہ آبادی بڑے بزرگ تھے اور تصوف میں بڑے عالم تھے۔ وہ اپنے وقت کے

مولانا عبدالرحمن صوفی تھے۔ ایک بار میں ان کی مجلس سماع میں مدعو تھا۔ قوال دیر تک گاتے رہے۔ لیکن مجھے کیفیت نہ ہوئی۔ مولانا نے قوال سے کہا کہ بھئی نعت اور عاشقانہ رنگ کی غزلیں بہت ہو چکیں۔ اب کچھ آگے بڑھو۔ قوال نے شروع کیا ؎

کے کہ سر نہاں است ور علن ہمہ اوست
عروس خلوت و ہم شمع انجمن ہمہ اوست

اس پر مجھے زور کی کیفیت ہوئی۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین صاحب فرمانے لگے۔ کہ بعض میں جانتا ہوں جب تک مغلظات انہیں نہ سنائی جائے ان کی رگوں میں جوش نہیں آتا۔ دیکھئے جب کھلے کھلے الفاظ سن لئے تو بھڑکے۔

مرحوم مغفور خوب شخص تھے۔ ایک بار میرے سامنے ان کا ایک عقیدت مند ان کی شان میں قصیدہ لکھ کر لایا۔ کہتے کہتے ایک جگہ کہہ گیا کہ آپ مثل خدا کے ہیں۔ اس کو سن کر مولوی صاحب نے نہایت ہی بلاغت کے ساتھ فرمایا۔ کہ یار شرک نہ کرو۔ "مثل خدا" کے بجائے "عین خدا" کہو۔ سمجھ جائے گی۔

حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ

حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار نصورہ تشریف لائے۔ اس وقت میری واعظانہ زندگی کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں مطب کرتا تھا۔ میں تازہ حج سے واپس آیا تھا۔ میں حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہو رہا تھا۔ شرف الدین مرحوم (جسٹس شرف الدین جو حضرت حاجی صاحب کے غالی مریدوں میں تھے) نے حضرت سے کہا کہ حکیم سلیمان آئے ہیں۔ حضرت اٹھ کر میری طرف دوڑے اور مجھ سے معانقہ کیا اور گلے سے لگائے ہوئے اپنی جگہ تک لائے اور ساتھ بٹھایا۔ حضرت کے اس غیر معمولی استقبال سے مجھے حیرانی اور خجالت ہو رہی تھی۔ اور تمام لوگ اس تماشا کو دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے۔ یہاں تک ایک بھیڑ لگ گئی۔ حضرت مدینہ منورہ کا حال پوچھنے لگے۔ پھر فرمایا۔ کہ تم بڑے مولانا ہو۔ میں نے عرض کی کہ نہیں میں تو حضرت کا ادنیٰ خادم ہوں۔ فرمانے لگے۔ نہیں تم بڑے مولانا ہو۔ پھر حضرت نے تمام لوگوں سے جو اکٹھا ہو گئے تھے فرمایا۔ کہ بھئی اپنے اپنے بستر پر جاؤ۔ سب لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے بھی رخصت طلب کی۔ حضرت نے فرمایا۔ کہاں جاؤ۔ بستر پر جاؤ۔

اس وقت تک لوگ مجھے حکیم صاحب کہتے تھے مگر اتفاق کہ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد مجھے مونگیر کی طرف جانا ہوا۔ اور لکھنیہ وغیرہ میں ایک جماعت نے مجھ سے بیعت کی اور لوگ مولانا کہنے لگے۔ میں اپنے پیر و مرشد حضور شاہ علی حبیب صاحب کے بعد سب سے پہلے حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب ہی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن چونکہ میں سلوک کا طالب تھا اور یہ چیز مجھے وہاں نہ مل سکتی تھی۔ اس لئے اس خیال سے اور نیز میری مولویت اور حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی و مولانا نذیر حسین (محدث) دہلوی کی شاگردی نے مجھے آپ کی صحبت و ارادت میں بیٹھنے سے باز رکھا۔ بہرکیف حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب کا معاملہ سمجھ سے باہر ہے۔ مگر صوفیہ کا ہر گروہ آپ کی تعظیم کرتا ہے۔ میں نے خود شیخ العالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب طیب اللہ رمسہ کو فرماتے سنا کہ بھئی حاجی وارث علی کی توحید بے مثل ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت وہ نماز نہیں پڑھتے۔ آپ نے فرمایا۔ واہ یہاں حرم میں بھی دیکھتا تھا کہ کعبہ کے سامنے اس طرح سے تشریف فرما کر بیٹھے رہتے تھے۔ اور جماعت ہوتی رہتی تھی۔ حضرت یہ فرمانے کے بعد مسکرانے لگے۔ واللہ اعلم کیا معاملہ تھا اور حضرت حاجی وارث علی صاحب کہاں کے لیے مامور تھے۔

میرے دوست . . . . حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب کے خاص قرابت مند تھے۔ انہیں حاجی صاحب سے اعتقاد نہ تھا۔ گنج مراد آباد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوئے مولانا نے فرمایا کہ تم حاجی وارث علی صاحب سے مرید نہ ہوئے؟ کہنے لگے حضرت مجھے آپ ہی سے اعتقاد ہے۔ مولانا نے فرمایا "تم انہیں سے جا کر مرید ہو۔ کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں" وہ واپس آئے۔ حضرت حاجی صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا "آؤ آؤ۔ کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں، کل مرید کریں گے" چنانچہ دوسرے دن وہ حضرت حاجی کے مرید ہوئے۔

شاہی مسجد لاہور شروع شروع جب میں نے لاہور کی شاہی مسجد کو دیکھا تو اس میں بڑے بڑے پیپل کے درخت تھے۔ یہاں ایک زمانے میں رنجیت سنگھ کے گھوڑے بندھتے تھے۔ یہ مسجد شہنشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ مسجد اتنی وسیع بنوائی گئی تھی کہ سلطنت عالمگیری سے باہر بخارا میں تو اتنی بڑی مسجد تھی لیکن اس سلطنت کے اندر کہیں نہیں تھی۔ اس مسجد میں مجھے جمعہ کی نماز پڑھانے اور وعظ کہنے کا بہت بار موقع ہوا ہے۔ ایک مرتبہ عید اضحیٰ کے موقع پر میں لاہور میں تھا۔ قزلباش صاحب انجمن اسلامیہ کے صدر تھے جس کے زیر انتظام یہ مسجد ہے۔ سردار محمد ایوب خاں شہزادۂ کابل کی خواہش پر مجھے عید پڑھانے کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھائی اور خطبہ پڑھا۔ سردار محمد ایوب خاں اٹھارہ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں آئے تھے۔ وہاں کے دستور کے مطابق بیسیوں شالیں اور پگڑیاں رؤسا و انجمن کی جانب سے مجھے پیش کی گئیں۔ سردار صاحب کی طرف سے بھی ایک قیمتی شال مع ایک سو روپیہ نقد پیش کی گئی لیکن میں نے کوئی ہدیہ قبول نہ کیا۔ بلکہ یہ کہہ کر کہ یہ سب حق یہاں کے مستقل امام صاحب کا ہے، کل شالیں، پگڑیاں اور روپے امام صاحب کے حوالے کر دیئے کچھ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا مگر تمام سنجیدہ طبقہ نے میری اس انصافانہ کارروائی کو بہت اچھی نظر سے دیکھا۔ قزلباش صاحب اپنی شیعہ جماعت میں نماز پہلے ادا کرنے کے بعد شاہی مسجد میں چلے آئے تھے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ انتظام کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ایک عجیب استغنا صوفیہ کے یہاں یہ کائنات اسماء و صفات باری تعالیٰ کی تجلی کا نام ہے۔ اسی لئے میں یہ نہیں کہتا کہ غوث و قطب وغیرہ اس زمانے میں نہیں ہیں۔ مگر پہلے "یا ظاہر" کی تجلی تھی اور اب اس زمانے میں "یا باطن" کی تجلی ہے۔ یہی وجہ ہے یہ بزرگان دین اب بطون و خفا میں ہیں۔ اپنے ایام جوانی میں اکثر ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کے حالات معلوم کر کے سخت تعجب ہوا ایک بار میں اجمیر شریف حاضر ہوا تو ایک شخص کو دیکھا کہ پشت پر مشک لادے ہوئے لوگوں کو پانی پلا رہا ہے اور اس کے ساتھ دو ایک آدمی اور ہیں جو اسی کی طرح سقائی کر رہے ہیں۔ مسجد میں بھی نماز کے وقت وہ حاضر رہتے ہیں۔ میرے قلب کو ایک خاص مناسبت ان سے پیدا ہوئی۔ اور میں بار بار تعجب سے دیکھتا تھا کہ یہ کون شخص ہے۔

یہ واقعہ گزر گیا اور ایک مدت دراز کے بعد فیض آباد میں ایک بار میں وہاں کے رئیس خان بہادر صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مقطع شخص لکھنوی پلے کی خوبصورت دلائی اوڑھے مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت! میں وہی ہوں جس کو آپ نے اجمیر شریف میں سقائی کرتے دیکھا تھا اور بار بار مجھے گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ میں نے تعجب سے کہا۔ جناب اب یہ رنگ کب سے اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے پیر و مرشد نے کئی خدمتیں میرے سپرد کی تھیں۔ انہیں میں تین برس

سقائی کرتا بھی تھا۔ بحمد اللہ کہ ان خدمتوں کو میں انجام دے چکا اور اب ایک مسجد کی خدمت میں مصروف ہوں۔ یہ کپڑے اور پوشاک لوگوں نے مجھ کو پہنا دیے ہیں۔ میں نے انکار بھی نہیں کیا مگر کل پھر یہ آپ کسی دوسرے کے بدن پر دیکھیں گے۔ میں اس وقت آپ سے ایک فتویٰ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا ارشاد ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پیر و مرشد نے مجھے ایک مراقبہ بتایا ہے اور وہ اس حدیث کا مراقبہ ہے۔ اذا سئلت فاسئل اللہ و اذا استعنت فاستعن باللہ۔ یعنی جو کچھ مانگنا ہو صرف خدا سے مانگو اور جو کچھ مدد چاہنا ہو وہ اللہ ہی سے چاہو۔ پس ہمارے یہاں سوال عن غیر اللہ حرام ہے۔ یہی مراقبہ میں نے اپنے شاگردوں (یعنی مریدوں) کو بھی بتایا ہے۔

میرا ایک مرید تھا جس کو میں نے سقائی کے کام پر مامور کیا تھا ایک بار وہ پانی بھر رہا تھا کہ پیر پھسلا اور کنوئیں میں جا رہا۔ پانی اس کے سر تک نہ تھا۔ اس لیے وہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ چونکہ ہمارے مسلک میں کسی غیر سے مدد مانگنا درست نہیں اس لئے وہ بغیر چیخے چلائے خاموش اس میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ کامل تین دن تک وہ کھڑا رہا۔ یکایک کسی پانی بھرنے والے کا ڈول اس کے سر سے ٹکرایا اور اس آدمی نے دیکھ کر اس کو باہر نکالا۔ اب مجھے آپ سے یہ فتویٰ پوچھنا ہے کہ جو خدمتیں ہم نے اس کے سپرد کی تھیں اس کو جاری رکھیں یا اب اسے آزاد کر دیں۔ میں نے کہا کہ حضرت! یہ عجیب و غریب استفتاء ہے جو نہ در مختار میں ملے گا نہ ہدایہ میں۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ہدایہ و در مختار کا فتویٰ درکار نہیں۔ بتلاؤ کہ غزالی و ابو طالب مکی کیا کہتے ہیں؟ پھر میں نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اب اسے آزاد کر دیجئے اور رشد و ہدایت کے کسی منصب پر بٹھلا دیجئے۔ انہوں نے کہا "ہاں میں بھی ایسا ہی پسند کرتا ہوں۔"

گاندھی جی ایک بار چھپرہ میں گاندھی جی نے میرے پیروں کو پکڑ کر کہا کہ مسلمانوں سے گائے کی قربانی موقوف کرا دیجئے۔ میں نے کہا۔ بے شک۔ بشرطیکہ آپ اپنی قوم سے بت پرستی موقوف کرا دیجئے۔ وہ ہنس کر کہنے لگے۔ اس کو کوئی نہیں مان سکتا

ایک بار گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ جوگ اور ریاضت فقط اپنی نجات کے لیے کرتے ہیں اور میں قوم کے لیے کرتا ہوں۔

مولوی سید علی بلگرامی تذکرہ ابو النجیب سہروردی (مصنفہ مولانا حسن میاں مرحوم) کو مولوی سید علی بلگرامی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے حرفاً حرفاً پڑھا تھا اور پڑھ کر دونوں نے بہت داد دی تھی۔ مولوی سید علی صاحب نے کہا کہ جس تذکرہ لکھا جائے تو اسی اصول پر کہ جو کچھ کہا اس کا ثبوت پیش کر دیا۔ ان دونوں حضرات نے تذکرہ ابو النجیب اس وقت پڑھا تھا جب کہ ہم لوگ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں یوپی، پنجاب اور سندھ کا دورہ کر رہے تھے۔ میں اور مولوی سید علی بلگرامی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ایک ڈبہ میں رہتے تھے۔ اور راجہ صاحب محمود آباد اپنے مصاحبوں کے ساتھ دوسرے ڈبہ میں۔ مگر کھانا وانا اکثر ہمارے ہی ڈبہ میں آکر کھاتے۔

مولوی سید علی بلگرامی بڑے ظریف آدمی تھے۔ ایک بار وہ کھا رہے تھے مجھ سے کہنے لگے۔ "میں کتنے دنوں اور زندہ رہوں گا؟" میں نے کہا۔ "بہت تھوڑے دن" وہ کہنے لگے کہ "نہیں میں اپنے قویٰ اور صحت کا اندازہ کر کے کہتا ہوں کہ ابھی دس برس اور

زندہ رہوں گا۔ مگر عجب اتفاق کہ وہ ہماری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔ وہ پھر لوٹ گئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد لکھنؤ سے یہ اطلاع آئی کہ مولوی سید علی بلگرامی نے انتقال کیا۔

شاہ نظام الدین بریلوی حضرت شاہ نظام الدین صاحب (ابن حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ) میرے مواعظ و مجالس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ حضور اس قدر ضعیف و نحیف ہو کر وعظ میں آنے کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں۔ تو جواب میں فرمایا کہ "بھئی یہ زمانہ اب لامذہبیت اور بے دینی کا آگیا ہے۔ اور دینی و روحانی بیانات کی قدر لوگ کم کرنے لگے ہیں۔ اس لیے میں خاص کر آتا ہوں تاکہ اور لوگ بھی شرما شرمی شریک ہو جائیں اور مجالس وعظ کی رونق زیادہ ہو۔"

میں نے ایک بار ان کے آگے نذر پیش کی تو فرمایا۔ بھئی تم نے ایک بار کہا تھا کہ میں ماں کی طرف سے فریدی ہوں۔ لہٰذا تم میرے پیرزادے بھی ہو۔ اس لئے میں نذر تو لوں گا مگر اس طرح کہ میں اپنا ہاتھ نیچا کرتا ہوں اور تم ہاتھ اوپر کر کے مجھے دیدو۔

جسٹس سید امیر علی رائٹ آنریبل سید امیر علی مرحوم و مغفور جب کلکتہ ہائی کورٹ میں جج تھے میں اس وقت ایک بار کلکتہ میں ان کا مہمان تھا۔ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاریؒ کی مکتوبات صدی کا تذکرہ ہوا۔ جسٹس امیر علی نے اس کتاب کا پورا مطالعہ کیا تھا اور اس کے بڑے مداح تھے۔ مجھ سے دریافت کیا کہ حضرت شیخ کی کچھ یادگار باقی ہے یا نہیں۔ میں نے مخدوم زادگی کا ذکر کیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ان میں ضرور مکتوبات شریف کو رائج و متداول رکھئے۔

یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کا جب سنگ بنیاد رکھا گیا تو میں بھی بنیاد رکھنے میں شریک تھا۔

تسلیط کا عجیب واقعہ ضلع دربھنگہ میں شہر سے بہت دور ایک گاؤں ایکھتا نامی ہے۔ اس گاؤں کو کوردہ سمجھنا چاہیئے۔ جب میں وہاں گیا تو تعلیم کی کوئی روشنی وہاں نہ پہنچی تھی۔ وہاں میں نے تسلیط کا ایک عجیب و غریب واقعہ دیکھا۔ اس زمانہ میں وہاں تسلیط کی وارداتیں بہت ہو رہی تھیں اور عجیب عجیب طور سے۔ ایک بار میں وہاں گیا۔ اتفاقاً ایک زمیندار کے یہاں ایک لڑکی تھی۔ نہ تو صاحب خانہ ہی پڑھے لکھے تھے نہ لڑکی۔ اس لڑکی پر تسلیط ہوئی اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اس حالت میں وہ بہت صاف شستہ فصیح اُردو بولنے لگی۔ یعنی ایسی زبان جس سے اس کے کان کبھی آشنا نہ تھے۔ لوگ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ ہمارے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس اللہ نفسہٗ کا معمول تھا کہ جب اس طرح کوئی تسلیط کی خبر لاتا تو فرماتے کہ اچھا ان کو میرا سلام کہو۔ مولانا کا قول تھا کہ اگر جن کوئی مسلمان ہوں گے تو صرف سلام سے خود ہی چلے جائیں گے۔ ان لوگوں کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں اگر عمل کے زور سے ان کو بھگایا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ہماری اولاد سے اگر وہ قوی عامل نہ ہوں تو بدلہ لیں۔ اس لئے ان کو رضا و خوشی کے ساتھ روانہ کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

چنانچہ اس لڑکی پر تسلیط ہونے کی اطلاع جب لوگ میرے پاس لائے تو میں نے بھی کہا کہ جاؤ۔ ان کو میرا سلام کہو۔ لوگوں نے جا کر کہا کہ مولانا صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں۔ اس لڑکی نے پوچھا۔ "کون مولانا؟" لوگوں نے کہا۔ مولانا محمد سلیمان صاحب پھلواری شریف کے۔ یہ لوگ مجھے مولانا صاحب ہی کہتے تھے مگر اس لڑکی نے سن کر بڑی خندہ پیشانی سے کہا: "اہا شاہ صاحب

آئے ہیں۔ میں ان سے خوب واقف ہوں۔ الٰہ آباد میں مولوی محمد حسین صاحبؒ کے یہاں مجھ سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ میں وہاں طالب العلم تھا۔ شاہ صاحب نے میرا امتحان بھی لیا تھا اگر شاہ صاحب کہیں تو میں چلا جاؤں گا۔ مگر وہ کبھی نہیں کہیں گے۔ الغرض لوگ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ میں نے کہا طالب العلم صاحب کا نام پوچھو۔ اس نے کہا۔ میرا نام خالد ہے۔ اس نام کا کوئی شخص اس کی برادری میں یا گاؤں میں نہ تھا۔ اس لڑکی نے فتوح الشام پڑھی تھی۔ بہرکیف یہ بالکل صحیح ہے کہ میں مولانا محمد حسین صاحب علیہ الرحمتہ کے یہاں الٰہ آباد جایا کرتا تھا۔ طلبہ کا امتحان بھی لیتا تھا۔ طلبہ میری خدمت میں رہا کرتے تھے۔ خاص خالد مجھے یاد نہیں۔

گاؤں والوں نے مجھے بہت دق کیا کہ آپ جن کو چلے جانے کو کہہ دیجئے مگر مجھے مولانا فضل الرحمٰن قدس اللہ نفسہٗ کی نصیحت یاد تھی۔ اس لیے میں نے صریح لفظوں میں ایسا کہنے سے قطعاً پرہیز کیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ تسلیط خود بخود موقوف ہوگئی اس کے بعد میں نے گاؤں کا حصار کیا اور کچھ اعمال کیے جس کے بعد سات آٹھ برس تک امن رہا۔ مگر اس کے بعد پھر تسلیط کی وارداتیں اس گاؤں میں ہونے لگیں مگر مجھے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

خان بہادر مولوی خدا بخش مولوی خدا بخش خان بہادر سی آئی ای مرحوم نے ایک بار اپنے خاص احباب کی دعوت کی۔ جسٹس شرف الدین مرحوم جو اس وقت بیرسٹری کرتے تھے، مولوی محمد یحییٰ وکیل مرحوم، نواب امداد امام اثرؔ مرحوم خان بہادر علی محمد شادؔ مرحوم، خان بہادر مولوی ضمیر الحق رئیس عظیم آباد مرحوم اور شمس العلماء حافظ محب الحق وغیرہم احباب وارباب خلوص جمع تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ صوبہ بہار کے شعرا کا تذکرہ آگیا۔ خان بہادر علی محمد شادؔ مرحوم نے راسخؔ عظیم آبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ وہ بھی مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ میں نے زبردست تردید کی اور لوگوں نے میرا ساتھ دیا۔ نواب امداد امام مرحوم خاموش مسکراتے اور پُر مذاق چٹکلے چھوڑتے رہے۔

خان بہادر علی محمد شادؔ نے کہا کہ میرے پاس ان کی بعض تحریریں ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کی منقبتیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شیعہ ہی تھے۔ میں نے کہا کہ جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں بھی لکھتا ہوں اور کون سا سنّی ہے جو ان کا منقبت خواں نہ ہو۔ یہ کوئی دلیل شیعیت نہیں۔

ہمارے ہاں بھی راسخؔ مرحوم کی تحریریں موجود ہیں۔ وہ اپنا فارسی کلام تو پھلواری ہی کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت تپاںؒ قدس سرہٗ کو دکھاتے تھے اور ان کی بیعت کی دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مرید بھی حضرت تپاںؒ ہی کے تھے۔ دوسری یہ کہ ان کی بیعت حضرت مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری پھلواری قدس سرہٗ سے تھی۔ حضرت مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی قدس سرہٗ سے میں نے یہ سنا تھا کہ ان کو بیعت تو باہر کسی سے تھی مگر ارشاد پھلواری میں تھا۔ اور دونوں بزرگوں سے یعنی حضرت تپاںؔ اور حضرت شاہ نعمت اللہ قدس سرہما سے فارسی کلام خصوصیت کے ساتھ حضرت تپاںؔ ہی کو دکھاتے تھے

مگر راسخؔ مرحوم پھلواری کے ہر بزرگ کا بے حد ادب کرتے تھے اور خط و کتابت میں، ملنے جلنے میں بالکل ایک مرید ہی کی طرح یہاں کے ہر بزرگ سے ملتے تھے چنانچہ ان کے بعض خطوط سے ظاہر ہے جو بعض گھروں میں موجود ہیں۔

خان بہادر علی محمد شاد مرحوم کو آخر مان ہی لینا پڑا۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے پاس کی تحریریں کسی دن یہاں لے آئیں۔ اس دن میں بھی اپنے بزرگوں کے ہاں سے ان کی تحریریں حاصل کر کے یہاں لے آؤں گا۔ مگر اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

مراقبہ کی کیفیت آج کل جب میں مراقبے کے بعد آنکھیں کھولتا ہوں تو روشنی کی متعدد شعاعیں سامنے ادھر ادھر دھبہ کے طور پر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جاہل صوفی ایسے موقع پر بھٹک جاتے ہیں۔ چونکہ میں طب کی کتابیں پڑھا ہوا ہوں اس لیے سمجھتا ہوں کہ یہ ضعف بصارت، کمزوری دماغ اور نزول الماء کی وجہ سے ہے۔ میں مراقبہ اندھیرے میں کیا کرتا ہوں مگر ایسی کیفیت اکثر آنکھوں کے سامنے دن کے وقت بھی ہو جایا کرتی ہے۔

در دیار بے رنگی عالم خدائی ہست پہلے میں اپنے قلب کو شام کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرح دیکھتا تھا مگر اب ہر رنگ میں دیکھتا ہوں حتیٰ کہ سیاہ رنگ میں بھی دیکھتا ہوں اور اسی میں انوار و تجلیات نظر آتے ہیں اور کبھی سب رنگ مٹ جاتے ہیں۔

در دیار بے رنگی عالم خدائی ہست

مگر یہ باتیں بولنے کی نہیں ہیں اور ان چیزوں کو دنیا داری سمجھنا یا دنیا کے لیے کرنا خدا کی لعنت ہے۔

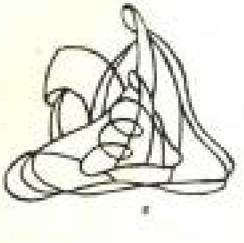

حضرت مخدوم علی ہجویری

المعروف داتا گنج بخشؒ

علی بن عثمان بن علی جلابی غزنویؒ، ہجویری عرض کرتا ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور جو اغراض نفس میں چھپی تھیں، دل سے دور کر دیں۔ تمہاری[1] درخواست کے مطابق (خدا تمہیں سعادت عطا کرے) کام کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس کتاب سے تمہاری امید بر لانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کتاب کا نام "کشف المحجوب" رکھا۔ میں نے جو آغازِ کتاب میں اپنا نام درج کیا ہے اس سے مراد دو چیزیں ہیں، ایک خاص لوگوں کے متعلق ہے اور دوسری عام لوگوں کے۔ عام لوگوں کے باب میں تو یہ بات ہے کہ جب اس علم سے بے بہرہ لوگوں کو کوئی نئی کتاب نظر آتی ہے، جس پر جگہ جگہ نام درج نہ ہو تو وہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ اس سے مصنف کا مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ تصنیف و تالیف سے مصنف کی مُراد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس کتاب سے اس کا نام زندہ رہے اور پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے والے اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔ مجھے دو مرتبہ یہ حادثہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ یہ کہ کسی نے میرے شعروں کا دیوان مجھ سے مانگ کر لیا اور اصل نسخہ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے سارا دیوان الٹ پلٹ کر دیا اور میرا نام اس پر سے اڑا کر میری ساری محنت برباد کر دی۔ خدا اس پر رحم کرے۔ دوسری مرتبہ یہ کہ میں نے تصوف کے موضوع پر اللہ اسے آباد رکھے "منہاج الدین" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ ایک کمینے مدعی نے جس کا نام قابلِ ذکر نہیں، میرا نام اس پر سے مٹا دیا اور عوام پر یہ ظاہر کیا کہ کتاب اس نے خود لکھی ہے۔ اگرچہ خاص لوگ اس بات پر ہنسا کیے، یہاں تک کہ اس کی بے برکتی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ خدا نے اپنے طالبوں کی درگاہ کے دیوان سے اس کا نام ہی خارج کر دیا، لیکن خواص کا حصہ یہ ہے کہ جب وہ کتاب دیکھیں گے اور اسے پڑھنے اور یاد کرنے میں زیادہ جدوجہد سے کام لیں گے۔ اس طرح پڑھنے والے اور مصنف کی مراد زیادہ اچھے انداز سے بر آئے گی۔

غرض میں نے یہ کتاب اس لیے تالیف کی ہے کہ یہ اُن دلوں کو صیقل کر کے صاف کرے جو تاریکی کے حجاب میں مبتلا ہیں، لیکن نورِ حق کا سرمایہ ان کے اندر موجود ہے۔ تاکہ اس کتاب کے مطالعے سے تاریکی کا حجاب اُٹھ جائے اور حقیقتِ معنی کا راستہ مل جائے۔ جن لوگوں کی فطرت اور خمیر ہی میں حق سے انکار اور باطل کا ارتکاب ہوتا ہے، انہیں دلائل و شواہد کے باوصف راہِ حق نہیں ملتی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اس کتاب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ عرفان کی نعمت پر خدا کا شکر ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا، جس کے لوگوں نے ہوا و ہوس کا نام شریعت، جاہ و ریاست کی طلب اور تکبر کا نام عزت و علم رکھ دیا ہے۔ خلقت سے ریاکاری کو خوفِ الٰہی اور دل کے اندر کینہ پوشیدہ رکھنے کو حلم سے موسوم کر دیا ہے۔ فضول جنگ و جدل کو مناظرہ، باہم لڑائی جھگڑے اور نادانی کو پاک دامانی قرار دے لیا ہے۔ منافقت کا نام پرہیزگاری، جھوٹی آرزو کا ارادت، طبیعت کے ہذیان کا معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی دعوے کا عشقِ الٰہی، گمراہی کا فقر، انکارِ حق کا برگزیدگی، بے دینی کا فنا، شریعتِ رسولؐ سے برگشتہ ہو جانے کا طریقت اور دنیا داروں کی آفت کا نام مجاہدہ رکھ

---

[1] ابوسعید ہجویری

دیا ہے۔ یہاں تک کہ معارفِ حق کے راز آشنا لوگ اس جہان سے یکسر الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور دنیا داروں نے غلبہ پا لیا ہے، جیسا کہ آغازِ اسلام میں آلِ مروان نے اہل بیتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

جان لو کہ میں نے اولیاء اللہ کے حق میں اس عالم کو خدا کے بھیدوں کا مقام، موجودات کو اس کی امانتوں کا محل اور مخلوقات کو اس کے لطیف اسرار کی جگہ پایا ہے۔ جواہر، اعراض، عناصر، اجرامِ فلکی، اجسامِ ارضی اور مخلوقات کی طبیعتیں، سب ان اسرارِ خداوندی کا پردہ ہیں۔ خدا کی توحید کے مقام میں ان میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔

ایک دفعہ مجھے کسی ایسے صاحبِ علم سے مناظرے کا اتفاق ہوا، جس نے تکبر کی کلاہ کا نام عزت، ہوا و ہوس کی پیروی کا نام سنتِ رسولؐ اور شیطان کی تائید کا نام ائمہ دین کی سیرت قرار دے رکھا تھا۔ اس نے مناظرے کے دوران میں کہا کہ ملحدوں کے بارہ گروہ ہیں، جن میں سے ایک گروہ صوفیہ کا ہے۔ میں نے کہا، اگر ایک گروہ صوفیہ میں سے ہے تو گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ صوفیہ ایک گروہ ہونے پر بھی جس عمدگی سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، تم گیارہ گروہوں میں ہونے پر بھی ویسی حفاظت نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ سب کچھ اہلِ زمانہ کی بے دینی و گمراہی اور ان آفتوں کا نتیجہ ہے، جو آج کل نازل ہو رہی ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے اولیا کو ان لوگوں کے درمیان چھپائے رکھا ہے اور ان لوگوں کو مخلوق میں ان اولیا سے دور کر رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) نے طوس میں شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے پوچھا کہ درویش کے لیے کم از کم کیا چیز ہونی چاہیے، جس کی بنا پر وہ نامِ فقیر کا حق دار ہو سکے، انہوں نے فرمایا کہ کم از کم تین چیزیں:۔

(اوّل) یہ کہ چیتھڑا سیدھا سینا جانتا ہو۔

(دوم) یہ کہ سچی بات سننے کا علم ہو۔

(سوم) یہ کہ وہ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھ سکے۔

اس وقت درویشوں کا ایک گروہ میرے پاس حاضر تھا۔ جب ہم لوگ دروازے پر واپس آئے تو ہم میں سے ہر شخص اس قول میں کچھ تصرف کر رہا تھا۔ جاہلوں کے ایک گروہ کو اس میں طمع پیدا ہوئی، وہ کہنے لگے کہ بس فقر اسی کا نام ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ چیتھڑا سیدھا سینا اور پاؤں زمین پر مارنا اچھا مراد لینے لگے۔ ہر شخص کو یہ خیال ہوا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا جانتے ہیں۔ چونکہ میرا دلی خیال شیخ کی جانب تھا، لہٰذا میں نے ان کے قول کو زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور ان لوگوں سے کہا، آئیے ہم میں سے ہر ایک اس قول کے معنی سے متعلق کچھ اظہارِ خیال کرے۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا:۔ چیتھڑا صحیح طور پر سینا یہ ہے کہ وہ اصل فقر سے سیا جائے، نہ کہ ظاہری آرائش سے۔ جب تو چیتھڑا فقر سے سیے گا تو گو کج سیے گا، پھر بھی راست ہو گا۔ سچی بات سننا یہ ہے کہ وہ حال سے سنی جائے نہ کہ قال سے۔ اس کی تاویل حق و معقول بات سے کی جائے نہ کہ لغویات سے، وہ دل سے سمجھی جائے نہ کہ عقل سے۔ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھنا یہ ہے کہ جذبۂ عشقِ خدا سے زمین پر پاؤں رکھا جائے نہ کہ لہو و لعب اور رسمِ ظاہر سے۔ جب کسی شخص نے یہ بات شیخ المشائخ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا:۔ "اصاب علی خیر اللہ" (علی نے درست کہا، خدا اسے جزا دے)

مجھے (علی بن عثمان جلابی کو) ایک بار ایک واقعہ پیش آیا۔ میں نے اس امید پر کہ وہ حل ہو جائے، بہت جد و جہد کی لیکن حل نہ ہوا۔ اس سے قبل اسی قسم کا ایک پیچیدہ عقدہ سامنے آیا تھا۔ میں نے شیخ بایزیدؒ کے مزار پر جا کر مجاوری کی کہ وہ حل ہو جائے، مگر نہ ہوا۔ میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تیس مرتبہ وضو کیا کرتا تھا، اس توقع پر کہ وہ عقدہ مجھ پر کھل جائے، لیکن وہ نہ کھلا۔ میں وہاں سے اٹھا اور خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ایک

شب میں موضع "کمس" میں پہنچا۔ وہاں ایک خانقاہ کے اندر صوفیوں جیسا ایک گروہ تھا۔ میں ایک سخت اور پرانی گدڑی اوڑھے ہوئے تھا اور رواجی صوفیوں کے ساز و سامان میں سے عصا اور ٹاٹ کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ اس گروہ کی نظروں میں میں نہایت ذلیل معلوم ہوا۔ کوئی بھی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ وہ باہم رسماً کہتے تھے کہ یہ شخص ہم میں سے نہیں۔ درست قول وہی تھا جو وہ کہہ رہے تھے کہ میں اُن میں سے نہ تھا، لیکن اس رات میرے لیے وہاں رہنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے مجھے ایک بالاخانے میں بٹھا دیا اور خود اس سے زیادہ اونچے بالاخانے میں چلے گئے۔ میں فرش پر تھا، انہوں نے خشک اور باسی روٹی جو پھپھوندی سے سبز ہو گئی تھی، میرے آگے رکھی، جو طعام وہ کھا رہے تھے، اس کی بو مجھے آ رہی تھی۔ وہ بالاخانے سے میرے ساتھ طنزیہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ظرافت اور میری تذلیل کے لیے خربوزہ کھا کر اس کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تھے۔ میں دل میں کہتا تھا، بار الہٰا، اگر ایسا نہ ہوتا کہ وہ تیرے دوستوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو میں ہرگز اُن سے ایسی تذلیل برداشت نہ کرتا۔ ان کی طرف سے مجھ پر طعن کا جتنا اضافہ ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی میرا دل حظ و سرور محسوس کرتا تھا، حتیٰ کہ یہ تذلیل سہنے کے باعث وہ پیچیدہ عقدہ حل ہو گیا۔ اسی وقت میں سمجھ گیا کہ مشائخ طریقت نے کس وجہ سے جاہلوں کو اپنے حلقے میں داخل ہونے کی راہ دی ہے اور ان کی تذلیل کا بار کیوں اٹھاتے ہیں

ایک مرتبہ غزنی میں (خدا اُسے نظر بد سے بچائے) امامت علم کے ایک مدعی نے کہا، گدڑی اوڑھنا بدعت ہے۔ میں نے کہا حشیشی و دیبقی جو سر بسر ریشمی کپڑے ہیں، جن کا استعمال مردوں کے لئے قطعاً حرام ہے، پھر منت و سماجت کر کے ظالموں کے مال سے جو سراسر حرام ہے، حاصل کرنا اور بھی حرام ہے، تم انہیں تو لے کر خوشی سے استعمال کرتے ہو اور نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے۔ بھلا ایک حلال کپڑے کو حلال جگہ اور حلال روپے سے خریدا گیا ہو، تم بدعت قرار دیتے ہو۔ اگر تم طبیعت کی سرکشی اور نفس کی گمراہی سے مغلوب نہ ہوتے تو اس سے زیادہ پکی بات کہتے۔ مگر ریشمی لباس پہننا عورتوں پر حلال ہے اور مردوں پر حرام، اگر تمہیں ان دونوں باتوں کا اعتراف ہے تو معذور رہو۔ ایسی بے انصافی سے تو خدا کی پناہ۔

میں علی بن عثمان جلابیؒ ملک شام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت بلالؓ کے روضۂ مبارک پر سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں اپنے آپ کو مکہ معظمہ کے اندر دیکھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے۔ حضور نے ایک بوڑھے کو اس طرح آغوش میں لے رکھا تھا جس طرح لڑکوں کو شفقت سے آغوش میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر حضور کے سامنے گیا اور آپ کے پائے مبارک پر بوسہ دیا۔ میں حیران تھا کہ وہ بوڑھا کون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعجازاً میری دلی کیفیت اور خیال سے مطلع ہو کر فرمایا۔ یہ تیرا اور تیرے اہلِ ملک کا امام یعنی ابوحنیفہؒ ہے اس خواب سے مجھے اور میرے اہلِ شہر کو بڑی امید بندھی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ان افراد میں سے ایک ہیں جو اوصافِ طبع سے فانی، احکامِ شرع سے باقی اور ان سے قائم ہیں۔ حقیقتاً انہیں اوصافِ طبع سے نکال کر لے جانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا میں طریقت میں پیرو ہوں۔ ایک مرتبہ میں وضو کے لئے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا کہ دل میں خیال گزرا۔ جب تمام کاموں کا انحصار تقدیر اور قسمت پر ہے تو آزاد لوگ کرامت کی امید پر اپنے آپ کو پیروں کا غلام کیوں بناتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا۔ بیٹا! جو خیال تیرے دل میں گزرا ہے، وہ مجھے معلوم ہو گیا ہے، جان لے کہ ہر حکم کا ایک سبب ہے۔ جب خدائے بزرگ و برتر چاہتا ہے کہ کسی عام بچے کو تاج و سلطنت[1] بخش دے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر کے اپنے کسی دوست کی خدمت میں مشغول کر دیتا ہے تاکہ یہ خدمت اس کی کرامت کا سبب بن جائے۔

---

[1] یعنی سلطنت فقر

ایک دن گرمی کے موسم میں میں سفری لباس پہنے کوفت سے چور حضرت ابو احمد المظفر الدین حمدانؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا: "اے ابوالحسن! مجھے بتاؤ اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟" میں نے عرض کی۔ "میں راگ سننا چاہتا ہوں۔" انہوں نے فوراً آدمی بھیج کر ایک قوال اور اہلِ ذوق و سماع کو طلب کیا۔ شروع ہی میں مجھے بچپن کے جوش، قوتِ ارادہ اور صحبت کے سوز نے راگ سننے سے بے تاب کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھ میں اس آفت کا جوش و خروش ذرا کم ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: "یہ راگ تمہارے لیے کیسا رہا؟" میں نے عرض کی: "اے شیخ! میں نہایت خوش ہوا۔" فرمایا: "ایک وقت ایسا آئے گا کہ سماع کی یہ آواز اور کوے کی کائیں کائیں تمہارے لیے برابر ہوں گی، کیوں کہ قوتِ سماع اسی وقت تک ہوتی ہے کہ مشاہدۂ حق نہ ہو۔ جب مشاہدہ میسر آجاتا ہے تو قوتِ سماع زائل ہو جاتی ہے۔ دیکھنا، کہیں اس راگ کو عادت نہ بنا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ طبیعتِ ثانیہ بن جائے اور تم اس کے سبب اصل مقصد سے محروم رہ جاؤ۔"

میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں، ایک مرتبہ مجھے ایک مشکل پیش آئی، جس کا حل کرنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ میں نے حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ کی زیارت کو طوس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں ان کے مکان کے پاس مسجد کے اندر تنہا پایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہو بہو میرا واقعہ ایک ستون کو سنا رہے ہیں۔ مجھے پوچھے بغیر اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اس پر میں نے عرض کی: "اے شیخؒ! آپ یہ واقعہ کسے سنا رہے ہیں؟" فرمایا: "بیٹا! اس ستون کو اس وقت خدا نے اسے بولنے کی قوت عطا فرما دی تھی کہ اس نے مجھ سے سوال کیا۔"

ولایتِ فرغانہ میں ایک گاؤں ہے، جسے سلاٹک کہتے ہیں۔ وہاں اوتاد میں سے ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام باب عمر تھا۔ اس علاقے کے تمام درویش بڑے مشائخ کو باب ہی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں فاطمہ نامی ایک بوڑھی عورت تھی۔ میں نے مقام اوزگند سے ان کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: "تو کس غرض سے آیا ہے؟" عرض کی: "اس غرض سے کہ شیخ کا دیدار اصل صورت میں کروں اور وہ مجھ پر شفقت کی نگاہ ڈالیں۔" انہوں نے ارشاد کیا: "بیٹا! میں خود فلاں دن سے تجھے دیکھ رہا تھا اور اس وقت تک دیکھتا رہوں گا، جب تک مجھ سے تجھے غائب نہ کر دیا جائے۔" جب میں نے دن اور برس گنے تو جو دن انہوں نے بتایا تھا، وہ دن میرے آغازِ توبہ کا دن نکلا۔ انہوں نے فرمایا: "بیٹا! تھوڑے وقت میں لمبا سفر کرنا بچوں کا کام ہے۔ اب اس کے بعد اس ذات کی زیارت کے لیے ہمت کر، جسے ہر شخص نہیں پا سکتا اور نہ اس کی زیارت کو شرطِ سفر ضروری ہے۔" پھر فرمایا: "اے فاطمہ! جو کچھ تیرے پاس ہے، لے آ تاکہ یہ درویش کھائے۔" وہ تازہ انگوروں کا ایک تھال لے آئیں، حالاں کہ ان کا موسم نہ تھا۔ انگوروں کے اوپر چند تازہ کھجوریں تھیں، حالانکہ فرغانہ میں تازہ کھجوروں کا ملنا غیر ممکن تھا۔

ایک مرتبہ میں ایک گاؤں میہنہ میں حسبِ معمول تنہا شیخ ابوسعیدؒ کے مزار پر بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا، ایک سفید کبوتر آیا اور مزار پر نظر ڈالتے ہوئے غلاف کے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے دل میں کہا، شاید یہ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آیا ہے۔ جب میں نے اٹھ کر غلاف کے نیچے نظر ڈالی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ دوسرے دن بھی یہی دیکھا اور اس سے میں حیران رہ گیا، حتیٰ کہ ایک رات میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور ان سے اس واقعے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: "وہ کبوتر میرے معاملے کی صفائی ہے، جو ہر روز قبر میں میری مصاحبت کے لیے آتی ہے۔"

میں (علی بن عثمان جلابی) نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ اوصنی (اے خدا کے رسولؐ مجھے وصیت فرمائیے) حضور نے ارشاد فرمایا: "احبس حواسک" (اپنے تمام حواس بند رکھو) کیوں کہ حواس کو بند رکھنا ہی پورا مجاہدہ ہے*۔

---

* عارف رومی کا شعر "چشم بند و گوش بند و لب ببند ۔ گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور ہمارے زمانے کے صوفی (باقی اگلے صفحے کے حاشیہ میں دیکھیے)

ایک مرتبہ میں نے دمشق سے دو درویشوں کے ہمراہ "ابن معلاؒ" کی زیارت کا ارادہ کیا وہ موضع "رملہ" میں مقیم تھے۔ ہم نے راستے میں ایک دوسرے سے کہا: ہم میں سے ہر ایک کو دل میں کوئی ایسی بات سوچ لینی چاہیے، جس کا اُسے علم ہو تاکہ وہ پیر ہمارے باطن سے ہمیں آگاہ کر دیں اور ہمارا واقعہ حل ہو جائے چنانچہ میں نے دل میں کہا: مجھے ان سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے اشعار کی استدعا کرنی چاہیے۔ دوسرا بولا مجھے دعا کرانی چاہیے تاکہ میری تلی دور ہو جائے۔ تیسرے نے کہا: مجھے صابونی حلوا درکار ہے۔ جب ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُن کے حکم سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے چند شعر تحریر کیے ہوئے تھے جو میرے سامنے رکھ دیے گئے۔ دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا۔ اس کی تلی جاتی رہی۔ تیسرے سے فرمایا صابونی حلوا سلطانی اہل کاروں کی خوراک ہے۔ تیرا لباس اولیاء کا ہے۔ اولیا کا لباس سرکاری اہل کاروں کے ساتھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کرلے۔

ایک مرتبہ میں عراق کے اندر دنیا کی طلب اور اس کے فنا کرنے میں بے باکی سے مصروف تھا اور قرض بڑھ گیا تھا۔ جسے ضرورت پیش آتی، وہ میری جانب رُخ کرتا۔ میں ان کی ہوائے نفس کے پورا کرنے کی مصیبت میں گرفتار تھا۔ وقت کے سرداروں[عہ] میں سے ایک سردار نے مجھے تحریر کیا: بیٹا! دیکھ، اپنا دل خدا سے بے تعلق کر کے اس دل کو، جو ہوائے نفس میں مصروف ہے، فراغت پہنچانے پر نہ لگا۔ پس اگر تو اپنے دل سے کوئی محبوب تر دل پائے تو جائز ہے کہ اس کو آرام پہنچانے میں اپنا دل مشغول کرے، ورنہ اس کام سے دست بردار ہو جا، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ میں بہت جلد اس کام سے فارغ ہو گیا۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ فرائض ادا کر چکتے تو سو جاتے۔ میں نے شیخ احمد سمرقندیؒ کو دیکھا، جو "بخارا" میں رہتے تھے۔ وہ چالیس برس تک رات کو نہیں سوتے تھے، البتہ دن کو تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔

ایک دن میں شیخ ابو العباس شقانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: "ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً لا یقدر علیٰ شیءٍ" (خدا نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے، جو دوسرے کے قبضے میں ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتا) اور اشک بار تھے۔ یکایک انہوں نے نعرہ لگایا اور بے ہوش ہو گئے۔ میں سمجھا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عرض کی: اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ فرمایا: گیارہ سال ہو گئے ابھی تک میرا ورد یہاں تک پہنچا ہے اس سے آگے میں نہیں جا سکا۔

میں نے حضرت ابو العباس عطاؒ سے پوچھا: آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں؟ فرمایا: اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا، مگر اب چودہ سال گزر گئے، ابھی تک سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔

ایک مرتبہ میں مرو میں تھا۔ اہل حدیث[عہ] کے ایک مشہور ترین امام نے مجھ سے کہا: میں نے "سماع" کے مباح ہونے سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا: دین میں بھاری مصیبت پیدا ہو گئی کہ خواجہ امام نے ایک لہو کو جو تمام بدکاریوں کی جڑ ہے، حلال کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا اگر تو اسے حلال نہیں سمجھتا تو سُنتا کیوں ہے؟ میں نے کہا: اس کا حکم متعدد اسباب پر مبنی ہے۔ ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کی

(بقیہ حاشیہ) شاعر اصغر گونڈوی کہ: جان ہے محو تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند — حسن کو جس نے یہاں حسن نظر سمجھا تھا میں۔ — نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

[عہ] یعنی اولیا وقت کے سرداروں میں سے ایک نے [عہ] یعنی محدث۔ آج کل جو اہل حدیث کی اصطلاح مشہور ہے۔ یہ بالکل نئی اور زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ متقدمین نے جہاں منہ اہل حدیث استعمال کیا ہے اس سے مراد محدث سے ہوتی ہے۔

تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے اور اگر حرام ہے تو اس کا سماع بھی حرام ہے۔ اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے: "السماع زاد المضطرین فمن وصل استغنیٰ عن السماع" (سماع عاجز لوگوں کا زادِ راہ ہے، پس جو منزل پر پہنچ گیا، وہ سماع سے بے نیاز ہو گیا) کیوں کہ وصل کے مقام میں سننے کا حکم غائب ہو جاتا ہے، اس وجہ سے کہ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کی بات ہوتی ہے۔ جب مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سننا جاتا رہتا ہے۔

میں نے ان (منصور حلاج) کے کلام کی شرح میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں ان کے کلام کی بلندی اور حال کی صحت دلائل و براہین سے ثابت کی ہے۔ علاوہ بریں میں نے اپنی تصنیف "منہاج الدین" میں جس کا ذکر پہلے کیا ہے، ان کے حالات کے آغاز و انجام پر روشنی ڈالی ہے۔ ...... میری اکثر کتابیں "غزنی" (خدا اسے محفوظ رکھے) میں رہ گئی ہیں۔ اور میں ملک ہندوستان میں بمقام شہر "لہاور" (لاہور) جو نواح ملتان میں سے ہے۔ ناجنسوں کے درمیان گھر گیا ہوں۔ راحت اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کا شکر ہے۔

میں نے ان شُبہ کی تردید میں ایک مختصر دلیل (کشف المحجوب میں) بیان کر دی ہے، کیوں کہ یہ کتاب ان لغو عقائد کی دھجیاں بکھیرنے کا موزوں مقام نہیں۔ اس علم کے مشتاق کو یہ مسئلہ میری دوسری کتاب میں دیکھنا چاہیے۔ جو میں نے اس موضوع پر لکھ کر اس کا نام "الرعایۃ بحقوق اللہ" رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، تاکہ وہ مجھے اس مقام میں ہر بلا سے بچائے رکھے اور نفس کی شرارت سے نجات دلائے۔ اگر وہ مجھے اپنے قہر میں رکھے تو میں لطف کی آرزو نہ کروں اور اگر لطف میں رکھے تو مجھے قہر کی خواہش نہ ہو کیوں کہ ہمیں اس کے اختیار میں ذرا دخل نہ ہو۔

میں علی بن عثمان جلابیؒ اس امر کو اچھا سمجھتا ہوں کہ نو آموزوں کو سماع کی اجازت نہ دی جائے، تاکہ ان کی طبیعت کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ اس میں زبردست خطرے اور بڑی خرابیاں ہیں، کیوں کہ عورتیں چھتوں پر سے اور مکانوں سے درویشوں کو سماع کے عالم میں دیکھتی ہیں۔ اس سے اہل سماع پر شدید حجاب پڑ جاتے ہیں۔ لازم ہے کہ نوجوانوں کو بھی ان کے درمیان نہ بٹھایا جائے کیوں کہ جاہل صوفیہ نے یہ تمام امور مذہب میں شامل کر لیے ہیں اور سچائی کو درمیان سے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ میں ایسی باتوں سے، جو اس طرح کی خرابیوں کے باعث مجھ پر گزر چکی ہیں، توبہ کرتا ہوا اللہ تعالیٰ سے امداد خواہ ہوں کہ وہ میرے ظاہر و باطن کو خرابیوں سے بچائے رکھے۔ تمہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اس کی رعایت حقوق کے لیے وصیت کرتا ہوں، توفیق دینے والا اللہ ہی ہے۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً۔

(انتخاب از انوار القلوب ترجمہ کشف المحجوب)

امام الصوفیہ حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سالِ وصال ۴۶۵ھ مشہور ہے۔ بعض کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مثلاً کشف المحجوب، الرعایت بحقوق اللہ، منہاج الدین

عہ آتش پرست، فلسفی اور معتزلہ وغیرہ

الیمان لاہل العیان اور دیوان علی۔ "علی" آپ کا تخلص ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسالہ "کشف الاسرار" بھی آپ کی تصنیف ہے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نے اُن سے منسوب کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس میں بعض باتیں بالکل سطحی سی درج ہیں جن کو حضرت موصوف کی طرف منسوب کرنا اُن پر افترا سے کم نہیں۔ غرض کہ اس وقت دنیا میں آپ کی ایک ہی تصنیف "کشف المحجوب" موجود ہے۔ یہ کتب تصوف میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے، اور اس موضوع کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں، جسکو اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہو۔ مزار مقدس آپ کا لاہور کے لیے باعث برکت و اعزاز ہے ؎

خاک پنجاب از دم اُو زندہ گشت   از جبینش آشکارا اسرارِ عشق

(اقبال)

ترتیب : حکیم محمد موسیٰ امرتسری

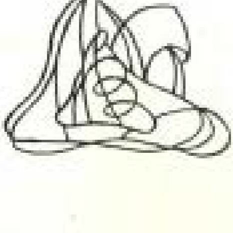

خواجہ حسن نظامی

مختصر سراپا

میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے۔ (والدین نے قاسم علی نام رکھا مگر ماموں سید بہادر علی شاہ صاحب علی حسن کہہ کر پکارتے تھے۔ آخر یہی نام قرار پا گیا۔ چوبیس برس تک رہا۔ ابتدائی زمانہ میں اخباروں کے مضامین سید محمد علی حسن نظامی کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ ———— حسن نظامی کے نام سے سب سے پہلا مضمون حلت زاغ کے عنوان سے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوا) والد کا نام سید عاشق علی ہے۔ والدین زندہ نہیں (میں بارہ سال کا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا) میری قوم سید ہے۔ پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء پرانی دہلی ہے اور وہیں آج کل اقامت ہے۔ معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔ تعلیم عربی، فارسی، اردو۔ عمر ۴۵ سال (سنہ ۱۳۴۰ھ میں) حلیہ یہ ہے۔ بہت لمبا قد۔ اس قدر دبلا کہ سوائے ہڈیوں اور کھال کے گوشت کا نام نہیں۔ رنگ گورا۔ چہرہ کتابی۔ آنکھیں سفید و سیاہ اور بڑی بڑی دونوں بھوؤں کے وسط میں ہلکا سا ایک سرخ نشان (جس کو بچپن سے آج تک پیشین گوئیاں کرنے والوں نے خوش نصیبی کی علامت بیان کیا) پیشانی چوڑی۔ ناک سیدھی۔ رخسارے نہ بہت پچکے ہوئے نہ گوشت سے بھرے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دہانہ بڑا۔ دانت اب تک سلامت۔ داڑھی یک مشت اور بھری ہوئی۔ سر کے بال کمر تک جن میں بل پڑے ہوئے گھونگھر والے ہیں (۱۰ محرم سنہ ۱۳۴۰ھ کو بال کٹوا دیئے) سینہ بہت چھوٹا جیسا کہ بارہ سال کے بچے کا ہوتا ہے۔ سینہ کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی ہیں کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ ان پر گوشت بالکل نہیں۔ گردن بہت پتلی اور خمیدہ (جو بچپن میں بہت لمبی اور بہت سیدھی تھی) گردن سے ناف تک کا حصہ بہت لمبا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کمر چلنے میں ذرا جھکی رہتی ہے۔ کان درمیانی۔ ٹانگیں لمبی۔ پاؤں درمیانے۔ سر لمبوترا اور بڑا۔

آواز بہت بڑی اور ذرا گرج دار (جو حلق کی شیرینی نہیں رکھتی۔ اگر گانے کی کوشش ہو تو بہت بھدی اور مکروہ معلوم ہوگی) بال بالکل سیاہ۔ جسم کے کسی عضو میں کمزوری نہیں ہے۔ سوائے جگر اور معدہ کے کہ دماغی کام کرنے سے وہ عموماً خراب رہتے ہیں۔ دماغ میں اب تک شدید سے شدید محنت کی برداشت ہے اور رات دن میں بارہ گھنٹہ مسلسل کام کر سکتا ہے۔

زبان میں پہلے بہت لکنت تھی۔ اب بھی کبھی کبھی بولنے میں گرفت ہوتی ہے۔ حافظہ درست نہیں۔ گفتگو میں اس وجہ سے سلسلہ کلام قائم نہیں رہتا۔

داڑھی صرف ایک دفعہ منڈوائی تھی۔ پھر کتروانے لگا۔ اب پوری ہے سالہا سال سے۔

شادیاں دو ہوئیں۔ پہلی بیوی سے چار بچے ہوئے۔ ابن حسن نظامی۔ حسن بصری۔ حور بانو۔ نور بانو۔ ان بیوی کا انتقال ہو گیا

اور سوائے حُور بانو تینوں بچے بھی مر گئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے سات برس بعد دوسرا عقد کیا۔ ان سے ایک لڑکا حسین نظامی ہے جو اس وقت ڈھائی سال کا ہے اور دوسرا لڑکا علی بلال دو مہینے کا ہے۔

ولادت اور تعلیم

تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب سنہ ۱۲۹۶ھ میں ۲ محرم کو جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ ہوش سنبھال کر اپنے ایک بڑے بھائی سید علی حسن شاہ کو دیکھا اور ایک بہن حسینی بانو کو ——— حسن نظامی نے پہلے ناظرہ قرآن شریف پڑھا پھر فارسی کی چند معمولی کتابیں۔ اس کے بعد عربی صرف و نحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا)

اس کے استاد اوّل دن سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ساکن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھے جو دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمت کے سبب یہاں درگاہ شریف کے قریب ساری عمر مقیم رہے اور یہیں ان کا انتقال ہوا اور اسی جگہ ان کا مزار بنا۔ حسن نظامی شرح تہذیب اور کنز الدقائق پڑھتا تھا۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی اور اس کی عربی تعلیم کے جاری رکھنے میں مددگار رہے۔

جلالین اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے اور سنن ابو داؤد و ترمذی شروع کرنے کے بعد حسن نظامی شہر دہلی میں چلا گیا اور وہاں اس نے مولوی وصیت علی صاحب مرحوم اور مولوی عبدالعلی صاحب محدث اور مولوی علیم الدین صاحب پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب ساکن کاندھلہ سے کچھ دنوں مختلف کتب کی تعلیم حاصل کی اور درگاہ کے قیام میں بعد وفات مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا میاں محمد صاحب سے بھی دو تین سبق لیے۔ اس کے بعد جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم خلف جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ساکن کاندھلہ جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے شاگرد رشید تھے مجھ کو گنگوہ لے گئے۔ وہاں میں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔

شادی

گنگوہ سے واپسی کے بعد حسن نظامی کا نکاح اس کے مرحوم چچا سید معشوق علی صاحب کی لڑکی حبیب بانو سے ہوا اور اس نکاح کے بعد متواتر کئی سال نہایت عسرت و پریشان حالی میں گزرے۔ یہ ایام اخباری مضامین لکھنے، مطالعہ کتب، قومی مجالس کی شرکت اور مختلف و بے اصُول تجارتی جستجو میں بسر ہوئے۔ اس دور میں حسن نظامی نے اہل درگاہ کے مروجہ طرزِ معاش کو ترک کر دیا تھا اور کسی تجارتی سہارے کے نہ ہونے کے سبب روٹی کا میسر آنا محال نظر آتا تھا۔

آخر سنہ ۱۹۰۸ء میں سید محمد ارتضیٰ صاحب عرف محمد الواحدی نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی اور حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کی بنیاد ان کی شرکت و امداد سے ڈالی گئی ——— یہ لکھنا رہ گیا کہ مذکورہ ایام میں حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ

صاحب نے حسن نظامی کو مرید کرنے کی اجازت دے دی تھی اور ریاست الور میں مولوی ظفر دراز نظامی درگاہی شاہ کی معیت میں ایک معقول جماعت نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خطوط کے ذریعے سے لگاتار اور جوق در جوق خلقت بیعت ہو رہی تھی۔

اسی زمانے میں حسن نظامی پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کی صابرہ اہلیہ حبیب بانو نے انتقال کیا۔ اس کے لڑکے مر گئے اور اس کے خلاف درگاہ کی برادری نے ایک باضابطہ یورش برپا کی۔ روزانہ درگاہ میں آنے والوں کے سامنے حسن نظامی کی برائیاں بیان کی جاتی تھیں اور طرح طرح کے غلط بہتان اس کے ذمے لگائے جاتے تھے۔ اس شورش نے یہاں تک ترقی کی کہ ایک دفعہ عرس کے موقع پر جبکہ ختم شریف کی شرکت کے لیے کئی ہزار آدمی مزار شریف کے سامنے جمع تھے ایک قرابتی بھائی صاحب نے حسن نظامی کے خلاف نہایت دل آزار تقریر کی اور جو الزامات اس میں لگائے گئے ان کی تائید و تصدیق خاص حسن نظامی کے قریبی کنبہ داروں نے کی جو اس کے جد شریک بھائی تھے۔

درگاہ والوں کو یہ خیال تھا کہ حسن نظامی کی شہرت و ترقی ہماری معاش کے لیے مضر ہوگی اور حسن نظامی کے سامنے ہم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ مگر جب انھوں نے دیکھ لیا کہ حسن نظامی ہماری آمدنی سے کچھ غرض نہیں رکھتا اور اس کی روزی تجارت پر منحصر ہے تو رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے۔

مقصود کا تقرر

ان تمام امتحانات و مشکلات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کے قلب کو ہدایت کی اور اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصود قرار دے لیا اور وہ یہ تھا کہ اسلامی تصوف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا جائے، کہا جائے، برتا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اپنا عمل شروع کیا۔ حلقہ نظام المشائخ کی اغراض اربعہ بھی اسی اصول پر قائم کی گئی تھیں جن میں ایک تصوف کی حفاظت و اشاعت، دوسری مشائخ صوفیہ کو مرکز اتحاد پر لانا۔ تیسری عرسوں اور خانقاہوں کے ان مراسم کی اصلاح تھی جو دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہو گئی ہیں۔ چوتھی مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔

حلقہ کی پہلی غرض حفاظت و اشاعت تصوف پر عمل کرنے کے لیے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا گیا جس نے وہ کام کیا کہ نہ صرف خود زندہ رہا اور زندہ ہے اور بہت کامیابی اور شان کے ساتھ موجود ہے بلکہ اس نے ایک عام تحریک ملک میں اس قسم کے علم ادب میں پیدا کر دی۔

حلقہ کی غرض حفاظت کے ماتحت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا جہاں آج بے شمار قلمی و نایاب کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

اصلاح مراسم کی کوششوں میں ایک اصلاح بہت زیادہ کامیاب ہوئی کہ درگاہوں سے بازاری عورتوں کا ناچ گانا بند ہو گیا جس کی بدولت حسن نظامی نے بڑے بڑے مصائب برداشت کیے تھے۔

باقی اغراض پر حکومت کے چند در چند شبہات کے سبب عمل نہ ہو سکا۔ حکومت کے شبہات کا باعث یہ ہوا کہ حسن نظامی نے ممالک اسلامیہ کا ایک طولانی سفر حلقہ کی اغراض کے ماتحت کیا تھا تاکہ بیرونی مشائخ اور خانقاہوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۱ء میں ممالک مصر، فلسطین، شام، حجاز کا ایک مفصل دورہ کر کے واپس آیا اور بہت وسیع تجربے ساتھ لایا جو ایسے تھے کہ اگر سلطنت رخنہ انداز نہ ہوتی تو ان سے بہت اچھے اور بڑے فائدے حاصل کیے جا سکتے" تھے۔ حکومت کا شبہ بعض ترکوں کی ملاقات اور مصر کی آزاد جماعت کے پیشواؤں سے ملنا جلنا تھا جو زمانۂ سفر میں حسن نظامی کے لیے ایک لازمی امر تھا کیونکہ وہ تصوف اور اہلِ تصوف کی نسبت جدید جماعتوں کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔

واپسی سفر کے بعد پولیس کی زبردست نگرانی شروع ہو گئی اور جنگ طرابلس و بلقان کے ایام نے اس کو اور بڑھا دیا اور کانپور کا واقعہ تو اس سونے کے لیے سہاگہ ثابت ہوا اور کوئی مرحلہ مشکلات و تکلیفات کا باقی نہ رہا جو حسن نظامی کے جسم، مال اور روح کو نہ پہنچا ہو۔

قصہ مختصر ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک حسن نظامی کی زندگی مضامین نویسی، تصنیف و تالیف کتب اور خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدا تعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں اور عقد ثانی کر لینے کے سبب اس کی خانگی زندگی میں بھی ایک اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا۔

۱۹۱۲ء میں حسن نظامی نے نظام المشائخ تمام و کمال واحدی صاحب کے سپرد کر دیا اور خود میرٹھ سے ایک اخبار "توحید" جاری کیا جو پانچ مہینے زندہ رہ سکا اور اس قلیل زمانہ میں اس کی ایسی شہرت ہوئی کہ ہندوستان میں کسی ہفتہ وار اردو اخبار کی نہ ہوئی ہو گی اور ایسی ہی اس کی اشاعت و مقبولیت کی وسعت تھی۔ آخر حکام سلطنت نے اس کو جبراً ضبط کر لیا اور حسن نظامی کو قیام میرٹھ ترک کر کے دہلی آنا پڑا۔

چوری کرنے کا گناہ

خدا کے فضل سے میری ساری زندگی چوری اور دغابازی سے پاک ہے مگر بچپن میں جس قسم کی چوریاں میں نے کیں ان کے خیال سے روح ہمیشہ نادم رہے گی اور جب یہ واقعات یاد آتے ہیں ضمیر مجھ کو ادھ موا کر دیتا ہے۔ اگرچہ جب میں نے ان چوریوں کا ارتکاب کیا۔ اس وقت میں ان کو نہ سمجھتا تھا اور تمام درگاہ والوں کو اس میں مبتلا پاتا تھا۔

اس چوری کی حقیقت یہ ہے کہ درگاہ کے اندر درگاہ والوں کے حصے مقرر ہیں اور حصہ دار آپس میں ایک دوسرے کی چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک حصہ دار موجود نہیں ہے اور درگاہ میں کچھ نذر آئی تو دوسرے حصہ دار نے اس نذر کو چرا لیا اور اپنے شریک حصہ دار کو اس کی خبر نہ کی یا ایک روپیہ آیا تو آٹھ آنے بتائے۔

دوسری صورت چوری کی یہ ہے کہ درگاہ کے زیارت کرنے والے نے مثلاً ایک روپیہ کی مٹھائی نیاز دلانے کو بازار سے منگائی تو درگاہ والا لازمی طور سے بارہ آنے کی لائے گا۔ چار آنے چہارم کے نکال لینے اپنا حق تصور کرے گا۔ کیونکہ

والوں کا یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جن حصہ داروں کی میں نے چوری کی ان حصہ داروں نے مجھ سے دس حصے زیادہ میرے حق میں چوریاں کی ہوں گی کیونکہ میں درگاہ میں بوجہ سلسلہ تعلیم کی مصروفیت کے بہت کم حاضر رہ سکتا تھا اور وہ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ تاہم میرا ضمیر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہے اور اس کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے حصہ داروں کا حق چرا لینا ایک صاف اور کھلی ہوئی چوری تھی جس کا ارتکاب میں نے بار بار کیا اور باوجود تلافی کی کوشش کرنے اور چوری کی مقدار سے زیادہ واپس دینے کے میرا دل خدا کے سامنے شرمندہ ہے اور بچپن کی چوری کا دھبہ اور داغ خیال سے دور نہیں ہوتا۔

آج میری روح اپنے اور اپنے خاندان کے بچوں کو اس بلائے سرقہ سے محفوظ رکھنے کو تڑپتی ہے اور میں خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ ان سب کی معاش کو اس گناہ اور ذلت سے محفوظ رکھنے کی توفیق عطا فرما اور ایسے سامان پیدا کر کہ وہ سب ان گناہوں سے پاک و صاف رہیں۔

جوتیوں کی حفاظت

اس کتاب (آپ بیتی) کے لکھنے کے زمانہ میں ایک دن ایک دوست کے ہمراہ درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی میں حاضر ہوا اور جوتیاں باہر چھوڑ دیں (جیسا کہ قاعدہ ہے) وہاں جو محافظ فقیر بیٹھا تھا واپسی کے وقت اس کو کچھ دینا چاہا، مگر جیب میں اس وقت پیسے نہ تھے، روپے تھے۔ میں نے ایک روپیہ اس فقیر کو دے دیا۔ اسی وقت مجھ کو یاد آیا کہ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی جوتیوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا اور ایک آنہ کا دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ میرے بچپن میں فقیر دروازہ پر نہ ہوتا تھا بلکہ درگاہ کے متعلقین میں سے بعض لوگ یہ خدمت انجام دیتے تھے اور اس میں ان کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کر کے پیسے کماتا تھا چنانچہ ایک دن ایک ہندو بابو کی جوتیوں کی حفاظت میں نے کی۔ جب وہ باہر آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تم کو کیا دوں۔ میں نے کہا جو آپ کا جی چاہے۔ وہ بولا جو تم مانگو گے دے دوں گا۔ تم خوب سوچ کر مانگو اور جتنا زیادہ مانگ سکتے ہو کہو میں دے دوں گا۔ میں نے سوچا تو مجھ کو چار پیسے بہت زیادہ معلوم ہوئے کیونکہ اور لوگ ایک پیسہ دیا کرتے تھے اور چار پیسے سے زیادہ مجھے اور کسی رقم کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ مجھے تم چار پیسے دے دو۔ وہ بابو یہ جواب سن کر ہنسا اور اس نے چار پیسے مجھ کو دے دیئے۔

اس کے جانے کے بعد میرے خاندان کے لوگوں نے مجھ کو بہت طعنے دیئے اور کہا کہ بڑا کم ظرف ہے۔ چار پیسے سے زیادہ نہ مانگے۔ ایک صاحب نے کہا۔ اس کے بڑے بھی کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تھے۔ مجھ کو ان باتوں سے بہت صدمہ ہوا اور یہ واقعہ میرے دل پر نقش ہو گیا کہ لوگوں نے میری اس حرکت کے سبب میرے بزرگوں کو بھی برائی سے یاد کیا۔

طفلی اور ناسمجھی کے زمانے میں کوئی شخص بھی حوصلہ مند نہیں ہوتا اور اس کو خبر نہیں ہوتی کہ زیادہ اور کم میں کیا فرق ہے۔ تاہم فقیر کو روپیہ دیتے وقت مجھے اپنا بچپن یاد آیا اور میں نے اپنے نفس کو یاد دلایا کہ تیری اصلیت آنی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کہ آج

اُس نے مجھ کو اتنا دیا کہ تو نے ایک روپیہ کا دے دینا کچھ بات نہ سمجھا۔

صورت وجہ مصیبت

والدین کی وفات کے بعد شادی تک میری زندگی ایسی پُرالم و پُرغم گزری کہ خدا کسی شخص کو وہ نصیب نہ کرے۔ ایک وجہ میری تکلیف کی خود میری صورت بھی تھی۔ میری شکل دیکھنے والوں کو شاید بہت اچھی معلوم ہوتی ہوگی کہ بہت سے دوبدو اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور ہر روز ایک نہ ایک نیا دعوے دار ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی مرحوم میرے باپ کی جگہ تھے۔ ان کا فرض تھا کہ مجھ کو بُرے اور آوارہ لوگوں سے بچاتے چنانچہ انھوں نے بڑی سختی سے بندشیں لگائی تھیں اور میں کسی شخص سے بات نہ کر سکتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں بدچلن اور آوارہ صحبتوں سے محفوظ رہا۔ تاہم اس سلسلے میں بھائی صاحب کے اوہام اور غلط شکوک میرے لیے باعث اذیت ہوتے تھے کہ وہ شریف اور نیک چلن آدمیوں کو بھی بدمعاش تصور کرتے تھے اور اعلانیہ ان کی توہین کر ڈالتے تھے۔

میں نے اپنے بھائی کی اطاعت سے ان معاملات میں کبھی سرتابی نہیں کی۔ البتہ منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی اور حافظ عبدالغنی مرحوم تاجر جست دہلی کے ملنے میں میں نے بھائی صاحب مرحوم کا بہت کم کہنا مانا کیونکہ میں ان دونوں کو پاکباز اور اپنا بہت ہی خیرخواہ مخلص دیکھتا تھا۔ چنانچہ منشی غلام نظام الدین صاحب نے آج تک وہی تعلق قائم رکھا ہے اور اپنی ہمدردی کو ایک ذرہ کے برابر بھی کم نہیں کیا اور میں علی الاعلان اقرار کر چکا ہوں اور کرتا ہوں کہ لکھنے پڑھنے اور دنیا میں قومی کام کرنے کی ترغیب دینے والے اور پھر قدم بقدم آگے بڑھانے والے یہی بزرگ ہیں۔ جنھوں نے میرے باعث مرحوم بھائی کے بڑے بڑے جور برداشت کیے ہیں اور میں نے بھی ان کے ملنے اور ان کے مشوروں پر چلنے کے سبب ناقابل بیان اذیتیں اٹھائی ہیں۔

تھیٹر کا شوق

میں پندرہ سال کا تھا۔ دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی تھی اور اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور دھوبیوں نے اپنے بیل فروخت کر کے اس کمپنی کا تماشا دیکھا تھا۔ اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشا دیکھنے گیا۔

پہلا تماشا دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری عقل کا ذرا سا حصہ بھی باقی نہ تھا اور سب پر تماشا کا طلسم مسلط ہو گیا تھا۔ آدھی رات کو میری آنکھ کھلتی تو میرے کان گانا سنتے اور ان میں ہوبہو ایکٹروں کی آوازیں آتیں ۔۔۔ کھانا پینا، سونا، پڑھنا سب زہر معلوم ہوتا تھا اور تماشا کے سوا کسی چیز کا خیال نہ آتا تھا مگر میرے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لے کر تماشا دیکھتا۔

اسی زمانہ میں درگاہ کی نذر کے ایک شخص نے مجھ کو تین روپے دیے۔ جن سے میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشا دیکھا۔ ان دنوں میں ایک عمل پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھا کر میں درگاہ میں آتا اور وہاں سے چپ چاپ چار میل طے کر کے دہلی پہنچتا۔ چار آنے کا ٹکٹ لے کر تماشا دیکھتا اور پھر رات کو دو بجے جنگل بیابان اور ڈراؤنے

راستہ سے گزر کر چار میل کی مکرر مسافت پیدل طے کر کے درگاہ آتا اور سو جاتا۔ عمل پڑھنا روز کا چکر ہو گیا اور [illegible] کی تکان کے سبب ہر وقت میری آنکھیں سرخ اور خمار آلود رہتی تھیں اور لوگ سمجھتے کہ میں عبادت اور شب بیداری میں مصروف رہتا ہوں اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے بہت معتقد ہو گئے تھے۔

سفلی اعمال کا شوق

اسی زمانہ میں مجھ کو تسخیر ہمزاد، مسمریزم اور سفلی عملیات کا شوق پیدا ہوا اور ان کے حصول میں ہر قسم کی تکلیفیں اور جستجو کرنے لگا ہمزاد کے متعدد طریقے آزمائے اور ان میں بڑی بڑی ناہنجار و نامناسب ریاضتیں کی گئیں۔ اگرچہ ایک حد تک اس جفاکشی کا صلہ حاصل ہوا۔ تاہم محنت شاقہ اور اوقات عزیز کے خرچ کے مقابلے میں وہ بالکل ہیچ اور ناکافی تھا۔

البتہ مسمریزم کی مشق بڑھنے سے مجھ میں سلب مرض کی ایک غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی۔ اعصابی امراض اور خیالی و وہمی علامتیں پانچ منٹ کے اندر دور کر دیتا تھا۔ دق کے بعض مایوس بیماروں کا بھی حیرت انگیز علاج کیا اور وہ اچھے ہو گئے۔ حافظ محمد عمر چڑیا چاندی والے ساکن کوچہ استاد حامد دہلی کی اہلیہ دق کی آخری حد میں پہنچ گئی تھیں اور انگریزی و یونانی اطباء نے جواب دے دیا تھا میں نے صرف تین دن مسمریزم کے طریق سلب سے ان کا علاج کیا اور وہ اچھی ہو گئیں اور اب تک موجود ہیں۔ گو ان کے شوہر سابق کا انتقال ہو چکا ہے۔ جن کی خاطر سے میں نے یہ علاج کیا تھا۔ حافظ صاحب کے اس واقعہ سے غلغلہ مچ گیا اور ہزاروں مریض میرے پاس آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک مریض دق کے سلب مرض کے سبب میں خود دق میں مبتلا ہو گیا اور بہ ہزار دقت و پریشانی اچھا ہوا۔ جب سے میں نے سلب کا علاج ترک کر دیا۔

پنجاب کے سفر

اس زمانہ میں ایک عرصہ تک اخبار وکیل امرتسر کے دفتر میں قیام رہا اور جب ہی پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ دیکھا۔ وکیل آفس کے ایام قیام میں پہلی مرتبہ مولانا ابوالنصر آہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوئی اور حافظ عبدالرحمٰن مرحوم سیاح ممالک اسلامیہ سے بھی ہم نشینی رہی۔

اخبار وکیل امرتسر کے مالک و بانی شیخ غلام محمد مرحوم کی اس چند روزہ صحبت نے اخلاق و عادات اور ضروریات قوم سے آگاہ کر کے طرح طرح کے ذاتی تجربے سکھائے۔ خصوصاً شیخ غلام محمد مرحوم کے اخلاص و صداقت نے جو سارے پنجاب کے اخبار نویسوں میں ممتاز شان رکھتی تھی۔ دنیا میں تحریری خدمت قوم کا ایک راستہ بتایا۔

والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خورد سالی میں کئے تھے۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری پھلواری کی ہمراہی میں بہاولپور کا ہوا جبکہ وہاں نواب مرحوم کی مسند نشینی کا جشن تھا — سفر بہاولپور میں سب سے پہلی بار شیخ عبدالقادر صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں اخبار وا پیسہ کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر کہا

کہ شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڑھے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نوعمر ہیں۔ آج دیکھ کر مجھ کو اپنے اندازہ کی تصدیق ہوئی کہ وہ صحیح تھا۔

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور امرتسر میں زیادہ قیام ہوا تھا۔ اس سفر میں شیخ محمد اقبال صاحب سے ملاقات ہوئی اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا اثر لے کر دہلی واپس آیا۔

مولانا شبلی

تیرتھ یاترا کے زمانہ میں چند روز مسلسل لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس زمانہ میں رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ میں انہی کے کمرہ میں ان کے ساتھ عرصہ تک ٹھہرا رہا اور مولانا شبلی مرحوم کی صحبتوں سے فیض اٹھائے۔ مولانا سید سلیمان ایڈیٹر رسالہ معارف اس زمانہ میں کم سن اور طالب علم تھے۔ اسی زمانہ میں میری اور مولانا ابوالکلام کی بہت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی۔

بے غیرتی کا سفر

بہاولپور میں نواب صاحب کی سالگرہ کے جشن میں اخبار نویسوں کو کچھ انعام ملا کرتے تھے اور دہلی کے اخبار والے بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ مجھ کو بھی اس خیرات کے لیے آمادہ کیا گیا اور میں وہاں گیا مگر میرا نہ کوئی اخبار تھا نہ میں شاعر تھا جس کی بنا پر مجھے کچھ ملتا۔ شہزادہ مرزا محمد اشرف صاحب بی اے دہلوی کے نام جو وہاں ایک افسر تھے۔ شہزادہ مرزا امیر الملک صاحب کا خط لے کر گیا تھا جس کی بدولت ایک وقت شہزادہ صاحب نے اپنا مہمان بنایا مگر دوسرے وقت کہہ دیا کہ سرائے میں جا کر ٹھہریے۔ چنانچہ میں نہایت ذلت سے ریاست کی سرائے میں آن پڑا جہاں اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند دن گزارے اور سخت تکلیف و رسوائی کے بعد بے مراد گھر کو واپس آیا — نہیں کہہ سکتا کہ میرے ضمیر پر اس سفر نے کیسی کیسی قیامتیں ڈھائیں اور مجھ کو یہ سفر کتنا بے غیرتی کا سفر معلوم ہوا۔

آج خدا کے فضل سے وہ زمانہ ہے کہ مولانا رحیم بخش صاحب مدار المہام بہاولپور اور بعض نامور اراکین ریاست مجھ کو بہاولپور آنے کی دعوت دیتے ہیں اور مجھ کو جانے کی فرصت نہیں ملتی یا وہ وقت تھا کہ میں ایک بھیک مانگنے والے کی حیثیت سے وہاں گیا تھا اور سرائے میں پڑا رہا اور اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند روپے حاصل کرنے کے لیے میں نے دربدر کے دھکے کھائے۔

مزدوری کی خوشی

اسی سلسلے میں یہ واقعہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب میں کتابوں اور دہلی کی عمارات کے نقشوں کی تجارت کرتا تھا اور دہلی دربار (۱۹۰۳ء) کے موقع پر میں بیرا کا بوجھ سر پر رکھ کر کیمپوں میں فوٹو فروخت کرتا پھرتا تھا تو ایک خیمہ میں چند امیر مسلمانو

نے مجھ سے کچھ خریدا اور حسن نظامی کو مجھ سے دریافت کیا جس کا نام اخباروں میں مشہور ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے یہ نہ کہا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں بلکہ کہا کہ درگاہ کے فلاں حجرے میں حسن نظامی رہتا ہے۔ آپ وہاں جائیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ لوگ میرے حجرے میں آئے اور مجھ کو وہاں دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں تو ان کو بہت افسوس ہوا کہ میں اس قدر غریب و مفلس ہوں کہ اتنا بوجھ سر پر اٹھا کر کوسوں کی منزل طے کرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ بات افسوس کی نہیں بلکہ خوشی کی ہے کہ میں اپنی روزی محنت سے مزدوری سے حاصل کرتا ہوں۔ بھیک نہیں مانگتا۔

اس وقت میرے دل میں خوشی کی ایسی لہریں اٹھیں جو بہادر پور کے مذکورہ سفر کی ذلت کے مقابلہ میں بادشاہی کی خوشی معلوم ہوتی تھیں۔

ایک تقریر

کوہ تکبیر میری ایک تقریر کا عنوان تھا جو کانپور کی مسجد اور وہاں کے مقتولوں، مجروحوں، قیدیوں کی حمایت میں جامع مسجد میرٹھ میں جمعہ کے دن ہوئی تھی اور جو ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ شائع ہوئی کیونکہ ہر صوبہ کے مسلمانوں نے اس کی لاکھوں کاپیاں چھپوا کر دیہات میں تقسیم کرائی تھیں اور اردو کے تمام اخباروں نے اس کو چھاپا تھا۔

ہندوستان میں شاید کوئی مذہبی تقریر اتنی مقبول نہ ہوئی ہوگی اور اس نے یہ اثر نہ پیدا کیا ہوگا جو کوہ تکبیر کو خدا نے دیا۔

وہ عربی اخبارات میں حواشی و رائے زنی کے ساتھ شائع ہوئی اور قسطنطنیہ کے ایک دوست نے اس زمانہ میں مجھ کو لکھا تھا کہ تمھاری تقریر کوہ تکبیر کا ترجمہ پڑھ کر انور پاشا بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف کی۔

مسٹر میسٹن گورنر نے جنھوں نے اس تقریر کی ضبطی کا سب سے پہلے حکم دیا تھا اور اسی تقریر کی بنا پر اپنے ملنے والوں سے جب میرا کچھ ذکر کرتے تو یوں کہتے تھے۔ کہئے آپ کے دوست کوہ تکبیر کا کیا حال ہے۔ یعنی حسن نظامی نام نہ لیتے تھے اور کوہ تکبیر سے اس کو یاد کرتے تھے — اس تقریر کی ضبطی تمام ہندوستان میں ہوئی اور جن جن اخباروں نے اس کو چھاپا تھا وہ بھی ضبط کر لیے گئے گجرات کا اسلامی اخبار پولیٹیکل ہومینو محض اس تقریر کے ترجمہ گجراتی چھاپنے پر یکا بند کرا دیا گیا۔

زندگی میں موت

مجھ کو اپنی زندگی میں دو مرتبہ موت کی خبر سننے کا موقع ملا۔ ایک تو خاندان کے کسی دشمن نے اخبار وکیل امرتسر۔ وطن لاہور۔ پیسہ اخبار لاہور کو لکھ دیا تھا جس پر ان اخبارات نے بڑے بڑے نوٹ تعزیت کے لکھے تھے اور میرے احباب میں بڑی تشویش اس سے پیدا ہو گئی تھی۔

اور دوسرا واقعہ میرٹھ میں پیش آیا۔ کوہ تکبیر کی تقریر کے زمانہ میں ۱۴ر اگست کو ایک بڑے بلوہ کا اندیشہ میرٹھ میں کیا جاتا تھا اور چونکہ باشندگان شہر میں ہر شخص کو یہ خیال تھا کہ میں ۱۴ر اگست کو میرٹھ میں فساد کراؤں گا اور حکام بھی اس شہرت سے اتفاق

میں معروف تھے۔ اس لیے ۲۴ر اگست کے دن جب کہ شہر میں فوجیں اور توپ خانے گشت کر رہے تھے کسی شریر نے دہلی میں مشہور کر دیا کہ میرٹھ میں بلوہ ہو گیا اور حسن نظامی اس میں مارا گیا۔

جس وقت میں اپنے گھر میں آیا ایسا جوش خوشی کا میں نے لوگوں میں دیکھا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ صدقے دیے گئے۔ نیازیں دلوائی گئیں اور عورتیں مجھ سے لپٹ کر خوشی کا رونا روئیں۔

سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک

میرٹھ سے واپس آ کر درگاہ میں قیام کیا گیا اور اسی قیام نے آٹھ برس ختم کر دیے۔ آٹھ سال۔ اللہ اکبر! زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ خبر نہیں کہاں اور کیونکر چلے گئے۔ اس زمانے کا خلاصہ احوال یہ ہے کہ کتابیں لکھیں۔ شادی کی۔ بچے ہوئے۔ ہندوستان بھر کے چکر لگائے۔ جنگ یورپ کی بہار دیکھی۔ خفیہ پولیس کے ہاتھوں سنہ ۱۹۱۶ء کے ستمبر تک طرح طرح کی چھیڑ چھاڑ برداشت کی۔ خطوط پر سنسر (محتسب) مقرر ہوا اور ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء سے نگرانی پولیس کی دور ہوئی۔ رسالہ مرشد جاری کیا۔ وغیرہ۔ یہ تو مجمل خلاصہ تھا۔ اب تفصیل وار بعض حصوں کی تشریح سنیے۔

سب سے پہلی تصنیف

غالباً سنہ ۱۹۰۹ء کے شروع یا اس کے کچھ بعد مفلسی کے مجرب علاج کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا ٹھیک زمانہ یاد نہیں۔ یہ رسالہ حضرت مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ تھا جس میں مفلسی دور کرنے اور تونگری حاصل ہونے کی دعائیں اور اعمال درج تھے۔ اس کا دیباچہ میرے نام سے حکیم عبد الستار صاحب لطفی دہلوی نے لکھا تھا جو خاکسار صاحب کے دوست تھے۔

دوسری تصنیف

سنہ ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آ کر ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی حصہ اول کے نام سے دو جزو (۳۲ صفحہ) کا ایک رسالہ لکھا جس میں آئندہ زمانے کے انقلابات اور پیش گوئیاں امام مہدی کے ظہور کے متعلق تھیں۔ یہ رسالہ ایسا مقبول ہوا کہ پچاس ہزار کے قریب چھپ کر بکا۔ یہی رسالہ تھا جس کی ہر دلعزیزی اور فوری فروخت سے میری مالی حالت درست ہوئی اور دوسری کتابیں لکھنے کی طرف راغب ہوا۔

اس رسالہ کا دوسرا حصہ کتاب المعروف امام مہدی کے انصار کے نام سے شائع ہوا۔ یہ چار جزو یعنی ۶۴ صفحہ کا تھا اور اس میں بھی پہلے کی طرح پیشین گوئیاں تھیں اور پہلے حصہ میں شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہو جانے کی پیشین گوئی تھی۔ اس دوسرے حصے میں اس پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔

یقین کی قوت

ان رسالوں کے شائع کرنے کے وقت مجھ کو شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہونے کا اتنا یقین تھا کہ عین دربار دہلی ۱۹۱۱ء کے وقت خوب جلی قلم اشتہارات (شہنشاہ انگلستان کا مسلمان ہوجانا) کے عنوان سے شاہی کیمپ میں تقسیم کرائے اور خود کنگ جارج کو ایک کتاب بھیجی اور لکھ دیا کہ اس میں آپ کے مسلمان ہونے کی پیشین گوئی ہے۔ جس وقت میں یہ کام کر رہا تھا۔ واحدی صاحب مجھ کو روکتے تھے۔ ڈراتے تھے اور ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے شائع کنندہ کی حیثیت سے اپنا نام لکھنے سے انکار کیا تھا۔ مگر میں بالکل بے خوف تھا۔ یا تو یقین کی قوت تھی اور یا دوسروں سے زیادہ میرا دل مضبوط تھا اور کسی مواخذہ سے نہ ڈرتا تھا اور جب کنگ جارج نے کتاب کا شکریہ بھجوایا تو یہ ڈرنے والے احباب حیران رہ گئے۔

سفر بمبئی کا روزنامچہ

چوتھی تصنیف سفر بمبئی کا روزنامچہ تھا۔ یہ بھی ۱۹۱۲ء کے شروع میں شائع ہوا تھا۔ ضخامت ایک سو دو صفحے۔ اس میں بمبئی گجرات کاٹھیاواڑ کے حالات ہیں۔ کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

"اسلام کا انجام" کے نام سے شیخ توفیق بکری شیخ المشائخ مصر کی کتاب مستقبل اسلام کا ترجمہ تھا اس میں مسلمانوں کی تعداد اور اسلام کے انجام کی فلسفیانہ بحث ہے۔

"اسرار" کے نام سے حضرت بہاء اللہ آفندی بانی فرقہ بابیہ کی کتاب کا اُردو ترجمہ تھا۔ اصل کتاب مصر میں حضرت عبدالبہا عباس آفندی خلف حضرت بہاء اللہ نے مجھ کو دی تھی۔ اس کتاب میں تصوف کا نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں بیان ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔

"مجموعہ مضامین حسن نظامی"۔ ۱۹۱۲ء میں یہ مجموعہ پہلی بار چھپا۔ اس میں اس وقت تک کے اخباروں اور رسالوں سے میرے لکھے ہوئے مضامین جمع کئے گئے تھے اور میر نیرنگ صاحب بی اے وکیل انبالہ نے اس پر دیباچہ لکھا تھا۔ ایک سو باون صفحہ کی ضخامت تھی۔ یہ مجموعہ دوبارہ نہ چھپا اور بھیا احسان نے ۱۹۱۳ء کے آخر میں سی پارۂ دل کے نام سے ایک بڑا مجموعہ اس کے عوض مرتب کیا۔

"سفرنامہ مصر و شام و حجاز" دو سو بارہ صفحے کی ضخامت تھی۔ با تصویر و بے تصویر چھپا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں دفتر اخبار توحید نے شائع کیا تھا۔

"اعمال حزب البحر" یہ بھی ۱۹۱۳ء کے آخر میں دفتر توحید نے چھاپی تھی۔ ایک سو صفحے کی ضخامت کی کتاب ہے۔ بہت مقبول چیز ہے۔ مشائخ نے اس کو بہت پسند کیا۔

"سی پارۂ دل" بھیا احسان کی دلچسپ ترتیب ابواب کے ساتھ میرے تمام مضامین کا مجموعہ ہے۔ بڑے سائز کے باریک قلم کے دو سو تیس صفحے ہیں۔ واحدی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اُردو نے دیباچے لکھے ہیں۔

"غدر دہلی کے افسانے" بقیا احسان کی احتیاط نے سابقہ مجموعہ مضامین کے بہت سے مضامین کئی پاروں میں درج کئے تھے۔ انہی میں غدر دہلی کے قصے بھی نکال دیئے گئے تھے جن کو میں نے ایک رسالہ میں علیحدہ چھاپ دیا۔ کئی بار چھپی۔ پہلا ایڈیشن شاید ۱۹۱۴ء کے شروع میں چھپا تھا۔ جنگ یورپ کے شروع ہونے کے بعد اندیشہ ہوا تھا کہ ضبط ہو جائے گی مگر مسٹر بیلی چیف کمشنر دہلی نے تحریری اجازت اس کے چھاپنے کی دی اور اضافہ مزید کے بعد بڑے سائز پر اس کو چھاپا گیا۔

غدر دہلی کے افسانے حصہ دوم ۱۹۱۸ء میں پہلی بار اور ۱۹۱۹ء میں دوبارہ چھپا۔ اس میں انگریزوں کے حالات ہیں۔

"فیضانِ سنوسی" یہ شیخ سنوسی کا تیسرا حصہ ہے۔ اس میں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ چار دفعہ چھپا۔ اب چھاپنے کی ممانعت ہے۔

"تین پر ایک" یہ چوتھا حصہ شیخ سنوسی کا ہے۔ اس میں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔ پھر دوسرا شائع ہوا۔ اس کے بعد ممانعت ہو گئی۔

"ناگفتہ بہ" یہ پانچواں حصہ شیخ سنوسی کا تھا اور پیشین گوئیاں تھیں۔ اس کے چھاپنے کی بھی ممانعت ہے۔

"جرمنی خلافت" چھٹا حصہ شیخ سنوسی کا تھا۔ پیش گوئی کے مضمون پر چھپ کر آیا اور فوراً پولیس ضبط کر کے لے گئی۔ ایک کتاب بھی بکنے نہ پائی۔ اب اشاعت کی اجازت مل گئی ہے۔

"اُردو دعائیں" ستر صفحہ کی کتاب ہے اور اس میں ہر قسم کی مؤثر اُردو دعائیں ہیں۔ تین بار چھپ چکی ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا۔

"کم و موت" ایک سو ساٹھ صفحے کی کتاب ہے اور موت یاد دلانے کے مضامین ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں چھپی تھی۔

"قبروں کے غیبی نوشتے" اس میں الواح قبور ہیں اور بہت دلچسپ و جدید طرز کی کتاب ہے۔ خیالی و اصلاحی لوحیں نامور لوگوں کی لکھی گئی ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں چھپی تھی۔

"محرم نامہ" واقعات کربلا اور اسلام کے دورِ اول کی تاریخ ہے۔ بہت ہی مقبول کتاب ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

"میلاد نامہ" میلاد شریف اور اسلام کی تاریخی کتاب ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا۔

"بیوی کی تعلیم" ۱۹۱۵ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔ زنانہ تعلیم کے لیے بہت پسند کی گئی۔

"یزید نامہ" محرم نامہ کا دوسرا حصہ۔ کربلا کے بعد کی تاریخ ہے۔ بنی امیہ کے خاتمہ تک۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا

"آیاتِ خطوط نویسی" دو حصوں میں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں دوبارہ چھپی۔ اس میں میرے خطوط اور نامور مسلمانوں کے خطوط ہیں۔

"مجموعہ خطوط حسن نظامی" ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ ۱۲۰ صفحہ کی ضخامت ہے۔

"محفل نامہ گیارھویں شریف" حضرت غوث پاک کے حالات میں ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

"کرشن بیتی" سری کرشن کے حالات میں بہت مقبول و نامور تصنیف ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ با تصویر ہے۔

"رہنمائے سیر دہلی"۔ دہلی کی گائڈ اردو زبان میں ہے۔ باتصویر ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔

"انتخاب توحید" اخبار توحید کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جیا احسان نے ۱۹۱۳ء میں چھاپا تھا۔ ختم ہو گیا۔ ۱۷۶ صفحہ کی ضخامت تھی۔ اس میں زیادہ تر میرے مضامین تھے۔

"چٹکیاں گدگدیاں" اس میں میرے ظرافت کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا۔

"جنگ جُو" اس میں میری لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ۸۰ صفحہ کی ضخامت ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

"رسول کی عیدی" بچوں کے لیے مفید دلچسپ مضامین ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔

"فلسفۂ شہادت" شہادت کربلا کا فلسفیانہ ٹریکٹ ہے۔

"توپ خانہ" جنگ یورپ شروع ہونے کے وقت چھوٹا سا ٹریکٹ لکھا گیا تھا۔ کئی بار چھپا۔

"بندوق" ۱۶ صفحہ۔ "بم" ۱۶ صفحہ۔ "قیصر کا اعلان جنگ" ۳۲ صفحہ۔ "قیصر کا اعلان جنگ" ۳۲ صفحہ۔ "کھلی کا میدان جنگ" ۳۴ صفحہ۔ "ہوائی جہاز" ۱۶ صفحہ۔ "جرمن شہزادہ کی لاش" ۱۶ صفحہ۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ ہیں اور کئی بار چھپے ہیں ان میں تصوفانہ طریقے سے بحث کی گئی ہے۔

"قرآن قبلہ ٹو شملہ" ۱۹۱۳ء میں ایک خط لارڈ ہارڈنگ کو لکھا گیا تھا۔ ۸ صفحہ کی ضخامت ہے۔ دو بار چھپا ہے۔

"خدائی انکم ٹیکس" زکوٰۃ کا ٹریکٹ۔ ۴۰ صفحہ ضخامت۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ ختم ہو گیا۔ اب مزید اضافہ کے بعد چھپا ہے۔

"مُرشد" ۲۰ صفحہ۔ "دینی یادداشت"۔ "ہمارے رسول کی عادتیں"۔ "آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن"۔ غرض اسی طرح متعدد چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ بار بار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

مذکورہ بالا رسائل و کتب میں پبلک کو جو کتابیں سب سے زیادہ پسند ہیں اس کا اندازہ بکری سے کرنا چاہئے۔ میں کارکن صاحب حلقہ المشائخ سے جو میری کتابوں کے ناشر و پبلشر ہیں ہر مہینہ کے خاتمہ پر ایک نقشہ منگا کر دیکھتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ بکری میں کونسی کتاب سب سے زیادہ ہے تو پانچ کتابیں سب سے بڑھی چڑھی رہتی ہیں۔ ایک میلاد نامہ۔ دوسرے بیوی کی تعلیم تیسرے غدر دہلی کے افسانے چوتھے محرم نامہ۔ پانچویں حزب البحر۔ ان پانچوں میں بھی تین کتابوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ کسی مہینہ میلاد نامہ بڑھ جاتا ہے، کسی میں بیوی کی تعلیم اور کسی میں غدر دہلی کے افسانے۔ (حصہ دوم اس کا کم بکتا ہے) بعض مہینوں میں حزب البحر کی بکری سب سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ ان ایام میں اس کی زکوٰۃ دینے والے زیادہ خریدتے ہیں۔ ایام محرم قریب ہوتے ہیں تو محرم نامہ اور یزید نامہ کی فروخت سب کتابوں پر فائق ہوتی ہے۔

پبلک میں صاحب رائے جماعت میری کل تصنیفات میں غدر دہلی کے افسانوں کو سب سے زیادہ کامیاب تصور کرتی ہے اور اس کو ماسٹر پیس (چوٹی کی چیز) کا خطاب دیا جاتا ہے۔ فلسفی اور بہت اعلیٰ طبقہ والے کم ٹو موت کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی اور مولوی عبدالماجد صاحب (دریا بادی) مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ کا یہی خیال ہے لیکن میں خود میلاد نامہ

محرم نامہ، یزید نامہ اور بیوی کی تعلیم کو اپنی کامیاب تصانیف خیال کرتا ہوں ۔

میں نے کسی کتاب میں اتنی محنت نہیں کی جتنی تلاش و عرق ریزی کرشن بیتی لکھنے میں ہوئی مگر وہ مذکورہ پانچ کتابوں کی طرح کچھ زیادہ فروخت نہیں ہوئی۔ البتہ تعریف ہندو مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اور بعض قومی و ملکی خیال کے لوگ اسی کو سب سے بڑھ کر درجہ میری تصنیفات میں دیتے ہیں (آج کل میسور ریاست نے کورس میں شامل کیا ہے)

سی پارۂ دل اور چٹکیاں گدگدیاں بھی پسند کی جاتی ہیں اور بہت بکتی ہیں مگر ان کی قبولیت محض انشا پرداز یا ادب پسند طبقہ میں زیادہ ہے۔

بھیا احسان اور واحدی صاحب کہتے ہیں کہ اب میری تحریر میں وہ مخصوص جدت اور زور نہیں پایا جاتا جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کہنا درست ہے یا نہیں۔ البتہ یہ خیال مجھ کو بھی ہوتا ہے کہ کم فرصتی اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تحریر میں وہ خوبی پیدا نہیں کر سکتا جو فرصت کے زمانہ میں ہو جاتی تھی اور کچھ یہ بھی ہے کہ وہ وقت جوش اور نمو کا تھا۔ تندرستی اچھی تھی۔ اب زوال اور کمزوری کا زمانہ ہے۔

میں کتنا کام کرتا ہوں

اگر کوئی مجھ کو کام کرتا دیکھے تو میرے ناتواں جسم اور روز روز کی بیماری کا خیال کر کے حیران رہ جائے کہ میں کیونکر اتنی محنت کر سکتا ہوں اور کس طرح میرے اوسان چاروں طرف کی بے تکی یورش اور جاہلانہ ہلچل میں سلامت رہتے ہیں اور میں سب کے ساتھ اخلاق و نرمی کا برتاؤ کر سکتا ہوں۔ چار بجے صبح سے لے کر دس گیارہ بجے رات تک مجھ کو ایک سیکنڈ کی ایسی فرصت نہیں ملتی جس کو میں فرصت کہہ سکوں۔ واحدی صاحب اور بھیا احسان تعجب کرتے ہیں کہ میں پراگندہ بات چیت اور لوگوں کے ذاتی جھگڑوں میں مصروف رہ کر کیونکر مضامین اور کتابیں لکھ لیتا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی وجہ سے مضامین اور کتابیں پہلے کی طرح دلچسپ اور اچھی عبارت میں نہیں ہوتیں۔

میری اچھی اور بُری خصلتیں

انسان کو اپنے عیب بہت کم نظر آتے ہیں مگر میری عادت ہے کہ میں اکثر اوقات اپنے عیبوں کو سوچا کرتا ہوں اور اچھی خصلتوں کو بھی یاد کرتا ہوں تاکہ اچھی بُری خصلتوں میں تمیز کر سکوں۔

خود پسندی

سب شاعروں، انشا پردازوں، علمی کام کرنے والوں میں خود پسندی کا مادہ ہوا کرتا ہے اور اپنے سامنے کسی کی لیاقت و قابلیت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ مجھ میں یہ عیب زیادہ تو نہیں ہے مگر تھوڑا بہت اثر اپنے اندر پاتا ہوں۔

ضد اور ہٹ

راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ مشہور ہے۔ میں نہ راجہ ہوں نہ بچہ ہوں نہ عورت۔ مگر میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ

پایا جاتا ہے اور اس کو بعض حالات میں بُرا سمجھتا ہوں — باوجود رائے کی بے استقلالی کے میرا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اس پر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس پر اڑا رہتا ہوں۔

ہمدردی

میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خدا جو کچھ مجھے دیتا ہے اس کا بڑا حصہ مستحق غربا کو بانٹ دیتا ہوں — میرا عقیدہ ہے کہ محنت کرنے والے کو اُجرت سے کچھ زیادہ بطور انعام دینا خیرات میں شامل ہے کیونکہ محنت کرنے والے کو اس انعام سے محنت کی طرف رغبت ہوتی ہے اور دنیا سے کاہلی و بیکاری کا اثر دور ہوتا ہے — مہمان کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور اکثر اوقات میں بھوکا سوتا ہوں اور سب کچھ مہمانوں کو کھلا دیتا ہوں۔

دشمن بڑا دوست ہے

میں نے دشمنوں کے ہجوم میں زندگی گزاری ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ دشمن سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوست نہیں ہے کہ اس کے سبب سے آدمی ہوشیار رہتا اور بدی سے بچتا اور نیک بننا سیکھتا ہے۔ دشمن ہی اس کو ترقی کا جوش دلاتا ہے۔ دشمن ہی اس کی زندگی میں جان ڈالتا ہے۔

عرفانِ نفس

میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے۔ پس یہ آپ بیتی کی نوشت ہی مجھ کو آگے چل کر (اگر میں زندہ رہا) زندگی کا حساب بتائے گی۔ ناظرین کچھ ہی سمجھیں۔ میں نے تو یہ کتاب (آپ بیتی) لکھ کر عرفانِ نفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔

لوحِ مزار

(خواجہ صاحب کے مزار پر ان کا خود نوشتہ مندرجہ ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے جو ان کی آپ بیتی کا آخری ورق ہے)

"یہ قبر ایک مسلمان کی ہے۔ اس خاک میں وہ سوتا ہے جس نے دنیا کی بیداری میں سونے والوں کو جگانے کی خاطر اچھی اور بُری موت کا فرق قلم کی بجلی سے زندہ کر کے دکھا دیا۔

چار دن کی شہرت پر گھمنڈ نہ کرنا کہ یہ بھی بہت مشہور تھا۔ قوت تحریر و تقریر کا غرور دل میں نہ لانا کہ اس کی طاقت انشا پردازی نے بھی ہندوستان میں دھاک بٹھا دی تھی مگر آج وہ ساری دھوم اس تودۂ خاک میں چپ چاپ پڑی ہے۔

یہ اس کی قبر ہے جس نے الواحِ قبور اس وقت لکھیں جب کہ دنیا کی کسی زبان میں ان کی نظیر موجود نہ تھی۔ لیکن یہ بے مثال باتیں ایجاد کرنے والا بھی آخر مر گیا اور کہہ گیا کہ کام آخرت کی نیت سے کرنا جس کا نتیجہ لازوال ہے۔ اس زندگی کے لیے نہیں، جہاں کا رہنا چند ساعت کا خواب و خیال ہے۔"

سعدی شیرازی

بچپن کی یادیں کسے عزیز نہیں۔ مجھے ابھی تک بچپن کا وہ واقعہ نہیں بھولا جب میرے والد محترم اپنے ساتھ مجھے بھی عید میلہ دیکھنے لے گئے۔ اتفاقاً لوگوں کے بے پناہ ہجوم میں میں اُن سے بچھڑ گیا۔ اسی حالت میں زور زور سے رونے لگا۔ والد محترم بھی پریشانی کے عالم میں تلاش کرتے آ پہنچے۔ اور میرا کان کھینچ کر کہا! گستاخ! مجھے میں نے کہا تھا۔ کہ میرا دامن نہ چھوڑنا۔ مگر تو نے پرواہ نہ کی۔ بچپن کا یہ واقعہ میری ساری زندگی میں راہنمائی کرتا رہا۔ کہ جو بزرگوں کا دامن چھوڑ دیتا ہے، وہ دنیا کے میلے میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔

مجھے اتنی کم عمری میں ہی روزہ رکھنے کا شوق تھا، جبکہ مجھے دائیں اور بائیں ہاتھ میں تمیز کرنا بھی نہ آتا تھا۔ اسی عمر میں ایک دن روزہ رکھ کر محلہ کی مسجد میں گیا۔ خطیب مسجد عابد و زاہد بزرگ تھے۔ مجھے وضو کا طریقہ بتا رہے تھے کہ اس طرح بسم اللہ پڑھنے کے بعد وضو کی نیت کرو۔ اس طرح ہاتھ دھوؤ۔ اس طرح کلی کرو اور یوں تین بار ناک صاف کرو۔ انگشتِ شہادت سے دانت صاف کرو۔ کیونکہ مسواک روزہ کے دوران منع[1] ہے۔ سر کے بالوں سے ٹھوڑی تک تین بار مُنہ دھولو۔ کہنیوں تک ہاتھ صاف کرو۔ اور تسبیح و ذکر ساتھ ساتھ پڑھتے جاؤ۔ سر کے مسح کے بعد یوں پاؤں دھوؤ۔ وضو کروا لینے کے بعد فخریہ انداز میں فرمانے لگے۔ ساری بستی میں میرے جیسے مسائل کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ اس بستی کا ہر فرتوت[2] مسلوب العقل ہو چکا ہے۔ جب یہ بات گاؤں کے پرانے نمبردار نے سُنی، تو غصہ میں کہا "تم مسواک کو روزہ میں ناجائز قرار دیتے ہو۔ مگر غیبت کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے میں تامل نہیں کرتے۔" محلے کے اس مکتبِ نصیحت نے میری سیرت میں پختگی پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ میں عمر بھر غیبت سے احتراز کرتا رہا۔

ابھی میں چھوٹا ہی تھا۔ کہ والد محترم نے سونے کی انگوٹھی خریدی ۔ ایک شخص چند کھجوریں دے کر انگوٹھی لے گیا۔ یہ عمر بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ کہ قیمتی انگوٹھی چند میٹھی کھجوروں کے عوض دینے میں تامل نہیں ہوتا۔ دنیا داروں کی قیمتی زندگیاں بھی دنیا کے سستے عیش و آرام کی نذر ہو جاتی ہیں۔

میری زندگی کا یہ زمانہ بڑا پُرلطف تھا۔ میں اپنے مہربان اور شفیق والد کی گود میں بڑے مزے سے کھیلتا اگر میرے بدن پر مکھی بھی بیٹھ جاتی تو سارے افرادِ خانہ بے چین ہو جاتے۔ مگر والد کا سایۂ عاطفت اُٹھ جانے کے بعد یہ حالت ہو گئی ہے۔ کہ

---

[1] شیخ سعدیؒ اور ان کے استاد شافعی تھے۔ مذہب شافعی میں روزہ میں مسواک کا استعمال منع ہے۔ مگر حنفیہ کے نزدیک درست ہے۔ [2] نہایت بوڑھا

جیل میں جانا پڑے تو کوئی مددگار نہیں ملتا۔

"کنوں گر بزنداں برندم اسیر — نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر"

میری ابتدائی تربیت اور اخلاقی نشوونما والدِ محترم کی خاص دلچسپی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اکثر اپنے ساتھ ہی شب بیداری کا عادی بناتے۔ تہجد اور ریاضت کا پابند بناتے۔ ایک رات ان کے ساتھ ہی نوافل پڑھ رہا تھا۔ قرآن کریم میرے بغل میں تھا۔ اور عبادت الٰہی میں منہمک تھا۔ ہمارے اردگرد کچھ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے والد کو کہا۔ "ان نیند کے متوالوں میں سے کوئی بھی نماز کے لیے سر نہیں اٹھاتا۔ یہ ایسے غافل ہوتے ہیں۔ گویا انہیں موت نے سُلا دیا ہے۔" انہوں نے فرمایا۔ "بیٹا! اگر تم بھی سو جاتے تو خلقِ خدا کی غیبت کرنے سے بہتر تھا۔"

تحصیل علم کے شوق نے ہر اہلِ علم کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ میرا شہر شیراز تاتاری حملوں کی زد میں تھا۔ شہر کا امن تباہ ہو چکا تھا۔ علم کی شمعیں گُل ہو گئیں تھیں۔ اہل اللہ کی مجالس ویران ہو چکی تھیں۔ اگرچہ شیراز کی محبت میرے رگ و ریشہ میں تھی۔ مگر تحصیل علم کی خاطر مجھے بغداد کا رُخ کرنا پڑا۔

"دلم از صحبتِ شیراز بکلی بگرفت — وقت آنست کہ پرسی از بغدادم
سعدیا حبِّ وطن گرچہ حدیثیست صحیح — نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم"

بغداد پہنچ کر مدرسہ نظامیہ[1] میں داخلہ لے لیا۔ مجھے دورانِ تعلیم حسبِ ضرورت وظیفہ ملنے لگا۔

جستجوئے علم میں نظامیہ کے اکثر طلباء میں مجھے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ مسائل کی بحث و تکرار میں اکثر طلباء کو ہزیمت ہوتی تو دلوں میں حسد کرتے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے استاد (شمس الدین ابوالفرج ابن جوزیؒ) سے شکایت کی۔ کہ فلاں طالب علم میری حدیث دانی اور علمی قابلیت پر حسد کرتا ہے۔ اُستادِ محترم نے بات سُن کر مجھے ڈانٹا اور فرمایا۔ "تمہیں دوست کا حسد بہت بُرا لگا ہے۔ مگر اپنی غیبت کی عادت بُری نہیں سمجھتے۔"

"گر او راہِ دوزخ گرفت از خسی — ازیں راہِ دیگر تو در وے رسی"

بچپن سے ہی میرا طبعی رجحان فقر و درویشی کی طرف تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اکثر سماع و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا علامہ ابوالفرج[2]

---

[1] مدرسہ نظامیہ کی بنیاد بغداد میں نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ھ میں رکھی۔ اس دینی مدرسے نے اسلامی دنیا کے مشاہیر کی تربیت میں خاص حصہ لیا۔ امام غزالیؒ، عبدالقاہر سہروردیؒ۔ عماد الدین موصلیؒ وغیرہم جیسے عظیم علماء اسی مدرسے سے فارغ ہوئے تھے۔ فاروقی

[2] علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی الملقب بہ جمال الدین وقت کے امام حدیث و تفسیر تھے۔ صاحبِ علم تھے۔ اصحابِ تصوف سے تعلقاً کم تھا۔ یہی وجہ ہے وجد اور قوالی کی مجالس سے اجتناب فرماتے تھے۔ ہزاروں کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا انتقال ۵۹۷ھ میں ہوا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ جن قلموں سے کتبِ حدیث لکھتا رہا ہوں۔ ان کا تراشہ میرے حجرہ میں پڑا ہے۔ اسی سے پانی گرم کر کے غسل دیا جائے۔ سعدی کی تحریر میں آپ کا نام شمس الدین لکھا گیا ہے۔ فاروقی

ابن جوزی ہمیشہ مجھے سماع سے منع فرمایا کرتے تھے۔ مگر مجھے سماع کا ایسا چسکا پڑ چکا تھا۔ کہ ان کی نصیحت کے باوجود بھی اس عادت سے باز نہ آیا۔ ایک رات ایک مجلس میں ایک قوال سے پالا پڑا۔ اس کی آواز نہ صرف مکروہ تھی۔ بلکہ دل آزار بھی تھی۔ ساری رات مجبوراً اس کی غیر مانوس آواز کو برداشت کرنا پڑا۔ مجلس کے اختتام پر میں نے اس کے فن کی داد دی۔ اسے گلے لگا لیا۔ اور اپنا قیمتی عمامہ سر سے اتار کر اس کے سر پر رکھا۔ اور ایک دینار نذرانہ پیش کیا۔ احباب مجلس میری اس خلاف معمول حرکت پر بڑے حیران تھے۔ کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا۔ کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت کا مشاہدہ کیا ہے۔ کہ میرے مربی و مہربان استاد سماع سے منع فرماتے رہے۔ مگر میں نے ان کی نصیحت نہ مانی۔ آج اس مجلس میں شرکت کا موقع ملا۔ تو اس قوال کے تصرف سے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

اگرچہ زہد و ریاضت میری زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ مگر ایک درویش کو خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں داخل ہوتے دیکھا تو ان سے سوال کیا "حضرت! زاہد و عالم میں کیا فرق ہے؟ آپ خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں آگئے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا۔ زاہد صرف اپنی بخشش کا سامان اکٹھا کرتا ہے۔ مگر عالم ایک جہان کو ہدایت دیتا ہے۔"

"صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ   بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عابد و عالم چہ فرق بود؟   تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت آں گلیم خویش بدر می برد ز موج   ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را"

اس واقعہ کے بعد تحصیل علم میں پہلے سے کہیں زیادہ سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔

ایک درویش جسے امراء کو برا بھلا کہنے کی لت پڑ چکی تھی۔ میرے ساتھ بحث میں الجھ پڑا اور امراء کو دشنام دیتا اور فقراء کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ میں نے امراء کے حق میں دلائل دیئے تو بھونچکا رہ گیا۔ دلائل ختم ہوئے تو گالیوں پر اتر آیا۔ میں نے اسے برا بھلا کہا۔ تو اس نے میرا گریبان پھاڑ دیا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی زخمی کر دی۔

"دشنامم داد و سقطش گفتم   گریبانم درید زنخدانش شکستم

معاملہ عدالت تک پہنچا۔ قاضی نے دونوں میں بعد از زجر و توبیخ صلح کروا دی۔

شیخ شہاب الدین سہروردی[1] رحمۃ اللہ علیہ میرے روحانی پیشوا تھے۔ بغداد کا امن برباد ہوا۔ تو انہوں نے سفر (حجاز) میں اپنا ہمسفر بنا لیا۔ ان کی صحبت فیضان بخش نے مجھے جذب و سلوک کے کئی مقامات حاصل کرنے میں مدد دی۔ ایک دفعہ سمندر کے کنارے پر کشتی پر سوار ہو کر دوسرے کنارے جانے کے لیے پہنچے۔ میرا ایک ہمسفر قریب کا بوڑھا درویش تھا۔ اس کے پاس کشتی کا کرایہ نہ تھا۔ میرے پاس بھی صرف اتنے ہی پیسے تھے کہ اپنا کرایہ ادا کر سکوں۔ کشتی کے ملاح نے انہیں پار لیجانے سے انکار کر دیا۔ میں نے منت سماجت کی مگر ملاح کو ترس نہ آیا اور اسے وہیں چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ درویش نے مجھے تسلی دی۔ کہ فکر نہ کرو۔ جو کشتی کو دوسرے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ وہ مجھے بھی پہنچانے گا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اپنا مصلیٰ پانی پر بچھایا۔ اور دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں اتر کر مجھے کہنے لگے "تمہیں کشتی لے آئی۔ ہمیں اللہ!"

"عجب ماندی اے یار فرخندہ رائے   تُرا کشتی آورد و مارا خدا"

---

[1] شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ [illegible] میں سہرورد میں پیدا ہوئے اور [illegible] میں وفات پائی۔ آپکا مزار بغداد میں ہے۔ عوارف المعارف، اعلام الہدیٰ آپکی مشہور تصانیف ہیں۔

دورانِ سفر میدانِ رودبار میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ جو چیتے پر سوار تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر میں ڈر سے کانپنے لگا۔ پاؤں بوجھل ہو گئے میری حالت دیکھ کر کہنے لگا۔ "سعدی تعجب نہ کرو۔ تم اللہ کے بن جاؤ تو دنیا کی کوئی چیز تمہارے حکم سے سرتابی نہیں کرے گی۔"

"تبسم کناں دست برلب گرفت کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت
تو ہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ"

دمشق کی جامع مسجد کے پہلو میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر اعتکاف میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن ایک عرب باشندہ جو ظلم وستم میں بدنام تھا۔ مسجد میں آیا۔ اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر میرے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا۔ "مجھے ایک زبردست دشمن سے خدشہ ہے۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں۔" میں نے کہا "کمزور رعیت پر رحم کرو تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہ سکو۔"

"کسے کہ تخم بدی کاشت امید نیکی داشت دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست"

اہلِ دمشق سے ملول خاطر ہو کر فیصلہ کیا کہ فلسطین کے بیابانِ قدس میں گوشہ نشینی اختیار کر لوں اور کسی کو نہ ملوں اور صرف اللہ کی یاد میں ہی رہوں۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا۔ عیسائی فوج نے مجھے بھی گرفتار کر لیا۔ اور طرابلس الشرق (طرابلس شہر) کی خندق کھودنے میں یہودی قیدیوں کے ساتھ کام پر لگا دیا۔ کچھ عرصہ گذرنے پر حلب کے ایک واقف امیر کا اس طرف گذر ہوا۔ اور مجھے پہچان کر حال دریافت کرنے لگا۔ میں نے بڑے درد انگیز حالات بیان کئے اور کہا۔ "جو انسانوں سے بھاگ کر آیا تھا درندوں کی قید میں پڑا ہے۔"

"ہمی گریختم از مرداں بکوہ و دشت کہ از خدا نبودم بہ دیگرے پرداخت
قیاس کن کہ چہ حالت بود دریں ساعت کہ با طویلۂ نامردم بباید ساخت"

رئیسِ حلب کو میری حالتِ زار پر رحم آیا۔ دس دینار دے کر مجھے چھڑا لیا۔ اور اپنے ساتھ ہی حلب میں لے گیا۔ از راہِ مروت اپنی اکلوتی بیٹی ایک سو دینار حق مہر میں میرے ساتھ کر دی۔ بدقسمتی سے میری یہ بیوی بڑی شوخ اور زبان دراز واقع ہوئی۔ اس کی باتوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ ایک دن کہنے لگی۔ "تم اپنی ہستی بھول گئے ہو۔ کہ میرے باپ نے تمہیں دس دینار میں چھڑایا تھا۔" میں نے کہا "ہاں! میں وہی ہوں۔ جسے دس دینار میں چھڑا کر سو دینار میں تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا۔"

میں نے کبھی زمانے کی ستم رانیوں اور سختیوں کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامنِ استقلال ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا۔ میں پاؤں سے ننگا تھا۔ جوتا خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ غمگین و افسردہ خاطر کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا۔ جو پاؤں سے بھی محروم ہے۔ سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور اپنی برہنہ پائی کو ہی غنیمت جانا۔

جن دنوں میں اسکندریہ میں مقیم تھا۔ وہاں اتنا شدید قحط پڑا کہ درویشوں پر فاقے گذرنے لگے۔ اسی شہر میں ایک بدکردار ہیجڑہ بڑا دولت مند تھا۔ وہ ان حالات میں غریبوں کو نقدی اور مسافروں کو کھانا کھلاتا۔ فاقہ کش درویشوں کی ایک جماعت میرے پاس آئی اور کہا۔ چلو! دعوت اڑائیں۔" میں نے انہیں یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ "شیر بھوکا بھی رہ جائے۔ تو کتے کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔"

"نخورد شیر نیم خوردۂ سگ گر بسختی بمیرد اندر غار
تن بہ بیچارگی و گرسنگی بنہ و دست پیش سفلہ مدار"

چنگیز خان چینی تاتار خوارزمیوں سے لے چکا تو سلطان محمد خوارزم کے ساتھ عارضی صلح کا ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں ان دنوں کاشغر میں مقیم تھا۔ جامع مسجد میں مجھے ایک خوش شکل طالب علم مقدمۂ[1] زمخشری سے "ضَرَبَ زَیدٌ عَمرواً" کی رٹ لگاتا نظر آیا۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "کیوں صاحب! خوارزم و ختا میں تو صلح ہو گئی۔ مگر زید و عمرو کی دشمنی ابھی تک چلی جا رہی ہے؟" طالب علم ہنس پڑا۔ اور میرے وطن کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "خاکِ پاکِ شیراز" اس نے پوچھا۔ آپ کو "سعدی شیرازی" کا کوئی کلام یاد ہو تو سنائیں۔ میں نے عربی کے ایک دو اشعار سنائے۔ تو کہنے لگا۔ سعدی کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ اگر یاد ہو تو ارشاد فرمائیں۔" میں نے کہا۔

اے دل عشاق بدامِ تو صید　　ما بتو مشغول تو با عمرو و زید"

دوسری صبح جب میں سفر پر روانہ ہوا۔ تو اسے کسی نے بتایا۔ کہ سعدی میں ہی ہوں۔ دوڑ کر میرے پاس آیا اور معذرت کی۔ اور چند روز مزید قیام کرنے کو کہا۔ تاکہ شہر کے عوام بھی مستفیض ہوں۔ میں نے اسے چند شعر سنائے اور الوداع کہا۔

"بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　قناعت کردہ از دنیا بغارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی　　کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغزند　　چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند"

جوانی کی واردات سے کسے سابقہ نہیں پڑا۔ آغازِ جوانی میں مجھے بھی ایک ماہ رو اور شیریں گفتار سے محبت ہو گئی۔ اس کی گستاخانہ حرکت نے مجھے مجبور کر دیا کہ کنارہ کش ہو جاؤں۔ اور بات چیت چھوڑ دوں۔ اُسے صاف صاف کہہ دیا۔

"برو ہر چہ می بایدت پیش گیر　　سر ما نداری سر خویش گیر"

مجھے کسی نے بتایا۔ کہ وہ جا رہا تھا۔ اور میرے متعلق کہہ رہا تھا۔

"اگر چمگادڑ آفتاب کی روشنی سے محروم رہنا چاہتی ہے۔ تو رونقِ آفتاب تو کم نہیں ہوگی"

اس کے جانے کے ایک عرصہ بعد تک مجھے اس کی یاد ستاتی رہی۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ کچھ مدت بعد وہ خود ہی لوٹ آیا۔ مگر اس کا حلقِ داؤدی بدل چکا تھا۔ جمالِ یوسفی ختم ہو چکا تھا۔ چہرے کی رنگت اپنی دلکشی کھو چکی تھی۔ اور بازارِ حسن اُجڑ چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ دیکھتے ہی اسے گلے لگا لوں گا۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور کہا۔

"تازہ بہار تو کنوں زرد شد　　دیگ منہ کاتشِ ما سرد شد
چند خرامی و تکبر کنی　　دولتِ دیرینہ تصور کنی
پیش کسے رو کہ خریدار تست　　ناز براں کن کہ طلبگار تست"

---

[1] علامہ جار اللہ زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ کا مقدمہ زمخشری (کتاب المفصل) نحو کی مشہور درسی کتاب ہے۔ آپ خوارزم کے قصبہ زمخشر کے رہنے والے تھے تفسیر کشاف آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ معتزلہ مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔ مقدمۃ الادب (لغت عربی میں) کتاب الامکنہ (علم جغرافیہ میں) نوابغ الکلم (مجموعہ ضرب الامثال) اطواق الذہب (اخلاقیات پر) ان کی مشہور تصانیف میں سے شمار کی جاتی ہیں۔

میں نے پوچھا۔ کہ تمہارے حسن و جمال کو کیا ہوا؟" کہنے لگا۔ "ماتم حسن میں چہرے نے سیاہ لباس پہن لیا ہے۔"

ایک دفعہ دمشق میں قحط سالی تھی۔ دوست و احباب محبتیں بھول گئے۔ آسمان زمین کے لیے ایسا بخیل ہوا کہ کھیتیاں اور درخت پانی کے قطرے کو ترس گئے۔ چشم یتیم کے آنسوؤں کے علاوہ ملک کے سارے چشمے خشک ہو گئے۔ پہاڑ، باغ، کھیت اور وادیاں غرضیکہ کہیں سبزی کا نام و نشان نہ رہا۔ بھوکی ٹڈی درخت چاٹ گئی اور لوگ ٹڈی کھا کر گذر اوقات کرنے لگے۔ اس ناگفتہ بہ حالت میں میرا قیام بھی دمشق میں رہا۔ ایک قدیم دوست سے ملاقات ہوئی۔ جو صاحب جائیداد بھی تھا۔ اور خوشحال بھی۔ مگر میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے جسم کی ہڈیوں پر چمڑے کے بغیر کچھ نہ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "تم امیر آدمی ہو تمہیں کیا ہوا ہے۔ کہ سوکھ گئے ہو؟" مجھے جھڑک کر کہنے لگا۔ "تم قحط کی شدت سے بے خبر ہو کہ مخلوق خدا کا کیا حال ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں فکر کیا سب کچھ تمہارے پاس ہے۔" اس نے بڑی نفرت سے مجھے گھور کر کہا۔ "جب لوگ بھوک کے مر رہے ہوں۔ تو اہل دل کے لیے کھانا زہر بن جاتا ہے۔" اس دوست کی گفتگو پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ انسانی ہمدردی کے چشمے خشک نہیں ہوئے۔

فارس کے حالات پُر آشوب ہونے پر میں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ سومنات (گجرات) میں پہنچا۔ وہاں ہاتھی دانت کا بہت بڑا بت پڑا تھا۔ جسے پوجنے کے لیے دُور دراز سے لوگ آتے تھے۔ اس بے زبان کے سامنے آہ و زاری کرتے۔ اور مرادیں مانگتے۔ مجھے دیکھ کر تعجب ہوا۔ کہ جاندار بے جان کی پرستش میں مرے جا رہے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے بات کی۔ کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر اس قدر کیوں فریفتہ ہیں۔ جبکہ یہ بے جان، حقیر، ذلیل پتھر سنگ دیوار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔" میری بات سنتے ہی برہمن سیخ پا ہو گیا اور مندر کے پجاریوں سے شکایت کی۔ کہ ایک بد اعتقاد آدمی سومنات میں آگھسا ہے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے ان کے برہمن کی خوشامد کرتے ہوئے مصلحتاً کہا۔ "بد اعتقادی کی کوئی بات نہیں۔ میں تو اس بت پر خود فریفتہ ہوں۔ دراصل میں نو وارد ہوں۔ اور حقیقت حال معلوم کر کے اعتقاد کامل جتانا چاہتا ہوں۔" پجاریوں کو یہ بات پسند آئی اور مجھے رات وہیں بسر کرنے کو کہا۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ یہ رات میرے گناہوں کی جزا تھی۔ ان خبیث لوگوں میں رات گذارنا بڑا ہی گراں اور شاق تھا۔

شبے ہمچو روز قیامت دراز مغاں گرد من بے وضو در نماز

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ شہر کے تمام مرد و عورت جمع ہو گئے۔ اور اس بت نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ یہ دیکھتے ہی سب کے سب بے تحاشا پکار اٹھے۔ جب لوگ چلے گئے۔ تو برہمن نے مجھے دیکھا اور کہا اب تو کوئی شبہ نہیں رہا؟ میں روتا ہوا اٹھا۔ اور بت کو چوم کر دل ہی میں کہا "تم پر اور تمہارے پجاریوں پر خدا کی لعنت ہو!" چند ہی دنوں میں سب میرے دوست بن گئے۔ اور میں سب کو اپنے اعتماد میں لے کر بت خانہ کی نگہداشت پر مامور ہو گیا۔ ایک رات جب سب اپنے گھروں کو چلے گئے میں نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی ٹھانی۔ جس سے بت ہاتھ اٹھا لیتا تھا۔ میں دروازے بند کر کے دیکھنے لگا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھے ایک پردہ دکھائی دیا۔ جس کے پیچھے ایک پنڈت بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈوری تھی جسے وہ ضرورت کے وقت کھینچ لیتا تو بت کے ہاتھ اٹھ جاتے۔ پنڈت مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور راز فاش ہونے پر کھسیانا ہو کر بھاگ نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے شکایت کر دی۔ تو میری خیر نہیں۔ اسے دوڑ کر دبوچ لیا۔ اور کنوئیں میں گرا دیا۔ اور خود دہلی۔ لاہور کے راستے بحیرہ عرب سے ہوتے ہوئے یمن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور وہاں سے سیدھا حجاز مقدس آ گیا۔

بیابان مکہ میں سفر کرتے تھک گیا۔ اور راستہ میں ہی سو رہا۔ میرے قافلہ کا شتربان مجھے کہنے لگا۔ "میرے بھائی! وادیٔ حرم

آگے ہے۔ اور حرامی ڈاکو پیچھے۔ اگر جاگو گے تو سلامت رہو گے۔ اور اگر سو جاؤ گے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ تم نے سنا نہیں۔

"خوش است زیر مغیلاں براہ بادیہ خفت   شبِ رحیل و لے ترک جان بباید گفت

سفرِ حجاز میں صاحب دل نوجوانوں کے ہمراہ میں بھی جا رہا تھا۔ سفر کی سختی کو غلط کرنے کے لیے کبھی کبھی دلچسپ اشعار اور عاشقانہ ترانے گائے جاتے۔ اسی قافلہ میں ایک زاہد مسافر بھی تھا۔ جو درویشوں کے ذوق و وجدان سے بے بہرہ تھا۔ جونہی ہم بنی ہلال کے نخلستان کے پاس پہنچے۔ تو قبیلے ہی کا ایک سیاہ فام بچہ باہر آیا اور اس ذوق سے نغمہ سرا ہوا۔ کہ پرندے اپنی پرواز بھول گئے۔ عابد کا اونٹ وجد میں آ گیا۔ اور اسے زمین پر گرا کر بیابان میں بھاگ نکلا۔ میں نے کہا "حضرت! حیوان تو وجد میں آ گئے۔ مگر آپ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔"

"بذکرش ہر چہ بینی در خروش است   دل داند دریں معنی کہ گوش است
نہ بلبل بر گلش تسبیح خوان است   کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانست"

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہا تھا۔ حاضرین بڑے ہی بے ذوق اور مردہ دل واقع ہوئے تھے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی۔ کہ ان کے قلب و جگر کو گرما سکوں۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" پر گفتگو کر رہا تھا۔ مگر مجلس پر ایک مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک راہ گیر نے جو مجلس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ نعرہ مارا تو حاضرین تڑپ اٹھے۔ اور ساری مجلس پر رقت طاری ہو گئی۔ میں نے کہا "سبحان اللہ۔ دُور کے صاحب ذوق تو حضوری کی لذتیں پائیں۔ اور بے ذوق حاضرین مجلس میں محروم رہیں۔"

جہاں گردی میں مجھے زمانے بھر کی سیر کرنا پڑی۔ ہر قسم کے انسانوں سے گفتگو کرنے اور وقت گزارنے کا موقع ملا۔ جہاں کہیں بھی علمی خزانے ملے اپنی دامن بھر لیا۔ دنیا کا گوشہ گوشہ چھانا۔ مگر "شیراز کے خاک نہاد پاکباز" لوگ مجھے کہیں بھی نہ ملے۔ شام و روم جیسے شہروں میں بھی مجھے شیرازی دوستوں کی یاد ستاتی رہی۔ اور کسی ملک سے وابستگی نہ ہو سکی۔ اتنی سیر و سیاحت کے بعد جب اپنے وطن شیراز جانے لگا۔ تو مجھے خیال آیا۔ کہ دوستوں کے پاس خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ دل میں سوچا کہ لوگ مصر میں جا کر "قند مصری" لاتے ہیں۔ میں "قند مصری" خریدنے کے قابل تو نہیں البتہ میری باتیں قند مصری سے زیادہ میٹھی ہیں۔ قند ظاہری طور پر کھائی جاتی ہے۔ مگر میرا کلام "ارباب معنی" "کاغذ زر" پر لکھ کر لے جائیں گے۔ میرے کلام کی شہرت کوہ قاف تک پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے شیرازی احباب کے لیے ایک خوشنما باغ "بوستان" تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس "بوستان" کے دس دروازے (ابواب) بنائے جنہیں عدلؔ۔ احسانؔ۔ عشقؔ۔ تواضعؔ۔ رضاؔ۔ قناعتؔ۔ تربیتؔ۔ شکرؔ۔ توبہؔ اور مناجاتؔ کے ناموں سے منسوب کیا۔ یہ کتاب بوستان بروز جمعہ ماہ ذیقعدہ ۶۵۵ھ میں مکمل ہوئی

"بروز ہمایوں و سال سعید   بتاریخ فرخ میان دو عید
ز ششصد فزوں بود پنجاہ و پنج   کہ پردر شد ایں نام بردار گنج"

ایک رات بیٹھے بیٹھے اپنی گذشتہ زندگی پر غور کر رہا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ میری عمر کا عزیز ترین حصہ ضائع ہو چکا ہے اس کیفیت کے اظہار کے لیے چند رقت آمیز اشعار میری زبان پر آئے۔

"اے کہ پنجاہ رفت در خوابی   مگر ایں پنج روز دریابی
خجل آنکس کہ رفت و کار نساخت   کوس رحلت زدند و بار نساخت
خواب نوشین بامداد رحیل   باز دارد پیادہ را ز سبیل

عمر برف است آفتاب تموز　　اندکے ماند و خواجہ غرۃ ہنوز
اے تہیدست رفتہ در بازار　　ترسمت پر نیاوری دستار"

اس غور و خوض کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ باقی ماندہ زندگی گوشہ نشینی میں بسر کرنی چاہیے۔ اور احباب کی فضول مجلس سے دامن کش ہو جانا چاہیے۔ بیہودہ باتوں سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ بجز یادِ الٰہی کے ہر چیز سے دست بردار ہو گیا۔ اتنے میں ایک قدیم اور ہم راز دوست حسبِ معمول آ پہنچا۔ اور حسبِ عادت خوش گپیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر میری طرف سے جواب نہ پا کر حیران رہ گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ طاقتِ گفتار ہوتے ہوئے خاموش رہنا ستم ظریفی ہے۔ میرے کسی رشتہ دار نے اسے میرے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اپنی محبت اور پرانی یادوں کی قسمیں دے کر کہنے لگا۔

"جب تک سعدی بات نہیں کرے گا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ کیوں کہ

"آزردنِ دلِ دوستاں جہل است و کفارتِ یمین سہل"

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ حضرت علیؓ کی تلوار اور سعدیؒ کی زبان بند پڑی رہے" چونکہ وہ میرا پرانا دوست تھا۔ اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ہم باتوں باتوں میں باہر ایک باغ میں جا بیٹھے۔ جہاں بہار کی فیاضیاں اپنے شباب پر تھیں۔ ساری رات وہیں مجلس رہی۔ علی الصبح وہی دوست رنگا رنگ پھولوں کی جھولی بھر کر میرے پاس لایا۔ میں نے کہا۔ پھولوں کی عارضی خوشبو چند روزہ ہے۔ میں "زندہ دلانِ شیراز" کے لیے ایک ایسا "گلستان" تیار کروں گا۔ جس کی خوشبو قیامت تک رہے۔ اور زمانے کی خزاں بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس نے پھول وہیں پھینکے اور مجھے وعدہ کا پابند کر دیا۔ اسی دن سے قلم پیہم لکھنا شروع کر دیا۔ اور ابھی موسمِ بہار ختم ہونے نہ پایا تھا۔ کہ کتاب "گلستان" مکمل ہو گئی۔

دراں مدت کہ ما را وقت خوش بود　　ز ہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود
مراد ما نصیحت بود کردیم　　حوالت با خدا کردیم و رفتیم

گلستان لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ زندگی کی کوئی یادگار باقی رہ سکے۔ اور کسی صاحبِ نظر کے لطف سے بخشش ہو جائے۔

"غرض نقشیست کز ما یاد ماند　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت　　کند در حقِ درویشاں دعائے"

میرے سفر و سیاحت کی داستانیں سننے کے بعد آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔ کہ میں خاکِ پاکِ شیراز سے اتنا طویل عرصہ کیوں دور رہا۔ ترکوں کے پے در پے حملوں نے میرے ملک کا امن زلفِ حبشی کی طرح درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ لوگ بظاہر انسانی شکل میں تھے۔ مگر ان کی سیرت خونخوار بھیڑیئے کی سی بن چکی تھی۔ شیراز کی فرشتہ خصلت شہری آبادی تاتاریوں کے درندہ صفت سپاہیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد جب مجھے واپس وطن آنے کا موقعہ ملا تو ان درندوں نے درندگی ترک کر دی تھی۔ ملک کی پُر آشوب اور آشفتہ حالت پُر سکون ہو چکی تھی۔ اب بادشاہِ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کا دورِ حکومت تھا جس نے حالات کو خوشگوار بنا دیا۔　　"چنیں شد در ایامِ سلطانِ عادل　　اتابک ابوبکر بن سعد زنگی"

داستانِ حیات شیریں ہوتی ہے۔ اور پھر میری سرگزشت جس کا شہرہ قاف سے قاف تک پہنچ چکا ہے۔ میرے شیریں اشعار ارباب معنی "مغزِ جاں" بنا کر ملک بملک لے جاتے ہیں۔ مگر　　"نخواہم دریں باب ازیں بیش گفت
کہ شنعت بود سیرتِ خویش گفت"

(اقبال احمد فاروقی ایم۔ اے)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی

سلطان محمد علاؤالدین خلجی کے عہد عظمت نشان میں ہمارے جد امجد آغا محمد ترک بخاری اپنے وطن "بخارا" سے دہلی تشریف لائے۔ چوں کہ اپنے قبیلے کے سردار تھے اس لیے بہت سے ترک جو آپ کے رشتہ دار، مرید اور تابع تھے، وہ بھی آپ ہی کے ساتھ "بخارا" سے دہلی آگئے۔ بادشاہ کی نظرِ عنایت کے باعث عزت و عظمت کے بلند ترین منصب و مرتبہ پر فائز ہوئے۔

علاؤالدین خلجی ممالک گجرات سر کرنے کے ارادہ سے نکلا اور اپنے ساتھ چند امیروں اور آپ کو بھی ہمراہ لیا۔ راستہ میں اس نے پڑاؤ ڈالا اور وہیں ایک دن اس کے مصاحبوں اور رفیقوں سے کسی معاملہ میں رنجش پیدا ہوئی، چنانچہ وہ بحکمِ الٰہی اپنے ان تمام امراء سے کٹ کر جد امجد آغا محمد ترک کی جانب مزید متوجہ ہوا اور پہلے سے زیادہ منصب و عہدہ پر سرفراز کیا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت کے بعد سلطان قطب الدین اور سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں جد امجد کے تمام فرزند جو ذاتی فضیلت و برتری اور کمال میں سرآمد روزگار تھے، سب کے سب دولت و نعمت سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنے اپنے زمانے کے عزت دار و دولتمند کہلائے اور "مال و فرزند دنیاوی زندگی کی زینت ہیں" کے اس حکمِ الٰہی کے پیشِ نظر ان سب نے دادِ عیش دی اور بامراد و کامیاب رہے۔ اللہ نے آپ کو ایک سو ایک نرینہ اولاد دی۔ ان کے علاوہ آپ کی زندگی میں آپ کے پوتے وغیرہ اور بھی تھے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد آپ کے تمام بیٹے بحکمِ الٰہی انتقال کر گئے، جن میں سے اللہ کی حکمت بالغہ نے آپ کے صرف ایک بڑے بیٹے "ملک معز الدین" کو زندہ رکھا۔ تمام فرزندوں کی وفات کی وجہ سے آپ کی آسائش و فراغت سب کی سب رنج و غم سے بدل گئی، آپ نے ملک کے اعلیٰ رتبہ اور تمام لاؤ لشکر وغیرہ کو چھوڑ کر سیاہ لباس پہنا اور شیخ صلاح الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں بغرضِ اعتکاف بیٹھ گئے۔ ایک عرصہ بعد بشارت ہوئی کہ موجودہ فرزند "ملک معز الدین" کی بکثرت اولاد ہوگی، اور رہتی دنیا تک ان کی اولاد باقی رہے گی۔ اللہ نے ملک معز الدین کو ان کے سو بھائیوں کی فضیلت، استعداد اور نعمتوں سے مالا مال کیا اور بے انتہا صلاحیتوں سے نوازا، اور اپنے بیٹے "ملک موسیٰ" کو اپنی دولت وغیرہ حوالے کرکے ۷۳۳ھ میں وفات پائی۔ عیدگاہ "شمسی"[1] کے عقب میں آپ کا مزار ہے۔

"ملک موسیٰ" بھی مملکت کے بڑے عہدہ دار اور رئیسِ وقت تھے۔ "ماوراء النہر" گئے، اور وہاں سے صاحب قِران امیر تیمور گورگاں کے معزز عہدیدار کے طور پر "دہلی" تشریف لائے۔ اور اپنے آباؤ اجداد کا سلسلہ تازہ کیا اور "دہلی" ہی کو وطن بنا لیا۔ ان کی اولاد میں سے پھر کوئی باہر نہیں گیا۔ "ملک موسیٰ" کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک کا نام "شیخ فیروز" تھا جو میرے والد کے حقیقی دادا تھے۔ یہ "شیخ فیروز" تمام فضائلِ ظاہری

---

[1] آپ کا مزار حضرت مخدوم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار پرانوار کے قریب ہے اور ۲۲ صفر کو عرس ہوتا ہے۔ واقعات دہلی

و باطنی سے موصوف تھے اور دینی و کسبی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ فنِ سپہ گری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ جنگی ترکیبوں میں اپنی قوتِ طبع، جودت اور سلیقہ کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ تعلیم، شاعری، دلیری، سخاوت، ظرافت و لطافت، عشق و محبت اور دیگر تمام عمدہ صفات میں لاجواب تھے۔ نیز دولت، حشمت، جاہ و عزت، سرفرازی و عظمت میں یکتائے روزگار تھے۔ ہمارے گھر میں شیریں کلامی، ذوقِ شاعری اور خوش طبعی آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ آپ اوائل عہدِ حکومت سلطان بہلول بقیدِ حیات تھے[1]۔ آپ نے سلطان حسین شرقی کی آمد اور سلطان بہلول سے جنگ کا قصہ نظم کیا ہے، جو ہمارے پاس تھا لیکن اس وقت موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے دو شعر یاد ہیں جو منجانب حسین شرقی، سلطان بہلول کو مخاطب کرتے ہوئے کہے ہیں ؎

ایا تابعِ شہرِ دہلی شنو — خیانت چو خواہی ازیں جا برو
منم تابعِ ملک مارا ست ملک — خداداد مارا خدا راست ملک

شیخ فیروز [illegible] میں بھرائچ گئے تھے، جہاں جنگ میں شہادت پائی، اور وہیں دفن ہوئے۔ جنگ میں جاتے وقت آپ کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ امید سے ہوں، آپ نے جواب دیا انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا اور اس سے بکثرت اولاد ہوگی۔ پیٹ کے فرزند اور تم دونوں کو اللہ کے سپرد کیا۔ جنگ میں نہ معلوم کیا ہو۔ غرضیکہ اللہ نے ان کو بیٹا دیا، جن کا نام شیخ سعد اللہ[2] تھا، وہ میرے حقیقی دادا تھے۔ یہ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح فضیلت، لطافت و ظرافت، خوش مزاجی، عشق و محبت وغیرہ میں ہمہ صفت موصوف تھے۔ بچپن ہی میں آپ کے چہرہ بشرہ سے رشد و ہدایت اور بزرگی کے آثار ظاہر تھے۔ دولتِ علم سے فراغت کے بعد مصباح العاشقین شیخ محمد مکنؒ کے مرید ہوئے، جو اپنے وقت کے کامل شیخ و بزرگ تھے .... غرضیکہ شیخ سعد اللہ نے بروز جمعہ [illegible] ربیع الاول کو وفات پائی، اور اس وقت میرے والد صاحب شیخ سیف الدینؒ کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

غرضیکہ دادا صاحب کے وصال کے بعد میرے والد بزرگوار شیخ سیف الدینؒ میں اپنی ذاتی استعداد اور والد کی دعا و برکت سے آثارِ ترقی و قبول جھلکنے لگے۔ آپ نے اپنے بھائیوں کی موجودگی میں اپنی والدہ کی ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ سے خوب خدمت کی، خرچ کی تنگی اور حالات کے موانع کے باوجود تعلیم حاصل کرنے لگے۔ شاعری، فضیلت، مقبولیت، ذوق و شوق، محبت و الفت، خوش مزاجی، بے تعلقی، اور عشق، خوش کلامی، حضورِ قلب، ذکرِ الٰہی، لطائف و ظرائف، باریک بینی و دور رسی میں یکتائے زمانہ اور ملک کے لیے باعثِ افتخار ہوئے۔

والد بزرگوار اس چیز کی مانند تھے جس سے پانی ٹپکتا ہو، اور ذرا سا دھکا لگنے پر بہنے لگے۔ وہ بڑے ہی رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے۔ جب درد و محبت کی کوئی گفتگو ان کے سامنے کی جاتی تو وہ متاثر ہو کر گریہ و زاری کرنے لگتے تھے۔ میں نے خیام کی یہ رباعی جب ان کے سامنے پڑھی تو ان پر گریہ کی کیفیت اور وجد طاری ہو گیا، حالانکہ میں اس رباعی کو روزانہ بارہ مرتبہ پڑھتا ہوں ؎

ایں کوزہ چو من عاشقِ زارے بودہ است — در بندِ سرِ زلفِ نگارے بودہ است
ایں دست کہ در گردنِ او می بینم — دستے است کہ در گردنِ یارے بودہ است

میرے والد بزرگوار شیخ سیف الدینؒ اور عمِ کلاں شیخ رزق اللہؒ کی یہ حالت تھی کہ یہ دونوں جب کسی کی جانب توجہ کرتے، یا اس کی تربیت فرماتے اور طالب میں ذرا سی بھی قابلیت ہوتی تو وہ متاثر ہو کر اثراتِ تربیت اور توجہ قبول کرتے ہوئے لیاقت آپ ہو جاتا۔ مجھ فقیر کو یقین ہے کہ انہوں نے اپنی محبت و الفت کی خاص نظروں اور عنایت فرمائیوں سے جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، مجھے مخصوص فرمایا۔ مجھے یاد

---

[1] بہلول لودی کا دورِ حکومت ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء سے ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء تک ہے۔

[2] آپ [illegible] میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول [illegible] میں وفات پائی۔

ہے کہ والد بزرگوار کے سامنے میں ایک دن ایک علمی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھ میرے منہ پر ملتے ہوئے مجھے دعا دی۔ اور فرمایا "مجھے تمہارے چہرہ پر ایک تجلی اور نور جھلکتا ہوا دکھائی دیا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" اللہ جانتا ہے کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ . . . . . آپ ۱۷ شعبان ۱۱۳۱ھ کو رحمت حق سے پیوست ہو گئے۔ بعض لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات "ولی تحت القباب" بھی نکالی ہے[ع]۔

والد بزرگوار اپنے بڑھاپے، کمزوری اور اخیری زمانہ میں میری دل جوئی کی جانب زیادہ متوجہ تھے۔ جوانی ختم ہو جانے اور دانتوں کے گر جانے کی وجہ سے وہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں میری عمر تقریباً چار سال کی تھی۔ میں آپ کی بیماری میں ان کے غم اور تکلیف کو دور کرنے میں مشغول رہتا۔ آپ رات دن شفقت و عنایت فرمایا کرتے۔ انہیں دنوں جبکہ میں بچہ تھا، صوفیوں کے اقوال سناتے اور میری باطنی تربیت کرتے۔ اور میں بھی فطری طور پر ان باتوں کے سننے کا متوالا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو کر بالکل از خود رفتہ ہو جاتے۔

میرے والد شیخ سیف الدین کو فقر و فنا اور توحید و تجرید کا کافی حصہ ملا تھا۔ وہ تکلف و تصنع سے بالکل پاک تھے۔ نگاہ میں ایسا اثر تھا کہ جس پر توجہ کی خالی نہ گئی۔ اور اس کو حسب استعداد فائدہ پہنچا۔ وہ وحدت وجود پر اعتقاد رکھنے والے صوفیہ میں تھے۔ ابن عربی قدس سرہ کے تابعان میں تھے۔ اس طبقہ کے علم میں اونچا مرتبہ اور بلند درجہ رکھتے تھے۔ مسئلہ وجود پر بڑی شافی تقریر کرتے تھے اور اسرار توحید کو کھلم کھلا بیان کرتے تھے۔

زمانہ طفل میں انہوں نے مجھے حضرت صوفیہ کے اقوال بتائے اور شفقت ظاہری کے ساتھ باطنی تربیت کا برابر خیال رکھا۔ میں بھی بہ تقاضائے فطرت ان اقوال کا دلدادہ تھا۔ جب وہ ذرا خاموش ہوتے میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتا اور وہ اقوال اسرار کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کی استعداد رکھتا۔ ان میں سے بعض باتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک حافظے میں موجود ہیں۔ یہ امر بہت غیر معمولی ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ چھٹنے کا زمانہ جبکہ عمر دو ڈھائی سال کی ہوگی ایسا یاد ہے، جیسے کہ کل کی بات۔ اسی زمانہ میں جب کہ والد کی تربیت و عنایت کا فیض جاری تھا، میں تحصیل علم کر چکا تھا اور ان کی خدمت میں علمی بحث و تکرار میں مصروف رہتا تھا۔ اسی شغل میں راتیں گزر جاتی تھیں۔ والد ماجد فقیر کو خصوصاً تلقین توحید اور تحقیق مسئلہ وحدت وجود میں شرف مکالمت عطا کرتے اور خوش ہوتے تھے۔

میرے والد نے سب سے پہلے قرآن مجید بے سابقہ تعلیم قواعد ہجی کے (جس طرح لڑکوں کو عموماً پڑھایا جاتا ہے) دو تین جزو بلکہ اس سے کم تعلیم فرمائے تھے۔ وہ سبق لکھتے تھے میں پڑھتا تھا۔ قرآن کی یہی مقدار میں نے اُن سے سبقاً پڑھی ہے۔ اس کے بعد ان کی تربیت و شفقت کے اثر سے ایسی قوت بہم پہنچی کہ ہر روز تھوڑا سا قرآن پڑھنے لگا۔ اور جتنا پڑھتا تھا اُن کو سنا دیتا تھا۔ غرض دو تین مہینے میں قرآن شریف ختم کر لیا — اور تھوڑی ہی مدت میں اگر ایک مہینہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا، کتابت اور انشاء کا سلیقہ پیدا ہو گیا۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے وہ اُن (والد ماجد) کی توجہ اور عنایت کا اثر ہے۔ اور نظم کی اُن کتابوں میں سے جو اس ملک میں مروج ہیں، شاید گلستاں بوستاں کے چند جزو اور دیوان حافظ (والد ماجد نے) پڑھایا ہو۔ اور لڑکپن ہی سے قرآن پاک ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح و کافیہ تک خود تعلیم دی۔ اور پڑھاتے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انشاء اللہ تو جلد ہی عالم بن جائے گا۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے، جس وقت یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کمال تک پہنچا دے کہ جو میں نے خیال کیا ہے۔"

[ع] آپ شیخ امان پانی پتی (متوفی ۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء) کے مرید تھے اور سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی فرماتے تھے (اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہیں) کہ ہر ایک علم میں سے مختصر پڑھ لوگے تو تم کو کافی ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد برکت اور سعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تمہیں سارے علوم بے تکلف حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد پاک نے یہ اثر کیا کہ تحصیل علوم میں مجھ کو ایسی سرعت حاصل ہوئی کہ جس کو طی زمان اور طی مکان کہتے ہیں۔ ہر علم حاصل ہو گیا۔ یعنی مختصرات کو مثل کافیہ و لب و ارشاد وغیرہ شاید ایک جزو بلکہ زیادہ یاد کرتا تھا اور تمام تحصیل علم کے لیے اس قدر بے چینی تھی کہ اگر کوئی جزو ان مختصرات کا صحیح اور محشی مل جاتا تھا تو اس کو خود مطالعہ کر لیتا۔ حاجت استاد سے پڑھنے یا دریافت کرنے کی نہ ہوتی۔ اگر بحث آسان ہوتی یا مضمون سے پہلے واقفیت ہوتی تو میرا فکر اس کو قبول نہ کرتا۔ خدا جانے کہ ان دنوں میں کیا سمجھتا تھا اور کیا دیکھتا تھا۔ لیکن ہر کتاب کے متن اور حاشیے اور ان کے الفاظ سے پورا فائدہ حاصل کرتا تھا اور جو کتاب میرے ہاتھ آتی یا جزو کسی کتاب کا ملتا، خواہ میرے پڑھے ہوئے ہوتے یا نہ ہوتے اُس کو اوّل سے آخر تک دیکھنا اپنے اوپر واجب کر لیتا تھا، اور میں اس امر کا مقید نہ تھا کہ شروع یا خاتمہ کتاب ملے تو دیکھوں۔ میری نظر تحصیل علم پر تھی۔ خواہ کسی طرح پر ہو۔

ایک مرتبہ جبکہ میں کافیہ وغیرہ پڑھا کرتا تھا میرے ساتھی اس بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ حصول علم کے بعد کیا کرو گے اور اس کی تحصیل سے ان کا مقصد کیا ہے۔ بعض نے بناوٹ کے طور پر کہا ہمارا مطلب تو معرفت الٰہی ہے۔ بعض نے سادگی کے ساتھ صاف صاف کہا ہمارا مطلب تو دنیا طلبی ہے پھر مجھ سے پوچھا بتاؤ تم کیا کرو گے؟ میں نے کہا میں بالکل نہیں جانتا کہ تحصیل علم سے معرفت الٰہی حاصل ہو یا اسباب ہو۔ بالفعل مجھے یہ شوق ہے کہ معلوم کروں کہ اتنے عقلاء اور علماء جو گزرے ہیں کیا کہتے ہیں اور کشف حقیقت معلومات میں کس قدر موتی پروئے ہیں۔ اور اس کے حاصل کرنے کے بعد کیا حالت ہوگی یعنی حظ نفس کی طرف گئے یا محبت مولیٰ یا تحصیل دنیا یا طلب عقبیٰ کی طرف۔

بچپن سے میرا یہ حال ہے کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ کھیل کود کیا ہے۔ خواب مصاحبت، آرام اور آسائش کے کیا معنی ہیں۔ نہیں جانتا کہ سیر کیسی ہوتی ہے ؎

شب خواب چہ و سکوں کدامست   خود خواب بعاشقاں حرام است!

تحصیل علم میں مشغولیت کی بنا پر کھانا کبھی بروقت نہیں کھایا اور نیند بھر کر نہیں سویا۔ میں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں ہر روز بازار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا جو ہمارے مکانوں سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر گھر ٹھہر کر چند لقمے ضرورتاً کھا لیتا۔ میرے والدین ہر چند کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا آخر کھیلنے سے مقصد دل کا خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبیعت اسی سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے کبھی مطالعہ کے دوران میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ میرے والد نے مجھ سے فرمایا کہ بابا! کیا کرتے ہو۔ میں سُنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ واقع نہ ہو اور کہتا کہ میں سوتا ہوں۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔؟ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اُٹھ بیٹھتا اور مشغول ہو جاتا۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود مطالعہ کرنے اور بحث و تکرار میں ہر وقت منہمک رہنے کے، جو کتابیں پڑھتا تھا بلکہ ان کے علاوہ شروح و حواشی بھی جو نظر سے گزرتے تھے، ان کے لیے بھی لکھنے کی مشق کو ضروریاتِ وقت سے شمار کرتا تھا۔ رات کا زیادہ حصہ اور تھوڑا حصہ دن کا مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اور تھوڑا حصہ رات کا اور زیادہ حصہ دن کا لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی اور میں نے ایک سال اور کچھ دنوں میں اس نعمت کو حاصل کر لیا۔ اگر اس قدر ذوق و شوق کا اظہار ریاضت اور طلب مولیٰ میں ہوتا تو میں

کیا کیا حاصل کر لیتا۔

پروردگارِ عالم نے جن کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس نے مجھ غریب کو اپنے ذوق و شوق کی اس حالت سے مخصوص اور مالا مال کیا ہے کہ میرا دل اور میرا تمام وقت صرف اس کے حضور میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کے میل جول وغیرہ سے الگ ہوں۔ میں اپنے خیال میں مگن ہوں اگرچہ وہ رازہائے سربستہ کا سر ہی ہو یا مالیخولیا، لیکن یہ قطع میرے حالات کا آئینہ دار ہے ؎

حقی کجا و صحبت کس کز خیالِ دوست   دارم بخود چو مردم دیوانہ عالمے

والد ماجد کی وصیت کہ ملّا تے خشک و ناہموار نباشی" کے مطابق میں بچپن ہی سے ہمیشہ عشق و محبت کا دم بھرتا ہوں اور غم خواری و دردمندی کی راہ پر گامزن ہوں ؎

بے درد نہ ایم ہرگز از عشق   دارم دلِ دردناک دارم

گزشتہ زمانے میں ایک عرصہ تک عقل کی مزاحمت کی وجہ سے توحید کی صورت نظر نہ آئی اور نقشِ مقصود بحالتِ درستی و صفائی حاصل نہ ہو سکا۔ حالاں کہ طلب گارانِ حقیقت کے لیے شرطِ اولین یہی ہے کہ توحیدِ الٰہی ان کو حاصل ہو جائے۔ آخر کار جب مخلوق کے مشوروں سے مقصود برآری نہ ہوئی اور عقل کی تدبیروں سے گتھی نہ سلجھی تو اللہ تعالیٰ سے طلبِ خیر کے اور دیوانگی اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا ؎

زیں خرد بیگانہ می باید شدن   دست در دیوانگی باید زدن

غرض کہ راحت و آرام کے حصول اور خطرات و وساوس کے زوال کے بعد . . . . . میں تمام کاموں سے ہاتھ دھو اور اغیار سے آنکھیں بند کر کے دردِ دل پر اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اب کیا ہوتا ہے اور کون سا راستہ کھلتا ہے۔ چنانچہ بے بسوں کے چارہ گر اور پریشان لوگوں کے راہنما نے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور اس بے خانماں کی گردن میں زنجیرِ شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا، اور مجھ نامراد کو منزلِ مراد پر پہنچا دیا۔ یعنی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مجھے جگہ دی۔ سنہ ۹۹۶ھ میں (سفرِ حج کا) جذبہ پیدا ہو گیا، اور دل پر وحشت طاری ہو گئی۔ دیوانگی کی حالت میں سفر کا ارادہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔

مجھ فقیر حقیر کو حضرت بشیر و نذیر کے انعامات و اکرامات سے جو کچھ بشارت ملی ہے، وہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ اور یقین ہے کہ یہ آثار و انوار نیک لوگوں کے لیے ان شاء اللہ ضامن و کفیل ہوں گے۔

مجھے بار بار بشارتِ غیبی سے اشارہ ہوا کہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ" اور اس فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے جس وسیلہ و نسبت کی ضرورت ہے، وہ سلسلہ ارادت ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی سے باطنی طور پر دینی نسبت قائم کروں اور قرابتِ جسمانی کو رشتۂ روحانی سے منسلک کروں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی پوری زندگی اس کے قدموں میں گزار دوں۔ بالآخر میرے صدقِ نیت نے کام کیا اور میرا درختِ مراد بار آور ہوا۔ ویرزقہ من حیث لا یحتسب" کے مثال اللہ نے میرے لیے ایک عیسیٰ نفس کو بھیجا، جن کا ہر سانس آسمانِ معرفت سے نازل ہونے والا خوانِ نعمت تھا اور اگلے پچھلوں کے لیے عید و سرور۔ موسیٰ مقام جن کا کمال شجرِ وحدت کی آگ اور حقیقت کا نور ہے زین العابدین و امام العارفین سید التقی و العلوی العلی المہدی یعنی کلیم اللہ و محبوب حبیب اللہ۔

[illegible] یعنی حضرت سید موسیٰ پاک شہید گیلانی ملتان (متوفی [illegible]) بن حضرت سید حامد معروف بہ حامد گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (متوفی [illegible])

غرض کہ جب یہ آفتاب دین و دولت طلوع ہوا تو میں نے یقین کر لیا کہ یہ میرے ہی مقدر میں ہے۔ اور جوں ہی ان کے جمال جہاں نما سے آنکھیں روشن ہوئیں تو دل میں کچھ اور ہی نور و سرور جلوہ گر ہوا۔ پہلی ملاقات میں دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

مدتے بود کو مشتاق لقایت بودم لاجرم رُوئے تو را دیدم و از جا رفتم

چنانچہ بے اختیار ہو کر بغیر کسی توقف کے میں نے ان کی بیعت کر لی اور ان کی خدمت کرنے لگا۔ اور یہ واقعہ [illegible] کا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

حقا بیان شوق بپایاں نمی رسد کوتاہ ساز قصۂ دور و دراز را

(ماخوذ از اخبار الاخیار و حیات شیخ عبدالحق از خلیق احمد نظامی)

حضرت شیخ محدثؒ محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک دہلی میں ہے۔ حضرت موصوف علیہ الرحمتہ کی تصانیف ساٹھ سے زائد ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔ مدارج النبوۃ۔ اخبار الاخیار۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب۔ اخبار الاخیار فی احوال الابرار۔ اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ۔ شرح فتوح الغیب وغیرہ۔ آپ بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے، حقی تخلص تھا۔

(مرتبہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری)

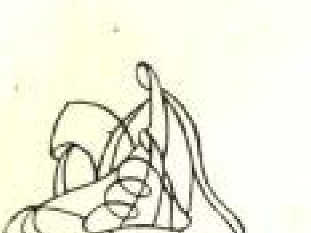

میر حسن دہلوی

(۱)

پوشیدہ نہ رہے کہ میری اصل ہرات سے ہے۔ میرے والد غلام حسین ولد میر عزیز اللہ ولد میر امامی تھے۔

میر امامی
|
خواجہ عزیز اللہ
|
میر غلام حسین المعروف میر ضاحک
|
میر حسن

میر امامی نور اللہ مرقدہٗ ہفت قلم اور فاضل متبحر تھے۔ بہ سبب فضیلت شاہجہان آباد میں تشریف لا کر اپنے زمانہ کے لوگوں میں بڑا مرتبہ پایا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز کا تعلق شاعری سے خاندانی ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف میلان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قوت کے موافق اس فن میں استعداد قبولیت عطا فرمائی۔ اصلاح سخن میں نے میر ضیا سے لی۔ لیکن ان کی طرز گوئی کا حق نباہ نہ سکا اور دیگر بزرگوں مثلاً خواجہ میر درد۔ مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر اختیار کی۔ شروع جوانی میں گردش روزگار ناہنجار کے باعث کہ ہرگز کسی سے وفا نہیں کرتا ہے۔ لکھنؤ اور فیض آباد پہنچا۔ بارے نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ کی قدردانی سے معاش کا تھوڑا سا سہارا ہو گیا اور ان کے خلف الرشید مرزا نوازش علی خاں بہادر کی صحبت اختیار کی چنانچہ اب تک کسی نہ کسی طرح گزر کرتا ہوں۔ اکثر نواب معلی القاب کی فرمائش سے مرثیہ امام علیہ السلام بھی کہتا ہوں۔ ان کی طبیعت مختلف فنون میں بہت رسا ہے۔ خصوصاً علم موسیقی میں تو ایسی مہارت ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ مرثیہ اور سوز کہتے ہیں کہ یہ سامان آخرت کے لیے ہے اور اس کا اجر اللہ کی طرف سے ہے اور سالار جنگ بہادر بھی اسی طرح ذہن رسا اور گوش شنوا رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مع دولت و امارت اور فرزند کے جب تک دنیا قائم ہے زندہ اور سلامت رکھے۔ فقیر نے اس مدت میں قریب سات آٹھ ہزار شعر کہے۔ ایک ترکیب بند اور ایک مثنوی رموز العارفین کہی ہے۔ جسے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور وہ مشہور ہے۔

(۲)

مولانا میر غلام حسین ضاحک ابن میر عزیز اللہ اس فقیر کے والد ہیں۔ سید عالی شان بہر مکان۔ عالم و فاضل و ناشر۔ بغایت فہیم بذل و سخا۔ مزاح پسند، بذلہ گو، نکتہ سنج، درویش مزاج، متوکل۔ تیس سال سے ترک روزگار کر کے کمال بے پروائی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ علم موسیقی میں گوش شنوا اور شاعری میں فکر رسا رکھتے ہیں۔ باوجود علم کی اس قدرت کے جس کا اظہار مولوی ساجد کی ہجو میں کیا ہے۔ چونکہ سامعین کی طبیعت کو اپنے سخن بلند کے قابل نہ پایا۔ ان کے حوصلے کے بقدر توسن قلم ہزل کے میدان میں دوڑایا۔ لیکن زبان عجیب و غریب اختیار کی کہ آدم سے ایں دم کسی نے استعمال نہ کی ہوگی۔ چنانچہ ایک مطلع کہتا ہے۔ ـــ یا ایہا الفلاکم کر دھسلا تکہ   کل تو بیچی بر آئینہ فرو بکا سرہ

ان کی غزل چالیس پچاس بیت سے کم نہیں ہوتی۔ اور ہر غزل صد ہزل پہ تھوڑی سی نثر بھی ضرور لکھتے ہیں۔ چونکہ اس دفتر میں گنجائش نہ تھی۔ اس لئے ہزلیات سے قطع نظر صرف غزل پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ اس فن میں ان کی صلاحیت ظاہر ہو سکے

وہ چپ اگر روز ازل آہ نہ ہوتا   قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیکھئے اصلاح خلائق کو تو لیکن   کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا
اس آن مجھے آنسو حسن آن کر جی ڈوبا   تب جان سے اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۲
(لکھنؤ کا دبستان شاعری)

بیانِ حالِ دلِ زار و آوارہ شُدن از دیار بہ دیار

ہوا[1] آوردہ ہندستان جب سے   قضا پورب میں لائی مجھکو تب سے
لگا تھا ایک بُت سے واں مرا دل   ہوئی اس کی جُدائی سخت مشکل
مری آنکھوں میں وہ صورت کھڑی ہے   خیال میں وہ چھبی سی جڑی ہے
چلا گاڑی میں ہوں آیا میں ناچار   قفس میں جس طرح صید گرفتار
جب اس کی بات آجاتی ہے کچھ یاد   جرس کی طرح میں کرتا ہوں فریاد
بہانہ رکھ جُدائی کا وطن کی   میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی
مثالِ شمع جی دیتا تھا کھپ کھپ   گرے پڑتے تھے آنسو میرے ٹپ ٹپ
رہا میں ڈیگ میں آکر کئی ماہ   چلا واں سے رضائے حق کے ہمراہ

روانہ شدن ہمراہ چھڑی مدار و قدم برداشتن از ملک بیدار

کمن پور کو چھڑی[2] جاتی تھی واں سے   اُٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
یہ مشفق میر سیف اللہ جو ہیں   اور اُن کے بھائی نوراللہ جو ہیں
یہ دونوں اس سفر کے آشنا ہیں   اگرچہ ان دنوں مجھ سے جُدا ہیں
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر   چلے ہم واں سے چھڑیوں ساتھ مل کر

---

[1] مثنوی گلزار ارم میں میر حسن دہلوی نے اپنے کچھ حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالباری آسی الحق اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:
"یہ مصنف کے دورِ زندگی کی ایک اہم اور دلچسپ تاریخ ہے یا یوں کہئے کہ تسلسلِ واقعات کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اُس سفر کا حال لکھا ہے جو دہلی سے لکھنؤ تک پہنچنے کے لیے کیا تھا۔" (مثنویات میر حسن طبع نولکشور صفحہ ۱)

[2] وہ جھنڈی جو سجا کر کسی بزرگ کے نام پر بناتی اور پھر مزار پر چڑھائی جاتی ہے۔

زمیں میوات کا اکثر تھا عالم
عجائب مہوشاں تھیں اس میں باہم

تقریرِ جلوہ ہائے معشوقانِ مردمانِ چھڑی و تحریرِ عشوہ ہائے محبوبانِ رشکِ حور و پری

کوئی پردے سے تھی چہرہ دکھاتی
کوئی آواز کچھ گا کر سناتی
کوئی چھپتی اتر انگنیوں سے
کوئی بیٹھی ہی جی جی دلوں سے
کنوئیں پر یوں نظر آتا ہر اک ماہ
کہ جوں یوسف کھڑا ہو بر سرِ چاہ
کوئی شربت کوئی ساغر بناتا
کسی کو کوئی حقہ ہی پلاتا
وہیں میں عشق سے بے برگ و نوا تھا
مجھے تریاق اور حقے سے کیا تھا
پریزادوں میں تھے باہم اشارات
ہر اک چوکی وہاں تختِ طلسمات
پہنچے آکے جب منزل سرِ شام
اتر پڑتا ہر اک واں بہرِ آرام

دربیانِ حرکات و سکنات فقیرانِ ملنگانہ و شرح و بسطِ نکات حاجتمندانِ معتقدانہ

وہ ٹیلی واں کھڑی کرتی تھیں چھڑیاں
وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی تھیں گھڑیاں
زیادہ حاجتی مائل تھے سب سے
رسوم اس کی بجا لاتے ادب سے
ملنگوں کو جو دیکھا تو عجب حال
کھڑے بجتے ہیں اور کھیلیں ہیں دھمال
چڑھاتا ریوڑی کوئی کوئی پھول
ملیدا ہی کوئی لاتا ہے معمول
ہجومِ ماہرویاں اس قدر تھا
کہ ہم کو دل کے پس جانے کا ڈر تھا
زمیں تھی حسن کی کثرت سے گوری
مثالِ موم تھا دل صرفِ نرمی
مثالِ بید مجنوں ہر چھڑی تھی
کہ اس کے گرد ہر لیلا کھڑی تھی
وہ چھڑیاں تھیں کہ تھیں مژگانِ دلدار
دیا تھا پیر کے نیزے نمودار
بلندی میں ہر اک ایسی چھڑی تھی
کٹوری ماہ کی جس پر پڑی تھی
سیاہی یوں بھلی لگتی تھی سب کی
کہ گویا زلف تھی بکھری وہ شب کی
پری رو گرد یوں چھڑیوں کے پھرتے
پتنگے شمع پر جیسے ہوں گرتے
میں اپنے دل کی کرتا تھا زیارت
مجھے منظور واں کی تھی بشارت

مرادوں کا وہی اک آسرا تھا
خدا ہی کے میں دروازے پڑا تھا

گرفتار شدن آشنا و افزودن بلا بر بلا

قضا را اُن میں اک رشکِ پری تھی   کہ مدھ میں اپنے جوبن کے بھری تھی
ہوا اس کو بھی رنجِ عشق منظور   قضا نے ایک جا رکھے دو رنجور
ہم آپس میں غم اپنا کہتے سنتے   مثالِ شمع رہتے سر کو دھنتے
جب آئے منزلِ مقصود پہ ہم   ہوا اس آشنا کو اور بھی غم
کہ اب روزِ سیہ در پیش آیا   قضا نے یاں سے اس مہ کو چھڑایا
لکھن پور میں رہے ہم رات کی رات   اسی کی زلف کی کرتے رہے بات
سحر ہوویں گے اس گنگا سے ہم پار   یُوں ہی رہ جائے گا دل اپنا جی مار

طلوعِ صبحِ قیامت و دُور افتادن ازاں سرو قامت و غرق شدن بہ دریائے ملامت و ہم خوابہ شدن بدردِ ملامت

مثالِ غنچہ جب دم کا تھا دھڑکا   ہوا صبحِ قیامت کا وہ تڑکا
فلک نے کیا قیامت یہ اُٹھائی   پڑی بیچ وصل آپس میں جُدائی
چلا جب قافلہ پورب کا واں سے   جُدا ہونے لگے ہم کارواں سے
ہوا احوال جو اس دن ہمارا   لکھا جاتا نہیں احوال سارا
یہ افسانہ اگرچہ سرسری ہے   وے اس وقت کی لذت بھری ہے
اگرچہ اب تو وہ صحبت کہاں ہے   نہیں گو زخم پر اس کا نشاں ہے
کرے ہے ذکر دلی کا کوئی جب   مری آنکھوں سے ٹپکے ہے لہو تب

رسیدن بہ بجن و واضح شدن معنی

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں   نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا   لگا اس جا پہ ہرگز جی نہ میرا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی   گہے پستی ہے گاہے ہے بلندی
مثالِ فرد جو اینٹ اس کی ہے لال   لکھا ہے اس میں دقیانوس کا حال
لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال   کمیتِ خامہ چل سکتا نہیں چال
زمیں کو دے ہے یہ شہر ہم عدو ہے   اگر خیمہ کہیں نیک اس کو بد ہے

سوائے تودۂ خاک اور پانی　　یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

دل برداشتن این آزاد از قیدِ شہر بیداد و رفتن بہ گلگشت فیض آباد

زبس تنگی سے یاں کی ہوا تنگ　　مری چھاتی پہ ہر ٹیلا ہوا سنگ
یہ دیکھی میں نے جب کیفیتِ شہر　　مجھے اک روز جی میں آئی یوں لہر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر　　چلا میں واں سے دل اپنا اٹھا کر
عجب معمورۂ آباد پایا　　مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا
وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا　　ارم جس کے حسد سے داغ دیکھا
جو کوئی شام کو واں چوک جاوے　　شبِ راحت کا دن کو حظ اٹھاوے
سرِ بازار واں تربولیا ہے　　کہ جوں دروازۂ جنت کھلا ہے
ادھر کو جوہری ادھر کو بزاز　　ادھر صراف اور اودھر طلاساز
تختی ہیں بھرے دکاں کے لعل با لعل　　اُگلتے ہیں زباں سے جوہری لعل
کناری اور گوٹے واں مسلسل　　مثالِ برق کرتے ہیں جھلاجھل
صدا کرتا ہے کوئی ہاتھ اُٹھا کے　　معطر پھول ہیں جی موتیا کے
کوئی مصری کے گنڈے کہہ پکارے　　کوئی کہتا ہے پیٹھے ہیں کہ تارے
یہ فرنی اور فالودے کا عالم　　کہے تُو چاند اور تارے ہیں باہم
چنے والا لگا کہنے یہ ہنس کے　　کرارے بھربھرے گھیو کے ہیں بھنے
صدائیں ریوڑی والوں کی واں ہیں　　کڑاکڑ بولتی غلابیاں ہیں
پھریں کھترانیاں سنتوں کے ہمراہ　　کہیں ہندو بچے پھرتے پھریں آہ
رزلے طوطیاں سے ہاتھ اپنے　　جدھر پھرتے ہیں لے کر ساتھ اپنے
ضلع بولے ہے کوئی - کوئی پھکڑ　　کہیں ٹھٹھا کہیں ہے دھول تھپڑ
بہشت آں جا کہ آزارے نباشد　　کسے را با کسے کارے نباشد

دربیانِ آراستگیِ معشوقانِ گل اندام بہ تراش وخراش تازہ وزیب وزینت زیور لباسِ محبوبانِ خودکام

بہ ادائے دلربایانہ بے اندازہ

زر و زیور میں یوں آراستہ سب　　کٹے شمشاد جن کی دیکھ کر چھب

کوئی پہنے کناری اور مسلسل　　جامۂ شبنم و کم خواب و مخمل
وہ رنگا رنگ ہر لاہی کی پشواز　　کناری کے وہ بند ان کے بے انداز
وہ املاسی کرتے پاؤں میں موٹے　　کہ جن کے ہاتھ دل عاشق کا لوٹے
وہ پٹہ اوڑھنا اس کا الٹ کر　　کھسل پڑنا پھر اس کا واں الٹ کر
وہ کنگھی اور وہ چوٹی بوریا باف　　وہ انگیا اور تمامی کی وہ سنجاف
وہ مہندیوں کے پہنچے ان میں پرکار　　چمک سے جن کی شرمندہ ہو گلزار
دھڑی مسی کی اور پانوں کی بیڑی　　کہ جوں ابر سیہ میں لال ٹیری
بنت انگیا میں سرخ و سبز دے کر　　کرے ہے خون دل عاشق کا لے کر
وہ بیکل جس کے دیکھے دل کو ہے کل　　وہ چھلے جس کے اندازہ میں چھل بل
وہ پاجامے کا ایڑی تک ڈھلکنا　　مغرق کفش کا پہنچے چمکنا
بنارس کا وہ دوپٹہ ڈال کاندھے　　پھرے جوڑے کو اور گاتی کو باندھے
وہ توڑے ہاتھ میں تاروں کے باریک　　کہ بن دیکھے جہاں ہو جس کے تاریک
نمایاں وہ وہ یوں زلفوں میں گھر کر　　کہ نکلے چاند جوں بدلی سے چر کر

طریق گلگشت لال باغ و گلزار و دل بُردن نظارگیاں داغدار بنوے کہ شاہدان چمن چوں عندلیب نالاں و گلعذاران گلشن چوں گل خنداں

غرض جو ماہرو یا گلبدن ہے　　ہر اک مصروف گل گشت چمن ہے
جو دیکھا تو کوئی اوڑھے دوشالا　　بناتی ہے کوئی چمپا کی مالا
رکھے ہے کان پر کوئی گلوں کو　　شکستہ دل کرے ہے بلبلوں کو
کوئی لالے کی پتی توڑتی ہے　　کھڑی کوئی پٹاخا چھوڑتی ہے
کھڑی ہے کوئی منہ کو پھیر اکڑے　　کوئی ہے سوچ میں ٹہنی کو پکڑے
کسی گل پاس چھوٹی سی کلی ہے　　کسی کے ہاتھ کوری گڑگڑی ہے
کسی کو دیکھ کوئی دے ہے تالی　　کسی کے رنگ پر آتی ہے لالی

عجائب باغ اور طرفہ جگہ ہے
کہ عشاقوں کی گویا وعدہ گہ ہے

دریا و سیر رمنہ و میلہ اہلِ ہند و مسلمین و تاسف خوردن بحسرت از جدائی آں سرزمین

وہ سیر رمنہ اپنے حسب دلخواہ   وہ نوحؑ اور شیثؑ پیغمبر کی درگاہ
وہ پنجشنبہ کا درگاہوں میں جانا   ہزاروں واں پریزادوں کا آنا
کہیں گپتار میں جانا گپت ہو   بہانا عشق کے دریا میں دل ہو
وہ سورج کنڈ کے میلے میں چلنا   ہر اک خورشید رو کے غم میں جلنا

در ترانہ سازیِ مجلس سرور و مشفق مہربان میاں اسراری سلمہ اللہ تعالیٰ و نغمہ پردازیِ محفل زمزمہ آموز بکمال سلیقہ شعاری

میاں اسرار کے بنگلے کا عالم   نہ تھا بنگلے سے فیض آباد کے کم
اُنھوں نے جس کو تھا اک عشرہ مارا   وہاں ہوتا تھا پریوں کا گزارا
کہوں کیا ان کی تعویذوں کا اسرار   سراپا ہیں وہ اک خوبی کا طومار
کہاں ایسا کسی نے دوست پایا   رہے سب دوستوں پر ان کا سایا
اُنھوں کے پاس سب جمعے کو آکر   عطائی جی کو خوش کرتے تھے گا کر
اُنھوں کی چوپ کرسیں تھے آتے   کچھ ان سے سنتے اور اپنا سناتے
طنبورے سے کے مرزائی و مرزا   سبھی گنگتے تھے گانے بے محابا
طنبوروں کی وہ تانوں کا گرجنا   پکھاوج کا اور اُن کے ساتھ بجنا
عطائی بھی ہر اک لیتا تھا وہ تان   کہ جس سے بُو علی سینا ہو حیران
اسی سے نقش کا ان کے ہے شہرا   کہ ان کو یاد ہے تیغہ زہرا
عجب ساون میں گڑیوں کا مزا ہے   ہنڈولہ جس طرف دیکھو گڑا ہے
کہا جاتا نہیں کچھ واہ بس واہ   عجائب شہر ہے اللہ اللہ
یہ فیض آبادیاں اُس نے بنایا   بہشت اس کی عوض دیجو خُدایا
جہاں جس سے ہوا آباد و معمور   شجاع الدولہ مرحوم و مغفور
یہ دیکھی سیر میں نے واں کی جس دم   وطن کا دل سے سب جاتا رہا غم
رہا القصہ میں واں گھر بنا کر   اُسی عشرت کدے کے پاس جا کر
وہاں بھی میں اک محبوب پایا   نہایت دل کو وہ مرغوب پایا

نئی طرزوں سے میرے دل کو پھیرا   بھلایا عشق قدیمی اُس نے میرا
غرض دل دے کے اپنا ہاتھ اُس کے   رہا آرام سے میں ساتھ اُس کے
نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جُدائی   قضا پھر لکھنؤ میں مجھکو لائی
بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا   مجھے جنت سے جُوں آدم نکالا

خاتمہ در اجتماعِ یارانِ قدیم و راندارانِ صحیح دراں مقامِ عالی مقام و استدعائے قیامِ آں مقام علی الدوام

دُعا میری یہی ہے اب شب و روز   کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز
وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار   وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھروں میں پیچھے کرتا جہاں میں   غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رہیں میری غزل خوانی میں شامل
رجب بیگ اور حبیب اللہ و فاضل

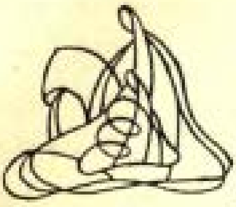

روسو

جب حشر کے دن پرسش کا بازار گرم ہوگا، تو میں قادر مطلق کے سامنے جرأت کے ساتھ یہ کتاب پیش کرتے ہوئے کہوں گا "یہ ہے میرے افکار و اعمال کا نقش۔ میں نے اپنی ہر اچھائی اور برائی اس میں پوری صفائی سے بیان کر دی ہے۔ میں نے خود اپنے بھیدوں کو جنہیں اے خدائے علیم تو خوب جانتا تھا، ظاہر و آشکار کر دیا ہے۔"

میں نے جنیوا میں ۱۷۱۲ء میں اس عالم وجود میں قدم رکھا۔ میرے پیدا ہونے میں میری والدہ کو جان کی قربانی دینی پڑی اس طرح میری پیدائش ہی سے میری بدنصیبیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میری پرورش پھوپھی کی مہربان گود میں ہوئی۔ میں نے پانچ چھ سال کی عمر ہی میں بہادرانہ قصوں سے اپنی تعلیم کا خود ہی آغاز کیا۔ گو بچپن ہی سے میرے جذبات ایک خطرناک ڈگر پر آنے لگے تھے۔ پلوٹارک اور ناآنی جیسے نامور لوگوں کی کتابوں کے مطالعہ نے مجھ میں شروع ہی سے ایک آزاد اور جمہور پسند رجحان پیدا کر دیا۔ اس کم عمری میں دروغ گوئی اور بسیار خوری کی کمزوریوں میں تو مبتلا رہا لیکن کسی کمزور کو ایذا پہنچانے یا بہتان تراشنے میں مجھے کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ میرے سامنے اپنے اسلاف کے بلند کردار کی مثالیں موجود تھیں۔ چند سال بعد ہم لوگ جنیوا چھوڑ کر بوسے میں رہنے لگے۔ یہاں کے ماحول نے مجھ میں انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کی خوبیاں پیدا کیں۔ پھر میں کچھ دن مس لمبرکیسی کی زیر نگرانی رہا جس نے بہت سلیقہ اور ہمدردی سے میری پرورش کی اور مجھ میں کچھ ایسے اخلاقی اطوار پیدا کیے جن سے میں جوانی میں کام لے کر جذبات کی اس ہنگامہ خیز رو سے محفوظ رہا ہوں جس میں اکثر نوجوان بہہ جاتے ہیں۔ یہ اس صحبت کا اثر ہے کہ میرے احساسات اور عنفوان شباب کا رومان پرور مزاج ہمیشہ حیوانی جذبات سے پاک رہا سوائے ایک موقع کے جو میرے بچپن ہی میں پیش آیا۔

میری زندگی بھی کچھ عجیب متضاد خوبیوں کی حامل ہے۔ ایک دن میں مس لمبرکیسی کے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ جب یہ خاتون اپنے کمرہ میں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے کنگھے کے سارے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ آخر یہ کس کا قصور تھا؟ بظاہر تو صرف میں ہی اس کمرہ میں تھا۔ لیکن یہ میری خطا نہ تھی۔ لمبرکیسی نے ہر ممکن سزا دیکر مجھ سے یہ اقبال کروانا چاہا کہ خطا میری تھی۔ میں جان دیدیتا لیکن ناکردہ گناہ کو اپنے سر کیوں لیتا۔ آخر جبر و تشدد کو جھکنا پڑا اور میری فتح ہوئی۔ مجھے جسمانی تکلیف ضرور ہوئی لیکن اس سے زیادہ ملال اور دکھ یہ تھا کہ میرے ایک مشفق نے مجھ بے گناہ پر یہ ظلم توڑا۔ اب یہ بات میرے شعور میں داخل ہو گئی ہے کہ میں جب کبھی کسی مغرور اور ظالم آقا کی ناانصافی سنتا ہوں تو دل میں غصہ کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایک

خنجر اس ظالم کے جگر کے پار کر دوں۔ اس معمولی واقعے نے نہ صرف میری خوشی چھین لی بلکہ ایسا احساس بھی پیدا کیا کہ غلط کام کرنے سے شرم کم آتی اور بدنامی کا خوف زیادہ رہتا۔ ذرا سوچیے تو اس واقعے کے اثرات کہاں تک پہنچے!

میں اپنے چچا کی سرپرستی میں جینوا واپس آگیا۔ انہوں نے مجھے سنگتراشی سیکھنے کے لیے ایک استاد کے حوالے کر دیا۔ یہ استاد بڑا ظالم تھا۔ اس کی زیادتیوں ہی نے مجھ میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی لت پیدا کی۔ لیکن اس کے باوجود میری یہ خصلت رہی کہ میں نے چوری صرف کسی چیز کو حاصل کرنے کی خوشی کی خاطر کی، نہ کہ پیسے کے لگاؤ کی وجہ سے۔ میں خوشی اور محض خوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دولت کا اس حقیقی خوشی اور مسرت سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ دھن اس خوشی کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ مجھے ایسی چیز کے حصول کی خواہش رہی ہے جو صفت کے اعتبار سے اچھی ہو۔ دولت کے بدلے میں جو چیز ملے وہ یقیناً آلودہ ہوگی۔ میں آزادی کا پجاری ہوں اور کسی چیز کا احتیاج پسند نہیں کرتا۔ مجھے پیسے کی قدر صرف اس لیے ہے کہ اس کے سبب میری آزادی محفوظ ہے اور میں کسی کا محتاج نہیں لیکن دولت سے محبت کرنا غلامی ہے۔

سولہ سال کی عمر میں اپنے استاد کی ناانصافیوں سے تنگ آکر میں نے بے سروسامانی کے عالم میں فرار اختیار کیا اور دشت نوردی کرتا ہوا 'کنفینگ نان' پہنچا جہاں ایک مہربان پادری سے ملاقات ہوئی۔ اس مرد نیک نے مجھے دعوتِ دین دے کر 'اینے سی' میں مقیم مادام دی وارنیس نامی عورت کے پاس بھیجا۔ یہ ایک غمزدہ، نرم دل، خوب صورت عورت تھی۔ کردار کے اعتبار سے فرشتہ صفت۔ میں نے مادام کو اپنی ساری روداد سنائی اور ان کے مشورہ اور اہتمام سے میں "تیورن" روانہ کر دیا گیا۔ یہ سفر میری زندگی کا بہترین حصہ رہا۔ تیورن پہنچ کر مجھے رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنا تھا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب کشمکش تھی۔ مجھے یہ تبدیلیٔ مذہب فریب معلوم ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں اپنا مذہب فروخت کر رہا ہوں ایک موہوم مستقبل کی امید میں! اس نئے شہر میں تلاشِ معاش میں طواف کرتا مادام لیبل نامی ایک خوبصورت عورت سے ملا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ اس طرح بڑھا کہ میں ایک دن مادام کے گھر بیٹھا رومانی باتوں میں مصروف تھا کہ اس کا شوہر آ پہنچا۔ عجلت میں رخصت ہوتے ہوئے میں نے مادام کے ہاتھ پر دو گرم بوسے دیے جن کی لطافت آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بہرکیف، مجھے مادام دی ورسل نامی ایک متمول عورت کے یہاں بھی ملازمت مل گئی لیکن اتفاق کہ کچھ عرصہ بعد ہی اس خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران میں ایک یادگار واقعہ پیش آیا۔ میں نے اس عورت کے اثاثہ میں سے صرف ایک ربن چوری کیا لیکن جلد ہی یہ چوری ظاہر ہو گئی۔ جب مجھ سے بازپرس ہوئی تو میں نے میرین نامی لڑکی کے سر یہ الزام ڈال دیا۔ اس سے اس غریب کی بدنامی ہوئی اور ہم دونوں برطرف کر دیے گئے۔ آج میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب لکھ کر اپنے اس جرم کا اعتراف کروں۔ میں جانتا ہوں کہ مجرم میں تھا لیکن رسوائی اس بے گناہ کی ہوئی۔ میں وہ ربن میرین کو ہی پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اس ہنگامہ کی خاطر نہ کر سکا۔ میں نے اس موقع پر اس لڑکی کو اس لیے مجرم نہیں بتایا کہ مجھے سزا کا خوف تھا بلکہ دراصل ان سب لوگوں کے سامنے رسوائی سے کانپتا تھا۔ اس وقت یہ منظور تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور میں سما جاتا، لیکن وہ رسوائی ہرگز منظور نہیں تھی۔ آج بھی میں اپنی اس حرکت پر آنسو بہاتا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ایک گناہ کے ارتکاب نے میرے اندر رسوائی کا جو خوف پیدا کیا ہے اس کے سبب میں آئندہ زندگی میں ایسے تمام افعال سے دور رہا ہوں جو رسوائی

کا باعث بن سکتے ہوں۔

میں آخر ۱۷۲۹ء میں مادام دی وارنس کے پاس واپس پہنچ گیا۔ اب زندگی ایک نئے موڑ پر داخل ہوئی جہاں شاید قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے اسباب فراہم ہو سکتے تھے۔ مادام میرے ساتھ بہت مہربان رہیں۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایک ہمدرد ماں، ایک عزیز بہن اور ایک دلچسپ ساتھی کے روپ میں دیکھا۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں کہ میرے اور ان کے درمیان ایک پاکیزہ محبت تھی اور میں انہیں احتراماً ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ یہاں بہت آرام سے شب و روز گزرنے لگے۔ میں مطالعہ میں مصروف رہتا تھا مگر میرے افکار اور مشاہدات منتشر رہتے تھے۔ اسی سبب سے اکثر محفلوں میں بدھو سمجھا گیا ہوں۔ اسی زمانے میں فن موسیقی سے رغبت پیدا ہوئی۔ ماما کے ملاقاتی لی میتر کی صحبت میں اس فن سے واقفیت اور شوق کچھ اور بڑھ گیا۔

مجھے شائستہ اور جوان عورتوں سے دوستی کرنے کا ہمیشہ شوق رہا ہے۔ ایک دن صبح کو میں چہل قدمی میں مصروف تھا۔ اتفاقاً میڈماسل دی گریفنری اور گیلی ادھر سے گزریں۔ ان کی خواہش پر میں بھی پکنک کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ تمام دن رنگ رلیوں میں گزرا لیکن ہم لوگ کبھی بھی شائستگی کی حدود سے آگے نہیں گزرے۔ پاکدامنی کے ساتھ ملاقاتوں میں ایک قسم کا لازوال لطف ہوتا ہے۔ آپ کو میری طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہیئے کہ میں سرمستی کے ان لمحات سے بھی گزرا ہوں جہاں مستی اور لذت کی انتہا ہاتھ کا ایک بوسہ ہوتی ہے جبکہ تمہاری خوشی اور لذت کی ابتدا بوسے سے ہوتی ہے!

کچھ دنوں تک مختلف شہروں کی پیمائش کرتا۔ مختلف انداز میں اپنے مستقبل اور معاش کی ترکیبیں کرتا ہوا ۱۷۳۱ء میں پیرس پہنچا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ ماما ان دنوں پیرس سے کسی نامعلوم جگہ کوچ کر گئیں، میں نے بھی سفر اختیار کیا۔ اس دوران میں ایک دن ایک کسان کو میزبان بنایا۔ اس غریب کی حالت دیکھ کر مجھے ایسا احساس ہوا جیسے یہ شخص باوجود محنت کے پیٹ بھر روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ اس دن سے ہی میرے دل میں ان لوگوں سے ہمدردی اور ان کے ظالم جاگیرداروں کے لیے بے پناہ نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا چمبیری میں پھر ماما سے ملاقات ہوئی۔ یہاں ان کے توسل سے معاش کا سلسلہ بھی بنا اور میں پیمائش اراضی کے کام میں سیکرٹری کے عہدہ پر مامور ہوا۔ اس زمانے میں موسیقی سے شوق بہت بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فن میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر میں نے ملازمت چھوڑ دی۔ شاید موسیقی سے اتنی بڑھی ہوئی دلچسپی کی وجہ تھی کہ میں اکثر نوجوان عورتوں کے جھنڈ میں رہتا تھا۔ میری اس روش کو ماما نے پسند نہیں کیا۔ مجھے تنبیہ کی اور آٹھ دن کی مہلت اس بات پر غور کرنے کے لیے دی کہ میں اپنے مستقبل کو کس طرح سنواروں۔ یہ آٹھ دن میرے لیے آٹھ صدیوں کے برابر تھے۔ غور کیجیے میرے گرم و جوان خون کی حدت پر، اور عاشق مزاجی پر۔ لیکن واضح ہے کہ اس تمام ہنگامۂ عاشقی میں میں نے پاکدامنی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ مجھے ماما سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ وہ میرے لیے ایک ماں اور ایک ہمدرد دوست سے کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ رہنے میں خوشی اور مسرت تو محسوس کی لیکن اس میں جذباتیت کو کوئی دخل نہیں تھا۔ آخر میں نے ماما سے وعدہ کیا کہ اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لیے اُن کے مشورہ کی روشنی میں کام کروں گا اور اسے نباہنے کی کوشش کی۔ اپنے منصوبہ کے مطابق میں نے فن موسیقی کو منتخب کیا اور مختلف مواقع پر 'اوپیرا' اور 'کنسرٹ' میں رول ادا کرنے شروع کیے۔

کہا جاتا ہے کہ اکثر تلوار اپنے میان کو کاٹ دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ میرا حال ہے۔ میں اپنے احساسات کے سہارے زندہ ہوں اور ان احساسات کی شدت ہی نے مجھے مار ڈالا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے دل میں محبت کی آگ محسوس کی ہے۔ لیکن اس محبت میں کسی کو پا کر جذبات کو سکون تو ملا ہے لیکن دل کی بے قراری اور اضطراب کچھ سوا ہی ہو گیا ہے۔ اس کش مکش نے میری صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اور محبت خواب ہونے کے بعد جذبات میں کچھ اعتدال آیا۔ لیکن محبت کی یہ آگ میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے زندگی کی اس کش مکش کے طویل مرحلوں میں کچھ دن چین سے بھی گذرے ہیں قدرت نے جس قدر اسباب فراہم کر دیئے تھے اُن سے زیادہ کی مجھے خواہش بھی نہیں تھی۔ فرصت اور سکون کے دنوں میں میرا مطالعے کا شوق جاگا۔ اس مشغلے سے مجھے جس قدر خوشی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ سب سے پہلے میں نے فلسفہ اور منطق کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے سے میں نے بہت سے کار آمد نظریات حاصل کیے۔ پھر علم ہندسہ سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس میں دل چسپی اور کامیابی بہت کم رہی۔ لاطینی زبان سیکھنے کی کوشش میں تو بالکل ہی ناکام رہا۔ بہرحال کچھ دسترس حاصل کرنے کے بعد تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اسی دوران میں سخت بیماری کا شکار ہوا۔ شکر ہے کہ جوانی کا عالم تھا جو موت آنکھ ملانے سے شرما گئی۔ ورنہ شاید یہ بات صحیح ہے کہ انسان زیادہ خوشی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے جسم یا روح دونوں میں سے ایک تو ضرور مجروح ہو جاتے ہیں۔

میری خوشیوں کے دن کچھ اس طرح ختم ہوئے کہ میری زندگی پر اس موڑ کا گہرا اثر پڑا۔ کچھ دن سفر کی لذتوں اور مشقتوں میں گذارے پھر چمبیری واپس آیا۔ میں آس لگائے ہوئے تھا کہ ماما مجھے واپس دیکھ کر فرط خوشی سے کود پڑے گی۔ خوب خیر مقدم ہوگا۔ لیکن اُف کس طرح میری اُمیدوں کی پامالی ہوئی۔ میری عدم موجودگی میں وہاں ایک اجنبی نے مقام پیدا کر لیا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ماما نے سرد مہری برتی۔ میری اُمیدوں کے چراغ ایک دم گُل ہو گئے۔ مجھے اپنا مستقبل بالکل تاریک نظر آنے لگا۔ میرے حسین خوابوں کے سارے محل منہدم ہو گئے۔ میں اس لمحہ جوان ضرور تھا لیکن یہ طبیعت کی جولانی اور زندہ رہنے کی قوت مردہ ہو گئی تھی۔ میں اپنے ساتھ اس ناانصافی کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی خودی کو سرخرو رکھنے کی خاطر ماما کو الوداع کہنے پر مجبور ہوا۔ اس طرح مجھے زندگی کی حقیقت اور فریب کے درمیان تمیز کرنے کا موقع ملا۔

نئی زندگی کے نئے خاکوں اور تصورات کو ذہن میں بسائے ہوئے ۱۷۴۲ء میں پیرس پہنچا۔ میں نے فن موسیقی میں انقلابی اصلاحات کے موضوع پر ایک مضمون لکھا اور ایک دوست کی مہربانی سے اس مضمون کو "پیرس اکیڈمی" کے سامنے پیش کرنیکا موقع ملا اس پر خاصی داد و تحسین ملی لیکن اصلاحات کے سلسلے میں ہمت افزائی نہ مل سکی۔ البتہ اس سلسلے سے مادام دوپن نامی ایک متمول اور صاحب اثر عورت سے تعارف کا موقع ملا۔ یہ ملاقات کئی اعتبار سے دلچسپ اور مفید ثابت ہوئی۔ میں مستقل تلاش معاش کی فکر میں تھا ہی۔ ان ہی دنوں مادام دوپن کے ایک ملاقاتی دی مان تیگو کو وینس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ مادام کی عنایت سے میں دی مان تیگو کا سیکرٹری مقرر ہو کر وینس چلا گیا۔ سفیر نے مجھ پر کافی اعتماد کیا اور مجھے ایسے فرائض اور اختیارات سونپ دیئے جن سے میری حیثیت اہم اور قابل رشک بن گئی۔ لیکن اس نئے منصب پر آنے کے چند دن بعد ہی دی مان تیگو سے میری ایک جھڑپ ہو گئی۔ سفارت خانہ میں رواج تھا کہ فرانس جانے والے لوگوں کے پاسپورٹ بنانے کا کام سیکرٹری کرتا تھا اور ہر پاسپورٹ پر دستخط کے عوض ایک

ہیکن' وصول کرتا تھا۔ جب سفیر کو اس کا علم ہوا تو اس نے اس رقم میں سے اپنا حصّہ طلب کیا۔ اس کے اصرار پر میں نے کہا "نہیں۔ جناب آپ اپنی چیزوں کے مالک رہیں اور مجھے میری چیزوں کا حقدار رہنے دیں۔ میں آپ کو ایک پائی بھی نہیں دے سکتا" اس جواب پر اس تنگدل اور کم ظرف سفیر کی ناراضگی ظاہر ہے۔ ویسے اس شخص کی لیاقت کا یہ حال تھا کہ سفارتی خطوط کی خفیہ علامات کو الفاظ و بیان میں منتقل کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔ میں نے پوری دیانتداری اور محنت و جرأت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ بعض مواقع پر میں نے ہمت سے کام لے کر ایسے کام بھی کیے جنہیں مان ٹیگو نے نامنظور کر دیا تھا۔ یہ سب فرانسیسی بادشاہ اور عوام کی خدمت کے جذبہ کے تحت کیا۔ اسی دوران میں ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ سفیر نے ڈیوک آف اڈینا کو ڈنر پر مدعو کیا۔ لیکن میرے لیے حکم تھا کہ اس دعوت میں شریک نہ ہوں۔ میں نے غصے سے تلملا کر سفیر سے کہا کہ مجھے اپنی پوزیشن کے پیش نظر اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں ایک حکمران کی دعوت کے اعزاز میں شرکت کروں۔ میری اس جرأت سے سفیر بہت چراغ پا ہوا اور اس نے میرے ساتھ برتاؤ میں نفرت اور بے توجہی شروع کر دی۔ پھر انتقامی جذبہ کے تحت اس نے مجھ پر خفیہ علامات کی کنجی چرا لینے کا الزام لگایا اور میں نے احتجاج اور ناراضگی کے طور پر اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ وینس میں قیام کے دوران ایک مرتبہ ایک بحری جہاز پر دعوت میں شریک ہوا جہاں ایک حسین کافرہ بہ تمام شوخی و رعنائی آئی اور مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیے۔ میرے جذبات مشتعل ہو گئے لیکن یہ آگ جلد ہی ٹھنڈی ہو گئی جب مجھے یہ خیال آیا کہ قدرت نے مجھے غلط تفریحات کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔

میں بڑی بے سر و سامانی کے عالم میں پیرس واپس پہنچا۔ یہاں سفیر کے غیر مہذب برتاؤ کے خلاف چارہ فریاد کی لیکن نتیجہ میں اس سوسائٹی پر افسوس ہوا جس میں ظالم کی حمایت اور مظلوم کی مذمت دستور عام بن گئی ہے۔ بالآخر میں نے اپنے اوپیرا کے کام کی تجدید کی۔ اسی دوران میں تھیریسی نامی ایک عورت سے ملاقات ہوئی اور اس سے جلد ہی قرب پیدا ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ بہت مخلص معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بھی ماما کے نعم البدل کی تلاش تھی۔ آخر راہ و رسم بڑھتی گئی۔ اس دوران میں چند اوپیرا تیار کیے۔ والٹیر کے ڈرامہ میں بھی کچھ ترمیم اور اضافہ کر کے اسٹیج کیا لیکن کوئی خاص کامیابی کی صورت نظر نہیں آئی۔ آخر میں نے مادام ڈیوپن کے یہاں نجی ملازمت کر لی۔ گو آمدنی کم تھی لیکن اس قدر سہارا ہو گیا کہ اب میری صحت کچھ بحال ہو گئی۔ ادھر تھیریسی کچھ پھولنے لگی اور آخرکار اس کے بچہ پیدا ہوا۔ کافی غور و فکر کے بعد میں نے اس بچے کو سرکاری ہسپتال کے حوالے کر دیا۔ اس نجی ملازمت کے ہی سلسلہ میں فن موسیقی کی لغت مرتب کرنے والے دو اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میری مدد طلب کی۔ میں نے دو تین مہینے کافی محنت سے کام کیا لیکن باوجود اُجرت کی یقین دہانی کے کوئی معاوضہ نہیں ملا۔

میں ایسی بے اطمینانی کی زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ دیجان اکیڈمی نے ایک انعامی مضمون کے مقابلہ کا اعلان کیا جس کا عنوان تھا "کیا آرٹ اور سائنس نے انسانی زندگی کی اخلاقی قدروں میں اضافہ کیا ہے؟" میں نے ہمت کر کے اس مقابلہ کے لیے مضمون لکھ ڈالا۔ گو مجھے اعتراف ہے کہ میری تصنیفات میں یہ سب سے کم معیاری مضمون تھا لیکن اتفاق سے مجھے اکیڈمی کا انعام مل گیا۔ ادھر کچھ معاشی حالات کی بہتری کی بھی سبیل پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں ایک خزانچی کے فرائض انجام دیے لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ اور اب صرف قناعت اختیار کرنے کی خاطر موسیقی کی نقلیں بنانے کا کام شروع کیا۔ میں نے اپنا وہ انعامی مضمون بھی شائع کرا دیا لیکن اس سے کوئی منفعت

کی بجائے کچھ اصحاب قلم کی مخالفت ہی مول لینا پڑی۔ اوپیرے لکھنی باقی تھی ہی۔ میں نے "دیوان" لکھا اور اس بات کا اہتمام کیا کہ یہ مجھ سے منسوب ہوئے بغیر ہی شاہی دربار میں اسٹیج کیا جائے۔ آخر وہ دن آیا۔ بادشاہ اور امراء کو 'دیوان' بہت پسند آیا۔ شاہی دربار کی طرف سے اعانت کی پیشکش ہوئی لیکن میں نے اسے قبول نہیں کیا اس لیے کہ اس سے میری آزادی پر حرف آتا تھا اور یہ مجھے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ اس شہرت سے کچھ لوگ اس حد تک مخالف ہوگئے کہ میری جان کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن میں اس سے بے نیاز رہا۔

۱۷۵۳ء میں اس دیجان اکیڈمی نے "انسانی غیر مساوات کی بنیاد اور حقیقت" کے عنوان پر اصحاب قلم کو دعوت فکر دی۔ میں نے بھی نظریۂ غیر مساوات پر ایک مضمون 'essay on inequality' لکھ ڈالا۔ اب کچھ مستقل بیماری اور کچھ دنیاوی معاملات میں مسلسل ناکامی نے دنیا سے الگ تھلگ رہ کر آرام سے زندگی گذارنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک مہربان دوست مادام دی اپینی نے پیرس کے نواح میں ایک مکان بنوا دیا جسے میں نے "خانقاہ" hermitage کا نام دیا۔ میں نے یہاں اپنی زندگی کے چھ سال انتہائی آرام اور سکون سے گذارے۔ یہاں آکر میرے ذہن میں کئی منصوبے تھے جن میں سب سے اہم اپنی کتاب "سیاسی ادارے" کی تکمیل تھی۔ اسی دوران میں میں نے تھیریسی سے شادی کر لی۔ اور اس عرصہ میں مجھے ہر طرح کا سکون رہا اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میں اپنی اس کٹیا میں بغیر کسی روک ٹوک کے پوری آزادی سے اپنے معمولات زندگی پورے کر رہا تھا۔ اس قیام کے دوران میں مادام دی ہادی تو سے تعلقات بڑھے۔ یہ ایک شادی شدہ خاتون تھی۔ ساتھ ہی اس کا ایک عاشق بھی تھا۔ میرے اور اس کے درمیان تعلقات کی نوعیت کچھ انوکھی تھی۔ ایک چاندنی رات میں ہم دونوں ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھے دو گھنٹے تک پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ ہم تنہا تھے۔ گفتگو کا موضوع بھی نازک تھا لیکن ہم دونوں اپنی پوری معصومیت اور پاکیزگی کے ساتھ اس جگہ سے واپس آگئے۔ اس سے زیادہ میں اور کیا لکھوں۔ یہ نہیں ہے کہ اس موقع پر میرے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں ہر لمحہ اپنی محبت کی حدود سے باخبر رہا! ہمارے درمیان یہ تعلقات مادام دی اپینی کو بہت ناگوار گذرے اور شاید اس نے کچھ حسد کے جذبے سے ان تعلقات کی خبر مادام ہادی تو کے عاشق تک پہنچا دی۔ گویا مجھ پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ میں ان دونوں عاشق و معشوق کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ اتنی بڑی تہمت تھی جسے میں برداشت نہ کر سکا اور باوجود مادام اپینی کا ممنون ہونے کے میں نے hermitage چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا چھ سال بعد پھر اپنے عزم کے خلاف پیرس واپس چلا آیا۔ اب یہاں کی فضا بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ نام نہاد دوستوں نے میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عجیب ناپاک منصوبے میری رسوائی کے بنا رکھے تھے۔ جب یہ حالات مجھ پر منکشف ہوئے تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے اتنے بڑے غول میں ایک دو کے علاوہ کوئی بھی ساتھی نہ رہا۔

اس مخالفت اور عداوت کے طوفان نے مجھے سوسائٹی سے الگ کر دیا۔ اس کنارہ کشی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اپنی تمام توجہ اُن کتابوں کو مکمل کرنے پر لگا دی جو اب تک اُدھوری تھیں۔ سب سے پہلے میں نے "کانٹریکٹ سوشل" مکمل کر کے پبلشر کے حوالے کر دی۔ یہ کتاب بیک وقت ہالینڈ اور فرانس سے شائع ہوئی۔ تقریباً اسی زمانے میں "ایمائیل" کا مسودہ بھی تیار ہو گیا جس کو میں بہت خفیہ طور پر رکھتا تھا۔ یہ کتاب میرے نزدیک میری سب سے اعلیٰ تصنیف تھی۔ لیکن عجیب ستم تھا کہ اس کی اشاعت

میں مختلف رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔ ابھی اس کتاب کی اشاعت شروع ہی ہوئی تھی کہ اس کتاب اور اس کے مضمون کا علم ایک نصرانی پادری کو ہوگیا۔ اس کتاب میں اہلِ نصاریٰ کے خلاف بہت سخت باتیں تھیں۔ تمام لوگ بہت چراغ پا ہوئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ظالموں نے کسی طرح اس بات کی بھی کوشش کی کہ کتاب کا اصل مسودہ حاصل کرلیں اور اس کی اشاعت رکوادیں۔ بہرحال "کانٹریکٹ سوشل" کی اشاعت کے دو ماہ بعد "ایمائیل" بھی منظرِ عام پر آگئی۔ یہ کتاب صرف ہالینڈ سے شائع ہوئی لیکن جب یہ فرانس میں داخل ہوئی تو مخالفت کی ہوائیں اور تیز ہوگئیں۔ اس کتاب کے آخر میں میں نے جاگیرداروں کے اس رویہ کی مذمت کی تھی جو وہ لوگ اپنے علاقہ کے عوام کے ساتھ رکھتے ہیں۔ مخالفت کو ہوا دینے میں یہ تذکرہ سب سے اہم اور پیش پیش تھا۔ کچھ ہی دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ پارلیمنٹ نے بھی اس پر اظہارِ ناراضگی کیا ہے۔ اور یہ کہ مصنف کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس رسوائی کی وجہ سے اور اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کی خاطر میں نے فرانس چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ کی راہ لی اور "ورڈن" میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ "برن" پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدائے برتر کا شکریہ ادا کیا۔

مگر وائے قسمت! اب بھی چین کہاں۔ جینوا میں "ایمائیل" کی کاپیاں جلادی گئیں جینوا اور پیرس سے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے۔ فرانسیسی لوگ جو عموماً شریف اور مہربان ہوتے ہیں، میری مخالفت کے جوش میں اپنی ان خوبیوں کو بھول گئے۔ مجھے پاگل، دہریہ اور جنگلی کہہ کر پکارا گیا۔ مذہب دشمن ہونے کا الزام تو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ اب میں نے "موتیرز" منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے لارڈ کیتھ، مارشل آف اسکاٹ لینڈ، کو اس بات کی اطلاع دی۔ اس سلسلہ میں کیتھ سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ انہیں کے کرم سے بادشاہ ایران نے مجھے سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح دوستوں اور دشمنوں سے کنارہ کش ہونے پر پھر سکون میسر آسکے گا۔ لیکن یہ کہاں۔ مستقل طور پر اخبار اور رسائل میں "ایمائیل" کے مصنف کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا ہوتا رہا۔ اسی دوران میں مجھے ماما کے انتقال کی افسوسناک خبر ملی۔ مزید برآں لارڈ کیتھ نے بھی انگلستان چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس مشفق نے میری ہمدردی کی خاطر مجھے شہری حقوق دلوادیے۔ ادھر چرچ نے مجھے مذہب سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کچھ کم رسوائی کی بات نہ تھی۔ جو لوگ مذہب میں اصلاحات کا دم بھرتے تھے وہی غلط رسم و رواج پر تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سارا عالم میرے خلاف تھا۔ میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی آواز تھی۔ ادھر لوگ میری جان کے درپے تھے۔ الغرض ان حالات سے مجبور ہوکر میں نے موتیرز کو بھی خیرباد کہا اور ایک چھوٹے سے جزیرہ "سینٹ پیری" میں سکونت اختیار کی۔ یہ بڑی دل کش جگہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دور دراز حصہ میں سکونت اختیار کرنے سے لوگ جلد ہی مجھے بھول جائیں گے اور مخالفت کا طوفان دب جائے گا۔ لیکن کم نصیبی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک دن اچانک حکم ملا کہ میں اس جزیرہ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چھوڑ دوں۔ ساری داد و فریاد بیکار گئی۔ آخر سوچا کہ کارسیکا کے اس جزیرہ میں جاکر زندگی کے باقی دن گذاروں جس کے باشندوں کی عظمت اور شجاعت کو میں نے "کانٹریکٹ سوشل" میں روم اور اسپارٹا کی مثال دے کر بیان کیا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ بجائے اس پرسکون علاقہ کے میرے سفر کا رخ انگلستان کی طرف ہوگیا۔ یہ ہیں وہ سب واقعات جو پوری سچائی اور صفائی سے میں نے اپنے بارے میں بیان کردیے!

(ترجمہ و تلخیص: احتشام شیخ)

ڈاکٹر اشرف

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میں مراد آباد (اتر پردیش) میں مسلم ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور اسی اسکول کے ایک استاد کے ساتھ ان کے گھر محلہ کسرول میں رہتا تھا۔ مجھے یہ دن اب بھی یاد ہیں کہ اعلان جنگ کے کچھ دن بعد میرے والد کو دردانیال اور مشرقی افریقہ کی مہم پر جانا پڑا اور گھر بار کا ذمہ مجھے سونپا گیا۔ والد صاحب کے جذبۂ وفاداری کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا کہ جب دہلی جنکشن سے ان کی فوجی اسپیشل روانہ ہوئی اور انہوں نے مجھے آبدیدہ دیکھا تو دلاسا دینے یا سینہ سے لگانے کی بجائے راجپوتی غیرت یاد دلا کر جھڑکیاں دیں اور حق نمک خواری پر لکچر دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کامل صبر و سکون کے ساتھ اپنی دیکھ بھال میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت میری عمر بارہ برس کے قریب ہوگی۔ وابستہ ہوا لڑائی کا حال معلوم کرنے کے شوق میں میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے دن بعد جب دردانیال کی پسپائی کی خبر آئی تو مجھے والد کے بارے میں تشویش ہوئی اور میں نے مسجد کی راہ لی۔ چلتے چلتے چاشت و اشراق بھی معمولات میں داخل ہو گئے۔ رمضان میں تراویح پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ کبھی کبھار میں شبینہ میں بھی شامل ہوتا تھا۔ مراد آباد کے دیندار مسلمان اس زمانہ میں آریہ سماج کے مناظروں سے بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے اور دہ انجمن اور مولوی مرتضیٰ حسن کی بحث سننے دور دور سے آکر جمع ہوتے تھے۔ دوسرا محبوب مشغلہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کا ناٹک "خون ناحق" اور اس کا حسین ایکٹر دلفگار تھا جسے دیکھنے کی خاطر بعض لوگوں نے اپنی ضرورت کی چیزیں تک بیچ دی تھیں۔ مجھے ان مناظروں اور کھیلوں سے البتہ کوئی رغبت نہ ہوئی جس کی واحد وجہ مولوی مصطفےٰ کریم کی اور ہماری نئی جماعت حزب تھی۔ مصطفےٰ کریم علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور ہمارے مدرسہ میں حال میں آئے تھے۔ وضع قطع میں وہ علی گڑھ کے معلوم ہوتے تھے وطن بھلول (اودھ) تھا۔ مگر ویسے تھے نرے مولوی یعنی مسجد میں سب سے پہلے آتے اور سب سے آخر جاتے تھے۔ چنانچہ میری اور دوسرے طالب علموں کی ان سے خاصی ملاقات ہو گئی۔ کچھ دن بعد آنا جانا ہو گیا۔ بلکہ ہر اتوار کی صبح دیوان بازار میں ان کے گھر پر ایک اجتماع ہونے لگا۔ انہوں نے شروع شروع میں حسرت موہانی کی بعض غزلیں سنائیں مثلاً

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
عیش دل و جان ہے کرم یار پہ موقوف

وغیرہ پھر اقبال کا ترانہ اور شکوہ سے دل بہلانے لگے۔ غالباً تیسرے ہفتے سورۂ صف اور سورۂ جمعہ کا درس شروع ہوا جس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی۔ لب لباب ان سب تعلیمات کا یہ ہوتا تھا کہ جہاد بالسیف ہر مسلمان پر فرض ہے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن انگریز ہیں۔ بالآخر یہ عقیدہ بھی کھل گیا کہ مصطفےٰ کریم دراصل مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور ایک خفیہ جماعت مجاہدین کے ممبر ہیں۔ جو انگریزوں کے خلاف جہادی تنظیم میں سرگرم ہے۔ تھوڑے دن بعد ہم سب نے بھی جہاد کا حلف لیا اور "حزب اللہ" کے ممبر بن گئے

یوں سمجھیے کہ ہمارا سیاسی سفر شروع ہو گیا۔

میرا گھرانا تو ریاست الور کا ہے مگر میرے دادا ضلع علی گڑھ کے ایک گاؤں میں بس گئے تھے چنانچہ میری جب بھی چھٹی ہوتی علی گڑھ جایا کرتا تھا۔ "حزب اللہ" کی شرکت کے بعد مجھے شوق پیدا ہوا کہ حسرت موہانی اور بیگم حسرت کی زیارت کی جائے۔ یہ اس لیے بھی کہ حسرت علی گڑھ کے پہلے گریجویٹ تھے، جس نے "سودیشی" تحریک میں حصہ لیا تھا اور کئی بار جیل جا چکے تھے۔ حسرت نے رسل گنج میں سودیشی کپڑے کی دکان کھولی تھی۔ میں نے پہلی بار بیگم حسرت کو سیاہ ترکی برقع پہنے اسی دکان پر دیکھا۔ وہ اخلاق کی پیکر تھیں، شفقت سے پیش آئیں اور میرے اوپر ان کی محبت کا اثر اس لیے اور بھی ہوا میں ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھے اپنے "دولت کدہ" پر یاد فرمایا۔ یہ دولت کدہ دراصل دھرم پورہ کوٹھی میں نوکروں کے رہنے کا کمرہ تھا اور بیگم اسی شاگرد پیشہ میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کی دکان کا سارا اسباب غالباً دو تین سو روپیہ سے کم ہو گا بلکہ کبھی بڑے نام تھی۔ خفیہ پولیس برابر نگرانی کرتی تھی گرفتاری اور تلاشی کا ہر وقت کھٹکا رہتا تھا۔ مگر بیگم حسرت کے بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دنیا بھر کی دولت اور ہر قسم کا آرام انہیں نصیب ہے۔ ان کی اور حسرت کی یہ فاقہ کشی زندگی بھر رہی اور مجھے یہ کہتے ہوئے ایک مسرت سی محسوس ہوتی ہے کہ میں ان کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا۔ ہاں مشکل البتہ یہ پیش آئی کہ لطف و کرم کی تعلیم پیار کے بعد جب حسرت اور بیگم عملی نمونہ کے طور پر سامنے آئے تو ایک زمانہ تک اس کسوٹی پر پھر کوئی دوسرا جماعت پورا نہ اتر سکا۔

۲

جنگِ عظیم کے بعد ہماری جدوجہدِ آزادی کا ایک نیا اور انقلابی دور شروع ہوا۔ ہم جیسوں کے لیے اس کی ابتدا تحریکِ ہجرت سے ہو چکی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام مہاجرین کے پہلے قافلہ کے لیے دیا تھا مگر حسنِ اتفاق کہ جس دن پہلا قافلہ پشاور سے روانہ ہونے والا تھا میرے والد جنگ سے صحیح سلامت واپس آ گئے اور میں شریک نہ ہو سکا۔ کچھ دن بعد میں ایف اے پاس کر کے بی اے میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ پہنچا اور ایم اے او کالج کی دیرینہ روایت کے مطابق ایک "سینئر" طالب علم کا سامان فراہم کرنے یعنی عمدہ قسم کے نئے انگریزی سوٹ پر دو سے قیمتی کپڑے وغیرہ بنوانے میں مصروف تھا کہ مولانا محمد علی کی رہائی کی خبر آئی پھر تحریکِ خلافت کا غلغلہ شروع ہوا تھوڑے دن بعد گاندھی جی کی شہرت ہوئی۔ اور ستیہ گرہ اور سوراج کا چرچا جگہ جگہ ہونے لگا۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ کرو۔ انگریزی عدالتوں میں مقدمہ کی پیروی نہ کرنا۔ انگریزی امدادی مدرسوں میں پڑھنا انگریزی خطاب اور اعزاز قبول کرنا بھی گناہ، انگریزوں کی نوکری حرام ہے۔ کھادی پہنو، چرخہ چلاؤ، ستیہ گرہ کے لیے تیار رہو، خلافت و سوراج فنڈ میں چندہ دو۔ کانگریس کے ممبر بنو، سال بھر میں سوراج ملے گا۔ اہنسا شرط ہے۔ کس کا جی ایسے سودے پر نہ چلتا۔ ستیہ گرہ میں شریک ہونے کے لیے مجھے ویسے بھی کسی تحریص کی ضرورت نہ تھی چنانچہ میں نے پرچار کا کام گاندھی جی اور محمد علی کی آمد سے بہت پہلے شروع کر دیا اور جب انگریز پرنسپل نے والدین کو لکھ کر طالب علموں کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے مراد آباد کے ایک "حزب اللہی" کو اپنا والد قرار دے کر ترکِ موالات کی حمایت میں کالج کی مسجد میں تقریریں کرنا شروع کر دیں اور ایک مہینہ تک کسی کو گمان نہ ہوا کہ یہ حضرت میرے دوست ہیں والد نہیں ہیں۔ بالآخر ایک دن گاندھی جی اور گاندھی جی کے ساتھ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، آزاد سبحانی، سیٹھ وغیرہ غرض کانگریس اور خلافت کے سب ممتاز رہنما آن پہنچے اور ہم نے بلا اختلاف رائے کالج یونین میں ترکِ موالات کی حمایت کی تجویز منظور کر لی۔ اب ہمارا مطالبہ تھا کہ کالج حکومت سے امداد

لینا چھوڑ دے اور چونکہ کالج قوم کی ملکیت تھا ہم اس کی عمارتوں پر قابض ہو گئے چند دن کالج کی مسجد میں مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑ گئی یوں سمجھیے کہ ایم اے او کالج کی چار دیواری میں دو جداگانہ کیمپ بن گئے۔ ایک میں کالج کے ٹرسٹی اور اساتذہ، دوسرے میں ہم حامیانِ ترکِ موالات اور مولانا محمد علی۔ بالآخر ہمارے نکلوانے کے لیے نگران کالج نے پولیس سے مدد مانگی۔ حضرت کا مشورہ تھا کہ ہم پولیس کا مقابلہ کریں۔ مگر دوسرے کانگرسی رہنما ستیہ گرہ کے اصول کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح ہم پولیس کی مدد سے بہ یک بینی و دو گوش کالج کے احاطے سے نکال باہر کر دیئے گئے اور شہر کی بارہ دری کے قریب بستی کالج سے چند قدم کے فاصلہ پر ڈیروں میں رہنے لگے۔ اتفاقاً یوں اب میرے لیے جامعہ ملیہ کی زندگی کا نیا باب کھلا۔

ہماری زندگی کچھ انوکھی سی تھی نام کے لیے جامعہ بھی یونیورسٹی تھی۔ بلکہ خود مولانا محمد علی ہمیں انگریزی اور تاریخ کا درس دیتے تھے مگر اصل میں یہ ستیہ گرہیوں کا ایک کیمپ بلکہ پڑاؤ تھا جہاں سے جتھے ملک کے مختلف حصوں میں جاتے تھے دو چار جتھوں کے جانے کے بعد باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھوڑے دن بعد مولانا محمد علی نے اس کا نصاب بھی تیار کر لیا۔ مولانا محمد سورتی عربی پڑھانے کے لیے، خواجہ عبدالحی تفسیر کے لیے، لیاقت انگریزی کے لیے اور مسٹر شفیق کچھ درس کے لیے، مولانا اسلم تاریخ کے لیے، مولانا اشرف الدین اردو کے لیے مقرر ہوئے اور یہ سب صحیح معنی میں اُستاد تھے۔

لاہور، پشاور، دہلی، حیدر آباد، تمام اطراف ہر جگہ کے نوجوان تھے۔ ان پس ماندگان راہ میں میں بھی شریک ہو گیا۔

میں اس زمانے میں دو دوستوں کے ساتھ ایک کمرہ میں رہتا تھا کلاس میں جانے کے لیے ہمارے پاس جامعہ کا سبز رنگ کا چوغہ تھا کھانا ہمیں ڈائننگ ہال میں ملتا تھا ناشتہ کے لیے دو پیسے روز کی گاجریں میاں لوٹھی لے آتے تھے۔ ہماری مشترکہ ملکیت ٹین کا ایک بکس تھا جس میں چار جوڑے کھادی کے کپڑے، ایک دو انگوچھے، دیوان غالب کا ایک نسخہ محمد علی لاہوری کا قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دو زبانوں میں میر تقی کے چھپے ہوئے کچھ قومی گیت تھے۔ میری انفرادی ملکیت میں ایک پرانی دری اور رضائی کا ایک پارہ آٹے والا ہوتا شامل تھا کھیل تفریح کے لیے جامعہ کا کھلا میدان اور گنبدی والی گولڈ جس میں ہر ہم خود مجھے ملکہ حاصل ہو چکا تھا جامعہ کے ماحول میں البتہ ایک خاص قسم کی کشش تھی جسے غالباً روحانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے منصوبوں میں ترک و تجرید کو بھی دخل تھا اس سلسلہ میں میری آشفتہ مرحوم والی کہانی دشنو داتی (الہ آباد) میں غالباً ۱۹۳۲ء کے نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اور میں یہاں اس دردناک داستان کی تفصیلات نہ دہراؤں گا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار ہم چند دوست ایک جوتشی کو ہاتھ دکھا کر مستقبل کا حال پوچھ رہے تھے کہ اس نے رؤف پاشا کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تمہاری قسمت میں حجاز کا سفر ہے" کوئی دوسرا ہوتا تو شاید یورپ کے سفر کا خواب دیکھتا۔ مگر یہ جامعہ تھی، رؤف پاشا بے ساختہ بولے کہ مجھے حج بیت اللہ نصیب ہو گا!! اور مارے خوشی کے ناچنے لگے عجیب سا سماں تھا رؤف پاشا سے زیادہ غلام حسین روتی والا مگن تھا مگر ان کا قصہ سنانے سے پہلے میں ان کا تعارف کرا دوں۔

غلام حسین اب بوڑھا ہو چکا تھا، ایک آنکھ بھی خراب تھی مگر برسوں سے ایم اے او کالج میں بسکٹ لا کر بیچا کرتا تھا جس سال ترک موالات کا ہنگامہ شروع ہوا اس نے بدایوں کے پیڑے بھی لانا شروع کر دیئے تھے۔ متقی، پرہیزگار اور نماز روزہ کا پابند چنانچہ جب ہم کالج سے نکالے گئے تو غلام حسین نے بھی ایم اے او کالج سے قطع تعلق کر لیا اور اب اس کا گزر صرف جامعہ کی غریب بکری پر تھا۔ غلام حسین شہر میں رہتا تھا اس کی بیوی مر چکی تھی، اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جو جوان ہو چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر اکلی بیٹی نہ ہوتی یا بیٹی کی شادی ہو گئی ہوتی تو وہ یقینی ستیہ گرہ میں

شریک ہو کر جیل خانہ میں چلا جاتا۔ غلام حسین کا معمول تھا کہ شہر سے بسکٹوں اور پیڑوں کا ٹوکرا لے کر وہ جامعہ کے کھلتے ہی آ پہنچتا اور اسے برآمدہ کے ایک کونے میں رکھ دیتا۔ اب جس کا جو جی چاہے ٹوکرے میں سے لے اور جتنے پیسے چاہے اس میں رکھ دے۔ نہ کوئی پوچھنے والا نہ کوئی دیکھنے والا۔ کوئی کہتا میاں غلام حسین تم بکری کا حساب کیوں نہیں رکھتے تو ہنس پڑتا اور کہتا کہ یہ مال سب ان لڑکوں کی خدمت کیلئے ہے حساب کس بات کا غرضیکہ جب جوتشی نے رؤف پاشا کو حجاز کے سفر کی خوشخبری دی اور پاشا نے حج بیت اللہ کی بشارت سمجھے تو فکر غلام حسین کو ہوئی کہ اس نوجوان کے مصارف حج کا انتظام کرنا چاہیے۔ بالآخر چند ماہ بعد رؤف پاشا نے حج کا ارادہ کر لیا۔ مصارف کے لیے انہیں کوئی دقت نہ تھی۔ مگر [illegible] کچھ تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ غلام حسین رؤف پاشا کے پاس ایک تھیلی سی لے کر آیا اور انہیں پیش کر کے کہنے لگا کہ میں نے زندگی بھر میں پانچ سو روپیہ جمع کیا ہے آپ انہیں لے لیجئے۔ پاشا حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ غلام حسین نے پھر کہا کہ ارادہ میرا بھی تمام عمر یہی تھا کہ میں بھی حج کروں چنانچہ میں نے ایک ایک روپیہ جوڑ کر یہ رقم اکٹھا کی ہے مگر ایک تو میں بڈھا ہوں پھر میری بیٹی موجود ہے جسے چھوڑنا ناممکن ہے۔ اب آپ حج کو جا رہے ہیں تو میرے روپوں سے حج کر آئیے۔ میں سمجھوں گا میں نے ہی حج کیا ہے۔ پاشا نے یہ نذر قبول نہیں کی تو غلام حسین آبدیدہ ہو گیا اور اس کے خلوص و محبت اور اس کی ناداری دیکھ کر ہمارے دل بھی بھر آئے۔ سیاسی زندگی میں میں نے خلوص و قربانی کے بہت سے مظاہرے دیکھے مگر غلام حسین جیسا مجھے نظر نہیں آیا۔ چند سال بعد جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ البتہ یہ خوشی تھی کہ بیٹی کا نکاح ہو چکا تھا۔

۱۹۲۳ء کی وحشت ناکی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس لیے کہ ایک طرف گاندھی جی نے وطن پر چوری چورا کے تشدد کا الزام رکھ کر ستیہ گرہ کی تحریک دفعتاً روک دی تھی دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی خلافت کا جنازہ نکل چکا تھا اور ہم سب کٹی پتنگ کی طرح بے سنگ و میل مارے مارے پھر رہے تھے۔ کہاں یہ امنگیں تھیں کہ سال بھر میں سوراج آ جائے گا اب آئے دن یہ حال ہو گیا کہ کبھی اس ضلع میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کبھی اس ضلع میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کبھی اس صوبہ سے کشت و خون کی خبریں آنے لگیں۔ تھوڑے دن بعد اضطراری ہنگاموں میں شدھی اور تبلیغ کی مرتب اور منظم دشمن تحریکوں کا اضافہ ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ سیاسی اور سماجی فراق نے مستقل طور پر وطن میں ڈیرے ڈال دیئے۔ نماز روزہ کی مجھے ویسے بھی عادت تھی۔ مگر اب کچھ کچھ انہماک اس درجہ بڑھا کہ میرے دینیات کے استاد میرے مرشد بن گئے ان کا معمول تھا کہ پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد کی نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی اس میں شریک ہونے لگا بالآخر یہ قرار پایا کہ میں چلہ کشی کروں اس کی شرطیں بھی تھیں مثلاً گوشت ترک کرنا۔ کامل طہارت اور اعتکاف۔ چلہ میں ایک مخصوص دعا کا ۷۰ ہزار بار دہرانا بھی شامل تھا۔ میں شاید ان پابندیوں سے گھبرا کر ارادہ ترک بھی کر دیتا مگر چلہ کے فضائل ایسے تھے کہ طبیعت مانتی نہ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں درجہ بدرجہ نور خداوندی کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور شجر و حجر مجھ سے ہم کلام ہونے لگیں گے۔ مستزاد یہ کہ میری روحانی ترقی کا اندازہ مجھے خود اپنے خوابوں سے ہوتا رہے گا۔ میں اسکول کے زمانہ میں بھی حضرت علیؓ اور حضرت رسالت مآبؐ کے دیدار سے مشرف ہو چکا تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ روحانی ارتقا کا یہ سلسلہ آئندہ جاری نہ رہے غرضیکہ میں نے پورے اعتماد اور کامل احتیاطوں کے ساتھ چلہ شروع کیا۔ میں رات کو جو کچھ خواب میں دیکھتا یا دن میں جو کچھ میرے دل میں القا ہوتا مرشد سے بیان کر دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بارہ دن کوئی خاص بات بیان کرنے کے قابل نہ تھی۔ اطمینان قلب البتہ مجھے پورے طور پر حاصل ہو چکا تھا اور میں کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا

گیا کسی بڑے وجود میں سما گیا ہوں۔ مگر یہ تصورات اس درجہ مبہم اور غیر متعین تھے کہ مرشد سے ان کا بیان کرنا مشکل تھا۔ بالآخر تیرھویں شب کے اور آخر چودھویں کی صبح میں نے ایک واضح سا خواب دیکھا اور آنکھ کھلتے ہی مرشد کو جا سنایا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے عزیز دوست شنکر لال کے ساتھ گاؤں میں کلال کی دکان پر بیٹھا دیسی شراب پی رہا ہوں اور ہم دونوں مست ہوئے جا رہے ہیں۔ بالآخر نشہ اتنا بڑھا کہ ہم دونوں زمین پر گر پڑے اور سو گئے۔ خواب بس اتنا ہی تھا اور میں نے جوں کا توں سنا دیا۔ مرشد خواب سن کر ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے بعض سوالات پوچھے۔ شراب میں نے کبھی پیا یا کھایا تھا؟ بد خوابی تو نہیں ہوئی۔ یہ چلے سے پہلے کسی سے عشق تو نہیں تھا؟ والد کی کمائی میں رشوت کا روپیہ تو شامل نہیں تھا؟ اتفاق یہ کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں تھا۔ پھر بزرگ تھوڑی دیر کے لیے مراقبہ میں رہے اور اس کے بعد آہ بھر کر فرمانے لگے۔ "روحانی ترقی تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ تم چلے اور تپسیا کا خیال چھوڑ دو۔ غالباً ازل سے ہی تمہارے نصیب میں شقاوت لکھی ہوئی ہے۔" آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کشف کے بعد میرے اوپر کیا گزری ہوگی۔ میں چار گھنٹے سے بھی کم سویا کرتا تھا اور باقی وقت زیادہ تر کلام پاک کے مطالعہ اور مختلف قسم کی نمازوں اور وظیفوں میں صرف ہوتا تھا۔ بہر نوع جب دو چار دن کے غم و اندوہ کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے ہلکے ہلکے اپنا دامن روزے نماز سے چھڑانا شروع کیا۔ مگر اس میں برسوں لگ گئے۔ اس لیے کہ کسی عادت کا ترک کرنا اس کے اختیار کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ البتہ سماجی زندگی کے بعض حقائق نے میری بڑی امداد کی۔

اس زمانہ میں آریہ سماج کے رہنماؤں کو دفعتاً خیال آیا ہندوستان کی تو مسلم آبادی کو از سر نو اپنے آبائی دھرم کی برکتوں سے روشناس کرانا چاہیے۔ میں اتفاق سے یہی نہیں کہ راجپوت مسلمان ہوں بلکہ میرے بعض قریبی عزیز اب بھی ہندو ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ بھی چھتری دھرم کی دیرینہ ذاتیوں کا لحاظ ضرور کرتے ہیں۔ چنانچہ میری ملکانہ برادری آج بھی آدھا تیتر آدھا بٹیر یعنی آدھی مسلمان ہندو کہلاتی ہے اور اسی رعایت سے میرے والد اور میرے دادا کا ایک ہندو اور ایک مسلمان نام تھا۔ اس گمنام اور پسماندہ برادری پر اب دفعتاً آریہ سماج کی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کی اسلامی تبلیغی جماعتوں کی بھی توجہ مبذول ہوئی اور جگہ جگہ گرو کل بنائے اور مولانا لوگ گشت کرنے لگے۔ مجھے ضلع آگرہ کے بعد عزیزوں سے ۱۹۲۳ء کے وسط میں پتہ چلا کہ عنقریب موضع سانڈھن میں بیک وقت ایک عظیم الشان سمیلن اور ایک تبلیغی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں ۵۰ کے قریب سوامی اور پنڈت اور ۵۰ سے زیادہ علمائے کرام تشریف لائیں گے اور یہ حضرات اس اجلاس کے بعد ملکانہ دیہات میں اعلائے کلمۃ اللہ اور ویدک دھرم کا پرچار فرمائیں گے۔ مجھے اب تک اس کا گمان نہ تھا کہ مذہب بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ اور مذہبی افسانے جب انقلابی بیداری کے زمانے میں تراشے جائیں تو ان کی پشت پر منظم رجعت پسند طاقتوں کا ہاتھ ہے۔

بہر نوع اس اجتماع کے موقع پر میں بھی سانڈھن پہنچا۔ گو مجھے اس سے پہلے اپنی ننھیال کے علاوہ کسی ملکانے گاؤں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میری وضع یعنی کہ سر پر ترکی ٹوپی، بدن پر عمدہ شیروانی، پاؤں میں گرگابی جوتا اور صورت سے یعنی میں خاص شہری مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ اچھنیرا اسٹیشن سے پیدل چل کر جب میں گاؤں کے پاس پہنچا تو کھیت میں ایک مختار صاحب نظر پڑے اور مجھے آتا دیکھ کر ٹھٹکے۔ ان سے پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ کے علاقہ میں بعض لوگ ہندو ہونا چاہتے ہیں؟ انہوں نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمانے لگے پہلے اورنگ زیب کا دباؤ تھا اور ہمارے اجداد مجبوراً مسلمان ہو گئے تھے اب آزادی کا زمانہ ہے اور ہم اپنے قدیمی مذہب پر واپس جانا چاہتے ہیں۔ بات ختم ہوئی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کہ اتنے میں انہوں نے میرا وطن پوچھا۔ اور جب میں نے اپنے آبائی گاؤں کا نام لیا تو وہ بڑے غور سے

مجھے دیکھتے رہے پھر باپ کا نام دریافت کیا۔ میں نے بھی بتایا تھا کہ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ میری ماں اور دادا نانا، تایا، پھوپی وغیرہ کے نام گنا دیے بلکہ مجھے بچپن سے لگا کر فرمانے لگے کہ بیٹا میں تو تمہیں پردیسی مسلمان سمجھ کر بات کر رہا تھا تم نے پہلے ہی اپنا پتہ اور نکاس کیوں نہ بتایا۔ میں نے اب انھیں ان کا سانس بھر کر پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ آپ کے گاؤں میں آبادی سے زیادہ پنڈت اور مولوی جمع ہیں۔ ٹھاکر صاحب اب اپنا حقہ پیتے تھے اور ہنس کر فرمانے لگے کہ بیٹا ہم دن میں تو کسی کو اپنے کھیت پر آنے نہیں دیتے پر جب کام کاج سے فرصت ہو جاتی ہے تو شام کو جلدی کر حقہ لیکر چوپال پر جا بیٹھتے ہیں، پھر کیا پوچھتے ہو۔ کہیں وید پڑھا جا رہا ہے کہیں قرآن کی تفسیر ہو رہی ہے کوئی رامچندر جی کا جیون چرتر سنا رہا ہے یہ تو کسی نے حضرت کے کارنامے سنا کر دیے ہیں۔ ہم جاہل ناخواندہ لوگ ہیں یہ کہاں نصیب کہ پڑھے لکھے لوگ ہمارے گاؤں میں آئیں اور ہمیں یہ سب عالموں کی باتیں بتائیں۔ ٹھاکر مزے لے لے کر کچھ اس طرح بیان فرما رہے تھے گویا یہ سب حضرات ان کی تفریح کے لیے جمع ہوئے ہیں جیسی مفت کا سینما ہے جو ان کے اور ان کے عزیزوں کی تفنن طبع کے لیے اس دور دراز گاؤں میں ہو رہا ہے۔ میں ٹھاکر صاحب کو کیسے یقین دلاتا کہ آپ کی مجلس آرائی شہروں میں ہندو مسلمانوں کے فسادات بلکہ باہمی کشت و خون کا باعث ہے بہر نوع یہ اکتشاف مجھ پر محض عزیزداری کے باعث ہوا کہ ہماری نگاہ میں تبلیغ اور شدھی جو بھی منصب رکھتی ہے ایک دن بھر کے تھکے ماندے اور محنتی کاشتکار کی نگاہ میں اس کی حیثیت تفریح طبع سے زیادہ نہیں۔ بقول خود ٹھاکر صاحب کے "یہ سب ٹھلوؤں کے کام ہیں۔"

دوسرے مہینے میں اپنی ننھیال میں گیا۔ یہ تحصیل ہاتھرس کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں میں نے دیکھا، میرے نانا کی چوپال پر چند قادیانی مولویوں نے مدرسہ کھول رکھا ہے اور بچے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب مجھ سے تپاک سے ملے اور جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ مجھے قادیانیوں سے کوئی تعصب نہیں ہے تو علیحدہ لے جا کر فرمانے لگے کہ اب تم اپنے نانا سے سفارش کر دو کہ اس چوپال پر جہاں مدرسہ ہے اور روزانہ باجماعت نماز ہوتی ہے مسجد بنانے کی اجازت دے دیں۔ بالآخر میں نے نانا سے مولوی صاحب کی خواہش بیان کر دی اور اپنی طرف سے حمایت کے الفاظ بھی کہہ دیے۔ شام کو میں اور قادیانی مولوی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ میرے نانا آ گئے اور خاص برج بھاشا میں فرمانے لگے کہ مولوی اب تک تو میں خاموش تھا مگر آج آپ نے مسجد کی بات شروع کی ہے تو میں بھی کہہ ڈالوں۔ دیکھئے جس ہفتہ آپ نے نماز پڑھنا شروع کی میری گائے مر گئی پھر دوسرے مہینے جب آپنے باجماعت نماز پڑھنا شروع کر دیا تو میری بڑی لڑکی بیمار پڑ گئی اور وہ اب تک بیمار چلی جاتی ہے۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جب خدا ہم سے ذرا دور ہے تو یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور اگر اس کا گھر ہی یہاں بن گیا یعنی مسجد، تو پھر وہ سب کو مار ڈالے گا۔ ایک بھی ہم میں سے زندہ نہ بچے گا۔

اب مولوی صاحب پریشان تھے کہ ٹھاکر صاحب کو کیسے سمجھائیں بالآخر انہوں نے نماز چوپال پر پڑھنا بند کر دی اور باہم صلح ہو گئی مسجد اس گاؤں میں اب تک نہیں ہے۔

میں گاؤں ہی میں تھا کہ عید آ گئی اور میری خوش نصیبی کہ والد صاحب بھی عید سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ طے ہوا کہ عید کی نماز نہر کے پاس کھیت میں پڑھی جائے گی۔ قریب ہی لاکھنو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے ایک سنی حنفی امام بھی عید کی نماز پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ دوسرے روز ہم پچاس کے قریب آدمی کھیت میں جا پہنچے۔ امام نے اتنی سیدھی نماز پڑھا دی اور ہم گاؤں واپس آنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کہ راستے ہی میں میں نے دیکھا والد صاحب میرے ماموں پر خفا ہو رہے ہیں۔ قصور یہ تھا کہ غریب نے چلتے وقت

کھیت میں کہیں چبوترہ دیوتا کا بت تھا، اس پر بھی وہ پھول توڑ کر چڑھا دیتے تھے۔ والد صاحب فارسی عربی پڑھ چکے تھے۔ پھر شہر میں رہائش تھی چنانچہ ان پر شریعت کا غلبہ ہو چلا تھا۔ وہ صرف یہی نہیں کہ داڑھی رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ بت کی پرستش ان کی نگاہ میں شرک اور گناہ عظیم تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس معاملہ میں ماموں کی کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتے۔ غرضیکہ ان کی تنبیہ اور خفگی دیکھ کر دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے ان میں ایک بزرگ اور معمر آدمی تھے اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اسلام کے معبود کے ساتھ ساتھ ہندو دیوتا سے بھی عقیدت رکھتے تھے بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ والد صاحب ہیں کہ مانتے ہی نہیں تو ان میں سے ایک بوڑھا ان کو علیحدہ ایک طرف لے گیا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ اور اب دونوں میں مکالمہ شروع ہوا۔ والد صاحب نے کہا کہ بت کا پوجنا شرک اور گناہ ہے۔ بزرگ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں مرنے کے بعد کا حال کیسے معلوم ہے۔ کیا کوئی مرنے کے بعد واپس آیا ہے؟ والد صاحب اس سوال پر ذرا خاموش تھے۔ کہ گاؤں کے بزرگ نے دیوتا کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اگر کہیں مرنے کے بعد تمہارے خدا کی جگہ یہ بچ نکلا تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں والد صاحب نے پھر اپنا اسلامی عقیدہ دہرایا۔ مگر بزرگ کے سوال کی خاطر خواہ تردید نہ کر سکے بالآخر گاؤں کے بزرگ نے فصیح برج بھاشا میں والد صاحب کو نصیحت کی کہ جب مرنے کے بعد پتہ نہیں کیا ہوگا تو بہتر یہی ہے کہ دونوں کو خوش رکھا جائے۔ "پتہ ناہیں کہ داؤ ناکون کام آئے جا"۔ میں نے بڑے غور سے یہ جھگڑا، مشورہ اور باتیں سنیں اور بالآخر مجھے دیہات کے لوگوں کی خوش مذاقی اور دور اندیشی کا دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

۳

جامعہ چھوڑنے کے بعد میری زندگی میں ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا یعنی مہاراجہ الور سے میری ملاقات بلکہ دوستی ہوگئی۔ اس کی وجہ بہت ہو سکتی تھیں۔ اول تو میرے اجداد الور کے قدیم باشندے ہیں پھر ان میں سے بعض ریاست کے عہدوں پر ملازم رہے تھے۔ مگر سرسری ملاقات اور دوستی کی وجہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک تھی۔ اس سرسری ملاقات کے بعد مہاراج نے مجھے گرمی کی تعطیلات میں الور آنے اور شیر کے شکار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس سے آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مجھے شکار سے کوئی دلچسپی ہے۔ یا میں نے کبھی بندوق چلائی ہے۔ بہر نوع میں دو تین مہینے [illegible] کی گرمیوں میں مہاراج کے ساتھ رہے منصوری اور سرسکا محلوں میں رہا اور میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کروں کہ پہلی ملاقات میں مہاراجہ بے تکلف مجھے بہت بھا گئے۔ میں ہندو مسلم تفرقہ سے دل برداشتہ، یہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی بلکہ مسلک "صلح کل" پر عامل۔ میں مذہب کی رسموں سے متنفر، یہ روح تصوف و ویدانت کے دلدادے۔ مجھے برطانوی حکومت سے بغض، یہ دبی زبان سے ہندوستانی سوراج کے حامی اور بیماری کے زمانہ میں مولانا محمد علی کا علاج کرا رہے تھے۔ مجھے معاً یہ محسوس ہوا کہ میرا آبائی وطن الور اور اس کا حکمران خود میرے جذبات وطن پرستی اور آزادی کا ترجمان ہے اور اگر اس انداز میں کوتاہی تھی تو مولانا محمد علی کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی نے پوری کر دی۔ غرضیکہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد میں دوبارہ الور پہنچا تو مہاراجہ کا اصرار تھا۔ کہ اب مجھے ریاست میں ملازمت اختیار کر لینی چاہیے بالآخر یہ قرار پایا کہ میں سردست دو سال انگلستان میں تعلیم حاصل کروں چنانچہ میں [illegible] میں لندن جا کر بیرسٹری کے لیے لنکنس ان میں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیلیے علوم مشرقیہ کے اسکول میں داخل ہوگیا۔ خوش نصیبی سے میرے نگران سر ڈنزلی بیگ

مقرر ہوئے جو اعلیٰ پایہ کے مؤرخ ہونے کے علاوہ ادیب بھی تھے۔ اور مہاراجہ سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

مجھے لندن میں رہتے سال بھر سے کچھ ہی زیادہ ہوا ہوگا کہ مہاراجہ کے مشیر خاص راؤ راجہ امر سنگھ مہاراجہ کی جوبلی کی دعوت کے سلسلے میں انگلستان مہمانوں کو جانے کے لیے وارد ہوئے اور مولانا محمد علی اور میں دونوں اس موقع پر الور پہنچے۔ مولانا اس زمانہ میں میرے ساتھ لندن میں رہے تھے۔ مہاراجہ ہم دونوں پر مہربان تھے چنانچہ ہم دونوں سرکاری محل میں کچھ دن رہے۔ جب جوبلی کا زمانہ قریب آیا مہاراجہ نے مجھے ہندوستانی مہمانوں کا جن میں بیشتر راجہ اور نواب قسم کے لوگ تھے، نگران مقرر کر دیا۔ ان معززین کے کھانے کا کام ایک انگریز کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا تھا اور ہم فی کس ۲۵ روپے روز انہیں دو وقت کے کھانے کے لیے ادا کرتے تھے۔ ان کی تفریح کے لیے ہم نے ایک تھیٹر کو بھی دعوت دی تھی جسے ..... ۵۰ ہزار روپے پیشگی ادا کر دیے تھے۔ آپ کو اخراجات کا اس سے اندازہ ہوگا کہ ہم نے جوبلی کی رسوم پر تین دن میں تیس لاکھ خرچ کیا جو ریاست کی سالانہ آمدنی سے کچھ ہی کم تھا۔ مجھے البتہ پہلی بار اس جاگیری نظام اور حکمرانوں کا تجربہ ہوا جنہیں میں اور کانگریسی رہنما قومی آزادی اور خودداری کا ترجمان سمجھتے تھے۔

جوبلی کے ان تین دنوں میں میرا معمول تھا کہ میں شام کو ہر رئیس کے خیمہ پر حاضر ہوتا اور ان سے دریافت کرتا کہ انہیں اور ان کے عملہ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں۔ میں حسب معمول راجپوتانہ کے ایک مشہور حکمران کے شامیانہ پر حاضر ہوا۔ موصوف نفس نفیس خود تشریف فرما تھے۔ میں نے مؤدبانہ دریافت کیا کہ حضور کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ فرمانے لگے کہ مجھے ہر قسم کی راحت نصیب ہے۔ البتہ رات کا انتظام نہیں۔ میں سمجھا جاڑے کا موسم ہے شاید لحاف یا بجلی کافی نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی شکایت نہیں ہے۔ رئیس نے دوبارہ فرمایا کہ رات کا خیال مجھے اب کی بار میرا دھیان سامان نوشیدنی پر گیا میں سمجھا کہ شاید شراب کی ضرورت ہو۔ پتہ چلا کہ اس کی فراوانی ہے۔ جب انہوں نے تیسری بار وہی فقرہ دہرایا تو آخر میں تاڑ گیا کہ انہیں ایک حسینہ کی رات کو ضرورت رہتی ہے اور ہمارے فرائض منصبی میں اس کی فراہمی بھی شامل تھی۔ مجھے معذرت کرنا پڑی کہ اس کوتاہی کی تلافی مشکل ہے صرف دو دن اور صبر فرمائیے پھر اپنی ریاست میں پہنچ جائیے گا۔ البتہ مجھے خود اپنے مستقبل کے منصوبوں کو دہرانا پڑا۔

جوبلی جشن کا غالباً تیسرا دن تھا کہ میں اور مہاراجہ ان کی نئی ہسپانو سوئزا گاڑی میں وجے مندر محل سے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ خود مہاراجہ موٹر چلا رہے تھے تیسرا کوئی اور ہمارے ساتھ نہ تھا۔ محل سے نکلے ہی تھے کہ مہاراجہ نے ایکسیلیریٹر دبایا اور موٹر ۸۰ میل گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگی۔ مہاراجہ بالعموم اسی رفتار سے موٹر چلاتے تھے۔ سڑک سیدھی اور صاف تھی دونوں طرف سرکاری باغات کی پختہ چار دیواری نظر آتی تھی۔ دور سڑک کے بیچ میں ایک باوردی کانسٹیبل کھڑا ہوا انہیں اشارہ دے رہا تھا کہ چلے آؤ۔ صورت یہ تھی کہ اگر مہاراجہ کانسٹیبل سے بچ کر چلتے ہیں تو موٹر کے مڈگارڈ کا باغ کی چار دیواری سے رگڑ کھا کر خراب ہو جانے کا ڈر ہے۔ مگر باغ سے بچتے ہیں تو کانسٹیبل کی زندگی کا اندیشہ تھا۔ میں یوں بھی تیز موٹر کا عادی نہیں ہوں۔ میری نگاہ راستے پر جمی ہوئی تھی میں نے آناً فاناً میں صرف یہ دیکھا کہ ہم کانسٹیبل کو روندتے ہوئے ۸۰ میل کی رفتار سے گزر گئے۔ مہاراجہ نے بس ایک نظر مڑ کر لاش کو دیکھا اور واپسی پر بیوہ کے لئے ۵۰ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ شہر کے [illegible] لوگوں نے البتہ مہاراجہ کی دریا دلی اور انسان دوستی کی داد دی۔

جوبلی کے دو مہینے بعد مہاراجہ کا مشیر خاص اور سرکاری مہمان خانہ اور محلوں اور بھنڈاروں کا نگران مقرر ہو گیا۔ تقریباً ۵۰۰ آدمیوں

کا علاحدہ ماتحت کام کرتا تھا اس میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ منشی محرر۔ پہرے دار۔ فراش۔ صفائی والے۔ جمعداری وغیرہ۔ ایک دن شکایت آئی کہ مہمان خانہ کا ایک فراش اپنے کام پر بروقت نہیں آتا۔ عمارت میں سوتا ہوا پایا جاتا ہے جرم سنگین معلوم ہوتا تھا میں نے پیشی کا حکم صادر کر دیا یہ فراش جب میرے دفتر میں داخل ہوا تو میں بلا ارادہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ خیر تھی کہ کوئی دوسرا آدمی کمرہ میں نہ تھا۔ عمر ۷۰ برس کے قریب داڑھی سفید براق میں درگشتہ۔ مجھے اپنے بوڑھے دادا اور ان کی نورانی صورت یاد آ گئی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے اپنی کوتاہیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جی ہاں۔ مجھ سے خطا ہوتی ہے دراصل مجھ سے زیادہ دیر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میرے لیے جھکنا یا بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہے۔ ہانپنے لگتا ہوں میں نے بڑے میاں سے باتوں باتوں میں کہا کہ آپ ملازمت چھوڑ کر اللہ اللہ کیوں نہیں کرتے اس پر بڑے میاں رونے لگے اور ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بولے۔ سرکار میرے پاس زندگی گزارنے کے لیے پیسے نہیں ہیں میں نے حیران ہو کر پوچھا عمر کتنی ہے جواب ملا ۷۰ سال اور تنخواہ معلوم ہوا دس روپے ماہوار۔ مدت ملازمت؟ فرمانے لگے مجھے فراش کا کام کرتے ہوئے ۵۰ سال ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد میں نے مزید سوالات کر کے ان کا دل نہیں دکھایا البتہ چند دن پیچھے جب مہاراج شیر کے شکار کے لیے سرسکا روانہ ہو گئے تو میں دوسرے دن الور سے علی گڑھ واپس آ گیا۔

۴

۱۹۳۰ء کے آخر میں میں دوبارہ لندن وارد ہوا۔ میری زندگی کے غالباً یہ سب سے مسرت انگیز دن تھے اس لیے کہ اب افسانے سب ختم ہو چکے تھے اور میں تراشیدم، پرستیدم، شکستم کی منزلوں سے گزر چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جب میں مہاراجہ کا فرستادہ ہو کر آیا تھا تو میرے پاس ضرورت سے بہت زیادہ روپے تھے۔ اب میری آمدنی تین سو روپے ماہوار تھی جو کسی صورت سے کافی نہ تھی اور مجھے ایک وقت کا کھانا اور چائے ترک کرنا پڑی۔ مگر ہزار روپے ماہوار کی آمدنی سے زیادہ میری وہ دولت تھی جو سماجی اور ذہنی معتقدات کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ میں نے یوں بھی پہلے سری نواس آئنگر، مولانا محمد علی اور سکلتوالا کے ساتھ لندن کانگریس کمیٹی کے قیام میں حصہ لیا تھا۔ اب لندن آتے ہی میں ان رفیقوں سے ملا جو میری طرح فاقہ مستی میں دن گزارتے تھے اور مجھ سے بہت پہلے درد و خراش و عبرت انگیز تجربوں سے دوچار ہوئے بغیر ہی ایک مکمل فلسفۂ زندگی تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ دوسرے اتوار کو ہم سب لوگ پہلے شاپور جی سکلتوالا کے مکان پر اور وہاں سے واپسی پر ہائی گیٹ کے قبرستان میں پہنچے اور یہاں ایک نئے مرشد کے مزار پر عہد کیا جو ابھی تک باقی ہے۔ میری زندگی کا یہ دور نیا اور ماضی سے بالکل مختلف تھا۔

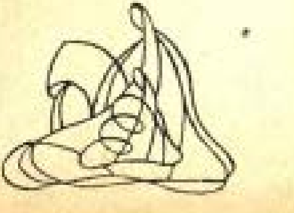

من متھ ناتھ گپت

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم ہندوستانی سیاست دانوں کو اس طرح متوجہ نہیں کر سکی تھی جس طرح دوسری جنگ عظیم نے متوجہ کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی سیاسی تحریک بہت کچی اور غیر واضح سی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کو اگر ہندوستان میں کسی نے سمجھا تھا تو انقلابی پارٹی نے جس نے شہنشاہیت کی جنگ کو آزادی کی لڑائی میں بدل دینا چاہا تھا مگر وہ ناکام رہی۔ تاہم اس کی یہ ناکامی اس وقت زریں حروف میں لکھی جائے گی جب ہندوستان کی سچی اور حقیقی تاریخ لکھی جائے گی۔

ہمارے نامی گرامی سیاست دانوں نے اتنا ہی سمجھا تھا کہ ہم لڑائی میں مدد دیں گے تو لڑائی کے بعد ہمیں اگر آزادی نہیں تو کسی نہ کسی طرح اس کی پہلی قسط ادا کر دی جائے گی۔ مگر اس کے برعکس ایک رولٹ کمیٹی بیٹھائی گئی۔ جس نے کچھ سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کا مطلب یہ لیا کہ ہندوستانیوں کو لڑائی میں جو تھوڑی سی بہت آزادی حاصل تھی، وہ بھی جاتی رہے۔

میں اس وقت تو عمر ۱۲ کا تھا اسکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر انہیں دنوں ایک حادثہ ہوا جس کی خبر ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہر بچے کو لگ گئی۔ رولٹ بل کے خلاف تحریک پیدا ہو گئی کہ یہ تو بڑا دھوکا ہوا۔ ہم نے نیکی کی مگر اس کے بدلے میں ہمارے ساتھ بدی کی جانے والی ہے۔ گاندھی جی انہیں دنوں آسمان ہند پر چاند کی طرح ظاہر ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ پرانے ڈھنگ کے جتنے بھی لیڈر رہتے تھے وہ سب خالی کارتوس ثابت ہوئے۔ ان کے پاس تو ایک ہی ہتھیار تھا، خوشامد اور گدا گری، عرضی پرچی اور بہت ہوا تو ولایت بھیج کر کسی سے تحریک چلوا دی یعنی دو چار جلسے کرا دیے۔ جن کی رپورٹ بھی ٹھیک طرح وہاں کے اخبارات میں شائع نہیں ہوتی تھی۔

ایسی حالت میں گاندھی جی سامنے آئے اور انہوں نے عدم تعاون کا نعرہ لگایا۔ اسی سلسلے میں وہ پنجاب جا رہے تھے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ گاندھی جی نے اس غیر منصفانہ حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر وہ پکڑ لیے گئے اور پلول اسٹیشن سے اسپیشل گاڑی کے ذریعہ، ادھر ہی بمبئی واپس کر دیے گئے۔

بنارس میں مجھ جیسے بچوں کو بھی اس کی خبر لگ گئی اور اسی زمانے سے گاندھی جی ہمارے خیالی ہیرو ہو گئے۔

اس کے بعد ہی اطلاع آئی کہ جلیانوالہ باغ میں گولی چل گئی۔ برٹش حساب سے تین سو آدمی مارے گئے تھے، لیکن حقیقت میں ایک ہزار آدمیوں کی جانیں ختم ہوئی تھیں۔ کتنے ہزار تو زخمی ہو کر رات بھر وہیں پڑے کراہتے رہے۔ انہیں نہ کسی قسم کی امداد دی گئی اور نہ دینے دی گئی۔

بچپن میں جیل

جیسا کہ میں نے ان دنوں محسوس کیا، عام سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی کا معتقد ہو گیا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مجھ جیسا ایک لڑکا کس طرح ان کی کچھ خدمت کر سکتا تھا۔ میں چوری چھپے کو ماڈرن ریویو اور دیگر اخبار پڑھتا اور گاندھی جی کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ جو کچھ معلوم ہوتا رہا اس سے میری عقیدت میں اور بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور بھی خواہش ہوتی کہ میں کچھ کروں۔ مجھے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ گاندھی جی کا کام تو بڑا ہے

کہ اس میں میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ اسی جذبے کے زیرِ اثر محض تیرہ سال کی عمر میں کس طرح جیل پہنچا اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

خلافت

جلیانوالہ کے خونی حادثہ کے ساتھ ایک اور واقعہ جڑ گیا، وہ تھا خلافت کی تحریک۔ گاندھی جی نے ہندی مسلمانوں کو ساتھ ملانے کے لیے اس تحریک کو رولٹ بل کی مخالف تحریک میں جوڑ دیا۔ سب لوگ اس سے خوش تھے کہ مسلمان ہمارے ساتھ آگئے ہیں۔ ہمارے بڑے بوڑھے خوش تھے ہم لوگ بھی خوش تھے۔ پہلے جب کبھی سننے میں آتا تھا کہ مسلمانوں نے فلاں پیپل کو کاٹ دیا ہے تو اس پر غصہ آجاتا تھا ہم بچوں کو بھی غصہ سا آتا تھا۔ لیکن اب آپس کے جھگڑے بھلا کر ہندو مسلمان ایک ہو گئے تھے یہ بہت ہی نیک فال تھی۔

اس اتحاد کا اصل رنگ چند ہڑتالوں میں ہوا۔ یہ ہڑتالیں غدر کی لڑائی کے بعد ہندوستان کی پہلی انگریزوں کی خلاف تھیں۔ ان ہڑتالوں کی کامیابی نے یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر ایک نئی قوت کا طلوع ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کی امداد اس میں بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ اگر مسلمان ساتھ نہ دیتے تو یہ ہڑتالیں ملک بھر کی ہڑتالیں نہ ہو پاتیں اور پہلے سے ہی جاری تحریک ہندو تحریک ہو جاتی۔ جیسا کہ بعد میں ہندی مسلمانوں کی ناراضی اور کچھ حد تک ان کے رہنماؤں کے برٹش اشاروں پر چلنے کی وجہ سے ہو گئی۔

ہڑتالوں کے بعد یہ نعرہ لگایا گیا کہ خطابات اور اسناد کو واپس کیا جائے۔ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کیا جائے۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا جائے۔

آخری کام ایسا تھا جس میں ہم بخوشی حصہ لے سکتے تھے۔ میرے والد صاحب بھی ایک اسکول میں استاد تھے۔ ان کیلئے اسکول چھوڑنا آسان نہیں تھا کیوں کہ خاندان کی روٹی کا سوال تھا مگر انہوں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔ ایک یا دو ٹیوشن تھے، صرف انہیں کا سہارا رہ گیا تھا۔ ساتھ ہی ہم دونوں بھائیوں نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔

ہزاروں طلباء نے اسکول چھوڑا۔ گو ان میں سے تقریباً ایک ہزار کے علاوہ بنارس کے تمام اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں میں لوٹ گئے، لیکن جو رہ گئے ان کا ایک اسکول اور بعد میں چل کر ایک کالج بنا۔ بابو شیو پرشاد گپت نے لاکھوں کا چندہ دیا، بابو بھگوان داس اپنے بیٹے شری پرکاش جی کے ساتھ آگے بڑھے اور اس طرح "کاشی ودیا پیٹھ" کا قیام عمل میں آیا۔

اس سے قبل ہی ایک اسکول کھلا تھا جس کا نام گاندھی اسکول تھا۔ میں اسی کا طالب علم تھا۔ آچاریہ کرپلانی اس کے صدر تھے [illegible] شرما وغیرہ اساتذہ تھے۔

یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جن طلباء نے ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی پکار سن کر اپنے اسکول اور کالج چھوڑ دیے تھے ان میں سے بہت تھوڑے گاندھی اسکول میں شریک ہو سکے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی منموہن اسی اسکول میں پڑھتے رہے۔ اس کا فخر میرے والد صاحب کو حاصل ہے۔ اس تحریک میں انہوں نے جس طرح حصہ لیا تھا اور ملازمت ترک کر کے کود پڑے تھے، اس سے گھر کی حالت بہت ہی بگڑ گئی تھی۔ جنگ کے بعد اشیاء ویسے ہی کافی مہنگی ہو گئی تھیں، زندگی بہت ہی دوبھر ہو گئی تھی۔ اگر میں کہوں کہ ہم لوگوں کو ان کی قربانی کے سبب تقریباً روٹیوں کے لالے پڑ گئے تھے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ میرے والد محترم پھر زندگی میں اٹھ ہی نہیں سکے۔ بعد کو نہایت قابلِ رحم حالت میں غالباً تپ دق میں مرے۔ میں ان کی مصیبت کو دیکھ نہیں سکا کیوں کہ میں اس کے نو سال بعد جیل سے رہا ہوا اور میرے دو مخلص دوستوں نے میرے پاس خاطر سے بہت سی آئیں

ہم بھائیوں سے چھپایا، ان کا انتقال ہوا۔ جب کہ ایک طرف میں بریلی سنٹرل جیل میں کاکوری کی سازش کی لمبی سزا کاٹ رہا تھا اور من موہن بہت دور، بارہ بنکی جیل میں اسی لاہور بم کے سلسلے میں اپنی قید کے دن گزار رہے تھے۔ میری والدہ محترمہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ تو ۱۹۲۱ء میں میرے جیل جانے سے قبل ہی گزر گئی تھیں۔

اللہ اکبر

ہم گاندھی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس اثنا میں ملک عدم تعاون کی راہ پر گامزن رہا۔ ان دنوں صرف مہاتما گاندھی کی جے، بھارت ماتا کی جے، علی بھائیوں کی جے، اس وقت تک زندہ باد کا نعرہ نہیں چلا تھا جسے بھگت سنگھ نے بعد میں رائج کیا، یہی دو چار نعرے تھے۔ یہ نعرے ہر طرح سیاسی تھے مگر ان کے ساتھ اس زمانے میں اللہ اکبر بھی چلتا تھا، جو مناسب نہ تھا کیونکہ یہ مکمل طور پر مذہبی نعرہ تھا۔ ہم لوگوں کو اللہ اکبر کہتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہم مسلمانوں کو اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔ بعد میں مسلمانوں کو مذہبی شدت کے نظریہ کا جو انجام ہوا وہ تو ہم سبھی جانتے ہیں۔ کچھ حد تک ہندو اس لیے مجرم تھے کہ انہوں نے قومی تحریک کو ہندو تحریک کی شکل دی۔ اس میں ان نشانات وغیرہ کو سامنے رکھا جو خالصتاً ہندوؤں کے تھے مگر ساتھ ہی مسلمان بھی سولہ آنے مجرم تھے کہ جب وہ قومی تحریک میں آتے تو خلافت جیسے مطالبے کرتے جو کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اور جسے دوسرے ملک کے ترقی یافتہ مسلمانوں نے خود ہی ٹھکرا دیا۔

ننھی دلیل

ہم لوگ اسکولوں میں چرخا کاتنا بھی سیکھتے رہے۔ ایک چرخا کلاس بھی ہوتا تھا۔ ہمارے اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کلی جنگ کی تیاری جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ جو لڑائی ہو گی ہمیں ہماری فتح ہو گی۔ اس اثنا میں ہم لوگ معمولی درسی مضامین کے ساتھ ساتھ رسکن، ٹالسٹائی، تھورو، ایمرسن، لنکن، گیری بالڈی کے بارے میں تقاریر سنتے رہے۔ باہر سے بھی رہنما آتے تو ہم ان کی تقریر سنتے۔ ہمارے ننھے دل پر کیسی کیسی باتیں اثر کرتی تھیں اس کا ایک نمونہ پیش کروں۔ ایک دن گیان واپی میں تقریر ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ رام نے راون کو، کرشن نے کنس کو مارا، اسی طرح گاندھی گورنمنٹ کو مارے گا۔ اس دلیل کا ہم پر اتنا اثر ہوا کہ آج تک وہ یاد ہے۔ بڑے بڑے اقتصادی اور سیاسی دلائل فراموش ہو گئے، مگر یہ یاد ہے۔

یہ طے ہوا کہ گاندھی اسکول میں پڑھتے ہوئے ہم جو کام کر رہے تھے، وہ تو کر ہی رہے تھے مگر تعطیل میں دوسری طرح کا کام بھی کریں اور ساری تعطیل اسی میں ختم کر دیں۔ بڑے لیڈروں کے مقابلہ میں گاندھی جی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ دیہات کے بغیر ہندوستان آگے نہیں بڑھ سکتا۔

پروگرام یہ بنا کہ ہم اسکول کے طلبہ کا ایک وفد اودھ کے گاؤں میں جا کر کانگریس کا پیغام سنائے۔ اودھ کو غالباً اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ وہاں کے کسان بہت ہی مصیبت زدہ تھے۔ کسانوں میں سے کچھ لوگ خود بخود اپنے بھائیوں کی رہنمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مثلاً بابا رام چندر، اور دیو نارائن، جو ان دنوں اتنے صاحب اثر ہو گئے تھے کہ کھڑے کھڑے کسانوں سے بازار لٹوا سکتے تھے۔

بابا رام چندر کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا مگر ان کے ساتھی دیو نارائن سے میں کئی بار ملا۔ بابا صاحب میں تنظیم قائم کرنے کی صلاحیت تھی۔ انہوں نے اودھ کے کسانوں کو متحد ہو کر آواز اٹھانے کی تعلیم دی۔

بچی سے ساٹھ تک

اودھ کے تعلقہ دار اور زمیندار کس قدر ظالم تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کچھ عرصہ بعد جیل میں ایک ایسے تعلقہ دار کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جو راجہ صاحب کہلاتا تھا۔ اور دفعہ ۴۰۰ یعنی گروہ بندی کے جرم میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس گروہ نے سینکڑوں ڈاکے ڈالے تھے۔ اسی گروہ کے ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے میرا تعارف ہوا جسے کالے پانی کی سزا ملی تھی۔ اس شخص کے بارے میں دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ جنسی لحاظ سے سنچری پوری کر چکا تھا یعنی ایک سو ساٹھ سے زائد عورتوں سے جنسی تعلق قائم کر چکا تھا اس کا کہنا تھا کہ اس کی جنسی زندگی کا شکار بارہ سال کی بچی سے لے کر ساٹھ سال کی بڑھیاں تک تھیں۔ راجہ صاحب اپنے گروہ کے سرغنہ تھے جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ چوری سے سگریٹ کی صورت میں چرس پی سکتا تھا اور وہاں بھی عیش و آرام اسے حاصل تھا۔

اب میں مختصر طور پر یہ بیان کروں کہ ہم طلبہ گرمیوں کی چھٹی میں کس طرح اودھ کے ضلع میں کانگریس کا پیغام پہنچانے کے لیے چل گئے۔ چھٹیوں سے دو ہفتہ پہلے ہی ہمارے استاد وچتر نارائن شرما نے ان طلبہ کی الگ میٹنگ بلائی جو چھٹیوں میں رضاکار بن کر کام کرنا چاہتے تھے رضاکار بننے کی ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ والدین کی رائے سے ہی طلبہ رضاکار بن سکتے تھے۔ جو تقریباً چودہ طالب علموں نے میٹنگ میں شرکت کی۔

وچتر نارائن صاحب خود جوشیلے تھے اور دوسروں کو جوش دلا سکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا، اس کا اختصار یہ ہے —— "پہلے آپ جب سرکاری اسکولوں میں تھے تو ان چھٹیوں میں آپ کی تفریح ہوتی تھی۔ مگر قومی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے ملک کو آزادی حاصل ہونے تک آپ کو کوئی چھٹی نہیں مل سکتی۔ گاندھی جی نے کہا ہے اگر ایک کروڑ ممبر بن جائیں اور ایک کروڑ روپے تلک سوراج فنڈ میں آ جائیں تو ۳۱ دسمبر کی رات تک آزادی حاصل ہو جائے گی"۔

مقرر نے یہ یقین دلایا کہ یہ چھٹی بڑی ضرور دلچسپ ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی متنبہ کر دیا کہ دیہات میں ہماری زندگی کچھ آرام کی زندگی نہ ہوگی۔ ہم گرفتار ہو سکتے ہیں، مارے جا سکتے ہیں، جیل میں بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں قتل بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ دشمن بہت ہی چالاک ہے۔

اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ ان کی یہ تقریر ہمارے جوش میں کمی پیدا نہیں کر سکی۔ وچتر بھائی روز ہمارے سامنے تقریر کرتے تھے اور ہمارا دل فولاد کی طرح سخت ہوتا جا رہا تھا۔ ہمیں اودھ بھیجنے کا پروگرام طے ہوا اور یہ ہدایت کی گئی کہ ہم کانگریس کے ممبر بنائیں اور تلک سوراج فنڈ کے لیے چندہ جمع کریں۔ ہم لوگوں کے علاوہ ہمارے کچھ اساتذہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم سبھی لوگ تیسرے درجے میں سلطان پور روانہ ہو گئے۔

ڈاکوؤں سے زیادہ خطرناک

اس زمانے میں سلطان پور کے سب سے بڑے وکیل یوگیت سہائے نے ہم لوگوں کو ٹھہرا دیا ہمیں ایک مکان دے دیا اور فوراً زور و شور کے ساتھ کام شروع ہوا۔ ہمارے گھر کا نام گاندھی آشرم رکھا گیا۔

سلطان پور میں پہلے ہی سے دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ جس کی وجہ سے جلسہ وغیرہ نہیں ہو سکتا تھا جیل کے دروازے ہمارے لیے بالکل سپاٹ کھلے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہم چاہتے تو شہنشاہیت کے جبڑے میں داخل ہو سکتے تھے لیکن اس سے کچھ نہ بنتا۔ اس زمانے میں ہمارے اخبارات بھی جاندار نہ تھے اس لیے کچھ پروپیگنڈا بھی نہ ہوتا۔ اس کے پیش نظر ہمیں یہ ہدایت ملی تھی کہ ہم دفعہ ۱۴۴ نہ توڑیں۔

ایک ایک تحصیل کے لیے دو دو آدمی منتخب ہوتے۔ ایک کالج سے چھوٹا ہوا طالب علم اور ایک اسکول سے نکلا ہوا طالب علم۔ مجھے امیٹھی جانے کا حکم ہوا۔ تھیلے کے علاوہ ہمارے پاس کانگریس کے ممبر بنانے کی کچھ کاپیاں اور بابو گیت سہائے کے دیے ہوئے کچھ نقدی

خطوط تھے۔ یہاں سے امیٹھی پہنچے تو دیکھا ہمارے استقبال کو خفیہ پولیس والے لگے ہیں۔ مگر وہ کر کچھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کوئی قانون نہیں توڑ رہے تھے۔

کانگریس کی ممبری فیس صرف چار آنے سالانہ تھی پھر بھی ممبران کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہمیں بہت کم کامیابی ہی مگر یہ ناکامیابی کامیابی سے بڑھ کر تھی کیونکہ لوگوں کے کانوں میں گاندھی، کانگریس، خلافت، سوراج وغیرہ کے نام پڑ رہے تھے۔

امیٹھی تو پھر بھی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں کانگریس کے دو ایک مقامی خیر خواہ پیدا کرتے ہوئے ہم اور بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں کی طرف بڑھتے۔ ہم کام بہت کم کرتے تھے ان نئے ناموں اور نظریات کو ہر سانس کے ساتھ ان گاؤں میں پھیلا رہے تھے جہاں ہزاروں سال سے کوئی ایسی بات نہیں پہنچی تھی۔

سرکار انگریزی نے ہر ممکن ذریعہ سے ہمارے کام کو مشکل تر بنا دیا تھا۔ چوکیداروں، پٹواریوں، مکھیوں کے ذریعہ بتا دیا گیا تھا کہ ہم سے بات چیت کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو کچھ بھلے لوگ نہایت نرمی سے یہ کہہ دیتے کہ آپ لوگ یہاں داخل ہونے کی زحمت نہ کریں۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ ہم لوگ ڈاکوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں لیکن وہ ہمارے چہروں کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ ساری بات جھوٹ ہے۔ ہماری باتوں کو گاؤں والے دھیان سے سنتے بھی تھے۔

چمار کے مہمان

اس طرح ہم ایک ایک دن میں خوفناک لو کے باوجود کئی کئی گاؤں میں گاندھی جی کا پیغام پہنچاتے رہے۔ جب تھک جاتے تو کسی کنویں کے کنارے بیٹھ کر ستو اور گڑ کھا لیتے۔ کبھی کبھی کوئی دیہاتی روٹی بھی کھلا دیتا۔ ایک ایسے گاؤں کی یاد آتی ہے جہاں ہم نے ایک رات ایک چمار کے یہاں قیام کیا تھا۔ اس بیچارے کے پاس نہ پیتل کانسے کے برتن تھے نہ گیہوں کا آٹا۔ اس نے کہیں سے آٹا مانگ کر ہمیں کھلوایا۔ اس نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ اپنی روٹی خود پکا لیں مگر ہم نے اسی کی گھر والی کے ہاتھ کی روٹیاں کھائیں۔ ہم لوگ اس طرح سیاسی مقاصد کے علاوہ اور بہت سی دیواریں بھی توڑتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں خود ابھی تک چھوت چھات کے ذہنی بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے لفظ "ہم" میں مَیں کو سب سے پیچھے سمجھا جائے۔

ہماری سب سے زیادہ مخالفت قدرت نے کی۔ یہ خیال تو بہت دلکش تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں کانگریس کا پیغام گاؤں گاؤں پہنچانے میں بسر کی جائیں لیکن زیادہ قابل عمل نہیں تھا۔ چلتی ہوئی لو میں جب گرم ہوا اور باد سموم منہ پر تمانچے مارتی تھی اس وقت ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا بہت تکلیف دہ تھا۔ خود کاشتکار بھی ایسے وقت باہر نہیں نکلتے۔

چنانچہ ایک بار اسٹیشن سامنے پاکر اور یہ جان کر کہ گاڑی پریاگ سے سیدھی بنارس کی طرف جا رہی ہے میں کام چھوڑ کر گھر بھاگ گیا۔ جب ٹنڈن صاحب نے ساری بات سنی تو انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ رہے۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے غلطی کی ہے ——— اور زیادہ سے زیادہ دو راتیں گزار کر واپس اپنی ٹولی پر لوٹ گیا۔ پھر جب تک چھٹیاں ختم نہیں ہو گئیں بارش شروع نہیں ہو گئی میں نہایت مستعدی سے گاؤں گاؤں کانگریس کا پیغام پہنچاتا رہا

ایک بار میں پھر طالب علم بن گیا مگر کچھ ہی دن کے لیے..........

سوراج کی جھلک

کانگریس اپنا کام کرتی رہی۔ جہاں تہاں گرفتاریاں بھی ہوتی رہیں۔ ایسے وقت میں غالباً کچھ لال بجھکڑوں نے برٹش سرکار کو سمجھایا کہ برطانیہ کے شہزادے پرنس آف ویلز کے ہندوستان آتے ہی اور ان کا ٹھاٹھ دیکھتے ہی سب باغیان حکومت اس کے بہی خواہ اور ہمدرد بن جائیں گے اور بوکھلائی ہوئی برٹش سرکار نے اس بات کو مان لیا۔ چنانچہ شہزادے ہندوستان تشریف لائے۔ اس دن بمبئی میں فسادات ہو گئے۔ مسز سروجنی نائیڈو، مہاتما جی اور دوسرے رہنما ہجوم میں گھس گھس کر لوگوں سے منتشر ہو جانے کی اپیل کر رہے تھے مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ گاندھی جی نے اس کی تلافی کے لیے پانچ دن تک بھوک ہڑتال کی۔ انہیں دنوں گاندھی جی نے کہا ——— میری ناک میں سوراج کی بھبک آ رہی ہے۔

اس طرح مہاتما جی نے تحریک کو انقلاب یا بغاوت ہونے سے بچایا۔ اچھا کیا یا برا، اپنے سوچنے کا انداز ہے کیونکہ انقلاب سب کے لیے نعمت ثابت نہیں ہوتا۔

شہزادے دورہ کرکے کاشی (بنارس) جانے والے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو میں معمول کے مطابق اسکول گیا۔ راستے میں دیکھا تو چاروں طرف پولیس والوں کی لال پگڑیاں پھیلی ہوئی نظر آئیں۔ اسکول میں داخل ہوا تو اساتذہ بہت جوش میں معلوم ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ آج چھٹی رہے گی۔ کتابیں سنبھال کر میں گھر لوٹنے ہی والا تھا کہ ایک استاد نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میرے ساتھ تقریباً ایک درجن طلباء رہ گئے اور باقی سب چلے گئے۔ ہم ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ وہاں ہمیں یہ بتایا گیا کہ موقع بہت نازک ہے۔ ہم یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے لیکن ماسٹر صاحب تھے کہ کہے ہی جا رہے تھے۔

بالآخر انہوں نے یہ بتایا کہ صوبائی کانگریس کمیٹی کے کچھ پرچے آئے ہیں۔ جن میں شاہزادے کا بائیکاٹ کرنے کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ ہم سے پوچھا گیا کہ ہم ان پرچوں کا تقسیم کرنا پسند کریں گے یا نہیں، کیونکہ انہیں تقسیم کرتے ہوئے ہم گرفتار ہو سکتے ہیں۔

ہمیں پرچے دیدیے گئے اور الگ الگ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ کس کس کو کس سڑک پر پرچے تقسیم کرنا ہیں۔ میں پرچوں کا بنڈل لے کر جلدی جلدی بھاگا مجھے گودولیا (بنارس کے ایک محلے کا نام) سے دشاشومیدھ (ایک مشہور گھاٹ) تک جو سڑک جاتی ہے اس پر تقسیم کرنا تھی پرچے ہندی میں تھے گو میں نے تقسیم سے پہلے پڑھ نہیں دیکھا کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ مجوزہ مقام پر پہنچ کر ہم نے اپنا کام شروع کیا۔ لوگوں نے پرچے لیے لیکن ان کے چہروں سے کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں مایوس ہوا۔ میں نے گودولیا سے شروع کرکے دشاشومیدھ تک تمام پرچے تقسیم کر ڈالے۔ اپنے لیے بھی ایک پرچہ نہیں رکھا۔

اب میں لوٹ کر یہ دیکھنے لگا کہ کوئی پرچہ پڑھ رہا ہے یا نہیں۔ مجھے مسرت ہوئی کہ کچھ لوگ پڑھ رہے ہیں اور ایک ایک پرچے والے کے قریب کئی کئی دوڑے ہیں۔ گھومتے گھومتے میں نے دیکھا کہ چاروں طرف پولیس پھیل گئی ہے۔

پولیس بھی کچھ مستعد ہو رہی تھی۔ تقسیم پرچہ جات کے بعد کھسک جاؤں، اس لیے ادھر ادھر ٹہل کر دیکھ رہا تھا کہ کیا تحقیقات ہوتی۔ اس اثنا میں پولیس والوں کو پتہ لگ گیا کہ میں نے ہی پرچے تقسیم کیے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کئی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ ایک پولیس والا میری طرف بڑھا۔ میں اس صورت کے لیے تیار تھا، مگر فوراً ہی میں نے کچھ محسوس کیا جس سے میں نے سمجھ لیا کہ میری زندگی کا بہت بڑا موڑ آ گیا۔ اس نے مجھ سے تھانے چلنے کو کہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں پولیس والے کے ساتھ تھانے کی طرف چلا اور میرے جلو میں ایک ہجوم بھی چلا جو مہاتما گاندھی کی جے اور بھارت ماتا کی جے وغیرہ نعرے لگا رہا تھا۔

جیل کی پہلی رات

میں جب سڑک سے گرفتار کر کے چوکی پر پہنچایا گیا تو میں نے دیکھا ایک چھوٹی سی بھیڑ جمع ہو گئی ہے اور لوگ بڑے زور زور سے مہاتما گاندھی کی جے اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے چوکی میں بس ایک طرف رکھا گیا جب تک لوگوں کا ہجوم منتشر نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے وہاں سے تقریباً ایک میل دور دوسری چوکی پر لے جایا گیا۔ جس کا نام یوں تو کھاڑی کی چوکی تھا پہلے وہ چاہے چوکی ہی ہو لیکن اب تو باقاعدہ ایک تھانہ تھا۔ وہاں جاتے ہی معلوم ہوا کہ ہمارے گاندھی اسکول کے دوسرے ساتھی جو تقریر پر جماعت کے لیے بھیجے گئے تھے ان میں سے کئی وہاں موجود ہیں۔ اس سے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ آہستہ آہستہ دل سے تنہائی کا احساس دور ہوا۔

تھوڑی دیر میں ان لوگوں میں لے جایا گیا جو گرفتار ہو کر آئے تھے یا آتے جا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کو میں نے پہلے دیکھا تھا اور کچھ سے تعارف نہیں تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے بہت قریب ہیں بلکہ سب سے زیادہ قریب۔

تھوڑی دیر تھانے میں رکھنے کے بعد ہم لوگوں کو باہر نکالا گیا اور جیل بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی میں نے اپنے والد کو باہر کھڑے دیکھا۔ مجھے ہتھکڑیوں میں دیکھ کر انہیں بہت صدمہ ہوا تھا۔ اگرچہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ کہہ ہی گئے اگر میں ضمانت پر رہا ہونا چاہوں تو وہ ضمانت کر سکتے ہیں جانتا تھا کہ وہ یہ بات چاہتے نہیں تھے تاہم ایک بار میں نے سوچا کہ شاید وہ محبت پدری کے سبب کچھ تشویش کر رہے ہیں۔ یا شاید مجھے موقع دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ضمانت پر رہائی نہیں چاہتا۔

بھیجا کی بو

تھوڑی ہی دیر میں ہم ضلع جیل پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کو لوہے کا ایک ایک تسلا، ایک ایک کٹوری، لوہے کا پیالہ اور دو کمبل دیئے گئے۔ یہی ہمارا سامان تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو روٹی بٹ چکی تھی۔ بیرک میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بھیجا کی بو ہے گوشت وغیرہ تو افسران کھا لیتے تھے اس لیے بکروں کی بھیجا ہی قیدیوں کے حصے میں آتی تھی ہم لوگوں کو بھی روٹیاں اور بھیجا دی گئی۔ اگرچہ یہ کھانا عجیب لگ رہا تھا مگر ہم سب حلق تلے اتار کر ڈکار گئے۔ اس کے بعد ہاتھ منہ دھو کر بچھونے پر لیٹ گئے۔ رات ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا ہو گیا۔ اب بیرکوں میں گنتی شروع ہو رہی تھی۔ بیٹھے ہوئے قیدی بیرک کے بیچ میں بیٹھا جاتا تھا اور چلا چلا کر کہتا تھا ——— ایک ——— دو ——— تین ——— چار ——— آخر میں اپنے کو گن کر کہتا تھا ——— اور ہم ۔ اتنے قیدی "۱۱۱"۔ جنگلا، لالٹین سب ٹھیک ہیں حضور۔

بہت ہی عجیب حالت تھی۔ کچھ دیر تک ہم اس کا لطف لیتے رہے۔ ویسے مجھے مجموعی طور پر تقریباً ڈیڑھ سال جیل میں گزارنا تھے

میں اور میرا ادب

ایک مصنف کی حیثیت سے میری زندگی کے تجربات بہت وسیع ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ مبالغہ ہرگز نہیں سمجھا جائے گا۔ "پتنگا کاغذ" میں میری شائع شدہ تحریروں کی ضخامت تقریباً دس ہزار صفحات کے برابر ہو گی۔ اور غیر مطبوعہ تصنیفات بھی اسی قدر ضخامت رکھتی ہوں گی۔ موضوع کے اعتبار سے میں نے ناول، تنقید، فلسفہ، جنسیات، بچوں کا ادب، سوانح نگاری، صحافت وغیرہ سبھی موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ بہرحال زمانہ میں نے ایک دور پہلے سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مصنف کی حیثیت سے میری زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب میری عمر صرف تیرہ یا چودہ سال تھی۔ اس وقت میری تحریروں سے میری معاش کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کے بعد بھی برسوں تک مجھے اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آخر زمانہ میں یہی میرا ذریعہ معاش بن جائے گی۔ یہی سوچتا تھا کہ پولیس کی گولیوں سے جیل یا بھوک ہڑتال میں مر جاؤں گا۔ مستقبل کی فکر اور بالخصوص ذریعہ معاش کا خیال نہ تھا۔ اس وقت تو ہر روزگار کے بھروسے ہی سے کٹ رہی تھی۔ غربت البتہ ضرور تھی لیکن ضرورت بھی کچھ ایسی نہ تھی۔

پہلے میں صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے لکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ لکھنے کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا بلکہ اگر یوں کہیں کہ اس میں چھپنے کے شوق کو زیادہ دخل تھا تو شاید یہ بات حقیقت سے بہت ہی قریب ہو گی۔

تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں میری سیاسی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔ اس زندگی کو سیاسی کے بجائے سپاہیانہ زندگی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ بہر حال ان دونوں میں ظاہری طور پر بھی سر پر کفن باندھے ہوئے انقلابی تھا۔ ان دنوں بھی برابر لکھتا رہا۔ میں بنگلہ میں لکھتا تھا اور انگریزی میں بھی لکھتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں پہلی بار میں جیل گیا اور اسی زمانہ میں پہلی بار ہندی میں لکھا۔ ان دنوں جیل میں میرے ساتھ جناب بیچن شرما "اگر" اور جناب رام ناتھ "سمن" جیسے لوگ تھے جو ہندی ادب میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔

انقلابی پارٹی

جب گاندھی جی نے چوری چورا کے تشدد کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں تحریک روک دی تو عدم تعاون کی تحریک اور اس کے لائحہ عمل سے میرا یقین اٹھ گیا اور میں انقلابی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ ادبی مضامین لکھنا جاری رہا مگر اب اس کے ساتھ ساتھ میرا قلم انقلاب کی خدمت میں لگ گیا۔ انہیں دنوں جناب شچیندر ناتھ سانیال نے گاندھی جی کے نظریہ اہنسا کا مضحکہ اڑاتے ہوئے انہیں ایک خط لکھا۔ گاندھی جی نے اپنے ہفت روزہ اخبار "ینگ انڈیا" (YOUNG INDIA) میں اسے شائع کر دیا اور جواب بھی دیا۔ انہوں نے کچھ نئے سوالات اٹھائے جن کا جواب دینا ضروری تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ جناب سانیال نے ان کا جواب نہیں دیا تو ڈر کے ایک خط میں نے گاندھی جی کو جواب لکھ بھیجے۔ وہ خط بھی شائع ہوا اور گاندھی جی نے اس کا جواب بھی دیا۔ اسطرح دو تین بار خط و کتابت رہی۔ اس وقت یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شچیندر بابو پہلے خط کے کاتب تھے اور میں بعد کے خطوط کا۔ گاندھی جی بھی نہ جانتے ہوں گے کہ ان خطوط کے کاتب ایک نہیں بلکہ دو شخص ہیں۔ صرف پارٹی کے تھوڑے سے لوگ اس راز سے آگاہ تھے۔ یہ خطوط مع جوابات شمالی ہندوستان کے تمام اہم اخباروں میں شائع ہوئے اور لوگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق ان پر تنقید بھی کی۔

ان خطوط کی اشاعت سے میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ میں اسی سے خوش تھا کہ میرے خطوط کی اشاعت ہوئی مجھے اس بات کی خواہش نہیں تھی کہ لوگ یہ جانیں کہ خطوط کا مصنف کون ہے۔

کاکوری سازش

اس کے بعد جب میں ۱۹۲۵ء میں کاکوری کی سازش میں گرفتار ہو گیا اور مجھے مسلسل بارہ سال جیل میں رہنا پڑا تو مجھے لکھنے کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ کچھ آسانیاں حاصل کی گئیں اور لکھنے کا فن مجھے قید کی زندگی گزارنے میں کافی معاون ثابت ہوا۔ میں نے جیل میں کئی کتابیں لکھیں اور جب ۱۹۳۷ء میں مجھے رہائی ملی تو ان میں کئی کتابیں شائع ہو گئیں۔

اس کے بعد مجھے جنگ کے خلاف تقریر کرنے پر دو سال کی سزا ہوئی۔ لیکن برٹش انصاف اتنا معقول تھا کہ سزا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی مجھے سات سال تک جیل میں رکھا گیا۔ اور نظر بندوں کی آخری ٹولی کے ساتھ میں ۱۹۴۶ء میں رہا کیا گیا۔ اب کی بار میں نے بہت کچھ لکھا تھا۔

پہلی طویل قید کے زمانہ میں جو کچھ میں نے لکھا تھا اس میں میرا تجارتی مقصد نہیں تھا۔ جو اچھا سمجھا لکھتا رہا۔ ہاں جیسا کہ میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں میں کبھی غیر جانبدار مصنف نہیں رہا۔ میری طرفداری ہمیشہ انقلاب کی اور جمہور کی طرف داری رہی۔

دوسری طویل قید کے زمانہ میں میرے سامنے کاروباری مقصد آ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کتابیں پیش کروں گا وہ اقتصادی نقطۂ

نظر سے مفید ہوں گی یا نہیں، پھر بھی میں نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد سماجی اور سیاسی انقلاب کو بڑھانا تھا۔ "گرہ بند" "دھار" "جنگلی زندگی" اور "بیچ"میں میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور فرقہ بندی ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ "زہر" میں جنگ ۱۹۴۲ کے انقلاب کے حسن و قبح کو ظاہر کیا ہے۔ "اوسان" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جوا، قتل اور جرم کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ "سدا بہار" میں ایک فن کار کی زندگی کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ "سید بہار" میں امریکی جمہوریت کا مذاق اڑایا گیا ہے جس میں ووٹ دینے کا حق تو سب کو حاصل ہے مگر دولت اور پیداوار کے ذرائع مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وغیرہ وغیرہ

ناولوں کے علاوہ میں نے جتنی بھی کتابیں تصنیف کیں ان میں میں نے ایک ایک منصوبے کے ساتھ ترقی پسندی کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ "پرگتی واد کی روپ ریکھا" "ساہتیہ کا سیکھشا" "پریم چند — ایک ادھیین"۔ "شرت چندر" "بنگلہ کے آدھونک کوی" "پریم چند اور ان کا ساہتیہ" وغیرہ ادبی تصنیفات میں بھی میں نے ہر ایک بات کا معیار جمہور کا نظریہ ہی رکھا ہے۔

اپنی کہانیوں کے سلسلے میں صرف اتنا ہی کہنا پسند کروں گا کہ میں کہانیوں کو ذریعہ سمجھتا ہوں، مقصد ان کے ذریعے میں زیادہ حسین زیادہ صحت مند دنیا کے لیے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں جن اصولوں کو لے کر چلا ہوں اگر فنکاری کے ساتھ میں ان کی اشاعت کر سکا ہوں تو میرا ادب بامعنی ہے ورنہ وہ بے معنی ہوگا۔ مجھے یقین ہے مستقبل میں میری تصنیفات اسی نظریہ کے مطابق کامیاب یا ناکامیاب تسلیم کی جائیں گی۔

(ترجمہ: نسیم عباسی)

ٹراٹسکی

کہتے ہیں بچپن عمر کا شگفتہ ترین دور ہوتا ہے۔

ہوتا ہوگا!

لیکن انہی کے لیے جو دولت کی فراوانی اور حالات کی آسودگی میں پل کے جوان ہوتے ہیں۔ وہ عمر کے ہر گام اور ہر منزل پہ بچپن کو یاد کرتے ہیں۔ یہی ان کی راہِ فرار اور یہی ان کی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ آج جب میں اپنی زندگی کی روئیداد لکھنے بیٹھا ہوں تو ذہن میں کوئی ایک بھی یاد محفوظ نہیں جسے خوشگوار کہہ سکوں اور جو دل کو ہلکے سے گدگدا دے اور ہونٹوں پہ تبسم پیدا کر دے۔ پہلے تو سوچا تھا کہ اپنی داستانِ حیات کسی فرضی نام سے لکھ دوں۔ پتہ ہی نہ چلنے دوں کہ یہ ٹراٹسکی کی آپ بیتی ہے۔ لیکن کچھ باتیں، چند یادیں اور ان گنت حقائق ایسے ہیں جن پر میں افسانے کا لیبل چسپاں کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ میری کہانی روس کے عوام کی ہی نہیں نوعِ انسان کی جدوجہد کی داستان ہے —— مظلوم کی جدوجہد ظالم کے خلاف۔

میرے ماں باپ غریب تو نہیں تھے لیکن امیر بھی نہ تھے۔ میرا باپ کسان تھا جس نے دھرتی کا سینہ چیر کر بچوں کو پالا پوسا تھا۔ بھیڑیں پال رکھی تھیں، فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور ہمارے ہاں تین چار مزارعے بھی تھے۔ میں اس طبقے کا بچہ ہوں جس کی زندگی اول تا آخر جدوجہد ہوتی ہے۔ غربت اور عسرت کے خلاف مسلسل جدوجہد —— ہم نے غالباً غربت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہی ہمارے طبقے کی فیاضی تھی۔ میں نے ایسے گاؤں میں پرورش پائی ہے جہاں قدرت کی رنگینیاں تھیں، شہری تصنع اور معاشرتی آداب کی زنجیریں نہ تھیں۔

میں بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ پیتے دیکھتا ہوں تو بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ماں کا دودھ پیا ہوگا۔ میرے لیے کبھی کھلونے نہیں خریدے گئے تھے۔ ایک خادمہ تھی جو چیتھڑوں سے مجھے گڑیاں بنا دیا کرتی تھی۔ ایک مستری تھا جس نے مجھے گتے کی ایک موٹر بنا دی تھی۔

ایک روز، بچپن میں، میں ایک عورت کے ساتھ گھنی گھاس میں کھیل رہا تھا کہ گھاس میں مجھے گول سی ایک چمکتی ڈبیا نظر آئی۔ میں نے اس عورت کو دکھائی تو اس نے دور سے دیکھ کے کہا۔ "جاؤ، اٹھاؤ، ڈبیا ہی ہے" میں ڈبیا کے قریب گیا تو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ڈبیا انوکھی سی حرکت کرنے لگی اور "سوں سوں" کی ڈراؤنی سی آوازیں اٹھنے لگیں۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ عورت نے چلا کر کہا۔ "بھاگ آؤ، یہ سانپ ہے۔" اور دوسرے ہی لمحے گول چمکتی ڈبیا ایک لمبا سا سانپ بن گئی اور پھر چھوٹا سا یہ سانپ گھاس میں غائب ہوگیا۔

کوئی اچھی بات یاد نہیں آرہی۔ کوئی ہو تو لکھوں۔ یاد آیا میں نے ایک بار شہد کی مکھی کو پھول پہ بیٹھے دیکھا تو پکڑ لیا۔ ایک دم میری چیخ نکل گئی

زہریلی سوئی سی انگوٹھے کی پوری طرح اتر گئی۔ محفل اُٹھ گئی اور ماحول میرے آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں چھپ گیا۔ لگتا ہے جیسے وہ زہریلی خلش آج بھی برسوں گزرنے پر بھی صرف انگوٹھے ہی میں نہیں رگ رگ میں محسوس کرتا ہوں۔

جب میرا جسم ماں کی کوکھ میں پرورش پا رہا تھا تو ملک میں بدامنی اور بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ میں ۲۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ روسی عوام زار کے محلات کو بارود سے اڑانے کے منصوبے تیار کر چکے تھے۔ لوگ "پیپلز ول" "PEOPLES' WILL" نامی جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے۔ میری پیدائش سے دو ماہ پہلے باغی جاں نثار زار کی ریل گاڑی کو بارود سے اڑانے کی ایک ناکام کوشش کر چکے تھے۔ یکم مارچ ۱۸۸۱ء کو الیگزینڈر دوم کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک ہی سال پہلے روسیوں اور ترکوں کی جنگ ختم ہوئی تھی۔

گھر کے متعلق یہی کچھ یاد ہے کہ مٹی کا جھونپڑا نما مکان تھا جس پر سرکنڈوں کی چھت تھی۔ اسی پر مٹی بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن جگہ جگہ یہ چھتیں بارش میں ٹپکتی تھیں۔ باڑے میں مرغیاں، بھیڑیں، گھٹے اور سور ہوتے تھے اور میں مرغیوں کے انڈے اکٹھے کیا کرتا تھا۔

ہم بچوں کو ماں سے زیادہ باپ سے پیار تھا کیونکہ ماں ہم سے اُکتائی اُکتائی رہتی تھی اور باپ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ ماں اکتاہٹ میں حق بجانب تھی۔ اتنے سارے بچوں نے اس کی جوانی اور امنگیں دودھ کی راہ چوس لی تھیں۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی اور اُسے بات بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ باپ بھی عمر کے آخری دور میں غصیلا ہو گیا تھا۔ ہونا ہی تھا۔ شبانہ روز مشقت اور ملک کے غیر یقینی حالات نے اس کی دلی زندگی ختم کر ڈالی تھی۔ جوانی کی جو امنگیں اس نے بڑھاپے کے آرام کے لیے پیسے کی راہ بہا دی تھیں بڑھاپے میں آ کر بھی دغا دے گئیں اور وہ ۱۹۲۲ء میں اس وقت مر گیا جب میں سیاسی قیادت میں عالمی شہرت حاصل کر کے چوتھی بین الاقوامی کمیونسٹ کانگریس میں اپنی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

سنانے کو تو بہت کچھ ہے لیکن سننے والوں کے لیے شاید کچھ بھی دلچسپ نہ ہو۔ ہمارے مکان سے ملحق ہمارے مزارعوں کے چار جھونپڑے تھے۔ وہ غریب اور پسماندہ لوگ تھے۔ شاید اسی لیے ہم بچوں کو ان کے گھروں میں جانے کی ممانعت تھی لیکن میں چوری چھپے وہاں چلا ہی جاتا تھا۔ ان لوگوں کی غربت اور پسماندگی میں مجھے پُرلطف سے جذبات نظر آیا کرتے تھے۔ ایک مزارع دوسرے مزارع کی بیوی سے محبت کرتا تھا کیونکہ اس کی بیوی کا خاوند فالج سے معذور تھا۔ ان کے ہاں ایسے رومان چلتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو جو اُجرت ملتی تھی وہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی ناکافی ہوتی تھی۔ برفباری کے موسم میں انہیں تاپنے کو ایندھن بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ دن بھر کی مشقت کے باوجود مالکوں سے بھیک مانگا کرتے تھے۔ ان کے جسم مریض اور روحیں علیل تھیں۔ اخلاق اور کردار ان کے لیے ثانوی حیثیت کی بے معنی سی چیزیں تھیں۔ اہم ترین مسئلہ دو وقت کی روٹی اور جاڑے کو ٹھٹھر کر بسر کرنے کا تھا۔

میرے کردار اور ذہنی رجحان کی تشکیل میں ان لوگوں کی بدحالی کا بہت دخل ہے۔ اس کے علاوہ میرے کردار اور شخصیت کا ڈھانچہ میرے بزرگوں کی ان باتوں نے تیار کیا جو وہ مجھے بے سمجھ بچہ سمجھ کر آپس میں کیا کرتے تھے۔ میں بڑوں کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا تھا اور وہ کمال بے احتیاطی سے جو منہ میں آتا ایک دوسرے کو کہتے رہتے تھے۔ میرے کان طرح طرح کی باتیں سنا کرتے تھے جو میرے ذہن میں معمے بن کر محفوظ ہوتی چلی گئیں۔ پھر وقت ان رازہائے معمے آپ ہی آپ حل کرتا چلا گیا۔ نتیجۃً معاشرتی نظام کے متعلق میرا ذہن خود ہی راہ بناتا چلا گیا۔

عمر کے پہلے چند برسوں نے مجھے بہت سے سبق دیئے ہیں۔ ہمارے قرب و جوار میں ایسے زمیندار آباد تھے جن کی زمینوں نے سونا اگلا تھا اور جنہوں نے مزارعوں اور مزدوروں کا خون بھی چوس کر محل نما مکانوں میں دولت کے انبار لگا لیے تھے۔ ۱۸۸۳ء کے زرعی بحران نے

انھیں کنگال کر کے رکھ دیا۔ کھیتیاں ویران ہو گئیں۔ گوداموں کو کیڑے کھا گئے اور دولت جُل دے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ان زمینداروں نے شان اور خودفریبی کے جو زرق برق خول چڑھا رکھے تھے غربت نے یوں اتار پھینکے جیسے قصابوں نے زندہ بکروں کی کھالیں اتار دی ہوں۔ مزارعوں کے ان آقاؤں کو میں نے مزارعوں کے روپ میں دیکھا۔ محل میں پلے مرمریں جسموں پر میں نے بوریاں اور موٹے کمبل لپٹے دیکھے۔ بوکھلائے ہوئے انسانوں کے ردِ عمل سے چند ایک حادثات رونما ہوئے جو ہیبت ناک بھی تھے شرمناک بھی اور عبرت آموز بھی۔

محنت کشوں کے بچے تو بچپن میں ہی جوان ہو جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اسی طبقے کا بچہ تھا۔ عمر کے چھٹے ہی برس میرا دماغ سنجیدہ باتیں سوچنے لگا تھا۔ مجھے دیہات کے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ کسی کو شاید یقین نہ آئے کہ میں سکول میں دوسرے ہی سال شعر کہنے لگا تھا اور تیسرے سال چچا زاد بھائی سے مل کر اپنا ایک رسالہ لکھنے لگا تھا۔ ایک روز باپ کو پتہ چل گیا تو اس نے میرا رسالہ پھاڑ کر سختی سے تنبیہ کی کہ میں بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کروں۔ میرے ماں باپ میری تحریروں کو بچپن کا کھیل سمجھتے تھے لیکن سینے میں ان گنت باتیں غنودگی کی حالت میں پڑی تھیں جو اظہار کی راہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

سکول کی کتابیں مجھ پر راہیں کھولنے لگیں اور میں ان راہوں پر سرپٹ بھاگ اٹھا۔ مجھ پر نئی دُنیا کے دروازے کھلتے جا رہے تھے۔

نویں برس مجھے اوڑیسہ کے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا ایک ماموں زاد بھائی رہتا تھا۔ میری رہائش کا انتظام اُسی کے ہاں تھا۔ اُس وقت اس کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ شگفتہ مزاج، خوش لباس، خوش شکل اور کھاتا پیتا انسان تھا۔ گھر سے اتنی دور طبیعت کچھ گھبرائی لیکن بھائی کی پرکشش شخصیت اور اُس کے مشفقانہ انداز میں جذب ہو گیا۔ وہ اور اس کی بیوی میری تعلیم و تربیت میں اس طرح دلچسپی لیتے تھے۔ جیسے میں ان کا بچہ ہوں۔

ان کی ایک ملازمہ تھی جو مجھ سے ہر رات سبق لیا کرتی تھی۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میں اُسے بڑے ہی شوق سے پڑھایا کرتا تھا۔ ان کے ہاں ایک اور جوان سال ملازمہ تھی جس کا خاوند امریکہ گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے خاوند کی طرف مجھ سے خطوط لکھوایا کرتی تھی۔ خطوط میں جذبات سے بھرپور محبت کے اظہار کے علاوہ پیارے پیارے شکوے ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کسی اور کو بھی خط لکھوایا کرتی تھی جس کے متعلق وہ مجھے بتایا کرتی تھی کہ چچیرا بھائی ہے۔ اس کی طرف خطوط میں بھی وہ والہانہ محبت کا اظہار کیا کرتی تھی اور اُس سے ملنے کے پروگرام بنائی رہتی تھی۔ ایک روز دوسری ملازمہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا چچیرا بھائی نہیں جانے کون ہے۔ اُسی رات میرے ماموں زاد بھائی کی بیوی نے مجھے سختی سے کہا کہ میں اس کے خطوط نہ لکھا کروں۔

ایسے ہی ذرا ذرا سے واقعات ہیں، جنھوں نے مجھ پر انسانی فطرت کے راز فاش کیے ہیں۔ میرے بھائی نے نشر و اشاعت کا ایک ادارہ کھول لیا۔ وہ خود یونانی ادب کا ترجمہ کر کے چھپوایا کرتا تھا۔ میں فارغ وقت میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ میں چھ برس وہاں رہا۔ اس عرصے میں میں نے پروف ریڈنگ، پرنٹنگ اور پریس کے تمام کام سیکھ لیے۔ مختلف مصنفوں کے مسودے پڑھتے پڑھتے مجھے لکھنے کا بھی سلیقہ آ گیا اور یوں مجھے اپنے گھٹے ہوئے جذبات کے اظہار کے لیے راہ ملی۔

سکول کا دور ختم ہوا۔ ساتھ ہی رنگین جوانی بھی منظر پر ہونے لگی۔ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اوڑیسہ سے بھی دور ایک شہر میں چلا گیا جہاں دیہاتی طلباء شہری لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ کالج میں فیشن اور نمود و نمائش کا دور دورہ تھا۔ باتوں میں مصنوعی پن اور حرکات

میں ادائیں اور اداکاری تھی۔ وہاں مخلوط تعلیم تھی اور عشق بازی فیشن کا ایک لازمی جزو تھی۔ جس کی کوئی لڑکی دوست نہ ہو اُسے بدھو اور پسماندہ سمجھا جاتا تھا۔ کلاسوں میں شام کی ملاقاتوں کے پروگرام بنتے تھے۔ جہاں عشق ہو وہاں رقابت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں لڑکوں میں اکثر ہاتھاپائی اور چاقو زنی ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار ایک پتھر میرے سر پر بھی لگا تھا۔ حالانکہ میں کسی کا حبیب تھا نہ رقیب تھا۔ کشتی رانی و پکنک کا عام رواج تھا لیکن میں زندگی کے رنگ و بو اور اس کی ہماہمی سے یکسر بیگانہ تھا۔ حسن و عشق کی ہنگامہ خیزیوں میں بیٹھ کر میں کتابوں میں گھستا جا رہا تھا۔ علم کی جو قندیلیں میری راہ میں روشن ہوتی جا رہی تھیں ان کی چکا چوند میں الجھ گیا تھا۔ ایسے جلنے ہی میں لطف آتا تھا کیونکہ جذبۂ تجسس کی اس سے تسکین ہوتی تھی۔

میں علم کے سمندر میں جا پہنچا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ ایک وقت تھا کہ میں نے انسانوں کا کم مطالعہ کیا مگر اب انسان میری نظروں کے سامنے دھندلے سے سائے بننے لگے۔ اور کتابوں کا روپ نکھر آیا۔ میں ہر شے کو کتابوں کے آئینے میں دیکھنے لگا۔ میں پڑھ پڑھ کر کھویا چلا جا رہا تھا سمندر کے کنارے، باغوں میں، پھولوں کی کیاریوں کے قریب، گھنے پیڑوں کی چھاؤں تلے، سبزپوش وادیوں کے گوشوں میں اور جہاں کہیں بھی میں ہوتا تھا کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اور میں قدرت کی رنگینیوں سے بے بہرہ علم کے اسرار و رموز میں بھٹکتا رہتا تھا۔ جب ہاتھ میں کتاب نہیں ہوتی تھی تو بھی میرا دماغ فارغ نہیں ہوتا تھا۔ الجھنیں سی تھیں جنھیں دماغ سلجھاتا رہتا تھا۔ کبھی الجھنیں اور الجھ جاتی تھیں تو میں لپک کر کتاب کھول لیتا تھا اور الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹک بھٹک کر الجھن سلجھا لیتا۔

بچپن سے ہی ذہن میں کشمکش سی رہتی تھی جو عمر کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ لیکن جیسے ہوش کی تفصیلات نکھر آئیں مجھے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور بے انصافی کا کوئی جواز نہ ملتا تھا اور معاشرتی ڈھانچہ مجھے اکثر پریشان رکھتا تھا۔ میں نے اس کا حل بھی کتابوں میں ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن میں کتابوں سے نکل کر عملی میدان میں آیا تو مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ پہلی بار تو کالج سے میرا نام ہی خارج کر دیا گیا اور مجھے اپنے تحفظ میں کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ پرنسپل نے کہا تم تخریب پسند ہو۔

تعلیم کا سلسلہ سات برس جاری رہا۔ آج میرے ذہن میں سکول اور کالج کی بے شمار یادیں محفوظ ہیں۔ اچھی بھی بری بھی۔ خوش آئند، اداس بھی۔ تعلیمی ادارے تھے، جنھوں نے مجھے علم و فن کی راہ پر ڈالا۔ میں ان کا احسان مند ہوں لیکن میرے دل میں ان درسگاہوں اور استادوں کا ذرہ بھر احترام نہیں۔ استاد محض مشینیں تھیں جن کی حرکات اور سرگرمیوں میں یکسانیت اور یبوست ہوتی تھی۔ ان کے طور طریقوں میں خلوص اور بے ساختگی کی جگہ سرکاری پن سا ہوتا تھا اور یہ بے کیف اور انداز بے روح۔

طبیعت حساس رہی۔ میں تعلیم سے فارغ ہو کر گاؤں آ گیا تھا۔ ایک شام میں نے اپنے دروازے پر ایک علیل سی عورت کو بیٹھے دیکھا۔ نقاہت سے وہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ دیوار کا سہارا لیے تقریباً نیم دراز تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ چھ سات کوس پیدل چل کے آئی ہے۔ اُسے میرے باپ سے ایک روپیہ لینا تھا۔ یہ ایک روپیہ اس کے ایک یتیم پاگل بیٹے کی اُجرت تھی جو میرے باپ کا ملازم رہ چکا تھا۔ اتنے میں میرا باپ آ گیا۔ ایک غریب سا کسان دست بستہ سراپا التجا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ خدا کے لیے میری گائے دے دو، آئندہ وہ آپ کے کھیت میں نہیں جائے گی۔ لیکن میرا باپ حاکموں کی طرح گردن اکڑائے چلا آ رہا تھا۔ وہ کسان کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا اور وہ آدمی بھی علیل عورت کے پاس دہلیز پر بیٹھ گیا۔

اس رات میں کھانا کھائے بغیر بستر پر جا گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

تعلیم کے دوران میرا دماغ سیاست سے بیگانہ تھا۔ لیکن ملک کے معاشرتی نظام کے خلاف میرے دل میں نفرت پرورش پا رہی تھی۔ معاشی توازن کا فقدان، بے انصافی، ظلم و تشدد، رشوت خوری، سرخ فیتہ، پولیس کی دھاندلیاں، جاگیرداری، اور زمینداری کا ناقابلِ فہم نظام اور ایسی ہی چند ایک معاشرتی ناہمواریاں تھیں جنھوں نے مجھے عملی سیاست کی طرف مائل کیا۔ میرے پیشِ نظر بظاہر چھوٹا سا ایک واقعہ ہے، جو معاشرے کی ہمہ گیر ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔

میرا ایک دوست تھا جس کا باپ کرنل تھا۔ دوست نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا تو کرنل صاحب نے مجھے یوں گھور کے دیکھا جیسے مجھ جیسے دیہاتی اور عام سے آدمی کو حق ہی حاصل نہیں کہ اس قسم کی عالیشان کوٹھی میں داخل بھی ہو سکے۔ دوسرے ہی روز اس کرنل نے اپنے بیٹے کو مجھ سے ملنے جلنے سے منع کر دیا اور ہماری محبت چھوٹے بڑے کی وسیع طبقاتی خلیج میں ڈوب گئی۔

مغربی یورپ اور امریکہ کے نظامِ معاشرت و حکومت کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور اسی کی روشنی میں میرے ذہن میں مثالی جمہوریت کی تصویر واضح ہوتی جا رہی تھی لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مغربی یورپ والے بھی توہم پرست متعصب ہو سکتے ہیں اور امریکہ میں بھی سفید فام سیاہ فاموں سے نفرت کر سکتے ہیں۔ میں اپنے ملک کے نظام سے اس قدر جلا بھنا تھا کہ مجھے غیر ممالک کی ہر شے اچھی لگتی تھی اسی رجحان نے مجھے انقلاب پسندی پر اکسایا۔

یہ تیسرے زار کا دورِ حکومت تھا۔ روس پر زاروں کی گرفت کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی مگر کھلے بندوں تو نہیں لیکن ڈھکے چھپے زار کے خلاف انقلابی عناصر کی سرگرمیاں پرورش پا رہی تھیں۔ روس کے ادیبوں میں بھی انقلابی رجحانات پیدا ہو چکے تھے۔ ٹالسٹائی کا مکتبۂ فکر دم توڑ رہا تھا اور مارکس کی تعلیمات کی قبولیت عام ہوتی جا رہی تھی۔ نوجوان تیزی سے انقلاب پسند ہوتے جا رہے تھے۔ پولیس دھڑا دھڑ گرفتاریوں میں مصروف تھی۔ لوگ جیلوں میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ جلاوطن بھی کیے جا رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں میں کبھی کبھی اپنے آپ کو دوراہے پر کھڑا پاتا تھا۔ میں اپنے مطالعہ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جمہوریت کو ترجیح دیتا تھا اور اُدھر عوام کے دلوں میں مارکس کے نظریات گھر کر چکے تھے اور وہ اشتراکیت کی راہ پر چل پڑے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تو بعد کی باتیں ہیں، اوّلین ضرورت یہ ہے کہ موجودہ نظام کو بنیادوں سے اکھاڑ دیا جائے۔ میں انسان کو اس کے پیدائشی حقوق دلانے کے حق میں تھا۔

میں سیاسی میدان میں انقلابی بن کر کود گیا۔ والدین اور دیگر لواحقین میرے متعلق پریشان رہنے لگے۔ انھوں نے مجھے انقلابی ڈگر سے ہٹانے کے تمام جتن کر ڈالے اور میں ماں باپ سے بھی باغی ہو گیا۔ گھر میں تُو تُو میں میں اور جھک جھک ہر شام کا معمول بن گئی۔ آخر میں نے گھر ہی کو خیرباد کہہ دیا اور ایک دوست کے ہاں رہنے لگا۔ ہم دونوں نے چند اور دوستوں کو ساتھ ملایا اور ایک زیرِ زمین تحریک کو جنم دے ڈالا۔

ہم چندہ جمع کر کے لائبریریوں سے کتابیں کرائے پر لیتے تھے اور لوگوں کو پڑھنے پر اکساتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم جماعت کے لیے نئے ممبر بھی بھرتی کرتے تھے۔ ہماری تحریک چونکہ انقلابی تھی اس لیے ہم صرف بیس برس کی عمر کے نوجوانوں کو ممبر بناتے تھے۔ جب بیس بائیس ممبر ہو گئے تو ہم نے فیکٹریوں میں جا کر مزدوروں میں کتابیں تقسیم کرنی شروع کیں مگر چند دنوں بعد پتہ چلا کہ جو مزدور بھاگ بھاگ کر کمال دلچسپی سے ہم سے کتابیں لیتے تھے، وہ مزدوروں کے بھیس میں زار کے جاسوس تھے۔ ہم انھیں جو لٹریچر دیتے تھے وہ شام کو پولیس ہیڈ کوارٹر میں جمع

کر دیتے تھے۔

ہم نے تعلیم بالغاں قسم کی باقاعدہ کلاسیں کھول دیں اور لوگوں کو انقلاب کا سبق دینے لگے مگر ایک دو دوستوں کی غداری نے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھنے دیا۔ پھر ہم نے ایک ڈرامہ لکھا جسے سٹیج کرنے کو ہم نے تین چار مہینے ریہرسل کیا مگر ڈرامہ سٹیج نہ ہو سکا۔

میرا باپ سائے کی طرح میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے انجینئر بنانا چاہتا تھا۔ میرا ایک ماموں انجینئر تھا۔ میرے باپ نے مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔ میں نے ماموں کے قصبے میں جا کر انجینئرنگ کرنا تو درکنار البتہ لوگوں میں انقلابی اور غیر قانونی لٹریچر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب ماموں بھی مجھ سے خفا رہنے لگے تو میں واپس آ گیا اور اپنی تحریک کے رفیقوں سے ملا۔ ہم نے تحریک میں نئی زندگی ڈالی۔ لیکن ابھی تک ہماری سرگرمیاں علمیت اور بحث مباحثوں تک محدود تھیں۔ ہم عمل میدان میں آنے کو بے تاب تھے۔ ہماری نفری بہت کم تھی اور حالات کے تیور خوفناک تھے۔

۱۹۰۵ء میں سنٹ پیٹرزبرگ میں پارچہ بافوں نے ہڑتال کر دی۔ گرفتاریوں اور انسدادی کارروائیوں کا پیہم سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھی دنوں ایک نوجوان لڑکی نے برسرِعام اپنے اوپر تیل ڈال کر اپنے آپ کو بھسم کر ڈالا۔ یہ آگ عوام کے سینوں میں بھڑک اٹھی اور انقلابی عناصر آپ ہی آپ بیدار ہونے لگے اور احتجاجی جلسے جلوسوں کا دور شروع ہو گیا۔ ہماری تحریک نے ان واقعات کو خوب استعمال کیا اور ہم میدانِ عمل میں آ گئے۔ قیادت میری تھی۔ ہم نے مزدوروں کی ذہنی رگیں جا پکڑیں اور لوگ جوق در جوق ہمارے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ میری اور میرے دوستوں کی گرفتاری اور جلاوطنی کسی بھی لمحے متوقع تھی لیکن ہم چوکنے رہے اور میں اپنا نام بدل کر زیرِ زمین چلا گیا۔

عوام کی بیداری کے ساتھ گرفتاریوں کا سلسلہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کے جاسوس ہمارے گرد سائے کی طرح منڈلایا کرتے تھے۔ انتہائی تکلیف دہ اور دلچسپ کیفیت تو یہ تھی کہ جنھیں میں اپنا دست راست اور قابلِ اعتماد رفیق سمجھتا تھا وہ کسی نہ کسی مقام پر سی آئی ڈی کا آدمی نکلتا تھا۔ ایک رات مجھے اپنے ایک آدمی کو چند غیر قانونی دستاویزات دے کر کہیں بھیجنا تھا۔ رات کو قبرستان میں ملنے کا وقت طے کیا تھا۔ میرا رفیق رات کو مقررہ وقت پر آ گیا لیکن میں اسے کاغذات دے ہی رہا تھا کہ اندھیرے سے پولیس نکل آئی اور مجھے گرفتار کر لیا۔ انھوں نے میرے رفیق کو گرفتار نہ کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔

مجھے کئی ایک جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ پہلی جیل میں مجھے ایک ایسی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ سلاخوں والے دروازے کے ساتھ لکڑی کا دروازہ تھا جو مقفل رہتا تھا۔ آگے برآمدے کے دروازے بھی بند رہتے تھے اور میں دنیا سے بے خبر اندھیرے میں پڑا رہتا تھا۔ وارڈر وقتاً فوقتاً مجھے کھانا دینے آتا تھا۔ میں اس کی صورت کو دیکھ کر باہر موسم کا حال معلوم کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً اس کی ناک سرخ ہو اور وہ مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورے یا برتن پٹخ کر باہر نکل جائے تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔

دو سال تک مجھے متعدد جیلوں میں منتقل کیا گیا۔ یہ تمام عرصہ مجھے پڑھنے کو کوئی کتاب نہ ملی۔ دو تین وارڈر تھے جو میری طرح انقلاب پسند تھے۔ ان کی معرفت میں کاغذ قلم حاصل کر لیتا تھا اور مضمون لکھ کر انھی کے ہاتھ باہر منتقل کر دیتا تھا۔ یہ مضمون میری جماعت کو پہنچ جاتے تھے اور قلمی نام سے چھپ بھی جاتے تھے۔

دو سال کی قید کے بعد میری جلاوطنی کے احکام آ گئے۔ ماسکو جیل میں میرے ساتھ میری تحریک کی ایک سرگرم رکن لڑکی بھی میرے ساتھ جلاوطنی

کی جاری تھی وہ اولوالعزم اور جنگجو لڑکی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے کیونکہ ہم ایک ہی مشن کے روح رواں تھے۔ اکٹھے رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا جو ہم نے اختیار کر لیا۔ وہ یہ کہ ہم نے جیل ہی میں شادی کر لی۔ اور اکٹھے جلاوطنی کو روانہ ہو گئے۔ ہمیں قانون اور معاشرے کے نام نہاد محافظ تہذیب و تمدن سے دور یخ بستہ جنگل میں چھوڑ آئے۔ دریا قریب ہی تھا وہاں چند جھونپڑے تھے جو شاید ہم سے پہلے جلاوطنوں نے بنائے تھے۔ ہم میاں بیوی بے سروسامانی کے عالم میں ایک جھونپڑی میں جا بسے۔ میری کل متاع چند کتابیں، میری بیوی اور انقلابی عزائم تھے۔ رات کو جھونپڑی میں لیٹے ٹھٹھرتے تھے اور دن کے وقت زہریلی مکھیاں ناک میں دم کیے رکھتی تھیں۔ برف جمی رہتی تھی یا موسم کھلتا تھا تو ہر طرف کیچڑ ہوتا تھا۔ چند کوس پرے ذرا سی آبادی تھی جس کی اکثریت جلاوطنوں کی تھی۔ ہمیں محدود علاقے میں ہجرت کرنے کی اجازت تھی۔ میں نے ایک تاجر کے ہاں ملازمت کر لی لیکن میری ایک غلطی سے نوکری سے جواب مل گیا اور مجھے پھر جنگل میں جانا پڑا۔ وقت اسی قدر گزر گیا تھا کہ میری بیوی کی گود میں اب ایک نوزائیدہ بچی تھی۔ بچی کو سردی سے بچائے رکھنا جان لیوا مسئلہ تھا۔ ہم اپنے کپڑے اتار کر اس کے جسم کو لپیٹ دیتے تھے اور ذرا ذرا دیر بعد دیکھتے تھے کہ وہ زندہ تو ہے!

روس میں انقلابی تحریک اور زور پکڑ گئی۔ جلاوطنوں میں اسی قدر اضافہ ہو گیا کہ ہم نے جنگل میں ایک کالونی بنا لی۔ مجھے چند اور کتابیں اور کام کے بہت سے انسان مل گئے اور میں نے اپنی تحریک کا پرچار شروع کر دیا۔ ہم جلاوطنوں میں بہرحال سرگرمی اور گہما گہمی رہتی تھی لیکن ماحول پر اداسی اور یاسیت بھی چھائی رہتی تھی۔ کون وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ہم میں سے کوئی واپس بھی جا سکے گا۔ اکثر جلاوطن یخ بستہ وادیوں میں مرکھپ جاتے تھے اور برف کے گالے ان کی لاشوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ اسی یاسیت اور سائبیریا کی برفانی ویرانی کا اثر تھا کہ ہم سب ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتے تھے۔ دھتکارے ہوئے یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر ترش کلامی اور ہاتھاپائی پر اتر آتے تھے۔ ہم میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی، چنانچہ وہاں بھی دلوں کے سودے ہوتے تھے۔ رقابت بھی چلتی تھی اور محبت کی ناکامی میں خودکشی تو عام تھی۔ مرنے والوں کو ہم نہایت خاموشی اور بوجھل دل سے برف تلے دفن کر آیا کرتے تھے۔

سائبیریا میں جلاوطنوں کی دو تین اور کالونیاں آباد ہو گئیں اور ملک میں انقلابی تحریک اور زیادہ زور پکڑ گئی۔ ہماری کالونیوں کے گرد پولیس کی گاڑیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ غیر ملک کی چند تنظیمیں بھی ہماری تحریک کی پشت پناہی کرنے لگی تھیں۔ ان حالات میں میرا پنجرے میں بند رہنا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے فرار کی راہ سوچی۔ چند نوجوان فرار ہو گئے۔ میری بیوی نے مجھے بھی جلدی بھاگ جانے اور ملک میں تحریک کو مہمیز لگانے کا پُرزور مشورہ دیا۔ بیوی اولوالعزم تھی کہنے لگی تم بھاگ جاؤ میں یہیں رہوں گی۔

ایک رات میں فرار ہو گیا۔ ایک بگھی والے نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے بگھی میں لٹایا اور اوپر گھاس ڈال کر چل پڑا۔ بہت کٹھن سفر کے ساتھ ہم دو روز بعد ایک قصبے میں پہنچ گئے۔ وہاں میری تحریک کا ایک ساتھی مل گیا۔ ہم نے ایک جعلی راہداری تیار کی جس پر میں نے اپنا نام "ٹراٹسکی" لکھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا یہ فرضی نام ہمیشہ کے لیے مجھ سے چپک جائے گا۔ (میرا اصل نام ایل۔ ڈی۔ برانسٹین ہے)

میں سمارا جا پہنچا اور ایک انجینئر سے ملا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی لینن کے دوست تھے۔ اس نے میری مدد کی اور مجھے ایک اور فرضی نام سے اپنے ادارے میں رکھ لیا۔

اپنی بیوی کے متعلق پتہ چلا کہ میرے فرار کی پاداش میں اسے سائبیریا کے خطرناک ترین علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد میری دونوں بچیاں مجھے ڈرامائی طریقے سے مل گئیں لیکن بیوی کو موت نے اس دنیا سے ہی جلاوطن کر ڈالا (میری ایک اور بچی میرے فرار کے چند روز

جو پیدا ہوئی تھی۔

لینن کو میرے متعلق معلوم ہوا تو اس نے مجھے اسٹریا چلے جانے کو کہا۔ میں ایک مفرور قیدی تھا۔ لینن میری اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے سرحد سے سمگل کرنے کے انتظامات کر دیے۔ رات مجھے سرحد کے قریب ایک تاریک جھونپڑے میں چھپا دیا گیا اور آدھی رات پیشہ ور سمگلروں کے حوالے کر دیا گیا جو مجھے بیسیوں میل کیچڑ اور پگھلتی برف پر پیدل چلاتے رہے۔ سرحدی پولیس کا خوف الگ تھا بہرحال انتہائی کٹھن اور پرخطر راہوں سے مجھے زیورچ پہنچا دیا گیا۔ جہاں میں اپنی زیر زمین تحریک کے چند آدمیوں سے جا ملا۔

۱۹۰۲ء میں میں پیرس کی راہ لندن پہنچا۔ لینن لندن میں تھا۔ عجیب آزاد مرد تھا۔ میں نے اسے روس کے حالات اور اپنے عزائم اور لائحہ عمل سے تفصیلات سنائیں۔ اس نے مجھے لندن میں خوب گھمایا اور میں نے وہاں کی ثقافت، سیاست اور لوگوں کے رجحانات کا قریب سے مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ لینن کے زیر سایہ رہ کر میں اس کی ہدایت کے مطابق پیرس چلا گیا۔ پیرس کے حسن اور رنگین زندگی نے میرے دل و دماغ کے پٹ کھول دیئے۔ مجھ پر ایک گھٹن سی تھی جو چھٹ گئی۔ میں نے لندن کے اخباروں میں بھی اور پیرس کے جرائد میں بھی قلمی نام سے بہت سے مضامین لکھے۔ میں خود تو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ البتہ ترجمہ کروا لیتا تھا۔

جنوری ۱۹۰۵ء میں جینیوا میں تھا جب مجھے روس کے "خونی اتوار" کی اطلاع ملی۔ یہ تاریخی حادثہ مجھے یاد رہے گا۔ سینٹ پیٹرزبرگ کے عوام نے جلوس نکالا تھا اور زار کے محل کے سامنے مظاہرہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تھا لیکن فوج نے ان پر گولی چلا دی ہزاروں نہتے مارے گئے۔ جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ ایسے ہی چند اور واقعات اور حادثات رونما ہوئے تو میرے متعلق پارٹی نے فیصلہ کیا کہ میں روس چلا جاؤں۔ اس عرصے میں میں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ میں نے ایک اور جعلی پاسپورٹ تیار کیا اور اپنی بیوی سمیت روس کی سرحدوں کی طرف چل پڑا۔

مجھے فن لینڈ کے ایک ہوٹل میں رات گزارنی پڑی تھی۔ میرے اوپر والے کمرے میں ایک ادیب ایک بازاری ایکٹرس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا جبکہ اس کی اپنی بیوی ساتھ والے کمرے میں کسی مرض سے کراہ رہی تھی۔ رات ہی رات ادیب ہوٹل کا بل ادا کیے بغیر ایکٹرس کو ساتھ لے کے بھاگ گیا اور اسی رات اس کی بیوی مر گئی۔ صبح بیرے نے مجھے روس کے اخباروں کا بنڈل دیا۔ تمام اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں روس میں ہڑتالوں اور مظاہروں کی خبروں کی آئینہ دار تھیں۔ میں نے بیرے سے اپنا بل منگا، ادا کیا اور اسی شام روانہ ہو گیا۔ اگلی شام میں سینٹ پیٹرزبرگ کے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں تقریر کر رہا تھا۔

روس میں میں نے اپنا نام پیٹروکی رکھ لیا اور اخباروں میں ٹراٹسکی کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد میں نے "رشین گزٹ" کی ادارت سنبھال لی۔ میں نے اس پرچے میں اپنی انقلابی تحریک کا خوب پرچار کیا۔ اس کے بعد مجھے اس سے کہیں زیادہ بہتر اخبار مل گئے اور میں نے روسی عوام کے سینوں میں انقلاب کی چنگاریوں کو بھڑکتے شعلے بنا دیا۔ میری قیادت مسلم ہو گئی اور عوام ٹراٹسکی کے نام کے نعرے لگانے لگے۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء کی ملک گیر ہڑتال میری تحریک کی پہلی فتح تھی۔ سب سے بڑی فتح تو یہ تھی کہ میں روس کا مفرور قیدی ہوتے ہوئے روس میں رہ کر بھی گرفتار نہیں ہوا تھا اور روس کے تمام اخبار میرے نظریات اور مشن کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ روس کے مزدور، دہقان پوری طرح

طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو رہے تھے۔ بعض نے فیکٹریوں میں، جہاں وہ ملازم تھے، چوری چھپے اپنے لیے اسلحہ بنا کر گھروں میں چھپا لیا تھا۔

دسمبر ۱۹۰۵ء میں جبکہ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا کہ فوج نے ہمیں محاصرے میں لے لیا۔ سیکڑوں ممبر موجود تھے۔ بیشتر کے پاس پستول تھے۔ میں نے کمان سنبھال لی اور اعلان کیا: "گولی نہ چلاؤ لیکن کوئی ممبر اپنے ہتھیار سے دستبردار نہ ہو" ——— شدید تعجب تھی کسی ممبر نے پستول نہ چلایا نہ ہی فوج کے حوالے کیا۔ یہ باغیانہ مظاہرہ ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ میرے شب و روز کے لمحات اب تقریروں، مضامین نویسی اور پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے فیصلے کرنے کے لیے وقف ہو گئے۔ بعض راتیں تو میں سو بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے جو تحریک ایک گوشے میں بیٹھ کے چلائی تھی، روس کے گوشے گوشے میں بجلی کی طرح چمکنے اور ابھرنے لگی۔

میں ایک بار پھر گرفتار ہو گیا اور میرے چند اور ساتھی بھی دھر لیے گئے۔ اب کے جیل میں ہمیں چند سہولتیں اور مراعات دے دی گئیں۔ میں جیل میں زیادہ وقت لکھنے پڑھنے اور لائحہ عمل تیار کرنے میں گزارتا تھا۔ ہمارے وکیلوں کو کیس تیار کرنے کے لیے ہم سے جیل میں ملنے کی اجازت مل گئی۔ ہم وکیلوں کا استعمال بھی کچھ کرتے تھے کہ میں مضامین لکھ کر ان کے کاغذوں میں چھپا دیتا تھا اور وہ باہر لے جا کر میری پارٹی کو پہنچا دیتے تھے۔ مضامین کی یہ سمگلنگ عرصہ تک جاری رہی اور پارٹی کو میری ہدایات باقاعدگی سے ملتی رہیں۔

پھر ہمارا کورٹ مارشل ہوا۔ ہمارے خلاف دو سو گواہ لائے گئے جو سب کے سب پولیس کے اپنے آدمی تھے۔ کورٹ روم کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ میری ماں اور میرا باپ بھی مقدمہ سننے آیا کرتے تھے۔ اُن کے پریشان حال چہرے ان کے جذبات کے آئینہ دار تھے لیکن میں اب بچہ نہ تھا۔ میں ایسے مقام پر جا پہنچا تھا۔ جہاں ماں باپ کے جذبات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ میرے باپ کے چہرے پر وقار بھی ہوتا تھا آخر وہ میرا باپ بھی تھا اور زاروں کا ستایا ہوا شہری بھی۔ میں اس کا بیٹا بھی تھا اس کا لیڈر بھی۔ اُسے احساس تھا کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور ہمیشہ کے لیے جیل یا جلاوطنی کو جا رہا ہوں۔

کورٹ مارشل میں ایک نقطے پر جج نے میرے وکیل کی ایک درخواست مسترد کر دی تو صفائی کے تمام وکیلوں نے واک آؤٹ کر دیا۔ ہم کورٹ روم سے نکل آئے اور مقدمے کا بائیکاٹ کر دیا۔ ہجوم بھی باہر آ گیا اور کورٹ روم میں تین جج اور ایک سرکاری وکیل رہ گیا۔ ججوں نے ہماری غیر حاضری میں ہی فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کی نقل روس میں آج تک نایاب ہے اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ملا ہے۔ ہمیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ صرف جلاوطنی تھی۔ سائبیریا کی عمر قید یا مشقت نہیں تھی۔ جلاوطنی میں ہم ایک مخصوص اور محدود علاقے میں جا کے آباد ہو سکتے تھے۔

ہمیں ایسے ہی ایک برفانی خطے میں پہنچا دیا گیا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ میں وہاں جاتے ہی فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ تحریک کی کامیابی کے عروج کے وقت میں ویرانے میں مرنا نہ چاہتا تھا۔ اب کے پھر ایک کوچوان نے مجھے اپنی گھوڑا گاڑی میں لٹایا اور اوپر گھاس ڈال دی۔ انتہائی صبر آزما حالت میں برفانی راہوں پر پُرخطر حالات میں راتوں کو ٹھٹھرتے، سردی سے تھر تھر کانپتے گھوڑوں پر ظلم کرتے ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے۔ چند روز بعد میں چھپتا چھپاتا سینٹ پیٹرزبرگ پہنچ گیا اور ایک دوست ڈاکٹر کے گھر چلا گیا۔ مجھے بے شمار لوگ جانتے تھے۔ چنانچہ کوئی ایسا ڈر نہ تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ ہر کوئی مجھے چھپا لینے کو تیار تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو جا لیا اور ہم فن لینڈ چلے گئے۔ لینن سے ملاقات ہوئی تو اس نے ہدایت دی کہ عوام کو اور زیادہ راہنمائی کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر حاضری میں انقلابی روح مرجھا جائے۔ لینن نے مجھے بالشویکوں سے بھی رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی

زینوویز کے ساتھ فن لینڈ میں جا چھپا۔ وہاں کی پولیس کا چیف بھی انقلاب پسند تھا۔ اس نے مجھے چھپائے رکھنے کا وعدہ دیا۔ چنانچہ میں نے جھوٹی جلاوطنی سے فرار ہو کر پہلے اپنے آپ کو دس برس فن لینڈ میں چھپائے رکھا لیکن روسی عوام میری قیادت سے کبھی بھی محروم نہ ہوئے۔ میں قلم اور اخباروں کی وساطت سے اُن کے درمیان رہتا تھا۔ میں اس دوران میں یورپ کے مختلف ممالک میں گھوما اور روس میں انقلاب کی پُر اثر تبلیغ کرنے کے لیے بین الاقوامی پشت پناہی اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب میکسم گورکی میرا ترجمان تھا وہ ہر لمحہ میرے ساتھ رہتا تھا

بالآخر ۱۹۱۲ء میں میں نے وی آنا سے "پراودا" (حقیقت) کے نام سے روسی زبان کا ایک جریدہ نکالا جو روس کی سرحدوں میں سمگل کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی میں بحیرۂ اسود کے ملاحوں کی ایک زیر زمین تنظیم کے ایک پرچے کا بھی نگران تھا۔ "پراودا" کی مالی سرپرستی سٹالن نے جوڑنے کر رہا تھا اور وہ بالاس جریدہ کا سرگرم رکن تھا۔ اس نے جریدے کی کامیابی اور اشاعت کی وسعت کے لیے دن رات اس طرح بھاگ دوڑ کی کہ اس کے اعصاب پر شدید اثر پڑا جس سے دماغ مفلوج ہونے لگا۔ اس نے وی آنا کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر نفسیات الفریڈ ایڈلر سے مشورہ کیا تو ایڈلر اس کا علاج کرنے لگا۔

الفریڈ ایڈلر فرائیڈ کا شاگرد تھا لیکن نظریاتی اختلاف کی بنا پر فرائیڈ کے مکتبۂ فکر سے الگ ہو گیا تھا۔ میں ایڈلر سے ملا تو مجھے علم نفسیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس علم کا مطالعہ کیا جو آگے چل کر میرے لیے سودمند ثابت ہوا

"پراودا" عوام اور محنت کشوں کے لیے مخصوص تھا اور روس میں یہی طبقہ ہمارا مخاطب تھا۔ جوزف کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ پراودا کی کامیابی کی خاطر اور انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کے لیے روس چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر گرفتار ہو گیا۔ اُسے طویل عرصہ کے لیے جیل رکھا گیا پھر سائبیریا بھیج دیا گیا لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں اسے رہا کر دیا گیا۔ وہ جوشیلا ادیب اور جاں نثار سپاہی تھا۔ بعد میں کامیاب ترین ڈپلومیٹ ثابت ہوا۔ میں اس کی بہت قدر کیا کرتا تھا مگر اس کی موت روس کے لیے شرمناک واقعہ ہے جس کا ذکر میں آخر میں کروں گا۔

میں وی آنا سے "پراودا" اور کئی اور اخباروں کی وساطت سے روسی عوام کے سینوں میں انقلاب کے شعلے بھڑکاتا رہا اور انھیں ایک مرکز پر یکجا کرتا رہا۔ اس دوران میرے ماں باپ چوری چھپے کبھی کبھی میرے پاس آتے رہے۔ میری ماں بیمار ہوئی تو میں نے برلن کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ صحت یاب تو ہو گئی مگر بیماری کا دوسرا حملہ شدید تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔ کیا روسی معاشرہ اُس ماں کی قبر پر پھول نہ چڑھائے گا جس کی کوکھ نے انقلاب کو جنم دیا تھا۔

میری ذاتی آمدنی محدود تھی۔ وقت نہیں ملتا تھا کہ اخباروں میں معاوضے پر مضامین لکھوں۔ میں زیادہ تر "پراودا" اور دوسرے انقلاب پسند اخباروں کے لیے مفت لکھا کرتا تھا۔ گھر میں بیوی اور دو بچے تھے۔ پہلی بیوی سے جو دو بچیاں تھیں روس میں میرے باپ کے پاس تھیں وہ دونوں خاصی بڑی ہو گئی تھیں۔ میرے گھر میں تنگ دستی بڑھنے لگی تو بیوی نے گھر کی چیزیں گروی رکھنی شروع کر دیں۔ دوسری [illegible] نے [illegible] کر دیا۔ اس کی دوا دارو کے لیے چند ضروری اشیا فروخت کرنی پڑیں۔ گھر میں علاوہ تنگ دستی [illegible]۔ سارا گھر بیوی نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے باوجود خندہ پیشانی سے سب کچھ سہہ رہی تھی اور مجھے میرے مشن کے لیے تازہ دم رکھتی تھی۔ میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کا آغاز تھا۔ جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو وی آنا میں تمام روسی باشندوں کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ میں بیوی بچوں کو ساتھ لیے زیورچ چلا گیا۔ چند ہی روز بعد وہاں کی سوشلسٹ پارٹی میرے ہاتھ میں آ گئی اور میری سرگرمیوں کا میدان اور وسیع ہو گیا

وہاں میں نے ایک پمفلٹ بعنوان "جنگ اور اقوام عالم" لکھا۔ یہ پمفلٹ بہت سی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور میری آواز کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں جا پہنچی۔ فرانس کی حکومت کو اس پمفلٹ نے زیادہ ہی پریشان کیا۔ وہاں کی ایک عدالت نے میری عدم موجودگی میں مجھے پانچ برس سزائے قید بامشقت سنادی۔ یہ پمفلٹ امریکہ پہنچا تو پریذیڈنٹ ولسن (جو چودہ نکات" طے کر رہا تھا) اسے خاص طور پر دیکھا اور اپنے نکات کے لیے اس سے استفادہ کیا۔ جنگ کے بعد امریکی پریس نے میرے خلاف بہت زہر اگلا اور پمفلٹ پر پابندی عاید کر دی۔ روس میں آج تک اس پمفلٹ پر پابندی عاید ہے۔

تھوڑا عرصہ بعد میں فرانس چلا گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں ہی اس پمفلٹ کا مصنف ہوں اب کے پیرس اجڑا ہوا تھا۔ جنگ کی ہولناکیوں نے گلیاں ویران کر رکھی تھیں اور فیشن زدہ زندگی پر جیسے سکتہ طاری تھا۔ میں نے وہاں ایک اخبار کی ادارت سنبھال لی اور دو اخباروں کی کالم نویسی مل گئی۔ وہاں فوجی سنسر بہت سخت تھا لیکن میرا قلم زبان بندی کا قائل نہ تھا۔ وہاں کی سوشلسٹ پارٹی مردہ ہو چکی تھی میں نے اسے از سر نو زندہ کیا۔ لینن بھی وہیں آ گیا۔ پھر میرے بیوی بچے آ گئے۔ لیکن فرانسیسی حکومت نے مجھے ملک بدر کر دیا۔ وہاں میرا سب سے بڑا دشمن روسی سفارت خانہ تھا۔

فرانس کی پولیس مجھے حراست میں لیے سپین کی سرحدوں پر چھوڑ گئی اور میں ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد سپین کی سی آئی ڈی کے دو سپاہی آئے اور مجھے پولیس سٹیشن لے گئے۔ پولیس کے ایک آفیسر نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے بچ بچ کر جچے تلے جواب دیئے۔ جس سے اس کے رویے اور مزاج میں نرمی آگئی لیکن وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا ——— تمھارے سیاسی نظریات کیا ہیں ——؟ میں نے اپنے نظریات تفصیل سے واضح کئے تو وہ سٹپٹا اٹھا اور بولا ——— تمھارے خیالات سپین کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ تمھیں اس ملک سے نکلنا پڑے گا۔"

مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ عجیب جیل خانہ تھا۔ کچھ کوٹھڑیاں صحیح معنوں میں کال کوٹھڑیاں تھیں اور بعض رہائشی کمروں کی طرح جن میں فرنیچر بھی تھا اور گھر کی سی ہر سہولت مہیا کی جاتی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ کمرے سزا یافتہ قیدیوں کو کرائے پر دیئے جاتے ہیں اگر قیدی مفت رہنا چاہے تو اسے کال کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ جیل میں کرائے کی کوٹھڑی میں رہتا۔ میرے مقابلے میں چور اچکے پیسے دے کر رہائشی کمروں میں رہ رہے تھے۔ گویا چور اچکے تو عیش کرتے تھے اور مجھ جیسے نادار پڑھے لکھے اور سیاسی لیڈر کال کوٹھڑیوں میں رکھے جاتے تھے۔ قید خانے میں یہ درجہ بندی مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ میں نے سوچا کہ معاشرے کا نظام ہر قیمت بدلنے کے قابل ہے۔

چند دنوں بعد مجھے میرے بیوی بچوں سمیت ایک بحری جہاز میں لاد دیا گیا جو نیو یارک جا رہا تھا۔ اس جہاز میں طرح طرح کے مسافر سوار تھے۔ مشکوک چال چلن کے لوگ، مفرور قیدی، کوئی باغی، کوئی جلاوطن۔ اسی انبوہ میں اوسکر وائلڈ کا چچازاد بھائی بھی تھا جو ناول نگار بھی تھا اور باکسر بھی۔ کہتا تھا کہ امریکہ جا کر بہت سے امریکیوں کے دانت توڑوں گا اور اچھے اچھے ناول لکھوں گا۔

اٹھارویں روز جہاز نے ہمیں نیو یارک پہنچا دیا۔

میں نے امریکہ کے متعلق سنا تھا دیکھا نہیں تھا۔ اب جو دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ دنیا ہی نرالی تھی۔ دولت ہی دولت تھی

مکانوں کی شکل و شباہت میں، مکانوں کے اندر، گلیوں اور بازاروں میں، سڑکوں اور پارکوں میں، لوگوں کی چال ڈھال اور لباس میں دولت ہی دولت کی نمائش تھی مجھے، ماڈرن کے عملی معانی نیویارک میں معلوم ہوئے۔ میں نے امریکہ میں بھی انقلابی سوشلسٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی امریکہ میں بکھرے ہوئے اشتراکیوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے لگا۔ میں دوسری تیسری شام کسی نہ کسی ہال میں تقریر کیا کرتا تھا

نیویارک میں ہم جب آئے تھے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمیں کرائے کا ایک مکان مل گیا۔ مالک مکان کے ایک حبشی کلرک نے ہم سے تین ماہ کا کرایہ پیشگی لے لیا لیکن رسید نہ دی۔ بولا کل دے دوں گا۔ لیکن اگلے روز وہ نظر نہ آیا پھر پتہ چلا کہ وہ کئی کرایہ داروں سے کرایہ وصول کر کے بمعہ بیوی بھاگ گیا ہے۔ مالک مکان ہمیں مزید کرایہ کے لیے پریشان کرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ ہم ادا کر چکے ہیں تو وہ رسید مانگتا تھا جو ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم نے گھر کی دو چار چیزیں بیچنے کا ارادہ کیا۔ چینی کے برتن ہی تھے۔ میں برتنوں کی پیٹی کا جائزہ لینے لگا تو اس میں کاغذ کی پڑیا نظر آئی۔ کھول کر دیکھی تو اس میں ہمارا تین ماہ کا کرایہ چھپا ہوا تھا جو ہم نے حبشی کلرک کو دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جن کا کرایہ لے بھاگا تھا انھیں رسیدیں دے گیا تھا تاکہ مالک پریشان نہ کرے۔ اسی لیے وہ ہماری رقم بھی چھپا گیا تھا۔ ہم نے وہ رقم مالک مکان کو ادا کر دی۔ سیاہ فام چور ہی سہی لیکن ان کے کردار میں ایک پہلو قابل تعریف بھی تھا۔

امریکہ میں ایک روز خوشخبری ملی کہ پیٹروگراڈ میں مکمل طور پر انقلاب شروع ہو گیا ہے اور زاروں کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ میرا ایک بیٹا جس کی عمر دو سال تھی بخار میں پڑا تھا۔ اس نے سنا تو اچھل کر بستر سے نکلا اور ناچنے لگا۔ اس کے ننھے سے دل میں ایک ہی بات آئی تھی کہ اب وہ روس جا سکے گا۔ وہ بخار ہی میں ناچتا کودتا باہر نکل گیا اور شام تک واپس نہ آیا۔ بہت تلاش کیا کچھ پتہ نہ چلا رات کا وقت تھا پولیس سٹیشن سے ٹیلی فون آیا کہ تمہارا بچہ راستہ بھول گیا اور بھٹک کر پولیس سٹیشن پہنچ گیا ہے۔ ہم جا کر اسے گھر لائے۔ دیکھا اس کا بخار اتر چکا تھا۔

اب وہ چٹانیں بنیادوں سے اکھڑ گئی تھیں جو میرے وطن کی راہ میں حائل تھیں میں نے بھاگ دوڑ کر روس کا پاسپورٹ بنوا لیا۔ بہت سے اور روسی باشندے بھی وطن جا رہے تھے انھیں بھی واپسی کے پاسپورٹ مل گئے۔ میں نے انقلاب کی پہلی نشانی نیویارک میں ہی دیکھ لی۔ روسی سفارت خانے میں زار کی جو تصویر آویزاں تھی اتار دی گئی تھی۔

ایک بحری جہاز ہمیں امریکہ سے نیو فن لینڈ لے آیا جہاں برطانوی افسروں نے روسی اور دوسرے یہودی مسافروں کے سامان کی تلاشی لی۔ انھوں نے مجھ سے میرے سیاسی نظریات کے متعلق بھی سوال پوچھے۔ میں نے گول سا جواب دیا کہ میں صرف وہ باتیں بتاؤں گا جو میری ذاتی شناخت سے متعلق ہوں گی مگر وہ جامہ تلاشی پر اتر آئے ایک افسر نے مجھے توہین آمیز لہجے میں کہا تم خطرناک قسم کے سوشلسٹ ہو لیکن میں اپنی ضد پر قائم رہا اور وہ اپنی ہٹ پر ڈٹے رہے۔

جہاز کو روک لیا گیا۔ پولیس کے چند اور آدمیوں کو بلا کر مجھے، میری بیوی اور دونوں بچوں کو اٹھا اٹھا کر جہاز سے باہر نکال دیا گیا۔ میرے گیارہ سالہ بیٹے نے ایک افسر کے پیٹ میں گھونسا مارا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا ——— پاپا! اسے اور مارو ——— مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی کہ میرا بیٹا برطانوی سیاست کو سمجھ گیا تھا۔

میں نے اعلیٰ افسروں کو ہر طرح کے دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ زار کی حکومت انقلاب کی نذر ہو چکی ہے اور اس

کے تمام وزرا یا تو روس سے بھاگ گئے ہیں یا انقلابیوں نے گرفتار کر لیے ہیں لیکن برطانیہ کے یہ اعلیٰ افسر بار بار کہتے رہے۔ ”تم زار کی حکومت کے لیے خطرناک عنصر ہو۔“

دراصل حکومت برطانیہ زار کی دوست حکومت تھی لہٰذا وہ انقلابی حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ انقلاب ابھی کامیاب نہیں ہوا تھا۔ زار کی فوجیں انقلابیوں کو کچلنے میں مصروف تھیں۔ معدودے چند جگہوں پر انقلابی کامیاب ہوئے تھے

مجھے ایک کھلے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور میری بیوی اور دونوں بچوں کو زنانہ جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ جس قیدی کیمپ میں مجھے محبوس کیا گیا وہاں آٹھ سو سے زائد قیدی تھے۔ جن میں پانچ سو صرف جرمن ملاح تھے۔ انھیں جنگ کے دوران برطانوی بحریہ نے جنگی قیدی بنایا تھا۔ وہاں میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی جنگی قیدیوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ میں وہاں ایک مہینہ قید رہا اور اس عرصے میں میں قیدیوں کو لینن، انقلاب اور اشتراکیت اور بغاوت کے بھی سبق دیتا رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قیدی، قیدی کیمپ کے افسروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور حکم عدولی پر اتر آئے۔ مجھے اکثر زبان بند رکھنے کا حکم دیا گیا لیکن میری سرگرمیاں بدستور جاری رہیں

میں نے برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی گئی نہ ہی میرا کوئی مراسلہ روسی حکومت تک پہنچنے دیا جاتا تھا۔ برطانیہ میں روسی سفارت خانہ مجھے قید میں رکھنے اور میرے خطوط کو روکے رکھنے میں پیش پیش تھا۔ یہ سفارت خانہ زار کا نمایندہ تھا۔

میری قید کی اطلاع روس پہنچ ہی گئی۔ روس میں مقیم برطانوی سفیر نے میرے خلاف ایک بیان دے دیا جس کا جواب لینن نے پراودا کی وساطت سے دیا۔ پراودا، لینن کی زیرِ نگرانی باقاعدگی سے چھپ رہا تھا۔ لینن نے لکھا کہ ٹراٹسکی وہ عظیم انسان ہے جس نے روسی عوام کو زاروں کے استبداد سے آزاد کرانے کے لیے اپنی عمر کے تیس ماہ و سال قید خانوں اور جلاوطنی میں گزار دیے ہیں۔ وہ کرۂ ارض کا خانہ بدوش بن گیا ہے۔ انقلاب کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس پر یہ الزام کہ اسے جرمنی کی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے سراسر غلط ہے۔

آخر مجھے رہا کر دیا گیا لیکن ذلیل کن طریقے سے ہمارا سامان قید خانے سے باہر پھینک کر ہمیں دھکے مار مار کر باہر نکالا گیا۔

روس کی سرحدوں میں داخل ہو کر میں سیدھا پارٹی کی انتظامیہ کمیٹی کے اجلاس میں چلا گیا۔ وفود نے میرا پُرجوش استقبال کیا لیکن منشویکوں اور ان کے حاشیہ برداروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ مجھے پارٹی کی قیادت سے محروم کرنا چاہتے تھے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن میں نے محسوس کیا کہ کچھ میرے مخالف بھی ہیں۔ پیٹرو گراڈ کی گلیوں میں عجیب رونق تھی۔ انقلابی گلیوں میں عسکری گیت گاتے گزر رہے تھے۔ بسوں اور ٹراموں میں بھی جنگ اور فتح کے گیت گونج رہے تھے۔ یار سے یوں لگا جیسے مجھے میری عمر کے وہ ماہ و سال واپس مل گئے ہیں جو میں نے قید خانوں اور جلاوطنی میں گزار دیے ہیں۔

میں نے پیٹرو گراڈ میں ہی کرائے کا ایک مکان لے لیا۔ اگلے روز ایک جوان سال فوجی افسر آیا وہ انقلابی تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ ایک کارخانے میں مستری ہوا کرتا تھا اور انقلابی تحریک کا سرگرم رکن۔ اسی طرح میں نے چند اور تبدیلیاں دیکھیں تو اس عظیم حقیقت کو ماننے سے ہی گھبرا رہا تھا جس کا ذکر میں سنتا ہی رہا تھا۔ اس کے باوجود میں قرائن سے اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ انقلاب ابھی ایک اور انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ میں

اسے کامیاب انقلاب سے کو بچا رہا تھا۔ زار کی فوجیں مورچوں میں ڈٹی ہوئی تھیں اور انقلاب کی پیش قدمی بہت سست تھی۔

عجیب واقعہ پیش آیا کہ کسی غلطی یا تعصب نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔ گو مجھے جلدی ہی رہا کر دیا گیا لیکن انقلابی صفوں اور سوسائٹی میں میرے خلاف شر پھیلا دیا گیا۔ میرے بیوی بچوں کو بھی گرد و پیش کے لوگ طعنے دینے لگے۔ کسی نامعلوم گوشے سے آواز اٹھی کہ لینن اور ٹراٹسکی جرمنی کے جاسوس ہیں۔ پڑوسیوں نے میرے گھر کے ساتھ بول چال بند کر دی لیکن میرا ایک بااثر رفیق مارکن آڑے آیا۔ اس نے میرے حق میں مدلل پروپیگنڈا کیا اور میرے لیے فضا صاف کی۔ اس کے باوجود مخالف گروہ نے مجھے اخبار سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مارکن کو مجھ سے نہیں اپنے عزائم سے ہمدردی تھی۔ وہ پیٹروگراڈ میں پرولتاری ڈکٹیٹرشپ قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بااثر ضرور تھا۔ سیاسیات میں اناڑی تھا۔ لہٰذا کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی بدولت میری پوزیشن اور مضبوط ہو گئی۔

اب انقلاب کی صورت خانہ جنگی کی سی ہو گئی۔ میں نے پیٹروگراڈ میں تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک ہجوم میری تقریریں سننے کو جمع ہوتا تھا۔ اور اس ہجوم میں روز بروز اضافہ ہوتا تھا۔ ایک رات میں تقریر کے بعد پیدل ہی گھر آ رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو اپنے تعاقب میں آتا محسوس کیا۔ میں ایک اندھیری گلی میں داخل ہو گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔ میں نے پستول نکال لیا اور گھوم کر انھیں للکارا۔ ایک نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کی حفاظت کے لیے ساتھ آئے ہیں۔ آپ اپنے گھر داخل ہو جائیں گے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔" دوسرے نے کہا "آپ کو شاید علم نہیں کہ ہر شام اس ہجوم میں آپ کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ انقلابیوں میں بعض لوگ ایسے ہیں جو آپ سے قیادت چھیننے کے لیے آپ کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ عوام کے دلوں میں میری اس قدر قدر و منزلت ہے۔ لینن بھی پیٹروگراڈ میں آ گیا۔ مخالف گروپ باقاعدہ ہمارے پیچھے پڑ گئے یہ روایتی تھی کہ ہمارے خلاف مظاہرے کرائے گئے۔ ہمیں علانیہ جرمنی کا ایجنٹ کہا گیا۔ انقلابی فوجوں میں بھی اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ بعض دستے ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ لینن نے ایک روز مجھے کہا۔ "اب وہ ہم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ وہ صرف موزوں وقت کے انتظار میں ہیں۔" اس دور میں شاہ عالم تماشائی تھا اور پارٹی کا والی وارث۔ اس نے حالات کا دھارا موڑنے یا قابو میں کرنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی ———

میری دونوں بڑی لڑکیاں جو پہلی بیوی سے تھیں سیاسی میدان میں آ گئیں۔ ان کے عزائم اور حوصلے بلند تھے۔ لیکن انھیں میری بیٹی ہونے کی پاداش میں جلسوں میں ذلیل و رسوا کیا گیا۔ مخالفین نے پراودا کے دفتر کو آگ لگا دی۔ تمام پریس بالشویکوں کے خلاف زہر اگل رہا تھا اس کے باوجود پارٹی کی وونگ میں میدان بالشویکوں کے ہاتھ رہا۔

عجیب تکلیف دہ صورت تھی۔ گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ رہی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح انقلابی فوج کو کمان میں لینا چاہتا تھا۔ وہ وقت بھی آ گیا۔ ایک روز مشین گن رجمنٹ کا کمانڈر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کی رجمنٹ میرا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ میں نے فوراً جا کر رجمنٹ کا معائنہ کیا اور اسی رجمنٹ کی وساطت سے فوجی انتظام پر آ گیا۔ اطلاع ملی کہ حکومت نے سرکاری پریس بند کر کے تمام سرکاری جرائد بند کر دیئے ہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ پریس کے قریب ہی ایک پلٹن مقیم ہے جو انقلابیوں کے ساتھ مل جانا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے کمانڈر سے بات کی تو اس نے میری حمایت کا وعدہ کیا۔ میں نے اس پلٹن کو سرکاری پریس پر قابض کر دیا اور اعلان کر دیا کہ پریس بدستور چلتا رہے گا اور تمام عملہ سرکاری جرائد

پہلے اس پر عمل شروع کرے گا۔ میرے ساتھ اب دو رجمنٹیں تھیں۔ میں نے ٹیلی فون ایکس چینج پر قبضہ کر لیا اور اپنے فوجی افسروں کو ہدایت دی کہ اب الفاظ کی جگہ اسلحہ استعمال کرو۔ کسی کو قتل کرنے سے گریز کرو اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔

اس اثنا میں چند اور فوجی دستے میری کمان میں آ گئے جنھیں میں نے منظم کر لیا۔ اور شہر کی اہم ترین جگہوں پر قبضہ کر لیا۔ میں مسلسل دو رات سو نہ سکا۔ میں اپنی فوج کو منظم طریقے سے لڑانے کی سکیمیں سوچا کرتا تھا۔ ایک شام ایک فوجی افسر نے مجھے سگریٹ پیش کیا تو میں پہلے ہی کش سے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو افسر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ بولا۔ "ڈاکٹر کو بلاؤں — ؟" میں نے کہا "نہیں! یہ تھکان کا اثر ہے۔ مجھے کھانے کو دو اور محاذ کی تازہ صورت حال سناؤ۔"

خبریں امید افزا تھیں۔ مخالف گروپوں کے علمی، سیاسی، عسکری اور معاشرتی ادارے ایک ایک کر کے ہمارے قبضے میں آ رہے تھے۔ ہماری فوج دفاعی جنگ لڑ رہی تھی۔ ادھر میری فوج میں نفری بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسرے ہی روز میں نے اعلان کر دیا کہ آج سے صوبائی حکومت کا وجود ختم کر دیا۔ ہم نے بعض وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ریلوے سٹیشن، ڈاکخانے، تار گھر، سرکاری دفاتر اور سٹیٹ بنک ہمارے قبضے میں آ چکے تھے۔ صرف زار کا سرکاری محل ابھی ہماری دست برد سے محفوظ تھا۔

آہ! وہ وقت مجھے اس طرح یاد ہے۔ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ میں اور لینن ایک کمرے میں داخل ہوئے تو لینن کی بہن نے فرش پر کمبل بچھا دیا۔ ہم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ہم دونوں کمبل پر دراز ہو گئے۔ لینن نے مسکراہٹ آمیز آہ بھر کر کہا۔ "کیا منظر ہے۔ مزدور، بندوق سے مسلح سپاہی کے دوش بدوش لڑ رہا ہے۔" ہمیں نیند سی آ رہی تھی کہ لینن چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بولا "محل کے متعلق کیا خبر ہے؟ کیا وہاں قبضہ کرنے میں خطرہ نہیں ہے؟ ہماری نفری شاید کافی نہیں۔" میں نے بڑے تحمل سے کہا "لیٹے رہو لینن! میں کسی کو بھیج کر پتہ کراتا ہوں۔"

ہمارے ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی کہ کرینسکی ہم سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے آگ بگولہ ہو کر کہا "ان سے کہو تمھیں اقتدار ملا تھا تو تم نے ہمیں جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ اب اقتدار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ تم شکست خوردہ ہو۔ کیا فاتح مفتوح سے سمجھوتا کر سکتا ہے؟ جاؤ انھیں کہو کہ تم اب اپنی اصلی جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ جہاں تاریخ کے گمنام صفحات تمھیں آوازیں دے سکیں گے۔"

لینن نے جب مجھے کہا کہ میں سرکاری اقتدار سنبھال لوں تو میں نے اپنے آپ کو اس عظیم پوزیشن کے لیے تیار نہ پایا۔ مجھے انقلاب کو سارے ملک میں پھیلانا تھا۔ میرے سامنے کریملن اور ماسکو تھے۔ عجیب بات ہے کہ میں بچپن سے ہی رائٹر بننا چاہتا تھا لیکن میرا دماغ تو جنگجو ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔ اور میں ادیب بننے کی بجائے جنگی ماہر بن گیا۔ میکسم گورکی نے میری فوجی اہمیت کو سراہتے ہوئے لینن کا حوالہ دے کر لکھا تھا "لینن کہتا ہے کہ صرف ٹراٹسکی ہے۔ جس نے افواج کو جدید مگر اثر انگیز انداز سے منظم کیا ہے۔ اس کے سوا یہ عظیم کام کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ٹراٹسکی معجزے کر دکھائے گا۔"

معجزے تو رونما ہوتے ہی رہتے تھے۔ جو شاید میری ہی اہلیت اور خلوص کا نتیجہ تھا۔ کریملن اور ماسکو میں ہمارا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ میں حالات اور کوائف کے مطابق اپنی مٹھی بھر فوج کو منظم کر کے لڑا رہا تھا۔ ہمارے مخالف گروپ ہمارے خلاف سرگرم تھے۔ انھیں ایک نقطہ مل گیا جو جرمنوں کی زبان سے کہلوایا گیا کہ "ٹراٹسکی نسل کا یہودی ہے۔" میرے آباؤ اجداد میں کوئی ایک کٹر یہودی تھی۔ لیکن نسل امتیاز انقلاب میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ بیرونی حلقے خصوصیت سے اس پروپیگنڈے کی تائید کرنے لگے

لیکن میں اس طوفانِ بدتمیزی سے بے نیاز عسکری انقلاب میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ لینن کی طرح میرے ساتھ تھا اور مخالفین کے الفاظ میں ملٹری ڈکٹیٹرشپ واضح شکل میں سامنے آرہی تھی۔ زار کی صفوں سے صلح کی کوشش ہونے لگیں لیکن شرائط ہمیں منظور نہ تھیں زار کی فوجوں کے سپاہی صلح پر آمادہ ہو رہے تھے۔ وہ دراصل زاریت سے اکتا گئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ صلح اور امن کی کوئی گنجائش نہیں تو وہ ایک ایک کر کے مورچوں سے باہر نکلنے لگے۔ انھوں نے کہا "ہم تو دو چار صلح کر لیتے ہیں"۔ ان کے کمانڈروں نے چلا چلا کر کہا "تم باغی ہو، تمھیں بغاوت کے جرم میں گولی مار دی جائے گی۔" بعض کو گولی مار بھی دی گئی۔ اس کے باوجود بے شمار سپاہی اسلحہ بارود سمیت ہم سے آملے ان کے کمانڈروں کو شاید علم نہ تھا کہ بغاوت کی جائز تعریف تو یہ ہے۔ "غلاموں کا بادشاہوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا" اور یہ کوئی جرم نہ تھا

سپاہیوں کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ ان کے کمانڈر رسپوتین جیسے مجذوب کے احکام اور ہدایات پر لڑ رہے تھے۔ احکام تو انھیں افسر دیتے تھے۔ لیکن احکام کے پس منظر میں رسپوتین پاگل ہو رہا تھا۔ سپاہی تو یخ بستہ راتیں مورچوں میں گزارتے تھے اور ان کے افسر رات بھر شراب پیتے تھے اور رسپوتین نیم عریاں لڑکیوں کے ساتھ ناچتا تھا۔

جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی اور یہ دور صبر آزما تھا۔ جرمنی نے پولینڈ کا کچھ علاقہ چھین لیا تھا۔ اور اب جرمنی کا خطرہ ہم انقلابیوں پر منڈلانے لگا۔ میری فوجیں ہر محاذ پر ثابت قدم تھیں لیکن قازان کے علاقے میں زار کی فوجیں اس قدر چابک دستی اور خوبی سے منظم تھیں کہ انقلابی فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ میں ریل گاڑی میں وہاں پہنچا لیکن گاڑی سے نکل نہ سکا۔ میں نے گاڑی کو ہی فوجی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ اس محاذ پر مقابلہ بہت سخت تھا۔ میں نئی سے نئی جنگی چالیں اختراع کر رہا تھا۔

میں ایک روز میدانِ جنگ میں کھڑا تھا۔ ایک جواں سال افسر مجھے محاذ کی صورت حال کی تفصیلات سنا رہا تھا۔ میرا توپ خانہ بے دریغ گولے داغ رہا تھا کہ اتنے میں دشمن کی توپ کا ایک گولہ مجھ سے چند گز دور آ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور گولہ میرے بالکل قریب آگرا اور میں سر سے پاؤں تک مٹی میں اَٹ گیا وہ جواں سال افسر جوں کا توں میرے پاس کھڑا تھا۔ پھر خیریت پوچھی۔ دو سال بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ افسر دراصل زار کا جاسوس تھا جو میری افواج کے بھیس میں آیا تھا۔ اس نے میرے پاس کھڑے ہو کر اپنے توپخانے کو اشارہ کیا تھا کہ گولے یہاں پھینکو۔ اس افسر نے مجھے مروانے کے لیے اپنی جان کو بھی توپ کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں بھی بچ گیا اور وہ بھی بچ رہا روس کو ایسے ہی دلیر اور جانباز افسروں کی ضرورت تھی کاش وہ میری افواج میں ہوتا۔

میں وہاں سے اپنی گاڑی کی طرف چلا تو میرے چاروں طرف گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اوپر سے ایک ہوائی جہاز اُڑتا ہوا گزر گیا اور میری گاڑی پر تین بم پھینک گیا۔ میرے محافظ دستوں نے دھڑا دھڑ ہوائی فائر کیے میں بال بال بچ گیا۔

انقلابی فوجوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بیری دور جنگیں گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور موسلا دھار بارش میں ایک عرصے سے لڑ رہی تھیں۔ ان کے کمانڈروں نے کھلے لفظوں میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں وہاں سے تبدیل کیا جائے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ ان کمانڈروں نے جب اصرار کیا تو میں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ میں حکم دے کر مطمئن بھی جانتا تھا۔ میں اپنی صفوں میں بغاوت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایسی کئی مثالیں دی ہیں کہ میری فوج میں بے اطمینانی پھیلنے لگی تھی۔ بعض سپاہیوں نے بھاگ جانے کی بھی کوشش کی۔ کچھ بھاگ گئے۔ بعض پکڑ لیے گئے۔ ہماری حالت نازک ہو چکی تھی۔ میں اب محاذ کے کونے کونے میں گھوم رہا تھا۔ ہر قدم پر توپوں کے گولے میرے ارد گرد پھٹتے تھے۔

ایک رات میں ایک تارپیڈو کشتی میں بیٹھ کر دریا میں جا رہا تھا۔ دشمن کے مورچے دریا کے پار تھے۔ میں وہاں تک جا کر ان کی پوزیشن دیکھنا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں کشتی دشمن کو نظر آ گئی تھی لیکن ہماری ایک توپ کا گولہ دشمن کے تیل اور پٹرول کے ذخیرے پر جا پڑا۔ آگ کے وہ شعلے بلند ہونے لگے کہ دور دور تک ذرہ ذرہ نظر آنے لگا۔ میری کشتی بھی اسی زد میں تھی۔ دشمن نے دیکھ لیا اور توپوں کے منہ کشتی کی طرف کر دیئے۔ تین گولے کشتی کے کنارے پر لگے۔ انجن بیکار ہو گیا اور کشتی میں پانی بھی بھرنے لگا۔ اب کشتی دریا کے رخ پر لہروں کے رحم و کرم پر جا رہی تھی۔ ہم تو سمجھے تھے کہ زندہ پکڑ لیے جائیں گے لیکن کشتی اندھیرے میں کنارے جا لگی۔ اور ہمیں بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

مجھے ہوائی جہازوں کی شدید ضرورت تھی۔ ہمارے ساتھ صرف ایک ہوا باز تھا مگر ہوائی جہاز کوئی نہ تھا۔ میں نے اسے کہا تو وہ بھاگ دوڑ کے اور ڈرامائی انداز میں چند ہوا باز مع ہوائی جہاز گھیر لایا۔ یہ جہاز فرسٹ کلاس نہیں تھے لیکن میری ضرورت پوری کر دیتے تھے۔ میں انھیں اسی قدر استعمال کرتا تھا کہ ہوا باز کے دشمن کے محاذ اور حرکات و سکنات کو دیکھ آتے تھے اور میں ان کی رپورٹ کے مطابق اپنی فوجوں کو آگے پیچھے کرتا تھا۔

ہم نے کازان کو بھی فتح کر لیا۔ میں اسی ریل گاڑی میں رہا۔ زار کی فوجیں دوسرے محاذوں پر ثابت قدم تھیں اور میں تلخ تجربات کی روشنی میں اپنی صفوں کو منظم کر رہا تھا۔ میری فوج کے بھگوڑوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ان میں سے بے شمار پکڑ لیے گئے۔ میں جب ان سے مخاطب ہوا تو وہ بے جگری سے لڑنے لگے۔ اور وہ میرے سب سے زیادہ وفادار سپاہی ثابت ہوئے۔ اس کے برعکس زار کی فوج کا جو بھگوڑا پکڑا جاتا تھا اسے وہ گولی مار دیتے تھے۔ دشمن کے بھگوڑوں کو بھی میں نے اپنی فوج میں بھرتی کیا اور لڑایا تھا۔

میں مسلسل ڈھائی برس اسی ریل گاڑی میں رہا۔ اسی کو فوجی ہیڈ کوارٹر بنایا تمام عملہ اسی میں بلا لیا۔ جہاں ضرورت ہوتی یہ گاڑی وہاں پہنچائی جاتی بیسیوں پر اس ہیڈ کوارٹر نے بہت کام کیا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس گاڑی نے مجموعی طور پر ایک لاکھ میل سے زیادہ سفر طے کیا ہے۔ اس گاڑی میں تار گھر بھی تھا، ٹیلیفون ایکسچینج بھی۔ موٹروں کا گیراج اور تیل پٹرول کا ذخیرہ بھی۔ اسی گاڑی میں ہمارا بھرتی کرنے والا عملہ بھی تھا۔ اسی میں گولے بارود کا ذخیرہ تھا۔ اور دوائیوں کا گودام بھی۔ آخر ایک رات یہ گاڑی دشمن کی گولہ باری کی نذر ہو گئی۔

پیٹروگراڈ کا محاصرہ کڑے امتحان کا وقت تھا۔ شہر میں دشمن نے حوصلہ شکن افواہیں پھیلا دی تھیں۔ جن سے ہماری فوجوں اور شہریوں میں بھی بے اطمینانی پیدا ہو چلی تھی۔ میں نے شہر کی گلی گلی میں جا کے لوگوں کو، اور مورچوں میں سپاہیوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شہر کی عورتیں اور بچے بھی شہر کی حفاظت کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے شہر کے ارد گرد مورچے کھدوا کر توپیں اور مشین گنیں نصب کرا دیں۔ میں نے شہریوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ کسی خبر پر یقین نہ کریں خواہ وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ معلوم ہو۔ زار کے اتحادی ممالک نے اپنے اخباروں میں اس طرح کی بے بنیاد خبریں چھاپ دی تھیں کہ زار کی فوجوں نے انقلابیوں سے پیٹروگراڈ چھین لیا ہے۔

اتحادیوں نے میرے خلاف پروپیگنڈے کے سلسلے ایک اور ذلیل حرکت کی وہ یہ کہ انقلابی فوج دراصل ایک آدمی کی فوج ہے اور ٹراٹسکی اس فوج کا ڈکٹیٹر ہے یہ کسی حد تک تھا بھی درست۔ میں انقلابی افواج کا سپریم کمانڈر تھا لیکن میرے پاس ایک جواز تھا۔ وہ یہ کہ جن حالات میں اور جس انداز میں میں نے انقلابی افواج کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک مرکز پر لایا گیا تھا اُسے صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔ لینن مجھے اکثر ہدایات دیا کرتا تھا لیکن وہ فیصلے مجھ پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگی صورت حال سے نمٹنے کا جو ملکہ مجھے حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ میرے پیش نظر ذاتی اقتدار نہیں روسی عوام کی نجات تھی۔

میری فوج میں مزدور، کسان، طلبا، زار کے باقی سپاہی، جیلوں سے بھاگے ہوئے قیدی اور دیگر شہری عوام تھے۔ انھیں زار کے تجربہ کار سپاہیوں کے مقابلے میں لڑانا آسان نہ تھا۔ بعض قصبوں میں میری فوجوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔ ادھر اتحادیوں اور زار پرستوں کا پروپیگنڈا میرے سپاہیوں کے حوصلے پست کر رہا تھا۔ ادھر پارٹی میں بھی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ایسی روح کش صورتِ حال میں مجھے ایسے احکام جاری کرنے پڑتے تھے، جنھیں عام آدمی کا دماغ "سمجھنے سے قاصر ہوتا تھا۔ پس منظر کا کسی کو علم نہ تھا۔

ہم نے جوابی حملے شروع کیے تو ہم سرکاری فوجوں کو دور پیچھے برفانی علاقے تک دھکیل لے گئے۔ جہاں سرکاری سپاہی بھوک اور بیماری سے مرنے لگے۔ ان کے کمانڈروں نے برطانوی امیر البحر کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ان کی کوئی مدد کیوں نہ کی۔ انھیں شاید معلوم نہ تھا کہ ان کا یہ برطانوی دوست ہماری تین تارپیڈو کشتیاں ڈبو چکا تھا اور بچوں کو بموں سے ہلاک کیا تھا اور برطانوی بحری جہازوں نے ہمارے ساحلی علاقوں پر گولہ باری کی تھی۔

میں نے پیٹروگراڈ کو بچا لیا۔ انتظامیہ کمیٹی نے، لینن نے، پولٹ بیورو نے اور تمام اداروں نے مجھے مبارک باد دی۔ کمیٹی نے روس کا اعلیٰ ترین اعزاز "آرڈر آف ریڈ فلیگ" مجھے عطا کرنے کی سفارش کی لیکن ایک کونے سے آواز آئی کہ اس اعزاز کا حقدار شالن ہے۔ شالن اس وقت ایک گمنام سالار تھا۔ سب حیران ہوئے کہ شالن کیوں حقدار ہے؟ لیکن لینن نے اس آواز کو دبانے کی بجائے مجھے کہا کہ یہ اعزاز شالن کو بھی دینے دو۔ لینن نے مجھے رازدارانہ انداز میں کہا "تم شالن کو نہیں جانتے۔ اسے جب تک وہ سب کچھ نہ مل جائے جو کسی دوسرے کو دیا گیا ہے تو وہ اپنے لیے جینا حرام کر لیتا ہے، نہ دوسرے کو جینے دیتا ہے۔ اور نہ کسی کو وہ بخشتا ہے۔" میں لینن کے خیال کو سمجھ گیا اور تائید کر دی۔ جب اعزاز دینے کی تقریب آئی تو شالن غیر حاضر تھا۔

ادھر جاری فتح سامنے نظر آنے لگی ادھر میرے خلاف الزامات سر اٹھانے لگے۔ ایک الزام یہ تھا کہ میں کسانوں کی توہین کر رہا ہوں اور ان کے عقیدے کو رسوا کر رہا ہوں۔ لیکن صحیح صورت یہ تھی کہ مجھے جاں نثار سپاہی کسانوں سے ہی ملتے تھے۔ لہٰذا میں ان سے سپاہی بھرتی کرتا تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت براہِ راست شالن سے کی۔ اس کے باوجود پارٹی میں جھک جھک چلتی رہی۔ ادھر ہمارے پرانے سپاہی جنگ سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ سستانا چاہتے تھے۔ زار اپنے فوجی افسروں کو ذرا ذرا سی بات پر بے رحمی سے بے عزت کر کے اپنی فوج سے نکال رہا تھا۔ ہم ان افسروں کو بھی اپنی فوج میں لے لیتے تھے۔ میری فوج میں "تنظیم نو" اور جدید ڈسپلن کا رواج تھا جسے پرانے سپاہی قبول نہ کرتے تھے۔ یہ قدامت پسندی پارٹی کے عہدیداروں میں بھی پائی جاتی تھی۔ اس تغیر نے اختلافات کے لیے گنجائش پیدا کر دی۔ اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ جو بالشویک محب وطن تھے بعد میں "ڈیموکریٹ" بن کر شالن کی نرالی "اشتراکیت" میں گم ہو گئے۔

شالن میرے خلاف درپردہ سرگرم رہنے لگا۔ افواج میں اب حکم عدولی بھی ہونے لگی۔ میرے بعض احکام پر اکثر تاخیر سے عمل ہوتا تھا۔ لینن کو معلوم تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ اس بدانتظامی کے پیچھے شالن کا ہاتھ ہے جو اس قدر درپردہ ہے کہ پکڑا نہیں جا سکتا۔ آخر میں نے شالن کو بلایا۔ اس سے بات کی تو اس نے بے رخی سے کہا، "تمہاری فوج کے افسر پیچھے ہٹتے ہیں۔"

میں نے تمام فوجوں کا دورہ کیا۔ تنظیم کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میں بیمار پڑ گیا اور شالن کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک شہر کا نام شالن گراڈ رکھ دیا حالانکہ لوگ شالن کے نام سے پوری طرح واقف بھی نہیں تھے۔

سٹالن کی کارستانیاں نمایاں ہونے لگیں تو میں نے لینن سے بات کی۔ اس نے مشورہ دیا کہ سٹالن سے مل کر کام کروں۔ میں نے کوشش کی کہ لینن کے مشورے پر عمل کر سکوں لیکن مجھ سے ایسا نہ ہو سکا۔ سٹالن کے عزائم اور نیت قابلِ اعتراض تھی۔ لینن بیمار تھا اور میں زیادہ تر محاذ پر رہتا تھا۔ چنانچہ سٹالن گروپ کو ابھرنے کا موقع ملا۔ پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سٹالن لینن کو میرے خلاف کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اس نے لینن کے کان میں یہاں تک ڈال دیا کہ ٹراٹسکی لینن کے خلاف ایک گروپ منظم کر رہا ہے۔

بات غلط ہی سہی لیکن یہ منصوبہ سٹالن کا تھا خطرناک۔ میں نے لینن سے براہِ راست بات کی اور پوچھا "کامریڈ لینن! کیا تم یقین کرو گے کہ میں تمھارے خلاف ایک گروہ منظم کر رہا ہوں؟"

"بکواس ہے۔" لینن نے کہا لیکن اس کا لب و لہجہ بدلا سا تھا۔

لینن مانے نہ مانے سٹالن شیطانیت کا بیج بو چکا تھا۔ بخارین کو کون نہیں جانتا۔ اس نے ایک بار کہا تھا: "سٹالن سست الوجود انسان ہے۔ وہ حاسد ہے ہر اس آدمی سے حسد کرتا ہے، جو اس سے بہتر کام کرنے کا اہل ہو۔" بخارین کی یہ رائے غلط نہیں تھی۔ جنگ آزادی فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ سفارتی کوشش چل رہی تھی۔ میں فوج اور سیاست کو نئے انداز سے منظم کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن سٹالن اپنی زمین دوز کارروائیوں میں مصروف تھا۔

آزادی کے پروانوں کا خون رنگ لایا۔ انقلابی فوجیں سارے ملک پر چھا گئیں اور ہم بدامنی کو سکون پذیر کرنے لگے۔ میں نے ملک میں خوراک کی کمی دور کرنے کے لیے ایک ٹیکس کی تجویز پیش کی تو لینن نے اختلاف کیا۔ میں چپ ہو گیا۔ یہ مخالفت لینن نے کی ہے مگر سٹالن کو موقع ملا اور اس نے اس مخالفت کو خوب اچھالا۔ لیکن یہ کسی نے بھی نہ سوچا کہ میری تجویز نہ ماننے پر ملک میں ایک سال تک اقتصادی بحران رہا۔

۱۹۲۲ء کا موسم بہار تھا۔ میری صحت دن رات کی مسلسل محنت اور اعصابی کھنچاؤ کو برداشت نہ کر سکی۔ میں دو ماہ کی چھٹی لے کر ماسکو چلا گیا۔ ایک روز میں مچھلی کے شکار کو گیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرا پاؤں جو پھسلا تو پاؤں میں موچ آ گئی اور بستر سے بھی نکلنے سے معذور ہو گیا۔ ادھر اطلاع ملی کہ لینن سخت بیمار ہے۔ لینن اپنی اور اپنے رفقاء کی صحت کے متعلق بہت ہی محتاط رہا کرتا تھا۔ کہتا تھا "ہم جیسے بوڑھے مر جائیں گے تو نوجوان ہتھیار ڈال دیں گے۔"

دسمبر ۱۹۲۲ء تک لینن کی صحت اور زیادہ بگڑ گئی اور اس نے کہیں باہر چلے جانے کا ارادہ کیا لیکن جا نہ سکا۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں اس کی صحت تشویشناک حد تک خراب ہو گئی۔ بخارین میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ کر رو دیا۔ کہنے لگا: "لینن بہت بیمار ہے۔ خدا کے لیے تم صحت یاب ہو جاؤ اور تندرست ہی رہنا۔ تم دو ہی تو ہو ورنہ روس کی تباہی یقینی ہے۔" لینن کا چلنا پھرنا بھی دشوار ہو گیا۔ تو سٹالن کو کھلا میدان مل گیا۔ اس نے بیشتر عناصر اپنے ساتھ ملا لیے۔ لینن صحت یاب ہونے لگا اور اسے ہلکا سا افاقہ ہوا ہی تھا کہ اس نے پھر پارٹی کی باگ ڈور تھام لی۔ سٹالن دب گیا۔ لیکن وہ دوسرے ہتھکنڈوں سے میرے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

لینن اپنے لیے ہی روسی عوام کی بہبود کے لیے بے رحم ثابت ہوا۔ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہو کر کام پر آنا چاہیے تھا مگر وہ ذرا سا چلنے کے قابل ہوا اور دفتر میں آ گیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے وہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اس کی صحت یابی کے عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ پارٹی کے ہنگامہ خیز اجلاس ہوئے۔ کئی اہم ترین مسائل زیر بحث آئے جھک جھک ہوتی۔ فیصلے ہوتے۔ لینن جو بارہ چودہ گھنٹے مسلسل کام کرنے

کا عادی تھا۔ وہ ہی تین گھنٹوں بعد بستر پر جا گرا۔ میری اپنی صحت ڈانواں ڈول تھی۔ بعض افسروں کے کورٹ مارشل ہوئے جنھیں میں نے سزائیں دیں اور سٹالن نے اسے ظلم کا نام دے کر میرے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا۔ اب تو لینن کبھی نہ اٹھنے کے لیے بستر پر گرا تھا۔ سٹالن اس کی علالت کو دیکھتے ہوئے پچھلے دروازے سے بے خوف و خطر اندر رینگنے لگا۔ اور جن لوگوں نے انقلاب بپا کر کے زاروں سے حکومت چھینی تھی انھیں باہر دھکیلا جانے لگا۔

لوگ اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔ "تم سے اقتدار کیوں چھین گیا تھا؟" تو مجھے طویل، بہت ہی طویل داستان سنانی پڑتی ہے مختصر یہ کہ جو انقلاب لایا تھا۔ وہ نفسیاتی تھا۔ ہمارے دلوں میں جذبہ ہی کار فرما تھا۔ مگر سٹالن اپنی نفسیاتی کیفیت سے مجبور تھا۔ اب تو یہ عالم تھا کہ پارٹی کے اجلاس سے پہلے ممبر لابی میں کانا پھوسی میں مصروف نظر آتے تھے۔ لیکن مجھے آتا دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے جیسے مجھ سے کچھ چھپا لینا چاہتے ہوں۔ ایک سازش تھی جو اندر ہی اندر پنپ رہی تھی اور اس کا روح رواں سٹالن تھا۔ سٹالن میں خصوصیت ہے کہ بحث کا پکا ہے۔ کام جو ہاتھ میں لیتا ہے ختم کر کے دم لیتا ہے۔ لیکن اس کے ہاں خلوص ناپید ہے۔ اس کا سیاسی شعور بہت محدود ہے۔ اور اس کے نظریے قدیم ہیں۔ اس میں ذہانت کی ہے اور وہ کمیونزم کے پردے میں بادشاہ ہے۔ سیاسی میدان میں انقلاب کے دوران بھی اس کا تیسرے درجے کا رول ادا کرتا رہا اور وہ بھی گمنام سا رول۔

۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء لینن مر گیا۔ وہ زندہ ہی تھا کہ ڈاکٹروں نے میری صحت کو دیکھتے ہوئے مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ وہیں مجھے سٹالن کا تار ملا کہ لینن مر گیا ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ اسے اگلے ہی روز دفن کر دیا جائے گا۔ میں اتنی جلدی پہنچ نہ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی لکھا گیا تھا۔ "تم اپنے علاج کو جاری رکھنا۔" لیکن بعد میں پتہ چلا کہ لینن کو تین روز بعد دفن کیا گیا تھا۔ سٹالن وغیرہ مجھے اس کی زندگی میں بھی آخری وقت بھی اور دفن ہونے تک مجھے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ ڈرامہ کامیابی سے کھیلا تھا۔

لوگوں نے مجھے کہا کہ میں لینن کی موت پر کچھ کہوں یا لکھوں لیکن جذبات کی فراوانی نے مجھے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔ میں نے اس قدر کہا، لینن مر گیا ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ میں ہسپتال کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں سے سمندر نظر آتا تھا۔ میرے ذہن کے گوشے گوشے میں لینن چھایا رہتا تھا۔ مجھے اس کی ہر بات یاد آتی تھی تو دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اس سے پہلی ملاقات، اس کی رفاقت، اس سے اختلافات رائے، دوستی، محبت، اس کے دوش بدوش جنگ اور جان لیوا حالات کا سامنا —— آہ! ہم دونوں نے طویل اور کٹھن مسافت طے کی تھی!

لوگوں کو تو توقع تھی کہ میں لینن کی موت کے بعد فوراً ماسکو پہنچ جاؤں گا۔ لیکن میں نہ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد پارٹی کے چار عہدیدار میرے پاس آئے اور کہا کہ محکمہ جنگ میں چند تبدیلیوں کے لیے ماسکو میں میری شدید ضرورت ہے۔ مجبوراً میں بھی چلا گیا۔ میں جانتا تھا مجھ پر طنز کیا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ جن تبدیلیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کے متعلق فیصلے بھی کیے جا چکے ہیں۔ مجھے صرف تماشا دکھانا اور تماشا بنانا مقصود تھا۔

میرے قابل اعتماد جرنیلوں کو تبدیل کیا جا چکا تھا۔ ان کی جگہ سٹالن کے حاشیہ برداروں نے لے لی تھی اور سٹالن نے خود محکمہ اقتصادیات سنبھال لیا تھا۔ اس نے اپنی مرضی کا ایک افسر مشینری وغیرہ خریدنے کے لیے اور وہاں کی اقتصادیات کا جائزہ لینے

کے لیے امریکہ بھیج دیا تھا۔ سب سے زیادہ قبیح حرکت تو یہ ہوئی کہ سٹالن گروپ نے انقلاب کی ایک فرضی تاریخ مرتب کرلی تھی جس میں عجیب و غریب اور بے بنیاد واقعات اختراع کر لیے تھے جو وہ لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔ حالات اور واقعات کو اپنے عزائم اور ضرورت کے مطابق بڑی ڈھٹائی سے توڑا مروڑا گیا تھا۔ لینن اور ٹراٹسکی (میرے) سے متعلق واقعات کو بھی کھول کر مسخ کیا گیا اور جیالوں کے کارناموں کو ایک ناکام سازش کا نام دے دیا گیا۔ عوام کو جادۂ حق سے گمراہ کیا گیا۔ ان کے خیالوں میں انتشار پیدا کیا گیا اور ان کے لیے وہی کارنامے جو انھوں نے میری قیادت میں سرانجام دیئے تھے معمے بن گئے۔ یہ سب کچھ اقتدار کی خاطر ہو رہا تھا۔

میرا بخار تیز تر ہوتا چلا گیا۔ پریس میں میرے خلاف الزامات کی طویل فہرست چھپنے لگی اور "پراودا" جیسا اخبار جھوٹ کا پلندہ بن گیا۔ تاریخی اخبار اب سرکاری پرچہ بن چکا تھا۔ میں نے اخبار پڑھنے ہی چھوڑ دیئے۔ پارٹی اب دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک حصہ در پردہ کام کرتا تھا اور دوسرا حصہ محض تماشائی تھا۔

جنوری ۱۹۲۵ء کو مجھے جنگ کے محکمے سے سبکدوش کر دیا گیا اور مجھے بظاہر بیکار سی ایک کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اس کے تحت سائنسی اور صنعتی محکمے تھے جن کے ساتھ میرا ذرہ کا بھی تعلق نہ تھا۔ میں سائنس اور صنعت کی الف ب بھی نہ جانتا تھا۔ تاہم میں اسی میدان کے نشیب و فراز کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اپنے خلوص کے زیر اثر ملک کی سائنسی اور صنعتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ ملک کے اقتصادی نظام کے استحکام کے لیے سائنس اور صنعت کی ترقی لازمی ہے ورنہ ہم غیر ملکی انحصار سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ میں نے کارخانوں اور تجربہ گاہوں کے دورے کرنے شروع کیے۔ صف اول کے صنعتکاروں اور سائنسدانوں کو یکجا کیا اور انھیں دن رات محنت کرنے پر اکسایا۔ میں نے شبانہ روز محنت کرکے اس موضوع پر کتابیں پڑھیں اور خود پمفلٹ لکھے لیکن میرے مخالفین نے میری ان سرگرمیوں کو خوب رسوا کیا۔ انھوں نے بہ بانگ بلند کہا: "ٹراٹسکی اب سائنس اور صنعت کے ذریعے ملکی اقتصادیات کو مفلوج کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

سائنسدان اور صنعتکار میری نیت، دانشمندی اور تیز رفتاری کے قائل ہو گئے تھے لیکن سٹالن کا اثر و رسوخ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا اور میری سرگرمیوں کو تار تار کرتا رہتا تھا۔ ہر جگہ "ٹراٹسکی ازم" کی اصطلاح پھیلا کر لوگوں کو مجھ سے خبردار رہنے کو کہا گیا۔ اس کا اثر اور بہت ہوا۔ سائنسدان، صنعتکار اور ماہرین اقتصادیات مجھ سے بدکنے لگے، اور میرے منصوبوں کو ردی کی ٹوکریوں میں پھینکنے لگے۔ میں نے آخر تنگ آکر اس محکمے سے استعفیٰ دے دیا۔

میرے حامیوں نے چنداں پروا نہ کی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ سٹالن آخر ہے ہی کیا؟ ان کا خیال تھا کہ پارٹی کی انتظامیہ میں مجھے اکثریت حاصل ہے۔ لیکن جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اکثریت پر سٹالن کا سایہ غالب ہے۔ اجلاس میں جب میرے حامیوں نے سٹالن کے خلاف آواز اٹھائی تو انھیں "ٹراٹسکی ازم" کا پیروکار کہہ کر ان پر ہوٹنگ کی گئی۔

میں پہلے کہیں کہہ آیا ہوں کہ انقلاب سے پہلے اور دوران میں سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا دور تھا لیکن انقلاب کے بعد نفسیات کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ سٹالن کی سرد جنگ اس کی نفسیاتی خلفشار کی آئینہ دار تھی۔ دراصل روس کے انقلاب کے بعد کے جو مسائل تھے وہ نفسیات سے نہیں سیاسیات کی روشنی میں حل ہو سکتے تھے۔ اسی دوراہے سے میرا زوال شروع ہوا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے

ساتھیوں سے مل کر تخریب کے خلاف ان تھک جدوجہد شروع کی لیکن میں سیلاب میں ایسے مشکیزے پر تیر رہا تھا جس میں کئی سوراخ تھے اور مشکیزہ پانی سے بھرتا جا رہا تھا۔

مجھے ہلکی ہلکی سی حرارت رہتی تھی پھر بخار تیز ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مجھے برلن جانے کا مشورہ دیا اور میں برلن چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ ماسکو میں میری غیر حاضری میں کیا ہو گا لیکن میری صحت خطرناک حد تک بگڑ چکی تھی۔ برلن میں ڈاکٹروں نے میرے ٹانسلوں کا اپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ لیکن بخار بدستور رہا۔ ہسپتال میں کافی عرصہ رہنا پڑا۔ مگر میں صحت یاب ہونے لگا۔ ایک صبح آنکھ کھلی۔ میں اٹھا تو دیکھا میرے کمرے کے دروازے پر جرمن پولیس کے دو افسر کھڑے تھے کھڑکی سے باہر دیکھا تو برآمدے میں دس بارہ پولیس کانسٹیبل رائفلیں لیے کھڑے نظر آئے ہسپتال سے ذرا پرے ایک ہجوم کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اور پولیس ہجوم کو روکے کھڑی تھی اتنے میں میرا ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش عین وقت پر پکڑی گئی ہے۔ ایک آدمی جو روسی تھا مجھے قتل کرنے کو آ رہا تھا۔ لیکن پولیس کو بر وقت پتہ چل گیا اور اس آدمی کو ریوالور سمیت گرفتار کر لیا گیا ہے۔

میں حیران نہ ہوا۔ میں جانتا تھا کہ سیاسی حلقوں میں جس شدت سے میری مخالفت ہو رہی تھی وہاں میرا قتل حیران کن نہ تھا جس آدمی کو میرے قتل کی کوشش میں گرفتار کیا گیا اس نے عدالت میں بیان دیا: "مجھے روس کے سرکاری محافظ دستوں کی طرف سے ٹراٹسکی کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔" جرمن والے ملزم کے بیان پر یقین کرنے سے گریز کر رہے تھے لیکن پولیس کی تحقیقات اور شہادتوں نے ثابت کر دیا کہ ملزم کا بیان درست تھا۔

ماسکو میں "پراودا" کے صفحوں میں انقلاب کی روح کے خلاف اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے دل کھول کر جھوٹ چھاپا جا رہا تھا۔ میں نے جنگ عظیم کے بعد کے حالات سے متاثر ہو کر ایک کتاب لکھی: "انگلستان کس طرف جا رہا ہے" ظاہر ہے کہ برطانوی شہنشاہ بہت سخت برہم ہوئے۔ میں نے ماسکو جا کر مرکزی کمیٹی سے پہلا مطالبہ کیا کہ ماسکو میں برطانوی کونسل خانے کو بند کیا جائے مگر سٹالن نے مطالبہ ٹھکرا دیا۔ اس وجہ سے بھی کہ سٹالن انگریزوں کی دوستی سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ یہ میری تجویز تھی۔

سٹالن خود تو ذرا دور رہا، اس نے اپنے حواریوں سے یہ لکھوا دیا کہ "ہم نے بالآخر مان لیا ہے کہ ٹراٹسکی ازم ایک فتنہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے مفاد کو نظر انداز کر کے ڈکٹیٹرشپ قائم کی جائے۔" اس کے باوجود جب پارٹی کے سالانہ اجلاس کا وقت آیا تو لوگوں نے سڑکوں اور گلیوں میں میرے نام کے نعرے لگائے۔ پولیس کے افسروں نے مجھے گھیر لیا اور کہا کہ پولیس میری حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ کیوں کہ لوگوں کا ہجوم میرے خلاف بھڑکا ہوا ہے۔

پھر انقلاب اکتوبر کی دسویں سالگرہ کا موقع تھا۔ لوگوں نے ایک بار پھر میرے اور لینن کے نام کے نعرے لگائے۔ لیکن ایک پولیس افسر نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میں بال بال بچ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد بظاہر پاگل سا ایک آدمی میری گاڑی کے پائیدان پر چڑھ آیا اور شیشے توڑ دیے پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ یہ آدمی پولیس کا اپنا آدمی تھا۔

اس وقت اے اے جوفے، جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے، جاپان میں روس کا سفیر تھا۔ وہ میرا دست راست تھا اور دوست۔ اسی نے "پراودا" کو مالی سہارا دیا تھا اور ایک طویل مدت وی آنا سے اخبار کے پرچے روس کی سرحدوں میں سمگل کرتا رہا

تھا۔ سٹالن اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ جوفے میرا حامی اور سچا دوست ہے۔ وہ اب جاپان میں سفیر تھا اور پارٹی میں اس کا اچھا اثر تھا۔ سٹالن نے اسے واپس بلا لیا اور اسے طرح طرح کے دکھ دے کر اس کے لیے ایسی فضا پیدا کی کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ سٹالن گروپ نے اس کے علاج میں بھی رخنہ اندازی کی۔ آخر جوفے نے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنے آپ کو گولی ماری تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ مرنے سے پہلے اس نے میرے نام ایک خط لکھ کر میز پر رکھا تھا اور چند کاغذات کا ایک بنڈل بھی جس پر میرا نام چھوڑا تھا۔ لیکن یہ خط بھی اور بنڈل بھی غائب کر دیئے گئے۔ ان دونوں چیزوں کی گمشدگی پر پریس میں بھی شور اٹھا۔ سٹالن گروپ بوکھلا گیا اور ایک غلط سلط خط لکھ کر عوام کو دکھایا۔

میرے بھی کچھ قابلِ اعتماد ذرائع تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جوفے نے میرے نام طویل خط لکھا تھا، جس کا لب لباب یہ تھا: "ٹراٹسکی! تم میرے رفیق ہو اور میں تمھارا بہت احترام کرتا ہوں۔ تم نے روسی عوام کے لیے اور میرے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ راہِ راست ہے۔ لیکن تم میں ایک خامی ہے جو لینن میں نہیں تھی۔ وہ یہ کہ تم فوراً سمجھوتوں پر اتر آتے ہو۔ اس کے برعکس لینن اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔ تمھارے سمجھوتے بھی نیک نیتی کے مظہر ہوتے ہیں لیکن تمھارے دشمنوں نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ میں تمھیں یہ خامی جتانا چاہتا تھا لیکن موقع نہ ملا۔ اب جب کہ میں جا رہا ہوں تمھیں کہہ جاتا ہوں کہ تم بہرحال سچے ہو لیکن لینن کی طرح تم ہٹ کے پکے نہیں۔ تمھارا خلوص رنگ لائے گا۔ ہاں ہاں ——— !
الوداع میرے رفیق — ؟"

۱۰ جنوری ۱۹۲۸ء میں اور میری بیوی ایک بار پھر بوریا بستر باندھ رہے تھے۔ ہماری عمر کا ایک طویل حصہ بوریا بستر باندھتے گزرا ہے کبھی جیل، کبھی جلاوطنی۔ ہم نے گلی گلی قریہ قریہ اور ملک ملک کی خاک چھانی ہے مگر جس مشن کے لیے ہم خانہ بدوش رہے وہ سر کر چکے تو ہمیں ایک بار پھر خانہ بدوش ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ہم بستر باندھ چکے، سامان ٹرنکوں میں بند کر چکے تو میرا کنبہ پولیس کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ مجھے میرے پورے کنبے سمیت جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ میرے مکان کے گرد میرے پیروکاروں کا ہجوم ہیجان اور تجسّس لیے کھڑا تھا۔ حکم ملا تھا کہ ہمیں دو گھنٹے بعد اسکول کی حدود میں نظر بند کیا جائے گا۔ لیکن یہ دو گھنٹے دو دنوں پر پھیل گئے۔

اس دن گاڑی کے گرد ہجوم نعرے لگا رہا تھا جس میں مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ ہجوم مجھے الوداع کہنے آیا تھا لیکن پولیس نے جابرانہ سے کام لیا اور مجھے اس ڈبے میں بیٹھنے ہی نہ دیا جو میرے لیے وقف تھا۔ عوام نے ریلوے سٹیشن پر ہلہ بول دیا۔ پولیس اور عوام کی جھڑپیں ہوئیں۔ کئی مرے، کئی گرفتار ہوئے پھر بھی لوگ "ٹراٹسکی زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ گاڑی روک لی گئی اور مجھے واپس گھر پہنچا دیا گیا۔ چند روز بعد پولیس مجھے لینے کو چوری چھپے آئی تو میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں پولیس نے مجھے اٹھا کر، گھسیٹ کر اور دھکے مار کر گھر سے نکالا اور ریلوے سٹیشن پہ پہنچایا۔

میرا ایک تلخ ترین سفر شروع ہوا اور مجھے اسکول کی حدود میں پابند کر دیا گیا۔ لیکن میں نے عوام کو بیدار کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ میرے حامیوں کے خطوط اور تاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ اور میں حزبِ مخالفت کے قائد کا رول ادا کرنے لگا۔ آخر مجھے حکم ملا کہ "میں سیاسی سرگرمیاں بند کر دوں" ورنہ ملک بدر کر دیا جائے گا۔" میں نے اس حکم کی پروا نہ کی۔ میں نے مسلسل تیس برس کی جدوجہد اور خانہ بدوشی سے روس کو شہنشاہیت سے آزاد کرایا تھا۔ اب اس سے کیوں کر دستبردار ہو جاتا۔ لیکن مخالف طوفانوں کے تھپیڑے بڑے ہی جان لیوا تھے۔

میرے دو ساتھی جو اب بھی میرے ساتھ تھے گرفتار کر لیے گئے اور انھیں جیل میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بے شمار بالشویکیوں اور لینن کے حامیوں کو چن چن کر گرفتار کیا گیا اور انھیں جیلوں میں اذیتیں دی گئیں۔ مجھے زبان بندی کا حکم ملا تو میں نے تحریری جواب دیا کہ میں اپنی جدوجہد سے باز نہ رہ سکوں گا۔

اس کا جواب مجھے یہ ملا ——— "تعزیرات کی دفعہ ۱۰/۵۸ کے تحت روس کے شہری ٹراٹسکی کی سرگرمیاں غیر قانونی اور ملک کے مفاد کے منافی ہیں۔ اس امر کا بھی ثبوت ملا ہے کہ ٹراٹسکی کی سرگرمیاں موجودہ روسی حکومت کے خلاف مسلح کارروائی کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں ٹراٹسکی کو جو روس کا شہری ہے، روس کی سرحدوں سے نکال دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

پولیس کا ایک افسر یہ حکم نامہ لیے میرے پاس آیا۔ میں نے حکم نامے پر یہ تحریر لکھی ——— "ملزم ٹراٹسکی جو روس کا شہری ہے اس نے یہ حکم وصول کر لیا ہے جو تعزیرات کی دفعہ ۱۰/۵۸ کے تحت سراسر غیر قانونی ہے ——— ٹراٹسکی"

روس سے میرا آخری سفر شروع ہوا جو میری جانی پہچانی، دیکھی بھالی جگہوں سے ہوتا ہوا مجھے ترکی کی سرحد تک لے گیا۔ میرے ہمراہ میرا کنبہ اور پولیس کی گارد تھی۔ مجھے ترکی کی سرحد پر ترکی کی پولیس کے حوالے کر کے میرے اپنے وطن کی پولیس واپس چلی گئی۔ میں نے ترکی کے صدر مصطفےٰ کمال پاشا کو ایک تحریری پیغام بھیجا ———

محترم صدر ———!

میں قسطنطنیہ کی دہلیز پر پہنچا ہوں۔ میں آپ کے ملک میں اپنی مرضی سے نہیں آیا
بھیجا گیا ہوں۔ براہِ کرم میرا سلام قبول کیجیے۔ آپ کا خادم ٹراٹسکی

۱۲ر فروری ۱۹۲۹ء

قسطنطنیہ میں مجھے ایک مکان مل گیا۔ ترکی کے پریس میں بھی بے بنیاد خبریں چھپنے لگیں۔ ان کا منبع سٹالن کا دماغ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سچائی کو منظرِ عام پر آتے آتے ایک لمبی مدت درکار ہوگی۔ برطانوی اخبار "دی ٹائمز" نے یہاں تک کہہ دیا کہ ٹراٹسکی سٹالن کی مرضی کے مطابق ترکی میں آیا ہے تاکہ مشرقِ قریب میں فوجی کارروائی کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ چرچل نے بھی اپنے اخبار پر یقین نہیں کیا ہوگا!

میں اب پھر خانہ بدوش ہوں۔ جرمنی نے اعلان کر دیا ہے کہ میں ان کے ملک میں داخل نہ ہو سکوں۔ فرانس نے بھی انکار کر دیا ہے اور امریکہ ایک مضبوط اور طاقتور ملک ہوتے ہوئے بھی خوفزدہ ہی رہتا ہے۔ مجھے اپنے انجام پر اکثر ہنسی آجاتی ہے لیکن روسی عوام پر رونا آتا ہے۔ جو کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے، وہ غلام ہیں، آزادی کے بعد بھی غلام ہیں۔

فیڈر دوستوسکی

(اپنے خطوں میں)

(۱۸۲۱ء — ۱۸۸۱ء)

ماسکو۔ موسمِ بہار ۱۸۳۴ء

پیاری امّی! جب تم ہم سے دُور چلی گئیں، تو میں بہت اُداس ہوگیا۔ اب جس دم مجھے تمھاری یاد آتی ہے تو میں بے حد مغموم ہوجاتا ہوں۔ کاش! امّی جان سمجھتیں کہ میں تمھیں ملنے کے لیے کتنا بیتاب ہوں۔ میں ہر دم خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ تمھاری صحت اچھی رہے۔

سینٹ پیٹرز برگ۔ ۴ر فروری ۱۸۳۸ء

ابّا جان! میں نے آخر کار ملٹری انجینئرنگ اسکول میں داخلہ لے لیا ہے اور وردی پہن کر سرکار کی ملازمت اختیار کرلی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جماعتوں، پڑھائی اور فرائض سے کچھ وقت نکال کر آپ سے باتیں کرنے کا موقع نکالا ہے۔ آپ کو خط لکھے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا سبب فقط یہ تھا کہ مجھے اب تک بالکل فرصت نہ ملی۔ ہماری مصروفیت کا اندازہ آپ یوں کرسکتے ہیں کہ صبح سے شام تک تو جماعت میں بیٹھے بیٹھے وقت گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ سُننے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ شام ہونے پر فراغت تو درکنار صبح کا آموختہ یاد کرنے کے لئے بھی ایک لمحہ تک میسّر نہیں آتا۔ کبھی ناچ کا سبق ہے تو کبھی گانے کا۔ ان سے کسی کو مفر نہیں۔ آخر ہمیں پہرہ دینے پر مامور کیا جاتا ہے۔ اس طرح سارا وقت کٹ جاتا ہے۔ چونکہ مجھے آپ کا خط ملا ہے۔ اس لیے میں سب کام چھوڑ کر جلدی جلدی اس کا جواب دے رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی حد تک یہاں کی زندگی کا عادی ہوگیا ہوں۔ لیکن میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے بارے میں حکام اچھی رائے رکھتے ہیں۔ سابق نگران میرے کام سے مطمئن تھا۔ مجھے پچاس روبل مل گئے ہیں۔ اب بھائی کے پاس ہیں۔ اس کے لیے میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ مجھے اس رقم کی ازحد ضرورت تھی۔ اب میں جلدی ضروری اشیا حاصل کروں گا۔ اتوار اور تہوار کے دن میں باہر نہیں جاتا۔ اس لیے کہ ہر جونیئر طالب علم کو لازمی طور پر اپنے افسر کو پہلے بتانا پڑتا ہے کہ اسے کس رشتہ دار سے ملنا ہے۔ اس لیے میں فی الحال بھائی سے نہیں مل سکا۔ نہ آپ کے تازہ ترین خط ہی پڑھ سکا۔ مجھے صرف ایک بار کیشا مارو سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ وہیں مجھے بھائی کے انجینئر ہونے کی خوش خبری ملی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری دیرینہ خواہش پوری ہوگئی اور بھائی کو ذریعۂ معاش مل گیا۔ اُمید ہے اب ہمارے حالات درست ہوجائیں گے۔ آپ نے اس بارے میں اب بھی چند خدشات ظاہر کئے ہیں۔ بیشک اگر کیشا مارو نہ ہوتا تو بات خواہ مخواہ نہ بڑھتی اور وہ میرے بھائی کو حتی الوسع اپنے پاس رکھ کر بصورت

تین سو روبل پر اپنا حق جتاتا رہتا جو وہ نہایت کمینگی سے ہم سے بٹور لیا کرتا تھا۔ آپ کو میرے بھائی کے تازہ خط سے پتہ چل گیا ہوگا۔ کہ وہ اپنے ہونے والے جرنیلوں گیروگس اور ٹروسن سے ملا ہے اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا ہے جیسے وہ ابھی سے سرکاری ملازم ہوگیا ہے۔ اس لیے فیصلہ یقینی ہے اور تردد کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ٹروسن نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بھائی کو کمیشن دلوانے کے لیے افسروں پر اپنا رسوخ استعمال کرے گا۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا — مجھے حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ جرنیل نے امتحانات کے بعد چار نوواردوں کو سرکاری خرچ پر داخلہ دلوانے کے لیے اور اس کے علاوہ کیشا مارد (جس نے میری اسامی پر ڈاکہ ڈالا تھا) کے امیدوار کے لیے اپنا رسوخ لڑایا۔ کتنی کمینہ حرکت ہے! یہ سن کر میرے سر پر بجلی گری۔ ہم لوگوں کو (جنھیں ایک ایک روبل کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے) تو ہر شے کی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن امیروں کے بچوں کو مفت داخلہ مل جائے۔ لعنت ہے ان پر!

۱۸۴۴ء ——— ۱۸۴۹ء

(ایم۔ ایم۔ ڈی کے نام)

میں زندہ کس طرح رہوں گا؟ اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے روکھا سوکھا روٹی کا ٹکڑا مل سکتا ہے۔ میں ابلیس کی طرح کام کروں گا۔ اب میں آزاد ہوں۔ لیکن اس وقت کیا کروں؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔

کسی کو معلوم نہیں کہ میں نوکری چھوڑ رہا ہوں اور چھوڑ کر کیا کروں گا، میرے پاس کپڑوں کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ میرا استعفا اکتوبر تک منظور ہو جائے گا۔ اگر یہودیوں نے کچھ نہ کیا تو میرا برا حال ہوگا۔ وہ مجھے سچ مچ گھسیٹ کر جیل لے جائیں گے یہ (ظاہر ہے) بڑی مضحکہ خیز بات ہے . . . .

تم کہتے ہو ڈرامے لکھنے سے میری مصیبت ختم ہو جائے گی لیکن کھیل پیش کرنے کے لیے بھی تو روپیہ درکار ہے۔ رہا میرا استعفا تو اگر میں نے پہلے نہ دے دیا ہوتا تو اب فوراً دے دیتا۔ اس کا مجھے افسوس نہیں۔

بس ایک امید ہے۔ میں "یوجینی گرانڈٹ" کے سائز کا ناول ختم کر رہا ہوں۔ خاصے کی انوکھی چیز ہے۔ میں نے اسے نقل کرنا بھی شروع کر دیا ہے اور ۱۴ تاریخ تک مجھے اس کے بارے میں فیصلہ یقیناً مل چکا ہوگا۔ میں اسے "اینلز آف دی فادر لینڈ" کو دے دوں گا۔ (میرا دل مطمئن ہے) کہ مجھے شاید چار سو روبل مل جائیں گے اور یہی میرا کل اثاثہ ہوگا۔ میں اپنے ناول کے بارے میں تفصیل سے لکھتا لیکن اس کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔

ماسکو والے انتہائی خود غرض، احمق اور جھکی ہیں۔ کارپن نے بغیر کسی حوالے کے اپنے خط میں مجھے نصیحت کی تھی کہ میں شیکسپیئر کی رَو میں نہ بہہ جاؤں — اس کے خیال میں وہ محض صابن کا بلبلا ہے۔

مجھے اپنے ناول پر بے انتہا خوشی ہے۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ کتنی۔ مجھے یقین ہے اس سے کافی رقم مل جائے گی — اور

پھر؟

سینٹ پیٹرز برگ ۔ ۱ اپریل ۱۸۴۶ء

میری شہرت بام عروج تک پہنچ گئی ہے۔ دو ماہ کے عرصے میں مختلف مطبوعات میں میرا پینتیس بار ذکر آ چکا ہے۔ بعض نے تو میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ بعض نے کچھ گھٹی گھٹی سی باتیں کی ہیں اور بعض نے جی بھر کر گالیاں دی ہیں کہ اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک بات سے میں بیزار اور دل برداشتہ ہو جاتا ہوں۔ ہمارا اپنا حلقہ بیلنسکی اور دیگر لوگ گولیاڈکن کی وجہ سے مجھ سے خفا ہیں۔ پہلا رد عمل تو ذرا جوش، باتیں، شور و غوغا اور چہ میگوئیاں تھیں، دوسرا تنقید تھا . . . . ہمارے حلقے اور ہماری پبلک کے ہر شخص کو گولیاڈکن (GOLYADKIN) نہایت بے مزہ، بیزار کن اور بے حد طویل لگا۔ یہاں تک کہ اسے پڑھنا بھی ناممکن تھا . . .

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں کچھ عرصے کے لیے پژمردہ رہا۔ مجھ میں ایک خوفناک کمزوری ہے۔ بے پناہ خود پسندی اور اُمنگ۔ مجھے اس خیال سے خفت ہوئی کہ میں لوگوں کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکا جو کچھ بننا چاہئے تھا نہ بن سکا۔ میں اس سے متنفر ہو گیا۔ اس کا بیشتر حصہ روا روی اور تھکاوٹ کے زیر اثر لکھا گیا۔ پہلا حصہ دوسرے سے بہتر ہے۔ نہایت عمدہ صفحات کے ساتھ ساتھ اتنی بکواس اور واہیات باتیں ہیں کہ انسان کو متلی آنے لگتی ہے۔ آدمی اسے پڑھ نہیں سکتا۔ اس نے کچھ عرصے کے لیے مجھے عذاب میں مبتلا رکھا اور میں برگشتہ خاطر ہو گیا۔ بھائی! میں تمھیں دو ایک ہفتے کے اندر اندر اسے بھیجوں گا۔ پڑھ کر دیکھنا اور مجھے اپنی رائے لکھنا۔

اب میں اپنی زندگی اور شاگردی کا ذکر ختم کرتا ہوں اور تمھیں ایک خبر سناتا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیلنسکی "اینلز آف دی فادر لینڈ" کو چھوڑ رہا ہے۔ اس کی صحت تشویشناک حد تک گر گئی ہے۔ وہ کسی چشمے پر یا شاید بیرون ملک جا رہا ہے۔ وہ ایک دو برس تنقید نہیں کرے گا اور اپنی مالی مدد کے لیے ایک ضخیم المناک (۹۶۰ صفحات) چھاپ رہا ہے۔ میں اس کے لیے دو کہانیاں لکھ رہا ہوں . . . . دونوں المناک دلچسپی کا باعث اور ٹھوس ہیں۔ ان کے لیے جواب دہ ہوں گا۔ ان کے علاوہ اوازکی اور نکراسو کے لیے کچھ لکھ رہا ہوں۔ یہ سارا کام مجھے ایک برس تک مصروف رکھے گا۔

دوسری خبر یہ ہے کہ نئے لکھنے والے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ چند مجھ سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں ہرزن اور گونچری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہرزن کی منظر عام پر آ گیا ہے۔ دوسرا منتظر ہے۔ ابھی کہیں نہیں چھپا۔ ان کی بے پناہ تعریف کی جاتی ہے۔ فی الحال میرا نام سرفہرست ہے اور مجھے اُمید ہے ہمیشہ رہے گا۔ مجموعی طور پر آج تک ادب میں اتنی سرگرمی پیدا نہیں ہوئی جتنی آج کل ہے۔ اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے . . . .

تیسری بات میرے عزیز ترین دوست یہ ہے کہ اگر تم اپنی دُنیا سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمھیں اپنی صلاحیتیں دکھانے اور ترجمہ کر کے نام پیدا کرنے کا موقع ہے۔ گوئٹے کی فاؤسٹ کا ترجمہ کرو۔ درحقیقت مجھے فرمائش کی گئی ہے کہ یہ کام تمھارے سپرد کروں۔ کیونکہ نکراسو کو ایسی چیز اپنے المناک کے لیے درکار ہے۔ اگر تمھیں پسند ہو تو اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ اگر میں ۱۵ مئی یا یکم جون تک تمھارے ہاں آ سکوں اور یہ تیار ہو تو بھیج دینا۔ ہر شخص موسم گرما کی وجہ سے باہر جا رہا ہے۔ تاہم اگر تم اسے بھیج سکو تو میں اسے موسم بہار میں کسی کے پاس بیچ دوں گا اور اس سے روپے لے کر ساتھ لیتا آؤں گا۔ اگر موسم بہار نہیں تو خزاں سہی۔ لیکن کرنا ضرور۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے کچھ حاصل وصول نہ ہو۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے آئی اسے خریدنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ی کی طرح RATKOII

بھی اور گے تو یہاں ہر وقت میرے اشارے پر رہتا ہے۔ یہ کام نفع بخش ہے۔ اس ترجمے کے بارے میں ہمارے مابین بات چیت ہو چکی ہے۔ اس لیے اگر پسند ہو تو شروع کر دو۔ اس کی کامیابی کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم اس کے تین باب کا ترجمہ کر دو اور مجھے بھیج دو۔ تو میں اسے ان حضرات کو بھیج دوں گا اور وہ شاید پیشگی رقم بھی ادا کر دیں۔

جنوری۔ فروری ۱۸۴۷ء
سینٹ پیٹرزبرگ

بھائی میں کام کر رہا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ جب تک میں کسی تحریر کو تسلی بخش طور پر مکمل نہ کر لوں اسے ناشر کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اگر چند مہربان میری مدد نہ کرتے تو میں تباہ ہو جاتا۔ ۔ ۔ ۔ میری حالت بہت بُری ہے تمھیں آخری بار ملنے کے بعد میں نے ۴۵۰ روبل خرچ کر ڈالے ہیں اور ان میں سے ۲۰۰ روبل قرضہ چکانے میں صرف ہو گئے ہیں موسم بہار میں کسی سے کافی رقم ادھار لوں گا اور اس میں سے تمھیں ۱۰۰ روبل یقیناً بھیج دوں گا۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کیونکہ تمھارے تفکرات میرے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ہیں۔ ۔ ۔ ۔

لیکن میرے سر پر بجلی گرنے دو۔ میں متزلزل نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوں۔ میں اپنے کام کو ذلیل نہیں کروں گا موسم خزاں میں میری کتاب شائع ہو کر کامیاب ہو جائے گی تو اس کی آمدنی سے میری حالت سدھر جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ بھائی اپنا خیال رکھو۔ خاص طور پر اپنی صحت کا۔ زندگی کے مزے اڑاؤ اور دعا کرو کہ میں اپنا کام جلد ختم کروں۔ اس کے فوراً بعد روپیہ آنے لگے گا اور پھر میں تم سے ملنے آؤں گا۔ ۔ ۔ تمھیں دیکھنے کو کتنا جی چاہتا ہے۔ بعض اوقات مجھے یہ بات بار بار یاد آتی ہے کہ ریوال (REVAL) میں میں کتنا بے کیف اور بے چین رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تمھاری طرف میرے رویے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم دونوں برابر نہیں۔ میرے عزیز بھائی! یہ صریحاً ناانصافی تھی۔ لیکن افسوس میرا کردار کتنا بُرا اور قابل نفرت ہے میں نے تمھیں ہمیشہ اپنے سے برتر اور اعلیٰ گردانا ہے۔ لیکن بعض اوقات فرط محبت سے بے بس ہو کر میری زبان سے ایک میٹھا بول بھی نہیں نکلتا ایسے موقعوں پر میرے اعصاب میرا ساتھ نہیں دیتے۔ میں نفرت کا مستحق ہوں۔ اس لیے ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ میں وحشت مزاج اور سنگدل ہوں۔ ۔ ۔ EMILFA FEDORVONA جیسی عالی ظرف عورت سے جو مجھ جیسے ہزاروں مردوں کے برابر ہے میں کتنی گستاخی سے پیش آیا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک بار اس پر، جس میں ان دنوں تم سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا، جان بوجھ کر برس پڑا تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر خارجی حالات اور مواقع مجھے روزمرہ کی چخ چخ سے بچانے کے اہل ہوں تو میں محبت کرنے والا انسان ثابت ہو سکتا ہوں، ورنہ قابل نفرت ہوں، مزاج کی ناہمواری ایک قسم کی بیماری ہے۔ ۔ ۔

تم عنقریب NETOCHKA NEZVANDVA پڑھو گے۔ یہ "جی" کی طرح ایک اعتراف ہو گا۔ حالانکہ نوع اور لہجے کے اعتبار سے مختلف۔ مجھے پوشیدہ طور پر اور بہت سے لوگوں سے "جی" کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ یہ زبردست چیز ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تخلیقی معجزہ ہے اور اسے کسی نے نہیں سمجھا مستقبل میں اسے ایک بلند مقام حاصل ہو گا اور اگر

میں نے "بچی" کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا ہوتا تو اتنا ہی کافی تھا کچھ لوگوں کے نزدیک تو یہ ڈوما سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن میں نے تو خودداری کا دامن چھوڑ دیا۔ بھائی! اگر ایک شخص کو دوسرے سمجھ جائیں تو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے — میں تم سے عنقریب ملنے کی کوشش کروں گا ہم ایک دوسرے کو جی بھر کر پیار کریں گے۔ میری کامیابی کے لیے دعا کرو۔ میں نے "لینڈ لیڈی" لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ابھی سے "پوڑوک" سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اسی انداز میں ہے۔ میرا قلم وجدان کے زور سے چلتا ہے۔ جس کے سوتے براہ راست روح سے پھوٹتے ہیں PHOKORCHIN کے برعکس جس پر میں ساری گرمیاں عرق ریزی کرتا رہا۔ بھائی! کاش میں تمھاری جلد از جلد مدد کر سکتا۔ لیکن میں نے تمھیں جو روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو جیسے یہ دیوار یا پتھر پر نقش ہو — !

سینٹ پیٹرز برگ
یکم فروری ۱۸۴۹ء

(اندری الیگزنڈر ووچ کے نام)

ہمارے مابین کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں نجی طور پر ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ گو اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے۔ دونوں مشکلات کو دور کرنا ہے۔ ان کا علاج بہت جلد ہونا چاہیے۔ ورنہ ہمارے لیے یہ کاروبار جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ خود ہی اس کا فیصلہ کیجیے۔

اوّل۔ دو برس ہوئے آپ کا میں خاصا مقروض ہو گیا تھا۔ یہ رقم کم ہونے کی بجائے ناقابلِ برداشت حد تک زیادہ ہو گئی چونکہ میری اوّلین خواہش قرضہ اتارنے کی ہے۔ اس لیے میں نے اس ضمن میں فیصلہ کن اقدامات سوچے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ پتا کرنا ہو گا کہ یہ رقم کم ہونے کی بجائے بڑھتی کیوں گئی ہے۔ میں نے اس پر کافی عرصہ غور کیا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات دریافت ہوئی ہیں:

(۱) چونکہ مجھے باقاعدہ رقم ملے بغیر لکھنا پڑا۔ یعنی گو مجھے وقتاً فوقتاً روپیہ ملتا رہا لیکن یہ گاہے ماہے تھا۔ آدمی کو اپنی گزر بسر کے لیے ہر ماہ روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ بے وقت نہیں بلکہ وقت پر باقاعدہ ملے۔ چاہے یہ رقم جو کچھ طے کر دیا جائے۔ اس کے معاوضے کا نصف ہی ہو تاکہ اس کے باقی حصے سے قرضہ چکایا جائے۔ ہوا یہی لیکن باقاعدہ نہیں ہوا۔

(۲) چونکہ مجھے اپنے معاہدے کے مطابق بروقت مسودہ دینے کی خاطر مجبوراً لکھنا پڑا۔ اس لیے کئی بے کار چیزیں بھی لکھی گئیں۔ "لینڈ لیڈی" اس کی ایک مثال ہے۔ اس سے مجھے اپنی فنی قابلیت پر شک ہونے لگا اور میں بے قدری کا شکار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کافی عرصہ حد تک میں کوئی عمدہ اور سنجیدہ چیز لکھنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکا۔ ہر ناکامی نے مجھے بیمار کیا۔

(۳) میری بیماری ایک برس تک رہی اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ بیماری ایسی تھی جو دماغی سوزش پر منتج ہوئی جس کے باعث مجھے کام قطعاً بند کرنا پڑا۔

(۴) ایک خاص وجہ جس نے مجھے ایسے کام سے بالکل متنفر کر دیا۔ یہ وقت کی پابندی تھی اس نے مجھے کھانا پینا تک بھلا دیا اور آخر مجھے ایسی غلامی برداشت کرنے پر رضامند ہونا پڑا۔ اپنی پوری قدر نہ کرنے یا شاید طبع نازک کے سبب میں نے یوں محسوس کیا کہ آپ نے روپیہ دے کر مجھے اپنا مقروض کر لیا۔ حالانکہ حقیقت میں یہ خدمت کا معاوضہ تھا۔ آپ نے مجھے جو رقم پیشگی ادا کی۔ اسے میں نے قرضہ تصور نہ کیا۔ . . . یہ رقم آپ نے مجھے اس امید پر دی تھی کہ میں آپ کو کام کی صورت میں لوٹا دوں گا بہرنوع اس کی کچھ نہ کچھ حیثیت تو ضرور تھی۔

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ جتنی بار میں نے آپ کو روپے کے لیے لکھا آپ نے میرے مطالبے کو قرض جانا۔ لیکن میں تو خود ہی بے قدری اور بے بسی کے چنگل میں گرفتار تھا۔

(ایم ایم ڈی کے نام)

امسک

۱۲ر فروری ۱۸۵۴ء

مجھے قید سے رہا ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا ہے۔ یہ خط تمہیں خفیہ ذریعے سے بھیج رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کسی سے ایک حرف نہ کہنا۔ . . . اس سے تمام عرصہ میں مجھ پر جو کچھ بیتی، میرے ذہن میں جو مواد جمع ہوا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور دیکھا۔ جو اصول وضع کئے۔ وہ میں تمہیں کیسے بتاؤں؟ میری عزیز ترین ہستی، میرے محبوب! تمہیں یاد ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کیسے جدا ہوئے تھے۔ تمہارے چلے جانے کے فوراً بعد ہم تینوں . . . . ڈی۔ وائی اور مجھے . . . طوق و زنجیر پہنا کر لے گئے۔ پورے بارہ بجے عین کرسمس کے دن میں نے پہلی بار زنجیریں پہنیں۔ ان کا وزن تقریباً دس پونڈ تھا۔ انھیں پہن کر چلنا نہایت تکلیف دہ تھا۔ . . میں مغموم تھا اور مختلف قسم کے جذباتی انتشار میں گرفتار۔ لیکن تازہ ہوا نے میرے جسم میں روح پھونک دی۔ زندگی میں ہر نیا قدم اٹھانے سے پہلے آدمی قدرے توانائی اور جسارت محسوس کرتا ہے۔ میں بھی بنیادی طور پر مطمئن تھا۔ جشن چراغاں کے موقعہ پر جب مجھے پیٹرز برگ کے پاس سے لے جایا جا رہا تھا تو میں ہر ایک کو فرداً فرداً الوداع کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں تمہارے فلیٹ کے قریب سے لے گئے اور میں نے دیکھا کہ کراوسکی کا فلیٹ روشن تھا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کرسمس پارٹی باہر کر رہے ہیں اور یہ کہ بچے امیلیا فیڈرووناکے ساتھ گئے ہیں۔ اب اس گھر کے قریب پہنچ کر میں بہت مایوس ہوا۔ تاہم میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بچوں سے رخصت لے رہا ہوں۔ انھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بعد ازاں بلکہ سالہا سال بعد جب میں ان کا خیال کرتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں . . . .

. . . سفر نے میری صحت حیرت انگیز حد تک بحال کر دی۔ پرم PERM کی سرحد پر ہم نے ایک رات ۴۰ درجہ انجماد میں بسر کی . . . . ہمارے چاروں طرف برف تھی۔ طوفان تھا۔ یہ یورپ کی سرحد تھی۔ اس سے آگے سائبیریا اور ہماری نامعلوم قسمت تھی۔ جب سارا ماضی پیچھے رہ گیا تو میں اتنا افسردہ ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے . . . . قدیم جلاوطن لوگوں نے

(اور ان کی بیویوں) نے ہماری یوں دیکھ بھال کی جیسے ہم ان کے خویش و اقارب ہوں۔ عجیب حیرت انگیز لوگ تھے۔ پچیس برس کے غم زدہ اور قربانیوں کے مارے ہوئے۔ ہم ان کی فقط ایک ہی جھلک دیکھ سکے۔ کیونکہ ہمیں بڑی سختی سے قید کر دیا گیا تھا۔۔۔۔ اُنھوں نے ہمیں کپڑے اور کھانا بھیجا۔ ہمیں تسلی تشفی دی اور ہماری ہمت بندھائی۔۔۔۔

۔۔۔ TOBOLSK کے مجرموں سے تو میں نے پہلے ہی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ OMSK میں میں نے ان کے ساتھ چار برس رہنا منظور کر لیا تھا۔ وہ اکھڑ، بدفطرت اور سرپھرے لوگ تھے۔ انھیں اشراف سے بے پناہ نفرت تھی۔ اُنھوں نے شرفا کی حیثیت میں ہمیں گرفتار دیکھ کر خصومت اور کینہ پرور انداز میں ہمارا سواگت کیا۔ اگر انھیں موقع ملتا تو وہ ہمیں کچا چبا جاتے۔ اس کے علاوہ تم خود بھی اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمیں ان لوگوں کے مقابلے میں کھانے پینے اور سونے کے معاملے میں کتنی سہولتیں میسر آتی ہوں گی۔ جب کہ ہمیں اپنی جائز شکایات اور توہین آمیز سلوک کے خلاف احتجاج کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ "تم اعلیٰ ذات ہو۔ لوہے کی چونچ والے ہو جنھوں نے ہمیں ٹھونگیں مار مار کر مار ڈالا۔ اس سے پہلے مالکوں کے لیے ٹھیک اور دوسری دنیا میں تھیں۔ لیکن اب تو معاملہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔ تم انھیں میں سے ایک ہو۔۔۔۔"

ہمارے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ فوجی قید خانہ شہریوں کے لیے جیل سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ میں نے پورے چار سال جیل کی دیواروں کے سائے میں بسر کیے اور کام کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے وہاں سے باہر قدم نہ نکالا۔ ہمیں جو کام دیا جاتا وہ اکثر نہایت کٹھن ہوتا۔ بعض اوقات خراب موسم، نمی، برف و باراں، ناقابلِ برداشت سردی میں کام کرنے کی وجہ سے میں تھک کے چور ہو جاتا۔ ایک بار تو میرا پاؤں پالے سے بے جان ہو گیا۔۔۔۔

میں اکثر ہسپتال میں صاحبِ فراش رہتا۔ اعصابی کمزوری کے باعث مجھے مرگی لاحق ہو گئی لیکن دورے شاذ و نادر ہی پڑتے۔ ویسے میں اپنے آپ کو خاصا بھلا چنگا محسوس کرتا ہوں۔

خدا کے لیے اس خط کو مخفی رکھنا بلکہ جلا دینا۔ لوگوں سے مجھوتہ نہ کرنا۔ کتابیں نہ بھولنا۔ میرے دوست، خاص طور پر مورخین اور ماہرینِ اقتصادیات کی۔ اینلز آف دی فادر لینڈ۔ فادرس آف دی چرچ اور داستانِ کلیسا کچھ وقفے کے بعد بھیج دینا لیکن بھیجنا فوراً شروع کر دو۔ میں تمھارے روپے یوں استعمال کرتا ہوں جیسے وہ میرے اپنے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تمھارے مالی حالات سے واقف نہیں۔ اس کا مفصل حال لکھنا تاکہ میں سمجھ سکوں۔ لیکن بھائی ایک بات یاد رہے کہ کتابیں ہی میری جان، میری غذا اور میرا مستقبل ہے۔ مجھے قرآن بھیجنا، کانٹ ڈی ریزن پیور

اگر ہمارے لیے غیر سرکاری طور پر ملتی ہو تو ہیگل ضرور بھیجنا۔ خاص طور پر ہیگلین ہسٹری آف فلاسفی میرا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔۔۔۔

سیمی پولا ٹنسک

۱۳ر جنوری ۱۸۵۶ء

(ایم ایم ڈی کے نام)

وہ مجھے افلاس کے چنگل سے جلد از جلد چھٹکارا پانے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن میری اپنی تشویش جذبات میں ہیجان

پیدا کر دیتی ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں تمھیں ان حالات سے باخبر کروں۔ اوّل یہ کہ میں تصنیف و طبع کا خواہش مند ہوں۔ مجھے آج اس امر کا پہلے سے کہیں زیادہ احساس ہے کہ میں نے یہ ڈگر یونہی اختیار نہیں کی تھی۔ میں دھرتی کے سینے پر یونہی بوجھ نہیں ہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ میں قابلیت ہے اور میں اصل چیز لکھ سکتا ہوں۔ خدارا میرے الفاظ کو فقط لاف زنی نہ سمجھنا۔ اگر میں تمھیں اپنا خواب اور امیدیں نہ بتاؤں تو اور کسے بتاؤں۔

اب میں دوسری بات کی طرف آتا ہوں جو میرے لیے نہایت اہم ہے لیکن اس کا ذکر میں نے تم سے نہیں کیا۔ میرے دوست! تم جانتے ہو کہ میں جیل کے اندھیرے سے خوش و خرم اور پُر امید نکلا تھا۔ . . . میرے دل میں بڑی آرزوئیں تھیں میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ . . . خدا نے مجھ پر کرم کیا۔ ایک ایسے خاندان سے میری دوستی کرا دی جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ یہ لوگ ISAEV ہیں جن کے بارے میں میں نے تمھیں لکھا اور جن کے لیے میں نے تمھیں کمیشن بھی دی تھی . . . جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر لیتا تھا۔ . . . پھر وہ مقروض ہو گیا . . . عیش و عشرت میں پڑ گیا . . . وہ واقعی بے قابو فطرت کا مالک تھا . . . تاہم اس کا کردار خاصا پختہ تھا۔ وہ دل کا نہایت اچھا اور کافی تعلیم یافتہ تھا۔ آپ اس سے کسی موضوع پر بات کریں وہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے گھناؤنے پن کے باوجود انتہائی شریف آدمی تھا لیکن میرے لیے اس میں نہیں اس کی بیوی میں کشش تھی . . . وہ خاتون اب بھی جوان ہے۔ عمر ۲۸ برس ہوگی۔ دلکش، خاصی تعلیم یافتہ، نہایت ہوشیار، شائستہ، حیرت انگیز حد تک وسیع القلب۔ اس نے اپنے دکھ سکھ بڑی خودداری اور زبان پر حرف شکایت لائے بغیر برداشت کیے۔ وہ سارے کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتی۔ نوکر کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتی اور اپنے لاپروا شوہر کی، جسے میں دوست کی حیثیت سے کئی لیکچر پڑھ کر سناتا اور اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کرتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری زود حس اور چڑچڑی ہو گئی اس کے باوجود وہ فطری طور پر خوش مزاج اور ہنس مکھ تھی۔ میں ان کے گھر سے باہر شاذ ہی قدم رکھتا۔ میں نے ان کے ساتھ کئی خوشگوار شامیں بسر کیں۔ میں بہت کم ایسی عورت سے ملا ہوں۔ لیکن وہ دوستانہ نبھا نہ سکی۔ آخر اسے KUZNETSK میں اسیسر کی جگہ مل گئی . . . اس سے قبل وہ کسٹمز کے محکمے میں ایک افسر تھا۔ معقول تنخواہ تھی اور اہم عہدہ۔ اسے چھوڑ کر اسیسری کرنا اس کے لیے ذلت کا باعث ہوا۔ لیکن اس کا بھی کیا علاج تھا۔ انھیں کھانے کو مشکل روکھا سوکھا ٹکڑا میسر آتا۔ لیکن ایک طویل اور مخلصانہ دوستی کے بعد میں بھی اس مقام تک پہنچ سکا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اس میں شریک ہونا منظور کریں۔

. . . دو ماہ بعد وہ پتھری کے عارضے میں مبتلا ہو کر مر گیا اور وہ اجنبی جگہ پر اکیلی رہ گئی۔ وہ طویل جد و جہد سے نڈھال ہو چکی تھی۔ سات سالہ بچے اور اس کے لیے کھانے کو روٹی تک نہ تھی۔ شوہر کو دفنانے کے لیے بھی اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرا ہاتھ بھی خالی تھا۔ میں نے ایلگزینڈر اگورووچ سے فی الفور پہلے ۲۵ روبل اور بعد میں ۴۰ روبل قرض لے کر اسے بھیج دیے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے اب اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اس کے شوہر کی وجہ سے ان کے تعلقات قدرے کشیدہ تھے . . . میں نے اس عورت سے کافی عرصہ محبت کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ محبت کرنے کے لیے ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے حالات ذرا بھی بہتر اور مستحکم ہو جائیں تو میں اس سے شادی کروں۔ میری دانست میں وہ انکار نہیں کرے گی . . . میں نے ارادہ

کر لیا ہے کہ میرے سر پر آسمان ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔ میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ لیکن فی الحال میرے پاس کچھ نہیں۔ میں برتر شخصیت کی نظرِ التفات کا فائدہ اٹھا کر اس وقت اسے شادی پر رضامند نہیں کرنا چاہتا۔ مئی کے مہینے میں میں ان سے جدا ہوا تھا۔ اس وقت سے زندگی میرے لیے جہنم بنی ہوئی ہے۔ ہم ہر ہفتے ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے ہیں . . . .

یہ امرِ واقعہ ہے کہ جب تک بات نہیں بنتی میں کسی کو یہ نہیں لکھوں گا کہ میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں تمھیں یہ بات نہایت رازداری سے بتا رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں یہ بات تمھیں بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ معاملہ دل کا ہے۔ "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی"۔ کم از کم میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اس لیے خدارا اس بات کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ کسی شخص کو ہرگز نہ بتانا۔ میرے خط کا کسی سے ذکر کرنا نہ دکھانا۔ بخدا میری بہنوں کو بھی نہیں۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگیں گی اور مجھے محتاط رہنے کے لیے نصیحت کریں گی۔ لیکن میں اس چیز کے بغیر جو میری زندگی میں اہم ترین ہے زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں صرف تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ میرے پیارے میرے بہترین دوست، میرے لیے صرف تم ہی . . . .

(اے ۔ ای ۔ ڈبلیو کے نام)

سینٹ پیٹرزبرگ
۹ر اپریل ۱۸۶۵ء

. . . . جب میرے بھائی کا انتقال ہوا . . . . اس کے گھرانے کے پاس فی الواقعہ کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا — اسے گداگری کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ سب بیوی بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ اس امید کہ میں انھیں بچا لوں گا۔ میں اپنے بھائی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ میرے سامنے دو حل تھے: (۱) رسالہ بند کر کے اسے قرض خواہوں کے حوالے کر دوں (کیونکہ یہ آخر کار جائداد کی ایک صورت تھی اور مالیات کی بھی) اور اس کے ساتھ فرش فروش، ایک ٹنک، انھیں دے دوں اور مرحوم کے اہل و عیال کو اپنے پاس لے آؤں۔ اس کے بعد کام کروں، صحیفہ نگاری کروں، ناول لکھوں اور اپنے بھائی کی بیوہ اور یتیم بچوں کو اپنے پاس رکھوں۔ (۲) روپیہ حاصل کر کے ہر صورت نشر و اشاعت جاری رکھوں۔

افسوس میں نے پہلا فیصلہ نہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قرض خواہوں کو چالیس فی صد بھی نہ ملتا۔ لیکن مجھے وراثت سے محروم کر کے کوئی اس گھرانے کو روپیہ ادا کرنے پر مجبور تو نہ کر سکتا تھا۔ ان پانچ برسوں میں میں نے اپنے بھائی اور رسائل کے لیے آٹھ دس ہزار روبل سالانہ کمائے ہیں اور یوں ان دونوں کا اور اپنا پیٹ پال رہا ہوں — کام کر کے — صبح سے رات تک کام کر کے — اس لیے کہ میں نے دوسرا راستہ پسند کیا تھا یعنی رسالہ جاری رکھنے کا —

(اے ۔ جی ۔ ڈی کے نام)

ہامبرگ
۲۲ مئی ۱۸۶۷ء

انیا پیاری، میری محبوبہ، میری بیوی، مجھے معاف کر دو۔ یہ نہ کہنا کہ میں بدذات ہوں۔ میں نے ایک جرم کیا ہے۔ تم

نے مجھے جو کچھ دیا تھا میں نے ہار دیا ہے۔ کریو زننگ . . . . . یہ مجھے کل ملا اور میں نے کل ہی جوئے میں ہار دیا۔ ایک اور عرض ایک چیز سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیا تم اب بھی میری عزت کرو گی؟ تمھاری رائے ہی میرے لیے خوف کا باعث ہے۔ عزت کے بغیر محبت ہی کیا ہے؟ اس نے ہماری ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ کل مجھے جب روپیہ ملا تھا اور میں نے نوٹ تڑوایا تھا تو کچھ رقم واپس جیت لینے کے خیال سے گیا تھا۔ اپنے وسائل میں قدرے اضافہ کرنے کے لیے، خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ مجھے تھوڑی بہت رقم جیتنے کا یقین تھا۔ پہلے تو میں نے تھوڑا سا ہارا لیکن جب میں نے اس کی تلافی کرنا چاہی تو زیادہ ہارنے لگا۔ میں جیتنے کے لیے کھیلتا گیا تاکہ باہر نکلنے کے لیے کچھ تو بنا لوں۔ یہاں تک کہ سب کچھ ہار گیا۔ آخری پیک تک . . . مجھے اپنے بارے میں خوف نہیں۔ اس کے برعکس میں آئندہ کے لیے سبق حاصل کر کے مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب کام ہے۔ اور محنت شاقہ اور کام۔ میں بتا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔

(اے۔ این۔ ایم کے نام)

جنیوا

۳۱ر دسمبر ۱۸۶۷ء - ۱۲ر جنوری ۱۸۶۸ء

مجھے ایک گھنٹے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ہر کسی کو بھول گیا تھا۔ میرے پاشا کا کیا حال ہے؟ میں نے پچھلے دو ماہ سے اسے کچھ نہیں بھیجا۔

مجھ پر کیا افتاد پڑی؟ سن لو . . . . . میں کام کر رہا تھا اور تڑپ رہا تھا . . . . . تمام گرمیاں اور خزاں میں مختلف چیزوں کے ذہنی خاکے بناتا رہا (کچھ تو بہت انوکھے تھے) اور تھوڑے بہت تجربے کی بنا پر مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ایک سے ایک خیال یا تو مشکل تھا یا تجربے پر پوری طرح مبنی نہ تھا۔

مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ میں نے کس قسم کی تحریریں بھیجیں . . . . . کافی عرصہ تک میرے ذہن پر ایک خاص خیال مسلط رہا۔ . . . لیکن مجھے اسے ناول کے روپ میں ڈھالنے سے ڈر لگتا تھا کیونکہ یہ موضوع نہایت مشکل ہے اور میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں . . . . موضوع یہ ہے . . . . . کلیتہً ایک حسین انسانی کردار تخلیق کرنا۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ مشکل اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص اس زمانے میں . . . . .

جنیوا

۱۳ر جنوری ۱۸۶۸ء

میرے مذکورہ ناول کا تصور بہت پرانا ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن یہ اتنا مشکل ہے کہ میں اسے نبھانے کا حوصلہ نہیں پاتا اور اب اگر میں نے اسے ہاتھ میں لیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری حالت نہایت خستہ تھی۔ ناول کا مرکزی خیال ایک انتہائی

خوبصورت کردار پیش کرتا ہے۔ یہ دُنیا میں واحد مثبت کردار ہے: . . . مسیح۔ اس لامحدود، بے پناہ حسین شخصیت کا ظہور بذاتِ خود ایک معجزہ سے کم نہیں (سینٹ جان کے تمام تر عقائد اسی سے عبارت ہیں) اس کے نزدیک یہ سارا معجزہ تجسیم میں مضمر ہے جس کا ظہور انجیل میں دُور نکل گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ عیسوی ادب میں مکمل ترین کردار DON QUIXOTE کا ہے لیکن وہ اس لیے خوبصورت ہے کہ بیک وقت مضحکہ خیز بھی ہے۔ ڈکنس کا پک وک (اگرچہ ڈان کو اکس اوٹ سے کہیں زیادہ کمزور تصور ہے۔ پھر بھی عظیم ہے) بھی مضحکہ خیز ہے اور اس کے بوجب کامیاب ہے جب مضحکہ خیز چیز کی پھبتی اڑائی جاتی ہے اور جسے اپنی قدر و قیمت کا خود علم ہے، اس پر رحم آتا ہے . . .

(اے ۔ این ۔ ایم کے نام)

جنیوا

۲۱ مارچ / ۲ اپریل ۱۸۶۸ء

تم روس کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہو، اسے جان کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میرے دوست! تمھارے نظریات میرے نظریات سے ملتے جلتے ہیں۔ تم نے آخر کار انہی خیالات کا اظہار کیا ہے جنھیں میں تین برس پہلے اپنے رسالے میں جو اس وقت تک شائع ہو رہا تھا پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ اس وقت لوگوں نے مجھے نہ سمجھا۔ یعنی ہمارا آئین بادشاہ کی عوام سے اور عوام کی بادشاہ سے محبت پر مبنی ہے۔ ہماری بادشاہت محبت کی پیداوار ہے نہ کہ فتح کی (جیسے سلیوفلز SLAVOPHILS نے یہ نظریہ پہلی بار پیش کیا) یہ ایک عظیم نظریہ ہے جس پر بہت کچھ استوار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ خیال یورپ تک پہنچائیں گے جو اس کے بارے میں کچھ نہیں سمجھتا . . . یہاں پردیس میں، روس کے لیے میں شخصی حکومت کا مکمل علمبردار بن گیا ہوں۔

۳۰ / ۱۸ مئی ۱۸۶۸ء

. . . میری سونیا مر گئی۔ ہم نے اسے پرسوں دفن کر دیا۔ مجھے دو گھنٹے پہلے تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مر جائے گی۔ اس سے تین گھنٹے پہلے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ پہلے کی نسبت بہتر ہے اور بچ جائے گی . . . اوہ ایوان نکولووچ! تم خواہ یہ کہو کہ ننھی سی بچی کے لیے میری اتنی محبت مضحکہ خیز تھی، خواہ یہ کہو کہ جن لوگوں نے مجھے مبارکباد دی تھی ان کو میں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کے باعث میں انھیں بے حد مضحکہ خیز معلوم ہُوا، ان کے لیے تو میں فقط مضحک تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں لیکن تمھارے لیے ــ، تمھیں لکھتے سے میں نہیں ڈرتا کہ وہ مجھے پہچاننے لگی تھی، پیار کرنے لگی تھی اور جب میں اس کے قریب جاتا تو مسکراتی تھی۔ جب میں اپنے مضحکہ خیز انداز میں اسے گا کر سناتا تو وہ رونا بند کر دیتی تھی ــــ اور اب لوگ مجھے تسلی دینے کے لیے کہتے ہیں کہ میرے ہاں اور بچے ہو جائیں گے۔ لیکن سونیا کہاں ہے؟ وہ ننھی سی جان کہاں ہے جس کے لیے مجھے اتنا کہنے کی جرأت ہے کہ اگر مجھے سُولی پر چڑھا کر اس کی جان بچائی جا سکتی تو میں اس کے لیے تیار ہو جاتا۔

(ایس۔ اے۔ آئی کے نام)

فلارنس

۸/۲۰ مارچ ۱۸۶۹ء

. . . . . ان ادبی حالات پر . . . . میرا حال اور استقبال منحصر ہے . . . . میرے دوست! میں اس بات کا ذکر نہیں کر رہا (جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو) کہ میرے نزدیک میرے ادبی کام کا ایک سنجیدہ پہلو ہے۔ میرا مقصد اور میری امید — شہرت اور روپیہ حاصل کرنا نہیں بلکہ فنی اور سیاسی خیالات میں امتزاج پیدا کرنا ہے یعنی مرنے سے پہلے حتی الامکان اپنے آپ کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی خواہش ہے۔ اب تو میں نے اپنے ذہن میں ناول کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ اس کا نام اتھیسٹ ATHEISTS رکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں اپنے اس ناول میں پوری طرح اپنے خیالات کا اظہار کروں گا — تم نے TURGENEV اور جرمنوں کے متعلق لکھا ہے۔ بیرونی ممالک کے لیے تو وہ بے مزہ ہو گیا ہے اور اپنی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے . . . . میں خود جرمن ہونے سے نہیں ڈرتا کہ مجھے جرمنوں سے نفرت ہے لیکن مجھے تو روس کی ضرورت ہے۔ روس کے بغیر میری بچی کھچی، تھوڑی بہت طاقت اور صلاحیت ضائع ہو رہی ہے . . . .

(ایس۔ اے۔ وی کے نام)

شاریاں ورسا

۱۱ جولائی ۱۸۷۹ء

. . . . آپ نے اپنے خط میں ایک جملہ لکھا ہے کہ میں نے آپ کے متعلق اپنی رائے اب تک نہیں بدلی حالانکہ ہمیں ملے عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن کیا ہماری واقعی ملاقات ہوئی تھی اور کیا ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں؟ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ اس قسم کی یادداشتوں سے مجھ پر کتنا غمناک اثر پڑتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں ۲۵ برس سے مرگی میں مبتلا ہوں۔ میں اس کا سائبیریا میں شکار ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اس بیماری نے لوگوں اور واقعات کے متعلق میری یادداشت اتنی کمزور کر دی ہے کہ میں فی الحقیقت اپنے ناولوں کے سارے پلاٹ اور تفصیلات بھول گیا ہوں اور چونکہ جب سے شائع ہوئے ہیں میں نے ان میں سے اکثر دوبارہ نہیں پڑھے اس لیے میرے لیے سچ مچ نامعلوم ہیں۔ ان حالات میں آپ اس سوال کا برا نہ مانیے کہ ہم کن حالات میں اور کس وقت ملے تھے اور میں آپ سے کب ملا کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے معاملے میں بھی میرا اکثر یہی حال ہے . . . .

ماسکو

۸ جون ۱۸۸۰ء ۸ بجے شام

میری پیاری انیا! میں نے آج تمھیں گزشتہ روز کا خط بھیجا ہے لیکن اب حالانکہ میں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تھک

گیا ہوں۔ پھر بھی تمھیں چند سطور لکھ رہا ہوں تاکہ یہ خط بھی پہلے خط کے ساتھ ہی تمھیں مل جائے۔ مجھے آج صبح تقریر کرنی تھی . . . ہال روزا تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس نے کتنی سنسنی پیدا کی۔ میرے سینٹ پیٹرز برگ کے معرکے کیا ہیں؟ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جب میں داخل ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کافی عرصہ تک انھوں نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں شکرگزاری میں سر خم کرتا رہا۔ اشاروں اشاروں میں ان سے بولنے کی اجازت مانگتا رہا، لیکن سب کچھ بے اثر ثابت ہوا۔ ہر طرف جوش اور ولولہ تھا۔ خود میں نے اپنی تقریر پڑھنی شروع کی۔ مجھے ہر صفحے پر اور بعض اوقات ہر فقرے پر تالیوں کے ذریعے روکا گیا۔ میں نے نہایت بلند آواز اور جذباتی لہجے میں تقریر پڑھی۔ "تاتیانہ کے متعلق" میں نے جو لکھا تھا اسے تپاک سے سنا گیا (پچیس سالہ غلطی کے بعد ہمارے نظریے کی عظیم فتح ہے) آخر میں جب میں نے انسانیت کی ہمہ گیر متحدہ انجمن کا اعلان کیا تو ہال پر سناٹا چھا گیا اور جب میں نے اپنی تقریر ختم کی ـــ تو میں تمھیں کیا بتاؤں کہ جوش و خروش کے نعروں سے ہال کیسے گونج اٹھا۔ ہال میں موجود اجنبی رو رہے تھے، سسکیاں لے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر آئندہ ایک دوسرے سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنے کے حلف اٹھا رہے تھے۔ اجلاس میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر شخص پلیٹ فارم کی طرف لپکا . . . سوسائٹی کے تمام اراکین، جو پلیٹ فارم پر موجود تھے مجھ سے اٹھ اٹھ کر گلے ملے۔ انھوں نے مجھے بوسہ دیا اور وہ سب فرط جذبات سے رو رہے تھے۔ تالیاں ایک گھنٹہ تک بجتی رہیں۔ ترجینو TURGENEV جس کی حمایت میں نے اپنی تقریر میں کی تھی، روتا ہوا مجھ سے بغلگیر ہونے کے لیے دوڑا۔ اینن کو ANNENKOV نے جلدی جلدی مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے کندھے کو چوم لیا۔ "تم جینئس ہو۔ تم جینئس سے بھی بالاتر ہو" دونوں نے مجھ سے کہا۔ اکساکو (آئی ون) AKSAKOV(IVAN) پلیٹ فارم کی طرف دوڑا آیا۔ اور اس نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میری تقریر نہ صرف ایک تقریر تھی بلکہ ایک تاریخی معاملہ تھا۔ بادلوں نے افق کو چھپا دیا تھا، لیکن دوستوسکی کے الفاظ سورج کی روشنی کی طرح ان کو چیرتے ہوئے آئے اور ہر چیز پر (روشنی کا) سیلاب بن کر چھا گئے۔ اس وقت سے راستی کی ابتدا ہوئی اور شک کا خاتمہ" ہر شخص چلا اٹھا۔ بے شک، بے شک۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے پھر لوگ بغلگیر ہوئے اجلاس برخاست کر دیا گیا۔ میں نے گوشوں میں پناہ ڈھونڈنا چاہی، لیکن ہر شخص ہال طے کر کے آ گیا تھا۔ خاص طور پر عورتیں۔ وہ میرے ہاتھ چومتی تھیں اور چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک آنسو بہا رہی تھی گویا ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ میرے سامنے گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ یہ ایک مکمل اور قطعی فتح تھی۔ میئر نے گھنٹی بجائی اور اعلان کیا "انجمن محبان روس (SOCIETY OF LOVERS OF RUSSIA) ـــ نے مجھے اپنا اعزازی رکن منتخب کیا ہے۔ پھر نعرے اور چیخیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے وقفے کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ کوئی شخص بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اکساکو AKSAKOV نے آ کر اعلان کیا کہ وہ تقریر نہیں کرے گا کیونکہ ہر ممکن بات کہہ دی گئی ہے۔ ہمارے عظیم جینئس دوستوسکی کے عظیم الفاظ نے ہر سوال حل کر دیا ہے۔ لیکن سب نے اصرار کیا کہ وہ ضرور بولے۔ تقاریر جاری رہیں لیکن اس اثنا میں ایک سازش کی گئی۔ میں نڈھال ہو گیا تھا اور رخصت لینا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً روک لیا گیا۔ اس ایک گھنٹے کے وقفے میں انھوں نے جگمگاتا ہار کہیں سے حاصل کر لیا۔ یہ تقریباً پانچ فٹ چوڑا تھا۔ اجلاس کے آخر میں خواتین (جو سو سے زیادہ تھیں) پلیٹ فارم کی طرف دوڑیں اور انھوں

نے "روس کی خواتین کی جانب سے" پھولوں کا یہ ہار پہنا کر مجھے اعزاز بخشا۔ ان کے متعلق تم نے بڑی حیرت انگیز باتیں بتائی ہیں۔ [illegible] TRETYAKOV نے ماسکو شہر کی طرف سے میرا شکریہ ادا کیا۔ تم اتفاق کرو گی اینیا کہ یہ قابلِ دید نظارہ تھا۔ یہ مستقبل کے وعدے ہیں۔ ہر چیز کے وعدے۔ خواہ میں مر بھی جاؤں . . . . ایک گھنٹہ بعد مجھے دوسرے اجلاس میں پڑھنا ہے۔ میں "ری پرافٹ" پڑھوں گا۔ اگر کسی انتہائی ضروری کام کی خاطر مجھے رکنا نہ پڑا۔ تو لو! جا رہا ہوں۔ تم سب پر رحمت ہو۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میرے بازو اور ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔

شاریا، رما

١٠/اگست ١٨٨٥ء

میں تمھارے عمدہ، مشفقانہ، حوصلہ افزا خط کے لیے تمھارا ممنون ہوں۔ انسان کی حیثیت سے میں حوصلہ افزائی کا ہمیشہ طالب رہتا ہوں، ان سے جن پر مجھے اعتبار ہے اور جن کے ذہن اور شعور کی میں عزت کرتا ہوں۔ ہر بار جب میں لکھتا ہوں مجھے بخار چڑھ جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں اس پر مجھے یقین نہیں بلکہ اس خیال سے مجھے اذیت ہوتی ہے کہ لوگوں پر اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا لوگ بنیادی نقطہ سمجھ جائیں گے اور کیا میں نے اپنے دلی اعتقادات لوگوں پر ظاہر کر کے انھیں فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان تو نہیں پہنچایا۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی

ولادت ـــــــ سنہ ۱۲۹۶ھ / سنہ ۱۸۷۵ء

وفات ـــــــ ۱۳ مئی سنہ ۱۹۵۱ء

یاد ش بخیر لالہ لال چند فلک نے آخر سنہ ۱۹۰۷ء میں بزمانہ سورت کانگریس کچھ حالات زندان لاہور کے سنائے تھے لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرف اس وقت ہوئی جب کہ ۲۳ جون سنہ ۱۹۰۸ء کو بعلت سڈیشن داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلۂ جیل گو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیے۔ ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہو سکتا ہے جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا علم کسی کو نہیں، اسی طرح سے مقدمۂ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علیحدہ ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں کی آب و ہوا، طریق بود و باش، طرز رفتار و گفتار، غرض کہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھیے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں آئندہ کے لیے امید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہو جایا کرتی ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدۂ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا تھا جسے دیکھ کر جیل کارپردازان متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہ امر حق کی پیروی کے باعث یوں ہی قوی تھا۔ لیکن ان کی تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انہوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتے آتی رہیں۔ اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فالحمدللہ۔ ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی اس لیے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انہیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوئی تھی۔ اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے۔ لیکن جسٹس داور کے فیصلے نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اسی کیفیت خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی وہ نذر ناظرین ہے۔

طاقت ہے جو زنگیوں کی بیکار ستور　　کیا خاک نہیں دادگری کا جو شعور
انصاف کے دشمنوں کا وار بے جا عقب　　ہر عکس بزند ہم زنگی کا نور

حوالات میں داخل ہونے پر گرفتاران زنداں کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالت زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمان جیل ناجائز حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں بے گناہ و پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ سنگدلی کا یہ قابل نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قواعد جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کچھ کام نہیں لیا جا سکتا لیکن علی گڑھ جیل میں تو ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلتے، کسی کو جھاڑو دیتے، کچھ نہیں تو پانی ہی بھرتے پایا کیونکہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زدوکوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت کافی محض اس لیے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہوگی تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔

ایسے لوگوں کے مقدمات کو اہل پولیس ملتوی کراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ حوالات کی زندگی سے تنگ آ جاتے اور بری ہونے پر بھی ایک طرح سے کافی سزا برداشت کر چکتے ہیں۔ ہم سے ایک نوجوان حوالاتی نے بقسم بیان کیا کہ پولیس نے مجھے از راہ عداوت ڈیڑھ برس سے حوالات میں بند کر رکھا ہے اور دوران مقدمہ میں علانیہ مجھے سنا سنا کر کہا کرتے ہیں کہ بیٹا! اب چھوٹ بھی جاؤ گے تو کیا۔ تم نے سزا سے زیادہ تو ہم نے حوالات میں تکلیف بھگتوا لی۔ یکساں طور پر مبتلائے مصیبت ہونے کی وجہ سے تمام حوالاتیوں میں باہم ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے اپنی داستان الم بیان کر کے طالب ہمدردی و تسکین ہوتے ہیں۔ راقم حروف کا زمانہ حوالات اسی قسم کے افسانوں کی سماعت میں صرف ہوا۔

ان تمام واقعات کو سن سن کر راقم حروف کو اپنی گرفتاری میں بھی مصلحت ایزدی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ نظر آتا تھا کہ اسی کی بدولت اہل پولیس و بعض حکام کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے اور ان کی تمام پوشیدہ کارروائیوں کے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بے کار طوالت کے بعد آخر کار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، یعنی ۲۳ اگست سنہ ۰۸ سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا، ایک چھوٹا دیگر ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

ان چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان پرورش کی تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لیے انسان کو مجبوراً مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہونا حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی ذرا شکل

کے اور اکرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے کسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت چکی سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق "بر سر اولاد آدم ہرچہ آید بگذرد" اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا چنانچہ ۲۰ اگست کو دفعتاً تبادلہ الٰہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی سے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے ہی پڑھنے کی کوئی خدمت لی جائے گی۔ لیکن راقم کو اہل فرہنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ثابت ہوا کہ میرا خیال صحیح تھا اور الٰہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

روانگی الٰہ آباد کے لیے علی گڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس مینوں کے ہمراہ پابجولاں بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی۔ علاوہ بریں آسمان کو ہجوم ابر نے عنبریں اور زمین کو خفیف ترشح نے تر کر دیا تھا۔ کچھ دور بمشکل پاپیادہ چلنے کے بعد ہمراہی ملازمان پولیس نے حسب معمول از رہ تاوان بیگار ایک یکہ گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے۔ واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لیے کرایہ ریل کے سوا ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لیے ایک آنہ فی کس روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علی گڑھ سے اطلاع نہ تھی البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقف حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف کا ایک پرچہ دستیاب ہو گیا۔ دس بارہ روز سے چونکہ اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ اس لیے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ٹرکی میں دستوری حکومت کے قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ اس روز کے بعد سے پھر آخر مدت قید تک اور کسی اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے کہ جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانہ حوالات کے آئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھڑی بھی ہمراہ تھی۔ اثنائے راہ میں آخری بار دیوان حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حافظ کی غزلیں ارباب ذوق و محبت کے لیے ہر حالت میں سرمایہ سوز و سرور ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس فقیر کے قلب مضطر نے بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین حاصل کی۔ ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف نے اسے زبانی یاد کر لیا اور دوران قید میں بحالت تنہائی بارہا اسے دہرایا اور ہر بار نیا لطف پایا۔

وہو ہذا

خیز تا از در میخانہ گشادے طلبیم ۔۔۔ بہ رہ دوست نشینیم و مرادے طلبیم
لذت داغ غمت بر دل ما باد حرام ۔۔۔ اگر از جور غم عشق تو دادے طلبیم
زاد راہ حرم وصل نداریم مگر ۔۔۔ بہ گدائی ز در میکدہ زادے طلبیم
چوں غمت را نتواں یافت مگر در دل شاد ۔۔۔ ما بہ امید غمت خاطر شادے طلبیم

بر در مدرسہ تا چند نشینی حافظ
خیز تا از در میخانہ گشادے طلبیم

ٹنڈلے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب ٹرین وہاں سے چلی تو انہوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے کے قریب جمع ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ باچشم پرنم سلام کیا۔

کانپور میں ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ غالباً آپ اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر حسرت موہانی ہیں اور جواب اثبات میں پاکر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے۔ انہیں بھی الٰہ آباد جانا تھا اس لیے راستے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا۔ والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الٰہ آباد ہی میں ہوں گے۔ اس لیے میں نے انہی صاحب کے ذریعے سے اپنے جناب والد کو اطلاع اور سنٹرل جیل میں مل جانے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ والد مرحوم کے جائے قیام سے مجھ کو آگاہی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انہیں بکوشش تلاش کر کے میرا پیام اسی روز پہنچا دیا۔ کیونکہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ مجھ کو اس واقعے کا کس قدر افسوس ہوا خصوصاً اس لیے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح پر گرفتار مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون جیل میں مجھ کو اس واقعہ کی خبر تک نہیں ہوئی۔

الٰہ آباد کا سنٹرل جیل نینی میں ہے جہاں جانے کے لیے الٰہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اترنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے۔ اس وقت تک کالے کپڑے چیتھڑوں کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف، غلیظ اور بدبودار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لیکن قہر درویش بجان درویش پہننا پڑے۔ راقم حروف کی نگاہ دور بین نہیں ہے۔ اس لیے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگائے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن الٰہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو باستثنائے دیوان حافظ اپنے

سامنے جلا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر ہسپتال بھیجے جاؤ گے اور ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ اس خطاب پُر عتاب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہو گی۔ کیونکہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل اکثر صحیح ہے کہ مر جائیں تو مکھی نکل جائیں تو شیر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جائے تو وہاں اس واقعہ کی اہمیت ایک مکھی کے مر جانے سے زیادہ نہیں سمجھی جائے گی، لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو واقعہ اسی قدر اہم شمار کیا جائے گا جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گزشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے نئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی شردھانند سے اوّل اوّل اسی مقام پر ملاقات ہوئی کیونکہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

مذکورہ بالا ضروری کارروائیوں کے بعد ہم یعنی راقم حروف اور سوامی جی حسب قاعدہ مقررہ معائنہ ثانی "پرانی تکلیف" بھیج دیئے گئے۔ جہاں دس بارہ روز قیام رہا۔ "پرانی تکلیف" الٰہ آباد سنٹرل جیل کے چار خاص حصوں میں سے ایک حصے کا نام ہے جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگجو و شورہ پشت لوگوں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لیے تمام جیل سے ہر ہفتے کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں۔

"پرانی تکلیف" میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقنداز نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے . . . .

سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح گیہوں کا دلیا منگا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لیے صاف روٹیاں اور ترکاری بھجواتے تھے بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقنداز بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز پکواتے تھے تو ہم لوگوں کا حصہ بھی لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا۔ اس لیے انہیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا۔ لیکن راقم حروف کو چکی پیسنے کی غرض سے پرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھیجا۔ نئے احاطے کا وارڈر نیک تھا اس لیے چکی خانے کے برقنداز و جمعدار نے راقم پر کوئی سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آ گیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پرانے احاطے میں بھیج دو اور وہ چکی پیسنے نئے احاطے میں نہ جانے پائے۔

پرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لیے بدنام تھا۔ پھر اس احاطے میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی و بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ یہ سختی اور نگرانی کے خفیہ احکام تھے جن کو سن کر میرے لیے لوگ بہت متفکر تھے۔ لیکن بمصداق "دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است" جن لوگوں سے بدی کی توقع تھی انہیں نے راقم حروف کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ . . . چونکہ [illegible] راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ درپردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو، راقم ان تمام معاملات

سے آگاہ تھا لیکن ان سے بے تعلق بے پروا اکثر فکر و تصور کے دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا چنانچہ ایک ہفتے کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ میں کسی سے بولا نہ ڈاکٹر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اسلامی تعلیم کا اعجاز پرست اثر میں نے اس موقع پر زندانِ فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہماری بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزے رکھے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہو کر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا جس سے بے سر و سامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شانِ مساوات و اخوت، سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہو جاتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ڈاکٹر کے دل نے بھی قبول کیا چنانچہ ایک روز وہ مجھ سے بالتقریب مخاطب ہو کر بولے کہ جمالی صاحب! میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجیے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہو کر ہسپتال بھیجے گئے اور پھر وہیں سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کی خوشی کے موقع پر رہا ہو گئے۔

جن لوگوں کی مشقت چکی چلانے میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیونکہ بعد زوال پیا چکی پیسنے کے واجبات میں داخل ہے علاوہ بریں بے کھائے پیے ایک من گیہوں پیسنا یوں ہی کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمتِ الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیونکہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس دس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پیے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے ہیں۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب ذوقی کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اسی وقت کے لکھے ہوئے چند اردو اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی۔ دو ہی چار روز کے بعد عید الفطر کی تقریب پیش آئی۔ ڈاکٹروں کی زبانی معلوم ہوا کہ الٰہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور نہ تھا لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی قیدیان بتقریب جشنِ پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز حکام جیل کو ملا جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی کر دیا۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لیے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل ہسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف، نئی تکلیف اور نئے احاطے کے سب لوگ آ گئے تھے لیکن ہمارے احاطے کے وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ۲۰ ۔۔۔ لوگوں کو علیحدہ نماز پڑھنا پڑی۔ نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا جس میں تمام فرائض اسلام کی عموماً اور فریضہ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوش گزار کی گئیں۔

الٰہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے اور راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ

تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں بسر ہوئی۔ قاعدے کی رو سے فی قیدی ۲۰ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۴۰ سیر غلہ پیسنا چاہیے لیکن الٰہ آباد میں ۴۰ سیر کی بجائے ۴۴ سیر پسواتے ہیں۔ اگر چالیس سیر غلے کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹانک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی لگ جاتی ذرا بھی بڑھ جائے تو پیشی اگر آٹے میں ذرا سی بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی۔

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لیے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دسترس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب سے چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انہیں اکثر کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔

چکی پیسنے والوں کی نگرانی ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔ راقم حروف چونکہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا۔ اس سے سینکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے وہاں آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تندرست نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لیے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لیے تبدیل مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے بھی آگاہ کیا (داخلہ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۰ پونڈ تھا۔ لیکن اس وقت صرف ۱۰۰ پونڈ باقی رہ گیا تھا) لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوت قلب نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی۔ اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔

ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا کرتا تسلا کٹوری چکی خانے کے باہر برآمدے میں اتار کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر دفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے۔ کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لیے دفعدار کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف دہی کا معاوضہ اکثر ٹھڈوں اور سونٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لیے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ . . . لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا کیونکہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو وارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا تھا۔ اور فقیر درویش بیچارے کو اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی۔ راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقنداز نگراں کار مقرر تھے۔ ایک میر مظفر حسین صاحب فوق بجنوری

اور دوسرا ضلع باندہ کا بندا امیر جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین دن میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نائب جیلر کا اشارہ پا کر بلا وجہ میری پیشی کرا دی تھی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ پھر بھی نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا۔ بندہ کے بعد امروہہ کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک بندا ہی کی پیروی کی لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تو وہ مجھ سے کام نہ لیتے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ کیونکہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پیسنے کے لیے دن بھر کھڑے رہنا کارے دارد کا مضمون تھا۔

ایزد بخش کے بعد کسول ضلع مظفر پور کے منشی عبد الحق آئے۔ یہ صاحب حضرت ذوق کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے۔ ایک روز وہ اپنے ہمراہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے جسے جیل پریس کے خوش مذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لیے مرتب کیا تھا۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھائی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھ کو حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا۔ لیکن افسوس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی چنانچہ اس نے دفعتاً کئی برقندازوں کے ہمراہ آ کر چکی خانہ کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کے تلاشی لی۔ مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا۔ مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبد الحق کے سر پڑا۔ انہوں نے بہت کچھ معذرت کی لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ سن کر ان کی برقندازی تڑوا دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ کو چالان کر دیا۔

مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمہ میں سزا دہی کے سارے اختیارات ختم کر دیئے تھے۔ یعنی دو سال قید سخت اور پانچسو روپیہ جرمانہ۔ زیادہ کا اگر انہیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا کل ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کر لیں چنانچہ ابتدائے قید سے کئی ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو ملی تھی وہ مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلےٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا۔ اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے دواوین شعرا وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلیوں میں بھر بھر کے اس طرح

لے لے گئے جیسے کہ لوگ کوٹھی یا بکس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری، اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے اس لیے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے اور جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے!

زرِ جرمانہ کے نقد ادا ہو جانے سے قید کی معیاد صرف ایک سال رہ گئی پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کر لینے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم رہ گیا۔ اب تو منتظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انہیں میرے ساتھ اپنے برتاؤ کی سختی کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ایک روز خلافِ معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دی جائے گی اسے پسند کرو گے یا نہیں۔ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہارِ لطف و کرم پر کمال تعجب تھا، لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لیے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلیِ مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔

قیدیوں کے ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی ہے جس کے لیے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے۔ راقم کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ ملی تھی اس لیے اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف و کرم کی بدولت تاریخ مقررہ کے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خلافِ معمول مجھے طلب کیے بغیر حساب کر کے ۲ر جولائی سنہ ۹ء تاریخ رہائی مقرر کر دی جس سے اس خیال کی پوری تصدیق ہو گئی۔

راقم حروف کو بزرگانِ دین کی عقیدت کے ساتھ جو فطری انس ہے اس کی بدولت زندانِ فرنگ میں بھی جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا اور خصوصاً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعے ان کی حقیقت صحیح طور پر بیان ہو سکتی ہے نہ ان کے ذکر کا محل ہے۔ اس لیے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ البتہ آخر زمانہ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

ردولی کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے سنہ ۹ء میں یہ تاریخیں ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں سے مطابق واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہو گا۔ مجھ کو چونکہ حاضری میں حضرت شیخ العالم سے سعادت اندوز فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا اس لیے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز قبل بھی مقرر ہوتی تو عرس میں شرکت کا موقع مل سکتا تھا، لیکن تاریخ رہائی کے ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہو سکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ پھر بھی صبح اٹھتے ہی سب سے پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کی بجائے نئی تکلیف میں طلب کیا ہے۔

نئی تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا کہ صاحب بہادر میرے استقلال اور نیک چلنی سے بہت خوش ہیں اور اس

اپنے اختیار سے غالباً وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مژدہ جانفزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گذشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہوگی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ کو دیکھتے ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں چنانچہ اسی حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ سے پندرہ دن پہلے رہا ہو کر شام تک الٰہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور دس دن قیام کرنے کے بعد باطمینان تمام رودولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت مخدوم احمد عبد الحق رودولوی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا

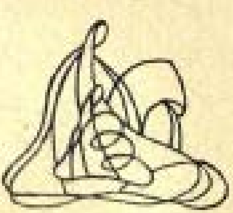

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

ولادت ــــــــــــــــــــ سنہ ۱۸۶۷ء

وفات ــــــــــــــــــــ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء

خاندان

ہمارا خاندان شروانی ہے جو روہی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد ہے۔ سلطان بہلول لودھی کے وزیر اعظم عمر خاں شروانی تھے جن کا خطاب مسند عالی تھا، وہ ہمارے مورث ہیں۔ عمر خاں شروانی کے خاندان میں سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک قائم رہی۔

شیر شاہ سوری کے عہد میں اقتدار حاصل رہا۔ شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کا اخراج ہندوستان سے کیا اور ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ۔ اس وجہ سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے اور فوج سے خارج کر کے ان کو آوارہ کر دیا۔ اکبر بادشاہ اور شاہ جہان کے عہد میں ہمارے بزرگ دلی سے اس نواح میں آئے اور زمینداریاں قائم کیں جو آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے ساتھ قائم ہیں۔ ہمارے پردادا صاحب [illegible] تھے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں مورث نواب محمد مزمل اللہ خاں بڑے، منجھلے محمد خان زماں خاں ہمارے دادا، موصوف انتظام ریاست اور کاغذات ریاست میں ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھی۔

مسائل اربعین رسوم شادی و غم کے متعلق شاہ محمد اسحاق صاحب محدث مرحوم سے لکھوا کر اس کے مطابق خاندان کے رسوم کی اصلاح کی جو تقریباً ایک صدی سے بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم ہے۔ چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں دادوں کے مورث تھے۔ بھائیوں میں سب سے پہلے انہوں نے انتقال کیا۔ خان زماں خاں کے تین فرزند تھے۔ حاجی محمد ہدایت اللہ خاں جو عابد و زاہد تھے انتظام ریاست میں ماہر، علم دوست تھے۔ شباب میں انتقال کیا۔ منجھلے حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب عربی کے عالم تھے۔ ملا حسن، شمائل ترمذی وغیرہ کتابوں تک باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ انتظام ریاست میں پوری مہارت تھی۔ ۵۰ برس کی عمر ہوئی۔ علوم کے پورے خادم تھے۔ مدرسہ لطفیہ علی گڑھ، دار العلوم دیوبند، سہارنپور، مدرسہ امدادیہ مراد آباد وغیرہ کی ہمیشہ خدمت کی۔ طلبہ کو وظائف دیئے۔ سرسید کے ساتھ مل کر محمڈن کالج کی بھی خدمت کی، اگرچہ ان کے عقائد کے خلاف رہے۔ تخمیناً [illegible] میں حج کیا۔ زیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں بمقام جدہ رحلت کی۔ وہیں مدفون ہیں۔ چھوٹے بھائی محمد تقی خاں صاحب میرے والد تھے۔ ان بھائیوں کا باہمی اتفاق مشہور تھا۔ یہ ریاست ہمیشہ مشترک رہی۔

والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی، ورزش، کشتی کا شوق رہا۔ نیز بندوق کے شکار کا۔ اسی کے ساتھ ادب اردو سے ذوق تھا۔ شروع میں مجھ کو غالب کی انشا اردوئے معلیٰ پڑھنے کے واسطے عنایت کی تھی اسی سے مجھ کو ادب اردو کا ذوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم نے ایک کتاب سراپائے معشوق اردو میں فراہم کر کے چھپوائی تھی۔ اس میں سر سے پاؤں تک جملہ اعضا کے متعلق اساتذہ کے

اشارہ میں کیے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں بھی ہے۔ والد مرحوم کو غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد دہلی جانے وہاں رہنے اور وہاں کے علماء مثلاً مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ اور حکیم حسن اللہ خاں صاحب وغیرہ سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس واسطے خورد و نوش، نشست و برخاست، لباس و ذوق صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔ مجھ کو اپنے والد مرحوم اور عم محترم دونوں کی صحبت و تربیت کا فیض حاصل ہوا۔ ادب، شکار، لباس اور خورد و نوش اور فنون مردانہ بنوٹ، لکڑی وغیرہ کی مشق نتیجہ ہے والد مرحوم کی تربیت کا۔ والد مرحوم ہمیشہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

علم عربی کی تحصیل اور پابندی مذہبی عم محترم کی نگرانی میں تربیت کا نتیجہ ہے ریاست کے انتظام سے واقفیت مرحوم کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئی۔

اساتذہ کرام (فارسی و عربی)

(۱) بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رامپوری نے پڑھائی۔ موصوف کا ذکر تذکرہ کاملان رامپور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی میں ہے۔ بسم اللہ کے چند روز کے بعد قطع تعلق ہو گیا اور رامپور چلے گئے۔

(۲) ان کے بعد میر فرزند علی صاحب متوطن مارہرہ نے پڑھایا۔ مولوی حسن شاہ صاحب نے صرف پارہ عم پڑھایا تھا۔ باقی قرآن مجید میر صاحب نے پڑھایا۔ فارسی بہار دانش تک پڑھائی خط کی مشق کرائی۔

(۳) میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب ساکن محلہ بنی اسرائیل کرل (دہلی گیٹ) نے پڑھایا۔ سہ نثر ظہوری تک۔

(۴) میر فرزند علی صاحب کے پڑھانے کے زمانے میں عربی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید اکبر صاحب جو کانو خاں ضلع پشاور کے متوطن اور سادات ترمذی سے تھے، مولانا لطف اللہ کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے پڑھی تھی۔ باوجود ولایتی ہونے کے اردو صاف صحیح بولتے تھے۔ تذکیر و تانیث کی صحت کا پورا اہتمام تھا۔ مولانا سہارنپوری کے درس میں افغانوں کو بوجہ ان کی اردو زبان صاف نہ ہونے کے قرات کی اجازت نہ تھی۔ مگر مولوی صاحب اس سے مستثنیٰ تھے۔ صحت موصوف کی اچھی نہ تھی۔ اس لیے تعلیم کم حاصل ہو سکی صرف فارسی رسالے صرف میر، نبذہ تک پڑھائے اس کے بعد

(۵) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی مقرر ہوئے جو شاگرد تھے مولوی محمد لطف اللہ صاحب کے نحو اپنے وطن میں اس اہتمام سے پڑھی تھی جو اہل پنجاب کا اس فن کے پڑھانے میں ہے۔ مولوی صاحب نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب اور بدیع المیزان تک منطق پڑھائی۔ فقہ میں منیۃ المصلی، قدوری، کنز الدقائق پڑھیں۔ شرح جامی کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا۔ ایک بار رامپور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب نے "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان لیا۔ وہاں سے جا کر عم محترم سے کہا کہ "خوب سمجھتا ہے"۔

(۶) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی کے بعد مولوی عبدالغنی صاحب (جو اجلہ تلامذہ مولانا لطف اللہ صاحب سے تھے،) تشریف لائے قطبی سے پڑھانا شروع کیا۔ قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی بڑی سعی پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سخت تاکید تھی۔ اس کی خامی پر تنبیہ فرماتے۔ فقہ میں ہدایہ اخیرین کتاب الدین تک منطق ملا حسن تک پڑھائی۔ اصول فقہ میں نور الانوار اور توضیح تلویح

مقامات ایک حد تک پڑھی۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین، تفسیر بیضاوی (سورۂ بقرہ تک) اسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم ہوتی رہی۔

(۷) اس زمانہ کے بعد ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ حاضر ہوا۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ ادب تہ کیا۔ حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ (مع غلام یحییٰ مولانا) سے پڑھا۔

(۸) شمائل ترمذی ساڑھے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین صاحب عرب بھوپالی سے پڑھے باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔

(۹) حدیث المتحابون فی اللہ الخ کی روایت حضرت پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہ نے (جو موصوف کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہنچی تھی) عطا فرمائی۔

(۱۰) چہل حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحاق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی۔

(۱۱) مکہ مکرمہ میں قاری سید عبدالرحیم صاحب کو (جو مصر اور قرأ کے دور سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔

(۱۲) مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا۔ آخری سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔

(۱۳) شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی نیز دیگر روایات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اساتذۂ انگریزی

(۱) مولوی غلام محمد صاحب کی تعلیم عربی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں ماسٹر عبدالرشید خاں صاحب ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی جو ۱۸۸۵ء تک جاری رہی۔

(۲) ۱۸۸۵ء میں آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخل ہوا۔ ۱۸۸۸ء تک یہ تعلیم جاری رہی۔

(۳) علاوہ اسکول کی تعلیم کے مسٹرون ہیڈ ماسٹر اور رام ماسٹر کالج سکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ وہاں سے علی گڑھ آکر (۴) مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور (۵) مسٹر گیپ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی۔

تعلیم انگریزی کے دوران میں الحمد للہ کبھی تعلیم مذکور کو تعلیم عربی پر غلبہ نہیں ہوا۔ بلکہ تعلیم عربی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی۔ اسی وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

طریقہ حساب کاغذات ریاست (جس کو اصطلاحاً سیاق کہتے ہیں) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور (حبیب گنج) سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔

انتظام ریاست (مشترکہ و خاص)

۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

گھر آکر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ معاملات ریاست میں عم محترم کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ موصوف کی نگرانی میں کام کیا۔ علاقہ مہرولی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشتکاروں کی اراضی اور اس کے پیداوار کے دیکھنے کا موقع ملا۔ کچے کے کھیتوں کی مساحتیں کیں۔ اس زمانے میں نیل کا کاروبار پورے عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا بھجوا کر کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا ۱۹۰۵ء۔

مطابق [illegible] میں والد مرحوم کا انتقال ہوا۔ موصوف اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا اتفاق مشہورِ عام تھا والد کے انتقال کے بعد میں نے بھی عم محترم کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس اسلوب سے کہ پہلے موقع پر ان کی خدمت میں میر امداد حسین کارندہ کی زبانی عرض کی کہ اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ اس سے جو توحش کہ والد کے انتقال سے عم محترم کی طبیعت میں پیدا ہو گئی تھی صاف ہو گیا چنانچہ بجنسہٖ ہر صبح کو جا کر میں کام کرتا تھا۔ قبل دوپہر واپس آ جاتا تھا۔ والد مرحوم کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔

جولائی [illegible] مطابق [illegible] اثنائے سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہنچ کر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔ اس وقت عزیزوں اور حکام کی متفقہ مشاورت اور تحریک سے کل ریاست کا کام میرے سپرد ہوا تاکہ قرضہ ادا کیا جائے۔ بعد ادائگی قرضہ ریاست تقسیم ہو گئی چونکہ عم محترم ریاست کے کارگزار تھے اس لیے قرضہ سب ان کے دورِ عمل ہی کا تھا۔ والد مرحوم کا ایک بھی نہ تھا۔

والد مرحوم کا اصول قرض کشی کے بالکل خلاف تھا اس لیے بھائی کی قرض کشی پر نہ صرف معترض تھے بلکہ بیزار تھے۔ وقتاً فوقتاً اس کا شکوہ والد صاحب کی زبانی میں نے بھی سنا تھا۔

اپنے معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی کہ اگر میں قرضہ سے انکار کر دوں تو میرے ذمہ قرضہ عاید نہیں ہو سکتا۔ قرضہ سودی تین لاکھ روپیہ تھا جس کا سود آٹھ آنہ اور ایک روپیہ سینکڑہ تھا۔

بفضلہ تعالیٰ میری طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا کہ میں سبکدوش ہو کر سارا بار دوسرے عزیزوں پر ڈال دوں۔ دو لاکھ روپیہ برادر عزیز عبدالجلیل خاں کے ذمہ تھا اور ان کی ریاست کا حصہ گورنمنٹ کی جانب سے میرے ٹھیکہ میں تھا اس طرح مجھ کو پانچ لاکھ روپیہ سودی ادا کرنا تھا۔ عم محترم مرحوم کی فیاضی مشہور روزگار تھی۔ نیک کاموں میں دینی عربی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کے اہل حاجت کی خدمت وغیرہ میں، بے دریغ روپیہ صرف فرماتے تھے۔ یہ فضل ربانی تھا کہ کام ہاتھ میں لے کر تمام مصارف خیر جاری رکھے اور سارا قرض مثل پانی کے بہہ کر بہت آسانی سے ادا ہو گیا۔ یہ حضرت پیر و مرشد قدس سرہٗ کی دعائے خیر کا نتیجہ تھا۔

ساڑھے چھ برس اس نہج سے ریاست کا انتظام جاری رہا۔ بالآخر بعض عزیزوں کو یہ طریقہ گوارا نہ رہا اور ریاست کی تقسیم انہوں نے چاہی۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کو درمیان میں ڈالا۔ شروع میں مجھ کو یہ ناگوار ہوا خصوصاً نواب صاحب کی وساطت۔ لیکن بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ میری کارگزاری یا عدم کارگزاری، دیانت یا خیانت اگر کھل سکتی ہے تو اسی طریقے سے۔ لہٰذا میں نے بھی تقسیم پر آمادگی ظاہر کر دی اور نواب صاحب مرحوم کل شرکاء کی جانب سے ثالث باضابطہ قرار پا گئے۔ موصوف نے بہت محنت سے ثالثی کے فرائض انجام دیے۔ اپنے فیصلہ میں میری دیانت کا اعتراف کر کے کل شرکاء کے حصے تقسیم کر دیے۔

تقسیم کے بعد بھی جو کچھ قرضہ باقی تھا لہٰذا اکثر حصہ اپنی اپنی جائداد کا شرکاء نے میرے ہی قبضے میں چھوڑا کہ میں ان کا قرضہ ادا کر دوں چنانچہ قرضے ادا ہونے کے بعد ان کی جائدادیں ان کے سپرد کر دی گئیں۔ ان عزیزوں کے سوا خاندان کے اور عزیزوں کے بھی سودی قرضے اس طور چکوا دیے گئے کہ ان کو اپنے پاس سے رقم دے کر سودی قرضے کے بار سے سبکدوش کرایا اور ان کی جائدادیں اپنے یہاں رہن رکھ کر رفتہ رفتہ آمدنی سے اپنا قرضہ بلا سود وصول کر لیا۔ یہ جائدادیں تین ضلعوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ علی گڑھ۔ ایٹہ۔ بلند شہر۔ مدیون مسلمان سنی شیعہ اور ہندو سب تھے جب قرضہ ادا ہو گیا۔ فوراً جائداد واگذاشت کر دی۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ باوجود تھوڑا قرضہ رہ جانے کے بلحاظ ضرورت مدیونان

جائداد چھوڑ دی۔ بقیہ رقم معاف کر دی۔ والحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذالک۔ اس طرح تقریباً کل چھ لاکھ قرضہ سودی ادا کیا گیا۔

اس کے بعد پھر میں نے اپنی جائداد ذاتی کا انتظام کیا اور بفضلہ تعالیٰ وافر جائداد کا اضافہ ہوا جس کی قیمت کم و بیش چھ لاکھ روپیہ ہوگی۔ بہت سے جھگڑے جو عرصہ دراز سے چلے آتے تھے پاک و صاف ہو گئے۔

حبیب گنج کا کتاب خانہ

یہ تو یاد نہیں کہ میری عمر اس وقت کیا تھی۔ مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض بچہ تھا جب یہ دیکھتا تھا کہ والد مرحوم کو کتابوں کا اور کتاب دیکھنے کا شوق تھا۔ شب کو ایک معین وقت پر کھانے سے پہلے کتاب دیکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی کی تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین یا ادب اردو مثلاً بوستان خیال۔ گفتگو میں اکثر بادشاہوں کے تاریخی واقعات بیان فرماتے۔ دوپہر کو لیٹ کر سونے سے قبل بھی کتاب دیکھتے۔ جب میں اردو پڑھنے لگا تو مرزا غالب کی اردوئے معلیٰ کا نسخہ مجھ کو عنایت ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا، کچھ سمجھتا بہت کچھ نہ سمجھتا۔ تاہم دیکھے جاتا اور اتنا دیکھتا کہ والد مرحوم تنگ آ جاتے۔ منع فرماتے۔ ذوق ادب کی یہ بنیاد تھی۔

ایک کتاب فروش تھے عبدالرحیم نامی۔ اپنی گٹھڑی لے کر مکتب میں درسی کتابیں بیچنے آتے۔ درسی کتابوں کے سوا چھوٹی چھوٹی نظم کی کتابیں دکھا کر شوق دلاتے کہ بچے خریدیں۔ مثلاً وفات نامہ، حضرت بلال کا قصہ، معجزہ معترضہ۔ ہم کتابیں دیکھتے تو استاد کہتے جاتے: لڑکو! مصطفائی یا نظامی مطبع کی کتاب لینا، نولکشوری نہ لینا۔ یہ صحیح کتاب کا اہتمام تھا۔ درسی کتابوں کی قیمت تو بزرگوں کی سرکار سے ملتی۔ غیر درسی کی خود دینی ہوتی۔ اتوار کے دن ہمارے یہاں بازار لگتا تھا۔ اس میں پیسے ملتے۔ انہیں میں سے اس کام میں صرف ہوتے۔ خوب یاد ہے کہ ایک بار کتاب فروش کے ایک روپیہ چار آنے میرے ذمہ واجب ہو گئے۔ میرے پاس صرف چھ پیسے تھے۔ تقاضا کے بعد دھمکی دی کہ خاں صاحب سے کہوں گا۔ یہ بڑی دھمکی تھی۔ قرض کی چیز پڑھنا سخت جرم تھا۔ اس رات جو فکر رہی وہ آج تک یاد ہے۔ دوسرے روز کچھ کتابیں واپس دیں۔ کچھ بعوض میں دیں۔ پاس کے پیسے دیئے۔ جب تقاضا ہلکا ہوا۔ بچپن کے اسی شوق کا یہ اثر تھا کہ رات کو زنانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کوئی چادر یا جائے نماز مل جاتی تو لپیٹ کر گٹھڑی بنائی جاتی اور کتابیں بیچی جاتیں۔ بیبیاں دیکھ کر تعجب کرتیں۔

بہر حال یہ شوق کتابیں دیکھنے کا عبدالرحیم مرحوم نے لگایا تھا۔ بلحاظ استعداد کے ساتھ کتابوں کا معیار بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ نظم وغیرہ تو موجود نہیں۔ البتہ ان سے خریدی ہوئی شرح سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض پر شکستہ تحریر بھی میرے قلم سے درج ہے۔ انہیں کتابوں کی خریداری کے ساتھ اردو دواوین کا شوق ہوا۔ ایک واقعہ کی مدد سے یاد آتا ہے کہ ۱۲۹۳ھ تک سو ڈیڑھ سو کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ ایک صندوق پلنگ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں یہ کتابیں اور پڑھنے لکھنے کا سامان رہتا۔ اسی طرح کتابیں بڑھتی رہیں۔ جب علیحدہ کمرہ رہنے کو ملا تو والد مرحوم نے اس میں ایک الماری کتابوں کے واسطے بنوا دی۔ یہ الماری جب تک بھری نہ تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ تعلیمی وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں انگریزی پڑھنے کے لیے آگرہ گیا۔ وہاں قلمی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا موقع ملا۔ یاد آتا ہے کہ سب سے پہلے قاضی ابو زید دبوسی کا رسالہ مساحت خریدا۔ واقعات بابری کا ایک نادر قلمی نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں تھا جو ندرت کی وجہ سے سیف میں رکھا جاتا تھا۔ عم محترم مرحوم کی اجازت سے اس کی نقل ۱۸۸۳ء میں کرائی۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان کے فیض صحبت سے وسعت نظر پیدا ہوئی۔ پنڈت رام پرشاد

کے کتاب خانوں کے حالات سنے۔

یہی زمانہ تھا کہ والد مرحوم کے مطب میں دل جاتا اور رہتا ہوا خریداری کتب کا شوق ساتھ تھا۔ مولوی سلیم الدین خاں صاحب مرحوم بہت وسیع پیمانہ پر قلمی کتابوں کی فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ قیمت پوری لیتے تھے۔ ان سے علاوہ بعض کتابیں خریدیں مثلاً دیوان طالب آملی کا قلمی نسخہ۔ ایک کباڑی کے ہاں سے کشف العجائب فی علم الاصطرلاب کا عمدہ نسخہ خریدا۔ اسی کی معرفت بعض اور کتابیں اور خوشخط قطعات خریدے۔ قطعات کا یہ پہلا شوق اور خریداری تھی جیسا مصرعہ "زر زر کشد" کا تجربہ ہوا۔ حکیم سعداللہ صاحب ہمارے یہاں لکھنؤ کے ایک طبیب تھے، حکیم یعقوب صاحب مرحوم کے شاگرد۔ اس عہد کی تہذیب کے موافق خوشخط تھے خطاطی کی باقاعدہ مشق کی تھی۔ میں نے دل کے قطعات کا سرمایہ ان کو دکھایا تو میرا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے جو قطعے کہ استادوں کی نشانی ان کے پاس تھے وہ مجھ کو عنایت کر دیے، اب تک ان کی یادگار کی تصریح کے ساتھ کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آمدم برسر مطلب۔ جو قلمی چیز خریدی جاتی علامہ مرحوم کو دکھائی جاتی جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انہیں کے ذریعے سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا جن کو مولانا "غارت گر" کہتے تھے وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کر دیتے۔ اب بھی ان کی قیمت دیکھتا ہوں تو گرانباری محسوس ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔ دوسرے مقامات سے بھی کتابیں ملتی رہیں۔ اب اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ رہنے کے کمرہ میں چاروں طرف چھوٹی بڑی الماریاں کتابوں سے معمور پیش نظر رہتی تھیں۔ حفاظت سے رکھتا تھوڑی بہت فہرست، یہ سب اپنے ہی ہاتھ سے کرتا۔

ایک بار استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن پلکھنے میں ہوئی۔ میں بھی حاضر ہوا۔ عجیب عالم تھا۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا ان میں نامور علماء بھی شامل تھے مثلاً مولانا سید محمد علی صاحب، مولانا احمد حسن صاحب، مولانا عبدالغنی خاں صاحب، مولانا عبدالجلیل صاحب۔ لطف یہ تھا مہمانوں کے سامان پہنچانے پر ہر طرف مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے۔ پلنگ، پانی، برتن، غرض جملہ اشیاء اہل علم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی تھیں۔ میرے یہاں جب سامان لانے لگے تو میں نے معذرت کی کہ آپ نہ لائیں۔ ایک صاحب (مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری غفرلہ) نے جو واقف تھے ہنس کر کہا کہ یہاں مولویوں کے سوا اور ہے کون جو تمہارے لیے سامان لائے گا۔ غرض ان حضرات میں سے بعض کو میں نے تکلیف دی کہ شادی کے بعد بھیکم پور تشریف لائیں۔ کرم فرمایا، کتاب خانہ دیکھا۔ متعارف فنون کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابل تحسین ٹھہرا۔

مولانا سید محمد علی صاحب اور علامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابوں کے خریدنے کا شوق ہوا۔ ندوۃ العلماء کے جلسوں کے سلسلے میں کانپور جانا ہوتا تو مولوی نور الدین مرحوم اور مولوی سلیمان صاحب تاجر کتب مصریہ کی فہرستیں دیکھ کر کتابیں خریدی جاتیں۔

قدم آگے بڑھا تو بمبئی، مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔ متفرق طور سے بھی کتابیں اور نادر کتابیں ہاتھ آتی رہیں۔ یہ ارزاں مل جاتیں۔ مثلاً مباحث مشرقیہ امام رازی کا نسخہ ایک بیوہ شریف زادی کے یہاں سے تین روپیہ کو ملا۔ الٰہ آباد سے ایک صاحب نے ایک بیوہ کا مال گلستان کا نادر مصور نسخہ بے طلب بھیج دیا۔ جب دس روپیہ قیمت بھیجی تو دعا اور شکریہ بھی ملا۔ جو نادر کتاب ہاتھ آتی علامہ شبلی مرحوم کو مطلع کرتا۔ وہاں سے تحسین آتی۔ یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا کلام مجید کا نسخہ ہاتھ آیا تو نیاز نامہ کے جواب میں

فرمایا۔ گاؤں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو۔" اس کلام مجید کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی شنیدنی ہے۔

ایک علمی اور درویش خاندان کے صاحبزادہ نے روش خاندانی بدل کر باپ کی موجودگی میں سرمایہ علمی پر دست درازی شروع کر دی ایک بار ایک نادر نسخہ معمولی داموں پر یہاں فروخت کر گئے۔ چلتے وقت کتاب والے سے کہا کہ یہ تو معمولی چیز تھی۔ ہمت ہو تو ایک چیز لاؤں کہا گیا ضرور۔ دوبارہ آئے تو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نادر روزگار نسخہ لائے کہ آنکھیں کھل گئیں۔ ظفر خاں شاہ جہانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس پر تھی: "بقلم یاقوت مستعصمی کہ بہتر ازیں نہ نوشتہ اند۔" ہدیہ چالیس روپیے لگے۔ چند روز بعد اہل خانہ کو خبر ہوئی وہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کے امیدوار تھے بعد مشورہ چالیس روپے دے کر صاحبزادے کے والد کو میرے پاس بھیجا۔ میں ایک جگہ عزیزداری میں گیا ہوا تھا۔ وہاں ملے۔ تخلیے کی فرمائش کی۔ کھٹک گیا۔ تنہائی میں لڑکے کی نالائقی کا شکوہ کر کے دریافت کیا کہ آیا کلام مجید کا نسخہ حبیب گنج پہنچنے کی خبر صحیح ہے۔ مشکل کا سامنا ہوا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شوق کا تقاضا کیا ہوا ہوگا۔ دل نے کہا کہ خطاب کرنے والے سید، معاملہ کلام مجید کا، جھوٹ بولنا روا نہیں۔ صاف واقعہ کہہ دیا اور واپسی کا وعدہ کیا۔ سید صاحب یہاں تشریف لائے تو نسخہ واپس کر دیا۔ چلتے وقت فرمایا: "وقف ہے۔ حفاظت نہ ہو سکی تو تمہارے پاس امانتاً رکھوا دوں گا۔"

آگے سنیے۔ صاحبزادے چالیس روپیہ میں ہدیہ کر گئے تھے۔ خود بزرگوار نے بارہ سو روپیہ میں گروی رکھ دیا۔ مجھ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تو زر رہن بھیج کر نسخہ اپنے پاس منگوا لیا۔ سید صاحب نے پھر کرم فرمایا۔ نسخہ مجھے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ ان کے زر طلب عزیز ایک ریاست میں لے گئے اور ساڑھے گیارہ سو روپیہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے اس عزیز کو جدا کر دیا۔ میں نے اس واقعہ کا پہلا حصہ علامہ شبلی سے بیان کیا تو فرمایا: "تمہاری شرافت تمہارے شوق پر غالب آئی۔"

جب حیدر آباد میں تعلق ہوا تو وہاں بھی عمدہ مواقع کتابوں کے حاصل کرنے کے ملے۔ خود اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمایہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے بعض نادر نسخے ہیں مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عہد قطب شاہی کا نفیس لکھا ہوا تانا شاہ کے بعض حاشیے اس پر درج ہیں۔

داستان بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے بلکہ ایسا ہوا ہے کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی۔ میں نے زیادہ دام دیئے بہت سی کتابیں نقل کے ذریعے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ سفر حج میں حرمین شریفین میں بھی کتابیں ہاتھ آئیں۔ احباب اور اعزہ کے عطیات نے بھی سرمایہ بڑھایا تحفہ اثنا عشری کا نسخہ منشی احتشام علی صاحب کا عطیہ ہے جو خود شاہ صاحب نے صحیح کر دیا تھا۔ بعض دفعہ حماقتیں ہوئیں جن پر اب تک افسوس ہے۔ ایک حماقت سن لیجیے۔ بوستان سعدی کا ایک نسخہ آیا۔ مشہور خطاط (غالباً اسحاق) کے ہاتھ کا لکھا ہوا بغرض کتب خانۂ شاہی۔ کئی مغل بادشاہوں کی مہریں اور دستی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں جن میں جہانگیر اور شاہجہاں شامل تھے۔ اس کی آراستگی قابل دید تھی۔ تین سو روپیہ قیمت تھی۔ ایک دوست نے بھیجا۔ چند روز رکھا رہا۔ نامعلوم دماغ ان ایام میں صحت کے کس درجہ میں تھا کہ نہ لیا۔ واپس کر دیا۔ خود ان دوست نے خرید لیا۔ اب میں ہوں اور وہ دوست۔ طرح طرح سے پھسلاتا ہوں مگر ان کا دل نہیں پسیجتا۔

کتابوں کے جمع کرنے میں زیادہ اہتمام قلمی نسخوں کا رہا ہے۔ مطبوعہ علمی اور فنی کتابیں جمع کی ہیں۔ معمولی کتابوں سے تعداد بڑھانا کبھی

پیش نظر نہیں رہا۔ اس تمام تجربہ سے قدیم زمانہ کے علمی و کتابی شوق کا جو اندازہ ہوا ہے اس کے مقابلہ میں عہد حاضر کی بے ذوقی بلکہ بدذوقی دیکھ کر دل دکھتا ہے۔

اس وقت (اکتوبر ۱۹۳۸ء) کتاب خانہ میں کل جلدیں ۴۰۲۰ ہیں ان میں سے ۳۱۱۱ مطبوعہ ہیں اور ۹۲۰ قلمی (۳۰ مئی ۱۹۴۲ء کو کتابوں کی تعداد ۹۰۰۰ تک پہنچ گئی تھی گویا ڈیوڑھی ہو گئی تھی) اب ایک وسیع عمارت بھی اس ذخیرہ کے لیے تنگی کر رہی ہے جو اوسط پیمانہ کے صندوقوں سے شروع ہوا تھا۔

ترتیب فن وار ہے۔ کتابیں عربی، فارسی، اور اردو تینوں زبانوں کی ہیں۔ انگریزی کی بھی ۱۰۰ ہیں جو فہرست بالا سے خارج ہیں۔ فہرستیں ایک سے زیادہ مرتب ہو چکی ہیں اور بعض ہنوز زیر ترتیب ہیں۔ سرمایہ الحمدللہ برابر ترقی پذیر ہے۔ حال میں دلی کے ایک کباڑی کے یہاں سے قدیم مطبوعات کے بہت سے نسخے ملے ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است
خم میخانہ با مہر و نشان است

چند تصنیفات (۱) ذکر الحبیب (۲) ذکر جمیل (۳) شان رسالت (۴) رسالت عامہ (۵) شمع ہدایت (۶) ذکر شریف (۷) پیغام محبت (۸) آفتاب رسالت (۹) سیرۃ الصدیق (۱۰) ذکر محبوب (پیران پیر دستگیر کے حالات) (۱۱) قرۃ العین (حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے سوانح) (۱۲) تبصرہ (حضرت امام ابو حنیفہ اور اساطین فقہ حنفی وغیرہ) (۱۳) علمائے سلف و نابینا علما (۱۴) اسلامی اخلاق (۱۵) مقالات شروانی (۱۶) استاذ الاعلیٰ (۱۷) نقد حنفی (۱۸) تذکرۂ بابر (۱۹) حالات حزیں (۲۰) نقش وفا (۲۱) سرسید کی یاد۔ (۲۲) عرض اخلاص (۲۳) مسلمانوں کی تعلیم قدیم (۲۴) مرثیہ تجلی (۲۵) تعلیم اسلام کا اثر عرب و عجم پر (۲۶) خطبہ صدارت اور شبلی کا فرض

امیر خسرو

ولادت : ۶۵۱ھ بمقام مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ)
وفات : ۱۸ شوال ۷۲۵ھ بمقام دہلی

سرگذشتِ خویش

میرے والد سیف شمسی (منسوب بہ سلطان شمس الدین التمش) نہایت بہادر اور صف شکنی میں شہرۂ روزگار تھے۔ باوجود اس کے نہایت کم سخن تھے۔ ترک کی نسبت مشہور ہے کہ "ترک در خواب فرشتہ است" مگر وہ بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ ایسے فرشتے خواب میں نظر آئیں تو آئیں۔ نہایت پاکباز اور باخدا تھے۔ خود تو محض امی تھے لیکن ان کی ہمت اس طرف متوجہ رہی کہ مجھ کو کچھ آجائے جو تھوڑی بہت قابلیت مجھ میں ہے وہ انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو شہادت کی بہت تمنا تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس سعادت سے ان کو سرفراز فرمایا ؂

سیف از سرم "برفت" و دل من دو نیم ماند
دریائے من رواں شد و "در یتیم" ماند

(فرشتہ نے بجائے "برفت" کے "گزشت" لکھا ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے)

میری عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اس صغر سنی ہی میں جبکہ دودھ کے دانت ٹوٹتے تھے۔ میرا کلام نمونۂ درافشانی تھا: "دراں صغر سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت"۔ والد کے بعد نانا عماد الملک کفیل تربیت ہوئے۔ نانا نہایت با اقبال اور صاحب ثروت تھے۔ اگرچہ لقب "سلطانی" سے محروم تھے مگر حقیقت میں سلطان وہی تھے۔ ان کی فراخ حوصلگی نے تمام ہندوستان تابع کر رکھا تھا۔ تخت کی آڑ میں کل کام وہی کرتے تھے۔ حاسدوں کا منہ بند رکھنے کے واسطے بعض خدمات بھی انھوں نے رکھی تھیں۔ دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلام اور دس ہزار سوار ان کی سرکار میں تھے۔ سال بسال کثرت سے کلاہ و قبا ان کے توشہ خانہ سے تقسیم ہوتی۔ باورچی خانہ سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا۔ ان کا فیض ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا تھا۔ ستر برس عہدۂ عرض ممالک پر ممتاز رہے۔ میں جب ان کی آغوش شفقت میں بیس برس کا ہوا تو انھوں نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نانا کے انتقال کرنے پر میں شاہزادہ کشلو خاں عرف چھجو (علاء الدین محمد بن اعز الدین کشلی خاں ملقب بخانِ اعظم سلطان بلبن کا بھتیجا) کے دامنِ دولت سے جا لپٹا۔ دو برس شہزادہ ممدوح کی سرکار میں رہا۔ کئی قصیدے اس کی شان میں لکھے۔ میں ہمیشہ اس کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔

ایک روز بادشاہ (سلطان غیاث الدین بلبن) کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، خانِ معظم کشلو خاں کے یہاں مہمان آیا۔ یہ دونوں باہم

چچازاد بھائی تھے) چند مصاحب و ندیم ساتھ تھے۔ منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ خان معظم کی مصاحبت میں صرف میں ہی تھا۔ اس طرف سے وہ سب چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس طرف سے صرف میں جواب دیتا تھا۔ تاہم سب کا قافیہ تنگ تھا۔ میں نے لطائف و ظرائف سے محفل کو اس قدر گرمایا کہ شاہزادہ بغرا خاں نے فرط سرور میں ایک طبق زر میرے سامنے رکھ کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانہ کا خرچ ہے۔ ہمارے خان (قتلغ خان) کا مزاج نہایت غیور تھا۔ اس کو یہ امر شاق ہوا۔ میں نے ہرچند معذرت کی لیکن اس کا مزاج صاف نہ ہوا۔ بلکہ یہاں تک بڑھا کہ میری صفائی کی فکر ہونے لگی۔ آخر مجھ کو کنارہ کش ہونا پڑا اور بے سروسامانی میں سامانے ہی میں جائے امن نظر آیا اور میں وہیں چلا گیا (سامانے کا حاکم شہزادہ بغرا خاں تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کا دوسرا بیٹا تھا) لوگوں نے شاہزادے سے غائبانہ میری اس قدر تعریف کی کہ وہ سراپا شوق بن گیا۔ جب میں حاضر ہوا تو ندیم خاص مقرر کیا۔ میرا عروج روز بروز ترقی پذیر تھا کہ ناگاہ پرچم شاہی دارالملک دہلی سے لکھنوتی کی جانب رواں ہوا (۶۷۸ھ) شاہزادہ خود عزم ہمرکابی کر رہا تھا کہ قاصد سلطانی پہنچا اور شاہزادہ مع سپاہ لشکر شاہی میں آملا۔ بندہ ساتھ تھا۔ ایک سال تک قطع مسافت کرتا رہا تاہم منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ لکھنوتی (بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنت تھا۔ گوڑ بھی اسی کو کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے جنت آباد لقب دیا۔ اب ویران پڑا ہے اور گنگا کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے) سے ڈیڑھ سو کوس اس طرف پہنچے۔ پھر بھی گھوڑوں کی پشت زین سے گراں بار رہی۔ مچھر کا یہ عالم تھا کہ پرندہ اس میں گر پڑتا تو شہد کی مکھی کی طرح پھنس جاتا۔ قصہ دراز اور حوصلہ بیان تنگ۔ مختصر یہ کہ طغرل کا قلع قمع ہو گیا اور شاہزادے کو حکومت لکھنوتی عطا ہوئی۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے چاہا کہ میں بھی شاہزادے کے دربار میں حاضر رہوں مگر میں عزیزوں کی مفارقت سے گھبرا گیا تھا۔ لشکر شاہی کے ہمراہ دہلی چلا آیا۔

انہی مہینوں میں قاآن الملک (خان شہید) فاتح و منصور داخل دارالسلطنت ہوا۔ میری سخنوری کی شہرت سن چکا تھا۔ بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مغلوں کا معرکہ پیش آیا اور شہزادے کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر زندگی باقی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس بلا سے نجات دی۔ رہائی پا کر میں قبۃ الاسلام (دہلی) کی زیارت سے مشرف ہوا اور والدہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تک مومن پور عرف پٹیالی میں گنگا کے کنارے وقت خوشی سے گزرا۔ اسی عرصے میں سلطان عادل غیاث الدین نے رحلت فرمائی (۶۸۶ھ) اور دولت معزی کا علم بلند ہوا۔ بندے کی طلبی ہوئی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور اس کے دل میں ایک وجہ سے مجھ خاکی کی جانب سے غبار تھا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ضرر نہ پہنچائے۔ اس لیے کنارہ کشی کر کے حاتم خاں کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر موصوف نے اس قدر دولت مجھ کو عطا کی کہ اگر میں اس کو خرچ نہ کرتا تو میری اولاد کی عمر بھی آبرو اور فراغت سے بسر ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دن حاتم خاں کی ندیمی میں گزرے تھے کہ نظام الدین جنت کو سدھارا (مجلس نظامی بہ بوستان فردوسی جائے خوش کرد) اور میں دربار شاہی میں حاضر ہو کر خلعت ندیمی سے ممتاز ہوا اور دولت تقرب سے مالا مال۔ بادشاہ کی اقبال مندی کا زمانہ تھا اور رات دن عیش و عشرت کے چرچے تھے۔ آخر ساقی زمانہ نے اس کو وہ جام نامرادی پلایا جس کے خمار نے آنکھ کھولنے کی مہلت نہ دی۔ اس کا قرۃ العین شمس الدین تخت پر بٹھایا گیا اور شائستہ خاں (جو آسمان فیروزی تھا) اس کا پشت و پناہ بنا۔ بندہ خسرو کو خدمت شائستہ خاں

سے سرفرازی ہوئی۔ آخر چترِ شاہی خود شائستہ خاں کے سر پا کر ٹھہرا اور وہ فیروز شاہ بن کر تخت نشین ہوا (۶۸۹ھ) خداوند تعالیٰ اس کے اقبال کو بلند رکھے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ درباروں ہی میں زندگی بسر کی اور شاہزادوں کا ہمنشیں اور ہم زانو رہا مگر اوجِ ناموری پر اسی بادشاہ کی تربیت و مرحمت سے پہنچا۔ تمام بادشاہوں میں سے زیادہ وہ ذی علم ہے اور اگلے پچھلے بادشاہوں میں کوئی اس کے مثل سخن فہم نہیں ہوا۔ میرے کلام کی جو کچھ حقیقت ہے۔ اس کو خوب سمجھتا ہے اور پوری قدردانی فرماتا ہے۔

میرے چار سخن سنج اور سخن فہم دوست ہیں ـــ مولانا شہاب الدین، قاضی سراج الدین، برادر تاج الدین زاہد اور برادرم علاؤ الدین علی شاہ۔ آخر الذکر دوست موافق و منصف ہے۔ نہ میری طرفداری کرتا ہے نہ انصاف کی جانب پشت۔ اس کا مرتبہ شاہانِ سخن میں مسلّم ہے اور ایسا دوست ہے کہ اگر برادرانِ موافق اس یوسف لقا کو ہزار جان کے بدلے بیچ ڈالیں تو بھی ٹوٹے میں نہ رہیں گے۔

لڑکپن

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایتِ ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلاء و علماء روزگار ان کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ ان کے تعجب سے میرا شوق ابھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم کہ کثرتِ شوق کے باعث شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مشقِ نظم میں سرنگوں رہتا تھا اور دن کو مطالعہ میں مصروف۔ یہاں تک کہ نظم میں قوت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دل گرماتا تھا اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا قلم کو بے راہ روی سے روکتا، نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نو آموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشقِ سخن کرتا تھا اور سخن بھی سیکھتا تھا۔

اسی طرح آئینۂ دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا حتیٰ کہ مذاقِ لطف کرم و ذوقِ سخن سے آشنا ہوا۔ انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آئی اس کا جواب لکھتا۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتا اسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک مدت تک خاقانی کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا۔ جو اشعار اس کے کلام میں مغلق تھے ان کی تعلیق کی (معنی نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نوعمری کماحقہ حقائقِ کلام واضح نہ ہوتے تھے۔ ہر چند میری ہمت کا تقاضا تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔ با ایں ہمہ عاقبت الامر استادوں کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی۔ چونکہ میرے کلام کا کوئی مرجع نہ تھا۔ ہر استاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لیے اس مجموعہ (تحفۃ الصغر) میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصلِ کلام میرے والد نے تحصیلِ علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے استاد مولانا سعد الدین خطاط مشقِ خطاطی کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دُھن میں تھا۔ وہ چھڑی پر چھڑی لگاتے۔ مجھ کو زلف و خال کا سودا تھا۔ انتہا یہ کہ اسی کی تحصیل

وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے استاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے لیے بلایا۔ میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہوا۔ اس عہدیدار کے گھر میں خواجہ عزیز الدین نظر بند تھے۔ خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصروف تھے۔ اثنائے مطالعہ میں جب کسی مضمون پر گفتگو کرتے تو منہ سے موتی جھڑتے اور جواہر آبدار زباں سے نکلتے۔ میرے استاد نے ان سے کہا: "یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بے حد شائق ہے۔ شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دے کر امتحان لیجیے۔" خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھ کو دے کر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجے میں پڑھنے شروع کیے۔ اس کے اثر سے آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی۔ پھر میرے استاد نے کہا: "پڑھنا سن لیا اب کوئی بیت پیش کر کے جودت طبع کی آزمائش کیجیے۔" خواجہ ممدوح نے چار غیر مناسب چیزوں کے نام لے کر کہا۔ "ان کو نظم میں موزوں کرو۔" وہ نام مُو۔ بیضہ۔ خربزہ۔ تیر تھے۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ رباعی موزوں کر کے سنائی ؎

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم ست — صد بیضۂ عنبریں بر آں موئے ضم ست
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا — چوں خربزہ دندانش درونِ شکم ست

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی، خواجہ نے بہت ہی آفریں فرمائی اور نام پوچھا۔ میں نے کہا: "خسرو۔" باپ کا نام پوچھا میں نے کہا "لاچین"۔ کہا۔ "لاچین ترک تھا ہے؟" میں نے جواب دیا کہ بے خطا ترک ہے۔ دریافت کیا "تم درم خریدۂ ناصری ہو؟" (اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین) عرض کی "سلطانی شمسی ہوں" (اشارہ بجانب سلطان شمس الدین التمش ہے۔ سلطانی اشرفی کو بھی کہتے ہیں درم خریدہ کی کیسی رعایت ہے) فرمایا "چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہے، لہٰذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔" اس کے بعد بہت سی باتیں میرا دل بڑھانے کو کہیں اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین کیں جن کو میں اپنے دل میں رکھتا گیا۔ اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ تخلص بہت رائج ہے۔ اس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر زمانہ لڑکپن کا تھا۔ اس لیے کلام کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج الدین زاہد (جس کی باریک بینی جیسے مشاطۂ سلوۂ اشعار ہے) ان اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اس کا ایک مجموعہ اس نے بنایا۔ میں نے اس کو دیکھ کر کہا: "یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔" اس نے نہ مانا اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ میں نے ہر حصہ کلام پر ایک شعر اس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہے۔ مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام "تحفۃ الصغر" ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر چند اوراق باطل جمع ہیں۔ میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور پاؤں میں لنگ تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ بادپائے نظم کو جنبش نہ کرنے دوں، لیکن دوستوں نے نہ مانا۔ عموماً سب (اور خصوصاً بھائی تاج دین) برابر مصر رہے۔ میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلک محبت میں سرفراز رہا ہوں اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بلا مبالغہ برادران توام کی مثال بنا دیا ہے۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے ؎

بسکہ جانم یگانہ شد با او — در گمانم کہ ایں منم یا او

اس کا مقصد تھا کہ یہ دفتر پُرحشو کسی شمار میں آ جائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر

(جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) کہ یہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کرے گا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا! میں کہتا تھا کہ اس میں شتر گربہ (رطب و یابس) بہت ہے۔ اس کا جواب تھا کہ لوگ اس کو تعویذ بنا کر نوشک بازو (بازو کی پونچیا) پر باندھیں گے۔ غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یاران خوب و شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ بطیب خاطر قبول فرمائیں گے۔

(خلاصہ دیباچہ تحفۃ الصغر)

شباب

ایک روز میں شب کو بیٹھا ہوا چمن سخن کی سیر کر رہا تھا۔ اپنے ہی کلام کا ایک گلدستہ (جو بہار جوانی کا شگوفہ ہے) ہاتھ میں تھا کہ

ربیع العمر ایام الشباب

یعنی جوانی بہار زندگانی ہے۔ کبھی اس کے پھول پتے سے اپنا دل نہال کرتا اور کبھی اس کو ترنم میں ادا کر کے بلبل کا دل شاد کرتا کبھی لکھتا کبھی پڑھتا۔ اسی عرصے میں برادرم علاء الدین شاہ کاتب (گویا اسی کی شان میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "علیکم بحسن الخط فانھا مفاتیح الرزق" (خوش خطی سیکھو کہ روزی کی کنجی ہے) آپہنچا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ میں نے حال کہا۔ سُن کر بولا کہ تمھارے تازہ کلام کا ایک انبار میرے پاس جمع ہے جو ہنوز غیر مرتب ہے۔ اوّل اس کو مرتب کر دو۔ پھر اور کلام کی فکر میں پڑنا۔ میں نے ٹالا۔ لیکن اس نے نہ مانا۔ باصرار کہا: "اوّل مسودات کہ بریں است بیاض کن۔ بعد ازاں قطعات پیشینہ کہ نسیات شدہ است بداں پیوند۔ پس ضابطۂ و رابطۂ بیاں بند بعد ازاں چنانچہ روئے "تحفۃ الصغر" و "وسط الحیوٰۃ" را بمحاسن دیباچہ مزین گردانیدہ جمال "غرہ" را نیز بدیباچہ کمال بیارائے"

یعنی جو مسودات میرے پاس ہیں پہلے ان کو صاف کرو۔ پھر ان میں پرانی تحریریں جو طاق نسیاں کی نذر ہو چکی ہیں ملا دو۔ اس کے بعد ایک ضابطہ اور رابطہ ان پر باندھو۔ یہ سب ہو چکے تو "تحفۃ الصغر" اور "وسط الحیوٰۃ" کی طرح "غرہ" کو بھی دیباچہ سے آراستہ کرو۔"

آخر مجھ کو اپنے دوست کی فرمائش ماننی پڑی اور دوسرے ہی روز صبح کو مسودوں کا تھیلا کھول کر ترتیب شروع کر دی۔ شبانہ روز محنت کر کے دو ہفتے کے بعد یہ مجموعہ تیار کر دیا۔ "تا بعد دو ہفتہ ایں ماہ چہاردہ را کہ غرہ کمالش خوانند بآراستگی تمام برآوردم ؎

ز ماہ است ایں کہ خورشید است پرتو   بنامیزد چہ گویم چشم بد دور

مرتب ہوتے ہی شائقین کے مطالعہ میں پہنچا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ جب دیوان مرتب ہو کر سخن شناس دوستوں کی نظر سے گزر گیا۔ اس وقت میں نے یہ دیباچہ لکھ کر لگا دیا۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھ کو عربی شعر کہنا نہیں آتا۔ "حقیقت ایں است کہ ایں طرق نیک نمی دانم"۔ میں نے چند جزو ہندی نظم کے بھی لکھے ہیں۔ مجھ سے پہلے شاہان سخن میں سے کسی کے تین دیوان نہ تھے (دیوان کے ایک معنی دربار بھی ہیں) مسعود سعد سلمان کے البتہ تین دیوان ہیں ایک عربی، دوسرا فارسی، تیسرا ہندی۔ صرف فارسی میں تین دیوان سوا میرے کسی کے نہیں ہیں۔ دیوان اول تحفۃ الصغر جو بچپن کا کلام ہے دوسرا وسط الحیوٰۃ عنفوان شباب کا ذخیرہ ہے تیسرا یہ غرۃ الکمال۔ میرے نزدیک کلام غرۃ الکمال ہی ہے۔ پہلا دیوان اس لیے جداگانہ مرتب کر دیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بچپن کا کلام ہے اور وہ حرف گیری سے باز رہیں۔ دوسرا اس واسطے فراہم کیا کہ "اوسط مردم را امید کنم"۔

(خلاصہ دیباچہ غرۃ الکمال)

تصانیف

میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں (نظم و نثر کی متفرق کتابوں میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں جن میں بہت سی طبع ہو چکی ہیں (۱) قران السعدین (۲) خزائن الفتوح (۳) دول رانی خضر خاں (۴) نہ سپہر (۵) تغلق نامہ (۶) مطلع الانوار (۷) شیریں خسرو (۸) آئینۂ سکندری (۹) لیلیٰ مجنوں (۱۰) ہشت بہشت (۱۱) انشائے خسرو یا خیالات خسرو (۱۲) رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروی (۱۳) افضل الفوائد۔ (۱۴) راحت المحبین (۱۵) خالق باری (۱۶) ناصر باری (۱۷) جواہر البحر (۱۸) مقالہ (۱۹) قصہ چہار درویش (۲۰) دیوان تحفۃ الصغر (۲۱) دیوان وسط الحیوٰۃ (۲۲) دیوان غرۃ الکمال (۲۳) دیوان بقیہ نقیہ (۲۴) دیوان نہایۃ الکمال وغیرہ۔ محمد عبداللہ قریشی) اور وہ مادہ جو عناصر کے مرکب ہیں۔ وعظ اور حکمت پر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں سنائی و خاقانی کی پیروی کی ہے اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہے جو عالم بالا کی طرف میل رکھتی ہے۔ تخلص (قصیدہ) اور خلاصۂ خیال میں طرز رضی و کمال اختیار کی ہے جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جلتی ہے۔ غزل اور مثنوی میں سعدی اور نظامی کے قدم بقدم ہوں۔ اس روش کو بلحاظ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہے۔

محاکمہ

میرے کلام کا حصہ مقطعات، رباعیات، معما و لغز خود میرے وجود خاکی کا غبار ہے جو اس لحاظ سے خاک ہے کہ اس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنون احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ استادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحب طرز خاص ہونا مجھ میں موجود نہیں۔ میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے بہت سے ساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ دوسری شرط کہ کلام خطا اور نقص سے پاک ہو۔ اس کا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہے لیکن غزل اور لغز (جیسا کہ) میں جابجا لغزشیں بھی ہیں: "نظم بندہ اگرچہ بیشتر روانست۔ اما جابجا در غزل و لغز، لغزیدنی ہم ہست"۔ دونوں مذکورہ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ استادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو۔ نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے۔ صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو۔ یہ بھی مجھ میں موجود ہے۔ میں نے آج تک دوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصہ مختصر میں مالک طرز خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوب شعرا کے مطابق ہے۔ سرقہ میں نے نہیں کیا۔ پس استادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں۔ دو نہیں ہیں۔ میں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سند استادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے۔ ع

ناتمام ناتمام ناتمام

مصطفٰے خاں شیفتہ

شیفتہ تخلص، راقم عاصم ہے۔ کم مائیگی کی بنا پر نہیں چاہتا ہوں کہ شعرا کے زمرہ میں شمار کیا جاؤں لیکن ارباب کرم کی اُمید کرم پر کہ عیب کو بھی ہنر سمجھیں اور غلط کو بھی صحیح تصور کریں۔ اپنے کلام میں سے تھوڑا سا، جو میرے کردار کے مانند زیادہ اچھا نہیں ہے پیش کر رہا ہوں ؎

شنیدم کہ در روز اُمید و بیم   بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم
تو ہم ار بدی بینی اندر سخن   بہ خُلق جہاں آفریں کار کُن

اور اپنے افکار عرض کرنے سے پیشتر اپنا حال گزارش کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ فقیر کو بچپن ہی سے اس شغل کا شوق تھا عمر کا بڑا حصہ اس میں ضائع کیا۔ چونکہ اس فن میں انہماک دوسرے اشغال عالیہ اور شریفہ سے باز رکھتا ہے اس لیے مدت ہوئی کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر اہل محفل کی تحریک پر کبھی کبھی واردات جدیدہ سے اتفاق پڑتا ہے اور وہ بھی مہینوں میں نہیں برسوں میں۔ کبھی شائقان ریختہ کے ہجوم عشق کی خاطر اُردو میں فکر سخن کرنے کے لیے مضطر ہوتا ہوں اور کبھی اسی طرح آرزومندان فارسی کے شوق کے جوش میں فارسی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مراتب سخن میں اگرچہ میرا ایک خاص انداز ہے لیکن طبیعت ہر انداز میں کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر اسلوب میں شعر کہہ لیتا ہوں۔ ایسا کہ گویا وہی میری طرز خاص ہے اور اگر میرے نظم و نثر کا مجموعہ دیکھا جائے تو میرے اس دعوے کی تصدیق ہوگی اور جو کچھ میرے جام سخن میں ہے۔ وہ میخانۂ سخن کے ساقی مومن خاں کے ہاتھ سے ڈالا ہوا ہے۔

(از گلشن بے خار)

شیفتہ کا سفر نامہ

[نواب مصطفٰے خاں شیفتہ جنھیں ہم سب مومن و غالب کے شاگرد اور دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انیسویں صدی کی اسلامی معاشرت اور شائستگی کے ایک نمائندہ فرد تھے۔ شرافت، وضعداری، انسان دوستی، مذہبی پاکیزگی اور دینی جذبہ ان کی شخصیت میں اسی طرح نمایاں ہے جس طرح شعر و سخن میں ان کی لطافتِ ذوق۔

شیفتہ حج کے لیے گئے تو ان کے علمی اور ادبی ذوق نے ایک سفر نامہ بھی مرتب کرا دیا جو اُنھوں نے فارسی میں لکھا اور ترغیب السالک الی احسن المسالک کے نام سے شائع کیا۔ دیباچے میں اُنھوں نے کتاب کا نام "رہ آورد" تجویز کیا تھا، چنانچہ اس کی طباعت مطبع مصطفائی دہلی میں ۱۲۰۳ھ میں اسی نام سے ہوئی تھی، لیکن بعد میں اُنھوں نے اس کے لیے نیا مرقع

دوسرے نام سے مطبع مرتضائی دہلی میں چھپوا کر مطبوعہ نسخوں میں سے ۱۲۵ نسخوں میں کتاب کا نام بدل دیا۔ باقی نسخے اسی نام سے رہے۔

اس سفرنامے کا بیشتر حصہ حج و زیارت کے اصول و آداب، متعلقہ مسائل اور متبرک مقامات کے بیان پر مشتمل ہے لیکن اس کے بعض حصے روزنامچہ سفر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا تلخیصی ترجمہ کر کے ہم نے شیفتہ کے سفرنامے کی نئی تشکیل کی ہے۔ پوری کتاب کا مکمل لفظی ترجمہ سید زین العابدین نے "سراج منیر" کے نام سے سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع کیا تھا۔

شیفتہ دہلی سے ۱۰ر ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ (مطابق ۱۵ر فروری ۱۸۴۱ء) کو واپس آئے۔ ان کے اس سفر کی کل مدت دو سال کچھ دن ہے]

دوشنبہ ۱۷ر ذوالحجہ ۱۲۵۴ھ (۲ر مارچ ۱۸۳۹ء)

حرمین شریفین کی زیارت کے لیے دارالخلافہ شاہجہان آباد سے شام ہوتے روانگی ہوگئی۔ پہلے پیر نورانی، عالم ربانی مولانا محمد اسحاق مدظلہ العالی سے رخصت ہونے اور دعائیں لینے کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ پھر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کے آستانے پر رخصتی کے لیے حاضری دی اور والد مرحوم اور دوسرے عزیزوں کی قبروں سے بغلگیر ہو کر خواجہ قطب الاقطاب بختیار اوشی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ رات اسی آستانے پر گزاری اور دوسرا دن بھی، اگرچہ دل ترک علائق کا خوگر اور محبت و نفرت کے بند و پیوند سے آزاد ہے، لیکن ان عزیزوں اور بزرگوں کے ہجوم میں جو پہنچانے آئے ہیں، منت پذیری کے جذبات سے جی اس طرح اُمڈا آ رہا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

۱۹ر ذی الحجہ / ۴ر مارچ

اہلِ وطن سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے اور گڑگانوے پہنچ کر قیام کیا جو دہلی سے سات کوس ہے۔

۲۰ر ذی الحجہ / ۶ر مارچ

پاٹودی میں جا کر اترے۔ یہ گڑگانوے سے چودہ کوس ہے۔

۲۱ر ذی الحجہ / ۷ر مارچ

ریواڑی — یہ گڑگانوے سے آٹھ کوس ہے۔ راستہ میں شیخ فریدالدین شکر گنجؒ کی مسجد اور اربعین گاہ کی زیارت کی۔ یہ پہاڑ پر واقع ہے۔ بہت مختصر سی عمارت ہے۔ وہ کنواں بھی دیکھا جس میں شیخ فریدؒ نے اُلٹے لٹک کر نماز پڑھی ہے۔

۲۲ر ذی الحجہ / ۸ر مارچ

شاہجہان پور، ریواڑی سے دس کوس

۲۳ر ذی الحجہ / ۹ر مارچ

بڑوڈ — شاہجہان پور سے آٹھ کوس۔ بڑوڈ، الور کی ریاست میں ہے۔ یہاں ایک بزرگ کا مزار ہے۔

۲۴ر ذی الحجہ / ۱۰ر مارچ

کوٹ پتلی — بڑوڑ سے آٹھ کوس۔ یہ بستی کنتری کے مضافات میں ہے۔ بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ مشہور مجذوب کلن شاہ یہیں کا ہے۔

۲۵ر ذی الحجہ / ۱۱ر مارچ

بھابھرا۔ کوٹ پتلی سے بارہ کوس۔ یہاں سے ریاست جے پور کی حد شروع ہوتی ہے۔ "ایں موضع در خرابی رشک وادیِ مجنون است"۔

۲۶ر ذی الحجہ / ۱۲ر مارچ

منوہر پور — بھابھرا سے سات کوس

۲۷ر ذی الحجہ / ۱۳ر مارچ

اچرول — منوہر پور سے سات کوس

۲۸ر ذی الحجہ / ۱۴ر مارچ

جے پور — اچرول سے نو کوس۔ جے پور وسیع شہر ہے۔ کھلے کھلے بازار ہیں۔ عمارتیں اکثر پتھر کی ہیں۔ خوب آباد ہے۔ سبزہ و گل کی کثرت ہے۔ کوکنار یہاں اچھا ہوتا ہے۔ آم بہت کم ہے اور ہوا گرم ہے۔ یہاں سید رحمت علی سے ملاقات ہوئی۔ یہ مولانا محمد فخر الدین کے خلیفہ مولانا ضیاء الدین کے سجادہ نشین ہیں: "گزین و وارستہ مرویست متین و نکتہ"۔ یہاں چار دن قیام رہا۔

۴ر ماہ محرم ۱۲۵۵ھ / ۱۸ر مارچ ۱۸۳۹ء

بگرو — جے پور سے دس کوس۔ اب آگے مسافت کا حساب بدل گیا ہے۔ دس کوس کو ہمارے حساب سے پندرہ کوس سمجھنا چاہیئے۔

۵ر محرم / ۱۹ر مارچ

دودوکا — بگرو سے دس کوس۔ یہاں حکومت جے پور کی حد ختم ہوتی ہے۔ بگرو اور دودوکا میں چوروں کی کثرت ہے۔ کوئی مہمان سرائے نہیں۔ جہاں کی رسم مسافر کشی ہو وہاں مسافر نوازی کی کیا پڑی۔

۶ر محرم / ۲۰ر مارچ

کشن گڑھ — دودوکا سے بارہ کوس۔ شہر سے جہاں اجمیر کو راستہ جاتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی بنائی ہوئی سرائے ہے۔ اچھی جگہ ہے۔

۷ر محرم / ۲۱ر مارچ

دار الخیر اجمیر — کشن گڑھ سے آٹھ کوس۔ خواجہ معین الدین کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ درگاہ کے پاس شاہجہاں بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ درگاہ کی دلکشی اور اس مسجد کی خوش نمائی بیان سے باہر ہے۔ شہر کا نقشہ جے پور کے انداز پر ہے

اب نئی عمارتیں بنائی گئی ہیں جس سے شہر کی رونق بڑھ گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے شہر میں یہ رونق نہ تھی۔ یہاں سید تفضل حسین خاں سے تعارف ہوا جو خیرآباد کے 'اکابرزادہ' ہیں۔ اجمیر میں چار دن قیام رہا۔ (سید تفضل حسین خاں کے بارے میں رائے)

۱۲ر محرم / ۲۲ر مارچ

نصیرآباد — اجمیر سے سات کوس۔ انگریزی فوج کی چھاؤنی ہے۔

۱۳ر محرم / ۲۳ر مارچ

موضع بھناہ — نصیرآباد سے سات کوس۔ انگریزوں کی حکومت کا علاقہ جو اجمیر سے شروع ہوا تھا یہاں ختم ہوگیا۔

۱۴ر محرم / ۲۴ر مارچ

موضع انگوچھہ — بھناہ سے آٹھ کوس۔ یہاں کوئی سرائے نہیں بلکہ یہاں سے بڑودے تک یہی حال ہے۔ میواڑ کا علاقہ ہے۔ یہاں سے اودے پور کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

۱۵ر محرم / ۲۵ر مارچ

بھنیرہ — موضع انگوچھہ سے نو کوس

۱۶ر محرم / ۲۶ر مارچ

بھیلواڑہ — بھنیرہ سے پانچ کوس

۱۷ر محرم / ۲۷ر مارچ

سوفواناں — گاؤں ہے بھیلواڑہ سے سات کوس۔ ویسے ہمیرگڑھ میں ٹھہرنا چاہیے تھا جو کہ بھیلواڑہ سے پانچ کوس ہے لیکن اگلی منزل کا سفر لمبا ہوجاتا۔

۱۸ر محرم / ۲۸ر مارچ

چتوڑ — سوفواناں سے سات کوس۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ ہے۔ ہندوستان کے مشہور قلعوں میں سے ہے بہت بڑا قلعہ ہے اور بہت مستحکم۔ خربوزہ یہاں بہت میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اودے پور کی عملداری یہاں ختم ہوتی۔ نصیرآباد سے چتوڑ تک مسافروں کے لیے ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ بنانے والوں نے بستی سے نزدیکی کا خیال نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ ان بنگلوں کے آس پاس سایہ دار درخت بھی نہیں اور غضب کی بات ہے کہ چشموں اور کنوؤں سے بھی یہ بنگلے دور ہیں۔ ان میں ٹھہریں تو قافلے کے لوگوں اور چوپاؤں کو بڑی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے خاص طور سے گرمی کے موسم میں۔ جہاں یہ دقتیں نسبتاً کم تھیں وہاں بنگلوں ہی میں ٹھہرے ورنہ اکثر مقامات پر بستی کے پاس ڈیرہ لگا کر قیام کیا۔

۱۹ر محرم / ۲۹ر مارچ

نمبہیڑہ — چتوڑ سے نو کوس۔ رات یہاں گزاری۔ یہ قصبہ ریاست ٹونک کا ہے۔ نواب محمد وزیر خاں خلف ارشد

نواب محمد امیر خاں مرحوم کے زیر حکومت۔

۲۰ محرم / ۳۰ مارچ

نیمچ — نیمبہیڑہ سے سات کوس۔ یہ ریاست گوالیار کے مضافات میں ہے۔ لیکن اس وقت یہاں انگریزی فوجیں مقیم ہیں۔ نیمچ میواڑ اور مالوہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں چھ دن قیام رہا۔

۲۷ محرم / ۷ اپریل

ملہار گڑھ — نیمچ سے سات کوس

۲۸ محرم / ۸ اپریل

مندسور — ملہار گڑھ سے سات کوس۔ سنا تھا بڑا شہر ہے۔ اب دیکھا کچھ بھی نہیں ہے۔ گوالیار کی ریاست میں ہے۔

۲۹ محرم / ۹ اپریل

کچنارہ — مندسور سے سات کوس

۳۰ محرم / ۱۰ اپریل

جاورہ — کچنارہ سے چھ کوس۔ جاورہ نواب غوث محمد خاں فرزند نواب غفور خاں مغفور کے زیر حکومت ہے مجھ سے ملنے آئے، بڑی محبت سے ملے اور صد درجہ مہمان نوازی کی۔ سفر حج کے باوجود اصرار کر کے دو دن ٹھہرایا۔ نوجوان ہیں مگر بڑے سمجھ دار۔ نو عمری میں دماغ بزرگوں کا پایا۔ ادب، حیا، مہر و وفا کے مجسمہ ہیں۔ "پوشش خوش ست و چشم و ابروئش درست۔"

۳۰ صفر / ۱۰ مئی

رتلام — جاورے سے دس کوس۔ گاؤں ہے مگر طول و عرض میں شہر نظر آتا ہے۔ مکانات یہاں کے سب لکڑی کے ہیں اسی لیے اس بستی کی زیادہ اہمیت نہیں۔ مالوے کے علاقے میں مٹی بہت پھوکی اور بودی ہوتی ہے۔ مکان سب لکڑی کے بنائے جاتے ہیں اور خدا کی قدرت ہے، لکڑی ایسی مضبوط کہ "حمد داستان" کی ہم پلہ! اس حکیم علی الاطلاق جل شانہٗ و عم نوالہٗ کی کیا کیا حکمتیں ہیں۔ سبحان اللہ!

حنفیوں کی شرائط کے مطابق طاہر پانی ان مقامات پر قطعاً میسر نہ تھا، ناچار بحکم اضطرار امام مالکؒ کے فتوے پر عمل کیا اس لیے کہ بعض مقامات پر امام شافعیؒ کی پیروی کا بھی امکان نہ تھا۔ اب آگے کی منزلوں میں، سنتے ہیں، پانی اور بھی نایاب ہے۔ دیکھیے کس کو کونسا مشرب اختیار کرنا پڑتا ہے۔

رتلام سے بڑودے کو تین راستے جاتے ہیں جن میں اکثر خطرہ رہتا ہے۔ تحقیق حال کے لیے رتلام میں ایک دن قیام کیا۔ ربیع الاول کی پانچویں تاریخ کو روانہ ہو کر رتلام سے چھ کوس کے فاصلے پر "ماہی" ندی کے کنارے جا کر اترے۔ یہاں آبادی نہیں اس لیے آٹا اور گھی کہاں ملتا۔ یہاں سے راجہ جھابوہ کی راجدھانی شروع ہو جاتی ہے۔

۶ ربیع الاول / ۱۶ مئی

کرالود جا کر ٹھہرے۔ یہ مہی ندی سے چار کوس کے فاصلے پر ہے۔ ویسے مسافر عام طور پر پٹ لاود میں ٹھہرتے ہیں، جو کرالود سے ایک کوس آگے ہے، لیکن سنا تھا کہ پٹلاود میں سایہ دار درخت بہت کم ہیں اور وہاں کا پانی بھی اچھا نہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ کرالود میں ٹھہر جائیں۔ یہاں درختوں کا سایہ بھی خوب ہے اور پانی بھی خاصا اچھا ہے۔

۷ ربیع الاول / ۱۷ مئی

جھگڑ میں جا کر اترے۔ کہتے ہیں یہ جگہ کرالود سے آٹھ کوس ہے۔ یہ آٹھ کوس ہماری طرف کے سولہ کوس سے کم نہیں معلوم ہوتے۔ مسافتوں کی صعوبتوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اب اس بات میں شاید تکرار محسوس ہوگی، لیکن اب اس کے بعد وہ کوس آنے والے ہیں جو اس علاقے کے کوس اور فرسخ سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ سفر کی اس پوری منزل میں پانی کہیں میسر نہیں بلکہ جھگڑ میں بھی نہیں .... جہاں آ کر ٹھہرے ہیں۔ ایک ندی ضرور ہے جو اس موسم میں خشک رہتی ہے۔ یہاں کے باشندے ان دنوں میں ندی میں ایک دو ہاتھ زمین کھود کر پانی نکال لیتے ہیں۔ اس سفر میں جہاں بھی پہنچے ایک دو ندیاں ضرور ملیں لیکن یہ گرمی کا موسم ہے، بہتی ندیاں نہیں، ندیوں میں اتھلا پانی ہے یا بالکل خشک ہیں، الا ماشاء اللہ۔

اس نشیبی علاقے میں شیر بہت ہیں۔ جہاں ہمارا قیام ہے یہاں شیر آ جاتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بہت دیر انتظار کیا پیچھے آنے والوں کے گھوڑوں اور خچروں وغیرہ کی گرد تک اڑتی نظر نہ آئی۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ جگہ خطرے کی ہے، ادھر نہیں آنا چاہیے تھا، شیر گڑھ جانا تھا۔ پیچھے آنے والوں کو ضرور صورت حال کا پتہ چل گیا ہوگا اور انھوں نے شیر گڑھ کی راہ لی ہوگی۔ غرض رات یہیں گزاری، آٹھویں کی صبح کو روانہ ہوئے۔

(یہاں تک[1] یہ سفرنامہ سید وزیر الحسن صاحب عابدی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے ترتیب دیا ہے)

خط بنام مومن خاں مومن

برادر والاقدر مومن خاں صاحب، سلامت

بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے کے دن خط لکھا تھا۔ ۱۵ کو جہاز چلا اور ہم پانچویں رمضان کو عدن میں پہنچے اور لنگر ڈالا

---

[1] اس کے بعد ناس (۸) دوحد (۹) بجے کوٹ (۱۰) پانیا (۱۱) اروانہ (۱۲) گودھرہ (۱۳) کلول (۱۵) جمود (۱۶) بڑودہ (۱۸) یہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ ۲۶ صفر کو بڑودہ سے روانہ ہوئے اور انکھولہ میں آئے وہاں سے نکاریہ (۲۷) بڑودچا (۲۸) انکلیسر (۲۹) چوکی (یکم ربیع الاول) سورت (۲) یہاں سے براہ دریا۔ ۴ ربیع الثانی کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے لاج پور میں منزل کی وہاں سے نوساری (۳) بلساڑ (۵) پارڈی (شب پنجم) دمن (۶) کرگاؤں (۷) دہنو (۸) مرسہ (۹) دنتو (۱۰) بسی (۱۱) گھوڑ بندر (۱۲) ماہم (۱۳) اسی روز بمبئی میں وارد ہوئے۔

دو دن کے بعد عدن سے روانہ ہوئے اور دسویں تاریخ کو مخا میں آئے، وہاں تین دن ٹھہر کر پندرھویں کو حدیدہ میں نزول کیا۔ یہاں دس دن قیام رہا۔ چھبیسویں کو حدیدہ سے چلے۔ واضح رہے کہ اگر ہوا موافق چلتی رہے تو حدیدہ سے جدہ تک پانچ دن کا سفر ہے۔ ہم نے حدیدہ سے روانگی کے دن یہ سمجھا تھا کہ ہوا موافق ہے اور پانچ دن میں جدہ پہنچ جائیں گے۔ تین دن تک چلتے رہے اور معلم جہاز کے اندازے کے مطابق جدہ پہنچنے میں دو دن باقی رہ گئے تھے، اچانک ڈیڑھ پہر رات گئے جہاز ایک پہاڑی چٹان سے ٹکرا گیا جو پانی میں چھپی ہوئی تھی اس سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گیا۔ جہاز میں پانی بھرنا شروع ہوا اور باہر سے موجیں آنے لگیں، پانی کا تلاطم کبھی جہاز کو اچھالتا تھا، کبھی پٹکتا تھا۔ ایسا حال تھا جس کی شرح نہیں کی جا سکتی ہے

شب تاریک، بیم موج، گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

[ترجمہ: اندھیری رات، موجوں کا خوف اور ایسے بھنور کا سامنا۔ بھلا ساحل پر آرام کرنے والے، ہماری اس حالت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں) یہ حافظ شیراز کا مشہور شعر ہے۔]

اچھا لطف یہ کہ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ جگہ کونسی ہے ساحل پر پہنچ کر ڈوبتا ہے یا بیچ راستے میں چکنا چور ہوا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بہر حال صبح کے انتظار میں ایک ایک دم گن رہے تھے کہ اگر صبح کے نمودار ہونے تک جہاز بربادی سے بچ رہا تو معلوم ہوگا کہ قسمت کا بدا کیا ہے۔ قیاس کرنا چاہیے کہ یہ رات کس جوکھم سے صبح ہوئی ہوگی۔ غرض یہ کہ حافظ حقیقی نے جہاز کو بالکل تباہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ہر چند اندر ایک قد آدم پانی بھر گیا تھا لیکن سطح ہی رہی کیونکہ پہاڑی چوٹی پر اس سے زیادہ پانی نہ تھا۔ ورنہ جہاز ڈوبے بغیر نہ رہتا۔ مگر جہاز کے ارد گرد تین طرف بہت زیادہ پانی تھا اور ایک طرف قد آدم سے زیادہ نہ تھا۔ صبح کو ظاہر ہوا کہ کنارے کا دور دور پتا نہیں۔ ہاں اتنے فاصلے پر جہاں تک توپ کا گولہ جا سکے، ایک چھوٹے سے جزیرے کا سراغ نظر آیا۔ ادھر پانی بھی کم تھا۔ لوگ پانی میں کود پڑے کہ جس طرح بن پڑے جزیرے تک پہنچ جائیں۔ اس کا طول و عرض تقریباً پچاس گز کا نظر آیا۔ نہ وہاں پانی کا کنواں تھا نہ برگ گیاہ، نہ کوئی ایسا درخت جس کا میوہ کھایا جا سکے۔ نہ ایسا جھاڑ جس کے سائے میں آرام کیا جا سکے۔ سوائے گھونگھوں اور کنکریوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ سامان و اسباب میں سے جو کچھ تھا وہ ہم نے بیچ آب پر پھینک دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جو بچ جانا ہے وہ چلا جائے گا اور جو قسمت میں ہے وہ ساحل سے آ لگے گا۔ ایسا ہی ہوا جو جانا تھا گیا، جو بچنا تھا وہ آ گیا۔ بہر حال اب ڈوبنے کا خطرہ دل سے نکل گیا۔ اب یہ خوف رہا کہ اس جزیرے سے نکلنا بظاہر مشکل بلکہ محال ہے۔ یہاں کھانے پینے کا سامان تو ہے نہیں اور جہاز والے دو سو سے زیادہ ہیں۔ پانی کے پیپے جو جہاز سے ساحل تک پہنچ چکے تھے صرف آٹھ عدد تھے باقی سمندر میں رہ گئے۔ پھر یہ کہ جہاز میں پانی بھر چکا تھا۔ بیوپاریوں نے ہر چند چاول اور بلغور کافی مقدار میں بھر رکھا تھا لیکن اس کا یہاں تک لانا مشکل تھا اور لے بھی آئیں تو پانی کے بغیر کس کام آئے گا؟ پانی پر تو زندگی کا انحصار ہے۔

مگر جب معاملہ تدبیر کی حدوں سے نکل جائے تو کیا کریں۔ چونکہ سب لوگ مرنے کے لیے آمادہ تھے، عافیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ایک چھوٹی کشتی جو جہاز میں موجود تھی کسی طرف بھیجی جائے، اگر ہم لوگوں کی زندگی باقی ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سلامتی کے

ساتھ واپس آجائیں، ورنہ وہ سمندر میں مر جائیں گے اور ہم یہاں جنگل میں۔ یہ طے کر کے کشتی جہاز سے نکالی گئی اور ہم میں سے دو آدمی جن میں ایک مولوی فضل علی اور دوسرے سعادت خاں سپاہی تھے اور تین دوسرے اشخاص اس میں سوار ہوئے اور اس ناپیدا کنار سمندر میں کشتی چلا دی۔

جہاز ٹوٹنے کے سولہ دن کے بعد جب ان کی واپسی نہ ہوئی تو یقین ہو گیا کہ وہ سب ڈوب گئے۔ ناگاہ دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں، ہم نے سمجھا کہ یہ ہمارے ہی لوگ واپس آئے ہیں۔ جب وہ نزدیک آئے تو پتہ چلا کہ ہمارے لوگوں میں سے تو ان میں ایک بھی نہیں۔ بہت حیرانی ہوئی۔ بارے جب کشتی والے ساحل پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ کشتی ایک ہفتہ دریا میں تیرتی رہی اور آخر ساحل قنفذہ پر سلامت پہنچی۔ قنفذہ کے حاکم نے جیسے ہی یہ حال سُنا تو ان کے ساتھ یہ کشتیوں کو روانہ کیا جن میں سے دو یہ ہیں اور باقی کشتیوں کے نہ آنے کا سبب یہ بتایا کہ تمہارے لوگوں نے وہاں بحر عرب میں جہاز کا ٹوٹ جانا بیان کیا تھا چنانچہ وہ کشتی والے اسی سمندر میں کھوج لگا رہے ہوں گے۔ ہم تو اتفاق سے راستہ بھول کر یہاں آ گئے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ہم بحر قلزم میں ہیں۔ سبحان اللہ کہاں سے کہاں آ پڑے! بہر حال ان دو کشتیوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ ان گم کردہ کشتیوں کا انتظار کرنا ضروری ہوا۔ جب چھ دن تک ان کا کوئی نشان نہ ملا تو دونوں کشتیوں میں کچھ لوگوں کو سوار کر کے روانہ کیا۔ اس خیال سے کہ یہاں جتنے لوگ بھی رہیں کم رہیں اچھا ہے جو بھی نکل جائے وہ تو نجات پا جائے گا باقی لوگوں کے لیے بھی خدا کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مجھے ان کشتیوں میں جانا اس لیے گوارا نہ ہوا کہ اگر چلا جاؤں تو دوسروں کی دل شکنی ہو گی اور یہ مروت کے خلاف ہے کہ یہ بیچارے یہاں رہ جائیں اور میں نکل جاؤں، اسی لیے میں نے کہا کہ اگر یہاں ایک آدمی بھی رہے گا تو وہ میں ہوں گا۔ دوسرے ہر چند بعض لوگوں کو کشتی کے جانے سے خوف لگتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا دل اسی طرح مطمئن تھا۔ اس کشتی کے روانہ ہونے سے ایک ہفتے کے بعد دو کشتیاں اور نظر آئیں خیال ہوا کہ یہ وہی کشتیاں ہیں جو راستہ بھول گئی تھیں۔ لیکن ان کے نزدیک آنے پر کھلا کہ یہ وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ کشتیاں چند دن تک سمندر میں کھوج لگانے کے بعد اور بحر عرب کے علاقے میں تلاش کر کے قنفذہ واپس پہنچ گئیں۔ امیر قنفذہ نے اسی وقت انہیں ڈانٹ کر پھر لوٹا دیا اور ایک کشتی ساتھ کر دی اور کہا کہ یا تو گم شدہ مسافروں کا کوئی سراغ لگاؤ ورنہ ان کی طرح تم بھی گم ہو جاؤ۔ ہم پھر اسی طرح بحر عرب میں ڈھونڈتے رہے اور کوئی نشان نہ ملا۔ ناگاہ موجوں کے تلاطم نے ہمیں وہاں سے دُور پھینک دیا۔ اب ہم بے خبری کے عالم میں بہتے رہے۔ اچانک دُور سے جزیرہ نمودار ہوا۔ ہم یہاں آئے تو ہم نے یہ کچھ دیکھا۔ یہ دونوں کشتیاں اگرچہ پہلی کشتیوں سے چھوٹی تھیں لیکن اب کی بار یہی طے ہوا کہ سب لوگ سوار ہو جائیں اور جتنا ہو سکے سامان ساتھ لے لیں۔ باقی چھوڑ دیں۔ مگر ہم نے مزید دس دن تک ان تین کشتیوں کے آنے کا انتظار کیا، کچھ تیز ہواؤں کا چلنا اور موجوں کا تلاطم بھی مانع سفر ہوا۔ بہر حال دس دن کے بعد اللہ پر بھروسہ کر کے روانہ ہوئے۔ اگرچہ راستے میں موجوں کی طغیانی سے جو کچھ پیش آیا، اس سے یہ یقین نہ تھا کہ ہم کنارے تک سلامت پہنچ جائیں گے مگر عنایت الٰہی نے ساحل تک پہنچا دیا۔ وہاں چھ دن قیام کیا پھر خشکی کے راستے سے چار دن میں حرم شریف پہنچے (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے)

اب اس سے پہلے کہ کچھ اور بیان کروں، اس آیت کے مطابق کہ (اور اللہ کی نعمتوں کا چرچا کیا کرو) چند نعمتوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس منعم حقیقی کی طرف سے اس ناچیز کو ملیں۔ ہر چند نعمتوں کا بیان میرے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ ہر آن ہزاروں نعمتیں اس وجود پر نازل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے دو تین کا شمار کرتا ہوں: پہلی یہ کہ جہاز ٹوٹنے کے وقت سے اس وقت تک جب ہم جزیرے سے نکلے

مجھے مرتبۂ تسلیم و رضا حاصل رہا کہ زبان سے سوائے شکر اور حمد کے دوسری بات نہ نکلی اور گھبراہٹ سے کوسوں دور رہا۔ ورنہ انسان ضعیف البنیان ہے، اسے اتنی تاب کہاں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاز جزیرے کے قریب ہی ٹوٹا ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ جزیرے میں آب و دانہ کے بغیر بھی ہمیں زندہ سلامت رکھا۔ پانی کا قصہ تو میں نے سنایا ہی نہیں، کہاں تک کہوں، بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ اسی زمانے میں بارش ہو گئی اور اس کے پانی سے ہم دو تین دن تک سیراب ہوئے۔ اس کے علاوہ خدا کی طرف سے یہ حکمت ذہن میں آئی کہ سمندر کے پانی کو عرق کی طرح کشید کر کے پیا جائے اسی طرح وہ میٹھا ہو جاتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ایک ایسے جزیرے کے جو جہازوں کی آمد و رفت سے ہٹا ہوا تھا، ہمیں سلامتی کے ساتھ نکال لیا اور اس طرح کہ اہلِ جہاز میں سے ایک شخص بھی نہیں مرا۔ پانچویں نعمت یہ کہ ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں خوب لطیفہ کر کے لوگ بیٹھے اور ساحل تک پہنچے۔ چھٹے یہ کہ کعبۂ مراد کی زیارت نصیب ہوئی اور یہ ساری نعمتوں سے افضل ہے۔

بھائی! جب سے اس مقامِ مقدس میں وارد ہوا ہوں جو فرحت و سرور مجھے حاصل ہے وہ روئے زمین کے بادشاہوں میں بھی کسی کو نصیب نہ ہوگا اور کیوں نہ ہو۔ میں نے اسی دنیا میں جنت کی زیارت کر لی۔ اب تو صرف ان لوگوں کے حال پر حسرت ہے جو یہاں تک نہ پہنچ سکے خصوصاً تمھارے حال پر ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔ یہ بیت خواص کے لیے بھی ہے اور عوام کے لیے بھی۔ البتہ عوام کے لیے خطاب کعبہ سے ہوگا اور لفظ "یہاں" سے مراد یہ دنیا اور خواص کے لیے مخاطب ربِ کعبہ اور یہاں سے مقصود کعبۂ معظم۔ اگرچہ ان باتوں کا لکھنا غرور یا پر محمول کیا جا سکتا ہے (خدا اس سے محفوظ رکھے) لیکن تمھارے معاملے میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ زیادہ کہاں تک لکھوں اور لکھنے کا موقع بھی کیا ہے۔ لہٰذا ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔ مولوی فضل علی اور سعادت خاں کا قصہ بھی بہت طویل ہے۔ اب لکھنے کے لیے دماغ وفا نہیں کرتا۔ بہرحال خیریت سے رہے اور ہمارے پہنچنے کے چند روز بعد وہ بھی یہاں آ گئے اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں پر۔ (محررہ۔ یکم ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ) (از آج کل دہلی۔ جنوری ۱۹۶۲ء)

پیدائش: ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) والد کا نام: عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب محمد مرتضیٰ خان بہادر جنگ
والدہ کا نام: اکبری بیگم نواب میرزا اسماعیل بیگ ہمدانی کی دختر تخلص: شیفتہ و حسرتی تخلص کرتے تھے۔
تصانیف: (۱) گلشنِ بے خار (شعرا کا تذکرہ) (۲) ترغیب السالک الی احسن المسالک المعروف بہ (رہ آورد) سفرنامہ
(۳) دیوانِ شیفتہ (اردو فارسی کا کلام)
وفات: ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

ابوالفضل

ولادت - ۹۵۸ھ وفات - ۱۰۱۱ھ

میرے والد شیخ مبارک نے ۹۵۰ھ میں آگرہ کی نواح میں قیام کیا اور یہیں اتر پڑے۔ اس شہر میں انہیں شیخ علاؤالدین مجذوب کی صحبت میسر آئی۔ انہوں نے ایک دن سُکر کی حالت سے ہوشیار ہو کر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم اس مبارک شہر میں قیام کرو اور سیاحت چھوڑ دو۔ غرض پسند دل مطلق ہوا اور دریائے جمنا کے کنارے پر میر رفیع الدین صفوی الحسینی کے ہمسائے میں اتر پڑے اور قریشی خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ جو علم و فضل سے سلیقہ مند تھی شادی کر لی۔ [illegible] میں میرے والد بزرگوار گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گئے۔ وہ ہمیشہ صفائی باطن اور شرافت ظاہری کو بے عیب رکھنے کی کوشش کرتے۔ کارساز حقیقی کی طرف توجہ فرماتے اور مختلف علوم پڑھانے میں مشغول رہتے۔

تخت نشینی کے پہلے سال اور قتل ہیموں بقال کے وقت ان حالات کا لکھنے والا (ابوالفضل) پانچویں سال میں تھا۔ اس وقت علم کا ستارہ اس طرح ماتھے پر چمکتا تھا جس کی تشریح بیان یا صورت میں سما نہیں سکتی اور اگر سما جائے تو زمانے والے سننے کی تاب نہیں لا سکتے۔

تخت نشینی کے چودھویں برس [illegible] میں انوکھی باتیں ظہور میں آئیں۔ دشمنی کا جتھا شورش کی شکل میں تھا دوستی کا شب چراغ بجھا ہوا تھا۔ دشمنی کا دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ والد بزرگوار ایک خدا پرست دوست کے گھر تشریف لے گئے۔ مجھے بھی ان کی معیت کا شرف حاصل تھا۔ ایک مغرور و متکبر اس جلسے میں آگیا اور قسم قسم کی باتیں بنانے لگا۔ میرے دماغ میں جوانی اور دانائی کی مستی سمائی ہوئی تھی۔ مدرسے سے اٹھ کر معاملات دنیا میں پاؤں نہ دھرا تھا۔ اس کی فضول باتوں کے جواب میں میں نے زبان کھولی۔ گفتگو یہاں تک پہنچی کہ وہ شرمندہ ہو گیا اور دیکھنے سننے والے بہت متعجب ہوئے۔ اس دن سے وہ گھمنڈی بدلہ لینے پر کمربستہ ہوا۔ میں علمی سرمستی کے باعث بالکل بے خبر تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمانہ کے رنگ ایک عرصے سے اس خاندان کی دشمنی کرتے آتے تھے وہ اس وقت موقع پا کر سب طرف چھا گئے اور ہر جانب سے فتنے اٹھانے لگے۔ میرا بھائی فیضی عجیب وہموں میں مبتلا تھا۔

اسی دوران میں اس گروہ میں سے ایک شخص آدھی رات گئے آیا اور مجھے خبر دی کہ دشمن کیا کر رہے ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں ان کی حرکات سے بے چین ہو کر تم تک پہنچا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ دن طلوع ہو جائے اور تم بالکل بے بس ہو جاؤ اور کوئی روک تھام نہ کر سکو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسی وقت کسی کو اطلاع دیئے بغیر شیخ کو ساتھ لو اور پوشیدہ ہو جاؤ اور چند روز کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ دوست جمع ہوں اور وہ حقیقت حال بادشاہ کے گوش گزار کریں۔ فیضی بے چین ہو گیا۔ اسی وقت والد کی خلوت گاہ میں پہنچا اور تمام واقعہ بلا کم و کاست بیان کیا۔ اس نے عرض کیا کہ اگرچہ اس وقت دشمن غالب ہیں مگر خدائے واحد خبردار ہے اور انصاف پسند بادشاہ سریر سلطنت پر موجود ہے۔ کیا ہوا اگر تھوڑے سے بے ایمان اور بددیانت حسد اور دشمنی کی مستی سے بے حال ہیں۔ حق گوئی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تحقیقات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اگر خدا کا حکم ہمارے ستانے کا نہیں ہوا، تو یہ سب مل کر بھی ہمیں تکلیف نہیں دے سکتے اور نہ ان کی دھوکے بازی چل سکتی ہے۔ اگر خدا کی مرضی یہی ہے

تو ہم بھی خوشی خوشی زندگی کا سرمایہ اس کے سپرد کر دیں گے اور دنیا سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔ چونکہ فیضی کی عقل حیران تھی اور وہ شدید مشکل میں مبتلا تھا اس نے حقیقت واقعہ کو قصہ سمجھ کر ہتھیار پر ہاتھ ڈال دیا اور کہا کہ معاملے کی حقیقت ادب اور تصوف کی داستان سے جدا۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں بھی اپنے آپ کو ہلاک کئے دیتا ہوں۔

بہرحال ہم اندھیری رات میں تینوں پیدل نکلے۔ نہ کوئی رہبر ہمارے ساتھ تھا نہ کوئی مقصد۔ والد بزرگوار نیرنگیٔ تقدیر کو دیکھتے اور خاموش تھے۔ وہ کچھ باتیں کرتے پناہ لینے والی جگہ کے بارے میں زمانے عشرت میں انکار کر دیتا تھا جو جگہ میں جانا ہمارے لئے پسند نہ کرتے تھے۔ مجبوراً بڑی رد و کد کے بعد کسی ایک شناسا کے گھر کا رخ کیا جس کی یگانگی اور خلوص پر بھائی کو یقین تھا۔ میں خود متزلزل تھا کیونکہ مجھے اس شخص پر اعتبار نہ تھا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو وہ ہم سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ بڑے بھائی بہت الجھ گئے اور فرزانگی کے گرداب میں پڑ جانے کے باوجود مجھ سے غلطی سرزد ہوئی اور تو نے کم عمری کے باوجود حالات کا ٹھیک اندازہ لگا لیا۔ اب کیا کرنا چاہیئے اور ہمیں کہاں آرام مل سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ لوٹ کر اپنے گھر چلنا چاہیئے۔ مجھے حضور شاہ میں جواب دہی کے لئے اپنا قائم مقام کر دینا۔ مجھے امید ہے کہ زمانے کا پھر دوبارہ جانے کا اندیشہ بہت معاملات مکمل ہو جائیں گے۔ میرے والد نے مجھے شاباش بھی دی اور میری بات کو پسند کیا۔ بھائی نے بدستور انکار کیا اور کہا کہ تمہیں اس بھید کی خبر نہیں اس معاملے کو چھوڑ دو۔

غرض ادھر ادھر کی تجویزیں ہوئیں۔ ایک دوست کا خیال آیا۔ تو کے تڑکے اس کے دروازے پر پہنچے۔ اسے جب خبر ہوئی تو وہ محبت سے پیش آیا۔ اس نے ہمارے لئے عمدہ خلوت سرا مقرر کی۔ تھوڑے عرصے کے لئے ہر طرح کا غم جاتا رہا۔ اس خلوت سرا میں دو دن کے بعد خبر آئی کہ حسد کی جلن کو دل میں چھپانے والوں نے شرم و حیا کے تمام پردے اٹھا دیئے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں جس قدر گندگی پوشیدہ تھی اسے ظاہر کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ کے گوش گزار کیا کہ جب ملکی اور مالی انتظامات علماء کے مشورہ کے بغیر طے نہیں پاتے تو یہ تو مذہب و ملت کا معاملہ ہے۔ شیخ مبارک کو محکمۂ عدالت میں بلائیں اور جو حکم شریعت نافذ کرے اس پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ شاہی پیادوں کو حکم ہوا کہ وہ ہمیں بلا لائیں۔ انہوں نے تلاش شروع کی۔ جب گھر میں نہ پایا تو گھر کا محاصرہ کر لیا۔ شیخ ابوالخیر کو پکڑ کر آستانۂ شاہی میں لے گئے اور ہمارے چھپ جانے کے واقعہ کو حسد و انکار کی نوں سے بیان کیا۔ بادشاہ ان کی حرکتوں سے پہچان گیا کہ واقعہ کیا ہے اور انہیں مخاطب کر کے کہا ایک گوشہ نشین درویش اور خدا پرست دانشمند کے لئے اتنی سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے اور کس لئے بے فائدہ فتنہ و فساد اٹھاتے ہو۔ شیخ ہمیشہ سیر کے لئے جاتا ہے۔ اب بھی کہیں گیا ہو گا۔ اس بچے کو کیوں پکڑ لائے ہو۔ گھر کی ترقی کیوں کی ہے۔ فوراً بچے کو چھوڑ دو اور گھر کا محاصرہ اٹھا لو۔

جب سات روز ختم ہو گئے تو صاحب خانہ نے بھی بے قراری کا بے مروتی شروع کی۔ اس کے نوکر چاکروں نے بھی اپنا رویہ بدل دیا۔ ہمیں بھی حالات پر غور کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر بادشاہ ہمیں تلاش کروا رہا ہے اور دنیا جستجو اور کوشش میں لگی ہوئی ہے تو بے شک صاحب خانہ ہمیں پکڑوا دے گا۔ اس خیال سے دل زخمی ہوا۔ میں بولا کہ بادشاہ کے جواب میں خلوص نہ ہوتا تو وہ بھائی کو نہ چھوڑتا اور گھر کا محاصرہ اٹھا لینے کا حکم نہ دیتا۔ بادشاہ کی نیت درست ہے۔ وہ ہمیں اذیت دینی نہیں چاہتا۔ جہاں تک گھر کے مالک کے اندیشے کا سوال ہے تو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے خیال میں تو یہ مناسب ہے کہ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ تاکہ صاحب خانہ کے دل سے بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اب حالت پہلی رات سے زیادہ کٹھن تھی۔ ساتھیوں نے وعدہ کیا کہ تمہاری کم عمری تمہاری فراست کے راستے میں دیوار نہیں بن سکتی۔ آئندہ جو کچھ ہو گا تیری رائے کے خلاف نہ ہو گا۔ جب شام ہوئی ہم نے اس مکان کو ترک کر دیا۔ ہمت کا قدم آگے بڑھایا اور منزل تعین کئے بغیر بڑھتے چلے گئے۔ یکایک اس اندھیرے میں بجلی چمکی اور خوش قسمتی نے ہمارا چہرہ روشن کیا۔ ایک شاگرد کا گھر دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے آرام کا سانس لیا۔ گو یہ گھر اس کے دل سے بھی زیادہ چھوٹا تھا اور اس کا دل ہمارے سفر کی رات سے بھی زیادہ تاریک تھا لیکن تھوڑی دیر سستائے۔ بے فائدہ سرگردانی سے آزاد ہوئے۔ ہم کو گمنامی کے گوشے میں عمر گزرنے وقت صرف کرنے کی فکر ہوئی اور مصلحت اس بات پر ٹھہری کہ اس پُر نفاق شہر سے اسباب سفر باندھیں اور ان نفاق پرست

دوستوں، بے وفا ملنے والوں کو خیرباد کہہ دیں۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسا تنہائی کا گوشہ مل جائے جہاں کچھ دن کاٹے جا سکیں اور کسی آدمی کے ذریعے دربار کی حالت معلوم ہو جائے اور پھر اس کے مطابق دربار میں کوشش کی جائے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ چنانچہ ایک دوست جو رخصت لے کر اپنی جاگیر میں اترا ہوا تھا اس کے پاس چلیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے کچھ کام بن جائے۔ بڑے بھائی نے تبدیل لباس کیا اور اس جانب تیز قدم بڑھائے۔ اسے اس خبر سے خوشی ہوئی اور ہمارے اس طرف آنے کو غنیمت سمجھا۔ فیضی واپس آیا اور آرام کی خوش خبری سنائی۔ وہ اس امیر کے چند تنگ سپاہی بھی ساتھ لایا کہ ہمیں راستے میں تکلیف نہ ہو اور ہم مخبروں کے قیدی نہ بن جائیں۔ ہم نے اس مقام پر آرام سے کچھ دن بسر کئے مگر تقدیر آسمانی میں ہمارے لئے ابھی کچھ پریشانی باقی تھی۔ کیونکہ جس گھر میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا اس گھر والے کو دربار میں طلب کیا گیا۔ ہم حالات کی تبدیلی دیکھ کر آدھی رات کے وقت وہاں سے نکلے۔ بہت سوچا کہ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ مگر کوئی آرام کا ٹھکانہ نہ ملا۔ مجبوراً اسی امیر کے گھر پہنچے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس مقام کے آدمیوں کو ہمارے چلے جانے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے سلسلۂ توکل کے ناامیدوں نے دم لیا اور پریشانی دور ہونے کے بعد بھائی نے کہا یہاں سے نکل جانا وہم کا نتیجہ تھا۔ عقل کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ میں نے اس کی تردید کی مگر کسی نے نہ مانا۔

جب اس کم عقل امیر نے دیکھا کہ یہ آدمی متنبہ نہیں ہوتے اور اس کے فیصلے خلاف نہیں کرتے تو وہ خود وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔ اب اس جنگل میں ہم تین آدمی تھے۔ ہم کو وہاں سے اٹھنا اور کسی جگہ کے لئے قدم بڑھانا ضروری تھا۔ ہم وہاں سے چل پڑے اور خطرناک مقام سے نکل گئے اور ایک باغیچہ میں قیام کیا۔ یکایک معلوم ہوا کہ کچھ مخبر یہاں آتے جاتے ہیں۔ وہ تلاش سے تھک کر تھوڑی دیر کے لئے ستا گئے ہیں۔ اسی عالم میں ایک مالی نے ہمیں پہچان لیا۔ ہم بہت ڈرے مگر اس نے دم دلاسا دے کر ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور بڑی غمخواری کی۔ اگرچہ بڑے بھائی کی حالت مخدوش تھی اس کا رنگ فق ہوا جاتا تھا مگر میں ان کے خلاف خوش تھا۔ تھوڑی رات گئے باغ کا مالک دلجوئی کے لئے آیا۔ گفتگو کے لئے زبان کھولی۔ اس نے ہمیں تسلی دی۔ ہم تھوڑی دیر خوش ہوئے اس نے کہا کہ مجھ جیسے محبت کرنے والے دوست کے ہوتے ہوئے اس فتنہ و فساد کی سرزمین میں کہاں قیام فرمائیں گے؟ میں نے جواب دیا کہ دشمنوں کی کامیابی کے طوفان نے سارے دلی دوستوں اور خیر خواہوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس معاملے میں آپ کو بھی تکلیف پہنچے۔ اس نے کہا اگر آپ میرے گھر کو پسند نہ کریں گے تو میں آپ کو اپنے تہ خانوں کے پتے بتائے دیتا ہوں۔ وہاں چین سے قیام فرمائیے۔ اس کی بات سے دوستی کی بُو آتی تھی۔ اس کی بات مان کر ہم ایک اچھے تہ خانے میں اتر آئے۔ دل جس قسم کی پاکیزہ جگہ تلاش کرتا تھا ویسی ہی میسر آ گئی۔

یہاں ایک مہینے سے زیادہ بسر ہوا۔ بعض گروہ سے فتح پور پہنچے تاکہ وہاں شاہی فوج سے مل کر محبت کرنے والے دوستوں کو تسلی دیں اور انہیں مدد کے لئے ابھاریں۔ ایک صبح کو بھائی مصیبت کے زمانے کا پیام لے کر وہاں پہنچا اور کہنے لگا کہ شاہی دربار کے امیروں میں سے ایک نے بدذات دشمنوں کی دراندازیوں سے غضبناک ہو کر بادشاہ سے ترش لہجے میں غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، شاید آسمانی گردش ختم ہونے والی ہے اور قیامت کا دن قریب ہے کہ اس بادشاہت میں پاکوں جیسا دل و دماغ رکھنے والے بدکاروں کی بکواس رنگ چھین رہے ہیں شریف آوارۂ دشت ہیں۔ ایسا کس قاعدے کی رو سے ہو رہا ہے؟ بادشاہ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ تو کس سے باتیں کرتا ہے اور تیری مراد کس سے ہے؟ تو خواب دیکھ رہا ہے یا تیرا دماغ چل گیا ہے؟ جب اس نے شیخ مبارک کا نام لیا تو بادشاہ اس کی کم عقلی پر ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ بڑے بڑے سرداروں نے اس کی ہلاکت اور تباہی پر کمر کس لی ہے فتوے تیار کئے ہیں اور وہ مجھے بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مگر میں جانتا ہوں جہاں شیخ مبارک ہے۔ لوگوں نے مجھے اس کی گوشہ نشینی کا پتہ بھی دیا ہے۔ میں جان بوجھ کر لاپرواہی سے کام لیتا ہوں۔ ہر ایک کو جواب دے کر دبا دیتا ہوں اور تو بلا سوچے سمجھے شور مچا کر پریشان کرتا ہے۔ صبح کو آواز دی جائے اور شیخ مبارک کو بلا کر لائے۔ علماء کا مجمع ہوگا اور شیخ مبارک کو جواب دینا ہوگا۔

بڑے بھائی نے اسی دم ادھر کا ارادہ کیا اور راتوں رات وہ منزلیں طے کر کے ہم تک پہنچا۔ ہمیں خبر پہنچا کر ہمیں بدلا اور پھر چل نکلا۔ یہ دن سخت پریشانی

کا ارن تھا۔ ناکامیابی نے دل میں گھبراہٹ پیدا کر دی۔ اگرچہ ہم پر کسی قدر یہ ظاہر ہو گیا کہ آدمی کہاں تک ہمارے ساتھ ہیں اور بادشاہ سے کیا کیا لگائی بجھائی گئی ہے اور بادشاہ کو اصل حقیقت کا علم ہے۔ دل سخت پریشان ہوا۔ ان لوگوں کو تپ دے کے بے اضطراب بے وقت آوارگی اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ سورج کی روشنی میں بدولت دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر کے گلی اور کوچے ہمارے دشمن، بد انجام مخبر ہنگامہ آرائی میں مشغول، مددگار ناپید۔ قلم میں تاب نہیں کہ آپ بیتی کا یہ ورق بیان کر سکے۔

ناچار و مجبور طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہوئے ایک ویرانے میں پہنچے۔ چونکہ از سر نو عنایت شاہی کا حال معلوم ہو چکا تھا مشورہ یہ ہوا کہ گھوڑے تیار کئے جائیں اور اس ویرانہ سے دار الخلافہ آگرہ کی جانب روانہ ہوں اور فلاں دوست کے مکان پر چلیں کیوں کہ اس کی سچائی اور اخلاص کا یقین ہو چکا تھا۔ جب شور و شر دب جائے، بادشاہ عنایت کا دروازہ کھولے تو دربار میں رسائی کی کوشش کی جائے۔ اس رات جو دشمنوں کے دل سے زیادہ تاریک اور بدنصیبوں کی داستان سے زیادہ طولانی تھی ہم روانہ ہوئے۔ رہنما ناتجربہ کار تھا۔ اس کے باوجود تھکتے ہوتے ہوئے مصیبت نگری میں پہنچے۔ دوست جس کے ہاں ہمیں جانا تھا اس نے اتنے خوفناک واقعات بیان کئے جو دہرائے نہیں جا سکتے۔ البتہ اس نے اتنا کہا کہ اب وقت نکل چکا ہے۔ بادشاہ کسی قدر آزردہ خاطر ہو گیا ہے۔ اگر اس سے پہلے آ جاتے تو یہ دشوار کام سہل ہو جاتا۔ پاس ہی ایک گاؤں ہے۔ چند روز وہاں بسر کریں یہاں تک کہ بادشاہ مہربان ہو جائے۔ اس نے ایک بہلی میں بٹھا کر ہمیں اس طرف روانہ کر دیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ گاؤں ہمارے دشمنوں میں سے کسی ایک خادم کا ہے۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ اس روز تیس کوس سفر کیا۔ گاؤں کا مالک بڑی شرافت سے پیش آیا لیکن یہ معلوم ہوا کہ ہمارا ایک دشمن یہاں کھیتی باڑی کرتا ہے اور تھوڑی دیر میں اس جگہ آئے گا۔ اس جگہ کو بھی چھوڑا اور آدھی رات کے وقت وہاں سے چل کر شہر کا رخ کیا۔ صبح آگرہ پہنچ کر اس دوست کے گھر گئے۔ یہاں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ وہاں ایک سعادت مند شخص کا خیال آیا۔ ہم فوراً اس کے مکان پر گئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا اور بڑا سعادت مند ثابت ہوا۔

دو مہینے وہاں قیام کیا۔ پھر مقصد کا دروازہ کھل گیا۔ حق پسند خیر خواہ امداد کے لئے کھڑے ہو گئے۔ دربار میں شیخ کی نیکی کا تذکرہ ہونے لگا۔ بادشاہ نے قدردانی اور تجربہ کاری کی رو سے محبت بھرے جواب دیئے۔ بڑی شرافت سے اسے بلایا۔ چونکہ میرا سر دنیا کی طرف نہ جھکتا تھا میں ساتھ نہ گیا والد نے بڑے بھائی سمیت دربار شاہی کی طرف نیازمندانہ توجہ کی۔ بادشاہ نے بڑی عنایات کیں اور اقبال مندی کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ آخر ایک موقع پر مجھ گوشہ نشین کو بھی دربار شاہی میں لے گئے اور اقبال مندی کا دروازہ کھول دیا۔ لالچی اور حاسد حسد کی بنا پر عجیب حالت میں مبتلا ہو گئے۔ میرے دل میں رحم آیا اور ان کی پریشانی پر پسیجا۔ بے شک خداوند تعالیٰ سے میں نے سچا وعدہ کیا اور دل میں ٹھان لی کہ ان اندھوں کے رنج دہ معاملات جو کام کرنے والے دل سے بھلا دیئے جائیں۔ ان کی بدی کے بارے میں بھلائی کے سوا دل میں کوئی اور بات راہ نہ پائے۔ خدا کی مدد اور برکت سے مجھ کو بے حد خوشی حاصل ہوئی۔

۱۷ ذیقعد ۱۰۰۱ ہجری کو میرا والد باغ بہشت کی طرف روانہ ہوا۔

میں ۶ محرم ۹۵۸ھ کی رات کو سیر گاہ دنیا میں آیا تھا۔ سال سوا سال کا تھا کہ میری زبان میں فصاحت بخش گئی۔ پانچ سال کی عمر میں علم و دریچہ کھول دیئے گئے اور پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار کے علمی خزانوں کا خزانچی بن گیا اور مضامین کے جواہرات کا نگہبان اور امین بن گیا۔ تعجب انگیز بات ہے کہ اس آسمان کے چکر سے میرا دل ہمیشہ دنیوی علوم اور رسوم زمانہ کی طرف سے مردہ، متنفر اور طبیعت گریزاں رہتی تھی۔ والد اپنی طرز پر واقفیت کا منتر چلاتے اور ہر ایک فن میں ایک مختصر رسالہ بنا کر یاد کراتے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے عقل بڑھتی لیکن علمی مکتب سے کچھ دلنشین نہ ہوتا۔ کبھی تو اثر کچھ نہ ہوتا اور کبھی شبہات راستہ روک لیتے۔ زبان میں ان کے اظہار کی طاقت نہ تھی۔ لکنت کا پردہ پڑ جاتا۔ قوت تقریر کے باوجود بات نہ کر سکتا تھا۔ اس محفل میں رونے لگتا۔

یکایک ایک معمولی واقعے سے یہ کیفیت بدل گئی۔ دس برس تک درس و تدریس میں رات دن کی تمیز نہ کی۔ بھوک پیاس کی پروا نہ ہوتی۔ خدائی تعلق اور سلسلۂ علم کے سوا اور کچھ بھی نہ آتا تھا۔ چنانچہ دو دو تین تین دن ہو جاتے کہ دوا و غذا کی طرف طبیعت راغب ہی نہ ہوتی۔

اس وقت مبارک کا بیٹا ابوالفضل مختلف قسم کی مصیبتوں کا نشانہ اور دنیاداروں کے لئے عبرت کی کتاب بنا ہوا ہے۔ محبت اور دشمنی کے کئی ہنگامے اس کی دشمنی کی وجہ سے برپا ہیں۔ حقیقت پسند خدا پرست اس کو واحد کامل کہتے ہیں اور بے شک خدا کا یکتا عارف شمار کرتے ہیں۔ میدان جنگ کے جواں مرد عاقل بہت نام رکھتے ہیں ہستی کے دشمنی سے یکتا لوگوں میں خیال کرتے ہیں اور عقل ہمیشہ اسے بلند فطرت کہتی ہے۔ عام لوگوں کی کتابوں میں اس کو دنیاپرستی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت اسے کفر و الحاد کے معروف شدہ لوگوں میں گنتی ہے اور ملامت و مذمت کرنے کے جلسے کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ باوجود ان مختلف خیالات کے وہ زمانے کے عجائبات کی سیر سے علیحدہ نہیں ہوتا اور بداخلاقی و برائی کرنے والوں کے لئے خیرخواہی کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا اور دل و زبان کو نفرت اور شاباشی کے لئے آلودہ نہیں کرتا۔

(تصانیف۔ اکبر نامہ۔ آئین اکبری۔ انشائے ابوالفضل) (تلخیص و ترجمہ۔ محمد علم الدین سالک)

رابندر ناتھ ٹیگور

۱۸۶۱ء ——— ۱۹۴۱ء

میری پیدائش قدیم کلکتہ میں ہوئی تھی۔ ان دنوں شہر میں چھکڑے چھڑ چھڑ کرتے گرد و غبار اڑاتے دوڑا کرتے اور رسی والے چابک گھوڑوں کی ہڈیوں والی پیٹھ پر جڑ جڑ پڑا کرتے۔ نہ ٹرام تھی نہ بس اور نہ موٹر گاڑی۔ ان دنوں کام کاج کے جھمیلے بھی ایسے جان کا وبال نہ تھے۔ اطمینان سے دن بسر ہوتے تھے۔ بابو لوگ تمباکو کا کش لگا کر پان چباتے چباتے دفتر جاتے۔ کوئی پالکی میں اور کوئی گاڑی میں۔ جو لوگ صاحب توفیق تھے ان کی گاڑیوں پر تمغے لگے ہوتے۔ چمڑے کے آدھے گھونگٹ والے کوچ بکس پر کوچوان بیٹھا، اس کے سر پر بانکی پگڑی لہراتی رہتی۔ پیچھے کی طرف دو دو سائیس کھڑے رہتے جن کی کمریں چنور جھلتے ہوتے۔ عورتوں کا باہر آنا جانا بند دروازے کی پالکی میں دم گھوٹنے والے اندھیرے میں ہوتا۔ گاڑی پر چڑھنا شرم کی بات تھی۔ دھوپ اور بارش میں ان کے سر پر چھاتا نہیں لگ سکتا تھا۔ کسی کے بدن پر قمیص اور پاؤں میں جوتا نظر آ گیا تو اسے میم صاحبی فیشن کہا جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ اس نے شرم و حیا گھول کر پی لی ہے۔ کوئی عورت اگر اچانک غیر مرد کے سامنے آ جاتی تو اس کا گھونگٹ فوراً ناک کے نیچے تک ڈھلک جاتا اور وہ اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر جھٹ پیٹھ پھیر لیتی۔ گھر میں جس طرح ان کا دروازہ بند رہتا ویسے ہی باہر نکلتے وقت ان کی پالکی بھی بند ہوتی۔ بڑے بڑے آدمیوں کی بہو بیٹیوں کی پالکی پر ایک موٹا گھٹا ٹوپ سایہ پڑا رہتا۔ جو دیکھنے میں چلتی پھرتی خانقاہ معلوم ہوتا۔ ساتھ ساتھ پیتل کے دستے والی لاٹھی لئے دربان بھی چلا کرتے۔ ان کا کام تھا دروازے پر بیٹھ کر گھر کی نگہبانی کرنا۔ گل مونچھ سہلانا، بینک میں روپے اور رشتہ داروں میں عورتوں کو پہنچانا اور تیج تیوہار کے دن بند پالکی کے ہمراہ جا کر مالکن کو گنگا میں ڈبکی لگوانا۔ دروازے پر پھیری والے اپنا سودا بیچنے آیا کرتے جس میں شونندن کا بھی حصہ ہوا کرتا اور پھر کرائے کی گاڑی کا گاڑی بان تھا جو بانٹ بخرے کے معاملے میں ناراض ہوتا تو ڈیوڑھی کے سامنے جھگڑا کھڑا کر دیتا تھا۔ گاہے گاہے ہمارا پہلوان جمعدار شوبھا رام کسرت کرتا، وزنی مگدر گھماتا، بیٹھا بیٹھا بھنگ گھوٹتا اور کبھی کبھی نہایت آرام سے پتوں سمیت مولی چباتا اور ہم لوگ شرارت سے اس کے کان کے پاس چلا اٹھتے "رادھا کرشن!" وہ جتنا ہی ہاں ہاں کر کے ہاتھ پاؤں پٹختا اتنی ہی ہماری ضد بھی بڑھتی جاتی۔ اپنے معبود کا نام سننے کے لئے اس نے یہ فریب بنا رکھا تھا۔

ان دنوں شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی تھی۔ بعد ازاں جب مٹی کے تیل کا اجالا آیا تو ہم اس کی روشنی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شام کو خدمت گار آتا اور گھر گھر ارنڈی کے تیل کا دیا جلا جاتا۔ ہمارے پڑھنے کے کمرے میں دو بتیوں کا ایک دیا ڈیوٹ پر جلا کرتا۔

ماسٹر صاحب ٹمٹماتی روشنی میں پیاری سرکار کی فرسٹ بک ریڈنگ کتاب پڑھایا کرتے۔ مجھے پہلے تو جماہی آتی پھر نیند اور پھر آنکھ ملنا شروع ہوتی بار بار سننا پڑتا کہ ماسٹر صاحب کا کوئی دوسرا شاگرد ستین تو ہیرا ہے سونے کا ٹکڑا ہے۔ پڑھائی میں ایسا دل لگاتا ہے کہ لوگ حیران ہوتے ہیں۔ نیند آتی ہے تو آنکھوں میں سُرتی ڈال کر آنکھیں رگڑ دیتا ہے۔ اور میں؟ نہ کہنا ہی اچھا ہے۔ تمام لڑکوں میں صرف میں ہی اکیلا نکما بنتا۔ اس کے باوجود دیکھو

یہاں بھی مجھے ہوش میں نہ لا سکتا۔ رات کے نو بجے جب نیند کی وجہ سے آنکھوں کی پلکیں بوجھل ہو جاتیں تو چھٹی ملتی۔

باہر کی بیٹھک سے گھر کے اندر جانے کے راستے پر جھلملی کا پردہ تھا اور یہاں ہوا کا طاق اور پرشتانی روشنی کی لالٹین جلا کرتی۔ جب میں ادھر سے گزرتا تو دل کپتا۔ نہیں معلوم کون پیچھا کر رہا ہے۔ چھم سنسناتی ان دنوں بھوت پریت قصے کہانیوں میں رہا کرتے اور انسانی دل کے کونے میں بھی موجود رہتے۔ . . . گھر کے مغربی کونے پر ایک گھنے پتوں والا بادام کا درخت تھا۔ ایک پاؤں اس کی شاخ پر اور دوسرا پاؤں تلے کے کارنس پر رکھ کر کوئی ایک شکل جو کھڑی رہا کرتی۔ اس کی عینی شہادت دینے والے ان دنوں بے شمار تھے۔ یقین کرنے والے بھی کم نہ تھے۔ بڑے دادا کے ایک دوست جب ان گپتوں کو ہنسی میں اڑا دیتے تو نوکر چاکر سمجھتے کہ اس آدمی کو دھرم کرم کا علم ایک دم سے ہی نہیں . . . . خوف و ہراس نے ان دنوں چاروں طرف ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ میز کے نیچے پاؤں رکھنے سے وہ لرز اٹھتے تھے۔

اس وقت پانی کا نل نہیں آیا تھا۔ جنوری فروری میں کہار بہنگی بھر بھر کر گنگا سے پانی لاتے تھے۔ نچلی منزل کے تاریک کمرے میں بڑے بڑے کونڈے مٹکے رکھے ہوتے انہی میں سال بھر کے لئے پانی بھرا رہتا۔ ان اندھیری کوٹھڑیوں میں جو لوگ ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے کون نہیں جانتا کہ وہ منہ چھپائے رہتے تھے۔ آنکھیں ان کی چھاتی پر ہوا کرتی تھیں۔ دونوں کان سنتوپ کی مانند ہوتے تھے اور دونوں پاؤں الٹی طرف مڑے ہوتے۔ میں جب اس بھوت کے سایہ کے مقابل سے مکان کے اندرونی باغیچے کی طرف جاتا تو دل اندر ہل جاتا، پاؤں میں تیزی آ جاتی۔

ان دنوں راستے کے کنارے کنارے نالے بنے ہوئے تھے طغیانی کے ایام میں انہیں میں سے ہو کر گنگا کا پانی آیا کرتا تھا۔ بابا کے زمانہ ہی سے اس نالے کے پانی کا مستقر ہمارا تالاب تھا۔ جب کواڑ کھول دیئے جاتے تو جھر جھر کل کل کرتا ہوا پانی جھرنے کی طرح بھرتا اور نیچے کا حصہ جھاگ سے بھر جاتا۔ مچھلیوں کو الٹی طرف کسرت دکھانے کی سوجھتی۔ میں جنوبی برآمدے کی ریلنگ پکڑ کر نہایت خاموشی سے دیکھا کرتا۔ آخر کار اس تالاب کی موت آ پہنچی اور اس میں گاڑیوں میں بھر بھر کر گندگی ڈالی جانے لگی۔ تالاب کے پُر ہوتے ہی دیہاتی ہریاول والا وہ آئینہ بھی گویا اوجھل ہو گیا۔ بادام کا درخت اب بھی کھڑا ہے لیکن پاؤں پھیلا کر کھڑے ہونے کی اتنی سہولت ہوتے ہوئے بھی اس شکل کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اندر اور باہر روشنی پھیل گئی ہے۔

دادی کے زمانے کی پالکی کافی لمبی چوڑی نوابی طرز کی تھی۔ دو دو ڈنڈے آٹھ آٹھ کہاروں کے کندھے کے ناپ کے تھے۔ ہاتھوں میں سونے کے کنگن، کانوں میں سونے کے کنڈل اور تن پر لال رنگ کی چھوٹی سی مرزئی پہننے والے وہ کہار بھی قدیم زمین دولت کے ساتھ اسی طرح غائب ہو گئے جس طرح غروب ہوتے ہوتے آفتاب کے ساتھ رنگین بادل۔ پالکی کے اوپر رنگدار خطوط کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے کچھ حصے گھس گھس کر برابر ہو گئے۔ جا بجا داغ لگ گئے اور اندرونی گدے میں سے ناریل کی جٹا باہر نکل آئی۔ گویا یہ اس زمانے کا کوئی غیر مستعمل سامان تھا جو مال خانے کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ میری عمر ان دنوں سات آٹھ سال کی ہوگی۔ اس وسیع اور لا محدود کائنات کے کسی ضروری کام میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا اور یہ بوسیدہ پالکی بھی ضرورت کے تمام کاموں سے علیحدہ کر دی گئی تھی۔ اسی لئے اس سے میرے دل کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ گویا وہ سمندر کے درمیان کا ایک ٹاپو ہو اور میں تعطیل کے دن کا رابنسن کروسو جو بند دروازے میں گمراہ ہو کر چاروں طرف سے نظر بچا کر اس پر بیٹھا ہوتا۔

ان دنوں ہمارا گھر آدمیوں سے بھرا تھا۔ کتنے اپنے کتنے پرائے، کچھ دوست، معلوم نہیں خاندان کے الگ الگ کتنے محلوں کے نوکر نوکرانیوں کا شور و غل ہر جگہ برپا رہتا تھا۔

دن چڑھ جاتا ہے۔ دھوپ کڑی ہوتی جاتی ہے۔ ذرا دیر میں گھٹن سی لگنے لگتی ہے۔ لیکن پالکی کے اندر کا دن گھنٹے کا حساب تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں کا بارہ بجے کا وقت وہی پرانے زمانے کا ہے۔ جب راج محل کے پھاٹک پر نوبت ختم ہونے کا ڈنکا بجا کرتا۔ راجہ چندن کے پانی سے نہانے کے لئے اٹھ جاتے۔ بچپن کے دنوں میں جتنی کہانی میں سنی تھیں وہ سب کہانی کے سوار ہیں میں تنہا بیٹھا ہوں۔ چلنے کا راستہ میری ہی حسب خواہش نکالا گیا ہے۔ اسی راستے پر میری پالکی دور دور کے ممالک کو چلی ہے ان ممالک کے نام میں نے ہی اپنے کتابی علم کے مطابق گھڑ لئے ہیں۔ کبھی کبھی راستہ گھنے جنگل کے درمیان میں گھس جاتا ہے جہاں شیر کی آنکھیں چمک رہی ہیں جسم چپکا اٹھتا ہے۔ ساتھ وشوناتھ شکاری ہے۔ وہ اس کی بندوق زن سے چھوٹی۔ بس سب خاموش۔ اس کے بعد یکبارگی پالکی کا چہرہ تبدیل ہو گیا۔ وہ بن گئی مور پنکھی بجرا بہہ چلی سمندر میں۔ ساحل نظر نہیں آتا۔

یہ تو تھا پالکی کے اندر کا میرا سفر۔ پالکی کے باہر میری ماسٹری چلتی تمام بچے میرے شاگرد تھے۔ خوف کے مارے چپ رہا کرتے۔ ایک آدھ بڑے شرارتی تھے۔ پڑھنے لکھنے میں مطلق دل نہ لگاتے تھے۔ میں انہیں یہ خوف دلاتا کہ بڑے ہونے پر قلی کا کام کرنا پڑے گا۔ مار کھاتے کھاتے ان کے جسم پر نیچے سے اوپر تک نیل پڑ گئے تھے مگر بھی ان کی شرارت نہیں جاتی تھی۔ کیوں کہ اگر ان کی شرارت رک جاتی تو کام کیسے چلتا۔ کھیل ہی ختم ہو جاتا۔ لکڑی کے ایک شیر کو لے کر ایک اور ہی کھیل تھا۔ پوجا میں بلیدان کی کہانی سن کر سوچا تھا کہ شیر کی قربانی پر ایک بھاری دھوم دھام ہو جائے گا۔ اس کی پیٹھ پر کئی جھٹکے لگائے۔ منتر بنانا پڑا تھا نہیں تو پوجا ہو نہ ہو سکتی تھی۔

سنگی دسنکی راما کا نمر۔ آخند بوسرے باگھم
نٹ ڈھل کٹ ڈمسکر کو
آخروٹ باخروٹ کھٹ کھٹ کھٹا اس
پٹ پٹ پٹا اس

اس میں تقریباً تمام الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ صرف آخروٹ (اخروٹ) میرا اپنا ہے۔ اخروٹ مجھے بہت پسند تھے۔ کھٹا اس لفظ سے معلوم ہوگا کہ میری تلوار لکڑی کی تھی اور پٹاس لفظ بتاتا ہے کہ وہ مضبوط نہیں تھی۔

اس مرحلہ پر بتا رکھوں کہ ہماری چال ڈھال بڑی معمولی تھی۔ گاڑی گھوڑے کی کوئی بلا برائے نام ہی تھی۔ باہر کے کونے کی طرف املی کے درخت کے نیچے پھوس کے گھروں میں ایک بگھی اور ایک بوڑھا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ پہننے کے کپڑے نہایت سادہ ہوتے تھے۔ پاؤں میں موزہ لگانے کی نوبت بہت دیر کے بعد آئی۔ جب برجیشور کی فہرست کو پار کر کے ناشتہ میں ڈبل روٹی اور کیلے کے پتے میں لپٹا ہوا مکھن نصیب ہوا تو ایسا احساس ہوا گویا آسمان ہاتھ کی رسائی میں آ گیا۔ قدیم زمانے کی بڑی آدمیت کو باآسانی تسلیم کر لینے کی تعلیم چل رہی تھی۔

ابھی بازار میں چاکلیٹ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک پیسہ قیمت والی گلابی ریوڑیاں، گلابی خوشبو میں بسے ہوئے تل سے ڈھکے چپچپی کے ڈھیلے آج بھی لڑکوں کی جیب چپچپا رہتے ہیں کہ نہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ ریوڑیاں یقیناً آج کل کے مہذب لوگوں کے گھروں سے مارے شرم کے بھاگ کھڑی ہوئی ہیں وہ بھنے ہوئے والا شوشہ آج کہاں چلے گئے اور وہ کم قیمت والا تل کا گجا؟ وہ کیا اب بھی موجود ہے؟ موجود نہ ہوں تو پھر واپس لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمارے زمانہ سے کچھ پیشتر ہی امیر گھروں میں شوقیہ یاترا کا رواج تھا۔ تیز ہو گلے والے لڑکوں کا انتخاب کر کے پارٹیاں بنانے کی دھوم تھی۔ میرے منجھلے چچا ایک ایسی یاترا پارٹی کے منتظم تھے۔ ان میں مکالمے لکھنے کی بھی قابلیت تھی اور لڑکوں کو تیار کر لینے کا شوق بھی تھا۔ امیر لوگوں کی زیر نگرانی جس طرح یہ شوقیہ گروہ تھے ویسے ہی پیشہ ور

لوگوں کے یاتراؤں کا بھی ان دنوں بنگال پر نشہ چھایا ہوا تھا۔ اس قصبے یا اس محلے میں نامور کارکنوں کی زیرِ نگرانی یاترا دل جسم لیتے تھے۔ ہمارے گھر بھی گاہے گاہے یاترا کے گانے ہوا کرتے تھے۔ لیکن دیکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ میں تھا بچہ۔ صرف شروع شروع کی تیاری دیکھ سکا تھا۔

ایسے موقعوں پر بچوں کو منع کرنا ہی بڑوں کا فرض تھا لیکن ایک بار نا معلوم کیوں ان کا دل نرم پڑ گیا۔ حکم جاری ہوا کہ لڑکے بھی یاترا سن سکیں گے۔ اسی دن نل دمینتی کا کھیل تھا۔ میں شروع ہونے سے پہلے رات کے گیارہ بجے تک بچھونے پر تھا۔ عین وقت پر مجھے نیند سے اٹھا کر باہر لایا گیا۔ پہلی منزل کی طرف بالائی منزل کے جھاڑ فانوس جھلملاتی ہوئی روشنی چاروں طرف پھیلا رہی تھی۔ میں جب محفل میں بڑے بھائیوں کے ساتھ بیٹھا تو رومال میں کچھ روپے باندھ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ داد دینے کے موقع پر روپیہ پھینک دینے کا رواج تھا۔ اس سے یاترا والوں کی بالائی آمدنی بھی ہوتی تھی اور خاندان کا نام ہوتا تھا۔ رات ختم ہونے کو آئی لیکن یاترا ختم ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ درمیان ہی میں اونگھ گئے۔ ڈھلک پڑے اور جسم کو گود میں لے کر کون کہاں اٹھا لے گیا۔ اس کا علم بھی نہ ہو سکا۔ معلوم کرنے پر کیا کم شرم کی بات تھی کہ جو بڑوں کے برابر بیٹھ کر بخشش لٹا رہا ہو۔ بھرے آنگن کے لوگوں کی موجودگی میں اس کی یہ توہین۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ ماں کی کھاٹ پر سویا ہوا ہوں۔

ہمارا گھرانہ راج کنور کی طرح تھا۔ کبھی کبھی تیوہار میلے کے دن جب اس کی طبیعت ہوتی اپنے علاقے میں دان خیرات کرتا۔ آج کا زمانہ سوداگر کا بیٹا ہے۔ ہر قسم کا مال بجا کر شاہراہ کے چوک پر بیٹھا ہے۔ بڑے راستے سے بھی خریدار آتے ہیں چھوٹے راستے سے بھی۔

نوکروں کا بڑا سردار برج شیور تھا۔ چھوٹے سردار کا نام شیام تھا وہ جیسور کا رہنے والا منزل دیہاتی تھا۔ اس کی بولی کلکتہ کی نہیں تھی۔ رنگ سانولا آنکھیں بڑی بڑی۔ تیل سے تر بتر لمبے بال۔ مضبوط دوہرا جسم۔ اس کے مزاج میں کوئی بھی سختی نہ تھی۔ دل کا بہت اچھا۔ بچوں کے لئے اس کے دل میں درد تھا۔ اس سے ہمیں ڈاکوؤں کی کہانیاں سننے کو ملتیں۔ . . . جن دنوں ہماری پیدائش ہوئی تھی ان دنوں بھی ایسے آدمی دکھائی دیتے تھے جو جب بیٹھے کئے تھے تو ڈاکوؤں کے گروہ میں تھے۔ ان کے پیچھے لاٹھی کھیلنے والے شاگرد چلا کرتے تھے۔ ان کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ نام سنتے ہی لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ ان دنوں کی ڈکیتی گنواروں کی طرح محض خون خرابہ کا کاروبار نہیں تھی۔ اس میں جتنی جرأت ضروری تھی اتنی ہی دریا دلی بھی تھی۔ ادھر بھلے آدمیوں کے گھر میں بھی لاٹھی سے لاٹھی کا مقابلہ کرنے کے لئے اکھاڑے کھلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شہرت حاصل کی تھی انہیں ڈاکو بھی استاد مانتے تھے اور ان کے سامنے سے بچ کر چلتے تھے۔

ہمارے گھر پر بھی ایک دن ڈکیتی کا کھیل دکھایا گیا۔ لمبے لمبے کالے جوان بڑے بڑے ان کے لمبے بال۔ اور محل میں چادر باندھ کر انہوں نے دانت سے پکڑ کر وزن پیٹھ کی طرف الٹ دیا۔ گھنے بالوں میں آدمی کو باندھ کر اسے دیر تک گھماتے رہے۔ لمبی لمبی لاٹھیوں پر پاؤں رکھ کر دوسری منزل پر چڑھ گئے۔ ایک تو دونوں ہاتھوں کے درمیان سے چڑیا کی طرح پھر سے نکل گیا۔ ان لوگوں نے یہ بھی دکھایا کہ دس بیس کوس کی دوری پر سے ڈکیتی کر کے اسی رات کو لوٹ کر اپنے گھر میں شریف آدمی کی طرح کیسے سویا جا سکتا ہے۔ خوب بڑی دو لاٹھیاں تھیں جن کے درمیان پاؤں رکھنے کے لئے لکڑی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس لاٹھی کو رڑپا کہتے تھے۔ لاٹھیوں کے اگلے سروں کو ہاتھ سے پکڑ کر لکڑی کے ٹکڑے والے پائیدان پر رکھ کر چلنے سے ایک ایک قدم دس دس قدم کے برابر پڑتا اور گھوڑے سے کہیں زیادہ تیز دوڑ ہوتی۔ اگرچہ میرا مقصد کبھی ڈاکہ ڈالنے کا نہیں تھا تاہم شانتی نکیتن کے لڑکوں کو ایک بار رڑپا پر دوڑنے کی مشق میں نے بھی کرائی تھی ڈکیتی کے اس منظر کے ساتھ شیام کے منہ سے سنی ہوئی کہانی کو ملا کر نا معلوم کتنی بار دونوں ہاتھوں سے دل کو دبا کر میں نے شام کا وقت کاٹا ہے۔

صبح سے شام تک پڑھائی کی چکی چلتی ہی رہتی۔ اس کی کل اینٹھنے کا کام منجھلے دادا ہیمندر ناتھ کے ذمہ تھا۔ وہ بڑے سخت حاکم تھے۔ طنبورے کا تار زیادہ زور سے کھینچنے پر ترتڑا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ انہوں نے ہمارے دل پر جتنا زیادہ بوجھ لادنا چاہا اس میں سے بیشتر کی کشتی الٹ گئی اور وہ نہ جانے کس تہ میں

ڈوب چکا ہے۔ اب بات کو اب چھپا کر کہنا بےکار ہے کہ میری تعلیم گنوانے کا سودا ہے۔ منجھلے دادا اپنی بڑی لڑکی کو تعلیم یافتہ بنانے میں خود مصروف ہو چکے تھے۔ جب موقعہ سے فرصت میں بھرتی کرا دیا ہے بھا کو انہوں نے ولائتی سنگیت میں ماہر بنا لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے دیسی گانے کا راستہ بند نہیں ہو گیا تھا۔ گانے کے اس مکتب میں مجھے بھی داخل ہونا پڑا۔ میرا قصور یہ ہے کہ سکھانے کے طریقے پر مجھے کوئی زیادہ دور تک کسی طرح بھی نہیں چلا سکا۔ اپنی حسب خواہش جوڑ توڑ کر جو کچھ حاصل کیا ہے اسی سے میں نے اپنی جھولی بھر لی ہے۔ دل لگا کر سیکھتا اگر میری عادت میں ہوتا تو آج کل کے استاد مجھے نظر انداز نہ کر سکتے کیونکہ مجھے کافی موقعہ ملا ہے۔ جتنے دنوں تک ہمیں تعلیم دلانے کے ذمہ دار رہے تھے تب تک میں ان منا سا وشنو کے پاس بیٹھ کر برہمو سنگیت گنگنایا کرتا۔ گاہے گاہے جب دل خود بخود لگ جاتا تو دروازے کے پاس کھڑا ہو کر گانا سیکھ لیتا وہ اینگ گا رہے ہیں "اتی جگ گا منی سے" اور میں چپ چپ کر دل میں اس کی نقل اتارتا رہا ہوں۔ شام کو ان کے پاس وہی گیت گا کر حیران کر دینا میرے لئے نہایت آسان کام تھا۔

ہمارے گھرانے کے موسیقی دوست سری کنٹھ بابو دن رات گانے میں محو رہا کرتے تھے۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے چنبیلی کے تیل کی مالش کر کے غسل کرتے۔ ان کے ہاتھ میں حقہ ہوتا اور عنبری تمباکو کی مہک فضا میں پھیل جاتی۔ گن گن گانا چلتا رہتا اور لڑکوں کو اپنے چاروں طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ وہ گانا سکھاتے نہیں تھے۔ دیتے تھے اور میں کب لیتا یہ معلوم بھی نہ ہوتا۔ جب وہ زیادہ جوش و بادہ سکتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ناچ ناچ کر ستار بجانے لگتے۔ وہ فرط مسرت سے ان کے چہرے پر ایک دلآویزی آ جاتی اور فرط تبسم سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ گانا شروع کرتے " مے چھوڑوں برج کی بانسری"
اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی گوائے بغیر نہ چھوڑتے۔

یہ تو ہوا علم موسیقی کے متعلق۔ منجھلے دادا کے ہاتھوں ہماری دوسری تعلیم کی جو بنیاد پڑی وہ بھی خوب دھوم دھام کے ساتھ۔ عادت کی مجبوری کے باعث خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمارے جیسے ہی کو سامنے رکھ کر رام پرشاد سین نے کہا تھا "من تو نہ جانے کرشی کرم (اے دل تو کھیتی باڑی کا کام نہیں جانتا) فصل تیار کرنے کا کام بھی مجھ سے نہیں ہوا۔

اس کھیتی کی بیکار زمین کن کھیتوں میں لگی ہوئی ہے اس کی بھی خبر دے رہا ہوں۔ اندھیرا رہتے ہی بچھونے سے اٹھتا۔ اکھاڑا کھودتا۔ سردی کے دن میں جسم کانپتا رہتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ شہر میں ایک نامور پہلوان تھا کانا پہلوان وہی ہمیں کشتی سکھایا کرتا۔ اکھاڑے میں پہلوان کے ساتھ لنگوٹ کستا میرے لئے بچوں کا ایک کھیل ہی تو تھا۔ تھوڑی دیر تک جسم میں خوب مٹی مل کر انجام کار ایک کرتا پہن کر چلا جاتا۔ صبح صبح ہر روز اتنی مٹی لگنا ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا انہیں خوف تھا کہیں لڑکے کا رنگ مٹ میلا نہ ہو جائے۔

کشتی کے اکھاڑے سے لوٹ کر دیکھتا کہ میڈیکل کالج کے ایک طالب علم انسان کی ہڈی پہچاننے کی تعلیم دینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ دیوار پر ایک پورا ڈھانچہ جھولا کرتا۔ ڈیوڑھی پر سات بج گئے۔ نیل کمل ماسٹر کی گھڑی کا درست کیا ہوا وقت ایک دم ٹھوس تھا۔ ایک منٹ بھی ادھر ادھر ہونے کا چارہ نہیں تھا . . . . میں کتاب اور سلیٹ لے کر میز کے سامنے جاتا۔ تختہ سیاہ پر کھڑیا مٹی کے داغ پڑا کرتے۔ سب کچھ بنگالی میں۔ حساب، جیومیٹری، اقلیدس، ادب میں سیتا بن باس سے سیدھا میگھناد بدھ میں چڑھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قدرتی سائنس بھی چلا کرتی۔ گاہے گاہے سیتا ناتھ دت آیا کرتے تھے۔ ان کی بتائی ہوئی باتوں کی تحقیقات کے ذریعے سائنس کی ارتقا ہوئی تجربے ملا کرتے۔ درمیان میں ایک مرتبہ ہیرمب تتوا رتن آتے۔ بغیر کچھ سمجھے بوجھے ہی فلسفہ کی گتھیوں میں الجھ گیا۔ اسی طرح صبح کے سارے وقت میں کئی قسم کی پڑھائیوں کا جتنا بھی بوجھ پڑتا اندر ہی اندر دل اتنی ہی مستعدی سے چوری چوری کچھ بوجھ پھینکتا رہتا۔ جال میں سوراخ بنا کر ٹھونسی ہوئی تعلیم کھسک جانا چاہتی اور نیل کمل اپنے شاگرد کی فہم و فراست کے متعلق اپنی رائے کا جو اظہار کرتے رہے وہ ایسا نہیں ہوتا تھا جو پانچ شریف آدمیوں کو بلا کر سنایا جا سکے۔

آہستہ آہستہ سورج ڈوبتے دن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ شہر کی بیچ پیل دھند کی آواز سے اینٹ اور لکڑی کے دیو شہر کے جسم میں خواب کا رنگ لگ اٹھتا

ہے۔ پڑھنے کے کمرے میں تیل کی بتی جل اٹھتی ہے۔ ماسٹر صاحب آتے ہیں۔ انگریزی کی پڑھائی شروع ہوتی۔ پڑھتے پڑھتے اونگھ پڑتا ہوں اور بستر میں گھس کر آزادی کا موقع پاتا ہوں۔

میں جب وظیفے کے نچلے درجہ میں پڑھتا تھا تو سپرنٹنڈنٹ گوبند بابو نے افواہ سنی کہ میں نظم لکھتا ہوں۔ مجھے لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے سوچا تھا ان کے نارمل سکول کا نام چمک اٹھے گا۔ مجھے لکھنا پڑا اور جماعت کے لڑکوں کو پڑھ کر سنانا بھی پڑا اور سننا بھی پڑا کہ یہ نظم یقیناً چوری کی ہے۔ نقاد لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس کے بعد جب اور سیانا ہوا تو جذبات کی چوری کرنے میں ہاتھ کی صفائی کی میں نے اچھی مشق کی لیکن یہ چرائی ہوئی چیزیں بیش قیمت تھیں۔

یاد آتا ہے ایک بار پیار اور تریپدی چھندوں کو ملا کر میں نے ایک نظم کہی تھی۔ اس میں یہ درد آشکار کیا کہ تیر کر کنول کے پھول چنتے وقت اپنے ہی ہاتھ کی لہروں سے کنول کا پھول دور ہٹا جاتا ہے۔ اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ اکشے بابو اپنے عزیزوں کے گھر جا کر یہ نظم سناتے پھرتے تھے۔ ان کے رشتہ داروں نے بھی کہا تھا کہ لڑکے میں شاعری کا مادہ موجود ہے۔ط

گھومتے پھرتے شباب کے صدر دروازے تک آ گیا ہوں۔ اب پھر ان کہیں کی حد کی طرف ہی لوٹنا پڑ رہا ہے۔ اب سولہ سال کی عمر کا حساب دینا ہے۔ اس کے شروع میں ہی بھارتی دکھائی پڑی تھی (یہ ایک اخبار رسالہ تھا جو شاعر کے خاندان کے ادیبوں کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا) آج کل ملک میں چاروں طرف رسالے نکالنے کی بے تحاشا ہوس اٹھی ہے۔ جب گھوم کر ان دنوں کے لئے پاگل پن کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرے جیسا لڑکا جس میں نہ علم تھا نہ طاقت، وہ بھی اس مجلس میں جگہ حاصل کر کے بیٹھ گیا اور میری کچی عمر کسی کی نگاہوں میں کھٹکی نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چاروں طرف لڑکپن کی ہوا کتنی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت ملک میں تجربہ کار بزرگ ہاتھ کا تو ایک واحد رسالہ دکھائی دیتا تھا وہ تھا بنگ درشن۔ ہمارا رسالہ بھارتی اس کے پیچھے اناڑیوں کی کھچڑی تھی۔ بڑے دادا جو کچھ لکھتے اس کا لکھنا جتنا کٹھن تھا سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ اور اسی میں میں نے بھی ایک کہانی لکھ ڈالی یہ سمجھنے کی ان دنوں عمر نہیں تھی کہ وہ کس حد تک بکواس کی بناوٹ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اور لوگوں کو بھی غور و خوض کرنے کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔

جب سترھواں سال لگا تو ایڈیٹروں کے بورڈ سے مجھے علیحدہ ہو جانا پڑا۔ اسی وقت میرے ولایت جانے کا فیصلہ ہوا۔ ساتھ ہی طے ہوا کہ جہاز پر بیٹھنے سے پیشتر مجھلے دادا کے ساتھ رہ کر مجھے ولایتی چال چلن کی بنیاد قائم کر لینی چاہئے۔ وہ ان دنوں احمد آباد میں جج تھے۔ مجھے جڑ سمیت اکھاڑ کر ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں لے آیا گیا۔ نئی آب و ہوا کے ساتھ سمجھوتہ ہوا۔ کچھ دن یہاں رہنے کے بعد مجھلے دادا نے سوچا کہ جو لوگ غیر ملک میں اپنے وطن کا لطف لے سکیں ایسی کچھ عورتوں سے تعارف کرا دینے سے میرا اجاڑ وطن دل کچھ سکون حاصل کرے گا۔ انگریزی زبان سیکھنے کا بھی یہی آسان طریقہ ہو گا۔ اسی لئے میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی کے ایک رئیس کے گھر میں رہنے لگا۔ اس گھر کی کوئی آج کل کی پڑھائی لکھائی والی خاتون اپنی تعلیم ولایت سے مانجھ کر چمکا لائی تھیں۔ میری تعلیم معمولی ہی تھی۔ میری طرف اگر وہ لاپروائی دکھاتیں تو انہیں الزام نہیں دیا جا سکتا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

ولایت جا پہنچا۔ زندگی کی بناوٹ میں ولایتی صنعت شروع ہوئی جسے کیمسٹری میں اصل چیز کی پیدائش کہتے ہیں۔ اس میں قسمت کا کھیل یہ دیکھ سکتا ہوں کہ باقاعدہ اصول کے مطابق کچھ سیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ کوشش تو ہونے لگی لیکن آخر تک کچھ نہیں ہو سکا۔ مجھلی بہو ٹھکرانی وہیں تھیں۔ ان کے لڑکے بچے تھے۔ انہیں میں الجھا ہوا اپنے ہی گھر کے جال میں پھنسا رہا۔ سکول کی دہلیز کے آس پاس گھومتا رہا۔ گھر پر ماسٹروں نے بھی پڑھایا۔ لیکن ہر جگہ پڑھنے سے بھاگتا ہی رہا۔ جو کچھ حاصل کر سکا وہ انسان کے آس پاس رہنے ہی کی برکت سے۔ ہر طرف سے دل پر ولایت کی آب و ہوا کا اثر پڑنے لگا۔

ط۔ احسان دانش نے اسی خیال کو یوں منظوم کیا ہے۔

حوض میں گر پڑا گلاب کا پھول　　پاس لانے سے دور جاتا ہے
جیسے مدت میں ملنے والے کا　　نام مشکل سے یاد آتا ہے

میں اسکول میں بہت دنوں تک نہیں پڑھ سکا۔ لیکن میری غیر رسمی تعلیم کا بیشتر حصہ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ تمام کا تمام حصہ انسانی صحبت سے آیا تھا۔ ہمارے گھر جو قصے پڑھتے تھے ہماری بہادری میں نیا رسالہ شامل کرتے تھے۔ میں جیسے تک انگریزوں کے دل کے نزدیک رہنے سے ایک ملاقات ممکن ہوئی تھی۔ میرے اوپر یہ بار ڈالا گیا تھا کہ میں روز شام سے کے گرد بیٹھ کر بار بار ان سے شعر و شاعری، ڈرامہ، تاریخ پڑھ کر سناؤں۔ یہ کلاس کی پڑھائی نہیں تھی۔ یہ تو عمر بھر کے ساتھ ان کے دل کا ملاپ تھا، ذرا بھی ہرگز نہیں ہوا۔ زندگی کے ابتدائی فرائض کو مٹا دینے والا دھکا مجھے نہیں لگا۔ مشرق اور مغرب کی دوستی اپنے آپ میں قبول کر سکا۔ اپنے نام کا مطلب میں نے اپنی زندگی میں پا لیا ہے۔

(۱۹۱۳ء میں ادب کی خدمت کے صلہ میں نوبل پرائز ملا اور ۱۹۱۵ء میں سر کا خطاب۔ جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد واپس کر دیا اور نوبل پرائز کی رقم سے شانتی نکیتن یونیورسٹی قائم کی جو اب تک چل رہی ہے)

GEVAERT

گیورٹ کا سودا سب سے کھرا

GF-15

نواب مرزا خاں داغ

اجداد

میں نے اپنے بچپن کے واقعات زیادہ تر اپنی والدہ اور خالہ کی زبان سے سُنے۔ میرے اجداد[1] ثمرقندی تھے۔ میرے ابا نواب شمس الدین خاں ریاست فیروزپور جھرکہ کے نواب تھے۔ میری عمر ابھی پانچ سال کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ والد کو پھانسی ہو گئی۔ پھانسی کی وجہ یہ تھی کہ فریزر ریذیڈنٹ گورنر جنرل اور نواب صاحب کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ مسٹر ولیم فریزر ایجنٹ ایک عیاش اور آوارہ انگریز تھا۔ وہ عام طور سے ہندوستانی مستورات سے ملتفت رہا کرتا تھا۔ میرے والد نواب شمس الدین خاں اور فریزر مذکور سے ہمیشہ اختلاف رہا اور اسی اختلاف کی بنا پر وہ قتل کیا گیا۔ نواب شمس الدین خاں اور ان کے برادران نواب ضیاءالدین خاں و نواب امین الدین خاں کے تعلقات بھی خراب تھے۔ فریزر مذکور نواب شمس الدین کی مخالفت اور دوسرے بھائیوں کی مدافعت میں تیز دم تھا۔ یہ چیز نواب شمس الدین خاں کو سخت ناگوار تھی اور چونکہ وہ دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں با اثر و بارسوخ تھے۔ اس لیے فریزر کو اکثر معاملات میں زک اٹھانا پڑتی تھی۔ یہی مخالفت رنگ لائی اور آخر کار فریزر کے قتل کی وجہ بنی۔ فریزر کو کسی نے قتل کیا مگر نواب کی شہرت نے انھیں مجرم بنا دیا۔ بھائیوں کی مخالفت نے اور جرم کو ثابت کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب کو اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی[2] دے دی گئی۔

پیدائش

میری پیدائش ۱۲۴۶ھ ۲۵ ذی الحجہ مطابق ۱۸۳۱ء ہے (زبانِ داغ صفحہ ۱۹۳)۔ جب ہم[4] بچّے تھے تو ”محمدہ“ نامی ایک ماما ہمیں کھلانے پر مقرر تھی۔ وہ کہیں پورب کی رہنے والی تھی۔ ہمارا سن اس وقت کوئی ۹ یا ۱۰ برس کا ہوگا۔ جب کبھی زیادہ گرمی پڑتی تھی اور ہوا بالکل بند ہو جاتی تھی تو ہم اس سے کہا کرتے تھے کہ ”ہوا اچھالا“۔ ہمارے اس کہنے پر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگتی اس کی زبان سے یہ کلے

---

[1] مرزا صاحب کے پردادا عارف جان ہندوستان آئے (بزمِ داغ صفحہ ۹) دادا کا نام نواب احمد بخش خاں تھا (جلوۂ داغ صفحہ ۹)

[2] ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازہ کے قریب فوج کی نگرانی میں پھانسی دے دی گئی۔ (مقدمہ فریادِ داغ صفحہ ۸)

[3] مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عجیب اتفاق تھا کہ ماما کے اس طرح پڑھنے سے فوراً ہوا چل اٹھتی تھی۔ (بزمِ داغ صفحہ ۱۲)

[4] مرزا صاحب نے ”ہم اور میں“ دونوں ضمیریں بلا تکلف استعمال کی ہیں۔ اس لیے اسے شتر گربہ پر محمول نہ کیا جائے

الفاظ ادا ہوا کرتے تھے ؎

باوش باوش بابا کا بگنی کا الموری   گمروڑی ہنر کرے بادل اڑی جائے

فنون سپہ گری

مجھے ابتدائی عمر میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ گدہ پھرانے کی مشق بہت ہی بڑھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی سواری کا شوق اب بھی کچھ باقی ہے۔ لیکن صحت کی خرابی اس شوق میں حائل ہے۔ تلوار چلانا، تیر اندازی کرنا، پھرنگ اور بنیٹا کاٹنا۔ بندوق چلانا مجھے ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے خود سکھلایا تھا اور میں نے کوشش اور شغف سے ان میں مہارت حاصل کی تھی۔

شاگردی

میں سب سے پہلے فتح الملک بہادر مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر کا شاگرد ہوا۔ دو چار غزلیں انھیں دکھائیں۔ خود ولی عہد بہادر نے مجھ سے فرمایا کہ میں حضرت ذوق کا شاگرد ہو جاؤں۔ مرزا فخرو ہی نے داغ تخلص قرار دیا تھا۔ میں حضرت ذوق کا شاگرد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں ہوا تھا۔ جہاں شاہ ظفر اور ولی عہد بہادر بھی تشریف فرما تھے۔ نواب فتح الملک بہادر مرزا فخرو نے میری طرف سے حضرت ذوق کی خدمت میں ایک دو شالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اس روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت استاد کے در دولت پر حاضر ہوتا۔ مغرب کے بعد وہاں سے واپسی ہوتی۔ بادشاہ کی غزل اور میری غزل پر خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا اور استاد اصلاح دیتے جاتے لیکن جب کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ہی ملاحظہ کر کے اصلاح فرما دیا کرتے تھے۔

قلعہ معلیٰ کی فضا رقص و سرود کے جلسوں اور بزم شعر و ادب سے گونج رہی تھی۔ ایسے حالات میں مردہ دل بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہم تو پھر بھی ازل ہی سے لٹکا ہوا دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ دل میں عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہو گئی تو دماغ شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ مرزا فخرو ولی عہد اور شاہ ظفر کی نظر التفات نے وہ کام کیا کہ بہت جلد شاعری میں چار چاند لگ گئے اور صہبائی، آزردہ اور غالب ایسے باکمالوں سے داد ہنر ملنے لگی۔

میں نے خاقانی ہند جناب ذوق سے کامل ۱۴ سال اصلاح لی تھی۔ میرا پہلا دیوان جب مکمل ہو گیا تو میں نے استاد کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ گو آپ اس دیوان کی تمام غزلیں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ان غزلوں کی اصلاح ہو چکی ہے مگر مضائقہ نہ ہو تو ایک بار اس مجلد کو اور ملاحظہ فرما لیا جائے۔ استاد نے وہ مجلد مجھ سے لے لیا اور ایک ہفتہ کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کیا کہ میں نے کل غزلوں پر نظر ثانی کر لی ہے اور جہاں جہاں مزید اصلاح کی ضرورت محسوس کی ہے وہ بھی کر دی ہے۔ تم اتنا اور کرو کہ

---

[1] حضرت داغ گیارہ برس کی عمر میں خاقانی ہند کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے (جلوۂ داغ ص ۱۱)

اس مجلد کے حاشیوں پر وہ تمام اصلاحیں بھی درج کرو جو اس سے پہلے میں دے چکا ہوں۔ بارہ برس کے بعد اس اصلاح کو دیکھنا اس وقت اس کا صحیح لطف تم کو آئے گا۔

ظفرؔ و غالبؔ و داغؔ

ایک دفعہ مرزا نوشہ غالبؔ، شاہ ظفرؔ کے حضور ایک غزل لے کر پہنچے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بادشاہ کو یہ زمین بہت پسند آئی۔ حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ ہماری جوانی کا زمانہ تھا طبیعت پورے جوش پر تھی ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور جب کہ آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔

میں نے مرزا غالبؔ کی مشہور غزل ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

پر غزل کہہ کر جب انھیں سنائی تو بڑی تعریف کی بعض بعض اشعار پر تو مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا ؎

دلبروں پر طبیعت آتی ہے اس طرح اس قدر نہیں آتی

یہ شعر حضرت غالبؔ نے کئی مرتبہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد جب اس شعر پر پہنچا ؎

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور یہ تجھے مفت پر نہیں آتی

تو غالبؔ بے چین ہو گئے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ صاحبزادے! تم نے کمال کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شطرنج بھی ہوتی تھی۔ میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس ہرجانے میں اپنی غزل سناؤ۔ ایک دفعہ شطرنج کی بازی ہارا۔ حسبِ معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ۔ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین ”نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے“ میں جو غزل تم نے کہی تھی۔ وہ سناؤ۔ میں نے تعمیلِ حکم کی۔ میرے اس شعر پر ؎

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

مرزا غالبؔ بولے۔ میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے اور پھر اپنا شعر پڑھا ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا ؎

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

شعر سن کر مرزا غالب اُف کر کے رہ گئے۔ میں نے فوراً یہ دوسرا شعر پڑھا ؎

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑا آج تو کوئی ٹھکانا چاہیے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے۔ بولے ظفر۔ زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے۔ میرے گرد چار پانچ بار گھومے۔ گھومنے کی حالت میں نہایت دردناک آواز میں میرا یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔

ذوق و داغ

استاد ذوق نے تمام عمر میں ایک شعر اپنا مجھے دیا تھا اور وہ یہ کہ ؎

رکھے قدم سنبھل کے رہِ عشق میں وہی
آگے بھی جس کو ہو کبھی ٹھوکر لگی ہوئی

یہ شعر استاد نے مجھے دیا اور ایک مصرع انھوں نے مجھ سے مانگ لیا۔ وہ مصرع یہ ہے۔ ع

رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس زمین میں استاد نے جو غزل فرمائی تھی۔ اس کا بھی ایک لطیفہ ہے۔ میرا مصرع لے کر شعر بنا چکے تھے۔ پوری غزل کی فکر تھی۔ ایک روز پاخانے میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے مجھے آواز دی اور فرمایا کہ شعر لکھو۔ میں نے قلم دوات سنبھال کر عرض کیا، ارشاد۔ استاد نے پاخانے سے برجستہ فرمایا ؎

ہے تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

پاخانے سے برآمد ہوئے تو برابر فکر میں مستغرق تھے۔ میں نے خیال کیا کہ دوسرے شعر کی فکر میں ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بولے داغ ایک مطلع اور ہو گیا۔ لکھو ؎

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اک چھانس سی کلیجے کے اندر لگی ہوئی

یہ مطلع فرما کر استاد دوسرے شعر کی فکر میں غلطاں ہوئے۔ اُدھر میرے ذہن میں بھی ایک مطلع آ گیا۔ استاد سے عرض کیا کہ حضور ایک مطلع میرا بھی سن لیجیے۔ فرمایا: سناؤ ؎

یہ کس کی لو ہے اے دلِ مضطر لگی ہوئی
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے اور شعر پر شعر فرما رہے تھے۔ ادھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیس منٹ میں استاد و شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہو گئیں۔ استاد نے فرمایا۔ دونوں غزلیں صاف کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ میری غزل پر اصلاح فرما دیجئے۔ تو پھر اکٹھی دونوں غزلیں صاف کروں۔ حکم ہوا استاد غزل سنتے رہے حسبِ موقع اصلاح بھی دیتے رہے میں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

بے شک ہے کچھ لگاؤ جو کرتا ہے یہ گریز
زاہد سے دخترِ رز ہے مقرر لگی ہوئی

بہت تعریف کی اور بولے بھائی ہم سے یہ قافیہ چھوٹ گیا اور تم لے اڑے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔ اس قافیہ میں ہماری غزل میں یہ شعر لکھ دو ؎

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

جب میں شعر لکھ چکا تو بولے کہ لو شعر تمہارا اچھا رہا کہ ہمارا۔ میں نے عرض کیا: استاد کا شعر بہت "روشن" ہے۔

صہبائی و داغ

ایک مرتبہ محلہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا۔ گیسو اپنا، جادو اپنا اسی ردیف و قافیہ میں مصرع طرح دیا گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا۔ میں بھی غزل کہہ کر لے گیا۔ جب میں نے یہ مقطع پڑھا ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجکو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

اس کو سنتے ہی آفریں صد آفریں کہتے ہوئے حضرت صہبائی اُٹھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

جلال و داغ

ایک دفعہ ایک مشاعرے میں میں نے یہ مطلع پڑھا اور جلال سے داد کا طالب ہوا ؎

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال مسکرائے اور فرمایا کہ پہلا مصرع نہیں لگا۔ جب ان کے پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے میرے اس مطلع کے مصرعِ اُولیٰ کو بدل کر یوں شعر بنایا ؎

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

اسیر و داغ

ایک دفعہ میں جناب اسیر سے ملنے گیا۔ کیا دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہونے کی بجائے باہر دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ اسیر نے کہا۔ اندر تشریف لائیے۔ میں نے باہر سے جواب دیا کہ حضرت میں حبس میں نہیں آتا۔ یہ آپ کو ہی مبارک رہے۔ اسیر ہنس کر باہر نکل آئے۔

مرزا فتح الملک ولی عہد بہادر کی وفات[1]

میں نے اپنی عمر میں چند ایسے رنج فرسا و جاں گزا صدمے اٹھائے ہیں جن کے بیان سے کلیجہ شق ہوتا ہے اور ان صدموں میں سب سے بڑا صدمہ ولی عہد بہادر کے انتقال کا ہے۔

داغ رام پور میں

ہم رام پور پہنچے اور ہمیں اصطبل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر یا بباطن حارج ہوئے۔ ایک روز عجب واقعہ ہوا صبح کو جب اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا۔ غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

شہر دلی سے آیا اک گھُتّل   آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

یہ شعر ہماری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی شکل قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی۔ اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغے گئے تھے۔ اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت معلوم کیا۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کے کہنے والا کون ہے۔ اگر مجھ سے آ کر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس کی شاعرانہ قابلیت اور ذہانت کی داد بھی دوں گا۔ لیکن افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنف[2] کا پتہ نہ چل سکا۔

* * *

ریاست رام پور کا طریقہ تھا کہ ریاست کے ملازموں کو تنخواہ بہت کم ملا کرتی تھی لیکن خاطر مدارات، دل دہی اور انعام و عنایات میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ ہر ملازم کی گزر اوقات کا خاص ذریعہ انعامات وغیرہ ہی ہوتے تھے جو خاص خاص موقعوں پر یا کسی تقریب کے وقت یا کسی کارگزاری کے موقع پر انعام کی صورت میں عطا ہوتے تھے۔ ہر ملازم کے علاوہ اس کے عزیز بھی

---

[1] ولی عہد بہادر نے ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی تھی۔

[2] حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شعر رسا رامپوری کا تھا (نگار، جنوری فروری ۱۹۵۳ء)

کے کرتی مصاحبانہ[1] خدمت بھی ضرور بجا لایا کرتی تھی۔

ایک دفعہ جلال کے تلامذہ میں سے کسی نے مشاعرہ کیا۔ اس مشاعرے میں علاوہ مرزا صاحب کے منشی امیر احمد امیر مینائی۔ مظفر علی اسیر، سید ضامن علی جلال۔ امیر اللہ تسلیم۔ سید محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ جب میری باری آئی اور میں نے غزل شروع کی سو داد کا جھنکار بپا ہو گیا۔ بعض شعرا نے تو اپنی غزلیں پھاڑ کر میرے آگے ڈھیر کر دیں۔ میں حیران اور اپنی مقبولیت اور خدا کے فضل و کرم پر حد درجہ شاداں و فرحاں تھا۔ میری غزل کا مطلع کم از کم بیس یا پچیس مرتبہ پڑھوایا گیا لیکن لوگ کسی طرح سیر نہ ہوتے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے تو یاد نہیں کہ اس مطلع پر مجھے جس قدر داد ملی۔ اتنی کسی اور مطلع پر کبھی داد ملی ہو۔ مطلع یہ ہے ؎

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی راہ میں
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

حج

نواب صاحب رام پور نے حج بیت اللہ کے جانے کا خیال ظاہر کیا اور مجھے ہمرکاب ہونے کا حکم ملا تو مجھے عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ شب و روز اسی کے اذکار تھے اور یہی فکر تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ یہ سفر شروع ہو لیکن جو وقت معین ہو چکا تھا اس سے پہلے یہ سفر کیوں کر ممکن ہوتا۔ اکثر احباب مجھے سعادت حج نصیب ہونے کی مبارکباد دینے لگے۔ مجھ جیسے آزاد منش انسان کو حج بیت اللہ کی اتنی خوشی تھی کہ رات دن اسی سفر کے خیال میں گم رہتا تھا۔ میرے اکثر اشعار میری اس کیفیت پر گواہ ہیں ؎

دیر سے کعبہ کو ہم ڈرتے ہوئے جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

مجھے اپنی خطاؤں اور اپنے معاصی کا جس قدر احساس اس موقع پر ہوا کبھی نہیں ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فریضۂ حج کی ضرورت بھی اسی احساس کو بیدار کرنے کے لیے محسوس کی گئی ورنہ انسان اپنی تمام عمر عیش و غفلت میں گزار دیتا ہے اور اسے اپنی کوتاہیوں اور اپنی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

فریضۂ حج کی ادائیگی میں یہ اندازہ بھی ہوا کہ یہی اک وہ مقام ہے جہاں امیر و غریب بادشاہ اور گدا دوش بدوش ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کے محاسبہ کا موقع ملتا ہے اور فروتنی و برتری کے تمام تصورات اس مقام پر دھندلے پڑ جاتے ہیں اور دل ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک فریضۂ حج کی آخری رسم ادا نہیں ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک ایسے سکون اور ایک ایسے اطمینان سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جس کا لطف اگر

---

[1] مرزا صاحب کو ستر روپیہ ماہوار ملتا تھا (بزم داغ ص۲۳)

وہ چاہے تو تمام عمر اُٹھاتا رہے۔

داغ عظیم آباد میں

عظیم آباد کے قیام کی اصل وجہ میرے بھائی آغا مرزا شاغل تھے جو ابتداً میرے ساتھ رام پور رہے اور پھر عظیم آباد جا رہے تھے۔ انھیں جب میرا کلکتے جانا معلوم ہوا تو اصرار کیا کہ میں عظیم آباد رکتا ہوا جاؤں۔ میرا قیام انھیں کی معرفت میر باقر کے یہاں رہا۔ شاغل بھی میر صاحب کے مکان کے متصل ہی محلہ گرہٹہ میں رہتے تھے۔ میرے عظیم آباد پہنچتے ہی وہاں کے با مذاق اور با علم لوگوں میں ایک سیلاب سا آگیا چاروں طرف مشاعرے ہونے لگے۔ میری دعوتوں پہ دعوتیں ہونے لگیں۔ جوق در جوق لوگ مجھ سے ملاقات کرنے آتے۔ میر باقر کا مکان تماشا گاہ بنا ہوا تھا۔ سارا عظیم آباد اُمڈ آیا تھا۔ ہر شخص مجھ سے آکر ملتا۔ غزل سنتا اور غزل سناتا۔ کوئی شاگرد ہوتا۔ الغرض عظیم آباد کے قیام کے چند روز بڑی مصروفیت اور دلچسپی کے ساتھ گزرے۔ میرے پہنچنے پر وہاں مشاعرے تو بہت ہوئے لیکن دو ایک مشاعرے ایسی خصوصیت کے حامل تھے کہ وہ آج تک مجھے یاد ہیں۔

میرے خیر مقدم میں میر باقر نے جو مشاعرہ کیا، وہ بھی بڑے اعلیٰ پیمانے کا مشاعرہ تھا۔ طرحی غزل[1] میں جب میں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

بہت رویا ہوں میں جب سے میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہاتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

تو مشاعرے میں داد کی ایک لہر دوڑ گئی جس کا سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔

مجھ کو فرصت ملی نہ یاروں سے روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی یہ مروت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہمان نوازیاں دیکھیں کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو اُن کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
میر باقر کے گھر قیام ہوا خوب دعوت کا اہتمام ہوا

داغ کلکتے میں

سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا دُور تک ساتھ اک زمانہ ہوا

---

[1] اسی غزل کا مقطع ہے:
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

آئی ایسی ہوائے کلکتہ   دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا   داغ آیا تو باغ باغ آیا
ہم جو بالائے بام رہتے تھے   لوگ عالی مقام کہتے تھے[1]
سامنے نا خدا کی مسجد تھی   نا خدا کیا خدا کی مسجد تھی

عبدالرزاق صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا اور بجائے پہلے سے دعوت دینے اور مصرع طرح بھیجنے کے مشاعرے سے کچھ گھنٹا پہلے تشریف لے آئے اور شرکت کے لیے مُصر ہوئے۔ میں کچھ ایسا مجبور ہوا کہ مشاعرے میں شریک ہونا پڑا۔ لیکن شرط یہ ہوئی کہ مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں غزل کہہ لوں۔ چنانچہ ایک کمرے میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا اور میں نے فکر سخن شروع کی۔ اسی دوران کلکتہ کے دو سرکاری عہدے دار میری ملاقات کو پہنچے۔ وہ لوگ بلا تکلف کمرے میں چلے آئے اور مجھے مصروفِ سخن دیکھ کر ایک طرف بالکل خاموش کھڑے ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب تک خاموشی سے اس طرح کھڑے رہے۔ میں اپنی فکر اور دھن میں اتنا مصروف تھا کہ ان کے آنے اور اس طرح کھڑے رہنے سے بالکل ناواقف تھا۔ یکایک میری نظر اوپر اُٹھی۔ ان دونوں کے وجود سے چونکہ بالکل خالی الذہن تھا اور ذہن دوسری دُھن میں تھا۔ بے ساختہ میری زبان سے یہ جملہ ادا ہوا۔

”یہ ابھی سے منکر نکیر کہاں سے آگئے۔ میں تو ابھی زندہ ہوں!“

میرے اس جملے پر دونوں مسکرائے اور مجھے بدستور کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

داغ حیدرآباد میں

حیدرآباد کی اُمیدواری کے زمانے میں کوئی چھ ہزار روپیہ خرچ کیا۔ جب امیدواری کرتے کرتے تنگ آگیا تو ایک عرضی سر وقارالامراء کی خدمت میں، ایک درخواست افسر جنگ بہادر اور ایک محبوب یار جنگ کے پاس روانہ کی اور ان سب میں یہ اظہار کیا کہ امیدواری کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں اور اب وطن جانا چاہتا ہوں۔ کچھ خرچ کا بندوبست کرلاؤں تو پھر یہاں آکر امیدواری کروں۔ میری یہ عرضیاں بے سود رہیں۔ لاچار وطن واپس ہوا۔ بی بی نے خوب آوازے کسے کہ حیدرآباد سے تشریف لائے ہیں ذرا ہمیں بھی تو حیدرآباد کی کمائی دکھاؤ۔ میں اس نیک بخت سے کیا کہتا اور وہ کیا سمجھتیں۔

میرے دلی چلے جانے کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام کو معلوم ہوا کہ داغ مایوس ہو کر دلی چلے گئے ہیں۔ وقار الامراء سے فرمایا کہ خط بھیج کر انھیں بلاؤ۔ اُنھوں نے دلی مجھے لکھا۔ میں نے آنے کا وعدہ تو کیا مگر یہ بھی لکھا کہ ایسا نہ ہو پھر میں وہاں سے ناکام واپس آؤں۔ میں نے چھ ہزار روپے حیدرآباد میں خرچ کیے تھے۔ وہ ایک مکان رہن رکھ کر یا دوستوں سے قرض لے کر گئے تھے۔ اب جو بلاوا آیا تو مکان بیچنا پڑا۔ لیکن یہاں پہنچ کر پھر ایک برس گزر گیا اور کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ میرا دل پھر اچاٹ ہوگیا۔ پھر اعلیٰ حضرت کے

---

[1] اقتباس از یاد داغ

بعض مصاحبین کی خدمت میں معروضات پیش کئے اور کہا کہ میں جاتا ہوں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰ حضرت کی سواری نکلی۔ صدر میں اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ بائیں میں دو مصاحب تھے۔ جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی۔ میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے۔ تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو۔ یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں؟ دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپیہ منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے۔ یہ خبر عام مشہور ہو گئی۔ لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔ میں نے اعلیٰ حضرت کے بعض مقربین سے دریافت کیا تو اُنھوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی لیکن اس واقعہ کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دلی دُور است کے مصداق کچھ نہیں ہوا۔ ایک دفعہ وقارالامراء سے ملنے کے لیے گیا۔ اُنھوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی میں ہی مجھے بلا لیا۔ وہاں میں ایک گاڑی پر بیٹھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ میں گاڑی کو ایک طرف کھڑا کرکے انتظار کرنے لگا۔ اتفاق دیکھئے ٹہلتے ٹہلتے اعلیٰ حضرت بھی ادھر آنکلے۔ میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا کہاں ہیں۔ اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام بتایا گیا جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے۔ گھوڑے پر سوار تھے۔ میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آگئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے جو اس وقت میری جیب میں تھے۔ نذر گزارے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سنانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی ؎

دیکھئے منصور اگر آج زمانا تیرا ہو انا الحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا
داغ ہر ایک زباں پر ہے فسانا تیرا وہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانا تیرا

جب میں نے دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا کہ اس میں کیا شک ہے جس وقت ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سُنے۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

تو بھی دیکھ ہمیں چشم حقارت سے نہ دیکھ کل ہمارا تھا جو ہے آج زمانا تیرا

اعلیٰ حضرت بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ یہ شعر پڑھوایا۔ اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا ؎

ترک عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرہانا تیرا

میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا افسردہ ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت بھی متاثر ہوئے۔ لیکن شاہی محل میں اس طرح کی افسردگی مجھے گوارا نہ تھی۔ فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی ؎

کس وجہ سے لب پر مرے فریاد نہ آتی
وہ چوٹ نہیں کھائی تھی جو یاد نہ آتی

ایک دفعہ حضور نظام مجھ سے کھڑے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی عادت ہے کہ جب وہ باتوں میں مصروف ہوتے ہیں تو گھنٹوں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آداب شاہی کا تقاضا ہوتا ہے کہ مخاطب بھی مؤدب اسی حال میں حاضر رہے۔ میں تقریباً

ایک گھنٹے تک تو اس صورت کو برداشت کرتا رہا اور جس طرح ممکن ہوا گزارا۔ اعلیٰ حضرت باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انھیں میرے اس حال کا ذرا اندازہ نہ ہوا۔ بالآخر جب میرے لیے اور زیادہ دیر کھڑا رہنا ناقابلِ برداشت ہو گیا تو مجھے چکر آ گیا اور میں گر پڑا۔ میرے گرنے پر اعلیٰ حضرت کو احساس ہوا اور انھوں نے اسی وقت مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور ازراہِ الطافِ خسروانہ اجازت ہوئی کہ میں کسی حال میں ہوں آپ جس وقت چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ میرے اس اعزاز پر بعض لوگوں کو بڑا حسد ہے اور بہت رشک۔ چنانچہ گرامی جو درباری شاعر ہیں۔ انھیں بھی میرے اس اعزاز پر سخت ناگواری ہے جس کا اظہار وہ اکثر کرتے رہتے ہیں۔ مجھے خود بعض اوقات اس تخصیص کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ خود اعلیٰ حضرت کھڑے ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنا معمول بنا لیا ہے کہ حدِ برداشت تک تو میں اعلیٰ حضرت کے سامنے کھڑا رہتا ہوں جس وقت زیادہ کھڑا رہنا ممکن نہیں ہوتا تو اجازت لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور اعلیٰ حضرت بڑی خوشی سے مجھے بیٹھنے کی اجازت دیا کرتے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ایشیائی شاعری کا آسمان روشن ستاروں سے منور تھا۔ اب زمانے سے یہ چیزیں مٹ رہی ہیں۔ نئی نئی بساطیں بچھائی جا رہی ہیں۔ انقلاب کا یہ حال ہے کہ بے چین طبیعت والوں کی طرح زمانہ کروٹیں بدلتا ہے۔ ایک رنگ نہیں جمنے پاتا کہ دوسرا جھلک جاتا ہے۔ اس حال میں جو شخص بھی جس قدر مطمئن ہے۔ وہ بہت خوش نصیب ہے۔ میں خدا کا صد ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے فکرِ معاش سے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ ورنہ اہلِ ہنر عموماً اور اہلِ سخن خصوصاً ہر ملک میں بدنصیبی اور بداختری کا شکار ہو رہے ہیں۔ میر، انشا، سودا، غالب، مصحفی، جرأت وغیرہ کی مثالیں پیشِ نظر ہیں۔ سخن سنجوں کے ہجوم میں صرف معدودے چند ہی ایسے ملتے ہیں جو راحت کی بسر کر گئے ورنہ شاعری اور عسرت لازم ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

فرد[1] تاریخ ورود فرخندہ بنیاد حیدرآباد حسب تفصیل ذیل

غرۂ خورداد ۱۲۹۷ف مطابق ۷ اپریل ۱۸۸۸ء

خورداد ۱۲۹۷ف لغایت غرۂ خورداد ۱۲۹۸ف	ایک سال
خورداد ۱۲۹۸ف لغایت غرۂ خورداد ۱۲۹۹ف	ایک سال
خورداد ۱۲۹۹ف لغایت غرۂ خورداد ۱۳۰۰ف	ایک سال
خورداد ۱۳۰۰ف لغایت آخر آبان ۱۳۰۰ف	۶ ماہ

اس ساڑھے تین سال کی مدت میں ایک مرتبہ ہندوستان جانے کا اتفاق اس طرح ہوا کہ ۳ شہریور ۱۲۹۸ف کو بلدہ سے گیا

---

[1] حضرت داغ کی تنخواہ ریاست حیدرآباد سے تاریخ ورود سے مقرر ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں جب مرزا داغ سے قیامِ حیدرآباد کی تفصیل چاہی گئی تو انھوں نے اپنے دست و قلم سے یہ تفصیل مہیا کی (زبانِ داغ صفحہ ۲۳۴)

اور خورداد ۱۲۹۹ف کو بلدہ میں واپس آ گیا جس کی مدت کل دس مہینے ہے۔ فقط۔

؎ تو اے کبوتر بام حرم چہ مے دانی
تپیدن دل مرغان رشتہ برپا را

نظام کی نوکری مشکل ہے۔ بندگانِ عالی شیر کے شکار میں ہیں۔ گرمی قیامت کی پڑتی ہے۔ فرصت مرنے کی بھی نہیں۔ صدہا شکایت نامے آتے ہیں۔ سرکاری کام سے پہلے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

یہاں متصلات اور صیغہ جات میں غریب الوطن کو نوکری ملنا عنقا صفت ہے۔ قطعی ممانعت ہے۔ یہاں کے لوگ اہلِ جنود کے مٹانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ خدا نے حضور پرنور کو میرا قدردان بالذات کر دیا کہ تین برس کی جانفشانی اور دس ہزار کے خرچ کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ کوئی شعبہ بھی جلد ہو۔ نہایت مقروض ہو گیا ہوں۔ میرے معاملے میں اب صدر المہام تک کو دخل نہیں رہا۔

فارسی و اُردو شاعری میں فرق

آنکھ پھرتی ہے تری لیل و نہار   ہے اسے گردشِ ایام کی

اس مضمون کو جو میں نے اس شعر میں پیدا کیا ہے۔ ذرا سی تبدیلی مگر بہترین تبدیلی کے ساتھ ایک فارسی شاعر نے نظم کیا ہے سُنیے اور لطف اٹھائیے ؎

با ما بگردشے چہ کند روزگار!
ما دیدہ ایم گردشِ چشمِ تو یار!

لاکھ کوشش کریں لیکن اُردو میں وہ قوتِ بیان پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کے لیے مخصوص ہے۔

شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جھڑتے ہیں

ایک دفعہ میرے پاس بشیر خاں[1] رامپوری آئے۔ میں اس وقت بہت مصروف تھا۔ میرا ایک ماتحت کچھ سرکاری کاغذات لیے محکمے کے بعض معاملات کی رپورٹ سنا رہا تھا اور میں روئداد سُن کر جگہ بجگہ اسے ہدایات کرتا جاتا تھا۔ دوسری طرف ایک شاگرد بیٹھے ہوئے اشعار لکھ رہے تھے۔ گویا اس طرح بیک وقت شاعری بھی ہو رہی تھی اور سرکاری کام بھی جاری تھا۔ بشیر خاں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ بولے کہ حضرت عجیب طریقہ ہے۔ آپ ایسے موقع پر اشعار کیسے کہتے جاتے ہیں۔ مجھ سے تو تمام عمر شاعری اس طرح نہیں ہو سکتی۔

---

[1] حضرت نوح ناروی نے اپنے مضمون میں یہ واقعہ مرزا مظفر حسین بارق کے متعلق لکھا ہے۔ (نگار لکھنؤ۔ داغ نمبر)

پھر آپ شاعری کس طرح کرتے ہیں؟" "میں تو اس طرح شاعری کرتا ہوں کہ حقہ بھروایا۔ سب سے علیحدہ کمرے میں پلنگ پر جا بیٹھا۔ کسی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بار بار تازہ حقہ بھرواتا ہوں۔ جب کوئی مصرع موزوں نہیں ہوتا تو تڑپتا ہوں، بے چین ہوتا ہوں۔ پلنگ پر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا ہوں۔ جب کہیں جا کر شعر مکمل ہوتا ہے۔"

مرزا صاحب نے یہ سب سُن کر کہا: "تو پھر آپ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں۔"

مصرعِ بدیہہ

سعد آباد ضلع متھرا میں اپنے دوست اور شاگرد کنور امتیاز علی خان کا مہمان تھا۔ ایک روز شام کو کوٹھی کے برآمدے میں کنور صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور حقے کا شغل ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بچہ سات آٹھ سال کا کھیل رہا تھا۔ برآمدے کے دروں میں جگہ جگہ طوطوں، بلبلوں، میناؤں اور دوسرے خوبصورت و خوش نوا پرندوں کے پنجرے ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ بچہ کنور صاحب ہی کا تھا۔ اسے جو شرارت سوجھی جھٹ ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور بلبل کو باہر نکال کر ایک ڈورے سے اس کا پاؤں باندھ دیا اور لگے صاحبزادے اسے ہوا میں اڑانے۔ کنور صاحب صاحبزادے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ مجھے مخاطب کر کے بولے ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا

میں نے مصرع سُنا ہی تھا دوسرا مصرع ذہن میں آ گیا اور کنور صاحب سے کہا کہ لیجئے آپ کا شعر پورا ہو گیا ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

محاورہ

"تار نکالنا" عین محاورۂ حضراتِ دہلی ہے۔ اس بات کا تار نکالا یعنی اصل ماہیت دریافت کی۔ چونکہ تار گریباں سے مناسبت خالی لطف سے نہیں ؎

ہم نے جب کھوج نکالا تو گریباں نکلا

ناتوانوں کو گریباں ہی مار ڈالتا ہے۔ گریباں کے ساتھ گلوگیر ہی مناسب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس شعر کے معنی پوچھنا چہ معنی دارد۔ اب بھی اگر کسی کے سمجھ میں نہ آئے تو خدا سمجھے۔

---

[1] ناتوانوں کے گلوگیر تھا ہر جیب جھوٹ ہم نے جب تار نکالا تو گریباں نکلا

شیخ محمود وزیر نام تھا، کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ مرزا داغ سے اس شعر کا مطلب پوچھا جواب میں اوپر والا لکھا گیا (بزمِ داغ) ص ۲۰۵

محاورہ میں تصرف ۔ ناجائز

[1] آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہو اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے محاورہ کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں اور اس کے لیے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور کیجیے کہ انھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے۔ لفظ "جوبن" کے متعلق میں پھر کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بمعنی "پستان" اہلِ لکھنؤ کا اختراع ہے۔ دہلی والے اسے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کیا ہے۔ اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دھن میں لکھ گئے۔ دہلی کے شرفا کا بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح ؎

عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں بنتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں

بہر حال یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے محض میرے لکھ دینے پر اکتفا نہ کر کے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ وہ جرأت ہے جو ہر نومشق کو نہیں ہوتی۔

تذکیر و تانیث

یہ لکھنؤ والوں نے اصلاح دے کر بچایا ہوگا۔ میں نے اس وقت آفتابِ داغ دیکھا طرز[2] مونث ہے۔ ہرگز مذکر نہیں۔ کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا۔ حالانکہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ کسی صاحب نے لفظ بیت جو بکسر یائے تحتانی ہے اس کو بہ فتح یا باندھا۔ بو کے قافیہ میں ابرو کو مونث باندھا ہے وہ بھی مذکر ہے۔ (زبانِ داغ ص)

بیوی

میری بیوی[3] کا یہ طریقہ تھا کہ ہر سال عید و بقرعید کے موقعوں پر وہ سروقد کھڑی ہو کر تعظیم دیا کرتی تھیں۔ ایک روز بہت سخت بیمار تھیں اور زیست کی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے جرموں اور بے اعتدالیوں کا عذر چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے تمام

---

[1] خط بنام ناطق گلاوٹھی (انشائے داغ ص ۱۲۳، ۱۲۴)

[2] طرز اپنا ہے جدا سب سے جُدا کہتے ہیں (آفتابِ داغ) میں مذکر بھی کہا ہے۔

[3] حضرت داغ کی شادی ۱۵ برس کی عمر میں ہوئی۔ اہلیہ کا انتقال ۱۳۱۵ھ میں ہوا اور حیدرآباد میں سید یوسف شریف صاحب کی درگاہ میں مدفون ہوئیں۔

لوگ ان کے گرد جمع ہو کر اپنا اپنا کہا سنا معاف کرا رہے ہیں۔ مرحومہ سب کو معاف کر رہی ہیں۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے نہایت منت و سماجت سے پوری مجبوری کے عالم میں ان سے کہا کہ میری بھی خطا معاف کر دو۔ بی بی نے کہا کہ میں تمھاری خطا کبھی نہیں معاف کروں گی۔ میں نے دوبارہ التجا کی۔ پھر بھی یہی جواب ملا۔ میں بھی تم کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا جمعرات کے دن ان کا انتقال ہوا۔ مجھے بلایا اور فرمایا کہ اس روز میں تمھیں آزماتی تھی۔ تم ایسے خفا ہوئے کہ پھر آئے بھی نہیں۔ اچھا تو اب میں تمھیں معاف کرتی ہوں۔ تم بھی مجھ کو معاف کر دو۔

ایک دفعہ بی بی نے مجھ سے سوال کیا کہ میرے بعد نکاح تو نہیں کرو گے۔ اگر کرو گے تو بہشت میں تمھارے ساتھ میری سوکن بھی ہوگی اور ایسی بہشت میں میرا گزر ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسی بہشت تم ہی کو مبارک ہو۔

اولاد

احمد[1] کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
دل کا سرور تھا مری آنکھوں کا نور تھا

شرطِ شاگردی

فوق[2] صاحب! میں تمھاری طبیعت سے بہت خوش ہوا ہوں۔ اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمھارا نام شاگردوں میں درج کر لیا گیا ہے۔ نیاز دلا دینا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔ حافظ شیرازیؒ۔ حضرت امیر خسرو۔ خواجہ میر درد۔ شاہ نصیر۔ حضرت استاد ذوق کے نام کی۔

شاگردوں کی تعداد

شاگردوں کی بڑی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ ضرور ہے کہ شاگردوں کی بڑی تعداد ایک شاعر کی مقبولیت پر گواہ ہوتی ہے لیکن وہ شخص کیا کم خوش قسمت ہے۔ جس کے صرف چند شاگرد ہوں مگر سچے اور پُرخلوص شاگرد ہوں۔ استاد کو جائز طور سے ان مخلص اور سعادت مند شاگردوں پر ناز ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے لاتعداد شاگردوں میں ایک خاصی تعداد ایسے تلامذہ کی ہے۔ جن پر مجھے پورا پورا اطمینان ہے اور جن کی محبت اور جن کے خلوص پر مجھے قطعی بھروسہ ہے۔ جناب ذوق کے شاگردوں کی تعداد بھی نسبتاً کافی ہے اور اکثر وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے ایسے مخلص اور سعید شاگرد ملے۔ استاد ذوق کے ساتھ اور شعرا میں بھی بعض ایسے خوش قسمت شاعر ملتے ہیں۔ جن کو اپنے شاگردوں کی فرمانبرداری و اطاعت پر بڑا ناز تھا۔ میرے ساتھیوں میں امیر مینائی کے

---

[1] مرزا صاحب کی صلبی اولاد میں صرف ایک لڑکا ہوا تھا نام احمد مرزا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوا۔ رامپور ہی میں فوت ہو گیا۔ احمد مرزا کی یادگار مذکورہ شعر ہے۔ (بزم داغ صفحہ ۱۱۵)

[2] خط بنام محمد الدین فوق مرحوم (زبان داغ صفحہ ۲۳۶)

کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی ہے اور ان میں بہت سے ان کے نہایت مخلص اور وفادار شاگرد ہیں جن پر امیر مینائی کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ شاعروں میں ادبی چشمک زنی ہمیشہ رہی لیکن ایک دوسرے کی اس ادبی و شاعرانہ مخالفت کا اثر ان کے شاگردوں کے اخلاق پر خراب کبھی نہیں پڑا کرتا تھا اور وہ اپنے استاد کے احباب کی ایک شاگرد کی حیثیت سے ہی قدر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے نہیں پسند کرتے تھے کہ ان چشمک آرائیوں میں وہ استاد کا ہاتھ بٹائیں۔

پند نامہ

اپنے شاگردوں کی ہے مجھ کو ہدایت منظور
کہ سمجھ لیں تہ دل سے وہ بجا و بے جا
شعر گوئی میں رہیں پیش نظر یہ باتیں
کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا
چست بندش ہو نشست ہی خوبی ہے
وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا
عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں
حرف علت کا برا ان میں ہے گرنا دبنا
الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں
لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں گنجلک ہو تھوڑی بھی صراحت سے وہی
وہ کنایا ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
عیب خوبی کا سمجھنا ہے اک امر نازک
پہلے کچھ اور تھا اب رنگ بیاں کچھ اور ہوا
یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے
اہل دہلی نے لئے اور سے اب اور کیا
مستند اہل زباں خاص ہیں دلی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا
جوہری نقد سخن کے ہیں پرکھنے والے
ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا
بعض الفاظ جو دو آتے ہیں اک معنی میں
ایک کو ترک کیا ایک کو قائم رکھا
ترک جو لفظ کیا اب وہ نہیں مستعمل
اگلے لوگوں کی زباں پر وہی دیتا تھا مزا
گرچہ تعقید بری ہے مگر اچھی ہے کہیں
ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زوائد بھی برے ہوتے ہیں
ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے
وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اسے بے معنی
استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ
اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا پھر کیا کہنا
اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی
روزمرہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا
ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو
ایک مصرع میں ہو جو چار جگہ بلکہ سوا
عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے
وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے برا
لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے
اور جو غیر مرتب تو نہیں کچھ بے جا

شعر میں آئے جو ایہام کسی موقع پر
کیفیت اس میں بھی ہے وہ بھی نہایت اچھا
جو نہ مرغوب طبیعت ہو بڑی ہے وہ صنعت
شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
ایک مصرع میں ہو تم دوسرے مصرع میں جو تو
یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا
چند بحریں متعارف ہیں فقط اردو میں
فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان سے سوا
شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اس کی
پر عروض اس نے پڑھا وہ ہے سخنور دانا
مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت استاد
دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا
بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام
اور تاثیر وہ شے ہے جسے دیتا ہے خدا
گرچہ دنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر
کسب فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا
سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکر رسا طبع رسا
شعر کے حسن و قبائح جو انھوں نے پوچھے
ان کی درخواست سے اک قطعہ یہ برجستہ لکھا

پند نامہ جو کہا داغ نے بیکار نہیں
کام کا قطعہ ہے یہ وقت پہ کام آئے گا

فصیح اللغات

مشفق بلا واسطہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ فصیح اللغات کا کیا حال ہے۔ اس فقرے کا جواب قلم انداز ہوتا ہے۔ آپ[1] ہی فرمائیے کیا لکھا جائے۔ آپ کی اسناد جس قدر نظر آئیں وہ تمام و کمال آپ کو بھیج دی گئیں۔ ان کی رسید بھی یقیناً وصول نہیں ہوئی۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ جتنا غصہ کریں گے۔ اسی قدر زمانہ فصیح اللغات کی ترتیب میں بڑھے گا۔ جب کوئی ایک کام پر کمر ہمت چست کرتا ہے تو اسی کو پورا کر گزرتا ہے۔ مجھے آپ کا پاس ہے لیکن آپ کے تساہل و تامل سے یہی خیال ہوتا ہے کہ کتاب کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ابراہیم[2] خان کے اکثر تقاضے سنتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں۔ اگر یہاں آجاتے۔ اس سے کسی اسلوب سے معاملہ طے ہو جاتا۔ فصیح اللغات بھی تمام ہو جاتی۔

فصیح اللغات کا کام نہ خود کرتے ہو نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہو۔ اس سے مطلب یہ نہ تھا کہ تم[3] بددل ہو کر کام چھوڑ بیٹھو۔ تمھاری تلون مزاجی سے جی کڑھتا ہے۔ زبان پر مجبوراً ایسے الفاظ آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تمھارے سوا میرے شاگردوں میں دوسرا نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے آنے میں تساہل اور لغت کا کام رک جانے سے مجھے

---

[1] حضرت احسن مارہروی مرحوم مراد ہیں۔

[2] مالک مطبع شمسی حیدرآباد دکن کا نام ہے۔

[3] "تم" سے مراد حضرت احسن مارہروی مرحوم مراد ہیں۔

بہت تکلیف پہنچی اور شاید اس کا افسوس مرتے دم تک رہے۔ میرے لیے یہ مشکل نہیں کہ یہ کام میں یہاں دوسروں کے سپرد کر دوں۔ سراج الدین خان کی رائے تھی کہ ایک ایک لفظ سب شاگردوں کو دے دیا جائے۔ مجھے یہ بھی ہرگز منظور نہ ہوا۔ اگر کر سکتے ہو تو یہ کام تم ہی تمام کرو۔ یہاں آ کر کرو تو سب سے بہتر ہے۔ یہاں آئے بغیر کرتے ہو تو بھی مضائقہ نہیں۔ کسی کا دین صاف کر دینا سب قرضوں پر مقدم ہوتا ہے۔ تم نے حساب صاف کر دیا تمھارے حق میں یہی بہتر رہا۔ مجھے بھی ایک بڑی کوفت سے نجات ملی۔ اسی طرح آدمی اگر ذمہ داری محسوس کرتا ہے تو رونا کس بات کا اور پریشانیاں کیسی۔

خطابات

میرا خطاب بلبل ہندوستان۔ جہان استاد۔ دبیر الدولہ ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک بہادر ہے۔ (زبانِ داغ ص۲۶)

خبرِ انتقال

آپ نے میرے[1] انتقال کی جو خبر سنی میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے تو ایک مرتبہ میرے مرنے کی خبر سنی۔ میں ہر سال سنتا ہوں اور اس کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں۔ ہر سال مرنے کی خبر اڑانے سے اتنی ہی عمر بڑھ جاتی ہے ؎

الٰہی! کیوں غمِ فرقت میں ہم مر مر کے جیتے ہیں
کہ دُنیا میں تو کوئی مر کے پیدا ہو نہیں سکتا

ولادت : ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بدھوار، دو بجے دن محلہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔

نام : اصل نام ابراہیم تھا۔ شادی کے بعد احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا۔ (آئینۂ داغ ص۵۶)

تصانیف : ۱۔ گلزارِ داغ ۔ دیوان مشتمل بر جملہ اصناف سخن
۲۔ آفتابِ داغ 〃 〃 〃 〃
۳۔ مہتابِ داغ 〃 〃 〃 〃

---

[1] مرزا صاحب کے انتقال کی خبر تقریباً ہر سال اُڑا کرتی تھی۔ (بزمِ داغ ص۸۳)

۴ –	یادگارِ داغ	دیوان
۵ –	ضمیمہ یادگارِ داغ	〃
۶ –	فریادِ داغ	عاشقانہ مثنوی
۷ –	انشائے داغ	مکاتیب
۸ –	زبانِ داغ	انشائے داغ کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ۔ مرتبہ رفیق مارہروی
۹ –	بزمِ داغ	روزنامچے کی صورت میں حضرت داغ کے کچھ فرمودات جو احسن مارہروی اور مولوی افتخار عالم نے مرتب کئے تھے اور مدت سے یہ مسودہ کی شکل میں موجود تھے۔ ۱۹۵۸ء میں رفیق مارہروی نے لکھنؤ سے شائع کئے ہیں۔
۱۰ –	فصیح اللغات[۱]	نامکمل لغت محاورہ

---

[۱] فصیح اللغات۔ فصیح الملک ایک ماہوار رسالہ حضرت داغ مرحوم کی وفات کے بعد بطور یادگار حضرت احسن مارہروی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اسی میں فصیح اللغات بالاقساط چھپتی رہی ہے۔

فلو پمپ (رجسٹرڈ)

آبپاشی کا بہترین ذریعہ

یہ پمپ اونٹ، بیل، انجن، بجلی اور ہاتھ سے چلایا جاتا ہے۔ کنواں، نہر، دریا یا تالاب پر لگا کر حسب منشا پانی نکالا جاسکتا ہے۔ چلنے میں ہلکا اور پائیدار ہے

تصدق اینڈ سنز لمیٹڈ
۲۴ شالامار لنک روڈ
باغبانپورہ لاہور ۹

جگر مُرادآبادی

ولادت : ۱۸۹۳ء بمقام بنارس
وفات : ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء بمقام گونڈہ

گھر کی باتیں

مسلسل دو سال علیل رہنے کے بعد میرے برادرِ نسبتی داغِ مفارقت دے گئے۔ میری اہلیہ کا خاندان بہت ہی مختصر سا ہے۔ لے دے کے دو بھائی بہنیں۔ اب ایک ہی بھائی رہ گئے ہیں۔ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ گھر بھر کا کیا عالم تھا۔ مشکل یہ کہ چلے ہوئے تھے کہ دورانِ سفر دس بارہ ہزار کی چوری ہو گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ میں اور میری "رفیقۂ زندگی" ۲۹/۳۰ نومبر کو مراد آباد کے لیے سفر کر رہے تھے کہ لکھنؤ اور بریلی کے درمیان اُن کا ٹرنک چرا لیا گیا۔ نکلس طلائی، دست بند طلائی، کرن پھول جھمکا طلائی، اور بھی چند زیورات ٹرنک میں رکھ دیے گئے تھے۔ چاندی کا سامان بھی بہت کافی تھا۔ نقد بھی موجود تھا اگرچہ صرف سو روپیہ۔ کپڑا خریدنے کا مجھے جنون ہے۔ اپنے لیے بہت کم، بیوی کے لیے خاص طور پر بہت زیادہ اور نہایت اعلیٰ درجہ کا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے جسے ان شاء اللہ کبھی بیان کروں گا۔ زیور اور روپیہ سے زیادہ اہم تر کپڑوں کا سرمایہ تھا۔ بہرحال خلافِ توقع میری بیوی نے بھی اس معاملے میں جرأت و ہمت کا کافی ثبوت دیا اور مجھے تو ایک گونہ اس تصور سے اب تک مسرت محسوس ہونے لگی ہے کہ صدمہ ہوا ہی نہیں اور اگر تھوڑا بہت ہوا بھی تو "اپنی" شریکِ زندگی کے خیال سے۔ (۱۹۳۳ء)

میں اس صورت میں گونڈہ پہنچا کہ اضمحلال انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "انگزیٹی" کے علاوہ بظاہر کوئی دوسری بیماری بھی نہ تھی۔ ڈاکٹری معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ "بلڈ پریشر" بہت گر چکا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا علاج خود شروع کر دیا یعنی انڈا، دودھ اور شہد۔ بحمداللہ کہ تجویز کامیاب ثابت ہوئی۔ اب حالت بہت کچھ روبہ اصلاح ہے۔ (۱۹۳۵ء)

عام طور پر ہر عورت خصوصاً مرد کے متعلق بے حد ذہین، ذکی اور ماہرِ نفسیات ہوتی ہے۔ میری "محترمہ" اس حیثیت سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں اور اگر آپ مبالغہ تصور نہ فرمائیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ذکی اور ذہین ہونے کے ساتھ صحیح معنوں میں ایک بلند درجہ شریف عورت اور شریف ترین بیوی ہیں۔ مجھ سے انھیں قدرتاً محبت ہے۔ بے حد، گہری، بے غرض اور دینی ہمدردیوں کے ساتھ

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی ہیں اور حضرت اصغر کے تمام و کمال فیوض و برکات سے معمور ہیں۔ ڈر تھا کہ اگر ان کے علم میں تمام حالات آگئے تو ان کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ وہی ہوا اور ایک حیثیت سے بہت ہی اچھا ہوا۔

انھوں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے میں کبھی آپ سے بیان بھی کروں گا۔ اس خواب نے تمام "طلسم" توڑ کر رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ ان کے علم میں ہر چیز آگئی۔ جس کا لازمی نتیجہ بے ہوشیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری اہلیہ محترمہ عام عورتوں کی طرح مطلق آزردہ سرشت واقع نہیں ہوئی ہیں۔ ان تمام حالات میں صداقت ہی صداقت اور محبت ہی محبت کار فرما تھی۔ اگرچہ حالات نہایت درجہ دل شکن اور اندوہناک تھے لیکن میں سمجھوں گا کہ بحمد اللہ ہم دونوں کی حقیقتیں بھی صحیح معنوں میں نہ صرف دماغ بلکہ پوری زندگی پر منکشف ہوگئیں اور اس طرح میں اس عذاب کو رحمت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب میں نے عہد کر لیا ہے کہ "افراد معلومہ" سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھوں گا کہ اس صورت میں خطرات ہی خطرات ہیں۔ دینی اور دنیوی دونوں۔ "ایمان و آبرو" ایک طرف۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس طرح کی صورت پھر پیدا ہوئی تو مجھے اپنے آپ کو "قاتل" کی حیثیت سے بھی محسوس کرنا پڑے گا۔[1]

(۹/۸ نومبر ۱۹۳۵ء)

شعلۂ طور

شعلۂ طور منظر شہود پر آچکا جس اہتمام اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ غالباً اب تک کوئی دیوان اس بلند معیار کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ مجھے کچھ جلدیں دی گئی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک کثیر الاحباب انسان کتنے گھاٹے میں رہا کرتا ہے خصوصاً جب کہ وہ صاحب مروت بھی ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

طفیل صاحب مالک ادارۂ فروغ اردو جو شعلۂ طور کے ناشر ہیں۔ چاہتے تھے اور اب بھی چاہتے ہیں کہ "آتش گل" بھی وہی شائع کریں۔ اس دیوان کے لیے وہ اپنی سعی و کاوش کو اور بھی زیادہ صرف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ میں اپنے مختصر لیکن اہم حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی نظریات علمی و ادبی لکھتا جاؤں تاکہ جلد از جلد انھیں ایک مقالے کی صورت میں شامل مجموعۂ کلام کیا جا سکے۔

خیر، یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف آٹھ ہزار پیش کرنا چاہتے ہیں اور دس ہزار جلدوں کی اجازت۔ وہ پورا دیوان بلاک کے ذریعے چھپوانے پر مصر تھے اور دس بارہ اشعار کو مصور صورت میں بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اولاً تو آمادگی ظاہر کی لیکن تفصیلاً تمام حالات بیان کر دئے جانے (سے پہلے) ارادہ تھا کہ نیاز محمد خان[2] صاحب کو صورت حال سے مطلع کر دیا جاتا اور ان کی

---

[1] شخصیات کی تصریح اور واقعہ کی نوعیت و تفصیل دونوں غیر ضروری ہیں۔ توبہ کے بعد "آزمائش و ابتلا" کا دور ضرور آتا ہے۔ پھر توبہ جس قدر راسخ و صادق ہوتی ہے اور تائب جتنا بلند مرتبت ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت و کٹھن ہوتی ہے۔ جگر صاحب کو بھی اس دور ابتلا سے گزرنا پڑا اور وہ خدا کے فضل سے توبہ کی عظمت و تقدیس کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

[2] (حاشیہ اگلے صفحے پر)

اجازت حاصل کرنے کے بعد اس طرف قدم اٹھایا جاتا لیکن . . . اب معاملہ ختم کر دیا گیا۔ نیاز[1] صاحب کو لکھنے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ (اپریل ۱۹۵۲ء)

میرا کلام میری نظر میں

یہ میں فخریہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور بے ربط واقع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔

شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین لکھے جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے۔ افسوس کہ سب ضائع ہو گئے۔

اولاً تو میرے لیے لکھنا لکھانا ہی مصیبت سے کچھ کم نہیں۔ اس پر بار بار کی شدید جگر کاویوں کے نتائج کا اس آسانی سے گم ہو جانا خصوصاً میرے لیے کس قدر اندوہناک سانحہ ہو سکتا ہے۔

ارادہ تھا "شعلۂ طور" پر خود کوئی مقدمہ لکھوں۔ چنانچہ کئی بار لکھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ضائع ہی ہوتا چلا گیا۔ اور مشیت الٰہی شاید مجھ سے یہ کام لینا نہیں چاہتی یا کسی آنے والے وقت تک منتظر رکھنا چاہتی ہے۔ انشاء اللہ العزیز "شعلۂ طور" کی دوسری اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔

سرسری طور پر اپنے کلام کے متعلق کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں:

اغلاط سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پروا رکھا ہے اور نہ انھیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔ اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے میں خوش ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں سے متنبہ کر دیا جائے۔

(میرے نظریۂ شعری کے اعتبار سے) مشاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے۔ تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کیے بغیر نہیں گزر سکیں گے۔

میری شاعری "غزل" ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق ہی میری زندگی ہے، اس لیے بعض عشقیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

واقعۂ کانپور کے متعلق جو نظم ہے، وہ بے شک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آ گیا ہے

---

[1] نیاز محمد خاں صاحب چاٹگام میں اس وقت کمشنر تھے اور شاید پاکستان کو اپریٹیو سوسائٹی (ڈھاکہ) کے سرپرست بھی تھے۔ "آتش گل" کا پہلا ایڈیشن آپ کی تجویز و تحریک پر وہیں سے شائع ہوا تھا۔

جس کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تاسف رہا اور وہ لفظ "مادر وطن" ہے۔ میں وطنیت اور قومیت دونوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ناظرین میں کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انھیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو صحیح کر دیں۔

اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن احباب کے سخت اصرار پر۔ ممکن ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں اجزائے دل پائے جائیں لیکن میرے لیے وہ سرمایۂ ناز نہیں۔ اچھا ہوا کہ ضائع ہو گیا۔ البتہ دو نظمیں جن میں سے ایک نظم "تلک کی موت" پر ہے اور دوسری اسکول اسٹرائک کے موقع پر "بچوں سے خطاب"۔ ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے۔ لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تحقیق کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخ ادبی" میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے۔ اس لیے یہ ظاہر کیے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی جب کہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی۔ اس لیے اس میں بے جا غلو اور بعض شدید قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے۔ لیکن نہیں ہو سکی۔ اس لیے احتیاطاً اس قدر لکھ دیا گیا۔

اپنی خصوصیات شاعری کے متعلق فی الوقت کسی طویل مضمون نگاری کے لیے آمادہ نہیں۔ صرف کچھ لکھنے کے لیے کہنا پڑا۔ مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔ نقالی اور استاد و شاگردی میرے لیے ننگ رہی ہے اور انشاء اللہ اور ننگ سمجھتا رہوں گا۔

دوسری خصوصیت کی جانب بہت کم حضرات کی توجہ منعطف ہوئی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ میں نے (اول کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کو قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق ان کے حقیقی تاثرات و واردات کو تا امکان صحیح صحیح شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

معاملات کے اعتبار پر اکثر مقامات آپ کو ایسے ملیں گے کہ مصور کے تمام کمالات ان کی تصویر کشی میں بیکار محض ثابت ہوں گے۔ لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے آپ کو اکثر و بیشتر مستقل اضافات ادبیات ملیں گے جنھیں بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔ وقت نہیں کہ اس سے زیادہ کچھ لکھا جا سکے۔ ناظرین نکتہ رس خود ہی اندازہ فرما لیں گے۔

ممکن ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبش قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر از رہ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً ماننا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں۔ بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں نفسیات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔

میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے ہجوم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا بنا دیا ہے۔ لیکن میں منہ بنا بنا کر رونے دھونے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے ؎

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق
دل ہمہ خوں کردہ، خنداں می روم

بے شک جس طرح جذبات مسرت و انبساط فطرتی عملیات ہیں اسی طرح جذبات غم و الم بھی۔ لیکن پیچھے رونے والے کہاں؟

الفاظ بے شک رونے والے صرف کیے جاتے ہیں لیکن تڑپ یا درد کا نام بھی نہیں۔

مشاق کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے یا جو چاہا اور جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن اگر سچے رٹنے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا "شعر و ادب" اولاً تو حیات قومی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ دوئم اس کا جتنا رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و محرومیت پائی جاتی ہے۔

آپ میرے کلام میں بظاہر درد کا عنصر بہت کم پائیں گے لیکن ذرا ٹھہر کر اگر آپ جذبات اور شعر کا جائزہ لیں گے تو ایک بہت ہی نازک سی موج درد ضرور محسوس کریں گے اور جس طرح میری زندگی تازہ بتازہ نو بنو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تبدیل ہوتی گئی ٹھیک اسی طرح رنگ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکا اور حافظے نے مدد کی "شعلۂ طور" کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا۔ تاہم نظرثانی کا محتاج رہ گیا۔ انشاء اللہ دوسری اشاعت میں پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

(شعلۂ طور، پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۳۲ء مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

وقف نامہ (رجسٹرڈ)

منکہ شیخ علی سکندر متخلص بہ جگر مراد آبادی خلف شیخ علی نذر مرحوم ساکن حال گونڈہ کا ہوں چونکہ من مقر اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا ہے۔ آئے دن کی بیماریوں نے کمزور کر دیا ہے۔ پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ معلوم کب روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے۔ ہر فرد بشر کا فرض ہے کہ اپنی حیات میں اپنی ملک کا ایسا انتظام کر دے کہ اس کے بعد اسے ثواب دارین ملتا رہے اور اس کے ورثا میں تنازعات بھی نہ ہوں۔ من مقر کے پاس کوئی جائداد غیر منقولہ نہیں ہے۔ میرا سرمایۂ حیات میرے تین دیوان ۱۔ داغ جگر ۲۔ شعلۂ طور ۳۔ آتش گل ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں اور جنھیں بفضل الٰہی ایک بڑی حد تک مقبولیت عام بھی حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ان کا ایسا انتظام کر دوں کہ مجھے ان کے ذریعے ثواب ملتا رہے اور میری اہلیہ جانی کی ان کی زندگی بھر مالی اعانت بھی ہوتی رہے۔

میرے کوئی اولاد ذکور و اناث سے نہیں ہے۔ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور میرے برادر حقیقی علی مظفر بقید حیات ہیں۔ ان دو کے علاوہ میرا کوئی جائز وارث نہیں ہے۔ میں نے تمام امور پر کافی غور کر کے اور اپنے بہی خواہوں سے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ میں ایک وقف الی اللہ الخیر علی الدوام موسوم بہ "جگر ٹرسٹ" قائم کر دوں جس کے ذریعے میرا نام بھی قائم رہے۔ میری روح کو بھی ثواب پہنچتا رہے اور میری اور میرے وارثان کی تاحیات کفالت بھی ہوتی رہے۔

لہٰذا بحالت صحت نفس و ثبات عقل بدرستی حواس خمسہ بطیب خاطر خود یہ اقرار کرتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ تاریخ امروزہ سے اپنی تصانیف مندرجہ بالا اور ان کے جملہ حقوق طباعت وکاپی رائٹ کو اپنی ذاتی ملکیت سے نکال کر بہ ملکیت حق باری تعالیٰ عزاسمہٗ دے دیا۔ اب میری یہ تصانیف میری ملکیت نہیں رہیں بلکہ ملکیت حضرت باری تعالیٰ ہو گئیں۔

شرائط و مقاصد وقف حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ یہ کہ یہ وقف جگر ٹرسٹ کے نام سے موسوم ہوگا۔

۲۔ یہ کہ جگر ٹرسٹ کے متولی آج سے میرے دورانِ حیات اور میری وفات کے بعد بھی میرے عزیز و مخلص دوست جناب محمد یٰسین قریشی صاحب المتخلص بہ شکیبین ساکن حال محلہ بنی اسرائیل میرٹھ ہوں گے۔

۳۔ یہ کہ متولی جناب شکیبین صاحب کو یہ اختیار ہوگا کہ اپنی وفات سے قبل اپنا جانشین متولی اغراض و مقاصدِ وقف کے لحاظ سے کسی بہتر و مناسب شخص کو مقرر کردیں۔ اسی طرح پر ان کے جانشین کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

۴۔ یہ کہ متولی نامزد شدہ ہمیشہ حنفی المذہب مسلمان ہوگا۔

۵۔ یہ کہ متولی کو جائداد موقوفہ کے انتظام کا پورا اختیار ہوگا اور یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ میری تصانیف کو جس زمانہ میں مفید اور منفعت بخش سمجھیں طبع کرادیں۔ چھپوانے کے شرائط و دیگر امور متعلق نفاذ و انتقال کاپی رائٹ طے کرنے کا حق بھی متولی کو ہوگا لیکن وہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو اغراض و مقاصدِ وقف کے منافی ہو۔

۶۔ یہ کہ ضروری مصارف طباعت وغیرہ نکالنے کے بعد جگر ٹرسٹ کی کل آمدنی کا چار بٹہ پانچ حصہ ($\frac{4}{5}$) میری زندگی میں متولی مجھ کو دے گا اور ایک بٹہ پانچ حصہ ($\frac{1}{5}$) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نادار مسلمان طلبا کو بطور امدادی وظیفہ کے دیا جائے گا۔ طلبا میں ترجیح ان کو دی جاوے گی جو اردو ادب کے مطالعہ اور خواندگی میں مصروف ہوں۔

۷۔ یہ کہ واقف یعنی من مقر کی وفات کے بعد جگر ٹرسٹ کی چار بٹہ پانچ ($\frac{4}{5}$) آمدنی دو مساوی حصہ میں تقسیم کی جاوے گی اس طرح پر کہ دو بٹہ پانچ ($\frac{2}{5}$) حصہ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور بقیہ دو بٹہ پانچ ($\frac{2}{5}$) حصہ میرے برادر حقیقی علی مظفر کو دیا جاوے گا۔ واضح رہے کہ نسیم جگر اور علی مظفر صرف اپنی حیات ہی میں حصہ پائیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حصوں کی آمدنی بھی بسبیل خیر بصورت امدادی وظائف نادار مسلمان طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حسب ہدایت ماقبل تقسیم کر دی جاوے گی۔

۸۔ یہ کہ مسماۃ نسیم جگر اور علی مظفر کے انتقال کے بعد ان کے ورثا کو کوئی حصہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی سے نہیں ملے گا نہ وہ اس کے دعویدار ہو سکیں گے اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو وہ باطل و نامسموع ہوگا۔

۹۔ یہ کہ متولی کا فرض ہوگا کہ وہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھے اور سالانہ حساب کتاب کی جانچ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آڈیٹر یا کسی اور کوالیفائڈ آڈیٹر یا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے کراوے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرے۔

۱۰۔ یہ کہ کم از کم سال میں ایک بار متولی تقسیم منافع حسب شرائط و فقرہ ۶، ۷ کیا کرے۔ متولی وقف میری زندگی میں مجھے اور میرے انتقال کے بعد نسیم جگر اور علی مظفر کو سال کے آخر میں حساب جانچ کرا دیا کریں یا نقل حساب بھیج دیا کریں۔

۱۱۔ یہ کہ ان تصانیف کے علاوہ آئندہ میں یا کوئی دیگر شخص جگر ٹرسٹ میں نقد یا کوئی جائداد وقف کرے تو وہ بھی شرائط بالا کی پابند ہوگی۔

۱۲۔ یہ کہ تصانیف مندرجہ بالا کی مالیت کا صحیح اندازہ بحالت موجودہ نہیں لگایا جا سکا۔ اس لیے بغرض ادائے اسٹامپ

مالیت تصانیف مندرجہ بالا مبلغ ایک ہزار روپیہ قرار دی جاتی ہے۔ بنا بریں یہ چند کلمہ بطریق وقف تا سالی اللہ و الخیر علی الدوام تحریر کر دیا ہے کہ سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آوے۔ تاریخ تحریر ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء

دستخط

جگر مراد آبادی   علی مظفر   نسیم خازن   محمد ایوب احمد وکیل   محمد بشیر صدیقی وکیل گونڈہ

اپنے اشعار میں

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

دستِ کرم بڑھائے جا غیر کی دشمنی نہ دیکھ   ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگر

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

یار و اغیار سے محبت ہے   گل تو گل خار سے محبت ہے

خونِ جگر کا حاصل اک شعرِ تر کی صورت   اپنا ہی عکس جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا

بہت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن   طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں

لاکھ رسوا سہی جگر لیکن   خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے

جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق   یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

صرف نقالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

—

کوئی حسین حسین ٹھہرتا نہیں جگر
باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

—

میں نہیں بسملِ خیام جگر
حافظِ خوش کلام نے مارا

—

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

—

مرا شوق بھی مرا ذوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں
مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر "ادبِ کثیف" کی جا نہیں

—

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

—

شعلہ سامانیٔ غم پہ نہ کرو ناز جگر
تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہوں گے

—

عالم تمام میرا ثنا خواں ہوا جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا

—

بزمِ مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیل
بلبل چہک رہا ہے یا حضرت جگر ہیں

—

تیرا دیوانہ غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

—

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر جو اٹھو بے خبر ہو کر

—

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھ کو

—

نگاہ حضرت اصغر کی ہے ودیعت خاص
قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

پابند شریعت نبیؐ ہوں   خاک در دولت غنیؓ ہوں

کچھ ہم کو نہیں کام جگرؔ اور کسی سے   کافی ہے بس اک نسبت سلطان مدینہ

جانتا ہوں کہ ہوں اصل میں ننگ اسلام   کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوف انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام   وہی میخانہ و ساقی وہی بادہ وہی جام
مجھ کو اپنی روش خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے   اور جگرؔ کو شراب نے مارا

کہاں پھر یہ ہستی کہاں ایسی مستی   جگرؔ کی جگرؔ تک ہی مے خواریاں ہیں

کیا جگرؔ سے آپ بھی واقف نہیں   اک یہی تو رند مے آشام ہے

للہ اب تو ذرا ہوش میں آ جا   تنگ آ گئے احباب تری بے خبری سے

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ   جب آپ دیکھیں گے غرق شراب دیکھیں گے

دیکھا تھا کل جگرؔ کو سر راہ میکدہ   اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چور تھا

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب   کوئی پلا رہا ہے پیئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترک میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

وہ علم وہ تواضع وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

قریبِ منزلِ ہستی ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند چھائی جاتی ہے

دل کو سکوں، روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

(مرتب: محمد عبداللہ قریشی)

میر لائق علی

میں نے ہند اور حیدر آباد کے تعلقات کی بات چھیڑی تو یوں محسوس ہوا جیسے ولبھ بھائی پٹیل کے جذبات پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ اُس نے بڑی سرد مہری سے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ میرے نزدیک سوائے ہندوستان سے الحاق حیدر آباد کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں۔ مونٹ بیٹن اور میرے دوسرے ساتھی اگر کوئی اور طریق کار آزمانا چاہتے ہیں تو انہیں اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حیدر آباد سے تعلقات کی نوعیت پر بھارتی کابینہ کے درمیان اختلاف رائے کا مجھے براہ راست سراغ ملا۔ ورنہ اس سے پہلے صرف خفیہ طور پر بعض اطلاعات پہنچی تھیں۔

انہی ملاقاتوں میں سے ایک کا ذکر ہے۔ میں اور پٹیل بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ راج گوپال اچاریہ جو اس زمانے میں مغربی بنگال کے گورنر تھے اچانک آ گئے۔ رسمی آداب و نیاز کے بعد انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ معاف کیجیے میں بے جا مخل ہوا ہوں تاہم ولبھ بھائی نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی آمد ہمارے لیے باعث مسرت ہے اور اُن کی شرکت سے معاملہ کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ وہ بیٹھ گئے اور خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے رہے۔ اس دوران میں دو چار جملے جو ان کی زبان سے نکلے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مقابلۃً حیدر آباد کے نقطۂ نظر کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اتنے میں پٹیل کو کہیں دور دراز سے ٹرنک کال آ گئی اور وہ خاصی دیر تک اس میں منہمک رہا۔ پٹیل کی غیر موجودگی میں راج گوپال اچاریہ حیدر آباد سے متعلق حکومت ہند کے رویّہ پر اظہار افسوس کرتے رہے اور حکومت حیدر آباد کے موقف کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ انہوں نے کہا کہ حیدر آباد اور ہندوستان کی باہمی مفاہمت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پٹیل ہے۔ اور اسے دونوں ملکوں کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے پٹیل کو بارہا سمجھایا ہے کہ اپنا رویہ بدلو تم خود مدراس سے آئے ہو اور حیدر آباد کے پڑوسی ہو تمہارا انداز نظر زیادہ ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ مگر پٹیل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ میرے اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔ اس لیے اس سے زیادہ حیدر آباد کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا پھر راجہ جی نے بڑے دردمندانہ لہجے میں کہا۔ ہندوستان بھر میں مسلم اقلیت سے جو برتاؤ ہو رہا ہے میرے دل میں اس کی بھی کسک ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کے فیاضانہ سلوک کا پرچار کیا ہے لیکن پٹیل کے دماغ میں نہ جانے کیا سمائی۔ وہ کسی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔ میں نے راجہ جی سے پوچھا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی سن سکتا ہوں کہ اس قضیہ میں مونٹ بیٹن ہمارے لیے کہاں تک سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

راجہ جی نے صاف لفظوں میں کہا کہ پٹیل کی خواہشات کے خلاف مونٹ بیٹن کچھ نہیں کر سکتا۔ تاہم وقتی طور پر اس کے ذریعے جتنا کام چل سکے اتنا ہی غنیمت ہے۔ پھر میں نے ان سے التجا کی کہ اس قضیہ کے مناسب حل کے لیے ان سے جہاں تک ممکن ہو ہماری امداد کریں۔ انہوں نے کہا کہ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ بہر کیف اپنی بساط بھر کوشش ضرور کروں گا۔

پنڈت نہرو سے میری ابتدائی گفتگوؤں کے دوران حسبِ معمول ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جوہری قوت کے سہانے سپنے ان کے خیالوں کی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور اس قوت کے بل پر نسلِ انسانی بالخصوص ہندوستان جیسے پسماندہ ملک نے مستقبل میں ترقی و ارتقاء کی جو منزلیں طے کرنی تھیں۔ پنڈت جی اس کا تفصیلی نقشہ کھینچتے رہے۔ جب حیدرآباد کے قضیہ کا سوال اٹھاتا تو فرمانے لگے کہ مونٹ بیٹن خود اس مسئلہ پر بات چیت کر رہے ہیں میری کیا ضرورت ہے۔ ایک گفتگو میں انہوں نے رٹ لگائے رکھی کہ مستقبل میں ایشیا کی رہنمائی ہندوستان کے ہاتھوں میں ہوگی اور وہ دن دور نہیں جب ایشیا میں ہندوستان کی شوکت و سطوت کا وہی عالم ہوگا جو شمالی اور جنوبی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہے۔

نہرو کے بعد مونٹ بیٹن سے میری گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں بعض رسمی اور بعض غیر رسمی ملاقاتیں ہوئیں۔ معین نواز جنگ اس وقت وزارت خزانہ کے علاوہ امور خارجہ کے بھی سربراہ تھے۔ وفد کا رکن ہونے کی بنا پر وہ بھی ۲۶ مارچ ۴۸ء کے روز گفتگو میں شریک ہوئے۔ معاہدہ جنگ بندی کے وقت حیدرآبادی وفد کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ ۲۶ مارچ کی گفتگو میں مینن اور مونٹ بیٹن نے ان کی ذات پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ کہ معین نواز جنگ کو چاہیے تھا کہ حیدرآباد کے تمسکات پاکستان منتقل ہونے کے متعلق ہمیں سچ سچ بتا دیتا۔ مونٹ بیٹن کے خیال میں معین نواز جنگ نے اُسے اعتماد میں لینے کے قابل نہیں سمجھا۔ اور یہ سراسر اس کی توہین تھی۔ معین نواز جنگ نے جواب دیا کہ میں دہلی میں ہند اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات کے لیے آیا تھا، نہ کہ حیدرآباد کے باقی دنیا کے ساتھ ان تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹنے جن کا معاہدہ جنگ بندی پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا کہ حیدرآباد دولت مشترکہ کے ممالک میں اپنا سرمایہ لگانا چاہے تو اس معاملہ میں وہ کلیتاً خود مختار ہے۔ میں نے مونٹ بیٹن سے کہا کہ ہند اور حیدرآباد کے مابین اختلاف کی بنیاد کیا یہی تمسکات ہیں؟ اور اب جبکہ یہ تمسکات پاکستان منتقل ہو چکے ہیں انہیں واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مونٹ بیٹن نے جواب دیا کہ اگر آپ حکومت سے درخواست کریں کہ وہ ان تمسکات کو معاہدہ جنگ بندی کے اختتام تک وصول نہ کرے تو ہند اور حیدرآباد کے تعلقات بہت حد تک خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

میری طبیعت اس بات پر متزلزل تھی کہ پہلے تو رضاکارانہ طور پر اپنے تمسکات پاکستان منتقل کرنے کے بعد اب پاکستان سے درخواست کی جائے کہ وہ انہیں معاہدہ جنگ بندی ختم ہونے تک قبول نہ کرے۔ پھر میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی تجویز پاکستانی حکام کے لیے قابل قبول ہوگی یا نہیں۔ تاہم مجھے ہر قیمت پر ہندوستان سے امن برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے بذاتِ خود کراچی جانے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ معاملے کی صورت اسی طرح مرتب کی جا سکے جیسی مونٹ بیٹن کی خواہش ہے۔ میں نے مونٹ بیٹن کو جتا دیا کہ اگر اس سے ہند اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات میں واقعی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے تو میں اپنی اور اپنی ریاست کی شہرت و توقیر کو خطرے میں ڈال کر بھی یہ قدم اٹھانے کیلئے تیار ہوں۔ مونٹ بیٹن یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور کہا کہ یہ ہندوستان اور حیدرآباد کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اس نے بڑے واشگاف لفظوں میں مجھے یقین دلایا کہ اگر ایک بار یہ کام ہو جائے تو ہند اور حیدرآباد کی دوستی کی راہ کے سب کانٹے دور ہو جائیں گے۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ اگر کشمیر کی آگ نہ دہک رہی ہوتی تو ہندوستان کو بالخصوص اس نقطہ پر اتنا گرم ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

ہندوستان کے سبھی رہنما حتیٰ کہ پٹیل اور مینن بھی اس فیصلے پر بڑے مطمئن اور مسرور تھے۔ لیکن مرارجی نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا کہ اب صرف ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون سا؟ کہنے لگے کہ حکومت حیدرآباد نے ریاست کی حدود میں ہندوستانی کرنسی کے استعمال پر جو پابندی لگائی ہے یہی آخری کانٹا ہے۔ میں نے کہا ہندوستان کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اپنی ریاست کی حدود کے اندر فقط اپنے سکے کو قانوناً تسلیم کرنا صرف حیدرآباد سے مخصوص نہیں۔ مینن نے جواب دیا کہ ان گنت مسافر ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں سفر کے دوران حیدرآباد میں سے گزرتے ہیں۔ ہندوستانی کرنسی پر پابندی کی بنا پر ریاست میں ان مسافروں کے گرفتار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے ماؤنٹ بیٹن سے سوال کیا کہ اگر حکومت حیدرآباد ان لوگوں سے کوئی باز پرس نہ کرے جن کے پاس ٹکٹ موجود ہو تو پھر کیسا رہے گا؟ مینن اور ماؤنٹ بیٹن دونوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہندوستان کو اور کیا چاہیے۔ چنانچہ معین نواز جنگ حیدرآباد کرنسی آرڈیننس میں یہ ترمیم شامل کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ ٹکٹ والے مسافروں پر کوئی قدغن نہ ہوگی۔

ان مذاکرات کے دوران دہلی اور حیدرآباد کا سیاسی ماحول انتہائی کشیدہ اور ناسازگار تھا۔ اس لیے حیدرآباد کے وزیر اعظم کی کراچی کو روانگی کا اعلان انتہائی دہشت خیز بدگمانیوں کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ پھر اس روانگی کو صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش بھی بے سود تھی۔ بلکہ اس سے مزید بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ایک سیدھا سادا بیان جاری کر دیا جائے کہ حیدرآباد کا وزیر اعظم مختصر سے دورے پر کراچی روانہ ہو رہا ہے اور حکومت ہند کو اس دورے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ بہرکیف اخبارات کی بدگمانیوں کے سدباب کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ اس موقع پر پھر ایک بار وی پی مینن ہمارے کام آیا۔ اس نے بلا تامل کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے اس بات کی نگرانی میں خود کروں گا اور نگرانی میں اس نے واقعی بڑی تندہی سے کام لیا۔ چنانچہ دوسرے روز تمام بھارتی اخبارات میں وہی میرا مختصر سا بیان شائع ہوا جس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ یا تبصرہ شامل نہ تھا۔ یہ حکومت کے اخبارات پر کنٹرول کی حیرت انگیز مثال تھی۔ وہی اخبارات جن کے بارے میں حکومت ہند بڑے بھولپن سے بہانے بنایا کرتی تھی کہ انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے اس لیے وہ جو چاہیں لکھیں ہمارا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔

پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح وزیر اعظم لیاقت علی خاں اور دوسرے متعلقہ حکام سے ٹیلیفون پر فوراً بات چیت کی گئی اور انہوں نے اگلے روز ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو میں کراچی روانہ ہو گیا۔ میرے ہمراہ فقط حیدرآباد کا ایڈیشنل ایجنٹ جنرل، یوسف یار جنگ، ایک اے۔ ڈی۔ سی اور ایک نجی ملازم تھا۔ قائد اعظم نے انتہائی شفقت سے مجھے اپنے ہاں قیام کی دعوت دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ ان سے بالمشافہ گفتگو عصرانے کے بعد طے پائی تھی۔ اس دوران میں مجھے چند ایک وزراء سے گفتگو کرنے اور اپنی تجویز کے بارے میں ان کا ردعمل معلوم کرنے کا موقع مل گیا۔ جب حیدرآباد کے دیئے ہوئے تحفظات قبول نہ کرنے کی بات چھڑی تو حیدرآباد سے قلبی ہمدردی کے باوجود ان حضرات کا جواب حوصلہ افزا نہ تھا۔ پاکستان نے اپنے آئندہ مالی منصوبوں میں ان تحفظات کی رقم شامل کر کے قلم زد شدہ درج کر دیا تھا اور اس رقم کو واپس کرنے سے منصوبوں کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا
عصرانے کے بعد قائد اعظم سے گفتگو شروع ہوئی اس گفتگو کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔ انہوں نے برملا فرمایا کہ ہندوستان و پاکستان

کے باہمی تعلقات کو مستحکم اور دونوں ملکوں کے مابین مفاہمت کو خوشگوار بنانے کے لیے میں کسی ایثار یا قربانی سے گریز نہیں کروں گا۔

میں نے اشارۃً عرض کیا کہ آپ کے بعض وزراء اس بات پر رضامند نہیں کیونکہ ان تحفظات کی رقم کو مالی خساروں میں کھپایا جا چکا ہے۔ انہوں نے مخصوص متین اور مستقیم انداز میں انگشت شہادت کو جنبش دی اور فرمایا ”کسی ایسی حرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی جس سے حیدرآباد کے مفاد کو ٹھیس پہنچے۔“

اسی شام وزیر اعظم اور پاکستان کے دوسرے وزراء کا اجلاس بلایا گیا جس میں قائد اعظم بنفس نفیس شریک ہوئے۔ کچھ دیر باہم صلاح مشورہ ہوا۔ اس کے بعد قائد اعظم نے اپنا آخری فیصلہ دیا کہ معاہدہ جنگ بندی کے دوران حیدرآباد کے تحفظات کو استعمال میں نہیں لایا جائے گا۔ میں نے قائد اعظم اور ان کے وزراء کا اس فیاضانہ سلوک کا شکریہ ادا کیا۔ اور یہ امید ظاہر کی کہ اس اقدام سے حیدرآباد کے لیے پاکستان کے احساس مروت میں کمی نہیں آئے گی۔ قائد اعظم نے یقین دلایا کہ اس اقدام سے پاکستان کے دل پر کسی تکدر کی آلائش تک نہیں آئی اور مستقبل میں جب بھی کبھی حیدرآباد کو کسی امداد یا تعاون کی ضرورت ہوگی پاکستان بے جھجک اپنی خدمات پیش کر سکے گا۔ پھر انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ بدقسمتی سے کشمیر کے مسئلہ پر ہند اور پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے فی الحال میں اور میرے رفقاء ہندوستان کی حیدرآباد سے چپقلش دور کرنے کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کر سکتے۔ ورنہ پاکستان مخلصانہ جدوجہد کر کے ان ملکوں کے درمیان مصالحت کرا دیتا۔

حالات کے سدھرنے کی رفتار بڑی خوش آیند تھی۔ ہند اور حیدرآباد کے مابین فساد کی سب سے بڑی جڑ فی الحال بڑی آسائش اور اطمینان سے کٹ چکی تھی۔ قائد اعظم نے دوران گفتگو مجھ سے بلاشبہ دو مرتبہ پوچھا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے مجوزہ طریق پر اگر ہم تحفظات قبول کرنے سے انکار کر دیں تو ہند اور حیدرآباد کی باہمی مفاہمت کے امکانات روشن ہو جائیں گے؟ قائد اعظم کا تکرار بے معنی نہ تھی مگر میں اپنی ہی خوش فہمیوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ لہٰذا کہا کہ جی ہاں! مجھے قوی امید ہے۔“ چنانچہ بات ختم ہو گئی۔ اجلاس کے اختتام پر قائد اعظم اپنے کمرے میں گئے اور چند لمحوں کے لیے کرسی پر دراز ہو گئے۔

کتنا فرق ہے ان دونوں جگہ کے ماحول میں! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ یہاں ذہنی سکون ہے۔ ہر طرح کی بے تکلفی ہے اور کسی کام میں انصاف کا دامن نہیں چھوٹتا۔ مگر دہلی میں انسان سر سے پاؤں تک خوف اور شکوک میں مبتلا رہتا ہے۔ آدمی سوچے تو کتنی بڑی بات ہے۔ یہ کہ ایک نیا ملک، جس کا ابتدائی نظم و نسق بھی ابھی تک درست نہیں ہو سکا جو تعمیر و ترقی کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ جسے اپنی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیسے پیسے کی ضرورت ہے۔ خود برضا و رغبت حیدرآباد کے مفاد کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر وہاں دہلی میں ہر شخص کے لب پر یہی سوال ہے کہ دیکھیں کونسا چرکا حیدرآباد کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے اور کب اس کا تار نفس ٹوٹتا ہے۔

نہ جانے کتنے عرصے کے بعد وہ شام میں نے صحیح معنوں میں بے فکری سے گزاری۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے اپنی رہائش گاہ پر مجھے عشائیہ میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے قائد اعظم سے اجازت چاہی تو اس مشفق و فیاض میزبان نے بخوشی اجازت دے دی۔ وہاں پر لیاقت علی خاں اور دوسرے وزراء بھی شریک تھے کسی کے چہرے پر دو کروڑ روپے کے نقصان کا کوئی تاثر نہ تھا۔ یہاں تک کہ وزیر

خزانہ کے چہرے پر بھی۔ انھیں فکر تھی تو اس بات کی کہ بھارت اور حیدرآباد کی باہمی مفاہمت کی جلد سے جلد کوئی صورت پیدا ہو جائے اور حیدرآباد اپنی روایات، اپنی ثقافت اور سب سے بڑھ کر اپنی فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھ سکے، جو گذشتہ کئی صدیوں سے برقرار ہے۔ اس اجتماع میں بیرونی ممالک کے سفراء اور دوسرے معززین کی خاصی تعداد تھی ان میں سے بہت سے حضرات کسی زمانے میں حیدرآباد میں رہ چکے تھے اور ہر ایک کے پاس خوشگوار یادوں کا کثیر سرمایہ تھا۔ بیرونی ملکوں کے جن جن سفیروں سے میرا تعارف کرایا گیا انھوں نے حیدرآباد کی بہبودی اور میری کامیابی کی تمنا کی۔

جب حیدرآباد سے متعلقہ مسائل میری توقع سے بھی جلد طے ہو گئے تو میں نے موقع غنیمت جان کر قائد اعظم اور دوسرے پاکستانی رہنماؤں سے مسئلہ کشمیر پر گفتگو شروع کی۔ یہ گفتگو عصرانہ اور پھر عشائیہ کے بعد خاصی دیر تک جاری رہی۔ عشائیہ کے بعد لیاقت علی خاں بھی غلام محمد کے ہمراہ آ گئے اور باتوں میں شریک ہو گئے۔ کئی رات تک ہمارے درمیان تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ جب سب اٹھنے لگے تو قائد اعظم نے مجھ سے کہا کہ آپ تھوڑی دیر اور بیٹھئے۔ میں بیٹھ گیا اور پھر مسلسل دو گھنٹوں تک وہ میرے ساتھ باتیں کرتے رہے میری تجویز کا لب لباب یہ تھا کہ جموں کا علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے اور باقی ریاست کشمیر میں یو۔ این۔ او کی زیر نگرانی اس سوال پر استصواب کرایا جائے کہ اہل کشمیر پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں؟ جب تک انتخابات کے نتائج نہ نکل آئیں، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں کا انتظام سنبھالے رکھیں۔ میری ایک تجویز یہ بھی تھی کہ پاکستان اور بھارت کی فوجیں اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں سے اقوام متحدہ کے مبصرین کی نگرانی میں مکمل طور پر پسپا ہو جائیں۔ اور فریقین کی ایک مختصر سی جمعیت امن عامہ کی حفاظت کے لیے موجود رہے۔ اس مختصر جمعیت کی مقدار اور اختیارات کا خاکہ اقوام متحدہ کے مقرر کردہ غیر جانبدار فوجی ماہرین کو فی الفور مرتب کر لینا چاہیے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد میں زیادہ تر ہندوستان کی حمایت کرتا رہا۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کہنے لگے کہ اصولی طور پر وہ جموں کو استصواب سے مستثنیٰ کرنے کو تیار نہیں لیکن اگر راقم الحروف کے خیال میں اس تجویز پر ہندوستان کا ردعمل خوشگوار ہو گا تو اسی تجویز کی بنیاد پر بات آگے چلائی جائے۔ میرے نزدیک یہ تجویز بڑی ہی معقول اور منصفانہ تھی اور مجھے یقین تھا کہ ہندوستان بھی کسی مناسب اور باعزت حل کا دل سے خواہشمند ہے۔ اس لیے اسے میرے اجمالی خاکے پر متفق ہونے سے کوئی گریز نہ ہو گا۔ بعد ازاں فریقین مزید تفصیلات خود طے کر لیں گے۔

قائد اعظم کو شب بخیر کہنے کے بعد جب میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ لیاقت علی اور غلام محمد ابھی تک میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم تینوں طلوع صبح تک مسئلہ کشمیر کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیتے رہے۔ بالآخر انھوں نے مجھے الوداع کہہ کر ذرا آنکھ جھپکنے کی مہلت دی۔ میں روانگی سے پہلے صرف گھنٹہ بھر آرام کر سکا۔ کراچی میں میرا قیام مشکل بیس گھنٹے تک رہا۔ جب میں ہوائی اڈہ پر پہنچا تو طیارے کا عملہ میرے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانے کے لیے بے چین تھا کہ میرا مشن کہاں تک کامیاب رہا۔ جب انھوں نے نقاہت کے باوجود میرے چہرے پر بشاشت کے آثار دیکھے تو خوشی سے پھولے نہ سمائے پائلٹ کہنے لگا کہ پرواز میں انشاء اللہ کسی قسم کی دقت نہ ہو گی کیونکہ موسم بہت خوشگوار ہے۔ کراچی میں سونے کی مہلت جو نہ ملی وہ عرض کر چکا ہوں چنانچہ انجن کی گھن گھن اور بھنبھناہٹ کے درمیان میں خواب کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا

کہ طیارہ زمین پر اترنے کے لیے دہلی کی فضا میں چکر لگا رہا ہے۔

دہلی کے ہوائی اڈے پر بہت سی بے قرار نگاہیں میرے لیے منتظر تھیں۔ احباب و رفقائے کار کے علاوہ اخباری نمائندوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ یہ سب مجھے گھیرنا چاہتے تھے۔ بیشتر کو میرے سفر کے محرکات کا پتہ چل گیا تھا۔ تاہم وزارت اطلاعات کی ہدایات کے تحت وہ زبان نہیں کھولتے تھے۔

کراچی روانہ ہونے سے قبل میں نے نہرو، پٹیل بلکہ ماؤنٹ بیٹن سے بھی مسئلہ کشمیر پر سرسری گفتگو کی تھی اور ان سب نے مسئلے کے مناسب حل کے لیے میری خدمات کو قبول کر لیا تھا۔ ۴ مارچ ۴۸ء کو دہلی پہنچنے کے چند گھنٹے بعد ماؤنٹ بیٹن سے میری ملاقات ہوئی۔ جب اُسے بتایا کہ میں نے حکومت پاکستان کو معاہدہ جنگ بندی کے دوران حیدرآباد کے عطا کردہ تمسکات قبول نہ کرنے پر آمادہ کر لیا ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگا حکومت ہند کو یہ دھڑکا کھائے جا رہی تھی کہ کہیں حکومت پاکستان ان تمسکات کو بھارتی منڈی میں صرف کر کے بھارتی مالیات کو درہم برہم نہ کر دے۔ اس خبر اور معین نواز جنگ کے حیدرآباد کرنسی آرڈیننس میں ترمیم کرنے کے وعدے پر ماؤنٹ بیٹن نے یقین ظاہر کیا کہ حکومت ہند بے تامل و حجت تمام پابندیاں اٹھا لے گی اور حیدرآباد کا وہ تمام مال جو ہندوستان کی بندرگاہ پر پڑا ہے بآسانی حیدرآباد پہنچ جائے گا۔ مزید برآں جنگ بندی کے تحت دی جانے والی اسلحہ اور گولہ بارود کی کھیپ اور دیگر اشیائے ضرورت کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔

اس کے بعد میں نے ماؤنٹ بیٹن کو مسئلہ کشمیر پر پاکستانی رہنماؤں کے خیالات سے مطلع کیا اور وہ فارمولا پیش کیا جس کی بنیاد پر پاکستانی راہنماؤں سے گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں یہ حل انتہائی منصفانہ ہے اور اسی میں دونوں متحارب ملکوں کی نجات ہے۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن کے نزدیک یہ امر مشکوک تھا کہ بھارتی رہنما کسی ایسی تجویز پر متفق ہوں گے جو کشمیر میں دونوں فریقوں کے زیر نگرانی استصواب رائے پر مشتمل ہو کیونکہ کسی حل کی تلاش سے پہلے ان کا اصرار و مطالبہ یہ تھا کہ پاکستانی افواج و قبائل کو وادی کشمیر سے واپس بلا لیا جائے پھر بھی ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ میں بھارتی رہنماؤں کو اس مسئلہ پر بات کر کے آپ کو ان کا ردعمل بتاؤں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی نصیحت کر دی کہ آپ اس سلسلے میں بھارتی رہنماؤں سے براہ راست کوئی گفتگو نہ کیجیے کیونکہ ایک عرصے کی لے دو کے بعد اب حیدرآباد کے معاملات سلجھنے کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھارتی راہنماؤں کے دل میں بیجا شکوک و شبہات راہ پا جائیں اور یہ معاملہ چوپٹ ہو جائے۔ پھر اس نے ذرا کھل کر بات کرتے ہوئے کہا کہ اس قضیہ کو نپٹانے کے لیے آپ نے جو راہ اختیار کی ہے وہ بھارتی لیڈروں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس لیے حیدرآباد کے مفاد کے پیش نظر یہی بہتر ہے کہ آپ مزید سرکھپائی نہ کریں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دس ماہ بعد ہندوستان نے [illegible] یہی شرائط تسلیم کر لیں۔ اگرچہ ان پر عمل کرنے کی توفیق کبھی نہ ہوئی، لیکن اس دوران میں لاتعداد انسان لقمۂ اجل بن گئے، بے شمار گھر ویران ہو گئے اور بھارتی خزانے کو کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

کراچی سے میری واپسی پر ہندوستان اور حیدرآباد کے نمائندوں کا ایک رسمی اجلاس ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ یہ پہلی اور آخری تقریب تھی جس کی فضا میں تنفر و تحقیر کی بو باس نہ تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس میں قصیدہ خوانی کا حق ادا کر دیا۔ اور جی بھر کے

حیدر آباد کے وفد کی حمد و ستائش کی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت ہند فی الفور معاہدہ جنگ بندی کی تمام شرائط کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گی۔

اجلاس میں بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جائے جس کا خاکہ والٹر مانکٹن تیار کرے۔ اور جس میں معاہدہ کے اہم نکات مندرج ہوں۔ بہرکیف میں نے حکومت ہند کے اس التماس کو قبول کر لیا کہ عوامی احساسات کے پیش نظر اس اعلامیہ میں حیدر آباد کو اسلحہ اور گولہ بارود کی سپلائی کا کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ اجلاس نہایت خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔ حیدر آباد کے وفد کے اراکین نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ یہی حال ہندوستانی اراکین کا تھا۔ سب کا تاثر یہی تھا کہ ہند اور حیدر آباد کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ مانکٹن نے سوچا کہ معاہدہ سے متعلقہ شرائط کا ایک چھوٹا سا خاکہ تیار کر کے دونوں حکومتوں کی طرف سے شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ ملکی اور بیرونی اخبارات بڑی بے تابی سے ان سرگرمیوں کا پتہ لگانے کی تاک میں ہیں۔ چنانچہ مانکٹن نے اعلامیہ کا ایک مختصر خاکہ مرتب کر لیا۔

مانکٹن کے تیار کردہ مشترکہ اعلامیہ کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

> "ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل کی زیر صدارت حکومت ہند اور حکومت حیدر آباد کے نمائندوں کے درمیان گذشتہ کئی روز سے مذاکرات جاری تھے۔ یہ مذاکرات انتہائی دوستانہ ماحول میں ہوتے رہے۔ بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کے سلجھاؤ پر منتج ہوئے۔"
>
> "جہاں تک حیدر آباد اور پاکستان کے مابین کفالتوں کے تبادلہ کا تعلق ہے حکومت حیدر آباد حکومت پاکستان سے یہ درخواست کرنے پر رضامند ہو گئی ہے کہ ہندوستان اور حیدر آباد کے باہمی معاہدہ جنگ بندی کی میعاد گزر جانے تک وہ مذکورہ کفالتوں کو بین الاقوامی منڈی میں صرف نہ کرے۔ اور جہاں تک حالیہ کرنسی آرڈیننس کا سوال ہے۔ حکومت حیدر آباد اس بات پر بھی آمادہ ہے کہ مذکورہ آرڈیننس میں ایک ترمیم کے ذریعہ ہندوستانی مسافروں کو ریاست کی حدود میں سے گزرتے وقت اپنی جائز ضروریات کے لیے ہندوستانی کرنسی استعمال کرنے کی اجازت عطا کرے۔ دوسری جانب حکومت ہند معاہدہ بندی میں مندرج تمام شرائط کو بروئے کار لانے پر رضامند ہے۔ خصوصاً ریاست میں مشینری، سامان نقل و حمل اور دیگر اشیائے ضرورت کی درآمد پر سے تمام پابندیاں اٹھا لینے پر آمادہ ہے۔ مشترکہ دلچسپی کے دوسرے تمام مسائل میں بھی دونوں حکومتیں باہمی اتحاد و تعاون سے عمل کریں گی۔"

اعلامیہ کا یہ مسودہ گورنر جنرل کے انتہائی معتمد سیکرٹری ارسکن کرم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی روداد کے عین مطابق تھا۔ ارسکن نے مانکٹن کے مسودے کو دیکھ کر حرف بحرف درست قرار دیا تھا۔ حکومت ہند نے درخواست کی کہ اعلامیہ میں اسلحہ اور گولہ بارود کی رسد کے متعلق حکومت ہند کے وعدہ کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب یہ خاکہ میرے پاس لایا گیا تو میں نے مانکٹن سے خواہش ظاہر کی کہ اس کی تاثیر میں اضافہ کے لیے اسے زیادہ جذباتی بنا دیا جائے۔ کیونکہ اس اعلامیہ کی حیثیت ہند اور حیدر آباد کے تعلقات میں سنگ میل کی ہے۔ مانکٹن کو میری رائے سے اختلاف تو نہ تھا۔ بہرکیف اس کا خیال تھا کہ اعلامیہ میں زیادہ سے زیادہ محتاط

زبان استعمال ہونی چاہیے چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ یہ خاکہ حکومت ہند کی رسمی منظوری کے لیے وی پی مینن کے پاس بھیج دیا گیا اور ہم لوگوں نے حیدرآباد کو واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس وقت حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل نے ایک شاندار عشائیہ ترتیب دیا جس میں حکومت ہند کے بہت سے وزراء و افسران بالا اور خارجی ممالک کے سیاسی مندوبین کو دعوت دی گئی۔ نہرو نے حسب معمول دعوت میں شرکت سے انکار کر دیا۔ مگر دوسرے مدعوین میں سے بیشتر نے دعوت قبول کر لی۔ حیدرآباد ہاؤس کی فضا عمدہ خوشبوؤں سے معمور ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں کے بعد تھکے ماندے عملے کو اطمینان کا سانس نصیب ہوا تھا۔ ہمارا ایک انڈر سیکرٹری جو اعلامیہ کا مسودہ دے کر وی پی مینن کے پاس گیا تھا۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ میں حیران تھا کہ خدا جانے کیا بات ہوئی ہے جو وہ ابھی تک نہیں پلٹا۔

> "مہمانوں کی گہما گہمی جب اپنے عروج پر آ گئی تو وہ مجھے بوکھلایا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے کے اضطراب نے دور ہی سے میرے دل کو مضطرب کر دیا۔ میں پارٹی چھوڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ اور پوچھا کیا بات ہوئی؟ تو اس نے گلوگیر آواز میں کہا — "غضب ہو گیا! جب میں مسودہ لے کر مینن کے پاس پہنچا۔ تو اس نے معمولی سی کانٹ چھانٹ کی۔ پھر نائب وزیر اعظم پٹیل نے خاصا رد و بدل کیا۔ لیکن جب یہ نہرو کے ہاتھ میں پہنچا تو اس نے اس کی صورت ہی مسخ کر دی اور اب یہ مسودہ اپنی موجودہ شکل میں حیدرآباد کے لیے قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا۔"

— میں نے جھنجھلا کر کہا کہ مسودہ تو حرف بحرف مذاکرات کی روداد کے مطابق تھا۔ اس نے جواب دیا کہ نہرو اور پٹیل کو یہ بات بار بار بتائی گئی مگر وہ اسی پر مصر رہے کہ یا تو اعلامیہ ان کے تیار کردہ خاکے پر مبنی ہو یا پھر سرے سے جاری ہی نہ کیا جائے۔ اس غیر متوقع چرکے سے میں بوکھلا سا گیا۔ مجھے اصل تشویش مسودے میں کانٹ چھانٹ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس شیطنت کی بنا پر تھی جو اس کانٹ چھانٹ کے پس پردہ کارفرما تھی۔ میں نے مانکٹن اور دوسرے رفقاء کو ایک طرف لے جا کر فوراً مشورہ کیا۔ اور نہرو کی کانٹ چھانٹ کو قدرے معتدل بنا کر مسودہ کو نظر ثانی کے لیے مینن کے پاس بھیج دیا۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ یہ بڑا ظلم ہو گا اگر محض اعلامیے کے الفاظ میں ردو بدل کو بہانہ بنا کر گزشتہ کئی روز کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا جائے۔ میں نے مانکٹن کو سمجھایا کہ ہم مسودے کو دوبارہ کچھ اس طرح سے مرتب کر دیں کہ ایک حد تک نہرو کی بھی تسلی ہو جائے اور ہماری بھی شرم رہ جائے لیکن ہندوستان کے فرعون مزاج ڈکٹیٹر اپنے ترمیم شدہ مسودے میں ایک لفظ کا رد و بدل کرنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ ہمیں بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ دیا گیا کہ مشترکہ اعلامیے کے مندرجات بالکل وہی ہوں گے جو پنڈت نہرو چاہتے ہیں ورنہ کسی اعلامیے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہرو ہم سے جو کچھ منوانا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کی کوئی کمزور سے کمزور حکومت بھی نہیں مان سکتی اور اگر مان لے تو اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ سکتی۔ نہرو کے ترمیم شدہ مسودے کی عبارت درج ذیل ہے:۔

> "ہندوستان کے گورنر جنرل کی زیر صدارت، حیدرآباد اور بھارت کے نمائندوں کے درمیان گزشتہ کئی روز سے مذاکرات جاری تھے۔ یہ مذاکرات فی الحال کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچے۔ بہر کیف حیدرآباد وفد اس ماہ کے آخر میں مذاکرات ختم ہونے پر واپس چلا جائے گا۔"

جہاں تک حیدر آباد اور پاکستان کے مابین کفالتوں کے تبادلے کا تعلق ہے حکومت حیدر آباد نے یقین دلایا ہے کہ پاکستان کو معاہدہ جنگ بندی کے دوران یہ کفالتیں استعمال کرنے سے منع کر دیا جائے گا۔ حکومت حیدر آباد نے اس بات پر بھی رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ وہ حکومت ہند کے مشورہ کے بعد حالیہ کرنسی آرڈیننس میں مناسب ترمیم کر دے گی۔ معاہدہ جنگ بندی میں درج شدہ مشترکہ دلچسپی کے امور پر دونوں حکومتیں پوری ہم آہنگی سے کام کریں گی۔

غور فرمایئے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم یہ معصومانہ اور مبنی بر حقیقت الفاظ بھی برداشت نہ کر سکا کہ مذاکرات دوستانہ ماحول میں جاری رہے۔ پھر ہر وہ بات جس پر حیدر آباد نے رضامندی ظاہر کی تھی یا پسپائی اختیار کی تھی۔ اسے نمایاں طور پر درج کیا گیا مگر حکومت ہند نے جو وعدے کیے ان کو سرے سے غتربود کر دیا گیا۔ اس حرکت کے پس پردہ خواہ کچھ ہو۔ مگر اتنی سی بات بالکل واضح تھی کہ بھارتی نیتاؤں کی نیتوں میں فتور تھا۔ اس فتور کے اصل خد و خال کچھ عرصہ بعد تو بالکل ننگے ہو گئے۔ چنانچہ پنڈت نہرو نے اپنی ترمیمات پر نظر ثانی کرنے کی تمام درخواستیں رد کر دیں تو میں نے مجوزہ اعلامیہ میں فریق بننے پر معذوری ظاہر کی۔ اور انجام کار یہ فیصلہ ہوا کہ کسی اعلان و بیان کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔

حیدر آباد کے رندی کی کوشش کا اس بری طرح جنازہ نکلنے پر نہرو اور پٹیل کی جان میں جان آ گئی۔ بیچارے ماؤنٹ بیٹن اور مانکٹن جن میں مؤخر الذکر براہ راست مذاکرات کا اہتمام کر رہا تھا، کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ مانکٹن اس نتیجہ پر پہنچا کہ ماؤنٹ بیٹن اگرچہ حکومت ہند کے ایما پر مذاکرات کی صدارت کر رہا تھا۔ تاہم اس کے اپنے بس میں کچھ نہ تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس موضوع پر نہرو یا پٹیل سے بات بھی کرے۔

بعض لوگوں کو شاید یہ خیال پیدا ہو کہ بھارتی نیتاؤں کے رویہ سے ماؤنٹ بیٹن کو ذاتی طور پر جو کوفت اٹھانی پڑی اس کی بنا پر اس نے کم از کم آئندہ مذاکرات میں فریق بننے ہی سے انکار کر دیا ہو گا۔ کیونکہ اس نے الف سے ے تک دیکھ لیا تھا۔ کہ بھارتی نیتاؤں کی نہ تو نیتوں میں نیکی ہے نہ روش میں راستی۔ مگر ماؤنٹ بیٹن اتنی حساس مٹی کا نہیں بنا تھا۔ پھر اسے تو بھارتی راہنماؤں کی خدمت کرنی تھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس سے کیا خدمت لی جاتی ہے۔ اس کے اسباب کیا تھے یہ خود اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ تاہم مانکٹن شرم کے مارے ڈوبا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ نجانے میرے ممتاز ہم وطن کو کیا ہو گیا ہے۔ خود میری یہ پختہ رائے ہو گئی تھی کہ اب براہ راست بھارتی نیتاؤں ہی سے دو دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ اور ماؤنٹ بیٹن کی آڑ بیچ میں سے ہٹ ہی جائے تو بہتر ہے۔

حیدر آباد ہاؤس کے عشائیہ کی چہل پہل اس طرح برقرار رکھی گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں مصنوعی قہقہے لگاتا اور سیاسی حلقوں کے مخصوص مزاج میں حصہ لیتا رہا۔ تاہم دل یہ چاہتا تھا کہ کاش! چند لمحوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

چار مارچ۔ یہ ایک دن حیدر آباد کی سیاسی فضا کا کتنا پر کیف اور خوشگوار دن تھا۔ ایک وقت یوں محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ ہر قدم پر کامیابی پاؤں چوم رہی ہے اور ہند اور حیدر آباد کے باہمی مراسم کا ایک نیا باب کھلنے والا ہے مگر شب کی سیاہیاں پھیلتے ہی ہر چیز بدلنے لگ گئی تھی۔ کہیں یہ سوچا سمجھا منصوبہ تو نہیں تھا کہ حیدر آباد کتنے پانی میں ہے اور کس حد

تک جھک سکتا ہے۔ اگر یوں ہی تھا تو یہ ناٹک بڑی چابکدستی سے رچایا اور حیدر آباد کو خوب انگلیوں پر نچایا گیا تھا۔ حیدر آباد نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مگر اس کے بدلے اس سے جو عہد باندھا گیا اس کی قیمت اتنی بھی نہیں تھی جتنی ردی کاغذ کے اس ٹکڑے کی جس پر وہ عہد لکھا گیا تھا۔ کے ایم منشی حیدر آباد میں بیٹھا بڑی بے قراری سے وفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ اسے مذاکرات میں شریک نہیں کیا گیا — چنانچہ وہ اس تاک لگائے بیٹھا تھا کہ دیکھیں ان مذاکرات کی ناؤ کب ڈوبتی ہے۔ وفد کی واپسی کے جلد ہی بعد وہ بڑی کھلی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرے مجھے ملا اور بہت اتراتے ہوئے کہنے لگا کہ بھارت کا کوئی شخص اگر حیدر آباد کے گورکھ دھندے کو حل کرنا چاہے تو یہ اس کی بھول ہوگی۔ کیونکہ میرے سوا اس الجھن کو کوئی نہیں سلجھا سکتا۔ مجھے کسی ایرے غیرے نے نہیں خود گاندھی جی نے اس کام کے لیے چنا تھا۔ پھر ذرا دبی آواز میں جھلاتے ہوئے کہا۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ حیدر آباد کے نمائندوں کا بات بات پر دہلی کے چکر لگانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ جبکہ قصے کی کنجی دلکشا ساون میں پڑی ہے جو شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کنجی سے مراد اس کی اپنی ذات تھی۔ اب اس کے لہجے میں تناؤ تیور آ گئے اور یوں گویا ہوا کہ چار مارچ کی شام کو مجھے پتہ چلا کہ دونوں ملکوں کے مابین نزاعی مسائل پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے والا ہے تو میں نے اسی وقت دہلی کو ڈانٹ پلائی کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہو گیا تو میں فی الفور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا اور لوک سبھا کے سنگھاسن پر بیٹھ کے ایسی جنگ لڑوں گا کہ حکومت دہلی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

مجھے یقین تھا کہ میرا کہا ہوا رد نہیں ہو سکتا اور اس ڈانٹ کے بعد دہلی میں کسی کو کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اعلامیہ میں کچھ اس طرح کی کاٹ چھانٹ کی گئی کہ حیدر آباد کا وفد سر پکڑ کے رہ گیا۔ اب یہی چاہیے کہ ہند اور حیدر آباد کے تصفیے کے کے ایک ایک نکتے پر نئے سرے سے بحث شروع کریں۔ یہ آخری فقرہ اس نے بڑے محبت آمیز انداز میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ میرے اپنے گھر سے چند میل کے فاصلے پر دلکشا ساون میں بیٹھا ہوا یہ مہربان اتنی زور اور اتنی طاقت سے طنابیں کھینچ سکتا ہے۔ اور ٹیلیفون پر بیٹھا سب دہلی والوں کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ نہ ہی میں کبھی یہ سوچ سکتا تھا کہ ایک فرد واحد گورنر جنرل اور مرکزی وزراء کے سوچے سمجھے فیصلے کو بدل کے رکھ سکتا ہے۔ لیکن دہلی کی سیاست اس قدر پیچدار تھی کہ ہر لیڈر دوسرے سے خم کھاتا تھا اور اسے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کوئی سبھا یا اخبار میں اس کی پگڑی اچھال دے۔ خصوصاً اس لیے کہ اخبارات اور آل انڈیا ریڈیو کے جھوٹے اور بھیانک پراپیگنڈے کی بناء پر حیدر آباد عوام کے لیے ہوا بن گیا تھا اور لوگ حیدر آباد کے متعلق ہر قسم کی افواہ پر یقین کرنے کو تیار تھے۔

ان حالات میں منشی کے لیے ارباب دہلی کو آنکھیں دکھانا کوئی مشکل نہ تھا۔ میں اس پیش کش کو تامل میں ڈالنے پر مائل نہ تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر از سر نو تمام مسائل کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن معین نواز جنگ چاہتے تھے کہ یوں بھی کر کے دیکھ لیا جائے۔ نظام کو منشی کے ساتھ اس مجوزہ گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہ کھمبا نوچنے والی بات تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ارباب دہلی کی ہمارے ساتھ اس قدر بد سلوکی پر اسے کوئی تعجب نہ تھا۔ مگر ماؤنٹ بیٹن کی کارگزاریوں پر وہ ضرور حیرت زدہ تھا۔ قدرے سوچنے

کے بعد اس نے مونٹ بیٹن کو ایک ذاتی مکتوب لکھنے کا فیصلہ کیا جس میں بیان کیا کہ حکومت ہند کو مطمئن کرنے کی پہلی تمام کوششوں کے باوصف میں پھر آپ کی توجہ عالی اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ ریاست کی ناکہ بندی ختم کر دی جائے اور معاہدہ جنگ بندی کی شرائط کو پورا کیا جائے۔ مکتوب کی آخری سطور یہ تھیں: "اگر حضور والا میری ان گزارشات کو رد بعمل لا سکتے ہیں تو یقین جانیں کہ مجھے اپنی ان کوششوں میں کبھی کوتاہ دست نہیں پائیں گے۔ جن کا خاکہ میرے وزیر اعظم نے پیش کر دیا ہے۔ اور جن کا مدعائے مقصود یہ ہے کہ حیدر آباد کے بارے میں ہندوستان کے پاس شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔"

۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو دوپہر کے قریب مجھے کے ایم منشی کا ٹیلیفون آیا، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ چند دن پیشتر ہندوستان اور حیدر آباد کے مابین متنازعہ فیہ مسائل پر میرے اور ان کے درمیان سمجھوتہ ہو جانے کے بعد وہ دہلی گیا تھا۔ مجھے یہ زعم تھا کہ اس سمجھوتے پر حکومت ہند بلا حیل و حجت مہر تصدیق ثبت کر دے گی اور وہ جلد ہی واپس لوٹ کر دیگر مسائل پر توجہ دے سکے گا۔ حیدر آباد سے روانگی کے وقت اس نے اس سمجھوتے کو اپنی سیاسی فتح قرار دیا تھا۔ جب اسے دہلی میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے تو میری رہی سہی امیدیں بھی ٹوٹنے لگیں۔ واپسی کے جلد ہی بعد اس نے ٹیلیفون پر مجھ سے ملنے کے لیے بڑی بے قراری ظاہر کی۔ میں نے اسے فوراً چلے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہنچ گیا۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے چہرے پر ہیجان اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔ میں نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جائے۔ رسمی آداب و نیاز کے بعد اس نے جیب میں سے ایک لمبا سا سربمہر لفافہ نکالا اور بڑے ہی پُرتصنع انداز میں کہا: "میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل، اپنی حکومت کے زیر ہدایت، یہ مراسلہ آپ کو بحیثیت وزیر اعظم حیدر آباد پیش کر رہا ہوں۔" منشی کی اس حرکت سے مجھے ایک دھچکا سا لگا لیکن جلد ہی اپنے اعصاب پر قابو پا کر میں نے مراسلہ تھام لیا اور کہا "کہیں یہ ہندوستان کی طرف سے الٹی میٹم تو نہیں؟" اس نے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر سر کو جنبش دی اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے لفافہ چاک کر کے مراسلے کے مندرجات پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ مراسلہ جو وی۔ پی۔ مینن نے حکومت ہند کی طرف سے بھیجا تھا ذاتی طور پر میرے نام تھا۔ اسے الٹی میٹم تو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس میں مذکورہ شرائط کی تکمیل کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ تاہم یہ ایک قسم کی تنبیہ تھی۔ جس میں وہ تمام مطالبات دہرائے گئے تھے جن پر دہلی کے مذاکرات کی بنیاد تھی۔ مزید برآں بہت سے نئے مطالبات جو اس سے پیشتر کسی مراسلت یا مذاکرات میں زیر بحث نہیں آئے تھے، شامل کر دیئے گئے تھے اور ان تمام مطالبات کو معاہدہ جنگ بندی کے تحت پوری کی جانے والی حیدر آباد کی ذمہ داریاں قرار دیا تھا۔ ان اضافہ شدہ مطالبات میں سر فہرست ریاست کی واحد مسلم سیاسی تنظیم، اتحاد المسلمین پر پابندی اور اس کی تمام شاخوں کو بند کرنے کا مطالبہ تھا۔

اس تہدیدی مراسلے کو پڑھ کر میں نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا بلکہ منشی سے کہا کہ چائے کی ایک پیالی پی کر جائیے گا۔ "چلیے اسی بہانے رسمی اور سرکاری سطح سے ذرا ہٹ کر بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔" دوران گفتگو منشی نے انتہائی صاف گوئی سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ:

> بھارت اگرچہ غیر مذہبی مملکت ہونے کا دعویدار ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنیادی اور لازمی طور پر یہ ایک ہندو ریاست ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے ارباب اقتدار

> خواہ وہ کتنے ہی وسیع النظر کیوں نہ ہوں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ عین قلب ہند میں حیدرآباد جیسا مضبوط و مستحکم اسلامی مرکز قائم ہو۔ اس پر ستم یہ کہ ریاست کی بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے کسی نہ کسی مسلم حکمران کے زیر نگین رہے ہیں۔ میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہتا ہوں کہ یہ کانٹا سب کے حلق میں اٹکا ہے اور جب تک حیدرآباد کو بھارت میں کامل جذب نہیں کر لیا جاتا یہ کانٹا کھٹکتا ہی رہے گا۔"

بھارتی رہنما جو قضیہ کی اصل جڑ پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچاتے رہے ہیں، خوش قسمتی سے اب حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں۔" "تو کیا وہ کسی مسلح تصادم کے لیے تیار ہو رہے ہیں؟" ——— میرے اس استفسار پر منشی نے کہا۔ "اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے حکام تصادم سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس طرح سے پلک جھپکتے میں معاملہ نپٹ جائے گا۔

> مسلح تصادم کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ پانچ سات ہزار مسلمان اور اس کے لگ بھگ ہندو مر جائیں گے لیکن اگر ان داموں حیدرآباد خریدا جا سکے تو سودا مہنگا نہیں۔ بھارت نے تو بلا وجہ کشمیر کی مصیبت مول لے رکھی ہے اور حیدرآباد کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ میری رائے میں بھارت کو کشمیر سے گلو خلاصی کرا کے پوری تندہی سے حیدرآباد کے پیچھے پڑنا چاہیے۔"

بھارتی فوجوں کے لیے حیدرآباد کی فتح چند دن کی بات ہے اور جب حیدرآباد دبا لیا گیا تو جنگ کشمیر سے بددل ہونے والے ہمارے جوانوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ بھارت نے فوجی کارروائی میں اگر مزید تاخیر کی تو عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد حیدرآباد اتنی تیاریاں کر لے کہ بھارت کے لیے ایک مصیبت بن جائے۔ پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ حیدرآباد دنیا بھر کی ہمدردی حاصل کر لے اور اس بہانے مجلس اقوام متحدہ کو دخل اندازی پر اکسانے میں کامیاب ہو جائے جس سے مسئلہ اتنا الجھ جائے کہ حکومت ہند کے بس کی بات نہ رہے۔"

ظاہر ہے کہ منشی کی اس بے باکانہ گفتگو کا مقصد فقط مجھے حکومت ہند کی متشددانہ روش سے مرعوب اور اس بات کا قائل کرنا تھا کہ بھارت اب عسکری اقدام پر تل گیا ہے۔ مگر میں نے یہ جواب دے کر اس کی امید پر پانی پھیر دیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے "میں حیدرآباد کی بے طاقتی سے پوری طرح باخبر ہوتے ہوئے بھی کسی گھٹیا دباؤ کے آگے سر جھکانے کی بجائے مرتے دم تک لڑنا پسند کروں گا ——— اور یہ خیال رہے کہ میں جو کہتا ہوں وہی کیا کرتا ہوں۔" اس جواب پر منشی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ——— "آپ فکر نہ کیجیے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر آپ اپنا رویہ ذرا سا نرم کر لیں تو عین ممکن ہے کہ ساری کایا پلٹ کے بعد بھی وزارت عظمیٰ آپ ہی کے ہاتھ میں رہے!"

اس گفتگو کی فضا اگرچہ بہت ناگوار تھی پھر بھی ہم ہنستے ہنستے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ میں نے فوراً نظام کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ میں جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔ چند لمحے بعد نظام کے ہاں پہنچ کر میں نے منشی کی ساری گفتگو من و عن سنا دی۔ اور دہلی سے آیا ہوا مراسلہ پیش کر دیا۔ قدرے سوچ کر نظام نے مجھے تلقین کی کہ اس گفتگو کو یادداشت کی صورت میں قلمبند کروں کیونکہ اسے یقین تھا کہ منشی اپنی اکثر باتوں سے مکر جائے گا۔ میں نے حسب ہدایت یادداشت قلمبند کر کے اس کی ایک نقل نظام کو بھیج دی۔

میں مانتا ہوں کہ یہ گفتگو غیر رسمی انداز میں ہو رہی تھی لیکن اس میں پہلی مرتبہ اتنی بے تکلفی سے بعض ایسے امور زیر بحث آئے تھے جن کا خاکہ محض حافظے میں محفوظ رکھنا کافی نہ تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ نظام نے اپنے ذاتی تبصرے کے ساتھ اس یادداشت کی ایک نقل مونٹ بیٹن کو بھیج دی تاکہ اُسے پتہ چل جائے کہ بھارتی رہنما جس انداز میں سوچ رہے ہیں وہ مونٹ بیٹن کی بار بار کی یقین دہانیوں سے قطعی مختلف ہے۔ مونٹ بیٹن کو یہ یادداشت پڑھ کر یقیناً کوفت ہوئی ہو گی۔ اس نے اسے نہرو کے حوالے کر دیا۔ منشی کے حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل منتخب ہونے پر مونٹ بیٹن ذاتی طور پر کبھی خوش نہ تھا۔ اور شروع ہی سے مختلف اندیشوں کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن اس میں اتنی جرأت کہاں کہ منشی کے خلاف کوئی کارروائی کرے جب کہ دوسرے تمام معاملات میں وہ اپنے عقائد و نظریات کو بھینٹ چڑھا کر بھی اپنے آقاؤں کا حکم بجا لاتا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب نظام کی توقعات کے عین مطابق منشی باز پرس ہونے پر بہت سی باتوں سے مکر گیا۔ یا پھر اس طرح آئیں بائیں شائیں کرنے لگا کہ "میرا مطلب یہ نہیں تھا"۔ میں نے اس سے ذرا مختلف انداز میں بات کہی تھی! پھر منشی نے مجھے بے جا طور پر کوسنا شروع کر دیا۔ کہ دیکھیے! ایک بے تکلف گفتگو کو جو رسمی اور سرکاری سطح سے بلند ہو کر کی جائے۔ ریکارڈ میں لے آنا کہاں کی شرافت ہے؟ مجھے آداب سیاست میں رخنہ اندازی پر اپنے جرم کا اقبال ہے اور یہ بھی اعتراف ہے کہ نظام کو مونٹ بیٹن کے پاس یادداشت نہیں بھیجنی چاہیے تھی۔ لیکن یہ محفوظ رہے کہ اس گفتگو کے وقفہ میں میرے کاندھوں سے شخصی ذمہ داری اور قوم کے سامنے جوابدہی کا بوجھ نہیں اتر گیا تھا۔ پھر یہ بھی پیش نظر ہے کہ بھارتی لیڈروں کے عزائم کی تصدیق ایک ایسے شخص کی زبانی ہو رہی تھی جسے بھارتی سیاسیات میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اب حیدرآباد کے کسی فرد کے دل میں حکومت ہند کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہمی باقی نہ تھی۔ اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ بھارت سے کسی منصفانہ حل کی امیدیں وابستہ کرنا خود فریبی ہے تاہم مجھے ابھی تک یقین نہ تھا کہ بھارت اس قدر جلد مسلح تصادم پر آمادہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کی حرکت سے بین الاقوامی سطح پر بہت سی الجھنیں پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ عالمی رائے عامہ کو بآسانی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

ہندوستان کے تہدیدی مراسلے کے جواب میں مانکٹن نے ایک انتہائی فصیح و بلیغ مکتوب لکھا جو اپریل ۱۹۴۸ء کے آغاز میں دہلی ارسال کر دیا گیا۔ حالات کے خدوخال کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد حکومت حیدرآباد نے اس مکتوب کے آخر میں اپنی انتہائی مخلصانہ آرزو ظاہر کی کہ جن شکوک و شبہات نے حکومت ہند کے دل میں جگہ پائی ہے وہ جس قدر جلد ہو سکے، دور ہو جانے چاہئیں۔ حیدرآباد نے اس ضمن میں اپنے تعاون اور مفاہمت کی پُر جوش پیش کش کی۔ اور لکھا کہ اگر حکومت ہند حیدرآباد کے ساتھ براہ راست گفت و شنید پر مائل نہ ہو تو معاہدہ جنگ بندی کی رُو سے کسی ثالث کے ذریعہ فیصلہ کرا لینا چاہیے۔ مجھے ذاتی طور پر یقین تھا کہ حکومت ہند ثالث کے تقرر پر کبھی رضامند نہیں ہو گی کیونکہ اس کا رویہ اتنا غیر معقول اور جابرانہ تھا کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص ایک لمحے میں اس کی تہ تک پہنچ سکتا تھا مگر یہی ایک آئینی راستہ تھا جس کی طرف ہندوستان کو دعوت دی جا سکتی تھی۔

اس رسمی مکتوب کے ہمراہ نظام نے مونٹ بیٹن کو ایک جذبات انگیز خط ارسال کیا۔ اس خط کے نمایاں نقوش درج ذیل ہیں:۔

"حیدرآباد میں موصولہ اطلاعات کی بنا پر میرا یہ قیاس غلط نہ ہو گا کہ آپ کی وزارت امور ریاست نے میرے وزیر اعظم کو جو

مواصلہ بھیجا ہے اس کی نوعیت الٹی میٹم کی سی ہے۔ اور یہ دوستانہ مراسم سے کھلا انحراف ہے۔ لہٰذا میں آپ سے آخری بار اپیل کرتا ہوں کہ اس صورت حال کے سدّباب کے لیے اپنے اثر و اختیار کو تصرف میں لائیے۔ اس میں شک نہیں کہ معاہدہ جنگ بندی کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا تعین بہت دشوار ہے اور یہ تحقیق بھی آسان نہیں کہ اس معاہدے کی رُو سے کن ذمہ داریوں کو دائمی حیثیت حاصل ہے پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ فریقین میں سے کسی کی سیاسی برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا ان امور کا تعین کسی معاہدے یا انتظامی تعامل کے تحت نہیں ہوا اور جو اول سے آخر تک باہمی تعلقات کا نتیجہ تھے۔ ان کی پابندی اب لازمی نہیں رہی بجا وہ ممکن ہے جو مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ لیکن جیسا کہ معاہدہ جنگ بندی میں مذکور ہے ان پیچیدگیوں کو ثالث کے تقرر کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد نظام نے تفصیلاً لکھا کہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے باہم جو عہد باندھا تھا حیدر آباد نے اُسے خوش اسلوبی سے نبھایا۔ مگر دوسری جانب اسلحہ اور گولہ بارود کی رسد کے سلسلے میں جو رویّہ اختیار کیا گیا وہ کتنا افسوس ناک تھا۔

"مجھے کوفت اس بات کی ہے کہ حکومت برطانیہ بڑی باقاعدگی سے مجھے حسب ضرورت اسلحہ فراہم کیا کرتی تھی مگر جولائی ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک میری فوج اور پولیس کو اسلحہ اور دیگر سامان دفاع سے محروم رکھا گیا ہے۔ میں نے آپ اور آپ کی حکومت کو مسلسل اس موضوع کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہنوز کوئی شنوائی نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ قیام امن عامہ اور فوج کی مناسب تربیت نہ ہونے کی بنا پر میں سخت آزردہ خاطر ہوں۔ پھر میں نے بارہا سر والٹر مانکٹن کی زبانی اپنے اس اندیشے کو آپ کے گوش گذار کیا ہے کہ حکومت برطانیہ کی یقین دہانیوں کے پیش نظر اگر میں خود مختار رہنے کو ترجیح دوں تو حکومت ہند مجھے مختلف حیلوں سے الحاق پر مجبور کرے گی۔ میری ریاست کا اقتصادی بائیکاٹ کرے گی اور اگر کوئی آڑ مل گئی تو میرے علاقوں پر جبراً قبضے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ آپ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء میں مجھے یہ الفاظ لکھے تھے: "مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یور ایگزالٹڈ ہائنس اس بات پر مشوش ہیں کہ موجودہ حالات میں الحاق نہ کرنے کا فیصلہ کہیں آئندہ ہندوستان کی نظر میں معاندانہ فیصلہ نہ قرار دے اور ریاست ناکہ بندی کی شکار نہ ہو جائے مگر میں اس بات پر بالکل مطمئن ہوں کہ نو آزاد ہندوستان اس قسم کا دباؤ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" پھر نظام قدرے تند لہجے میں یوں رقمطراز ہوا:

"مگر میں کوئی بات پسِ پشت رکھے بغیر یور ایکسی لینسی کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام یقین دہانیوں اور معاہدہ جنگ کے باوجود جب سے انگریز گئے ہیں۔ ریاست پر اقتصادی دباؤ میں روز بروز اضافہ کیا جا رہا ہے اور بلاشک و شبہ آج یہ دباؤ اپنی انتہا کو پہنچا ہے۔ حتیٰ کہ ادویات اور ہسپتالوں کے سامان ضرورت کے علاوہ کلورین تک روک لی گئی ہے۔ تاکہ اہل ریاست کو صاف پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ میرے پاس اس ناکہ بندی کی دستاویزی شہادتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بہت سے انگریز اور غیر ملکی لوگ جو اس دوران میں حیدر آباد آئے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ارباب اختیار میں سے بھی کسی نے اس ناکہ بندی کی سنجیدگی سے انکار نہیں کیا۔"

پھر نظام نے بہت تیکھے ہوئے انداز میں ماؤنٹ بیٹن کی توجہ اپنے مکتوب مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کی طرف مبذول کی جس میں زیادہ طور پر برصغیر ہند کی آئندہ سیاست میں حیدر آباد کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ نظام نے کھلے لفظوں میں خود مختار رہنے اور

دونوں نو زائیدہ مملکتوں میں سے کسی ایک میں شامل نہ ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے حیدر آباد کی آئینی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برطانیہ کو ان ذمہ داریوں کا احساس دلایا تھا جو گذشتہ روایات اور معاہدات کی رُو سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ نظام نے پُر زور الفاظ میں حکومت برطانیہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ برصغیر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت حیدر آباد کی منفرد حیثیت کو فراموش نہ کرے۔

اس تاریخی اور اہم ترین دستاویز کا آج برطانیہ کے نمائندے لارڈ مونٹ بیٹن کی طرف سے نظام کو یہ جواب موصول ہوا کہ نظام کا مکتوب حکومت برطانیہ کو ارسال کر دیا گیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب جواب موصول ہو جائے گا۔

بعد ازاں نظام نے مونٹ بیٹن سے اپیل کی کہ جس انداز سے ریاست پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس قضیہ میں فریق کی حیثیت اختیار نہ کریں۔ آج ہر طرف یہ افواہیں گرم ہیں کہ حیدر آباد کی سرحدات کے چاروں طرف بھارتی فوجیں بھاری تعداد میں پھیلا دی گئی ہیں۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ میں آپ کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اسی حکمت عملی پر اصرار کیا گیا تو نہ صرف حیدر آباد بلکہ تمام جنوبی ہندوستان کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نظام کے مکتوب کی آخری سطور اس قابل ہیں کہ انہیں من و عن یہاں درج کیا جائے:-

> ”انگریزوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر مجھے اس سختی سے جکڑ لیا کہ میری ریاست تاج برطانیہ کا جزو لاینفک ہو گی۔ کیا یور ایکسی لینسی اب مجھے اعتماد میں نہیں لیں گے؟ زور آور کے مقابلے میں کمزور کے اعتماد کو ٹھیس لگانا شاید وقتی طور پر کم نقصان دہ ہو لیکن انجام کار اس کا بدلہ ضرور ملا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یور ایکسی لینسی میرے جذبات و احساسات کے اس بے تکلف اور بے لوث اظہار پر مجھے معاف رکھیں گے۔“

مئی ۱۹۴۸ء کے آغاز میں مونٹ بیٹن نے ذاتی طور پر نظام کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ دہلی کے جانشینان جلال کی یہ بہت بھیانک سازش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ترکیب کارگر ہو گی۔ نظام بخوبی جانتا تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ دہلی چلا گیا تو وہاں سے تب ہی واپس آ سکے گا جب جہاں جہاں ضرورت ہو گی بغاوت کے حق میں اس سے دستخط کرا لیے جائیں گے۔ میں نظام سے ملاقات کے لیے گیا تو ملتے ہی اس نے مونٹ بیٹن کا دعوت نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خط پڑھتے وقت میرے تاثرات کا خاموشی سے جائزہ لیتا رہا۔ ابھی میں یہ خط ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے ایک اور کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ مونٹ بیٹن کے دعوت نامہ کا جواب تھا۔ میں نے جواب پڑھ کر کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ بظاہر نظام نے خود معاملہ پر اس قدر دماغ سوزی کی تھی کہ اُسے مزید تبصرے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن مجھے چونکہ کسی ترمیم و تخفیف کی کوئی گنجائش نظر نہ آئی تھی اس لیے خاموش ہو رہا۔

نظام نے اپنے جوابی خط میں انتہائی انکساری سے دعوت نامہ قبول نہ کرنے کی معذرت کی اور اس کے بجائے مونٹ بیٹن کو ہندوستان سے روانگی سے قبل حیدر آباد کا دورہ کرنے کی مستقل دعوت دے دی۔ اس سے پیشتر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مونٹ بیٹن کو حیدر آباد دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ مگر اس کے آقایان ولی نعمت اسے اجازت نہیں دیتے۔ جب نظام کا مکتوب دہلی پہنچا تو بھارتی نیتا تلملا اٹھے۔ انہوں نے اس پروپیگنڈے کی مہم شروع کی کہ نظام کے دائرہ اختیار میں اب کچھ نہیں رہا۔ اس کی

حیثیت اب محض رضاکاروں کے ایک قیدی کی سی ہے۔ رضاکاروں نے اس قید کا شکنجہ کسنے کے لیے حکومت حیدرآباد کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے اثرات اس قدر شدید تھے کہ مونٹ بیٹن نے حقیقتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنا ذاتی نمائندہ حیدرآباد بھیجا چنانچہ مئی کے وسط میں اس کا انتہائی معتمد معاون کیمپبل جانسن حیدرآباد آیا۔ اس شخص نے جنگِ عظیم دوم کے دوران برما اور بعض دیگر نازک مواقع پر مونٹ بیٹن کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ارباب دہلی کے اس زہرناک پروپیگنڈے نے مجھے بھی بہت بے چین کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں مونٹ بیٹن کے ایلچی کا خیرمقدم کیا تاکہ وہ خود سارے کوائف کا جائزہ لے کر مونٹ بیٹن پر اصلیت واضح کر دے۔ مگر نظام کے احساسات یکسر مختلف تھے۔ وہ پروپیگنڈے سے تو آزردہ تھا ہی اس بات سے بھی رنجیدہ ہو گیا کہ مونٹ بیٹن اس کے مکتوب کے بجائے اپنے ذاتی نمائندے کے ذریعے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اولین ردعمل تو یہ تھا کہ کیمپبل جانسن کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے مگر میرے اصرار پر وہ اس سے ملاقات پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے جب یہ التجا کی کہ آپ تنہا اس سے ملاقات کیجیے گا تو نظام نہ مانا اور کہا کہ راقم الحروف کا اس موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔ کیمپبل جانسن نظام سے ملاقات کا سنہری موقع ملنے پر بہت مسرور تھا مگر یہ سن کر اسے قدرے مایوسی بھی ہوئی کہ ملاقات کے دوران راقم الحروف بھی موجود ہوگا۔ کہنے لگا کہ مونٹ بیٹن نے مجھے اس امید پر بھیجا تھا کہ نظام مجھے تخلیہ میں ملاقات کا موقع دے گا۔

> "حیدرآباد میں مئی کی چلچلاتی دوپہریں بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں اور نظام مصنوعی تبرید یا فضابندی کا قائل نہیں چنانچہ جانسن کو نظام کی گرمئ گفتار اور تمازتِ آفتاب کو بیک وقت برداشت کرنا پڑا۔ اس دوپہر نظام بڑے جلال میں تھا کہ میں اتنے قریبی روابط کے باوجود انتہائی متحیر اور حواس باختہ ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نظام مدت سے مونٹ بیٹن تک اپنے جذبات و احساسات پہنچانے کی تاک میں تھا اور اب اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔"

ملاقات کے اختتام پر نظام نے راقم الحروف سے پوچھا کہ اس گفتگو کے متعلق تمہارا کیا تاثر ہے؟ میں نے جھجکتے ہوئے عرض کی کہ میرے خیال میں آپ کے جذبات ضرورت سے زیادہ شدید تھے۔ نظام نے مطمئن لہجے میں کہا کہ بالکل یہی میرا مقصد تھا اور اسی خاطر میں تمہارے موجود رہنے پر مصر تھا۔

اس کے بعد جانسن کئی روز تک عوام سے ملاقاتیں اور مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ کئی ایک سرحدی علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اور تباہی و بربادی کا بچشم خود نظارہ کیا جو بھارتی غنڈوں کی مسلح یورشوں کے سبب ان علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ بعدازاں اس کے دورۂ حیدرآباد پر بھارتی اخبارات کے ایک مخصوص طبقے نے شدید ردوقدح کی اور ذاتی نمائندہ بھیجنے کے متعلق مونٹ بیٹن کے اختیارات کو سختی سے چیلنج کیا گیا۔

جب کبھی مذاکرات یا گفت و شنید کا مرحلہ قریب آتا تو دہلی کے گوئبلز کوئی ایسا کرتب دکھاتے کہ ساری فضا میں سنسنی پھیل جاتی۔ اور ہر مرتبہ حکومتِ ہند کا ترجمان یہ رونا روتا کہ صورتِ حال ہمارے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے اس لیے بھارت کی مسلح افواج کی یورش سے بچنے کا واحد طریق یہی ہے کہ حیدرآباد بھارت سے الحاق کر لے۔ چنانچہ اس مرتبہ بمبئی، مدراس ایکسپریس پر بمبئی

غلط افسانہ تراشا گیا۔ یہ گاڑی حیدر آباد کے علاقے میں سے گزرتی ہوئی مدراس پہنچتی ہے۔ اس افسانہ کا تتمہ یہ تھا کہ حیدر آباد پولیس نے ہندوستانی فوج کے تین سپاہیوں کو ریاست میں روک لیا ہے۔ پھر ان دو واقعات کو بہانہ بنا کر وہ شور اٹھایا گیا کہ خدا کی پناہ! میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان واقعات کا منصوبہ محض میری آمد کے سلسلے میں تیار کیا گیا تھا یا نہیں، تاہم وی۔ پی۔ مینن کی پٹاری میں وحشت پھیلانے کا خاصا سامان تھا اور وہ بآسانی ہمارے ذہن نشین کر سکتا تھا کہ حکومت ہند حیدر آباد کے الحاق سے اب مزید بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اور فراعنۂ دہلی نے اب پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ یہ مہم بھی جلد ہی طے ہو جانی چاہیے۔ بعض دوسرے ذرائع سے مجھے پتہ چلا کہ چند روز قبل ہندوستانی افواج کو کشمیر کے محاذ پر بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اب ارباب دہلی اس تاک میں ہیں کہ کوئی ایسا کرتب دکھایا جائے جس سے عوام کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اور حیدر آباد ایک ایسا ہدف ہے جسے بآسانی نشانہ بنا کر عوام کی توجہ اس طرف مرکوز کی جا سکتی ہے۔

نہرو سے میری گفتگو کا کوئی خصوصی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ یہ بات میں نے پہلی دفعہ مشاہدہ کی کہ اب یہاں پر ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ساری قوت و اقتدار نظام کے ہاتھ میں ہے اور حیدر آباد کا موقف محض چند وزیروں یا چند سیاسی راہنماؤں کی شرارت نہیں ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ تھا مونٹ بیٹن کے ذاتی نمایندہ کے دورہ حیدر آباد کا کچھ عرصہ بعد مونٹ بیٹن نے خود تسلیم کر لیا کہ کسی زمانے میں اُسے شک تھا کہ نظام اپنی مرضی و منشا کے مطابق عمل نہیں کر رہے۔ مگر اب یہ شک یکسر دور ہو چکا ہے۔

مونٹ بیٹن نے دہلی واپس آتے ہی مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ اس مرتبہ وہ حیدر آباد کے مسائل سے مقابلتاً زیادہ باخبر معلوم ہوتا تھا اور سارے نشیب و فراز کا خاصی حقیقت پسندی سے جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا کہ کچھ عرصہ بعد میں بھارت کو خیرباد کہہ کے انگلستان چلا جاؤں گا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس قضیہ کا کوئی نہ کوئی تصفیہ ہو جانا چاہیے۔ میرے نزدیک اب بھی اس کا بہترین حل "الحاق" ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حیدر آباد فی الحال اس نقطہ پر سپر انداز ہونے کے موڈ میں نہیں اس لیے الحاق کے علاوہ کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے جس سے سلجھاؤ کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

میں نے اسے بتایا کہ کسی باعزت حل پر متفق ہونے میں مجھے ذرہ بھر تامل نہ ہوگا۔ اور میں اپنی حتی المقدور کوشش کروں گا کہ فوری طور پر کوئی تصفیہ ہو جائے۔ مونٹ بیٹن نے راقم الحروف کے سامنے نہایت ہی ہولناک منظر کھینچتے ہوئے کہا کہ اگر میں اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑ کر انگلستان چلا گیا تو نہ جانے حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ ہندوستانی راہنما تو حیدر آباد پر جبراً قبضہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں مگر میں نے ان کا راستہ روک رکھا ہے۔ بس میری روانگی کی دیر ہے۔ کہ حکومت ہند کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر حیدر آباد پر فوج کشی کر دے گی۔ اور پھر اپنی جارحیت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے حیدر آباد کے خلاف بے پناہ پراپیگنڈہ کرے گی۔ ہندوستان کے ذرائع و وسائل حیدر آباد کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ موثر اور دور رس ہیں۔ مجلس اقوام متحدہ کا رکن ہونے کی بنا پر ہندوستان زیادہ سہولت کے ساتھ اپنا مقصد منوا سکتا ہے۔ مگر یہ سہولت حیدر آباد کو میسر نہیں ہو سکتی۔ خواہ اخلاقی اعتبار سے اس کا موقف کتنا ہی مضبوط ہو۔ یہ بھی بعید نہیں کہ حکومت ہند حیدر آباد کے مسئلہ کو ہندوستان کا داخلی مسئلہ قرار دے کر اوروں کا منہ بند کر دے۔ پھر یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ برطانیہ کی روش کس طرف ہوگی؟ عین ممکن ہے کہ برطانیہ، بھارت کا ساتھ دے۔ کیونکہ وہ حیدر آباد کی خاطر

ہندوستان سے تعلقات منقطع کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے بعد مونٹ بیٹن نے وہ بھیانک منظر پیش کیا جب برطانیہ کے لاتعداد متحرک ٹینک حیدر آباد کی سرزمین کو روندتے چلے جائیں گے اور حیدر آبادی فوج ٹینکوں کی اس یلغار کو اپنی پرانی رائفلوں سے روکنے میں بے بس ہو جائے گی۔ پھر آسمان سے طیاروں کی مسلسل بمباری اور زمین سے توپوں اور مشین گنوں کی دھواں دھار گولہ باری حیدر آباد کے جوانوں کو اسپند کے دانوں کی طرح بھونتی چلی جائے گی۔ مونٹ بیٹن نے پیش گوئی کی کہ خود نظام کو بھی قیدی بنا لیا جائے گا۔ اور اگر ہندوستان نے عالمی رائے عامہ کے ڈر سے نظام کو سلاخوں میں بند رکھنے سے گریز کیا تو بھی اس کی حیثیت لازماً نظر بندی کی سی ہوگی۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کو سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس دلگداز المیے کی پیش بندی کا واحد طریق یہ ہے کہ تمہیں مزید بیکار مزاحمت کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور میری ہندوستان سے روانگی سے قبل ہی کوئی ایسی صورت پیدا ہونی چاہیے جو الحاق کی بندشوں سے قدرے آزاد ہو۔ تاکہ آپ لوگوں کو ان مصائب و آلام کا سامنا نہ کرنا پڑے جن کے منصوبے ہندوستانی راہنماؤں نے پہلے ہی تیار کر رکھے ہیں۔

۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ میرے بستر سے متصل ٹیلیفون کی چیخ سنائی دی۔ میرا یہ ٹیلیفون آرمی کمانڈر (العدروس) کے ٹیلیفون سے براہ راست منسلک تھا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی مجھے یقین تھا کہ یہ بھارتی افواج کی پیش قدمی کی اطلاع ہے۔ چنانچہ وہی ہوا!

آرمی کمانڈر لرزتی ہوئی آواز میں مجھے کہہ رہا تھا کہ گزشتہ پندرہ منٹوں میں اُسے پانچ مختلف مقامات سے بھارتی افواج کی بھاری تعداد میں پیش قدمی کی خبریں ملی ہیں۔ اثنائے گفتگو ہی میں اسے بیدر، اورنگ آباد اور ورنگل کے ہوائی اڈوں پر زبردست بمباری کی مزید اطلاعات موصول ہوئیں۔ العدروس مجھ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا کہ آپ کو مجھ سے کس قسم کے جواب کی توقع ہے؟ —— اپنے جوانوں کو حکم دیجئے کہ اس پیش قدمی کے آگے سینہ سپر ہو جائیں!

"بہت اچھا حضور" اس نے یہ الفاظ کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ میں نے پھر ٹیلیفون اٹھایا اور اسے یہ ہدایت کی کہ مختلف محاذوں سے جو اطلاعات موصول ہوں، ان سے مجھے مسلسل باخبر کرتے رہئے۔ وہ کہنے لگا کہ میں دفتر سے باہر جا کر محاذ جنگ پر بذات خود کنٹرول کرنے کے لئے تیار ہو رہا ہوں۔ میں نے اُسے شاباش دی اور کامرانی کی دعا دی۔

یہ وقت میری صبح خیزی کے معمول سے قریباً آدھ گھنٹہ قبل تھا۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں تیزی سے تیار ہو گیا۔ اسی اثنا میں چند مرتبہ پولیس کے افسر اعلیٰ اور آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ٹیلیفون آئے جن سے پتہ چلا کہ بھارتی افواج نے اور بھی کئی ایک مقامات سے پیش قدمی کا آغاز کر دیا ہے اور بھارتی طیاروں نے مزید کئی جگہوں کو بموں کا نشانہ بنایا ہے۔

نظام کے ہاں جانے سے پہلے میں سیدھا آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ آرمی کمانڈر نے جنگی کارروائیوں کو کنٹرول کرنے کا تمام سامان اپنے کمرے ہی میں نصب کر رکھا تھا اور جنرل اسٹاف کے اعلیٰ افسران کے ساتھ کھڑا سامنے پھیلے ہوئے ایک بہت بڑے نقشے پر بعض مقامات کو نشان زدہ کر رہا تھا۔ اس سے مقصود حملہ آور افواج اور دفاعی دستوں کی صحیح پوزیشن کا تعین تھا۔ اس سے پیشتر جو خفیہ اطلاعات پہنچی تھیں۔ اور صبح تک صورت حال کا جو نقشہ سمجھ میں آ سکا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا

کہ بھارتی فوج کا زیادہ تر دباؤ مغرب میں حیدرآباد شولاپور روڈ کی جانب ہے اور مشرق میں مسولی پٹم حیدرآباد روڈ کی طرف ان دونوں محاذوں پر بھارتی فوجیں شرمن ٹینکوں سے مسلح تھیں۔ شمال مغربی محاذ کے دیگر تین مقامات پر بھارتی فوج کے ہراول میں ہلکے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ شمالی محاذ کے پانچ مزید گوشوں پر محض بکتر بند گاڑیوں کی پیش قدمی کی خبریں آ رہی تھیں۔ شمال مشرقی محاذ پر حملہ آور فوجوں کو ریل گاڑیوں میں بٹھا کر دریائے دھارا پار کیا گیا تھا۔ مشرقی جانب اگرچہ مسولی پٹم روڈ پر شرمن ٹینکوں کی یلغار جاری تھی تاہم محاذ کے باقی تمام حصوں میں بکتر بند گاڑیاں اور ہلکے ٹینک استعمال کئے جا رہے تھے۔ جنوبی محاذ پر کم از کم پانچ مقامات سے بھارت کے سوار دستوں کی چڑھائی کی خبریں ملیں اور یہ پتہ چلا کہ جنوبی دریا تنگا بھدرا کو ریل کے پل کے ذریعہ پار کرنے کی کئی دفعہ کوشش کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ چاروں طرف سرخ نشانات سے بھر گیا۔ ان نشانات سے بھارت کے فوجی دستوں کی مختلف مقامات پر تعداد اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

بھارت نے اپنے شرمن ٹینکوں کا ایک پورا بریگیڈ شولاپور روڈ کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس بریگیڈ کی معیت میں ایک مکمل موٹر سوار لشکری ڈویژن پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس محاذ پر بھارت کی جنگی تیاریاں گذشتہ کئی ماہ سے جاری تھیں اور ارد گرد کا تمام علاقہ عوام سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ یہاں سے وہ یا تو بذریعہ سڑک تلدرگ ہمنا آباد اور ظہیر آباد میں سے ہوتے ہوئے ریاست کے دارالحکومت میں پہنچ سکتے تھے۔ یا پھر تلدرگ سے گذر کر عثمان آباد لاطور روڈ کے ذریعہ بیدر پہنچ کر پھر جنوب مشرق میں ظہیر آباد کی طرف مڑ سکتے تھے اور بیدر سے کوئی اور راستہ اختیار کر کے دارالحکومت میں پہنچ سکتے تھے۔ حیدرآبادی دستوں کی مداخلت سے زیادہ بھارتی فوج کو ریاست کی دشوار گذار سرزمین نے پریشان کر رکھا تھا۔ سطح مرتفع دکن کا یہ علاقہ لاتعداد چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں اور گہری گھاٹیوں سے اٹا پڑا تھا۔ چنانچہ حملہ آور فوج کو اپنے ٹینکوں اور موٹر سوار دستوں کی پیش قدمی کے لئے عام شاہراہیں اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

مغرب کی جانب سے بھارتی افواج کی پیش قدمی کا ہمیں پہلے ہی علم تھا۔ چنانچہ درہ تلدرگ پر بہت مضبوط دفاعی انتظامات کئے گئے تھے۔ پچیس پونڈ گولے کی توپوں کا ایک زبردست بٹالین اس درہ کی حفاظت کے لئے متعین تھا۔ تلدرگ کے قریب پیچ در پیچ پہاڑیوں کے درمیان ایک کھائی میں سے تند و تیز دریا دونوں جانب تین یا چار سو فٹ کی بلندی پر بہتا تھا۔ ایک سڑک دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کھائی کے نشیب میں واقع پتھروں کے ایک پل پر سے گذرتی تھی۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ اس پل کو اڑا دیا جائے اور دریا کے داہنے کنارے پر جب تک ممکن ہو سکے قبضہ قائم رکھا جائے۔

مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۴۹ء کو سلامتی کونسل کے ۴۲۶ ویں اجلاس میں پاکستانی نمائندے نے اپنی گذشتہ تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "۱۰ جون ۱۹۴۸ء کو نظام گورنمنٹ کے ناظم محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک بیان جاری ہوا تھا۔ اس بیان کا ماحصل یہ تھا کہ بھارتی افواج کے ساتھ مسلح تصادم کے امکانات سے بچنے کی خاطر یہ احکامات جاری کر دئے گئے ہیں کہ حیدرآباد کے تمام فوجی دستے سرحد سے تین میل پیچھے ہٹ جائیں۔ ۱۹ جون ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد

کے وزیر اعظم نے بھارت کے ساتھ روابط کا بھرپور جائزہ پیش کیا اور کہا کہ طویل مذاکرات کے بعد بھارتی حکومت نے تین متبادل تجاویز پیش کی ہیں۔ اوّلاً الحاق ثانیاً ریاست میں فی الفور ایک ایسی نمائندہ حکومت کا قیام جو بھارتی حکومت کے متعین کردہ خطوط پر مرتب ہو۔ ثالثاً بھارت میں ادغام یا خود مختار حیثیت کا فیصلہ کرنے کے لئے غیر جانبدار مبصرین کی زیر نگرانی استصواب رائے کا اہتمام۔ جہاں تک تیسری تجویز کا تعلق ہے نظام نے اس بات سے اتفاق کیا کہ کسی غیر جانبدار بین الاقوامی ادارہ کی زیر نگرانی استصواب رائے کرالیا جائے۔ اس پر بھارتی حکومت نے یہ پینترا بدلا کہ حیدرآباد کی عوام کی رائے بعد میں معلوم ہوتی رہے گی۔ فی الحال عارضی طور پر حیدرآباد کو الحاق کرلینا چاہئے اور ریاست میں بھارت کے متعین کردہ خطوط پر نمائندہ حکومت قائم ہونی چاہئے۔ اس مرحلہ پر حیدرآباد کے وزیر اعظم کے پاس بھارتی تجاویز کو رد کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اب دونوں مملکتوں کے سامنے مزید تگ و دو کی کوئی راہ نہیں تھی۔ چنانچہ مذاکرات کے دروازے بند ہوگئے۔ مذاکرات کی روش سے ظاہر تھا کہ نظام تمام متنازعہ فیہ مسائل کو گفت و شنید کے ذریعہ حل کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس کے برعکس حکومت ہند الحاق پر اصرار کئے جارہی تھی۔ اور الحاق سے مراد یہ تھی کہ بھارت کو حیدرآباد کے لئے قانون سازی کا براہ راست حق حاصل ہوجائے۔ اس کے بعد جلد ہی بھارت کی عسکری یورش کا آغاز ہوگیا اور چار پانچ روز کی خونریز جنگ کے بعد بھارت کی بے پناہ فوجی قوت نے کمزور و ناکافی مدافعین پر غلبہ پالیا۔ بھارت کے جنگی طیاروں نے بیس سے زیادہ محاذوں پر ہولناک بمباری کی۔ نظام نے اپنے تمام اختیارات حکومت بھارت کے فوجی کمانڈر کو منتقل کردیئے اور ریاست کی زمام کار ابھی تک اس فوجی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ریاست پر جبراً قبضہ کرنے کے بعد تمام سرکردہ مسلمانوں کو محض اس جرم کی پاداش میں سزائیں دی گئیں کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک رضاکار تنظیم کا رکن اور بھارت سے الحاق کی راہ کا کانٹا تھا۔ جہاں تک ۲۰ اکتوبر ۴۸ء کے فوجی انقلاب کے الزام کا تعلق ہے۔ اس کی حقیقت محض اتنی ہے کہ چند ایک عوامی مظاہروں سے گھبرا کر حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم نے اپنا انفرادی استعفیٰ داغ دیا اس کے بعد ریاست میں جو حکومت مرتب ہوئی اس میں اکثریت سابق وزراء کی تھی۔ میر لائق علی کو وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کی دعوت دی گئی اور حکومت کے ڈھانچے کی توسیع کی گئی۔ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بارہ افراد پر مشتمل وزارت کے سات ارکان عوام کے منتخب نمائندے تھے۔ بھارتی نمائندے کی غلط بیانی کی تردید میں میں بیشمار ایسی مثالیں پیش کرسکتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حیدرآباد سنسر شپ کی پابندیوں سے یکسر آزاد تھا۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا سلامتی کونسل حیدرآباد کا کیس سننے کی مجاز ہے یا نہیں، تو اس کے لئے آرٹیکل نمبر ۹۶ کے تحت عالمی عدالت انصاف سے مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی اثنا میں آرٹیکل نمبر ۴۰ کے تحت عارضی طور پر کوئی ایسا بندوبست ہونا چاہئے کہ اتحاد المسلمین اور ریاست کی دوسری تنظیموں کو تعزیر و احتساب کے شکنجوں سے نجات نصیب

ہو جائے۔ وزراء اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے۔ ہر قسم کے امتیاز اور انتقام کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور اس کے بعد اگر عالمی عدالت کی رائے یہ ہو کہ جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے وہ نامنصفانہ جارحیت کے مترادف ہیں تو پھر سلامتی کونسل پر یہ فرض عائد ہو جائے گا کہ وہ ہر ممکن طریق سے ریاست کے حالات کو معمول پر لانے کے لئے مناسب اقدامات کرے اور اگر کسی معاملے میں کونسل شک و شبہ میں مبتلا ہو تو ان شکوک کو تیقنات میں بدلنے کے لئے اس کے پاس ذرائع کی کمی نہیں۔

حکومت ہند بارہا ان جذبات کا اظہار کر چکی ہے کہ حیدر آباد کے مستقبل کا فیصلہ حیدر آبادی عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ الحاق یا آزادی کے سوال کو حل کرنے کے لئے سلامتی کونسل کی رہنمائی اور نگرانی میں استصواب رائے کرایا جائے۔ پاکستان بھارت سے دوستانہ روابط استوار کرنے کا آرزومند ہے۔ سلامتی کونسل کو جلد سے جلد کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہئے جس سے ہندو مسلم مناقشت کی موجودہ فضا کی گھٹن دور ہو جائے جس نے بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کی حکومتوں کے لئے باہمی خیر سگالی کا برقرار رکھنا محال کر دیا ہے۔"

پاکستان کے نمائندہ کی تقریر کے اختتام پر کونسل کے ارکان کی یہ کیفیت تھی کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ اس گمبھیر سکوت سے کسی گھناؤنی سازش کی بو آتی تھی۔ چنانچہ بغیر کسی تجزیہ نیز نقد و تبصرہ کے، اجلاس ختم کر دیا گیا۔ بھارتی جارحیت کی مذمت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ حتیٰ کہ کسی طرف سے یہ مطالبہ تک نہ ہوا کہ مسئلہ زیر بحث کے عادلانہ حل پر پہنچنے کے لئے اصل حقائق ہی دریافت کر لئے جائیں۔ کونسل نے بھارتی جارحیت پر گرفت کرنے سے احتراز کیا حالانکہ بھارت نے واشگاف انداز میں نہ صرف مجلس اقوام متحدہ کے اختیارات بلکہ وقار کو بھی مجروح کیا تھا۔ سلامتی کونسل ایک چھوٹی سی مملکت کو اس کے بڑے اور طاقتور پڑوسی کی چیرہ دستیوں سے بچانے میں ناکام رہی تھی۔ اس طرح اس نے درپردہ بھارت کو جارحیت کے مزید منصوبے بنانے کی شہ دی تھی۔ اس عالمی تنظیم سے کئے ہوئے بھارت کے وہ تمام وعدے طاق نسیان کی زینت ہو گئے جن میں حیدر آباد کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام کی منشا و مرضی پر چھوڑنے کا ذکر تھا۔ آہستہ آہستہ تمام ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور ان ٹکڑوں کو بھارت کے مختلف صوبوں کے ساتھ ٹانک دیا گیا۔

آج نظام فی الواقع ایک قیدی کی زندگی گذار رہا ہے۔ اس کی دولت، اس کی ثروت، اس کی املاک، اس کے اختیارات اس سے چھن چکے ہیں۔ مگر مجلس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے دروازے حیدر آباد کے لئے ابھی تک بند ہیں۔ اس کے کان بہرے ہو چکے ہیں اور زبان گنگ!

(ترجمہ: سید عالی رضوی)

چودھری خلیق الزمان

میں ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء کی رات ضلع مرزاپور کے قصبہ چنار میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد شیخ محمد زمان نائب تحصیلدار تھے۔ لکھنؤ میں آباؤ اجداد کے مکان تھے۔ میں نے بچپن کا کچھ عرصہ چنار میں گزارا پھر والد صاحب کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا۔ اُس وقت لکھنؤ نوابوں اور تعلقداروں کا شہر تھا۔ عجیب مخلوق تھی نواب اور تعلقدار بھی۔ ہر ایک کا ذوق الگ، مشاغل جدا اور باتیں نرالی۔ ہر تعلقدار کسی نہ کسی رنگ میں دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک بار لکھنؤ کے کسی ڈاکٹر سے کسی نے پوچھا: "پاگل پن کی کتنی قسمیں ہیں؟" تو ڈاکٹر نے برجستہ کہا: "جتنے لکھنؤ میں تعلقدار ہیں۔" یہ نواب اور تعلقدار نہایت سرعت سے کنگال ہوتے جا رہے تھے مگر دستی کا عمل جاتا نظر نہ آتا تھا۔

اردو پر ہندی کے سائے پڑ رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ اردو کو ختم نہیں تو مغلوب ضرور کر دیا جائے گا لیکن نوابوں کے ادب سے ہی چند ایک درد مند بیدار ہو گئے اور اپنی زبان کی دستگیری پر کمربستہ ہوئے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت مسٹر موریسن نے کی اور وقت کی جن عظیم شخصیتوں نے شمولیت کی ان میں مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی بھی شامل تھے۔ راجہ محمد علی محمد خان آف محمود آباد نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ میں اس کانفرنس میں طلباء کے ساتھ رضاکار تھا۔ اس کانفرنس نے اردو کو خاطر خواہ تحفظ دیا۔ ان دنوں لکھنؤ سے اردو کے دو جریدے "اودھ پنچ" اور "اودھ اخبار" نکلا کرتے تھے۔ "اودھ پنچ" طنز و مزاح کے لئے معروف ہوا اور آج بھی اسی دیرینہ حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ نے اردو کی بقا اور ارتقا کے لئے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ یہ شہر میرے وقتوں میں اور پہلے بھی شاعروں اور ادیبوں کا گلستان رہا ہے۔ میر، سودا، انشاء، ناسخ، آتش اور صبا جیسے شاعر بھی دلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ مثنوی کی صنف نے بھی لکھنؤ میں جنم لیا۔ مثنوی زہر عشق یہیں لکھی گئی۔ افسانہ نویسی کی ابتدا بھی مرزا رجب علی سرور نے یہیں سے کی۔ فسانۂ آزاد اور طلسم ہوشربا بھی لکھنؤ کی زرخیز زمین کی تخلیق ہیں۔ اردو کا پہلا ڈرامہ امانت نے لکھنؤ میں ہی لکھا تھا۔ اب جب لکھنؤ کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہاں کے صرف آم اور تربوز ہی مشہور نہیں تھے۔ ٹھمری اور دادرا بھی لکھنؤ کی ہی تخلیق ہیں اور اس تاریخی حقیقت کو شاید نہ ہی ٹھکرایا جا سکے کہ اس کا خالق اور موجد واجد علی شاہ تھا۔

۱۹۰۷ء کا ذکر ہے جب میں لکھنؤ کے جوبلی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو علی گڑھ کالج کے طلباء نے ہڑتال کر دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچبولڈ نے یونین کلب کے نائب صدر راجہ غلام حسین کو کالج سے برطرف کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے پس منظر میں مسلم آزاد سیاسی رجحان تھا۔ خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ مسلمان طلباء کی کچھ دھکم پیل بھی ہوئی اور انہیں چھوڑ دیا گیا لیکن راجہ غلام حسین کو نہ بخشا گیا۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اُسے اپنے شہر میں دفن کیا جائے لیکن اسے اپنے عزیز دوست سر سید احمد خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

میں نے ۱۹۰۷ء میں میٹرک پاس کر لیا اور والدین نے مجھے علی گڑھ کالج میں بھیج دیا۔ مجھے ویسٹرن کورٹ میں کمرہ نمبر ۴۲ دیا گیا۔ میں سکول کی

فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا۔ کالج میں جاتے ہی کالج کی ٹیم میں شامل ہو گیا پھر مجھے اس ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ میرا زیادہ تر وقت کھیلوں اور کالج کی دوسری سرگرمیوں میں گذرتا تھا جس کا اثر میری تعلیم پر پڑا۔ ساتھ بھی کچھ ایسا تھا۔ شہزادہ حمید اللہ خان (جو بعد میں نواب آف بھوپال بنے) میرے ہم جماعت تھے۔ وہ رہتے تو باہر بنگلے میں تھے لیکن زیادہ وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں گزارتے تھے۔

اس دور میں مجھے سیاسیات سے کوئی قابلِ ذکر قسم کی دلچسپی نہ تھی گو مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری سے مجھے خاصہ صدمہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مجھے مولانا محمد علی اور شوکت علی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کے ساتھ کالج کے احوال و کوائف کے متعلق تفصیل بات چیت کی۔ اس ملاقات نے مجھ پر انوکھا سا اثر کیا اور میرے رجحانات میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ ان دنوں آغا خان مولانا شوکت علی کے ہمراہ یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ راجہ محمود آباد نے ایک بار پھر ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ اکابرین کی ان قومی سرگرمیوں نے میرے کردار کی تشکیل میں نمایاں کام کیا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنی خالہ زاد کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ لیبیا میں (جو اس وقت ترپولی تھا) اطالیہ نے ترکی کی مقبوضات پر حملہ کر دیا۔ ترکی نے مصر سے کمک گذارنا چاہی تو انگریزوں نے اجازت نہ دی۔ ہم نے علی گڑھ کی مسجد میں احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستانی علماء کو انگریزوں کی پالیسی کے خلاف ابھارنے کی کوشش کرنے لگے۔

کلکتہ سے "الہلال" اور لاہور سے "زمیندار" اخبار نے ہماری آواز دور دور تک پہنچانے میں بہت تعاون کیا۔ ادھر دلی دربار میں جارج پنجم نے بنگال کی تقسیم کالعدم قرار دے دی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹاف میں یورپین خاصی تعداد میں تھے۔ انگریزوں کی ہمہ گیر مسلم آزار پالیسیوں نے کالج کے طلباء کے دلوں میں یورپین سٹاف کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور کالج میں سیاست کا آغاز ہو گیا۔ میں ہدایات لینے کے لئے راجہ محمود آباد کے ہاں باقاعدگی سے جانے لگا۔

خبر ملی کہ بلقان نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم طلباء نے لیبیا کے حملے کے وقت سے ہی گوشت کھانا ترک کر رکھا تھا۔ اب ترکی پر حملہ ہوا تو ہم نے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک بیان لکھا جو اس لڑکے کے خلاف تھا جس پر ہمیں شک تھا کہ وہ ہماری مذہبی و سیاسی سرگرمیوں کی مخبری کرتا ہے۔ ہم چند طلباء کے خلاف تحقیقات بھی ہوئی تھی لیکن ہمارے خلاف شہادت مہیا نہ کی جا سکی۔ ہم نے حکومت برطانیہ کے خلاف پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ مولانا محمد علی نے اپنا اخبار "کامریڈ" کلکتہ سے دہلی منتقل کر لیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ ترکوں کی مدد کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک طبی وفد ترکی بھیجا جائے۔ دلی کے ڈاکٹر انصاری اس وفد کی قیادت کے لئے تیار ہو گئے۔

پھر وہ دن آیا کہ میں ترکی جانے والے وفد سے جا ملا اور دلی پہنچ گیا۔ میری والدہ، اہلیہ اور گھر کے دیگر لوگ مجھے ترکی کے لئے الوداع کہنے دلی آئے۔ ہم نے بمبئی سے جہاز لیا۔ جب ہم استنبول کی بندرگاہ میں داخل ہوئے تو ترکی کے میناروں نے ہمارا استقبال کیا۔ عمر پاشا اور ہلال احمر کے چند عہدیدار ہمیں لینے بندرگاہ پر آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گلے لگا لیا۔ ہم ترکی زبان تو جانتے نہ تھے۔ عجیب تکلیف دہ اور دلچسپ صورت تھی۔ ہم ان کے ساتھ دو الفاظ انگریزی کے، ایک آدھ اردو کا، ادھورا سا جملہ فارسی میں اور کچھ عربی ملا کر باتیں جو کرتے تھے تو وہ بے چارے کیا سمجھتے ہم خود ہی بھول جاتے تھے کہ ہم کیا کہنا چاہتے تھے اور زبانوں کی کھچڑی میں کیا کہتے ہیں۔ لیکن سینے میں درد جو تھا اسے وہ خوب سمجھتے تھے۔

ایک بات کا دکھ آج بھی ہے کہ ترکوں کو ایک محاذ پہ شکست ہوئی تھی اور خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ترک دوسرے محاذوں سے بھی پسپا ہو جائیں گے لیکن انہوں نے جانوں کی قربانی دے کر بلغاریوں کو ساٹھ میل پیچھے دھکیل دیا۔ جب ترکی کی عزت و آبرو بلغاریوں کی سنگینوں سے چھلنی ہو رہی تھی ترکی فوج کا کمانڈر انچیف پیرا میں یونانی لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

ترکی کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے غازی انور بے چھپتا چھپاتا تیزی سے ترکی پہنچ گیا۔ میں اس سے ملا اور اس کے ساتھ جنگی صورت کے متعلق اور ترکوں کے لئے ہندی مسلمانوں کے جذبات کے متعلق تفصیلی باتیں کیں۔ ترکی کا وزیر جنگ ناظم پاشا ترکی کا کچھ علاقہ بلغاریہ کو دے کر شرائطِ امن پر رضامند ہو گیا لیکن انور بے کے اے ڈی سی نے اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ گویا ایسا تھا کہ اس کے اے ڈی سی نے انور بے کے اے ڈی سی کو گولی ماری اور اس اے ڈی سی نے مرتے مرتے اپنے قاتل کو بھی گولی سے مار دیا۔ اس طرح آنِ واحد میں تین لاشیں تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ انور بے نے اعلان کیا کہ ترکی شرائطِ امن پر رضامند نہیں اور ہم ترکی کی سرزمین کا ایک انچ بھی دینے کو تیار نہیں۔

ہمارے طبی وفد کو بمباری اور بارش میں دن رات زخمیوں کی مرہم پٹی کرنی پڑتی تھی لیکن انوکھا سا لطف بھی آتا تھا۔ ترک ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے لیکن انگریزوں نے بلغاریہ کی پشت پناہی ختم کر دی تو جنگ بھی ختم ہو گئی۔ ہم واپس اپنے وطن آ گئے۔ ہمارا ایک ساتھی عبدالرحمان پشاوری جو ہمارے ساتھ گیا تھا وطن نہ آیا وہ ترکی کی فوج میں شامل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں وہ ترکی محاذوں پر خوب لڑا۔ وہ رؤف بے کے ساتھ اس کے مکان میں رہتا تھا۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ ایک صبح وہ مکان سے باہر مردہ پایا گیا۔ کسی نے اُسے سحر کے دھندلکے میں رؤف بے سمجھ کر گولی مار دی تھی۔

واپس آ کر میں پھر علی گڑھ کالج میں گیا اور بی۔ اے کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ہم صرف ترکی کے لئے متفکر تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ترکی غیر جانبدار رہے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک شام مولانا محمد علی اور شوکت علی میرے ہاں یہ تجویز لے کے آئے کہ ترکی اور خلافت کے تحفظ کے لئے ہم شمالی مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں رائفلوں کے کارخانوں کا جائزہ لیں اور کوشش کریں کہ وہاں کی رائفلیں انگریزوں کے خلاف استعمال ہو سکیں۔

ہم پشاور پہنچے اور وہاں سے قبائلی علاقے میں گئے۔ رائفلوں کے خفیہ کارخانے دیکھے اور قبائلی سرداروں کو ترکی کے حق میں انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا۔ ہم نے افغانستان جا کر شاہِ افغانستان کو آمادہ کر لیا کہ اگر جرمنی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے تو اس کی فوجوں کو افغانستان سے گزرنے دیا جائے۔ ہم مسلمان انگریزوں کے خلاف لڑ کر ہندوستان میں کم از کم مسلمانوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ہم نے جو چندہ فراہم کیا تھا اس سے ہم نے انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے افغانستان اور عرب ممالک میں وفد بھیجے۔ ہم چاہتے تھے کہ جرمنی ہندوستان پر حملہ کرے لیکن میدانِ جنگ میں جرمنی کے قدم اکھڑنے لگے۔ ترکوں نے نہر سویز پر حملہ کرنا چاہا لیکن بات بن نہ سکی۔

اپریل ۱۹۱۶ء میں میں نے ایل ایل بی کر لیا۔ ایک روز راجہ محمود آباد نے مجھے بلا کر کہا کہ وکالت نہ کروں تو ان کا سیکرٹری بن جاؤں۔ یہ تجویز بُری نہ تھی۔ میں نے قبول کر لی۔ میں جب سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے دفتر جانے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لئے وہاں کوئی کام نہ تھا سوائے اس کے کہ راجہ صاحب مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات اسی دور میں ظاہر ہونے لگے تھے اور میں محسوس کرنے لگا تھا کہ ابھی تقسیمِ ہند کا بیج بو دینا چاہیے جو میں نے مسلم لیگ کے اسی سال کے سیشن میں بو دیا۔ مسلمانوں کے تمام ہی بڑے بڑے لیڈر اس سیشن میں شریک ہوئے تھے۔

مسلم لیگ کے ۱۹۱۸ء کے سیشن میں جو دلی میں منعقد ہوا ہم نے خلافت کے تحفظ اور مسلمانوں کے حقوقِ آزادی پر بڑا زور دیا۔ لیگ کونسل کا ایک اجلاس حکیم اجمل خان کے گھر پر ہوا تھا۔ اس وقت میں مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ آئندہ تیس سال سیاسی ہنگاموں کا دور دورہ رہا۔ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میدان میں موجود تھے۔ علی برادران محمد علی جناح کو بھی سامنے لے آئے۔ میری زندگی کی گھڑیاں کانفرنسوں اور اجلاسوں میں مسلمانوں کی ترجمانی کرتے گزر گئیں۔ میں مراد آباد خلافت کانفرنس میں شریک ہونے گیا تو پہلی بار میرے لئے جلوس نکالا گیا۔ مولانا شوکت علی نے کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا کہ خلیق الزمان وکالت کا پیشہ ترک کر رہے ہیں۔ لوگوں نے بانگِ دہل مجھے سیاسی میدان میں آنے کو کہا جس پر میں نے لبیک کہا۔

سیاسی مصروفیات اور قیادت اپنی جگہ لیکن زندہ رہنے کے لئے بھی کچھ کرنا تھا۔ وکالت تو چھوٹ گئی تھی۔ میں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے کپڑے کا کاروبار کرنے کا ارادہ کیا۔ بمبئی سے کپڑا خریدا۔ میرا خیال تھا کہ لکھنؤ میں کپڑے کا مرکزی ادارہ بنا دوں گا لیکن دوست کپڑا ادھار لے گئے۔ بیوپاریوں نے کپڑا خرید اسکے پیسے نہ دیئے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں مجھے سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جب رہا ہو کے آیا تو کپڑا غائب تھا اور کاروبار ختم۔

میری گرفتاری پرنس آف ویلز کے دورہ ہند کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ میں نے برطانوی شہزادے کے دورے کا بائیکاٹ کرنے کے لئے رائے عامہ ہموار کرلی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو میرے ساتھ تھے لیکن ۵ نومبر ۱۹۲۱ء کی صبح پولیس کے دو سپاہیوں نے مجھے جگایا اور گرفتار کر کے لے گئے۔ پنڈت نہرو اور موتی لال نہرو بھی گرفتار ہوئے۔ مجھے ڈیڑھ برس اور ان دونوں کو چھ چھ ماہ سزائے قید ہوئی۔ ہم تینوں کو جیل میں اکٹھے رکھا گیا۔ پنڈت نہرو بہت سویرے اٹھا کرتے تھے اور زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزارتے تھے لیکن موتی لال نہرو میرے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے یا دیوانِ حافظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں جگہ جگہ حکومت کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ گورکھپور کے تھانے میں مظاہرین نے ایک پولیس انسپکٹر اور گیارہ سپاہیوں کو بند کر کے زندہ جلا ڈالا۔ انگریزوں نے بہت زیادہ ظلم کیا اور مشین گنوں اور رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ لیڈر دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے۔ گاندھی تشدد کا قائل نہیں تھا۔ اس نے سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی جس کا اثر عوام پر اچھا نہ پڑا۔

خلافت اور کانگریس کو یکجا کر کے مجھے چمن بنایا گیا لیکن ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے جن کی ابتدا ہندوؤں نے کی تھی۔ مسلمان چونک اٹھے۔ سوامی شردھانند نے شدھی کی مہم شروع کر دی تھی۔ گاندھی نے گوہاٹی کانفرنس میں انگریزوں پر الزام لگایا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کا محرک انگریز خود ہے جو فرقوں میں پھوٹ پیدا کر کے حکومت کرنا چاہتا ہے۔

محرک خواہ انگریز ہی تھا لیکن ہندو مسلمانوں کو چن چن کر مار رہے تھے۔ ہم مسلمان لیڈر اب کسی اور انداز سے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ فسادات تیزی سے بڑھ رہے تھے اور ہندوستان کے قریہ قریہ میں مسلمان شہید ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے شہر میں دونوں فرقوں کے لیڈروں کی میٹنگ بلائی اور سب نے محلے محلے میں جا کر ہندو مسلم فسادات ختم کرنے کی تلقین کی۔ وہاں تو فساد ختم ہو گیا لیکن ہندو کی مسلم کش ذہنیت میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کے لاہور سیشن کے لئے میں نے محمد علی جناح کی صدارت کی تجویز پیش کی۔ خلافت کی تنظیم دم توڑ رہی تھی۔ اب مسلم لیگ کو تقویت دینے کی ضرورت تھی۔ بعض صوبوں کے مسلمان شاکی تھے کہ ان کی نمائندگی غیر تسلی بخش ہے چنانچہ میں نے دو تجویزیں پیش کیں جن سے مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں تحفظ مل گیا۔ مجھے علی برادران کی پشت پناہی حاصل تھی جس سے میری قیادت مسلم تھی۔ ہندو مسلم فساد زوروں پر تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر فساد ہو جاتے تھے۔ اس خونچکاں صورت حال میں میں دوسرے مسلم قائدین کے تعاون سے قوم کی شکستہ کشتی کنارے لگانے کے لئے خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ گاندھی گروپ کی اپنی پالیسیاں تھیں جن میں سے بیشتر ہمیں منظور نہیں تھیں۔

۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا تو راجہ محمود آباد نے میرے مکان میں کہا کہ اب ہم بائیکاٹ کے مظاہرے کے لئے کوئی نیا طریقہ سوچیں۔ ہم نے طریقہ سوچ لیا۔ ہم نے سائمن واپس چلے جاؤ کے پوسٹر لکھ کر غباروں اور پتنگوں کے ساتھ باندھے۔ لکھنؤ کے تعلقداروں نے کمیشن کے افراد کو قیصر باغ میں چائے کی دعوت دی۔ جب وہ لوگ باغ میں چائے پی رہے تھے تو میں نے اپنے مکان کی چھت سے پتنگ بڑھانے شروع کئے۔ پھر غبارے اڑا دیئے۔ اتفاق سے ہوا کا رخ موافق تھا غبارے مہمانوں کے درمیان جا گرے۔ جب پتنگیں مطلوبہ بلندی تک پہنچیں تو میں نے ڈوریں کاٹ دیں اور یہ بھی مہمانوں میں جا گریں۔ تعلقدار تو بہت گھبرائے لیکن کمیشن کے برطانوی ممبروں نے اس دلچسپ طریقہ احتجاج سے بہت لطف اٹھایا۔ شام کو پولیس میرے دروازے پر کھڑی تھی لیکن ان کے پاس وارنٹ

گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے مزاحمت کی اور وہ وارنٹ لیے چلے گئے لیکن لوٹ کے نہ آئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۸ء کو کل جماعتی کانفرنس ہوئی تو پہلی بار محمد علی جناح اور مولانا شوکت علی ایک سٹیج پر اکٹھے ہوئے۔ آل انڈیا کنونشن میں مسلم لیگ کی نمائندگی کے لئے محمد علی جناح، مولانا ظفر علی خاں، لیاقت علی کے نام منتخب ہوئے۔ اس فہرست میں میرا نام بھی تھا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک تاریک دن تھا۔ مولانا محمد علی لندن میں فوت ہو گئے۔ ہماری سیاست کی جیسے کمر ہی ٹوٹ چلی تھی۔ ایسے نازک دور میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تاریک کرنے کے لئے اغیار اپنے پروپیگنڈے کر رہے تھے محمد علی جیسے فرزند کی موت کا اثر جانکاہ ضرب کاری تھا لیکن ہم نے تاریخ کی درسگاہ سے جو سبق سیکھے تھے انہیں مشعل راہ بنا لیا۔

اسی دور کا ذکر ہے کہ خان عبدالغفار خان لکھنؤ آئے اور مجھ سے کہا کہ میں گاندھی جی سے ان کا تعارف کرا دوں۔ میں نے انہیں گاندھی جی سے ملایا اور میں نے دیکھا کہ غفار خان ہندوستان کے مسلمانوں کے بنیادی تقاضوں اور مطالبوں سے بہت حد تک بے بہرہ تھے اور ان کے سیاسی رجحانات مسلمانوں کے لئے کسی طور سود مند نہیں تھے۔ انہوں نے غالباً مسلمانوں کے مفاد کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کانگرس کے چکر میں الجھ گئے اور ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔

۱۹۳۳ء میں آغا خان ہندوستان کی سیاست سے ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔ محمد علی جناح بھی لندن جاتے وقت کہہ گئے کہ لوٹ کے نہ آئیں گے۔ ہند کے مسلمانوں کا سارا بار میرے کندھوں پر آ پڑا۔ میں بھی کانگرس کی چند ایک پالیسیوں کو ناپسند کرتا تھا تاہم میں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان پھیلی ہوئی خلیج کو پر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے مسلمانوں کے لئے ان دو راہوں میں سے صرف ایک ہی رہ گئی ہے کہ یا انگریز کو خوش رکھیں یا ہندو کو۔ غرض اب سیاسی حالات اور مسلمانوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ دونوں راہیں پر خطر تھیں۔ میں نے مسلم کانفرنس اور نیشنلسٹ گروپ کا مشترکہ اجلاس بلایا اس میں میرے موقف کو خاصی تقویت ملی۔

انگریز ہندوستان کے بال و پر نوچ کر اس کی اندرونی سیاست کو مفلوج کرنے کے لئے تمام آئینی اور غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ مسلم لیگ جس نے ۱۹۰۶ء میں جنم لیا تھا نوابوں، جاگیرداروں اور خان بہادروں کی مخلوط سی جماعت بن چکی تھی۔ خلافت کا ہنگامہ ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت قبول کر کے اس جماعت کو بے موت مرنے سے بچا لیا۔ آپ نے کئی مسائل پر مجھ سے مشورے لئے۔ کئی باتوں میں ہمارا اختلاف ہوا اور اس طرح ہم نے مسلمانوں کے لئے ایک پلیٹ فارم تیار کر لیا۔

الیکشن کا وقت آیا تو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کئے۔ رفیع احمد قدوائی نے اپنے دو امیدوار مسلم لیگ کے مقابلے میں اور ایک نواب چھتاری کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راہ پر نہ آئے۔ خلافت کے ہیرو مولانا شوکت علی زندہ تھے آپ نے صوبہ بھر میں سپاہیوں کی طرح کام کیا۔ ہم نے بیس ہزار روپے کے بجٹ پر ووٹ کا بندوبست کر لیا اور شبانہ روز بھاگ دوڑ سے چھتیس میں سے اٹھائیس سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔

یو پی کے گورنر سر ہیگ نے نواب چھتاری کی زبانی مجھے پیشکش کی کہ میں یو پی کی عبوری حکومت کی کیبنٹ میں شامل ہو جاؤں لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پارٹی کے مفاد کے پیش نظر یہ پیشکش قبول کرنے کو تیار نہیں۔

مجھے جمعیت علمائے ہند کے ایک اجلاس میں بلا لیا گیا لیکن وہ لوگ میرے لئے اجنبی تھے۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ ہم بھی ہندوستان کی آزادی سے زیادہ مسلمانوں کے اتحاد ملت، زندگی اور الگ انتخاب کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جنگ آزادی بعد میں لڑی جائے گی۔ یہ جمعیت دراصل کانگرس کی جماعت تھی جو چند ہی روز بعد مسلم لیگ کو خیر باد کہہ کے کانگرس سے جا ملی۔

مسلمان عوام اب خوب سمجھنے لگے تھے کہ جمہوریت میں انتخاب کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جب کانگرس کو پہلی بار غالب اکثریت حاصل ہوئی تو مسلمانوں نے

انگریزوں کی موجودگی میں ہندو راج کا خطرہ محسوس کر لیا۔ یہی وہ بات تھی جو میں محمد علی جناح کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتا تھا

مولانا ابوالکلام آزاد نے اور جمعیت علمائے ہند نے بھی میرے ساتھ خط و کتابت اور طویل ملاقاتیں شروع کر دیں۔ مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں پر کانگریس کا سایہ غالب رہے جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ محمد علی جناح نے مسلم لیگ کا ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا تھا اور ہم سب کو مضبوط بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک عرصہ میرے پیچھے پڑے رہے کہ میں لیگ کو کانگریس کی اتحادی جماعت بنا دوں۔ ایک بار نہیں ابوالکلام آزاد نے سینکڑوں بار کہا لیکن میں نے ایک بار انہیں صاف الفاظ میں کہہ دیا "مولانا! میں اپنے ہاتھوں مسلم لیگ کا گلا نہ گھونٹوں گا۔"

الیکشن میں ہمیں ہر صوبے میں معمولی سی کامیابی ہوئی لیکن یہ معمولی نہیں بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس سے ہم نے جداگانہ انتخاب تسلیم کرا لیا تھا۔ میں جب پہلی بار یو۔پی کے اسمبلی ہال میں بیٹھا تو عجیب جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ عمر رفتہ کا ایک ایک لمحہ یاد آیا جو میں نے ملک اور قوم کی نجات اور بہبودی کی خاطر صرف کیا تھا۔ آج کی کامیابی اور وہ امروز مجھے مسرور کر رہا تھا لیکن خیال آگیا کہ میں اکھاڑے میں تو اب اترا ہوں چنانچہ میں ایک جنگ کے لئے یا اسی جنگ کے نئے محاذ کے لئے تیار ہو گیا۔

بعض مسلمان لیڈروں کے کردار کا یہ حال تھا کہ مولانا حسین احمد کی سفارش پر ہم نے مولانا محمد اسمٰعیل کو لیگ کا ٹکٹ دیا، ساتھ تین ہزار روپیہ نقد بھی دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے تین ہزار روپیہ کانگریس سے بھی لے لیا تھا۔ اس نے مجھ سے اور پیسے مانگے تو میں نے تین سو روپے اور دے دیئے مگر اگلے روز مولانا کانگریس کے ٹکٹ پر تشریف فرما تھے۔

اگلے دو برسوں میں مسلم لیگ کو مخالفت کے باوجود خاصی تقویت ملی۔ اسمبلیوں میں گو کانگریس کا راج تھا لیکن مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں محمد علی جناح آئے تو ان کا تاریخی جلوس نکالا گیا۔ پنجاب سے سر سکندر حیات خان بھی آئے تھے۔ پنجاب میں ڈاکٹر اقبال نے مسلم لیگ کے قدم جما دیئے تھے اور بڑی کامیابی سے مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مولانا آزاد نے مجھے ایک اور خط لکھا جس میں انہوں نے مجھے پند و نصیحت کی کہ میں کانگریس سے کٹ کے الگ نہ ہوں۔ آپ نے خط کے آخر میں لکھا "اگر مقصود جواہر لال یا سوبھاش سے ملنا ہو تو پہلے لکھوا دو اور پیچ و خم کی باتیں دل سے نکال دو۔" ظاہر ہے کہ میں نے کیا جواب دیا ہوگا۔ یہ خط مولانا کی ذہنیت کا مظہر تھا جسے اب میں نظر انداز کرنے لگا تھا۔ دراصل مولانا کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ کانگریس کی خاطر اور اپنی ذات کی خاطر کرانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی۔

۱۹۳۸ء میں سیاسی حالات سرعت سے بدلنے لگے۔ ان بدلتے حالات سے یہی میرے ذہن میں آتی تھی کہ ہندوستان کا نظام حکومت آزادی کے بعد کچھ ایسا ہو کہ جس صوبے میں جس قوم کی اکثریت ہے وہاں اس کی آزاد حکومت قائم ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا جو میں نے اس وقت سوچا تھا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے لیکن میں نے اس تجویز کو کسی موزوں موقع و محل کے لئے اٹھا رکھا تھا۔

اسی سال مجھے مصر میں فلسطین کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے بلاوا آیا۔ میں نے اس کانفرنس میں ہندی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ یہ کانفرنس فلسطین کی تقسیم کو رکوانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ کانفرنس کے بعد میں لندن چلا گیا اور فلسطین کے مسئلے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی حکومت برطانیہ کے گوش گزار کر دیا۔

لندن میں میری ملاقات چوہدری رحمت علی سے ہوئی۔ یہی وہ شخصیت تھی جس نے پاکستان کا لفظ سوچا تھا۔ گو اس وقت مجھے یہ نام پسند نہ آیا تھا لیکن تقسیم ہند کے متعلق آپ نے جو کچھ سوچا تھا اس سے مجھے پورا پورا اتفاق تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے جب میں چوہدری رحمت علی سے لندن میں ملا تھا۔ آپ کے ساتھ دوسری ملاقات دس سال بعد ۱۹۴۸ء میں لاہور میں ہوئی۔ آپ کا سوچا ہوا "پاکستان" معرض وجود میں آ چکا تھا لیکن چوہدری صاحب پنجاب اور بنگال کی

کی تقسیم کے متعلق بہت پریشان تھے۔ لیکن ان کے لئے سب سے زیادہ روح فرسا بات یہ تھی کہ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے مکان کے ارد گرد سی آئی ڈی کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں لیکن انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ کیوں!

چوہدری رحمت علی اس سلوک ناروا سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ لنڈن واپس چلے گئے اور ایک کتاب THE GREAT BETRAYAL لکھ کر فوت ہو گئے۔ کس قدر دردناک ہے یہ روداد کہ جس نے ہمیں ہماری آزاد ریاست کو پیارا سا نام دیا تھا وہ دیار غیر میں مر گیا اور اس کی قبر پر کوئی جا کر فاتحہ بھی نہیں پڑھتا۔ پاکستانی مسلمان اب بھی چاہیں تو اس کی میت کو قبر سے نکال کر کراچی یا لاہور کے کسی قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں۔

فلسطین کانفرنس کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ میں لنڈن سے واپس ہونے ہی والا تھا کہ انڈر سیکرٹری برائے ہندوستان سے ملاقات کا موقع مل گیا اور میں نے اس کے سامنے ہندوستان کا نقشہ رکھ کر آئندہ کے پاکستان کے صوبے اسے دکھائے اور زور دیا کہ اس طرح ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس نے مجھے نو آبادیات کے سکریٹری لارڈ زیٹ لینڈ کے پاس بھیج دیا۔ میں نے زیٹ لینڈ کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل صرف تقسیم ہے لیکن زیٹ لینڈ نے کہا کہ عالمی سیاسیات پر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ شاید جنگ جلدی شروع ہو جائے۔ ان حالات میں ہندوستان کا مسئلہ التوا میں رہے گا۔

لنڈن سے ہم بمبئی آئے اور مسٹر جناح کو وہ تمام گفتگو سنائی جو میں نے دونوں سکرٹریوں سے کی تھی۔ مسٹر جناح نے تقسیم ہند کے متعلق میری باتیں بڑی غور سے سنیں اور کہا "اور اچھی طرح سوچ لو۔"

میں لکھنؤ چلا آیا جہاں پنڈت نہرو میرا منتظر تھا۔ اس نے ایک بار پھر کانگریس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے پر زور دیا۔ مولانا آزاد بھی خفیہ طور پر تنازعہ کا تصفیہ کرانے کے لئے میرے پاس آئے لیکن میں نے مسلم لیگ کے لائحہ عمل کی وضاحت کر کے انہیں بتا دیا کہ سمجھوتہ کبھی نہ ہو سکے گا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور کانگریس نے نیا محاذ قائم کیا۔ کانگریسی لیڈروں نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے کئی حربے استعمال کئے اور سرکاری طور پر منوانا چاہا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندہ جماعت ہے لیکن انگریز نے ماننے سے انکار کر دیا۔ وائسرائے نے گاندھی اور مسٹر جناح سے ملاقاتیں کر کے ایک بیان دیا کہ جنگ کے بعد دونوں فریقوں کے موقف اور موجودہ ایکٹ کی ترمیم پر غور کیا جائے گا۔

۱۹۴۰ء کے آغاز میں تقسیم ہند کی جدوجہد ایک واضح صورت اختیار کر گئی۔ وائسرائے سے گاندھی بھی ملا اور مسٹر جناح بھی لیکن وائسرائے نے گاندھی کی ہر تجویز ٹھکرا دی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء مسلم لیگ سیشن میں قرارداد پاکستان منظور کر کے وائسرائے کو پیش کر دی گئی۔

ادھر جنگ عظیم زور پکڑ رہی تھی کیونکہ دنیا کا گوشہ گوشہ جنگ کی لپیٹ میں آیا جا رہا تھا۔ ادھر کانگریس اور مسلم لیگ کی جنگ واضح صورت اختیار کر کے عروج کو جا پہنچی۔ مسلمان عوام نے محمد علی جناح کو قائد اعظم کی حیثیت سے اور مسلم لیگ کو اپنی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے مجھے اتحاد المسلمین کے اجلاس میں شرکت کے لئے حیدرآباد بلایا تو میں چلا گیا۔ میں پہلی بار اس عظیم شخصیت سے ملا اور اس سے بہت متاثر ہوا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء (پاکستان کے معرض وجود میں آنے تک) کا عرصہ ہندی مسلمان کے جہاد اور ایثار کا عرصہ تھا اور میری زندگی کا مصروف ترین دور۔ اس دور کو ہند و پاکستان کی تاریخ میں ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں نمایاں حروف سے لکھا جائے گا۔ مسلمانوں پر جو بیتی اور کیوں بیتی، مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا وہ کیوں ہوا؟ اس کا جواب ماسٹر تارا سنگھ کے ایک فقرے سے دیا جا سکتا ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے خضر حیات نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ہم اسمبلی ہال کی سیڑھیوں

پہ کھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ بھیم سین سچر کے پہلو میں کھڑا تھا۔ کٹر مسلمانوں کی فتح سے بوکھلا گئے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے کھڑے کھڑے اچانک کرپان نکال لی اور کرپان بلند کر کے مخاطب ہو کر آواز سے بولا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے ہوگی۔ سکھ اس کے لئے تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کو ہوش میں لے آئیں گے"۔ تارا سنگھ کی یہ دھمکی کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔ اس کے بعد جو ہوا دنیا نے دیکھا۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اور جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان سے ہر کسی کو اتفاق نہیں ہوگا۔ میری رائے بہرحال ایک ذاتی رائے ہے۔ میں نے جب اپنی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN لکھی تو کئی لوگوں کو محض اس لئے پسند نہ آئی کہ اس سے قائد اعظم کی شخصیت اور ان کے جہاد کی عظمت کم ہونے کا اندیشہ ہے لیکن کتاب لکھنے سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے کئی مواقع پر قائد اعظم سے اختلاف رائے کیا ہے لیکن میں نے آپ کے احکام ماننے سے کبھی پس و پیش نہیں کی۔ ہم نے پاکستان نصف صدی کی جد و جہد اور مسلسل ایثار سے حاصل کیا ہے۔ اس طویل مدت میں کسی لیڈر سے کون سی لغزش نہیں ہوئی ہوگی۔ میں نے اپنی کتاب میں یہ تمام لغزشیں، ادوار اور واقعات پیش کر دیئے ہیں اور یہ فیصلہ پڑھنے والوں پہ چھوڑ دیا ہے کہ کون ٹھیک تھا اور کس نے کیا کیا!

اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ قائد اعظم عظیم انسان تھے اور جب آپ نے پاکستان کا مطالبہ ہاتھ میں لے لیا تو آخر دم تک منحرف نہ ہوئے لیکن میں سردار پٹیل کا بھی ایک جملہ دہرانا چاہتا ہوں۔ میں جب اپنے آبائی شہر لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی آ گیا تو خیال تھا کہ سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں گا لیکن نہ ہو سکا۔ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل نے میرے شہر لکھنؤ میں ہزاروں لوگوں کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے میرے متعلق کہا تھا۔

"پاکستان بنانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دیا سے وہ چلا گیا ہے، ہم بہت خوش ہیں۔"

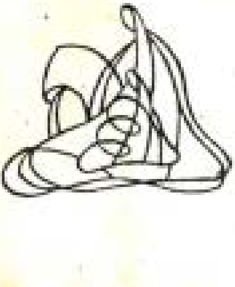

قرۃ العین حیدر

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ :

"موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے اُلفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے۔ پردے بھی۔ دریچوں میں بنفشے کے شگوفے پڑے لٹکتے ہیں۔"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی "شخصیت نگاریاں" اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق شوق سے رسالہ "شمع" بھی پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء اللہ۔ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھائی صاحب پیانو سے شغل فرما رہے ہیں۔ گیلری میں "چوپے دوڑ پی آئی" کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھابھی صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائیٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دُنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو فنون لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ جگ ہیڈ اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سب گپ بازی ہے) ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنگریلا کو کینیڈا میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتاً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہر صورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحی حِس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "مضحکیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی

اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اُٹھ کر کینیڈا چلا گیا)

میری بہت عزیز تر سہیلیاں[1] جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۶ء تک عمر کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا۔ ہندوستان ہی میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاء اللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ، تھرڈ، فورتھ، ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "ہیکیٹ ہاؤس" تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہ جہاں پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے نیچے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹڑی پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹڑی سے اُترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو دیکھیے۔ ایک سے ایک عالم فاضل چلا آ رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹاکھٹ توڑ ڈالے۔ ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں۔ ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی کی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست دان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ قبیلے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے یلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دُور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلیٰ، قاہرہ، ٹرکی۔ مستقل اِدھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بعمر چھ سال لکھی (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا ——) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لیے اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے جگنوؤں کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی۔" وغیرہ وغیرہ ماشاء اللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا یعنی غور کیجیے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی نے

---

[1] لکھنؤ کی مشہور جیپال سسٹرز، شکنتلا قدوائی، کملا جیپال، وِملا سہگل

بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی ہیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ برا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی۔ اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سیدھا برلن سے آ رہا ہے۔ تمہاری "لیڈی ہیلنڈا" گو بوڑھی ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی اور مدتوں تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو ——— فساد کرانے میں البتہ لطف آتا تھا بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی ہے جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے۔ LITERARY SINS HAVE VERY LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسب حال مقولہ ہے۔ یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں:

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں: "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!" — اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے "پارٹیوں" کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بذات خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت"! تو بھئی یہ تو ایک بڑا عجیب قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت" — یہ کیا مسخرہ پن ہے!

شوکت تھانوی

ولادت:- ۲؍ فروری ۱۹۰۴ء

وفات:- ۴؍ مئی ۱۹۶۳ء

جائے پیدائش

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق۔ اب ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری۔ زمانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے کرشن کا استھان بندرابن ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس کی؟ ...... شوکت تھانوی کی۔

یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے۔ بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک بیچارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲؍ فروری ۱۹۰۴ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور اولاد نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود ہری ہو گئی۔ سپاہیوں نے گولے داغے۔ بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے۔ ایک ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ عقیقہ کے دن نام رکھا گیا۔ محمد عمر اور تاریخی نام نکلا تمیز احمد۔ یہ ان ہی حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے۔ جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے۔ تھانوی اس لئے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن کے تھانہ میں ہوئی بلکہ اس لئے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے۔

بے ہوشی کی باتیں

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ سنبھالے دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ سنا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مال حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا ضعف معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ شاعری اور فاقہ مستی میں جو چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

ہوش کی باتیں

ہم نے اپنی ہوش کی آنکھیں بھوپال کے ایک عالی شان مکان میں کھولیں۔ بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گزر

رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہیئے۔ اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا چندر کا تماشا شروع کریں گے۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر آئے جو چوتھے دن اس لئے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے۔ اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ اب ایک اور ماسٹر آئے جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا۔ چھوٹا سا قد، ناک کی پھنگی پر روپہلی عینک، منہ میں کچھ دانت اور باقی پان، جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما۔ عالم یہ تھا ہمارے ان ماسٹر صاحب کا کہ تشریف لائے، اندر سے ان کے لئے چائے آ گئی۔ وہ نوش فرمائی۔ پان آ گئے، وہ منہ میں رکھ لئے۔ اور پھر کتاب سامنے رکھ کر ہم تھے پڑھنے اور وہ تھے اونگھنے۔ کبھی کبھی اونگھتے اونگھتے ایک نعرہ بلند کیا آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا اور پھر اونگھ گئے۔ اگر وہ بالکل سو گئے تو ہم نے ان کے چہرہ پر روشنائی سے پھول پتے بنا دیئے اور اگر وہ جاگتے رہے تو ہم سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہے اور منہ سے بکتے رہے آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ مگر فلک کی رفتار کو ہمارا یہ سودا بھی پسند نہ آیا اور ایک دن والد صاحب نے نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ صاحبزادے اپنے ماسٹر سے آنکھ مچولی و چھپ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹا دیئے گئے۔

الیگزنڈرا ہائی اسکول

والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آ کر آخر ہمارا داخلہ الیگزنڈرا ہائی اسکول کے جماعت اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیچے صافے میں ایک چپراسی کے ساتھ الیگزنڈرا ہائی اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا چپراسی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا۔ اور ہم پڑھتے کیا تھے۔ اسکول میں بھی گڑیاں کھیلتے تھے۔ مگر ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھی گئی اور ہم کو درجہ اول میں جا پہنچا۔ الیگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا صحبت کم زمانہ گزرا۔ اس لئے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آ گئے۔ البتہ اتنا ہم کو اب بھی احساس ہے کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو ہو رہی تھی بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگوانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکول کی کتابوں سے زیادہ ہمارے لئے مفید ثابت ہوا۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا، مضمون نگار ہو گئے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔

دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے۔

لکھنؤ

لکھنؤ بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آ چکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس سلسلہ میں بلا کے بے پروا، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا ہی چاہا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ رح

کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا۔ جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بُری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کئے۔

ماسٹر پیارے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے۔ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ بہر صورت ان بیچارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی اور حساب وغیرہ میں اپنے نزدیک ہم کو چالو کر دیا۔ باقی مضامین بھی ضمنی طور پر ہمارے مطالعے سے وہ بیچارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔

آمد نامہ

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یا ویسی ہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لئے آمد نامہ خرید لیا گیا اور گھر کے باہر میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ آمد۔ آمدند۔ آمدی۔ آمدید۔ آمدم۔ آمدیم کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن۔ پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اسی پہلی ہی منزل پر استقبال کے لئے آئی ہوئی ہے۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا۔ اس پہلے سبق کو سننے کے لئے اور یہاں آثار یہ تھے کہ صاحبزادے کورے کے کورے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں۔ آخر طوفان اٹھا۔ برق و رعد۔ زلزلہ۔ انہدام۔ چیخ۔ گریہ۔ حقے کی چلم الٹ گئی۔ آمد نامہ کے پرزے فضا میں ایران کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سر نگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ معہ بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور کتے نے دُم ہلانا چھوڑ دی۔ ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچایا۔

مولانا عبدالرحیم کلیم

آمد نامہ کے سلسلہ میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا تو آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا کریں۔ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کیا۔ کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دل نشین تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لئے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔

خالو مدن اور ان کا لال اسکول

محض فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ والدہ صاحبہ کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی کہ صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سید محمد رضا اور کہلاتے تھے مدن۔ ہمارے ان خالو مدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا۔ کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا

جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "فش" یعنی کچھ بھی نہیں ۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا ۔ لہٰذا انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے سکول میں کر دیا جائے ۔ ان کے سکول کا نام لال اسکول تھا ۔ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چوتھے درجے میں لے لئے گئے اور پہلے ہی سال نہ جانے کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آ گئے ۔ تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا ۔ اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا ۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے ۔ والد صاحب کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے ۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے ۔ پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوتے ہیں ۔ جونپور کے رہنے والے ہیں اسم مبارک بخشش احمد ہے ۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے ۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ہماری تعلیم و تربیت شروع کر دی ۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا ۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا ۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی اسی دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی باتوں نے نشتر رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھتا تھا ۔ تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا ۔

پہلی غزل

اب ایک بات پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا ۔ ایک آدھ مصرع کبھی کبھی خود موزوں کر لیتے تھے مگر وہ ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ اس کو سنانے یا لکھنے کو دل نہ چاہتا تھا ۔ ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو بھی ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا ردی کلام جھوم جھوم کر نہایت خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے ۔ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لاتے اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا ۔ آپ نے امتحان لینے کے لئے ہم کو ایک مصرع دیا ۔

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا ۔

اور فرمایا کہ اس پر مصرع لگاؤ ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرع تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرع پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا ۔ ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا ۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود میں بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا ۔ کچھ دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنؤ کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیج دی کہ اس کو چھاپ دیا جائے ۔ اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں ۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے اور ہمارے غزلوں کے ترچھی نظروں کا دفتر پاشت

دیا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ، اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ نتیجے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

شادی کا ذکر

تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو اور ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجئے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجئے گا۔ تاوقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بیچارے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۳ء کا ہے۔ چنانچہ دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ وحشت منزل، احاطہ خانم فقیر محمد خاں پہنچے اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔

علیگڑھ جوبلی

اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آ جاؤ۔ اور جوبلی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے۔ امین سلونوی، وصل بلگرامی، پیرزادہ فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیماب وغیرہ۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خرید لیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ سال بھر تک گھر ہی پر پوری تیاری کے بعد ایک دم علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے تو یکایک بیمار پڑ گئے۔ بخار آیا اور جم کر رہ گیا۔ تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے۔ کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سال خراب ہو گیا۔

پہلا مزاحیہ مضمون

تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی اور اب ہم بالکل ہوم ممبر تھے۔ خالص انشا پرداز۔ اس زمانہ میں رسالہ "ترچھی نظر" جو امین سلونوی کی ادارت میں آ کر رسالہ "نظر" بن چکا تھا اور اس کا ترچھا پن نکالا جا چکا تھا ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ حالانکہ تھا بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرف کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر لو۔

رسالہ حسن ادب

اب تک ہم صرف رسالہ ترچھی نظر اور اس کے بعد اسی کی اصلاحی شکل رسالہ نظر سے واقف تھے مگر ایک دن پاٹانالہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "رسالہ حسن ادب لکھنؤ"

اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرتا اتارے، پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا اور کانوں میں اکھاڑے کی لگی ہوئی مٹی۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے۔ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے، خود ہی مدیر تھے، خود ہی کاتب تھے، خود ہی پبلشر ہیں اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں۔

رخصتی

سنہ ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آ جائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آ سکے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا۔ اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو ہماری عقلمندی کہ ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں کیا لکھ دیا کہ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ آخر ہم نے پھر ایک نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی اور ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔

اب ہم خود اپنی نظر میں کچھ وقیع، کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے تھے حالانکہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آ چکی تھی اور ہم محض رئیس تھے۔ نہ کمانے کی فکر نہ کچھ تدبیر مستقبل۔ تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو نہ تھی کہ معلوم نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے۔ والد صاحب کی معمولی پنشن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی جو روپیہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو چکا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آ سکی۔ ہم تو اپنے شاہانہ ٹھاٹھ میں تھے کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا کرتی تھی۔

پہاڑ پھٹ پڑا

ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے تو کل گورکھپور کا مشاعرہ۔ آج یہ اردو کانفرنس ہے تو کل وہ مناظرہ۔ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پھر سننا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑے۔ پھر آپریشن ہوا۔ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر ہی پر کیپٹن نگم سے آپریشن کرایا۔ مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آ سکا۔ وقت آ چکا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء کو روح پرواز کر گئی۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آسائش، یہ تمام بے فکریاں اور یہ تمام ریاستیں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

فکر معاش

والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا۔ ہم نے ماموں صاحب سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس لے کر چلئے وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں

اور آج کل روزنامہ "ہمدم" کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ وہ اگر مجھ کو ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے تو میں معمولی سے معمولی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا۔ ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری عزیزدارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ ۴۰ روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر تقریباً جھکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد زیر قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا "لے جاؤ" اور دزدیدہ نظر سے اس خاکسار کو دیکھا۔ ہم نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کیا۔ جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی۔ گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے کچھ لکھا اور آواز دی "لے جاؤ" دفتر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دے کر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔

قاضی محمد عادل صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی آپ نے بغیر کچھ دریافت کئے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لئے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کئے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ شروع شروع میں حال یہ تھا کہ ہمارے شذرے کا شاید ہی کوئی لفظ سید صاحب کی سرخ روشنائی سے بچا ہو مگر رفتہ رفتہ یہ عمل کم ہوتا گیا۔

سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی لکھا کیجئے۔ لہٰذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلے میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے "دو دو باتیں" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

سودیشی ریل

ابھی ہم ہمدم ہی میں تھے اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ مختلف رسالوں کے لئے لکھا کرتے تھے اور اب زیادہ تر فکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۳۰ء کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھئے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل

کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب کوئی بزرگ ہیں۔ انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے گلوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ سودیشی ریل ہے۔

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی۔ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا۔ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے بلکہ اس کے آگے کچھ اور مانگ رہے ہیں۔

اودھ اخبار ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ "اودھ" اخبار کے لئے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے اور سید نورالحسن صاحب سے ملے۔ اسی دن ہم اس اخباروں کے باوا آدم کے عملہ ادارت میں آ گئے۔

اخبار سرپنچ کا اجرا نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زنانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ اس رسالہ کے عملہ ادارت میں شوکت دلہن کا نام بھی تھا اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے نسیم صاحب سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں امین سلونوی اور نسیم انہونوی ہی دو ایسے تھے جن پر ہر طرح پورا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ ہم نے اخبار کا نام "سرپنچ" تجویز کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم احباب ثلاثہ کا اخبار سرپنچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ نکلا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی۔ کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔

رفیع احمد خاں ان حضرت کو اکثر مشاعروں میں صف سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ امین سلونوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا مگر اب تک آپ سے براہ راست ملاقات نہ تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک مشاعرے سے جو بلا وجہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا دو تین آدمی پیچھے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خاں صاحب تھے۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت شمیم الدین صاحب ایڈووکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خاں صاحب نے دیکھا۔ ان کی کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لئے آ رہی تھی۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے کار روک لی تو آپ نے پوچھا "شمیم صاحب کی گاڑی ہے نا" اس نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "فوراً چلو امین آباد" اور ہم سے کہا۔

متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خان صاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا: "اچھا اب جاؤ اور کہہ دینا کہ دکان بند تھی۔" ڈرائیور بے چارہ چپکا چلا گیا تو خان صاحب نے ہنسی سے بے قرار ہو کر کہا: "یہ آخری ٹکڑا قسم خدا کی حاصل مشاعرہ ہے کہ 'کہہ دینا دکان بند تھی'۔ اس وقت چار بجے رات کو دکان کے بند ہونے کی وہ لاجواب دلیل ہے کہ متین صاحب بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔" اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد جیسے یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ قطعاً مہمل ہے اور اس وقت تک کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ ساتھ پیش نہ ہوں۔

ہر چند کہ خاں صاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکتی تھی مگر خاں صاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی ترک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ آپ کے لئے شام کے وقت چوک جانا روز کی حاضری سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا اور تقاضا یہ تھا کہ تم بھی چلو اور ہم ان کے ساتھ بلا ناغہ چوک جانے لگے۔

تاش اور بازیاں

رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے لگا کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن خان صاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دو روپے کا سرمایہ لگا کر ہم نے ۴۰ روپے جیتے۔ اب کیا تھا چسکا پڑ گیا۔ روز خاں صاحب کے یہاں پہنچ رہے ہیں اور روز کھیل رہے ہیں۔ جب عادت اچھی طرح پڑ چکی تو اب ہار شروع ہوئی اور ہارے بھی ایسا کہ طبیعت بری ہو گئی۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کر کے اٹھتے تھے۔ مالی نقصان، بیوی سے خراب تعلقات، اخلاقی خسارہ ان سب پر اس وقت نظر جاتی تھی اور ہم گویا عہد کر لیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا اور اجل نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔

روزنامہ ہند

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا۔ اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تاشوں کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے لکھنؤ آ کر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کی اور ہند کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لئے ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ ورما صاحب نے امین سلونوی کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آ جانے کی دعوت دی۔ تنخواہ بھی اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کر لیا۔ اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہو گئے۔ ہم کو اخبار کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کے ۸ بجے دفتر جاتے تھے۔ صبح چار پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے دن کو تھوڑی دیر کے لئے دفتر جانا پڑتا تھا مگر یہ تھوڑی دیر اکثر اس قدر طول کھینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹہ کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آ جاتی تھی۔ مگر اب ہم کو اطمینان تھا ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے اطمینان ہو چلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ اخبار واقعی شاندار تھا اور انتظامات اس قدر ٹھاٹ کے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں اور اخبار نویسی جس

کو کہتے ہیں وہ دراصل اب شروع ہوتی ہے۔ گر لمیٹڈ کمپنی تو کچی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی۔ اس کا چوراہے پہ ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند۔ تنخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

بک ڈپو

اپنی بک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ موج تبسم اور بحر تبسم نسیم انہونوی صاحب نے چھاپی تھیں۔ سیلاب تبسم، صدیق بک ڈپو نے۔ لہذا چوتھا مجموعہ طوفان تبسم اور کچرستان ہم نے خود چھاپے۔ ان کی اشاعت کے بعد اگر ہم آدمیت سے کام لیتے تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا اور اب تک جو بیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لئے کوئی مستقل سامان کر دیتے مگر یہاں تو منظور یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اسی وقت تک ساتھ دیتی تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا بس بیکل رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو۔ گر جائے۔ کوئی چرا لے۔ کوئی مانگ لے۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔

پھر وہی تاش اور وہی ہم

ہم کوئی بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے۔ مقصد تو روپیہ نکالنے سے تھا اور منافع کمانے سے۔ لہذا ہم نے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار کا نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یا تو وارے نیارے ورنہ ہارے تو جاگے تا بارے۔

روزنامہ حق

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا: حق۔ عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر مرحوم علی افسر صاحب عباسی ہمارے لئے اجنبی نہ تھے۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو روزنامہ بنا دیں۔ اخبار کی پوری اسکیم بننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان بجائے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا۔ لکھ دیا کریں گے۔ تنخواہ طے ہو ہی چکی تھی۔ ہم حق کے دفتر پہنچ گئے اور ملازمت قبول کر لی۔ خبروں کا ترجمہ۔ حق و باطل کا لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

رسالہ کائنات

عبدالرؤف صاحب عباسی نے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور اس کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے۔ اس کا نام کائنات تجویز ہوا۔ پہلا نمبر اس قدر شاندار تھا کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔

طوفان

۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونے کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہو گی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے، خریدار فراہم کرنے، ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے اور یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی۔ طوفان نے زمینداروں کی ہر ممکن وکالت کی مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا۔ "طوفان" طوفان بن کر آیا اور طوفان ہی کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم گھر کے رئیس تھے۔

لکھنؤ اس بیکاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا۔ برادرم ملک حبیب احمد صاحب ڈائرکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے گانا بھی گواتے۔ وہ تو کہیے کہ خیریت گزری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں پاٹ دیا گیا۔ ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا کہ آخر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہی روشنی طبع ہمارے لیے بلا بننے والی ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا۔ کیوں نہ اس کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا۔ چلو ریڈیو سٹیشن ملازمت کا حکم آگیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں تو ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گزرتا تھا۔ اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو ہمیشہ سے خیرباد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتداء کا بگل بجا کر شروع کر دی۔

(تلخیص مابدولت)

مکتبۂ تاجر کے انمول شاہکار

دیوالی کی راتیں —— شمیم اختر —— تین روپے پچاس پیسے
سفرنامۂ حجاز —— عاجز لدھیانوی —— چھ روپے
شگفتہ جوانی —— تاج لدھیانوی —— تین روپے پچاس پیسے
آوارہ حسن —— نسیم اختر —— پانچ روپے
میں آوارہ ہی سہی —— دت بھارتی —— چار روپے
بہار آگئی —— نسیم اختر —— پانچ روپے
لٹ گئے ہم بہار میں —— شمیم اختر —— پانچ روپے
سوسائٹی کے گناہ —— حکیم یوسف حسن —— ۳ روپے پچاس پیسے
نیلام ہوتا رہا —— تاج لدھیانوی —— پانچ روپے
شگفتہ آنچل —— دت بھارتی —— پانچ روپے
عشق خانہ (مزاحیہ) —— تاج لدھیانوی —— پانچ روپے
سرخ ہونٹ —— شمیم اختر —— پانچ روپے
وہ بک نہ سکی —— نسیم اختر —— پانچ روپے
ان کی بستی میرا پیار —— شمیم اختر —— آٹھ روپے
ایک دل ہزار ارماں —— رابن پراجی —— پانچ روپے
زمانہ ہنستا رہا —— تاج لدھیانوی —— پانچ روپے
کتنے مجبور ہیں —— دت بھارتی —— چار روپے پچھتر پیسے
میرے بچے —— شمیم پرویز —— چار روپے
گھائل کو گھائل جانے —— شمیم اختر —— پانچ روپے
رات کی بات —— تاج لدھیانوی —— تین روپے پچاس پیسے
دوشیزۂ ہند —— صادق حسین صدیقی سردھنوی —— چار روپے
رات گئی بات گئی —— دت بھارتی —— پانچ روپے
لٹ گئے ہم پیار میں —— نسیم اختر —— پانچ روپے
تیری محبت ہو نہ سکی —— شمیم اختر —— پانچ روپے
دل نادان —— طارق بشیر —— تین روپے پچاس پیسے
[illegible] —— نسیم اختر —— پانچ روپے
یہ ظالم دنیا —— دت بھارتی —— پانچ روپے
میں انتظار نہ کر سکی —— تاج لدھیانوی —— پانچ روپے
دیپ جلے دیپ بجھے —— دت بھارتی —— پانچ روپے
میں خاموش رہی —— تاج لدھیانوی —— پانچ روپے

فہرست کتب ایک خط لکھ کر طلب کیجئے

مکتبۂ تاجر، بہارستان، کراچی

ونسٹن چرچل

پہلی یادیں

یہ طے کرنا تو مشکل ہے کہ انسان باتوں کو یاد رکھنا کب سے شروع کرتا ہے اور آغازِ شعور کی تھرتھراتی ہوئی نوری اور لرزتے ہوئے سایے کب بچے کے ذہن پر اپنے نقش ثبت کرنے لگتے ہیں؟ مگر میری پہلی یادیں آئرلینڈ سے وابستہ ہیں۔ مجھے اب بھی آئرلینڈ کے مناظر اور واقعات یاد آتے ہیں۔ اتنا تو بہرحال مجھے معلوم ہے ہی کہ میں ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوا تھا اور ۱۸۸۰ء کے آغاز میں آئرلینڈ کو خیرباد کہا۔ میرے دادا۔ ڈیوک آف مالبرو تھے۔ میرے والد ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے آئرلینڈ گئے تھے۔ ہمارا گھر وائسرائے کے محل سے قریب ہی تھا۔ میرے بچپن کے تقریباً تین سال یہیں گزرے۔ مجھے اب بھی وہ واقعہ یاد ہے جب ۱۸۷۸ء میں میرے دادا نے جو وائسرائے تھے۔ لارڈ گف کے مجسمے کی نقاب کشائی کی تھی۔ شاید یہی میری پہلی یادداشت ہے جو ابھی تک محفوظ ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں بعد کے واقعات بہت صاف طور پر یاد آتے ہیں۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں پڑھائی لکھائی کی مصیبت سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا۔ ایک دن ایک ہیبت ناک شخصیت کی آمد کا اعلان کیا گیا جسے "گورنس" کہا جاتا تھا۔ اس دن کی تیاری کے لئے مجھے مسز ایورسٹ نے ایک کتاب دی تھی جس کا نام تھا "ریڈنگ ود آؤٹ ٹیرز"۔ جہاں تک میرا تعلق تھا کتاب اپنے نام کی سچی ثابت نہیں ہو سکی۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہوا کہ "گورنس" کے آنے سے پہلے ہی مجھے اتنی تیاری کر لینی چاہیے کہ میں اس کے سامنے کتاب بغیر روئے دھوئے پڑھنے لگوں۔ میں روزانہ اسی میں لگا رہتا۔ مسز ایورسٹ ایک قلم سے مجھے حروف بتاتی جاتیں اور میں اُن کی ان باتوں سے بہت تنگ تھا۔ ہماری تیاریاں ابھی پوری نہیں ہو پائی تھیں کہ "گورنس" کی آمد کی گھڑی آ گئی۔ میں نے اس موقع پر وہی کیا جو ایسے موقعوں پر دنیا کے ستائے ہوئے لوگوں نے ہمیشہ کیا ہے۔ میں وہاں سے بھاگ گیا اور ان جنگل جیسی گھنی جھاڑیوں میں چھپ گیا جو میرے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ کئی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد میں پکڑا گیا اور گورنس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے روزانہ صرف حروف اور الفاظ ہی نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ گنتی بھی سیکھنی پڑتی جو اُن سے بھی کہیں بدتر تھی۔ حروف سے تو بہرحال واقف ہونا ہی تھا۔ انہیں ایک خاص طریقے پر جوڑ دینے سے جو شکل بنتی تھی وہ سمجھ میں آ جاتی تھی۔ پھر ایک آسانی یہ بھی تھی کہ اُن میں خاص طرح کی آوازیں بھی ہوتی تھیں مگر اعداد کا تو معاملہ ہی الگ تھا۔ وہ آپس میں طرح طرح سے اٹنے گتھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے پیش آتے تھے کہ ان کے بارے میں پہلے سے بالکل صحیح طور پر کچھ جان لینا انتہائی دشوار تھا۔ جب وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیئے جاتے تھے تو یہ بتانا بھی میرے لئے ضروری ہو جاتا تھا کہ اس عمل سے نتیجہ کیا نکلا اور گورنس کو اس بات پر حد سے زیادہ اصرار تھا کہ میرا جواب صحیح بھی ہو۔

ان حرکتوں میں اگرچہ میری والدہ نے کوئی حصّہ نہیں لیا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ انہیں پسند ضرور کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ گورنس کا ساتھ دیتی تھیں۔ میرے ذہن میں اپنی ماں کی وہ تصویر ابھی تک نقش ہے۔ کھال کی طرح چست شہسواری کی پوشاک میں ملبوس اور کیچڑ میں لت پت۔ وہ اور میرے والد اپنے اپنے گھوڑے سنبھال کر شکار پر نکل جایا کرتے اور گھر پر بعض اوقات اُن کی وجہ سے بڑی فکر اور پریشانی پھیل جاتی کیونکہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے مقررہ وقت سے گھنٹوں بعد واپس آتا۔ اپنی ماں مجھے ہمیشہ پریوں کی شہزادی لگتی تھی۔ وہ مجھے ایسی ماورائی اور نورانی ہستی معلوم ہوتی جس کی دسترس میں بے پناہ دولت اور قوت ہو۔ وہ اس تابندہ ستارے کی مانند تھی جو میرے سامنے سرِ شام آسمان پر جگمگاتا تھا۔ میں اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ مگر ہمارے درمیان ذرا سا فاصلہ بھی تھا۔ دراصل مجھے سب سے زیادہ قرب اپنی نرس مسز ایورسٹ سے تھا جو میری پوری دیکھ بھال کرتیں اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ میں اپنے دل کی ساری باتیں ان ہی سے کہتا اور اپنا سارا دُکھڑا ان ہی سے روتا تھا۔

میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میری اس چھوٹی سی دنیا میں گورنس کتنی بھیانک بن کر آئی تھی مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک مرحلہ ایک اور تھا جس کا مجھے اب سامنا کرنا تھا۔ میں اب سات برس کا ہو گیا تھا کہ جس عمر کو تکلیف دہ حد تک شریر سمجھا جاتا ہے چنانچہ مجھے اسکول بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

میرے ماں باپ نے میرے لئے جس اسکول کا انتخاب کیا تھا وہ انگلستان کے سب سے اچھے اور سب سے مہنگے اسکولوں میں سے تھا۔ ایک جماعت میں دس سے زیادہ لڑکے نہیں رکھے جاتے تھے۔ یہاں بجلی بھی آچکی تھی جو اس زمانے میں ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔ تیرنے کے لئے ایک تالاب تھا۔ فٹ بال اور کرکٹ کے لئے وسیع میدان تھے۔ ہر ٹرم میں کم از کم دو تین بار طلبہ سیر پر بھیجے جاتے تھے۔ اپنا الگ چرچ تھا۔ غرض کہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسکول کے ارباب حل و عقد نے بہم نہ پہنچائی ہو۔ نومبر کی ایک سیاہ دوپہر کو میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ہم نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ چائے پی اور میری والدہ ان سے بڑے پرسکون انداز میں باتیں کرتی رہیں۔

ماں کے رخصت ہو جانے کے بعد مجھے زبان کے اُستاد نے بُلایا۔ اس وقت سب لڑکے باہر جا چکے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے ایک لاطینی زبان کی کتاب کھول کر رکھ دی۔ اس میں سے گرامر کا ایک حصّہ بتا دیا اور کہا ”میں آدھے گھنٹے بعد آکر دیکھوں گا کہ تم نے کیا کیا۔“ اب ذرا تصور کیجیے کہ اس اُداس شام کو میں اپنے دُکھے ہوئے دل کو تھامے ہوئے گرامر کا پہلا سبق کھولے بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ جو الفاظ میں بُدبُدا رہا تھا ان کا مطلب کیا تھا اور کوئی مطلب ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ بہرحال اب تو رٹنا تھا اور صرف یہی اپنے اختیار میں تھا، چنانچہ جتنا اپنے غم پر قابو پا سکا اتنا رٹتا گیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ماسٹر صاحب واپس آگئے اور انہوں نے مجھ سے سارا سبق سُنا۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے مطمئن ہیں، چنانچہ میں نے کچھ اور سوالات کرنے کی جرأت کی۔ وہ ایک کے جواب تو انہوں نے دے دیے مگر جب میں نہ رُکا تو بولے ”اگر زیادہ بدتمیزی کی تو تمہیں سزا ملے گی اور میں بتائے دیتا ہوں کہ سزا بڑی سخت ہوگی۔“

یہ تھا کلاسیکس سے میرا پہلا تعارف، جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ ہمارے قابل ترین لوگوں نے ان ہی کی بدولت زندگی میں سارے فوائد حاصل کئے۔

سزا کے بارے میں ماسٹر صاحب نے جو کچھ کہا وہ محض یونہی نہیں تھا۔ ٹھکائی تو گویا یہاں کے نصاب تعلیم کا ایک اہم جزو تھی۔ بعد کے تجربات سے مجھے اندازہ ہوا کہ دراصل وہ بے چارے اپنے مزاج ہی سے مجبور تھے۔ مجھے اس اسکول سے سخت نفرت تھی اور یہاں دو سال میں نے بڑی پریشانی میں کاٹے۔ میں نے یہاں پڑھائی میں بہت ہی کم ترقی کی اور کھیلوں میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں گھڑیاں گنا کرتا تھا کہ کب گھر جانے کی نوبت آئے گی جہاں میں اپنی نرسری کے فرش پر اپنے سپاہیوں کو جنگ کے لئے تیار کروں گا۔ اُن دنوں مجھے سب سے زیادہ خوشی اپنے مطالعہ میں حاصل ہوتی تھی۔ جتنے دن بھی میں اس اسکول میں رہا کوئی مجھ سے نہ تو لاطینی لکھوانے میں کامیاب ہو سکا اور نہ یونانی۔ میں اپنی اس احمقانہ بے توجہی کو خود بھی معاف نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے میں نے وہ مواقع کھو دئے جو میرے والدین نے بہت کچھ خرچ کر کے میرے لئے فراہم کئے تھے اور جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے میرے اساتذہ مجھے بے حد مجبور کیا کرتے تھے لیکن اگر مجھے ان قدیم چیزوں یا گرامر کی بجائے ان ملکوں کی تاریخ اور رسم و رواج کے ذریعے متعارف کرایا گیا ہوتا تو شاید میرے ماضی کا نامۂ اعمال کچھ بہتر ہوتا۔

یہاں میری صحت بھی بہت خراب ہو گئی جس کی بنا پر بالآخر میرے والدین نے مجھے واپس بلا لیا اور برائٹن بھیجا۔ جہاں میرے خاندان کے ڈاکٹر رابسن روز بھی رہتے تھے تاکہ وہ مجھ پر مستقل نگرانی رکھ سکیں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں میں ایک اسکول میں داخل ہوا اور مجھے دو خواتین کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ اسکول پہلے اسکول کے مقابلے میں چھوٹا بھی تھا سستا بھی تھا اور اس کے بڑے بڑے دعوے بھی نہیں تھے مگر ان سب کے باوجود جو ہمدردی اور محبت مجھے یہاں ملی اس کا تو وہاں دور دور پتہ نہیں تھا۔ یہاں میں تین سال رہا اور اگرچہ ایک بار ڈبل نمونیا سے بس مرتے مرتے بچا۔ مگر یہاں کی کھلی ہوئی اور سہانی فضائیں مجھے راس آئیں اور رفتہ رفتہ تندرست ہو گیا۔ یہاں اپنی پسند کی ساری چیزیں پڑھنے کی اجازت تھی۔ فرانسیسی زبان پڑھائی جاتی تھی، تاریخ پڑھائی جاتی تھی اور نظمیں تو لاتعداد مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے یہاں شہسواری اور تیراکی بھی سیکھی۔ میری تعلیمی زندگی کے ابتدائی دنوں کی تلخ یادوں کے قطعاً برخلاف اس دور میں میرے ذہن پر بڑی خوشگوار تصویریں نقش ہو گئیں۔

ہیرو میں داخلہ

میں ابھی ۱۲ برس کا ہی تھا کہ امتحانوں سے سابقہ پڑا اور آنے والے سات برس میں مجھے اس ناہموار اور خار دار سرزمین کو طے کرنا تھا۔ یہ امتحانات میرے لئے بڑی سخت آزمائش ثابت ہوئے۔ جن مضامین سے مجھے سب سے کم رغبت تھی وہی ممتحنوں کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ ہیرو میں داخلے کے موقع پر تو مجھ پر بہت ہی بری گذری۔ لاطینی نثر کا پرچہ تھا۔ جتنے سوالات آئے سب ہی میں بالکل کورا نکلا۔ میں نے ایک صفحے پر سب سے اوپر اپنا نام لکھا پھر پہلے سوال کا نمبر لکھا اور پھر بڑی دیر تک گیان دھیان کرنے کے بعد اس نمبر کو بریکٹ میں کر دیا۔ اس کے بعد خدا جانے کس ان دیکھی سمت سے اس کاغذ پر ایک دھبہ اور چند لکیریں اور خود اد

ہو گئیں۔ میری طبیعت کے ان دھندلے نقوش سے مسٹر ویلڈن (ہیڈ ماسٹر) نے نہ معلوم کیسے یہ نتیجہ نکالا کہ میں ہیرو میں داخلے کے لائق ہوں۔

جماعت کی فہرست میں میرا نام حروفِ تہجی کے اعتبار سے بھی بالکل نیچے آتا تھا اور قابلیت کے اعتبار سے بھی۔ اور حاضری کے وقت ایک ایک کر کے سب لڑکوں کو ماسٹر صاحب کے سامنے سے گزرنا پڑتا تو مجھے کچھ تحقیر کا سا احساس ہوتا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۸ء کا ہے جب لارڈ رڈولف چرچل نے ہاؤس آف کامنز کے لیڈر اور وزیر خزانہ کے عہدوں سے استعفاء دے دیا تھا اور اب تک ملک کی سیاسی زندگی میں وہ بڑی اہمیت کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے اسکول کی سیڑھیوں پر مجھے گزرتا ہوا دیکھنے کے لئے بڑا مجمع لگ جایا کرتا تھا اور میرے کانوں میں اکثر اس طرح کے کلمات پڑتے تھے کہ ”آخر یہ لڑکا سب سے پیچھے کیوں ہے۔“

ہیرو میں میرا داخلہ گرمیوں میں ہوا تھا۔ یہاں اس زمانے میں تیرنا اور حوض میں پڑے رہنا ایک عام مشغلہ تھا۔ کہنے کو تو ایک بڑا حوض تھا مگر دیکھنے میں پورا دریا لگتا تھا۔ حوض کے کنارے کھڑے ہوئے لڑکوں کے پیچھے چپکے چپکے جا کر اچانک انہیں پانی میں دھکا دے دینے میں بڑا مزا آتا تھا۔

میں پڑھائی میں بہت کمزور ہونے کے باوجود بھی بالکل ہی چغد نہیں تھا۔ میں نے ایک بار میکالے کی ایک مشہور نظم ”Days of the ancient Rome“ کی بارہ سو سطریں زبانی یاد کر کے بغیر اٹکے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سنا دی تھیں جس پر مجھے انعام بھی ملا تھا۔ اسی زمانے میں فوج میں داخلے کے لئے ابتدائی امتحان میں بھی میں پاس ہو گیا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی فوجی کھیلوں سے دلچسپی تھی۔ میری اس دلچسپی کے پیشِ نظر میرے والد نے مجھے اسی کے مطابق تعلیم دلانے کا انتظام کیا تھا

میں نے ہیرو میں کوئی ساڑھے چار سال گزارے جن میں سے تین سال فوجی جماعت میں صرف ہوئے۔

سینڈہرسٹ میں داخلہ

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سینڈہرسٹ کی فوجی درس گاہ میں داخلے کی تیاری شروع کی۔ تین بار داخلے کے امتحان میں بیٹھا اور بالآخر پاس ہو ہی گیا۔ ریاضی میں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ ہیرو کے ایک بہت ہی محترم استاد مسٹر میو نے مجھے یہ مضمون کچھ اس طرح پڑھایا کہ میرے سامنے اس کے بہت سے دلچسپ پہلو بھی روشن ہو گئے اور مجھے یقین ہونے لگا کہ بظاہر غیر دلچسپ شکلوں کے پیچھے جو مفاہیم اور ان میں جو مترنم آوازیں چھپی ہوتی ہیں اُن سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت سے میں بالکل ہی بے بہرہ نہیں ہوں اور آخری امتحان میں جو سوالات پوچھے گئے وہ بھی اتفاق سے ایسے تھے جن کے لئے میں تیار تھا اور سچی بات بھی دراصل یہی ہے کہ اگر اس بوڑھے خرانٹ سول سروس کمشنر نے وہ سوالات نہ پوچھے ہوتے جو صرف ایک ہفتہ پہلے میں نے سیکھے تھے۔ تو شاید اس آپ بیتی کا ایک باب بھی آپ کے سامنے نہ آتا۔

سینڈہرسٹ میں داخلے کے دوسرے امتحان میں فیل ہونے کے بعد میں ہیرو سے چلا آیا اور مجھے کیپٹن جیمز کے سپرد

کر دیا گیا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کا پڑھایا ہوا کبھی اس امتحان میں ناکام نہیں ہوا۔ ہاں! کوئی بالکل ہی گاؤدی ہو تو اس کی بات اور ہے۔

ان ہی دنوں سردیوں کے موسم میں میں اپنی ایک عزیزہ لیڈی ویمبرن کے یہاں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اپنے ہم عمر دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ کھیل ہی کھیل میں بڑی اونچائی سے گر پڑا اور ایسی بُری چوٹیں آئیں کہ بہت دنوں تک بستر پر پڑا رہا اور انگلستان کے مشہور ترین ڈاکٹروں کے زیر علاج رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۸۹۲ء کے الیکشن کے بعد نئی پارلیمنٹ بنی تھی اور مسٹر گلیڈسٹون کی رہنمائی میں نئی حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی۔ ملک میں عام طور پر یہ خیال ہو رہا تھا کہ میرے والد حزبِ مخالف میں رہ کر پارلیمنٹ اور پارٹی میں پھر وہی اہم حیثیت حاصل کر لیں گے جو اب سے چھ سال پہلے ان کے مستعفی ہو جانے سے ختم ہو گئی تھی۔ مجھے ان ہی دنوں اُس دور کے اہم ترین سیاسی رہنماؤں کو اپنے گھر پر دیکھنے کا، اُن سے ملنے کا، کھانے کی میز پر اُن کے ساتھ بیٹھنے اور اپنے والد کے ساتھ ان کی گفتگو سننے کا موقع بھی ملا۔ ان لوگوں میں میرے والد کے سیاسی مخالفین بھی ہوا کرتے تھے جن سے ان کی بڑی بڑی سخت اور تلخ معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں مگر مختلف لمحات میں ان سب کو ایک ساتھ دیکھنے سے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ سیاسی دنیا کی تلخیوں کے باوجود اُن کے ذاتی تعلقات کس قدر بے لاگ ہوا کرتے تھے اور سب آپس میں کس قدر گرمجوشی سے ملتے تھے۔

جب میری صحت کچھ بہتر ہوئی تو میں پھر امتحان کی تیاری میں لگ گیا اور بالآخر کامیاب ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میرا بارہ سال کا اسکول کا زمانہ ختم ہوا اور میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسکول کی زندگی میں مجھے بہت کم ایسی چیزیں ملیں جو میرے شوق کی تھیں اور کامیابی کی تو بس تھوڑی سی جھلکیاں ہی دیکھنے میں آئیں۔

ہیرو میں میرے سب سے عزیز دوست کا نام تھا جیک مل بینک۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ پڑھائی اور کھیلوں میں تو زیادہ ممتاز نہیں تھا مگر اس کے طور طریقے، رکھ رکھاؤ، بات کرنے کا سلیقہ اور اس کی عام سوجھ بوجھ یہ سب باتیں غیر معمولی طور پر حیرت انگیز اور دل موہ لینے والی تھیں۔ وہ بے انتہا شریف، خوش مزاج اور خوش پوشاک آدمی تھا۔ جب کبھی میرے والد مجھ سے ملنے کے لئے آتے تو وہ ہم دونوں کو کنگز ہیڈ ہوٹل میں لنچ پر مدعو کرتا اور اُن سے اس قدر مزے میں اور اعتماد کے ساتھ باتیں کرتا جیسے بالکل اُن کے برابر کا ہو۔ مجھے اُس پر بڑا رشک آتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ کاش میرے تعلقات بھی والد صاحب کے ساتھ ایسے ہی ہوتے مگر میں تو بالکل پھسڈی سا طالب علم تھا — جب کبھی ان کے درمیان دخل در معقولات کی کوشش کرتا تو ضرور کوئی نہ کوئی حماقت کی بات کر بیٹھتا۔

مل بینک کے ساتھ سازش کر کے میں نے ایک بار اسکول میں ایک حرکت بھی کی۔ یہاں کی پُرانی روایت کے مطابق فٹ بال کھیلنا سب کے لئے لازمی نہیں تھا مگر رفتہ رفتہ اس روایت کی پابندی ختم ہو گئی تھی اور فٹ بال کھیلنا سب کے لئے ضروری ہو گیا تھا چنانچہ ہم دونوں نے ایک دن فٹ بال کھیلنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی کہ نہ صرف اس میں لازمی طور پر حصہ لینا روایت کے خلاف ہے بلکہ اس سے ہماری پڑھائی میں بھی ہرج ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم دونوں کو بہت مار کھانی پڑی۔

مانیٹروں نے بھی جی بھر کے قمچیاں لگائیں مگر پھر بھی قانون ہمارے ساتھ تھا۔ بالآخر فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ہماری قائم کی ہوئی روایت آنے والی نسلوں نے ختم نہیں کی ہوگی۔

مل بینک مجھ سے ایک سال قبل ہیرو سے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فوج میں گیا جہاں اُس نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور جنوبی افریقہ کی جنگ میں سخت زخمی ہو جانے کے باوجود دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں ایک سپاہی کی جان بچانے پر اسے وکٹوریہ کراس بھی عطا کیا گیا۔

اب مجھے اپنے والد کے ساتھ شہسواری کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیاسی مجلسوں میں، اور اہم لوگوں کے یہاں بھی لے جانے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دُنیا کی ہر چیز کی کنجی ان کے پاس ہے، بشرطیکہ وہ چیز اس قابل ہو کہ اس کی تمنا کی جا سکے۔ مگر جب میرے ذہن میں ان کی برابری کا خیال آتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی۔ اور ایک بار جب میں نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُن کی طرف سے جو خطوط لکھے جاتے ہیں، ان کے مسودات تیار کرنے میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی مدد کروں۔ تو وہ اس قدر برہم ہوئے تھے کہ بس مت پوچھئے۔ مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ ہمارے تعلقات کا یہ دور عارضی ہے۔ اگر وہ چار پانچ سال اور زندہ رہتے تو وہ شاید میرے بغیر نہ رہ سکتے۔ مگر چار پانچ سال گزرنے کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔

۲۴ جنوری ۱۸۹۵ء کی صبح کو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصے سے مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اُن کی رفاقت اور پارلیمنٹ میں اُن کے شانہ بہ شانہ شریک ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کے سارے خواب اب ختم ہو چکے تھے۔ اب اگر میرے لئے کچھ رہ گیا تھا تو وہ تھا ان کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور ان کی یاد کو زندہ رکھنا۔

میں اب اپنی تقدیر کا خود مالک تھا۔ میری والدہ میری مدد کرنے اور مجھے مشورہ دینے کے لئے ہر وقت میرے ساتھ تھیں مگر میں اب اکیس برس کا ہو گیا تھا اور وہ بھی اب مجھے اپنے بزرگانہ اختیار اور قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ دراصل وہ بہت جلد میری بہت اچھی رفیق بن گئیں۔ وہ اپنے سارے اثر و رسوخ اور اپنی ساری طاقت میرے منصوبوں کو پورا کرانے اور میرے مفادات کی دیکھ بھال میں صرف کرتی تھیں۔ وہ ابھی صرف چالیس برس کی تھیں اور ہم دونوں ماں، بیٹے کی بجائے بہن اور بھائی کی طرح ہر کام میں ساتھ رہتے۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا۔ ہمارے یہ تعلقات آخر تک اسی طرح قائم رہے۔

میں دسمبر ۱۸۹۴ء میں سینڈہرسٹ کی فوجی تعلیم مکمل کر کے گھر واپس آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کی تعلیمی زندگی میں میرا جو حال رہا تھا، یہاں اس کے قطعاً برخلاف میں نے بہت سے امتیازات حاصل کئے۔ ایک سو پچاس طلبہ کے اس گروپ میں میرا آٹھواں نمبر تھا۔ ان باتوں کا ذکر میں صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کر رہا ہوں کہ دراصل ایسا نہیں تھا کہ اہم اور قابل قدر چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت مجھ میں سرے سے نہ ہو۔

سینڈہرسٹ سے جب میں نکلا تو ایک نئی دُنیا نے الٰہ دین کے غار کی طرح اپنے پٹ میرے سامنے کھول دئے۔

۱۹۳۰ء سے لے کر آج تک مجھے اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ میں اس گذرے ہوئے زمانے کی طرف مڑ کر ایک نظر دیکھ لیتا۔ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی متحرک تصویر سی معلوم ہوتی ہے جس میں میں ایک کردار ہوا کرتا تھا۔ مگر ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک جو عرصہ گذرا وہ بڑا دلچسپ، بڑا رنگا رنگ اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ جب بھی میں اُس کی طرف دیکھتا ہوں تو قسمت کا شکر ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستان کا سفر

مجھے کیوبا کی مہم کے بعد برطانوی فوج کے ساتھ ہندوستان جانے کا بھی موقع ملا۔ ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد ہمارے جہاز کے افسر اور سپاہی بمبئی کے ساحل پر بڑے بڑے تاڑ کے درخت اور خوبصورت محلوں کی جھل جھلک دیکھ کر کس قدر خوش ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہم سب لوگ چمکتے دمکتے اور جھاگ اُگلتے ہوئے سمندر کے ساحل کی طرف گھورتے ہی چلے جاتے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ جہاز سے اتر کر جلد از جلد ہندوستان کی سرزمین کو چھوئے مگر اُترتے اُترتے کافی وقت صرف ہو گیا۔

ہندوستان میں فوجی زندگی کے معمولات کے علاوہ میرا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ "پولو" تھا۔ ہندوستان میں بنگلور کا قیام میری زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں مجھے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اسکول سے نکلنے کے بعد میں سینڈہرسٹ کی فوجی درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا جہاں پڑھنے لکھنے اور پڑھے لکھے لوگوں سے کچھ حاصل کرنے کے وہ مواقع نہیں تھے جو یونیورسٹیوں میں حاصل ہوتے ہیں۔

میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی طرف توجہ دینی شروع کی اور فوجی مشقوں کے ختم ہونے سے لے کر پولو شروع ہونے کے وقت تک جو وقفہ میسر ہوتا تھا اُسے مطالعہ میں صرف کرنے لگا۔ میں نے تاریخ، فلسفہ، معاشیات، اخلاقیات، مذہبیات اور دوسرے موضوعات پر نہ جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس زمانے میں میں نے جو کتابیں پڑھیں اُن میں گبن کی "زوالِ سلطنتِ روما" اور آپ بیتی اور میکالے کی تحریروں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔

ہندوستان کے قیام میں میرا سب سے دلچسپ تجربہ صوبۂ سرحد کا سفر تھا، جہاں میں ایک فوجی مہم کے سلسلے میں بڑی کوششوں کے بعد پہنچ سکا تھا۔ یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ کرۂ ارض کے کسی حصے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ وادی چاروں طرف سے پانچ پانچ چھ چھ ہزار فٹ بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں جو نسل آباد ہے، اُس کی خصوصیات بھی یہاں کی فضاؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ فصل کٹنے کے زمانے میں تو یہ لوگ عارضی طور پر صلح کر لیتے ہیں اور سال کے باقی دنوں کسی نہ کسی طرح کی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں کا ہر شخص یا تو سپاہی ہو گا یا سیاست داں یا پھر عالمِ دین۔ ہر بڑا مکان اپنی جگہ پر ایک مکمل قلعہ ہے۔ ہر گاؤں میں دفاع کا اپنا نظام ہے۔ یہاں ہر گھرانہ اور گروہ اپنے جھگڑوں کو پالتا رہتا ہے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے کسی نہ کسی طرح کا حساب ضرور رکھتا ہے۔ کوئی بات کبھی بھلائی نہیں جا سکتی اور کم ہی حساب ایسے ہیں جو چکائے نہیں جاتے۔ ان کی سماجی زندگی کی بنیاد چند رسم و رواج ہیں جن کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جو شخص بھی ان رواجوں سے واقف ہے اور ان پر بغیر کہیں لغزش کھائے ہوئے عمل کرے، وہ

بے خوف و خطر سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہتا گھوم سکتا ہے مگر اس میں ایک ذرا سی لغزش جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ غرض کہ پٹھان کی زندگی بڑی ہی دلچسپ ہے۔ جن زرخیز وادیوں میں وہ رہتا ہے وہاں سورج کی روشنی بھی اتنی ہی فراواں ہے جتنا کہ پانی۔ اور تھوڑی سی محنت سے یہاں کی بکھری ہوئی آبادی کی تمام معمولی مادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ انیسویں صدی میں اس خوشحال دُنیا کے اندر دو نئے عناصر در آئے۔ ایک تو رائفل اور دوسرے برطانوی حکومت۔ رائفل تو ایک عیاشی اور رحمت بن کر آئی جبکہ برطانوی حکومت ایک مستقل وبال کی صورت میں نازل ہوئی۔ رائفل کی قدر دانی کہیں بھی ایسی نہیں ہوئی جیسی کہ ہندوستان کے اس کہستانی علاقے میں۔ ایک ایسے ہتھیار نے جس سے پندرہ سو گز کے فاصلے پر بے خطا نشانہ لگایا جا سکے۔ یہاں کے ہر قبیلے اور ہر گھرانے کے لئے جس میں اسے خریدنے کی ذرا بھی استطاعت ہو، مسرتوں کے نئے دروازے کھول دئے اس کے ذریعے گھر بیٹھے ایک میل کی دُوری سے جسے چاہے مار گرائے۔ پٹھانوں کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے اقدامات یہاں بڑے غیر اطمینان بخش تھے۔ نہ صرف پٹھانوں کو میدانوں کی طرف آنے سے روکا جاتا بلکہ ان کے معاملات میں طرح طرح سے دخل اندازی کی جاتی تھی۔ ان پر حملے کئے جاتے۔ اُن سے جرمانے وصول کئے جاتے اور سزائیں دی جاتیں۔ اگر صرف مار کر بھاگ جانے ہی پر بس کی جاتی تب بھی کوئی بات نہیں تھی مگر انیسویں صدی کے اواخر میں ان وادیوں میں سڑکوں کی تعمیر شروع کرا دی گئی۔ ان سڑکوں کی حفاظت کی خاطر آئے دن دھمکیاں دی جاتی تھیں اور طرح طرح سے پٹھانوں کو باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی مگر پٹھانوں کو سڑکوں کی تعمیر ہی کچھ بُری لگتی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے رہنے والوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ امن و سکون کے ساتھ رہیں، مار دھاڑ نہ کریں اور خصوصاً راہگیروں پر حملہ کرنے سے باز رہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے اتنی ساری توقعات رکھنا زیادتی تھی۔ چنانچہ سارے جھگڑوں کی جڑ در اصل یہیں سے پڑی۔

میں نے صوبہ سرحد کی جنگوں میں دو اخباروں کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ یہاں سے میں تار اور خط کے ذریعے پانیر اور ڈیلی ٹیلی گراف کو اس مہم کے بارے میں خبریں اور رپورٹیں بھیجا کرتا تھا اور عام طور پر قارئین میری تحریروں کو پسند کرتے تھے۔ یہ خطوط میرے نام سے چھپنے کی بجائے "ایک نوجوان افسر" کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ ان ہی کی بدولت مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اسی مہم کے بارے میں ایک کتاب "مالاکنڈ فیلڈ فورس" لکھی جو میری پہلی کتاب تھی۔ اس کے شائع ہوتے ہی میرے پاس تعریفوں سے بھرے ہوئے خطوط آنے لگے۔ اخبارات نے بھی طرح طرح سے میری اس پہلی کوشش کو سراہا اور اس وقت تو میری خوشی اور فخر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب پرنس آف ویلیس نے (جو بعد میں شاہ ایڈورڈ ہفتم بنے) مجھے ایک خط لکھا جس میں میری کتاب کی تعریف کے ساتھ ساتھ انہوں نے اُمید ظاہر کی تھی کہ مجھے ایک نہ ایک دن وکٹوریہ کراس ملے گا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ میں فوج کو چھوڑ کر پارلیمنٹ کا رُخ نہیں کروں گا۔

لکھنے کا شوق مجھے ایسا ہوا کہ ایک ناول تک لکھنے کی ہمت کر بیٹھا۔ دُنیا کے حقائق کی روداد پیش کرنے کے مقابلے میں یہ کام تھا بھی آسان اور جھٹ پٹ پورا بھی ہو جاتا تھا۔ جہاں ایک بار کہانی شروع ہوئی وہ خود بخود آگے بڑھنے لگتی تھی۔ جب

نے جو کہانی سوچی وہ یوں تھی کہ بلقان یا جنوبی امریکا کی ایک جمہوری ریاست میں انقلاب ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب کا بانی ایک آزاد خیال شخص ہے۔ وہ ایک جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دیتا ہے۔ بالآخر اس کی حکومت بھی ایک اشتراکی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے۔ میرے ساتھی کہانی کو سُن کر بہت محظوظ ہوئے مگر کہنے لگے کہ اس میں عشق کا رنگ بھرے بغیر مزا نہیں آئے گا۔ مگر مجھے یہ بات کوئی جچی نہیں۔ پھر بھی کہانی میں جنگ، سیاست، فلسفہ غرض کہ ہر وہ چیز اس حد تک شامل کی گئی جس حد تک مجھ میں اُسے پیش کرنے کی صلاحیت تھی۔ دو ماہ کے اندر ناول ختم ہو گیا اور میکملن میگزین میں "ساورولا" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن الگ بھی شائع ہوئے جن سے مجھے کُل ملا کر سات سو پاؤنڈ کی آمدنی ہوئی۔

مجھے اب ایک تجربہ یہ ہوا کہ اخبارات کے نامہ نگار، مضمون نگار اور مصنف کی حیثیت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ میری اس تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی جو مجھے فوج میں ملتی تھی۔ صرف ڈیلی ٹیلی گراف کے وقائع نگار کی حیثیت سے ہی مجھے جو رقم ملتی تھی وہ اس سے پانچ گنا زیادہ تھی جو ملکہ معظمہ کی سرکار میری فوجی خدمات کے صلے میں مجھے عطا کرتی تھی۔ ماہانہ تنخواہ میں تو میری ضروریات بھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے اپنا ۱۸۹۹ء کا ایک منصوبہ بنایا جو یہ تھا۔ ہندوستان واپس جانا اور پولو ٹورنامنٹ جیتنا۔ فوج کو خیرباد کہنا۔ اپنی والدہ کو اس فکر سے نجات دلانا کہ وہ مجھے مستقل الاؤنس دیتی رہیں۔ اپنی نئی کتاب لکھنا۔ پائنیر کو مراسلات بھیجنا اور پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی تدابیر اختیار کرنا۔ جیسا کہ حالات سے ظاہر ہے ان میں سے بیشتر منصوبے پورے ہو گئے۔ اسی زمانے میں مَیں بالکل اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے خاندان کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ تندرستی، تفریح اور اطمینان غرض کہ دنیا کی ہر خوشی ہمیں میسر تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے یہ سب کچھ بالکل اپنے بل بوتے پر حاصل کیا۔ اتفاق سے ۱۹۲۱ء میں مجھے اپنی ایک پرنانی کی طرف سے بالکل غیر متوقع طور پر کچھ جائداد بھی مل گئی جس کی بنا پر مالی اعتبار سے اور بھی اطمینان ہو گیا۔

اسی زمانے میں قدامت پرست پارٹی کے اہم اراکین سے ملنے اور ان سے تبادلہ خیال کا بھی موقع ملا۔ قدامت پرست پارٹی کے ممبروں اور رہنماؤں کو جب میرے سیاسی ارادوں کا علم ہوا تو انھوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اس پذیرائی میں کچھ تو میری تحریروں کو دخل تھا اور کچھ میرے والد صاحب کی خدمات، اور پارٹی اور پارلیمنٹ میں ان کی اہمیت کا بھی حصہ تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد پارٹی کی طرف سے مجھے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مارننگ پوسٹ کا ایک خاص رپورٹر میری ساری تقریر نوٹ کرے گا جو اگلے روز کے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کی جائے گی۔ اس اطلاع سے میرا دل بھی بڑھا اور میری گھبراہٹ اور پریشانی میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں گھنٹوں تقریر کی تیاری میں لگا رہتا۔ میں نے اسے اتنی اچھی طرح رٹ لیا تھا کہ شاید سوتے میں بھی ساری کی ساری تقریر حرف بہ حرف دُہرا دیتا۔ ایک جملہ جو میں نے اس موقع کے لئے خاص طور سے تراشا تھا، مجھے بہت پسند تھا۔

(انگلستان انتہا پسندی کے سوکھے ہوئے پرنالے کے مقابلے میں "ٹوری جمہوریت" کے چڑھتے ہوئے دھارے سے فائدہ زیادہ حاصل کرے گا)۔ اس طرح کے جملے ادا کرنے کی میں نے خاص طور سے مشق کی۔

پھر وہ گھڑی آہی گئی۔ مجھے ڈائس پر بٹھایا گیا۔ صدر نے میرا تعارف کرایا۔ میری فوجی زندگی کے بارے میں توصیفی کلمات کہے۔ میری کتابوں اور مضامین کی بے پناہ تعریف کی۔ میرے والد کی خدمات اور قومی زندگی میں ان کی اہمیت کا ذکر کیا۔

صدر کے بعد میری باری آئی۔ میں نے ایک بار جی کڑا کر کے اور اپنا سارا زور لگا کر تقریر شروع کر دی۔ مجمع رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ حاضرین نے ایسے مقامات پر بے تحاشہ تالیاں بجائیں جہاں میں خاص طور سے اس کے لئے رُکتا تھا کہ ان کو اس کا موقع دوں بلکہ بعض اور مقامات پر بھی انہوں نے جی کھول کر داد دی اور آخر میں تو بڑی طوفانی تالیاں بجائی گئیں۔ غرض کہ اس طرح یہ مرحلہ سر ہُوا۔ اب اچانک ایسا لگنے لگا جیسے یہ کام تو مشکل تھا ہی نہیں۔ اخباری نمائندے نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھے مبارکباد دی اور اگلے روز اخبار نے نہ صرف ایک پورا کالم میری تقریر کے لئے وقف کر دیا بلکہ ایک چھوٹا سا اداریہ بھی لکھا۔ میں بے انتہا خوش تھا، خود اپنے آپ سے بھی اور اس دنیا سے بھی جو میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں پولو ٹورنامنٹ میں شرکت کے لئے ہندوستان کی سمت چل دیا۔

اسی عرصے میں میں نے اپنی نئی کتاب "دی ریور وار" پر کام شروع کیا۔ یہ کتاب سوڈان سے متعلق تھی۔ اس میں میں نے میکالے اور گبن کے اسالیب کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں وہ لاتعداد کتابیں میری نظر سے گذریں جو اس موضوع پر اب تک لکھی گئی تھیں۔ ہندوستان سے واپس ہوتے ہوتے مجھے اس دور کے بہترین صحافی مسٹر جی۔ ڈبلیو سٹیفنس سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ افسوس ہے کہ جب ہمارے دوستانہ تعلقات پختہ ہونے لگے تو وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔

۱۸۹۸ء میں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ایک اور ونسٹن چرچل صاحب بھی موجود ہیں جو ناول نگار ہیں۔ بہت اچھے ناول لکھتے ہیں اور امریکا میں ان کی نگارشات بہت مقبول ہیں۔ میرے پاس اکثر مبارکباد کے خطوط آیا کرتے تھے جن میں میری ناول نگاری کی تعریفیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہی نام کے کوئی اور صاحب بھی ہیں جو خوش قسمتی سے اٹلانٹک کے اُس پار رہتے ہیں۔ میں نے انہیں خط لکھ کر صورت حال سے آگاہ کیا۔ ان کے جواب سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلے میں وہ بھی خاصے متفکر تھے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ میں اپنا نام ونسٹن سپنسر چرچل لکھا کروں گا۔ سال بھر بعد جب میں بوسٹن گیا، تو وہاں سب سے پہلے جن صاحب نے میرا خیر مقدم کیا، وہ یہی چرچل صاحب تھے۔ انہوں نے میرے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت دی۔

۱۸۹۹ء میں ہی ہاؤس آف کامنز کی دو سیٹیں خالی ہوئیں۔ یہ دونوں سیٹیں اولڈہم کے حلقہ انتخاب میں تھیں۔ ضمنی انتخابات عام طور پر صاحب اقتدار پارٹی کے لئے نقصان دہ اور حزب مخالف کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس حلقے میں مزدوروں کی اکثریت تھی جس کی بنا پر انتہا پسند اور سوشلسٹ نمائندوں کے جیتنے کے امکانات زیادہ تھے۔ تجربہ کار لوگوں نے مجھے روکنا چاہا، مگر میں پکا ارادہ کر چکا تھا اس لئے الیکشن میں کھڑا ہوا اور سخت مقابلے کے بعد شکست کھائی۔ مگر مسٹر بالفور اور مسٹر چیمبرلین جیسے بزرگ سیاست دانوں نے میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ میری ہمت بڑھائی۔ خصوصاً مسٹر چیمبرلین کی گفتگو تو میرے لئے سیاست کے عملی سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں گرفتاری اور فرار

۱۸۹۹ء میں ہی بوئر کی جنگ شروع ہوئی اور میں بھی اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے جنگ کی خبریں حاصل کرنے اور جنوبی افریقہ کے حالات کی تفتیش کرنے کے لئے مصمم ہو گیا۔ یہاں کے حالات بہت خراب تھے۔ ہر وقت جان کو خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ جس ریل سے ہم لوگ نتال کے لئے روانہ ہوئے، اس پر بھی حملہ ہوا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا مگر پھر ہم سب گرفتار کر لئے گئے۔ مجھے جنگی قیدیوں کے ساتھ لے جایا گیا اور وہی برتاؤ کیا گیا جو عام جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ دشمنوں کو سمجھاؤں کہ میں اخبار کا نمائندہ ہوں مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ ہم سب کو ایک اسکول کی عمارت میں قید کر دیا گیا۔ قید کی زندگی مجھ پر بڑی دوبھر تھی۔ اس طرح میں جنگ اور اس کے تمام ہنگاموں سے اچانک الگ ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلوں اور برطانوی فوجوں میں جا پہنچوں۔ چنانچہ ہم لوگ بہت دن تک بھاگنے کے منصوبے بناتے رہے۔ میں نے ایک دن موقع پایا اور رات کے وقت دیوار پھاند کر ایک باغ میں جا پہنچا اور پھر شہر کی سڑکوں پر چلتا ہوا نہایت سکون کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک مال گاڑی دکھائی دی۔ میں اچک کر اس میں ہو لیا۔ رات بھر کے سفر کے بعد گاڑی پر سے کودا اور جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ دن بھر ان ہی جھاڑیوں میں گذارا۔ جب رات آئی اور چھپ کر نکلا تو اتفاق سے ایک ایسے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو برطانیہ کے ایک پرانے ہمدرد اور اس علاقہ کے ایک متمول شخص مسٹر ہاورڈ کا تھا۔ انہوں نے مجھے بڑی حفاظت سے اپنے ہاں رکھا اور سرحد تک پہنچا دیا۔

اس دوران میرے بارے میں طرح طرح کی خبریں پھیل چکی تھیں۔ مجھے گرفتار کرنے پر انعام کا اعلان کیا گیا تھا اور زیادہ تر لوگوں کو تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں یا تو گرفتار ہو چکا ہوں یا کہیں مارا گیا۔ مگر میرے نمودار ہونے سے سب لوگ حیرت میں رہ گئے۔ بعض اخبارات نے میری دلیری کی داد دی۔ بعض نے سخت تنقید کی کہ میں نے اخباری نمائندہ ہوتے ہوئے وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جو فوجی سپاہی کا ہوتا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے تین برس بعد بوئر کے جنرلوں کا ایک وفد انگلستان مالی امداد اور قرض کی درخواست لے کر آیا۔ میرا تعارف اس وفد کے لیڈر جنرل بوتھا سے کرایا گیا۔ وہ بولے: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں وہی شخص ہوں جس نے آپ کو گرفتار کیا تھا۔" اور ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک دوڑ گئی۔ ان صاحب سے میرے تعلقات بڑے وسیع ہو گئے۔ یہ ۱۹۰۷ء میں ٹرانسوال کے وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی انگلستان آئے۔ اس وقت میں نو آبادیات کا انڈر سیکرٹری ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ آتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اس جنگ کے بعد میں نے درخواست کی کہ مجھے پھر فوج میں لے لیا جائے اور اخباری نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ بڑی کوششوں کے بعد میری درخواست منظور کر لی گئی اور پھر مجھے جنوبی افریقہ جا کر اپنی زندگی کے بڑے اہم، قیمتی اور دلچسپ تجربات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہاں بارہا ایسے خطرات کا سامنا کرنا پڑا کہ زندہ بچ نکلنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح ہر مصیبت سے بچا اور پھر آنے والی مصیبتوں کے لئے تیار ہوا۔

الیکشن میں پہلی کامیابی

جنوبی افریقہ کی جنگوں میں برطانیہ کو فتح ہوئی اور سارے ملک میں قدامت پرست پارٹی کی حکومت کو سراہا گیا۔ میں جب انگلستان واپس پہنچا تو میرا شاندار استقبال کیا گیا خصوصاً اولڈہم میں تو لوگوں نے میری آؤ بھگت میں انتہا کر دی۔ اسی زمانے میں پارلیمنٹ کا تاریخی الیکشن ہوا۔ میں اپنی پارٹی کی طرف سے اولڈہم سے کھڑا ہوا اور جیت گیا۔ سارے ملک میں میری جیت پر خوشیاں منائی گئیں۔ مخصوص استقبالیہ جلسوں میں اور دوسرے حلقوں کی انتخابی مہم میں بھی مجھے مدعو کیا گیا۔ ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں نے مجھے طرح طرح سے سراہا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ۲۶ برس کی عمر میں میں نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں وہ اتنے غیر معمولی ہیں کہ سارے نوجوانوں کو مجھ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ میں نے امریکہ اور کناڈا کا بھی سفر اسی زمانے میں کیا۔ وہاں کے عمائدین نے میرے جلسوں میں شرکت کی۔ امریکہ والے تو بوئر کی جنگ سے اتنے خوش یا متاثر نہ تھے جتنے برطانیہ یا کناڈا والے، پھر بھی وہ لوگ بڑی فراخ دلی سے پیش آئے۔

ہاؤس آف کامنز میں میں اسی جگہ بیٹھا جہاں سے میرے والد صاحب نے استعفیٰ دیتے وقت تقریر کی تھی۔ بوئر کی جنگ زیر بحث تھی، چنانچہ بڑے تامل کے بعد میں نے بھی تقریر کرنے کی ٹھانی۔ اس سے قبل میں بغیر پہلے سے لکھے ہوئے اور یاد کئے ہوئے ایک لفظ نہ بولا تھا، پھر بھی میں نے ہمت کی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ کب میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا اور کیا بولا مگر بعد میں تقریر کی تعریف کی گئی۔ اسی زمانے میں پارلیمنٹ کے کچھ ممبروں کے ساتھ مل کر میں نے ایک سوسائٹی بنائی، جو ہولی گنز کے دلچسپ اور عجیب نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس سوسائٹی میں پارلیمنٹ کے اہم ممبروں میں سے کسی ایک کو ڈنر پر بلایا جاتا اور اس سے مختلف سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔

میری زندگی کا یہ دور ۱۹۰۸ء میں ختم ہوا۔ اسی سال میری شادی ہو گئی اور اس کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی کا نیا باب شروع ہوا +

راجندر سنگھ بیدی

مجھے آج تک پتہ نہ چل سکا کہ میں کون ہوں!

اس جملے سے اگر کوئی یہ مفہوم اخذ کرے کہ میں انکسار کر رہا ہوں تو یہ غلط ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوست کے سامنے نہیں جھکتا یا کسی خاص مکتبۂ خیال، مذہبی عقائد یا عہدوں کی پروا نہیں کرتا وہ انکسار کا پتلا ہو اور وہ آدمی جو ہر ایک سے جھک جھک کے ملتا ہو، تکبر اور انا کا گٹھا ہوا نمونہ ہو۔ میرا خیال ہے انکسار کا مظاہرہ کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہو سکتا ہے۔

«اپرادھی دونا نیوے، جیوں ہنتا مرگاہ (گرنتھ صاحب)

(مجرم دگنا جھکتا ہے، جیسے ہرنوں کو مارنے والا شکاری۔)

میں جانتا ہوں کہ سیدھے سادے مزاج کا آدمی ہوں لیکن مجھ پر ایسے لمحے بھی گزرتے ہیں کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا بری رائے بھی قائم کر سکتا ہے۔ ایسے لمحے اس وقت آتے ہیں جب کوئی ادبی تخلیق کرنے بیٹھوں، موضوع میرے ذہن میں ہو، بات نئی اور نرالی ہو اور اسے بیان کرنے کے انداز پر مجھے اندرونی قوت کا احساس ہو۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں خود کو اپنے سے علیحدہ کر کے دیکھ رہا ہوں۔

ہٹ جاؤ میں آ رہا ہوں!

باادب باملاحظہ ہوشیار!

با . . . ہوشیار! ..... شہنشاہوں کے شہنشاہ، سلطان اعظم راجندر سنگھ بیدی تشریف فرما ہوتے ہیں۔

چونکہ اس قسم کے احساس کے بغیر لکھنا آسان نہیں۔ اس لیے میری یہ لمحاتی اکڑفوں بعید از قیاس نہیں ہو سکتی! اس وقت اللہ اور میرے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس سے کسی دوسرے کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے گھر بیٹھ کر ایک آدمی اپنے کو کالی داس یا شیکسپیئر سمجھے تو اس میں کسی دوسرے کا کیا جاتا ہے؛ البتہ لکھنے اور ناشر تک پہنچنے کے دوران بھی اگر وہ آدمی خود کو عظیم سمجھتا رہے تو یقیناً وہ بڑا احمق آدمی ہے۔

ہاں تو میں کون ہوں!

عام طور پر یہی دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ میرے متعلق یہ دونوں سوالات فالتو ہیں۔ کیونکہ چند آدمی مجھے جانتے ہیں۔

کیا کام کرتا ہوں! اس سے بھی واقف ہیں۔

بھلا ہو فلموں کا جنہوں نے مجھے بدنام کر دیا۔ یہ دنیا اشتہار اور تشہیر کی دنیا ہے۔ شہرت یافتہ آدمی کی جانب لوگ آنکھیں

بچا کر رکھتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو اپنی شہرت کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہوتے، اسی لیے وہ لوگ شہرت و نام آوری کی تمنا کیا کرتے ہیں۔

میں تو کچھ بھی نہیں، ہماری فلموں کے جو ہیرو ہیں ان سے پوچھیے، کیا وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی عام انسانوں کے مانند گزار سکتے ہیں؟ وہ تو اپنے گھر میں بھی بیوی کے لیے ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں ——— حالانکہ بیوی ان کی رگ رگ کو پہچانتی ہے اور اکثر کہتی ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من انداز قدت را مے شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتّا یاد آ جاتا ہے (میں اب بھی انکسار کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہوں) جسے ایک ڈائرکٹر نے اپنی ایک فلم میں لے لیا تھا۔

کتا فلم کی کہانی میں آ گیا۔ یعنی سین نمبر ۳۶ میں یا آؤٹ سین نمبر ۸۶ میں بھی اس کی ضرورت تھی اور یہ سین کچھ مہینے بعد فلمایا جانے والا تھا۔ بے چارہ اچھا بھلا کتا تھا۔ بازار میں گھومتا پھرتا تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں پہ یا ادھر ادھر جگہ جگہ کھانے کی چیزوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا، لیکن فلم پر آ جانے کے بعد وہ ایک تجارتی شے ——— ایک جنس بن گیا، جو بک سکتی تھی، اس کا مول تول ہو سکتا تھا۔ اس ڈائرکٹر صاحب نے اسے باندھ کر رکھ لیا۔ اب بے چارے کو دن میں تین چار وقت کا کھانا ملتا تھا۔ سونے کے لیے نرم گدے تھے۔ زکام ہو جانے پر ڈاکٹر طلب کیا جاتا اور ہر آدمی کے آنے پر وہ کتا زور زور سے اپنی دم ہلاتا تھا جس کے جواب میں انہیں ٹھوکریں ملتیں اور وہ چیں چیں کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتے لیکن گھوم پھر کر وہیں ...... وہی حیرانی، وہی اپنی اوقات کا علم، وہی گالی۔

ڈاکٹر جیکل نہیں، کوئی انسان ہے۔

یہ اس آدمی کی حالت ہے جو شہرت ملنے پر بہک جائے یا زندگی میں کسی عہدے یا کرسی کا بھوکا ہو، پیسہ چاہتا ہو جس سے وہ ہر چیز خرید لینے کی قوت حاصل کر سکے۔ قانون، مذہب، سیاست سب کو اپنی جیب میں ڈال لے۔ ٹریجیڈی کے ہیرو کی مانند کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جائے، مزے اڑائے اور لوگ داد دیں۔

یہ بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔

شہرت، دولت، کرسی ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ ہر شریف آدمی انہیں ترک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کسی نے کہا ہے میں تو کمبل چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ لیکن یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آدمی واقعی ان چیزوں کو ترک کرنا چاہتا ہے یا خالی باتیں ہی کرتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک پرستار مجھے مل گئے جنہوں نے میری چند کہانیاں پڑھی تھیں۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو زندگی کے اسرار جانتے ہیں۔ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ بلاواسطہ مطلب کی بات پر آ گئے۔

"بیدی صاحب! آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"جی!" میں نے گھبراتے ہوئے کہا: "میں تو کہانیاں لکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ جی میں کچھ بھی نہیں۔"

اور جب انہوں نے میری باتوں سے اتفاق کا اظہار کیا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

"میں کون ہوں؟ ـــ کیا ہوں؟" کے سوال تو ختم ہو چکے۔ درحقیقت یہ سوالات مجھ بیلا گر کے نہیں ہوتے۔ میں تو اور لوگوں میں سے ہوں، جن سے پوچھنا چاہیے۔

"آپ کیوں ہیں بیدی کہ آخر کیوں؟"

یہ بھی میں نہیں جانتا۔

دنیا میں کروڑوں انسان ہر روز پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک میں بھی اچانک ایک دن پیدا ہو گیا۔ ماں کو خوشی ہوئی ہوگی۔ باپ کو خوشی ہوئی ہوگی۔ لیکن دائیں ہاتھ کی طرف رہنے والے پڑوسی کو علم بھی نہ ہوا اور پڑوسی کو علم ہوا تو کوئی اچھی بات نہیں وہ ضرور مبارک باد دینے آیا ہوگا۔ لیکن محض دنیاوی رسم و رواج کے ناطے۔ ورنہ میرے پیدا ہو جانے سے کونسی خوشی ہو سکتی تھی؟ الٹے اس لین دین کی دنیا میں اس کے بیٹے پنا لال کا ایک حریف پیدا ہو گیا۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لیے ایک خواہ مخواہ کا خطرہ تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہوں تو مبارک باد دو۔ جوہڑ سنگھ پیدا ہو تو مبارک باد دو۔

ڈھول رام یا چمن خان آ جائیں تو خوشیاں مناؤ۔ ڈھول بجاؤ۔ ٹیگور کا قول ہے دنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہوتے ہیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ابھی بھگوان انسان بنانے سے مایوس نہیں ہوا۔ بھگوان بھی جنسی میں کتنا ظلم کرتا ہے۔ چونکہ وہ مایوس نہیں اس لیے انسان بنائے جا رہا ہے۔

بیکار مباش کچھ کیا کر
پاجامہ ادھیڑ کر سیا کر

چنانچہ بھگوان کے پاجامے کا ایک ٹانکا یعنی پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء کی صبح کو تین بج کر سنتالیس منٹ پہ لاہور ٹیگور کے قول کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے پیدا ہوا۔ رام اور رحیم انسانوں کے مانند بھول گئے کہ دنیا کرتار کا گھر ہے ـــ ورنہ مجھے اس دنیا میں بھیجنا ان کی کونسی رحمت ہے۔ بلکہ ہمارے شاستر کے مطابق تو یہ ان کا انتقام لینے کا انداز ہے: پچھلے جنم میں کوئی کرم کیا ہو گا جسے بھگوان کی رحمت بھی دھونے کی طاقت نہیں رکھتی!

ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے میرے ماں باپ کی بھی یہی تمنا تھی۔ اس تمنا میں ان بیچاروں کا قصور بھی کیا تھا۔ ان کے سوچنے کی حد کلکٹر کے عہدے تک ہی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے سامنے کلکٹر بھی پانی بھرے جس طرح ایک سادہ لوح جاٹ مال گزاری کی ادائیگی کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا اور جب تحصیلدار نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اس نے خوش ہو کر دعا دی۔

"بھگوان کرے تحصیلدار صاحب آپ ایک دن پٹواری بن جائیں۔"

کیپٹلزم کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے خطاب دے کر بات کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ ہر عام انسان اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ لنکن شکاگو کی کسی لکڑی کی جھونپڑی میں پیدا ہوا۔ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا صدر بن گیا۔ اس

طرح لاگ کیبن سے پریذیڈنٹ کی کہاوت چل نکلی لیکن اس کا تذکرہ کرنے والے یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو جھونپڑی سے نکل کر ایوان صدر تک پہنچے ہیں؟ اس فریب اور اس سازش کا شکار ہو کر لاکھوں کروڑوں آدمی سسک سسک کر مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر

اس کے بعد بھی آپ اس کی خدائی سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی!

میں ایک بیمار بچہ تھا۔ ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے معیاری بخار کے جھکڑ دیکھے ہیں جن کا مرکز خود مریض ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بار بار موت کی افق کے پار پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے بخار میں آنکھیں دھنسا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں جو کسی عکس کی گرفت میں نہیں آسکتے اور دھنک بھی جن کی حد بندی کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ میں نے وہ آنسو بہائے ہیں جو نمکین تھے نہ میٹھے جو کسی ذائقے کی گرفت میں نہیں آتے اور پیار کرنے والے ماں باپ بھائی بہن یا محبوب بھی جنہیں پونچھ نہیں سکتے۔ سینکڑوں بار کسی ڈراؤنے ویرانے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور شدت خوف میں مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں میل تک میرے قریب کوئی نہیں، خود میں بھی نہیں۔ بیسیوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار یا بنارس کا وہ گھاٹ دیکھا ہے کہ جہاں میں پچھلے جنم میں پیدا ہوا تھا ——— باڑھ کے بعد گنگا پیچھے سرک گئی ہے۔ اور ساحل کے قریب سرخ اور زرد چکنی مٹی کے نیچے ہزاروں چھوٹی چھوٹی لہریں چھوڑ گئی ہے جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک اور لہر ابھرتی ہے۔ اور وہاں آٹھ نو سال کا ایک کالا کلوٹا بچہ ننگا، کمر کے گرد سیاہ دھاگا باندھے اور سر پر چٹیا لیے کھڑا ہے اور وہ میں ہوں۔۔۔!

قبل اس کے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری ہتھکنڈوں میں بیمار کر لیتا، میرے جسم کے رگ پٹھے ختم ہو چکے ہیں۔ ذرا سی بات ناراضی اور غصہ، خفیف سی بات پر بڑی بڑی ٹرول ٹرول ——— ماں جھلا کر مجھے دور پھینک دیا کرتی تھیں، کیونکہ میں اس کی بیمار چھاتی کو چچوڑ ڈالتا تھا ——— ماں نرم ہو نہ ہو مجھے میرا دودھ دے دو۔ اور ماں کہیں نہیں ہے۔ اس کا مطلب جانتے ہیں ماں کہیں نہیں ہے ——— ہاں ایک بار پھینکنے کے بعد بے پایاں ممتا کے جوش میں ماں مجھے پھر اٹھا لیا کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مجھے رکھے یا پھینک دے۔ میں کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر حادثہ کے بعد پریشان، میری حیرانی اور پریشانی کی کوئی حد نہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، میری جنم کنڈلی دکھائی گئی۔ جوتشی نے کہا، یہ لگن میں کیتی ہے۔ برہسپت اپنے گھر کا ہے اور بدھ پر نظریں ڈال رہا ہے۔ یہ بچہ ایک بڑا فن کار بنے گا۔ لیکن شنی کی نظریں بھی ہیں۔ اس لیے نام اور شہرت مرنے کے بعد ہی حاصل ہوگی۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ دولت کے خانے میں شکر ہے جسے سورج نے اپنی تیز روشنی سے ماند کر دیا ہے۔ چونکہ شنی شکر کو دیکھتا ہے اس کی زندگی میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھوں پر بھی لے جائے، لیکن برہسپت کے غلبے کے سبب کبھی اس کو بدنامی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ منگل کبھی سنیچر کے ساتھ پڑتا ہے، حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن منگل پھر منگل ہے۔ اشٹم ہوگا ہی کام چلتے چلتے ایک دم سے رک جائے گا۔ دسویں گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھ رہا ہے اس کی بیوی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا پہلے باپ کی بیوی بیمار، دائم المریض اور میری بیوی بھی شاید پورے خاندان کو یہ دعا لگی تھی۔

چنانچہ ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے سوا میں نے آج تک کوئی دوسرا کام نہیں کیا اور اگر کوئی نامہ جنسی اور تخلیقی کام کیا ہے، تو یہی کاغذ سیاہ کرنا، چند کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی انہیں خریدتے چل دینا ——— چند فلمیں فیل کرانا۔

چند تصویریں بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میری ماں برہمن تھی اور میرا باپ چھتری۔ اس زمانے میں اس قسم کی شادی گرینا گرین (ایک مقام جہاں بھاگے ہوئے جوڑے کی شادی کرتے ہیں) میں بھی ہونا ممکن نہ تھی لیکن ہو گئی۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کے احساسات و خیالات کا بڑا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اس لیے گھر میں ایک طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پاٹ ہوتا تھا۔

ابتدائی کہانیاں جو بچپن میں سنیں وہ جن اور پریوں کی داستانیں نہ تھیں بلکہ "مہاتم" تھے جو گیتا کے ہر باب کے بعد ہوتے ہیں اور جسے ہم ماں کے پاس بیٹھ کر بڑی عقیدت سے سنا کرتے تھے۔ چند باتیں تو سمجھ میں آ جاتی تھیں جیسے راجہ، برہمن، شیطان لیکن ایک دن:

"ماں! یہ رنڈی کیا ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔"

"اوں ہوں۔ بتاؤ نا رنڈی۔۔۔۔"

"چپ رہو۔"

اور پھر وہ جذبۂ ترحم جو ماں کے سینے ہی میں اٹھ سکتا ہے۔ جب وہ اپنے بچے کے چہرے کو کملاتا ہوا دیکھتی ہے۔

"رنڈی بری عورت کو کہتے ہیں۔"

"تم تو اچھی عورت ہو نا ماں؟"

"ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے ——— کسی کی بھی ہو۔"

"تو پھر بری کون ہوتی ہے؟"

"تو تو سر کھا گیا راج۔ بری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔"

میں سمجھ گیا۔

لیکن اگلے دن مجھ پر وہ جوتے پڑے کہ بس۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں ساوتری کی ماں کو رنڈی کہہ دیا، کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے اٹ شنٹ کے بہت سے مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری بقیہ زندگی بس ایسی ہی ہے۔

ادھر میں نے کوئی سوال کیا ادھر زندگی نے کہا۔

"چپ رہو۔"

اور اگر کبھی جواب دیا بھی تو ایسا کہ میں اسے سمجھ ہی نہ سکوں اور سمجھوں تو جوتے پڑیں۔

میری جسمانی کمزوریاں، نسواں کا الجھاؤ، میرے سوالوں کا مناسب سا جواب نہ دینا، خود میرا ان جوابوں کی اہمیت کو نہ سمجھنا یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی بچے میں خودی کا شعور پیدا کر سکتی ہیں۔ اور وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتا ہے ——— اس کے علاوہ

زندگی گھپ اندھیرے کے ساتھ ساتھ خلا بھی ہے — مقام ہو — بیسیوں ڈر ہیں خطرات ہیں مایوسیاں ہیں جو ہر وقت دل میں لرزے پیدا کرتی رہتی ہیں جس طرح بجلی کا معمولی سا جھٹکا بھی ڈایافرام میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے — ان پراسرار حادثات اور تجربات میں جو ہر ادیب کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ ان سے سبق لیتا ہے۔ ان سے متاثر ہوتا ہے اور پھر انہیں کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔

یوں تو میں پانچ سال کی عمر میں رامائن اور مہابھارت کی داستانوں اور ان کے کرداروں سے متعارف ہو چکا تھا۔ بلاشبہ رامائن ایک عظیم کتاب ہے اس میں کتنے ہی خوبصورت ہزاروں گن والے اور قناعت پسند کردار ملتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے رامائن کے تمام کرداروں میں سب سے زیادہ ہمدردی صرف سگریو کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا بھائی بالی اس کی بیوی تک کو اٹھا لے جاتا ہے اور وہ بیچارا ٹک ٹک دیکھتا رہ جاتا ہے؟

اگر بھگوان رام ادھر نہ جا نکلتے تو بے چارہ سگریو تو روتا ہی رہ جاتا! اسی طرح مہابھارت میں بھی میری دلچسپیوں کا مرکز صرف ایک ہی کردار ہے شکھنڈی جسے درمیان میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے۔

ورنہ وہ بھلا مر سکتے؟

آج تک زندہ رہتے!

ماں کی علالت کے باعث میرے پتا جی ایک پیسہ یومیہ کے کرائے پہ بازار سے کوئی نہ کوئی کتاب لے آتے اور ان کے قریب بیٹھ کر انہیں سنایا کرتے۔ میں بھی پاس بیٹھا سنا کرتا۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچتے پہنچتے تک میں ٹاڈ کے راجستھان اور شرلاک ہومز کے کارناموں سے متعارف ہو چکا تھا۔ البتہ جو چیز ابھی سمجھ میں نہ آئی تھی وہ تھی دی مسٹریز آف دی کورٹ آف پیرس۔ صرف اتنا یاد ہے کہ پتا جی اسے مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور میں حیران ہوتا تھا کہ ہر آدمی کیوں ہر بار کسی نئی عورت سے گڑبڑ کرتا ہے اس وقت تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے بھاگنا کوئی شرافت کی بات نہیں۔ اور یہ عورت بے حد گندی شے ہے.....!

اس کے بعد میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید لیا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا پرائمری سے مڈل کلاس تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ تمام کتابیں چاٹ کر ڈالیں۔ میں وہ نقرئی کیڑا تھا جو ہر پرانی کتاب کے درمیان میں پایا جاتا ہے وہ بک مارک جسے ہر شریف پڑھنے والا نئی کتاب میں رکھ دیتا ہے۔

تھیوری کی حد تک میں تقریباً ہر چیز سے متعارف ہو چکا تھا۔ لیکن عملی طور پر سب چیزوں سے ناواقف تھا۔ . . تھیوری اور عمل کے درمیان فاصلے کے باعث جو تباہی ہو سکتی تھی ہوئی اور میں ہر تجربے کی صلیب پر چڑھا۔

شاید میرے لیے ضروری بھی تھا۔

زندگی کی اس قسم کی بنیادی باتیں تفصیل سے بتا دینے کے بعد حادثات کا ذکر کرنا فضول ہوگا — یہی نا کہ — میں نے میٹرک پاس کیا کالج میں داخل ہوا۔

انگریزی اور پنجابی میں شعر کہے۔

اردو میں افسانے لکھے۔

ماں چل بسی
ڈاکخانے میں ملازم ہو گیا
شادی ہوئی، بچہ ہوا
پتا چل بسے
بچہ چل بسا
نو سال ڈاک خانے میں ملازمت کی
ریڈیو میں چلے گئے
بٹوارہ
خون خرابہ...... تباہی
خون میں لتھڑے ہوئے جسم
ریل کے ڈبے کی چھت پر ننگے دلی پہنچے
اسٹیشن ڈائرکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن!
ریاست کی رعایا کی "حکومت" سے جنگ......

پھر بمبئی
اچھی فلمیں
بری فلمیں
درمیان میں کبھی کبھی کہانیوں کی کسی کتاب پر ہاتھ قلم کرتے رہے۔
ہاتھ قلم ہوتے سنے ہیں۔ دیکھے نہیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کئی مصیبتیں، ایسے لمحے جو کسی بدعدو پر بھی نہ گزرے، ایسے لمحے جنہیں آج تک بھی نہ جھیل سکا۔
بیوی میں دلچسپی کا خاتمہ۔
بیوی سے محبت قائم۔

سبب؟
ادھیڑ عمری کا پاگل پن۔
بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بے وقوف سمجھنا اور میلا سے صرف پیسے کا پجاری اور غیر ذمے دار سمجھنا... بھلا کوئی بات ہوئی!

میری تمنائیں کیا ہیں؟ — کوئی نہیں۔

میری امیدیں کیا ہیں؟ کوئی نہیں۔

اور مایوسیاں کیا ہیں؟ کوئی نہیں۔

میں عقل مندی کے باعث کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اور وہ بے وقوفی کی وجہ سے مجھ سے پریم نہیں کرتی۔ اس لیے کہ میں ہوس و محبت کا فرق پہچانتا ہوں!

بغیر خواہش کے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں پیسے کے لیے، کسی پبلشر کے لیے نہیں۔

میں بس لکھنا چاہتا ہوں۔

مجھے مذہبی کتابوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ان باسی کتابوں سے اچھی کتابیں خود لکھ سکتا ہوں۔

مجھے استاد یا کسی شاگرد کی تلاش نہیں کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا استاد ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا شاگرد!

باقی دکھ ہی ہیں۔

میں نے ہرے بھرے پتوں اور جنبیلی کے پھولوں سے گفتگو کی ہے اور ان سے جواب لیا ہے۔ میں گگ مجاشار جادو بھی جانتا ہوں۔ میرا کتا مجھے سمجھتا ہے اور میں اُسے۔

مجھے سچ اور جھوٹ کے بکھیڑوں سے کوئی غرض نہیں!

اگر بھگوان انسان بنانے کی جسارت کرتا رہتا ہے تو میں انسان ہو کر بھگوان بناتے رہنے کی حماقت کیوں کروں؟ اگر اس عظیم ذات کو میری ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ صلح و آشتی کے کسی ایسے لمحے میں جو ماضی اور مستقبل کی گرفت سے آزاد ہو۔ مجھے خود ہی تلاش کر لے گی۔

میں ایک انسان کی مانند زندہ رہنا چاہتا ہوں ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں تمنا سے بے نیاز ہو کر — جسے ہم درویشوں کی اصطلاح میں "عام حالات" کہتے ہیں اور جو صرف جاں کاری کے بعد ہی آتے ہیں۔

اور! . . . .

میں نہیں جانتا! . . . . . !

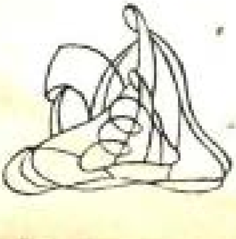

(خان بہادر منشی) محمد عنایت حسین خاں

(پنشنر ڈپٹی کلکٹر و سابق نائب وزیر ریاست بھوپال)

بزرگان میرے ہندوستان زادہ نہ تھے نہ مجھ میں ہندوستانی خون شامل ہے۔ میرے دادا سردار غلام محی الدین خاں از قوم بارکزئی پٹھان باشندہ کابل اور میرے نانا سردار غلام علی خاں از قوم غلزئی پٹھان باشندہ غزنی تھے سو سوا سو برس گزرے ہوں گے کہ وہ دونوں بوجہ نااتفاقی اور عداوت باہمی شاہ اور وزیر کے اپنے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر مع خاندان اور نقد و جنس اپنے کے چلے آئے۔ بمقام لدھیانہ علاقہ پنجاب میں آ کر بعد قیام چندے اول الذکر نے ہندوستان میں بمقام کلکتہ عام تجارت اور آخر الذکر نے بمقام سلہٹ خاص تجارت ہاتھیوں سے بہت کچھ نفع اٹھایا۔ افسوس کہ غلام محی الدین خاں بعالم جوانی شیر کے شکار میں ہلاک ہوئے اور ان کے مرتے ہی کارخانہ تجارت کا بوجہ کم سنی سردار یحییٰ خاں عرف سردار خاں والد میرے کے درہم برہم ہو گیا البتہ نقد و جنس لاکھوں روپیہ کا ہاتھ آیا۔

میری دادی نے بصلاح احباب مرحوم کے اعلیٰ ترین مدرسہ میں جو اس وقت بمقام کلکتہ تھا میرے والد کو بھی بھرتی کرایا اور وہ چودہ برس تک برابر مدرسہ مذکورہ میں پڑھا کئے جب اعلیٰ درجہ کی تعلیم تمام علوم انگریزی، فارسی و عربی وغیرہ میں ختم ہو چکی تو وہ بموجب قانون ہفتم ۱۸۳۳ء کے کہ اسی زمانہ میں اجرا اس کا ہوا تھا ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو کر ضلع الہ آباد صوبہ شمالی میں تعینات ہوئے۔ تب سے الہ آباد میں استقلال بود و باش کل خاندان کی ہو گئی اور اب وہ مثل وطن کے ہو گیا ہے۔

میں مہینہ ستمبر [illegible] میں بمقام الہ آباد پیدا ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں جبکہ میں سولہ برس کا ایک طفل مکتب تھا بوجہ خدمات خاندانی اور رعایت حکام کے ضلع باندہ میں نائب تحصیلدار حضور تحصیل کا مقرر ہوا اور پھر ۱۸۵۸ء میں بعد دینے ایک امتحان معقول عہدہ تحصیلداری کے قائم مقام تحصیلدار جیت پور ضلع ہمیرپور مقرر ہو کر اسی سال میں بہ ترقی تنخواہ مستقل تحصیلدار راٹھ ضلع مذکور مقرر ہوا۔ وہاں کام بندوبست جاری تھا اور مسٹر جارج ایلفنسٹن فرینگ صاحب بہادر مہتمم بندوبست تھے۔ ان کو میری دیانت و لیاقت و جفاکشی پر بہت بھروسہ و تجربہ تھا۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۶۳ء یا اخیر ۱۸۶۵ء میں وہاں کا کام ختم کر کے ضلع جالون میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تو فوراً مجھ کو بلا کر خاص جالون میں جہاں کا کام نہایت سخت و دشوار طلب تھا بعطائے اختیارات دیوانی و فوجداری و میونسپلٹی وغیرہ کے تحصیلداری درجہ اول پر مقرر فرمایا۔ یہ مقام پہلے بہت آباد اور بارونق تھا اور بزمانہ عملداری مرہٹوں کے وہ دارالریاست ان کا تھا۔ گرد و پیش کی ریاستیں ماتحت اس کے تھیں۔ انگریزی عہد میں وہاں کے راجہ کو صرف پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔ میرے وقت میں نانی اس کی صاحبیان کی زیست تھیں و مع خاندان اپنے کے قدیم محلات بیرون قلعہ میں رہا کرتی تھیں۔ اور میں مع زوجہ و دیگر مرد و زن ملازمان وغیرہ اپنے کے محلات اندرون قلعہ میں جو شیش محل و راجہ منزل وغیرہ کے نام سے موسوم تھے رہا کرتا تھا۔ اور کل عدالتیں اور کچہریاں مع دفتر و خزانہ وغیرہ کے وہاں نہایت وسیع اور عمدہ مکانات ہیں

واقع تھیں۔ اور گرچہ مقام اول روز تک پر نہ تھا مگر تمام ضلع میں بہ نسبت دیگر مقامات کے نہایت آباد اور پر رونق تھا۔ متمول مہاجنان و آسودہ حال تجار ان سے بکثرت آباد تھی۔ ویرانی میں بھی کثرت مندرات کی اس کی وجہ سے باقی تھی مگر باوجود ان باتوں کے صدر مقام اورئی میں تھا جو وہاں سے قریباً بیس میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ شاید وجہ اس کی یہ ہو کہ مقام اورئی وسط ضلع میں لب سڑک جھانسی و کانپور کے واقع ہے۔

مجھ کو بہت دن وہاں نہ گزرے تھے کہ قسمتی سے فرلنگ صاحب بوجہ وفات میم صاحبہ اپنی کے ولایت تشریف لے گئے۔ اور جاتے وقت کپتان مرون صاحب جانشین اپنے کو میرے حالات و امور سے اچھی طرح آگاہ کر گئے تھے کہ وہ بھی میرا اعتبار و اعتقاد مثل ان کے کرتے رہیں۔ قریب زمانہ غدر میں اول تو تقسیم روٹیوں پوریوں کی تعمیل ایک عجیب طور پر بطور چھپا ان کے دیہہ بدیہہ ہوتا تھا اور تمام ملک میں بلا مزاحمت پھیل گئی اور پھر پتہ اس کا نہ لگا کہاں سے ابتدا اس کی ہوئی۔ دوسرے ایک فقیر زرد رنگ صورت کا اس ہولناک حال پر کہ ہر وقت گشت کناں پکارتا پھرتا تھا اور کسی سے باوجود اصرار کے کچھ نہ لیتا تھا کہ اے یارو لوگو اچھی یا بری چیزیں ہانڈی سے گندے ہو گئے بھول کے بھول رنگ نہایت خائف تھے کہ گویا وہ کسی تباہی آئندہ کی پیشین گوئی سے خبر کرتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا اور نہ اس کا وہم و خیال تھا کہ تھوڑے ہی دن بعد ویسا شر برپا ہوگا جیسا کہ غدر ہوا۔ لوگ اسی سوچ میں تھے کہ یہ روٹیوں کا ماجرا کیا ہے کوئی قوت ایسی غالب وہ سریع الاثر ہے کہ طرفۃ العین میں اس کی تعمیل قریب قریب تمام جگہ مفت میں ہو گئی۔ اور کوئی یہ سوال یا مزاحم اس کا نہ ہوا اور اس فقیر کا یہ رنگ تھا کہ بغیر کسی مجمع کے ایسی بے کی ہانک لگاتا پھرتا تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد غالباً وسط ماہ مئی ۱۸۵۷ء میں ایکا ایک یہ خبر اڑی کہ میرٹھ وغیرہ میں بہ تقریب کارتوس کاٹنے کے جھگڑے میں بوجہ لگانے یا سور کی چربی سے جو بھیجے تھے غدر ہو گیا اور کل ہندو مسلمان سپاہیان فوج انگریزی نے متفق ہو کر اپنے اپنے افسروں کو مار کر بنگلے جلا دیے ہیں اور شہر والوں نے بھی اس خونریزی اور گڑبڑ میں ساتھ ان کا دے کر ہنگامہ عظیم برپا کیا ہے۔

میں نے ہر شخص کو یہ کہہ کر کہ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں، مطمئن کر دیا اور شہر میں تمام خبروں جو اڑتی ہیں براہ جنہیں مطلق کیا گو خیال اس کے کہ تمام علاقہ میں اکثر زمیندار بد قوم ٹھاکران شورہ پشت کی بہ وہ دور ہی رہتے آباد ہیں سوا کوئی فساد برپا ہو علاوہ اس کے خزانہ تحصیل بھی پر چند لاکھ روپیہ مال اور فصل ربیع کے سبب سے زیادہ جمع ہوا تھا۔ اور ادھر میں سپاہیان تلنگے کے پہرہ میں تھا جن کی طرف سے کھٹکا عظیم تھا لہٰذا کل زر موجودات کو جو چالیس پچاس ہزار روپیہ کے قریب تھا بمقام اورئی خزانہ صدر میں بحفاظت تمام نہایت استقلال کے روانہ کر دیا اور کوئی غیر معمولی بات پیش نہیں ہونے پائی اگر کچھ شبہ ہی ہو۔ پھر تھوڑے ہی دن بعد جیلہ شرکت میرٹھ کیفیت کے ہونا تو تا بمقام مذکور ہوا کہ لی تھی اپنے گھر سے پکی نہایت عمدہ اور بھروسہ کا تھا سوار ہو کر اسی طرف روانہ ہوا اس راستہ میں گھبراتی ہوئی سال ... کرتا ہوا اورئی پہنچ کر صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر گیا۔ صاحب اس وقت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے مجھ کو دیکھ کر علیحدہ کمرہ میں لے گئے۔ ہنوز میں کل کیفیت اپنی ختم بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ صاحب نے کل تقریر میرٹھ کا بھی کہ خود وہی بیان کی کہ نہایت پریشانی کے ساتھ فرمایا کہ کچھ عجب نہیں کہ یہ آگ کل ملک میں پھیل کر موجب بربادی ہم سب کی ہو اور بلا انتظام مناسب اس کا ہونا چاہیے ورنہ جب کانپور تک جو ... میل یہاں سے ہے شورش اس کی پہنچے گی تو اس ضلع میں بھی شر برپا ہو جائے گا اور لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ ان کا زیادہ تر پریشان ہونا اس وجہ سے بھی تھا کہ بال بچوں کا ساتھ تھا۔

بہر حال صاحب نے بعد غور و خوض کے میم صاحبہ وغیرہ کو بمقام جھانسی اس حیثیت پر بھیج دیا کہ وہاں ایک مضبوط قلعہ کل سامان حرب

رسد وغیرہ سے مرتب ہے اور بہت سے صاحبان جلیل القدر اور افسران فوج جن میں اکثر دوست و احباب صاحب کے تھے موجود ہیں اور نیز یہ اگر کل باغیان نے محاصرہ بھی اس کا کیا تو فتح کرنا ایک مدت چاہیے جس میں ہر طرح کی مدد گوروں کی پہنچ سکتی ہے اور واسطے انتظام ضلع کے ایک خط بنام کیشو راؤ راجہ گور سرائے لکھ کر بدست سوار رجطلب و دو سو سپاہیان بندوقچی و دو ضرب توپ روانہ کیا ہنوز کچھ امدادی سپاہیان وغیرہ ریاست مذکور سے نہیں پہنچے تھے اور نہ میں بانتظار آنے ان کے اپنے مقام تحصیل جالون واپس گیا تھا کہ ناگاہ ایک سوار جو شاید صاحب کی اردلی کا میم صاحب وغیرہ کے ساتھ گیا تھا گھبرایا ہوا جھانسی کی طرف سے بدحواس آیا اور بیان کیا کہ جس وقت ہم لوگ مع بچوں و میم صاحب کے جھانسی پہنچے وہاں قتل عام ہو رہا تھا، نوبت قلعہ میں داخل ہونے کی نہیں پہنچی تھی کہ باغیوں نے راستہ ہی میں میم صاحب وغیرہ کو پکڑ کر قریب ایک باغ کے دیگر صاحبوں کے ساتھ تہ تیغ کیا۔

اس خبر ہوش ربا سے ڈینک صاحب پر ایک عالم سکتہ کا طاری رہا اور پھر جب ہوش میں آئے تو دیوانہ وار سر پٹکنے لگے۔ مجھ سے بھی اس دردناک سین پر ضبط نہ ہو سکا زار زار رونے لگا اور صاحب کو اپنے زیر دست ہاتھوں سے ڈینک مضبوط پکڑے رہا اور اس وقت تک دن رات مسلح ان کے پاس رہا جب تک کہ میں نے ان کو مع کل موجودات خزانہ صدر کے جس میں تمام ضلع کی آمدنی لکھو کھا روپیہ کی مع خزانہ لائے ہوئے میرے کے جمع تھی بہمراہی دو کمپنیاں ریاست گوالیار کے جن کو میں نے خود صاحب کی طرف سے خط بنام صوبہ ریاست مذکور متعینہ علاقہ سرحدی کے لکھ کر طلب کیا تھا بحفاظت تمام پاس صوبہ مذکور کے روانہ کیا۔ روح اللہ خاں چپراسی اردلی تحصیل خاص کو میں نے صاحب کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ دوسرے روز واپس آ کر اطلاع دی کہ صاحب مع کل خزانہ کے بخیریت و بحفاظت تمام پاس صوبہ ریاست مذکور کے پہنچ گئے خدا کا شکر ہے کہ پھر یہاں سے صاحب مذکور جابجا ٹھہرتے ہوئے مع کپتان انگرڈ صاحب کے جو پیچھے سے آکر شامل ان کے ہو گئے تھے بہ آرام تمام آگرہ پہنچ گئے۔

یہاں تانتیا صاحب پسر راجہ گور سرائے مع دو سو سپاہیان و دو ضرب توپ کے حسب الطلب صاحب موصوف کے روح اللہ کی واپسی سے قبل پہلے بمقام اورئی آ گیا تھا۔ اس وقت بانک رام جی جو مدت سے پیشہ مختاری کا عدالت ہائے جالون میں قبل آنے میرے سے کیا کرتا تھا جو اپنی عادات و صفات میں نہایت چالاک و مفتری تھا میرے پاس کھڑا تھا۔ میرے دل میں صد ہا خطرات تانتیا پسر راجہ گور سرائے کی طرف سے پیدا ہو گئے۔ مگر اب ان سے علیحدگی کا بجز اس کے کیا حیلہ ہو سکتا تھا جو میں نے ان سے کہا یعنی یہ کہ آپ یہاں مقام اورئی میں چند روز شہر کی نگرانی بہ اپنے سپاہی تعینات کر دیجیے تاکہ باہر سے کوئی غول بدمعاشوں کا نہ آئے اور قصبہ میں ہر طرح کا امن رہے۔ یہ کہہ کر میں فوراً جالون چلا گیا جہاں کے قلعہ کا بہت کچھ انتظام بہ نیابت تانتیا پسر راجہ مذکور کے تحریر رہتا تھا۔ کوئی توپ میرے پاس نہ تھی ورنہ تائی بائی صاحبہ زوجہ خاوند کے پاس تھی۔ مگر میں نے گولے بارود و کھانے پینے کا سامان اس قدر جمع کر لیا تھا کہ ڈھائی سو بندوقچیوں کے لیے تین چار مہینے تک کافی ہو۔ میں نے احتیاطاً مواضعات روزہ سرسہ و سرسہ روزہ وغیرہ کے سو سو اصحاب گوجران سرغنہ کو بھی جن کا وہاں علاقہ میں بڑا اثر تھا اور جو ان مرہٹوں کے جانی دشمن تھے اور مجھ کو ان کے قول و قرار اور ہمت مردانہ پر پورا پورا بھروسہ تھا بلا کر اپنی جمعیت اندرون حلقہ میں شامل کر لیا تھا۔

تانتیا صاحب پسر کیشو راؤ راجہ گور سرائے صرف دو روز اورئی میں رہ کر اور کچھ سپاہی اپنے ناکہ بندی وغیرہ کے لیے چھوڑ کر مع بقیہ سپاہیان اور سامان حرب کے جالون میں چلے آئے غالباً شروع ہفتہ دوم ماہ جون تھا کہ کانپور میں نانا کا تسلط قرار واقعی ہو گیا۔

راجہ سے مراسلت نامہ جاری تھی اور وہ اس کے حکم کا منتظر تھا۔ دو کمپنیاں وہ رجمنٹ کی جو بکمان افسری انگرٹیڈ صاحب بہادر کے اردلی میں تعینات تھیں وہ بالکل منحرف ہو کر باغی ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اردلی میں سوائے ان کے کوئی انگریز نہ تھا اور خزانہ سے وہ مقام پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ اور باشندگان میں بجز چند گھر غریب بنیوں کے کوئی مالدار نہ تھا اور ناکہ پہ راجہ کے سپاہی تعینات تھے جو اپنے تئیں منجانب راجا حکمران مشہور کیے ہوئے تھے۔ کمپنیاں مذکورہ نے بجز جلانے چند بنگلوں اور دفتر ہائے سرکاری کے اور کوئی ہنگامہ غارتگری وغیرہ کا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بہت سے سپاہی مقام جالون آکر راجہ کے سپاہیان محاصرین قلعہ میں شریک ہو گئے۔

شام کو چار بجے کے وقت ایک نئی بات ان کی جانب سے یہ ہوئی کہ بالک رام جس مردود نمک حرام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مع ایک لفافہ سربمہر مرسلہ راجہ کے میرے پاس آیا۔ اور نہایت فخر و مسرت کے ساتھ طالب جواب اس کے کا ہوا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ایک حکم تحریری دستخطی راجہ ملفوف تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آج کی تاریخ سے تمام علاقہ میں عملداری مہاراجہ صاحب پیشوا کی ہو گئی اور انگریزوں کے جن کا قلع قمع پورے طور پر ہر جگہ ہو گیا ہے۔ لہذا آپ کو چاہیئے کہ اپنے دل سے خیال ملازمت انگریزوں کا دور کر کے پیشوا صاحب کا نوکر اپنے کو سمجھئے اور چونکہ پیشوا صاحب نے اس علاقہ کا صوبہ مجھ کو مقرر کیا ہے اس لیے آپ زیر حکم و ہدایت میری کے انتظام متعلقہ کل علاقہ اپنے کا کریں اور زر تحویل سرکاری جو کچھ خزانہ تحصیل میں ہو وہ حوالہ خزانچی ہمراہی شخص ہمارے کے بعد سمجھانے حساب کے کر دیں۔ میں یہ پڑھ کر مارے غصہ کے آگ بگولہ ہو گیا کہ الٰہی جو لوگ پہلے میری اطاعت و فرمانبرداری میں سرگرم تھے وہ دفعتاً ایسے سرکش ہو کر اپنی حکومت اپنی جتاتے ہیں اور اسی حالت غیظ و غضب میں اس کاغذ کو پھاڑ کر اس مردود کے منہ پر پھینک دیا۔ تھانہ دار نے یہ حال دیکھ کر برقندازان کو اشارہ کیا انہوں نے خوب ہی مرمت اس کی گھونسوں و جوتوں سے کی اور پھر دونوں کان اس کے کھینچ کر ایسا [illegible] کہ نیم جان ہو گیا۔ آخر ش باہر پھاٹک کے گھسیٹ کر لے گئے اور خندق میں پھینک کر چلے آئے صبح کو غالباً ہوش میں آ کر تمام اس واقعہ کو راجہ صاحب سے اس نے بیان کیا کہ اسی وقت سے جنگ شروع ہو گئی۔

راجہ کو اس تین چار روز کی جنگ میں جب کامیابی نہ ہوئی اور وہ سمجھا کہ میری موجودگی میں کچھ بس اس کا نہ چلے گا تو ایک مضبوط سپاہی کو جس کی دلیری و ہمت پر اس کو ہر طرح کا اطمینان تھا میرے قتل پر آمادہ کیا وہ نہ معلوم کس وقت چور کھڑکی سے خفیہ طور پر آ کر قلعہ میں کہیں چھپ کر موقع کا منتظر رہا چار بجے شام کو کچہری کے بعد حسب عادت اپنے رفع حاجت کے لیے میں اوپر گیا تو بعد فراغ اترتے ہوئے ایک گراں ڈیل شخص کو برہنہ تلوار کھینچے ہوئے زینہ کے بالائی دروازہ پر دیکھا۔ اس وقت ایک پیر اس کا آخری زینہ پر اور دوسرا چھت پر تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ وہاں سے جھپٹ کر مجھ پر حملہ کرے۔ اس وقت خداوند کریم حافظ حقیقی نے ایسی جرات مجھ کو دی کہ ایک لات میں نے اس کو اس زور سے ماری کہ وہ مع تلوار اپنی کے الٹی بازی کھاتا ہوا گرا اور نیچے تک پہنچتے پہنچتے کہ سیڑھیاں بہت تھیں وہ مردہ ہو گیا۔ اور تلوار اس کی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی چند برقنداز تھانہ اس وقت وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ حال دیکھ کر اس قدر اس کو مارا کہ روح اس کی پرواز کر گئی۔ آخر ش نعش اس کی گھسیٹ کر خندق میں پھینک دی گئی۔

اس واقعہ نے اور بھی راجہ کے آتش غضب کو بھڑکایا مگر کیا کر سکتا تھا دانت پیس کر رہ گیا۔ آخر ش وہ ہولناک وقت آ پہنچا جس کا پہلے سے مجھ کو اندیشہ تھا یعنی بے شمار باغیان افواج جھانسی نے مع بھاری توپ خانوں و دیگر کثیر سامان حرب کے یہاں

پہنچ کر ایک وسیع میدان سایہ دار میں کیمپ اپنا تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ تھا لگایا۔ یہاں آتے ہی انہوں نے پھاٹک کو ضربات توپ قلعہ شکن سے گرا کر اندر گھس آئے تراب علی تھانہ دار کھڑا تھا۔ اس کو بموجب اشارہ بانک راؤ کے (جس کے کان اس نے برقندازان سے پکڑوا کر روڈ دیا تھا) قتل کیا اور پھر مجھ پر حملہ آور ہو کر زمین پر گرا دیا اور کل ہتھیار چھین کر قید کر لیا اور مشکیں کس کر روبرو افسر اعلیٰ اپنے کے کھڑا کیا اور کہا کہ اس کا قصور اس درجہ کا نہیں ہے کہ صرف قتل پر اکتفا کیا جائے بلکہ یہ اس قابل ہے کہ نانا کے روبرو سب کے عوض میں پیش کیا جائے اس طریقہ پر ان ظالموں نے سوائے ان کپڑوں کے جو جسم پر تھے اور کل مال از قسم زیورات و پارچہ ہائے قیمتی از آں میرے اور میری بیوی کے جن میں ان کے جہیز کا مال بہت تھا لوٹ کر اپنے کیمپ میں لے گئے اور توپ خانہ کی گاڑیوں پر مستورات چار پوش کر کے مع حاجی دولت کے بٹھا کر پہنچا ذلت کے ساتھ سپاہیان کی حراست میں لے گئے اور میری مشکیں کس کر ایک مسلح گارد کے حلقہ میں تمام شہر کے اندر گھماتے ہوئے اپنے کیمپ میں لے جا کر ایک چھوٹی سی پرانی راوٹی میں (جس کے اندر چودہ پندرہ قیدی پہلے سے نہایت تکلیف کے ساتھ قید تھے اور تل دھرنے کی گنجائش نہ تھی) ٹھونس دیا۔ دو روز تک اسی حالت میں کہ زندگی وبال ہو گئی تھی بمشکل تمام کٹے۔ تیسرے روز قریب چار بجے شام کے ایک غول سپاہیان مسلح نے جس میں دس پندرہ نفر سے زیادہ تھے قریب راوٹی کے میرا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ اس میں عنایت حسین کی جو کوئی ہوں باہر نکل آویں۔ میں خوش ہوا کہ اب وقت موت کا جو اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے آ گیا ہے اور کلمہ طیب پڑھتا ہوا باہر نکلا۔ برخلاف توقع کے انہوں نے بعد سلام علیک کے نہایت اخلاق کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور بعض ان میں سے بغلگیر ہو کر میری مصیبت پر آبدیدہ ہو گئے اور کمال ہمدردی کہا کہ اب آپ ہمارے ڈیرہ میں چل کر بآرام تمام رہیے کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی آپ پر ٹیڑھی نگاہ تک ڈالے۔ اس کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے پناہ دہندگان کے ڈیروں کی طرف چلا گیا جہاں انہوں نے ایک عمدہ راوٹی میری بیوی کے رہنے کے لیے علیحدہ نصب کرا دی تھی اور میں ان کے ساتھ بآرام تمام مثل ایک معزز مہمان کے رہنے لگا۔

قریب ان راوٹیوں کے جن میں میں اپنے پناہ دہندگان کے ساتھ رہتا تھا امام الدین وردی میجر کا خیمہ تھا جو اپنے اوصاف حمیدہ میں نہایت شریف النفس و منصف مزاج و زندہ دل فطرتاً معلوم ہوتا تھا اس کی ملاقات سے ہر ایک کا دل از حد خوش اور اس کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ میں بھی اس سے اکثر ملا کرتا تھا میرا اصل مقصد وردی میجر مذکور سے اپنی ملاقات کرنے بے تکلفی کے ساتھ بڑھانے اور اس طور پر رسوخ اپنا پیدا کرنے سے یہ تھا کہ وہ کسی وقت میرے دوستوں کی تدبیر رہائی میں کام آئے۔ سو خدا کا شکر ہے کہ انجام ان تمام کاروائیوں کا بھی ان بیچاروں کے لیے ایسا خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ ہوا کہ وہ سب ایسی جگہ پر اثناء راہ کانپور میں رہا ہو گئے جہاں سے وہ سب بلا خوف و خطر بھاگ کر ایک محفوظ و پوشیدہ مقام میں اپنے دوستوں کی زیر حمایت رہے جب تک کہ صورت امن پیدا نہ ہوئی۔

آخر ش انہوں نے تمام غصہ اپنا مجھ پر اتارا اور ان سب کی عوض میں جو میرے حسن تدبیر سے رہا ہوئے تھے مجھ ہی اکیلے کو دھر لیا میں نے بھی یہ کہہ کر صبر اختیار کیا کہ بندہ میں یہ گناہ ان کے عطف زندگی قائم رکھنے کے لیے صرف مجھ ایک متنفس کا بدل دیا جانا خالی از مصلحت الٰہی نہیں۔ ہاں اگر کچھ اضطراب تھا تو اپنی زوجہ کی نازک حالت پر کہ کچھ مہینہ کا حمل تھا اور ضعف و دکھ سے نہایت مضمحل و ناتواں ہو گئی تھیں۔ بہر حال ان ظالموں نے اگلے کوچ میں مجھ کو ایک چھکڑے پر جو شاید رسد کے ہو گئے اشکر رسیوں سے جکڑ دیا اور ایسے ہی ایک دوسرے چھکڑے پر کسی قدر کربی اس میں خشک و تر لکڑیاں جوار کی مع پتوں کے جو مویشیان کی خوراک کے لئے جمع تھیں رکھا کر میری

بیوی کو جو چادر اوڑھے تھیں بغیر کسی سایہ کے بیچ ان کی خاص سواری حاجی دولت کے بٹھا دیا۔ اور ایک ڈبل پہرہ سپاہیان جدیدہ کا جن پر انہیں اعتبار تھا دونوں چھکڑوں پر مقرر کر دیا۔ اس بندش و تیز دھوپ کی شدت سے میری حالت مثل ماہی بے آب کے جو تڑپ بھی نہ سکے ہو گئی اور میری بیوی کو بھی تیزی بخار سے سرسام ہو گیا۔ ہوش و حواس باقی نہ رہے اور ایک حالت نزع کی سی پیدا ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر حاجی دولت نے ان ظالموں کے افسر اعلیٰ سے کہ وہ بھی اعظم تھا کل کیفیت بیان کی۔ وہ دیر تک سوچتا رہا اور پھر جب تحقیق ہوا کہ حاجی سچ کہتا ہے مغرورانہ حکم دیا کہ زنانی سواری کو باہر کیمپ لے جا کر جہاں چاہو لے جاؤ اس بلا کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ حاجی نے اس اجازت کو غنیمت سمجھ کر اس چھکڑے کو باہر کیمپ کے لے جا کر چھوڑ دیا اور ایک کرایہ کی بہلی اپنے حسن تدبیر سے بہم پہنچا کر اور زنانی سواریوں کو اس میں بٹھا کر ریاست کدورہ کی طرف جہاں کے نواب سے میری ملاقات تھی روانہ ہو گیا گو اس کارروائی سے میرا دل کسی قدر مطمئن ہو گیا مگر بخیال مفارقت دائمی جو بمقتضائے حالت ہم دونوں کے یقینی تھی سخت بے قراری ہوئی حتیٰ کہ جب تک جاتے ان کے پیچھے دیر تک مجنوں کی طرح چلا کر رہ گیا اور پھر آج تک وہ زندہ دلی مجھ کو نصیب نہ ہوئی جو ان کی حیات میں تھی۔

بہر حال وہ اسی طرح مجھ کو کافور ہو گئے۔ نہ معلوم آگے بڑھ کر انہوں نے تا قیام لکھنؤ اور تا بہار وہ سے حاضری اپنی دیتے وقت میری نسبت کیا علم حاصل کیا کہ بروقت پہنچنے میرٹھ اور کل ہمراہیان لے گئے ایک خالی چھاؤنی کی گول کوٹھری میں جہاں ہتھیار وغیرہ سپاہیان کے رہا کرتے تھے۔ لے جا کر ہتھکڑیاں میری کھول دیں اور ایک بھاری قفل دروازہ میں لگا کر ڈبل پہرہ سپاہیان معتبرین اپنے کا بہ کمال تاکید حفاظت کے مقرر کر دیا۔ اگلے روز دو بجے دن کو ڈبل گارڈ سپاہیان کا آیا اور وہاں سے نکال کر مجھے سنگینوں کے حلقہ میں گھاٹ کنارے کشاں کشاں پیدل لے گئے۔ وہاں کشتیاں انگریزوں اور ان کی میموں اور بچوں سے بھری ہوئی لب دریا پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر گہرے پانی میں جمع تھیں اور ساحل پر پھوس کی جھونپڑیاں سایہ دار بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کشتی پر مجھ کو بٹھا کر چلے گئے۔

تمام کشتیاں جب بھر گئیں یا جس قدر بیٹھنے والے تھے بیٹھ چکے تو بجائے اس کے کہ ملاحان رسیاں ان کی کھول کر جن سے وہ بندھی ہوئی تھیں آگے کھیتیں برعکس اس کے انہوں نے ایک دم تمام جھونپڑوں میں آگ لگا دی اور خود نہایت تیزی کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچ کر کچھ ایسا اشارہ کیا کہ جس پر توپوں کے گولوں نے اپنی تباہ کن ضربات سے بھری ہوئی کشتیوں کو تہ و بالا کر دیا اور قریب قریب کل کشتیاں مع اپنے بدنصیب راکبوں کے بے چون و چرا ہو کر غرق آب ہو گئیں۔ مگر میرا پیمانہ حیات اس طوفان عظیم میں بھی لبریز نہ ہوا اور کچھ ٹوٹے تختوں پر جو باہم ملحق تھے بہہ کر گولوں کی زد اور پانی کے تھپیڑوں سے جو بے طرح اچھل رہا تھا بچ کر ایک ناہموار کنارہ دریا سے جو مقام گھاٹ سے بہت دور تھا ٹکرایا۔ وہاں سے درختوں کی جڑ اور گھاس وغیرہ جو کنارہ پر جا بجا جمی ہوئی تھی پکڑتا ہوا بمشکل تمام اس پار پہنچا۔ شتر بے مہار کی طرح چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں ایک جنگل نظر آیا۔ اندر اس کے گیا تو بیروں سے فاقہ شکنی اپنی کی۔ ایک نالہ پر منہ ہاتھ دھو کر اور کچھ پانی پی کر شکر خدا بجا لایا اور اپنا صافہ سر سے اتار کر مٹی سے اس کو رنگا اور بقدر ایک لنگوٹ اور تہمد کے پھاڑ کر ستر پوشی اپنی فقیرانہ وضع کی اور جو کچھ صافہ میں سے بچا اس میں سے بقدر ایک انگوچھے کے پھاڑ کر باقی سر پر باندھ لیا اور باقی کل کپڑے اتار کر وہیں چھوڑ دیے اور آگے بڑھا۔ شاید مجھ کو کسی نے شناخت نہیں کیا ورنہ دوبارہ گرفتاری کا سخت اندیشہ تھا۔

الغرض ایسا ہی بھیس بدلے کرتا جاتا ہوا اس بارہ منزل میں بمقام کدورہ پہنچا جہاں حاجی دولت میری بیمار بیوی کو باغیوں کے کیمپ سے لے گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مریضہ کی حالت زیادہ خراب دیکھ کر حاجی مذکور ان کو قبل اس کے بدایوں لے گئے جہاں میرے والدین موجود تھے پھر بھی نہ

باندہ گیا یہاں اپنی بی بی کو مرض الموت یعنی تپ دق میں مبتلا پایا۔ نبی بخش خاں بھائی ان کا الٰہ آباد سے آگیا تھا مرضہ کو اس آخیر وقت میں اپنی ماں کو ایک نظر دیکھنے کی از حد تمنا تھی مگر راستہ مخدوش تھا مگر بھائی ان کا ڈولی پر بٹھا کر نیم مردہ راستے ملکٹ حالی نکال لے گیا اور راج پور کے گھاٹ سے جمنا کر کے الٰہ آباد پہنچ گیا جہاں ان کا شدت مرض و نقاہت راہ سے بعد وضع حمل اپنی ماں کے آغوش میں ہزاروں حسرت و ارمان کے ساتھ انتقال ہو گیا اور خاندانی قبرستان میں دفن ہو کر خلد نشین ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف دوہ و لوٹ مار ہو رہی تھی۔ الٰہ آباد کانپور وغیرہ میں عملداری سرکاری ہو چکی تھی اور باندہ میں ہر چہار جانب ناکہ بندی کے علاوہ باغیوں نے گھاٹ چلہ تارہ کو جو باندہ سے بارہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور جدھر سے ہو کر عام راستہ ہر جگہ جانے کا ہے بالکل بند کر دیا تھا اور سخت انتظام تھا کہ پرندہ پر نہ مار سکے۔ اگر تنہا ہوتا تو شاید کسی حکمت عملی سے نکل جاتا مگر قبل اس کے شروع غدر میں الٰہ آباد سے جہاں میرا مکان ہے تمام کنبہ کے لوگ باندہ میں آگئے تھے اور اب میرے ہمراہ الٰہ آباد واپس آنے پر آمادہ ہوئے۔ اس وقت تک میرے پاس نہ تو کوئی سارٹیفکیٹ متعلق ایام غدر مقام جالون اور نہ بابت ایام مقام باندہ کے موجود تھا اور بغیر اس کے تمام مقبوضہ برٹش گورنمنٹ میں جانا از حد خطرناک تھا۔ اولاً میں نے قیام باندہ کی نسبت مسٹر کارن صاحب بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ باندہ کو درخواست تحقیقات چال چلن اپنے کی دی۔ انہوں نے تحقیقات باضابطہ کامل طور پر کی اور واسطے مزید اطمینان اپنے کے کل تحصیلداران ضلع معززین روساء شہر سے تفتیش عمل میں لا کر نہایت عمدہ سارٹیفکیٹ انگریزی عطا فرمایا۔ بعدہ میں اکثر ان دنوں میں جبکہ باندہ آیا تھا مقام کانپور گیا۔ وہاں سے بھی اسناد متعلق بابت ایام غدر ضلع جالون کے مسٹر پرنسپ صاحب و گریفتھ صاحب سے (جو اب کانپور میں ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر تھے) حاصل کر کے واپس آیا تاکہ اپنے والدین و دیگر اقربا اپنے کو لے کر الٰہ آباد جاؤں مگر اس وقت میں بھی تمام شہر باندہ و گھاٹ چلہ تارہ کا وہی حال تھا جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ سب طرف سے مایوس ہو کر باندہ سے نکلنے کی کوشش اس وقت تک نہیں کی جب تک کہ فوج انگریزی نے قلعہ میر گڈھ میں آکر گولہ باری نہیں کی۔ اس وقت تمام شہر باندہ میں کھلبلی پڑ گئی اور نواب باندہ بھی مع اپنی عورتوں کے ہاتھیوں پر بیٹھ کر بھاگ گئے۔ ہم لوگ بھی اس گڑبڑ میں باندہ سے نکل کر موضع سروئی کی طرف بھاگے جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور پیر روشن علی نامی ایک خاتون گو اس میں رہا کرتا تھا۔ وہاں چار بجے شام کو پہنچے۔

پیر روشن علی کے مکان پر اس عرصہ میں موضع اور ساتھ کچھ لوگ میرے سسرال کے رشتہ دار آگئے تھے اور پیر روشن علی نے بھی کچھ آدمی اپنے ہمارے ساتھ کر دیئے تھے ان سب نے مل کر ہم کو بحفاظت تمام راجپور کے گھاٹ سے مع زنانی سواریوں وغیرہ کے اتار کر الٰہ آباد کے رستہ پر پہنچا دیا۔ یہاں سے الٰہ آباد بہت دور نہ تھا تین چار روز میں ہم لوگ الٰہ آباد پہنچ گئے۔ یہاں پر مکان میں قفل سرکاری لگا ہوا تھا۔ محلہ نخاس کہنہ میں اپنے رشتہ داروں کے مکان میں ٹھہر گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسٹر چارلس جیمس ٹرنگ صاحب بہادر سابق ڈپٹی کمشنر جالون ولایت سے یہاں آگئے ہیں چونکہ وہ میرے مربی تھے۔ میں ان سے ملنے کو اگلے دن صبح ہی کو چلا گیا اور والد میرے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف حاضری دینے کو روانہ ہوئے۔ صاحب ممدوح نے مجھ کو صلاح دی کہ میں فوراً الٰہ آباد سے روانہ ہو کر ڈپٹی کمشنر ضلع جالون کو اپنی حاضری سے مطلع کروں اور ایک چٹھی مجھ کو علاوہ ایک عمدہ سارٹیفکیٹ کے لکھ دی اور کہا کہ یہ سب کاغذات ڈپٹی کمشنر جالون کو دکھانا۔ میں فوراً جہاں تک جلد ممکن ہو سکا۔ الٰہ آباد سے روانہ ہو کر ضلع جالون کو چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر کرنل ٹرنر صاحب ایک فوجی افسر تھے جن

بھی کی شناسائی میری نہ تھی اور نہ وہ مجھ کو جانتے تھے۔

جب میں قریباً دس بجے دن کے بنگلہ پر صاحب ڈپٹی کمشنر کے پہنچا تو اردلی کے سپاہی سے معلوم ہوا کہ صاحب کو اس وقت فرصت نہیں۔ سررشتہ دار دفتر کے کمرہ میں رپورٹ خوانی کر رہے ہیں۔ میں نے ایک کارڈ پر نام اور عہدہ اپنا انگریزی میں لکھ کر چپراسی کو دیا کہ صاحب کو دے دیوے اور خود برآمدے میں کچھ کرسی پر بیٹھ کر منتظر طلبی اپنی کا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی مذکور واپس آکر زینہ برآمدہ کھڑا ہوا اور اشارہ سے بلا کر مجھ سے کہا کہ آپ پیچھے پیچھے میرے چلے آؤ۔ میں سمجھا کہ شاید حاضری لکھانے کو ہیڈ کلرک کے پاس کچہری لیے جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ شہر کی طرف چلا اور ایک پختہ عالی شان مکان کے دروازہ پر کھڑے ہو کر پہرہ کے سپاہی سے کواڑ اس کے کھلوائے اور مجھ کو اشارہ کیا کہ اندر جا کر اپنے ہم رتبہ عہدہ داروں سے مل کر دل بہلاؤ۔ اس وقت میں سمجھا کہ سررشتہ دار کی کشش ذہنی اور صاحب بہادر کی لاعلمی سے یہ سب کارروائی بیجا و غلط فہمی ہوئی۔ اور اندر جا کر دیکھا تو ایک دالان وسیع میں منشی شیو پرشاد تحصیلدار کونچ اور عبداللہ خاں تحصیلدار اپنی اپنی دریاں فرش پختہ دالان میں بچھائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر نہایت متعجب اور افسردہ ہوئے۔ مگر میں مسکرا کر عبداللہ خاں کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

اسی وقت ایک عرضداشت بہ اطلاع حالات یہاں کے اور جو کچھ مجھ پر گزرا تھا درج کر کے فوراً مسٹر فریلنگ صاحب کی خدمت میں ایک معتبر ملازم کے ہاتھ بمقام ہمیر پور (جو وہاں سے تخمیناً چالیس میل کے فاصلہ پر ہوگا اور جہاں صاحب ممدوح کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر الٰہ آباد سے آئے) روانہ کر دی۔ بہر حال ایک ہفتہ کامل مجھ کو اس مکان میں گزر گیا۔ آخرش ایک سوار نے آکر مجھ کو لفافہ فریلنگ صاحب کلکٹر ہمیر پور بجواب میری عرضداشت مذکورہ کے دیا اور اس نے یہ بھی کہا کہ ایک دوسرا سوار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ چٹھی انگریزی موسومہ صاحب ڈپٹی کمشنر جالون سے لے کر صاحب موصوف کے بنگلہ پر گیا ہے۔

اگلے روز آٹھ یا نو بجے صبح کو پہرے کا سپاہی مع ایک چپراسی اردلی صاحب ڈپٹی کمشنر کے میرے پاس آیا۔ کہا کہ صاحب نے آپ کو سلام دیا ہے اور اپنا ٹمٹم سواری کے لیے بھیجا ہے۔ میں نہایت خوش ہو کر بہ سواری مذکور فوراً صاحب کے بنگلہ پر آیا۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے پاس کرسی پر بٹھا کر نہایت دلجوئی اور دلداری میری کی اور فرمایا کہ میری لاعلمی کے سبب سے جو تکلیف آپ کو ہوئی معاف کیجیے اور فوراً جا کر اسسٹنٹ صاحب سے جن کے نام کی چٹھی میں اس وقت دیتا ہوں چارج اپنے عہدہ کا لیجیے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر اظہار شکر ادا کیا اور یہ عرض کیا کہ حضور کو اس ضلع میں مجھ کو بایام غدر باغیوں کے ہاتھ سے نہایت تکلیف پہنچی ہے اور اب بعد رفع غدر کے بھی کسی قدر آپ کی لاعلمی سے ذلیل ہوا اب اس صورت میں اس جگہ کام کرنا پسند نہیں کرتا اور فریلنگ صاحب کا بھی خط میں نے ان کو دکھلایا کہ اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو میں فریلنگ صاحب کے پاس چلا جاؤں۔ صاحب دیر تک سوچا کیے۔ آخرش میرے اصرار پر میری التجا انہوں نے قبول فرمائی اور کہا کہ تم کو اختیار ہے چاہے یہاں رہو یا ہمیر پور چلے جاؤ۔

تین دن بعد وہاں سے روانہ ہو کر ہمیر پور چلا آیا۔ یہاں فریلنگ صاحب بہادر میری اس کارروائی پر نہایت خوش ہوئے اور فوراً تحصیلداری مہوبہ کا چارج دلا دیا۔ میں وہاں باطمینان خاطر تمام کام انجام دیتا۔ بالآخر گورنمنٹ نے بذریعہ ریزولیوشن مورخہ ۲۰ جون ۱۸۵۹ء نمبری ۱۳۰۷ ایک پختہ بنگلہ واقع شہر باندہ جس میں کلکٹر صاحب بمقام مذکور بکرایہ سو روپیہ ماہوار رہتے تھے، اور علاوہ بریں ڈپٹی کلکٹری میں بحالی خیر خواہی سند و رپورٹ کے عطا فرمایا۔

(تلخیص سرگزشت ایام غدر)

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

میں ۱۳ اپریل ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوا۔ دہلی میرا آبائی وطن تھا۔ عمر کے ابتدائی ایام یہیں بسر ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں پانی پت چلا آیا۔ مگر یہاں بھی جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جہاں جہاں تقدیر میں لکھا تھا پھرتا رہا۔ اور اب لاہور میں بیٹھا ہوا موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ بچپن کھیل کود میں، جوانی طلسم ہوش ربا جیسی داستانوں، فسانۂ عجائب، گل بکاولی، آرائش محفل، طوطا کہانی جیسے قصوں اور مولوی عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے پڑھنے میں ضائع کی۔ کسی قسم کی لیاقت اور کسی طرح کی قابلیت پیدا نہ کی اور اب بڑھاپے میں عمر رفتہ پر بیٹھا افسوس کر رہا ہوں۔ نہ معلوم کب بلاوا آ جائے اور میں محروم ہو کر رہ جاؤں۔

انگریز دشمنی مجھے ورثہ میں ملی تھی۔ میرے دادا حاجی محمد ابراہیم ایک خوش بیان شاعر، بڑے صوفی منش بزرگ، بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے زمانہ کے اچھے ادیب تھے۔ وہ تمام عمر انگریز اور انگریزی کے سخت مخالف رہے۔ دادا کا اثر پوتے میں کیوں نہ آتا۔ جب میں دہلی میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور کمپنی باغ میں سے گزر کر چاندنی چوک کے ایک پرائمری مدرسہ میں روزانہ جایا کرتا تھا تو گھنٹہ گھر (مرحوم) کے سامنے ٹاؤن ہال کے بالمقابل ملکہ وکٹوریہ کا بت ایک سنگین چبوترے پر قائم تھا۔ میں نے ایک روز مدرسہ جاتے ہوئے صبح ہی صبح دیکھا کہ اس بت کے گلے میں رات کو کوئی شخص ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار ڈال گیا ہے۔ اس نظارہ کو دیکھ کر ایسا لطف اور مزہ آیا اور اس قدر مسرت ہوئی کہ اس کی حلاوت آج تک یاد ہے۔ پھر جب ۱۹۳۶ء میں اصلاح دیہات کے ایک سرکاری اخبار "دیہات" کا ایڈیٹر ہو کر میں جھنگ گیا تو میں نے پہلی شرط یہ پیش کی کہ کام محنت اور دیانتداری سے کروں گا، مگر گورنمنٹ کی خوشامد قطعاً نہیں کروں گا۔ جب مجھے کام کرتے چھ مہینے ہو چکے تو ایک روز یکایک گورنر پنجاب ایمرسن کی چٹھی مجھے ملی کہ پنجاب میں اصلاح دیہات کے جتنے اخبارات سرکاری انتظام میں نکل رہے ہیں، تمہارا اخبار ان سب سے بہتر ہے۔ ہم تمہیں اپنی خوشنودی کی سند دینا چاہتے ہیں لاہور آ کر لے جاؤ۔ یہ چٹھی دیکھ کر افسروں نے کہا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ فوراً چلے جاؤ۔ میں نے کہا۔ انگریز کے ہاتھ سے سند کبھی نہیں لوں گا۔ آپ چاہیں تو مجھے برخاست کر دیں اور میں نہیں گیا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ مدرسہ سے گھر آتے ہی بستہ پھینک کوئی کتاب یا اخبار یا رسالہ اٹھا کر بیٹھ جاتا اور کھانا بھی اسی حالت میں کھاتا کہ ایک ہاتھ میں کتاب، دوسرے میں نوالہ۔ ایک روز بازار میں جا رہا تھا۔ مولوی سید وحید الدین سلیم، سابق لائبریری اسسٹنٹ سرسید ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سامنے سے گزرا تو مجھے اشارہ سے بلایا۔ اور میرا نام و پتہ پوچھ کر کہنے لگے۔ تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم اچھے مصنف اور کامیاب ادیب بنو گے۔ میرے پاس میرے مکان پر آیا کرو۔ میں تمہیں مضمون نگاری سکھاؤں گا۔ پھر تم بڑے مشہور انشا پرداز بن جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی صاحب! میں تو کسی سے کچھ سیکھنا چاہتا نہیں۔ مجھے

مضمون نگاری آتی ہو گی تو خود ہی آجائے گی۔ مولوی صاحب نے کہا تمہاری مرضی۔ اور میں چلا آیا۔ اس واقعہ کو سالہا سال گزر گئے۔ اور اسی دوران میں مولوی صاحب اردو کے پروفیسر مقرر ہو کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں چلے گئے۔ جب موسمی تعطیلات میں ایک مرتبہ دلی و پانی پت آئے۔ تو حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب خلف الرشید مولانا حالی سے ملنے کے لئے ان کے ہاں گئے۔ میں بھی اتفاقاً پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی محبت سے گلے لگا لیا۔ اور کہنے لگے تمہارا طول طویل مضمون "سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم" میں نے رسالہ اردو" میں بڑے شوق سے پڑھا۔ نہایت ہی عمدہ اور فاضلانہ مضمون ہے۔ میں نے تو حیدرآباد میں اسے اپنے پلنگ کے سرہانے رکھا ہوا ہے۔ جو شخص بھی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ میں اسے دکھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میرے پانی پت کے ایک شخص نے یہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا مولوی صاحب! آپ کو وہ واقعہ یاد ہے۔ جب آپ نے مجھے اپنے پاس آ کر مضمون نگاری سیکھنے کو کہا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ مضمون نگاری آتی ہو گی تو یوں ہی آجائے گی۔ سیکھ سکھا کر تو یوں نہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے۔ ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ تم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا اور واقعی مضمون لکھنے میں کمال کر دیا۔ اس وقت سے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات مولوی صاحب سے قائم ہو گئے جو آخر تک قائم رہے۔

میں نے سب سے پہلا مضمون "ریل گاڑی" پر لکھ کر مولوی محبوب عالم کے اخبار "انتخاب لاجواب" کو بھیجا۔ مگر مولوی صاحب کا جواب آیا کہ صاحبزادے! ابھی تم بچے ہو۔ اس جھمیلے میں نہ پڑو۔ مضمون نگاری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ کوئی اور دھندا اختیار کرو۔ اور اس شغل کو چھوڑ دو۔ پانی پت کا ہر شخص حالی نہیں بن سکتا۔ تمہارا مضمون کسی کام کا نہیں۔ اس لئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ میں نے مولوی صاحب کے اس تلخ جواب کا برا نہیں مانا۔ اور سمجھ لیا کہ واقعی مضمون ردی میں پھینک دینے کے قابل ہو گا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ مشق جاری رکھی اور دن گزرتے گئے۔ آخر ایک وقت وہ بھی آیا۔ جب مولوی محبوب عالم نے میرا ایک مضمون نہایت فخر کے ساتھ بہت نمایاں طریقہ پر "انتخاب لاجواب" میں شائع کیا اور لکھا کہ ہم بڑی خوشی سے یہ شاندار مضمون شائع کر رہے ہیں۔ اور ہم نے اس پرچہ کی کچھ زائد کاپیاں چھپوائی ہیں۔ خریدار حضرات قیمتاً منگوا کر مطالعہ فرمائیں۔

میں نے سب سے پہلی کتاب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے لئے ۱۹۱۹ء میں "لوریاں اور پہیلیاں" لکھی۔ کانفرنس کی طرف سے اس موضوع پر کتابیں لکھنے کے لئے انعامی مقابلہ کا اشتہار دیا گیا تھا۔ سارے ملک سے کل ۲۰ کتابیں کانفرنس کو موصول ہوئیں جن میں سب سے بہتر کتاب میری قرار پائی۔

میں نے اپنی سب سے پہلی ملازمت "حالی مسلم ہائی سکول پانی پت" میں کی۔ جہاں میں اورینٹل ٹیچر تھا۔ اس کو کچھ عرصہ بعد چھوڑ کر وکٹوریہ میموریل لائبریری پانی پت کا لائبریرین کچھ دنوں تک رہا۔ پھر مولانا حالی کی لائبریری کا لائبریرین ہو گیا اور تیرہ سال تک یہاں کام کرتا رہا۔ اسی دوران میں میں نے ۱۹۱۹ء میں خود بھی ایک لائبریری قائم کی جس کا نام اورینٹل پبلک لائبریری تھا۔ اور جو تقسیم ملک کے وقت تک جاری رہی۔ پھر اسے گورنمنٹ ہند نے ضبط کر لیا۔

سب سے پہلا رسالہ میں نے ۱۹۲۳ء میں "جام جہاں نما" کے نام سے پانی پت سے ماہوار نکالا۔ جس کا نام مولوی وحید الدین سلیم کے مشورہ سے بعد میں "کائنات" کر دیا۔ پھر حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کی طرف سے ایک ادبی ماہنامہ "شعلہ" کے نام سے نکالا

میری ادارت میں سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار جھنگ سے نکلا جس کا نام "مروج" تھا اور جو اصلاح دیہات کا سرکاری اخبار تھا اور ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ مجھے اس اخبار کو ایڈٹ کرتے تین سال ہوئے تھے کہ ایک دفعہ رات کے دس بجے ایک دوست آئے اور انھوں نے مجھے اچانک ایک ایسا دردناک واقعہ سنایا کہ تمام رات نیند نہ آئی اور فوراً ہی اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ اس دورہ نے اتنا طول کھینچا کہ مجھے بالآخر ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر آنا پڑا۔ اور استاذی المرحوم حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب سول سرجن گوجرانوالہ کی ہدایات کے ماتحت چار ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ جب جاکر آرام آیا۔

۱۹۳۰ء میں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے میرا ادارت کا تعلق قائم ہوا۔ جو آج تک ۳۰ برس ہو چکے ہیں قائم ہے۔ یہ رسالہ آج کل میری ادارت میں دہلی سے نکل رہا ہے۔ رسالہ کے مالک اور بانی سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ تو فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے لائق فرزند سردار مہرجگ سنگھ تھاپر رسالہ نکال رہے ہیں۔ میری ادارت میں رسالہ ہذا کے بعض خاص نمبر بڑی شان سے شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً مرقع ادب جمیل، مدیکراس سائیکلو پیڈیا، جوبلی نمبر، تاجپوشی نمبر وغیرہ اور حال میں جگت سنگھ نمبر۔

۱۹۳۵ء ہی وہ سال ہے۔ جب مولانا حالی کے فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کی امداد کے لئے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ مجھے بھی براہ عنایت انھوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ جہاں مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم ریاست سے ملنے گئے تو میرا تعارف حضرت خواجہ صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ مہاراجہ سے کرایا کہ یہ والد مرحوم (مولانا حالی) کے حالات اور تصنیفات کے متعلق سب سے زیادہ جاننے والا شخص ہے۔ وہیں میری ملاقات مولوی عنایت اللہ دہلوی ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ہوئی۔ اور ہم دونوں بہت جلد نہایت گہرے دوست بن گئے۔ اور یہ دوستی نہایت اخلاص کے ساتھ آخر وقت تک قائم رہی۔ مولوی عبدالحق سے بھی میری ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مولانا حالی کے مضامین کا مجموعہ اشاعت کے لئے لیا۔ جسے میں نے ۴ برس کی محنت اور تلاش کے بعد مرتب کیا تھا۔ مگر جب وہ مجموعہ شائع ہوا تو سرورق پر سے میرا نام بحیثیت مرتب غائب تھا۔ اور اندر دیباچہ میں مولوی صاحب نے لکھ دیا تھا کہ یہ مضامین کچھ میرے کچھ محمد اسماعیل کے مرتب کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان مضامین کی ایک سطر بھی مولوی صاحب کی مہیا کی ہوئی نہیں تھی۔ یہ سب سے پہلی بدمعاملگی تھی جو کسی پبلشر نے میرے ساتھ کی۔

۱۹۳۷ء میں مولانا حالی کی پیدائش کا صد سالہ جشن اورنگ آباد دکن میں سرکاری طور پر بڑی شان سے منعقد کیا گیا۔ اس میں مولانا کے فرزند خواجہ سجاد حسین کو بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب ان دنوں کچھ علیل تھے اور ضعیف بھی بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے نمائندہ کے طور پر مجھے اورنگ آباد بھیج دیا۔ اور حالی مسلم ہائی سکول کی طرف سے میرے نہایت ہی عزیز دوست شیخ محمد ضیاء الاسلام فضلی کو۔ ہم دونوں کا وہاں بڑی عزت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ اور جشن نہایت کامیاب رہا۔ وہاں مولوی عبدالحق نے ہماری دعوت کی۔ اور مشہور ریسرچ سکالر شیخ چاند صاحب کو بھی مدعو کیا۔ دعوت میں مولانا حالی کی تصنیفات پر کچھ گفتگو ہونے لگی۔ تو شیخ صاحب نے مجھ سے کچھ اختلاف کیا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے شیخ چاند سے کہا کہ مولانا حالی کے متعلق جو اسماعیل کہتا ہے بلا چون و چرا مان لو۔ اور اس کی مخالفت نہ کرو۔ پروفیسر محی الدین قادری زور ایم اے سے میری پہلی ملاقات

اسی جشن میں ہوئی اور بڑی دلچسپ علمی بحث دیر تک ہوتی رہی۔ اختصار کا خیال نہ ہوتا تو مفصل لکھتا۔

اورنگ آباد سے واپس آ کر میں نے حضرت خواجہ سجاد حسین سے عرض کیا کہ پانی پت میں بھی مولانا حالی کی صد سالہ پیدائش کا جشن اسی شان سے منعقد ہونا چاہیئے جیسا اورنگ آباد میں ہوا۔ خواجہ صاحب تیار ہو گئے۔ اور ۱۹۳۵ء میں عظیم الشان ادبی جشن نواب بھوپال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے تمام ممتاز اصحاب نے بڑے شوق سے شرکت کی۔ میں نے اس ادبی جشن کی مفصل روداد رسالہ "حیات نو" کے خاص نمبر میں شائع کی۔ یہ سہ ماہی رسالہ میرے اور شیخ بدر الاسلام صاحب فضلی کے مشترکہ انتظام میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس خاص نمبر میں میں نے رپورٹ سے پہلے پانی پت کی مفصل تاریخ بھی نہایت تلاش کے بعد مرتب کر کے شائع کی۔

اس کے بعد میں نے ایک ہفتہ وار اخبار "پیغام حیات" کے نام سے پانی پت سے جاری کیا۔ جو کچھ عرصہ تک نکلتا رہا اور جب میں ایک سرکاری اخبار "ستارہ صبح" کا ایڈیٹر ہو کر کرنال چلا گیا۔ تو بند ہو گیا۔ اور جب "ستارہ صبح" کو گورنمنٹ نے بند کر دیا تو اپنے گھر چلا آیا۔

تقسیم ملک کے بعد میں بحال تباہ اکیلا، ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ ڈیوس روڈ کی ایک کوٹھی کی ایک کوٹھڑی میں مجھے مشکل سے جگہ ملی۔ لیکن حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ نہ کھانے کو پیسہ تھا۔ نہ بدن پر کپڑے پورے تھے۔ نہ پاس کوئی بستر تھا، نہ سونے کے لئے کوئی پلنگ اور بیٹھنے کے لئے کوئی فرش تھا۔ میں نے اس بیکسی اور بے بسی اور ناداری اور محتاجی کی حالت میں چند مقامی ایڈیٹروں کو خط لکھے کہ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی لکھنے پڑھنے کا کام ہو تو مجھے دیجئے تاکہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکوں۔ جس پر حافظ محمد عالم، مالک رسالہ عالمگیر نے فوراً تانگہ بھیج کر مجھے بلوایا۔ میری نہایت پرتکلف دعوت کی اور فرمایا کہ اسلامی تاریخی افسانوں کا ایک مجموعہ میرے لئے لکھ دو۔ میں تمہیں تین سو روپے دے دوں گا۔ بلا مبالغہ مجھے اس وقت یہ معلوم ہوا کہ یہ مجھے تین لاکھ روپے دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا بڑی خوشی کے ساتھ۔ مگر ایک سو روپے پیشگی مرحمت ہوں تاکہ اپنی حالت کچھ درست کر سکوں۔ اور کھانے پینے کا کچھ سہارا ہو۔ فوراً بلا تامل ایک سو روپے کا نوٹ انہوں نے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں نے ایک مہینے میں ان کو کتاب لکھ دی جس کا نام "جگمگاتے تارے" تھا اور جو پاکستان میں میری سب سے پہلی تصنیف ہے۔

کتاب لکھنے کے بعد حافظ صاحب نے فرمایا کہ اب تم رسالہ عالمگیر کی ایڈیٹری سنبھال لو۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور میں نے کام شروع کر دیا۔ لیکن میرا کلرک بہت ہی خبیث طبیعت کا انسان تھا۔ اس نے میری جھوٹی شکایتیں حافظ صاحب سے کرنی شروع کیں۔ حافظ صاحب کانوں کے کچے تھے۔ ہر شکایت کو وحی اور الہام سمجھتے چنانچہ بلاوجہ مجھ پر اعتراضات ہونے لگے۔ میری خوددار طبیعت نے اس صورت حال کو گوارا نہ کیا اور استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گیا۔ اور اب تک بیٹھا ہوا ہوں۔

فسادات ۱۹۴۷ء کے وقت میرے تمام قیمتی مسودات، میری عظیم الشان لائبریری، پرانے اخباروں اور قدیم رسالوں کا نہایت بیش بہا ذخیرہ وغیرہ سب کا سب پانی پت ہی میں رہ گیا۔ صرف تھوڑے سے مسودات میرے بچے محمد احمد اور مبارک محمود بمشکل پاکستان لا سکے۔ اور باقی سب کچھ وہیں رہ گیا۔

میں نے شروع سے اب تک ہزاروں مضامین مختلف موضوعات پر ملک کے ممتاز جرائد و رسائل میں لکھے۔ مگر وہ سب سوائے چند چھپ کر چھپ گئے۔ اور میرے پاس بھی اب ان کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اسی طرح میں نے ۹۰ کے قریب کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے بہت ہی کم کتابیں میرے پاس ہیں۔ آٹھ نو اخبارات و رسائل کا ایڈیٹر بھی رہا۔

آخر عمر میں مجھے دو ایسے زبردست حادثات سے دوچار ہونا پڑا جنھوں نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔ پہلا حادثہ ۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو واقع ہوا۔ جبکہ میرے نہایت ہی لائق۔ قابل اور بے حد سعادت مند فرزند محمد احمد کا بہت مختصر علالت کے بعد عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف ۳۴ برس کی عمر پائی مگر اس قلیل عرصہ میں ۴۰ سے زیادہ اعلیٰ پائے کی علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی کتابیں اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ بقول مکرمی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش دوسرے لوگ ایک سو برس کی عمر میں بھی اتنا ٹھوس کام نہیں کر سکتے جو مرحوم صرف ۳۴ برس کی عمر میں کر گیا۔ وہ عربی سے اردو ترجمہ کرنے کی حیرت انگیز قابلیت رکھتا تھا اور اس کے انتقال پر طفیل صاحب نے کہا تھا کہ محمد احمد پاکستان میں خاص اسلامی سوانحی اور تاریخی تراجم کا بانی تھا۔ ڈھائی سو سے زیادہ تار اور خطوط اس کی وفات پر پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا، انگلستان، افریقہ اور امریکہ کے مختلف ممالک سے آئے جن میں لوگوں نے اس ارتحال کو ایک قومی نقصان قرار دیا۔ دوسرا واقعہ میرے ساتھ ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو پیش آیا جبکہ مرحوم کی والدہ اپنے پیارے بیٹے کا غم برداشت نہ کر سکی۔ اور مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ مرحومہ عجیب و غریب قابلیت کی عورت تھی۔ قرآن کریم کی اتنی زبردست حافظ تھی کہ میں جب کبھی کسی آیت کے متعلق پوچھتا کہ کہاں ہے؟ تو فوراً پارہ۔ سورت اور رکوع کا نام بتا دیتی۔ اردو ضرب الامثال اور محاورات کی وہ گویا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ جب کبھی میں اس سے کسی محاورہ کی تشریح یا کسی کہاوت کا مطلب پوچھتا تو ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتی کہ میں سن کر حیران ہو جاتا۔ پھر امور خانہ داری میں اتنی اعلیٰ درجہ کی ماہر تھی کہ شاید ہی کوئی عورت ہو۔ اس نے ہمیشہ انتہائی محبت کے ساتھ میری خدمت کی اور میرے تمام علمی کاموں میں میری زبردست معاون رہی۔ محمد احمد کے مرنے سے میری علمی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی ماں کے انتقال سے میری گھریلو زندگی ختم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ محمد احمد کے انتقال سے پانچ ماہ بعد ۸ جون ۱۹۶۳ء کو اس کا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میں نے احمد طاہر رکھا۔ اور یہی اس وقت میری زندگی کا سہارا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے اپنے مرحوم باپ کا صحیح جانشین اور وارث بنائے۔ آمین۔

میری مرتبہ، مصنفہ اور مؤلفہ کتابوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ جواہرات حالی (مولانا کی غیر مطبوعہ نظمیں)، مکاتیب حالی۔ (خطوط کا مجموعہ)، افکار سلیم (مولانا وحید الدین سلیم کی نظمیں)، مضامین سلیم ہر سہ جلد۔ مکتوبات سرسید (میری چالیس سالہ محنت کا نتیجہ)، سرسید کا سفرنامہ لندن۔ مقالات سرسید (۱۶ حصے)، سیرۃ ابن ہشام اردو ایڈیشن اور تاریخ اشاعت اسلام جو میری سب سے زیادہ اہم اور سب سے بہتر تصنیف ہے۔ جو کتابیں زیر ترتیب یا زیر تالیف ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ مولانا حالی کی مفصل سوانح عمری جس کا مواد میں ۱۹۱۲ء سے جمع کر رہا ہوں۔ مشاہیر پانی پت۔ ترجمہ طبقات ابن سعد، ترجمہ کتاب الاصنام از ہشام کلبی مفصل تاریخ اسلام جس کے مختلف حصے بنی عباس تک لکھ چکا ہوں۔ تاریخ تمدن اسلام۔ تاریخ مشاہیر اسلام، جغرافیہ تاریخ اسلام

سرسید کا سفر نامہ پنجاب، کلیات نثر حالی، کلیات نظم حالی اور تاریخ اخبارات و رسائل جن کا مواد ۱۹۲۶ء سے جمع کر رہا ہوں۔ مگر اب جبکہ تمام قویٰ کمزور ہو گئے ہیں۔ چلتے ہوئے چکر آتے ہیں۔ ہاتھ میں طاقت اور دماغ میں قوت نہیں رہی تو بظاہر حالات امید نہیں کہ یہ نامکمل مسودات مکمل ہوں۔

عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ۱۹۱۴ء میں جو سب سے پہلی کتاب لکھی وہ بچوں کے لیے تھی، یعنی "لوریاں اور پہیلیاں"۔ اور میری سب سے آخری کتاب جو حال میں شائع ہوئی، وہ بھی بچوں کے لیے ہے۔ یعنی "ایمان کی باتیں"۔ درمیان کے تمام عرصہ میں مختلف ادبی اور تاریخی کتابیں لکھتا رہا۔

سید ہمایوں مرزا

ولادت

بتاریخ ۴ ماہ رجب المرجب ۱۳۱۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۸۹۹ء بمقام شہر مینو سواد عظیم آباد عرف پٹنہ محلہ دیوان گنج میں نماز صبح کے وقت کتم عدم سے عالم شہود میں آیا۔ اذان والد مرحوم نے کہی۔ میرے والد نظام الملک حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد رحمۃ اللہ علیہ تھے اور والدہ مرحومہ نواب عفت آرا بیگم صاحبہ نور اللہ مرقدہا تھیں۔

میری ولادت کے تیسرے یا چوتھے مہینے میری والدہ کی رضاعت بند ہو گئی۔ خاندان کے اصول اور دستور کے مطابق انا گری کے لیے سیدانی کی تلاش ہوئی اور ایسی سیدانی جو صحیح النسب ہو۔ عجیب اتفاق بروقت کوئی دستیاب نہ ہوئی۔ اتفاقاً میرے ہاں کے سپاہیوں میں ایک شخص امیر خاں نامی پٹھان تھا اور اس کی اہلیہ بھی پٹھانی تھی۔ اس کے ایک لڑکی اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ پٹھانی جو میری پہلی انا تھیں بلائی گئیں۔ میرے والد بہت ناراض ہوئے کہ کیوں پٹھانی کا دودھ میرے بچے کو دیا جا رہا ہے۔ میری والدہ کے اور چند اہل خاندان خواتین کے سمجھانے پر خاموش ہو گئے۔

مگر مجھے خوب یاد ہے۔ اپنی کم سنی میں میں بہت مغلوب الطیش تھا اور غصہ کا جب کبھی اظہار کرتا تو میری والدہ کو والد مرحوم طعنہ دیتے اور فرماتے "اور پٹھانی کا دودھ پلاؤ۔ دیکھا پٹھانی کا دودھ پلانے کا یہ نتیجہ ہے۔" میں نے ڈھائی تین ماہ سے زیادہ اپنی پٹھانی کا دودھ نہیں پیا کہ بہت جستجو کے بعد ایک شریف الخاندان سیدانی جن کی لڑکی میری ہم عمر تھی مل گئیں۔ کامل تین سال جن کا دودھ میں نے پیا۔ میری انا ذرا ہکلاتی بھی تھیں۔ میں جب چھ سات سال کا تھا میں ان کے ہکلانے کی نقلیں کرتا اور وہ میری اس مہمل حرکت سے بہت خوش ہو ہو کر میری بلائیں لیتیں۔

میں جب ایک سال کا ہوا تو میری پہلی سالگرہ عظیم آباد میں بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ میری عمر جب سوا سال کی ہوئی تو والد مرحوم مع متعلقین کلکتہ واپس تشریف لے گئے۔ جہاں عرصہ دراز سے اقامت گزیں تھے۔ اس دفعہ ڈھائی سال کے قریب عظیم آباد میں قیام رہا تھا۔

محبت پدری

عظیم آباد سے جب روانہ ہونے لگے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ جس ٹرین میں کلکتہ جانے والے تھے اس کا ایک خانہ ریزروڈ یعنی مخصوص کر لیا گیا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا خانہ تھا۔ اس میں میری والدہ مرحومہ مع مغلانی اور ایک پیش خدمت کے سوار

ہو گئیں۔ میری انا کو بھی چاہیے تھا کہ مجھے لے کر اسی خانہ میں سوار ہو جاتیں مگر وہ مرد ملازموں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار ہو گئیں۔ میرے والد پلیٹ فارم پر ان اشخاص سے باتیں کر رہے تھے جو رخصت کرنے آئے تھے اور اس خیال میں تھے کہ جب سیٹی ہو گی تو مخصوص خانہ میں سوار ہو جائیں گے۔ اتنے میں سیٹی ہو گئی تو والد مرحوم ٹرین میں سوار ہوئے اور اپنے خانہ میں آ کر میری والدہ سے پوچھنے لگے۔ بچہ کہاں ہے؟ انھوں نے کہا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ انا بچہ کو لے کر آپ کے قریب برقع پہنے ٹہل رہی تھی۔ والد مرحوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنے خانہ سے دروازہ کھول کر کود پڑے اور چاروں شانے چت گرے۔ لوگ دوڑے اور حضرت کو اٹھایا اور میری انا نے جو اپنے خانہ میں سے گردن نکالے جھانک رہی تھیں چیخنا شروع کیا۔ سرکار گرے سرکار گرے۔ اللہ نے بڑی خیر کی کہ ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر جا رہی تھی۔ گارڈ نے فوراً ٹرین روکی۔ اس وقت میری انا کو جس کی گود میں تھا تھرڈ کلاس سے اتروا کر اپنے خانہ میں سوار کر کے خود سوار ہوئے۔ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ والد کو میرے ساتھ تعشق کا درجہ تھا۔ بعض اوقات اس واقعہ کا ذکر کر کے لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس بچہ کی خاطر میری جان جانے میں کچھ باقی نہ تھا۔ ان کو اللہ نے بیٹیاں دی تھیں۔ اولاد نرینہ کی بے حد آرزو اور تمنا تھی کہ ان کے گھر میں پیدا ہوا۔

میرے خاندان کے تفصیلی حالات مرحوم مغفور خان بہادر سید علی محمد متخلص بہ شادؔ سابق رئیس عظیم آباد نے "حیات فریاد" میں درج کئے ہیں جو مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڑھ میں ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب میں میرے والد کے ہم عصر امرا و کاملین صوبہ بہار کے حالات اور بھی مفید معلومات نکات شاعری وغیرہ کے متعلق درج ہیں۔ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے۔

والد مرحوم عالم متبحر عربی و فارسی کے تھے۔ فارسی زبان کے شاعر وحید العصر اور مؤرخ تمام بلاد و عالم کے یکتائے دہر تھے آبائی معاش میں ان کے حصہ میں سالانہ چودہ ہزار کی جائداد آئی تھی۔ حضرت نے آٹھ ہزار کی جائداد تحصیلی بی بی عینی اپنی منجھلی بہن کے نام ہبہ نامہ کے ذریعہ سے ہبہ کر دی اور چھ ہزار کی جائداد بذریعہ وقف نامہ کے وقف کر دی۔ مرشدآباد میں جب حضرت والد مرحوم حسب طلب ناظم بنگال مبر ہمایوں جاہ ۱۸۳۲ء میں جبکہ حضرت کا سن شریف اٹھائیس سال کا تھا پہنچے۔ پہلی خدمت مرشد زادوں کی اتالیقی کی دی گئی۔ نظامت کی جانب سے نیابت و سفارت کا عہدہ ملنے پر حضرت کا قیام کلکتہ میں قرار پایا تاکہ نظامت کے پولیٹیکل امور کا تصفیہ گورنر جنرل سے کلکتہ میں کرائیں۔ تین گورنر جنرلوں کے زمانہ تک حضرت اس عہدۂ جلیلہ پر رہے۔ لارڈ ایلن برا کا آخیر زمانہ اور لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کا پورا زمانہ۔ آخرالذکر دو گورنر جنرلوں کے پوتے سنہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء تک وائسرائے ہند تھے۔ زمانۂ اقامت مرشدآباد میں میری والدہ مرحومہ سے حضرت نے شادی کی۔

اخبار کا اجرا

بزمانۂ اقامت کلکتہ حضرت نے اخبار "مہر گیتی نما" سنہ ۱۲۶۲ھ[1] میں نکالنا شروع کیا۔ مشرقی زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جو

---

[1] حیدرآباد دکن سے سب سے پہلا زنانہ پرچہ "النساء" میرے گھر سے میری بی بی (صغرا بیگم ہمایوں) نے سنہ ۱۳۳۸ھ میں نکالا۔ انجمن خواتین دکن بھی قائم کی۔

ہند سے نکلا۔ یہ حضرت کی روشن خیالی کی بڑی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی ترقی علمی و ذہنی کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی تھی اور بھی بہت سے مسلمانوں کی بھلائی و ترقی کے کام حضرت نے کیے۔

بسم اللہ

ہمارے خاندان کے رواج و دستور کے موافق میری تعلیم کا آغاز ساتویں سال ہوا۔ اس وقت تک سوا کھیلنے کودنے کے میرا کوئی اور کام نہ تھا۔ البتہ میری تربیت کا خیال میری والدہ مرحومہ کو تھا جو بہت روشن خیال اور بڑے گھرانے کی خاتون تھیں۔ جب میں تین چار سال کا ہوا اس وقت سے والدہ مرحومہ نے بہت سی مفید باتیں باتوں باتوں میں میرے گوش گزار کرنی شروع کیں۔ مثلاً نشست و برخاست کا طریقہ، بڑوں کا ادب، خوفِ خدا، آدابِ مجلس کے نکات، بڑوں کی، برابر والوں کی اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف یعنی بڑوں سے کیا مراد ہے۔ برابر والا کسے کہتے ہیں چھوٹوں سے کیا غرض ہے۔ ان سب سے مخاطبت کے جدا جدا طریقے بتلایا کرتیں۔ اصولِ دین، فروعِ دین، دوازدہ اماموں کے نام یاد کروائیں۔ والدہ مرحومہ کو زباندانی کا بڑا خیال تھا۔ مذکر و مونث، وحدت و جمعیت کا خیال ہمیشہ ان کو ملحوظ رہتا اور نہایت فصیح اُردو بولتی تھیں اور جب میں چھ سات سال کا بلکہ اس سے بھی کم عمر کا ہوں گا کہ جہاں کوئی لفظ میری زبان سے غلط نکلا تو مجھ کو بتلاتیں کہ یوں نہیں اس کو یوں بولتے ہیں۔ ان کو زباندانی کا اس قدر خیال تھا کہ میرے یہاں کی پروردہ چھوکریاں بھی شستہ اور صاف اُردو بولتی تھیں۔

ساتویں سال میری بسم اللہ خوانی ہوئی۔ یہ تقریب بہت دھوم اور تکلفات سے منائی گئی۔ تمام احباب کو زنانہ اور مردانے میں پندرہ بیس روز پیشتر سے تورے تقسیم کیے جا رہے تھے۔ توروں میں ایک ندرت یہ کی گئی تھی کہ مختلف اقسام کے لڈو، مونگ، موتی چور، بُندیا، چلغوزہ، بادام، بھونے چنے اور نہ معلوم کن کن چیزوں کے بڑے بڑے لڈو بنوائے گئے تھے۔ ان لڈوؤں کے بنانے کے لیے مٹیا برج سے لکھنؤ کے دو رکابدار بلوائے گئے تھے۔ جن میں ایک شاہی رکابدار مرزا منے نامی تھا۔

بروز بسم اللہ خوانی گانا بجانا بھی تھا۔ کئی مشہور طوائف کروٹولے سے جہاں ان کا مخزن ہے بلوائی گئی تھیں۔ زنانہ میں لکھنؤ کی ڈومنیاں یعنی میراثنیں جو عید اور بقر عید کی تقریبوں میں بھی ہمیشہ مبارکباد دینے اور انعام لینے آیا کرتی تھیں۔ بلوائی گئی تھیں۔ مردانے میں والد مرحوم کے احباب آئے تھے۔ بسم اللہ خوانی کی رسم مردانہ میں ادا کی گئی۔ دوات قلم اور تختی چاندی کی بنوائی گئی تھی۔ ہمارے ہاں ایک قاری صاحب اکثر آیا کرتے تھے انھوں نے یہ رسم ادا کی۔ نقرئی چیزیں انھیں کی نذر کی گئیں اور ایک کشتی میں ایک شال چادر اور کچھ روپے بھی دیے گئے۔ باریک باریک سونے چاندی کے پھول بنائے گئے تھے جو مجھ پر اڑائے گئے یعنی نچھاور کیے گئے اور ملازمین نے لوٹے۔ دوسرے دن سے میں پڑھنے بٹھایا گیا۔ ابتدا کلام مجید سے کی۔ میں پڑھنے سے عرصہ دراز تک جی چراتا رہا۔ کئی استاد بدلے گئے۔ جو معلم مقرر کیا جاتا۔ وہ شب و روز گھر ہی پر رہتا مگر صبح کو ڈیڑھ دو گھنٹہ میں کتاب کھول کر اس کے پاس بیٹھتا اور کچا پکا کچھ یاد کر لیتا۔ حافظہ بہت تیز اور قوی تھا ذرا سی توجہ سے سبق یاد ہو جاتا مگر توجہ کون کرتا۔ دل سارا دن کھیل میں رہتا۔ مختصر یہ کہ تعلیم کی رفتار والدہ مرحومہ کی حیات تک اور کچھ دنوں بعد بھی بہت سست رہی۔

والدہ کا انتقال

مجھے جب دسواں سال ختم ہونے کو تھا کہ داعی اجل کو میری والدہ نے لبیک کہا۔ دو سال کی پڑھائی جو برائے نام تھی اس میں کلام مجید ختم کیا۔ کریما، مامقیماں کے بعد حمد فارسی تہذیب النفوس یہ سب فارسی کی کتابیں ختم کیں۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد بھی ڈیڑھ دو سال تعلیم میں بہت نرمی برتی گئی۔ وہ اس خیال سے کہ والدہ کی وفات کا صدمہ مجھے بہت تھا میں بھڑک نہ جاؤں۔ کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں کی جاتی اور طرح طرح کے اسباب و سامان میری دل بہلائی و دلچسپی کے لیے پیدا کیے جاتے۔

میری والدہ کے انتقال پرملال کا صدمہ والد مرحوم کو بھی بے غایت ہوا۔ کلکتہ کی اقامت ان کو دوبھر ہو گئی۔ بہت سے ان کے قدیم دوستوں نے بھی راہ عدم اختیار کر لی تھی۔ وہ اصحاب جن سے ان کی دل بستگی ہوتی تھی۔ وہ بھی جب نہ رہے تو والد بہت شکستہ خاطر و مغموم رہنے لگے۔ یہ خیال کر کے کہ آخیر زمانہ اپنے وطن اور عزیزوں میں گزار دینا چاہیے۔ والد مرحوم نے جہاں اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے صرف کیے ہمیشہ کے لیے کلکتہ کو خدا حافظ کہا اور عظیم آباد پٹنہ آ گئے۔

اسکول میں داخلہ

پٹنہ کے پہلے معلم نے آمدنامہ شروع کرایا اور رقعات عالمگیری فارسی میں میزان عربی پڑھانے لگے۔ یہ مولوی صاحب زیادہ دن نہیں رہے۔ دوسرے استاد رکھے گئے۔ یہ بہت دنوں رہے۔ ان کا نام مولوی الٰہی بخش تھا۔ یہ خود بھی والد مرحوم سے عربی تھوڑی دیر پڑھتے تھے اور مجھ کو بھی فارسی عربی کا درس دیتے تھے۔ انھوں نے میزان الصرف ختم کرائی۔ منشعب و تصریف وغیرہ پڑھائی۔ صرف کے ساتھ ادب بھی شروع کرائی۔ ہدایۃ الادب و علم الادب انھوں نے ختم کرایا۔ فارسی میں انوار سہیلی۔ انشائے بے نظیر وغیرہ بھی انھیں مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ اسی زمانہ میں میں سٹی اسکول میں داخل ہوا۔ اسکول جانے کے لیے ایک ٹٹو یعنی یابو خرید لیا گیا تھا۔ میں پون گھنٹہ میں اسکول پہنچ جاتا تھا۔ میرا مکان گذری معصوم خاں میں تھا اور سٹی اسکول اس وقت گلزار باغ میں دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ بہرحال چار بجے اسکول بند ہوتا۔ ساڑھے چار کے قریب مکان پر پہنچتا۔ رفتہ رفتہ کبوتروں اور کنکووں کا شوق کم ہوتا گیا۔ چند دنوں کے بعد بالکل غائب ہو گیا۔ کرکٹ کا شوق پیدا ہوا۔

والد کی رحلت

میں اپنی جماعت میں ہمیشہ فرسٹ یا سیکنڈ رہتا۔ سالانہ امتحانات میں فرسٹ آتا۔ دو سال متواتر ڈبل پروموشن اور انعامات مجھ کو ملے۔ والد مرحوم بہت خوش ہوتے۔ اس واقعہ کے غالباً ایک سال کے بعد والد مرحوم نے بعارضہ فالج انتقال فرمایا۔ میری تعلیم میری نانی صاحبہ کی سرپرستی میں جاری رہی۔ سیکنڈ کلاس تک پٹنہ گورنمنٹ سٹی اسکول میں تعلیم پائی۔ سیکنڈ لینگویج عربی لی تھی۔ اس کے بعد پٹنہ ٹریننگ اکاڈمی کے انٹرنس (میٹرک) میں داخل ہو کر وہاں سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اسی زمانہ میں جبکہ انٹرنس میں تعلیم پا رہا تھا، پٹنہ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن کی بنا میں نے ڈالی۔ جس کے اراکین سب کے سب امیر زادے تھے۔ میں سکریٹری منتخب ہوا۔ ہر اتوار کو انگریزی میں کوئی مضمون پڑھا جاتا اور تمام مباحث انگریزی میں ہوتے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی میں تقریر کرنے کی مہارت پیدا ہو۔

پٹنہ ہائی اسکول کی بُنیاد

جب انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں ایف اے میں آیا تو چند ماہ فرسٹ ایر میں پڑھنے کے بعد پھر علیل ہوا اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ چند دنوں دماغی محنت نہ کروں اور آرام کروں۔ زمانۂ بیکاری میں بمشورہ برادر زادہ سید احمد علی خاں بعد کو مخاطب بہ خان بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ ڈپٹی کلکٹر وغیرہ پٹنہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کی کلاسوں کی فیس بمقابلہ اور اسکولوں کے بہت کم رکھی گئی اور غیر مستطیع طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی۔ جب یہ انتظام کر چکا تو سرکار میں درخواست کی۔ ڈاکٹر مارٹن ال۔ ال۔ ڈی سے جو اس وقت سرکل انسپکٹر تھے، اسکول کا معائنہ کرایا۔ انھوں نے انسپکشن بک یعنی کتاب الرائے میں میری بڑی تعریف لکھی کہ اعزازی منیجر سید ہمایوں مرزا نے باوجود کمسن ہونے کے اسکول کا انتظام بہت اچھا رکھا ہے اور یہی اسکول کی جان ہیں۔ دو سو روپیہ ماہانہ سرکار سے دینا منظور کیا۔

اب تو میری خوشی و اطمینان قلبی کی انتہا نہ تھی۔ کئی بی اے مدرس رکھے۔ پنڈت جی کی تنخواہ بڑھا دی اور مولوی جی کو برقرار رکھا۔ ہیڈ ماسٹر مسٹر ڈن ایک انگریز مقرر کیا۔ یہ پہلے بہار نیشنل اسکول میں جس کو چند ہندوؤں نے تجارتی غرض سے قائم کیا تھا ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے اور وہاں ان کا طریقہ تعلیم دینے کا بہت پسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔ جب مسٹر ڈن میرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے تو بہت سے لڑکے اسکول میں داخل ہوئے خصوصاً انٹرنس کلاس میں۔

انگلستان کو روانگی

اسی سال میرے انگلستان جانے کا انتظام ہو گیا اور اسکول کا انتظام اپنے برادر زادہ سید علی احمد علی خاں کے سپرد کیا۔ میرے یورپ جانے کے تقریباً سال بھر کے بعد مسٹر ڈن سے اور احمد علی خاں سے ان بن ہو گئی۔ ڈن علیحدہ کر دیے گئے اور مسٹر ان گپتا ایم اے کا جو تعلیم دینے کا اچھا تجربہ و صلاحیت رکھتے ہیں، بنگال کے کسی ضلع کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کر چکے ہیں، بمشورہ سید احمد علی خاں صاحب تقرر کر لیا گیا۔

انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے مڈل ٹمپل میں داخل ہوا۔ چند دنوں کے بعد میں کیمبرج بغرض تعلیم یونیورسٹی گیا اور چند دن قیام کیا۔ کسی کالج میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ میں نے کچھ دن انتظار کیا۔ پھر میں علیل ہو گیا۔ علالت کا سلسلہ بہت دنوں تک رہا۔ ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا کہ کیمبرج بارشی مقام ہے یعنی دلدل ہے۔ بعض طبائع سے موافقت نہیں کرتا خصوصاً بلغمی مزاج والوں کی۔ اس لیے بہتر ہے کہ کیمبرج سے چلے جاؤ۔ وہاں سے میں لندن میں واپس آ گیا اور

کنگس کالج میں فرے اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوا اور وہاں میں نے اکنامکس (معاشرت) لیا۔ یہ حالات ۱۸۹۱ء کے ہیں۔

لندن میں انجمن اسلام

۱۸۸۶ء میں خدا غریق رحمت کرے سید علی امام (بعد کو سر وغیرہ) اور میاں شاہ دین (بعد کو چیف کورٹ پنجاب کے جج) سید کرامت حسین (بعد کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج) حسن امام مرحوم جج کلکتہ ہائی کورٹ۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم اور دو تین طلباء نے لندن میں ایک انجمن موسوم بہ انجمن اسلام لندن قائم کی تھی۔ خیالات کی اصلاح، زبانی تقریر کرنے کی عادت و صلاحیت پیدا کرنی، آپس میں اتحاد پیدا کرنا اور مفاد اسلام کی حفاظت وغیرہ مقاصد اس انجمن کے تھے۔ مگر سید کرامت حسین مرحوم اور سر علی امام کے واپس آنے کے بعد ممبران نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں یہ حضرات ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ شفیع مرحوم، حسن امام مرحوم وغیرہ وہیں تھے مگر انجمن کے جلسے وغیرہ کم ہو رہے تھے۔ میں ۱۸۹۰ء کے اپریل میں لندن پہنچا۔ چند ماہ کے بعد انجمن کا ممبر بنایا گیا۔ میں نے بہت دلچسپی لینی شروع کی۔ میں نے اس انجمن میں تازہ روح پھونکی اور جو نیا طالب علم لندن آتا اس کو گھیر کر انجمن کے جلسوں میں لاتا اور ممبر بناتا۔ جب تک میرا قیام انگلستان میں رہا برابر انجمن کے کاروبار میں امداد دیتا رہا۔ ایک سال سیکرٹری کی خدمت پر رہا۔ دوسرے سال نائب صدر انجمن تیسرے سال صدر انجمن باتفاق آرا منتخب ہوا۔ میرے زمانۂ قیام انگلستان میں جو لوگ وقتاً فوقتاً اس کے ممبر رہے ان کے نام جہاں تک مجھے یاد ہیں یہ ہیں:

ارادت اللہ خاں ساکن چاٹگام بنگالہ۔ ظہیر الدین احمد مرحوم بہاری۔ سید حسن امام مرحوم بہاری۔ میاں محمد شفیع مرحوم (بعد کو سر وغیرہ) پنجابی۔ نواب علی حسن خاں قزلباش پنجابی۔ محمد اسماعیل خاں مرحوم میرٹھی۔ ڈاکٹر عبدالغنی پنجابی جن کو نصر اللہ خاں خلف امیر عبدالرحمٰن خاں سابق والی افغانستان اپنے ہمراہ لندن سے کابل لائے تھے۔ وہاں بڑی خدمتیں وغیرہ ملیں۔ پھر قید کئے گئے۔ علی محمد خاں دہلوی۔ (حال سر پریسیڈنٹ لیجسلیٹو کونسل بمبئی) رفیع الدین احمد (حال سر سابق وزیر تعلیم بمبئی) احمد علی حسین علی مرحوم (بعد کو آئی سی ایس ہو کر پنشن لینے سے قبل علی گڑھ کے سیشن جج تھے) سید محمد یونس مرحوم ساکن بنگالہ۔ شیخ اصغر علی پنجابی (بعد کو آئی۔ سی۔ ایس) ۱۹۲۳ء میں آخیر دفعہ لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کہیں کمشنر تھے۔ سید شاہ عبدالمجید بعد کو گورنمنٹ پراسیکیوٹر علی گڑھ مقرر ہوئے۔ ضیاء الحق ہندوستان کے کسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی میں نے اپنے زمانہ میں طریقہ نکالا تھا کہ عید بقر عید کی نماز پڑھنے ووکنگ کی مسجد میں مسلمان جمع ہوں۔ ممبران انجمن کے علاوہ جس قدر مسلمان لندن، کیمبرج، اوکسفورڈ میں زیر تعلیم ہوتے سب انجمن کی طرف سے مدعو کئے جاتے اور جن لوگوں کو ہندوستانی کھانا پکانا آتا، ایک دن پیشتر سے وہ حضرات جاتے اور مال مصالحہ وغیرہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ بروز عید صبح ہی سے پلاؤ قورمہ پکانے کا انتظام کیا جاتا۔ بعض دفعہ شامی کباب بھی بنائے جاتے۔ پکانے والوں میں غیر ممبر بھی شریک ہو جاتے یا یہ کہ ممبروں میں سے کسی کو ہنر نہ آتا تو غیر ممبر مسلمان جو خاصہ پزی سے کچھ واقف ہوتے، ان سے کھانا پکوایا جاتا۔ ایک دفعہ ایسے لوگوں نے ذمہ پکانے کا لیا جو بالکل اناڑی تھے۔ کچے چاول اور قورمہ کا گوشت کچا اور قورمہ میں خوب ہی نمک ڈال دیا۔ اس روز سب کے سب بھوکے رہے۔ پکانے والوں کی جانوں کو دعا دیتے رہے۔ امانت کے لیے

ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ایک عید میں ٹرکش ایمبیسی (سفارت خانہ ترکی) میں جو امام صاحب رہتے۔ ان کو لاکر امامت کرواتے۔ دوسری عید میں پرشین لیگیشن (سفارت خانہ ایران) سے پیش امام صاحب کو لاتے اور امامت کراتے۔ حضرات اہل السنت اور حضرات اثنا عشری دونوں مذہب کے لوگ ان اماموں کے پیچھے نماز عیدین کی پڑھتے۔ کوئی ہاتھ باندھ کر اور کوئی ہاتھ کھول کر پڑھتا۔

ووکنگ مسجد

ڈاکٹر لائٹنر جو کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں سے اپنے تئیں مسلمان بتلا کر چندہ لیا خصوصاً شاہ جہان بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال سے خوب پیٹ بھر کر لیا اور مختصر سی مسجد ووکنگ میں بنائی اور مسجد کے متصل اپنا عالی شان قصر بنایا۔ اس میں ایک میوزیم بھی قائم کیا۔ یہ حضرت اصل میں یہودی تھے۔ عیدین میں جو لوگ نماز پڑھنے آتے۔ ان کو تیسرے پہر کی دعوت دیتے اور اپنے تئیں مسلمان بیان کرتے۔

مسجد ذاتی ملکیت

۱۸۹۲ء کا ذکر ہے کہ بنگال کے ایک طالب علم سلیم نامی نے انتقال کیا۔ ہم چند مسلمانوں نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور ان کی لاش ووکنگ میں بغرض تدفین لائے۔ اس خیال سے کہ مسجد کے صحن میں ان کو مدفون کریں گے۔ جب ہم لوگ جنازہ لے کر وہاں پہنچے تو لائٹنر LIGHTNER کو معلوم ہو گیا اور چند آدمی بھیج کر مزاحمت کی اور کہا کہ یہ ملک میری ہے۔ مجھے اختیار کلی ہے کہ لاش دفن ہونے دوں یا نہ ہونے دوں۔ کچھ دیر تک تُو تُو میں میں ہوتی رہی۔ پھر اس نے پولیس کو بلایا کہ نقص امن کا اندیشہ ہے۔ ان کالے آدمیوں کو یہاں سے نکال دو۔ اگر کوئی دعویٰ ان کو ہے تو عدالت سے تصفیہ کرائیں۔ یہ انوکھا بیان کہ مسجد میری ذاتی ملک ہے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ بہر حال ہم لوگ جنازہ واپس لائے اور وورپول لے گئے۔ وہاں ایک قبرستان ترکی گورنمنٹ کا ہے۔ وہاں سلیم مرحوم کو دفن کیا۔ میں اس زمانہ میں انجمن اسلام لندن کا سکرٹری تھا۔ میں نے مراسلہ ڈاکٹر لیٹنر کو لکھا کہ مسجد کو خانگی ملک کیسے بتلایا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے روپیہ سے مسجد بنی ہے۔ اس میں ایک اور صاحب نے جو میرے دوست تھے کچھ مدد دی ہے۔ جواباً اس کو لکھا کہ یہ مسجد مسلمانوں کے چندہ سے بنی ہے۔ مہربانی کر کے اپنے دوست کا نام بتلائیے۔ مگر اس نے اس کا جواب نہیں دیا۔

یہ سراسر غلطی ہم مسلمانوں کی تھی کہ ایک اجنبی شخص پر اعتبار کر کے ہزاروں روپے دے دیئے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت اور وثیقہ اس کا نہیں تھا کہ کس کس نے چندہ دیا تھا۔ مگر یہ امر یقینی اور محقق تھا کہ انڈیا کے مسلمانوں سے خصوصاً بھوپال سے اس بہانہ سے بہت روپیہ لیا۔ کسی سے سنا تھا کہ ایک لاکھ کے قریب بھوپال سے لیا تھا۔ بھوپال کی ریاست کو ایک مراسلہ انجمن کی طرف سے لکھ کر حقیقت دریافت کی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر خاموش ہو جانا پڑا۔

جب خواجہ کمال الدین مرحوم ۱۹۱۳ء میں بغرض تبلیغ لندن گئے تو سید امیر علی صاحب مرحوم کی اور وزیر ہند کی امداد سے ڈاکٹر لیٹنر کے بیٹے کے قبضے سے یہ مسجد نکالی اور ایک مکان جو مسجد کے متعلق تھا جس کو لائٹنر کے بیٹے نے گرو کر دیا تھا اس کو چھڑایا۔ انجمن کی جانب سے میلاد النبی کی تقریب میں ڈنر دیا جانا میرے زمانہ میں قرار پایا۔ چنانچہ پہلا ڈنر ماہ نومبر ۱۸۹۲ء ہوبرن رسٹراں میں بڑے پیمانہ پر ترتیب دیا گیا۔ علاوہ ممبران کے غیر ممبروں سے بھی شرکت کے لیے کہا گیا اور اُنھوں نے منظور کیا۔ کھانے کا فی کس پانچ شلنگ چندہ قرار پایا۔ ممبران سے فی کس چھ شلنگ لیا گیا۔ وہ اس لیے کہ بعض اشخاص کو انجمن کا مہمان بنایا گیا۔ کھانے کی رقم اسی روپیہ میں سے نکالی گئی۔ مہمان کی حیثیت سے ٹرکی کے سفارت خانہ اور ایران کے سفارت خانہ کے اعلیٰ عہدہ دار مدعو کیے گئے۔ سید امیر علی صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے رخصت پر لندن آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے صدارت کے لیے کہا۔ اُنھوں نے منظور کیا۔ یہ سب انتظام بحیثیت سکرٹری کے مجھ کو کرنا پڑا۔ امیر علی صاحب نے کھانا ختم ہونے پر ملکہ وکٹوریہ اور خاندانِ شاہی کے جام صحت کی تحریک کی۔ مسٹر ظہیر نے "انڈیا دی لینڈ وی لیو ان" (INDIA THE LAND WE LIVE IN.) اور حسن علی مرحوم نے انجمن کا ٹوسٹ پروپوز کیا اور میرا نام پیش کیا۔ میں نے بحیثیت سیکرٹری انجمن کی جانب سے جواب دیا۔

اشتعال انگیز ڈرامہ

انجمن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ہال کن (HALLCOIN) مشہور ناول نویس نے ایک ڈرامہ پیغمبر خدا محمد مصطفےٰ کے متعلق بنایا تھا جس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں تھیں اور بڑے شہوت پرست تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مونٹنگ (MOUNTING) تک ہو گئی ہے۔ مونٹنگ کے معنی یہ ہیں کہ پردے سینریز اکسریز لوازمات ایکٹروں کے ڈریسز اقسام کے سب تیار ہو چکے ہیں۔ امروز فردا میں کھیل شروع ہو گا۔ اس وقت اخباروں میں یہ خبر شائع کی گئی۔ یہ خبر پڑھتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے اور چند مسلمان احباب سے اس کا ذکر کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ان دنوں امیر علی صاحب لندن آئے ہوئے ہیں اور تم سے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ تم ان سے جا کر ملو اور مشورہ کرو کہ کیا کرنا چاہیے۔

بہرحال میں اسی روز تیسرے پہر کو امیر علی صاحب مرحوم سے ملا اور اُنھوں نے کہا کہ انجمن کی جانب سے وزیر ہند کے پرائیویٹ سکرٹری کو لکھو کہ منجانب انجمن اسلام لندن ایک وفد وزیر ہند کے پاس آنا چاہتا ہے اور میرا نام لکھو کہ فلاں صاحب اس کے اسپوکسمن ہوں گے یعنی فلاں کی سرکردگی میں وفد آئے گا۔ فلاں معاملے کے متعلق گفتگو کرے گا۔ وقت اور مقام سے اطلاع دی جائے اور مجھ سے فرمایا کہ دو آدمی اپنی انجمن سے لے لو۔ ایک پریسیڈنٹ اور ایک سیکرٹری۔ میں نے کہا کہ سیکرٹری تو میں خود ہوں اور پریسیڈنٹ اس سال سید ظہیر الدین احمد بی اے ہیں۔ لائق آدمی ہیں اور قصبہ بہار کے زمیندار ہیں۔ امیر علی صاحب نے فرمایا۔ بہتر ان کو بھی ساتھ رکھ لیں گے۔ خط کا مسودہ ابھی کر لو۔ چنانچہ جیسا اُنھوں نے فرمایا۔ میں نے مسودہ لکھ لیا اور انجمن کے دفتری کاغذ پر لکھ کر شام کو روانہ کر دیا۔

چوتھے دن جواب آیا۔ میں اسی وقت جواب لیتا ہوا امیر علی صاحب کے پاس گیا۔ اس کی اطلاع میں نے سید ظہیرالدین کو بھی دے دی تھی۔ اسی اثنا میں امیر علی صاحب نے ایرانی لیگیشن کے منسٹر جنرل پرنس مرزا محمد علی خاں اور ٹرکش امبیسیڈر رستم پاشا سے مل کر ان سے کہا کہ اپنے اپنے ملک کی جانب سے احتجاجی مراسلے وزیر خارجہ کو بھیجیے اور لکھیے کہ ایران و ترکی سے ہدایت آئی ہے۔ بیلکم پاتا قوم کے ادیعین اور مذہب کے عیسائی تھے۔ امیر علی صاحب نے جنرل مرزا محمد علی خاں مرحوم سے بذریعہ ایک فارسی خط کے میرا تعارف بھی اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد کرایا تھا اور میں نے جنرل مرحوم کو اپنے والد کی مثنوی دبستان اخلاق کی ایک کاپی دی تھی جس کو پڑھ کر وہ بہت محظوظ و خوش ہوئے اور پہلے چائے کی دعوت مجھ کو دی پھر کھانے کی دعوت دی۔ عمدہ سے عمدہ اقسام کے ایرانی کھانے کھلائے۔ جب تک میں لندن میں رہا۔ گاہے ماہے جنرل مرحوم سے ملتا رہا۔ امیر علی صاحب کو فارسی زبان سے اُنس تھا اور بڑی تیزی سے فارسی بولتے تھے۔

بہر حال وزیر ہند کی جانب سے جو جواب بنام سیکرٹری انجمن اسلام لندن یعنی میرے نام آیا تھا اس میں جو تاریخ و وقت و مقام وفد سے ملنے کا مقرر کیا گیا تھا۔ ہمارا وفد مقررہ پر انڈیا آفس پہنچا۔ بہت ہی خوش خلقی سے سیکرٹری آف اسٹیٹ (وزیر ہند) ملے اس وقت وزیر ہند لارڈ کراس تھے اور انڈیا سیکرٹری مسٹر کرزن (بعد کو لارڈ اور وائسرائے ہند ہوئے)

امیر علی صاحب کی قابلیت کا کیا کہنا۔ برسوں نہایت قابلیت سے کلکتہ میں بیرسٹری کرنے کے بعد جج ہوئے تھے۔ لارڈ کراس کے سامنے ان کے پولیٹیکل اے ڈی سی اور پرسنل اسسٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے جونہی کمرہ میں قدم رکھا سب کھڑے ہو گئے۔ امیر علی صاحب سے وزیر ہند پہلے سے واقف تھے۔ پہلے ان سے ہاتھ ملایا۔ امیر علی صاحب نے ظہیر کا اور میرا تعارف کرایا پھر سب سے یکے بعد دیگرے مصافحہ ہوا۔ امیر علی صاحب نے ہماری انجمن کے متعلق بھی خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس کی اہمیت بتائی اور کہا کہ بڑے بڑے اشخاص مختلف اقطاع ہند کے اس کے ممبر ہیں۔ اس انجمن کے لندن میں قیام کا مقصد مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہے۔ برطانیہ عظمیٰ دنیا میں سب سے بڑی مسلم گورنمنٹ ہے جس کے تحت سات آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ فخر نہ ترکی کو حاصل ہے نہ ایران کو۔ ہر گورنمنٹ کا فرض ہے کہ رعایا کو خوش رکھے۔ برطانیہ عظمیٰ کو چاہیے کہ مسلمان رعایا کی خوشنودی و رضامندی کا بدل و جان خیال رکھے۔ صرف یہی نہیں کہ مسئلہ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کے لیے باعث اشتعال طبع ہو گا بلکہ جو دوستانہ تعلقات ترکی و ایران وغیرہ سے قائم ہیں وہ باقی نہ رہیں گے اور نہ معلوم اس کے عواقب کیا کیا ہوں گے ——— اور بہت سی باتیں کہیں جو یاد نہیں۔ وزیر ہند خاموش سب سنتے رہے اور جب ہم لوگوں کے اٹھنے کا وقت آیا تو وزیر ہند نے دو چار لفظ کہے۔ ہم لوگوں کی زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ امداد اس خصوص میں مجھ سے ہو سکے گی۔ میں دریغ نہ کروں گا۔ جس کا شکریہ امیر علی صاحب نے ادا کیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر جب گاڑی میں سوار ہوئے۔ امیر علی صاحب کا چہرہ بہت بشاش تھا یوں تو فطرتاً ان کا چہرہ مائل بہ مسکراہٹ ہمیشہ رہتا تھا مگر اس موقع پر وہ مسکراہٹ بہت نمایاں تھی۔ تھوڑی دور گاڑی جب جا چکی تو ظہیر سے مخاطب ہو کر امیر علی صاحب نے فرمایا۔ مسٹر ظہیر وزیر ہند پر میری تقریر کا کچھ اثر ہوا۔ ہم دونوں بیک زبان بولے۔ بہت کچھ اثر ہوا۔ آپ کی تقریر اس قدر مدلل اور معقول تھی۔ جس کا جواب وہ کیا دیتے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ امیر علی صاحب نے فرمایا۔ مجھے یقین ہے

خدا نے چاہا تو اب یہ منحوس قرار نہیں ہوگا۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ چند دنوں کے بعد اخباروں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ گورنمنٹ نے خاص مصالح کی بنا پر "محمد دی عربین پرافٹ" والا ڈرامہ اسٹیج ہونے سے روک دیا۔ جس کی بڑی خوشی ہم لوگوں کو ہوئی اور انجمن کی جانب سے گورنمنٹ کے شکریے کا اعلان دو اخباروں ڈیلی ٹیلی گراف اور لندن کرانیکل میں شائع کیا گیا اور انجمن کے ممبروں میں سے ارادت اللہ سید ظہیر الدین سید امیر علی صاحب کے ہاں گئے اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

تعلیم کا حال

میں نے انٹرمیڈیٹ اگزام ۱۸۹۳ء کے پہلے ٹرم میں پاس کر لیا تھا۔ ۱۸۹۳ء کے دوسرے ٹرم میں فائنل یعنی خاتمہ کا امتحان دیا۔ تیرہ چودہ مضامین تھے۔ سب کو یکدفعہ پاس کیا۔ ورنہ ہوتا یہ بھی ہے کہ دو چار مضامین کسی ٹرم میں اور دو چار کسی ٹرم میں لوگ پاس کرتے ہیں۔ فائنل امتحان کو جب دو ڈھائی مہینے رہ گئے تو میں سخت علیل ہو گیا۔ مطالعہ ناممکن ہو گیا۔ کبھی دو دن کبھی تین دن کے بعد ملیریا کا بخار آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ رہا۔ جب بخار سے نجات ملی تو میں بہت کمزور و ناتواں ہو گیا تھا۔ میرے اُستادوں نے کہا کہ اس ٹرم میں تم امتحان میں نہ بیٹھو کیونکہ امتحان کو ڈیڑھ دو ماہ کا قلیل عرصہ رہ گیا ہے۔ گو تم نے سب کتابیں ختم کر دی ہیں مگر سب مضامین کو دوبارہ دیکھ جانا ضروری ہے۔ مدت کافی نہیں۔ میں نے استادوں کی شفقت آمیز رائے سُن کر کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ لیکن میں نے ان کی اطلاع کے بغیر شرکت کی درخواست دے کر فیس مقررہ داخل کر دی اور شبانہ روز مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ حوائج ضروری اور کھانے کے وقت میں جو کچھ وقفہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جو وقت بچتا وہ سب پڑھنے میں صرف کرتا۔ راتوں کو چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتا۔ دوستوں سے ملنا ملانا یک قلم موقوف کر دیا۔ خدائے لم یزل نے مجھے قوتِ حافظہ غیر معمولی دی تھی۔ دو مہینے میں کُل مضامین پر حاوی ہو گیا۔ اگر دیکھا جائے تو بالکل غیر متوقع و غیر معمولی امر ہے۔ غرض امتحان میں جا کر بیٹھا۔ سوالات کے پرچے جب سامنے آتے اور ان پر نظر دوڑاتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کے جوابات دے سکوں گا۔ روزانہ دو پرچے ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں امتحان ختم ہو گیا۔ آخری امتحان جس روز دے کر آیا تو مجھے شدت سے بخار آیا۔

انہی دنوں ایک صبح کو جونہی بیدار ہوا کہ خواب گاہ کے کمرہ کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا کون۔ مسز کالنس نے کہا۔ میں ہوں مسٹر مرزا۔ یہ کہہ کر دروازہ کا باہر کا کھٹکا کھول کر باہر سے ہاتھ بڑھا کر اس دن کا ٹائمس مجھ کو دے کر کہا۔ مبارک ہو۔ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے اپنی محنت و جانفشانی کا پھل پا لیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔ اخبار پڑھنا شروع کیا۔ اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ جسم میں یک بیک تھوڑی طاقت آگئی۔ ۱۸۹۳ء کے جون میں ٹرم کال ہوا۔ بیرسٹری کی تکمیل ہو گئی۔

انگلستان سے واپسی

اوائل نومبر میں انگلستان کو خدا حافظ کہنے والا تھا۔ ہمارے دوستوں کی جانب سے وداعی ڈنر دیا گیا۔

خاص خاص دوستوں نے بھی اپنے مکانوں اور بعض نے ہوٹلوں میں دعوتیں دیں۔ بعض انگریز دوستوں نے تحفے بھی دیئے اور ایک ڈنر بہت بڑے پیمانے پر مختلف صوبوں کے رہنے والے چند مسلمان پارسی دوستوں نے چندہ کرکے مجھ کو دیا۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے میری ٹرین ڈوور آئی۔ بذریعہ اسٹیمر انگلش چینل عبور کرکے فرانس کی بندرگاہ میں اترے۔ خوش قسمتی سے اس روز انگلش چینل مطلق متموج و متلاطم نہ تھا۔ اس لیے نصف گھنٹہ میں اس پار سے اُس پار پہنچ گئے۔ جب میں کیلے پہنچا تو ٹامس کک اینڈ سنز ایجنسی کا ایک ملازم ملا جس نے مجھے پیرس جانے والی ٹرین میں باآسائش بٹھایا۔ پیرس میں بارہ دن رہا۔ وہیں سے جاکر وارسیلیز (وارسائے) وغیرہ دیکھ آئے۔ پیرس کا ایفل ٹاور، نپولین کی قبر، تریز گارڈنس، نیشنل آرٹ گیلری وغیرہ دیکھی۔ پیرس سے مارسیلیس (مارسائی) آیا۔

جہاز کی روانگی میں جو انڈیا آنے والا تھا تین دن باقی تھے۔ دو دن پھر پھرا کر مارسائی کو اچھی طرح دیکھ لیا جس جہاز پر انڈیا آئے۔ اس کا نام شینین تھا۔ یہ جہاز بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے بہت ہلتا ڈولتا تھا۔ جہاز نے قریب شام لنگر اٹھایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے قریب تو خلیج لیون ساکت ملا۔ اس کے بعد سے طوفانی سمندر کا سامنا ہوا اور طوفان بھی وہ قیامت خیز کہ پناہ بخدا۔ میرے سوا اس جہاز پر اور دو ہندی تھے۔ ایک پارسی مسٹر راس بہاری گھوش بعد کو ڈاکٹر اور سر ہوئے۔ یہ کلکتہ ہائی کورٹ کے بہت مشہور اور ممتاز وکیلوں میں تھے۔ انھوں نے بے حد دولت حاصل کی تھی۔ تیرہ لاکھ روپیہ اپنی زندگی میں خیراتی مدوں میں دیئے اور تقریباً اسی قدر روپے بذریعہ وصیت نامہ کے تعلیمی امور کے لیے دے گئے۔

بمبئی بخیر و خوبی خدا نے ماہ نومبر ۱۸۹۴ء میں پہنچا دیا۔ وہاں سے رخصت ہو کر تیسرے دن سر مغرب ٹرین منزل مقصود پٹنہ اسٹیشن پہنچی۔ پلیٹ فارم پر ایک دریا انسانوں کا تھا۔ بہت سے لوگ تلے اوپر میرے خانے میں گھسے جہاں پہلے ہی بہت سے عزیز و احباب بیٹھے تھے۔ بمشکل میں باہر نکلا۔ ہر شخص چاہتا تھا مجھے گلے لگائے۔ چار پانچ آدمیوں نے مجھے حلقہ میں لے لیا ورنہ نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا۔

میرے عزیزوں اور دوستوں کا پہلے یہ مشورہ ہوا کہ میں پٹنہ ہی میں وکالت شروع کروں اور بعض کا خیال ہوا کہ میں کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کروں۔ آخر میں سب لوگ اسی پر متفق ہوئے اور جنوری ۱۸۹۵ء میں بحیثیت ایڈووکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ میں میں نے پریکٹس یعنی وکالت شروع کی۔

احساسِ تنہائی

انگلستان سے واپسی کے بعد اپنے وطن پٹنہ میں میرا قیام چند روزہ ہوا۔ دو ہفتہ کے قریب رہا۔ اس قلیل عرصہ میں بہت سی جگہ سے میری نسبتیں آئیں۔ اسی طرح کلکتہ میں چند نامی لوگوں نے نسبتیں مسٹر ابوالحسن خاں جج عدالت خفیفہ کے ذریعے بھیجی تھیں۔ میں نے برابر انکار کیا۔ اس میں کلام نہیں کہ بڑے بڑے دولت مندوں اور اعلیٰ عہدہ داروں نامی وکلاء کے ہاں سے میری بات آئی مگر کوئی نہ کوئی شق ضرور ہوتی اور میں بعد تحقیقات کوئی لم نکالتا اور میں پیچ نکالتا تھا۔ اس ادھیڑبن میں زندگی

کشش اور وبالِ جان ہو گئی۔ اسی اثنا میں پٹنہ سے ایک تار سید احمد رضا صاحب حیدر آباد کے ہائی کورٹ کے جج کا آیا۔ مضمون آیا کہ گرمیوں کی تعطیل میں حیدر آباد سے پٹنہ آیا ہوں۔ جب سے تم انگلستان سے واپس آئے ہو، میں نے تمھیں دیکھا نہیں۔ یہ موقع غنیمت ہے۔ اگر ممکن ہو تو ہفتہ عشرہ کے لیے پٹنہ آجاؤ۔ بات جو ہونے والی ہوتی ہے، اس کے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت میں کیونکر سمجھ سکتا تھا کہ یہ تار وقوع میں آنے والے کسی واقعہ کا پیش خیمہ ہے۔

میں پٹنہ صبح کو پہنچا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ شدت کی گرمی تھی۔ تیسرے پہر کو لو چلتی تھی اس لیے سرِ شام گیا۔ مجھے دیکھ کر حافظ صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگایا۔ چونکہ سال بھر میں ایک دفعہ ان کا وطن آنا تھا اور ملنے والے بکثرت تھے۔ نیچے اوپر لوگ آرہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ حافظ صاحب کو مجھ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ شب کے دس بجے کے قریب سب لوگ جب چلے گئے۔ میں بھی یہ کہہ کر رخصت ہونے لگا کہ کل صبح بہت سویرے حاضر ہوں گا۔ حافظ صاحب نے فرمایا اس وقت جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا تیار ہے۔ کھا کر آرام کرو۔ تم سے مجھے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ پھر مجھے لے کر کھانے کے کمرے میں گئے۔ انگلستان کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کرتے رہے۔ پھر میری شادی کا ذکر آیا۔ پٹنہ کے اور کلکتہ کے پیغاموں کا میں نے ذکر کیا۔ حافظ صاحب فرمانے لگے۔ افسوس ہے کہ مسلمان تعلیم سے بالکل غافل ہیں۔ جب لڑکوں کو تعلیم نہیں دی جاتی تو لڑکیاں کس شمار میں ہیں۔ صوبہ بہار اور بنگال کے مسلمانوں میں تم کو تعلیم یافتہ لڑکی جیسی تم چاہتے ہو شاید ہی ملے۔ البتہ حیدر آباد میں تعلیم نسواں کا چرچا اب کچھ ہو چلا ہے۔ میرے علم میں دو لڑکیاں ہیں۔ تعلیم یافتہ اور اب بھی ان کی تعلیم جاری ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کے باپ کے نام لے کر کہا کہ ایک تو میرے دوستوں میں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ ان کے حسب نسب میں کوئی نقص نہیں۔ ایک نے میٹرک پاس کیا ہے اور دوسری میٹرک میں ہے۔ لڑکیوں کے اخلاق اور صورت شکل کی تعریف کر کے کہا۔ میرے گھر میں ان لڑکیوں میں سے ایک کو دیکھا ہے وہ تعریف کرتی تھیں۔ ایک ان میں سے اخباروں میں مضمون بھی لکھتی ہے اور پنجاب کے امتحان منشی فاضل کی تیاری کر رہی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں زمانہ موجودہ کے لحاظ سے مسلمان لڑکیوں میں بہت شائستہ اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تمھارے حسبِ دلخواہ ضرور ہوگی۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے والدین بھی اس امر پر رضامند نہ ہوں گے کہ اس قدر دور فاصلہ پر لڑکی کا بیاہ کیا جائے۔ میں نے کہا اگر میں حیدر آباد ہی میں رہ جاؤں تب تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ حافظ صاحب بولے جب تو بے شک کوئی عذر نہ ہوگا۔ میرے خیال میں تمھارے لیے حیدر آباد بہت مناسب ہوگا۔

قیامِ حیدر آباد

دوسرے دن رات کی گاڑی سے جو شب کے آٹھ بجے پٹنہ سے چلتی ہے کلکتہ روانہ ہوا اور علی الصبح ہوڑہ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا مگر حیدر آباد کی طرف دل سے لگی تھی۔ میں نے پٹنہ میں اپنے عزیزوں کو خط لکھے اور حیدر آباد بغرض سیاحت درگا پوجا کی چھٹیوں میں جانے کی اطلاع دے دی۔ کلکتہ کو خدا حافظ کہا۔

۲۶ر اگست کو وہاں سے روانہ ہوا۔ تیسرے دن واڑی میں جب ٹرین پہنچی تو مسافروں سے اسٹیشن ماسٹر نے آکر کہا کہ آپ لوگ اُتر جائیے۔ یہ ٹرین آگے نہیں جا سکتی۔ شدت بارش کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلہ پر آگے دو پل ٹوٹ گئے ہیں ندیاں زوروں پر چل رہی ہیں کشتیوں کا جب انتظام ہو جائے گا تو آپ لوگوں کو سوار کریں گے۔ دو دن واڑی میں قیام رہا۔ صبح کے آٹھ بجے ٹرین حیدر آباد کے نامپلی اسٹیشن پر پہنچی۔

حافظ صاحب قبلہ نے لڑکی کے پھوپھا کو بلوایا، میرے حیدر آباد آنے کی اطلاع دی اور کہا کہ آپ کے اشارہ پر میں نے ان کو یہاں بلوایا ہے۔ لڑکی کے پھوپھا نے مجھ سے کہا کہ کل تیسرے پہر کو فلاں مقام پر زحمت فرما کر آپ تشریف لائیے۔ میرے برادر نسبتی یعنی لڑکی کے والد کا مکان ہے۔ وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے بعض احباب بھی آپ سے ملیں گے۔ جب میں وہاں پہنچا تو لڑکی کے پھوپھا نے پہلے تو لڑکی کے والد سے ملایا۔ پھر بھائیوں سے، پھر یکے بعد دیگرے اور حاضرین سے۔ لڑکی کے والد تو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں مرحوم مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں کشتیوں میں چاخوری کا سامان آیا اور کیک اور پیسٹری وغیرہ تھی۔ پس پردہ عورتیں مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت اصل معاملہ میں کوئی گفتگو مجھ سے نہیں ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے میں وہاں بیٹھا پھر رخصت ہو کر چلا آیا۔

وکالت

دوسرے دن میں نے اس صحبت کا ذکر حافظ صاحب سے کیا۔ مجھ سے کہلا بھیجا کہ لڑکی منشی فاضل کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے اور امتحان کے تین مہینے باقی ہیں۔ محنت بہت کی ہے بعد الفراغ امتحان عقد نکاح ہو جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ بعد شادی دُلہن پٹنہ یا کلکتہ نہیں جائے گی۔ میں نے تین مہینے انتظار کرنا قبول کیا۔ پھر میرے پاس ایک پیغام آیا کہ جبکہ حیدر آباد میں مستقل سکونت اختیار کرنے کو میں رضامند ہوں تو ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دینی چاہئے۔ چنانچہ پانچ سو روپیہ عدالت العالیہ میں داخل کر کے میں انرول ہو گیا۔

حیدر آباد آنے کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۹۵ء میں درجہ اول یعنی ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان کا بھی میں ممتحن مقرر ہوا۔ میرا مضمون یا پرچہ امتحان قانون داد رسی خاص تھا۔ دوسرے سال میں درجہ اول کے امتحان کا ممتحن مقرر ہوا۔ میرا پرچہ قانون شہادت کا تھا۔ دو سال کے بعد پھر میں ممتحن مقرر ہوا۔ میرا پرچہ قانونِ معاہدہ کا تھا۔ میں اپنے سوالات اس طرح مرتب کرتا جس سے امیدواروں کی قوت حافظہ اور ذہانت معلوم ہو۔ کچھ سوالات تو یاد کے متعلق ہوتے اور کچھ اس ترکیب کے ہوتے جن سے ذہانت و ذکاوت معلوم ہو۔ سوالات میں اپنی شاعری بھی چھانٹتا تھا۔ تناسب لفظی کی بھی قید رکھتا۔ میرا پرچہ امیدواروں میں تقسیم ہونے کے بعد بہت مقبول ہوتا۔ میری قابلیت و ذہانت کی وکلاء اور اراکین ہائی کورٹ تعریفیں کرتے۔

انجمن ترقی نسواں کا قیام ۱۸۹۵ء میں مسٹر موراج کے آنے کے بعد میں نے ایک انجمن بنام ترقی نسواں قائم کی۔ مسٹر

موراج اس زمانہ میں جام باغ والی گلی میں رہتے تھے۔ انھیں کے مکان میں انجمن کے جلسے منعقد ہوتے تھے اور یہ ممبر بھی تھے۔ میرے آنے کے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے ایک بیرسٹر محمد سلیمان مرحوم بغرض وکالت یہاں آئے۔ یہ میرے عزیز بھی ہوتے تھے اور کچھ عرصہ تک میرے ساتھ رہے۔ یہ بھی اس انجمن کے ممبر ہو گئے۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی حیدر یار جنگ مرحوم کو بھی ممبر بنایا گیا اور سید علی بہار جو حقیقتاً مخبر دکن کے ایڈیٹر تھے ان کو بھی اور مولوی محب حسین مرحوم ایڈیٹر معلم نسواں کو بھی رکنیت میں شریک کیا گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق گفتگو کرنا گناہ میں داخل تھا۔ یہ انجمن ایک سال سے زیادہ نہیں چلی۔

شادی

سنہ ۱۹۰۲ء کا سال میرے لیے بہت مبارک ہوا جس نے میری کتاب زندگی کا نیا ورق اُلٹا۔ جب کہ پہلی نسبت سے جس کی کشش مجھے کالے کوسوں کلکتہ سے حیدرآباد کھینچ لائی تھی، میں نے ہاتھ کھینچا تو کچھ عرصہ تک مجھے شادی کے نام سے تنفر سا ہو گیا اور دل میں ٹھان لیا تھا کہ مدت العمر یکہ و تنہا آزاد رہوں گا اور تجرد کی زندگی بسر کروں گا۔ زمانۂ علالت میں دو مہینہ مجھے ایک سچے ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یوں بھی تنہائی بہت کھلنے لگی۔ اب میں نے شادی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کا ذکر چند احباب سے کیا۔ بہت سے پیغام آئے۔ خدا غریق رحمت کرے مولوی میر لطف علی صاحب سابق وکیل ہائی کورٹ کو۔ ان سے اور ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سے جو بعد کو میرے خسر ہوئے قدیم دوستانہ تھا اور میر صاحب کی اہلیہ اور ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ سے بھی بہت دوستانہ ہی نہیں بلکہ بہناپا تھا۔ غرض میر صاحب کی سعی و کوشش سے میری نسبت ڈاکٹر صاحب کے ہاں ٹھہری۔ تحریکات آٹھ مہینے کے رگڑے جھگڑے کے بعد ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء کو میری شادی ہوئی۔ میرے خسر مرحوم اور میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ صاحبہ نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے۔

اللہ کے فضل و کرم سے مجھے خدا نے ایسی بیوی دی جو ظاہری وجاہت، حسن صورت، حسن سیرت، ہنرمندی، سلیقہ شعاری سے مالا مال ہے۔ بہت سے لوگوں کو رشک اس بات کا ہوا کہ ان کے ہاں نسبتیں منظور نہ ہوئیں۔ وہ منہ دیکھتے رہ گئے اور میں بازی لے گیا۔

انجمن افتخارِ دکن

چند وکلاء مثلاً غلام قادر خاں مرحوم، شیخ ولایت حسین مرحوم اور شیخ عبدالرحیم صاحب نے میرے مشورہ سے ایک انجمن موسوم بہ افتخار دکن قائم کی جس کے اغراض چند در چند تھے۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی، مسلمان لڑکوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا اور اراکین میں برجستہ تقریر کرنے کی مہارت پیدا کرنی اور معاشرتی اصلاح وغیرہ۔ میری صدارت سے اس کے جلسے پہلے تو کلکٹر کورٹ کی بارہ دری میں جو منیر الملک کی بارہ دری بھی مشہور ہے کچھ عرصہ تک ہوتے رہے۔ پھر شیخ ابراہیم فاروقی وکیل ہائی کورٹ (بعد کو فاروق یار جنگ رکن ہائی کورٹ) کے مکان میں اس کے جلسے ہوتے رہے۔ مولوی فاروقی کے

مکان میں جو جلسے ہونے لگے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میرے مکان کے متصل تھا۔ مولوی شبلی نعمانی کے مکان کے بھی متصل تھا اور مسٹر ظفر علی خاں کے مکان کے بھی قریب تھا۔ شبلی نعمانی اس زمانہ میں ناظم محکمۂ علوم و فنون مقرر کئے گئے تھے۔ غرض شبلی صاحب و مسٹر ظفر علی خاں حال مولانا جو اس زمانہ میں ہوم سیکرٹری کے دفتر میں مترجم تھے اور مولوی فاروقی وغیرہ ہماری انجمن کے ماہانہ جلسوں میں ضرور شریک ہوتے تھے مگر جلسے میری صدارت سے ہوتے تھے۔

انجمن ترقی اُردو

شبلی صاحب نے اس زمانہ میں اپنے مکان میں اس غرض سے کئی جلسے کئے کہ انجمن ترقی اردو قائم کی جائے اور وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت کر دی جائے۔ دو تین جلسے ان کے مکان میں ہوئے اور ہر بار انھوں نے مجھے صدر بنایا۔ مختصر جلسہ ہوتا تھا۔ شرکا میں مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم سابق مددگار صدر محاسب، عبدالغفور خاں، مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اور مرزا سجاد بیگ مرحوم وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ حیدرآباد سے جب مولوی شبلی جا چکے تو مولوی عزیز مرزا ضلع بیڑ کی تعلقداری سے دکن ہائی کورٹ کے گئے۔ اور وہ اس حیثیت سے حیدرآباد آ گئے۔ انھوں نے نظام کلب میں کئی جلسے انجمن ترقی اردو کے قیام کے متعلق منعقد کئے۔ نہیں معلوم انجمن پھر کیونکر قائم ہوئی اور مولوی عبدالحق کے تحت کیونکر آ گئی اور اس کے اراکین کون کون ہیں۔ اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ شبلی صاحب کا ناظم محکمۂ علوم و فنون ہونا سنہ ۱۹۰۲ء اور سنہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔

شبلی صاحب سنہ ۱۹۱۲ء میں جب حیدرآباد آئے تو میرے مہمان رہے۔ تقریباً ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ ان کا قیام میرے مکان میں رہا۔ اس زمانہ میں میرا قیام ہمایوں منزل والی کوٹھی میں تھا جس کو میں نے بکرایہ مالک نظامیہ ہوٹل کر دیا ہے۔ شبلی صاحب کو سو روپیہ منصب کے طور پر سید علی صاحب بلگرامی کی کوشش سے سر وقار الامرا نے مقرر کئے تھے۔ شبلی صاحب سیرۃ النبی لکھ رہے تھے۔ بھوپال سے بھی ماہانہ پانچ سو مقرر ہوئے تھے۔

محکمۂ دار القضاء

یہ بھی ایک اسلامی خدمت میں نے کی۔ آخر ۱۳۱۱ف میں مفتی دارالقضا نواب محبوب نواز الدولہ مرحوم نے انتقال کیا تو یہ تجویز گورنمنٹ کے زیر غور تھی کہ محکمۂ دارالقضا، عدالت العالیہ میں ضم کر دیا جائے۔ یہ خبر پا کر مولوی حیدر علی مرحوم جو اس زمانہ میں مفتی صاحب مرحوم کے مددگار اور بعد کو ناظم دارالقضا ہوئے میرے پاس آئے۔ بہت ہی متشوش اور پریشان حال تھے۔ مذکورالصدر خبر سنا کر مجھ سے طالب امداد ہوئے۔ میں نے مولوی حیدر علی سے کہا کہ میں ایک ترکیب کرتا ہوں اگر کارگر ہوئی تو انشاءاللہ آپ کا محکمہ قائم رہے گا۔ کامیابی مجھ کو ہوئی اور دارالقضا کا محکمہ میری کوشش کی وجہ سے بچ گیا۔

محکمۂ بلدیہ کی ممبری سنہ ۱۹۰۳ء تھا یا سنہ ۱۹۰۴ء میرا تقرر میونسپلٹی (بلدیہ) کی ممبری پر ہوا اور سنہ ۱۹۱۲ء میں میں علیحدہ ہوا۔ میری

دلچسپی لینے کی وجہ سے میں ورکنگ کمیٹی کا ایک سال چیئرمین بھی رہا اور جب کسی خاص نزاعی امر کے فیصلہ کے لیے یا کسی متنازعہ فیہ مقام کے معائنہ کے لیے کوئی سب کمیٹی مقرر کی جاتی تو میں ضرور بحیثیت ایک ممبر کے شریک کیا جاتا۔

طغیانی رود موسیٰ ۱۹۰۸ء

۲۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو قیامت خیز طغیانی آئی تو میں اسپیشل مجسٹریٹ اعزازی مقرر کیا گیا اور بہت ذمہ داری کا کام میرے سپرد ہوا یعنی جس قدر لاوارثی مال امین باغ میں جس میں اب زچگی خانہ ہے جمع کیا جاتا اور جس کے حاصل کرنے کے لیے متعدد لوگ یہ کہہ کر آتے کہ ہمارا فلاں فلاں مال مال خانہ میں ہے ہم کو دلایا جائے اور ایک فہرست پیش کرتے۔ اس کا تصفیہ کرنا کہ فلاں شے زید کی ہے یا بکر کا بہت دشوار امر تھا کیونکہ بہت سے جھوٹے دعویدار بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس میں بڑے تجربہ اور دیانت و تدین کی ضرورت تھی۔ خدا نے میری مدد کی۔ میرے فیصلے تسلی بخش ثابت ہوئے۔ غرض چھ ماہ یہ خدمت اعزازی طور پر میں نے کی۔ جس طرح محکمہ صفائی کی چھ سال خدمت کی

حادثات

شادی کے بعد تین اہم واقعات و حادثات پیش آئے۔ ایک تو میری شادی کے دس مہینے بعد میری خوشدامن صاحبہ مغفورہ نے انتقال فرمایا۔ ان کے چہلم کے چار روز بعد میرے خسر حاجی ڈاکٹر صفدر علی صاحب کا انتقال یک بیک فالج سے ہو گیا۔ میرے سالے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک بچہ اکیس دن کا تھا جس کا نام مہدی علی مرزا ہے۔ کرنل ریاست علی مرزا تیرہ سال کے تھے۔ غرض سب بچے چھوٹے تھے۔ میری خوشدامن صاحبہ کے بچوں میں صرف میری بی بی کی شادی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں میرے خسر کے انتقال کے چار پانچ ماہ بعد مجھے ایک لڑکی خدا نے دی تھی۔ ایک سال اس دار فانی میں رہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس نے داغ مفارقت اپنے والدین کو دے کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ نہایت حسینہ و جمیلہ بچی تھی۔ جس کی دائمی جدائی کا صدمہ آج تک اس کے ماں باپ کو ہے۔ اس کے بعد کئی دفعہ استقرار حمل ہوا۔ مگر کوئی اولاد باری تعالیٰ نے پھر عطا نہیں کی۔

سفر عراق عرب

۱۹۰۶ء میں دوران حمل میری اہلیہ ایسی علیل ہوئیں کہ معالجین نے جواب دے دیا۔ میں نے بارگاہ حسینی سے استمداد طلب کی اور یہ منت مانی کہ جب مریضہ کو صحت بتصدق امام حسین علیہ السلام شافی مطلق عطا فرمائے گا تو بعد صحت کل زیارت عتبات عالیات کے لیے میں مریضہ کو بھی لے جاؤں گا۔ چنانچہ میری دعا باری تعالیٰ نے مستجاب کی اور میری اہلیہ کو صحت بخشی۔ ۱۹۰۶ء میں بقصد زیارات عتبات عالیات یعنی کاظمین کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، سامرہ اور بغداد کا سفر ہم لوگوں نے کیا۔ میرے گھر میں سے سفرنامہ عراق میں اس مقدس سفر کے تمام و کمال حالات لکھے ہیں۔ یہ سفرنامہ طبع و شائع ہو چکا ہے۔ میری اہلیہ (صغرا ہمایوں) کو مضمون نگاری، تالیف و تصنیف و خدمات قومی کا شوق و ورود ۱۹۰۳ء سے پیدا ہوا۔ پہلی تصنیف مشیر نسواں ۱۹۰۶ء میں طبع و شائع ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ

نکل چکے ہیں۔ مشار الیہ مرحوم نے ایک طلائی تمغہ اس کتاب کے لکھنے پر میری بیوی کو دیا۔ اس حوصلہ افزائی سے ان کو آئندہ تصنیف کے لیے ترغیب و تحریص ہوئی۔ اب اس وقت مختلف موضوعات پر ان کی تالیفات و تصنیفات تعداد میں بعنایت ایزدی سولہ ہیں۔

بھوپال، پٹنہ وغیرہ کا سفر

سنہ ۱۹۰۶ء میں ہم اپنی بی بی کے ساتھ بھوپال گئے اور وہاں سے دلی اور آگرہ گئے۔ اس سفر کے حالات تفصیل وار روزنامچہ بھوپال و آگرہ میں ہماری بیوی نے لکھے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں میں اپنے وطن عظیم آباد پٹنہ اپنی بی بی کو لے کر گیا۔ راستہ میں بنارس دیکھا۔ پھر کلکتہ گئے۔ اس سفر کا حال ہماری بیوی نے سیاحت بہار و بنگالہ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں درج ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اورنگ آباد اور ایلورہ دیکھنے گئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں میں اپنی بیوی کو مدراس لے گیا۔ اس سفر کا حال میری بیوی نے سفرنامہ ہند و مدراس میں لکھا ہے۔ اس کے بعد بھی مدراس دو دفعہ ہم اپنی بیوی کو لے گئے۔ ایک دفعہ سنہ ۱۹۳۲ء میں گئے۔ ان سفروں سے پیشتر سنہ ۱۹۲۹ء میں کشمیر گئے اور سر البین بنرجی وزیر اعظم کشمیر کے مہمان رہے۔ جس کا ذکر سیر کشمیر میں تفصیل سے میری بیوی نے کیا ہے اور اس سے پیشتر سنہ ۱۹۲۳ء میں انگلستان بیوی کو لے گئے جس میں جرمنی، اٹلی، فرانس وغیرہ تمام پھرے۔ دو جلدوں میں سفرنامہ یورپ میری بیوی نے لکھا ہے۔

ان چند معززین میں جو وقتاً فوقتاً میرے ہاں مہمان رہے مثلاً نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم، مولانا شبلی نعمانی سنہ ۱۹۱۳ء، مولوی محبوب عالم مرحوم سابق ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار، خواجہ حسن نظامی، عطیہ بیگم فیضی، ڈاکٹر ٹیگور بھی ہمارے ہاں آئے تھے۔ ان کو چندہ جمع کر کے میری بی بی نے دیا اور جواہر لال نہرو کی دعوت بھی ہمارے ہاں ہوئی۔ معہ اپنی لڑکی کے وہ آئے تھے۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں جالنہ کا سفر کیا۔ جالنہ میں میری بی بی نے جلسہ عید میلاد النبی کیا۔ انجمن خواتین دکن کی شاخ قائم کی۔ وہاں سے اورنگ آباد گئے۔ وہاں بھی ایک شاخ انجمن خواتین دکن کی قائم کی۔ اورنگ آباد سے ناندیڑ کا سفر کیا۔ اسی سنہ میں میری یہ سوانح عمری ختم ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں پھر دوبارہ ہم جالنہ گئے۔ وہاں مجھے فالج گرا۔ ایسا علیل ہوا کہ بستر پر سے اٹھ نہیں سکتا ہوں۔

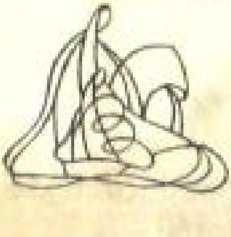

محمد اشرف علی تھانوی

وفات : ۱۵-۱۶ ؍ رجب ۱۳۶۲ھ
۱۹-۲۰ ؍ جولائی ۱۹۴۳ء

نام اور کام

میرا سن ولادت ۱۲۸۰ ہجری ہے، پانچویں ربیع الثانی بوقت صبح صادق۔ مادۂ تاریخی "کرم عظیم" ہے یا "مکرم عظیم" کہئے۔ ایک صاحب نے بلا مشورہ و اجازت مٹھائی بازار سے منگا کر بطور ہدیہ پیش کی۔ میں نے کہا جب آپ نے یہیں سے منگائی ہے تو مجھ سے بے تکلف دریافت کر لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ دیکھئے آپ کا تو روپیہ خرچ ہوا اور میرے یہاں یہ مٹھائی کسی کام نہ آئے گی۔ میرے کوئی بچہ نہیں جو کھائے۔ بس ہم دو میاں بیبی ہیں۔ مٹھائی کا شوق نہیں۔ اب سوائے اس کے کہ اوروں کو تقسیم کر دی جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ احسان اور بوجھ تو میرے اوپر ہوا اور فائدہ دوسروں کا ہوا۔ بھلا ایسے ہدیہ دینے سے کیا ہی بھلا ہو لیکن آپ کی دل شکنی کے خیال سے خیر اتنا کرتا ہوں کہ نصفٌ لی و نصفٌ لک۔ آدھی میں نے لی، آدھی آپ رکھئے تاکہ آپ کو بھی تو معلوم ہو کہ بے دل سے جو چیز کھائی جاتی ہے وہ کیسی بری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کھائیں گے لیکن مزا نہ آئے گا تو معلوم ہوگا کہ دوسرے کو بھی مزا نہ آیا ہوگا۔ آئندہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ یہ آپ نے تکلف کا برتاؤ کیا۔ افسوس ہے اتنے دن سے ملتے جلتے ہو گئے لیکن میری طبیعت کا انداز آپ کو معلوم نہیں ہوا۔ اب آپ ہی اس مٹھائی کے دو حصے کیجئے لیکن "استادی" نہ کیجئے گا۔ ان صاحب نے اپنی طرف کا حصہ کم رکھا، میری طرف کا زیادہ۔ میں نے ان کی طرف کا حصہ اٹھا لیا کہ اب آپ اس کے خلاف تو کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا نہیں ہے کیونکہ آپ کے نزدیک اس کا آدھا ہونا مسلم ہے۔ وہ صاحب بیچارے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ دیکھئے میرا مادۂ تاریخی "مکرم عظیم" ٹھیک ہے یا نہیں! میں آخر شیخ زادہ ہوں۔ شیخ زادے بڑے فطرتی ہوتے ہیں۔ مجھے بھی فطرتیں بہت آتی ہیں لیکن الحمد للہ انہیں کبھی استعمال نہیں کرتا۔ ہاں کبھی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا تو اپنے رفع ضرر کے لیے استعمال بھی کر لیتا ہوں جیسے اس وقت کیا۔

ایک صاحب نے میرے نام کا سجع کہا تھا "از گروہ اولیا اشرف علی"۔ میں نے بھی سجعے لوگوں کی فرمائش سے کہے ہیں اور بہت عجیب عجیب لیکن محفوظ نہیں ہیں۔

خوش حالی

میرے والد (عبد الحق) بہت خوش حال تھے۔ انہوں نے بڑے شوق کے ساتھ مجھے عربی پڑھائی اور نہایت فراخ دلی سے میرے اوپر

خرچ کیا۔ ہزاروں روپیہ میں نے اپنے ہاتھوں سے خرچ کر دیے۔ اس کا یہ تو اثر ہوا کہ اب الحمدللہ دل میں کسی قسم کی تمنا نہیں رہی اور کسی نواب یا رئیس کا اثر اس کی وجاہت اور مال و دولت کی وجہ سے میرے قلب پر مطلق نہیں پڑتا بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی تو خوب ہیں۔ مقبولیت عند اللہ کے لیے شرافت نسب اور عالی خاندانی کی مطلق ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ لیکن جن سے حق تعالیٰ عام خدمت دین لینا چاہتے ہیں ان کو عالی خاندان میں پیدا فرماتے ہیں تاکہ ان کے اتباع میں امراء و شرفا کو بھی کسی قسم کی عار نہ آئے۔ اسی مصلحت سے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کوئی نبی گھٹیا خاندان کا نہیں ہوا۔ ایسے لوگوں سے عام نفع بہت ہوتا ہے۔

بچپن کا حال

میں بہت کم عمر تھا لیکن اتنا بڑا تھا کہ کچھ معمولی سودا سلف بازار سے لے آتا تھا۔ میرٹھ میں بازار ذرا دور تھا۔ راستہ میں مسجدیں پڑتی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ نو دس بجے صبح کا وقت ہوتا تھا مگر جہاں مسجد نظر آئی بے وقت مسجد کے اندر گیا اور سیدھا منبر پر جا چڑھا اور خطبہ کے طور پر جو یاد آیا پڑھ پڑھا کر سودا لینے بازار چلا جاتا۔ گو وہ کھیل کود کا زمانہ تھا مگر اس وقت بھی مسجد سے اس قدر محبت تھی۔ یہ میرا کھیل تھا۔ یہ سب منجانب اللہ تھا۔ ہونے والی بات مجھے یاد تو نہیں لیکن نانی صاحبہ کہتی تھیں کہ ننگا پیٹ دیکھتے ہی مجھ کو قے ہو جایا کرتی تھی۔ لڑکے مجھ کو تنگ کیا کرتے تھے۔ جہاں کرتا اٹھا کر پیٹ دکھلایا اور مجھے قے ہوئی مگر اب تو کوئی سامنے گوہ بھی کھائے تب بھی کچھ نہیں ہوتا۔

کانپور میں ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم تھے بجنور ضلع گھنٹہ کے رہنے والے۔ کچھ طالب علم مل کر گئے کہ ریل دیکھیں گے مغرب کی نماز پڑھنے کے قریب پہنچ رہے تھے کہ ریل نکل گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر مولوی (فضل الرحمن) صاحب ریل دیکھنے کے لیے چلے۔ طالب علموں نے کہا کہ ریل تو نکل بھی گئی، کہنے لگے انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔

ہر عمر کا ایک جدا اقتضا ہے۔ اب گھی اچھا معلوم ہوتا ہے، پہلے نفرت تھی۔ کیونکہ اب قوت کی زیادہ ضرورت ہے۔ پیشتر بکری کے گوشت سے نفرت تھی۔ کانپور میں کبھی بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ وطن میں بھی کوئی فرمائشی چیز پکانے کو پوچھا تو گائے کا گوشت بتلا دیا تھا۔ اب بہ نسبت گائے کے بکری کا گوشت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خدائی انتظام ہے۔ پیشتر چھاچھ سے بہت رغبت تھی، اب جاتی رہی۔ بس یہ قدرتی انتظام ہے جس چیز کی ضرورت جس عمر میں ہوتی ہے اس کی رغبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

تربیت

والد صاحب نے بہت شفقت کے ساتھ رکھا۔ بچپن میں گلی سے پکڑ کر روٹی اپنے ہاتھ سے بٹھلا کر کھلاتے تھے، ہمیں مصیبت معلوم ہوتی تھی کہ یہ کہاں سے مسلط ہو گئے۔ بڑے منتظم تھے۔ اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ تعلیم ہو اور تربیت ہو۔ عاقلانہ محبت تھی۔ مدتوں میرٹھ میں رہنا ہوا۔ رمضان شریف کے زمانہ میں ختم میں کہیں نہیں جانے دیتے تھے کہ اس سے نیت خراب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی اس قدر رعایت کرتے تھے کہ بازار سے مٹھائی خوب فراغت کی منگاتے تھے اور کہتے تھے کہ مٹھائی کے لیے وہاں جاتے ہیں، لو ہم اس سے زیادہ

ہمیں کھلائے دیتے ہیں لیکن وہاں مٹھائی کے دلانے میں جانا ہمیں برا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اثر اب تک یہ ہے کہ کسی سے کوئی چیز لیتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ ہر جگہ دعوت میں بھی ذلت سی معلوم ہوتی ہے' بجز بے تکلفی کی جگہ کے' اور طالب علموں کو تو کسی دعوت میں بھیجنا پسند ہی نہیں کرتا۔

ہم جب پڑھتے تھے تو روٹھتے تھے۔ ہمارا روٹھنا ہوتا ہی تھا کہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کھانے کو کہتے تو کہہ دیتے کہ بھوک نہیں لگی۔ والد صاحب فرماتے کہ چونکہ ہم نے تم کو مارا تھا اس لیے بھوک نہیں لگی۔ اچھا منہ دھو لاؤ۔ ایک روپیہ نکال کر دیتے۔ پھر ہم کھانا کھاتے۔ فرماتے کہ اب کیسے بھوک لگ گئی۔ ادنیٰ ادنیٰ بات پر روک ٹوک کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کے واسطے انگرکھے سلے۔ ذرا تکلف کے تھے۔ پیک وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ بچے تو تھے ہی، عید سے ایک دن پہلے کا قصہ ہے درزی سے تقاضا کر کے سلوایا۔ عصر کے بعد ملا۔ بس دوڑا ہوا خوش خوش یہ کہتا ہوا آیا کہ ابا جی کل پہنیں گے۔ والد صاحب وہاں بیٹھے ہوئے مسواک کر رہے تھے۔ اٹھ کر ایک چپت لگائی کہ بڑے نالائق ہو۔ کوئی سُنے تو یوں سمجھے کہ ان کو کبھی کپڑا پہننے کو نہیں ملا جو ایسے خوش ہو رہے ہیں۔

ہم دونوں بھائی کھانا کھا رہے تھے۔ بھائی نے پوچھا آج کونسا روزہ ہے' کیا فلاں ہے؟ میں نے کہا ہاں سُنا تو ہے۔ ایک چپت لگائی کہ یہ کیا کہ سُنا ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب مجھے کیا معلوم۔ کہا جواب دیتے ہو؟ ان باتوں کا اب تک اثر ہے۔ غلطی کی تاویل بُری معلوم ہوتی ہے' غلطی کا اقرار پسند ہے۔ ان کی باتیں گو ذرا ذرا سی تھیں لیکن دل میں گھس گئیں۔ وہی تو زمانہ تربیت کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے میرے ساتھ تو ایسا احسان کیا کہ چار حرف دین کے پڑھا دیے۔ اگر چار گاؤں چھوڑ جاتے تب بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ تھا۔ ویسے دنیا دار کہلاتے تھے۔ اکثر دنیا دار علم دین کو حقیر رکھتے ہیں مگر والد صاحب مجھے بھائی پر ہر بات میں مقدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ تائی نے کہیں کہہ دیا کہ چھوٹے بیٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے' وہ تو کما کھائے گا' بڑا بیٹا کہاں سے کھائے گا؟ یہ سن کر والد صاحب کا منہ سرخ ہو گیا۔ خفا ہو کر کہا: "بھابی! تم نے اس وقت مجھ کو بہت پریشان کیا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ روپے اس کی جوتیوں سے لگے رہیں گے اور یہ ان کی طرف منہ بھی نہ کرے گا۔" اگر کوئی درویش یہ بات کہتا تو کرامت سمجھی جاتی لیکن دنیا دار آدمی تھے۔ میری شادی میں ایک شخص سے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا بڑا خوش قسمت ہے' ہمیشہ فراغت و آرام سے رہے گا۔ جب سے پیدا ہوا ہے بسم اللہ سے لے کر شادی تک میں نے اس کے کاموں میں بہت ہی روپیہ صرف کیا ہے۔ دیکھئے ان کی خوش فہمی کہ انہوں نے کبھی یہ بے فکری نہیں کی کہ اس کے لیے معاش کی کیا صورت ہوگی۔ جب ہم لوگ پاجامہ بھی نہیں پہنتے تھے تب ہی سے انہوں نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ اس کو انگریزی پڑھائیں گے اس کو عربی۔ خدا نے پہچان ان کو ایسی دی تھی طبیعتوں کے اندازہ کی۔ یہ بڑی دانشمندی کی بات ہے۔ ایک بادشاہ نے اپنے دو غلاموں کو تعلیم دینا چاہی۔ ایک کو تیر اندازی کی' ایک کو خوش نویسی کی مگر دونوں میں ناکامی ہوئی۔ ایک ماہر سے مشورہ لیا کہ کس کو کونسی تعلیم دی جائے۔ وہ ان دونوں کی طبیعتوں کے اندازہ سے پہچان گیا کہ خلاف تجویز بادشاہ کے اس کو تو تیر اندازی سے مناسبت ہے اور اس کو خوش نویسی سے۔ چنانچہ اس طرح تعلیم دی گئی۔ دونوں اپنے اپنے فن میں کامل ہو گئے۔

الحمدللہ میں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کبھی ظاہراً یا باطناً اختلاف نہیں کیا اور ہر طرح ادب ملحوظ رکھا۔ حالانکہ مجھ کو سینکڑوں اختلافات سُوجھتے تھے لیکن میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم کیا جانیں اور اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں نہ بھی آئی تب بھی دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ کیا ضروری ہے کہ کوئی بات بھی بلا سمجھے نہ رہے۔ سو واقعی طالب تحقیق کو پیشتر تقلید ہی ضروری ہے بعد کو یہ برکت تحقیق کا درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تربیت یہی ہے

دیکھئے اگر کوئی بچہ اپنے استاد کی تقلید نہ کرے اور پڑھاتے وقت کہے کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے یہ بے نہیں تو بس وہ پڑھ چکا۔ اس کو چاہیے کہ جو کچھ استاد پڑھاتا جائے اس کو بے چون و چرا مانتا جائے۔ پھر ایک دن وہ ہوگا کہ سب باتیں خود ہی اس کو معلوم ہو جائیں گی۔ میں توکلاً علی اللہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میرے کسی بزرگ کے قلب میں میری طرف سے کبھی ایک منٹ کے لیے بھی ذرا کدورت یا تغیر پیدا نہیں ہوا۔

قلبی کیفیت

ایک دفعہ میں بالاخانہ پر شرح مثنوی شریف کی لکھ رہا تھا۔ پڑوس میں کسی کے گھر موسل سے چاول کوٹے جا رہے تھے۔ اس کی آواز سے میرے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی کہ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ خوب چلاؤں اور اچھلوں۔ میں نے بہت ضبط کیا تب وہ حالت فرو ہوئی۔ الحمد للہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بھی ایک بار موسل کی آواز پر وجد آگیا تھا، ان سے مشابہت ہوگئی۔

حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کے ذکر سے گو وہ کسی درجہ کا ہو میرے ہوش بجا نہیں رہتے۔ گو دوسرے کو محسوس نہ ہو لیکن مجھ پر تو گزرتی ہے۔ میں بلا خوف تردید قطع نظر عقیدت و بیعت کے کہہ سکتا ہوں کہ ڈیڑھ سو دو سو برس سے ایسا شیخ محقق نہیں پیدا ہوا۔ حضرت اس فن تصوف کے مجتہد اور مجدد تھے۔

یہ جو میں بعض مرتبہ اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں یہ ان مجذوب صاحب کی نسبت کا اثر ہے جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں ورنہ حضرت حاجی صاحب تو مجسم رحمت ہی رحمت تھے۔

مسئلہ وحدۃ الوجود

میں جب مکہ میں تھا ہمارے معروف نیک آدمی تھے۔ ہندوستان سے تحصیلداری چھوڑ کر ہجرت کر گئے تھے۔ [illegible] جلد باندھ کر گزر کرتے رہے۔ عالم تھے، نیک شخص تھے۔ گو علم مستحضر نہیں تھا۔ ذہول ہو گیا تھا۔ مجھ سے تصوف کے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ ایک دن کہا کہ مسئلہ وحدۃ الوجود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اسے کفر سمجھتا ہوں۔ بہت لوگوں سے اس مسئلہ کو پوچھ چکا ہوں لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں دعویٰ تو تسلی کا نہیں کر سکتا لیکن میں اس کے متعلق آپ سے تقریر کروں گا۔ سمجھنے کے بعد آپ یہ کہیں گے کہ بدوں اس کے ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بعد آ جائیے لیکن کسی کو ساتھ نہ لائیے گا۔ ان کے بھتیجے بہت خشک اور ضدی آدمی تھے۔ انہی کی وجہ سے میں نے یہ شرط لگائی تھی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ صرف وہ شخص آئے گا۔ میں نے کہا کہ انہی کا آنا تو ناگوار ہے۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا آئیں لیکن بولیں نہیں۔ کچھ ایسا دیکھا ہے کہ جو طالب نہ ہو اس کے سامنے گفتگو کرنے سے طبیعت رکتی ہے مگر میں نے اقرار لے لیا کہ وہ بولیں گے نہیں۔

جمعہ کے دن بعد نماز صبح وہ آئے۔ میں نے کہا کہ میری ایک تقریر سن لیجئے۔ وہ کہنے لگے کہ پہلے میرے شبہات سن لو۔ میں نے کہا کہ نہیں میری تقریر کے بعد شبہات کہئے گا۔ چنانچہ میں نے تقریر کی۔ اب تو وہ تقریر حاضر نہیں۔ لیکن ایک گھنٹہ

میں وہ تقریر ختم ہوئی۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ علوم درسیہ کے اصطلاحات و قواعد پر ان کے استبعادات و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔ پھر بعد تقریر کے انھوں نے شبہات پیش کیے۔ میں نے کہا کہ فلاں شبہ کا فلاں تقریر سے جواب ہو گیا اور فلاں شبہ کا فلاں تقریر سے۔ غرض ایک بھی شبہ نہ رہا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھے کہ واقعی بدوں اس کے ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ بڑی دعائیں دیں۔ یہ اس قدر باریک مسئلہ ہے کہ مدتوں تک خواہ حقیقت سے گئے لیکن کم از کم جب تک خالی الذہن ہو کر نہ سنے تب تک سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ بہت سے بزرگوں کی تکفیر ہوئی ہے اسی کی بدولت۔ اسی لیے سب کے سامنے دقائق کے ظاہر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ مضر ہے۔ گفتگو کرنا تو نرا قال ہے۔ اس سے حال تھوڑا ہی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ ایک ذوقی مسئلہ ہے جب تک حال طاری نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اگر کسی کو انکشاف ہوا ہو اجمالاً اس کے سامنے واجب ہے ظاہر کرنا تاکہ وہ مجمل مفصل ہو جائے جب تک کہ اجمال سے ضلال کا اندیشہ ہو۔

گھر والی

میرے گھر میں بوجہ شفقت و ایثار اکثر مقروض رہتی ہیں۔ اب کی دفعہ معلوم ہوا کہ زیادہ مقروض ہیں۔ میں خفا ہوا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ اگر موت آ گئی تو سر پر بار رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ تم ادا کر دینا۔ میں نے کہا کہ اگر میں ہی پہلے مر گیا تو کس کو خبر ہے۔ انھوں نے کہا خدا نہ کرے ایسی بات کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ میں نے کہا کہ اچھا یوں ہی سمجھو کہ اگر دونوں ایک ساتھ ہی مر گئے تو پھر کیا ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے کہ دونوں ساتھ ہی مر جائیں۔ میں نے کہا کہ طاعون میں دکھا دیں گے کہ کئی کئی مُردے ایک گھر سے ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دعا کرو قرضہ اتر جائے گا۔ میں نے کہا میں تو اس حالت میں دعا نہیں کرتا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوگا کہ یا اللہ ہمیں ایسوں کو جو کچھ دیں۔ یہ تو پھانسنا ہوا۔ کیا کروں مجھے اموال کی بابت دعا کی توفیق بہت کم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک کمی کی بات ہے۔

ایک مرتبہ اعظم گڑھ کا سفر ہوا تھا۔ اس میں فتوحات سے ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ میرے اوپر اتنے روپیہ کا رکھنا بار ہو گیا۔ کیا کروں ضعف قلب ہے۔ زیادہ چیزوں کا ملک میں ہونا بھی گراں ہوتا ہے۔ میں نے پانچ سو کی سونے کی چوڑیاں گھر کے لوگوں کو بنوا دیں اور پانسو ان کو نقد دے دیا۔ اس میں ایک مصلحت تھی۔ وہ یہ کہ میں نے اپنا مکان گھر کے لوگوں کو مہر میں دے دیا ہے۔ ان سے تو ظاہر نہیں کیا لیکن بجائے کرایہ کے میں نے وہ چوڑیاں بنوا دیں کیونکہ میں ان کے مکان میں رہتا ہوں۔ ھل جزاء الاحسان...... الخ اس خدا کی بندی نے وہ بھی صرف کر ڈالے۔

مفت کی اولاد

یہ بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ میرے اولاد نہیں ہوئی ورنہ چونکہ میری طبیعت میں اہتمام تربیت کا ہے اس سبب سے مجھے سخت الجھن و مشغولی رہتی۔ حضرت حاجی صاحب سے میری خالہ صاحبہ نے اولاد کے متعلق دعا کے لیے عرض کیا تھا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ بھائی

تمہاری خالہ نے مجھ سے دعا کے لیے کہا ہے لیکن میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم رہو۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے بھی وہی حالت پسند ہے جو حضرت کو پسند ہے ——— اللہ تعالیٰ نے بہت سی اولاد دے رکھی ہے۔ یہی اولاد ہے بلکہ اولاد سے بھی بڑھ کر، جو ماں باپ کو اس طرح چھوڑ آتے ہیں کہ مجھے سنبھالنا پڑتا ہے کہ ماں باپ سے کہیں قطع تعلق نہ کرنے لگیں، ورنہ نافرمانی ہوگی۔ مفت کی اولاد حق تعالیٰ نے دے رکھی ہے۔ نہ پالنا پڑا نہ پرورش کرنا پڑا۔ اکثر ایسے لوگوں کو جن کے اولاد نہیں ہوتی دوسروں کے بچے دیکھ کر رنج ہوتا ہے اور حسد کرتے ہیں لیکن الحمدللہ مجھے بہت فرحت ہوتی ہے۔

اب یہ باتیں کہاں

بہت بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا رونا سن کر فرمایا کہ میرے بعد یہ لڑکا ہوگا۔ میرے انہیں بہت محبت تھی حالانکہ والد صاحب سے احیاناً مقدمے بھی رہا کرتے تھے اور باوجودیکہ دونوں صاحبوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔ والد صاحب مولانا کیلئے ایک مرتبہ میرٹھ سے پان لائے۔ مجھ سے کہا کہ تم جا کر دے آؤ میرے دینے سے نہیں لیں گے۔ چنانچہ میں لے گیا۔ پہلے بہت دیر تک سوچتے رہے اور پھر لے لیے کہ میرا دل برا ہوگا۔ اب یہ باتیں کہاں۔ اب اگر کسی سے رنج ہو تو اس کی اولاد سے بھی رنج رکھتے ہیں۔ انہوں نے والد صاحب کے بارے میں بھی رنج کو جاری نہیں کیا۔ پہلے سے اخلاق اب کہاں ہیں۔ الا ماشاءاللہ (احسن العزیز)

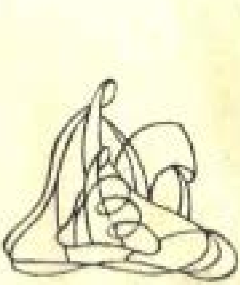

ہز ہائی نس شاہ کریم آغا خان چہارم

ہز ہائی نس پرنس شاہ کریم آغا خان چہارم ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء جنیوا میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم سوئٹزرلینڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پائی۔ آپ کے دادا سلطان محمد شاہ ہز ہائی نس آغا خان سوئم ۱۱ر جولائی ۱۹۵۷ء کو رحلت فرما گئے۔ اس وقت شاہ کریم کی عمر اکیس برس تھی۔ دادا کی رحلت کے بعد آپ آغا خان چہارم کی حیثیت سے شیعہ امامی اسماعیلی فرقے کی امامت کی گدی پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسماعیلیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے جو اکیس مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ملکہ معظمہ نے آپ کو ہز ہائی نس کا اور ۱۹۵۹ء میں شہنشاہ ایران نے ہز رائل ہائی نس کا خطاب عطا کیا۔

آغا خان چہارم ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ کھیلوں میں آپ کو بہت دلچسپی ہے۔ سکیٹنگ (برف پر پھسلنا) اور کشتی رانی میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں آپ نے کشتی رانی میں سوئٹزرلینڈ کی چیمپئن شپ جیتی تھی۔ سکیٹنگ میں کرایشنڈرز کی چیمپئن شپ مسلسل دو برس ۱۹۶۲-۶۳ء آپ کے ہاتھ رہی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے آسٹریا میں منعقدہ کھیلوں کے مقابلوں میں سکیٹنگ کی ایرانی ٹیم کی قیادت کی تھی۔

آپ کی رسم تاج پوشی کئی ممالک میں منائی گئی جس کی تفصیل یوں ہے۔

دارالسلام، ٹانگانیکا۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۷ء
نیروبی، کینیا - ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۷ء
کمپالا، یوگنڈا - ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء
کراچی - ۲۳ر جنوری ۱۹۵۸ء
ڈھاکہ - ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء
بمبئی - ۱۱ر مارچ ۱۹۵۸ء

ہز ہائی نس آغا خان چہارم نے دنیا بھر کی سیاحت کی ہے اور آپ بین الاقوامی طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۷ء سے دسمبر ۱۹۶۳ء تک آپ نے کرۂ ارض پر بحیثیت مجموعی پچاس لاکھ میل کا سفر طے کیا ہے۔ آپ نے یہ سفر مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے اپنے معتقدین اور پیروکاروں سے ملنے کے سلسلے میں اختیار کیا۔ اس کے علاوہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپ نہ گئے ہوں۔

راجہ غضنفر علی خان

[میر نور احمد صاحب ۔۔۔ "راجہ غضنفر علی خاں کی سرگزشت کے آئینے میں" ۔۔۔ کے عنوان سے راجہ صاحب کی یادداشتوں کو باضابطہ صورت دے رہے ہیں۔ اسے ہم راجہ صاحب کی سرگزشت تو نہیں کہہ سکتے مگر نصف صدی کی سیاسی اور ملی تحریکوں کا جتنا سچا اور بے ریا عکس یہ ہے، شاید کہیں اور نہ ملے ۔۔۔ ان یادداشتوں کو کہیں کہیں سے آپ کو بھی پڑھواتے ہیں] ادارہ

مسٹر لیاقت علی خاں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس سے فارغ ہو کر جنوری ۱۹۵۱ء کے تیسرے ہفتے میں پاکستان واپس آئے۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ تک ان کی بیشتر توجہ پنجاب کے انتخابات پر مرکوز رہی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب تھا جو بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنا پر ہونے والا تھا۔ لیاقت علی اس انتخاب میں مسلم لیگ کی ٹیم کو کامیاب کرانے کے لیے پورا زور لگانا چاہتے تھے۔ عوام کے دلوں پر مسلم لیگ کے نام کا سکہ ابھی تک چلتا تھا لیکن جو جماعت مسلم لیگ کا مقابلہ کر رہی تھی وہ بھی اس نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی کی سیاسی طاقت فی الحال نظر انداز کی جا سکتی تھی۔ لیکن جناح عوامی مسلم لیگ میں جس کے ساتھ سرکاری مسلم لیگ کا اصل مقابلہ تھا چند ایسے افراد جمع تھے جو قائد اعظم کے ساتھیوں میں نمایاں حیثیت کے مالک رہے تھے۔ سہروردی، نواب ممدوٹ، پیر مانکی شریف اور میاں عبدالباری جیسے سابق مسلم لیگی بآسانی یہ نعرہ لگا سکتے تھے اور لگا رہے تھے کہ اصل مسلم لیگ تو ہم ہیں۔ اور جو پارٹی ہمارے خلاف صف آرا ہے اسے حکومت پاکستان کی تائید ضرور حاصل ہے مگر وہ محض دولتانہ لیگ ہے۔ لیکن انتخاب کے مواقع کے لحاظ سے جناح عوامی مسلم لیگ کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کے دو بڑے ستون، مسٹر سہروردی اور پیر مانکی شریف اپنے اپنے صوبے میں بے شک خاص اثر و رسوخ کے مالک تھے لیکن پنجاب کے دیہات کی برادریوں اور ان کے جتھوں کے لیے وہ اجنبی تھے۔ نواب ممدوٹ بھی پاکستانی پنجاب کے رہنے والے نہ تھے بلکہ ایک بے وطن مہاجر تھے۔

سرکاری مسلم لیگ بھی اندرونی دھڑے بندیوں کی کمزوریوں سے محفوظ نہ تھی لیکن صوبے کے زمینداروں کے ساتھ دولتانہ کے خاندانی اور ذاتی تعلقات اور ان سے بھی بڑھ کر ملک کے وزیر اعظم کی پشت پناہی نے مسلم لیگ کے لیے سازگار فضا پیدا کر دی تھی۔ لیاقت علی خان یا گورنر کے متعلق یہ بدگمانی نہ کی جا سکتی تھی کہ انہوں نے سرکاری افسروں کے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سرکاری افسر بہرحال اس انتخاب سے بے تعلق نہ رہے۔ مختلف امیدواروں کے ساتھ سرکاری افسروں کے ذاتی تعلقات بھی تھے اور چونکہ مسلم لیگ کی کامیابی کے امکانات روشن نظر آتے تھے اس لیے چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری عناصر لازماً مسلم لیگ کی امداد کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ انتخاب کے لیے مسلم لیگ کے امیدوار نامزد کرنے کا کام خاصا مشکل ثابت ہوا۔ لیاقت علی خاں کو یہ کام خود ہی کرنا پڑا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے اندر مسٹر دولتانہ کے مخالف دھڑے کو بھی کسی نہ کسی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی تاہم پنجاب میں مسلم لیگ کی قیادت کے

لیے دولتانہ سے زیادہ موزوں فرد کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اسمبلی کی تنسیخ سے پہلے نواب ممدوٹ کے مقابلہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ کے امیدوار ملک فیروز خاں نون تھے۔ لیکن وہ اپریل ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان کی گورنری کا عہدہ قبول کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ ملک فیروز خاں نون اس صوبے کے پہلے پاکستانی گورنر تھے۔ ان سے پہلے وہاں سر فریڈرک بورن گورنر تھے جو تقسیم کے وقت سی پی کے گورنر تھے لیکن انہوں نے اپنی باقی ماندہ ملازمت کے لیے پاکستان کو منتخب کیا تھا۔ سر فریڈرک ایک زمانے میں متحدہ پنجاب کے چیف سیکرٹری اور اس سے پہلے لاہور کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ یہ وہی ڈپٹی کمشنر تھے جو مارچ ۱۹۴۰ء میں خاکسار رضاکاروں اور پولیس کے تصادم میں زخمی ہوئے تھے۔ ملک فیروز خاں نون گورنری کی خاطر پنجاب کی سیاست کے میدان سے ہٹ چکے اور میاں عبدالباری اور نواب ممدوٹ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو چکے تھے لہٰذا اس صوبے میں مسلم لیگ پر قبضہ بھی دولتانہ گروپ کا تھا اور مسلم لیگ کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری بھی اسی گروپ کے سپرد کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ انتخابی حلقوں کی تقسیم کے معاملے میں بالآخر بہت حد تک دولتانہ صاحب ہی کے مشورے پر عمل کیا گیا۔

مسلم لیگ کے امیدواروں کی فہرست فروری ۱۹۵۱ء کے شروع میں شائع کی گئی۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد یعنی ۱۰ مارچ کو انتخابات شروع ہونے والے تھے۔ اس درمیانی عرصہ میں لیاقت علی خاں انتخابی مہم کے سلسلے میں پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صوبے کے لوگوں نے ملک کے وزیراعظم کو سپیشل ٹرین کے ذریعے جگہ جگہ انتخابی جلسوں سے خطاب کرتے دیکھا۔ لیاقت علی کے اس دورے نے لیگ کی کامیابی کے امکانات کو یقین میں بدل دیا۔ نئی صوبائی اسمبلی کل ایک سو چھیانوے نشستوں پر مشتمل تھی جن میں پانچ نشستیں اقلیتی فرقوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مسلم لیگ نے ایک سو نوے حلقوں میں امیدوار کھڑے کیے تھے جن میں سے ایک سو چالیس امیدوار کامیاب ہوئے۔ جناح عوامی مسلم لیگ بتیس نشستوں پر قبضہ کر سکی۔ آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی کے ہاتھ صرف ایک ایک نشست آئی۔ سولہ ایسے امیدوار کامیاب ہوئے جو کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے۔

جناح عوامی مسلم لیگ نے جلسوں اور تقریروں میں اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی تھی۔ سہروردی صاحب سرکاری مسلم لیگ کے خلاف زور دار نعرے بازی بھی کرتے رہے اور یہ شور بھی مچاتے رہے کہ دیہات میں پولیس ووٹروں پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ انہیں غالباً خود بھی اکثریت حاصل کرنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن ان کی جماعت جتنی نشستوں پر قبضہ کرنے کی توقع کر رہی تھی، اس سے بہت کم نشستیں اس کے حصہ میں آئیں۔ مسلم لیگ کی اندرونی دھڑے بندی کی وجہ سے اس شکایت کی جگہ پیدا ہوئی کہ جن مسلم لیگیوں کو انتخابی ٹکٹ نہ ملے تھے اور بعض ایسے مسلم لیگی جو دولتانہ گروپ کے ذاتی طور پر مخالف تھے۔ وہ مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کی حمایت کرتے رہے۔ بعد میں ان شکایات کی تحقیقات ہوئی اور صوبائی لیگ نے ایسے چار سو چھپن مسلم لیگیوں کی فہرست مرتب کی جنہیں انتخابات کے زمانے میں پارٹی کا ڈسپلن توڑنے کے الزام میں پانچ پانچ سال کے لیے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ ان میں دو سابق منسٹر ملک محمد انور اور سید میر احمد شاہ بھی شامل تھے۔

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے بہ آسانی مسٹر دولتانہ کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اس وقت کے حالات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب نے بالآخر سیاسی عدم استحکام کے خطرے سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اور دولتانہ وزارت اپنی عظیم اکثریت کے بل پر کسی خطرے کے بغیر اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ صوبے میں اپنا پروگرام چلا سکے گی لیکن اس کے چند مہینوں کے بعد لیاقت علی خاں کا قتل پورے پاکستان کے لیے سیاسی عدم استحکام کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور حالات کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔

۱۵ جولائی ۱۹۵۱ء کو مسٹر لیاقت علی خان نے کراچی میں ایک بیان دیا جس نے پورے پاکستان بالخصوص مغربی پاکستان میں ہلچل پیدا کر دی انہوں نے بتایا کہ بھارت کچھ دنوں سے اپنی فوجوں کو ان کے سابقہ مقامات سے منتقل کر کے بتدریج مغربی پاکستان کی سرحد کی جانب آگے بڑھا رہا ہے اور اس وقت اس کے بھاری اسلحہ رکھنے والے ڈویژن پاکستان کی سرحد سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ پاکستان کا سرحدی علاقہ ان کی توپوں کی زد میں ہے۔ لیاقت علی خان نے یہ بھی کہا کہ بھارت کی تقریباً نوے فیصد افواج اس نقل و حرکت میں شامل ہیں جو پاکستان کی جانب کی جا رہی ہے۔

آپ نے کہا کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک تار اور ایک خط بھیجا ہے اور اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کے لیے فوجی حملے کا خطرہ پیدا نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس خطرے کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملے کی حماقت کی تو پاکستان کی فوج اپنا فرض ادا کرے گی اور عوام کو چاہیے کہ وہ اعتماد ہمت اور تنظیم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں۔

اگلے ہی دن نواب ممدوٹ اور پیر مانکی شریف نے حزب مخالف کی جانب سے ایک بیان دیتے ہوئے وزیر اعظم کو یقین دلایا کہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کو حزب مخالف کی پوری تائید حاصل ہو گی اور حکومت اس سلسلے میں جو اقدامات مناسب سمجھے ان کی کامیابی کے لیے حزب مخالف ہر قسم کا تعاون کرے گی۔ بیرون ملک سے بھی لیاقت علی خان کو فوری طور پر دو پیغام موصول ہوئے ایک آسٹریلیا کے وزیر اعظم رابرٹ مینزیز کی جانب سے تھا جس میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر اور دوسرے اختلافی مسائل کے متعلق مصالحت کرانے کی پیش کش کی گئی تھی۔ دوسرا عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام پاشا کی جانب سے تھا جنہوں نے لیاقت علی خان کے نام ایک تار میں کہا تھا: "پاکستان پر حملے کی صورت میں پوری دنیائے اسلام پاکستان کی مدافعت کرے گی۔"

پنڈت نہرو نے لیاقت علی خان کے احتجاج کا جواب دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ مختلف مقامات پر متعین ہندوستانی افواج کی تعداد میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ کہا کہ یہ تبدیلیاں ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کی خاطر کی گئی ہیں ان کی پشت پر کوئی جارحانہ مقصد کارفرما نہیں ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم کے جواب میں بھی پنڈت نہرو نے کہا کہ بھارت پاکستان پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لہٰذا مصالحت کی پیش کش غیر ضروری اور بے محل ہے۔ امریکہ کے اخبار نیویارک ٹائمز نے پنڈت نہرو کے ان دونوں مراسلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پنڈت جی کا یہ بیان کہ بھارت کی فوجی نقل و حرکت اپنی سرحد کی حفاظت کے لیے ہے ایک غلط توجیہ ہے۔ وہ کون سا نیا خطرہ پیدا ہوا تھا جس کے خلاف بھارت کی سرحد کی حفاظت کے نئے انتظامات کرنے ضروری ہو گئے تھے۔ کیا سرحد کی جانب پاکستان کی فوج نے کوئی نقل و حرکت کی تھی۔ مسٹر منزیز کو جو جواب پنڈت نہرو نے دیا تھا اس کے متعلق نیویارک ٹائمز کے مقالہ نگار نے لکھا کہ بھارت کوریا کے معاملے میں مصالحت کرانے کی پیش کش کر رہا تھا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کے اور پاکستان کے درمیان تنازعہ میں کوئی مصالحت کنندہ دخل دے۔

پنڈت نہرو نے لیاقت علی خان کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بھارت ایک امن پسند ملک ہے اور وہ کسی تنازعہ کو طاقت کے استعمال کے ذریعے حل کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ بھارت نے اپنے تازہ ترین بجٹ میں دفاع کے اخراجات میں کمی کر دی ہے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے ایک طویل خط میں پنڈت جی کی باتوں کا جواب دیا۔ آپ نے کہا بھارت کی امن پسندی کے کئی ثبوت دنیا کے سامنے ہیں۔ مثلاً ریاست حیدرآباد، جوناگڑھ، کشمیر پر کس حد تک خیال۔ بھارت کے فوجی بجٹ کے متعلق لیاقت علی خاں نے بتایا کہ آپ کی حکومت کی جانب سے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق آپ کے فوجی بجٹوں کی حیثیت کی صحیح صورت حسب ذیل ہے۔

۴۹-۱۹۴۸ء کے بجٹ میں ۵۰ کروڑ روپیہ۔

۵۰-۱۹۴۹ء کے بجٹ میں ۱۵۹ کروڑ روپیہ۔

۵۱-۱۹۵۰ء کے بجٹ میں ۱۶۸ کروڑ روپیہ۔ (جس کے بجائے ۱۹۱ کروڑ روپیہ خرچ ہوا)

۵۲-۱۹۵۱ء کے بجٹ میں ۱۹۹ کروڑ روپیہ۔

پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کے درمیان خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا رہا لیکن ادھر پاکستان میں شہری دفاع کے انتظامات بھی مستعدی کے ساتھ شروع کر دیے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت نے بعض دفاتر لاہور سے دوسرے مقامات کو منتقل کرنے کے منصوبے تیار کر لیے لیکن خطرے کی جو فضا پیدا ہو گئی، اس کے باوجود لاہور کے شہریوں میں اس شہر کو چھوڑ کر دوسری جگہوں میں پناہ ڈھونڈنے کا قطعاً کوئی رجحان پیدا نہ ہوا۔

بھارتی حکومت یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی؟ تقریباً ایک سال پہلے بظاہر اس کی پالیسی لیاقت نہرو معاہدے کو کامیاب بنانے اور دونوں ملکوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے کی تھی۔ اب پاکستان کی سرحد پر فوج جمع کرنے اور پاکستان پر فوجی دباؤ ڈالنے کا مقصد کیا تھا؟ اس کا راز جلد ہی کھل گیا۔

پنڈت جی اپنے خاص مقصد کے لیے ایک طریقے کو آزما چکے تھے۔ اور اب دوسرے طریقے کو آزمانا چاہتے تھے۔ ایک سال پہلے انھوں نے اس بات کی آزمائش شروع کی تھی کہ پاکستان بھارت کی مشفقانہ اور دوستانہ پالیسی سے متاثر ہو کر کشمیر کے سوال پر اپنے رویہ کو نرم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پاکستان بھارت کی دوستی کی کس حد تک قدر کرے گا؟ کیا وہ دوستی کی خاطر کشمیر کے متعلق وہی نیم دلی کا رویہ اختیار کرنے پر راضی ہو جائے گا جو وہ جوناگڑھ کے متعلق اختیار کر چکا تھا؟ لیکن پاکستان کشمیر اور لیاقت نہرو معاہدے کے مقتضیات کو خلط ملط کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس معاہدے اور بھارت کی چکنی چپڑی باتوں کے باوجود پاکستان ہر ممکن موقع پر کشمیر کا سوال اٹھانے اور بھارت کی جارحیت طشت ازبام کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ سلامتی کونسل کی جانب سے مصالحت کنندوں کا تقرر بار بار بھارت کی بدنامی کا باعث بنا تھا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں نے دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کو اس مسئلے میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک اس مسئلے کے متعلق پاکستان کے نقطہ نگاہ کی حمایت کر رہے تھے لہٰذا پنڈت نہرو نے ایک اور حربے کو آزمانا چاہا۔ کیا پاکستان کو خوف زدہ کر کے کسی ایسی بات پر راضی نہیں کیا جا سکتا جو مسئلہ کشمیر کو دنیا کے ضروری اور فوری مسائل کی فہرست سے خارج کر دے اور دنیا کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا دے۔ اگر مسئلہ کشمیر پر جنگ کا امکان باقی نہیں رہتا تو لامحالہ عالمی امن کے نقطہ نگاہ سے اس مسئلے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

لہٰذا پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحدوں کے قریب فوج متعین کی اور اسے ہٹانے سے انکار کر دیا اور اپنے دوسرے لیڈر

خط میں اپنی امن پسندانہ پالیسی کے ثبوت میں لیاقت علی خان کو پیش کش کر دی کہ بھارت اپنے ارادوں کے متعلق پاکستان کو اطمینان دلانے کی غرض سے باہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

یہ پیش کش پہلی مرتبہ پنڈت نہرو نے ۲۴ جولائی ۱۹۵۱ء کو کی۔ جسے وہ اس کے بعد بار بار دہراتے رہے۔ لیاقت علی خان نے اس کا جواب ۲۶ جولائی کو دیا اور پاکستان آج تک اسی جواب پر قائم ہے۔ جواب یہ تھا کہ پہلے کشمیر کا منصفانہ حل کرو۔ اس کے بعد جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ایک حقیقت پسندانہ اقدام بن سکے گا۔

۲۷ جولائی کو کراچی کے شہریوں نے مدافعت کی تیاری کے سلسلے میں ایک مظاہرے کا انتظام کیا اور ایک دو میل لمبا جلوس نکالا۔ اس جلوس میں حصہ لینے والوں سے لیاقت علی خان نے ایک مکان کی بالائی منزل سے خطاب کیا اور کہا کہ پاکستان جنگ نہیں چاہتا لیکن حملہ آور کے لیے پاکستان کا مکا تیار ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا مکا ہوا میں بلند کیا۔ اور بھارت کے لیے پاکستان کا مکا وقتی طور پر ایک قومی نعرہ بن گیا۔

بہر حال پنڈت نہرو نے یہ طریقہ بھی آزما کر دیکھ لیا یہ بھی ان کے حسب منشا نتائج پیدا نہ کر سکا۔

پاکستان میں بنگلہ زبان کی حیثیت کیا ہو گی، یہ سوال قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد موضوع بحث بن گیا تھا۔ اس بحث کو ہوا دینے والوں میں مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ ہندو پروفیسر اور وکیل پیش پیش تھے۔ اور جو اخبار سب سے زیادہ اس بحث کے لیے اپنے کالم وقف کرتا رہا وہ کلکتہ کا امرت بازار پتریکا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کافی عرصے تک مشرقی پاکستان میں انگریزی اخبار پڑھنے والوں کو کلکتے کے اخباروں کے سوا اور کوئی اخبار نہ ملتا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں میں ہندوؤں کی کافی تعداد موجود تھی۔ بلکہ سینیئر پروفیسروں میں ان کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں نے لسانی زبان کے سوال کو ایک اہم سیاسی نعرہ بنا دیا۔

قائد اعظم نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد مشرقی پاکستان کے جن مسائل کا خاص نوٹس لیا ان میں زبان کا مسئلہ اور اس انتشار پسند گروہ کا مسئلہ جس نے زبان کا سوال کھڑا کیا تھا، شامل تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم نے مشرقی پاکستان کا آٹھ دس دن کا دورہ کیا اور اپنی پبلک تقریروں میں زبان کے مسئلے کے متعلق اپنے خیالات کو اور پاکستان کے ملی مفاد کے نقطۂ نگاہ کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا۔ آپ نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا، وہ اس قابل ہے کہ پاکستانیوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ رکھی جائے۔ ذیل کا اقتباس آپ کے انگریزی الفاظ کا بلا کم و کاست ترجمہ ہے جو آپ نے فرمایا۔

" کیا آپ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ بھارت کے بعض اخبار جو پاکستان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے زبان کے سوال پر آپ کے حقوق کے خود ساختہ محافظ بن گئے ہیں۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں ہے کہ وہی لوگ جو قیام پاکستان کے خلاف لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے بنیادی حق خود ارادیت کی مخالفت کرتے رہے ہیں، یکایک آپ کے حقوق کے حامی بن گئے ہیں اور آپ لوگوں کو زبان کے سوال پر حکومت سے ٹکر لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اس پانچویں کالم سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں پاکستان کی سرکاری زبان کے سوال پر اپنے خیالات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک صوبے کی سرکاری زبان کا تعلق ہے صوبے کے لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ فیصلہ اس صوبے کے نمائندوں کے، اور صرف ان کے، منشا کے مطابق ٹھنڈے دل سے غور اور سوچ بچار کے بعد کیا جائے گا۔ لیکن پورے ملک کے لیے سرکاری زبان یعنی وہ زبان جو مختلف صوبوں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ

بن سکے، ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ یہی وہ زبان ہے جسے اس برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں نے پالا پوسا ہے۔ جو پورے پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کی زبانوں کے بہت قریب ہے اور اسی زبان میں اسلامی کلچر اور روایات کا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے۔ جو لوگ زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، انہیں یہ تمام چیزیں بخوبی معلوم ہیں لیکن ان کا مقصد اس ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ بھڑکانا ہے۔ آپ کے صوبے کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے حال ہی میں کراچی سے واپس آکر زبان کے سوال پر ایک واضح بیان دیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ اگر چاہیں بنگلہ زبان کو اپنے صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کر لیں۔ اس کے بعد ایجی ٹیشن کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے بعد لوگوں نے جن کا مقصد ہی ایجی ٹیشن پیدا کرنا ہے، اپنا پینترا بدل کر یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ بنگالی کو پورے ملک کی سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے اور چونکہ وہ ان واضح دلائل کو جو پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر اردو کے حق میں موجود ہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کیا کہ اردو اور بنگالی دونوں زبانوں کو ملک کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر اس مملکت کے مختلف حصوں کو باہمی اتحاد کے ساتھ ترقی کرنی ہے تو پھر یہ بات ناگزیر ہے کہ ملک کی سرکاری زبان ایک ہی ہو اور وہ اردو ہی ہو سکتی ہے۔"

جس کانووکیشن میں قائد اعظم نے یہ دو ٹوک خیالات ظاہر کئے تھے۔ اس میں خواجہ ناظم الدین بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب کے جس بیان کا ذکر قائد اعظم کے مندرجہ بالا الفاظ میں آیا ہے وہ انہوں نے کراچی میں قائد اعظم کے ساتھ گفتگو کے بعد ڈھاکہ واپس آ کر دیا تھا لہٰذا انہیں بخوبی علم تھا کہ قائد اعظم اردو کو پاکستان کی آئیڈیالوجی کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔ قائد اعظم اور ان کے بعد لیاقت خان کی قیادت کے زمانے میں زبان کے متعلق بحث جاری رہی۔ لیکن خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد اس بحث نے یکایک ایک سخت ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ آئین کے بنیادی اصول مرتب کرنے والی کمیٹی نے کام شروع کر دیا تھا۔ دوسری اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ خواجہ شہاب الدین جن بنیادوں پر ناظم الدین وزارت کے لیے تائید و حمایت حاصل کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اس سے لازماً صوبائی عصبیت کو شہ ملی اور مشرقی پاکستان کے صوبائی مفاد کا نعرہ لگانے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن کرانے والوں نے نوجوان طلبہ کو اپنی تحریک کا ہر اول دستہ بنا لیا۔ طلبہ کو بھڑکانے کے لیے یہ آسان دلیل موجود تھی کہ اگر مرکزی حکومت کی سرکاری زبان اردو قرار پائی تو مشرقی پاکستان کے طلبہ مقابلے کے امتحانوں میں گھاٹے میں رہیں گے۔ ۱۹۵۱ء کے موسم سرما میں زبان کے سوال پر کئی مرتبہ مظاہرے ہوئے اور ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں طلبہ کا ایک جلوس پولیس کے ساتھ متصادم ہو گیا۔ مظاہرین نے وہی حرکتیں کیں جو شرارت پسند عناصر کے اکسانے پر ہر بے مہار ہجوم کیا کرتا ہے۔ پولیس کو مظاہرین پر گولی چلانی پڑی۔ کچھ گرفتاریاں ہوئیں۔ اگلے دن گرفتار ہونے والوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے جلوس نکالا گیا۔ یہ جلوس پھر بے قابو ہو گیا۔ اور ۲۲ فروری کو پھر گولی چلی۔ ۲۳ فروری کو ڈھاکہ یونیورسٹی کو غیر معین مدت کے لیے بند کر دیا۔ ڈھاکہ میں معمولی فسادات پھر بھی ہوتے رہے۔ جب گرفتار شدگان کو عدالت میں لایا جاتا تھا تو ہجوم اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور جلوس کی صورت اختیار کر کے پولیس کے ساتھ متصادم ہو جاتے تھے۔ صوبائی حکومت کی جانب سے ان دنوں جو بیان جاری کیے گئے۔ ان میں بار بار یہ کہا گیا کہ زبان کے سوال پر جو مطالبہ کیا جا رہا ہے، حکومت کا مقصد اسے دبانا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بعض

وطن دشمن عناصر اس مطالبے کی آڑ میں بد امنی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ طلبہ کو ان سے خبردار رہنا چاہیئے۔ لیکن تحریک اتنا طول پکڑ چکی تھی کہ مسٹر نورالامین کی وزارت کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی قرارداد کی صورت میں مرکزی دستور ساز اسمبلی سے یہ سفارش کرے کہ اردو کے ساتھ بنگلہ زبان کو بھی پاکستان کے آئین میں سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اور خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے اس مطالبے کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

یہ بات سمجھ میں آ سکتی تھی کہ ان دونوں زبانوں کو آئین میں مساوی درجہ دینا عملاً ناگزیر ہو گیا تھا لیکن اس سلسلے میں ایک بحث؟! دونوں زبانوں کے رسم الخط کا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسم الخط کے ذریعے دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور مملکت کے اندر ایک حد تک لسانی وحدت پیدا کرنے کا مقصد سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مسئلے کے اس پہلو کی جانب توجہ کرنے کی جرأت نہ ناظم الدین وزارت نے کی۔ نہ اس کے بعد کسی اور حکومت نے کی۔ حالانکہ مسئلے کا یہ پہلو اب بھی قابلِ توجہ ہے۔

کس کی گھات میں گم سم ہیں کرنوں کے شکاری جاگ بھی ——

کرنوں کے شکاری

اردو کے جانے پہچانے افسانہ نویس اور ناول نگار احمد سعید کا
”داغ داغ اجالا“ کے بعد دوسرا ناول
جذبۂ آزادی سے سرشار، طوفان کے تھپیڑے کھاتے ہوئے
مثبت اور منفی طاقتوں کے تصادم کی پیداوار طاقتوں کی داستان

ادارۂ فروغ اردو ——— لاہور

محمد حسین آزاد

ولادت : ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء بمقام دہلی
وفات : ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء بمقام لاہور

میرے بزرگ

میرے بزرگ دورۂ نادری میں ایران سے ہندوستان گئے تھے[1] میرے دادا (آخوند محمد اکبر) ایک مشہور قصیدے کا شعر جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی شان میں ہے، اکثر لکھ کر اپنے بستوں میں رکھتے تھے تاکہ کسی کے ہاتھ پڑے، وہ پڑھے اور ثواب عام ہو۔ وہی فرمایا کرتے تھے کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ میں ایک دروازے کی محراب پر سر بلند ہوا ہے۔ ان کا مطبوع شعر یہ تھا:[2]

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است و چہ جا است
کز زمیں تا بفلک مظہر انوار خدا است

میاں عبدالرزاق ایک فاضل (کابلی دروازے کے پاس) اسی محلے میں صاحب تدریس تھے۔ ان کے درس میں (ذوق) جا کر شریک ہوئے۔ وہیں والد مرحوم (محمد باقر) سے ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک استاد کے دامن شفقت میں ہوتی رہی۔ نیکی کی بنیاد استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ آخیر دم تک قائم رہا۔[3]

والد مرحوم کا اور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ بڑھے۔ ہر معرکے میں شریک حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔[4]

والد مرحوم نے بہ نیت وقت امام بارہ تعمیر کیا۔ ایک دن (ذوق) تشریف لائے۔ ان سے تاریخ کے لئے کہا۔ اسی وقت تامل کر کے کہا "تعزیت گاہ امام دارین" پوری تاریخ ہے۔[5]

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار[6] تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔[7] (یہ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا)

---

[1] جب مولانا آزاد ۱۸۸۵ء میں ایران گئے تو ایران کے وزیر اعظم کے نام ایک عرضداشت اجازت ملاقات میں یہ الفاظ لکھے۔ [2] سیر ایران صفحہ ۱۲۵ [3] دیوان ذوق صفحہ ۲ [4] دیوان ذوق صفحہ ۲۰ [5] دیوان ذوق صفحہ ۲۹ [6] یہ دلی کا پہلا اخبار تو ہو سکتا ہے اردو کا پہلا اخبار نہ تھا۔ [7] آب حیات

والد مرحوم نے آغازِ شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور تصنیفی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب وقت پاتے تھے تو استاد (ذوق) کا کلام ان سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ جا بجا حاشیوں میں (ذوق) بکھرے ہوئے تھے۔ اس لئے بہت احتیاط کرتے۔ تصنیف کسی کو نہ دیتے تھے البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے، جانتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی۔[1]

دلی کی صحبتیں

کابلی دروازہ کے پاس ہی (ذوق) کا مکان تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی، خیالات علمی ان فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا۔ کیا عرض کروں۔ فرمایا میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ خوں خاں۔ کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا ع

سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا۔ ہاں درست ہے ؎

آ جائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام میں گذر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ (دیوان ذوق ص ۴۳)

ایک دن میں اوج سے ملا اور استاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستے میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا ؎

یہاں جو برگِ گلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا اور استعارہ میں لا کر۔ میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو کبھی ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوتی ہوتی۔ نہ ہوتی نہ ہوتی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ

---

[1] دیوان ذوق ص ۳۶

تو جیسا تھا، مبتذل، عامیانہ اب تھا۔ متین اور شستہ، شریفانہ ہے۔

استاد کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ سا کی جگہ پانی بہایا کیونکہ بچپن سے لے کر دم واپسیں تک کا کلام انہیں میں تھا اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی، بیشتر غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

زمانہ کا الٹ پھیر

چنانچہ اوّل ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کرنے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خدا کا بندہ اقرار ہے کہ کام میں نے تیار کیا مگر با اطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق الٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے دل کے ارمان دل میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزندان روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ، بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا، ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلی بھی ایک بہشت ہے۔ انہی کا پوتا ہوں دلی سے کیوں نہ نکلوں (آب حیات)

سرگردانی

"۲۲ نیم جانوں کو لے کر شہر سے نکلا۔ وہ بھی تباہ ہو جائیں۔ مگر جب آ کر خیال دیکھا، جان ہی نکل گئی۔ ہے ہے ننھے ننھے بچے ساتھ ہیں۔ ہے ہے عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ ایک میں۔ باپ تو شہید (ہو گئے) وہ مجھے کیوں کر پائیں اور میں انہیں کیوں کر؟

سپاہی بھی چار ساتھ تھے۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑے، منت کی۔ سر سے ٹوپی اتار کر پاؤں میں گر پڑا۔ جب وہ ساتھ لے کر سکندر سنگھ کی کوٹھی میں لائے (سردار بہادر کشمیری دروازہ میں مولوی صاحب کے گھر کے قریب رہتے تھے) سردار بہادر دیکھا رہے نے رحم کیا۔ کہا۔ لے جاؤ، چھاؤنی میں ہمارے بنگلے پر۔ وہ عورتیں گھر سے کبھی نکلی نہیں۔ ان میں اکبر علی (جس کی بڑھیا ماں نے مولانا آزاد کو پالا تھا) ان میں امداد حسین (رسول پت کے رہنے والے اردو اخبار میں منشی تھے) وہ کہیں ہائے مرے جاتے ہیں۔ چلا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں بھائی ہمت کا وقت ہے۔ یہ تو اللہ کی مدد ہے۔ کہاں سردار بہادر کہاں ہیں کہاں ہم تم اور کہاں یہ سپاہی حفاظت کو۔ وہ کہیں بھائی تمہاری ہمت۔ وہ کہے تمہاری ہمت ہے۔ ہماری کہاں نہیں۔ مطلب یہ کہ اسے (آزاد کو) دو نہیں۔ آپ عورتوں میں مرد بنا کے بیٹھے رہیں اور رسالہ میں سرکار کا ساتھ ہے۔ وہ کہیں یہ کون ہے؟ یہ ادھر کیوں جاتے ہیں؟ ان کو نکالو۔ ادھر (آزاد) سپاہی کو آگے کرتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ بھاری سردار بہادر کے . . . . . حکم منہ سے نہیں نکلتا کہ سردار بہادر کا ہے۔ سپاہی کا منہ دیکھتا ہے کہ تم کہو بھائی۔

خدا خدا کر کے پہنچے۔ وہاں سردار بہادر کا بھائی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ بٹھا دو ایک طرف۔ میدان میں بٹھا دیا۔ علی نقی بیگ کی جورو (مولانا آزاد کی بہن آغا صاحب) بولی۔ ہے ہے یہاں ہمیں کہاں۔ کوٹھی تو وہ ہے وہ نکالتا سنانی ہی کہ تم ایسے اور ویسے۔ وہ نہ سمجھا یہ (آزاد) نہ سمجھا۔ گھبرا کر بولا۔ حرمت شما است۔ جائے کہ حکم فرمائید بنشینید۔ حجرۂ باشد کہ درو سر خود فرو بردہ بنشینیم۔ دعا ہا کنند۔ اس کے پاس ایک اور شخص کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ کیست؟ اس نے کہا، از کلاں سرکار ایں جا است۔ اس نے پھر پوچھا۔ ایں (آزاد) اس نے کہا۔ آغا ایشاں۔ سامنے ایک چھپر تھا۔ کہا۔ اس میں بٹھا دو۔ وہاں گھوڑے بندھتے تھے

اور بید کوئی انکا انکا نہ تھا۔ وہ چکر دم گھٹی تھی۔ اکبر علی اندر گھسا۔ پاؤں کی جگہ گرد گرد محسوس ہوئی۔ ہاتھ سے اور ٹھوکر سے ٹٹولا۔ معلوم ہوا کہ اندر لیپ ہے۔ گھبرا کر سب کو بلا کر باہر ہو۔ اندر تو یہ حال ہے۔ عورتیں ذرا کر تھم گئیں۔ ان سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کئی جھکی جھکی آئیں اور جھکی کھڑی رہیں۔ اس نے کہا جب دے جاتے ہیں۔ ایک کا منہ ایک دیکھنے لگی۔ پروفیسر آزاد نے کہا۔ جی اکبر علی بیٹھ تو تم صاف کرو۔ ایک پرانی شیشی سامنے پڑی تھی۔ وہ پیچھے سے اٹھا لایا۔ اکبر نے دیکھو تو میں کیا لایا ہوں۔ تم ذرا ان کے نوکروں سے کہو۔ جی یہ صاف کر دو۔ لے لو یہ ہے۔ اس سے خوب کسے گا۔ پروفیسر آزاد وقت ہو گیا تھا۔ میاں اکبر علی تم جب قصہ خوانی جلالی بیان کہاں۔ ارے بابا! خدا کا شکر کرو۔ غنیمت سمجھو کہ یہاں آ نکلے۔ وہ امداد حسین مل کر عورتوں کے پیچھے جا بیٹھا کہ ضعف کے مارے کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ میں یہاں حیران کو دروں کا یہ حال ہے۔ خدا جانے کیوں کیا کرنا چاہیے۔ پروفیسر آزاد نے بیچوں سے کہا۔ تم اندر جا کر دیکھو تو سہی۔ یہ نعمت الٰہی۔ یہ رحمت الٰہی۔ گھر سے اس حالت کے ساتھ نکل کر اس عمارت الٰہی کے سائے میں آنا کیا بات ہے۔ میرا منہ اس قابل نہیں یہ کہہ کر میران (مسرور اراد وہ اور گھرانے کے بھائی) کے پاس گیا اور کہا۔ فرحت شمار یاد نشستند مگر میران کار ہستم۔ پولے ندارم۔ چہ کنم۔ وہ مسکرایا اور کہا۔ ما ہم ندا ریم۔ اس (آزاد) نے کہا۔ خدا خیر کند۔ حالا ہر چہ شد صاحب فردو و دا امد و فرحت شود کر بخرام بیرم۔ اس نے کہا۔ بہر حال بیٹے کہ آپ چلا۔ انہیں خدا کے حوالے کیا۔ اس نے کہا۔ یہ بھوکی مر جائیں گی۔ خدا نے اس کے دل میں رحم دیا اس نے روٹیاں پکائیں اور دو دو روٹیاں سب کو دیں۔ اس نے وہ لے کر چار اور دو دو اوروں کو دیں۔ کہا۔ جبھی چار لائی ہیں۔ امداد حسین نے کہا۔ ان کے ٹکڑے کرو۔ دو دو آپ لو۔ ایک ایک سب کو دو۔ یہ جیب۔ بہن نے کہا۔ منہ کیا دیکھتا ہے۔ یہ انہی مولوی محمد باقر کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" واقعہ اس کی ازرہ مائل فلسفۂ الٰہیات)

سیر ایران

بندۂ آزاد خانماں برباد تباہی دلی کے بعد کئی سال تک سرگرداں پھرتا رہا۔ جب کئی برس کے بعد قسمت نے قرار بخشا اور اتنی فرصت ملی کہ اپنے حال پر افسوس کروں تو سب سے زیادہ افسوس مجھے اس کتب خانہ کا تھا جو وراثت سے میرے بزرگوں نے جمع کیا تھا اور میں نے بھی ہمیشہ اس کے بڑھانے اور آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ رنج ہر دم تازہ ہوتا تھا کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی کیونکہ نہ اسے کسی سے مروت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک نئی کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی۔

اسی رنج میں خدا سے التجا کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر گاہ خاص و عام میں آراستہ کروں اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی قسم کے ضرورت مند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ الحمد للہ کہ روز بروز کچھ نہ کچھ صورت بنتی ہی گئی۔

اس قسم کے ارادے حقیقت میں عبادت عظیم کی قسم سے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ میری کمی عمر کی کمائی ہی اس ارادہ کو پورا کرے گی۔ اس لئے سوچا تھا کہ جو کتابیں اس ملک میں نایاب ہیں۔ وہ عرب اور ایران میں ارزاں ملیں گی۔ اس لئے ایک سیاحت ان ملکوں میں کرنی چاہیئے۔ لیکن عمر گزری جاتی تھی۔ وقت مجھ جیسے محتاج شخص کو سب سے پہلے گذارے کا فکر کرنا واجب تھا۔

الحمد للہ کہ اب مئی ۱۸۸۵ء میں پنشن کی مقدار پوری ہو گئی۔ دل چاہوں سے آرزومند ہے کہ رخصت لے کر بجلی سے جلوت اور خدا سے برکت لینی چاہیئے۔ اس میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ بعض کتابیں زبان فارسی کی (مسودہ) پڑی ہیں ان کی تکمیل اس کے سوا ممکن نہیں۔

انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی جو حقیقت میں ساری عمر کی کمائی تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا۔ یہاں تک کہ جو دوست دوں کو جنون کا

تو میں پٹیالہ اور لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا۔ لیکن چونکہ اس سفر میں کئی مقاصد اہم بھی آ گئے اور خاکِ وطن کو سفر کا پیوند رکھنا فرض بھی معلوم ہوا۔ اس لئے رخصت لی۔ سا [illegible] ستمبر [illegible] - ۹ ذوالحجہ [illegible] یوم سہ شنبہ ۹ بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے (ریل) پر سوار ہو کر فرشِ خاک کو لپیٹا۔ دو دن اور رات کی [illegible] تھا۔ وہاں سے نہنگِ دخانی (جہاز) پر بیٹھ کر سطحِ آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچا۔ جہاز میں دورانِ سفر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا دموی مزاج ہوں۔ مگر شکر خدا کا معلوم بھی نہ ہوا۔ بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ شوقِ سفر اور سواریِ جہاز کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ جب جہاز چند میل ا، تب یاد آیا کہ خلل ہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟ اس وقت خیال کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

بوشہر بندرِ نامی ملکِ ایران ہے۔ کاروباری ایرانی ہمارے ساتھ ایرانیوں سے بہت زیادہ رعایت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ مجھے یہاں سب سے پہلے تو یہ بات معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے، فارسی بولتے تھے جیسے ہمارے داستان اور اس خوش ادائی سے بات کو ادا کرتے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ آٹھ دن کے انتظار کے بعد ایک ایرانی راہوار پر بیٹھ کر کاروان میں روانہ ہوا۔ کازرون تک کچھ پہاڑ کچھ میدان لپیٹ لپیٹ کر شیراز میں جا اترا۔

شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا۔ اللہ اللہ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن۔ جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند پرانی مسجدیں اور کچھ مدرسے گرے پڑے کھڑے ہیں اور رہنے والوں کی ہمتوں پر لاحول پڑھ رہے ہیں۔ ان میں نوجوان لڑکے صرف نحو، بلاغت، فقہ، اصول کی کتابیں سامنے رکھے بے مدد کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے ہیں۔ علما کتب علمیہ کی تدریس سے پرانی ہڈیوں پر آبِ حیات چھڑکتے ہیں۔

نواب مرزا علی خاں صدر ایک امیر خاندانی کی زندگانی شیراز کے لئے سرمایۂ آبادانی ہے اور ان کی مہمان نوازی اس پاک مٹی کے لئے قدیمی قبالہ ہے۔ مجھے بھی دو دن مہمان رکھا۔ باوجود دستگاہ و امارت اور پیرانہ سالی کے جب دیکھو گرد کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو طلبا پاس بیٹھے ہیں بیچ میں آپ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ . . . . کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دستر خوان بچھا۔ اٹھے۔ پہلے سجدۂ شکرانہ بجا لائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ بھی گویا ایک فرض تھا کہ ادا کر لیا۔ پھر کتابوں کے حلقے میں جا بیٹھے۔

اسی سلسلے میں حکیم حاذق حاجی مرزا حسن کا ذکر بھی واجب ہے۔ انہوں نے ایک مفصل تاریخ شیراز کی لکھ کر فارس نامۂ ناصری نام رکھا ہے اور ان کا علوِ خاندان مجھے کتابوں سے حدِ ثبوت کو پہنچا معلوم ہوا۔ . . . حکیم صاحب خبر سن کر نواب صدر کے ہاں آئے۔ باوجودیکہ میری روانگی میں ایک شب باقی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ [illegible] تھیں۔ باصرار اجازت لے کر اپنے گھر لے گئے۔ رات بھر اپنی کتاب سناتے رہے۔ مطالب پر مشورہ کرتے رہے۔ میری کتاب یادداشت نے بھی اس کے اکثر مطالب سے سرمایہ حاصل کیا۔

شیراز میں چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بکتی دیکھیں کہ ان سے لوگ سر اور داڑھیاں دھوتے تھے۔ وہ ایک قسم کی مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے۔ اس میں خوشبو کے اٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے۔ اسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہروں میں تحفے جاتے ہیں۔ گِلِ گُل اس کا نام ہے مجھے گلستان کا سبق یاد آیا ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے

جن دنوں ہم نے پڑھا تھا تو خدا جانے کیا سمجھے تھے۔ پھر ایک خیالِ شاعرانہ سمجھے رہے۔ اب معلوم ہوا کہ شیراز کا اصلی تحفہ ہے۔

جاڑے کا موسم کوہ و برف سے سر پر چلا آتا تھا۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اب اصفہان کو دیکھو اور آگے [illegible]

کی منزل ابھی دور ہے۔

رستہ آب رواں سے سیراب اور آبادیوں سے معمور تھا۔ جہاں منزل کرتا، گاؤں میں جا کر پوچھتا اور جو اہل علم ہوتا اس سے ملاقات کرتا . . . میرے پاس کھانے پکانے کا سامان نہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر کسی گھر سے روٹی مول لیتا۔ کہیں سے انڈے کہیں سے گھی۔ اشکنہ یعنی انڈوں کا قلیہ پکاتا۔ اس میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتا اور چلا جاتا۔ اس میں بہت باتوں اور تحقیقاتوں کے موقع ملتے تھے اور وہ لوگ ان کاموں میں میری مدد کرنی مہمان نوازی کا جزو سمجھتے تھے۔ جو کہ حقیقت میں فرض مذہب ہے۔ غرض بارہ دن کے بعد اصفہان میں جا اترا۔ شہر سے پہلے تخت فولاد کا میدان سامنے آیا۔ یہاں ہزاروں بزرگان دین اور دستگاہان دنیا کے اجسام بے ارواح نے شہر خاموشاں بسایا ہے۔ میر باقر داماد علیہ الرحمۃ صاحب حکمت یمانیہ نے خاک پر سو کر نام کو زندہ کیا ہے۔

یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے۔ جگہ مہینوں رہنے کی ہے مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ چلے چلو۔ طہران میں چل کر ڈیرے ڈالیں گے۔

اصفہان سے آٹھ منزل چل کر کاشان میں پہنچا۔ مخمل بافوں کی صنعت اب تک اس کے نام کو چمکاتی ہے۔ فاضل زمانی ملا محسن کاشانی علیہ الرحمۃ کا مزار اب تک مرجع خاص و عام ہے۔ تین دن یہاں رہا۔ چوتھے دن شہر قم پہنچا۔ یہاں سلطان دنیا و دین شفیع علی ابن موسیٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزار مقدس ہے اور دین و دولت و دربار شاہانہ رنگ لگا ہوا ہے۔ کئی عالم نامی و گرامی موجود ہیں۔ شیخ ابن بابویہ علیہ الرحمۃ یہاں مدفون ہیں۔ دن بھر میں کئی دفعہ ان کی قبر پر جا کر بیٹھتا اور برکت حاصل کرتا تھا۔

اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران میں داخل ہوا۔ لوگ اسے دار الخلافہ ایران کہتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ کی ہمت و برکت سے آج علوم و فنون، تہذیب اور دولت و اقبال کا دار الخلافہ ہے۔ شاہ جمجاہ نے جو سفر یورپ سے آ کر ملک و مملکت میں روشنی پھیلائی ہے تو شہر کے باہر قصر عالیشان بنا کر شمس العمارۃ نام رکھا ہے۔ اس کے پہلو میں مدرسہ دار الفنون بنایا ہے جسے یونیورسٹی کہنا چاہیے۔ عمارت کی وضع بھی انگریزی طرز پر ہے۔ اس میں فرنچ، انگریزی اور روس کے مدرس زبانیں اور فنون سکھاتے ہیں اور ایران کے نئے تعلیم یافتہ بھی مدرس ہو گئے ہیں۔

مجھے اس سفر میں سب سے بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اس سے زیادہ یہ کہ جامع لغات فارسی کے لئے سرمایہ جمع کروں۔ اس لئے جاتے ہی مطلب کے ٹھکانے ڈھونڈنے شروع کئے۔ خوش نصیبی نے پہلے شہزادۂ آزادہ معتضد الدولہ نواب فرہاد مرزا کے حضور میں پہنچایا۔ یہ صاحب علم، صاحب فضل، صاحب ہمت، حکومت کے تجربہ کار، شاہزادۂ روزگار، نائب السلطنت عباس مرزا کے خلف الرشید، فتح علی شاہ جنت مکان کے پوتے، چچا شاہ جمجاہ کے ہیں۔ ان کے علمی دربار میں ہمیشہ حسب الارشاد حاضر ہوتا تھا۔ رخصت کے وقت ایک تصویر بھی عنایت فرمائی اور دو نسخے کتابوں کے دیئے جو خود تصنیف کی تھیں یا فرمائش و تصحیح سے چھپوائی تھیں۔ فرمایا کہ کتب خانہ آزاد میں یادگار رکھنا۔

مرزا رضا خاں افشار بگشلو سے ملاقات ہوئی۔ دبیر ایران کا خطاب ہے اور دولت ایران کی طرف سے اسلامبول میں سر ترجمان ہیں۔ انہیں لغات فارسی پر عبور کامل ہے۔ فرنچ اور ترکی بھی خوب جانتے ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں کہ فارس میں فارسی خالص کا رواج عام ہو جائے۔ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان کی کوشش میری رائے ناقص سے ایک جزو میں اختلاف کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج ہی سب کو مستعد ہونا چاہیے کہ عربی لفظوں کو زبان سے نکال ڈالیں اور فارسی قدیم کو جاری کر دیں۔ میں نے کہا کہ علما کا فرقہ بالکل مخالف کار ہے اور پبلک نے ابھی ہمارے مطلب کو سمجھا نہیں۔ اگر دفعتاً کل تصنیفات اور عام کاروائی میں پابندی کے ساتھ جاری ہوئی تو پبلک گھبرا جائے گی اور حق بجانب ان کے ہوگا۔ کیوں کہ صدہا لفظ فارسی کے ہیں کہ زبان سے بالکل معدوم ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ الفاظ عربی کا رواج کر رہے ہیں۔ ہزاروں کے لئے لفظ فارسی میں ہیں مگر مستعمل نہیں۔ ہر شخص ادنے ادنے کام میں مثلاً لفظ کے لئے ڈکشنری

[illegible]

لے یہ حالت ہے نہ دیکھیں تو کام بند۔ ایسی حالت میں علاوہ کہ قومی رقیب ہمارے ہاں فتحیاب ہو جائیں گے اور ہمارے کام میں خلل عظیم واقع ہوگا۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو اور روز مرہ گفتگو جو خاص و عام کے کانوں کو اب بھی مانوس ہیں۔ جس عربی و مغلی کی جگہ اصل لفظ فارسی نہ ملے وہاں فی الحال عربی رہنے دو یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کر دو۔ جب اہل ملک کو ہمارے ارادہ کی مصلحت معلوم ہوگی اور حب الوطنی کی گرمی دلوں میں دوڑ جائے گی تو سب خود بخود ہمارے ارادہ پر متفق ہو جائیں گے۔ ہمیں اس مصلحت کے پھیلانے میں اخباروں سے بھی مدد لینی چاہیے اور شاہ کی عالی بیٹھکوں میں بھی اس غرض کو پہنچانا چاہیے۔ کیونکہ دار التصنیف شاہی میں بھی طرز عبارت کی اصلاح پر نظر ہے۔

اس کے جواب میں مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہم کو اپنے کام میں باستقلال مصروف ہونا چاہیے۔ خواہ کوئی مانے خواہ نہ مانے۔ الغرض با شاہ وزیر اور میرزا اصل اپنے دو رسالے انہوں نے کتب خانہ آزاد کے لیے مرحمت فرمائے۔

آخر جب سب سے اخیر برف پڑ چکی تو میں شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہد مقدس کو روانہ ہوا۔ ۶ منزل چل کر شہر سمنان میں پہنچا پانچویں دن دامغان کو اس سے بدتر حالت میں پایا۔ شاہرود بدتر یہ بدتر۔ شاہرود سے داہنے ہاتھ ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر شہر بسطام ہے جو کبھی حضرت بایزید بسطامی کا وطن تھا۔ جوش محبت نے ادھر کھینچا۔ بہر حال فقط بزرگوں کی زیارت کا وہاں رہ گئی۔ نیشاپور کا بڑا اقبال تھا۔ اس پر بڑا رونا آیا۔ تمام خرابی اور کھنڈر پڑے تھے۔ یہاں سے چوتھی منزل میں مشہد مقدس کی زیارت سے مشرف ہوا۔ ۲۰ دن مقام کیا۔ اکثر شاہوں اور شہزادوں کی قبریں دیکھی گئیں۔ علماء میں شیخ بہاؤالدین عاملی، شیخ حر عاملی، شیخ طبرسی رحمہ اللہ مدفون ہیں۔ ان بزرگوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی۔

ہرات کے رستہ میں ہمارا کارواں شتری تھا۔ تیسری منزل میں نیند نے مجھ پر غفلت کا شبخون مارا۔ اونٹ سے گر پڑا۔ ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ قدرت الٰہی نے جوانی کی آپ ہی جڑ کر اچھی ہو گئی۔ مگر درد اب تک موجود ہے۔ راہ مشہد اور ہرات میں جام مولانا جامی کا وطن آیا۔ ایک ویران قصبہ رہ گیا ہے۔ یہاں حضرت شیخ جام کی تربت ہے۔ شہر ہرات شاہان گذشتہ کا عیش باغ تھا لیکن ۵۰۔۶۰ برس سے اس پر ایسی نحوست کا ستارہ آیا ہے کہ سلطنتوں کے انقلاب نے کھنڈر ویرانہ کا میدان بنا دیا ہے۔ ایک عالی شان گنبد کے اندر جو اب کھنڈر پڑا ہے چھ تعویذ برابر برابر بچھے ہیں۔ ان کی منبت کاری کو مرصع کاری کہنا چاہیے۔ ان میں امیر تیمور کے کئی بیٹے اور پوتے پڑپوتے سوتے ہیں۔ وہیں سلطان حسین بایقرا مدفون ہے۔ انہی میں گوہر شاد بیگم تیمور کی بہو ہے جس کی مسجد مشہد مقدس میں ہے۔

قندھار میں پہنچ کر پانچ دن ٹھہرنا پڑا۔ وہاں رہ کر ڈاک کی جگہ ۲۰ روپے کرایہ کے دیئے اور کوئٹہ کو روانہ ہوا۔ خدا خدا کر کے ۵ دن کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ کوئٹہ میں پہنچ کر شکر خدا بجا لایا۔ دوسرے دن ایک چھکڑا کرایہ پر کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ آپ بچھونے بچھا کر اوپر بیٹھا۔ دو دن ایک رات میں سبی پہنچا وہاں سے ریل میں بیٹھ کر (جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور) حاضر خدمت ہوا۔

اپنا تجربہ

ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئے۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اترا۔ ان ملکوں کے لوگ کم علم، کم معلومات ہوتے ہیں۔ اپنی آرام طلبی اور رستوں کی دشواری انہیں ادھر کے سفر میں سد راہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے ملک کے آدمیوں کے ساتھ شوق سے ملتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ قافلہ میں پھرنے لگے۔ دستور ہے کہ اہل آبادی روٹیاں، گھی، دودھ، دہی، انڈے، گوشت، مرغیاں، قالین وغیرہ اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے لاتے ہیں۔ قافلہ والے قیمت میں کپڑا، سوئیاں، رنگ، پیتل کی انگوٹھیاں، جگنیاں، کانچ اور شیشے کے دانے دے کر خریدتے ہیں۔

ایک ترک بچہ طالب علم میرے بستر کے پاس آ بیٹھا۔ دو تنگے میرے ہاتھ میں تھے، اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس نے پوچھا۔ "در ملک شما [illegible]" ایک افغان کا بستر برابر تھا۔ وہ بولا "در ہند روپیہ کلدار است۔ فرنگی ہا آں تصویر خود را نقش می کنند" طالب علم نے میری طرف دیکھ کر کہا "چطور؟" میں نے کہا "راست می گوید۔ روپیہ ہند سہ برابر تنگۂ شما است"۔ اس نے پوچھا "تصویر چرا نقش می کنند؟" میں نے کہا "یہ سکۂ سلطنت است۔ در روے او تاریخ و نام و نشان و تصویر شاہ است۔ آں ہم تمام نیست۔ کلہ اش را نقش می کنند"۔ ترک بچہ بولا "آرے یہی سبب روپیہ را کلدار نام کردہ باشند"۔ کلدار کو کلہ دار سمجھا۔ خوب سمجھا۔ مگر غلط سمجھا۔

ایک دن میں کوکان میں چند اشخاص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک بڈھے نرقوت نے پوچھا "در ملک شما فرنگی سلطنت می کند؟" میں نے کہا "بلے" اس نے کہا "او چہ نام دارد؟" میں نے کہا "پادشاہ در ملک فرنگ پایہ تخت خود است۔ ینگی دنیا نائب فرستادہ است۔ او حکم می راند"۔ پادشاہ کا نام وقت پوچھا "آخر او چہ نام دارد؟" میں نے کہا "بعد ہر چند سال عوض می شود۔ البتہ باعتبار عہدہ و منصب او را لاٹ می گویند"۔ ایک بولا "گویا نام لات باشد"۔ ایک کچھ [illegible] میں نے کہا "بلے۔ ہمچنیں"۔ ایک اور ترک نے کہا "لات چہ معنی دارد؟" میں نے تامل کیا کہ کیا کہوں۔ دوسرا بولا "ہماں لات و منات است"۔ دوسرا بولا "فرنگ بت پرست نیست"۔ بڈھے ازبک نے کہا "آخر کافر است۔ کفر ہمہ جا یکیست۔ لات شاں ہماں لات و منات باشد"۔

اب تم خود خیال کرو۔ ہندوستان میں جو انگریزی روپیہ کے لئے کلدار کا لفظ پیدا ہوا، یہ بھی ایک عجیب اور اتفاقی ولادت تھی۔ پھر بھولے بھالے ترک نے جو اس کے لئے وجہ نکالی یہ عجیب در عجیب اتفاق ہے۔

لاٹ کو اور لارڈ کے معنوں کو دیکھو کہ ہندوستان میں آ کر الفاظ میں تغیر پیدا کیا۔ اور بعض اس کے یہاں کیا خیال پیدا کرتے ہیں؟ پھر اس ازبک کو دیکھو کیا سمجھا اور دلیل کیا خوب پیدا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلیت الفاظ کی تحقیق بہت نازک کام ہے۔ قیاس دوڑانا بہرحال ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ اندھیرے میں تیر پھینکتے ہیں۔ لگا تو لگا ورنہ [illegible]۔

سخندانِ فارس

مجھے ان زبانوں کی (فلسفی تحقیقات) کا شوق نہیں، جنون ہے۔ لڑکپن میں ہی لفظوں کے حروف کو زیر و زبر اور الٹ پلٹ کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں تھوڑی تھوڑی معلومات بھی پیدا کیں۔ بڑی کوشش سے ژند، پہلوی اور دری کی کتابیں جو مل سکیں بہم پہنچائیں۔ ابھی کے لئے بمبئی گیا۔ پھر ایران تک سفر کیا۔ موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ فائدہ بہت کم حاصل ہوا۔

اہل یورپ نے اس تحقیقات کو بہت پھیلایا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ دور دور کے لوگ تو کوشش کریں اور ہم اپنے پیارے وطن اور عالی خاندان بزرگوں کی زبان کی طرف سے بے غرض اور بے پروا رہیں۔ جو کچھ آزاد کی ناتمام تحقیق نے پیدا کیا اور تلاش میں دانہ دانہ چن کر سرمایہ بنایا ہے قلم کی معرفت کاغذ کے حوالے کرتا ہے۔ یہ [illegible] صاف امانت دار ہے دیانت سے اہل طلب تک پہنچا دے گا۔

دربار اکبری

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور [illegible] کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ [illegible] پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں

[illegible] بخارا میں چاندی کا سکہ ہوتا ہے۔ [illegible] افغان کا مطلب یہ تھا کہ تصویر کے [illegible] بت پرستی ثابت کرے اور ترک بچہ کے خیالات اسلامی کو [illegible] روپیہ کی بدولت [illegible] وہ بھی جان گئے تھے۔ [illegible]

تو پوچھو۔ وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دیدیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ رہا ملکہ رہا ہے مگر اکیلا ہے کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے؟ جو ہم سے ہو سکتا ہے ہم بھی کریں۔ میں درماندہ عرض کرتا ہوں کہ میرا کام سوا خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد۔ چار بجے ہیں۔ صبح قریب ہے۔ وقت تو قبول کا ہے۔ اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے

(۲۰، مارچ ۱۹۰۳ء)

عجب تماشا ہے۔ آفرینش کا خمیر تو یہ اور تصنیفات کے مضامین دیکھ کر۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نیچری کہتے ہیں۔ اں بابا نیچری ہوں۔ مگر علی کا نیچری ہوں ؎

من نمی گوئم ولیکن از تو نیچر پیداست   آنکہ می گوئند خدایست یا امیر المومنین

آبِ حیات

مجھے یاد ہے اور میرے ہمدرس بھائیوں کو یاد ہوگا کہ جب دلی کالج مرحوم زندہ تھا اور میری تحصیل اس کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی تھی تو ڈاکٹر بوٹ صاحب کمشنر مدارس کلکتہ سے تشریف لائے۔ جب کالج میں آئے تو میری جماعت کا بھی جزوی سا امتحان لیا اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ تم مدرسے سے نکل کر کیا کرو گے۔ ایک ایک نے اپنا خیال بیان کیا۔ اے میرے پیارے اہلِ وطن! تمہارے آزاد کی زبان سے اس وقت بھی یہی لفظ نکلا کہ تحصیل علوم کروں گا اور جو کچھ خیالات ہیں اور ہوں گے انہیں اپنے اہلِ وطن میں پھیلاؤں گا۔ جب سے اب تک مجھ پر اور میری طبیعت پر ہزاروں انقلاب گذر گئے۔ مگر الحمد للہ وہ ارادہ بدستور قائم ہے اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ وہ قائم رہے ؎

گوہر مخزن اسرار ہماں است کہ بود   حقہ مہر بداں مہر و نشان است کہ بود
گرچہ یکساں شدہ با خاک بہ ہجر تو تنم   ہمچناں دیدہ براہت نگرانست کہ بود

دنیاوی ترقیوں نے بہت شاندار آرائش و آسائش کے درجے پیش قدم دکھائے مگر اسی ارادہ کی محبت تھی جس نے تعلیم کے سلسلے سے مجھے نہ نکلنے دیا۔ اور ہرگز کسی علمی یا مالی عہدہ کی طمع دامن گیر نہ ہوئی ؎

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے
مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لینا

اکثر ذوق شوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گیا۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا۔ لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے، جاگتے، سوتے بچوں کے خیالات میں دن مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوتے۔ جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوتے۔ خیر۔ میرے پیارے اہلِ وطن! تمہاری خدمت نہ کی تمہارے بچوں کی خدمت کی۔ مگر کاش وہ دن جو میری عمر کی فصلِ بہار تھی، طبیعت جوان تھی، جوش ٹپکتے تھے۔ مضامین برستے تھے۔ اور رنگ اڑتے تھے، ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے، ملک کی صلاح و اصلاح ہوتی، گورنمنٹ کے مقاصد پورے ہوتے، تمہاری نظر سے گذرتے، تم خوش ہوتے اور میرا دل خوش ہوتا۔ لیکن بندگی بیچارگی۔ آخر نوکر تھا۔ وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اے اہلِ وطن! میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں۔ جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے لکھتا تھا اور رکھتا جاتا تھا۔ انہی میں سے یہ اوراق پریشان نکلے اور آبِ حیات کا جام بن کر

تمہاری ضیافت طبع کے لئے حاضر کیا۔

اب افسوس ہے اور افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ دل و دماغ فرسودہ ہو گئے۔ اب ہمت کچھ نہیں ہے۔ آخر کہاں تک۔ محنت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کئی کتابیں اور رسالے ہیں مگر مسودے دھرے ہیں۔ کئی نا تمام پڑے ہیں۔ بہت سے خیالات دل کے دل ہی میں گرہ ہیں۔ اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں۔ کیا استاد مرحوم نے میرے ہی لئے کہا تھا ؎

جو حسرت ہے وہ دل کی آرزوؤں میں کہاں اس کو
نہ وہ زیر فلک نکلے نہ وہ زیر زمیں نکلے

میرا مذہب

مذہب کے معاملے میں میرا ایک خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک۔ سنی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنہوں نے لیا حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں حق اوروں کا تھا۔ ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں! لینے والے موجود ہیں؟ نہیں! طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں! اچھا۔ جب یہ صورت ہے تو آج تیرہ سو برس بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائے۔ دنیا مزرعۃ الآخرہ ہے۔ اس کا وقت کار ہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا الجھے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور؟ بہت خوب۔ تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انہوں نے صبر اور سکوت کیا۔ پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت کرو۔ زبانی بد گوئی اور بد کلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے اور کیا انسانیت ہے کیا تہذیب ہے اور کیا حسن خلق ہے؟

تیرہ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے اس میں خوبی کیا ہے؟

میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوش طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آ گئیں لاکھوں خون بہہ گئے۔ خیر۔ اب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی اوپر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنائیت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے؟ اور دیکھو اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کرتے ہو وہ سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا سو نصیب ہوا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم تیرہ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو۔ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے آثار میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور مسکین فرقے میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہو جاتے ہیں۔ بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روزگار جاتے ہیں۔ دوستیوں سے مناقشے ہو جاتے ہیں۔ آئندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دیں گے کہ جوش محبت میں مخالفوں کے لئے حرف بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے لئے صرف اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے کہ عجب جوش محبت ہے جو لفظوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور عجیب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی ہم کریں اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں تو کیا اطاعت اور پیروی ہے؟

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے؟ ایک اتفاقی اثر ہے۔ تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اس طرح بالعکس۔ کیا

ہو کر جو چیز نصیبوں سے جاتی ہے وہ کاسب کو جائے؟ یہ بات کیوں کر چل سکتی ہے۔ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص تمہارے رستہ پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے تو احسان مند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے اور بے خبر ہے تو ناہے واجب الرحم ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ دو۔ جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو۔ غصہ کیا اور جھگڑا کیا؟

میرے باکمال دوستو! میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ اس میں صرف دشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو اس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے اور ان شیطانوں کی جمعیت ہو جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں کہ بات تو نہیں سمجھتے مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں۔ رستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے، مل جل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے۔ ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف اٹھاؤ گے اور ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے بدمزہ ہو جائے گی۔

مذہب کے معاملہ میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں دو فرقے ہیں اور ان میں بھی سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی میاں بیوی ہوتے ہیں کہ مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا، بولنا، رہنا، سہنا سب ایک جگہ۔ مذہب کا ذکر ہی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں، ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے۔ باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک گرجا آیا وہ وہاں اتر پڑا۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجے کو چلا گیا۔ گرجا ہو چکا وہ بگھی میں سوار ہو کر پھر رفیق کے گرجے پر آیا۔ اسے سوار کر لیا۔ گھر پہنچے۔ پھر وہی ہنسنا بولنا، کاروبار۔ اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں کیوں نہ گئے جہاں ہم گئے تھے۔

درسی کتابیں و دیگر تصنیفات

(۱) اردو کی پہلی کتاب سلسلۂ قدیم (۲) اردو کی دوسری کتاب سلسلۂ قدیم (۳) فارسی کی پہلی کتاب (۴) فارسی کی دوسری کتاب (۵) اردو کی پہلی کتاب (۶) اردو کی دوسری کتاب (۷) اردو کی تیسری کتاب (۸) اردو کی چوتھی کتاب (۹) قصص ہند حصہ دوم (۱۰) ترجمہ عربک نارمل کورس (انگریزی) (۱۱) جامع القواعد (۱۲) فارسی قواعد (۱۳) اردو قواعد (۱۴) ترکی قواعد (۱۵) عربی قواعد (۱۶) قواعد فارسی برائے مڈل اسکول (۱۷) آئینۂ صحت (۱۸) نصیحت کا کرن پھول (۱۹) قند پارسی (۲۰) آموز گار (۲۱) کاوشات عرب (۲۲) تذکرۂ علما (۲۳) حکایات آزاد (۲۴) شہزادہ ابراہیم کی کہانی۔ (۲۵) لغت آزاد (۲۶) جغرافیۂ پنجاب (۲۷) آب حیات (۲۸) بیاض آزاد (۲۹) جانورستان (۳۰) خمکدۂ آزاد (۳۱) دربار اکبری (۳۲) دیوان ذوق مرتبہ آزاد (۳۳) ڈرامہ اکبر (۳۴) رسائل سپاک و منک (۳۵) سیر ایران (۳۶) فلسفۂ الٰہیات (۳۷) مجموعۂ نظم آزاد (۳۸) مکتوبات آزاد (۳۹) نگارستان فارس (۴۰) سخندان فارس (۴۱) نیرنگ خیال

(مرتب: محمد عبداللہ قریشی)

جارج برنارڈ شا

۱۸۵۶ ۱۹۵۰

عالمِ بے خبری بچپن بھی کیا عالم تھا، خواب ہی خواب تھے، حقیقت جیسے کہ بہت معدوم سی۔

مجھ سے بچپن میں جو سلوک روا رکھا گیا وہ بالارادہ تھا۔ نہ مجھے لاڈ پیار کیا گیا، نہ میری کسی طرح دستگیری کی گئی۔ جس کسی نے جو برتاؤ بھی کیا، وہ دنیا سازی کا نہ تھا۔ کسی نے مجھے دنیا کے حیران کن عجوبے دریافت کرنے سے نہ روکا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کی نظروں میں یوں ہی ہوں جو حقیقت میں ہوں، ایک ننھا سا ناپسندیدہ جانور۔ یہ بات جاننے کی کسی کو فکر نہ تھی کہ میں کیا کچھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ مجھے خود بھی علم تھا کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔ خود اور خود داری تو دور کی بات ہے۔ مجھے اپنی تمام تر داخلی قوتوں کا احساس بھی خارجی دنیا کے ذریعے ہی ہوا جیسے دوسروں میں یہ موجود تھیں۔ میں تا اوائل تعلیم جہالت کی حد تک شرمیلا اور بزدل ہی رہا۔

میری زندگی نہایت تیزی سے گزر گئی۔ جو شخص میرے قریب نہیں آیا میں بھی اس سے بہت کم ملا۔ بیوی کے علاوہ میری اور کسی سے رفاقت نہیں ہوئی۔ ایسا وصال بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ شدید لیکن مختصر۔ پل بھر میں بے تکلف ہو جاتا ہوں اور آدھ گھنٹے میں سب بھول جاتا ہوں۔

مجھے عام پبلک کو خطاب کرنے کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا میں جب ننھا سا تھا۔ باپ مجھے گھمانے پھرانے کے لیے انگلی پکڑ کر لے جاتا تھا اور جب میں چلتے چلتے تھک جاتا تو وہ مجھے گود میں اٹھا لیتا۔ ایک شام گھاٹ پر ہمیں موسلا دھار بارش نے آ لیا۔ ہم ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ میرا باپ مجھے اٹھا کر لے گیا۔ اس عمارت پر اشتہار لگانے والوں نے اشتہاروں کا لیپ کر رکھا تھا۔ میں اپنے باپ کے کندھے پر چڑھا یہ اشتہار بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ سارے جنوبی علاقے کے عوام لکھنے پڑھنے سے نا آشنا تھے۔ وہ نقطے جتنے چھوٹے بچے کو پڑھتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ معجزے سے کم نہ تھا لیکن میری یہ حرکت دکھاوے کے لیے نہیں تھی۔ میں تو یہ خیال کرتا تھا کہ جب مجھے چھپی ہوئی چیز دکھائی گئی ہے تو مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے ویسے بھی یہ میرا فرض ہے کہ میں اسے سبق کی طرح بلند آواز سے پڑھوں۔

مجھے اپنے باپ کی اس عادت سے الجھن تو ہوتی تھی کہ جب ہمیں گھر جانا ہوتا تو وہ ڈرائیور کو اس طرف موڑنے کی ہدایت دیتا۔ لیکن یہ بات اتنی بے ہودہ نہ تھی جتنی بظاہر دکھائی دیتی تھی کیونکہ سب لوگ ہمارے گھر کا راستہ جانتے تھے۔ میں تمہیں کئی سال کے قصے اسی لیے نہیں سناتا کہ شاید تمہیں خیال ہو میں اپنی ماں کے رحم سے جوان ہی پیدا ہوا ہوں۔

میں معاشرتی دستور العمل سے بے خبر ہونے کی بنا پر دوستانہ محفلوں میں بے تکلف نہ ہو سکا۔ اس لیے بے حد شرمیلا اور سبھی رکھ رکھاؤ جانے بغیر بنا رہا۔

[illegible] میری ماں جس کی پرورش ملکہ وکٹوریہ کی طرز پر ہوئی تھی اتنی رحمدل تھی کہ وہ کسی بچے پر اپنی طبیعت کے خلاف زیادہ سختی نہ کرتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ بیشتر بچے سلیم الفطرت پیدا ہوتے ہیں، اور اسے جو تربیت حاصل ہوئی تھی، وہ یہی تھی۔ بہرنوع اس نے ہمیں کچھ نہ سکھایا بلکہ ہماری علاحدہ ہی [illegible] گالیا۔ اس کے نتائج کا اندازہ تم اچھی طرح لگا سکتے ہو۔

کاہلی کا الزام

(کسی نے مجھ پر سست ہونے کا الزام لگایا ہے۔ ... میرا کلرکی جاری ملازمت اختیار کرنے کا واحد سبب مالی احتیاج ہے مجھے اس میں کھیلی حاصل کرنے کے لیے انتظار کرنا آتا ہے لیکن اس عرصہ میں ہوا یہ کہ زندہ رہنا نہیں آتا۔ میرے گھر والے مصیبت میں مبتلا ہیں ہو سکتا ہے کہ مجھے ادبی اہلیت کے بارے میں دھوکا ہوا ہو۔ بہرصورت اگر آدمی کو اس کے ذریعے حلال روزی نہ مل سکے تو فنون لطیفہ سے بے نیاز ہونا مناسب ہوگا۔ مثلاً میں جنگ کے کاروبار کو مصنف بننے پر ترجیح دوں گا۔ میں مزدور قلم کار بننے کی بجائے اور سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

اب تک میں نے مخلص دوستوں کی نصیحتوں کی اس قدر پروا نہیں کی یہی وجہ ہے کہ میں نکما آدمی کی حیثیت سے بدنام ہو گیا ہوں۔

انمل بے جوڑ شادی

(جب شا کی بیوی ماریَن اس کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر ایک شخص ڈگلس کے ساتھ امریکہ بھاگ گئی تو اس کی آگ بہت بری بھڑکی)

میں نے ماریَن سے شادی کر کے اپنے طبقے سے بے وفائی کی۔ ... مجھے کسی حد تک یہ خیال تھا کہ میری ابتدائی تربیت نے مجھے جتنی تہذیب کا آشنا کر دیا ہے وہ جتا دوں۔ یہ بات مجھے آسانی سے مزدور طبقہ کی لڑکی میں نہ مل سکتی تھی۔ ماریَن کا ایسا ہونا فطری تھا۔ مجھے جلد پتہ چل گیا کہ اس میں بیگم بننے کا شوق تو ہے لیکن جمالیاتی حس قطعاً مفقود ہے۔ جن باتوں کی خاطر میں نے مل کی لڑکیوں پر ترجیح دی تھی مل میں کام کرنے والی کوئی لڑکی ان باتوں میں میرے معیار سے اتنی کم تر نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محبت نے مجھے نہایت لغو کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ ... میں نے گھٹیا ذات کی عورت سے شادی کر لی۔

(۹ ستمبر ۱۸۸۵ء کے ایک خط میں مس لوکٹ کے ساتھ عاشقانہ بے تکلفی کا اظہار کیا) تم نے اس وقت یہ محسوس نہ کیا کہ اب تم جوان ہو گئی ہو اور مجھ میں سہارے کے لیے پکڑنے والی ڈوریاں تمہارے ہاتھ سے نکل کر سونے کی زنجیروں میں تبدیل ہو کر میرے کندھوں پر آ پڑی ہیں۔ جب تم نے جنگلے کے قریب پہنچ کر آہستہ سے مڑ کر دیکھا اور آگے جھکنے میں تامل کیا تو تمہیں دیکھ کر کوئی دیوانہ ہی اطمینان کر سکتا تھا۔ پھر میرا ذوقِ حسن ہے، اس لیے نہ رکا لیکن اس ادا نے ایک عجیب حرکت کی۔ مجھ میں امید و بیم کی حالت پیدا کر دی۔ یہی تو عورتوں کا وہ کرشمہ ہے جو مردوں کو متاثر کرتا ہے۔ تم نے مجھے اس کا پہلے کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ ... تم جو کہو گی مجھے اس کا پہلے سے یقین تھا میں نے تمہیں تکلیف پہنچا کر بدلہ لے لیا۔ تم نے مجھے خوش کرنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہا میں نے اس کا فقط جواب دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کیا اس لیے مجھے معاف کر دینا۔“

ایک اتوار کو شام کے وقت لیکچر دینے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ہیمر سمتھ کی دہلیز سے قدم رکھا تو میں مورس کو الوداع کہنے کے لیے مڑا۔ اس وقت وہ کھانے کے کمرے سے ہال میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے دیکھ کر اس کے خوبصورت لباس اور حسین

صورت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں سے رضامندی ظاہر کی۔ مجھے فوراً احساس ہیں عارفانہ نسبت قرار پا گئی ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب تمام مالی مشکلات کافور ہو جائیں گی اور میری اپنی حالت افلاس کی غلاظت سے پاک ہو جائے گی کیونکہ مجھے نیم شعوری طور پر اپنے جینیئس ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔

آرچر نے مجھے پر زور مشورہ دیا ہے کہ میں اپنے ان ابتدائی ناولوں کو نیست و نابود ہو جانے دوں گویا آغاز ایک غلط دانے سے ہوا ہے اگلے روز میں نے سی ریڈیل کے کالموں پر نگاہ دوڑائی اس سے پہلے اتنی بے چارگی اور ناشائستہ خرافات دیکھ کر میں ایک لمحے کبھی اندھا نہیں ہوا تھا۔

میرے خیال میں اس ناول میں کوئی ایسی کام کی چیز بھی نہ ملے گی جو غوطہ لگا کر باہر نکالنے کے قابل ہو۔

ذہنی ترقی جسمانی زوال میں پانچ منٹ کے لیے تو اتنا جوان ہو سکتا ہوں جتنا تم ایک ہفتے کے لیے لیکن بیس یا تیس سال پہلے ہو سکتا تھا اب نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے جو خیالات پہلے قطعاً واضح نہ تھے اب بالکل واضح ہیں۔ جہاں میں بڑھ رہا ہوں وہاں زوال پذیر بھی ہو رہا ہوں۔ یہ زوال جسمانی ہے جس میں میری قوت یادداشت مرا اعتبار سے اتنی کم ہو رہی ہے کہ مجھے شکست دے رہی ہے حتیٰ کہ وہ جلد میری موت کا باعث بن جائے گی۔ جب انسان بڑھاپے کی وجہ سے مرتا ہے تو وہ جسمانی ذہنی بچوں کو بھی مار دیتا ہے جن کا وہ حامل ہوتا ہے۔

اخباری زندگی کا خاتمہ امریکہ میں برنارڈ شا کے ڈرامے دی ڈیولز ڈسائپل "THE DEVIL'S DISCIPLE" کی بے پناہ کامیابی ہوئی جب اس کے دن پلٹے تو اس نے سیٹرڈے ریویو "SATURDAY REVIEW" کی ملازمت چھوڑتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۸۹۸ء کے شمارے میں الوداعی نوٹ لکھا)

میں یہاں بے بس پڑا ہوں میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں میری حیثیت زیادہ سے زیادہ سٹراسبرگ STRASBOURG کی اس بطخ کی سی ہے جس کا ایک پاؤں کیل کے ذریعے فرش سے جکڑ دیا گیا ہے۔ مجھے شدید ترین احساس اس چوٹ کا ہے کہ تقریباً چار سال سے میں تھیٹر کا غلام بن گیا ہوں۔۔۔ مجھ میں ان حالات کا ذکر کرنے کی ہمت نہیں۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کا پہلے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میرے پاس ان چار برسوں میں ڈرامے پر تنقید کرنے اور اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ آئندہ کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔ میں آئندہ تھیٹر کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ یہ موضوع ختم ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ میرا بھی خاتمہ ہے۔

تاہم قوموں کی رنگ رلیاں کہیں نہیں بھولنی چاہئیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگانی حسین ہوتی ہے ان کی ایک قطار باری باری میرے بستر کے قریب آ کر میری غمگساری کے لیے چوکی میں کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ اسے یقین دلاؤ کہ میرے تنقیدی مضامین کا سلسلہ بند ہونے کے بعد ان کی شمع حیات گل نہیں ہو جائے گی۔ میں ہر ایک کو وہ پھول پیش کروں گا جو میرے پیش رو نے مجھے ودیعت کیا ہے۔ اور انہیں یقین دلاؤں گا کہ سمندر میں اب بھی اتنی ہی مچھلیاں موجود ہیں جتنی اس سے باہر نکالی جا چکی ہیں۔ نئی پود دروازے پر دستک دے رہی ہے اور جو نئی

وہی جاؤ بستہ ہوں تو بے نظیر میکس (۱۸۹۸ء) شوخی سے اندر داخل ہوتا ہے جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے میکس گراں کی طرف سے بات کرنے و
ما ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ اور اب میں آرام کی نیند سونے چلا ہوں۔"

ی کی جدائی

اپنی بیوی کے مرنے کے بعد شا نے ۱۴ جولائی ۱۹۴۴ء کو ایک خط میں لکھا۔

"میں یہاں مجبوراً زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لندن بھی تب جاتا ہوں جب بے حد ضروری ہوتا ہے کار روڈ سے اور اپنے معاملات سلجھانے کیلئے اور ان میں سے جتنے ممکن ہوں ختم کرنے کے لیے۔ بالفاظ دیگر اپنی جائداد سے حتی الوسع چھٹکارا پانے کی خاطر۔ مسز نے اپنے پیچھے میرے لیے ۰۰۰۰ ۵ پونڈ چھوڑے ہیں۔ ان سے میری دولت میں رتی برابر بھی اضافہ نہیں ہوا۔ میں نے اس میں سے بیس ہزار پونڈ کی رقم ٹیکس کی صورت میں اور دیگر اخراجات پورے کرنے کے سلسلے میں ادا کر دی ہے۔ یہ جنگی ٹیکسوں کے علاوہ ہیں جو بے پناہ ہیں۔ میرے لیے یہ قطعاً باعث تکلیف نہیں حالانکہ اس نے میرے ہاتھوں ادبی کام کو نسبتاً بڑھا دیا ہے۔ دوسرے لوگ تو اسّی برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ میں ریٹائر نہیں ہو سکتا بلکہ جیسے جیسے نوّے کے قریب پہنچوں گا مجھے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ہوگا۔ میں اپنی آئرلینڈ والی جائداد قوم کے نام کر رہا ہوں۔ جو اسے لینا نہیں چاہتی۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے اور اب آئرش کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہی اس معاملے کا واحد حل ہے۔ کاش یہ جائداد کارلو کی بجائے قفقاسیہ میں ہوتی تاکہ [illegible] مجبور کر کے اسے لپک کر دبوچ لیتے۔

میں ہر روز درجنوں غلطیاں کرتا ہوں۔ سر چکرانے کی وجہ سے ٹانگیں لڑکھڑا جاتی ہیں۔ لیکن میں اپنی عمر کے لحاظ سے جسمانی اور ذہنی طور پر کامل تندرست ہونے کا والہانہ تاثر برقرار رکھتا ہوں۔ لیکن یہ محض اداکاری ہے۔ مسز ہمیشہ شکایت کیا کرتی تھی کہ تم ایکٹنگ کرتے ہو۔"

وصیت نامہ

میری آرزو ہے کہ میری لاش جلا دی جائے اور راکھ میری مرحوم بیوی کی راکھ میں اس طرح ملا دی جائے کہ اس سے الگ نہ ہو سکے۔ وہ گولڈرز گرین کی آتش گاہ کے پاس ہے۔ ہم چھتیس برس ایوٹ سینٹ لارنس میں رہے ہمارے گھر کے باغ میں ایک خاکدان ہے۔ میری راکھ اس میں بند کر کے رکھ دی جائے یا بکھیر دی جائے بشرطیکہ میرے متولی اسے بانٹنے کا کوئی اور موزوں طریقہ اختیار نہ کریں۔ ذاتی طور پر میں باغ کو خانقاہ پر ترجیح دوں گا۔

چونکہ اس وقت میرے تمام مذہبی اعتقادات اور سائنسی نظریات تخلیقی ارتقاء کے نظریہ کو ماننے والے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اس لیے میری خواہش ہے کہ میری کسی قومی یادگار یا فن پارے یا عبادت یا دعا یا رسم جنازہ وغیرہ سے یہ ظاہر نہ ہو کہ میں نے کسی منظور شدہ کلیسا یا فرقہ کے اصول اپنائے تھے نہ ہی میرے لیے صلیب یا کسی دوسرے آلۂ اذیت یا خونی قربانی کی علامت اختیار کی جائے۔

تلخیص و ترجمہ۔ احمد سعید

ابوالکلام آزاد

ولادت ۔ ذوالحجہ سنہ ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء

وفات ۔ ۱۹۵۸ء بمقام دہلی

ذیل میں جو کچھ درج کیا گیا ہے یہ مولانا کی مختلف تحریرات سے ماخوذ ہے۔ اسے سمندر میں سے ایک قطرہ سمجھنا چاہیے۔ زیادہ کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ بہرحال انتخاب میں مولانا غلام رسول مہر کے مشورہ سے تین حقیقتیں بطور خاص پیش نظر رہیں:

۱۔ جو چیز لی جائے، صاحب تحریر کی انفرادی زندگی کے کسی حصہ کا نقشہ ہو۔

۲۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے اس کی حیثیت خاص بلند ہو۔

۳۔ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کو مستقل حیثیت سے فائدہ حاصل ہو۔ (محمد عبداللہ قریشی)

در مجلس وصالش نہ باشید مرداں
چوں زر سرو آمدے در حجرہ ماندہ

فیروز بخت یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے فیروز بخت تاریخی نام رکھا تھا اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔ ع

جواں بخت و جواں طالع جواں باد

سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی پر عمر عزیز شورشوں اور مشغولیوں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی، یہ عمر جو شاید باقی ہے وہ بھی اور وقت آنے میں ختم ہو رہی ہے۔ منزل مقصود کا پتا ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی و منزل پیمائی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پاؤں میں درماندگی ہے تو قدم میں رہروی کی راستی۔ دشت میں کاروان طلب نے آنکھیں کھولیں، دور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور اور نشان منزل گم، کیسہ زاد خالی اور سر و سامان کا پتا نہیں۔ وقت جا چکا اور جو آن پہنچا ہمت و قفس سے دوری اور منزل راہ سے مجبوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس مل جائے پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی اور وہ قافلہ امید کب پس ماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

وہی باہم بسر ہو رہی تھی اور بجز اس خاص کا معاملہ تو نہیں کہ اس کی فضیلت ہو سکے، البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض وجوہ تسمیہ و وجوہ اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے مندی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پوری اترے ۔۔۔۔۔

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے سلام علی نجد و من حل بالنجد نجد اور نجد کے نازنین پر سلام و رحمت نازل ہو مگر وطن مادری سرزمین طیبہ و ہجرۃ سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے، قبلۂ عبادت گزاران عشق و کعبۂ نیازمندان شوق اعلیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ۔

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نمائی خوانمش
رو سوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم کن فی الدنیا کانک غریب ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کا ایک ہی مستقر و موطن در پیش، البتہ کسی کے لیے ساءت مستقرا و مقاما میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لیے حسنت مستقرا و مقاما

مولد و منشاء مولد و منشاء و طفولیت وادی غیر ذی زرع "عند بیتک المحرم" ہے یعنی مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و کرامۃ، محلہ قدوہ متصل باب السلام۔

بلاد بہا نیطت علیّ تمائمی
و اول ارض مس جلدی ترابہا

یہ وہ وادی ہے جہاں میری گردن میں تعویذ ڈالے گئے یعنی جہاں بچپن کا زمانہ گزرا ہے اور یہی وہ زمین ہے جس کی خاک کو سب سے پہلے میرے بدن نے چھوا۔

اس وقت کہ رشتۂ عمر قریب الاختتام ہے قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا۔

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعبا
فقلت وھل قبل الثلاثین ملعبا

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تیس سال کے بعد بھی کھیل کود کا موقع ہے؟ میں کہتا ہوں کہ کیا تیس سال سے پہلے بھی کوئی کھیل کھیلا جا سکتا ہے؟ قریب ہے چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید از منزل آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

(تذکرہ)

ماحول اور خاندانی روایات میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ متعصب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر ادھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں وہ بھی سر تا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ خاص تعصب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے

پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیار عقائد و فکر پر پورے اتر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس دروازے سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے، میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن میری سوسائٹی اوائل عمر میں گھر کی چار دیواری کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علا کوئی دوسرا اگر وہاں تھا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے یا [illegible] کے پیچھے بیٹھتے اور مؤدب ہو کر بیٹھے رہتے۔ یہ فضا صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اسے گہری کرتی رہی۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر ان کا مجمع رہتا مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں۔ وہ مجھے کچھ سنانے کی گستاخانہ جرأت کب کر سکتے تھے۔

قدیم تعلیم کے مدارس

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسی تعلیمی زندگی بہرحال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس میں طبیعت کو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسے یعنی مدرسہ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابل وقعت تھی بھی نہیں اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے تقرر کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ البتہ اس کے بعد قدم نکلے اور [illegible] سے باہر تک پہنچے لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جب کہ طالب علمی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔

فرسودہ نظام

پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا، جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں، اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں۔ ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم جسے فن تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے سرتاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریق تعلیم کے اعتبار سے ناقص، درس و مطالعہ کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔ اگر فنون عالیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں۔ علوم دینیہ اور معقولات۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے، اس سے ان کتابوں کے مطالب و عبارات کا علم ہو جاتا ہے لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تاریخ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالانکہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنون ریاضیہ جس قدر پڑھائے

جو موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے ہیں نے اپنے شوق سے جامع ازہر تک مصر کے نصاب تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتب معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی۔ ع

اے طبل بلند بانگ در باطن ہیچ

سید جمال الدین اسد آبادی نے جب مصر میں کتب حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں اور علماء ازہر ان کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ اب شباب ازہر کا نظام تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درس گاہ دار العلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجیے میرے قدم اسی منزل میں رک گئے ہوتے اور علم و فلسفہ کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈھی گئیں، ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور نا آشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

دورِ تعلیم

تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں جب میری عمر بارہ برس سے زیادہ نہ تھی میں فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح ملا اور قطبی وغیرہ کے دور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی مجھ سے عمر میں دو برس بڑے تھے باقی اور بڑے تھے۔ ان کی عمریں بیس اکیس برس سے کم نہ ہوں گی۔ والد مرحوم کا طریق تعلیم یہ تھا کہ ہر علم میں پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کا طریق تعلیم ایسا ہی تھا چنانچہ اسی زمانے میں میں نے فقہ اکبر، تہذیب، خلاصہ کیدانی وغیرہ بر زبان حفظ کر لی تھیں اور اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بحث اٹھاتے تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انہیں منطق کے قضیوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔ اس طریقہ کے فائدہ میں کلام نہیں۔ آج تک ان متنوں کا ایک ایک لفظ حافظہ میں محفوظ ہے۔ خلاصہ کیدانی کی طرح کا شعر تک بھولا نہیں۔ کسی افغانی طالب نے ”کے دانی“ اور ”کیدانی“ کی تک بندی کی تھی۔

تو طریق صلوٰۃ کے دانی گر نہ خوانی خلاصہ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذہ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجھلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا تو باہر کے چند طلبا بھی شریک ہو جاتے لیکن ابھی چند دن بھی گزرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے استاد لوگوں سے کہا کرتے تھے: یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں۔

درس نظامیہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کی ایماء سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا

نہ جائے استعداد پختہ نہیں ہوتی۔ اس لیے فاتحۂ فراغ کی مجلس ہی میں طلبا کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا اور ان کے مصارف والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیلِ فنون کے لیے طب شروع کر دی تھی۔ خود قانون پڑھتا تھا اور طلبا کو مطول، میر زاہد، دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ بے چینی عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے چنی تھیں یک دفعہ متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم در آں روزے کہ خرمن داشتم

دماغی ترقی میں سب سے بڑی روک

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے، اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی، لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سر تا سر اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی تھی جو موروثات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے۔ تعلیم نے انہیں اور زیادہ پختہ کرنا چاہا اور گردوپیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔

علم و نظر نہ کہ تقلید و توارث

میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں، لیکن بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیاد کی پہلی اینٹ کا ہل جانا تھا کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا۔

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست

...ملی یہی بےچینی تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سہاروں سے تہی دست کر دیا تھا لیکن نئے سہارا [illegible] بھی لگادی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ جس علت نے بیمار کیا تھا [illegible] دارو نے شفا بھی ثابت ہوئی۔

درد یا دادی و درمانی ہنوز !

ہر چند سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا۔ مگر کوئی پتہ نہیں لگتا۔ کوئی تعلیل کام نہیں دیتی۔

چہ مستی است ندانم کہ رو بما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد

بلاشبہ آگے چل کر کئی حالات ایسے پیش آئے جنہوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کر دی لیکن اس وقت تک تو کسی خارجی محرک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اور ہوش و آگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے موثرات کے لیے دل و دماغ کے دروازے کھل سکتے۔

پیرزادگی اور نسلی بزرگی

یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اس وقت محسوس نہیں کرتا تھا مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضا تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جا رہا تھا۔

بوئے آں دود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید
نہ ز آتشے بود کہ در خانہ من بار گرفت

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور موثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان عقائد و افکار کا جو سانچہ ڈھالنا چاہتا تھا نہ ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی نہ لے جا سکی۔ حلقۂ صحبت کے اثرات کا جو تقاضا تھا پورا نہ ہوا۔ اس عالم اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علت سے بندھا ہوتا ہے آخر اس رشتہ کا بھی تو کوئی سرا ملنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو۔ اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈ نکالے۔ مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

پندرہ برس سے چوبیس برس تک

جس نامراد ہستی کو چودہ پندرہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو وہ اگر کچھ عرصے کے لیے شاہراہ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشت وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟ ایک عرصہ تک اسی طرح کی سرگردانیوں میں نشان راہ گم رہا۔ نہ مقصد کی خبر مل سکی نہ منزل کی۔

سگ آستانم، اما ہمہ شب قلادہ خایم   کہ سر شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی
عجب ست گر نباشد خضرے بہ تیرہ بختیم   کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلال زندگانی

لیکن جس ہاتھ نے زمانے کی آغوش سے کھینچا تھا بالآخر اسی نے دشت نوردیوں کی تمام بے راہ رویوں میں راہنمائی بھی کی اور اگرچہ قدم قدم

ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا اور پیچھے پیچھے رکاوٹوں سے الجھنا پڑا۔ اگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھاتے لیے گئی اور کبھی درمیانی منزلوں میں رک کر دم نہ لے۔ بالآخر پایا تو اس وقت پایا جب منزل مقصود سامنے جلوہ گر تھی، اور اس کی گرد راہ روشن ہو رہی تھی۔

بہ گلشن نازکم صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخ بلندے آشیاں دارم

پھر بیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

زمانے سے الٹی چال

گویا اس معاملہ میں بھی اپنی چال الٹی ہی رہی، لوگ زندگی کے جس مرحلے کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروان رفتار عمر منزل خمسین سے بھی گزر چکا، فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمائیوں کے نقوش جابجا بنانے پڑے۔ وقت یا تو انہیں مٹا دے گا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے یا محفوظ رکھے گا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے۔

آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویر خود بہ لوح دگر می کشیم ما

دو طریقے

یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ جنہیں ابو طالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے۔

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا، ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا۔

کار مشکل بود ما بر خویش آساں کردہ ایم

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ منزل راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں، نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر ہوتے ہیں، تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں کیونکہ قدم اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ بار بار ان کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر ان کے عزم و ہمت سے الجھتی رہتی ہیں، تاہم ان کا سفر جاری رہتا ہے

[illegible] پہنچ سکتے تھے، لیکن زمانہ کے اوپر سے گزر جاتے تھے اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔

وقتِ ہلالی خوش کہ نگشود و دگر در بر رخش
ہر در کہ گشودہ ساکن شدہ و در دیگر نہ زد
(غبار خاطر)

[illegible]

والی حکایت

میر تقی والی حکایت مندرجہ یادگارِ غالب عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیںؔ۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب ملا عبدالصمد میرے مکان پر آ کر مقیم ہوا فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقعہ ملا ہو گا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا جن سے سراج الدین علی خاں آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگان مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو اور ندرت و طرافت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا ہو، حتیٰ کہ میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا دیا ہو؟

ذاتی حالات

اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا لیکن محض رفع غرابت کے لیے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو پنج بہادر نکالا کرتے تھے، ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعرا اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔

ابتدائی غزل

ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔ ع
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر ان مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کیے

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آ تو بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

ؔ سوال یہ تھا آیا یہ درست ہے کہ مرزا غالب کے اشعار دیکھ کے میر تقی کہنے لگے: اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ حالانکہ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ مولانا نے اپنے ابتدائی حالات اسی سلسلے میں بیان فرمائے اور [illegible] کسی دوسرے ذریعے سے نہیں مل سکتے تھے۔

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی کہ چھپن ں وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں وہ غزل چھپ کر آئی تھی اور یں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

نادر شاہ خاں شوخی

اس زمانے میں میرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں۔ وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے طرح بتلائی۔ یاد نہ ہو، شاد نہ ہو۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
ہیں تو مجبور نہ کہیں ان کو بھی یاد نہ ہو

کہنے لگے "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی"۔ اس وقت سوچتا ہوں تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

لسان الصدق

پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ "مخزن" نیا نیا نکلا تھا اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر "خدنگ نظر" نکالا کرتے تھے اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کریں اور اس کی ترتیب اپنے ذمے لے لی۔ اسی زمانہ میں مولوی احمد حسن مرحوم فتح پوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیے۔ چنانچہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ یہ سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

پہلی تقریر

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ رسم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصے تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔ اس لیے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ ان میں [illegible] کے ایک [illegible] صاحب تھے جن کی داڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔

اسی زمانے میں تقریر کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر غالباً سنہ ۱۹۰۳ء میں کی۔ اس وقت عمر پندرہ برس تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر گوئی کرنی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں۔ اگر اس عمر میں میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لیے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لیے پیدا کیا تھا، یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے!

ترک و اختیار

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے

[illegible] ———— ۱۸۴۳

[illegible] میز پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیر اثر پہلے ہاتھ بڑھایا کہ اسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورت حال کا احساس ہوا تو رک گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، اصرار کیا کہ ضرور جیب میں رکھ لو، میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگریٹ تھے۔ [illegible] ان کے آفس میں پیا، دوسرا راستہ میں سلگایا، دو ساتھیوں کو پیش کیے، چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر کے اندر جانے لگا تو خیال ہوا اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگریٹوں کے نذر کر دیا اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سگریٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض شرب الیہود[1] کا طریقہ کام میں لاتے تھے۔ ع

شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

بعضوں کی جرأت رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ لا تسقنی سراً فقد امکن الجہار پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے ترکِ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیئے۔

خوشم کہ توبہ من نرخ بادہ ارزاں کرد

سرگزشت کا اصل واقعہ اب سنیے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ مجبوری پر ماتم ہوا تھا، حصول پر نشاط ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا۔

حریف ساقی و دور می نہ خطا ایں جاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی بلا ایں جاست

سنہ ۴۲ء کے بعد پھر تیسری مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا۔ لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔ (غبار خاطر)

آنچہ دل از گرمی آں می سوخت ہم بگذرد
آنچہ از بے مہری گردوں بجاں ہم ساختیم

بیگم کے انتقال کا سانحہ

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ پہلی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

داغ بر فلک و دل ہوائے حیرتی   یکرنگ حرف نزدم دل کجا و داغ کجا

---

[1] یعنی چھپ کر پینا اور کم پینا۔ عراقی سلطنتوں میں یہودیوں کا یہی طریقہ تھا۔

بیگم کی علالت

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں احمد نگر جیل میں قید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام مدت کم و بیش علالت کی حالت رہی۔ قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹر سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں، میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی۔

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

آخری وداع

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتے کے بعد کلکتے واپس ہوا اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان نہیں آیا تھا مگر طوفانی آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی وجہ سے حکومت کو غیر معمولی اختیارات مل گئے ہیں اور ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر جا کر آتی تھی۔ اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے سفروں کے درمیان بسر کیے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن ہم دونوں کی خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست ۱۹۴۲ء کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

غور ما بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوا کہ یہ افواہیں بے اصل نہیں تھیں۔ [illegible] گرفتار کر کے جنوبی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات بھی ہو گئے تھے لیکن [illegible] رکھا جائے اور ہمیں [illegible] ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا [illegible] حاصل ہو جائے گا۔ (م)

[illegible] کی روحانی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال [illegible] ہولناک صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات [illegible] اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

[illegible] کا ڈھنگ پلٹ گیا

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہو گا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور ہمیشہ اس کی تلخی ہمارے دلوں میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور مدتوں میں اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آ سکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹا لی گئی تو ۱۰ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی، اس لیے گھر کے بعض اور عزیزوں سے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۵ فروری کو مجھے ایک خط ۳ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتے کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

خطرناک علالت کی اطلاع

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتے سے ملا ہے۔ نہیں معلوم یہ ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہمارے قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ابتدا سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آ سکتا ہے، کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعے نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے، وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے، بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لیے مجھے کوئی تار بھی ایک ہفتے سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتے سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا اس میں خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ [illegible]